تفسیر، حدیث، فقہ، تصوف اور اسرار شریعت کا حسین مجموعہ

ایک عظیم انسائیکلوپیڈیا

جلد چہارم

احیاء علوم الدین

جدید اور بامحاورہ سلیس ترجمہ

مذاق العارفین

مصنف

حجۃ الاسلام امام ابو حامد محمد الغزالیؒ

جدید ترجمہ: مولانا ندیم الواجدی فاضل دیوبند

دار الاشاعت

اردو بازار، کراچی ۱ فون ۲۶۳۱۸۶۱

باہتمام : خلیل اشرف عثمانی
طباعت : شکیل پرنٹنگ پریس
ناشر : دارالاشاعت کراچی ۱
ضخامت : صفحات

بسم تعالیٰ

میں ندیم الواجدی ولد واجد حسین ساکن دیوبند ضلع سہارنپور یوپی بھارت نے احیاء علوم الدین (اصل تصنیف عربی میں ہے) مصنف امام غزالیؒ جس کا ترجمہ اردو میں جدید انداز سے کیا ہے۔ اس کو پہلے ہندوستان میں شائع کیا ہے۔ میں اس کے کاپی رائٹ پاکستان کے لئے خلیل اشرف عثمانی مالک دارالاشاعت اردو بازار کراچی کو رجسٹرڈ کر دیتا ہوں کہ وہ اسے کمپیوٹر کتابت سے آراستہ کر کے جدید اور معیاری انداز سے شائع کریں گے

Ownership of Copy Right پاکستان میں خلیل اشرف عثمانی کے پاس ہوں گے۔ وہ چاہیں تو کاپی رائٹ آفس میں اپنے نام رجسٹرڈ کرا سکتے ہیں مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔

ندیم الواجدی
مترجم احیاء العلوم و مالک دارالکتاب دیوبند
یو پی۔ انڈیا

ملنے کے پتے

بیت القرآن اردو بازار کراچی ۱
ادارۃ القرآن گارڈن ایسٹ بیلہ کراچی ۵
ادارۃ المعارف کورنگی کراچی ۱۴
مکتبہ دارالعلوم دارالعلوم کورنگی کراچی ۱۴
ادارۂ اسلامیات ۱۹۰۔ انارکلی۔ لاہور
بیت العلوم ۲۶ نابھہ روڈ انارکلی لاہور

کشمیر بکڈپو : چنیوٹ بازار فیصل آباد
مکتبہ سید احمد شہید : اردو بازار لاہور
مکتبہ رحمانیہ : ۱۸۔ اردو بازار لاہور
کتب خانہ رشیدیہ : راجہ بازار راولپنڈی
یونیورسٹی بک ایجنسی : خیبر بازار پشاور
مکتبہ امدادیہ : ٹی بی ہسپتال روڈ ملتان

فہرست مضامین

جلد چہارم

کتاب الخوف والرجاء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کتاب التوبہ

توبہ کا بیان

توبہ کی ضرورت گناہوں سے تائب ہونا' اور غیبوں کے جاننے والے اور عیبوں کو چھپانے والے کی طرف رجوع کرنا راہ سلوک کا پہلا قدم ہے' اور منزل تک پہنچنے والوں کی گراں قیمت پونجی ہے' سالکین طریقت سب سے پہلے توبہ کا راستہ اختیار کرتے ہیں' توبہ گم کردہ راہ لوگوں کے لئے استقامت کی کنجی ہے' مقربین اسی سے تقرب حاصل کرتے ہیں' انبیاء اسی کے ذریعہ سعادت پاتے ہیں' خاص طور پر ہمارے جد امجد حضرت آدم علیہ السلام کے لئے توبہ ہی نجات اور بلندئ درجات کا باعث بنی' اپنے آباؤ اجداد کی اقتداء کرنا اولاد ہی کے شایان شان ہے' اگر کسی سے کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو یہ بات حیرت انگیز نہیں کیوں کہ خطا کار آدم کی اولاد ہے' لیکن کیوں کہ باپ نے توبہ کے ذریعہ اپنی خطا کی تلافی کی تھی اس لئے بیٹے کے لئے بھی ضروری ہے کہ وہ ان دونوں باتوں میں باپ کے مشابہ ہو' حضرت آدم علیہ السلام نے خطا کی' لیکن وہ طویل مدت تک ندامت کے آنسو بہاتے رہے' اگر کوئی شخص صرف خطا میں انھیں اپنا مقتدی سمجھے اور توبہ میں ان کی تقلید نہ کرے وہ گمراہ ہے' ناخلف ہے' اسے اپنے باپ کی طرف نسبت کرنے اور اقتدی کا دعویٰ کرنے کا حق حاصل نہیں ہے' حق بات یہ ہے کہ خیر کا ہو کر رہ جانا ملائکہ مقربین کا شیوہ ہے' اور صرف شر میں مشغول ہونا شیطان کا مشغلہ ہے' شر میں پڑکر خیر کی طرف رجوع کرنا انسان کا کام ہے' اس کی سرشت میں دونوں خصلتیں پائی جاتی ہیں' خیر کی خصلت بھی اور شر کی خصلت بھی' اب یہ خود اس پر موقوف ہے کہ وہ انسان بنے یا شیطان کی طرف منسوب ہو' اگر کوئی شخص گناہ کے بعد تائب ہوتا ہے تو یہ کہا جائے گا کہ اس نے اپنی انسانیت کیلئے دلیل فراہم کی ہے اور سرکشی پر اصرار کرنے والے کے متعلق کہا جائے گا کہ وہ اپنے آپ کو شیطان کی طرف منسوب کرانا چاہتا ہے جہاں تک ملائکہ کی طرف نسبت کا سوال ہے تو یہ انسان کے دائرہ امکان سے خارج ہے کہ وہ صرف نیک اعمال کرے اس سے گناہ سرزد نہ ہو' اس لئے کہ خمیر میں شر اور خیر دونوں کی ایسی پختہ آمیزش ہے کہ صرف ندامت کی حرارت یا دوزخ کی آگ ہی سے ان دونوں میں جدائی ہو سکتی ہے' انسانی جوہر کو شیطانی خباثت سے پاک کرنے کیلئے ضروری ہے کہ اسے ان دونوں حرارتوں میں سے ایک میں ڈالا جائے اب یہ اس کے اختیار کی چیز ہے کہ وہ کونسی حرارت پسند کرتا ہے جس حرارت کو ہلکی سمجھے اسی کی طرف سبقت کرے ورنہ موت کے بعد مہلت نہیں ہے وہاں یا جنت میں ٹھکانہ ہوگا یا دوزخ میں۔

دین میں توبہ کا ایک اہم مقام ہے' اس لئے منجیات کے ابواب میں اس کا سب سے پہلے ذکر کرنا ضروری ہے' تاکہ سالک کے سامنے اس کی حقیقت' شرائط' اسباب' علامات' ثمرات' آفات و موانع اور طریقۂ علاج کی تفصیل آجائے' یہ تمام امور چار ابواب میں بیان کئے جائیں گے۔

پہلا باب

توبہ کی حقیقت اور تعریف

توبہ کی تعریف : توبہ تین چیزوں کا نام ہے جو بالترتیب پائی جاتی ہیں' اول علم' دوم حال اور سوم فعل۔ ان میں پہلا دوسرے کے لئے اور دوسرا تیسرے کے لئے موجب ہے یہ نظم و ترتیب ملک اور ملکوت میں اللہ تعالیٰ کی سنت کے مطابق ہے' اب ان تینوں

کی الگ الگ تفصیل کی جاتی ہے۔

علم' حال' اور عمل : علم سے مراد یہ جاننا ہے کہ گناہوں کے بے شمار نقصانات ہیں ان میں سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ یہ گناہ بندے اور اس کے محبوب کے درمیان حجاب بن جاتے ہیں' جب یہ حقیقت دل پر غالب آجاتی ہے کہ گناہ سے انسان اپنے محبوب سے محروم ہو جائیگا تو اس معرفت سے وہ تکلیف محسوس کرتا ہے کیونکہ اسے محبوب سے محروم رہنا کسی بھی حالت میں گوارہ نہیں ہوتا اس لئے وہ اپنے اس فعل پر افسوس کرتا ہے جو اس سے سرزد ہوا ہے' اور جو اس کے اور محبوب کے درمیان حجاب بنا ہے' اس افسوس کو ندامت کہتے ہیں اور یہی توبہ کی دوسری چیز یعنی حال ہے' پھر جب یہ رنج دل پر غالب آتا ہے تو اس سے ایک حالت اور پیدا ہوتی ہے جسے فعل کا قصد و ارادہ کہتے ہیں' اس فعل کا تعلق تینوں زمانوں سے ہوتا ہے' زمانہ حال سے اس طرح کہ جو گناہ پہلے کیا کرتا تھا' وہ چھوڑ دے مستقبل سے اس طرح کہ آنے والی زندگی میں اس گناہ کو چھوڑنے کا عزم کرے جو محبوب کے ملنے میں حارج ہے اور ماضی سے اس طرح کہ اس گناہ سے جو نقصان ہوا ہے اگر وہ قابل تلافی ہے تو اس کی تلافی کرے۔

حال قصد و ارادہ اور فعل ان تمام امور کا سرچشمہ علم ہے جسے ہم ایمان و یقین بھی کہہ سکتے ہیں ایمان اس حقیقت کی تصدیق کا نام ہے کہ گناہ مہلک زہر ہیں اور یقین اس تصدیق کا دل میں اسطرح راسخ ہو جانا ہے کہ کسی طرح کا کوئی شک باقی نہ رہے جب ایمان و یقین کا نور دل کے مطلع پر چھا جاتا ہے' تو اس سے دل میں رنج و غم اور ندامت کی آگ بھڑک اٹھتی ہے کیوں کہ وہ اس نور کی روشنی میں یہ دیکھتا ہے کہ وہ اپنے فلاں عمل کی وجہ سے محبوب سے دور ہو گیا' جیسے کوئی شخص اندھیرے میں ہو کہ اچانک رات کے پہلو سے سپیدہ سحر نمودار ہو یا ابر چھٹے اور سورج طلوع ہو اور اچانک محبوب نظر آئے' اور وہ ہلاکت کے قریب ہو' تو دل میں محبت کی آگ شعلہ زن ہوتی ہے' اور اسکی حرارت اسے اس بات پر آمادہ کرتی ہے کہ کوئی نہ کوئی تدبیر ضرور کی جائے' اسی طرح جب گناہ ہلاکت سے قریب کر دیتے ہیں تو ایمان و یقین کی شمع اسے تدارک کے راستے دکھلاتی ہے۔ غرضیکہ علم' ندامت اور زمانہ حال و استقبال میں ترک گناہ اور ماضی میں تلافی' مافات کے قصد و ارادے کے مجموعے کا نام توبہ ہے۔

توبہ اور ندامت : کبھی ندامت اور توبہ ایک ہی مفہوم کے لئے بولے جاتے ہیں' اس صورت میں علم کو اس کا مقدمہ اور ترک گناہ کو اس کا ثمرہ کہتے ہیں۔ اسی اعتبار سے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

اَلنَّدَمُ تَوْبَةٌ (ابن ماجہ' ابن حبان' ابن مسعود)

ندامت توبہ ہے۔

ندامت کے لئے ضروری ہے کہ وہ کسی وجہ سے ہوئی ہو' اور بعد میں اس پر کچھ ثمرہ بھی مرتب ہوا ہو' اس طرح گویا ندامت اپنے دونوں طرفوں علم اور قصد کو شامل ہے' اور اپنے سبب اور مسبب دونوں کے قائم مقام ہے اس لحاظ سے کسی شخص نے توبہ کی یہ تعریف کی ہے کہ توبہ سابقہ غلطی پر باطن کا سوز ہے' بعض لوگوں نے کہا ہے کہ توبہ ایک آگ ہے جو دل میں بھڑکتی ہے اور درد ہے جو جگر سے جدا نہیں ہوتا' کسی شخص نے ترک گناہ کا لحاظ کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ توبہ جفا کا لباس اتار کر وفا کی بساط بچھانے کا نام ہے' سہیل ابن عبد اللہ تستری فرماتے ہیں کہ توبہ مذموم اخلاق کو محمود اوصاف سے بدلنے کا نام ہے' اور یہ بات گوشہ نشینی' سکوت اور اکل حلال کے بغیر حاصل نہیں ہوتی' سہیل ابن عبد اللہ نے غالباً توبہ کی تیسری تعریف کی طرف اشارہ کیا ہے' توبہ کی تعریف میں اور بہت سے اقوال ہیں' ہم یہاں صرف چند اقوال کے ذکر پر اکتفا کرتے ہیں' جو شخص ان باتوں کو جان لے جو ہم نے بیان کی ہیں' ان کے درمیان ربط و ترتیب بھی سمجھ لے تو وہ یقیناً یہی کہے گا کہ توبہ کی اس تعریف میں جس قدر جامعیت ہے وہ دوسری تعریفوں میں نہیں ہے' مقصود توبہ کی حقیقت جاننا ہے الفاظ کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔

توبہ کا وجوب اور اسکے فضائل : اخبار و آیات سے صاف ظاہر ہے کہ توبہ واجب ہے' جس شخص کو اللہ نے نور بصیرت

سے نوازا ہے' اور ایمان کی روشنی سے اس کا سینہ منور کیا ہے' یہاں تک کہ وہ تاریک راستوں میں اپنے ایمانی نور کی روشنی میں چلتا ہے اور منزل تک پہنچنے کے لئے کسی رہنما اور دستگیر کی ضرورت محسوس نہیں کرتا وہ جانتا ہے کہ توبہ ایک امر واجب ہے (۱) جس طرح چلنے والوں کی دو قسمیں ہوتی ہیں' ایک وہ جو دیدہ بینا رکھتے ہیں' اور وہ آگے بڑھنے کے لئے کسی کی اعانت کے محتاج نہیں ہوتے' اور دوسرے وہ جو بصارت سے محروم ہوتے ہیں اور کسی کی اعانت کے بغیر قدم نہیں بڑھا پاتے' اسی طرح سالکین دل کی دو قسمیں ہیں بعض لوگ وہ ہیں جو صرف تقلید کرسکتے ہیں' وہ قدم قدم پر قرآن یا حدیث کے کسی نص صریح کی حرارت محسوس کرتے ہیں' اور جہاں کہیں انھیں نصوص نہیں ملتیں وہاں حیران کھڑے رہ جاتے ہیں' ایسے لوگوں کا سفر طول عمر' اور مسلسل محنت و مشقت کے باوجود مختصر ہوتا ہے' ان کے قدم بھی چھوٹے ہوتے ہیں' رفتار بھی سست ہوتی ہے' گرتے پڑتے زندگی کا سفر پورا کرتے ہیں' اور بعض لوگ جنھیں بجا طور پر نیک بخت اور خوش قسمت کہا جاسکتا ہے وہ ہیں جن کے سینے اللہ تعالیٰ نے اسلام کے لئے کھول دئے' اور جن کے دلوں میں ایمان کے اجالے بھر دئے' وہ اپنے رب کے عطا کردہ نور کے حامل ہیں' ذرا سی رہنمائی سے راہ سلوک کی مشکلات پر قابو پالیتے ہیں' اور بڑی سہولت سے دشوار گزار وادیاں اور گھاٹیاں طے کرلیتے ہیں' ان کے دل میں نور ایمان اور نور قرآن کی شمعیں روشن ہیں' اور اس نور کی شدت کے باعث ان کے لئے ذرا سی رہنمائی' معمولی تنبیہ اور ادنیٰ اشارے کافی ہوجاتے ہیں' ان کی مثال ایسی ہے۔

یَكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ (پ۱۸ر۱۱ آیت ۳۴)

اسکا تیل (اس قدر صاف اور سلگنے والا ہے کہ) اگر اسکو آگ بھی نہ چھوئے تو ایسا لگتا ہے کہ خود بخود جل اٹھے گا۔

آگ لگانے یعنی بتلانے کے بعد ان کی یہ مثال ہوجاتی ہے کہ

نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ يَهْدِى اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ (پ۱۸ر۱۱ آیت ۳۴)

اور (جب آگ بھی لگ گئی) تو نور علی نور ہے اللہ تعالیٰ اپنے (اس) نور تک جس کو چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے۔

ایسا شخص ہر واقع میں نص منقول کا محتاج نہیں ہوتا' جس شخص کی یہ حالت ہوتی ہے اگر وہ وجوب توبہ کا علم حاصل کرنا چاہے تو کسی منقول نص کی جستجو نہیں کرتا' بلکہ اپنے نور بصیرت کے ذریعہ پہلے یہ دیکھتا ہے کہ توبہ کسے کہتے ہیں' اور وجوب کے معنی کیا ہیں' پھر توبہ اور وجوب دونوں کے معنوں میں جمع کرتا ہے اور کسی شک کے بغیر یہ جان لیتا ہے کہ توبہ کے لئے وجوب ثابت ہے۔

وجوب کے معنی: پہلے وہ یہ جانتا ہے کہ واجب اور ضروری وہی چیز ہے جو ابدی سعادت حصول کا ذریعہ اور دائمی ہلاکت سے نجات کا باعث ہو' اسلئے کہ اگر کسی چیز کے کرنے یا نہ کرنے سے سعادت یا شقاوت کا تعلق نہ ہو تو اسکے واجب ہونے کے کوئی معنی نہیں جہاں تک کہنے والے کے اس قول کا تعلق ہے کہ فلاں کام واجب کرنے سے واجب ہوگیا تو یہ محض لفاظی ہے' حقیقت سے اس کا ذرا واسطہ نہیں ہے اسلئے کہ جن چیزوں سے حال یا مستقبل میں ہماری کوئی غرض وابستہ نہیں ہے' ان میں مشغول ہونے سے ہمیں کیا فائدہ ہوگا خواہ کوئی انھیں ہم پر واجب کرے یا نہ کرے اس سے معلوم ہوا کہ واجب وہی چیز ہے جو دائمی سعادت کے حصول کا ذریعہ ہو چنانچہ جب وہ واجب کے معنی جان لیتا ہے' اور یہ بھی جان لیتا ہے کہ قیامت کے دن دیدار الٰہی سے بڑھ کر کوئی دوسری سعادت نہیں ہے' نیز جو شخص اس سعادت عظمیٰ سے محروم رہتا ہے' اس کی بدبختی میں کوئی شبہ نہیں ہے' دیدار الٰہی کی

---

(۱) توبہ کے وجوب پر اس طرح کی روایات دلالت کرتی ہیں' مسلم میں اغر المزنی کی روایت "يَا أَيُّهَا النَّاسُ تُوْبُوْا إِلَى اللّٰهِ" ابن ماجہ میں حضرت جابر کی روایت "يَا أَيُّهَا النَّاسُ تُوْبُوْا إِلٰى رَبِّكُمْ قَبْلَ أَنْ تَمُوْتُوْا"

سعادت سے وہ شخص محروم رہتا ہے' جو خواہشات نفس کا اسیر ہو یہ خواہشات اللہ کے اور اسکے درمیان حجاب بن جائیں گی' وہ آتش فراق میں بھی جھلسے گا اور دوزخ کی آگ میں بھی جلے گا' وہ یہ بھی جان لیتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ملاقات اور اس کے دیدار سے بندہ اسی وقت دور ہوتا ہے' جب وہ نفسانی خواہشات میں مبتلا ہو' عالم فانی سے انس رکھتا ہو اور ان چیزوں پر گرتا ہو جن سے بچنا نجات کیلئے ناگزیر ہے' دیدار الٰہی سے قریب تر وہی شخص ہے جو دنیا کی چمک دمک والی چیزوں سے اپنے قلب کا تعلق قطع کر کے ہمہ تن اللہ کی طرف متوجہ ہو جائے اس کی یاد اور اس کے ذکر سے انسیت پیدا کرے اور اپنی ہمت کے بقدر اس کے جلال و جمال کی معرفت حاصل کرے اور اس سے محبت کرے اور وہ یہ بات بھی سمجھ لیتا ہے کہ جن گناہوں کے باعث میں اللہ تعالیٰ سے منحرف' اس کا عاصی اور نافرمان اور شیطان مردود کا متبع کہلاتا ہوں ان ہی کی وجہ سے میں بارگاہ خداوندی سے محجوب ٹھہروں گا اور راندۂ درگاہ کہلاؤں گا۔ ان تمام باتوں کے جاننے کے بعد وہ شخص کبھی اس حقیقت میں شک نہیں کرے گا کہ قرب الٰہی کے لئے اس راستے سے انحراف کرنا ضروری ہے جو قرب سے دور کرتا ہے۔ اور دوری کی راہ سے انحراف ان تین باتوں کے بغیر ممکن نہیں جنہیں علم' ندامت اور عزم کہتے ہیں' اسلئے کہ جب تک یہ بات معلوم نہیں ہوگی کہ گناہ محبوب سے دوری کے اسباب ہیں اس وقت تک ندامت نہیں ہوگی' اور نہ دوری کی راہ پر چلنے سے تکلیف محسوس کرے گا' اور جب تک درد کی راہ سے نہیں گزرے گا اس وقت تک واپسی کا تصور بھی نہیں کرے گا' واپسی کے معنی ہیں ترک گناہ کا عزم کرنا' اس سے معلوم ہوا کہ محبوب تک پہنچنے کے لئے یہ تینوں معانی ضروری ہیں یہ ان لوگوں کی حالت کا بیان ہے جنہیں نور بصیرت سے ایمان حاصل ہوتا ہے' مگر جو لوگ اس مرتبے کے قابل نہیں جیسا کہ اکثر لوگوں کا یہی حال ہے ان کیلئے تقلید اور اتباع کی بڑی گنجائش ہے' وہ اس راہ سے سلامتی حاصل کر سکتے ہیں' اپنی زندگی کا سفینہ ساحل مراد تک لے جا سکتے ہیں' ان ہی لوگوں کیلئے توبہ کے سلسلے میں وارد آیات قرآن' احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور اقوال سلف درج کئے جاتے ہیں' اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ۔

وَتُوبُوا إِلَى اللّٰهِ جَمِيعًا أَيُّهَ الْمُؤْمِنُونَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ (پ ۱۸ ر ۱۰ آیت ۳۰)

اور مسلمانو تم سب اللہ کے سامنے توبہ کرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔

اس میں تمام اہل ایمان کو توبہ کا حکم دیا گیا ہے۔ ایک جگہ ارشاد فرمایا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا تُوبُوا إِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَصُوحًا (پ ۲۸ ر ۲۰ آیت ۸)

اے ایمان والو تم اللہ کے سامنے سچی توبہ کرو

نصوح کے معنی یہ ہیں کہ توبہ صرف اللہ کے لئے ہو' اسمیں کسی طرح کی آمیزش نہ ہو' یہ لفظ نصح سے مشتق ہے جسکے معنی ہیں خلوص' توبہ کی فضیلت پر قرآن کریم کی یہ آیت دلالت کرتی ہے۔

إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ (پ ۲ ر ۱۲ آیت ۲۲۲)

اللہ تعالیٰ محبت رکھتے ہیں توبہ کرنے والوں سے اور محبت رکھتے ہیں پاک و صاف رہنے والوں سے

حدیث شریف میں ہے

التَّائِبُ حَبِيبُ اللّٰهِ (ابن ابی الدنیا۔ انس)

توبہ کرنے والا اللہ کا دوست ہے۔

اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَا ذَنْبَ لَهُ (ابن ماجہ۔ ابن مسعود)

گناہ سے توبہ کرنے والا اس شخص کی مانند ہے جس پر کوئی گناہ نہیں۔

لِلّٰهِ أَفْرَحُ بِتَوْبَةِ الْعَبْدِ الْمُؤْمِنِ مِنْ رَجُلٍ نَزَلَ فِي أَرْضٍ دَوِيَّةٍ مُهْلِكَةٍ مَعَهُ رَاحِلَتُهُ عَلَيْهَا طَعَامُهُ وَشَرَابُهُ فَوَضَعَ رَأْسَهُ فَنَامَ نَوْمَةً فَاسْتَيْقَظَ وَقَدْ ذَهَبَتْ رَاحِلَتُهُ فَطَلَبَ حَتّٰى اشْتَدَّ عَلَيْهِ الْحَرُّ وَالْعَطَشُ أَوْ مَا شَاءَ اللّٰهُ قَالَ أَرْجِعُ إِلٰى مَكَانِي الَّذِي

كُنتُ فِيهِ فَأَنَامُ حَتّٰى أَمُوتَ فَوَضَعَ رَأْسَهُ عَلٰى سَاعِدِهِ لِيَمُوتَ فَاسْتَيْقَظَ فَإِذَا رَاحِلَتُهُ عِنْدَهُ عَلَيْهَا زَادُهُ وَشَرَابُهُ فَاللّٰهُ تَعَالٰى أَشَدُّ فَرَحًا بِتَوْبَةِ الْعَبْدِ الْمُؤْمِنِ مِنْ هٰذَا بِرَاحِلَتِهِ (مسلم۔ انس۔ بخاری و مسلم۔ ابن مسعودؓ)

ایک شخص ناموافق اور مہلک سرزمین میں فروکش ہو' اس کے ساتھ اس کی سواری ہو جس پر کھانے پینے کا سامان لدا ہوا ہو' وہ شخص زمین پر سر رکھ کر سو جائے' جب آنکھ کھلے تو دیکھے کہ سواری گم ہے اس کی تلاش میں نکلے' یہاں تک کہ گرمی و پیاس کی وجہ سے حالت دگرگوں ہو جائے اور یہ کہنے لگے کہ میں جہاں تھا وہیں چلا جاؤں' اور سو رہوں یہاں تک کہ مر جاؤں' چنانچہ وہ مرنے کے لئے اپنے بازو پر سر رکھ کر سو جائے' جب جاگے تو یہ دیکھے کہ اسکی سواری کھانے پینے کی اشیاء کے ساتھ اسکے سامنے موجود ہے' یہ شخص اپنی سواری کی بازیافت سے جس قدر خوش ہوتا ہے اس سے زیادہ اللہ تعالیٰ اپنے بندۂ مومن کی توبہ سے خوش ہوتا ہے۔

ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ وہ اپنی سواری کے ملنے سے اس قدر خوش ہو کہ الفاظ میں تقدیم و تاخیر کی تمیز کھو بیٹھے' اور یہ الفاظ اس طرح نکلیں کہ اے اللہ تو میرا بندہ اور میں تیرا پروردگار ہوں۔

آدم علیہ السلام کی تہنیت: حضرت حسن سے مروی ہے کہ جب حضرت آدم علیہ السلام کی توبہ قبول ہوئی تو فرشتوں نے انھیں مبارک باد پیش کی' حضرت جبرئیل علیہ السلام اور میکائیل علیہ السلام اسکے پاس تشریف لائے اور کہنے لگے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی توبہ قبول فرمائی' اور آپ کے دل کو سکون بخشا' حضرت آدم علیہ السلام نے فرمایا کہ اگر اس توبہ کے بعد بھی قیامت کے روز مجھ سے سوال ہوا تو کیا ہو گا اللہ تعالیٰ نے وحی نازل فرمائی کہ اے آدم تیری اولاد کو تجھ سے معصیتیں بھی وراثت میں ملی ہیں اور توبہ بھی' ان میں سے جو شخص مجھے پکارے گا میں اسکی پکار سنوں گا جس طرح تیری پکار سنی ہے اور جو شخص مجھ سے مغفرت کا خواستگار ہو گا میں اس کی مغفرت کرنے میں بخل نہیں کروں گا' اسلئے کہ میں قریب ہوں' مجیب ہوں۔ اے آدم! میں توبہ کرنے والوں کو ان کی قبروں سے ہنستے ہوئے اور بشارت سنتے ہوئے اٹھاؤں گا' ان کی دعا قبول ہوگی۔ توبہ کے وجوب کے سلسلے میں بے شمار روایات اور آثار موجود ہیں اس پر امت کا اجماع بھی ہے' اس لئے کہ توبہ کے معنی یہ ہیں کہ بندہ کو اس بات کا علم ہو کہ معاصی مہلک ہیں اور اللہ سے دور کرنے والے ہیں اور یہ بات وجوب ایمان میں داخل ہے' مگر کبھی اس سے غفلت ہو جاتی ہے' اور توبہ کے ذریعہ اسکا تدارک کیا جاتا ہے' پچھلے صفحات میں توبہ کی تعریف میں علم کا ذکر کیا گیا تھا' اس سے مراد اسی غفلت کا ازالہ ہے' اور اس علم کے وجوب میں کوئی شبہ نہیں ہے' توبہ کی تعریف میں یہ بھی داخل ہے کہ زمانۂ حال میں معاصی ترک کر دیئے جائیں' مستقبل میں ترک کا عزم کیا جائے' اور ماضی میں جو تقصیر ہو چکی ہے اس کا تدارک کیا جائے' ظاہر ہے اس کے وجوب میں بھی کوئی شبہ نہیں کیا جاسکتا' ماضی کے افعال پر ندامت اور حزن بھی واجب ہے' کیوں کہ حزن و ندامت ہی توبہ کی روح ہے' اور ماضی کے گناہوں کا تدارک اسی طرح ہوتا ہے' اور ظاہر ہے جس سے توبہ کی تکمیل اور ماضی کی تلافی ہو وہ واجب کیسے نہ ہو گی' یہ تو ایک طرح کا رنج ہے جو اس معرفت کے بعد پیدا ہوتا ہے کہ میں نے اپنی عمر اللہ کی نافرمانی میں گزار دی۔

اختیار و قدرت کا مسئلہ: اگر یہ کہا جائے کہ قلب کا غمگین ہونا ایک امر ضروری ہے' اس پر بندے کو اختیار نہیں ہے' اسلئے قلب کے حزن کو واجب قرار نہیں دیا جاسکتا' اس کا جواب یہ ہے کہ اس حزن کا سبب یہ ہے کہ بندے کو محبوب کے نہ ملنے کا قطعی علم ہوا ہے' اور وہ اس علم کے سبب کو حاصل کرنے کا اختیار رکھتا ہے اسی اعتبار سے علم وجوب میں داخل ہے اس لئے نہیں کہ بندہ خود علم کو پیدا کرنے والا ہے' کیونکہ یہ محال ہے' بلکہ' ندامت' فعل' ارادہ' قدرت قادر سب اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ چیزیں ہیں' اور اس کے فعل سے انھیں وجود حاصل ہوا ہے' ارشاد ربانی ہے۔

وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ (پ ۲۳ ر ۷ آیت ۹۶)

حالانکہ تم کو اور تمہاری بنائی ہوئی چیزوں کو اللہ ہی نے پیدا کیا ہے۔

ارباب بصیرت کے نزدیک یہی صحیح ہے' باقی گمراہی ہے' تاہم یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ بندے کو فعل اور ترک فعل کا اختیار حاصل ہے یا نہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ بندے کو اختیار حاصل ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ بندے کا اختیار اس کی تخلیق ہے بلکہ تمام چیزیں ان میں بندے کے اختیارات بھی داخل ہیں اللہ تعالیٰ کی تخلیق ہیں لہٰذا وہ اپنے ان اختیارات میں جو اسے اللہ کی طرف سے عطا ہوئے ہیں مجبور ہے' مثلاً اللہ تعالیٰ نے انسان کا ہاتھ صحیح سالم پیدا کیا' لذیذ کھانا پیدا کیا' معدے میں کھانے کی خواہش پیدا کی' اور دل میں یہ علم پیدا کیا کہ کھانے سے معدہ کی خواہش پوری ہوتی ہے' اور یہ تردد بھی پیدا کیا کہ اس کھانے میں کوئی ضرر بھی ہے جس کے باعث اس کا کھانا مشکل ہو جائے' پھر یہ علم پیدا کیا کہ اس طرح کا کوئی مانع نہیں ہے' یہ تمام اسباب جمع ہوتے ہیں تب کہیں جا کر کھانے کا ارادہ پختہ ہوتا ہے' ان ترددات اور غذا کی خواہش کے غلبہ کے بعد ارادے کی پختگی کو اختیار کہتے ہیں' اور اسباب کی فراہمی کے بعد اختیار کا وجود ضروری ہو جاتا ہے مثلاً جب اللہ تعالیٰ کے پیدا کرنے سے ارادے میں پختگی آتی ہے' تب ہاتھ کھانے کی طرف ضرور بڑھتا ہے کیونکہ ارادہ و قدرت کی تکمیل کے بعد فعل کا ظہور میں آنا ضروری ہے اسی لئے ہاتھ کو حرکت ہوتی ہے' معلوم ہوا کہ ارادے کی پختگی اور قدرت اللہ کی تخلیق ہے' اور ان سے ہاتھ کو حرکت ہوتی ہے' جسے اختیار کہتے ہیں' اسلئے اختیار بھی اللہ کی تخلیق ہے' البتہ ان اختیارات میں اللہ تعالیٰ نے ایک مخصوص ترتیب قائم فرمائی ہے' اور بندوں میں یہ نظام اسی ترتیب اور عادت کے مطابق جاری ہے' چنانچہ ہاتھ اس وقت تک لکھنے کیلئے حرکت نہیں کرتا جب تک اس میں قدرت' حیات' اور مصمم ارادہ نہ ہو' اور مصمم ارادہ اس وقت تک پیدا نہیں کرتا جب تک نفس میں خواہش اور رغبت نہ ہو۔ اور یہ رغبت اس وقت تک عروج پر نہیں آتی جب تک دل میں اس امر کا علم نہ ہو کہ لکھنے کا عمل حال یا مآل میں نفس کے مطابق ہے خلاصہ یہ ہے کہ علم اور خواہش طبع کے بعد پختہ ارادہ ہوتا ہے اور قدرت وارادے کے بعد حرکت واقع ہوتی ہے' ہر فعل میں یہی مخصوص ترتیب ہے اور اس ترتیب کے تمام اجزاء اللہ تعالیٰ کی تخلیق ہیں' لیکن کیوں کہ بعض مخلوقات بعض کے لئے شرط ہیں اسلئے بعض کا مقدم اور بعض کا مؤخر ہونا ناگزیر ہے' چنانچہ جب تک علم نہ ہو اس وقت تک ارادے کی تخلیق نہیں ہوتی' اور حیات کی تخلیق سے پہلے علم پیدا نہیں کیا جاتا اور جسم سے پہلے حیات معرض وجود میں نہیں آتی' اس سے معلوم ہوا کہ جسم کا وجود حیات کے لئے ضروری ہے' کیونکہ حیات جسم سے پیدا ہوتی ہے' اور علم کے وجود کے لئے حیات شرط ہے' اسکے یہ معنی نہیں کہ علم حیات سے پیدا ہوتا ہے' بلکہ محل میں معلومات قبول کرنے کی استعداد اس وقت پیدا ہوتی ہے' جب وہ زندہ ہو' اسی طرح پختگی ارادہ کے لئے علم کا وجود شرط ہے' اسکا یہ مطلب نہیں ہے کہ ارادے کی پختگی علم سے پیدا ہوتی ہے' بلکہ ارادے کو وہی جسم قبول کرتا ہے جس میں حیات ہو اور علم ہو' غرضیکہ موجودات میں تمام ممکنات داخل ہیں اور امکان میں ایسی ترتیب ہے جس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی' اسلئے کہ اس طرح کی ہر تبدیلی محال ہے' جب کسی وصف کی شرط پائی جاتی ہے تو اس شرط کے باعث محل میں وہ وصف قبول کرنے کی لیاقت اور صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے' پھر وہ وصف اللہ تعالیٰ کی عنایت اور قدرت ازلی کی عطا سے لیاقت پیدا ہو جانے کے بعد موجود ہو جاتا ہے' پھر جس طرح شرطوں کے باعث لیاقت کے وجود میں ترتیب ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کے کرنے سے ممکنات کے موجود ہونے میں بھی ترتیب ہوتی ہے' اور بندہ حوادث و ممکنات کی ترتیب کے لئے محل ہے' اور یہ حوادث قضاء الٰہی ہیں' جو پلک جھپکنے سے بھی کم مدت میں قدرت ازلیہ کے اشارے سے اپنی مخصوص اور متعین ترتیب کے ساتھ ظہور پزیر ہوتے ہیں' جس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ ان کے ظہور کی تمام تفصیلات اندازۂ الٰہی سے متعلق ہیں' ایک جزئی بھی اپنی حد سے تجاوز نہیں کرتی' ارشاد باری ہے۔

إِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ (پ ۲۷ ر ۱۰ آیت ۴۹)

ہم نے ہر چیز کو اندازے سے پیدا کیا۔

اس آیت میں قضائے کلی ازلی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

وَمَا اَمْرُنَا اِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍ بِالْبَصَرِ (پ ۲۷ ر ۱۰ آیت ۵۰)

اور ہمارا حکم یکبارگی ایسا ہو جائیگا جیسے آنکھوں کا جھپکانا۔

مخلوق قضاء الٰہی کی پابند ہے: بندے اس قضاء و قدر الٰہی کے آگے مجبور محض ہیں۔ یہ بھی قدر الٰہی ہے کہ کاتب کے ہاتھ میں حرکت پیدا کی لیکن اس سے پہلے ایک مخصوص صفت پیدا فرمائی جسے قدرت کہتے ہیں' اور نفس میں پختہ میلان پیدا کیا جس کا نام قصد ہے اور مرغوب چیزوں کی واقفیت پیدا کی جسے ادارک کہتے ہیں' جب باطنی ملکوت سے یہ چاروں باتیں اس جسم پر ظاہر ہوتی ہیں' جو تقدیر الٰہی کے تابع اور قضاء الٰہی کے لئے مسخر ہے تو عالم شہادت (ظاہری دنیا) کے رہنے والے جن کی نگاہوں سے غیب کی باتیں اور اسرار او جھل ہیں یہ کہنے لگتے ہیں کہ اس شخص نے حرکت کی' اس نے لکھا اسنے پھینکا۔ لیکن غیب کے پردے سے یہ آواز آتی ہے۔

وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى (پ ۹ ر ۱۶ آیت ۱۷)

اور آپ نے خاک کی مٹھی نہیں پھینکی مگر اللہ نے پھینکی۔

قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ (پ ۱۰ ر ۸ آیت ۱۴۰)

ان سے لڑو اللہ ان کو تمہارے ہاتھوں سزا دیگا۔

یہاں پہنچ کر ان لوگوں کی عقلیں حیران رہ جاتی ہیں جو عالم ظاہری سے وابستہ ہیں اسی لئے بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ بندہ مجبور محض ہے' اور بعض یہ کہتے ہیں کہ بندہ اپنے افعال کا موجد ہے' تقدیر سے اس کے افعال کا کوئی تعلق نہیں ہے' بعض اعتدال پسند یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ بندے کے تمام افعال کسبی ہیں' لیکن اگر ان پر آسمان کے دروازے کھول دیئے جائیں اور وہ عالم غیب اور عالم ملکوت کا مشاہدہ کرلیں تو ان پر یہ ظاہر ہو کہ ہر فرقہ من وجہ سچا ہے' لیکن کچھ نہ کچھ اور کہیں نہ کہیں غلطی ہر فرقے سے ہوئی ہے کسی بھی فرقے کے بارے میں یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس کا علم زیر بحث مسئلے کے تمام پہلوؤں کو محیط ہے' اس کا مکمل علم اسی صورت میں حاصل کیا جاسکتا ہے جب اس روشندان سے جو عالم غیب کی طرف کھلا ہوا ہے' نور کی چمک آئے' اور یہ جانے کہ اللہ تعالیٰ ظاہر و باطن سب کچھ جانتا ہے' اپنی غیب کی باتوں پر کسی کو مطلع نہیں کرتا' سوائے اپنے منتخب پیغمبروں کے' جب کہ ظاہر پر ان لوگوں کو بھی مطلع کردیتا ہے جو پسندیدگی کے زمرے میں نہیں آتے' جو شخص اسباب اور مسببات کے سلسلے کو حرکت دے' ان کے تسلسل کی کیفیت' اور ارتباط کی وجہ دریافت کرے اور یہ جانے کہ اس سلسلے کی انتہا مسبب الاسباب پر کس طرح ہوئی ہے تو اس پر تقدیر کا راز ظاہر ہو جائے۔

ایک تناقض کا ازالہ: ہمارے اس بیان میں بظاہر تناقض ہے' اسلئے کہ ہم نے جبر' اختراع' اور اختیار کے قائلین کو من وجہ سچا بھی کہا ہے' اور ہر ایک کی غلطی بھی واضح کی ہے' جبکہ صدق و خطا میں تناقض ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہاں کوئی تناقض نہیں ہے' یہ بات ہم ایک مثال کے ذریعے سمجھاتے ہیں' اسطرح آپ سہولت سے سمجھ جائیں گے۔ فرض کیجئے کہ کچھ اندھوں نے یہ سنا کہ فلاں شہر میں ایک عجیب و غریب جانور آیا ہوا ہے جسے ہاتھی کہتے ہیں' نہ وہ ہاتھی سے واقف تھے' اور نہ اس کا نام جانتے تھے' پہلی مرتبہ اسکا ذکر اور حال سنکر انھیں بڑا تعجب ہوا' اسلئے انھوں نے طے کیا کہ اپنے چند نمائندوں کو اس کے بارے میں صحیح حالت دریافت کرنے کے لئے بھیجنا چاہیے' چنانچہ چند اندھے وہاں پہنچے جہاں ہاتھی موجود تھا' اور ٹٹول کر دیکھنے لگے' ایک اندھے کا ہاتھ پاؤں پر پڑا' ایک نے دانتوں کو چھو کر دیکھا' اور ایک نے کان پکڑ کر دیکھے' جب وہ لوگ اپنے باقی ساتھیوں کے پاس واپس پہنچے تو انھوں نے ہاتھی کی کیفیت دریافت کی' اس اندھے نے جس نے پاؤں چھو کر دیکھا تھا کہا کہ ہاتھی ستون کی مانند ہے' اس کا ظاہر کھردرا ہے' البتہ ستون کی بنسبت تھوڑی سی نرمی لئے ہوئے ہے' جس نے دانتوں پر ہاتھ رکھا تھا اس نے کہا کہ وہ سخت ہے' اس

میں نرمی نام کو نہیں ہے' تم کہتے ہو کہ وہ کھردرا ہے حالانکہ وہ کھردرا نہیں ہے چکنا ہے' وہ ستون کی طرح تو نہیں البتہ موسل کی طرح ہے' تیسرے اندھے نے جس نے کان دیکھے تھے کہا کہ وہ تو نرم اور کھردرا ہوتا ہے' ستون اور موسل کی طرح نہیں ہوتا بلکہ موٹے چمڑے کی طرح پھیلا ہوا ہے۔ ظاہر ہے ان تینوں کے بیانات مختلف ہونے کے باوجود من وجہ صحیح ہیں کیونکہ جتنا جسے معلوم تھا اس نے اتنا ہی بیان کیا' سب نے ہاتھی ہی کے اوصاف بیان کئے' مگر مجموعی طور پر کسی ایک کا بیان بھی صحیح نہیں ہے' ہاتھی کی حقیقت کسی کو بھی معلوم نہ ہو سکی۔

یہ بڑی اہم مثال ہے' اسے خوب اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے' اور ذہن میں محفوظ کرلینا چاہئے' اس لئے کہ اکثر اختلافات کی یہی نوعیت ہے' اس موضوع کا تعلق علوم مکاشفہ سے ہے' اسلئے ہم اس موضوع کو یہیں چھوڑتے ہیں' اور اسی موضوع پر دوبارہ گفتگو شروع کرتے ہیں جو زیر بحث تھا یعنی توبہ واجب ہے' اور اسکے تینوں اجزاء' علم' ندامت اور ترک بھی واجب ہیں' ندامت وجوب میں اس لئے داخل ہے کہ یہ ان افعال الٰہی میں واقع ہے جو بندے کے علم اور ارادے کے درمیان گھرا ہوا ہے' اسکے ایک طرف بندہ کا علم ہے اور دوسری جانب ارادۂ ترک' جس فعل کا یہ وصف ہو وہ وجوب کو شامل ہوتا ہے۔

توبہ فوری طور پر واجب ہے

توبہ کے فوری طور پر واجب ہونے میں کسی قسم کا شبہ نہیں ہے' اسلئے کہ معاصی کو مہلک سمجھنا نفس ایمان میں داخل ہے' اور یہ علی الفور واجب ہے' یہ واجب وہی شخص ادا کرسکتا ہے جو اس کے وجوب سے واقف ہو اس طرح واقف ہو کہ ان معاصی سے باز رہ سکے' یہ معرفت علوم مکاشفہ میں سے نہیں ہے' جن کا عمل سے کوئی تعلق نہیں ہوتا' بلکہ اس کا تعلق علوم معاملہ سے ہے' اور جس علم سے یہ مقصد ہوتا ہے کہ اس سے عمل پر تحریک ہو' اس کی ذمہ داری سے آدمی اس وقت تک عہدہ برآ نہیں ہو سکتا جب تک اس کی علت غائی ظہور میں نہ آئے' گناہوں کے ضرر کی معرفت اسی لئے مقصود ہے کہ اس سے گناہوں کے ترک کی ترغیب ہوتی ہے' چنانچہ جو شخص گناہوں سے اپنا دامن نہ بچائے گا وہ ایمان کے اس حصے سے محروم رہے گا' حدیث شریف سے مراد یہی ہے

لَا یَزْنِی الزَّانِیْ حِیْنَ یَزْنِیْ وَھُوَ مُؤْمِنٌ (بخاری و مسلم۔ ابوہریرۃ)
زنا کرنے والا جب بھی زنا کرتا ہے وہ اس حال میں مومن نہیں رہتا۔

اس میں ایمان سے وہ ایمان مراد ہے جس کا تعلق علوم مکاشفہ سے ہے جیسے اللہ اور اسکی وحدانیت' اسکی صفات' اس کی کتابوں اور پیغمبروں کا علم' زنا سے یہ ایمان زائل نہیں ہوتا' بلکہ خدا کی قربت کو ایمان سے تعبیر کیا گیا ہے' زنا سے یہ قربت ختم ہوجاتی ہے' اور بندہ خدا کا مبغوض ٹھہرتا ہے' زنا کرنے والا گویا اس گناہ کے مہلک یا مضر ہونے کا معتقد نہیں ہے' اسکی مثال ایسی ہے جیسے کسی طبیب نے مریض سے کہا کہ فلاں چیز مت کھانا' وہ تمہارے لئے زہر ہے' وہ شخص کھالیتا ہے' تو یہ کہا جائیگا کہ یہ شخص طبیب کا معتقد نہیں ہے' اسکا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ وہ طبیب کے وجود پر یقین نہیں رکھتا یا اسکے معالج ہونے کا معترف نہیں ہے' بلکہ یہ مطلب ہوتاہے کہ طبیب نے جس چیز کو زہر قاتل کہا تھا وہ اسے تسلیم نہیں کرتا کیونکہ اگر وہ اس کو مہلک سمجھتا تو کبھی نہ کھاتا' اس سے معلوم ہوا کہ گناہ گار کا ایمان ناقص ہوتا ہے۔

ایمان کی ستر قسمیں : ایمان ایک ہی چیز کا نام نہیں ہے بلکہ اس کے ستر سے زائد شعبے ہیں' سب سے اعلیٰ شعبہ توحید باری کی شہادت ہے' اور سب سے ادنیٰ شعبہ راستے سے ایذا دینے والی چیز ہٹانا ہے' اسکی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص یہ کہے کہ دنیا میں انسان ایک ہی طرح کے نہیں ہوتے' بلکہ انکی ستر سے زیادہ قسمیں ہیں' ان میں سب سے اعلیٰ قسم ان لوگوں کی ہے جن کے قلب و روح دونوں صاف ہوتے ہیں اور ادنیٰ قسم میں وہ لوگ شامل ہیں جن کی ظاہری جلد میل کچیل سے صاف ہو' ناخن کٹے ہوئے

ہوں، مونچھیں ترشی ہوئی ہوں، تاکہ بہائم سے ممتاز ہو سکے، جو بے مہار گھومتے پھرتے ہیں، ان کا جسم خود ان کی نجاست سے آلودہ رہتا ہے، گھر اور ناخن اتنے بڑھے رہتے ہیں کہ انکی صورت بری ہو جاتی ہے، یہ مثال بالکل ٹھیک ہے، ایمان کی مثال انسان کی سی ہے اگر شہادت سے توحید نکال دی جائے تو ایمان باقی نہیں رہتا، اسی طرح آدمی کے جسم سے اسکی روح اور قلب نکال دیا جائے تو اس کا ہونا نہ ہونا برابر ہو جاتا ہے، جو شخص توحید و رسالت کا ایمان رکھتا ہے وہ اس انسان کی مانند ہے جس میں روح تو ہو مگر ہاتھ پاؤں آنکھ اور دوسرے ظاہری و باطنی اعضاء سے محروم ہو، یہ شخص بظاہر جیتا جاگتا ہے لیکن مردوں سے بدتر ہے، قریب ہے کہ موت کی گرفت میں آجائے اسلئے کہ اعضاء کی قوت سے محرومی کے باعث اسکی روح ضعیف ہے، وہ مدافعانہ قوت نہیں رکھتی، اس لئے بہت جلد پرواز کر جائے گی، اسی طرح جو شخص صرف کلمۂ طیبہ کی شہادت پر قانع ہو اور اعمال میں کوتاہ ہو، وہ بھی فنا ہونے کے قریب ہے، ذرا بھی تیز و تند ہوا چلے گی اسکے ایمان کا کمزور درخت جڑ سے اکھڑ جائے گا تیز و تند ہوا سے وہ اہوال و خطرات مراد ہیں جو ملک الموت کی آمد کے وقت پیش آتے ہیں، جس ایمان کی جڑیں مضبوط نہیں ہوتیں اور جس کی شاخیں وسیع نہیں ہوتیں، وہ ملک الموت کی آمد کے وقت پیش آنے والے خطرات کا مقابلہ نہیں کرپاتا، بلکہ اپنی جگہ سے ہل جاتا ہے اور بعض اوقات زمین پر آرہتا ہے، خاتمے کے وقت وہی ایمان سلامت رہتا ہے جسکی بنیاد طاعات پر ہو، اور جو اعمال خیر کے چشموں سے سیراب ہوا ہو اور جس کی جڑیں زمین کی گہرائیوں میں اور شاخیں آسمان کی بلندیوں میں دور تک ہوں۔

<u>گناہ گار مومن کی مثال</u> : بعض گناہ گار اہل ایمان نیک مومنین سے کہتے ہیں کہ تم میں اور ہم میں فرق ہی کیا ہے، ہم بھی ایمان کی دولت رکھتے ہیں، تم بھی رکھتے ہو، ان کی مثال ایسی ہے جیسے کدو کے درخت نے صنوبر کے درخت سے کہا تھا کہ ہم دونوں میں فرق ہی کیا ہے، میں بھی درخت ہوں اور تو بھی درخت ہے، صنوبر نے جواب دیا کہ ہم دونوں کا نام یقیناً مشترک ہے لیکن نام کے اس اشتراک سے تو جس غلط فہمی کا شکار ہے وہ بہت جلد دور ہو جائے گی، جب موسم خریف کی آندھی چلے گی تیری جڑ اکھڑ جائے گی، اور پتے بکھر جائیں گے، اس وقت معلوم ہو گا کہ تو نام کی وجہ سے دھوکے میں تھا، اور اس وصف سے غافل تھا جس کے باعث درخت مضبوط رہتا ہے۔

سَوْفَ تَرَىٰ إِذَا انْجَلَى الْغُبَارُ - أَفَرَسٌ تَحْتَكَ أَمْ حِمَارٌ

(جب غبار چھٹ جائے گا تو خود دیکھ لے گا کہ تیرے نیچے گدھا ہے یا گھوڑا ہے؟)

حقیقت خاتمے کے وقت منکشف ہوتی ہے، ایمان کی قوت و ضعف کا حال اس وقت ظاہر ہوتا ہے جب فرشتۂ اجل قریب آتا ہے، موت کی مصیبت اور اس کے اہوال و خطرات سے عارفین کے جگر پارہ ہو جاتے ہیں، عام لوگوں کا تو ذکر ہی کیا ہے، وہ وقت ہی ایسا نازک ہے کہ بہت کم لوگ ثابت قدم رہتے ہیں، اور سلامتی کے ساتھ منزل تک پہنچتے ہیں، اگر کوئی گناہ گار اپنے گناہوں کے باعث دوزخ کی آگ میں رہنے سے خائف نہ ہو تو اس کی مثال ایسے تندرست و توانا شخص کی سی ہے جو یہ سوچ کر شہوات میں ڈوبا رہتا ہے اور موت سے نہیں ڈرتا کہ موت عام طور پر اچانک نہیں آتی، اس سے کہا جائے گا کہ تندرست کو مرض کا خوف رہنا چاہئے اور مریض ہو تو موت سے ڈرنا چاہئے، اسی طرح گناہ گار کو بھی سوء خاتمہ کا خوف ہونا چاہئے، خدانخواستہ خاتمہ اچھا نہ ہوا تو آگ میں ہمیشہ کے لئے رہنا ہو گا، ایمان کے لئے گناہ ایسے ہیں جیسے بدن کے لئے مضر غذائیں کہ معدے میں جا کر اخلاط کے مزاج میں تبدیلی کرتی ہیں، اور آدمی اپنی بدلتی ہوئی حالت سے اچھی طرح باخبر بھی نہیں ہوتا کہ موت اسے اچانک آلیتی ہے، ایمان پر گناہ بالکل اسی طرح اثر انداز ہوتے ہیں۔

جب اس فانی دنیا کا یہ عالم ہے کہ لوگ ہلاکت کے خوف سے زہریلی چیزیں اور مضر غذائیں چھوڑنا واجب سمجھتے ہیں اور اسی وقت عمل کرتے ہیں تو ابدی ہلاکت کے خوف سے مہلک چیزیں استعمال نہ کرنا بطریق اولیٰ فوری طور پر واجب ہو گا، اسی طرح جب انسان کوئی زہریلی غذا کھالیتا ہے تو اپنے فعل پر نادم ہوتا ہے اور ضروری سمجھتا ہے کہ قے کر کے یا کسی دوسری تدبیر سے اپنا معدہ

اس زہریلی چیز سے خالی کرلے' تاکہ یہ زہر مؤثر ہو کر اس کے جسم کے ضیاع کا باعث نہ بن جائے جو چند روز بعد فنا ہونے والا ہے' یہی حال اس شخص کا ہونا چاہئے جو دین کا زہر کھالے' یعنی گناہ کرلے' اس کے لئے بطریق اولیٰ ضروری ہے کہ وہ گناہوں سے رکے' اور اگر مرتکب ہوجائے تو فوری طور پر تدارک کرے تاکہ آخرت تباہ نہ ہو جس میں دائمی نعمتیں اور پائدار لذتیں ہیں' اگر آخرت تباہ ہوئی' تو پھر دوزخ کی آگ' اور جہنم کے عذاب کے سوا کچھ ملنے والا نہیں ہے یہ سزا اتنے طویل عرصے تک بھگتنی ہوگی جس کی کوئی تحدید نہیں کی جاسکتی' آخرت کے دنوں کو دنیا کے دنوں سے ذرا بھی مناسبت نہیں ہے' جب صورت حال یہ ہے تو گناہ گار کے لئے ضروری ہے کہ وہ توبہ ہی کی طرف سبقت کرے' ایسا نہ ہو کہ تاخیر کرنے سے گناہوں کا زہر روح میں سرایت کرجائے' اور پھر طبیب بھی اسکا علاج نہ کرسکے' نہ اس کے لئے پرہیز مفید ہو' نہ وعظ و نصیحت سے کام بنے اور تباہ حال لوگوں کے زمرے میں اسکا شمار ہوجائے' اور اس آیت کا مصداق بنے۔

إِنَّا جَعَلْنَا فِي أَعْنَاقِهِمْ أَغْلَالًا فَهِيَ إِلَى الْأَذْقَانِ فَهُمْ مُقْمَحُونَ وَجَعَلْنَا مِنْ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ سَدًّا وَمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَأَغْشَيْنَاهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُونَ وَسَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أَأَنْذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ (پ ۲۲ ر ۱۸ آیت ۸ تا ۱۰)

ہم نے انکی گردنوں میں طوق ڈال دیئے ہیں پھر وہ ٹھوڑیوں تک ہیں جس سے ان کے سر اُلل گئے اور ہم نے ایک آڑ ان کے سامنے کردی' اور ایک آڑ انکے پیچھے کردی' جس سے ہم نے انکو (ہر طرف سے) گھیر دیا سو وہ نہیں دیکھ سکتے اور ان کے حق میں آپ کا ڈرانا نہ ڈرانا دونوں برابر ہیں' یہ ایمان نہ لائیں گے۔

یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ اس آیت میں کافروں کا ذکر ہے' کیونکہ ہم یہ بات واضح کرچکے ہیں کہ ایمان کے ستّر سے زائد شعبے ہیں اور یہ کہ زانی حالت زنا میں مومن نہیں رہتا' اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص اس ایمان سے دور ہوگا جو شاخ اور فرع کی مانند ہے وہ خاتمے کے وقت اصل ایمان سے بھی محجوب ہوگا' جس طرح وہ شخص جو تمام اعضاء سے محروم ہو جلد مرجاتا ہے کیونکہ اصل شاخوں کے بغیر قائم نہیں رہتی اور شاخیں بغیر اصل کے باقی نہیں رہتیں' اصل اور فرع میں صرف ایک فرق ہے فرع کا وجود اور اس کی بقاء دونوں اصل کے وجود پر منحصر ہیں جب کہ اصل کا وجود فرع پر منحصر نہیں' البتہ اسکی بقا فرع پر منحصر ہے۔

علوم مکاشفہ اور علوم معاملہ لازم و ملزوم ہیں : علوم مکاشفہ اور علوم معاملہ دونوں لازم و ملزوم ہیں جیسے فرع و اصل ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں' ایک دوسرے سے مستغنی نہیں رہ سکتا' اگرچہ ایک اصل کے مرتبے میں ہے' اور ایک تابع کی حیثیت رکھتا ہے' علوم مکاشفہ اصل ہیں' اور علوم معاملہ فرع کے قائم مقام ہیں' علوم معاملہ سے اگر آدمی کو عمل پر تحریک نہ ہو تو اسکے ہونے سے نہ ہونا بہتر ہے' اسلئے کہ ان کا جو اثر یا جو فائدہ ہونا چاہئے تھا' وہ نہیں ہوا اسلئے وہ وبال جان بنیں گے' اور تارک عمل پر حجت قائم کریں گے' اسی لئے اگر عالم گناہ کرتا ہے تو اسے جاہل گناہ گار کی بہ نسبت زیادہ گناہ ملتا ہے' اس سلسلے میں جو آیات و روایات وارد ہیں وہ کتاب العلم میں لکھی جاچکی ہیں۔

وجوب توبہ کی عمومیت : وجوب توبہ کی عمومیت اس آیت سے ثابت ہے۔ اہل ایمان کو خطاب عام ہے۔

تُوبُوا إِلَى اللَّهِ جَمِيعًا أَيُّهَا الْمُؤْمِنُونَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ (پ ۱۸ ر ۱۰ آیت ۳۱)

اے مسلمانو! تم سب اللہ کے سامنے توبہ کرو تاکہ فلاح پاؤ۔

نور بصیرت سے بھی اسی حقیقت کی طرف رہنمائی ہوتی ہے' اس لئے کہ توبہ کے معنی ہیں اس راستے پر واپسی جو اللہ تعالیٰ سے دور کرنے والا ہے' اور شیطان سے قریب کرنے والا ہے اور یہ رجوع صرف عاقل ہی سے ممکن ہے۔

عقل کب کامل ہوتی ہے : عقل کی اصل اس وقت تک کامل نہیں ہوتی جب تک شہوت' غضب اور ان تمام صفات

مذمومہ کی اصل جو انسان کی گمراہی کے لئے شیطان نے بطور وسیلہ اختیار کر رکھی ہیں' درجۂ کمال تک نہیں پہنچتی' جب آدمی چالیس برس کی عمر کو پہنچتا ہے تب اس کی عقل مکمل ہوتی ہے البتہ اصل عقل سن بلوغ تک پہنچتے تک مکمل ہو جاتی ہے اور اس کے مبادی سات سال کی عمر سے ظاہر ہونے لگتے ہیں' شہوات شیطانی لشکر ہیں' اور عقل ملائکہ کی فوج ہے' جب یہ دونوں فوجیں کسی ایک مقام پر جمع ہوتی ہیں تو ان میں جنگ برپا ہوتی ہے اسلئے کہ ایک کے سامنے دوسرا ٹھہر نہیں سکتا دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں' ایک دوسرے کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتے جس طرح رات اور دن میں' روشنی اور تاریکی میں اجتماع نہیں ہو سکتا' اگر ایک غالب آجائے تو دوسرے کا وجود کسی حال میں باقی نہیں رہتا' اور کیوں کہ شہوات کمال عقل سے پہلے ہی جوانی اور بچپن کے زمانے میں انسان پر غالب آجاتی ہیں' اس لیے شیطان کے قدم عقل سے پہلے ہی راسخ ہو جاتے ہیں' یہی وجہ ہے کہ دل عموماً شہوات کی محبت و انسیت میں گرفتار رہتا ہے اور اس کی گلو خلاصی مشکل ہو جاتی ہے' پھر جب عقل ظاہر ہو جاتی ہے جو اللہ کی جماعت اور اسکا لشکر ہے' اور اولیاء اللہ کو دشمنان خدا کے ہاتھوں سے بتدریج نجات دلانے والی ہے' اس لئے اگر عقل میں قوت و کمال نہ ہو گا تو شیطان اپنا کہا کر دکھائے گا' اور میدان اس کے ہاتھ رہے گا

لَأَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهُ إِلَّا قَلِيلًا (پ ۵ ر ۷ آیت ۴)

تو میں (بھی) بجز قدر قلیل اسکی اولاد کو اپنے بس میں کروں گا۔

جب عقل پختہ اور مکمل ہو جاتی ہے تو اس کا پہلا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ شہوات کا زور توڑ کر' عادات سے کنارہ کش ہو کر اور طبیعت کو زبردستی عبادات کی طرف مائل کر کے شیطانی فوجوں کو عبرتناک شکست دے' یہی توبہ کے معنی ہیں کہ آدمی اس راہ سے انحراف کرے جس کا رہبر شیطان ہے اور جس کی رہنما شہوت ہے اور اس راستے پر چلے جو اللہ تعالیٰ تک پہنچاتا ہے۔

شہوت عقل پر مقدم ہے: ہر انسان میں عقل سے پہلے شہوت ہوتی ہے شہوت کی عزیمت عقل کی عزیمت پر مقدم ہوتی ہے' اسلئے شہوات کی اتباع میں جو اعمال سرزد ہوئے ہوں ان سے رجوع کرنا ہر انسان کے لئے ضروری ہے خواہ وہ نبی ہو یا غبی' یہ خیال نہ کرنا چاہئے کہ رجوع کرنا صرف حضرت آدم علیہ السلام کی خصوصیت تھی بلکہ یہ تو حکم ازلی ہے جو جنس انسان کے ہر فرد پر لکھا ہوا ہے' اس کے خلاف فرض کرنا ممکن ہی نہیں ہے جب تک سنت الہیہ میں تبدیلی نہ ہو۔

اگر کوئی شخص حالت بلوغ میں کفر یا جہل پر ہو اس کے لئے ان سے توبہ کرنا ضروری ہے' اور اگر کوئی شخص اپنے والدین کی اتباع میں مسلمان ہوا ہو اور یہ نہ جانتا ہو کہ اسلام کی حقیقت کیا ہے' اسپر واجب ہے کہ وہ اپنی اس جہالت اور غفلت سے توبہ کرے اور یہ توبہ اسطرح ہو گی کہ اسلام کی حقیقت سمجھے' اور یہ جانے کہ والدین کے اسلام سے اسے کوئی فائدہ نہیں ہو گا' جب تک خود مسلمان نہ ہو' جب یہ بات جان لے تو شہوات کی الفت اور بے راہ روی کی محبت سے تائب ہونا اور صحیح راستے پر چلنا بھی ضروری ہے' یعنی ہر حال میں اللہ تعالیٰ کی عائد کردہ حدود کی رعایت اور فرائض کی پابندی کرے' خواہ دینے میں ہو یا لینے میں' عمل میں ہو یا ترک عمل میں' اور یہ مرحلہ توبہ کا دشوار ترین مرحلہ ہے' اکثر لوگ یہیں پہنچ کر ہلاک ہوئے ہیں کہ خواہش کے باوجود رجوع نہ کر سکے۔

توبہ فرض عین ہے: اس تفصیل سے ثابت ہوا کہ توبہ ہر شخص کے لئے فرض عین ہے' کوئی فرد بشر بھی اس سے بے نیاز نہیں رہ سکتا' جب حضرت آدم علیہ السلام جیسے اولوالعزم پیغمبر' اور انسانی سلسلے کے پہلے فرد اس سے بے نیاز نہ رہ سکے تو دوسرے لوگ کیسے رہ سکتے ہیں۔

وجوب توبہ کی عمومیت کا سبب: توبہ ہر حال میں اور ہمیشہ واجب ہے اس لئے کہ کسی بھی شخص کے اعضاء گناہ سے خالی نہیں ہیں' اس سے انبیاء کرام تک محفوظ نہ رہ سکے جیسا کہ قرآن کریم میں ان کی خطاؤں کا' ان پر پشیمانی' گریہ و زاری کا ذکر ہے'

اگر بعض اوقات آدمی اعضاء کی معصیت سے محفوظ رہ گیا تو دل کے ارادۂ معصیت سے محفوظ نہ رہ پائے گا' دل میں ارادۂ گناہ نہ ہوا تو شیطانی وساوس سے نہ بچ سکے گا کیونکہ شیطان دلوں میں وسوسے ڈالتا رہتا ہے جن سے اللہ کے ذکر سے غفلت ہوتی ہے' اگر وساوس سے بھی محفوظ رہ گیا تو اللہ کی صفات اور افعال سے واقف ہونے میں کوتاہی کرے گا یہ تمام باتیں نقصان کی ہیں' اور ہر نقصان کا کوئی نہ کوئی سبب ہوتا ہے اس سبب کو ترک کرنا اور اس کی ضد اختیار کرنا ہی رجوع ہے توبہ سے یہی مقصود بھی ہے' آدمی کا اس نقصان سے خالی ہونا بظاہر نا قابل فہم ہے' البتہ لوگ مقدار نقصان میں ایک دوسرے سے مختلف اور متفاوت ہو سکتے ہیں' اصل نقصان میں تمام لوگ شریک ہیں' یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

إِنَّهُ لَيُغَانُ عَلَى قَلْبِي حَتَّى أَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ فِي الْيَوْمِ وَاللَّيْلَةِ سَبْعِيْنَ مَرَّةً (مسلم' اعز المزنی)

میرے دل پر زنگ آجاتا ہے یہاں تک کہ میں دن رات ستر مرتبہ اللہ سے مغفرت کی دعا کرتا ہوں۔

اسی لئے اللہ تعالیٰ نے انھیں فضیلت بخشی' فرمایا۔

لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ (پ ۲۶ ر ۹ آیت ۲)

تاکہ اللہ تعالیٰ آپ کی سب اگلی پچھلی خطائیں معاف فرمادے۔

جب آپ کا یہ حال ہے کہ مغفرت کی دعا فرماتے اور تمام گناہوں کی بخشش کی بشارت کے باوجود دن میں ستر بار اور ایک روایت کے مطابق سو بار اپنی خطاؤں کی بخشش چاہتے تھے۔

<u>ایک شبہ کا جواب</u>: یہاں ایک اعتراض ہو سکتا ہے' اس اعتراض کی تمہید یہ ہے کہ قلب پر جو فاسد خیالات یا وساوس وارد ہوتے ہیں وہ نقص ہیں' کمال یہ ہے کہ قلب ان سے خالی رہے' اسی طرح اللہ عزوجل کی صفات و افعال سے پوری طرح واقف نہ ہونا بھی ایک نقص ہے' اس میں بھی کمال ہے کہ آدمی کی معرفت زیادہ سے زیادہ ہو' جتنی معرفت زیادہ ہوگی اتنا ہی کمال زیادہ ہوگا' اسکے یہ معنی ہوئے کہ اسباب نقص سے اسباب کمال تک پہنچنے کے معنی رجوع ہیں' اسے توبہ بھی کہہ سکتے ہیں' اور توبہ کے سلسلے میں یہ بات بیان کی جاچکی ہے کہ توبہ بہرحال اور ہمیشہ واجب ہے' ہمارے خیال میں وساوس سے قلب کا خالی ہونا اور صفات الٰہیہ سے کماحقہ' واقفیت فضائل ہیں فرائض نہیں ہیں' کیونکہ کمال حاصل کرنا واجب نہیں ہے' اس صورت میں مذکورہ بالا امور میں توبہ ہر حال میں کیسے واجب ہو سکتی ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ جیسا پہلے بیان کیا جاچکا ہے انسان عقل کی دہلیز پر قدم رکھنے سے پہلے شہوت کی اتباع سے اپنا دامن نہیں بچا پاتا' توبہ کے معنی یہ نہیں کہ جن اعمال سے توبہ کی جارہی ہے وہ آئندہ کے لئے ترک دیئے جائیں بلکہ توبہ کے لئے ضروری ہے کہ ماضی میں جو کچھ ہو چکا ہے اس کا تدارک بھی ہو جائے' آدمی جس شہوت میں بھی مبتلا ہوتا ہے' اس سے دل پر تاریکی سی چھاجاتی ہے' جیسے منہ کی بھاپ سے آئینے پر تاریکی آجاتی ہے' پھر اگر شہوات کی اتباع مسلسل ہوتی رہے تو دل کی تاریکی تہہ بہ تہہ گہری ہوجاتی ہے' اور زنگ سا لگ جاتا ہے جس طرح منہ کی بھاپ اگر آئینے پر مسلسل پڑتی رہے تو زنگ لگ جاتا ہے' شہوات سے دل پر زنگ لگنے کا ذکر قرآن کریم میں ہے۔ فرمایا

كَلَّا بَلْ رَانَ عَلَى قُلُوْبِهِمْ مَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (پ ۳۰ ر ۸ آیت ۱۴)

ہرگز ایسا نہیں بلکہ ان کے دلوں پر انکے اعمال (بد) کا زنگ بیٹھ گیا ہے۔

اگر زنگ گہرا ہو جاتا ہے تو اسے دل پر مہر لگنے سے تعبیر کیا جاتا ہے جیسے اگر آئینے پر زنگ لگ جائے اور اسے دیر تک اسی حالت پر رہنے دیا جائے تو میقل کی کوئی گنجائش نہیں رہتی اور وہ آئینہ بیکار قرار دیدیا جاتا ہے' بہرحال جس طرح آئینے کی صفائی کے لئے یہ کافی نہیں ہے کہ آئندہ اس پر زنگ نہ لگنے دیا جائے بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ جو زنگ ماضی میں اس پر لگ چکا ہے وہ مٹایا جائے'

اسی طرح دل کے لئے بھی یہ کافی نہیں کہ آئندہ کے لئے اتباعِ شہوات سے توبہ کی جائے 'بلکہ ماضی میں جو گناہ سرزد ہو چکے ان سے بھی رجوع کرنا ضروری ہے تاکہ دل پر پچھلے گناہوں کی جو تاریکی چھائی ہے وہ مٹ جائے جس طرح گناہ سے دل تاریک ہوتا ہے اسی طرح نیکی سے دل منور اور روشن ہوتا ہے 'اطاعت سے معصیت کا اندھیرا ختم ہوتا ہے 'اور روشنی پھیلتی ہے 'حدیث شریف میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔

أَتْبِعِ السَّيِّئَةَ الْحَسَنَةَ تَمْحُهَا (ترمذی۔ ابوذرؓ)

معصیت کے بعد نیکی کرے 'نیکی اس معصیت کو مٹا ڈالے گی۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ بندے کو ہر حال میں اپنے دل سے گناہوں کا اثر ختم کرنے کے لئے جدوجہد کرنی چاہئے 'اور یہ جدوجہد اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ نیک عمل کرے کیوں کہ نیک اعمال کے آثار گناہوں کے آثار کی ضد ہیں یہ ہوں گے تو پچھلے آثار خود بخود ختم ہو جائیں گے 'یہ اس دل کا بیان تھا جسے پہلے صفائی حاصل تھی 'پھر عارضی اسباب کی وجہ سے وہ زنگ آلود ہو جاتا ہے ایسے دل کا زنگ دور کرنا زیادہ مشکل نہیں ہے 'لیکن ابتداء میں قلب کا تزکیہ اور تصفیہ بہت دشوار ہے 'یہ ایسا ہی ہے جیسے آئینے سے زنگ دور کرنا مشکل نہیں ہے 'لیکن آئینے کو ابتداء ہی میں چمکدار اور روشن بنانا بڑا مشکل ہے۔

ہر حال میں توبہ کا وجوب : اس سے معلوم ہوا کہ آدمی پر ہر حال میں توبہ واجب ہے 'یہ جواب کا ایک پہلو ہے 'دوسرا پہلو یہ ہے کہ ہر حال میں وجوب توبہ کے کیا معنی ہیں؟ یاد رکھئے وجوب دو طرح کے ہیں ایک وہ جس کا تعلق شرعی احکام سے ہے 'اسمیں تمام مخلوق برابر ہے 'اور یہ وجوب اس قدر ہے کہ اگر تمام بندگانِ خدا اسے ادا کریں تو عالم تباہ و برباد نہ ہو جیسے بدنی اور مالی عبادات 'نماز روزہ 'حج وغیرہ 'کمال کے درجات اس وجوب میں داخل نہیں ہو سکتے 'کیونکہ اگر ہر شخص پر یہ واجب کر دیا جائے کہ وہ اللہ سے اس طرح ڈرے جیسا کہ ڈرنے کا حق ہے تو تمام لوگ دنیاوی کاروبار 'اور معاش وغیرہ ترک کر دیں گے 'اس صورت میں تقویٰ باقی ہی نہ رہے گا 'کیوں کہ تقویٰ کی فرصت کسی کو بھی نہ ملے گی 'ہر شخص کاروبار معیشت میں مصروف رہے گا 'خود بوئے گا خود کاٹے گا 'خود بنے گا خود سیئے گا 'یہ تمام درجات واجب نہیں ہیں 'شریعت میں واجب صرف اس قدر ہے کہ تمام لوگ اس پر عمل کریں تو عالم کے نظام میں خلل نہ ہو۔

دوسرا واجب وہ ہے جو صدیقین کے مقامِ محمود تک پہنچنے اور رب العالمین کا تقرب حاصل کرنے کے لئے ضروری ہو 'جن چیزوں سے ہم نے توبہ کرنے کے لئے لکھا ہے وہ سب اس درجے تک پہنچنے کے لئے واجب ہیں 'اس کی مثال اس طرح سمجھنی چاہیے جیسے یہ کہا جائے کہ نوافل میں طہارت واجب ہے اسکے معنی یہ ہیں کہ نفلی نماز پڑھنے کے لئے طہارت بدن ضروری ہے اس کے بغیر نفل کا ثواب نہیں ملے گا 'مگر جو شخص نوافل سے محروم رہے اس پر نفل کی رو سے طہارت واجب نہیں ہے 'یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص یہ کہے کہ آنکھ 'کان 'ہاتھ اور پاؤں انسان کے وجود کے لئے ضروری ہیں 'یعنی انسان مکمل ہی اسوقت ہوتا ہے جب یہ تمام اعضاء موجود ہوں 'اسی صورت میں اس کی انسانیت مفید ہو سکتی ہے اور انہی اعضاء کے ذریعہ وہ دنیا میں درجاتِ کمال تک پہنچ سکتا ہے 'اب اگر کوئی شخص ان اعضاء سے محرومی پر قانع ہو اور گوشت پوست کے ایک لوتھڑے کی حیثیت سے زندہ رہنا منظور کرے تو اس کے لئے یہ اعضاء ضروری نہیں ہیں 'بہر حال ان تمام واجبات سے جن میں سب لوگ برابر کے شریک ہیں نجات حاصل ہوتی ہے 'اس نجات کی مثال زندگی ہے 'اور اس نجات کے علاوہ جتنی سعادتیں ہیں 'اور جس قدر بلند درجات ہیں وہ سب اعضاء کی مانند ہیں 'محض نجات خوبصورت نہیں ہوتی جب تک اسکے ساتھ سعادتیں نہ ہوں 'اسی طرح محض زندگی خوبصورت نہیں ہوتی جب تک اسکے ساتھ اعضاء نہ ہوں انبیاء کرام 'اولیاء اللہ 'اور علمائے ربانی انہی سعادتوں کے حصول کے لئے جدوجہد کرتے ہیں وہ انہی بلند درجات تک رسائی حاصل کرنے کے لئے دنیا کی لذتوں سے اپنا تعلق منقطع کر لیتے ہیں 'چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایک دن سر کے نیچے پتھر رکھ کر سو گئے 'شیطان نے آکر کہا کہ آپ نے تو دنیا ترک کر دی تھی 'فرمایا! یقیناً 'تو نے کیا دیکھا

جس سے یہ معلوم ہوا کہ میں نے دنیا ترک نہیں کی' شیطان نے عرض کیا پتھر کو تکیہ بنانا بھی دنیاوی لذت ہے' زمین پر سر رکھئے' آپ نے سر کے نیچے سے پتھر نکال کر پھینک دیا اور زمین پر سر رکھ کر سو گئے' پتھر نکال کر پھینکنا آپ کی ایک دنیاوی لذت سے توبہ تھی' ہم پوچھتے ہیں کیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس حقیقت سے واقف نہ تھے کہ پتھر پر سر رکھنا عام شریعت میں واجب نہیں ہے' اسی طرح کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس امر سے لاعلم تھے کہ منقش چادر پر نماز ادا ہو جاتی ہے' اسکے باوجود آپ نے نماز میں منقش چادر کو وجہ خلل سمجھا اور اسے اتار کر نماز پڑھی' اسی طرح آپنے جوتے کے نئے تسمے کو قلب کی مشغولیت کا باعث سمجھ کر پرانا تسمہ باقی رکھنا بہتر سمجھا' حالانکہ یہ وہ امور ہیں جو عام لوگوں پر مقرر کردہ شریعت میں واجب نہیں ہیں' ظاہر ہے یہ بات حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی معلوم تھی' اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی جانتے تھے' پھر آپ حضرات نے وہ اعمال ترک کیوں کئے؟ اس کا ایک ہی جواب ہے اور وہ یہ کہ آپنے ان اعمال کو اپنے قلب میں مؤثر اور مقام محمود تک پہنچنے کے لئے مانع سمجھا۔

حضرت صدیق اکبرؓ نے ایک بار کہیں سے آیا ہوا دودھ نوش فرمایا' بعد میں معلوم ہوا کہ وہ کسی ناجائز ذریعے سے حاصل ہوا تھا آپ نے بلا تاخیر حلق میں انگلی ڈال کر قے کی' اور اس شدت سے دودھ کا ایک ایک قطرہ جسم سے باہر نکال دیا کہ قریب تھا کہ ساتھ ہی روح بھی نکل جائے' کیا آپ کو معلوم نہیں تھا کہ بھول کر کھا لینے میں کوئی گناہ نہیں ہے' اور پی ہوئی چیز کا نکالنا واجب نہیں ہے' پھر آپ نے پینے سے رجوع کیوں کیا' اور معدے کو اس شدت سے خالی کرنے کی ضرورت کیوں محسوس کی؟ اس کا جواب صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ حضرت ابوبکر جانتے تھے کہ عوام کے لئے جو احکام ہیں ان کا اطلاق خواص پر نہیں ہوتا' راہ آخرت کے خطرات سے بچنا بڑا مشکل مرحلہ ہے اور اس سے صرف صدیقین ہی محفوظ رہ سکتے ہیں۔

بہرحال ان بزرگوں کے حالات پر غور کرنا چاہئے جو مخلوق میں سب سے زیادہ اللہ کو جاننے والے اس کے طریق اور اس کے عذاب کی معرفت رکھنے والے اور بندوں کے مغالطوں سے واقفیت رکھنے والے ہیں' دنیوی زندگی کے فریب سے ایک بار' اللہ تعالیٰ پر فریب کھانے سے ہزار بار بچو' اور اس کی خوفناک پکڑ سے ڈرو۔ غرضیکہ یہ وہ اسرار و رموز ہیں کہ جس شخص کے دل و دماغ میں ان کی خوشبو بس جاتی ہے وہ یہ سمجھ لیتا ہے کہ اللہ کی راہ پر چلنے کے لئے ہر لمحہ اور ہر آن توبۂ نصوح واجب ہے' اگرچہ اسے عمر نوح ہی کیوں نہ مل جائے' اور توبہ بھی فوراً بلا تاخیر واجب ہے' ابو سلیمان دارانیؒ نے کس قدر سچی بات کہی ہے کہ اگر عقل مند انسان اپنی زندگی کے باقی دن اس افسوس میں رو کر گزار دے کہ اس کا ماضی اطاعت کے بغیر ضائع ہو گیا' تو یہ اسکے شایان شان ہے' اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جو لوگ اپنی باقی زندگی میں بھی نافرمانیوں کے مرتکب رہیں ان کا حال کیا ہو گا' اس کی وجہ یہ ہے کہ جب عقل مند انسان کی ملکیت میں کوئی قیمتی جوہر آتا ہے' اور وہ بلا وجہ ضائع ہو جاتا ہے' تو وہ اس پر روتا ہے اور اگر جوہر کے ساتھ مالک بھی برباد ہو رہا ہو تو اسکا گریہ دیکا قابل دید ہو گا' آدمی کی زندگی کا ایک ایک لمحہ اور اس کا ہر سانس ایک ایسا جوہر ہے جس کا کوئی بدل نہیں' اس لئے کہ اس میں انسان کو ابدی سعادت تک پہنچانے اور دائمی شقاوت سے بچانے کی صلاحیت ہے' اس سے زیادہ قیمتی جوہر اور کیا ہو گا' اگر آدمی اپنی غفلت اور لاپرواہی سے یہ جوہر ثمین ضائع کر دے تو یہ ایسا خسارہ ہو گا جس کی تلافی نہیں ہو سکتی اور اسے معصیت الٰہی میں ضائع کرنا تو انتہا درجے کی بربادی اور ہلاکت ہے' اگر آدمی اس عظیم مصیبت پر خون کے آنسو نہ روئے تو یہ اس کی نادانی اور جہالت ہے' جہالت بجائے خود ایک بڑی مصیبت ہے' لیکن جاہل کو اپنی مصیبت کا احساس نہیں ہوتا کیونکہ غفلت کی نیند اس کے اور مصیبت کی معرفت کے درمیان حائل ہو جاتی ہے' افسوس تمام لوگ اسی خواب غفلت میں مبتلا ہیں جب موت انکے دروازوں پر دستک دے گی تب بیدار ہونگے اسوقت ہر مفلس کو اپنے افلاس کا اور ہر مصیبت زدہ کو اپنی مصیبت کا اندازہ ہو گا' لیکن تدارک کا کوئی ذریعہ باقی نہ رہے گا' جو نقصان ہو چکا ہے اس کی تلافی نہ ہو سکے گی' ایک عارف کہتے ہیں کہ جب فرشتۂ اجل کسی بندے کے پاس آتا ہے اور اسے یہ بتلا دیتا ہے کہ تیری موت میں ایک لمحہ باقی رہ گیا ہے' جو اپنی جگہ اٹل ہے' نہ اس سے پہلے موت آئے گی اور نہ بعد میں تو اس وقت اس کی حسرت و ندامت کا عالم قابل دید ہوتا ہے' اگر اسکے پاس دنیا جہاں کی دولتیں ہوں تو

وہ اپنی زندگی میں تدارک کا ایک لمحہ حاصل کرنے کے لئے یہ تمام دولتیں قربان کردے مگر اس وقت مہلت نفس بھی نہ ملے گی' اس آیت کریمہ کا یہی مفہوم ہے۔

وَحِيلَ بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ مَا يَشْتَهُونَ (پ ۲۲ ر ۱۲ آیت ۵۴)

اور ان میں اور ان کی آرزو میں ایک آڑ کردی جائے گی۔

ذیل کی آیت کریمہ سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُولَ رَبِّ لَوْلَا أَخَّرْتَنِي إِلَىٰ أَجَلٍ قَرِيبٍ فَأَصَّدَّقَ وَأَكُنْ مِنَ الصَّالِحِينَ وَلَنْ يُؤَخِّرَ اللَّهُ نَفْسًا إِذَا جَاءَ أَجَلُهَا (پ ۲۸ ر ۱۴ آیت ۹ تا ۱۱)

اس سے پہلے (خرچ کرلو) کہ تم میں سے کسی کی موت آکھڑی ہو اور پھر وہ بطور تمنا و حسرت کہنے لگے کہ اے میرے پروردگار مجھ کو اور تھوڑے دنوں کی مہلت کیوں نہ دی کہ میں خیر خیرات دے لیتا' اور نیک کام کرنے والوں میں شامل ہو جاتا' اور اللہ تعالیٰ کسی شخص کو جب کہ اس کی میعاد آجاتی ہے ہرگز مہلت نہیں دیتا۔

اس میں اجل قریب تک مہلت دینے کی خواہش ہے' جیسا کہ بعض بزرگ کہتے ہیں کہ جب ملک الموت بندے پر یہ انکشاف کرتا ہے کہ تیری موت کا وقت قریب آچکا ہے' تو وہ فرشتۂ اجل سے درخواست کرتا ہے کہ اسے ایک دن کی مہلت دی جائے تاکہ وہ اپنے خالق سے اپنی کوتاہیوں کی اور گناہوں کی مغفرت طلب کرسکے' اور اپنے لئے اچھے اعمال کا توشہ تیار کرسکے' فرشتۂ اجل اس سے کہتا ہے کہ تو نے بے شمار روز و شب ضائع کردئے تجھے ایک دن کی بھی مہلت نہیں دی جاسکتی بندہ کہتا ہے کہ ایک دن کی نہ سہی ایک ساعت ہی کی مہلت دیدو' فرشتہ کہتا ہے کہ تو نے بہت سی ساعتیں ضائع کی ہیں' اب ایک ساعت کی بھی مہلت نہیں ملے گی' اس کے بعد اس پر توبہ کا دروازہ بند کردیا جاتا ہے' موت آگے بڑھتی ہے' روح تمام جسم سے نکل کر سینے میں آجاتی ہے' سانس بے ترتیب ہونے لگتے ہیں' اور وہ عمر ضائع کرنے کے صدمے اور تلافی مافات سے مایوسی کے ساتھ روح نکلنے کا منظر دیکھتا ہے' انجام کے خوف' حال کی تکلیف اور ماضی کے صدمے اسے اس قدر مضطرب اور بے چین کرتے ہیں کہ اصل ایمان میں اضطراب آجاتا ہے' جب روح نکلنے لگتی ہے' اگر اس کی تقدیر میں خدا نے خیر لکھا ہے تو ایمان پر خاتمہ ہوتا ہے' یہی حسن خاتمہ ہے' ورنہ شک اور اضطراب پر خاتمہ ہوتا ہے' یہ سوء خاتمہ ہے' یہ ان لوگوں کے حصے میں آتا ہے' جن کی قسمت میں دائمی شقاوت لکھ دی گئی ہے' اسی خاتمے کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السَّيِّئَاتِ حَتَّىٰ إِذَا حَضَرَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ إِنِّي تُبْتُ الْآنَ (پ ۴ ر ۱۴ آیت ۱۸)

اور ایسے لوگوں کی توبہ نہیں جو گناہ کرتے رہتے ہیں' یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کی موت آکھڑی ہوئی تو کہنے لگا کہ میں اب توبہ کرتا ہوں۔

توبہ گناہ کے متعلق ہونی چاہئے۔ قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا۔

إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللَّهِ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السُّوءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوبُونَ مِنْ قَرِيبٍ (پ ۴ ر ۱۴ آیت ۱۷)

توبہ جس کا قبول کرنا اللہ کے ذمہ ہے وہ تو ان ہی کی ہے جو حماقت سے کوئی گناہ کر بیٹھتے ہیں پھر قریب ہی وقت میں توبہ کرلیتے ہیں۔

اس آیت کے معنی یہ ہیں کہ گناہ سے متصل زمانے میں توبہ ہونی چاہیے' یعنی اگر گناہ سرزد ہو تو فوراً اس پر نادم ہو' اور اسکے معاً بعد کوئی عمل خیر کرے جس سے اس عمل بد کا تدارک ہو سکے' ایسا نہ ہو کہ زیادہ وقت گزر جانے سے دل پر اس گناہ کے اثرات زیادہ ہو جائیں' اور وہ زائل نہ ہو سکیں اسی لئے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اتبع السیئۃ الحسنۃ گناہ کے بعد ایسی نیکی کر کہ جس سے وہ گناہ ختم ہو جائے حضرت لقمان کی اس وصیت کے بھی یہی معنی ہیں جو انھوں نے اپنے صاحزادے کو فرمائی تھی کہ اے بیٹے! توبہ کرنے میں تاخیر نہ کر' اس لئے کہ موت اچانک آتی ہے' جو شخص ٹال مٹول سے کام لیتا ہے' اور توبہ کی طرف سبقت نہیں کرتا وہ دو عظیم خطروں کے درمیان ہے' ایک تو یہ کہ معاصی کی ظلمت دل پر چھا جاتی ہے' اور آہستہ آہستہ وہ زنگ کی صورت اختیار کر لیتی ہے' اور طبیعت ثانیہ بن جاتی ہے' پھر مٹانے کی کوشش کامیاب نہیں ہوتی' دوسرے یہ کہ بعض اوقات مرض یا موت اچانک نرغے میں لے لیتی ہے اور آدمی کو اتنی مہلت نہیں ملتی کہ وہ اپنے دل سے گناہوں کا زنگ دور کر سکے' اسی لئے حدیث شریف میں وارد ہوا ہے کہ

إِنَّ أَكْثَرَ أَهْلِ النَّارِ مِنَ التَّسْوِيفِ (۱)

اکثر دوزخی ٹال مٹول کے باعث دوزخ میں جائینگے۔

اکثر لوگوں کی ہلاکت کا سبب یہی ہے کہ وہ نیک کاموں' یا گناہوں سے توبہ کرنے میں ٹال مٹول سے کام لیتے ہیں' گناہوں سے دلوں کا سیاہ ہو جانا نقد ہے' اور انھیں نیک اعمال یا توبہ کے ذریعہ جلاء دینا ادھار ہے یہاں تک کہ موت آجاتی ہے اور سیاہ دل کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے یہاں پیش ہونا پڑتا ہے' حالانکہ نجات کے اصل مستحق وہی لوگ ہیں جن کے دل گناہوں کی سیاہی سے خالی ہوں۔

کسی عارف کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے ہر بندے سے بطور الہام دو باتیں ارشاد فرماتا ہے' ایک اس وقت جب وہ اپنی ماں کے پیٹ سے نکلتا ہے' اس وقت اس کے کان میں فرماتا ہے' اے بندے! میں تجھے دنیا میں پاک و صاف بھیج رہا ہوں میں نے تجھے تیری عمر بطور امانت دی ہے' اور تجھے امین مقرر کیا ہے' اب میں دیکھتا ہوں کہ تو اس امانت کی کیسے حفاظت کریگا' اور دوسری اس وقت جب اس کے جسم سے روح نکلتی ہے' اس وقت ارشاد فرماتا ہے' اے بندے تیرے پاس میری ایک امانت تھی' تو نے اس کی حفاظت کی ہے یا نہیں؟ اگر کی ہے تو میں بھی اپنا وعدہ پورا کروں۔ اور نہیں کی تو میں بھی اپنی وعید کی تکمیل کروں' قرآن کریم کی ان دونوں آیتوں میں اسی عہد کی طرف اشارہ ہے۔

وَأَوْفُوا بِعَهْدِي أُوفِ بِعَهْدِكُمْ (پ ۱ ر ۴ آیت ۴۰)

اور پورا کرو تم میرے عہد کو پورا کروں گا میں تمہارے عہد کو۔

وَالَّذِينَ هُمْ لِأَمَانَاتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُونَ (پ ۲۹ ر ۷ آیت ۳۲)

اور جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا خیال رکھنے والے ہیں۔

قبول توبہ شرائط کی صحت پر منحصر ہے

اگر تم نے قبولیت کے معنی سمجھ لئے ہیں تو تمہیں اس امر میں شک نہ کرنا چاہئے کہ ہر صحیح توبہ قبول کر لی جاتی ہے' جو لوگ نور بصیرت سے دیکھتے ہیں اور قرآنی انوار سے فیض پاتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ ہر قلب سلیم اللہ تعالیٰ کے یہاں مقبول ہے' وہ آخرت میں اللہ تعالیٰ کے قرب کی لذتیں پائیگا اور اپنی غیر فانی آنکھوں سے اللہ تعالیٰ کا دیدار کرے گا۔ یہ لوگ اس حقیقت سے بھی واقف ہیں کہ ہر

---

(۱) اس کی اصل مجھے نہیں ملی

قلب اپنی اصل کے اعتبار سے سلیم پیدا کیا گیا ہے' جیسا کہ حدیث شریف میں ہے کہ ہر بچہ فطرت پر پیدا کیا جاتا ہے' دل کی سلامتی' گناہوں کی تاریکی' اور سیئات کے غبار سے ختم ہوجاتی ہے' وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ ندامت کی آگ اس غبار کو جلا کر راکھ کردیتی ہے' نیکی کا نور دل کے چہرے سے گناہوں کی سیاہی زائل کردیتا ہے' معاصی کی تاریکی کو یہ تاب ہی نہیں کہ وہ نیکیوں کے نور کے سامنے ٹھہر سکیں' جس طرح رات کی تاریکی دن کی روشنی کے سامنے نہیں ٹھہرپاتی بلکہ جس طرح صابون کے سامنے میل کچیل نہیں ٹھہرپاتا' نیز جس طرح بادشاہ میلا کچیلا کپڑا اپنے لباس کے لئے پسند نہیں کرتا' اسی طرح بادشاہ حقیقی بھی گندے دلوں کو اپنے قرب کے لئے منتخب نہیں کرتا پھر جس طرح گندے کاموں میں کپڑوں کا استعمال انھیں میلا کردیتا ہے اور وہ صابون اور گرم پانی سے دھوئے بغیر صاف نہیں ہوتے اسی طرح شہوات میں قلوب کا استعمال انھیں اتنا گندہ کردیتا ہے کہ وہ آنسوؤں کے پانی اور ندامت کے بغیر پاک وصاف نہیں ہوتے' ہر پاک وصاف دل اسی طرح مقبول وپسندیدہ ہے جسطرح صاف کپڑا پسند کیا جاتا ہے' اسلئے کہ تم پر تزکیہ و تطہیر واجب ہے تاکہ قضائے الٰہی کے بموجب اسے شرف قبولیت حاصل ہوجائے' اسی قبولیت کا نام فلاح ہے' جیسا کہ قرآن کریم۔

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا (پ ۳۰ ر ۱۶ آیت ۹)

یقیناً وہ مراد کو پہنچا جس نے اس کو پاک کرلیا۔

اطاعت و معصیت کی تاثیر: یہ ایک واقعہ ہے کہ قلب پر معصیت اور اطاعت کے اثرات بڑے مختلف ہیں ان میں سے معصیت کے اثرات کو مجازاً "ظلمت" کہہ سکتے ہیں' اور اطاعت کو نور سے تعبیر کرسکتے ہیں' جیسے جہالت کو بطور مجاز تاریکی اور علم کو روشنی کہتے ہیں' ظاہر ہے کہ نور اور ظلمت دونوں ایک دوسرے کی ضد ہوتے ہیں جو شخص اس حقیقت سے واقف نہیں وہ گویا صرف پوست اور چھلکے پر قانع ہے مغز سے جو اصل دین ہے واقف نہیں ہے' بلکہ دین کی طرف سے عقل پر دبیز پردہ پڑا ہوا ہے' اگر غور کیا جائے تو ایسا شخص اپنے نفس کی حقیقت اور اس کی صفات کا علم بھی نہیں رکھتا' جو شخص اپنے نفس سے واقف نہ ہو وہ کسی دوسری چیز سے کیا واقف ہوگا' کیونکہ نفس سے ہی دوسری چیز کی معرفت حاصل ہوتی ہے' جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ توبہ اگر درست اور صحیح ہو تب بھی قبول نہیں ہوتی وہ ایسا ہے جیسے کوئی شخص یہ وہم کرے کہ آفتاب کی روشنی سے اندھیرا دور نہیں ہوتا یا صابون سے کپڑے کی نجاست زائل نہیں ہوتی' البتہ اگر میل اتنا تہہ بہ تہہ ہوجائے کہ کپڑے میں اور اس میں کوئی فرق ہی نہ رہے تو وہ صابون سے بھی نہیں دھلتا' اسی طرح اگر گناہ پے بہ پے ہوں تو دل پر اتنا گہرا زنگ ہوجائے گا کہ آسانی سے دور نہ ہوسکے گا' بلکہ بدبختی کی مہر لگ جائے گی۔ ایسا دل نہ کبھی توبہ کرسکے گا' اور نہ رجوع الی اللہ کی طرف مائل ہوگا' زبان سے ہزار بار توبہ توبہ کرے تب بھی کچھ حاصل نہ ہوگا' یہ ایسا ہی ہے جیسے دھوبی زبان سے یہ کہے کہ میں نے کپڑا دھو دیا' کیا زبان سے کہنے سے کپڑا دھل جائے گا ہرگز نہیں' جب تک کپڑے کا میل کچیل دور کرنے کیلئے تدبیر نہ کی جائے اور اسے پانی اور صابون کے ذریعہ دور کرنے کی کوشش نہ کی جائے اس وقت تک میل بدستور باقی رہے گا' یہی حال ان لوگوں کا ہے جو اصل توبہ سے باز رہتے ہیں' بلکہ اکثر لوگوں کا جو دنیا پر کتوں کی طرح گرے ہوئے ہیں' اور باری تعالیٰ سے بالکل منحرف ہیں' یہی حال ہے کہ ان کے دل کا میل دور نہیں ہوتا کیونکہ وہ محض زبان سے توبہ کرتے ہیں دل سے نہیں کرتے۔

قبولیت توبہ کے دلائل: قبولیت کے متعلق اب تک جو کچھ ہم نے لکھا ہے وہ اہل بصیرت کے نزدیک کافی وافی ہے' تاہم عوام الناس اس وقت تک تشنگی محسوس کریں گے جب تک ہم اپنے دعوئی کو دلائل کا پیرہن نہ پہنادیں گے اسلئے کہ جس دعوئی کے لئے کتاب و سنت سے کوئی دلیل نہیں ہوتی وہ عام طور پر لائق اعتماد نہیں ہوتا' اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَهُوَ الَّذِيْ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَيَعْفُوْ عَنِ السَّيِّاٰتِ (پ ۲۵ ر ۴ آیت ۲۵)

اور وہ ایسا ہے کہ اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور ان کے گناہ معاف فرمادیتا ہے۔

غَافِرِ الذَّنْبِ وَقَابِلِ التَّوْبِ (پ ۲۴ ر ۶ آیت ۳)

گناہ معاف کرنے والا اور توبہ قبول کرنے والا

اسکے علاوہ بھی قبول توبہ کے باب میں بے شمار آیات وارد ہیں۔ اس سے پہلے ایک حدیث لکھی گئی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بندے کی توبہ سے بہت خوش ہوتا ہے' ظاہر ہے کہ خوشی قبولیت کے بعد ہے' اور یہ حدیث بھی قبولیت توبہ پر دلالت کرتی ہے۔ ایک حدیث میں ہے

إِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ يَبْسُطُ يَدَهُ بِالتَّوْبَةِ لِمُسِيْءِ اللَّيْلِ إِلَى النَّهَارِ وَلِمُسِيْءِ النَّهَارِ إِلَى اللَّيْلِ حَتّٰى تَطْلُعَ الشَّمْسُ مِنْ مَغْرِبِهَا (مسلم۔ ابو موسیٰ۔ بلفظ آخر)

اللہ تعالیٰ اس شخص کی توبہ کے لئے ہاتھ پھیلائے رکھتا ہے جو رات سے دن تک اور دن سے رات تک گناہ کرے یہاں تک کہ سورج مغرب سے طلوع ہو۔

ہاتھ پھیلانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے ان بندوں سے جو سر تا پا گناہوں میں آلودہ رہتے ہیں' توبہ کا طالب رہتا ہے' طلب کا درجہ قبول کے بعد ہے' یہ ممکن ہے کہ قبول کرنے والا طالب نہ ہو' لیکن طالب قبول کرنے والا ضرور ہوگا۔ ایک حدیث میں ہے

لَوْ عَمِلْتُمُ الْخَطَايَا حَتّٰى تَبْلُغَ السَّمَاءَ ثُمَّ نَدِمْتُمْ لَتَابَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ (ابن ماجہ۔ ابو ہریرہؓ)

اگر تم اتنے گناہ کرو کہ آسمان تک پہنچ جائیں' پھران پر نادم ہو تو اللہ تعالیٰ تمہاری توبہ قبول فرمالیگا۔

ایک حدیث میں ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ بندہ گناہ کرتا ہے اور اس کی وجہ سے جنت میں داخل ہوتا ہے۔ لوگوں نے عرض کیا ایسا کس طرح ہوسکتا ہے کہ ایک شخص گناہ بھی کرے اور جنت میں بھی جائے' فرمایا وہ شخص اس گناہ سے توبہ کرتا ہے اور اس سے گریز کرتا ہے یہاں تک کہ جنت میں داخل ہوجاتا ہے (ابن المبارک فی الزہد' عن الحسن مرسلاً) ایک حدیث کے الفاظ یہ ہیں۔

كَفَّارَةُ الذَّنْبِ النَّدَامَةُ (احمد' طبرانی۔ ابن عباس)

گناہ کا کفارہ ندامت ہے۔

ایک روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَّا ذَنْبَ لَهُ گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہے جیسے اسکا کوئی گناہ ہی نہ ہو۔ ایک روایت ہے کہ کسی حبشی نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا یا رسول اللہ میں برے عمل [illegible] تھا' اگر میں ان سے توبہ کرلوں تو کیا میری توبہ قبول ہوجائے گی؟ آپ نے ارشاد فرمایا کیوں نہیں؟ وہ شخص چلا گیا' پھر واپس آیا اور [illegible] لگا کہ جب میں برے کام کرتا تھا تو کیا میرا اللہ مجھے دیکھتا تھا' آپ نے فرمایا: یقیناً وہ تجھے دیکھتا تھا' یہ سن کر اس حبشی نے [illegible]' اور جان جان آفریں کے سپرد کردی[1] روایت ہے کہ جب شیطان کو بارگاہ خداوندی سے [illegible] اس نے مہلت کی درخواست کی' اللہ تعالیٰ نے اسے قیامت تک کے لئے مہلت سے نوازا' اس نے عرض کیا مجھے قسم ہے تیری عزت و جلال کی میں اس وقت تک ابن آدم کے دل سے نہیں نکلوں گا جب تک اسکے جسم میں روح رہے گی' اللہ تعالیٰ نے فرمایا میں اپنی عزت و جلال کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ جب تک ابن آدم کے جسم میں روح رہے گی اس پر قبولیت توبہ کے دروازے بند نہیں کروں گا (احمد' ابو یعلیٰ' حاکم' ابو سعید) ایک حدیث میں ہے۔

إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ كَمَا يُذْهِبُ الْمَاءُ الْوَسَخَ

[1] مجھے اس روایت کی اصل نہیں ملی [2] ان الفاظ میں یہ روایت نہیں ملی البتہ اس معنی کی روایت ترمذی کے حوالوں سے ابھی گزری ہے

نیکیاں برائیوں کو اس طرح مٹادیتی ہیں جس طرح پانی نجاست کو دور کرتا ہے۔

حضرت سعید بن المسیبؒ ارشاد فرماتے ہیں کہ قرآن کریم کی یہ آیت اِنَّهُ كَانَ لِلْاَوَّابِيْنَ غَفُوْرًا ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی جو گناہ کرتے ہیں' توبہ کرتے ہیں پھر گناہ کرتے ہیں پھر توبہ کرتے ہیں' فضیلؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ گناہ گاروں کو خوشخبری سناؤ کہ اگر انھوں نے توبہ کی تو میں ان کی توبہ قبول کروں گا' اور صدیقین کو تنبیہہ کردو کہ اگر میں نے ان پر عدل کیا تو میں انھیں عذاب دوں گا' طلق ابن حبیب کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے حقوق ایسے عظیم ہیں کہ لوگ انھیں ادا نہیں کرپاتے' بلکہ گناہ گار ہوتے ہیں' اگر وہ صبح و شام توبہ نہ کریں تو معاملہ دشوار ہوجائے' حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ جو بندہ اپنے قصور پر نادم ہوتا ہے اسکا وہ قصور نامہ اعمال سے محو ہوجاتا ہے۔ روایت ہے کہ بنی اسرائیل کے ایک پیغمبر سے کوئی غلطی سرزد ہوگئی اس پر اللہ تعالیٰ نے وحی نازل فرمائی کہ اگر تو نے یہ غلطی دوبارہ کی تو میں عذاب دوں گا' انھوں نے عرض کیا اے اللہ! تو تو ہے میں میں ہوں' تیری عزت کی قسم اگر تو مجھے نہ بچائے گا میں اس قصور کے ارتکاب سے محفوظ نہ رہ سکوں گا' تو ہی مجھے اس غلطی سے محفوظ رکھ' چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انھیں دوبارہ اس قصور سے محفوظ رکھا' ایک بزرگ کا قول ہے کہ بندہ گناہ کرتا ہے اور زندگی بھر اس گناہ پر نادم رہتا ہے یہاں تک کہ وہ موت کے بعد جنت میں داخل ہوجاتا ہے' اس وقت شیطان کہتا ہے کاش میں اسے اس گناہ میں مبتلا ہی نہ کرتا' حبیب ابن ثابت کہتے ہیں کہ قیامت کے دن بندے پر اس کے گناہ پیش ہوں گے' اس کے سامنے جب بھی کوئی گناہ آئے گا وہ کہے گا کہ میں اسی سے خوف زدہ تھا' اس کے کہنے سے وہ قصور معاف کردیا جائیگا' ایک شخص نے حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کی خدمت میں عرض کیا کہ میں نے ایک گناہ کیا ہے' اگر میں توبہ کروں تو اللہ تعالیٰ کے یہاں قبول ہوجائیگی یا نہیں؟ پہلے آپ نے اس کی طرف سے منہ پھیرلیا' پھر آنسو بہاتے ہوئے فرمایا کہ جنت کے آٹھ دروازے ہیں جو کبھی بند ہوتے ہیں اور کبھی کھولدئے جاتے ہیں' صرف توبہ کا ایک دروازہ ایسا ہے جو بند نہیں ہوتا' تم عمل کرتے رہو اور اللہ کی رحمت سے مایوس مت ہو' عبدالرحمٰن بن ابوالقاسم سے روایت ہے کہ ایک بار عبدالرحمٰن کی مجلس میں کافر کی توبہ کا ذکر ہوا' اور اس آیت پر بھی گفتگو ہوئی۔ ان ینتھوا یغفر لھم ما قد سلف۔ انھوں نے فرمایا کہ مجھے توقع ہے کہ مسلمان کا حال اللہ کے نزدیک زیادہ اچھا ہوگا۔ کیوں کہ مجھے یہ روایت ملی ہے کہ مسلمان کا توبہ کرنا ایسا ہے جیسے اسلام کے بعد پھر اسلام لانا' عبداللہ ابن سلام فرماتے ہیں کہ میں تم سے جو روایت بیان کرتا ہوں وہ یا تو نبی مبعوث آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہوئی یا آسمان سے نازل شدہ کتاب قرآن کریم میں دیکھی ہوئی ہے' اور وہ یہ ہے کہ بندہ گناہ کرنے کے بعد ایک لمحہ کیلئے توبہ کرلیتا ہے تو اس سے کم عرصے میں وہ گناہ اس سے ساقط ہوجاتا ہے۔

حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ توبہ کرنے والوں کے پاس بیٹھا کرو' اس لئے کہ وہ نرم خو اور نرم دل ہوتے ہیں' ایک بزرگ نے کہا کہ میں یہ بات جانتا ہوں کہ میری مغفرت اللہ کب کریگا' کسی نے پوچھا کب کرے گا' فرمایا جب وہ میری توبہ قبول کرے گا۔ ایک بزرگ کا قول ہے کہ میں توبہ سے محروم رہوں اس سے زیادہ خوفناک بات یہ ہے کہ میں مغفرت سے محروم رہوں اس لئے کہ مغفرت توبہ کے لئے لازم ہے' اگر توبہ نہ ہوگی تو مغفرت بھی نہ ہوگی' روایت ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک شخص تھا جس نے بیس برس تک اللہ تعالیٰ کی عبادت کی' پھر بیس برس تک اس کی نافرمانی کی' ایک دن آئینے میں چہرہ دیکھا تو سر اور داڑھی کے بالوں میں سفیدی نظر آئی' یہ دیکھ کر اسے بڑی تکلیف ہوئی' اس نے جناب الٰہی میں عرض کیا کہ اے اللہ میں نے تیری بیس برس تک عبادت کی ہے' اور پھر بیس برس تک نافرمانی کی ہے' اب اگر میں تیری طرف رجوع کروں تو تو میری توبہ قبول کرلے گا' غیب سے آواز آئی کہ اے شخص تو ہم سے محبت کرتا تھا ہم تجھ سے محبت کرتے تھے' تو نے ہمیں چھوڑا ہم نے تجھے چھوڑدیا' تو نے نافرمانی کی' ہم نے تجھے مہلت دی' اب اگر تو ہماری طرف رجوع کرے گا تو ہم تجھے اپنے سایۂ رحمت میں جگہ دیں گے' حضرت ذوالنون مصری فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے کچھ بندے ایسے ہیں جنھوں نے گناہوں کے درخت لگائے اور انھیں توبہ کے پانی سے سیراب کیا پھر ان پر ندامت و حزن کے پھل لگے' یہاں تک کہ بغیر جنون کے دیوانے ہوگئے اور بغیر عاجزی و گونگے پن کے گونگے بن گئے' حالانکہ یہ لوگ بڑے فصیح و بلیغ' اور

اللہ و رسول کی معرفت رکھنے والے ہیں' پھر انھوں نے جام صفا نوش کیا' اور طول مشقت کے باوجود صبر کے خوگر بنے' پھر ان کے دل عالم ملکوت کی سیاحت کی مشتاق ہوئے اور انھوں نے اپنی فکر کی کمندیں پردہ ہائے جبروت کے مخفی اسرار پر پھینکنی شروع کیں ندامت کے شجر سایہ دار کے نیچے بیٹھ کر انھوں نے اپنے گناہوں کا صحیفہ پڑھا اور اپنے نفوس پر خوف طاری کیا' یہاں تک کہ تقویٰ کی سیڑھی لگا کر زہد کی بلندیوں تک جا پہنچے' دنیا کی تلخی بھی شیریں ہوگئی' اور بستر کی سختی بھی نرمی سے بدل گئی نجات اور سلامتی کے زینے میسر آئے' اور ان کی روحیں اتنی بلند ہوئیں کہ جنات نعیم کو ٹھکانہ بنالیا' یہ لوگ دریائے حیات میں محو سفر ہوئے' انھوں نے مایوسی اور خوف کی خندقوں کو عبور کیا نفسانی خواہشات کے پلوں سے گزرے' یہاں تک کہ علم کے وسیع میدان میں فروکش ہوئے' حکمت کے چشموں سے سیراب ہوئے' ذہانت کی کشتی کو ذریعۂ سفر بنایا' اس پر نجات کے بادبان تانے' اور سلامتی کے سمندروں میں کشتی کو آگے بڑھایا' ساحل مراد تک پہنچے' راحت کے خیمے لگائے' اور عزت و کرامت کے معدن سے فیض اٹھایا۔

اب تک جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس سے یہ بات پوری طرح ثابت ہو جاتی ہے' کہ اگر توبہ اپنی صحت کی شرائط رکھتی ہو تو اسکی قبولیت کے لئے کوئی چیز مانع نہیں ہے۔

کیا اللہ تعالیٰ پر توبہ قبول کرنا واجب ہے؟ : یہاں ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ گزشتہ سطور سے پتہ چلتا ہے کہ اگر کوئی شخص شرائط کا لحاظ رکھتے ہوئے توبہ کرے تو اللہ تعالیٰ پر اسکا قبول کرنا واجب ہے' یہ بات معتزلہ کے مسلک کے مطابق ہے کیونکہ وہی لوگ یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ پر توبہ قبول کرنا واجب ہے' ہمارا جواب یہ ہے کہ معتزلہ نے وجوب کے جو معنی لئے ہیں وہ ہماری مراد سے مختلف ہیں' ہمارے نزدیک قبول توبہ کا وجوب ایسا ہے جیسے کوئی یہ کہے کہ اگر گندہ کپڑا صابون سے دھویا جائے تو اس کا صاف ہونا واجب ہے' یا پیاسا آدمی پانی پی لے تو اس کی تشنگی دور ہونا واجب ہے' یا اگر کسی شخص کو پانی سے محروم کر دیا جائے تو اس کا پیاس کی شدت سے مرجانا واجب ہے' ظاہر ہے یہاں وجوب کے معنی ضروری کے ہیں' معتزلہ کے نزدیک وجوب کے جو معنی ہیں وہ ان میں سے کسی ایک میں بھی نہیں پائے جاتے' ہم صرف یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اطاعت کو گناہ کا کفارہ بنایا ہے اور نیکی کو برائی مٹانے والی چیز قرار دیا ہے' جیسا کہ پانی کو پیاس بجھانے والی شئی قرار دیا ہے' البتہ اس کی قدرت سے اس کے خلاف بھی ہو سکتا ہے کہ پانی ہو پیاس دور نہ ہو' اطاعت ہو گناہ کا کفارہ نہ بنے' نیکی ہو لیکن اس سے برائی نہ مٹے' خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پر کوئی چیز واجب نہیں ہے' ہاں اگر کسی چیز کے وجود یا عدم وجود کا فیصلہ ازل میں ہو چکا ہے اس کا ہونا بلاشبہ واجب ہے۔

قبول توبہ میں شک کی وجہ : یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر کوئی توبہ کرنے والا یقین سے یہ بات نہیں کہہ سکتا کہ میری توبہ قبول ہوگی' وہ شک میں رہتا ہے' جبکہ پانی پینے والے کو تشنگی دور ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہوتا' اسکی وجہ کیا ہے اسکا جواب یہ ہے کہ توبہ کے قبول ہونے میں کوئی شک نہیں ہوتا بلکہ ان شرائط کی صحیح طور پر ادائیگی میں شک ہوتا ہے جو قبول توبہ کے لئے ضروری ہیں' ان شرائط کا بیان بہت جلد آئے گا انشاء اللہ کیونکہ بندہ عاجز و مسکین تمام شرائط ادا کرنے سے قاصر رہتا ہے' اس لئے وہ اپنی توبہ کے بارے میں یقین سے یہ بات نہیں کہہ سکتا کہ وہ قبول ہوگی' جیسا کہ جلاب لینے والا یقین سے یہ بات نہیں کہہ سکتا کہ دست آئیں گے کیونکہ یہ بات ممکن ہے کہ موسم' مریض کے مزاج اور ماحول کے اعتبار سے جلاب کی جو شرائط ہیں وہ پوری نہ ہوتی ہوں یا دست آور دوا کو اس طرح جوش نہ دیا گیا ہو جس طرح دیا جانا چاہئے' نیز اسہال کی مفرد دوائیں اصلی بھی ہیں یا نہیں اسی طرح کے اندیشے آدمی کے دل میں یہ وسوسے پیدا کرتے ہیں کہ اس کی توبہ قبول نہیں ہوتی۔

دوسرا باب

گناہوں کا بیان

جاننا چاہئے کہ توبہ کے معنی ہیں گناہ ترک کرنا۔ اور کسی چیز کو ترک کرنا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اس کی معرفت نہ

ہو' پھر کیونکہ توبہ واجب ہے اس لئے وہ چیز بھی واجب ہے جس کے ذریعے توبہ کے درجہ تک پہنچا جائے' اس سے معلوم ہوا کہ گناہوں کی معرفت واجب ہے۔

گناہ کی تعریف : گناہ کے معنی ہیں کسی فعل یا ترک فعل میں اللہ کے اوامر کی مخالفت کرنا' اس کی تفصیل کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے تمام احکام اول سے آخر تک بیان کریں لیکن یہ ہمارے مقصد سے خارج ہے' البتہ ہم گناہوں کی اقسام اور ان کے باہمی روابط کی طرف کچھ اشارہ کرتے ہیں' اللہ ہی اپنی رحمت سے ہدایت کی توفیق عطا کرنے والا ہے۔

بندوں کے اوصاف کے لحاظ سے گناہوں کی قسمیں : انسان کے بے شمار اخلاق اور اوصاف ہیں' جیسا کہ عجائب قلب کے ابواب میں ان کی شرح ہو چکی ہے' البتہ وہ اوصاف و اخلاق جن سے گناہوں کو تحریک ملتی ہے چار قسموں میں منحصر ہیں' ربانی اوصاف' شیطانی اوصاف' بہیمانہ اوصاف اور سبعی اوصاف' اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کا خمیر مختلف اخلاط سے تیار کیا گیا ہے' اس لئے ہر خلط انسان کے اندر اپنا الگ اثر چاہتا ہے جیسا کہ سکنجبین میں شکر' سرکہ اور زعفران کی آمیزش کی جائے تو ان میں سے ہر ایک کا اثر جداگانہ ہوتا ہے' اسی طرح انسان کے یہ چاروں اوصاف الگ الگ اثر دکھاتے ہیں' مثلاً ربانی صفت کا تقاضا یہ ہے کہ اس میں کبر اور فخر ہو' وہ جبر پسند ہو' مدح و ثنا' دولت و عزت' اور سطوت و اقتدار کا خواہاں ہو' اور یہ چاہتا ہو کہ تمام مخلوق پر سربلند ہو جائے' اسکا وجود زبان حال سے یہ کہتا ہوا نظر آتا ہے' انا ربکم الاعلیٰ (میں تم سب کا رب اعلیٰ ہوں) اس صفت کے پہلو سے ایسے ایسے گناہ جنم لیتے ہیں کہ لوگوں کو ان کا احساس بھی نہیں ہوتا' اور نہ انھیں گناہوں میں شمار کرتے ہیں' حالانکہ وہ انتہائی مہلک ہیں' اور بے شمار گناہوں کا منبع ہیں' جلد ثالث میں ہم ایسے تمام گناہوں پر بڑی تفصیلی گفتگو کر چکے ہیں' دوسرا وصف شیطانی ہے' اس سے حسد' سرکشی' حیلے' فریب' مکر' جھگڑے' فساد جنم لیتے ہیں' اسی وصف کی بنا پر آدمی منکرات کا حکم دیتا ہے' نفاق' بدعت' بے ایمانی اور دوسری خرافات کی طرف بلاتا ہے' تیسری صفت بہیمی ہے' اس صفت سے بھی بے شمار برائیاں پیدا ہوتی ہیں' جیسے حرص' طمع' شکم و شرمگاہ کی شہوت' زنا' لواطت' چوری' یتیموں کے مال میں تصرف اور غیر شرعی کاموں کے لئے دولت اکٹھا کرنے کی خواہش وغیرہ چوتھی صفت سبعی ہے' اسکے پہلو سے بھی لاتعداد قباحتیں نکلتی ہیں' جیسے غصہ' حسد' کینہ' لوگوں کو مارنا پیٹنا' انھیں گالیاں دینا' قتل کرنا اور ان کا مال تباہ و برباد کرنا' پھر ان گناہوں سے بھی بے شمار گناہ متفرع ہوتے ہیں۔

اوصاف اربعہ کی فطری ترتیب : پیدائش کے لحاظ سے یہ چاروں اوصاف بتدریج پیدا ہوتے ہیں پہلے بہیمی صفت غالب آتی ہے' اسکے بعد سبعی صفت کا غلبہ ہوتا ہے پھر یہ دونوں صفتیں جمع ہو کر عقل کو مکر و فریب اور حیلے کی راہ پر ڈال دیتی ہیں' یہیں سے شیطانی وصف سر اٹھاتا ہے' آخر میں ربوبیت کی اوصاف ابھرتے ہیں یعنی آدمی یہ قصد کرنے لگتا ہے کہ وہ تمام مخلوق پر تفوق حاصل کرلے' چنانچہ بات بے بات فخر کرتا ہے' تعلّی اور کبر کا مظاہرہ کرتا ہے' اپنی عزت و عظمت کے اظہار کے لئے دوسروں کی اہانت کرتا ہے' خلاصہ یہ ہے کہ تمام گناہوں کا منبع اور سرچشمہ یہی چار صفتیں ہیں' ان سے گناہ نکلتے ہیں تو اعضاء پر منتشر ہو جاتے ہیں' بعض گناہ دل سے متعلق ہو جاتے ہیں' جیسے کفر' بدعت' اور نفاق' اور بغض و حسد کا تعلق آنکھ اور کان سے ہوتا ہے' بعض شکم اور شرمگاہ سے متعلق ہوتے ہیں' اور بعض گناہ ہاتھ' پاؤں اور بدن کے دوسرے حصوں سے سرزد ہوتے ہیں' کیوں کہ یہ تمام گناہ واضح ہیں اس لئے ان کی تفصیل کی ضرورت نہیں۔

حقوق اللہ اور حقوق العباد : گناہوں کی ایک اور تقسیم ہے' بعض گناہ وہ ہیں جو بندے اور اسکے خدا کے درمیان ہیں' اور بعض گناہ ایسے ہیں جن کا تعلق بندگان خدا کے حقوق سے ہے' جن گناہوں کا تعلق اللہ تعالیٰ کے حقوق سے ہے وہ یہ ہیں جیسے نماز روزہ اور دوسرے فرائض و واجبات ترک کر دینا اور جو بندوں کے حقوق سے متعلق ہیں وہ یہ ہیں جیسے زکوٰۃ نہ دینا' کسی کو ہلاک کرنا'

کسی کا مال چھین لینا' کسی کی آبرو پر حملہ کرنا' خلاصہ یہ ہے کہ جو شخص غیر حق لیتا ہے' وہ یا تو اسکا نفس لیتا ہے' یا جزو' یا مال' یا آبرو' یا دین' دین کا لینا اس طرح ہے کہ اسے گمراہ کرے اور بدعت میں لگائے' دل میں گناہ کی رغبت پیدا کرے' اور ایسے خیالات میں الجھائے جن سے آدمی میں اللہ تعالیٰ پر جسارت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے' چنانچہ بعض پیشہ ور واعظوں کا طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنے مواعظ میں خوف کو درخور اعتنا نہیں سمجھتے بلکہ رجاء کے پہلو کو اتنا نمایاں کرتے ہیں اور امید و رحمت کے موضوعات پر اس قدر کلام کرتے ہیں کہ آدمی گناہوں پر جری ہو جاتا ہے۔

جن گناہوں کا تعلق بندوں سے ہے ان میں بڑی دشواری ہے' البتہ جو گناہ اللہ اور اسکے بندے کے درمیان ہیں' بشرطیکہ شرک نہ ہوں معافی کی بڑی گنجائش ہے' چنانچہ حدیث شریف میں ہے۔

اَلدَّوَاوِیْنُ ثَلَاثَۃٌ دِیْوَانٌ یُغْفَرُ وَدِیْوَانٌ لَا یُغْفَرُ وَدِیْوَانٌ لَا یُتْرَکُ (احمد' حاکم' عائشہ)

نامۂ اعمال تین طرح کے ہوں گے ایک معاف کردیا جائیگا ایک معاف نہ کیا جائیگا اور ایک چھوڑا نہ جائے گا۔

پہلے نامۂ اعمال سے مراد وہ گناہ ہیں جو بندے اور خالق حقیقی کے درمیان ہیں' دوسرے نامۂ اعمال سے مراد شرک ہے' اور تیسرے سے بندوں کے حقوق مراد ہیں' جن کے متعلق باز پرس ضرور ہوگی' یہاں تک کہ متعلقہ افراد سے معاف کرادئے جائیں گے۔

<u>صغیرہ کبیرہ گناہ :</u> گناہوں کی ایک تقسیم صغیرہ اور کبیرہ گناہوں سے کی جاتی ہے' ان کی تعریف کے سلسلے میں زبردست اختلاف ہے' بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ گناہ نہ چھوٹے ہوتے ہیں اور نہ بڑے ہوتے ہیں' بلکہ ہر وہ عمل بڑا گناہ ہوتا ہے جس میں اللہ تعالیٰ کے احکام کی مخالفت ہو' لیکن یہ رائے صحیح نہیں ہے اس لئے کہ قرآن و حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ صغیرہ گناہ موجود ہیں' چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

اَلَّذِیْنَ یَجْتَنِبُوْنَ کَبَائِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ (پ ۲۷ ر ۶ آیت ۳۲)

وہ لوگ ایسے ہیں کہ کبیرہ گناہوں سے اور بے حیائی کی باتوں سے بچتے ہیں مگر ہلکے ہلکے گناہ

اِنْ تَجْتَنِبُوْا کَبَائِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُکَفِّرْ عَنْکُمْ سَیِّاٰتِکُمْ وَنُدْخِلْکُمْ مُّدْخَلًا کَرِیْمًا (پ ۵ ر ۶ آیت ۳۱)

جن کاموں سے تمکو منع کیا جاتا ہے اگر تم ان میں سے بڑے بڑے کاموں سے بچتے رہو تو ہم تمہاری خفیف برائیاں معاف فرمادینگے۔ اور ہم تم کو ایک معزز جگہ میں داخل کریں گے۔

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں۔

اَلصَّلَوَاتُ الْخَمْسُ وَالْجُمُعَةُ اِلَی الْجُمُعَةِ یُکَفِّرُ مَا بَیْنَهُنَّ اِنِ اجْتُنِبَتِ الْکَبَائِرُ

(مسلم- ابو ہریرہؓ)

پانچوں نمازیں اور جمعہ سے دوسرے جمعہ تک وہ گناہ دور کرتے ہیں جو ان کے درمیان سرزد ہوئے ہیں سوائے کبائر کے۔

ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کَفَّارَاتٌ لِمَا بَیْنَهُنَّ اِلَّا الْکَبَائِرَ' (درمیانی گناہوں کو دور کرنے والے سوائے کبائر کے) حضرت عبداللہ ابن عمرو ابن العاصؓ کی روایت ہے۔

اَلْکَبَائِرُ الْاِشْرَاکُ بِاللّٰهِ وَعُقُوْقُ الْوَالِدَیْنِ وَقَتْلُ النَّفْسِ وَالْیَمِیْنُ الْغَمُوْسُ

(بخاری)

اللہ کا شریک ٹھہرانا' والدین کی نافرمانی کرنا' قتل نفس کرنا اور جھوٹی قسم کھانا بڑے گناہ ہیں۔

صحابہ تابعین کے نزدیک کبائر کی تعداد مختلف فیہ ہے' یہ اختلاف چار سے سات' نو اور دس تک بلکہ اس سے زیادہ تک ہے' حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ کبائر چار ہیں' ابن عمر فرماتے ہیں کہ ان کی تعداد سات ہے' حضرت عبداللہ ابن عمرو کہتے ہیں' جب حضرت عبداللہ ابن عباس نے یہ سنا کہ ابن عمر نے کبائر کی تعداد سات بتلائی ہے تو انھوں نے فرمایا کہ سات کے بجائے ستر کہنا زیادہ قرین ثواب ہے' ایک مرتبہ انھوں نے فرمایا کہ جس بات سے اللہ نے منع فرمایا اس پر عمل کرنا کبیرہ گناہ ہے' ایک بزرگ کی رائے یہ ہے کہ جس گناہ پر دوزخ کے عذاب کی وعید سنائی گئی ہے' وہ کبیرہ ہیں جن کے ارتکاب پر حد واجب ہوتی ہے' بعض لوگوں نے یہ بھی کہا ہے کہ کبائر مبہم ہیں' ان کی تعداد متعین نہیں کی جاسکتی' جس طرح شب قدر معین نہیں ہے' یا جمعہ کی وہ ساعت معلوم و مخصوص نہیں ہے جس میں دعائیں قبول ہوتی ہیں حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ سے کسی نے کبائر کے بارے میں دریافت کیا' آپ نے فرمایا' سورۂ نساء کے شروع سے تیسویں آیت تک پڑھو' جب سائل نے یہ الفاظ پڑھے۔ "اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَائِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ" تو آپ نے فرمایا اس سورت میں یہاں تک اللہ تعالیٰ نے جن امور سے منع فرمایا ہے' وہ کبائر ہیں' ابو طالب مکیؒ فرماتے ہیں' کبائر سترہ ہیں' میں نے یہ تعداد حدیث سے اخذ کی ہے' البتہ اگر حضرت عبداللہ ابن عباسؓ' ابن مسعودؓ اور ابن عمرؓ کے مختلف اقوال جمع کئے جائیں تو ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ چار کبیرہ گناہ دل میں ہوتے ہیں' شرک باللہ' اس کی معصیت پر اصرار' اسکی رحمت سے ناامیدی اور اسکی پکڑ سے بے خوفی' چار کا تعلق زبان سے ہے' جھوٹی گواہی دینا' پاکباز (عورت یا مرد) پر زنا کی تہمت لگانا' اور جھوٹی قسم کھانا' جھوٹی کے معنی یہ ہیں کہ اسکے ذریعہ باطل کو حق اور حق کو باطل بنا کر پیش کیا جائے' اور بعض کے نزدیک اس کی تعریف یہ ہے کہ جس کے ذریعہ کسی مسلمان کا مال ناحق قبضا لیا جائے۔ خواہ وہ پیلو کی مسواک ہی کیوں نہ ہو' جھوٹی قسم کو غموس اس لئے کہتے ہیں کہ اپنے مرتکب کو دوزخ میں ڈال دیتی ہے' اور غموس کے معنی ہیں غوطہ دینا' زبان سے متعلق چوتھا کبیرہ گناہ سحر ہے' اس سے ہر وہ کلام مراد ہے جو انسان کو یا اس کے اعضاء کو اصل خلقت سے بدل دے' تین کبیرہ پیٹ سے متعلق ہیں' شراب اور دیگر نشہ آور چیزیں استعمال کرنی' یتیم پر ظلم و تشدد کر کے ان کا مال کھانا' جان بوجھ کر سود کھانا' دو گناہوں کا تعلق شرمگاہ سے ہے' زنا اور لواطت' دو ہاتھ سے متعلق ہیں' قتل اور چوری' ایک کا تعلق پاؤں سے ہے' میدان جنگ سے فرار' اس طرح کہ ایک دو کے مقابلے سے اور دس بیس کے مقابلہ سے فرار ہو جائیں' ایک گناہ پورے جسم سے تعلق رکھتا ہے' والدین کی نافرمانی' والدین کی نافرمانی یہ ہے کہ اگر وہ کسی چیز کی قسم کھائیں تو بیٹا ان کی قسم پوری نہ کرے' یا وہ اپنی کوئی ضرورت سامنے رکھیں تو اس کی تکمیل نہ کرے یا وہ برا بھلا کہیں تو بیٹا مرنے مارنے پر آمادہ ہو جائے اگر وہ بھوکے ہوں تو انھیں کھانے کو نہ دے یہ رائے اگرچہ قریب فہم ہے لیکن پوری تشفی اس سے بھی نہیں ہوئی کیونکہ اس تعداد میں کمی بیشی کی گنجائش ہے' مثلاً اس میں سود اور یتیم کا مال کھانے کو کبیرہ گناہ کہا گیا ہے' حالانکہ یہ گناہ اموال سے متعلق ہیں' اسی طرح صرف قتل نفس کو کبیرہ گناہ کہا گیا ہے' آنکھ پھوڑنے' ہاتھ کاٹنے اور مسلمان کو اسی طرح جسمانی تکلیفیں پہنچانے کا کہیں ذکر نہیں ہے' یتیم کو مارنا' اس کو تکلیف پہنچانا' اس کا ہاتھ وغیرہ کاٹنا اسکا مال کھانے سے بھی بڑا گناہ ہے' حدیث میں ایک گالی کے جواب میں دو گالی دینے کو بھی کبیرہ گناہ کہا گیا ہے' اور کسی مسلمان کی عزت پر حملہ کرنے کو بھی کبائر میں شمار کیا گیا ہے (احمد' ابوداؤد' ابن زید) یہ گناہ پارسا پر زنا کی تہمت سے الگ ایک گناہ ہے' حضرت ابو سعید الخدریؓ اور بعض دوسرے صحابہ فرماتے ہیں کہ تم بعض کاموں کو بال سے سے زیادہ باریک (معمولی) تصور کرتے ہو' حالانکہ ہم سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانۂ مبارک میں انھیں کبائر سمجھتے تھے (احمد' بزار باختلاف یسیر' بخاری۔ انسؓ) ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ "ہر وہ گناہ جو قصداً کیا جائے کبیرہ ہے اسی طرح ہر وہ گناہ کبیرہ ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے۔

کبیرہ کے معنی : یہ تمام اقوال اپنی جگہ درست ہیں' لیکن ہم یہ کہتے ہیں کہ اس تفصیل سے کبیرہ یا صغیرہ گناہ کی تعریف واضح

نہیں ہوتی' ایک شخص چوری کے متعلق دریافت کرتا ہے کہ یہ گناہ کبیرہ ہے یا نہیں' ظاہر ہے وہ اس وقت قطعیت کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا جب تک اسے کبیرہ کے معنی نہ معلوم ہوں یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص سرقے کے متعلق سوال کرے کہ یہ حرام ہے یا نہیں ظاہر ہے اس کی حرمت یا عدم حرمت کے بارے میں صحیح فیصلہ وہی شخص کر سکتا ہے کہ جسے حرمت کے معنی معلوم ہوں یا یہ معلوم نہ ہو کہ جو گناہ حرام میں ہوتا ہے وہی چوری میں ہوتا ہے' اس صورت میں وہ شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ چوری حرام ہے ہمارے خیال میں تو کبیرہ ایک مبہم لفظ ہے نہ لغت میں اسکے مخصوص معنی ہیں' اور نہ شرع میں اسلئے کہ کبیرہ و صغیرہ اضافی امور ہیں ہر گناہ اپنے چھوٹے کی بہ نسبت بڑا اور بڑے کی نسبت چھوٹا ہے مثلاً کسی اجنبی عورت کے ساتھ لیٹنا اسکی طرف دیکھنے کی بہ نسبت بڑا گناہ ہے' اور اسکے ساتھ زنا کرنے کی بہ نسبت چھوٹا گناہ ہے' البتہ اگر کوئی شخص ان گناہوں کو کبیرہ کہنے لگے جن پر دوزخ کے عذاب کی وعید ہے تو اسمیں کوئی حرج نہیں ہے کیونکہ وہ یہ وجہ بیان کر سکتا ہے کہ دوزخ کا عذاب خوفناک سزا ہے یہ سزا انھیں گناہوں پر مل سکتی ہے جو بڑے ہوں یا یہ کہے کہ جن گناہوں پر حدود واجب ہوتی ہیں وہ کبیرہ ہیں' کیونکہ دنیا میں ان کے لئے جو سزائیں واجب کی گئی ہیں وہ زبردست ہیں' اسی طرح ان گناہوں کو بھی یقین کے ساتھ کبیرہ کہا جا سکتا ہے جن کو کتاب و سنت میں خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے' کتاب و سنت میں ان کے ذکر کی تخصیص ان کی عظمت پر دلالت کرتی ہے' پھر ان کی عظمت میں بھی تفاوت ہو گا کیوں کہ قرآن کریم میں جو گناہ منصوص ہیں ان میں بھی درجات کا تفاوت ہے' بہر حال ان اطلاقات میں کوئی حرج نہیں ہے' صحابہ کرام سے کبیرہ کی تعریف و تحدید میں جو اقوال وارد ہیں وہ بھی اسی نوع کے ہیں' اور ان میں بھی اس طرح کے احتمالات نکل سکتے ہیں۔

کیونکہ قرآن کریم کی اس آیت "إِنْ تَجْتَنِبُوا كَبَائِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ" اور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد "اَلصَّلَوَاتُ كَفَّارَاتٌ لِمَا بَيْنَهُنَّ اِلَّا الْكَبَائِرَ" میں کبیرہ کا ذکر ہے اسلئے یہ ضروری ہے کہ ہم کبیرہ کی تحقیق کریں اور اسکے معنی جاننے کی کوشش کریں' ورنہ ہم کبائر سے اجتناب کیسے کر سکیں گے۔

اس سلسلے میں تحقیقی بات یہ ہے کہ شرعی نقطۂ نظر سے گناہوں کی تین قسمیں ہیں' ایک وہ جن کا بڑا ہونا معلوم ہے' دوسرے وہ جو صغائر میں شمار کئے جاتے ہیں اور تیسرے وہ جن کے شرعی احکام معلوم نہیں' ان کے صغیرہ یا کبیرہ ہونے میں شک ہے' اس طرح کے مشکوک اور مبہم گناہوں کی کوئی جامع مانع تعریف ممکن نہیں ہے' یہ بات اس وقت ممکن تھی جب شارع علیہ السلام سے اس سلسلے میں کوئی تفصیلی حکم منقول ہوتا' یعنی آپ یہ فرما دیتے کہ کبائر سے ہماری مراد فلاں فلاں گناہ ہیں' اور وہ دس یا پانچ ہیں' لیکن کیونکہ روایات میں یہ تفصیلات مذکور نہیں ہیں بلکہ بعض روایات میں تین گناہوں کو کبائر کہا گیا ہے' (بخاری و مسلم۔ ابو بکرہؓ) اور بعض میں سات کو (طبرانی اوسط' ابو سعیدؓ) پھر ایک روایت میں یہ بھی مذکور ہے کہ ایک گالی کے جواب میں دو گالی دینا بھی کبیرہ گناہ ہے حالانکہ نہ اسے تین میں شمار کیا گیا ہے اور نہ سات میں اس سے معلوم ہوا کہ آپ نے کبائر کی ایسی تعداد بیان نہیں فرمائی جس میں حصر کیا گیا ہو' جب شارع ہی نے حصر کا قصد نہیں فرمایا تو دوسرے لوگ اس کی توقع کیسے کر سکتے ہیں' غالباً شارع علیہ السلام نے کبیرہ گناہوں کا عدد اسی لئے مبہم رکھا ہے تاکہ لوگ ڈرتے رہیں' جیسے شب قدر کو اسلئے مبہم رکھا گیا ہے' تاکہ لوگ اس کی تلاش و جستجو میں محنت کریں۔

<u>کبائر کی تقسیم :</u> تاہم ایک اصول کی روشنی میں کبائر کی قسمیں تحقیق کے ساتھ بیان کر سکتے ہیں اور ظن و تخمین سے ان کی جزئیات بھی احاطۂ تحریر میں لا سکتے ہیں' اور یہ بھی بتلا سکتے ہیں کہ سب سے بڑا گناہ کونسا ہے لیکن یہ بتلانا بڑا مشکل ہے کہ سب سے چھوٹا گناہ کون سا ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ ہم شرعی شواہد اور انوار بصیرت سے یہ بات جانتے ہیں کہ تمام شرائع کا مقصد مخلوق کو اللہ تعالیٰ کے قریب کرنا ہے' اور اس کے دیدار کی سعادت سے بہرہ اندوز کرنا ہے' لیکن اللہ تعالیٰ کی قربت اور دیدار کی سعادت کے لئے ضروری ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات اس کی کتابوں اور رسولوں کی معرفت حاصل کرلے' قرآن کریم کی اس آیت میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ (پ ۲۷ ر ۲ آیت ۵۶)
میں نے جن و انس کو صرف اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے

یعنی جن و انس کی تخلیق کا مقصد یہ ہے کہ یہ میرے بندے بن جائیں' اور بندہ صحیح معنوں میں بندہ اس وقت تک نہیں ہوتا جب تک وہ اپنے رب کی ربوبیت اور اپنے نفس کی عبودیت کی معرفت حاصل نہ کرلے' اور یہ نہ جان لے کہ رب کسے کہتے ہیں' اور نفس کیا ہے' رسول اسی اعلیٰ اور اصل مقصد کے لئے بھیجے جاتے ہیں' لیکن دنیوی زندگی کے بعد اس مقصد کی تکمیل نہیں ہوتی' اسی لئے حدیث شریف میں دنیا کو آخرت کی کھیتی کہا گیا ہے' اس سے معلوم ہوا کہ دنیا کی حفاظت بھی دین کی اتباع میں مقصود ہے' اسلئے کہ دنیا دین کا وسیلہ ہے' دنیا میں جو چیز آخرت سے متعلق ہے وہ دو ہیں نفس اور مال' اس طرح یہاں تین درجات ہوئے ایک معرفت الٰہی کا درجہ ہے' جس کی حفاظت دلوں میں ہوتی ہے' ایک نفس کی حفاظت ہے جس کا تعلق جسموں سے ہے' اور ایک مال کی حفاظت ہے جس کا تعلق لوگوں سے ہے' اسی اعتبار سے گناہ کی تقسیم بھی ہے' یعنی سب سے بڑا گناہ وہ ہے' جو معرفت الٰہی کا دروازہ بند کردے' اور اس کے بعد وہ گناہ ہے جو لوگوں پر ان کی زندگی تنگ کردے' اور اسکے بعد وہ گناہ ہے' جس سے لوگوں پر معاش کے دروازے بند ہوجائیں' بہرحال یہ تین درجات ہیں' قلوب میں معرفت الٰہی کی حفاظت' جسموں میں زندگی کی حفاظت' اور بندگان خدا کے پاس اموال کی حفاظت' یہ تینوں چیزیں تمام شرائع میں مقصود ہیں۔ اور کسی قوم کے بارے میں یہ تصور نہیں کیا جاسکتا کہ وہ اس سے اختلاف کرے گی' اس لئے کہ یہ بات عقل تسلیم ہی نہیں کرسکتی کہ اللہ تعالیٰ کسی پیغمبر کو دین و دنیا کے معاملات میں مخلوق کی اصلاح کے لئے مبعوث کرے' پھر انھیں ایسے کاموں کا حکم دے جو اس کی اور اسکے رسولوں کی معرفت کی راہ میں رکاوٹ ڈالیں لوگوں کی جانوں اور مالوں کو ضائع کریں۔

<u>کبائر کے تین مراتب</u> : اس سے معلوم ہوا کہ کبائر کے تین مراتب ہیں' ایک وہ ہے جو اللہ اور اس کی معرفت کے مانع ہے' یہ کفر ہے' اور کفر سے بڑھ کر کوئی کبیرہ نہیں ہے' اللہ اور اسکے درمیان جو حجاب ہے وہ جہل ہے اور جس ذریعہ سے اللہ کا تقرب حاصل ہوتا ہے وہ علم و معرفت ہے آدمی کے پاس جس قدر معرفت ہوتی ہے اسی قدر وہ اللہ کے قریب ہوتا ہے' اور جس قدر جہالت ہوتی ہے اسی قدر وہ اللہ سے دور ہوتا ہے' جہالت سے قریب تر جسے کفر بھی کہتے ہیں یہ بات بھی ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بے خوف ہوجائے اور اس کی رحمت سے مایوس ہوجائے' عذاب الٰہی سے بے خوفی اور اس کی رحمت سے ناامیدی بھی جہل محض ہے' اس لئے کہ جو اللہ تعالیٰ کی معرفت رکھتا ہے' وہ نہ اسکے عذاب سے بے خوف ہوتا ہے' اور نہ اسکی رحمت سے مایوس اور ناامید۔ بدعت کی وہ تمام قسمیں کبیرہ گناہ کے اسی مرتبے کے قریب ہیں جو اللہ تعالیٰ کی ذات' اوصاف اور افعال سے متعلق ہیں' تاہم ان میں سے بعض بدعتیں بعض بدعتوں سے شدید تر ہیں' یہ تفاوت اسی قدر ہے جس قدر ان سے جہالت ہے' یا جس قدر ان کی معرفت ہے۔ ان کے مراتب بھی بے شمار ہیں لیکن بحیثیت مجموعی انہیں تین درجوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے' کچھ وہ ہیں جو قرآن کریم میں مذکور کبائر میں داخل ہیں' اور کچھ وہ ہیں جو داخل نہیں ہیں' اور کچھ وہ ہیں جن کا قرآن کریم میں مذکور کبائر میں داخل ہونا مشکوک ہے۔

کبائر کے دوسرے مرتبے کا تعلق نفوس سے ہے' ان کے تحفظ اور بقا سے حیات باقی رہتی ہے' اور حیات سے معرفت الٰہی حاصل ہوتی ہے۔ کسی کو جان سے مار دینا بلاشبہ کبیرہ گناہ ہے' لیکن اس کا درجہ کفر سے کم ہے' اس لئے کہ کفر کا براہ راست اصل مقصد (معرفت الٰہی) سے ٹکراؤ ہے' اور قتل سے ذریعہ معرفت پر ضرب پڑتی ہے۔ اس لئے کہ دنیا کی زندگی آخرت کے لئے مقصود ہے اور آخرت تک پہنچنا معرفت الٰہی کے بغیر ممکن نہیں' ہاتھ پاؤں کاٹنا' یا کوئی ایسا کام کرنا جو ہلاکت کا باعث ہو' خواہ معمولی زدوکوب ہی سے آدمی ہلاک ہوجائے' قتل سے قریب ہیں' اور کبیرہ گناہ ہیں' تاہم ہلاکت کا باعث بننے والے افعال متفاوت ہیں' بعض میں شدت زیادہ ہے' اور بعض میں کم ہے' اسی مرتبے میں زنا اور لواطت بھی داخل ہے' لواطت کو قتل کے مرتبے میں اس لئے رکھا گیا ہے کہ اگر بالفرض تمام انسان اپنے ہم جنسوں سے شہوت پوری کرنے لگیں تو نسل انسانی کا سلسلہ ہی منقطع ہوجائے' جس طرح وجود کا ختم کرنا گناہ ہے اسی طرح وجود کا سلسلہ منقطع کرنا بھی گناہ ہے۔ اگرچہ زنا سے انسانی نسل کا سلسلہ ختم نہیں ہوتا' لیکن نسب میں انتشار پیدا ہوجاتا ہے' اور وراثت کا نظام ختم ہوجاتا ہے' ایک دوسرے کی مدد اور تعاون سے چلنے والے امور درہم برہم ہوجاتے ہیں' اگر زنا مباح کردیا جائے تو دنیا کا نظام کس طرح صحیح طور پر قائم رہ سکتا ہے' یہی وجہ ہے کہ بہائم میں کوئی نظام نہیں' کیونکہ ان کے نر مخصوص مادہ کے ساتھ علیحدہ نہیں ہوتے' اس سے معلوم ہوا کہ کسی ایسی شریعت میں جس سے اصلاح مقصود ہو زنا مباح ہو ہی نہیں سکتا' پھر زنا یقیناً قتل سے رتبے میں کم ہے' کیوں کہ زنا سے نہ وجود ختم ہوتا ہے اور نہ دوام وجود کا سلسلہ متاثر ہوتا ہے' صرف نسب کا امتیاز ختم ہوتا ہے' اور ایسے عوامل کا محرک ہوتا ہے جن سے زندگی کا نظام درہم برہم ہو۔ اور فساد برپا ہو' لیکن زنا لواطت سے بڑا گناہ ہے' کیونکہ اس میں جانبین سے شہوت کے دواعی ہوتے ہیں' اس لئے زنا لواطت کی بنسبت کثیر الوقوع ہے۔

تیسرے مرتبہ میں اموال ہیں' اموال سے انسانی زندگی کے معاشی مسائل حل ہوتے ہیں اس لئے کسی انسان کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ کسی دوسرے کا مال چوری' غصب یا کسی اور ذریعہ سے چھینے' بلکہ مال کی حفاظت ضروری ہے کیونکہ نفوس مال ہی سے باقی رہتے ہیں لیکن کیونکہ مال چھین کر بعینہ واپس کیا جاسکتا ہے' اور ضائع ہوجانے کی صورت میں اس کا معاوضہ دیا جاسکتا ہے اس لئے بظاہر اس کی کوئی اہمیت نہیں معلوم ہوتی' تاہم اگر مال اس طرح لیا جائے کہ اس کا تدارک نہ کیا جاسکے تو اس وقت اس عمل کے کبیرہ ہونے میں کوئی شبہ نہیں' اور اس طرح لینے کی چار صورتیں ہوسکتی ہیں' ایک یہ کہ چھپا کرلے' اسے چوری کہتے ہیں' کیونکہ اس میں صاحب مال کو اطلاع نہیں ہوتی اس لئے تدارک نہیں ہوپاتا' دوسرے یتیم کا مال کھانا' یہ بھی مخفی رہتا ہے' مثلاً کوئی ولی اگر اسکے مال کا نگراں ہے اور وہ اسے استعمال کرلے تو دوسرا اس سے باخبر نہیں ہوتا اس مال کا حقدار صرف یتیم ہے اور وہ اپنی بے خبری یا ناطاقتی کے باعث اپنا حق وصول کرنے پر قادر نہیں ہے' یتیم کا مال کھانا غصب اور خیانت سے مختلف ہے' غصب تو علی الاعلان ہوتا ہے' اور خیانت بھی ظاہر ہوجاتی ہے۔ ان دونوں صورتوں میں مالک مال دعوے کے ذریعہ اپنا حق حاصل کرسکتا ہے۔ تیسری صورت یہ ہے کہ جھوٹی گواہی سے کسی کا مال ضائع کردیا جائے' اور چوتھی صورت یہ ہے کہ جھوٹی قسم کھا کر امانت پر قبضہ کرلیا جائے' یہ چاروں صورتیں ایسی ہیں کہ ان کا تدارک ممکن نہیں ہے' ان تمام صورتوں کی حرمت میں شریعتیں مختلف بھی نہیں ہیں ان میں سے بعض صورتیں بعض کی بنسبت سخت ہیں' مگر مرتبہ دوم سے کم ہیں جس کا تعلق نفوس سے ہے یہ چاروں مرتبے کبیرہ کہلانے کے مستحق ہیں اگرچہ شریعت نے ان میں سے بعض کے اندر حد واجب نہیں کی ہے لیکن وعید کی کثرت اور دنیاوی

مصالح میں اپنے اثرات کے اعتبار سے انھیں کبائر میں شمار کیا جانا چاہئے۔

سود کھانا کبیرہ ہے یا نہیں : سود کا مال کھانا دراصل دوسرے کا مال اس کی رضامندی سے کھانا ہے اگرچہ اس میں وہ شرط مفقود ہے جو شریعت نے عائد کی ہے' اسلئے یہ ممکن ہے کہ اس کی حرمت میں شرائع کا اختلاف بھی ہو۔ اور کیوں کہ غصب کو ان دو باتوں کی موجودگی کے باوجود کبیرہ نہیں کہا گیا کہ اس میں غیر کا مال اس کی رضا کے بغیر لیا جاتا ہے' اور شریعت کی رضا کے خلاف بھی ہے تو سود کھانے کو کبیرہ کیسے کہا جاسکتا ہے' جس میں مالک کی رضا موجود ہے' صرف شریعت کی رضا مفقود ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ سود کے سلسلے میں شریعت نے بڑی شدت سے کام لیا ہے اور اس ذیل میں سخت ترین وعیدیں وارد ہیں تو غصب وغیرہ کے مظالم اور خیانت کے سلسلے میں بھی کچھ کم وعیدیں منقول نہیں ہیں' اسلئے انھیں بھی کبیرہ کہنا چاہئے' اور یہ کہنا کہ خیانت و غصب کا ایک دھیلا بھی کبیرہ ہے غور و فکر کا محتاج ہے' غالب ظن یہی کہتا ہے کہ اسے کبائر کے ذیل میں داخل نہ کیا جائے' بلکہ مناسب یہ ہے کہ کبیرہ صرف ان گناہوں کو قرار دیا جائے جن میں شرائع مختلف نہ ہوں تاکہ دین کے ضروری امور شامل ہو سکیں۔

گالی دینا اور شراب خوری وغیرہ : ابو طالب مکی نے متعدد کبائر بیان کئے ہیں' ان میں سے گالی دینا' شراب پینا' سحر' میدان جنگ سے فرار اور والدین کی نافرمانی جیسے گناہ باقی رہ جاتے ہیں۔

جہاں تک شراب نوشی کا معاملہ ہے' اس سے عقل زائل ہو جاتی ہے' اس اعتبار سے اس کا کبیرہ ہونا مناسب ہے' شریعت کی وعیدیں بھی اس کے کبیرہ ہونے پر دلالت کرتی ہیں' اور عقلی دلائل سے بھی کچھ ایسا ہی ثابت ہوتا ہے' عقلی دلیل یہ ہیکہ جس طرح نفس کی حفاظت ضروری ہے اسی طرح عقل کی بھی حفاظت ضروری ہے بلکہ اگر عقل نہ ہو تو جسم و جان بیکار ہیں' اس سے ثابت ہوا کہ کسی کی عقل ختم کرنا بھی کبیرہ گناہ ہے۔

لیکن یہ دلیل صرف اتنی شراب نوشی پر جاری ہوتی ہے جس سے عقل زائل ہو جائے' ایک قطرہ شراب کو اس پر قیاس نہیں کیا جاسکتا کیونکہ اس سے عقل زائل نہیں ہوتی' مثلاً اگر کوئی شخص پانی پئے اور اس میں شراب کا ایک قطرہ بھی ہو تو عقل کا تقاضا یہ ہے کہ اسے کبیرہ نہ کہا جائے بلکہ یہ کہا جائے کہ اس نے نجس پانی پیا ہے لیکن کیونکہ شریعت نے شراب کے ایک قطرے پر بھی حد واجب کی ہے اس سے معلوم ہوا کہ شریعت کی نظر میں ایک قطرے کا معاملہ بھی سخت ہے' اسی لئے اسے کبیرہ کہا جاتا ہے' شریعت نے اسے کبیرہ کیوں قرار دیا یہ اسرار ہیں' اور آدمی کے بس سے باہر ہے کہ وہ شریعت کے تمام اسرار سے واقف ہو جائے' بہ ہر حال اگر اس طرح کے امور کے کبیرہ ہونے پر اجماع ہو تو اتباع واجب ہوگا' ورنہ توقف کی گنجائش ہے۔

قذف میں آبرو پر حملہ ہوتا ہے' اس کا رتبہ مال کے رتبہ سے کم ہے' پھر اسکے بے شمار مراتب ہیں' ان میں سب سے بڑا مرتبہ اسکا ہے کہ کسی پر زنا کی تہمت لگائی جائے' شریعت نے تہمت زنا کو بہت بڑا جانا ہے' یہاں تک کہ حد بھی واجب کی ہے' غالب گمان یہی ہے کہ صحابہ کرام ان گناہوں کو کبیرہ قرار دیا کرتے تھے جن پر شریعت نے حد واجب کی ہے' اس لحاظ سے قذف بھی گناہ کبیرہ ہے' یعنی ایسا گناہ ہے جو پنج وقتہ نمازوں سے معاف نہیں ہوتا' کبیرہ سے ہم ایسے ہی گناہ مراد لیتے ہیں جن کا کفارہ فرض نمازوں سے نہیں ہوتا لیکن کیونکہ اسکے کبیرہ ہونے میں شرائع مختلف ہیں اس لحاظ سے اس میں کچھ سنگینی محسوس نہیں ہوتی' بلکہ ہو سکتا تھا کہ شریعت کا حکم یہ ہوتا کہ اگر ایک معتبر آدمی کسی شخص کو زنا کرتے ہوئے دیکھ لے تو اسے اسکے خلاف گواہی دینے کا حق ہوتا ہے' اگر اس کی شہادت قابل قبول نہ ہوتی تو دنیاوی مصالح کے اعتبار سے بھی اس پر حد جاری کرنا ضروری نہ ہوتا' اگرچہ بظاہر وہ مصالح حاجات کے رتبے میں ہوتے' مگر اس صورت میں صرف اس شخص کے حق میں قذف کبیرہ گناہ ہوتا ہے' جسے شریعت کا حکم معلوم ہے مگر جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ محض میرے لئے گواہی دینی جائز ہے یا یہ سمجھتا ہے کہ دوسرا میری گواہی میں میری مدد کرے گا تو اسکے حق میں کبیرہ قرار نہیں دینا چاہیے۔

جادو کی بات یہ ہے کہ اگر اس میں کفر ہے تو وہ کبیرہ ہے ورنہ اس کی سنگینی اتنی ہی ہوگی جتنا اس کا ضرر ہوگا مثلاً جان چلی جائے

یا بیماری وغیرہ پیدا ہو جائے۔ میدان جہاد سے فرار' اور والدین کی نافرمانی کے متعلق بھی قیاس کا تقاضہ یہ ہے کہ ان میں توقف کیا جانا چاہیے۔ جیسا کہ یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو چکی کہ صرف کبیرہ گناہ ہے "گالی دینا مارنا" ظلم کرنا (یعنی مال چھین لینا) گھروں سے نکال دینا اور وطن سے بے وطن کر دینا یہ تمام گناہ کبیرہ میں داخل نہیں ہیں کیونکہ کبیرہ گناہوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد سترہ منقول ہے' اور یہ گناہ ان سترہ میں شمار نہیں کئے گئے ہیں کہ اس لحاظ سے اگر والدین کی نافرمانی اور میدان جنگ سے فرار کو بھی کبیرہ نہ کہا جائے تو کوئی حرج نظر نہیں آتا' لیکن کیونکہ حدیث میں انہیں کبیرہ قرار دیا گیا اسلئے یہ دونوں گناہ کبیرہ ہیں۔

اس گفتگو کا حاصل یہ نکلا کہ جن گناہوں کو کبیرہ کہا جاتا ہے اس سے ہماری مراد وہ گناہ ہیں جن کا تدارک فرض نمازوں سے نہ ہو سکے' اور ایسے گناہوں کی تین قسمیں ہیں' کچھ وہ ہیں جن کے بارے میں قطعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ پنج وقتہ نمازوں سے ان کا تدارک ہو جاتا ہے' اور کچھ وہ ہیں جن کے بارے میں یہ گمان ہے کہ پنج وقتہ نمازیں ان کے لئے کفارہ بن جانی چاہییے' اور کچھ وہ ہیں جن کے سلسلے میں توقف کیا جاتا ہے' ایسے گناہوں کی بھی دو قسمیں ہیں کچھ وہ ہیں جن کے بارے میں غالب گمان یہی ہے کہ وہ کبیرہ ہے' اور کچھ وہ ہیں جن کا حکم مشکوک ہے' پھر یہ شک ایسا ہے کہ کتاب و سنت کی نصوص کے بغیر اسکا ازالہ ممکن نہیں' اور کیونکہ اب کوئی جدید نص نہیں آئے گی اس لئے یہ شک یقینی طور پر اپنی جگہ باقی رہے گا۔

ایک اعتراض کا جواب: یہاں ایک اعتراض یہ کیا جا سکتا ہے کہ تمہارے دلائل سے ثابت ہوتا ہے کہ کبیرہ کی تعریف معلوم کرنا محال ہے پھر شریعت کسی ایسی چیز پر کوئی حکم کیسے لگا سکتی ہے جس کی تعریف ہی معلوم نہ ہو' اسکے جواب میں کہا جائیگا کہ دنیا میں جتنے بھی گناہوں سے کوئی حکم متعلق ہے ان سب میں کچھ نہ کچھ ابہام ضرور پایا جاتا ہے' دنیا ہی ایک ایسی جگہ ہے جہاں شرعی احکام نافذ ہو سکتے ہیں' کبیرہ کے متعلق کوئی مخصوص حکم شریعت میں نہیں ہے' بلکہ کچھ گناہ ہیں جن پر حدود واجب ہیں' اور ان کے نام الگ الگ ہیں جیسے چوری اور زنا وغیرہ' اور پھر ہر ایک کی الگ الگ سزا ہے' البتہ کبیرہ ہی ایک ایسا حکم ہو سکتا ہے' جو مشترک ہو یعنی نماز پنجگانہ سے انکا کفارہ نہیں ہوتا' یہ حکم آخرت سے متعلق ہے دنیا سے متعلق نہیں ہے کہ کبیرہ کی صحیح صحیح تعریف جاننے کی ضرورت پیش آئے بلکہ اسکا مبہم رہنا ہی مناسب ہے تاکہ لوگ ہر وقت خوفزدہ رہیں اور پنج وقتہ نمازوں پر اکتفا کر کے صغیرہ گناہوں پر جری نہ ہو جائیں۔

ایک آیت کی تشریح: قرآن کریم میں ایک آیت کبائر سے متعلق یہ ہے۔

اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ (پ ۵ ر ۲ آیت ۳۱)

جن کاموں سے تمکو منع کیا جاتا ہے ان میں جو بڑے بڑے کام ہیں اگر تم ان سے بچتے رہو تو تمہاری خفیف برائیاں تم سے دور فرما دیں گے۔

بظاہر اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر کبائر سے اجتناب کیا جائے تو یہ عمل صغائر کے لئے کفارہ بن جاتا ہے' لیکن یہ بات ہر صورت میں نہیں ہے' بلکہ قدرت اور ارادے کے ساتھ مشروط ہے کہ کوئی شخص اپنے ارادے اور قدرت کے باوجود کبیرہ گناہ سے اجتناب کرے' مثلاً ایک شخص کسی عورت پر قدرت رکھتا ہو' اور وہ اس کے ساتھ مباشرت کا خواہش مند بھی ہو' لیکن زنا کے خوف سے محض ہاتھ سے چھونے اور آنکھ سے دیکھنے پر اکتفا کرے' اس صورت میں چھونے اور دیکھنے سے جو ظلمت دل میں پیدا ہو گی' وہ زنا نہ کرنے کے نور سے زائل ہو جائے گی' یہی معنی کفارہ کے ہیں کہ ایک سے دوسرا زائل ہو جاتا ہے' اور ایک دوسرے کا عوض بن جاتا ہے' لیکن اگر کوئی شخص نامرد ہے' یا کسی اور وجہ سے مثلاً کسی کے دیکھنے کے خوف سے جماع نہ کر سکا تو یہ صورت چھونے اور دیکھنے کے گناہ کا کفارہ نہیں بنے گی' اسی طرح ایک شخص شراب پینے کا عادی نہیں ہے' اور طبیعت شراب کو قبول کرتی ہے' اس صورت میں اگر اسے شراب میسر آجائے اور وہ پینے سے باز رہے تو یہ عمل ان چھوٹے گناہوں کا کفارہ نہ بن سکے گا جو شراب نوشی کی مجلسوں میں عام طور پر ہوا کرتے ہیں' جیسے موسیقی وغیرہ سے دل بہلانا۔ ہاں اگر وہ شخص شراب کا عادی بھی

ہے' اور موسیقی سے بھی شغف رکھتا ہے' اور اپنے نفس پر مجاہدہ کرکے شراب سے باز رہتا ہے' اور موسیقی سے دل بہلاتا ہے تو یہ ہوسکتا ہے کہ مجاہدے کے ذریعہ نفس کو شراب پینے سے روکنے کا عمل اسکے دل سے اس تاریکی کا خاتمہ کردے جو موسیقی کے سننے سے پیدا ہوتی ہے' یہ تمام احکام آخرت سے متعلق ہیں' ہوسکتا ہے ان میں سے بعض مشکوک رہیں اور متشابہات میں شمار کئے جائیں جن کے بارے میں کوئی فیصلہ کسی قطعی نص کے بغیر نہیں کیا جاسکتا۔

کبیرہ کی جامع تعریف : کبیرہ گناہ کی کوئی ایسی تعریف جسے جامع کہا جاسکے وارد نہیں ہوئی ہے بلکہ روایات میں مختلف الفاظ منقول ہیں' مثلاً ایک روایت میں جو حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی یہ الفاظ ہیں۔

اَلصَّلٰوۃُ اِلَی الصَّلٰوۃِ کَفَّارَۃٌ وَرَمَضَانُ اِلٰی رَمَضَانَ کَفَّارَۃٌ اِلَّا مِنْ ثَلَاثٍ اِشْرَاکُ بِاللّٰہِ وَتَرْکُ السُّنَّۃِ وَنَکْثُ الصَّفْقَۃِ قِیْلَ مَاتَرْکُ السُّنَّۃِ قِیْلَ اَلْخُرُوْجُ عَنِ الْجَمَاعَۃِ وَنَکْثُ الصَّفْقَۃِ اَنْ تُبَایِعَ رَجُلاً ثُمَّ یَخْرُجُ عَلَیْہِ بِالسَّیْفِ یُقَاتِلُہٗ (حاکم۔ ابو ہریرہؓ)

ایک نماز دوسری نماز تک کا کفارہ ہوتی ہے' ایک رمضان دوسرے رمضان تک کا کفارہ ہوتا ہے' مگر نماز اور رمضان سے تین چیزوں کا کفارہ نہیں ہوتا' شرک باللہ' ترک سنت اور نقض عہد' لوگوں نے عرض کیا' ترک سنت اور نقض عہد سے آپ کی مراد کیا ہے' فرمایا جماعت سے نکلنا ترک سنت ہے' اور نقض عہد یہ ہے کہ کوئی معین آدمی کسی کے ہاتھ پر بیعت کرے پھر تلوار لے کر اس سے لڑنے کیلئے نکل آئے۔

اسی طرح کی روایات ہیں' نہ ان سے کبائر کا احاطہ ہوتا ہے' اور نہ کوئی جامع تعریف سامنے آتی ہے' اسلئے کبیرہ مبہم ہی رہے گا' البتہ یہاں آپ ایک اعتراض کرسکتے ہیں کہ شہادت ان لوگوں کی قبول کی جاتی ہے' جو کبیرہ گناہوں سے اجتناب کرتے ہیں' صغائر سے اجتناب قبول شہادت کے لئے شرط نہیں ہے' تم پہلے یہ لکھ چکے ہو کہ کبیرہ سے کوئی دنیوی حکم متعلق نہیں بلکہ اسکا تعلق آخرت سے ہے' جب کہ شہادت وغیرہ کے احکام دنیوی ہیں' اور کبائر سے اجتناب ان احکام کے نفاذ کے لئے ایک اہم شرط کی حیثیت رکھتا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ کسی کی شہادت محض اس لئے قابل رد نہیں ہوتی کہ وہ کبائر کا ارتکاب کرتا ہے' بلکہ بعض دوسرے اسباب کی بنائر بھی رد کردی جاتی ہے' مثلاً اس شخص کی گواہی بالاتفاق مردود ہے' جو موسیقی سنے' ریشم کا لباس پہنے' سونے کی انگوٹھی پہنے' اور چاندی سونے کے برتنوں میں کھائے پیئے' حالانکہ یہ تمام گناہ صغیرہ ہیں' کسی بھی عالم نے ان کو کبیرہ نہیں کہا ہے' امام شافعی نے تو یہاں تک کہا ہے کہ اگر کسی حنفی نے نبیذ پی لی تو میں اس پر حد جاری کردوں گا لیکن اسکی شہادت رد نہیں کروں گا' گویا انھوں نے حد جاری کرنے کے اعتبار سے نبیذ پینے کو کبیرہ قرار دیا' لیکن اسے شہادت رد کرنے کا باعث نہیں سمجھا' اس سے معلوم ہوا کہ شہادت کا رد و قبول صغائر و کبائر پر منحصر نہیں ہے' بلکہ تمام گناہوں سے عدالت مجروح ہوتی ہے' سوائے ان باتوں کے جن سے آدمی عادتاً اجتناب نہیں کرپاتے' جیسے غیبت' تجسس' بدگمانی' بعض باتوں میں کذب بیانی' غیبت سننا' امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ترک کرنا' مشتبہ مال کھانا' بچوں اور غلاموں کو گالی دینا' اور غصے کے وقت ضرورت اور مصلحت سے زیادہ ان کو زدوکوب کرنا' ظالم بادشاہوں کی تعظیم کرنا' برے لوگوں سے تعلق رکھنا' اور اپنے بیوی بچوں کو دینی تعلیم دینے میں سستی کرنا' یہ تمام گناہ ایسے ہیں کہ ہر گواہ میں یہ تمام گناہ یا ان میں سے کچھ یا اسکے تھوڑے بہت اثرات ضرور پائے جاتے ہیں' البتہ صرف وہ شخص اس نوع کے گناہوں سے پوری طرح محفوظ رہ سکتا ہے جو کچھ عرصے کے لئے لوگوں سے کنارہ کش ہوجائے اور صرف آخرت پیش نظر رکھے' ایک عرصہ دراز تک نفس کے ساتھ مجاہدہ کرے اور اس قدر کامل ہوجائے کہ اگر لوگوں کے ساتھ اختلاط بھی ہو تو کوئی فرق نہ پڑے بلکہ ایسا ہی رہے جیسا خلوت میں تھا' اگر شہادت کے لئے ایسے ہی لوگوں کی شرط ہو تو ان کا ملنا مشکل ہی نہیں محال ہوجائے' اور شہادت وغیرہ کے تمام احکام ضائع ہوجائیں۔

بہرحال ریشمی لباس پہننے موسیقی سننے' نرد کھیلنے شراب خوری کے وقت مے نوشوں کے ساتھ بیٹھنے اجنبی عورتوں کے ساتھ خلوت میں رہنے سے شہادت کی اہلیت ختم نہیں ہوتی' اور کسی شخص کی گواہی کے رد و قبول کا معیار یہ رہنا چاہیے جو بیان کیا گیا' کبیرہ و صغیرہ پر نظر نہ رکھنی چاہیے' البتہ ان صغائر میں سے بھی کسی ایک پر کوئی شخص مواظبت کرے گا اور مسلسل اسکا ارتکاب کرتا رہے گا' تو اس کا یہ عمل بھی رد شہادت میں مؤثر ہو سکتا ہے جیسے کوئی شخص غیبت اور عیب گوئی کو اپنی عادت ثانیہ بنا لے' یا مستقل بدکاروں کی مجلسوں میں بیٹھا رہے' اور ان سے دوستی رکھے' مواظبت اور تسلسل سے صغائر بھی کبائر ہو جاتے ہیں جیسا کہ بعض مباح امور مواظبت سے صغیرہ بن جاتے ہیں مثلاً شطرنج کھیلنا (۱) اور ترنم سے گانا وغیرہ۔

اخروی درجات کی تقسیم دنیاوی اعمال میں

جاننا چاہیے کہ دنیا عالم ظاہری کو کہتے ہیں' اور آخرت عالم غیب کا نام ہے' دنیا سے ہماری مراد تمہاری وہ حالت ہے جو موت سے پہلے ہے۔ اور آخرت سے مراد وہ حالت ہے جو موت کے بعد ہے' گویا دنیا اور آخرت ہماری صفات ہیں جن میں سے ان صفات کو جو قریب میں واقع ہیں' دنیا کہتے ہیں اور جو دیر میں آنے والی ہیں انھیں آخرت سے تعبیر کیا جاتا ہے' اس وقت ہم دنیا کے ذکر سے آخرت میں پہنچنے کا قصد رکھتے ہیں' یعنی اگرچہ ہم دنیا میں کلام کریں گے' لیکن ہمارا مقصد یہ ہے کہ اس عالم اسرار کا بیان کریں جسے آخرت کہتے ہیں' اور عالم ملک (دنیا) میں عالم ملکوت (آخرت) کی تشریح بغیر مثال کے ممکن نہیں ہے' جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد ہے۔

وَتِلْكَ الْأَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ وَمَا يَعْقِلُهَا إِلَّا الْعَالِمُونَ (پ۲۰ ر۱۶ آیت ۴۳)

اور یہ مثالیں ہیں جنھیں ہم بیان کرتے ہیں لوگوں کے لئے اور انھیں صرف اہل علم سمجھتے ہیں۔

دنیا کے مقابلے میں آخرت کی زندگی ایسی ہے' جیسے آدمی سوتے ہوئے خواب دیکھ رہا ہو' جس طرح خواب کا عالم جاگنے کے مقابلے میں مختلف ہوتا ہے' اس طرح دنیا کی زندگی بھی آخرت کی زندگی سے مختلف ہے' حدیث شریف سے بھی یہ مضمون ثابت ہوتا ہے۔ ارشاد فرمایا۔

اَلنَّاسُ نِيَامٌ فَإِذَا مَاتُوْا انْتَبَهُوْا

لوگ سوئے ہوئے ہیں' جب مر جائیں گے تو جاگیں گے۔ (۲)

جو کچھ بیداری کے عالم میں وقوع پذیر ہوتا ہے' وہ خواب کے عالم میں بطور مثال نظر آتا ہے' اسی لئے اسکی تعبیر پوچھی جاتی ہے' اسی طرح آخرت کی بیداری میں جو واقعات رونما ہوں گے وہ دنیا کی خوابیدہ زندگی میں بطور مثال ہی ظاہر ہو سکتے ہیں یعنی اسطرح جیسے تم خواب میں مختلف مناظر دیکھتے ہو اور علم التعبیر سے ان واقعات کی معرفت حاصل کرتے ہیں۔

تعبیر خواب کی حقیقت : خواب کی تعبیر ایک معتبر فن ہے اور اس فن کے نکتہ شناس اور رمز آشنا ہی اسکے ساتھ انصاف کرتے ہیں' یہاں ہم بطور نمونہ تین واقعات بیان کرتے ہیں' ان سے معلوم ہوگا کہ خواب میں اصل بات کس طرح معلوم ہو جاتی ہے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ ایک شخص ابن سیرین کے پاس آیا' اور کہنے لگا کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میرے ہاتھ میں مہر ہے'

---

(۱) احناف شطرنج کھیلنے سے منع کرتے ہیں' اور ان احادیث سے استدلال کرتے ہیں کہ حضرت علیؓ سے منقول ہے فرماتے تھے کہ شطرنج عجمیوں کا جوا ہے ابو موسیٰ اشعری سے منقول ہے کہ شطرنج سے صرف خطاکار کھیلتے ہیں' ابو موسیٰ اشعری سے شطرنج کے بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے فرمایا کہ یہ باطل ہے اور اللہ تعالیٰ باطل کو پسند نہیں فرماتا (۲) مجھے یہ روایت مرفوع نہیں ملی' البتہ اس قول کی نسبت حضرت علی ابن ابی طالب کی طرف کی جاتی ہے

اور میں وہ مہر لوگوں کے چہروں اور ان کی شرمگاہوں پر لگا رہا ہوں' آپ نے یہ تعبیر دی کہ تو مؤذن ہے اور رمضان میں صبح صادق سے پہلے اذان دیتا ہے' اس نے عرض کیا کہ آپ سچ فرماتے ہیں' ایک اور شخص آیا اور کہنے لگا کہ میں نے خواب دیکھا ہے کہ میں تیل ڈال رہا ہوں' ابن سیرین نے فرمایا کہ تو نے کوئی باندی خریدی ہے' اسکے متعلق تحقیق کر' غالباً وہ تیری ماں ہے' کیونکہ تیل کی اصل تل ہیں' معلوم ہوا کہ تو اپنی ماں کے پاس جاتا ہے' اس نے تحقیق کی' پتہ چلا کہ وہ واقعی اسکی ماں ہے' اسکی صغر سنی میں گرفتار کرلی گئی تھی۔ ایک شخص نے اپنا یہ خواب بتلایا کہ میں نے اپنے آپ کو خنزیر کے گلے میں موتیوں کے ہار ڈالتے ہوئے دیکھا ہے' آپ نے فرمایا کہ تم حکمت کی باتیں نااہلوں کو بتلاتے ہو' حقیقتاً وہ ایسے لوگوں کو تعلیم دینے پر مامور تھا جو اسکے اہل نہ تھے۔

یہ تعبیریں مثالیں ہیں اور ان سے معلوم ہوتا ہے کہ مثالیں کس طرح بیان کی جاتی ہیں' مثال سے ہماری مراد یہ ہے کہ معنی کو کسی ایسے پیرائے میں بیان کیا جائے جو اپنے مفہوم کے اعتبار سے صحیح ہو اور ظاہری صورت کے اعتبار سے غلط ہو' مثلاً مؤذن نے انگوٹھی دیکھی کہ وہ اس سے شرمگاہوں پر مہر لگا رہا ہے' اب اگر وہ انگوٹھی اور مہر کو ظاہر پر رکھتا تو یہ بات حقیقت کے خلاف ہوتی کیونکہ اس نے کبھی انگوٹھی سے شرمگاہ پر یا چہرے پر مہر نہیں لگائی' لیکن جب اسکے معنی و مفہوم پر نظر ڈالی تو بات درست نکلی' اس سے مہر لگانے کا فعل سرزد ہوا' جس کی معنی ہیں کسی کام سے روک دینا گویا رمضان میں صبح صادق سے پہلے اذان دے کر وہ لوگوں کو کھانے پینے اور بیویوں کے ساتھ ہم بستری کرنے سے روک دیتا ہے۔

انبیاء علیہم السلام کا کلام: انبیاء علیہم السلام کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ لوگوں کے ساتھ ان کی عقل و فہم کے مطابق گفتگو کریں' اور لوگوں کی عقل کا عالم یہ ہے کہ وہ دنیاوی زندگی میں ایسے ہیں جسے حالت خواب کہا گیا ہے' سونے والے پر جو واقعات منکشف ہوتے ہیں وہ بطور مثال ہوتے ہیں ہو بہو نہیں ہوتے' جب مرجائیں گے تب وہ ان مثالوں کی صداقت بنیں گے' سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں۔

قَلْبُ الْمُؤْمِنِ بَيْنَ اِصْبَعَيْنِ مِنْ اَصَابِعِ الرَّحْمٰنِ (۱)

مومن کا دل اللہ تعالیٰ کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں کے درمیان ہے۔

یہ ایک مثال ہے اسے صرف اہل علم ہی سمجھ سکتے ہیں' جاہل آدمی صرف اسی قدر سمجھ سکتا ہے جتنا حدیث کے ظاہر الفاظ سے مفہوم ہوتا ہے' کیونکہ وہ اس تفسیر سے واقفیت نہیں رکھتا جسے تاویل کہتے ہیں' جس فن سے خواب کی تفسیر ہوتی ہے اسے تعبیر کہتے ہیں اور جس سے قرآن و حدیث کے معانی سمجھ میں آتے ہیں اسے تاویل کہا جاتا ہے' جاہل آدمی اس حدیث کو اسکے ظاہری الفاظ پر رکھتا ہے' اور وہی معنی مراد لیتا ہے جو بظاہر اس سے سمجھ میں آتے ہیں یعنی اللہ تعالیٰ کے لئے ہاتھ پاؤں ثابت کرنے بیٹھ جاتا ہے' حالانکہ اللہ تعالیٰ ان چیزوں سے منزہ اور پاک ہے۔ اسی طرح ایک روایت ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ آدَمَ عَلٰى صُوْرَتِهٖ (۲)

اللہ تعالیٰ نے آدم کو اپنی صورت پر بنایا۔

جاہل آدمی صورت سے' رنگ' ہیئت اور شکل کے علاوہ اور کچھ سمجھ ہی نہیں سکتا' چنانچہ وہ اللہ تعالیٰ کے لئے یہ چیزیں اعتقاد کرلیتا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ ان مادّی چیزوں سے پاک اور بلند و بالا ہے' بعض لوگ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ کی صفات کے باب میں لغزش کھا گئے ہیں' یہاں تک کہ کلام الٰہی کو بھی اپنی نادانی کے باعث آواز اور حروف کی قبیل سے سمجھنے لگے' اسی طرح کی دوسری صفات میں بھی بعض مدعیان علم نے ٹھوکریں کھائی ہیں' اور عقل و فہم کا ماتم کیا ہے۔

آخرت کے سلسلے میں وارد مثالیں: روایات میں آخرت سے متعلق جو مثالیں وارد ہیں ملحدین ان کی اسی لئے تکذیب و

---

(۱) یہ حدیث پہلے گزر چکی ہے (۲) یہ روایت بھی گزر چکی ہے

تردید کرتے ہیں کہ ان کی نظر محض الفاظ پر ٹھہر جاتی ہے' اور الفاظ میں تناقض پایا جاتا ہے' وہ کم فہمی کے باعث الفاظ کا تناقض دور نہیں کرپاتے' مثلاً حدیث شریف میں ہے' سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

يُؤْتَى بِالْمَوْتِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِصُورَةِ كَبْشٍ أَمْلَحَ يُذْبَحُ (بخاری و مسلم۔ ابو سعید الخدریؓ)

قیامت کے دن موت کو ایک سفید مینڈھے کی شکل میں لایا جائے گا اور اسے ذبح کردیا جائے گا۔

نادان ملحد یہ بات نہیں مانتا' اور سنتے ہی تردید کردیتا ہے' اور دلیل یہ دیتا ہے کہ موت ایک عرض یعنی قائم بالغیر چیز ہے' جب کہ مینڈھا جسم ہے۔ بھلا عرض جسم کیسے بن سکتا ہے' یہ ایک محال بات ہے ان احمقوں کو معلوم نہیں کہ ان کی کوتاہ عقلیں اللہ تعالیٰ کے اسرار و رموز کا ادراک کرنے سے قاصر ہیں' قرآن میں کھلے طور پر اعلان کردیا گیا ہے۔

وَمَا يَعْقِلُهَا إِلَّا الْعَالِمُونَ

اور ان باتوں کو صرف اہل علم سمجھتے ہیں۔

ان بے چاروں کو تو یہ معلوم نہیں کہ اگر کسی نے خواب میں یہ دیکھا کہ ایک مینڈھا اس کے پاس لایا گیا ہے اسے لوگ وباء کہتے ہیں' پھر اسے ذبح کردیا گیا' تعبیر گو اسے بتلائے گا کہ تو نے اچھا خواب دیکھا ہے' معلوم ہوتا ہے اب وباء ختم ہوجائے گی' کیونکہ وباء کو مینڈھے کی شکل میں ذبح کردیا گیا ہے' اور جو جانور ذبح ہوجائے وہ زندہ نہیں ہوتا' اس مثال میں خواب دیکھنے والا بھی سچا ہے' اور تعبیر دینے والا بھی سچا ہے حالانکہ ملحدین یہ بات نہیں سمجھتے۔

خواب سچے کیوں ہوتے ہیں؟ : اس میں شک نہیں کہ بعض خواب سچے ہوتے ہیں' اور ان کی تعبیر صحیح نکلتی ہے' اس کی حقیقت یہ ہے کہ جو فرشتہ خواب پر مقرر کیا گیا ہے وہ روحوں کو ان حقائق سے مطلع کردیتا ہے جو لوح آسمان پر محفوظ ہیں' لیکن یہ حقائق مثالوں کی صورت میں منکشف کئے جاتے ہیں' سونے والا مثال کے بغیر سمجھنے کا متحمل نہیں ہوتا' اسکی مثال صحیح ہوتی ہے۔ اسی لئے معنی بھی صحیح ہوتے ہیں' اسی طرح انبیاء علیہم السلام بھی دنیا میں لوگوں کے ساتھ مثالوں کے ذریعہ گفتگو کرتے ہیں' کیونکہ دنیا آخرت کی بہ نسبت نیند کی حالت ہے' اس لئے وہ اللہ تعالیٰ کی حکمتیں بندوں کی عقلوں تک مثالوں کے ذریعے پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں' اس میں اللہ تعالیٰ کی حکمت بھی ہے۔

بندوں پر اسکی شفقت و کرم بھی ہے' اور ادراک کے سلسلے کو سہل تر بنانا بھی ہے' بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں' کہ انکا صحیح ادراک مثالوں کے ذریعہ ہی ہوسکتا ہے' قیامت کے روز موت کو سفید مینڈھے کی صورت میں لاکر ذبح کرنا بھی ایک مثال ہے' اس سے یہ بتلانا مقصود ہے' کہ اس وقت موت کا سلسلہ منقطع ہوجائیگا۔ دل فطرتاً" مثالوں کے ذریعہ معانی کا جلد ادراک کرلیتے ہیں' مثالوں کو اثر انگیزی میں بڑا دخل ہے' ایک عام بات اگر کسی بلیغ مثال کے ذریعہ ادا کی جائے تو دل اس سے متاثر ہوتے ہیں' اور اس کا اثر دیر تک رہتا ہے' اس لئے اللہ تعالیٰ نے دو لفظوں "کن فیکون" کے ذریعہ اپنی قدرت کی انتہا بیان کی ہے' اور دل کی تغیر پذیر کیفیت کو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے' کہ بندہ کا دل اللہ تعالیٰ کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں کے درمیان ہے۔ ہم نے جلد اول کی کتاب قواعد العقائد میں اس حکمت پر کچھ روشنی ڈالی ہے' یہاں اسی قدر گفتگو پر اکتفا کرتے ہیں' اور اپنے اصل مقصد کی طرف واپس چلتے ہیں۔

بندوں پر آخرت کے درجات کس طرح تقسیم ہوں گے؟ : ہمارے بیان کا مقصد یہی ہے کہ بندوں پر دوزخ اور جنت کے درجات کی تقسیم مثال کے ذریعہ ہی سمجھی جاسکتی ہے' اسلئے ہم اولاً" مثال بیان کرتے ہیں' جو مثال بیان کی جائے اسکے معنی و مفہوم پر نظر رکھی جائے' صورت اور الفاظ سے غرض نہ رکھی جائے۔

ہم کہتے ہیں لوگوں کی آخرت میں بہت سی قسمیں ہوں گی' اور ان کے درجات و درکات میں ناقابل بیان تفاوت ہوگا' یہ فرق

ایسا ہی ہے جیسے دنیا کی شقاوتوں اور سعادتوں میں فرق پایا جاتا ہے' اس سلسلے میں دنیا و آخرت میں کوئی فرق نہیں ہے' عالم ملک اور عالم ملکوت دونوں کا مدبر اور منتظم اللہ تعالیٰ ہے' جس کا کوئی شریک نہیں ہے' اسکے ارادۂ ازلی سے ان دونوں عالموں میں جو سنت الٰہیہ جاری ہے وہ بھی یکساں ہے' نہ اس میں تبدیلی ہوئی ہے' اور نہ تبدیلی کا امکان ہے' لیکن کیوں کہ ہم مختلف درجات کے افراد کا احاطہ کرنے سے عاجز ہیں اس لئے اجناس لکھتے ہیں' اور ان کا حصر کرتے ہیں۔

قیامت میں لوگوں کی قسمیں : قیامت کے روز لوگ چار قسموں میں منقسم ہوں گے' ایک ہلاکت پانے والے' دوم عذاب پانے والے' سوم نجات پانے والے' اور چہارم کامیاب۔ دنیا میں اس تقسیم کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی بادشاہ کسی ملک پر قابض ہو جائے' اور اس کے بعض باشندوں کو قتل کرا دے' وہ ہلکین کہلائیں گے۔ کیونکہ بادشاہ نے انھیں ہلاک کردیا ہے' بعض کو کچھ عرصہ کے لئے ایذائیں دے' قتل نہ کرے' یہ معذبین ہیں' بادشاہ نے انھیں تکلیف دینا منظور کیا ہے' ان کے قتل کا حکم صادر نہیں کیا' بعض لوگوں کو کچھ نہ کہے' یہ زمرۂ ناجین میں ہیں' انھیں قتل' اور عذاب دونوں سے نجات ملی ہے' اور بعض کو خلعت فاخرہ سے نوازے' یہ فائزین کی صف میں ہیں۔ یہ لوگ نہ صرف یہ کہ بادشاہ کے عذاب و عتاب سے بچے ہیں' بلکہ انھوں نے مزید کامیابی یہ حاصل کی ہے کہ بادشاہ سے انعام و اکرام بھی پایا ہے اگر بادشاہ عادل ہے تو وہ یہ تقسیم بلا وجہ نہیں کرے گا بلکہ جو شخص جس سلوک کا مستحق ہوگا' اسکے ساتھ وہی سلوک کرے گا' قتل کی سزا ان لوگوں کو دے گا جو اسکی حکومت کے باغی ہوں گے اور اسکے دشمنوں کے ساتھ مل کر اسے اقتدار سے محروم کرنے کی سازش کریں گے' جسمانی یا ذہنی اذیتیں ان لوگوں کو دے گا جو اس کی بالادستی تسلیم کرتے ہوئے بھی اس کی خدمت سے گریز کریں گے ان لوگوں سے کوئی تعرض نہ کرے گا جنھوں نے اس کی بالادستی تسلیم کی اور اس کی مناسب طور پر خدمت بھی انجام دی' اور خلعت سے ان لوگوں کو سرفراز کرے گا جنھوں نے اسکی وفاداری کا پورا پورا حق ادا کیا اور زندگی بھر اسکی خدمت انجام دی' پھر اعزاز و اکرام میں بھی فرق ہوگا' جس نے جیسی خدمت کی ہوگی اسی کے مطابق خلعت پائے گا قتل کے درجات میں بھی فرق ہوگا' بعض کی صرف گردن اڑادی جائیگی اور بعض کی سرکشی اتنی خطرناک ہوگی کہ انھیں ہاتھ پاؤں اور ناک کان کاٹ کر دردناک طریقے سے ہلاک کیا جائے گا' جن کو عذاب دیا جائے گا اسکے درجات بھی مختلف ہوں گے' کسی کو کم عذاب دیا جائے گا کسی کو زیادہ عرصے تک عذاب دیا جاتا رہے گا' اور کسی کو محدود مدت تک عذاب کے مرحلے سے گزرنا ہوگا۔

اس سے معلوم ہوا کہ ان چاروں میں سے ہر درجہ بے شمار درجات پر منقسم ہے' اسی طرح قیامت کے دن بھی ان چاروں گروہوں کے بے شمار درجات ہوں گے' مثال کی طور پر آخری گروہ کے جسے فائزین کہا گیا ہے بعض افراد کو جنت عدن میں جگہ ملے گی' بعض کو جنت ماویٰ میں' کسی کو جنت الفردوس میں' کسی کو جنت نعیم میں' اسطرح جن لوگوں کو عذاب ہوگا ان میں سے بعض کے عذاب کی مدت بے حد مختصر ہوگی' بعض کو ہزار برس بعض کو سات ہزار برس عذاب دیا جائیگا' یہ آخری مدت عذاب ہوگی' دوزخ سے سب سے آخر میں جو شخص باہر آئیگا وہ سات ہزار برس کے عذاب سے نجات پاکر باہر نکلے گا' جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے

إِنَّ آخِرَ مَنْ يَخْرُجُ مِنَ النَّارِ يُعَذَّبُ سَبْعَةَ آلَافِ سَنَةٍ (الحکیم الترمذی فی نوادر الاصول)

آخر میں جو شخص دوزخ سے نکلے گا اسے سات ہزار برس عذاب دیا جائیگا۔

اسی طرح ان لوگوں کے درجات بھی مختلف ہوں گے جن کی قسمت میں ازل سے ابد تک کی بدبختی لکھدی گئی ہے' اور اللہ تعالیٰ کی رحمت کی ایک ہلکی سی کرن بھی ان کے نہاں خانوں میں روشنی نہیں کرسکتی' اب ہم یہ بیان کرتے ہیں کہ ان چاروں فرقوں پر درجات کی یہ تقسیم کس طرح ہوگی؟

پہلا درجہ۔ ہالکین : ہالکین سے وہ لوگ مراد ہیں جو اللہ کی رحمت سے مایوس ہیں' مثال مذکورہ بالا میں بادشاہ نے جس شخص کو قتل کیا تھا' یہ وہی تھا جو بادشاہ کی خوشنودی اور اسکے اکرام سے مایوس تھا مثال کے معنی و مفہوم کو سامنے ضرور رکھیں' اس اعتبار سے یہ درجہ ان لوگوں کا ہوگا جو منکرین خدا ہیں' اس سے اعراض کرنے والے ہیں' انھوں نے اپنے آپ کو دنیا کے لئے وقف

کردیا ہے' وہ اللہ اور اسکے رسولوں کی' ان پر نازل شدہ کتابوں کی تکذیب کرتے ہیں' اخروی سعادت اللہ کی قربت اور اسکے دیدار میں ہے' اور یہ سعادت اس معرفت کے بغیر قطعاً حاصل نہیں ہوتی جسے ایمان اور تصدیق کہتے ہیں' منکرین اللہ تعالیٰ سے اعراض کرنے والے' اسے جھٹلانے والے ہیں' وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس رہیں گے' اللہ تعالیٰ کے انکار' پیغمبروں اور آسمانی کتابوں کی تکذیب کی پاداش میں وہ قیامت کے روز اسکے دیدار کے شرف سے محروم رہیں گے' جیسا کہ قرآن کریم میں ہے۔

إِنَّهُمْ عَنْ رَبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوبُونَ (پ ۳۰ ر ۸ آیت ۱۵)

اس روز یہ لوگ اپنے رب کریم (کا دیدار کرنے) سے روک دیئے جائیں گے۔

اور ظاہر ہے جو شخص اپنے محبوب سے دور رہتا ہے اس کے اور اس کی آرزوؤں کے درمیان پردہ حائل رہتا ہے' اسلئے منکرین خدا اللہ تعالیٰ سے جدائی کی آگ میں جلیں گے' اسلئے عارفین خدا کہتے ہیں کہ نہ ہمیں حورعین کی خواہش ہے' اور نہ دوزخ کے عذاب کا خوف' ہمارا مقصد اصلی تو اللہ تعالیٰ سے ملاقات اور اس کا دیدار ہے' اور اس حجاب سے بچنا ہے جو گناہوں کی بدولت بندے اور اسکے رب کے درمیان حائل ہو جاتا ہے' عارفین یہ بھی کہتے ہیں کہ جو شخص کسی عوض کے لئے اللہ کی عبادت کرتا ہے' وہ کمینہ ہے' گویا جنت کے حصول اور دوزخ سے نجات کے لئے عبادت نہ کرنی چاہیے۔ بلکہ عارف حقیقی وہی ہے جو ذات الٰہی کے لئے عبادت کرے' صرف ذات الٰہی کا طالب ہو' نہ حورعین کی خواہش رکھے' اور نہ پھلوں میووں کی تمنا کرے' نہ دوزخ کی آگ سے ڈرے' اور نہ اسکے مصائب سے فرار ہو کر عبادت میں پناہ ڈھونڈے' آتش فراق کا سوز بسا اوقات دوزخ کی آگ کے سوز سے بڑھ جاتا ہے' آگ جسموں کو خاکستر کرتی ہے' اور نار فراق وہ ہے جس کے بارے میں یہ ارشاد فرمایا گیا ہے۔

نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ الَّتِيْ تَطَّلِعُ عَلَى الْأَفْئِدَةِ (پ ۳۰ ر ۲۹ آیت ۶-۷)

وہ اللہ کی آگ ہے جو سلگائی گئی ہے (یہ آگ) دلوں تک جا پہنچے گی۔

(جسموں کی آگ دلوں کی آگ سے ہلکی ہوتی ہے۔ ایک شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

وفی فواد المحب نار جوی — احر نار الجحیم ابردها

(عاشق کے دل میں جو آگ بھڑک رہی ہے وہ دوزخ کی آگ سے زیادہ گرم ہے۔ اور دوزخ کی آگ اس سے سرد تر ہے)

آتش فراق کی شدت سے آخرت میں کیا انکار کیا جاسکتا ہے جب کہ دنیا میں اس کا مشاہدہ عام ہے' جس شخص پر عشق کا غلبہ ہوتا ہے وہ آگ کے دہکتے ہوئے انگاروں پر لوٹتا ہے' اور کانٹوں پر چلتا ہے' اور غم کی شدت کا عالم یہ ہوتا ہے کہ جسم و جان پر جو کچھ گزرتا ہے وہ اسکا ذرا بھی احساس نہیں کرتا' یہی حال اس شخص کا ہوتا ہے جس پر غصہ غالب آجائے' غیظ و غضب کی شدت سے مغلوب ہو کر لڑنے والے انسان کا جسم زخموں سے چھلنی بھی بن جائے تو اسے اس وقت ذرا بھی احساس نہیں ہوتا' اس لئے کہ غضب بھی دل ہی کی ایک آگ ہے' جیسا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

اَلْغَضَبُ قِطْعَةٌ مِّنَ النَّارِ (الحکیم الترمذی۔ ابو ہریرۃ)

غصہ آگ کا ایک ٹکڑا ہے۔

دل کی سوزش جسم کی سوزش سے زیادہ ہوتی ہے' اور شدید تر ضعیف تر کا احساس ختم کردیتا ہے' جیسا کہ اس کا عام مشاہدہ ہے' آدمی تلوار یا آگ سے ہلاک ہوتا ہے' اسکے نتیجے میں اسکے جسم کو جو تکلیف پہنچتی ہے' اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ جسم کے وہ اعضاء جو آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ مربوط تھے' آگ کی حرارت یا تلوار کی حدت سے علیحدہ ہو جاتے ہیں' کیا اس چیز کی تکلیف محسوس نہ کی جائے گی' جس سے آدمی کے دل اور اسکے محبوب کے مابین تفریق ہو جائے جب کہ دل اور محبوب کے درمیان جسم کے اعضاء سے زیادہ اتصال اور ارتباط ہوتا ہے' اس صورت میں تکلیف بھی جسم کی نسبت زیادہ ہونی چاہیے' بشرطیکہ معاملہ

ارباب قلوب اور اصحاب بصیرت کا ہو' جس کے دل ہی نہ ہو وہ رنج والم کی شدت کس طرح محسوس کر سکتا ہے بلکہ جسم کی تکلیف کو وہ زیادہ ترجیح دے گا اور جسم کی تکلیف کے مقابلے میں دل کی تکلیف کو معمولی سمجھ کر نظرانداز کردے گا' چنانچہ اگر بچہ سے ایک طرف اسکی گیند بلاّ چھین لیا جائے اور دوسری طرف بادشاہ کی قربت سے محروم کردیا جائے تو اسے گیند بلّے کی جدائی کا افسوس ہوگا' بادشاہ کی قربت سے محرومی کا احساس بھی نہیں ہوگا' چہ جائیکہ اسے غم تصور کرے' اور یہ کہے کہ میرے نزدیک گیند کے پیچھے میدان میں بلاّ لے کر دوڑنا شاہی مسند پر بادشاہ کے ساتھ بیٹھنے سے زیادہ محبوب ہے' بلکہ جس شخص پر شہوت بطن کا غلبہ ہے اگر اسے ایک طرف ہریسہ' اور حلوا کھانے کے لئے دیا جائے' اور دوسری طرف یہ مطالبہ کیا جائے کہ وہ کوئی ایسا کام کرے جس سے دشمنوں کو شکست دے سکے' اور دوستوں کے دل جیت سکے تو وہ حلوہ اور ہریسہ کھانے کو ترجیح دیگا' کیونکہ اس پر پیٹ غالب ہے' وہ ان لذتوں کے سامنے کسی اعلیٰ سے اعلیٰ منصب کی بھی پروا نہیں کرے گا' لیکن یہ صرف ان لوگوں کا حال ہے جنھوں نے بہیمانہ اوصاف اپنالئے ہیں' اور ملائکہ کے ان اوصاف سے محروم ہیں جو ان کی ضد ہیں' اگر آدمی پر ملکوتی صفات غالب آجائیں تو وہ صرف قرب الٰہی میں لذت پاتا ہے' اور اس کے لئے سب سے زیادہ رنج اور تکلیف کا باعث وہ حجاب ہوتا ہے جو اس کے اور محبوب کے درمیان حائل ہوجائے۔

لطیفۂ قلب : ہر عضو کے لئے ایک مخصوص وصف ہے' کان کے لئے سننا' آنکھ کے لئے دیکھنا' وغیرہ اسی طرح قلب کے لئے ایک مخصوص وصف ہے' یعنی قرب الٰہی سے لذت پانا جس کے قلب نہ ہوگا اسے قرب کی لذت اور بعد کی تکلیف کا احساس ہی نہیں ہوگا' جیسے اگر کسی شخص کے کان نہ ہوں تو وہ سننے کی قوت سے محروم رہتا ہے اور آنکھ نہ ہو تو وہ دیکھنے کی لذت سے محروم رہتا ہے' ہر انسان کے پاس قلب نہیں ہوتا' اگر ایسا ہوتا تو اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان صحیح نہ ہوتا۔

اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَذِکْرٰی لِمَنْ کَانَ لَہٗ قَلْبٌ (پ۲۶ر۱۷ آیت ۳۷)

اس میں اس شخص کے لئے بڑی عبرت ہے جس کے پاس دل ہو یا وہ متوجہ ہو کر (بات کی طرف) کان لگا دیتا ہو۔

جو شخص قرآن پاک سے وعظ و نصیحت حاصل نہیں کرتا اسے قلب کا مفلس قرار دیا گیا ہے' قلب سے ہماری مراد وہ مخصوص عضو نہیں ہے' جو سینے اور پشت کی ہڈیوں کے درمیان دھڑکتا ہے' بلکہ یہ ایک سر ہے جس کا تعلق عالم امر سے ہے' اور سینے کا دل گوشت کا ایک ٹکڑا ہے جس کا تعلق عالم خلق سے ہے' گوشت کا یہ ٹکڑا قلب کا عرش ہے' سینہ اس کی کرسی ہے اور جسم کے دوسرے اعضاء اس کی مملکت ہیں' اگرچہ خلق اور امر دونوں اللہ ہی کے حکم سے وجود میں آئے ہیں' اور اسی کے محکوم ہیں' لیکن جس قلب کو سر اور لطیفہ کہا گیا ہے' اور جس کا ذکر قرآن کریم کی اس آیت میں ہے۔

قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ (پ۱۵ر۱۰ آیت ۸۵)

آپ فرمادیجئے کہ روح میرے رب کے حکم سے ہے۔

وہ اس مملکت جسم کا امیر اور سلطان ہے' عالم امر اور عالم خلق دونوں میں ایک خاص ترتیب ہے' اول کو دوسرے پر حاکم بنایا گیا ہے' قلب ایک ایسا لطیفہ ہے کہ اگر وہ صحیح ہو تو تمام بدن صحیح ہو' وہ بیمار ہو تو تمام بدن بیمار ہو' جو شخص اس لطیفے کی معرفت حاصل کرلیتا ہے وہ اپنے نفس کی بھی معرفت پالیتا ہے' اس وقت بندہ ان معانی کی خوشبوئیں سونگھنے کا اہل ہوجاتا ہے جو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد گرامی میں پوشیدہ ہیں۔

اِنَّ اللّٰہَ خَلَقَ آدَمَ عَلٰی صُوْرَتِہٖ

اللہ تعالیٰ نے آدم کو اپنی صورت میں پیدا کیا ہے۔

جو لوگ اس حدیث کے ظاہری الفاظ پر نظر رکھتے ہیں اور اس کی تاویل کے طریقوں میں بھٹکے ہوئے ہیں اللہ ان پر رحم کرے گا جو خاص طور سے ان لوگوں پر جو الفاظ ظاہری پر عمل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں' کیونکہ رحم بقدر معصیت ہوتا ہے' ظاہر میں الجھ کر رہ

جانے والوں کی معصیت تاویل کی وادیوں میں بھٹک کر رہ جانے والے سے کم ہے۔

امر اللہ تعالیٰ کا فضل اور اسکا انعام ہے' جسے چاہے نوازتا ہے' جسے چاہے محروم رکھتا ہے اس میں کسی کو اختیار نہیں ہے' یہ ایک حکمت ہے اور قرآن کریم میں ہے۔ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا جسے حکمت دی گئی اسے خیر کثیر دیا گیا۔

قلم کا رخ ان مطالب کی طرف مڑ گیا تھا جو علم معاملات سے اعلیٰ ہیں' ہم اس کتاب میں معاملات سے تعلق رکھنے والے علوم ہی بیان کرنا چاہتے ہیں' اسلئے اصل مقصود کی طرف چلتے ہیں' اس تفصیل سے یہ بات سامنے آئی ہے کہ ہلکین کے درجے میں وہ لوگ ہیں جو جاہل محض ہیں' اللہ تعالیٰ کے منکر' اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکذب ہیں' قرآن و حدیث میں اس کی بے شمار دلیلیں ہیں' یہاں ان کے ذکر کی ضرورت نہیں ہے۔

<u>دوسرا درجہ معذبین</u> : ایک درجہ ان لوگوں کا ہے جنہیں عذاب ہوگا' یہ وہ لوگ ہیں جو اصل ایمان رکھتے ہیں لیکن ایمان کے مقتضیات پر عمل کرنے سے قاصر ہیں' مثلاً اصل ایمان توحید ہے' جس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو وحدہٗ لا شریک مانے اور صرف اسی کی عبادت کرے' اب اگر کوئی شخص نفس کی خواہشات کی اتباع کرتا ہے تو کہا جائے گا کہ وہ توحید کے تقاضوں پر عمل پیرا نہیں ہے' وہ صرف زبان سے توحید کا اعتراف کرتا ہے' اسکی روح کو نہیں سمجھتا' توحید کی روح یہ ہے کہ کلمۂ توحید "لا الٰہ الا اللہ" کو ان آیات کے ساتھ مربوط سمجھے۔

قُلِ اللّٰهُ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِيْ خَوْضِهِمْ يَلْعَبُوْنَ (پ ۷ ر ۱۷ آیت ۹۲)

آپ کہہ دیجئے کہ اللہ نے نازل فرمایا ہے' پھر ان کو انکے مشغلے میں بے ہودگی کے ساتھ لگا رہنے دیجئے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا (پ ۲۴ ر ۱۸ آیت ۳۰)

جن لوگوں نے اقرار کرلیا کہ ہمارا رب اللہ ہے پھر مستقیم رہے۔

اس دوسری آیت میں توحید بھی ہے' اور اس راستے پر استقامت کا اظہار بھی ہے' جس پر آدمی اللہ کو ایک ماننے کے بعد چلتا ہے' یہ صراط مستقیم جس کے بغیر توحید مکمل نہیں ہوتی' بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہے' آخرت میں اسکی مثال پل صراط ہے۔ بظاہر ایسا کوئی آدمی نظر نہیں آتا جو راہ استقامت سے تھوڑا ہی سہی۔ ادھر ادھر مائل نہ ہو' اس لئے کہ خواہشات نفسانی سب میں ہیں' اور سب ہی لوگ ان خواہشات پر عمل کرتے ہیں' فرق یہ ہے کہ بعض صرف خواہشات کے تابع ہوتے ہیں' اور بعض لوگ احکام الٰہی کے تابع ہوتے ہوئے بھی اپنے نفس کی کسی خواہش پر عمل کرلیتے ہیں' خواہ وہ خواہش ان کے پہاڑ جیسے اعمال خیر کے مقابلے میں ذرہ برابر ہی کیوں نہ ہو' خواہش نفس کے اتباع سے توحید کا کمال متاثر ہوتا ہے' جس قدر آدمی راہ راست سے منحرف ہوگا' اسی قدر اسکی توحید ناقص ہوگی' قرب کے درجات میں نقصان اسی لئے ہوتا ہے' اور ہر نقصان کے ساتھ دو آگ ہیں' ایک اس فراق کی آگ ہے' جو کمال توحید میں نقص کے باعث حاصل ہوتی ہے' اور ایک دوزخ کی آگ ہے' جس کا ذکر قرآن کریم میں موجود ہے اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص راہ راست سے منحرف ہوگا' اسے دو طرح کا عذاب ہوگا' لیکن اس عذاب کی نوعیت و کیفیت' شدت و ضعف کا مدار ایمان کی قوت و ضعف اور اتباع نفس کی قلت و کثرت پر ہے عام طور پر آدمی ان دو میں سے ایک سے خالی نہیں ہوتا' اسی لئے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا۔

وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّنَذَرُ الظّٰلِمِيْنَ فِيْهَا جِثِيًّا (پ ۱۶ ر ۸ آیت ۷۲)

اور تم میں سے کوئی بھی نہیں جس کا اس پر سے گزر نہ ہو' پھر ہم ان لوگوں کو نجات دیں گے جو خدا سے ڈر کر ایمان لاتے تھے اور ظالموں کو اس میں گھٹنوں کے بل پڑا رہنے دیں گے۔

اسی لئے بعض وہ سلف صالحین جن پر خوف کا غلبہ تھا کہا کرتے تھے کہ ہم اسلئے ڈرتے ہیں کہ دوزخ کی آگ پر سے گزرنا ہر شخص کے لئے یقینی ہے' لیکن اس سے نجات پانا مشکوک ہے حضرت حسن بصریؒ نے وہ روایت بیان کی جس میں اس شخص کا ذکر ہے جو ایک ہزار برس کے بعد دوزخ سے یاحنان یامنان کہتا ہوا نکلے گا (احمد' ابو یعلی۔ انسؓ) اسکے بعد آپ نے فرمایا کتنا اچھا ہو اگر وہ شخص میں ہوں۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ اس شخص کا دوزخ سے نکلنا یقینی ہے' اگرچہ ایک طویل مدت تک سزا بھگتنے کے بعد نکلے گا' لیکن اوروں کا نکلنا تو مشکوک ہے۔

آخرت کے عذاب کی مدت' شدت اور کیفیت میں اختلاف : روایات میں ہے کہ سب سے آخر میں جو شخص دوزخ سے نکلے گا وہ سات ہزار برس کے بعد نکلے گا' بعض لوگ بجلی کی طرح ایک لمحے میں گذر جائیں گے' ایک لمحہ اور سات ہزار برس کے عذاب کے مختلف درجات کی ابتداء اور انتہا کے دو سرے ہیں' ان کے درمیان بے شمار درجات ہیں مثلاً منٹ' گھنٹہ' دن' ہفتہ' مہینہ' سال وغیرہ یہ عذاب کی مدت کا حساب ہے جسکی بظاہر کوئی انتہا نہیں ہے' یہی حال عذاب کی کمی زیادتی کا ہے' زیادتی کی کوئی انتہا نہیں ہے' کم سے کم عذاب یہ ہے کہ آدمی کو حساب کتاب میں الجھا دیا جائے' جیسے دنیا کے حکام اپنے محکومین کو کوئی جسمانی سزا نہیں دیتے' بلکہ حساب کتاب میں سخت گیری کرکے ان پر دائرۂ حیات تنگ کردیتے ہیں' پھر معاف کردیتے ہیں' بعض کو ہلکے پھلکے کوڑے لگوا کر چھوڑ دیا جاتا ہے' عذاب میں مدت اور شدت کی کمی بیشی کا اختلاف تو ہے ہی ایک اختلاف نوعیت کا بھی ہے' سزا ایک طرح کی نہیں ہوتی' اس کی بھی لاتعداد قسمیں ہیں' دنیا ہی کے معاملات میں دیکھ لیجئے' بعض خطا کاروں پر جرمانہ کیا جاتا ہے' کسی کا مال ضبط کرلیا جاتا ہے کسی کی بیوی بچے قید یا قتل کردیئے جاتے ہیں' کسی کے رشتہ داروں کو تکلیفیں دی جاتی ہیں' کسی کے ہاتھ پاؤں وغیرہ کاٹ لئے جاتے ہیں' اسی طرح آخرت کے عذاب میں بھی نوعیت کا اختلاف ہوگا' جیسا کہ شرعی دلائل سے ثابت ہے' لیکن عذاب کا یہ اختلاف ایمان کی قوت و ضعف' اعمال کی کثرت و قلت اور گناہوں کی شدت و خفت پر موقوف ہے' چنانچہ جس قدر گناہوں کی برائی زیادہ ہوگی اسی قدر عذاب بھی زیادہ ہوگا' اور جس نوع کی غلطی ہوگی' اسی نوع کی سزا دی جائے گی۔

عذاب عدل کے ساتھ ہوگا : ارباب قلوب پر یہ حقائق قرآن و سنت کے شواہد ہی کے ذریعہ نہیں بلکہ نور ایمان سے بھی منکشف ہوئے ہیں' قرآن کریم کی ان آیات سے یہی حقائق مفہوم ہوتے ہیں۔

وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيدِ (پ ۲۴ آیت ۴۶)

اور آپ کا رب بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے۔

اَلْيَوْمَ تُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ (پ ۲۴ ر ۷ آیت ۱۷)

آج ہر شخص کو اسکے کیے کا بدلہ دیا جائے گا

وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى (پ ۲۷ ر ۷ آیت ۳۹)

اور یہ کہ انسان کو صرف اپنی ہی کمائی ملے گی۔

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ (پ ۳۰ ر ۲۴ آیت ۸)

سو جو شخص دنیا میں ذرہ برابر نیکی کرے گا وہ اسکو دیکھ لے گا اور جو شخص ذرہ برابر بدی کریگا وہ اسکو دیکھ لے گا۔

ان کے علاوہ بھی بے شمار آیات و احادیث ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اعمال صالحہ کی جو جزا آخرت میں عذاب یا ثواب کی صورت میں دی جائے گی وہ عادلانہ ہوگی' اس میں ظلم نہ ہوگا' بلکہ ترجیح رحمت کے پہلو کو حاصل رہے گی' جیسا کہ حدیث قدسی میں ارشاد ہے۔ سَبَقَتْ رَحْمَتِيْ غَضَبِيْ (مسلم۔ ابو ہریرہؓ)

میری رحمت میرے غضب پر سبقت کرگئی ہے۔

قرآن کریم میں فرمایا گیا۔

وَاِنْ تَکُ حَسَنَۃً یُّضٰعِفْھَا وَیُؤْتِ مِنْ لَّدُنْہُ اَجْرًا عَظِیْمًا (پ۵ ر۴ آیت ۴)
اور اگر نیکی ہوگی تو اس کو کئی گنا کردیں گے اور اپنے پاس سے اجر عظیم دیں گے۔

اس سے معلوم ہوا کہ درجات کا ارتباط حسنات سے اور درکات کا تعلق سیئات سے بحیثیت مجموعی نہ صرف یہ کہ شرعی دلائل سے ثابت ہے بلکہ نور معرفت سے بھی ثابت ہے' تاہم تفصیل ظن سے معلوم ہوتی ہے' جس کا مدار ظاہری حدیثوں پر بھی ہے اور ایک نوع کے الہام پر بھی جو واقعات کو چشم عبرت سے دیکھنے کے نور سے حاصل ہوتا ہے۔

چنانچہ تمام روایات پر نظر ڈالنے سے جو نتائج سامنے آتے ہیں وہ یہ ہیں کہ اگر کسی نے اصل ایمان کو مضبوط پکڑے رکھا' کبائر سے اجتناب کیا' اور فرائض یعنی ارکان خمسہ اچھی طرح ادا کئے اور اس سے صرف چند متفرق صغیرہ گناہ سرزد ہوئے جن پر اس نے اصرار بھی نہیں کیا تو ایسا لگتا ہے کہ اسے صرف حساب فہمی کا عذاب دیا جائیگا اور جب حساب ہوگا تو اس کی حسنات کا پلڑا سیئات کے مقابلے میں بھاری ہوگا' جیسا روایات میں ہے کہ پنج گانہ نمازیں جمعہ اور رمضان کے روزے درمیان کے گناہوں کا کفارہ ہیں' اسی طرح کبائر سے بچنا بھی صغائر کے لئے کفارہ ہے جیسا کہ قرآن کریم میں ہے' اور کفارہ کا کم سے کم درجہ یہ ہے کہ آدمی سے عذاب دفع کردیا جائے' اگر حساب رفع نہ کیا جائے' جس کا حال یہ ہوتا ہے کہ اس کے اعمال نامے

بھاری ہوتے ہیں' اسکے بارے میں امید کی جاسکتی ہے کہ وہ نیکیوں کا پلڑا بھاری ہونے کے بعد' اور حساب سے فراغت کے بعد مزدار زندگی گزارے' البتہ مقربین یا اصحاب یمین کے زمرے میں شامل ہونا اور جنات عدن' یا جنات فردوس میں داخل ہونے کا انحصار ایمان کی قسموں پر ہے۔

ایمان کی دو قسمیں: ایمان کی دو قسمیں ہیں ایک تقلیدی جیسے عوام کا ایمان' یہ لوگ جو کچھ سنتے ہیں' اسے سچ سمجھتے ہیں اور ہمیشہ اسی پر قائم رہتے ہیں' دوسرا کشفی' یہ ایمان اس وقت تک حاصل ہوتا ہے جب نور الٰہی سے سینہ کھل جائے' اور اس میں تمام موجودات اپنی اصل حالت میں منکشف ہوجائیں جو لوگ اس ایمان کی دولت سے مالا مال ہیں وہ یہ بات جانتے ہیں کہ تمام چیزوں کا مرجع اللہ کی ذات ہے اور موجود صرف اللہ تعالیٰ کی ذات' صفات' اور افعال ہیں' باقی سب فنا ہونے والی چیزیں ہیں' ایسے لوگوں کو تقرب کا اعلیٰ درجہ ملیگا' یہ لوگ ملأ اعلیٰ میں فروکش ہوں گے' اور فردوس اعلیٰ میں ٹھکانہ پائینگے پھر ان کی بھی بے شمار قسمیں ہیں' بعض آگے بڑھے ہوئے ہوں گے' بعض ان سے پیچھے ہوں گے جتنی جس کی معرفت کم ہوگی اسی قدر وہ تقرب میں کم ہوگا' اللہ تعالیٰ کی معرفت رکھنے والے کے درجے اتنے زیادہ ہیں کہ ان کا احاطہ نہیں کیا جاسکتا' اسلئے کہ جلال خداوندی کی حقیقت معلوم کرنا ناممکن ہے اور معرفت الٰہی ایک وسیع سمندر ہے' نہ اسکا کنارہ ہے' اور نہ گہرائی جو لوگ بحر معرفت میں غوطہ لگاتے ہیں وہ اپنی ہمت اور وسعت کے بقدر نیچے تک پہنچتے ہیں' اور اسی منزل تک رسائی حاصل کرتے ہیں جو ازل میں ان کی قسمت میں لکھدی گئی ہے' جس طرح راہ آخرت کی منزلیں بے شمار ہیں اسی طرح اس راستے کے چلنے والوں کے درجات بھی بے شمار ہیں۔

ایمان تقلیدی رکھنے والا مومن اصحاب یمین کے زمرے میں شامل ہے' لیکن اس کا درجہ مقربین کے درجے سے کم ہے' پھر اصحاب یمین کے بھی بے شمار درجے ہیں' ان میں سے اعلیٰ درجہ وہ ہے جو مقربین کے درجے سے قریب تر ہو۔

بعض ارکان کا تارک: اب تک اس شخص کا حال بیان کیا جارہا تھا جس نے تمام کبائر سے اجتناب کیا' اور تمام فرائض یعنی پانچوں ارکان ادا کئے' پانچوں ارکان سے مراد یہ ہے کہ کلمۂ شہادت پڑھا' نماز' زکوٰۃ' روزہ اور حج ادا کئے' جو شخص ایک یا چند گناہ کا ارتکاب کرتا ہے' یعنی اسلام کے بعض ارکان ترک کرتا ہے' اگر وہ موت سے پہلے خلوص دل کے ساتھ توبہ کرلے تو اس کا انجام بھی ان ہی لوگوں میں ہوگا جنھوں نے گناہوں کا ارتکاب نہیں کیا اور ارکان اسلام ادا کئے اسلئے کہ حدیث شریف کے مطابق گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہے جیسے اس سے کوئی گناہ سرزد نہ ہوا ہو' چنانچہ اگر نجاست آلود کپڑا دھولیا جائے تو وہ پاک ہوجاتا ہے اور اس پر نجاست کا اثر باقی نہیں رہتا' اور اگر توبہ سے پہلے مرجائے تو موت کے وقت اسکی حالت باعث تشویش ہے کیونکہ موت اگر گناہ پر

اصرار کی حالت میں واقع ہوئی تو ایمان اپنے ضعف کے باعث متزلزل بھی ہو سکتا ہے' اس صورت میں سوء خاتمہ کا خوف ہے خاص طور پر اس وقت جب کہ ایمان تقلیدی ہو' تقلیدی ایمان پختہ ضرور ہوتا ہے' لیکن معمولی شبہات سے متاثر ہو جاتا ہے' معرفت و بصیرت رکھنے والوں پر سوء خاتمہ کا اندیشہ نہیں ہوتا' تاہم اگر یہ دونوں توبہ سے پہلے ایمان پر جاں بحق ہوئے تو (بشرطیکہ اللہ تعالیٰ معاف نہ فرمائے) عذاب دیا جائیگا اور یہ عذاب حساب فہمی کے عذاب سے الگ ہوگا' اور اس عذاب کی کمی و زیادتی گناہ پر اصرار کی مدت کی کمی یا زیادتی پر موقوف ہوگی اسی طرح گناہوں کی قباحت اور نوعیت کے اختلاف پر بھی موقوف ہوگی' اور عذاب کی مدت گزر جانے کے بعد سادہ لوح مقلدین اصحاب یمین کی صف میں داخل ہو جائیں گے' اور اہل بصیرت عارف اعلیٰ علّیین میں ٹھکانہ پائیں گے' حدیث شریف میں ہے۔

آخِرُ مَنْ يَخْرُجُ مِنَ النَّارِ يُعْطَى مِثْلَ الدُّنْيَا كُلِّهَا عَشَرَةَ أَضْعَافٍ (بخاری و مسلم۔ ابن مسعودؓ) جو شخص سب کے بعد دوزخ سے باہر نکلے گا اسے دنیا کے برابر دس گنا ملے گا۔

<u>اضعاف کی حقیقت</u>: اس سے اجسام کی پیمائش مراد نہیں ہے' یعنی یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ اگر دنیا ایک ہزار کوس کی ہے تو اسے دس ہزار کوس ملیں گے' اگر کوئی ایسا سمجھتا ہے تو یہ مثال بیان کرنے کے طریقے سے ناواقفیت کی دلیل ہے بلکہ اسے اس طرح سمجھنا چاہیئے کہ اگر کوئی شخص مثلاً یہ کہے کہ اس نے اونٹ لیا' اور دس گنا دیا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اگر اونٹ دس روپے کا تھا تو اس نے سو روپے دیئے' اگر اس سے مثل مراد لیا جائے' تو ظاہر ہے کہ سو روپے اونٹ کے سویں حصے کے برابر بھی نہیں ہے' مثالوں میں اجسام و ارواح کے معانی کا موازنہ ہوتا ہے' ان کے وجود اور اشکال کا موازنہ نہیں ہوتا' مذکورہ بالا مثال میں اونٹ سے اسکا وزن' طول اور عرض مقصود نہیں ہے' بلکہ مالیت ہے اس سے معلوم ہوا کہ اونٹ کی مالیت روح ہے' اسلئے سو روپے کو اونٹ کا دس گنا کہا جاسکتا ہے' بلکہ اگر سو روپے نہ دے اور اس کی قیمت کا ایک موتی دیدے' تب بھی یہی کہا جائے گا کہ اس اونٹ (کی قیمت) کا دس گنا دیا' کیونکہ مالیت کی روح سونا چاندی اور جواہرات ہیں' اس حقیقت سے صرف جوہری واقف ہیں' وہ یہ جانتے ہیں کہ ایک چھوٹا سا موتی دس جسیم اونٹوں کے برابر کیسے ہو سکتا ہے' جوہر کی جوہریت آنکھ سے نظر آنے والی چیز نہیں ہے بلکہ اس کے لئے ظاہری نظر کے علاوہ عقل و خرد کی بھی ضرورت ہے یہی وجہ ہیکہ جاہل آدمی اور بچہ یہ بات تسلیم نہیں کرے گا کہ ایک چھوٹا سا موتی دس اونٹوں کے برابر ہو سکتا ہے' وہ یہی کہیں گے کہ موتی کا وزن چند ماشے بھی نہیں ہوتا اور اونٹ اس سے ہزاروں لاکھوں گنا زیادہ ہے' اس لئے جو شخص یہ کہتا ہے کہ میں نے ایک اونٹ کے عوض دس گنا دیا وہ جھوٹا ہے' حالانکہ حقیقت میں جھوٹا وہ بچہ ہے' یا وہ جاہل دیہاتی ہے جو اپنی جہالت کے باعث جوہر اور اونٹ کی قیمت میں موازنہ نہ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے' یہ دونوں اس قول کو اسی وقت صحیح تسلیم کر سکتے ہیں' جب انکے دل میں وہ نور پیدا ہو جائے جس سے اس طرح کے حقائق کا ادراک کیا جاسکتا ہے' اور یہ نور لڑکے کے دل میں بلوغ کے بعد اور جاہل دیہاتی کے دل میں تعلیم کے بعد پیدا ہو سکتا ہے' اسی طرح عارف بھی کسی مقلد محض کو مثالوں کی حقیقت نہیں سمجھا سکتا' اور نہ وہ اسے اس طرح کی روایات کی صداقت تسلیم کرنے پر مجبور کر سکتا ہے کہ مومن کو دنیا کی دس گنی جنت عطا کی جائے گی' مقلد یہ تقریر کرتا ہے کہ احادیث کے مطابق جنت آسمانوں میں ہے (بخاری۔ ابو ہریرہؓ) اور آسمان دنیا میں شمار ہوتے ہیں' پھر دنیا سے دس گنی بڑی دنیا کیسے مل سکے گی' جس طرح کوئی عاقل بالغ شخص کسی بچے کو یہ فرق نہیں سمجھا سکتا اسی طرح جوہری بھی اس وقت عاجز نظر آتا ہے جب اس سے کہا جائے کہ وہ دیہاتی کو جوہر اور اونٹ کا فرق سمجھا دے یہی حال عارف کا بھی ہے کہ وہ سادہ لوح مقلد کو اس موازنے کا طریق نہیں سمجھا پاتا' اسی لئے حدیث شریف میں ارشاد فرمایا گیا۔ اِرْحَمُوا ثَلَاثَةً عَالِمًا بَيْنَ الْجُهَّالِ وَغَنِيَّ قَوْمٍ افْتَقَرَ وَعَزِيزَ قَوْمٍ ذَلَّ (ابن حبان۔ انسؓ)

تین آدمی قابل رحم ہیں' جاہلوں کے درمیان عالم' کسی قوم کا مالدار جب تنگ دست ہو جائے کسی قوم کا عزت دار آدمی جب ذلیل ہو جائے۔

انبیاء و اولیاء کی آزمائش: انبیاء کرام بھی اپنی امت کے درمیان اسی لئے قابل رحم ہیں کہ جس قوم کی طرف ان کی بعثت ہوتی تھی' وہ اپنی کم عقلی' اور کج فہمی کے باعث اذیتیں پہنچاتی تھیں' یہ اذیتیں ان کے حق میں اللہ کی طرف سے امتحان اور آزمائش تھیں' حدیث شریف میں یہی مراد ہے۔

اَلْبَلَاءُ مُوَكَّلٌ بِالْاَنْبِيَاءِ ثُمَّ الْاَمْثَلِ فَالْاَمْثَلِ (ترمذی' نسائی' ابن ماجہ۔ سعد بن ابی وقاصؓ)

آزمائش متعین ہے انبیاء اور اولیاء پر' پھر ان پر جو انبیاء و اولیاء کے مشابہ ہوں۔

اس آزمائش سے صرف وہی آزمائش مراد نہیں ہے جو حضرت ایوب علیہ السلام کے جسم پر نازل ہوئی' بلکہ اس سے وہ مصیبت اور اذیت بھی مراد ہے جو حضرت نوح علیہ السلام کو اپنی قوم سے اس وقت پہنچی جب انہوں نے قوم کو اللہ کی طرف بلایا' اور وہ نفرت سے دور ہٹ گئے' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بعض لوگوں کے کلام سے اذیت ہوئی' تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ میرے بھائی موسیٰ علیہ السلام پر رحم کرے کہ لوگوں نے انہیں ستایا مگر انہوں نے صبر کیا (بخاری۔ ابن مسعودؓ)

انبیاء اپنی نبوت کے منکرین کی وجہ سے آزمائش میں مبتلا کئے جاتے تھے' اولیاء اور علماء کو جاہلوں کی وجہ سے مبتلا کیا جاتا ہے جس طرح انبیاء کو آزمائش کے صبر آزما مرحلے سے گزرنا پڑتا ہے' اسی طرح اولیاء اللہ' اور علماء ربانی سخت امتحان کا سامنا کرتے ہیں۔ کبھی شہر چھوڑنے پر مجبور کردئے جاتے ہیں' کبھی سلاطین وقت کے درباروں میں انکی چغلی ہوتی ہے' اور وہ حق گوئی کی پاداش میں ہر طرح کے مظالم برداشت کرتے ہیں کچھ لوگ انھیں کافر اور ملحد کہتے ہیں' کچھ بددین اور فاسق و فاجر کہہ کر ستاتے ہیں اس میں شک نہیں کہ جاہلوں کے نزدیک اہل علم و معرفت کافروں سے کم نہیں ہیں جیسے کوئی اگر ایک موتی کے عوض اپنا اونٹ دیدے تو بے وقوف لوگ اسے پاگل کہیں گے کہ اس نے اتنا لمبا چوڑا جانور اتنے چھوٹے سے پتھر کے عوض دیدیا۔

اس وضاحت کے بعد تمہیں حدیث شریف کے اس مضمون پر ایمان لانا چاہئے کہ سب کے بعد دوزخ سے نکلنے والے شخص کو دنیا سے دس گنی بڑی جنت عطا کی جائے گی' یہ ایک سچا وعدہ ہے اور بلاشبہ اس پر عمل کیا جائے گا۔ تصدیق صرف ان چیزوں کے ساتھ مخصوص نہیں ہوتی جو حواس خمسہ سے پہچانے جاتے ہیں اگر تم نے محض ایسی ہی چیزوں کے ساتھ تصدیق کو مخصوص جانا تو تم میں اور گدھے میں کیا فرق ہوگا حواس خمسہ سے تو گدھا بھی چیزوں کا ادراک کرلیتا ہے' تم گدھے سے اسی لطیفے کی وجہ سے ممتاز ہو جو پہلے آسمانوں' زمینوں اور پہاڑوں پر پیش ہوا' جب انھوں نے اس لطیفے کا بوجھ سنبھالنے سے اپنی معذوری ظاہر کی تو یہ لطیفہ انسان پر پیش کیا گیا' یہ وہی لطیفہ ہے جس سے حواس کے دائرے سے خارج چیزوں کا ادراک کیا جاتا ہے حیوانات کو یہ لطیفہ میسر نہیں ہے جو شخص اس لطیفے سے کام نہ لے اور اسے ضائع کردے اور اپنی معلومات کی حد صرف محسوسات ہی کو قرار دے وہ انھی حیوانات میں شامل ہے۔

معرفت الٰہی حواس کے دائرے سے خارج ہے: برادران اسلام تمہیں ایسا نہ ہونا چاہئے۔ جو شخص صرف محسوسات کے ذریعہ چیزوں کا ادراک کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کو بھول جاتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات کا ادراک حواس سے نہیں ہوتا جو شخص اللہ تعالیٰ کو بھلا دیتا ہے۔ اللہ اسے اس کا نفس بھلا دیتا ہے۔ پھر اُفق اعلیٰ تک ترقی نہیں کرپاتا اور بہائم کے مرتبے میں پہنچ جاتا ہے' اور اسی رتبے پر قانع ہوجاتا ہے' ایسا شخص دراصل اس امانت میں خیانت کرنے والا ہے جو اسے اللہ کی طرف سے ودیعت ہوئی' اور اس کی نعمتوں کا منکر ہے اور خود کو اس کے انتقام کا نشانہ بنانے والا ہے' ایسے شخص کا حال تو بہائم کے حال سے بھی بدتر ہے' بہائم تو موت کے ذریعہ چھٹکارہ پالیتے ہیں اسے موت کے بعد بھی چھٹکارا نہیں ملتا' بلکہ اسے وہ امانت جو اسکے سپرد کی گئی تھی لامحالہ مالک امانت کو واپس کرنی ہوگی' کیوں کہ امانت اسی کی طرف رجوع کرے گی' اسی کے پاس اس کا ٹھکانہ ہے۔

یہ امانت کیسی ہے؟: یہ امانت ایک روشن آفتاب کی طرح ہے' جو ازل کے افق سے طلوع ہوئی ہے اور اسی فانی جسم میں

غروب ہو گئی ہے' جب اس جسمانی قالب کا نظام درہم برہم ہو گا تب یہ آفتاب اپنے مغرب سے طلوع ہو گا اور اپنے خالق و باری کے حضور پہنچے گا یا تو گہنا کر یا خوب روشن ہو کر' روشن آفتاب تو بلا حجاب رب کریم کے دربار میں پہنچے گا' پہنچے گا تو گہنایا ہوا آفتاب بھی' کیونکہ تمام کا مرجع اللہ تعالیٰ کی ذات ہی ہے' لیکن اوندھے منہ پہنچے گا' اس کا رخ اعلا علیین کے بجائے اسفل السافلین کی طرف پھرا ہوا ہو گا۔ قرآن شریف میں ارشاد ہے۔

وَلَوْ تَرَىٰٓ إِذِ ٱلْمُجْرِمُونَ نَاكِسُوا۟ رُءُوسِهِمْ عِندَ رَبِّهِمْ (پ ۲۱ ر ۱۵ آیت ۱۲)

اور اگر آپ دیکھیں تو عجیب حال دیکھیں جب کہ یہ مجرم لوگ اپنے رب کے سامنے سر جھکائے ہوں گے۔

اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ قیامت کے دن گنہ گار بھی دربار الٰہی میں حاضر ہوں گے' لیکن اطاعت گزاروں کی طرح نہیں' بلکہ ان کے چہرے الٹے ہوئے ہوں گے یعنی بجائے پیٹ کے ان کا رخ پشت کی طرف ہو گا' اور اوپر اٹھنے کے بجائے وہ زمین کی طرف مائل ہوں گے اس میں بندے کو کوئی اختیار نہیں ہے' جو شخص توفیق ایزدی سے محروم ہے اس پر حکم الٰہی اسی طرح نافذ ہو گا کہ وہ ہدایت کے راستے پر قدم نہ اٹھا سکے گا' اور گمراہی کی وادیوں میں بھٹکتا رہے گا ہم گمراہی سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں' اور اس بات سے بھی اللہ کی پناہ چاہتے ہیں کہ ہمیں جاہلوں کے درجے میں شمار کیا جائے۔

دوزخ سے صرف موحد نکلیں گے : یہاں تک ان لوگوں کے بارے میں گفتگو تھی جو دوزخ سے نکل کر دنیا سے دس گنا یا اس سے زیادہ پائیں گے' اب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ دوزخ سے صرف موحد نکلیں گے' موحد سے مراد وہ لوگ ہیں جنھوں نے صرف زبان سے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہنے پر اکتفا کیا' اس لئے کہ زبان عالم ظاہر سے ہے' اسکا فائدہ صرف دنیا میں ہے کہ نہ اس کی گردن ماری جاتی ہے اور نہ اسکا مال لوٹا جاتا ہے' ظاہر ہے جان اور مال کا معاملہ صرف زندگی تک ہے' جہاں نہ جان ہو گی اور نہ مال وہاں زبان سے لَآ اِلٰهَ کہنے کا کوئی فائدہ نہ ہو گا' وہاں توحید کا کمال اور اس کی صداقت کام آئے گی' توحید کا کمال یہ ہے کہ بندہ تمام امور کا منبع اور مرجع اللہ تعالیٰ کی ذات کو قرار دے' اس کی علامت یہ ہے کہ کسی مخلوق کی بدسلوکی پر ناراض نہ ہو' کیونکہ اس اعتراف کے بعد کہ تمام امور اللہ تعالیٰ سے ہیں یہ بدسلوکی بھی اللہ ہی کا حکم قرار دی جائے گی' مخلوق تو محض اس حکم کے نفاذ کا ذریعہ بنی ہے' اس کی مزید تحقیق توکل کے باب میں آئے گی۔

اس توحید میں بھی لوگوں کے مختلف درجات ہیں' بعض کی توحید پہاڑ کے برابر ہے' اور بعض کی رائی برابر' چنانچہ جس کے پاس مثقال برابر توحید ہو گی وہ پہلے دوزخ سے باہر آئے گا' جیسا کہ حدیث شریف میں ہے۔

اَخْرِجُوْا مِنَ النَّارِ مَنْ فِیْ قَلْبِهٖ مِثْقَالُ دِیْنَارٍ مِّنْ اِیْمَانٍ (۱)

اس شخص کو دوزخ سے نکالو جس کے دل میں دینار کے برابر ایمان ہے۔

اور آخر میں وہ شخص باہر نکلے گا جس کے دل میں رائی کے برابر ایمان ہو گا' مثقال اور رائی کے درمیان بے شمار درجات ہیں' ان درجات کے لوگ مثقال کے بعد اور رائی سے پہلے علی الترتیب باہر آئیں گے' مثقال اور ذرہ یہ دونوں چیزیں مثال ہیں جیسا کہ اعیان اور اموال کے ضمن میں اسکی وضاحت کر دی گئی ہے کہ اس طرح کے امور بطور مثال بیان کئے جاتے ہیں' ان سے وہ حقیقت مراد نہیں ہوتی جو بظاہر سمجھ میں آتی ہے۔

ظلم دخول جہنم کا بڑا سبب : عام طور پر موحدین بندوں پر اپنے مظالم کے باعث دوزخ میں جائیں گے' بندوں کے حقوق نظر انداز نہیں کئے جا سکتے۔

دوسری نوعیت کے گناہوں میں عفو و بخشش کی گنجائش ہے' چنانچہ روایات میں ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑا کیا جائے گا' اس کے پاس پہاڑوں کے برابر نیک اعمال ہوں گے' اگر وہ تمام اعمال تسلیم کر لئے جائیں تو اس کے جنتی ہونے میں کوئی شبہ نہ

(۱) یہ روایت پہلے گزر چکی ہے

ہو' لیکن وہ تمام لوگ اپنی اپنی فریاد لیکر کھڑے ہوں گے جن پر اس نے مظالم کئے ہوں گے' بعض کو گالی دی ہوگی' بعض کا مال لوٹا ہوگا' بعض کو مارا ہو یہ تمام حق تلفیاں اسکے نیک اعمال کا قصہ تمام کردیں گی' یہاں تک کہ اس کے پاس ایک نیکی بھی باقی نہ رہے گی' ملائکہ کہیں گے' پروردگار عالم' یہ شخص اعمال خیر کا ذخیرہ رکھتا تھا لیکن وہ تمام ذخیرہ ختم ہوچکا ہے' اس کی تمام نیکیاں مطالبہ کرنے والوں پر تقسیم کردی گئی ہیں' لیکن ابھی ان لوگوں کی بڑی تعداد باقی ہے جن کے مطالبے نیکیاں نہ ہونے کے باعث پورے نہیں کئے جاسکے' حکم ہوگا کہ ان مطالبہ کرنے والوں کے گناہ اس کے اعمال نامے میں لکھ دئے جائیں' اور اسکے لئے دوزخ کے نام ایک تحریر لکھدو' جس طرح آدمی نیک اعمال رکھتے ہوئے بھی دوسروں کی حق تلفیوں کے باعث ہلاک ہوجاتا ہے' اسی طرح مظلوم کے پاس جب ظالم کی نیکیاں آجاتی ہیں تو وہ اپنے گناہوں کے باوجود بخش دیا جاتا ہے۔ ابن جلاء صوفی منش انسان تھے' ان کے متعلق کسی کتاب میں لکھا ہے کہ ان کے کسی بھائی نے ان کی غیبت کی' پھر وہ اپنے اس فعل پر نادم ہوئے' اور ایک قاصد بھیج کر اس غلطی کی معافی چاہی' ابن الجلاء نے کہا کہ میں معاف کرنے سے قاصر ہوں' میرے اعمال نامے گناہوں سے سیاہ ہیں' ان میں ایک نیکی یہی نظر آتی ہے بھلا میں اپنے اعمال نامے کو اس سے کیوں زینت نہ دوں؟

یہ احکام ظاہر پر مبنی ہیں : اب تک ہم اس موضوع پر گفتگو کرتے رہے کہ آخرت میں سعادت اور شقاوت کے اعتبار سے لوگوں کے حالات مختلف ہوں گے ہم نے ہر فرقے کا حکم بیان کیا ہے' مگر یہ تمام احکام ظاہری اسباب کے اعتبار سے ہیں' جیسے ڈاکٹر کسی مریض کے بارے میں کہہ دیتا ہے کہ اس کا مرض خطرناک ہے اسلئے بچنا ممکن نہیں ہے' اور کسی مریض کے متعلق یہ ظاہر کرتا ہے کہ اسکا مرض معمولی نوعیت کا ہے اسلئے اسکی زندگی کو کوئی خطرہ نہیں ہے یہ محض اندازے ہیں' بسا اوقات صحیح ہوجاتے ہیں' اور بعض اوقات غلط' یہاں تک کہ وہ مریض جو بظاہر موت سے ہم کنار ہے' اچھا ہوجاتا ہے اور معمولی نوعیت کا مریض دیکھتے ہی دیکھتے ختم ہوجاتا ہے' یہ اللہ تعالیٰ کے مخفی اسرار ہیں' جو اس نے زندہ لوگوں کی روحوں میں ودیعت کردئے ہیں' اور ایسے دقیق اسباب ہیں جنھیں اللہ رب العزت نے ایک مقررہ اندازے پر مرتب کررکھا ہے' کسی بندے کے لئے ممکن نہیں ہے کہ وہ ان کی حقیقت پر مطلع ہوسکے' اسی طرح نجات اور کامیابی کے اسباب بھی مخفی ہیں' کسی انسان کے بس میں نہیں کہ وہ انکی حقیقت کا علم حاصل کرسکے جس سبب سے نجات ہوتی ہے اسے عفو اور رضا کہتے ہیں' اور جس سے آدمی ہلاک ہوتا ہے اسے غضب یا انتقام کہتے ہیں' اسکے پیچھے ایک راز اور ہے جسے اللہ تعالیٰ کی ازلی مشیت سے تعبیر کرتے ہیں' مخلوق کو ازلی مشیت کا علم نہیں ہوتا' اس لئے ہمیں یہ سوچنا ہوگا کہ گنہ گار کی مغفرت ممکن ہے' اگرچہ اس کے ظاہری گناہ بے شمار ہوں' اور مطیع کے لئے عذاب ممکن ہے اگرچہ اسکی ظاہری نیکیاں بے حساب ہوں' اس لئے کہ اعتبار تقویٰ کا ہے' اور تقویٰ دل میں ہوتا ہے' یہ ایک ایسا دقیق معاملہ ہے کہ خود متقی کو اس کی اطلاع نہیں ہوتی' دوسرے کو کس طرح ہوسکتی ہے؟ ارباب قلوب پر یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ بندہ کو عفو اسی وقت حاصل ہوتا ہے جب اس کے باطن میں کوئی مخفی سبب اسکا متقضی ہو' اسطرح وہ غضب کا مستحق بھی اسی وقت ٹھہرتا ہے' جب اسکے باطن میں کوئی مخفی سبب غضب کا محرک بنتا ہے' اگر ایسا نہ ہو تو اعمال و اوصاف کی جزاء عفو و غضب نہ ہو' اور اگر جزاء نہ ہو تو عدل بھی نہ ہو' اور عدل نہ ہو تو اللہ تعالیٰ کے یہ ارشادات بھی صحیح نہ ہوں۔

وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيدِ (پ ۲۴ ر ۱۹ آیت ۴۶)

اور آپ کا رب بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ (پ ۵ ر ۳ آیت ۴۰)

اللہ تعالیٰ ذرہ برابر بھی ظلم نہیں فرمائے گا۔

حالانکہ یہ سب اقوال درست ہیں' اس سے معلوم ہوا کہ انسان کو خود اپنی کاوش و کوشش کا صلہ ملتا ہے' جیسا کہ ارشاد فرمایا گیا

وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى (پ ۲۷ ر ۷ آیت ۳۹)

اور یہ کہ انسان کو صرف اپنی ہی کمائی ملے گی۔

كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ رَهِينَةٌ (پ ۲۹ ر ۱۴ آیت ۳۸)

ہر شخص اپنے اعمال کے بدلے میں محبوس ہو گا۔

جب کوئی شخص کج روی اختیار کرے گا' اللہ تعالیٰ اسے کجرو کردے گا' جو شخص اپنے نفس کو بدلنے کی کوشش کرے گا اللہ تعالیٰ اسکا حال بدل دے گا' چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنفُسِهِمْ (پ ۱۳ ر ۸ آیت ۱۱)

واقعی اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت میں تغیر نہیں کرتا جب تک کہ وہ خود اپنی حالت کو نہیں بدل دیتے۔

یہ تمام باتیں دل والوں پر اتنی صاف اور واضح منکشف ہوتی ہیں کہ دیدۂ بینا رکھنے والے بھی اتنا کھلا مشاہدہ نہیں کرپاتے' آنکھ غلطی کرسکتی ہے کہ دور سے کسی چیز کو دیکھے اور کچھ کا کچھ سمجھ بیٹھے' یا چھوٹے کو بڑا اور بڑے کو چھوٹا تصور کرے' قلب کے ذریعہ مشاہدہ کرنے میں غلطی کا کوئی امکان نہیں ہے' لیکن یہ صلاحیت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب بصیرت کے بند دروازے اچھی طرح کھل جائیں' اس کے بعد جو حقائق منکشف ہوتے ہیں' ان میں غلطی کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا' اللہ تعالیٰ کے اس قول میں اسی امر کی طرف اشارہ ہے۔ مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَأَىٰ (پ ۲۷ ر ۵ آیت ۱۱)

قلب نے دیکھی ہوئی چیز میں کوئی غلطی نہیں کی۔

تیسرا درجہ نجات یافتگان : نجات سے ہماری مراد سلامتی ہے' سعادت اور فوز و فلاح نہیں ہے نجات یافتہ وہ لوگ ہونگے جنھوں نے نہ کوئی خدمت کی کہ انھیں خلعت فاخرہ سے نوازا جائے اور نہ کوئی کوتاہی کی کہ عذاب دیا جائے غالباً" یہ حال کافر بچوں اور دیوانوں کا ہو گا' ان میں وہ لوگ بھی ہیں جو بے ہوش رہے یا ان تک اسلامی دعوت نہیں پہنچی' اور انھوں نے شہری تمدن سے دور رہ کر غفلت اور جہالت کے ساتھ زندگی گزار دی' نہ انکے پاس معرفت تھی' نہ انکار' نہ اطاعت تھی اور نہ معصیت' نہ کوئی وسیلہ تھا جو انھیں اللہ تعالیٰ سے قریب کرتا اور نہ ایسا گناہ تھا جو بعد کا سبب بنتا' نہ وہ جنت میں جائینگے' اور نہ دوزخ میں بلکہ ان دونوں کے درمیان ایک ایسے مقام پر رہیں گے جسے شریعت نے اعراف سے تعبیر کیا ہے' مخلوق کے بعض گروہوں کا اعراف پر رہنا آیات اور روایات سے یقینی طور پر معلوم ہے' (۱) تاہم کسی فرقے کے بارے میں قطعی طور پر یہ کہنا کہ وہ اعراف میں رہے گا غلط ہے بلکہ یہ ایک ظنی امر ہے' مثلاً کافروں کی نابالغ اولاد کا اعراف میں رہنے کا حکم ظنی ہے' یقینی نہیں ہے اس کی صحیح صحیح اطلاع صرف نبوت ہی کے ذریعہ ممکن ہے' علماء اور اولیاء بھی اس درجے تک رسائی سے محروم ہیں' بچوں کے بارے میں روایات مختلف ہیں' چنانچہ ایک مرتبہ کوئی بچہ مرگیا' حضرت عائشہؓ نے فرمایا یہ بچہ تو جنت کی چڑیوں میں سے ایک چڑیا ہے' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے دریافت فرمایا تمھیں یہ بات کیسے معلوم ہوئی؟ (مسلم شریف) اس سے معلوم ہوا کہ ان مقامات میں اشکال اور اشتباہ کو غلبہ ہے۔

چوتھا درجہ۔ اصحاب فلاح : یہ وہ لوگ ہیں جنھیں تقلید کے بغیر معرفت حاصل ہوتی ہے' یہ مقربین سابقین ہیں' مقلدین کو اگرچہ فی الجملہ کامیابی حاصل ہوتی اور وہ جنت میں کوئی درجہ پائیں گے' لیکن انھیں اصحاب یمین ہی کہا جائیگا' جب کہ وہ مقربین ہوں گے جو کچھ اجر و ثواب انھیں حاصل ہو گا' وہ حد بیان سے باہر ہو گا' بس انکے بارے میں اتنا ہی کہا جائے گا جو قرآن کریم میں مذکور ہے' اللہ تعالیٰ نے بطور اجمال ارشاد فرمایا ہے۔ فرمایا:

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّا أُخْفِيَ لَهُم مِّن قُرَّةِ أَعْيُنٍ (پ ۲۱ ر ۱۵ آیت ۱۷)

---

(۱) چنانچہ بزار میں حضرت ابوسعید الخدریؓ سے منقول ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے اہل اعراف کے متعلق دریافت کیا گیا آپ نے فرمایا یہ وہ لوگ ہوں گے جنھوں نے اللہ کی راہ میں شہادت پائی لیکن وہ اپنے آباء کے نافرمان تھے' شہادت نے انھیں دوزخ میں جانے سے روک دیا اور معصیت نے جنت میں۔

سو کسی شخص کو خبر نہیں، جو جو آنکھوں کی ٹھنڈک کا سامان خزانۂ غیب میں موجود ہے۔

ایک حدیث قدسی میں فرمایا گیا۔

أَعْدَدْتُ لِعِبَادِيَ الصَّالِحِيْنَ مَالَا عَيْنٌ رَأَتْ وَلَا أُذُنٌ سَمِعَتْ وَلَا خَطَرَ عَلٰى قَلْبِ بَشَرٍ (۱)

میں نے اپنے نیک بندوں کے لئے ایسی چیزیں تیار کی ہیں جنھیں نہ کسی آنکھ نے دیکھا نہ کسی کان نے سنا اور نہ کسی انسان کے دل پر اسکا خیال گزرا۔

عارفین کو وہی حالت مطلوب ہوتی ہے جو کسی انسان کے دل پر نہ گزری ہو، وہ حور و قصور میوے، دودھ، شہد اور شراب، زیور اور لباس وغیرہ جنت کی اشیاء کے حریص نہیں ہوتے، اگر انھیں یہ چیزیں عطا بھی کی گئیں تو وہ ان پر قناعت نہ کریں گے، بلکہ اللہ تعالیٰ کے دیدار کی لذت کے طالب ہوں گے، جو سعادت کی غایت اور لذت کی انتہا ہے۔ حضرت رابعہ بصریؒ سے کسی نے دریافت کیا کہ جنت میں آپ کو کس چیز سے رغبت ہوگی، فرمایا، پہلے صاحب خانہ سے پھر خانہ سے، یہ وہ لوگ تھے جنھیں صاحب دار کی محبت نے دار سے بے نیاز کردیا تھا، بلکہ اس کے علاوہ ہر چیز سے بے پروا بنادیا تھا، یہاں تک کہ انھیں اپنی ذات سے بھی کوئی تعلق نہ تھا، ان کی مثال ایسے عاشق کی تھی جسے معشوق کا چہرہ دیکھنے کی آرزو ہو، اور وہ اسی آرزو میں اس قدر مستغرق ہو کہ اس کے علاوہ کوئی فکر، کوئی آرزو، اور کوئی خواہش اسکے دل میں نہ ہو، نہ اپنے نفس کی خبر ہو، بلکہ ہر چیز سے بے نیاز ہو کر بلکہ اپنے جسم کے ہر زخم سے بے پروا ہو کر وہ معشوق کے چہرے سے نقاب اٹھنے کا منتظر ہو، اس حالت کو فانی الحب کہتے ہیں، یعنی وہ اپنے محبوب کی محبت میں اتنا غرق ہو گیا ہے کہ اسے سوائے محبوب کے کوئی دوسری چیز نظر نہیں آتی، اسکے تمام افکار و تصورات کا صرف ایک مرکز ہے، اسکے دل اور ذہن میں کسی دوسرے کے لئے کوئی گنجائش ہی نہیں ہے، اللہ کی یاد میں جس کی یہ حالت ہوتی ہے اسے آخرت میں وہ چیز عطا کی جاتی ہے جس کا تصور تک کسی بشر کے دل میں نہیں گزرتا، جیسے بہرے اندھے آدمی کو رنگ کی صورت اور آواز کی کیفیت معلوم نہیں ہوتی، لیکن اگر اس کے کان اور آنکھ کے حجابات دور کردیئے جائیں تو رنگ اور آواز کی صورت و کیفیت معلوم ہو جائے گی، اور یہ بات جان لے گا کہ اس سے پہلے دل میں ان کا تصور بھی نہیں آسکتا تھا۔ یہ دنیا بھی ایک حجاب ہے، جب یہ حجاب اٹھے گا تو بہت سی ایسی چیزیں منکشف ہوں گی، جن کا دنیوی زندگی میں تصور بھی ممکن نہیں ہے، اور حیات طیبہ کی لذت حاصل ہوگی، اور پھر اس آیت کریمہ کا مضمون واضح ہوگا۔

وَإِنَّ الدَّارَ الْآخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ (پ ۲۱ ر ۳ آیت ۶۴)

اور آخرت کی زندگی ہی باقی رہنے والی ہے اگر وہ لوگ جان لیں۔

صغیرہ گناہ کبیرہ کیسے بنتا ہے

جاننا چاہیے کہ صغائر چند اسباب سے کبائر بن جاتے ہیں۔

پہلا سبب۔ اصرار و مواظبت: پہلا سبب یہ ہے کہ صغیرہ گناہ پر اصرار اور مداومت کی جائے۔ اسی لئے مثل مشہور ہے کہ اصرار کے ساتھ کوئی گناہ صغیرہ نہیں اور استغفار کے ساتھ کوئی گناہ کبیرہ نہیں، اس مثل کا حاصل یہ ہے کہ اگر کوئی شخص ایک کبیرہ کرکے باز رہے، اور دوسرے کبیرہ کا ارتکاب نہ کرے تو امید یہ ہے کہ اسکا گناہ معاف کردیا جائے گا، اسکے برعکس اس صغیرہ کا معاملہ سخت ہے جس پر مداومت کی جائے، اس کی مثال ایسی ہے جیسے پتھر پر پانی قطرہ قطرہ گرتا ہے تو اس لئے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

---

(۱) یہ روایت پہلے بھی گزر چکی ہے

خَيْرُ الْأُمُوْرِ أَدْوَمُهَا وَإِنْ قَلَّ (بخاری و مسلم۔ عائشہ)

بہترین امور وہ ہیں جن پر مداومت کی جائے اگرچہ وہ تھوڑے ہوں۔

کیونکہ اشیاء اپنی اضداد سے پہچانی جاتی ہیں' اسلئے جب اس حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ وہ تھوڑا عمل جس پر مداومت کی جائے زیادہ مفید ہے تو یہ بھی ثابت ہوا کہ بہت سا عمل اگر ایک وقت میں کرلیا جائے تو وہ نفس کی تطہیر اور قلب کے تزکیہ میں اتنا مفید نہیں ہے' اسی طرح جب چھوٹے چھوٹے گناہوں پر مداومت اختیار کرلی جاتی ہے' تو قلب کو تاریک کرنے میں ان کی تاثیر زیادہ ہوجاتی ہے' تاہم یہ بات صحیح ہے کہ آدمی اس وقت تک کسی کبیرہ کا مرتکب نہیں ہوتا جب تک سابق میں صغائر نہ ہوں' مثلاً زانی اچانک زنا نہیں کرتا بلکہ زنا سے پہلے قصدوارادہ بھی ہوتا ہے' اسی طرح قاتل ایک دم قتل نہیں کرتا بلکہ پہلے دشمنی اور عداوت ہوتی ہے' تمام کبائر کا یہی حال ہے کہ ان کی ابتداء اور انتہا میں صغائر پائے جاتے ہیں' اگر کوئی ایسا کبیرہ فرض کرلیا جائے جو بغیر کسی سابقے یا لاحقے کے اچانک وجود میں آجائے' اور اس کی طرف دوبارہ واپسی کا امکان نہ ہو تو اس کی بخشش کی زیادہ امید کی جاسکتی ہے بہ نسبت اس صغیرہ کے جس پر آدمی نے زندگی بھر مداومت کی ہو۔

دوسرا سبب گناہ کو معمولی سمجھنا : دوسرا سبب جس سے صغیرہ گناہ کبیرہ بن جاتا ہے' یہ ہے کہ آدمی اپنے گناہ کو معمولی سمجھے' ہر وہ گناہ جسے بندہ اپنے دل میں بڑا تصور کرتا ہے' اللہ تعالیٰ کے نزدیک معمولی ہوجاتا ہے' اور جسے معمولی سمجھتا ہے وہ اللہ کے یہاں بڑا بن جاتا ہے' اسلئے کسی گناہ کو عظیم سمجھنے کا مطلب یہ ہے کہ مرتکب دل سے اپنے فعل کو برا جانتا ہے' اور اسے بنظر کراہت دیکھتا ہے' چنانچہ وہ اپنی اس نفرت اور کراہت کے باعث گناہ کے زیادہ اثرات قبول نہیں کرتا' اسکے برعکس کسی گناہ کو معمولی سمجھنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے دل میں اس گناہ سے محبت اور رغبت ہے' اس لیے وہ اپنے دل پر اس گناہ کے زیادہ اثرات قبول کرتا ہے' قلب کو اطاعت کے ذریعہ روشن کرنا مطلوب ہے' اور اسے معصیت سے تاریک کرنا ممنوع ہے' اسلئے غفلت میں آدمی جن برائیوں کا مرتکب ہوجاتا ہے ان پر مواخذہ نہیں ہوگا' اسلئے کہ آدمی کا دل اس عمل سے متاثر نہیں ہوتا جو بے خبری میں ہوگیا ہو جیسا کہ حدیث شریف میں ہے۔

اَلْمُؤْمِنُ يَرٰى ذَنْبَهُ كَالْجَبَلِ فَوْقَهُ يَخَافُ اَنْ يَّقَعَ عَلَيْهِ وَالْمُنَافِقُ يَرٰى ذَنْبَهُ كَذُبَابٍ مَرَّ عَلٰى اَنْفِهِ فَاَطَارَهُ (بخاری۔ حرث بن سوید عن ابن مسعودؓ)

مومن اپنے گناہ کو ایسا سمجھتا ہے جیسے سر پر معلق پہاڑ جس کے گرنے کا خطرہ ہو' اور منافق اپنے گناہ کو مکھی سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا کہ ناک پر سے گزری اور اس نے اڑادی۔

بعض اکابر کا قول ہے کہ آدمی کے جس گناہ کی بخشش نہیں ہوتی وہ یہ ہے کہ کوئی گناہ کرے' اور اس کے بعد یہ کہے کاش! جو گناہ ہم نے کیے ہیں وہ اسی گناہ کی طرح (ہلکے پھلکے) ہوتے۔

مومن گناہ کو بڑا سمجھتا ہے : مومن چھوٹے سے چھوٹے گناہ کو بڑا تصور کرتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کو اللہ تعالیٰ کی جلالت اور سطوت وقدرت کا علم ہوتا ہے' اللہ تعالیٰ نے اپنے کسی نبی پر وحی بھیجی کہ ہدیہ کی کمی پر نظر مت کر' بلکہ اسکی عظمت پر نظر رکھ جس نے یہ ہدیہ تمہیں بھیجا ہے' اپنے گناہ کو معمولی مت سمجھ' بلکہ اس ذات کی عظمت وجلالت پیش نظر رکھ جس کا تونے اس گناہ سے مقابلہ کیا ہے' بعض عارفین نے اسی لئے صغائر کے وجود کا انکار کیا ہے ان کے نزدیک اللہ تعالیٰ کے ہر حکم کی مخالفت کبیرہ گناہ ہے' اسی طرح بعض صحابہ رضوان اللہ علیہم نے تابعین سے فرمایا کہ تم ایسے عمل کرتے ہو جو تمہاری نگاہ میں بال سے زیادہ باریک ہیں حالانکہ ہم انھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور مبارک میں مہلکات تصور کرتے تھے' اس کی وجہ یہ ہے کہ صحابہ کرام اللہ تعالیٰ کے جلال سے پورے طور پر واقف تھے' چنانچہ اللہ تعالیٰ کے جلال کی نسبت سے ان کے نزدیک صغائر بھی کبائر سے کم نہ تھے' یہی وجہ ہے کہ جاہل جس چیز کو معمولی سمجھ کر نظرانداز کردیتا ہے' عالم اسی چیز کو اہم سمجھتا ہے' عام آدمی سے بعض باتیں نظرانداز کردی جاتی

ہیں جب کہ وہی باتیں عارف سے درگزر نہیں کی جاتیں کیونکہ گناہ اور مخالفت کا کم یا زیادہ ہونا گناہ گار اور مخالفت کرنے والے کی معرفت کی کمی یا زیادتی پر موقوف ہے۔

تیسرا سبب گناہ سے خوشی: تیسرا سبب جس سے صغیرہ گناہ کبیرہ بن جاتا ہے یہ ہے کہ گناہ کرکے خوش ہو اس پر فخر کرے، اور یہ سمجھے کہ مجھ سے یہ فعل سرزد ہوا ہے اللہ کے خاص انعام اور فضل سے ہوا ہے، نیز اس امر سے بھی غافل ہو کر یہ عمل کوتاہی ہے، اور اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور مرتکب کی بدبختی کا سبب ہے، آدمی کو جس قدر صغیرہ میں لذت معلوم ہوتی ہے اسی قدر وہ کبیرہ ہوجاتا ہے اور اسی قدر دل میں اسکی سیاہی اثر انداز ہوتی ہے، بعض گناہ گاروں کو دیکھا گیا ہے کہ وہ اپنے گناہ پر تعریف کے خواہاں ہوتے ہیں اتراتے ہیں اور لاف زنی کرتے ہیں، مثلاً اپنے مخاطب سے کہتے ہیں کیا تو نے دیکھا نہیں کہ میں نے اس کی دھجیاں کس طرح بکھیریں، مناظر کہتا ہے تو نے دیکھا نہیں میں نے اپنے حریف کو کیسے رسوا کیا، اسکے عیوب بیان کرکے شرمندہ کیا، بھرے مجمع میں اسکی ذلت ہوئی پھر میں نے اس مناظرے میں ایسا فریب دیا جس کا وہ تصور بھی نہیں کرسکتا تھا، تاجر کہتا ہے دیکھا میں نے اسے کھوٹے سکے دیکر بے وقوف بنادیا اور ایسا دھوکہ دیا اتنا نقصان پہنچایا، بے چارہ احمق بھی بنا، اور گھاٹے میں بھی رہا، یہ اور اس طرح کی باتیں ہیں جن سے معمولی گناہ بھی غیر معمولی بن جاتے ہیں، گناہ مہلکات ہیں اگر آدمی ان میں مبتلا ہوجائے اور نادانی سے شیطان بن آئے اور وہ تمہیں گناہ کے ارتکاب پر مجبور کردے تو یہ رنج و غم کا مقام ہے، خوشی کا مقام نہیں کیا تم نے کسی شخص کو دیکھا ہے کہ وہ دشمن سے مغلوب ہونے میں بڑائی سمجھتا ہو، اور اپنی شکست پر نازاں ہو، نیز کیا کوئی ذی ہوش انسان ایسی حرکتیں کرکے خوش رہ سکتا ہے، جن سے محبوب ناراض ہو، اسکی مثال ایسے مریض کی سی ہے جو دوا کی بوتل ٹوٹنے پر خوش ہو، کیا یہ مریض دوا کے بغیر شفا کا امیدوار ہے؟

چوتھا سبب۔ اللہ تعالیٰ کے حکم کا سہارا لینا: ایک اور سبب جس سے صغیرہ گناہ کبیرہ بن جاتا ہے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی پردہ پوشی حلم اور ڈھیل کا سہارا لے، اور یہ نہ جانے کے ڈھیل ناراضگی کے باعث ہوتی ہے، تاکہ مہلت ملنے سے وہ گناہ زیادہ کرے، اور زیادہ مبغوض بنے اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ میرا گناہ کرنا بھی اللہ تعالیٰ کی عنایت اور رحمت کا مظہر ہے تو یہ اسکی جہالت، غرور کے مواقع سے اس کی ناواقفیت، اور اللہ کی پکڑ سے جرأتمندانہ بے خوفی کی دلیل ہے، ایسے لوگوں کے مزاج کی حکایت ذیل کی آیت کریمہ میں کی گئی ہے۔

وَيَقُولُونَ فِي أَنفُسِهِمْ لَوْلَا يُعَذِّبُنَا اللَّهُ بِمَا نَقُولُ حَسْبُهُمْ جَهَنَّمُ يَصْلَوْنَهَا فَبِئْسَ الْمَصِيرُ (پ ۲۸ ر ۲ آیت ۸)

اور اپنے دل میں کہتے ہیں کہ ہم کو ہمارے اس کہنے پر سزا کیوں نہیں دیتا، انکے لئے جہنم کافی ہے اس میں یہ لوگ داخل ہوں گے، سو وہ برا ٹھکانہ ہے۔

پانچواں سبب۔ گناہ کا اظہار و اعلان: صغیرہ کے کبیرہ بن جانے کا ایک سبب یہ ہے کہ آدمی گناہ کرے، اور پھر لوگوں کو بتلائے کہ میں نے فلاں گناہ کیا ہے، یا جان بوجھ کر ایسی جگہ کرے جہاں لوگ اسے دیکھ رہے ہوں، جو شخص ایسا کرتا ہے وہ گویا اللہ تعالیٰ کا ڈالا ہوا پردہ چاک کرنا چاہتا ہے، اور ان لوگوں کو گناہ پر اکسانے کا ارادہ رکھتا ہے جنہیں اپنے گناہ کی اطلاع دی ہے، یا جن کی موجودگی میں گناہ کا ارتکاب کیا ہے ایک گناہ پہلے سے تھا اس میں دو گناہ مزید شامل ہوگئے، اسلئے یہ گناہ غیر معمولی بن جائیگا، اور اگر کوئی شخص اپنے گناہ کے اظہار کے ساتھ ساتھ لوگوں کو اس گناہ کی ترغیب دے اور انکے لئے اس گناہ کی راہ ہموار کرے تو یہ چوتھا گناہ ہوگا، اور اس سے وہ گناہ انتہائی سنگین بن جائے گا، حدیث شریف میں ہے۔

كُلُّ النَّاسِ مُعَافًى إِلَّا الْمُجَاهِرِينَ يَبِيتُ أَحَدُهُمْ عَلَىٰ ذَنْبٍ قَدْ سَتَرَهُ اللَّهُ عَلَيْهِ فَيُصْبِحُ فَيَكْشِفُ سِتْرَ اللَّهِ وَيَتَحَدَّثُ بِذَنْبِهِ (بخاری و مسلم۔ ابوہریرہ)

تمام لوگ معاف کردیئے جائیں گے مگر ان کی بخشش نہیں ہوگی جو اپنے گناہ ظاہر کرتے پھرتے ہیں، ایک

شخص گناہ کر کے بستر پر لیٹتا ہے اللہ تعالیٰ اس کا گناہ رات کے اندھیروں میں چھپا دیتا ہے، لیکن جب صبح ہوتی ہے تو وہ اللہ کا چھپایا ہوا گناہ ظاہر کر دیتا ہے، اور لوگوں کو بتلا دیتا ہے۔

اس کی وجہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کی صفات و انعامات میں سے ایک یہ بھی کہ وہ اچھائیوں کو ظاہر کرتا ہے، اور برائیوں کو چھپاتا ہے، اور کسی کا راز آشکارا نہیں کرتا، جو شخص اپنے عیب ظاہر کرتا ہے وہ گویا اس نعمت کی ناشکری کا کرتا ہے، اور عملاً اس صفت الٰہیہ کا انکار کرتا ہے، اکابرین میں سے کسی کا قول ہے کہ اول تو بندہ گناہ ہی نہ کرے اور کرے تو دوسروں کو ترغیب نہ دے، ورنہ وہ دو گناہوں کا مرتکب ہوگا۔ یہ وصف منافقین کا ہے کہ وہ ایک دوسرے کو برائیوں کی ترغیب دیتے ہیں، قرآن کریم میں ہے۔

اَلْمُنَافِقُوْنَ وَالْمُنَافِقَاتُ بَعْضُهُمْ مِنْ بَعْضٍ يَامُرُوْنَ بِالْمُنْكَرِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ (پ ۱۰ ر ۱۵ آیت ۶۷)

منافق مرد اور منافق عورتیں، ان میں سے بعض بعض کو برائی کا حکم دیتے ہیں اور بھلائی سے روکتے ہیں۔

ایک بزرگ نے ارشاد فرمایا کہ آدمی اپنے بھائی کی اس سے بڑھ کر پردہ دری نہیں کرتا کہ پہلے اس کی گناہ پر اعانت کرے اور پھر اسے یہ باور کرادے کہ وہ گناہ کوئی زیادہ سنگین نہیں ہے۔

<u>چھٹا۔ مقتدیٰ کا گناہ کرنا</u> : بعض گناہ اسلئے بھی کبیرہ بن جاتے ہیں کہ ان کا ارتکاب کسی ایسی شخصیت نے کیا ہے جس کی لوگ شرعی امور میں اقتداء کرتے ہیں، کیونکہ لوگ اسے دیکھ کر اقتدار کریں گے، اسلئے اسکا گناہ بھی بڑا ہے، جیسے کسی عالم کا ریشم پہننا، یا سونے کی سواریوں پر سوار ہونا، یا بادشاہوں کا مشکوک مال لینا، یا ان کے پاس آنا جانا، ان کے برے اعمال پر انکار نہ کر کے ان کی مدد کرنا، مسلمانوں کی آبرو سے کھیلنا، کسی مسلمان کو مناظرہ وغیرہ میں زبان یا تحریر سے ایذا پہنچانا یا ان کی تحقیر کرنا اور ایسے علوم میں مشغول ہونا جن سے صرف جاہ حاصل ہوتی ہو جیسے علم مناظرہ وغیرہ یہ وہ گناہ ہیں کہ سادہ لوح مسلمان انکی تقلید کر سکتے ہیں، یہ علماء مر جائیں گے لیکن ان کا شر ساری دنیا میں پھیلتا رہے گا، ایسا شخص کتنا خوش قسمت ہے جس کے گناہ اسکے ساتھ دفن ہو جائیں حدیث شریف میں ہے۔

مَنْ سَنَّ سُنَّةً سَيِّئَةً فَعَلَيْهِ وِزْرُهَا وَوِزْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا لَا يُنْقَصُ مِنْ اَوْزَارِهِمْ شَيْئًا (بخاری و مسلم۔ ابو ہریرہؓ)

جس نے کوئی برا طریقہ جاری کیا، اس کا وبال جاری کرنے والے پر ہے، نیز اس کا وبال بھی اس پر ہے جو اس پر عمل کرے حالانکہ ان کے وبال میں سے ذرا کم نہ کیا جائے گا۔

وَنَكْتُبُ مَا قَدَّمُوْا وَآثَارَهُمْ (پ ۲۲ ر ۱۸ آیت ۱۲)

اور ہم لکھتے جاتے ہیں انکے وہ اعمال بھی جن کو وہ آگے بھیجتے ہیں، اور وہ اعمال بھی جن کو پیچھے چھوڑ جاتے ہیں۔

آثار ان اعمال کو کہتے ہیں جو عمل اور عامل کے فنا ہو جانے کے بعد عامل تک پہنچتے ہیں، حضرت عبد اللہ ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ عالم کی بربادی کا باعث یہ ہے کہ لوگ اسکی اتباع کرتے ہیں، وہ لغزش کرتا ہے تو توبہ کر لیتا ہے، لیکن لوگ اسکی لغزش کو حکم شرعی سمجھ کر دنیا جہان میں پھیلا دیتے ہیں، اور اسکی تقلید کرتے ہیں، کسی کا مقولہ ہے کہ عالم کے قصور کا حال یہ ہے کہ جیسے سمندر کے بیچ میں کشتی ٹوٹ جائے، خود بھی ڈوبے اور اپنی سواریوں کو بھی غرق کرے، اسرائیلی روایات میں ہے کہ ایک عالم بدعت میں پڑ کر گمراہ ہوا، پھر اسے اپنی گمراہی کا احساس ہوا اور اس نے توبہ کی، اور ایک عرصے تک مخلوق خدا کی اصلاح کے کام میں مشغول رہا، اس دور کے نبی پر وحی نازل ہوئی کہ اس سے کہہ دیجئے کہ اگر تو نے صرف میرا قصور کیا ہوتا تو معاملہ میرے اور تیرے درمیان رہتا، لیکن تو نے میرے بندوں کو گمراہ کیا ہے اور وہ تیری گمراہی کے باعث دوزخ میں گئے ہیں، اسلئے میں تجھے کیسے معاف کر سکتا ہوں، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ علماء کا معاملہ خطرناک ہے، انکی بڑی ذمہ داریاں ہوتی ہے، اسی طرح اعمال خیر کی وجہ سے انکے اجر و ثواب میں بھی اضافہ ہوتا ہے اگر کوئی اعمال خیر میں اسکی اتباع کرے، اگر کسی عالم نے دنیاوی زیب و زینت ترک کی، اس سے متنفر رہا، اور صرف بقدر

ضرورت مال پر قناعت کی' قوت لایموت پر اکتفا کیا اور پرانے کپڑے پسند کئے' اور لوگوں نے ان کی عادات صالحہ میں اسکی اقتدا کی تو اسے نہ صرف اپنے عمل کا ثواب ملے گا' بلکہ وہ اقتداء کرنے والوں کے برابر ثواب سے بھی نوازا جائے گا' اور اگر دنیاوی زیب و زینت کی طرف راغب رہا تو جو اس سے کم درجے کے لوگ ہیں وہ اس کی مشابہت اختیار کرنے کی کوشش کریں گے' اور وہ اپنے مالی حالات کے بنا پر اس میں کامیاب نہ ہوسکیں گے' مجبوراً انھیں بادشاہوں کی خدمت کرکے اور حرام ذرائع سے مال حاصل کرکے اپنی خواہشات پوری کرنی ہوں گی' اس طرح وہ تنہا ان سب کے اعمال کا سبب قرار پائے گا' دونوں حالتوں میں' عالم کی ذات سے جس طرح نفع پہنچتا ہے اسی طرح نقصان بھی پہنچتا ہے' اور دونوں کے ہی آثار مرتب ہوتے ہیں' ہمارے خیال میں ان گناہوں کے لئے اس قدر تفصیل کافی ہے جن سے توبہ واجب ہے۔

تیسرا باب

کمال توبہ کی شرائط اور آخیر عمر تک اس کی بقا

کمال توبہ : ہم پہلے بیان کرچکے ہیں کہ توبہ اس ندامت کا نام ہے' جو عزم اور قصد کا موجب ہو' اور یہ ندامت عاصی کے اس علم سے حاصل ہوتی ہے کہ اسکے گناہ محبوب کے اور اس کے درمیان حجاب بن گئے ہیں' اس طرح تین چیزیں ذکر کی گئی تھیں' علم' ندامت اور عزم' ان میں سے ہر ایک کے لئے دوام اور کمال ہے' کمال کے لئے ایک علامت ہے' اور دوام کی چند شرائط ہیں جن کا یہاں ذکر کردینا نہایت ضروری ہے' علم کا بیان تو گویا توبہ کے اسباب کا بیان ہے' اس موضوع پر عنقریب گفتگو ہوگی' اس لئے اولاً ندامت پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔

ندامت کی پہچان اور کمال و دوام : ندامت دل کے درد کا نام ہے' یہ درد اس وقت ہوتا ہے جب اسے یہ اطلاع دی جاتی ہے کہ اس کا محبوب اس کے ہاتھوں سے نکلا جارہا ہے' ندامت کی پہچان یہ ہے کہ دل میں بے پناہ غم ہو' چہرے پر اس کے اثرات نمایاں ہوں' اور آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہوں' فکر میں استغراق کی سی کیفیت ہو' نادم کی کیفیت اس شخص کی سی ہوجاتی ہے جسے اسکے عزیز از جان بیٹے پر' یا کسی رشتہ دار پر نازل ہونے والی کسی مصیبت کا علم ہو' ایسے شخص کے رنج و غم کا صحیح اندازہ نہیں کیا جاسکتا' اب ہم پوچھتے ہیں کہ انسان کے لئے اس کے نفس سے بڑھ کر کون عزیز ہوسکتا ہے' دوزخ کے عذاب سے بڑھ کر کون سی مصیبت ہوسکتی ہے' اس مصیبت پر گناہوں سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہوسکتی ہے' اور اللہ رسول سے زیادہ سچا مخبر کون ہوسکتا ہے' جنھوں نے عاصی کے عذاب کی خبر دی ہے' اگر ایک شخص جسے طبیب کہتے ہیں یہ اطلاع دے کہ تمہارا بیمار بیٹا صحت یاب نہ ہوسکے گا اور مرجائے گا' تو تم اسی لمحے رنجیدہ ہوجاتے ہو' گویا تم پر مصیبتوں کا کوہ گراں آپڑا ہے حالانکہ نہ بیٹا نفس سے عزیز ہے نہ طبیب اللہ و رسول سے زیادہ صادق و عالم ہے' نہ موت دوزخ کے عذاب سے سخت تر ہے' معاصی اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور عذاب شدید پر جس قدر دلالت کرتے ہیں اس قدر دلالت بیماری سے موت پر نہیں ہوتی' پھر کیا وجہ ہے کہ لوگ بیماری سے ڈرتے ہیں گناہ سے نہیں ڈرتے' بہرحال ندامت کی آگ جس قدر تیز ہوگی اسی قدر گناہ راکھ کا ڈھیر بن جائیں گے' ندامت کے صحیح ہونے کی علامت یہ ہے کہ آدمی کا دل رقیق ہو' آنکھ میں آنسوؤں کی فراوانی ہو' حدیث شریف میں ہے' زیادہ توبہ کرنے والوں کے پاس بیٹھا کرو اس لئے کہ ان کے دل نہایت نرم ہوتے ہیں (۱)

گناہوں کی لذت کیسے دور ہو : یہاں یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ گناہ انسان کو طبعاً مرغوب ہوتے ہیں بھلا ان کی رغبت کیسے زائل ہوگی' اور رغبت کی جگہ حلاوت کیسے پیدا ہوگی؟ اسکا جواب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص شہد کھائے اور اس میں زہر کی آمیزش ہو' ذائقے سے معلوم نہ ہوتا ہو کہ اس میں زہر ملا ہوا ہے' زہریلا کھانا کھاکر بیمار پڑجائے' اور بیماری اس قدر طول پکڑے کہ بال جھڑ جائیں' اعضاء مفلوج ہوجائیں' اور جسم میں تشنج پیدا ہوجائے' اب اگر اسکے سامنے وہی زہریلا شہد دوبارہ پیش کیا جائے' اور اسے

---

(۱) مجھے یہ روایت مرفوع نہیں ملی' ابن ابی الدنیا نے اسی مضمون سے ملتا جلتا ایک مضمون عون ابن عبداللہ کے قول کی حیثیت سے ذکر کیا ہے

بھوک بھی لگ رہی ہو' اور حلاوت کی خواہش بھی ہو اس صورت میں وہ شخص شہد سے نفرت کرے گا یا نہیں؟ اگر تم یہ کہتے ہو کہ وہ نفرت نہیں کرے گا تو یہ مشاہدے کی بھی نفی ہے' اور فطرت کے بھی خلاف ہے بلکہ تجربہ تو یہ ہے کہ ایسا شخص خالص شہد سے بھی نفرت کرتا ہے چنانچہ توبہ کرنے والے کے دل میں گناہ کی نفرت اور کراہت کی وجہ یہی ہے' وہ یہ بات جانتا ہے کہ ہر گناہ شہد کی طرح میٹھا ہے' لیکن اسکی تاثیر ایسی ہے جیسے زہر کی' جب تک مومن کے دل میں گناہ کے متعلق یہ تصورات نہ ہوں اس وقت تک اس کی توبہ نہ صحیح ہوتی ہے اور نہ سچی ہوتی ہے' کیونکہ اس طرح کے ایمان کا وجود تقریباً ناپید ہے' اس لئے اس طرح کی توبہ بھی ناپید ہے' اور توبہ کرنے والے بھی ناپید ہیں۔ ہر طرف وہی لوگ نظر آتے ہیں جو اللہ تعالیٰ سے اعراض کرتے ہیں گناہوں کو معمولی سمجھتے ہیں' اور ان پر اصرار کرتے ہیں۔

بہر حال کمال ندامت کی یہ شرط ہے جو اوپر ذکر کی گئی' موت تک اس پر مداومت ضروری ہے پھر یہ بھی ضروری ہے کہ تمام گناہوں سے یکساں کراہت کرے' خواہ ان کا ارتکاب نہ کیا ہو' یہ ایسا ہی ہے جیسے کسی شخص نے زہر آلود شہد کھایا ہو' پھر اسے پتہ چلے کہ پانی میں بھی اسی طرح کے زہر کی آمیزش ہے تو یقیناً وہ پانی سے بھی اسی قدر نفرت کرے گا کیونکہ اسے شہد سے نقصان نہیں پہنچا تھا بلکہ شہد میں جو چیز تھی اس سے نقصان ہوا تھا' اور وہی ضرر رساں چیز پانی میں موجود ہے' اسی طرح تائب اگر کسی گناہ سے اپنا نقصان محسوس کرتا ہے تو اسلئے نہیں کہ وہ گناہ اس سے سرزد ہوا ہے' بلکہ اس کی وجہ یہ کہ گناہ سے اللہ تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی ہوئی ہے' اور یہ وجہ تمام گناہوں میں موجود ہے خواہ وہ چوری ہو یا زنا وغیرہ۔

قصد کا تعلق تینوں زمانوں سے ہے: اب رہا قصد جس کے معنی ہیں تدارک کا ارادہ' اس کا تعلق تینوں زمانوں سے ہے' حال سے اس طرح کہ جو ممنوع عمل کر رہا ہو اسے ترک کر دے' اور وہ فرض بجالائے جس کی طرف اس وقت متوجہ ہے' قصد کا تعلق ماضی سے یہ ہے کہ اب سے پہلے جو کوتاہیاں اس سے سرزد ہوئی ہیں ان کی تلافی کرے' اور مستقبل سے اس طرح ہے کہ موت تک اطاعت اور ترک معصیت پر مداومت کرے۔

اطاعت میں قصور کا تدارک: ماضی کے اعتبار سے توبہ کی صحت کی یہ شرط ہے کہ اپنے فکر کی عنان اس دن کی طرف موڑے جس دن بلوغ کی دہلیز پر قدم رکھا' خواہ عمر کے اعتبار سے یا احتلام کی رو سے' پھر اپنی عمر کے سال' مہینے' دن اور لمحے گنے' اور یہ دیکھے کہ اس عرصے میں کس قدر اطاعتیں ایسی ہیں جن میں مجھ سے کوتاہی ہوئی ہے' اور کتنے گناہ ایسے ہیں جو مجھ سے سرزد ہوئے ہیں مثلاً اس نے نماز نہیں پڑھی تھی یا نجس کپڑے میں پڑھی تھی' یا نماز کی نیت صحیح طریقے سے نہیں کی تھی کیونکہ اسے نیت کا صحیح طریقہ معلوم نہ تھا' ان تمام صورتوں میں نماز کا اعادہ کرے' اور اگر فوت شدہ نمازوں کی صحیح تعداد معلوم نہ ہو تو ان نمازوں کو شمار کرے جن کی ادائیگی یقینی ہو' اور اسکے علاوہ جس قدر نمازیں بلوغ سے اس وقت تک باقی بچتی ہوں' ان سب کا اعادہ کرے' باقی نمازوں کی تعداد ظن اور تخمینے سے کرلینی چاہیے۔ اسی طرح روزوں کا معاملہ ہے اگر کسی شخص نے حالت سفر میں روزہ افطار کیا' اور واپس آکر اس کی قضا نہیں کی' یا جان بوجھ کر روزہ چھوڑا اور بعد میں نہیں رکھا' یا رات میں نیت کرنا بھول گیا ان تمام صورتوں میں اعادہ ضروری ہے' نماز کی طرح ایسے تمام روزوں کی صحیح تعداد تحری اور اجتہاد سے متعین کرے جن کی قضا واجب ہے' پھر ان کی قضا میں مشغول ہو' زکوٰۃ کا معاملہ یہ ہے کہ اس وقت سے مال کا حساب لگانا چاہیے جس وقت سے وہ مالک بنا ہے' کیونکہ زکوٰۃ صرف بلوغ سے واجب نہیں ہوتی' بلکہ نابالغ کے مال میں بھی واجب ہوتی ہے' (۱) اس طرح جس قدر زکوٰۃ اسکے مال میں واجب ہے اسی قدر ادا کرے' اسی طرح اگر کسی شخص نے زکوٰۃ ادا کردی تھی لیکن جس طرح اسکے امام نے بتلائی تھی اس طرح ادا نہیں کی تھی مثلاً ایک شافعی المسلک کے لئے ضروری ہے کہ وہ زکوٰۃ کے آٹھوں مصارف میں زکوٰۃ کا مال تقسیم کرے' مگر اس نے ایسا نہ کیا' یا زکوٰۃ جنس مال سے ادا نہ کی (شافعی مسلک کی رو سے اس کے لئے) ضروری ہے کہ وہ دوبارہ زکوٰۃ ادا کرے' کیونکہ اس کی زکوٰۃ ادا ہی نہیں

---

(۱) احناف کے نزدیک نابالغ بچے کے مال میں زکوٰۃ واجب نہیں ہے

ہوئی ہے' البتہ زکوٰۃ کے حساب میں جو تفصیلات ہیں وہ وقت طلب ہیں' اس لئے علماء سے رابطہ قائم کیا جائے' اور ان کے بیان کردہ مسائل کی روشنی میں زکوٰۃ ادا کی جائے حج کا معاملہ یہ ہے کہ اگر ماضی کے کچھ برسوں میں اس پر حج واجب رہا ہے' اور وہ اس وقت ادا نہ کرسکا' اور اب مفلس ہوگیا تب بھی اس کے لئے اس فرض حج کی ادائیگی ضروری ہے' افلاس کی وجہ سے اگر حج پر قادر نہ ہو تو جائز ذرائع سے اتنا کمائے جو سفر حج کے لئے کافی ہو' اگر کمانے کی ہمت نہ ہو تو لوگوں سے کہے کہ مجھے اپنی زکوٰۃ اور صدقات میں سے اتنا دے جس سے میں اپنا حج ادا کرسکوں' اگر یہ شخص حج کئے بغیر مرجائے گا تو گنہگار ہوگا۔ حدیث شریف میں ہے۔

مَنْ مَاتَ وَلَمْ يَحُجَّ فَلْيَمُتْ إِنْ شَاءَ يَهُودِيًّا وَإِنْ شَاءَ نَصْرَانِيًّا (١)

جو شخص حج کئے بغیر مرگیا وہ چاہے یہودی مرے یا نصرانی مرے۔

قدرت کے بعد عاجز ہونے سے حج کی فرضیت ساقط نہیں ہوتی' اطاعت کی تفتیش اور ان میں کوتاہیوں کی تلافی کا یہی طریقہ ہے۔ جو بیان کیا گیا۔

معاصی کا تدارک: معاصی کی تحقیق اور ان کے تدارک کا طریقہ یہ ہے کہ بلوغ کے آغاز سے توبہ کے دن تک اپنے تمام اعضاء کان' آنکھ' زبان' اور پیٹ' ہاتھ پاؤں اور شرمگاہوں وغیرہ کے تمام چھوٹے بڑے گناہوں کے بارے میں سوچے کہ فلاں وقت فلاں عضو سے فلاں گناہ سرزد ہوا ہے معاصی کا رجسٹر کھول کر گناہ کا الگ الگ جائزہ لے' پھر یہ دیکھے کہ کتنے گناہ ایسے ہیں جن کا تعلق اللہ تعالیٰ کے حقوق سے ہے' مثلاً غیر محرم کی طرف دیکھنا' ناپاکی کی حالت میں مسجد کے اندر بیٹھنا' قرآن کریم کو بلاوضو ہاتھ لگانا' کسی بدعت کا معتقد ہونا' شراب پینا اور مزامیر سننا وغیرہ' یہ تمام گناہ اللہ تعالیٰ کے حقوق سے متعلق ہیں' انکے تدارک کی صورت یہ ہے کہ ان پر ندامت اور حسرت ظاہر کرے' پھر ہر ایک گناہ کے بڑے ہونے کی مقدار اور وقت کی تحدید کرے' اور کوئی ایک ایسی نیکی کرے جو مقدار اور وقت میں اس گناہ کی متبادل ہوسکے' اور وہ نیک اعمال اس کی سیئات کی تلافی کرسکیں جیسا کہ حدیث شریف میں ہے۔

اِتَّقِ اللّٰهَ حَيْثُ كُنْتَ وَاَتْبِعِ السَّيِّئَةَ الْحَسَنَةَ تَمْحُهَا

جہاں بھی رہو اللہ سے ڈرو اور برائی کے بعد بھلائی ضرور کرلو تاکہ نیکی بدی کو مٹادے۔

بلکہ یہ مضمون قرآن کریم سے بھی ماخوذ ہے۔ فرمایا۔

اِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ (پ ١٢ ر ١٠ آیت ١١٥)

واقعی نیکیاں برائیوں کو مٹادیتی ہیں۔

چنانچہ مزامیر سننے کے گناہ کا کفارہ قرآن کریم کی تلاوت سننے اور ذکر کی مجالس میں بیٹھنے سے ہوسکتا ہے ناپاکی کی حالت میں مسجد کے اندر بیٹھنے کا گناہ معتکف ہوکر مسجد میں بیٹھنے اور عبادات میں مشغول ہونے سے ہوسکتا ہے' قرآن کریم کو بلاوضو چھونے کے گناہ کا کفارہ اس طرح ہوسکتا ہے کہ قرآن کریم کی تعظیم کرے اسے کثرت سے چومے اور زیادہ سے زیادہ تلاوت کرے' ایک مصحف اپنے ہاتھ سے لکھ کر (اس دور میں خرید کر) عام تلاوت کے لئے وقف کردے' شراب پینے کا کفارہ اس طرح ہوسکتا ہے کہ کوئی ایسا حلال شربت غریبوں کو خیرات کرے جو اس سے زیادہ پاکیزہ لذیذ اور مرغوب ہو۔ تمام گناہوں کا شمار ممکن نہیں ہے' مقصود یہ ہے کہ جو طریقہ گناہوں کے خلاف ہو اس پر چلنا چاہیے۔ کیونکہ مرض کا علاج اس کی ضد سے ہوتا ہے' گناہ کی وجہ سے دل پر جو تاریکی چھاگئی ہے وہ اس نیکی کے علاوہ کسی چیز سے دور نہ ہوگی جو اس گناہ کے مقابل ہو' ضدین میں باہم مناسبت ہوتی ہے' اسلئے کسی گناہ کے اثرات اس جیسی کسی نیکی سے زائل کئے جاسکتے ہیں' مگر یہ نیکی اس گناہ کی ضد ہونی چاہیے' اس لئے کہ سیاہی سفیدی سے دور ہوتی ہے' گرمی یا سردی سے دور نہیں ہوتی۔ ہمارے خیال میں گناہوں کے ازالے کے لئے تدریج اور تحقیق کا یہ طریقہ نہایت مناسب ہے' امید ہے کہ اس طریقہ پر عمل کرنے سے گناہ جلد زائل ہوں گے' بہ نسبت اس کے کہ ایک ہی نوع کی عبادتوں کا التزام کیا جائے'

(١) یہ روایت کتاب الحج میں گزری ہے

اور ان پر مداومت کی جائے تو ان کی تاثیر سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا'

ہر طرح کی عبادتیں گناہوں کا کفارہ بنتی ہیں۔ اب رہا یہ سوال کہ گناہ اپنی ضد سے کیوں دور ہوجاتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ دنیا کی محبت تمام گناہوں کی جڑ ہے' اور دنیا کی اتباع کا اثر یہ ہوتا ہے کہ دل دنیا سے خوش ہو اور اس کی طرف مائل ہو اسلئے اگر کسی مسلمان پر کوئی ایسی مصیبت آپڑے' جس سے اسکا دل رنجیدہ ہوجائے اور دنیا سے اچاٹ ہوجائے تو یہ بھی اسکے حق میں کفارہ ہوگا کیونکہ رنج و غم کی وجہ سے دل دنیا کے ہنگاموں سے گھبرا جاتا ہے' حدیث شریف میں ہے۔

مِنَ الذُّنُوبِ ذُنُوبٌ لَا يُكَفِّرُهَا إِلَّا الْهُمُومُ (ابو نعیم۔ ابو ہریرہ)

بعض گناہ ایسے ہیں جن کا کفارہ صرف رنج سے ہوتا ہے۔

ایک حدیث میں یہ الفاظ ہیں اِلَّا الْهَمُّ بِطَلَبِ الْمَعِيشَةِ یعنی بعض گناہ کا کفارہ صرف طلب معیشت کی فکر سے ہوتا ہے' ایک روایت حضرت عائشہؓ سے مروی ہے' اسکے الفاظ یہ ہیں۔

وَإِذَا كَثُرَتْ ذُنُوبُ الْعَبْدِ وَلَمْ يَكُنْ لَهُ أَعْمَالٌ تُكَفِّرُهَا أَدْخَلَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْغُمُومَ فَتَكُونُ كَفَّارَةً لِذُنُوبِهِ (احمد۔ عائشہؓ)

جب بندے کے گناہ زیادہ ہوجاتے ہیں' اور اس کے پاس ایسے اعمال خیر نہیں ہوتے جو ان گناہوں کا کفارہ بن سکیں تو اللہ تعالیٰ ان پر غم ڈال دیتا ہے جو اسکے گناہ کے کفارہ بن جاتے ہیں۔

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ جو رنج بندے کے دل میں پیدا ہوتا ہے اور وہ اسے نہیں جانتا وہ گناہوں کی تاریکی ہے' اور گناہوں سے رنج کرنے کے معنی یہ ہیں کہ دل وقفۂ حساب اور میدان حشر کی دہشت کا احساس کرے۔

اگر کوئی شخص یہ سوال کرے کہ عام طور آدمی کو مال' اولاد اور جاہ کا رنج ہوتا ہے اور یہ رنج گناہ ہے' اس صورت میں ایک گناہ دوسرے گناہ کا کفارہ کیسے بن سکتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ان چیزوں کی محبت گناہ ہے' اور ان سے محروم رہنے کا رنج کفارہ ہے' اگر کوئی شخص اپنی محبت کے بموجب ان چیزوں سے متمتع ہوتا اسکا گناہ کامل ہوگا' چنانچہ روایت ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس قید خانے میں تشریف لے گئے' آپ نے ان سے دریافت کیا تم نے غم زدہ بوڑھے (مراد حضرت یعقوب علیہ السلام ہیں) کو کس حال میں چھوڑا ہے۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے جواب دیا کہ انھوں نے تمہاری گمشدگی پر اتنا رنج کیا جتنا رنج وہ سو عورتیں کرتی ہیں جن کے بچے مرگئے ہوں' آپ نے دریافت کیا اس رنج کا انھیں کتنا ثواب ملے گا' فرمایا سو شہیدوں کے برابر' اس سے معلوم ہوا کہ رنج و غم بھی اللہ تعالیٰ کے حقوق کا کفارہ بن جاتے ہیں۔

حقوق العباد میں کوتاہی کا تدارک: اب تک ان گناہوں کا ذکر تھا جن کا تعلق اللہ تعالیٰ کے حقوق سے ہے' اب حقوق العباد پر نظر ڈالئے' حقوق العباد میں کوتاہی کرنا بھی اللہ تعالیٰ کے حق میں کوتاہی کرنا ہے' اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے بندوں پر ظلم کرنے سے منع فرمایا ہے' جو شخص دوسرے پر ظلم کرتا ہے وہ پہلے اللہ تعالیٰ کے حکم کی خلاف ورزی کرتا ہے' حکم الٰہی کی مخالفت کے گناہ ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے جو گناہ اسطرح کے ہوں ان میں حقوق خدا میں کوتاہی کا تدارک تو اسطرح ہوسکتا ہے کہ ان پر ندامت ظاہر کرے' رنج و افسوس کرے' آئندہ اسطرح کے افعال سے باز رہے' اور ایسے اعمال خیر کرے جو ان گناہوں کی ضد ہوں' چنانچہ اگر کسی کو ایذاء پہنچائی ہو تو اس پر احسان کرے' کسی کا مال چھین لیا ہو تو اپنی جائز ملکیت سے صدقہ کرے' کسی کی غیبت کی ہو یا کسی پر طعنہ زنی کی ہو تو اس کی تعریف کرے بشرطیکہ دیندار ہو' اپنے ہم عصروں اور برابر کے لوگوں کی اچھائیاں ظاہر کرے' اگر قتل کیا ہو تو غلام آزاد کرے' اس میں بھی ایک طرح سے زندہ کرنے کا عمل پایا جاتا ہے' کیونکہ غلام اپنے نفس کے اعتبار سے نابود ہے' اس کا وجود صرف مالک کے وجود سے ہے' اسے صرف آزادی سے زندگی ملتی ہے' اور وہی زندگی اسکے نفس کے لئے خاص ہوتی ہے' اسلئے آزاد کرنا ایک طرح سے وجود دینے کے برابر ہے' اور یہی عمل صحیح معنی میں اس گناہ کا کفارہ بن سکتا ہے' جس سے کوئی وجود عدم میں تبدیل ہوا ہو۔

کفارۂ اعمال کے سلسلے میں ہم نے مخالف راستے پر چلنے کا طریقہ تجویز کیا ہے' شریعت میں اس کی نظیر موجود ہے' کفارۂ قتل میں غلام آزاد کیا جاتا ہے' اس کی وجہ یہی ہے کہ فنا کے مقابلے میں ایجاد آجائے' بندوں کے حقوق میں تلافی کے لئے صرف اتنا ہی کافی نہیں ہے' کہ محض ندامت ظاہر کرے یا اسکے مقابلے میں کوئی نیکی کرلے' ندامت یا عمل خیر سے نجات نہیں ہوگی' بلکہ نجات کے لئے ضروری ہے کہ بندوں کے حقوق سے بھی عہدہ برآ ہو۔

حقوق العباد کی تفصیل : پھر حقوق العباد یا جان سے متعلق ہیں' یا مال سے یا عزت سے یا دل سے' دل سے متعلق حقوق سے ہماری مراد وہ اعمال ہیں جن سے ایذا پہنچے' یہاں ان تمام حقوق کی تفصیل کی جاتی ہے۔

نفس سے متعلق حقوق : اگر کسی نے نفس پر ظلم کیا ہے' اس طرح کہ قتل خطا کا مرتکب ہوا اس کی توبہ یہ ہے کہ مستحق کو خون بہا ادا کردے' خواہ اپنے پاس سے دے یا اپنے رشتے داروں سے لے کردے' جب تک مستحق کو مقتول کا خون بہا نہ ملے گا وہ اپنی ذمہ داری سے بری نہیں ہوگا' اور اگر قتل عمداً کیا تھا تو قصاص ضروری ہوگا' اسکے بغیر توبہ قبول نہیں ہوگی' اگر قتل کا حال معلوم نہ ہو' اور حکومت قصاص لینے میں ناکام رہے تو خود قاتل کے لئے ضروری ہے کہ وہ مقتول کے ولی کے پاس پہنچے' اور اپنی جان اسکے سپرد کردے' چاہے وہ اسے معاف کردے یا قتل کردے۔ اپنی جان سپرد کئے بغیر اسکا گناہ معاف نہیں ہوگا' اس گناہ کا چھپانا کسی بھی طرح مناسب نہیں ہے' قتل کا معاملہ چوری زنا' شراب خوری' راہزنی' اور دوسرے موجب حد افعال سے بالکل الگ ہے' ان صورتوں میں توبہ کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ اپنے آپ کو ظاہر کرے اور رسوا ہو' اور ولی سے اللہ کا حق لینے کا مطالبہ کرے' بلکہ واجب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح اسکے گناہوں کا پردہ رکھا ہے' اسی طرح پردہ رکھے اور تلافی کے لئے طرح طرح کے مجاہدے کرکے اپنے نفس کو سزا دے جو گناہ اللہ تعالیٰ کے حقوق سے متعلق ہیں وہ محض توبہ اور ندامت سے معاف ہوسکتے ہیں' اس طرح کے معاملات میں اگر حاکم کی عدالت سے سزا ہوجائے اور حد قائم ہوجائے تو توبہ صحیح ہوگی' اور عنداللہ مقبول ہوگی جیسا کہ روایت میں ہے کہ ماعز ابن مالکؓ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہنے لگے کہ میں نے اپنے نفس پر ظلم کیا ہے' میں زنا کا مرتکب ہوا ہوں' اب میں پاک ہونے کے لئے آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں' آپ نے ان کی درخواست مسترد کردی اگلے روز بھی وہ صحابی پھر حاضر ہوئے اور اپنے زنا کا اقرار کیا۔ آپ نے دوسری بار بھی حد جاری کرنے سے منع فرمادیا' جب تیسری بار وہ اعتراف گناہ کے ساتھ حاضر ہوئے تو آپ نے ایک گڑھا کھودنے کا حکم فرمایا (جب وہ گڑھا تیار ہوگیا تو) ماعزؓ کو حکم دیا (کہ وہ اس گڑھے میں کھڑے ہوجائیں) چنانچہ (وہ کھڑے ہوگئے) اور لوگوں نے ان پر پتھر مارے' اس واقعے کے بعد صحابہ میں دو گروہ ہوگئے' بعض کی رائے تھی کہ انکا گناہ معاف نہیں ہوا وہ گناہ کے ساتھ ہلاک ہوئے ہیں' اور بعض کی رائے یہ تھی کہ ان کی توبہ نہایت سچی تھی' ان سے زیادہ صحیح اور مقبول توبہ کسی کی ہو ہی نہیں سکتی' جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس اختلاف کا علم ہوا تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ اس کی توبہ ایسی تھی کہ اگر تمام امت پر تقسیم کردی جاتی تو سب کے لئے کافی ہوجاتی (۱) اسی طرح غامدیہ کا واقعہ مشہور ہے' وہ بھی زنا کے اعتراف اور تطہیر کی درخواست کے ساتھ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر ہوئیں' آپ نے انھیں واپس کردیا' دوسرے دن وہ پھر حاضر ہوئیں اور کہنے لگیں کہ آپ مجھے کیوں لوٹا رہے ہیں غالباً آپ مجھے ماعز کی طرح لوٹانا چاہتے ہیں' میں تو بخدا اس زنا سے حاملہ بھی ہوگئی ہوں' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا' اس وقت گھر جاؤ' جب وضع حمل ہوجائے تب آنا' جب بچہ پیدا ہوا تو غامدیہ اسے ایک کپڑے میں لپیٹ کر لائیں اور کہنے لگیں یہ ہے وہ بچہ جو میں نے جنا ہے' آپ نے فرمایا اسے لیجاؤ اور دودھ پلاؤ جب اس کا دودھ چھٹ جائے تب آنا' جب دودھ کی مدت ختم ہوگئی تو غامدیہ بچے کو اس حال میں لے کر آئیں کہ اسکے ہاتھ میں روٹی کا ٹکڑا تھا' اور عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میں نے بچے کا دودھ چھڑا لیا ہے' اور اب یہ روٹی کھاتا ہے' آپ نے وہ بچہ کسی مسلمان کے سپرد کردیا' اور غامدیہ کے لئے ایک گڑھا کھودنے کا حکم دیا' اور گڑھا کھود کر غامدیہ کو اس میں سینے

(۱) مسلم میں بریدہ ابن الحصیب کی روایت

تک کھڑا کردیا' اور پھر لوگوں کو حکم دیا کہ وہ اس پر پتھر برسائیں' اسی اثناء میں خالد بن ولید آئے اور انھوں نے ایک پتھر غامدیہ کے سر پر مارا اس ضرب سے ان کے خون کی کچھ چھینٹیں اڑ کر خالد بن ولید کے چہرے پر پڑیں' انھوں نے غامدیہ کو برا کہا' سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا' خالد گالی مت دو' اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے اس نے ایسی توبہ کی ہے کہ اگر ایسی توبہ صاحب مکس (۱) کرے تو وہ قبول ہو جائے' اسکے بعد آپ نے غامدیہ کی نماز جنازہ پڑھی' اور دفن کیا (۲)

قصاص اور حد قذف وغیرہ: اوپر ان حقوق کی تفصیل تھی جو نفس سے متعلق ہیں' لیکن قصاص اور حد قذف میں مستحق شخص کو اپنے اوپر اختیار دینا ضروری ہے' یہی حال مال کا ہے' اگر کسی نے غصب' خیانت یا غبن کے ذریعہ کسی کا مال لے لیا ہو' مثلاً کھوٹا سکہ چلا دیا ہو' یا اپنی مبیع کا عیب پوشیدہ رکھا ہو' یا مزدور کی اجرت کم دی ہو' یا بالکل نہ دی ہو' ان تمام صورتوں میں تحقیق و تلاش ضروری ہے' پھر اس میں بلوغ کی بھی کوئی قید نہیں بلکہ روز اول سے مالی معاملات میں جو خرابیاں پیدا ہوئی ہیں' ان کی تحقیق کرنا اور پھر ان کا تدارک کرنا ضروری ہے' اگر کسی نابالغ بچے کے مال میں خراب اور ناجائز مال مل جائے تو بلوغ کے بعد اس مال کا نکالنا واجب ہے بشرطیکہ بچے کے ولی نے کوتاہی کی ہو' اگر لڑکے نے بلوغ کے بعد ایسا نہ کیا تو ظالم و گناہ گار ٹھہرے گا' اس لئے کہ مالی حقوق میں بالغ اور نابالغ دونوں برابر ہیں' پھر محاسبہ بددیانتی کے پہلے دن سے توبہ تک پائی پائی اور پیسے پیسے کا ہونا چاہیے' آدمی کو اپنا حساب خود کرلینا چاہیے اس سے پہلے کہ قیامت کے دن حساب دینا پڑے جو شخص دنیا میں اپنا حساب نہیں کرتا قیامت کے دن اسکے حساب کا مرحلہ طویل تر ہو جاتا ہے' حساب کا طریقہ یہ ہے کہ اپنے ظن غالب اور اجتہاد سے کام لے کر تمام فروگزاشتیں تحریر کرلے' اور متعلقہ لوگوں کے نام اور ظلم کی نوعیت الگ الگ لکھ لے' پھر دنیا بھر میں پھرے' جہاں جہاں اسکے ظلم و ستم کا نشانہ بننے والے لوگ بستے ہیں' وہاں وہاں پہنچے' انھیں تلاش کرے' یا تو ان سے معاف کرائے یا ان کے حقوق ادا کرے' ظالموں اور تاجروں کے لئے یہ توبہ نہایت دشوار ہے اس لئے کہ ان کا بے شمار لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے' اور سب کا تلاش کرنا ممکن نہیں رہتا' نہ ان کے ورثاء کی تلاش ممکن رہتی ہے' تاہم ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ مقدور بھر کوشش کریں' اور جہاں تک ممکن ہو مظلومین یا ان کے ورثاء کو تلاش کریں اگر تمام تر کوششوں کے باوجود ناکامی ہو تو پھر اسکا علاج صرف یہ ہے کہ اچھے اعمال بکثرت کرے تاکہ قیامت کے روز نیکیوں کے ذریعہ مستحقین کے حقوق ادا کرسکے' اس سے معلوم ہوا کہ لوگوں کے جس قدر حقوق اپنے ذمے ہیں انھیں کے مطابق نیکیاں بھی ہونی چاہئیں تاکہ ہر مستحق کا حق پورے پورے طور پر ادا کیا جاسکے اور اپنی بخشش کا سامان بھی رہے اگر نیکیاں کم ہوئیں اور مطالبہ کرنے والوں کے حقوق صحیح طور پر ادا نہیں ہوئے تو ان کے گناہوں سے یہ کمی پوری کی جائے گی' اور مستحقین کے گناہ اس کے نامۂ اعمال میں لکھ دئے جائیں گے' اس سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ ایسے آدمی کو اپنی باقی زندگی نیک اعمال میں بسر کرنی چاہیے' بشرطیکہ اتنی عمر ہو جتنی حق دبانے میں گزری ہے لیکن کیونکہ عمر کا حال معلوم نہیں ہوسکتا ہے کہ باقی زندگی کا وقفہ ظالمانہ زندگی کے وقفے سے کم ہو' اور نیکیوں کے ذریعہ تدارک نہ ہوسکے' اس صورت میں بھی مایوس نہ ہونا چاہیے' بلکہ گناہوں کے لئے جس قدر مستعد رہا کرتا تھا اس سے زیادہ اعمال خیر کے لئے مستعد رہنا چاہیے' جو مال ظالم کے پاس بچ رہا ہے' اور وہ اب توبہ پر آمادہ ہے' اگر اس کا مالک معلوم ہے تو اسے موجودہ مال مالک کے سپرد کردینا چاہیے' اور معلوم نہ ہو تو خیرات کردینا چاہیے' اور اگر جائز مال میں ناجائز مال مل گیا ہو تو اندازے سے وہ مال نکال دینا چاہیے جو ناجائز ہے' حلال و حرام کے باب میں اس کی تفصیل گزر چکی ہے۔

دلوں کو ایذا دینے کا جرم: بہت سے لوگ محض دلوں کو ایذا پہنچاتے ہیں' مثلاً مخاطب کے سامنے ایسی باتیں کرتے ہیں جن سے انھیں تکلیف ہو' یا کسی کی غیبت کرتے ہیں' اس جرم کا تدارک صرف اس طرح ہوسکتا ہے کہ جس جس کا دل دکھایا اور غیبت کی ہو ان میں سے ایک ایک کو تلاش کرے اور ان سے اپنی غلطی معاف کرائے' اگر ان میں سے کوئی مرگیا ہو' یا غائب ہوگیا ہو تو اس کی تلافی کی اس کے علاوہ اور کوئی صورت نہیں کہ بہت زیادہ نیک اعمال کرے' تاکہ قیامت کے دن اس غلطی کے بدلے نیکیاں دے

(۱) مکس ایک طرح کا جرمانہ ہے جو عاملین عشر و زکوٰۃ لوگوں سے ناحق اور زبردستی وصول کرتے ہیں (۲) یہ واقعہ بھی پچھلی روایت میں مذکور ہے۔

کر چھٹکارا پاسکے' اور اگر کوئی مل جائے اور خوشی سے معاف کردے تو یہ معافی اسکے گناہ کا کفارہ بن جائے گی' لیکن اسکے لئے شرط یہ ہے کہ جس سے قصور معاف کرائے اسکے سامنے اپنے قصور کی پوری تفصیل رکھدے' مبہم طور پر یہ کہہ دینا کافی نہیں کہ میرا قصور معاف کردو' کیونکہ بعض اوقات آدمی ایذا پہنچانے میں حد سے گزر جاتا ہے' اور ایسی باتیں کہہ دیتا ہے جنھیں معاف کرنے کو دل نہیں چاہتا بلکہ قیامت پر انحصار رکھنے کو دل چاہتا ہے تاکہ قصوروار کی نیکیاں حاصل کی جاسکیں' یا اپنے گناہ اسکے اعمال نامے میں درج کرائے جاسکیں۔ تاہم بعض گناہ ایسے بھی ہیں کہ اگر متعلقہ افراد کے سامنے ذکر کئے جائیں تو انہیں بہت زیادہ تکلیف ہو' اور عفو درگزر کی راہ مسدود ہوجائے' مثلاً کسی سے یہ کہنا کہ میں نے تیری باندی سے یا تیری بیوی سے زنا کیا ہے یا یہ بیان کرنا کہ میں نے تیرا فلاں مخفی عیب لوگوں پر ظاہر کیا تھا' ظاہر ہے کہ یہ باتیں اگر کسی پر ظاہر کی جائیں گی تو اسے بے حد تکلیف ہوگی۔ اور وہ ہرگز معاف نہیں کرے گا اس صورت میں یہی بہتر ہے کہ مجمل طور پر اپنا گناہ بیان کرکے معاف کرالیا جائے' پھر جو گناہ باقی رہ جائے نیکیوں کے ذریعہ اسکی تلافی کردی جائے' جس طرح مردہ یا غائب شخص سے متعلق گناہ کا تدارک کیا جاتا ہے' پھر ذکر کرنا اور بیان کرنا ایک الگ اور نیا قصور ہے' اسے معاف کرانا بھی ضروری ہے اگر کسی ایسے شخص کے سامنے جس کا قصور کیا ہے اپنے قصور کا ذکر کیا' اور وہ معاف کرنے پر تیار نہیں ہے' تو اس کا وبال قصوروار پر ہے' کیونکہ معاف کرنا یا نہ کرنا اس کا حق ہے' اس صورت میں غلطی کرنے والے کو چاہیے کہ وہ اس کے ساتھ نرمی اور محبت سے پیش آئے' اس کی خدمت کرے تاکہ اسکا دل خطاکار کی طرف مائل ہوجائے' اسلئے کہ انسان احسان سے دبتا ہے' ہوسکتا ہے کہ وہ مسلسل احسانات سے مجبور ہوکر معاف کرنے پر راضی ہوجائے' اگر ان تمام کوششوں کے باوجود وہ معاف نہ کرنے پر مصر ہے تو مجرم کا سلوک' احسان' خدمت اور محبت و شفقت کے تمام معاملات ان احسانات میں شامل ہوں گے' جن سے قیامت کے روز گناہوں کی تلافی کی جائے گی' لیکن مستحقین کی دلجوئی' رضامندی اور ان کے ساتھ نرمی و محبت میں اسی قدر کوشش کرے' جس قدر ایذا پہنچائی تھی' تاکہ قیامت کے روز اس قصور کی اچھی طرح تلافی ہوسکے' اور یہ تلافی اللہ کے حکم سے ہوگی' جیسے اگر کوئی شخص دنیا میں کسی کا مال ضائع کردے اور وہ مالک کو اتنا ہی مال لاکردے جتنا اس نے ضائع کیا ہے اور مالک لینے سے انکار کرے تو دنیاوی حکام اسے لینے کا حکم دیں گے' خواہ اس کی مرضی ہو یا نہ ہو' اسی طرح آخرت میں بھی قصوروار کی نیکیاں تدارک میں کام آئیں گی خواہ صاحب حق اسے پسند کرے یا نہ کرے۔

پچھلی امتوں کے ایک شخص کا قصہ : بخاری و مسلم میں حضرت ابو سعید الخدریؓ سے منقول ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ گذشتہ امتوں میں ایک شخص تھا جس نے ننانوے قتل کئے تھے' اس نے کسی شخص سے پوچھا کہ دنیا میں سب سے بڑا عالم کون ہے' لوگوں نے ایک عالم کا نام لیا وہ اس کے پاس گیا اور کہنے لگا کہ میں نے ننانوے قتل کئے ہیں' کیا توبہ کی کوئی صورت ہے' اس عالم نے جواب دیا اب توبہ کی کوئی صورت نہیں' اس نے اس عالم کو بھی قتل کردیا' اور اس طرح سو قتل مکمل کرلئے' اس کے بعد پھر کسی سے دریافت کیا کہ دنیا میں بڑا عالم کون ہے' لوگوں نے ایک اور عالم کی طرف اس کی رہنمائی کی' وہ وہاں گیا اور اس سے دریافت کیا کہ میں نے سو قتل کئے ہیں کیا میری توبہ قبول ہوسکتی ہے' اس نے جواب دیا یقیناً' لیکن اس کے لئے تمہیں اپنے وطن کو خیرآباد کہہ کر فلاں مقام پر جانا ہوگا' وہاں کچھ لوگ عبادت میں مشغول ہوں گے' ان کے ساتھ عبادت کرنا' اور اپنے وطن ہرگز واپس مت آنا' اسلئے کہ یہ بری جگہ ہے' وہ ان لوگوں کے ساتھ عبادت کرنے کے ارادے سے چلا لیکن راستے ہی میں تھا کہ موت نے آلیا' اس سوال پر کہ یہ روح رحمت کی مستحق ہے یا عذاب کی رحمت اور عذاب کے فرشتوں کے درمیان اختلاف ہوا' رحمت کے فرشتے کہتے تھے کہ یہ تائب ہوکر آرہا تھا' اور دل سے اللہ کی طرف متوجہ تھا' عذاب کے فرشتوں کا یہ دعویٰ تھا کہ اس نے اب تک کوئی نیک عمل نہیں کیا تھا اسلئے اسکی روح ہم لے جائیں گے' اسی اثناء میں ایک فرشتہ بصورت انسان وہاں آیا' انھوں نے اسے حکم بنالیا' اس نے یہ فیصلہ دیا کہ زمین کی پیمائش کرنی چاہیے' اگر وہ خیر کی زمین سے قریب تر تھا تو رحمت کے فرشتے اسکے مستحق ہیں' اور شر کی زمین سے قریب تر تھا تو عذاب کے فرشتوں کا دعویٰ صحیح ہے جب پیمائش کی گئی تو معلوم ہوا کہ وہ کافی فاصلہ طے کرچکا

ہے' اور اس زمین سے قریب تر ہے جہاں پہنچ کر عبادت میں مشغول ہونا چاہتا تھا' چنانچہ ملائکہ رحمت نے اس کی روح پر قبضہ کرلیا' ایک روایت میں ہے کہ وہ شخص صالح بستی سے بالکل قریب پہنچ چکا تھا' صرف ایک بالشت کا فاصلہ باقی رہ گیا تھا' اس لئے معاف کردیا گیا' اس سے معلوم ہوا کہ نجات کی صرف ایک صورت ہے اور وہ یہ کہ نیک اعمال کا پلڑا جھکا رہے خواہ تھوڑا ہی ہو' اسی لئے تجربہ کرنے والوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ کثرت سے نیک اعمال کریں تاکہ ان کی نیکیاں گناہوں کا عوض بننے کے بعد بھی نجات کے لئے بچ رہیں۔

مستقبل سے متعلق قصد : اب تک اس قصد کا بیان تھا جس کا تعلق زمانہ ماضی سے ہے' اب اس قصد کا بیان ہے جس کا تعلق مستقبل سے ہے' تائب کو چاہیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ یہ مستحکم عہد اور مصمم عزم کرے کہ آئندہ کبھی ان گناہوں کی طرف رجوع نہیں کرے گا' اور نہ ان جیسے دوسرے گناہوں کا ارتکاب کرے گا یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی مریض اپنی بیماری کے دوران یہ بات جانے کہ فلاں پھل یا میوہ اس کے لئے انتہائی نقصان دہ ہے اسلئے وہ یہ طے کرے کہ میں جب تک بیماری سے شفایاب نہ ہوجاؤں اس وقت تک یہ پھل نہ کھاؤں گا' یہ ارادہ اس وقت تو پختہ ہی ہوتا ہے لیکن یہ ممکن ہے کہ کسی دوسرے وقت اس پر شہوت غالب آجائے اور وہ پھل کھا بیٹھے لیکن آدمی تائب اسی وقت کہلائے گا جب ترک فعل پر اس کا عزم مؤکد ہو اور اس عزم پر مستقبل میں عمل پیرا ہونے کے لئے ضروری ہے کہ گوشہ نشینی اختیار کرے' سکوت کو ترجیح دے' کم کھانے اور کم سونے کے اصول پر کاربند ہو' اور حلال غذا کھائے' اگر کسی شخص کے پاس کوئی جائز موروثی جائداد یا ذریعہ آمدنی ہے' یا وہ کوئی ایسا جائز پیشہ کرتا ہے جس سے بیوی بچوں کے ساتھ گزربسر ہوجاتی ہے' تو اسی پر اکتفاء کرے' کیونکہ حرام کھانا تمام گناہوں کی جڑ ہے' اگر حرام غذا پر اصرار کرتا رہا تو توبہ کیسے قبول ہوگی' جو شخص لباس اور غذا میں اپنی خواہشات ترک نہیں کرسکتا نہ وہ حلال پر قانع رہ سکتا ہے' اور نہ شبہات سے دامن بچا سکتا ہے۔

بعض اکابرین کا قول ہے کہ جو شخص ترک خواہشات میں سچا ہو اور اپنے نفس کے ساتھ سات مرتبہ جہاد کرچکا ہو وہ انشاء اللہ ان میں مبتلا نہ ہوگا اور نفس سے فریب نہ کھائے گا' ایک بزرگ کہتے ہیں کہ جو شخص گناہ سے توبہ کرکے سات برس تک اس کی پابندی کرے اس سے وہ گناہ کبھی سرزد نہ ہوگا۔ تائب کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ مستقبل میں اسے جس راستے پر چلنا ہے اگر وہ راستہ معلوم نہ ہو تو اسکا علم حاصل کرے' تاکہ راہ راست پر چلنا سہل ہوجائے' اور استقامت نصیب ہو' اگر اس نے عزلت اختیار نہ کی تو استقامت بھی کامل نہ ہوگی' صرف یہ ہوگا کہ چند گناہوں سے تائب ہوجائے گا جیسے شراب زنا اور غصب وغیرہ سے' لیکن وہ توبہ نہیں کرے گا جسے مطلق کہتے ہیں' اور جو تمام گناہوں کو شامل ہے' بعض لوگوں کے نزدیک تو ایسی توبہ صحیح ہی نہیں ہے' بعض لوگ صحیح کہتے ہیں لیکن لفظ صحت مجمل ہے اسکی تفصیل کی ضرورت ہے۔

صحت کے اجمال کی تفصیل : ہم پہلے ان لوگوں سے پوچھتے ہیں جو بعض گناہوں سے توبہ کو صحیح نہیں مانتے کہ اگر اس سے تمہارا مقصد یہ ہے کہ بعض گناہوں کا چھوڑنا آدمی کے لئے مفید نہیں ہے' لیکن ان گناہوں کی موجودگی میں جن کا ارتکاب جاری ہے' دوسرے گناہوں سے توبہ کوئی معنی نہیں رکھتی' اگر تمہارا مقصد یہ ہے تو یہ صریح غلطی ہے' اس لئے کہ گناہوں کی کثرت عذاب کی کثرت کا سبب ہے' اور گناہوں کی کمی عذاب میں کمی کا باعث ہے' پھر ہم ان سے سوال کرتے ہیں' جو توبہ کو صحیح مانتے ہیں کہ ان کی مراد کیا ہے' اگر ان کی مراد یہ ہے کہ بعض گناہوں سے توبہ باقی تمام گناہوں سے توبہ کیلئے کافی ہوجائے گی' اور اس سے آدمی نجات اور کامیابی کے مطلوبہ درجے تک پہنچ جائے گا تو یہ بھی ایک واضح غلطی ہے' اسلئے کہ نجات اور کامیابی بظاہر اسی صورت میں حاصل ہوتی ہے' جب آدمی تمام گناہ چھوڑ دیتا ہے' عفو الٰہی کے مخفی اسرار یہاں زیر بحث نہیں ہیں' یہاں صرف ظاہر پر حکم لگایا جاتا ہے' اور ظاہر کے اعتبار سے قرین قیاس یہی ہے کہ تمام گناہوں کے تارک کو ناجی اور فائز کہا جائے۔

فریق اول یہ کہہ سکتا ہے کہ توبہ کے صحیح نہ ہونے سے ہماری مراد یہ ہے کہ توبہ ندامت کا نام ہے' گناہ پر آدمی اس لئے ندامت

کرتا ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی معصیت اور نافرمانی ہے' مثلاً چوری پر ندامت کرتا ہے' اس لئے نہیں کہ اس سے چوری کا فعل سرزد ہوا ہے' بلکہ اس لئے کہ اس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی ہے' اس سے معلوم ہوا کہ ندامت کی علت معصیت ہے' کوئی مخصوص گناہ نہیں' لہٰذا یہ ممکن نہیں کہ آدمی چوری پر تو نادم ہو لیکن زنا پر ندامت نہ کرے' جب کہ چوری اور زنا دونوں میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی موجود ہے' جس طرح وہ چوری پر نادم ہوا ہے' اسی طرح اسے زنا پر بھی نادم ہونا چاہیے' مثلاً جو شخص بیٹے کی تلوار سے قتل ہونے میں درد محسوس کرتا ہے' اسی طرح اسے کسی دوسرے کی چھری سے قتل ہونے میں بھی تکلیف ہوگی' یا تکلیف چھری یا تلوار میں نہیں ہے' بلکہ محبوب (جان) کے جانے کا ہے جو تلوار سے بھی ضائع ہوا اور چھری سے بھی' اسی طرح بندے کو بھی اپنے محبوب کے چھننے کا افسوس ہوتا ہے' اور یہ محبوب نافرمانی سے جدا ہوتا ہے خواہ وہ کوئی سی بھی نافرمانی ہو' اور ندامت بھی سب پر برابر ہونی چاہیے' آدمی اسی علم و یقین کے بعد توبہ کرتا ہے کہ نافرمانی سے محبوب جدا ہوجاتا ہے' اس میں یہ قید نہیں کہ فلاں گناہ سے محبوب ناراض نہیں ہوتا اور فلاں گناہ سے ہوجاتا ہے' اس لئے یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ آدمی بعض گناہوں پر نادم ہو' اور بعض پر ندامت نہ کرے' اگر یہ بات ممکن ہے تو پھر اس شخص کی توبہ کو بھی صحیح کہنا ہوگا جو شراب کے دو مٹکوں میں سے ایک مٹکے سے توبہ کرے' اور دوسرے سے نہ کرے' مگر اس شخص کی توبہ اس لئے قبول نہیں ہوتی کہ دونوں مٹکوں کی شراب میں نافرمانی برابر ہے' مٹکے صرف ظرف ہیں انکے بدلنے سے شراب کا حکم نہیں بدلتا' اسی طرح چوری' زنا' وغیرہ گناہوں کا معاملہ ہے' یہ تمام گناہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کا موجب ہیں' اور یہ نافرمانی تمام گناہوں میں مشترک ہے۔

ہم نے ایسی توبہ کو غیر صحیح کہا ہے' جو بعض گناہوں سے ہو اور بعض سے نہ ہو' اس توبہ کے غیر صحیح ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے توبہ کرنے والوں کے لئے جس مرتبہ کا وعدہ کیا ہے وہ ندامت کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا اور جو چیزیں برابر ہوں ان میں یہ ممکن نہیں کہ ایک پر ندامت ہو اور ایک پر نہ ہو' ندامت کے بعد توبہ کا حصول ایسا ہے جیسے ایجاب و قبول کے بعد کوئی چیز ملکیت میں آجاتی ہے' جب تک ایجاب و قبول نہیں ہوتا اس وقت تک ملکیت بھی تمام نہیں ہوتی' اور معاملہ صحیح نہیں ہوتا' ایجاب و قبول پر ملک کا ثمرہ ہونا چاہیے' جب ایجاب و قبول ہی مکمل نہ ہو تو اس پر ملکیت کا ثمرہ کیسے مرتب ہوسکتا ہے' اسی طرح جب تک ندامت کا محرک یہ حقیقت نہ ہوگی کہ گناہ نافرمانی کا باعث ہیں اس وقت تک ندامت کا ثمرہ توبہ بھی حاصل نہ ہوگا' اور گناہوں کا اللہ تعالیٰ کی معصیت ہونا تمام معاصی کو شامل ہے اس میں کسی ایک گناہ کی تخصیص نہیں ہے۔

ترک اور ندامت کا فرق : اس سلسلے میں تحقیقی بات یہ ہے کہ ترک اور ندامت میں فرق ہے۔ ترک گناہ کا مطلب تو یہ ہے کہ جو گناہ اس نے چھوڑا ہے اس کا عذاب آئندہ کے لئے منقطع ہوجائے گا' جب کہ ندامت پچھلے گناہ کا کفارہ بھی بنتی ہے' مثلاً ایک شخص چوری ترک کرتا ہے' اس شخص کو یقیناً وہ عذاب نہیں ہوگا جو چوری کرنے پر ہوتا ہے' لیکن جو چوری وہ زمانۂ ماضی میں کرچکا ہے' یہ ترک گناہ اس گناہ کا کفارہ نہیں بنے گا' بلکہ ماضی کی چوری کے کفارے کے لئے ندامت ضروری ہے' یہ تفصیل سنجیدہ اور قابل فہم ہے' ہر منصف شخص کو ایسی ہی تفصیل بیان کرنی چاہیے جس سے مطلب صاف سمجھ میں آجائے۔

بعض گناہوں سے توبہ کرنے کی تین صورتیں : اس لئے ہم یہ کہتے ہیں کہ بعض گناہوں سے توبہ کرنے کی تین صورتیں ہیں' ایک یہ کہ صرف کبیرہ گناہوں سے توبہ ہو صغیرہ سے نہ ہو' دوسری یہ کہ صغیرہ سے توبہ ہو کبیرہ سے نہ ہو' تیسری یہ کہ بعض کبائر سے ہو اور بعض سے نہ ہو' ان میں سے پہلی صورت ممکن ہے' اسلئے کہ گناہ گار یہ بات جانتا ہے کہ کبائر اللہ کے یہاں سخت ناپسندیدہ اور اسکے شدید ترغیظ و غضب کا باعث ہیں جب کہ صغائر عفو و درگزر سے قریب تر ہیں' اسلئے ہوسکتا ہے وہ شخص محض بڑے گناہوں سے توبہ کرے اور انہی پر نادم ہو' اسکی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص بادشاہ کی ملکہ کے ساتھ نازیبا سلوک کرے' اور اس کے جانور بھی مارے' یقیناً ایسے شخص کو ملکہ کے ساتھ نازیبا سلوک کرنے کا خوف ہوگا' جانور کو مارنے کا معاملہ اسکی نظر میں نہایت حقیر ہوگا' اور یہ سمجھے گا کہ اگر ملکہ کے ساتھ بدسلوکی کا جرم معاف ہوگیا تو جانور کے مارنے کے جرم کی پرسش نہ ہوگی' پھر جس قدر بڑا

گناہ ہوتا ہے' اور اس گناہ کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی دوری کا جس قدر احساس ہوتا ہے اسی قدر ندامت بھی زیادہ ہوتی ہے' شریعت میں ایسا ہونا ممکن ہے' پچھلے زمانوں میں بہت سے توبہ کرنے والے ایسے گزرے ہیں جو معصوم نہ تھے' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ توبہ کے لئے معصوم ہونا شرط نہیں ہے' ڈاکٹر مریض کو شہد کھانے سے روکتا ہے کیونکہ اس کا ضرر زیادہ ہے شکر سے منع نہیں کرتا کیونکہ اس کا نقصان کم ہے' چنانچہ مریض شہد سے توبہ کرلیتا ہے' اور شکر سے نہیں کرتا' اگر شہوت سے مغلوب ہو کر دونوں کھالے گا تو شہد کھانے پر نادم ہوگا' شکر پر اسے کوئی افسوس نہ ہوگا' کیونکہ اسکے خیال میں اصل نقصان شہد سے ہوتا ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ بعض کبائر سے توبہ کرے اور بعض سے نہ کرے' یہ بھی ممکن ہے' کہ گناہ گار یہ اعتقاد کرتا ہے کہ بعض گناہ اللہ کے نزدیک بعض سے زیادہ غلیظ اور شدید ہیں' مثلاً وہ قتل' لوٹ مار' ظلم اور بندوں کی حق تلفی سے توبہ کرلیتا ہے کیونکہ وہ یہ بات جانتا ہے کہ بندوں کے حقوق ہرگز معاف نہ ہونگے البتہ ان حقوق میں معافی ممکن ہے' جو اللہ تعالیٰ کے اور اسکے مابین ہیں' بہرحال جس طرح صغائر اور کبائر میں تفاوت ہے' اسی طرح کبائر بھی ایک دوسرے سے متفاوت ہیں' حقیقت میں بھی اور گناہ گار کے اعتقاد میں بھی' اسلئے آدمی کبھی ان گناہوں سے توبہ کرلیتا ہے جو بندوں سے متعلق نہیں ہوتے مثلاً شراب پینے سے توبہ کرلیتا ہے' زنا سے نہیں کرتا' کیونکہ وہ یہ خیال کرتا ہے' کہ شراب تمام برائیوں کی جڑ ہے' اس سے عقل زائل ہوجاتی ہے' اور جب عقل زائل ہوجاتی ہے تو اعضاء سے گناہ سرزد ہونے لگتے ہیں اور مرتکب کو اس کا احساس بھی نہیں ہوتا جس قدر اسکے ذہن میں شراب کی برائی راسخ ہوتی ہے اسی قدر وہ توبہ میں شدت کرتا ہے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ ایک صغیرہ یا چند صغائر سے توبہ کرے' مگر کبائر پر اصرار کرتا رہے' جب کہ یہ بھی جانتا ہو کہ یہ کبائر ہیں' اور ان کا عذاب صغائر سے زیادہ ہے' مثلاً ایک شخص شراب پینے پر اصرار کرتا ہے لیکن غیبت کرنے یا غیر محرم کی طرف دیکھنے سے توبہ کرلیتا ہے' یہ صورت بھی ممکن ہے' اور امکان کی وجہ یہ ہے کہ ہر مومن اپنے معاصی سے خائف اور اپنے افعال پر نادم رہتا ہے' یہ اور بات ہے کہ اس کا خوف یا ندامت ضعیف ہو یا قوی' لیکن گناہ میں اسے جس قدر لذت ملتی ہے اتنا زیادہ خوف نہیں ہوتا' جہل' غفلت اور دوسرے اسباب کی بنا پر خوف و ندامت کا محرک کمزور اور شہوت کا محرک طاقتور ہوتا ہے' اگرچہ ندامت رہتی ہے لیکن وہ اتنی مضبوط نہیں ہوتی کہ شہوت پر غالب آسکے' اگر آدمی شہوت کی طاقت سے بچا رہے اور خوف کے مقابلہ میں شہوت ضعف پڑجائے تو خوف شہوت پر غالب آجائے گا' اور نتیجہ یہ ہوگا کہ آدمی معصیت ترک کردے گا۔

کبھی فاسق کو شراب کی اتنی زبردست خواہش ہوتی ہے کہ وہ اس سے صبر نہیں کرپاتا' لیکن غیبت عیب جوئی' اور نامحرم عورتوں کی طرف دیکھنے اور اسی طرح کے دوسرے گناہوں کی طرف ذرا میلان نہیں رکھتا' اسکے دل میں خوف بھی ہوتا ہے' لیکن اتنا قوی نہیں ہوتا کہ شراب جیسے گناہوں کا استیصال کرسکے البتہ اس درجے کا خوف ضرور ہوتا ہے کہ ضعیف رغبتوں اور شہوتوں پر قابو پاسکے اور ان گناہوں کا استیصال کرسکے جن کی رغبت کم ہوتی ہے' ایسا شخص یہ سوچتا ہے کہ اگر شیطان غلبۂ شہوت کی وجہ سے مجھ پر غالب ہوگیا ہے اور اس کی تحریک سے بعض بڑے گناہ مجھ سے سرزد ہوجاتے ہیں تو اسکا یہ مطلب نہیں کہ میں اپنے نفس کی عنان پورے طور پر اس کے سپرد کردوں' بلکہ بعض گناہ ایسے ہیں جن کے سلسلے میں میں نفس سے مجاہدہ کرسکتا ہوں' اور اپنے مجاہدے سے شیطان پر غلبہ پاسکتا ہوں' ہوسکتا ہے بعض معمولی گناہوں کے خلاف میرا مجاہدہ ہی بعض بڑے گناہوں کا کفارہ بن جائے' اگر فاسق اس طرح نہ سوچے تو پھر اس کے لئے نماز اور روزے میں بھی کوئی رغبت نہ ہو' اگر اس سے یہ کہا جائے کہ تو نماز روزہ کرتا ہے اگر یہ غیر اللہ کیلئے ہے تو ناجائز ہے' اور اللہ کے لئے ہے تو ترک فسق بھی اللہ کے لئے ہے' جب تو نماز پڑھتا ہے تو تجھے گناہ بھی نہ کرنے چاہئیں' کیونکہ جس طرح اللہ نے نماز پڑھنے اور روزہ رکھنے کا حکم دیا ہے' اسی طرح گناہ نہ کرنے کا حکم بھی دیا ہے' یہ عجیب بات ہے کہ تو نماز سے اللہ کا تقرب حاصل کرتا ہے' اور ترک فسق سے حاصل نہیں کرتا' اس سوال کا جواب وہ یہ دے گا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر دو حکم نازل کئے ہیں' ایک اطاعت کا دوسرے ترک معصیت کا' اگر میں دونوں حکم نہ مانوں تو مجھ پر بیک وقت دو عذاب ہوں گے' ایک

اطاعت نہ کرنے کا' دوسرا معصیت کرنے کا' جب کہ میں ان میں سے ایک عذاب دفع کرنے پر قادر ہوں اور اطاعت کرکے ایک معاملے میں شیطان کو شکست دینے کی قدرت رکھتا ہوں' مجھے امید ہے کہ ایک معاملے میں میرا مجاہدہ دوسرے معاملے میں میری تقصیر کا کفارہ بن جائے گا' اس جواب کے درست ہونے میں کوئی شبہ نہیں' ہر مسلمان کا یہی حال ہے' ہمیں کوئی ایسا مسلمان نظر نہیں آتا جو معصیت و طاعت کا جامع نہ ہو' اس کی وجہ یہی ہے' جو ہم نے بیان کیا کہ طاعت معصیت کا کفارہ بن جاتی ہے' اگر یہ بات سمجھ میں آگئی تو پھر یہ حقیقت بھی سمجھ میں آجانی چاہیے کہ بعض گناہوں میں خوف کا شہوت پر غالب آنا' اور بعض میں خوف پر شہوت کا غالب آنا ممکن ہے' نیز یہ کہ خوف اگر ماضی کے فعل پر ہو تو یہ ندامت کا موجب ہوتا ہے' اور ندامت سے عزم پیدا ہوتا ہے' حدیث شریف میں ہے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ اَلنَّدَمُ تَوْبَةٌ (۱) ندامت توبہ ہے۔

اس حدیث میں یہ شرط نہیں کہ تمام گناہوں پر نادم ہونا چاہیے۔ اسی طرح ایک حدیث میں ہے۔

اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَا ذَنْبَ لَهُ (۲)

گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہے جیسے وہ شخص جس نے کوئی گناہ نہ کیا ہو۔

اس حدیث میں بھی تمام گناہوں سے توبہ کرنے کا ذکر نہیں ہے' اس تفصیل سے مذکورہ بالا قول ساقط ہو جاتا ہے کہ دو مٹکوں میں سے ایک مٹکے کی شراب سے توبہ کرنی غیر ممکن ہے' کیونکہ ان دونوں کا حال شہوت اور اللہ تعالیٰ کی ناراضگی میں گرفتار کرنے میں یکساں ہے' البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ آدمی شراب سے توبہ کرلے اور نبیذ سے نہ کرے' اسلئے کہ اللہ تعالیٰ کے غضب کے اعتبار سے دونوں میں فرق ہے' اسی طرح یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بہت سے گناہوں سے توبہ کرے' اور تھوڑے گناہوں سے نہ کرے' کیونکہ گناہوں کی زیادتی عذاب کی زیادتی میں مؤثر ہوتی ہے' اس لئے جب عذاب کی زیادتی کا خوف ہوتا ہے تو بعض شہوتیں چھوڑ دیتا ہے اور وہ خواہشیں نہیں چھوڑتا جن میں خوف خدا غالب نہیں ہوتا' جیسے کوئی ڈاکٹر اپنے کسی مریض کو کوئی مخصوص پھل کھانے سے روک دے تو وہ تھوڑا سا کھانے پر جرأت کرلیتا ہے البتہ زیادہ کھانے سے ڈرتا ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ یہ بات غیر ممکن سی ہے کہ آدمی ایک چیز سے توبہ کرے اور اس جیسی دوسری چیز سے توبہ نہ کرے' بلکہ یہ ضروری ہے کہ جس چیز سے توبہ کی ہے وہ اس چیز کے مخالف ہو جس سے توبہ نہیں کی' خواہ یہ مخالفت شدت معصیت میں ہو یا غلبۂ شہوت میں اور جب یہ فرق توبہ کرنے والے کے اعتقاد میں موجود ہے تو اسی کے مطابق خوف اور ندامت میں اسکا حال بھی مختلف ہوتا ہے' اور اسی بنیاد پر ترک عمل کا حال بھی مختلف ہوتا ہے' بہرحال اگر کوئی شخص اپنے گناہ پر نادم ہو' اسے ترک کرنے کا عزم کرے' اور اس عزم کو مکمل کردے تو وہ ان لوگوں کے دائرے میں آجائے گا جن سے وہ گناہ سرزد نہیں ہوا ہے' اگرچہ اس نے باقی تمام اوامر و نواہی میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت نہ کی ہو۔

عنین کی زنا سے توبہ : یہاں یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ کیا اس عنین کی توبہ صحیح مانی جائے گی جس نے یہ مرض لاحق ہونے سے پہلے زنا کیا تھا اور یہ مرض لاحق ہونے کے بعد توبہ کر رہا ہے؟ اسکا جواب یہ ہے کہ اس کی توبہ صحیح نہ ہوگی' اسلئے کہ توبہ اس ندامت کو کہتے ہیں جس سے ایسے افعال کے ترک کا عزم ہو' جن پر قدرت ہے' جن افعال پر قدرت ہی نہیں رہی وہ اسکے توبہ کرنے سے نہیں چھوٹے' بلکہ خود بخود معدوم ہوگئے' البتہ میں یہ کہتا ہوں کہ اگر نامردی کا مرض لاحق ہونے کے بعد اس پر زنا کے نقصانات اس طرح واضح ہوئے کہ اگر تندرستی کی حالت میں اس طرح واضح ہوتے تو وہ شدت شہوت اور غلبۂ خواہش کے باوجود اس فعل شنیع سے بچتا تو امید یہ ہے کہ اس کی توبہ قبول ہوگی اور اس گناہ کا کفارہ بن جائے گی' اس لئے کہ اسمیں کوئی اختلاف نہیں کہ اگر وہ نامردی سے پہلے زنا کے بعد اس حال میں توبہ کرتا کہ نہ اسے قضاء شہوت کے اسباب میسر ہوتے اور نہ نفس میں شہوت کی آگ شعلہ زن ہوتی ہے اور توبہ کے بعد مرجاتا تو یقینا تائبین میں شمار ہوتا اس لحاظ سے کہ اسکی ندامت اس درجے پر ہوتی جہاں آدمی فعل کے قصد سے رک

---

(۱) و (۲) یہ دونوں روایتیں پہلے گزر چکی ہیں

جاتا ہے' اور قصد ہو تو اس پر عمل سے باز رہتا ہے' ہو سکتا ہے نامرد کے حق میں بھی ندامت اس درجے کو پہنچ جائے' اگرچہ اسے معلوم نہ ہو' عام طور پر آدمی جس فعل پر قادر نہیں ہوتا وہ اپنے دل کے معمولی خوف سے یہ سمجھ لیتا ہے کہ اسکے ترک میں میرے عزم یا ندامت کو دخل ہے' حالانکہ اللہ تعالیٰ اسکے دل کی کیفیات' اور ندامت کی مقدار سے اچھی طرح واقف ہے' ہو سکتا ہے کہ عنین کی توبہ قبول ہو جائے ظاہر تو یہی ہوتا ہے کہ توبہ قبول ہو جائے گی حقیقت سے اللہ واقف ہے۔

دل سے معصیت کی ظلمت کیسے دور ہو : اس تمام گفتگو کا ماحصل یہ ہے کہ دل سے معصیت کی ظلمت دو چیزوں سے دور ہوتی ہے' ایک آتش ندامت سے' اور دوسری مستقبل میں ترک عمل پر مجاہدے کی شدت سے' اور عنین کی جو صورت فرض کی گئی ہے' اس میں عدم شہوت کی وجہ سے مجاہدے کا پہلو کمزور ہے' البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ اس کی ندامت قوی ہو' اور اتنی قوی ہو کہ مجاہدے کے بغیر ہی دل سے گناہ کی تاریکی زائل کردے۔ اگر ایسا نہ ہو تو پھر یہ کہنا پڑے گا کہ توبہ کرنے والے کی توبہ اس وقت قبول ہوتی ہے جب گناہ کرنے کے بعد وہ کچھ دنوں تک زندہ رہے' اور اس عرصے میں اس گناہ کا چند بار تصور کرکے مجاہدے کے ذریعہ اپنے نفس کو اس سے روکے' حالانکہ شریعت نے یہ شرط عائد نہیں کی ہے۔

دونوں میں سے کون افضل ہے : اس تفصیل کے بعد دو ایسے شخص تصور کئے جاسکتے ہیں جن میں سے ایک کا دل گناہ کی رغبت سے خالی ہوچکا ہے' اور دوسرے کے دل میں شہوت باقی ہے' لیکن وہ نفس پر مجاہدہ کرتا ہے اور اسے شہوت پر عمل نہیں کرنے دیتا' ان دونوں میں کون افضل ہے' وہ شخص جس کے دل میں شہوات باقی نہیں رہیں' وہ محض پچھلے گناہوں پر نادم ہے یا وہ شخص جو شہوات کے ہتھیار سے مسلح ہونے کے باوجود نفس کو گناہ کے دوبارہ ارتکاب سے روکتا ہے؟ اس سوال کے جواب میں اختلاف ہے' احمد ابن ابی الحواری' اور ابو سلیمان دارانی اور انکے رفقاء مجاہدہ کی فضیلت کے قائل ہیں کیونکہ اس کی توبہ میں مجاہدے کی آمیزش ہے' علماء بصرہ کے نزدیک پہلا شخص افضل ہے' اسلئے کہ اگر وہ توبہ میں کسی وجہ سے سستی بھی کرے تب بھی وہ گناہ پر قادر نہ ہونے کی وجہ سے نجات و سلامتی سے زیادہ قریب ہے' جب کہ دوسرے تائب کے ساتھ مجاہدے کی شرط ہے اگر وہ اس میں سستی کر بیٹھا تو کہیں کا نہ رہے گا' یہ دو قول ہیں' کچھ نہ کچھ سچائی دونوں میں ہے' لیکن کمال حقیقت کسی ایک قول میں بھی نہیں۔

اس سلسلے میں تحقیقی بات یہ ہے کہ جس شخص کے دل میں گناہ کی خواہش اور رغبت باقی نہیں رہی اس کی دو صورتیں ہیں' ایک تو یہ کہ نفس شہوت میں ضعف کی وجہ سے گناہ کی طرف میل نہیں رہا' اس شخص سے مجاہد کرنے والا بہر صورت افضل ہے کہ اس سے اپنے نفس پر مجاہدہ کرکے گناہ ترک کیا ہے جب کہ دل گناہ پر آمادہ ہے' یہ مجاہدہ اس کی قوت نفس اور شہوت پر دین کی حکومت پر دلالت کرتا ہے' یہ یقین اور قوت دین دونوں کی دلیل بھی ہے قوت دین سے ہماری مراد وہ قوت ارادی ہے جو قوت یقین کے پہلو سے جنم لیتی ہے' اور اس شہوت کا قلع قمع کردیتی ہے' جو شیطان کی تحریک اور اس کے اشارے پر سر ابھارتی ہے' یہ مجاہدہ ان دونوں قوتوں پر دلالت کرتا ہے' کہنے والے کا یہ کہنا صحیح ہو سکتا ہے کہ وہ گناہ پر قادر نہ ہونے کی وجہ سے سلامتی سے قریب ہے لیکن اس کے لئے افضل کا صیغہ استعمال کرنا مناسب نہیں گناہ پر قادر نہ ہونے والے کو گناہ پر قدرت رکھنے والے سے افضل کہنا ایسا ہی ہے جیسے نامرد کو مرد پر فضیلت دی جائے کیونکہ وہ شہوات کے خطرے سے محفوظ ہے' یا بچے کو بالغ پر فوقیت دی جائے کیونکہ اسے گناہوں کا کوئی خطرہ نہیں ہے' یا مفلس کو اس بادشاہ سے افضل کہا جائے جو اپنی قوت و شوکت سے دشمنوں کو شکست دیدے' اور دلیل دی جائے کہ مفلس کا کوئی دشمن ہی نہیں ہوتا کہ شکست و فتح کے مرحلے سے گزرے' جب کہ بادشاہ اپنی تمام تر قوت و شوکت کے باوجود کبھی شکست سے بھی ہم کنار ہو سکتا ہے' یہ باتیں وہ لوگ کرتے ہیں جو سیدھا سچا دل رکھتے ہوں' ان کی نظر صرف ظاہر پر ہو' وہ حقائق کی معرفت نہ رکھتے ہوں' اور یہ نہ جانتے ہوں کہ عزت خطرات سے دوچار ہونے میں ہے' اور بلندی اس وقت حاصل ہوتی ہے جب آدمی خوفناک وادیوں سے بچ کر منزل پر پہنچ جائے' اگر تم عاجز کو مجاہد سے افضل کہتے ہو تو تمہیں یہ بھی کہنا چاہیے کہ وہ شخص جس کے پاس شکار کے لئے نہ کتا ہے اور نہ گھوڑا وہ فن شکار میں اس شکاری سے افضل ہے جس کے پاس کتا بھی ہے اور گھوڑا بھی کیونکہ وہ

گھوڑے کی سرکشی اور اس پر سوار ہو کر زمین پر گرنے اور اپنی ہڈیاں تڑوانے کے خطرے سے محفوظ ہے' نیز اسے کتے کے کاٹنے اور حملہ آور ہونے کا بھی کوئی خطرہ نہیں ہے' ایسا کرنا محض نادانی ہے بلکہ وہ شکاری جو گھوڑا اور کتا رکھتا ہو' طاقتور ہو' ان جانوروں کی تربیت اور انھیں اپنے مقاصد میں استعمال کرنے کے طریقے سے واقف ہے وہ یقیناً شکار کے فن میں اس سے اعلیٰ ہوگا۔

گناہ پر قدرت رکھنے والے کی دوسری حالت یہ ہے کہ اسکے دل سے گناہ کی رغبت شہوت کے ضعف کی وجہ سے دور نہ ہوئی ہو' بلکہ اس میں زبردست قوت یقین ہو' یا ماضی میں اتنا شدید مجاہدہ اس نے کیا ہو کہ اب شہوات میں ہیجان اور اشتعال ہی نہ ہوتا ہو' اس کی تمام تر شہوات اور خواہشات شریعت کے بنائے ہوئے سانچوں میں ڈھل گئی ہوں' شریعت کے اشارے پر حرکت میں آتی ہوں' اور اسی اشارے پر پر سکون ہو جاتی ہوں' یہ شخص یقیناً اس مجاہد سے افضل ہے جو شہوت کا قلع قمع کرنے اور اس کے ہیجان پر قابو پانے کے لئے سخت ترین جدوجہد کرتا ہے۔

مجاہدہ مقصود نہیں ہے : جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ مجاہد کے ساتھ مجاہدے کی زیادتی ہے ایسے لوگوں کو مجاہدے کے مقصد سے واقفیت نہیں ہوتی ہے' ورنہ ایسا نہ کہتے' حقیقت یہ ہے مجاہدہ بذات خود مقصود نہیں ہے' بلکہ اس کے ذریعہ دشمن سے نفس کا دفاع کیا جاتا ہے' تاکہ وہ نفس کو اپنی طرف نہ کھینچ سکے اور اگر کھینچنے سے عاجز ہو تو دین کا راستہ مسدود نہ کر سکے' بہرحال اگر کسی نے مجاہدہ کیا اور دشمن پر غلبہ پالیا تو یہ اس کی فتح ہے' لیکن اگر اس پر غلبہ پانے کی جدوجہد جاری ہے تو فتح کا مرحلہ دور ہے اسکی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص دشمن پر غالب آجائے' اور اسے اپنا غلام بنالے' اسکے برعکس دوسرا شخص اپنے دشمن سے ابھی برسرپیکار ہے' اور یہ نہیں جانتا کہ میں اس سے کس طرح نجات پاؤں گا ظاہر ہے اس مثال میں پہلا شخص دوسرے سے افضل ہے کہ اس نے اپنے دشمن کو مقہور کرلیا ہے دوسرا جہاد میں مصروف ہے' اسی قسم کی دوسری مثال یہ ہے کہ ایک شخص اپنے کتے اور گھوڑے کو اتنا سدھادے کہ اسے ان کی سرکشی سے کوئی خطرہ نہ ہو' جب کہ دوسرا شخص انھیں تربیت دینے اور سدھانے میں مشغول ہو۔ ظاہر ہے ان دونوں میں بھی پہلا افضل ہے۔

اصل میں یہاں فہم کی غلطی ہوئی ہے' لوگ یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ مقصود صرف مجاہدہ کرنا ہے' جب کہ مقصود یہ ہے کہ مجاہدے کے ذریعہ راہ راست کی رکاوٹیں دور کی جاسکیں' اسی طرح بعض لوگوں نے یہ گمان کیا کہ مجاہدے سے مقصود یہ ہے کہ شہوات کا قلع قمع کردیا جائے اور انھیں نفس کی سطح سے کھرچ کر پھینک دیا جائے' انھوں نے اپنے نفسوں کی اسی نقطۂ نظر سے آزمائش کی' اور جب انھیں آزمائش میں ناکام پایا تو یہ کہنے لگے کہ نفسوں سے شہوات کا دور ہونا ایک محال بات ہے' نادانی میں شریعت کو جھوٹا کہنے لگے' اباحت کی راہ پر چلنے لگے اور شہوات کی اتباع میں نفس کی عنان پورے طور پر ڈھیلی کر بیٹھے' یہ تمام باتیں جہالت اور گمراہی کی ہیں' کتاب ریاضۃ نفس میں ہم نے اس موضوع پر تفصیل سے گفتگو کی ہے۔

افضلیت میں ایک اور اختلاف : یہاں ایک اختلاف اور ہے' اور وہ یہ ہے کہ ایک شخص توبہ کرکے اپنا گناہ بھول جاتا ہے' اسے کبھی یاد نہیں آتا کہ ماضی میں اس سے کوئی گناہ سرزد ہوا ہے' ایک اور شخص ہے وہ بھی اپنے گناہ سے تائب ہو چکا ہے لیکن اسے اپنا گناہ اکثر یاد آتا ہے' اور جب بھی یاد آتا ہے دل میں ندامت کی آگ روشن کردیتا ہے' ان دونوں میں کون سا شخص افضل ہے؟ اسکے جواب میں بھی علماء کا اختلاف ہے' بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ توبہ کی حقیقت یہ ہے کہ گناہ ہر وقت تمہارے سامنے رہے' بعض لوگوں کے نزدیک گناہ کو بھول جانے اور مٹا دینے کا نام توبہ ہے' ہمارے نزدیک یہ دونوں رائیں حق ہیں مگر یہ دونوں دو حالتوں سے متعلق ہیں' صوفیوں کے کلام میں ہمیشہ قصور رہتا ہے' کیونکہ عام طور پر یہ لوگ اپنے نفسوں کا حال بیان کرتے ہیں' دوسروں کے حالات سے انھیں کوئی غرض نہیں ہوتی' جب کہ احوال کے اختلاف سے جواب بھی مختلف ہو جاتے ہیں' علمی نقطۂ نظر سے صوفیوں کی یہ عادت مناسب نہیں ہے' بلکہ نقصان کا باعث ہے' آدمی جب کسی بات کا جواب دے' تو اس کی نظر اس مسئلے کے تمام پہلوؤں پر

ہونی چاہیے' تاکہ سامع کا ذہن مخل نہ ہو' یہ علمی نقطۂ نظر کی بات ہے' اگر ہمت اور ارادے کے پہلو سے غور کیا جائے تو یہ عادت مناسب لگتی ہے' کیونکہ جب آدمی کی نظر اپنے نفس پر ہوگی' تو وہ کسی دوسرے کے حال پر متوجہ نہیں ہوگا' اسکا نفس اللہ تک پہنچنے کا راستہ ہے' اور اسکے مختلف حالات و کیفیات راستے کی منزلیں ہیں' جب آدمی کسی منزل کیلئے پابہ رکاب ہوتا ہے' تو اسے دوسرے کے حال سے دلچسپی نہیں ہوتی' بلکہ اس کی تمام تر توجہ اپنے سفر' اپنی منزل' راستے کی صعوبتوں اور دشواریوں پر رہتی ہے' کبھی اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کا راستہ علم ہوتا ہے' کیونکہ اس کی طرف جانے کے راستے بے شمار ہیں' بعض میں اختصار ہے' اور بعض میں طوالت' لیکن اصل ہدایت سب میں ہے' اور یہ اللہ جانتا ہے کہ سب سے زیادہ ہدایت کا راستہ کون سا ہے۔

اس تمہید کے بعد ہم کہتے ہیں کہ گناہ کا تصور' اسکا ذکر اور اس پر تکلیف کا احساس مبتدی کے حق میں کمال ہے' اسلئے کہ اگر وہ گناہ بھول گیا تو نفس میں سوزش بھی نہیں ہوگی' اور اسکی وجہ سے اسکا ارادہ بھی قوی نہ ہوگا اور نہ راہ سلوک طے کرنے کا شوق پیدا ہوگا' اگر گناہ یاد رہے گا تو کم از کم یہ خیال ضرور رہے گا کہ اس کا اعادہ نہ ہو' یاد رکھنا کامل کیلئے نہ صرف یہ کہ بہتر نہیں ہے' بلکہ باعث نقصان ہے۔ اسلئے کہ یاد رکھنا بھی ایک شغل ہے جو راہ حق پر چلنے میں رکاوٹ بن سکتا ہے' سالک کی تمام تر توجہ اپنے سفر پر مرکوز رہنی چاہیے' جب اسے منزل پر پہنچنے کی علامات نظر آنے لگیں' اور مطلع غیب سے معرفت کے انوار پھوٹنے لگیں گے' تو وہ اپنے پورے وجود کے ساتھ ان میں مستغرق ہو جائے گا' پھر اسکی توجہ اپنے سابقہ احوال پر نہیں رہے گی' اور نہ منزل پر پہنچنے کے بعد اسکی گنجائش رہتی ہے' کمال کے معنی ہی یہ ہیں کہ آدمی اپنے موجودہ حال میں اتنا مستغرق ہو کہ کسی دوسری جانب توجہ ہی نہ رہے۔ بلکہ اگر مسافر کے راستے میں کوئی ایسی نہر پڑے' جس کا پل خود اس نے توڑ دیا تھا' اب وہاں حیران و پریشان کھڑا ہے' کیا کرے' کس طرح یہ نہر عبور کرے' مایوس ہو کر رونے بیٹھ جائے' اور اپنے سابقہ رویے پر نادم ہو کہ اگر پل نہ توڑا ہوتا تو میں آج کسی دشواری کے بغیر دوسرے کنارے پر پہنچ جاتا' مسافر کے لئے یہ رونا دھونا' اور پل ٹوٹنے پر افسوس کرکے بیٹھنا بھی ایک امر مانع ہے' اس سے خواہ مخواہ سفر میں تاخیر ہوگی اور منزل تک دیر سے پہنچے گا' ہاں اگر ایسا وقت ہے کہ اب سفر جاری نہیں رکھا جاسکتا' مثلاً رات کا وقت ہے جس میں سفر کرنا خطرناک ہے یا کوئی اور دشواری ہے جو سفر جاری رکھنے میں مانع ہے' اس صورت میں ٹوٹے ہوئے پل کے پاس بیٹھ کر رونے میں کوئی مضائقہ نہیں' تاکہ گریہ وزاری سے اسکا یہ عزم مزید پختہ ہو جائے کہ آئندہ پل نہ توڑوں گا۔ یہ امور ہم نے کتاب العلم میں اور احیاء العلوم کی جلد ثالث میں بیان کئے ہیں۔

ہمارے نزدیک عوام توبہ کیلئے یہ شرط ہے کہ آدمی آخرت کی نعمتوں کے بارے میں زیادہ سے زیادہ سوچتا ہے تاکہ اسکی رغبت و شوق میں اضافہ ہوتا ہے' لیکن جوان آدمی کیلئے آخرت سے تعلق رکھنے والی ان چیزوں میں زیادہ غور و فکر کرنا بھی مناسب نہیں جن کی نظیر دنیا میں موجود ہے جیسے حور و قصور وغیرہ' کیونکہ اس کی فکر کا رخ کبھی حقیقت سے مجاز کی طرف بھی مڑ سکتا ہے' اس کے لئے زیادہ بہتر یہ ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ کے دیدار کی لذت کو اپنے فکر کا محور بنائے' کیونکہ یہ ہی ایک نعمت ایسی ہے جس کی دنیا میں کوئی نظیر نہیں ہے' جس طرح آخرت کی نعمتوں میں زیادہ غور و فکر کرنے سے مبتدی دنیاوی نعمتوں میں الجھ سکتا ہے' اسی طرح مبتدی کے حق میں گناہوں کو زیادہ یاد کرنا بھی نقصان کا باعث بن سکتا ہے' اس طرح اس کے شہوانی جذبات بھڑک سکتے ہیں اور گناہوں کی طرف میلان ہو سکتا ہے' اس اعتبار سے مبتدی کے حق میں بھی بھول جانا ہی بہتر ہے۔

حضرت داؤد علیہ السلام کے واقعے سے استدلال: ہو سکتا ہے کہ تم ہماری اس تحقیق کو تسلیم کرنے سے انکار کرو' اور حضرت داؤد علیہ السلام کے واقعے سے استدلال کرو کہ انھوں نے اپنے گناہ پر گریہ کیا تھا' ہم یہ کہتے ہیں کہ انبیاء کے نفوس کو اپنے نفسوں پر قیاس کرنا کم عقلی اور کم فہمی کی دلیل ہے' کیونکہ انبیاء علیہم السلام بعض اوقات اپنے اقوال و افعال میں وہ اسلوب اختیار کرتے ہیں' جو ان کی امت کے حال کے مناسب ہو' کیونکہ وہ امت کی رہنمائی اور اس کی تربیت کے لئے مبعوث ہوتے ہیں' اسلئے وہ اپنے قول و فعل میں اپنی شان سے اتر کر اتنی کمی کر دیتے ہیں' جو امت کی شان کے مطابق اور اس کے لئے مفید ہو' ہم نے بہت سے مشائخ ایسے دیکھے ہیں جو اپنے مرید کو وہ ریاضت نہیں بتلاتے جو خود کرتے ہیں' جب کہ انھیں اسکی ضرورت بھی نہیں

ہوتی کہ کوئی ریاضت کریں، کیونکہ وہ مجاہدہ نفس سے فراغت پاچکے تھے، مگر وہ ایسا اس لئے کرتے تھے تاکہ مرید کے لئے سلوک کا معاملہ سہل ہو جائے۔ اسی بنا پر حدیث شریف میں ہے، سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

اَمَّا اِنِّیْ لَا اَنْسٰی وَلٰکِنِّیْ اُنَسّٰی لِاَشْرَعَ (مؤطا امام مالک مرسلاً)

میں خود نہیں بھولتا بھلا دیا جاتا ہوں تاکہ امت کے لئے سند ہو جائے۔

یہ روایت نماز وغیرہ کے متعلق ہے کہ کبھی کبھی آپ رکوع، سجدہ یا قعدہ وغیرہ بھول جاتے تھے، پھر اس کی سجدۂ سہو اور اعادۂ نماز سے تلافی کیا کرتے تھے، ایک روایت میں ہے۔

اِنَّمَا اَسْھُوْ لِاَسُنَّ (بخاری۔ ابو ہریرہؓ)

میں اس لئے بھولتا ہوں تاکہ سنت مقرر کروں۔

ظاہر ہے اگر آپ کو نماز میں سہو نہ ہوتا تو ہمیں سہو کے مسائل کیسے معلوم ہوتے اور امت پریشانی میں مبتلا ہو جاتی جب کہ امت اپنے نبی کے سایۂ رحمت میں ایک بچے کی طرح ہوتی ہے جیسے اپنے باپ کا سایۂ عاطفت حاصل ہو یا اس چوپائے کی طرح ہوتی ہے جسے چرواہے کی حفاظت و حمایت میسر ہو، عام طور پر مشاہدہ کیا جاتا ہے کہ جب باپ اپنے بچے کو بولنا سکھاتا ہے تو خود بھی اسی طرح کی آواز نکالتا ہے، عام حالات میں اگر وہ اس طرح کی آوازیں نکالے تو لوگ اسکی ہنسی اڑائیں گے اور بے وقوف کہیں، ایک مرتبہ حضرت حسنؓ نے صدقے میں آیا ہوا چھوارہ اٹھا کر منہ میں رکھ لیا آپ نے ان سے فرمایا کخ کخ (چھی چھی) حالانکہ یہ الفاظ فصاحت نبوی کے خلاف تھے، اگر حسنؓ بچے نہ ہوتے، اور ان کے فہم کے مطابق کلام مقصود ہوتا تو آپ ان سے کخ کخ کے بجائے یہ فرماتے کہ یہ چھوارہ پھینک دو کیونکہ یہ صدقہ کا ہے اور صدقہ ہمارے لئے حرام ہے، لیکن آپ جانتے تھے کہ حسنؓ اپنی صغر سن کے باعث یہ بات نہیں سمجھ سکتے، اسلئے آپ نے اپنے درجۂ فصاحت سے اتر کر توتلی زبان میں خطاب فرمایا۔ اسی طرح جب بکری یا پرندے وغیرہ کو کوئی بات سکھلانی ہوتی ہے تو معلم کو جانوروں ہی کے لہجے میں بولنا پڑتا ہے، یہ اہم ترین دقائق ہیں اس طرح کے مقامات میں عارفین کے قدم لغزش کھا جاتے ہیں، غافلوں کی تو کیا حیثیت ہے، اس لئے تم غفلت سے بچو، ہم اللہ تعالیٰ سے حسن توفیق کے طالب ہیں۔

دوام توبہ میں لوگوں کی قسمیں

پہلی قسم: جاننا چاہیے کہ توبہ کرنے والوں کے چار طبقے ہیں، ان میں سے پہلا طبقہ ان گنہگاروں کا ہے جو گناہ سے تائب ہوں، اور آخر عمر تک اپنی توبہ پر قائم رہیں، ماضی میں جو قصور واقع ہوا ہے، اس کی تلافی کریں، اور دوبارہ اس گناہ کے ارتکاب کا تصور تک نہ کریں، سوائے ان لغزشوں کے جن سے نبی کے علاوہ کوئی انسان محفوظ نہیں ہے، یہ استقامت علی التوبہ ہے، اس طبقے کے تائبین کے بارے میں کہا جائے گا کہ یہ اپنی استقامت اور ثابت قدمی سے نیک کاموں میں آگے نکل گئے، اور انہوں نے گناہوں کے عوض نیکیاں حاصل کرلیں، اس توبہ کا نام توبۃ النصوح ہے اور ایسے تائب کو نفس مطمئنہ کہتے ہیں، جو اپنے رب کی طرف اس حال میں جائے گا کہ رب اس سے خوش ہو گا، اور وہ رب سے خوش ہو گا، حدیث شریف میں ایسے ہی نیک نفوس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

سَبَقَ الْمُفْرِدُوْنَ الْمُسْتَھْتِرُوْنَ بِذِکْرِ اللّٰہِ تَعَالٰی وَضَعَ الذِّکْرُ عَنْھُمْ اَوْزَارَھُمْ فَوَرَدُوْا الْقِیَامَۃَ خِفَافًا (ترمذی۔ ابو ہریرہؓ)

مفرو یعنی اللہ تعالیٰ کے ذکر کے شائق آگے بڑھ گئے ذکر نے انکے بوجھ (گناہوں کے) اتار دیے ہیں چنانچہ وہ لوگ قیامت کے دن ہلکے پھلکے پہنچیں گے۔

اس حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ ان پر گناہوں کا بوجھ تھا، لیکن ذکر کی کثرت اور اس عمل پر استقامت نے ان کا بوجھ ہلکا کر دیا، اب وہ ہلکے پھلکے ہو چکے ہیں، اور قیامت کے دن اسی حال میں وارد ہوں گے، پھر اس طبقے میں بھی شہوات کی طرف میلان کے اعتبار سے مختلف مراتب ہوں گے، بعض وہ لوگ ہوں گے جن کی شہوات معرفت کے قہر میں دب گئیں، اب ان کے دلوں میں شہوات کا

کوئی نزاع نہ رہا' اور نہ راہ سلوک میں ان سے مزاحمت باقی رہی' بعض وہ ہیں جن کے نفس سے شہوات کا نزاع باقی ہے' اور وہ ان کے خلاف مجاہدہ کرنے اور انھیں دور کرنے میں دیر تک کوشاں رہتے ہیں' پھر نزاع کی کیفیات بھی قلت و کثرت مدت اور نوع کے اعتبار سے مختلف ہیں' عمر کی کمی بیشی سے بھی درجات مختلف ہو جاتے ہیں' بعض ایسے ہیں جو توبہ کرتے ہی موت کی آغوش میں پہنچ جاتے ہیں' ان کا حال اسلئے قابل رشک ہوتا ہے کہ انتہائی سلامتی کے ساتھ راستے کے کانٹوں میں الجھے بغیر رخصت ہو گئے' اور توبہ میں کوئی رخنہ نہ پڑا' بعض لوگ توبہ کے بعد بھی مہلت نفس پاتے ہیں' ان کا جہاد اور صبر طویل ہو جاتا ہے' توبہ پر استقامت سے ان کی حسنات بڑھتی ہیں' ان کی حالت انتہائی اعلیٰ ہے' کہ جتنے گناہ تھے نیکیوں سے محو ہو گئے' بعض علماء کہتے ہیں کہ کسی گناہ کی توبہ اس وقت تک قبول نہیں ہوتی جب تک گناہ کرنے والا اس پر دس بار قدرت نہ پائے اور ہر بار اللہ کے خوف کی بنیاد پر اسکے ارتکاب سے نہ رکے' اگرچہ یہ شرط بعید از قیاس ہے' لیکن اگر لوگ اس نہج پر مجاہدہ کرنے لگیں تو اس کے اثرات دور رس اور دیرپا ہوں گے' پھر بھی کمزور مرید کے لئے مناسب نہیں کہ وہ یہ طریقہ اختیار کرے کہ پہلے تصورات کے ذریعے شہوات میں ہیجان برپا کرے پھر ان پر قابو پائے' ہو سکتا ہے کہ کمزوری کے باعث اسکے قدم ڈگمگا جائیں' اور معاملہ اسکے اختیار سے باہر نکل جائے' اور توبہ توڑ کر گناہ میں مبتلا ہو جائے بلکہ ایسے شخص کو جسے بہکنے کا خطرہ ہو ابتداء میں یہ کوشش کرنی چاہیے کہ جو اسباب گناہ کی تحریک کرتے ہوں' ان سے گریز کرے' اور نفس پر ان کے راستے مسدود کر دے اور اسکے ساتھ شہوت توڑنے کی کوشش کرے تاکہ اس کی توبہ ابتداء ہی میں محفوظ ہو جائے۔

دوسری قسم : ان توبہ کرنے والوں کی ہے جو اہم ترین اطاعات میں استقامت کا راستہ اپناتے ہیں اور تمام کبیرہ گناہ ترک کر دیتے ہیں' تاہم ایسے گناہوں سے دامن نہیں بچا پاتے جو ان سے قصد و ارادہ کے بغیر سرزد ہوتے ہیں' اگرچہ پہلے سے ان کے ارتکاب کا عزم نہیں ہوتا' لیکن جب بھی ان سے کوئی گناہ سرزد ہوتا ہے وہ اپنے نفس کو ملامت کرتے ہیں' شرمندہ ہوتے ہیں' اور یہ عزم کرتے ہیں کہ ہم ان اسباب سے محفوظ رہنے کی کوشش کریں گے جو گناہ پر آمادہ کرتے ہیں' ایسے نفس کو نفس لوّامہ کہتے ہیں' کیونکہ یہ ان احوال ذمیمہ پر اپنے نفس کو ہدف ملامت بناتا ہے' جو اس پر قصد و ارادہ کے بغیر طاری ہو جاتے ہیں' پہلے طبقے کے لوگ ہر حیثیت سے اعلیٰ تھے' لیکن اس طبقے کے افضل ہونے میں بھی کوئی شبہ نہیں ہے' اگرچہ پہلے طبقے سے رتبے میں کم ہے' اکثر تائبین کا حال ایسا ہی ہوتا ہے' اسلئے کہ شر آدمی کی سرشت میں داخل ہے' اور اس کے خمیر میں شامل ہے' اس سے بچنا قریب قریب محال ہے' تاہم انسان اتنا کر سکتا ہے کہ شر کے مقابلے میں خیر کے کام زیادہ کرے' تاکہ نیکیوں کا پلڑا بھاری ہو جائے' اس سے معلوم ہوا کہ نیکیوں کا پلڑا بھاری تو ہو سکتا ہے' لیکن برائی کا پلڑا بالکل خالی ہو جائے ایسا ہونا مشکل ہے' ایسے لوگوں کے لئے اللہ رب العزت نے مغفرت کا وعدہ فرمایا ہے۔

اَلَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ اِنَّ رَبَّكَ وَاسِعُ الْمَغْفِرَةِ (پ ۲۷ ر ۶ آیت ۳۲)

وہ لوگ ایسے ہیں کہ کبیرہ گناہوں سے اور بے حیائی کی باتوں سے بچتے ہیں' بلاشبہ آپ کے رب کی مغفرت بڑی وسیع ہے۔

جو صغائر آدمی سے بلا قصد و ارادہ سرزد ہو جاتے ہیں' وہ لمم ہیں' جو کبائر سے بچتے ہیں' ان کے صغائر معاف کر دیئے جاتے ہیں' ایک جگہ ارشاد فرمایا۔

وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ (پ ۴ ر ۴ آیت ۱۳۵)

اور ایسے لوگ کہ جب کوئی ایسا کام کر گزرتے ہیں جس میں زیادتی ہو' یا اپنی ذات پر نقصان اٹھاتے ہیں' پھر اپنے گناہوں کی معافی چاہنے لگتے ہیں۔

انھوں نے گناہ کر کے اپنے نفسوں پر ظلم کیا اسکے باوجود اللہ نے ان کی مدح فرمائی ہے' اسکی وجہ یہی ہے کہ وہ گناہ کے بعد نادم

ہوئے اور انھوں نے اپنے نفسوں کو ملامت کیا' اور اپنے گناہوں کے لئے بخشش کی دعا مانگی' حضرت علیؓ کی اس روایت میں توبہ کرنے والوں کی یہی قسم مراد ہے' ارشاد فرمایا' خِيَارُكُمْ كُلُّ مُفْتَتَنٍ تَوَّابٍ (بیہقی)

تم میں سب سے بہتر وہ لوگ ہیں جو معصیت میں مبتلا ہو کر توبہ کرلیں۔

ایک حدیث میں فرمایا گیا۔

اَلْمُؤْمِنُ كَالسُّنْبُلَةِ يَفِيْئُ اَحْيَانًا وَيَمِيْلُ اَحْيَانًا (ابو یعلی' ابن حبان۔ انسؓ)

مومن گیہوں کی بالی کی طرح ہے کبھی گناہ کی طرف جھکتا ہے' کبھی نیکی کی طرف لوٹتا ہے۔

ایک حدیث میں یہ مضمون وارد ہے۔

لَا بُدَّ لِلْمُؤْمِنِ مِنْ ذَنْبٍ يَاتِيْهِ الْفَيْنَةَ بَعْدَ الْفَيْنَةِ (طبرانی۔ بیہقی۔ ابن عباسؓ)

مومن کے لئے ضروری ہے کہ کبھی کبھی گناہ کا ارتکاب کرلے۔

ان تمام روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر کسی سے کوئی اِکّادُکّا گناہ سرزد ہوجائے تو اس سے توبہ ساقط نہیں ہوتی' اور نہ اس قسم کا گناہ گار ان لوگوں کے زمرے میں شامل ہوتا ہے جو گناہ پر اصرار کرتے ہیں' جو شخص ایسے لوگوں کو تائبین کے درجے میں شمار کرتا ہے' وہ اس ڈاکٹر کی طرح ہے جو اپنے تندرست مریض کو صحت سے مایوس کردے' اور وجہ یہ بتلائے کہ تم کبھی کبھی گرم میوے اور غذائیں کھاتے ہو یا اس فقیہ کی طرح ہے جو اپنے شاگرد کو فقیہ بننے سے مایوس کردے' اور دلیل یہ دے کہ تم کبھی کبھی اپنا سبق نہیں دہراتے' حالانکہ ایسا محض اتفاقاً ہوتا ہے' ورنہ عام طور پر وہ اپنے اوقات کو فقہ کے تکرار و اعادے اور حفظ و ذکر میں مشغول رکھتا ہے' اگر کوئی طبیب یا فقیہ ایسا کرتا ہے تو یہ اس کے نقص کی علامت ہے' فقیہ فی الدین کے لئے تو یہ بات ضروری ہے کہ وہ کبھی ان لوگوں کو سعادتوں کے حصول سے مایوس نہ کرے جن سے گاہے بگاہے کوئی گناہ سرزد ہوجائے' حدیث شریف میں ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

كُلُّ بَنِيْ آدَمَ خَطَّاؤُنَ وَخَيْرُ الْخَطَّائِيْنَ التَّوَّابُوْنَ الْمُسْتَغْفِرُوْنَ (ترمذی' انسؓ)

تمام انسان خطا کار ہیں' بہترین خطا کار وہ لوگ ہیں جو توبہ کرتے ہیں اور اپنی خطاؤں کی مغفرت چاہتے ہیں۔

ایک حدیث میں ارشاد فرمایا۔

اَلْمُؤْمِنُ وَاهٍ رَاقِعٌ فَخَيْرُهُمْ مَنْ مَاتَ عَلٰى رَقْعِهِ (طبرانی۔ بیہقی۔ جابرؓ)

مومن پھاڑنے والا اور پیوند لگانے والا ہے بہتر ہے وہ شخص جو پیوند لگا کر مرے۔

پھاڑنے والے سے مراد گناہ گار اور پیوند لگانے والے سے مراد توبہ کرنے والا ہے' اللہ تعالٰی کا ارشاد ہے۔

اُولٰٓئِكَ يُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوْا وَيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ (پ ۲۰ ر ۹ آیت ۵۴)

ان لوگوں کو ان کی پختگی کی وجہ سے دوہرا ثواب ملے گا اور وہ لوگ نیکی سے بدی کا دفعیہ کردیتے ہیں۔

اسمیں مومنین کا یہ وصف بیان کیا گیا ہے کہ وہ گناہ کے بعد نیکی کرتے ہیں' یہ نہیں فرمایا کہ وہ کوئی گناہ ہی نہیں کرتے۔

تیسری قسم : اس میں وہ لوگ شامل ہیں جو توبہ کرکے کچھ عرصے اس پر مستقیم رہتے ہیں' پھر کسی گناہ کی خواہش ان پر غالب ہوجاتی ہے' اور وہ اسے قصد و ارادے کے ساتھ کر بیٹھتے ہیں' کیونکہ ان میں اتنی قوت نہیں ہوتی کہ شہوات کو مغلوب کرسکیں' مگر نیک اعمال کی پابندی کرتے ہیں اور اطاعت بجالاتے ہیں' عام طور پر گناہوں سے بھی بچتے ہیں' لیکن دو چار خواہشوں سے مجبور ہوتے ہیں' جب تحریک ہوتی ہے تو نفس پر ان کا اختیار باقی نہیں رہتا اور وہ خواہشات کے بموجب عمل کر بیٹھتے ہیں' دل میں اسے برا سمجھتے ہیں اور یہ آرزو کرتے ہیں کہ جس طرح ہمیں اطاعات کی توفیق میسر ہے' اور جس طرح ہم بے شمار گناہوں سے محفوظ ہیں' اسی طرح اگر ان دو چار گناہوں سے بھی بچے رہیں تو کتنا اچھا ہو' معصیت سے پہلے یہ آرزو کرتے ہیں' اور معصیت کے بعد اس پر نادم ہوتے

ہیں' اور یہ عہد کرتے ہیں کہ آئندہ ہم اس معصیت پر قابو پانے کے لئے نفس کے ساتھ سخت مجاہدہ کریں گے' لیکن انکے نفس ٹال مٹول سے کام لیتے ہیں' اور وہ اپنے عہد کی تکمیل نہیں کرپاتے' ایسے نفس کو مسومہ کہا جاتا ہے' اللہ تعالیٰ نے ایسے ہی لوگوں کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے۔

وَاٰخَرُوْنَ اعْتَرَفُوْا بِذُنُوْبِهِمْ خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّاٰخَرَ سَيِّئًا (پ ۱۱ ر ۲ آیت ۱۰۳)

اور کچھ اور لوگ ہیں جو اپنی خطا کے مقر ہو گئے جنھوں نے ملے جلے عمل کئے تھے' کچھ بھلے اور کچھ برے۔

اس قسم کے تائبین چونکہ اپنی عمل کو برا سمجھتے ہیں' اور نیک اعمال کی پابندی کرتے ہیں' اسلئے یہ امید کی جاسکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی توبہ کو شرف قبولیت سے نوازے گا' البتہ ایسے لوگوں کو اپنے نفس کے ٹال مٹول کی وجہ سے ایک خطرہ لاحق ہے' اور وہ یہ ہے کہ موت توبہ سے پہلے بھی آسکتی ہے' اس صورت میں انجام خراب ہونے کا اندیشہ ہے' اگر اللہ تعالیٰ نے اپنا فضل کرم کیا اور توبہ کے ذریعہ انھیں تدارک کا موقع بخشا تو یقیناً وہ سابقین سے ملحق ہوں گے' اور اگر بد قسمتی غالب آئی' اور شہوت نے اتنا مقہور کیا کہ تلافی کی نوبت ہی نہ آنے دی تو سوء خاتمہ کا خوف ہے' یہ بات عام طور پر مشاہدے میں آئی ہے کہ کوئی طالب علم تحصیل علم کے لئے مانع امور سے اجتناب نہ کرے تو اس کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ اس کی قسمت میں علم نہیں ہے' اور جو طالب حصول علم کے تمام تقاضے پورے کرتا ہے' اسکے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ کاتب تقدیر نے اس کا نام عالموں میں لکھ دیا ہے۔

مسبب الاسباب نے آخرت کی سعادتوں اور شقاوتوں کو نیکیوں اور گناہوں کے ساتھ اس طرح مربوط کیا ہے جس طرح صحت و مرض' غذا دواء کے استعمال کے ساتھ مربوط ہیں' یا جس طرح دنیا میں فقہ کا اعلیٰ منصب حاصل کرنے کا عمل کاہلی ترک کرنے' اور نفس کو فقہ کا عادی بنانے کے ساتھ مربوط ہے' جسطرح ریاست قضاء اور دوسرے علمی مراتب کے لئے صرف وہ لوگ اہل ہیں جن کے نفوس فقہی علوم میں مسلسل مشغول رہنے کی وجہ سے فقیہ بن گئے ہوں' اسی طرح آخرت کی نعمتوں اور اللہ تعالیٰ کے قرب کی سعادتوں کے لیے صرف وہ لوگ اہل ہیں جن کے پہلو میں تزکیہ و تطہیر کے طویل اور مسلسل عمل سے دھلے دھلائے پاکیزہ اور سلیم قلب ہوں' اللہ تعالیٰ نے ازل سے اپنی تدابیر اسی طرح مقرر فرمائی۔

وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَا فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَا قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا (پ ۳۰ ر ۱۶ آیت ۷-۱۰)

اور قسم ہے (انسان کی) جان کی اور اس ذات کی جسنے اسے درست بنایا' پھر اسکی بد کرداری اور پرہیزگاری دونوں باتوں کا اس کو القا کیا' یقیناً وہ مراد کو پہنچا جس نے اس (جان) کو پاک کیا اور نامراد ہوا جس نے اسکو (فجور میں) دبا دیا۔

خلاصہ یہ ہے کہ اگر کسی سے گناہ سرزد ہو گیا' اور وہ توبہ میں تاخیر کرے تو یہ اسکی بدبختی اور رسوائی کی علامت ہے' اس سے معلوم ہوا کہ گناہ کرنے کے بعد توبہ کرنی چاہیے' اس میں تاخیر سے ناقابل نقصان پہنچ سکتا ہے۔ ایک حدیث میں ہے۔

اِنَّ الْعَبْدَ لَيَعْمَلُ بِعَمَلِ اَهْلِ الْجَنَّةِ سَبْعِيْنَ سَنَةً حَتّٰى يَقُوْلَ النَّاسُ اِنَّهُ مِنْ اَهْلِهَا وَلَا يَبْقٰى بَيْنَهُ وَبَيْنَ الْجَنَّةِ اِلَّا شِبْرٌ فَيَسْبِقُ عَلَيْهِ الْكِتَابُ فَيَعْمَلُ بِعَمَلِ اَهْلِ النَّارِ فَيَدْخُلُهَا (بخاری و مسلم۔ سہل بن سعد)

بندہ ستر برس تک جنت والوں کے سے عمل کرتا ہے' یہاں تک کہ لوگ اسے جنتی کہنے لگتے ہیں' اس میں اور جنت میں صرف ایک بالشت کا فاصلہ رہ جاتا ہے کہ اس پر تقدیر ازلی غالب آتی ہے' پھر وہ دوزخیوں کے سے عمل کرتا ہے اور دوزخ میں داخل ہو جاتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ سوء خاتمہ کا خوف توبہ سے پہلے بھی ہے اور بعد میں بھی' اور آدمی کا ہر سانس اپنے سے پہلے سانس کا خاتمہ

ہے، ہوسکتا ہے اگلا سانس آنے سے پہلے ہی موت آجائے، اس لئے ہر سانس کی حفاظت ضروری ہے، ورنہ امر ممنوع کا مرتکب ہوسکتا ہے، اس وقت ندامت ہوگی، اور ندامت کام نہ آئے گی۔

چوتھی قسم : ان تائبین کی ہے جو توبہ کریں، کچھ عرصے توبہ پر قائم رہیں، اور پھر گناہوں کے ارتکاب میں مشغول ہوجائیں، نہ ان کے دل میں گناہوں کی قباحت کا خیال آئے، نہ وہ یہ سوچیں کہ ہمیں ان اعمال بد سے توبہ کرنی چاہیے، اور آئندہ کے لئے اجتناب کرنا چاہیے۔ نہ انھیں اپنے فعل پر افسوس ہو، نہ ندامت ہو، بلکہ غافلوں کی طرح شہوات میں غرق رہیں، ایسے لوگوں کی توبہ کا کوئی اعتبار نہیں، ان کا شمار گناہ پر اصرار کرنے والوں میں ہوتا ہے، اس قسم میں شامل لوگوں کا نفس امارہ بالسوء کہلاتا ہے، یہ نفس خیر کے کاموں سے دور بھاگتا ہے، ایسے نفس پر سوء خاتمہ کا خوف ہے، اگر برائی پر اس کا خاتمہ ہوا تو اسکے حصے میں ایسی بدبختی آئے گی جس کے بعد کوئی بدبختی نہیں، اور بھلائی پر مرا تو یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ اسے عذاب دوزخ سے نجات مل جائے گی، خواہ تھوڑے عرصے کے بعد ملے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کسی ایسے مخفی سبب کے باعث جس کا ہمیں علم نہیں اسے دامان رحمت میں لے لیا جائے، اور اس کے اعمال نامے کی سیاہی دور کردی جائے، اللہ تعالیٰ کی مشیت ازلی سے کچھ بعید نہیں، جیسے کوئی شخص بے آب وگیاہ میدان میں یہ آرزو لے کر جائے کہ مجھے وہاں سے خزانہ مل جائے گا تو یہ محال نہیں، ہوسکتا ہے کہ اسے خزانہ ہاتھ آہی جائے، جیسے کوئی شخص گھر میں بیٹھ کر حصول علم کی توقع رکھے، یہ بھی ممکن ہے انبیاء کرام نے کسی معلم کے سامنے زانوئے ادب طے کئے بغیر علوم حاصل کئے ہیں، طاعات کے ذریعے مغفرت طلب کرنا ایسا ہے جیسے کوئی شخص تکرار و مطالعے کی جدوجہد سے علم کا طالب ہو، یا تجارت اور بحر و بر کے اسفار سے مال کا خواہاں ہو، اور بلا عمل کے مغفرت چاہنا ایسا ہے جیسے بنجر زمین سے خزانہ پانے کی خواہش کرنا۔ یا ملائکہ کے ذریعہ تعلیم کے خواب دیکھنا اگرچہ بنجر زمین سے خزانہ پانا اور فرشتوں کے ذریعہ تعلیم حاصل کرنا محال نہیں ہے، لیکن بعد از عقل ضرور ہے۔ عجیب بات ہے لوگ عمل کے بغیر اس کے نتائج دیکھنا چاہتے ہیں، ہمارے خیال سے تو یہی غنیمت ہے کہ عمل کے بعد مغفرت، تجارت میں جدوجہد کے بعد مال، اور تکرار و مطالعہ کی مشقت کے بعد علم حاصل ہوجائے، ایک بزرگ کا قول ہے کہ آدمی سب محروم ہیں سوائے عالموں کے، اور عالم سب محروم ہیں سوائے عاملوں کے، اور عامل سب محروم ہیں سوائے مخلصوں کے اور مخلص خطرے میں ہیں۔

کوئی بھی عقل مند انسان اس شخص کی بے وقوفی میں شبہ نہیں کرتا جو اپنا گھر برباد کردے، اپنا مال ضائع کردے، اپنے آپ کو اور اپنے اہل و عیال کو فاقہ کشی پر مجبور کردے، محض اس توقع پر کہ اللہ تعالیٰ مجھے اپنے فضل سے زیر زمین مدفون خزانہ عطا کرے گا، اگرچہ یہ فضل خداوندی غیر ممکن نہیں ہے۔ لیکن اس کی امید میں بیٹھ رہنا سراسر حماقت ہے، اسی طرح اس شخص کی جہالت اور نادانی میں بھی کوئی شبہ نہیں کیا جاسکتا جو اطاعات میں قصور کرے، مغفرت کے راستے سے گریز کرے، گناہوں پر اصرار کرے، اور ان تمام کوتاہیوں کے باوجود بخشش کا امیدوار رہو، بڑا تعجب اس نادان کی نادانی پر ہے جو اپنی بے عملی اور بد عملی کو اس خوب صورت پیرائے میں بیان کرے کہ اللہ تعالیٰ کریم ہے، اسکی جنت اس قدر وسیع ہے کہ مجھ جیسے معمولی شخص کے لئے تنگ نہیں ہوسکتی اور نہ میری نافرمانی اسے نقصان پہنچا سکتی ہے۔ ایک طرف وہ اپنی گناہ آلود زندگی کی یہ تاویل کرتا ہے دوسری طرف تم اسے طلب رزق کے لئے سمندروں کا سینہ چیرتے ہوئے اور میدانی خطروں سے الجھتے ہوئے دیکھتے ہو، اگر اس سے یہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ کریم ہے، اسکے خزانۂ غیب میں زر و جواہر کی کوئی کمی نہیں، اور نہ تجھ جیسے شخص کے لئے اس میں تنگی ہے اگر تو تجارت ترک کرکے گھر کے کسی گوشے میں بیٹھ رہے تو یہ ہوسکتا ہے کہ تجھے ایسے ذرائع سے رزق پہنچے جن کا تجھے گمان بھی نہ ہو، اگر اس سے یہ تمام باتیں کہی جائیں تو وہ کہنے والے کا منہ نوچ لے، اور اس مشورے پر اسکا مذاق اڑائے، اسے بے وقوف سمجھے اور کہے کہ آسمان سے سونا چاندی نہیں برستا، یہ چیزیں محنت سے حاصل ہوتی ہیں، مسبب الاسباب نے رزق کمانے کا یہی طریقہ مقرر فرمایا ہے اور یہی سنت جاری فرمادی ہے، اللہ کی سنت میں کسی تبدیلی کی گنجائش نہیں ہے۔ انسان کا یہ دوہرا معیار سمجھ میں نہیں آتا، اس احمق کو معلوم نہیں کہ دنیا اور آخرت

دونوں کا رب ایک ہے' اور ان دونوں میں جو سنت جاری کردی ہے وہ ناقابل ترمیم ہے' اس نے یہ اصول بنادیا ہے۔

وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى (پ ۲۷ ر ۷ آیت ۳۹)

اور یہ کہ انسان کو صرف اپنی ہی کمائی ملے گی۔

جب دنیا و آخرت کا ایک رب ہے' ایک اصول اور ایک ذریعہ ہے' پھر کیا وجہ ہے کہ وہ اللہ کو آخرت میں کریم سمجھتا ہے' دنیا میں کریم نہیں سمجھتا' اگر کرم کا مقتضیٰ یہ ہے کہ آدمی عمل سے رک جائے' اور عمل کے بغیر اخروی نعمتوں کا امیدوار ہو تو کرم کا تقاضا یہ بھی ہونا چاہیے کہ آدمی پیسہ کمانے سے رک جائے اور کمائے بغیر ہی حصول رزق کا خواہاں ہو' یہ کیسے ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی بے بہا' اور لازوال دولت' آخرت کا اجر و ثواب' بلا عمل' اور بغیر جدوجہد عطا کردے گا' اور دنیا کی ناپائدار' اور فانی نعمتیں بغیر عمل کے عطا نہیں کرے گا' کیا قرآن کریم میں یہ آیت موجود نہیں ہے۔

وَفِي السَّمَاءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوعَدُونَ (پ ۲۶ ر ۱۸ آیت ۲۲)

اور تمہارا رزق اور جو تم سے وعدہ کیا جاتا ہے (سب) آسمان میں ہے۔

ہم اس جہالت و گمراہی سے اللہ کی پناہ چاہتے ہیں' جو شخص اس طرح کے معتقدات کا حامل ہے وہ گویا اپنے آپ کو اوندھے منہ کنویں میں گرا کر ہلاک کرنے کے درپے ہے' اور اس آیت کے تحت داخل ہے جس میں ارشاد فرمایا گیا۔

وَلَوْ تَرٰى اِذِ الْمُجْرِمُوْنَ نَاكِسُوْا رُءُوْسِهِمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ رَبَّنَا اَبْصَرْنَا وَسَمِعْنَا فَارْجِعْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا (پ ۲۱ ر ۱۵ آیت ۱۲)

اور اگر آپ دیکھیں تو عجب حال دیکھیں جب کہ یہ مجرم لوگ اپنے رب کے سامنے سر جھکائے ہوں گے' کہ اے ہمارے پروردگار بس ہماری آنکھیں اور کان کھل گئے' سو ہم کو پھر بھیج دیجئے ہم نیک کام کریں گے۔

یعنی یہ کہیں گے کہ ہمیں یقین آگیا' تیرا یہ قول واقعی سچا تھا "وان لیس للانسان الا ما سعی" ہم وعدہ کرتے ہیں کہ اگر ہمیں دنیا میں واپس جانے کا موقع دیا گیا تو ہم تیرے قول کی صداقت پر عملاً ایمان لائیں گے' اور کوشش میں کوتاہی نہ کریں گے' یہ درخواست اس وقت کی جائے گی' جب واپسی کا کوئی راستہ باقی نہ رہے گا' اور تقدیر ازلی اپنا عمل مکمل کرچکی ہوگی' اور اس کی قسمت پر عذاب کی مہر لگ چکی ہوگی' ہم اس جہالت' شک' اور شبہے کے دواعی سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں' جو انجام کی خرابی کا باعث ہیں۔

ارتکاب معصیت کے بعد

اس عنوان کے تحت یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ اگر تائب اتفاقاً یا قصداً کسی گناہ کا مرتکب ہو جائے تو اسے کیا کرنا چاہیے؟ جاننا چاہیے کہ اس پر توبہ' ندامت اور نیکی کے ذریعہ اس گناہ کو زائل کرنا واجب ہے' جیسا کہ ہم نے اس کا طریقہ گزشتہ صفحات میں تفصیل سے لکھ دیا ہے' اگر نفس غلبۂ شہوت کی وجہ سے ترک گناہ پر معاونت نہ کرے تو سمجھا جائے گا کہ وہ دو واجبوں میں سے ایک پر عمل کرنے سے قاصر ہے' اس صورت میں' دوسرے واجب پر عمل کرنے میں کوتاہی نہ کرنی چاہیے' اور وہ یہ کہ گناہ کو نیکی سے زائل کرنے کے لئے کوئی اچھا سا عمل کرے تاکہ ان لوگوں کے زمرے میں آجائے جو اپنے اعمالنامے میں نیک اور بد دونوں طرح کے اعمال رکھتے ہیں۔

نیک عمل کرنے کا طریقہ : وہ نیک اعمال جو گناہوں کا کفارہ بنتے ہیں' دل سے متعلق ہیں' یا زبان سے' یا اعضاء سے' بہتر یہی ہے کہ جس جگہ سے گناہ کا ارتکاب کیا ہے' یا جس جگہ سے گناہ پیدا ہوا ہے' اسی جگہ سے نیک عمل کرے۔ چنانچہ اگر دل سے گناہ کا ظہور ہو تو اسکا ازالہ اللہ تعالیٰ کی جناب میں تضرع اور گریہ و زاری سے کرے' نیز اس سے عفو و مغفرت کا طلب گار ہو' جس طرح بھگوڑا غلام اپنے عمل پر نادم ہوتا ہے' اور اپنے آپ کو ذلیل سمجھتا ہے' اسی طرح خود کو ذلیل سمجھے' بلکہ ذلیل بن کر دکھائے تاکہ تمام

لوگوں پر اسکی ذلت واضح ہو جائے' اس کا طریقہ یہ ہے کہ اگر دوسروں کے مقابلے میں خود کو بڑا سمجھتا ہو تو اس گناہ کے بعد ان کے مقابلے میں حقیر تصور کرے' جس طرح بھگوڑے غلام کو اپنے جیسے دوسرے غلاموں پر تکبر زیب نہیں دیتا' اسی طرح گنہ گار کے لئے بھی یہ بات مناسب نہیں ہے کہ وہ اپنے جیسے دوسرے انسانوں پر خود کو برتر تصور کرے' اسکے علاوہ دل میں اعمال خیر کا عزم بھی کرے' اور مسلمانوں کے ساتھ بھلائی کی نیت رکھے۔

زبان سے گناہ کے کفارے کا طریقہ یہ ہے کہ اپنے ظلم کا اعتراف کرے' اور صاف طور پر یہ کہے رَبِّ ظَلَمْتُ نَفْسِيْ وَعَمِلْتُ سُوْءً فَاغْفِرْلِيْ ذُنُوْبِيْ (اے میرے رب میں نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے' میں نے برا عمل کیا ہے' میرے گناہ معاف فرما) کتاب الدعوات والاذکار میں ہم نے بہت سے استغفار درج کئے ہیں' ان کا ورد کرے۔

اعضاء کے ذریعہ کفارہ کا طریقہ یہ ہے کہ ان کے ذریعے اچھے اعمال کرے' صدقہ و خیرات کرے اور نیک کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے۔ آثار میں ہے کہ اگر گناہ کے بعد آٹھ عمل کرلئے جائیں تو اس کے عفو کی امید کی جاسکتی ہے' ان میں سے چار کا تعلق دل سے ہے۔(۱) توبہ (۲) توبہ کا عزم (۳) گناہ سے بچنے میں دلچسپی (۴) اور عذاب کا خوف۔ اور چار کا تعلق اعضاء سے ہے (۱) گناہ کے بعد دو رکعت نماز پڑھے (۲) دو رکعت نماز کے بعد ستر بار استغفار اور سو مرتبہ سبحان اللہ العظیم وبحمدہ پڑھے (۳) صدقہ دے (۴) ایک روزہ رکھے' بعض روایات میں یہ ہے کہ اچھی طرح وضو کرکے مسجد میں جائے' اور دو رکعت نماز توبہ پڑھے (اصحاب سنن۔ ابوبکرالصدیقؓ) اور بعض میں چار رکعتوں کا ذکر ہے (بیہقی۔ ابن عباسؓ) ایک روایت میں ہے کہ جب کوئی گناہ کرے تو اسکے بعد نیک کام ضرور کرے تاکہ اس گناہ کا تدارک ہو جائے' پوشیدہ گناہ کے بدلے میں پوشیدہ نیکی کرے' ظاہری گناہ کے عوض ظاہری عبادت کرے (بیہقی۔ معاذ) غالباً اسی حدیث کی بنا پر یہ کہا جاتا ہے کہ پوشیدہ طور پر صدقہ دینے سے رات کی تاریکی میں کئے ہوئے گناہ معاف ہو جاتے ہیں' اور ظاہری طور پر صدقہ دینے سے دن کے اجالے میں کئے ہوئے گناہ بخش دئے جاتے ہیں' ایک صحیح روایت میں ہے کہ کسی شخص نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ میں نے ایک عورت کے ساتھ سب کچھ کیا ہے لیکن زنا نہیں کیا۔ اب آپ فرمائیں میرے لئے اللہ تعالیٰ کا کیا حکم ہے' آپ نے اس سے دریافت فرمایا کیا تو نے ہمارے ساتھ صبح کی نماز پڑھی ہے؟ اس نے عرض کیا جی ہاں! آپ نے فرمایا نیکیاں برائیوں کو مٹا دیتی ہیں (بخاری و مسلم۔ ابن مسعودؓ) اس سے معلوم ہوا کہ زنا کے علاوہ عورت کے ساتھ کچھ کرنا صغیرہ گناہ ہے' اسی لئے تو نماز کو اسکا کفارہ بتلایا گیا ہے' دوسری طرف ایک حدیث میں یہ فرمایا گیا اَلصَّلَوَاتُ الْخَمْسُ كَفَّارَاتٌ لِّمَا بَيْنَهُنَّ اِلَّا الْكَبَائِرَ (پنجوقتہ نمازیں کبائر کے علاوہ درمیانی گناہوں کے لئے کفارہ ہیں' ان دونوں روایتوں میں تطبیق کی یہی صورت ہو سکتی ہے۔

حاصل یہ ہے کہ آدمی کو ہر روز اپنے نفس کا احتساب کرنا چاہیے' اس طرح کہ تمام دن کی برائیوں کو جمع کرلے' اور پھر انہیں اتنی ہی نیکیوں سے مٹانے کی جدوجہد کرے۔

ایک اعتراض کا جواب : یہاں ایک حدیث کے حوالے سے ہماری گفتگو پر اعتراض کیا جاسکتا ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ جو شخص گناہ سے استغفار بھی کرلے اور اس پر اصرار بھی کرتا رہے وہ گویا اللہ تعالیٰ کی آیات کے ساتھ استہزاء کرنے والا ہے (بیہقی۔ ابن عباسؓ) ایک طرف تم یہ کہتے ہو کہ آدمی کتنے بھی گناہ کرلے استغفار سے سب ختم ہو جاتے ہیں' دوسری طرف یہ حدیث ہے کہ بار بار گناہ کرکے بار بار استغفار کرنے والا اللہ کی آیات کے ساتھ کھلواڑ کرنے والا ہے ایک بزرگ کے نزدیک زبان سے استغفار کی کوئی حقیقت ہی نہیں ہے' ایک بزرگ کے قول کے مطابق زبان سے استغفار کی ضرورت ہے۔ ان اقوال میں کون سا استغفار مراد ہے' اور تم کس استغفار کی بات کررہے ہو؟ آخر اس تضاد کا حل کیا ہے؟ اس کے جواب کی تفصیل یہ ہے کہ استغفار کی فضیلت میں بے شمار روایات وارد ہیں' ہم نے ان میں سے بہت سی روایات کتاب الاذکار والدعوات میں نقل کی ہیں' استغفار کی فضیلت کے لئے صرف اتنا جان لینا ہی کافی ہے کہ قرآن پاک میں اس کی تاثیر اور کسی قوم میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی

موجودگی کا اثر ایک ہی بیان کیا گیا ہے۔

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ

(پ ۹ ر ۱۸ آیت ۳۳)

اور اللہ تعالیٰ ایسا نہ کریں گے کہ ان میں آپ کے ہوتے ہوئے ان کو (ایسا) عذاب نہ دیں گے جس حالت میں کہ وہ استغفار بھی کرتے رہتے ہیں۔

اسی لئے بعض صحابہ فرمایا کرتے تھے کہ ہماری دو پناہ گاہیں تھیں' ایک پناہ گاہ رخصت ہو گئی' یعنی سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ہم سے پردہ فرما گئے' دوسری پناہ گاہ باقی ہے' یعنی استغفار موجود ہے' اگر یہ بھی نہ رہا تو ہم ہلاک ہو جائیں گے' اس تمہید کے بعد یہ جاننا چاہیے کہ جس استغفار کو جھوٹوں کی توبہ کہا گیا ہے وہ محض زبانی استغفار ہے' اس میں قلب شریک نہیں ہوتا' جیسے بہت سے لوگ عادتاً استغفراللہ کہدیتے ہیں' نہ دل سے اسکی تحریک ہوتی ہے' اور نہ ذہن میں یہ بات ہوتی ہے کہ ہماری زبان پر استغفار ہے' بعض لوگ دوزخ کے عذاب کا ذکر سن کر نعوذباللہ منہ کہہ دیتے ہیں' جب کہ دل میں ذرا خوف نہیں ہوتا' محض زبان حرکت کرتی ہے' حالانکہ محض زبان کو حرکت دینے میں کوئی فائدہ نہیں' جب تک دل میں اثر نہ ہو' حقیقی استغفار یہ ہے کہ زبان کے ساتھ دل میں تضرع اور خشیت ہو' مغفرت کی طلب میں صدق ارادت اور خلوص نیت بھی ہو' یہ استغفار بجائے خود ایک نیکی ہے' اور گناہ مٹانے میں مؤثر ہو سکتی ہے' استغفار کی فضیلت میں جو روایات وارد ہیں' ان میں یہی استغفار مراد ہے' اگر کوئی شخص استغفار کا حق ادا کرے' اور پھر گناہ کا ارتکاب کر بیٹھے تو اسے گناہ پر اصرار کرنے والا نہیں کہا جائے گا' جیسا کہ حدیث شریف میں ہے۔

مَا اَصَرَّ مَنِ اسْتَغْفَرَ وَلَوْ عَادَ فِي الْيَوْمِ سَبْعِيْنَ مَرَّةً (۱)

جو شخص استغفار کرتا ہے وہ گناہ پر اصرار کرنے والا نہیں ہے' اگرچہ دن میں ستر بار اس گناہ کا اعادہ کرے۔

توبہ و استغفار کے درجات : توبہ اور استغفار کے بے شمار درجات ہیں' ان کے ابتدائی درجات بھی فوائد سے لبریز ہیں' انتہائی کا تو ذکر ہی کیا ہے' اسی لئے حضرت سہیل تستریؒ فرماتے ہیں کہ بندے کو ہر حال میں اپنے پروردگار کی ضرورت ہوتی ہے' اور یہی اس کے حق میں بہتر بھی ہے کہ ہر حال میں اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرے خواہ اچھا ہو یا برا' مثلاً گناہ کا مرتکب ہو تو یہ دعا کرے کہ اے اللہ! میرے گناہ کا پردہ رکھ' معصیت سے فارغ ہو تو یہ دعا کرے کہ اے اللہ میری خطا معاف فرما' توبہ کے بعد یہ دعا کرے کہ اے اللہ! گناہ سے میری حفاظت کر' کوئی اچھا کام کرے تو یہ کہے کہ اے اللہ میرے اس عمل کو شرف قبولیت سے نواز' ان سے کسی نے دریافت کیا کہ وہ استغفار کون سا ہے جس سے گناہ معاف ہوتے ہیں' آپ نے جواب دیا استغفار کی ابتدا استجابت ہے' پھر انابت اسکے بعد توبہ' استجابت سے اعضاء کے اعمال مراد ہیں اور انابت سے قلوب کے' توبہ یہ ہے کہ مخلوق سے لاتعلق ہو کر اللہ کی طرف متوجہ ہو جائے' اور جس گناہ میں مبتلا ہے اسکی مغفرت طلب کرے' نیز کفران نعمت اور ترک شکر جیسی خطاؤں کی بھی بخشش چاہے' امید ہے اسکے بعد مغفرت ہو جائے گی' اور رب العالمین کے پاس ٹھکانہ مل جائے گا توبہ کے بعد بھی مراحل ہیں' پہلا مرحلہ تنہائی ہے' پھر ثبات' اسکے بعد بیان' پھر فکر' پھر معرفت' پھر مناجات' اسکے بعد مصافات' پھر موالات' پھر راز کی گفتگو جسے خلت کہتے ہیں' لیکن یہ تمام احوال اس بندے کے دل پر گزرتے ہیں جس کی غذا علم' جس کا قوام ذکر' جس کا زاد راہ رضائے الہی' جس کا رفیق توکل ہو' ایسے دل پر اللہ تعالیٰ اپنی خاص توجہ ڈالتے ہیں' اور اسے عرش پر اٹھا لیتے ہیں' جہاں اسے حاملین عرش کے درمیان جگہ ملتی ہے' ان سے کسی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد گرامی کے بارے میں دریافت کیا۔

اَلتَّائِبُ حَبِيْبُ اللّٰهِ (۲)

توبہ کرنے والا اللہ کا حبیب ہے۔

---

(۱) یہ روایت کتاب الدعوات میں گزری ہے (۲) یہ روایت اسی کتاب کے شروع میں گزر چکی ہے

آپ نے فرمایا کہ توبہ کرنے والا اللہ تعالیٰ کا حبیب اسی وقت ہوگا جب اس میں مندرجہ ذیل اوصاف پائے جائیں گے۔

اَلتَّائِبُوْنَ الْعَابِدُوْنَ الْحَامِدُوْنَ السَّائِحُوْنَ الرَّاكِعُوْنَ السَّاجِدُوْنَ الْآمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحَافِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ (پ ۱۱ ر ۳ آیت ۱۲)

وہ ایسے ہیں جو توبہ کرنے والے ہیں (اور) اللہ کی عبادت کرنے والے ہیں (اور) حمد کرنے والے' روزہ رکھنے والے' رکوع کرنے والے (اور) سجدہ کرنے والے' نیک باتوں کی تعلیم کرنے والے' اور بری باتوں سے باز رکھنے والے ہیں۔

یہ بھی فرمایا کہ حبیب اسے کہتے ہیں جو اپنے محبوب کا اس حد تک اطاعت گزار ہو کہ جو بات اسے بری لگتی ہو' اس کے قریب بھی نہ بھٹکتا ہو۔ اس تمام تفصیل سے یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ توبہ کے دو ثمرے ہیں' پہلا ثمرہ تو یہ ہے کہ گناہ مٹ جائے' اور ایسا ہو جائے گویا کبھی گناہ کا ارتکاب کیا ہی نہیں ہے' دوسرا ثمرہ یہ ہے کہ توبہ کے ذریعہ قرب کے درجات حاصل کرے' یہاں تک کہ حبیب بن جائے' پھر کفارۂ ذنوب کے مختلف درجات ہیں' بعض گناہ اس طرح مٹ جاتے ہیں گویا کبھی وجود ہی میں نہیں آئے تھے' بعض گناہوں میں صرف تخفیف ہوتی ہے' جیسی توبہ ہوتی ہے' ازالۂ معصیت میں ویسا ہی اس کا اثر ہوتا ہے۔

توبہ ہر حال میں مؤثر ہے: آثار سے ثابت ہوتا ہے کہ توبہ و استغفار اگر دل سے ہو تو یہ ہر حال میں مؤثر ہے' اگرچہ تائب گناہ پر اصرار کرتا رہے' ہو سکتا ہے ایسی توبہ کچھ زیادہ مؤثر نہ ہو' لیکن جس حد تک مؤثر ہوگی مفید ثابت ہوگی' اور اگر استغفار کے ساتھ گناہ کے تدارک کے لئے حسنات کا اضافہ کر دیا جائے' تو یہ سونے پر سہاگہ والی بات ہے' جو شخص استغفار اور حسنات کے ساتھ ساتھ گناہ بھی کرتا ہو' اس کے بارے میں یہ گمان کرنا مناسب نہیں کہ اس کا استغفار اور نیکیاں سب بیکار ہیں' ارباب بصیرت اور اصحاب قلوب کشف و مشاہدے کے ذریعے اس آیت کی صداقت پر یقین رکھتے ہیں۔

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ (پ ۳۰ ر ۲۴ آیت ۷)

جو شخص ذرہ برابر نیکی کرے گا وہ وہاں اس کو دیکھ لے گا۔

اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر ذرۂ خیر میں اثر ہے' جیسے ترازو کے ایک پلڑے میں چاول کا ایک دانہ ڈال دیا جائے تو وہ دوسرے پلڑے سے کچھ نہ کچھ ضرور جھک جائے گا' اگر ایک دانہ چاول پلڑے کو جھکانے میں مؤثر نہ ہو تو دوسرا دانہ بھی مؤثر نہ ہونا چاہیے' بلکہ اس سے تو یہ لازم آتا ہے کہ مٹھی بھر چاول بھی اثر انداز نہ ہوں گے' حالانکہ یہ بات مشاہدے کے خلاف ہے' یہی حال حسنات کی ترازو کا ہے' اس کا پلڑا ابھی خیر کے ذرے سے جھک جاتا ہے' خواہ تھوڑا ہی جھکے کہ دیکھنے والا محسوس بھی نہ کر سکے' اگر خیر کے چند ذرات مل جائیں تو یقیناً پلڑا زیادہ جھکے گا' ہو سکتا ہے اتنا جھکے کہ سیئات کا پلڑا اوپر اٹھ جائے' ذرات خیر کو حقیر نہ جانو' اگر تم بڑے گناہ چھوڑنے پر قادر نہیں ہو تو چھوٹے چھوٹے کاموں سے گریز نہ کرو' ہو سکتا ہے کہ یہی چھوٹے چھوٹے عمل تمہاری بخشش کا سامان کر دیں' اسی طرح اگر تم بڑے گناہ چھوڑنے پر قادر نہیں ہو تو چھوٹے چھوٹے گناہوں کو معمولی نہ سمجھو' بلکہ انھیں ہی ترک کر دو' ہو سکتا ہے اس طرح تمہاری ترازو کا پلڑا کچھ ہلکا رہ جائے' جس میں برائیاں رکھی جائینگی تمہارا حال اس احمق عورت جیسا نہ ہو جو سوت کاتنے سے بھاگتی ہے' اور دلیل یہ دیتی ہے کہ میں دن بھر میں ایک دو تار کات پاتی ہوں' ان سے کون سا مال جمع ہو گا' اس بے چاری کو معلوم نہیں کہ دنیا بھر کے کپڑے تاروں سے بنتے ہیں' اگر ہر روز دو دو تار بھی کاتے گئے تو کسی مرحلے پر یہ اتنے زیادہ ہو جائیں گے کہ ان سے وسیع و عریض کپڑا بنایا جا سکے گا۔ غرض یہ ہے کہ دل سے توبہ و استغفار کرنا ایک ایسی نیکی ہے جو اللہ کے یہاں ہرگز ضائع نہ ہوگی' بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ استغفار کے لئے زبان کو حرکت دینا بھی ایک نیکی ہے' اسلئے کہ زبان کو کلمات استغفار کے ساتھ بحالت غفلت حرکت دینا' کسی مسلمان کی غیبت کرنے یا لغو کلام کرنے سے بہر حال افضل ہے' بلکہ یہ خاموشی سے بھی بہتر ہے' اگرچہ قلب کے عمل سے بہتر نہیں ہے' لیکن سکوت اور لغو کلام سے یہ ہر حال افضل ہے' حضرت ابو عثمان مغربیؒ کی خدمت میں ان

نے کسی مرید نے عرض کیا کہ بعض اوقات میرا قلب غافل ہوتا ہے' اور زبان کلمات ذکر اور آیات قرآنی کا ورد کرتی ہے' انھوں نے جواب دیا کہ اللہ کا شکر ادا کرو کہ اس نے ایک عضو کو خیر کے کام میں لگا رکھا ہے' اور اسے ذکر کی عادت ڈال دی ہے' شر میں استعمال نہیں کیا' اور نہ اسے فضولیات کا عادی بنایا' ابو عثمان مغربیؒ نے بالکل صحیح بات کہی ہے' اعضاء کو اعمال خیر کا اس قدر عادی بنانا کہ وہ انکی طبع ثانیہ بن جائیں' معاصی کے ازالے میں بھی مفید ہے' چنانچہ اگر وہ شخص جس کی زبان استغفار کی عادی ہے' کسی سے کوئی جھوٹی بات سنے تو برجستہ یہی کہے گا۔ استغفر اللہ۔ جبکہ فضولیات بکنے والا شخص جھوٹ بولنے والے کو احمق' کاذب اور مفتری کہکر جھٹلائے گا' اسی طرح وہ شخص جس کی زبان تعوذ کی عادی ہے کسی شریر کی شرانگیزی دیکھ کر اللہ کی پناہ چاہے گا جب کہ فضول کلام کا عادی انسان کہے گا اللہ اس پر لعنت کرے' ان میں سے ایک کلمۂ خیر کہہ کر ثواب حاصل کرے گا' دوسرا کلمۂ شر کہہ کر گناہ گار ہوگا' اس سے معلوم ہوا کہ سلامتی زبان کو خیر کا عادی بنانے میں ہے' قرآن کریم کی ان آیات میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

إِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ (پ ۱۱ ر ۴ آیت ۲۰)

یقیناً اللہ تعالیٰ مخلصین کا اجر ضائع نہیں کرتے۔

وَإِنْ تَكُ حَسَنَةً يُضَاعِفْهَا وَيُؤْتِ مِنْ لَدُنْهُ أَجْرًا عَظِيمًا (پ ۵ ر ۳ آیت ۴۰)

اور اگر ایک نیکی ہوگی تو اسکو کئی گنا کر دیں گے اور اپنے پاس سے اجر عظیم دیں گے۔

مذکورہ بالا صورت پر غور کرو کس طرح ایک نیکی کو دو چند کیا ہے' نیکی یہ تھی کہ زبان کلمۂ خیر کی عادی تھی' اس کا ثواب اپنی جگہ' اس نیکی کے نتیجے میں دوسری نیکی یہ ہوئی کہ فضول گوئی' اور غیبت کے گناہ سے محفوظ رکھا' نیکی پر نیکی کا اضافہ تو دنیا میں ہے' آخرت میں کس قدر اجر و ثواب ملے گا اسکا کچھ اندازہ نہیں کیا جاسکتا' نیکی کتنی ہی معمولی اور غیر اہم کیوں نہ ہو' اسے معمولی یا غیر اہم سمجھ کر نظر انداز نہ کرنا چاہیے جو لوگ ایسا کرتے ہیں وہ در اصل شیطان کے فریب میں مبتلا ہیں' شیطان انھیں بتلاتا ہے کہ تم صاحب بصیرت' عقل مند' اور دانا انسان ہو' مخفی اور پوشیدہ باتوں کا علم رکھتے ہو' تم جیسے لائق اور فاضل و کامل انسان کو محض زبان سے ذکر کرنا زیب نہیں دیتا' تم خود یہ بات اچھی طرح جانتے ہو کہ قلب کی غفلت کے ساتھ زبان کو ذکر سے متحرک کرنا مفید نہیں ہے۔

مخلوق کی تین قسمیں

اس شیطانی مکر کی بنیاد پر مخلوق کی تین قسمیں ہوگئیں (۱) وہ جنھوں نے اپنی جان پر ظلم کیا (۲) میانہ رو (۳) خیر میں سبقت کرنے والے۔ خیر میں سبقت کرنے والے شیطان کے جواب میں کہتے ہیں کہ اگرچہ تیرا قول درست ہے' لیکن تیرا مقصد درست نہیں ہے' تو کلمۂ حق سے معنیٔ باطل پر استدلال کر رہا ہے' ہم تجھے دوبار ایذا دیں گے اور دو مرتبہ ذلیل کریں گے' ہم وہ محض زبان کی حرکت پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ اس کے ساتھ دل کا اخلاص بھی شامل کرلیتے ہیں' تاکہ شیطان کو زبان کی حرکت سے بھی تکلیف پہنچے اور دل کے خلوص سے بھی' ان کی مثال اس شخص کی سی ہے جو شیطان کے زخم دل پر مرہم رکھنے کے بجائے نمک چھڑک دے۔

اپنے نفس پر ظلم کرنے والے وہ لوگ ہیں جو شیطان کی تائید کرتے ہیں' اور اس غلط فہمی میں مبتلا ہو کر کہ اسرار الٰہی سے واقف ہیں زبانی ذکر بھی چھوڑ دیتے ہیں' شیطان کے زخم کا مرہم یہی لوگ بنتے ہیں' ان لوگوں میں اور شیطان میں اس حد تک موافقت ہوتی ہے کہ باہم شیر و شکر ہو جاتے ہیں۔

میانہ رو وہ لوگ ہوتے ہیں جو شیطان کی خواہش کے برخلاف دل کو تو ذکر میں شریک نہیں کرپاتے لیکن زبان کو بھی اس عمل سے نہیں روکتے' بلکہ یہ سمجھتے ہیں کہ زبانی ذکر اگرچہ قلبی ذکر کے مقابلے میں ناقص ہے' لیکن سکوت اور یاوہ گوئی کی بنسبت' بہرحال افضل ہے یہ لوگ زبانی ذکر نہیں چھوڑتے اور ساتھ ہی یہ دعا بھی کرتے ہیں کہ جس طرح تو نے ہماری زبان کو کلمات خیر کا عادی بنایا ہے' اسی طرح ہمارے دل کو بھی عادی بنا' ان تینوں میں سابق بالخیرات کی مثال اس جولاہے کی سی ہے جو اپنے پیشے کو برا سمجھے اور کاتب بن جائے۔ اور ظالم نفس کی مثال اس جولاہے کی سی ہے جو اپنے پیشے کو برا سمجھ کر بھنگی بن جائے' اور مقتصد کی مثال اس جولاہے کی

سی ہے جو یہ کہے کہ اگرچہ کتابت پارچہ بافی سے افضل ہے' لیکن کیونکہ میں اپنے عجز اور کم علمی کی بنا پر یہ پیشہ اختیار نہیں کر سکتا اسلئے اپنے پیشے میں رہوں گا جو یقیناً پاخانہ صاف کرنے سے افضل ہے۔

اس کلام کے بعد حضرت رابعہ عدویہ کے قول کی تفسیر سہل ہے' انھوں نے فرمایا کہ ہمارے استغفار کو بھی استغفار کی ضرورت ہے' ان کا مقصد یہ ہے کہ جب ہم استغفار کرتے ہیں تو ہمارا دل غافل رہتا ہے' صرف زبان حرکت کرتی ہے' اگرچہ زبان کی حرکت اپنی جگہ مستحسن ہے' لیکن دل کی غفلت بھی اپنی جگہ قبیح ہے' ہمیں اپنے دل کی قباحت سے بھی استغفار کی ضرورت ہے' حضرت رابعہ بصریہ نے زبانی استغفار کی مذمت نہیں فرمائی' بلکہ دل کی غفلت کی مذمت فرمائی ہے' اب اگر کوئی شخص زبان سے بھی استغفار نہیں کرتا اسے دو استغفار کی ضرورت ہے ایک زبان سے استغفار نہ کرنے پر' دوسرے قلب کی غفلت پر' غرض یہ کہ اس قول میں عمدہ چیز (زبانی استغفار) کی تعریف اور مذموم چیز (دل کی غفلت) کی مذمت ہے' اگر ہم نے یہ قول اس طرح نہیں سمجھا تو پھر ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد گرامی کا مطلب بھی نہیں سمجھ پائیں گے۔

حَسَنَاتُ الْأَبْرَارِ سَيِّئَاتُ الْمُقَرَّبِيْنَ

نیک لوگوں کی نیکیاں مقربین کی برائیاں ہیں۔

یہ امور اضافی ہیں' انھیں اضافت کے ساتھ ہی سمجھنا چاہیے' بہرحال کسی معمولی سی معمولی اطاعت کو بھی حقیر نہ سمجھنا چاہیے' اور نہ کسی چھوٹے سے چھوٹے گناہ کو معمولی سمجھ کر نظرانداز کرنا چاہیے۔ حضرت جعفر الصادقؓ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے چار باتیں چار میں مخفی رکھی ہیں' رضا کو اطاعت میں' اس لئے کسی چھوٹی سی طاعت کو بھی حقیر مت جانو' ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا اسی میں پوشیدہ ہو' غضب کو معصیت میں' اسلئے کسی چھوٹے سے گناہ کو بھی حقیر مت سمجھو' ہو سکتا ہے وہی گناہ اللہ کے غضب کا باعث ہو' ولایت کو بندوں میں' اسلئے کسی بندے کو حقیر مت سمجھو ہو سکتا ہے وہی ولی اللہ ہو۔ قبولیت کو دعا میں' اس لئے کسی بھی موقع پر دعا نہ چھوڑو ہو سکتا ہے اس میں قبولیت ہو۔

چوتھا باب

دوائے توبہ اور گناہ پر اصرار کا طریق علاج

آدمی کی دو قسمیں : جاننا چاہیے کہ لوگوں کی دو قسمیں ہیں' ایک وہ جوان جس میں برائی کی رغبت نہ ہو' اس نے خیر پر پرورش پائی ہو' اور شر سے اجتناب کرنا اس کی سرشت میں داخل ہو' ایسے شخص کے بارے میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

يُعْجِبُ رَبُّكَ مِنَ الشَّابِ لَيْسَتْ لَهُ صَبْوَةٌ (احمد' طبرانی۔ عقبہ ابن عامرؓ)

تیرا پروردگار ایسے نوجوانوں پر تعجب کرتا ہے جسے میل ورغبت نہ ہو۔

مگر ایسے لوگ شاذ و نادر ہی ملتے ہیں۔

دوسری قسم میں وہ لوگ ہیں جو گناہ کا ارتکاب کرتے ہیں۔ پھر ان کی بھی دو قسمیں ہیں' توبہ کرنے والے' اور گناہ پر اصرار کرنے والے' اس باب میں ہم یہ بیان کرنا چاہتے ہیں کہ گناہ گار پر اصرار کا علاج کیا ہے' اور اس مرض کے ازالے میں کون سی دوا مؤثر اور شفا بخش ثابت ہو سکتی ہے۔

یہ بات اچھی طرح جان لینی چاہیے کہ توبہ شفا ہے' اور یہ شفا دوا سے حاصل ہوتی ہے' اور دوا سے واقف ہونے کے لئے ضروری ہے کہ آدمی مرض سے بھی واقف ہو' دواء کے معنی ہیں ان اسباب کے خلاف کرنا جو کسی مرض کے وجود کا باعث بنے ہیں' اگر کسی مرض کا علاج کرنا ہو تو اس سبب کا ازالہ کیا جائے جس سے وہ مرض پیدا ہوا ہے' پھر یہ بات بھی مسلم ہے کہ ہر چیز اپنی ضد سے

باطل ہوتی ہے' اس اصول کی روشنی میں دیکھا جائے تو گناہ پر اصرار کا سبب غفلت اور شہوت ہے' غفلت کی ضد علم ہے' اور شہوت کی ضد یہ ہے کہ آدمی شہوات میں ہیجان پیدا کرنے والے اسباب پر صبر کرے' غفلت گناہوں کی جڑ ہے اللہ تعالیٰ نے غافلوں کے انجام کی ان الفاظ میں خبر دی ہے۔

لَاجَرَمَ أَنَّهُمْ فِي الْآخِرَةِ هُمُ الْخَاسِرُونَ (پ ۱۴ ر ۲ آیت ۲۲)

بلاشبہ وہ آخرت میں سخت خسارے میں ہیں۔

غفلت کے علاج کے لئے جو معجون تیار کی جائے گی' اس میں علم کی حلاوت اور صبر کی تلخی کی آمیزش کی جائے گی' جس طرح سکنجبین میں شکر کی حلاوت اور سرکے کا کھٹا پن ہوتا ہے' مگر دونوں کا مجموعہ مقصود ہوتا ہے' اور صفراوی امراض کے علاج میں اسے استعمال کیا جاتا ہے' اسی طرح قلب کے مرض اصرار میں جو معجون استعمال کی جاتی ہے اس میں علم اور صبر دونوں کے فوائد مقصود ہوتے ہیں' اب رہا یہ سوال کہ ازالۂ غفلت کے لئے ہر علم مفید ہے یا کوئی مخصوص علم ہے جس کے ذریعہ اسکا علاج کیا جاتا ہے' اسکا جواب یہ ہے تمام علوم دل کے امراض کا علاج ہیں' لیکن یہ ضروری نہیں کہ ایک علم ہر مرض میں مفید ہو' البتہ ہر مرض کے لئے ایک الگ اور خاص علم ہے' یہی صورت گناہوں پر اصرار کے مرض میں ہے' ذیل میں ہم وہی مخصوص علم بیان کرتے ہیں' جو اس مرض کے لئے مفید ہے' اور فہم سے قریب تر کرنے کے لئے بدن کے امراض کی مثال بھی بیان کرتے ہیں۔

غفلت کی ضد علم : مریض کو علاج سے پہلے متعدد امور کی تصدیق کرنی پڑتی ہے' ان میں سے پہلا امر اس حقیقت کو ماننا ہے کہ مرض و صحت کے کچھ نہ کچھ اسباب ہوتے ہیں' یہ اسباب اللہ تعالیٰ نے ہمارے اختیار میں رکھدئے ہیں' اس حقیقت کا اعتراف دراصل طب کی اصل پر ایمان لانے کے مترادف ہے' جو شخص اصل طب پر ایمان نہیں رکھتا' وہ علاج نہیں کرتا' اور موت کے منہ میں چلا جاتا ہے' زیر بحث مسئلے میں اسکے موازنے کی صورت یہ ہے کہ اصرار کا مریض اصل شریعت پر ایمان لائے یعنی اس حقیقت کا اعتراف کرے کہ آخرت میں سعادت و شقاوت کے کچھ اسباب ہیں' سعادت کا سبب اطاعت ہے' اور شقاوت کا سبب معصیت ہے' اس حقیقت کا ماننا ہی اصل شریعت پر ایمان لانا ہے' خواہ یہ علم بطور تحقیق حاصل ہو' یا بطور تقلید' دوسرا امر جس کا مریض کو علاج سے پہلے تصدیق کرنی پڑتی ہے یہ ہے کسی خاص طبیب کے بارے میں یہ اعتقاد رکھے کہ وہ فن طب میں ماہر ہے' نبض شناس ہے' اور اللہ تعالیٰ نے اسکے ہاتھ میں شفادی ہے' جو دوا وہ تجویز کرتا ہے مفید ہوتی ہے' جو مرض وہ بتلاتا ہے وہی واقع میں ہوتا ہے' وہ ہر بات بے لاگ طریقے پر کہہ دیتا ہے' نہ کوئی بات چھپاتا ہے' اور نہ غلط بیانی کرتا ہے' اسی طرح اصرار کرنے والے کو چاہیے کہ وہ صادق و امین سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت پر ایمان لائے' اور یہ یقین کرے کہ جو کچھ آپ ارشاد فرماتے ہیں وہ حق اور درست ہوتا ہے' اس میں جھوٹ اور غلط بیانی کی آمیزش نہیں ہوتی' تیسرا امر جس کی تصدیق مریض کے لئے ضروری ہے' یہ ہے کہ طبیب کی تشخیص و تجویز پر دھیان دے' اور جو کچھ وہ کہے غور سے سنے' تاکہ مریض کے دل میں مرض کی سنگینی کا خوف سما جائے اور وہ اسکی ہدایت کے مطابق عمل کرسکے' اسی طرح روحانی مریض کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان آیات و روایات کو غور سے سنے جن میں تقویٰ کی ترغیب دی گئی ہے' اور ارتکاب ذنوب' اور اتباع ہونے سے ڈرایا گیا ہے' جو کچھ اس سلسلے میں سنے اسے بلا چون و چرا تسلیم کرے' کسی طرح کا کوئی شک نہ کرے' تاکہ اس سے خوف پیدا ہو' اسی خوف سے دواء کی تلخی اور علاج کی شدت پر صبر کرنے کی قوت پیدا ہوتی ہے چوتھا امر یہ ہے کہ مریض ہر اس بات پر دھیان دے جو طبیب اس کے مرض کے متعلق بتلائے' خواہ وہ داء سے متعلق ہو یا دوا سے تاکہ اسے اپنے احوال' اقوال اور اکل و شرب کی ہر تفصیل معلوم ہوجائے اور یہ بات بھی جان لے کہ اس کے لئے کون سی دوا نفع بخش ہے اور کون سی مضر ہے' کیونکہ دوائیں بے شمار ہیں' اور ہر دوا ہر مرض میں مفید نہیں ہوتی' اسی طرح یہ بات معلوم کرلے کہ اس مرض میں کون کون سی غذائیں مفید ہیں' اور کون کون سی مضر ہیں' مریض کے لئے جس طرح ہر دوا مفید نہیں ہے اسی طرح اس کے لئے ہر چیز سے پرہیز بھی ضروری نہیں ہے' اسی طرح ہر انسان بیک وقت تمام معاصی اور شہوات میں مبتلا نہیں ہوتا

بلکہ ہر مومن کے لئے ایک یا ایک سے زیادہ گناہ مخصوص ہوتے ہیں' اسلئے اصرار کرنے والے کے لئے سر دست یہ ضروری ہے کہ وہ گناہوں کو جان لے' پھر ان کی آفات کا علم حاصل کرے اور یہ دیکھے کہ دین میں ان سے کس قدر نقصان ہو سکتا ہے' پھر ان پر صبر کرنے کا طریقہ دریافت کرے اور یہ جانے کہ جو گناہ مجھ سے سرزد ہو چکے ہیں' ان کا ازالہ کیسے ہو۔ یہ وہ علوم ہیں جن سے اطبائے دین یعنی انبیاء کے وارث علماء ہی واقف ہیں۔

علماء کا فرض : جب عاصی کو یہ معلوم ہو جائے کہ اس سے فلاں گناہ سرزد ہوا ہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ کسی طبیب (عالم) سے اپنا علاج کرائے' اور اگر اسے اپنے مرض کی پہچان نہ ہو تو عالم کو چاہیے کہ وہ اس کے مرض کی نشاندہی کرے' اور اس کی صورت یہ ہے کہ ہر عالم کسی ایک ملک' شہر' محلّے' مسجد' یا مجمع کا کفیل ہو جائے' اور انھیں دین کی تعلیم دے' جو چیزیں ان کے لئے معتر ہیں' وہ بتلائے' جو مفید ہیں ان کی خبر دے' سعادت اور شقاوت کے تمام اسباب پوری وضاحت سے بیان کر دے' عالم کو یہ انتظار نہ کرنا چاہیے کہ لوگ مجھ سے دریافت کریں تو میں انھیں بتلاؤں' بلکہ خود لوگوں کو اپنے پاس بلائے' یا ان کے پاس جائے' اور انھیں صحیح راستہ بتلائے' کیونکہ وہ انبیاء کرام کے وارث ہیں' اور دعوت و تبلیغ میں انبیاء کرام کا اصول یہ رہا ہے کہ خود ہی لوگوں کو پکارتے پھرتے تھے' گھر گھر جاتے تھے' اور راہ حق کی دعوت دیتے تھے' ایک ایک کو تلاش کر کے اسے دین کی تلقین کرتے تھے' عام طور پر لوگ اپنے دلوں کے امراض سے واقف نہیں ہوتے' اسلئے علماء کو از خود ان کی رہنمائی کرنی چاہیے' ظاہری امراض میں تو آدمی خود بھی طبیب کی طرف رجوع کر سکتا ہے' مثلاً کوئی شخص برص میں مبتلا ہو یا اسکے چہرے پر داغ ہوں تو وہ آئینہ دیکھ کر اپنے مرض کا حال جان سکتا ہے' مگر آئینہ ہر شخص کے پاس نہیں ہوتا' جسکے پاس آئینہ نہیں اسے اپنا مرض اس وقت تک معلوم نہ ہو گا جب تک کہ کوئی دوسرا اسے نہ بتلادے یہ تمام علماء کا فرض عین ہے' سلاطین کو چاہیے کہ وہ ہر بستی اور ہر محلے میں ایک دیندار فقیہ مقرر کرے جو لوگوں کو ان کے دین کی تعلیم دے سکے' لوگ جاہل پیدا ہوتے ہیں' اس لئے اصول و فروع میں دین کی دعوت ان تک پہنچانا ضروری ہے' دنیا ایک بیمار خانہ ہے' جو زیر زمین ہے وہ مردہ ہے' اور جو بالائے زمین ہے وہ بیمار ہے' دل کی بیماریاں جسم کی بیماریوں سے زیادہ ہیں' اس لئے دنیا کے ہسپتال میں جسمانی مریضوں کی بہ نسبت روحانی مریضوں کی کثرت ہے' علماء اس ہسپتال کے ڈاکٹر ہیں' اور سلاطین اسکے منتظم ہیں' اگر کوئی مریض اپنے طبیب کا مشورہ قبول نہ کرے' اور اس کی تجویز کردہ دوا نہ لے تو اسے سلاطین کے سپرد کر دینا چاہیے' تاکہ وہ لوگوں کو اسکے شر سے محفوظ رکھ سکے' جس طرح کوئی مریض پرہیز نہیں کرتا یا دیوانہ ہو جاتا ہے' تو اسے داروغۂ زنداں کے حوالے کر دیا جاتا ہے' تاکہ وہ اسے زنجیروں میں قید کر سکے' اور لوگوں کو اور خود اسکو اس کے شر سے بچا سکے۔

دل کے امراض زیادہ کیوں ہیں : دل کے امراض جسم کے امراض کی بہ نسبت زیادہ ہیں' اس کی تین وجہیں ہیں' پہلی وجہ تو یہ ہے کہ مریض یہ نہیں جان پاتا کہ وہ کسی مرض میں مبتلا ہے' دوسری وجہ یہ ہے کہ اس مرض کا انجام دنیا میں مشاہد نہیں ہے' جب کہ جسمانی امراض کا انجام دنیا ہی میں سامنے آجاتا ہے' یعنی موت آجاتی ہے' اسی لئے لوگ جسمانی امراض سے ڈرتے ہیں کیونکہ وہ یہ جانتے ہیں کہ اگر ہم نے علاج نہیں کیا تو موت ہمیں صفحۂ ہستی سے مٹادے گی' دل کے گناہوں کا انجام دل کی موت ہے' لیکن دنیا میں اسکا پتہ نہیں چلتا' اسی لئے گناہوں سے نفرت کم ہوتی ہے' اگرچہ انسان کو معلوم ہوتا ہے کہ میں گناہ گار ہوں' لیکن وہ اپنے گناہ کو کوئی خاص اہمیت نہیں دیتا' اور عفو و بخشش کے معاملات میں اللہ پر توکل کرتا ہے' جب کہ جسمانی امراض میں توکل نہیں کرتا' بلکہ ایک طبیب سے دوسرے طبیب تک بھاگا بھاگا پھرتا ہے' تیسری وجہ سب سے اہم اور بنیادی ہے' بلکہ بجائے خود ایک سنگین اور ناقابل علاج مرض ہے' وہ یہ ہے کہ اطبائے قلب مفقود ہیں' ان امراض میں جن لوگوں کی طرف رجوع کیا جا سکتا ہے وہ علماء ہیں لیکن آج کے دور میں وہ خود سخت ترین امراض کا شکار ہیں' وہ دوسروں کا علاج کیا کریں گے خود اپنے علاج سے عاجز ہیں کیونکہ یہ امراض عام ہیں' اور شاذ و نادر ہی کوئی شخص ان سے بچا ہوا ہے' اس لئے علماء کا عیب ظاہر نہیں ہوپاتا' اور وہ مخلوق کو بہکاتے رہتے ہیں' اور انھیں ایسی ایسی باتیں بتلاتے ہیں جن سے ان کے مرض میں اضافہ ہو' سب سے زیادہ ہلاکت آفریں مرض دنیا کی محبت ہے' اور اطبائے دین پر اسی کا غلبہ ہے یہی

وجہ ہے کہ تم دوسروں کے لئے علاج کی تجویز کرتے ہو، اور خود اسی مرض میں مبتلا ہو، اسی وجہ سے یہ مرض عام ہو گیا، بلکہ ایک وبا بن گیا، ہر شخص اسی ناقابل علاج مرض میں گرفتار نظر آتا ہے، اطباء کے فقدان کی وجہ سے مخلوق خدا ہلاکت اور تباہی سے دوچار ہو رہی ہے، جنھیں طبیب بننا چاہیے تھا وہ اللہ کے سادہ لوح بندوں کو لوٹنے کے لئے طرح طرح کے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں اور مختلف طریقے سے گمراہ کرتے ہیں، اگر ان کے لئے بھلائی نہیں کر سکتے تو بددیانتی بھی نہ کریں اصلاح نہیں کر سکتے تو انھیں بگاڑیں بھی نہیں، بلکہ اگر چپ رہیں تو یہی بہتر ہے، کیونکہ جب بھی یہ زبان کھولتے ہیں، ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ ان کی طرف رجوع کریں، اور یہ مقصد صرف اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے کہ انھیں مغفرت کی جھوٹی امیدیں دلائیں، رجاء کے اسباب کو ترجیح دیں، رحمت کے دلائل ذکر کریں، اور جان بوجھ کر ایسی روایات و آثار سے گریز کریں، جن میں عذاب سے ڈرایا گیا ہے، اور اللہ کے غضب کا ذکر کیا گیا ہے، لوگوں کو ان کے مواعظ میں بڑا سکون ملتا ہے، ان کی باتیں کانوں میں رس گھولتی ہیں اور دلوں کو سرمایہ فراہم کرتی ہیں، چنانچہ جب وہ ان نام نہاد عالموں کی محفلوں سے لوٹتے ہیں تو گناہ پر ان کی جرأت کچھ اور بڑھ جاتی ہے، اور اللہ کے فضل پر توکل میں کچھ اور اضافہ ہو جاتا ہے۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اگر طبیب جاہل یا بددیانت ہو تو وہ اپنے مریض کو مہلک دوا دے دیتا ہے، اور بجائے تندرست کرنے کے موت کے منہ میں دھکا دیتا ہے، کیوں کہ اسے وہ دوا نہیں دی جاتی جس کی اسے ضرورت ہے، اور اس طریقے سے نہیں دی جاتی جس طریقہ سے دی جانی چاہیے۔

رجاء اور خوف : رجاء اور خوف دو الگ الگ دوائیں ہیں، اور دونوں دو ایسے مریضوں کے لئے مفید ہیں جن کا مرض ایک دوسرے سے مختلف ہو، جس شخص پر خوف کا غلبہ ہو، یہاں تک کہ اس نے دنیا سے مکمل کنارہ کشی اختیار کر لی ہو، اور اپنے نفس کو ایسے امور کا مکلف بنا لیا ہو جو اس کی حد استطاعت سے باہر ہیں یہاں تک کہ زندگی کا پیرہن اسکے وجود پر تنگ ہو گیا ہو تو اس کے علاج کے لئے رجاء کی ضرورت ہے، اسے رجاء کے مضامین سنائے جائیں گے، تاکہ خوف میں اسکی انتہا پسندی کا خاتمہ ہو، اور اس کی طبیعت اعتدال پر آئے، اسی طرح وہ شخص جو گناہوں پر اصرار کرتا ہے، اگرچہ اسکے دل میں توبہ کی خواہش ہے، لیکن وہ اپنے گناہوں کی کثرت اور سنگینی کے پیش نظر قبولیت سے مایوس ہے، اور یہ سمجھتا ہے کہ میں گناہوں کے دلدل میں اس قدر ڈوب چکا ہوں کہ اب باہر نکلنا ممکن نہیں رہا۔ میں اتنا سیاہ کار ہوں کہ اللہ تعالیٰ کی نظر رحمت مجھ پر پڑ ہی نہیں سکتی، ایسے شخص کے لئے دوائے رجاء کی ضرورت ہے، تاکہ وہ قبولیت توبہ کی امید رکھے، اور بارگاہ خداوندی میں اپنے گناہوں سے توبہ کرے، اس کے برعکس جو شخص فریب خوردہ ہو، اور آزادی کے ساتھ گناہوں میں مبتلا ہو، اس کا علاج اسباب رجاء کے ذکر سے کرنا ایسا ہے جیسے کسی گرم مزاج انسان کو شہد کھانے کے لئے دیا جائے، اور یہ امید رکھی جائے کہ وہ شہد کے استعمال سے تندرست ہو جائے گا۔ یہ جاہلوں اور غبیوں کا شیوہ ہے عقل مند طبیب ایسا نہیں کر سکتا، خلاصہ یہ ہے کہ طبیبوں کے فساد سے عوام الناس کی بیماری ناقابل علاج ہو چکی ہے۔

وعظ کا صحیح طریقہ : اب ہم وعظ کا صحیح طریقہ بیان کرتے ہیں، گناہ پر اصرار کرنے والوں کے لئے یہی طریقہ نفع بخش ہو سکتا ہے، اگرچہ اسکا بیان بڑا تفصیلی ہے، اور اس کے تمام پہلوؤں کا استقصاء نہایت دشوار ہے، لیکن ہم وہ اقسام ضرور بیان کریں گے جن سے لوگوں کو ترک گناہ پر آمادہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ چار انواع ہیں، ان میں سے ہر نوع کا الگ الگ ذکر کیا جاتا ہے۔

پہلی قسم : یہ ہے کہ قرآن کریم میں جو آیات گنہ گاروں اور بدکاروں کو ڈرانے اور خوف دلانے کے لئے مذکور ہیں، انھیں بیان کرے، اسی طرح اس موضوع کی روایات بھی ذکر کرے، مثلاً اس طرح بیان کرے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے۔

مَامِنْ يَوْمٍ طَلَعَ فَجْرُهُ وَلَا لَيْلَةٍ غَابَ شَفَقُهَا إِلَّا وَمَلَكَانِ يَتَجَاوَبَانِ بِأَرْبَعَةِ أَصْوَاتٍ يَقُوْلُ أَحَدُهُمَا يَالَيْتَ هٰذَا الْخَلْقَ لَمْ يُخْلَقُوْا وَيَقُوْلُ الْآخَرُ يَالَيْتَهُمْ

اِذْ خُلِقُوْا عَلِمُوْا لِمَاذَا خُلِقُوْا فَيَقُوْلُ الْآخَرُ يَا لَيْتَهُمْ اِذْلَمْ يَعْلَمُوْا لِمَا ذَا خُلِقُوْا عَمِلُوْا بِمَا عَلِمُوْا۔

ہر روز جب فجر طلوع ہوتی ہے اور ہر رات جب شفق ڈوبتی ہے دو فرشتے چار آوازوں میں ایک دوسرے کا جواب دیتے ہیں' ان میں سے ایک کہتا ہے کاش یہ لوگ پیدا ہی نہ ہوتے دوسرا کہتا ہے کیا اچھا ہوتا اگر یہ لوگ پیدا ہونے کے بعد یہ جان لیتے کہ کس لئے پیدا ہوئے ہیں' پھر پہلا کہتا ہے کیا اچھا ہوتا کہ جب انہیں اپنے پیدا ہونے کی وجہ معلوم نہیں تو جو بات معلوم ہے اسکے مطابق عمل کرتے۔

ایک روایت میں یہ مکالمہ اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ ایک فرشتہ کہتا ہے کہ کیا اچھا ہوتا اگر یہ لوگ آپس میں بیٹھتے اور جو کچھ جانتے ہیں ایک دوسرے کو بتلاتے' دوسرا کہتا ہے کہ کیا خوب ہوتا اگر یہ لوگ اپنے علم کے مطابق عمل نہ کرتے تو اپنے اعمال سے توبہ ہی کر لیتے۔ (۱)

ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ جب بندہ کوئی گناہ کرتا ہے تو دائیں طرف کا فرشتہ بائیں طرف کے فرشتے سے (پہلا دوسرے کا حاکم ہے) کہتا ہے کہ ابھی چھ ساعت یہ گناہ درج نہ کرنا' چنانچہ اگر وہ اس عرصے میں توبہ و استغفار کر لیتا ہے تو نہیں لکھتا ورنہ لکھ لیتا ہے' ایک بزرگ کا ارشاد ہے کہ جب بندہ کوئی گناہ کرتا ہے تو اس جگہ کی زمین جہاں وہ گناہ سرزد ہوا ہوتا ہے' جناب باری میں عرض کرتی ہے کہ اگر حکم ہو تو میں شق ہو جاؤں' اور اس گناہ گار کو دھنسا دوں' نیز اسکے اوپر کا آسمان عرض کرتا ہے کہ اگر حکم ہو تو میں اس پر ٹوٹ پڑوں' مگر اللہ تعالیٰ دونوں کی درخواست مسترد کر دیتا ہے' اور فرماتا ہے کہ میرے بندے سے باز رہو' تم نے اسے پیدا نہیں کیا ہے' اگر تم اسے پیدا کرتے تو شاید اسکے حال پر رحم کرتے ہو سکتا ہے' یہ توبہ کر لے' اور میں اسکی بخشش کر دوں' یا کوئی نیک عمل کرے اور وہ اس گناہ کا بدل بن جائے' اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں یہی بات بیان کی گئی ہے' فرمایا۔

اِنَّ اللّٰهَ يُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ اَنْ تَزُوْلَا ۚ وَلَئِنْ زَالَتَا اِنْ اَمْسَكَهُمَا مِنْ اَحَدٍ مِّنْ بَعْدِهٖ (پ ۲۲ ر ۱۷ آیت ۴۱)

یقینی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین کو تھامے ہوئے ہے کہ وہ موجودہ حالت کو چھوڑ نہ دیں' اور اگر موجودہ حالت کو چھوڑ بھی دیں تو پھر خدا کے سوا اور کوئی ان کو تھام بھی نہیں سکتا۔

حضرت عمر رضی اللہ سے حدیث مروی ہے کہ مہر لگانے والا عرش الٰہی سے معلق ہے' جب بے حرمتیاں ہوتی ہیں' اور حرام چیزوں کو حلال سمجھا جانے لگتا ہے' تو اللہ تعالیٰ مہر لگانے والے کو بھیج دیتے ہیں' وہ دلوں پر مہر لگا دیتا ہے' چنانچہ جو چیزیں دلوں کے اندر رہتی ہیں وہ دلوں میں رہ جاتی ہیں' (ابن عدی ابن حبان ۔ ابن عمرؓ)

حضرت مجاہد سے ایک حدیث منقول ہے کہ دل کھلی ہتھیلی کی طرح ہوتا ہے' جب آدمی ایک گناہ کرتا ہے تو اسکی ایک انگلی بند ہو جاتی ہے' یہاں تک کہ تمام انگلیاں بند ہو جاتی ہیں' پھر دل بند ہو جاتا ہے' اور یہی اسکی مہر ہے حضرت حسن بصریؒ ارشاد فرماتے ہیں کہ بندے اور اس کے رب کے درمیان معاصی کی ایک معلوم حد ہے' جب بندہ اس حد پر پہنچتا ہے اللہ تعالیٰ اسکے دل پر مہر لگا دیتا ہے' پھر اسے عمل خیر کی توفیق نہیں ہوتی' معاصی کی مذمت' اور تائبین کی مدحت میں بے شمار آثار و اخبار مروی ہیں' اگر واعظ وارث رسول ہے تو اسے یہ اخبار و آثار بکثرت ذکر کرنے چاہئیں' اسلئے کہ یہی روایات سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ورثہ ہیں' حدیث شریف میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے درہم و دینار نہیں چھوڑے' بلکہ علم و حکمت کا ورثہ چھوڑا ہے' ہر عالم کو اس

---

(۱) یہ روایت ان الفاظ میں غریب ہے' مجھے کہیں نہیں ملی' البتہ ابو منصور دیلمی نے مسند الفردوس میں حضرت ابن عمرؓ سے ایک روایت نقل کی ہے' جس میں فرشتوں کا ایک مکالمہ ذکر کیا گیا ہے

ورثے میں سے اسی قدر ملا ہے جس قدر اس نے لینا چاہا ہے (بخاری - عمرو بن الحرث)

دوسری قسم: یہ ہے کہ انبیاء اور سلف صالحین کے واقعات ذکر کرے، اور یہ بتلائے کہ اگر ان سے گناہ سرزد ہوا تو اس کی سزا میں انھیں کتنے زبردست مصائب برداشت کرنے پڑے، اس طرح کے واقعات قلوب پر اثرانداز ہوتے ہیں، اور ان کا نفع محسوس ہوتا ہے، سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام کا واقعہ ہے کہ انھیں ایک نافرمانی کی بنا پر جنت سے نکلنا پڑا، روایات میں یہاں تک بیان کیا گیا ہے کہ جب انھوں نے شجر ممنوعہ کا پھل کھایا تو ان کے جسم کی تمام گرہیں کھل گئیں، ستر ظاہر ہو گیا صرف تاج سر پر اور اکلیل چہرے پر باقی رہ گیا، حضرت جبرئیل نے آکر تاج اور اکلیل سر اور چہرے سے جدا کیا، آسمان سے آواز آئی "تم دونوں مجھ سے دور ہو جاؤ، نافرمانوں کے لیے یہاں کوئی گنجائش نہیں ہے"، حضرت آدم علیہ السلام نے روتے ہوئے حضرت حوا علیہ السلام سے کہا کہ معصیت کی پہلی نحوست یہ ہے کہ ہم محبوب کی قربت سے محروم کئے گئے، حضرت سلیمان ابن داؤد علیہ السلام کا واقعہ بھی مشہور ہے کہ انھیں اس بت کی وجہ سے سزا دی گئی تھی جو چالیس روز تک انکے محل میں پوجا گیا۔ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ ایک عورت نے آپ سے درخواست کی تھی کہ میرے باپ کی خواہش کے مطابق فیصلہ کرنا مگر آپ نے ایسا نہ کیا، بعض لوگوں کی رائے یہ ہے کہ انھوں نے ایک عورت کے باپ کے حق میں فیصلہ دے دیا تھا کیونکہ اس عورت کے لئے آپ کے دل میں کوئی جگہ تھی، وجہ جو بھی ہو، بہرحال آپ سے غلطی سرزد ہوئی، اور اسکی سزا یہ دی گئی کہ چالیس روز کے لئے سلطنت سے محروم کر دیئے گئے، سلطنت سے ہی نہیں بلکہ کھانے پینے سے بھی محروم ہو گئے، ادھر ادھر بھاگے بھاگے پھرتے، لوگوں سے کہتے کہ میں داؤد کا بیٹا سلیمان ہوں، مجھے کھانا دو، مگر لوگ انھیں ڈانٹ کر بھگا دیتے، ایک بڑھیا سے آپ نے کھانا مانگا تو اس نے منہ پر تھوک دیا، ایک بڑھیا نے پیشاب سے لبریز برتن آپ کے سر پر الٹ دیا، یہاں تک کہ آپکی انگوٹھی ایک مچھلی کے پیٹ سے نکلی، اور آپ نے چالیس روز بعد یہ انگوٹھی پہنی تو پرندے آپ کے سر پر آکر بیٹھ گئے، شیاطین، جنات، اور درندوں نے آپ کے ارد گرد اجتماع کیا، ان میں سے بعض نے اپنی بدسلوکی کی معذرت کی تو آپ نے فرمایا میں نے آج سے پہلے تمہیں اس بدسلوکی کے لئے ملامت نہیں کی، اور نہ آج میں معذرت پر تمہاری تعریف کروں گا، یہ ایک آسمانی حکم تھا، جسے ہر حال میں ظاہر ہونا تھا۔

اسرائیلی روایات میں یہ واقعہ مذکور ہے کہ بنی اسرائیل کے ایک شخص نے کسی دوسرے شہر میں نکاح کیا تھا، خود کسی وجہ سے اس عورت کو ساتھ نہ لا سکا، اپنے غلام کو لینے کے لئے بھیجا، راستے میں نفسانی خواہشات نے سر ابھارا اور اسکا دل چاہا کہ میں اس سے اپنا قصد پورا کر لوں لیکن اس نے اپنے نفس پر مجاہدہ کیا، اور نفس کو اسکی خواہش سے روکے رکھا، اللہ تعالیٰ نے اس مجاہدے کا یہ صلہ عطا فرمایا کہ اسے پیغمبر بنا دیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت خضر علیہ السلام سے دریافت کیا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو علم غیب کس بنا پر عطا فرمایا؟ انھوں نے جواب دیا کہ اس وجہ سے کہ میں نے اللہ کے واسطے تمام گناہ ترک کر دیئے ہیں، روایات میں ہے کہ ہوا بھی حضرت سلیمان علیہ السلام کے حکم کے تابع تھی، ایک مرتبہ آپ کو اپنی نئی قمیض اچھی معلوم ہوئی، آپ نے نظر بھر کر اسے دیکھا، ہوا نے انھیں نیچے گرا دیا، آپ نے ہوا سے پوچھا تو نے ایسا کیوں کیا، میں نے تجھے گرانے کا حکم نہیں دیا تھا، ہوا نے عرض کیا کہ ہم آپ کی اطاعت اسی وقت کرتے ہیں جب آپ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرتے ہیں، روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت یعقوب علیہ السلام سے پوچھا کہ کیا تم جانتے ہو میں نے تمہیں یوسف سے جدا کیوں کیا انھوں نے عرض کیا نہیں۔ جواب ملا کہ تم نے ایک مرتبہ یوسف کے بھائیوں سے یہ کہا تھا۔

وَأَخَافُ أَن يَأْكُلَهُ الذِّئْبُ وَأَنتُمْ عَنْهُ غَافِلُونَ (پ ۱۲ ر ۱۲ آیت ۱۳)

اور میں یہ اندیشہ کرتا ہوں کہ اسکو کوئی بھیڑیا کھا جائے اور تم اس سے بے خبر ہو۔

تم نے بھیڑیے کا خوف کیا، مجھ سے امید نہ رکھی، تم نے یوسف کے بھائیوں کی غفلت پر نظر کی، میری حفاظت پر نظر نہ ڈالی، اسکے

بعد ارشاد ہوا کہ کیا تم جانتے ہوں میں نے یوسف کو تمہارے پاس واپس کیوں بھیجا عرض کیا نہیں' جواب ملا اس لئے کہ تم نے ایک مرتبہ یہ کہا تھا۔

عَسَى اللّٰهُ أَنْ يَأْتِيَنِي بِهِمْ جَمِيعًا (پ ۱۳ ر ۴ آیت ۸۳)

اللہ سے امید ہے کہ ان سب کو مجھ تک پہنچا دے گا۔

نیز یہ بھی کہا تھا۔

اِذْهَبُوا فَتَحَسَّسُوا مِنْ يُوسُفَ وَأَخِيهِ وَلَا تَيْأَسُوا مِنْ رَوْحِ اللّٰهِ (پ ۱۳ ر ۴ آیت ۸۷)

جاؤ اور یوسف اور اسکے بھائی کی تلاش کرو' اور اللہ کی رحمت سے ناامید مت ہو۔

حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ ہے کہ انھوں نے بادشاہ کے مصاحب سے کہا تھا اُذْكُرْنِي عِنْدَ رَبِّكَ (اپنے رب کے پاس ہمارا ذکر کرنا) اللہ تعالیٰ نے اس واقعے کا ان الفاظ میں ذکر فرمایا۔

فَأَنْسَاهُ الشَّيْطَانُ ذِكْرَ رَبِّهِ فَلَبِثَ فِي السِّجْنِ بِضْعَ سِنِينَ (پ ۱۲ ر ۱۴ آیت ۴۲)

پھر اسکو اپنے آقا سے تذکرہ کرنا شیطان نے بھلا دیا تو قید خانے میں اور بھی چند سال ان کا رہنا ہوا۔

اس طرح کے واقعات بے شمار ہیں' قرآن و حدیث میں ان کا ذکر قصہ کہانی کے طور پر نہیں آیا' بلکہ عبرت کے لئے آیا ہے' جنھیں اللہ نے عقل اور بصیرت سے نوازا ہے انھیں اس طرح کے واقعات سے عبرت پکڑنی چاہیے اور یہ سوچنا چاہیے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں۔ جو محبوب خدا ہوتے ہیں۔ کے صغائر معاف نہیں فرمائے تو ہم جیسے لوگوں کے کبائر کس طرح معاف ہو سکتے ہیں' البتہ یہ ان کی سعادت اور نیک بختی تھی کہ دنیا ہی میں سزا دیدی گئی' ان کا معاملہ آخرت پر نہیں رکھا گیا' جب کہ بد بختوں کو چھوٹ دی جائے گی' تاکہ ان کے گناہوں میں اضافہ ہو' یا اس لئے کہ آخرت کا عذاب زیادہ بڑا اور زیادہ شدید ہوتا ہے' اگر اس طرح کی باتیں گناہ پر اصرار کرنے والوں کے سامنے کی جائیں تو امید یہ ہے کہ انھیں نفع ہو گا' اور ان کے دلوں میں توبہ کی تحریک پیدا ہو گی۔

تیسری قسم : گناہ پر اصرار کرنے والوں کو بتلایا جائے کہ یہ خیال نہ کرنا چاہیے کہ صرف آخرت ہی میں گناہوں کی سزا ملے گی' بلکہ دنیا میں بھی مل سکتی ہے' چنانچہ بندوں پر جو مصائب نازل ہوتے ہیں' ان کا سبب وہ گناہ ہیں جن کے وہ مرتکب ہوتے ہیں' بعض لوگوں کو دیکھا گیا ہے کہ وہ آخرت کے معاملے میں تساہل برتتے ہیں' اور اخروی عذاب کے مقابلے میں دنیا کے عذاب سے زیادہ خوف زدہ رہتے ہیں' یہ ان کی انتہائی جہالت ہے' انھیں دنیا کے عذاب سے بھی ڈرایا جانا چاہیے' ضروری نہیں کہ عذاب کی شکلیں اور نوعیتیں وہی ہوں جو آخرت میں ہوں گی' بلکہ دنیا کی مصیبتیں' پریشانیاں اور تفکرات سب گناہوں کا نتیجہ ہیں' اور عام طور پر لوگ اس نتیجے کا سامنا کرتے رہتے ہیں' اکثر یہی ہوتا ہے کہ دنیا میں گناہوں کی نحوست سامنے آجاتی ہے' جیسا کہ داؤد علیہ السلام کے قصے میں بیان کیا گیا ہے' یہاں تک کہ گناہ کے باعث گنہ گاروں پر رزق کا دروازہ تنگ ہو جاتا ہے' بعض بد کردار لوگ عزت و وقار کھو دیتے ہیں' اور دشمن ان پر غلبہ حاصل کر لیتے ہیں' حدیث شریف میں ہے۔

اِنَّ الْعَبْدَ لَيُحْرَمُ الرِّزْقَ بِالذَّنْبِ يُصِيبُهُ (ابن ماجہ' حاکم۔ ثوبان)

بندہ کبھی گناہ کے سبب رزق سے محروم ہو جاتا ہے۔

حضرت عبد اللہ ابن مسعودؓ فرماتے ہیں میرے خیال سے آدمی گناہ کے باعث علم بھول جاتا ہے' اس حدیث شریف میں یہی مراد ہے' فرمایا۔

مَنْ قَارَفَ ذَنْبًا فَارَقَهُ عَقْلٌ لَا يَعُودُ إِلَيْهِ أَبَدًا (۱)

---

(۱) یہ روایت پہلے بھی گزر چکی ہے

جو شخص گناہ کا ارتکاب کرتا ہے اس سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے عقل رخصت ہو جاتی ہے۔

ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ لعنت یہی نہیں کہ آدمی روسیاہ ہو جائے یا اس کا مال ضائع ہو جائے' بلکہ لعنت یہ بھی ہے کہ آدمی ایک گناہ سے نکلے اور اسی جیسے یا اس سے شدید تر گناہ میں ملوث ہو جائے' حقیقت بھی یہی ہے اس لئے کہ لعنت کے معنی ہیں' دھتکارنا' اور دور کرنا' جب آدمی کو خیر کی توفیق نہیں ہوتی۔ اور شر کے بعد سیاہ ہو جاتے ہیں تو وہ رحمت سے دور ہو جاتا ہے' ہر گناہ دوسرے گناہ کا داعی ہے' اس طرح گناہ بڑھتے رہتے ہیں' اور گناہوں کے ساتھ ساتھ اس رزق سے محرومی بھی بڑھتی رہتی ہے' جو علماء اور صلحاء کی ہم نشینی سے حاصل ہوتا ہے' خدا کا مبغوض بننے کی وجہ سے وہ بزرگوں کی نظروں سے گر جاتا ہے' اور ان کی پاکیزہ مجلسوں میں بیٹھنے کا اہل نہیں رہتا۔ ایک عارف کا واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ کیچڑ میں اپنے پائینچے اٹھائے چلے جا رہے تھے' اور قدم احتیاط سے جما جما کر رکھتے تھے تاکہ پھسل نہ جائیں' مگر سوء اتفاق سے پاؤں پھسل گیا' اور موصوف گر پڑے' اس کے بعد اٹھے' اور کیچڑ کے درمیان چلنے لگے' اس حالت میں روتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے' کہ یہ اس شخص کا حال ہوتا ہے جو گناہوں سے اجتناب کرتا ہے' لیکن ایک آدھ بار لغزش کھا کر گناہوں میں دھنس جاتا ہے' ان بزرگ نے گویا' یہ بھی فرمایا کہ گناہ کی عقوبت میں یہ بھی داخل ہے کہ دوسرے گناہ کا ارتکاب کرے۔ عارفین کے نزدیک دنیا کی تمام مصیبتیں گناہوں کی عقوبتیں ہیں' حضرت فضیل ابن عیاض فرماتے ہیں کہ تم پر زمانے کی گردش آئے یا تمہارے دوست تم پر ستم ڈھائیں' ان سب کو اپنے گناہوں کا ورثہ سمجھو۔ ایک بزرگ یہ کہتے ہیں کہ جب میرا گدھا سرکش اور بد خلق ہو جاتا ہے تو میں جان لیتا ہوں کہ یہ میرے کسی گناہ کی سزا ہے۔ ایک بزرگ کہتے ہیں کہ میں گھر کے چوہوں کے روپ میں عقوبت پہچان لیتا ہوں' شام کے ایک صوفی کہتے ہیں کہ میں نے ایک خوب رو نصرانی غلام دیکھا' اور چند لمحے دیکھتا رہا' اسی اثناء میں میرے پاس ابن الجلاء دمشقی گزرے' اور انھوں نے میرا ہاتھ پکڑ لیا' میں سخت شرمندہ ہوا' اور کہنے لگا' سبحان اللہ! قربان جایئے اللہ تعالیٰ کی محکم صنعت پر' دوزخ کی آگ میں جلانے کے لئے کیا حسین صورت بنائی ہے' انھوں نے میرا ہاتھ دبایا' اور فرمایا چند روز کے بعد تمہیں اسکی سزا ملے گی' صاحب واقعہ کہتے ہیں کہ تیس برس بعد مجھے اس گناہ کی سزا ملی' ابو سلیمان دارانی کہتے ہیں کہ احتلام ہونا بھی سزا ہے' نیز کسی کا جماعت سے محروم ہو جانا بھی ایک عقوبت ہے' جو اسے کسی گناہ پر دی جاتی ہے' حدیث شریف میں ہے۔

مَا أَنْكَرْتُمْ مِنْ زَمَانِكُمْ فِيمَا غَيَّرْتُمْ مِنْ أَعْمَالِكُمْ (بیہقی فی الزہد۔ ابو الدرداء)

زمانے کی جو بات تمہیں بری معلوم ہو اسے اپنے اعمال کے تغیر کا نتیجہ سمجھو۔

ایک روایت میں ہے کہ جب کوئی بندہ اپنی شہوت کو میری اطاعت پر ترجیح دیتا ہے تو میں اسے معمولی سے معمولی سزا یہ دیتا ہوں کہ اپنی مناجات کی لذت سے محروم کر دیتا ہوں۔ (۱) ابو عمران ابن علوان سے ایک طویل قصہ نقل کیا گیا ہے اسکا ایک ٹکڑا یہ ہے کہ میں ایک روز نماز پڑھ رہا تھا کہ میرے دل میں ایک خواہش نے انگڑائی لی' اور میں دیر تک اسکے بارے میں سوچتا رہا' یہاں تک کہ اس سے لواطت کی خواہش پیدا ہوئی' میں فوراً ہی زمین پر گر پڑا' اور میرا تمام جسم سیاہ پڑ گیا' میں تین دن گھر میں چھپا رہا' اس عرصے میں صابن مل مل کر نہاتا' لیکن جسم کی سیاہی دور نہ ہوتی' بلکہ بڑھتی رہی' تین روز کے بعد رنگ صاف ہوا' اسکے بعد حضرت جنید کی خدمت میں انکی دعوت پر عازم بغداد ہوا' جب انکے سامنے حاضر ہوا تو انھوں نے فرمایا' تمہیں اللہ سے شرم نہ آئی کہ نماز کی حالت میں ایسا غلط خیال آیا' اگر میں تمہارے لئے دعاء نہ کرتا' اور تمہاری طرف سے توبہ نہ کرتا تو تم اسی سیاہ رنگ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے یہاں جاتے' مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ انھیں میرا حال کیسے معلوم ہو گیا جب کہ میں رقہ میں تھا اور وہ بغداد میں تشریف رکھتے تھے۔

---

(۱) یہ روایت مجھے نہیں ملی

جاننا چاہیے کہ جب کوئی بندہ گناہ کا ارتکاب کرتا ہے' اس کا چہرہ دل سیاہ پڑجاتا ہے' اگر وہ خوش بخت ہو تو دل کی سیاہی چہرے پر نمایاں ہوجاتی ہے' تاکہ وہ متنبہ ہوجائے' اور بد عملی سے رک جائے' اور بدبخت ہوتا ہے تو پھر کوئی اثر چہرے پر نہیں آتا' تاکہ وہ گناہوں میں منہمک رہے اور عذاب کا مستحق ہو۔ بہرحال دنیا میں گناہوں کے بے شمار آفات ہیں جیسے فقر اور مرض وغیرہ دنیا میں گناہوں کی یہ نحوست کیا کم ہے کہ آدمی گناہ کے بعد اسکے اثرات کا شکار رہے' یعنی گناہ کی سزا میں مصیبت کا شکار ہو۔ اور اس مصیبت پر اچھی طرح صبر کرنے سے بھی محروم رہے' تاکہ بدبختی اور بڑھ جائے۔ اور اگر مصیبت سے مہلت دیکر کوئی نعمت اسے دی جائے تو پر شکر کی توفیق نہ ہو' اور ناشکری پر الگ سزا ملے' مطیع کا حال اس کے برعکس ہوتا ہے' اسکی اطاعت کی یہ برکت ہوتی ہے کہ ہر نعمت اسکے حق میں جزا بن جاتی ہے' اور شکر کی توفیق دیئے جانے سے وہ مزید اجر و ثواب کا مستحق ہوجاتا ہے' ہر مصیبت اسکے گناہوں کا کفارہ اور اسکے درجات کی بلندی کا باعث بن جاتی ہے۔

چوتھی قسم : یہ ہے کہ ان عقوبتوں کا ذکر کرے جو الگ الگ گناہوں کے سلسلے میں مذکور ہیں' اور ہر گناہ کی الگ الگ مذمت کرے' مثلاً شراب خوری' زنا' چوری' قتل' غیبت' کبر' حسد وغیرہ گناہوں کی الگ الگ برائی بیان کرے' اور جو سزائیں شریعت نے ان گناہوں پر مقرر کی ہیں انھیں بتلائے' ہر گناہ کے سلسلے میں بے شمار روایات وارد ہیں' لیکن اتنا خیال رکھنا چاہیے کہ ہر شخص کے سامنے وہی روایات بیان کرے جو اس سے متعلق ہوں' اور اسکے حال پر منطبق ہوتی ہوں غیر متعلق روایات ذکر کرنا ایسا ہے جیسے کسی کو مرض کچھ ہو اور دوا کچھ دیدی جائے' عالم کو طبیب حاذق کی طرح ہونا چاہیے۔ جو پہلے نبض دیکھتا ہے' پھر رنگ اور حرکات و سکنات سے باطن کی پوشیدہ بیماریوں کو پتہ چلاتا ہے' اور ان کا علاج تجویز کرتا ہے' اسی طرح عالم کو بھی قرائن احوال سے آدمی کی پوشیدہ صفات پر استدلال کرنا چاہیے۔ اور انھیں بیان کرنا چاہیے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی پورے طور پر اقتداء ہوسکے۔ ایک صحابی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا' یا رسول اللہ! مجھے کوئی نصیحت فرمایئے' مگر لمبی چوڑی نہ ہو' فرمایا' غصہ مت کیا کرو' اسی طرح ایک اور صحابی نے نصیحت کی درخواست کی' آپ نے اس سے ارشاد فرمایا۔

عَلَيْكَ بِالْيَاسِ مِمَّا فِي أَيْدِي النَّاسِ فَإِنَّ ذٰلِكَ هُوَ الْغِنٰى وَإِيَّاكَ وَالطَّمَعَ فَإِنَّهُ الْفَقْرُ الْحَاضِرُ وَصَلِّ صَلَاةً مُوَدِّعٍ وَإِيَّاكَ وَمَا تَعْتَذِرُ

لوگوں کے پاس جو (مال و متاع) ہے اس سے مایوس رہو' یہی مالداری ہے' لالچ سے بچو' یہ فوری مفلسی ہے' اور نماز رخصت ہونے کی طرح پڑھنا اور ایسی بات سے اپنے آپ کو بچانا جس سے عذر کرنا پڑے۔

ایک شخص نے محمد ابن واسع سے عرض کیا کہ مجھے وصیت کیجئے' آپ نے فرمایا' میں تمھیں وصیت کرتا ہوں کہ تم دنیا و آخرت میں بادشاہ بن کر رہنا' اس نے عرض کیا' میں یہ منصب کس طرح حاصل کروں گا' فرمایا دنیا میں زہد اختیار کرنا۔ پہلی روایت کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے شخص میں غضب کی علامات دیکھیں تو اسے یہ ہدایت فرمائی کہ تم غضب سے بچو' دوسرے شخص میں حرص اور لالچ کی علامتیں دیکھیں تو اسے ہدایت فرمائی کہ وہ حرص سے بچے' ان لوگوں کے مال میں طمع نہ کرے' اسی طرح محمد ابن الواسع نے سائل میں حرص دنیا کی علامات پائیں تو اسے زہد فی الدنیا کی وصیت فرمائی' ایک شخص نے حضرت معاذ ابن جبلؓ سے وصیت کی درخواست کی' فرمایا تم رحم اختیار کرو میں تمہارے لئے جنت کا ضامن ہوں' گویا انھوں نے سوال کرنے والے میں سخت گیری' اور سخت مزاجی دیکھی اس لئے اسے نرم خو بننے کا مشورہ دیا ایک شخص نے حضرت ابراہیم ابن ادہم سے عرض کیا کہ مجھے وصیت فرمائیں' آپ نے اس سے ارشاد فرمایا' لوگوں سے بچو' اور لوگوں کے ساتھ رہو' لوگوں کی ضرورت اس لئے ہے کہ آدمی بھول چوک کا پتلا ہے' ہر آدمی آدمی نہیں ہوتا' آدمی چلے گئے' بھوت رہ گئے' انھیں آدمی کیسے سمجھا جائے' وہ تو یاس کے سمندر میں غوطہ زن ہیں گویا حضرت ابن ادہم نے اپنی فراست ایمانی سے یہ بات جان لی کہ وہ شخص لوگوں سے اختلاط کے باعث آفات میں مبتلا ہے' اس لئے اسے ترک اختلاط کرنے' اور اس حد تک مل جل کر رہنے کا مشورہ دیا جس حد تک دنیاوی معاملات میں ان کی ضرورت

ہو۔ خلاصہ یہ ہے کہ عالم کو سائل کی طلب اور حالت کا لحاظ رکھ کر گفتگو کرنی چاہیے۔ خود اپنی حالت اور شان کے مطابق گفتگو نہ کرنی چاہیے۔ حضرت معاویہؓ نے حضرت عائشہؓ کی خدمت میں تحریر کیا کہ مجھے کوئی مختصر وصیت نامہ لکھ کر بھجوا دیجئے' آپ نے اس خط کے جواب میں لکھا' حمد و صلاۃ کے بعد واضح ہو کہ میں نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے' آپ فرماتے تھے۔

مَنْ طَلَبَ رِضَا اللّٰہِ فِیْ سُخْطِ النَّاسِ کَفَاہُ اللّٰہُ مُؤْنَۃَ النَّاسِ وَمَنِ الْتَمَسَ سُخْطَ اللّٰہِ بِرِضَا النَّاسِ وَکَلَہُ اللّٰہُ اِلَی النَّاسِ وَالسَّلَامُ عَلَیْکَ (ترمذی۔ حاکم)

جو شخص لوگوں کی ناراضگی میں اللہ کی رضا چاہتا ہے اللہ اسے لوگوں کی مشقت سے بچا دیتا ہے اور جو اللہ کو ناراض کر کے لوگوں کی رضامندی تلاش کرتا ہے اللہ اسے لوگوں کے سپرد کر دیتا ہے' فقط والسلام۔

غور کیجئے حضرت عائشہؓ کی فہم و فراست پر' آپ نے اسی آفت پر قلم اٹھایا جس میں حکام و سلاطین مبتلا ہوتے ہیں' اور وہ لوگوں کی رضا جوئی' اور ان کی پاسداری ہے' خواہ معاملہ جائز حدود میں ہو یا ان سے متجاوز ہو' ایک مرتبہ انھوں نے یہ لکھا کہ اللہ سے ڈرو' اگر تم اللہ سے ڈرتے رہے تو وہ تمہیں لوگوں کی دست برد سے محفوظ رکھے گا' اور لوگوں سے ڈرو گے تو وہ تمہیں ذرا فائدہ نہیں پہنچائیں گے غرض یہ ہے کہ ناصح کی تمام تر توجہ اس امر پر ہونی چاہیے کہ وہ جن لوگوں کو نصیحت کرنے میں مصروف ہے انکے مخفی اوصاف اور باطن احوال کا پتہ لگالے' تاکہ ان ہی کے مطابق نصیحت کی جاسکے' ورنہ ایک شخص کو بیک وقت تمام نصیحتیں نہیں کی جاسکتیں' اور نہ وہ اتنی بہت سی نصیحتیں قبول کر سکتا ہے' پھر جو بات اہم ہو اسے چھوڑ کر غیر اہم بات میں مشغول ہونا وقت ضائع کرنے کے برابر بھی ہے۔

ایک سوال کا جواب: یہاں ایک سوال یہ ہو سکتا ہے کہ اگر کوئی واعظ کسی مجمع سے خطاب کر رہا ہو یا کسی' ایسے شخص سے مخاطب ہو جس کے باطن کا حال معلوم نہیں' اس صورت میں کیا کرے' اسکا جواب یہ ہے کہ اس صورت میں واعظ کو ایسا وعظ کہنا چاہیے جس میں تمام مخلوق شریک ہو' یا ایسی باتیں کرنی چاہیں جن کی عام طور پر لوگوں کو ضرورت رہتی ہے' خواہ ہر وقت یا اکثر اوقات' اور شرعی علوم میں اسکی گنجائش ہے' اس لئے کہ علوم شرعیہ غذا بھی ہیں اور دوا بھی غذا سب کے لئے ہیں' اور دوا ان لوگوں کے لئے جو کسی مرض میں مبتلا ہیں۔ اس کی مثال یہ روایت ہے کہ ایک شخص نے حضرت ابو سعید الخدری سے درخواست کی کہ مجھے نصیحت فرمائیں' انھوں نے فرمایا کہ تقویٰ اختیار کرو' اسلئے کہ تقویٰ ہر خیر کی جڑ ہے' جہاد کرو' اسلام کی رہبانیت جہاد ہے۔ قرآن پڑھو' اہل زمین میں قرآن تمہارے لئے نور ہے' اور اہل آسمان میں ذکر کا باعث ہے' سکوت اختیار کرو' مگر حق بات سے نہیں' اس طرح تم شیطان پر غالب آجاؤ گے' ایک شخص نے حضرت حسن بصری سے نصیحت کی درخواست کی' آپ نے اسے یہ نصیحت فرمائی کہ احکام الہی کی تعظیم کر اللہ تجھے عزت سے نوازے گا' حضرت لقمان نے اپنے بیٹے سے فرمایا' اے بیٹے! علماء کے زانو پر زانو رکھ' لیکن ان سے مجادلہ نہ کر' ورنہ وہ تجھے برا سمجھیں گے' دنیا میں سے اتنا رکھ لے جو تیری بقا کے لئے کافی ہو' اور اپنی زائد آمدنی اپنی آخرت کے لئے خرچ کردے' دنیا کو بالکل مت ترک کر کہ دوسروں پر اپنا بوجھ ڈالدے' اور ان کے لئے وبال بن جائے۔ روزہ رکھ مگر ایسا جس سے تو اپنی شہوت کا زور توڑ سکے' ایسا نہیں جس سے نماز میں خلل واقع ہو' اسلئے کہ نماز روزے سے افضل ہے' بے وقوف کے پاس مت بیٹھ' اور نہ منافق سے میل جول رکھ۔ انھوں نے اپنے بیٹے کو یہ نصیحت بھی فرمائی۔ اے بیٹے! بلا تعجب مت ہنس' اور بلا ضرورت مت پھر' اور جس چیز سے تجھے فائدہ نہ ہو اس کے بارے میں دریافت مت کر۔ اپنا مال کھو کر دوسرے کے مال کی حفاظت مت کر' تیرا مال وہ ہے جو تو نے آگے بھیجا ہے' اور دوسروں کا مال وہ ہے جو باقی بچا ہے' اے بیٹے! جو رحم کرتا ہے اس پر رحم کیا جاتا ہے' جو خاموش رہتا ہے وہ سلامتی پاتا ہے' جو کلمۂ خیر کہتا ہے' وہ فائدہ اٹھاتا ہے' اور جو کلمۂ شر کہتا ہے وہ گناہ کماتا ہے' جو شخص اپنی زبان پر قابو نہیں رکھتا وہ نادم ہوتا ہے۔ ایک شخص نے ابو حازم کی خدمت میں عرض کیا کہ مجھے نصیحت فرمائیں۔ انھوں نے فرمایا۔ "اگر کوئی کام ایسا ہو کہ تجھے اس پر موت آجائے اور وہ اچھی معلوم ہو تو وہ کام ضرور کر' اگر کوئی کام ایسا ہو کہ جس پر تجھے موت آجائے اور وہ بری معلوم ہو تو اس سے اجتناب کر"۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت خضر علیہ السلام سے وصیت کی درخواست کی' انھوں نے فرمایا: خندہ رو رہو' بہت زیادہ غصہ مت کیا کرو' ایسے بنو جس سے لوگ نفع اٹھائیں' ایسے نہ بنو جس سے لوگ نقصان پائیں' جھگڑوں سے بچو' بلا ضرورت مت چلو' بلا تعجب مت ہنسو' جن سے قصور ہو گیا ہو انھیں انکے قصور اور عیب کا طعنہ دے کر شرمندہ مت کرو' بلکہ اے عمران کے بیٹے اپنی خطاؤں پر نادم ہو' اور ان پر آنسو بہاؤ۔ ایک شخص نے محمد ابن کرام سے نصیحت کی درخواست کی انھوں نے فرمایا' تمہیں اپنے خالق کی رضامندی کے لئے اس قدر کوشش کرنی چاہیے' جس قدر تم اپنے نفس کو راضی کرنے کے لئے کرتے ہو۔ ایک شخص نے حامد لفاف سے نصیحت کی درخواست کی' انھوں نے فرمایا تم اپنے دین کے لئے ایک غلاف بنالو جس طرح قرآن کریم کے لئے غلاف بنایا جاتا ہے' تاکہ وہ گرد آلود نہ ہو' سائل نے عرض کیا دین کے غلاف سے آپ کی مراد کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: دنیا کی طلب ترک کرنا' الّا یہ کہ جتنی ضرورت ہو' اسی طرح فضول کلام اور بلا ضرورت لوگوں سے اختلاط ترک کرنا دین کا غلاف ہے حضرت حسن بصریؒ نے حضرت عمر ابن عبد العزیز کو ایک خط لکھا' اس کا مضمون یہ تھا" جن چیزوں سے اللہ تعالیٰ ڈراتا ہے' ان میں اللہ سے ڈرو' جو مال تمہارے پاس اس وقت موجود ہے' اس میں سے آگے کے لئے کچھ لے لو' موت کے وقت تمہیں یقینی خبر ملے گی" ایک مرتبہ حضرت عمر ابن عبد العزیزؒ نے ان کی خدمت میں ایک عریضہ تحریر کیا اور درخواست کی کہ وہ کچھ ناصحانہ کلمات تحریر فرمائیں' انھوں نے جواب میں لکھا" سب سے زیادہ دہشتناک اور ہولناک مناظر عنقریب سامنے آنے والے ہیں' تمہیں انھیں دیکھنا ہوگا' خواہ نجات کے ساتھ دیکھو' یا بربادی کے ساتھ' یہ بات یاد رکھو جو شخص اپنے نفس کا محاسبہ کرتا ہے وہ نفع اٹھاتا ہے' اور جو نفس سے غفلت برتتا ہے وہ نقصان اٹھاتا ہے' جو انجام پر نظر رکھتا ہے وہ نجات پاتا ہے' جو اپنی خواہشات کی پیروی کرتا ہے' وہ گمراہ ہوتا ہے' جو بردباری اختیار کرتا ہے' وہ نفع پاتا ہے' جو ڈرتا ہے وہ بچ جاتا ہے' اور جو بچ جاتا ہے وہ عبرت پکڑتا ہے' اور جو عبرت پکڑتا ہے وہ صاحب بصیرت ہوتا ہے' اور جو صاحب بصیرت ہوتا ہے وہ فہم رکھتا ہے' اور جو فہم رکھتا ہے وہ علم بھی رکھتا ہے' اگر تم سے کوئی خطا سرزد ہو جائے تو اس سے باز رہنے کی کوشش کرو' جب ندامت کرو تو اس گناہ کو جڑ سے اکھاڑ پھینک دو' اگر تمہیں کوئی بات معلوم نہ ہو تو دریافت کرلو' اور غصہ آجائے تو اپنے آپ پر قابو رکھو"۔

مطرف ابن عبد اللہ نے حضرت عمر ابن عبد العزیز کو ایک خط تحریر کیا' جس کا مضمون یہ تھا" دنیا سزا کا گھر ہے' اسکے لئے وہی جمع کرتا ہے جسے عقل نہیں ہوتی' اس سے وہی فریب کھاتا جو علم سے محروم ہوتا ہے' اے امیر المومنین! آپ اس میں اس طرح زندگی بسر کریں جس طرح کوئی زخمی اپنے زخم کا علاج کرتا ہے' اور انجام کی خرابی کے خوف سے دوا کی شدت پر صبر کرتا ہے"۔

حضرت عمر ابن عبد العزیزؒ نے عدی ابن ارطاة کو لکھا کہ دنیا اللہ کے دوستوں اور اس کے دشمنوں دونوں کی دشمن ہے' اس کے دوستوں کو رنج پہنچاتی ہے' اور اس کے دشمنوں کو فریب دیتی ہے۔ حضرت عمر ابن عبد العزیز نے اپنے ایک عامل کو لکھا کہ میں نے تمہیں عامل مقرر کیا ہے اس طرح تمہیں مخلوق خدا پر ظلم کرنے کی قدرت حاصل ہو گئی ہے' لیکن جب تم کسی پر ظلم کرنے کا ارادہ کرو تو یہ یاد رکھو کہ تم پر کسی کو قدرت حاصل ہے' تم لوگوں کے ساتھ جو زیادتی کروگے وہ ان سے زائل ہو جائے گی' لیکن تم پر باقی رہ جائے گی' اور یہ بات بھی یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ ظالموں سے مظلوموں کا انتقام ضرور لے گا۔

حاصل گفتگو یہ ہے کہ مجمع عام میں وعظ اسی طرح ہونا چاہیے' جس سائل کا حال معلوم نہ ہو اس کو نصیحت کرنے کا اسلوب بھی یہی ہونا چاہیے' یہ مواعظ غذاؤں کی طرح ہیں جن سے فائدہ اٹھانے میں تمام مخلوق شریک ہے' لیکن کیونکہ اس طرح کے واعظ موجود نہیں ہیں' اسلئے وعظ کا دروازہ بند ہو گیا ہے لوگوں پر معاصی غالب آچکے ہیں' فساد پھیل گیا ہے' اور مخلوق خدا ایسے واعظوں کی وجہ سے فتنے میں مبتلا ہو گئے ہیں' جو مسجع اور مقفیٰ باتیں کرتے ہیں' وعظ کے دوران مخرب اخلاق اشعار سناتے ہیں' اور ایسے علمی موضوعات پر زبان کھولتے ہیں جو ان کی علمی پرواز سے بلند ہیں۔ بتکلف وعظ کی کوششیں کی جاتی ہیں یہی وجہ ہے کہ عوام کی نظروں میں ان کا وقار گر چکا ہے' ان کا کلام سننے والوں کے دلوں پر اثر انداز نہیں ہوتا' کیونکہ وہ خود دل سے کلام نہیں کرتے' نہ دل سے نکلتا

ہے اور نہ دل تک پہنچتا ہے' وعظ کہنے والے لاف و گزاف ہانکتے ہیں اور سننے والے صاف دلی سے نہیں سنتے' دونوں ہی راہ حق سے بھٹکے ہوئے ہیں۔

صبر سے علاج : ہم نے بتلایا تھا کہ گناہ پر اصرار ایک سنگین مرض ہے' اور اس کے علاج کے دو رکن ہیں' ایک علم' اس کی تفصیل گزر چکی ہے دوسرا رکن صبر ہے' جس طرح آدمی جسمانی امراض میں پہلے طبیب کو تلاش کرتا ہے' اسی طرح روحانی امراض میں عالم کو تلاش کرنا چاہیے' اسکے بعد علاج کا مرحلہ پیش آتا ہے' علاج کے دوران صبر کی ضرورت اسلئے ہے کہ بیماری مضر غذاؤں کے استعمال سے طویل ہو جاتی ہے' اور مریض یہ غذائیں دو وجہ سے کھاتا ہے یا تو اس لئے کہ اسے ان غذاؤں کی مضرت کا علم نہیں ہوتا' یا اسلئے کہ کھانے کی خواہش شدید ہوتی ہے' اب تک ہم نے جو کچھ بیان کیا اس سے غفلت کا علاج کیا جاسکتا ہے' اب رہا دوسرا سبب یعنی شدت شہوت تو اس کا علاج ہم نے کتاب ریاضۃ النفس میں بیان کیا ہے' اسکا خلاصہ یہ ہے کہ جب مریض کو کسی نقصان دہ چیز کی خواہش ہو تو یہ سوچے کہ اسکے کھانے سے کیا نقصان ہو سکتا ہے' پہلے اس نقصان کا تصور کرے' پھر وہ چیز اس کی نگاہوں کے سامنے سے دور کر دی جائے اور کبھی نہ لائی جائے بلکہ وہ خواہش اس طرح پوری کرے کہ اسی سے ملتی جلتی کوئی چیز جس میں ضرر کم ہو استعمال کرے' پھر اسے ترک کر دے اور خوف کی طاقت سے اس تکلیف پر صبر کرے جو من پسند چیز چھوڑنے کی وجہ سے حاصل ہونی والی ہے' بہرحال صبر کی تلخی ناگزیر ہے' اسی طرح معاصی میں شہوت کا علاج کیا جاسکتا ہے' مثلاً ایک نوجوان ہے' جس پر شہوت غالب آچکی ہے' اور اب وہ اپنی آنکھوں' اپنے دل اور اعضاء کو اس شہوت سے محفوظ رکھنے پر قادر نہیں ہے' اس صورت میں اسکے لئے مناسب یہ ہے کہ پہلے اس گناہ کے نقصان کا تصور کرے' اس طرح کہ کتاب و سنت میں جو آیات یا روایات اس گناہ سے ڈرانے والی موجود ہیں ان کی تلاوت کرے' جب خوف شدید ہو جائے تو ان اسباب سے راہ فرار اختیار کرے جو شہوت میں ہیجان پیدا کرنے والی ہیں۔

جوش شہوت کے دو سبب : شہوت کے ہیجان کے دو سبب ہیں' ایک خارجی' دوسرا داخلی' خارجی سبب اس شخص کا سامنے موجود ہونا ہے' جس کی خواہش ہو' اس سبب کا علاج یہ ہے کہ اس کے قریب نہ رہے' دور بھاگے' اور تنہائی اختیار کرے' شہوت کا داخلی سبب لذیذ اور مقوی غذائیں کھانا ہے' اس کا علاج یہ ہے کہ بھوکا رہے یا مسلسل روزے رکھے' لیکن یہ دونوں علاج صبر کے محتاج ہیں' اور صبر کے لئے خوف کی ضرورت ہے' خوف علم کے بغیر نہیں ہوتا' علم زیادہ تر بصیرت و تامل سے حاصل ہوتا ہے' یوں سماع اور تقلید سے بھی علم میسر ہو سکتا ہے' ان تمام باتوں سے بھی پہلے یہ ضروری ہے کہ ذکر کی مجلسوں میں حاضر ہو' اور علماء کے مواعظ اس طرح سنے کہ دل تمام مشاغل سے خالی ہو' جو سنے اسے پوری طرح دل و دماغ میں اتارنے کی کوشش کرے' اس تدبیر پر عمل کرنے سے انشاء اللہ خوف پیدا ہوگا' اور جس قدر قوی ہوگا اسی قدر صبر پر اعانت ہوگی اسکے بعد اللہ تعالیٰ کی توفیق و تیسیر شامل ہوگی۔ جو شخص دل لگا کر سنے گا' اللہ سے ڈرے گا' ثواب کا منتظر ہوگا' اور اچھی باتوں کی تصدیق کرے گا' اللہ تعالیٰ اسے عمل کرنے میں سہولت بخشے گا' اور جو شخص سننے میں بخل کرے گا' لاپروائی برتے گا' اور سچی باتوں کو جھٹلائے گا اللہ اسے تنگی میں مبتلا کرے گا اس وقت دنیا کی لذتیں کچھ کام نہ آئیں گی' خواہ ہلاک ہو یا برباد ہو' انبیاء کرام صرف ہدایت کا راستہ دکھلاتے ہیں فی الحقیقت دنیا و آخرت اللہ کے ہیں' وہ جسے چاہتا ہے دنیا دیتا ہے' اور جسے چاہتا ہے آخرت سے نوازتا ہے۔

مصر علی المعصیت کا ایمان : یہاں ایک اعتراض یہ کیا جاسکتا ہے کہ تم نے گذشتہ سطور میں جو تقریر کی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ ایمان ہی اصل ہے' تمہاری تقریر کی ابتداء یہاں سے ہوئی تھی کہ صبر کے بغیر گناہ ترک نہیں کئے جاسکتے' اور صبر بغیر خوف کے ممکن نہیں' خوف علم سے پیدا ہوتا ہے' اور علم اس وقت حاصل ہوتا ہے جب آدمی گناہوں کے ضرر کی تصدیق کرے' اور گناہوں کے ضرر کی تصدیق کے معنی ہیں اللہ اور رسول کی تصدیق' جسے ایمان کہتے ہیں' اس سے یہ ثابت ہوا کہ جو شخص گناہ پر اصرار کرتا ہے وہ ایمان سے محرومی کی بناء پر کرتا ہے حالانکہ بڑے سے بڑے گناہ گار کو بھی مومن کہتے ہیں' گناہ کے ارتکاب سے آدمی ایمان سے محروم نہیں ہوتا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ آدمی گناہ پر ایمان سے محرومی کی بناء پر اصرار نہیں کرتا بلکہ ایمان سے کمزوری کی بناء پر کرتا ہے' اس لئے کہ ہر صاحب ایمان اس کی تصدیق کرتا ہے کہ معصیت اللہ تعالیٰ سے دوری کا باعث' اور آخرت میں عذاب کا سبب ہے' اس کے باوجود وہ گناہ میں ملوث ہو جاتا ہے' اسکی چند وجوہات ہیں۔

اسکا جواب یہ ہے کہ آدمی گناہ پر ایمان سے محرومی کی بناء پر اصرار نہیں کرتا بلکہ ایمان سے کمزوری کی بناء پر کرتا ہے' اسلئے کہ ہر صاحب ایمان کی تصدیق کرتا ہے معصیت اللہ تعالیٰ سے دوری کا باعث' اور آخرت میں عذاب کا سبب ہے' اسکے باوجود وہ گناہ میں ملوث ہو جاتا ہے' اس کی چند وجوہات ہیں۔

مومن گناہ کیوں کرتا ہے؟ : پہلی وجہ یہ ہے کہ گناہ پر جس عذاب کی وعید وارد ہے وہ نگاہوں سے اوجھل ہے' سامنے نہیں ہے' اور نفس فطرتاً موجود سے متاثر ہوتا ہے' اسلئے موعودہ عذاب سے اس کا تاثر موجودہ عذاب کے تاثر کی بنسبت ضعیف ہوتا ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ جو شہوات گناہوں پر آمادہ کرتی ہیں' وہ دراصل نفسانی لذات ہیں' نقد ہیں' اور ہردم آدمی کے ساتھ ہیں عادت اور رجحان کی بناء پر مزید قوت اور غلبہ پاتی ہیں' عادت بجائے خود ایک طبیعت ہے' آئندہ کی تکلیف کے خوف سے حال کی لذت چھوڑنا نفس کے لئے نہایت دشوار ہے' چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ وَتَذَرُوْنَ الْآخِرَةَ (پ۲۹ ر۱۷ آیت ۲۰-۲۱)

ہرگز ایسا نہیں بلکہ تم دنیا سے محبت رکھتے ہو اور آخرت کو چھوڑ بیٹھتے ہو۔

بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا (پ۳۰ ر۱۲ آیت ۱۶)

مگر اے منکرو تم آخرت کا سامان نہیں کرتے (بلکہ) تم دنیوی زندگی کو مقدم رکھتے ہو۔

بلکہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی سے اس معاملے کی شدت کا احساس ہوتا ہے' فرمایا۔

حُفَّتِ الْجَنَّةُ بِالْمَكَارِهِ وَحُفَّتِ النَّارُ بِالشَّهَوَاتِ (بخاری و مسلم۔ ابو ہریرہؓ)

جنت ناپسندیدہ چیزوں (سختیوں) سے گھری ہوئی ہے' اور دوزخ شہوتوں سے۔

ایک حدیث میں ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ النَّارَ' فَقَالَ لِجِبْرَئِيْلَ عَلَيْهِ السَّلَامُ اِذْهَبْ فَانْظُرْ اِلَيْهَا' فَنَظَرَ اِلَيْهَا فَقَالَ وَعِزَّتِكَ لَا يَسْمَعُ بِهَا اَحَدٌ فَلَا يَدْخُلُهَا فَحَفَّهَا بِالشَّهَوَاتِ' ثُمَّ قَالَ اِذْهَبْ فَانْظُرْ اِلَيْهَا فَنَظَرَ فَقَالَ وَعِزَّتِكَ لَا يَسْمَعُ بِهَا اَحَدٌ اِلَّا دَخَلَهَا وَخَلَقَ الْجَنَّةَ فَقَالَ لِجِبْرَئِيْلَ عَلَيْهِ السَّلَامُ اِذْهَبْ فَانْظُرْ اِلَيْهَا فَنَظَرَ' فَقَالَ وَعِزَّتِكَ لَا يَسْمَعُ بِهَا اَحَدٌ اِلَّا دَخَلَهَا' فَحَفَّهَا بِالْمَكَارِهِ ثُمَّ قَالَ فَاذْهَبْ فَانْظُرْ اِلَيْهَا فَنَظَرَ اِلَيْهَا فَقَالَ وَعِزَّتِكَ لَقَدْ خَشِيْتُ اَنْ لَا يَدْخُلَهَا اَحَدٌ (ابوداؤد' ترمذی' حاکم۔ ابو ہریرہؓ)

اللہ تعالیٰ نے دوزخ پیدا فرمائی اور جبرئیل علیہ السلام سے فرمایا جاؤ اسے دیکھو' انہوں نے دوزخ دیکھی اور عرض کیا قسم ہے تیری عزت کی' جو اس کا حال سنے گا وہ کبھی اس میں نہ جائے گا' اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے دوزخ کو شہوات سے گھیر دیا پھر حضرت جبرئیل علیہ السلام سے فرمایا جاؤ اسے جاکر دیکھو انہوں نے دیکھا اور عرض کیا قسم ہے تیری عزت کی جو اس بارے میں سنے گا وہ اسمیں داخل ہوئے بغیر نہ رہے گا' اسکے بعد جنت پیدا کی اور جبرئیل کو اسے دیکھنے کا حکم ہوا' جبرئیل نے جنت دیکھا اور عرض کیا قسم تیری عزت کی جو اسکا حال سنے گا وہ ضرور اس میں جائے گا' پھر اسے سختیوں سے گھیر دیا' اسکے بعد دیکھنے کا حکم ہوا انہوں نے اسے دیکھا اور عرض کیا' تیری عزت کی قسم مجھے ڈر ہے کہ اس میں کوئی نہ جاسکے گا۔

بہرحال شہوت کا فی الوقت موجود ہونا' اور عذاب کا مؤخر ہونا گناہوں پر اصرار کے واضح سبب ہیں' اگرچہ اصل ایمان اپنی جگہ باقی رہتا ہے' لیکن صاحب ایمان گناہ نہیں چھوڑپاتا' گناہ کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ایمان کا منکر ہے' یا گناہوں کی مضرت کا یقین نہیں رکھتا' مثلاً ایک شخص بحالت مرض پیاس کی شدت سے مغلوب ہو کر برف کا پانی پیتا ہے کیا اسکے بارے میں یہ کہا جائے گا کہ اصل طب منکر ہے' یا اس بات کا یقین نہیں رکھتا کہ برف کا پانی اسکے حق میں مضر ہے نہ وہ طب کا منکر ہے اور نہ اسکی مضرت سے ناواقف' لیکن اس پر شہوت غالب ہے' اور صبر کرنے جو تکلیف ہوگی وہ سامنے موجود ہے' اسلئے آئندہ کی تکلیف یا نقصان کا یا تو دھیان نہیں ہے' یا وہ آسان معلوم ہوتی ہے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ عام طور پر گناہ گار مومن توبہ کا عزم اور حسنات کے ذریعہ سیئات کی تکفیر کا عزم رکھتے ہیں' کیونکہ ان سے یہ وعدہ کیا گیا ہے' کہ توبہ اور حسنات سے گناہوں کے نقصان کی تلافی ہوجاتی ہے' لیکن طبعیتوں پر طول امل کا غلبہ ہے' اسلئے توبہ و تکفیر کے باب میں ٹال مٹول سے کام لیتے ہیں معلوم ہوا کہ بندہ مومن ایمان کی موجودگی میں توبہ کی امید پر گناہ کا ارتکاب کرتا ہے۔

چوتھی وجہ یہ ہے کہ ہر مومن کو یہ یقین اور اعتقاد ہے کہ گناہوں کی پاداش میں جو عذاب دیا جائیگا وہ ایسا نہیں جو معاف نہ ہوسکے' اسلئے وہ گناہ کرتا ہے' اور معافی کے لئے اللہ کے فضل و کرم پر آس لگائے بیٹھا رہتا ہے۔

یہ وہ چار اسباب ہیں جن کی بناء پر گناہ گار اصل ایمان کی موجودگی میں اصرار کرتا ہے' ہاں ایک وجہ اور ہوسکتی ہے' لیکن اس سے اصل ایمان مجروح ہوجاتا ہے اور وہ وجہ یہ ہے کہ کوئی شخص انبیاء کرام کی صداقت میں شک کرتا ہو' اور اسے یہ یقین نہ ہو کہ عقوبت کے بارے میں جو کچھ انبیاء فرماتے ہیں وہ حق ہے' یہ شک کفر ہے' یہ ایسا ہے جیسے کوئی طبیب کسی مریض سے کہے کہ فلاں چیز مت کھانا کیونکہ یہ مضر ہے اگر مریض اس طبیب کا معتقد نہیں اور یہ سمجھتا ہے کہ اسے طب کی ابجد بھی نہیں آتی تو وہ اس کی تنبیہہ کی پروا نہیں کرتا' بلکہ اسکی تکذیب کرتا ہے' اسی کا نام کفر ہے۔

مذکورہ اسباب کا علاج : بہرحال یہ اسباب ہیں جن کی وجہ سے آدمی گناہ پر اصرار کرتا ہے' اب ان تمام اسباب کا علاج بیان کیا جاتا ہے' پہلے سبب یعنی "عذاب نظروں کے سامنے نہیں ہے" کا علاج یہ سوچنا ہے کہ جو چیز آنے والی ہے آکر رہے گی اور یہ کہ کل آنے میں زیادہ دور نہیں ہے' بلکہ دیکھنے والے کے لئے بہت قریب ہے' نیز موت آدمی سے اتنی قریب ہے جس قدر قریب جوتے کا تسمہ' کیا معلوم قیامت قریب ہو' اور بس دو چار لمحے میں واقع ہونے والی ہو' یہ بھی سوچے کہ آدمی فطرتاً" مستقبل کی خوش حالی کے لئے حال میں محنت و مشقت کرتا ہے اور تکلیفیں اٹھاتا ہے مثلاً سمندروں کا سفر کرتا ہے' صحراؤں کی خاک چھانتا ہے اس امید پر کہ ان اسفار کے ذریعہ جو نفع حاصل ہوگا وہ آنے والی زندگی میں کام آئے گا' یہی نہیں بلکہ اگر وہ بیمار پڑجائے' اور کوئی نصرانی (غیر مسلم) طبیب اسے یہ خبر دے کہ ٹھنڈا پانی تیرے لئے سخت مضرت کا باعث ہے' یہ تجھے موت سے ہم کنار کرسکتا ہے' حالانکہ ٹھنڈا پانی اسکے لئے انتہائی لذیذ شئی ہے' لیکن وہ اسے ہاتھ بھی نہیں لگاتا' جبکہ موت کی تکلیف ایک لمحے کی ہے' بشرطیکہ مابعد الموت کی زندگی کا خوف نہ ہو' اور دنیا سے جدائی کی تکلیف نہ ہو' غور و فکر کا مقام ہے کہ آدمی ایک نصرانی کے کہنے سے لذت ترک کردیتا ہے' ہوسکتا ہے وہ طبیب ہو' لیکن اسکی مہارت طب پر کوئی معجزہ تو قائم نہیں ہے جب کہ انبیاء کی حقانیت پر معجزات بھی قائم ہیں' وہ دل میں یہ سوچے کہ میں ایک غیر مسلم کی بات تو مان سکتا ہوں' لیکن پیغمبروں کی خبر کا یقین نہیں کرتا' کس قدر عجیب بات ہے' کیا میں یہ بات سمجھتا ہوں کہ دوزخ کا عذاب میرے لئے مرض کی تکلیف یا موت کی مشقت سے ہلکا ہوگا' جب کہ انبیاء صادقین یہ خبر دیتے ہیں کہ آخرت کا ایک دن دنیا کے پچاس ہزار دنوں کے برابر ہوگا۔

دوسرے سبب کا علاج بھی اسی طرح ہوسکتا ہے' اگر گناہ پر اصرار لذت کا غلبہ ہو تو اسے زبردستی ترک کرے' اور یہ سوچے کہ جب میں اس چند روزہ زندگی میں یہ لذت ترک نہیں کرسکتا تو پھر ابدالآباد کی لذت مجھ سے کیسے چھٹے گی' اگر مجھ سے یہ چند روزہ تکلیف برداشت نہیں ہوسکتی اور میں اس معمولی مشقت پر صبر نہیں کرسکتا تو دوزخ کی تکلیف کس طرح برداشت کروں گا' نیز جب میں دنیا کی

نعمتوں پر صبر نہیں کر سکتا جو کدورتوں سے لبریز ہوتی ہیں تو میں آخرت کی پاکیزہ اور صاف و شفاف نعمتوں پر کیسے صبر کر سکوں گا۔

تیسرے سبب یعنی قبولیت توبہ کی امید میں توبہ سے ٹال مٹول کرنے کے علاج کے لئے اس طرح سوچے کہ اکثر دوزخیوں کی چیخ و پکار کا سبب یہی تاخیر ہوگی کیونکہ وہ گناہ سے توبہ کرنے میں تاخیر کریں گے اور یہ تاخیر موت پر جاکر ختم ہوگی اسکے بعد توبہ کا وقت نہیں رہے گا' دراصل ٹالنے والا اپنے کام کی بنیاد ایسے امر پر رکھتا ہے جو اس کے اختیار میں نہیں ہے یعنی آئندہ زندگی پر' اور یہ کہتا ہے میں زندہ رہوں گا اور توبہ کرلوں گا لیکن کیا اسے یقین سے معلوم ہے کہ وہ زندہ رہے گا' ہو سکتا ہے توبہ سے پہلے مرجائے' اور اگر زندہ بھی رہا تو کسے معلوم کہ وہ گناہ ترک کردے گا' جس طرح وہ اس وقت گناہ ترک کرنے پر قادر نہیں ہے' ہو سکتا ہے آئندہ بھی نہ رہے' کیونکہ ترک نہ کرنے کا جو سبب آج موجود ہے وہ آئندہ بھی ہوگا' بلکہ یہ بھی ممکن ہے وہ سبب مسلسل عمل کرنے اور عادی ہونے کی وجہ سے اور پختہ ہوجائے' جسے عادت نہیں ہوتی وہ اگر کوئی کام چھوڑنا چاہے تو چھوڑ سکتا ہے' لیکن جسے عادت ہوتی ہے وہ خواہش کے باوجود نہیں چھوڑپاتا' ہم رات دن اسکا مشاہدہ کرتے رہتے ہیں' ٹالنے والوں کی ہلاکت کا اصل سبب یہی ہے کہ وہ ایک ہی طرح کی دو چیزوں میں فرق سمجھتے ہیں' جیسے آج شب و روز ہیں وہی آئندہ بھی ہوں گے' جب وہ آج گناہ کے ترک پر قادر نہیں ہیں تو آئندہ یہ قدرت انھیں کیسے حاصل ہوگی' ٹالنے والے کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص درخت اکھاڑ کر پھینکنا چاہے' لیکن وہ مضبوط ہو اور آسانی سے اکھاڑا نہ جاسکے تو یہ سوچ کر چھوڑدے کہ آئندہ سال کوشش کروں گا' وہ یہ بات اچھی طرح جانتا ہے کہ درخت جتنی دیر زمین میں رہتا ہے اس کی جڑیں اتنی وسیع اور مضبوط ہوتی ہیں' اور اس پر جتنے ماہ و سال گزرتے ہیں قویٰ میں اضمحلال پیدا ہوتا ہے' اس سے بڑھ کر کیا حماقت ہوسکتی ہے جب وہ اپنی طاقت کے باوجود ایک نسبتاً کمزور درخت اکھاڑنے سے عاجز ہے' تو وہ اپنے ضعف کی حالت میں ایک مضبوط درخت کیسے اکھاڑ سکتا ہے۔

چوتھی وجہ یعنی اللہ تعالیٰ کے عفو و کرم کے منتظر رہنے کا علاج وہی ہے جو پہلے بیان کیا جاچکا ہے۔ اسکی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص اپنا تمام مال و متاع خیرات کردے' اپنے اہل و عیال کو تنگدست بنا دے' اور منتظر رہے کہ اللہ تعالیٰ غیب سے رزق بھیجے گا' اور کسی بنجر زمین کے سینے سے خزانہ ہاتھ لگ جائے گا گناہ کی بخشش کا امکان ایسا ہی ہے جیسے خزانہ پانے کا امکان یا اس شخص کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص اس شہر میں جہاں دن دھاڑے خزانہ لوٹ لیا جاتا ہو اپنا سامان صحن میں ڈال دے' اور یہ کہے کہ مجھے اللہ کے فضل پر بھروسہ ہے' وہ میرے سامان کی حفاظت کرے گا' حالانکہ خود اسے اپنے سامان کو محفوظ جگہ پر رکھنے کی قدرت حاصل ہے' ان مثالوں میں خزانے کا دستیاب ہوجانا' اور مال کا لٹیروں سے بچ جانا ممکن ہے' اور بعض اوقات ایسا ہو بھی گیا ہے' لیکن جو شخص محض اسی بھروسے پر کمانا چھوڑدے' یا مال کو لاپرواہی سے ڈال دے وہ بڑا احمق ہے' اسی طرح گناہ کی بخشش ممکن ہے لیکن بخشش کی توقع پر گناہ کیے جانا اور توبہ نہ کرنا سخت جہالت ہے۔

پانچویں وجہ یعنی انبیاء کرام کی صداقت میں شک کرنے کا علاج وہ اسباب ہیں جن سے انبیاء کی حقانیت ثابت ہوتی ہے' یہ اسباب اگرچہ طویل ہیں' لیکن ان کا ذکر مفید ہے اور عقل سے قریب لوگوں کا ان سے علاج ہوسکتا ہے' مثال کے طور پر اس شک رکھنے والے انسان سے یہ کہا جائے کہ انبیاء کرام نے جن سے معجزات صادر ہوتے ہیں اور جو ان کے حق ہونے کی دلیل ہیں یہ خبر دی ہے کہ ایک عالم آخرت ہے' جو اس عالم سے الگ ہے اور موت کے بعد آدمی اس عالم سے متعلق ہوجاتا ہے' کیا تو اس خبر کی صداقت پر یقین رکھتا ہے' یا تیرے خیال میں' یہ اسی طرح محال ہے جس طرح ایک آدمی کا بیک وقت دو جگہ ہونا محال ہے' اگر وہ یہ کہے کہ میں اسے محال سمجھتا ہوں' تو اس سے بحث کرنا بیکار ہے ایسے شخص کا حال عقل سے محروم دیوانے کا سا ہے' جس طرح ان مسائل میں دیوانے کو مخاطب نہیں بنایا جاسکتا اسی طرح اسے بھی مخاطب نہ بنانا چاہیے' البتہ اگر وہ یہ کہے کہ مجھے شک ہے تو اس سے یہ پوچھا جائے کہ اگر تجھے ایک اجنبی شخص یہ خبر دے کہ جب تو اپنے گھر میں کھانا چھوڑ کر باہر گیا تھا تو ایک سانپ نے تیرے کھانے میں منہ ڈال دیا تھا اور اپنا زہر ملا دیا تھا' اگر اس کی صداقت کا امکان ہو تو کیا تو یہ کھانا کھائے گا یا چھوڑدے گا' اگرچہ وہ کھانا

لذیذ ترین کھانا ہی کیوں نہ ہو' یقیناً" وہ اس کے جواب میں کہے گا کہ میں کھانا نہیں کھاؤں گا" اس لئے کہ میں یہ کہوں گا" اگر وہ شخص جھوٹ بول رہا ہے' تب بھی ازارہ احتیاط مجھے یہ کھانا نہیں کھانا چاہیے' زیادہ سے زیادہ اس صورت میں یہ ہو سکتا ہے کہ لذیذ کھانا ضائع ہو جائے' لیکن اگر وہ سچ کہتا ہے تو یہ کھانا میرے لئے ہلاکت کا باعث ہو گا" اب اس سے کہا جائے کہ تو ایک مجہول اجنبی کا کہنا مانتا ہے' اور اس کی خبر پر یقین کر کے کھانا ضائع کر دیتا ہے' جب کہ اس کے پاس نہ کوئی دلیل ہے نہ ثبوت ہے' پھر یہ گمان موجود ہے کہ اس نے حسد میں کہہ دیا ہو' یا پریشان کرنے کی خاطر کہا ہو' دوسری طرف انبیاء کرام کے اقوال ہیں' جنھیں معجزات کی تائید حاصل ہے' اولیاء' علماء' حکماء اور عقلاء کا اجماع ہے' مگر تو نہ انبیاء کا قول مانتا ہے اور نہ ان کی خبر تسلیم کرتا ہے' جاہل عوام زیر بحث نہیں ہیں' عقل مندوں میں اگر کوئی ایسا شخص موجود ہو تو بتلاؤ جو یوم آخرت پر یقین نہ رکھتا ہو' اور ثواب و عذاب کا قائل نہ ہو' کیفیت میں اختلاف ہو سکتا ہے لیکن وجود پر تمام اہل عقل کا اتفاق ہے' اگر ان کی خبر سچ ہے تو تو ایک ایسے عذاب کے قریب پہنچ چکا جو ہمیشہ ہمیشہ رہنے والا ہے اور اگر جھوٹ بول رہے ہیں' تب بھی تیرا کوئی خاص نقصان نہیں ہے' صرف اتنا نقصان ہے کہ دنیا کی چند لذتیں تجھے حاصل نہ ہو سکیں گی' اگر مخاطب میں تھوڑی سی بھی عقل ہے تو وہ اس تقریر کے بعد توبہ میں ذرا توقف نہ کرے گا اسلئے کہ دنیا کی زندگی خواہ کتنی ہی طویل کیوں نہ ہو ابد الاباد کی زندگی کے برابر نہیں ہو سکتی اگر ہم دنیا کو غلے کے دانوں سے بھرا ہوا تصور کریں' اور یہ فرض کریں کہ ایک پرندہ دس لاکھ سال بعد ایک دانہ اٹھائے اور ٹھہر جائے' پھر دس لاکھ سال بعد اٹھائے اور رک جائے' اس صورت میں دانے ختم ہو جائیں گے' لیکن ابد الاباد میں کمی نہ آئے گی' اس لئے عقل رکھنے والا انسان دنیا کی چند روزہ زندگی میں شہوات سے صبر کر کے ابد الاباد کی سعادت حاصل کرنے میں سستی کیسے کرے گا ابو العلاء معری کہتا ہے۔

قَالَ الْمُنَجِّمُ وَالطَّبِيْبُ كِلَاهُمَا لَا تُبْعَثُ الْأَمْوَاتُ، قُلْتُ إِلَيْكُمَا
إِنْ صَحَّ قَوْلُكُمَا فَلَسْتُ بِخَاسِرٍ أَوْ صَحَّ قَوْلِيْ فَالْخَسَارُ عَلَيْكُمَا

(نجومی اور طبیب دونوں نے کہا مردے زندہ نہیں کئے جائیں گے' میں نے کہا کہ اگر تمہارا قول درست ہے تو پھر میں نقصان میں نہیں ہوں' اور اگر میرا قول صحیح ہے تو پھر تم سراسر نقصان میں ہو)

اسی لئے حضرت علیؓ نے اس شخص سے جس کی عقل اس طرح کے امور کی تحقیق اور فہم سے قاصر تھی فرمایا کہ اگر تو سچ کہتا ہے تو میں اور تو دونوں بچ جائیں گے' اور اگر میں سچ کہتا ہوں تو تو ہلاک ہو گا' اور میں نجات پاؤں گا' بہر حال عقل مند انسان کو تمام حالات میں امن اور احتیاط کی راہ چلنی چاہیے۔

ایک سوال کا جواب : یہاں یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ یہ امور نہایت واضح ہیں' اور معمولی غور و فکر سے سمجھ میں آ جاتے ہیں' لیکن لوگوں کے دلوں کو کیا ہو گیا ہے کہ انھوں نے اس طرح کے امور میں غور و فکر کرنا چھوڑ دیا' اور اسے گراں سمجھنے لگے' ایسے قلوب کا علاج کیسے ہو' اور انھیں کس طرح فکر کے راستے پر ڈالا جائے' خاص طور پر ان لوگوں کو جو اصل شریعت پر ایمان رکھتے ہیں۔

اسکے جواب کی تفصیل یہ ہے کہ اس فکر کی مانع دو باتیں ہیں' ایک تو یہ کہ آخرت کے عذاب' اس کی ہولناکیوں' سختیوں اور جنات نعیم سے محرومی پر گنہ گاروں کی حسرتوں کا تصور انتہائی تکلیف دہ' اور المناک تصور ہے' قلب اس طرح کے تصورات سے نفرت کرتا ہے' بلکہ اسکی دلچسپی کا سامان دنیا کی لذتوں میں ہے' یہاں کے عیش و آرام' اور راحت و عشرت کے بارے میں فکر کرتا ہے۔ اور خوش ہوتا ہے' دوسری بات یہ ہے کہ فکر دنیاوی لذات کے حصول' اور شہوات نفسانی کے تکمیل کے لئے مانع شغل ہے' کوئی انسان ایسا نہیں ہے' جس پر ہر لمحہ کوئی نہ کوئی شہوت مسلط نہ رہتی ہو' اسلئے عموماً" آدمی کا تمام تر وقت شہوات کی تکمیل کرنے کی تدبیر میں صرف ہوتا ہے' اس کی عقل شہوت کی اسیر ہوتی ہے اور وہ اسی کے تصور' یا اس کے تکمیل کے حیلے ہی میں لذت پاتا ہے' آخرت کے عذاب کی فکر کرنا اس لذت کیلئے مانع ہے۔

ان دونوں مانع امروں کا علاج یہ ہے کہ اپنے دل کو سمجھائے اور اس سے پوچھے کہ جب تو موت اور مابعد الموت کے واقعات میں

فکر نہیں کر سکتا اور تجھے آخرت کے عذاب کے تصور ہی سے تکلیف ہوتی ہے' اس وقت کا عالم کیا ہو گا جب موت اچانک آئے گی' اور پھر وہ عذاب جس کے تصور سے تو دل برداشتہ ہو جاتا ہے خود تجھ پر واقع ہو گا' اس وقت تو صبر بھی نہ کر سکے گا۔ دوسرے فکر کا علاج اس طرح ہو سکتا ہے کہ دل کو سمجھائے کہ تجھے دنیا کی لذتیں ضائع جانے کا افسوس نہ کرنا چاہیے' آخرت کی لذتیں دنیا کی لذتوں سے زیادہ اہم اور بڑی ہیں' اور اتنی ہیں کہ ان کی انتہا نہیں ہے' ان میں کسی طرح کی کدورت بھی نہیں ہے' جب کہ دنیا کی لذتیں جلد فنا ہو جانے والی ہیں' اور ان میں کدورتوں کی آمیزش بھی ہے' دنیا کی کوئی لذت ایسی نہیں ہے جو کدورت سے خالی ہو' تاہم گناہوں سے تائب ہو کر اللہ کی اطاعت کرنے' اور اسکی مناجات میں مشغول ہونے میں جو لذت ہے اس سے بڑھ کر کوئی لذت نہیں ہے' اللہ تعالیٰ کی اطاعت و معرفت میں جو راحت ہے وہ کسی کام میں نہیں ہے' اگر مطیع کو اس لذت' حلاوت اور راحت کے علاوہ کوئی اور جزا نہ ملتی تب بھی کافی تھی۔ لیکن اللہ نے اسکے علاوہ بھی دوسری نعمتیں دینے کا وعدہ کر رکھا ہے' کس قدر بے وقوف ہیں وہ لوگ جو فانی لذتوں کے پیچھے دائمی نعمتیں چھوڑتے ہیں۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ یہ لذت و حلاوت توبہ کی ابتداء میں حاصل نہیں ہوتی' لیکن جب آدمی توبہ پر کچھ عرصے صبر کر لیتا ہے اور خیر اس کی طبیعت میں داخل ہو جاتا ہے تب وہ لذت حاصل ہوتی ہے۔ جس طرح شر آدمی کا مزاج بن جاتا ہے' اسی طرح خیر کی بھی عادت ہو جاتی ہے' اور آدمی کو خیر ہی کے کاموں میں لذت ملنے لگتی ہے یہ افکار خوف کے لئے محرک ہیں اور انسان کے اندر لذات سے صبر کرنے کی قوت پیدا کرتے ہیں' لیکن خود افکار کو واعظوں کے مواعظ اور تنبیہی بیانات سے تحریک ملتی ہے' جب یہ افکار طبیعت کے موافق ہوتے ہیں تو قلب انکی طرف مائل ہوتا ہے' اس سبب کو جو طبع اور فکر کے درمیان موافقت پیدا کرتا ہے توفیق کہتے ہیں' توفیق اس موافقت کا نام ہے جو ارادے اور اطاعت کے درمیان ہوتی ہے' ایک طویل حدیث میں بیان کیا گیا ہے کہ عمار ابن یاسرؓ نے کھڑے ہو کر حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خدمت میں عرض کیا' امیر المومنین یہ بتلائیں کہ کفر کس چیز پر مبنی ہے؟ حضرت علیؓ نے ارشاد فرمایا کفر کی عمارت چار ستونوں پر قائم ہے' جفا' اندھاپن' غفلت' اور شک' جو جفا کریگا وہ حق کو حقیر جانے گا' باطل کا بول بالا کرے گا' اور علماء کو برا بھلا کہے گا' جو نابینا ہو گا وہ ذکر بھول جائے گا' جو غفلت کرے گا وہ راہ راست سے بھٹکے گا' اور جو شک کرے گا اسے اس کی آرزوئیں فریب دیں گی' حسرت و ندامت اس پر چھا جائے گی' اور جس کا اسے گمان بھی نہیں ہے وہ دیکھ لے گا فکر سے غفلت کی یہ چند آفتیں ہیں جو ذکر کی گئیں' توبہ کے باب میں اسی قدر بیان کافی ہے' اب ہم صبر کا ذکر کرتے ہیں' توبہ کے علاج کے لئے دو رکنوں کی ضرورت ہے' ان میں سے ایک رکن علم ہے اس کا بیان ہو چکا' اب دوسرے رکن صبر ایک مستقل کتاب کے تحت روشنی ڈالی جاتی ہے۔

کتاب الصبر والشکر

صبر اور شکر کا بیان

ایمان کے دو حصے ہیں نصف صبر اور نصف شکر' جیسا کہ آثار و روایات سے پتہ چلتا ہے' (ابو منصور دیلمی۔ انسؓ) نیز یہ دونوں اللہ تعالیٰ کے اوصاف میں سے دو وصف ہیں اور اسکے اسمائے حسنیٰ میں سے دو اسم ہیں' یعنی صبور اور شکور۔ صبر اور شکر کی حقیقت سے ناواقف ہونا دراصل ایمان کے دونوں نصف حصوں سے ناواقف ہونا ہے' اور اللہ تعالیٰ کے دو وصفوں سے جاہل رہنا ہے' جب کہ ایمان کے بغیر اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل نہیں ہوتا' اور ایمان کا راستہ یہ جانے بغیر طے نہیں ہوتا کہ کس چیز پر اور کس ذات پر ایمان لانا ہے' جو یہ بات نہیں جانتا وہ صبر اور شکر سے کیا واقف ہو گا' اس سے معلوم ہوا کہ ایمان کے دونوں حصوں پر روشنی ڈالنا نہایت ضروری ہے' لیکن کیونکہ یہ دونوں حصے ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہیں اس لئے ہم ایک ہی کتاب کے سات ابواب میں ان دونوں کی وضاحت کریں گے۔

پہلا باب

صبر کا بیان

صبر کی فضیلت : اللہ تعالیٰ نے صابرین کے بے شمار اوصاف بیان کئے ہیں' قرآن کریم میں ستر سے زائد جگہوں پر صبر کا ذکر ہے' ان آیات میں بہت سے بلند درجات اور خیرات کی نسبت صبر کی طرف کی گئی ہے اور انھیں صبر کا ثمرہ قرار دیا گیا ہے' چنانچہ ارشاد فرمایا۔ وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُونَ بِأَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوا (پ۲۱ ر۲ آیت ۲۴)

اور ہم نے ان میں جب کہ انھوں نے صبر کیا بہت سے پیشوا بنائے تھے جو ہمارے حکم سے ہدایت کرتے تھے۔

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنَىٰ عَلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ بِمَا صَبَرُوا (پ۹ ر۶ آیت ۱۳۷)

اور آپ کے رب کا نیک وعدہ بنی اسرائیل کے حق میں ان کے صبر کی وجہ سے پورا ہو گیا۔

وَلَنَجْزِيَنَّ الَّذِينَ صَبَرُوا أَجْرَهُم بِأَحْسَنِ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ (پ۱۴ ر۱۹ آیت ۹۶)

اور جو لوگ ثابت قدم ہیں' ہم ان کے اچھے کاموں کے عوض میں ان کا اجر ضرور دیں گے۔

أُولَٰئِكَ يُؤْتَوْنَ أَجْرَهُم مَّرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوا (پ۲۰ ر۹ آیت ۵۴)

ان لوگوں کو ان کی پختگی کی وجہ سے دوہرا ثواب ملے گا۔

إِنَّمَا يُوَفَّى الصَّابِرُونَ أَجْرَهُم بِغَيْرِ حِسَابٍ (پ۲۴ ر۱۶ آیت ۱۰)

مستقل مزاج والوں کو ان کا صلہ بے شمار ہی ملے گا۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے صبر کا اجر بلا حساب دینے کا وعدہ کیا ہے' نیکیوں میں صرف ایک نیکی یہی ہے کہ جس کا ثواب بے حساب دیا جائے گا' کیونکہ روزہ بھی صبر میں داخل ہے بلکہ اسے نصف صبر کہا جاتا ہے' اسلئے اللہ تعالیٰ نے اسے بھی اپنی طرف منسوب فرمایا' دوسری کوئی عبادت ایسی نہیں ہے' جس کے اجر کو اللہ تعالیٰ نے اپنے لئے مخصوص فرمایا ہو' حدیث قدسی ہے۔

الصَّوْمُ لِي وَأَنَا أَجْزِي بِهِ

روزہ میرے لئے ہے اور میں اسکی جزا دوں گا۔

صابرین کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ فرمایا ہے کہ وہ ان کے ساتھ ہے۔

وَاصْبِرُوا إِنَّ اللَّهَ مَعَ الصَّابِرِينَ (پ۱۰ ر۲ آیت ۴۶)

اور صبر کرو' بلاشبہ اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

ایک جگہ اپنی مدد و نصرت کو صبر پر معلق فرمایا۔ ارشاد ہوتا ہے۔

بَلَىٰ إِن تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا وَيَأْتُوكُم مِّن فَوْرِهِمْ هَٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُم بِخَمْسَةِ آلَافٍ مِّنَ الْمَلَائِكَةِ مُسَوِّمِينَ (پ۴ ر۴ آیت ۱۲۵)

ہاں کیوں نہیں' اگر مستقل رہو گے' اور متقی رہو گے اور وہ لوگ تم پر ایک دم سے آپہنچیں گے تو تمہارا رب تمہاری امداد فرمائے گا پانچ ہزار فرشتوں سے جو ایک خاص وضع بنائے ہوئے ہوں گے۔

ایک جگہ صابرین کے لئے رحمت' صلوٰۃ اور ہدایت تینوں وصف یکجا بیان کئے گئے ہیں' کسی دوسرے عابد کے لئے یہ اوصاف ایک جگہ بیان نہیں کئے گئے۔ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ (پ۲ ر۳ آیت ۱۵۷)

ان لوگوں پر خاص خاص رحمتیں بھی ان کے پروردگار کی طرف سے ہوں گی' اور عام رحمت بھی ہو گی۔

احادیث : صبر کے سلسلے میں بے شمار آیات ہیں' اگر یہ سب لکھی جائیں تو صفحات کی تنگ دامانی مانع آجائے' روایات بھی بکثرت ہیں' چنانچہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں۔

اَلصَّبْرُ نِصْفُ الْاِیْمَانِ (ابو نعیم، خطیب۔ ابن مسعودؓ) صبر آدھا ایمان ہے۔

اسکے نصف ایمان ہونے کی وجہ عنقریب بیان کی جائے گی' ایک روایت میں ہے کہ جو چیزیں تمہیں کم دی گئی ہیں' ان میں یقین اور صبر ہیں جسے ان دونوں میں سے زیادہ حصہ ملا ہے اسے اگر تہجد اور نفلی روزے نہ ملیں تو کوئی پروا نہیں کرے گا' جس حال پر اب تم ہو اگر اس پر صبر کرو تو یہ بات میرے نزدیک اسکی بنسبت زیادہ پسندیدہ ہے کہ تم میں سے ہر ایک میرے پاس اس قدر عمل لے کر آئے جس قدر عمل تم سب کرتے ہو' لیکن مجھے ڈر ہے کہ تم پر میرے بعد دنیا فتح ہوگی' اور تم ایک دوسرے کو برا جانو گے اور اس وقت آسمان والے تمہیں برا جانیں گے' جو شخص اس حال پر صبر کرے گا اور احتساب کرے گا اسے پورا پورا ثواب ملے گا' اسکے بعد آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔

مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ وَلَنَجْزِيَنَّ الَّذِيْنَ صَبَرُوْا اَجْرَهُمْ (۱) (پ ۱۴ ر ۱۹ آیت ۹۶)

اور جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ ختم ہو جائے گا اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ دائم رہے گا۔

حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایمان کے متعلق سوال کیا گیا' آپ نے ارشاد فرمایا۔ "اَلصَّبْرُ وَالسَّمَاحَةُ" (طبرانی' ابن حبان۔ عبداللہ ابن عبید ابن عمیرؓ عن ابیہ عن جدہ) یعنی صبر اور سخاوت۔ ایک مرتبہ ارشاد فرمایا "اَلصَّبْرُ كَنْزٌ مِنْ كُنُوْزِ الْجَنَّةِ" صبر جنت کے خزانوں میں سے ایک خزانہ ہے (۲) ایک مرتبہ کسی نے ایمان کے بارے میں دریافت کیا' آپ نے ارشاد فرمایا' صبر (دیلمی۔ انسؓ) آپ کا یہ ارشاد دراصل اس حدیث کے مشابہ ہے جس میں آپ نے فرمایا "اَلْحَجُّ عَرَفَةُ" (۳) (حج عرفہ ہے) یعنی حج کا بڑا حصہ عرفہ ہے ایک روایت میں ارشاد فرمایا "اَفْضَلُ الْاَعْمَالِ مَا اُكْرِهَتْ عَلَيْهِ النُّفُوْسُ" (۴) (اعمال میں افضل عمل وہ ہے جس پر نفسوں کو جبر ہو) روایات میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر حضرت داؤد علیہ السلام کو وحی بھیجی کہ میرے اخلاق اختیار کرو' اور میرا ایک خلق یہ ہے کہ میں نہایت صبر کرنے والا ہوں' عطاء کی روایت میں حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم انصار کے پاس تشریف لائے تو ان سے دریافت فرمایا کہ کیا تم مومن ہو' تمام حاضرین خاموش رہے' پھر حضرت عمرؓ نے عرض کیا' جی ہاں' ہم مومن ہیں' آپ نے پوچھا تمہارے ایمان کی علامت کیا ہے۔ انصار نے عرض کیا ہم خوش حالی میں شاکر پریشانی میں صابر اور فیصلوں پر راضی رہتے ہیں' آپ نے ارشاد فرمایا مُؤْمِنُوْنَ وَرَبِّ الْكَعْبَةِ (طبرانی) رب کعبہ کی قسم تم مومن ہو۔

ایک حدیث میں یہ الفاظ ہیں "فی الصبر علی ماتکرہ خیر کثیر" (ترمذی۔ ابن عباسؓ) ناپسندیدہ چیز پر صبر کرنا بڑا خیر ہے۔ حضرت عیسٰی علیہ السلام فرماتے ہیں' جس چیز کو تم پسند کرتے ہو وہ تمہیں اسی وقت حاصل ہوگی جب تم ناپسندیدہ چیزوں پر صبر کرو گے۔ ایک روایت میں ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

لَوْ كَانَ الصَّبْرُ رَجُلًا لَكَانَ كَرِيْمًا وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصَّابِرِيْنَ (طبرانی۔ عائشہؓ)

اگر صبر کوئی آدمی ہوتا تو کریم ہوتا اور اللہ صبر کرنے والوں کو محبوب رکھتا ہے۔

یہ مشتے نمونے از خروارے ہے' ورنہ صبر کی فضیلت میں لاتعداد روایات ہیں' ان سب کے ذکر کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔

آثار: حضرت عمر ابن الخطاب نے حضرت ابو موسٰی اشعری کو ایک تفصیلی خط لکھا تھا' اس میں بھی یہ تحریر فرمایا تھا کہ صبر اختیار کرو' اور یہ بات یاد رکھو کہ صبر کی دو قسمیں ہیں' ایک دوسرے سے افضل ہے' مصیبتوں پر صبر کرنا افضل ہے' اور اس سے زیادہ افضل یہ ہے کہ جو چیزیں اللہ نے حرام کی ہیں ان پر صبر کیا جائے' جان لو کہ صبر ایمان کا خلاصہ ہے' اور وہ اس طرح کہ تقویٰ افضل ترین نیکی ہے' اور تقویٰ صبر سے ہے" حضرت علی کرم اللہ وجہہ ارشاد فرماتے ہیں کہ ایمان کی بناء چار ستونوں پر ہے' یقین' صبر' جہاد

---

(۱) مجھے یہ روایت اس تفصیل کے ساتھ نہیں ملی' البتہ اسکا اختصار کتاب العلم میں گزر چکا ہے (۲) یہ روایت مجھے نہیں ملی (۳) یہ روایت کتاب الحج میں گزری ہے (۴) یہ مرفوع روایت نہیں ہے' بلکہ حضرت عمر ابن عبدالعزیز کا قول ہے' جسے ابن ابی الدنیا نے نقل کیا ہے۔

اور عدل' آپ نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ صبر ایمان کے لئے ایسا ہے جیسے جسم کے لئے سر جس طرح بغیر سر کے جسم جسم نہیں ہوتا' اسی طرح صبر کے بغیر ایمان بھی نہیں ہوتا' حضرت عمرؓ کا قول ہے کہ دونوں گٹھریاں بھی عمدہ ہیں' اور ان کے علاوہ زائد گٹھری بھی' دونوں گٹھریوں سے مراد صلاۃ اور رحمت ہے' اور زائد گٹھری سے مراد ہدایت ہے' اس قول میں عدلین اور علاوہ دو لفظ مذکور ہیں عدلین سے وہ دو گٹھریاں مراد ہیں جو سواری کے اونٹ کے دائیں بائیں لٹکادی جاتی ہیں' اور علاوہ سے وہ گٹھری مراد ہے جو ان پر سے رکھ دی جاتی ہے' حضرت عمرؓ نے اس قول سے قرآن کریم کی اس آیت کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ (پ ۲ ر ۳ آیت ۱۵۷)

ان لوگوں پر خاص خاص رحمتیں بھی انکے پروردگار کی طرف سے ہوں گی اور عام رحمت بھی۔

حبیب ابن حبیب اس آیت کریمہ کی تلاوت کیا کرتے تھے تو یہ کہہ کر رویا کرتے تھے' سبحان اللہ خود ہی صبر دینے والا ہے' اور خود ہی تعریف کرنے والا ہے' یعنی خود ہی کی قوت دیتا ہے' اور خود ہی صبر کرنے پر تعریف فرماتا ہے۔

إِنَّا وَجَدْنَاهُ صَابِرًا ۚ نِّعْمَ الْعَبْدُ ۖ إِنَّهُ أَوَّابٌ (پ ۲۳ ر ۱۳ آیت ۴۴)

بے شک ہم نے ان کو صابر پایا' اچھے بندے تھے کہ بہت رجوع ہوتے تھے۔

ابو الدرداء فرماتے ہیں کہ ایمان کی بلندی' فیصلے پر صبر کرنا' اور تقدیر پر راضی رہنا ہے' یہ صبر کی فضیلت کا بیان تھا' اس ضمن میں کتاب و سنت کے منقول دلائل بیان کئے گئے ہیں عقل کے اعتبار سے بھی صبر ایک عمدہ وصف ہے' لیکن ہمارا یہ دعویٰ اس وقت تک صحیح نہیں سمجھا جاسکتا جب تک ہم صبر کی حقیقت اور اسکے معنی بیان نہ کردیں' اس لئے کہ حقیقت کی معرفت حاصل کرنا صفت کی معرفت حاصل کرنا ہے' جو موصوف کی معرفت سے پہلے حاصل نہیں ہوتی' اسلئے ہم پہلے صبر کی حقیقت اور اسکے معنی بیان کرتے ہیں۔

صبر کی حقیقت اور اسکے معنی

صبر' مقام دین' منزل سلوک : جاننا چاہیے کہ صبر دین کے مقامات میں سے ایک مقام اور سالکین کی منزلوں میں سے ایک منزل ہے۔ دین کے تمام مقامات تین امور سے ترتیب پاتے ہیں' اول معارف' دوم احوال' سوم اعمال' ان میں معارف بنیادی امر ہے' ان سے احوال جنم لیتے ہیں' اور احوال سے اعمال ظاہر ہوتے ہیں' ان تینوں میں معارف کو درختوں' احوال کو شاخوں اور اعمال کو پھلوں سے مشابہت حاصل ہے' سالکین کی تمام منزلوں کا یہی حال ہے' ایمان کا اطلاق کبھی صرف معارف پر ہوتا ہے اور کبھی معارف' احوال اور اعمال سب پر' اس اختلاف کی وہی نوعیت ہے جو کتاب قواعد العقائد میں ایمان و اسلام کے باب میں گزر چکی ہے' صبر بھی ایمان کی طرح ہے اسکے لئے بھی ضروری ہے کہ پہلے معرفت حاصل ہو' پھر ایک حالت اس پر واقع ہو' بلکہ تحقیقی بات یہ ہے کہ صبر نام ہی معرفت اور حالت کے مجموعے کا ہے' عمل تو ایک ثمرہ ہے جو ان دونوں کے وجود میں آتا ہے' اب ہم تینوں امور پر روشنی ڈالتے ہیں۔

معرفت : فرشتوں' انسانوں' اور جانوروں میں جو ترتیب ہے اس کی معرفت کے بغیر صبر کی معرفت حاصل نہیں ہوتی' صبر انسان کی خصوصیت ہے' جانوروں اور فرشتوں میں صبر کا تصور نہیں کیا جاسکتا' جانوروں میں ان کے نقص کی بناء پر' اور فرشتوں میں انکے کمال کی وجہ سے' اس کی تفصیل یہ ہے کہ بہائم پر شہوات مسلط کی گئی ہیں' اور وہ انکے لئے اس حد تک مسخر ہو کر رہ گئے ہیں کہ انکی حرکت و سکون کا باعث صرف شہوت ہوتا ہے' ان کے اندر کوئی ایسی قوت نہیں ہوتی جو اس شہوت کے مزاحم ہو' اور اسے اس کے مقتضیٰ سے روک سکے' شہوت کے مقابلے میں اس قوت مزاحمہ کا باقی رہنا ہی صبر ہے' ملائکہ علیہم السلام صرف اسلئے پیدا کئے گئے ان میں رب عظیم کا شوق ہو اور وہ اسکے قرب کے درجات سے خوش رہیں' ان میں شہوت نہیں رکھی گئی ہیں کہ جو انھیں قرب کے درجات اور رب عظیم کے شوق سے دور کرسکے' اور نہ انھیں ایسے لشکر کی ضرورت ہے جو ان کو حضرت ربوبیت سے باز رکھنے والی قوتوں پر غالب کرسکے۔ اسلئے کہ جو قوتیں حضرت ربوبیت سے باز رکھتی ہیں' وہ شہوات ہیں' اور ان میں شہوات پیدا ہی نہیں کی گئیں۔

جب کہ انسان کو شہوت بھی دی گئی ہے' اور وہ قوت بھی جس کے ذریعے وہ شہوت پر قابو پاسکے' ابتدائے پیدائش میں وہ جانور کی طرح ناقص پیدا کیا گیا کہ اسمیں سوائے اس غذا کی شہوت کے کوئی اور شہوت نہ تھی جس کا وہ محتاج تھا' پھر کچھ عرصہ بعد اس میں کھیل اور زیب و زینت کی شہوت پیدا ہوئی' اسکے بعد نکاح کی شہوت نے جنم لیا' یہ شہوات بہ ترتیب ظاہر ہوتی ہیں' شروع میں اس کے اندر صبر کی قوت بالکل نہیں ہوتی' اس لئے کہ صبر نام ہے ایک لشکر کا دوسرے لشکر کے مقابلے میں ٹھہرنے اور ثابت قدم رہنے کا' جب کہ ان دونوں میں مقتضیات اور مطالب کے تضاد کی بنا پر جنگ برپا ہو' بچے میں صرف خواہشات کا لشکر ہوتا ہے' جیسے جانوروں میں' لیکن کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے انسان کا درجہ اعلیٰ بنایا ہے اور اسکا درجہ بہائم کے درجہ سے بلند رکھا ہے' اس لئے جب اسکا وجود مکمل ہوجاتا ہے' اور وہ بلوغ کی دہلیز پر قدم رکھتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس پر دو فرشتے متعین کرتے ہیں' ان میں سے ایک اسے صحیح راستہ بتلاتا ہے اور دوسرا صحیح راستے پر چلنے میں اسکی اعانت کرتا ہے' انھی دو فرشتوں کی وجہ سے انسان جانوروں سے ممتاز اس کے علاوہ بھی انسان کے اندر اور مخصوص وصف ہیں' ایک اللہ اور اسکے رسول کی معرفت کا وصف' اور دوسرا عواقب سے متعلق مصلحتوں کی معرفت کا وصف۔ یہ دونوں وصف بھی اس فرشتے سے حاصل ہوتے ہیں جس کے سپرد ہدایت اور رہنمائی کا کام ہے' جانوروں کو نہ اللہ اور رسول کی معرفت ہے اور نہ وہ یہ جانتے ہیں کہ ان کا انجام کیا ہوگا' بلکہ انھیں صرف وہی راستہ نظر آتا ہے جس کی انھیں اس وقت خواہش ہوتی ہے' وہ صرف لذیذ چیزوں کے منتظر رہتے ہیں' یہاں تک کہ اگر انھیں کوئی مرض ہو اور کوئی تلخ مگر مفید دوا انھیں دی جائے تو وہ اسے قبول نہ کریں' اور نہ اس کی افادیت تسلیم کریں۔

انسان نور ہدایت سے یہ بات جانتے ہیں کہ شہوات کی اتباع کرنا اس کے حق میں انجام کے اعتبار سے مضر ہے' لیکن اسکے لئے صرف اتنا جان لینا کافی نہیں ہے' بلکہ جتنی ضرر رساں چیزیں ہیں اسکے ترک پر قدرت بھی ہونی چاہیے' انسان بہت سی ایسی چیزوں سے واقف ہوتا ہے جو اسے ضرر دیتی ہیں لیکن وہ ان کے ترک یا دفع پر قدرت نہیں رکھتا' جیسے مرض وغیرہ' اس صورت میں اسے ایک ایسی قدرت اور ایک ایسی قوت کی ضرورت پڑتی ہے جس کے ذریعہ وہ شہوات کو دور کرسکے۔ اور ان کے ساتھ اس قدر مجاہدہ کرسکے کہ نفس سے ان کی منازعت منقطع ہوجائے' اس مقصد کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایک اور فرشتہ مقرر فرمایا ہے جو اسے راہ راست پر رکھتا ہے' اور ایسے لشکروں سے اس کی تائید اور توثیق کرتا ہے جو نظر نہیں آتے' ان لشکروں کا فریضہ یہ ہے کہ وہ شہوات کے لشکروں کے ساتھ صف آرا ہوں' اور انھیں مقابلہ میں پسپا کریں' کبھی یہ لشکر کمزور پڑجاتے ہیں' اور کبھی طاقت بن کر ابھرتے ہیں' ان کا کمزور یا طاقت ور ہونا دراصل اس امر پر موقوف ہے کہ بندے کو اللہ عزوجل کی طرف سے کس قدر مدد اور اعانت ملی ہے' یہ ایسا ہی ہے جیسے مخلوق میں ہدایت کا نور بھی کم و بیش ہوتا ہے۔

باعث دین اور باعث شہوت : سہولت تفہیم کے لئے ہم اس وصف کا نام جس کے ذریعے شہوات پر غلبہ پانے میں انسان کو حیوان پر فوقیت ہے باعث دین کہتے ہیں' اور شہوات کا اپنے مقتضیات کی طلب کو باعث شہوت کہتے ہیں۔ اب یہ سمجھئے کہ باعث دین اور باعث شہوت میں جنگ برپا ہے' کبھی پہلا دوسرے پر غالب آجاتا ہے' اور کبھی دوسرا پہلے کو شکست دے دیتا ہے' اس جنگ کا میدان بندے کا دل ہے' باعث دین کو فرشتوں سے مدد پہنچتی ہے' جو اللہ تعالیٰ کی جماعت کے معاونین ہیں' اور باعث شہوت کو شیطان کی مدد حاصل ہے جو اللہ تعالیٰ کے دشمنوں کے مددگار ہیں' صبر یہ ہے کہ باعث دین باعث شہوت کے مقابلے میں ثابت قدم رہے' اگر بندے نے ثابت قدم رہ کر حریف کو شکست دیدی' اور اس کی مخالفت پر ہمیشہ کمربستہ رہا تو گویا اس نے اللہ تعالیٰ کے گروہ کی مدد کی' اور زمرۂ صابرین میں شامل ہوا' اور اگر کمزور پڑا' اور شکست سے دوچار ہوا یہاں تک کہ شہوت اس پر غالب آگئی' اور صبر کا یارا نہ رہا تو شیطان کے متبعین میں داخل ہوا۔

حالت اور ثمرہ : اس تفصیل کا حاصل یہ ہے کہ شہوت ترک کرنا ایک ایسا عمل ہے جو حالت صبر سے وجود میں آتا ہے' یعنی حالت صبر کا ثمرہ یہ ہے کہ آدمی شہوات ترک کردے' اور صبر باعث شہوت کے مقابلے میں باعث دین کے ثابت قدم رہنے کو کہتے

ہیں' اور باعث دین کا ثبات ایک ایسی حالت ہے جو شہوات اور دنیا و آخرت میں انکے متضاد اسباب کی معرفت سے حاصل ہوتی ہے' جب اس بات کا یقین پختہ ہوتا ہے کہ شہوت دشمن خدا ہے' اور راہ ہدایت کی راہزن ہے' تو باعث دین بھی قوی ہوتا ہے' یہی یقین دراصل وہ معرفت ہے جسے ایمان سے تعبیر کیا جاتا ہے' جب باعث دین قوی ہوتا ہے' تو اسکے پائے ثبات میں لغزش بھی نہیں آتی' اور وہ افعال خود بخود سرزد ہونے لگتے ہیں' جو شہوات کے متقضیات کے خلاف ہوں' اس سے ثابت ہوا کہ ترک شہوت کا مرحلہ اس باعث دین کی معرفت کے بغیر نہیں طے کیا جاسکتا جو باعث شہوت کی ضد ہے۔

کراماً" کاتبین کے فرائض: گزشتہ صفحات میں جن دو فرشتوں کا ذکر ہوا ہے' اللہ کے اذن سے وہ ان دونوں لشکروں کے کفیل رہتے ہیں' یہ فرشتے کراماً کاتبین کہلاتے ہیں' ہر شخص پر دو فرشتے مقرر ہیں' ان میں سے وہ فرشتہ جسے ہدایت کی ذمہ داری سونپی گئی ہے' اپنے شرف اور بزرگی کی بنا پر دائیں طرف رہتا ہے' اور جو تقویت دیتا ہے وہ بائیں جانب ہے پھر کیوں کہ آدمی کی دو حالتیں ہیں کبھی غافل رہتا ہے اور کبھی فکر کرتا ہے' کبھی گناہوں میں غرق ہو جاتا ہے' اور کبھی گناہوں کے خلاف مجاہدہ کرتا ہے' اس لئے جب غفلت کرتا ہے تو یہ اس بات کی علامت ہوتی ہے کہ اس نے دائیں طرف کے فرشتہ اسے اعراض کرلیا ہے' اور اسکے ساتھ بدسلوکی پر آمادہ ہے' چنانچہ دائیں جانب کا فرشتہ اسکے اعراض کے گناہوں کے ضمن میں لکھ لیتا ہے اور جب فکر کرتا ہے تو اس بات کی علامت ہوتی ہے کہ وہ ہدایت حاصل کرنے کے لئے دائیں جانب کے فرشتے کی طرف متوجہ ہے' اسلئے وہ اسکی توجہ کو نیکی لکھ لیتا ہے اسی طرح جب بندہ گناہوں میں غرق ہو جاتا ہے تو گویا بائیں طرف کے فرشتے کی مدد سے اعراض کرتا ہے اور اسکے ساتھ بدسلوکی کرتا ہے اسلئے وہ اس اعراض کو گناہ شمار کرتا ہے اور اگر مجاہدہ کرتا ہے تو یہ اس بات کی علامت ہوتی ہے کہ وہ اس فرشتے کی مدد کا طلب گار ہے اسلئے وہ اسکے مجاہدے کو نیکی لکھتا ہے کیونکہ نیک اور بد دونوں طرح کے اعمال یہ فرشتے اپنے اپنے روزنامچوں میں درج کرتے ہیں' اسلئے انھیں کراماً کاتبین کہا جاتا ہے' کرام۔ اسلئے کہ بندگان خدا کو اس سے نفع ہوتا ہے' نیز یہ اللہ تعالیٰ کے فرشتے ہیں جو معصوم' اور مقدس ہیں انھیں کاتبین اس لئے کہا جاتا ہے کہ یہ اللہ کے بندوں کے اچھے اور برے ہر طرح کے اعمال لکھتے ہیں' جن صحیفوں پر یہ اعمال لکھے جاتے ہیں' وہ سرّ قلب میں لپٹے رہتے ہیں' اور سرّ قلب سے مخفی رہتے ہیں' اس دنیا میں کوئی نہ جان پائے گا کہ ان صحیفوں میں کیا لکھا گیا ہے' اسلئے کہ وہ دونوں فرشتے اور ان کی تحریریں' اور جو چیزیں ان سے متعلق ہیں وہ سب عالم غیب اور عالم ملکوت سے تعلق رکھتی ہیں' عالم ظاہری سے نہیں' جو چیز عالم غیب سے ہوتی ہے وہ ظاہری آنکھوں سے اس عالم میں نہیں دیکھی جاسکتی۔

کراماً" کاتبین کے صحیفے: کراماً" کاتبین کے تحریر کردہ صحیفے دو مرتبہ کھولے جائیں گے' ایک مرتبہ اس وقت جب قیامت صغریٰ برپا ہوگی' اور دوسری مرتبہ اس وقت جب قیامت کبریٰ واقع ہوگی' قیامت صغریٰ سے ہماری مراد وہ حالت ہے جو موت کے وقت بندے کی ہوتی ہے' جیسا کہ حدیث شریف میں ہے :۔

مَنْ مَاتَ فَقَدْ قَامَتْ قِيَامَتُهُ (ابن ابی الدنیا۔ انسؓ)

جو شخص مرجاتا ہے اسکی قیامت برپا ہو جاتی ہے۔

اس قیامت کے وقت بندہ تنہا ہوتا ہے' اس موقع پر اس سے کہا جاتا ہے:۔

وَلَقَدْ جِئْتُمُونَا فُرَادَىٰ كَمَا خَلَقْنَاكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ (پ ۷ ر ۱۷ آیت ۹۵)

اور تم ہمارے پاس تنہا تنہا آگئے جس طرح ہم نے اول بار تم کو پیدا کیا۔

اس سے یہ بھی کہا جاتا ہے :۔

كَفَىٰ بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيبًا (پ ۱۵ ر ۲ آیت ۱۴)

آج تو خود اپنا آپ ہی محاسب کافی ہے۔

قیامت کبریٰ میں جو تمام مخلوق کو جامع ہوتی ہے آدمی تنہا نہیں ہوتا' بلکہ بعض اوقات اس کا احتساب بھرے مجمع میں کیا جاتا

ہے' اس قیامت میں متقین جنت اور مجرمین دوزخ میں جھوم در جھوم بھیجے جائیں گے' تنہا تنہا نہیں بھیجے جائیں گے' قیامت صغریٰ کی سب سے پہلی وحشت ہے' اسکے بعد جس قدر دہشتیں قیامت کبریٰ میں طاری ہوں گی قیامت صغریٰ میں ان سب کی نظیریں موجود ہیں' مثلاً زمین کا ہلنا' یہ ہولناک حادثہ قیامت کبریٰ میں پیش آئے گا' قیامت صغریٰ میں اسکی نظیر آدمی کا بدن ہے' جو روح کے لئے زمین کی مانند ہے' موت سے زمین ڈگمگانے لگتی ہے' یہ بات اچھی طرح معلوم ہے کہ جب کسی جگہ زلزلہ آتا ہے تو یہ کہا جاتا ہے فلاں ملک میں زلزلہ آیا' خواہ پاس پڑوس والوں کو اس سے کوئی نقصان نہ پہنچا ہو' بلکہ اگر کسی انسان کا گھر متزلزل ہو جائے اور باقی زمین محفوظ رہے تو وہ انسان زلزلہ کا شکار مانا جائے گا' کسی کے حق میں زلزلہ کا تصور اسی وقت ہوتا ہے جب اسے نقصان پہنچا ہو' خواہ پوری دنیا زلزلہ کا شکار ہوئی ہو' یا خاص طور پر اس کے گھر میں زلزلہ آیا ہو' اب موت کے بارے میں تصور کیجئے' بدن پر اس کے اثرات زلزلے کے اثرات سے کسی بھی طرح کم نہیں ہیں بلکہ کچھ زیادہ ہی ہیں۔

بدن کی زمین سے مشابہت : بدن کو زمین سے اس لئے تشبیہ دی گئی ہے کہ آدمی مٹی سے بنا ہے' اسکے حصے میں جس قدر مٹی آئی ہے اس سے اس کا بدن تخلیق پایا ہے' دوسرے کا بدن اس کا حصہ نہیں ہے۔ وہ زمین جس پر تم بیٹھتے ہو تمہارے جسم کا ظرف اور مکان ہے' تم زمین کے زلزلے سے اسی لئے ڈرتے ہو کہ کہیں تمہارا جسم متزلزل نہ ہو جائے ورنہ ہوا گردش میں رہتی ہے' تم اس سے خوف نہیں کھاتے' کیونکہ ہوا سے تمہارا جسم نہیں لرزتا اس سے معلوم ہوا کہ تمام زمین کے زلزلے سے آدمی کا صرف اسی قدر حصہ ہے جس قدر اسکا جسم جھٹکے کھائے' جو اس کی مٹی اور مخصوص زمین ہے' جس طرح زمین کے مخصوص اجزاء ہیں اسی طرح تمہارے جسد خاکی کے بھی اجزاء ہیں' اور وہ زمینی اجزاء کی نظیریں ہیں' ہڈیوں کی نظیر پہاڑ ہیں' سر کی مثال آسمان ہے' دل آفتاب کی حیثیت رکھتا ہے' آنکھ کان' ناک اور دوسرے حواس کی مثال ایسی مانند ہے جیسے سیارے اور ستارے جسم سے پسینہ بہتا ہے جیسے زمین پر دریا بہتے ہیں' بال سبزہ کی مانند ہیں' ہاتھ اور پاؤں درخت ہیں' تمام اجزاء کو اسی طرح قیاس کرنا چاہیے' جب موت کی وجہ سے تمہارے بدن کے یہ ارکان منعدم ہو جاتے ہیں' تو اس حالت پر یہ قول صادق آتا ہے :۔

اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا (پ ۳۰ ر ۲۴ آیت ۱)

جب زمین اپنی سخت جنبش سے ہلائی جائے گی۔

جب تمہارا گوشت ہڈیوں سے جدا ہو گا تو اس پر یہ مضمون منطبق ہو گا :۔

وَّحُمِلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً (پ ۲۹ ر ۵ آیت ۱۴)

اور اس وقت زمین اور پہاڑ (اپنی جگہ سے) اٹھالئے جائیں گے پھر دونوں ایک ہی دفعہ میں ریزہ ریزہ کردئے جائیں گے۔

جب ہڈیاں گل جائیں گی تو یہ مضمون صادق آئے گا :۔

وَاِذَا الْجِبَالُ نُسِفَتْ (پ ۲۹ ر ۲۱ آیت ۱۰)

اور جب پہاڑ اڑتے پھریں گے۔

دماغ پھٹے گا تو یہ آیت منطبق ہو گی :۔

اِذَا السَّمَاءُ انْشَقَّتْ (پ ۳۰ ر ۹ آیت ۱)

جب آسمان پھٹ جائے گا۔

موت کے وقت دل پر تاریکی چھا جائے گی' اس منظر کے لئے قرآن کریم میں یہ آیت ہے :۔

اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ (پ ۳۰ ر ۲۶ آیت ۱)

جب آفتاب بے نور ہو جائے گا۔

کان، آنکھ اور دوسرے حواس کے بیکار ہونے کے لئے یہ مضمون ہے :۔

وَاِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ (پ ۳۰ ر ۶ آیت ۲)

اور جب ستارے ٹوٹ ٹوٹ کر گر پڑیں گے۔

موت کے خوف کی وجہ سے پیشانی پر پسینہ آنے کی منظر کشی اس آیت سے ہوتی ہے :۔

وَاِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ (پ ۳۰ ر ۷ آیت ۳)

اور جب سب دریا بہہ جاویں گے۔

ایک پنڈلی دوسری پنڈلی سے لپٹ جائے گی۔ قرآن کریم میں ہے :۔

وَاِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ (پ ۳۰ ر ۶ آیت ۴)

اور جب دس مہینے کی گابھن اونٹنیاں چھٹی پھریں گی۔

جسم سے روح کی مفارقت کا منظر اس آیت سے بیان کیا جاسکتا ہے :۔

وَاِذَا الْاَرْضُ مُدَّتْ وَاَلْقَتْ مَا فِيْهَا وَتَخَلَّتْ (پ ۳۰ ر ۹ آیت ۴)

اور زمین کھینچ کر بڑھادی جائے گی (وہ زمین) اپنے اندر کی چیزوں کو (یعنی مردوں کو) باہر اگل دے گی اور خالی ہو جائے گی۔

قیامت کے احوال اور اہوال کے سلسلے میں جو واقعات قرآن کریم نے بیان کئے ہیں انسان کی موت میں ان سب کی نظیریں موجود ہیں ان تمام کا بیان تفصیل طلب ہے۔ مجملاً اتنا کہہ سکتے ہیں کہ موت کے ساتھ ہی انسان پر چھوٹی قیامت ٹوٹ پڑتی ہے۔ قیامت کبریٰ میں جو چیزیں تمہارے ساتھ مخصوص ہیں وہ قیامت صغریٰ میں بھی تم سے فوت نہ ہوں گی، البتہ جو چیزیں دوسروں کے لئے خاص ہیں وہ فوت ہو جائیں گی، مثلاً دوسروں کے حق میں ستاروں کا باقی رہنا تمہیں کیا نفع پہنچا سکتا ہے جب کہ تمہارے وہ حواس جن سے تم ستاروں کا نظارہ کرتے ہو بیکار ہو جائیں، اندھے کے نزدیک دن رات برابر ہوتے ہیں، سورج اپنی تابانی کے ساتھ روشن ہو یا گہنایا ہوا ہو اندھا ان دونوں میں کوئی فرق نہیں کرتا۔ اسلئے کہ اس کے حق میں تو وہ بیک وقت گہنا گیا ہے اب اگر آفتاب روشن بھی ہو تو وہ دوسرے کا حصہ ہو گا، جس کا سر پھٹ جائے گویا اس پر آسمان ٹوٹ پڑا کیونکہ آسمان اسی کو کہتے ہیں جو سر کی جانب ہو، اگر اس کا سر پھٹ جائے تو دوسرے کے حق میں آسمان کے باقی رہنے یا نہ رہنے سے کیا فائدہ ہو گا یہ تو قیامت صغریٰ کا حال ہے، اصل خوف اور دہشت کے مناظر اس وقت دیکھنے میں آئیں گے جب قیامت کبریٰ برپا ہو گی، خصوصیت کسی کی باقی نہ رہے گی، آسمان اور زمین بیکار ہو جائیں گے، پہاڑ ریزہ ریزہ بکھر جائیں گے، خوف و دہشت درجہ کمال کو پہنچ جائے گا۔

قیامت صغریٰ اور قیامت کبریٰ کا فرق : جاننا چاہیے کہ قیامت صغریٰ کے سلسلے میں اگرچہ ہم نے بہت کچھ لکھا ہے لیکن یہ اس کا عشر عشیر بھی نہیں جو لکھا نہیں گیا۔ قیامت صغریٰ قیامت کبریٰ کے سامنے ایسی ہے جیسے ولادت صغریٰ ولادت کبریٰ کے سامنے۔ انسان کی دو ولادتیں ہیں۔ ایک ولادت تو یہ ہے کہ آدمی باپ کی پشت سے ماں کی رحم میں منتقل ہو اور وہاں ایک مقررہ مدت تک قیام کرے، اس مدت قیام میں اس پر مختلف حالتیں طاری ہوتی ہیں۔ یہ حالتیں اسکے حق میں کمال کی منزلیں ہیں، پہلے نطفہ ہوتا ہے، پھر جما ہوا خون، پھر گوشت کا لوتھڑا، اسی طرح وہ ایک مکمل بچے کی صورت میں ماں کے تنگ رحم سے نکل کر وسیع و عریض دنیا کی آبادی میں اضافہ کرتا ہے۔ یہ ولادت کبریٰ ہے۔ قیامت کبریٰ کے عموم کی نسبت قیامت صغریٰ کے خصوص کے ساتھ وہی ہے جو فضائے عالم کی وسعت کو رحم مادر کی وسعت سے ہے۔ بندہ موت کے بعد جس عالم میں قدم رکھے گا اس کی وسعت کا دنیا کی وسعت سے وہی تعلق ہے جو عالم کی وسعت کو رحم مادر کی وسعت سے ہے، بلکہ وہ انتہائی عظیم وسعت ہے۔ آخرت کو دنیا پر اسی طرح قیاس کیا جاسکتا ہے۔ قرآن کریم میں ہے۔

خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ إِلَّا كَنَفْسٍ وَاحِدَةٍ (پ ۲۱ ر ۴ آیت ۲۸)

تم سب کا پیدا کرنا اور زندہ کرنا بس ایسا ہی ہے جیسا ایک شخص کا۔

دوسری دفعہ کا پیدا کرنا بھی ایسا ہی ہے جیسے پہلی دفعہ کا پیدا کرنا' بلکہ اگر غور کیا جائے تو پیدائش دو میں منحصر نہیں ہو سکتی' بلکہ آدمی دو سے زائد بار اس اس مرحلے سے گزرتا ہے۔ قرآن کریم میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

وَنُنْشِئَكُمْ فِي مَا لَا تَعْلَمُونَ (پ ۲۷ ر ۱۵ آیت ۶۱)

اور تم کو ایسی صورت میں بنادیں گے جنکو تم جانتے ہی نہیں۔

جو شخص دونوں قیامتوں کا معترف ہے وہ عالم ظاہر اور عالم باطن دونوں پر ایمان رکھتا ہے' ملک اور ملکوت دونوں کا اعتقاد رکھتا ہے' اور جو شخص صرف قیامت صغریٰ کا قائل ہے' قیامت کبریٰ کو نہیں مانتا وہ گویا ایک آنکھ سے محروم ہے' اور ایک ہی عالم کو دیکھنے پر قادر ہے' یہ جہالت اور گمراہی ہے' کانے دجال کی اقتداء اور پیروی ہے' بے چارہ کس قدر غافل ہے۔ اس غفلت کا شکار یہی شخص نہیں ہے' بلکہ ہم سب اسی غفلت میں مبتلا ہیں' خطرات تیرے سامنے ہیں' اگر تو اپنی نادانی' جہالت اور گمراہی کے باعث قیامت کبریٰ پر ایمان نہیں رکھتا تو کیا قیامت صغریٰ کی دلالت تیرے لئے کافی نہیں ہے' کیا تو نے سید الانبیاء سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی نہیں سنا :۔ كَفَى بِالْمَوْتِ وَاعِظًا (البیہقی فی الشعب۔ عائشہؓ) موت نصیحت کے لئے کافی ہے۔ کیا تو نے وفات کے وقت سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے کرب کا حال نہیں سنا' یہاں تک کہ آپ نے اس اذیت کے عالم میں ارشاد فرمایا :۔

اَللّٰهُمَّ هَوِّنْ عَلَى مُحَمَّدٍ سَكَرَاتِ الْمَوْتِ (ترمذی' ابن ماجہ۔ عائشہؓ)

اے اللہ! محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر موت کی سکرات آسان فرما۔

کیا تجھے اس بات پر شرم نہیں آتی کہ تو موت کی تاخیر سے غفلت کا شکار ہو جاتا ہے' اور ان غافل گمراہوں کی پیروی کرنے لگتا ہے جن کے بارے میں ارشاد فرمایا گیا :۔

مَا يَنْظُرُونَ إِلَّا صَيْحَةً وَاحِدَةً تَأْخُذُهُمْ وَهُمْ يَخِصِّمُونَ فَلَا يَسْتَطِيعُونَ تَوْصِيَةً وَلَا إِلَى أَهْلِهِمْ يَرْجِعُونَ (پ ۲۳ ر ۲ آیت ۵۰)

یہ لوگ بس ایک آواز سخت کے منتظر ہیں جو ان کو پکڑے گی' اور وہ سب باہم لڑ جھگڑ رہے ہوں گے' سو نہ تو وصیت کرنے کی فرصت ہوگی اور نہ اپنے گھر والوں کے پاس لوٹ کر جاسکیں گے

مرض تیرے پاس موت کا نذیر (ڈرانے والا) بن کر آتا ہے' لیکن تجھے خوف نہیں آتا' بالوں میں سفیدی موت کا پیغام بر ہوتی ہے' لیکن تو یہ پیغام قبول نہیں کرتا' بلکہ تیری مثال ان لوگوں کی سی ہوتی ہے جن کے بارے میں اللہ رب العزت کا ارشاد ہے :۔

يَا حَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ مَا يَأْتِيهِمْ مِنْ رَسُولٍ إِلَّا كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِئُونَ (پ ۲۳ ر ۱ آیت ۳۰)

افسوس ایسے بندوں کے حال پر کبھی ان کے پاس کوئی رسول نہیں آیا جس کی انہوں نے ہنسی نہ اڑائی ہو

کیا تو سمجھتا ہے کہ تجھے دنیا میں ہمیشہ رہنا ہے کیا تو نے یہ آیت نہیں پڑھی :۔

أَلَمْ يَرَوْا كَمْ أَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِنَ الْقُرُونِ أَنَّهُمْ إِلَيْهِمْ لَا يَرْجِعُونَ (پ ۲۳ ر ۱ آیت ۳۰)

کیا ان لوگوں نے اس پر نظر نہ کی کہ ہم ان سے پہلے بہت سی امتیں غارت کر چکے کہ وہ انکی طرف لوٹ کر نہیں آتے۔

اگر تیرا خیال یہ ہے کہ مردے معدوم ہو گئے' ان کا وجود باقی نہیں رہا تو یہ تیری خام خیالی ہے' قرآن کریم نے اس سلسلے میں ارشاد فرمایا :۔ وَإِنْ كُلٌّ لَمَّا جَمِيعٌ لَدَيْنَا مُحْضَرُونَ (پ ۲۳ ر ۱ آیت ۳۲)

اور ان میں سے کوئی ایسا نہیں کہ جو مجتمع طور پر ہمارے روبرو حاضر نہ کیا جائے۔

یہ لوگ اپنے رب کی آیات سے اعراض کرتے ہیں' اس کی وجہ اس آیت میں بیان کی گئی ہے :-

وَجَعَلْنَا مِنْ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ سَدًّا وَمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَأَغْشَيْنَاهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُونَ وَسَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أَأَنْذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ (پ ۲۲ ر ۱۳ آیت ۹-۱۰)

اور ہم نے ایک آڑ ان کے سامنے کردی اور ایک آڑ ان کے پیچھے کردی جس سے ہم نے ان کو گھیر دیا سو وہ نہیں دیکھ سکتے' اور ان کے حق میں آپ کا ڈرانا یا نہ ڈرانا دونوں برابر ہیں یہ ایمان نہ لائیں گے

مقصد کی طرف واپسی : اب ہم مقصد کی طرف واپس چلتے ہیں۔ اب تک جو کچھ عرض کیا گیا اس کا مقصد ان کی طرف اشارہ کرنا ہے جو علوم معاملہ سے اعلا ہیں چنانچہ ہم کہتے ہیں کہ صبر باعث ہوا کے مقابلے میں باعث دینی کے ثبات کا نام ہے' یہ مقابلہ انسان کی خصوصیت ہے' اسلئے کہ اس پر کراما" کاتبین مقرر ہیں' فرشتے دیوانوں اور بچوں پر مقرر نہیں ہوتے اور نہ ان کے اعمال ضبط تحریر میں لاتے ہیں' ہم یہ بات پہلے لکھ چکے ہیں کہ اگر ان فرشتوں کی طرف استفادے کی غرض سے توجہ کی جائی تو وہ حسنہ لکھتے ہیں' اور اعراض کیا جائے تو سیئہ لکھتے ہیں۔ بچوں اور دیوانوں میں استفادے کی صلاحیت نہیں ہوتی اس لئے ان ان سے توجہ یا روگردانی کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا' اور کراما کاتبین سوائے اقبال اور اعراض کے کچھ نہیں لکھتے' اور صرف ان لوگوں کا لکھتے ہیں جو اقبال اور اعراض پر قادر ہوتے ہیں۔ البتہ بعض اوقات نور ہدایت کا آغاز سن تمیز سے ہی ہو جاتا ہے' اور سن بلوغ تک پہنچتے پہنچتے یہ نور مکمل ہو جاتا ہے' جیسے صبح کی روشنی ابتدا میں کم رہتی ہے' جوں ہی آفتاب طلوع ہوتا ہے' یہ روشنی مکمل ہو جاتی ہے' لیکن یہ ہدایت ناقص ہے' اگر اس کے بموجب عمل نہ کیا جائے تو آخرت میں کوئی ضرر نہ ہوگا' البتہ دنیا کے ضرر سے محفوظ نہیں رہے گا' یہی وجہ ہے کہ نابالغ بچے کو نماز ترک کرنے پر زدو کوب کیا جاتا ہے' لیکن آخرت میں اسکو کوئی عذاب نہ ہوگا' اور نہ اس کے اعمال نامے میں نماز ترک کرنے کا یہ عمل بطور گناہ درج کیا جاتا ہے' جو شخص کسی بچے کا کفیل یا مربی ہو' اور اس پر شفیق اور مہربان بھی ہو' اور کراما" کاتبین کی طرح نیک بخت بھی اسے چاہیے کہ وہ بچے کے صحیفۂ دل پر نیکی اور بدی کے تمام تصورات نقش کردے پھر اس صحیفے کا پھیلانا یہ ہے کہ اگر وہ بچہ اچھا کام کرے تو اسکی تعریف کرے' اور برا کام کرے تو اسے سزادے' خواہ مارنا پیٹنا پڑے' جس مربی کا اپنے زیر تربیت بچے کے ساتھ یہ معاملہ ہوگا وہ فرشتوں کی عادات کا وارث اور ان کے اخلاق کا امین ہے بچے کے حق میں ملکوتی اخلاق و عادات کے استعمال سے وہ فرشتوں کی طرح اللہ تعالٰی کی قربت حاصل کرے گا' اور انبیاء صدیقین اور مقربین کی جماعت میں شامل ہوگا۔ حدیث شریف میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے :-

أَنَا وَكَافِلُ الْيَتِيمِ كَهَاتَيْنِ (بخاری۔ سہیل ابن سعدؓ)

میں اور یتیم کا کفیل ان دو انگلیوں کی طرح قریب قریب ہوں گے۔

صبر نصف ایمان کیوں ہے؟

: جاننا چاہیے کہ ایمان کا اطلاق کبھی اصول دین کی تصدیقات پر ہوتا ہے' اور کبھی ان نیک اعمال پر جو ان تصدیقات کے نتیجے میں ظہور پزیر ہوتے ہیں۔ اور کبھی ان دونوں کے مجموعے پر اس لفظ کا اطلاق ہوتا ہے۔ کیونکہ معارف کی بھی متعدد قسمیں ہیں۔ اور اعمال کی بھی بے شمار قسمیں ہیں' ایمان کا لفظ ان سب پر بولا جاتا ہے' اسلئے ایمان کی ستر سے زیادہ قسمیں ہیں' باب قواعد العقائد میں اس موضوع پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

صبر کو دو اعتبار سے نصف ایمان کہتے ہیں' اور ایمان کے دو ہی معنی اسے نصف ایمان کہنے کے مقتضی ہیں۔ ایک تو یہ کہ ایمان کا اطلاق تصدیقات اور اعمال دونوں پر ہو' اس صورت میں ایمان کے دو رکن ہوں گے ایک یقین اور دوسرا صبر' یقین سے مراد قطعی اصول دین کی معرفت ہے جو بندے کو اللہ تعالٰی کی ہدایت سے حاصل ہوئی ہے' اور صبر سے مراد یہ ہے کہ یقین کے موجب پر عمل کیا

جائے یقین آدمی کو یہ بتلاتا ہے کہ معصیت مضر ہے' اور طاقت مفید ہے' ترک معصیت اور اطاعت پر مداومت صبر کے بغیر ممکن نہیں' یعنی جب تک آدمی کا باعث دینی اسکے باعث ہوا پر پوری طرح غالب نہ ہو اس وقت تک نہ معصیت ترک کی جاسکتی ہے اور نہ طاعت پر عمل کیا جاسکتا ہے' اسی کا نام صبر ہے' اس اعتبار سے صبر کو نصف ایمان قرار دیا جاسکتا ہے اسی لئے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یقین اور صبر کو ایک جگہ ذکر فرمایا :۔

مِنْ اَقَلِّ مَا اُوْتِيْتُمُ الْيَقِيْنُ وَعَزِيْمَةُ الصَّبْرِ (۱)

تمہیں جو چیزیں کم دی گئی ہیں ان میں سے یقین اور قصد صبر ہے۔

دوسرے یہ کہ ایمان کا اطلاق ان احوال پر ہو جو اعمال کا موجب ہیں' نہ اعمال پر ہو' اور نہ معارف پر بندے کے تمام احوال دو طرح کے ہیں' ایک یہ کہ وہ دنیا اور آخرت میں اسکے لئے نفع بخش ہوں۔ اور دوسرے یہ کہ وہ دنیا و آخرت میں اسکے لئے نقصان دہ ہوں' اگر مضر چیزوں کا اعتبار کیا جائے تو بندہ کی حالت کو صبر کا نام دیا جائے گا' اور مفید چیزوں کا اعتبار کیا جائے تو اسے شکر کہا جائے گا۔ اس صورت میں شکر ایمان کا نصف ہے' جیسا کہ پہلے معنی کے اعتبار سے یقین ایمان کا نصف تھا۔ اسی لئے حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ ایمان کے دو نصف ہیں' ایک نصف صبر ہے اور ایک نصف شکر ہے' یہ روایت سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے مرفوع بھی نقل کی گئی ہے (۲)

باعث ہوی کی دو قسمیں : جیسا کہ بیان کیا جاچکا ہے کہ صبر باعث دینی کا باعث ہوی کے مقابلے میں ٹھہرنا اور ثابت قدم رہنا ہے۔ باعث ہوی کی دو قسمیں ہیں ایک باعث وہ ہے جو شہوت کی جہت سے پیدا ہو' اور دوسرا وہ ہے جو غضب کی جہت سے سامنے آئے' کیونکہ لذیذ چیز کی طلب کیلئے ہو تو شہوت کی طرف سے ہوگا' اور ایذا دینے والی تکلیف سے فرار کے لئے ہو تو غضب کی طرف سے ہوگا روزے میں کیونکہ شکم اور فرج کی شہوت سے رکنا ہوتا ہے اسلئے اسے مکمل صبر نہیں کیا گیا' کیونکہ اس میں غضب سے صبر کرنا داخل نہیں ہے حدیث شریف میں ہے :۔

اَلصَّوْمُ نِصْفُ الصَّبْرِ (۳) روزہ نصف صبر ہے۔

اس لئے کہ صبر اس وقت مکمل ہوتا ہے جب شہوت اور غضب دونوں کے دواعی سے باز رہا جائے' اس اعتبار سے روزہ ایمان کا چوتھائی حصہ ہوگا

شریعت نے بعض اعمال کی حدود مقرر کی ہیں اور انکو ایمان کا آدھا' یا چوتھائی حصہ قرار دیا ہے ان شرعی تقدیرات کو سمجھنے کا یہی طریقہ ہے جو بیان کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں اصل بات یہ ہے کہ پہلے ایمان کی قسمیں معلوم کی جائیں' تاکہ یہ معلوم ہوسکے کہ ایمان کے کس معنی کی رو سے یہ نسبت بیان کی گئی ہے' اس کے بغیر اعمال کی حدود کے سلسلے میں شریعت کی بیان کردہ تقدیرات کا سمجھنا دشوار ہے' ایمان کسی ایک مفہوم یا معنی کے لئے مخصوص نہیں ہے' بلکہ بہت سے مختلف معانی پر اسکا اطلاق ہوتا ہے

صبر کے مختلف مفہوم مختلف نام

جاننا چاہیے کہ صبر کی دو قسمیں ہیں' ایک تو یہ کہ بدن سے صبر کیا جائے جیسے جسم پر مشقتیں سہنا' اور ثابت قدم رہنا پھر اس کی دو قسمیں ہیں' ایک تو یہ کہ اپنے جسم پر خود ہی مشقتیں ڈھائے' دوسری یہ کہ اپنے علاوہ کسی دوسرے شخص کی جسمانی ایذا سے اور برداشت کرے۔ پہلے کی مثال یہ ہے جیسے کوئی مشکل کام یا سخت ترین عبادت بجالائے' اور دوسرے کی مثال یہ ہے کہ کسی کی مار برداشت کرے۔ شدید مرض اور سخت زخم [illegible] بہت پر تحمل سے کام لے' یہ قسم بھی عمدہ ہے' بشرطیکہ شریعت کے موافق ہو' لیکن پورے طور پر پسندیدہ قسم یہ ہے کہ طبیعت کی شہوتوں اور ہوائے نفس کے تقاضوں سے باز رہے۔ اس صورت میں اگر شکم اور شرمگاہ کی شہوت سے صبر ہوگا تو اس کا نام عفت ہے' اور اگر کسی بری بات سے صبر ہو تو یہ دیکھا جائے گا کہ وہ بری بات کون سی ہے' اس لئے

---

(۱) یہ روایت ابھی چند صفحات پہلے گزری ہے (۲) یہ روایت بھی ابھی گزری ہے (۳) یہ روایت کتاب الصوم میں گزر چکی ہے

کہ ہر بری بات سے صبر کے لئے الگ نام ہے۔ مثلاً اگر کسی معصیت پر صبر ہو تو اسے صبر ہی کہا جائے گا اس کی متضاد حالت وہ ہے جسے جزع اور ہلع کہتے ہیں، یعنی ہوا کے دواعی کو پورے طور پر آزاد چھوڑ دے، چیخے چلائے، سینہ کوبی کرے، گریبان پھاڑے وغیرہ۔ اگر مالداری برداشت کرنے میں صبر ہو تو اسے ضبط نفس کہتے ہیں اسکی ضد اترانا ہے، اگر صبر میدان جنگ میں ہو تو اسے شجاعت کہتے ہیں، اس کے مقابلے میں نامردی اور بزدلی ہے، اگر صبر غصہ پینے میں ہو تو اسے حلم کہتے ہیں، اسکے مقابلے میں غضبناکی ہے، اگر زمانے کی آفات میں سے کسی آفت پر صبر کیا جائے تو اسے وسعت ظرفی اور فراخ حوصلگی کہا جاتا ہے، اس کی ضد تنگ ظرفی اور کم حوصلگی ہے، اگر کسی کی بات چھپانے میں صبر ہو تو اسے رازداری کہتے ہیں اور بات چھپانے والے کو رزدار کہا جاتا ہے، اگر زندگی کی زائد ضروریات سے صبر ہو تو اسے زہد کہتے ہیں، اسکے مقابلے میں حرص ہے، اگر بقدر ضرورت پر صبر کیا جائے اور جو کچھ حاصل ہو اس پر راضی رہا جائے تو اسے قناعت کہتے ہیں، اسکے مقابلے میں ہوس ہے۔ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اکثر ایمانی اخلاق صبر کے اندر داخل ہیں اسی لئے جب سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایمان کے متعلق دریافت کیا گیا آپ نے فرمایا ایمان صبر ہے۔ اس لئے کہ ایمان کے اکثر اور بڑے اعمال صبر ہی میں منحصر ہیں، اسی لحاظ سے آپ نے حج کو عرفہ قرار دیا کہ حج کے ارکان میں عرفہ بڑا رکن ہے۔

اللہ تعالیٰ نے یہ تمام اقسام جو اوپر کی سطور میں بیان کی گئی ہیں قرآن کریم میں یکجا بیان فرمائی ہیں۔

وَالصَّابِرِيْنَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَحِيْنَ الْبَأْسِ أُولٰئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَأُولٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ (پ ۲ ر ۶ آیت ۱۷۷)

اور (وہ لوگ) مستقل رہنے والے ہیں تنگ دستی میں اور بیماری میں اور قتال میں، یہ لوگ ہیں جو سچے ہیں اور یہی لوگ ہیں جو (سچے) متقی (کہے جاسکتے) ہیں

باساء سے مراد مصیبت کے وقت صبر کرنا ہے، ضراء سے مراد افلاس کے وقت، اور حین الباس سے مراد جہاد کے میدان میں صبر کی یہ قسمیں ہیں، متعلقات کے اختلاف کی بنا پر ان کے نام بھی مختلف ہو گئے ہیں، جو شخص الفاظ کے معنی سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہے، وہ یہ بات بھی جانتا ہے کہ الفاظ کے اختلاف سے معنی بھی مختلف ہو جاتے ہیں، یعنی صبر کی مختلف حالتوں کے لئے جو مختلف نام وضع کئے گئے ہیں انکا تقاضا یہ ہے کہ ہر حالت کی ذات اور ماہیت دوسری حالت کی ذات اور ماہیت سے مختلف ہو۔ صراط مستقیم پر چلنے والے اور نور الٰہی سے دیکھنے والوں کی نظر پہلے معانی پر جاتی ہے، پھر الفاظ پر، اس لئے کہ الفاظ معانی پر دلالت کے لئے وضع کئے جاتے ہیں، معانی اصل ہیں اور الفاظ ان کے تابع ہیں، جو شخص توابع سے اصول کو سمجھنا چاہے گا وہ لغزش سے اپنا دامن نہ بچا سکے گا قرآن کریم نے دونوں فریقوں کی طرف اشارہ فرمایا ہے

أَفَمَنْ يَمْشِيْ مُكِبًّا عَلٰى وَجْهِهٖ أَهْدٰى أَمَّنْ يَمْشِيْ سَوِيًّا عَلٰى صِرَاطٍ مُسْتَقِيْمٍ (پ ۲۹ ر ۲ آیت ۲۲)

سو جس کافر کا حال اوپر سنا ہے اسکو سن کر سوچو کہ) کیا وہ شخص منہ کے بل گرتا ہوا چل رہا ہو وہ منزل مقصود پر زیادہ پہنچنے والا ہو گا یا وہ شخص جو سیدھا ایک ہموار سڑک پر چلا جا رہا ہو

اگر غور کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جائے کہ کفار نے سب سے پہلے جو غلطی کی ہے وہ اسی طرح کے امور میں تھی

قوت اور ضعف کے اعتبار سے صبر کی قسمیں

باعث دینی کو باعث ہویٰ کے مقابلے میں رکھ کر دیکھیں تو اسکے تین احوال ہوتے ہیں، ایک حال یہ ہے کہ داعیہ ہویٰ کو اس قدر مقہور کر دیا جائے کہ منازعت کی کوئی قوت باقی نہ رہے، یہ حالت مسلسل صبر کرنے سے حاصل ہوتی ہے، یہ جملہ اسی صورت میں کہا جاتا ہے :۔ مَنْ صَبَرَ ظَفَرَ (جس نے صبر کیا اس نے کامیابی حاصل کی)

اس مرتبے پر پہنچنے والے لوگ بہت کم ہیں، جو لوگ ہیں وہ صدیق اور مقرب ہیں، جنھوں نے اللہ کو اپنا رب کہا، پھر اپنے کہے پر ثابت قدم رہے، یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے سیدھے راستے کو لازم پکڑا، اور اس سے انحراف نہیں کیا۔ باعث دین پر ان کے نفوس

راضی اور مطمئن ہیں' ایسے ہی لوگوں کو یہ ندا دی جائے گی :-

يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِي إِلَى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَرْضِيَّةً (پ ۳۰ ر ۱۴ آیت ۲۸)

اے اطمینان والی روح تو اپنے پروردگار (کے جوار رحمت) کی طرف چل اس طرح سے کہ تو اس سے خوش اور وہ تجھ سے خوش

دوسری حالت یہ ہے کہ ہوی کے دواعی غالب ہو جائیں اور باعث دین کی منازعت بالکل ختم ہو جائے یہ لوگ اپنے نفسوں کو شیطانی لشکروں کے حوالے کر دیتے ہیں' اور مجاہدے کے نتائج سے مایوس ہو کر کوشش ترک کر دیتے ہیں' یہ لوگ غافلین کے زمرے میں ہیں' اور ان کی تعداد بہت زیادہ ہے' ایسے ہی لوگ شہوات کے غلام اور نفس کے بندے ہیں' جب ان پر بدبختی غالب آئی تو انھوں نے اپنے دلوں پر جو اللہ تعالیٰ کے اسرار سے تعلق رکھتے ہیں اللہ کے دشمنوں کو غالب کر لیا۔ قرآن کریم کی اس آیت میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے :-

وَلَوْ شِئْنَا لَآتَيْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدَاهَا وَلَٰكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّي لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ (پ ۲۱ ر ۱۵ آیت ۱۳)

اور اگر ہم کو منظور ہوتا تو ہم ہر شخص کو اس کا رستہ عطا فرماتے اور لیکن میری یہ بات محقق ہو چکی ہے کہ میں جہنم کو جنات اور انسان دونوں سے ضرور بھروں گا۔

یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے آخرت کے عوض دنیا کی زندگی خریدی ہے' اور اس خرید و فروخت میں نقصان اٹھایا ہے' جو نیک لوگ ایسے گم کردہ راہ لوگوں کو ہدایت کا راستہ دکھلانا چاہتے ہیں ان کے بارے میں ارشاد کیا جاتا ہے :-

فَأَعْرِضْ عَن مَّن تَوَلَّىٰ عَن ذِكْرِنَا وَلَمْ يُرِدْ إِلَّا الْحَيَاةَ الدُّنْيَا ذَٰلِكَ مَبْلَغُهُم مِّنَ الْعِلْمِ (پ ۲۷ ر ۶ آیت ۳۰)

تو آپ ایسے شخص سے اپنا خیال ہٹا لیجئے جو ہماری نصیحت کا خیال نہ کرے' اور بجز دنیاوی زندگی کے اسکو کچھ مقصود نہ ہو' ان لوگوں کی فہم کی رسائی کی حد بس یہی ہے۔

اس حالت کی پہچان یہ ہے کہ آدمی مجاہدے سے مایوس اور ناامید ہو' اور آرزوؤں سے فریب خوردہ ہو' اور یہ انتہائی درجے کی حماقت ہے۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں :-

الْكَيِّسُ مَنْ دَانَ نَفْسَهُ وَعَمِلَ لِمَا بَعْدَ الْمَوْتِ وَالْأَحْمَقُ مَنِ اتَّبَعَ هَوَاهَا وَتَمَنَّى عَلَى اللَّهِ (۱)

عقلمند وہ ہے جو اپنے نفس کو ڈرائے اور موت کے بعد کی زندگی کے لئے عمل کرے' اور احمق وہ ہے جو اپنے نفس کی اتباع کرے' اور اللہ پر تمنا کرے

اس حالت والے کو جب نصیحت کی جاتی ہے تو وہ یہ جواب دیتا ہے کہ میں توبہ کرنے کا متمنی تھا' لیکن کسی وجہ سے میں توبہ نہیں کر پایا اس لئے اب اس کی خواہش بھی نہیں رہی' یا یہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ غفور' رحیم اور کریم ہے' اس لئے توبہ کی ضرورت ہی کیا ہے؟ اس بے چارہ کی عقل شہوات کی اسیر ہے' وہ اپنی عقل کو اسی طرح کے حیلے بہانے تراشنے میں استعمال کرتا ہے جن سے اپنی نفسانی خواہشات پوری کر سکے۔ اسکی عقل شہوات کے ہاتھوں میں اس طرح مقید ہوتی ہے جس طرح مسلمان کفار کے ہاتھوں میں قید ہوتا ہے کہ اسے جس طرح چاہتے ہیں استعمال کرتے ہیں' اس سے خنزیر چرواتے ہیں' شراب بنواتے ہیں' اور اسکی نگہداشت اور حمل و نقل پر مامور کرتے ہیں' اور اسی طرح کے دوسرے ناجائز کام لیتے ہیں' اللہ تعالیٰ کے یہاں اس شخص کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص کسی مسلمان کو کفار کے حوالے کر دے' اس کا گناہ یہی ہے کہ اس نے ایک ایسے شخص کو مغلوب بنایا جسے غالب ہونا چاہیے تھا' اور ایک ایسے شخص کے لئے مسخر کیا ہے جسے مسخر اور مغلوب رہنا چاہیے تھا۔ مسلمان کا حق تو یہ ہے کہ وہ غالب ہو کیونکہ اس میں

(۱) اس روایت کا حوالہ احیاء العلوم جلد سوم کے باب ذم الغرور میں گزر چکا ہے

معرفت الٰہی اور باعث دینی ہے' کافر کا حق یہ ہے کہ وہ مغلوب ہو کیونکہ اس میں دین سے جہالت اور شیطانی باعث ہے۔ مسلمان کا حق اپنے نفس پر دوسروں کی بنسبت زیادہ واجب ہے۔ چنانچہ اگر کوئی شخص اس شریف شئے کو جو اللہ کی جماعت اور فرشتوں کے گروہ سے تعلق رکھتی ہے یعنی عقل کو کسی ایسی رذیل شئے کے لئے مسخر کردے جو شیطانی گروہ سے متعلق ہو اور اللہ تعالیٰ سے دور کرتی ہو وہ ایسا ہے جیسے کوئی شخص کسی مسلمان کو کافر کا غلام بنادے' بلکہ جیسے کوئی شخص کسی محسن اور منعم بادشاہ کے عزیز ترین بیٹے کو گرفتار کرکے اس کے بدترین دشمن کے حوالے کردے۔ غور کیجئے یہ شخص کتنا بڑا احسان فراموش ہے' اور اسے کس قدر کڑی سزا ملنی چاہیے کہ اس نے اپنے محسن کو تکلیف پہنچائی' یہ مثال اس مقام کے لئے اس لئے موزوں ہے کہ ہوائے نفس بدترین معبود ہے جسکی زمین پر پرستش کی جاتی ہے' اور عقل انتہائی پیاری اور قیمتی چیز ہے جو دنیا میں پیدا کی گئی ہے خود سوچئے اس شخص کو کتنی بڑی سزا ملنی چاہیے جو عقل جیسی قیمتی چیز کو ہوائے نفس جیسی بدترین شئے کے حوالے کردے۔

تیسری حالت یہ ہے کہ جنگ برابر کی ہو' کبھی باعث دین غالب آجائے اور کبھی باعث ہوی' ایسے شخص کا شمار مجاہدین کے زمرے میں ہوتا ہے' فتح پانے والوں میں نہیں ہوتا۔ اس قسم کے لوگوں کا حال قرآن کریم کی اس آیت میں مذکور ہے :۔

خَلَطُوْا عَمَلًا صَالِحًا وَّ آخَرَ سَیِّئًا عَسَى اللّٰهُ اَنْ یَّتُوْبَ عَلَیْهِمْ (پ ۱۱ ر ۲ آیت ۱۰۲)

جنھوں نے ملے جلے عمل کئے تھے کچھ بھلے اور کچھ برے شاید اللہ تعالیٰ ان کی دعا قبول کرے۔

یہ تینوں حالتیں قوت و ضعف کے اعتبار سے ہیں جن چیزوں پر صبر کیا جائے ان کے اعتبار سے بھی آدمی کی تین حالتیں ہوسکتی ہیں۔ ایک یہ کہ آدمی تمام شہوات پر غالب ہو جائے' دوسری یہ کہ کسی شہوت پر غالب نہ ہو' تیسری یہ کہ کسی شہوت پر غالب ہو اور کسی پر نہ ہو۔ اوپر جو آیت ذکر کی گئی ہے وہ اسی تیسری حالت والوں کے بارے میں ہے۔ جو لوگ صرف شہوات پر عمل کرتے ہیں مجاہدہ نہیں کرتے وہ چوپایوں کی مانند ہیں' بلکہ ان سے بھی زیادہ گم گشتہ راہ ہیں چوپایوں کے لئے معرفت اور قدرت پیدا نہیں کی گئی جس سے وہ شہوات کے مقتضی کے خلاف جہاد کرسکیں' انسان کے لئے پیدا کی گئی ہے' لیکن وہ اسے بیکار رکھتا ہے' ایسا شخص بلاشبہ ناقص اور بدبخت ہے۔ جو قدرت کے باوجود کمال حاصل نہ کرے' بقول شاعر :۔

وَلَمْ اَرَ فِیْ عُیُوْبِ النَّاسِ عَیْبًا ۔۔۔ کَنَقْصِ الْقَادِرِیْنَ عَلَى التَّمَامِ

(میں نے لوگوں کے عیوب میں کوئی عیب ایسا نہیں دیکھا جیسے کمال قدرت رکھنے والوں کا نقص)

صبر کی دو اور قسمیں : آسانی اور دشواری کے اعتبار سے بھی صبر کی دو قسمیں ہیں' ایک وہ صبر ہے جو نفس پر شاق ہو اور بغیر مشقت اور جدوجہد کے اس پر مداومت مشکل ہو' اسکا نام تصبر (زبردستی صبر کرنا) ہے۔ دوسرا صبر وہ ہے جس میں کوئی خاص مشقت یا محنت نہ ہو' بلکہ نفس پر معمولی دباؤ ڈالنا کافی ہو جائے' اس قسم کا نام صبر ہے۔ اگر تقویٰ پر مداومت ہو' اور یقین میں پختگی ہو تو صبر آسان ہو جاتا ہے' خواہ بظاہر کتنا ہی مشکل کیوں نہ ہو' باری تعالیٰ کا ارشاد ہے' :۔

فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى فَسَنُیَسِّرُهٗ لِلْیُسْرٰى (پ ۳۰ ر ۱۷ آیت ۷)

سو جس نے اللہ کی راہ میں مال دیا اور اللہ سے ڈرا اور اچھی بات کو سچا سمجھا تو ہم اسکو راحت کی چیز کے لئے سامان دیں گے۔

اس تقسیم کی مثال ایسی ہے جیسے پہلوان اپنے مدمقابل حریف کے مقابلے میں' اگر وہ کمزور ہے یا زیادہ طاقتور اور چست نہیں ہے تو معمولی جھٹکے سے زمین پر آرہتا ہے' اسکے برخلاف اگر مقابلے میں کوئی مضبوط اور طاقتور پہلوان ہے تو اسے شکست دینے کے لئے بڑی زبردست جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ باعث دینی اور باعث ہوی کی کشتی کا حال بھی یہی ہے' یہ مقابلہ شیاطین اور ملائکہ کے لشکروں میں ہے ان میں جو طاقتور اور اسلحہ سے لیس ہو گا وہ اپنے مقابل کو مار بھگائے گا۔

مقام رضا : جب شہوات ختم ہو جاتی ہیں' اور باعث دینی غالب آجاتا ہے' اور مسلسل جدوجہد اور طویل مواظبت سے صبر آسان

ہو جاتا ہے، تو بندے کو وہ مقام حاصل ہو جاتا ہے جسے رضا کہتے ہیں، جیسا کہ عنقریب کتاب الرضا میں اسکی تفصیل آئے گی۔ رضا صبر سے اعلیٰ مرتبہ ہے۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

اُعْبُدِاللّٰہَ عَلَی الرِّضَا فَاِنْ لَمْ تَسْتَطِعْ فَفِی الصَّبْرِ عَلٰی مَاتَکْرَہُ خَیْرٌ کَثِیْرٌ (ترمذی۔ ابن عباس)

اللہ کی عبادت رضا سے کر اگر یہ ممکن نہ ہو تو جو چیز بری لگے اس پر صبر کرنے میں بڑی بھلائی ہے۔

صابرین کے تین درجے: بعض عارفین کا کہنا ہے کہ صبر کرنے والوں کے تین درجے ہیں۔ ایک درجہ ترک شہوت ہے یا تائبین کا درجہ ہے، دوسرا تقدیر پر راضی رہنا ہے، یہ زاہدین کا درجہ ہے۔ تیسرا اس سلوک سے محبت کرنا ہے جو اللہ تعالیٰ اسکے ساتھ کرے یہ صدیقین کا درجہ ہے۔ کتاب المحبت میں ہم بیان کریں گے کہ مقام محبت مقام رضا سے اعلیٰ ہے، جس طرح مقام رضا مقام صبر سے بلند ہے۔

صبر کا حکم: جاننا چاہیے کہ صبر اپنے شرعی احکام کے اعتبار سے بھی مختلف قسموں پر تقسیم ہو سکتا ہے جیسے فرض، نفل، مکروہ اور حرام۔ چنانچہ محرمات پر صبر کرنا فرض ہے، اور مکروہات پر صبر کرنا نفل ہے۔ جو ایذا شرعاً ممنوع ہو اس پر صبر کرنا حرام ہے، جیسے کوئی شخص کسی کا ہاتھ کاٹنا چاہے اور وہ اس پر خاموش رہ کر صبر کرے تو یہ جائز نہ ہوگا، اسی طرح اگر کوئی شخص اسکی بیوی پر ہاتھ ڈالے، یہاں تک کہ اسکی غیرت میں اشتعال پیدا ہو، لیکن صبر کی وجہ سے غیرت کا اظہار نہ کرسکے، اور جو کچھ بیوی کے ساتھ ہو رہا ہو اس پر خاموش تماشائی بنا رہے، یہ صبر بھی حرام ہے۔ مکروہ صبر وہ ہے جو کسی ایسی اذیت پر کیا جائے جو شرعاً مکروہ ہو۔ اس تقسیم کے بیان سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ صبر کے باب میں بھی شریعت کو کسوٹی سمجھنا چاہیے۔ حدیث شریف میں صبر کو نصف ایمان قرار دیا گیا ہے اسکا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ ہر قسم کا صبر قابل تعریف ہے، بلکہ صبر وہی اچھا ہے جو شریعت کی نظر میں اچھا ہو، ورنہ خواہ مخواہ جسم کو تکلیف دینا ہے جس کا کوئی اجر نہیں ہے۔

بندہ ہر حال میں صبر کا محتاج ہے

جاننا چاہیے کہ زندگی میں بندے کو جن حالات سے سابقہ پیش آتا ہے وہ دو طرح کے ہوتے ہیں، یا تو اس کی خواہش کے موافق ہوتے ہیں، یا موافق نہیں ہوتے بلکہ وہ انھیں ناپسند کرتا ہے۔ بندہ ان دونوں حالتوں میں صبر کا محتاج ہے۔

خواہش کے موافق احوال: یہ ہیں کہ جیسے صحت، تندرستی، مال، جاہ، احباب، واقارب اور متبعین ومعاونین کی کثرت، مال ومتاع کی زیادتی، اور دنیا کی تمام لذتیں اور نعمتیں، ان حالات میں بندے کو صبر کی بڑی سخت ضرورت ہے، اسلئے کہ اگر اس نے ضبط نفس سے کام نہیں لیا، اور نفس کو ان تمام دنیاوی لذتوں میں آزاد چھوڑ دیا خواہ وہ لذتیں مباح ہی کیوں نہ ہوں تو اس کا اندیشہ ہے کہ وہ سرکش بن جائے گا، اور اترانے لگے گا۔ قرآن کریم کے ارشاد کے مطابق یہ انسانی طبیعت کی خصوصیت ہے کہ جب وہ غنی ہوتا ہے تو سرکشی پر کمربستہ ہو جاتا ہے:

اِنَّ الْاِنْسَانَ لَیَطْغٰی اَنْ رَّاٰہُ اسْتَغْنٰی (پ ۳۰ ر ۲۱ آیت ۷)

بے شک (کافر) آدمی حد (آدمیت) سے نکل جاتا ہے اس وجہ سے کہ اپنے آپ کو مستغنی دیکھتا ہے۔

اس لئے بعض اللہ والے فرماتے ہیں کہ مصیبت پر مومن صبر کرتا ہے، اور سلامتی پر صدیق کرتا ہے۔ حضرت سہل تستری کا ارشاد ہے کہ سلامتی پر صبر کرنا مصیبت پر صبر کرنے سے زیادہ سخت ہے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین پر جب دنیاوی مال ومتاع کے دروازے کھولے گئے تو انھوں نے فرمایا کہ جب تنگدستی اور مفلسی کے ذریعے ہماری آزمائش کی گئی تو ہم نے صبر کیا، اور

اس آزمائش میں پورے اترے، لیکن اب مالداری اور فارغ البالی کے فتنے کے ذریعے ہمارا امتحان لیا جارہا ہے۔ اب ہم صبر نہ کرسکیں گے، اور ناکام ہوجائیں گے۔ قرآن کریم میں اسی لئے مال، اولاد، اور بیویوں کے فتنے سے ڈرایا گیا ہے :۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُلْهِكُمْ أَمْوَالُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ (پ ۲۸ ر ۱۴ آیت ۹)

اے ایمان والو تم کو تمہارے مال اور اولاد اللہ کی یاد سے غافل نہ کرنے پائیں۔

إِنَّ مِنْ أَزْوَاجِكُمْ وَأَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَكُمْ فَاحْذَرُوهُمْ (پ ۲۸ ر ۱۶ آیت ۱۴)

تمہاری بعض بیبیاں اور اولاد تمہارے (دین کی) دشمن ہیں۔ سو تم ان سے ہوشیار رہو۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :۔

الولد مبخلة مجبنة محزنة (ابو یعلی۔ ابو سعید)

لڑکا بخل، بزدلی اور غم میں مبتلا کرتا ہے۔

ایک مرتبہ آپ نے اپنے نواسے حضرت حسنؓ کو دیکھا کہ وہ کرتے میں الجھ کر گرنا چاہتے ہیں، آپ انھیں اٹھانے کے لئے منبر سے اترے، اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا قول برحق ہے :۔

إِنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ (پ ۲۸ ر ۱۶ آیت ۱۵)

تمہارے اموال اور اولاد تمہارے لئے ایک آزمائش کی چیز ہے۔

جب میں نے اپنے بیٹے کو لڑکھڑاتے ہوئے دیکھا تو اپنے آپ کو نہ روک سکا اور اسے اٹھانے کے لئے منبر سے اتر پڑا، (۱) یہ مقام اصحاب بصیرت کے لئے عبرت کا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کامل وہی ہے جو عافیت پر صبر کرے، اور عافیت پر صبر کرنے کے معنی یہ ہیں کہ اس کی طرف مائل نہ ہو، اور یہ اعتقاد رکھے کہ یہ عافیت اور سلامتی چند روز کے لئے میرے پاس بطور امانت ہے، بہت جلد مجھ سے واپس لے لی جائے گی، یا اسے پاکر خوش ہونا، اور ان نعمتوں، لذتوں، اور لہو ولعب میں ڈوب رہنا کسی عقلمند کے شایان شان نہیں ہے بلکہ بہتر یہ ہے کہ اس پر اللہ تعالیٰ کے جو حقوق ہیں ان نعمتوں کے ذریعے وہ حقوق ادا کرے، مثلاً مال کا حق یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرے، بدن کا حق یہ ہے کہ اس کے ذریعے دوسروں کی مدد کرے، زبان کا حق یہ ہے کہ سچ بولے، اگر آدمی اس طرح صبر کرے گا تو اس کا یہ صبر شکر سے قریب تر ہوگا، جب تک آدمی شکر ادا نہ کرے اس وقت تک صبر مکمل نہیں ہوتا جیسا کہ عنقریب یہ بیان آئے گا۔ عافیت اور سلامتی پر صبر کرنا اسلئے دشوار تر ہے کہ اسمیں قدرت موجود ہوتی ہے، ورنہ جسے قدرت نہ ہو بے چارہ صبر نہ کرے تو کیا کرے، حقیقت میں صبر وہی ہے جو قدرت رکھنے کے بعد ہو، اسکی مثال ایسی ہے جیسے کوئی دوسرا تمہارے پچھنے لگائے، یا فصد کھولے اس صورت میں صبر کرنا پہلے کی بہ نسبت دشوار ہے، اسی طرح اگر بھوکے کے سامنے کھانا نہ ہو تو صبر آسانی سے کرسکتا ہے، لیکن اگر اسکے سامنے عمدہ اور لذیذ کھانا رکھا ہوا ہو، اور اس سے صبر کرنے کے لئے کہا جائے تو یقیناً اس کے لئے صبر کرنا دشوار ہوگا۔

ناموافق حالات : دوسری قسم میں وہ حالات ہیں جو خواہش سے موافقت نہ رکھتے ہوں، یہ حالات تین طرح کے ہوسکتے ہیں، ایک وہ ہیں جو بندے کے اختیار میں ہوں جیسے اچھے اور برے اعمال، دوسرے وہ ہیں جو اس کے اختیار میں نہ ہوں جیسے مصیبتیں اور حادثے، اور تیسرے وہ ہیں کہ ابتداء ان کے اختیار میں نہ ہو، لیکن بعد میں اختیار ممکن ہو جیسے موذی سے انتقام لینا۔

پہلی قسم۔ اختیاری احوال : پہلی قسم یعنی وہ احوال جن میں بندے کے اختیار کو دخل ہے اسکی بھی دو قسمیں ہیں، پہلی قسم

---

(۱) اصحاب السنن بروایت بریدۃ

طاعت اور دوسری قسم معصیت بندہ ان دونوں میں صبر کا محتاج ہے۔

اطاعت پر صبر: اطاعت پر صبر کرنا ایک سخت اور دشوار گزار مرحلہ ہے' اس لئے کہ نفس طبعاً اطاعت سے گریز کرتا ہے عبودیت سے متنفر ہے' اس کا میلان ربوبیت کی طرف رہتا ہے' اس لئے بعض عارفین کا مقولہ ہے کہ کوئی نفس ایسا نہیں جسمیں وہ بات پوشیدہ نہ ہو جو فرعون نے ظاہر کردی تھی' یعنی اس کا یہ دعویٰ۔

أَنَا رَبُّكُمُ الْأَعْلَىٰ (پ۳۰ر۳ آیت ۲۴)

میں تمہارا رب اعلیٰ ہوں۔

فرعون کو اس دعوئ کا یا اپنی دل کی پوشیدہ بات ظاہر کرنے کا موقع اس لئے مل گیا تھا کہ اسکی قوم حقیر تھی' کمزور تھی' اس نے فرعون کی طاقت کے سامنے سر تسلیم خم کیا' اور اسکی اطاعت قبول کی' یوں ہر شخص کے دل میں یہ جذبہ پوشیدہ ہے کہ وہ رب کہلائے' اسکی پرستش کی جائے' یہی وجہ ہے کہ اکثر لوگ اپنے سے چھوٹوں' خادموں' نوکروں' اور غلاموں کے سامنے اسطرح کا رویّہ رکھتے ہیں جس سے ان کے اس جذبۂ برتری کی تسکین ہو جاتی ہے' نیز یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی خادم یا نوکر اپنے مالک یا آقا کی خدمت میں ذرا سی کوتاہی کر بیٹھتا ہے تو اسے یہ بات بعید معلوم ہوتی ہے' اس وقت اسکے غصے اور غیظ و غضب کا عالم دیدنی ہوتا ہے' اسکی وجہ اگر وہ بات نہیں جسے اس نے اپنے دل کے کسی گوشے میں چھپا رکھی ہے تو اس کے علاوہ کیا ہے؟

بہر حال عبودیت مطلقاً نفس پر شاق ہے' پھر عبادات میں سے بعض وہ عبادتیں ہیں جو سستی کی بناء پر شاق گزرتی ہیں جیسے' نماز' اور بعض بخل کی وجہ سے دشوار ہیں جیسے زکوٰۃ' اور بعض سستی اور بخل دونوں وجہ سے گراں گزرتی ہیں جیسے حج اور جہاد۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اطاعات پر صبر کرنا ایسا ہے جیسے مصائب پر صبر کرنا۔ پھر مطیع کو اپنی اطاعت پر تین احوال میں صبر کرنا پڑتا ہے' اولا" اطاعت سے پہلے' اور اخلاص نیت کی تصحیح اور اخلاص کے عزم کے سلسلے میں' اور اپنے اخلاص کو ریا کے شوائب اور آفات کے دواعی سے بچانے کے سلسلے میں انتہائی صبر کی ضرورت ہے' جو لوگ خلوص کی اہمیت جانتے ہیں' اور راہ وفا پر ثابت قدم رہنا جزو ایمان سمجھتے ہیں وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ اس طرح کے امور میں صبر کرنا کس قدر دشوار ہے۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں نیت کی اہمیت اور عظمت واضح فرمائی ہے۔

إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ وَلِكُلِّ امْرِئٍ مَا نَوَىٰ (بخاری و مسلم۔ عمرؓ)

اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے' ہر شخص کے لئے وہی ہے جس کی وہ نیت کرے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ (پ۳۰ر۲۳ آیت ۵)

حالانکہ ان لوگوں کو یہی حکم ہوا تھا کہ اللہ کی اس طرح عبادت کریں کہ عبادت اسی کے لئے خاص رکھیں۔

اسی اللہ تعالیٰ نے صبر کو عمل پر مقدوم فرمایا :-

إِلَّا الَّذِينَ صَبَرُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ (پ۱۲ر۲ آیت ۱۱)

مگر وہ لوگ جنھوں نے صبر کیا اور نیک اعمال کئے۔

دوسری حالت عمل کی حالت ہے' اس حالت میں بھی صبر کا التزام بے حد ضروری ہے تاکہ عمل کے دوران اللہ سے غافل نہ رہے' اس کے مقرر کردہ آداب و سنن کی پابندی کرے' اور عمل کے آغاز سے آخر تک ہر ہر ادب کی رعایت کرے' اور عمل سے فارغ ہونے تک ان تمام دواعی سے صبر کرے جن سے عمل میں نقص پیدا ہوتا ہے یہ صبر بھی نہایت سخت ہے' غالباً قرآن کریم کی اس آیت میں یہی لوگ مراد ہیں :-

وَنِعْمَ اَجْرُ الْعَامِلِيْنَ اَلَّذِيْنَ صَبَرُوْا (پ ۲۱ ر ۵ آیت ۵۹)

اور بہت خوب ہے ان عمل کرنے والوں کا اجر جنہوں نے صبر کیا۔

یعنی وہ لوگ ہیں جنہوں نے عمل کی ابتداء سے انتہا تک صبر کیا۔

تیسری حالت وہ ہے جو عمل سے فارغ ہونے کے بعد طاری ہو' اس وقت بھی بندہ صبر کا محتاج ہے کہ وہ اپنی عبادت کو ناموری اور ریا کے لئے ظاہر نہ کرے' اور نہ اسے پسندیدگی کی نظر سے دیکھے' اور نہ کوئی ایسا کام کرے جس کا اس عبادت کا اجر و ثواب ختم ہو جائے یا وہ عمل باطل ہو جائے۔ ارشاد ربانی ہے۔

وَلَا تُبْطِلُوْا اَعْمَالَكُمْ (پ ۲۶ ر ۸ آیت ۳۳)

اور اپنے اعمال کو برباد مت کرو

ایک جگہ ارشاد فرمایا :۔

لَا تُبْطِلُوْا صَدَقَاتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى (پ ۳ ر ۴ آیت ۲۶۴)

تم احسان جتلا کر یا ایذا پہنچا کر اپنی خیرات کو برباد مت کرو۔

جو شخص صدقہ دے کر من واذی (احسان جتلانے اور ایذا دینے) سے صبر نہ کر سکے گا وہ گویا اپنا عمل ضائع کر دے گا اور بجائے ثواب کے گناہ کمائے گا۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے طاعات کی دو قسمیں ہیں' فرض اور نفل' مطیع اپنی نفل اور فرض ہر طرح کی اطاعت میں صبر کا محتاج ہے' قرآن کریم نے ان دونوں طرح کی عبادتوں کو اس آیت میں جمع کیا ہے :۔

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِى الْقُرْبٰى (پ ۱۴ ر ۱۹ آیت ۹۰)

بے شک اللہ تعالیٰ اعتدال اور احسان اور اہل قرابت کو دینے کا حکم فرماتے ہیں۔

عدل سے مراد فرض اور احسان سے مراد نفل ہے' قرابت داروں کو دینا مروت اور صلۂ رحمی ہے' ان سب میں صبر کی ضرورت ہے۔

معصیت پر صبر : معاصی پر صبر کرنا بھی نہایت ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے معاصی کی تمام قسموں کو اس آیت میں جمع فرما دیا ہے

وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْىِ (پ ۱۴ ر ۱۹ آیت ۹۰)

اور اللہ تعالیٰ کھلی برائی اور مطلق برائی اور ظلم کرنے سے منع فرماتے ہیں۔

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں :۔

اَلْمُهَاجِرُ مَنْ هَاجَرَ السُّوْءَ وَالْمُجَاهِدُ مَنْ جَاهَدَ هَوَاهُ (ابن ماجہ' نسائی۔ فضالہ ابن عبید)

ہجرت کرنے والا وہ ہے جو برائی چھوڑ دے اور مجاہد وہ ہے جو خواہش نفس سے جہاد کرے۔

معاصی باعث ہوی کے لوازم ہیں' اور معاصی پر صبر کرنا بھی دشوار ہے' خاص طور پر ان معاصی پر صبر کرنا نہایت دشوار ہے جو مسلسل عمل کے باعث عادت بن گئے ہوں' عادت بھی ایک طرح کی طبیعت ہی ہے۔ جب عادت اور خواہش نفس دونوں مل جاتی ہیں تو گویا دو شیطانی لشکر ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں' اور اپنے مشترکہ دشمن کے خلاف جنگ میں ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں' یہ مقابلہ باعث دینی سے ہوتا ہے' نتیجہ وہ باعث ہوی کو شکست نہیں دے پاتا' اور خود شکست کھا جاتا ہے۔ اگر ان گناہوں کا تعلق ان اعمال سے ہو جن کا کرنا سہل ہے تو ان میں صبر کرنا اور زیادہ دشوار ہے' مثلاً زبان کے گناہوں جیسے غیبت' جھوٹ' عداوت' اشاروں یا واضح لفظوں میں اپنی تعریف' ایسا مذاق جس سے دلوں کو تکلیف ہو' تحقیر آمیز کلمات' مردوں کی عیب جوئی' اور انکے علم و عمل اور منصب کی تحقیر و مذمت وغیرہ' یہ امور بظاہر غیبت ہیں' لیکن فی الحقیقت اپنی تعریف ہیں' اس طرح کے گناہوں میں دوسروں کی نفی اور

اپنی ذات کا اثبات ہوتا ہے' اس لئے نفس ان کی طرف زیادہ مائل ہوتا ہے' ان ہی دونوں باتوں سے ربوبیت کی تکمیل ہوتی ہے' جو نفس کا نصب العین ہے' جب کہ ربوبیت عبودیت کی ضد ہے' انسان کو عبودیت کا حکم دیا گیا ہے
ربوبیت کا حکم نہیں دیا گیا۔ کیوں کہ نفس میں یہ دونوں شہوتیں جمع رہتی ہیں' اور زبان کو حرکت دینا آسان ہوتا ہے' بلکہ عام زندگی میں اس طرح کی فضول باتوں کو عادت سمجھ لیا گیا ہے اور اس کے حسن و قبح پر کوئی کلام کرنا بیکار سمجھا جاتا ہے اس لئے ان گناہوں پر صبر کرنا نہایت دشوار ہے حالانکہ مہلکات میں ان کا شمار سرفہرست ہے' عجیب بات ہے اگر کوئی شخص ریشمی لباس پہن لے تو اسے نہایت برا تصور کرتے ہیں' غالباً ان کے سامنے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نہیں ہے :۔

اِنَّ الْغِیْبَۃَ اَشَدُّ مِنَ الزِّنَا (۱) غیبت زنا سے شدید تر ہے۔

جو شخص گفتگو میں زبان پر قابو نہ رکھ سکے' اور ان معاصی سے صبر پر قادر نہ ہو اس پر عزلت نشینی اور تنہائی واجب ہے' اسکے لئے نجات کی کوئی دوسری صورت نہیں ہے' کیونکہ تنہائی میں صبر کرنا لوگوں کے درمیان رہ کر صبر کرنے کی بہ نسبت زیادہ آسان ہے۔

خیال رہے کہ معاصی کا سبب جس قدر قوی یا ضعیف ہوگا اسی قدر ان پر صبر کرنا بھی دشوار یا آسان ہوگا' وسوسے دلوں میں غلجان ہوتا ہے' یہ عمل زبان ہلانے کے عمل سے زیادہ سہل ہے اس آفت سے تنہائی میں بھی مفر نہیں ہے' لہٰذا ہر وساوس سے صبر کرنا ممکن ہے' الا یہ کہ دل پر دین کی کوئی فکر غالب ہو جائے' اور ذہن ہر طرف سے یکسو ہو کر اسی فکر میں لگ جائے' جب تک دل و دماغ کسی مخصوص فکر میں مشغول نہ ہوں گے وسوسوں سے چھٹکارا نہ پائیں گے۔

دوسری قسم۔ ابتدا میں غیر اختیاری' پھر اختیاری : یہ وہ احوال ہیں جن کا آنا اپنے اختیار میں نہیں ہوتا' لیکن ان کا دفع کرنا اختیار میں ہوتا ہے' مثال کے طور پر کسی کو قول یا فعل سے ایذا دی گئی' یا اس کے نفس اور مال میں کوئی قصور کیا گیا ان امور پر صبر کرنا' اور بدلہ نہ لینا کبھی واجب ہوتا ہے' اور کبھی فضیلت کا باعث بعض صحابہؓ فرماتے تھے کہ ہم اس شخص کے ایمان کو ایمان ہی نہیں سمجھتے جو ایذاء پر صبر نہ کرے' اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَلَنَصْبِرَنَّ عَلٰی مَا آذَیْتُمُوْنَا وَعَلَی اللّٰہِ فَلْیَتَوَکَّلِ الْمُتَوَکِّلُوْنَ (پ ۱۳ ر ۱۴ آیت ۱۲)

اور (تم نے جو کچھ ہم کو ایذا پہنچائی ہے) ہم اس پر صبر کریں گے اور اللہ ہی پر بھروسہ رکھنے والوں کو بھروسہ رکھنا چاہیے۔

ایک مرتبہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے مال تقسیم فرمایا' ایک مسلمان اعرابی نے کہا یہ ایسی تقسیم نہیں ہے جس سے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی مقصود ہو' اعرابی کا یہ قول آپ تک پہنچا' آپ کے رخسار مبارک سرخ ہو گئے اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ میرے بھائی موسیٰ علیہ السلام پر رحم کرے کہ لوگوں نے انھیں اس سے بھی زیادہ ستایا مگر انھوں نے صبر کیا (بخاری و مسلم۔ ابن مسعودؓ) قرآن کریم میں متعدد مواقع پر صبر کی تلقین کی گئی ہے فرمایا :۔

وَدَعْ اَذَاھُمْ وَتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ (پ ۲۲ ر ۳ آیت ۴۸)

اور ان کی طرف سے جو ایذا پہنچے اس کا خیال نہ کیجئے' اور اللہ پر بھروسہ کیجئے۔

وَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ وَاھْجُرْھُمْ ھَجْرًا جَمِیْلًا (پ ۲۹ ر ۱۳ آیت ۱۰)

اور یہ لوگ جو باتیں کرتے ہیں ان پر صبر کرو' اور خوبصورتی کے ساتھ ان سے الگ رہو۔

وَلَقَدْ نَعْلَمُ اَنَّکَ یَضِیْقُ صَدْرُکَ بِمَا یَقُوْلُوْنَ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ وَکُنْ مِّنَ السّٰجِدِیْنَ (پ ۱۴ ر ۶ آیت ۹۷-۹۸)

---

(۱) یہ روایت کتاب آفات اللسان میں گزر چکی ہے

اور واقعی ہم کو معلوم ہے کہ یہ لوگ جو باتیں کرتے ہیں ان سے آپ تنگ دل ہوتے ہیں' تو آپ اپنے پروردگار کی تسبیح و تحمید کرتے رہئے اور نمازیں پڑھنے والوں میں رہئے۔

وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا أَذًى كَثِيرًا وَإِنْ تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ ذَٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ (پ ۴ ر ۱۰ آیت ۱۸۶)

اور البتہ آگے کو اور سنو گے بہت سی باتیں دل آزاری کی' ان لوگوں سے جو تم سے پہلے کتاب دیئے گئے ہیں' اور ان لوگوں سے جو مشرک ہیں اور اگر صبر کرو گے اور پرہیز رکھو گے تو یہ تاکیدی احکام میں سے ہیں۔

ان تمام آیات کا مقصد یہی ہے کہ بدلہ لینے کے بجائے صبر کیا جائے' اس کا بڑا اجر ہے' جو لوگ قصاص وغیرہ میں اپنا حق معاف کر دیتے ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کی توصیف فرمائی ہے' ارشاد فرمایا۔

وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا بِمِثْلِ مَا عُوقِبْتُمْ بِهِ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِلصَّابِرِينَ (پ ۱۴ ر ۲۲ آیت ۱۲۶)

اور اگر بدلہ لینے لگو تو اتنا ہی بدلہ لو جتنا تمہارے ساتھ برتاؤ کیا گیا' اور اگر صبر کرو تو وہ صبر کرنے والوں کے حق میں بہت ہی اچھی بات ہے۔

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:۔

صِلْ مَنْ قَطَعَكَ وَاعْطِ مَنْ حَرَمَكَ وَاعْفُ عَمَّنْ ظَلَمَكَ (۱)

جو تجھے چھوڑ دے اس سے مل' جو تجھے نہ دے اسے دے' اور جو تجھ پر ظلم کرے اسے معاف کر۔

میں نے انجیل میں لکھا ہوا دیکھا ہے' حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے حواریوں سے فرمایا کہ تمہیں پہلے سے یہ حکم ہے دانت کے بدلے دانت اور ناک کے بدلے ناک' یعنی تمہیں جس قدر ایذا پہنچے تم بھی اسی قدر پہنچاؤ' لیکن میں یہ کہتا ہوں کہ شر کا جواب شر سے مت دو' بلکہ جو تمہارے دائیں رخسار پر مارے تم اپنا بایاں رخسار بھی پیش کر دو' جو تمہاری چادر چھین لے تم اپنا تہبند بھی اسے دیدو' جو تمہیں زبردستی ایک میل لے جائے تم دو میل تک اس کیساتھ چلے جاؤ' یہ سب روایات اذیت اور تکلیف پر صبر کے باب میں ہیں۔ یہ صبر کا اعلا مرتبہ ہے' اس لئے کہ اس صورت میں باعث دینی کے مقابلے میں غضب اور شہوت دونوں ہوتے ہیں' ان دونوں پر قابو پانا بڑے حوصلے کا کام ہے۔

تیسری قسم۔ اختیاری احوال: یہ وہ احوال ہیں جو نہ ابتداء میں اختیاری ہیں اور نہ انتہا میں' جیسے مصائب اور حادثات وغیرہ' مثلاً کسی عزیز کی موت' مال کی ہلاکت' صحت کا زوال' بینائی کا ضیاع' اعضاء کا بگاڑ' اسی طرح کی دوسری مصیبتیں' ان پر صبر کرنا بھی صبر کے مقامات میں انتہائی اعلیٰ ہے۔ حضرت عبد اللہ ابن عباس ارشاد فرماتے ہیں کہ قرآن کریم میں صبر کی تین صورتیں مذکور ہیں' اول ادائے فرض پر صبر' اس کے تین سو درجے ہیں دوم اللہ تعالیٰ کی حرام کردہ چیزوں پر صبر' اسکے چھ سو درجے ہیں۔ سوم پہلے صدمے پر صبر اس کے نو سو درجے ہیں۔ مصیبت پر صبر کرنا اگرچہ فضائل میں سے ہے' پر جب کہ محرمات پر صبر کرنا فرائض میں سے ہے' مگر اس کے باوجود مصیبت پر صبر کرنے کو جو فضیلت حاصل ہے وہ محرمات پر صبر کرنے کو نہیں ہے اسکی وجہ یہی ہے کہ محرمات پر صبر کرنے کی طاقت ہر مومن رکھتا ہے' لیکن اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ مصیبتوں پر صبر کرنے کی قوت صرف انبیاء علیہم السلام میں ہوتی ہے' یا ان میں جنھیں صدیقین کے اخلاق میسر ہوں یہ صبر نفس پر انتہائی شاق ہے' اسی لئے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک دعا میں یہ الفاظ تھے۔

---

(۱) یہ روایت احیاء العلوم جلد دوم میں گزری ہے

اَسْئَلُکَ مِنَ الْیَقِیْنِ مَا تُھَوِّنُ عَلَیَّ بِہٖ مَصَائِبَ الدُّنْیَا (ترمذی' نسائی۔ ابن عمرؓ)
میں تجھ سے اس یقین (صبر) کی درخواست کرتا ہوں جس سے تو مجھ پر دنیا کی مصیبتیں آسان کردے۔

اس دعا سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ صبر حسن یقین کے درجے میں ہے۔ حضرت ابو سلیمان دارانی کہتے ہیں 'بخدا ہم ان چیزوں پر صبر نہیں کرسکتے جنہیں ہم اچھا سمجھتے ہیں بھلا ان چیزوں پر صبر کیسے کرسکتے ہیں جو ناپسندیدہ ہیں؟ ایک حدیث قدسی میں یہ الفاظ ہیں :۔

اِذَا وَجَّھْتُ اِلٰی عَبْدٍ مِنْ عَبِیْدِیْ مُصِیْبَۃً فِیْ بَدَنِہٖ اَوْ مَالِہٖ اَوْ وَلَدِہٖ ثُمَّ اسْتَقْبَلَ ذٰلِکَ بِصَبْرٍ جَمِیْلٍ اِسْتَحْیَیْتُ مِنْہُ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ اَنْ اَنْصِبَ لَہٗ مِیْزَانًا اَوْ اَنْشُرَ لَہٗ دِیْوَانًا (ابن عدی۔ انسؓ)

جب میں اپنے بندوں میں سے کسی بندے پر اس کے بدن' مال یا اولاد میں کوئی مصیبت بھیجتا ہوں اور وہ صبر جمیل سے اسکا استقبال کرتا ہے تو مجھے قیامت کے روز اس سے شرم آتی ہے کہ میں اسکے لئے ترازو کھڑی کروں یا اسکے اعمال نامے پھیلاؤں۔

ایک حدیث میں ہے :۔

اِنْتِظَارُ الْفَرَجِ بِالصَّبْرِ عِبَادَۃٌ (مسند الشہاب۔ ابن عمرؓ)
صبر کے ساتھ فراخی کا انتظار عبادت ہے۔

ایک حدیث میں ہے جب کسی مسلمان کو کوئی تکلیف پہنچے اور وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق یہ کلمات کہے "اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ' اَللّٰھُمَّ اْجُرْنِیْ فِیْ مُصِیْبَتِیْ وَاَعْقِبْنِیْ خَیْرًا مِنْھَا" تو اللہ تعالیٰ اس کی دعا قبول کرتا ہے اور جو وہ چاہتا ہے اسے عطا کرتا ہے (مسلم۔ ام سلمہؓ) حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام سے فرمایا اے جبرئیل! میں جس بندے کی دونوں آنکھیں چھین لوں اسکا اجر کیا ہے؟ جبرئیل نے عرض کیا سُبْحَانَکَ لَا عِلْمَ لَنَا اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ارشاد فرمایا: اس کا اجر یہ ہے کہ وہ ہمیشہ میرے گھر میں رہے' اور میرے دیدار سے بہرہ مند ہو (طبرانی اوسط۔ ہلال ابن میمونؓ) ایک حدیث قدسی میں ہے کہ جب میں اپنے کسی بندے کو مصیبت میں مبتلا کرتا ہوں اور وہ صبر کرتا ہے۔ اور اپنی عیادت کرنے والوں سے شکوہ نہیں کرتا تو میں اسکا گوشت بہتر گوشت سے بدل دیتا ہوں' اور اسکا خون بہتر خون سے تبدیل کردیتا ہوں' اور جب اسے تندرست کرتا ہوں تو اس حال میں کرتا ہوں کہ اسکے ذمے کوئی گناہ باقی نہیں رہتا' اور جب موت دیتا ہوں تو اسے اپنی رحمت سے ڈھانپ لیتا ہوں (موطا امام مالک۔ ابو سعیدؓ)

حضرت داؤد علیہ السلام نے عرض کیا اے اللہ اس غمزدہ کا اجر کیا ہے جو صرف تیری رضا کے لئے مصائب پر صبر کرے' ارشاد فرمایا اس کا اجر یہ ہے کہ میں اسے ایمان کا ایسا لباس فاخرہ پہناؤں جو اسکے جسم سے کبھی جدا نہ ہو' ایک مرتبہ حضرت عمر ابن عبد العزیزؒ نے اپنے خطبے میں ارشاد فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے کو کوئی نعمت عطا کرتا ہے' پھر اسے چھین لیتا ہے' اور وہ بندہ اس نعمت سے محرومی پر صبر کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے پہلی نعمت سے اعلا اور افضل نعمت سے نوازتا ہے' اسکے بعد آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی:۔

اِنَّمَا یُوَفَّی الصَّابِرُوْنَ اَجْرَھُمْ بِغَیْرِ حِسَابٍ (پ ۲۳ ر ۱۴ آیت ۱۰)
مستقل رہنے والوں کو ان کا صلہ بے شمار ہی ملے گا۔

حضرت فضیل ابن عیاض سے صبر کی حقیقت دریافت کی گئی' آپ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر راضی ہونے کا نام صبر ہے لوگوں نے دریافت کیا یہ کیسے؟ فرمایا جو شخص راضی رہتا ہے وہ اپنی حیثیت سے زیادہ کا طالب نہیں ہوتا۔ حضرت شبلیؒ شفاخانے

میں محبوس ہوئے تو کچھ لوگ آپ کی عیادت کے لئے آئے' آپ نے ان سے دریافت فرمایا کیوں آئے ہو' انھوں نے عرض کیا کہ ہم لوگ آپ کی زیارت کے لئے آئے ہیں آپ کے احباب ہیں' آپ نے انھیں ڈھیلوں سے مارنا شروع کردیا' وہ لوگ مارے خوف کے بھاگنے لگے' آپ نے فرمایا اگر تم میرے دوست ہوتے تو میری مصیبت پر صبر کرتے۔ ایک عارف اپنی جیب میں پرچہ رکھ کر پھرا کرتے تھے' اور بار بار نکال کر اس کا مطالعہ کیا کرتے تھے' اس پرچے میں لکھا ہوا تھا۔

وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا (پ ۲۷ ر ۴ آیت ۴۸)

اور آپ اپنے رب کی (اس) تجویز پر صبر سے بیٹھے رہئے کہ آپ ہماری حفاظت میں ہیں۔

بیان کیا جاتا ہے کہ فتح موصلی کی بیوی ٹھوکر کھا کر گر پڑیں' گرنے سے ان کا ناخن ٹوٹ گیا' مگر وہ ہنسنے لگیں' لوگوں نے عرض کیا کہ کیا آپ تکلیف محسوس نہیں کرتیں' کہنے لگیں میں اس تکلیف پر صبر کے ثواب کے خیال سے ہنس رہی ہوں' اس خیال نے میری تکلیف زائل کردی ہے۔ حضرت داؤد نے حضرت سلیمان علیہ السلام سے ارشاد فرمایا مومن کے تقویٰ پر تین چیزوں سے استدلال کیا جاتا ہے' جو چیز حاصل نہ ہو اس میں حسن توکل' جو حاصل ہو جائے اس پر حسن رضا' جو دے کر چھین لی جائے اس پر حسن صبر۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں۔

مِنْ إِجْلَالِ اللّٰهِ مَعْرِفَةِ حَقِّهِ أَنْ لَا تَشْكُوَ وَجْعَكَ وَلَا تَذْكُرَ مُصِيبَتَكَ (ابن ابی الدنیا موقوفاً۔ سفیانؒ)

خدا ئی تعالیٰ کی تعظیم اور اس کے حق کی معرفت یہ ہے کہ تم اپنے درد کا شکوہ نہ کرو اور نہ اپنی مصیبت کا ذکر کرو۔

ایک بزرگ تھیلے میں کچھ روپے لیکر نکلے' آگے جا کر تھیلا غائب تھا' کہنے لگے جس نے لیا ہے' اللہ اسے ان روپوں میں برکت عطا کرے' ہو سکتا ہے اسے ان روپوں کی مجھ سے زیادہ ضرورت ہو۔ ایک بزرگ روایت کرتے ہیں کہ میں سالم مولی ابی حذیفہ کے پاس اس حال میں گیا کہ ان کی زندگی کی چند سانسیں باقی رہ گئیں تھیں' میں نے ان سے عرض کیا کیا میں آپ کو پانی پلاؤں' کہنے لگے مجھے تھوڑا سا کھینچ کر دشمن کی طرف پہنچادو' (تاکہ میں آخری سانس تک ان سے لڑسکوں) اور پانی میری ڈھال میں رکھ دو' اگر شام تک زندہ رہا پی لوں گا میں اس وقت روزے سے ہوں۔

راہ آخرت کے سالکین کا صبر یہی تھا' وہ مصائب پر شکوہ تو کجا اللہ کا شکر ادا کرتے تھے کہ اس نے انھیں آزمائش کے قابل سمجھا اور اجر و ثواب کا موقع عنایت فرمایا۔

کیا صبر اضطراری ہے یا اختیاری؟ : یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ صابر کو مصائب پر صبر کرنے میں یہ درجہ کس طرح حاصل ہوتا ہے جب کہ معاملہ اسکے اختیار میں نہیں ہوتا' مصائب سب غیر اختیاری ہیں' وہ چاہے نہ چاہے اسے یہ مصیبتیں برداشت کرنی ہوں گی' اگر اس صبر سے مراد یہ ہے کہ اسکے دل میں ذرا سی کراہیت بھی نہ ہو تو یہ آدمی کے اختیار میں داخل نہیں ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جو لوگ مصائب پر واویلا کرتے ہیں' چیختے چلاتے ہیں' سینہ کوبی کرتے ہیں' کپڑے پھاڑتے ہیں' شکایت اور تکلیف کے اظہار میں مبالغہ کرتے ہیں' اور مارے غم کے کھانے' پینے' پہننے اور سونے میں اپنی عادت ترک کردیتے ہیں وہ صابرین کے درجے میں شمار نہیں ہوتے۔ جب کہ یہ تمام اختیار کے تحت آتے ہیں' اس لئے صبر کرنے والے کیلئے ان سب سے بچنا اور اللہ کے فیصلے پر راضی رہنا ضروری ہے' ہزار مصائب ٹوٹیں لیکن بندے کو اپنی عادات میں تبدیلی نہ کرنی چاہیے' اور یہ اعتقاد رکھنا چاہیے کہ جو نعمت اس سے سلب ہوئی ہے وہ اس کے پاس امانت کے طور پر تھی' جس نے یہ امانت رکھوائی تھی اس نے واپس لے لی' جیسا کہ رمیصاء ام سلیم سے مروی ہے کہ میرے ایک لڑکے کا انتقال اس حال میں ہوا کہ اس کے والد موجود نہیں تھے میں نے اسے گھر کے ایک گوشے میں لٹادیا اور اس پر کپڑا ڈال دیا کچھ دیر بعد ابو طلحہؓ تشریف لائے' میں نے اٹھ کر ان کے لئے کھانا تیار کیا' اور انکے سامنے

رکھا وہ کھانے لگے' اسی دوران انھوں نے لڑکے کے بارے میں دریافت کیا میں نے کہا الحمد للہ اچھے حال میں ہے' یہ اس لئے کہا کہ جیسا سکون اسے اس رات میسر ہوا بیماری کے بعد اتنا سکون کبھی نہ ملا تھا' پھر میں نے اچھے کپڑے پہنے اور اپنے آپ کو خوب بنایا سنوارا' یہاں تک کہ وہ مجھ سے ہم بستر ہوئے' پھر میں نے ان سے کہا کہ ہمارے ہمسائے کو ایک چیز مانگنے سے ملی تھی' جب دینے والے نے وہ چیز اس سے واپس لے لی تو وہ شور مچانے لگا' انھوں نے کہا ہمسائے نے اچھا نہیں کیا' اسے ایسا نہ کرنا چاہیے تھا' اسکے بعد میں نے ان سے کہا کہ تمہارا بیٹا ہمارے پاس اللہ کی طرف سے امانت تھا' اس نے اپنی امانت واپس لے لی' انھوں نے اللہ کا شکر ادا کیا اور انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا' صبح کو وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے' اور پورا واقعہ عرض کیا' آپ نے فرمایا۔

اَللّٰھُمَّ بَارِکْ لَھُمَا فِیْ لَیْلَتِھِمَا (بخاری و مسلم۔ انس)

اے اللہ ان دونوں کو رات کے معاملے میں برکت دے۔

راوی کہتے ہیں اس دعا کا یہ اثر ہوا کہ اللہ نے انھیں سات لڑکے عطا کئے' جو سب کے سب قرآن کریم کے حافظ اور قاری ہوئے۔ حضرت جابر ابن عبداللہؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا میں نے خود کو جنت میں دیکھا وہاں میری ملاقات ابو طلحہؓ کی بیوی رمیصاء سے ہوئی۔ بعض عارفین فرماتے ہیں کہ صبر جمیل یہ ہے کہ مصیبت والا دوسروں سے ممتاز نہ ہو' یعنی اسکے چہرے پر کوئی ایسی علامت نہ پائی جائے جس سے وہ مصیبت زدہ معلوم ہو۔

مردے پر رونا صبر کے خلاف نہیں: مردے پر آنسو بہانا یا دل کا غمزدہ ہونا صبر کے خلاف نہیں ہے' اس لئے کہ یہ بشریت کے تقاضے ہیں' انسان زندگی میں خود کو ان سے جدا نہیں کر سکتا' اسی لئے جب سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وفات ہوئی تو آپ کی آنکھوں میں آنسو آگئے' صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ تو ہمیں رونے سے منع کرتے ہیں' آپ نے جواب میں ارشاد فرمایا:۔

اِنَّ ھٰذِہٖ رَحْمَۃٌ وَاِنَّمَا یَرْحَمُ اللّٰہُ مِنْ عِبَادِہِ الرُّحَمَاءَ

یہ رحمت ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں سے رحم کرنے والوں پر رحم کرتا ہے۔

مرنے والے کے غم میں رونے سے آدمی مقام رضا سے بھی دور نہیں ہوتا' آدمی فصد کھلواتا ہے' پچھنے لگواتا ہے' کیا وہ اس پر راضی نہیں ہوتا' یقیناً راضی ہوتا ہے اگرچہ تکلیف بھی محسوس کرتا ہے بلکہ اگر تکلیف زیادہ ہو تو رونے لگتا ہے' کیا اس کے رونے کا یہ نتیجہ نکالا جائے کہ وہ خوشی سے فصد نہیں کھلوا رہا ہے۔ ہم اس کی مزید تحقیق کتاب الرضا میں کریں گے انشاء اللہ۔

ابن نجیح نے کسی خلیفہ کی موت پر تعزیتی خط میں لکھا جو شخص یہ بات جانتا ہے کہ جو چیز اللہ نے اس سے لی ہے وہ اس کا حق ہے وہ اس بات کا زیادہ مستحق ہے کہ جو چیز اللہ نے اسکے لئے باقی رکھی ہے اس میں اس کے حق کی عظمت کا احساس کرے' جان لو کہ جو تم سے پہلے چلا گیا ہے وہ تمہارے لئے باقی ہے' اور جو تمہارے بعد باقی ہے اسکو تمہارے باب میں (صبر کرنے کا) ثواب ملے گا' یہ بات بھی یاد رکھو کہ صابرین کو مصیبت پر صبر کرنے کا جو ثواب ملتا ہے وہ اس نعمت کی بہ نسبت زیادہ عمدہ اور اعلا ہے جو مصائب سے بچے رہنے کی صورت میں انھیں حاصل ہوئی ہے۔

مصیبتوں کو چھپانا کمال صبر ہے: کمال صبر یہ ہے کہ آدمی اپنے مرض' تنگدستی اور دوسری تمام مصیبتیں پوشیدہ رکھے' ایک بزرگ کا قول ہے کہ مصائب' آلام' اور صدقات کا اخفاء احسان کے خزانوں میں سے ایک قیمتی خزانہ ہے۔

صبر کی ان تقسیمات سے پتہ چلتا ہے کہ صبر تمام احوال اور افعال میں واجب ہے' جو شخص شہوات سے بچنے کے لئے گوشہ نشین ہو جائے' وہ صبر سے بے نیاز نہیں ہو سکتا' خواہ کتنا ہی تنہا کیوں نہ رہے اس لئے کہ شیطانی وسوسے قلب پر اثر انداز ہوتے ہیں'

وساوس کا غلجان تنہائی میں بھی چین نہیں لینے دیتا' دل میں دو طرح کی باتیں آتی ہیں' یا تو ان چیزوں سے متعلق آتی ہیں جو فوت ہو چکی ہیں اور اب ان کا تدارک ممکن نہیں' یا ان چیزوں سے متعلق آتی ہیں جن کا مستقبل میں ملنا ممکن ہے' بشرطیکہ قسمت میں ہو' خیالات خواہ فوت شدہ چیزوں کے باب میں ہوں یا مستقبل میں حاصل ہونے والی چیزوں کے متعلق' دونوں صورتوں میں وقت ضائع ہوتا ہے' دل انسان کا آلہ ہے' اور عمر اسکی پونجی ہے' اگر اس کا دل ایک لمحے کے لئے بھی ذکر اور فکر سے غافل رہ گیا تو یہ بڑے خسارے کی بات ہے' ذکر سے مراد قلب کا وہ عمل ہے جس اللہ سے انسیت حاصل ہو' اور فکر سے مراد وہ عمل ہے جس کے ذریعے بندہ اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کرے' اور اس معرفت کو اللہ کی محبت کا وسیلہ بنائے' اور یہ صورت بھی اس وقت ہے جب کہ قلب کے وساوس مباح امور میں ہوں' لیکن اکثر ایسا نہیں ہوتا' عام طور پر دلوں کے خیالات کا محور شہوات ہوتی ہیں' اور ان کی تکمیل کی تدبیریں سوچی جاتی ہیں' یہ شخص ہمیشہ ان لوگوں سے نزاع میں مبتلا رہتا ہے جو ایک مرتبہ بھی اسکے منشاء کے خلاف عمل کے مرتکب ہوئے ہوں یا اسے اس کا وہم ہو گیا ہو کہ وہ اسکے خلاف جاسکتے ہیں' بلکہ جو لوگ اسکے لئے انتہائی مخلص' جاں نثار اور فدائی ہوتے ہیں' اور عمر بھر اسکی خوشنودی میں لگے رہتے ہیں' یہ شخص انھیں بھی اپنا مخالف فرض کرلیتا ہے' اور ایسی تدبیریں سوچتا ہے' جن سے انھیں زیر کرسکے' اور ان کے دلوں سے اختلاف کا خیال بھی مٹا سکے غرضیکہ مستقل یہی مشغلہ رہتا ہے' شب و روز اسی فکر میں گزرتے ہیں۔

شیطان کے دو لشکر: یہ سب شیطان کی کرشمہ سازیاں ہیں' دراصل شیطان کے دو لشکر ہیں ایک اڑنے والا لشکر' دوسرا چلنے والا لشکر' اڑنے والے لشکر سے مراد وساوس ہیں' اور چلنے والے لشکر سے مراد شہوات ہیں' اس کی وجہ یہ ہے کہ شیطان کی تخلیق آگ سے ہوئی ہے' اور انسان کھنکھناتی ہوئی مٹی سے پیدا کیا گیا ہے' اس مٹی میں آگ بھی ہے' مٹی کی طبیعت میں سکون ہے' اور آگ کی سرشت میں حرکت۔ چنانچہ بھڑکتی ہوئی آگ کے بارے میں یہ تصور نہیں کیا جاسکتا کہ وہ حرکت نہیں کرے گی بلکہ وہ اپنی سرشت کے مطابق مسلسل حرکت میں رہتی ہے' شیطان ملعون کو جو آگ سے پیدا کیا گیا ہے' یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ سکون پذیر ہو جائے اور اس مخلوق کو سجدہ کرے جسے اللہ نے مٹی سے پیدا کیا ہے' لیکن اس نے یہ حکم ماننے سے انکار کردیا' تکبر کیا' نافرمانی کی' اور اپنی حکم عدولی کی یہ توجیہ بیان کی کہ میں آگ سے پیدا کیا گیا ہوں' اور انسان مٹی سے پیدا کیا گیا ہے چنانچہ جب اس خبیث نے ہمارے جد امجد حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ نہیں کیا تو وہ انکی اولاد کو کیسے سجدہ کرے گا' اولاد کو سجدہ کرنے سے مقصود یہی ہے کہ اسکے دلوں میں جو وساوس پیدا کرتا ہے ان سے باز رہے' اگر شیطان اپنی حرکتوں سے باز رہا تو گویا وہ انسان کا مطیع اور تابع بنا کہ اس نے اس کے خوف سے وہ حرکتیں چھوڑ دیں' سجدے کی روح بھی اطاعت اور انقیاد ہی ہے' زمین پر پیشانی رکھنا تو اس کا جسم ہے' زمین پر پیشانی رکھنے کے عمل کو اصطلاحاً سجدہ کہا جاتا ہے' اگر یہ عمل تحقیر و تذلیل کے لئے بطور استعمال وضع ہوتا تو اسی کا تصور ہوتا' چنانچہ کسی محترم شخصیت کے سامنے منھ کے بل گر پڑنے کو عادتاً گستاخی تصور کیا جاتا ہے۔

بہر حال تمہیں صدف موتی سے' قالب روح سے اور چھلکا مغز سے غافل نہ کرے' اس کا خیال رہنا ضروری ہے' ایسا نہ ہو کہ تم صرف عالم ظاہر میں مقید ہو کر رہ جاؤ' اور عالم غیب سے غفلت برتنے لگو۔ تم یہ بات جانتے ہو کہ شیطان تمہارا ازلی دشمن ہے' اسے تمہیں گمراہ کرنے کی مہلت دی گئی ہے' اب قیامت تک یہ تصور نہیں کیا جاسکتا کہ وہ تمہاری اطاعت قبول کرے گا' یا تمہارے دل میں وسوسہ پیدا کرنے سے باز رہے گا' الا یہ کہ تمہارے تمام افکار کا مرکزی نقطہ ایک ہو' اور تم ہمہ تن اللہ کی فکر میں مشغول ہوں' اس صورت میں یقیناً یہ شیطان ملعون تم تک پہنچنے کا کوئی راستہ نہ پائے گا' اور تم اللہ کے ان بندوں میں شامل ہو جاؤ گے جو مخلص ہیں' اور اس ملعون کی سلطنت سے باہر ہیں' یہ ممکن نہیں کہ تمہارے دل میں فکر الٰہی بھی نہ ہو' اور شیطانی وسوسے بھی نہ ہوں' یہ شیطان ایک سیال عنصر ہے' انسان کی رگوں میں اس طرح گردش کرتا ہے جس طرح خون گردش کرتا ہے' یہ ایسا ہے جیسے پیالے میں کوئی رقیق چیز بھری ہوئی ہو' اب اگر کوئی یہ چاہے کہ پیالے میں یہ سیال بھی باقی رہے اور ہوا بھی رہے تو یہ ممکن نہیں' یا یہ کہ پیالے میں

ہوا بھی نہ بھری جائے' اور یہ سیال مادّہ بھی نہ ہو' بظاہر یہ بھی ممکن نہیں بلکہ جس قدر پیالے میں سیال چیز کم ہوگی اسی قدر اس میں ہوا بھر جائے گی۔ یہی حال دل کا ہے' اگر وہ کسی عمدہ فکر سے بھرا ہوا ہو گا تو شیطان کی مداخلت سے محفوظ رہے گا' ورنہ جس قدر غافل ہو گا اسی قدر شیطان بھی مداخلت کرے گا' یہاں تک کہ اگر ایک لمحے کے لئے بھی غافل ہوا تو غفلت کے اس لمحے میں شیطان کے علاوہ اسکا کوئی جلیس نہ ہو گا' چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَمَنْ يَعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهُ شَيْطَانًا فَهُوَ لَهُ قَرِيْنٌ (پ ۲۵ ر ۲۰ آیت ۳۶)

اور جو شخص اللہ کی نصیحت سے اندھا بن جائے ہم اس پر ایک شیطان مسلط کر دیتے ہیں۔ سو وہ (ہر وقت) اسکے ساتھ رہتا ہے۔

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:۔

إِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى يُبْغِضُ الشَّابَّ الْفَارِغَ (۱)

اللہ تعالیٰ خالی نوجوان کو ناپسند کرتا ہے۔

خالی نوجوان کو ناپسند کرنے کی وجہ یہ ہے کہ جب وہ کوئی ایسا کام نہ کرے گا جس سے اسکا دل کسی امر مباح میں مشغول ہو یا کسی دینی فکر میں منہمک ہو تو بظاہر وہ خالی نظر آئے گا' لیکن فی الحقیقت اسکے دل میں شیطان اپنا آشیانہ بنائے ہوئے ہو گا' اور اسمیں اپنی نسل بڑھانے کے درپے ہو گا۔ تمام حیوانات کے مقابلے میں شیطان کی نسل سب سے زیادہ بڑھتی ہے کیوں کہ اسکی سرشت میں آگ ہے اور آگ کے سامنے اگر کوئی سوکھی چیز آجائے تو وہ رکنے کا نام نہیں لیتی' بلکہ تیزی سے بڑھتی چلی جاتی ہے' نوجوان آدمی کے دل میں شہوت کا وجود ایسا ہی ہے جیسے آگ کے سامنے سوکھی ہوئی گھاس آجائے۔ پھر جس طرح آگ کی غذا (لکڑی) نہ رہنے سے آگ خاموش ہو جاتی ہے' اسی طرح اگر شہوت باقی نہ رہے تو شیطان کو دم مارنے کی بھی مجال نہیں ہوتی' اور وہ اپنا آشیانہ خود اپنے ہاتھوں سے جلانے پر مجبور ہو جاتا ہے' اگر تم غور کرو تو یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ تمہارا بدترین دشمن خود تمہارے دل کا وہ وصف ہے جسے تم شہوت کہتے ہو۔ حسین ابن منصور حلاج کو جس وقت سولی پر چڑھایا جا رہا تھا اس وقت ان سے کسی نے تصوف کے بارے میں سوال کیا' آپ نے فرمایا تصوف خود تمہارا نفس ہے اگر وہ کسی لغو کام میں مشغول نہ ہو۔

صبر کی دوا' اور اس پر اعانت کی صورت

جاننا چاہیے کہ جس نے بیماری دی ہے اس نے دوا بھی بتلائی ہے' اور شفا کا وعدہ بھی کیا ہے صبر اگرچہ نہایت دشوار اور مشکل عمل ہے' لیکن علم و عمل کے معجون کے ذریعے اسکا حصول ممکن ہے' علم و عمل ہی دو ایسی مفرد دوائیں ہیں جن سے قلوب کے تمام امراض کی دوائیں تیار کی جاتی ہیں لیکن ہر مرض کے لئے یکساں علم و عمل مفید نہیں ہے' بلکہ جیسا مرض ہو گا ویسے ہی علم اور عمل کی ضرورت پیش آئے گی۔

<u>مانع صبر اسباب</u>: جس طرح صبر کی متعدد اور مختلف قسمیں ہیں' اسی طرح وہ علتیں اور اسباب بھی مختلف اور متعدد ہیں' جو صبر کے لئے مانع ہیں' اس لئے علاج بھی مختلف ہے کیونکہ ہر سبب کا علاج اس کی ضد سے کیا جاتا ہے' اور کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ سبب ہی باقی نہ رہے جو اس بیماری کا باعث بنا ہے۔ ہم صبر کی تمام قسموں کے اسباب اور ان کے اضداد کا تجزیہ تو نہیں کر سکتے لیکن بعض مثالوں میں طریقۂ علاج کی نشاندہی کئے دیتے ہیں' مثلاً ایک شخص شہوت زنا سے صبر کا خواہاں ہے' لیکن اسے اپنی شرمگاہ پر قابو نہیں ہے' یا شرمگاہ پر تو قابو ہے لیکن آنکھ پر اختیار نہیں ہے' یا آنکھ پر تو اختیار ہے لیکن دل پر قابو نہیں ہے' ہر وقت شہوتوں کی جولان گاہ

---

(۱) یہ حدیث مجھے نہیں ملی

بنا رہتا ہے' اور اسے ذکر و فکر اور نیک اعمال پر مواظبت سے باز رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ ایک مرض ہے' اس کے علاج کی تفصیل یہ ہے جیسا کہ ہم پہلے بھی بیان کرچکے ہیں کہ صبر باعث دین اور باعث ہوی کے ٹکراؤ کا نام ہے' اگر ہم ان دونوں سے کسی ایک کو غالب دیکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں اسکو تقویت دینی ہوگی تاکہ وہ غالب آسکے' اور دوسرے کو کمزور کرنا ہوگا تاکہ وہ مغلوب ہوسکے' پیش نظر معاملے میں ہم یہ چاہیں گے کہ باعث دین غالب ہو' اور باعث شہوت کمزور پڑے۔

<u>باعث شہوت کس طرح کمزور ہو</u> : باعث شہوت کو کمزور بنانے کی تین صورتیں ہیں' ایک تو یہ کہ اسکی قوت اصلی کا جائزہ لیں' اور یہ دیکھیں کہ اسے کہاں سے قوت ملتی ہے' غور کیا جائے تو یہ معلوم ہوگا کہ شہوت کو عمدہ غذاؤں سے تقویت حاصل ہوتی ہے اس کا علاج یہ ہے کہ مسلسل روزے رکھے جائیں' اور افطار کے وقت ایسی غذا معمولی مقدار میں کھائی جائے جس سے شہوت کو تحریک نہ ہو' مثلاً گوشت وغیرہ استعمال نہ کیا جائے' دوسری صورت یہ ہے کہ وہ اسباب ترک کئے جائیں جن سے شہوت میں فوری طور پر ہیجان برپا ہوتا ہے' شہوت میں ہیجان نظر کے باعث ہوتا ہے' نظر قلب کو حرکت دیتی ہے' اور قلب شہوت کو تحریک دیتا ہے' اس لئے سب سے پہلے نظر کے امکانات کو معدوم کرنا ہے' اور اسکی شکل یہ ہے کہ تنہائی اختیار کی جائے' اور ان مواقع سے دور رہا جائے جہاں خوبصورت چہروں پر نظر پڑنے کا موقع ہو' سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

اَلنَّظْرَةُ سَهْمٌ مَسْمُوْمٌ مِنْ سِهَامِ اِبْلِيْسَ (۱)

نظر ابلیس کے تیروں میں سے ایک زہریلا تیر ہے۔

شیطان یہ تیر کچھ اس طرح پھینکتا ہے کہ نشانہ خطا نہیں ہوتا' اس کی کوئی ڈھال بھی نہیں کہ تیروں کی یورش اس پر روکی جاسکے' الا یہ کہ آنکھیں بند کرلی جائیں' یا اس کے نشانے سے ہٹ کر کھڑا ہوا جائے۔ شیطان یہ تیر خوبصورت چہروں کے چشم ابرو کے ذریعے برساتا ہے' اگر آدمی حسین چہروں کی زد سے نکل جائے تو ان زہریلے تیروں سے محفوظ رہ سکے گا۔ تیسری صورت یہ ہے کہ شہوت کی تسکین کے لیے مباح طریقے اختیار کئے جائیں' زنا سے بچنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ نکاح کرلیا جائے' اور اس طرح نفس کو تسلی دی جائے' اس لئے کہ جس چیز کی نفس کو خواہش ہے وہ مباح میں موجود ہے' پھر ممنوع وسائل اختیار کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اکثر لوگوں کے حق میں یہی مفید ترین طریقہ علاج ہے' اس لئے کہ عمدہ غذائیں سب کھاتے اور باقی غذاؤں میں کمی سے صحت متاثر ہوگی' اور باقی اعمال میں بھی سستی کو راہ ملے گی۔ اسکے باوجود بعض مردوں سے شہوت کلی طور پر ختم نہیں ہوپاتی' اسی لئے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

عَلَيْكُمْ بِالْبَاءَةِ فَمَنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَعَلَيْهِ بِالصَّوْمِ فَاِنَّ الصَّوْمَ لَهُ وِجَاءٌ (۲)

اپنے اوپر نکاح کو لازم پکڑو' جس کو نکاح کی استطاعت نہ ہو اس پر روزے رکھنا ضروری ہیں روزہ رکھنا اس کے حق میں خصّی ہوجانا ہے۔

یہ تین اسباب علاج ہیں' پہلے علاج یعنی غذا کا سلسلہ منقطع کرنے کی مثال ایسی ہے جیسے سرکش جانور یا کٹ کھنے کتے کی غذا موقوف کردی جائے تاکہ وہ کمزور ہوجائیں' اور اکی طاقت زائل ہوجائے دوسرے علاج کی مثال ایسی ہے جیسے کتے کے سامنے سے گوشت اور جانور کے سامنے سے گھاس وغیرہ ہٹالی جائے تاکہ گوشت دیکھ کر کتے اور گھاس دیکھ کر جانور کے باطن میں تحریک نہ ہو' اور تیسرے کی مثال ایسی ہے جیسے کتے کو کوئی ایسی چیز دے کر تسلی دینے کی کوشش کی جائے جس کی طرف اس کے طبیعت کا میلان ہو تاکہ اتنی قوت اس میں باقی رہ جائے' جس کے ذریعے وہ تادیب پر صبر کرسکے۔

<u>باعث دین کی تقویت</u> : یہ گفتگو باعث شہوت کو کمزور کرنے کے باب میں تھی۔ اب ہم باعث دین کی تقویت کو موضوع گفتگو

(۱) یہ حدیث کئی بار گزر چکی ہے (۲) یہ حدیث کتاب النکاح میں گزری ہے

بناتے ہیں باعث دین دو طریقوں سے مضبوط ہو سکتا ہے' ایک تو یہ کہ نفس کو مجاہدے کے فوائد اور دین و دنیا میں اسکے ثمرات کی ترغیب دی جائے' اور ترغیب دینے کی صورت یہ ہے کہ صبر کی فضیلت میں جو روایات وارد ہیں' اور دین و دنیا میں اس کے انجام کی خوبی کے متعلق جو کچھ ہم نے لکھا ہے اسمیں زیادہ سے زیادہ غور و فکر کرے' روایت میں ہے کہ مصیبت کا ثواب فوت شدہ چیز سے زیادہ ہے' یہی وجہ ہے کہ ایسی مصیبتوں پر ارباب بصیرت غبطہ کرتے ہیں۔ اس لئے کہ مصیبت زدہ کے پاس سے ایسی چیز گئی ہے جو آج نہیں تو کل ضرور جاتی' وہ ہمیشہ رہنے والی نہیں تھی' لیکن اس کے عوض اسے وہ چیز حاصل ہوئی جو موت کے بعد بھی ابد الآباد تک اسکے ساتھ رہے گی۔ اسکی مثال ایسی ہے جیسے کوئی خراب چیز دے کر بیع سلم کرے اور عوض میں بہترین چیز لینے کی شرط لگائے ظاہر ہے اسے اس خراب شئے پر افسوس نہ کرنا چاہیے۔ اس کا تعلق معرفت سے ہے' اور معرفت ایمان کی قبیل سے ہے' کبھی یہ معرفت ضعیف ہوتی ہے' اور کبھی قوی' اگر قوی ہو تو باعث دین بھی قوی ہوتا ہے اور اس میں زبردست ہیجان پیدا ہو جاتا ہے' اور اگر کمزور ہو تو باعث دین بھی کمزور ہوتا ہے' اس معرفت یعنی قوت ایمان کا نام یقین بھی ہے' یہ یقین عزیمت صبر کا محرک ہے' لیکن لوگوں میں بہت کم ایسے ہیں جنہیں یقین اور صبر کی عزیمتیں عطا کی گئی ہیں۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ باعث دین کو باعث ہوی پر بتدریج غالب لانے کی کوشش کرے' اور آہستہ آہستہ اس مقابلے کا عادی بنائے' یہاں تک کہ جب فتح کی لذت سے ہم کنار ہو تو دفعۃً جری ہو کر اس پر غلبہ حاصل کرلے' اس طرح غلبہ پانا کوئی مشکل کام نہیں ہے' محنت طلب کاموں کی عادت اور مشق سے وہ اعضاء مضبوط ہو جاتے ہیں جن سے وہ اعمال صادر ہوں' یہی وجہ ہے کہ بوجھ اٹھانے والوں' کاشتکاروں اور سپاہیوں میں قوت زیادہ ہوتی ہے' نیز جسمانی محنت کا کام کرنے والوں کی طاقت درزیوں' عطر فروشوں' فقیہوں' اور صوفیوں سے زیادہ ہوتی ہے' ان کے قویٰ مشق اور عادت نہ ہونے سے کمزور رہتے ہیں'۔

ان دونوں طریق ہائے علاج میں سے پہلے طریقے کی مثال ایسی ہے جیسے پہلوان کو کشتی لڑنے پر یہ کہہ کر آمادہ کیا جائے کہ کامیابی کی صورت میں تمہیں خلعت فاخرہ سے نوازا جائے گا' اور تمہارا نہایت اعزاز و اکرام کیا جائے گا' جیسے فرعون نے جادوگروں سے کہا تھا کہ اگر تم نے موسیٰ کو شکست دیدی تو میں تمہیں اپنا مقرب بنالوں گا۔ دوسرے طریقے کی مثال ایسی ہے جیسے کسی ایسے لڑکے کو جسے پہلوان یا سپاہی بنانا مقصود ہو فنون سپہ گری کی تعلیم دی جائے' اور پہلوانی کے داؤ پیچ سکھلائے جائیں' یہاں تک کہ وہ ان فنون سے مانوس ہو جائے اور اسکی قوت و جرأت میں بچپن ہی سے اضافہ ہوتا رہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ جو شخص بالکل ہی صبر کی طاقت نہ رکھے' اور ذرا بھی مجاہدہ نہ کرے اس میں باعث دین کمزور پڑجاتا ہے یہاں تک کہ وہ ضعیف شہوت پر غلبہ نہیں پاسکتا۔ اور جو شخص اپنے نفس کو شہوت کی مخالفت کا عادی بنالیتا ہے' وہ جب چاہتا ہے شہوت پر غالب آجاتا ہے۔ یہ ہے صبر کی مختلف قسموں میں علاج کا طریقہ کار۔ ان تمام قسموں کا معاملہ بہت مشکل ہے' ان سب میں دشوار ترین قسم باطن کو حدیث نفس سے روکنا ہے' خاص طور پر ایسے شخص کے لئے جو تمام شہوات ترک کرکے عزلت نشین ہو جائے' اور ذکر و فکر کے مراقبے میں مشغول ہو جائے' ایسے شخص کو وساوس ادھر سے ادھر کھینچے پھرتے ہیں' بظاہر اسکا کوئی علاج نہیں' الا یہ کہ اہل و عیال' مال جاہ' دوست اور احباب سے راہ فرار اختیار کرکے تمام ظاہری اور باطنی رشتے منقطع کرلئے جائیں' اور غذا کی معمولی مقدار پر قناعت کرکے کسی گوشۂ تنہائی کو اپنا ٹھکانا بنالیا جائے' لیکن اس طریقے سے اسی وقت فائدہ ہوگا جب تمام افکار کا محور ایک ہو یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات' پھر قلب پر فکر الٰہی کا غلبہ بھی کافی نہیں ہے' جب تک وہ آسمان و زمین کے ملکوت' اللہ تعالیٰ کے عجائب صنعت' اور اسکے معارف کو اپنے فکر کی جولان گاہ اور باطن کی سیرگاہ نہ بنائے۔ اس صورت میں یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ شیطان رسہ کشی سے باز آجائے' اور آدمی کے دل کو وساوس کا شکار نہ کرے' اگر سیر باطنی کی صلاحیت نہیں تو نجات کی صورت بجز اسکے کوئی نہیں کہ اوراد و وظائف پر مداومت کرے یعنی بیداری کا کوئی لمحہ ایسا نہ گزرنے دے جس میں نماز' یا تلاوت' یا کوئی ذکر نہ ہو' اور اوراد و وظائف میں صرف زبان کی حرکت کافی نہیں ہے' بلکہ دل کو بتکلف حاضر کرنا بھی ضروری ہے' اس منصوبہ بند طریقے کے بعد عام طور سلامتی قلب کی امید کی جاسکتی ہے' البتہ بعض اوقات کا فکر رہ

جائے گا۔ اس لئے کہ بعض اوقات ایسے ہو سکتے ہیں، جن میں ذکر و فکر سے مانع عادثات پیش آئیں گے، مثلاً خوف، مرض، کسی انسان کی طرف سے پہنچنے والی ایذاء یا جن لوگوں سے تنہائی کے باوجود اسباب معیشت میں سابقہ پڑے انکی سرکشی یا نافرمانی، یہ وہ تمام اسباب ہیں جن سے قلب کی مشغولیت متاثر ہو سکتی ہے۔

انکے علاوہ بھی بعض اور مانع بن سکتے ہیں، مثلاً کھانا، پینا، پہننا اور معیشت کے وسائل اختیار کرنا، ظاہر ہے معاش کے لئے بھی وقت کی ضرورت ہے بشرطیکہ اپنی معاش کا خود کفیل ہو، لیکن کوئی دوسرا شخص کفیل ہو تو ہو سکتا ہے معاش کے مسائل سے فارغ رہے، لیکن لباس اور طعام کے لئے وقت نکالنے پر ضرور مجبور ہو گا۔ اس طرح یہ امور بھی قلب کے اشتغال میں رکاوٹ کا باعث بنیں گے، لیکن امید یہ ہے کہ تمام دنیاوی علائق منقطع کرنے کے بعد آدمی اکثر اوقات سلامت رہ سکتا ہے، بشرطیکہ کوئی حادثہ پیش نہ آئے، یا مصیبت نازل نہ ہو، ان اوقات میں دل صاف رہتا ہے، اور فکر آسان ہو جاتا ہے، آسمان و زمین کے ملکوتی اسرار اس قدر منکشف ہوتے ہیں، کہ اس شخص کے دل پر انکا دسواں حصہ بھی منکشف نہیں ہوتا، جو علائق میں گرفتار ہو، عارف کا اس مرتبے پر پہنچنا ممکن ہے، یہ انتہائی مرتبہ ہے انسان اپنی کوشش سے یہ مرتبہ حاصل کر سکتا ہے، جہاں تک قلب کے تصفیئے اور اس پر اسرار الہی کے انکشاف کا معاملہ ہے وہ تقدیر پر منحصر ہے، اسکی مثال ایسی ہے جیسے شکار اور رزق کہ جتنا جس کی قسمت میں ہوتا ہے اسی قدر ملتا ہے۔ بعض اوقات ذرا سی محنت سے بہت سا شکار ہاتھ آجاتا ہے، اور کبھی دن بھر کی محنت کے بعد تھوڑا سا شکار ملتا ہے۔ اس میں بندے کے اختیار کو کچھ دخل نہیں، یہ تمام معاملات اللہ کے ہاتھ میں ہیں اور تمام دارومدار کشش الہی پر ہے، البتہ بندے کے اختیار میں یہ ہے کہ اس کشش کے لئے جدوجہد کرتا رہے، اس طرح کہ ان تمام باتوں سے دل کا تعلق منقطع کرلے جو دنیا کی طرف کھینچتی ہیں، اوپر کی طرف کشش اسی وقت ہو گی جب نیچے کی کشش منقطع ہو جائے گی، اس حدیث شریف میں انہی دنیاوی علائق کو قطع کرنے کا حکم وارد ہے فرمایا :۔

اِنَّ لِرَبِّكُمْ فِيْ اَيَّامِ دَهْرِكُمْ نَفَحَاتٍ اَلَا فَتَعَرَّضُوْا لَهَا (۱)

تمہارے رب کے تمہارے زمانہ کے دنوں میں نفحات ہیں، یاد رکھو تم ان نفحات کے سامنے ہو جاؤ۔

اسکی وجہ یہ ہے کہ ان نفحات الہیہ اور جذبات خالقیہ کے آسمانی اسباب ہیں، چنانچہ ارشاد ربانی ہے :۔

وَفِي السَّمَاءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوْعَدُوْنَ (پ ۲۶ ر ۱۸ آیت ۲۲)

اور تمہارا رزق اور جو تم سے وعدہ کیا جاتا ہے (ان) سب کا (معین وقت) آسمان میں ہے۔

معرفت سے زیادہ اعلیٰ اور افضل کونسا رزق ہو سکتا ہے۔ جہاں تک آسمانی اسباب کا معاملہ ہے یہ ہماری نگاہوں سے پوشیدہ ہیں، ہمیں نہیں معلوم کہ اللہ تعالیٰ کس وقت ہمارے لئے رزق کے اسباب آسان کرے گا۔ اس لئے ہمارے لئے اسکے علاوہ کوئی چارہ نہیں کہ جگہ خالی رکھ کر نزول رحمت کا انتظار کریں، اور اس وقت معین کے منتظر رہیں، جس میں رحمت الہی کا نزول ہونا ہے، اس کی مثال کسان کی سی ہے، کسان زمین ہموار کرتا ہے، اس میں بیج ڈالتا ہے، اسے کھاد دیتا ہے، حالانکہ وہ جانتا ہے، کہ اسکی تمام محنت رائیگاں جائے گی اگر بارش نہ ہوئی، وہ یہ بھی نہیں جانتا کہ بارش کب ہو گی، لیکن اسے اللہ کی رحمت پر اعتماد ہوتا ہے، وہ یہ دیکھتا ہے کہ کوئی برس بھی باران رحمت سے خالی نہیں گیا، اس توقع پر وہ سخت سے سخت محنت کرتا ہے، اسی طرح کوئی سال، کوئی مہینہ بلکہ کوئی دن بھی ایسا نہیں گزرتا جو جذبہ الہی اور نفحہ رحمانی سے خالی ہو، اس لئے بندے کو چاہیے کہ وہ اپنے قلب کی زمین کو شہوات کی خودرو گھاس سے صاف کرے، اس میں ارادت و اخلاص کے بیج ڈالے، اور باران رحمت کا انتظار کرے، خاص طور پر جو بہترین اوقات ہوں، ان میں ضرور انتظار کرے اور یہ توقع کرے کہ میرے دل کی زمین پر نفحات الہیہ کی ہوائیں چلیں گی، اور جذبات الٰہیہ کی بارشیں ہوں گی، جس طرح کسان آسمان کو ابر آلود دیکھ کر بارش کی توقع کیا کرتا ہے، یا موسم برسات میں اسے بارش کی امید رہتی ہے، بہترین اوقات سے ہماری مراد جمعہ یا عرفہ یا رمضان وغیرہ کے مبارک ایام ہیں۔ ان ایام میں قبولیت کی ساعتیں پوشیدہ ہیں، اور ان

(۱) یہ روایت احیاء العلوم جلد اول کتاب الصلوٰۃ میں گزری ہے

میں ہمتیں مجتمع ہوتی ہیں' اور قلوب ایک دوسرے کی مساعدت کرتے ہیں' ہمتیں' اور انفاس بھی رحمت اللہ کے نزول کے اسباب ہیں' ان کے طفیل قحط سالی کے زمانے میں بارش نازل ہوتی ہے' جب ان کے حوالے سے پہاڑوں اور سمندروں کے اطراف و جوانب سے گھٹائیں اٹھنے اور برسنے کی دعائیں ہوسکتی ہیں' تو ملکوت کے خزانوں سے مکاشفات اور معارف کی بارش کی دعا کیوں نہیں کی جاسکتی بلکہ یہ دعا جلد قبول ہوسکتی ہے' اس لئے کہ گھٹائیں تو سمندروں سے اٹھیں گی اور پہاڑوں سے ٹکرا کر برسیں گی' احوال اور معارف کے خزانے تو خود تمہارے دل میں موجود ہیں' یہ اور بات ہے کہ دنیاوی تعلقات اور شہوات کی وجہ سے ان پر حجاب پڑ گیا ہو۔ اس لئے اب آدمی کے کرنے کا کام صرف یہ ہے کہ وہ حجاب دور کردے تاکہ معارف کے انوار روشن ہوجائیں۔ ظاہر ہے زمین کھود کر پانی نکالنا زیادہ سہل ہے بہ نسبت اسکے کہ کسی دور دراز جگہ سے پانی اس میں لا کر ڈالا جائے۔

یہ بات معلوم ہوچکی ہے کہ معارف ایمانی ہر وقت دل میں موجود رہتے ہیں' انسان انھیں بھولا ہوا ہے' یا ان کی طرف سے لاپروا ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں متعدد جگہوں پر لفظ تذکر استعمال فرمایا ہے' اور اس امر کی طرف اشارہ کیا کہ ان معارف کو یاد کیا جائے' اور ان سے لاپروائی نہ برتی جائے۔ چنانچہ ارشاد ہے:۔

وَلِيَتَذَكَّرَ أُولُوا الْأَلْبَابِ (پ ۱۳ ر ۱۹ آیت ۵۲)

اور تاکہ دانشمند لوگ نصیحت حاصل کریں۔

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُدَّكِرٍ (پ ۲۷ ر ۸ آیت ۱۷)

اور ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لئے آسان کردیا ہے' سو کیا کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے۔

یہ ہے وساوس کے علاج کی تفصیل' یہ درجہ صبر کا انتہائی درجہ ہے' اور تمام علائق سے صبر کرنا خواطر اور وساوس پر صبر کرنے سے مقدم ہے۔ حضرت جنیدؒ فرماتے ہیں کہ دنیا سے آخرت کی طرف چلنا مومن کے لئے آسان ہے' اور حق کی محبت میں مخلوق سے جدائی اختیار کرنا دشوار ہے' نفس سے فرار اختیار کرکے اللہ کی طرف جانا بھی کچھ کم سخت نہیں ہے' لیکن سب سے زیادہ سخت اور دشوار امر یہ ہے کہ آدمی اللہ کے ساتھ صبر کرے۔ حضرت جنیدؒ نے اولاً اس صبر کی شدت کا ذکر کیا جو دل کے مشاغل ترک کرنے کی صورت میں کیا جاتا ہے۔ اسکے بعد مخلوق سے ترک تعلق کی شدت بیان فرمائی۔

ربوبیت مطلوب ہے : نفس کو سب سے زیادہ تعلق علق اور جاہ سے ہوتا ہے' اقتدار' غلبہ' حاکمیت اور بالاتری میں جو لذت ہے وہ دنیا کی کسی چیز میں نہیں ہے' اچھے اچھے عقلمند اس لذت کے اسیر ہیں' اور انکے نزدیک اس سے بڑھ کر کوئی دوسری لذت نہیں ہے اور یہ اعلا ترین لذت کیوں نہ ہو جب کہ یہ اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ایک صفت ہے یعنی ربوبیت' اور قلب کو یہ صفت اس لئے محبوب ہے کہ اسمیں امور ربوبیت کی مناسبت پائی جاتی ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے :۔

قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي (پ ۱۵ ر ۱۰ آیت ۸۵)

آپ فرما دیجئے کہ روح میرے رب کے حکم سے بنی ہے۔

قلب کے لئے ربوبیت کی محبت معیوب نہیں ہے' بلکہ اسکی مذمت کی وجہ محض شیطان ہے' کیونکہ شیطان اسے عالم امر سے دور کرتا ہے' اسے فریب دیتا ہے' اور اسے اس کے اصل راستے سے ہٹاتا ہے' شیطان کے حسد کی وجہ ظاہر ہے' اسے یہ گوارا نہیں کہ آدمی کا دل عالم امر سے ہو' اسی لئے اسے گمراہ کرنے کے درپے ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ طلب ربوبیت مذموم نہیں ہے' بلکہ یہ تو عین سعادت ہے' کیونکہ اس طرح وہ ربوبیت کا طلبگار بن کر آخرت کی سعادتوں کا خواہاں ہے' یعنی ایسی بقا چاہتا ہے جس میں فنا نہیں' ایسی عزت چاہتا ہے جسمیں کوئی ذلت نہیں' ایسا امن چاہتا ہے جس میں کوئی خوف نہیں' ایسی مالداری چاہتا ہے جس میں فقر نہیں' ایسا کمال چاہتا ہے جس میں نقص نہیں' یہ تمام اوصاف ربوبیت کے اوصاف ہیں' اور ان کا طلب کرنا مذموم نہیں ہے' بلکہ ہر بندے کو اسکا حق ہے کہ وہ اپنے لئے لامحدود سلطنت چاہے' اور جو ملک طلب کرتا ہے' وہ سربلندی' عزت اور کمال کا طالب پہلے ہوتا ہے۔

لیکن یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ ملک دو قسم کے ہیں۔ ایک ملک وہ ہے جو طرح طرح کی مصیبتوں سے گھرا ہوا ہے' اور بہت جلد حاصل ہو جاتا ہے' اور بہت جلد فنا ہو جاتا ہے' یہ ملک دنیا میں ہے' اور ایک ملک وہ ہے جو ہمیشہ رہنے والا ہے' اس میں نہ کوئی رنج ہے' اور نہ مصیبت ہے' نہ کوئی شخص اس ملک پر حملہ آور ہو سکتا ہے' اور نہ اسے تباہ و برباد کر سکتا ہے' لیکن یہ ملک جلد ہاتھ آنے والا نہیں۔ یہ ملک آخرت میں ہے۔ لیکن کیونکہ انسان فطرتاً "جلد باز ہوتا ہے اس لئے وہ حال کو مال پر ترجیح دیتا ہے۔ شیطان اسکی فطرت کے اس پہلو سے آشنا ہے۔ اس لئے اس نے اس کا رخ ملک دنیا کی طرف موڑ دیا۔ اس دنیا کو اس کے لئے آراستہ کیا' آخرت کے مالک بھی بن سکتے ہیں' یہ مغالطہ شیطان نے اسے احمق سمجھتے ہوئے دیا' چنانچہ حدیث شریف میں ہے۔

وَالْاَحْمَقُ مَنْ اَتْبَعَ نَفْسَہٗ ھَوَاھَا وَتَمَنّٰی عَلَی اللّٰہِ (۱)

احمق وہ ہے جو اپنے نفس کو اسکی خواہش کا تابع کردے اور اللہ تعالیٰ پر تمنا کرے۔

جس کی قسمت میں ذلت اور رسوائی لکھ دی گئی ہے وہ شیطان کے فریب میں آکر دنیا کی عزت و سلطنت کا طالب بن جاتا ہے' اور اسکے حصول میں ہمہ تن مشغول ہو جاتا ہے' لیکن جس کے حصے میں توفیق ارزانی ہے وہ اس فریب کا شکار نہیں ہوتا' حال کی سلطنت سے روگردانی کرتا ہے اور مال کی سلطنت کے حصول میں مشغول رہتا ہے۔ پہلی قسم کے لوگوں کا حال قرآن کریم میں اس طرح بیان کیا گیا ہے۔ کَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَۃَ وَتَذَرُوْنَ الْاٰخِرَۃَ (پ۲۹ر۱۷ آیت ۲۰٬۲۱)

ہرگز ایسا نہیں بلکہ (صرف بات یہ ہے) تم دنیا سے محبت رکھتے ہو اور آخرت چھوڑ بیٹھے ہو۔

اِنَّ ھٰٓؤُلَآءِ یُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَۃَ وَیَذَرُوْنَ وَرَآءَھُمْ یَوْمًا ثَقِیْلًا (پ۲۹ر۲۰ آیت ۲۷)

یہ لوگ دنیا سے محبت رکھتے ہیں اور اپنے آگے (آنے والے) ایک بھاری دن کو چھوڑ بیٹھے ہیں۔

فَاَعْرِضْ عَنْ مَّنْ تَوَلّٰی عَنْ ذِکْرِنَا وَلَمْ یُرِدْ اِلَّا الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا ذٰلِکَ مَبْلَغُھُمْ مِّنَ الْعِلْمِ (پ۲۷ر۶ آیت ۲۹٬۳۰)

تو آپ ایسے شخص سے اپنا خیال ہٹا لیجئے جو ہماری نصیحت کا خیال نہ کرے اور بجز دنیوی زندگی کے اسکا کوئی مقصود نہ ہو ان لوگوں کی فہم کی رسائی کی حد بس یہی ہے۔

جب شیطان کا مکر تمام مخلوق میں پھیل گیا اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام کے پاس فرشتے بھیجے' اور انھیں دشمن کو ہلاک کرنے کے طریقے سے آگاہ کیا' چنانچہ انبیاء کرام مخلوق کو ملک مجازی سے ملک حقیقی کی طرف بلاتے ہیں' اور اسے اس حقیقت سے آگاہ کرتے ہیں کہ ملک مجازی کی کوئی اصل نہیں ہے' نہ اسے دوام ہے نہ بقا' یہ ایک ناپائدار اور فانی ملک ہے' چنانچہ وہ مخلوق کو اسطرح دعوت دیتے ہیں :- یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَا لَکُمْ اِذَا قِیْلَ لَکُمُ انْفِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اثَّاقَلْتُمْ اِلَی الْاَرْضِ اَرَضِیْتُمْ بِالْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا مِنَ الْاٰخِرَۃِ فَمَا مَتَاعُ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا فِی الْاٰخِرَۃِ اِلَّا قَلِیْلٌ
(پ۱۰ر۱۲ آیت ۳۸)

اے ایمان والوں تم لوگوں کو کیا ہوا کہ جب تم سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کی راہ میں (جہاد کے لئے) نکلو تو تم زمین کو لگے جاتے ہو کیا تم نے آخرت کے عوض دنیوی زندگی پر قناعت کرلی؟ سو دنیوی زندگی کا تمتع تو آخرت کے مقابلے میں بہت قلیل ہے۔

دنیا و آخرت کی بادشاہی : تورات' انجیل' زبور' قرآن اور موسیٰ اور ابراہیم علیہم السلام کے صحیفے' اور دوسری تمام آسمانی کتابیں اسی لئے نازل ہوئی ہیں کہ مخلوق کو دائمی ملک کی طرف دعوت دیں' اور انھیں یہ تلقین کریں کہ وہ دنیا میں بھی بادشاہ بن کر رہیں اور آخرت میں بھی بادشاہ ہوں' دنیا کی بادشاہی یہ ہے کہ اس میں زہد اختیار کریں' تھوڑے مال پر قناعت کریں' اور آخرت کی بادشاہی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرکے وہ بقا پائیں جسے فنا نہ ہو' اور وہ عزت پائیں جس پر ذلت کا اثر نہ پڑے' اور آنکھوں کی

(۱) یہ روایت احیاء العلوم جلد سوم میں گزری ہے

وہ ٹھنڈک حاصل کریں جو اس عالم میں مخفی کردی گئی ہے' اور کوئی نفس اس سے واقف نہیں ہے۔ شیطان مخلوق کو دنیا کی سلطنت کی طرف اس لئے بلاتا ہے کیوں کہ وہ یہ بات جانتا ہے جو لوگ دنیا کی سلطنت کے درپے ہوتے ہیں انھیں آخرت کی سلطنت نہیں ملتی' اس لئے کہ دنیا و آخرت دو سوتنوں کی طرح ہیں ایک کی موجودگی میں دوسری نہیں رہ سکتی' نیز شیطان یہ بھی جانتا ہے کہ دنیا اگر کسی کو مل جائے تو باقی رہنے والی نہیں ہے' اسی لئے وہ دنیا کی ترغیب دیتا ہے' پھر یہی نہیں کہ اگر کسی کو دنیا مل جائے تو اسے سکون سے رہنے دے' بلکہ اس پر حسد کرتا ہے' طرح طرح سے پریشان کرتا ہے' جھگڑے کھڑے کرتا ہے' دنیا کے تمام مال و متاع کا یہی حال ہے' اول تو مشکل سے حاصل ہوتا ہے' مل بھی جائے تو اسے باقی رکھنے کے لئے بڑی تدبیریں کرنی پڑتی ہیں' شدید مشقتیں برداشت کرنی پڑتی ہیں' اور باقی بھی رہ جائے تو کب تک؟ فنا ہو جائے گی' موت سے کسی کو مفر نہیں' خواہ وہ حاکم ہو یا محکوم۔ قرآن حکیم نے ان دنیاداروں کی صحیح تصویر کھینچی ہے:

حَتّٰٓى اِذَآ اَخَذَتِ الْاَرْضُ زُخْرُفَهَا وَازَّيَّنَتْ وَظَنَّ اَهْلُهَآ اَنَّهُمْ قٰدِرُوْنَ عَلَيْهَآ ۙ اَتٰىهَآ اَمْرُنَا لَيْلًا اَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنٰهَا حَصِيْدًا كَاَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْاَمْسِ (پ۱۱ر۸ آیت ۲۴)

یہاں تک کہ جب وہ زمین اپنی رونق کا (پورا حصہ) لے چکی اور اسکی خوب زیبائش ہو گئی اور اس کے مالکوں نے سمجھ لیا کہ اب ہم اس پر بالکل قابض ہو چکے تو دن میں یا رات میں اس پر ہماری طرف سے کوئی حادثہ آپڑا' سو ہم نے اس کو ایسا کر دیا گویا کل وہ موجود ہی نہ تھی۔

ایک مثال ان لوگوں کی یہ بیان کی گئی ہے:

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ فَاَصْبَحَ هَشِيْمًا تَذْرُوْهُ الرِّيٰحُ (پ۱۵ر۱۷ آیت ۴۵)

اور آپ ان لوگوں سے دنیوی زندگی کی حالت بیان فرمایئے (کہ وہ ایسی ہے) جیسے آسمان سے ہم نے پانی برسایا ہو پھر اسکے ذریعے سے زمین کی نباتات خوب گنجان ہو گئی ہو' پھر وہ ریزہ ریزہ ہو جائے اور اسکو ہوا اڑائے لئے پھرتی ہو۔

زہد سلطنت کیوں ہے؟: زہد کے معنی یہ ہیں کہ آدمی اپنی شہوت اور غضب پر قابو پالے' اور یہ دونوں چیزیں باعث دین اور اشارۂ ایمان کے تابع ہو جائیں یہ حقیقی سلطنت ہے' حقیقی سلطنت کے معنی ہیں مکمل آزادی' غضب اور شہوت سے بچ کر ہی انسان آزاد کہلانے کا مستحق ہو سکتا ہے' ورنہ اگر شہوت کا اسیر ہوا تو کبھی وہ بندۂ شکم بن جائے گا' کبھی بندۂ شرمگاہ بن جائے گا' کبھی کسی اور غرض کا بندہ بن جائے گا' بلکہ ایک جانور کی طرح ہو جائے گا جسے اپنی ذات پر ذرا اختیار نہیں ہوتا' بلکہ دوسروں کے ہاتھوں مسخر ہوتا ہے' جو جس طرح چاہتا ہے' جہاں چاہتا ہے گردن میں رسی ڈال کر لے جاتا ہے۔ انسان کس قدر دھوکے میں ہے' بے چارہ مملوک بن کر یہ سمجھتا ہے کہ میں مالک ہوں' اور خواہشات کا غلام بن کر یہ سمجھتا ہے کہ مجھ میں ربوبیت کے اوصاف پیدا ہو گئے ہیں' ایسا شخص دنیا میں بھی ذلیل ہے' اور آخرت میں بھی ذلیل۔ ایک بادشاہ نے کسی زاہد سے دریافت کیا تمہیں کوئی ضرورت ہے؟ زاہد نے جواب دیا میں تم سے کیا مانگوں میری سلطنت تمہاری سلطنت سے زیادہ وسیع ہے۔ بادشاہ نے پوچھا وہ کیسے؟ زاہد نے جواب دیا کہ جس کے تم غلام ہو وہ میرا غلام ہے بادشاہ کو اس جواب پر بڑی حیرت ہوئی اس نے وضاحت چاہی' زاہد نے کہا کہ تم اپنی شہوت' غضب' شکم اور شرمگاہ کے غلام ہو' جب کہ میں ان سب کا مالک ہوں حقیقت یہی ہے کہ زہد ہی اصل سلطنت ہے' اسی سلطنت کے باعث اخروی سلطنت ملتی ہے' جو لوگ شیطان کے فریب میں آگئے' وہ دنیا و آخرت دونوں جگہ خسارے میں رہے' اور جنھیں راہ راست پر ثابت قدم رہنے کی توفیق ملی' دنیا و آخرت دونوں جگہ کامیاب رہے۔

اب جب کہ تم ملک' ربوبیت' تسخیر اور عبودیت کے معنی سمجھ گئے ہو' اور ان امور میں مغالطے کی راہ سے واقف ہو گئے ہو' نیز

یہ بات جان گئے ہو کہ شیطان کس طرح تمہیں بہکاتا ہے' اور راہ حق سے بھٹکاتا ہے تو تمہارے لئے سلطنت اور جاہ سے راہ فرار اختیار کرنا' اس سے اعراض کرنا' اور ان کے فوت ہونے پر صبر کرنا آسان ہے۔ اس طرح تم ایک ملک کی امید میں دوسرا ملک چھوڑتے ہو اگر کسی کا دل جاہ سے مانوس ہو جائے' اور اقتدار کی محبت اسکے اسباب پر عمل پیرا ہونے کی وجہ سے دل میں پوری طرح راسخ ہو جائے تو محض ان امور کا جاننا کافی نہیں ہے' بلکہ عمل بھی ضروری ہے۔

علم کے ساتھ تین عمل : اور یہ عمل تین امور میں ہوگا۔ ایک تو یہ کہ جاہ کی جگہ سے فرار ہو جائے تاکہ جاہ کے اسباب مشاہدہ میں نہ آسکیں' اسباب سامنے ہوں تو صبر دشوار ہوتا ہے' جس طرح غلبۂ شہوت کا علاج یہ بیان کیا گیا تھا کہ جو اسباب شہوت میں ہیجان پیدا کرنے والے ہوں ان سے دور رہا جائے' مثلاً خوبصورت چہرے' جو شخص جاہ سے بچنے کیلئے راہ فرار اختیار نہیں کرتا وہ گویا اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا انکار کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :-

أَلَمْ تَكُنْ أَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوا فِيهَا (پ ۵ ر ۱۱ آیت ۹۷)

کیا خدا کی زمین وسیع نہ تھی تم کو ترک وطن کرکے اس میں چلے جانا چاہئے تھا۔

دوسرا عمل یہ ہوگا کہ اپنے نفس کو ان اعمال کا مکلف کرے جو اس کے سابقہ اعمال کے خلاف ہوں جن کا وہ عادی ہے' مثلاً اگر تکلفات کا عادی ہو تو انھیں ترک کردے' اور سادگی اختیار کرے' متواضع بنے' بلکہ ذلیلوں کا سا شیوہ اختیار کرے۔ یہ تبدیلی ہر معاملے میں ہونی چاہئے رہنے سہنے' کھانے پینے' پہننے اوڑھنے اور اٹھنے بیٹھنے ہر معاملے میں وہ عمل کرنا چاہئے جو سابقہ عادت کے خلاف ہو' تاکہ یہ نئے افعال دل میں اچھی طرح راسخ ہو جائیں۔ تیسرا عمل یہ ہے کہ تبدیلی کے اس مرحلے میں نرمی اور تدریج کا رویہ اختیار کرے' ایک دم کوئی عادت ترک کرکے اسکے مخالف عادت کو یک لخت ختم نہیں کیا جاسکتا' تدریج ہر اعتبار سے ضروری ہے' اس طرح کہ عادت کا ایک حصہ چھوڑ دے' اور نفس کو اس ایک حصے کے لئے تسلی دے' پھر جب نفس اس پر قانع ہو جائے تو دوسرے حصے پر توجہ دے' اور اسے ترک کرے' اسی طرح تھوڑا تھوڑا حصہ چھوڑے' یہاں تک کہ ان تمام صفات کا قلع قمع ہو جائے جو دل میں راسخ ہو چکی ہیں' اسی تدریج کی طرف سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے۔

إِنَّ هٰذَا الدِّينَ مَتِينٌ فَأَوْغِلْ فِيهِ بِرِفْقٍ وَلَا تُبَغِّضْ إِلَىٰ نَفْسِكَ عِبَادَةَ اللّٰهِ (احمد۔ انس)

یہ دین مضبوط ہے اس میں نرمی سے داخل ہو اور اپنے نفس کے لئے عبادت کو ناپسندیدہ مت کرو۔

اس حدیث میں بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے :-

لَا تُشَادُّوا هٰذَا الدِّينَ فَإِنَّ مَنْ يُشَادُّهُ يَغْلِبُهُ (۱)

اس دین کا مقابلہ مت کرو' جو اسکا مقابلہ کرے گا' اس پر یہ غالب ہو جائے گا۔

وساوس' شہوات اور جاہ و اقتدار سے صبر کرنے کے سلسلے میں جو کچھ ہم نے لکھا ہے اس میں ان قوانین کا اضافہ بھی کرلو جو باب ریاضت نفس میں بیان کئے گئے ہیں' ان قوانین سے طریق مجاہدہ کا علم ہوتا ہے۔ امید یہ ہے کہ اس طرح صبر کی تمام قسموں کا علاج بالتفصیل معلوم ہو جائے گا۔ ورنہ ہر ایک قسم کی تفصیل کرنی پڑے گی۔

جو شخص تدریج کے پہلو پر نظر رکھے گا وہ اس حال پر پہنچ جائے گا اسے صبر کے بغیر سکون نہ ملے گا' پہلے اسے ان چیزوں کے بغیر چین نہ ملتا تھا جن سے صبر کیا ہے' اور اب صبر ہی میں سکون تلاش کرتا ہے' گویا معاملہ بالکل الٹا ہو جائے گا جو چیز پہلے پسندیدہ تھی اب ناپسندیدہ ہو جائے گی' اور جو پہلے ناپسندیدہ تھی وہ اب پسندیدہ بن جائے گی۔ مزاج کی اس تبدیلی پر تجربہ اور مشاہدہ بھی دال ہے۔ بچے کی مثال ہمارے سامنے ہے پہلے اسے زبردستی پڑھنے بٹھاتے ہیں' وہ بادل ناخواستہ تعلیم حاصل کرتا ہے' کھیل سے صبر کرنا اسے نہایت شاق گزرتا ہے' نیز وہ تعلیم کی مشقت پر صبر نہیں کرسکتا' لیکن جب اس میں شعور پیدا ہوتا ہے' اور علم سے انسیت پیدا ہوتی ہے تو

---

(۱) یہ روایت پہلے بھی گزری ہے

معاملہ اس کے برعکس ہو جاتا ہے۔ اب پڑھنے سے صبر کرنا دوبھر ہو جاتا ہے' کھیل پر صبر کرنا' سہل نظر آتا ہے بعض عارفین سے روایت ہے کہ انھوں نے حضرت شبلیؒ سے سوال کیا کہ کون سا صبر شدید تر ہے' انھوں نے کہا اللہ تعالیٰ کے باب میں صبر کرنا' عارف نے کہا نہیں یہ صبر سخت تر نہیں حضرت شبلی نے کہا اللہ کے لئے صبر کرنا' عارف نے اس کی بھی نفی کی' حضرت شبلی نے کہا اللہ کے ساتھ صبر کرنا عارف نے کہا نہیں اللہ تعالیٰ کے لئے صبر کرنا' عارف نے اس کی بھی نفی کی' حضرت شبلیؒ نے پوچھا پھر کون سا صبر' عارف نے کہا اللہ سے صبر کرنا۔ یہ سن کر حضرت شبلیؒ نے ایک زبردست چیخ ماری' قریب تھا کہ روح جسم کا ساتھ چھوڑ دیتی' اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے متعلق "اصبروا وصابروا ورابطوا" کہا گیا ہے خدا کے باب میں صبر کرو' خدا کے ساتھ صبر کرو' اور خدا کے ساتھ لگے رہو۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اللہ کے لئے صبر کرنا غناء ہے' اللہ کے ساتھ صبر بقاء ہے اللہ کے ساتھ صبر وفاء ہے' اور خدا سے صبر جفا ہے۔ اسی مفہوم میں یہ دو شعر کہے گئے ہیں :۔

وَالصَّبْرُ عَنْکَ فَمَذْمُوْمٌ عَوَاقِبُہٗ - وَالصَّبْرُ فِیْ سَائِرِ الْاَشْیَاءِ مَحْمُوْدُ
اَلصَّبْرُ یَجْمُلُ فِی الْمَوَاطِنِ کُلِّھَا - اِلَّا عَلَیْکَ فَاِنَّہٗ لَا یَجْمُلُ

(ترجمہ :۔ تجھ سے صبر کرنا' انجام کے اعتبار سے مذموم ہے' باقی تمام چیزوں میں صبر کرنا پسندیدہ عمل ہے۔ صبر تمام مواقع میں پسندیدہ ہے مگر تجھ پر صبر کرنا پسندیدہ نہیں ہے)

دوسرا باب

شکر کا بیان

اس باب کے تین ارکان ہیں' ایک شکر کی فضیلت' اسکی حقیقت' اقسام اور احکام کے ذکر میں ہے۔ دوسرا نعمت کی حقیقت اور اسکی خاص و عام قسموں کے بیان میں ہے۔ تیسرا رکن اس بیان میں ہے کہ شکر اور صبر میں سے کون سی قسم افضل ہے۔

پہلا رکن

نفس شکر

شکر کی فضیلت : ایک طرف تو قرآن کریم نے ذکر کی یہ تعریف کی ہے :۔

وَلَذِکْرُ اللّٰہِ اَکْبَرُ (پ ۲۱ ر ۱ آیت ۴۵)

اور اللہ کی یاد بہت بڑی چیز ہے۔

دوسری طرف شکر کو یہ اعزاز بخشا ہے کہ اسے ذکر کے پہلو بہ پہلو ذکر کیا ہے' چنانچہ ارشاد فرمایا :۔

فَاذْکُرُوْنِیْ اَذْکُرْکُمْ وَاشْکُرُوْا لِیْ وَلَا تَکْفُرُوْنَ (پ ۲ ر ۲ آیت ۱۵۲)

تو (ان نعمتوں پر) مجھ کو یاد کرو میں تم کو یاد رکھوں گا اور میری (نعمت کی) شکر گزاری کرو اور میری ناسپاسی مت کرو۔

ذکر جیسی عظیم شی کے ساتھ اس کا ذکر اس کے کمال فضیلت پر دلالت کرتا ہے' قرآن کریم میں ہے :۔

مَا یَفْعَلُ اللّٰہُ بِعَذَابِکُمْ اِنْ شَکَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ (پ ۵ ر ۱۷ آیت ۱۴۷)

اللہ تعالیٰ کو سزا دے کر کیا کریں گے اگر تم سپاس گزاری کرو اور ایمان لے آؤ۔

وَسَنَجْزِی الشّٰکِرِیْنَ (پ ۴ ر ۶ آیت ۱۴۵)

ابلیس کا قول ان الفاظ میں نقل کیا گیا ہے۔

لَاَقْعُدَنَّ لَھُمْ صِرَاطَکَ الْمُسْتَقِیْمَ میں قسم کھاتا ہوں کہ میں ان کے لئے آپ کی سیدھی راہ پر بیٹھوں گا۔ (پ ۸ - ر ۹ - آیت ۱۶)

اس میں صراط مستقیم کے معنی بعض مفسرین نے صراط الشاکرین یعنی شکر گزاروں کا راستہ لکھے ہیں کیوں کہ شکر کا مرتبہ عالی ہے' اس لئے اس نے مخلوق پر یہ طعن کیا ہے۔ ایک جگہ ارشاد فرمایا :۔

وَلَا تَجِدُ أَكْثَرَهُمْ شَاكِرِينَ (پ ۸ ر ۹ آیت ۱۷)

اور آپ ان میں اکثروں کو احسان ماننے والا نہ پائیے گا۔

ایک اور موقع پر ارشاد فرمایا :۔

وَقَلِيلٌ مِنْ عِبَادِيَ الشَّكُورُ (پ ۲۲ ر ۸ آیت ۱۳)

اور میرے بندوں میں شکر گزار کم ہی ہوتے ہیں۔

ایک جگہ شکر نعمت پر زیادتی نعمت کو قطعیت کے ساتھ ذکر فرمایا' اس میں استثناء نہیں ہے' جب کہ دوسری نعمتوں میں استثناء موجود ہے' چنانچہ غنی کرنے' دعا قبول کرنے' روزی دینے' مغفرت عطا کرنے اور توبہ قبول کرنے میں استثناء کا ذکر موجود ہے۔ ان سب کو اپنی مشیت پر موقوف فرمایا ہے' ارشاد ہے :۔

فَسَوْفَ يُغْنِيكُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهِ إِنْ شَاءَ (پ ۱۰ ر ۱۰ آیت ۲۸)

خدا تم کو اپنے فضل سے اگر چاہے گا تو محتاج نہ رکھے گا۔

فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُونَ إِلَيْهِ إِنْ شَاءَ (پ ۷ ر ۱۰ آیت ۴۰)

پھر جس کے لئے تم پکارو اگر وہ چاہے تو اس کو ہٹا بھی دے۔

يَرْزُقُ مَنْ يَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ (پ ۳ ر ۱۱ آیت ۲۷)

اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے بیشمار رزق عطا فرماتا ہے۔

وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ (پ ۵ ر ۴ آیت ۴۸)

اور اسکے سوا جتنے گناہ ہیں جس کے لئے منظور ہو گا وہ بخشش دے گا۔

وَيَتُوبُ اللّٰهُ عَلَىٰ مَنْ يَشَاءُ (پ ۱۰ ر ۸ آیت ۱۵)

اور جس پر منظور ہو گا اللہ تعالیٰ توجہ فرمائے گا۔

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ شکر ایک عمدہ شئی ہے' اسی لئے اس میں باری تعالیٰ نے اپنی مشیت کی قید نہیں لگائی بلکہ زیادتی نعمت کا قطعی وعدہ فرمایا۔ شکر کے عمدہ وصف ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے' یہ اخلاق ربوبیت میں سے ایک خلق ہے' چنانچہ اللہ تعالیٰ نے خود اپنے لئے اس وصف کا ذکر فرمایا ہے :۔

وَاللّٰهُ شَكُورٌ حَلِيمٌ

اور اللہ نہایت شکر گزار اور حلیم ہے۔

نیز قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہےکہ اہل جنت اپنی گفتگو کا آغاز شکر سے کریں گے۔

وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي صَدَقَنَا وَعْدَهُ (پ ۲۴ ر ۵ آیت ۷۴)

اور اللہ کا (لاکھ لاکھ) شکر ہے جس نے ہم سے اپنا وعدہ سچا کیا۔

وَآخِرُ دَعْوَاهُمْ أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ (پ ۱۱ ر ۶ آیت ۱۰)

اور ان کی اخیر بات یہ ہو گی الحمد للہ رب العالمین۔

شکر کی فضیلت میں بیشمار روایات اور آثار وارد ہیں' سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں :۔

اَلطَّاعِمُ الشَّاكِرُ بِمَنْزِلَةِ الصَّائِمِ الصَّابِرِ (بخاری تعلیقاً - ترمذی ابن ماجہ - ابو ہریرہؓ)

کھانے والا شکر گزار صابر روزہ دار کے برابر ہے۔

عطاء سے روایت ہے کہ میں حضرت عائشہؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے عرض کیا کہ آپ نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی جو سب سے عجیب و غریب حالت دیکھی ہو وہ بیان فرمائیے' یہ سن کر حضرت عائشہؓ رونے لگیں' اور کہنے لگیں کہ ان کا کون سا حال عجیب نہیں تھا' ایک رات آپ میرے پاس تشریف لائے' اور میرے ساتھ میرے بستر میں یا میرے لحاف میں لیٹے' یہاں تک کہ آپ کا جسم مبارک میرے جسم سے مس ہوا' اس کے بعد آپ نے فرمایا اے ابوبکر کی بیٹی! مجھے چھوڑ دے تاکہ میں اپنے رب کی عبادت کرسکوں' میں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میں تو آپ کی قربت چاہتی ہوں' ویسے آپ کی مرضی' پھر میں نے اجازت دیدی' آپ پانی کے ایک مشکیزے کی طرف تشریف لے گئے' وضو فرمایا' آپ نے وضو میں زیادہ پانی نہیں بہایا' اسکے بعد آپ نماز پڑھنے کھڑے ہوگئے' نماز کے دوران رونے لگے' یہاں تک کہ آپ کے آنسو سینہ مبارک پر بہنے لگے' پھر آپ نے رکوع کیا' رکوع میں بھی روئے' پھر سجدہ کیا اس میں بھی روئے' سجدہ سے سر اٹھا کر بھی روئے' آپ اسی طرح روتے رہے یہاں تک کہ صبح ہوگئی' اور بلال نے آپ کو نماز فجر کے وقت اطلاع دی' میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ اس قدر کیوں روتے ہیں' جبکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے اگلے پچھلے گناہ معاف فرمادیئے ہیں' آپ نے فرمایا کیا میں شکر گزار بندہ نہ ہوں؟ اور کیسے نہ روؤں جب کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں یہ آیت نازل فرمائی ہے (۱)

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ إِلَى الْآخر (پ ۲ ر ۴ آیت ۱۶۴)

بلاشبہ آسمانوں کے اور زمین کے بنانے میں اور یکے بعد دیگرے رات اور دن کے آنے میں الخ

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ رونا کسی بھی حالت میں موقوف نہ ہونا چاہیے' اللہ کا خوف تو پتھروں کو رونے پر مجبور کردیتا ہے' کیا انسان پتھروں سے بھی زیادہ سخت ہے؟ روایات میں ہے کہ ایک پیغمبر کہیں سے گزر رہے تھے کہ راستے میں دیکھا کہ ایک چھوٹے سے پتھر سے کافی مقدار میں پانی نکل رہا ہے' انھیں بڑی حیرت ہوئی' اللہ تعالیٰ نے پتھر کو زبان عطا کی' اس نے عرض کیا کہ جب سے میں نے یہ آیت سنی ہے وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ (اور جہنم کا ایندھن آدمی اور پتھر ہوں گے) میں اس خوف سے مسلسل روتا ہوں۔ انھوں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ اسے آگ سے نجات دے' بارگاہ الٰہی میں دعا قبول ہوئی' کچھ دنوں کے بعد ادھر سے دوبارہ گزر ہوا' دیکھا پتھر پہلے کی طرح رو رہا ہے' اس سے دریافت کیا اب کیا بات ہے؟ پتھر نے عرض کیا کہ پہلے خوف کی وجہ سے رو رہا تھا' اب شکر اور خوشی کے آنسو بہا رہا ہوں۔ بندے کا دل پتھر کی طرح سخت ہے' بلکہ سختی میں اس سے کچھ زیادہ ہی ہے' یہ سختی صرف رونے سے دور ہوتی ہے خواہ آدمی خوف کی حالت میں روئے یا شکر کی حالت میں' نیز ایک روایت میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :۔

يُنَادِيْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ لِيَقُمِ الْحَمَّادُوْنَ فَتَقُوْمُ زُمْرَةٌ فَيُنْصَبُ لَهُمْ لِوَاءٌ فَيَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ قِيْلَ وَمَنِ الْحَمَّادُوْنَ؟ قَالَ الَّذِيْنَ يَشْكُرُوْنَ اللّٰهَ تَعَالٰى عَلٰى كُلِّ حَالٍ (وفی لفظ آخر) اَلَّذِيْنَ يَشْكُرُوْنَ اللّٰهَ عَلَى السَّرَّاءِ وَالضَّرَّاءِ (طبرانی' ابو نعیم' بیہقی۔ ابن عباسؓ)

قیامت کے روز اعلان کیا جائے گا کہ بہت زیادہ حمد کرنے والے کھڑے ہوجائیں' ایک گروہ کھڑا ہوگا' کے لئے ایک جھنڈا نصب کیا جائے گا وہ جنت میں داخل ہوں گے' عرض کیا گیا حمد کرنے والے کون لوگ ہیں؟ فرمایا: یہ لوگ وہ ہیں جو ہر حال میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں (ایک روایت میں ہے) جو تنگی اور فراخی دونوں حالتوں میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں۔

ایک مرتبہ آپ نے ارشاد فرمایا :۔

اَلْحَمْدُ رِدَاءُ الرَّحْمٰنِ (۲) شکر خدا کی چادر ہے۔

---

(۱) ابن حبان۔ عروۃ مفصلاً' مسلم۔ عروۃ مختصراً (۲) مجھے اس کی اصل نہیں ملی' بخاری میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے

اللہ تعالیٰ نے حضرت ایوب علیہ السلام پر وحی نازل فرمائی کہ میں اپنے دوستوں کی مکافات میں شکر سے راضی ہوتا ہوں' یہ وحی بھی انہی پر نازل ہوئی کہ صابرین کا گھر دار السلام ہے' جب وہ اس میں داخل ہوں گے تو میں ان کو شکر کے کلمات کی تلقین کروں گا یہ بہترین کلمات ہیں' شکر ادا کرنے کے وقت میں اور زیادہ کا طالب ہوں' اور جب وہ میری طرف دیکھیں گے تو میں ان کے مرتبے میں اضافہ کروں گا۔ جب زیر زمین مدفون خزانوں کے متعلق قرآن کریم میں یہ آیت نازل ہوئی :۔

اَلَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّھَبَ وَالْفِضَّةَ (پ ۱۰ ر ۱۱ آیت ۳۴) جو لوگ سونا چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں۔

تو حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ ہم اپنے پاس کون سا مال رکھیں' آپ نے ارشاد فرمایا :۔

لِیَتَّخِذْ اَحَدُکُمْ لِسَانًا ذَاکِرًا وَقَلْبًا شَاکِرًا (۱)

تم میں سے کوئی ذکر کرنے والی زبان اور شکر کرنے والا دل حاصل کرے۔

اس میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ تم مال جمع کرنے کے بجائے شکر گزار دل پر قناعت کرو۔ حضرت عبد اللہ ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ شکر نصف ایمان ہے۔

شکر کی حقیقت : شکر سالکین کے مقامات میں سے ایک مقام ہے۔ یہ مقام بھی علم' عمل اور حالت سے ترتیب پاتا ہے' ان تینوں میں علم اصل ہے' علم سے حال اور حال سے عمل پیدا ہوتا ہے علم کے معنی ہیں منعم کی جانب سے عطا کی جانے والی نعمت کو پہچاننا' اور حال اس خوشی کا نام ہے جو نعمت پا کر حاصل ہوتی ہے' اور عمل نعمت دینے والے کی رضا کے مطابق کام کرنا ہے' یہ عمل قلب' اعضاء اور زبان تینوں سے متعلق ہے۔ یہاں ان سب کا بیان ضروری ہے تاکہ شکر کی حقیقت مکمل طور پر واضح ہو سکے۔ اب تک جو کچھ شکر کی تعریف میں کہا جاتا ہے رہا ہے' وہ شکر کے معانی بتمام و کمال ظاہر نہیں کرتا۔

پہلی اصل علم : اس سلسلے میں تین امور کا علم ہونا چاہئے ایک نعمت کا' دوسرے اس امر کا کہ یہ نعمت اسکے حق میں نعمت ہے' تیسرے منعم کی ذات' اور ان صفات کا جن سے انعام صادر ہوتا ہے' اور مکمل ہوتا ہے۔ نعمت کے لئے ان تین چیزوں کا وجود ضروری ہے' ایک نعمت کا' دوسرے نعمت دینے والے کا' اور تیسرے اس شخص کا جسے منعم کے قصد وارادے سے نعمت پہنچتی ہے' لیکن ان تمام باتوں کا تعلق غیر خدا سے ہے' اللہ کے سلسلے میں یہ علم ہونا چاہئے کہ تمام نعمتیں اللہ کی طرف سے ہیں' وہی منعم حقیقی ہے' درمیان کے تمام واسطے اس کے قبضۂ قدرت اور دست تسخیر میں ہیں' یہ معرفت تقدیس۔ اور توحید کے بعد ہے' اور رتبے میں ان دونوں معرفتوں سے اعلاء ہے' ایمان کی معرفتوں میں سے سب سے پہلے تقدیس ہے جس کے معنی ہیں اللہ تعالیٰ کو پاک جاننا' اس کے بعد توحید ہے' یعنی جس ذات کو پاک سمجھا گیا ہے وہ ایک ہے' اسکا کوئی شریک نہیں ہے' اسکے بعد یہ جاننا ہے کہ عالم میں جتنی بھی چیزیں موجود ہیں وہ سب اسی ذات واحد کی ایجاد سے وجود پذیر ہوئی ہیں اور اسی کی طرف سے بطور انعام عطا ہوئی ہیں' ظاہر ہے یہ معرفت سابقہ دونوں معرفتوں کے بعد آئی ہے' اس لئے اسکا مرتبہ ان دونوں سے اعلاء ہے' کیوں کہ اس میں تقدس اور وحدانیت کے اعتراف کے علاوہ کمال قدرت' اور کمال ایجاد کا اعتراف بھی ہے۔ اسی لئے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ جو شخص سبحان اللہ کہتا ہے اسے دس نیکیاں ملتی ہیں' جو لا الہ الا اللہ کہتا ہے اسے بیس نیکیاں عطا کی جاتی ہیں' اور جو الحمد للہ کہتا ہے اسے تیس نیکیاں دی جاتی ہیں۔ (۲) ایک حدیث میں یہ الفاظ ہیں :۔

اَفْضَلُ الذِّکْرِ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَفْضَلُ الدُّعَاءِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ (ترمذی' نسائی' ابن ماجہ۔ جابرؓ)

بہترین ذکر لا الہ الا اللہ ہے اور بہترین دعا الحمد للہ ہے۔

یہ خیال کرنا غلط ہے کہ یہ نیکیاں جو اوپر بیان کی گئی ہیں ان کلمات کو محض زبان سے ادا کرنے پر مل جائیں گی' خواہ انکے معانی دل میں آئیں یا نہ آئیں۔ حقیقت یہ ہے کہ سبحان اللہ کلمۂ تقدیس ہے لا الہ الا اللہ کلمۂ توحید ہے' اور الحمد للہ وہ کلمہ ہے جس سے یہ

(۱) یہ روایت کتاب النکاح میں گزری ہے (۲) یہ روایت جلد اول میں گزری ہے

معلوم ہوتا ہے کہ تمام نعمتیں اللہ کی عطا کردہ ہیں' یہ نیکیاں ان تین امور کے اعتراف و اقرار کی بدولت حاصل ہوتی ہیں' محض زبان کو حرکت دینے سے نہیں ملتیں' یہ تینوں امور ایمان و یقین کے ابواب ہیں۔

توحید سے شرک کی نفی : یہاں یہ بات جان لینا بھی ضروری ہے کہ یہ معرفت اس وقت تک مکمل نہیں ہوتی۔ جب تک منعم کی ذات سے شرکت کی نفی نہ کی جائے' مثال کے طور پر کوئی بادشاہ تمہیں انعام دیتا ہے' اور تم یہ سمجھتے ہو کہ یہ انعام تنہا بادشاہ کا نہیں ہے' بلکہ اس میں اسکے وزیر' یا وکیل وغیرہ بھی شریک ہیں' اس لحاظ سے کہ انھوں نے انعام دینے کی سفارش کی' یا وہ انعام اس تک پہنچایا' یا انعام پانے میں اسکی مدد کی' یہ نعمت میں غیر کو شریک کرنے والی بات ہے' اسکا مطلب یہ ہوا کہ وہ تنہا بادشاہ کو بہر طور منعم نہیں سمجھتا' بلکہ ایک اعتبار سے اسے' اور ایک اعتبار سے اسکے وزیر کو منعم گردانتا ہے' اسی لحاظ سے اسکی خوشی بھی ان دونوں پر تقسیم ہو جائے گی' اس طرح وہ بادشاہ کے حق میں موحد نہیں کہا جاسکتا۔ البتہ اگر وہ یہ سمجھے کہ جو نعمت مجھے حاصل ہوئی ہے' وہ بادشاہ کے حکم سے حاصل ہوئی ہے' بادشاہ کی اس تحریر سے ملی ہے' جو اس نے اپنے قلم سے لکھی' اپنے کاغذ پر لکھی' تو یقیناً وہ موحد کہلائے گا' اس صورت میں وہ قلم' کاغذ سے خوش نہیں ہوتا اور نہ ان کا شکر گزار ہوتا ہے' کیوں کہ وہ حصول انعام میں ان دونوں کا کوئی دخل نہیں سمجھتا' اگر ان کا کوئی دخل ہے تو صرف اس قدر کہ یہ دونوں چیزیں بادشاہ کے لئے مسخر ہیں۔ اسی طرح وزیر اور وکیل بھی بادشاہ کی مرضی کے پابند اور اسکے احکام کی بجا آوری پر مجبور ہیں' بادشاہ نے انھیں حکم دیا تو وہ دے رہے ہیں' ورنہ اگر دینے کا معاملہ صرف انکے اختیار پر موقوف ہوتا یا بادشاہ کی نافرمانی کا ڈر نہ ہوتا تو وہ ہرگز نہ دیتے۔ اگر بادشاہ کی نعمتوں کے بارے میں یہ گمان ہو تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ تنہا بادشاہ کو منعم نہیں سمجھتا۔ اسی طرح جو شخص اللہ تعالیٰ کی ذات اور افعال کی معرفت رکھتا ہے' اور اس حقیقت سے واقف ہے کہ چاند' سورج اور ستارے سب اسکے لئے اسی طرح مسخر ہیں' جس طرح قلم لکھنے والے کے ہاتھ میں مسخر ہے۔ جن حیوانات کو اختیار حاصل ہے وہ دراصل اپنے نفسوں کے زیر اختیار ہیں' اللہ تعالیٰ نے ان پر افعال کے دواعی مسلط کردئے ہیں' وہ ان افعال پر مجبور ہیں خواہ ان کی مرضی ہو یا نہ ہو جیسے خازن کہ وہ بادشاہ کا حکم پڑھ کر دینے پر مجبور ہے خواہ وہ دینا چاہتا ہو یا نہ چاہتا ہو' اگر دینے نہ دینے کا اختیار خازن کو دیدیا جائے تو وہ کسی کو ایک پیسہ بھی دینے کا روادار نہ ہو۔

درمیانی واسطے مضطر ہیں : بہرحال اگر کسی شخص کو اللہ تعالیٰ کی نعمت کسی دوسرے ذریعہ سے پہنچتی ہے تو اسے یہ سمجھنا چاہئے کہ یہ دوسرا شخص اس نعمت کو اس تک پہنچانے کے لئے مجبور تھا۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے اس پر اپنا ارادہ مسلط کردیا تھا اور وہ تمام دواعی پیدا کردئے تھے جن کی بنا پر وہ دینے پر مجبور تھا۔ اسکے دل میں یہ بات ڈال دی تھی کہ دنیا و آخرت میں میری بھلائی صرف اسی صورت میں ہے کہ میں اسے دوں۔ جب دل میں خدا کی طرف سے یہ تصور پیدا ہو جاتا ہے تو اسکے مقتضی پر عمل کرنے کے علاوہ کوئی چارۂ کار نہیں رہتا۔ چنانچہ یہ سمجھنا چاہئے کہ وہ شخص اگر تمہیں کچھ دے رہا ہے تو اپنی غرض کے لئے دے رہا ہے' تمہاری غرض کے لئے نہیں دے رہا ہے' اگر دینے میں اسکی غرض نہ ہوتی تو وہ ہرگز نہ دیتا' اور اگر اسے یہ بات معلوم نہ ہوتی کہ اس کا نفع تیرے نفع میں مضمر ہے تو تجھے ہرگز نفع نہ پہنچاتا۔ اب تو وہ تمہیں نفع پہنچا کر اپنے نفس کے لئے نفع کا طالب ہے' وہ تمہارا منعم یا محسن نہیں ہے بلکہ اس نے تمہیں ایک متوقع نعمت کے لئے وسیلہ بنایا ہے' اصل منعم دوسرا ہے' اس نے ظاہری منعم کو تمہارے لئے مسخر کردیا ہے' اور اس کے دل میں ایسے اعتقادات اور ارادے القاء کردئے ہیں جن کی بنا پر وہ اس نعمت کو تم تک پہنچانے پر مجبور ہوگیا ہے۔

اگر تم نے یہ امور اس طریقے پر سمجھے تو تم اللہ تعالیٰ کی ذات و افعال کی معرفت حاصل کرلوگے اور تم موحد بن جاؤ گے' شکر پر تمہیں قدرت حاصل ہو جائے گی' بلکہ محض اس معرفت سے تم بندۂ شکور کہلاؤ گے' چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مناجات کے دوران عرض کیا: یا اللہ! آپ نے آدم کو اپنے ہاتھ سے پیدا کیا ہے' پھر اس پر بے شمار احسانات کئے ہیں' اس نے آپ کا شکر کس طرح ادا کیا؟ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اس نے تمام امور کا مرجع مجھے قرار دیا' یہی اعتراف اس کا شکر تھا۔ اس سوال و جواب سے یہ

حقیقت اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ شکر گزاری کے لئے یہ معرفت ضروری ہے کہ تمام نعمتیں اللہ کی طرف سے ہیں' اگر اس معرفت میں ذرا بھی شک ہوا تو نہ وہ نعمت کا حق ادا کرپائے گا' اور نہ نعمت دینے والے کا' انسان کو صرف ظاہری منعم ہی پر بھروسہ نہ کرنا چاہئے' اور نہ اس پر اکڑنا اترانا چاہئے' حقیقی منعم کا بھی دھیان رکھنا چاہئے' ورنہ علم کا نقصان لازم آئے گا' اور علم کے نقصان سے عمل کے نقصانات کا اندیشہ ہے۔

دوسری اصل۔ حال : یہ حال اصل نعمت کی معرفت سے حاصل ہوتا ہے' اسکے معنی ہیں خشوع و خضوع اور عجز و تواضع کی ہیئت کے ساتھ منعم سے خوش ہونا۔ یہ حال بھی شکر ہے' جیسا کہ معرفت کو شکر کہا گیا ہے' لیکن حال اسی وقت شکر کہلائے گا جب اپنی تمام شرائط کو حاوی ہوگا۔ ان میں سے اہم ترین شرط یہ ہے کہ خوشی صرف منعم سے ہو' نہ نعمت سے ہو اور نہ انعام سے۔ غالباً تم یہ بات مشکل سے سمجھ پاؤ گے اس لئے ہم ایک مثال بیان کرتے ہیں۔ مثلاً ایک بادشاہ سفر کے لئے پابہ رکاب ہے' اس نے کسی شخص کو گھوڑا انعام میں بخشا' یہ شخص گھوڑا پاکر تین وجہ سے خوش ہو سکتا ہے۔ ایک وجہ یہ ہے کہ صرف انعام یعنی گھوڑے سے خوش ہو' یہ ایک قیمتی انعام ہے' اس پر اچھی طرح سواری کی جاسکتی ہے' اصیل ہے' اور منشاء کے مطابق ہے' ظاہر ہے یہ خوشی صرف اس شخص کو ہو سکتی ہے جسے بادشاہ سے کوئی غرض نہ ہو' بلکہ اس کا مطمح نظر صرف گھوڑا ہو' بالفرض اگر اسے یہ گھوڑا جنگل میں ملا ہوتا تب بھی وہ اسی قدر خوش ہوتا۔ دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ وہ صرف گھوڑا پانے پر خوش نہ ہو' بلکہ اس لئے خوش ہو کہ یہ گھوڑا بادشاہ کی عنایات اور الطاف کی دلیل ہے' اس سے پتہ چلتا ہے کہ بادشاہ کے دل میں اسکے لئے جگہ ہے۔ اگر اسے یہ گھوڑا کسی جنگل میں ملا ہوتا یا بادشاہ کے علاوہ کسی اور نے دیا ہوتا تو اسے ذرا خوشی نہ ہوتی' کیونکہ وہ گھوڑے کا محتاج نہیں ہے' یا وہ جس چیز کا محتاج ہے یعنی بادشاہ کے دل میں جگہ پانے کا وہ گھوڑے سے کہیں زیادہ بلند ہے' تیسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ وہ گھوڑا پاکر اس لئے خوش ہو کہ میں سوار ہو کر بادشاہ کی خدمت کروں گا' یا اس پر سفر کی مشقت برداشت کرکے بادشاہ کی قربت حاصل کروں گا' ہو سکتا ہے مسلسل محنت سے وزارت تک ترقی کر جاؤں یہ شخص محض اس پر قانع نہیں ہے کہ بادشاہ کے دل میں اسکے لئے جگہ ہے' وہ اس عنایت کو زیادہ لائق اعتناء نہیں سمجھتا' بلکہ وہ تو اس قدر قربت کا طالب ہے کہ بادشاہ لوگوں کو جو کچھ بھی عطا کرے اسے ہی واسطہ بنائے' ظاہر ہے یہ مرتبہ صرف انتہائی قریبی اور معتمد لوگوں کو دیا جاتا ہے پھر وہ وزارت کا خواہاں بھی نہیں ہے بلکہ محض بادشاہ کی قربت' اسکا اعتماد' اور اسکے مسلسل دیدار کا شرف چاہتا ہے' اگر اسے وزارت اور قربت میں اختیار دیا جائے تو وہ قربت اختیار کرے۔

یہ تین درجے ہیں' ان میں سے پہلے درجے میں تو کا کوئی پہلو سرے سے ہے ہی نہیں' اس لئے کہ اس کی تمام توجہات کا مرکز صرف گھوڑا ہے' وہ گھوڑا پاکر خوش ہے' اسے دینے والے سے کوئی غرض نہیں خواہ وہ بادشاہ ہے یا کوئی کم حیثیت آدمی۔ اسی طرح جو شخص نعمت پاکر اس کی لذت میں کھو جاتا ہے' اور اسے مطلب کے موافق پاکر خوش ہوتا ہے وہ بھی شکر سے بعید تر ہے' دوسرا درجہ شکر کے معنی میں داخل ہے' اس لحاظ سے کہ اس میں نعمت پانے والا نعمت دینے والے سے خوش ہے' لیکن یہ خوشی منعم کی ذات سے نہیں ہے' بلکہ اس اعتبار سے ہے کہ اس نے اپنی عنایت کا مستحق سمجھا' اس سے مستقبل میں بھی عنایت کی امید کی جاسکتی ہے یہ حال ان نیک بندوں کا ہے جو عذاب کے خوف اور ثواب کی امید میں اچھے عمل کرتے ہیں' اور شکر ادا کرتے ہیں مکمل شکر تیسرے درجے میں ہے۔ یعنی انعام پانے والے کا یہ سوچ کر خوش ہونا کہ میں اسے اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرنے کا وسیلہ بناؤں گا' اسکی علامت یہ ہے کہ وہ دنیا سے خوش نہ ہو' بلکہ صرف اتنی دنیا پر قانع ہو جس کے بارے میں زبان رسالت سے یہ ارشاد ہوا ہے "اَلدُّنْيَا مَزْرَعَةُ الْآخِرَةِ" (دنیا آخرت کی کھیتی ہے) اور جس سے دنیوی زندگی پر مدد مل سکے' دنیا کی ان نعمتوں پر رنجیدہ ہو جو عبادت سے غافل کرتی ہیں' اور اسے حق کے راستے سے ہٹاتی ہیں' کیوں کہ نعمت اس حیثیت سے اس کا مقصود نہیں ہے کہ اس میں لذت ہے جس طرح گھوڑا پانے والا گھوڑے سے اس لئے خوش نہیں تھا کہ وہ اصیل یا صبا رفتار ہے بلکہ وہ اسے بادشاہ کی خدمت میں پہنچنے کا وسیلہ سمجھتا تھا کہ وہ ہر وقت اسکے دیدار اور قربت کا شرف حاصل کرتا رہے۔ اسی لئے حضرت شبلیؒ نے ارشاد فرمایا کہ شکر منعم کا دیدار ہے' نعمت کا مشاہدہ نہیں ہے۔ خواصؒ ارشاد فرماتے ہیں کہ عام لوگوں کو خورد و نوش کی اشیاء اور لباس پر شکر ادا کرنا چاہیے' اور خواص کو

واردات قلبی پر۔

یہ رتبہ بلند وہ شخص حاصل نہیں کرسکتا جس کے نزدیک دنیا کی تمام لذتیں شکم اور شرمگاہ میں محصور ہو کر رہ گئی ہوں' اور حواس کا دائرہ ادراک رنگ اور آواز تک محدود ہو' دل ہر لذت سے خالی' اور ہر ادراک سے نا آشنا ہو' اگر قلب صحیح ہو تو وہ صرف اللہ کے ذکر' اس کی معرفت' اسکی ملاقات سے لذت پاتا ہے' وہ قلب ان چیزوں سے لذت نہیں پاتا جو عادات کی خرابی کا شکار ہو' چنانچہ بعض لوگ مٹی کھانا پسند کرتے ہیں' یا بعض لوگوں کو میٹھی چیزیں ذرا نہیں بھاتیں' بلکہ وہ تلخ چیزوں میں لذت پاتے ہیں۔

وَمَنْ یَّکُ ذَافَمٍ مُرٍّ مَرِیْضٍ یَجِدْ مُرًّا بِہِ الْمَاءَ الزُّلَالَا

(جس کی زبان ہی کڑوی ہو وہ آب شیریں کو بھی کڑوا پاتا ہے)

اللہ تعالیٰ کی نعمت کا شکر اسی طرح ادا کرنا چاہیے جس طرح اوپر مذکور ہوا۔ اگر اس درجے میں شکر ادا نہ کرسکے تو دوسرے درجے پر قناعت کرنی چاہیے' پہلے درجے کی کوئی اہمیت نہیں ہے' دوسرے اور تیسرے درجے میں بھی بڑا فرق ہے' دوسرے درجے والے کا مطلوب بادشاہ ہے تاکہ گھوڑا دے' اور دوسرے درجے میں مطلوب گھوڑا ہے تاکہ اسے بادشاہ کی قربت کا وسیلہ بنا سکے۔ کتنا بڑا فرق ہو گا ان دونوں میں جن میں سے ایک اللہ کا طالب ہو اس لئے کہ وہ اس پر نعمتیں نازل کرے اور دوسرا نعمتوں کا طالب ہو تاکہ ان کے ذریعے اللہ تک پہنچ سکے۔

تیسری اصل۔ فرح کے بموجب عمل: منعم کی معرفت سے جو فرحت حاصل ہوتی ہی اسکے موجب پر عمل کرنا یہ تیسری اصل ہے' یہ عمل دل' زبان اور اعضاء تینوں سے متعلق ہے۔ قلب کے عمل کے معنی یہ ہیں کہ بندہ خیر کا قصد کرے اور تمام مخلوق کے لئے خیر کا جذبہ پوشیدہ رکھے۔ زبان کے ذریعے عمل کا مطلب یہ ہے کہ ان تحمیدات کے ذریعے جو شکر پر دلالت کرتی ہوں اللہ کا شکر ادا کرے' اور اعضاء کے ذریعے عمل کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کی نعمتوں کو اسکی اطاعت میں استعمال کرے' اور ان سے ترک معصیت پر مدد لے' چنانچہ آنکھوں کے ذریعے شکر یہ ہے کہ مسلمان کا ہر وہ عیب چھپائے جس پر نظر پڑ جائے' کانوں کا شکر یہ ہے کہ مسلمان کے ان تمام عیوب کی پردہ پوشی کرے جو سماعت کے ذریعے معلوم ہوں' زبان کے ذریعے شکر یہ ہے کہ ایسے الفاظ زبان سے نکالے جس سے اللہ تعالیٰ خوش ہو اگر اعضاء کو اس طرح استعمال کیا جائے تو ان نعمتوں کا شکر ادا ہوتا ہے' اور اسی کا حکم بھی دیا گیا ہے' چنانچہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص سے دریافت فرمایا کیا حال ہے؟ اس نے عرض کیا ٹھیک ہے' آپ نے دوسری بار یہی سوال کیا' اس نے پھر یہی جواب دیا۔ تیسری بار سوال کرنے پر اسنے جواب دیا اللہ کا شکر ہے میں بخیر ہوں' اس پر آپ نے ارشاد فرمایا: ھٰذَا الَّذِیْ اَرَدْتُ مِنْکَ (طبرانی۔ فضیل ابن عمرؓ) یہ ہے وہ بات جو میں تم سے چاہ رہا تھا

سلف صالحین ایک دوسرے کی خیریت اس لئے دریافت کیا کرتے تھے کہ وہ جواب میں کلمۂ شکر ادا کریں' اور ان کے نامۂ اعمال میں شکر کی اطاعت کا اضافہ ہو جائے' کلمۂ شکر زبان سے نکالنے والا اطاعت گزار ہے' اظہار شوق سے ان کا مقصود ریا کاری نہیں تھا۔

جس شخص سے اس کا حال دریافت کیا جاسکتا ہے وہ جواب میں شکر بھی ادا کرسکتا ہے' شکوہ بھی کرسکتا ہے' اور خاموش بھی رہ سکتا ہے' شکر اطاعت ہے' شکایت بدترین معصیت ہے۔ اس غلام کی شکایت کے کیا معنی جس کے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں ہے' اس ملک الملوک سے جس کے قبضۂ قدرت میں سب کچھ ہے۔ اگر بندہ معصیت پر اچھی طرح صبر نہ کرسکے' یا قضاء الٰہی پر قانع نہ ہوسکے' اور پست ہمتی اسے شکوہ بہ لب ہونے پر مجبور کردے تو مناسب یہ ہے کہ وہ صرف اللہ تعالیٰ سے شکایت کرے' اس لئے کہ معصیت دینے والا بھی وہی ہے' اور معصیت دور کرنے والا بھی وہی ہے۔ غلام اگر اپنے آقا کے سامنے سرنگوں ہے تو یہ اس کے لئے عزت کی بات ہے۔ اپنی معصیت کا اظہار اس کے سامنے کرتا ہے تو اسمیں بھی کوئی ذلت کی بات نہیں ہے' ذلت کی بات تو یہ ہے کہ غلام کسی دوسرے کے سامنے اپنی ذلت کا اظہار کرے جو خود بھی غلام ہے' اور عزت دینے پر قادر نہیں ہے' ارشاد خداوندی ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ لَا یَمْلِکُوْنَ لَکُمْ رِزْقًا فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰہِ الرِّزْقَ وَاعْبُدُوْہُ

وَاشْكُرُوْا لَهٗ (پ ۲۰ ر ۱۴ آیت ۱۷)

تم خدا کو چھوڑ کر جن کو پوج رہے ہو وہ تم کو کچھ بھی رزق دینے کا اختیار نہیں رکھتے سو تم رزق خدا کے پاس سے تلاش کرو اور اسی کی عبادت کرو اسی کا شکر کرو۔

اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ (پ ۹ ر ۱۴ آیت ۱۹۴)

واقعی تم خدا کو چھوڑ کر جن کی عبادت کرتے ہو وہ بھی تم ہی جیسے بندے ہیں۔

زبان سے شکر ادا کرنا بھی شکر ہے' روایت ہے کہ ایک وفد حضرت عمر ابن عبدالعزیز کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ان میں سے ایک نوجوان اپنی بات کہنے کے لئے کھڑا ہوا' آپ نے فرمایا پہلے تم میں سے وہ شخص بولے جو عمر میں سب سے بڑا ہو' اسکے بعد اس سے چھوٹا' یہاں تک کہ تمہارا نمبر آئے۔ اس نے عرض کیا امیر المومنین! اگر معاملہ عمر پر منحصر ہوتا تو مسلمانوں کا امیر کوئی ایسا شخص ہوتا جو عمر میں آپ سے بڑا ہوتا' آپ نے فرمایا اچھا تم ہی بولو! اس نے عرض کیا! ہم لوگ نہ مانگنے آئے ہیں اور نہ کسی خوف سے حاضر ہوئے ہیں' مانگنے کی ہمیں اس لئے ضرورت نہیں کہ آپ عدل پرور ہیں' عادل سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے' ہم تو اس لئے آئے ہیں کہ زبان کے ذریعے آپ کا شکر ادا کریں اور واپس چلے جائیں۔

شکر کی مختلف تشریحات: جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ شکر منعم کی نعمت کا متواضعانہ اعتراف ہے' ان کے پیش نظر بعض قلبی احوال کے ساتھ زبان کا اظہار ہے۔ جن کے نزدیک شکر محسن کے احسان کے حوالے سے اسکی تعریف کرنا ہے وہ صرف زبان کے اظہار کے قائل ہیں بعض لوگوں کے خیال میں شکر کے معنی یہ ہیں کہ بندہ ہروقت مشاہدہ کے عالم میں رہے' اور منعم کی حرمت ملحوظ رکھے۔ یہ تعریف شکر کے اکثر پہلوؤں کو محیط ہے' صرف زبانی عمل اس سے خارج ہو جاتا ہے۔ حمدون دعوبی کے خیال میں شکر نعمت یہ ہے کہ آدمی شکر کرنے میں خود کو طفیلی جانے۔ اس قول میں اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ شکر میں معرفت بھی پائی جاتی ہے۔ حضرت جنیدؒ کے نزدیک شکر یہ ہے کہ تم اپنے آپ کو اس نعمت کا اہل نہ سمجھو' اس میں خاص طور پر قلب کے احوال کا لحاظ کیا گیا ہے' جن لوگوں کے اقوال یہ ہیں انھوں نے دراصل اپنے احوال کی عکاسی کی ہے۔ اسی لئے یہ اختلاف نظر آتا ہے۔ بعض مرتبہ ایک ہی شخص کے دو مختلف قول ملتے ہیں' دراصل یہ اختلاف حالتوں کے اختلاف پر مبنی ہے' بعض اوقات ان کا جواب اپنی موجودہ حالت کے پیش نظر ہوتا ہے' اور کبھی سائل کی حالت ان کے سامنے ہوتی ہے' اور وہ اسی کو ملحوظ رکھ کر جواب دیتے ہیں' صرف اسی قدر جواب دیتے ہیں' جتنی اسے ضرورت ہوتی ہے' اسکی ضرورت سے زائد ایک لفظ نہیں بولتے۔ اس وضاحت سے ہمارا ہرگز یہ مقصد نہیں کہ ان پر طعن کیا جائے' بلکہ اگر اسکے سامنے شکر کی یہ مختلف تشریحات پیش کی جائیں تو وہ ان کی بھی تصدیق کریں گے' کسی بھی صاحب بصیرت سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ شکر کی ان مختلف تعریفوں میں سے کسی تعریف کا انکار کرے گا' اگر کوئی نزاع ہوا بھی تو وہ صرف لفظی ہوگا۔ لفظ شکر وضع کے اعتبار سے ان تمام معانی کو شامل ہوگا یا صرف بعض معانی کو باعتبار مقصود شامل ہوگا اور باقی کو توابع اور لوازم کی حیثیت سے یہاں ہم لغوی تحقیقات بیان نہیں کرنا چاہتے کیونکہ تحقیق لغت کا تعلق علوم آخرت سے نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کے حق میں شکر کے معنی کی وضاحت

ہوسکتا ہے تمہارے دل میں یہ خیال آئے کہ شکر ایسی جگہ متصور ہونا چاہئے جہاں منعم کو شکر سے کوئی فائدہ ہو' مثال کے طور پر ہم دنیا کے بادشاہوں کا شکر کرتے ہیں' اور اسکے لئے متعدد طریقے اختیار کرتے ہیں' ان میں سے ہر طریقے میں بادشاہ کا کوئی نہ کوئی فائدہ مضمر ہوتا ہے۔ مثلاً تعریف کے ذریعے شکر کرتے ہیں' اس میں بادشاہوں کا فائدہ یہ ہے کہ عوام کے دلوں میں ان کے لئے جگہ زیادہ ہوتی ہے' اور مخلوق میں ان کے جود و کرم کی تشہیر ہوتی ہے' اس طرح ان کی شہرت اور جاہ و مرتبے میں اضافہ ہوتا ہے' شکر کے لئے ایک طریقہ ہم یہ اختیار کرتے ہیں کہ ان کی خدمت انجام دیتے ہیں' اس میں بعض اغراض پر ان کی اعانت ہے' تیسرا طریقہ یہ

ہے کہ غلاموں اور خادموں کی طرح ان کے سامنے کھڑے ہوتے ہیں۔ یہ صورت ان کے جتھے کی تقویت اور جاہ میں اضافے کا باعث ہے۔ غرضیکہ شکر کا کوئی طریقہ اختیار کیا جائے اس کا کچھ نہ کچھ فائدہ ضرور ہوگا۔ یہ تمام فوائد دو وجہوں سے اللہ تعالیٰ کے حق میں محال ہیں۔ ایک وجہ تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ حظوظ اور اغراض سے منزہ' خدمت' حاجت' اعانت' تعریف و توصیف کے ذریعے جود و کرم کی تشہیر' خدام کی دست بستہ حاضری' ان کے رکوع و سجود' معاونین و انصار کی کثرت سے بے نیاز ہے' اس صورت میں اللہ تعالیٰ کے لئے ہمارا شکر کرنا ایسا ہے جیسے ہم اپنے ممدوح بادشاہوں کا شکر ادا کرنے کے لئے گھروں میں گھس جائیں' اور بند دروازوں کے پیچھے سجدہ و رکوع میں مشغول رہیں ظاہر ہے نہ اس سے بادشاہ کو معلوم ہوگا' اور نہ وہ کوئی فائدہ اٹھا سکے گا' اسے علم غیب نہیں ہے کہ وہ ہمارے گھریلو احوال سے واقف ہو۔ دوسری وجہ اللہ تعالیٰ کے لئے شکر نہ ہونے کی یہ ہے کہ اپنے اختیار سے جس قدر اعمال ہم انجام دیتے ہیں' وہ بھی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے۔ چنانچہ ہمارے اعضاء' ہماری قدرت' ارادہ' داعیہ اور وہ تمام امور جو ہماری حرکت کے اسباب ہیں اور خود ہماری حرکت یہ سب چیزیں اللہ تعالیٰ کی نعمت ہیں بھلا ہم اسکی نعمت سے اس کی نعمت کا شکر کس طرح ادا کریں؟ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی بادشاہ نے تمہیں ایک گھوڑا دیا' اور تم نے اسی کا گھوڑا لیکر اس پر سواری شروع کردی یا دوسرا گھوڑا بھی اسی بادشاہ نے عطا کیا' ظاہر ہے اس صورت میں دوسرا گھوڑا پہلے گھوڑے کا شکر نہ ہوگا' بلکہ تمہارے لیے دو گھوڑوں کا شکر ادا کرنا ضروری ہوگا پھر اس دوسری نعمت کا شکر ادا کرنا بھی ضروری ہوگا۔ وہ شکر بھی ایک نعمت میں مجسم ہوگا' اسی طرح تیسری نعمت کے لئے چوتھی نعمت ہوگی یہ سلسلہ یونہی دراز سے دراز تر ہوتا رہے گا معلوم ہوا کہ ان دونوں وجوہات کی بنا پر اللہ تعالیٰ کے حق میں شکر محال ہے۔ اور ہمیں ان دونوں وجہوں کی صحت میں بھی کوئی شک نہیں ہے کیونکہ شرع میں ان دونوں کا ثبوت ملتا ہے۔ کوئی ایسی صورت ہونی چاہیے کہ شکر بھی ادا ہو جائے اور ان دونوں وجہوں کی بنیاد پر جو اشکال لازم آرہا ہے وہ بھی باقی نہ رہے۔

جاننا چاہیے کہ یہ اشکال جو تمہیں پیش آرہا ہے حضرت داؤد علیہ السلام کو بھی پیش آیا تھا' اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھی' ان دونوں پیغمبروں نے باری تعالیٰ کی جناب میں عرض کیا تھا الٰہا! ہم تیرا شکر کس طرح ادا کریں' کیونکہ جب بھی تیرا شکر ادا کریں گے تیری نعمتوں سے کریں گے' ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ ہمارا شکر تیری دوسری نعمت ہے اس پر بھی شکر ادا کرنا واجب ہے۔ اسکے جواب میں اللہ تعالیٰ نے وحی نازل فرمائی کہ اگر تم یہ بات جان گئے ہو تو تم نے شکر ادا کردیا' دوسری روایت میں وحی کے یہ الفاظ بیان کئے گئے ہیں کہ اگر تم یہ بات جان گئے کہ نعمت میں نے عطا کی ہے تو میں تم سے شکر کے بدلے میں اس بات سے خوش ہوا۔

یہاں تم یہ کہہ سکتے ہو کہ جہاں تک انبیاء کرام علیہم السلام کے سوال کا تعلق ہے وہ ہم سمجھ گئے ہیں' لیکن وحی کے ذریعے جو جواب دیا گیا وہ ہم اپنے قصور فہم کے باعث سمجھ نہیں سکے' یعنی یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آسکی کہ خدا تعالیٰ کی جناب میں شکر کو محال سمجھنا شکر کیسے ہے' کیونکہ اسے محال سمجھنا بھی ایک نعمت ہے' یہ نعمت ہے' یہ نعمت شکر کس طرح بن جائے گی' اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ آدمی شکر ادا کئے بغیر شکر گزار کہلا سکتا ہے' یا جو شخص بادشاہ سے دوسری نعمت قبول کرلے وہ پہلی نعمت کا شاکر کہلانے کا مستحق ہے۔ یہ ایک پیچیدہ بات ہے' اور بظاہر ناقابل فہم ہے' اگر کسی مثال کے ذریعے اسے سمجھایا جائے تو شاید سمجھ میں آجائے' ویسے بھی اسکا سمجھنا بے حد ضروری ہے۔

جاننا چاہیے کہ یہ بحث معارف کے دروازہ پر دستک دینے کے مترادف ہے' جو علوم معاملہ میں سر فہرست ہے' یہاں ان علوم کا بیان مناسب نہیں ہے' تاہم بطور اشارہ کچھ بیان کئے دیتے ہیں۔

نظریۂ وحدت یا فنائے نفس: اس سلسلے میں دو اعتبارات ہیں' ایک اعتبار کا نام نظریۂ وحدت ہے۔ اس نظریے کے جو لوگ قائل ہیں ان کے نزدیک شاکر اور مشکور محب اور محبوب دونوں ایک ہی وجود کے دو نام ہیں' ان کے خیال میں اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی موجود ہی نہیں ہے۔ كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ (پ ۲۰ ر ۱۲ آیت ۸۸) سب چیزیں فنا ہونے والی ہیں بجز اس کی ذات کے۔ ان کے دل کی آواز ہے' یہ نظریہ حقیقت پر مبنی ہے' اس میں ازلی اور ابدی دونوں طرح کی صداقتیں موجود ہیں۔ اس لئے کہ

اللہ کے سوا اس ذات کا وجود ہو سکتا ہے جو بذات خود قائم ہو' اور اس طرح کی کوئی ذات نہیں' بلکہ اسکا وجود محال ہے' وجود حقیقی صرف وہ ہے جو اپنی ذات سے قائم ہو' جو اپنی ذات سے قائم نہ ہو اسکا وجود ذاتی نہ ہوگا' بلکہ غیر کے ساتھ وابستہ ہوگا' یہاں تک کہ اگر صرف اسکی ذات کا اعتبار کیا جائے' اور غیر کی طرف التفات نہ کیا جائے تو اس کا وجود یقینی نہ ہوگا۔ موجود وہ ہے جو اپنی ذات سے قائم ہو' اور ذات سے قائم وہ وجود ہے کہ اگر اسکا غیر معدوم ہو جائے تو اسکے وجود پر اثر نہ پڑے۔ اگر کوئی ایسا وجود ہے جو اپنی ذات سے قائم ہو' اور غیر کا وجود بھی اسکی ذات سے قائم ہو تو اسکو قیوم کہتے ہیں' اور قیوم اس ذات واحد کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا' اسلئے کہ وہ حی قیوم ہوگا' یہ وصف صرف ذات واحد کا ہے۔ اگر تم نقطۂ نظر سے دیکھو تو یہ بات واضح ہے کہ تمام چیزوں کا مصدر اور مرجع وہی ایک ذات واحد ہے۔ اس لئے وہی شاکر ہے وہی مشکور ہے' وہی محب ہے اور وہی محبوب ہے' چنانچہ حبیب ابن حبیب نے جب یہ آیت تلاوت کی۔ اِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا نِعْمَ الْعَبْدُ اِنَّهٗ اَوَّابٌ (پ ۲۳ ر ۱۳ آیت ۴۴)

بے شک ہم نے ان کو صابر پایا' اچھے بندے تھے بہت رجوع ہوتے تھے۔

تو فرمایا: سبحان اللہ! کس قدر حیرت کی بات ہے' اسی نے صبر کی طاقت بخشی' اور وہی تعریف کرتا ہے' گویا اس نے اپنی تعریف کی ہے' وہ خود ہی تعریف کرنے والا ہے' اور شیخ ابو سعید المیہنی کے سامنے یہ آیت تلاوت کی گئی۔

وَيُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗ (پ ر آیت) اور وہ ان سے محبت کرتا ہے اور وہ ان سے محبت کرتے ہیں۔

انھوں نے کہا بلاشبہ وہ انھیں چاہتا ہے' اسے چاہنے دو' وہ حق کو چاہتا ہے' اس لئے کہ وہ خود اپنی ذات کو چاہتا ہے' اس سے معلوم ہوا کہ وہ محبت بھی ہے اور محبوب بھی ہے' یہ ایک عالی مرتبہ ہے تم اسے کسی ایسی مثال کے ذریعے سمجھ سکتے ہو جو تمہاری حد عقل سے قریب تر ہو۔ اور وہ مثال یہ ہے کہ جب کوئی مصنف اپنی تصنیف پسند کرتا ہے تو اس کے بارے میں یہی کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنا نفس پسند کیا ہے' اسی طرح جب کوئی صانع اپنی صنعت کو پسند کرتا ہے تو گویا اپنے نفس کو پسند کرتا ہے' یا کوئی باپ اس حیثیت سے اپنے بیٹے کو پسند کرتا ہے تو وہ اس کی اولاد ہے تو گویا اپنی ذات کو پسند کرتا ہے۔ دنیا میں اللہ تعالیٰ کے سوا جتنی بھی چیزیں ہیں وہ سب اللہ تعالیٰ کی تصنیف اور اسکی تخلیق ہیں' اگر وہ اپنی تصنیف یا تخلیق سے محبت کرتا ہے تو گویا اپنی ذات سے محبت کرتا ہے۔ یہ نظریۂ توحید کی تفصیل ہے' حضرات صوفیاء اسے فنائے نفس سے تعبیر کرتے ہیں' اسکے معنی یہ ہے کہ بندہ اپنی ذات سے اور ماسوی اللہ سے فنا ہو گیا وہ ہر طرف ذات حق کا مشاہدہ کرتا ہے' جو شخص یہ حقائق نہیں سمجھتا وہ اس کا انکار کرتا ہے اور کہتا ہے آدمی فنا کس طرح ہو گیا' چار گز لمبا سایہ رکھتا ہے' دن بھر میں کلو دو کلو آٹا کھا جاتا ہے جاہل اپنی جہالت کے باعث فنائے نفس کے دعوی پر ہنستے ہیں' بے چارے عارفین کی قسمت میں یہی ہے کہ جاہل ان کا کلام نہیں سمجھتے' ان کی ہنسی اڑاتے ہیں' اور انکے سینے طنز کے تیروں سے چھلنی کرتے ہیں' قرآن کریم نے اسکی طرف اشارہ کیا ہے :۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا كَانُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَضْحَكُوْنَ وَاِذَا مَرُّوْا بِهِمْ يَتَغَامَزُوْنَ وَاِذَا انْقَلَبُوْا اِلٰى اَهْلِهِمُ انْقَلَبُوْا فَكِهِيْنَ وَاِذَا رَاَوْهُمْ قَالُوْا اِنَّ هٰؤُلَاءِ لَضَالُّوْنَ وَمَا اُرْسِلُوْا عَلَيْهِمْ حَافِظِيْنَ (پ ۳۰ ر ۸ آیت ۲۹ تا ۳۳)

جو لوگ مجرم تھے وہ ایمان والوں سے (تحقیر) ہنسا کرتے تھے' اور یہ جب ان کے سامنے سے گزرتے تھے تو آپس میں آنکھوں سے اشارے کرتے تھے' اور جب اپنے گھروں میں جاتے تھے تو دل لگیاں کرتے اور جب ان کو دیکھتے تو یوں کہا کرتے کہ یہ لوگ یقیناً غلطی میں ہیں حالانکہ یہ لوگ ان پر نگرانی کرنے والے بنا کر نہیں بھیجے گئے۔

ایک جگہ عارفین کی تسلی کے لئے ارشاد فرمایا :۔

فَالْيَوْمَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُوْنَ (پ ۳۰ ر ۸ آیت ۳۴)

سو آج (قیامت کے دن) ایمان والے کافروں پر ہنستے ہوں گے۔
طوفان نوح سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام نے ایک لمبی چوڑی کشتی بنانی شروع کی تو ان کی قوم نے ہنسی اڑائی، حضرت نوح علیہ السلام نے فرمایا تم ہماری ہنسی اڑاتے ہو ہم بھی تمہاری ہنسی اڑائیں گے۔

منکر، مشرک، موحد: یہ فنائے نفس کا مرتبہ تھا، اس میں آدمی ہر چیز کو توحید کی نظر سے دیکھتا ہے، دوسرا مرتبہ یہ ہے کہ دیکھنے والے کو فنائے نفس کا درجہ حاصل نہ ہو۔ اس درجے پر پہنچنے والوں کی دو قسمیں ہیں۔ ایک قسم تو یہ ہے کہ وہ لوگ اپنے وجود کے سوا ہر وجود کی نفی کرتے ہیں، اور یہ بات تسلیم نہیں کرتے کہ ان کا کوئی رب یا معبود ہو گا یہ لوگ اندھے ہیں، ان کی عقل بھی الٹی ہے، اس لئے کہ وہ ایک ایسی حقیقت کی نفی کرتے ہیں جو یقینی طور پر ثابت ہے، یعنی اس ذات پاک کی جو قیوم ہے، اپنی ذات سے قائم ہے، اور ہر وجود کو قائم رکھنے والا ہے۔ جتنی چیزیں موجود ہیں وہ سب اسی کی وجہ سے موجود ہیں، ان عقل کے اندھوں نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا کہ ذات واحد کی نفی کی، بلکہ اپنے نفسوں کا اثبات کیا، حالانکہ اگر انھیں صحیح معرفت حاصل ہوتی تو وہ یہ بات جان لیتے کہ ان کا کوئی مستقل وجود نہیں ہے، ان کا وجود اگر ہے تو اس اعتبار سے ہے کہ انھیں وجود میں لایا گیا ہے، اس اعتبار سے نہیں کہ وہ موجود ہیں، موجود اور ایجاد کی ہوئی چیز میں بڑا فرق ہے، موجود حق ہے، اور ایجاد کی ہوئی چیز بذات خود باطل ہے، موجود بذات خود قائم ہے، اور اپنے غیر کے لئے قیوم ہے، اور ایجاد کی ہوئی چیز ہلاک ہونے والی اور فنا ہونے والا ہے۔

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَيَبْقَى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ (پ ۲۷ ر ۱۲ آیت ۲۶-۲۷)

جتنے (ذی روح) روئے زمین پر موجود ہیں سب فنا ہو جائیں گے اور آپ کے پروردگار کی ذات جو کہ عظمت اور احسان والی ہے باقی رہ جائے گی۔

دوسری قسم میں جو لوگ ہیں وہ دونوں آنکھوں سے اندھے نہیں ہیں، بلکہ کانے ہیں، یعنی ایک آنکھ سے موجود حقیقی کا وجود دیکھتے ہیں، اس کا انکار نہیں کرتے، کیونکہ دوسری آنکھ میں ذرا بینائی نہیں اس لئے وہ یہ نہیں دیکھتے کہ موجود حقیقی کے سواجتنے بھی معنوی وجود ہیں وہ سب فنا ہونے والے ہیں، اس لئے وہ اللہ کے ساتھ دوسرے وجود بھی مانتے ہیں، یہ مشرک ہیں، اس سے پہلی قسم کے لوگ منکر تھے، اگر آدمی اندھا نہ ہو صرف چوندھا ہو تو دونوں موجودوں میں فرق کر سکتا ہے، اور اسی فرق کی بنیاد پر ایک کو رب اور دوسرے کو بندہ کہہ سکتا ہے، اور اسی فرق کے اثبات اور ایک وجود کو رب اور ایک کو عبد ماننے سے آدمی توحید کی حدود میں داخل ہو جاتا ہے، پھر اگر وہ آنکھوں میں سرمہ لگائے، اپنی بینائی بڑھائے، اور چوندھاپن دور کرے تو جس قدر آنکھوں کا نقص دور ہو گا اسی قدر وہ اللہ کے سوا دوسرے وجود سے انکار کرے گا، جب نظر بالکل ٹھیک ہو جائے اور آنکھ میں کوئی عیب باقی نہ رہے تو اسی ذات واحد کے سوا کوئی وجود نظر نہ آئے گا، اس وقت کہا جائے گا کہ وہ شخص موحد کامل بن چکا ہے۔ توحید کی ابتدا اور انتہا کے درمیان بے شمار درجات ہیں، ان ہی درجات کی بنا پر موحدین کے درجات بھی متفاوت ہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء علیہم السلام پر جو کتابیں نازل فرمائی ہیں وہ سرمہ ہیں جن سے نور بڑھایا جاتا ہے۔ اور انبیاء علیہم السلام سرمہ لگانے والے ہیں۔ یہ حضرات اللہ کے بندوں کو اس توحید کی دعوت دیتے ہیں جو کلمہ لا الٰہ الا اللہ میں مضمر ہے، اس کلمے کے معنی ہیں کہ وجود حق کے سوا کوئی وجود نظر نہ آئے۔ کمال توحید تک پہنچنے والے لوگ بہت کم ہیں، مشرک اور منکر بھی زیادہ نہیں ہیں یہ لوگ توحید کے انتہائی درجے کے بالکل مقابل درجے پر ہیں، کیونکہ یہ بت پرست ہیں، اور اپنی بت پرستی کی یہ توجیہہ کرتے ہیں۔

مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللَّهِ زُلْفَى (پ ۲۳ ر ۱۵ آیت ۳)

ہم تو ان کی پرستش صرف اس لئے کرتے ہیں کہ ہم کو خدا کا مقرب بنا دیں۔

یہ لوگ ابواب توحید کے اوائل میں داخل ہیں، درمیانی لوگ زیادہ ہیں، ان میں وہ لوگ بھی ہیں، جن کی بصیرت کے دریچے کبھی کبھی کھل جاتے ہیں، اور ان پر توحید کے حقائق منکشف ہو جاتے ہیں، لیکن یہ انکشاف ایسا ہوتا ہے، جیسے آسمان میں بجلی سی لپک

جائے، یہ انکشاف دیرپا نہیں ہوتا۔ بعض لوگوں کیلئے توحید کے حقائق منکشف ہوتے ہیں، اور کچھ دیر تک انکشاف حق کی کیفیت رہتی ہے لیکن دائمی نہیں ہوتی۔

لِکُلٍّ اِلٰی شَاوِ الْعُلَا حَرَکَاتٌ وَلٰکِنْ عَزِیْزٌ فِی الرِّجَالِ ثَبَاتٌ

(ترجمہ۔ بلندی کی طرف سب ہی حرکت کرتے ہیں، لیکن وہ لوگ بہت کم ہیں جنہیں اس میں ثبات ہو

رسول خدا کی توحید: جب اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم دیا:

وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ (پ ۳۰ ر ۲۱ آیت ۱۹)

اور نماز پڑھتے رہئے اور قرب حاصل کرتے رہئے۔

تو آپ نے سجدہ کیا اور یہ دعا کی:

اَعُوْذُ بِعَفْوِکَ مِنْ عِقَابِکَ وَاَعُوْذُ بِرِضَاکَ مِنْ سَخَطِکَ وَاَعُوْذُبِکَ مِنْکَ لَا اُحْصِیْ ثَنَاءً عَلَیْکَ اَنْتَ کَمَا اَثْنَیْتَ عَلٰی نَفْسِکَ (مسلم۔ عائشہؓ بفرق یسیر)

میں پناہ چاہتا ہوں تیرے عذاب سے تیرے عفو کی، اور پناہ چاہتا ہوں تیری ناراضگی سے تیری رضا کی، اور پناہ چاہتا ہوں تجھ سے تیری، میں تیری تعریف کا احاطہ نہیں کرسکتا تو ایسا ہے جیسی تو نے اپنی تعریف کی ہے۔

اس دعا کا پہلا جملہ "اعوذبک بعفوک من عقابک" اس بات کی دلیل ہے کہ اولاً سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے افعال خداوندی پر نظر فرمائی، اور انہی کے حوالے سے اپنی دعا کا آغاز فرمایا، یعنی اسکے فعل سے اسی کے فعل کی پناہ مانگی، پھر اس درجے سے ترقی کی، اور افعال کے مصادر کا حوالہ دیا، یعنی صفات ذکر فرمائیں اور یہ دعا کی "اعوذبرضاک من سخطک" رضا اور غصہ دونوں صفتیں ہیں۔ اس درجے کو بھی توحید میں نقصان کا باعث تصور کیا، کچھ اور قریب ہوئے، کچھ اور ترقی کی، اور مشاہدۂ صفات سے مشاہدۂ ذات تک تجاوز فرمایا، اور دعا میں یہ کلمات ادا فرمائے "اعوذبک منک" اس میں صرف ذات حق ملحوظ ہے۔ کسی صفت کا حوالہ نہیں ہے، مگر اس میں بھی اپنے وجود کا اظہار تھا، دنیا کے طلب گار تھے، اسے بھی توحید کے لئے باعث نقص سمجھتے ہوئے، آگے بڑھے، اور عرض کیا "لا احصی ثناء علیک انت کما اثنیت علی نفسک" اس میں پہلا جملہ آپ کے فنائے نفس، اور مشاہدۂ نفس سے تجاوز کی خبر ہے، اور دوسرے جملے سے معلوم ہوتا ہے کہ ثناء گو، اور لائق ثنا دونوں ایک ہی ذات ہیں، اسکے سوا جو کچھ ہے اسکا مصدر بھی وہی ہے، مرجع بھی وہی ہے، وہی باقی رہنے والا ہے، اسکے سوا ہر وجود فنا کے دروازے پر دستک دے رہا ہے۔

موحدین کے مقامات جہاں ختم ہوتے ہیں وہاں سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مقام توحید کی ابتدا کی یعنی پہلے ہی مرحلے میں آپ کی یہ کیفیت ہوئی سوائے افعال خدا کے اور کچھ آپ کو نظر نہ آیا، آپ کے مقام کی انتہا ذات حق تک پہنچ کر ہوئی، سوائے ذات حق کے کوئی شئی آپ کے مشاہدے میں نہیں رہی، جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک درجے سے دوسرے درجے تک ترقی فرماتے ہیں تو پہلے درجے کو دوسرے کی نسبت ناقص، اور توحید کے لئے باعث نقصان تصور فرماتے، اور پہلے درجے سے استغفار فرماتے۔ چنانچہ ایک حدیث میں اسی امر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:۔

اِنَّہٗ لَیُغَانُ عَلٰی قَلْبِیْ حَتّٰی اَسْتَغْفِرَ اللّٰہَ فِی الْیَوْمِ وَاللَّیْلَۃِ سَبْعِیْنَ مَرَّۃً (۱)

میرے قلب پر میل آجاتا ہے، یہاں تک کہ میں اللہ تعالیٰ سے رات دن میں ستر مرتبہ استغفار کرتا ہوں۔

ستر کا عدد اس لئے ذکر فرمایا کہ آپ ہر روز ستر درجے ترقی فرماتے تھے، ان میں سے ہر درجہ اپنے سابقہ درجے سے اعلا ہوتا تھا۔ ان میں سے پہلا درجہ بھی مخلوق کی پہنچ سے باہر تھا، لیکن آپ کی نظر میں وہ بھی نقصان کا باعث تھا اس لئے آپ اس سے استغفار فرماتے اور دوسرے درجے پر قدم رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت عائشہؓ نے عرض کیا، یا رسول اللہ! کیا اللہ تعالیٰ نے آپ کے اگلے پچھلے گناہ معاف نہیں فرمادئے؟ پھر آپ سجدوں میں اس قدر کیوں رویا کرتے ہیں؟ اور اس قدر تعب کیوں اٹھاتے ہیں؟ آپ نے ارشاد فرمایا کیا میں شکر گزار بندہ نہ بنوں۔ (۲)

(۱) یہ روایت کتاب التوبہ میں گزری ہے۔ (۲) مسلم۔ مع بخاری و مسلم۔ مغیرہ ابن شعبہ

اسکے معنی یہ ہیں کیا میں مقامات میں زیادتی کا طالب نہ بنوں۔ اس لئے کہ شکر زیادتی کا سبب ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ہے :-
لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ (پ ۱۳ ر ۱۴ آیت ۷) اگر تم شکر کرو گے تو تم کو زیادہ (نعمت) دوں گا۔

مقصد کی طرف رجوع : اب تک ہم علوم مکاشفہ کے بحر ناپید اکنار میں غوطہ زن تھے' اب کلام کی عنان اپنے اصل موضوع یعنی علوم معاملہ کی طرف موڑتے ہیں' اور کہتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا مقصد یہ تھا کہ وہ مخلوق کو کمال توحید کی طرف بلائیں' لیکن جو راہ کمال توحید تک پہنچاتی ہے اس میں بے شمار رکاوٹیں ہیں' اور بڑی طویل اور جاں گسل مسافت ہے' شریعت اس سخت راہ پر چلنے' اور یہ صبر آزما مسافت طے کرنے کا طریقہ بتلاتی ہے' اس دوسرے نقطۂ نظر کے مطابق شاکر اور مشکور' محب اور محبوب جدا جدا ہیں' رہا یہ سوال کہ شکر سے اللہ تعالیٰ کو کیا فائدہ ہوتا ہے؟ اسکا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو کوئی فائدہ نہیں ہوتا' یہ خالص بندوں کے منفعت کی بات ہے۔ اس بات کو ہم ایک مثال کے ذریعے سمجھاتے ہیں' فرض کرو کوئی بادشاہ اپنے کسی غلام کو جو کسی دور دراز علاقے میں مقیم ہے سواری' لباس اور زاد راہ بھجواتا ہے' تاکہ وہ سفر کرکے دربار شاہی سے قریب ہو جائے' اسے اپنے قریب کرنے کے سلسلے میں بادشاہ کی دو حالتیں ہو سکتی ہیں' ایک تو یہ کہ اسے بلانے کا مقصد یہ ہو کہ وہ اس کی خدمت انجام دے گا' اور کسی مہم میں شریک ہو کر سلطنت کی پائداری کا باعث بنے گا' دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ بادشاہ کا اپنا فائدہ کچھ نہ ہو' اور نہ وہ کوئی ایسی خدمت انجام دینے کے قابل ہو جس سے بادشاہ کو بے فکری ہو جائے' غرضیکہ وہ ایک ایسا وجود ہے جس سے نہ سلطنت میں چاند لگیں' نہ کوئی کمی واقع ہو' ایسی صورت میں اگر بادشاہ اسے سواری' لباس اور زاد راہ فراہم کرتا ہے تو یہ اسکی عنایت خسروانہ ہے' مقصد صرف یہ ہو سکتا ہے کہ وہ ان وسائل کو قریب تر ہونے کے لئے استعمال کرے' اور حاضری کی سعادت سے مشرف ہو' بادشاہ کو اپنا نفع مقصود نہیں ہے۔ بندوں کا حال بھی یہی ہے جو کچھ انھیں اللہ کی طرف سے حاصل ہوتا ہے وہ خود ان کے درجات کی بلندی کے لئے ہے' خود اسکا کوئی فائدہ نہیں۔

مفروضہ مثال کی پہلی صورت میں بادشاہ کے پاس چلے آنے سے بندہ شاکر نہیں ہو سکتا' جب تک وہ خدمت نہ بجالائے' جو اس سے لیتی مقصود ہے۔ دوسری صورت میں اگرچہ بادشاہ کو خدمت کی ضرورت نہیں' لیکن بندہ پھر بھی شاکر یا کافر ہو سکتا ہے' شکر گزاری کی صورت یہ ہے کہ بادشاہ نے جن انعامات سے اسے نوازا ہے انھیں اسکے پسندیدہ مصارف میں استعمال کرے' اپنی مرضی کے مطابق خرچ نہ کرے' اور کفر کی صورت یہ ہے کہ بادشاہ کی عطا کردہ نعمتوں کو ایسی جگہوں پر صرف کرے جو بادشاہ کو پسند نہیں ہیں' یا ایسے سفر میں خرچ کرے جو بادشاہ سے دور کرنے والا ہے چنانچہ اگر غلام نے بادشاہ کا عطا کردہ لباس پہنا' گھوڑے پر سوار ہوا' اور زاد راہ صرف راہ میں خرچ کیا تو کہا جائے گا کہ اس نے اپنے آقا کا شکر ادا کیا ہے' کیونکہ اس نے ان چیزوں کو آقا کے پسندیدہ کاموں میں صرف کیا ہے' یعنی ان کاموں میں جو خود غلام کے لئے پسند تھے' اپنے لئے پسند نہیں تھے' اور اگر لباس شاہی زیب تن کرکے اور سواری پر سوار ہو کر راہ میں چلا' لیکن اس راہ کا انتخاب کیا جو بادشاہ کی مخالف سمت میں ہے' اور اسے بادشاہ سے قریب تر کرنے کے بجائے بعید تر کرتی ہے تو کہا جائے گا کہ اس نے کفران نعمت کیا' کیونکہ اس نے ان نعمتوں کو اپنے آقا کی مرضی کے خلاف اس مقصد میں خرچ کیا جو اس نے خود اسکے کے لئے پسند کیا تھا نہ کہ اپنے لئے پسند کیا تھا۔ اسی طرح وہ شخص بھی کفران نعمت کا مرتکب ہے' جو بادشاہ کے عطایا سے فائدہ نہ اٹھائے اور انھیں بیکار پڑا رہنے دے' نہ لباس پہنے' نہ سواری پر سوار ہو' نہ راستے کا زاد سفر لے کے چلے۔ اس شخص کا کفر پہلے کی بہ نسبت کم ہے۔

یہی حال مخلوق کا ہے' اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا فرمایا' ابتداء میں یہ شہوات کے استعمال کے محتاج ہیں' تاکہ ان کے جسم تکمیل پائیں' شہوات کے استعمال سے وہ قرب الٰہی سے بعید ہو جاتے ہیں' جب کہ ان کی سعادت صرف قربت میں ہے اس لئے ان کے لئے ایسی نعمتیں بھی پیدا فرمائیں جو انھیں اللہ تعالیٰ سے قریب کرتی ہیں اور ان کے استعمال کی قدرت بھی پیدا فرمائی' قرآن کریم نے انسانوں کے بعد و قرب کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے :-

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ (پ ۳۰ ر ۲۰ آیت ۴)

ہم نے انسان کو بہت خوبصورت سانچے میں ڈھالا ہے۔

ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ ۙ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَلَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ (پ ۳۰ ر ۲۰ آیت ۵-۶)

پھر ہم اس کو پستی کی حالت والوں سے بھی پست تر کر دیتے ہیں (ان میں سے جو بوڑھا ہو جاتا ہے) لیکن جو لوگ ایمان لائے اور اچھے کام کئے تو ان کیلئے اس قدر ثواب ہے جو کبھی منقطع نہ ہو گا۔

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ایسے آلات ہیں جن کے ذریعے بندہ اسفل السافلین سے ترقی کر کے سعادت کے درجے تک پہنچ سکتا ہے' اللہ تعالیٰ نے یہ آلات بندوں کے لئے پیدا کئے ہیں' اسے اس کی پروا نہیں کہ بندہ اسکے قریب ہوتا ہے۔ تاہم بندے کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ چاہے تو ان آلات سے اطاعت پر مدد لے' اور چاہے تو معصیت پر' اطاعت کرے گا تو شکر گزار کہلائے گا' کیونکہ اس نے اپنے آقا کی رضا چاہی ہے' معصیت کا مرتکب ہو گا تو کافر کہلائے گا' کیونکہ اس نے ان امور کا ارتکاب کیا ہے جو اسکے آقا کو پسند نہیں ہیں۔ قرآن کریم میں ارشاد فرمایا :-

وَلَا يَرْضَىٰ لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ (پ ۲۳ ر ۱۵ آیت ۶) اور وہ اپنے بندوں کے لئے کفر پسند نہیں کرتا۔

اگر بندے نے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو معطل رکھا' نہ انہیں طاعت میں استعمال کیا اور نہ معصیت میں' یہ بھی کفران نعمت ہے' دنیا میں جتنی بھی چیزیں پیدا کی گئی ہیں وہ بندوں کے لئے آلات کے حکم میں ہیں' ان کے ذریعے بندہ کو آخرت کی سعادت' اور اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہو سکتا ہے۔ ہر مطیع اپنی اطاعت کے بہ قدر اللہ کی نعمت کا شاکر ہے' اور ہر وہ شخص جس نے نعمتیں استعمال نہیں کیں' یا ہر وہ گناہ گار جس نے بعد کی راہ میں انہیں استعمال کیا کافر ہے' اور غیر خدا کی محبت میں تجاوز کرنے والا ہے' معصیت اور اطاعت دونوں مشیت کی پابند ہیں' لیکن محبت و کراہت مشیت سے الگ ہیں' یہ تقدیر کی بحث ہے' اس لئے ہم موضوع پر زیادہ کلام نہیں کرنا چاہتے' تقدیر کا راز افشاء کرنے کا حکم نہیں ہے۔

فعل۔ عطائے خداوندی : اس تفصیل سے دونوں اشکال حل ہو جاتے ہیں۔ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ شکر سے ہماری مراد یہ ہے کہ اللہ کی نعمت کو اس طرح خرچ کیا جائے جس طرح اسے پسند ہو' چنانچہ اگر اللہ تعالیٰ کی نعمت اسی کے فعل سے اسکی پسندیدہ جگہ صرف ہوئی تو مراد حاصل ہے۔ آدمی کا فعل اللہ تعالیٰ کی عطا ہے' کیونکہ تم اس فعل کے محل ہو اس لئے تمہاری تعریف کی جاتی ہے اور ثناء اسکی دوسری نعمت ہے جس سے تمہیں نوازا گیا ہے' اسی نے ثنا کی' اسی کے دو کاموں میں سے ایک کام اس امر کا باعث بنا کہ دوسرا فعل محبت کی جہت میں ہو' بہرحال اسکے لئے ہر حالت میں شکر ہے اور تم شاکر کے وصف سے متصف ہو جس کا مطلب یہ ہے کہ اس معنی کے محل ہو جسے شکر کہتے ہیں' یہ مطلب نہیں کہ تم اپنی لئے وصف کے موجد ہو' یہ ایسا ہی ہے جیسے تمہیں عالم اور عارف کہا جائے' کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہاری بھی کچھ حیثیت ہے' یہ حیثیت بھی اس لئے ہے کہ جس نے تمہیں بنایا ہے اسی نے تمہارے لئے حیثیت بھی بنائی ہے' اگر کوئی یہ گمان کرتا ہے کہ مجھے اپنی ذات یا وصف کی بنا پر یہ حیثیت ملی ہے تو یہ اسکی خام خیالی ہے۔ بہرحال جو کچھ ہے خواہ تم ہو یا تمہارا عمل سب اللہ کی مخلوق ہیں۔ اور اسکے اچھے یا برے ہونے کا فیصلہ ازل میں ہو چکا ہے۔ صحابہ کرام نے ایک مرتبہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ عمل کس لئے کیا جائے جب کہ تمام چیزوں کے فیصلے پہلے ہی ہو چکے ہیں۔ آپ نے جواب میں ارشاد فرمایا۔

اِعْمَلُوا فَكُلٌّ مُيَسَّرٌ لِمَا خُلِقَ لَهُ (بخاری و مسلم۔ علیؓ عمران ابن حصین)

عمل کرو' ہر شخص کو اسی کام کی سہولت دی جائے گی جس کے لئے وہ پیدا ہوا ہے۔

خلق۔ خدا کے عمل کا محل ہے : اس سے معلوم ہوا کہ مخلوق خدا کی قدرت کے جاری ہونے کی جگہ اور اس کے افعال کا محل ہے' اگرچہ مخلوق خود بھی اللہ تعالیٰ کے افعال میں سے ہے' لیکن اسکے بعض افعال بعض کا محل بن سکتے ہیں' اب یہی جملہ لیجئے اعملوا' یہ جملہ اگرچہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے نکلا ہے' لیکن یہ بھی افعال الٰہی میں سے ہے' اور مخلوق کو یہ

بتلانے کا سبب ہے کہ عمل کرنا مفید ہے' مخلوق کا جاننا بھی ایک عمل ہے' اور یہ عمل اعضاء کی حرکات کا سبب بنتا ہے جب کہ اعضاء کی حرکات بھی اللہ کے افعال ہیں' معلوم ہوا کہ بعض افعال الٰہی بعض کا سبب بنتے ہیں' یعنی ایک سبب دوسرے کے لئے شرط ہوتا ہے۔ جیسے جسم کی تخلیق عرض کے لئے شرط ہے یعنی عرض جسم کی پیدائش سے پہلے نہیں ہوتا' زندگی علم کے لئے شرط ہے' علم ارادے کے لئے شرط ہے' حالانکہ یہ سب اللہ کے افعال ہیں اور بعض بعض کے لئے سبب اور شرط ہیں۔ اس اعتبار سے نہیں کہ وہ ایک دوسرے کے ایجاد کرنے والے ہیں' بلکہ مقصود یہ ہے کہ ان میں سے ایک دوسرے کے حصول کا سبب اور شرط ہے یعنی ایک واقع ہو جائے تو دوسرا وجود میں آئے' جیسے پہلے جوہر وجود میں آتا ہے' پھر اس میں زندگی کی حرارت دوڑتی ہے' اسی طرح پہلے زندگی پیدا کی ہوتی ہے پھر اس میں قبول علم کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے' علم پہلے وجود میں آتا ہے پھر ارادہ پیدا ہوتا ہے' اگر تحقیق کی جائے تو یہ سلسلہ دراز سے دراز تر ہوتا چلا جائے گا۔ اور جس قدر یہ سلسلہ دراز ہو گا اسی قدر مرتبۂ توحید میں ترقی ہو گی۔

اختیار نہیں تو عمل کا حکم کیوں : یہاں ایک سوال اور پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ جب ہمارے اختیار میں کچھ نہیں تو ہمیں یہ حکم کیوں دیا گیا ہے کہ عمل کرو ورنہ تمہیں عذاب دیا جائے گا' اور نافرمانی پر تمہاری مذمت کی جائے گی بھلا ہمیں عذاب کیوں دیا جائے گا اور ہماری مذمت کیوں کی جائے گی جب کہ ہمیں کوئی اختیار ہی نہیں ہے' اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ قول عمل کرو ہمارے اندر ایک اعتقاد کی پیدائش کا سبب بنتا ہے۔ اور اعتقاد سے خوف کو تحریک ہوتی ہے' اور خوف کی تحریک ترک شہوات' اور دنیاوی فریب سے فرار کا باعث بنتی ہے' اور یہ ترک و فرار جوار رحمت میں جگہ پانے کا سبب بنتے ہیں۔ یہ مختلف اسباب ہیں' اللہ تعالیٰ ان تمام اسباب کا مرتب اور مسبب ہے' جس کے لئے ازل میں سعادت مقدر ہو چکی ہے اسکے لئے یہ اسباب سہل بنادئے جاتے ہیں' یہاں تک کہ وہ درجہ بدرجہ ترقی کر کے جنت میں ٹھکانہ بنالیتا ہے' اوپر جو حدیث بیان کی گئی ہے اس کا مفہوم بھی یہی ہے کہ بندوں کی تقدیر میں جو اعمال لکھ دئے گئے ہیں انکے لئے ان اعمال کے اسباب سہل کردئے جاتے ہیں' اور جن کی تقدیر میں ازلی قلم سے نیکی نہیں لکھی گئی وہ اللہ' اسکے رسول' اور علماء کے کلام سے دور بھاگتے ہیں' جب وہ ان کا کلام نہیں سنیں گے تو شریعت کی منہاج کا علم نہیں ہو گا' اور جب علم نہیں ہو گا تو وہ ڈریں گے نہیں اور جب ڈریں گے نہیں تو دنیا پر ان کا اعتماد متزلزل نہیں ہو گا' اور جب دنیا میں مشغول رہیں گے' تو شیطان کے گروہ میں شامل ہونے سے انھیں کوئی نہ بچاسکے گا' اور شیطانی گروہ کے تمام افراد کا ٹھکانہ جہنم ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایک قوم جنت میں پابہ سلاسل داخل ہو گی' اور ایک قوم دوزخ میں زنجیروں میں گرفتار ہو کر جائے گی' اہل جنت کے لئے وہ زنجیریں علم اور خوف کی ہیں' اور اہل دوزخ کے لئے غفلت اور خدا کے عذاب کی' زنجیروں میں مقید کرنے والا اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں' اور نہ اسکے سوا کسی کو اس کی قدرت حاصل ہے۔ مگر غافلوں کی آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا ہے' جس روز یہ پردہ اٹھ جائے گا حقیقت منکشف ہو جائے گی' اس وقت وہ منادی کی آواز سنیں گے۔

لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ (پ ۲۴ر ۱ آیت ۱۶)

آج کے روز کس کی حکومت ہو گی؟ بس اللہ ہی کی ہو گی جو یکتا غالب ہے۔

اگرچہ ملک اور سلطنت ازل سے ابد تک ہر دن' ہر لمحہ اللہ ہی کی ہے' خاص طور پر اسی دن نہیں ہو گی' لیکن غافلوں کی سماعت سے یہ آواز اسی دن ٹکرائے گی' اس وقت وہ ہوش و خرد سے بیگانہ ہو جائیں گے' ان کی سمجھ میں نہیں آئے گا کہ اپنے بچاؤ کے لئے کیا تدبیریں کریں' لاکھ تدبیر کریں مگر کوئی فائدہ نہ ہو گا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ہلاکت کے اصل اسباب جہالت اور غفلت سے محفوظ رکھے۔

اللہ تعالیٰ کی پسندیدہ اور ناپسندیدہ چیزیں

اللہ تعالیٰ کا شکر اس وقت تک ادا نہیں ہو سکتا جب تک شکر کرنے والے بندے کو یہ معلوم نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کو کیا پسند ہے اور کیا نہیں ہے' کیونکہ شکر کے معنی ہیں اللہ کی نعمتوں کو اسکی مرضی اور پسند کے مطابق خرچ کرنا۔ اور کفر کے معنی ہیں اللہ کی نعمتوں کو ایسی جگہوں پر صرف کرنا جو اسے ناپسند ہوں' یا انھیں بیکار محض پڑے رہنے دینا۔ اللہ تعالیٰ کی محبوب چیزوں کو غیر محبوب چیزوں سے ممتاز

کرنے والے دو مدرک ہیں' ایک سماعت' جس کا مستند آیات اور روایات ہیں' دوسرا مدرک قلب کی بصیرت ہے' اس کے معنی ہیں چشم عبرت سے دیکھنا' یہ مدرک دشوار ہے' اسی لئے اس کا وجود انتہائی نادر اور کمیاب ہے' اور اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے انبیاء بھیجے' اور ان کے ذریعے راہ سہل بنائی' اس راہ کی پہچان یہ ہے کہ بندہ ان تمام احکام شریعہ سے واقف ہو جو اس سے متعلق ہیں' جو شخص اپنے تمام افعال میں شریعت کے احکام سے واقف نہیں ہو گا وہ شکر کی ذمہ داری سے بری قرار نہ دیا جا سکے گا۔

چشم عبرت سے دیکھنے کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی تمام موجودہ مخلوقات میں حکمت کے پہلو تلاش کرے' اس لئے کہ دنیا میں کوئی ایسی چیز پیدا نہیں کی گئی جس میں کوئی نہ کوئی حکمت نہ ہو' ہر حکمت سے کچھ نہ کچھ مقصود ہے' اور وہی مقصود خدا تعالیٰ کو محبوب ہے۔

حکمت کی دو قسمیں : حکمت کی دو قسمیں ہیں جلی اور خفی۔ جلی جیسے یہ جاننا کہ آفتاب کی تخلیق میں یہ حکمت ہے کہ اس سے دن اور رات میں فرق کیا جاتا ہے یعنی دن میں روزی کمائی جاتی ہے' اور رات کو آرام کیا جاتا ہے' کیوں کہ حرکت کے لئے اجالے کی ضرورت ہے اندھیرے میں صرف پر سکون رہا جا سکتا ہے۔ دن اور رات کا فرق آفتاب کی حکمتوں میں سے ایک ہے' اس کے علاوہ بھی بے شمار حکمتیں ہیں جن میں سے کچھ ہمیں معلوم ہیں' اور بہت سی ابھی تک پردۂ خفا میں ہیں۔ اسی طرح ابر و باراں کی حکمتیں بھی معلوم کرنی چاہئیں' ان کی حکمتوں میں سے ایک یہ ہے کہ ان سے زمین کا سینہ پھٹتا ہے' اور اس میں سے طرح طرح کے لہلہاتے ہوئے پودے نکلتے ہیں جن میں سے کچھ انسانوں کی غذا بنتے ہیں' اور کچھ حیوانوں کے لئے چارہ بنتے ہیں۔ قرآن کریم نے اسی طرح کی بہت سے جلی حکمتیں بیان کی ہیں جنہیں لوگ اپنی کوتاہ عقل کے باوجود سمجھ لیں' دقیق حکمتیں بیان نہیں فرمائیں کیونکہ لوگ انہیں سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ ارشاد فرماتے ہیں :-

فَلْيَنظُرِ الْإِنسَانُ إِلَىٰ طَعَامِهِ أَنَّا صَبَبْنَا الْمَاءَ صَبًّا ثُمَّ شَقَقْنَا الْأَرْضَ شَقًّا فَأَنبَتْنَا فِيهَا حَبًّا وَعِنَبًا وَقَضْبًا وَزَيْتُونًا وَنَخْلًا وَحَدَائِقَ غُلْبًا وَفَاكِهَةً وَأَبًّا مَّتَاعًا لَّكُمْ وَلِأَنْعَامِكُمْ (پ ۳۰ ر ۵ آیت ۲۴ تا ۳۲)

سو انسان کو چاہیے کہ اپنے کھانے کی طرف نظر کرے کہ ہم نے عجیب طور پر پانی برسایا پھر عجیب طور پر زمین کو پھاڑا پھر ہم نے اس میں غلہ اور انگور اور ترکاری اور زیتون اور کھجور اور گنجان باغ اور میوے اور چارا پیدا کیا تمہارے اور تمہارے مویشی کے فوائد کے لئے۔

ثوابت اور سیار ستاروں میں بھی بہت سی حکمتیں ہیں' لیکن وہ مخفی ہیں' عام لوگ ان سے واقف نہیں ہوتے' تاہم وہ اتنا جانتے ہیں کہ یہ ستارے آسمان کے لئے زینت ہیں' آنکھیں انہیں دیکھ کر لطف اندوز ہوتی ہیں' قرآن کریم نے بھی اسی حکمت کی طرف اشارہ کیا ہے :-

إِنَّا زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِزِينَةٍ الْكَوَاكِبِ (پ ۲۳ ر ۵ آیت ۶)

ہم ہی نے رونق دی ہے اس طرف والے آسمان کو ایک عجیب آرائش یعنی ستاروں کے ساتھ۔

دنیا کے تمام اجزاء آسمان' ستارے' ہوا' پہاڑ' معادن' نبات' حیوانات' ان کے اعضاء وغیرہ سب حکمتوں سے لبریز ہیں' ان اجزاء کے ذرہ ذرہ میں بیشمار حکمتوں کے خزانے مدفون ہیں' بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ ہر ذرہ میں ایک سے ایک ہزار اور دس ہزار حکمتیں پوشیدہ ہیں' تو ذرا مبالغہ نہ ہو گا۔ اعضاء انسانی ہی کو لیجئے' ان میں بہت سی حکمتیں ہیں بعض ان میں سے مخفی ہیں' اور بعض ہمیں معلوم ہیں جیسے یہ کہ آنکھ دیکھنے کے لئے ہے' اس سے پکڑنے کا کام نہیں لیا جا سکتا' ہاتھ پکڑنے کیلئے ہے' اس سے چلنے کا کام نہیں لیا جا سکتا' پاؤں سونگھنے کے لئے نہیں ہیں' یہ صرف چلنے میں کام آتے ہیں' یہی حال اندرونی اعضاء آنت' پتے' جگر' گردہ پٹھے اور رگ کا ہے' ان میں سے بعض میں خلاء ہے' بعض پیچیدہ ہیں' بعض ایک دوسرے میں گھسے ہوئے ہیں' بعض مڑے ہوئے ہیں' بعض باریک ہیں' بعض موٹے ہیں' اسطرح کی بے شمار صفات ہیں انکی حکمتوں سے عام لوگ واقف نہیں ہیں' جو لوگ واقف ہیں وہ بھی بہت تھوڑی واقفیت رکھتے ہیں' ان کے علم کو اللہ کے علم سے اتنی نسبت بھی نہیں ہے جتنی ذرہ کو آفتاب سے ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا

ارشاد ہے۔ وَمَا أُوتِيتُمْ مِنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا (پ۱۵ ر۱۰ آیت ۸۵) اور تم کو بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے۔

مذکورہ بالا تفصیل سے معلوم ہوا کہ جو شخص کسی نعمت کو اس جگہ میں خرچ نہ کرے گا جس کے لئے وہ پیدا کی گئی ہے اور اس طرح پر خرچ نہ کرے گا جو اس سے مقصود ہے تو وہ اس نعمت میں اللہ تعالیٰ کی ناشکری کا مرتکب ہو گا' مثلاً اگر کسی نے کسی کو ہاتھ مارا تو وہ ہاتھ کی نعمت میں اللہ تعالیٰ کی ناشکری کرے گا اس لئے کہ ہاتھ مہلک چیز کو دفع کرنے اور مفید چیز لینے کے لئے بنایا گیا ہے' اسی طرح جو شخص نامحرم کی طرف دیکھے گا وہ آنکھ اور آفتاب دونوں میں اللہ تعالیٰ کی ناشکری کرے گا کیونکہ آنکھ اور آفتاب کی روشنی دونوں سے مل کر بصارت مکمل ہوتی ہے' انسان کو آنکھوں سے اس لئے نوازا گیا ہے کہ وہ انکے ذریعے دین و دنیا میں نفع دینے والی چیزوں کا مشاہدہ کر سکے اور ان چیزوں سے محفوظ رہ سکے جو دین و دنیا میں اسکے لئے نقصان دہ ہیں' جو شخص غیر محرم کو دیکھتا ہے وہ انھیں اس کام میں استعمال کرتا ہے جو اس سے مقصود نہیں ہے۔ اس سلسلے میں اصولی بات یہ ہے کہ دنیا اور اس کے تمام مال و متاع کی تخلیق کا اصل مقصد یہ ہے کہ انسان ان سے وصول الی اللہ میں مدد لے' اور وصول الی اللہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اس سے دنیا میں انس و محبت نہ ہو' اور اس سے دور کرنے والی چیزوں سے نفرت نہ ہو' حصول انس کا طریقہ یہ ہے کہ ذکر پر مواظبت کی جائے' اور محبت معرفت سے پیدا ہوتی ہے' اور دوام بدن یعنی جسم کی بقاء غذاء پر موقوف ہے' اور غذا زمین پانی اور ہوا سے تشکیل پاتی ہے' اور ان چیزوں کی تکمیل کے لئے آسمان و زمین اور تمام ظاہری اور باطنی اعضاء کی تخلیق ناگزیر ہے' یہ تمام دنیا بدن کے لئے ہے' بدن نفس کی سواری ہے' اور اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹنے والا نفس وہ ہے جو طول عبادت اور کمال معرفت سے مطمئن ہو اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:۔ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ مَا أُرِيدُ مِنْهُم مِّن رِّزْقٍ (پ۲۷ ر۲ آیت ۵۵)

اور میں نے جن اور انسان کو اسی واسطے پیدا کیا ہے کہ میری عبادت کیا کریں میں ان سے رزق کی درخواست نہیں کرتا۔

بہرحال جو شخص کسی چیز کو اللہ تعالیٰ کی معصیت میں استعمال کرے گا وہ گویا ان تمام اسباب میں اللہ تعالیٰ کی ناشکری کا مرتکب ہو گا جو معصیت کے لئے ضروری ہیں۔

مخفی حکمتوں کی امثال: یہاں ہم ان مخفی حکمتوں کی ایک مثال بیان کرتے ہیں جو زیادہ مخفی نہیں ہیں' اس مثال کی ضرورت اس لئے پیش آئی تاکہ اس سے سبق لیا جائے' اور یہ دیکھا جائے کہ ہمارے کس عمل سے نعمتوں کی ناشکری ہوتی ہے اور کونسا عمل نعمتوں کے لئے شکر بن جاتا ہے۔ مثال یہ ہے کہ اللہ نے درہم و دینار پیدا کئے ہیں' ان سے دنیا کا انتظام قائم ہے' بظاہر یہ دو پتھر ہیں جن میں فی نفسہ کوئی منفعت نہیں ہے' لیکن مخلوق خدا ان کے لئے مجبور ہے' اس لئے کہ ہر انسان کو اپنے طعام' لباس اور دوسری ضروریات زندگی کے لئے بہت سی چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے' بعض اوقات اسکی ملکیت میں وہ چیزیں ہوتی ہیں جن کی اسے ضرورت نہیں ہوتی' اور ان چیزوں سے محروم ہوتا ہے جن کی اسے ضرورت ہوتی ہے' مثلاً ایک شخص زعفران کا مالک ہے لیکن زعفران اسکی ضرورت نہیں ہے' وہ سواری کا محتاج ہے' اور جس کے پاس سواری ہے ہو سکتا ہے اسے زعفران کی ضرورت نہ ہو' اس لئے ان دونوں میں معاوضہ بھی ہونا چاہیے' اور عوض کے مقدار کی تعیین بھی ہونی چاہیے۔ کیونکہ یہ ممکن نہیں کہ زعفران کی ہر مقدار کے عوض اونٹ دیا جائے' اونٹ اور زعفران میں کوئی مناسبت نہیں ہے کہ جتنے وزن کا اونٹ ہو اسی وزن کی زعفران دی جائے گی' اسی طرح اگر کوئی شخص کپڑا دے کر گھر' موزہ دے کر غلام' اور گدھا دے کر آٹا خریدے تو ظاہر ہے ان میں کوئی مناسبت نہیں ہے اس صورت میں یہ جاننا مشکل ہو جائے گا کہ کس قدر زعفران کے عوض میں مکمل اونٹ دیا جائے گا؟ اس طرح معاملات یقینی طور پر دشوار ہو جائیں گے۔

درہم و دینار کی تخلیق کا مقصد: دنیا کا انتظام کسی دشواری کے بغیر صحیح طور پر چلانے کے لئے ایک ایسی درمیانی چیز کی ضرورت ہے جو مختلف غیر متناسب چیزوں میں مساوات پیدا کر سکے' اور اسے اپنے سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو مساوی اور غیر مساوی کا فرق

معلوم ہو جائے' اس لئے اللہ تعالیٰ نے درہم و دینار پیدا کئے تاکہ یہ تمام اموال میں مساوات پیدا کرسکیں' اور ان کے ذریعے قیمت کی تعین ہوسکے' یعنی یہ کہا جاسکے کہ یہ اونٹ سو دینار کا ہے' اور زعفران کی یہ مقدار سو دینار ہے' اس طرح یہ دونوں درمیان کی ایک چیز کے مساوی بن جائیں گے' اور ان دونوں میں بھی مساوات ہو جائے گی' درہم و دینار کے ذریعے ان دونوں غیر متناسب چیزوں کا مبادلہ اس طرح ممکن ہے کہ یہ دونوں (درہم و دینار) اپنی ذات سے مقصود نہیں ہیں' اگر یہ بذات خود مقصود ہوتے (مثلاً کھانے پینے میں انکی ضرورت پڑتی) تو صرف اسی مقصد کے لئے استعمال ہوتے' دنیا کا نظم ان سے وابستہ نہ ہوتا' اللہ نے انھیں اس لئے پیدا فرمایا ہے کہ لوگوں کے ہاتھوں میں آتے جاتے ہیں' اور غیر متناسب اعمال میں مناسبت پیدا کریں' درہم و دینار میں ایک حکمت یہ بھی رکھی گئی کہ ان کے ذریعے دوسری تمام چیزیں حاصل ہو جاتی ہیں۔ یہ دونوں اگرچہ محبوب ہیں' لیکن بذات خود مقصود نہیں ہیں' تاہم دوسرے تمام اموال کی طرف ان کی نسبت یکساں ہے اس لئے جو شخص ان دونوں چیزوں کا مالک ہوتا ہے وہ گویا تمام چیزوں کا مالک ہوتا ہے' جو شخص صرف کپڑے کا مالک ہوتا ہے اسکے بارے میں یہ نہیں کہا جاسکتا ہے کہ وہ تمام چیزوں کا مالک ہے۔ اس لئے کہ اگر اسے غلے کی ضرورت پیش آئے اور وہ کپڑے کے عوض میں غلہ لینے کے لئے جائے تو ممکن ہے کہ غلہ والا کپڑے کا ضرورت مند نہ ہو بلکہ اسے سواری کی ضرورت ہو۔ اس لئے ہر شخص کو کسی ایسی چیز کی ضرورت پیش آتی ہے جو ظاہر میں کچھ بھی نہ ہو' اور باطن میں سب کچھ ہو' ایسی کوئی چیز جو بظاہر خاص نہ ہو' دوسری مختلف چیزوں کی طرف اسکی نسبت یکساں ہوتی ہے' مثلاً آئینے میں کوئی خاص رنگ نہیں ہوتا' لیکن اسمیں ہر رنگ معکوس ہو جاتا ہے' یہی حال درہم و دینار کا ہے' یہ بذات خود مقصود نہیں ہیں' لیکن ہر مقصود کا وسیلہ ہیں' اسکی ایک مثال حرف ہے' اسکے کوئی مستقل اور مخصوص معنی نہیں ہیں' لیکن اسکے ذریعے دوسرے کلمات کے معنی ظاہر ہوتے ہیں۔

درہم و دینار میں یہی حکمتیں نہیں ہیں' انکے علاوہ بھی دوسری حکمتیں ہیں' لیکن یہاں ان کا ذکر طوالت کا باعث ہوگا۔ فی الحال انہی دو حکمتوں کو سامنے رکھئے' اور غور کیجئے کہ اگر کوئی شخص ان دونوں چیزوں سے وہ کام نہیں لیتا جن کے لئے یہ وضع کئے گئے ہیں یا وہ کام کرتا ہے جو ان کی حکمتوں کے خلاف ہے تو گویا وہ ان چیزوں میں اللہ تعالیٰ کی ناشکری کرتا ہے' مثلاً ایک شخص انھیں چھپا کر رکھتا ہے خرچ نہیں کرتا وہ ان کی حکمت باطل کرتا ہے' اور ان کے ساتھ ناانصافی کرتا ہے' اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی مسلمانوں کے حاکم کو قید خانے میں ڈال دے' یہاں تک کہ وہ حکومت کا کام نہ چلاسکے تو یہی کہا جائے گا کہ اس نے ناانصافی کی ہے' کیونکہ حاکم نظم حکومت برقرار رکھنے کے لئے ہے قید میں ڈالے جانے کے لئے نہیں ہے' درہم و دینار بھی محض اموال میں مساوات قائم کرنے کے اعتبار سے حاکم ہیں' انھیں چھپا کر رکھنا حاکم کو چھپا کر رکھنے کے مرادف ہے۔ وہ شخص دنیاوی نظم میں بگاڑ کا باعث ہوگا' اور جو غرض ان سے وابستہ ہے اسے ضائع کرنے کا سبب بنے گا' یہ چیزیں نوع انساں کے کسی مخصوص اور متعین فرد کے لئے وجود میں نہیں آئیں' یا یہ چیزیں کھانے پینے میں کام نہیں آتیں اس لئے فی نفسہ مقصود نہیں ہیں یہ صرف پتھر ہیں انھیں اس لئے پیدا کیا گیا ہے کہ مخلوق میں دائر و سائر رہیں' اور ان کے درمیان معاملات میں مساوات قائم کریں۔

موجودات عالم میں یہ حکمتیں پنہاں ہیں' جس طرح کتاب کے صفحے پر الفاظ و نقوش مرتسم رہتے ہیں اسی طرح ان موجودات کے صفحات پر یہ حکمتیں مرقوم ہیں' یہ قدرت ازلیہ کے قلم سے لکھی گئی ہیں' ان میں نہ آواز ہے' نہ رنگ ہے' نہ حرف ہے' ظاہری آنکھوں سے ان "مرقوم حکمتوں" کا ادراک نہیں کیا جاسکتا' بلکہ بصیرت کی آنکھیں انھیں پڑھ سکتی ہیں' تاہم جو لوگ ان حکمتوں کے مشاہدے سے محروم ہیں' ان کے لئے کلام نبوت ایک آئینے کی مانند ہے' وہ اسکے ذریعے مشاہدہ کرسکتے ہیں' اللہ نے ان غیر محسوس حکمتوں کو الفاظ میں مقید فرمادیا ہے اب یہ ظاہری آنکھوں سے بھی دیکھی جاسکتی ہیں۔ ارشاد ربانی ہے :۔

وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبَشِّرْهُم بِعَذَابٍ أَلِيمٍ (پ ۱۰ ر ۱۱ آیت ۳۴)

اور جو لوگ سونا چاندی جمع کرکے رکھتے ہیں' اور ان کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے سو آپ ان کو ایک بڑی دردناک سزا کی خبر سنادیجئے۔

چاندی سونے کے برتن : درہم و دینار پگھلا کر سونے چاندی کے برتن بنانے والا بھی اللہ تعالیٰ کی نعمت کا کافر ہے' بلکہ اسکا حال کچھ زیادہ ہی برا ہے' اس لئے کہ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص حاکم شہر کو قید میں رکھ کر پارچہ باقی یا جاروب کشی جیسے کام کرنے پر مجبور کرے جو معاشرے کے پس ماندہ افراد کرتے ہیں' قید اس طرح کے ذلیل کام کرنے کے مقابلے میں یقیناً معمولی ہے' چاندی اور سونے کے برتن بنانے اور استعمال کرنے سے اس لئے منع کیا گیا ہے کہ برتن صرف اشیاء کی حفاظت اور سیال چیزوں کو بہنے سے روکنے کے لئے بنائے گئے ہیں' اور یہ مقصد مٹی لوہے' جست اور تانبے کے برتنوں سے بھی لیا جاسکتا ہے' لیکن سونے چاندی سے جو مقصود ہے وہ ان چیزوں سے پورا نہیں ہو سکتا۔ جس شخص نے اس طرح حکمت کی معرفت حاصل کی' اسے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام سے آگاہ کیا گیا' آپ نے ارشاد فرمایا۔

مِنْ شَرِبَ فِی آنِیَۃٍ مِنْ ذَھَبٍ اَوْ فِضَّۃٍ فَکَاَنَّمَا یُجَرْجِرُ فِی بَطْنِہٖ نَارَ جَھَنَّمَ (بخاری و مسلم۔ ام سلمہ) جو شخص سونے یا چاندی کے برتن میں پانی پیتا ہے وہ گویا اپنے پیٹ میں جہنم کی آگ انڈیلتا ہے۔

سودی کاروبار : اسی طرح وہ شخص بھی کافر نعمت ہے جو دینار و درہم کو سودی لین دین میں استعمال کرتا ہے' اس لئے کہ یہ دونوں دوسری چیزوں کے لئے ذریعہ حصول بنائے گئے ہیں' فی نفسہ مقصود نہیں ہیں' جو شخص ان دونوں ہی میں تجارت کرتا ہے وہ انھیں خلاف وضع حکمت استعمال کرتا ہے' اور یہ ظلم ہے' کیونکہ نقد کو کسی ایسی چیز کے واسطے لینا ظلم ہے جسکے لئے وہ وضع نہیں کیا گیا ہے۔ ایک شخص کے پاس کپڑا ہے' نقد نہیں ہے' اب اسے غذا یا سواری کی ضرورت ہے' لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ جس کے پاس غذا یا سواری ہے وہ کپڑا لے کر یہ چیزیں فروخت کردے گا' اس لئے کپڑے والا اپنا کپڑا نقد کے عوض بیچنے پر مجبور ہے تاکہ نقد کے ذریعے غذا اور سواری خرید سکے کیونکہ نقد سے اغراض پوری ہوتی ہے' اور مقاصد حاصل ہوتے ہیں' وہ اپنی ذات سے مقصود نہیں ہوتا' اموال میں اسکا مقام ایسا ہے جیسا کلام میں حرف کا حال ہے' نحوی کہتے ہیں حرف وہ ہے جو غیر میں موجود معنی کے لئے آئے' نقد آئینے کی طرح ہے' جس طرح اس میں تمام رنگ جھلکتے ہیں' اسی طرح نقد سے بھی تمام اغراض پوری ہوتی ہیں' اب اگر کوئی شخص اپنے نقد مال کو نقد مال کے عوض فروخت کرے' اور اسی کو اپنا کاروبار بنالے تو گویا وہ نقد کو مقید رکھنا چاہتا ہے' اور اسے ذخیرہ کرنے کا ارادہ رکھتا ہے' حاکم یا قاصد کو قید کرنا اسی لئے ظلم اور ناانصافی ہے کہ انھیں دائر و سائر رہنا چاہیے تاکہ نظم میں خلل واقع نہ ہو' اور ان کی وضع سے جو مقصود ہے وہ پورا ہو۔

یہاں یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ اگر نقد میں بیع جائز نہیں تو درہم کی بیع دینار کے عوض' خود درہم کی بیع درہم کے عوض کیسے جائز ہے' یا وہ عمل کیسے جائز ہے جسے روپیہ بھنانا کہتے ہیں' اسکا جواب یہ ہے کہ ہر نقد کا الگ الگ مقصد ہے' اور ہر ایک سے جدا جدا غرض پوری ہوتی ہے' مثلاً دینار اپنی قیمت کے باعث بہت سی چھوٹی چھوٹی ضرورتوں میں کام نہیں آسکتا' اسکے برعکس دراہم کم قیمت ہوتے ہیں' انکے ذریعے معمولی حاجتیں پوری کی جاسکتی ہیں' پھر دینار کے عوض درہم کی بیع' اور درہم کے عوض درہم کی بیع صورتاً بیع ہے' حقیقت میں بیع نہیں ہے' اس لئے کہ اس بیع میں کسی فریق کو کوئی نفع حاصل نہیں ہوتا' بلکہ درہم کی بیع اسی قیمت کے درہم سے ہوگی' یا دینار کی بیع اسی قیمت کے دراہم سے ہوگی۔ اسی لئے اس بیع سے عقلمند کو دلچسپی نہیں ہے۔ نہ ہم نے کسی تاجر کو اس میں مشغول دیکھا ہے' یہ ایک بیکار کام ہے' اور اس میں لگنا وقت ضائع کرنا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص زمین پر درہم پھینک دے اور پھر اٹھالے' ظاہر ہے کون عقلمند ہوگا جو اس میں اپنا قیمتی وقت ضائع کرے گا' البتہ کھرے اور کھوٹے سکوں کی بیع میں فرق ہو سکتا ہے' لیکن ہم اس میں بھی فرق نہیں کرتے۔ ہمارے نزدیک قیمت کے اعتبار سے کھرا اور کھوٹا دونوں سکے برابر ہیں' اس لئے اگر کوئی کھوٹا سکہ لے کر کھرا لینا چاہے تو اسے برابر لینا ہوگا' کم و بیش کی اس میں بھی اجازت نہیں ہے۔ جب حال یہ ہو تو کوئی بے وقوف ہی ہوگا جو کھرے سکے دے کر کھوٹے لے گا۔ کھرے کھوٹے کا لحاظ ان چیزوں میں کیا جائے گا جو بذات خود مقصود ہیں' جو چیزیں اپنی ذات سے مقصود نہیں ہیں ان میں ایسی باریک باتوں کا اعتبار نہیں کیا جائے گا' یہ ظلم اس شخص کا ہے جس نے بعض سکے کھرے اور بعض سکے کھوٹے بنائے یہاں تک کہ بذات خود مقصود ہوگئے' جب کہ ان کا حق یہ ہے کہ مقصود نہ ہوں۔ نقد کے بدلے نقد کی ادھار بیع صرف

وہی شخص کر سکتا ہے 'جو احسان کے پہلو کو نظر انداز کرنا چاہتا ہے۔ یہ بیع بھی جائز نہیں بظاہر اس کی ضرورت بھی نہیں ہے 'اگر روپیہ ادھار ہی دینا ہے تو بیع کی صورت کیوں اختیار کی جائے قرض کی صورت کیوں نہ اپنائی جائے جس میں احسان بھی ہے اور اجر و ثواب بھی بیع کی صورت میں نہ احسان ہے نہ ثواب۔ اس لئے وہ ظلم میں داخل ہے یہی حال غلوں کا ہے۔ یہ اس لئے پیدا کئے گئے ہیں کہ ان سے غذائیں اور دوائیں تیار کی جاسکیں 'اس لئے انھیں جہت مقصود سے منحرف کرنا مناسب نہیں 'اور جہت مقصود سے انحراف یہ ہے کہ ان میں تجارت شروع کردی جائے کہ غلہ دے کر غلہ لیا جائے 'پھر اس غلے سے دوسرا غلہ لیا جائے 'یہاں تک کہ غلہ ہی دائرہ سائر رہے کھانے میں استعمال نہ ہو اس طرح غلے بھی قید ہو جائیں گے اور ان سے جو اہر مقصود ہے وہ حاصل نہ ہو سکے گا 'غلے کھانے کے لئے پیدا کئے گئے ہیں 'اور بقاءِ انسانی کے لیے غذا کی ضرورت سخت ہے اس لئے یہ ضروری ہے کہ جس شخص کو غلے کی ضرورت نہ ہو اس کے پاس غلہ نہ رہنے دیا جائے۔ اور غلے کا کاروبار ہی کرے جسے غلے کی ضرورت نہ ہو 'اس لئے کہ اگر اسے غلے کی ضرورت ہے تو وہ کھا کیوں نہیں لیتا 'تجارت کیوں کرتا ہے 'اور اگر اس سے تجارت کرتا ہے تو جو لوگ غلے کے طالب بن کر آئیں 'اور غلے کے علاوہ کسی دوسری چیز کے عوض غلہ خریدنا چاہیں تو اسے ان کے ہاتھ غلہ فروخت کر دینا چاہیے 'اگر وہ غلے کے عوض ویسے ہی غلے کا طالب ہے تو یہ کہا جائے گا کہ وہ تجارت نہیں کرنا چاہتا 'بلکہ غلے کی ذخیرہ اندوزی کرنا چاہتا ہے شریعت میں ذخیرہ اندوزی کرنے والے پر لعنت کی گئی ہے 'اس سلسلے میں بہت سی سخت وعیدیں وارد ہیں 'باب آداب کسب میں کچھ وعیدیں لکھی بھی گئی ہیں۔

البتہ جو شخص گیہوں کو چھوہارے کے ذریعے فروخت کرتا ہے اسے معذور سمجھنا چاہیے 'اس لئے کہ جو مقصد گیہوں سے حاصل ہوتا ہے وہ چھوہارے سے نہیں ہوتا 'گیہوں کو گیہوں کے عوض برابر سرابر فروخت کرنے والا معذور نہیں 'کیونکہ وہ ایک لغو حرکت کرتا ہے 'اسی لئے شریعت نے اس سے منع نہیں کیا 'منع کی ضرورت اس لئے پیش نہیں آئی کہ سلیم العقل انسان اس طرح کی حرکتیں خود بھی گوارا نہیں کرتا 'البتہ دونوں طرح کے گیہوں میں اچھے بڑے کا فرق ہوتا ہے تب کوئی عقلمند انسان ایک کے عوض دوسرے کی فروخت کر سکتا ہے 'لیکن اس میں برابر سرابر کا تصور نہیں کیا جاسکتا 'کیونکہ ایسا کون عقلمند ہوگا جو ایک کلو خراب گیہوں لے کر ایک ہی کلو اچھا گیہوں دیدے گا 'ہاں کم و بیش ہونے کی صورت میں یہ بیع چل سکتی ہے 'لیکن شریعت نے جنس کو معیار قرار دیا ہے 'اور وجہ معیار غذائیت ہے 'رنگ 'ذائقہ وغیر معیار نہیں ہے 'اس لئے ایک کلو گیہوں کے بدلے ایک ہی کلو گیہوں دیا جاسکتا ہے زیادہ یا کم ہونے کی صورت میں سود لازم آئے گا 'سود کی حرمت کی ایک حکمت یہ بھی ہے 'لیکن ہم پہلی جلد میں فقہ کے ابواب لکھ چکے ہیں 'اور یہ حکمت اب ہمارے ذہن میں آئی ہے 'اس لئے اسے بھی ہم فقہ کے ابواب میں داخل کئے دیتے ہیں۔ خلافیات کے ذیل میں سود کی حرمت کے متعلق جس قدر حکمتیں ہم نے لکھی ہیں ان میں یہ سب سے زیادہ مضبوط حکمت ہے۔ اسی سے حضرت امام شافعی کے اس رجحان کی وجہ سمجھ میں آتی ہے کہ انھوں نے سود کے باب میں غلے کی تخصیص کی ہے 'کیلات کی تخصیص نہیں کی' اس لئے کہ کیلات میں چونا بھی داخل ہے 'اگر چونے میں ربا ہو سکتا ہے تو پھر کپڑے اور جانور میں بھی ہونا چاہیے 'اگر حدیث میں نمک کا ذکر نہ ہوتا تو حضرت امام مالک کی رائے زیادہ صحیح ہوتی (۱) کیونکہ انھوں نے قوت کی تخصیص کی ہے 'شرع جس معنی کی رعایت کرتی ہے اسکا کسی حد یا تحدید سے منضبط ہونا ضروری ہے۔ یہاں قوت سے بھی تحدید ہو سکتی ہے 'اور غلے کے ذریعے بھی۔ شریعت نے یہ مناسب سمجھا کہ جنس مطعوم سے تحدید کی جائے کیونکہ بقاء کی ضرورت کے لئے یہ ناگزیر ہے۔

حدود شرع : کبھی شرعی تحدیدات ایسے اطراف کو محیط ہوتی ہیں جن میں وہ اصل معنی جو حکم کا باعث بنتے ہیں قوی نہیں ہوتے' لیکن ضرورتاً ان کی بھی تحدید کرنی پڑتی ہے 'ورنہ مخلوق کے لئے اصل معنی کی اتباع بڑی دشوار ہو جاتی ہے 'کیونکہ ایک ہی حکم اموال اور اشخاص کے اختلاف سے مختلف ہو جاتا ہے 'اس لئے حد مقرر کرنی ضروری ہے۔

حدود شرع کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :۔

وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ (پ ۲۸ ر ۱۷ آیت ۱)

(۱) یہ ایک اختلافی بحث ہے 'ربا کی بحث میں اس پر تفصیل سے گفتگو ہو چکی ہے

اور جو شخص احکام خداوندی سے تجاوز کرے گا اس نے اپنے آپ پر ظلم کیا۔

اصل احکام میں شرائع مختلف نہیں ہوتیں، بلکہ حدود کی وجوہ میں مختلف ہو جاتی ہیں، مثلاً شراب شریعت مصطفوی اور شریعت عیسوی دونوں میں حرام ہے، لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں حرمت کی حد نشہ ہے، اس لئے اگر کسی نے اس قدر شراب پی جس سے نشہ نہیں ہوا تو یہ حرام نہیں ہے، جب کہ ہماری شریعت میں جنس مسکر حد ہے، خواہ وہ تھوڑی ہو، یا زیادہ کیونکہ تھوڑی چیز سے زیادہ کی رغبت ہوتی ہے۔

درہم و دینار کی مخفی حکمت کی تفہیم کے لئے یہ ایک مثال دی گئی ہے۔ شکر اور کفران نعمت کو اس مثال کے آئینے میں سمجھنا چاہیے۔ لیکن یہ بات بھی وہی شخص سمجھ سکتا ہے جسے حکمت کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔ حکمت ایک گراں قدر جوہر ہے، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا (پ ۳ ر ۵ آیت ۲۶۹)

اور جس کو دین کا فہم مل جائے اس کو بڑی خیر کی چیز مل گئی۔

لیکن حکمت کے جوہر ان دلوں میں نہیں ٹھہرتے جہاں شہوتوں کے ڈھیر ہوں۔ اور شیطان لہو و لعب میں مشغول رہتا ہو، صرف اہل دل اور اہل عقل ہی حکمت کی باتیں سمجھ سکتے ہیں، اسی لئے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

لَوْلَا أَنَّ الشَّيَاطِينَ يَحُومُونَ عَلَى قُلُوبِ بَنِي آدَمَ لَنَظَرُوا إِلَى مَلَكُوتِ السَّمَاءِ (۱)

اگر شیاطین بنی آدم کے دلوں پر گشت نہ لگائیں تو وہ آسمانی ملکوت کا مشاہدہ کرنے لگیں۔

اگر تم یہ مثال سمجھ گئے ہو تو تمہیں اس پر اپنی حرکت، سکون، نطق، سکوت اور ہر اس فعل کو قیاس کرنا چاہیے جو تم سے صادر ہوتا ہے کہ وہ شکر ہے یا کفر۔ ہر فعل کی دو حالتیں ہو سکتی ہیں شکر کی یا کفر کی۔ ناشکری کی بعض حالتوں کو فقہ کی زبان میں ہم مکروہ اور بعض کو حرام کہتے ہیں۔ اگرچہ ارباب قلوب کے نزدیک مکروہ اور حرام میں کوئی فرق نہیں ہے، حرام تو حرام ہی ہے ہی مکروہ بھی حرام ہے۔ مثال کے طور پر اگر تم دائیں ہاتھ سے استنجا کرو گے تو اس نعمت میں اللہ کی ناشکری کرو گے، کیونکہ اللہ نے تمہیں دو ہاتھ دئے ہیں، اور ان میں سے ایک کو دوسرے پر قوی تر بنایا ہے، جو زیادہ قوی ہے وہ زیادہ فضیلت اور شرف کا مستحق بھی ہے، کم تر کو فضیلت دینا عدل کے خلاف ہے، جب کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ (پ ۱۴ ر ۱۹ آیت ۹۰) بے شک اللہ تعالیٰ عدل کا حکم فرماتے ہیں۔

<u>عدل کے تقاضے</u>: پھر جس نے دو ہاتھ دئے ہیں اسی نے ایسے اعمال کا محتاج بھی بنایا ہے جن میں سے بعض شریف ہیں، جیسے قرآن کریم اٹھانا، اور بعض خسیس ہیں، جیسے نجاست زائل کرنا۔ اب اگر تم بائیں ہاتھ سے قرآن کریم اٹھاؤ اور دائیں سے نجاست صاف کرو تو لازم آئے گا کہ تم نے شریف چیز سے خسیس کام لیا۔ اور وہ جس مرتبے کا مستحق تھا اسے اس سے کم مرتبہ دیا، اس طرح تم نے عدل سے انحراف کیا، اور ظلم کا ارتکاب کیا، اسی طرح اگر تم نے قبلے کی سمت میں تھوکا، یا قضائے حاجت کے وقت قبلے کا استقبال کیا تو تم نے جہات اور وسعت عالم میں اللہ کی ناشکری کی۔ اس لئے کہ اللہ نے عالم کو وسیع بنایا ہے تاکہ تم اپنی حرکات میں تنگی محسوس نہ کرو، اور جدھر چاہے حرکت کر سکو، پھر عالم کو مختلف جہتوں اور سمتوں میں تقسیم کیا اور ان میں سے بعض کو شرف و فضیلت سے نوازا، اور اس سمت میں ایک گھر بنایا، اور اسے اپنی طرف منسوب فرمایا تاکہ تمہارا دل اپنے پروردگار کی طرف مائل ہو، اور جب تم عبادت کرو تو تمہارا قلب ایک ہی سمت میں مقید رہے، اور قلب کے باعث تمہارا تمام بدن سکون و وقار کے ساتھ عبادت میں مشغول رہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے تمہارے افعال بھی تقسیم کئے ہیں، بعض شریف ہیں جیسے اطاعات، اور بعض خسیس جیسے استنجاء کرنا، اور تھوکنا۔ چنانچہ اگر تم قبلے کی طرف تھوکو گے تو یہ قبلہ پر ظلم ہوگا اور اس نعمت کی ناشکری ہوگی جو اللہ تعالیٰ نے عبادت کی تکمیل کے لئے بنائی ہے، اسی طرح اگر تم نے بائیں پاؤں سے موزے پہننے کا آغاز کیا تو یہ بھی ظلم ہے، اس لئے کہ موزے پاؤں کی

(۱) یہ روایت کتاب الصوم میں گزری ہے

حفاظت کے لئے وضع کئے گئے ہیں گویا پاؤں کے لئے موزے میں حظ ہے' اور حظوظ میں اشرف کا لحاظ ضروری ہے' اگر لحاظ کرو گے تو عدل اور حکمت کے مطابق عمل کرو گے' ورنہ ظلم ہوگا' موزے اور پاؤں کی ناشکری ہوگی۔ عارفین کے نزدیک تو یہ عمل (بائیں پاؤں سے موزہ یا جوتا پہننا) حرام ہے' اگرچہ فقہاء اسے مکروہ کہتے ہیں' بعض اللہ والوں کو دیکھا گیا کہ وہ گیہوں کے سینکڑوں ہزاروں پیانے جمع کرتے ہیں' اور انھیں اللہ کی راہ میں صدقہ کردیتے ہیں' لوگوں نے اس کا سبب دریافت کیا' فرمایا کہ میں نے غلطی سے بائیں پاؤں میں جوتا پہنا تھا' میں خیرات کے ذریعہ اس غلطی کا تدارک کرنا چاہتا ہوں۔

فقہاء کا منصب : فقہاء کا یہ منصب نہیں ہے کہ وہ اس طرح کے امور کو کبیرہ قرار دیں' کیونکہ ان بیچاروں کو تو عوام کے اصلاح کی ذمہ داری سپرد کی گئی ہے جو چوپایوں جیسے ہیں' اور ایسے ایسے گناہوں میں سر سے پاؤں تک ڈوبے ہوئے ہیں جن کے سامنے ان معمولی گناہوں کی کوئی حقیقت نہیں ہے' چنانچہ اگر ایک عام آدمی بائیں ہاتھ سے شراب کا جام اٹھائے گا تو یہ نہ کہا جائے گا اس نے دو گناہ کئے ہیں' ایک یہ کہ شراب کا جام لیا ہے' اور دوسرا یہ ہے کہ بائیں ہاتھ سے لیا ہے' اسی طرح اگر کسی شخص نے جمعہ کے دن اذان کے وقت شراب فروخت کی تو یہ کہنا مناسب نہ ہوگا کہ اس نے دو گناہ کئے ہیں شراب فروخت کی ہے' اور اذان جمعہ کے وقت خرید و فروخت کا مشغلہ اختیار کیا ہے' اس طرح اگر ایک شخص نے محراب مسجد میں قبلہ رو ہو کر قضائے حاجت کی تو یہ نہیں کہا جائے گا کہ اس نے دو عمل خلاف شرع کئے ایک تو مسجد میں قضائے حاجت کی' دوسرے قبلہ رو ہو کر بیٹھا۔ گناہ خواہ چھوٹے ہوں یا بڑے ظلمات (تاریکیاں) ہیں' یہ اور بات ہے کہ چھوٹے گناہ کی تاریکی بڑے گناہ میں چھپ جاتی ہے' اگر کوئی غلام اپنے آقا کی چھری اسکی اجازت کے بغیر استعمال کرتا ہے تو آقا اسے اس پر ملامت کرتا ہے' لیکن اگر وہ اسکی چھری لے کر اسکے عزیز بیٹے کو قتل کردے تو کیا وہ اس پر بھی تنبیہ کرے گا کہ اسنے اجازت کے بغیر چھری کیوں استعمال کی یا بچے کو قتل کرنے کی سزا دے گا۔

انبیائے علیہ السلام اور اولیاء اللہ نے جن آداب اور مستحبات کی رعایت کی ہے' اور فقہاء نے عوام کے حق میں ان سے تسامح برتا ہے تو اس کی وجہ یہی ہے کہ عوام بڑے بڑے گناہوں کے دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں' اس طرح کے معمولی گناہوں سے کیا بچ پائیں گے' ورنہ جتنے بھی مکروہ اعمال ہیں ان سب سے نعمتوں کی ناشکری ہوتی ہے' عدل کی تقاضوں سے انحراف ہوتا ہے' اور قرب الٰہی کے درجات میں نقصان ہوتا ہے۔ تاہم بعض گناہ (اگر وہ امور مکروہہ میں ہوں) صرف قرب کی حدود سے نکال کر بعد کی اس دنیا میں پہنچا دیتے ہیں جہاں شیاطین کا مسکن ہے۔ یہ ایک جملہ معترضہ تھا۔ اب پھر ہم شکر نعمت اور کفران نعمت کے بحث کی طرف رجعت کرتے ہیں۔

درخت کی شاخ توڑنا : اگر کوئی شخص بغیر کسی اہم مکمل ضرورت اور صحیح غرض کے درخت کی شاخ توڑتا ہے تو وہ درختوں اور ہاتھوں کی تخلیق میں اللہ تعالیٰ کی ناشکری کرتا ہے' ہاتھوں کی نعمت میں اللہ تعالیٰ کی ناشکری یہ ہے کہ اس نے انھیں غیر اطاعت میں استعمال کیا' یہ ہاتھ بیکار پیدا نہیں کئے گئے ہیں' بلکہ اطاعت' اور خیر پر معاون اعمال کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔ درختوں کا حال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں پیدا کیا ہے' ان میں رگیں پیدا کی ہے' پھر انھیں پانی دیا ہے' اور ان میں غذا حاصل کرنے اور نمو پانے کی صلاحیت پیدا فرمائی ہے تاکہ وہ پوری طرح نشو نما پاسکیں' اور اللہ کے بندے اس سے نفع اٹھاسکیں' جو شخص بلا ضرورت توڑتا ہے' وہ گویا اس کو مکمل طور پر نمو پذیر ہونے سے روکتا ہے' حالانکہ مکمل ہونے کے بعد یہ درخت بندگان خدا کے لئے بہتر اور مکمل صورت میں قابل انتفاع ہوتا' قبل از وقت اور صحیح مقصد کے بغیر شاخ توڑنے کا عمل حکمت کے مقصود کے خلاف اور عدل سے انحراف ہے' اگر مقصد صحیح ہوتا تو کوئی حرج نہیں تھا اس لئے کہ نباتات اور حیوانات سب انسان ہی کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔ یہ سب فانی ہیں' انسان بھی فانی ہے' اگر انسان کی خاطر جو مخلوقات میں اشرف ہے' احسن چیزیں پہلے فنا ہوجائیں تو یہ عدل سے زیادہ قریب ہے۔ اللہ تعالیٰ کے اس قول میں اسی امر کی طرف اشارہ ہے۔

وَسَخَّرَ لَكُم مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مِّنْهُ (پ ۲۵ ر ۱۸ آیت ۱۳)

اور جتنی چیزیں آسمانوں میں ہیں اور جتنی چیزیں زمین میں ہیں ان سب کو اپنی طرف سے مسخر بنایا۔

ہاں اگر کوئی صحیح ضرورت' اور واقعی مقصد ہے' لیکن جس درخت سے توڑتا ہے وہ غیر کا مملوکہ ہے اس صورت میں بھی اسکا یہ عمل ظلم ہوگا۔ اس لئے کہ درخت اگرچہ انسان کے لئے پیدا کئے گئے ہیں' لیکن جس طرح تمام درخت ایک انسان کے لئے نہیں ہیں اسی طرح ایک درخت بھی تمام انسانوں کے لئے نہیں ہے' بلکہ ایک درخت سے ایک انسان کی ضرورت پوری ہو سکتی ہے۔ اب اگر ایک شخص کو کسی ترجیح یا اختصاص کے بغیر ایک درخت سے خاص کردیا جائے تو یہ ظلم ہوگا۔ اختصاص و ترجیح اس شخص کو ہے جس نے زمین میں بیج ڈالا' اسے پانی دیا' اسکی نگہداشت کی' یہ شخص اس درخت سے فائدہ اٹھانے کا حق رکھتا ہے۔ اگر درخت کسی غیر مملوکہ زمین میں از خود پیدا ہوا ہے' نہ کسی نے بیج ڈالا' نہ پانی دیا' نہ نگہداشت کی' اسکے لئے وجہ اختصاص سبقت ہے' جو پہلے سبقت کرے گا اسے متمتع ہونے کا حق ہوگا' یہی عدل کا تقاضا ہے۔ اس اختصاص کے لئے فقہاء نے ملک کی تعبیر استعمال کی ہے' یہ ایک مجازی استعمال ہے' ورنہ حقیقی ملکیت تو صرف مالک الملوک کے لئے ہے' جس کے لئے تمام آسمان اور زمین ہیں' بندہ مالک کیسے ہو سکتا ہے جب کہ وہ خود اپنے نفس کا مالک نہیں ہے' اسکا نفس غیر یعنی اللہ کی ملکیت ہے' ہاں تمام افراد انسانی اللہ کے بندے ہیں' اور زمین اس کا دستر خوان ہے اس نے انھیں اپنے دستر خوان سے ضرورت کے بقدر کھانے کی اجازت دی ہے۔ اسکی مثال ایسی ہے جیسے کوئی بادشاہ اپنے غلاموں کے لئے دستر خوان بچھائے' ان میں سے ایک غلام لقمہ ہاتھ میں لے لے' اتنے میں دوسرا غلام آئے اور وہ لقمہ اس سے چھیننا چاہے تو اسے اس کی اجازت نہیں دی جائے گی' اس لئے کہ لقمہ ہاتھ میں لینے کے باعث اسکا ہو چکا ہے' اس لئے نہیں کہ لقمہ اٹھانے سے وہ غلام کی ملکیت میں آگیا' لقمہ اور صاحب لقمہ دونوں ہی اللہ کی ملکیت ہیں' لیکن کیونکہ ایک مخصوص لقمہ سب کی ضرورت پوری نہیں کر سکتا' اس لئے تخصیص کی ضرورت پیش آئی' اور تخصیص وجہ ترجیح میں سے کوئی ایک وجہ حاصل ہونے سے ہوتی ہے' یہاں لقمہ اٹھانے میں سبقت کرنا ایک وجہ ترجیح ہے' اب کسی دوسرے کو اسکا حق حاصل نہیں ہے کہ اس کے ہاتھ سے لقمہ چھینے' بندوں کے ساتھ بھی اللہ تعالیٰ کا یہی معاملہ ہے' اسی لئے ہم یہ کہتے ہیں کہ جو شخص دنیا کا مال ضرورت سے زائد لے' اور اسے چھپا کر رکھے' اس سے اللہ کے بندوں کو محروم کرے' جب کہ ان میں سے بہت سے اس کے محتاج ہوں تو وہ ظالم ہے' قرآن کریم میں ہے:۔

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ (پ ۱۰ ر ۱۱ آیت ۳۴)

اور جو لوگ سونا چاندی جمع کرتے ہیں اور ان کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے سو آپ ان کو ایک درد ناک عذاب کی خبر سنا دیجئے۔

اللہ کا راستہ اس کی اطاعت ہے' اس راستے کا توشہ مال ہے جس سے بندگان خدا کی ضرورتیں پوری ہوتی ہیں' تاہم یہ بات فقہی حکم میں داخل نہیں ہے' اس لئے ضرورتوں کی مقدار مخفی ہے' اور مستقبل میں متوقع فقر و افلاس کے بارے میں مختلف لوگوں کے مختلف احساسات ہیں' نیز عمر کے آخری ماہ و سال بھی پردۂ خفا میں ہیں' اب اگر ہر شخص کو مال کے سلسلے میں یکساں مقدار کا مکلف قرار دیا گیا تو یہ ایسا ہوگا جیسے کسی بچے کو باوقار اور پر سکون رہنے کا پابند کردیا جائے' اور اسے حکم دیا جائے کہ وہ ہر غیر اہم کلام سے سکوت اختیار کرے' بچے اپنی ناسمجھی' اور کم عقلی کے باعث ان احکام کے پابند اور ان امور کے متحمل نہیں ہو سکتے' یہی وجہ ہے کہ ہم نے ان کے کھیل کود پر اعتراض نہیں کیا' بلکہ انھیں اس کی اجازت دی لیکن انکے لئے اس اجازت کا یہ مطلب نہیں کہ لہو و لعب فی نفسہ حق ہے' اسی طرح اگر ہم نے عوام کو یہ اجازت دی ہے کہ وہ اپنے مال کو زکوٰۃ نکال کر محفوظ رکھ سکتے ہیں' تو یہ نہیں کہا جاسکتا کہ مال بچا کر رکھنا حق ہے۔ ہم نے یہ حکم اس لئے دیا ہے کہ عوام فطری طور پر بخیل' کم حوصلہ اور بے ہمت ہوتے ہیں' انھیں اللہ پر اتنا توکل نہیں ہوتا کہ وہ اس کے سہارے اپنا تمام ترمال و اسباب اسکی راہ میں خرچ کر سکیں' قرآن کریم نے بھی اس فطرت کی طرف اشارہ فرمایا ہے:۔

إِنۡ يَسۡـَٔلۡكُمُوهَا فَيُحۡفِكُمۡ تَبۡخَلُواْ (پ۲۶ ر۸ آیت ۳۷)

اگر تم سے تمہارے مال طلب کرے پھر تم سے طلب کرتا رہے تو تم بخل کرنے لگو۔

ہر کدورت سے خالی حق' اور ہر ظلم سے محفوظ عدل یہ ہے کہ انسان اللہ کے مال میں سے صرف اتنا لے جتنا ایک مخصوص سفر کے مسافر کو لینا چاہیے۔ ہر شخص اپنے جسم کا سوار ہے' اور راہ آخرت کا سفر درپیش ہے' باری تعالیٰ کا دیدار' اور اس کے حضور شرف باریابی اسکی منزل ہے' جو شخص راستے کی ضرورت سے زائد مال لے' اور دوسرے مسافر کو محروم رکھے وہ ظالم ہے' تارک عدل ہے' مقصود حکمت کی خلاف ورزی کرنے والا ہے' اور نعمت خدا کی ناشکری کرنے والا ہے' اس کا علم ہمیں اللہ اور اسکے رسول کے کلام سے بھی ہوتا ہے' اور عقل کی رو سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ ضرورت سے زیادہ مال حاصل کرنا دنیا و آخرت دونوں میں اسکے لئے باعث وبال ہے۔

جو شخص موجودات عالم کی تمام اقسام میں اللہ تعالیٰ کی حکمت سمجھ لیتا ہے وہ حق شکر ادا کرنے پر قدرت رکھتا ہے' حق شکر کیا ہے؟ اس سوال کے جواب کے لئے یہ صفحات کم ہیں' ہم جتنا بھی لکھیں گے کم ہی ہوگا' یہاں ہم نے جو کچھ لکھا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کریم کی اس آیت کی صداقت واضح ہو جائے۔

وَقَلِيلٌ مِّنۡ عِبَادِيَ ٱلشَّكُورُ (پ۲۲ ر۸ آیت ۱۳)

اور میرے بندوں میں شکر گزار کم ہی ہوتے ہیں۔

اور یہ بات سمجھ میں آجائے کہ ابلیس لعین اپنے اس قول سے کس لئے خوش ہوتا ہے۔

وَلَا تَجِدُ أَكۡثَرَهُمۡ شَٰكِرِينَ (پ۸ ر۹ آیت ۱۷)

اور آپ ان میں سے اکثروں کو احسان والا نہ پائیے گا۔

مذکورہ بالا صفحات میں جو کچھ بیان کیا گیا اسے سمجھنے کی کوشش کیجئے' جو شخص یہ تمام باتیں نہ سمجھے گا وہ اللہ تعالیٰ کے اس قول کا مفہوم بھی نہیں سمجھے گا۔ جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے اس کے علاوہ بھی بے شمار باتیں ہیں جن کے اواخر تو خیر کیا بیان ہوں گے مبادی ہی میں عمریں ختم ہو جائیں گی' جہاں تک آیت کا تعلق ہے اسکے معنی ہر وہ شخص جانتا ہے جو عربی زبان سے واقف ہے' لیکن تفسیر سے ہر شخص واقف نہیں' اس سے تمہیں تفسیر اور معنی کا فرق بھی معلوم ہو گیا۔

ایک اعتراض اور اسکا جواب: ہماری اس تقریر پر ایک اعتراض یہ بھی وارد ہوتا ہے کہ اسکا حاصل یہ ہے کہ ہر شئی میں اللہ کے لئے ایک مخصوص حکمت ہے' اور یہ کہ اسنے اپنے بندوں کے بعض افعال کو اس حکمت کے کمال اور حکمت کی غایت مراد تک پہنچنے کا ذریعہ بنایا' اور بعض افعال کو کمال حکمت کے لئے مانع بنایا' اس سے ثابت ہوا کہ ہر وہ فعل جو مقتضائے حکمت کے موافق ہو' یہاں تک کہ حکمت اپنی غائیت تک پہنچ جائے تو یہ شکر ہے' اور جو اس کے مخالف ہو یعنی اسباب کو حکمت کی غایت مراد تک نہ پہنچنے دے وہ کفر ہے یہ تمام باتیں سمجھ میں آگئیں' لیکن اصل اشکال ابھی باقی ہے' اور وہ یہ کہ بندہ کا فعل کمال حکمت کا باعث بھی ہے' اور نقصان حکمت کا سبب بھی' اور یہ دونوں فعل اللہ تعالیٰ کے ہیں' پھر بندہ درمیان میں کہاں سے آگیا کہ کبھی وہ شاکر بنتا ہے' اور کبھی کافر؟

اللہ تعالیٰ کی صفت و قدرت: اس اعتراض کے جواب کے لئے علوم مکاشفہ کا ایک بحر زخار بھی ناکافی ہے' ماقبل کی سطور میں ہم اس کے مبادی مجملاً" بیان کر چکے ہیں' اب ہم اسکی غایت اختصار کے ساتھ لکھتے ہیں' جو شخص پرندوں کی گفتگو سمجھ لیتا ہے وہ یہ بات بھی سمجھ لے گا' اور جو اس میدان میں تیز رفتاری سے نہیں چل سکتا وہ اسکے انکار پر بھی مجبور ہو گا چہ جائیکہ وہ پرندوں کی طرح ملکوت کی فضاؤں میں اڑتا پھرے۔

اللہ تعالیٰ کی جلالت اور کبریائی میں ایک صفت ہے جس سے خلق اور اختراع کا فعل صادر ہوتا ہے، یہ صفت انتہائی اعلیٰ اور اعظم ہے، یہاں تک کہ کسی واضع لغت کی نظر ایسے لفظ پر نہیں پڑتی جو اس صفت کی عظمت اور حقیقت کو پوری طرح واضح کرسکے، اس صفت کی حقیقت اس قدر اعلا ہے، اور واضعین لغت کے فہم و عقل کا دائرہ اس قدر تنگ ہے کہ وہ اسکے مبادی کا نور بھی نہیں دیکھ پاتے کہ اسکے لئے کوئی شایان شان لفظ وضع کرسکیں، اسی لئے دنیا میں اس صفت کے لئے کوئی مناسب لفظ موجود نہیں ہے، واضعین لغت اس صفت کی روشنی سے اس طرح محروم رہتے ہیں، جس طرح شپرک سورج سے محروم رہتی ہے، اس کی وجہ یہ نہیں ہوتی کہ سورج کی روشنی میں کوئی نقص ہے، بلکہ یہ شپرک کی نگاہ کا قصور ہوتا ہے۔ جن لوگوں نے اس صفت کی عظمت کا مشاہدہ کرنے کے لئے اپنی آنکھیں کھولیں وہ اس بات کے لئے مجبور ہوئے کہ اس کے حقائق کے مبادی میں سے کچھ سمجھنے کے لئے بولنے والوں کی زبان سے کوئی لفظ بطور استعارہ لیں، اور اس صفت کے لئے اصطلاح مقرر کریں، چنانچہ انھوں نے لفظ قدرت وضع کیا، اسی بناء پر ہمیں بھی کچھ جرات ہوئی اور ہم نے بھی اس موضوع پر کچھ لکھنے کی کوشش کی۔

اس تمہید کے بعد عرض ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ایک صفت ہے قدرت، جس سے تخلیق اور ایجاد کا فعل صادر ہوتا ہے پھر مخلوق وجود میں آکر بہت سی قسموں میں منقسم ہوجاتی ہے، تقسیم کا یہ عمل، اور مختلف و مخصوص صفات پر لوگوں کا منقسم ہونا دوسری صفت کے تابع ہے، جس کے لئے ضرورتاً لفظ مشیت مستعار لیا گیا ہے۔ یہ لفظ ان کے لئے اس صفت کا کچھ مفہوم آشکار کرتا ہے جو زبان یعنی حرف و آواز سے گفتگو کرتے ہیں، اور بات سمجھتے ہیں، ورنہ حقیقتاً مشیت کا لفظ اس صفت کی حقیقت بیان کرنے سے اتنا ہی قاصر ہے جتنا قاصر خلق و اختراع کی حقیقت واضح کرنے سے لفظ قدرت ہے۔

قدرت سے جو افعال صادر ہوتے ہیں ان میں سے بعض وہ ہیں جو منتہا تک پہنچیں جو غایت حکمت ہے۔ اور بعض منتہا سے نیچے رہ جائیں، ان میں سے ہر ایک کو مشیت کے ساتھ نسبت ہے، وہ فعل جو غایت کو پہنچے اس کی نسبت کیلئے محبت کا لفظ مستعار لیا گیا ہے، اور جو غایت سے ادھر رہ جائے اسکی نسبت کیلئے کراہت کا لفظ مقرر کیا گیا اور یہی کہا گیا ہے کہ یہ دونوں لفظ مشیت میں داخل ہیں لیکن ان میں سے ہر ایک میں نسبت کے اعتبار سے جو خصوصیت ہے وہ محبت اور کراہت جیسے الفاظ سے مجملاً مفہوم ہوتی ہے، پھر وہ بندے بھی دو قسم کے ہیں جو اس کے خلق و اختراع سے وجود پذیر ہوئے، بعض وہ ہیں جن کے حق میں مشیت ازلی اس طرح ہوئی کہ وہ ایسے کام کریں جن سے حکمت اپنی غایت کو نہ پہنچے، یہ بات ان کے حق میں بطور قہر ہوئی ہے، ان پر اسی طرح کے دواعی اور بواعث مسلط کردئے جاتے ہیں جن سے مجبور ہو کر وہ حکمت کے خلاف کام کرنے پر مجبور ہوتے ہیں کچھ وہ ہیں جن کے حق میں مشیت ازلی اس طرح ثابت ہوئی کہ وہ ایسے کام کریں جن سے حکمت بعض امور میں اپنی غایت کو پہنچے، دونوں فریقوں کو مشیت کی طرف ایک خاص نسبت حاصل ہے، جو نسبت غایت کو پہنچنے والے فریق کو ہے اسکا نام رضا رکھ دیا گیا ہے، اور جو غائت سے پیچھے رہ جانے والے کو ہے اسکے لئے لفظ غضب مستعار لیا گیا ہے، جس شخص پر ازل میں غضب ہوا اور اس سے کوئی ایسا فعل سرزد ہوا، جو حکمت کے خلاف تھا یعنی اس فعل کی وجہ سے حکمت اپنی غائت کو نہیں پہنچی، اسکے لئے کفران کہا جانے لگا، اور اس کے لئے لعنت، ملامت اور مذمت، عقوبت میں اضافے کے بطور زیادہ کی گئی، اور جس کے لئے ازل میں رضا لکھ دی گئی اس سے کوئی ایسا فعل انجام پایا جس سے حکمت اپنی غائت کو پہنچی اسکے لئے لفظ شکر مستعار لیا گیا، اور شکر سے رضا میں اضافے کے لئے تعریف و توصیف زیادہ کی گئی۔

حاصل کلام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جمال بھی عطا کیا ہے، اور اس پر تعریف بھی کی ہے، اسی طرح بدبخت بھی بنایا گیا ہے، اور بدبختی پر اسے برا بھی کہا ہے، اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی بادشاہ اپنے غلام کو نہلائے دھلائے، اسکے جسم سے میل کچیل دور کرے، پھر اسے عمدہ کپڑے پہنائے، جب اسکی آرائش مکمل ہوجائے تو اس سے کہے تو کتنا حسین اور کس قدر خوبصورت ہے، اس مثال میں بادشاہ خود ہی خوبصورت بنانے والا ہے، اور خود ہی اپنی تعریف کرنے والا ہے، گویا وہ اپنی تعریف کرتا ہے بظاہر غلام تعریف کا محل ہے، لیکن حقیقت میں وہ خود ہی تعریف کررہا ہے، اسی طرح امور ازلیہ کا حال ہے، اسباب اور مسببات کا مسلسل اسی طرح ظہور ہورہا ہے

جو رب ارباب' اور مسبب اسباب نے مقرر کردیا ہے' یہ امور اتفاقی نہیں ہیں' نہ کوئی واقعہ بلا سبب اور اچانک پیش آتا ہے' بلکہ ہر واقعے کے پس پردہ ایک امر محکم' یقینی حکمت اور ارادۂ جازم ہے' اس کے لئے اہل زبان نے لفظ قضاء مستعار لیا ہے' کہتے ہیں کہ کسی امر کا فیصلہ پلک جھپکنے سے بھی کم وقفے میں ہوجاتا ہے' تقدیر کے سمندروں میں اسی قضاء سے مد و جزر اور روانی و طغیانی ہے' واقعات کی اسی ترتیب کے لئے قدر کا لفظ بولا جاتا ہے گویا لفظ قضاء امر واحد کلی ہے' اور قدر وہ تمام تفصیلات ہیں جن کا لامتناہی سلسلہ ہماری آنکھوں کے سامنے جاری ہے' کہتے ہیں کہ امور دنیا میں کوئی امر قضاء و قدر سے خالی نہیں ہے' اس لئے بعض عابدین کو یہ وہم ہوا کہ قسمت اس تفصیل کی متقضی کیوں ہوئی ہے' اور اس تفاوت کے باوجود عدل کیسے برقرار رہ سکا؟ بعض لوگ اپنے قصور فہم' اور عجز ادراک کے باعث اس امر کی حقیقت نہیں سمجھ سکتے تھے' اور نہ اسکی تمام تفصیلات سے واقف ہونے کی صلاحیت رکھتے تھے اس لئے انھیں اس موضوع پر گفتگو کرنے سے روک دیا گیا' حکم ہوا تم خاموش رہو' تمہاری تخلیق اس لئے نہیں ہوئی کہ اس سلسلے میں زبان کھولو۔

لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْئَلُوْنَ (پ۱۷ ر۲ آیت ۲۳)

وہ جو کچھ کرتا ہے اس سے کوئی بازپرس نہیں کرسکتا اوروں سے بازپرس کی جاسکتی ہے۔

بعض لوگوں کے دلوں میں نور الٰہی کی شمع روشن ہوئی' ان کے قلوب میں پہلے ہی اس نور کو قبول کرنے کی صلاحیت تھی' اس لئے جب ان پر تجلیات ربانی منکشف ہوئیں تو وہ نور علیٰ نور بن گئے' ان کے نگاہوں کے سامنے آسمانوں اور زمین کے ملکوت واضح ہوگئے' انھوں نے ان تمام امور کو ایسا ہی پایا جیسے وہ حقیقت میں ہیں' ان کے لئے بھی یہ حکم ہوا کہ آداب الٰہیہ کے زیور سے آراستہ ہو' اور چپ رہو' جب تقدیر کا ذکر آئے تو خاموشی اختیار کرو' اس لئے کہ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں' اور تمہارے اردگرد کم نگاہوں کی کثرت ہے' تم اگرچہ دیدۂ بینا رکھتے ہو' لیکن ایسے رہو جس سے معلوم ہو کہ تم بھی نگاہوں کے ضعف میں مبتلا ہو' شپرہ چشم لوگوں کے لئے آفتاب پر پڑا ہوا حجاب نہ ہٹاؤ' ایسا نہ ہو کہ وہ اس کے نور کی تاب نہ لاسکیں اور ہلاک ہوجائیں۔ اللہ تعالیٰ کے اخلاق اپناؤ' اور اپنی بلندی سے نیچے اترو' تاکہ ناتواں لوگ تم سے مانوس ہوں' اور تمہارے دلوں کے نور سے فیضان حاصل کریں' اگرچہ اس پر حجاب ہی کیوں نہ پڑا ہوا ہو' چلمن سے بھی روشنی جھلکتی ہے' اور اندھیروں کا سینہ چیر کر راہ رو کو راستہ دکھلاتی ہے' جس طرح شپرک دن کے اجالے کی تاب نہیں لاتی لیکن جب رات ڈیرے ڈال دیتی ہے اور سورج کی باقی ماندہ روشنی اور کواکب کے اجالے سے فائدہ اٹھاتی ہے' تو وہ زیادہ روشنی کے متحمل نہیں ہوسکتی' صرف اتنی روشنی اخذ کرتی ہے جو اسکا وجود برداشت کرسکتا ہے' ان لوگوں جیسے بنو جن کے بارے میں کسی شاعر نے کہا ہے۔

شَرِبْنَا شَرَابًا طَيِّبًا عِنْدَ طَيِّبٍ۔ كَذَاكَ شَرَابُ الطَّيِّبِيْنَ يَطِيْبُ
شَرِبْنَا وَاَهْرَقْنَا عَلَى الْاَرْضِ فَضْلَهُ۔ وَلِلْاَرْضِ مِنْ كَاْسِ الْكِرَامِ نَصِيْبُ

(ہم نے پاکیزہ لوگوں کے پاس شراب پی' پاکیزہ لوگوں کی شراب بھی پاکیزہ ہوتی ہے' ہم نے شراب پی' اور باقی ماندہ زمین پر گرادی' سخاوت پیشہ لوگوں کے گلاس میں زمین کا حصہ بھی ہوتا ہے)

خلق و اختراع کے اول و آخر یہ ہے جو بیان کیا گیا' لیکن اسے وہی سمجھ سکتا ہے جو سمجھنے کا اہل ہوگا' اگر تم اس کے اہل ہوئے تو خود آنکھیں کھول کر دیکھ لوگے' تمہیں کسی راہ نما کی ضرورت پیش نہ آئے گی' یہ صحیح ہے کہ اندھے کو راستہ بتایا جاتا ہے' بلکہ اسکا ہاتھ پکڑ کر چلا جاتا ہے' لیکن کس حد تک؟ بعض راستے اس قدر تنگ ہوتے ہیں کہ ان پر تلوار سے زیادہ تیز اور بال سے زائد باریک کا گمان ہوتا ہے' اس پر سے پرندہ اڑ کر گزر سکتا ہے' لیکن کسی اندھے کو انگلی پکڑ کر پار نہیں کرایا جاسکتا' بعض اوقات راستے میں دریا پڑتے ہیں' جنھیں صرف وہی لوگ عبور کرسکتے ہیں' جو تیرنا جانتے ہوں' ایسے میں خود تیر کر کنارے لگنا اور کسی ناواقف کو اپنے ساتھ کھینچ کر پار لگانا بسا اوقات بڑا مشکل ہوجاتا ہے۔

جو لوگ اس میدان کے شہسوار ہیں عوام الناس کے مقابلے میں ان کی نسبت ایسی ہے جیسے پانی پر چلنے والے کو زمین پر چلنے والے سے ہے، تیراکی تو ایک فن ہے مشق سے ہر شخص یہ فن حاصل کر سکتا ہے، لیکن پانی پر چلنا ہر کسی وناکس کے بس کا روگ نہیں ہے، اسکے لئے یقین کی قوت ضروری ہے۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں کسی صحابی نے عرض کیا، یا رسول اللہ! سنا ہے حضرت عیسٰی علیہ السلام پانی پر چلتے تھے، فرمایا اگر یقین اور زیادہ ہوتا تو ہوا پر چلتے۔

محبت، کراہت، رضا، غضب، شکر اور کفران کے معانی کے سلسلے میں یہ باتیں رموز اشارات ہیں، علم معاملہ میں اس سے زیادہ کی گنجائش بھی نہیں ہے۔

عبادت ــ غایت تخلیق : لوگوں کی فہم سے قریب تر کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے بطور مثال ارشاد فرمایا ہے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ (پ ۲۷ ر ۲ آیت ۵۶)

اور میں نے جن اور انسان کو اسی واسطے پیدا کیا ہے کہ میری عبادت کیا کریں۔

گویا بندوں کی عبادت ان کے حق میں غایت حکمت ہے، پھر یہ بتلایا کہ میرے دو بندے ہیں، ان میں سے ایک مجھے محبوب ہے اسکا نام جبرئیل، روح القدس، اور امین ہے، وہ میرے نزدیک محبوب، مطاع، امین اور مکین ہے، دوسرا بندہ مبغوض ہے اس کا نام ابلیس ہے، اس پر دن رات لعنتیں بھیجی جاتی ہیں، اسے قیامت کے دن تک مہلت دی گئی ہے، اس کے بعد یہ بیان فرمایا کہ جبرئیل حق کا راستہ دکھلاتے ہیں۔

قُلْ نَزَّلَهُ رُوحُ الْقُدُسِ مِنْ رَبِّكَ بِالْحَقِّ (پ ۱۴ ر ۲۰ آیت ۱۰۲)

آپ فرمادیجئے کہ اسکو روح القدس آپ کے رب کی طرف سے حکمت کے موافق لائے ہیں۔

يُلْقِي الرُّوحَ مِنْ أَمْرِهِ عَلَىٰ مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ (پ ۲۴ ر ۷ آیت ۱۵)

وہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے وحی بھیجتا ہے۔

ابلیس گمراہی کا راستہ دکھاتا ہے۔

لِيُضِلُّوا عَنْ سَبِيلِهِ (پ ۱۳ ر ۱۷ آیت ۳۰)

تاکہ دوسروں کو بھی اس (اللہ) کی راہ سے گمراہ کریں۔

گمراہ کرنے کے معنی ہیں بندوں کو غایت حکمت تک پہنچنے سے روک دینا، غور کیجئے اللہ تعالیٰ نے گمراہ کرنے کے فعل کو کس طرح اس بندے کی طرف منسوب فرمایا جو مغضوب ہے، ہدایت کی راہ دکھلانے کے معنی یہ ہیں کہ بندوں کو غایت حکمت تک پہنچانا۔ یہاں بھی قابل غور بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رہنمائی کے عمل کی اپنے ایسے بندے کی طرف نسبت فرمائی جو محبوب ہے، عادات میں بھی اس طرح کی نسبتوں کی مثال ملتی ہے۔ مثلاً بادشاہ کو دو آدمیوں کی ضرورت ہے، ایک پانی پلانے والے کی، دوسرے پچھنے لگانے والے اور جھاڑو دینے والے کی۔ اگر اسکے پاس دو غلام ہوں تو وہ پچھنے لگانے اور نجاست صاف کرنے کا کام اس غلام کے سپرد کرے گا جو ان میں کم تر اور بدتر ہوگا، جب کہ پانی پلانے کا کام اس غلام کے سپرد ہوگا جو ان دونوں میں خوب رو، حسن خلق سے آراستہ، مکمل اور محبوب ہوگا۔

فعل کی نسبت : اب اگر تم سے کوئی برا فعل سرزد ہو تو یہ ہرگز نہ کہو کہ یہ میرا فعل ہے، اللہ کا فعل نہیں ہے، ایسا کہنا غلطی ہے، ہر فعل خدا کا ہے، خواہ وہ اچھا ہو یا برا۔ یہ جو تم اچھے فعل کو اچھے آدمیوں کی طرف اور برے فعل کو برے انسانوں کی طرف منسوب کرتے ہو یہ بھی اللہ ہی کا فعل ہے کہ وہ آدمی کے ارادے کا رخ بدل دیتا ہے، اور وہ برائی کی نسبت برے آدمی اور اچھائی کی نسبت اچھے آدمی کی طرف کرنے لگتا ہے۔ یہ بھی اسکا کمال عدل ہے کبھی اسکا عدل ان امور میں کامل ہوتا ہے جن میں بندوں کو کوئی دخل نہیں ہوتا اور کبھی خود تمہارے وجود میں مکمل ہوتا ہے، جس طرح تمہارا وجود اسکا فعل ہے اسی طرح تمہارے وجود سے نکلنے والا ہر

فعل بھی اسی کا فعل ہے، تمہارا ارادہ، تمہاری قدرت، تمہارا عمل اور تمہاری تمام حرکات سب اسی کے افعال ہیں، اس نے ان تمام کو عدل کے ساتھ مرتب کیا ہے تب ہی تو تم سے معتدل اعمال سرزد ہوتے ہیں، لیکن تمہارے سامنے صرف تمہارا نفس رہتا ہے، اس لئے تم یہ سمجھتے ہو کہ جو کچھ عالم ظاہر میں وقوع پذیر ہو رہا ہے اس کا عالم غیب و ملکوت میں کوئی سبب نہیں ہے۔ اس لئے تم ہر فعل کی نسبت اپنی طرف کرتے ہو۔

تمہاری مثال ان لڑکوں کی سی ہے جو رات میں کٹ پتلیوں کا تماشہ دیکھتے ہیں، ان کی آنکھوں کے سامنے کپڑے کی بنی ہوئی چند پتلیاں پردے کے پیچھے سے نکلتی ہیں، اور رقص کرتی ہیں، اچھلتی ہیں کودتی ہیں، کبھی اٹھتی ہیں، کبھی بیٹھتی ہیں، بچے اپنی سادہ لوحی اور کم فہمی کے باعث یہ سمجھتے ہیں کہ یہ پتلیاں از خود حرکت کر رہی ہیں، ان بے چاروں کو کیا معلوم کہ پردے کے پیچھے کوئی بیٹھا ہوا انہیں حرکت دے رہا ہے، یہ پتلیاں چند ایسے باریک تاروں یا بالوں سے بندھی ہوئی ہیں جو ان بچوں کو نظر نہیں آتے، اگر کوئی بچہ اس راز سے واقف بھی ہے تو اسے اتنی واقفیت نہیں ہوتی جتنی تماشہ دکھانے والے کو ہوتی ہے۔ دنیا کے لوگوں کی مثال ایسی ہی ہے، علماء کے علاوہ سب بچوں کے مانند ہیں، جب یہ خود کو اور اپنے جیسے دوسرے انسانوں کو حرکت کرتے ہوئے دیکھتے ہیں تو یہ سمجھتے ہیں کہ یہی حرکت کر رہے ہیں، اور علماء جانتے ہیں کہ انہیں کوئی حرکت دینے والا ہے، یہ خود بخود حرکت نہیں کرتے مگر علماء بھی عام طور پر تحریک کی کیفیت سے واقف نہیں ہوتے، اس حکم سے وہ علماء اور عارفین مستثنیٰ کئے جاسکتے ہیں، جنہیں علم اور معرفت میں رسوخ حاصل ہے، یہ لوگ اس تحریک کی کیفیت بھی ملاحظہ کرلیتے ہیں، وہ دیکھتے ہیں کہ مکڑی کے جال سے زیادہ باریک تاروں کا ایک سلسلہ آسمان سے زمین کی طرف لٹکا ہوا ہے، اور ان تاروں میں زمین والوں کے سر بندھے ہوئے ہیں، وہ تار اس قدر مہین اور باریک ہے کہ ظاہری آنکھوں سے نظر ہی نہیں آتے، پھر وہ یہ دیکھتے ہیں کہ ان تاروں کے سرے ان فرشتوں کے ہاتھوں میں ہیں جو آسمانوں کو حرکت دیتے ہیں، وہ یہ بھی مشاہدہ کرتے ہیں کہ ان فرشتوں کی نگاہیں حاملین عرش کی طرف لگی ہوئی ہیں، اور وہ اس بات کے منتظر ہیں کہ حضرت ربوبیت سے ان پر کیا حکم نازل ہوتا ہے، تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کے ہر حکم کی اسی طرح تعمیل کریں جس طرح مطلوب ہے، انکے کسی حکم میں نافرمانی نہ ہو :-

لَا يَعْصُونَ اللّٰهَ مَا أَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ (پ ۲۸ ر ۱۹ آیت ۶)

جو کسی بات میں خدا کی نافرمانی نہیں کرتے، اور جو کچھ ان کو حکم دیا جاتا ہے وہ کرتے ہیں۔

قرآن کریم نے بھی ان مشاہدات کی طرف اشارہ فرمایا :-

وَفِي السَّمَاءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوعَدُونَ (پ ۲۶ ر ۱۸ آیت ۲۲)

اور تمہارا رزق اور جو تم سے وعدہ کیا جاتا ہے سب کا سب آسمان میں ہے۔

قدر اور امر کا جو انتظار کرتے ہیں، یہ بات قرآن کریم نے ان الفاظ میں بیان فرمائی ہے :-

خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَمِنَ الْأَرْضِ مِثْلَهُنَّ يَتَنَزَّلُ الْأَمْرُ بَيْنَهُنَّ لِتَعْلَمُوا أَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ وَأَنَّ اللّٰهَ قَدْ أَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا (پ ۲۸ ر ۱۸ آیت ۲)

جس نے سات آسمان پیدا کئے ہیں اور ان ہی کی طرح زمین بھی (اور) ان سب میں (اللہ کے) احکام نازل ہوتے رہتے ہیں کہ تم کو معلوم ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ ہر شئی پر قادر ہے اور اللہ ہر شئی کو احاطہ علمی میں لئے ہوئے ہے۔

یہ وہ امور ہیں جن کی تاویل صرف اللہ جانتا ہے، یا علم میں رسوخ رکھنے والے علماء حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کے نزدیک راسخین فی العلم وہ لوگ ہیں جو ان علوم کے حامل ہوں جنہیں مخلوق کی ناقص عقلیں نہ سمجھ سکیں، ایک مرتبہ آپ کے سامنے قرآن کریم کی یہ آیت پڑھی گئی یتنزل الامر بینھن، اور اس آیت کے معنی دریافت کئے گئے فرمایا اگر میں اس آیت کے معنی بیان

کروں تو تم مجھے پتھروں سے مارو' ایک روایت میں ہے کہ اس آیت کی معنی بیان کرنے پر تم مجھے کافر کہو۔ اب ہم اس گفتگو کو یہیں ختم کرتے ہیں' بات کافی طویل ہوئی' کلام کی باگ دوڑ سرکش گھوڑے کی طرح قبضۂ اختیار سے نکل گئی' اور علم معاملہ کے ساتھ کچھ ایسے علوم مخلوط ہو گئے جو اس میں سے نہیں ہیں اس لئے اب ہم بحث کی طرف رجوع کرتے ہیں جسے پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔

مقاصد شکر : بات مقاصد شکر کی ہو رہی تھی' ہم یہ بیان کر رہے تھے کہ شکر کی حقیقت یہ ہے کہ بندہ ایسے عمل کرے جن سے اللہ کی حکمت پوری ہو' بندوں میں جو سب سے زیادہ شاکر ہو گا وہی جو سب سے زیادہ محبوب ہو گا' اور وہی اللہ تعالیٰ سے زیادہ قریب بھی ہو گا۔ اللہ تعالیٰ سے اسکے بندوں میں سب سے زیادہ قریب فرشتے ہیں' ان میں بھی درجات کی ترتیب ہے۔

بعض فرشتوں کا درجہ بعض سے بلند ہے' سب سے زیادہ اعلا مرتبے کے حامل حضرت اسرافیل علیہ السلام ہیں' فرشتوں کے درجات اس لئے بلند ہیں کہ وہ اپنی ذات سے کریم اور نیک ہیں۔ ان کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے حضرات انبیاء علیہم السلام کو صلاح عطا فرمائی' اور یہ روئے زمین پر تمام مخلوق میں اشرف ہیں' ملائکہ کے درجے سے قریب تر درجہ حضرات انبیاء علیہم السلام کا ہے' اس لئے کہ یہ بھی اپنی ذات میں بہتر ہیں' ان کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوق تک ہدایات پہنچائی' اور اپنی حکمت پوری کی' ان تمام پیغمبروں میں بلند تر مرتبہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے' آپ پر دین کی تکمیل ہوئی' اور انبیاء کرام علیہم السلام کا سلسلہ ختم ہوا۔ انبیاء کرام کے درجے سے قریب تر درجہ علماء کا ہے جو انبیاء کرام کے وارث ہیں' یہ بھی بذات خود صالح ہیں' ان کے ذریعے بھی اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوق کی اصلاح فرمائی' تاہم تمام علماء کے درجات برابر نہیں ہیں۔ بلکہ ہر شخص کا درجہ اس کی صلاح نفس اور غیر کے اعتبار سے بلند ہے' علماء سے قریب تر درجہ منصف مزاج بادشاہوں کا ہے' اس لئے کہ علماء لوگوں کے دین کی اصلاح کرتے ہیں' اور عادل بادشاہ ان کے دین کی اصلاح کرتے ہیں۔ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس دین بھی تھا' اور سلطنت بھی تمام انبیاء پر آپ کی فضیلت کی وجہ بھی یہ ہے کہ آپ کے ذریعے دین اور دنیا دونوں کی اصلاح ہوئی اس سے پہلے جو انبیاء تشریف لائے انھیں سلطنت اور سیف عطا نہیں کی گئی' علماء اور نیک دل بادشاہوں سے قریب تر وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے دین اور نفس کی اصلاح کی' یہ وہ لوگ ہیں جن کے ذریعے حکمت الٰہی کی تکمیل نہیں ہوتی' بلکہ خود ان کی ذات میں ہوتی ہے' ان کے علاوہ جو لوگ ہیں وہ کسی شمار قطار میں نہیں ہیں۔

سلاطین دین کی تقویت کا باعث ہیں : مسلمان بادشاہ دین محمدی کی تقویت کا باعث ہوتے ہیں' اس لئے ان کی تحقیر نہ کرنی چاہیے خواہ وہ ظالم اور فاسق ہی کیوں نہ ہوں' حضرت عمرو ابن العاص ارشاد فرماتے ہیں کہ ظالم امام دائمی فتنے سے بہتر ہے۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں۔

سَيَكُونُ بَعْدِي عَلَيْكُمْ أُمَرَاءُ تَعْرِفُونَ مِنْهُمْ وَتُنْكِرُونَ وَيُفْسِدُونَ وَمَا يُصْلِحُ اللّٰهُ بِهِمْ أَكْثَرُ، فَإِنْ أَحْسَنُوا فَلَهُمُ الْأَجْرُ وَعَلَيْكُمُ الشُّكْرُ، وَإِنْ أَسَاءُوا فَعَلَيْهِمُ الْوِزْرُ وَعَلَيْكُمُ الصَّبْرُ (مسلم۔ام سلمہ)

عنقریب میرے بعد تم پر کچھ حکمراں ہوں گے جن میں سے بعض کو تم جانتے ہوں گے' اور بعض کو نہیں جانتے ہوں گے' وہ فساد کریں گے (تاہم) جس قدر ان کے ذریعے اللہ تعالیٰ اصلاح فرمائے گا وہ زیادہ ہو گا اسلئے اگر وہ اچھا کام کریں گے تو ان کے لیے اجر ہو گا' اور اگر وہ برا کام کریں گے تو ان پر گناہ ہو گا اور تم پر صبر ہو گا۔

حضرت سہیل ارشاد فرماتے ہیں کہ جو شخص سلطان کی امامت کا انکار کرے وہ زندیق ہے' جسے سلطان بلائے اور وہ اس کے پاس نہ جائے تو وہ بدعتی ہے' اور جو بغیر بلائے چلا جائے وہ جاہل ہے' آپ سے دریافت کیا گیا کہ لوگوں میں سب سے بہتر کون ہے' فرمایا سلطان' لوگوں نے عرض کیا ہم یہ سمجھتے تھے کہ سلطان بدترین انسان ہے' آپ نے فرمایا ایسا نہ کہو اللہ تعالیٰ ہر روز اسکی دو بائیں دیکھتا

ہے ایک تو یہ کہ اسکی وجہ سے مسلمانوں کے اموال سلامت ہیں' دوسرے یہ کہ اس کی وجہ سے مسلمانوں کی جانیں سلامت ہیں۔ یہ دونوں باتیں اسکے نامۂ اعمال میں پاتا ہے' اور اسکے تمام گناہ معاف فرماتا ہے' حضرت سہیل یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ سلاطین کے دروازوں پر لگی ہوئی سیاہ لکڑیاں ستر واعظوں سے بہتر ہیں جو وعظ کریں۔

دوسرا رکن لائق شکر نعمتیں

شکر کا دوسرا رکن وہ نعمتیں ہیں جن پر شکر ادا کیا جاتا ہے' یہاں نعمت کی حقیقت' اسکے اقسام اور درجات بیان کئے جائیں گے' اور یہ بتلا دیا جائے گا کہ کس چیز میں نعمت خاص ہے اور کس میں عام ہے' اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو اتنی نعمتوں سے نوازا ہے کہ انھیں احاطۂ شمار میں بھی نہیں لایا جاسکتا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :-

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا (پ ۱۳ ر ۱۷ آیت ۳۴)

اور اللہ تعالیٰ کی نعمتیں اگر شمار کرنے لگو تو شمار میں نہیں لاسکتے۔

پہلے ہم چند کلی امور ذکر کرتے ہیں تاکہ وہ نعمتوں کی معرفت میں قوانین کے قائم مقام بن جائیں' پھر ہر نعمت کا الگ الگ ذکر کریں گے' اس رکن میں تین بیان ہیں۔

نعمت کی حقیقت اور اسکی اقسام

جاننا چاہیے کہ ہر خیر' ہر لذت' ہر سعادت بلکہ ہر مطلوب اور ہر مؤثر نعمت ہے' لیکن حقیقی نعمت اخروی سعادت ہے' سعادت اخروی کے علاوہ جن چیزوں کو نعمت کہا جاتا ہے یا تو ایسا کہنا غلط ہے' یا یہ استعمال بطور مجاز ہے۔ مثلاً دنیوی سعادت کو جس سے آخرت پر مدد نہ ملے نعمت کہنا قطعاً غلط ہے' بعض اوقات کسی شئی کو نعمت کہنا صحیح ہوتا ہے' لیکن زیادہ صحیح یہ ہے کہ نعمت کا اطلاق اخروی سعادت پر ہو' ہر اس شئی پر نعمت کا اطلاق صحیح ہے جو ایک واسطے سے یا ایک سے زائد واسطوں سے سعادت اخروی تک پہنچنے میں معاون ہو' اس لئے کہ یہ شئی نعمت حقیقی کے حصول کا سبب ہے۔ جو نعمتیں اور لذتیں اخروی سعادت کے حصول کا ذریعہ اور اس پر معین ہوتی ہیں ان کی تشریح کے لئے ہم نعمتوں کی کئی قسمیں کرتے ہیں۔

پہلی تقسیم : اگر ہم تمام امور کی نسبت اپنی طرف کرکے دیکھیں تو ان کی چار قسمیں ہوتی ہیں۔ اول وہ امور جو دنیا اور آخرت دونوں میں نافع ہوں جیسے علم اور حسن اخلاق' دوم وہ جو دونوں میں غیر مفید ہوں جیسے جہالت اور بد اخلاقی' سوم وہ جو دنیا میں مفید ہوں اور آخرت میں غیر مفید جیسے شہوات سے تلذذ حاصل کرنا' چہارم وہ جو دنیا میں نقصان دہ ہوں اور آخرت میں نفع بخش جیسے شہوات پر قابو پانا' اور نفس کی مخالفت کرنا۔ ان میں سے پہلی قسم جو دنیا و آخرت دونوں میں نافع ہے وہ نعمت حقیقی ہے یعنی علم اور حسن خلق' اور جو دونوں میں مضر ہے وہ حقیقی مصیبت ہے' یہ علم کی ضد جہالت اور حسن خلق کی ضد بد خلقی ہے' اور جو دنیا میں نفع بخش اور آخرت میں مضرت رساں ہے اسے اہل بصیرت خالص مصیبت کہتے ہیں' اور جاہل لوگ نعمت سمجھتے ہیں' اسکی مثال ایسی ہے جیسے کسی بھوکے کو زہر آلود شہد مل جائے' اگر وہ زہر سے واقف ہوگا تو اس شہد کو مصیبت سمجھے گا' اور ناواقف ہوگا تو اسے نعمت قرار دے گا۔ جو چیز آخرت میں نافع اور دنیا میں مضر ہے وہ اہل عقل کے نزدیک نعمت اور جاہلوں کے نزدیک مصیبت ہے' اس کی مثال ایسی جیسے کڑوی دوا کہ اس کا ذائقہ برا ہے' لیکن اس کا اثر و نتیجہ ہوتا ہے' جب کہ اس سے ملنے والی شفا خوش آئند اور دیرپا ہے' اگر کسی بچے کو تلخ دوا پینے کے لئے دی جائے تو وہ اسے مصیبت تصور کرے' اور اسے پینے پر کبھی راضی نہ ہوگا' الا یہ کہ زبردستی پلادی جائے' جب کہ باشعور انسان نہ صرف یہ کہ کڑوی سے کڑوی دوا خوشی خوشی پی لیتا ہے بلکہ جو شخص اسے یہ دوا دیتا ہے یا اس کا سامان فراہم کرتا ہے' یا اسکی تیاری میں مدد کرتا ہے اس کا شکر گزار اور ممنون احسان بھی ہوتا ہے کہ' احسان شناسی اور منت کشی کے طور پر اس کی قربت

حاصل کرتا ہے' اور اسے ہدایا سے نوازتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ماں اپنے بچے کا گندہ خون نہیں نکلوانے دیتی' جب کہ باپ اس پر رضا مند ہو جاتا ہے' اس لئے کہ باپ اپنے کمال عقل کے باعث انجام پر نظر رکھتا ہے' اور ماں اپنی شدت محبت کے باعث صرف حال پر نظر رکھتی ہے' اور بچہ اپنی جہالت کے باعث ماں کو اپنی محسن تصور کرتا ہے' اور اس شفقت اور محبت سے مانوس ہوتا ہے اور باپ کو اپنا دشمن سمجھتا ہے' اگر اس میں ذرا بھی عقل ہوتی تو یہ بات جان لیتا کہ ماں دوست کی صورت میں دشمن ہے' اس لئے کہ خون نکلوانے سے منع کرنا اسے ایسے امراض میں مبتلا کرے گا جو خون نکالنے کے عمل سے زیادہ تکلیف کا باعث ہوں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ جاہل دوست عقلمند دشمن سے زیادہ نقصان دہ ہے' ہر انسان اپنے نفس کا دوست ہے' لیکن وہ جاہل دوست ہے' اس لئے وہ اسکے ساتھ وہ سلوک کرتا ہے' جو دشمن بھی نہیں کرتا۔

دوسری تقسیم : دنیوی اسباب میں خیر اور شر دونوں کی آمیزش ہے' بہت کم اسباب ایسے ہیں جن میں صرف خیر ہی خیر ہے شر نہیں ہے۔ مال' جاہ' اولاد' اقربہ' اور دوسرے تمام اسباب ایسے ہیں کہ ان میں خیر بھی ہے اور شر بھی۔ تاہم ایسے اسباب کی تین قسمیں ہیں' پہلی قسم وہ اسباب ہیں جن کا نفع ان کے ضرر کے مقابلے میں زیادہ ہے جیسے بقدر کفایت مال اور جاہ وغیرہ اسباب' دوسری قسم میں وہ اسباب ہیں جن کا ضرر اکثر لوگوں کے حق میں ان کے نفع سے زیادہ ہے جیسے بہت سا مال' اور وسیع تر جاہ' تیسری قسم وہ اسباب ہیں جن کا نفع و ضرر برابر ہے یہ وہ امور ہیں جو اشخاص کے اعتبار سے مختلف ہوتے ہیں' مثلاً نیک آدمی اچھے مال سے اگرچہ وہ زیادہ ہی کیوں نہ ہو نفع اٹھاتا ہے' اللہ کی راہ میں خرچ کرتا ہے' صدقہ و خیرات کرتا ہے اگر کسی کو یہ توفیق ہو تو مال کی کثرت اسکے حق میں نعمت ہے' بعض بدبخت لوگ تھوڑے مال سے بھی نقصان اٹھاتے ہیں' یعنی اسے حقیر سمجھتے ہیں اور ہر وقت اپنے رب سے شکوہ کناں رہتے ہیں' اور زیادتی کی ہوس کرتے ہیں' ایسے شخص کے حق میں یقیناً یہ مال ذلت اور معصیت کا باعث ہے۔

تیسری تقسیم : خیر کے جس قدر امور ہیں وہ ایک اعتبار سے تین قسم کے ہیں' ایک وہ جو لذاتہ مطلوب ہوں دوسرے وہ جو غیر کے لئے مطلوب ہوں' تیسرے وہ جو لذاتہ بھی مطلوب ہوں اور بغیر بھی۔ پہلی قسم یعنی ان امور کی مثال جو لذاتہ مطلوب و محبوب ہوں دیدار الٰہی کی لذت' اور اس کی ملاقات کی سعادت ہے۔ یہ اخروی سعادت ہے' اس کا سلسلہ کبھی منقطع نہیں ہوگا' یہ سعادت اس لئے مطلوب نہیں ہوتی کہ اس کے ذریعے دوسری حاصل کی جاتی ہے' بلکہ اپنی ذات سے مطلوب اور مقصود ہوتی ہے۔ دوسری قسم یعنی ان امور کی مثال جو اپنی ذات سے مقصود نہیں ہوتے بلکہ غیر کے لئے مقصود ہوتے ہیں درہم و دینار ہیں' اگر دنیا کی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے کوئی اور چیز مقرر ہوتی تو سونا چاندی اور اینٹ پتھر میں کوئی فرق نہ ہوتا' لیکن کیونکہ یہ لذات کے حصول کے ذریعہ ہیں' اور اسکے ذریعے دنیاوی راحتیں بسہولت اور بسرعت حاصل ہو جاتی ہیں' اس لئے جاہلوں کے نزدیک یہ لذاتہ محبوب ہو گئیں یہاں تک کہ وہ انھیں جمع کرتے ہیں' زمین میں دفن کرتے ہیں' ریاکارانہ طریقے پر خرچ کرتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ درہم و دینار ہی مقصود ہیں' ان لوگوں کی مثال اس شخص کی سی ہے جو کسی سے محبت کرے' اس کی وجہ سے اس قاصد سے بھی محبت کرے جو ان دونوں کے درمیان پیغام رسانی یا ملاقات کا وسیلہ بنتا ہے' پھر قاصد کی محبت یہاں تک بڑھے کہ اصل محبوب کو فراموش کردے' اور زندگی بھر اسکا نام نہ لے' بلکہ اس کے بجائے قاصد کی محبت میں مشغول رہے اس کی خاطر مدارت میں لگا رہے' یہ انتہائی جہالت اور کھلی گمراہی ہے۔ تیسری قسم میں وہ امور تھے جو اپنی ذات سے بھی مطلوب ہیں اور غیر کے لئے بھی مقصود ہیں جیسے صحت اور سلامتی۔ یہ اس لئے بھی مقصود ہے کہ انسان صحت پا کر ذکر اور فکر پر قدرت حاصل کرتا ہے' اور ذکر و فکر اسے اللہ تک پہنچاتے ہیں' نیز ان کے ذریعے انسان دنیاوی لذات بھی حاصل کرتا ہے۔ صحت اپنی ذات سے بھی مقصود ہے' اس لئے کہ بعض اوقات آدمی پیدل نہیں چلنا چاہتا اس کے باوجود یہ چاہتا ہے کہ اس کے دونوں پاؤں سلامت رہیں' حالانکہ پاؤں کی سلامتی اس لئے مقصود ہونی چاہیے کہ یہ چلنے کا ذریعہ ہیں' لیکن کیونکہ سلامتی بذات خود بھی محبوب ہے اس لئے اسکی طلب کی جاتی ہے۔

ان تینوں قسموں میں حقیقی نعمت پہلی قسم ہے' یعنی اخروی سعادت جو لذاتہ مقصود ہوتی ہے' جو چیز لذاتہ بھی مقصود ہو' اور غیرہ

بھی وہ بھی نعمت ہے مگر پہلی قسم کے مقابلے میں اس کا درجہ کم ہے' اور جو چیز اپنی ذات سے مقصود نہ ہو بلکہ غیر کے لئے مقصود ہو جیسے درہم و دینار انھیں اس اعتبار سے نعمت نہیں کہا جائے گا کہ یہ نعمت ہیں بلکہ اس لحاظ سے نعمت کہا جائے گا کہ یہ وسیلہ ہیں' اس لئے یہ صرف اس شخص کے حق میں نعمت ہوں گے جو اپنی ضرورت اس کے بغیر پوری نہ کر سکتا ہو' اگر کسی شخص کا مقصد علم اور عبادت ہے' اور اس کے پاس بقدر کفایت مال ہے جس سے اس کی ضروریات پوری ہو سکتی ہیں تو اس کے نزدیک سونا اور پتھر دونوں برابر ہیں' اسے نہ ان کے وجود سے دل چسپی ہوگی اور نہ ان کے عدم سے' اور اگر وہ اسے فکر و عبادت سے مشغول رکھیں تو یہ اسکے حق میں مصیبت ہوں گے نعمت نہیں ہوں گے۔

چوتھی تقسیم : خیر کی ایک اور تقسیم کی جا سکتی ہے' اس اعتبار سے بھی خیر کی تین قسمیں ہیں' نافع' لذیذ' جمیل۔ لذیذ وہ ہے جس کا نفع فوری طور پر معلوم ہو' نافع وہ ہے جو انجام کے اعتبار سے مفید ہو' اور جمیل وہ ہے جو تمام حالات میں عمدہ ہو' شر کی بھی تین قسمیں ہیں ضرر رساں' قبیح اور ایذا دہ۔ پھر ان دونوں کی دو قسمیں ہیں' مطلق اور مقید' مطلق وہ ہے جس میں مذکورہ بالا تینوں وصف جمع ہو جائیں خیر میں اس کی مثال علم و حکمت ہے یہ اہل علم و حکمت کے نزدیک نفع بخش بھی ہیں' لذیذ بھی ہیں' اور جمیل بھی۔ شر میں اس کی مثال جہالت ہے یہ نقصان دہ بھی ہے ایذا رساں بھی ہے اور قبیح بھی' جاہل آدمی اس وقت اذیت محسوس کرتا ہے' جب وہ یہ دیکھتا ہے کہ جاہل ہوں' اور دوسرا شخص عالم ہے۔ اس وقت اپنے نقص کا ادراک کرتا ہے' اور تکلیف اٹھاتا ہے' کبھی اسکے اندر علم کی لذت شہوت سر ابھارتی ہے' کبھی حسد' کبر' اور جسمانی شہوات تعلیم کے لئے مانع بن جاتی ہیں' اس طرح چکی کے دو پاٹوں کے درمیان آجاتا ہے' یا دو متضاد قوتیں اسے اپنی اپنی طرف کھینچنے لگتی ہیں' اس کی جان تحت ضیق میں آجاتی ہے' ہر صورت میں اذیت میں مبتلا ہوتا ہے علم حاصل کرنے میں بھی کہ اس صورت میں کبر چھوڑنا پڑتا ہے' تعلیم کی ذلت برداشت کرنی پڑتی ہیں سب سے بڑھ کر یہ کہ شہوات ترک کرنی پڑتی ہے' علم حاصل نہ کرنے میں اپنے نقص کا احساس ہوتا ہے' ایسا شخص ایک مستقل عذاب میں گرفتار رہتا ہے۔

خیر و شر کی دوسری قسم مقید ہے' یہ وہ قسم ہے جو بعض اوصاف کو جامع ہو' اور بعض کو نہ ہو' چنانچہ بعض باتیں نفع بخش ہوتی ہیں' ساتھ ہی ایذا دینے والی بھی جیسے کوئی کینسر زدہ انگلی کٹوا دے' یا جسم سے خراب مادہ نکلوا دے۔ اور کبھی ایک چیز نافع ہونے کے باوجود بری ہوتی ہے' جیسے حماقت' یہ وصف بعض حالات میں سود مند ہے' اسلئے یہ قول مشہور ہے اِسْتَرَاحَ مَنْ لَا عَقْلَ لَهُ (جسے عقل نہیں ہوتی وہ آرام سے رہتا ہے) اسکی وجہ یہ ہے کہ وہ انجام پر نظر نہیں رکھتا' نہ مستقبل کے اندیشے اسے پریشان کرتے ہیں' وہ ہمہ وقت سکون سے رہتا' یہاں تک کہ موت آجائے' بظاہر یہ ایک مفید وصف ہے' لیکن اس کی قباحت سے انکار نہیں کیا جاسکتا' بعض چیزیں ایک پہلو سے نافع اور ایک پہلو سے ضار ہوتی ہیں جیسے ڈوبتے ہوئے آدمی کا اپنا مال دریا میں غرق کر دینا' مال ضائع کرنا ایک اعتبار سے نقصان دہ ہے' لیکن دوسرے اعتبار سے نفع بخش بھی ہے کہ جسم سے مال و اسباب کا بوجھ کم ہوگا تو تیر کر کنارے تک پہنچنے میں سہولت ہوگی۔ نافع کی دو قسمیں ہیں' ایک ضروری جیسے ایمان' اور اخلاق حسنہ جو انسان کو سعادت اخروی تک پہنچانے میں مفید ہیں' ان دونوں سے ہماری مراد علم اور عمل ہے' یہ دونوں اس لئے ضروری ہیں کہ کوئی چیز ان دونوں کے قائم مقام نہیں ہو سکتی' دوسری غیر ضروری جیسے سکنجبین صفراوی مادہ کے ازالے کے لئے استعمال کی جاتی ہے' لیکن اس مادے کا ازالہ دوسری چیزوں سے بھی ہو جاتا ہے' اس لئے سکنجبین ضروری نہیں ہے۔

پانچویں تقسیم : ہر لذت پر نعمت کا اطلاق ہوتا ہے' اور لذتیں انسان کے لئے مخصوص ہونے کے اعتبار سے یا انسان اور غیر انسان میں مشترک ہونے کے لحاظ سے تین طرح کی ہیں' اول عقلی' دوم بدنی مخصوص مشترک ان میں انسان کے ساتھ بعض حیوانات بھی شریک ہیں' سوم بدنی عام مشترک ان میں انسان کے ساتھ تمام حیوانات شریک ہیں۔ عقلی لذتوں کی مثال علم و حکمت ہے' اس

لئے کہ علم و حکمت کی لذت کا ادراک نہ کان کرتے ہیں' نہ آنکھ' نہ ناک' نہ ذائقہ' نہ پیٹ اور نہ شرمگاہ' اس کی لذت صرف قلب محسوس کرتا ہے' کیونکہ ایسی صفت کے ساتھ مخصوص ہے جسے عقل کہتے ہیں' لذات میں سب سے کم تر یہی پائی جاتی ہے' اگرچہ سب سے اعلا یہی ہے' اس کی قلت کی وجہ یہ ہے کہ علم کی لذت کا ادراک صرف عالم کرسکتے ہیں' اور حکمت کی لذات صرف علماء محسوس کرسکتے ہیں' اور اہل علم و حکمت کی تعداد کتنی ہے یہ سب جانتے ہیں زیادہ تر لوگ وہ ہیں جو علماء اور حکماء کا نام اختیار کئے ہوئے ہیں' اور ان کی ہیئت اپنائے ہوئے ہیں' علم کے شرف کی وجہ یہ ہے کہ لذت آدمی کے ساتھ ہمیشہ رہتی ہے' کبھی زوال پذیر نہیں ہوتی' نہ دنیا میں اور نہ آخرت میں۔ یہ ہردم ساتھ رہنے والا رفیق ہے' اس کی دائمی رفاقت کے باوجود اہل علم و حکمت اس سے اکتاہٹ محسوس نہیں کرتے۔ باقی تمام لذتیں آدمی کو تھکا دیتی ہیں' مثلاً شکم سیر ہو کر کھانے سے جسم میں سستی پیدا ہوتی ہے' جماع سے فراغت کے بعد تھکن اور گرانی کا احساس ہوتا ہے' علم و حکمت کے سمندر میں جتنی چاہے شناوری کرو' غوطے لگاؤ نہ طبیعت پر گرانی ہوتی ہے نہ جسم سستی کا شکار ہوتا ہے۔ جو شخص اس قدر اشرف و اعلا شئے حاصل کرنے پر قدرت رکھنے کے باوجود ادنیٰ پر قناعت کرے' اور چند روزہ لذت کے پیچھے مارا مارا پھرے اس کے پاگل پن میں اور بد قسمتی میں کون ہوشمند شبہ کرسکتا ہے؟

علم کا ادنیٰ شرف یہ ہے کہ صاحب علم کو اپنے علم کے خزانوں کی حفاظت نہیں کرنی پڑتی' جب کہ زر و جواہر کی حفاظت میں دن رات کا سکون غارت ہو جاتا ہے' مالدار آدمی ہزار چوکیدار مقرر کرلے اور اپنے خزانوں پر پہرے بٹھالے لیکن کبھی بھی مطمئن ہو کر نہیں سوسکتا۔ علم آدمی کی حفاظت کرتا ہے جب کہ آدمی کو مال کی حفاظت کرنی پڑتی ہے' علم خرچ کرنے سے بڑھتا ہے' مال کم ہوتا ہے' مال چوری ہو جاتا ہے' مناصب حکمرانوں کی نگاہیں پھرنے سے ختم ہو جاتے ہیں لیکن علم تک نہ چوروں کے ہاتھ پہنچتے ہیں اور نہ بادشاہوں کے' عالم ہمیشہ امن و سکون سے رہتا ہے۔ مالدار خوف کے کرب میں مبتلا رہتا ہے' پھر علم بیک وقت نافع بھی ہے' لذیذ اور جمیل بھی ہے' جب کہ مال کبھی تمہیں نجات دیتا ہے' اور کبھی ہلاکت میں مبتلا کردیتا ہے' اسی لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں مال کی مذمت فرمائی ہے' اگرچہ بعض مواقع پر مال کو خیر بھی قرار دیا ہے۔

جہاں تک یہ سوال ہے کہ عام لوگ علم کی لذت کا ادراک کیوں نہیں کرپاتے تو اسکی وجہ یہ ہے کہ ان میں ذوق ہی نہیں ہوتا' اور جسے ذوق نہیں ہوتا اس میں نہ معرفت ہوتی ہے اور نہ شوق ہوتا ہے' شوق ذوق کے تابع ہے' اگر ذوق ہی نہ ہو تو شوق کیا ہوگا' یا شہوات کی اتباع کے باعث ان کے مزاج میں فساد ہوتا ہے' اور قلوب میں مرض۔ جیسے مریض کو شہد میں بھی حلاوت نہیں ملتی' بلکہ وہ اسے ایلوے کی طرح کڑوا سمجھتا ہے' یا اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ انکی ذہانت کی کمی ہوتی ہے جیسے دودھ پیتے بچے کو جو لذات ماں کے دودھ میں ملتی ہے وہ نہ شہد میں ملتی ہے نہ پرندے کے گوشت میں اسکا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ شہد یا پرندے کا گوشت لذیذ نہیں ہے۔ یا دودھ کی طرف اسکی رغبت سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ دودھ سے زیادہ کوئی چیز لذیذ نہیں ہے۔ بہرحال جو لوگ علم کی لذت سے محروم ہیں وہ تین طرح کے ہیں' ایک وہ جن کا باطن ابھی تک زندگی سے ہم کنار نہیں ہوا' جیسے بچہ اس کا باطن مردہ ہوتا ہے' دوسرے وہ شخص جس کا باطن زندہ ہوچکا تھا لیکن شہوات کی اتباع سے مردہ ہوگیا۔ تیسرے وہ شخص جس کا دل شہوات کی اتباع سے بیمار ہوگیا' اللہ تعالیٰ کے اس قول فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ" میں مریضان عقل کی طرف اشارہ ہے' اور اس قول "لينذر من كان حيا" میں اس شخص کی طرف اشارہ ہے جس کا باطن زندہ ہو' جو شخص بدن سے زندہ ہو' اور سینے میں دل مردہ رکھتا ہو وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مردہ ہے' اگرچہ جاہل لوگ انھیں زندہ شمار کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شہداء زندہ ہیں' اپنے رب کی طرف سے رزق پاتے ہیں' کھاتے اور خوش ہوتے ہیں' اگرچہ انکے جسم مردہ ہیں دوسری لذت بدنی مخصوص مشترک ہے' اس میں انسان کے ساتھ بعض حیوانات بھی شریک ہیں جیسے اقتدار' برتری' اور تفوق کی لذت' اس میں انسان کے ساتھ شیر' چیتا اور دوسرے طاقتور جانور بھی شریک ہیں۔

تیسری بدنی عام مشترک ہے انسان کے ساتھ حیوانات شریک ہیں جیسے شکم اور شرمگاہ کی لذت' یہ لذت زیادہ پائی جاتی ہے' اگرچہ تمام لذتوں میں یہ انتہائی ادنیٰ اور خسیس لذت ہے اسی لئے روئے زمین پر جتنے ذی روح جانور ہیں سب اس میں شریک ہیں'

یہاں تک کہ کیڑے مکوڑے بھی اس لذت سے لطف اٹھاتے ہیں۔ جو شخص اس لذت سے تجاوز کرتا ہے وہ غلبہ اور اقتدار کی لذت کا شکار ہو جاتا ہے' یہ لذت غفلت شعاروں کو اپنے پنجوں میں زیادہ جکڑتی ہے جو شخص اس لذت سے بھی آگے بڑھ جاتا ہے وہ تیسری لذت میں مشغول ہوتا ہے' یہاں تک کہ علم و حکمت کی لذت اس پر غالب آجاتی ہے خاص طور پر اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات کی معرفت میں اسے جو لذت ملتی ہے وہ کسی دوسری چیز میں نہیں ملتی' لیکن یہ صدیقین کا مرتبہ ہے' اور اس لذت کا حصول صرف اسی وقت ہوتا ہے جب دل سے غلبہ و اقتدار کی خواہش پوری طرح نکل جائے چنانچہ صدیقین کے سروں سے آخر میں جو محبت نکلتی ہے وہ ریاست اور اقتدار کی محبت ہوتی ہے۔ جہاں تک پیٹ اور شرمگاہوں کی شہوتوں کا سوال ہے دوسرے صالحین بھی ان کا قلع قمع کر سکتے ہیں' اس میں صدیقین ہی کی تخصیص نہیں ہے' تاہم اقتدار کی شہوت پر صرف صدیقین ہی قابو پا سکتے ہیں۔ غلبہ و اقتدار کی شہوت پر اس طرح قابو پانا کہ کبھی یہ فتنہ سر نہ اٹھائے انسان کی طاقت سے باہر ہے۔ تاہم بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت قلب پر غالب ہو جاتی ہے' اور اسکی موجودگی میں کسی دوسری لذت کا احساس نہیں ہوتا' لیکن یہ دائمی حالت نہیں ہوتی' وقتی حالات اور کیفیات کی بنا پر کم و بیش ہوتی رہتی ہے' جب اس معرفت کے غلبے میں کمی واقع ہوتی ہے تو بشری صفات سر ابھارنے لگتی ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ بشری صفات اور تقاضے موجود رہتے ہیں' لیکن غلبۂ معرفت میں دبے رہتے ہیں' ان کا وجود اتنا مؤثر نہیں ہوتا کہ نفس کو عدل سے منحرف کر سکے۔

قلب کی چار قسمیں: اس تفصیل کی رو سے قلب کی چار قسمیں ہوتی ہیں' ایک قلب وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے محبت نہیں کرتا' اور نہ اس وقت تک قرار پاتا ہے جب تک معرفت الٰہی میں زیادتی کا عمل جاری نہ رہے' دوسرا قلب وہ ہے جسے یہ معلوم ہی نہیں کہ معرفت میں کیا لذات ہوتی ہے' وہ صرف جاہ' ریاست مال' اور تمام جسمانی شہوات میں لذت پاتا ہے۔ تیسرا وہ قلب ہے جو اکثر حالات میں اللہ تعالیٰ کے ذکر و فکر اور معرفت سے انس پاتا ہے' مگر کبھی کبھی اس پر انسانی اوصاف بھی اثر انداز ہو جاتے ہیں۔ چوتھا قلب وہ ہے جس پر اکثر اوقات انسانی صفات غالب رہتی ہیں' لیکن کبھی کبھی وہ علم اور معرفت کے چشموں سے بھی فیض اٹھا لیتا ہے۔ ان میں سے پہلے دل کا وجود ممکن نہیں ہے' بالفرض اگر ممکن ہو تو پھر یہ اتنی کم تعداد میں ہیں کہ نہ ہونے کے برابر ہیں' دوسری طرح کے دلوں سے دنیا پر ہے' تیسرے اور چوتھے دل موجود ہیں لیکن بہت کمی کے ساتھ' بلکہ نادر کہے جائیں تو زیادہ بہتر ہے۔ پھر جو تھوڑے بہت قلب اس طرح کے موجود ہیں' وہ بھی قلت و کثرت میں متفاوت ہیں' انبیاء علیہم السلام کے زمانے سے قریب تر زمانوں میں اس طرح کے قلوب کی کثرت تھی' جوں جوں عہد رسالت دور ہوتا گیا اس طرح کے قلوب کم ہوتے گئے' قیامت تک کمی کا یہ عمل مسلسل جاری رہے گا۔

اس طرح کے قلوب کی کمی کی وجہ یہ ہے کہ لوگ ان قلوب کے حامل ہوتے ہیں وہ گویا اخروی سلطنت کا آغاز کرتے ہیں' لیکن کیوں کہ ہر شخص کو سلطنت حاصل نہیں ہوتی اسی لئے بادشاہ کم ہوتے ہیں' بلکہ اچھی صورتیں بھی زیادہ نہیں ہوتیں' اکثر لوگ جمال میں بہت پیچھے ہوتے ہیں' دنیا آخرت کا عکس ہے' جس طرح دنیا میں فائق زیادہ نہیں ہوتے' اسی طرح آخرت میں بھی کم ہوں گے' اس لئے کہ جو چیزیں دنیا میں پیش آتی ہیں وہ سب آخرت کا نمونہ ہیں' دنیا نام ہے عالم ظاہر کا اور آخرت نام ہے عالم غیب کا۔ عالم ظاہر عالم غیب کے تابع ہے' آئینے کے اندر جو تصویر نظر آتی ہے وہ اگرچہ دیکھنے والے کے تابع ہوتی ہے' اور اس اعتبار سے مرتبہ ثانی میں ہونی چاہیے' لیکن تمہارے دیکھنے کے اعتبار سے یہ مرتبہ اول میں ہے' اس لئے جب تم آئینہ دیکھتے ہو تو تمہیں اپنی صورت نظر نہیں آتی' بلکہ تم اپنا عکس دیکھتے ہو' اسکے ذریعے تم اپنی اصل صورت کی معرفت حاصل کرتے ہو' چنانچہ جو چیز وجود میں تابع تھی یعنی عکس وہ معرفت کے باب میں مقدوم ہو گئی' اور جو چیز وجود میں مقدم تھی وہ مؤخر ہو گئی' لیکن اس طرح کے اختلافات اور تغیرات اسی عالم میں رونما ہو سکتے ہیں۔ صورت اور عکس صورت کی مثال بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ عالم الملک والشہادۃ (عالم ظاہری) عالم الغیب والملکوت کی نقل ہے۔ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے چشم عبرت سے نوازا ہے وہ جب بھی دنیا کی کسی چیز کو دیکھتے ہیں اسے عالم

آخرت پر قیاس کرتے ہیں' اور اس سے عبرت حاصل کرتے ہیں۔ خدا تعالی نے ایسے ہی لوگوں کو یہ ہدایت فرمائی۔
فَاعْتَبِرُوْا یَا اُولِی الْاَبْصَارِ (پ۲۸ر۴ آیت۲)
سو اے دانش مندوں! عبرت حاصل کرو۔
بعض لوگوں کی بصیرت پر حجاب رہتا ہے' اس لئے وہ کوئی عبرت حاصل نہیں کرتے' اور عالم ظاہری میں محبوس و مقید رہتے ہیں' اس قید سے نکلنا نصیب نہ ہوگا ان پر جہنم کے دروازے کھل جائیں گے اور یہ قید خانہ آگ سے پر ہے' اور یہ آگ دلوں پر چھا گئی ہے' لوگ اس آگ کی حرارت اس لئے محسوس نہیں کرتے کہ انکے اور آگ کے درمیان ایک رکاوٹ ہے' یہ رکاوٹ موت سے دور ہو جائے گی' اس وقت وہ آگ کی تکلیف محسوس کریں گے' اور جس حقیقت کا یہاں انکار کرتے ہیں وہاں اعتراف کریں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ جنت اور دوزخ دو مخلوق ہیں' لیکن کبھی دوزخ کا ادراک ایسے ذریعہ علم سے ہوتا ہے جسے علم الیقین کہتے ہیں اور کبھی ایسے ذریعہ علم سے جسے عین الیقین کہتے ہیں لیکن عین الیقین کا تعلق صرف عالم آخرت سے ہے' جب کہ علم الیقین دنیا میں بھی حاصل ہو جاتا ہے' لیکن صرف ان لوگوں کو جو نور یقین رکھتے ہوں' ارشاد ربانی ہے:۔
كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ (پ۳۰ر۲۷ آیت ۵-۶)
ہرگز نہیں! اگر تم لوگ یقینی طور پر جان لیتے واللہ تم لوگ ضرور دوزخ کو دیکھو گے۔
اس کا تعلق دنیا سے ہے پھر ارشاد فرمایا :۔
ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ (پ۳۰ر۲۷ آیت ۷)
پھر واللہ تم لوگ اس کو ایسا دیکھنا دیکھو گے جو نور یقین ہے۔
اس یقین کا تعلق آخرت سے ہے' اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ جو قلب آخرت میں سلطنت کریں گے وہ بہت کم ہوں گے' جس طرح وہ لوگ بہت کم ہوتے ہیں' جو دنیا میں سلطنت کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

چھٹی تقسیم: یہ تقسیم تمام نعمتوں کو حاوی ہے' اس تقسیم کا حاصل یہ ہے کہ نعمتیں دو قسم کی ہیں' یا تو وہ نعمت جو بذات خود غایت مطلوب ہیں' اخروی سعادت ہے' اور اسمیں چار امور شامل ہیں وہ بقا جو فنا نہ ہو' وہ سرور جس میں کوئی غم نہ ہو' وہ علم جسکے ساتھ کوئی جہل نہ ہو' وہ مالداری جس میں فقر نہ ہو' سعادت اخروی ہی حقیقی نعمت ہے۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ لَا عَيْشَ اِلَّا عَيْشَ الْآخِرَةِ (بخاری و مسلم۔ انس) آخرت کی زندگی کے سوا کوئی زندگی نہیں۔
یہ قول آپ نے نفس کی تسلی کے لئے شدت اور سختی کے ماحول میں فرمایا' ان دنوں آپ اپنے رفقاء کے ساتھ خندق کھودنے میں مصروف تھے' اور ایک ایک لمحہ سخت گزر رہا تھا' ایک مرتبہ آپ نے یہ الفاظ خوشی کے موقع پر بھی فرمایا تاکہ نفس اس خوشی پر قانع نہ ہو جائے' اور اسے یہ خیال رہے کہ اس زندگی کے بعد بھی ایک زندگی ہے جسے فنا نہیں ہے' وہاں صرف سرور ہوگا جو کبھی غم میں تبدیل نہ ہوگا' یہ حج الوداع کا موقعہ تھا' لوگ آپ کے چاروں طرف جمع تھے (حاکم) ایک مرتبہ ایک شخص نے یہ دعا مانگی :۔
اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْاَلُكَ تَمَامَ النِّعْمَةِ اے اللہ! میں آپ سے کمال نعمت کی درخواست کرتا ہوں۔
آپ نے اس شخص سے دریافت کیا کیا تم جانتے ہو کمال نعمت کیا ہے۔ اس نے عرض کیا نہیں! آپ نے فرمایا جنت میں داخل ہونا کمال نعمت ہے۔

وسائل کی قسمیں: غایت مطلوب کے وسائل کی چار قسمیں ہیں' ایک مخصوص تر قریب تر جیسے فضائل نفس' دوسرے جو قرب میں فضائل نفس سے قریب ہوں جیسے بدن کے فضائل' تیسرے وہ جو خارج از بدن ہوں' لیکن قرب میں فضائل بدن سے قریب جیسے بدن سے متعلقہ اسباب مال' بیوی بچے اور اعزہ۔ چوتھے وہ جو نفس سے خارج اور نفس کے لئے حاصل اسباب کے جامع

ہوں جیسے توفیق اور ہدایت۔ چار قسمیں ہیں ذیل میں ہم ان پر الگ الگ گفتگو کرتے ہیں۔

پہلی قسم مخصوص تر وسائل: ان سے مراد فضائل نفس ہیں 'اگرچہ فضائل نفس کے فروع بے شمار ہیں 'لیکن انہیں دو اصلوں میں سمیٹا جاسکتا ہے 'ایمان اور حسن خلق 'پھر ایمان کی دو قسمیں ہیں علم مکاشفہ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی ذات 'صفات اسکے ملائکہ اور پیغمبروں کا علم ہے 'دوسری قسم علم معاملہ ہے۔ حسن خلق کی بھی دو قسمیں ہیں۔ اول شہوات اور غضب کے مقتضیات ترک کرنا 'اس کا نام عفت ہے 'دوم شہوات کے ارتکاب اور ترک ارتکاب میں عدل کی رعایت کرنا 'یہ نہ ہو کہ جہاں دل چاہے اقدام کرے اور جہاں دل نہ چاہے وہاں اقدام سے باز رہے 'بندے کو اپنے اقدام اور ترک دونوں میں اس عدل کو مد نظر رکھنا چاہیے کہ جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی ہے۔

اَلَّا تَطْغَوْا فِی الْمِیْزَانِ وَاَقِیْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِیْزَانَ (پ ۲۷ ر ۱۱ آیت ۸-۹)

تاکہ تم تولنے میں کمی بیشی نہ کرو اور انصاف کے ساتھ وزن کو ٹھیک رکھو۔

اس صورت میں ہر وہ شخص میزان عدل سے منحرف ہوگا جو نکاح سے بچنے کے لئے اپنی شہوت زائل کردے 'یا قدرت رکھنے اور تمام آفات سے محفوظ رہنے کے باوجود نکاح نہ کرے 'یا کھانا پینا ترک کردے یہاں تک کہ عبادت اور ذکر و فکر کی سکت باقی نہ رہے۔ اسی طرح وہ شخص بھی عادل نہیں جو شکم اور شرمگاہ کی شہوات میں سر سے پاؤں تک ڈوب جائے 'عدل یہ ہے کہ میزان عدل کے دونوں پلڑے برابر رہیں 'ایسا نہ ہو کہ ایک پلڑا خالی ہو جائے اور دوسرا وزن کی وجہ سے جھک جائے 'معلوم ہوا کہ وہ فضائل جو نفس کے ساتھ مخصوص ہیں اور اللہ تعالیٰ سے قریب کرنے والے ہیں 'چار قسم کے ہیں علم مکاشفہ 'علم معاملہ 'عفت اور عدالت 'فضائل نفس کی تکمیل کے لئے فضائل بدن بھی ناگزیر ہیں اس لئے ذیل میں ان کا ذکر کیا جاتا ہے۔

دوسری قسم فضائل بدنی: اس کی بھی چار ہی قسمیں ہیں صحت 'جمال اور طول عمر۔ یہ فضائل تیسری قسم کی فضائل سے خاص ہوتے ہیں جو بدن سے خارج اور اسکے محیط ہیں ان کی بھی چار قسمیں ہیں۔

تیسری قسم فضائل غیر بدنی: ان فضائل سے بھی آدمی اس وقت تک منتفع نہیں ہوسکتا جب تک چوتھی قسم کے فضائل حاصل نہ ہوں جو بدنی 'خارجی 'اور نفسی تمام فضائل کو جامع ہیں۔

چوتھی قسم جامع فضائل: اسکی بھی قسمیں ہیں 'اللہ کی ہدایت 'ارشاد 'تسدید اور تائید 'اس طرح اگر ہم تمام نعمتوں کو چار میں 'پھر ان چاروں میں سے ہر قسم کو چار پر تقسیم کریں تو کل قسموں کی تعداد سولہ ہوتی ہے۔ اس تقسیم کے ضمن میں یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ ان قسموں میں سے بعض بعض کی طرف محتاج ہیں 'خواہ یہ احتیاج ضروری ہو 'یا نافع ہو۔ ضروری احتیاج کی مثال یہ ہے کہ سعادت اخروی ایک نعمت ہے 'اور یہ نعمت ایمان اور حسن اخلاق کی بہر صورت محتاج ہے 'کیوں کہ ایمان اور حسن اخلاق کے بغیر آخرت کی سعادت حاصل ہی نہیں ہو سکتی 'انسان کو آخرت میں وہی حاصل ہوگا جو وہ دنیا میں کمائے گا 'ہر شخص کو آخرت میں وہی ملتا ہے جو وہ دنیا میں توشہ کرتا ہے 'اسی طرح فضائل نفسی کو کسب علوم کی ضرورت ہے 'اور تہذیب اخلاق کے لئے جسمانی صحت ضروری ہے۔ لیکن جو حاجت صرف نافع ہو اس کا ضروری ہونا ضروری نہیں ہے۔ اسکی مثال ایسی ہے جیسے نفسی اور بدنی فضائل کو خارج کی حاجت ہوتی ہے 'جیسے مال 'جاہ اور اہل و عیال کی 'مگر یہ حاجت ضروری نہیں ہے 'صرف نافع ہے 'اگر یہ حاجت پوری ہو تو اس سے بہت سے کام تکمیل پائیں 'اور پوری نہ ہو تو یہ ممکن ہے کہ بعض فضائل نفسی اور بدنی میں خلل واقع ہو۔

طریق آخرت کے لئے خارجی نعمتوں کی ضرورت: سوال یہ ہے کہ طریق آخرت کے لئے مال 'جاہ 'اولاد وغیرہ جیسی خارجی نعمتوں کی کیا ضرورت ہے۔ اسکا جواب یہ ہے کہ اسباب کی مثال ایسی ہے جیسے بازو جو منزل مقصود تک پہنچائیں یا آلہ جس سے

مقصد کا حصول سہل ہو مثلاً مال ہی کو لیجئے' یہ ایک بڑی نعمت ہے' مال ہو تو آدمی بے شمار پریشانیوں سے محفوظ رہتا ہے' تنگدست انسان تو صحیح طور پر نہ علم حاصل کرسکتا ہے نہ کسی فن میں کمال پیدا کرسکتا ہے' الا ماشاء اللہ۔ بلکہ مال کے بغیر کسب علم اور اکتساب کمال کرنے والا انسان ایسا ہے جیسے بغیر ہتھیار کے لڑنے والا' یا بازوؤں سے محروم شکاری پرندہ۔ مال کی تعریف میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :۔

نِعْمَ الْمَالُ الصَّالِحُ لِلرَّجُلِ الصَّالِحِ (احمد' ابو یعلی' طبرانی۔ عمرو ابن العاص)
کتنا اچھا ہے بہترین مال نیک آدمی کے لئے۔

نِعْمَ الْعَوْنُ عَلَى تَقْوَى اللّٰهِ الْمَالُ (ابو منصور دیلمی۔ جابر) اللہ کے خوف پر بہترین معاون مال ہے۔

مال کی اس قدر اہمیت کیوں نہ ہو' ہم دیکھتے ہیں کہ مفلس انسان اپنے بہترین اوقات کو ذکر و فکر میں مشغول رکھنے کے بجائے معاش کی جستجو اور لباس و مسکن کی فکر میں صرف کرتا ہے' صحیح طریقے پر عبادت نہیں کرپاتا' حج' زکوٰۃ اور خیرات و صدقات جیسے اعمال خیر سے محروم رہتا ہے' کسی دانشور سے دریافت کیا گیا نعمت چیز کیا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ مالداری' کیوں کہ میرے نزدیک تنگدست کی کوئی زندگی نہیں ہے' سائل نے کہا کہ کچھ اور بتلائیں' دانشور نے کہا امن' اس لئے کہ میرے خیال میں خوف زدہ کی کوئی زندگی نہیں' سائل نے کہا مزید بتلائیں' اس نے کہا تندرستی اس لئے کہ مریض کی زندگی زندگی نہیں' سائل نے مزید درخواست کی دانشور نے جواب دیا کہ جوانی اس لئے کہ بڑھاپے کی زندگی بے لطف ہے' گویا دانشور نے دنیا کی ان تمام نعمتوں کی طرف اشارہ کیا جو آخرت پر معاون ہیں' حدیث شریف میں ہے۔

وَمَنْ أَصْبَحَ مُعَافًى فِي بَدَنِهِ آمِنًا فِي سِرْبِهِ عِنْدَهُ قُوتُ يَوْمِهِ فَكَأَنَّمَا خِيْرَتْ لَهُ الدُّنْيَا بِحَذَافِيْرِهَا (ترمذی' ابن ماجہ۔ عبید اللہ)
جو شخص اس حال میں صبح کرے کہ اسکے بدن کو صحت' اور نفس کو امن ہو' اور اسے اس روز کی غذا میسر ہو گویا اسے پوری دنیا حاصل ہے۔

جس طرح انسان کو مال کی ضرورت ہے اسی طرح بیوی اور بچوں کی ضرورت بھی ہے' بیوی کے سلسلے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے ۔

نِعْمَ الْعَوْنُ عَلَى الدِّيْنِ الْمَرْأَةُ الصَّالِحَةُ (۱) نیک عورت دین پر بہترین معاون ہے۔

اولاد کے متعلق آپ نے فرمایا:۔

إِذَا مَاتَ الْعَبْدُ انْقَطَعَ عَمَلُهُ إِلَّا مِنْ ثَلَاثٍ وَلَدٍ صَالِحٍ يَدْعُوْ لَهُ (مسلم۔ ابو ہریرہ)
جب آدمی مرجاتا ہے تو اسکے اعمال کا سلسلہ منقطع ہوجاتا ہے مگر تین (چیزیں باقی رہتی ہیں ان میں سے ایک) نیک لڑکا ہے جو اسکے لئے دعائے خیر کرتا ہے۔

بیوی اور بچوں کے فوائد ہم کتاب النکاح میں لکھ چکے ہیں یہاں ان کے اعادے کی ضرورت نہیں ہے'۔

اقارب کا وجود بھی کسی نعمت سے کم نہیں' آدمی کے لئے اسکے بچے اور اقارب آنکھ اور ہاتھ کے مانند ہیں' ان کی وجہ سے بہت سے وہ کام سہل ہوجاتے ہیں جو آخرت کے لئے ضروری ہیں' بالفرض اگر وہ تنہا ہوتا تو انھیں انجام نہ دے پاتا یا انجام دے لیتا تو کافی وقت ان کی نذر کرتا' اولاد' اور اقارب سے بہت سے دینی امور پر مدد ملتی ہے' اور جن چیزوں سے دین پر مدد ملے ان کے نعمت ہونے میں کوئی شبہ نہیں کیا جاسکتا۔

عزت اور جاہ کے ذریعے انسان اپنے نفس سے ظلم اور ذلت دور کرتا ہے' جاہ و عزت سے کوئی مسلمان بے نیاز نہیں رہ سکتا' اس

(۱) مسلم میں اس مضمون کی ایک روایت ہے مگر الفاظ مختلف ہیں

لئے کہ جو انسان اسلام کا حلقہ بگوش ہو جاتا ہے ایک بڑی دنیا اس کے درپے آزار ہو جاتی ہے' اور اس کی عزت و آبرو پر حملہ کرنا اپنا شعار بنالیتی ہے اسطرح مسلمان جمعیت قلبی اور سکون دلی سے عبادت نہیں کرپاتا' قلب تفکرات اور پریشانیوں کی آماجگاہ بنا رہتا ہے' قلب ہی انسان کا اصل سرمایہ ہے اگر یہی خطرہ میں پڑجائے تو وہ آخرت کیلئے کیا کماپائے گا' اس لئے قلب کی حفاظت کے لئے عزت و جاہ بھی ضروری ہے' بعض اکابر نے دین و سلطنت کو دو جڑواں بچے قرار دیا ہے' ان میں سے ایک دوسرے سے جدا نہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ (پ ۲ ر ۱۷ آیت ۲۵)

اور اگر یہ بات نہ ہوتی کہ اللہ تعالیٰ بعض آدمیوں کو بعض کے ذریعے سے دفع کرتے رہا کرتے تو (تمام) زمین فساد سے پر ہو جاتی۔

جاہ کے معنی ہیں دلوں کا مالک ہونا' جس طرح آدمی روپے پیسے کا مالک بن سکتا ہے' اسی طرح دلوں کا مالک بھی بن سکتا ہے' بہت سے کام ایسے ہیں جو دولت سے پورے نہیں ہوتے" بلکہ دلوں کا مالک ہونا ضروری ہوتا ہے' جب تم کسی پریشانی میں مبتلا ہوتے ہو' یا کسی خطرے سے دوچار ہوتے ہو' تو وہ لوگ تمہارے لئے سینہ سپر ہو جاتے ہیں جن کے دلوں پر تمہارا سکہ چلتا ہے' جس طرح تمہیں بارش سے حفاظت کے لئے چھت کی' سردی سے تحفظ کے لئے کپڑوں کی' مال کی حفاظت کے لئے شکاری کتے کی ضرورت پیش آتی ہے اسی طرح شر سے مدافعت کے لئے بھی تمہیں کسی شخص کی ضرورت ہے' اسی لئے وہ انبیاء کرام جو کسی ملک کے حکمراں نہیں تھے' اپنے دور کے حکمرانوں کے ساتھ رعایت کا معاملہ کرتے تھے' اور ان کے دلوں میں اپنے لئے جگہ بناتے تھے' تاکہ وہ ان کے ساتھ شر کا معاملہ نہ کریں' علماء دین کا بھی یہی معمول رہا' ان حضرات کا منشاء یہ نہیں ہوتا کہ بادشاہوں کے خزانوں سے اپنی جیبیں بھریں' یا ان کے اختیارات سے ناجائز فائدہ اٹھائیں' اور دنیاداروں پر حکمرانی کریں۔ تمہیں یہ گمان نہ کرنا چاہیے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر اس وقت نعمت زیادہ تھی جب مکہ مکرمہ فتح ہوا' اس وقت نہ صرف یہ کہ اللہ نے آپ کی نصرت فرمائی' دشمنوں پر آپ کو فتح دی' انکے دلوں میں آپ کی محبت اور ہیبت پیدا فرمائی اور عزت و جاہ میں اضافہ فرمایا بلکہ اس دن اپنے دین کی تکمیل فرمائی' اور آپ کے ذریعے اس کا اعلان و اظہار فرمایا' اور اس وقت اللہ کی نعمت آپ پر کم تھی جب آپ اسلام کے ابتدائی دنوں میں مکہ مکرمہ میں تھے' اور دشمنان خدا آپ کو ایذا پہنچارہے تھے' ان کے شر سے بچنے کے لئے آپ نے مدینہ منورہ ہجرت فرمائی۔ تمہارا یہ گمان صحیح نہیں ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دونوں زمانوں میں یکساں نعمت حاصل رہی ہے۔ نسب کی عمدگی اور خاندانی شرافت بھی اپنی جگہ ایک اہم ترین نعمت ہے۔ حدیث شریف میں ہے :۔

اَلْاَئِمَّةُ مِنْ قُرَيْشٍ (نسائی' حاکم۔ انس) سردار قریش میں سے ہیں۔

اس لحاظ سے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم عرب کے اعلاء اور اشرف قبیلے کے ایک فرد ہوئے (۱) ایک حدیث میں ہے آپ نے ارشاد فرمایا :۔ تَخَيَّرُوْا لِنُطَفِكُمْ (ابن ماجہ۔ عائشہ) اپنے نطفوں کے لئے اچھا انتخاب کرو۔

ایک حدیث میں ہے آپ نے فرمایا :۔ اِيَّاكُمْ وَخَضْرَاءَ الدِّمَنِ کوڑی کے سبزے سے بچو۔

لوگوں نے عرض کیا کوڑی کے سبزے سے کیا مراد ہے؟ فرمایا : وہ خوبصورت عورت جو خراب نسب رکھتی ہو (۲) خاندانی شرافت سے ہماری یہ مراد نہیں کہ تم ظالموں اور دنیاداروں سے اپنی رشتہ داری قائم کرو' بلکہ منشاء یہ ہے کہ وہ گھرانہ تلاش کرو جس کا سلسلہ نسب سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملتا ہو' یا صالحین' علماء' اور بزرگان دین اور علم و عمل میں شہرت رکھنے والوں پر منتہی ہوتا ہو۔

فضائل بدنی کی ضرورت : خارجی فضائل کی طرح بدنی فضائل کی بھی ضرورت پڑتی ہے' جیسے صحت' قوت' اور طول عمر' ان

(۱) اس مضمون کی ایک روایت مسلم میں واثلہ ابن اسقع سے مرفوعاً منقول ہے (۲) یہ روایت کتاب النکاح میں گزری ہے

کی ضرورت اس لئے ہے کہ علم و عمل کی تکمیل ان ہی سے ہوتی ہے' سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد مبارک سے طول عمر کے نعمت ہونے پر روشنی پڑتی ہے' فرمایا :-

أَفْضَلُ السَّعَادَةِ طُوْلُ الْعُمْرِ فِي عِبَادَةِ اللّٰهِ (۱) بہترین سعادت یہ ہے کہ اللہ کی عبادت میں دیر تک زندہ رہے۔

ان تمام نعمتوں میں جمال کا پہلو ذرا کمزور ہے' بعض لوگ تو یہ کہتے ہیں کہ عبادت کے لئے بدن کا امراض سے خالی ہونا ہی کافی ہے' لیکن ہمارے خیال میں اگرچہ ذکر و فکر اور دوسرے اعمال حسنہ کے لئے جمال کی ضرورت نہیں ہے مگر اسکے باوجود اسکے نعمت ہونے میں کوئی شبہ نہیں کیا جاسکتا' جہاں تک دنیا کا تعلق ہے' اس میں اس کا نفع مخفی نہیں ہے' اور آخرت میں بھی دو اعتبار سے مفید ہے' ایک تو اس لئے کہ لوگ برے کی مذمت کرتے ہیں اور طبائع اس سے نفرت کرتی ہیں' خوبصورت آدمی کی ضرورتیں جلد پوری کی جاتی ہیں' دلوں میں اسکے لئے محبت اور احترام کے جذبات ہوتے ہیں' گویا جمال بھی مال اور دیگر ذرائع کی طرح ایک وسیلہ ہے' اسکے ذریعہ انسان منزل مقصود تک پہنچتا ہے' خوبصورتی میں بھی ایک طرح کی قدرت پائی جاتی ہے' خوبصورت آدمی بدصورت آدمی کے مقابلے میں اپنی حاجات کی تکمیل پر زیادہ قادر ہوتا ہے۔ اپنی اس خوبی سے وہ ایسے کاموں میں بھی فائدہ اٹھا سکتا ہے جو آخرت کے لئے مفید ہوں۔ خوبصورتی آخرت میں اس اعتبار سے بھی مفید ہے کہ ظاہر کا حسن باطن کے حسن پر دلالت کرتا ہے' اس لئے کہ جب نفس کا نور مکمل ہو جاتا ہے تو اس کا اجالا ظاہری اعضاء پر پھیلنے لگتا ہے' اکثر ظاہر و باطن یکساں ہوتے ہیں' اسی لئے زیرک لوگ شرافت نفس کی معرفت کیلئے ظاہر کو دلیل بنایا کرتے تھے' چنانچہ یہ ایک حقیقت ہے کہ اندرونی کرب اور مسرت کا اظہار آدمی کے چہرے اور آنکھ سے ہوتا ہے' کہتے ہیں کہ کشادہ پیشانی آدمی کی بلند اقبالی اور اولوالعزمی پر دلالت کرتی ہے' بدصورت انسان کا چہرہ اپنے باطن کا اظہار کردیتا ہے۔ ایک مرتبہ خلیفہ مامون نے اپنی فوج کا معائنہ کیا' اس دوران اسکے سامنے ایک بدصورت آدمی پیش کیا گیا' جب مامون نے اس سے گفتگو کی تو پتہ چلا کہ وہ ہکلا بھی ہے' یہ دیکھ کر مامون نے اسے فوجی خدمات سے معزول کردیا اور لوگوں سے کہا کہ جب روح کی چمک چہرے پر نمودار ہوتی ہے تو خوبصورتی کا باعث بنتی ہے' اور باطن پر عیاں ہوتی ہے' تو فصاحت کا روپ اختیار کرتی ہے' یہ شخص ظاہر و باطن دونوں کے حسن سے محروم ہے۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں۔

اُطْلُبُوا الْخَيْرَ عِنْدَ صِبَاحِ الْوُجُوْهِ (بیہقی۔ ابن عمرؓ) خیر خوبصورتوں کے پاس تلاش کرو۔

حضرت عمرؓ ارشاد فرماتے ہیں کہ جب تم کسی شخص کو قاصد بنا کر بھیجو تو یہ دیکھو کہ وہ اچھے چہرے اور خوبصورت نام والا ہے یا نہیں' فقہاء کے نزدیک اگر چند لوگ ایسے جمع ہو جائیں جو یکساں طور پر امامت کے مستحق ہوں تو خوب رو کو ترجیح دی جائے گی۔ اللہ تعالیٰ نے ایک جگہ جمال کو بطور احسان ذکر فرمایا :-

وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ (پ ۲ ر ۱۶ آیت ۲۴۷)

اور علم اور جسامت میں ان کو زیادتی دی ہے۔

خوبصورتی سے ہماری مراد انسان کا وہ وصف نہیں ہے جس سے شہوت میں تحریک ہو' یہ تو زنانہ پن ہے جمال بلند قامت' معتدل جسامت' اور متناسب اعضاء کے مجموعے کا نام ہے ساتھ ہی چہرے کے نقوش بھی اچھے ہوں تاکہ دیکھنے والے کو نفرت نہ ہو۔

نعمت بھی مذمت بھی : یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر مال' جاہ' اہل' اولاد' اور نسب وغیرہ نعمتیں ہیں تو اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ان کی مذمت کیوں فرمائی ہے۔ ارشاد ربانی ہے :-

إِنَّ مِنْ أَزْوَاجِكُمْ وَأَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ (پ ۲۸ ر ۱۶ آیت ۱۴)

تمہاری بعض بیویاں اور اولاد تمہارے (دین کی) دشمن ہیں سو تم ان سے ہوشیار رہو۔

إِنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ (پ ۲۸ ر ۱۶ آیت ۱۵)

---

(۱) یہ روایت ان الفاظ میں غریب ہے۔ البتہ ترمذی میں اسی مضمون کی ایک روایت ابوبکرؓ سے منقول ہے

تمہارے اموال اور اولاد بس تمہارے لئے آزمائش کی چیز ہے۔

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی مال و جاہ کی مذمت فرمائی ہے' اور صحابہ وعلماء نے بھی' حضرت علیؓ نے نسب کی مذمت میں ارشاد فرمایا کہ آدمی اپنے اعمال خیر کا بیٹا ہے' اور ہر شخص کی قیمت اسکے اعمال حسنہ کو سامنے رکھ کر مقرر کی جاتی ہے' کہا جاتا ہے کہ آدمی اپنی ذات سے ہوتا ہے نہ کہ اپنے باپ سے' ان آیات' روایات اور آثار کی موجودگی میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر مال' جاہ وغیرہ نعمتیں ہیں تو ان کی مذمت کیوں کی جاتی ہے' اور اگر یہ چیزیں قابل مذمت ہیں تو پھر انھیں نعمت کیسے کہا جاسکتا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ جو شخص موؤل اور منقول الفاظ' اور عام مخصوص منہ البعض سے علوم اخذ کرتا ہے اس پر عموماً گمراہی غالب رہتی ہے' یہاں تک کہ وہ اللہ تعالیٰ کے نور ہدایت کی روشنی میں علوم کو ان کی اصل ماہیت اور حقیقت پر حاصل نہ کرلے' اور پھر منقول کو کبھی تاویل اور کبھی تخصیص کے ساتھ اس حقیقت کے ساتھ ہم آہنگ نہ کرے' اس تمہید کے بعد عرض ہے کہ اوپر جن چیزوں کو نعمت قرار دیا گیا ہے' ان کے نعمت ہونے میں' یا راہ آخرت پر معین ہونے میں کسی شبہے یا انکار کی گنجائش نہیں ہے' لیکن ساتھ ہی اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا ہے کہ ان نعمتوں میں فتنے بھی ہیں' مثلاً مال کو لیجئے' ایک ایسے سانپ کی مانند ہے جس میں مہلک زہر بھی ہے' اور نافع تریاق بھی۔ اب کوئی ایسا شخص سانپ پکڑتا ہے جسے زہر سے بچنا بھی آتا ہے اور تریاق نکالنا بھی تو سانپ اسکے حق میں نعمت ہے' اور اگر کسی کو یہ معلوم نہیں کہ سانپ کا تریاق کیسے نکالا جاتا ہے تو یہ اسکے حق میں مصیبت اور باعث ہلاکت ہے یا مال ایک سمندر کی طرح ہے جس کی تہہ میں قیمتی موتی اور جواہر چھپے ہوئے ہیں' جو شخص تیرنا جانتا ہے' اور سمندر میں گہرائی تک ڈوب کر ابھرنے کے فن سے واقف ہے' اور سمندر کے خطرات سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ رکھتا ہے تو یہ اسکے حق میں نعمت ہے' اگر کوئی ایسا شخص زر و جواہر کے لالچ میں سمندر کی تہہ کو پامال کرنے کے ارادے سے کودے گا جو تیراکی کے فن سے ناآشنا ہے تو اس کا انجام اسکے سوا کچھ نہ ہوگا کہ سمندر کے خطروں میں گھر کر جان سے ہاتھ دھو بیٹھے' خلاصہ یہ ہے کہ ایسا شخص ہلاک ہوگا' سمندر اسکے حق میں یقیناً نعمت نہیں ہے' بلکہ ایک زحمت ہے۔ بہرحال اللہ اور اسکے رسول نے اسی لئے مال کی تعریف فرمائی ہے اور اسے خیر فرمایا ہے' سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے مال کو خوف پر بہترین معاون قرار دیا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے جاہ اور عزت کی بھی مدح فرمائی ہے کہ اپنے رسول کو جاہ و عزت سے نوازا' اسکے لائے ہوئے دین کو تمام ادیان پر غلبہ عطا کیا' اور بندوں کے دلوں میں اسکی عظمت اور ہیبت پیدا فرمائی' جاہ سے یہی مقصود بھی ہے' تاہم اتنی بات صحیح ہے کہ جاہ و مال کی مدح اتنی نہیں کی ہے جتنی مذمت کی ہے' شریعت میں جہاں جہاں ریا کی مذمت کی گئی ہے وہ بھی جاہ ہی کی مذمت ہے' اس لئے کہ ریا کا مطلب ہے دلوں کو اپنی طرف کھینچنا' اور جاہ کے معنی ہیں دلوں کا مالک ہونا۔ ان دونوں کا مفہوم ایک ہی ہے۔

قلت مدح اور کثرت ذم کی وجہ: رہا یہ سوال کہ مال و جاہ کی مدح کم اور مذمت زیادہ کیوں ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اکثر لوگ سانپ کو قابو میں کر کے تریاق نکالنے کے فن سے ناواقف ہیں' اسی طرح کثرت ایسے لوگوں کی ہے جو سمندر میں غوطہ لگانا نہیں جانتے اسی لئے انھیں سانپ اور سمندر میں غوطہ لگانے سے ڈرانا ضروری ہے کیونکہ ناواقف آدمی سانپ کو ہاتھ لگاتے ہی زہر کا شکار ہوجاتا ہے' اور تریاق ملنے سے پہلے ہی ہلاک ہوجاتا ہے' اسی طرح فن شناوری سے ناآشنا زر و جواہر حاصل کرنے سے پہلے ہی سمندر کے جانوروں کی غذا بن جاتا ہے۔ اگر مال و جاہ ہر شخص کے لئے اور ہر زمانے میں قابل مذمت ہوتے تو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت کے ساتھ جاہ نہ ملتی' اور نہ حضرت سلیمان علیہ السلام کو سلطنت عطا کی جاتی دراصل عام لوگ نادان اور نو عمر لڑکے کی طرح ہیں' جو عاقبت کی پروا کئے بغیر ہر سنہری اور چمکیلی چیز کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہیں' جب کہ انبیاء علیہ السلام ان بالغ نظروں کی طرح ہیں جو تیراکی کے فن سے آشنا ہوتے ہیں اور سانپ کو قابو میں کرنے کے طریقے جانتے ہیں' جن چیزوں سے بچوں کو ضرر ہوتا ہے' ان بالغ نظروں کو ان چیزوں سے ضرر نہیں پہنچتا۔

البتہ ایک شخص سانپ کو قابو کرنے کے فن سے واقف ہے' اور اسے تریاق کی ضرورت بھی ہے دوسری طرف اسکے گھر میں ایک پیارا سا بچہ بھی ہے جو اسے دل و جان سے محبوب ہے' لیکن خطرہ یہ ہے کہ اگر وہ سانپ کو تریاق نکالنے کی غرض سے اپنے گھر

لے گیا تو ہو سکتا ہے بچہ اسے پکڑنا چاہے اور اسکے ساتھ کھیلنے کا ارادہ کرے' اگر اس نے ایسا کیا تو وہ یقینی طور پر ہلاک ہو جائے گا اس صورت میں اس شخص کو اپنے مقصد تریاق' اور بچے کی بقا میں موازنہ کرنا چاہیے' ان دونوں میں کیا چیز ضروری ہے۔ اگر اسکا خیال یہ ہو کہ تریاق میرے لئے زیادہ ضروری نہیں ہے' بلکہ بچے کا وجود زیادہ ضروری ہے تو اسے سانپ سے دور بھاگنا چاہیے' اور بچے کو بھی اس سے دور رکھنا چاہیے' اور اسکے علم میں یہ بات لے آنی چاہیے کہ وہ کوئی کھیل نہیں ہے' بلکہ ایک زہر جو جسم کے اندر پہنچتے ہی ہلاک کر دیتا ہے' اسے تریاق کے نفع سے ہرگز آگاہ نہ کرنا چاہیے' ایسا نہ ہو کہ وہ مکمل واقفیت کے بغیر اسکے پکڑنے کے لیے قدم اٹھائے اور ہلاک ہو جائے' یہی حال غواص کا ہے اسے اپنے بیٹے کے سامنے ہرگز سمندر میں غوطہ نہ لگانا چاہیے' ہو سکتا ہے کہ باپ کی اتباع میں وہ بھی سمندر میں کود پڑے اور ہلاک ہو جائے' بچے کو سمندر اور دریا کے ساحل سے دور رکھے' اگر بچہ منع کرنے سے باز نہ آئے' اور ساحل کے قرب و جوار میں دوڑتا پھرے تو ہر ماں باپ کی ذمہ داری ہے کہ بچے کو لیکر خود بھی ساحل سمندر سے دور چلا جائے اور جب تک وہ آنکھوں کے سامنے رہے ساحل پر قدم نہ رکھے۔

امت کی مثال: امت کی مثال ایسی ہے جیسے اپنے آباء کی گود میں بچے معصوم اور ناسمجھ ہوتے ہیں۔ اسی لئے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

إِنَّمَا أَنَا لَكُمْ مِثْلُ الْوَالِدِ لِوَلَدِهِ (مسلم۔ ابو ہریرہ۔ بلفظ آخر)

میں تمہارے لئے ایسا ہوں جیسے باپ اپنے بیٹے کے لئے ہوتا ہے۔

ایک حدیث میں ہے ارشاد فرمایا:۔

إِنَّكُمْ تَتَهَافَتُونَ عَلَى النَّارِ تَهَافُتَ الْفِرَاشِ وَأَنَا آخِذٌ بِحُجَزِكُمْ (بخاری و مسلم۔ ابو ہریرہ۔ بلفظ آخر)

تم لوگ آگ پر پروانوں کی طرح گرتے ہو اور میں تمہاری کمریں پکڑ کے کھینچتا ہوں۔

انبیاء کرام علیہم السلام کی بعثت کا اہم ترین مقصد اپنی اولاد یعنی امت کو ہلاکت سے بچانا تھا' مال سے انھیں کوئی دلچسپی نہیں تھی' مال میں سے صرف اتنا لیتے جتنا قوت کے لئے کافی ہوتا' اگر زائد مال آ جاتا تو اسے اپنے پاس نہ رکھتے بلکہ خیرات کر دیتے' کیونکہ مال کا خیرات کر دینا ہی تریاق ہے' روکنا زہر ہے' اگر لوگوں کے لئے کسب مال کا دروازہ کھول دیا جائے اور انھیں مال جمع کرنے اور بچانے کی ترغیب دی جائے تو وہ روکنے کے زہر کی طرف مائل ہو جائیں' اور خیرات کے تریاق کی طرف دھیان نہ دیں۔

زاد سفر کتنا ہو: ہر مسافر کے لئے ضروری ہے کہ صرف اسی قدر زاد راہ اپنے ساتھ لے جتنی اسے ضرورت ہو' بشرطیکہ یہ ارادہ رکھتا ہو کہ یہ زاد راہ صرف اپنی ذات پر خرچ کرے گا' ہاں اگر یہ عزم ہو کہ اپنے سفر کے رفیقوں اور ساتھیوں پر بھی خرچ کرے گا تو ضرورت سے زیادہ زاد راہ لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اگرچہ حدیث شریف میں یہ تلقین کی گئی ہے۔

لِيَكُنْ بَلَاغُ أَحَدِكُمْ مِنَ الدُّنْيَا كَزَادِ الرَّاكِبِ (ابن ماجہ' حاکم۔ سلمان)

دنیا میں سے تمہارا توشہ اتنا ہونا چاہیے جتنا مسافر کا ہوتا ہے۔

اس حدیث کے معنی یہ ہیں کہ اپنے نفسوں کے لئے صرف اس قدر لیں' جتنی ضرورت ہو' ورنہ اسی حدیث کی روایت کرنے والوں اور اس پر عمل کرنے والوں میں سے بعض ایسے تھے جو ایک ایک لاکھ درہم لیتے اور اسی جگہ خرچ کر ڈالتے' اس میں سے ایک حبہ بھی بچا کر نہ رکھتے' حضرت عبدالرحمن ابن عوف نے جب یہ روایت سنی کہ مالدار مشقت کے ساتھ جنت میں داخل ہوں گے تو انھوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت چاہی کہ جو کچھ میرے پاس ہے وہ سب میں فقراء کے حوالے کر دوں' آپ نے اجازت عطا فرمادی' اسی وقت حضرت جبرئیل علیہ السلام تشریف لائے اور فرمایا کہ انھیں بھوکوں کو کھانا کھلانا' ننگوں کی ستر پوشی کرنے اور مہمانوں کی ضیافت کرنے کا حکم فرمایئے (حاکم۔ عبدالرحمن ابن عوف)

دنیا کی تمام نعمتوں میں امتزاج ہے' دواؤں میں مرض کی آمیزش ہے' نفع میں ضرر ملا ہوا ہے' جو شخص اپنی بصیرت اور کمال

معرفت پر اعتماد رکھتا ہو اسکے لئے اجازت ہے کہ وہ مرض سے بچ کر دوا حاصل کرلے' اور ضرر سے محفوظ رکھ کر نفع اٹھالے' جسے اعتماد نہ ہو اسکے لئے دور رہنا اور خطرات کی جگہوں سے فرار اختیار کرنا ہی بہتر ہے' اگر کوئی شخص سلامت رہ جائے تو یہ اسکے حق میں بڑی نعمت ہے' عام طور پر لوگ محفوظ نہیں رہ پاتے صرف وہ لوگ سلامتی پاتے ہیں جنھیں اللہ سلامت رکھے اور اپنے راستے کی ہدایت سے نوازے۔

توفیقی نعمتوں کی حاجت : دنیا میں کوئی شخص ایسا نہیں ہے جسے توفیقی نعمتوں کی حاجت نہ ہو توفیق کے معنی ہیں بندے کے ارادے اور اللہ تعالیٰ کی قضاء و قدر کے درمیان موافقت ہونا۔ یہ خیر کو بھی شامل ہے اور شر کو بھی' سعادت کو بھی اور شقاوت کو بھی لیکن عرف میں توفیق کا لفظ امور سعادت میں بندے کے ارادے کے ساتھ قضاء الٰہی کی موافقت کے لئے بولا جانے لگا ہے جیسا کہ لغت میں الحاد کے معنی ہیں میلان کے اور اصطلاح میں حق سے انحراف کر کے باطل کی طرف مائل ہونے کو الحاد کہتے ہیں' یہی حال ارتداد کا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ توفیق کی بہرحال ضرورت ہے۔ ایک شعر ہے۔

إِذَا لَمْ يَكُنْ عَوْنٌ مِنَ اللّٰهِ لِلْفَتٰى فَأَكْثَرُ مَا يَجْنِيْ عَلَيْهِ اجْتِهَادُهُ

(اگر انسان کو اللہ کی مدد نہ ملے تو اسکی کوشش خیر بھی گناہ کا سبب بن جاتی ہے)

ہدایت ایک ایسی حقیقت ہے جس کے بغیر کوئی شخص سعادت کا طالب نہیں ہو سکتا' ایک انسان کسی ایسی چیز کا خواہاں ہو سکتا ہے' جس میں اسکی آخرت کی فلاح ہو' لیکن جب وہ یہی نہ جانتا ہو کہ اسکی فلاح کس امر میں مضمر ہے' اور فساد کو صلاح سمجھ لیتا ہو تو اسے محض ارادہ کر لینے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا' اگر ہدایت نہ ہو تو ارادے' قدرت اور اسباب کسی چیز میں کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

رَبُّنَا الَّذِيْ أَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهُ ثُمَّ هَدٰى (پ ۱۶ ر ۱۱ آیت ۵۰)

ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو اسکے مناسب بناوٹ عطا فرمائی' پھر رہنمائی فرمائی۔

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ مَا زَكٰى مِنْكُمْ مِنْ أَحَدٍ أَبَدًا وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَاءُ (پ ۱۸ ر ۹ آیت ۲۱)

تم میں سے کوئی کبھی بھی پاک و صاف نہ ہوتا لیکن اللہ جس کو چاہتا ہے پاک و صاف کر دیتا ہے۔

حدیث شریف میں ہے' سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

لَنْ يُدْخِلَ أَحَدَكُمُ الْجَنَّةَ إِلَّا عَمَلُهُ

تم میں سے ہر شخص کو صرف اسکا عمل جنت میں لے جائے گا۔

صحابہ نے عرض کیا نہ آپ یا رسول اللہ! فرمایا نہ میں (بخاری و مسلم۔ ابو ہریرہ)

منازل ہدایت : ہدایت کی تین منزلیں ہیں' پہلی منزل خیر و شر کی معرفت ہے' قرآن کریم کی اس آیت سے یہی منزل مراد ہے۔

وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ (پ ۳۰ ر ۱۵ آیت ۱۰)

اور ہم نے اسکو دونوں راستے بتلادئے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے تمام بندوں کو ہدایت کی اس نعمت سے نوازا ہے' بعض لوگوں کو عقل عطا کر کے اور بعض کو انبیاء کے ذریعے پیغام پہنچا کر چنانچہ قوم ثمود کے بارے میں ارشاد فرمایا:۔

وَأَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَيْنَاهُمْ فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى (پ ۲۴ ر ۱۷ آیت ۱۷)

اور وہ جو ثمود تھے تو ہم نے انکو راستہ بتلایا سو انھوں نے ہدایت کے مقابلے میں گمراہی کو پسند کیا۔

آسمانی کتابیں، انبیاء کرام، اور بصیرتیں ہدایت کے اسباب ہیں، یہ اسباب تمام مخلوق کو میسر ہیں، ان سے کسی کو روکا نہیں جاتا، صرف وہ لوگ ان اسباب کے حصول اور ان کے موجب پر عمل کرتے ہیں، جن کے دلوں میں کبر، حسد، اور دنیا کی محبت ہو، یا ایسے اسباب میں گرفتار ہوں جن سے بصیرت پر پردے پڑجاتے ہیں، اگرچہ آنکھیں روشن ہوں، ارشاد ربانی ہے:۔

فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلَٰكِن تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ (پ ۱۷ ر ۱۳ آیت ۴۶)

بات یہ ہے کہ آنکھیں اندھی نہیں ہو جایا کرتیں بلکہ دل جو سینوں میں ہیں وہ اندھے ہو جایا کرتے ہیں۔

جن چیزوں سے عقل و خرد پر پردہ پڑتا ہے ان میں عادت، روایات سے انس، اور اپنے آباء و اجداد کے ورثے کو سنبھال کر رکھنے کی خواہش بھی ہے، قرآن کریم نے اسکی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے:۔

إِنَّا وَجَدْنَا آبَاءَنَا عَلَىٰ أُمَّةٍ وَإِنَّا عَلَىٰ آثَارِهِم مُّقْتَدُونَ (پ ۲۵ ر ۸ آیت ۲۳)

ہم نے اپنے باپ دادوں کو ایک طریقے پر پایا ہے اور ہم بھی انکے پیچھے پیچھے چلے جا رہے ہیں۔

کبر اور حسد بھی قبول ہدایت کے لئے زبردست رکاوٹ ہیں، قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا:۔

وَقَالُوا لَوْلَا نُزِّلَ هَٰذَا الْقُرْآنُ عَلَىٰ رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيمٍ (پ ۲۵ ر ۹ آیت ۳۱)

اور کہنے لگے کہ یہ قرآن ان دونوں بستیوں میں سے کسی بڑے آدمی پر کیوں نازل نہیں کیا گیا۔

أَبَشَرًا مِّنَّا وَاحِدًا نَّتَّبِعُهُ (پ ۲۷ ر ۹ آیت ۲۴)

کیا ہم ایسے شخص کا اتباع کریں گے جو ہماری جنس کا آدمی ہے۔

کبر، حسد اور برتری کا احساس یہ ایسے امور ہیں جو دلوں کو اندھا کر دیتے ہیں، اور انھیں ہدایت کے راستے پر چلنے سے باز رکھتے ہیں، ہدایت کی دوسری منزل پہلی منزل کے بعد ہے، اور وہ حاصل ہوتی ہے، مجاہدے کے نتیجے میں۔ اللہ تعالیٰ اسے ہر حال میں ہدایت سے نوازتا ہے۔ ارشاد فرمایا:۔

الَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (پ ۲۱ ر ۳ آیت ۶)

اور جو لوگ ہماری راہ میں مشقتیں برداشت کرتے ہیں ہم ان کو اپنے راستے ضرور دکھائیں گے۔

اس آیت میں بھی یہی مراد ہے:۔

وَالَّذِينَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى (پ ۲۶ ر ۶ آیت ۱۷)

اور جو لوگ راہ پر ہیں اللہ تعالیٰ ان کو اور زیادہ ہدایت دیتا ہے۔

ہدایت کی تیسری منزل اس دوسری منزل کے بعد ہے، یہ ہدایت ایک ایسا نور ہے جو کمال مجاہدہ کے بعد عالم نبوت اور عالم ہدایت میں چمکتا ہے، اور اس نور کی وجہ سے آدمی کو وہ باتیں معلوم ہو جاتی ہیں جو عقل سے معلوم نہیں ہوتیں جس پر شرعی اوامر و نواہی کا مدار ہے، اور جس کے ذریعے علوم کی تحصیل ممکن ہوتی ہے، اس ہدایت کا نام مطلق ہدایت ہے۔ اسکے علاوہ جتنی ہدایتیں ہیں وہ سب اسی کے مقدمات اور حجابات ہیں، یہی ہدایت ایسی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر اپنی طرف منسوب فرمایا ہے، اگرچہ تمام ہدایتوں کا مرجع اللہ ہی کی ذات ہے ارشاد ربانی :۔

قُلْ إِنَّ هُدَى اللَّهِ هُوَ الْهُدَىٰ (پ ۱ ر ۱۴ آیت ۱۲۰)

آپ کہہ دیجئے حقیقت میں ہدایت کا راستہ وہی ہے جو خدا نے بتلا دیا ہے۔

اسی کا نام حیات ہے جیسا کہ قرآن کریم کی اس آیت میں ہے :۔

أَوَمَن كَانَ مَيْتًا فَأَحْيَيْنَاهُ وَجَعَلْنَا لَهُ نُورًا يَمْشِي بِهِ فِي النَّاسِ (پ ۸ ر ۲ آیت ۱۲۲)

ایسا شخص جو کہ پہلے مردہ تھا، پھر ہم نے اس کو زندہ بنا دیا اور ہم نے اسکو ایسا نور دیدیا کہ وہ اسکو لئے ہوئے

آدمیوں میں چلتا ہے۔
اس آیت میں بھی یہی مراد ہے :۔
اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ (پ ۲۳ ر ۲ آیت ۲۲)
سو جس شخص کا سینہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کے لئے کھول دیا اور وہ اپنے پروردگار کے نور پر ہے۔

رشد کے معنی : رشد سے ہماری مراد وہ عنایت الٰہی ہے جو انسان کی اس وقت مدد کرتی ہے جب وہ مقاصد کی طرف متوجہ ہوتا ہے' اگر وہ مقاصد خیر ہوتے ہیں تو اس کے ارادوں کو تقویت دی جاتی ہے' اور برے ہوتے ہیں تو ارادوں میں اضمحلال پیدا کردیا جاتا ہے تقویت دینے اور اضمحلال پیدا کرنے کا یہ عمل باطن سے ہوتا ہے' چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :۔
وَلَقَدْ آتَيْنَا اِبْرَاهِيْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا بِهٖ عَالِمِيْنَ (پ ۱۷ ر ۵ آیت ۵۱)
اور ہم نے پہلے ابراہیم کو ان کی خوش فہمی عطا فرمائی تھی اور ہم ان کو خوب جانتے تھے۔
حاصل یہ ہے کہ رشد ایسی ہدایت کو کہتے ہیں جو جانب سعادت کو قریب تر کرنے کا باعث اور محرک ہو' چنانچہ اگر کوئی لڑکا اس حال میں بالغ ہو کہ وہ مال کی حفاظت' اور اسکو نمو بخشنے کے طریقوں سے واقف ہو' اور تجارت کی تمام تدبیریں جانتا ہو' لیکن اسکے باوجود اسراف کرتا ہو' اور مال بڑھانے کی فکر نہ کرتا ہو تو یہ کہا جائے گا کہ اسے رشد میسر نہیں ہے' اگرچہ اسے خیر و شر کے طریق معلوم ہیں' لیکن اسکی ہدایت اس لحاظ سے ناقص ہے کہ اس سے اسکے ارادۂ خیر کو تحریک نہیں ہوتی' اسی لئے وہ صاحب رشد بھی نہیں ہوا۔ اسی طرح ایک شخص جان بوجھ کر ایسا عمل کرتا ہے جس میں اس کا نقصان ہے تو کہا جائے گا کہ اسے رشد حاصل نہیں ہے' اسے صرف وہ ہدایت حاصل ہے جو خیر کے راستوں سے ناواقف انسان سے ممتاز بناتی ہیں' معلوم ہوا کہ رشد ہدایت سے بڑی نعمت ہے' اس لئے کہ ہدایت میں صرف اعمال خیر کے راستوں کا علم ہوتا ہے' جب کہ رشد سے ان راستوں پر چلنے کی تحریک ہوتی ہے۔ ظاہر ہے اس نعمت میں کمال زیادہ ہے۔

تسدید کی تعریف : تسدید کے معنی ہیں بندے کی حرکات کو مطلوب کی طرف متوجہ کرنا' اور اس پر ان حرکات کو سہل بنادینا تاکہ وہ جلد سے جلد اور صواب کی طرف پختگی کے ساتھ متوجہ ہوجائے۔ جس طرح تنہا ہدایت کافی نہیں ہے' بلکہ اس کے لئے مرشد کی ضرورت ہے جس سے ارادے کو تحریک ہوتی ہے' اسی طرح رشد بھی کافی نہیں ہے' بلکہ اس کے لیے اعضاء کی مساعدت ضروری ہے تاکہ حرکات سہل ہوجائیں' اور جس امر خیر کی طرف تحریک ہوئی ہے وہ پورا ہوجائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہدایت محض تعریف (خیر و شر کا علم دینا) ہے' رشد کے معنی ہیں ہدایت کے لئے ارادے کو تحریک دینا اور اسے بیدار کرنا' اور خیر کی طرف اعضاء کو حرکت کرنے میں مدد دینے کا نام تسدید ہے۔

تائید اور عصمت کے معنی : تائید گویا ان تمام امور کو جامع ہے۔ اسکے معنی یہ ہیں کہ بندے کے باطن میں اسکے ارادۂ خیر کو بصیرت کے باعث تقویت ملے' اور خارج میں اسباب اور لوازم کی اعانت سے قوت پہنچے' اس آیت میں یہی معنی مراد ہیں :۔
اِذْ اَيَّدْتُّكَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ (پ ۷ ر ۵ آیت ۱۱۰)
جب کہ میں نے تم کو روح القدس سے تائید دی۔
تائید سے قریب عصمت ہے' اس کے معنی یہ ہیں کہ آدمی کے باطن میں عنایت الٰہی موجود ہے جس کے باعث وہ خیر پر اقدام کرنے اور شر سے باز رہنے پر قادر ہے' گویا باطن میں کوئی ایسا غیر محسوس وجود ہو جو اسے شر سے باز رکھ سکے' اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے یہی مراد ہے۔
وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَا اَنْ رَّاٰى بُرْهَانَ رَبِّهٖ (پ ۱۲ ر ۱۳ آیت ۲۴)

اور اس عورت کے دل میں تو ان کا خیال جم ہی رہا تھا' اور ان کو بھی اس عورت کا کچھ خیال ہو چلا تھا اگر اپنے رب کی دلیل کو انہوں نے نہ دیکھا ہوتا۔

یہ تمام نعمتیں اسی شخص کو عطا کی جاتی ہیں جسے اللہ نے ذہن کی صفائی' قوت سامعہ کی تیزی' اور قلب کی آگہی سے نوازا ہو' اسکا باطن تواضع کے جذبات سے معمور ہو' اسکا دل خیر خواہ استاذ کا فرض ادا کرتا ہو' اسے اتنا مال بھی میسر ہو کہ وہ کبھی باعث دین کی مہمات میں مشغول نہ ہو سکے اور کثرت کے باعث امور خیر سے اعراض کرے' اسے وہ عزت بھی حاصل ہو جو بے وقوفوں کی زیادتی' اور دشمنوں کے ظلم سے اسکی حفاظت کر سکے۔ یہ کل مسلسلہ اسباب ہیں' ان میں سے ہر سبب متعدد اسباب کا متقاضی ہے' پھر ان میں سے ہر سبب کو بے شمار اسباب چاہئیں' یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہتا ہے۔ یہاں تک کہ مسبب الاسباب پر جاکر ختم ہوجاتا ہے جو گم کردہ راہوں کا راہ نما' مجبوروں کا سہارا اور پریشان حالوں کا آسرا ہے' کیونکہ ان تمام اسباب کا استقصاء ممکن نہیں ہے' اس لئے کہ ہم بطور نمونہ کچھ ذکر کرتے ہیں' تاکہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے معنی واضح ہو جائیں۔

وَاِنۡ تَعُدُّوۡا نِعۡمَةَ اللّٰهِ لَا تُحۡصُوۡهَا (پ ۱۴ر ۸ آیت ۱۸)

اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گننے لگو تو گن نہ سکو۔

اللہ تعالیٰ کی بے شمار نعمتیں' اور ان کا تسلسل

: جاننا چاہیے کہ ہم نے نعمت کی سولہ قسمیں کی ہیں' تندرستی بھی ان ہی نعمتوں میں سے ایک ہے' اگرچہ مرتبے میں مؤخر ہے' اگر تنہا اس نعمت کے ان اسباب کا احاطہ کرنے بیٹھ جائیں جن سے یہ نعمت تمام ہوتی ہے تو ہمیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے' اس لئے صرف ایک سبب کا ذکر کرتے ہیں' اور وہ ہے کھانا۔ یہ بھی صحت اور تندرستی کے بے شمار اسباب میں سے ایک سبب ہے' یہ سبب یعنی کھانا کتنے اسباب سے مکمل ہوتا ہے' ذیل میں ہم اس پر روشنی ڈالتے ہیں۔ کھانا ایک فعل ہے' اور اس نوع کے تمام فعل حرکت کہلاتے ہیں۔ اور ہر حرکت کے لئے ایک متحرک جسم کی ضرورت ہے جسے اسکا آلہ کہنا چاہیے' پھر حرکت پر قدرت ضروری ہے' اور حرکت کے لئے ارادہ بھی چاہیے' اپنی مراد کا علم اور ادراک بھی ضروری ہے' کھانے کے لئے غذا بھی چاہیے' اور غذا کے لئے کوئی ایسی چیز ہونی ضروری ہے جس سے غذا حاصل کی جاسکے' پھر غذا کے لئے ایک صانع بھی چاہیے' اس لئے ہم پہلے ادراک کے اسباب بیان کرتے ہیں' پھر ارادہ' قدرت اور غذا کے اسباب علی الترتیب بیان کریں گے' صفحات کی تنگ دامانی کے باعث ہم انتہائی اجمال کے ساتھ لکھنے کی کوشش کریں گے' سہولت تفہیم کے لئے ہم اس موضوع کو آٹھ بنیادی عنوانات پر تقسیم کرتے ہیں۔

اسباب ادراک کی تخلیق میں اللہ کی نعمتیں

جاننا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے نباتات پیدا کیں' اور انہیں پتھر' ڈھیلے' لوہے' تانبے اور دوسرے جواہر کے مقابلے میں زیادہ مکمل وجود عطا کیا' ان جواہرات میں قوت نمو نہیں ہے' اور نہ یہ غذا حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں' جب کہ نباتات میں ایسی قوت پیدا کی گئی ہے جس کے ذریعے وہ اپنی طرف غذا کھینچتی ہیں' اور اس عمل کے لئے اپنی جڑ اور رگوں اور ریشوں کا استعمال کرتی ہیں' یہ رگیں اور جڑیں زمین میں پھیلی رہتی ہیں' یہ رگیں پہلے باریک ہوتی ہیں' پھر موٹی ہو جاتی ہیں' پھر ان سے اور رگیں پھوٹتی ہیں' یہاں تک کہ ان کا سلسلہ پتوں پر ختم ہو جاتا ہے اور وہاں تک پہنچتے پہنچتے یہ رگیں اتنی باریک ہو جاتی ہیں کہ نظر نہیں آتیں' معدنیات کے مقابلے میں اگرچہ نباتات میں کمال نمو ہے' لیکن یہ کمال بھی نقص سے خالی نہیں ہے' اس لئے کہ اگر نباتات کی غذا جڑوں میں نہیں پہنچے گی' اور رگوں سے مس نہیں کرے گی تو درخت سوکھ جائیں گے' پودے مرجھا جائیں گے' ان کے لئے یہ ممکن نہ ہوگا کہ اپنی غذا کسی اور جگہ سے حاصل کر سکیں' اس لئے کہ کسی چیز کی طلب اسی وقت ممکن ہے جب مطلوب معلوم ہو' اور اس تک پہنچنا ممکن ہو نباتات ان دونوں ہی چیزوں سے عاجز ہے' نہ اسے یہ معلوم ہے کہ اس کی غذا کیا ہے؟ اور اسے کیسے حاصل کیا جاسکتا ہے؟ یہ انسان پر

اللہ کا بڑا انعام ہے کہ اس نے احساس اور حرکت کے آلات پیدا کر کے اسکے لئے حصول غذا کے طریقے آسان کر دئے ہیں۔

حواس خمسہ کی ترتیب میں حکمت: حواس خمسہ کی ترتیب میں بھی اللہ تعالیٰ کی بڑی حکمت نظر آتی ہے۔ یہ تمام حواس اوراک کے آلات ہیں' ان میں پہلا لمس (چھونے) کا حاسہ ہے' یہ حاسہ اس لئے پیدا کیا گیا ہے کہ جب تمہارے ہاتھ پر کوئی چنگاری گرے' یا مجز پڑے تو تم فوراً اسکی تپش یا سوزش محسوس کرلو اور اس سے بچنے کی کوشش کرو۔ یہ پہلی حس ہے جو حیوان کے اندر پیدا کی گئی ہے' کوئی ایسا حیوان تصور نہیں کیا جاسکتا جس کے اندر چھونے کی حس موجود نہ ہو' اگر کسی میں یہ حس ہی نہ ہو تو اسے حیوان کہنا صحیح نہ ہوگا حاسۂ لمس کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ اگر جسم سے کوئی چیز مس کرے یا متصل ہو جائے تو اسکا احساس ہو' دور کی چیز کا احساس کرنا درجۂ کمال ہے' اور ادنیٰ درجے کی حس تو ہر حیوان میں موجود ہے' یہاں تک کہ مٹی کے اندر رہنے والا کیڑا بھی اس سے محروم نہیں ہے' اگر اسکے جسم میں سوئی چبھودی جائے تو وہ بھی سمٹ سکڑ کر اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کرتا ہے' نباتات کا یہ حال نہیں ہے' تم اسے کاٹ ڈالو نہ وہ سکڑے گی نہ سمٹے گی نہ تم سے دور بھاگے گی' اس لئے کہ نباتات میں حس نہیں ہے۔

اگر آدمی میں صرف یہی قوت لامسہ ہوتی تو اس کا حال بھی کیڑے جیسا ہوتا جیسے کیڑا ناقص ہوتا ہے اسی طرح آدمی بھی ناقص ہوتا کہ جو چیز اسکے جسم سے مس کرتی صرف اسے اپنی طرف کھینچتا' اور اسی کو اپنی غذا بناتا' اس کے لئے یہ ممکن نہ ہوتا کہ کسی ایسی چیز کو غذا بناتا جو اس سے دور ہوتی' اس لئے ایک ایسی حس کی ضرورت پیش آئی جس کی مدد سے دور کی چیز کا ادراک ممکن ہو چنانچہ تمہارے اندر سونگھنے کی قوت پیدا کی گئی' بو سے آدمی دور کی چیز بھی معلوم کرلیتا ہے' لیکن کیونکہ محض سونگھنے سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ بو کس طرف سے آرہی ہے' اس لئے تم بو سونگھ کر چاروں طرف دوڑتے پھرتے' اس تگ و دو کے نتیجے میں یہ ہوسکتا تھا کہ تمہیں غذا مل جاتی' اور یہ ممکن بھی تھا نہ ملتی' اس لئے تمہارے اندر بینائی کی قوت رکھی گئی' تاکہ جو چیز تم سے دور ہو اور سونگھ کر تم اسکی جہت اور دوری متعین نہ کرسکو اسے دیکھ لو اور صرف اسی سمت کا قصد کرو' پھر اگر تمہارے پاس یہی دو قوتیں ہوتیں تب بھی تم ناقص ہوتے اس لئے کہ تم ان دو قوتوں کے ذریعے صرف انہی چیزوں کا ادراک کرسکتے ہو جو تمہاری نگاہوں کے سامنے ہیں' جو چیزیں دیواروں کے پیچھے ہیں یا جن چیزوں کے درمیان کوئی چیز حائل ہے تم ان کا ادراک نہیں کرسکتے' اگر غذا دیوار کے پیچھے ہوتی تو تم اسکا ادراک نہ کرپاتے' اسی طرح صرف اس دشمن کا ادراک کرسکتے تھے جو تمہاری آنکھوں کے سامنے ہوتا' اگر دشمن پس پردہ ہوتا تو تم اسے قریب ہو کر محسوس کرتے' اور قریب ہونے کی صورت میں یہ ممکن تھا کہ دشمن تم پر قابو پالیتا اور تم اپنے بچاؤ کی کوئی تدبیر نہ کرپاتے۔ اس لئے تمہارے اندر حس سمع (سننے کی قوت) پیدا کی گئی' اسکے ذریعے تم ان آوازوں کا ادراک کرلیتے ہو جو پردوں اور دیواروں کے پیچھے ہونے والی حرکات کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہیں' آنکھ کے ذریعے تم موجود کا ادراک کرسکتے ہو' غائب کا ادراک محض اس کلام سے ممکن ہے جو حس سمع سے ادراک کی گئی' اور کلام سمجھنے کی صلاحیت دے کر تمہیں دوسرے حیوانات سے ممتاز بنایا گیا۔

پھر یہ تمام حواس بھی ناکافی ہوتے' اگر تمہارے اندر قوت ذائقہ نہ ہوتی۔ اس صورت میں تم غذا کھاتے لیکن تمہیں یہ معلوم نہ ہوتا کہ جو غذا تم کھا رہے ہو وہ تمہارے مخالف ہے یا موافق' کبھی ایسا بھی ہوتا کہ تم ناموافق غذا کھا کر ہلاک ہو جاتے' جس طرح درخت میں قوت ذائقہ نہیں ہوتی' وہ اپنی جڑوں میں پہنچنے والے پانی سے غذا حاصل کرتا ہے' اور سرسبز و شاداب رہتا ہے' بعض اوقات یہی پانی اسکے خشکی کا باعث بن جاتا ہے' یہ تمام حواس تمہارے لئے ناکافی تھے اگر تمہارے دماغ کے اگلے حصے میں قوت ادراک نہ پیدا کی جاتی جسے حس مشترک کہتے ہیں' اس میں حواس خمسہ کے ذریعے حاصل ہونے والے محسوسات جمع رہتے ہیں۔ اگر آدمی میں یہ حس مشترک نہ ہوتی تو اسے بڑی دشواری کا سامنا کرنا پڑتا۔ مثال کے طور پر اگر وہ زرد رنگ کی کوئی تلخ چیز کھاتا اور اسے اپنی طبیعت کے ناموافق دیکھ کر چھوڑ دیتا' پھر وہ چیز اس کے سامنے آتی تو یہ نہ جان پاتا کہ یہ چیز مضر ہے' جب تک اسے چکھ نہ لیتا' اس لئے کہ آنکھ زردی دیکھتی ہے' تلخی کا احساس نہیں کرتی' اسی طرح ذائقہ سے تلخی کا احساس ہوتا ہے' زردی کا پتہ نہیں چلتا' اس لئے کہ کسی ایسی حس مشترک کا وجود ضروری ہے' جسے زردی اور تلخی دونوں کا احساس ہو' یہاں تک کہ جب زردی نظر آئے تو حس مشترک اسکی تلخی کا

حکم دے، اور دوسری مرتبہ کھانے سے باز رکھے۔

خصوصیت عقل : اگر تمہارے پاس صرف یہی حواس ہوتے جن میں حس مشترک بھی شامل ہے تب بھی تمہاری کوئی خصوصیت نہ ہوتی اس لئے کہ یہ حواس تو تمام حیوانات کے پاس بھی ہیں، یہاں تک کہ ایک حقیری بکری بھی یہ حواس رکھتی ہے، اگر تم یہی حواس رکھتے تو بکری اور دیگر جانوروں کی طرح ناقص ہی رہتے۔ چنانچہ اگر جانور کسی حیلے سے گرفتار ہو جائیں تو وہ یہ نہیں جان پاتے کہ اس قید سے آزادی کے لئے کیا تدبیر کی جائے، اسی طرح اگر وہ کنوئیں میں گر جائیں تو انھیں یہ نہیں معلوم ہو پاتا کہ کنویں میں گرنے سے ہلاک ہو جاتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ جانور وہ چیزیں کسی خوف و خطر کے بغیر کھالیتے ہیں جو فی الحال انھیں لذت دیتی ہیں خواہ بعد میں نقصان دہ ثابت ہوں، اور انکی بیماری یا موت کا باعث بن جائیں، انھیں صرف حاضر کا احساس رہتا ہے، اس کے علاوہ کچھ نہیں سوجھتا، عواقب کا ادراک ایک ایسی خصوصیت ہے جو اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر تمہیں بخشی ہے، اللہ تعالیٰ نے تمہیں حیوانات سے ممتاز کیا اور ایک ایسی صفت سے نوازا جو تمام صفات سے اعلاء و اشرف ہے، اور وہ صفت عقل ہے، اسکے ذریعے تم حال اور مآل کے اعتبار سے غذا کے منفعت اور مضرت کا علم حاصل کرتے ہو، اور یہ جانتے ہو کہ غذا کیسے پکائی جاتی ہے، مختلف چیزوں سے کس طرح ترکیب دی جاتی ہے، اور اسکے اسباب کس طرح مہیا کئے جاتے ہیں، غور کرو، صرف غذا کے سلسلے میں عقل کے کس قدر فوائد ہیں، جو انسانی تندرستی کے بے شمار اسباب میں سے ایک سبب ہے حالانکہ عقل کا یہ ایک ادنیٰ فائدہ اور معمولی حکمت ہے، عقل میں بڑی حکمت اللہ تعالیٰ کی معرفت، اس کے صفات، اس کے افعال، اور عالم میں اسکی حکمت کا جاننا ہے اگر آدمی اپنی عقل کو اس اعلا ترین فائدے، اور عظیم ترین حکمت میں استعمال کرلے تو اسکے فوائد کچھ اور ہو جاتے ہیں، اس صورت میں حواس خمسہ تمہاری لئے جاسوس اور خبر رساں افراد بن جائیں گے جو ملک کے اطراف میں پھیلے رہتے ہیں، اور حاکم وقت کو پل پل کی خبریں فراہم کرتے ہیں، ان میں سے ہر جاسوس کو مخصوص ذمہ داری سپرد کی جاتی ہے، اس طرح ایک ہی وقت میں حاکم طرح طرح کی خبریں حاصل کرلیتا ہے، جو حکومت کا انتظام چلانے میں اس کے لئے نہایت مفید ثابت ہوتی ہیں، حواس خمسہ کو بھی انہی جاسوسوں پر قیاس کرو، ان میں سے ایک حاسہ رنگوں کی خبریں فراہم کررہا ہے، دوسرا آوازوں کی خبریں دے رہا ہے، تیسرا خوشبوؤں کا خبر رساں ہے، چوتھا ذائقے کی چیزیں فراہم کرنے پر مامور ہے، پانچواں حاسہ سرد گرم، سخت و نرم، اور نشیب و فراز، کے امور کا نگراں ہے اور ان سے تعلق رکھنے والی خبریں حاصل کرتا ہے، اور متعلقہ محکمے کی طرف منتقل کردیتا ہے۔ یہ جاسوس حواس جسم کی سلطنت میں پھیل جاتے ہیں، اور گوشے گوشے سے خبریں فراہم کرکے حس مشترک کے پاس بھیج دیتے ہیں، یہ حس مشترک دماغ کی دہلیز پر بیٹھی ہوئی ہے۔ جیسے بادشاہ کے دروازوں پر عرض نویس، اور کارندے جنھیں آج کل کی اصطلاح میں چپراسی کہا جاتا ہے، بیٹھے رہتے ہیں، یہ لوگ ملک کے اطراف سے آنے والے مراسلات اکٹھے کرتے ہیں، یہ مراسلات سربمہر ہوتے ہیں کارندے ان مراسلات کو شاہی دربار میں پہنچادیتے ہیں، وہاں سے احکامات صادر ہوتے ہیں ان کارندوں اور دربانوں کو صرف اتنا اختیار حاصل ہے کہ وہ ان مراسلات کو مکمل حفاظت کے ساتھ بادشاہ تک پہنچادیں، یہ مراسلات کن حقائق پر مبنی ہیں، اور لکھنے والوں نے ان میں کیا کیا معلومات ودیعت کی ہیں یہ جاننا ان کے فرائض میں شامل نہیں ہے، حس مشترک بھی حواس خمسہ کے ذریعے حاصل ہونے والی خبروں کو دل کے سپرد کردیتی ہے، جو جسم کی سلطنت کے لئے امیر اور بادشاہ کے درجے میں ہے اگر دل عاقل ہوتا ہے تو ان اخبار و معلومات کی تحقیق کرتا ہے، اور اسکے ذریعے ملک کے اسرار و رموز پر مطلع ہوتا ہے اور ان کے مطابق ایسے ایسے عجیب و غریب احکامات صادر کرتا ہے جن کا اس موقع پر احاطہ نہیں کیا جاسکتا پھر جس موقع اور مصلحت کو مناسب سمجھتا ہے اسکے مطابق اپنے لشکر کو حرکت دیتا ہے، اسکے لشکر اعضاء ہیں، کبھی انھیں تلاش پر مامور کرتا ہے، کبھی فرار کا حکم دیتا ہے، کبھی ان منصوبوں اور تدبیروں کے لئے ان سے مدد لیتا ہے جو انتظام حکومت کے لئے اسے درپیش ہیں۔ ادراکات کے باب میں اللہ تعالیٰ کی نعمت پر یہ ایک اجمالی گفتگو ہے، اور یہ گفتگو اپنی موضوع کے تمام پہلوؤں کو محیط بھی نہیں ہے، اگر ہم ظاہری حواس کا ہی استقصاء کرنے بیٹھ جائیں تو صفحات کے صفحات سیاہ ہو جائیں، اور موضوع تمام نہ

ہو' بینائی حواس خمسہ میں سے ایک ہے' اور آنکھ اسکا ایک آلۂ کار ہے' یہ آلہ دس مختلف طبقات سے مرکب ہے بعض رطوبات ہیں' بعض پردے ہیں' ان پردوں میں سے بعض مکڑی کے جالے کی طرح ہیں' اور بعض رحم کی جھلی کے مانند ہیں' ان رطوبات میں بعض انڈے کی طرح سفید ہیں' اور بعض برف کے مانند سفید ہیں' پھران دس طبقات میں سے ہر ایک کی ایک مخصوص شکل و صورت ہے' صفت ہے' عرض ہے' گولائی ہے' بناوٹ ہے۔ اگر ان دس میں سے کسی ایک میں بھی کوئی خلل واقع ہو جائے' اور کسی ایک صفت میں بھی کوئی معمولی سی کمی پیدا ہو جائے تو بینائی میں وہ نقص واقع ہو کہ ماہرین چشم بھی اس نقص کے ازالے سے عاجز آجائیں' یہ ایک حاسّے کا بیان ہے' اسی پر حاسّۂ سمع اور دوسرے حواس کو قیاس کیجئے' ہمارے خیال میں صرف آنکھ کے حلقے اور اسکے طبقات میں اللہ تعالیٰ کی جو نعمتیں ہیں' اور نعمتیں جن حکمتوں پر مبنی ہیں ان کے بیان کے لئے بہت سی ضخیم جلدیں بھی ناکافی ہیں' حالانکہ یہ حلقہ اور اسکے تمام ظاہری و باطنی اجزاء کا دائرہ ایک چھوٹے اخروٹ کے دائرے سے بڑا نہیں ہے' جب ایک معمولی سے جزو بدن کا یہ حال ہے تو پورے جسم اور اسکے تمام اعضاء کا کیا حال ہوگا۔

ارادوں کی تخلیق میں اللہ تعالیٰ کی نعمتیں

اگر تمہیں صرف بینائی کی قوت بخشی جاتی' جس کے ذریعے تم دور رکھی ہوئی غذا دیکھ لیا کرتے' اور طبیعت میں میلان' غذا کی رغبت' اس کی طرف حرکت دینے والا شوق نہ پیدا کیا جاتا تو یہ قوت بینائی بیکار ہی رہتی' کتنے مریض ایسے ہیں جو یہ دیکھ لیتے ہیں کہ سامنے غذا رکھی ہوئی ہے' وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ غذا انکے لئے انتہائی نفع بخش چیز ہے مگر وہ اسے ہاتھ بھی نہیں لگاتے' کیونکہ دل کھانے کی رغبت سے خالی ہوتا ہے' ان کی قوت غذا کے حق میں بیکار ہوتی ہے' اس لئے تمہارے لئے ضروری ہے کہ جو چیز تمہاری طبیعت کے موافق ہو تمہارا اس طرف میلان بھی ہو' اس میلان کا نام شہوت ہے' اور جو چیز تمہاری طبیعت کے خلاف ہے اس سے تمہیں تنفر ہو' اسے کراہت کہتے ہیں' شہوت اس لئے ضروری ہے کہ تاکہ تم مفید چیز طلب کرنے کے درپے ہو' اور کراہت اس لئے ضروری ہے تاکہ مضر چیز سے بچنے کی کوشش کرو۔ اللہ تعالیٰ نے تمہارے اندر کھانے کی شہوت پیدا کی ہے' اسے تم پر مسلط کیا ہے' تاکہ وہ تم سے کھانے کا تقاضا کرتا رہے' بلکہ تمہیں کھانے پر مجبور کردے' اور تم غذا کھا کر زندہ رہ سکو' طبیعت میں کھانے کی رغبت بھی ایک ایسا وصف ہے جس میں حیوانات بھی تمہارے شریک ہیں' نباتات شریک نہیں ہیں۔

اللہ کی قدرت دیکھئے اس نے تمہارے اندر صرف شہوت طعام ہی پیدا نہیں کی' بلکہ اس میں ایک مرحلے پر پہنچ کر ٹھہراؤ اور سکون بھی پیدا کیا' اگر شہوت یوں ہی بے مہار رہتی' اور پیٹ بھرنے کے باوجود کھانے سے ہاتھ نہ رکتا تو آدمی ہلاک ہو جاتا جیسے کھیتی پانی کی ایک مخصوص مقدار جذب کرتی ہے' جب یہ مقدار ضرورت سے تجاوز کر جاتی ہے' تو پودے گلنے لگتے ہیں' اور کھیتی برباد ہوجاتی ہے اس لئے کاشتکار کو چاہئے کہ وہ ضرورت کے بقدر پانی دے اور ضرورت کی مقدار متعین کرے جب یہ مقدار سے تجاوز کر جائے تو پانی روک دے انسان کے جسم کی کھیتی اگر ضرورت سے زیادہ غذا کھالیتی ہے' اس دشواری کے ازالے کے لئے شکم سیری اور سیرابی کا اندازہ کس طرح ہو اللہ تعالیٰ نے آدمی کے اندر نفرت پیدا کی' تاکہ جب پیٹ بھر جائے تو دل خود بخود کھانے سے متنفر ہو جائے' اور ہاتھ رک جائے' جس طرح اللہ تعالیٰ نے آدمی کے اندر کھانے کی شہوت پیدا کی ہے جب یہ شہوت سر ابھارتی ہے تو طبیعت خود بخود کھانے کی طرف مائل ہو جاتی ہے' اسی طرح اس میں جماع کی شہوت بھی پیدا کی ہے جب یہ شہوت سر ابھارتی ہے تو آدمی جماع کرتا ہے' اور نسل انسانی کی بقاء کا باعث بنتا ہے' اگر ہم انسانی تخلیق کی ابتدا پر روشنی ڈالیں' اور اس سلسلے میں واقع ہونے والے عجائبات پر گفتگو کریں تو تم حیران رہ جاؤ' رحم کی بناوٹ کیسی ہے' حیض کا نظام کس طرح قائم ہے' جو پشت کی ہڈیوں سے وابستہ ہیں جن میں نطفہ رہتا ہے' عورت کی منی سینے کی رگوں سے نیچے کس طرح گرتی ہے' رحم میں کس طرح کے سانچے ہیں کہ کبھی منی کے قطرے سے مو بن جاتا ہے' اور کبھی عورت' پھر یہ منی کتنے مراحل سے گزرتی ہے' پھٹتی ہے' لوتھڑے میں تبدیل ہوتی ہے' ہڈیاں بنتی ہیں گوشت تشکیل پاتا ہے' خون بنتا ہے' پھر اسمیں اجزاء کی تقسیم ہوتی ہے' سر' ہاتھ' پاؤں' پیٹ' پشت' اور دوسرے اعضاء تخلیق پاتے ہیں' اگر تمہارے سامنے یہ سب کچھ بیان کیا جائے تو تمہاری حیرت کا عالم دیکھنے

کے قابل ہو گا' جب ابتدائے آفرینش میں اللہ تعالیٰ کی عجیب و غریب نعمتوں کا یہ حال ہے تو اس وقت کیا حال ہو گا جب تمہارا وجود مکمل ہو چکا ہو گا' لیکن فی الحال یہ موضوع زیر بحث نہیں ہے ہم صرف کھانے کی نعمتوں پر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں

شہوت طعام : خلاصہ یہ ہے کہ کھانے کی شہوت انسانی ارادوں میں سے ایک ہے' لیکن تنہا یہ شہوت کافی نہیں ہے' اس لئے کہ چاروں طرف سے تم پر مہلکات کی یلغار رہتی ہے' اگر تمہارے اندر غضب پیدا نہ کیا جاتا جس کی ذریعے تم ہر اس چیز کو دفع کرتے ہو جو تمہارے خلاف ہے یا تمہارے مزاج سے موافقت نہیں رکھتی تو تم آفتوں کا ہدف بن کر رہ جاتے' جو غذا تم حاصل کرتے وہ چھین لی جاتی' کیونکہ ہر شخص کو غذا کی خواہش ہے' اگر تم میں مدافعت یا مخالفت کی قوت نہیں تو تم اپنی غذا لوگوں کی دست برد سے محفوظ نہیں رکھ سکتے۔

پھر غذا کے استعمال اور اسکے تحفظ کے لئے محض شہوت اور غضب ہی کی ضرورت نہیں ہے' کیونکہ ان دونوں کا قائدہ حال سے تعلق رکھتا ہے' مال میں یہ دونوں ارادے کافی نہیں ہیں' اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایک اور ارادہ پیدا فرمایا جو عقل کے اشارے پر چلتا ہے' اور تمہیں انجام پر نظر رکھنے پر مجبور کرتا ہے' شہوت اور غضب دونوں کو اس حس کے ادراک کا محکوم بنایا جس سے موجودہ حالت معلوم ہوتی ہے' اس ارادے سے انسان کو پورا نفع حاصل ہوتا ہے' اسکے لئے محض یہ جان لینا کافی نہیں ہے کہ فلاں چیز مضر ہے' مثلاً شہوت اسکے لئے نقصان دہ ہے' جب تک اس معرفت کے مطابق عمل کرنے کی رغبت نہ ہو' اس طرح کے ارادوں کو صرف انسان کے ساتھ مخصوص کیا گیا' بہائم میں یہ ارادے پیدا نہیں کئے گئے' یہ تخصیص دراصل بنی آدم کا امتیاز اور اس کی عظمت و کرامت کا اظہار ہے' انجام کی معرفت بھی صرف انسانوں میں ہے' اس ارادے کا نام ہم نے باعث دینی رکھا ہے' اور صبر کے بیان میں تفصیل کے ساتھ اس پر روشنی ڈالی ہے۔

قدرت اور آلات حرکت کی تخلیق میں اللہ کی نعمتیں

: جاننا چاہیے کہ حس سے صرف ادراک ہوتا ہے' اور ارادے کے معنی ہیں کسی شئی کی طلب یا اس سے گریز کی طرف میلان ہونا۔ کسی کام کے لئے ادراک و ارادہ کافی نہیں ہیں جب تک تمہارے اندر کسی شئی کے طلب یا اس سے فرار کے آلات موجود نہ ہوں' بہت سے مریض ایسے ہیں جو دور کی چیز دیکھ کر اس کے مشتاق ہوتے ہیں' لیکن پاؤں نہ ہونے کے باعث اس چیز تک پہنچ نہیں پاتے' یا اس تک پہنچ جاتے ہیں لیکن ہاتھ نہ ہونے کی وجہ سے اسے اٹھا نہیں پاتے' بعض اوقات ہاتھ موجود ہوتے ہیں لیکن وہ فالج زدہ ہوتے ہیں' یا کسی مرض کے زیر اثر سن ہوتے ہیں گویا ان میں جان ہی نہیں ہوتی' اس لئے حرکت کے لئے آلات ضروری ہیں۔ اور ان آلات میں حرکت پر قدرت کا وجود ضروری ہے تاکہ وہ آلات شہوت کے تقاضے پر عمل کرتے ہوئے طلب پر' اور کراہیت کے تقاضے پر عمل کرتے ہوئے فرار پر قادر ہو سکیں' اسی حکمت کی تکمیل کے لئے اللہ تعالیٰ نے تمہیں ایسے اعضاء سے نوازا جو بظاہر تمہیں نظر آتے ہیں' لیکن تم ان کے اسرار سے واقف نہیں ہوتے' ان میں سے بعض طلب کے لیے ہوتے ہیں' بعض گریز کے لئے' جیسے انسان کے لئے پاؤں پرندوں کے لئے بازو' چوپایوں کیلئے ٹانگیں اور بعض مدافعت کے لئے ہیں' جیسے انسان کے لئے ہتھیار' اور حیوانوں کے لئے سینگ' مدافعت کے باب میں حیوانات کے احوال بہت زیادہ مختلف ہیں' بعض حیوانات کے دشمن زیادہ ہوتے ہیں' اور ان کی غذا بھی دور ہوتی ہے' اس لئے وہ دشمن سے بچنے' اور کم سے کم وقت کے اندر غذا تک پہنچنے میں سرعت حرکت کے محتاج ہیں' انہیں پر عطا کیے گئے تاکہ وہ تیزی کے ساتھ اڑ سکیں' بعض حیوانات کی چار ٹانگیں ہیں بعض کی دو ہیں' بعض زمین پر رینگتے ہیں۔ اس اختلاف کا ذکر تفصیل طلب ہے اس لئے ہم صرف ان اعضاء کا ذکر کرتے ہیں جن سے کھانے کا عمل پورا ہوتا ہے تاکہ اس پر دوسرے اعضاء کو قیاس کیا جا سکے۔

کھانے کے عمل میں اعضاء کا حصہ : تم دور سے کھانا دیکھتے ہو' اور اسکی طرف حرکت کرتے ہو' لیکن صرف حرکت ہی

کافی نہیں ہے بلکہ اسے لینا اور پکڑنا بھی ضروری ہے، اسکے لئے ایک ایسے آلے کی ضرورت ہے جس کے ذریعے تم پکڑ سکو، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں دو ہاتھ عطا کئے ہیں، یہ دونوں ہاتھ لمبے ہیں، اور ہر طرف پھیلتے ہیں، ان میں متعدد جوڑ ہیں تاکہ تم انھیں سہولت کے ساتھ چاروں طرف حرکت دے سکو، جدھر چاہے پھیلا سکو، موڑ سکو، سیدھی لکڑی کی طرح نہیں بنائے جس میں مڑنے پھیلنے سکڑنے اور سمٹنے کی صلاحیت نہیں ہوتی، پھر ہاتھ کا اگلا سرا چوڑا بنایا، یعنی ہتھیلی پیدا کی، ہتھیلی کو پانچ حصوں یعنی انگلیوں پر تقسیم کیا، اور انگلیوں کی دو صفیں بنائیں، انگوٹھے کو ایک جانب رکھا تاکہ باقی چاروں انگلیوں پر گھوم سکے، اگر یہ پانچوں انگلیاں ایک جانب میں ہوتیں یا ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہوتیں تو مطلب پورا نہ ہوتا، یہ انگلیاں ایسی بنائیں کہ اگر انھیں پھیلا لیا جائے تو بیلچہ بن جائے، سمیٹ لیا جائے تو چمچہ کی شکل اختیار کر جائے، اگر انھیں اندر کی طرف موڑ لیا جائے تو مارنے کا آلہ یعنی گھونسا بن جائے، کسی چیز پر پھیلا کر بند کیا جائے تو پکڑنے کا آلہ بن جائے، ان انگلیوں میں ناخن پیدا کئے، اور انھیں سروں پر بنایا، تاکہ انگلیاں ٹوٹنے نہ پائیں، اور جو باریک چیزیں انگلیوں سے نہ اٹھیں وہ ناخنوں کے ذریعے پکڑے جاسکیں۔

اگر تم نے ہاتھوں میں غذا اٹھالی تو اب مسئلہ اسے معدے میں پہنچانے کا ہے، معدہ جسم کے اندر ہے، اس تک پہنچنے کا کوئی نہ کوئی راستہ ہونا ضروری ہے، کیونکہ غذا براہ راست معدے میں نہیں پہنچائی جاسکتی، اس لئے منھ پیدا کیا، جس کے ذریعے غذا معدے کے اندر تک پہنچتی ہے، منھ سے صرف یہی ایک فائدہ نہیں کہ وہ معدے میں کھانا پہنچنے کا ذریعہ بنتا ہے، بلکہ اسکے علاوہ بھی بے شمار فائدے ہیں، پھر منھ میں غذا رکھ لینا ہی کافی نہیں ہے، اس طرح تم کھانا نہیں نگل سکتے، بلکہ ایک ایسی چکی کی بھی ضرورت ہے جس سے یہ کھانا پس سکے، اور باریک ہو کر معدے میں پہنچ سکے، اسکے لئے ہڈیوں کے دو جبڑے بنائے، ان میں دانت پیدا کئے، اوپر نیچے ڈاڑھیں بنائیں، انھیں ایک دوسرے کے اوپر اور برابر رکھا، بعض غذائیں توڑنے کی محتاج ہوتی ہیں، بعض کاٹی جاتی ہیں، اسکے بعد پسنے کا نمبر آتا ہے، اس لئے تین طرح کے دانت بنائے گئے، تاکہ یہ تینوں مقاصد حاصل کئے جاتی ہیں، ڈاڑھیں بنائیں جو غذا کو پیستی ہیں، آگے کے دانت بنائے جو تیز ہوتے ہیں اور غذا کو کاٹتے ہیں، کچلیاں بنائیں جن سے غذا کو توڑا جاسکے اور جدا کیا جاسکے۔ پھر جبڑے پلپلے بنائے تاکہ نیچے کا جبڑا اوپر نیچے ہو سکے، اور اوپر کی جبڑے پر اس طرح گھوم سکے جس طرح چکی گردش کرتی ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو دونوں جبڑے ایک دوسرے پر ٹکرا کر رہ جاتے، اور دونوں کے ٹکراؤ سے ایسی آواز نکلتی جیسے تالی بجتی ہے، اس سے دانتوں کی تخلیق کا مقصد پورا نہ ہوتا، یہ بھی اللہ تعالیٰ کی عجیب و غریب صنعت ہے کہ اسنے اوپر کے جبڑے کو گھومنے والی حرکت بخشی، اور نیچے کے جبڑے کو پرسکون اور اپنی جگہ جمارہنے والا بنایا، ذرا ملاحظہ کیجئے اس صنعت کا حیرت انگیز پہلو، دنیا کی تمام چکیوں میں اوپر کا پاٹ گھومتا ہے، اور نیچے کا اپنی جگہ برقرار رہتا ہے، صرف یہ چکی ایسی ہے جس میں نیچے کا پاٹ گردش کرتا ہے اور اوپر کا پاٹ اپنی جگہ برقرار رہتا ہے، یہ اللہ کی قدرت عظمت اور جلالت کی ایک روشن دلیل ہے۔

اب یہ فرض کر لیا جائے کہ تم نے کھانا منھ میں رکھ لیا ہے، اور دانت اپنے فرض کی ادائیگی کے لئے مستعد ہیں لیکن اب یہ دشواری درپیش ہے کہ کھانے کو دانتوں کے نیچے کیسے لایا جائے، دانتوں میں یہ طاقت نہیں کہ وہ کھانے کو کھینچ سکیں، یا ادھر ادھر کر سکیں، اسی طرح یہ بھی مشکل ہے کہ بار بار انگلی منھ میں ڈالی جائے اور کھانے کو ادھر سے ادھر منتقل کیا جائے، اس دشواری کو اللہ تعالیٰ نے زبان کی تخلیق سے حل فرمایا کہ یہ منھ کے طرف گھومتی ہے، کھانے کو حسب ضرورت درمیان سے دانتوں کے نیچے لاتی ہے، جیسے چمچے یا مٹھی سے تھوڑا تھوڑا گیہوں یا چنا چکی میں ڈالتے ہیں، یہ زبان کا ایک فائدہ ہے، اسکے علاوہ بھی بے شمار فائدے ہیں، مثلاً چکھنے، بولنے، رموز حکمت آشکار کرنے، بلاغت و فصاحت کے گہر لٹانے کی قوت زبان کے وہ فائدے ہیں جو یہاں زیر بحث نہیں ہیں۔

فرض کرو تم نے کھانا منھ میں رکھ لیا ہے، اسے توڑ بھی لیا ہے، اور پیس بھی لیا ہے، لیکن کھانا خشک ہے، تم اسے وقت تک نگلنے پر قادر نہیں ہو جب تک اس میں کوئی ایسی رطوبت شامل نہ ہو جائے جس سے غذا پھسل کر حلق کے اندر چلی جائے، اسکے لئے اللہ تعالیٰ

نے زبان کے نیچے ایک چشمہ رکھا ہے جس میں لعاب بہتا رہتا ہے' اور بقدر ضرورت زبان پر آکر کھانے میں ملتا ہے' اور کھانا اس میں آمیز ہو کر تر ہو جاتا ہے' زبان کتنی بڑی نعمت ہے' تمہاری خدمت کے لئے ہر وقت مستعد' ہمہ وقت کمربستہ۔ ابھی تم نے کھانے پر نظر ہی ڈالی ہے کہ یہ بیچاری تمہاری خدمت کے لئے پر تولنے لگتی ہے اور لعاب کے چشمے کا منہ کھول دیتی ہے' بعض اوقات اس لعاب سے تمہاری باچھیں تر ہو جاتی ہیں' حالانکہ کھانا تم سے بہت دور ہوتا ہے' پھر اگر کھانا لعاب میں گوندھ لیا جائے تب بھی وہ از خود حلق سے نیچے نہیں اتر سکتا' ہاتھ سے نیچے اتارنا مشکل ہے' پیٹ کے اندر بھی کوئی ہاتھ نہیں کہ وہ منہ میں آکر کھانے کا نوالہ نیچے لے جائے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے نرخرہ پیدا کیا اور اسکے اوپر کئی دروازے بنائے جو غذا کو لینے کے لئے کھل جاتے ہیں' اور جب غذا اندر چلی جاتی ہے تو بند ہو جاتے ہیں' اور غذا کو اس قدر بھینچتے ہیں کہ وہ پھسل کر نیچے چلی جاتی ہے غذا کا معدہ میں پہنچنا ہی کافی ہے' بلکہ غذا کے لئے ضروری ہے کہ وہ معدہ میں پہنچ کر جزو بدن بنے' یعنی خون اور گوشت وغیرہ تیار ہو' فرض کرو کہ تم نے روٹی اور میوے کے ٹکڑے کھائے ہیں' اور یہ چیزیں پس کر معدہ میں پہنچ چکی ہیں' معدہ دراصل انہیں گوشت اور خون میں تبدیل کرنے کا ایک کارخانہ ہے' معدے کی مثال ہانڈی کی سی ہے' جس میں مختلف قسم کی چیزیں ڈالی جاتی ہیں' اور اس کا منہ بند کر کے چولہے پر رکھ دیا جاتا ہے' آگ پر رکھنے کے بعد وہ مختلف اجزاء اس طرح ایک دوسرے میں آمیز ہو جاتے ہیں کہ کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ معدہ بھی ایک ہانڈی کی طرح ہے' اس کے دائیں جانب جگر' بائیں جانب تلی ہے آگے کی طرف چربی اور پیچھے کی سمت پشت ہے' چاروں طرف کے اعضاء کی حرارت معدے کو پہنچتی ہے' اس حرارت سے وہ مختلف غذائیں جو معدے میں پہنچتی ہیں اچھی طرح پک جاتی ہیں اور سیال مادہ بن جاتی ہیں تاکہ وہ معدے سے نکل کر رگوں میں گردش کر سکیں' ابھی ان میں یہ صلاحیت پیدا نہیں ہوئی کہ جزو بدن بن سکیں' اللہ تعالیٰ نے معدے سے جگر تک کے راستے میں رگوں کے متعدد راستے بنائے ہیں' اور ان میں منہ رکھے ہیں' ان نالوں کے ذریعے وہ غذائی سیال جگر میں منتقل ہو جاتا ہے' جگر کا خمیر خون سے بنایا جاتا ہے' بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ یہ جما ہوا خون ہے' اس میں بے شمار باریک رگیں ہیں جو پورے جگر میں پھیلی ہوئی ہیں' یہ سیال غذا ان رگوں میں پہنچتی ہے' اور پورے جگر میں پھیل جاتی ہے' یہاں تک کہ جگر اس غذا پر حاوی ہو جاتا ہے' اور اسے بھی اپنے رنگ میں رنگ لیتا ہے' یعنی خون بنا دیتا ہے' یہ غذا خون بن کر کچھ وقفے کے لئے جگر میں ٹھہرتی ہے' یہاں اسے طبخ و نضج (پکنے اور پختہ ہونے) کے ایک اور عمل سے گزرنا پڑتا ہے' اس عمل کے نتیجے میں دو فاضل مادے پیدا ہوتے ہیں' جیسا کہ عام طور پر ہر سیال چیز کو پکانے میں کچھ نہ کچھ فاضل مادہ پیدا ہوا کرتا ہے' ایک مادہ ایسا ہوتا ہے جیسے گدلا پانی اسے سوداوی کہتے ہیں' اور ایک جھاگ جیسا ہوتا ہے' اسے صفراوی مادہ کہا جاتا ہے۔ اگر یہ دونوں مادے خون سے جدا نہ ہوں تو اعضاء کا مزاج فاسد ہو جائے' اس لئے اللہ تعالیٰ نے تلی اور پتا پیدا کئے' پھر ان دونوں کو گویا تھیلی بنائی ہے کہ جگر کے اندر گھسی رہتی ہیں' پتا صفراوی مادہ جذب کر لیتا ہے اور تلی سوداوی مادہ جذب کر لیتی ہے' اس عمل کے نتیجے میں صاف ستھرا خون باقی رہ جاتا ہے' جس میں رقت اور رطوبت پہلے کی نسبت کچھ زیادہ ہی ہوتی ہے' کیونکہ فاسد اجزاء کے اخراج کے بعد مائی اجزاء باقی رہ گئے ہیں' اگر خون پتلا نہ ہو تو جسم میں پھیلی ہوئی پتلی رگوں میں گردش نہ کرے' اور نہ اعضاء میں منتقل ہو سکے' خون کا زیادہ رقیق ہونا بھی جسم کے مصالح کے خلاف ہے' اسکے لئے اللہ تعالیٰ نے دو گردے پیدا فرمائے ہیں' اور ان دونوں گردوں کو بھی تلی اور پتے کی طرح دو طویل رگیں دی ہیں جو جگر تک متصل ہیں' یہ بھی اللہ کی صنعت و حکمت کا ایک عجوبہ ہے کہ یہ دونوں رگیں جگر کے اندر تک نہیں پہنچیں بلکہ ان رگوں سے متصل ہیں جو جگر کے اوپر نکلتی رہتی ہیں' یہ گردے خون کی رطوبت اس وقت جذب کرتے ہیں جب خون جگر کی پتلی رگوں سے نکل آتا ہے' اگر اس سے پہلے جذب کریں تو خون گاڑھا ہو جائے گا اور رگوں سے نکل نہیں پائے گا۔ رطوبت کے جذب ہونے کے ساتھ ساتھ خون سے تینوں فاسد اور زائد مادے نکل جاتے ہیں' اور خون خالص باقی رہ جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے جگر میں سے بے شمار رگیں باہر نکالی ہیں' پھر ہر رگ کو بہت سی رگوں پر تقسیم کیا ہے' اور ان رگوں کا جال سر سے پاؤں تک تمام اعضاء بدن میں پھیلا دیا ہے' جگر سے صاف خون ان رگوں میں منتقل ہوتا ہے' اور ان رگوں سے ذیلی رگوں کے ذریعے

جسم کے تمام اعضاء میں چلا جاتا ہے۔ بعض ذیلی رگیں اتنی پتلی ہوتی ہیں کہ آنکھوں سے نظر نہیں آتیں، جس طرح درخت کی ٹہنی میں رگیں نظر آتی ہیں، اور جب وہ ٹہنی تنا بن جاتی ہے تو رگیں نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہیں، بالکل معدوم نہیں ہوتیں، بلکہ پانی کے جذب و کشش کا عمل جاری رکھتی ہیں، اسی سے درخت کی سرسبزی و شادابی قائم رہتی ہے یہی حال جسم کی رگوں کا ہے، اگر یہ اپنا عمل بند کردیں تو جسم کی آب و تاب ختم ہو جائے۔

اگر پتے پر کوئی آفت نازل ہوتی ہے تو وہ اپنا عمل ترک کر دیتا ہے، یعنی صفراوی مادّہ جذب نہیں کرتا، اس سے خون فاسد ہو جاتا ہے اور جسم میں صفراوی امراض پیدا ہو جاتے ہیں جیسے یرقان، پھنسیاں، اور سرخ دانے وغیرہ، اور تلی متاثر ہوتی ہے تو سوداوی امراض پیدا ہوتے ہیں جیسے برص، جذام اور مالیخولیا، گردہ متاثر ہوتا ہے تو خون کی زائد رطوبت جذب نہیں ہوتی اور استسقاء وغیرہ پیدا ہو جاتے ہیں۔

حکیم کامل اور مدبّر اعظم کی صنعت کے عجائب دیکھو، اس نے ان تینوں فاضل مادوں میں بھی جسمانی فوائد مضمر کردئے، پتا اپنی ایک رگ سے جگر کا صفراوی مادّہ کھینچتا ہے، اور دوسری رگ سے وہ مادہ آنتوں میں ڈال دیتا ہے تاکہ آنتوں میں چکناہٹ پیدا ہو جائے، اور غذا کی آمد و رفت سہولت سے چلتی رہے، اور آنتوں میں ایسی خلش پیدا ہو جائے جس سے طبیعت قضائے حاجت کا تقاضا کرے، اور چکناہٹ کی وجہ سے قضائے حاجت کے وقت فضلہ جلد نکلے، انسانی فضلے میں زردی کی وجہ یہی صفراوی مادّہ ہے۔ تلی کے ذریعے جو فاضل مادّہ جگر سے نکلتا ہے اس میں، تلی کے اثرات سے ترشی اور جماؤ پیدا ہو جاتا ہے، پھر اس میں ہر روز یہ اجزاء ضرورت کے بقدر فم معدہ تک پہنچتے ہیں، اور بھوک کی خواہش پیدا کرتے ہیں، اور باقی اجزاء پاخانے کے ساتھ باہر آجاتے ہیں، گردے، جو رطوبت جگر سے حاصل کرتے ہیں، اس کا صرف وہ حصہ جذب کرتے ہیں جو خون ہوتا ہے، اور باقی حصوں کو مثانے کی طرف منتقل کردیتے ہیں۔

اگرچہ ہم غذا کے اسباب بہت کچھ لکھ چکے ہیں، لیکن اسکے باوجود یہ موضوع تشنہ ہے، اس سلسلے میں ابھی بہت کچھ کہنے کی گنجائش ہے، اور بہت سے ایسے سوالات ہیں جن کے اجمالی جوابات بھی دئے جائیں تو صفحے سیاہ ہو جائیں، اور بات ادھوری رہے، مثلاً جگر کو دل و دماغ کی ضرورت ہے، اور پھر ان تینوں اعضائے رئیسہ میں سے ہر ایک کو دوسرے کی ضرورت ہے، دل سے بے شمار رگیں نکلتی ہیں، اور ہر حصۂ بدن میں پھیلی ہیں، ان کے ذریعے اعضاء میں احساس پیدا ہوتا ہے جگر سے بھی متعدد رگیں نکلتی ہیں، ان کے ذریعے تمام جسم میں غذا منتقل ہوتی ہے، پھر اعضاء بنتے ہیں، ہڈیاں، پٹھے، رگیں، اوتار اور رباط تیار ہوتے ہیں، پھر ہڈیوں میں نرم لچک دار اور سخت ہڈیاں پیدا ہوتی ہیں، ان میں سے ہر عضو، ہر حصۂ بدن کی غذا کے سلسلے میں ضرورت پڑتی ہے۔ اگر ہم ان تمام امور کو اپنی بحث کا موضوع بنالیں تو بات طویل سے طویل تر ہو جائے۔ پھر یہ اعضاء غذا کے علاوہ بھی دوسرے مقاصد میں کام آتے ہیں، یہی نہیں بلکہ انسان کے جسم کا کوئی بڑے سے بڑا اور چھوٹے سے چھوٹا حصہ ایسا نہیں ہے جس میں ایک، دو، تین، چار بلکہ دس اور اس سے زیادہ حکمتیں نہ ہوں، ان میں سے ہر حکمت اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے۔ انسانی نظام جسم کی دقت اور نزاکت کا حال یہ ہے کہ اگر اس کی ایک متحرک رگ ساکن، اور ایک ساکن رگ متحرک ہو جائے تو یہ پورا کارخانہ معطل ہو جائے، اس لئے پہلے تم ان نعمتوں پر نظر ڈالو جو چاروں طرف سے تم پر برس رہی ہیں تاکہ تم اس منعم حقیقی کے شکر پر قادر ہو سکو۔

اللہ تعالیٰ کی بے شمار نعمتیں ہیں، مگر تم صرف ایک نعمت یعنی کھانے سے واقف ہو، حالانکہ یہ ایک ادنیٰ نعمت ہے، اور اس نعمت سے بھی تم صرف اس قدر واقف ہو کہ بھوک لگتی ہے کھا لیتے ہو، اس کے علاوہ تم کسی چیز سے واقف نہیں، اتنی بات تو ایک گدھا بھی جانتا ہے، جب اسے بھوک لگتی ہے کھالیتا ہے، بوجھ اٹھاتا ہے اور تھک کر سو جاتا ہے، شہوت ہوتی ہے تو جماع کرلیتا ہے، اور دولتیاں جھاڑتا پھرتا ہے، جب تم اپنے نفس کے بارے میں صرف اس قدر جانتے ہو جتنا ایک گدھا جانتا ہے، پھر تم اسکا شکر کیسے ادا کرسکتے ہو؟

اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے متعلق ہم نے جو کچھ عرض کیا ہے، انتہائی ایجاز و اختصار کے ساتھ کیا ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے تو بہتر ہوگا

کہ ہماری گفتگو مجمل اشارہ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی' اللہ تعالیٰ کی بے پایاں نعمتوں کے وسیع تر سمندر کا صرف ایک قطرہ ہم نے تمہیں دکھلایا ہے اسی قطرے پر پورے سمندر کو قیاس کرلینا چاہیے۔ جس قدر نعمتیں ہم نے بیان کی ہیں یا لوگ جانتے ہیں 'اگر انھیں ان نعمتوں کے مقابلے میں رکھ کر دیکھا جائے جو بیان نہیں کیں یا جنھیں لوگ نہیں جانتے تو بحرِ زخار کے ایک معمولی قطرے سے بھی کم نظر آئیں گی' تاہم لوگ اس قطرے سے واقف ہیں 'وہ اس سمندر کی وسعت اور گہرائی کا کچھ اندازہ کرلیتے ہیں 'اور اس آیت کے کچھ حقائق سمجھ لیتے ہیں۔

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا (پ ۱۴ ر ۸ آیت ۱۸)

اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گننے لگو تو گن نہ سکو۔

روح ایک عظیم تر نعمت : پھر یہ دیکھو کہ اللہ تعالیٰ نے ان اعضاء کا' ان کے منافع' ادراک اور قوت کا مدار ایک ایسے لطیف بخار پر رکھا ہے' جو اخلاط اربعہ سے نکلتا ہے' اس کا مستقر قلب ہے' یہ بخار قلب کی رگوں کے ذریعے تمام بدن میں پھیلتا ہے' جیسے ہی بدن کے اجزاء میں سے کسی جزو میں یہ بخار پہنچتا ہے' اس میں حس و ادراک اور حرکت و قوت پیدا ہوجاتی ہے' جیسے چراغ کو اگر پورے گھر میں پھرایا جائے تو جہاں جہاں یہ چراغ پہنچے گا وہاں وہاں روشنی پہنچ جائے گی' گویا گھر کے کسی گوشے میں چراغ کا پہنچنا اس میں روشنی پھیلنے کا باعث ہوگا' اگرچہ یہ روشنی اللہ کی تخلیق اور اسکی اختراع ہے' لیکن اس نے اپنی حکمت سے چراغ کو روشنی کا سبب بنا دیا ہے' یہ لطیف بخار اطباء کی اصطلاح میں روح کہلاتا ہے' اس کا محل قلب ہے' چراغ کے ساتھ اسکی تمثیل اس طرح ہے کہ روح کو چراغ کی لو سے تشبیہ دی جائے' اور قلب کو ظرف کہا جائے جس طرح چراغ ہوتا ہے' دل کے اندر جو سیاہ خون ہوتا ہے' وہ بتی کی مانند ہے' اور غذا اسکے لیے ایسی ہے جیسے چراغ کے لئے تیل' اور اس کے باعث تمام بدن میں پائی جانے والی حیات ایسی ہے جیسے چراغ کی وجہ سے مکان کے اندر کی روشنی' جس طرح تیل ختم ہوجانے کی وجہ سے چراغ بجھ جاتا ہے' اسی طرح روح کا چراغ اس وقت بجھ جاتا ہے جب اس کی غذا کا سلسلہ منقطع ہوجاتا ہے' نیز جس طرح کبھی کبھی بتی جل جاتی ہے' اور راکھ بن جاتی ہے' یعنی اس میں تیل جذب کرنے کی صلاحیت باقی نہیں رہتی حالانکہ چراغ تیل سے لبریز ہوتا ہے' اس طرح وہ خون بھی جو دل میں ہے دل کی حرارت کی شدت سے جل جاتا ہے' اور غذا کے باوجود روح کا چراغ بجھ جاتا ہے' کیونکہ اس میں قبول کی غذا کی استعداد ہی باقی نہیں رہتی کہ اس سے روح کا وجود برقرار ہے جیسے راکھ میں تیل اس طرح جذب نہیں ہوتا کہ اس میں آگ قبول کرنے کی صلاحیت پیدا ہوجائے پھر جس طرح چراغ کبھی داخلی سبب (مثلاً تیل نہ رہنے یا بتی جل جانے) کے باعث بجھ جاتا ہے' اسی طرح خارجی سبب سے بھی بجھ جاتا ہے' مثلاً ہوا سے' اسی طرح روح کبھی اپنے داخلی سبب سے فنا ہوجاتی ہے' اور کبھی خارجی سبب یعنی قتل کرنے سے معدوم ہوجاتی ہے۔ چراغ چاہے تیل ختم ہونے سے بجھے یا بتی جلنے سے' یا کسی انسان کے پھونک مارنے سے یا ہوا کی زد میں آجانے سے' کسی بھی طرح بجھے اللہ کے حکم سے بجھتا ہے' اور یہ تمام امور تقدیر الٰہی کے مطابق عمل میں آتے ہیں' اسی طرح انسانی روح کا معاملہ بھی ہے' یہ کسی بھی طرح فنا ہو' کسی بھی سبب سے معدوم ہو' اللہ کے علم میں ہے' اسکی تقدیر ازلی کے بموجب ہے' ام الکتاب میں ہر روح کی انتہائی مدت مقرر ہوچکی ہے' جب یہ مدت پوری ہوگی روح کا رشتہ جسم سے منقطع ہوجائے گا' اور یہ انقطاع اسی صورت میں ہوگا جس طرح کاتب ازل نے لکھ دیا ہے۔

جس طرح چراغ بجھ جائے تو مکان تاریک ہوجاتا ہے' اسی طرح روح نکل جائے تو تمام بدن میں تاریکی پھیل جاتی ہے اور ان انوار کا سلسلہ منقطع ہوجاتا ہے جو روح سے حاصل کیے جارہے تھے' یعنی احساس' ادراک' ارادے' اور ان تمام امور کے انوار جن کو لفظ حیات شامل ہے' روح بھی ایک رمز ہے' اللہ کی نعمتوں کی طرف ایک بلیغ اشارہ ہے' اور اس مضمون کی صداقت کا اعلان ہے :۔

لَوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِكَلِمَاتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمَاتُ رَبِّيْ (پ ۱۶ ر ۳

آیت ۱۰۹)

اگر میرے رب کی باتیں لکھنے کے لئے سمندر (کا پانی) روشنائی ہو تو میرے رب کی باتیں ختم ہونے سے پہلے سمندر ختم ہو جائے۔

جو شخص یہ تمام باتیں جاننے کے باوجود اسکی نعمتوں کا منکر ہو' اور شکر ادا نہ کرے وہ کس قدر بد قسمت ہے' اللہ تعالیٰ کی رحمت سے کس قدر دور ہے اور اسکے عذاب سے کتنا قریب ہے۔

روح کی امثال پر اعتراض : یہاں ہماری اس مثال پر اعتراض کیا جاسکتا ہے' ہم نے روح کو چراغ سے تشبیہ دی ہے' بعض لوگ اسے ہماری جسارت بیجا کہہ سکتے ہیں' کیونکہ جب سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے روح کے متعلق سوال کیا گیا تو آپ نے ارشاد فرمایا اَلرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ" آپ نے روح کی یہ صفت بیان نہیں فرمائی جو ہم نے بیان کی ہے' اسکا جواب یہ ہے کہ اس طرح کے اعتراضات اس وقت پیدا ہوتے ہیں' جب کسی لفظ کے مشترک معانی پر توجہ دی جاتی۔ روح ایک ایسا لفظ ہے جو بہت سے معنوں کے لئے استعمال کیا جاتا ہے' یہاں ان تمام معانی کا ذکر طوالت کا باعث ہے ہم نے روح کو ایک جسم لطیف کہا ہے' اسے اطباء روح کہتے ہیں' انہوں نے اس کی صفت' اسکا وجود اعضاء میں اسکے جاری ہونے کی کیفیت' اور اسکے ذریعے اعضاء اور قویٰ میں حاصل ہونے والے احساس کی معرفت حاصل کی ہے' یہاں تک کہ اگر کوئی عضو سن ہو جاتا ہے تو وہ یہ کہتے ہیں' کہ روح کے جاری ہونے کی جگہ کوئی سدّہ پڑ گیا ہے' اس لئے وہ سن ہو جانے والے عضو کا علاج نہیں کرتے بلکہ ان کی جگہوں پر توجہ دیتے ہیں' جہاں سے اعصاب جنم لیتے ہیں' اور جہاں سدّے واقع ہوئے ہیں' اور وہ دوائیں تجویز کرتے ہیں' جن سے سدے کھل جائیں یہ روح اپنی لطافت کی بنا پر پٹھوں کے جال سے گزرتی ہے' اور پٹھوں کے ذریعے دل سے گزر کر تمام جسم میں پھیلتی ہے' اطباء نے روح کے جو معنی بیان کئے ہیں وہ اتنے پیچیدہ نہیں کہ سمجھ میں نہ آئیں' لیکن جہاں تک اس اصل روح کا سوال ہے جس کے فساد سے تمام بدن فاسد ہو جاتا ہے' وہ اللہ تعالیٰ کے اسرار میں سے ایک سرّ ہے' جس کی صفت بیان کرنا ہمارے لئے ممکن نہیں ہے' اور نہ ہمیں اس کی اجازت ہے' اس روح کے متعلق اگر کوئی سوال کیا جائے تو یہی کہا جائے گا کہ یہ ایک امر ربانی ہے' اور عقلیں ان امور کا ادراک نہیں کر سکتیں' بلکہ عام طور پر لوگ اس معاملے میں حیران رہ جاتے ہیں' اوہام اور خیالات تو اس کی حقیقت تک پہنچنے سے بہر صورت قاصر نظر آتے ہیں جیسے آنکھ آواز کا ادراک کرنے سے قاصر رہتی ہے' عقلیں جوہر و عرض کی قید میں گرفتار ہیں وہ ان امور کے اوصاف کا تحمل نہیں کر سکتیں' اس ادراک کے لئے ایک اور نور کی ضرورت ہے' جو عقل سے اعلا اور اشرف ہے' یہ نور صرف عالم نبوت اور عالم ولایت کے ساتھ مخصوص ہے' عقل کے ساتھ اس نور کی نسبت ایسی ہے جیسے وہم و خیال کے ساتھ عقل کی نسبت' اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو یکساں پیدا نہیں کیا' جس طرح ایک بچہ صرف محسوسات کا ادراک کر سکتا ہے' معقولات کا ادراک نہیں کر سکتا' اس لئے کہ ابھی وہ اس منزل پر نہیں پہنچا جہاں معقولات سے آگے کی چیزوں کا ادراک کر سکے' ماوراء معقولات کا ادراک کرنا ایک اعلا منزل' اور اشرف مرتبہ ہے' یہاں سے آدمی اپنے ایمان و یقین کے نور سے بارگاہ حق کا ادراک کر لیتا ہے' یہ مرتبہ اتنا بلند ہے کہ ہر کسی کو حاصل نہیں ہوتا' بلکہ ایک کے بعد دوسرا حاصل کرتا ہے' اس بارگاہ حق کا ایک صدر مقام ہے' اور اسکے اوپر ایک نہایت وسیع و عریض میدان ہے اور اس میدان کے آغاز میں ایک دروازہ ہے' جس پر ایک پاسبان متعین ہے' یہ پاسبان امر ربانی ہے' اور جو شخص اس دروازے تک نہ پہنچے' یا اسکے پاسبان کا دیدار نہ کرے وہ میدان تک کیسے پہنچ سکے گا' اور ان مشاہدات سے بہرہ اندوز کیسے ہو گا جو اس میدان میں قدم رکھنے کے بعد ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ اسی لئے اکابر علماء ارشاد فرماتے ہیں کہ جس نے اپنے نفس کو نہیں پہچانا اس نے رب کو نہیں پہچانا۔ یہ امور جو ہم نے بیان کئے ہیں اطباء کے موضوع سے خارج ہیں اسی لئے ان کی کتابوں میں ان کا ذکر نہیں ملتا۔ اطباء جس معنی کو روح کہتے ہیں امر ربانی کے مقابلے میں اس کی حقیقت اس گیند سے زیادہ نہیں جسے بادشاہ اپنے بلّے سے حرکت دے' اور دیکھنے والا گیند دیکھ کر یہ کہے کہ میں نے بادشاہ کو دیکھ لیا ہے' ظاہر ہے اسکا یہ کہنا خطاء وہم اور خام خیالی ہے بلکہ طبی روح کو وہ روح سمجھنا

جسے امر ربانی کہتے ہیں، محض خطا ہے۔ کیونکہ وہ انسانی عقلیں جن کے باعث اوامر ربانی صادر ہوتے ہیں اور جن سے دنیاوی مصالح معلوم ہوتے ہیں ان امور ربانیہ کے حقائق کا ادراک کرنے سے قاصر ہیں، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو روح کی حقیقت بتلانے کی اجازت نہیں دی، بلکہ آپ کو یہ حکم دیا کہ لوگوں سے ان کی عقلوں کے مطابق گفتگو کریں، اللہ تعالیٰ نے بھی اپنی کتاب میں اسکی حقیقت بیان نہیں فرمائی بلکہ اس کی نسبت اور فعل کا تذکرہ فرمایا، اس کی ذات یا وصف بیان نہیں فرمایا، نسبت ان الفاظ میں بیان فرمائی :۔

قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي (پ۱۵ ر۱۰ آیت ۸۵)

آپ کہہ دیجئے کہ روح میری رب کے حکم سے ہے۔

اور فعل کا ذکر ان الفاظ میں فرمایا۔

يَا أَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِي إِلَى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً فَادْخُلِي فِي عِبَادِي وَادْخُلِي جَنَّتِي (پ۳۰ ر۱۴ آیت ۳۰)

اے اطمینان والی روح تو اپنے پروردگار کی طرف چل اس طرح کہ تو اس سے خوش اور وہ تجھ سے خوش، پھر تو میرے بندوں میں شامل ہو جا۔ اور میری جنت میں داخل ہو جا۔

اب ہم پھر اپنے مقصود کی طرف واپس چلتے ہیں، ہم کھانے کے متعلق اللہ تعالیٰ کی نعمتیں بیان کر رہے تھے، اور گفتگو کھانے کے آلات کی چل رہی تھی۔

وہ اصولی نعمتیں جن سے غذا حاصل ہوتی ہے۔

جاننا چاہیے کہ غذائیں بے شمار ہیں، اور ان کی تخلیق میں اللہ تعالیٰ کے عجائبات شمار سے باہر ہیں، پھر ہر غذا کے اسباب کا سلسلہ بھی لامتناہی ہے، ان تمام عجائبات اور اسباب کا ذکر طوالت کا باعث ہے، اس لئے ہم اختصار کے ساتھ کچھ بیان کرتے ہیں۔

کھانے کی تین قسمیں : کھانے کی تین قسمیں ہیں، دوائیں، میوے، غذائیں، ہم ان تینوں میں سے صرف غذا کا ذکر کرتے ہیں، یہی اصل بھی ہے، اور غذا میں بھی گیہوں کو لے لیتے ہیں، طوالت کے خوف سے باقی تمام غذائیں نظر انداز کرتے ہیں۔ اب ہم کہتے ہیں کہ اگر تمہیں گیہوں کا ایک دانہ یا چند دانے مل جائیں اور تم انہیں کھالو تو آئندہ کے لئے کچھ باقی نہ بچے گا، اور چند دانوں سے پیٹ بھی نہ بھر پائے گا، اس لئے ضرورت پیش آئی کہ گیہوں کے دانوں میں بڑھنے اور نمو پانے کی صلاحیت ہو، تاکہ وہ تمہاری تمام ضرورت پوری کر سکیں، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے گیہوں کے دانے میں بھی غذا حاصل کرنے کی قوت پیدا کی ہے جس طرح تمہارے اندر پیدا کی ہے۔ تم میں اور نباتات میں صرف حس اور حرکت کا فرق ہے، جہاں تک غذا حاصل کرنے کا سوال ہے اس میں تم اور نبات دونوں مشترک ہو، نبات پانی سے غذا حاصل کرتی ہے، اور اپنی رگوں اور جڑوں کے ذریعے پانی اپنے باطن میں جذب کرتی ہے، جس طرح تم غذا حاصل کرتے ہو، اور رگوں کے ذریعے جسم میں جذب کر لیتے ہو، ہم ان آلات کا ذکر کر کے کلام کو طول نہیں دینا چاہتے جن کے ذریعے نبات پانی جذب کرتی ہے، مگر اسکی غذا ضرور بیان کرتے ہیں۔

ہر چیز کی غذا مخصوص ہے : جس طرح تم مٹی اور لکڑی سے غذا حاصل نہیں کر سکتے اور اس سے سیر نہیں ہو سکتے بلکہ ایک مخصوص کھانے کے محتاج رہتے ہو اسی طرح گیہوں کا دانہ بھی ہر چیز سے غذا حاصل نہیں کر سکتا، بلکہ ایک مخصوص چیز کا محتاج رہتا ہے، اسکی دلیل یہ ہے کہ اگر تم گھر میں کہیں ایک دانہ رکھ دو تو وہ بڑھے گا نہیں کیونکہ وہاں اسے صرف ہوا گھیرے رہتی ہے، اور صرف ہوا اس کے لئے غذا بننے کی صلاحیت نہیں رکھتی، اسی طرح اگر تم پانی میں ڈال دو گے تب بھی نہیں بڑھے گا، بلکہ اگر کسی زمین میں چھوڑ دو گے جہاں پانی نہیں ہوتا تب بھی نہیں بڑھے گا، بلکہ اسکی نمو اور بڑھوتری کے لئے ایسی زمین کا ہونا ضروری ہے جس میں پانی ہو، اور وہ

پانی مٹی میں مل گیا ہو' قرآن کریم نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے :۔

فَلْيَنْظُرِ الْإِنْسَانُ إِلَى طَعَامِهِ أَنَّا صَبَبْنَا الْمَاءَ صَبًّا ثُمَّ شَقَقْنَا الْأَرْضَ شَقًّا فَأَنْبَتْنَا فِيهَا حَبًّا وَعِنَبًا وَقَضْبًا وَزَيْتُونًا (پ ۳۰ ر ۵ آیت ۲۹)

سو انسان کو چاہیے کہ اپنے کھانے کی طرف نظر کرے کہ ہم نے عجیب طور پر پانی برسایا پھر عجیب طور پر زمین کو پھاڑا' پھر ہم نے اس میں غلہ اور انگور' اور ترکاری اور زیتون پیدا کئے۔

پھر گیہوں کی کاشت کیلئے محض پانی اور مٹی کافی نہیں ہے' اگر تم کسی تر' سخت اور ٹھوس زمین میں دانہ ڈال دو گے تو وہ اگ نہیں سکے گا' کیونکہ ہوا موجود نہیں ہے' اس لئے کسی ایسی زمین میں دانہ ڈالنا چاہیے جو گیلی ہو اور اس حد تک نرم ہو کہ اس میں ہوا گزر سکے' پھر ہوا خود بخود اندر نہیں پہنچتی' جب تک آندھی کے ذریعے اسے حرکت نہ دی جائے' اور اس طرح نہ مارا جائے کہ ہوا خود بخود زمین کے اندر گھستی چلی جائے' قرآن کریم کی اس آیت میں اسی امر کی طرف اشارہ ہے :۔

وَأَرْسَلْنَا الرِّيَاحَ لَوَاقِحَ (۱۴ ر ۲ آیت ۲۲)

اور ہم ہی ہواؤں کو بھیجتے ہیں جو کہ بادلوں کو پانی سے بھر دیتی ہیں۔

اس سے مراد یہی ہے کہ یہ تیز ہوائیں پانی' ہوا اور زمین کو ایک دوسرے میں خلط ملط کردیتی ہیں' پھر اگر تم نے یہ کاشت سخت سردی کے موسم میں شروع کی ہے تو تم کامیاب نہ ہوسکو گے' اسکے لئے موسم ربیع اور موسم صیف کی حرارت ضروری ہے' گویا تمہاری غذا گیہوں کو چار چیزوں کی ضرورت ہے پانی' ہوا' مٹی اور حرارت۔

ان میں سے ہر چیز مختلف چیزوں کی محتاج ہے' تم خود غور کرسکتے ہو' مثلاً پانی کے لئے دریاؤں نہروں' چشموں اور تالابوں کی ضرورت ہے' ان سے پانی حاصل کیا جاتا ہے' اور کھیتوں میں پہنچایا جاتا ہے' تمہاری سہولت کے لئے اللہ نے دریا پیدا فرمائے' چشمے نکالے' اور ان سے نہریں جاری کیں' اگر یہ آبی وسائل نہ ہوتے تو کھیتی کرنا کس قدر مشکل ہوتا' اگر زمین اتنی بلندی پر واقع ہو جہاں نہروں وغیرہ سے پانی نہیں پہنچایا جاسکتا اس کے لئے بادل پیدا فرمائے' ہوائیں پانی سے بھرے ہوئے بادلوں کو ان کے بے پناہ وزن کے باوجود اپنے کاندھوں پر لئے پھرتی ہیں' اور ربیع و خریف کے موسموں میں جس قدر پانی کی ضرورت ہوتی ہے یہ بادل حکم الٰہی سے اسی قدر برستے ہیں۔

یہ بھی دیکھو کہ اللہ تعالٰی نے پہاڑوں پر چشمے پیدا فرمائے اور پہاڑوں کو ان چشموں کا محافظ بنایا' یہ چشمے سبک روی سے بہتے ہیں' اور نشیب میں رہنے والوں کو فیضیاب کرتے ہیں' اگر یہ چشمے اپنی پوری رفتار سے بہیں تو جل تھل کردیں' تمام آبادیاں تہہ آب ہوجائیں' پہاڑوں' دریاؤں' بادلوں اور بارشوں میں اللہ تعالٰی کی نعمتیں احاطۂ شمار سے باہر ہیں۔

پھر کیونکہ پانی اور مٹی دونوں بارد ہیں اس لئے ان دونوں کے اختلاط سے حرارت پیدا نہیں ہوسکتی' اس لئے سورج کو مسخر فرمایا' اور اسے کھیتوں کو گرم کرنے کی ذمہ داری تفویض کی سورج کروڑوں میل دور ہے' یہ خدا تعالٰی کی قدرت ہے کہ وہ اتنی دور واقع ہونے کے باوجود حرارت فراہم کرتا ہے' پھر اسے وہ فاصلہ دیا جس سے دونوں موسموں سرد و گرم کا امتیاز باقی رہ سکے۔ آفتاب کی تخلیق میں بھی بے شمار حکمتیں ہیں ہم نے صرف اس حکمت کا ذکر کیا ہے' جس کا تعلق تمہاری کاشت سے ہے۔ جب پودے زمین سے اونچے اٹھ جاتے ہیں اور ان پر پھل لگنے لگتے ہیں تو وہ ابتداء میں سخت سبز اور کچے ہوتے ہیں' انھیں نرم کرنے' ان کو فطری رنگ دینے' اور پکانے کے سلسلے میں ایک رطوبت کی ضرورت ہے' اس مقصد کے لئے اللہ تعالٰی نے چاند پیدا فرمایا' اور اسمیں رطوبت کی صلاحیت پیدا فرمائی' جیسا کہ سورج میں گرم کرنے کی خاصیت پیدا کی' چاند پھلوں اور میووں کو پکاتا ہے اور انھیں ان کا قدرتی رنگ دیتا ہے' اسلئے اگر کوئی درخت کسی ایسی جگہ واقع ہو جہاں چاند اور سورج کی روشنی نہ پہنچ سکے تو وہ درخت بیکار ہوجاتا ہے' چنانچہ بڑے درختوں کے سائے میں اگنے والے چھوٹے پودے جو روشنی سے محروم رہتے ہیں' اپنے نشوونما کے کمال کو نہیں پہنچتے۔ چاند کی

اس خاصیت ہے کہ وہ رطوبت بخشتا ہے۔ کا اندازہ تم اس طرح کر سکتے ہو کہ چاندنی راتوں کو طول دینے سے کوئی فائدہ نہیں، یہ موضوع اس قدر تفصیلی ہے کہ کبھی تمام نہ ہو پائے گا، اصولی اور بنیادی بات یہ ہے کہ آسمان میں کوئی ستارہ ایسا نہیں جس سے کوئی فائدہ نہ ہو، جس طرح چاند میں رطوبت اور سورج میں حرارت ہوتی ہے اسی طرح باقی ستاروں میں بھی کوئی نہ کوئی افادیت موجود ہے ستاروں میں اس قدر نعمتیں پنہاں ہیں کہ انسان ان کا احاطہ کرنے سے قاصر ہے، اگر یہ نعمتیں نہ ہوتیں تو گویا ان کا پیدا کرنا لغو ہوتا اور قرآن کریم کا یہ دعوی صحیح نہ ہوتا:

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا (پ ۴ ر ۱۱ آیت ۱۹۱)

اے ہمارے پروردگار آپ نے اسکو لایعنی نہیں پیدا کیا ہے۔

مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ (پ ۲۵ ر ۱۵ آیت ۳۸)

اور ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان میں ہے اس کو اس طور پر نہیں بنایا کہ ہم عبث فعل کرنے والے ہوں۔

دنیا کی کوئی چیز بیکار نہیں: جس طرح تمہارے جسم کا کوئی عضو بیکار نہیں ہے، بلکہ ہر عضو کے ساتھ فوائد وابستہ ہیں اسی طرح عالم کے جسم کا کوئی عضو بھی بیکار نہیں ہے، بلکہ ہر عضو سے کچھ نہ کچھ فائدہ پہنچتا ہے، عالم کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص، اور اس کے آحاد کی مثال ایسی ہے جیسے اس شخص کے اعضاء۔ جس طرح تمہیں اپنے اعضا سے تقویت ملتی ہے، اسی طرح عالم کو بھی اپنے اعضاء سے تعاون ملتا ہے۔ اس ایجاز کو تفسیر میں بدلنے کی گنجائش نہیں ورنہ اس موضوع پر بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے۔

یہاں یہ کہنا صحیح نہیں کہ اللہ تعالی نے چاند، سورج اور ستاروں کو جن حکم اور مصالح کے لئے مسخر کیا ہے ان کی تسخیر پر ایمان لانا شریعت کے خلاف ہے، کیونکہ شریعت نے نجومیوں، اور علم نجوم کی تصدیق سے منع فرمایا ہے، تمہارا کہنا اسلئے صحیح نہیں کہ علم نجوم کی تصدیق سے شریعت نے ان دو باتوں کی وجہ سے مخالفت کی ہے، ایک تو یہ کہ جو لوگ ان علوم کی تصدیق کرتے ہیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ نجوم اپنے آثار کے لئے خود ہی مؤثر اور اپنے افعال کے خود ہی فاعل ہیں، وہ اپنے خالق، اور کائنات کے مدبر سے مقہور اور مسخر نہیں ہوئے، ظاہر ہے یہ عقیدہ کفر ہے، اس لئے اس سے منع کیا گیا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ جو کچھ منجمین کہتے ہیں اگر ان کو من وعن صحیح جانا جائے، اور ان کی تصدیق کی جائے تو یہ بھی صحیح نہیں ہے، بلکہ یہ علم اندازوں پر مبنی ہے، حقائق پر نہیں ہے، ضروری نہیں کہ جو کچھ وہ کہتے ہیں حقیقت میں بھی وہی ہو، احکام نجوم کا علم بعض انبیاء کرام کو بطور معجزہ عطا ہوا تھا بعد میں یہ علم باقی نہیں رہا۔ جو کچھ صحیح تھا اس میں غلط کی آمیزش ہو گئی۔ عام لوگ اپنے قصور عقل اور عجز فہم کے باعث غلط اور صحیح میں تمیز نہیں کر سکتے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص ان آثار کو صحیح مانتا ہے جو ان کواکب کے عمل سے ظہور پذیر ہوتے ہیں اور یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ ان آثار کا ظہور دراصل خالق کائنات کی حکمت کے مظاہر ہیں تو یہ صحیح ہے، اس سے دین میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا، لیکن نہ جاننے کے باوجود یہ دعوی کرنا کہ ہم ان کواکب کے تمام آثار سے واقف ہیں غلط ہے، اور دین کے لئے نقصان دہ ہے۔ اگر تم نے اپنے کپڑے دھوئے ہوں اور تم انہیں سکھانے کا ارادہ رکھتے ہو، اور کوئی شخص تم سے یہ کہہ دے کہ دھوپ پھیلی ہوئی ہے ہوا چل رہی ہے تم اپنے کپڑے دھوپ میں پھیلادو سوکھ جائیں گے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم اسکی تکذیب کرنے بیٹھ جاؤ، اور اسے جھوٹا ثابت کرو، اسی طرح اگر کسی شخص کا رنگ سیاہ سیاہ سا نظر آرہا ہو اور تمہارے پوچھنے پر وہ یہ بتلائے کہ میں دھوپ میں چل کر آرہا ہوں اس لئے میرے چہرے کے رنگ میں تغیر ہو گیا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم اسے دروغ گو کہو، اور اس سے پوچھو کہ تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ سورج رنگ کے تغیر میں مؤثر ہے۔ اسی پر دوسرے آثار کو قیاس کیا جاسکتا ہے، تاہم بعض آثار معلوم ہوتے ہیں اور بعض مجہول۔ جو مجہول ہیں ان کے بارے میں یہ دعوی کرنا صحیح نہیں کہ وہ ہمارے علم میں ہیں، جو معلوم ہیں وہ بھی دو طرح کے ہیں بعض وہ ہیں جو عام طور پر لوگوں کو معلوم ہیں جیسے سورج سے دھوپ اور گرمی کا اثر، اور بعض ایسے ہیں جو سب کو معلوم نہیں جیسے

چاندنی سے زکام ہو جانا۔ بہرحال کواکب بیکار پیدا نہیں کئے گئے۔ ان میں بے شمار حکمتیں مخفی ہیں' سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم رات کے وقت آسمان کی طرف دیکھتے اور یہ تلاوت فرماتے :-

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلاً سُبْحَانَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ (پ ۴ ر ۱۱ آیت ۱۹۱)

اے ہمارے پروردگار آپ نے اسکو لایعنی پیدا نہیں کیا ہے ہم آپ کو منزہ سمجھتے ہیں سو آپ ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا لیجئے۔

ایک مرتبہ آپ نے یہ آیت تلاوت کرنے کے بعد فرمایا ہلاکت ہے اس شخص کے لئے جو یہ آیت پڑھے اور اکڑ میں رہے (ثعلبی۔ ابن عباس) اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اس آیت کی تلاوت کرنے والے کے لئے ضروری ہے کہ وہ اسکے معانی پر غور و فکر کرے' آسمان و زمین کے ملکوت پر اسکی نظر صرف رنگ و ہیئت' عرض و طول تک محدود نہ ہو' یہ باتیں تو چوپائے بھی معلوم کر لیتے ہیں' انسان کی نظر اس سے آگے جانی چاہیے اسے انکی حکمتوں پر غور کرنا چاہیے' اور ان حکمتوں کے ذریعے حکیم مطلق کی عظمت اور جلالت کا احساس کرنا چاہیے' آسمانوں کے ملکوت (چاند' سورج' ستاروں) ہیں' آفاق و انفس اور حیوانات میں اللہ تعالیٰ کی صنعت و حکمت کے بے شمار عجائب ہیں ان کی معرفت صرف وہ لوگ حاصل کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہیں' چنانچہ یہ عام مشاہدہ ہے کہ اگر کسی مخصوص عالم سے تعلق ہوتا ہے تو وہ اسکی تصانیف کی تلاش میں رہتا ہے' جب بھی کوئی تصنیف ملتی ہے' اسکا نہایت شوق و ذوق سے مطالعہ کرتا ہے' ساتھ ہی پرانی کتابوں میں بھی پوری دلچسپی لیتا ہے' اپنے محبوب عالم کی تحقیقات ذہن نشین کرتا ہے' اور سارے زمانے میں گاتا پھرتا ہے' یہ دنیا بھی تو اللہ تعالیٰ کی تصنیف ہے' اور وہ مصنفین بھی اللہ کی تصنیف ہیں جو عجیب و غریب تصانیف منظر عام پر لاتے ہیں' اگر تمہیں کوئی کتاب پسند آئے تو تم اسکے مصنف کی شان میں مدح سرائی نہ کرو بلکہ اس ذات کا شکر ادا کرو جس نے ایسا مصنف بنایا اور اس کے ذریعے علوم کے مخفی خزانوں سے پردہ ہٹایا۔ اگر تمہیں کہیں کٹھ پتلیاں ناچتی ہوئی' اور اپنی عجیب و غریب حرکتوں سے ناظرین کی دل بستگی کا سامان فراہم کرتی ہوئیں نظر آئیں تو تمہیں ان پر حیرت نہ کرنی چاہیے' یہ تو کپڑے سے بنی ہوئی بے جان مورتیاں ہیں' اصل تماشہ وہ دکھلا رہا ہے جو پردے کے پیچھے سے انھیں کنٹرول کر رہا ہے' اور ان کو نظر نہ آنے والے دھاگوں اور بالوں کے ذریعے حرکت دے رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے محبت کرنے والے بھی دنیا کی ہر حرکت میں اسکا پرتو دیکھتے ہیں۔ کوئی بھی چیز ہو' اس کے اسباب کا سلسلہ مسبب الاسباب پر منتہی ہو گا۔ چنانچہ نباتات کی غذا پانی ہوا' سورج اور چاند کی روشنی ہے۔ چاند سورج کے لئے افلاک ہیں جن سے یہ وابستہ ہیں' افلاک کے لئے حرکتیں ہیں' آسمانی فرشتے انھیں حرکت دینے پر مامور ہیں' اور یہ فرشتے اللہ کے حکم و اشارے پر مفوضہ فرائض انجام دیتے ہیں' غرضیکہ ایک عمل دوسرے کا سبب بنتا ہے' اور دوسرا تیسرے کا' یہاں تک کہ سلسلہ خدائے واحد تک جا پہنچتا ہے۔

غذاؤں کے نقل و حمل میں اللہ کی نعمتیں

: یہ غذائیں ہر جگہ نہیں ملتیں' بلکہ ان کے وجود کی مخصوص شرائط ہیں' بعض جگہوں پر دستیاب ہوتی ہیں اور بعض جگہوں پر دستیاب نہیں ہوتیں' جب کہ ان غذاؤں کے استعمال کرنے والے تمام دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں' بعض لوگ ایسے ہیں جن تک غذاؤں کے نقل و حمل میں اللہ تعالیٰ کی نعمتیں نہ ہوتیں تو یہ بیچارے بھوکے مر جاتے۔

ان لوگوں تک غذائیں پہنچانے کے لیئے اللہ تعالیٰ نے تاجروں کو مسخر فرمایا' ان کے دلوں پر مال کی حرص' اور نفع کی خواہش مسلط فرمائی' جب کہ اکثر اوقات انھیں اس مال سے کوئی خاص فائدہ نہیں ہوتا جسے وہ زندگی بھر کماتے ہیں اور جمع کرتے ہیں' کبھی وہ اپنی مال بردار کشتیوں سمیت سمندروں میں غرق ہو جاتے ہیں' کبھی رہزن انھیں لوٹ لیتے ہیں' کبھی دشت و صحرا کی سختیاں برداشت نہیں کرپاتے اور ہلاک ہو جاتے ہیں' اور جو کچھ وہ چھوڑتے ہیں لاوارث مال سمجھا جاتا ہے اور حکومت کے خزانوں میں جمع ہو جاتا ہے' تجارتی اسفار کامیاب ہو بھی جائیں تو جمع پونجی ورثاء کے ہاتھ لگتی ہے اور وہ خوب داد عیش دیتے ہیں' دیکھو اللہ تعالیٰ نے انکے دلوں پر

غفلت اور جہالت کے پردے ڈال دیئے ہیں' آنکھیں کھلی ہیں لیکن پیسے کی محبت انھیں خطروں اور مشقتوں کو جھیلنے پر آمادہ کرلیتی ہے' وہ نفع کی طلب میں سختیاں جھیلتے ہیں' خطروں سے کھیلتے ہیں' سمندر کے سفر میں ہواؤں سے لڑتے ہیں' اور ضرورت کی چیزیں مغرب سے مشرق تک پہنچاتے ہیں۔ یہ بھی دیکھو کہ اللہ تعالیٰ نے بحر و بر میں سفر کرنے کے ذرائع پیدا کئے' اور ان ذرائع کی فراہمی کا طریقہ سکھلایا' مثلاً یہ سکھلایا کہ کشتیاں کیسے بنائی جاتی ہیں' ان پر کس طرح سواری کرتے ہیں' کیسے مال لادتے ہیں' پھر حیوانات پیدا کئے اور انھیں باربرداری کے لئے مسخر کیا' پھر جو جانور باربرداری اور سواری کے لئے موزوں ہیں انھیں انکے مناسب اوصاف عطا کئے' مثلاً گھوڑے کو برق رفتاری دی' گدھے کو صبر و تحمل دیا' اونٹ میں کم کھانے اور زیادہ سے زیادہ مشقت برداشت کرنے کی قوت بخشی' تم ہی میں سے بہت سے انسانوں کو وہ بحر و بر میں کشتیوں اور ان جانوروں کے ذریعے دنیا کے اس کونے سے اس کونے تک پھراتا ہے تاکہ وہ تمہاری ضرورت کی چیزیں تمہیں فراہم کرسکیں' اور جو چیزیں تم سے زائد ہیں اور تم سے دور رہنے والے انکے محتاج ہیں ان تک پہنچاسکیں' پھر حیوانات کی غذائیں بھی پیدا کیں' یعنی انکے آب و دانہ اور دیگر ضروریات کا انتظام بھی کیا' اور وہ چیزیں بھی پیدا فرمائیں جن سے کشتیاں بنتی ہیں' بہرحال غذاؤں کے نقل و حمل کے سلسلے میں جن نعمتوں سے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو نوازا ہے' وہ بھی ناقابل شمار ہیں۔

غذا کی تیاری میں اللہ تعالیٰ کی نعمتیں

دنیا میں جو چیزیں نباتات یا حیوانات میں سے کھانے کے لئے پیدا کی گئی ہیں وہ جوں کی توں کھائی نہیں جاتیں' اور نہ انھیں اسطرح کھانا ممکن ہے' بلکہ کھانے کے لئے انھیں اس قابل کرنا ضروری ہے کہ ایک سلیم الفطرت انسان اسے حلق سے اتار سکے' پھر یہ بھی ممکن نہیں کہ جتنی چیزیں کھانے کی ہیں ان کے تمام اجزاء کھالئے جائیں' بلکہ بعض اجزاء پھینک دیئے جاتے ہیں اور بعض استعمال کئے جاتے ہیں۔ ہم تمام غذاؤں کا الگ الگ جائزہ نہیں لے سکتے' اس لئے صرف ایک غذا کا ذکر کرتے ہیں اور وہ ہے روٹی' یہ غذا اپنی پیدائش سے ہمارا نوالہ بننے تک کتنے مراحل سے گزرتی ہے' اسکا اندازہ مندرجہ ذیل سطور سے کیا جاسکتا ہے۔

جب تم روٹی کی اصل گیہوں کو کاشت کرنے کا ارادہ کرتے ہو تو سب سے پہلے زمین کی درستی کا مسئلہ سامنے آتا ہے' یعنی پہلے زمین میں جوتتے ہو' اور اسکے لئے بیل استعمال کرتے ہو' پھر دانہ ڈالتے ہو' پھر ایک مدت تک اسکی آبیاری کرتے ہو' خود رو پودوں سے بچاتے ہو' اس میں کھاد ڈالتے ہو' جب کھیتی تیار ہوجاتی ہے تو اسے کاٹتے ہو' گاہتے ہو' اناج کے دانے الگ الگ کرتے ہو' پھر پیستے ہو' گوندھتے ہو' اسکے بعد آگ پر پکاتے ہو' اس سلسلے میں جتنے مرحلے ہم نے بیان کئے ہیں' اور جتنے چھوڑ دیئے ہیں انھیں شمار کرو' اور ان لوگوں کی تعداد بھی شمار کرو جو ان مختلف مراحل سے تمہاری غذا کو بسلامت گزارنے پر مامور ہیں' لوہے' لکڑی اور پتھر کے وہ آلات بھی گنو جو ان تمام مراحل میں کام آتے ہیں' پھر ان کاریگروں پر نظر ڈالو جو کرنے' پیسنے اور روٹی پکانے کے سلسلے میں استعمال ہونے والے آلات بنانے' اور ان کی اصلاح و مرمت کا کام کرتے ہیں' گویا تم ایک روٹی حاصل کرنے کے لئے لوہار اور بڑھئی تک کے محتاج ہوتے ہو' پھر لوہار لوہے' تانبے اور سیسے کی ضرورت محسوس کرتا ہے' اس ضرورت کی تکمیل کے لئے پہاڑ پیدا کئے' پھر بنائے' کانیں پیدا کیں' پھر زمینیں بھی مختلف بنائیں' بعض زمینیں غذاؤں کے لئے مخصوص بنائیں' اگر تحقیق کی جائے تو تمہیں یہ بات معلوم ہوجائے گی کہ گیہوں کے دانے گول روٹی بننے تک اور تمہاری غذا کی صلاحیت پانے تک کم از کم ایک ہزار افراد کے ہاتھوں سے گزرتے ہیں' ابتداء اس فرشتے سے ہوتی ہے جو بادل ہنکانے پر مامور ہے' جب فرشتے اپنے اعمال سے فارغ ہوتے ہیں' تب انسانوں کا عمل شروع ہوتا ہے' پھر جب وہ گول ہوجاتی ہے تو اسکے طلبگار سات ہزار کاریگر ہوتے ہیں جن میں سے ہر کاریگر ایسی اصل چیزیں بناتا ہے جن سے مخلوق کی مصالح پوری ہوتی ہیں' پھر آلات میں انسانی اعمال کی کثرت پر غور کرو' سوئی ایک چھوٹا سا آلہ ہے جو لباس سینے کے کام آتا ہے' اور لباس تمہیں سردی سے بچاتا ہے' یہ چھوٹی سی سوئی لوہے کے اس ٹکڑے سے جس سے سوئی بنائی جاسکتی ہو مکمل ہونے تک کم از کم پچیس مرتبہ کاریگر کے ہاتھوں سے گزرتی ہے اور ہر مرتبہ وہ اس میں کوئی نہ کوئی کام کرتا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ شہروں میں اجتماعیت پیدا نہ کرتا اور بندوں کو مسخر نہ کرتا تو کوئی بھی انسانی ضرورت پوری نہ ہوپاتی' مثلاً تمہیں کھیتی کاٹنے کے لئے درانتی کی

ضرورت ہوتی ہے' لیکن تم عمر تمام کردیتے یہ درانتی نہ بناپاتے' کس قدر عظیم ہے وہ ذات جس نے منی کے ایک گندے قطرے سے انسان کو پیدا کیا' پھر اسے عجیب و غریب چیزیں بنانے کی عقل عطا کی' مثلاً قینچی ایک حقیر سا آلہ ہے' اس کی دو پتیاں ایک دوسرے پر رہتی ہیں' مگر کپڑا کاغذ وغیرہ چیزیں تیزی سے کاٹ دیتی ہیں' اگر اللہ تعالیٰ پہلے زمانے کے لوگوں پر قینچی بنانے کا طریقہ واضح نہ کرتا' اور اب ہمیں اس کی ضرورت پیش آتی تو ہم سوچتے ہی رہ جاتے کیا کریں' اگر ہمیں عقل مکمل ملتی' اور حضرت نوح علیہ السلام کی عمر عطا کی جاتی تب بھی ہم محض یہ آلہ بنانے سے قاصر رہتے چہ جائیکہ دوسرے آلات بناتے' پاک ہے وہ ذات جس نے اندھوں کو بیناؤں کے ساتھ کردیا کہ وہ انھیں راہ دکھلا سکیں۔

یہ آلات' یہ کاریگر تمہارے لئے کتنے ضروری ہیں یہ تم خوب اچھی طرح جانتے ہو۔ فرض کرو تمہارے شہر میں کوئی طحان (آٹا پیسنے والا) لوہار' جولاہا یا حجام وغیرہ نہ ہو تو تمہیں کتنی زبردست مشکلات برداشت کرنی ہوں گی' اور کیسی اذیت کا سامنا کرنا پڑے گا' اور ان لوگوں سے متعلقہ معاملات میں تم کس قدر پریشان ہو گے' پاک ہے وہ ذات جس نے اپنے بعض بندوں کو بعض کے لئے مسخر کردیا' یہاں تک کہ اسکی مشیت پوری ہوئی' اس کی حکمت تمام ہوئی۔

غذا تیار کرنے والوں میں اللہ کی نعمتیں

اگر یہ تمام اہل حرفت' اور غذائیں تیار کرنے والے رائے' اور طبیعت میں مختلف ہوجائیں تو ایک دوسرے سے دور رہیں' جس طرح دو وحشی ایک دوسرے سے دور رہتے ہیں' نہ ایک دوسرے سے استفادہ کرتے ہیں' نہ حریف کی رائے سے اتفاق کرتے ہیں' نہ یہ لوگ ایک مقصد پر' ایک غرض پر متحد ہوسکتے ہیں' اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے دلوں میں الفت پیدا کی' ان میں انس و محبت کے جذبات پیدا کئے۔ قرآن کریم میں ہے :۔

لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مَّا اَلَّفْتَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَیْنَهُمْ (پ ۱۰ ر ۴ آیت ۶۳)

اگر آپ دنیا بھر کا مال خرچ کرتے تب بھی انکے قلوب میں اتفاق پیدا نہ کرسکتے لیکن اللہ ہی نے ان میں باہم اتفاق پیدا کردیا۔

چنانچہ اسی الفت' یگانگت' اور اتحاد و طبائع کے باعث لوگ جمع ہوئے' انھوں نے ویرانوں کو آبادیوں میں تبدیل کیا' شہر بسائے' بستیاں آباد کیں' رہنے کے لئے گھر تعمیر کئے' ایک دوسرے سے متصل' ایک دوسرے کی دیوار کے سائے میں بازار بنائے ان میں قریب قریب دکانیں رکھیں خلق کی تمام مصالح پوری کرنے کے لئے کارخانے قائم کئے غرضیکہ ایک انسان سے دوسرے کی اور دوسرے سے تیسرے کی ضرورت وابستہ کی۔

پھر کیوں کہ انسانوں کی طبیعت میں حرص و حسد بھی ہے' غصہ اور غضب بھی ہے' اس لئے وہ ایک دوسرے سے لڑ بھی پڑتے ہیں خاص طور پر وہ دو آدمی ضرور لڑتے ہیں جن کے مقاصد میں اشتراک ہوتا ہے' بعض اوقات یہ جھگڑے ہلاکت کا باعث بن جاتے ہیں' ان جھگڑوں سے نمٹنے کے لئے' اور لوگوں کو امن و سکون سے زندہ رکھنے کے لئے اللہ نے ان پر حکمران مقرر کئے' انھیں قوت دی' سہولتیں فراہم کیں' رعایا کے دلوں میں ان کا رعب اور دبدبہ پیدا فرمایا' تاکہ وہ ان کے احکام پر عمل کریں' اور سرکشی کرکے ملکی نظم کو درہم برہم نہ کریں۔ پھر اسی پر بس نہیں کیا بلکہ ان سلاطین اور حکمرانوں کو ملکوں کا نظم و نسق صحیح رکھنے کا سلیقہ سکھلایا' انھوں نے ملک کو مختلف حصوں میں' اور ان حصوں کو متعدد بڑے شہروں' بستیوں اور قریوں میں تقسیم کردیا' گویا ہر شہر ایک مستقل ملک ہے' ہر حصہ اپنی جگہ مستقل ہے' یہ تمام حصے اور شہر ایک دوسرے سے تعاون کرتے ہیں' جیسے ایک شخص کے اجزاء' ان میں سے بعض کو بعض سے نفع ہوتا ہے' پھر ان حکام نے ہر شہر میں اپنا ماتحت ایک حاکم' ایک قاضی اور ایک کوتوال مقرر کیا' اور لوگوں کو زبردستی امن اور عدل کے قوانین کا پابند بنایا' اور ان میں باہمی موافقت اور ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کا جذبہ پیدا کیا' چنانچہ ایک معمولی قصاب' اور ایک حقیر نانبائی شہر کے تمام اہل حرفت اور اصحاب پیشہ سے نفع اٹھاتا ہے' اور تمام ہنرمند' اور پیشہ ور اس

سے مستفید ہوتے ہیں، حجام کسان سے، اور کسان حجام سے فائدہ اٹھاتا ہے، اور سب سلطان کی قائم کردہ ترتیب کے تحت مرتب، اسکے ضبط کے تحت منضبط اور اسکی جمع کے تحت مجتمع رہتے ہیں، عام زندگی پر کوئی خلل نہیں پڑتا، ایک ضابطے اور اصول کے مطابق سب اپنی روش اپنی ڈگر پر گامزن رہتے ہیں، جس طرح اعضاء بدن میں سے ہر عضو اپنا اپنا فرض ادا کرتا ہے، اور دوسرے اعضاء کے ساتھ تعاون کرتا ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ کا انعام، اسکا کرم اور احسان دیکھئے کہ اس نے صرف سلاطین کو سلطنت، اور حکمرانوں کو حکمرانی دے کر مطلق العنان نہیں بنایا بلکہ انبیاء علیہم السلام کو مبعوث فرمایا، تاکہ سلاطین کی اصلاح کریں، انبیاء علیہم السلام نے انھیں اپنی رعایا کے ساتھ منصفانہ برتاؤ کرنے کے طریقے بتلائے، سیاسی قوانین سے آگاہ کیا، امامت اور سلطنت کے ضابطے بیان فرمائے، اور فقہ کے ان مسائل سے مطلع کیا جن کے ذریعے وہ اپنے دین اور دنیا کی اصلاح کرسکتے ہیں۔

فرشتوں کے ذریعہ انبیاء کرام کی اصلاح فرمائی، اور فرشتوں میں سے ایک کو دوسرے کا مصلح بنایا، اور انتہا اس مقرب فرشتے پر ہوئی جس کے اور رب العالمین کے درمیان کوئی واسطہ نہیں رہتا۔ گویا دنیا اصلاح اعمال کی ایک فطری ترتیب ہے، نانبائی روٹی پکاتا ہے پیسنے والا گیہوں کی اصلاح کرتا ہے، یعنی اسے پیستا ہے، کاشتکار غلے کی اصلاح کاٹنے سے کرتا ہے، لوہار کاشتکاری کے آلات کی اصلاح کرتا ہے، بڑھئی لوہار کے آلات کی اصلاح کرتا ہے، دوسرے ان تمام پیشہ وروں، اور کاریگروں کا یہی حال ہے کہ وہ ایک دوسرے کے استعمال میں آنے والے آلات کی اصلاح کرتے ہیں، بادشاہ ان سب کی اصلاح کرتا ہے، انبیاء علماء کی اصلاح کرتے ہیں جو انکے وارث ہیں، اور علماء سلاطین کی اصلاح کرتے ہیں، ملائکہ انبیاء کی اصلاح کرتے ہیں، یہ سلسلہ رب کائنات پر منتہی ہوتا ہے، جو ہر نظام کا سرچشمہ ہے، ہر حسن ہر خوبی کا مطلع ہے، اور ہر ترتیب و تالیف کا مظہر ہے۔

یہ تمام چیزیں اسی رب الارباب اور مسبب الاسباب کی نعمتیں ہیں، اگر اس کا کرم اور فضل شامل حال نہ ہوتا اور وہ اپنی کتاب میں یہ ارشاد نہ فرماتا :۔

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (پ ۲۱ ر ۳ آیت ۶۹)

اور جو لوگ ہماری راہ میں مشقتیں برداشت کرتے ہیں ہم ان کو اپنے راستے ضرور دکھائیں گے۔

تو ہمیں یہ نعمتیں بھی میسر نہ ہوتیں، جو اسکی نعمتوں کے بحر ناپید کنار کا ایک قطرہ ہیں، اگر اس نے اپنے اس اعلان کے ذریعے وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا" سے ہمارے حوصلے پست نہ کردیئے ہوتے تو ہمیں بھی نعمت شماری کا شوق چراتا، اچھا ہی ہوا جو اس نے ہمارے اس شوق کو مہمیز نہیں کیا، ورنہ سمندر کو کون عبور کرسکتا ہے۔ جس کا کنارا معدوم ہو، پھر نعمت شماری سے فائدہ بھی کیا؟ کیا اس طرح وہ نعمتیں ہمیں مل جائیں گی جو ہماری قسمت میں نہیں ہیں، یا وہ نعمتیں ہم سے چھن جائیں گی جو ہمیں ملی ہے، جو چیز وہ عطا کرتا ہے اسے کوئی روک نہیں سکتا، اور جو چیز وہ نہیں دیتا اسے کوئی دے نہیں سکتا۔ ہم تو اپنی زندگی کے ہر لمحے میں اپنے دل کی یہ آواز سنتے ہیں :۔

لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ (پ ۲۴ ر ۷ آیت ۱۶)

آج کے روز کس کی حکومت ہوگی، بس اللہ کی ہوگی جو یکتا اور غالب ہے۔

اللہ کا شکر ہے کہ اس نے ہمیں کافروں سے ممتاز کیا، اور عمریں گزرنے سے پہلے یہ آواز سنادی۔

فرشتوں کی تخلیق میں اللہ کی نعمتیں

تمہارے علم میں یہ بات آچکی ہے کہ فرشتوں کے ذریعہ انبیاء علیہم السلام کی اصلاح ہوتی ہے، وحی اور ہدایت کے لئے انھیں واسطہ بنایا جاتا ہے، لیکن تمہیں یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ فرشتوں کا صرف یہی کام ہے کہ وہ انبیاء تک وحی پہنچاتے ہیں، اور انھیں ہدایت کی راہ دکھلاتے ہیں، ملائکہ اپنی کثرت تعداد، اور کثرت مراتب کے باوجود بحیثیت مجموعی تین طبقوں میں تقسیم کیے جاسکتے ہیں،

زمین کے فرشتے' آسمانی فرشتے' عرش کے حاملین فرشتے۔ ان طبقات میں سے ہم صرف ان فرشتوں کا ذکر کریں گے جو تمہاری غذا پر متعین ہیں' رشد و ہدایت کے فرشتے یہاں زیر بحث نہیں ہیں۔

یاد رہے کہ انسانی بدن کا کوئی جزو' یا نباتات کے جسم کا کوئی حصہ اس وقت تک غذا نہیں پاتا جب تک اس پر کم سے کم سات' یا دس یا سو فرشتے متعین نہ ہوں۔ غذا کے معنی یہ ہیں کہ اسکا جزو اس جزو کے قائم مقام بنے جو ضائع ہو گیا' یہ غذا آخر میں خون بن جاتی ہے' پھر ہڈی اور گوشت کی شکل اختیار کر لیتی ہے' اس عمل کے بعد غذا مکمل ہوتی ہے' خون اور گوشت دونوں اجسام ہیں' انھیں قدرت' معرفت اور اختیار حاصل نہیں ہے' یہ نہ اپنے آپ حرکت کر سکتے ہیں' نہ خود متغیر ہو سکتے ہیں' محض طبیعت سے غذا مختلف شکلوں میں تبدیل نہیں ہو سکتی' جیسے گیہوں نہ خود پستا ہے' نہ گندھتا ہے' نہ روٹی ہوتا ہے' جب تک کوئی طاحن اسے نہ پیسے کوئی عاجن اسے نہ گوندھے کوئی خباز اسکی روٹی نہ بنائے' اسی طرح خون خود بخود گوشت' ہڈی' پٹھوں اور رگوں میں تبدیل نہیں ہوتا' جب تک کوئی صانع نہ ہو' اور باطن میں صانع فرشتے ہیں' جس طرح ظاہر میں شہر کے افراد صانع ہیں۔ اللہ نے تم پر ظاہری و باطنی نعمتیں نازل کی ہیں' پہلے ظاہر میں غذا کے تمام اسباب مہیا فرمائے' پھر باطن میں فرشتوں کو متعین کیا کہ وہ تمہاری غذا کو بدن کے مختلف حصوں میں پہنچادیں۔ تمہیں جس طرح ظاہری نعمتوں کی قدر کرنی چاہیے اسی طرح باطنی نعمتوں پر بھی اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے اور ان سے غفلت نہ برتنی چاہیے۔

غذا کو تحلیل ہونے اور جزو بدن بننے کے لئے مختلف فرشتوں کی اعانت کی ضرورت ہے۔ ایک فرشتہ وہ ہے جو غذا کو گوشت اور ہڈی کے پاس پہنچاتا ہے' کیونکہ غذا خود بخود حرکت نہیں کر سکتی' دوسرا فرشتہ غذا کو وہیں روکے رکھنے پر مامور ہے' تیسرا فرشتہ وہ ہے جو غذا سے خون کی شکل دور کرتا ہے' چوتھا وہ ہے جو غذا کو گوشت یا ہڈی یا رگ وغیرہ کی صورت میں بدل دیتا ہے' پانچواں وہ ہے جو غذا ضرورت سے زائد ہو اسے جسم سے دور کرے' چھٹا وہ ہے جو غذا کو اس کے مناسب مقام پر پہنچائے' مثلاً غذا کے اس حصے کو جس میں گوشت بننے کی اہلیت ہو گوشت سے ملحق کرے اور جس میں ہڈی بننے کی صلاحیت ہو اسی ہڈی سے ملائے تاکہ علیحدہ نہ رہ جائے' ساتویں فرشتے کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اس اتصال میں اصل مقدار کی رعایت کرے' یعنی جو چیز گول ہے اسے اتنی غذا فراہم کرے کہ اس گولائی پر اثر انداز نہ ہو' جو عضو عریض ہے' اس کا عرض اپنی جگہ برقرار رہے جو عضو کی ہیئت بدنمائی کی حد تک تبدیل نہ ہو' مثلاً ناک میں اگر ران کے برابر گوشت رکھ دیا جائے تو ناک بڑی ہو جائے گی' چہرہ خوفناک حد تک کریہہ ہو جائے گا' بلکہ جس عضو کو جس قدر گوشت کی ضرورت ہے اسی قدر ملے' مثلاً ناک کا ستواں پن' اس کا ابھار' اس کے نتھنوں کی چوڑائی' اندرونی خلاء سب جوں کے توں رہیں' یا تمام اعضاء کی جسامت کے ساتھ ساتھ بڑھیں' جیسے بچے کی ناک اسکے بدن کے باقی حصوں کے ساتھ ساتھ بڑھتی رہتی ہے' اسی طرح پلکیں باریک رہنی چاہیں' ڈھیلے میں صفائی ہونی چاہیے' رانیں موٹی' ہڈیاں سخت ہونی چاہیں' یعنی ہر عضو کے پاس غذا کی مقدار پہنچنی چاہیے' جس کی اس کی ہیئت' شکل' اور جسامت وغیرہ متقاضی ہو' ورنہ صورت مسخ ہو کر رہ جائے گی' بعض اعضاء بڑھ جائیں گے' بعض کمزور رہ جائیں گے' اگر یہ فرشتہ تقسیم و تفریق میں عدل ملحوظ نہ رکھے' اور بہت سا گوشت مثلاً سر اور اسکے متصل اعضاء میں ملادے اور ایک پاؤں کو محروم کردے تو وہ پاؤں ایسا ہی رہ جائے جیسا بچپن میں پتلا اور کمزور تھا' اور باقی اعضاء بدن بڑھ جائیں گے' گویا ایک ایسا شخص معرض وجود میں آجائے گا جس کا ایک پاؤں بچوں کا ہے' اور باقی اعضاء مکمل مرد کے ہیں۔

خون اپنی سرشت سے متغیر نہیں : تمہیں یہ خیال کرنا چاہیے کہ خون اپنی طبیعت کے باعث خود اپنی شکل تبدیل کر لیتا ہے' جو شخص جسمانی تبدیلی کو خون پر یا طبیعت پر محمول کرتا ہے' وہ جاہل ہے وہ یہ نہیں جانتا کہ کیا کہہ رہا ہے۔ فرشتے تمہارے جسمانی نظام میں تبدیلیوں پر متعین ہیں' یہ زمینی ملائک جب تم خواب خرگوش کے مزے لوٹتے ہو تمہارے ساتھ مشغول ہوتے ہیں' اور تمہارے باطن میں غذا اصلاح کرتے ہیں' تمہیں ان کے اصلاح و تغیر کی اطلاع بھی نہیں ہو پاتی' حالانکہ وہ تمہارے ہر جزو بدن میں داخل رہتے ہیں' اور مفوضہ فرض ادا کرتے ہیں' چاہے وہ جزو کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو' دل اور آنکھ جیسے بعض اجزاء کو سو سے زائد فرشتوں

کی ضرورت رہتی ہے' اختصار کے پیش نظر ہم اس ضرورت کی تفصیل ترک کئے دیتے ہیں'۔

زمین کے فرشتوں کو آسمانی فرشتوں سے مدد ملتی ہے' اس میں کیا ترتیب ہے' اور اس مدد کا کیا طریقہ ہے یہ اللہ ہی کو معلوم ہے۔ آسمانی فرشتے حاملین عرش سے مدد پاتے ہیں' ان سب کو خالق کائنات' رب ارباب قاضی الحاجات کی بارگاہ سے تائید' ہدایت' تسدید اور توفیق کی نعمتیں ہر لمحے ہر آن حاصل رہتی ہیں۔

روایات سے اس کی تائید ہوتی ہے کہ فرشتے آسمانوں' زمینوں کے نباتات اور حیوانات کے اجزاء پر مامور ہیں' بلکہ ابر و باراں پر بھی خدا کے حکم سے ان کا حکم چلتا ہے' یہاں تک کہ آسمان سے جو ایک قطرہ بارش کا ٹپکتا ہے' وہ بھی فرشتہ باراں کے عمل کے بغیر نہیں ٹپکتا' یہ روایات بے شمار ہیں' اور مشہور ہیں اس لئے ہم یہاں بطور دلیل انکے ذکر کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔

فرشتوں کی کثرت پر اعتراض: یہاں ایک اعتراض وارد ہو سکتا ہے' تم کہہ سکتے ہو کہ آدمی کے باطن میں غذائی تغیر و اصلاح کا عمل ایک ہی فرشتے کے سپرد کیوں نہیں کیا گیا' سات فرشتوں کی ضرورت کیوں پیش آئی' ہم دیکھتے ہیں کہ گیہوں کو غذا بنانے میں بہت سے مرحلے پیش آتے ہیں' پیسنا' گوندھنا' روٹی بنانا' وغیرہ' لیکن ایک ہی شخص یہ تمام مراحل طے کر لیتا ہے' کیا ایک فرشتہ غذائی تغیر و اصلاح کے یہ تمام مراحل تنہا طے نہیں کر سکتا؟ اسکا جواب یہ ہے کہ انسان کی پیدائش اور فرشتوں کی پیدائش میں بڑا فرق ہے۔ ہر فرشتہ ایک وصف کا حامل ہے' انسان کی طرح سے مختلف اوصاف نہیں دئے گئے اس لئے اس سے صرف وہی کام لیا جاتا ہے' جو اسکے وصف کے مطابق ہے۔ قرآن کریم میں ہے۔

وَمَا مِنَّا إِلَّا لَهُ مَقَامٌ مَّعْلُومٌ (پ ۲۳ ر ۹ آیت ۱۶۴) اور ہم میں سے ہر ایک کا ایک معین درجہ ہے۔

یہی وجہ ہے کہ وہ نہ ایک دوسرے سے نفرت کرتے ہیں' نہ ان میں ایک دوسرے سے بغض یا حسد کا جذبہ ہے' نہ مقابلہ آرائی کی خواہش ہے' وہ جس کام پر مامور کر دئے گئے ہیں' روز و شب اسی میں مشغول ہیں' ان کی مثال ایسی ہے جیسے حواس خمسہ اپنے اپنے عمل میں مشغول رہتے ہیں' ایک دوسرے سے مزاحمت نہیں کرتے' مثلاً آنکھ آواز کے ادراک میں کان سے مزاحمت نہیں کرتی' اور نہ قوت شامہ دیکھنے میں آنکھ سے متصادم ہوتی ہے' اور نہ کان سونگھنے میں قوت شامہ سے مزاحمت کرتا ہے' ہر حاسہ اپنے اپنے فرض کی ادائیگی میں مشغول نظر آتا ہے' فرشتوں کا حال اعضاء جیسا نہیں ہے' کہ ایک عضو کبھی دوسرے عضو کا کام کر لیتا ہے مثلاً ہاتھ کا کام پکڑنا ہے' لیکن کبھی تم پاؤں سے بھی پکڑنے کا کام لیتے ہو' تو اسکی گرفت مضبوط نہیں ہوتی' مگر ہاتھ کے کام میں شریک اور مزاحم ضرور ہو جاتا ہے' اسی طرح مارنے کا کام ہاتھ کا ہے لیکن کبھی کبھی وہ یہ کام سر سے کرتا ہے' حواس خمسہ کا حال انسان جیسا بھی نہیں' ایک انسان دس بیس طرح کے کام کر سکتا ہے' آٹا بھی پیس سکتا ہے' گوندھ سکتا ہے' کپڑے بنا سکتا ہے' روٹی پکا سکتا ہے' جب کہ حاسہ صرف ایک کام کر سکتا ہے' مثلاً آنکھ سے دیکھا جا سکتا ہے' سنا نہیں جا سکتا۔ دراصل انسان کا یہ وصف ان کی کجی' عدل سے اسکے انحراف پر دلالت کرتا ہے' اسکی وجہ یہ ہے کہ اسے مختلف صفات اور مختلف قسم کے دواعی و محرکات دئے گئے ہیں' وہ وحدانی الصفۃ (ایک صفت کا) نہیں ہے اس لئے وحدانی الفعل (ایک فعل کا) بھی نہیں ہے' اس لئے تم دیکھتے ہو کہ ایک انسان ایک وقت میں اللہ کی اطاعت کرتا ہے' اور دوسرے وقت میں اسکی معصیت پر کمربستہ ہو جاتا ہے' ملائکہ سے اس اختلاف کا تصور بھی ممکن نہیں ہے' انکی تخلیق اطاعت پر ہوتی ہے' ان کی فطرت میں اطاعت ہے' انکے حق میں معصیت کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔ ان کے اوصاف قرآن کریم میں بیان کئے گئے ہیں۔

لَا يَعْصُونَ اللَّهَ مَا أَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ (پ ۲۸ ر ۱۹ آیت ۶)

(جو) کسی بات میں خدا کی نافرمانی نہیں کرتے جو کچھ ان کو حکم دیا جاتا اس کو بجا لاتے ہیں۔

يُسَبِّحُونَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُونَ (پ ۱۷ ر ۲ آیت ۲۰)

رات دن اللہ کی پاکی بیان کرتے ہیں اور سستی نہیں کرتے۔

ان میں جو رکوع کرنے والا ہے وہ ہمیشہ رکوع میں رہتا ہے جو سجدہ کرنے والا ہے وہ ہمیشہ سجدہ میں رہتا ہے نہ انکے افعال میں اختلاف واقع ہوتا ہے نہ ان پر کاہلی اور سستی چھاتی ہے' ہر فرشتے کا متعین مقام ہے وہ اس سے تجاوز نہیں کرتا' ان کی اطاعت صرف اللہ کے لئے ہے' ان سے امرالٰہی میں کسی مخالفت کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا' فرشتوں کی اطاعت کی مثال ایسی ہے جیسے تمہارے اعضاء تمہاری اطاعت کرتے ہیں' چنانچہ جب تم اپنی پلکیں کھولنے کا پختہ عزم کرتے ہو اور وہ صحیح سلامت ہوتی ہیں تو پلکوں میں مخالفت کا یارا نہیں ہوتا' ایسا بھی نہیں ہوتا کہ ایک مرتبہ وہ تمہارا کہنا مان لیں' اور دوسری مرتبہ نافرمانی کریں' بلکہ یہ تو ہر وقت تمہارے اشاروں کی منتظر رہتی ہیں' خواہ وہ امر میں ہوں یا نہی میں جب بھی تم کھولنے کا ارادہ کرتے ہو یکلخت کھل جاتی ہیں' بند کرنا چاہتے ہو ارادے کے ساتھ ہی بند ہو جاتی ہیں' اس لحاظ سے فرشتوں میں اور تمہارے اعضاء بدن میں مشابہت ہے' لیکن ایک اعتبار سے دونوں میں فرق بھی ہے' اس لئے کہ پلکوں سے کھلنے اور بند ہونے کا جو فعل سرزد ہوتا ہے' انھیں اسکی خبر نہیں ہوتی' جب کہ فرشتے حیات ہیں اور اپنے اعمال کی علم و اطلاع رکھتے ہیں۔ یہ نعمتیں ہیں جو زمینی اور آسمانی فرشتوں کے سلسلے میں تمہیں عطا کی گئی ہیں اور غذا کے سلسلے میں تمہاری وہ ضرورتیں ان کے ذریعے پوری ہوتی ہیں جو ہم نے بیان کی ہیں' کھانے کے علاوہ تمہاری جو حاجات اور حرکات ہیں اور ان میں جہاں جہاں فرشتوں کی ضرورت ہوتی ہے ہم ان کا ذکر کرکے کتاب کی ضخامت نہیں بڑھانا چاہتے' اس لئے کہ یہ نعمتوں کا دوسرا طبقہ ہے' اور تمام طبقات کا احاطہ دشوار ہی نہیں ناممکن بھی ہے' بلکہ ایک طبقے کی نعمتوں کا احاطہ بھی نہیں کیا جاسکتا۔

ظاہری و باطنی نعمتوں کا شکر : اللہ تعالیٰ نے تمہیں ظاہری اور باطنی ہر طرح کی نعمتوں سے نوازا ہے' جیسا کہ قرآن کریم میں ہے :- وَأَسْبَغَ عَلَيْكُمْ نِعَمَهُ ظَاهِرَةً وَبَاطِنَةً (پ ۲۱ ر ۲ آیت ۲۰)

اور اس نے تم پر اپنی ظاہری اور باطنی نعمتیں پوری کر رکھی ہیں۔

اسکے بعد ارشاد فرمایا :- وَذَرُوا ظَاهِرَ الْإِثْمِ وَبَاطِنَهُ (پ ۸ ر ۱ آیت ۱۲۱) اور تم ظاہری گناہ کو بھی چھوڑو اور باطنی گناہ کو بھی۔

باطنی گناہوں سے وہ گناہ مراد ہیں جنھیں لوگ نہیں جانتے' جیسے حسد' بدظنی' بدعت' لوگوں کے لئے ارادۂ شر وغیرہ۔ یہ دل کے گناہ ہیں' ان گناہوں سے تائب ہونا دراصل باطنی نعمتوں کا شکر ہے' اور ظاہری گناہوں کا چھوڑنا ظاہری نعمتوں کا شکر ہے' بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ اگر کس شخص نے پلک جھپکنے میں اللہ کی نافرمانی کی' یعنی جہاں آنکھیں بند کرنی چاہئیں تھیں وہاں کھلی رکھیں تو گویا اس نے تمام نعمتوں کی ناشکری کی جو اسکے لئے آسمانوں اور زمین میں ہیں' اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے جتنی بھی چیزیں پیدا کی ہیں' ملائکہ' آسمان' زمین' حیوانات اور نباتات سب اللہ تعالیٰ کے بندوں میں سے ہر ایک کے لئے نعمتیں ہیں' اسکا نفع ان تمام چیزوں سے وابستہ ہے' گو دوسرے بھی ان سے فائدہ اٹھاتے ہوں۔

پلک جھپکنے میں اللہ کی نعمت

اب پلک جھپکنے ہی کا معاملہ لیجئے' یہ ایک ذرا سا عمل ہے' بظاہر اسکی کوئی اہمیت نہیں لیکن اس میں بھی اللہ کی بہت سی نعمتیں ہیں' وہ نعمتیں پلکوں میں ہیں' اللہ نے ہر ایک کے نیچے عضلات رکھے ہیں' ان میں اوتار اور رباط ہیں جو دماغ کے پٹھوں سے متصل ہیں' انکے ذریعے اوپر کی پلک نیچے آتی ہے' اور نیچے کی پلک اوپر کی طرف جاتی ہے' ہر پلک پر سیاہ بال ہیں' سیاہ بالوں میں اللہ کی نعمت یہ ہے کہ وہ آنکھ کی روشنی کو مجتمع رکھتے ہیں' سفیدی روشنی کو منتشر کر دیتی ہے' اور سیاہی جمع رکھتی ہے' پھر ان بالوں کو ایک وصف میں رکھا' یہ بھی ایک نعمت ہے' اس سے تمہاری نگاہیں محفوظ رہتی ہیں' اور ہوا میں اڑنے والے تنکے اور چھوٹے موٹے کیڑے اندر نہیں جاتے۔ پھر پلکوں کے ہر بال میں دو مستقل نعمتیں ہیں' ایک تو یہ کہ بالوں کی جڑیں نرم ہیں' اور دوسری یہ کہ اس نرمی کے باوجود بال کھڑا ہے۔ اوپر نیچے کی پلکیں مل کر ایک جال کی صورت اختیار کئے ہوئے ہیں' یہ بھی اللہ کی بڑی نعمت ہے' بعض اوقات ہوا میں اڑتا ہوا غبار آنکھ کھلنے میں مانع ہوتا ہے' اس صورت میں اگر آنکھیں بند کرلی جائیں تو کچھ بھی دکھائی نہ دے' آدمی اپنی آنکھیں اس طرح بند کر سکتا ہے کہ اوپر نیچے کی پلکوں کو ملا کر جال بنالے' اس طرح نظر بھی آتا رہتا ہے' اور گرد و غبار سے آنکھیں بھی محفوظ رہتی ہیں'

پھر اگر آنکھ کے ڈھیلے پر غبار اثر انداز ہو جائے تو وہ آنکھوں کے دو چار مرتبہ کھولنے بند کرنے سے خود بخود زائل ہو جاتا ہے ' دراصل دونوں پلکیں اس ڈھیلے سے ملی ہوئی ہیں ' ان کے اطراف سیدھے ڈھیلے پر اثر انداز ہوتے ہیں ' اور اسے اس طرح صاف کردیتے ہیں جس طرح صیقل آئینہ صاف کردیتی ہے ' دو ایک بار پلکوں کو اوپر نیچے کیجئے غبار خود بخود آنکھ کے گوشوں سے نکل کر باہر آجائے گا ' مکھی کو آنکھ پر پلکیں نہیں دی گئیں اس لئے وہ اپنی آنکھ کے ڈھیلے کو دونوں پاؤں سے صاف کرتی رہتی ہے۔ یہاں ہمارا مقصد اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا تفصیلی جائزہ لینا نہیں ہے ' اس سے کتاب ضخیم تر ہو جائے گی ' اگر اللہ نے توفیق دی ' اور زمانے نے فرصت دی تو ہم اس موضوع پر ایک کتاب لکھیں گے اور اس کا نام "عجائب صنع اللہ" رکھیں گے ' اب ہم پھر اپنے موضوع کی طرف واپس چلتے ہیں ' بات آنکھ کے گناہ کی ہو رہی تھی۔ فرض کرو ایک شخص نے غیر محرم کو دیکھنے کے لئے آنکھ کھولی تو گویا اس نے اللہ کی نعمت کی ناشکری کی جو پلکوں میں عطا کی گئی ہے۔ پھر پلکیں آنکھ سے قائم ہیں ' آنکھ سر سے قائم ہے ' سر جسم سے قائم ہے ' اور جسم غذا سے ' اور غذا پانی ' ہوا ' بارش ' بادل سورج اور چاند سے ہے ' اور ان میں سے کوئی چیز آسمانوں کے بغیر نہیں ' آسمان ملائکہ کے بغیر نہیں ' گویا تمام چیزیں ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں ان میں سے ہر کڑی دوسری کڑی سے اس طرح مربوط ہے جیسے بدن کے بعض اعضاء بعض سے مربوط ہیں ' جو شخص غیر محرم کیلئے آنکھ کھولتا ہے ان تمام نعمتوں کی ناشکری کرتا ہے جو اوج ثریا سے تحت الثریٰ تک موجود ہیں ' فلک ' ملک ' حیوان ' نباتات ' جماد ہر چیز اس پر لعنت بھیجتی ہے۔ حدیث شریف میں ہے۔

إِنَّ الْبُقْعَةَ الَّتِي يَجْتَمِعُ فِيهَا النَّاسُ إِمَّا أَنْ تَلْعَنَهُمْ إِذَا تَفَرَّقُوا أَوْ تَسْتَغْفِرَ لَهُمْ (۱)

جس زمین پر لوگ جمع ہوتے ہیں ' اور وہاں سے ہٹتے ہیں تو وہ زمین یا تو ان پر لعنت بھیجتی ہے یا دعائے مغفرت کرتی ہے۔

اسی طرح ایک حدیث میں وارد ہے کہ عالم کے لئے عالم کی ہر چیز مغفرت کی دعا کرتی ہے ' یہاں تک کہ پانی میں مچھلیاں بھی دعا کرتی ہیں (۲) ایک حدیث میں ہے کہ فرشتے گناہ گاروں پر لعنت بھیجتے ہیں (۳) اس طرح کی بے شمار روایتیں ہیں ' ان سب کا حاصل یہ ہے کہ جو شخص پلک جھپکنے میں بھی اللہ کی نافرمانی کرے گا وہ گویا ملک اور ملکوت کی تمام چیزوں کا قصور وار ہوگا ' اور اپنے نفس کو ہلاکت میں ڈالے گا ' الا یہ کہ اس گناہ کے بعد کوئی ایسا عمل کرلے جو اسے مٹا دے ' اس صورت میں امید ہے کہ لعنت دعائے مغفرت سے بدل جائے گی ' اور اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول کرلے گا اور اسے معاف فرمادے گا۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت ایوب علیہ السلام پر وحی نازل کی ' اور فرمایا کہ اے ایوب! میرا کوئی بندہ ایسا نہیں ہے جس پر دو فرشتے نہ ہوں ' جب بندہ میری نعمتوں پر شکر ادا کرتا ہے تو دونوں فرشتے زیادتی نعمت کی دعا دیتے ہے ' اور کہتے ہیں کہ اللہ تجھے نعمتوں پر نعمتیں عطا کرے ' تو حمد اور شکر والوں میں سے ہیں ' اے ایوب! تو بھی شکر گزار بندہ بن ' ان کے مرتبے کی بلندی کا عالم یہ ہے کہ میں خود ان کا شکر ادا کرتا ہوں ' میرے فرشتے ان کے لئے دعا مانگتے ہیں ' جہاں جہاں وہ رہتے ہیں وہاں کی زمینیں ان سے محبت کرتی ہیں اور وہاں کے آثار ان کے فراق پر آنسو بہاتے ہیں۔

سانس میں اللہ کی نعمتیں : جس طرح پلکوں میں اللہ کی بہت سی نعمتیں ہیں ' اسی طرح سانس لینے میں بھی اللہ کی دو نعمتیں ہیں ' جب تم اندر کا سانس باہر نکالتے ہو قلب کا دھواں باہر نکل جاتا ہے ' اگر یہ دھواں باہر نہ نکلے تو آدمی ہلاک ہو جائے اسی طرح جب تم اندر کی طرف سانس لیتے ہو تو باہر کی تازہ ہوا دل میں پہنچتی ہے ' اگر یہ ہوا اندر نہ پہنچے تو دل اپنے اندر کی تپش سے خاکستر ہو جائے ' اور تم ہلاک ہو جاؤ ' دن میں چوبیس گھنٹے ہیں ' اور ہر گھنٹے میں تم کم از کم ایک ہزار مرتبہ سانس لیتے ہو ' اور ہر سانس میں تقریباً دس لحظے صرف ہوتے ہیں ' گویا تم پر اللہ کی طرف سے ہر لحظے میں ہزار نعمتیں نازل ہوتی ہیں ' تم پر ہی نہیں بلکہ تمہارے ہر جزو بدن پر بلکہ اجزائے عالم پر۔ کیا ان نعمتوں کو شمار کرنا ممکن ہے؟ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اللہ تعالیٰ کے ارشاد "وَإِنْ تَعُدُّوا نِعْمَةَ اللَّهِ لَا تُحْصُوهَا" کی حقیقت منکشف ہوئی عرض کیا اے اللہ! میں تیری نعمتوں کا شکر کیسے ادا کروں ' میرے ہر موئے بدن میں تیری دو نعمتیں ہیں ' تو نے ان کی جڑ نرم بنائی اور سرا اونچا بنایا ' حدیث شریف میں ہے کہ جو شخص اللہ کی نعمتوں کو کھانے پینے کی اشیاء تک محدود سمجھتا ہے ' وہ کم علم ہے ' اس کا دردناک انجام قریب ہے۔ (۴)

اب تک جو کچھ ذکر کیا گیا اس کا تعلق کسی نہ کسی طریقے سے کھانے پینے کی اشیاء سے ہے ' اسی پر دوسری نعمتوں کو قیاس کیا

---

(۱) اسکی سند مجھے نہیں ملی (۲) یہ روایت کتاب العلم میں گزری ہے (۳) مسلم۔ ابو ہریرہ (۴) یہ حدیث مجھے نہیں ملی

جاسکتا ہے' عقلمند انسان کی نگاہ جب بھی کسی چیز پر پڑتی ہے یا جب بھی اسکے دل میں کسی شئے کا خیال گزرتا ہے وہ اس میں اللہ کی نعمتیں تلاش کرتا ہے۔

لوگ شکر کیوں نہیں کرتے

: جاننا چاہیے کہ لوگ جہالت اور غفلت کے باعث اللہ تعالیٰ کا شکر ادا نہیں کرتے' کیونکہ جن لوگوں کے دل و نگاہ پر غفلت و جہالت کے دبیز پردے پڑے رہتے ہیں' وہ اللہ کی کسی نعمت کو نعمت نہیں سمجھتے' جب وہ نعمت ہی نہ جانیں گے تو اس کا شکر کیسے ادا کریں گے' پھر اگر انھیں نعمت کی معرفت حاصل بھی ہے تو اسکے شکر کا طریقہ یہ جانتے ہیں کہ زبان سے الحمدللہ یا الشکرللہ کہہ دینا کافی ہے' وہ یہ نہیں جانتے کہ شکر کے معنی ہیں نعمت کو اس سے متعلق حکمت کی تکمیل میں استعمال کرنا' اور وہ حکمت اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے' اگر لوگوں کو یہ دونوں معرفتیں حاصل ہوں اور اسکے بعد وہ اللہ کا شکر ادا نہ کریں تو اس کا سبب اسکے علاوہ کچھ نہیں کہ اس پر شیطان کا تسلط ہے اور شہوات غالب ہیں۔

نعمت سے غفلت کے اسباب : نعمت سے غفلت کے بہت سے اسباب ہیں' ان میں سے ایک سبب یہ ہے کہ لوگ اپنی جہالت کے باعث ان نعمتوں کو جو عام طور پر لوگوں کو حاصل ہیں نعمت نہیں سمجھتے' اسی لئے ان کا شکر بھی ادا نہیں کرتے' ان کے نزدیک نعمت کے لئے تخصیص ضروری ہے' یعنی جو چیز خاص طور پر کسی کو حاصل ہو وہ نعمت کہی جاسکتی ہے' جہاں تک کھانے پینے کی اشیاء کا سوال ہے یا جسمانی نظام کے محاسن کی بات ہے ان امور میں بڑا چھوٹا' امیر' غریب' ذلیل' عزیز سب مشترک ہیں' اس لئے یہ چیزیں نعمت کس طرح ہوسکتی ہیں' یہی وجہ ہے کہ وہ تازہ ہوا کو بھی نعمت نہیں سمجھتے' حالانکہ یہ ایک عظیم ترین نعمت ہے' اگر ایک لمحے کے لئے کسی کا گلہ دبا دیا جائے' یہاں تک کہ ہوا کی آمد و رفت کا سلسلہ منقطع ہوجائے تو تازہ ہوا نہ پانے کی وجہ سے موت کی آغوش میں چلا جائے اسی طرح اگر اسے کسی ایسے حمام میں قید کردیا جائے جہاں صرف گرم ہوا کا گزر ہو یا کسی گہرے کنویں میں گرجائے جہاں رطوبت کے باعث ہوا بوجھل ہو تو دم گھٹنے کے باعث مرجائے' بالفرض اگر کسی کو گرم حمام' اور گہرے کنویں کی قید سے نکلنا نصیب ہوجائے تو اس سے تازہ ہوا کی قدر و قیمت پوچھو' وہ اسے نعمت سمجھے گا اور شکر بھی کرے گا' یہ انتہائی جہالت ہے کہ لوگ نعمت کو اسی وقت نعمت سمجھتے ہیں' جب وہ ان سے سلب کرلی جاتی ہے۔ بعض اوقات وہ نعمت دوبارہ مل جاتی ہے' اور کبھی ملتی ہی نہیں' حالانکہ نعمتوں کا ہر حال میں شکر ادا کرنا چاہیے۔ تم نے کسی بینا آدمی کو نہیں دیکھا ہوگا کہ وہ اپنی آنکھوں پر اللہ کا شکر ادا کرتا ہو' حالانکہ یہ ایک بڑی نعمت ہیں۔ لیکن جب اسکی آنکھوں کی روشنی ختم ہوجاتی ہے اور وہ اندھا ہوجاتا ہے تب اس نعمت کی قدر کرتا ہے' اور اگر خوش قسمتی سے دوبارہ بینائی مل جاتی ہے' تو اس نعمت کا شکر بھی ادا کرتا ہے' لیکن جب تک دیدۂ بینا رکھتا ہے اسے نعمت نہیں سمجھتا کیونکہ دنیا میں عام طور پر لوگ آنکھیں رکھتے ہیں' اسکے خیال میں جو چیز اس قدر عام ہو وہ نعمت کیسے ہوسکتی ہے' اسکی مثال ایسی جیسے کوئی بدتمیز اور بے ادب ناشناس غلام' جس پر ہروقت مار پڑتی رہنی چاہیے' اگر کچھ دیر کے لئے اسکو زدوکوب کرنے کا سلسلہ منقطع کردیا جائے تو وہ اسے نعمت سمجھے گا' اور اگر بالکل ہی موقوف کردیا جائے تو اکڑ جائے گا اور شکر ترک کردے گا۔ لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ صرف اس دولت پر شکر کرتے ہیں' جس میں انھیں ارد گرد کے لوگوں کی بہ نسبت کچھ خصوصیت یا کوئی امتیاز حاصل ہوتا ہے' خواہ وہ دولت کم ہو یا زیادہ۔ اس کے علاوہ جتنی نعمتیں ہیں ان سب کو فراموش کردیتے ہیں۔

ایک تنگدست کی شکایت کا قصہ : ایک مفلس نے کسی صاحب دل انسان سے اپنی تنگدستی' اور کثیر العیالی کا شکوہ کیا' اور عرض کیا کہ میں اپنے ناگفتہ بہ حالت کی بنا پر سخت مضطرب اور پریشان ہوں' بزرگ نے اس سے پوچھا کہ کیا تو دس ہزار درہم لیکر اندھا بننا پسند کرتا ہے' اس نے عرض کیا نہیں آپ نے دریافت کیا کیا دس ہزار درہم کے عوض گونگا بننا منظور ہے؟ اس نے کہا نہیں' بزرگ نے پھر پوچھا کیا تو یہ بات پسند کرتا ہے کہ دس ہزار درہم لے لے اور لنگڑا ہوجائے' اس نے یہ پیش کش بھی مسترد کردی' آپ نے پوچھا کیا تو دس ہزار کے بدلے میں لو بخا بننا پسند کرتا ہے' اس نے یہ بات بھی منظور نہیں کی' پھر پوچھا کیا تو دس ہزار کے عوض دیوانہ بننا پسند کرتا ہے؟ اس نے کہا نہیں! فرمایا تیرے آقا نے تجھے پچاس ہزار درہم کی دولت سے نوازا ہے' اسکے باوجود تو اپنی مفلسی اور تنگدستی کا رونا روتا ہے' اسی طرح کا ایک قصہ کسی حافظ قاری کے متعلق مشہور ہے' روایت ہے کہ یہ اپنی تنگدستی' اور مفلسی کے

بڑے شامی تھے ایک رات خواب میں دیکھا کہ کوئی کہنے والا کہتا ہے ہم تمہیں دس ہزار دینار دیتے ہیں، لیکن سورۂ انعام بھلا دیں گے، قاری صاحب نے انکار کر دیا، کہنے والے نے سورۂ ہود کے عوض دس ہزار دینار کی پیش کش کی، انہوں نے یہ پیش کش بھی ٹھکرا دی، اس نے سورۂ یوسف کے عوض بھی دس ہزار دینار دینے چاہے، مگر قاری صاحب نے یہ بھی گوارا نہ کیا، غرضیکہ اس منادی نے دس سورتوں کا نام لیا، اور ہر سورت کے عوض دس ہزار دینار مقرر کئے، مگر قاری صاحب ہر مرتبہ انکار کرتے رہے، آخر میں اس نے کہا کہ تم ایک لاکھ دینار کے مالک ہو، اس کے باوجود مفلسی کا رونا روتے ہو، صبح اٹھے تو دن کا اضطراب رخصت ہو چکا تھا، اور وہ اپنے حال پر مطمئن تھے۔

حضرت ابن السماک کسی خلیفہ کے پاس تشریف لے گئے، وہ اس وقت پانی کا گلاس لئے ہوئے تھا، اس نے عرض کیا کہ مجھے کچھ نصیحت فرمائیں، ابن السماک نے اس سے پوچھا فرض کرو اگر تمہیں سخت پیاس لگی ہو، اور تم سے یہ گلاس لیا جائے اور کہا جائے کہ جب تک تم اپنے تمام اموال ہمیں نہیں دو گے ہم تمہیں پانی نہیں دیں گے، کیا تم گلاس بھر پانی کے عوض انہیں ساری دولت دے ڈالو گے، خلیفہ نے کہا بے شک تمام دولت دے دوں گا، ابن السماک نے دریافت کیا اور اگر تمام ملک دینے کی شرط لگائی جائے تو! خلیفہ نے کہا میں تمام ملک دینے میں بھی جھجک محسوس نہ کروں گا، فرمایا جس ملک کا یہ حال ہو کہ ایک گھونٹ پانی کے عوض دیا جاسکے تمہیں اس پر چنداں خوش نہ ہونا چاہیے، اس سے معلوم ہوا کہ پیاس کے وقت ایک گھونٹ پانی اتنی عظیم نعمت ہے کہ تمام دنیا کی سلطنت اسکے حصول پر قربان کی جاسکتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی خاص نعمتیں: کیونکہ طبیعتیں ان نعمتوں کو نعمت سمجھتی ہیں جو کسی نہ کسی طور پر ان کے ساتھ مخصوص ہوں، عام نعمتوں کو نعمت ہی نہیں سمجھتیں اس لئے ہم بطور اشارہ ان نعمتوں کا شکر بھی کرتے ہیں جو کسی نہ کسی اعتبار سے صرف تمہارے ساتھ مخصوص ہیں، کوئی انسان ایسا نہیں ہے جس کے ساتھ ایک یا دو یا چند نعمتیں مخصوص نہ ہوں وہ نعمتیں تمام لوگوں میں نہیں پائی جاتیں، صرف اسی کے پاس ہوتی ہیں، یا بہت کم لوگ ان میں شریک ہوتے، چنانچہ تین امور ایسے ہیں جن میں ہر شخص اپنی تخصیص کا معترف نظر آتا ہے، عقل، اخلاق اور علم۔

جہاں تک عقل کا تعلق ہے، اس سلسلے میں ہر شخص اللہ تعالیٰ سے راضی نظر آتا ہے کہ اس نے دنیا کا انتہائی عقلمند انسان بنا کر پیدا کیا، بہت کم لوگ ایسے ہیں جو اللہ تعالیٰ سے عقل مانگتے ہیں، ورنہ عام طور پر لوگ عقل کی اس مقدار پر جو انہیں میسر ہے مطمئن نظر آتے ہیں، یہ بھی عقل ہی کی خصوصیت ہے کہ جو اس سے خالی ہے وہ بھی مطمئن نظر آتا ہے اور جو اس سے متصف ہے وہ بھی خوش رہتا ہے۔ بہرحال اگر کسی شخص کا خیال یہ ہے کہ وہ لوگوں میں سب سے زیادہ عقلمند ہے اور حقیقت بھی یہی ہے تو اس خدائے وحدہٗ لاشریک کا شکر ادا کرنا چاہیے جس نے اسے اس عظیم ترین نعمت سے نوازا، اور اگر واقع میں وہ دنیا کا عقلمند ترین انسان نہیں ہے تب بھی اس پر شکر واجب ہے کیونکہ اسکے حق میں نعمت موجود ہے جیسے کوئی شخص زمین میں خزانہ گاڑ دے اور خوش رہے، تو وہ اپنے علم کے مطابق خوش بھی رہے گا اور شکر بھی ادا کرے گا کیونکہ اسکے اعتقاد میں خزانہ موجود ہے۔

اخلاق کا حال یہ ہے کہ کوئی بھی شخص ایسا نہیں جو دوسرے کے عیوب پر نظر نہ رکھتا ہو، اور ان پر اپنی ناپسندیدگی ظاہر نہ کرتا ہو، خواہ وہ عیوب خود اسکے اندر کیوں نہ موجود ہوں لیکن دوسرے کے عیوب کی مذمت اس لئے کرتا ہے کہ خود کو ان عیوب سے خالی سمجھتا ہے، اگر کوئی شخص واقعی اس عیب سے بری ہے جس میں دوسرا مبتلا ہے تو اسے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اس نے اسے اس برائی سے محفوظ رکھا، اور دوسرے کو مبتلا کیا۔

جہاں تک علم کا معاملہ ہے ہر شخص اپنی باطن کے مخفی احوال اور دل کے پوشیدہ خیالات سے واقف ہوتا ہے، اور وہ احوال و خیالات ایسے ہوتے ہیں کہ اگر لوگوں پر منکشف ہو جائیں تو ساری عزت خاک میں مل جائے، اس طرح گویا ہر شخص کو چند ایسے امور کا علم ہے جو اسکے علاوہ کوئی نہیں جانتا، اس صورت میں ہر شخص کو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اس نے عیوب کی پردہ پوشی کی ہے، اور اسکی اچھائیوں کو نمایاں کیا ہے۔ یہ تین امور ہیں ان میں ہر شخص اپنی خصوصیت کا اقرار و اعتراف کرتا ہے۔

نعمتوں میں تخصیص کی ایک اور صورت: ہمارے خیال میں تخصیص ان ہی تین چیزوں میں نہیں ہے' بلکہ اسکی عام نعمتوں میں بھی خصوصیت کا پہلو پایا جاتا ہے۔ ہمیں دنیا میں کوئی ایسا شخص نظر نہیں آتا جسے اللہ تعالیٰ نے صورت' کردار' اخلاق و اوصاف' اہل' اولاد' گھر' شہر' رفقاء' عزیز' اقارب' جاہ منصب وغیرہ میں کوئی نعمت نہ دی ہو' اگر وہ نعمت اس سے سلب کرلی جائے اور دوسرے شخص کے پاس جو نعمتیں ہیں وہ عوض میں دی جائیں تو وہ ہرگز راضی نہ ہو' مثلاً اللہ تعالیٰ نے کسی شخص کو مومن بنایا' کافر نہیں بنایا' زندہ بنایا پتھر نہیں بنایا' انسان بنایا حیوان نہیں بنایا' مرد بنایا عورت نہیں بنایا' تندرست بنایا بیمار نہیں بنایا' صحیح سالم بنایا عیب دار نہیں بنایا' یہ نعمتیں اگرچہ عام ہیں' بہت سے لوگوں کو حاصل ہیں لیکن اس اعتبار سے مخصوص بھی ہیں اگر اس شخص سے کہا جائے کہ تم ان احوال کے مخالف احوال قبول کرلو' مثلاً صحت کے عوض بیماری لے لو' ایمان کے بجائے کفر قبول کرلو تو وہ ہرگز راضی نہ ہوگا' بلکہ بعض حالتیں ایسی ہوتی ہیں کہ کوئی شخص اپنی ان حالتوں کے عوض بہتر حالتیں بھی قبول نہیں کرتا' مثلاً اولاد' بیوی' ماں باپ' عزیز و اقارب وغیرہ۔ اگر کوئی تم سے تمہارے بچے لینا چاہے اور عوض میں دوسرے بچے دے اور وہ بچے تمہارے بچوں سے بہتر ہوں حسن میں' ذہانت میں' صحت میں' کیا تم یہ تبادلہ کرلوگے؟ ظاہر ہے اس کا جواب نفی ہی میں ہو سکتا ہے معلوم ہوا کہ جو نعمتیں تمہیں میسر ہیں وہ اگرچہ دوسروں کو بھی حاصل ہیں مگر تم ان نعمتوں کو اپنے لئے مخصوص سمجھتے ہو' اسی لئے تم انکے عوض دوسری نعمتیں قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہو۔ اگر کوئی شخص اپنے حال کو دوسرے کے مجموعی حال سے بدلنا نہیں چاہتا۔ یا کسی خاص بات میں بدلنا نہیں چاہتا تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ اسے اللہ کی ایسی نعمت حاصل ہے جو اسکے علاوہ کسی بندے کو حاصل نہیں ہے' اور اگر کوئی شخص اپنا حال دوسرے سے بدلنے پر راضی ہے تو دیکھنا چاہیے کہ ایسے لوگوں کی تعداد کیا ہے جن کے احوال سے یہ شخص اپنے احوال بدلنا چاہتا ہے' ظاہر ہے ایسے لوگ تعداد میں کم ہوں گے' اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے' کہ جو لوگ اسکی بہ نسبت کم ہیں وہ تعداد میں زیادہ ہیں اور جو اس سے آگے ہیں وہ تعداد میں کم ہیں' بڑے تعجب کی بات ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ کی نعمت کی تحقیر کے لئے اپنے سے بہتر کی طرف دیکھے' اپنے سے کمتر کی طرف نہ دیکھے' اور دین کے معاملے کو دنیا کے برابر نہ سمجھے ہم دیکھتے ہیں کہ اگر کسی شخص سے کوئی خطا سرزد ہوجاتی ہے تو وہ یہ کہہ کر شرمندگی سے دامن بچانا چاہتا ہے کہ اس طرح کی خطا بے شمار لوگوں سے سرزد ہوتی ہے' اگر مجھ سے یہ غلطی سرزد ہوگئی تو کیا ہوا' یہ دینی معاملات ہیں ان میں آدمی کی نظر اپنے سے کمتر پر ہے' اور جہاں دنیوی مسائل پیش آتے ہیں' جاہ و منصب اور مال و دولت کی بات آتی ہے تو نظر اپنی سے بہتر پر پڑتی ہے' حالانکہ اسکے پاس دولت نہیں تو اسے اپنے سے زیادہ مالدار کی طرف دیکھنے کے بجائے ان لوگوں کی طرف دیکھنا چاہیے جو اس سے زیادہ غریب اور مفلوک الحال ہیں۔ بھلا ایسے شخص پر شکر کیسے واجب نہ ہوگا جس کا حال دنیا میں اکثر سے بہتر اور دین میں اکثر سے کمتر ہو' اسی لئے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

مَنْ نَظَرَ فِي الدُّنْيَا إِلَى مَنْ هُوَ دُوْنَهُ وَنَظَرَ فِي الدِّيْنِ إِلَى مَنْ هُوَ فَوْقَهُ كَتَبَهُ اللّٰهُ صَابِرًا شَاكِرًا وَمَنْ نَظَرَ فِي الدُّنْيَا إِلَى مَنْ هُوَ فَوْقَهُ وَفِي الدِّيْنِ إِلَى مَنْ هُوَ دُوْنَهُ لَمْ يَكْتُبْهُ اللّٰهُ صَابِرًا وَلَا شَاكِرًا (ترمذی۔ عبداللہ ابن عمرؓ)

جو شخص دنیا میں اپنے سے کمتر اور دین میں اپنے سے برتر کی طرف دیکھتا ہے اللہ تعالیٰ اسے صابر و شاکر لکھتے ہیں' اور جو شخص دنیا میں اپنے سے برتر کی طرف اور دین میں اپنے سے کمتر کی طرف دیکھتا ہے اللہ تعالیٰ اسے نہ صابر لکھتے ہیں اور نہ شاکر۔

اگر ہر شخص اپنے نفس کا جائزہ لے' اور ان نعمتوں کی تحقیق و جستجو کرے جو خاص طور پر اللہ تعالیٰ نے اسے عطا کی ہیں تو وہ یہ دیکھے گا کہ اس طرح کی نعمتیں دو چار نہیں بلکہ بیشمار ہیں' خاص طور پر وہ لوگ جنہیں سنت' ایمان' علم' قرآن' فارغ البالی اور صحت جیسی نعمتوں کے خزانے ملے ہوئے ہوں' ایک شاعر نے مذکورہ بالا حدیث شریف کی کتنی اچھی تفسیر کی ہے۔

مَنْ شَاءَ عَيْشًا رَغِيْبًا يَسْتَطِيْلُ بِهِ فِي دِيْنِهِ ثُمَّ فِي دُنْيَاهُ إِقْبَالًا

فَلْيَنْظُرَنَّ اِلَى مَنْ فَوْقَهُ وَرَعًا وَلْيَنْظُرَنَّ اِلَى مَنْ دُوْنَهُ مَالاً

(جو شخص من پسند زندگی کا طالب ہو' دین میں عزت' اور دنیا میں سربلندی کا خواہاں ہو اسے ورع میں اپنے سے بہتر لوگوں کی طرف دیکھنا چاہیے اور مال میں اپنے سے کم تر کی طرف)

جو لوگ دین کی دولت پاکر بھی قانع نہیں ہیں ان کے بارے میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں :۔

مَنْ لَمْ يَسْتَغْنِ بِآيَاتِ اللّٰهِ فَلَا اَغْنَاهُ اللّٰهُ (۱)

جو شخص اللہ تعالیٰ کی آیات پاکر مستغنی نہیں ہے اللہ تعالیٰ اسے غنی نہ کرے۔

اَنَّ الْقُرْآنَ هُوَ الْغِنَى الَّذِيْ لَا غِنَى بَعْدَهُ وَلَا فَقْرَ مَعَهُ (ابو یعلی' طبرانی۔ انس)

قرآن ہی تونگری ہے' اس کے بعد نہ کوئی تونگری ہے اور نہ اسکی موجودگی میں مفلسی ہے۔

مَنْ آتَاهُ اللّٰهُ الْقُرْآنَ فَظَنَّ اَنَّ اَحَدًا اَغْنَى مِنْهُ فَقَدِ اسْتَهْزَأَ بِآيَاتِ اللّٰهِ (ابخاری فی التاریخ)

جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے قرآن کی دولت دی ہو اور وہ یہ گمان کرے کہ کوئی شخص مجھ سے زیادہ دولتمند ہے وہ اللہ تعالیٰ کی آیات کی ہنسی اڑاتا ہے۔

لَيْسَ مِنَّا مَنْ لَمْ يَتَغَنَّ بِالْقُرْآنِ كَفَى بِالْيَقِيْنِ غِنًى (۲) (طبرانی۔ عقبہ ابن عامرؓ)

جو شخص قرآن سے غنا حاصل نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں ہے' مالداری کے لئے یقین کافی ہے۔

ایک بزرگ ارشاد فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی بعض آسمانی کتابوں میں فرمایا ہے کہ میں اپنے جس بندے کو تین چیزوں سے بے نیاز کردیتا ہوں اس پر میری نعمت تمام ہوتی ہے' ایک یہ کہ اسے کسی بادشاہ کی ضرورت نہ رہے' دوسرے کسی معالج کی' تیسرے کسی کے مال کی۔ اس شعر میں یہی مضمون بیان کیا گیا ہے :۔

اِذَا مَا الْقُوْتُ يَاْتِيْكَ كَذَا الصِّحَّةُ وَالْاَمْنُ وَاَصْبَحْتَ اَخَا حُزْنٍ فَلَا فَارَقَكَ الْحُزْنُ

اگر تجھے غذا حاصل ہے اور صحت و امن بھی (اس کے باوجود) تو غم میں مبتلا ہے تو تجھ سے غم کبھی دور نہ ہوگا۔

یہ مضمون سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے فصیح و بلیغ کلمات کی روشنی میں اس طرح واقع ہوا ہے۔

مَنْ اَصْبَحَ آمِنًا فِيْ سِرْبِهِ مُعَافًى فِيْ بَدَنِهِ عِنْدَهُ قُوْتُ يَوْمِهِ فَكَاَنَّمَا حِيْزَتْ لَهُ الدُّنْيَا بِحَذَافِيْرِهَا (۳)

جو شخص بدن کی صحت اور نفس کے امن کی حالت میں صبح کرے اور اسکے پاس روز کی غذا ہو گویا اسے تمام دنیا حاصل ہے۔

لیکن دیکھا جائے تو لوگ ان تینوں نعمتوں پر شکر ادا کرنے کے بجائے ان نعمتوں کا شکوہ کرتے نظر آتے ہیں جو انھیں حاصل نہیں ہیں' حالانکہ اگر وہ نعمتیں حاصل ہو جائیں تو مصیبت کا باعث بن جائیں' سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ ایمان جیسی عظیم نعمت کا شکر ادا نہیں کرتے جس کی وجہ سے وہ ابدی دنیا یعنی آخرت میں جنت نعیم کے مستحق ہوں گے۔

ایمان و یقین ہی اصل دولت ہے : جس شخص کو اللہ نے بصیرت سے نوازا ہو اسے صرف معرفت' یقین اور ایمان ہی کی دولت پر خوش ہونا چاہیے بلکہ ہم ایسے علماء کو جانتے ہیں جنھیں اگر وہ تمام اموال انصار اور اتباع دیئے جائیں جو مغرب سے مشرق تک بادشاہوں کی قبضے میں ہیں اور ان سے کہا جائے کہ وہ یہ تمام مال و اسباب اپنے علم کے عوض قبول کرلیں اگر تمام علم نہ دینا چاہیں تو اسکا عشر عشیر ہی دیدیں تو وہ یہ پیشکش قبول نہیں کریں گے' کیونکہ وہ یہ بات جانتے ہیں کہ علم کی نعمت آخرت میں اللہ تعالیٰ سے قریب کرنے والی ہے' بلکہ اگر ان سے یہ کہا جائے کہ آخرت میں تمھیں جس کمال کی توقع ہے وہ بہرحال حاصل ہوگا' اسمیں کسی کمی کی توقع نہیں ہے' لیکن ہم یہ چاہتے ہیں کہ علم میں اشغال کے باعث جو لذت تمھیں ملتی ہے وہ ہمیں دیدو' اور دنیا کی لذتیں لے لو' وہ

(۱) یہ روایت مجھے ان الفاظ میں نہیں ملی (۲) یہ روایت کتاب آداب تلاوۃ القرآن میں گزری ہے (۳) یہ حدیث کئی بار گزر چکی ہے

یہ تبادلہ بھی منظور نہیں کریں گے' اس لئے کہ انھیں یہ بات معلوم ہے کہ علم کی لذت دائمی ہے' یہ کبھی منقطع نہیں ہوگی ہمیشہ باقی رہتی ہے' چوری نہیں کی جاسکتی ہے' اسے چھینا نہیں جاسکتا' نہ اس میں منافست کی جاسکتی ہے' یہ ایک صاف ستھری لذت ہے اس میں کسی طرح کی کوئی کدورت نہیں ہے' جب کہ دنیا کی لذتیں ناقص ہیں' ان میں کدورتیں ہیں' پریشانیاں ہیں' اسکا خوف اس سکون سے زائد ہے جو اس سے حاصل ہوتا ہے' اس کا غم اسکی لذت سے زیادہ ہے' اس کا رنج اسکی راحت سے زیادہ ہے' یہ لذت اب تک ایسی ہی رہی ہے جیسی ہم نے بیان کی ہے' اور آئندہ بھی ایسی ہی رہے گی' دنیا کی لذتیں صرف اس لئے پیدا ہوئی ہیں کہ ناقص عقل رکھنے والے لوگ ان کے جال میں پھنس جائیں' اور ان کے فریب میں مبتلا ہو جائیں' جب وہ ان کے فریب کا شکار ہو جاتے ہیں تب یہ لذتیں ان سے دور بھاگتی ہیں' ان کی قربت سے انکار کرتی ہیں جیسے کوئی خوبصورت عورت کسی مالدار جوان کے لئے اپنے آپ کو سنوارے' جب وہ اسکی زلفوں کا اسیر ہو جائے تو نگاہوں سے او جھل ہو جائے' اسکے صبر کا امتحان لے' دور رہ کر اسکی آتش شوق بھڑکائے' اسکے جذبات برانگیختہ کرے' اور پردے کے پیچھے سے اسے ماہی بے آب کی طرح تڑپتا دیکھ کر خوش ہو' یہ تمام پریشانیاں' اور مصیبتیں اس لئے حملہ آور ہوئی ہیں کہ وہ نظر کے فریب میں آگیا' اگر عقل سے کام لیتا' نگاہ نیچی رکھتا' اور اس لذت دیدار کو حقیر سمجھتا تو تمام عمر سلامت رہتا' اسی طرح دنیا والے دنیا کے جال میں پھنس گئے ہیں' اور اس کے ہتھکنڈوں کا شکار ہو گئے ہیں' یہ کہنا کسی طرح بھی صحیح نہیں کہ دنیا سے اعراض کرنے والے صبر کی تکلیف میں مبتلا ہیں اس لئے کہ حقیقت میں وہ لوگ زیادہ شدید اذیت کا شکار ہیں جو دنیا کی طرف مائل ہیں' کبھی وہ دنیا چاہتے ہیں مگر دنیا ان سے دور بھاگتی ہے' کبھی وہ بھاگ دوڑ کر کے دنیا حاصل کرلیتے ہیں' لیکن اسکی حفاظت کے لئے پریشان رہتے ہیں' دنیا سے اعراض کرنے والوں کو صبر کی تکلیف تسلیم' لیکن اس تکلیف کے بعد جو راحت ملنے والی ہے تم اسے کیوں بھولتے ہو' دنیا کی لذتوں کے پیچھے دوڑنے والے یہاں بھی تکلیف میں ہیں' اور آخرت کی تکلیف بھی ان کی منتظر ہے' انھیں تو اپنے نفس پر یہ آیت پڑھنی چاہیے :-

وَلَا تَهِنُوا فِي ابْتِغَاءِ الْقَوْمِ إِن تَكُونُوا تَأْلَمُونَ فَإِنَّهُمْ يَأْلَمُونَ كَمَا تَأْلَمُونَ وَتَرْجُونَ مِنَ اللَّهِ مَا لَا يَرْجُونَ (پ۵ ر۱۲ آیت ۱۰۴)

اور ہمت مت ہارو اس مخالف قوم کا تعاقب کرنے میں' اگر تم الم رسیدہ ہو تو وہ بھی الم رسیدہ ہیں' جیسے تم الم رسیدہ ہو' اور تم اللہ تعالیٰ سے ایسی ایسی چیزوں کی امید رکھتے ہو کہ وہ لوگ امید نہیں رکھتے۔

غافل قلوب کا علاج : اس تفصیل سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ لوگوں پر شکر کا راستہ اس لئے مسدود ہو گیا ہے کہ وہ ظاہری وباطنی اور عام وخاص نعمتوں سے ناواقف ہیں یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس غفلت کا علاج کیا ہے' کوئی ایسا علاج ضرور تجویز کرنا چاہیے جس سے ان غافل دلوں کی غفلت دور ہو جائے' اور یہ لوگ اللہ کی نعمتوں کو محسوس کرنے لگیں' ہو سکتا ہے اس احساس کے بعد وہ شکر بھی کرنے لگیں؟

اسکا جواب یہ ہے کہ جو دل بصیرت سے محروم نہیں ہیں ان کا علاج یہ ہے کہ وہ عام نعمتوں کی ان اقسام میں غور و فکر کیا کریں جن کی طرف ہم نے گذشتہ صفحات میں اشارہ کیا ہے' غبی دل رکھنے والے اس نعمت کو نعمت ہی نہیں سمجھتے جو ان کے ساتھ مخصوص نہ ہو' یا وہ ان سے سلب کر کے دوبارہ نہ دی جائے۔ ایسے دلوں کا علاج یہ ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے سے کم تر لوگوں کی طرف دیکھیں' اور ان صوفیائے کرام کی اقتداء کیا کریں جن کا معمول یہ تھا کہ وہ روزانہ ہسپتالوں' قبرستانوں اور زندانوں کا گشت لگایا کرتے تھے' ہسپتالوں کا اس لئے کہ جو مریض وہاں زیر علاج ہیں ان کے امراض معلوم کریں' اور یہ دیکھیں کہ وہ امراض خود ان کے جسموں میں تو نہیں ہیں اگر نہ ہوں تو اپنی سلامتی اور تندرستی پر اللہ کا شکر ادا کریں' زندانوں میں اس لئے جایا کرتے تھے کہ وہاں مجرمین کو دی جانے والی سزاؤں کا مشاہدہ کریں' کسی مجرم کا ہاتھ کاٹا جارہا ہے' کسی کے جسم پر کوڑے برسائے جارہے ہیں' کسی کی گردن اڑائی جارہی ہے یہ مناظر دیکھ کر اللہ کا شکر ادا کریں کہ اسنے انھیں گناہوں سے محفوظ رکھا' ورنہ ان مجرمین کی جگہ وہ خود بھی ہو سکتے تھے' قبرستانوں میں اس لیے جاتے تھے کہ وہاں پر موجود قبروں کو دیکھ کر ان کے باشندوں کا تصور آئے' جن کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب بات یہ ہیکہ

وہ کسی طرح دنیا میں لوٹ جائیں خواہ ایک ہی دن کے لئے لوٹیں گنہگار اس لئے واپسی کی آرزو کرتے ہیں کہ زندگی کی حالت میں جو گناہ اس سے سرزد ہوئے ہیں ان کا تدارک کر سکیں' اور اطاعت گزار اس لئے واپسی چاہتے ہیں کہ اپنی نیکیوں میں اضافہ کر سکیں' قیامت کا دن خسارے کا دن ہے' مطیع اس وقت اپنے خسارے کا احساس کریں گے جب وہ یہ دیکھیں گے کہ ہم ان اعمال سے زیادہ اعمال پر قادر تھے جو آج لیکر آئے ہیں' افسوس ہم نے اپنا قیمتی وقت ضائع کیا' اور اپنی عمر عزیز کے ہزار ہا لمحات مباحات میں صرف کردئے گنہگار کا خسارہ تو واضح ہے ہی۔

جب آدمی قبرستان جائے اور قبروں کی زیارت کرے تو ذہن میں یہ بات رکھے کہ ان قبروں میں جتنے لوگ ہیں خواہ نیک ہوں یا بد سب کے سب دنیا میں لوٹنے کے خواہشمند ہیں' تاکہ اپنے اعمال کا تدارک کر سکیں' یا ان میں اضافہ کر سکیں' یہ میری خوش قسمتی ہے کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے گذشتہ ایام کے تدارک کا اور اطاعات میں اضافہ کا موقع دے رکھا ہے' مجھے اپنی زندگی کے باقی دن اللہ کی اطاعت میں صرف کرنے چاہئیں' میرا ایک ایک سانس اللہ کی نعمت ہے' مجھے اس نعمت کی قدر کرنی چاہیے' آدمی نعمت کی معرفت کے بعد ہی شکر کرتا ہے' چنانچہ اگر اس نے زندگی کو نعمت سمجھ لیا ہے تو عمر کے باقی دن یقیناً ان کاموں میں صرف کرے گا جن کے لئے اس کی تخلیق ہوئی ہے' زندگی دراصل آخرت کے لئے زادِ راہ لینے کے لئے بنائی گئی ہے' اگر آدمی نعمت کا قدر شناس ہوگا تو کبھی اس مقصد سے غافل نہ ہوگا۔

یہ غافلوں کا علاج ہے' امید ہے اس علاج سے وہ لوگ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی قدر کریں گے' اور اسکا شکر ادا کریں گے' حضرت ربیع ابن خیثمؒ اپنی بزرگی' جلالت شان' اور کمال عقل و آگہی کے بعد یہی طریقہ اختیار کرتے تھے تاکہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی معرفت میں کمال پیدا ہو جائے' انھوں نے اپنے گھر میں ایک قبر کھود رکھی تھی' ہر روز ایک بار اس میں لیٹ جاتے' اور گلے میں ایک طوق ڈال لیتے' پھر یہ آیت پڑھتے:۔

رَبِّ ارْجِعُوْنِ لَعَلِّيْ اَعْمَلُ صَالِحًا (پ ۱۸ ر ۶ آیت ۹۹-۱۰۰)

اے میرے رب مجھ کو پھر واپس بھیج دیجئے تاکہ میں نیک اعمال کروں۔

اسکے بعد یہ کہتے ہوئے کھڑے ہو جاتے ربیع تیرا سوال پورا ہوا' تجھے موقع نصیب ہوا' اب اس وقت کے لئے عمل کر جب تیری درخواست قبول نہیں ہوگی' اور تجھے عمل کرنے کا موقع نہیں عطا کیا جائے گا۔ جو لوگ شکر ادا کرتے ہیں ان کا علاج یہ ہے کہ وہ اس حقیقت کو ہر وقت دل و نگاہ میں رکھیں کہ جو لوگ شکر نہیں کرتے ان سے نعمت سلب کر لی جاتی ہے' اور پھر واپس نہیں دی جاتی' اسی لئے حضرت فضیل ابن عیاضؒ فرمایا کرتے تھے کہ نعمت پر شکر کرنا سیکھو' اور اسے لازم پکڑلو' بہت کم ایسا ہوا ہے کہ کسی قوم سے نعمت چھین لی گئی ہو' اور دوبارہ دے دی گئی ہو' ایک حدیث میں ہے :۔

مَا عَظُمَتْ نِعْمَةُ اللّٰهِ عَلٰى عَبْدٍ اِلَّا كَثُرَتْ حَوَائِجُ النَّاسِ اِلَيْهِ فَمَنْ تَهَاوَنَ بِهِمْ عَرَّضَ تِلْكَ النِّعْمَةَ لِلزَّوَالِ (ابن عدی' ابن حبان۔ معاذ ابن جبلؓ)

جب کسی بندے پر اللہ کی نعمت زیادہ ہوتی ہے تو اس سے لوگوں کی ضرورتیں بھی زیادہ وابستہ ہو جاتی ہیں' جو شخص ان سے سستی برتتا ہے وہ اس نعمت کو زوال کے سپرد کر دیتا ہے۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا :۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (پ ۱۳ ر ۸ آیت ۱۱)

واقعی اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت میں تغیر نہیں کرتا جب تک وہ لوگ خود ہی اپنی حالت کو نہیں بدل دیتے۔

تیسرا باب

صبرو شکر کا ارتباط

ایک چیز میں صبرو شکر کا اجتماع اور اس کی وجہ: اب تک ہم نے جو گفتگو کی ہے اس سے تم یہ نتیجہ اخذ کرسکتے ہو کہ ہر موجود چیز میں اللہ تعالیٰ کی نعمت پائی جاتی ہے' دنیا میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو اللہ تعالیٰ کی نعمت سے خالی ہو' اس سے یہ ثابت ہوا کہ مصیبت کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں ہے' اس لئے کہ اگر مصیبت موجود ہے تو اس پر شکر کے کیا معنی؟ اور مصیبت نہیں تو پھر صبر کس پر کیا جائے گا؟ بعض لوگ یہ دعویٰ کرتے دیکھتے گئے ہیں کہ ہم تو مصیبت پر بھی اللہ کا شکر کرتے ہیں' نعمت کا تو ذکر ہی کیا ہے' کوئی ان سے پوچھے کہ تم اس چیز پر شکر کیسے کرتے ہو جس پر صبر کیا جاتا ہے' اس لئے کہ صبر تکلیف کا مقتضی ہے' اور شکر میں خوشی کا عنصر ہے' اور یہ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں' حالانکہ تمہاری تقریر سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جتنی چیزیں ایجاد کی ہیں سب میں نعمتیں موجود ہیں' اس کا کیا مطلب ہے؟

نعمت و مصیبت کی تقسیم: اسکا جواب یہ ہے کہ جس طرح نعمت موجود ہے اسی طرح مصیبت بھی موجود ہے' اگر تم نعمت کو مانتے ہو تو مصیبت کا وجود بھی تسلیم کرنا پڑے گا کیونکہ یہ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں' فقدان مصیبت نعمت ہے' اور فقدان نعمت مصیبت ہے۔ تاہم یہ بات پہلے بیان کی جاچکی ہے کہ نعمت کی دو قسمیں ہیں ایک تو نعمت مطلقہ یعنی ہر اعتبار سے نعمت ہو جیسے آخرت میں اللہ تعالیٰ کی قربت کا شرف اور سعادت' اور دنیا میں ایمان اور حسن اخلاق اور وہ چیزیں جو ان دونوں کے لئے معاون ہوں' اور دوسری نعمت مقیدہ' یعنی ایک اعتبار سے نعمت ہو اور دوسرے اعتبار سے نہ ہو' جیسے مال جس سے دین میں بھلائی بھی ہوسکتی ہے' اور فساد بھی پیدا ہوسکتا ہے' اسی طرح مصیبت کی بھی دو قسمیں ہیں مطلق اور مقید' آخرت میں مطلق مصیبت کی مثال اللہ سے بعد ہے خواہ وہ کچھ مدت کے لئے ہو یا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اور دنیا میں اسکی مثال کفر' معصیت اور بد خلقی ہے' ان ہی چیزوں سے آدمی آخرت میں مطلق مصیبت میں گرفتار ہوتا ہے' اور مقید مصیبت کی مثال میں فقر' مرض' خوف وغیرہ مصیبتوں کے نام لئے جاسکتے ہیں' یہ دینی مصائب نہیں ہیں بلکہ دنیاوی ہیں۔

نعمت پر شکر کی صورت یہ ہے کہ جو نعمت مطلق ہے اس پر شکر بھی مطلق ہونا چاہیے لیکن دنیا میں جو مصیبتیں مطلق ہیں ان پر صبر کی اجازت نہیں ہے' کفر ایک مصیبت ہے' لیکن کیا اس پر صبر کرنا صحیح ہے' یہی حال معصیت کا بھی ہے' کافر کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنا کفر ترک کرے' گنہگار پر بھی گناہ چھوڑنا لازم ہے' البتہ یہ بات صحیح ہے کہ کافر کو بعض اوقات اپنے کفر کا علم نہیں ہوتا' اسکی مثال اس مریض کی سی ہے جسے کوئی بیماری لاحق ہو' اور اسکی اذیت سے محفوظ رکھنے کے لئے اسے بے ہوشی کی دوا دیدی گئی ہو' ظاہر ہے جب اسے تکلیف ہی نہیں تو وہ صبر کیا کرے گا' گناہگار یہ بات جانتا ہے کہ میں گناہ کررہا ہوں' اس لئے اس پر گناہ ترک کرنا واجب ہے' صبر کے سلسلے میں اصل بات یہ ہے کہ جن مصائب کے ازالے پر انسان کو قدرت حاصل ہو اسے ان پر صبر کرنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی' مثلاً ایک آدمی شدت کے باوجود پانی نہ پئے' یہاں تک کہ اس کی تکلیف شدید ہوجائے' تو اس سے یہ نہیں کہا جائے گا کہ اس تکلیف پر صبر کر' بلکہ اس سے کہا جائے گا کہ وہ پانی پئے' اور اس خود ساختہ مصیبت سے چھٹکارا پائے' صبر اس تکلیف پر کیا جاتا ہے جس کا زائل کرنا انسان کی استطاعت سے باہر ہو' اس سے معلوم ہوا کہ دنیا میں مطلق مصیبت پر صبر نہیں ہے' بلکہ یہ ممکن ہے کہ جس مصیبت پر صبر کیا جائے وہ من وجہ نعمت بھی ہو' اس طرح ایک ہی چیز میں صبر اور شکر دونوں کا اجتماع ہوسکتا ہے' مثلاً دولت انسان کی ہلاکت کا سبب بھی ہوسکتی ہے کہ کچھ لوگ آکر اسے اور اسکی اولاد کو قتل کرڈالیں' اور مال لے کر فرار ہوجائیں' اسی طرح صحت اور تندرستی جہاں نعمت ہے وہاں مصیبت کا باعث بھی ہوسکتی ہے کہ کوئی حسد کی وجہ سے اسے ہلاک کردے۔

بعض نعمتیں مصیبت ہیں

حاصل یہ ہے کہ دنیا کی جتنی نعمتیں ہیں وہ نعمت والے کے لئے مصیبت ہو سکتی ہیں' اسی طرح بعض دنیاوی مصیبتیں بھی اہل مصیبت کے احوال کا اعتبار کرتے ہوئے نعمت ہو سکتی ہیں' مثلاً! اکثر لوگ ایسے ہیں' جن کے لئے فقر اور مرض ہی بہتر ہیں' ان دونوں چیزوں کے مصیبت ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے' لیکن اس لحاظ سے اس کے حق میں نعمت بھی ہیں کہ بالفرض وہ مالدار اور صحتمند ہوتا تو سرکشی اختیار کرتا۔ جیسا کہ اللہ تعالٰی کا ارشاد ہے :-

وَلَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْا فِي الْاَرْضِ (پ۲۵ ر۴ آیت ۲۷)

اور اگر اللہ تعالٰی سب بندوں کے لئے روزی فراخ کر دیتا تو وہ دنیا میں شرارت کرنے لگتے۔ حقیقتاً بلاشبہ (کافر) آدمی حد (آدمیت) سے نکل جاتا ہے اس لئے کہ اپنے آپ کو مستغنی دیکھتا ہے۔

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :-

اِنَّ اللّٰهَ لَيَحْمِيْ عَبْدَهُ الْمُؤْمِنَ مِنَ الدُّنْيَا وَهُوَ يُحِبُّهٗ كَمَا يَحْمِيْ اَحَدُكُمْ مَرِيْضَهٗ (ترمذی' حاکم)

اللہ تعالٰی اپنے مومن بندے کو دنیا سے بچاتا ہے اور وہ بندہ اسے محبوب بھی ہوتا ہے' جس طرح تم میں سے کوئی اپنے مریض کو بچاتا ہے۔

یہی حال بیوی' بچوں' اور اقرباء وغیرہ نعمتوں کا ہے' اور ان نعمتوں کا ہے جو نعمتوں کی سولہ قسموں کے ضمن میں مذکور ہیں' اس حکم سے ایمان اور حسن خلق جیسی نعمتیں مستثنیٰ ہیں' باقی نعمتوں کے بارے میں یہ امکان ہے' کہ وہ بعض لوگوں کے حق میں مصیبت ہوں اس صورت میں ان نعمتوں کی اضداد ان کے لئے نعمت ہوں گی۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ معرفت ایک کمال ہے' اور اس اعتبار سے ایک نعمت بھی ہے' کیونکہ یہ اللہ کی صفات میں سے ایک صفت ہے۔ لیکن بعض امور میں یہ صفت اس سے متصف شخص کے لئے مصیبت بھی ہو سکتی ہے' اس صورت میں یہی کہا جائے گا کہ اس نعمت کا فقدان یعنی جہالت اسکے حق میں نعمت ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ انسان اپنی موت کے وقت سے ناواقف ہے' اور یہ ناواقفیت اسکے حق میں نعمت ہے' کیونکہ اگر وہ اس بات سے واقف ہوتا کہ اسکی موت کب آئے گی تو زندگی کا سارا لطف خاک میں مل جاتا ہے' کوئی لمحہ سکون سے نہ گزرپاتا۔ اس طرح لوگوں کے مافی الضمیر پر مطلع نہ ہونا بھی نعمت ہے' کیونکہ اس طرح انسان لوگوں کے ان خیالات سے واقف نہیں ہوپاتا جو وہ اسکے بارے میں اور اسکے احباب و اقارب کے بارے میں رکھتے ہیں' کیونکہ اگر لوگوں کے خیالات جاننے کی نعمت پاتا تو ساری زندگی عذاب میں گزرتی' اگر وہ لوگ طاقتور ہوتے تو ان سے حسد کرتا اور انتقام نہ لینے کے باعث دل ہی دل میں کڑھتا' اور کمزور ہوتے تو ان سے انتقام لیتا' اور فساد برپا کرنے کا سبب بنتا' اس طرح دوسروں کی مذموم صفات سے واقف نہ ہونا بھی ایک نعمت ہے' کیونکہ اگر تم کسی کی مذموم صفات پر مطلع ہو گئے تو اس سے خواہ مخواہ بغض رکھو گے' اور اسے اپنے رویئے سے تکلیف پہنچاؤ گے' اور اس طرح دنیا و آخرت میں اپنے لئے وبال اور مصیبت کا سبب بنو گے' بلکہ بعض اوقات کسی کی اچھی صفات سے جاہل رہنا بھی ایک نعمت ہے' کیونکہ بعض اوقات آدمی دوسرے کو خواہ مخواہ تکلیف پہنچانا چاہتا ہے' اب اگر وہ شخص ولی ہے اور تم نادانستہ طور پر اسے تکلیف پہنچا رہے ہو تو تم پر اتنا بڑا گناہ نہیں ہے جتنا بڑا گناہ اس وقت ہے جب تم اس کے مرتبہ و مقام سے واقف ہونے کے بعد ایذا پہنچاتے ہو' یہ تو بدیہی بات ہے کہ جو شخص کسی نبی کو اسکے مرتبہ نبوت سے واقف ہونے کے بعد' اور ولی کو اسکے منصب ولایت سے متعارف ہونے کے بعد ایذا پہنچائے تو اسکا گناہ اس شخص سے زیادہ سنگین ہے جو کسی عام آدمی کو تکلیف پہنچاتا ہے۔ اللہ تعالٰی نے قیامت' لیلۃ القدر' ساعت جمعہ اور بعض کبائر کو مبہم رکھا ہے' یہ ابہام بھی ایک نعمت ہے' کیونکہ اس طرح تم شب قدر' اور ساعت جمعہ کے فضائل حاصل کرنے میں زیادہ سے زیادہ تگ و دو کرتے ہو' اور زیادہ سے زیادہ معاصی سے بچتے ہو' جب جہل میں اللہ تعالٰی کی نعمتوں کا یہ حال ہے تو علم میں کیا حال ہوگا؟

ہر وجود میں اللہ کی نعمت ہے : ہم یہ بات پہلے بھی بیان کرچکے ہیں کہ ہر وجود میں اللہ کی نعمت موجود ہے' یہ ایک حقیقت ہے اور اسکا اطلاق ہر شخص کے حق میں عام ہے' اس سے کوئی شخص بھی خارج نہیں' البتہ وہ تکلیفیں اس سے مستثنیٰ ہیں جو اللہ تعالیٰ نے بعض لوگوں میں پیدا کی ہیں' اگرچہ وہ ایذا پانے والے کے حق میں نعمت نہیں ہوتیں لیکن دوسرے کے حق میں نعمت ہوتی ہیں' جیسے کوئی شخص خود اپنا ہاتھ کاٹ لے یا چھو زخمی کردے' اس فعل سے وہ گناہ کا مرتکب بھی ہوگا اور تکلیف بھی پائے گا۔ لیکن اس تکلیف سے دیکھنے والے عبرت حاصل کریں گے اس لئے یہ تکلیف ان کے حق میں نعمت ہوگی' کافروں کو دوزخ کا عذاب دیا جائے گا یہ عذاب اگرچہ ان کے حق میں نعمت نہیں ہوگا' لیکن غیروں کے حق میں ضرور ہوگا۔ یہ خدا کا قانون ہے کہ وہ ایک قوم کی مصیبت سے دوسری قوم کو فائدہ پہنچاتا ہے' بالفرض اگر اللہ تعالیٰ عذاب پیدا نہ فرماتا اور کسی قوم کو اس عذاب میں مبتلا نہ کرتا تو نعمت پانے والے نعمت کی قدر نہ جانتے' اور نعمت پاکر خوش ہوتے' اہل جنت کی خوشی اس وقت دوچند ہوتی ہے جب وہ اہل جہنم کی تکلیفوں کے بارے میں سوچتے ہیں۔

دیکھو نعمتیں تمام موجودات میں ہیں' لیکن ضروری نہیں کہ ہم اہل دنیا ان نعمتوں کی قدر کریں یا انھیں دیکھ کر خوش ہوں' چنانچہ ہم سورج کی روشنی پاکر بہت زیادہ خوش نہیں ہوتے' کیوں کہ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ روشنی سب کے لئے عام ہے' اسی طرح ہمیں تاروں بھرا آسمان دیکھ کر فرحت نہیں ہوتی حالانکہ اسکا خوبصورت منظر ہمارے ان باغوں کے مناظر سے کہیں زیادہ دلفریب' حسین اور جاذب نظر ہوتا ہے جنھیں ہم سالہا سال کی محنت سے تعمیر کرتے ہیں' کیونکہ ہم یہ جانتے ہیں کہ آسمان کا حسن سب کے لئے عام ہے' اس میں کسی کی تخصیص نہیں ہے۔ بہرحال یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کوئی چیز ایسی پیدا نہیں کی جو حکمت سے خالی ہو اور نہ کوئی ایسی چیز پیدا کی ہے جس میں نعمت موجود نہ ہو یا تو وہ نعمت تمام لوگوں کے لئے عام ہوتی ہے' یا بعض لوگوں کے لئے مخصوص ہوتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے جو مصیبتیں دنیا میں پیدا کی ہیں وہ بھی نعمت سے خالی نہیں ہیں خواہ وہ مصیبت زدہ کے حق میں ہوں' یا غیروں کے حق میں۔ غرضیکہ بعض حالات کو نہ مطلق مصیبت کہا جاسکتا ہے' اور نہ مطلق نعمت' اس طرح کے حالات میں بندے پر صبر اور شکر دونوں واجب ہیں۔ اب اگر تم یہ کہو کہ صبر و شکر دو متضاد کیفیتیں ہیں' یہ دونوں جمع کیسے ہوسکتی ہیں' اس لئے کہ صبر غم پر ہوتا ہے' اور شکر خوشی پر۔ اس کا جواب یہ ہے کہ بعض حالتیں ایسی بھی ہیں جو ایک اعتبار سے خوشی کا اور دوسرے اعتبار سے غم کا باعث ہوتی ہیں' اس لئے صبر غم پر اور شکر خوشی پر ہوگا' اور دونوں چیزیں ایک ہی شئے سے متعلق ہوں گی۔

دنیا کی مصیبتوں کے پانچ پہلو : دنیا کی جتنی مصیبتیں ہیں جیسے فقر' مرض' اور خوف وغیرہ ان میں پانچ امور ایسے ہیں جن پر عقلمند انسان کو خوش ہونا چاہیے' اور شکر کرنا چاہیے۔

ان میں سے ایک یہ ہے کہ جو مصیبت یا مرض اس وقت نازل ہوا ہے اس سے زیادہ سخت مصیبت' اور سنگین مرض بھی ممکن ہے' اس لئے کہ اللہ کی تقدیرات میں کسی کو دخل نہیں ہے' بالفرض وہ کسی مصیبت کو دوگنا کردے اور کسی مرض کو بڑھادے تو کوئی کیا کرسکتا ہے؟ نہ منع کرسکتا ہے اور نہ رکاوٹ بن سکتا ہے' اس لئے یہ سوچ کر شکر کرنا چاہیے کہ اس نے اپنے فضل و کرم سے اس سے بڑی مصیبت نازل نہیں فرمائی۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ یہ مصیبت دنیاوی امور میں نازل ہوئی ہے' یہ بھی ممکن تھا کہ کوئی ایسی مصیبت نازل ہوتی جو تمہارے دین میں نقصانات کا باعث ہوتی۔ چنانچہ ایک شخص نے حضرت سہلؒ سے عرض کیا کہ چور میرے گھر میں گھس آئے اور مال و متاع لوٹ کر فرار ہوگئے' سہلؒ نے فرمایا کہ اللہ کا شکر ادا کرو' اگر چور کے بجائے شیطان داخل ہوتا' اور تمہارے گھر کے بجائے تمہارے دل میں داخل ہوتا اور توحید کو فاسد کردیتا تب تم کیا کرتے' اسی لئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے استعاذہ میں یہ الفاظ کہا کرتے تھے اے اللہ' مجھ پر کوئی ایسی مصیبت نہ ڈال جس کا تعلق دین سے ہو' حضرت عمر ابن الخطابؓ ارشاد فرماتے ہیں کہ مجھ پر کوئی ایسی مصیبت نازل نہیں ہوتی جس میں اللہ کی چار نعمتیں نہ ہوں' ایک یہ کہ وہ میرے دین میں نہیں ہوتی' دوسری یہ کہ مقدار میں اس سے زیادہ نہیں

ہوتی' تیسری یہ کہ مجھے اس مصیبت پر راضی رہنے سے محروم نہیں کیا جاتا' چوتھی یہ کہ مجھے اس پر ثواب کی توقع رہتی ہے۔ کسی بزرگ کا ایک دوست تھا جسے بادشاہ نے قید خانے میں ڈلوادیا' اس شخص نے اپنے بزرگ دوست کو اپنی قید کی خبردی' اور اس سے شکایت کی' بزرگ نے اس سے کہلایا کہ وہ اللہ کا شکر کرے' بادشاہ نے اسے پٹوایا' اس نے اپنے دوست کے پاس یہ داستان درد و غم بھی لکھ کر بھیجی' بزرگ نے پھر یہی کہلایا کہ وہ خدا کا شکر ادا کرے' بادشاہ نے ایک مجوسی کو بھی اس کے پاس قید کرویا' اور دونوں کو ایک زنجیر میں باندھ دیا۔ قیدی نے یہ حالات بھی کہلائی' اور دوست سے اعانت کی درخواست کی' دوست نے پھر شکر ادا کرنے کی نصیحت پر اکتفا کیا' وہ مجوسی دستوں کے مرض میں مبتلا تھا' بار بار رفع حاجت کے لئے جاتا' اور ایک زنجیر میں بندھے ہوئے ہونے کی وجہ سے مجوسی کے ساتھ اسے بھی جانا پڑتا اور جب تک وہ تقاضائے حاجت سے فارغ نہ ہوتا وہیں کھڑا رہنا پڑتا' قیدی نے اپنی یہ دلگداز کیفیت بھی گوش گزار کرائی' جواب یہی ملا شکر کرو' قیدی نے چڑ کر کہلایا آخر کہاں تک شکر کروں' بزرگ نے اس سے کہلایا ذرا سوچو اگر وہ زنار جو مجوسی کی کمر میں پڑی ہوئی ہے تمہاری کمر میں ہوتی تب کیا ہوتا' اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی انسان کسی مصیبت میں گرفتار ہو تو اسے سوچنا چاہیے کہ آخر میرے وہ کونسے اعمال بد ہیں جن کی وجہ سے میں اس مصیبت میں گرفتار ہوا ہوں' اگر اچھی طرح غور کرے گا تو نتیجہ یہی نکلے گا کہ وہ مصیبت اسکے اعمال بد کے مقابلے میں نہایت معمولی ہے' میں اس سے کہیں زیادہ سخت سزا کا مستحق تھا' میرا جرم سنگین ہے' مثلاً مجھ سے سو کوڑے کا جرم سرزد ہوا تھا جبکہ سزا دس ہی کوڑوں کی ملی' یا جرم اتنا شدید تھا کہ دونوں ہاتھ کٹنے چاہیے تھے' لیکن ایک ہی ہاتھ کاٹا گیا' ظاہر ہے اس صورت میں اللہ کا شکر ادا کرنا ضروری ہے' حضرت ابو یزید بسطامیؒ کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ وہ کسی گلی سے گزر رہے تھے کہ اوپر سے کسی نے راکھ کا برتن ان پر الٹ دیا' وہ ناراض نہیں ہوئے' بلکہ اللہ کے حضور سجدہ ریز ہوگئے' لوگوں نے حیرت سے انھیں دیکھا اور اسکی وجہ دریافت کی' فرمایا میں تو اس کا منتظر تھا کہ اوپر سے آگ برستی' اور مجھے خاکستر کرجاتی' یہاں تو راکھ پر ہیبت گئی' کیا یہ نعمت نہیں ہے کہ میں اس پر اللہ کا شکر ادا نہ کروں؟ کسی بزرگ نے ان سے درخواست کی کہ نماز استسقاء کے لئے تشریف لے چلیں' فرمایا تم یہ سمجھ رہے ہو کہ پانی برسنے میں تاخیر ہو رہی ہے' میں یہ سمجھ رہا ہوں کہ پتھر برسنے میں تاخیر ہو رہی ہے۔

اب اگر کوئی یہ کہے کہ ہم مصیبت پر کیسے خوش ہوں ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ جو لوگ ہم سے زیادہ گناہ کرتے ہیں وہ عیش و آرام کی زندگی گزارتے ہیں' کفار ہی کو لیجئے' وہ اپنے کفر کے باوجود نعمتیں سمیٹ رہے ہیں' اس کا جواب یہ ہے کہ کفار کے لئے تو اتنا سخت عذاب اور اتنی شدید مصیبتیں ہیں کہ تم ان کا تصور بھی نہیں کرسکتے' مگر یہ عذاب قیامت کے دن دیا جائے گا' دنیا میں انھیں اس لئے مہلت دی گئی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ گناہ کرلیں تاکہ طویل عذاب کے مستحق قرار پائیں' قرآن کریم میں ہے :-

اِنَّمَا نُمْلِیْ لَهُمْ لِیَزْدَادُوْا اِثْمًا (پ ۴ ر ۹ آیت ۷۸)

ہم ان کو صرف اس لئے مہلت دے رہے ہیں تاکہ جرم میں ان کو اور ترقی ہوجائے۔

جہاں تک ان گناہ گاروں کی بات ہے جنھیں تم اپنے سے بڑا گناہ گار سمجھتے ہو تو ہم یہ پوچھتے ہیں کہ یہ بات تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ فلاں شخص کے گناہ تم سے زیادہ ہیں' اللہ تعالیٰ کی ذات میں ہونے والی بدگمانی' سوء ادبی اور اس کی صفات و افعال کے بارے میں برے خیالات کا گناہ اتنا شدید ہوتا ہے کہ اس کے سامنے ظاہری شراب نوشی اور زنا وغیرہ کے گناہ ماند پڑجاتے ہیں' ایسے ہی لوگوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :-

وَتَحْسَبُوْنَهٗ هَیِّنًا وَّهُوَ عِنْدَ اللّٰهِ عَظِیْمٌ (پ ۱۸ ر ۸ آیت ۱۵)

اور تم اسکو ہلکی بات سمجھ رہے تھے حالانکہ وہ اللہ کے نزدیک بہت بھاری بات ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ کوئی شخص یہ نہیں جان سکتا کہ اسکا گناہ معمولی اور دوسرے کا گناہ سنگین ہے' پھر اگر کسی کو اسکے گناہوں کی سزا نہیں مل رہی ہے تو تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو کہ تم میں اور اس میں فرق کیا جارہا ہے اگرچہ اسے اس فرق کا اختیار ہے وہ جسے چاہے معاف کردے' جسے چاہے سزا دے ہو سکتا ہے تمہیں دنیا میں سزا دی جارہی ہو' اور اسے آخرت میں دی جائے' یہ بھی مقام شکر ہے

کہ تم آخرت کے مواخذے سے بچ گئے یہ مصیبت پر شکر کی تیسری وجہ ہے کہ ہر گناہ کی سزا آخرت تک مؤخر ہو سکتی ہے' یہ اللہ کا کرم ہے کہ اس نے دنیا میں مصیبت دے کر اس گناہ کی تلافی کردی نیز دنیاوی مصائب تو بعض حالات میں خفیف اور ہلکے بھی ہو جاتے ہیں' لیکن آخرت کی عقوبت اول تو دائمی ہوتی ہے' دائمی نہ ہو تو اس میں تخفیف نہیں ہوتی۔ دنیا میں تسلی کا کچھ نہ کچھ سامان ہو جاتا ہے لیکن آخرت میں اہل عذاب سے تسلی کے تمام اسباب منقطع ہو جاتے ہیں' اس لئے وہاں تخفیف نہیں ہوگی' حدیث سے یہ بھی ثابت ہے کہ جس شخص کو دنیا میں عذاب دیا جائے گا اسے آخرت میں نہیں ہوگا' چنانچہ ارشاد فرمایا :-

إِنَّ الْعَبْدَ إِذَا أَذْنَبَ ذَنْبًا فَأَصَابَتْهُ شِدَّةٌ أَوْ بَلَاءٌ فِي الدُّنْيَا وَاللّٰهُ أَكْرَمُ مِنْ أَنْ يُعَذِّبَهُ ثَانِيًا

(ترمذی' ابن ماجہ۔ علیؓ)

جب بندہ کوئی گناہ کرتا ہے' اور اس پر کوئی شدت یا مصیبت دنیا میں پہنچ جاتی ہے تو اللہ اس بات سے بے نیاز ہے کہ اسے دوبارہ عذاب دے۔

مصیبت پر شکر کی چوتھی وجہ یہ ہے کہ جب کوئی مصیبت نازل ہو تو اس طرح سوچے کہ میں جس مصیبت میں گرفتار ہوا ہوں وہ لوح محفوظ میں لکھی ہوئی تھی' اسے آنا ہی تھا' سو آب آچکی ہے' ہو سکتا تھا یہ مصیبت اس سے بڑی ہوتی اس لئے جو نہیں آئی وہ میرے لئے نعمت ہے' مجھے اس پر اللہ کا شکر کرنا چاہیے' شکر کی پانچویں وجہ یہ ہے کہ مصیبت کا ثواب مصیبت سے بڑا ہوا ہے۔

دنیا کے مصائب آخرت کے راستے ہیں

اس لئے کہ دنیا کے مصائب دو وجہ سے آخرت کے راستے ہیں' پہلی وجہ وہی ہے کہ جس کی بنیاد پر مریض کو تلخ اور کڑوی دوائیں دی جاتی ہیں' اور بچوں کو کھیلنے کودنے سے منع کیا جاتا ہے' مریض کے حق میں کڑوی دوا نعمت ہے' کیونکہ اسی مصیبت کے بعد وہ راحت پا سکتا ہے' اسی طرح کھیلنے سے منع کرنا بچے کے حق میں نعمت ہے' کیونکہ اگر اسے کھیل کود کی پوری آزادی دی گئی تو وہ علم و ادب سے محروم رہ جائے گا' اور تمام عمر نقصان میں رہے گا' یہی حال مال' اہل و عیال' اقارب اور اعضاء وغیرہ چیزوں کا ہے۔ یہ تمام چیزیں انسان کو عزیز ہوتی ہیں' بعض دفعہ انسان ان کے باعث ہلاک ہو جاتا ہے' حالانکہ عقل انتہائی بیش قیمت' اور اعلا چیز ہے' لیکن اس کی وجہ سے بھی آدمی کو ہلاکت کے مرحلے سے گزرنا پڑتا ہے' قیامت کے دن ملحدین تمنا کریں گے کہ کاش وہ مجنوں یا بچے ہوتے' تاکہ وہ اللہ کے دین میں اپنی عقلوں سے تصرف نہ کر پاتے' ضروری نہیں کہ ان اسباب میں صرف شر ہو' ان میں انسان کے لئے دینی بہتری بھی ہو سکتی ہے' اس لئے اگر کوئی شخص اللہ کے ساتھ حسن ظن کے پہلو کو ترجیح دے' اور یہ مان لے کہ ان امور میں میرے لئے دین کی بہتری ہے' تب بھی ان پر شکر ادا کرنا چاہیے' اس لئے کہ اسکی حکمت نہایت وسیع ہے' اور بندوں کی مصلحتوں سے ان سے بہتر طریقے پر واقف ہے' قیامت کے دن جب بندے یہ دیکھیں گے کہ وہ دنیا میں جن مصائب میں مبتلا تھے ان پر آج ثواب دیا جا رہا ہے تب شکر ادا کریں گے' جس طرح بچہ بلوغ اور شعور کے بعد اپنے استاد اور والدین کا شکر ادا کرتا ہے کہ انھوں نے اسے زدو کوب کیا' اسے کھیلنے سے روکا' اور اسکی تعلیم و تربیت میں سختی اختیار کی' ورنہ اگر نرمی سے کام لیتے تو یہ ممکن تھا کہ میں علم و ادب سے محروم رہتا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہونے والی مصیبتیں اور عقوبتیں بھی تادیب کے طریقے ہیں' بندوں پر اللہ کی عنایت اور مہربانی اولاد پر والدین کی عنایت اور مہربانی سے کہیں زیادہ' مکمل اور وسیع ہے' روایت ہے کہ ایک شخص نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ مجھے کوئی وصیت فرمائیے آپ نے فرمایا : اللہ کا جو حکم تم پر ہوا ہے اس میں تم اسے متہم نہ کرو (احمد' طبرانی۔ عبادہؓ) ایک مرتبہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم آسمان کی طرف دیکھ کر ہنسنے لگے' لوگوں نے ہنسنے کی وجہ دریافت کی' فرمایا مجھے مومن کے بارے میں اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر تعجب ہوا' جب اس کے حق میں فارغ البالی کا فیصلہ ہوتا ہے تو وہ خوش رہتا ہے' اور وہ فیصلہ اسکے حق میں مفید رہتا ہے' اور جب تنگی کا فیصلہ ہوتا ہے تب وہ راضی رہتا ہے اور یہ فیصلہ بھی اسکے حق میں مفید ہوتا ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ مہلک خطاؤں میں سرفہرست دنیا کی محبت ہے' اور اسباب نجات میں سرفہرست یہ ہے کہ دل دنیا کی محبت

سے دور رہے' اگر دنیا کی نعمتیں بلا طلب ملنے لگیں اور ان کے حصول کی راہ میں کوئی مصیبت بھی پیش نہ آئے تو دل دنیا کی طرف مائل ہو جاتے ہیں' اور اس کے اسباب سے مانوس ہو جاتے ہیں' یہاں تک کہ دنیا اس کے حق میں جنت کی طرح ہو جاتی ہے' جب موت آتی ہے اور جدائی کے لمحات قریب آتے ہیں تب دل اس جدائی کی تاب نہیں لا پاتا' اور اگر وقتاً فوقتاً مصیبتیں آتی رہیں' پریشانیوں سے سابقہ پڑتا رہے تو دل دنیا سے اکتا جاتا ہے' اور وہ اس سے مانوس نہیں ہو پاتا' بلکہ پے در پے حوادث سے دنیا کو قید خانہ تصور کرتا ہے' یہاں سے رخصت ہونا گویا قید خانے سے رہائی پانا ہے۔ اسی لئے حدیث شریف میں ہے :۔

اَلدُّنْیَا سِجْنُ الْمُؤْمِنِ وَجَنَّةُ الْکَافِرِ (مسلم۔ ابوہریرہؓ) دنیا مومن کا قید خانہ ہے اور کافر کی جنت ہے۔

کافر اس شخص کو کہتے ہیں کہ جو اللہ تعالیٰ سے اعراض کرے' اور صرف دنیا کی زندگی کا طالب ہو' اسے پاکر مطمئن' اور اسکی لذتیں پاکر خوش ہو' اور مومن وہ ہے جس کا دل دنیا سے بیگانہ ہو' اور اس تگ و دو میں مصروف ہو کہ کس طرح اس قید خانے سے آزاد ہو جائے' کفر ظاہر بھی ہوتا ہے اور مخفی بھی' دل میں دنیا کی جس قدر محبت رہتی ہے اسی قدر شرک خفی بھی رہتا ہے' موحّد مطلق وہ ہے جو صرف واحد مطلق کو اپنا محبوب جانے۔

یہ وجوہات ہیں جن کی وجہ سے مصیبتوں پر خوشی ہونی چاہیے مصیبتوں پر غم ہونا تو فطری بات ہے' اسکی مثال ایسی ہے جیسے پچھنے لگوانے کی ضرورت پیش آئے' اور کوئی شخص تمہارا یہ کام مفت کردے یا کسی مرض میں کڑوی دوا پینے کی ضرورت پیش آئے' ظاہر ہے پچھنے لگوانے میں بھی تکلیف ہے' اور تلخ دوا پینے میں بھی' لیکن اس کے باوجود آدمی پچھنے لگانے والے' اور طبیب کا شکر ادا کرتا ہے' وجہ اس کی یہی ہے کہ اس مصیبت کے پہلو میں خوشی ہے یعنی آدمی اپنے مرض سے نجات پاتا ہے' اس لئے پچھنے لگوا کر اور تلخ دوا پی کر جہاں خوشی ہوتی ہے وہاں تکلیف بھی ہوتی ہے۔ اسی طرح دنیا کی مصیبتوں کو بھی سمجھنا چاہیے یہ کڑوی دواؤں اور جسم پر عمل جراحی کے مشابہ ہیں' ان سے وقتی طور پر تکلیف ہوتی ہے لیکن انجام میں راحت ملتی ہے۔

<u>دنیا سے رغبت رکھنے والے کی مثال</u> : دنیا سے محبت کرنے والے کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص سیر و تفریح کے لئے شاہی محل میں جائے' اور وہاں کسی خوبصورت عورت کو دیکھ کر دل کھو بیٹھے' اس پر عاشق ہو جائے' اور یہ جاننے کے باوجود کہ شاہی محل میں اسکے رہنے کی گنجائش نہیں ہے وہیں فروکش ہو جائے' ظاہر ہے اسکی یہ جسارت معاف نہیں ہو سکتی' محل میں رہنا اسکے لئے مصیبتوں کا باعث بن سکتا ہے' فی الوقت وہ آرام سے رہ رہا ہو لیکن انجام کار اسے اس محل سے باہر نکلنا ہو گا' تب اس محل میں رہنے کی سزا پائے گا لیکن اگر جانے والے کو دل میں یہ خیال رہے کہ یہ محل ہم جیسے لوگوں کے لئے نہیں بنائے گئے ہم یہاں نہیں رہ سکتے' اگر رہیں گے تو شہنشاہ کے جلال و عتاب سے محفوظ نہ رہ سکیں گے' ظاہر میں یہ سوچنا اس کے لئے تکلیف دہ ہو گا' اور اس سے زیادہ باعث اذیت بات یہ ہو گی کہ وہ محل کے رنگین نظاروں سے محفوظ نہ ہو سکے گا لیکن یہ تکلیف اسکے حق میں نعمت سے کم نہ ہو گی۔ یہ دنیا بھی ایک مکان کی طرح ہے' اس میں لوگ رحم کے دروازے سے داخل ہوتے ہیں اور لحد کے دروازے سے نکلتے ہیں' یہ ایک عارضی قیام گاہ ہے جو شخص اس عارضی قیام گاہ سے جس قدر مانوس ہو جاتا ہے اسی قدر وہ انسیت اسکے لئے مصیبت کا باعث بنتی ہے اور جس قدر طبیعت اس سے منحرف رہتی ہے اسی قدر وہ انحراف اسکے لئے نعمت کی صورت اختیار کرتا ہے۔ جو شخص اس حقیقت سے واقف ہے وہ مصیبتوں میں بھی نعمتیں تلاش کرتا ہے اور ان پر شکر گزار ہوتا ہے' اور جو ان نعمتوں سے واقف نہیں ہوتا وہ شکر گزار بھی نہیں ہوتا اس لئے کہ شکر نعمت معرفت نعمت کے بعد ہی ممکن ہے' ورنہ مصیبت کو مصیبت سمجھنے والا تو ہر وقت ہونٹوں پر شکوہ سجائے رہتا ہے۔

<u>مصائب پر صبر کی فضیلت</u> : روایت ہے کہ ایک اعرابی نے حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کو ان کے والد حضرت عباس کی وفات پر بطور تعزیت یہ قطعہ لکھ کر بھیجا۔

اِصْبِرْ نَکُنْ بِکَ صَابِرِیْنَ فَاِنَّمَا۔ صَبْرُ الرَّعِیَّةِ بَعْدَ صَبْرِ الرَّأْسِ

خَيْرٌ مِّنَ الْعَبَّاسِ اَجْرُكَ بَعْدَهُ - وَاللّٰهُ خَيْرٌ مِّنْكَ لِلْعَبَّاسِ

(صبر کیجئے ہم بھی آپ کو دیکھ کر صبر کریں گے' اس لئے کہ رعایا کا صبر سردار کے صبر کے بعد ہوتا' حضرت عباس کے بعد آپ کے صبر کا ثواب ان سے بہتر ہوگا' اور اللہ تعالیٰ حضرت عباس کے لئے آپ سے بہتر ہیں)۔

حضرت عبداللہ ابن عباس نے ارشاد فرمایا کہ کسی شخص نے اس سے بہتر تعزیت نہیں کی' مصائب پر صبر کرنے کے سلسلے میں بے شمار روایات ہیں' ایک حدیث میں ہے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :۔

مَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ بِهٖ خَيْرًا يُصِبْ مِنْهُ (بخاری' ابو ہریرہ)

اللہ تعالیٰ جس شخص کی بھلائی چاہتا ہے اسے مصیبت میں مبتلا کردیتا ہے۔

ایک حدیث قدسی میں روایت ہے' اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے' کہ جب میں اپنے بندے پر مال' اولاد' یا بدن وغیرہ میں کوئی مصیبت ڈالتا ہوں تو مجھے قیامت کے دن اس بات سے شرم آتی ہے کہ اسکے لئے ترازو کھڑی کروں' اور اسکے اعمالنامے کھولوں' ایک حدیث میں ہے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس بندے پر مصیبت نازل ہوتی ہے' اور وہ اللہ تعالیٰ کے بتلائے ہوئے طریقے پر اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ کہتا ہے' اور یہ دعا کرتا ہے :۔

اَللّٰهُمَّ اْجُرْنِيْ مِنْ مُّصِيْبَتِيْ وَاَعْقِبْنِيْ خَيْرًا مِّنْهَا

اے اللہ تعالیٰ مجھے میری مصیبت سے نجات دے' اور اسکا بہتر عوض عطا کر۔

تو اس کی دعا قبول ہوتی ہے' اور اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ وہی معاملہ کرتے ہیں' جیسا وہ چاہتا ہے' ایک حدیث میں یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ میں جس شخص کی دونوں آنکھوں چھین لیتا ہوں اسے یہ جزا دیتا ہوں کہ وہ ہمیشہ میرے گھر میں رہے گا اور میرے دیدار سے مشرف ہوگا۔ روایت ہے کہ ایک شخص نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا میرا مال ضائع ہوگیا اور میرا جسم بیماریوں میں گرفتار ہے' سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :۔

لَا خَيْرَ فِيْ عَبْدٍ لَا يَذْهَبُ مَالُهُ وَلَا يَسْقَمُ جِسْمُهُ اِنَّ اللّٰهَ اِذَا اَحَبَّ عَبْدًا ابْتَلَاهُ وَاِذَا ابْتَلَاهُ صَبَّرَهُ (ابن ابی الدنیا' ابو سعید الخدری)

اس بندے میں کوئی خیر نہیں جس کا مال ضائع نہ ہو اور جس کا جسم بیمار نہ ہو' جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کو محبوب رکھتا ہے تو اسے (مصیبت میں) مبتلا کردیتا ہے' اور جب مبتلا کرتا ہے تو صابر بناتا ہے۔

ایک حدیث میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا گیا ہے :۔

اِنَّ الرَّجُلَ لَتَكُوْنُ لَهُ الدَّرَجَةُ عِنْدَ اللّٰهِ تَعَالٰى لَا يَبْلُغُهَا بِعَمَلٍ حَتّٰى يُبْتَلٰى بِبَلَاءٍ فِيْ جِسْمِهٖ فَيَبْلُغُهَا بِذٰلِكَ (ابوداؤد۔ محمد ابن خالد السلمی)

بندہ کا اللہ کے نزدیک ایک درجہ ہوتا ہے' جس پر وہ اپنے عمل سے نہیں پہنچ پاتا یہاں تک کہ اسے کسی جسمانی مصیبت میں مبتلا کردیا جاتا ہے پھر وہ اس درجے پر فائز ہوجاتا ہے۔

حضرت ابن الارث روایت کرتے ہیں کہ ہم سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے آپ دیوار کعبہ کے سائے میں تکیہ سے سہارا لئے ہوئے تشریف فرما تھے' ہم نے آپ کی خدمت میں اپنی شکایتیں پیش کیں اور عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! کیا آپ ہمارے لئے اللہ سے دعا نہیں کرتے کہ وہ ہماری مدد فرمائے' آپ اٹھ کر بیٹھ گئے' اور چہرۂ مبارک غصے سے سرخ ہوگیا' اسی حالت میں آپ نے ارشاد فرمایا :۔

اِنَّ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ لَيُؤْتٰى بِالرَّجُلِ فَيُحْفَرُ لَهُ فِى الْاَرْضِ حَفِيْرَةٌ وَيُجَاءُ

بِالْمِنْشَارِ فَیُوْضَعُ عَلٰی رَاْسِہٖ فَیُجْعَلُ فِرْقَتَیْنِ مَا یَصْرِفُہٗ ذٰلِکَ عَنْ دِیْنِہٖ (۱)

تم سے پہلے لوگ ایسے تھے کہ (ان میں سے) ایک آدمی کو لایا جاتا اس کے لئے گڑھا کھودا جاتا اور آری لائی جاتی' اور سر پر رکھ کر سر کے دو ٹکڑے کردیئے جاتے تو یہ (سزا بھی) اسے دین سے منحرف نہ کرپاتی۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے مروی ہے فرماتے ہیں کہ جس شخص کو بادشاہ ظلماً قید کردے اور وہ قید کی حالت میں مرجائے تو شہید ہوگا' اور وہ شخص بھی شہید ہوگا جسے بادشاہ کی طرف سے اتنی جسمانی سزا دی جائے کہ مرجائے۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ کے احترام اور تعظیم کا تقاضا یہ ہے کہ نہ تم اپنے درد کا شکوہ کرو' اور نہ اپنی مصیبت کا ذکر کرو (۲) حضرت ابوالدرداءؓ ارشاد فرماتے ہیں کہ تم موت کے لئے پیدا ہوئے ہو' خراب کے لئے تعمیر کرتے ہو' جو چیزیں فنا ہونے والی ہیں ان کی حرص کرتے ہو' اور جو چیزیں باقی رہنے والی ہیں انہیں چھوڑتے ہو' یاد رکھو یہ تینوں ناپسندیدہ چیزیں بہت عمدہ ہیں' فقر' مرض اور موت حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ کو کسی بندے کی بہتری منظور ہوتی ہے' اور وہ اسے دوست بنانا چاہتا ہے تو اس پر مصائب ڈال دیتا ہے' اور حوادث کی یلغار کردیتا ہے پھر جب بندہ اپنے رب کو پکارتا ہے تو ملائکہ کہتے ہیں آواز جانی پہچانی لگتی ہے' اور جب دوبارہ پکارتا ہے اور کہتا ہے یارب! اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں' اے بندے میں حاضر ہوں' جو مانگے گا وہ دوں گا' اگر میں نے دنیا میں کسی خیر سے محروم رکھا ہے تو یہاں آخرت میں اس سے بہتر عوض ذخیرہ کیئے ہوئے ہوں' جب قیامت کا دن ہوگا تو اہل عمل حاضر ہوں گے' ان کے اعمال نماز' روزہ' صدقہ' اور حج وغیرہ ترازو میں تولے جائیں گے' پھر وہ لوگ آئیں گے جو دنیا میں مصائب کا شکار رہے تو ان کے لئے نہ ترازو لگائی جائے گی' نہ ان کے اعمالنامے کھولے جائیں گے' بلکہ ان کے اوپر اجر و ثواب کی بارش اس طرح ہوگی جس طرح دنیا میں مصائب کی بارش ہوئی تھی' اس وقت وہ لوگ جنہیں دنیا میں عافیت ملی تھی یہ تمنا کریں گے کہ کاش ان کے جسم قینچیوں سے تراشے جاتے' اور جو اجر ثواب انہیں ملا ہے ہمیں بھی ملتا اسی لئے قرآن کریم میں فرمایا گیا (۳)

اِنَّمَا یُوَفَّی الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَھُمْ بِغَیْرِ حِسَابٍ (پ ۲۳ ر ۱۶ آیت ۱۰)

مستقل رہنے والوں کو ان کا صلہ بے شمار ہی ملے گا۔

حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ کسی پیغمبر نے بارگاہ الٰہی میں عرض کیا: اے اللہ! بندہ مومن تیری اطاعت کرتا ہے' تیرے معاصی سے اجتناب کرتا ہے' مگر اسے اسکی جزا یہ ملتی ہے کہ دنیا اس سے دور بھاگتی ہے' مصائب اسکے ارد گرد منڈلاتے ہیں' اور بندہ کافر تیری نافرمانی کرتا ہے' تجھ پر اور تیرے معاصی پر جرأت کرتا ہے' اس سے مصیبتیں دور رہتی ہیں' دنیا کی دولت اسکے قدم چومتی ہے' یہ التجا سن کر اللہ تعالیٰ نے وحی نازل فرمائی کہ بندے بھی میرے ہیں اور مصائب بھی میرے ہیں' یہ مصیبت زبان حال سے میری حمد کرتی ہے' بندہ مومن پر میں اس لئے مصیبت نازل کرتا ہوں کہ اسکے گناہوں کا کفارہ بن جائے' یہاں تک کہ وہ مجھ سے نیکیوں کے ساتھ ملاقات کرے اور میں ان کی جزا دوں' بندہ کافر سے مصیبتیں اس لئے دور رکھتا ہوں کہ اگر دنیا میں وہ کچھ نیک عمل کررہا ہے تو رزق میں کشادگی کے ذریعے اسکا اجر یہیں دیدیا جائے۔ جب وہ میرے پاس آئے تو اس کے پاس صرف گناہوں کا ذخیرہ ہو' اور میں ان کی سزا دوں' ایک روایت میں ہے کہ جب قرآن کریم کی یہ آیت نازل ہوئی :-

وَمَنْ یَّعْمَلْ سُوْٓءًا یُّجْزَ بِہٖ (پ ۵ ر ۱۵ آیت ۲۳)

جو شخص کوئی برا کام کرے گا اسے اس کی سزا دی جائے گی۔

تو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! اس آیت کے بعد کوئی کیسے خوش رہ سکتا ہے' آپ نے فرمایا: اے ابوبکر! اللہ تمہاری مغفرت فرمائے' کیا تم بیمار نہیں ہوگے' کیا تمہیں کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی' کیا تمہیں غم نہیں ہوگا' یہی تمہارے اعمال (بد) کی جزا ہے' یعنی تمہاری تکلیفیں بیماریاں اور حزن و غم تمہارے سیئات کا کفارہ بن جائیں گے' (احمد' ترمذی'

---

(۲۱) یہ دونوں روایتیں پہلے گزر چکی ہیں (۳) (ابن ابی الدنیا۔ انسؓ)

دار قطنی۔ عمرؓ) عقبہ ابن عامرؓ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں' آپ نے ارشاد فرمایا: جب تم کسی شخص کو دیکھو کہ اسے اس کی پسندیدہ چیزیں مل رہی ہیں تو سمجھ لو کہ اسے چھوٹ دی جارہی ہے' اس کے بعد آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی :-

فَلَمَّا نَسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهِ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ أَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ حَتَّىٰ إِذَا فَرِحُوا بِمَا أُوتُوا أَخَذْنَاهُم بَغْتَةً (پ ۷ ر ۱۱ آیت ۴۴)

پھر جب وہ لوگ ان چیزوں کو بھولے رہے جن کی ان کو نصیحت کی جاتی تھی تو ہم نے ان پر ہر چیز کے دروازے کشادہ کردیئے یہاں تک کہ جب ان چیزوں پر جو کہ ان کو ملی تھیں' وہ خوب اترا گئے تو ہم نے ان کو دفعۃً پکڑ لیا

یعنی جب انھوں ہمارے احکام پر عمل کرنا ترک کردیا تو ہم نے ان پر خیر (مال و دولت اور صحت وغیرہ) کے دروازے کھول دیئے پھر جب وہ ہماری عطا پر خوش ہوئے' اور مال و دولت پاکر اترانے لگے تو ہم نے انھیں اچانک گرفت میں لے لیا (احمد' طبرانی' بیہقی) حضرت حسن بصری روایت کرتے ہیں کہ ایک صحابی نے کسی ایک عورت کو دیکھا جسے وہ زمانۂ جاہلیت سے جانتے تھے' انھوں نے کچھ دیر ٹھہر کر اس سے بات چیت کی' اس کے بعد آگے بڑھ گئے' لیکن آگے بڑھتے بڑھتے وہ اچانک مڑتے اور عورت پر ایک نظر ڈال کر پھر آگے بڑھ جاتے' یہاں تک کہ ایک دیوار سے ٹکرا گئے اور چہرے پر زخم کا نشان بن گیا' سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور پورا واقعہ عرض کیا' آپ نے فرمایا :-

إِذَا أَرَادَ اللّٰهُ بِعَبْدٍ خَيْرًا عَجَّلَ لَهُ عُقُوبَةَ ذَنْبِهِ فِي الدُّنْيَا (احمد' طبرانی۔ عبداللہ ابن معقل مرفوعاً)

جب اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے ساتھ خیر کا ارادہ کرتا ہے تو دنیا ہی میں اسکے گناہ کی سزا دیتا ہے۔

حضرت علیؓ ارشاد فرماتے ہیں کہ میں تمہیں ایک ایسی آیت بتلاتا ہوں جو نہایت امید افزا ہے لوگوں نے عرض کیا بتلایئے' آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی :-

وَمَا أَصَابَكُم مِّن مُّصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ وَيَعْفُو عَن كَثِيرٍ (پ ۲۵ ر ۵ آیت ۳۰)

اور تم کو جو کچھ مصیبت پہنچتی ہے تو وہ تمہارے ہی ہاتھوں کے کئے ہوئے کاموں سے (پہنچتی ہے) اور بہت سے تو درگزر ہی کردیتا ہے۔

جیسا کہ ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں کہ مصائب گناہوں کی وجہ سے ہوتے ہیں' جب کسی گناہ کی سزا کے طور پر کوئی مصیبت نازل ہوجاتی ہے تو اللہ اس بات سے بے نیاز ہے کہ مرنے کے بعد اسے دوبارہ عذاب دے' حضرت انسؓ راوی ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں بندے کے دو گھونٹ بہت زیادہ محبوب ہیں' ایک غصہ کا گھونٹ جو حلم کے باعث پیا جائے' دوسرا مصیبت کا گھونٹ جو صبر کے باعث پیا جائے اور نہ کوئی قطرہ دو قطروں سے زیادہ محبوب ہے ایک قطرۂ خون جو اللہ کی راہ میں گرتا ہے' دوسرا وہ قطرۂ اشک جو رات کی تاریکی میں اور سجدے کی حالت میں بندے کی آنکھ سے ٹپکتا ہے' اور نہ کوئی قدم دو قدموں سے زیادہ محبوب ہے ایک وہ قدم جو فرض نماز کے لئے اٹھے' اور دوسرا وہ قدم جو دو رشتہ داروں میں صلح کرانے کے لئے اٹھے (ابن ماجہ۔ ابن عمرؓ بلفظ آخر) حضرت ابوالدرداءؓ روایت کرتے ہیں کہ حضرت سلیمان ابن داؤد علیہ السلام کے ایک صاحبزادے کی وفات ہوئی' اسکا آپ پر بہت زیادہ اثر ہوا' آپ کے پاس دو فرشتے آئے' اور دو زانوں ہوکر سامنے بیٹھ گئے گویا دو حریف ہوں ان میں سے ایک نے عرض کیا کہ میں نے کھیت میں بیج ڈالے تھے' جب بیج اگ آئے اور کھیتی ہری بھری ہوگئی تو اس نے اپنے قدموں سے تمام پودے روند ڈالے' آپ نے مدعا علیہ سے پوچھا تم کیا کہتے ہو' اس نے عرض کیا کہ میں اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھا' اچانک ایک جگہ راستہ ختم ہوگیا' میں نے ادھر ادھر دیکھا کہ کہیں راستہ نہ ملا' سوائے اسکے کھیت کے' اس لئے مجبوراً مجھے اس کے کھیت میں سے گزرنا پڑا۔ حضرت سلیمان نے مدعی سے دریافت کیا کہ تو نے راستے میں بیج کیوں بوئے' کیا تجھے معلوم نہیں کہ لوگوں کو راستے کی ضرورت ہے' اس نے عرض کیا اگر ایسا ہے تو پھر آپ اپنے بیٹے کی وفات پر اتنے رنجیدہ کیوں ہیں' موت بھی تو آخرت کا راستہ

ہے' یہ سن کر حضرت سلیمان علیہ السلام نے جناب باری تعالیٰ میں توبہ کی' اور بچے پر مزید غم نہیں کیا۔ مروی ہے کہ حضرت عمر ابن عبدالعزیز اپنے ایک بیمار صاحبزادے کی پاس تشریف لے گئے' اور فرمایا کہ تو میری ترازو میں ہو میرے نزدیک یہ اس سے بہتر ہے کہ میں تیری ترازو میں ہوں' صاحبزادے نے فرمایا کہ جو بات آپ کو پسند ہے وہ مجھے اپنی پسند کے مقابلے میں زیادہ محبوب ہے' راوی کہتے ہیں کہ حضرت عمر ابن عبدالعزیز کا منشاء یہ تھا کہ اگر تو پہلے مرجائے تو مجھے تجھ پر صبر کرنے کا ثواب ملے گا' اور یہ ثواب میرے پلڑے میں رکھا جائے گا اور میں تجھ سے پہلے مرجاؤں تو میری وفات پر صبر کرنے کا ثواب تجھے ملے گا' اور یہ ثواب تیرے ہی پلڑے میں رکھا جائے گا' حضرت عمرؒ نے اپنی خواہش ظاہر کردی' بیٹے نے بھی اس خواہش کی تکمیل ہی کو ترجیح دی' اور وہی بات پسند کی جو باپ کو پسند تھی۔

حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کو کسی نے ان کے بیٹے کی وفات کی خبردی' آپ نے "انا للہ وانا الیہ راجعون" پڑھا اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ایک عیب کو چھپایا' ایک مشقت سے بچایا' اور ایک اجر عطا کیا' اسکے بعد آپ اپنی جگہ سے اٹھے' اور دو رکعت نماز ادا کی' اسکے بعد فرمایا کہ جو حکم ہم سے متعلق تھا وہ ہم بجالائے یعنی ہمیں ایسے موقع پر یہ حکم ہے وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ (صبر اور نماز سے مدد لو) اس لئے ہم نے صبر کیا اور نماز بھی پڑھی' حضرت عبداللہ ابن مبارکؒ کے ایک صاحبزادے کے انتقال پر ایک مجوسی تعزیت کے لئے آیا اور اس نے یہ کہا کہ عقلمند انسان کو آج وہ کام کرنا چاہیے جو بے وقوف آدمی چند روز بعد کرے گا' یعنی موت پر خواہی نخواہی صبر کرنا ہی پڑتا ہے' آج نہیں کروگے' چند دن بعد کروگے کیوں نہ آج ہی کرلیا جائے۔ ابن المبارکؒ نے ارشاد فرمایا اس شخص نے بڑے پتے کی بات کہی ہے اسکا یہ جملہ لکھ لو۔ ایک عالم فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے پر پے در پے مصیبتیں ڈالتا ہے' یہاں تک کہ وہ زمین پر اس حال میں قدم اٹھاتا ہے کہ اس کے ذمے کوئی گناہ باقی نہیں رہتا۔ حضرت فضیل ابن عیاضؒ ارشاد فرماتے ہیں جس طرح تم اپنے گھر والوں کے لئے بھلائی کے کفیل ہوتے ہو اسی طرح اللہ تعالیٰ اپنے بندۂ مومن کے لئے مصیبت کا کفیل ہوتا ہے جو اسکے حق میں فلاح ہوتی ہے۔ حضرت حاتم اصمؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن چار طرح کے آدمیوں پر چار طرح سے حجت کرے گا' مالداروں پر حضرت سلیمان علیہ السلام سے' فقراء پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے' غلاموں پر حضرت یوسف علیہ السلام سے' اور مریضوں پر حضرت ایوب علیہ السلام سے۔ حضرت ذکریا علیہ السلام کا قصہ بیان کیا جاتا ہے کہ جب وہ بنی اسرائیل کے خوف سے ایک درخت کے خلاء میں روپوش ہوگئے' اور دشمن انھیں تلاش کرتے ہوئے اس درخت تک آپہنچے' اور انھیں یہ یقین ہوگیا کہ حضرت ذکریا علیہ السلام اس درخت کے اندر چھپے ہوئے ہیں' انھوں نے ایک آرہ منگوایا اور درخت کو کاٹنا شروع کردیا' جب آرہ حضرت ذکریا علیہ السلام کے سر کے قریب پہنچا تو بے ساختہ چیخ اٹھے وحی آئی کہ اگر دوبارہ آواز نکلی تو تمہارا نام انبیاء کی فہرست سے حذف کردیا جائے گا' اس تہدید کے بعد حضرت ذکریا علیہ السلام نے اپنی زبان دانتوں تلے دبالی' اور یہاں تک ضبط کیا کہ زبان کے دو ٹکڑے ہوگئے۔ حضرت ابو مسعود بلخیؒ فرماتے ہیں کہ اگر کسی شخص پر کوئی مصیبت نازل ہو' اور وہ ضبط نہ کرپائے' بلکہ سینہ کوبی کرے' یا کپڑے پھاڑے' وہ ایسا ہے گویا اس نے اپنے پروردگار سے لڑنے کے لئے تیر کمان ہاتھ میں لے لئے ہوں۔ حضرت لقمان علیہ السلام نے اپنے صاحبزادے سے فرمایا بیٹے سونے کی کسوٹی آگ ہے' اور انسان کی کسوٹی مصیبت ہے' جب اللہ کسی قوم سے محبت کرتا ہے تو اسے آزمائش میں ڈال دیتا ہے' جو اس آزمائش میں ثابت قدم رہتے ہیں' ان سے خوش ہوتا ہے' اور جن کے پاؤں میں لغزش آجاتی ہے' ان سے ناراض ہوتا ہے' احنف ابن قیسؒ فرماتے ہیں کہ ایک دن میری ڈاڑھ میں شدید تکلیف تھی' میں اس تکلیف کے باعث رات بھر سو نہیں پایا' صبح اٹھ کر میں نے اپنے چچا سے کہا کہ رات میں ڈاڑھ کے درد کی وجہ سے سو نہیں پایا' یہ بات میں نے تین بار کہی' چچا نے فرمایا تمہیں ایک رات تکلیف رہی تم نے اسکا بار بار ذکر کیا' میری یہ آنکھ تیس سال پہلے ضائع ہوئی تھی' لیکن آج تک کسی کو علم نہیں کہ مجھ پر کیا گزری ہے' اللہ تعالیٰ نے حضرت عزیر علیہ السلام پر وحی نازل فرمائی کہ جب تم پر کوئی مصیبت نازل ہو تو تم میری شکایت میرے بندوں سے مت کرنا' میں بھی تو تمہاری شکایت اپنے بندوں سے نہیں کرتا جب تمہارے گناہ اور عیوب میرے سامنے آتے ہیں۔

مصیبت پر نعمت کی فضیلت

اب تک جو کچھ عرض کیا گیا ہے اسے پڑھنے کے بعد تم یہ کہہ سکتے ہو کہ نعمت کے مقابلے میں مصیبت افضل ہے' اس صورت میں کیا ہمیں اس بات کی اجازت دی جائے گی کہ ہم اللہ تعالیٰ سے مصائب کی درخواست کریں؟ اسکا جواب یہ ہے کہ مصائب مانگنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے کہ آپ اپنی دعاؤں میں دنیا و آخرت کے مصائب سے پناہ مانگتے تھے۔ (احمد۔ بشر ابن ابی ارطاۃ)۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے انبیاء علیہم السلام کی متفقہ دعا یہ تھی رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ (اے اللہ ہمیں دنیا میں بھلائی عطا کر اور آخرت میں بھلائی دے) یہ حضرات شماتت اعداء سے بھی پناہ مانگتے تھے۔ (۱) روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضرت علیؓ نے صبر کی دعا مانگی سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تم نے مصیبت کی دعا مانگی ہے' اللہ تعالیٰ سے عافیت کی درخواست کرو (ترمذی' معاذ) حضرت ابوبکر الصدیق سے مروی ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :۔

سَلُوا اللّٰهَ الْعَافِيَةَ فَمَا أُعْطِيَ أَحَدٌ أَفْضَلَ مِنَ الْعَافِيَةِ إِلَّا الْيَقِيْنَ۔ (ابن ماجہ، نسائی)

اللہ تعالیٰ سے عافیت کی دعا کرو' کیوں کہ ایسا کوئی نہیں جسے یقین کے علاوہ عافیت سے بہتر کوئی چیز ملی ہو۔

یقین سے مراد دل کی عافیت اور صحت ہے' جس میں شبہات اور جہالت کے امراض نہ ہوں' دل کی عافیت بدن کی عافیت سے افضل ہے حضرت حسن فرماتے ہیں وہ چیز جس میں کوئی شر نہیں ہے۔ شکر کے ساتھ تندرستی کی نعمت ہے' کیوں کہ بعض لوگوں کو صحت ملتی ہے مگر وہ شکر ادا نہیں کرتے مطرف ابن عبداللہ فرماتے ہیں کہ مجھے تندرستی ملے اور میں اس پر اللہ کا شکر ادا کروں یہ اس سے بہتر ہے کہ مجھے مرض ملے اور میں اس پر صبر کروں' ایک روایت میں ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا مانگی وَعَافِيَتُكَ أَحَبُّ إِلَيَّ تیرا عافیت عطا کرنا مجھے زیادہ محبوب ہے۔

یہ ایک ظاہر و باہر حقیقت ہے' اسکے اثبات کے لئے کسی دلیل یا برہان کی ضرورت نہیں ہے' اور یہ اس کے لئے مصیبت دو وجہوں سے نعمت بن جاتی ہے' ایک تو اس مصیبت کی نسبت سے جو دین یا دنیا میں اس سے بڑی ہوتی ہے' اور دوسرے ثواب کی توقع اور امید کے اعتبار سے' اس نعمت پر شکر کا ثواب مانگنا چاہیے اس لئے کہ اللہ اس بات پر قادر ہے کہ وہ جو ثواب مصیبت پر عطا کرتا ہے اس سے زیادہ ثواب نعمت پر عطا کردے۔

اب اگر یہ کہا جائے کہ بعض لوگوں کے اقوال سے اس طرح کے اشارے ملتے ہیں گویا وہ مصائب کے خواہاں ہوں' کسی بزرگ کی طرف یہ قول منسوب کیا جاتا ہے' کہ میری خواہش یہ ہے کہ میں جہنم کا پل بنوں' لوگ میرے اوپر سے گزریں' اور نجات پائیں' اور صرف میں دوزخ میں رہ جاؤں' حضرت سمنون فرماتے ہیں :۔

وَلَيْسَ لِي فِي سِوَاكَ حَظٌّ   فَكَيْفَمَا شِئْتَ فَاخْتَبِرْنِي

(مجھے تیرے علاوہ کسی چیز سے مطلب نہیں' تو جس طرح چاہے میرا امتحان لے لے)

یہ مصیبت کی درخواست ہے' اس کا مطلب کیا ہے' جب کہ احادیث میں اس طرح کے سوالات سے منع کیا گیا ہے۔ اسکے جواب کی تفصیل یہ ہے کہ اس شعر کے بعد حضرت سمنون قبض کی بیماری میں مبتلا ہوئے' وہ دن رات مکاتب کے چکر لگایا کرتے تھے اور بچوں سے کہتے تھے کہ اپنے چچا کو جھوٹا کہا کرو' میں اپنی آزمائش میں پورا نہیں اترا' جہاں تک انسان کی اس محبت کا سوال ہے وہ تنہا دوزخ میں رہے' اور باقی سب نجات پاجائیں تو یہ ممکن ہے' لیکن بعض دلوں پر محبت اس قدر غالب ہوتی ہے کہ وہ اپنے نفس کو ہی ان باتوں کے لائق سمجھ لیتا ہے' شراب عشق میں بھی زبردست نشہ ہے' جو اسکا جام پی لیتا ہے وہ مدہوش ہوجاتا ہے' مست ہوجاتا ہے' اور مستی کے عالم میں ایسی باتیں زبان سے نکال بیٹھتا ہے کہ اگر اسکا نشہ ختم ہوجائے' اور بے خودی اور وارفتگی کی کیفیت زائل ہوجائے اور اس سے کہا جائے کہ تم یہ کہہ رہے تھے کہ تو وہ اپنا سر پیٹ لے' اور خود کہہ دے کہ یہ کلام حقیقت نہیں ہے' بلکہ ایک

(۱) یہ حدیث کتاب الدعوات میں گزر چکی ہے

لحاتی کیفیت اور وقتی حالت کا عکاس ہے' اس لئے اگر تم عشاق خدا کی زبان سے اس طرح کی باتیں سنو تو انھیں عاشقانہ کلام پر محمول کرو' ان کی باتیں سننے میں اچھی لگتی ہیں لیکن وہ حقیقت سے بعید ہوتی ہیں' ایک نر فاختہ کا قصہ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ اپنی مادہ سے صحبت کرنا چاہتا تھا مگر وہ انکار کررہی تھی نر فاختہ نے اس سے کہا کہ تو کیوں انکار کرتی ہے اگر میں چاہوں تو تیرے لئے حضرت سلیمان علیہ السلام کی سلطنت زیروزبر کردوں' حضرت سلیمان علیہ السلام نے فاختہ کی یہ گفتگو سنی تو اسے بلایا' اور ڈانٹ پلائی' فاختہ نے عرض کیا اے اللہ کے نبی! عشاق کی گفتگو قابل اعتبار نہیں ہوتی' آپ اس کا اثر نہ لیں' یہ ایک حقیقت ہے' اکثر عشاق جذب و سرمستی کے عالم میں ایسی باتیں کہہ جاتے ہیں کہ ہوش میں ہوں تو ہرگز نہ کہیں۔ ایک شاعر کہتا ہے۔

أُرِيْدُ وِصَالَهُ وَيُرِيْدُ هَجْرِيْ فَأَتْرُكُ مَا أُرِيْدُ لِمَا يُرِيْدُ

(میں اسکا وصال چاہتا ہوں اور وہ میری جدائی چاہتا ہے۔ اس لئے میں اسکی خواہش کے لئے اپنی خواہش ترک کرتا ہوں)۔

یہ ایک محال بات ہے' اس لئے کہ شاعر نے پہلے وصال کی خواہش کی' پھر محبوب کے ارادے کو اپنی خواہش بنالیا' حالانکہ دونوں خواہشیں ایک دوسرے کی ضد ہیں' جو وصال کا آرزو مند ہو گا' وہ جدائی کی خواہش کیسے کرے گا۔ تاہم اگر اس کلام کی دو تاویلیں کی جائیں تب اسے صحیح تسلیم کیا جاسکتا ہے' ایک تو یہ کہ یہ صورت بعض حالات میں پیش آتی ہو' اور مقصد یہ ہو کہ اس طرح محبوب کی رضا حاصل کرلی جائے' اس طرح مستقبل میں اسکا وصال بھی ہوسکتا ہے' اس صورت میں جدائی رضامندی کا وسیلہ ہے' اور رضا مندی وصال محبوب کا ذریعہ ہے' اور جو چیز محبوب کا وسیلہ ہوتی ہے وہ خود بھی محبوب ہوتی ہے' اسکی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص دو درہم کے وعدے پر ایک درہم چھوڑدے' حالانکہ اسے ایک درہم سے بھی محبت ہے' مگر وہ اسے چھوڑنے پر رضامند ہے' اسی طرح عاشق بھی وصال کا آرزومند ہے' مگر فی الحال معشوق کی خواہش کے احترام میں وہ یہ وصال ترک کرنے پر راضی ہے' کیونکہ اسے توقع ہے کہ مستقبل میں حاصل ہونے والا وصال مکمل اور پائدار ہو گا' دوسری تاویل یہ ہے کہ عاشق کو صرف محبوب کی رضا مقصود ہے' وصال وغیرہ سے اسے کوئی غرض نہیں' اگر اسے یہ معلوم ہو جائے کہ اسکا محبوب اس سے راضی ہے تو اسے وہ لذت ملتی ہے جو دیدار میں بھی نہیں ملتی' اس لئے وہ ایسے کام کرتا ہے جس سے اس کا محبوب خوش ہو' اگر اس کی خوشی ہجر میں ہے تو وہ اسے بھی محبوب کا تحفہ سمجھ کر قبول کرلیتا ہے۔ اسی لئے بعض عاشقان خدا کی حالت یہ تھی کہ وہ مصائب میں گرفتار ہو کر خوش رہتے تھے' اور تکالیف میں لذت پاتے تھے' کیونکہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ یہ تکلیفیں اور مصیبتیں اللہ کی رضامندی پر دلالت کرتی ہیں' غلبۂ عشق میں اس مرحلے کا آنا بعید نہیں ہے' لیکن یہ مرحلہ بہت مختصر ہوتا ہے' یہ حالت زیادہ دیر تک طاری نہیں رہتی' اور اگر یہ دیر تک رہ جاتی ہے تو پھر صحیح حالت مشتبہ ہوجاتی ہے' اور یہ معلوم کرنا مشکوک ہوجاتا ہے' کہ اس حالت نے دل کو اعتدال سے منحرف کردیا ہے' یا وہ اپنی جگہ پر قائم ہے' یہ ایک الگ بحث ہے' اس کی تحقیق اپنی جگہ ذکر کی جائے گی' یہاں اس کی گنجائش نہیں ہے' یہاں صرف یہ موضوع زیر گفتگو ہے کہ عافیت مصیبت سے بہتر ہے' ہم اللہ تعالیٰ سے دین و دنیا میں عفو و عافیت کے طالب ہیں۔

صبر افضل ہے یا شکر؟

جاننا چاہیے کہ اس سلسلے میں مختلف لوگوں کے مختلف اقوال ہیں' بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ صبر شکر سے افضل ہے' بعض کی رائے یہ ہے کہ شکر افضل ہے' بعض کہتے ہیں کہ یہ دونوں برابر ہیں' کچھ لوگ کہتے ہیں ان کی فضیلت احوال کے اختلاف پر مبنی ہے' بعض حالات میں شکر افضل ہے' اور بعض میں صبر ہے پھر ہر فریق نے استدلال میں کچھ ایسی گفتگو کی ہے کہ اس میں بڑا اضطراب ہے' اور مقصد سے نہایت بعید ہے۔ اس لئے ہم یہاں ان کے دلائل نقل کرنے کے بجائے حق بات عرض کرتے ہیں' اس سلسلے میں دو بحثیں ہیں۔

پہلی بحث عوامی: یہ بحث تساہل کے طور پر ہے یعنی اس میں صرف ظاہر امر پر نظر کی جاتی ہے 'تلاش حقیقت مقصود نہیں ہوتی 'اس بحث میں ہمارے مخاطب عوام ہیں 'کیونکہ ان کی عقلیں غامض دقائق اور مبہم حقائق کی متحمل نہیں ہو سکتیں 'واعظین بھی اسی کلام پر اعتماد کر سکتے ہیں 'کیونکہ وہ بھی عوام سے خطاب کرتے ہیں 'اور ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ان کی اصلاح ہو جائے 'وہ لوگ سدھر جائیں 'جیسے مادر مہربان اپنے بچے کی پرورش ہلکے پھلکے دودھ سے کرتی ہے 'اسے مرغن غذائیں 'اور انواع و اقسام کے کھانے نہیں کھلاتی 'مناسب یہی ہے کہ وہ یہ غذائیں بچے کو کھلانا تو کجا اسکے پاس بھی نہ لائے مبادا وہ چکھ لے اور بیمار پڑ جائے 'یا ہلاک ہو جائے 'یہ غذائیں وہ اسی وقت ہضم کر سکتا ہے جب اسکا ضعف دور ہو جائے گا اور وہ جسمانی طور پر تندرست و توانا ہو جائے گا اسی طرح یہ بحثیں بھی عوام کے لائق نہیں ہیں 'انھیں تو صرف وہ باتیں بتلانی چاہئیں جو شرعی دلائل سے مفہوم ہوتی ہیں۔

جہاں تک ظاہر کا تعلق ہے اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ صبر افضل ہے 'اگرچہ شکر کے فضائل بھی بے شمار ہیں لیکن جب ان کا صبر کے فضائل سے تقابل کرتے ہو تو معلوم ہوتا ہے کہ فضائل صبر کے زیادہ ہیں 'اور بعض روایات میں اسکی صراحت بھی موجود ہے کہ صبر افضل ہے 'جیسا کہ ایک حدیث میں ہے :۔

مِنْ أَفْضَلِ مَا أُوتِيتُمُ الْيَقِينُ وَعَزِيمَةُ الصَّبْرِ

جو افضل چیزیں تمہیں عطا کی گئی ہیں ان میں یقین اور صبر کے عزیمت ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن روئے زمین کے انتہائی شکر گزار بندے کو بلایا جائے گا اور اسے شاکرین کے ثواب سے نوازا جائے گا 'پھر اس شخص کو بلایا جائے گا جو روئے زمین پر سب سے زیادہ صابر ہو گا اور اس سے پوچھا جائے گا کہ اگر تجھے شاکر کے برابر ثواب عطا کیا جائے تو کیا تجھے منظور ہے 'وہ عرض کرے گا بے شک منظور ہے 'ارشاد ہو گا' ہرگز نہیں! ہم نے تجھ پر نعمت نازل کی تو تو نے شکر کیا اور تجھے مصائب میں مبتلا کیا گیا تو صبر کیا ہم تجھے دوگنا ثواب عنایت کریں گے 'پھر اسے دوگنا ثواب عطا کیا جائے گا۔(۱)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :۔

إِنَّمَا يُوَفَّى الصَّابِرُونَ أَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ (پ ۲۳ ر ۱۴ آیت ۱۰) صبر کرنے والوں کو انکا اجر بے حساب ملے گا۔

ایک حدیث میں ہے :۔

اَلطَّاعِمُ الشَّاكِرُ بِمَنْزِلَةِ الصَّائِمِ الصَّابِرِ (ترمذی 'ابن ماجہ۔ ابو ہریرہؓ)

کھانے والا شکر گزار بندہ صبر کرنے والے روزہ دار کے برابر ہے۔

اس حدیث سے بھی صابر کی فضیلت ثابت ہوتی ہے 'کیونکہ اس میں شکر کا درجہ صبر سے تشبیہ دے کر بڑھایا گیا ہے 'تشبیہ میں عموماً یہی ہوتا ہے کہ مشبہ بہ مشبہ سے افضل ہوتا ہے 'اس لئے اگر صبر افضل نہ ہوتا تو شکر کو اسکے ساتھ تشبیہ نہ دی جاتی 'یہ تشبیہ ایسی ہے جیسی ان روایات میں وارد ہے۔

اَلْجُمُعَةُ حَجُّ الْمَسَاكِينِ وَجِهَادُ الْمَرْأَةِ حُسْنُ التَّبَعُّلِ (حارث بن ابی اسامۃ۔ ابن عباسؓ)

جمعہ مساکین کا حج ہے 'اور عورت کا جہاد یہ ہے کہ اپنے شوہر کے ساتھ اچھی طرح رہے۔

شَارِبُ الْخَمْرِ كَعَابِدِ الْوَثَنِ (حارث بن ابی اسامۃ۔ عبداللہ ابن عمرؓ)

شراب پینے والا بتوں کی عبادت کرنے والا جیسا ہے۔

ایک حدیث میں ہے :۔

اَلصَّبْرُ نِصْفُ الْإِيمَانِ (۲) صبر نصف ایمان ہے۔

لیکن اسکا مطلب یہ نہیں کہ شکر کا حال بھی یہی ہے 'اسے بھی نصف ایمان کہا جائے گا 'بلکہ یہ فرمانا 'ایسا ہے کہ اس حدیث شریف میں فرمایا گیا :۔ اَلصَّوْمُ نِصْفُ الصَّبْرِ (۳)

---

(۱) اس حدیث کی اصل مجھے نہیں ملی (۲) یہ روایت پہلے گزر چکی ہے (۳) یہ روایت پہلے گزر چکی ہے

روزہ نصف ایمان ہے۔

اس سلسلے میں اصل یہ ہے کہ جس چیز کی دو قسمیں ہوتی ہیں ان میں سے ایک کو اس چیز کا نصف کہہ دیتے ہیں' اگرچہ دونوں میں فرق ہو' مثلاً کہتے ہیں ایمان علم و عمل کا نام ہے' اس سے معلوم ہوا کہ عمل نصف ایمان ہے' لیکن اسکا یہ مطلب نہیں کہ علم اور عمل دونوں درجے میں برابر ہیں۔ ایک حدیث میں ہے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ انبیاء علیہم السلام میں سے حضرت سلیمان علیہ السلام اپنی سلطنت کی وجہ سے سب کے بعد جنت میں داخل ہوں گے' اور میرے اصحاب میں سے عبدالرحمٰن ابن عوف اپنی مالداری کے باعث سب کے آخر میں جنت میں جائیں گے' (طبرانی۔ معاذ ابن جبل) ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام تمام انبیاء علیہم السلام کے چالیس برس بعد جنت میں جائیں گے (ابو منصور دیلمی۔ انس ابن مالک) یہ مالداروں کا حال ہے دوسری طرف فقراء اور مصیبت زدوں کے متعلق ارشاد فرمایا کہ جنت کے تمام دروازوں میں دو دو کواڑ ہیں مگر صبر کے دروازے میں صرف ایک کواڑ ہے' اس دروازے سے سب سے پہلے اہل مصیبت جنت میں جائیں گے اور حضرت ایوب علیہ السلام ان کے قائد ہوں گے۔ فقر کی فضیلت میں جو کچھ وارد ہے اس سے بھی صبر کی فضیلت ثابت ہوتی ہے' اس لئے کہ فقر صبر کا حال ہے' اور مالداری شکر کا حال ہے' یہ جو کچھ عرض کیا گیا ہے عوام اس پر قناعت کر سکتے ہیں' اور ان کے شایان شان بھی یہی ہے کہ وہ اس مختصر بیان پر اکتفا کریں جس میں ان کے دین کی بھلائی ہو۔

استدلال کا دوسرا رخ: دوسرا بیان ارباب بصیرت اور اہل علم کے لئے ہے اس بیان سے انھیں بطریق کشف حقائق امور پر مطلع کرنا مقصود ہوتا ہے' اس ذیل میں ہم یہ کہتے ہیں کہ اگر دو امر مبہم ہوں تو ابہام کی موجودگی میں ان دونوں کے اندر موازنہ نہیں ہو سکتا جب تک کہ ان دونوں میں سے ہر ایک کی حقیقت واضح نہ ہو' اور اگر وہ شئی جس کی حقیقت واضح ہو جائے چند قسموں پر مشتمل ہو تو ان میں بحیثیت مجموعی موازنہ ممکن نہیں' بلکہ ضروری ہے کہ ان قسموں کے ایک ایک فرد کا موازنہ کیا جائے تاکہ زیادتی اور رجحان واضح ہو سکے اس اصولی گفتگو کی روشنی میں صبر اور شکر پر نظر ڈالئے' ان میں سے ہر ایک کی بے شمار اقسام اور فروع ہیں اس لئے ان دونوں میں کمی اور زیادتی مجملاً بیان نہیں کی جا سکتی' بلکہ دونوں کے ہر ہر فرد کا مقابلہ ضروری ہے۔

صبر و شکر وغیرہ مقامات کے افراد: یہ بات پہلے بیان کی جا چکی ہے کہ صبر و شکر وغیرہ مقامات کے تین افراد ہیں' علوم' احوال اور اعمال' اگر ان تینوں افراد میں موازنہ کیا جائے تو ظاہر میں شخص یہی کہے گا کہ علوم سے احوال مقصود ہیں اور احوال سے مقصود ہیں' اس لئے ان تینوں میں اعمال افضل ہیں۔ اہل بصیرت کی رائے اسکے بالکل برعکس ہے وہ یہ کہتے ہیں کہ اعمال سے احوال کے لئے غرض ہے' اور احوال علوم کے لئے مقصود ہیں' ان کے نزدیک علوم کو ترجیح حاصل ہے' علوم کے بعد احوال ہیں' اور احوال کے بعد اعمال ہیں' اس لئے کہ جو چیز کسی دوسری چیز کے لئے مقصود ہوتی ہے وہ یقینی طور پر افضل ہوتی ہے جہاں تک ان تینوں کے افراد و آحاد کا تعلق ہے وہ کبھی مساوی ہوتے ہیں اور کبھی متفاوت' یہ مساوات اور تفاوت اس وقت نمایاں ہوتا ہے جب ان افراد و آحاد میں سے بعض کی نسبت بعض کی طرف جاتی ہے' یہی حال احوال اور علوم کا ہے۔

معارف کی کونسی قسم افضل ہے: معارف میں علوم مکاشفہ علوم معاملہ سے افضل ہیں' بلکہ علوم معاملہ معاملہ سے کمتر ہیں کیونکہ یہ علوم معاملے کے لئے مقصود ہیں' اور ان سے اصلاح عمل کا فائدہ حاصل کیا جاتا ہے۔ حدیث شریف میں عالم کو عابد سے افضل کہا گیا ہے' اس سے مراد وہ عالم ہے جس کے علم کا نفع عام ہو ایسا عالم یقیناً کسی خاص عبادت کرنے والے کی بہ نسبت افضل ہوگا' ورنہ کسی کا علم عمل سے خالی ہے تو وہ محض علم سے اچھا نہیں ہو سکتا۔

اصلاح عمل کا فائدہ یہ ہے کہ قلب کے احوال کی اصلاح ہو' اور قلب کی اصلاح کا فائدہ یہ ہے کہ اس پر اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات اور افعال کا جمال منکشف ہو' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ علوم مکاشفہ میں اللہ تعالیٰ کی معرفت افضل ہے معرفت الٰہی غایت

مقصود ہے' اور اپنی ذات سے مطلوب ہے اس لئے کہ سعادت اخروی اسی کے ذریعے حاصل کی جاتی ہے' بلکہ یہی عین سعادت ہے' مگر دل کو بعض اوقات دنیا میں یہ احساس نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت عین سعادت ہے بلکہ آخرت میں اسکا علم ہوتا ہے۔ بہرحال معرفت الٰہی تمام معارف میں افضل و اعلا ہے' اس پر کوئی رکاوٹ نہیں ہے' اور نہ یہ غیر کے ساتھ مقید ہے' جب کہ یہ تمام معرفتیں اس کے تابع اور خادم ہیں' یہ معارف اس لئے مطلوب ہوتے ہیں کہ ان کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کی جائے۔ جب یہ حقیقت سامنے آگئی کہ تمام معرفتیں معرفت الٰہی کے لئے مطلوب اور مقصود ہیں تو یہ دیکھا جائے گا کہ معرفت الٰہی کے حصول میں کون سی معرفت کس قدر مفید اور معاون ہے۔ جو معرفت جس قدر معاون ہوگی اسی قدر وہ دوسری معرفت سے فضیلت میں متفاوت ہوگی' چنانچہ بعض معارف اور معرفت الٰہی میں ایک واسطہ اور بعض میں بہت سے واسطوں کی ضرورت پیش آتی ہے' اس لئے جس معرفت میں واسطے کم ہوں گے اسی قدر وہ معرفت دوسری معرفتوں سے افضل ہوگی۔

احوال قلب کی کیفیت : احوال قلب سے ہم قلب کے وہ احوال مراد لیتے ہیں جو مخلوق کے مشاغل' اور دنیا کی کدورتوں سے قلب کی تطہیر کردیں' یہاں تک کہ جب قلب بالکل پاک و صاف ہوجائے تو اس پر حق کی حقیقت منکشف ہو اس سے معلوم ہوا کہ احوال قلب میں اسی قدر فضیلت ہوگی جس قدر وہ قلب کے تزکیہ و تطہیر میں مؤثر ہوں گے' اور جس قدر اس میں انکشاف حق کی صلاحیت پیدا کریں گے' قلب کی مثال آئینے کی سی ہے' جس طرح آئینے کو صیقل کرنے اور چمکانے سے پہلے کچھ احوال واقع ہوتے ہیں' جن میں بعض احوال آئینے کو زیادہ چمکاتے ہیں' اور بعض کم' یہی حال دل کا ہے' اس لئے جو حالت قلب کے صیقلے میں زیادہ قریب ہوگی اسی قدر وہ دوسری حالتوں سے افضل ہوگی' کیونکہ وہ حالت اصل مقصود سے زیادہ قریب ہوتی ہے' اعمال میں بھی اس ترتیب کا لحاظ کیا جائے گا' اعمال ہی سے قلب کا تصفیہ یقینی ہوتا ہے اور انہی کی بدولت قلب پر احوال طاری ہوتے ہیں۔

عمل۔ معصیت یا طاعت : اعمال دو حال سے خالی نہیں' یا تو وہ دل پر ایسے احوال طاری کرتے ہیں جو علوم مکاشفہ کے لئے مانع ہوں' اور جن سے دل پر تاریکی چھا جائے' اور اس میں مکروہات کی خواہش اور رغبت پیدا کریں' یا ایسے احوال طاری ہوتے ہیں جن سے دل میں علوم مکاشفہ کی صلاحیت اور استعداد پیدا ہوجائے' دنیاوی کدورتوں' آلائشوں' اور مخلوق کے علائق سے اسکا تعلق منقطع ہوجائے' پہلی قسم کی احوال کا نام معصیت ہے' اور دوسری قسم کے احوال کو طاعت کہتے ہیں' پھر معاصی اور طاعات دونوں اپنے اپنے اثرات میں مختلف اور متفاوت ہیں' بعض معاصی دل کو زیادہ تاریک اور زیادہ سخت بناتے ہیں' اور بعض کم اسی طرح بعض طاعات سے دل زیادہ روشن اور مجلّٰی ہوتا ہے اور بعض سے کم۔ گویا معاصی اور طاعات کے درجات میں تفاوت ان کے اثرات کے تفاوت پر مبنی ہے' اور یہ تفاوت احوال کے اختلاط سے ظہور پذیر ہوتا ہے۔ مثلاً ہم یہ کہتے ہیں کہ نفلی نماز تمام نفلی عبادتوں سے افضل ہے' اور صبح کی عبادت صدقہ سے بہتر ہے' اور تہجد کی نماز دوسری نمازوں سے اعلا ہے' لیکن تحقیقی بات یہ ہے کہ جس شخص پر مال کی محبت اور بخل غالب ہو' اور وہ ایک درہم اللہ کی راہ میں خیرات کرے' اس کا یہ عمل بہت سی شب بیداریوں اور روزوں سے افضل ہے' اس لئے کہ روزے اس شخص کے لئے موزوں ہیں جس پر شہوت شکم غالب ہو اور وہ اس کا خاتمہ چاہتا ہو یا جسے شکم سیری نے ذکرو فکر سے روک دیا ہو اور وہ بھوک کے ذریعے اس سے مربوط ہونے کا خواہشمند ہو' بخیل کا یہ حال نہیں ہے' وہ دوسرے مرض میں مبتلا ہے اسکا علاج بھوک سے نہیں بلکہ صدقہ و خیرات کے ذریعے ہوگا' اس پر پیٹ کی شہوت غالب نہیں ہے' اور نہ وہ کسی ایسے فکر میں مشغول ہے جس سے شکم سیری مانع ہو' پھر اسکا روزے رکھنا اپنی حالت ترک کرکے دوسرے کی حالت اختیار کرنے کے مشابہ ہے' اسکی مثال ایسی ہے جیسے کسی شخص کے پیٹ میں درد ہو اور وہ سر کے درد کی دوا کرے' یقیناً اسے اس علاج سے کوئی فائدہ نہ ہوگا' اسکے لئے تو اس مہلک بیماری یا معصیت کا قلع قمع کرنا ضروری ہے جو اس پر بلائے ناگہانی کی طرح مسلط ہوگئی ہے۔ بخل ایک سنگین اور مہلک مرض ہے' اگر کوئی شخص مسلسل سو سال تک روزے رکھے اور ہزار راتیں سجدے میں گزارے تو اس مرض کا ایک ذرہ بھی کم نہ ہو' اس کا علاج صرف مال نکالنا ہے بخیل کو چاہیے کہ وہ جو کچھ اسکے پاس ہے اسے اللہ کی راہ میں دے ڈالے۔ احیاء العلوم جلد

سوم کے متعلقہ باب میں ہم صدقہ و خیرات کے ذریعے بخل کے علاج پر مفصل کلام کرچکے ہیں۔
اس مثال کے ذریعے یہ بات واضح ہوچکی ہے اور اطاعات کی تاثیر حالات کے اختلاف سے مختلف ہوتی ہے' اہل بصیرت یہ بات جان چکے ہیں کہ افضلیت وغیرہ کی بحث میں مطلق جواب کسی بھی طرح صحیح نہیں ہے' بلکہ سراسر غلط ہے' مثلاً اگر تم سے یہ پوچھا جائے کہ روٹی افضل ہے یا پانی تم کسے افضل کہو گے ظاہر ہے روٹی بھوکے کے لئے افضل ہے اور پانی پیاسے کے لئے افضل ہے اگر بھوک اور پیاس دونوں موجود ہوں تو یہ دیکھا جائے گا کہ ان دونوں میں سے کون سی حالت غالب ہے' اگر پیاس زیادہ غالب ہے تو پانی افضل ہے' اور بھوک غالب ہے تو روٹی افضل ہے' اور اگر بھوک اور پیاس دونوں برابر ہیں تو روٹی اور پانی میں بھی افضلیت کا سوال بیکار ہے' یہ دونوں بھی برابر ہوں گے۔ اسی طرح اگر یہ سوال کیا جائے کہ سکنجین افضل ہے یا صفراوی مادّے کا عدم وجود؟ تب ہم اسکے جواب میں قطعیت کے ساتھ یہ بات کہیں گی کہ صفراوی مادّے کا نہ ہونا بہتر ہے' اس لئے کہ صفراء کے مرض میں گرفتار شخص ہی کو سکنجین کی ضرورت ہوتی ہے' اور یہ مسلمہ اصول ہے کہ جو چیز غیر کے لئے مطلوب ہوتی ہے تو غیر اس سے افضل ہوتا ہے۔
خلاصۂ کلام یہ ہے کہ مذکورہ شخص کے لئے مال کا خیرات کرنا بہتر ہے' کیونکہ مال خیرات کرنا ایک عمل ہے' اس سے دل میں ایک حالت پیدا ہوتی ہے' جسے ہم بخل کا زوال' اور دنیا کی محبت کا دل سے نکلنے کا عمل کہہ سکتے ہیں' پھر جب دل سے بخل زائل ہوجاتا ہے' اور دنیا کی محبت نکل جاتی ہے تو اس میں معرفت الہی کی صلاحیت پیدا ہوجاتی ہے۔ اور اسکے بعد عمل کا نمبر آتا ہے۔

ایک اعتراض کا جواب : اب اگر کوئی شخص یہ کہے کہ تم نے عمل کا درجہ آخری رکھا ہے' حالانکہ کتاب و سنت میں اعمال کی ترغیب موجود ہے' اور ان کے فضائل میں بے شمار آیات و روایات وارد ہیں۔ یہاں تک کہ خود رسالت مآب سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقات طلب فرمائے' اور علی الاعلان یہ ترغیب دی :-

مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا (پ ۲ر ۱۶ آیت ۲۴۵)
کون شخص ہے ایسا جو اللہ تعالی کو اچھے طور پر قرض دے۔

ایک جگہ ارشاد فرمایا :-

وَيَأْخُذُ الصَّدَقَاتِ (پ ۱۱ر ۲ آیت ۱۰۴)
اور وہی صدقات کو قبول کرتا ہے۔

ان ترغیبات اور فضائل کی موجودگی میں تم اعمال کی فضیلت کا انکار کیسے کرسکتے ہو؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر ڈاکٹر کسی دوا کی تعریف کرے تو اسکا یہ مطلب نہیں کہ وہ دوا ہر حال میں بہتر ہے یا وہ اپنی ذات سے مقصود ہے' یا اس شفاء اور صحت سے افضل ہے' جو اس دوا کے استعمال سے حاصل ہوئی ہے۔ ڈاکٹر دواء کی تعریف اس لئے کرتا ہے کہ تاکہ مریض کو ترغیب ہو اور وہ اسکے استعمال سے صحت حاصل کرے' یہی حال دل کے اعمال کا ہے' یہ دل کی بیماریوں کی دواء ہیں' اور دل کی بیماریاں محسوس نہیں ہوتیں جیسے کسی کے چہرے پر برص کے داغ ہوں اور اسکے پاس آئینہ نہ ہو تو اسے خبر ہی نہیں ہوپاتی کہ میں کس مرض میں مبتلا ہوگیا ہوں اگر کوئی شخص اسے اس کے عیب سے آگاہ کرے گا تو تسلیم نہیں کرے گا' ایسے شخص کا علاج یہی ہے کہ اس کے سامنے ان دواؤں کی تعریف میں بے حد مبالغہ کیا جائے جن سے برص کی داغ دور ہوتے ہیں' مثلاً اگر عرق گلاب میں یہ وصف ہو تو اسکی بے پناہ تعریف کی جائے' اور مریض کو ترغیب دی جائے کہ وہ عرق گلاب سے اپنا چہرہ بار بار دھوئے۔ تاکہ بہت زیادہ تعریف کرنے سے اسکے دل میں ترغیب پیدا ہو اور وہ عرق گلاب سے چہرہ دھونے پر مداومت کرلے' اور اسکا مرض دور ہوجائے۔ اگر اس سے پہلے ہی مرحلے میں یہ کہہ دیا گیا کہ عرق گلاب برص کے ازالے میں مؤثر ہے اور تیرے چہرے کے داغ اسی سے دور ہوسکتے ہیں' تو وہ سختی سے اس بات کی تردید کرے گا کہ میرے چہرے پر برص کے داغ ہیں۔
اس سے بھی قریب تر ایک مثال ہے' مثلاً ایک شخص نے اپنے بیٹے کو قرآن کریم کی تعلیم دی ہے' اور اسے علم کے زیور سے

آراستہ کیا ہے' اب وہ یہ چاہتا ہے کہ جو علوم اس نے حاصل کئے ہیں وہ اسکے پاس محفوظ رہیں' لیکن وہ بیٹے کا مزاج آشنا ہے اور یہ جانتا ہے کہ اگر میں نے بار بار مطالعہ تکرار اور اعادے کی تاکید کی تو وہ یہ کہہ کر ٹال دیگا کہ اس کی ذرا ضرورت نہیں ہے کیونکہ جو علوم میں نے حاصل کئے ہیں وہ میرے سینے میں محفوظ ہیں' باپ حکمت عملی سے کام لیتا ہے' اور اس سے کہتا ہے کہ وہ میرے نوکروں اور غلاموں کو تعلیم دیا کرے' اس کے عوض میں اسے عمدہ عمدہ چیزوں سے نوازا جائے گا' چنانچہ وہ اس خدمت کے معاوضے کے طور پر بہت سے اچھے اچھے وعدے کرلیتا ہے' تاکہ وہ اسکی تجویز پر عمل کرے' اصل میں نوکروں کو تعلیم دینا مقصود نہیں ہے' بلکہ وہ رسوخ اور پختگی مقصود ہے جو نوکروں کو تعلیم دینے سے اسکے علم میں پیدا ہوگی' اس صورت میں اگر لڑکا کم عقل اور نادان ہے تو وہ یہ سمجھتا ہے کہ میرا باپ مجھ سے اپنے نوکروں کی خدمت کرانا چاہتا ہے' حالانکہ وہ میرے مقابلے میں حقیر ہیں' پھر ان نوکروں کی تعلیم اس قدر ضروری بھی نہیں ہے کہ میرا وقت ضائع کیا جائے' اور مجھے اس خدمت پر مامور کیا جائے' اگر یہ لوگ جاہل رہ گئے تو میرے ماں باپ کو کیا نقصان پہنچ سکتا ہے' پھر یہ کام دوسرے بھی کرسکتے ہیں مجھے ہی کیوں مجبور کیا جارہا ہے' اس طرح کے خیالات اسے پریشان کرتے ہیں' چنانچہ وہ توجہ' دلچسپی اور دل جمعی سے نہیں پڑھاتا' سستی کرتا ہے' اور محض رسمی کارروائی پر اکتفا کرتا ہے تاکہ باپ کے حکم کی تعمیل ہوسکے' بد بختی اسے آلیتی ہے اور جو کچھ اس نے پڑھا ہے اسے ضائع کردیتی ہے۔

بعض لوگ اسی طرح کے خیالات سے دھوکا کھا گئے اور اباحت پسندی کی راہ پر چل پڑے' وہ یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ظاہری عبادتوں سے بے نیاز ہے' اسے ہم سے قرض لینے کی ضرورت نہیں ہے' پھر اس آیت کے کیا معنی ہیں؟

مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا اور اگر اللہ تعالیٰ غریبوں مسکینوں کو کھانا کھلانا چاہتا ہے تو کھلا سکتا ہے یہ کیا ضروری ہے کہ ہم انھیں کھانا کھلانے کے لئے اپنا مال خرچ کریں' قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے کافروں کا ایک قول فرمایا جس میں بعینہ یہی بات کہی گئی ہے :۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ آمَنُوْا اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ يَشَاءُ اللّٰهُ اَطْعَمَهٗ (پ ۲۳ ر ۲ آیت ۴۷)

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو کچھ تم کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرو تو یہ کفار (ان) مسلمانوں سے یہ کہتے ہیں کہ کیا ہم ایسے لوگوں کو کھانے کو دیں جن کو اگر خدا چاہے تو کھلادے۔

ایک جگہ ان کا یہ قول بیان فرمایا :۔

لَوْ شَاءَ اللّٰهُ مَا اَشْرَكْنَا وَلَا آبَاؤُنَا (پ ۸ ر ۵ آیت ۱۴۹)

اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا تو نہ ہم شرک کرتے اور نہ ہمارے باپ دادا۔

حالانکہ کفار کی یہ باتیں سچ تھیں' واقعی سب کچھ اللہ تعالیٰ کی مشیت پر موقوف ہے' مگر وہ اپنے سچ سے تباہ ہوگئے' خدا کی شان عجیب ہے وہ جسے چاہے سچ کی وجہ سے ہلاک کردے' اور جسے چاہے جہالت پر بخش دے' قرآن کریم میں ہے

يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا (پ ۱ ر ۳ آیت ۲۶)

اللہ تعالیٰ اس مثال کی وجہ سے بہت سوں کو گمراہ فرماتے ہیں' اور بہت سوں کو ہدایت سے نوازتے ہیں۔

ان لوگوں نے جب یہ گمان کیا کہ ان سے مساکین اور فقراء کی خدمت لی جاتی ہے' اور اللہ تعالیٰ کے نام پر صدقہ و خیرات کا حکم دیا جاتا ہے حالانکہ ہمیں مساکین سے کوئی غرض نہیں' اور نہ اللہ تعالیٰ کو ہم سے یا ہمارے اموال سے کچھ مطلب ہے' ہمارا خرچ کرنا نہ کرنا اسکے لئے برابر ہے' یہ لوگ ہلاک ہوگئے جس طرح وہ لڑکا ہلاک ہوا تھا جس نے یہ بدگمانی کی تھی کہ میرے والد کا مقصد یہ ہے کہ میں تعلیم کے ذریعے ان نوکروں' خادموں' اور غلاموں کی خدمت کروں' اسے یہ خیال نہیں آیا کہ باپ کا مقصد یہ نہیں ہے۔ بلکہ اس کے نفس و قلب میں صفت علم کو راسخ اور مؤکد کرنا ہے' تاکہ وہ اس کے ذریعے دین اور دنیا کی سعادتیں حاصل کرسکے' اسکے

باپ کا یہ سوچنا کہ نوکروں کو تعلیم دینے سے اسکا علم پختہ اور معلومات تازہ رہیں گی اس کی محبت اور شفقت کی علامت ہیں کیونکہ وہ اس طرح اسے سعادت سے قریب اور ہلاک سے دور کر رہا ہے۔ اس مثال سے ان لوگوں کی ہلاکت کی وجہ واضح ہو جاتی ہے جو اباحت کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔

مال لینا فقراء کا احسان ہے : فقراء اور مساکین تمہارا مال صدقہ' زکوٰۃ' اور خیرات کی صورت میں لیتے ہیں' اس لئے کہ اسطرح وہ تمہارے باطن سے بخل اور حب دنیا کا خبث دور کرتے ہیں' یہ خبث تمہارے لئے مہلک ہے۔ مسکین کی مثال حجام کی سی ہے' جو تمہارے جسم سے خون نکالتا ہے تاکہ خون نکلنے کے ساتھ ہی وہ بیماری بھی باہر آجائے جو تمہارے باطن میں پوشیدہ ہے اور تمہیں ہلاک کرنے کے درپے ہے' حجام تمہارا خادم ہے' تم اس کے خادم نہیں ہو' بالفرض اگر خون نکالنے سے حجام کا کوئی مقصد ہو' کرتا مثلاً خون میں کپڑے رنگنا وغیرہ تب بھی وہ تمہارے خادموں کی فہرست سے نہ نکلتا' پھر یہ مسکین تمہارا خادم کیوں نہ ہو گا جو تمہیں باطنی امراض سے نجات دیتا ہے' اگرچہ وہ تمہارے اموال سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ کیونکہ صدقات باطن کو پاک کرنے والے اور اسکی نجاستیں دور کرنے والے ہیں اسی لئے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقات استعمال نہیں فرمائے' اور اپنے اہل بیت کو بھی ان سے بچنے کی تاکید فرمائی اور انھیں لوگوں کے اموال کا میل قرار دیا (مسلم۔ عبدالمطلب ابن ربیعہ) اسی بنا پر حجامت کی مزدوری لینے سے بھی منع فرمایا۔ اس پوری تقریر کا حاصل یہ ہے کہ اعمال قلب کے احوال پر اثر انداز ہوتے ہیں' جیسا کہ اس کتاب کی تیسری جلد میں بیان کیا گیا' پھر قلب پر اعمال کے جتنے اثرات ہوتے ہیں اتنا ہی وہ ہدایت قبول کرنے' اور معرفت کا نور جذب کرنے کی صلاحیت حاصل کرتا ہے' اعمال' احوال اور معارف کے فضائل کے سلسلے میں یہ ایک اصولی اور کلی قاعدہ ہے' کسی عمل یا حال یا معرفت کی فضیلت معلوم کرنے کے لئے اسی قاعدے کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ اب ہم پھر اپنے اصل موضوع صبر و شکر کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

صبر و شکر میں تینوں مقامات کا وجود اور باہمی تقابل : ان دونوں میں سے ہر ایک میں معرفت' حال اور عمل موجود ہے' اور یہ بات کسی بھی طرح صحیح نہیں ہوگی کہ ایک کی معرفت کا دوسرے کے حال یا عمل سے موازنہ کیا جائے' بلکہ نظیر کا نظیر سے مقابلہ ہونا چاہیے' تاکہ تناسب نمایاں ہو' اور تناسب کے بعد ایک کی دوسرے پر فضیلت واضح ہو۔

اب اگر صابر کی معرفت کا تقابل شاکر کی معرفت سے کیا جائے تو نتیجہ ایک ہی نکلتا ہے' مثلاً آنکھ کے سلسلے میں شاکر کی معرفت یہ ہے کہ اس نعمت کا منبع اللہ تعالیٰ کو جانے' اور صابر کی معرفت یہ ہے کہ اس نعمت کا مرجع اسی ذات کو قرار دے۔ اس طرح دونوں معرفتیں ایک دوسرے کے لئے لازم اور مساوی ہوں گی۔ لیکن یہ اس صورت میں ہے جب کہ صبر کو بلا اور مصیبت میں لیا جائے۔ بعض اوقات صبر طاعات پر بھی ہوتا ہے' اور کبھی معصیت سے صبر ہوتا ہے' ایسے مواقع پر صبر اور شکر دونوں ایک ہوتے ہیں' کیونکہ اطاعت پر صبر کرنا عین شکر اطاعت ہے' ان کے اتحاد کی وجہ یہ ہے کہ شکر کے معنی ہیں اللہ تعالیٰ کی نعمت کو اس حکمت میں صرف کرنا جو اس سے مقصود ہے' اور صبر کے معنی یہ ہیں کہ باعث ہوئی کے مقابلے میں باعث دینی ثابت قدم رہے' اس معنی میں صبر اور شکر دونوں ایک ہی مسمّی کے دو نام اور ایک ہی معنی کی دو تعبیریں ہیں صرف اعتبار اور الفاظ کا اختلاف ہے۔ باعث ہوی کے مقابلے میں باعث دینی کا ثبات صبر ہے اگر نسبت باعث کی طرف ہو' اور شکر ہے اگر نسبت باعث دینی کی طرف ہو' باعث دین ایک حکمت کے لئے تخلیق کیا گیا ہے' اور وہ ایک حکمت یہ ہے کہ اسکے ذریعے باعث شہوت کو شکست دی جائے' شکر کی صورت میں تو یہ حکمت حاصل ہوتی ہے' صبر کی صورت میں بھی یہ حکمت اپنے مقصود کو پہنچ جاتی ہے جب کہ باعث ہوی کے مقابلے میں باعث دینی باقی رہ جائے۔ اس طرح گویا دونوں کا مدلول ایک ہوا۔ اس لئے دونوں کی معرفتوں میں کمی زیادتی کا سوال بیکار ہے۔

صبر کے تین مقامات : جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے کہ صبر اطاعت میں بھی ہوتا ہے' اور معصیت سے بھی' اور مصیبت پر بھی۔ اطاعت اور معصیت کا حکم معلوم ہو چکا ہے کہ ان دونوں میں صبر و شکر کا مقصود ایک ہے۔ اس لئے یہ دونوں ایک ہی مسمی کے دو اسم

ہیں' اور اس اعتبار سے دونوں کی معرفت مساوی ہے' اب مصیبت کا حکم ملاحظہ کیجئے۔

مصیبت فقدان نعمت کا نام ہے' اور نعمت یا تو ضروری ہوتی ہے جیسے آنکھیں' یا محل حاجت میں ہوتی ہے' یعنی اسکی ضرورت پڑتی ہے' جیسے قدر کفایت سے مال کا زیادہ ہونا۔ آنکھوں کے سلسلے میں مصیبت یہ ہے کہ ان کی بینائی سلب ہو جائے اس صورت میں نابینا کو صبر کرنا چاہیے' اور اسکا صبر یہ ہے کہ اس مصیبت پر شکوہ نہ کرے' بلکہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے کو خوشی سے تسلیم کرے اور یہ نہ سمجھے کہ مجھے اس مصیبت کی وجہ سے بعض معاصی میں چھوٹ مل گئی ہے۔ بینا اس نعمت پر عمل کے ذریعے دو طرح سے شکر ادا کرتا ہے' ایک تو یہ کہ ان کے ذریعے معصیت پر مدد نہ لے' اور دوسرے یہ کہ انھیں اطاعت میں استعمال کرے' اور ان دونوں امور میں سے ایک بھی صبر سے خالی نہیں ہے' نابینا آدمی اچھی صورتیں دیکھنے سے صبر کرتا ہے کیونکہ وہ انھیں دیکھ نہیں پاتا' اور بینا آدمی اس وقت صبر کرتا ہے جب اسکی نگاہ حسین چہرے پر پڑ جاتی ہے' اور وہ دوبارہ دیکھنے سے گریز کرتا ہے تاکہ معصیت نہ ہو' اس طرح گویا وہ اس نعمت کا شکر بھی ادا کرتا ہے جو آنکھوں کی صورت میں اسے عطا کی گئی ہے۔ اگر وہ دوبارہ دیکھے گا تو اس نعمت کا کافر ہوگا۔ کیونکہ دوبارہ دیکھنا معصیت ہے' اس سے معلوم ہوا کہ صبر میں شکر داخل ہے' اسی طرح آنکھوں کو اطاعت میں استعمال کرنا بھی صبر سے خالی نہیں ہے' کیونکہ اطاعت میں مشقت ہے' اور اسے بجالانا صبر ہی سے ممکن ہے' بعض اوقات آدمی آنکھوں کا شکر ادا کرتا ہے کہ دنیا میں اللہ تعالیٰ نے اپنی صنعت و قدرت کے جو عجائبات بکھیرے ہیں انھیں دیکھتا ہے' اور ان سے خالق کائنات کی معرفت حاصل کرتا ہے' یہ شکر صبر سے افضل ہے۔ اگر اس صورت میں شکر افضل نہ ہو تو حضرت شعیب علیہ السلام کا مرتبہ حضرت موسیٰ اور دوسرے انبیائے کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام سے بڑھا ہوا ہونا چاہیے' کیونکہ وہ نابینا تھے' اور حضرت موسیٰ علیہ السلام بینا تھے' انھوں نے بینائی سے محرومی پر صبر کیا' اور دوسرے حضرات انبیاء نے نہیں کیا' بلکہ اس سے تو یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ آدمی کو درجۂ کمال اسی وقت حاصل ہوتا ہے جب اسکے تمام اعضاء ضائع ہو جائیں' اور وہ گوشت کے ایک لوتھڑے کی شکل اختیار کرلے۔ حالانکہ یہ ایک خلاف عقل امر ہے' آدمی کے تمام اعضاء دین کے آلات ہیں' جب کوئی عضو بیکار ہوتا ہے تو دین کا ایک آلہ بیکار ہوتا ہے' اور وہ رکن متاثر ہوتا ہے جس پر اس آلے سے مدد لی جاتی ہے' جب کہ ہر عضو کا شکر یہ ہے کہ جس مقصد کے لئے وہ پیدا کیا گیا ہے اس میں اسے استعمال کیا جائے' یہ استعمال بھی صبر کے بغیر نہیں ہوگا۔

اور جو چیز محلّ حاجت میں واقع ہوتی ہے جیسے قدر کفایت سے مال کا زیادہ ہونا اس کا حال یہ ہے کہ اگر آدمی کو صرف اسی قدر مال ملا جتنا اسکے لئے ضروری تھا اور اسے زائد مال کی حاجت بھی ہے تو اس سے صبر کرنا مجاہدہ ہے' اور یہ فقراء کا جہاد ہے' اور زیادہ مال کا ملنا نعمت ہے اور اسکا شکر یہ ہے کہ اس مال کو خیر کے کاموں میں صرف کیا جائے اور معصیت میں استعمال نہ کیا جائے' اگر صبر کو اس شکر کے مقابلے میں رکھ کر دیکھا جائے جس سے مقصود مال کا خیر کے کاموں میں صرف کرنا ہے تو شکر افضل ہے' کیونکہ ایسے شکر میں صبر بھی پایا جاتا ہے' اس لئے کہ اسکے معنی یہ ہیں کہ آدمی اللہ تعالیٰ کی نعمت پر خوش ہوا اور اس نے اپنا مال فقراء پر صرف کرنے کی تکلیف گوارا کی' اور اسے مباح عیش میں خرچ نہیں کیا' حالانکہ وہ ایسا کر سکتا تھا۔ اس طرح اس عمل میں صبر بھی موجود ہے کہ آدمی دوسرے کو مال دینے کی تکلیف اٹھاتا ہے' اور شکر بھی ہے کہ مال جس حکمت کے لئے وضع کیا گیا ہے وہ اسے اسی میں استعمال کرتا ہے' لیکن اس عمل میں شکر کل ہے اور صبر جزو ہے' اور یہ ایک اصولی بات ہے کہ کل اپنے جزو کا مقابلہ صحیح نہ ہوگا' ہاں اگر شکر کی صورت یہ ہو کہ اس مال سے معصیت پر مدد نہ لے' بلکہ جائز عیش میں صرف کرے تو یہاں صبر شکر سے افضل ہوگا' اور صابر فقیر کو مال روکنے والے اور اسی مباحات میں خرچ کرنے والے پر فضیلت حاصل ہوگی' لیکن اس مالدار پر فضیلت نہ ہوگی جو اپنا مال خیرات میں صرف کرتا ہے اس لئے کہ فقیر نے اپنے نفس پر مجاہدہ کیا' اسکی ہوس کا بت توڑا' اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہونے والی آزمائش میں ثابت قدم رہا۔ نفس پر مجاہدہ کرنا ایک زبردست قوت کا طالب ہے' جبکہ غنی اپنی حرص کا اتباع کرتا ہے اور شہوات کے راستے پر چلتا ہے' تاہم وہ مباحات پر اکتفا کرتا ہے' اور حرام سے بچتا ہے' اگرچہ حرام سے بچنے میں بھی صبر کی قوت ضروری ہے' مگر فقیر کے صبر کے

لئے جس قوت کی ضرورت ہوتی ہے وہ اس قوت سے کہیں زیادہ اعلا ہے جس کی ضرورت مالدار کو حرام امور کے ارتکاب سے بچنے کے لئے پڑتی ہے۔ اصل میں شرف اور فضیلت اسی قوت کو حاصل ہے جس پر عمل دلالت کرتا ہے' اس لئے کہ اعمال صرف اسی لئے مطلوب ہوتے ہیں کہ ان سے قلب کے احوال حاصل ہوں' یہ قوت بھی فقیر کے قلب کی ایک حالت ہے جس قدر ایمان اور یقین میں قوت اور پختگی ہوگی اسی قدر اس میں بھی ہوگی' اس لئے جو چیز ایمان کی قوت پر دلالت کرے وہ دوسری چیزوں سے افضل ہوگی۔

صبر پر شکر کی فضیلت: بعض آیات اور روایات میں صبر کو شکر سے افضل قرار دیا گیا ہے' ان میں یہی خاص مرتبہ مراد ہے۔ اس لئے کہ جب لفظ نعمت کانوں میں پڑتا ہے تو ذہن اس امر کی طرف سبقت کرتا ہے کہ نعمت سے مراد مال اور اس سے نفع اٹھانا ہے' اور شکر کا یہ مفہوم سمجھا جاتا ہے کہ آدمی نعمت پاکر زبان سے الحمد للہ کہے اور اس سے معصیت پر مدد نہ لے' شکر کا یہ مطلب کوئی نہیں سمجھتا کہ اللہ کی نعمتوں کو اطاعات میں استعمال کرے۔ اس اعتبار سے صبر شکر سے افضل ہے۔ یعنی وہ صبر جسے عوام سمجھتے ہیں اس شکر سے افضل ہے جو عوام کے نزدیک شکر ہے' اور اسی مخصوص معنی کی طرف حضرت جنید بغدادیؒ نے اشارہ کیا ہے۔ ایک مرتبہ ان سے دریافت کیا گیا کہ صبر اور شکر میں افضل کیا ہے' انھوں نے فرمایا کہ نہ مالدار اس لئے قابل تعریف ہے کہ اس کے پاس مال ہے' اور مفلس اس لئے قابل تعریف ہے کہ وہ مال سے محروم ہے' بلکہ دونوں اس صورت میں قابل تعریف ہوتے ہیں جب وہ اپنی مفلسی اور مالداری کی شرائط پوری کریں۔ تاہم مالداری کی شرائط نفس کے مناسب ہیں اور ان سے نفس لطف اور لذت حاصل کرتا ہے' جب کہ فقر کی شرائط نفس کو ایذا دیتی ہیں' اور اسے پریشان رکھتی ہیں۔ صابر و شاکر دونوں ہی اپنی اپنی شرائط پر عمل کرتے ہیں' اور اللہ کے لئے صبر و شکر کرتے ہیں' اس لئے قدرتی طور پر وہ شخص جو اپنے نفس کو مشقت میں ڈالتا ہے اور مضطرب رکھتا ہے اس شخص سے افضل ہے جو اسے عیش اور فارغ البالی میں رکھتا ہے' حقیقت بھی یہی ہے جو حضرت جنید نے بیان فرمائی' لیکن اسکا اطلاق صبر کی قسموں میں سے تیسری قسم پر ہوتا ہے اور یہ قسم ہم نے ابھی بیان کی ہے حضرت جنید بھی نے صبر کی یہی قسم مراد لی ہے' کہا جاتا ہے کہ ابو العباس ابن عطاء اس معاملے میں حضرت جنید کے خلاف تھے' اور کہا کرتے تھے کہ مالدار شاکر صابر فقیر سے افضل ہے' ان کے خلاف حضرت جنید نے بددعا کی' اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ زبردست تباہی کا شکار ہوئے' سارا مال ضائع ہو گیا' اولاد قتل ہوئی' اور چودہ برس تک عقل و خرد سے بیگانہ بنے پھرتے رہے' جب صحیح حالات میں آئے تو کہا کرتے تھے کہ مجھے جنید کی بددعا نے تباہ کر دیا' پھر اپنے قول سے باز آئے اور فقیر صابر کو مالدار شاکر پر ترجیح دینے لگے۔

اگر ان امور پر غور کیا جائے جو ہم نے بیان کئے ہیں تو یہ بات واضح ہو جائے گی کہ صابر و شاکر کی فضیلت میں وارد یہ دونوں اختلافی اقوال اپنی جگہ صحیح ہو سکتے ہیں' اس لئے کہ جس طرح بہت سے صابر فقیر شاکر مالدار سے افضل ہوتے ہیں اسی طرح بہت سے مالدار شاکر فقیر صابر سے بھی افضل ہوتے ہیں' یہ وہ مالدار ہیں جو اپنے آپ کو فقیر تصور کرتے ہیں' اور اپنے لئے قدر ضرورت سے زائد مال بچا کر نہیں رکھتے' باقی مال خیر کے کاموں میں خرچ کر دیتے ہیں' اگر کچھ مال بچا کر رکھتے بھی ہیں تو یہ سمجھتے ہیں کہ ہم مفلسوں اور محتاجوں کے خازن ہیں' وہ صرف ایسے موقع کے منتظر رہتے ہیں جس میں مال خرچ کر سکیں' پھر اگر خرچ بھی کرتے ہیں تو صرف اللہ کے لئے خرچ کرتے ہیں' طلب جاہ' اور طلب شہرت کے لئے خرچ نہیں کرتے' اور نہ اس لئے خرچ کرتے ہیں کہ فقراء کو زیر بار احسان کر سکیں' بلکہ اللہ تعالیٰ کا حق ادا کرنے کے لئے ضرورت مند بندگان خدا کی جستجو کرتے ہیں۔ ایسے مالدار یقیناً صابر فقراء سے افضل ہیں۔

اب اگر تم یہ کہو کہ مال خرچ کرنا مالدار کے نفس پر اتنا شاق نہیں گزرتا جتنا دشوار فقیر کے لئے صبر کرنا ہوتا ہے اس لئے کہ مالدار کو قدرت کی لذت حاصل رہتی ہے' جب کہ فقیر کے حصے میں صرف صبر کی تکلیف آتی ہے' مالدار کو اگرچہ مال سے جدائی کی تکلیف پہنچتی ہے' لیکن اس تکلیف کا تدارک اس وقت ہو جاتا ہے جب وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ اسے خرچ کرنے پر قدرت میسر ہے۔ اسکا جواب یہ ہے کہ ہمارے خیال میں صرف وہ مالدار افضل ہے جو برضا و رغبت اور بطیب خاطر مال خرچ کرے' اس کے نفس کو مال

خرچ کرنے میں تکلیف نہ ہو' جو شخص بخیل ہو' اور نفس سے بتکلف مال جدا کرتا ہو ایسا شخص کم زیادہ اچھا نہیں ہے۔ اسکی تفصیل ہم کتاب التوبہ میں بیان کرچکے ہیں' اصل میں نفس کو تکلیف پہنچانا مقصود نہیں ہے۔ ایسا صرف تادیب اور تربیت کے ضمن میں ہوتا ہے' اس کی مثال ایسی ہے جیسے شکاری کتے کو اولا" تربیت دی جاتی ہے' اور اس مقصد کے لئے اسے مارا بھی جاتا ہے۔ اس کے مقابلے میں ایک تربیت یافتہ کتا ہے جو اپنے مالک کی مار نہیں سہتا اور اسکے چشم و ابرو کے اشاروں کی اتباع کرتا ہے' تم ان دونوں کتوں میں سے کس کتے کو ترجیح دوگے' ظاہر ہے دوسرے کتے کو ترجیح دی جائے گی' کیونکہ وہ پہلے کتے کے مقابلے میں مکمل ہے' اگرچہ پہلا کتا ضرب کی اذیت برداشت کرتا ہے' اور اس پر صبر کی تکلیف سہتا ہے۔ اسی لئے اولاً تکلیف پہنچانے اور مجاہدہ کرنے کی ضرورت ہوتی ہے' بعد میں ان چیزوں کی ضرورت نہیں رہتی' بلکہ ابتدا میں جو مشقت اور مجاہدہ نفس کو ناگوار گزرتا ہے انتہا میں اسی مجاہدے میں لذت ملنے لگتی ہے' جیسا کہ پڑھنا عقلمند بچے کا محبوب مشغلہ ہوجاتا ہے' جب کہ شروع میں اس تعلیم سے زیادہ اذیت ناک مشغلہ اس کے لئے کوئی دوسرا نہیں ہوتا۔ مگر کیونکہ عام طور پر لوگوں کی حالت ابتدا میں بچوں کے مشابہ ہوتی ہے' اس لئے حضرت جنیدؒ نے مطلقاً فرمادیا کہ جو وصف نفس کو تکلیف پہنچائے وہ افضل ہے' عوام کے حق میں حضرت جنیدؒ کا یہ ارشاد اپنی جگہ نہایت درست ہے' اگر کسی شخص کو صبرو شکر میں افضلیت کے سوال کا تفصیلی جواب دینا منظور نہ ہو اور عوام الناس کو سامنے رکھ کر جواب دینا ہو تو یہی کہنا چاہیے کہ صبر شکر سے افضل ہے' اس لئے صبرو شکر کے جو معنی عوام کے ذہنوں میں راسخ ہیں ان کی رو سے یہ جواب صحیح ہے' لیکن اگر تحقیق منظور ہو تو یہ جواب کافی نہ ہوگا بلکہ اس میں کسی قدر تفصیل ہوگی۔

صبرو شکر کے درجات: مطلق اور تفصیلی جواب میں فرق کی وجہ یہ ہے کہ صبر کے بہت سے درجات ہیں' جن میں سب سے پہلا درجہ یہ ہے کہ مصیبت کو برا سمجھے اور اس پر شکوہ نہ کرے' صبر کے ادنیٰ و اعلیٰ تمام درجات کے بعد رضا کا مقام ہے' رضا کے بعد مصیبت پر شکر کا درجہ ہے' اس کی وجہ یہ ہے کہ صبر میں تکلیف کا احساس رہتا ہے' رضا میں یہ ممکن ہے کہ نہ تکلیف ہو اور نہ خوشی' جب کہ شکر خوشی سے خالی نہیں ہوسکتا' جس طرح صبر کے بہت سے درجات ہیں اسی طرح شکر کے بھی بے شمار درجات ہیں' ہم نے اس کا اعلا درجہ بیان کیا ہے۔ بہت سے درجات ایسے ہیں جو اس درجہ کی بہ نسبت کم تر ہیں' لیکن ہم نے انھیں بیان نہیں کیا' جیسے اپنے اوپر اللہ تعالیٰ کی مسلسل نعمتوں سے شرمانا' اور یہ سمجھنا کہ میں ان نعمتوں کا شکر ادا کرنے سے عاجز ہوں' اور کم شکری پر عذر کرنا' اور اللہ تعالیٰ کی حلم اور اسکی صفت ستاریت کی معرفت حاصل کرنا' اس حقیقت کا اعتراف کرنا کہ تمام نعمتیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بلا استحقاق حاصل ہوتی ہیں' یہ جاننا کہ اللہ کا شکر ادا کرنا بھی اسی کی ایک نعمت ہے' نعمتوں سے متواضع اور منکسر رہنا' یہ تمام امور شکر ہیں' اور درجات ہیں ایک دوسرے سے مختلف ہیں' جس شخص کے واسطے سے نعمتیں ملتی ہیں اس کا شکر گزار ہونا' بھی ایک نعمت ہے' جیسا کہ حدیث شریف میں ہے۔

مَنْ لَمْ يَشْكُرِ النَّاسَ لَمْ يَشْكُرِ اللّٰهَ (۱)

جو شخص لوگوں کا شکر ادا نہیں کرتا وہ اللہ تعالیٰ کا شکر بھی ادا نہیں کرے گا۔

اسی طرح اعتراض کم کرنا' منعم کے ساتھ حسن ادب سے پیش آنا' نعمتیں' اچھی طرح قبول کرنا' اور چھوٹی سی نعمت کو بڑی سمجھنا وغیرہ سب شکر ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ جتنے اعمال و احوال صبر اور شکر میں داخل ہیں وہ بے شمار ہیں' اور ہر ایک کا الگ الگ درجہ ہے' اس صورت میں ایک کو دوسرے پر کس طرح ترجیح دی جاسکتی ہے' الا یہ کہ عام لفظ سے خاص صبر اور شکر مراد نہ لیا جائے' جیسا کہ اخبار و روایات میں وارد ہے۔

ایک بوڑھے کا قصہ: ایک بزرگ بیان کرتے ہیں کہ میں نے سفر میں ایک نہایت عمر رسیدہ اور ضعیف و ناتواں بوڑھے کو

(۱) یہ حدیث کتاب الزکوٰۃ میں گزر چکی ہے

دیکھا اور اس سے اس کا حال دریافت کیا' بوڑھے نے کہا کہ میں نوجوانی کے زمانے میں اپنے چچا کی بیٹی پر عاشق تھا اور وہ بھی مجھ سے اسی طرح محبت کرتی تھی' آخر کو ہم دونوں کی شادی ہو گئی' پہلی رات میں جب ہم دونوں ملے تو میں نے اس سے کہا کہ آؤ ہم اس نعمت پر اللہ کا شکر بجالائیں اور نوافل پڑھیں' چنانچہ اس رات ہم دونوں نے بے شمار نوافل پڑھے اور اسی طرح صبح کردی' اگلے روز بھی ہم دونوں نے نماز شکر پڑھی' اسی طرح ستر یا اسی برس گزر چکے ہیں ہم دونوں ہر رات اپنی یکجائی پر اللہ کا شکر ادا کرنے کے لئے صبح تک نمازیں پڑھتے ہیں۔ راوی کہتے ہیں کہ میں نے اس کی بیوی سے اس واقعے کی حقیقت دریافت کی' بوڑھیا نے کہا حقیقت میں یہی بات ہے جو اسکے شوہر نے کہی ہے۔ فرض کیجئے کہ اگر اللہ تعالیٰ ان دونوں کو نہ ملاتا اور انہیں جدائی کی تکلیف پر صبر کرنا پڑتا تو کیا ان کا صبر اس درجے کا ہوتا جس درجے کا ان کا شکر تھا جو انھوں نے اپنے وصال پر کیا' ظاہر ہے شکر کا یہ درجہ نہایت اعلا ہے اور صبر سے افضل ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مشکل حقائق تفصیل کے بغیر سمجھ میں نہیں آتے۔

کتاب الخوف والرجاء

خوف اور رجاء کا بیان

جاننا چاہیے کہ خوف اور رجاء دونوں ایسے بازو ہیں جن کی مدد سے مقربان خدا اعلا مقامات تک پرواز کرتے ہیں یا ایسی دو سواریاں ہیں جن پر سوار ہو کر آخرت کے پُر خطر راستے طے کئے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے قرب کی منزل' اور جنات نعیم کا ٹھکانہ نہایت دوری پر واقع ہے' ان کے راستے خطرات سے پُر ہیں' اپنے چلنے والوں کو تھکا دینے والے ہیں' اور اعضاء و جوارح کو مشقت میں ڈالنے والے ہیں' اس منزل اور ٹھکانے تک پہنچنے کے لئے رجاء کی سواری ناگزیر ہے' اسی طرح دوزخ کی خوفناک آگ اور الم ناک عذاب سے بچنا بھی خوف کے بغیر ممکن نہیں' اس لئے ان دونوں کی حقیقت' ان کے فضائل اور ان دونوں میں تضاد اور اختلاف کے بعد جمع کی صورت بیان کرنا نہایت ضروری ہے' اس لئے ہم اس کتاب کو دو ابواب میں تقسیم کرتے ہیں' پہلے باب میں رجاء کا حال بیان کریں گے' اور دوسرے باب میں خوف کا حال لکھیں گے۔

پہلا باب

رجاء کی حقیقت' فضائل' دوائے رجا' اور طریقۂ حصول

رجاء کی حقیقت: جاننا چاہیے کہ رجاء سالکین کے مقامات میں سے ایک مقام اور طالبین کے احوال میں سے ایک حال ہے' اگر کسی شخص کا کوئی وصف قائم اور باقی رہ جائے تو اسے مقام کہتے ہیں' اور اگر وصف عارضی اور جلد زائل ہونے والا ہو تو اسے حال کہا جاتا ہے۔ جس طرح زردی کئی طرح کی ہوتی ہے ایک سونے کی زردی ہے یہ باقی رہنے والی ہے' دوسری زردی جلد زائل ہو جانے والی ہے جیسے خوف کی زردی' اور ایک زردی ان دونوں کی درمیان ہے جیسے مریض کے جسم کی زردی' اسی طرح قلب کی صفات میں بھی یہ تقسیم ہے' جو وصف غیر ثابت ہو اسے حال کہتے ہیں' اس لئے کہ یہ وصف جلد متغیر ہو جاتا ہے' اور یہ صورت تمام اوصاف قلبیہ میں پیش آتی ہے' یہاں ہمارا مقصد رجاء کی حقیقت بیان کرنا ہے' رجاء اگرچہ حال' علم' اور عمل تینوں سے تکمیل پاتا ہے' یعنی علم حال کا باعث ہوتا ہے اور حال عمل کا سبب بنتا ہے مگر بحیثیت مجموعی رجاء صرف حال کا نام ہے' اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جس چیز کو تم مکروہ یا محبوب سمجھتے ہو' وہ تین حال سے خالی ہے یا تو حال میں موجود ہو گی' یا ماضی میں اسکا وجود رہ چکا ہو گا' یا مستقبل میں اس کا انتظار ہو گا' اگر تمہارے دل میں کسی ایسے وجود کا خیال آئے جو ماضی میں واقع ہو چکی ہے اسے ذکر و تذکر کرتے ہیں' اور اگر وہ چیز جو تمہارے دل میں آئی ہے فی الحال موجود ہے تو اسے وجد ذوق اور ادراک کہتے ہیں۔ اسے وجد اس لئے کہتے ہیں کہ یہ ایک ایسی حالت ہے جسے تم اپنے نفس میں موجود پاتے ہو اور اگر تمہارے دل میں کسی شئے کا خیال آئے جس کا وجود مستقبل میں متوقع ہے' اور

وہ شئے تمہارے دل پر غالب آجائے اسے توقع اور انتظار کہتے ہیں اگر وہ چیز جس کا تمہیں انتظار ہے مکروہ ہو اور اس کے خیال سے دل کو تکلیف ہو تو اسے خوف کہتے ہیں' اور اگر وہ چیز محبوب ہو' اور تمہیں اسکے انتظار سے خوشی اور لذت حاصل ہو تو اسے رجاء کہا جاتا ہے۔ معلوم ہوا کہ رجاء اس چیز کے انتظار سے خوش ہونے کا نام ہے جو تمہیں محبوب ہے۔ لیکن اگر تمہیں کسی محبوب شئے کا انتظار ہے اور تم اسکے ملنے کے خیال سے خوش ہوتے ہو تو یقیناً تمہارے پاس ایسے وسائل ہوں گے جن کے ذریعے تم اپنے محبوب تک پہنچ سکتے ہو' اگر ایسا ہے تو یہ رجاء ہے' اور اگر تمہارے پاس کوئی ایسا وسیلہ نہیں' اور خواہ مخواہ محبوب کے وصال کی آس لگائے بیٹھے ہو تو یہ فریب خوردگی اور بے وقوفی ہے' اور اگر وسائل کا وجود اور عدم وجود معلوم نہ ہو تو ایسے انتظار کو تمنی کہتے ہیں' کیونکہ اس میں بلا سبب انتظار پایا جاتا ہے۔

رجاء کا اطلاق کہاں ہوگا: رجاء اور خوف کا اطلاق ان اشیاء پر ہوگا جن کا وجود یقینی نہ ہو' بلکہ مشتبہ ہو' اور جن چیزوں کا وجود یقینی ہو ان پر رجاء کا اطلاق صحیح نہیں ہے' مثلاً طلوع آفتاب کے لئے یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ مجھے آفتاب طلوع ہونے کی امید ہے' کیونکہ طلوع اور غروب دونوں کا وجود یقینی ہے' البتہ یہ کہنا صحیح ہے کہ بارش ہونے کی رجاء ہے یا خشک سالی کا خوف ہے۔

ارباب قلوب پر یہ حقیقت منکشف ہے کہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے' اور قلب کی مثال ایسی ہے جیسے زمین' اور ایمان ایسا ہے جیسے زمین کے لئے بیج' طاعات کی مثال ایسی ہے جیسے زمین میں ہل چلانا' اسکی صفائی کرنا' نہریں کھودنا' اور ان سے کھیتی کی آبیاری کرنا' جو دل دنیا میں غرق' اور اس کی لذت میں منہمک ہو اس کی مثال ایسی ہے جیسے بنجر زمین جس میں کوئی بیج نہیں جمتا' آخرت کا دن کھیتی کاٹنے کا دن ہے اس لئے تم اس دن وہی کاٹو گے جو دنیا کی زندگی میں بوؤ گے آخرت کی کھیتی ایمان کے بیج کے بغیر ممکن نہیں' اور ایمان قلب کے خبث اور سوء اخلاق کی موجودگی میں کم ہی نفع پہنچاتا ہے' جس طرح بنجر زمین میں کوئی بیج نہیں جمتا' خواہ اسکی کتنی ہی آبیاری کیوں نہ کی جائے۔ اس لئے اگر کسی بندے کو مغفرت کی رجاء ہے تو اسے اپنی رجاء کو کاشتکار کی رجاء پر قیاس کرنا چاہیے۔ چنانچہ جو کاشتکار اچھی زمین منتخب کرتا ہے اور اس میں عمدہ بیج ڈالتا ہے اور وہ تمام طریقے اختیار کرتا ہے جن سے بیج پودوں کی صورت میں زمین کے نیچے سے ابھریں' اور انکی نشوونما ہو' یعنی وقت پر پانی دیتا ہے' خود رو گھاس صاف کرتا ہے' اور وہ تمام رکاوٹیں دور کرتا ہے جن سے پودوں کی بڑھوتری متاثر ہو یا کھیتی میں بگاڑ پیدا ہو جائے' اسکے بعد اللہ تعالیٰ سے یہ آس لگا کر بیٹھ جائے کہ وہ آسمانی اور زمینی آفات سے اسکی کھیتی کو محفوظ رکھے گا' اس انتظار اور توقع کو رجاء کہتے ہیں' اور اگر کسی شخص نے سخت پتھریلی زمین میں بیج ڈالے' جو بلندی پر واقع تھی' اور جہاں پانی پہنچنے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا' پھر اس کی نگہداشت نہیں کی' بلکہ کھیتی کٹنے کے انتظار میں بیٹھ گیا' یہ انتظار نہیں حماقت اور غرور ہے' رجاء نہیں ہے' اسی طرح اگر کسی نے اچھی زمین میں بیج ڈالے' لیکن اس کے بعد تمام مراحل سے غفلت برتی' پانی نہیں دیا' بلکہ آسمان سے پانی برسنے کا انتظار رہا' اور ایسے موسم میں' یا ایسے مقامات پر بارش کی آس لگائے بیٹھا رہا جہاں بارش نہیں ہوتی' یا ہوتی تو ہے لیکن وہ اتنی نہیں ہوتی کہ کھیتی کی تمام ضرورتیں پوری کرسکے۔ اس انتظار کو تمنی کہتے ہیں' رجاء نہیں کہتے۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ رجاء کا اطلاق صرف اس محبوب کے انتظار پر ہوتا ہے جس کے لئے وہ تمام اسباب مہیا ہوں جو بندے کے دائرہ اختیار میں ہیں' اور صرف وہ اسباب باقی رہ گئے ہوں جو بندے کے اختیار سے خارج ہیں' اور وہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے' جو اگر شامل حال ہو تو تمام موانع اور مفسدات دور رہیں۔ یہی حال بندہ مومن کا ہے' اگر وہ دل کی زمین پر ایمان کا بیج ڈالے اور اسے عبادات کا پانی دے' بد خلقی کے کانٹوں سے بچائے اور اللہ تعالیٰ کے فضل سے یہ توقع رکھے کہ اس کا ایمان موت تک باقی رہے گا' اور اسکے دل کی کھیتی اچھی طرح پک جائے گی تاکہ قیامت کے دن کاٹی جاسکے' اگر ایسا ہے تو اس کا انتظار صحیح معنوں میں رجاء ہے' اور عمدہ وصف ہے' یہ رجاء اسے ایمان کو باقی رکھنے اور اسے نشوونما دینے کے تمام اسباب پر مسلسل عمل کرنے کا پابند بنائے گی' تاکہ معرفت کے وقت مغفرت یقینی ہو' اور اگر کسی نے زمین دل میں بیج تو ڈال دئے' لیکن اسکے بعد کوئی خبر نہیں لی کہ وہ پانی نہ ملنے کے

باعث خشک ہو گئے ہیں' یا بارش کی زیادتی کے سبب گل گئے ہیں' یا اخلاق فاسدہ کے کانٹوں اور خود رو پودوں نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا ہے' یا دنیوی لذات کے کیڑوں نے حملہ کردیا ہے اور ان تمام غفلتوں اور کوتاہیوں کے باوجود مغفرت کا منتظر اور متوقع ہو تو یہ انتظار اور توقع حماقت اور غرور ہے' چنانچہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

الْاَحْمَقُ مَنْ اَتْبَعَ نَفْسَهُ هَوَاهَا وَتَمَنّٰى عَلَى اللّٰهِ (۱)

احمق وہ شخص ہے جو اپنے نفس کو اپنی خواہشات کے تابع بنادے اور اللہ پر تمنا کرے۔

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے :۔

فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوَاتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا
(پ۱۶ ر۷ آیت ۵۹)

پھر ان کے بعد ایسے ناخلف پیدا ہوئے جنھوں نے نماز برباد کی' اور نفسانی خواہشوں کی اتباع کی' سو یہ لوگ عنقریب خرابی دیکھیں گے۔

فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَرِثُوا الْكِتَابَ يَاْخُذُوْنَ عَرَضَ هٰذَا الْاَدْنٰى وَيَقُوْلُوْنَ سَيُغْفَرُ لَنَا (پ۹ ر۱۱ آیت ۱۶۹)

پھر ان کے بعد ایسے لوگ جانشین ہوئے جو کتاب کے وارث ہوئے (اور جو) دنیائے دنیا کا مال لے لیتے اور کہتے ہیں کہ ہماری مغفرت ہو جائے گی۔

ایک جگہ باغ والے کی مذمت فرمائی جب اس نے یہ الفاظ کہے :۔

مَا اَظُنُّ اَنْ تَبِيْدَ هٰذِهٖ اَبَدًا وَمَا اَظُنُّ السَّاعَةَ قَائِمَةً وَلَئِنْ رُدِدْتُّ اِلٰى رَبِّيْ لَاَجِدَنَّ خَيْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا (پ۱۵ ر۱۷ آیت ۳۵-۳۶)

میرے خیال میں یہ (باغ) کبھی تباہ نہیں ہوگا' اور نہ میرے خیال میں قیامت آنے والی ہے' اور اگر میں اپنے رب کے پاس پہنچایا گیا تو اس سے اچھی جگہ مجھے ضرور حاصل ہوتی۔

بہر حال وہ بندہ جو طاعات میں کوشش کرتا ہے' اور معاصی سے اجتناب کرتا ہے' اس بات کا مستحق ہے کہ اللہ کے فضل و کرم سے تمام نعمت کی امید کرے' اور تمام نعمت یہ ہے کہ جنت میں داخل ہو' اور وہ گناہ گار جو توبہ کرلیتا ہے' اور جو کچھ قصور اس سے سرزد ہوا اس کا تدارک کرتا ہے' اسے اس بات کا حق ہے کہ وہ اپنی توبہ کی قبولیت کی امید رکھے' اور اگر توبہ سے پہلے گناہ کو برا سمجھتا ہے' نیک اعمال سے خوش ہوتا ہے' اپنے نفس کی مذمت کرتا ہے' اور توبہ کا متمنی ہے تب اسے توفیق توبہ کی امید رکھنی چاہیے' کیونکہ گناہ کو برا سمجھنا' اور توبہ کی خواہش کرنا توبہ تک پہنچانے والے اسباب ہیں' رجاء کا مرحلہ اسباب کی پختگی کے بعد ہے' جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا ہے :۔

اِنَّ الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اُولٰئِكَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ
(پ۲ ر۱۱ آیت ۲۱۸)

حقیقتاً جو لوگ ایمان لائے ہوں اور جن لوگوں نے راہ خدا میں ترک وطن کیا ہو اور جہاد کیا ہو ایسے لوگ (ہی) رحمت خداوندی کے امیدوار ہوا کرتے ہیں۔

اس آیت کے معنی یہ ہیں کہ یہی لوگ رحمت الٰہی کی رجاء کا استحقاق رکھتے ہیں' یہ معنی نہیں کہ رجاء صرف ان ہی لوگوں کے

---

(۱) یہ روایت کئی مرتبہ گزر چکی ہے

ساتھ مخصوص ہے۔ اس لئے کہ ان کے علاوہ بھی لوگ رجاء کرتے ہیں حالانکہ ان میں رجاء کا استحقاق نہیں ہوتا' استحقاق صرف انہی لوگوں کو حاصل ہے۔ لیکن جو شخص از سرتاپا مکروہات میں غرق ہو' اور اپنے نفس کو برا بھی نہ سمجھتا ہو' اور نہ اسکے دل میں توبہ اور اللہ کی طرف واپسی کا عزم ہو ایسا شخص اگر مغفرت کی رجاء کرتا ہے تو یہ ایسا ہے جیسے کوئی نادان بنجر زمین میں بیج بوئے' اور یہ عزم کرے کہ وہ نہ پانی دے گا' اور نہ صفائی وغیرہ کا اہتمام کرے گا۔

حضرت یحیٰ ابن معاذ فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک بدترین فریب خوردگی یہ ہے کہ آدمی عفو کی امید میں ندامت کے بغیر گناہ کئے جائے' اللہ تعالیٰ سے کسی اطاعت کے بغیر قربت کی توقع رکھے' اور آگ کا بیج بو کر جنت پھلوں کا منتظر رہے' اور معاصی کے ذریعے اطاعت گزاروں کا گھر مانگے' بغیر عمل کے جزاء کا طالب ہو' اور ظلم و زیادتی کے باوجود اللہ سے کسی اچھے معاملے کا متمنی ہو۔ بقول شاعر۔

تَرْجُو النَّجَاةَ وَلَمْ تَسْلُكْ مَسَالِكَهَا　　إِنَّ السَّفِينَةَ لَا تَجْرِي عَلَى الْيَبَسِ

(تو نجات کی توقع رکھتا ہے حالانکہ اسکے راستے پر نہیں چلتا' کشتی خشکی پر نہیں چلا کرتی)

رجاء کے بعد جدوجہد: ہم نے رجاء کی حقیقت پر خاصی روشنی ڈالی ہے' اگر اس کا خلاصہ کیا جائے تو یہ حاصل نکلے گا کہ یہ ایک حالت ہے' جو علم کے نتیجے میں اکثر اسباب کے وقوع کے بعد پیدا ہوتی ہے۔ اس حالت کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ جو اسباب باقی رہ گئے ہیں ان کی تکمیل کے لئے ہر ممکن جدوجہد کی جائے کاشت کی مثال میں جو شخص اچھی زمین میں عمدہ بیج بوتا ہے' اور ضرورت کے مطابق پانی دیتا ہے اس کی رجاء صادق ہوگی' اور اسے اس بات پر آمادہ کرے گی کہ وہ زمین کی نگرانی رکھے' جو گھاس اور کانٹے وغیرہ پیدا ہو جائیں انہیں صاف کرے وقتاً" فوقتاً" پانی دیتا رہے' اور کھیتی کٹنے تک کسی بھی وقت غفلت نہ کرے' اس کی وجہ یہ ہیکہ رجاء کی ضد یاس اور ناامیدی ہے' اگر آدمی کسی چیز سے مایوس ہو تو وہ اسکے لئے جدوجہد کرکے اپنے آپ کو مشقت میں نہیں ڈالتا' جدوجہد وہی کرتا ہے جسے ملنے کی امید ہوتی ہے' چنانچہ جو شخص یہ بات جانتا ہے کہ اسکی زمین بنجر ہے اسکے بیج بیکار ہیں' اور پانی کی پہنچ سے باہر ہے تو وہ یقینی طور پر زمین کی نگرانی سے دور رہے گا' رجاء اس لئے محمود ہے کہ وہ عمل پر اکساتی ہے' اور ناامیدی اس لئے مذموم ہے کہ اس سے عمل میں سستی پیدا ہوتی ہے' خوف رجاء کی ضد نہیں ہے بلکہ سفر سلوک میں اسکا رفیق ہے' جیسا کہ عنقریب بیان کریں گے' بلکہ یہ بھی عمل کا محرک ہے' البتہ اسکا طریقہ دوسرا ہے' رجاء میں رغبت ہے' اور خوف میں رہبت۔

اگر کسی کو رجاء کی حالت میسر ہے تو یہ اس امر کی مقتضی ہے کہ اعمال میں زیادہ سے زیادہ مجاہدہ کرے اور طاعات پر مواظبت کرے' خواہ احوال میں تبدیلی ہوتی رہے۔ طول مجاہد اور مواظبت اعمال سے اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونے میں اور اس سے مناجات کرنے میں لذت حاصل ہوگی' اور وہ نرمی اور تعلق کے ساتھ دامن سوال دراز کرے گا' یہ صورت حال اس شخص کو بھی پیش آتی ہے جو کسی بادشاہ سے یا کسی اور شخص سے رجاء کرے' اگر کسی شخص کو یہ حالت پیش نہ آئے تو سمجھ لو کہ وہ ابھی مقام رجاء سے دور ہے' اور غرور و تمنا کی گھاٹی میں گرا ہوا ہے' یہ ہے تفصیل رجاء کی۔ اور اس علم کی جس سے رجاء پیدا ہوتی ہے اور اس عمل کی جو رجاء سے پیدا ہوتا ہے۔ رجاء سے ان اعمال کا پیدا ہونا حدیث شریف سے ثابت ہے۔ زید خیل روایت کرتے ہیں کہ میں نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ جس شخص کے ساتھ اللہ تعالیٰ بھتری کا ارادہ کرتا ہے اسکی کیا پہچان ہے اور جس کے ساتھ بھتری کا ارادہ نہیں فرماتا اسکی کیا علامت ہے؟ آپ نے ان سے دریافت کیا تیری کیا حالت ہے؟ عرض کیا کہ میں خیر اور اہل خیر سے محبت کرتا ہوں' جب کسی عمل پر قدرت پاتا ہوں تو اسکی طرف سبقت کرتا ہوں' اور یہ یقین رکھتا ہوں کہ مجھے اس عمل کا ثواب حاصل ہوگا' اور جب کوئی چیز مجھ سے فوت ہو جاتی ہے تو میں اس کے لئے غمزدہ ہو جاتا ہوں' اور اسے پانے کی خواہش کرتا ہوں' آپ نے فرمایا یہ اس شخص کی علامت ہے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ بھلائی کا ارادہ کرتا ہے' اگر تیرے لئے برائی کا ارادہ کرتا تو تجھے اسی میں لگا دیتا پھر تجھے یہ بات بھی معلوم نہ ہو پاتی کہ تیری ہلاکت کس وادی میں واقع ہونے والی ہے (طبرانی۔ ابن مسعودؓ) اس

حدیث میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کی علامات بیان فرمادی ہیں جس کے لئے خیر کا ارادہ کیا گیا ہے۔ اب اگر کسی شخص میں یہ علامات مفقود ہوں اور وہ یہ سمجھتا ہو کہ میرے لئے خیر کا ارادہ کیا گیا ہے وہ فریب خوردہ ہے۔

رجاء کے فضائل اور ترغیبات : جاننا چاہیے کہ رجاء کے ساتھ عمل کرنا خوف کے ساتھ عمل کرنے سے اعلا ہے' اس لئے کہ اللہ تعالیٰ سے قریب تر بندہ وہی ہوتا ہے جو اس سے زیادہ محبت کرتا ہو' اور محبت رجاء سے زیادہ ہوتی ہے' اس کی مثال ایسی ہے جیسے دو بادشاہ ہوں' اور ان میں سے ایک کی خدمت اسکے احسان کی امید میں اور دوسرے کی خدمت اسکے خوف کی بناء پر کی جاتی ہوں تو ظاہر ہے دوسرے ہی کے ساتھ محبت زیادہ ہوگی۔ اسی لئے رجاء اور حسن ظن کے سلسلے میں خاص طور پر موت کے وقت سے متعلق شریعت بہت سی ترغیبات موجود ہیں' ارشاد باری ہے :۔

لَا تَقْنَطُوا مِن رَّحْمَةِ اللّٰهِ (پ ۲۴ ر ۳ آیت ۵۳)

اس آیت کریمہ میں ناامیدی کو قطعاً حرام قرار دیا گیا ہے' حضرت یعقوب علیہ السلام کے حالات میں درج ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر وحی نازل فرمائی کہ تم جانتے ہو کہ میں نے تم میں اور یوسف میں جدائی کیوں کی؟ اس لئے کہ تم نے یوسف کی گمشدگی کی خبر سن کر اسکے بھائیوں سے یہ کہا تھا :۔

أَخَافُ أَن يَأْكُلَهُ الذِّئْبُ وَأَنتُمْ عَنْهُ غَافِلُونَ (پ ۱۲ ر ۲ آیت ۱۳)

اور میں یہ اندیشہ کرتا ہوں کہ اسکو کوئی بھیڑیا کھا جائے اور تم اس سے بے خبر رہو۔

تم نے بھیڑیئے سے خوف کیوں کیا' مجھ سے رجاء کیوں نہ کیا' یوسف کے بھائیوں کی غفلت پر نظر کیوں کی' میری حفاظت پر نظر کیوں نہ کی؟ ایک حدیث میں ہے :۔

لَا يَمُوتَنَّ أَحَدُكُمْ إِلَّا وَهُوَ يُحْسِنُ الظَّنَّ بِاللّٰهِ تَعَالَى (مسلم۔ جابرؓ)

تم سے جو شخص مرے اللہ کے ساتھ حسن ظن رکھے۔

ایک حدیث قدسی میں ہے' اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا :۔

أَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِي بِي فَلْيَظُنَّ بِي مَا شَاءَ (ابن الحبان۔ واثلہ ابن الاسقع)

میں اپنے بندے کے گمان کے ساتھ ہوں' وہ مرے ساتھ جو چاہے گمان رکھے۔

ایک مرتبہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ایک شخص کے پاس تشریف لے گئے' اس پر نزع کا عالم طاری تھا' آپ نے اس سے دریافت کیا کہ تمہاری کیا کیفیت ہے؟ اس نے عرض کیا میں اپنے دل میں گناہوں کا خوف' اور رحمت رب کی امید پاتا ہوں' آپ نے ارشاد فرمایا جس شخص کے دل میں یہ دونوں چیزیں جمع ہو جاتی ہیں اسے اللہ تعالیٰ اس کی رجاء کے مطابق عطا کرتا ہے' اور جس چیز سے ڈرتا ہے اس سے مامون رکھتا ہے' (ترمذی' نسائی' ابن ماجہ۔ انسؓ) ایک شخص اپنے گناہوں کی کثرت کے باعث سخت مایوسی کا شکار تھا' حضرت علیؓ نے اس سے ارشاد فرمایا کہ تیرا سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ تو اللہ کی رحمت سے مایوس ہے۔ حضرت سفیان ثوریؒ ارشاد فرماتے ہیں کہ جو شخص کوئی گناہ کرے اور یہ سمجھے کہ مجھے اس پر اللہ تعالیٰ نے قدرت دی ہے' اور مغفرت کی امید رکھے تو اللہ تعالیٰ اسکے گناہ بخش دیتا ہے' اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک قوم کا عیب ان الفاظ میں ذکر فرمایا :۔

وَذَٰلِكُمْ ظَنُّكُمُ الَّذِي ظَنَنتُم بِرَبِّكُمْ أَرْدَاكُمْ (پ ۲۴ ر ۱۷ آیت ۲۳)

اور تمہارے اسی گمان نے جو تم نے اپنے رب کے ساتھ کیا تھا تم کو برباد کیا۔

وَظَنَنتُمْ ظَنَّ السَّوْءِ وَكُنتُمْ قَوْمًا بُورًا (پ ۲۶ ر ۲ آیت ۱۲)

اور تم نے برے برے گمان کئے اور تم برباد ہونے والے لوگ ہو۔

ایک حدیث میں ہے کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندہ سے سوال کرے گا کہ تو نے فلاں برائی دیکھی مگر اس سے منع

کرنے سے کس چیز نے روکا تھا' اگر اللہ تعالیٰ اس کے ذہن میں جواب القاء فرمادے گا تو وہ عرض کرے گا کہ میں تیری رحمت سے پر امید رہا' اور لوگوں سے خوف زدہ' ارشاد ہوگا ہم نے تیرا قصور معاف کردیا۔ ابن ماجہ۔ ابو سعید الخدریؓ) ایک صحیح حدیث میں وارد ہے کہ ایک شخص لوگوں کو قرض دیا کرتا تھا پھر مالداروں کو سہولت دیتا اور مفلسوں کو معاف کردیتا' جب موت آئی' اور اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضر ہوا تو اسکے پاس کوئی ایسا عمل نہ تھا جسے اطاعت کہا جاسکتا ہو' تاہم وہ اللہ تعالیٰ سے حسن ظن اور رجاء رکھتا تھا' اس کے لئے معافی کا حکم صادر ہوا' اور فرمایا گیا کہ ہم سے زیادہ اسکا مستحق کون ہے (مسلم۔ ابن مسعودؓ) قرآن کریم میں ارشاد ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یَتْلُوْنَ کِتٰبَ اللّٰہِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰھُمْ سِرًّا وَّعَلَانِیَۃً یَّرْجُوْنَ تِجَارَۃً لَّنْ تَبُوْرَ (پ ۲۲ ر ۱۶ آیت ۲۹)

جو لوگ کتاب اللہ کی تلاوت کرتے ہیں' اور نماز کی پابندی رکھتے ہیں' اور جو رزق ہم نے انھیں عطا کیا ہے اس میں سے پوشیدہ اور علانیہ خرچ کرتے ہیں اور ایسی تجارت کے امیدوار ہیں جو کبھی تباہ نہ ہوگی۔

ایک مرتبہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام سے فرمایا اگر تم وہ باتیں جان لو جو میں جانتا ہوں تو کم ہنسو اور زیادہ روؤ' اور سینہ کوبی کرتے ہوئے' اپنے رب کی پناہ گاہ کی تلاش میں دشت صحرا کی طرف جانکلو' اسی وقت حضرت جبرئیل علیہ السلام تشریف لائے اور فرمایا کہ آپ کا رب فرماتا ہے میرے بندوں کو مایوس کیوں کرتے ہو' اس کے بعد آپ باہر تشریف لائے اور انھیں شوق و رجاء کا مضمون سنایا (ابن حبان۔ ابو ہریرہؓ) ایک حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام پر وحی نازل فرمائی کہ مجھ سے محبت کر' اور جو مجھ سے محبت کرے اس سے بھی محبت کر' اور لوگوں میں مجھے محبوب بنا' داؤد علیہ السلام نے عرض کیا لوگوں میں محبوب کیسے بناؤں؟ ارشاد ہوا کہ میرا ذکر اچھی طرح کیا کر' اور ان کے سامنے میرے انعامات اور احسانات کا تذکرہ کیا کر' اور انھیں یاد دلایا کر اس لئے کہ وہ صرف میرے احسان سے واقف ہیں۔ (۱) ابان ابن ابی عیاشؒ کو ان کی وفات کے بعد خواب میں دیکھا گیا' یہ زندگی میں لوگوں کی رجاء کی تلقین کیا کرتے تھے' خواب میں انھوں نے کہا کہ میری رب نے مجھے اپنے سامنے کھڑا کیا اور پوچھا کہ تو ایسا کیوں کرتا تھا' میں نے عرض کیا اس لئے کہ تجھے مخلوق میں محبوب کردوں حکم ہوا تیری مغفرت کردی گئی' یحییٰ ابن اکثم بھی اپنی موت کے بعد لوگوں کے خواب میں آئے' ان سے دریافت کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا ہے' فرمایا اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنے سامنے کھڑا کیا اور فرمایا اے بدترین بوڑھے تو نے فلاں فلاں گناہ کئے ہیں' اپنا اعمالنامہ سن کر مجھ پر بے پناہ رعب غالب ہوا' پھر میں نے عرض کیا یا اللہ! حدیث میں تیرے متعلق اس طرح بیان نہیں کیا گیا' فرمایا! کیا بیان کیا گیا ہے؟ میں نے عرض کیا مجھ سے عبدالرزاق نے روایت کی ہے' انھوں نے معمرؒ سے' معمر نے زہریؒ سے' اور زہری نے حضرت انسؓ سے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں' اور آپ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام سے سنا ہے کہ تیرا ارشاد ہے انا عند ظن عبدی بی فلیظن بی ماشاء اور میں یہ گمان رکھتا تھا کہ تو مجھے عذاب نہیں دے گا' اللہ عزوجل نے ارشاد فرمایا جبرئیل علیہ السلام نے سچ کہا میرے نبی نے سچ فرمایا' انس' معمر' زہری سب سچ کہتے ہیں' تو بھی سچ کہتا ہے' پھر مجھے خلعت عطا کیا گیا' اور جنت تک غلاموں نے میری رہنمائی کی' اس وقت میں نے کہا خوشی اسے کہتے ہیں۔

حدیث شریف میں ہے کہ بنی اسرائیل کا ایک شخص لوگوں کو مایوس کن باتیں بتلایا کرتا تھا' اور انھیں اذیت پہنچاتا تھا' قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس سے فرمائیں گے' کہ میں تجھے اپنی رحمت سے اسی طرح مایوس کروں گا جیسے تو نے میرے بندوں کو مایوس کیا ہے (بیہقی' زید ابن اسلم۔ مقطوعاً) ایک حدیث میں ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ایک شخص دوزخ میں جائے گا اور وہاں ہزار برس تک یا حنّان یا منّان پکارتا رہے گا' اللہ تعالیٰ جبرئیل سے فرمائے گا کہ جاؤ میرے بندے کو لے کر آؤ' چنانچہ

---

(۱) اسکی اصل مجھے نہیں ملی' غالباً یہ اسرائیلی روایت ہے

جبرئیل علیہ السلام اسے لیکر آئیں گے' اور رب کریم کے سامنے پیش کریں گے' اللہ تعالیٰ اس شخص سے دریافت کرے گا کہ تو نے اپنا ٹھکانہ کیسا پایا' وہ عرض کرے گا نہایت برا' ارشاد ہو گا اسے واپس وہیں لے جاؤ جہاں سے لائے ہو' فرشتے اسے لے چلیں گے' اور وہ بار بار پیچھے مڑ مڑ کر دیکھے گا' اس سے پوچھا جائے گا کہ تو بار بار پیچھے مڑ مڑ کیا دیکھتا ہے' وہ عرض کرے گا کہ مجھے یہ توقع تھی کہ ایک مرتبہ دوزخ سے نکالنے کے بعد مجھے دوبارہ وہاں نہیں بھیجا جائے گا' حکم ہو گا اسے جنت میں لے جاؤ (بیہقی' انس) اس سے معلوم ہوا کہ محض رجاء اس کی بخشش کا سبب بن گئی۔

رجاء کی تدبیر اور حصول کا طریقہ

جاننا چاہیے کہ رجاء کی ضرورت دو آدمیوں کو پڑتی ہے' ایک اس شخص کو جس پر یاس کا غلبہ ہو' اور وہ عبادت ترک کر دے' دوسرا وہ شخص جس پر خوف غالب ہو' اور وہ عبادت پر اس قدر مواظبت کرے کہ خود بھی پریشان ہو جائے اور اپنے اہل و عیال کو بھی پریشان کرے' یہ دونوں شخص حد اعتدال سے متجاوز اور افراط و تفریط کی طرف مائل ہیں' ان دونوں ہی کو ایسے علاج کی ضرورت ہے جس سے وہ اعتدال پر آجائیں' لیکن وہ فریب خوردہ گناہ گار جو ترک اطاعت کے باوجود اللہ تعالیٰ سے مغفرت کا خواہاں ہو' اور کوئی عمل ایسا نہ کرتا ہو جس سے یہ سمجھا جائے کہ وہ مغفرت کا مستحق ہے اسکے حق میں رجاء سم قاتل ہے' جیسے شہد ٹھنڈا' مزاج رکھنے والوں کے لئے شفا ہے لیکن ان لوگوں کے لئے مہلک زہر ہے جن کے مزاج میں حرارت و حدت ہو' ایسے شخص کے لئے صرف خوف مفید ہے یا وہ اسباب جن سے خوف پیدا ہوتا ہو' یہی وجہ ہے کہ جو شخص وعظ و نصیحت کرتا ہو اسے مرض اور اسباب مرض پر نظر رکھنی چاہیے' نیز اسے یہ بھی چاہیے کہ ہر مرض کا علاج اسکی ضد سے کرے' کسی ایسی چیز سے ہرگز نہ کرے' جس سے مرض میں افاقہ ہونے کے بجائے اضافہ ہو جائے' اسلئے کہ مطلوب اعتدال ہے' ہر صفت اور ہر خلق میں درجہ اعتدال کو پسند کیا گیا ہے' یہی درجہ سب سے اچھا ہے' اگر کوئی وصف یا خلق اس درجے سے مائل ہے خواہ افراط کی جانب یا تفریط کی طرف وہیں علاج کی ضرورت ہے تاکہ پھر درجہ اعتدال پر آجائے' ایسے علاج کی ضرورت نہیں جو اسے درجہ اعتدال سے اور زیادہ دور کرے۔

آج کے دور میں رجاء کسی بھی طرح مناسب نہیں' آج خوف کی ضرورت ہے' بلکہ اس میں بھی مبالغہ نہایت ضروری ہے' ہمارے خیال میں تو مبالغہ بھی راہ راست پر لانے میں مؤثر نہیں' چہ جائیکہ رجاء پیدا کیا جائے۔ اس سے تو انسان بالکل ہی تباہ و برباد ہو جاتا ہے' لیکن کیونکہ رجاء دلوں کے لئے خفیف تر' اور نفسوں کے لئے لذیذ تر ہے' اور واعظ صرف یہ چاہتے ہیں کہ لوگ ان کے وعظ کی طرف مائل ہوں' اور کلمات تحسین بلند کریں' انھیں اس سے یہ مطلب نہیں کہ سننے والوں کے لئے ان کا وعظ مفید ہے یا نہیں وہ صرف اپنی تعریف کے خواہشمند نظر آتے ہیں' رجاء پر اتنا زور اسلئے دیا جاتا ہے کہ سننے والے اس موضوع سے زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں' ان واعظوں کی نادانی نے ہر طرف فساد برپا کر دیا ہے' لوگوں کی سرکشی بڑھادی ہے' اور گناہوں کی سیاہی میں اضافہ کر دیا ہے' حضرت علیؓ ارشاد فرماتے ہیں کہ عالم وہ ہے جو نہ لوگوں کو اللہ کی رحمت سے مایوس کرے اور نہ انھیں اللہ کی پکڑ سے نڈر بنائے۔

ہم رجاء کے اسباب بیان کرنے کے قائل ہیں' لیکن ہر شخص کے لئے نہیں بلکہ صرف اس شخص کے لئے جو اللہ کی رحمت سے قطعاً مایوس ہو یا اس شخص کے لئے جس پر اللہ کا خوف غالب ہو۔ قرآن کریم اور حدیث شریف سے بھی یہی مفہوم ہوتا ہے' یہ دونوں ماخذ رجاء اور خوف دونوں پر مشتمل ہیں' اور ایسے تمام اسباب کو جامع ہیں جن سے مختلف قسم کے مریضوں کو شفا حاصل ہو سکے' ان اسباب کا علم اور انھیں استعمال کرنے کا طریقہ علماء کو بتلایا گیا ہے جو انبیاء علیہم السلام کے وارث ہیں' تاکہ وہ ضرورت کے مطابق دانا اور تجربہ کار طبیب کیطرح ان اسباب کو استعمال کر سکیں اور مریض کے لئے مناسب علاج تجویز کر سکیں' نادان اور جاہل حکیم کی طرح نہیں' جو یہ سمجھتا ہے کہ تمام دوائیں ہر مرض کے لئے مفید ہوتی ہیں خواہ وہ کیسا ہی مرض کیوں نہ ہو۔

حال رجاء کیسے پیدا ہو؟ : رجاء کا حال دو چیزوں سے غالب آتا ہے' ایک اعتبار سے' اور دوسری آیات و روایات اور آثار

کے استقراء اور تفحص سے۔

اعتبار کی صورت: یہ پہلی صورت ہے' اس کا مطلب یہ ہے کہ کتاب الشکر میں جو نعمتیں ہم نے بیان کی ہیں ان پر اچھی طرح غور و فکر کرے جہاں تک کہ وہ دنیا میں بندوں کو دی گئی نعمتوں کے لطائف سے آگاہ ہو جائے' اور جو عجیب و غریب حکمتیں اس نے انسان کی فطرت میں ملحوظ رکھی ہیں ان سے واقف ہو جائے' اللہ تعالیٰ نے انسان کو ہر وہ چیز عطا کی ہے جو دوام وجود کے لئے ضروری ہے جیسے غذا کے آلات' اور وہ چیزیں جن سے ان آلات کو استعمال کیا جاتا ہے جیسے ہاتھ' انگلیاں اور ناخن وغیرہ پھر یہی نہیں بلکہ اسے زینت کی چیزیں بھی بخشیں جیسے ابرو کا خمدار ہونا' آنکھوں میں رنگ کا اختلاف' اور ہونٹوں کی سرخی وغیرہ' اگر یہ چیزیں نہ ہوتیں تب بھی انسان کا وجود باقی رہتا' صرف حسن و جمال متاثر ہوتا جو انسان کی خصوصیت ہے' یہ اللہ تعالیٰ کی عنایت ہے کہ اس نے اپنے بندوں کے سلسلے میں اس طرح کے دقیق امور بھی نظرانداز نہیں کئے' اور انھیں زیب و زینت کی زائد خصوصیات سے بھی نوازا جب انسانوں پر اسکی عنایت اور کرم کا یہ حال ہے تو وہ انھیں آخرت میں دائمی ہلاکت میں ڈالنے پر کیسے راضی ہوگا۔

اگر اچھی طرح غور کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جائے کہ اکثر لوگوں کو دنیا میں سعادت کے اسباب حاصل ہیں' اسی لئے وہ دنیا سے جدائی پسند نہیں کرتے اگرچہ انھیں یہ بتلا دیا جائے کہ مرنے کی بعد ابد تک انھیں کوئی عذاب نہیں دیا جائے گا' وہ عدم کو برا نہیں جانتے' بلکہ اسباب عیش و سعادت سے جدائی کو برا سمجھتے ہیں جو انھیں میسر ہیں' اور جن کے بارے میں انھیں یہ خوف ہے کہ وہ موت کے ساتھ فنا ہو جائیں گے' بہت کم لوگ ایسے ہیں جو موت کی تمنا کرتے ہیں' وہ بھی عام حالات میں نہیں بلکہ کسی حادثے سے متاثر ہو کر' یا کسی لاعلاج مرض سے مایوس ہو کر' جب دنیا میں اکثر لوگوں پر خیر اور سلامتی کا غلبہ ہے تو سنۃ اللہ لا تجد لھا تبدیلا کی رو سے آخرت میں بھی خیر و سلامتی ہی غالب رہے گی' اسلئے کہ دنیا و آخرت دونوں کا مالک اور مدبر ایک ہے اور وہ ہے مغفرت کرنے والا۔ جب اس طرح غور و فکر کیا جائے تو بلاشبہ رجاء کے اسباب غالب آجائیں گے' اعتبار ہی کی ایک صورت یہ ہے کہ شریعت کی حکمتوں' اور سنن شرع میں مخفی دنیوی مصلحتوں پر نظر ڈالے کہ اللہ تعالیٰ نے رحمت کے کیا کیا بہانے ڈھونڈ لئے ہیں' اور کس کس طرح سعادت کے اسباب مہیا کئے ہیں۔

ایک بزرگ نے سورۂ بقرہ کی آیت مداینت (قرض لینے دینے سے متعلق احکام کی آیت) کو رجاء کا قوی تر سبب قرار دیا ہے' جب ان سے اسکی وجہ دریافت کی گئی تو انھوں نے کہا کہ دنیا اپنی تمام تر وسعت کے باوجود مختصر ہے اور بندوں کا رزق اس میں مزید مختصر ہے پھر دَین (قرض) رزق کے مقابلے میں نہایت کم ہے' مگر اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے اس موضوع پر طویل تر آیت نازل فرمائی تاکہ اسکے بندے دَین کے باب میں احتیاط کر سکیں' جب اس نے دین کے حفاظت کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا ہے تو دین کی حفاظت کیسے نہیں فرمائے گا جس کا کوئی عوض نہیں ہے۔

آیات و روایات کا استقراء: دوسری صورت یہ ہے کہ رجاء کے سلسلے میں جو آیات و روایات اور آثار وارد ہیں وہ تلاش کی جائیں اور ان میں غور کیا جائے' اس سلسلے میں بے شمار آیات ہیں جن میں سے چند یہ ہیں:-

قُلْ يَا عِبَادِيَ الَّذِينَ أَسْرَفُوا عَلَى أَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا مِنْ رَحْمَةِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعًا إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ (پ ۲۴ ر ۳ آیت ۵۳)

آپ کہہ دیجئے کہ اے میرے بندوں! جنھوں نے اپنے اوپر زیادتیاں کی ہیں' تم خدا کی رحمت سے ناامید مت ہو' یقیناً خدا تعالیٰ تمام گناہ معاف فرمادے گا وہ بڑا بخشنے والا اور بڑی رحمت والا ہے۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قرأت میں یہ الفاظ ہیں:-

وَلَا يُبَالِي إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ (ترمذی۔ اسماء بنت یزید)

اور اسے پروا نہیں ہے' بلاشبہ وہ مغفرت کرنے والا رحم کرنے والا ہے۔

وَالْمَلَائِکَةُ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِمَنْ فِي الْاَرْضِ (پ ۲۵ ر ۲ آیت ۵)

اور فرشتے اپنے رب کی تسبیح و تحمید کرتے ہیں اور اہل زمین کے لئے معافی مانگتے ہیں۔

ایک جگہ یہ ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے دوزخ کی آگ اپنے دشمنوں کے لئے تیاری کی ہے' دوستوں کو اس سے ڈراتا ہے :-

لَهُمْ مِنْ فَوْقِهِمْ ظُلَلٌ مِنَ النَّارِ وَمِنْ تَحْتِهِمْ ظُلَلٌ ذٰلِکَ يُخَوِّفُ اللّٰهُ بِهٖ عِبَادَهٗ (پ ۲۳ ر ۱۶ آیت ۱۶)

ان کے لئے انکے اوپر سے بھی آگ کے محیط شعلے ہوں گے' یہ وہی (عذاب) ہے جس سے اللہ اپنے بندوں کو ڈراتا ہے۔

وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ اُعِدَّتْ لِلْکَافِرِيْنَ (پ ۴ ر ۵ آیت ۱۳۱)

اور اس آگ سے بچو جو کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے۔

فَاَنْذَرْتُکُمْ نَارًا تَلَظّٰى لَا يَصْلٰهَا اِلَّا الْاَشْقَى الَّذِيْ کَذَّبَ وَتَوَلّٰى (پ ۳۰ ر ۱۷ آیت ۱۴-۱۵-۱۶)

میں تم کو ایک بھڑکتی ہوئی آگ سے ڈرا چکا ہوں' اس میں وہی بدبخت داخل ہو گا جس نے (دین حق کو) جھٹلایا' اور اس سے روگردانی کی۔

وَاِنَّ رَبَّکَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ لِلنَّاسِ عَلٰى ظُلْمِهِمْ (پ ۱۳ ر ۷ آیت ۶)

اور یہ بات بھی یقینی ہے کہ آپ کا رب لوگوں کی خطائیں ان کی بیجا حرکتوں کے باوجود معاف کر دیتا ہے۔

ایک حدیث میں ہے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی دعاؤں میں ہمیشہ اپنی امت کی مغفرت کا سوال فرماتے تھے' اس پر مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی' اور دریافت کیا گیا کیا آپ اب بھی راضی نہیں ہیں (۱)

وَلَسَوْفَ يُعْطِيْکَ رَبُّکَ فَتَرْضٰى (پ ۳۰ ر ۱۸ آیت ۵)

اور عنقریب اللہ تعالیٰ آپ کو (آخرت میں نعمتیں) دے گا سو آپ خوش ہو جائیں گے۔

اس حدیث کی تفسیر میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر امت محمدیہ میں سے ایک شخص بھی دوزخ میں رہا تو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کبھی راضی نہ ہو گا۔ ابو جعفر ابن محمد ابن علی نے اہل عراق سے فرمایا کہ تم یہ کہتے ہو کہ قرآن کریم میں سب سے زیادہ توقع اور امید کی آیت یہ ہے :-

قُلْ يَا عِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَحْمَةِ اللّٰهِ (پ ۲۴ ر ۳۱ آیت ۵۳)

آپ فرما دیجئے! اے میرے بندو جنھوں نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا تم اللہ کی رحمت سے ناامید مت ہو۔

اور ہم اہل بیت کہا کرتے تھے کہ سب سے زیادہ امید افزاء آیت یہ ہے "وَلَسَوْفَ يُعْطِيْکَ رَبُّکَ فَتَرْضٰى" رجاء کے سلسلے میں روایات بھی بے شمار ہیں جن میں سے چند درج کی جاتی ہیں۔ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں :-

---

(۱) مجھے ان الفاظ میں یہ روایت نہیں ملی' البتہ ابن ابی حاتم اور ثعلبی نے اپنی تفسیروں میں حضرت سعید ابن المسیبؓ سے یہ حدیث روایت کی ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کی مغفرت نہ ہوتی تو یہاں کوئی شخص خوش باش نہ ہوتا

أُمَّتِي مَرْحُومَةٌ لَا عَذَابَ عَلَيْهَا فِي الْآخِرَةِ عَجَّلَ اللّٰهُ عِقَابَهَا فِي الدُّنْيَا الزَّلَازِلَ وَالْفِتَنَ فَإِذَا كَانَ يَوْمُ الْقِيَامَةِ رُفِعَ إِلَى كُلِّ رَجُلٍ مِنْ أُمَّتِي رَجُلٌ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ فَقِيلَ هٰذَا فِدَاءُكَ مِنَ النَّارِ (ابوداؤد۔ ابن ماجہ۔ انسؓ)

حضرت موسیٰ اشعریؓ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ میری امت پر رحمت نازل کی گئی ہے' اس پر آخرت میں کوئی عذاب نہ ہوگا' اللہ نے زلزلوں اور فتنوں کی صورت میں اس کو دنیا میں عذاب دیدیا ہے' قیامت کے دن میری امت کے ہر فرد کو اہل کتاب میں سے ایک آدمی دیا جائے گا اور کہا جائے گا کہ یہ آگ سے تیرا فدیہ ہے۔

ایک روایت میں یہ ہے کہ میری امت کا ہر فرد ایک یہودی یا نصرانی کو پکڑ کر لائے گا اور اسے دوزخ کے کنارے کھڑا کرکے کہے گا کہ یہ آگ سے میرا فدیہ ہے' اور یہ کہہ کر اسے دوزخ میں دھکا دیدے گا (مسلم۔ ابو موسیٰؓ) ایک روایت میں ہے :۔

اَلْحُمّٰى مِنْ فَيْحِ جَهَنَّمَ وَهِيَ حَظُّ الْمُؤْمِنِ مِنَ النَّارِ (احمد۔ ابو امامہؓ)

بخار دوزخ کی لپٹ ہے' اور وہ دوزخ میں سے مومن کا حصہ ہے۔

قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا :۔

يَوْمَ لَا يُخْزِي اللّٰهُ النَّبِيَّ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ (پ۲۸' ر۲۰' آیت ۸)

جس دن کہ اللہ تعالیٰ نبی کو اور جو ان کے ساتھ ایمان لائے ہیں ان کو رسوا نہ کرے گا۔

اس آیت کی تفسیر میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک روایت نقل کی جاتی ہیکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل فرمائی کہ میں آپ کی امت کا حساب آپ کے سپرد کئے دیتا ہوں' آپ نے عرض کیا ایسا نہ کیجئے' آپ میری بہ نسبت میری امت کے حق میں زیادہ رحم کرنے والے ہیں' اللہ تعالیٰ نے فرمایا اب ہم آپ کو امت کے سلسلے میں رسوا نہ کریں گے (ابن ابی الدنیا) حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی میری امت کے گناہوں کا حساب میرے سپرد کردیجئے تاکہ ان کی برائیوں پر میرے علاوہ کوئی مطلع نہ ہو' اللہ تعالیٰ نے وحی نازل فرمائی کہ یہ لوگ آپ کی امت ہیں اور میرے بندے ہیں' میں ان پر آپ کی بہ نسبت زیادہ رحم کرنے والا ہوں' ان کا حساب میں خود اپنے پاس رکھوں گا تاکہ ان پر نہ آپ کو مطلع ہوں اور نہ کوئی اور شخص (۱) ایک روایت میں ہے :۔

حَيَاتِي خَيْرٌ لَكُمْ وَمَوْتِي خَيْرٌ لَكُمْ أَمَّا حَيَاتِي فَأَسُنُّ لَكُمُ السُّنَنَ وَأَشْرَعُ لَكُمُ الشَّرَائِعَ وَأَمَّا مَوْتِي فَإِنَّ أَعْمَالَكُمْ تُعْرَضُ عَلَيَّ فَمَا رَأَيْتُ مِنْهَا حَسَنًا حَمِدْتُ اللّٰهَ عَلَيْهِ وَمَا رَأَيْتُ مِنْهَا سَيِّئًا اِسْتَغْفَرْتُ اللّٰهَ لَكُمْ (بزار۔ عبداللہ ابن مسعودؓ)

میری زندگی بھی تمہارے لئے خیر ہے اور میری موت بھی' میری زندگی اس لئے کہ میں تمہارے لئے سنن اور احکام شرع بیان کرتا ہوں اور موت اسلئے کہ تمہارے اعمال میرے سامنے پیش کئے جائیں گے' ان میں سے جو اچھا عمل ہوگا اس پر اللہ کا شکر کروں گا اور جو برا ہوگا اس پر تمہارے لئے اللہ سے مغفرت کی درخواست کروں گا۔

ایک مرتبہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یا کریم العفو (اے کریم معاف فرما) کہا حضرت جبرئیل علیہ السلام نے آپ سے سوال کیا کہ آپ کو اس جملے کی تفسیر معلوم ہے' اسکے معنی یہ ہیں کہ اگر اس نے اپنی رحمت سے گناہ معاف کردیئے تو اپنے کرم سے

---

(۱) اس روایت کی اصل مجھے نہیں ملی

انھیں نیکیوں سے تبدیل کرے گا۔ (۱) ایک مرتبہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی شخص کو یہ کہتے ہوئے سنا اے اللہ میں آپ سے تمام نعمت کا سوال کرتا ہوں، آپ نے اس سے دریافت فرمایا کہ کیا تم تمام نعمت سے واقف ہو، اس نے عرض کیا، نہیں۔ آپ نے فرمایا تمام نعمت ہے جنت میں داخل ہونا۔ (۲) علماء کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے اسلام پسند کرکے ہم پر اپنی نعمت مکمل فرمائی ہے، جیسا کہ خود ارشاد فرمایا :-

وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (پ ۶ ر ۵ آیت ۳)

اور میں نے تم پر اپنا انعام تمام کردیا اور میں نے اسلام کو تمہارا دین بننے کے لئے پسند کرلیا۔

ایک حدیث میں ہے کہ جب کوئی بندہ گناہ کرتا ہے، اور اللہ سے مغفرت چاہتا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے ملائکہ سے فرماتا ہے کہ میرے بندے کو دیکھو کہ گناہ کیا پھر اس نے یہ جانا کہ اسکا ایک رب ہے جو گناہ معاف بھی کرتا ہے اور ان پر مواخذہ بھی کرتا ہے، تم گواہ رہو میں نے اسکا گناہ معاف کردیا ہے (بخاری و مسلم۔ ابو ہریرہؓ) ایک حدیث قدسی میں ہے کہ اے انسان! اگر تیرے گناہ آسمان تک پہنچ جائیں اور مجھ سے مغفرت کی درخواست کرے اور امید رکھے تو میں معاف کردوں گا (ترمذی۔ انسؓ) اسی طرح کی ایک روایت یہ ہے کہ جو بندہ مجھ سے اس حال میں ملاقات کرے گا کہ اسکے پاس زمین کی وسعت کے بقدر گناہ ہوں گے، مگر شرک نہ ہوگا تو میں بھی اسی قدر وسیع مغفرت کے ساتھ اس سے ملوں گا (مسلم۔ ابوذرؓ) ایک روایت میں ہے کہ جب بندہ کوئی گناہ کرتا ہے تو فرشتہ چھ گھڑی تک وہ گناہ اعمال نامے میں نہیں لکھتا، اگر اس عرصے میں وہ توبہ و استغفار کرلیتا ہے تو اسے نہیں لکھتا ورنہ لکھ لیتا ہے۔ یہ روایت دوسرے الفاظ میں اس طرح ہے کہ جب وہ فرشتہ برائی لکھ لیتا ہے، پھر وہ بندہ کوئی نیک عمل کرتا ہے تو دائیں طرف کا فرشتہ جو حاکم ہے بائیں طرف کے فرشتے سے جو محکوم ہے کہتا ہے کہ تو نے جو برائی ابھی درج کی ہے اسے حذف کردے، میں بھی ایک نیکی اسکے بدلے میں کم کئے دیتا ہوں یعنی بجائے دس نیکیوں کے نو نیکیاں لکھتا ہوں۔ (۳) حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب کوئی بندہ گناہ ترک کرتا ہے تو اسکے اعمالنامے میں درج کرلیا جاتا ہے، ایک اعرابی نے عرض کیا اگر وہ توبہ کرلے، آپ نے فرمایا دوبارہ لکھ لیا جاتا ہے، اس نے عرض کیا اگر دوبارہ توبہ کرے، آپ نے فرمایا دوبارہ حذف کردیا جاتا ہے، اس نے عرض کیا ایسا کب تک ہوتا ہے آپ نے ارشاد فرمایا جب تک وہ توبہ و استغفار کرتا رہے گا، اللہ تعالیٰ اس وقت تک مغفرت سے نہیں اکتاتا جب تک بندہ خود ہی استغفار سے نہ اکتا جائے، جب بندہ کسی نیک عمل کا قصد کرتا ہے تو دائیں جانب کا فرشتہ عمل سے پہلے ہی ایک نیکی لکھ لیتا ہے، اور جب عمل کرتا ہے تو دس نیکیاں لکھتا ہے، پھر اللہ تعالیٰ ان دس نیکیوں کو سات سو تک کردیتا ہے، اور جب کسی گناہ کا قصد کرتا ہے تو کچھ نہیں لکھتا، جب اس پر عمل کرتا ہے تو ایک گناہ لکھتا ہے، اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ کا حسن عفو ہے (بیہقی۔ بتغیر یسیر)۔ ایک شخص سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا اور کہنے لگا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں ایک مہینے سے زیادہ روزے نہیں رکھتا، اور نہ پانچ وقت کی نمازوں سے زیادہ نماز پڑھتا ہوں، نہ میرے مال میں کوئی صدقہ ہے، نہ مجھ پر حج اور خیرات ہے، اگر میں مرجاؤں تو میرا ٹھکانہ کہاں ہوگا۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم مسکرائے اور فرمایا جنت میں، اس نے عرض کیا آپ کے ساتھ، آپ نے فرمایا ہاں میرے ساتھ بشرطیکہ تم اپنے دل کو دو چیزوں حسد اور کینے سے بچاؤ، اور زبان کو دو چیزوں غیبت اور جھوٹ سے محفوظ رکھو، اور اپنی آنکھوں کو دو چیزوں سے بچاؤ یعنی اللہ تعالیٰ نے جو چیزوں حرام کی ہیں ان کی طرف نظر نہ کرو اور ان کے ذریعے کسی مسلمان کی اہانت نہ کرو، اگر تم نے ایسا کیا تو تم میرے ساتھ ان دو ہتھیلیوں

---

(۱) یہ مکالمہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت جبرئیل علیہ السلام کے درمیان نہیں ہوا، بلکہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ اور حضرت جبرئیل علیہ السلام کے مابین ہوا جیسا کہ بیہقی نے عقبہ ابن الولید سے روایت کیا ہے۔ (۲) یہ روایت پہلے بھی گزر چکی ہے۔ (۳) یہ دونوں روایتیں بیہقی میں حضرت ابو امامہ سے مروی ہیں

پر جنت میں جاؤ گے (۱) حضرت انسؓ اپنی ایک طویل حدیث میں روایت کرتے ہیں کہ ایک اعرابی نے عرض کیا کہ مخلوق کے حساب کا کفیل کون ہو گا آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ' اس نے عرض کیا وہ خود حساب لے گا' آپ نے فرمایا ہاں! یہ سن کر اعرابی مسکرایا' آپ نے ہنسنے کی وجہ دریافت کی اس نے عرض کیا' اللہ تعالیٰ کریم ہے جب قدرت پاتا ہے معاف کر دیتا ہے' اور حساب لیتا ہے تو چشم پوشی کرتا ہے' سرکار دو عالم صلی نے ارشاد فرمایا اعرابی نے سچ کہا' اللہ تعالیٰ کریم ہے' اور وہ تمام اہل کرم سے زیادہ کرم والا ہے' اس کے بعد آپ نے فرمایا اعرابی سمجھ گیا' اس حدیث میں یہ بھی فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے کعبہ مکرمہ کو شرف اور فضیلت سے نوازا ہے' اگر کوئی بندۂ خدا اس گھر کا ایک ایک پتھر گرا دے اور پھر اسے جلا ڈالے تو اس قدر گناہ نہیں ہو گا جس قدر گناہ کسی ولی اللہ کی تحقیر سے ہوتا ہے' ایک اعرابی نے عرض کیا اللہ کے اولیاء کون ہیں' آپ نے فرمایا تمام مومن اللہ کے دوست ہیں' کیا تو نے یہ آیت نہیں پڑھی :-

اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ آمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ إِلَى النُّوْرِ (۲) (پ ۳ ر ۲ آیت ۲۵۷)

اللہ تعالیٰ ساتھی ہے ان لوگوں کا جو ایمان لائے ان کو تاریکیوں سے نکال کر نور (اسلام) کی طرف لاتا ہے۔

اس روایت کی بے شمار احادیث سے تائید ہوتی ہے' جن میں سے بعض یہ ہیں :-

اَلْمُؤْمِنُ أَفْضَلُ مِنَ الْكَعْبَةِ (ابن ماجہ۔ ابن عمرؓ)

مومن کعبہ سے افضل ہے۔

اَلْمُؤْمِنُ طَيِّبٌ طَاهِرٌ (۳)

مومن پاک و طاہر ہے۔

اَلْمُؤْمِنُ أَكْرَمُ عَلَى اللّٰهِ تَعَالٰى مِنَ الْمَلَائِكَةِ (ابن ماجہ۔ ابو ہریرہؓ)

مومن اللہ کے نزدیک ملائکہ سے افضل ہے۔

یہ تو فضیلت مومن کی حدیثیں ہیں' ان سے بھی رجاء کا مضمون ثابت ہوتا ہے' خاص رجاء کی کچھ احادیث یہ ہیں :-

ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے دوزخ کو ایک کوڑا بنایا جس سے وہ اپنے بندوں کو جنت کی طرف ہنکاتا ہے۔ (۴)

ایک حدیث قدسی میں ہے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ میں نے مخلوق کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ مجھ سے نفع اٹھائیں اسلئے پیدا نہیں کیا کہ میں ان سے نفع اٹھاؤں۔ (۵) حضرت ابو سعید الخدریؓ روایت کرتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے کوئی چیز ایسی پیدا نہیں کی جس پر کوئی دوسری چیز غالب نہ ہو' اور اپنی رحمت کو اپنے غصے پر غالب بنایا (ابن حبان) ایک مشہور حدیث میں ہے :-

إِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ قَبْلَ أَنْ يَّخْلُقَ الْخَلْقَ إِنَّ رَحْمَتِيْ تَغْلِبُ غَضَبِيْ (بخاری و مسلم۔ ابو ہریرہؓ)

اللہ تعالیٰ نے مخلوق کی تخلیق سے پہلے ہی اپنے اوپر یہ جملہ لکھ لیا ہے "بلاشبہ میری رحمت میرے غضب پر غالب ہے"۔

حضرت معاذ ابن جبلؓ اور حضرت انسؓ ابن مالک روایت کرتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :-

مَنْ قَالَ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ (طبرانی' نسائی)

---

(۱) یہ حدیث پہلے بھی گزر چکی ہے (۲) اس روایت کی کوئی اصل مجھے نہیں ملی (۳) یہ روایت ان الفاظ میں نہیں ہے' بخاری و مسلم میں یہ الفاظ ہیں المومن لا ینجس مومن کبھی ناپاک نہیں ہوتا (۴) یہ روایت بخاری و مسلم میں ابو ہریرہؓ سے ان الفاظ میں مروی ہے "عجب ربنا من قوم یجاء بهم الی الجنة فی السلاسل" (۵) اس روایت کی کوئی اصل مجھے نہیں ملی

جس شخص نے لا الہ الا اللہ کہا وہ جنت میں داخل ہوگا۔

مَنْ كَانَ آخِرُ كَلَامِهِ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ لَمْ تَمَسَّهُ النَّارُ (ابوداؤد' حاکم۔ معاذ بلفظ آخر)

جس کا آخری کلام لا الہ الا اللہ ہوگا اسے دوزخ کی آگ مس نہیں کرے گی۔

مَنْ لَقِيَ اللّٰهَ لَا يُشْرِكُ بِهِ شَيْئًا حُرِّمَتْ عَلَيْهِ النَّارُ (بخاری و مسلم۔ انسؓ بتغیر قلیل)

جو شخص اس حال میں اللہ سے ملے کہ اس نے شرک نہ کیا ہو تو اس پر دوزخ کی آگ حرام ہوگی۔

لَا يَدْخُلُهَا مَنْ فِي قَلْبِهِ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِنْ اِيْمَانٍ (بخاری و مسلم۔ ابوسعید الخدری بلفظ آخر)

دوزخ میں وہ شخص داخل نہیں ہوگا جس کے دل میں ذرہ برابر بھی ایمان ہوگا۔

لَوْ عَلِمَ الْكَافِرُ سَعَةَ رَحْمَةِ اللّٰهِ مَا اَيِسَ مِنْ جَنَّتِهِ اَحَدٌ (بخاری و مسلم۔ ابوہریرہؓ)

اگر کافر کو اللہ کی رحمت کی وسعت معلوم ہوجائے تو اس کی جنت سے مایوس نہ ہو۔

ایک حدیث میں ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔

اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيْمٌ (پ ۱۷ ر ۸ آیت ۱)

قیامت کا زلزلہ بڑی بھاری چیز ہوگی۔

تو صحابہ سے دریافت فرمایا کہ تم جانتے ہو کہ کون سا دن ہوگا' یہ وہ دن ہوگا کہ حضرت آدم علیہ السلام سے کہا جائے گا جاؤ اور اپنی ذریت میں سے دوزخ کے لئے نکال لو' حضرت آدم علیہ السلام عرض کریں گے کتنے؟ حکم ہوگا ہزار میں سے نو سو ننانوے اور صرف ایک جنت میں جائے گا' یہ فرما کر سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے گئے اور صحابہ کرام نے رونا شروع کردیا۔ اس روز کسی نے کوئی کام نہیں کیا' سب بیٹھے روتے رہے (یہاں تک کہ) سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور صحابہ سے پوچھا تمہیں کیا ہوا تم نے آج کام کیوں نہیں کیا' انہوں نے عرض کیا جو حدیث آپ نے بیان فرمائی ہے اسے سننے کے بعد کون کام کرسکتا تھا؟ آپ نے دریافت فرمایا قوموں میں تمہاری تعداد کتنی ہے؟ تاویل' تاویس منسک' یاجوج ماجوج وغیرہ قومیں اتنی ہیں کہ ان کی صحیح تعداد اللہ ہی جانتا ہے' تمام قوموں میں تمہاری حیثیت صرف اتنی ہے جتنی حیثیت سیاہ رنگ بیل کے جسم پر سفید بال کی ہوتی ہے' یا جانور کے پاؤں میں سفید داغ کی ہوتی ہے' (ترمذی۔ عمران ابن حصینؓ) غور کیجئے پہلے آپ نے صحابہ کرام کو خوف کے کوڑوں سے ہنکایا اور جب وہ حد اعتدال سے تجاوز کرنے لگے اور مایوسی کی حدوں کو چھونے لگے تو انہیں رجاء کی لگام پہنا کر اعتدال کی طرف کھینچا' یہاں دوسرا قول پہلے قول کے خلاف نہیں تھا' پہلے آپ نے وہ بات بیان کی جسے آپ نے مخاطب کے لئے شفا جانا' پھر جب دوسرے موقعہ پر دوسرے علاج کی ضرورت پیش آئی تو دوسرا قول بیان فرمایا' چنانچہ واعظین کے لئے ضروری ہے کہ وہ سید الوعاظ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء کریں' اور خوف و رجاء کی روایات بیان کرنے میں احتیاط کا پہلو اختیار کریں' اگر ایسا نہیں کریں گے تو ان کے مواعظ سے اصلاح کے بجائے فساد کا اندیشہ ہے' رجاء کے سلسلے میں مزید روایات یہ ہیں' فرمایا :-

لَوْ لَمْ تُذْنِبُوْا لَخَلَقَ اللّٰهُ خَلْقًا يُذْنِبُوْنَ فَيَغْفِرُ لَهُمْ (مسلم۔ ابوہریرہؓ)

اگر تم نے گناہ نہ کئے تو اللہ تعالیٰ دوسری مخلوق پیدا کرے گا' جو گناہ کریں گے پھر اللہ ان کی مغفرت فرمائے گا۔

اس روایت کے دوسرے الفاظ یہ ہیں کہ تمہیں فنا کردے گا اور تمہاری جگہ ایسی مخلوق لے آئے گا جو گناہ کرے گی' پھر وہ ان کی مغفرت فرمائے گا۔ بلاشبہ وہ مغفرت کرنے والا' رحم کرنے والا ہے (مسلم۔ ابوایوبؓ) ایک حدیث میں ہے کہ اگر تم نے گناہ نہ کئے تو مجھے اس امر کا خدشہ ہے جو گناہ سے بدتر ہے' صحابہ نے عرض کیا وہ کیا چیز ہے؟ فرمایا عجب اور خود پسندی (بزار' ابن حبان۔ انسؓ) ایک جگہ ارشاد فرمایا' اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے اللہ تعالیٰ اپنے بندہ مومن پر اس ماں سے زیادہ رحم کرنے والا ہے جو اپنے بچے پر مہربان ہوتی ہے (بخاری و مسلم۔ عمر نحوہ) ایک حدیث میں ہے فرمایا' اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ایسی مغفرت فرمائے گا کہ کسی کے دل

پر نہ گزری ہوگی' یہاں تک کہ ابلیس بھی اس مغفرت کا منتظر ہوگا کہ شاید اس کے حصے میں آجائے (ابن ابی الدنیا۔ انس)۔ فرمایا' اللہ تعالیٰ کی سو رحمتیں ہیں جن میں سے اس نے ننانوے رحمتیں محفوظ رکھی ہیں اور ایک رحمت دنیا میں ظاہر فرمائی ہے' اسی رحمت کے باعث لوگ ایک دوسرے سے رحم کا برتاؤ کرتے ہیں' ماں اپنے بچے پر شفقت کرتی ہے' جانور اپنے بچوں پر مہربان ہوتا ہے' جب قیامت برپا ہوگی تو یہ رحمت بھی ان ننانوے رحمتوں میں شامل کردی جائے گی' پھر یہ رحمتیں تمام مخلوق پر عام کی جائیں گی اور ہر رحمت اس قدر وسیع ہوگی کہ تمام آسمان و زمین بھر جائیں گے' اس دن بد قسمت تباہ کار کے علاوہ کوئی ہلاک نہ ہوگا (بخاری و مسلم۔ ابو ہریرہ)۔ فرمایا :-

مَا مِنْكُمْ مِنْ اَحَدٍ يُدْخِلُهُ عَمَلُهُ الْجَنَّةَ وَلَا يُنْجِيهِ مِنَ النَّارِ قَالُوْا وَلَا اَنْتَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ قَالَ وَلَا اَنَا اِلَّا اَنْ يَتَغَمَّدَنِيَ اللّٰهُ بِرَحْمَتِهِ (بخاری و مسلم۔ ابو ہریرہ)

تم میں سے کوئی ایسا نہیں جسے اسکا عمل جنت میں پہنچادے یا دوزخ سے بچائے' لوگوں نے عرض کیا آپ کو بھی یا رسول اللہ! فرمایا نہ مجھے الا یہ کہ اللہ کی رحمت میرے شامل حال ہو۔

اِعْمَلُوْا وَاَبْشِرُوْا وَاعْلَمُوْا اَنَّ اَحَدًا لَمْ يُنْجِهِ عَمَلُهُ (۱)

عمل کرو' خوشخبری حاصل کرو' اور یہ بات جان لو کہ کسی کو اس کا عمل نجات نہیں دے گا۔

ایک روایت میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میں نے اپنی شفاعت اپنی امت کے اہل کبائر کے لئے پوشیدہ رکھی ہے کیا تم اسے اہل تقویٰ اور اطاعت گزاروں کے لئے سمجھتے ہو' بلکہ وہ گناہوں میں آلودہ ہوجانے والوں کے لئے ہے (بخاری و مسلم۔ ابو ہریرہؓ بلفظ آخر) فرمایا: میں خالص اور آسان دین حنیفی کے ساتھ بھیجا گیا ہوں (احمد۔ ابو امامہؓ) فرمایا میں چاہتا ہوں کہ دونوں کتابوں والے یعنی یہود و نصاریٰ یہ بات جان لیں کہ ہمارے دین میں وسعت و فراخی ہے۔ (احمد) چنانچہ اس کی تائید اس دعا سے ہوتی ہے جو بارگاہ الٰہی سے قبول ہوئی' مومنین نے یہ دعا کی تھی :-

وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا اِصْرًا (پ ۳ ر ۸ آیت ۲۸۶) اور ہم پر کوئی سخت حکم نہ بھیجے

اسکے جواب میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا :-

وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلَالَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ (پ ۹ ر ۹ آیت ۱۵۷)

اور ان لوگوں پر جو بوجھ اور طوق تھے ان کو دور کرتے ہیں۔

محمد ابن الحنفیہ حضرت علیؓ سے روایت کرتے ہیں کہ جب قرآن کریم کی یہ آیت نازل ہوئی :-

فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيْلَ (پ ۱۴ ر ۶ آیت ۸۵) سو آپ خوبی کے ساتھ درگزر کیجئے

تو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبرئیل علیہ السلام سے دریافت فرمایا کہ صفح جمیل کسے کہتے ہیں' حضرت جبرئیل علیہ السلام نے جواب دیا کہ اگر کسی شخص نے تم پر ظلم کیا ہو اور تم نے اسے معاف کردیا ہو تو پھر تم اس پر عتاب بھی نہ کرو' یہ صفح جمیل ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا اے جبرئیل! اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ جسے معاف کردے گا اس پر عتاب بھی نہ کرے گا' یہ بات سن کر حضرت جبرئیل رونے لگے' اور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم بھی روئے' اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کے پاس حضرت میکائیل علیہ السلام کو بھیجا' انھوں نے آکر کہا کہ اللہ تعالیٰ تم دونوں کو سلام کہتا ہے اور فرماتا ہے کہ جس کو میں معاف کردوں گا اس پر عتاب کیسے کروں گا؟ ایسا کرنا میرے کرم کے شایان شان نہیں (ابن مردویہ موقوفاً علی علی)۔ رجاء کے سلسلے میں بے شمار روایات ہیں' ہم ان ہی پر اکتفا کرتے ہیں' اور آثار بیان کرتے ہیں۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ جس شخص نے کوئی گناہ کیا اور اللہ تعالیٰ نے دنیا میں اسکی پردہ پوشی فرمائی تو اللہ تعالیٰ کے کرم کا تقاضا یہ نہیں ہے کہ آخرت میں اس کا راز ظاہر کرے اور جس شخص کو دنیا میں اس کے گناہ کی سزا دیدی گئی ہو اللہ تعالیٰ کے عدل و انصاف کا

---

(۱) یہ حدیث پہلے گزر چکی ہے

تقاضا یہ نہیں ہے کہ اسے آخرت میں بھی سزا دی جائے۔ حضرت سفیان ثوریؒ فرماتے ہیں کہ مجھے یہ پسند نہیں کہ میرا حساب میرے والدین کے حوالے کیا جائے اسلئے کہ اللہ تعالیٰ میرے والدین سے زیادہ مجھ پر مہربان اور رحم کرنے والا ہے' ایک بزرگ فرماتے ہیں جب کوئی بندہ گناہ کرتا ہے تو اسے فرشتوں کی نگاہوں سے اوجھل کر دیتا ہے تاکہ وہ اسے دیکھ کر گواہی نہ دے سکیں' محمد ابن صعب نے اسود ابن سالم کو اپنے قلم سے لکھا کہ جب بندہ اپنے نفس پر ظلم کرتا ہے (گناہ کرتا ہے) اور ہاتھ اٹھا کر یا اللہ کہتا ہے تو فرشتے اسکی آواز روک دیتے ہیں' وہ دوبارہ یا اللہ کہتا ہے' فرشتے دوسری بار بھی اس کی آواز اوپر نہیں جانے دیتے' تیسری بار بھی ایسا ہی ہوتا ہے' جب چوتھی بار بندہ اپنے خدا کو آواز دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرشتوں سے فرماتا ہے کہ میرے بندے کی آواز کب تک مجھ سے چھپاؤ گے' وہ یہ بات جان گیا ہے کہ میرے سوا کوئی اسکے گناہوں کی مغفرت نہیں کر سکتا' میں تمہیں گواہ بناتا ہوں کہ میں نے اس کے گناہ بخش دئے ہیں' حضرت ابراہیم ابن ادہم فرماتے ہیں کہ ایک رات مجھے خانہ کعبہ کا طواف تنہا کرنے کی سعادت نصیب ہوئی' یہ ایک تاریک رات تھی' میں دروازۂ کعبہ کے نزدیک ملتزم میں کھڑا ہو گیا' اور یہ دعا کرنے لگا اے اللہ! مجھے اپنی حفاظت میں رکھئے تاکہ میں تیری نافرمانی نہ کر سکوں' اسی دوران بیت اللہ کی طرف سے آواز آئی اے ابراہیم تم گناہوں سے حفاظت چاہتے ہو' میرے تمام مومن بندے بھی یہی دعا کرتے ہیں' اگر میں سب کو گناہوں سے محفوظ کر دوں اور معصوم بنا دوں تو اپنا فضل اور مغفرت کس پر کروں؟ حضرت حسن بصریؒ فرمایا کرتے تھے کہ اگر مومن گناہ نہ کرے تو آسمانی ملکوت میں اڑان بھرے لیکن اللہ تعالیٰ نے گناہوں کے ذریعے اسکے پر کتر دئے ہیں' حضرت جنیدؒ فرماتے ہیں اگر ایک نظر عنایت ہو گئی تو نیک و بد ایک ہو جائیں گے' حضرت مالک ابن دینار نے ابان سے دریافت کیا کہ تم لوگوں کو رخصت کی حدیثیں کب تک سناؤ گے' انھوں نے جواب دیا اے ابو یحییٰ! مجھے امید ہے کہ قیامت کے روز تم خدا تعالیٰ کے عفو و کرم کے اتنے مناظر دیکھو گے کہ برداشت نہ کر پاؤ گے' ربعی ابن حراش اپنے بھائی کے متعلق جو مشہور تابعی ہیں اور جنھوں نے موت کے بعد گفتگو کی ہے بیان کرتے ہیں کہ جب میرے بھائی کا انتقال ہوا' اور انھیں کفن پہنا دیا گیا' اور ایک چادر ان کی نعش پر ڈال دی گئی تو انھوں نے اپنے چہرے سے کپڑا ہٹایا' اور سیدھے ہو کر بیٹھ گئے' اور کہنے لگے میں نے اپنے رب سے ملاقات کی' اور اس نے روح و ریحان سے میرا استقبال کیا' میرا رب ناراض نہیں تھا' میں نے اپنا معاملہ اتنا آسان پایا جتنا تمہیں گمان بھی نہیں تھا' اس لئے سستی نہ کرو' سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی اصحاب سب میرے منتظر ہیں کہ میں ان کے پاس واپس جاؤں' یہ کہہ کر وہ گر پڑے گویا وہ کنکری ہوں جو کسی طشت میں گر پڑی ہو' ہم نے ان کا جنازہ اٹھایا اور نعش دفن کر دی' ایک حدیث میں بنی اسرائیل کے دو آدمیوں کا قصہ بیان کیا گیا ہے' ان دونوں نے آپس میں اخوت کا رشتہ قائم کیا تھا' ان میں سے ایک اپنے نفس پر گناہوں کے ذریعے ظلم کرتا تھا' اور دوسرا انتہائی عبادت گزار تھا' یہ دوسرا شخص اپنے بھائی کو اس سرکشی اور نافرمانی پر زجر و توبیخ کیا کرتا تھا' اور اسکے جواب میں یہ کہتا تھا کہ تو میرا نگراں نہیں ہے' میں جانوں اور میرا خدا جانے' تو میرے معاملات میں دخل نہ دے' ایک دن عابد نے اسے گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرتے ہوئے دیکھ لیا' اس بات پر اسے سخت غصہ آیا اور کہنے لگا کم بخت اللہ تیری مغفرت نہ کرے۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس سے فرمائیں گے کہ کیا کوئی شخص میری رحمت کو پابند کر سکتا ہے' ...سے میرے بندوں سے روک سکتا ہے؟ پھر گناہ گار بندے سے فرمائیں گے جا میں نے تجھے بخش دیا' اور عابد سے کہیں گے تو نے اپنے لئے آگ واجب کر لی ہے' اسکے بعد سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس ذات کی قسم جسکے قبضے میں میری جان ہے اس نے ایسی بات کہی تھی جو دنیا و آخرت میں اسکی ہلاکت کا باعث بن گئی (ابوداؤد۔ ابو ہریرہؓ)۔

بنی اسرائیل کا ایک شخص رہزنی کیا کرتا تھا' وہ چالیس برس تک اس مکروہ مشغلہ میں رہا۔ ایک مرتبہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اسکے پاس سے گزرے' ان کے پیچھے آپ کے حواریوں میں ایک شخص تھے' جو نہایت عبادت گزار تھے' اس رہزن نے ان حضرات کو دیکھ کر اپنے دل میں سوچا کہ یہ اللہ کے نبی یہاں سے گزر رہے ہیں' اور ان کے برابر میں ایک حواری ہیں' اگر میں بھی ان کے ساتھ ہو لوں تو دو سے تین افراد ہو جائیں گے' یہ سوچ کر آگے بڑھا اور انکے ساتھ چلنے کا ارادہ کیا لیکن حواری کی عظمت شان کی پیش نظر آگے بڑھنے کی

ہمت نہیں ہوئی' اور دل میں یہ خیال کیا کہ میں گناہ گار ہوں اور یہ بزرگ ہستی ہیں' مجھ جیسے برے آدمی کا ان کے پہلو بہ پہلو چلنا مناسب نہیں ہے' پھر کچھ سوچ کر ندامت اور شرمندگی کے ساتھ پیچھے پیچھے چلنے لگا' ادھر حواری کے دل میں یہ خیال آیا کہ ایک برا آدمی جو رہزنی کرتا ہے مجھ جیسی متقی و پرہیزگار شخص کے برابر چل رہا ہے اس لئے وہ حضرت عیسٰی علیہ السلام سے کچھ اور قریب ہو کر چلنے لگا' وہ رہزن پیچھے پیچھے چلتا رہا' اسی دوران حضرت عیسٰی علیہ السلام پر وحی نازل ہوئی کہ ان دونوں سے کہہ دو کہ جو اعمال انھوں نے کئے ہیں وہ سب ضائع ہو گئے' اب از سر نو عمل شروع کریں' حواری کے اعمال حسنہ اس کے عجب کی وجہ سے ضائع چلے گئے' اور راہزن کے اعمال سیئہ اس کی تواضع اور اپنے نفس کو حقیر سمجھنے کی وجہ سے محو ہو گئے' آپ نے ان دونوں کو اس وحی سے مطلع کیا' اور اس راہزن کو اپنا ہم سفر بنالیا اور اسے اپنے حواریوں میں شامل کر لیا۔ حضرت مسروقؒ روایت کرتے ہیں کہ ایک پیغمبر اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدہ ریز تھے کہ کوئی بدمست شرابی ان کی گردن اپنے پاؤں سے روندتا ہوا گزر گیا یہاں تک کہ زمین پر پڑی ہوئی کنکریاں ان کی پیشانی زخمی کر گئیں' پیغمبر نے سجدے سے سر اٹھایا اور غصے سے کہا دفع ہو جاؤ اللہ کی قسم تیری مغفرت نہیں ہوگی' اس پر اللہ تعالیٰ نے وحی نازل فرمائی کہ اے پیغمبر تو ہمارے بندوں پر قسم کھاتا ہے' میں نے اس کی مغفرت کر دی ہے۔ اسی سے ملتی جلتی ایک روایت حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے مروی ہے' وہ روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں مشرکین کے لئے بددعا کیا کرتے تھے اور ان پر لعنت بھیجتے تھے' اس پر یہ آیت نازل ہوئی :۔ لَیْسَ لَکَ مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ اَوْ یَتُوْبَ عَلَیْهِمْ اَوْ یُعَذِّبَهُمْ (پ ۴' آیت ۲۸)

آپ کو کوئی دخل نہیں یہاں تک کہ خدائے تعالیٰ یا تو ان پر متوجہ ہو جائیں یا ان کو کوئی سزا دیدیں۔

اس آیت کے بعد آپ نے بددعا ترک فرمادی اور اللہ تعالیٰ نے ان میں سے اکثر کو شرف ہدایت سے نوازا۔ (بخاری۔ ابن عمرؓ)۔

ایک اثر اس مضمون کا منقول ہے کہ دو آدمی تھے اور دونوں عبادت میں برابر درجہ رکھتے تھے' جب وہ دونوں جنت میں گئے تو ایک کو دوسرے کے مقابلے میں بلند درجات عطا کئے گئے' اس پر دوسرے عابد نے عرض کیا یا اللہ! ہم دونوں عبادت میں مساوی تھے پھر کیا وجہ ہے میرے رفیق کو بلند درجات ملے' فرمایا تو دنیا میں دوزخ سے نجات کی دعا مانگتا تھا اور تیرا ساتھی بلندیٔ درجات کا طالب تھا' اسلئے دونوں کو ان کے سوال کے مطابق عطا کیا گیا ہے۔ اس اثر سے ثابت ہوتا ہے کہ رجاء کے ساتھ عبادت کرنا افضل ہے' اس لئے کہ خائف کے مقابلے میں راجی پر اللہ تعالیٰ کی محبت زیادہ غالب ہوتی ہے' چنانچہ شاہان دنیا اپنے ان خادموں میں فرق کرتے ہیں جن میں سے بعض خوف کی بنا پر خدمت کرتے ہیں' اور بعض انعام و اکرام کی امید میں۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے حسن ظن کا حکم دیا ہے' اور اسی بنا پر سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا :۔

سَلُوا اللّٰهَ الدَّرَجَاتِ الْعُلٰی فَاِنَّمَا تَسْاَلُوْنَ کَرِیْمًا (۱)

اللہ تعالیٰ سے بلند درجات کا سوال کرو کیونکہ تم کریم سے سوال کرتے ہو۔

ایک حدیث میں ہے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :۔

اِذَا سَاَلْتُمُوا اللّٰهَ فَاَعْظِمُوا الرَّغْبَةَ وَاسْاَلُوا الْفِرْدَوْسَ الْاَعْلٰی فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یَتَعَاظَمُهُ شَیْءٌ (بخاری و مسلم۔ ابوہریرہؓ باختلاف یسیر)

جب تم اللہ تعالیٰ سے مانگو تو نہایت رغبت سے مانگو اور فردوس اس کا سوال کرو' اسلئے کہ اللہ کے نزدیک کوئی بڑی چیز نہیں ہے۔

بکر ابن سلیم صوافؒ کہتے ہیں کہ جس رات حضرت مالک ابن انسؒ کی وفات ہوئی ہم ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا آپ کا کیا حال ہے؟ انھوں نے جواب دیا مجھے نہیں معلوم کہ میں اس سوال کے جواب میں کیا کہوں' مگر بہت جلد تم اللہ تعالیٰ کے اتنے بڑے فضل و عفو کا مشاہدہ کرو گے جس کا تمہیں گمان بھی نہیں ہوگا اس سوال و جواب کو چند ہی لمحے گزرے تھے کہ آپ وفات فرما گئے یہاں

---

(۱) یہ روایت ان الفاظ میں نہیں ملی' ترمذی ابن مسعودؓ سے یہ الفاظ منقول ہیں "سَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ فَاِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ اَنْ یُّسْاَلَ"

تک کہ آپ کی آنکھیں ہم ہی نے بند کیں۔ یحیٰی ابن معاذ اپنی مناجات میں کہا کرتے تھے الٰہی گناہوں کے ساتھ جو توقع مجھے تیری ذات سے ہے وہ اعمال کے ساتھ نہیں ہے اسلئے کہ اعمال میں اخلاص پر اعتماد ہوتا ہے' جب کہ میں اخلاص کی نعمت سے محروم ہوں' میں آفت میں مبتلا ہوں' اور خود کو گناہوں میں ملوث پاتا ہوں' اسلئے میرا اعتماد صرف تیرے عفو و کرم پر ہے' تو میرے گناہ کیسے معاف نہیں کرے گا جب کہ تو جود و کرم سے متصف ہے۔ روایت ہے کہ ایک مجوسی نے حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے یہاں مہمان بننے کی خواہش کی' حضرت ابراہیم نے فرمایا اگر تو ایمان لے آئے تو میں تجھے اپنا مہمان بنالوں گا' وہ مجوسی چلا گیا' اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام پر وحی نازل فرمائی کہ تم نے دین کے اختلاف کی بناء پر اسے ایک وقت کا کھانا نہیں کھلایا' جب کہ میں اس کفر کے باوجود ستر برس سے کھانا کھلا رہا ہوں۔ اگر تم ایک رات اسے مہمان بنالیتے تو کیا ہو جاتا۔ حضرت ابراہیم خلیل اللہ اس مجوسی کے پیچھے دوڑے اسے واپس لے کر آئے' اور اسکی مہمانداری کی' مجوسی نے ان سے دریافت کیا کہ اس تبدیلی کی وجہ کیا ہے آپ اچانک اس قدر مہربان کیوں ہو گئے؟ حضرت ابراہیم نے وحی کا ذکر فرمایا' مجوسی نے کہا کیا خدا تعالیٰ میرے ساتھ یہ معاملہ فرماتا ہے' پھر اس نے حضرت ابراہیم کے دست حق پر بیعت کی اور مسلمان ہو گیا۔ استاذ ابوسہل صعلوکی نے جو بہت زیادہ ڈرایا کرتے تھے ابوسہل زجاجی کو خواب میں دیکھا اور دریافت کیا تمہارا کیا حال ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ جس قدر تم ہمیں خوف زدہ کرتے تھے معاملہ اس سے کہیں زیادہ سہل نکلا' کسی شخص نے ابوسہل صعلوکی کو ان کے انتقال کے بعد خواب میں نہایت عمدہ حال پر دیکھا' اور ان سے دریافت کیا کہ آپ کو یہ اچھی حالت کس عمل کے نتیجے میں حاصل ہوئی انھوں نے جواب دیا باری تعالیٰ کے ساتھ حسن ظن کے نتیجے میں۔ روایت ہے کہ ابوالعباس ابن سریج نے اپنے مرض موت کے دوران خواب میں دیکھا گویا قیامت برپا ہے' اور جبار سبحانہ و تعالیٰ فرما رہے ہیں علماء کہاں ہیں؟ علماء آئے اور باری تعالیٰ نے ان سے دریافت کیا کہ تم نے اپنے علم کے مطابق کیا عمل کیا ہے؟ انھوں نے عرض کیا رب کریم! ہم نے کوتاہی کی ہے' ہم نے برے عمل کئے ہیں' باری تعالیٰ اپنا سوال پھر دہرائیں گے' گویا وہ اس جواب سے راضی نہیں ہیں' اور دوسرا جواب چاہتے ہیں' چنانچہ میں نے عرض کیا جہاں تک میرا تعلق ہے میرے اعمال نامے میں شرک نہیں ہے اور آپ نے وعدہ فرمایا ہے کہ شرک کے سوا جتنے گناہ ہیں آپ وہ سب معاف کردیں گے' اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ اسے لے جاؤ' میں نے اسکے گناہ معاف کر دئے ہیں' اس خواب کے بعد وہ تین دن زندہ رہے' چوتھے دن انتقال فرما گئے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ ایک شخص بہت زیادہ شراب پیا کرتا تھا' ایک دن اس نے اپنے ہم نشینوں کو جمع کیا' اور غلام کو چار درہم دے کر بازار بھیجا کہ وہ اہل مجلس کے لئے کچھ پھل فروٹ خرید لائے' غلام اس مقصد کے لئے چلا' اور منصور ابن عمار کے دروازے سے گزرا' منصور اس وقت کسی حاجتمند کے لئے کچھ مانگ رہے تھے' اور کہہ رہے تھے کہ اگر کسی نے مجھے چار درہم دئے تو میں اس کے لئے دعائیں کروں گا' غلام نے انھیں چار درہم دے دئے' منصور نے ان سے دریافت کیا تم اپنے لئے کیا دعا کرانا چاہتے ہو' اس نے عرض کیا میں اپنے آقا سے نجات کا طالب ہوں' منصور نے اسکے لئے آزادی کی دعا کی' اور پوچھا کہ دوسری دعا کیا ہے' اس نے عرض کیا دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ مجھے ان چار درہم کا عوض عنایت فرمائے' منصور نے یہ دعا بھی کی' اور دریافت کیا تیسری دعا کیا ہے' اس نے عرض کیا دعا کیجئے اللہ تعالیٰ میرے آقا کو توبہ کی توفیق دے' منصور نے اس کے آقا کے لئے بھی دعا فرمائی غلام نے عرض کیا یہ دعا بھی فرما دیجئے کہ اللہ تعالیٰ میری' میرے آقا کی' آپ کی اور حاضرین مجلس کی مغفرت فرمائے' غلام بڑی تاخیر سے واپس پہنچا' آقا نے تاخیر کا سبب دریافت کیا' غلام نے تمام واقعہ من و عن بیان کر دیا' آقا نے دریافت کیا کہ تم نے کیا کیا دعائیں کرائی ہیں' غلام نے بتلایا میری پہلی دعا یہ تھی کہ مجھے آزادی مل جائے' آقا نے کہا جا میں نے تجھے آزاد کیا' غلام نے عرض کیا دوسری دعا میں نے یہ کرائی ہے کہ جو چار درہم میں خرچ کر رہا ہوں مجھے ان کا عوض مل جائے' آقا نے چار درہم نکال کر اسے دیدئے اور اس سے پوچھا کہ تیسری دعا کیا تھی' غلام نے جواب دیا کہ تیسری دعا یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ آپ کو توبہ کی توفیق بخشے' آقا نے کہا میں اللہ رب العزت کے سامنے توبہ کرتا ہوں' چوتھی دعا کیا تھا' غلام نے بتلایا کہ میری چوتھی دعا تھی کہ اللہ تعالیٰ میری' آپ کی' اور حاضرین کی بخشش فرمائے' آقا نے جواب دیا یہ چوتھی بات میرے بس سے باہر ہے' جب رات ہوئی اور وہ نیند کی آغوش میں پہنچا تو خواب میں دیکھا کہ ایک شخص یہ کہہ رہا ہے تیرے اختیار میں جو کچھ تھا وہ تو نے کیا' کیا تو یہ

سمجھتا ہے کہ جو ہمارے اختیار میں ہے وہ ہم نہیں کریں گے' جاؤ ہم نے تمہیں' غلام کو' منصور ابن عمار کو اور حاضرین مجلس کو بخش دیا۔
عبدالوہاب ابن عبدالحمید الثقفی سے مروی ہے کہ میں نے تین مردوں اور ایک عورت کو جنازہ اٹھا کر لے جاتے ہوئے دیکھا میں نے عورت کو ہٹایا اور اسکی جگہ خود سنبھال لی' پھر ہم چاروں اس جنازے کو قبرستان لے گئے' اور میت کو دفن کیا' میں نے عورت سے دریافت کیا کہ مرحوم سے تیرا کیا رشتہ ہے' عورت نے کہا' یہ میرا بیٹا ہے' میں نے اس سے پوچھا کیا تیرے پڑوس میں ایسے لوگ نہیں رہتے جو جنازے کی مشایعت کرتے' عورت نے جواب دیا کہ لوگ میرے بیٹے سے نفرت کرتے تھے' میں نے اسکی وجہ دریافت کی' عورت نے بتلایا کہ میرا بیٹا مخنث تھا راوی کہتے ہیں کہ مجھے اس عورت سے ہمدردی ہوئی میں اسے اپنے گھر لے کر آیا' اسے روپے' کپڑے اور غلہ وغیرہ دیا' رات کو سویا تو میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک شخص میرے پاس آیا' اس کا چہرہ چودھویں کے چاند کی طرح روشن تھا اس پر سفید کپڑے تھے' وہ میرا شکر ادا کرنے لگا' میں نے اس سے دریافت کیا کہ وہ کون ہے' اور کس لئے میرا شکر ادا کرتا ہے' اس نے جواب دیا کہ وہ وہی مخنث ہے جسے آج دن میں تم لوگوں نے دفن کیا ہے' آج میرے رب نے لوگوں کی حقارت آمیز نظروں کی وجہ سے جو وہ مجھ پر ڈالتے تھے مجھے رحمت کا مستحق سمجھا۔

ابراہیم اطروش کہتے ہیں کہ ہم بغداد میں دجلہ کے کنارے حضرت معروف کرخیؒ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ کچھ نوجوان لڑکے ایک کشتی میں نظر آئے جو اچھلتے کودتے' دف بجاتے اور شراب پیتے ہوئے جا رہے تھے' لوگوں نے حضرت معروف کرخیؒ سے کہا کیا آپ انھیں دیکھ رہے ہیں' کس طرح بے شرمی کے ساتھ علی الاعلان اللہ تعالیٰ کی نافرمانی پر کمربستہ نظر آتے ہیں' آپ ان کے لئے بددعا فرمائیں' آپ نے اپنے ہاتھ اٹھائے اور دعا کی اے اللہ جیسے تو نے انھیں دنیا میں خوشی بخشی ہے اسی طرح آخرت میں بھی مسرور کرنا تو لوگوں نے حیرت سے کہا آپ ان کے لئے ایسی دعا کرتے ہیں' فرمایا اگر ان کی قسمت میں آخرت کی خوشیاں ہوئیں تو انھیں توبہ کی توفیق ہوگی' بعض اکابر اپنی دعاؤں میں یہ عرض کیا کرتے تھے' الٰہی! کون ایسا ہے جو تیری نافرمانی نہ کرتا ہو' مگر تمام اہل دنیا پر تیری نعمت مکمل' اور سب کو تیرا رزق میسر ہے' تیرا علم اور تیری عظمت لامحدود ہے' لوگ سرکشی کرتے ہیں تو پھر بھی انھیں نعمتوں سے نوازتا ہے اور رزق عطا کرتا ہے گویا تجھے غصہ آتا ہی نہیں ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ یہ روایتیں' حدیثیں اور آثار مایوس اور خائف قلوب میں رجاء پیدا کرتے ہیں' لیکن مغرور احمق کو اس طرح کی باتیں نہ سنائی جائیں' بلکہ انھیں وہ مضامین پڑھنے چاہیے جو ہم کتاب الخوف میں لکھ رہے ہیں۔ اس لئے کہ اکثر لوگوں کی اصلاح صرف خوف سے ہوتی ہے' ایسے لوگوں کی مثال ایسی ہے جیسے بداطوار اور سرکش غلام' یا شریر لڑکا' ان کی اصلاح کے لئے کوڑے کی ضرورت ہے' نرمی سے یہ اور بگڑ جائیں گے' اور ان پر دین و دنیا میں اصلاح کا دروازہ بند ہو جائے گا۔

خوف کی حقیقت: جاننا چاہیے کہ خوف قلب کی اس تکلیف اور سوزش کو کہتے ہیں جو مستقبل میں کسی متوقع مصیبت کے خیال میں پیدا ہو' رجاء کی حقیقت کے ضمن میں خوف کی حقیقت بھی واضح ہو چکی ہے۔ جو شخص اللہ تعالیٰ سے مانوس ہوتا ہے' اور حق اس کے دل پر محیط ہو جاتا ہے' اور وہ ہر وقت جمال حق کے مشاہدے میں مستغرق رہتا ہے اسے مستقبل کا دھیان نہیں رہتا' اسلئے نہ اسکے دل میں خوف ہوتا ہے اور نہ رجاء' بلکہ اسکی حالت خوف و رجاء دونوں حالتوں سے اعلا و ارفع ہو جاتی ہے۔ اسلئے کہ یہ دونوں حالتیں دو باگیں ہیں جو نفس کے سرکش گھوڑے کو اعتدال سے بہکنے نہیں دیتیں اور دل میں خوف و رجاء کا نہ ہونا دراصل نفس کو مکمل طور سے مطیع ہونے پر دلالت کرتا ہے واسطیؒ فرماتے ہیں کہ خوف اللہ اور اسکے بندے کے درمیان حجاب ہے' یہ بھی فرمایا کہ اگر دلوں پر حق منکشف ہو جائے تو ان میں نہ رجاء کی گنجائش رہے' اور نہ خوف کی چنانچہ اگر کسی عاشق کے دل میں مشاہدۂ معشوق کے دوران فراق کا خوف ہو تو وہ اس کے جمال کے مشاہدے سے صحیح طور پر لطف اندوز نہیں ہو سکیگا' بلکہ اسکا مشاہدہ ناقص رہے گا' حالانکہ مقامات کی انتہا یہ ہے کہ مشاہدہ دائمی ہو اور اسے کسی منفعت کی امید اور مضرت کا خوف منقطع نہ کرے۔

خوف کے اجزائے ترکیبی: رجاء کی طرح خوف کی حالت بھی تین چیزوں سے مرکب ہے علم' حال' اور عمل۔ علم سے مراد اس

سبب کا ادراک ہے جو برائی پہنچائے۔ مثلاً ایک شخص نے بادشاہ کی شان میں گستاخی کی' یا اسکے حکم سے سرتابی کی' پھر وہ گرفتار کرلیا گیا' اور بادشاہ کے سامنے پیش کیا گیا' اس صورت میں اسے یقیناً اپنے قتل کئے جانے کا خوف ہوگا' اگرچہ یہ بھی ممکن ہے کہ بادشاہ اسے معاف کردے یا کسی طرح وہ قید سے رہا ہوجائے' لیکن اسکے قلب میں قتل کا خوف ضرور ہوگا۔ پھر وہ خوف اسی قدر قوی ہوگا جس قدر قوی قتل کے اسباب ہوں گے مثلاً جرم کا سنگین ہونا' یا بادشاہ کا دین کے تئیں کینہ اور حسد رکھنا' یا اس کا منتقم مزاج ہونا اور ایسے لوگوں میں گھرا ہوا ہونا جو اسے انتقام لینے پر اکسائیں' کسی سفارش کرنے والے سے محروم ہونا' اور ان تمام وسائل سے تہی دست ہونا جو بادشاہ کی ناراضگی ختم کرسکتے ہیں' یا اس کی آتش انتقام کو سرد کرسکتے ہیں' اگر یہ تمام اسباب مجتمع ہوں' اور مجرم کو ان کا علم بھی ہو تو بلاشبہ اسکے دل میں اپنے قتل کئے جانے کا خوف بہت زیادہ ہوگا۔ جس قدر یہ اسباب ضعیف ہوں گے' یا کم ہوں گے اسی قدر خوف کی تکلیف کم ہوگی۔

کبھی خائف اسلئے خوف زدہ نہیں ہوتا کہ اس نے کوئی جرم کیا ہے' بلکہ ڈرانے والے کا کوئی وصف اسے ڈرنے پر آمادہ کرتا ہے جیسے کوئی شخص کسی درندے کے پنجوں میں پھنس جائے وہ یقیناً درندے سے خوف کرے گا' کیونکہ اسے اسکے وصف درندگی کا علم ہے' اور وہ یہ جانتا ہے کہ چیر پھاڑ کرنا اسکا محبوب مشغلہ ہے' گو اس کا یہ وصف اختیاری ہے' اسی لئے بعض اوقات درندے اپنے شکار کو نقصان پہنچائے بغیر گزر جاتے ہیں' بعض اوقات ایسے وصف سے خوف ہوتا ہے جو اختیار میں نہیں ہوتا' بلکہ مخوف کی سرشت میں ہوتا ہے جیسے کوئی شخص پانی کے تیز بہاؤ میں گر جائے' یا ایسی جگہ محبوس ہوجائے جہاں آگ لگ رہی ہو' آدمی پانی اور آگ سے اس لئے ڈرتا ہے کہ پانی کی فطرت غرق کرنا ہے' اور آگ کی فطرت جلانا۔

غرضیکہ برائی کے اسباب کی معرفت سے دل میں سوزش اور باطن میں تکلیف ہوتی ہے' اسی سوزش درون' اور درد باطن کا نام خوف ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ سے خوف کرنا کبھی تو اس کی ذات وصفات کی معرفت سے ہوتا ہے کہ اگر وہ تمام عالم کو ہلاک کردے تو اسے ذرا پروا نہ ہو' نہ اسے کوئی روک سکتا ہے' اور نہ ہلاک کرنے پر ملامت کرسکتا ہے' اور کبھی بندہ اپنے گناہوں کی کثرت کی وجہ سے خوف کرتا ہے' اور کبھی یہ دونوں باتیں جمع ہوجاتی ہیں۔ پھر جس قدر یہ یقین پختہ ہوگا کہ اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے جو کچھ ہے' وہ بے نیاز ہے' وہ جو کچھ کرتا ہے کوئی اس پر گرفت کرنے والا نہیں ہے' جب کہ بندے ہر حال میں دارو گیر کے مرحلے سے گزریں گے جس قدر یہ اعتقاد بڑھے گا اسی قدر خوف بھی زائد ہوگا۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے زیادہ خوف اس شخص کو ہوتا ہے جو اپنے نفس سے زیادہ واقف ہوتا ہے' اسی لئے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :-

وَاللّٰہِ اِنِّی لَاَخْشَاکُمْ لِلّٰہِ وَاَتْقَاکُمْ لَہٗ (بخاری۔ انس)

بخدا میں خدا تعالیٰ سے تم سب میں زیادہ ڈرنے والا اور خوف کرنے والا ہوں۔

اور اسی بناء پر قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا :-

اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا (پ ۲۲ر ۱۶ آیت ۲۸)

اللہ تعالیٰ سے اس کے بندوں میں سے صرف اہل علم ہی ڈرتے ہیں۔

خوف کے اثرات : بہرحال جب یہ معرفت (باری تعالیٰ کی صفات اور اپنے گناہوں کی) مکمل ہوتی ہے تو اس سے دل میں خوف پیدا ہوتا ہے اور باطن میں سوزش ہوتی ہے' پھر اس سوزش کے اثرات دل سے منتقل ہوکر بدن کے دوسرے اعضاء تک پہنچتے ہیں' بدن میں اس سوزش و خوف سے کمزوری' لاغری' زردی وغیرہ رونما ہوتی ہے' بندہ روتا اور چلاّتا ہے' بعض اوقات اس سوزش کی وجہ سے پتّہ پھٹ جاتا ہے' اور ہلاکت کا سبب بنتا ہے' کبھی یہ حرارت دماغ پر حملہ آور ہوتی ہے اور اسے فاسد کردیتی ہے' اور کبھی یہ حرارت اس قدر اثر انداز ہوتی ہے کہ مایوسی اور ناامیدی کی حالت میں مبتلا کردیتی ہے' اعضاء میں اس خوف کا اثر یہ ہوتا ہے کہ اسے گناہوں سے روک دیتا ہے' اور اطاعات کا پابند بنادیتا ہے تاکہ ماضی میں جو تقصیر ہوچکی ہے' اسکی تلافی ہوجائے' اور مستقبل کی اچھی طرح تیاری ہوسکے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ خائف اس شخص کو نہیں کہتے جو روئے اور اپنے دامن سے آنکھیں پونچھ لے' بلکہ خائف وہ ہے کہ جس چیز سے سزا کا خوف ہے اسے ترک کردے۔ ابوالقاسم حکیم کہتے ہیں جو شخص کسی چیز سے ڈرتا ہے اس سے دور بھاگتا ہے مگر جو شخص خدا سے

ڈرتا ہے وہ اسی کے دامان رحمت میں پناہ لیتا ہے۔ حضرت ذوالنون مصریؒ سے کسی نے دریافت کیا کہ بندہ خائف کب ہوتا ہے' انھوں نے جواب دیا جب کوئی شخص اس مریض کی طرح ہوجائے جس کا مرض خطرناک ہو' اور وہ ہلاکت کے خوف سے مضر غذاؤں سے پرہیز کرے۔ صفات پر خوف کا اثر یہ ہوتا ہے کہ شہوات کا قلع قمع ہوجاتا ہے' دنیاوی لذات سے نفرت ہوجاتی ہے' یہاں تک کہ وہ تمام گناہ برے معلوم ہونے لگتے ہیں جو پہلے محبوب تھے۔ جیسے کسی کو شہد کی رغبت ہو' لیکن جب یہ معلوم ہو کہ اس میں زہر ملا ہوا ہے تو رغبت نفرت سے بدل جائے' اسی طرح خوف کی تپش سے شہوات جل جاتی ہیں' اعضاء میں ادب آجاتا ہے' دل میں انکسار' تواضع' خشوع و خضوع جیسے اوصاف پیدا ہوجاتے ہیں' کبر' حقد اور حسد جیسے اوصاف ذمیمہ دور ہوجاتے ہیں' آدمی کی پوری توجہ اپنے خوف کی طرف مبذول ہوجاتی ہے' اسے اتنا ہوش ہی نہیں رہتا کہ کسی اور طرف نظر کرسکے' وہ ہر وقت اپنے محاسبے' مجاہدے اور مراقبے میں مشغول رہتا ہے' اسے ایک ایک لمحہ' ایک ایک قدم اور ایک ایک لفظ اتنا عزیز ہوجاتا ہے کہ اسے ضائع نہیں کرتا' بلکہ ان چیزوں میں پوری طرح بخیل نظر آتا ہے۔ اس کا حال ایسا ہوتا ہے جیسے کوئی شخص کسی خونخوار درندے کے پنجوں میں مقید ہوجائے اور اسے یہ معلوم نہ ہو کہ اسکی غفلت سے فائدہ اٹھاکر میں بھاگ جاؤں گا یا اسکی گرفت میں دم توڑدوں گا' اور اس کے لئے لقمۂ تر بن جاؤں گا' اگر کوئی شخص اس حال میں گرفتار ہو تو اس کا دل دماغ اور ظاہر و باطن اسی ادھیڑبن میں لگا رہتا ہے کہ اس سے آزادی حاصل کرے' کسی دوسری چیز کا تصور بھی دل میں نہیں آتا' یہی حال اس شخص کا ہوتا ہے جس پر خوف زیادہ غالب ہو' بعض صحابہ اور تابعین کا یہی حال تھا کہ خوف انکے رگ و پے پر مسلط تھا۔

اعمال میں خوف کے مراتب: پھر جس قدر خوف قوی ہوتا ہے' اور جس قدر اللہ تعالیٰ کی صفات جلال اور اپنے نفس کے عیوب کی معرفت قوی ہوتی ہے اسی قدر مراقبہ' محاسبہ' اور مجاہدہ قوی ہوتا ہے' اعمال میں خوف کے اثرات کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ آدمی شرعی محرمات کے ارتکاب سے باز رہے' شریعت کے منع کردہ امور سے بچنے کو ورع کہتے ہیں' اگر خوف پختہ ہو تو آدمی ان امور سے بھی احتیاط کرے گا جن میں حرمت کا امکان ہے یعنی وہ امور جو یقینی طور پر حرام نہیں ہیں' بلکہ ان کی حرمت و حلت مشتبہ ہے ان سے بھی بچے گا' اس درجے کا نام تقویٰ ہے' تقویٰ کے معنی ہی یہ ہیں کہ آدمی مشتبہات ترک کردے' اور یقینی امور پر عمل کرے' بعض اوقات آدمی وہ امور بھی ترک کردیتا ہے جن میں کوئی حرج نہیں ہوتا' مگر انھیں بھی اس خوف سے چھوڑدیتا ہے کہ کہیں یہ مشتبہ نہ ہوں۔ اس درجے کا نام صدق فی التقویٰ ہے' اور اگر اس درجے پر مجرد عبادت ہو یعنی صرف وہی چیزیں استعمال کرتا ہو جو اسکی ضرورت کی ہیں' مثلاً جس گھر میں نہ رہنا ہو اسے تعمیر نہ کرے اور جو چیز نہ کھانا ہو اسے جمع نہ کرے' اور دنیا کی طرف ذرا التفات نہ کرے' اور یہ جانے کہ دنیا جدا ہوجانے والی چیز ہے' اور اپنے ایک بھی سانس کو غیر اللہ کے تصور میں ضائع نہ کرے یہ صدق ہے۔ اور ایسے شخص کو صدیق کہنا بالکل موزوں ہے' اس ترتیب کے لحاظ سے صدق میں تقویٰ داخل ہے۔ اور تقویٰ میں ورع داخل ہے' اور ورع میں عفت داخل ہے' اسلئے کہ عفت شہوات کے مقتضی سے بچنے کا نام ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ خوف اعمال پر دونوں اعتبار سے مؤثر ہوتا ہے' اقدام کے اعتبار سے بھی' اور باز رہنے کے اعتبار سے بھی' لیکن باز رہنے میں ان چیزوں کے اعتبار سے جن سے باز رہا جائے اعمال کے نام مختلف ہوجاتے ہیں' مثلاً شہوات سے رکنے کو عفت کہتے ہیں' اس سے اعلا مرتبہ ورع ہے' یہ عفت کی بہ نسبت عام ہے' کیونکہ ورع ہر ممنوع اور حرام چیز سے باز رہنے کو کہتے ہیں اس میں شہوت کی تخصیص نہیں ہے' ورع سے اعلا درجہ تقویٰ کا ہے' اسلئے کہ تقویٰ ممنوع اور مشتبہ دونوں چیزوں سے بچنے کا نام ہے' تقویٰ سے اعلا درجہ صدق کا ہے۔ اسکے معنی ہیں شبہے کے ڈر سے مباح پر بھی اقدام نہ کرے' جیسا کہ ظاہر ہے ان درجات میں سے ہر درجہ اپنے سے پہلے درجہ کے مقابلے میں اعلا ہے' اسلئے قدرتی طور پر آخری درجہ یعنی صدق اپنے سے پہلے تمام درجات کو شامل ہوگا' مثلاً یہ کہا جائے کہ انسان عربی ہے یا عجمی' اور عربی قریشی ہے یا نہیں' اور قریشی ہاشمی ہے یا نہیں' اور ہاشمی علوی ہے یا نہیں اور علوی حسنی ہے یا حسینی اگر تم یہ کہو کہ حسنی ہے تو گویا تم نے اس سے پہلے کے تمام اوصاف شامل کرلئے یعنی وہ علوی بھی ہے' ہاشمی قرشی اور عربی بھی ہے' لیکن اگر تم نے علوی کہا تو پیچھے کے تمام اوصاف شامل ہوں گے' اوپر کا وصف شامل نہیں ہوگا' یعنی وہ عربی قرشی' ہاشمی ہوگا' لیکن حسنی نہیں ہوگا۔

اسی طرح اگر تم نے کسی شخص کو صدیق کہا تو گویا اسے متقی صاحب ورع اور عفیف کہا۔ یہ خیال نہ کرنا چاہیے کہ ان درجات کے لئے الگ الگ الفاظ ہیں اسلئے ان کے معانی بھی ایک دوسرے سے مختلف اور جداگانہ ہوں گے۔ اگر یہ خیال کیا گیا تو امر حق کو سمجھنا مشکل ہو جائے گا' چنانچہ جو لوگ محض الفاظ سے معانی کی جستجو کرتے ہیں ان پر امر حق واضح نہیں ہوپاتا۔ اگر الفاظ کو معانی کے تابع کریں تو شبہے میں مبتلا نہ ہوں۔ یہ ہے خوف کا اجمالی بیان' اس میں خوف کی حقیقت بیان کی گئی ہے اور اس معرفت کا ذکر بھی ہے جو خوف کا موجب ہے اور ان اعمال کا بھی ذکر ہے جو خوف کی وجہ سے ترک کئے جاتے ہیں یا خوف کی وجہ سے کئے جاتے ہیں۔

خوف کے درجات اور قوت و ضعف کا اختلاف

جاننا چاہیے کہ خوف ایک عمدہ چیز ہے' اور کبھی قیاس کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ اچھی چیز کا قوی اور زیادہ ہونا بھی ایک عمدہ وصف ہو' اس لحاظ سے یہ بات طے شدہ ہونی چاہیے کہ خوف جتنا قوی اور شدید ہوگا اسی قدر بہتر ہوگا' حالانکہ یہ غلط ہے بلکہ خوف ایک کوڑا ہے جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو علم و عمل پر مواظبت کی طرف ہنکاتا ہے تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کی قربت کے درجے پر فائز ہوں' چوپائے اور بچے ہر حال میں اسکوڑے کے محتاج ہیں' لیکن اس کا مطلب نہیں کہ انھیں بہت زیادہ مارا جائے' یا زیادہ مارنا کوئی اچھی بات ہے' بلکہ جس طرح شریعت نے مختلف چیزوں کی حدود متعین کردی ہیں' اسی طرح خوف کی بھی ایک حد مقرر ہے' یہی حد اعتدال ہے ورنہ ایک طرف تفریط کی مثال عورتوں کا رونا ہے' عورتیں جب بھی قرآن کریم کی کوئی ایسی آیت سنتی ہیں جو وعید پر مشتمل ہوتی ہے تو ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے ہیں' لیکن جب دل اس آیت سے غافل ہوتا ہے تو پھر پہلی جیسی حالت کی طرف لوٹ جاتی ہیں' گویا اس آیت کا ان کے دلوں پر کوئی اثر ہوا ہی نہیں تھا۔ اس طرح کا خوف حد اعتدال سے کم ہے' اور اس سے فائدہ بھی بہت کم ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی تنومند اور سخت جان جانور کو کسی نرم و نازک ٹہنی کی ضرب لگائی جائے' بھلا اس ہلکی مار کا اسکے جسم پر کیا اثر ہوگا؟ جب اثر ہی نہ ہوگا تو وہ ہماری مرضی کے مطابق کیا کرے گا۔ عام طور پر جو لوگ خوف کرتے ہیں ان کا خوف اسی نوعیت کا ہوتا ہے' البتہ عارفین اور علماء اس کلیے سے مستثنیٰ ہیں' مگر علماء سے ہماری مراد وہ عالم نہیں ہیں جو علماء کی ہیئت اختیار کرلیتے ہیں' اور ان کے القاب اپنا لیتے ہیں' ایسے لوگ تو خوف میں بہت پیچھے ہوتے ہیں' بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ ان میں ذرا خوف نہیں ہوتا تو صحیح ہوگا علماء سے ہماری مراد ارباب علم و آگہی ہیں جو اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات' اسکے ایام اور اسکے افعال کا علم رکھتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس طرح کے علماء ناپید ہیں۔ حضرت فضیل ابن عیاض فرمایا کرتے تھے کہ اگر کوئی شخص تجھ سے پوچھے کہ کیا تو اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے تو خاموشی اختیار کر' اسلئے کہ اگر تونے اس سوال کے جواب میں "نہیں" کہا تو یہ کفر ہوگا اور "ہاں" کہا تو یہ جھوٹ ہوگا۔ حضرت فضیل کا منشاء یہ بتلانا ہے کہ خوف وہ ہے جو اعضاء کو معاصی سے روک دے اور انھیں اطاعات کا پابند کردے' جس خوف کا اعضاء پر اثر نہ ہو وہ محض وسوسہ اور خیال ہے' اس کو خوف کہنا کسی بھی طرح صحیح نہیں ہے۔

حد اعتدال سے متجاوز خوف جسے افراط کہہ سکتے ہیں کہ آدمی قطعی مایوسی اور ناامیدی کا شکار ہوجائے' یہ بھی ممنوع ہے' کیوں کہ اس سے بھی عمل میں رکاوٹ ہوتی ہے' جب کہ خوف محض ایک تازیانہ ہے' جس سے بندہ عمل کی طرف راغب ہے' اگر خوف کی بنا پر عمل ہی ترک کردے تو ایسے خوف سے کیا فائدہ۔ بلکہ یہ تو خالص نقصان کی بات ہے' یہ نقصان جہل اور عجز کی وجہ سے ہے' جہل یہ ہے کہ وہ اپنی عاقبت سے واقف نہیں ہے' اگر واقف ہوتا تو ہرگز مایوس نہ ہوتا' اور نہ اس قدر خوف کرتا' کیوں کہ خائف ہی انجام میں متردد رہتا ہے۔ اور عجز یہ ہے کہ وہ ایک امر ممنوع میں مبتلا ہے اور اسے دفع کرنے پر قادر نہیں ہے۔ اگر آدمی کے نقص کو سامنے رکھا جائے تو اس قسم کا خوف اچھا ہے' اور یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس خوف کا ہونا نہ ہونے سے بہتر ہے' مگر حقیقت میں علم' قدرت وغیرہ اوصاف ہی قابل تعریف ہیں' اسلئے کہ ان سے اللہ تعالیٰ کا وصف بیان کیا جاسکتا ہے۔ جن چیزوں سے اللہ تعالیٰ کا وصف بیان نہیں کیا جاسکتا وہ فی نفسہ قابل تعریف نہیں ہیں' تاہم انھیں اس نقصان کے مقابلے میں بہتر کہہ سکتے ہیں جو ان اوصاف کی بہ نسبت کم تر ہے' جیسے دوا کی مشقت

برداشت کرنا فی نفسہٖ کوئی پسندیدہ بات نہیں ہے' لیکن مرض اور موت کے مقابلے میں یہ مشقت بہرحال آسان ہے اور اس اعتبار سے بہتر بھی ہے۔ بہرحال جو خوف کہ مایوسی پر منتج ہو وہ مذموم ہے' کبھی خوف سے مرض' ضعف' حیرانی' بے ہوشی اور دیوانگی جیسی کیفیات پیدا ہو جاتی ہیں یہ خوف بھی پسندیدہ نہیں ہے' جیسے وہ مار مذموم ہے۔ جس سے بچے کی جان ضائع ہو جائے یا وہ ضرب جس سے جانور ہلاک ہو جائے یا بیمار پڑ جائے یا ناکارہ ہو جائے۔

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بکثرت رجاء کے اسباب بیان فرمائے ہیں' تاکہ ان کے ذریعے اس صدمۂ خوف کا علاج کیا جائے جو مایوسی تک پہنچا دے اور ہلاکت سے قریب تر کر دے اس سلسلے میں یہ قاعدہ یاد رکھنا چاہیے کہ جو چیز کسی دوسرے کے لئے مقصود ہوتی ہے اس میں صرف وہی حصہ محمود ہوتا ہے جس سے مطلوب حاصل ہو' جس سے مطلوب حاصل نہ ہو وہ مذموم ہوتا ہے۔ اس قاعدے کی روشنی میں دیکھئے خوف کا فائدہ یہ ہے کہ آدمی ممنوعات و محرمات سے بچے' تقویٰ اور پرہیزگاری اختیار کرے' مجاہدے' عبادت اور ذکر و فکر میں مشغول ہو اور وہ تمام اسباب حاصل کرنے کی کوشش کرے جو اسے اللہ تعالیٰ تک پہنچا دیں۔ ان میں سے ہر امر زندگی تندرستی اور عقل کی سلامتی پر موقوف ہے' اسلئے وہ مذموم ہو گا جو ان تینوں میں سے کسی ایک کو یا سب کو متاثر کرے۔

خوف سے مرنے والے کی فضیلت : یہاں تم یہ کہہ سکتے ہو کہ جو شخص خدا تعالیٰ کے خوف سے مرجاتا ہے وہ شہید ہوتا ہے اس صورت میں زیادتیٔ خوف کو مذموم کیسے کہا جا سکتا ہے؟ اسکا جواب یہ ہے کہ اس شخص کو خوف کے باعث مرنے کی بنا پر ایسا مرتبہ حاصل ہو گا کہ اگر اس وقت خوف کی وجہ سے نہ مرتا تو یہ مرتبہ حاصل نہ ہوتا جو اس وقت حاصل ہوا ہے' اس اعتبار سے دیکھا جائے تو ایسا شخص واقعی فضیلت کا حامل ہے۔ لیکن اگر یہ خیال کیا جائے کہ بالفرض یہ شخص خوف کی وجہ سے نہ مرتا' اور دیر تک زندہ رہ کر اللہ کی اطاعت کرتا' اور راہ سلوک طے کرنے میں مصروف رہتا تو یقیناً اسے زیادہ فضیلت حاصل ہوتی۔ اس لئے کہ جو شخص فکر اور مجاہدے میں مشغول رہتا اور اللہ تعالیٰ کی معارف میں ترقی کرتا ہے اسے ہر لمحہ اور ہر آن ایک شہید کا نہیں بلکہ بہت سے شہداء کی فضیلت حاصل ہوتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو وہ مجنون جسے کوئی درندہ لقمہ بنا لے یا وہ بچہ جو کسی ظالم کے ہاتھوں قتل ہو جائے ایسے انبیاء اور اولیاء سے افضل ہونا چاہیے جو اپنی موت انتقال کریں' حالانکہ یہ ایک ناممکن اور محال بات ہے۔ اسی طرح یہاں یہ بھی نہ سمجھنا چاہیے کہ خوف کے باعث مرنے والا شخص افضل ہے' بلکہ افضل ترین سعادت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں عمر زیادہ ہو' جس چیز سے بھی عمر ختم ہو گی یا عقل اور صحت برباد ہو گی وہ نقصان ہے' اگرچہ بعض امور کے اعتبار سے اس میں فائدہ بھی ہو' جیسے شہادت گناہ پر خاتمے کے مقابلے میں یقیناً ایک زبردست فضیلت ہے' لیکن شہداء کو یقیناً وہ درجہ حاصل نہیں ہوتا جو متقین اور صدیقین کو حاصل ہوتا ہے۔

اس تفصیل سے ثابت ہوا کہ اگر خوف اعمال پر اثر انداز نہ ہو تو اس کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے وہ کوڑا جو جانور پر استعمال ہو لیکن اسکی چال پر اثر انداز نہ ہو۔ لیکن اگر خوف مؤثر ہو تو اس کی اثرات کے مختلف اور متعدد مراتب ہیں' مثلاً وہ خوف عفت پر آمادہ کرے' یعنی محض شہوات کے تقاضوں پر عمل کرنے سے روکے' یہ بھی ایک اور درجہ ہے' ورع اس سے اعلا درجہ ہے' اور انتہائی درجہ صدیقین کا ہے۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ بندہ کا ظاہر و باطن صرف اللہ تعالیٰ کے لئے وقف ہو' یہاں تک کہ غیر اللہ کے لئے اس میں کوئی گنجائش ہی باقی نہ رہے' خوف کا یہ درجہ انتہائی پسندیدہ اور محبوب ہے۔ لیکن اس کا حصول صحت و عقل کی سلامتی کے ساتھ مربوط ہے' اگر کسی کا خوف اس قدر بڑھ جائے کہ صحت ضائع ہو جائے اور عقل جاتی رہے تو یہ مرض ہے اور اس کا علاج ضروری ہے' اگر یہ صورت پسندیدہ ہوتی کہ خوف کی وجہ سے آدمی فاتر العقل ہو جائے اور اس کا جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ بن جائے تو اسباب رجاء کی کیا ضرورت تھی' حضرت سہیل تستریؒ اپنے ان مریدین سے جو کئی کئی دن بھوکے رہ کر ریاضت کیا کرتے تھے فرماتے تھے کہ اپنی عقلوں کی حفاظت کرتے رہنا اسلئے کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی ولی ناقص العقل نہیں ہوتا۔

خوف کی اقسام : (ان چیزوں کی بنسبت جن سے خوف کیا جائے)۔

جاننا چاہیے کہ خوف کسی بری چیز کے انتظار اور توقع سے ہوتا ہے' اور بری چیز کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جو خود اپنی ذات سے بری ہو جیسے دوزخ کی آگ' اور دوسری وہ جو کسی بری چیز کا ذریعہ بنتی ہو جیسے گناہوں کو اس خیال سے برا سمجھنا کہ وہ آخرت میں عذاب کا باعث

بنیں گے' اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی مریض خوش ذائقہ میووں سے اسلئے نفرت کرے کہ وہ اس کے مرض میں اضافہ کا سبب بنیں گے' اور اسے ہلاک کردیں گے' ہر خائف کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے دل میں ان دونوں قسموں کا یا ان میں سے ایک کا تصور راسخ کرلے' اور ان دونوں برائیوں کے انتظار کو اپنے قلب میں اس قدر پختہ کرلے کہ دل جلنے لگے۔

خائفین کی مختلف حالتیں: خائفین کا حال اس امر مکروہ کے اعتبار سے مختلف ہوتا ہے جو ان کے دلوں پر غالب آجاتا ہے' ان میں ایک گروہ وہ ہے جن کے دل پر کوئی ایسی حالت غالب آجائے جو بذات خود مکروہ نہیں ہوتی' بلکہ کسی امر مکروہ کا ذریعہ ہونے کے باعث مکروہ ہوتی ہے' اس گروہ کے بعض افراد پر یہ خوف غالب ہوتا ہے کہیں توبہ سے پہلے ہی نہ مرجائیں' بعض لوگ توبہ کرلیتے ہیں اور انھیں توبہ شکنی کا خوف رہتا ہے' وہ عہد شکنی سے ڈرتے ہیں' یا اس لئے ڈرتے ہیں کہ کہیں قلب کی رقت سختی سے نہ بدل جائے' بعض لوگ پائے استقامت میں لغزش سے خوف کھاتے ہیں' ہمت سے اسلئے ڈرتے ہیں کہ کہیں وہ اتباع شہوات کے بات میں اپنی عادات کے اسیر نہ ہوجائیں' یا اسلئے خوف کرتے ہیں کہیں اللہ تعالیٰ ہمیں ہماری ان حسنات کے حوالے نہ کردے جن پر ہمیں بھروسہ ہے اور جن کی وجہ سے بندوں میں ہماری عزت قائم ہے' یا اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر اترانے سے ڈرتے ہیں' یا اللہ تعالیٰ سے اعراض کرکے غیر اللہ میں مشغول ہونے کا خوف کھاتے ہیں' یا اسلئے ڈرتے ہیں کہ اطاعات کے سلسلے میں جو کچھ مکر و فریب ہم کرتے ہیں وہ اللہ پر منکشف ہے' اور اس پر ہماری گرفت ہوسکتی ہے' یا اسلئے خوف کھاتے ہیں کہ ہم کچھ غیبت' خیانت' اور بد معاملگی کرتے ہیں ان سب سے اللہ تعالیٰ باخبر ہیں' اور ان پر سزا مل سکتی ہے' بعض لوگوں کو یہ خوف ہوتا ہے کہ نہ جانے باقی زندگی میں ہم سے کیا کیا قصور سرزد ہوں' اور ہم کن کن گناہوں میں مبتلا ہوں' بعض لوگوں کو دنیا میں عقوبت کی تعجیل کا خوف ہوتا ہے' بعض اسلئے ڈرتے ہیں کہ کہیں موت سے پہلے ہی ان کی رسوائی کا سامان نہ ہوجائے' بعض لوگ دنیاوی لذات کا شکار ہونے سے ڈرتے ہیں' بعض اسلئے ڈرتے ہیں کہ غفلت کے عالم میں ہمارے دل کی جو کیفیت ہوتی ہے اس سے اللہ تعالیٰ باخبر ہے۔ بعض کو سوء خاتمہ کا خوف ستاتا ہے' اور بعض تقدیر ازلی سے خوف زدہ رہتے ہیں کہ نہ جانے ہماری قسمت میں کاتب ازل نے کیا لکھا ہے' یہ سب امور وہ ہیں جن سے اللہ کی معرفت رکھنے والے خوف زدہ رہتے ہیں' ان میں سے ہر خوف کا ایک خاص فائدہ ہے' چنانچہ جو شخص کسی چیز سے ڈرتا ہے اس سے بچتا بھی ہے' مثلاً اگر کسی شخص کو یہ خوف ہو کہ وہ فلاں برائی کا عادی ہوجائے گا تو اس برائی کو ترک کرے گا' اور اس ترک پر مواظبت کرے گا' اسی طرح اگر کسی شخص کو یہ خوف ہو کہ اللہ تعالیٰ غفلت کی حالت میں میرے دل کی حالت سے باخبر ہے تو وہ اپنے دل کو وساوس سے پاک کرے گا' اسی طرح دوسرے مخاوف کو بھی قیاس کرنا چاہیے۔

متقین پر ان سب مخاوف میں سوء خاتمہ کا خوف زیادہ رہتا ہے' اسلئے کہ خاتمے کا معاملہ سب سے زیادہ خطرناک ہے' خوف کی اعلا قسم جو کمال معرفت کی دلیل ہے' وہ تقدیر ازلی کا خوف ہے' خاتمہ اسی تقدیر ازلی کا تتمہ' اسکی فرع اور ثمرہ ہے' درمیان میں چند چیزیں حائل ہوگئی ہیں' تقدیر ازلی میں جو کچھ لکھا ہوا ہے وہ خاتمے سے ظاہر ہوجاتا ہے۔ خاتمہ اور سابقہ سے ڈرنے والوں کی مثال ایسی ہے جیسے دو شخصوں کے بارے میں بادشاہ کوئی حکم تحریر کرے' یہ بھی ممکن ہے کہ اس حکم کی رو سے ان دونوں کو خلعت سے نوازا جائے اور انعام و اکرام عطا کیا جائے' اور یہ بھی ممکن ہے کہ دونوں سزا کے مستحق ہوں' اور سولی پر چڑھائے جائیں' ان دونوں کو یہ تو معلوم ہے کہ بادشاہ نے ان کے متعلق کوئی فرمان جاری کیا ہے' لیکن وہ یہ نہیں جانتے کہ اس فرمان کی رو سے انھیں کیا ملنے والا ہے' سزا یا انعام! ایک شخص کا دل اس وقت میں لگا ہوا ہے جب وہ فرمان اسکے پاس آئے گا اور اسے کھول کر دیکھے گا' اور دوسرے کا دل اس وقت کا تصور کئے ہوئے ہیں جس وقت وہ فرمان لکھا گیا' معلوم نہیں اس وقت بادشاہ کا دل غیظ و غضب سے لبریز تھا یا رحم و کرم سے معمور تھا۔ اس دوسرے شخص کی تمام تر توجہ حکم کے سبب پر ہے' جبکہ پہلے کا التفات اسکی فرع یعنی حکم پر ہے' ظاہر ہے دوسرے کا التفات پہلے کے التفات سے اعلا ہوگا۔ اسی طرح اس تقدیر کا خیال کرنا جو کاتب ازل نے لوح محفوظ پر لکھ دی ہے اس امر کے خیال سے افضل ہوگا جو خاتمے کے وقت ظاہر ہونے والا ہے۔ چنانچہ ایک روایت میں اس امر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

مروی ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر تشریف فرماتے کہ آپ نے اپنی دائیں مٹھی بند کی اور فرمایا یہ نوشتۂ الٰہی ہے' اس میں اہل جنت کے اور ان کے آباء کے نام لکھے ہوئے ہیں' نہ ان میں سے کوئی نام کم ہوگا اور نہ زیادہ ہوگا' پھر آپ نے بائیں مٹھی بند کی اور ارشاد فرمایا کہ یہ نوشتۂ الٰہی ہے' اس میں اہل جہنم کے نام اور ان کے آباء کے نام درج ہیں' نہ ان میں کمی ہوگی نہ زیادتی' اور جو لوگ اہل سعادت ہیں وہ اہل شقاوت کے سے کام کریں گے یہاں تک کہ لوگ کہیں گے یہ انہی میں سے ہیں بلکہ وہی ہیں پھر اللہ تعالیٰ موت سے پہلے انہیں بدبختوں کے زمرے سے خارج کر دیتا ہے گویا ایک ہی لمحہ پیشتر کیوں نہ خارج کرے اور بدبخت لوگ اہل سعادت کے سے اعمال کریں گے' یہاں تک کہ لوگ کہیں گے کہ یہ سعادت مندوں میں سے ہیں' بلکہ سعادت مند ہی ہیں' لیکن اللہ تعالیٰ موت سے قبل انھیں نیک بخت لوگوں کے زمرے سے نکال دے گا' گو ایک لمحہ پہلے ہی کیوں نہ نکالے۔ سعید وہی ہے جو قضاء الٰہی میں سعید ہو چکا ہے' اور شقی وہ ہے جو قضاء الٰہی میں شقی قرار پا چکا ہے' اور اعمال (کی قبولیت یا عدم قبولیت) کا مدار خاتمے پر ہے (ترمذی۔ عبداللہ ابن عمرو ابن العاص)

سابقہ اور خاتمہ سے خوف کرنے والے ان شخصوں کے لئے دوسری مثال یہ دی جاسکتی ہے کہ ان کا خوف ایسا ہے جیسے دو شخص کہ ان میں سے ایک اپنے گناہوں سے ڈرتا ہو' اور دوسرا اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہو' کیونکہ وہ اس کی صفت جلال کی معرفت رکھتا ہے اور ان اوصاف سے واقف ہے جو اسکی ہیبت کے مقتضی ہیں' ظاہر ہے یہ دوسرا شخص مرتبے میں اعلا ہوگا' اسی لئے یہ خوف باقی بھی رہتا ہے' اگرچہ وہ اطاعت پر مواظبت کرے تو اس فریب سے محفوظ بھی رہ سکتا ہے۔ بہرحال معصیت سے ڈرنا نیک لوگوں کا ڈرنا ہے' اللہ سے ڈرنا موحدین و صدیقین کا ڈرنا ہے' اور یہ ڈر معرفت الٰہی کا ثمرہ ہے جو شخص اللہ کی معرفت رکھتا ہے' اور اسکی صفات کا علم رکھتا ہے اسے یقیناً ان اوصاف کا علم بھی ہوگا جو اسکے خوف کے مقتضی ہیں' اگرچہ اس شخص سے کوئی گناہ سرزد نہ ہوا ہو بلکہ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی گناہ گار اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کرلے تو وہ اللہ سے ڈرے گناہ کا خوف نہ کرے۔

خوف خدا مقصود ہے : اصل میں اللہ سے ڈرنا ہی مقصود ہے' اگر اللہ تعالیٰ کو اپنی ذات سے ڈرانا مقصود نہ ہوتا تو وہ اپنے بندوں کو گناہ کے لئے مسخر نہ کرتا' اور نہ ان پر گناہوں کی راہ سہل کرتا' نہ ان کے اسباب مہیا فرماتا' اسلئے کہ معصیت کے اسباب فراہم کرنا بھی تو اپنی رحمت سے دور کرنا ہے' پھر معصیت سے پہلے بندہ سے کوئی ایسی معصیت سرزد نہیں ہوئی تھی جس کی بنا پر اسے گناہ کا مستحق قرار دیا جاتا' اور اس پر گناہ کے اسباب جاری کئے جاتے' اسی طرح طاعت سے پہلے بندے کی پاس کوئی ایسی نیکی نہیں تھی کہ اسکی وجہ سے نیک اعمال کا مستحق قرار پاتا' اور اس پر نیکی کی راہ روشن کی جاتی' یہ سب قضائے الٰہی کے اسرار ہیں' گناہ گار پر گناہ کا حکم ہو چکا ہے' خواہ وہ اس پر راضی ہو یا نہ ہو' اسی طرح اطاعت گزار کے مقدر میں نیکی لکھی جاچکی ہے خواہ وہ چاہے یا نہ چاہے' اس ذات کی بے نیازی کا عالم یہ ہے کہ وہ بغیر کسی وجہ سابق سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو اتنا اونچا مرتبہ عنایت کرتا ہے کہ مخلوق میں سے کوئی ان کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کرسکتا' دوسری طرف بلا کسی تقصیر کے ابوجہل کو اسفل السافلین میں پہنچاتا ہے۔ جس ذات کی بے نیازی کا یہ عالم ہے اس کے جلال سے ڈرنا ضروری ہے۔

مطیع و عاصی دونوں پابند ہیں : جب بھی کوئی بندہ اطاعت کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر ارادۂ اطاعت مسلط کیا جاتا ہے اور اس کو اس اطاعت پر قدرت عطا کی جاتی ہے' چنانچہ ان دونوں اسباب کی فراہمی کے بعد اس اطاعت کا وقوع ضروری ہو جاتا ہے' اسی طرح جب کوئی بندہ نافرمانی کرتا ہے تو اس لئے کرتا ہے کہ اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نافرمانی کا ارادہ مسلط کردیا گیا تھا' اور اسے اس نافرمانی پر قدرت دی گئی تھی۔ اب ہمیں اس کی وجہ معلوم نہیں کہ ایک شخص کو خیر کے اسباب کیوں مہیا کئے گئے اور اس کے جوارح کو اطاعات پر کس لئے مجبور کیا گیا اور اسے دوسرے شخص کے مقابلے میں فلاح و سعادت کا مستحق کیوں سمجھا گیا' جب کہ اس دوسرے پر گناہ کے دواعی مسلط کرکے اسے رحمت الٰہی سے دور کیا گیا اور ذلت و اہانت کا مستحق قرار دیا گیا' یہ اسرار الٰہی ہیں' ہم ان سے واقفیت کا دعویٰ نہیں کرسکتے' نیز ہم ان امور ۔۔۔ معصیت و طاعت ۔۔۔ کو بندوں پر بھی محمول نہیں کرسکتے' کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ بندہ مجبور ہے' وہ جو کچھ کرتا ہے قضاء الٰہی سے کرتا ہے' جب باری تعالیٰ کی ذات ایسی ہے تو عقل مندی کا تقاضا یہ ہے کہ اس سے خوف کیا جائے۔

اس موضوع پر یہی گفتگو کی جاسکتی ہے' اس کے بعد تقدیر کے مسائل ہیں' اور ان پر کلام کرنا درست نہیں ہے' جہاں تک اس امر کا تعلق ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات جلال سے خوف کیا جائے ہم اسے ایک مثال کے ذریعے سمجھا سکتے ہیں' اگر اذن شرع نہ ہوتا تو بڑے سے بڑے مدبّر اور صاحب بصیرت کی بھی یہ ہمت نہ ہوتی کہ وہ اس سلسلے میں کوئی مثال ذکر کرے' لیکن حدیث شریف میں اس کی مثال مذکور ہے اسلئے ہم تفہیم کے لئے اسے نقل کرنا مناسب سمجھتے ہیں' چنانچہ روایت کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام پر وحی نازل فرمائی کہ اے داؤد مجھ سے اس طرح ڈرا کر جس طرح تو کسی خونخوار درندے سے ڈرتا ہے۔ (۱) اس مثال سے تم مطلب کی بات سمجھ سکتے ہو اگرچہ سبب پر مطلع نہیں ہو سکتے' اسلئے کہ سبب پر مطلع ہونا ایسا ہے جیسے تقدیر پر مطلع ہونا' اور یہ ایک ایسا راز ہے جس کا امین صرف اس کا اہل ہی ہو سکتا ہے' اس مثال کا مفہوم یہ ہے کہ درندے سے تم اسلئے نہیں ڈرتے کہ تم سے اس کے حق میں کوئی قصور سرزد ہوا ہے' کوئی غلطی واقع ہوئی ہے' بلکہ اس لئے ڈرتے ہو کہ حملہ کرنا اور گرفت میں لینا اسکی خصوصیت ہے' اسکی یہ صفت اور ظاہری ہیبت خوف زدہ کرنے کے لئے کافی ہے۔ یہ درندہ جو چاہتا ہے کر بیٹھتا ہے' ذرا پروا نہیں کرتا' اگر تمہیں ہلاک کر دے تو اسکے دل میں ذرا رقت پیدا نہیں ہوتی اور نہ وہ تمہاری ہلاکت پر تکلیف محسوس کرتا ہے' اور اگر وہ تمہیں چھوڑ دیتا ہے' تو اسلئے نہیں کہ اس کے دل میں تمہارے لئے ہمدردی کا کوئی احساس پیدا ہوا ہے' یا وہ تم پر رحم کرنا چاہتا ہے' بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کی نظروں میں تمہاری کوئی ایسی وقعت نہیں ہے کہ وہ خاص طور پر تمہیں ہلاک کرے' اس کی نظر میں ایک ہزار آدمیوں کی ہلاکت اور ایک چیونٹی کی ہلاکت برابر ہے۔ وہ دونوں حالتوں میں اپنی درندگی برقرار رکھتا ہے' اور یکساں طور پر حملہ آور ہوتا ہے' تمہیں چھوڑنا یا مار ڈالنا اسکی مرضی پر منحصر ہے یہ تو مثال کا ایک مطلب ہے' لیکن اللہ تعالیٰ کے خوف کی مثال اس سے کہیں زیادہ اعلیٰ و ارفع ہے خود اسکا ارشاد ہے :-

وَلِلّٰهِ الْمَثَلُ الْأَعْلٰى (پ ر آیت) اور اللہ کے لئے اعلا مثال ہے۔

جس شخص نے ذات الٰہی کی معرفت حاصل کرلی' اور مشاہدۂ باطنی سے جو مشاہدۂ ظاہری سے اعلا و اوثق ہے اسکی صفات کا علم حاصل کرلیا اس نے اس حدیث قدسی کی صداقت کا بھی علم حاصل کرلیا ہے۔

هٰؤُلَاءِ فِي الْجَنَّةِ وَلَا أُبَالِيْ وَهٰؤُلَاءِ فِي النَّارِ وَلَا أُبَالِيْ (احمد۔ ابوالدرداءؓ)

یہ لوگ جنت میں ہیں اور مجھے (اس کی) پروا نہیں' اور یہ لوگ دوزخ میں ہیں اور مجھے (اسکی) پروا نہیں۔

اس استغناء اور بے نیازی میں ہیبت و خوف کے بے شمار اسباب جمع ہیں' اللہ سے خوف کے لئے یہ استغناء ہی کافی ہے۔

خائفین میں ایک گروہ ان لوگوں کا ہے جن کے دلوں میں خود مکروہ کا خوف راسخ ہوجائے' مثلاً سکرات موت یا منکر نکیر کے سوالات' عذاب قبر' اور بعث بعد الموت وغیرہ کی دہشت' یا باری تعالیٰ کے سامنے کھڑے ہونے کا خوف' اور اس بات کا ڈر کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے پردہ فاش ہوگا' اور اس بات کا خوف تنکے تنکے سے سوال ہوگا' پل صراط کی حدت' اسے عبور کرنے کا خوف دوزخ کی آگ' اور اس کی خطرناک گھاٹیوں کا خوف' یا اس بات کا ڈر کہ کہیں درجات کم نہ ہوجائیں یا اس امر کا خوف کہ جنت کی نعمتوں اور راحتوں سے محروم نہ ہوجائیں' یا خدا تعالیٰ اور ان کی درمیان حجاب نہ ہوجائے۔ یہ سب امور بذات خود برے ہیں' اسلئے دہشت زدہ کرنے والے بھی ہیں۔ اس گروہ میں بھی مختلف مراتب ہیں' سب سے اعلا مرتبہ ان لوگوں کا ہے جنھیں باری تعالیٰ کے اور اپنے مابین حجاب کا خوف ہے' یہ عارفین کا خوف ہے' اس سے پہلے کے تمام مخاوف کا تعلق علماء' صلحاء' عابدین اور زاہدین سے ہے' اصل میں وصال کی لذت اور فراق کے رنج و تکلیف سے صرف وہی لوگ آگاہ ہوتے ہیں جن کی معرفت مکمل ہوتی ہے' اور جس کی معرفت مکمل نہیں ہوتی اسکی بصیرت پر پردہ پڑا رہتا ہے وہ نہ وصال کی لذات محسوس کرتا ہے اور نہ فراق کی تکلیف سے آگاہ ہوتا ہے' بلکہ جب اسکے سامنے یہ بات ذکر کی جاتی ہے کہ عارف دوزخ کی آگ سے نہیں ڈرتا بلکہ حجاب سے ڈرتا ہے تو اسے بڑی حیرت ہوتی ہے بلکہ اسے دل میں برا جانتا ہے' یہی نہیں بلکہ یہ کور چشم انسان کبھی دیدار الٰہی کی لذت کا بھی منکر ہوجاتا ہے' اگر شریعت کی طرف سے اس انکار کی اجازت ہوتی تو وہ زبان ہی سے

---

(۱) اس روایت کی اصل نہیں ملی۔ غالباً یہ اسرائیلی روایت ہے

انکار کر بیٹھتا' لیکن کیوں کہ شریعت کی طرف سے اس کی اجازت نہیں ہے اس لئے وہ زبان سے تو دیدار الٰہی کی لذت کا اعتراف کرتا ہے' مگر دل میں یقین نہیں رکھتا' کیونکہ وہ تو صرف شکم و فرج کی لذت سے واقف ہے یا آنکھ کی لذت سے واقف ہے کہ خوبصورت رنگ دیکھ لئے اور اچھے چہروں پر نظر ڈال لی' وہ صرف ایسی لذت سے واقف ہوتا ہے جس میں بہائم بھی شریک ہوتے ہیں' عارفین کی لذت صرف ان ہی کے ساتھ مخصوص ہے غیر عارفین اس لذت کا ادراک نہیں کر سکتے۔ جو لوگ اس لذت کے اہل نہیں ان کے روبرو اس کی حقیقت بیان کرنا حرام ہے' اور جو لوگ اہل ہیں وہ خود جان لیتے ہیں کہ یہ لذت کیا ہے؟ اس لئے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

خوف کے فضائل اور ترغیبات کا ذکر

جاننا چاہیے کہ خوف کی فضیلت قیاس سے بھی ثابت ہوتی ہے اور آیات و روایات سے بھی' قیاس کی صورت یہ ہے کہ کسی چیز کی فضیلت کے لئے یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ دیدار الٰہی کی سعادت تک پہنچانے میں کس قدر مدد کرتی ہے' کیونکہ بندہ مومن کا اصل مقصد یہی سعادت ہے' اسلئے جو چیز بندے کو اس سعادت تک پہنچانے میں جس قدر مدد کرے گی اسی قدر اسکی فضیلت ہوگی۔

اور یہ بات پہلے بیان کی جاچکی ہے کہ آخرت میں اللہ تعالیٰ کی ملاقات اور سعادت کا حصول اس کی محبت و انس کے بغیر ممکن نہیں ہے' اور محبت بغیر معرفت کے حاصل نہیں ہوتی' اور معرفت کا حصول دوام ذکر کے بغیر ممکن نہیں ہے' اور ذکر و فکر پر مواظبت کے لئے قلب کا دنیا سے لاتعلق ہونا ضروری ہے اور دنیا سے قلب کا تعلق اسی وقت منقطع ہو سکتا ہے' جب بندہ دنیا کی لذات اور اس کی شہوات ترک کر دے' اور شہوات کا ترک کرنا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ ان کا قلع قمع نہ ہو جائے' اور شہوات کا قلع قمع کرنے کے لئے آتش خوف کی ضرورت ہے۔ خوف وہ آگ ہے جس سے شہوتیں خاکستر ہو جاتی ہیں اس لئے خوف وہی افضل ہو گا جو شہوات جلائے گا' گناہوں سے محفوظ رکھے گا' اور طاعات کی ترغیب دے گا' پھر خوف سے جس قدر شہوتیں جلیں گی اسی قدر گناہ کم ہوں گے اور جس قدر طاعات ظاہر ہوں گی اسی قدر وہ افضل ہو گا۔ درجات خوف کے اختلاف میں یہی اصل ہے' یہ اختلاف پہلے بیان کیا جاچکا ہے۔ جہاں تک خوف کی نفس فضیلت کا سوال ہے تو یہ شبہ کرنا ہی بیکار ہے کہ خوف افضل کیوں ہے' جب کہ اسکی وجہ سے بندے کو عفت' ورع' تقویٰ اور مجاہدے جیسے اوصاف حاصل ہوتے ہیں' اور ان اوصاف کی فضیلت میں شبہ نہیں کیا جا سکتا ہے قیاس سے بھی خوف کی فضیلت ثابت ہوتی ہے اور آیات و روایات سے بھی۔

آیات و روایات سے فضیلت خوف کا ثبوت: خوف کے فضائل میں بے شمار روایات اور آثار وارد ہیں' خوف کی فضیلت کے لئے محض اتنا جان لینا کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جنت کے چاروں مقامات ہدایت' رحمت' علم اور رضا کو ان تین آیات میں جمع فرمادیا ہے۔ هُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلَّذِينَ هُمْ لِرَبِّهِمْ يَرْهَبُونَ (پ ۹ ر ۹ آیت ۱۵۴)

ان لوگوں کے جو اپنے رب سے ڈرتے تھے ہدایت اور رحمت تھی۔

إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ (پ ۲۲ ر ۱۶ آیت ۲۸)

خدا سے اس کے وہی بندے ڈرتے ہیں جو اس کی عظمت کا علم رکھتے ہیں۔

رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ ذَٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهُ (پ ۳۰ ر ۲۳ آیت ۸)

اللہ تعالیٰ ان سے خوش رہے گا اور وہ اللہ سے خوش رہیں گے یہ اس شخص کے لئے ہے جو اپنے رب سے ڈرتا ہے۔

پہلی آیت میں ہدایت و رحمت' دوسری میں علم' اور تیسری آیت میں رضا کو خائفین کے لئے مخصوص کیا گیا ہے' علاوہ ازیں جن آیات یا روایات سے علم کی فضیلت ثابت ہوتی ہے انہی سے خوف کی فضیلت کا ثبوت بھی ملتا ہے اس لئے کہ علم خوف ہی کا ثمرہ ہے حضرت موسیٰ علیہ الصلاۃ والسلام ارشاد فرماتے ہیں کہ خائفین کو رفیق اعلیٰ کی رفاقت حاصل ہوگی اور اس مرتبے میں ان کا کوئی شریک نہیں ہوگا۔ یہ رفاقت انھیں اسلئے حاصل ہوگی کہ خوف صرف اہل علم کرتے ہیں' اور اہل علم کو انبیاء کا وارث ہونے کی حیثیت سے ان کی رفاقت کا حق حاصل ہے' اور انبیاء کو رفیق اعلیٰ کی رفاقت نصیب ہوگی۔ چنانچہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو مرض وفات کے

دوران یہ اختیار دیا گیا کہ وہ دنیا میں رہنا چاہیں تو دنیا میں رہیں اور ہمارے پاس آنا چاہیں تو ہمارے پاس آجائیں تو آپ نے یہی فرمایا۔

اسالک الرفیق الاعلی (بخاری و مسلم۔ عائشہ) تجھ سے رفیق اعلا کا سوال کرتا ہوں۔

خوف ایک ایسی قابل قدر شئے ہے کہ اسکی اصل علم ہے' اور اس کا ثمرہ ورع و تقویٰ ہے۔ اور ان تینوں اوصاف کے بے شمار فضائل وارد ہیں' یہاں تک کہ عاقبت کو تقویٰ کے ساتھ مخصوص کیا گیا ہے۔ جیسا کہ حمد خدائے وحدہٗ لاشریک کے ساتھ اور درود و سلام سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص ہیں۔ یہاں تک کے خطبے کے آغاز میں اس طرح کہا جاتا ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِیْنَ وَالصَّلٰوةُ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَآلِہٖ اَجْمَعِیْنَ

اللہ تعالیٰ نے تقویٰ کو اپنے ساتھ اس طرح بھی مخصوص فرمایا ہے:۔

لَنْ یَّنَالَ اللّٰہَ لُحُوْمُھَا وَلَا دِمَاءُھَا وَلٰکِنْ یَّنَالُہُ التَّقْوٰی مِنْکُمْ (پ ۱۷ ر ۱۲ آیت ۳۷)

اللہ کے پاس نہ ان کا گوشت پہنچتا ہے اور نہ ان کا خون' لیکن اس کے پاس تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے۔

تقویٰ کے معنی یہ ہیں کہ آدمی خوف خدا کے باعث اعمال بد اور مشتبہات سے باز رہے۔ اس کی فضیلت کا عالم یہ ہے' فرمایا:۔

اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقَاکُمْ (پ ۲۶ ر ۱۴ آیت ۱۳)

اللہ کے نزدیک تم سب میں بڑا شریف وہی ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہو۔

اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اولین و آخرین کو تقویٰ کی وصیت فرمائی' ارشاد فرمایا:۔

وَلَقَدْ وَصَّیْنَا الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتَابَ مِنْ قَبْلِکُمْ وَاِیَّاکُمْ اَنِ اتَّقُوا اللّٰہَ (پ ۵ ر ۱۶ آیت ۱۳۱)

اور واقعی ہم نے ان لوگوں کو بھی حکم دیا تھا جن کو تم سے پہلے کتاب ملی تھی' اور تم کو بھی کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرو۔

ایک آیت میں خوف کو بصیغۂ امر بیان کیا گیا ہے جو وجوب پر دلالت کرتا ہے اور اسے ایمان کے ساتھ مشروط کیا ہے۔

وَخَافُوْنِ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ (پ ۴ ر ۹ آیت ۱۷۵) اور مجھ ہی سے ڈرنا اگر ایمان والے ہو۔

کسی ایسے مومن کا تصور نہیں کیا جاسکتا جسے خوف میسر نہ ہو' خواہ وہ کتنا ہی ضعیف الایمان کیوں نہ ہو' اگر اس کا ایمان ضعیف ہوا تو خوف بھی ضعیف ہوگا' یہ نہیں ہو سکتا کہ کوئی شخص ایمان بھی رکھتا ہو اور اللہ تعالیٰ سے خوف زدہ بھی نہ ہو۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم تقویٰ کی فضیلت میں ارشاد فرماتے ہیں "جس روز اللہ تعالیٰ اپنے وعدۂ معلوم کے مطابق اولین و آخرین کو جمع فرمائے گا تو اچانک ایک آواز آئے گی' یہ آواز دور نزدیک کے تمام لوگ سنیں گے' اور اس آواز کا خطاب یہ ہوگا کہ اے لوگو' جب سے میں نے تمہیں پیدا کیا ہے میں آج کے دن تک خاموش رہا' آج تمہاری خاموشی کا دن ہے' تمہارے اعمال تمہارے سامنے آنے والے ہیں' اے لوگو! میں نے تمہیں ایک نسب دیا تھا تم نے اپنے لئے دوسرا نسب اختیار کر لیا اور میرا عطا کردہ نسب ترک کر دیا' میں نے کہا تھا اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقَاکُمْ تم نے اس پر عمل نہیں کیا' اور کہنے لگے کہ فلاں ابن فلاں' فلاں ابن فلاں سے زیادہ صاحب ثروت ہے' آج میں تمہارا نسب گراؤں گا' اور اپنا نسب اونچا کروں گا' متقین کہاں ہیں؟ پھر تمام اہل تقویٰ کے لئے ایک مخصوص جھنڈا نصب کیا جائے گا اور وہ سب اس جھنڈے تلے اکٹھے ہو جائیں گے' اور جھنڈا اٹھا کر جنت میں داخل ہوں گے اور اپنے مکانوں کی سمت بڑھ جائیں (طبرانی اوسط' حاکم مستدرک' ثعلبی فی التفسیر۔ ابو ہریرہ) سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:۔ رَاْسُ الْحِکْمَةِ مَخَافَةُ اللّٰہِ (بیہقی۔ ابن مسعود) اصل حکمت اللہ سے ڈرنا ہے۔

ایک مرتبہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ سے ارشاد فرمایا کہ اگر تمہیں مجھ سے ملنا منظور ہو تو میرے بعد بکثرت خوف کرنا۔ (۱) حضرت فضیل ابن عیاضؒ ارشاد فرماتے ہیں کہ جو شخص اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے خوف ہر طرح کی بہتری کی طرف اسکی رہنمائی کرتا ہے۔ حضرت شبلیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے جب بھی اللہ تعالیٰ سے خوف کیا ہے میرے سامنے حکمت اور عبرت کا ایک ایسا دروا ہوا ہے جو میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ حضرت یحییٰ ابن معاذ فرماتے ہیں کہ اگر مومن کوئی غلطی کرتا ہے اور اس کے ساتھ

---

(۱) اس روایت کی اصل مجھے نہیں ملی

عذاب کا خوف اور بخشش کی امید ہوتی ہے تو وہ غلطی ان دونوں کے درمیان ایسی ہو جاتی ہے جیسے دو شیروں کے درمیان لومڑی' ظاہر ہے لومڑی کو کسی ایک کا یا دونوں کا لقمہ بنتا ہی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی روایات میں ہے کہ قیامت کے دن باری تعالیٰ فرمائے گا کہ آج کے دن کوئی ایسا نہیں ہے جس کا میں حساب نہیں لوں گا۔ لیکن اہل ورع اس سے مستثنیٰ ہیں' مجھے شرم آتی ہے کہ میں ان کا محاسبہ کروں' وہ جس مرتبے پر فائز ہیں وہ حساب و کتاب سے بہت بلند ہے۔ ورع و تقویٰ دو ایسے الفاظ ہیں جن کا اشتقاق ایسے معنی سے ہوا ہے جن میں خوف کی شرط ہے' اگر خوف کی شرط نہ ہوتی تو ان معانی کا نام ورع و تقویٰ نہ رکھا جاتا۔

ذکر کی فضیلت میں بھی جو آیات و روایات وارد ہیں وہ بھی خوف کی فضیلت پر دلالت کرتے ہیں' چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ذکر کو خوف کے ساتھ مخصوص فرمایا ہے :- سَيَذَّكَّرُ مَنْ يَخْشَىٰ (پ ۳۰ ر ۱۲ آیت ۱۰) وہی شخص نصیحت مانتا ہے جو (خدا سے) ڈرتا ہے۔

ایک جگہ خوف کی فضیلت میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا :-

وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ جَنَّتَانِ (پ ۲۷ ر ۱۳ آیت ۴۶)

اور جو شخص اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرتا ہے اسکے لئے (جنت میں) دو باغ ہوں گے۔

ایک حدیث قدسی میں وارد ہے' فرمایا "مجھے اپنی عزت کی قسم ہے میں اپنے بندے پر دو خوف اور دو امن جمع نہیں کروں گا' اگر وہ دنیا میں مامون رہا تو آخرت میں ڈراؤں گا اور دنیا میں خوف زدہ رہا تو آخرت میں امن دوں گا (ابن حبان' بیہقی۔ ابو ہریرہؓ) ایک حدیث میں ہے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے اس سے ہر چیز ڈرتی ہے' اور جو غیر اللہ سے ڈرتا ہے اللہ اسے ہر چیز سے ڈراتا ہے (ابن حبان' ابو امامہؓ) ایک مرتبہ ارشاد فرمایا کہ تم میں کمال عقل اسے حاصل ہے جو اللہ تعالیٰ سے زیادہ ڈرتا ہے اور ان امور کو اچھی طرح بجالاتا ہے جن کا اللہ نے حکم دیا ہے' اور ان امور سے اچھی طرح رکتا ہے جن سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے۔ (۱)

یحییٰ ابن معاذؒ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ بندہ مسکین پر رحم فرمائے اگر یہ دوزخ سے بھی اسی طرح ڈرے جس طرح فقر سے ڈرتا ہے تو جنت میں داخل ہو۔ حضرت ذوالنون مصریؒ نے ارشاد فرمایا جو شخص اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے اس کا دل نرم ہو جاتا ہے' اللہ تعالیٰ سے اس کی محبت میں شدت پیدا ہو جاتی ہے' اور اس کی عقل درست رہتی ہے' موصوف نے یہ بھی فرمایا کہ رجاء کے مقابلے میں خوف زیادہ بہتر ہے' اس لئے کہ جب رجاء غالب ہوتی ہے تو دل پریشان ہو جاتا ہے۔ حضرت ابو الحسین نابینا فرمایا کرتے تھے کہ سعادت کی علامت یہ ہے کہ بندے کو شقاوت کا خوف ہو' خوف بندے اور رب کے درمیان ایک باگ ہے' جب یہ باگ منقطع ہو جاتی ہے تو بندہ تباہ ہو جاتا ہے۔ یحییٰ ابن معاذ سے دریافت کیا گیا کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے عذاب سے کون مامون ہوگا' انھوں نے جواب دیا وہ شخص جو دنیا میں زیادہ ڈرتا ہے۔ حضرت سہیل تستری ارشاد فرماتے ہیں کہ خوف خدا کے لئے اکل حلال شرط ہے۔ حضرت حسنؓ سے بعض لوگوں نے عرض کیا کہ ہم ایسے لوگوں میں اٹھتے بیٹھتے ہیں جو ہمیں بہت زیادہ خوف زدہ کرتے ہیں' یہاں تک کہ ہمارے دل اڑنے لگتے ہیں' بتلائیے ہم کیا کریں' فرمایا تمہارا ایسے لوگوں کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا جو تمہیں ڈراتے رہیں اور ایک دن مامون کردیں ایسے لوگوں میں اٹھنے بیٹھنے سے بہتر ہے جو تمہیں بے خوف کردیں یہاں تک کہ ایک دن تمہیں خوف گھیر لے۔ حضرت ابو سلیمان دارانی کہتے ہیں کہ جس شخص کے دل سے خوف اٹھ جاتا ہے وہ تباہ ہو جاتا ہے۔ ایک مرتبہ حضرت عائشہؓ نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! اس آیت میں وہ لوگ مراد ہیں جو چوری کرتے ہیں یا وہ لوگ مراد ہیں جو زنا کرتے ہیں :-

وَالَّذِينَ يُؤْتُونَ مَا آتَوا وَّقُلُوبُهُمْ وَجِلَةٌ (پ ۱۸ ر ۴ آیت ۴۰)

اور جو لوگ (راہ خدا میں) دیتے ہیں جو کچھ دیتے ہیں اور ان کے دل (دینے کے باوجود) خوف زدہ ہوتے ہیں۔

فرمایا اس میں وہ لوگ مراد ہیں جو روزے رکھتے ہیں' نماز پڑھتے ہیں' اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور ڈرتے ہیں کہ کہیں یہ عبادتیں رد نہ ہو جائیں (ترمذی' ابن ماجہ' حاکم) اللہ تعالیٰ کی پکڑ اور اس کے عذاب سے بے خوف رہنے والوں کے سلسلے میں سخت وعیدیں وارد ہیں' اور یہ تمام وعیدیں ایک طرح سے خوف کے فضائل ہیں' کیوں کہ کسی شئے کی مذمت اس کی ضد کی تعریف سے ہوا کرتی ہے خوف کی ضد

(۱) یہ روایت بے اصل ہے

امن ہے جسطرح رجاء کی ضد یاس ہے' چنانچہ جس طرح مایوسی کی مذمت سے رجاء کی فضیلت ثابت ہوتی ہے اس طرح امن کی مذمت خوف کی فضیلت پر دلالت کرتی ہے' اسلئے کہ خوف و رجاء دونوں لازم ملزوم ہیں' جو شخص بھی کسی محبوب کی آس رکھے گا اسے اس کی جدائی کا خوف بھی ہو گا' اگر اسے محبوب کے نہ ملنے کا خوف نہیں تو کہا جائے گا کہ وہ شئے اسکی محبوب نہیں ہے' اسلئے وہ اسکا منتظر بھی نہیں' خوف و رجاء دونوں ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح ہم آہنگ ہیں کہ انھیں ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا' اور نہ یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ قلب ان میں سے ایک کے ساتھ مشغول ہو' اور دوسرے سے غافل ہو' ان دونوں میں تلازم کی اور اس درجہ گہرے ربط کی وجہ یہ ہے کہ دونوں کے لئے یہ شرط ہے کہ جس چیز میں شک ہو اس سے متعلق ہوں اس لئے معلوم چیز کی نہ رجاء کی جاتی ہے' اور نہ خوف چنانچہ اگر تم کسی محبوب شئے کا تصور کرو' اور کا وجود ممکن ہو تو اس کا عدم بھی ممکن ہو گا' وجود فرض کرنے کی صورت میں دل کو راحت ہو گی' اس کا نام رجاء ہے اور عدم فرض کرنے کی صورت میں دل کو صدمہ ہو گا اس کا نام خوف ہے' یہ دونوں صورتیں ایک دوسرے کی ضد ہیں بشرطیکہ وہ شئی جس کا انتظار یا توقع ہے مشکوک ہو۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ شک کے دونوں طرفوں میں سے ایک طرف کو بعض اوقات کسی سبب کے پائے جانے کی بنا پر ترجیح حاصل ہو جاتی ہے' اس کا نام ظن ہے' ظن کی بنیاد پر خوف و رجاء ایک دوسرے پر غالب آسکتے ہیں' جب ظن پر محبوب کے وجوب کا غلبہ ہوتا ہے تو رجاء کا پہلو بھاری ہوتا ہے' اور جب محبوب کے عدم کا غلبہ ہوتا ہے تو خوف کا پہلو مظبوط ہوتا ہے' پہلی صورت میں خوف اور دوسری صورت میں رجاء کمزور پڑ جاتی ہے' جہاں تک ان دونون کے مابین لزوم کا تعلق ہے یہ ایک حقیقت ہے اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو ایک ساتھ ذکر فرمایا ہے :- وَيَدْعُونَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا (پ ۱۷ ر ۶ آیت ۹۰) اور امید و بیم کے ساتھ ہماری عبادت کیا کرتے تھے۔

يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا (پ ۲۱ ر ۱۵ آیت ۱۶) اپنے رب کو امید سے اور خوف سے پکارتے ہیں۔

اسی لئے عربی زبان میں بعض اوقات خوف کے لئے رجاء کو وسیلۂ تعبیر بنایا گیا ہے۔ قرآن کریم میں ہے :-

مَا لَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا (پ ۲۹ ر ۹ آیت ۱۳) تم کو کیا ہوا کہ تم اللہ کی عظمت کے معتقد نہیں ہو۔

اس میں لا ترجون کے معنی لا تخافون ہیں۔ قرآن کریم میں بہت سے مواقع پر رجاء کو خوف کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے' اور وجہ یہی ہے کہ یہ دونوں لازم ملزوم ہیں' عربوں کی یہ عادت ہے کہ وہ ایک لفظ سے کبھی لازم مراد لے لیتے ہیں' اور کبھی ملزوم' رجاء کو خوف کے معنی میں اسی بنیاد پر لیا جاتا ہے۔ بلکہ قرآن پاک میں متعدد مواقع پر خوف کے باعث رونے کی تحسین کی ہے' اور اس کی ترغیب دی ہے' اس سے بھی خوف کی فضیلت ثابت ہوتی ہے' فرمایا :-

فَلْيَضْحَكُوْا قَلِيْلًا وَّلْيَبْكُوْا كَثِيْرًا (پ ۱۰ ر ۱۷ آیت ۸۲) سو تھوڑا ہنسیں اور بہت روئیں۔

يَبْكُوْنَ وَيَزِيْدُهُمْ خُشُوْعًا (پ ۱۵ ر ۱۷ آیت ۸۲) روتے ہیں اور رونا ان کے خشوع کو بڑھاتا ہے۔

أَفَمِنْ هٰذَا الْحَدِيْثِ تَعْجَبُوْنَ وَتَضْحَكُوْنَ وَلَا تَبْكُوْنَ وَأَنْتُمْ سَامِدُوْنَ (پ ۲۷ ر ۷ آیت ۵۹-۶۰-۶۱)

سو کیا تم اس کلام (الہی) سے تعجب کرتے ہو اور ہنستے ہو اور (خوف عذاب سے) روتے نہیں ہو اور تم تکبر کرتے ہو۔

احادیث بھی رونے کے فضائل سے لبریز ہیں' ایک حدیث میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کوئی بندۂ مومن ایسا نہیں ہے' جس کی آنکھ سے خوف خدا میں آنسو ٹپکے خواہ وہ مکھی کے سر کے برابر ہی کیوں نہ ہو اور وہ رخسارے پر بہے پھر اللہ تعالیٰ اسے دوزخ پر حرام نہ کرے (طبرانی' بیہقی۔ ابن مسعودؓ) ایک حدیث میں ہے فرمایا :-

إِذَا اقْشَعَرَّ قَلْبُ الْمُؤْمِنِ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ تَحَاتَّتْ عَنْهُ خَطَايَاهُ كَمَا يَتَحَاتُّ مِنَ الشَّجَرَةِ وَرَقُهَا (طبرانی' بیہقی۔ ابن مسعودؓ)

جب مومن کا دل اللہ کی خشیت سے لرزتا ہے تو اس کے گناہ اس طرح جھڑتے ہیں جس طرح درخت سے پتے۔

لَا يَلِجُ النَّارَ عَبْدٌ بَكٰى مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ حَتّٰى يَعُوْدَ اللَّبَنُ فِي الضَّرْعِ (ترمذی' ابن ماجہ۔

ابو ہریرہؓ)

وہ بندہ دوزخ میں داخل نہیں ہوگا جو خشیت الٰہی کی وجہ سے رویا ہو یہاں تک کہ دودھ پستان میں لوٹ جائے۔

یعنی دودھ کا پستانوں میں واپس جانا محال ہے' اسلئے یہ بھی محال ہے کہ کسی ایسے بندے کو دوزخ میں داخل کیا جائے' جو اللہ کے ڈر سے رویا کرتا ہو' حضرت عقبہ ابن عامرؓ روایت کرتے ہیں کہ میں نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا یا رسول اللہ! نجات کی کیا صورت ہے؟ آپ نے فرمایا اپنی زبان بند رکھ' اپنے گھر میں محدود رہ' اور اپنی غلطی پر آنسو بہا' (۱) حضرت عائشہ نے عرض کیا' یا رسول اللہ! آپ کی امت میں سے کوئی شخص بلا حساب بھی جنت میں جائے گا' فرمایا' ہاں وہ شخص بلا حساب جنت میں جائے گا جو اپنے گناہوں پر روتا ہے۔ (۲) ایک حدیث میں ہے۔ فرمایا :-

مَا مِنْ قَطْرَةٍ أَحَبُّ إِلَى اللّٰهِ تَعَالَى مِنْ قَطْرَةِ دَمْعٍ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ تَعَالَى أَوْ قَطْرَةِ دَمٍ أُهْرِيقَتْ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ (ترمذی۔ ابو امامہؓ)

اللہ تعالیٰ کے نزدیک دو قطرے زیادہ محبوب ہیں' ایک وہ قطرۂ اشک جو اللہ تعالیٰ کے خوف سے نکلے اور دوسرے وہ قطرۂ خون جو راہ خدا میں بہایا جائے۔

روایت میں ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا فرمایا کرتے تھے :-

اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنِي عَيْنَيْنِ هَطَّالَتَيْنِ تَسْقِيَانِ بِذُرُوْفِ الدَّمْعِ قَبْلَ أَنْ تَصِيْرَ الدُّمُوْعُ دَمًا وَالْأَضْرَاسُ جَمْرًا (طبرانی' ابو نعیم۔ ابن عمرؓ)

اے اللہ مجھے کثرت سے پانی بہانے والی آنکھیں عطا کر جو آنسو بہا کر (قلب کی کھیتی کو) سینچیں اس سے پہلے کہ آنسو خون ہو جائیں اور داڑھیں چنگاریاں۔

ایک روایت میں ہے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ سات آدمی ایسے ہیں جنہیں اس دن اللہ تعالیٰ سایۂ رحمت عطا فرمائے گا جس روز اس کے سائے کے سوا کوئی سایہ نہ ہوگا' (پھر آپ نے ان سات کے نام گنائے' جن میں سے ایک وہ شخص ہے جو تنہائی میں اللہ تعالیٰ کو یاد کرکے روتا ہے (بخاری و مسلم۔ ابو ہریرہؓ) حضرت ابو بکر الصدیقؓ فرماتے ہیں کہ جو شخص رو سکے وہ روئے اور جسے رونا نہ آتا ہو وہ رونی صورت ہی بنالے۔ حضرت محمد ابن منکدر اگر آنسوؤں سے روتے تو اپنا چہرہ اور داڑھی بھگو لیتے' فرماتے تھے کہ میں نے سنا ہے جہاں جہاں آنسوؤں کی تری پہنچتی ہے وہاں دوزخ کی آگ حرام ہو جاتی ہے۔ حضرت عبد اللہ ابن عمرؓ فرماتے ہیں رویا کرو' اگر رونا نہ آتا ہو تو ایسی صورت بنالو جس سے دیکھنے والا یہ سمجھے کہ تم رو رہے ہو' اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہی اگر تم حقیقت حال جان لو تو اتنا روؤ کہ دم نکل جائے' اور اتنی نمازیں پڑھو کہ پیٹھ کی ہڈی ٹیڑھی جائے' حضرت سلیمان دارانی فرماتے ہیں کہ جس کی آنکھوں میں آنسو آئیں گے اس کا چہرہ قیامت کے روز ذلت اور رسوائی سے غبار آلودہ نہ ہوگا' اور اگر وہ آنسو آنکھوں سے بہہ پڑے تو آگ کے بہت سے سمندر سرد ہو جائیں گے' اور اگر کوئی شخص کسی مجلس میں روئے گا تو اس مجلس کے تمام شرکاء عذاب آخرت سے مامون رہیں گے' حضرت دارانیؒ یہ بھی فرماتے ہیں کہ رونا خوف سے ہوتا ہے' اور رجاء و طرب شوق سے حضرت کعب الاحبار فرماتے ہیں کہ اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے اگر میں گریہ کروں اور میرے آنسو دونوں رخساروں پر رواں ہوں یہ اس سے بہتر ہے کہ سونے کی ایک سلاخ اللہ کی راہ میں خیرات کروں حضرت عبد اللہ ابن عمرؓ فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کے خوف سے ایک آنسو بہانا راہ خدا میں ایک ہزار دینار صدقہ کرنے سے افضل ہے۔ حضرت حنظلہ روایت کرتے ہیں کہ ہم ایک دن سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ

---

(۱) یہ روایت پہلے بھی گزر چکی ہے (۲) یہ روایت مجھے نہیں ملی

وسلم کی خدمت میں حاضر تھے، آپ نے ہمیں کچھ نصائح فرمائیں، انھیں سن کر ہمارے دل بھر آئے، اور آنکھوں سے آنسو بہنے لگے، اور ہم نے اپنی نفسوں کو جان لیا، اسکے بعد میں اپنے گھر آیا، اور گھر والوں سے ملا، ہمارے درمیان دنیاداری کی باتیں ہوئیں، یہاں تک کہ جو کچھ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے میں نے سنا تھا وہ ذہن سے نکل گیا، اور وہ رقت و خوف بھی دل میں نہ رہا جو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضری کے وقت تھا، چنانچہ میں نے اپنے دل میں کہا کہ حنظلہ منافق ہو گیا، اور یہ خیال لے کر گھر سے نکلا اور پکار کر کہنے لگا کہ حنظلہ منافق ہو گیا، اتنے میں حضرت ابوبکر صدیق سامنے سے تشریف لائے انہوں نے فرمایا کہ حنظلہ ہرگز منافق نہیں ہوا، میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور میں نے آپ سے یہی بات عرض کی، آپ نے ارشاد فرمایا حنظلہ منافق نہیں ہوا۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! ہم آپ کی خدمت میں حاضر تھے، آپ نے ہمیں نصیحت فرمائی جس سے ہمارے دل نرم ہو گئے، اشک بہنے لگے، اور ہم نے اپنے نفسوں کو پہچان لیا، پھر میں اپنے گھر والوں کے پاس پہنچا، اور ہم نے دنیاوی امور میں گفتگو کی، اور جو کچھ میں نے آپ سے سنا تھا وہ بھول گیا، آپ نے فرمایا اے حنظلہ اگر تم ہمیشہ اسی حالت پر رہتے تو فرشتے راہوں میں اور تمہارے بستروں پر تم سے مصافحہ کرتے، لیکن اے حنظلہ یہ کیفیت بس تھوڑی دیر ہوا کرتی ہے، پھر تم اسی سابقہ کیفیت پر آجایا کرتے ہو۔

بہرحال جو آیات اور روایات رجاء، بکاء، تقویٰ، ورع، اور علم کی فضیلت میں اور امن کی مذمت میں وارد ہوئی ہیں ان سب سے خوف کی فضیلت ثابت ہوتی ہے، اس لئے کہ ان سب کا کسی نہ کسی طریقہ پر خوف سے تعلق ہے، بعض کا سبب ہونے کی حیثیت سے اور بعض کا مسبّب ہونے کی حیثیت سے۔

غلبۂ خوف افضل ہے، یا غلبۂ رجاء یا ان دونوں کا اعتدال افضل ہے

جاننا چاہیے کہ خوف اور رجاء کے فضائل میں بے شمار روایات وارد ہیں، پڑھنے والا یہ روایات پڑھتا ہے اور اس تردد میں پڑ جاتا ہے کہ ان دونوں میں سے کونسا وصف افضل ہے؟ لیکن ہماری خیال میں یہ ایک بے بنیاد سوال ہے، اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص یہ پوچھے روٹی افضل ہے یا پانی؟ ظاہر ہے اس کا جواب یہی دیا جائے گا کہ بھوک کے لئے روٹی افضل ہے اور پیاسے کے لئے پانی، اگر یہ دونوں جمع ہو جائیں تو دیکھا جائے گا کہ غلبہ بھوک کو حاصل ہے یا پیاس کو، بھوک کی صورت میں روٹی افضل ہوگی اور پیاس کی صورت میں پانی افضل ہوگا، اگر دونوں ضرورتیں برابر ہوں تو یہ دونوں چیزیں بھی برابر ہوں گی۔ اگر کسی چیز کے فضل و کمال کا اندازہ کرنا ہو تو یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ چیز کسی مقصود کے لئے تو مطلوب نہیں، اگر ایسا ہے تو اس مقصود کا جائزہ لینا چاہیے، جو فضیلت اس مقصود کو حاصل ہوگی وہی فضیلت اس چیز کے لئے بھی ہوگی کوئی چیز اپنی ذات سے افضل نہیں ہوتی۔ رجاء اور خوف دو دوائیں ہیں ان سے دلوں کا علاج ہوتا ہے، ان دواؤں میں بذات خود کوئی خوبی نہیں ہے بلکہ جس قدر وہ امراض کے لئے مفید ہوں گی اسی قدر ان میں خوبی ہوگی، چنانچہ اگر دل میں بے خوفی کا مرض ہے، اور یہ اندیشہ ہے کہ وہ شخص اللہ کے عذاب سے اپنے آپ کو محفوظ جان کر دنیاوی لذات میں مستغرق رہے گا تو اس صورت میں خوف افضل ہے، اور اگر دل پر ناامیدی اور مایوسی غالب ہے تو رجاء افضل ہوگی، اسی طرح اگر بندے پر گناہ غالب ہوں تب بھی خوف افضل ہوگا۔

یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ خوف مطلقاً افضل ہے جیسے یہ کہا جائے کہ روٹی سکنجبین سے افضل ہے اسلئے کہ روٹی سے بھوک کے مرض کا علاج ہوتا ہے، اور سکنجبین سے صفراوی مادّے کا، اور بھوک کا مرض غالب ہے، اور اسکے لئے روٹی کی ضرورت زیادہ پڑتی ہے، اس لئے روٹی افضل ہے، اس اعتبار سے ہم خوف کو بھی علی الاطلاق افضل کہہ سکتے ہیں اسلئے کہ لوگوں پر معاصی اور خود فریبی غالب ہے۔ اور اگر خوف و رجاء کے سرچشموں پر نظر ڈالی جائے تو رجاء کو افضل کہنا پڑے گا اس لئے کہ رجاء کا سرچشمہ رحمت ہے، اور خوف کا منبع غضب ہے، اور جو شخص ان صفات میں غور و فکر کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم کو متقضی ہیں تو اسکے دل میں اللہ کی محبت زیادہ پیدا ہوتی ہے، اور محبت کے بعد کوئی مقام نہیں ہے، اور خوف کی صورت میں بندے کی توجہ باری تعالیٰ کی ان صفات پر ہوتی ہے، جو غیظ و غضب اور ناراضگی پر دلالت کرتی ہیں، ان صفات کے نتیجے میں ہیبت زیادہ ہوتی ہے، اتنی محبت اور انس حاصل نہیں ہوتا جتنی

محبت اور انس رجاء کی صورت میں حاصل ہوتا ہے۔

افضل کے بجائے اصلح: اصل میں خوف و رجاء بذات خود مقصود یا مطلوب نہیں ہیں' بلکہ غیر کے لئے مطلوب ہیں ہمارے خیال میں جو چیزیں غیر کے لئے مطلوب ہوں ان کے لئے لفظ افضل کے بجائے اصلح استعمال کرنا زیادہ صحیح ہے۔ اگر یہ اصول تسلیم کرلیا جائے تو ہم یہ کہیں گے کہ اکثر لوگوں کے حق میں رجاء کے بہ نسبت خوف اصلح ہے کیونکہ اکثر لوگوں پر معاصی کا غلبہ ہے اور وہ خوف ہی کے تازیانے سے گناہ ترک کرسکتے ہیں' رجاء انہیں جری بنا سکتی ہے' جب کہ ان اہل تقویٰ کے حق میں جنہوں نے ظاہر و باطن کو گناہوں سے پاک کرلیا ہو خوف اور رجاء میں اعتدال اصلح ہے' اسی لئے کسی کا یہ مقولہ بہت مشہور ہے کہ اگر مومن کے خوف و رجاء کا وزن کیا جائے تو دونوں برابر نکلیں۔ حضرت علیؓ نے اپنے ایک صاحبزادے کو نصیحت کی کہ اللہ تعالیٰ سے بہت زیادہ ڈر اور یہ فرض کرلے کہ اگر میں اپنے ساتھ دنیا جہاں کی نیکیاں بھی لے کر گیا تو مقبول نہ ہوں گی' اور بہت زیادہ رجاء رکھ اور یہ سوچ لے کہ اگر میں تمام دنیا کے گناہ سمیٹ کر لے گیا تو بھی مغفرت ہو جائے گی۔ حضرت عمرؓ فرمایا کرتے تھے کہ اگر یہ اعلان کیا جائے کہ ایک شخص کے سوا تمام لوگ جہنم میں جائیں گے تو میں اس کی رجاء کروں گا کہ وہ ایک شخص میں ہی ہوں' اور اگر یہ اعلان کیا جائے کہ ایک شخص کے سوا باقی تمام لوگ جنت میں جائیں گے تو میں یہ خوف کروں گا کہ کہیں وہ شخص میں ہی نہ ہوں' یہ خوف اور رجاء کا انتہائی درجہ ہے' اس غلبہ و استیلا کے ساتھ اعتدال بھی ہے۔ حضرت عمرؓ کا خوف و رجاء ہی برابر ہو سکتا ہے' ایک گنہگار آدمی جب یہ اعلان سنے گا کہ ایک کے سوا تمام لوگ دوزخ میں جائیں گے اور وہ فرض کرے گا کہ دوزخ میں جانے سے جس شخص کو مستثنیٰ کیا گیا ہے وہ میں ہی ہوں تو اسے مغالطہ بھی ہو سکتا ہے۔

حضرت عمرؓ کے خوف و رجاء میں مساوات: یہاں یہ اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ حضرت عمرؓ کے خوف و رجاء میں برابری نہیں ہونی چاہیے بلکہ ان پر رجاء غالب ہونا چاہیے۔ جیسا کہ کتاب الرجاء کی ابتداء میں گزر چکا ہے کہ رجاء کی قوت اسباب کی قوت کے اعتبار سے ہوتی ہے ہم نے اس کے لئے کھیتی اور بیج کی مثال دی گئی تھی' اور یہ بات واضح ہے کہ جو شخص صحیح بیج کسی عمدہ زمین میں ڈالتا ہے اور اس کی نگرانی کرتا ہے اور کھیتی کی تمام شرائط پوری کرتا ہے اس کے دل میں یہ توقع غالب رہتی ہے کہ محنت بار آور ہوگی اور کھیتی پک جائے گی متقین کا حال بھی یہی ہونا چاہیے کیونکہ انہوں نے بھی عمدہ زمین میں بہترین بیج بوئے ہیں اور وہ اپنی کھیتی کی نگرانی میں غفلت نہیں کرتے۔ جواب یہ ہے کہ جو لوگ معانی سے ہٹ کر محض الفاظ سے مطالب اخذ کرتے ہیں وہ اکثر لغزش کھا جاتے ہیں' کتاب الرجاء کے آغاز میں ہم نے جو مثال بیان کی ہے وہ اگرچہ متقین کے بعض احوال پر منطبق ہوتی ہے لیکن تمام احوال پر باقاعدہ طور پر منطبق نہیں ہوتی۔ اصل میں غلبۂ رجاء کا سبب علم ہے' اور علم تجربے سے حاصل ہوتا ہے' مذکورہ مثال میں تجربے سے یہ بات معلوم ہو سکتی ہے کہ زمین اچھی اور صاف ہے' بیج عمدہ ہے' ہوا صاف ہے' اور کھیتی کو برباد کرنے والی بجلیاں اس علاقے میں شاذ و نادر ہی گرتی ہیں' لیکن زیر بحث مسئلے میں بیج کی آزمائش نہیں ہوتی کہ وہ اچھا ہے یا خراب' پھر وہ ایک اجنبی زمین میں ڈال دیا گیا اس کے بعد کاشت کار نے اس کی نگرانی کی' نہ کوئی خبر لی' اور وہ زمین بھی ایسے علاقے میں واقع ہے جس کے بارے میں نہیں نہیں کہا جاسکتا کہ وہاں بجلیاں گرتی ہیں یا نہیں' ایسے کسان پر خوف کے مقابلے میں رجاء غالب ہی نہیں آسکتی خواہ وہ کتنی ہی جدوجہد اور کوشش کیوں نہ کرے زیر بحث مثال میں بیج ایمان ہے اور اس کی عمدگی کی شرائط دقیق ہیں' زمین قلب ہے' اور قلب کی خباثتیں' اور صفات شرک خفی نفاق اور ریا وغیرہ نہایت غامض اور پوشیدہ ہیں' اور اس کھیتی کے لئے دنیاوی شہوات و لذات' دل کا موجودہ زمانے میں ان کا ملتفت ہونا یا مستقبل میں اسکے التفات کا امکان ہونا ایسی آفتیں ہیں جو اچھی خاصی کھیتی کو تباہ کرسکتی ہیں ان میں سے کوئی بھی چیز ایسی نہیں جو تجربے سے معلوم ہو سکے' اسلئے کہ بعض اوقات ایسے حالات پیش آتے ہیں جو آدمی کی طاقت سے باہر ہوتے ہیں' پھر صواعق (بجلیوں) کا خطرہ بھی اپنی جگہ ہے' یہ صواعق سکرات موت کی دہشتیں ہیں' اس وقت عقیدے مضطرب ہو جاتے ہیں' اور عزائم کے محل چکنا چور ہو جاتے ہیں' ان صواعق کا علم بھی تجربے کے دائرے سے خارج ہے' پھر یہ کھیتی دنیاوی کھیتی کی طرح جلدی نہیں کٹتی' بلکہ اس کا وقت وہ ہے جب قیامت برپا ہوگی'

اس دن کا بھی تجربہ نہیں ہے۔ اب اگر کوئی شخص کمزور دل ہے تو اس پر خوف غالب ہوتا ہے' جیسا کہ بعض ایسے صحابہ و تابعین کے احوال مذکور ہوں گے جن کے دل کمزور تھے' اور جو لوگ مضبوط دل کے ہوتے ہیں' اور معرفت میں کامل ہوتے ہیں ان کا خوف و رجاء برابر ہوتا ہے' اور ان پر صرف رجاء غالب نہیں ہوتا حضرت عمرؓ کا عالم تو یہ تھا کہ وہ ہر وقت اپنے دل کی جستجو کیا کرتے تھے' اور اسکے مخفی امراض کا پتا لگانے کے لئے تجسس سے کام لیتے تھے یہاں تک کہ حضرت حذیفہؓ سے دریافت فرماتے تھے کہ میرے اندر تمہیں نفاق کی کوئی علامت تو نظر نہیں آئی' حضرت حذیفہؓ سے دریافت کرنے کی کیا وجہ یہ تھی کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں منافقین کی علامات سے آگاہ فرمادیا تھا۔ (۱) آج کون ہے جو اپنے دل کو نفاق اور شرک خفی سے اس طرح پاک کرتا ہو' اور اگر کسی نے یہ سمجھ لیا کہ میرا دل صاف ہے تو اللہ تعالیٰ کی پکڑ سے کہاں تک مامون رہے گا' ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے دل میں صفائی کا خیال ڈال دیا ہو اور حقیقت اسکے برعکس ہو' اور اگر کسی شخص کو واقع میں بھی دل کا تزکیہ اور اس کی صفائی حاصل ہو اور وہ یہ اعتقاد بھی رکھتا ہے کہ میرا دل پاک و صاف ہے تو اس نے یہ بات کیسے جان لی کہ وہ خاتمے کے وقت تک اسی حال پر رہے گا' جب کہ حدیث شریف میں ارشاد فرمایا گیا ہے:۔

اِنَّ الرَّجُلَ لَیَعْمَلُ الزَّمَنَ الطَّوِیْلَ بِعَمَلِ اَھْلِ الْجَنَّةِ ثُمَّ یُخْتَمُ لَهٗ بِعَمَلِ اَھْلِ النَّارِ
(مسلم۔ ابوہریرہؓ)

آدمی طویل عرصے تک جنت والوں کے سے عمل کرتا ہے' پھر اس کا خاتمہ اہل دوزخ کے عمل پر ہوتا ہے۔

بعض روایات میں آیا ہے کہ آدمی زندگی بھر اچھے اعمال کرتا ہے' لیکن جب اس میں اور موت میں ایک بالشت کا فاصلہ رہ جاتا ہے اور بعض روایات کے مطابق اتنا وقفہ رہ جاتا ہے جتنا وقفہ اونٹنی کا دودھ دوہنے کے وقت دو دفعہ دودھ نکالنے کے درمیان ہوتا ہے تو نوشتہ ازلی سبقت کرتا ہے اور اس کا خاتمہ دوزخیوں کے عمل پر ہوتا ہے۔ یہ ایک مختصر وقفہ ہے' اس میں آدمی اعضاء سے عمل نہیں کرسکتا' لیکن اس وقفے میں دل ایسے تصورات اور وساوس کا آماجگاہ بن سکتا ہے جو اسکی بدبختی کا باعث بن جائیں' اور وہ تمام راس المال ضائع کردیں جو اس نے عمر بھر کی ریاضتوں سے ذخیرہ کیا ہے' جب صورت حال یہ ہو تو آدمی بے خوف کس طرح رہ سکتا ہے' اس لئے مومن کے لئے خوف اور رجاء دونوں کا وجود ضروری ہے' بلکہ ان دونوں میں مساوات بھی ضروری ہے۔ عام لوگوں پر رجاء کا غالب ہونا ان کی غلط فہمی اور کم علمی کی دلیل ہے اسی لئے قرآن کریم نے جہاں جہاں اپنے بندوں کے اوصاف ذکر فرمائے ہیں ان دونوں کو یکجا بیان فرمایا ہے:۔

یَدْعُوْنَ رَبَّھُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا (پ۲۱ ر۱۵ آیت ۱۶)

اپنے رب کو امید سے اور خوف سے پکارتے ہیں۔

وَیَدْعُوْنَنَا رَغَبًا وَّرَھَبًا (پ۱۷ ر۶ آیت ۹۰)

اور امید و بیم کے ساتھ ہمیں پکارا کرتے تھے۔

لیکن اب حضرت عمرؓ جیسے صاحب عزیمت انسان کہاں ہیں جو رجاء اور خوف میں مساوات برقرار رکھ سکیں' اسلئے موجودہ دور میں تو لوگوں کے لئے خوف زیادہ مناسب ہے' بشرطیکہ یہ خوف انھیں مایوسی' ترک عمل اور ناامیدی تک نہ پہنچائے' بعض لوگ اس خوف سے کہ ہم گنہگار ہیں' ہماری مغفرت کی کوئی امید نہیں ہے عمل ترک کردیتے ہیں اور گناہوں میں غرق رہتے ہیں' ایسا خوف مفید ہونے کے بجائے نقصان دہ ہے' ایسے خوف کی شریعت میں کہاں گنجائش ہوسکتی ہے جو عمل ترک کرادے' خوف وہی مفید ہے جس سے عمل پر ترغیب ہو' شہوات سے تنفر ہو' اور جو دنیا کی طرف ملتفت نہ ہونے دے۔ خوف یہ نہیں ہے کہ دل میں ایک خیال آیا' اور گزر گیا'

---

(۱) حضرت حذیفہ کی یہ روایت مسلم میں مروی ہے

اعضاء پر اسکا ذرا بھی اثر نہیں ہوا' نہ اعمال بد سے نفرت ہوئی اور نہ اعمال حسنہ کی ترغیب ہوئی یاس کا نام بھی خوف نہیں۔ جس سے ناامیدی جنم لے' حضرت یحییٰ ابن معاذؒ فرماتے ہیں کہ جو شخص محض خوف سے اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا ہے وہ فکر کے سمندروں میں غرق ہو جاتا ہے اور جو صرف رجاء کے ساتھ اللہ کی عبادت کرتا ہے وہ مغالطے کی وادی میں گم ہو جاتا ہے' صرف وہ شخص ذکر کی راہ میں مستقیم رہتا ہے جو خوف اور رجاء کے ساتھ عبادت کرے' مکحول دمشقی فرماتے ہیں جو شخص خوف کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا ہے وہ خارجی ہے اور جو خوف رجاء اور محبت کے ساتھ کرتا ہے وہ مرجی ہے اور جو محبت کے ساتھ کرتا ہے وہ زندیق ہے اور جو شخص خوف رجاء اور محبت کے ساتھ کرتا ہے وہ موحد ہے۔ ان سب اقوال کا خلاصہ یہ ہے کہ اگرچہ ان تمام چیزوں کا اجتماع پسندیدہ ہے۔ لیکن جب تک موت نہ آئے زیادہ مفید اور مناسب خوف ہے' موت کے وقت رجاء اور رحمت الٰہی کے ساتھ حسن ظن زیادہ موزوں ہے۔ اسلئے کہ خوف تو ایک تازیانہ ہے جو بندے کو عمل پر اکساتا ہے اور عمل کا وقت گزر چکا ہے' جو شخص موت سے ہم کنار ہونے والا ہے وہ عمل پر قدرت نہیں رکھتا اور نہ اسکی سکت رکھتا ہے کہ خوف کے اسباب برداشت کرسکے' خوف سے دل اور ڈوبے گا اور موت سے اور زیادہ قریب ہو گا جب کہ رجاء سے قلب کو تقویت حاصل ہوتی ہے' اور اللہ تعالیٰ کی محبت رگ و پے میں سما جاتی ہے' بندے کے لئے سعادت اسی میں ہے کہ وہ دنیا سے رخصت ہو تو اسکے دل میں اللہ کی محبت کے چراغ روشن ہوں' اور وہ باری تعالیٰ سے ملاقات کا مشتاق ہو' جو شخص اللہ سے ملاقات چاہتا ہے اللہ اس سے ملاقات چاہتا ہے اور یہ انس و محبت' شوق ملاقات اور تمنائے دیدار علوم اور اعمال سے مقصود اللہ تعالیٰ کی معرفت ہے' اور معرفت کا ثمر محبت ہے' مرنے کے بعد ہر ذی روح کو اسکے پاس پہنچنا ہے' وہیں اس کا اصل ٹھکانہ ہے جو شخص اپنے محبوب سے ملتا ہے اسے اسی قدر خوشی ہوتی ہے جس قدر محبت ہوتی ہے اور جو شخص اپنے محبوب سے جدا ہوتا ہے اسے اسی قدر اذیت ہوتی ہے جس قدر محبت ہوتی ہے۔ اب اگر کسی شخص کے دل پر محبت کے وقت بیوی بچوں کی' مال' مکان' زمین جائداد' دوست احباب اور اقارب کی محبت غالب ہے تو یہ ایسا شخص ہے جس کی تمام محبوب چیزیں دنیا میں ہیں' دنیا اس کی جنت ہے' اسلئے کہ جنت اسی مخصوص مکان کا نام ہے جو تمام محبوب اور پسندیدہ چیزوں کو جامع ہے' ایسے شخص کا مرنا ایسا ہے جیسے جنت سے نکلنا' موت اسکے اور اسکی محبوب چیزوں کے درمیان حجاب بن جاتی ہے اور یہ ایک ایسی تکلیف ہے جسے مشکل ہی سے برداشت کیا جاسکتا ہے' اس لئے دنیا دار لوگ موت سے خوف کھاتے ہیں' اور اس زندگی کو چھوڑ کر جانا پسند نہیں کرتے' جب کہ وہ شخص جس کا محبوب اللہ ہے' اور جس کو دنیا کی زندگی میں صرف ذکر' فکر اور معرفت سے انس رہا ہے' اور وہ دنیاوی علائق اور روابط کو اپنے لئے مضر تصور کرتا ہے اسکے لئے یہ دنیا ایک قید خانہ ہے' یہاں اسے ایک لمحے کے لئے بھی سکون نہیں ملتا' وہ ہر وقت اس کوشش میں رہتا ہے کہ قید خانے سے نجات پائے اور اپنے محبوب سے ملاقات کرے' اب تم اس کیفیت کا تصور کرو جو ایک قیدی کو قید خانے سے رہا ہونے کے بعد اس وقت حاصل ہوتی ہے جب وہ اپنے محبوب سے ملاقات کرتا ہے۔ یہ وہ خوشی ہے جو بندۂ مومن جسم کی قید سے نجات پانے کے بعد پہلے پہل پاتا ہے' یہ اس ثواب سے الگ ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے رکھ چھوڑا ہے' یہ ثواب کیا ہے' اسے نہ کسی آنکھ نے دیکھا ہے' نہ کسی کان نے سنا ہے اور نہ کسی کے دل میں اس کا خیال گزرا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ ثواب ان لوگوں کے لئے تیار رکھا ہے جو آخرت کی زندگی کو دنیا کی زندگی پر ترجیح دیتے ہیں' اسی پر راضی رہتے ہیں' اور اسی سے تسلی پاتے ہیں اسی طرح کافر کو دنیا چھوڑنے پر جو تکلیف ہوتی ہے وہ اس عذاب سے جدا ہے جو اللہ تعالیٰ نے نافرمان بندوں کے لئے رکھ چھوڑا ہے' اس میں طرح طرح کے مصائب ہیں' زنجیریں ہیں' طوق ہیں' رسوائی اور ذلت کے سامان ہیں۔ ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ہمیں بحالت اسلام موت دے' اور ہمیں صلحاء کے ساتھ ملائے' اور اس دعا کی قبولیت کی رجاء اللہ تعالیٰ کی محبت حاصل کئے بغیر نہیں ہے' اور اللہ تعالیٰ کی محبت اس وقت تک حاصل نہیں ہوتی جب تک دل سے غیر اللہ کی محبت نہ نکل جائے' اور ان تمام علائق سے دل کا تعلق منقطع نہ ہو جائے جو اللہ کی محبت کے حصول میں حارج ہیں جیسے مال' جاہ' وطن وغیرہ۔ ہمارے لئے بہتر یہ ہے کہ ہم اللہ رب العزت کے حضور وہ دعا کریں جو ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مانگی ہے :-

اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنِيْ حُبَّكَ وَحُبَّ مَنْ اَحَبَّكَ وَحُبَّ مَا يُقَرِّبُنِيْ اِلٰى حُبِّكَ وَاجْعَلْ حُبَّكَ اَحَبَّ اِلَيَّ مِنَ الْمَاءِ الْبَارِدِ (ترمذی۔ معاذ)

اے اللہ! مجھے اپنی اور ان لوگوں کی جو تجھ سے محبت رکھتے ہیں اور ان لوگوں کی جو مجھے تیری محبت سے قریب کردیں محبت عطا کر اور اپنی محبت کو میرے لئے ٹھنڈے پانی سے زیادہ بنا۔

بہرحال موت کے وقت غلبۂ رجاء اصلح ہے اس لئے کہ اس سے محبت پیدا ہوتی ہے اور موت سے پہلے خوف شہوات کی آگ سرد ہوتی ہے اور دل سے دنیا کی محبت نکالتی ہے۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

لَا يَمُوْتَنَّ اَحَدُكُمْ اِلَّا وَهُوَ يُحْسِنُ الظَّنَّ بِرَبِّهٖ

تم میں سے جو شخص بھی مرے وہ اپنے رب سے حسن ظن رکھے۔

ایک حدیث قدسی میں باری تعالیٰ کا یہ ارشاد منقول ہے "اَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِيْ بِيْ فَلْيَظُنَّ بِيْ مَا شَاءَ" میں اپنے بندے کے گمان کے مطابق ہوں' وہ جو چاہے میرے بارے میں گمان رکھے۔ حضرت سلیمان تیمی کی وفات کا وقت قریب آیا تو انہوں نے اپنے صاحبزادوں سے فرمایا کہ میرے سامنے رخصتیں بیان کرتے رہو' اور جب تک میں نہ مرجاؤں رجاء کا ذکر کرتے رہو تاکہ موت کے بعد میں اپنے مولیٰ سے حسن ظن کے ساتھ ملاقات کروں' اسی طرح حضرت سفیان ثوری کی وفات کا وقت قریب آیا اور ان کا اضطراب بڑھ گیا تو بہت سے علماء ان کے پاس آئے اور ان سے رجاء کا بیان کرنے لگے' حضرت امام احمد ابن حنبلؒ نے وفات کے وقت اپنے صاحبزادے سے فرمایا کہ میرے سامنے ان روایات کا ذکر کرو جن میں رجاء وارد ہے اور حسن ظن کی ترغیب ہے۔ ان سب کا مقصود یہ تھا کہ اس وقت میں اللہ تعالیٰ کو اپنا محبوب بنالیں' حضرت داؤد علیہ السلام پر وحی نازل ہوئی کہ مجھے میرے بندوں میں محبوب کر' عرض کیا کس طرح؟ فرمایا ان کے سامنے میرے انعامات اور احسانات بیان کر۔

خلاصہ یہ ہے کہ آدمی کی سعادت اسی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت میں موت آئے' اور محبت دو چیزوں سے حاصل ہوتی ہے معرفت سے' اور دل سے دنیا کی محبت نکال لینے سے یہاں تک کہ دنیا اسکے لئے محبوب کے اور اس کے درمیان ایک مانع کی حیثیت اختیار کرجائے' ایک بزرگ نے سلیمان دارانی کو خواب میں دیکھا کہ رو رہے ہیں' وجہ دریافت کی' فرمایا: ابھی میں قید سے رہا ہوا ہوں' صبح اٹھ کر انہوں نے سلیمان دارانی کے متعلق دریافت کیا' لوگوں نے بتایا رات ان کا انتقال ہوگیا۔

خوف کی حالت حاصل کرنے کی تدبیر

جاننا چاہیے کہ صبر کے باب میں ہم نے صبر کی دوا اور اس کا علاج نہایت بسط و تفصیل سے بیان کیا ہے' وہی علاج یہاں بھی مفید ہوگا' اسلئے کہ صبر اسی وقت ممکن ہے جب دل میں خوف اور رجاء ہو' اس کی وجہ یہ ہے کہ دین کے مقامات میں سے پہلا مقام یقین ہے جس کے معنی ہیں اللہ تعالیٰ پر' یوم آخرت پر' اور جنت و دوزخ پر پختہ اعتقاد ہونا۔ اس اعتقاد سے دوزخ کا خوف پیدا ہوتا ہے اور جنت کی رجاء حرکت میں آتی ہے [illegible] اور صاحب ہیں جن کے تحمل پر صبر کی قوت [illegible] شہوات سے حاصل ہوتی ہے جن کے استعمال پر صبر کرنا خوف کی قوت کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اسی لئے حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ جو شخص جنت کا مشتاق ہوتا ہے وہ شہوات سے غافل ہوجاتا ہے اور جو دوزخ سے ڈرتا ہے محرمات سے دور رہتا ہے۔ [illegible] صبر کے بعد مجاہدہ اور اللہ کے ذکر و فکر کے لئے تجرد کا مقام ہے' [illegible] کامل معرفت حاصل ہوتا ہے' اور کامل معرفت و انس کے بعد محبت کا درجہ ہے' اور محبت کے بعد رضا و توکل وغیرہ مقامات ہیں۔ دین کے راستے پر چلنے میں منازل کی یہ ترتیب ہے۔ سب سے پہلے یقین ہے' اسکے بعد خوف و رجاء ہے۔ خوف و رجاء کے بعد صبر کا درجہ ہے' اور صبر کے بعد مجاہدہ اور اللہ کے لئے ظاہری و باطنی طور پر تجرد کا مقام ہے' مجاہدے کے بعد اگر کسی کے لئے راستہ واضح کردیا جاتا ہے تو ہدایت اور معرفت ہے' اور معرفت کے بعد انس و محبت کا درجہ

ہے محبت کا تقاضا رضا ہے' رضا کے معنی ہیں محبوب کے فعل پر راضی رہنا' اسکی عنایت پر اعتماد کرنا اور توکّل کرنا۔

خوف کی دو صورتیں : اس تفصیل کا حاصل یہ ہے کہ صبر کے علاج میں جو کچھ ہم نے بیان کیا ہے وہ یہاں خوف کے علاج کے لئے بھی کافی ہے' اور اس سلسلے میں مزید کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تاہم خوف کا علاج ہم الگ مختصر طور پر ذکر کرتے ہیں۔ اصل میں خوف کی دو صورتیں ہیں' ان میں سے ایک دوسری کے بہ نسبت افضل ہے۔ ان دونوں صورتوں کی ایک مثال دی جاتی ہے۔ فرض کیجئے ایک بچہ کسی مکان میں موجود ہے' اچانک اس مکان میں کوئی درندہ یا سانپ وغیرہ گھس آتا ہے' ہو سکتا ہے وہ بچہ اس درندے یا سانپ سے عداوت نہ کھائے بلکہ اسے پکڑنے کی کوشش کرے' اور اس مقصد کیلئے ہاتھ بڑھائے' لیکن اگر اس کے ساتھ اس کا باپ بھی ہو اور عقل و خرد سے محروم نہ ہو اور وہ سانپ کو دیکھ کر ڈر رہے یا بھاگنے کی کوشش کرے تو بچہ بھی اسکی تقلید میں بھاگے گا' اور باپ کو دیکھ اس پر بھی خوف چھا جائے گا' اب دیکھئے یہاں ایک خوف باپ کا ہے' اور ایک بچے کا۔ باپ سانپ کی خاصیت سے واقف ہے' اور اسکے زہر کے اثرات کا علم رکھتا ہے' اسے یہ بھی معلوم ہے کہ درندہ اچک کر حملہ کرتا ہے' اور اپنے شکار کو بے رحمی سے ہلاک کرتا ہے' ایک خوف بچے کا ہے' اسے سانپ یا درندے کا کوئی علم نہیں' نہ وہ یہ جانتا ہے کہ سانپ زہریلا ہے' نہ وہ یہ جانتا ہے کہ درندہ چیر پھاڑ کر ہلاک کر دیتا ہے' وہ صرف باپ کی حرکات و سکنات پر نظر رکھتا ہے' اور جس طرح باپ ڈر کر بھاگتا ہے اسی طرح وہ بھی بھاگنے کی کوشش کرتا ہے' اور سانپ یا درندے سے ڈرنے لگتا ہے' لیکن سانپ اور درندہ خطرناک کیوں ہیں اسے اس کی وجہ معلوم نہیں ہوتی' اس مثال کے بعد یہ بات جان لینی چاہیے کہ جس طرح اس خوف کی دو صورتیں ہیں اسی طرح باری تعالیٰ سے خوف کی بھی دو صورتیں ہیں' ایک اس کے عذاب کا خوف اور دوسرا اسکی ذات سے خوف۔ دوسری قسم کا خوف ان لوگوں کو ہوتا ہے جو اہل علم ہیں' ارباب قلوب ہیں' اور اللہ تعالیٰ کی ان صفات سے واقف ہیں جو ہیبت خوف اور ڈر کو مقتضی ہیں' اور اللہ تعالیٰ کے ان ارشادات کے راز پر مطلع ہیں :-

وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهُ (پ ۳ ر ۱۱ آیت ۲۸) اِتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهِ (پ ۴ ر ۲ آیت ۱۰۲)

اور اللہ تعالیٰ تم کو اپنی ذات سے ڈراتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے ڈرا کرو (جو) ڈرنے کا حق ہے۔

اور پہلی قسم کا خوف عام مخلوق کو ہوتا ہے' یہ اسلئے ہوتا ہے کہ وہ جنت اور دوزخ پر ایمان لاتے ہیں اور یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ اطاعت کا صلہ جنت ہے اور معصیت کی سزا جہنم ہے' عام مخلوق میں یہ خوف غفلت کے باعث' اور ایمان کی کمزوری کی بناء پر اتنا قوی نہیں ہوتا جتنا ہونا چاہیے' اگر کوئی شخص وعظ و نصیحت سنتا ہے' اور قیامت کے ہولناک مناظر کا تصور کرتا ہے' اور آخرت کے مختلف عذابوں کے بارے میں سوچتا ہے تو یہ غفلت ختم بھی ہو جاتی ہے' بلکہ اس غفلت کے خاتمے کے لئے خائفین کو دیکھنا ان کے پاس بیٹھنا' اور ان کے احوال کا مشاہدہ کرنا بھی نہایت مفید ہے' بلکہ اگر مشاہدہ نہ ہو تو صرف سننا بھی مؤثر ہے' دوسری قسم کا خوف اعلا ہے' اس خوف کے معنی یہ ہیں کہ اس سے دوری اور حجاب سے ڈرا جائے' اور قرب کی رجاء کی جائے۔ حضرت ذوالنون مصریؒ فرماتے ہیں کہ دوزخ کے خوف کے مقابلے میں باری تعالیٰ کی جدائی کا خوف ایسا ہے جیسے سمندر کے مقابلے میں پانی کا قطرہ۔ لیکن عام لوگوں کو یہ خوف نہیں ہوتا' بلکہ یہ خوف صرف علماء کے ساتھ مخصوص ہے :-

إِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ (پ ۲۲ ر ۱۵ آیت ۲۸)

اللہ تعالیٰ سے اسکے بندوں میں صرف علماء ڈرتے ہیں۔

اس خشیت کا کچھ حصہ عام مومنین کو بھی میسر ہے' لیکن علم اور تجربے کی راہ سے نہیں' بلکہ محض تقلید سے' جیسے بچہ اپنے باپ کی تقلید میں سانپ سے ڈرتا ہے' اس کا تعلق بصیرت سے نہیں ہوتا' اس لئے یہ خوف ضعیف بھی ہوتا ہے' اور بہت جلد اسکے اثرات زائل بھی ہو جاتے ہیں' بچہ جس طرح باپ کی تقلید میں خوف زدہ ہوتا ہے اسی طرح اسکی تقلید میں جری بھی ہو جاتا ہے مثال کے طور پر کسی بچے کا باپ سپیرا ہے اور وہ اکثر و بیشتر سانپ پکڑتا ہے' اور انھیں ہاتھ پر لپیٹتا ہے' یا گلے میں لٹکاتا ہے تو باپ کی دیکھا دیکھی وہ بھی ایسا ہی کرنے لگتا ہے' اسے یہ خوف نہیں ہوتا کہ یہ سانپ اسے ہلاک کر دے گا۔ اکثر و بیشتر تقلیدی عقائد ضعیف ہوتے ہیں' الّا یہ کہ ان کے

اسباب کا مستقل طور پر مشاہدہ ہوتا رہے' اور ان اسباب کے مطابق طاعت پر اقدام اور معصیت سے اجتناب رہے اور مدّت دراز ہونے تک اس پر مواظبت ہو تو یہ عقائد پختہ اور راسخ ہو جاتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ جو لوگ اوج معرفت پر ہیں' اور اللہ تعالیٰ کو پہچانتے ہیں وہ ہر حال میں خوف کرتے ہیں' ان کے لئے علاج کی ضرورت نہیں ہے' جب کوئی مرض ہی نہیں ہے تو علاج کیا ہوگا' جیسے کوئی شخص درندے سے ڈرتا ہو' اور چشم تصور سے اپنے جسم کو اس کے پنجوں میں گرفتار دیکھ کر مضطرب ہو اسے حصول خوف کے لئے کسی اور سبب کی کیا ضرورت ہے' وہ تو ہر حال میں خوف زدہ ہوگا' خواہ خوف کا ارادہ کرے یا نہ کرے' اسلئے اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام پر وحی بھیجی کہ مجھ سے ایسا ڈر جس طرح خونخوار درندے سے ڈرا جاتا ہے' کسی خونخوار درندے سے ڈرنے کے لئے اسکے علاوہ کسی تدبیر یا حیلے کی ضرورت نہیں ہے' کہ درندگی کی خصلت سے واقف ہو' اور اس کے پنجوں میں گرفتار ہو کر ہلاکت کا یقین رکھتا ہو' اگر کسی کو یہ دونوں باتیں معلوم ہوں تو پھر اسے خوف کے لئے کسی خارجی سبب یعنی لوگوں کے سمجھانے وغیرہ کی ضرورت نہیں ہے' وہ خود اس سے ڈرے گا اور اسے دیکھ کر راہ فرار اختیار کرے گا۔ اس طرح جو شخص اللہ تعالیٰ کو پہچانتا ہے اور یہ بات جانتا ہے کہ وہ جو چاہے کر سکتا ہے' اسے کوئی روکنے والا نہیں ہے' وہ جو چاہتا ہے فیصلہ کرتا ہے کسی سے ڈرتا نہیں' اس نے بلا کسی وسیلۂ سابق کے ملائکہ کو مقرّب بنایا' اور بلا کسی قصور سبق کے شیطان کو مردود ٹھہرایا ہے' اس کا وصف تو یہ ہے :۔

هٰؤُلَاءِ فِي الْجَنَّةِ وَلَا أُبَالِي وَهٰؤُلَاءِ فِي النَّارِ وَلَا أُبَالِي

یہ لوگ جنت میں ہیں کہ مجھے اسکی پروا نہیں' اور یہ لوگ دوزخ میں ہیں مجھے اس کی پروا نہیں۔

عذاب و ثواب اطاعت و معصیت پر موقوف نہیں

تمہارے ذہن میں یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ صرف معصیت پر سزا دیتا ہے' اور صرف اطاعت پر جزاء سے نوازتا ہے' چنانچہ وہ جسے جزا دینا چاہتا ہے اسکی اطاعت کے اسباب سے اعانت کرتا ہے' پھر وہ چاہے نہ چاہے اس سے وہی اعمال سرزد ہوتے ہیں جنھیں اطاعت کہا جاتا ہے اور جن سے معصیت کا ارتکاب منظور ہوتا ہے انھیں معصیت کے اسباب فراہم کرتا ہے' پھر وہ چاہیں یا نہ چاہیں ان سے وہی اعمال سرزد ہوتے ہیں جن پر معصیت کا اطلاق ہوتا ہے' اسلئے اللہ تعالیٰ بغیر اطاعت کے سزا نہیں دیتا' اور بغیر معصیت کے عذاب نہیں دیتا۔ جب اطاعت و معصیت کے اسباب مہیا ہوتے ہیں تو بندہ کو طوعاً" و کرہاً" وہ عمل کرنا ہی پڑتا ہے جو اسکی قسمت میں لکھ دیا گیا ہے' اور جب وہ عمل ظہور میں آتا ہے' تو اس کے مطابق جزاء یا سزا بھی پاتا ہے' اس سے معلوم ہوا کہ جزاء و سزا اطاعت و معصیت پر ہے۔ لیکن ہم یہ کہتے ہیں کہ بندہ کو گناہ پر قدرت کسی سبب سے دی جاتی ہے' اگر یہ کہا جائے کہ سابقہ معصیت کی بناء پر' تو ہم یہ کہیں گے کہ اگر کسی شخص سے پہلی مرتبہ کوئی گناہ سرزد ہو تو اس کا سبب کیا ہوتا ہے' ظاہر ہے اس کے جواب میں یہی کہا جائے گا کہ ازل سے ہی اس کی قسمت میں یہ لکھا ہوا تھا' اس لئے اس سے وہ گناہ سرزد ہوا' یہی بات سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں بیان فرمائی ہے کہ ایک مرتبہ حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے درمیان باری تعالیٰ کے سامنے گفتگو ہوئی' حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت آدم علیہ السلام سے دریافت کیا کہ کیا آپ وہی آدم ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ سے پیدا فرمایا اور جن میں اپنی روح ڈالی' پھر جنھیں فرشتوں سے سجدہ کرایا اور اپنی جنت میں ٹھہرایا پھر آپ کے قصور کے باعث زمین پر اتار دیا گیا' حضرت آدم علیہ السلام نے جواب دیا کہ کیا تم وہی موسیٰ ہو جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی رسالت اور کلام کے لئے منتخب فرمایا' اور جسے تختیاں عطا کی گئیں جن میں ہر چیز کا بیان تھا' اور جسے سرگوشی کے لئے قریب کیا؟ ذرا یہ بتاؤ کہ اللہ تعالیٰ نے میری تخلیق سے کتنی مدّت پہلے تورات ایجاد فرمائی' حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا چالیس برس پہلے۔ حضرت آدم علیہ السلام نے دریافت کیا تمہیں اس میں یہ آیت بھی ملی ہے' وعصى آدم ربه فغوى' حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا جی ہاں! اس میں یہ آیت موجود ہے' حضرت آدم علیہ السلام نے فرمایا کیا تم مجھے ایسے عمل پر ملامت کرتے ہو جو اللہ تعالیٰ نے میری تخلیق سے چالیس برس پہلے مجھ پر لکھ دیا

تھا' سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اس تقریر سے حضرت آدم علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام پر غالب آگئے (مسلم۔ ابو ہریرہ) یہ ہے ثواب و عذاب کا سبب۔ جو شخص نور ہدایت سے اس سبب پر مطلع ہو گا اس کا شمار اللہ تعالیٰ کی خاص معرفت رکھنے والوں میں ہو گا' یہ لوگ تقدیر کے راز سے واقف ہوتے ہیں' اور جو لوگ سنتے ہی ایمان لے آتے ہیں' اور یقین کرلیتے ہیں وہ عام مومنین کے دائرے میں ہیں' ان دونوں فریقوں میں سے ہر ایک کے لئے خوف ہے' اگرچہ دونوں کے خوف میں وہ فرق ہے جو درندے اور بچے کی مثال میں واضح کیا گیا ہے۔

قبضہ قدرت میں انسان کی حیثیت : ہر انسان قبضہ قدرت میں ایسا ہے جیسے کوئی کمزور بچہ درندے کے پنجوں میں پھنس جائے' درندہ کبھی تو اتفاق سے غافل ہو تا ہے' اور اسے آزاد کر دیتا ہے' اور کبھی حملہ آور ہو تا ہے' اور چیر پھاڑ کر ہلاک کر دیتا ہے' یہ دونوں صورتیں حسب اتفاق ہوتی ہیں' لیکن ان اتفاقات کے لئے مرتب اور معلوم اسباب ہیں' اس لئے جسے عام آدمی اتفاق کہتا ہے اسے وہ لوگ تقدیر قرار دیتے ہیں' جو ہر معاملے کو قضائے الٰہی کے پس منظر میں دیکھتے ہیں' پھر درندے کے پنجوں میں گرفتار شخص اگر معرفت میں کامل ہے' اور وہ ہر شئی کو تقدیر ازلی سے مربوط سمجھتا ہے تو اس گرفتاری سے خائف نہیں ہو گا' اور نہ درندے سے ڈرے گا اسلئے کہ وہ یہ بات جانتا ہے کہ درندہ اللہ کے لئے مسخر ہے' اگر اس پر بھوک مسلط کی گئی تو وہ شکار کرے گا' اور غفلت مسلط کی گئی تو چھوڑ دے گا' بلکہ ایسا شخص درندے اور اس کی صفت سبعیت کے خالق سے ڈرتا ہے۔ اسلئے ہم یہ نہیں کہتے کہ اللہ تعالیٰ سے خوف کی مثال ایسی ہی جیسے درندے سے ڈرنا' بلکہ اگر دیکھا جائے تو درندے سے ڈرنا بعینہ اللہ تعالیٰ سے ڈرنا ہے' اسلئے کہ درندے کے ذریعے ہلاک کرنے والا وہی ہے۔

اس تفصیل کے بعد یہ بات جان لینی چاہیے کہ آخرت کے درندے دنیا کے درندوں کی طرح ہیں اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے عذاب کے اسباب بھی پیدا فرمائے ہیں' اور ثواب کے اسباب بھی پیدا فرمائے ہیں' جو جس چیز کا اہل ہے وہ تقدیر ازلی کے زور سے اسی کی سمت کھنچا چلا جاتا ہے' چنانچہ جنت پیدا فرمائی' اور اسکے اہل پیدا فرمائے جو اسباب جنت کے لئے مسخر ہیں خواہ وہ چاہیں یا نہ چاہیں' اسی طرح اس نے دوزخ پیدا کی اور اس کے اہل پیدا کئے جو اسباب جہنم کے لئے مسخر ہیں خواہ وہ اس پر راضی ہوں یا نہ ہوں۔ معرفت رکھنے والا شخص ہی تقدیر کے اسرار پر مطلع ہو سکتا ہے' اور وہی شخص حقیقی معنی میں خائف کہلا سکتا ہے جو اپنے آپ کو قضا و قدر کے سمندر میں ایک حقیر ذرہ سمجھتا ہو جسے تیز و تند موجیں کبھی ادھر پہنچا دیتی ہیں کبھی ادھر۔ بہرحال جو لوگ عارف ہیں انھیں خوف کا راستہ بتلانے کی ضرورت نہیں ہے' البتہ جو لوگ بصیرت کے مرتبے پر نہیں ہیں اور معرفت کے کمال سے محروم ہیں انھیں واقعی علاج کی ضرورت ہے۔ اور اس کی صورت یہ ہے کہ وہ اخبار و آثار سنیں' خائفین اور عارفین کے احوال کا علم حاصل کریں' اور ان لوگوں کا ان مغرور اور خود پسند لوگوں سے تقابل کریں جو رجاء کے گھوڑے پر سوار ہیں' اگر اس نے موازنہ کیا تو نتیجہ اسکے علاوہ کچھ نہ نکلے گا کہ پہلے فرقے کی اقتداء ہر حال میں مناسب ہے اسلئے کہ اس گروہ میں انبیاء اولیاء اور علماء ہیں' اور دوسرے گروہ میں فراعنہ' جہلاء اور خر دماغ لوگ ہیں۔

ایسے لوگوں کو سوچنا چاہیے کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اولین و آخرین کے سردار ہونے کے باوجود تمام لوگوں میں اللہ تعالیٰ کے زیادہ ڈرنے والے تھے۔ (۱) روایت ہے کہ ایک مرتبہ آپ کسی بچے کی نماز جنازہ پڑھا رہے تھے کہ کسی شخص کو یہ کہتے سنا "اَللّٰهُمَّ قِهِ عَذَابَ الْقَبْرِ وَعَذَابَ النَّارِ" (اے اللہ اس بچے کو عذاب قبر اور دوزخ سے بچائیے) ایک روایت میں ہے کہ آپ نے کسی کو یہ الفاظ کہتے ہوئے سنا "هَنِيْئاً لَكَ عُصْفُوْرٌ مِنْ عَصَافِيْرِ الْجَنَّةِ" (مبارک ہو تجھے' تو جنت کی چڑیوں میں سے ایک چڑیا ہے) آپ یہ سن کر خفا ہو گئے' اور کہنے والے سے فرمایا تو کیا جانے یہ ایسا ہی ہے بخدا میں اللہ کا رسول ہوں' لیکن مجھے نہیں معلوم کہ میرے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا' اللہ تعالیٰ نے جنت پیدا فرمائی ہے' پھر اس کے لئے اہل پیدا فرمائے ہیں' جن کی تعداد میں نہ زیادتی ہو گی اور نہ کمی (۲) حضرت عثمان ابن مظعونؓ ان صحابہ میں سے تھے جنھوں نے سب سے پہلے ہجرت فرمائی' روایت ہے کہ

(۱) یہ روایت پہلے بھی گزر چکی ہے (۲) اس میں پہلا جملہ طبرانی اوسط میں حضرت انسؓ سے مروی ہے اور دوسرا جملہ حضرت عائشہؓ سے۔

جب ان جلیل القدر صحابی کی وفات ہوئی، اور حضرت ام سلمہؓ نے ان کے جنازے پر یہ فرمایا "ھَنِیْئاً لَکَ الْجَنَّۃُ" (تجھے جنت مبارک ہو) اس پر سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ناراضگی کا اظہار فرمایا، اور وہی بات ارشاد فرمائی جو اس سے پہلے روایت میں گزر چکی ہے۔ اس واقعے کے بعد حضرت ام سلمہؓ فرمایا کرتی تھیں کہ عثمان کے بعد میں کسی کو پاک نہ کہوں گی (یعنی اسکے بارے میں کوئی ایسی بات نہ کہوں گی جس قطعیت کے ساتھ اسکے لئے جنت ثابت ہو) (بخاری۔ ام العلاء)۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے صاحبزادے محمد ابن خولہ الحنفیہ فرماتے ہیں کہ بخدا میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی کو پاک نہیں کہتا، نہ اپنے باپ کو جن سے میں پیدا ہوا ہوں، راوی کہتے ہیں کہ جب اس جملے کی وجہ سے شیعوں نے ان پر یلغار کی تو انہوں نے حضرت علی کے مناقب بیان کرنے شروع کردئے۔ ایک روایت میں اہل صفہ میں سے ایک کا حال مذکور ہے کہ جب انہوں نے شہادت پائی تو ان کی والدہ نے کہا مبارک ہو "تو جنت کی چڑیوں میں سے ایک چڑیا ہے" تو نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہجرت کی، اور اللہ کی راہ میں شہید ہوا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی والدہ سے فرمایا تجھے کیا معلوم؟ ہو سکتا ہے یہ شخص غیر مفید گفتگو کیا کرتا ہو، اور جو چیز اسکے لئے مضر نہ ہو، وہ نہ دیا کرتا ہو (بیہقی، ترمذی۔ انسؓ۔ باختلاف یسیر) ایک اور حدیث میں ہے کہ ایک مرتبہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے کسی صحابی کے پاس تشریف لے گئے جو بیمار تھے، آپ نے ایک عورت کو یہ کہتے ہوئے سنا "تجھے جنت مبارک ہو" آپ نے دریافت فرمایا یہ کون عورت ہے جو خدا پر حکم چلاتی ہے؟ مریض نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! یہ میری والدہ ماجدہ ہیں، آپ نے ارشاد فرمایا تجھے کیا معلوم شاید فلاں شخص لایعنی کلام کرتا ہو، اور ایسی چیز میں بخل کرتا ہو جسے اپنے پاس رکھنے سے مالدار نہ ہوتا۔ (۱)

خوف کا ثبوت قرآن و حدیث سے

مؤمنوں کو تو ہر حال میں خوف کرنا چاہیے کیا انہوں نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مبارک نہیں سنا :۔

شَیَّبَتْنِیْ ھُوْدٌ وَ اَخَوَاتُھَا سُوْرَۃُ الْوَاقِعَۃِ وَ اِذَا الشَّمْسُ کُوِّرَتْ وَ عَمَّ یَتَسَاءَلُوْنَ (ترمذی۔ ابن عباسؓ)

مجھے ہود اور اسکی بہنوں سورۂ واقعہ سورۂ کورت اور سورۂ عم یتساءلون نے بوڑھا کردیا ہے۔

علماء کرام کہتے ہیں کہ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ سورۂ ہود میں دھتکارنے اور دور کرنے کے مضامین زیادہ وارد ہوئے ہیں جیسے :۔

اَلَا بُعْدًا لِّعَادٍ قَوْمِ ھُوْدٍ (پ ۱۲ ر ۵ آیت ۶۰)

خوب سن لو رحمت سے دوری ہوئی عاد کو جو کہ ہود کی قوم تھی

اَلَا بُعْدًا لِّثَمُوْدَ (پ ۱۲ ر ۶ آیت ۶۸)

خوب سن لو رحمت سے ثمود کو دوری ہوئی۔

اَلَا بُعْدًا لِّمَدْیَنَ کَمَا بَعِدَتْ ثَمُوْدُ (پ ۱۲ ر ۸ آیت ۹۵)

خوب سن لو کہ مدین کو رحمت سے دوری ہوئی جیساکہ ثمود رحمت سے دور ہوئے تھے۔

آپ ان مضامین سے بہت زیادہ متاثر ہوئے، حالانکہ آپ کو معلوم تھا کہ اللہ تعالیٰ چاہتا تو یہ قومیں شرک نہ کرتیں اسلئے کہ ان سب کو راستے پر چلانا اسکے لئے آسان تھا۔ سورۂ واقعہ میں یہ مضمون بیان کیا گیا ہے :۔

لَیْسَ لِوَقْعَتِھَا کَاذِبَۃٌ خَافِضَۃٌ رَّافِعَۃٌ (پ ۲۷ ر ۱۳ آیت ۲-۳)

جس کے واقع ہونے میں کوئی خلاف نہیں ہے، وہ (بعض کو) پست کردے گی (اور بعض کو) بلند کردے گی۔

یعنی جو کچھ اللہ نے لکھ دیا ہے وہ ہو کر رہے گا، اسے کوئی جھٹلانے والا نہیں ہے، یہ واقعہ قیامت ہے، جو ہر حال میں ظہور پذیر ہوگا، پھر وہ قیامت یا تو ان لوگوں کو پست کرنے والی ہوگی جو دنیا میں بہت اونچے تھے، یا ان لوگوں کو اوپر اٹھانے والی ہوگی جو دنیا میں پست تھے،

(۱) یہ روایت گزر چکی ہے

سورۂ کورت میں قیامت کی وحشتوں کا بیان ہے' اور موت کے وقت کا ذکر ہے' فرمایا :

وَإِذَا الْجَحِيمُ سُعِّرَتْ وَإِذَا الْجَنَّةُ أُزْلِفَتْ عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا أَحْضَرَتْ (پ ۳۰ ر ۶ آیت ۱۲-۱۴)

اور جب دوزخ دہکائی جائے گی اور جب جنت نزدیک کر دی جائے گی اس وقت ہر شخص ان اعمال کو جان لے گا جو لے کر آیا ہے۔

عم کے حصے میں بھی کچھ اسی طرح کا مضمون وارد ہے :

يَوْمَ يَنظُرُ الْمَرْءُ مَا قَدَّمَتْ يَدَاهُ (پ ۳۰ ر ۲ آیت ۴۰)

جس دن ہر شخص ان اعمال کو دیکھے گا جو اس نے اپنے ہاتھوں کئے ہوں گے۔

لَا يَتَكَلَّمُونَ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ الرَّحْمَٰنُ وَقَالَ صَوَابًا (پ ۳۰ ر ۲ آیت ۳۸)

(اس روز) کوئی نہ بول سکے گا بجز اس کے جس کو رحمٰن (بولنے کی) اجازت دیدے' اور وہ شخص بات بھی ٹھیک کہے۔

قرآن کریم میں شروع سے آخر تک خوف کے مضامین ہیں' لیکن یہ مضامین ان لوگوں کے لئے ہیں جو قرآن کریم میں تدبر کرتے ہیں' اگر قرآن کریم میں صرف یہی ایک آیت ہوتی تو کافی ہوتی :

وَإِنِّي لَغَفَّارٌ لِّمَن تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدَىٰ (پ ۱۶ ر ۱۳ آیت ۸۲)

اور میں ایسے لوگوں کے لئے بڑا بخشنے والا بھی ہوں جو توبہ کرلیں اور ایمان لے آئیں اور نیک عمل کریں پھر (اسی) راہ پر قائم رہیں۔

اس آیت میں مغفرت کو چار شرطوں کے ساتھ مشروط کیا گیا ہے' توبہ' ایمان' عمل صالح اور ہدایت کے راستے پر استقامت' ان میں سے کوئی شرط ایسی نہیں ہے جو بندۂ ضعیف کے لئے مشکل نہ ہو' اور جسے توفیق ربانی کے بغیر ادا نہ کرسکے۔

فَأَمَّا مَن تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَعَسَىٰ أَن يَكُونَ مِنَ الْمُفْلِحِينَ (پ ۲۰ ر ۱۰ آیت ۶۷)

البتہ جو شخص توبہ کرے اور ایمان لائے اور نیک کام کیا کرے تو ایسے لوگ امید ہے کہ (آخرت میں) فلاح پانے والوں میں سے ہوں گے۔

اس طرح کے مضامین پر مشتمل آیتیں بے شمار ہیں جن میں سے کچھ یہاں درج کی جاتی ہیں۔

لِّيَسْأَلَ الصَّادِقِينَ عَن صِدْقِهِمْ (پ ۲۱ ر ۱۷ آیت ۸)

تاکہ ان سچوں سے ان کے سچ کی تحقیق کرے۔

سَنَفْرُغُ لَكُمْ أَيُّهَ الثَّقَلَانِ (پ ۲۷ ر ۱۳ آیت ۳۱)

اے جن و انس ہم عنقریب تمہارے (حساب کتاب کے) لئے خالی ہوئے جاتے ہیں۔

أَفَأَمِنُوا مَكْرَ اللَّهِ (پ ۹ ر ۲ آیت ۹۹)

ہاں تو کیا اللہ تعالیٰ کی اس (ناگہانی) پکڑ سے بے خوف ہو گئے۔

وَكَذَٰلِكَ أَخْذُ رَبِّكَ إِذَا أَخَذَ الْقُرَىٰ وَهِيَ ظَالِمَةٌ إِنَّ أَخْذَهُ أَلِيمٌ شَدِيدٌ (پ ۱۲ ر ۹ آیت ۱۰۲)

اور آپ کے رب کی دارو گیر ایسی ہی ہے جب وہ کسی بستی پر دارو گیر کرتا ہے جب کہ وہ ظلم کرتے ہوں' بلاشبہ اس کی پکڑ بڑی الم رساں اور سخت ہے۔

يَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِينَ إِلَى الرَّحْمَٰنِ وَفْدًا وَنَسُوقُ الْمُجْرِمِينَ إِلَىٰ جَهَنَّمَ وِرْدًا (پ ۱۶ ر ۹ آیت ۸۵-۸۶)

جس روز ہم متقیوں کو رحمٰن کی طرف مہمان بنا کر جمع کریں گے اور مجرموں کو دوزخ کی طرف (پیاسا) ہانکیں گے۔

وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا (پ۱۶ ر۸ آیت ۷۱)

اور تم میں سے کوئی بھی نہیں جس کا اس (دوزخ) پر سے گزر نہ ہو' یہ آپ کے رب کی طرف سے ضروری ہے جو پورا ہو کر رہے گا۔

اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (پ ۲۴ ر۹ آیت ۴۰)

جو جی چاہے کر لو وہ تمہارا سب کیا ہوا دیکھ رہا ہے۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ (پ۲۵ ر۴ آیت ۲)

جو شخص آخرت کی کھیتی کا طالب ہو ہم اسکو اس کھیتی میں ترقی دیں گے اور جو دنیا کی کھیتی کا طالب ہو تو ہم اسکو دنیا دے دیں گے اور آخرت میں اس کا کچھ حصہ نہیں۔

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ (پ۳۰ ر۲۴ آیت ۷-۸)

سو جو شخص دنیا میں ذرہ برابر نیکی کرے گا وہ (وہاں) اسکو دیکھ لے گا اور جو شخص ذرہ برابر بدی کرے گا وہ اسکو دیکھ لے گا۔

وَقَدِمْنَا اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا (پ۱۹ ر۱ آیت ۲۳)

اور ہم ان (کفار) کے اعمال کی طرف متوجہ ہوں گے سو ان کو ایسا (بیکار) کردیں گے جیسے پریشان غبار۔

وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ (پ۳۰ ر۲۸ آیت ۳-۱)

قسم ہے زمانے کی انسان بڑے خسارے میں ہے۔ مگر جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے اچھے کام کئے اور ایک دوسرے کو اعتقاد حق کی فہمائش کرتے رہے اور ایک دوسرے کو پابندی کی فہمائش کرتے رہے۔

اس سورت مین خسران سے بچنے کے لئے چار شرطیں بیان کی گئی ہیں' انبیاء علیہم السلام بھی اللہ تعالیٰ کے مکر سے بے خوف نہ تھے' اسلئے وہ بھی انعام و احسان کے باوجود اس سے ڈرتے تھے' اس لئے کہ وہ اس حقیقت سے واقف تھے :

فَلَا يَاْمَنُ مَكْرَ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْخٰسِرُوْنَ (پ۹ ر۲ آیت ۹۹)

سو خدا تعالیٰ کی پکڑ سے سوائے ان کے جو خسارہ پانے والے ہوں کوئی محفوظ نہیں رہتا۔

ایک روایت میں ہے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت جبرئیل علیہ السلام دونوں اللہ کے خوف سے روئے' اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کے پاس وحی بھیجی کہ تم کیوں روتے ہو میں نے تمہیں اپنے خوف سے مامون کردیا' دونوں نے عرض کیا کہ یا اللہ! تیرے مکر سے بے خوف کون ہو سکتا ہے؟ (ابن شاہین۔ عمرؓ) ان دونوں کو یہ بات معلوم تھی کہ اللہ تعالیٰ علام الغیوب ہے' اور وہ اپنے انجام سے واقف نہیں ہیں' اسلئے وہ اس بات سے بے خوف نہیں رہ سکتے کہ کہیں اللہ کا یہ قول کہ میں نے تمہیں اپنے خوف سے مامون کردیا محض ابتلاء اور آزمائش کے لئے نہ ہو' یہاں تک کہ جب وہ پرسکون ہو جائیں اور اللہ تعالیٰ کی پکڑ کا خوف باقی نہ رہے تب ان سے یہ دریافت کیا جائے کہ تم نے اپنا قول کیوں نہیں نبھایا چنانچہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نمرود نے منجنیق میں رکھوایا تو انھوں نے فرمایا "حَسْبِیَ اللّٰہُ" (اللہ میرے لئے کافی ہے) یہ ایک بہت بڑا دعویٰ تھا' اس لئے ان کا امتحان لیا گیا' اور حضرت جبرئیل علیہ السلام کو ان کے پاس بھیجا گیا وہاں جا کر انھوں نے دریافت کیا کہ آپ کو میری ضرورت تو نہیں' انھوں نے جواب دیا نہیں' تمہاری کوئی ضرورت نہیں

ہے' یہ جواب واقعۃً ان کے اس دعوی کی صداقت کا ثبوت تھا جو انھوں نے کیا تھا کہ میرے لئے میرا اللہ کافی ہے' اس واقعے کو اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے :۔

وَإِبْرَاهِيمَ الَّذِي وَفَّى (پ ۲۷ ر ۷ آیت ۳۷)

اور ابراہیم جنہوں نے احکام کی پوری بجا آوری کی۔

اسی طرح کا ایک واقعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مذکور ہے' حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جناب الٰہی میں عرض کیا۔

إِنَّنَا نَخَافُ أَن يَفْرُطَ عَلَيْنَا أَوْ أَن يَطْغَىٰ قَالَ لَا تَخَافَا إِنَّنِي مَعَكُمَا أَسْمَعُ وَأَرَىٰ (پ ۱۶ ر ۱۱ آیت ۴۶-۴۵)

اے ہمارے پروردگار ہمیں یہ اندیشہ ہے کہ وہ ہم پر زیادتی (نہ) کر بیٹھے' یا یہ کہ زیادہ شرارت نہ کرنے لگے' ارشاد ہوا کہ تم اندیشہ نہ کرو میں تم دونوں کے ساتھ ہوں سب سنتا ہوں' دیکھتا ہوں۔

یہ اطمینان دلانے کے باوجود تم دونوں کے ساتھ ہوں اور تمہیں دیکھ رہا ہوں اور تمہاری باتیں سن رہا ہوں جب جادو گروں نے اپنے جادو کا مظاہرہ کیا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام ڈر گئے' اسلئے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی پکڑ سے بے خوف نہیں تھے' اور ان پر بے خوفی کا معاملہ مشتبہ ہو گیا تھا' یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں نئے سرے سے اطمینان دلایا :۔

لَا تَخَفْ إِنَّكَ أَنتَ الْأَعْلَىٰ (پ ۱۶ ر ۱۲ آیت ۶۸)

تم ڈرو نہیں تم ہی غالب رہو گے۔

جب بدر کے دن مسلمانوں کے پاؤں اکھڑ گئے اور ان کی شوکت کمزور پڑ گئی تو رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا فرمائی کہ اے اللہ! اگر تو نے یہ جماعت ہلاک کردی تو روئے زمین پر کوئی شخص تیری عبادت کرنے والا باقی نہیں رہے گا' یہ دعا سن کر حضرت ابو بکرؓ نے ارشاد فرمایا یہ دعا چھوڑیئے اللہ تعالیٰ وہ وعدہ ضرور پورا کرے گا جو اس نے آپ سے کیا ہے' (بخاری۔ ابن عباسؓ) اس واقعے میں حضرت ابو بکر کا مقام یہ ہے کہ انھوں نے اللہ تعالیٰ کے وعدہ پر اعتماد کیا' اور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام یہ ہے کہ آپ اس کے مکر سے بے خوف نہیں ہوئے' یہ بڑا اعلا اور مکمل مقام ہے' اس مقام پر وہی لوگ فائز ہوتے ہیں جنھیں اسرار الٰہی' اس کے مخفی افعال اور صفات کے رموز کی معرفت حاصل ہوتی ہے' ان صفات میں بعض سے کچھ افعال صادر ہوتے ہیں' انھیں مکر کہا جاتا ہے' اللہ تعالیٰ کی صفات کی حقیقت پر مطلع ہونا کسی عام انسان کے بس کی بات نہیں ہے' جو شخص معرفت کی حقیقت سمجھتا ہے' اور یہ بھی جانتا ہے کہ میری معرفت حقائق امور کے ادراک سے قاصر ہے اسکا خوف لا محالہ زیادہ ہوتا ہے' اسی لئے جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے یہ سوال کیا گیا :۔

أَأَنتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُونِي وَأُمِّيَ إِلَٰهَيْنِ مِن دُونِ اللَّهِ (پ ۷ ر ۶ آیت ۱۱۶)

کیا تم نے ان لوگوں سے کہہ دیا تھا کہ مجھ کو اور میری ماں کو بھی خدا کے علاوہ دو معبود قرار دے لو۔

انھوں نے جواب میں فرمایا :۔

إِن كُنتُ قُلْتُهُ فَقَدْ عَلِمْتَهُ تَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِي وَلَا أَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِكَ (پ ۷ ر ۶ آیت ۱۱۶)

اگر میں نے یہ کہا ہو گا تو آپ کو اس کا علم ہو گا آپ تو میرے دل کے اندر کی بات بھی جانتے ہیں' اور میں آپ کے علم میں جو کچھ ہے اس کو نہیں جانتا۔

آخر میں ارشاد فرمایا :۔

إِن تُعَذِّبْهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ وَإِن تَغْفِرْ لَهُمْ فَإِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (پ ۷ ر ۶ آیت ۱۱۸)

اگر آپ ان کو سزا دیں تو یہ آپ کے بندے ہیں اور اگر آپ ان کو معاف کردیں تو آپ زبردست حکمت والے ہیں۔

آپ نے پورا معاملہ مشیت کو سونپ دیا' اور اپنے آپ کو مکمل طور پر درمیان سے نکال لیا' کیونکہ آپ یہ جانتے تھے کہ میرے اختیار میں کچھ نہیں ہے' تمام امور مشیت کے ساتھ اس طرح مربوط ہیں کہ عقل اور عادات کے دائرے سے خارج ہیں' اور ان پر قیاس' گمان اور وہم سے بھی کوئی حکم نہیں ہو سکتا' چہ جائیکہ تحقیق اور یقین کے ساتھ کسی امر کے بارے میں کچھ کہا جائے' عارفین کے دل یہی سوچ کر ٹکڑے ٹکڑے ہوتے ہیں' وہ جانتے ہیں کہ قیامت کے دن ہمیں ایک ایسی ذات سے واسطہ پڑے گا جسے کسی شخص کی ہلاکت کی کوئی پروا نہیں ہوتی' اسلئے کہ وہ نہ جانے اس جیسے کتنوں کو ہلاک کرچکا ہے' نہ جانے کتنے انسان ایسے ہیں جنہیں وہ دنیا میں طرح طرح کے عذاب دیتا ہے' اور انواع و اقسام کی جسمانی اذیتیں پہنچاتا ہے' اور ان کے دلوں میں بھی کفر و نفاق بھرتا ہے' اور ابد الآباد تک کے لئے ان کے مقدر میں عذاب لکھ دیتا ہے' پھر خود ہی فرماتا ہے:

وَلَوْ شِئْنَا لَآتَيْنَا كُلَّ نَفْسٍ هُدَاهَا وَلَٰكِنْ حَقَّ الْقَوْلُ مِنِّي لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ (پ ۲۱ ر ۱۵ آیت ۳)

اور اگر ہمیں منظور ہوتا تو ہم ہر شخص کو اس کا راستہ عطا فرماتے لیکن میری یہ بات محقق ہو چکی ہے کہ میں جہنم کو جنات اور انسان دونوں سے ضرور بھروں گا۔

ایک جگہ یہ ارشاد فرمایا:

وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ (پ ۱۲ ر ۱۰ آیت [illegible])

اور آپ کے رب کی (یہ) بات پوری ہوگی کہ میں جہنم کو جنات سے اور انسانوں سے دونوں سے بھروں گا۔

یقیناً اس امر سے ڈرنا چاہیے جس کا فیصلہ ازل میں ہو چکا ہے' اور جس کے تدارک کی کوئی صورت نہیں ہے اگر معاملہ فوری ہوتا' یا مستقبل پر موقوف ہوتا تو کوئی تدبیر یا حیلہ کیا جا سکتا تھا' لیکن اس صورت میں جب کہ ہر معاملہ ازل کی تقدیر سے وابستہ ہے سوائے تسلیم و رضا کے کچھ نہیں کیا جا سکتا' ان حالات میں صرف قرائن سے سابقہ ازلی کا کچھ حال معلوم کیا جا سکتا ہے' مثلاً ایک شخص ہے جس کے لئے شر کے اسباب مہیا ہوں' خیر کے اسباب اور اسکے درمیان حجاب حائل ہو' اور دنیا کے ساتھ اس کا تعلق [illegible] سکتا ہے کہ اس پر تقدیر ازلی [illegible] اسباب مہیا کئے جاتے ہیں جس کے لئے وہ پیدا کیا گیا ہے' اور اگر کسی شخص کو خیر کے اسباب میسر ہوں' اور اس کا دل قطعی طور پر دنیا سے منقطع ہو' اور اپنے ظاہر و باطن کے ساتھ اللہ کی طرف متوجہ ہو تو ایسا شخص بلاشبہ خوف میں کمی کر سکتا ہے بشرطیکہ وہ ہمیشہ اسی حال پر قائم رہے' لیکن خاتمے کا خوف' اور ثابت قدم رہنے کی دشواری سے خوف کی آگ بھڑکتی ہے' اور اس قدر بھڑکتی ہے کہ اسے بجھانا مشکل ہو جاتا ہے' بھلا قلب ایک حالت پر کیسے رہ سکتا ہے جب کہ حدیث کی رو سے مومن کا قلب اللہ تعالیٰ کی انگلیوں میں ہے جس طرح چاہے پلٹ دے' اور باری تعالیٰ یہ بھی ارشاد فرماتا ہے:

إِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَأْمُونٍ (پ ۲۹ ر ۷ آیت ۲۸)

(ان کے رب کا عذاب بے خوف ہونے کے لئے نہیں ہے۔)

عارفین کو سوءِ خاتمہ کا خوف

ان تمام آیات و روایات کو سننے کے بعد کوئی نادان جاہل ہی ایسا ہو سکتا ہے جو بے خوف ہو جائے' عارفین پر اللہ تعالیٰ کا احسان عظیم ہے کہ ان کے قلوب کو رجاء کے نرم جھونکوں سے تازہ رکھتی ہے' اگر ایسا نہ ہوتا تو خوف کی آگ سے ان کے دل جل جاتے' جس طرح خواص کے لئے رجاء کے اسباب رحمت ہیں اسی طرح عوام الناس کے لئے غفلت کے اسباب رحمت کا باعث ہیں' اس لئے کہ اگر عام لوگوں پر حقیقت حال منکشف ہو جائے تو روح جسم کا ساتھ چھوڑ دے' اور مقلب القلوب کے خوف سے دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے' ایک بزرگ کہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص پچاس برس تک توحید کے ساتھ معروف رہے' اور پھر ایک ستون کی آڑ میں مرجائے تو میں اسکی

توحید پر یقین نہ کروں۔ اس لئے کہ مجھے کیا معلوم اس وقفے میں اسکے قلب کے اندر کیا تبدیلی آئی۔ ایک بزرگ کہتے ہیں کہ اگر گھر کے دروازے پر مجھے شہادت ملے اور کمرے کے دروازے پر اسلام کی حالت میں موت ملے تو میں کمرے کے دروازے پر مرنے کو ترجیح دوں' اس لئے کہ مجھے اپنے قلب کا اطمینان نہیں ہے' ہو سکتا ہے کہ کمرے سے باہر دروازے تک پہنچتے پہنچتے بدل جائے' حضرت ابو الدرداءؓ فرماتے ہیں کہ بخدا اس شخص کا ایمان سلب ہو جاتا ہے جو موت کے وقت ایمان سلب ہونے سے بے خوف ہو' حضرت سہیل تستریؒ فرماتے ہیں کہ صدیقین کو ہر قدم پر یہ وسوسہ رہتا ہے کہ کہیں ان کا خاتمہ برا نہ ہو' اللہ تعالیٰ نے بھی ان کا یہ وصف بیان فرمایا ہے۔

وَقُلُوبُهُمْ وَجِلَةٌ (پ ۱۸ ر ۴ آیت ۴۰)

اور ان کے دل خوف زدہ ہوتے ہیں۔

جب حضرت سفیان ثوریؒ کی وفات کا وقت قریب آیا تو رونے لگے' وہ اس وقت انتہائی خوف زدہ تھے' لوگوں نے عرض کیا' آپ خوف نہ کریں' رجاء کریں' اللہ تعالیٰ کا عفو آپ کے گناہوں سے بڑھ کر ہے' فرمایا میں گناہوں کی وجہ سے نہیں روتا اگر مجھے یہ یقین ہو جائے کہ میرا خاتمہ توحید پر ہو گا تو مجھے گناہوں کی ذرا پروا نہ ہوں' خواہ وہ پہاڑوں کے برابر ہی کیوں نہ ہوں۔

ایک بزرگ کی وصیت : ایک بزرگ نے اپنے بھائی کو وصیت کی کہ جب میری وفات کا وقت قریب آئے تو میرے سرہانے بیٹھ جانا' اور یہ دیکھتے رہنا کہ میں کس حال پر مرتا ہوں' اگر میرا انتقال توحید پر ہو تو جو کچھ مال میرے پاس موجود ہے اس کی مٹھائی اور بادام خرید کر شہر کے بچوں میں تقسیم کر دینا' اور کہنا کہ ایک شخص قید خانے سے رہا ہوا ہے' مٹھائی اس کی آزادی کی خوشی میں ہے' اور اگر غیر توحید پر انتقال کروں تو لوگوں کو میرے حال سے مطلع کر دینا' ایسا نہ ہو کہ لوگ دھوکے میں مبتلا ہو کر میرے جنازے پر آئیں' اور مجھ سے ریاء لاحق ہو' اگر تم لوگوں کو میرے حال سے مطلع کر دو گے تو لوگ سوچ سمجھ کر آئیں گے' ریاء کی وجہ سے کوئی نہیں آئے گا' ان کے بھائی نے دریافت کیا مجھے کیسے معلوم ہو گا کہ آپ کا انتقال توحید پر ہوا ہے یا غیر توحید پر؟ انھوں نے اس کی کچھ علامات بتلادیں' راوی کہتے ہیں کہ انھوں نے توحید پر وفات پائی اور ان کے بھائی نے وصیت کی مطابق مٹھائی وغیرہ خرید کر بچوں میں تقسیم کی۔ حضرت سہیل تستریؒ فرماتے ہیں کہ مرید گناہ میں مبتلا ہونے سے ڈرتا ہے' اور عارف کفر میں مبتلا ہونے سے خوف زدہ رہتا ہے۔ ابو یزید کہا کرتے تھے کہ جب میں مسجد کے لئے گھر سے نکلتا ہوں تو مجھے ایسا لگتا ہے گویا میری کمر سے زنار بندھا ہوا ہے' گو میں اس بات سے ڈرتا ہوں کہ کہیں یہ زنار مجھے گرجا گھر' یا آتش کدے میں نہ لے جائے' جب تک مسجد میں داخل نہیں ہو جاتا زنار کا خیال دامنگیر رہتا ہے' یہ صورت حال شب و روز میں پانچ مرتبہ پیش آتی ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے حواریین سے ارشاد فرمایا کہ اے گروہ حواریین! تم گناہوں سے ڈرتے ہو' اور ہم انبیاء و رسل کفر سے ڈرتے ہیں' ایک نبی کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے برسوں تک بھوک' کھٹل اور برہنگی کی شکایت کرتے رہے' ان کا لباس اون کا ہوا کرتا تھا' اللہ تعالیٰ نے وحی نازل فرمائی کہ اے بندے ہم نے تجھے کفر سے بچایا کیا تیرے لئے یہ نعمت کافی نہیں ہے کہ دوسری نعمتیں مانگتا ہے' یہ سن کر انھوں نے اپنے سر پر خاک ڈالی' اور عرض کیا اے اللہ! میں راضی ہوں مجھے کفر سے محفوظ رکھ' جب عارفین اپنی قوت ایمانیہ' اور راہ خدا پر اپنی ثبات قدمی کے باوجود سوء خاتمہ سے ڈرتے ہیں' تو کمزور لوگوں کو اور بھی زیادہ ڈرنا چاہیے۔

سوء خاتمہ کے چند اسباب : جاننا چاہیے کہ سوء خاتمہ کے چند اسباب ہیں جو موت سے پہلے ظہور پذیر ہوتے ہیں' جیسے بدعت' نفاق' کبر اور دوسرے اوصاف ذمیمہ۔ ان میں نفاق سرفہرست ہے' اسی لئے صحابہ کرام نفاق سے بہت زیادہ ڈرا کرتے تھے' حضرت حسنؒ فرماتے ہیں کہ اگر مجھے یہ معلوم ہو جائے کہ میں نفاق سے بری ہوں تو یہ بات میرے لئے سورج نکلنے سے زیادہ محبوب ہے' یہاں نفاق سے مراد وہ نہیں ہے جو اصل ایمان کی ضد ہوا کرتا ہے' بلکہ اس سے مراد وہ وصف ہے جو ایمان کے ساتھ بھی جمع ہو سکتا ہے' یعنی آدمی بیک وقت مسلمان بھی ہو سکتا ہے اور منافق بھی۔ اور اسکی بہت سی علامتیں ہیں۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں۔

أَرْبَعٌ مَنْ كُنَّ فِيهِ فَهُوَ مُنَافِقٌ خَالِصٌ وَإِنْ صَلَّى وَصَامَ وَزَعَمَ أَنَّهُ مُسْلِمٌ وَإِنْ كَانَتْ

خَصْلَةٌ مِنْهُنَّ فَفِيْهِ شُعْبَةٌ مِنَ النِّفَاقِ حَتّٰى يَدَعَهَا مَنْ إِذَا حَدَّثَ كَذَبَ وَإِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ وَإِذَا ائْتُمِنَ خَانَ وَإِذَا خَاصَمَ فَجَرَ۔ (بخاری و مسلم۔ عبداللہ ابن عمرؓ)

چار باتیں ایسی ہیں کہ اگر کسی میں پائی جائیں تو وہ خالص منافق ہے' اگرچہ نماز روزہ کرے' اور مسلمان ہونے کا زعم رکھے' اور اگر ان میں سے ایک پائی جائے تو اس میں نفاق کا ایک شعبہ ہے یہاں تک کہ اس سے باز آجائے۔ جو شخص جب بھی بولے جھوٹ بولے' وعدہ کرے تو وعدہ شکنی کرے' اسکے پاس امانت رکھوائی جائے تو خیانت کرے' جھگڑا کرے تو گالیوں پر اتر آئے۔

ایک روایت میں اذا وعد اخلف کی جگہ اذا عاھد غادر کے الفاظ ہیں۔ صحابہ کرام اور تابعین نے نفاق کی ایسی تفسیر بیان کی ہے کہ صدیق کے علاوہ شاید ہی کوئی شخص اس سے محفوظ رہ سکتا ہو' حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ ظاہر و باطن' دل و زبان' اور اندر باہر کا مختلف ہونا بھی نفاق ہے' کون ہے جو اس اختلاف سے خالی ہو' بلکہ یہ تو انسان کی فطرت ثانیہ بن گیا ہے' اور ان امور میں شمار ہونے لگا ہے جنہیں لوگ عادتاً کرتے ہیں' ان کی برائی لوگوں کے ذہنوں سے نکل چکی ہے' بلکہ زمانۂ نبوت سے متصل زمانوں میں بھی لوگ اس طرح کے امور کی برائی کو برائی نہیں سمجھتے تھے' ہمارے زمانے کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ حضرت حذیفہؓ فرماتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور مبارک میں آدمی ایک کلمہ کہتا تھا اور منافق قرار پاتا تھا' جب کہ میں تم میں سے بعض لوگوں کی زبان سے وہ کلمہ دن میں دس مرتبہ سنتا ہوں' (احمد' حذیفہؓ) صحابہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ تم بہت سے ایسے عمل کرتے ہو جو تمہاری نگاہوں میں بال سے زیادہ باریک (غیر اہم) ہوتے ہیں جب کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں ہم ان امور کو کبائر سمجھتے تھے (بخاری۔ انسؓ)۔ بعض بزرگان دین کہتے ہیں نفاق یہ ہے کہ جو عمل تم کرتے ہو اگر وہ کسی دوسرے سے سرزد ہو جائے تو تم اسے برا سمجھو' اور ایک شخص سے اس لئے محبت کرو کہ وہ ظالم ہے' اور دوسرے سے اس لئے نفرت نہ کرو کہ وہ حق بات کہتا ہے۔ یہ بھی نفاق ہے کہ کوئی شخص تمہاری تعریف کرے اور تم اس تعریف کے مستحق رہنے کے باوجود اسے پسند نہ کرو' ایک شخص نے حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کی خدمت عرض کیا کہ ہم امراء و حکام کی محفلوں میں جاتے ہیں' اور جو کچھ وہ کہتے ہیں اسکی تائید کرتے ہیں' لیکن باہر نکل کر ان پر تنقید کرتے ہیں' فرمایا ہم اسے نفاق کہتے تھے (احمد' طبرانی) حضرت عبداللہ ابن عمرؓ نے ایک شخص کو حجاج کی مذمت کرتے ہوئے سنا آپ نے اس سے دریافت کیا اگر حجاج یہاں موجود ہوتا تب بھی تم اسے ایسا ہی کہتے؟ اس نے عرض کیا نہیں! فرمایا ہم عہد رسالت میں اسے نفاق کہتے تھے' ان تمام روایات سے سخت تر روایت یہ ہے کہ کچھ لوگ حضرت حذیفہؓ کے دروازے پر جمع ان کے باہر نکلنے کے منتظر تھے' اور آپ کے متعلق کچھ گفتگو کر رہے تھے' جب آپ باہر تشریف لائے تو وہ لوگ شرم کی وجہ چپ ہو گئے' آپ نے ان سے فرمایا تم اپنی گفتگو جاری رکھو' وہ لوگ چپ رہے' آپ نے فرمایا ہم لوگ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اسے نفاق سمجھتے تھے۔ (۱) یہ حضرت حذیفہؓ وہ صحابی ہیں جنہیں منافقین اور اسباب نفاق کا علم خاص طور پر عطا کیا گیا تھا' فرمایا کرتے تھے کہ ایک وقت ایسا آتا ہے کہ دل ایمان سے لبریز ہو جاتا ہے یہاں تک کہ نفاق کے لئے سوئی برابر بھی گنجائش باقی نہیں رہتی' پھر ایک وقت ایسا آتا ہے کہ دل نفاق سے بھر جاتا ہے یہاں تک کہ ایمان کے لئے سوئی برابر بھی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ اس تفصیل سے تم یہ بات جان گئے ہو گے کہ عارفین سوء خاتمہ سے خوف زدہ کیوں رہا کرتے ہیں۔

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے کہ سوء خاتمہ کے چند اسباب ہیں' جو خاتمے سے پہلے ظہور میں آتے ہیں' جیسے بدعتیں' معاصی' اور نفاق۔ انسان ان امور سے کب خالی رہ سکتا ہے' بلکہ یہ گمان رکھنا بھی نفاق ہے کہ میں نفاق سے خالی ہوں' یہ قول بے حد مشہور ہے کہ جو شخص نفاق سے خائف نہ ہو وہ منافق ہے۔ ایک شخص نے کسی عارف سے کہا کہ میں اپنے نفس پر نفاق کے تسلط سے خوف زدہ ہوں'

---

(۱) اس روایت کی کوئی اصل مجھے نہیں ملی

انھوں نے کہا کہ اگر تم منافق ہوتے تو کبھی نفاق کا خوف نہ کرتے۔ عارف کی نظر کبھی سابقے پر رہتی ہے اور کبھی خاتمے پر' اور وہ ان دونوں ہی سے خائف رہتا ہے' سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

اَلْعَبْدُ الْمُؤْمِنُ بَيْنَ مَخَافَتَيْنِ بَيْنَ اَجَلٍ قَدْ مَضٰى لَا يَدْرِىْ مَا اللّٰهُ صَانِعٌ بِهٖ وَبَيْنَ اَجَلٍ قَدْ بَقِىَ لَا يَدْرِىْ مَا اللّٰهُ قَاضٍ فِيْهِ فَوَالَّذِىْ نَفْسِىْ بِيَدِهٖ مَا بَعْدَ الْمَوْتِ مِنْ مُسْتَعْتَبٍ وَلَا بَعْدَ الدُّنْيَا دَارٌ اِلَّا الْجَنَّةُ وَالنَّارُ (بیہقی فی الشعب)

بندہ مومن دو خوفوں کے درمیان ہے۔ ایک وہ مدّت جو گزر گئی' وہ نہیں جانتا کہ اللہ تعالیٰ اس مدّت میں اسکے ساتھ کیا کرتا ہے' اور ایک وہ مدّت جو باقی ہے' وہ نہیں جانتا کہ اس میں اللہ تعالیٰ اس کے سلسلے میں کیا فیصلہ کرنے والا ہے' اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے کہ مرنے کے بعد رضا حاصل کرنے کی کوئی صورت نہیں ہے' اور دنیا کے بعد جنت و دوزخ کے علاوہ کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔

سوء خاتمہ کے معنی : سوء خاتمہ کی دو درجے ہیں' جن میں سے ایک دوسرے کی بہ نسبت سخت تر ہے' پہلا درجہ جو شدید تر ہے یہ ہے کہ جس وقت قلب پر موت کے سکرات اور اسکا غلبہ ہو وہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں شک یا انکار میں مبتلا ہو جائے' اور اسی حالت میں مرجائے یہ شک اور انکار ایک ایسی گرہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے اور اس کے مابین ہمیشہ کے لئے حجاب پیدا کردیتی ہے' اور حجاب دائمی دوری اور عذاب کو مقتضی ہے۔ سوء خاتمہ کی دوسری صورت جو درجے میں اس سے کم تر ہے یہ ہے کہ بندہ کے دل پر موت کے وقت دنیاوی امور میں سے کوئی امر' یا اسکی شہوات میں سے کوئی شہوت غالب آئے' اور دل و دماغ پر چھا جائے یہاں تک کہ اس کے تمام حواس اسی شہوت میں مشغول ہو جائیں' اس صورت میں غیر شہوت کی گنجائش ہی نہیں رہیگی' اور اگر اتفاق سے اسی حالت میں روح قبض ہو جائے تو وہ غیر اللہ میں اپنے قلب کے استغراق کی بناء پر متوجہ ہوگا' اور یہ صورت اللہ تعالیٰ کے اور اسکے درمیان حجاب کی صورت ہے' حجاب سے عذاب نازل ہوتا ہے' اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے جو آگ بھڑکائی ہے وہ صرف محجوبین کو خاکستر کرتی ہے' وہ مومن جو قلب سلیم رکھتا ہو' دنیا سے غافل ہو' اور ہمہ تن اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو اس سے آگ یہ کہتی ہے کہ اے مومن گزر جا' تیرے نور نے میرے شعلے بجھا دیے ہیں۔ دنیا کی محبت غالب ہونے کی حالت میں جان نکلنا بھی ایک خطرناک معاملہ ہے' کیوں کہ آدمی اسی صفت پر مرتا ہے جس پر وہ زندہ تھا' اور موت کے بعد کسی ایسی صفت کے اکتساب کی گنجائش نہیں ہے جو غالب رہنے والی صفت کے برعکس ہو' کیوں کہ قلوب میں اعمال کی گنجائش ہی نہیں رہی۔ نہ اب عمل کی طمع کی جاسکتی ہے' اور نہ دنیا میں واپسی کی امید کی جاسکتی ہے کہ تدارک کرلیا جائے' اس وقت بندہ شدید حسرت سے دوچار ہوتا ہے' لیکن کیوں کہ اصل ایمان اور اللہ تعالیٰ کی محبت ایک طویل مدت تک اس کے دل میں راسخ رہی تھی اور اعمال سے اسے پختگی حاصل ہوئی تھی' اس لئے وہ حالت جو بندے پر موت کے وقت طاری ہوئی تھی ان دونوں یعنی ایمان اور اعمال صالحہ کے اثر سے ختم ہو جائے گی' اگر اس کا ایمان قوت میں ایک مثقال کے برابر بھی ہوگا تو اسے جلد سے جلد دوزخ سے نکال لے گا' اور اگر ایک مثقال سے بھی کم ہوا تو اسے دیر تک دوزخ میں رہنا ہوگا' یہاں تک کہ اگر ایک رائی کے برابر بھی ہو تب بھی دوزخ سے ضرور نکلے گا خواہ ہزاروں لاکھوں سال کے بعد نکلے۔

دوزخ کا عذاب آخرت میں : یہاں تم یہ کہہ سکتے ہو تمہاری گفتگو سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ اس حالت میں مرنے والے کو دوزخ کا عذاب فوراً ہونا چاہیے' اگر ایسا ہے تو پھر یہ عذاب قیامت پر کیوں موقوف ہوتا ہے اور اس میں قدرت تاخیر کیوں کی جاتی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جو شخص عذاب قبر کا منکر ہو وہ بدعتی ہے' نور خدا نور ایمان اور نور قرآن سے محجوب ہے' مرنے کے بعد کافروں' اور بعض گنہگار مومنوں کو عذاب قبر میں مبتلا کیا جائے گا یہ بھی دوزخ کے عذاب ہی کی ایک قسم ہے۔ اس سلسلے میں صحیح روایات وارد ہیں' چنانچہ مروی ہے۔

اَلْقَبْرُ اِمَّا حُفْرَةٌ مِنْ حُفَرِ النَّارِ اَوْ رَوْضَةٌ مِنْ رِيَاضِ الْجَنَّةِ (ترمذی۔ ابو سعید)

قبر یا تو دوزخ کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہے یا جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے۔

یہ بھی روایت ہے کہ بعض اوقات اس قبر پر جس میں موے کو عذاب دیا جاتا ہے دوزخ کے ستر دروازے کھل جاتے ہیں صحیح روایات سے ثابت ہے کہ اگر کوئی شخص بدبخت ہے' اور سوء خاتمہ میں مبتلا ہو کر مرا ہے تو اس پر روح قبض ہوتے ہی مصائب کا نزول شروع ہو جاتا ہے' اگرچہ اوقات کے اختلاف کے اعتبار سے عذاب کی شکلیں مختلف ہوتی ہیں' مثلاً جب میت کو قبر میں رکھا جاتا ہے تو منکر نکیر کے سوالات کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے' اسکے بعد عذاب ہوتا ہے' پھر حساب کتاب میں الجھایا جاتا ہے' اسکے بعد قیامت کے دن برسرعام رسوا کیا جاتا ہے' اسکے بعد پل صراط عبور کرنے کا خطرہ ہے اسکے بعد دوزخ کے فرشتوں کی ہیبت کا سلسلہ ہے' اس سلسلے میں بیشمار روایات و اخبار وارد ہیں جو اپنے اپنے مواقع پر دیکھے جاسکتے ہیں (۱) بدبخت انسان مرنے کے بعد اپنے تمام حالات میں اسی طرح عذابوں کا نشانہ بنا رہتا ہے' اِلّا یہ کہ اللہ رب العزت اسے اپنے سایۂ رحمت میں ڈھانپ لے۔ یہ خیال نہ کرنا چاہیے کہ جس محل میں ایمان ہوتا ہے اسے مٹی کھالیتی ہے' بلکہ مٹی تمام ظاہری اعضاء کو کھالیتی ہے' اور انہیں منتشر کر دیتی ہے' یہاں تک کہ وقت مقرر آجائے' اس وقت تمام متفرق اجزاء جمع کئے جائیں گے' اور ان میں روح پھونکی جائے گی جو محل ایمان ہے' اور جو موت کے بعد سے دوبارہ جسم میں لوٹائے جانے تک ان سبز جانوروں کے پوٹوں میں رہتی ہے جو عرش کے نیچے لٹکے رہتے ہیں' بشرطیکہ وہ روح سعید ہو' اور اگر بدبخت ہو تو اس کے برعکس حالت میں رہتی ہے۔

سوء خاتمہ کے موجب اسباب : وہ اسباب جو آدمی کو سوء خاتمہ تک پہنچاتے ہیں بے شمار ہیں' ان کا احاطہ نہیں کیا جاسکتا لیکن بحیثیت مجموعی ان کی طرف اشارہ کیا جاسکتا ہے۔

پہلا سبب۔ شک و انکار : جہاں تک شک اور انکار پر خاتمے کا معاملہ ہے تو اسکا سبب دو صورتوں میں منحصر ہے' ان میں سے ایک صورت کا تصور اس شخص کے لئے بھی ممکن ہے جو ورع اور زہد میں کامل ہو' اور اعمال صالحہ رکھتا ہو جیسے زاہد بدعتی اس کا انجام بھی بے حد خطرناک ہے' اگرچہ اسکے اعمال نیک ہی کیوں نہ ہو' بدعت سے ہماری مراد کوئی خاص مذہب نہیں ہے' اس کے لئے ایک طویل بحث کی ضرورت ہے' بلکہ ہمارے نزدیک بدعت سے مراد یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی ذات' صفات اور افعال میں خلاف حق اعتقاد کرے' اور یہ غیر حق کا اعتقاد یا تو اپنی رائے' عقل اور قیاس سے ہو' جب بھی اپنے حریف سے مجادلہ کرے اپنی عقل پر اعتماد کرے' اور اپنی رائے اور قیاس کو سامنے رکھے' یا ان لوگوں کی تقلید سے ہو جن کا یہ حال ہو اس صورت میں جب موت اس کے قریب آتی ہے' اور ملک الموت کی پیشانی نمایاں ہونے لگتی ہے' اور قلب اپنے خیالات سے گھبرانے لگتا ہے' تو بعض اوقات سکرات موت کی حالت میں اس پر یہ واضح ہو جاتا ہے کہ جو اعتقادات میں نے اختیار کر رکھے ہیں وہ جہالت پر مبنی ہیں' اور باطل محض ہیں یہ انکشاف سکرات موت کی حالت میں اس لئے ہوتا ہے کہ موت دراصل رفع حجاب یعنی پردہ اٹھ جانے کا نام ہے' اور موت کے بعد امور اپنی حقیقت پر منکشف ہوتے ہیں۔ اور سکرات موت کے مبادی بھی گویا موت ہی میں شامل ہیں اس لئے اس حالت میں مرنے والے پر حقائق منکشف ہونے لگتے ہیں جب اس پر کسی ایسے اعتقاد کا بطلان منکشف ہوتا ہے جسے اس نے زندگی بھر اپنائے رکھا' اور جسے وہ اپنے دل میں صحیح اور یقینی تصور کرتا رہا تو یہ سمجھتا ہے کہ جس طرح میرے اعتقادات باطل ہیں اسی طرح دوسرے اعتقادات بھی باطل ہیں' وہ تمام عقائد کو باطل سمجھنے لگتا ہے' یہاں تک کہ جو معتقدات صحیح ہیں انھیں بھی غلط کہتا ہے' یا ان کی صحت میں شک کرتا ہے اور اسی حالت میں مرجاتا ہے' ظاہر ہے اسکا خاتمہ برا ہوگا' اور اسکی روح شرک پر قبض ہوگی۔ اس آیت کریمہ سے یہی لوگ مراد ہیں۔ فرمایا :-

وَبَدَا لَهُم مِّنَ اللّٰهِ مَا لَمْ يَكُونُوا يَحْتَسِبُونَ (پ ۲۴ ر ۲ آیت ۴۷)

اور خدا کی طرف سے ان کو وہ معاملہ پیش آئے گا جس کا انھیں گمان بھی نہیں تھا۔

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُم بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا (پ ۱۶ ر ۳ آیت ۱۰۳-۱۰۴)

---

(۱) اس سلسلے میں کتاب قواعد العقائد میں بہت سی روایات تخریج کی گئی ہیں

آپ کہئے کہ کیا ہم تم کو ایسے لوگ بتلائیں جو اعمال کے اعتبار سے بالکل خسارے میں ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی دنیا میں کی گئی محنت اکارت گئی اور وہ یہ سمجھ رہے ہیں کہ وہ اچھا کام کر رہے ہیں۔

خواب میں بہت سے ایسی امور منکشف ہو جاتے ہیں جن کا تعلق مستقبل سے ہوتا ہے' اسکی وجہ یہ ہوتی ہے کہ سونے کے وقت دنیا کے اشغال کم رہتے ہیں' اسی طرح سکرات موت کے وقت بھی بعض امور منکشف ہو جاتے ہیں' دنیا کا کاروبار اور جسمانی شہوات قلب کو سکوت کا مشاہدہ' اور لوح محفوظ پر لکھے ہوئے حقائق کا ادراک نہیں کرنے دیتیں تاکہ جو امور جس طرح پر واقع ہیں اسی طرح منکشف ہو جائیں' لیکن سکرات کے عالم میں قلب کی یہ استعداد واپس آجاتی ہے' اور اس پر بعض حقائق منکشف ہو جاتے ہیں' یہ انکشاف حق میں شک کا باعث بن جاتا ہے۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات اور افعال میں کسی غیر حقیقی امر کا معتقد ہو اسکے لئے شک اور انکار کا خطرہ ہے اور زہد و صلاح سے یہ خطرہ زائل نہیں ہوتا۔ یہ خطرۂ خوف اسی صورت میں دور ہوتا ہے کہ بندہ امر کا حق کا معتقد ہو جائے' البتہ سادہ لوح بندے اس خطرے سے دور ہیں' سادہ لوح بندوں سے ہماری مراد وہ لوگ ہیں جو اللہ' اس کے رسول اور یوم آخرت پر مجمل مگر پختہ ایمان لاتے ہیں' جیسے دیہاتی' بدو اور دوسرے عوام جو بحث و اعتراض میں نہیں پڑتے' اور نہ کلام کو مقصود بالذات سمجھتے ہیں' اور نہ متکلمین کے مختلف اقوال میں اپنا وقت ضائع کرتے ہیں۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:۔

أَكْثَرُ أَهْلِ الْجَنَّةِ الْبُلْهُ (بزار۔ انسؓ) اکثر اہل جنت سادہ لوح لوگ ہوں گے۔

اکابرین سلف اسی لئے لوگوں کو عقائد کے باب میں بحث و نظر' کلام و تقریر اور تحقیق و جستجو سے بچنے کی تلقین کیا کرتے تھے' اور کہتے تھے کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمایا ہے اسے من و عن قبول کر لو' اور جو کچھ ظاہر الفاظ سے سمجھ میں آتا ہے اسے صحیح سمجھو' نہ تشبیہ کا عقیدہ رکھو' نہ تاویلات کے دروازے کھولو' اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کے باب میں بحث کرنا ایک عظیم خطرہ ہے' اسکی گھاٹیاں سخت ہیں' اسکے راستے دشوار گزار ہیں' اللہ تعالیٰ کے جلال کا ادراک کرنے سے عقلیں قاصر رہ جاتی ہیں' قلوب دنیا کی محبت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی ہدایت اور یقین کے نور سے محجوب ہیں' اس لئے وہ حق کا احساس نہیں کر پاتے' پھر متکلمین اور اہل بحث نے اپنی عقل پر اعتماد کر کے جو کچھ کہا ہے' وہ اتنا مختلف' متضاد اور پیچیدہ ہے کہ ان کے درمیان سے حق کا گوہر آبدار چن لینا اس صورت میں جب کہ ہزاروں ملمع کئے ہوئے نگینے بکھرے ہوئے ہوں نہایت دشوار ہے' ہر شخص امر حق تلاش نہیں کر سکتا اسکے علاوہ دل ان امور کے عادی ہوتے ہیں جن پر انھوں نے ابتداء سے نشو نما پائی ہے' وہ ان امور میں اس قدر پختہ ہوتے ہیں کہ تعصبات کی حدود تک جا پہنچتے ہیں' بلکہ وہ حدود بھی تجاوز کر جاتے ہیں' موروثی عقائد کی جڑیں اس قدر گہرائی میں راسخ ہوتی ہیں کہ انھیں اپنی جگہ سے ہلانا بھی دشوار ہو جاتا ہے' پھر طبائع دنیا کی محبت میں مشغول ہیں اور انہی میں لگی ہوئی ہیں۔ دنیا کی شہوات ان کا گلا دبائے ہوئے ہیں اور انھیں کمال فکر سے باز رکھے ہوئے ہیں' جب یہ مختلف طبیعتوں کے حامل لوگ اللہ تعالیٰ کی ذات اسکی صفات و افعال میں اپنی رائے سے کلام کرتے ہیں تو اس کلام میں بھی اختلاف ہو جاتا ہے' اور ہر شخص یہی دعویٰ کرتا ہے کہ اسکا کلام حق ہے' اسکی رائے درست ہے' باقی تمام خیالات اور آراء لغو و باطل ہیں ان حالات میں کسی عام انسان کے بس کی بات نہیں کہ وہ ان مختلف خیالات کے درمیان سے حق بات تلاش کر لے۔

بندگان خدا کی سلامتی اسی میں ہے کہ وہ اعمال صالحہ میں مشغول ہوں' اور جو بات ان کی حد استطاعت سے خارج ہے اسکے درپے نہ ہوں' لیکن افسوس! اب حالات بدل گئے ہیں آزاد خیالی بڑھ گئی ہے' بے ہودگی عام ہو چکی ہے' اور ہر جاہل اپنے ظن و گمان کے مطابق عمل کرنے لگا ہے' اور اپنے خیالات میں مست رہنے لگا ہے' وہ اپنے وہم کو علم اور خیال کو تحقیق سمجھتا ہے' اور اپنے قلب کو ایمان کے نور سے مجلّٰی اور نفس کو اعمال صالحہ سے مزکّٰی تصور کرتا ہے' وہ دعویٰ کرتا ہے کہ جس نتیجے تک میں اپنے علم اور تحقیق کی روشنی میں پہنچا ہوں' یہی علم یقین اور عین یقین ہے حالانکہ چند روز بعد اس دعوے کی قلعی کھلے گی' اور اس وقت یہ شعر پڑھنے کو جی چاہے گا۔

أَحْسَنْتَ ظَنَّكَ بِالْأَيَّامِ إِذْ حَسُنَتْ وَلَمْ تَخَفْ سُوْءَ مَا يَأْتِيْ بِهِ الْقَدَرُ

وَسَالَمَتْکَ اللَّیَالِی فَاغْتَرَرْتَ بِھَا وَعِنْدَ صِفْوِ اللَّیَالِی یَحْدُثُ الْکَدَرُ

(تونے دنوں کے بارے میں اچھا گمان رکھا جب کہ وہ (بظاہر) اچھے تھے' اور تو اس برائی سے نہیں ڈرا جو مقدر لانے والا تھا اور راتیں سلامت رہیں تو تو فریب میں مبتلا ہو گیا حالانکہ راتوں کی سیاہی دور رہوتی ہے تب کدورت نمایاں ہوتی ہے)۔

یہ بات یقین سے جان لو کہ جو شخص اللہ' اسکے رسول اور اسکی کتابوں پر سادہ ایمان سے محروم ہو جاتا ہے' اور بحث و تحقیق میں پر جاتا ہے وہ اس خطرے کا سامنا کرتا ہے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے اس کی مثال اس شخص کی سی ہوتی ہے جس کی کشتی ٹوٹ گئی ہو' اور وہ سمندروں کی سرکش لہروں کے درمیان ہو' کوئی لہر اسے ادھر کر دیتی ہے اور کوئی ادھر' ایسا اتفاق بہت کم ہوتا ہے کہ آدمی صحیح سلامت کنارے پر پہنچ جائے' زیادہ تر ہلاک ہوتا ہے' اس لئے ذات و صفات کی حقیقت تلاش کرنا سراسر جہالت ہے' اور اپنے آپ کو خطرات کے سمندر میں دھکیلنا ہے۔

پھر جو لوگ دوسروں کو عقیدے بتلاتے ہیں' اور وہ دوسرے ان کی اتباع کرتے ہیں وہ دو حال سے خالی نہیں یا تو ان کے پاس ان عقیدوں کی کوئی ہوگی دلیل جو وہ بتلاتے ہیں' اور لوگ ان کے دلائل سے متاثر ہو کر انکے عقائد قبول کرتے ہیں' یا بلا دلیل مانتے ہیں' اب اگر وہ ان کے بتلائے ہوئے عقیدوں میں شک کرتے ہیں تو ان کا دین فاسد ہے' اور اگر ان پر بھروسا کرتے ہیں تو یہ اپنی ناقص عقلوں پر مغرور ہوتا ہے' یہی بحث کرنے والوں کا بھی ہے' مگر وہ لوگ اس حکم سے مستثنیٰ ہیں جو عقل کی حدود سے نکل جائیں' اور ان کی رسائی اس نور مکاشفہ تک ہو جائے جو نبوت اور ولایت کے افق پر چمکتا ہے' لیکن اس کمال تک پہنچنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں ہے' بہت کم لوگوں کو یہ درجہ حاصل ہوتا ہے۔ اس لئے بحث و تکرار کی راہ میں خطرات ہی خطرات ہیں' صرف وہ لوگ ان خطرات سے محفوظ ہیں جو سادہ لوح ہیں اور دوزخ کی آگ کے خوف سے اللہ کی اطاعت میں لگے ہوئے ہیں' وہ بحث کی فضولیات میں اپنا وقت ضائع نہیں کرتے۔

شک و انکار پر خاتمے کے سبب کی دوسری صورت یہ ہے کہ ایمان اصل میں ضعیف ہوتا ہے' اور دنیا کی محبت دل پر غالب ہوتی ہے' جس قدر ایمان ضعیف ہوگا اسی قدر اللہ کی محبت بھی ضعیف ہوگی۔ اور اسی قدر دنیا کی محبت قوی ہوگی' اور یہ قوت اس درجے کی ہوگی کہ دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت کے لئے کوئی گنجائش ہی نہیں ہوگی' بلکہ یہ محبت ایک سرسری خیال کی حیثیت اختیار کر جائے گی جو چند لمحوں کے لئے پیدا ہوتا ہے' اور ختم ہو جاتا ہے' اس کا اتنا اثر نہیں ہوتا کہ نفس کی مخالفت کر سکے' یا اسے شیطانی راہ سے منحرف کر سکے' اس صورت حال کا قدرتی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ آدمی از سر تا پا شہوات میں غرق ہو جاتا ہے یہاں تک کہ اس کا دل سیاہ اور سخت ہو جاتا ہے' پھر یہ تاریکی اور سختی گناہوں کے بقدر بڑھتی رہتی ہے' یہاں تک کہ ایمان کا وہ چراغ جو بہت مدھم روشنی دے رہا تھا' یکلخت بجھ جاتا ہے اور وہ محسوس بھی نہیں کرپاتا کہ اب اسکے دل میں ایمان کی روشنی باقی نہیں رہی ہے' تاریکی اس کی طبیعت' اسکا مزاج اور اس کا مقصد بن جاتی ہے۔ جب موت کے سکرات طاری ہوتے ہیں' تب اللہ کی محبت کا یہ ضعف اور بڑھتا ہے۔ کیوں کہ اسے یہ محسوس ہو جاتا ہے کہ وہ دنیا سے جدا ہونے والا ہے' جو اسکی محبوب ہے' اور اسکے دل پر غالب ہے' وہ جدائی کے احساس سے تکلیف محسوس کرتا ہے' اور اس وقت اسکے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ میرے اور دنیا کے درمیان جدائی موت سے پیدا ہوگی' اور موت اللہ کی طرف سے ہے' چنانچہ وہ موت کو برا سمجھتا ہے' یہاں یہ خطرہ ہوتا ہے کہ دنیا کی محبت کے جوش میں خدا تعالیٰ سے بغض نہ کرنے لگے' جیسے کوئی شخص اپنے بیٹے سے معمولی محبت کرتا ہے اور مال سے زیادہ' اس صورت میں اگر بیٹا مال ضائع کر دے تو جو تھوڑی محبت اسے بیٹے سے تھی وہ نفرت میں بدل جاتی ہے اور وہ اسے اپنا دشمن تصور کرنے لگتا ہے' اب اگر کسی شخص کی روح اسی لمحے قبض ہو جب اسکے دل میں اللہ تعالیٰ سے نفرت یا بغض کا جذبہ ابھر رہا ہو تو ظاہر ہے اسکا خاتمہ برا ہوگا' اور وہ ہمیشہ کے لئے تباہ و برباد ہو جائے گا۔ اس تفصیل سے ثابت ہوا کہ صورت مذکورہ میں اس شخص کا برا خاتمہ اس لئے ہوا کہ اسکے دل پر دنیا کی محبت غالب تھی' اسکا میلان اسباب دنیا کی طرف تھا' اور حال یہ تھا کہ اسکے ایمان میں ضعف تھا' جس کی وجہ سے اللہ کی محبت بھی ضعیف تھی۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص اپنے دل میں دنیا کی محبت کو مغلوب اور اللہ کی محبت کو غالب پائے' اگرچہ دنیا کی محبت موجود ہو تو وہ اس خطرے سے دور ہے۔

دنیا کی محبت ایک لاعلاج مرض ہے : ہم اب تک اسی نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اصل مرض دنیا کی محبت ہے' اور یہ ایک لاعلاج مرض ہے' تمام مخلوق اس میں مبتلا ہے' اس مرض میں ابتلائے عام کی وجہ یہ ہے کہ لوگ اللہ تعالیٰ کو کما حقہ' نہیں پہچانتے' اگر اسے صحیح طور پر پہچانتے تو اس سے محبت کرتے' جو شخص اسے پہچانتا ہے' اس سے محبت ضرور کرتا ہے۔ ارشاد ربانی ہے :-

قُلْ إِنْ كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَالٌ اقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَاكِنُ تَرْضَوْنَهَا أَحَبَّ إِلَيْكُمْ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوا حَتَّىٰ يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ (پ ۱۰ر ۹ آیت ۲۴)

آپ کہہ دیجئے کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارا کنبہ اور وہ مال جو تم نے کمائے ہیں اور وہ تجارت جس میں تمہیں کساد بازاری کا اندیشہ ہے' اور وہ گھر جن کو تم پسند کرتے ہو تم کو اللہ سے اور اسکے رسول سے' اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ پیارے ہوں تو تم منتظر رہو یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اپنا حکم سنائے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جس شخص کی روح اس طرح نکلے کہ وہ دل سے اللہ تعالیٰ کا منکر ہو' اور اسکے اس فعل موت۔ کو برا جانتا ہو جس سے اسکے اور اسکی محبوب چیزوں' مال دولت بیوی بچوں وغیرہ کے درمیان جدائی ہو گئی ہے تو ایسا شخص اسی بغض کے ساتھ مرے گا' اور اسی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہو گا' اس کی مثال اس مفرور غلام کی سی ہو گی جسے پابہ زنجیر آقا کے سامنے لایا گیا ہو' ظاہر ہے اس غلام کے دل میں اپنے آقا کے لئے بغض ہو گا نفرت ہو گی' اور اسکے نتیجے میں آقا اسکے ساتھ جو سلوک کرے گا' اور جس سزا کا مستحق ٹھہرائے گا وہ صاف ظاہر ہے۔ اور جس شخص کی موت اللہ کی محبت پر ہو گی وہ باری تعالیٰ کے سامنے اس غلام کی طرح حاضر ہو گا جو اپنے آقا کا وفادار' خدمت گزار اور چاہنے والا ہو' اور اسکی خدمت میں کسی طرح کی کوئی کوتاہی نہ کرتا ہو' بلکہ ہر اذیت اور مشقت برداشت کرکے اسے راحت پہنچاتا ہو' ظاہر ہے وہ غلام اپنے آقا کے دیدار سے بے حد خوش ہو گا' اور خود آقا بھی اس سے مل کر مسرور ہو گا' اور اسے طرح طرح کے انعامات سے نوازے گا۔

دوسرا سبب۔ معاصی : اب سوء خاتمہ کے دوسرے سبب کا ذکر کیا جاتا ہے۔ یہ سبب پہلے سبب یعنی شک اور انکار کی حالت میں مرنے کی بہ نسبت ہلکا ہے' اور ہمیشہ دوزخ میں رہنے کو مقتضی نہیں ہے' اس خاتمے کے بھی دو سبب ہیں' ایک معاصی کی کثرت اگرچہ ایمان قوی ہو' دوسرے ایمان کا ضعف اگرچہ معاصی کم ہوں۔

پہلی صورت یعنی کثرت معاصی کی تفصیل یہ ہے کہ آدمی گناہوں کا ارتکاب اس لئے کرتا ہے کہ اس پر شہوات غالب ہوتی ہیں اور انس و عادت کی وجہ سے شہوات دل میں راسخ ہو جاتی ہیں' آدمی زندگی بھر جن باتوں کا عادی رہتا ہے وہ باتیں اسی کے وقت ضرور یاد آتی ہیں' چنانچہ اگر کسی شخص کا میلان اطاعت کی طرف تھا تو وہ موت کے وقت بھی اطاعت الٰہی کی طرف متوجہ رہتا ہے' اسی کو یاد کرتا ہے' اور اسی کے ذکر میں مشغول رہتا ہے' اور جس کا میلان معاصی کی طرف ہوتا ہے تو موت کے وقت دل پر معاصی ہی غالب رہتے ہیں' پھر ایسا بھی ہوتا ہے کہ آدمی کی روح اسی حالت پر قبض کرلی جاتی ہے' جب اسکے دل میں کسی دنیوی شہوت یا کسی معصیت کا غلبہ ہوتا ہے' اس طرح وہ اللہ تعالیٰ سے محجوب ہو جاتا ہے' چنانچہ جو شخص کبھی کبھی گناہ کرتا ہے' وہ اس ذات سے بہت دور ہے' اور جو شخص بالکل گناہ نہیں کرتا وہ ہر طرح مامون و محفوظ ہے' لیکن جس شخص پر معاصی غالب ہیں۔ اور طاعات کی بہ نسبت زیادہ ہیں اور وہ ان سے خوش بھی ہوتا ہے اسکے حق میں سوء خاتمہ کا خطرہ بہت زیادہ ہے' اسے ہم ایک مثال کے ذریعے سمجھ سکتے ہیں۔

خواب کے واقعات کے مثال : اسکی صحیح اور مکمل مثال خواب کے واقعات ہیں۔ ہم خواب میں عام طور پر وہی مناظر وہی واقعات اور وہی باتیں دیکھتے ہیں جن میں ہم زندگی بسر کرتے ہیں' یہاں تک کہ سن بلوغ کو پہنچنے والا کوئی بچہ خواب میں اس وقت تک جماع سے محتلم نہیں ہو سکتا جب تک اس نے بیداری کی حالت میں جماع نہ کیا ہو' اسی طرح اگر کوئی شخص اپنی تمام عمر فقہ کی

تحصیل میں صرف کردے تو وہ خواب میں ایسے حالات کا مشاہدہ کرے گا جو علم اور علماء سے متعلق ہوں دوسری طرف تاجر ایسے واقعات دیکھے گا جو اسکی تجارت سے تعلق رکھتے ہوں' فقیہہ کو علم کے احوال تاجر سے زیادہ' اور تاجر کو تجارت کے واقعات فقیہہ سے زیادہ نظر آئیں گے' کیوں کہ دل پر نیند کی حالت میں وہی باتیں ظاہر ہوتی ہیں جن سے دل بوجہ کثرت اشتغال مانوس ہو جاتا ہے' موت نیند کے مشابہ ہے' اگرچہ اس سے کچھ بڑھ کر ہے' سکرات موت' اور اس سے پہلے طاری ہونے والی بے ہوشی نیند کے قریب قریب ہے' جب یہ بات ثابت ہو گئی تو نتیجہ نکلا کہ جس طرح نیند کی حالت میں وہ ان مناظر کا مشاہدہ کرتے ہیں جن سے بیداری کے عالم میں ہمارا تعلق رہا ہے' اسی طرح سکرات میں بھی ہم ان واقعات کا مشاہدہ کریں گے جو زندگی میں ہم سے متعلق رہے ہیں' گناہ گار بندے معاصی کو یاد کریں گے' اور نیک بندے طاعات کو یاد کریں گے صلحاء اور فساق کے خوابوں میں بھی یہی فرق ہوتا ہے' بہرحال کسی چیز سے زیادہ انس ہونا بھی ایک سبب ہے' اس انس سے اس چیز کی برائی دل میں نقش ہو جاتی ہے' اور نفس اسکی طرف مائل رہتا ہے' اب اگر اسی حالت میں جب کہ کوئی معصیت دل میں نقش ہو' اور نفس اسکی طرف راغب ہو روح پرواز کر جائے تو خاتمہ اچھا نہیں ہو گا' اگرچہ اصل ایمان باقی رہے گا' اور اس سے تجارت کی امید کی جا سکے گی۔

یہاں ایک بات یہ بھی ذہن نشین کرنی چاہیے کہ جس طرح بیداری کی حالت میں دل پر کوئی خیال گزرتا ہے اسکا کوئی نہ کوئی سبب ہوتا ہے' اسی طرح خواب کی حالت میں جو واقعات پیش آتے ہیں ان کے بھی اسباب ہوتے ہیں جو اللہ کے علم میں ہوتے ہیں ان میں سے بعض اسباب ہمیں معلوم ہوتے ہیں اور بعض نہیں

خوف خدا میں انبیائے کرام اور ملائکہ علیہم السلام کے حالات

حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ جب ہوا بدلتی تھی اور تیز آندھی چلتی تھی تو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ مبارک کا رنگ متغیر ہو جاتا تھا' آپ کھڑے ہو جاتے تھے' اور کمرے میں پھرنے لگتے تھے' کبھی اندر تشریف لے جاتے' اور کبھی باہر تشریف لے جاتے (بخاری و مسلم۔ عائشہؓ) سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ مبارک پر تغیر' اور یہ اضطرابی حرکات دراصل اللہ تعالیٰ کے خوف سے تھیں۔ ایک مرتبہ آپ نے سورۂ الحاقہ کی ایک آیت تلاوت فرمائی' اور بے ہوش ہو گئے' (ابن عدی۔ بیہقی) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :۔

وَخَرَّ مُوسٰى صَعِقًا (پ۹' ر۷ آیت ۱۴۳) اور موسیٰؑ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔

ایک مرتبہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بطحا میں حضرت جبرئیل علیہ السلام کی صورت دیکھی اور بے ہوش ہو گئے (بزار۔ ابن عباسؓ) ایک روایت میں ہے کہ جب آپ نماز میں مشغول ہوتے تو آپ کے سینے کے جوش کی آواز اس طرح سنائی دیتی جیسے ہانڈی میں ابال کی آواز آتی ہے (ابو داؤد' ترمذی۔ عبد اللہ ابن الشخیرؓ) سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام جب بھی میرے پاس آتے ہیں خوف خدا سے لرزتے ہوئے آتے ہیں۔ (۱)

روایت ہے کہ جب شیطان لعین کی نافرمانی کا واقعہ پیش آیا تو حضرت جبرئیل اور حضرت میکائیل علیہما السلام رونے لگے' ارشاد ہوا کیوں روتے ہو؟ عرض کیا الٰہا! ہم تیری پکڑ سے بے خوف نہیں ہیں' فرمایا اسی طرح رہو' میرے مکر سے بے خوف مت ہو' محمد ابن المنکدر ارشاد فرماتے ہیں کہ جب دوزخ پیدا کی گئی تو فرشتوں کے دل ان کے سینوں سے باہر آگئے' اور جب انسان پیدا کیا گیا تو وہ اپنی جگہ واپس آئے' حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبرئیل علیہ السلام سے دریافت کیا کہ میکائیل ہنستے کیوں نہیں ہیں' انہوں نے جواب دیا کہ جب سے دوزخ کی تخلیق ہوئی میکائیل نے مسکرانا بند کر دیا (احمد' ابن ابی الدنیا) یہ بھی روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بے شمار فرشتے ہیں' ان میں سے کوئی بھی اس وقت سے نہیں ہنسا جب سے

---

(۱) یہ روایت ابوالشیخ نے دوسرے الفاظ میں نقل کی ہے کہ قیامت کے روز حضرت جبرئیل علیہ السلام جبار تعالیٰ کے حضور اس حال میں کھڑے ہوں گے کہ خوف خدا سے کانپ رہے ہوں گے۔

دوزخ پیدا کی گئی' اس خوف سے کہ کہیں اللہ تعالیٰ اس سے خفا نہ ہو جائیں اور اسے دوزخ کے عذاب میں نہ ڈال دیں۔ حضرت عبداللہ ابن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ باہر نکلا' یہاں تک کہ آپ ایک انصاری کے باغ میں داخل ہو گئے' اور کھجوریں چن چن کر کھانے لگے' فرمایا : اے ابن عمرؓ! تم کیوں نہیں کھاتے' میں نے عرض کیا یا رسول اللہ مجھے خواہش نہیں ہے' فرمایا مجھے تو خواہش ہے' یہ چوتھی صبح ہے کہ میں نے کھانا نہیں کھایا' اور نہ مجھے کھانے کی کوئی چیز ملی' حالانکہ اگر میں اپنے پروردگار سے مانگتا تو وہ مجھے روم اور فارس کی سلطنت عنایت فرما دیتا' اے ابن عمرؓ! تمہارا کیا حال ہو گا جب تم ایسے لوگوں میں رہو گے جو اپنے سال بھر کا رزق چھپا کر رکھیں گے' ان کے دلوں میں یقین کمزور ہو گا' حضرت عبداللہ ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ بخدا ہم وہاں سے ہٹے بھی نہیں تھے کہ یہ آیت نازل ہوئی :-

وَكَأَيِّنْ مِنْ دَابَّةٍ لَا تَحْمِلُ رِزْقَهَا اللَّهُ يَرْزُقُهَا وَإِيَّاكُمْ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ۔ (پ ۲۱ ر ۲ آیت ۶۰)

اور بہت سے جانور ایسے ہیں جو اپنی غذا اٹھا کر نہیں رکھتے اللہ ہی ان کو روزی پہنچاتا ہے اور تم کو بھی اور وہ سب کچھ سنتا ہے اور سب کچھ جانتا ہے۔

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں مال ذخیرہ کرنے اور شہوات کی اتباع کرنے کا حکم نہیں دیا' جو شخص خالی زندگی کے لئے دینار جمع کرتا ہے (تو اسے یاد رکھنا چاہیے کہ) زندگی اللہ تعالیٰ کے قبضے میں ہے' آگاہ رہو' نہ میں درہم و دینار جمع کرتا ہوں' اور نہ آنے والے کل کے لئے رزق چھپا کر رکھتا ہوں (ابن مردویہ فی التفسیر' بیہقی) حضرت ابوالدرداءؓ روایت کرتے ہیں کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نماز کے لئے کھڑے ہوتے تو خوف خدا سے ان کے سینے میں پیدا ہونے والے جوش کی آواز ایک میل کے فاصلے سے سنی جاتی تھی' حضرت مجاہدؒ روایت کرتے ہیں کہ حضرت داؤد علیہ السلام چالیس دن تک مسلسل سجدے میں پڑے رہے اور روتے رہے' یہاں تک کہ ان کے آنسوؤں سے سبزہ اگ آیا اور اس سے ان کا سر چھپ گیا' آواز آئی کہ اے داؤد اگر تم بھوکے ہو تو تمہیں کھانا دیا جائے' پیاسے ہو تو پانی پلایا جائے' ننگے ہو تو کپڑا عطا کیا جائے' آپ اس قدر تڑپ کر روئے کہ آپ کی سوزش دل کی حرارت سے لکڑی جل گئی' پھر اللہ تعالیٰ نے ان پر توبہ اور مغفرت نازل فرمائی' آپ نے عرض کیا یا اللہ! میرا گناہ میرے ہاتھ میں کر دے' چنانچہ ان کی خطا ان کی ہتھیلی پر لکھ دی گئی' آپ جب بھی کھانے پینے یا کوئی چیز اٹھانے کے لئے ہاتھ بڑھاتے تو آپ کی نظر اس لکھے ہوئے پر ضرور پڑتی' اور آپ اپنی خطا کے تصور سے رونے لگتے' روایت ہے کہ جب آپ کے پاس پینے کے لئے پانی کا برتن لایا جاتا تو وہ تہائی لبریز ہوتا' اور ہونٹوں تک لے جانے کے وقفے میں آنسوؤں سے بھر جاتا' آپ کے حالات میں یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ آپ نے زندگی بھر حیاء کی وجہ سے آسمان کی طرف سر نہیں اٹھایا' آپ اپنی مناجات میں عرض کیا کرتے تھے! اے اللہ! جب میں اپنا گناہ یاد کرتا ہوں تو یہ زمین اپنی وسعت کے باوجود تنگ نظر آتی ہے' اور جب میں تیری رحمت کا تصور کرتا ہوں تو جسم میں جان پڑ جاتی ہے' الہا! تو پاک ہے' تیرے بندوں میں سے جو لوگ طبیب ہیں میں اپنے مرض کے علاج کے لئے ان کے پاس گیا انہوں نے تیرا ہی حوالہ دیا' بڑی خرابی ہے اس شخص کے لئے جو تیری رحمت سے مایوس ہو۔ حضرت فضیل ابن عیاضؒ فرماتے ہیں کہ مجھے یہ روایت پہنچی ہے کہ ایک روز حضرت داؤد علیہ السلام کو اپنا گناہ یاد آیا تو چیختے ہوئے کھڑے ہو گئے' اور اپنے سر پر ہاتھ رکھ کر پہاڑوں کی طرف نکل گئے' آپ کے پاس کچھ درندے جمع ہو گئے' آپ نے فرمایا تم جاؤ' مجھے تم سے غرض نہیں' مجھے وہ چاہیے جو اپنی خطا پر روئے' اور جب بھی میرے پاس آئے روتا ہوا آئے جو شخص خطاوار نہیں ہے اس کا مجھ خطاکار کے پاس کیا کام ہے' جب لوگ کثرت بکاء پر آپ کو ٹوکتے تو آپ ان سے فرماتے مجھے رونے دو' اس سے پہلے کہ رونے کا دن گذر جائے' اس سے پہلے کہ ہڈیاں جل اٹھیں' اور آنتیں سلگنے لگیں' اس سے پہلے کہ مجھے ایسے فرشتوں کے حوالے کر دیا جائے جن کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :-

مَلَائِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَا يَعْصُونَ اللَّهَ مَا أَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ۔ (پ ۲۸ ر ۱۹ آیت ۶)

تند خو اور مضبوط فرشتے ہیں جو خدا کی ذرا نافرمانی نہیں کرتے کسی بات میں جو ان کو حکم دیتا ہے اور جو کچھ ان کو حکم دیا جاتا ہے اسے فوراً بجالاتے ہیں

حضرت عبدالعزیز ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ جب حضرت داؤد علیہ السلام سے خطا سرزد ہوئی تو آپ کی آواز بیٹھ گئی' آپ نے عرض کیا یا اللہ! صدیقین کی آواز صاف ہے' اور میرا گلا بیٹھ گیا ہے' یہ بھی روایت ہے کہ جب آپ بہت روئے اور کوئی فائدہ نہ ہوا تو آپ بد دل ہو گئے' آپ کا رنج و غم بڑھ گیا' آپ نے عرض کیا یا اللہ! کیا آپ میرے رونے پر رحم نہیں فرمائیں گے؟ وحی آئی کہ اے داؤد! تجھے اپنا رونا یاد ہے گناہ یاد نہیں ہے' عرض کیا : یا اللہ! میں اپنا گناہ کیسے فراموش کر سکتا ہوں' میرا حال تو یہ تھا کہ جب میں زبور کی تلاوت کرتا تھا تو بہتا ہوا پانی ٹھہر جایا کرتا تھا' اور چلتی ہوئی ہوا رک جایا کرتی تھی' پرندے میرے سر پر سایہ افگن ہو جایا کرتے تھے' اور وحشی جانور میری محراب میں جمع ہو جاتے تھے' الٰہا! یہ کیسی وحشت ہے جو تیرے اور میرے درمیان پیدا ہو گئی ہے' اس پر اللہ تعالیٰ نے وحی نازل فرمائی کہ اے داؤد وہ طاعت کا انس تھا اور یہ معصیت کی وحشت ہے' اے داؤد! آدم میری مخلوقات میں سے ایک مخلوق ہے' میں نے اسے اپنے ہاتھ سے پیدا کیا ہے' اور اس میں اپنی روح پھونکی ہے' اور اسے فرشتوں کا مسجود بنایا ہے اور اسے اپنے اکرام کا خلعت پہنایا ہے' اور اپنے تاج کا وقار اس کے سر پر رکھا ہے' پھر جب اس نے تنہائی کا شکوہ کیا تو میں نے اپنی باندی حوا سے اس کا جوڑا بنایا اور اسے اپنی جنت میں رہنے کا شرف بخشا' پھر اس نے نافرمانی کی تو میں نے اسے ذلیل اور برہنہ جسم کر کے اپنے سے دور کر دیا' اے داؤد! میری بات سن' میں حق کہتا ہوں' اگر تو نے ہماری اطاعت کی تو ہم تیری اطاعت کریں گے جو تو مانگے گا وہ دیں گے' اور اگر تو نے ہماری نافرمانی کی تو ہم تجھے نظرانداز کر دیں گے' اس کے باوجود اگر تو نے ہماری طرف رجوع کیا تو ہم تجھے قبول کریں گے۔

حضرت یحییٰ ابن کثیر روایت کرتے ہیں کہ جب حضرت داؤد علیہ السلام نوحہ کرنے کا ارادہ فرماتے تو سات دن پہلے سے کھانا پینا ترک کر دیتے' اور عورتوں کے پاس بھی نہ جاتے' پھر جب ایک دن باقی رہ جاتا تو ان کے لئے ایک منبر جنگل میں نکالا جاتا' آپ حضرت سلیمان علیہ السلام کو حکم فرماتے تھے کہ وہ بآواز بلند اعلان کریں یہاں تک کہ وہ آواز شہروں اور اطراف میں پھیل جائے' اس آواز سے جنگل' پہاڑ' ٹیلے' بھکدے اور عبادت خانے گونج اٹھیں' حضرت سلیمان علیہ السلام یہ اعلان فرماتے کہ جو شخص حضرت داؤد علیہ السلام کا نوحہ سننا چاہتا ہے وہ آئے' چنانچہ جنگلوں سے وحشی جانور' پہاڑوں سے درندے' گھونسلوں سے پرندے' اور گھروں میں رہنے والی پردہ نشین خواتین آتیں' اور لوگ بھی جمع ہوتے' اس کے بعد حضرت داؤد علیہ السلام تشریف لاتے' منبر پر تشریف رکھتے' بنی اسرائیل کے لوگ ان کے منبر کو گھیر لیتے' ہر صنف کے افراد الگ الگ رہتے' حضرت سلیمان علیہ السلام آپ کے سر پر کھڑے ہوتے' پہلے آپ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء بیان فرماتے' لوگ چیخنے چلانے لگتے' پھر جنت اور دوزخ کا تذکرہ فرماتے' اس سے زمین کے اندر رہنے والے جانور' کچھ وحشی اور درندے اور کچھ انسان مر جاتے پھر قیامت کی دہشتوں کا ذکر ہوتا اور اپنے نفس پر گریہ فرماتے' اس سے ہر صنف کے بہت سے افراد مر جاتے' جب حضرت سلیمان علیہ السلام یہ دیکھتے کہ مرنے والوں کی کثرت ہو گئی ہے تو عرض کرتے ابا جان! آپ نے سننے والوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے ہیں' بنی اسرائیل کے بہت سے گروہ مر چکے ہیں' اور بے شمار وحشی' درندے اور حشرات الارض بھی ہلاک ہو چکے ہیں' آپ یہ سن کر دعا مانگنے لگتے' اسی اثناء میں بنی اسرائیل کا کوئی عابد بآواز بلند کہتا' اے داؤد! تو نے جزا مانگنے میں جلدی کی ہے۔ راوی کہتے ہیں اتنا سنتے ہی آپ بے ہوش ہو کر گر جاتے۔ جب حضرت سلیمان علیہ السلام یہ کیفیت دیکھتے تو ایک چارپائی منگواتے' اور انہیں اس پر لٹاتے' اور یہ منادی کراتے کہ اگر کسی کا دوست' عزیز' یا شناسا داؤد کے اجتماع میں تھا تو وہ چارپائی لے کر جائے اور اسے اٹھا لائے اس لئے کہ جنت اور دوزخ کے ذکر نے اسے ہلاک کر ڈالا ہے' ایک عورت چارپائی لے کر آتی' اور اس پر اپنے شوہر کو یہ کہتے ہوئے لٹاتی اے وہ شخص جسے دوزخ کے ذکر نے ہلاک کر دیا' اے وہ شخص جسے خوف خدا نے قتل کر دیا' جب حضرت داؤد علیہ السلام کو افاقہ ہوتا تو آپ کھڑے ہوتے اور سر پر ہاتھ رکھ کر اپنے عبادت خانے میں چلے جاتے' اندر سے دروازہ بند کر لیتے' اور عرض کرتے اے داؤد کے مالک! کیا تو داؤد سے

ناراض ہے' حضرت داؤد علیہ السلام اسی طرح اپنے رب کے ساتھ مناجات میں مشغول رہتے' یہاں تک کہ حضرت سلیمان علیہ السلام دروازے پر دستک دیتے' اور عرض کرتے کہ میں جَو کی ایک روٹی لے کر حاضر ہوا ہوں' آپ کچھ تناول فرمالیں' اور اپنے مقصد پر تقویت حاصل فرمائیں آپ اس روٹی میں سے کسی قدر کھاتے' اور پھر بنی اسرائیل میں تشریف لے جاتے۔

یزید رقاشی فرماتے ہیں کہ ایک روز حضرت داؤد علیہ السلام چالیس ہزار افراد سے خطاب کرنے کے لئے تشریف لے گئے' آپ نے انہیں وعظ و نصیحت فرمائی' اللہ سے ڈرایا' یہاں تک کہ ان میں سے تیس ہزار آدمی ہلاک ہو گئے' صرف دس ہزار افراد کے ساتھ آپ واپس تشریف لائے' یہ بھی روایت ہے کہ آپ کے پاس دو باندیاں تھیں جن کے سپرد یہ کام تھا کہ جب حضرت داؤد خوف خدا کی وجہ سے تڑپنے لگیں اور بے ہوش ہو جائیں تو یہ دونوں باندیاں آپ کے اعضاء کو لپٹ جائیں تاکہ آپ کے جسم کے جوڑ سلامت رہیں۔

حضرت عبداللہ ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ حضرت یحیٰ ابن زکریا علیہما السلام آٹھ برس کے تھے جب وہ بیت المقدس میں گئے' وہاں انہوں نے عابدین کو دیکھا کہ وہ بال اور اون کے کپڑے پہنے ہوئے ہیں' ان میں بھی جو اعلا درجے کے عابد ہیں انہوں نے اپنے گلے کی ہڈیاں چیر کر ان میں زنجیریں ڈال رکھی ہیں' اور ان زنجیوں کے ذریعے اپنے جسموں کو بیت المقدس کے ستونوں سے باندھ رکھا ہے' حضرت یحیٰ عبادت اور مجاہدے کے یہ مناظر دیکھ کر خوف سے کانپ اٹھے' جب وہ اپنے والدین کے پاس لوٹنے لگے تو راستے میں انہیں بہت سے بچے مختلف کھیلوں میں مشغول نظر آئے' ان بچوں نے انہیں بھی اپنے ساتھ کھیلنے کی دعوت دی' لیکن انہوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میں کھیلنے کے لئے پیدا نہیں ہوا ہوں' اس کے بعد اپنے والدین کے پاس پہنچے' اور ان سے درخواست کی کہ وہ انہیں بالوں کا لباس بنا کر دیں' ماں باپ نے ان کی مرضی کے مطابق لباس تیار کرا دیا' یہ لباس پہن کر آپ بیت المقدس تشریف لے آئے' دن کو اس کی خدمت کرتے' اور رات بھی وہاں بسر کرتے' اسی حالت میں آپ نے پندرہ برس گذار دیے' اس کے بعد آپ وہاں سے نکلے' اور پہاڑوں اور گھاٹیوں میں رہنے لگے' ان کے والدین انہیں ڈھونڈنے نکلے کافی جستجو کے بعد وہ بحر اردن کے کنارے اس حال میں ملے کہ اپنے دو پاؤں پانی میں ڈالے ہوئے تھے' اور پیاس کی شدّت سے پریشان تھے' لیکن پی نہیں رہے تھے' اور کہہ رہے تھے کہ قسم ہے تیری عزت اور عظمت کی میں اس وقت تک ٹھنڈا پانی نہیں پیوں گا جب تک مجھے یہ معلوم نہیں ہو گا کہ تیرے نزدیک میرا مقام کیا ہے' آپ کے والدین کے پاس جَو کی ایک روٹی تھی' انہوں نے زور دیا کہ وہ روٹی کھائیں اور پانی پئیں' انہوں نے اپنے والدین کی خواہش کا احترام کیا' ان کی دی ہوئی روٹی کھائی' اور ٹھنڈا پانی پیا بعد میں اپنی قسم کا کفارہ ادا کیا اللہ تعالیٰ نے ان کے اس وصف کو بھی سراہا ہے کہ وہ اپنے والدین کے مطیع تھے' فرمایا :-

وَبَرًّا بِوَالِدَيْهِ (پ۱۶ ر۴ آیت ۱۴) اور اپنے والدین کے اطاعت گذار تھے۔

ابن عمرؓ نے فرمایا کہ اس واقعے کے بعد حضرت یحیٰ کے والدین انہیں بیت المقدس سے لے آئے' آپ نے گھر پر عبادت شروع کر دی' جب آپ نماز کے لئے کھڑے ہوتے تو اس قدر روتے کہ شجر و حجر بھی رونے لگتے' حضرت زکریا علیہ السلام بھی ان کے رونے سے اس قدر روتے کہ بیہوش ہو جاتے' آپ اس قدر رویا کرتے تھے کہ آنسوؤں کی حرارت سے آپ کے دونوں رخساروں کا گوشت جل گیا تھا' اور منہ کے اندر کی داڑھیں نظر آنے لگی تھیں' یہ حال دیکھ کر ان کی والدہ نے کہا کہ اگر تمہاری اجازت ہو تو میں کوئی ایسی چیز بنا دوں سے جس تمہارا گوشت چھپ جائے اور داڑھیں نظر نہ آئیں' چنانچہ انہوں نے نمدے کے دو ٹکڑے لے کر ان کے رخساروں پر چپکا دیے' اس کے بعد آپ جب بھی نماز کے لئے کھڑے ہوتے' اور آنسو بہاتے تو وہ دونوں ٹکڑے گیلے ہو جاتے' اور ان کی والدہ وہ ٹکڑے نچوڑ کر پھر ان کے رخساروں پر چپکا دیتیں' ایسے موقع پر اپنے آنسو دیکھ کر آپ فرماتے اے اللہ! یہ میرے آنسو ہیں' اور یہ میری والدہ ہیں' اور میں تیرا بندہ ہوں اور تو ارحم الراحمین ہے۔ ایک دن حضرت زکریا علیہ السلام نے ان سے فرمایا اے بیٹے! میں نے تو اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کی تھی کہ تجھے میری آنکھوں کی ٹھنڈک بنا دے جب کہ تو روتا ہی رہتا ہے' انہوں نے عرض کیا ابا جان! مجھے حضرت جبرئیل علیہ السلام نے یہ خبر دی ہے کہ جنت اور دوزخ کے درمیان ایک گھاٹی ہے جسے وہی شخص

عبور کر سکتا ہے جو بہت زیادہ رونے والا ہو۔ یہ سن کر حضرت زکریا علیہ السلام نے فرمایا اے بیٹے! تب تمہیں ضرور رونا چاہیے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ارشاد فرمایا : اے گروہ حواریین! اللہ کا خوف' اور جنت کی محبت آدمی کو مشقت پر صبر کرنے کا حوصلہ دیتی ہے اور دنیا سے دور کرتی ہے' میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جو کھانا اور نالیوں پر کتوں کے ساتھ سونا۔ روایت ہے کہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ کو جب اپنا قصور یاد آتا تو بیہوش ہو جاتے اور ان کے قلب کے اضطراب کی آواز ایک میل کے فاصلے سے سنی جاتی' حضرت جبرئیل علیہ السلام آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور عرض کرتے کہ آپ کا رب آپ کو سلام کہلاتا ہے' اور فرماتا ہے کہ کیا دوست دوست سے ڈرتا ہے' حضرت ابراہیم نے فرمایا : اے جبرئیل جب مجھے اپنا گناہ یاد آتا ہے تو دوستی بھول جاتا ہوں۔ یہ ہیں انبیاء علیہم الصلاۃ والسلام کے احوال' تمہیں ان کے احوال میں غور کرنا چاہیے۔ یہ حضرات اللہ تعالیٰ کی صفات سے اس کی دوسری مخلوق کے مقابلے میں زیادہ واقف ہیں۔ ان بزرگوں پر' اور اللہ تعالیٰ کے تمام مقرب بندوں پر اس کی رحمتیں نازل ہوں۔

شدت خوف میں صحابہ کرام' تابعین اور سلف صالحین کے حالات : روایت ہے کہ حضرت ابوبکر الصدیق نے ایک پرندے سے فرمایا کاش میں تیرے جیسا پرندہ ہوتا' آدمی نہ ہوتا۔ حضرت ابوذر ارشاد فرمایا کرتے تھے کاش میں درخت ہوتا جسے کاٹ دیا جاتا' یہی بات حضرت طلحہؓ فرمایا کرتے تھے' حضرت عثمانؓ فرماتے تھے میری خواہش یہ ہے کہ مرنے کے بعد اٹھایا نہ جاؤں' حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں میری خواہش ہے کہ میں بالکل نیست و نابود ہو جاؤں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت عمرؓ خوف کے مضامین پر مشتمل کوئی آیت قرآنی سنتے تو مارے خوف کے بے ہوش ہو جاتے' اور بیمار پڑ جاتے' پھر کئی دن تک ان کی عیادت کی جاتی' ایک روز انہوں نے زمین سے ایک تنکا اٹھایا' اور کہنے لگے کاش میں یہ تنکا ہوتا' کاش میں کوئی قابل ذکر چیز نہ ہوتا' کاش میں نسیا منسیا ہوتا' کاش مجھے میری ماں نہ جنتی' حضرت عمرؓ کے چہرے پر آنسوؤں کی دو سیاہ لکیریں تھیں' حضرت عمرؓ یہ بھی فرمایا کرتے کہ جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے وہ غصہ نہیں کرتا اور اپنی مرضی کے مطابق عمل نہیں کرتا' اگر قیامت نہ ہوتی تو تم کچھ اور ہی منظر دیکھتے۔ ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے یہ سورت تلاوت فرمائی "وَإِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ" جب آپ اس آیت پر پہنچے "وَإِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ" تو غش کھا کر گر پڑے' ایک مرتبہ آپ کسی شخص کے گھر کے پاس سے گزرے' وہ شخص اس وقت سورۂ والطور کی تلاوت کر رہا تھا' آپ ٹھہر کر اس کی تلاوت سننے لگے' جب وہ شخص اس آیت پر پہنچا :-

إِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ مَا لَهُ مِنْ دَافِعٍ (پ ۲۷ ر ۳ آیت ۷)

بے شک آپ کے رب کا عذاب ضرور ہو کر رہے گا اور اسے کوئی دور نہ کر سکے گا۔

تو آپ اپنے گدھے سے اتر پڑے' اور دیوار سے سہارا لگا کر کھڑے رہ گئے' دیر تک اسی حالت پر رہے' پھر گھر واپس تشریف لے گئے' اور بیمار پڑ گئے' لوگ ایک مہینے تک ان کی عیادت کے لئے آتے رہے' لیکن کسی کو یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ ان کو کیا مرض لاحق ہوا ہے۔ ایک مرتبہ حضرت علیؓ نے فجر کی نماز کا سلام پھیرا تو طبیعت کچھ بوجھل تھی' اور آپ اضطرابی کیفیت میں مبتلا تھے' اسی حالت میں آپ نے لوگوں سے فرمایا : میں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کو دیکھا ہے' میں آج کوئی ایسی بات نہیں دیکھتا جن میں ان کی مشابہت پائی جاتی ہو' وہ لوگ پراگندہ بال زرد رو' اور غبار آلود تھے' ان کی دونوں آنکھوں کے درمیان بکری کے زانو کے برابر نشانات تھے' راتوں کو اللہ کے لئے سربسجدہ رہتے' قیام کرتے' اور اللہ کی کتاب کی تلاوت کرتے' عبادت میں پیشانی اور پاؤں پر باری باری زور ڈالتے' صبح ہوتی تو اس طرح لرزتے جس طرح تیز ہوا میں درخت ہلتے ہیں' ان کی آنکھیں اس قدر اشک بہاتیں کہ دامن تر ہو جاتے' بخدا اب مجھے ایسا لگتا ہے کہ میں ان لوگوں کے ساتھ ہوں جو غفلت کی نیند سوتے ہیں' یہ کہہ کر آپ کھڑے ہو گئے' اس تقریر کے بعد آپ کو کسی نے مسکراتے ہوئے نہیں دیکھا' یہاں تک کہ ابن ملجم نے انہیں زخمی کر دیا' عمران ابن حصین کہتے ہیں میری خواہش یہ ہے کہ میں راکھ بن جاؤں جسے ہوائیں ادھر سے ادھر لئے پھریں' اور میرے اجزاء بکھیر دیں' حضرت ابوعبیدہ ابن الجراحؓ فرماتے ہیں میری تمنا یہ ہے کہ میں مینڈھا بن جاؤں میرے گھر والے مجھے ذبح کریں اور میرا گوشت

کھائیں اور شوربہ پی لیں' حضرت علی ابن الحسین وضو کرتے تو آپ کا چہرہ زرد ہو جاتا' گھر والے دریافت کرتے کہ آخر وضو کے وقت آپ کا یہ حال کیوں ہو جاتا ہے آپ جواب دیتے کیا تمہیں معلوم نہیں میں کس کے روبرو کھڑا ہونا چاہتا ہوں۔ حضرت موسیٰ ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ جب ہم حضرت سفیان ثوریؒ کی خدمت میں حاضر ہوتے تو ایسا محسوس ہوتا گویا آگ گھیرے ہوئے ہے' کیوں کہ ثوری پر جزع و فزع کی کچھ ایسی ہی کیفیت طاری رہتی تھی' ایک مرتبہ مضر القاری نے یہ آیت تلاوت کی :-

هٰذَا كِتَابُنَا يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ إِنَّا كُنَّا نَسْتَنْسِخُ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ۔ (پ ۲۵ ر ۲۰ آیت ۲۹)

یہ ہمارا دفتر ہے جو تمہارے مقابلے میں بالکل ٹھیک بول رہا ہے اور ہم تمہارے اعمال کو لکھواتے جاتے تھے۔

یہ آیت سن کر حضرت عبدالواحد ابن زید رونے لگے' اور اتنا روئے کہ بے ہوش ہو گئے' جب افاقہ ہوا تو کہنے لگے قسم ہے تیری عزت کی جہاں تک مجھ سے ہو سکے گا میں تیری نافرمانی نہیں کروں گا تو اطاعت پر میری مدد فرما' اور مجھے توفیق عطا کر۔ مسور ابن مخرمہ اپنے خوف کی شدّت کی بناء پر قرآن کریم کی تلاوت نہ سن سکتے تھے' جب بھی کوئی شخص ان کے سامنے ایک لفظ یا ایک آیت پڑھتا تو چیخنے چلانے لگتے' حواس باختہ ہو جاتے' اور کئی روز تک اسی حال پر رہتے' ایک مرتبہ قبیلہ خشعم کا ایک شخص ان کے پاس آیا اور اس نے یہ آیت تلاوت کی :-

يَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِيْنَ إِلَى الرَّحْمٰنِ وَفْدًا وَنَسُوْقُ الْمُجْرِمِيْنَ إِلٰى جَهَنَّمَ وِرْدًا۔ (پ ۱۶ ر ۹ آیت ۸۶)

جس روز ہم متقیوں کو رحمٰن کی طرف مہمان بنا کر جمع کریں گے اور مجرموں کو دوزخ کی طرف ہانکیں گے۔

یہ آیت سن کر کہنے لگے میں مجرمین میں سے ہوں' متقین میں سے نہیں ہوں' اس کے بعد قاری سے کہا کہ اس آیت کو دوبارہ پڑھو' اس نے دوبارہ تلاوت کی' دوسری بار یہ آیت سنی تو بے اختیار ہو کر چیخ پڑے' اور اسی حال میں اپنے مولیٰ سے جا ملے۔ یحییٰ کے سامنے جنہیں لوگ ان کے زیادہ رونے کی بنا پر بکاء کہا کرتے تھے یہ آیت پڑھی گئی :-

وَلَوْ تَرٰى إِذْ وُقِفُوْا عَلَى النَّارِ۔ (پ ۷ ر ۹ آیت ۴۶)

آپ (اس وقت) دیکھیں جب کہ یہ دوزخ کے پاس کھڑے کئے جائیں گے۔

یہ آیت سن کر چیخ اٹھے' اور تقریباً چار ماہ تک صاحب فراش رہے' بصرے کے اطراف سے لوگ ان کی عیادت کے لئے آیا کرتے تھے۔ حضرت مالک ابن دینار کہتے ہیں ایک مرتبہ میں خانۂ کعبہ کا طواف کر رہا تھا کہ میری نگاہ ایک جوان عورت پر پڑی جو کعبہ کا پردہ تھامے ہوئے یہ کہہ رہی تھی : رب العالمین! بہت سی شہوتوں کی لذتیں جاتی رہیں' صرف ان کا عذاب باقی رہ گیا یا اللہ! کیا آگ' اور دوزخ کے علاوہ کوئی اور چیز ایسی نہیں ہے جسے تو بطور سزا تجویز کرتا' یا جس سے تو گنہگاروں کی تادیب کرتا' وہ عورت اسی طرح روتی رہی یہاں تک کہ فجر کا وقت آگیا' مالک کہتے ہیں میں نے اس عورت کا یہ حال اور اس کی یہ گریہ وزاری دیکھ کر ایک چیخ ماری اور اپنی زندگی پر لعنت بھیجی۔ روایت ہے کہ فضیل ابن عیاض کو عرفے کے روز دھاڑیں مار مار کر روتے ہوئے دیکھا گیا' وہ صبح سے شام تک اس طرح روتے رہے جیسے کوئی ماں اپنے بچے کے فراق میں روتی ہو' لوگ دعا کرتے رہے' غروب آفتاب کے وقت انہوں نے اپنی داڑھی پکڑی اور آسمان کی طرف منہ کر کے فرمایا اگر تو نے مجھے بخش بھی دیا تب بھی مجھے اپنے آپ پر شرم آئے گی' پھر وہ لوگوں کے ساتھ لوٹ آئے' حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے خائفین کے متعلق دریافت کیا گیا' انہوں نے جواب دیا خائفین وہ لوگ ہیں جن کے دل زخمی ہوتے ہیں' اور آنکھیں گریاں' وہ لوگ یہ کہتے ہیں ہم کیسے ہنسیں جب کہ موت ہمارے پیچھے ہے' قبر ہمارے سامنے ہے' قیامت ہمارا وعدہ گاہ ہے' جہنم ہماری گذر گاہ ہے' اور باری تعالیٰ کے سامنے ہمیں کھڑا ہونا ہے۔ حضرت حسن ایک ایسے نوجوان کے پاس سے گذرے جو کچھ لوگوں کے درمیان بیٹھا ہوا بے تحاشا ہنس رہا تھا' آپ نے اس سے دریافت کیا اے نوجوان! کیا تو پل صراط سے گذرا ہے؟ اس نے عرض کیا نہیں! آپ نے سوال کیا تجھے معلوم ہے کہ پل صراط سے گذر کر تو جنت میں جائے گا یا دوزخ میں؟ اس نے اس سوال کا جواب بھی نفی میں دیا' آپ نے فرمایا جب تیری لاعلمی کا حال یہ ہے تو پھر یہ قہقہے کیسے

ہیں، راوی کہتے ہیں کہ اس تنبیہہ کے بعد اس نوجوان کو ہنستے ہوئے نہیں دیکھا گیا۔ حماد ابن عبدر جب بھی بیٹھتے اس طرح بیٹھتے جیسے ابھی کھڑے ہو جائیں گے' لوگ عرض کرتے اطمینان سے تشریف رکھیں' فرماتے اطمینان کے ساتھ تو وہ شخص بیٹھ سکتا ہے جسے خوف نہ ہو' میں نے اللہ کی نافرمانی کی ہے اس لئے میرے دل میں سزا کا خوف ہے۔ حضرت عمر ابن عبدالعزیز فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بندوں کے دلوں کی غفلت کو ان کے لئے رحمت بنا دیا ہے تاکہ وہ اس کے خوف سے ہلاک نہ ہو جائیں۔ حضرت مالک ابن دینار کہتے ہیں کہ میرا ارادہ یہ ہے کہ لوگوں سے کہہ دوں کہ جب میں مرجاؤں تو مجھے زنجیروں میں باندھ دیں' اور گلے میں طوق ڈال کر اس طرح لے جائیں جس طرح بھاگے ہوئے غلام کو پکڑ کر آقا کے سامنے لے جایا جاتا ہے۔ حضرت حاتم اصم فرماتے ہیں کہ اگر تمہیں کوئی اچھی جگہ مل جائے تو اس پر نازاں مت ہو اس لئے کہ جنت سے زیادہ اچھی جگہ کوئی دوسری نہیں ہے' اور اس میں حضرت آدم علیہ السلام کا جو حال ہوا وہ تم پر عیاں ہے' اسی طرح کثرت عبادت پر بھی غرور نہ کرو اس لئے کہ طویل ترین عبادت کے بعد ابلیس کا کیا حشر ہوا اس سے تم واقف ہو' کثرت علم پر بھی نہ اتراؤ' اس لئے کہ بلعام اسم اعظم اچھی طرح جانتا تھا مگر اس کا انجام کیا ہوا' اور نہ صالحین کی زیارت پر اکڑو' اس لئے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کوئی شخص جلیل القدر نہیں ہو سکتا لیکن آپ کے بہت سے دشمنوں اور قریبی عزیزوں کو بھی آپ کی زیارت سے فائدہ نہیں ہوا۔ حضرت سری سقطی فرماتے ہیں میں دن بھر میں کئی مرتبہ اپنی ناک پر نظر ڈالتا ہوں کہ کہیں میرا چہرہ سیاہ نہ پڑ گیا ہو' ابو حفص کہتے ہیں کہ پچھلے چالیس سال سے میرے دل میں یہ اعتقاد راسخ ہے کہ اللہ تعالیٰ میری طرف غصے سے دیکھتے ہیں' اور میرے اعمال میں بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ ایک مرتبہ حضرت عبداللہ ابن المبارک اپنے رفقاء میں تشریف لائے اور کہنے لگے کہ رات میں نے اپنے رب پر جرأت کی ہے یعنی اس سے جنت کا سوال کر بیٹھا ہوں۔ محمد ابن کعب القرظی کی والدہ نے ان سے کہا : بیٹے! میں تجھے دیکھتی ہوں تو بچپن سے بھی پاکباز اور نیک تھا' اور بڑا ہو کر بھی پاک باز اور نیک رہا' پھر یہ رات دن کی عبادت کیوں کرتا ہے' میرے خیال سے تو یہ ایک مشقت ہے جو تو نے اپنے اوپر ڈال لی ہے' انہوں نے عرض کیا : امی جان! بھلا میں کیسے بے خوف ہو جاؤں؟ ہو سکتا ہے اللہ تعالیٰ میرے کسی گناہ پر مطلع ہو گیا ہو اور وہ ناراض ہو کر یہ فرمادے کہ مجھے اپنی عزت و جلال کی قسم ہے میں تیری مغفرت نہیں کروں گا۔

حضرت فضیل ابن عیاضؒ فرماتے ہیں کہ میں نہ کسی پیغمبر پر رشک کرتا ہوں' نہ کسی مقرب فرشتے پر رشک کرتا ہوں اور نہ کسی بندے پر رشک کرتا ہوتا ہوں' کیا یہ لوگ قیامت کے روز باری تعالیٰ کا سامنا نہیں کریں گے' میں صرف ان لوگوں پر رشک کرتا ہوں جو پیدا نہیں کئے گئے۔ روایات میں ہے کہ ایک انصاری نوجوان کے دل میں دوزخ کا خوف سا گیا' وہ اس خوف سے مسلسل روتا رہتا' یہاں تک کہ گھر میں قید ہو کر رہ گیا' اس کا حال سن کر سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اس کے پاس تشریف لے گئے اور اسے اپنے گلے سے لگایا' وہ اسی وقت مردہ ہو کر گر پڑا' سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے فرمایا اپنے ساتھی کی تجہیز و تکفین کرو' دوزخ کے خوف نے اس کے دل کو پارہ پارہ کر دیا ہے (ابن ابی الدنیا۔ ابو حذیفہؓ' بیہقیؒ۔ سہل ابن سعدؓ)۔ ابن ابی میسرہؓ سے مروی ہے کہ وہ جب اپنے بستر پر جاتے تو یہ کہتے کاش میری ماں نے مجھے نہ جنا ہوتا' ایک روز ان کی والدہ نے فرمایا : بیٹے اللہ تعالیٰ نے تجھے بہتر حال میں رکھا ہے' تجھے اسلام کی ہدایت سے نوازا ہے' میسرہ نے عرض کیا آپ کی بات صحیح ہے' لیکن اللہ تعالیٰ نے یہ بات صاف طور پر بیان فرمائی ہے کہ ہم دوزخ پر وارد ہوں گے' لیکن یہ نہیں فرمایا کہ ہم دوزخ سے نکل بھی آئیں گے۔ فرقد سنجی سے کسی نے دریافت کیا کہ اگر تمہیں بنی اسرائیل کا کوئی عجیب و غریب واقعہ معلوم ہو تو ہمیں ضرور بتلاؤ' انہوں نے کہا مجھے یہ واقعہ بتلایا گیا ہے کہ ایک دن بیت المقدس میں پانچ سو عورتیں پہنچیں' ان سب کا لباس کمبل اور ٹاٹ کا تھا' انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ثواب و عذاب اور جنت و دوزخ پر مذاکرہ کیا' اور سب کی سب اسی روز مر گئیں' عطاء سلمی کے خوف کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے کبھی جنت کی دعا نہیں مانگی' جب بھی دعا مانگی عفو و مغفرت کی مانگی' مرض الوفات کے دوران ان سے عرض کیا گیا کہ آپ کو کسی چیز کی خواہش تو نہیں؟ انہوں نے فرمایا کہ جہنم کے خوف نے میرے دل میں کسی خواہش کی جگہ ہی نہیں چھوڑی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے کبھی

آسمان کی طرف سر نہیں اٹھایا' اور نہ چالیس برس تک ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دیکھی گئی' ایک روز ان کی نظر اتفاقاً آسمان کی طرف اٹھ گئی' اسی وقت دل خوف سے لرز گیا' گر پڑے' اور جسم کی ایک آنت پھٹ گئی' آپ کا یہ بھی معمول تھا کہ رات میں اپنا جسم ٹٹول ٹٹول کر دیکھتے کہ کہیں مسخ نہ ہو گیا ہو' اگر کبھی آندھی چلتی' یا بجلی چمکتی' یا غلّے کے دام بڑھتے تو فرماتے کہ یہ مصائب میری وجہ سے نازل ہوئے ہیں' اگر عطاء مرجائے تو لوگ چین کا سانس لیں۔ فرماتے تھے کہ ایک مرتبہ ہم عتبہ غلام کے ساتھ نکلے' ہم میں بوڑھے بھی تھے اور جوان بھی' ان سب کی عبادت و ریاضت کا عالم یہ تھا کہ عشاء کی وضوء سے صبح کی نماز پڑھا کرتے تھے' ان کے پاؤں طول قیام کی وجہ سے ورما جاتے تھے' ان کی آنکھیں اندر کو دھنس جاتی تھیں اور ان کی کھالیں ہڈیوں سے چپک جاتی تھیں' اور ان کی رگیں اس طرح سوکھ جاتی تھیں گویا تار ہوں' اور ان کا حال یہ ہو جاتا تھا گویا خربوزے کے چھلکے ہوں' جسموں میں جان باقی نہیں رہتی تھی' لگتا تھا ابھی قبروں سے باہر نکلے ہیں یہ لوگ کہا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے اطاعت گذاروں کو عزت بخشی ہے' اور گناہگاروں کو رسوا کیا ہے۔ ان ہی بزرگوں میں سے ایک شخص کا واقعہ ہے کہ وہ ایک دن کہیں چلے جارہے تھے کہ راستے میں بے ہوش کر گر پڑے' حالانکہ سردی شدید تھی مگر ان کی پیشانی پسینے سے تر ہو رہی تھی ان کے رفقاء یہ حالت دیکھ کر رونے لگے' ان کے چہرے پر پانی وغیرہ ڈالا گیا تاکہ ہوش میں آجائیں' جب ہوش میں آئے تو ان سے کیفیت دریافت کی گئی' کہنے لگے کہ مجھے یہ بات یاد آگئی کہ میں نے اس جگہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی تھی' صالح مری کہتے ہیں کہ ایک روز میں نے ایک بزرگ کے روبرو یہ آیت پڑھی :۔ يَوْمَ تُقَلَّبُ وُجُوهُهُمْ فِي النَّارِ يَقُولُونَ يَا لَيْتَنَا أَطَعْنَا اللَّهَ وَأَطَعْنَا الرَّسُولَا۔ (پ ۲۲ ر ۵ آیت ۶۶)

جس روز ان کے چہرے دوزخ میں الٹ پلٹ کئے جائیں گے یوں کہتے ہوں گے اے کاش ہم نے اللہ کی اطاعت کی ہوتی اور ہم نے رسول کی اطاعت کی ہوتی۔

وہ بزرگ یہ آیت سن کر بے ہوش ہو گئے' کچھ دیر بعد ہوش میں آئے تو کہنے لگے اے صالح! کچھ اور پڑھو' مجھے تکلیف محسوس ہو رہی ہے میں نے یہ آیت تلاوت کی :۔

كُلَّمَا أَرَادُوا أَنْ يَخْرُجُوا مِنْهَا أُعِيدُوا فِيهَا۔ (پ ۱۷ ر ۹ آیت ۷۷)

وہ لوگ جب تکلیف سے (گھبرا جائیں گے اور) اس سے باہر نکلنا چاہیں گے تو پھر اسی میں دھکیل دیے جائیں گے۔

یہ آیت سن کر وہ بزرگ انتقال کر گئے' زرارہ ابن ابی اوفی نے ایک روز صبح کی نماز پڑھائی' جب اس آیت پر پہنچے :۔

فَإِذَا نُقِرَ فِي النَّاقُورِ۔ (پ ۲۹ ر ۱۴ آیت ۸) پھر جب سور پھونکا جائے گا۔

تو بے ہوش ہو کر گر پڑے' اور اسی حالت میں انتقال کر گئے۔ یزید الرقاشی حضرت عمر ابن عبدالعزیز کے پاس تشریف لے گئے' حضرت عمرؓ نے ان سے فرمایا یزید! مجھے کچھ نصیحت کیجئے' انہوں نے فرمایا : امیر المومنین! آپ پہلے خلیفہ نہیں ہیں جو مریں گے' حضرت عمرؓ نے فرمایا کچھ اور کہئے' فرمایا : اے امیر المومنین! حضرت آدم کے اور آپ کے درمیان آپ کا کوئی جد امجد ایسا نہیں جو رخصت نہ ہوا ہو' حضرت عمرؓ نے فرمایا کچھ اور نصیحت فرمائیں' فرمایا : امیر المومنین! آپ کے اور جنت و دوزخ کے درمیان کوئی منزل نہیں ہے' یہ سن کر حضرت عمر ابن عبدالعزیز بے ہوش ہو گئے۔ میمون ابن مہران کہتے ہیں کہ جب قرآن کریم کی یہ آیت نازل ہوئی :۔ وَإِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ أَجْمَعِينَ (پ ۱۴ ر ۳ آیت ۴۳) اور ان سب سے جہنم کا وعدہ ہے۔

تو حضرت سلمان الفارسی کی چیخ نکل گئی' اور سر پیٹتے ہوئے بھاگ نکلے' اس واقعے کے بعد تین دن تک نظر نہیں آئے۔(۱) داؤد طائی نے ایک عورت کو دیکھا کہ اپنے بیٹے کی قبر کے سرہانے کھڑی ہوئی رو رہی ہے' اور کہہ رہی ہے اے بیٹے نہ جانے تیرے کون سے رخسار کو کیڑوں نے پہلے کھایا' داؤد طائی یہ سنتے ہی بے ہوش ہو کر پڑے۔ ایک مرتبہ حضرت سفیان ثوری بیمار پڑے تو ان کا قارورہ ایک ذمی طبیب کو دکھلایا گیا' طبیب نے کہا اس شخص کا جگر خوف کی وجہ سے ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا ہے' اس کے بعد ان کی

---

(۱) اس روایت کی اصل مجھے نہیں ملی۔

نبض دکھلائی گئی' طبیب نے نبض دیکھ کر کہا اس جیسا شخص ملت اسلامیہ میں مجھے نہیں ملا' حضرت امام احمد ابن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ میں نے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کی کہ مجھ پر خوف کا دروازہ کھول دیجئے' اس کے بعد میرے دل میں اس قدر خوف پیدا ہوا کہ مجھے اپنی عقل میں فتور پیدا ہونے کا اندیشہ ہو گیا' اس کے بعد میں نے یہ دعا کی اے اللہ مجھے اتنا خوف دیجئے جو میری طاقت سے باہر نہ ہو' تب جا کر کہیں میری حالت درست ہوئی' اور دل میں سکون پیدا ہوا' حضرت عبد اللہ ابن عمرو بن العاصؓ فرماتے ہیں روؤ' اگر نہ رو سکو تو رونی صورت بنالو' اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے اگر تم میں سے کوئی حقیقت جان لے تو اتنا روئے کہ آواز بند ہو جائے' اس قدر نماز پڑھے کہ کمر ٹوٹ جائے' گویا انہوں نے اس حدیث کی طرف اشارہ کیا :-

لَوْ تَعْلَمُوْنَ مَا اَعْلَمُ لَضَحِكْتُمْ قَلِيْلاً وَلَبَكَيْتُمْ كَثِيْراً۔ (۱)

اگر تم وہ بات جان لو جو میں جانتا ہوں تو کم ہنسو اور زیادہ روؤ۔

عنبریؒ روایت کرتے ہیں کہ بہت سے ارباب حدیث حضرت فضیل ابن عیاض سے ملاقات کے لئے انکے دروازے پر جمع ہوئے' آپ نے ایک روشندان سے سر نکالا' آپ کے رخساروں پر آنسو رواں تھے' اور داڑھی لرز رہی تھی' فرمایا : لوگو! قرآن کریم کو لازم پکڑلو' نماز کی پابندی کرو' یہ حدیث کا زمانہ نہیں ہے' بلکہ خوف و خشیت آہ و بکا' اور دعا کا زمانہ ہے' ڈوبنے والوں کی طرح دعا کرو اس زمانے میں اپنی زبان کی حفاظت کرو' اپنے آپ کو پوشیدہ رکھو' اپنے قلب کا علاج کرو' جو جانتے ہو اس پر عمل کرو' جو نہ جانتے ہو اسے ترک کردو' ایک مرتبہ آپ تیز تیز قدم اٹھائے چلے جا رہے تھے' لوگوں نے دریافت کیا کہاں تشریف لے جا رہے ہیں' فرمایا مجھے نہیں معلوم' بعد میں معلوم ہوا اس وقت ان پر خوف طاری تھا' اور وہ اضطراب کے عالم میں بھاگ رہے تھے۔ ذرابن عمرؒ نے اپنے والد عمر ابن ذر سے دریافت کیا کہ کیا بات ہے کہ جب دوسرے بولتے ہیں تو کوئی نہیں روتا اور جب آپ بولتے ہیں تو ہر سمت سے رونے چلانے کی آوازیں آتی ہیں۔ آپ نے فرمایا بیٹے اس عورت کا رونا جس کا بچہ مر جائے اور اس عورت کا رونا جو اجرت لے کر روئے برابر نہیں ہوتا۔

بیان کیا جاتا ہے کہ کچھ لوگوں نے ایک عابد سے جو رو رہا تھا دریافت کیا کیوں روتے ہو' عابد نے کہا ایک پھوڑا ہے جو خائفین کے دلوں میں پیدا ہو جاتا ہے' اس پھوڑے نے مجھے بے چین کر رکھا ہے' لوگوں نے دریافت کیا تمہیں کس بات کا خوف ہے؟ انہوں نے کہا اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضری کے لئے پکارے جانے کا خوف۔ حضرت خواص روتے تھے اور اپنی مناجات میں کہتے تھے : اب میں بوڑھا ہو گیا ہوں' میرا جسم کمزور پڑ گیا ہے اس لئے مجھے اپنی خدمت سے آزاد کردے۔ صالح مری کہتے ہیں ایک مرتبہ ابن السماک ہمارے یہاں تشریف لائے' اور کہنے لگے کہ تم اپنے دیار کے عابدین کے عجائبات دکھاؤ' میں انہیں ایک شخص کے پاس لے کر گیا' وہ ایک محلے کی بوسیدہ سی جھونپڑی میں مقیم تھا' ہم نے ان سے داخلے کی اجازت چاہی' اندر داخل ہوئے تو دیکھا ایک شخص چٹائی بنا رہا ہے' میں نے اس کے سامنے یہ آیت تلاوت کی :-

اِذِ الْاَغْلَالُ فِیْ اَعْنَاقِهِمْ وَالسَّلَاسِلُ يُسْحَبُوْنَ فِی الْحَمِيْمِ ثُمَّ فِی النَّارِ يُسْجَرُوْنَ۔ (پ ۲۴ ر ۱۳ آیت ۱۷)

جب طوق ان کی گردنوں میں ہوں گے اور زنجیریں۔ ان کو گھسیٹتے ہوئے کھولتے پانی میں لے جائیں گے پھر یہ آگ میں جھونک دیے جائیں گے۔

وہ شخص ایک چیخ مار کر بے ہوش ہو گیا' ہم اسے اسی حالت میں چھوڑ کر باہر نکل آئے' اور ایک دوسرے شخص کے پاس پہنچے' اس کے سامنے بھی میں نے یہی آیت تلاوت کی' وہ بھی چیخ مار کر بے ہوش ہو گیا' اسے بھی ہم نے اس کے حال پر چھوڑا اور تیسرے شخص کے پاس پہنچے' اور اندر داخل ہونے کی اجازت مانگی' اس نے کہا اگر تم ہمیں ہمارے رب سے غافل نہ کرو تو آجاؤ' ہم اندر پہنچے' اور اس کے سامنے میں نے یہ آیت پڑھی :-

(۱) یہ روایت کتاب العلم میں گذری ہے۔

ذٰلِکَ لِمَنْ خَافَ مَقَامِیْ وَخَافَ وَعِیْدِ۔ (پ ۱۳ ر ۱۴ آیت ۱۴)

یہ ہر اس شخص کے لئے ہے جو میرے روبرو کھڑے ہونے سے ڈرے اور میری وعید سے ڈرے۔

یہ آیت سن کر وہ شخص چیخ اٹھا' اس کے نتھنوں سے خون بہنے لگا' اور اسی خون میں تڑپنے لگا' یہاں تک کہ خون نکلنا بند ہوگیا' ہم نے اسے اس کے حال پر چھوڑا' اور باہر نکل آئے' اس دن میں ابن السماک کو چھ آدمیوں کے پاس لے کر گیا' اور سب اسی کیفیت سے دوچار ہوئے' آخر میں ہم ساتویں فرد کے پاس پہنچے' اندر آنے کی اجازت طلب کی' اندر سے کسی عورت نے جواب دیا آجاؤ' ہم اندر پہنچے' اور دیکھا ایک نحیف و نزار بوڑھا مصلّٰی بچھائے بیٹھا ہے' ہم نے اسے سلام کیا' مگر اسے کوئی احساس نہ ہوا' میں نے بلند آواز سے کہا آگاہ رہو کل لوگوں کو کھڑا ہونا ہے' یہ سن کر اس بوڑھے نے پوچھا: کمبخت کس کے سامنے کھڑا ہونا ہے؟ اس سوال کے بعد وہ مبہوت ہو کر رہ گیا' منہ کھل گیا' آنکھیں اوپر کو چڑھ گئیں' اور آہ آہ کرنے لگا' یہاں تک کہ آواز بند ہوگئی' یہ حال دیکھ کر عورت نے کہا اب تم لوگ جاؤ' اب تم ان سے کوئی نفع نہ پا سکو گے' اس واقعہ کے کچھ روز بعد میں نے لوگوں سے ان ساتوں بزرگوں کے متعلق پوچھا لوگوں نے بتلایا کہ ان میں سے تین اچھے ہوگئے ہیں' اور تین جاں بحق ہوگئے ہیں' اور وہ بڑے میاں تین دن تک اسی طرح مبہوت اور ساکت رہے یہاں تک کہ فرض نمازیں بھی نہ پڑھ سکے' تین روز کے بعد اصل حالت پر واپس آئے۔

یزید ابن الاسود جن کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ ابدال تھے انہوں نے یہ قسم کھائی تھی کہ نہ کبھی وہ ہنسیں گے' نہ پیٹ پر سوئیں گے' اور نہ گھی کھائیں گے' یہ بزرگ اپنی قسم پر زندگی بھر قائم رہے۔ حجاج نے سعید ابن جبیرؓ سے کہا میں نے سنا ہے کہ تم کبھی ہنستے نہیں ہو؟ انہوں نے جواب دیا کیسے ہنسوں' جہنم بھڑک رہی ہے' طوق تیار ہیں' اور دوزخ کے فرشتے مستعد کھڑے ہوئے ہیں' ایک شخص نے حضرت حسن سے پوچھا: اے ابو سعید! آپ کا کیا حال ہے فرمایا ٹھیک ہے' اس کے بعد آپ مسکرائے اور فرمایا تم میرا حال کیا پوچھتے ہو' تمہارا ان لوگوں کے بارے میں کیا احساس ہے جو کشتی پر سوار ہوں اور جب ان کی کشتی سمندر کے بیچ میں پہنچ جائے تو لہروں میں طغیانی آجائے' اور کشتی ٹوٹ جائے' پھر ہر شخص ٹوٹی ہوئی کشتی کا ایک ایک تختہ لے کر سفر شروع کردے' تمہارے خیال میں کیا حال ہوگا' اس شخص نے عرض کیا یہ لوگ بدترین حالت سے دوچار ہیں' فرمایا میرا حال ان سے بھی زیادہ خراب ہے۔

حضرت عمر ابن عبدالعزیز کی ایک باندی ان کے کمرے میں داخل ہوئی' انہیں سلام کیا' اور اس جگہ جا کر نماز کی نیت باندھ لی جو نماز کے لئے مخصوص تھی' دو رکعت نماز پڑھی' پھر سو گئی' اچانک خواب کی حالت میں رونے لگے جب بیدار ہوئی تو امیر المومنین کی خدمت میں عرض کیا کہ میں نے اس وقت عجیب و غریب خواب دیکھا ہے' حضرت عمر ابن عبدالعزیز نے دریافت کیا وہ کیا خواب ہے' باندی نے عرض کیا میں نے دیکھا کہ دوزخ بھڑک رہی ہے' اور پھر ایک پل لایا گیا اور دوزخ کے اوپر رکھا گیا' حضرت عمرؓ نے فرمایا' اوہ۔ باندی نے عرض کیا اسکے بعد عبدالملک ابن مروان کو لایا گیا' اور اسے اس پل کے اوپر سے گذارا گیا' وہ ابھی اس پر چند قدم ہی چل پایا تھا کہ پل الٹ گیا اور وہ جہنم میں گر پڑا' حضرت عمرؓ نے ایک آہ بھری اور پوچھا پھر کیا ہوا' باندی نے عرض کیا پھر ولید ابن عبدالملک کو لایا گیا اور اسے اس پل کے اوپر سے گذارا گیا' ابھی چند ہی قدم چل پایا تھا کہ پل ٹیڑھا ہوگیا اور وہ بھی جہنم میں گر گیا' حضرت عمرؓ نے پھر ایک سرد آہ بھری اور دریافت کیا پھر کیا ہوا' باندی نے اپنا خواب جاری رکھا کہ پھر سلیمان ابن عبدالملک کو لایا گیا وہ بھی زیادہ دور نہ چل پایا تھا کہ گر پڑا' حضرت عمرؓ نے دریافت کیا پھر کیا ہوا باندی نے عرض کیا پھر امیر المومنین آپ کو لایا گیا' ابھی وہ باندی اتنا ہی کہہ پائی تھی کہ حضرت عمر ابن عبدالعزیز چیخ اٹھے' اور شدت غم کے باعث بے ہوش ہوگئے' وہ باندی ان کے پاس آئی' ان کے کان میں چیخ چیخ کر کہنے لگے واللہ! امیر المومنین! آپ نے میری پوری بات نہیں سنی ہے میں یہ کہہ رہی تھی کہ آپ پل پر سے گذرے اور اسے عبور کر گئے۔ لیکن حضرت عمر ابن عبدالعزیز دیر تک ہوش میں نہیں آئے' حالانکہ وہ اپنا خواب دہراتی رہی' ہوش میں آنے کے بعد بھی وہ دیر تک روتے رہے' اور اپنے پاؤں پٹختے رہے' حضرت اویس قرنیؒ قاصؒ کے پاس آیا کرتے تھے اور ان کے مواعظ سنا کرتے تھے' جب کبھی گفتگو کے دوران دوزخ کا تذکرہ ہوتا چیخ مارتے' اور روتے چلاتے بھاگ

جاتے' لوگ ان پر آوازیں کستے اور انہیں مجنوں کہہ کر پریشان کرتے۔ حضرت معاذ ابن جبلؓ فرماتے ہیں کہ مومن کا خوف اس وقت تک دور نہیں ہوتا جب تک وہ پل صراط کو اپنے پیچھے نہ چھوڑ دے۔ حضرت طاؤس کے لئے بستر کیا جاتا تو وہ اس پر اس طرح لیٹتے جس طرح گرم ریت میں چنے کا دانہ ڈال دیا جائے کہ ادھر ادھر پھدکتا پھرتا ہے' چنانچہ وہ کچھ دیر بستر پر ادھر ادھر کروٹیں بدلتے پھر اٹھ کر بیٹھ جاتے اور قبلہ کی طرف رخ کر کے نماز شروع کر دیتے' فرماتے تھے کہ دوزخ کے ذکر نے خائفین کی آنکھوں سے نیند اڑا دی ہے۔

حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ ایک شخص دوزخ میں سے ہزار برس کے بعد نکلے گا' کیا ہی اچھا ہوتا کہ وہ شخص میں ہوں' یہ بات انہوں نے اس لئے فرمائی تھی کہ انہیں یہ خوف تھا کہ کہیں وہ جہنم میں ہمیشہ کے لئے نہ ڈال دیے جائیں' ان کے بارے میں یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ وہ چالیس برس تک نہیں ہنسے' راوی کہتے ہیں کہ جب میں انہیں بیٹھے ہوئے دیکھتا تو ایسا لگتا جیسے قیدی ہوں' اور گردن مارنے کے لئے پکڑ کر لائے گئے ہوں' اور وعظ فرماتے تو ایسا لگتا تھا گویا دوزخ کے مناظر ان کی نگاہوں کے سامنے ہوں' اور خاموش ہوتے تو ایسا محسوس ہوتا گویا ان کی آنکھوں کے سامنے آگ بھڑک رہی ہو' بعض لوگوں نے انہیں شدت خوف اور کثرت غم پر معتوب کیا تو فرمایا میں کیسے بے خوف ہو جاؤں تمہیں کیا معلوم میرے رب نے مجھے کوئی برائی کرتے ہوئے دیکھ لیا ہے' اور آخرت میں اس برائی کے باعث مجھ سے یہ کہا جائے کہ تجھے بخشا نہیں جائے گا' گویا میرے یہ تمام اعمال بے کار ہیں۔ ابن السماک فرماتے ہیں ایک روز میں نے ایک مجلس میں تقریر کی' تقریر کے دوران ایک نوجوان کھڑا ہوا اور کہنے لگا اے ابو العباس! آج تم نے اپنی تقریر میں ایک جملہ کہا ہے' ہمارے لئے صرف یہ ایک جملہ ہی کافی ہے' اگر تم اس کے علاوہ کچھ نہ کہتے تو ہمیں کچھ پروا نہ ہوتی۔ میں نے اس سے دریافت کیا وہ جملہ کیا ہے' اس نوجوان نے کہا کہ تم نے یہ کہا ہے کہ خائفین کے دلوں کو دو خلود (ہمیشہ رہنے) نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے' اور وہ دو خلود یہ ہیں جنت میں ہمیشہ رہنا ہے یا دوزخ میں ہمیشہ رہنا ہے' یہ بات کہہ کر رخصت ہو گیا' اگلی مرتبہ جب میں نے تقریر کی تو وہ نوجوان موجود نہیں تھا' میں نے حاضرین سے اس کے متعلق دریافت کیا انہوں نے بتلایا کہ وہ بیمار ہے' میں یہ سن کر اس کی عیادت کو گیا اور اس سے کہنے لگا یہ تمہارا کیا حال ہو گیا ہے؟ وہ کہنے لگا اے ابو العباس! تم نے اس دن دوزخ میں یا جنت میں ہمیشہ رہنے کی بات کہی تھی' تمہارے اس جملے نے میرے دل کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے ہیں' چند روز بعد وہ نوجوان مر گیا' ایک رات میں نے خواب میں اسے دیکھا اور اس سے دریافت کیا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا ہے؟ اس نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے میری مغفرت فرما دی' مجھ پر رحم کیا اور مجھے جنت میں داخل کر دیا' میں نے پوچھا تم پر یہ کرم کس لئے ہوا اس نے جواب دیا اسی جملے سے متاثر ہونے کی وجہ سے جو تم نے کہا تھا۔

یہ انبیائے کرام' اولیاء اللہ' علماء اور صالحین کے مخاوف کی تفصیل ہے' دیکھو یہ لوگ کس قدر خوف کرتے تھے جب کہ خوف کی ضرورت ہم لوگوں کو زیادہ ہے۔ پھر یہ ضروری نہیں ہے کہ خوف گناہوں کی کثرت پر ہو' بلکہ صفائے قلب اور کمال معرفت کی موجودگی میں اللہ تعالیٰ سے ڈرنا اتنا ہی ضروری ہے جتنا ضروری گناہوں کی حالت میں ڈرنا ہے' اگر آدمی کے دل میں خوف نہ ہو تو اس کی وجہ یہ نہیں ہوتی کہ اس کے معاصی زیادہ ہیں' اور گناہ کم ہیں' بلکہ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اس کا دل شہوات سے خالی نہیں ہوتا' بلکہ وہ خواہشات نفس کا تابع ہوتا ہے' بدبختی اس پر غالب ہوتی ہے اور اسے اپنے قلب کی غفلت کا مشاہدہ نہیں کرنے دیتی' نہ موت کی قربت اسے بیدار کرتی ہے' اور نہ گناہوں کی کثرت سے اس کے باطن میں ہلچل ہوتی ہے' نہ خائفین کے احوال کا مشاہدہ اس کے قلب پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اور سوء خاتمہ کا خوف اسے سیأت کے ارتکاب سے باز رکھتا ہے' ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ اپنے فضل و کرم سے ہماری اس کوتاہی کو معاف فرما دے' اس لئے کہ اس غفلت کے عالم میں صرف دعا ہی ایک ذریعہ رہ جاتا ہے' بشرطیکہ عمل کے بغیر دعا قبول ہو سکتی ہو۔

عجیب بات یہ ہے کہ جب ہم دنیا میں مال جمع کرنا چاہتے ہیں تو کاشت کرتے ہیں' پودے لگاتے ہیں' تجارت کرتے ہیں'

سمندروں پر کشتیاں چلاتے ہیں' صحراؤں میں گھوڑے دوڑاتے ہیں' اور سفر کی مشقتیں اور صعوبتیں برداشت کرتے ہیں' اسی طرح جب ہم کوئی علمی منصب چاہتے ہیں تو علم حاصل کرتے ہیں' رات رات بھر بیدار رہ کر حفظ و تکرار کرتے ہیں' اور اپنے رزق تلاش کرنے میں جدوجہد کرتے ہیں' اللہ تعالیٰ نے رزق عطا کرنے کا جو وعدہ کیا ہے اس پر اعتماد نہیں کرتے' اور نہ اس رزق کے انتظار میں گھروں کے اندر بیٹھتے ہیں' اور نہ محض یہ دعا کرتے ہیں : اے اللہ! ہمیں رزق عطا کر۔ لیکن جب ہمارے سامنے ابدی سلطنت (آخرت) کا سوال آتا ہے' اور جنت کی بات آتی ہے تو ہم صرف زبان سے اتنا کہہ دینے پر اکتفا کرتے ہیں اے اللہ! ہماری مغفرت فرما' ہم پر رحم کر' حالانکہ جس ذات گرامی کو ہم ندا دیتے ہیں' اور جس پر ہمارا بھروسا ہے وہ علی الاعلان یہ کہتا ہے :-

وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى۔ (پ ۲۷ ر ۷ آیت ۳۹)

اور یہ کہ انسان کو صرف اپنی ہی کمائی ملے گی۔

وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ۔ (پ ۲۲ ر ۱۳ آیت ۵)

اور ایسا نہ ہو کہ تم کو دھوکہ باز شیطان اللہ سے دھوکہ میں ڈال دے۔

يٰۤاَيُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ (پ ۳۰ ر ۷ آیت ۶)

اے انسان! تجھ کو کس چیز نے اپنے رب کریم کے ساتھ بھول میں ڈال رکھا ہے۔

یہ تمام آیات بھی ہمیں متنبہ نہیں کرتیں' اور نہ ہمیں غرور اور آرزوؤں کی وادیوں سے نکالتی ہیں حقیقت میں تو بغیر عمل کے نجات کی امید رکھنا' اور عمل کے بعد بھی یہ یقین رکھنا کہ ہم نجات یافتہ ہیں بڑے خسارے کی بات ہے' الا یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنا فضل و کرم فرمائے' اور توبہ نصوح کی توفیق سے نوازے۔ ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ ہماری توبہ قبول فرمائے بلکہ ہم یہ دعا کرتے ہیں کہ ہمارے دلوں میں توبہ کا شوق پیدا فرمائے اور یہ کہ ہم محض زبان سے توبہ کے الفاظ ادا کرنے پر تکیہ نہ کریں' ورنہ ہم ان لوگوں میں سے ہو جائیں گے جو کہتے ہیں کرتے نہیں ہیں' سنتے ہیں قبول نہیں کرتے' جب ہم وعظ سنتے ہیں تو روتے ہیں اور جب سنے ہوئے وعظ کے مطابق عمل کرنے کا وقت آتا ہے تو عمل نہ کرکے گناہ کا ارتکاب کرتے ہیں' اس سے بڑھ کر رسوائی کی اور کیا علامت ہو گی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے فضل و کرم سے ہدایت' توفیق اور رشد سے نوازے۔ ہم خائفین کے صرف اسی قدر احوال پر اکتفا کرتے ہیں جو ہم نے بیان کئے ہیں' اس لئے یہ احوال اپنے اختصار کے باوجود قبول کرنے والے دلوں پر اثر انداز ہوں گے' اور جن دلوں میں قبول حق کی صلاحیت نہیں ان کے سامنے اگر صفحے کے صفحے بھی سیاہ کردیے جائیں تو انہیں کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔

عیسٰی ابن مالک خولانی جن کا شمار عابدین میں ہوتا ہے ایک راہب کے بارے میں بیان کرتے ہیں کہ میں نے اسے بیت المقدس کے دروازے پر غمگین صورت بنائے کھڑے ہوئے دیکھا' وہ انتہائی مضطرب' بے چین اور غمگین نظر آتا تھا' لگتا تھا کہ ابھی اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگیں گے' میں نے اس سے کہا اے راہب! اگر تم کچھ وصیت کرنا چاہتے ہو تو ضرور کرو' میں یاد رکھوں گا' اس نے کہا اے عزیز! میں تجھے کیا نصیحت کروں' اگر تجھ سے ممکن ہو تو اس شخص کی طرح رہنا جسے چاروں طرف سے درندے اور حشرات الارض گھیرے ہوئے ہوں' وہ شخص ہروقت خوف زدہ رہتا ہے اور ڈرتا ہے کہ اگر میں ایک لمحے کے لئے بھی غافل ہو گیا تو یہ درندے اور حشرات الارض میری جان لے لیں گے۔ ایسے شخص کی رات بھی خوف میں گذرتی ہے گو غافل سکون کی نیند سوئیں' اور دن بھی اضطراب میں کٹتا ہے اگرچہ ناکارہ لوگ عیش میں بسر کریں۔ پھر وہ راہب مجھے میرے حال پر چھوڑ کر چلنے لگا' میں نے اس سے کہا اگر تم کچھ اور بھی کہتے تو مجھے کچھ زیادہ ہی نفع ہوتا' وہ کہنے لگا کہ پیاسے کو جس قدر بھی پانی مل جائے غنیمت ہوتا ہے' یہ بات اس راہب نے بالکل صحیح کہی ہے اس لئے کہ صاف قلوب پر معمولی خوف بھی بہت زیادہ اثر انداز ہوتا ہے' اور غافلوں کو خواہ کتنا ہی ڈراؤ وہ اپنے حال پر رہتے ہیں اور ذرا نہیں بدلتے۔ راہب نے جو مثال بیان کی ہے وہ فرضی نہیں ہے' بلکہ حقیقت میں یہی صورت ہے' اگر آدمی غور سے دیکھے اور اپنے باطن کا جائزہ لے تو اسے معلوم ہو گا کہ وہ مختلف قسم کے

درندوں اور زہریلے جانوروں سے لبریز ہے' مثلاً غضب' شہوت' حقد' حسد' کبر' عجب اور ریاء وغیرہ۔ یہ تمام اوصاف درندے ہی تو ہیں جو ہر وقت اسے چیرتے پھاڑتے رہتے ہیں' بشرطیکہ وہ غافل ہو' تاہم انسان کو ان باطنی درندوں کی درندگی' اور موذی جانوروں کی اذیت کا احساس نہیں ہوپاتا' جب پردہ اٹھایا جائے گا اور بے جان جسم کے ساتھ قبر میں لٹایا جائے گا جب دیکھے گا کہ ان درندوں نے تجھے کس قدر نقصان پہنچایا ہے' اور ان کیڑوں نے تیری روح کو کس قدر زہریلی بنا دیا ہے' اس وقت یہ سب اوصاف اجسام بن کر قبر میں آئیں گے' اور سانپ بچھو بن کر اس کے جسم کو گھیر لیں گے۔ اس وقت معلوم ہوگا کہ باطن کے درندوں سے بچنے کی تاکید کیوں کی جاتی تھی۔ اگر تو یہ چاہتا ہے کہ ان درندوں پر قابو پالے یا ان موذی جانوروں کو ہلاک کردے تو تجھے موت سے پہلے ان پر قابو پانا ہوگا' اور دنیا سے رخصت ہونے سے پہلے ان کے قتل کا سامان کرنا ہوگا' اگر تو نے ایسا نہ کیا تو یاد رکھ یہ درندے اور کیڑے تجھے نوچ نوچ کر کھالیں گے۔

کتاب الفقر والزهد
زہد اور فقر کے بیان میں

جاننا چاہیے کہ دنیا اللہ تعالیٰ کی دشمن ہے' بہت سے لوگ اس کے فریب میں مبتلا ہو کر گمراہ ہوئے ہیں' اور اس کے مکر میں آکر بہت سے لوگوں نے لغزش کھائی ہے' اس کی دوستی گناہوں اور برائیوں کی جڑ ہے' اور اس کی دشمنی نیکیوں اور اچھائیوں کی اصل ہے۔ ہم نے دنیا کا حال" اور اس کی دوستی کی حقیقت اور مذمت ذم الدنیا میں بیان کی ہے۔ یہاں ہم دنیا سے بغض رکھنے اور اس میں زہد اختیار کرنے کے فضائل بیان کرتے ہیں' اس لیے کہ منجیات میں اصل یہی ہے۔ اس وقت تک نجات کی امید نہیں کی جاسکتی جب تک کہ دل بالکلیہ طور پر دنیا سے علیحدہ نہ ہو اور دل کے دنیا سے علیحدہ ہونے کی دو صورتیں ہیں یا تو وہ خود آدمی سے الگ رہے اسے فقر کہتے ہیں یا آدمی اس سے دور رہے اسے زہد کہتے ہیں' ان دونوں صورتوں کو حصول سعادات' اور کامیابی اور نجات کے حصول کے لئے ذریعۂ اعانت بننے میں الگ الگ درجہ حاصل ہے۔ پہلے ہم فقر اور زہد کی حقیقت' ان دونوں کی قسمیں' شرائط اور احکام بیان کرتے ہیں' پہلے باب میں فقر پر گفتگو کریں گے' اور دوسرے باب میں زہد پر گفتگو زیر بحث آئے گی۔

پہلا باب

فقر کی حقیقت اور فقیر کے احوال و اسماء کا اختلاف

فقر ان چیزوں کے فقدان کا نام ہے جن کی ضرورت ہے' ان چیزوں کے فقدان کو فقر نہیں کہتے جن کی ضرورت نہیں ہے' اسی طرح اگر ضرورت کی چیز موجود ہے' اور محتاج کو اس پر قدرت بھی ہے تو اسے فقیر نہیں کہا جائے گا' اگر تم نے یہ بات سمجھ لی تو تم اس حقیقت میں شک نہیں کرو گے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا ہر وجود فقیر ہے کیوں کہ اسے دوسرے وقت موجود رہنے کی حاجت ہے' اور کسی چیز کا ہمیشہ موجود رہنا محض اللہ کے فضل اور اس کی مشیت پر موقوف ہے' اگر عالم وجود میں ہے جس کا وجود کسی دوسرے وجود کا رہین منت نہیں تو وہ غنی مطلق ہے اور اس طرح کا وجود صرف ایک ہے' یعنی اللہ تعالیٰ کا وجود' جو غنی ہے' اس کا وجود کسی سے مستفاد نہیں ہے' اس کے علاوہ تمام موجودات اپنے دوام وجود کے لئے اسی ایک ذات کے محتاج ہیں' قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے اسی حقیقت کی طرف ارشاد فرمایا ہے :۔

وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَاۗءُ

(پ ۲۶ ر ۸ آیت ۳۸)

اور اللہ تو کسی کا محتاج نہیں اور تم سب محتاج ہو۔

لیکن فقر کے یہ مطلق معنی نہیں ہیں' جب کہ ہمارا موضوع فقر کے مطلق معنی بیان کرنا نہیں ہے' بلکہ خاص مال کا فقر بیان کرنا

مقصود ہے' ورنہ دیکھا جائے تو بندے کی بے شمار حاجات اور لاتعداد ضروریات ہیں' ان میں سے بعض حاجات وہ ہیں جو مال سے پوری ہوتی ہیں' اور انہی کا بیان یہاں مقصود ہے' چنانچہ ہم یہ کہتے ہیں کہ جو شخص مال نہیں رکھتا وہ اس مال کے اعتبار سے فقیر ہے جو اس کے پاس نہیں ہے بشرطیکہ اسے اس کی احتیاج بھی ہو' پھر اگر غور کیا جائے تو فقر میں آدمی کے پانچ احوال ہیں۔ سہولت تفہیم اور تمیز کے لیے ہم ہر حالت کا الگ الگ نام رکھتے ہیں' اور الگ الگ بیان کرتے ہیں۔

پہلی حالت یہ بہترین حالت ہے' اس کا حاصل یہ ہے کہ اگر آدمی کے پاس مال آئے تو اسے برا لگے' اور اس کی موجودگی سے اذیت محسوس کرے' اسے قبول کرنے سے گھبرائے' اسے برا سمجھے' اور اس کے شر سے بچنے کی کوشش کرے' اس حالت کو زہد کہتے ہیں' اور جس شخص کا یہ حال ہو وہ زاہد ہے۔

دوسری حالت یہ ہے کہ مال کی رغبت اتنی نہ ہو کہ اس کے ملنے سے خوش ہو' اور نہ اس قدر نفرت ہو کہ ملنے سے تکلیف محسوس کرے' بلکہ دل میں اس قدر ہمت ہو کہ اگر مال مل جائے تو اسے چھوڑ بھی سکے' اس حالت والے کو راضی کہتے ہیں۔

تیسری حالت یہ ہے کہ اسے مال ملنا نہ ملنے کی بہ نسبت محبوب ہو' کیوں کہ دل میں اس کی کچھ رغبت ہے' مگر یہ رغبت اتنی زیادہ نہیں ہے کہ اس کے حصول کے لئے جدوجہد کرے' بلکہ اگر بغیر مشقت اور محنت کے مل جائے تو خوش ہو' اور اگر اس کے حصول میں کچھ مشقت پیش آئے' تو اس کی طلب میں مشغول نہ ہو' جس کی یہ حالت ہو اسے قانع کہتے ہیں' اس لئے کہ اس نے موجود قناعت کی ہے' اور رغبت رکھنے کے باوجود غیر موجود کے حصول کے لئے جدوجہد نہیں کی ہے۔

چوتھی حالت یہ ہے کہ اپنے عجز کی بنا پر مال طلب نہ کرے' ورنہ دل میں رغبت موجود ہے' اور ہر اس تدبیر پر عمل کرتا ہے جس سے مال حاصل ہو' خواہ اس تدبیر پر عمل کرنے میں مشقت ہی کیوں نہ ہو' یا وہ مال کی طلب میں مشغول ہے' لیکن کوشش کے باوجود مال نہیں پاتا' اس حالت کو حریص کہتے ہیں۔

پانچویں حالت یہ ہے کہ جس مال سے وہ شخص محروم ہے اس کا وہ اضطرار احتاج ہو' جیسے بھوکے کے پاس روٹی نہ ہو' یا ننگے کے پاس کپڑا نہ ہو' جس کی یہ حالت ہو اسے مضطر کہتے ہیں' چاہے طلب میں اس کی رغبت ضعیف ہو یا قوی' ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ آدمی اضطرار کی حالت میں ہو' اور جس چیز کی طرف مضطر ہو اس کی رغبت نہ رکھتا ہو۔

غنی اور مستغنی یہ پانچ حالتیں ہیں' ان میں اعلا حالت زہد ہے' اور اگر اضطرار کے ساتھ زہد بھی ہو تو یہ انتہائی اعلا اور آخری درجے کی حالت ہے' جیسا کہ اس کا بیان عنقریب آئے گا۔ پھر ان پانچوں حالتوں سے افضل بھی ایک حالت ہے' اور وہ یہ ہے کہ بندے کے لئے مال کا عدم و وجود دونوں برابر ہوں' اگر مال مل جائے تو نہ دل خوش ہو' اور نہ اذیت پائے' اسی طرح اگر مال نہ ملے تب بھی نہ دل خوش ہو اور نہ تکلیف محسوس کرے' بلکہ اس کی حالت حضرت عائشہؓ کی حالت کے مشابہ ہے' ایک مرتبہ آپ کے پاس ایک ہزار درہم آئے' آپ نے وہ تمام درہم تقسیم کرا دیے' خادمہ نے عرض کیا کہ اگر آپ ہمارے لئے ایک درہم کا گوشت خرید لیتیں تو ہم اس سے روزہ افطار کر لیتے' آپ نے فرمایا اگر تو مجھے یاد دلا دیتی تو میں ایسا کر لیتی۔ جس شخص کا یہ حال ہو اگر پوری دنیا کے خزانے سمیٹ کر اس کے دامن میں رکھ دیے جائیں تو اسے ذرا نقصان نہ ہو' اس لئے کہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ تمام خزانے اللہ کے ہیں اگرچہ اس کے قبضے میں ہیں' آج وہ اس کے پاس ہیں' کل اگر دوسرے کے پاس چلے جائیں تو ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے' ایسے شخص کا نام مستغنی ہونا چاہیے' کیوں کہ وہ مال کے وجود اور عدم دونوں سے مستغنی اور بے نیاز ہے۔ مستغنی اور غنی دو الگ الگ مفہوم رکھنے والے لفظ ہیں جیسا کہ اس حالت سے واضح ہوتا ہے جو مستغنی کی بیان کی گئی ہے۔ غنی کا اطلاق اللہ تعالیٰ پر ہوتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے ان بندوں کے لئے اس لفظ کا استعمال ہے جو بہت سا مال رکھتے ہیں۔ یہ لوگ مال کی زیادتی

سے خوش ہوتے ہیں' اس لئے اس بات کے محتاج ہیں کہ یہ مال ان کے پاس باقی رہے۔ اس اعتبار سے انہیں فقیر بھی کہا جاسکتا ہے۔ لیکن مستغنی کو نہ اس کی پروا ہے کہ مال اس کے قبضے میں آئے' اور نہ وہ اس بات کی پروا کرتا ہے کہ مال اس کے قبضے سے نکل جائے۔ کیوں کہ نہ وہ مال سے تکلیف محسوس کرتا ہے کہ اسے نکالنے کا محتاج ہو' اور نہ اس سے خوش ہوتا ہے کہ رکھنے پر مجبور ہو' اور نہ یہ بات ہے کہ اس کے پاس مال نہیں ہے اس لئے وہ اسے اپنے قبضے میں رکھنے کا خواہشمند ہے۔ اس مستغنی کی غنا عام ہے' اور اس اعتبار سے وہ اس غنی سے قریب تر ہے جو اللہ تعالیٰ کا وصف ہے۔ بندہ صفات میں اللہ تعالیٰ سے قریب ہو سکتا ہے' مکان میں قریب نہیں ہو سکتا لیکن اس حالت والے کو ہم مستغنی کہتے ہیں' تاکہ یہ نام اسی ذات واحد کے ساتھ مخصوص رہے جو حقیقت میں غنی ہے' ہر چیز سے بے نیاز ہے' جب کہ یہ بندہ اگرچہ مال سے بے نیاز ہے لیکن بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن سے وہ کسی بھی حالت میں بے نیاز نہیں ہو سکتا' مثلاً" وہ توفیق الٰہی کی اعانت سے بے نیاز نہیں ہے' اس کے ذریعے وہ اپنے دل کا استغناء باقی رکھتا ہے۔ قلب مال کی محبت میں گرفتار ہے۔ اور وہ مستغنی اس کی محبت سے آزاد ہے اللہ تعالیٰ نے اسے اس غلامی سے آزاد کیا ہے' اور وہ اپنی آزادی برقرار رکھنے میں اللہ تعالیٰ کی مدد کا محتاج ہے۔ جبکہ دل غلامی اور آزادی میں بدلتے رہتے ہیں' کیوں کہ تمام قلوب اللہ تعالیٰ کی دو انگلیوں کے درمیان ہیں۔ اس لئے مستغنی کو غنی کہنا مناسب نہیں ہے' کیوں کہ وہ اپنے استغناء کے باوجود بہت سی چیزوں میں محتاج ہے۔

زاہد اور مستغنی زہد ایک بڑا درجہ ہے' بلکہ اسے ابرار کا انتہائی درجہ کہا جاسکتا ہے' جبکہ مستغنی مقربین میں سے ہے' اس اعتبار سے زہد اس کے حق میں نقصان دہ ہے' اس لئے کہ ابرار کے حسنات مقربین کے سیّآت ہیں' اور اس کی وجہ یہ ہے کہ زہد میں دنیا سے نفرت پائی جاتی ہے' اور دنیا سے نفرت کرنا بھی اسی میں مشغول ہونے کے برابر ہے' جیسا کہ دنیا سے محبت کرنے والا دنیا میں مشغول ہے' اور ماسوی اللہ کے ساتھ مشغولیت اللہ تعالیٰ سے حجاب ہے' اللہ تعالیٰ کے اور تمہارے درمیان کوئی دوری نہیں ہے کہ دوری کو حجاب کہا جائے' بلکہ وہ تو رگ جاں سے بھی زیادہ تمہارے قریب ہے' اور نہ وہ کسی مکان میں محصور ہے کہ آسمان اور زمین تمہارے اور اللہ کے درمیان حجاب بنیں' بلکہ تمہارے وہ مشاغل جن کا تعلق غیر اللہ سے ہے حجاب ہیں' اپنے نفس اور شہوات کے ساتھ مشغول ہونا بھی غیر اللہ کے ساتھ مشغول ہونا ہے' کیونکہ تم ہمیشہ اپنے نفس اور شہوات میں مشغول رہتے ہو اس لئے ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے محجوب رہتے ہو' خلاصہ یہ ہے کہ جو شخص اپنے نفس کی محبت میں مشغول ہے وہ اللہ سے منحرف ہے' اسی طرح اگر اپنے نفس کی نفرت میں لگا ہوا ہے تو وہ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ نہیں ہے' اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی مجلس میں عاشق اور معشوق دونوں جمع ہوں اور وہاں رقیب بھی آجائے۔ اب اگر عاشق کا دل رقیب کی طرف ملتفت ہو گیا' یعنی وہاں اس کی موجودگی پر دل ہی دل میں برا فروختہ ہوا' اور اسے برا سمجھنے لگا تو یہ کہا جائے گا کہ وہ اس حال میں جب کہ رقیب سے نفرت کرنے میں مشغول ہے' معشوق کے مشاہدے کی لذت سے ہم کنار نہیں ہے' حالانکہ اگر وہ عشق میں مستغرق ہوتا تو غیر معشوق کی طرف ذرا بھی التفات نہ کرتا' نہ رقیب کی دخل اندازی پر توجہ دیتا۔ اور نہ اس کے تئیں اپنی نفرت ظاہر کرنے میں وقت ضائع کرتا۔ چنانچہ جس طرح معشوق کی موجودگی میں غیر معشوق کو بنظر محبت دیکھنا اور اس کی طرف متوجہ ہونا عشق میں شرک اور اس کے لئے نقص و عیب کی بات ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ان میں سے ایک دوسرے سے خفیف تر ہے' کمال یہ ہے کہ قلب غیر محبوب کی طرف نہ بغض میں متوجہ ہو اور نہ حب میں۔ جس طرح دل میں بیک وقت دو محبتیں یکجا نہیں ہو سکتیں' اسی طرح ایک ہی وقت میں بغض اور محبت کا اجتماع بھی نہیں ہو سکتا۔

اس تفصیل کے بعد یہ وضاحت ضروری نہیں ہے کہ جو شخص بغض دنیا میں مشغول ہے وہ اللہ تعالیٰ سے غافل ہے' جیسے وہ اللہ تعالیٰ سے غافل ہے جس کے دل میں دنیا کی محبت ہو۔ تاہم جو شخص دنیا کی محبت میں مشغول ہے وہ اپنی غفلت میں بعد کے راستے پر گامزن ہے' اور جو شخص اس سے نفرت کرتا ہے وہ اپنی غفلت میں قرب کے راستے پر چل رہا ہے' اس لئے کہ اس شخص کے حق

میں یہ امید کی جاسکتی ہے کہ دنیا سے نفرت کی صورت میں جو غفلت اس کے دل میں ہے وہ زائل ہو جائے گی' اور شہود کی کیفیت پیدا ہو جائے گی۔ اور درجہ کمال حاصل کرلے گا' کیوں کہ دنیا سے نفرت کا عمل ایک ایسی سواری ہے جو اللہ تعالیٰ تک پہنچاتی ہے۔ دنیا سے محبت کرنے والوں' اور نفرت کرنے والوں کی مثال ایسی ہے جیسے دو مسافر حج کے راستے میں ہوں' اور اپنے جانوروں پر سواری کرنے اور ان کا دانہ پانی کرنے میں مشغول ہوں' لیکن ایک کا رخ کعبے کی طرف ہو' اور دوسرا مخالف سمت میں چل رہا ہو' یہ دونوں مسافر اس اعتبار سے کعبہ مکرمہ سے محجوب ہیں کہ غیر کعبہ یعنی سواری کی نگہداشت اور اس کے دانہ پانی میں لگے ہوئے ہیں' لیکن اس شخص کا حال اچھا ہے جس کا رخ کعبہ کی سمت ہے' کیوں کہ وہ اپنی غفلت کے باوجود کعبے سے قریب ہو رہا ہے' اور توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ کسی نہ کسی دن منزل مقصود پر پہنچ جائے گا' مگر اس شخص سے بہتر نہیں ہے جو کعبے میں معتکف ہے' اور اسی میں رہ رہا ہے' کبھی باہر نہیں نکلتا کہ سواری پر سوار ہونے اور اس کی خبر گیری کرنے کی نوبت پیش آئے۔ اس لئے تمہیں یہ گمان نہ کرنا چاہیے کہ بغض دنیا مقصود ہے' بلکہ دنیا اللہ تعالیٰ سے روکنے والی ہے' اور اس تک پہنچنا اس وقت ممکن نہیں ہے جب تک یہ رکاوٹ دور نہ ہو جائے' اسی لئے ابو سلیمان دارانیؒ فرماتے ہیں جو شخص دنیا میں زہد کرتا ہے اور اسی پر اکتفا کرتا ہے وہ گویا جلد از جلد راحت پانے کا طالب ہے اسے دنیا میں زہد کرنے کے بعد آخرت میں بھی تو مشغول ہونا چاہیے' آخری منزل تو یہی ہے۔ اس طرح ابو سلیمان دارانیؒ نے بتلایا ہے کہ آخرت کے راستے پر چلنے کا مرحلہ زہد کے بعد ہے' جس طرح حج کے راستے پر چلنا الگ ہے' اور حج کے موانع کا ازالہ الگ ہے۔

بہر حال اگر زہد فی الدنیا سے یہ مراد لیا جائے کہ نہ دنیا کے وجود سے رغبت ہو اور نہ اس کے عدم سے' تو یہ غایت کمال ہے اور اگر اس سے مراد یہ لیا جائے کہ دنیا کے عدم کی رغبت ہو تو یہ راضی' قانع اور حریص کی بہ نسبت کمال ہے' اور مستغنی کی بہ نسبت نقص ہے' بلکہ مال کے سلسلے میں درجۂ کمال یہ ہے کہ تمہارے نزدیک مال اور ماء (پانی) دونوں برابر ہیں۔ اگر تم سمندر کے کنارے پر ہو تو تمہیں پانی کی کثرت سے کوئی نقصان نہیں ہوتا' اسی طرح اگر تمہاری پیاس وغیرہ کی ضرورتیں پوری ہوتی رہیں تو پانی کی قلت تمہارے لئے مضر نہیں ہے' جس طرح تم بقدر ضرورت پانی کی احتیاج رکھتے ہو' اسی طرح بقدر ضرورت مال کے بھی محتاج ہو' چنانچہ جس طرح تم بہت سا پانی دیکھ کر راہ فرار اختیار نہیں کرتے' بلکہ یہ کہتے ہو کہ میں خود بھی اس میں سے ضرورت کے بقدر استعمال کروں گا' اور اللہ کے بندوں کو بھی پلاؤں گا' اسی طرح مال کا حال بھی ہونا چاہیے۔ اس لئے کہ روٹی اور پانی دونوں ضرورت کے اعتبار سے ایک ہیں' فرق صرف ایک کی قلت اور دوسرے کی کثرت کا ہے۔

جب بندہ اللہ تعالیٰ کو پہچان لیتا ہے' اور عالم کے سلسلے میں اس کی تدبیروں کا علم حاصل کرلیتا ہے تو یہ بات بھی جان لیتا ہے کہ جس طرح اسے ضرورت کے بقدر پانی ملتا ہے اسی طرح زندگی بھر ضرورت کے مطابق روٹی ملتی رہے گی' جیسا کہ عنقریب توکل کے ابواب میں یہ بحث آئے گی احمد ابن ابی الحواری کہتے ہیں کہ میں نے ابو سلیمان دارانی سے کہا کہ مالک ابن دینار نے مغیرہ سے کہا کہ گھر میں جاکر وہ کوزہ لے لو جو تم نے مجھے ہدیہ میں دیا تھا۔ اس لئے کہ شیطان میرے دل میں یہ وسوسہ ڈالتا ہے کہ چور لے گا۔ ابو سلیمان نے کہا کہ یہ صوفیاء کے دلوں کا ضعف ہے' اگر کوئی شخص یہ کوزہ لے جاتا تو انہیں پروا نہ ہونی چاہیے تھی گویا دل میں یہ خیال آنا بھی برا ہے کہ گھر میں کوزہ موجود ہے' اور اس کی طرف التفات بھی ضعف اور نقصان کا باعث ہے۔ اب اگر تم یہ سوال کرو کہ انبیاء اور اولیاء مال سے کیوں بھاگتے تھے اور اس سے نفرت کیوں کرتے تھے تو ہم یہ کہیں گے کہ مال سے ان کا فرار ایسا تھا جیسا پانی سے فرار' یعنی ضرورت سے زائد نہیں لیتے تھے' اور جو باقی بچتا تھا اسے مشکیزوں اور برتنوں میں جمع نہیں کرتے تھے' اس خیال سے کہ بعد میں کام آئے گا' بلکہ محتاجین کے لئے نہروں' کنوؤں' اور تالابوں میں چھوڑ دیا کرتے تھے اس لیے نہیں کہ ان کے دل پانی کی محبت یا نفرت میں مشغول تھے۔ دنیا کے خزانے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم' اور آپ کے دونوں اجل صحابہ حضرت ابوبکر الصدیقؓ اور حضرت عمرؓ کے پاس آئے' آپ نے وہ خزانے لئے جہاں ان کی ضرورت تھی وہاں خرچ کردیئے' آپ حضرات نے ان

سے راہ فرار اختیار نہیں کی اس لئے کہ ان کے نزدیک مال اور پانی سونا اور پتھر دونوں برابر تھے' ان حضرات سے کوئی مخالفت بھی منقول نہیں ہے' جن لوگوں نے منع کیا ہے انہیں یہ خوف تھا کہ اگر انہوں نے مال لیا تو وہ فریب کا شکار ہو جائیں گے' مال ان کے دل کو اپنا قیدی بنا لے گا' اور وہ شہوات میں مبتلا ہو جائیں گے' لیکن یہ ضعفاء کا حال ہے' اور ان کے حق میں مال سے نفرت کرنا اور اس سے دور بھاگنا ہی کمال ہے' تمام مخلوق کا یہی حکم ہے صرف انبیاء اور اولیاء اس سے مستثنیٰ ہیں' اگر کسی ایسے قوی شخص سے جو درجۂ کمال کو پہنچا ہوا ہو یہ منقول ہو کہ وہ مال سے بھاگتا تھا یا اس سے نفرت کی تھی تو یہ کہا جائے گا کہ اس نے ضعفاء کے درجے پر اتر کر ایسا کیا ہو گا تاکہ لوگ ترک میں اس کی اقتداء کریں۔ اگر اخذ میں اس کی اقتداء کریں گے تو ہلاک ہو جائیں گے' اگرچہ وہ خود محفوظ رہے گا۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی سپیرا اپنے بچوں کے سامنے سانپ پکڑنے سے باز رہے' وہ ان کی موجودگی میں سانپ نہیں پکڑتا اس لئے نہیں کہ اس میں کچھ ضعف ہے یا وہ سانپ پکڑنے پر قدرت نہیں رکھتا' لیکن وہ یہ جانتا ہے کہ اگر میں نے سانپ پکڑا اور بچوں نے دیکھ لیا تو وہ بھی پکڑیں گے اور ہلاک ہو جائیں گے۔ انبیاء اور اولیاء بھی ضعفاء کے سامنے انہی احکام پر عمل کرتے ہیں جن کے وہ پابند ہیں تاکہ ان کی اقتداء کریں' جو چیزیں خود ان کے ساتھ مخصوص ہیں ان پر عوام الناس کی موجودگی میں عمل نہیں کرتے۔

اس تفصیل سے تم یہ بات جان گئے ہوں گے کہ کل چھ مراتب ہیں' جن میں سب سے اعلا مرتبہ مستغنی کا ہے' پھر زاہد کا ہے' پھر راضی کا ہے' اس کے بعد قانع کا ہے' آخر میں حریص ہے۔ جہاں تک مضطر کا سوال ہے اس کے حق میں زہد' رضا اور قناعت کا تصور کیا جا سکتا ہے' اور اسی اعتبار سے اس کا درجہ بھی مختلف ہوتا ہے' البتہ فقیر کا اطلاق ان پانچوں مراتب کے لوگوں پر ہو سکتا ہے۔ مستغنی کو فقیر کہنا اس معنی میں تو صحیح نہیں ہے جس معنی میں یہ مشہور ہے البتہ اس معنی میں صحیح کہا جا سکتا ہے کہ مستغنی کو یہ معرفت حاصل ہے کہ وہ اپنے تمام امور میں عام طور پر' اور مال سے استغناء رکھنے میں خاص طور پر اللہ تعالیٰ کا محتاج ہے' مستغنی کو فقیر کہنا ایسا ہی ہے جیسے کسی ایسے شخص کو جو اپنے نفس کے لئے عبودیت کا معترف ہو عبد کہہ دیا جائے' اگرچہ بندے کا لفظ تمام مخلوق کے لئے عام ہے' مگر ایسے شخص پر اس کا اطلاق غافلوں کی بہ نسبت زیادہ مناسب ہے جو خود اپنے فقر و احتیاج کی معرفت رکھتا ہو وہ اس لفظ کا زیادہ مستحق ہے' گویا لفظ فقیر ان دونوں معنوں میں مشترک ہے' اور اگر تم یہ بات جان گئے کہ لفظ فقیر دونوں معنوں میں مشترک ہے تو تمہیں یہ بات سمجھنے میں بھی کوئی دشواری نہ ہو گی کہ ایک مرتبہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فقر کے سلسلے میں یہ ارشاد فرمایا:۔

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنَ الْفَقْرِ کَادَ الْفَقْرُ اَنْ یَکُوْنَ کُفْرًا۔

اے اللہ! میں فقر سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔ قریب ہے کہ فقر کفر ہو جائے۔

اور دوسری طرف سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا:۔

اَللّٰهُمَّ اَحْیِنِیْ مِسْکِیْنًا وَاَمِتْنِیْ مِسْکِیْنًا۔ (ترمذی۔ انسؓ)

اے اللہ! مجھے مسکین بنا کر زندہ رکھ' اور مسکینی کی حالت میں موت دے۔

یہ دونوں روایات ایک دوسرے سے متصادم نہیں ہیں' کیوں کہ پہلی دونوں روایتوں میں مضطر کا فقر مراد ہے' اس سے آپ نے پناہ مانگی ہے' اور آخری روایت میں وہ فقر مراد ہے جس کے معنی ہیں اپنی مسکنت' ذلت اور احتیاج کا اعتراف۔

فقر کے فضائل قرآن کریم کی متعدد آیات سے فقر کی فضیلت ثابت ہے۔ مثلاً:۔

لِلْفُقَرَاءِ الْمُهَاجِرِیْنَ الَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ یَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَیَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ (پ ۲۸ ر ۴ آیت ۸)

ان حاجتمند مہاجرین کا حق ہے جو اپنے گھروں سے اور اپنے مالوں سے جدا کر دیے گئے' وہ اللہ کے فضل اور

رضامندی کے طالب ہیں اور وہ اللہ اور اس کے رسول (کے دین) کی مدد کرتے ہیں۔

لِلْفُقَرَاءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ۔ (پ ۳ ر ۵ آیت ۲۷۳)

اصل حق ان حاجتمندوں کا ہے جو اللہ کی راہ میں مقید ہو گئے ہوں وہ لوگ کہیں ملک میں چلنے پھرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔

ان دونوں آیتوں میں کلام کی ابتداء مدح کے ساتھ کی گئی ہے' اور پھر فقر کو ہجرت اور محصور کیے جانے کے ساتھ ذکر فرمایا گیا ہے' اور ان دونوں صفتوں پر فقر کی صفت کو مقدم کیا گیا ہے' یہ تقدیم فقر کی فضیلت پر دلالت کرتی ہے احادیث میں بھی فقر کی تعریف کی گئی ہے' حضرت عبداللہ ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام سے دریافت کیا کہ لوگوں میں کون زیادہ اچھا ہے؟ صحابہ نے عرض کیا وہ مالدار شخص جو اپنے نفس اور مال میں اللہ تعالیٰ کا حق ادا کرتا ہو' آپ نے ارشاد فرمایا: یہ شخص بھی اچھا ہے' لیکن میں جس شخص کے متعلق دریافت کر رہا ہوں وہ یہ نہیں ہے' صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! پھر کون شخص بہتر ہے؟ فرمایا:۔ فَقِيْرٌ يُعْطِيْ جُهْدَهٗ (ابو منصور دیلمی) وہ فقیر جو اپنی محنت کی چیز دے۔

ایک مرتبہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بلالؓ سے ارشاد فرمایا:۔

اِلْقَ اللّٰهَ فَقِيْرًا وَلَا تَلْقَهٗ غَنِيًّا۔ (حاکم۔ بلالؓ) اللہ تعالیٰ سے فقیر ہو کر مل' غنی ہو کر نہ مل۔

ایک حدیث میں ارشاد فرمایا:۔

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْفَقِيْرَ الْمُتَعَفِّفَ اَبَا الْعِيَالِ۔ (ابن ماجہ۔ عمران ابن حصین)

اللہ تعالیٰ سوال نہ کرنے والے عیالدار تنگدست کو محبوب رکھتا ہے۔

ایک مشہور روایت میں وارد ہے' فرمایا:۔

يدخل فقراء امتي الجنة قبل اغنيائهم بخمس مائة عام (ترمذی۔ ابو ہریرہؓ)

میری امت کے فقراء اغنیاء سے پانچ سو برس پہلے جنت میں جائیں گے۔

ایک روایت میں اربعین خریفاً کے الفاظ ہیں' جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حریص فقیر حریص غنی کے مقابلے میں چالیس برس پہلے جنت میں داخل ہو گا (مسلم۔ عبداللہ ابن عمرؓ) اور پہلی روایت کا مفہوم یہ ہے کہ فقیر زاہد غنی راغب کی بہ نسبت پانچ سو برس پہلے جنت میں داخل ہو گا۔ اس سے پہلے ہم نے فقر کے درجات کا اختلاف بیان کیا ہے۔ اس سے تم نے یہ بات جان لی ہو گی کہ فقراء کے درجات میں تفاوت ہے' اور گویا فقیر حریص کا درجہ فقیر زاہد کے مقابلے میں ساڑھے بارہ درجے کم ہے' چالیس کو پانچ سو سے یہی نسبت ہے' یہاں یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ آپ نے مقدار کی تحدید فرمائی ہے' یہ تحدید ایسی نہیں ہے کہ اتفاقاً زبان سے نکل گئی ہو اور حقیقت میں اس کا کوئی وجود نہ ہو' بلکہ آپ تو ہر بات میں حق کا اظہار فرماتے تھے' اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى۔ (پ ۲۷ ر ۵ آیت ۴)

اور نہ آپ اپنی خواہش نفسانی سے باتیں بناتے ہیں' ان کا ارشاد صرف وحی ہے۔

درجات فقر کے اختلاف میں اس یقین و تقدیر کی مثال ایسی ہے جیسی رویاء صالحہ کے باب میں ہے آپ نے ارشاد فرمایا:۔

اَلرُّؤْيَا الصَّالِحَةُ جُزْءٌ مِّنْ سِتَّةٍ وَّاَرْبَعِيْنَ جُزْءًا مِّنَ النُّبُوَّةِ (بخاری۔ ابو سعید)

سچا خواب نبوت کا چھیالیسواں حصہ ہے۔

یہ ایک صحیح اور واقعی تقدیر ہے' لیکن سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کسی اور شخص کے لئے اتنی گنجائش نہیں ہے کہ وہ اس نسبت کی علت جان لے' محض اندازے سے کچھ کہہ سکتا ہے' جس کا صحیح ہونا ضروری نہیں ہے' نبوت اس امر کا نام ہے جو صرف نبی کے ساتھ مخصوص ہے' اور اسی اختصاص کی بنا پر نبی اپنے علاوہ دوسرے لوگوں سے مختلف اور ممتاز ہے۔ نبی کو بہت سی خصوصیات حاصل ہوتی ہیں' جن میں سے ایک یہ ہے کہ وہ ان امور کے حقائق سے واقف ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات'

ملائکہ' اور آخرت سے متعلق ہیں' یہ واقفیت ایسی نہیں ہوتی جیسی دوسروں کی ہوتی ہے' بلکہ معلومات کی کثرت' تحقیق' یقین اور کشف کی زیادتی کے اعتبار سے نبی کی معرفت عام لوگوں کی معرفت سے مختلف ہوتی ہے' نبی کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اسکے نفس میں ایک صفت ہوتی ہے جس سے خارق عادات اعمال ظہور پذیر ہوتے ہیں جیسے ہمارے لئے ایک صفت ہے جس سے وہ حرکات سرزد ہوتی ہیں جو ہمارے ارادے اور اختیار سے جسے قدرت بھی کہہ سکتے ہیں متعلق ہیں' اگرچہ قدرت اور مقدور دونوں کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہے' تیسری خصوصیت یہ ہے کہ نبی کو ایک ایسی صفت حاصل ہے جس کے ذریعے وہ مَلاَئِکَہ کو دیکھتا ہے اور ان کا مشاہدہ کرتا ہے' جیسے بینائی رکھنے والے شخص میں ایک ایسی صفت ہے جو نابینا میں نہیں ہے اور وہ یہ ہے کہ بینا آدمی محسوسات کو دیکھ لیتا ہے' اور نبی کی چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ اسے ایک صفت حاصل ہے جس کے ذریعے وہ غیب کے واقعات کا مشاہدہ کرلیتا ہے خواہ بیداری کے عالم میں' یا نیند کے دوران' اس صفت کے ذریعے وہ لوح محفوظ کا مشاہدہ کرتا ہے' اور غیب کی جو باتیں اس میں درج ہیں انہیں پڑھ لیتا ہے۔ یہ وہ صفات اور کمالات ہیں جن کا انبیاء کے لئے ثابت ہونا ظاہر ہے' اور یہ بھی واضح ہے کہ ان میں سے ہر صفت کی متعدد قسمیں ہو سکتی ہیں' بلکہ یہ ممکن ہے کہ ہم ان تمام خصوصیات کو چالیس' پچاس' یا ساٹھ قسموں میں تقسیم کردیں' بلکہ تکلف سے کام لیں تو یہ قسمیں چھیالیس بھی ہو سکتی ہیں' اور اس صورت میں یہ ثابت کیا جاسکتا ہے کہ رویائے صالحہ نبوت کا چھیالیسواں حصہ ہیں' لیکن کیوں کہ یہ تقسیم صرف ظن اور تخمین سے ہو سکتی ہے' اس لئے یقین کے ساتھ یہ بات نہیں کہی جاسکتی کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی رویائے صالحہ کو نبوّت کا چھیالیسواں حصہ اسی تقسیم کی رو سے قرار دیا ہے' البتہ ہم ان صفات کلّیہ سے واقف ہیں جن سے نبوت مکمل ہوتی ہے' اور اس تقسیم کی اصل سے بھی واقف ہیں' لیکن اس سے یہ معلوم نہیں ہو سکتا کہ مخصوص مقدار مقرر کرنے کی وجہ کیا ہے۔ اسی طرح ہم یہ بات جانتے ہیں کہ فقراء کے بہت سے درجے ہیں' لیکن یہ بات نہیں جانتے کہ فقیر زاہد فقیر حریص کے مقابلے میں چالیس برس پہلے اور فقیر غنی کے مقابلے میں پانچ سو برس پہلے جنت میں جائے گا' اس کی علت کیا ہے؟ اس کا صحیح جواب صرف انبیاء علیہم الصلاۃ والسلام ہی دے سکتے ہیں' انبیاء کے علاوہ اگر کوئی شخص کچھ کہے گا تو وہ محض اندازے سے کہے گا جس پر پورے طور پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔

یہ جملۂ معترضہ ہم نے اس لئے بیان کیا ہے کہ ان تقدیرات کو بعض ضعیف الاعتقاد لوگ یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے محض اتفاقاً یہ بات کہہ دی ہے' حالانکہ محض اتفاقی طور پر کوئی بات کہہ دینا منصب نبوت کے شایان شان نہیں ہے' اب پھر ہم روایات نقل کرتے ہیں' سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :۔

خَیْرُ هٰذِہِ الْاُمَّةِ فُقَرَاءُهَا وَاَسْرَعُهَا تَضَجُّعًا فِي الْجَنَّةِ ضُعَفَاءُهَا۔

اس امت کے بہترین لوگ اس کے فقراء ہیں اور جنت میں جلد تر لوٹ لگانے والے اس امت کے کمزور لوگ ہیں۔

ایک جگہ ارشاد فرمایا :۔

اِنَّ لِیْ حِرْفَتَیْنِ اِثْنَتَیْنِ فَمَنْ اَحَبَّهُمَا فَقَدْ اَحَبَّنِیْ وَمَنْ اَبْغَضَهُمَا فَقَدْ اَبْغَضَنِیْ اَلْفَقْرُ وَالْجِهَادُ۔

میرے دو پیشے ہیں جس نے انہیں پسند کیا اس نے مجھے پسند کیا اور جس نے انہیں ناپسند کیا اس نے مجھے ناپسند کیا فقر اور جہاد۔

ایک روایت میں ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ کو اللہ تعالیٰ کا یہ پیغام پہنچایا کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ آپ کو سلام کہتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ میں پہاڑوں کو سونے کا بنادوں' جہاں تم رہو یہ پہاڑ وہاں رہا کریں' سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے سر جھکالیا' اسکے بعد فرمایا :۔

یَا جِبْرَئِیْلُ اِنَّ الدُّنْیَا دَارُ مَنْ لَا دَارَ لَهُ وَمَالُ مَنْ لَا مَالَ لَهُ وَلَهَا یَجْمَعُ مَنْ لَا عَقْلَ لَهُ

فَقَالَ یَامُحَمَّدُ ثَبَّتَکَ اللّٰہُ بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ (۱)

اے جبرئیل! دنیا اس شخص کا گھر ہے جس کا کوئی گھر نہ ہو' اور اس کا مال ہے جس کا کوئی مال نہ ہو' اور اس کو وہ جمع کرتا ہے جس کے پاس عقل نہ ہو' حضرت جبرئیلؑ نے فرمایا اے محمد! اللہ تعالیٰ نے آپ کو قول محکم پر ثابت قدم کردیا۔

ایک روایت میں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے سفر کے دوران ایک ایسے شخص کے قریب سے گذرے جو اپنی عباء میں لپٹا ہوا سو رہا تھا' آپ نے اسے جگا دیا اور فرمایا اے سونے والے اٹھ اور اللہ تعالیٰ کا ذکر کر' اس نے عرض کیا آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں میں نے دنیا دنیا والوں کے لئے چھوڑ دی ہے' آپ نے فرمایا تب اے دوست تم سوتے رہو۔ اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کا گذر ایک ایسے شخص کے پاس سے ہوا جو زمین پر سو رہا تھا اور اس کے سر کے نیچے اینٹ رکھی ہوئی تھی' اس کا چہرہ اور داڑھی کے بال گرد میں اٹے ہوئے تھے' اور وہ ایک چادر باندھے ہوئے تھا آپ نے اللہ تعالیٰ کی جناب میں عرض کیا : الہا تیرا یہ بندہ دنیا میں ضائع ہوگیا' وحی آئی کہ اے موسیٰ کیا آپ کو یہ بات معلوم نہیں کہ جب میں کسی بندے کی طرف پوری طرح متوجہ ہوتا ہوں تو اس سے تمام دنیا کو علیحدہ کردیتا ہوں۔ حضرت ابو رافعؓ روایت کرتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں ایک مہمان وارد ہوا' اس وقت آپ کے گھر میں کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس سے آپ اس کی تواضع فرماتے' آپ نے مجھے خیبر کے یہودیوں میں سے ایک شخص کے پاس بھیجا' اور فرمایا کہ اس سے کہنا کہ محمد یہ کہتے ہیں کہ رجب کے مہینے تک یا تو آٹا ہمیں ادھار دیدے یا فروخت کردے اور مقررہ وقت پر اس کی قیمت وصول کرلے' میں نے اس یہودی تک سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ سلم کا پیغام پہنچایا' یہودی نے جواب دیا واللہ میں صرف رہن رکھ کر ہی آٹا دے سکتا ہوں' میں نے اس کی اطلاع آپ کو دی ہے' آپ نے فرمایا گواہ رہنا میں آسمان والوں میں بھی امین ہوں اور زمین والوں میں بھی امین ہوں' اگر وہ شخص میرے ہاتھ فروخت کرتا یا ادھار دیتا تو میں اسے ضرور ادا کرتا' جا میری یہ زرہ لے جا اور اسے رہن رکھ دے' جب میں باہر نکلا تو یہ آیت نازل ہوئی (طبرانی) :-

وَلَا تَمُدَّنَّ عَیْنَیْکَ اِلٰی مَا مَتَّعْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا لِنَفْتِنَهُمْ فِیْهِ وَرِزْقُ رَبِّکَ خَیْرٌ وَّاَبْقٰی (پ ۱۶ ر ۱۷ آیت ۱۳۱)

اور ہرگز ان چیزوں کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھئے جن سے ہم نے ان (کفار) کے مختلف گروہوں کو ان کی آزمائش کے لئے متمتع کر رکھا ہے کہ وہ (محض) دنیوی زندگی کی رونق ہے' اور آپ کے رب کا رزق بدرجہا بہتر ہے اور دیرپا ہے۔

یہ آیت سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی دل جوئی اور تسلی کے لئے نازل ہوئی۔ ایک حدیث میں ہے آپ نے فرمایا :-

اَلْفَقْرُ اَزْیَنُ بِالْمُؤْمِنِ مِنَ الْعِذَارِ الْحَسَنِ عَلٰی خَدِّ الْفَرَسِ۔ (طبرانی۔ شداد ابن اوسؓ)

فقر مومن کے لئے گھوڑے کے رخسار پر واقع خوبصورت پوزی کے مقابلے میں زیادہ اچھا ہے۔

ایک حدیث میں ہے :-

مَنْ اَصْبَحَ مِنْکُمْ مُعَافًی فِیْ جِسْمِهٖ اٰمِنًا فِیْ سِرْبِهٖ عِنْدَهٗ قُوْتُ یَوْمِهٖ فَکَاَنَّمَا حِیْزَتْ لَهُ الدُّنْیَا بِحَذَافِیْرِهَا۔ (*)

جو شخص بدن کی سلامتی کے ساتھ صبح کرے اپنے نفس میں مامون ہو' اور اس کے پاس اس روز کی غذا ہو تو گویا اسے تمام دنیا حاصل ہے۔

حضرت کعب الاحبار فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا اے موسیٰ! جب تم فقر کو آتا ہوا دیکھو تو یہ کہو کہ صلحاء کے شعار کی آمد خوب ہے۔ عطاء خراسانی بیان کرتے ہیں کہ ایک پیغمبر کسی دریا کے کنارے تشریف فرماتھے کہ ایک شخص

---

(۱) یہ عبارت دو حدیثوں سے مرکب ہے۔ پہلی حدیث ترمذی نے ابو امامہؓ سے نقل کی ہے' اور دوسری حدیث الدنیا دار من لا دار لہ سے آخر تک احمد نے نقل کیا ہے۔ (*) یہ روایت پہلے بھی گذری ہے۔

آیا اور بسم اللہ کہہ کر دریا میں جال پھینکا مگر کچھ ہاتھ نہ آیا' اتنے میں دوسرا شخص آیا اور اس نے بھی بسم اللہ کہہ کر جال ڈالا۔ اس جال میں اس قدر مچھلیاں آئیں کہ جال نکالنا مشکل ہو گیا' پیغمبر نے باری تعالیٰ کی جناب میں عرض کیا : الہا! یہ فرق کیوں ہے' میں جانتا ہوں کہ یہ سب کچھ تیرے قبضۂ قدرت میں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ملائکہ سے فرمایا میرے بندے پر ان دونوں کے احوال منکشف کرو' جب انہوں نے دیکھا کہ جس شخص کا جال خالی تھا اس کے لئے کس قدر کرامتیں اور عظمتیں ہیں اور جس کا جال مچھلیوں سے لبریز تھا اس کے لئے کس قدر ذلتیں اور رسوائیاں ہیں تو فرمایا اب میں مطمئن ہوں۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ میں نے جنت میں جھانکا تو یہ دیکھا کہ اس کے اکثر رہنے والے مالدار اور عورتیں ہیں (احمد۔ عبداللہ ابن عمرؓ) ایک روایت میں ہے کہ میں نے پوچھا کہ مالدار کہاں ہیں' ارشاد ہوا کہ مالداری نے انہیں (جنت سے) روک دیا ہے' ایک حدیث میں ہے کہ دوزخ میں اکثر عورتیں ہوں گی (راوی کہتے ہیں) میں نے عرض کیا یارسول اللہ! ان کا کیا قصور ہے' فرمایا : ان کے دو سرخ چیزوں یعنی سونے اور زعفران میں لگے رہنے کی وجہ سے (۲) ایک حدیث میں ہے :۔

تُحْفَةُ الْمُؤْمِنِ فِي الدُّنْيَا الْفَقْرُ۔ (ابو منصور دیلمی۔ معاذ ابن جبلؓ) دنیا میں مومن کا تحفہ فقر ہے

ایک روایت میں ہے کہ انبیائے کرام علیہم السلام میں حضرت سلیمان علیہ السلام اپنی سلطنت کی بناء پر سب کے بعد جنت میں جائیں گے' اور صحابہ کرام میں حضرت عبدالرحمٰن ابن عوف اپنی مالداری کی وجہ سے سب کے بعد جنت میں داخل ہوں گے۔ (۳) (۳) ایک حدیث میں ہے آپ نے ارشاد فرمایا کہ میں نے دیکھا کہ عبدالرحمٰن ابن عوف گھسٹ گھسٹ کر جنت میں داخل ہو رہے ہیں۔ (۴) حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے مروی ہے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :۔

إِذَا أَحَبَّ اللّٰهُ عَبْدًا ابْتَلَاهُ فَإِذَا أَحَبَّهُ الْحُبَّ الْبَالِغَ اقْتَنَاهُ قِيلَ وَمَا اقْتَنَاهُ قَالَ لَمْ يَتْرُكْ لَهُ أَهْلًا وَلَا مَالًا (طبرانی۔ ابن عتبہ الخولانیؓ)

جب اللہ تعالیٰ کسی بندہ سے محبت کرتا ہے تو اسے مصیبت میں مبتلا کر دیتا ہے' اور جب بہت زیادہ محبت کرتا ہے تو اسے منتخب کر لیتا ہے' لوگوں نے عرض کیا انتخاب کا کیا مطلب ہے' فرمایا اس کے لئے نہ اہل چھوڑتا ہے اور نہ مال چھوڑتا ہے۔

ایک مرتبہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب تو فقر کو آتا ہوا دیکھے تو اس وقت یہ کہہ کہ صالحین کے شعار کی آمد خوب ہے اور جب تو گری کو دیکھے تو یہ کہہ کہ کسی گناہ کا عذاب جلد آگیا ہے (ابو منصور دیلمی۔ مکحول عن الدرداءؓ)۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کیا : یا اللہ! مخلوق میں کون لوگ تیرے دوست ہیں' اگر مجھے ان کا علم ہو جائے تو تیری رضا کی خاطر میں بھی انہیں دوست رکھوں' جواب ملا اے موسیٰ ہر محتاج فقیر میرا دوست ہے۔ جواب میں کل فقیر فقیر فرمایا گیا۔ یعنی لفظ فقیر دوبار لایا گیا' یا تو اس کے لئے اعادے سے تاکید ہوتی ہے' یا دوسرے لفظ سے مراد سخت مصیبت والا ہے' حضرت عیسیٰ علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں کہ میں مسکنت پسند کرتا ہوں' اور دولت کو برا جانتا ہوں' ان کے نزدیک بہترین بات یہ تھی کہ کوئی انہیں یا مسکین کہہ کر آواز دے۔ ایک مرتبہ عرب کے سرداروں اور دولتمندوں نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ آپ ایک دن ہمارے لئے متعین فرمائیں' اور ایک دن دوسروں کے لئے' اس دن وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوں گے ہم نہیں آئیں گے' اور دوسرے دن ہم حاضر ہوں گے وہ لوگ نہیں آئیں گے' دوسرے لوگوں سے ان کی مراد حضرت بلال' سلیمان' صہیب' ابوذر' خباب ابن الارث' عمار ابن یاسر' ابوہریرہ اور دوسرے تنگدست اصحاب صفہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے تھی' اور جن لوگوں نے یہ درخواست کی تھی ان میں اقرع ابن حابس تمیمی' عینیہ ابن حصن الفزاری' عباس ابن مرداس سلمی وغیرہ تھے' ان لوگوں نے الگ الگ دنوں کی تعیین اس لئے کرانی چاہی تھی کہ یہ غریب اور مفلس صحابہ اون کا لباس پہنا کرتے تھے' اور گرمی کی شدت کی وجہ سے جو پسینہ ان کے جسموں سے بہا کرتا تھا وہ اونی کپڑوں میں جذب ہو جایا کرتا تھا

---

(۲) یہ روایت کتاب النکاح میں گزری ہے۔ (۳) (۴) یہ دونوں روایتیں بھی گزر چکی ہیں۔

اور اس سے جسم میں بدبو ہو جاتی تھی' اور یہ بات ان مالدار لوگوں کے لئے تکلیف دہ تھی' سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی درخواست قبول فرمائی اور وعدہ کیا کہ وہ دونوں طبقوں کا اجتماع ایک دن نہیں کریں گے اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی :۔

وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُم بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهَهُ وَلَا تَعْدُ عَيْنَاكَ عَنْهُمْ تُرِيدُ زِينَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَلَا تُطِعْ مَنْ أَغْفَلْنَا قَلْبَهُ عَن ذِكْرِنَا۔
(پ ۱۵ ر ۱۶ آیت ۲۸)

اور آپ اپنے کو ان لوگوں کے ساتھ مقید رکھا کیجئے جو صبح و شام اپنے رب کی عبادت محض اس کی رضا جوئی کے لئے کرتے ہیں اور دنیوی زندگی کی رونق کے خیال سے آپ کی آنکھیں ان سے ہٹنے نہ پائیں' اور ایسے شخص کا کہنا نہ مانئے جس کے قلب کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر رکھا ہے۔

"الحیاۃ الدنیا" سے مالداری مراد ہے' اور جن لوگوں کے دلوں پر غفلت کا پردہ ڈالا گیا ہے وہ مالدار ہیں' ایک جگہ ارشاد فرمایا :

وَقُلِ الْحَقُّ مِن رَّبِّكُمْ فَمَن شَاءَ فَلْيُؤْمِن وَمَن شَاءَ فَلْيَكْفُرْ۔ (پ ۱۵ ر ۱۶ آیت ۲۹)

اور آپ کہہ دیجئے کہ (یہ دین) حق تمہارے رب کی طرف سے (آیا) ہے سو جس کا جی چاہے ایمان لائے اور جسکا جی چاہے کافر رہے۔

ایک مرتبہ عبداللہ ابن ام مکتومؓ نے آپ کی خدمت میں باریابی کی اجازت چاہی' اس وقت آپ کے پاس اشراف قریش میں سے ایک شخص بیٹھا ہوا تھا' آپ کو اس موقع پر ابن مکتوم کی آمد گراں گذری اس وقت یہ آیات نازل ہوئیں :۔

عَبَسَ وَتَوَلَّىٰ أَن جَاءَهُ الْأَعْمَىٰ وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّهُ يَزَّكَّىٰ أَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنفَعَهُ الذِّكْرَىٰ أَمَّا مَنِ اسْتَغْنَىٰ فَأَنتَ لَهُ تَصَدَّىٰ۔ (پ ۳۰ ر ۵ آیت ۱-۶)

پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) چیں بجبیں ہو گئے' اور متوجہ نہ ہوئے اس بات سے کہ ان کے پاس اندھا آیا' اور آپ کو کیا خبر شاید نابینا (آپ کی تعلیم سے پوری طرح) سنور جاتا' یا (کسی خاص دین) نصیحت قبول کرتا' سو اس کو نصیحت کرنا فائدہ پہنچاتا' جو شخص دین سے بے پروائی کرتا ہے آپ اس کی فکر میں پڑتے ہیں۔

اس آیت کریمہ میں اس شخص سے مراد جسے وعظ و تذکیر سود مند ہو گی ابن اُم مکتوم ہیں' اور جو استغناء برتتا ہے اس سے قریش کا وہ سردار مراد ہے جو اس وقت آپ کی خدمت میں موجود تھا۔ ایک روایت میں ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا قیامت کے روز بندے کو بلایا جائے گا اور اس سے اللہ تعالیٰ اس طرح معذرت کرے گا جس طرح دنیا میں ایک آدمی دوسرے آدمی سے معذرت کرتا ہے' اللہ تعالیٰ فرمائے گا میری عزت و جلال کی قسم! میں نے تجھ سے دین کو اس لئے دور نہیں کیا کہ تو میرے نزدیک ذلیل ہے' بلکہ میں نے تیرے لئے جو عظمت اور فضیلت رکھی ہے' اس کی بناء پر میں نے تجھے دین سے دور رکھا' اے بندے! اب تو ان صفوں میں جا اور اس شخص کو پہچان جس نے تجھے محض میری رضا کی خاطر کھلایا یا پلایا ہو یا کپڑے پہنائے ہوں اور اس کا ہاتھ پکڑلے میں نے تجھے اس کا اختیار دیا۔ اس دن لوگوں کا یہ عالم ہو گا کہ پسینہ ان کے چہروں تک آیا ہوا ہو گا' وہ شخص ان صفوں کے درمیان جائے گا اور اس شخص کو تلاش کرے گا جس نے اس کے ساتھ یہ سلوک کیا ہو گا اور اسے جنت میں لے جائے گا (ابوالشیخ۔ ابن انسؓ) سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا : فقیروں کو اچھی طرح پہچان لو۔ اور ان سے زیادہ سے زیادہ نعمتیں حاصل کرو اس لئے کہ ان کے پاس بڑی دولت ہے لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! ان کے پاس کون سی دولت ہے؟ فرمایا : قیامت کے دن ان سے کہا جائے گا کہ ان لوگوں کو تلاش کرلیں جنھوں نے تمہیں روٹی کا ایک ٹکڑا کھلایا ہو' یا پانی کا ایک گھونٹ پلایا ہو یا لباس پہنایا ہو' اور ان کا ہاتھ پکڑ کر جنت میں لے جاؤ (ابو نعیم فی الحلیہ۔ حسین ابن علیؓ)

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ میں جنت میں داخل ہوا تو میں نے اپنے سامنے پاؤں کی آہٹ محسوس کی'

میں نے دیکھا کہ بلال چلے جاتے ہیں، پھر میں نے جنت کے اعلا حصے پر نظر ڈالی تو وہاں میری امت کے فقراء اور بچے نظر آئے اور نیچے دیکھا تو مالدار عورتیں نظر آئیں، جن کی تعداد کم تھی، میں نے عرض کیا یا اللہ! ان کی تعداد کیوں کم ہے؟ فرمایا کہ عورتوں کو دو سرخ چیزوں سونے اور ریشم نے جنت سے روک دیا ہے، اور مالداروں کو حساب کتاب کی طوالت نے نہیں آنے دیا ہے، میں نے اپنے اصحاب پر نظر ڈالی تو عبدالرحمن ابن عوف نہیں ملے، پھر وہ میرے پاس روتے ہوئے آئے میں نے ان سے پوچھا کہ تم مجھ سے پیچھے کیوں رہ گئے تھے، انہوں نے کہا یا رسول اللہ! میں آپ کے پاس اس وقت تک نہیں پہنچا جب تک میں نے تمام مشیبات طے نہ کرلیں، میں یہ سمجھ رہا تھا کہ شاید آپ کی زیارت نہیں کرپاؤں گا، میں نے پوچھا ایسا کیوں؟ انہوں نے کہا کہ میرے مال کا حساب لیا جارہا تھا (طبرانی۔ ابو امامہؓ) غور کیجئے حضرت عبدالرحمٰن ابن عوف اَلسَّابِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ میں سے ہیں اور ان دس صحابہ کرام میں شامل ہیں جن کے بارے میں یہ بشارت دنیا ہی میں سنا دی گئی کہ یہ حضرات یقینی طور پر جنتی ہیں (ابو داؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ۔ سعید ابن زید) اور ان کا شمار مالداروں کے اس گروہ میں ہوتا ہے، جس کے متعلق سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی منقول ہے۔ اِلَّا مَنْ قَالَ بِالْمَالِ هٰكَذَا وَهٰكَذَا یعنی جو اللہ کی راہ میں زیادہ سے زیادہ مال دیا کرتے تھے (بخاری و مسلم۔ ابو ذرؓ) اس کے باوجود انہوں نے مالداری کی بنا پر یہ نقصان اٹھایا کہ تمام صحابہ کرام کے بعد حساب کے مراحل سے گزر کر جنت میں داخل ہوئے۔ ایک مرتبہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ایک فقیر کے پاس تشریف لے گئے، اس کے پاس کچھ نہ تھا، آپ نے فرمایا: اگر اس کا نور تمام زمین والوں کو تقسیم کردیا جائے تو سب منور ہوجائیں (۱) ایک حدیث میں ہے، سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام سے فرمایا کیا میں تمہیں جنت کے بادشاہوں کی خبر نہ دوں؟ صحابہ نے عرض کیا کیوں نہیں یا رسول اللہ! ضرور بتلائیں، فرمایا ہر وہ ضعیف شخص جسے لوگ بھی ضعیف سمجھیں غبار آلود، پریشان حال، دو چادریں رکھنے والا جس کی لوگوں کے نزدیک کوئی قیمت نہ ہو، اگر وہ اللہ کی قسم کھالے تو اللہ تعالیٰ اس کی قسم ضرور پوری کرے (بخاری و مسلم۔ جاریہ ابن وہبؓ)

حضرت عمران ابن حصین فرماتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں میری بڑی قدر و منزلت تھی، ایک مرتبہ آپ نے مجھ سے فرمایا کہ اے عمران! ہم تیری عزت کرتے ہیں، اور قدر کرتے ہیں کیا تو فاطمہ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عیادت کے لئے چل سکتا ہے؟ میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں میں ضرور چلوں گا، چنانچہ آپ کھڑے ہوئے، میں بھی آپ کے ہمراہ چلا، یہاں تک کہ آپ نے حضرت فاطمہ کے دروازے پر پہنچ کر دستک دی اور سلام کیا، اور اندر آنے کی اجازت چاہی، حضرت فاطمہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ! تشریف لائیں، آپ نے دریافت کیا، میں اور جو شخص میرے ساتھ آیا ہے دونوں آئیں؟

حضرت فاطمہ نے پوچھا یا رسول اللہ! آپ کے ساتھ کون ہے؟ آپ نے جواب دیا: عمران! حضرت فاطمہؓ نے عرض کیا: اس ذات کی قسم! جس نے آپ کو حق کے ساتھ نبی بنا کر مبعوث کیا میرے بدن پر صرف ایک عباء ہے، آپ نے ہاتھ سے اشارہ کر کے فرمایا کہ اس کو اس طرح بدن پر لپیٹ لو، حضرت فاطمہؓ نے عرض کیا: میں نے اپنا جسم ڈھانپ لیا ہے، لیکن اپنا سر کیسے چھپاؤں، آپ کے پاس ایک پرانی چادر تھی، آپ نے وہ چادر ان کی طرف پھینکی اور فرمایا اسے اپنے سر پر لپیٹ لو، اس کے بعد حضرت فاطمہؓ نے اندر آنے کی اجازت دی، آپ اندر تشریف لے گئے، سلام کیا اور ان کی مزاج پرسی کی، حضرت فاطمہؓ نے عرض کیا بخدا میں بھوکی ہوں، اور اس پر مستزاد یہ حالت ہے، میرے پاس کھانے کے لئے کچھ نہیں ہے، بھوک نے مجھے پریشان کر رکھا ہے، یہ سن کر سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم رونے لگے، اور فرمایا: اے بیٹی! گھبرا مت، خدا کی قسم میں نے تین دن سے کھانا نہیں چکھا، حالانکہ میں اللہ کے نزدیک تجھ سے زیادہ مکرم ہوں، اگر میں اپنے رب سے سوال کرتا تو وہ مجھے ضرور کھانا کھلاتا مگر میں نے آخرت کو ترجیح دی ہے، پھر آپ نے اپنا دست مبارک حضرت فاطمہؓ کے شانے پر مارا اور فرمایا تجھے خوشخبری ہو کہ تو جنت کی عورتوں کی سردار ہے، انہوں نے عرض کیا فرعون کی بیوی آسیہ اور عمران کی بیٹی مریم کا درجہ کہاں ہے، آپ نے فرمایا آسیہ اپنے

(۱) مجھے یہ روایت نہیں ملی۔

زمانے کی عورتوں کی سردار ہوں گی' مریم اپنے زمانے کی عورتوں کی سردار ہوں گی' اور تو اپنے زمانے کی عورتوں کی سردار ہو گی' تم جنت کے ایسے مکانوں میں رہو گی جو زبرجد اور یاقوت سے بنے ہوئے ہوں گے' نہ ان میں کسی طرح کی تکلیف ہو گی' نہ شور ہو گا' پھر فرمایا: اپنے چچا کے بیٹے پر قانع رہ بخدا میں نے تیرا نکاح ایسے شخص سے کیا ہے جو دنیا میں بھی سردار ہے اور آخرت میں بھی سردار ہے (۱) حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ جب لوگ اپنے فقیروں کو برا جاننے لگیں گے' دنیا کی امارت ظاہر کرنے لگیں گے اور درہم جمع کرنے میں منہمک ہو جائیں گے تو اللہ تعالیٰ انہیں چار خصلتوں کا نشانہ بنا دے گا' قحط' بادشاہ کی طرف سے ظلم' حکام کی طرف سے خیانت' اور دشمنوں کا زور۔ (ابو منصور' دیلمی)۔

حضرت ابوالدرداء فرماتے ہیں کہ دو درہم والا ایک درہم والے کی بہ نسبت سخت روکا جائے گا یا اس سے سختی کے ساتھ حساب لیا جائے گا' حضرت عمرؓ نے سعید ابن عامر کے پاس ایک ہزار دینار بھیجے' وہ کبیدہ خاطر' اور غمگین گھر میں داخل ہوئے ان کی اہلیہ نے دریافت کیا کہ کیا کوئی نئی بات پیش آئی ہے' انہوں نے جواب دیا اس سے بھی بڑھ کر ایک واقعہ ہے' پھر آپ نے فرمایا ذرا اپنا پرانا دوپٹہ دینا (اہلیہ نے اپنا دوپٹہ دیدیا) آپ نے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کئے' ان کی تھیلیاں بنائیں' (اور ان تھیلیوں میں درہم بھر کر) تقسیم کر دیئے' پھر نماز کے لئے کھڑے ہو گئے' اور صبح تک روتے رہے اس کے بعد فرمایا کہ میں نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ میری امت کے فقراء مالداروں سے پانچ سو برس پہلے جنت میں جائیں گے' یہاں تک کہ اگر کوئی مالدار فقراء کی جماعت میں گھس جائے تو اس کا ہاتھ پکڑ کر نکال دیا جائے گا۔ حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ تین آدمی جنت میں بلاحساب داخل ہوں گے' ایک وہ شخص جو اپنے کپڑے دھونا چاہے تو اس کے پاس کوئی پرانا لباس نہ ہو جسے پہن کر کپڑے دھو سکے' دوسرا وہ شخص جو اپنے چولھے پر بیک وقت دو دو ہنڈیاں نہ چڑھائے' تیسرا وہ شخص جو پانی طلب کرے تو اس سے یہ نہ پوچھا جائے کہ وہ کس قسم کا پانی چاہتا ہے؟ (یعنی کھانے پینے کی اشیاء میں اس کے یہاں تنوع اور کثرت نہ ہو) روایت ہے کہ ایک شخص حضرت سفیان ثوری کی مجلس میں آیا' آپ نے اس سے فرمایا قریب آ' اگر تو مالدار ہوتا تو میں تجھے ہرگز اپنے قریب نہ بلاتا۔ ان کے رفقاء میں سے وہ حضرات جو صاحب ثروت تھے یہ تمنا کرتے تھے کہ کاش وہ غریب ہوتے' کیوں کہ آپ فقراء کو اپنے قریب بٹھایا کرتے تھے' اور امراء سے اعراض کرتے تھے' مومل کہتے ہیں کہ میں نے مالدار آدمی کو سفیان ثوری کی مجلس سے زیادہ ذلیل کہیں نہیں دیکھا' اور نہ کسی محتاج کو ان کی مجلس سے زیادہ کہیں باعزت پایا' ایک حکیم کہتے ہیں اگر یہ بیچارہ انسان دوزخ سے بھی اسی طرح ڈرتا جس طرح فقر سے ڈرتا ہے تو دونوں سے نجات پا لیتا' اور اگر جنت میں بھی اسی طرح راغب رہتا جس طرح تونگری کی طرف راغب رہتا ہے تو دونوں چیزیں حاصل کر لیتا' اور اگر باطن میں اللہ تعالیٰ سے اس طرح ڈرتا جس طرح ظاہر میں اس کی مخلوق سے ڈرتا ہے تو دونوں جہانوں کی سعادتیں سمیٹتا' حضرت عبداللہ ابن عباسؓ فرماتے ہیں وہ شخص ملعون ہے جو مالدار کا اکرام کرے' اور تنگدست کی اہانت کرے' حضرت لقمان علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو نصیحت فرمائی کہ کسی ایسے شخص کی جس کے کپڑے بوسیدہ ہوں تحقیر مت کرنا اس لئے کہ تمہارا اور اس کا رب ایک ہے۔ یحییٰ ابن معاذؓ فرماتے ہیں کہ فقراء سے محبت کرنا پیغمبروں کا اخلاق ہے' اور ان کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا صلحاء کا شعار ہے' اور ان کی ہم نشینی سے اجتناب کرنا منافقین کی علامت ہے' پچھلی آسمانی کتابوں سے نقل کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کسی پیغمبر پر وحی بھیجی کہ اس بات سے ڈر کہ میں تجھ سے ناراض ہوں' پھر تو میری نگاہ سے گر جائے اور میں تجھ پر دنیا انڈیل دوں۔ حضرت عائشہؓ ایک دن میں ہزار ہزار درہم خیرات کر دیتی تھیں' یہ درہم ان کی خدمت میں حضرت معاویہ اور ابو عامر وغیرہ بھیجا کرتے تھے' جب کہ آپ کا دوپٹہ پیوند زدہ رہا' اور آپ کی باندی یہ کہا کرتی کہ اگر آپ ایک درہم سے گوشت منگوا لیتیں تو اسی سے روزہ افطار کر لیا جاتا' خود آپ کا بھی روزہ ہوتا' لیکن اس کا خیال نہ آتا کہ اپنے لئے کچھ منگوا لیں' باندی کے توجہ دلانے پر ارشاد فرماتیں کہ اگر تو یاد دلا دیتی تو میں ایسا کر لیتی' سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو وصیت فرمائی تھی کہ اگر تو مجھ سے ملنا چاہتی ہے تو فقیرانہ زندگی بسر کرنا' مالداروں کی ہم نشینی سے اجتناب کرنا' اور اپنا دوپٹہ اس وقت تک مت اتارنا جب

---

(۱) یہ روایت پہلے گزر چکی ہے۔

تک تو اس میں پیوند نہ لگا لے (ترمذی)۔ ایک شخص دس ہزار درہم لے کر حضرت ابراہیم ابن ادہم کی خدمت میں حاضر ہوا' آپ نے یہ مال قبول کرنے سے انکار کردیا' اس شخص نے اصرار کیا' حضرت ابراہیم نے اس سے پوچھا کہ کیا تو میرا نام فقراء کی فہرست سے نکلوانا چاہتا ہے' میں ایسا ہرگز نہیں ہونے دوں گا۔

مخصوص فقراء یعنی راضین' قانعین اور صادقین کے فضائل

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں :۔

طُوْبٰی لِمَنْ هُدِیَ اِلَی الْاِسْلَامِ وَكَانَ عَیْشُهٗ كَفَافًا وَقَنَعَ بِهٖ (ترمذی۔ فضالہ ابن عبید)

اس شخص کے لئے خوشخبری ہو جسے اسلام کی ہدایت ہو اس کی معیشت بقدر ضرورت ہو' اور وہ اسی پر قانع ہو۔

ایک حدیث میں ہے' ارشاد فرمایا :۔

یَا مَعْشَرَ الْفُقَرَاءِ اَعْطُوا اللّٰهَ الرِّضٰی مِنْ قُلُوْبِكُمْ تَظْفَرُوْا بِثَوَابِ فَقْرِكُمْ وَاِلَّا فَلَا۔ (ابو منصور دیلمی۔ ابوہریرہؓ)

اے فقیروں کے گروہ! اللہ تعالیٰ سے اپنے دلوں میں راضی رہو کہ تمہیں تمہارے فقر کا ثواب ملے گا' ورنہ نہیں ملے گا۔

پہلی حدیث میں قانع کی فضیلت ہے' اور دوسری حدیث میں راضی کی' اس حدیث سے یہ بھی مفہوم ہوتا ہے کہ حریص کو اس کے فقر کا اجر نہیں ملے گا' لیکن فقر کی فضیلت میں جو روایات عام طور پر وارد ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ حریص کو بھی اجر ملے گا عنقریب اس کی تحقیق بیان کی جائے گی' غالباً یہاں عدم رضا سے مراد یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اس عمل کو پسند نہ کرے کہ اس سے دنیا کو محبوس کردیا گیا ہے' اس کراہت کی بناء پر یقیناً حریص فقر کے ثواب سے محروم رہے گا' البتہ بہت سے مال کے حریص ایسے ہیں جن کے دل میں اللہ تعالیٰ کے فعل پر انکار کا تصور بھی نہیں آتا' اور نہ وہ اسے برا سمجھتے ہیں' اگر کوئی شخص اس طرح کا حرص رکھتا ہے تو اس سے فقر کا اجر و ثواب ضائع نہیں ہوگا۔ حضرت عمر ابن الخطابؓ سے مروی ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :۔

اِنَّ لِكُلِّ شَیْءٍ مِفْتَاحًا وَمِفْتَاحُ الْجَنَّةِ حُبُّ الْمَسَاكِیْنِ وَالْفُقَرَاءُ لِصَبْرِهِمْ هُمْ جُلَسَاءُ اللّٰهِ تَعَالٰی یَوْمَ الْقِیَامَةِ (دار قطنی' ابن عدی' ابن حبان)

ہر چیز کی ایک کنجی ہوتی ہے جنت کی کنجی مساکین سے محبت ہے' اور فقراء اپنے صبر کی بناء پر قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کے ہم نشین ہوں گے۔

حضرت علیؓ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ روایت نقل فرماتے ہیں :۔

اَحَبُّ الْعِبَادِ اِلَی اللّٰهِ تَعَالٰی الْفَقِیْرُ الْقَانِعُ بِرِزْقِهِ الرَّاضِیْ عَنِ اللّٰهِ تَعَالٰی (۱)

اللہ تعالیٰ کے نزدیک بندوں میں محبوب تر وہ فقیر ہے جو اپنے رزق پر قانع ہو' اور اللہ تعالیٰ سے راضی ہو۔

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا فرمایا کرتے تھے :۔

اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ قُوْتَ اٰلِ مُحَمَّدٍ كَفَافًا (۲) اے اللہ! آل محمد کا رزق بقدر گذران کر۔

ایک حدیث میں ہے' ارشاد فرمایا :۔

مَا مِنْ اَحَدٍ غَنِیٍّ وَلَا فَقِیْرٍ اِلَّا وَدَّ یَوْمَ الْقِیَامَةِ اَنَّهٗ كَانَ اُوْتِیَ قُوْتًا فِی الدُّنْیَا۔ (ابن ماجہ۔ انسؓ)

---

(۱) یہ روایت ان الفاظ میں نہیں ملی' ابن ماجہ کی ایک حدیث اس مضمون کی ابھی گذری ہے۔ (۲) یہ روایت ابھی گذری ہے۔

کوئی مالدار یا تنگدست ایسا نہیں ہے جو قیامت کے دن یہ تمنا نہیں کرے گا کہ (کاش) اسے دنیا میں بقدر ضرورت رزق دیا جاتا۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت اسماعیل علیہ السلام پر وحی نازل فرمائی کہ مجھے ٹوٹے ہوئے دل والوں کے پاس تلاش کرنا' انہوں نے عرض کیا وہ کون ہیں؟ فرمایا وہ فقراء صادقین ہیں' ایک حدیث میں ہے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :۔

لَا اَحَدَ اَفْضَلَ مِنَ الْفَقِيْرِ اِذَا كَانَ رَاضِيًا (۱) فقیر اگر راضی ہو تو اس سے افضل کوئی نہیں ہے۔

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے روز فرمائے گا کہ میری مخلوق کے چیدہ چیدہ لوگ کہاں ہیں' فرشتے عرض کریں گے اے ہمارے پروردگار! وہ کون ہیں؟ فرمائے گا کہ مسلمانوں کے وہ فقراء جو میری عطا پر قانع ہوں' اور میری قضا پر راضی ہوں' انہیں جنت میں پہنچا دو' چنانچہ وہ لوگ جنت میں جا کر کھائیں گے' پئیں گے' اور لوگ حساب (کی الجھنوں) میں گرفتار ہو جائیں گے' یہ قانع اور راضی کے فضائل ہیں' زاہد کے فضائل اس کتاب کے دوسرے باب میں ذکر کئے جائیں گے۔ انشاء اللہ۔

رضا اور قناعت کے باب میں بے شمار آثار بھی وارد ہیں' یہ بات مخفی نہیں ہے کہ قناعت کی ضد طمع ہے' اور حضرت عمرؓ ارشاد فرماتے ہیں کہ طمع فقر ہے' اور لوگوں سے ناامید ہونا مالداری ہے' جو شخص لوگوں کے مال و دولت سے مایوس رہتا ہے اور قناعت اختیار کرتا ہے وہ ان سے مستغنی رہتا ہے حضرت ابو مسعودؓ فرماتے ہیں کہ ہر روز ایک فرشتہ عرش کے پیچھے سے یہ آواز لگاتا ہے اے ابن آدم! وہ تھوڑی چیز جو تجھے کفایت کر جائے اس زیادہ سے بہتر ہے جو تجھے سرکش بنا دے' حضرت ابو الدرداءؓ فرماتے ہیں کہ کوئی شخص ایسا نہیں ہے' جس کی عقل میں نقص نہ ہو' چنانچہ جب اس کی دنیا میں اضافہ ہوتا ہے تو وہ بے حد خوش ہوتا ہے' حالانکہ رات اور دن دونوں اس کی عمر کا محل گرانے میں مصروف ہیں اسے اسکا غم نہیں ہوتا۔ اس بدبخت کو معلوم نہیں کہ اگر عمر کم ہوتی رہے گی تو مال کی زیادتی سے کیا فائدہ ہو گا۔ کسی دانشور سے دریافت کیا گیا کہ تونگری کیا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ تیرا کم سے کم آرزو کرنا' اور بقدر کفایت پر قناعت کرنا۔ بیان کیا گیا ہے کہ ابراہیم ابن ادہم کا شمار خراسان کے دولتمندوں میں ہوا کرتا تھا' ایک مرتبہ وہ اپنے محل کے بالا خانے سے نیچے جھانک رہے تھے کہ ان کی نظر محل کے صحن میں موجود ایک شخص پر پڑی' اس کے ہاتھ میں روٹی تھی' روٹی کھا کر وہ شخص سو گیا' حضرت ابراہیم ابن ادہم نے اپنے خادم سے کہا کہ جب یہ شخص بیدار ہو جائے تو اسے میرے پاس لے کر آنا' چنانچہ جب وہ شخص نیند سے بیدار ہوا تو غلام اسے لے کر ابن ادہم کے پاس آیا' ابن ادہم نے اس سے دریافت کیا کہ تو نے روٹی کھائی تھی کیا تو بھوکا تھا؟ اس نے جواب دیا ہاں! پھر پوچھا کہ ایک روٹی کھا کر تیرا پیٹ بھر گیا' اس نے کہا بالکل' انہوں نے پوچھا کہ پھر تجھے نیند آگئی' اس نے کہا ہاں' سکون کی نیند سویا' حضرت ابراہیم ابن ادہم نے اپنے دل میں سوچا کہ میں دنیا لے کر کیا کروں گا' جب کہ نفس ایک روٹی پر قناعت کر سکتا ہے۔ ایک شخص عامر ابن عبد القیس کے پاس سے گذرا' اس وقت آپ نمک سے ساگ کھا رہے تھے' اس شخص نے حیرت سے دریافت کیا کہ آپ اس قدر دنیا پر راضی ہو گئے؟ عامر نے جواب دیا میں تمہیں ایسے شخص کے بارے میں نہ بتلاؤں جو اس سے بھی زیادہ بری چیز پر راضی ہوا؟ اس نے کہا ضرور بتلائیں! عامر نے کہا وہ شخص جو آخرت کے عوض دنیا پر راضی ہوا' محمد ابن الواسع کو بھوک لگتی تو روٹی نکالتے' اور پانی میں بھگو کر نمک سے کھا لیتے' اور فرماتے کہ جو شخص اس قدر دنیا پر راضی ہو وہ کسی کا محتاج نہیں ہو سکتا حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ ان لوگوں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو جن کے لئے اللہ تعالیٰ نے قسم کھائی مگر انہوں نے سچ نہ جانا' پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی :۔

وَفِي السَّمَاءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوعَدُونَ فَوَرَبِّ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ إِنَّهُ لَحَقٌّ۔ (پ ۲۶' ۱۸ آیت ۲۳)

اور تمہارا رزق اور جو تم سے وعدہ کیا جاتا ہے آسمان میں ہے تو قسم ہے آسمان اور زمین کے پروردگار کی کہ وہ برحق ہے۔

ایک دن حضرت ابو ذر کچھ لوگوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے کہ ان کی اہلیہ تشریف لائیں اور کہنے لگیں آپ یہاں بیٹھے ہیں' خدا کی

(۱) یہ روایت ان الفاظ میں نہیں ملی۔

قسم نہ گھر میں ایک چمچہ سالن ہے اور نہ ایک مٹھی ستو، حضرت ابوذرؓ نے فرمایا: بیگم! ہمارے سامنے ایک دشوار گذار گھاٹی ہے اسے وہی شخص عبور کرسکتا ہے جو ہلکا پھلکا ہو، یہ سن کر وہ خوشی خوشی واپس چلی گئیں۔ حضرت ذوالنون مصری فرماتے ہیں وہ شخص کفر سے قریب تر ہے جو فاقے سے ہو اور صبر کی قوت سے محروم ہو، ایک دانشور سے کسی شخص نے دریافت کیا کہ آپ کا مال کیا ہے۔ اس نے جواب دیا ظاہر کی زینت، باطن کا اعتدال، اور لوگوں کی دولت سے طمع کا انقطاع۔ روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کسی آسمانی کتاب میں ابن آدم کو اس طرح خطاب فرمایا ہے: اے انسان! اگر پوری دنیا تیرے لئے ہوتی تب بھی تجھے اتنا ہی ملتا جتنی تیری غذا ہے، اگر میں تجھے تیری غذا کے بقدر دیتا رہوں اور اس کا حساب تجھ پر نہ رکھوں تو یہ میرا احسان ہوگا۔ قناعت کے باب میں یہ اشعار کہے گئے ہیں:۔

اِجْزَعْ اِلَی اللّٰهِ لَا تَضْرَعْ اِلَی النَّاسِ وَاقْنَعْ بِیَأْسٍ فَاِنَّ الْعِزَّ فِی الْیَأْسِ
وَاسْتَغْنِ عَنْ کُلِّ ذِیْ قُرْبٰی وَذِیْ رَحِمٍ اِنَّ الْغَنِیَّ مَنِ اسْتَغْنٰی عَنِ النَّاسِ

(اللہ کے حضور گڑگڑاؤ، لوگوں کے سامنے آہ و زاری مت کرو، محرومی پر قانع رہو، اس لئے کہ عزت اسی میں ہے، ہر عزیز رشتے دار سے بے نیاز رہو، اس لئے کہ غنی حقیقت میں وہی شخص ہے جو لوگوں سے مستغنی ہو)۔

اس عنوان پر یہ اشعار بھی بہت عمدہ اور سبق آموز ہیں۔

یَا جَامِعًا مَانِعًا وَالدَّهْرُ یَرْمُقُهٗ۔ مُقَدِّرًا اَیَّ بَابٍ مِنْهُ یُغْلِقُهٗ
مُفَکِّرًا کَیْفَ تَاْتِیْهِ مَنِیَّتُهٗ۔ غَادِیًا اَمْ بِهَا یَسْرِیْ فَتَطْرُقُهٗ
جَمَعْتَ مَالًا فَقُلْ لِیْ هَلْ جَمَعْتَ لَهٗ۔ یَا جَامِعَ الْمَالِ اَیَّامًا تُفَرِّقُهٗ
اَلْمَالُ عِنْدَکَ مَخْزُوْنٌ لِوَارِثِهٖ۔ مَا الْمَالُ مَالُکَ اِلَّا یَوْمَ تُنْفِقُهٗ
اُرْفُهْ بِبَالِ فَتًی یَغْدُوْ عَلٰی ثِقَةٍ۔ اِنَّ الَّذِیْ قَسَمَ الْاَرْزَاقَ یَرْزُقُهٗ
فَالْعِرْضُ مِنْهُ مَصُوْنٌ مَا یُدَنِّسُهٗ۔ وَالْوَجْهُ مِنْهُ جَدِیْدٌ لَیْسَ یُخْلِقُهٗ
اِنَّ الْقَنَاعَةَ مَنْ یَحْلُلْ بِسَاحَتِهَا۔ لَمْ یَبْقَ فِیْ ظِلِّهَا هَمٌّ یُؤَرِّقُهٗ

(اے دولت کو جمع کرنے والے اور روکنے والے زمانہ تاک لگائے بیٹھا ہے، اور اس خیال میں ہے کہ کونسا دروازہ بند کرے اور یہ سوچ رہا ہے کہ وہ کون سی صبح یا شام ہوگی جب موت اس کے دروازے پر دستک دے گی۔ تو نے مال جمع کیا ہے، مجھے بتلا کیا تو نے زمانے کے لئے جمع کیا ہے اے مال جمع کرنے والے، یہ شب و روز تیرا تمام مال متفرق کردیں گے، مال تیرے پاس تیرے ورثاء کا خزانہ ہے، تیرا مال صرف وہ ہے جو تجھے قیامت کے روز نفع پہنچائے گا، وہ جوان مطمئن ہے جو اس یقین پر زندہ ہو کہ جس ذات نے رزق تقسیم کئے ہیں، اسی سے اسے بھی رزق ملے گا، اس کی آبرو داغدار نہیں ہوتی، اس کا چہرہ سوال کی ذلت سے زخمی نہیں ہوتا، جس شخص کے دل میں قناعت بسیرا کرلیتی ہے وہ ہر فکر سے آزاد ہو جاتا ہے۔)

غنیٰ پر فقر کی فضیلت

اس سلسلے میں لوگوں کا اختلاف ہے، حضرت جنیدؒ حضرت خواص اور اکثر حضرات فقر کی فضیلت کے قائل ہیں، اور ابن عطاء کہتے ہیں کہ وہ شکر گزار مالدار جو مال کا حق ادا کرتا ہو صبر کرنے والے فقیر سے افضل ہے، کہتے ہیں کہ حضرت جنیدؒ نے عطاء کے لئے ان کی اس رائے پر ناراض ہو کر بددعا کی تھی، اس بددعا کی وجہ سے انہیں بڑی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا تھا، کتاب الصبر میں ہم نے یہ واقعہ نقل کیا ہے، وہاں ہم نے صبر اور شکر کے درمیان فرق کے اسباب پر بھی روشنی ڈالی ہے، اور یہ بھی بیان کیا ہے کہ اعمال و احوال میں فضیلت تفصیل کے بغیر معلوم نہیں ہوسکتی۔ اب اگر فقر اور غنا مطلق لئے جائیں تو جو شخص اخبار و آثار پر نظر رکھتا ہے وہ اس حقیقت میں شک نہیں کرے گا کہ فقر افضل ہے، لیکن اس میں کچھ تفصیل ہے۔ یہاں دو مقام ایسے ہیں جن میں شک پڑسکتا ہے کہ کسے افضل کہا جائے، ایک تو یہ کہ فقیر صابر ہو، مال کی طلب پر حریص نہ ہو، بلکہ اس پر قانع ہو یا

راضی ہو' اس کا مقابلہ ایسے غنی سے کیا جائے جو مال روکنے پر حریص نہ ہو بلکہ اپنا مال خیر کے کاموں میں صرف کرتا ہو۔ دو سرا مقام یہ ہے کہ فقیر حریص سے کیا جائے۔ اس میں شک نہیں کہ قانع فقیر اس حریص غنی سے افضل ہے جو اپنا مال روکتا ہو' اسی طرح وہ مالدار بھی جو خیر کے کاموں میں اپنا مال خرچ کرتا ہو فقیر حریص سے افضل ہے لیکن پہلے مقام میں یہ گمان ہوتا ہے کہ غنی فقیر سے افضل ہے کیوں کہ جہاں تک مال میں ضعف حرص کا سوال ہے اس میں دونوں برابر ہیں' لیکن غنی صدقات و خیرات کے ذریعے تقرّب حاصل کرتا ہے' اور فقیر اس سے عاجز ہے ہمارے خیال میں ابن عطاء نے ایسے ہی غنی کو افضل کہا ہے' تاہم وہ غنی جو مال سے متمتع ہوتا ہے اگرچہ مباح امور ہی میں کیوں نہ ہو اس فقیر سے افضل نہیں ہو سکتا جو قانع ہو۔ جیسا کہ حدیث میں وارد ہے کہ فقراء نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں یہ شکایت کی کہ اغنیاء خیرات' صدقات' حج اور جہاد کے ذریعے ان سے سبقت لے جاتے ہیں' اس پر آپ نے انہیں تسبیح کے چند کلمات تلقین فرمائے' اور ارشاد فرمایا کہ ان کلمات کے ذریعہ اغنیاء سے زیادہ اجر و ثواب حاصل کرو گے چنانچہ فقراء نے یہ کلمات سیکھ لئے اور پڑھنے لگے' اس کے بعد یہ لوگ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے' اور اپنے معمول کی خبر دی' آپ نے فرمایا :

ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاءُ

(بخاری و مسلم۔ ابو ہریرہؓ)

یہ فضل خداوندی ہے' اللہ جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔

ابن عطاء نے اپنے دعویٰ کے لئے ایک اور استدلال بھی کیا ہے' جب ان سے دریافت کیا گیا کہ آپ غنی کو فقیر سے افضل کیوں کہتے ہیں تو آپ نے جواب دیا اس لئے کہ غنی اللہ تعالیٰ کا وصف ہے۔ لیکن ان کی یہ دونوں دلیلیں محل نظر ہیں' پہلی دلیل اس لئے محل نظر ہے کہ اس میں وہ بات پائی جاتی ہے جو عطاء کے مقصود کے خلاف ہے' اور وہ یہ کہ اس میں تسبیح کے ثواب کو صدقات و خیرات کے اجر سے افضل قرار دیا گیا ہے' اور فقراء کا یہ ثواب حاصل کرنا فضل خداوندی بتلایا گیا ہے' اللہ جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے' چنانچہ زید ابن اسلم حضرت انس ابن مالکؓ سے روایت کرتے ہیں کہ فقراء نے اپنا ایک قاصد سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجا' اس شخص نے (آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر) عرض کیا کہ میں آپ کی جناب میں فقراء کا قاصد بنا کر بھیجا گیا ہوں' آپ نے ارشاد فرمایا میں تجھے بھی مرحبا کہتا ہوں اور ان لوگوں کو بھی جن کے پاس سے تو آیا ہے' وہ ایسی قوم ہے جس سے میں محبت کرتا ہوں' قاصد نے عرض کیا : یارسول اللہ! فقراء کہتے ہیں کہ اغنیاء تمام خیر سمیٹ لیتے ہیں' وہ حج کرتے ہیں' ہمیں اس پر قدرت نہیں ہے' وہ عمرہ کرتے ہیں ہم اس سے عاجز ہیں اور جب بیمار پڑتے ہیں تو اپنا زائد مال آخرت کے لئے ذخیرہ بنا کر خرچ کر دیتے ہیں' رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا میری طرف سے فقراء کو یہ پیغام پہنچا دینا کہ جو شخص تم میں سے صبر کرے گا اور آخرت کے ثواب کا طالب ہو گا اس میں تین تین باتیں ایسی ہوں گی جو مالداروں کو حاصل نہیں ہوں گی' پہلی بات تو یہ کہ جنت میں بہت سی کھڑکیاں ایسی ہیں جنہیں جنت والے اس طرح دیکھیں گے جس طرح زمین والے آسمان کے تاروں کو دیکھتے ہیں' ان میں فقیر پیغمبر' فقیر شہید' اور فقیر مومن کے علاوہ اور کوئی نہیں جائے گا' اور دوسری بات یہ ہے کہ فقراء اغنیاء سے نصف روز یعنی پانچ سو برس پہلے جنت میں داخل ہوں گے' تیسری بات یہ ہے کہ جب مالدار یہ کلمہ کہتا ہے سُبْحَانَ اللّٰهِ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ وَلَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ' اور فقیر بھی یہ کلمہ کہتا ہے تو فقیر کو جو ثواب ملتا ہے مالدار کو اس قدر ثواب نہیں ملتا اگرچہ وہ اس کے لئے دس ہزار درہم خرچ کرے' باقی تمام نیک اعمال کو بھی اسی پر قیاس کرنا چاہیے' قاصد یہ پیغام لے کر واپس چلا گیا' اور فقراء تک پہنچایا' سب نے کہا ہم راضی ہیں' ہم راضی ہیں۔ (ابن ماجہ۔ بتغییر یسیر) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اوپر کی حدیث میں ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاءُ سے فقراء کے ثواب کی زیادتی مراد ہے' یہ ثواب انہیں ذکر پر ملتا ہے' جب کہ اغنیاء کو اسی ذکر پر کم ثواب حاصل ہوتا ہے۔ یہ پہلی دلیل کا جواب ہے۔

ابن عطاء کی دوسری دلیل یہ تھی کہ غنی اللہ تعالیٰ کا وصف ہے' اس کا جواب بعض مشائخ نے یہ دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے غنی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ تمام اسباب و اعراض سے مستغنی ہے' اس صورت میں بتلایئے انسان کے غنی کو اللہ تعالیٰ کے غنی سے کیا نسبت ہے' یہ سن کر ابن عطا چپ رہ گئے' وہ اس اعتراض کا جواب نہ دے سکے۔ بعض لوگوں نے اس دلیل کا جواب یہ دیا ہے کہ تکبّر اللہ تعالیٰ کا وصف ہے' اس اعتبار سے متکبر کو متواضع سے افضل ہونا چاہیے' ان مشائخ کا کہنا یہ ہے کہ فقر افضل ہے اس لئے کہ تمام صفات عبودیت بندے کے لئے افضل ہیں جیسے خوف' رجاء وغیرہ' صفات ربوبیت میں نزاع نہ ہونا چاہیے' جیسا کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک حدیث قدسی میں منقول ہے' اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :۔

اَلْكِبْرِيَاءُ رِدَائِيْ وَالْعَظَمَةُ اِزَارِيْ فَمَنْ نَازَعَنِيْ وَاحِدًا مِنْهُمَا قَصَمْتُهُ (۱)

کبریاء میری چادر ہے' اور عظمت میرا ازار ہے' جو ان دونوں میں سے کسی میں مجھ سے نزاع کرے گا میں اسے توڑ دوں گا۔

حضرت سہیل تستریؒ فرماتے ہیں کہ عزت اور بقاء کی محبت ربوبیت میں شرک کے مترادف ہے' اور ان دو صفتوں میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ منازعت کے ہم معنی ہے۔

فقر و غنی میں فضیلت کی حقیقت یہ ہے فقر و سا میں افضلیت کی بحث' اور اس سلسلے میں مختلف آراء' ان میں سے ہر رائے کی بنیاد عام روایات پر ہے' جن میں تاویل کی گنجائش ہے' اور ہر ایک رائے میں ایسے کلمات پائے جاتے ہیں جن سے مخالف مفہوم ثابت ہو سکتا ہے چنانچہ جس طرح ابن عطاء کی اس دلیل کا کہ غنی باری تعالیٰ کا وصف ہے یہ جواب دیا گیا ہے کہ تکبّر باری تعالیٰ کا وصف ہے' لیکن بندہ کا متواضع ہونا افضل ہے اسی طرح یہ جواب بھی اعتراض سے خالی نہیں ہے' ہم دیکھتے ہیں کہ علم اور معرفت دو ایسے وصف ہیں جن کی نسبت باری تعالیٰ کی طرف کی جاتی ہے اور جہل و غفلت دو ایسی صفتیں ہیں جو بندوں کی طرف منسوب ہوتی ہیں' اس اعتبار سے کسی بندے کو عارف یا عالم کہنا بہتر نہ ہوگا' کیوں کہ علم و معرفت صفات ربوبیت ہیں بلکہ جاہل و غافل کہنا بہتر ہوگا کیوں کہ جہل و غفلت ہی عبدیت کے لئے موزوں ہیں' حالانکہ اس روئے زمین پر کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں ملے گا جو غفلت کو علم کے مقابلے میں افضل کہتا ہو۔

اس سلسلے میں حق بات وہی ہے جو ہم نے کتاب الصبر میں بیان کی ہے' وہاں یہ اصول بیان کیا گیا ہے کہ جو شئے اپنی ذات سے مقصود نہیں ہوتی بلکہ غیر کے لئے مقصود ہوتی ہے اس کے فضل و کمال کا اندازہ مقصود کے فضل و کمال سے لگایا جاتا ہے' جیسا مقصود ہو گا ایسی ہی وہ شئی بھی ہوگی جو اس مقصود کے حصول کا وسیلہ ہے۔ چنانچہ دنیاوی مال و دولت کی اس لئے ممانعت کی گئی ہے کہ اس کی وجہ سے بندہ خدا تک پہنچنے سے قاصر رہتا ہے' اسی طرح فقر بھی بذات خود مطلوب نہیں ہے بلکہ اس لئے مطلوب ہے کہ اس کے باعث وہ رکاوٹ دور ہو جاتی ہے جو خدا تک پہنچنے سے مانع ہے لیکن بہت سے اغنیاء ایسے بھی ہیں جنہیں ان کے غنا نے اللہ تعالیٰ سے دور نہیں کیا جیسے حضرت سلیمان علیہ السلام' حضرت عثمان غنیؓ' اور حضرت عبدالرحمٰن ابن عوفؓ۔ دوسری طرف بہت سے فقراء ایسے بھی ہیں جنہیں فقر نے ان کے اصل مقصد سے ہٹا دیا ہے۔ دنیا میں اصل مقصد یہ ہے کہ بندہ کو اللہ تعالیٰ سے محبت ہو' اور اس کے ساتھ انس ہو' اور یہ مقصد اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جبکہ بندے کو اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہو جائے' اور معرفت کی وادی میں یہ قدم رکھنا اور اسے عبور کرنا شواغل کی موجودگی میں ممکن نہیں ہے' جس طرح آدمی کے لئے غنی مانع بن سکتا ہے اسی طرح فقر بھی مانع ہو سکتا ہے' فی الحقیقت معرفت و انس کے لئے اصل مانع دنیا کی محبت ہے' اس کا اجتماع محبت الٰہی کے ساتھ ممکن نہیں ہے' جس کے دل میں کسی چیز کی محبت ہوتی ہے وہ اسی میں مشغول رہتا ہے خواہ اس کے فراق میں مشغول ہو یا وصال میں۔ پھر بعض لوگ فراق میں زیادہ مشغول ہوتے ہیں اور بعض لوگ وصال میں' یہ لوگوں کے حالات اور رجحانات کے

(۱) یہ حدیث پہلے بھی گزری ہے۔

اختلاف پر موقوف ہے۔ دنیا غافلوں کی محبوب ہے' جن سے ان کا محبوب جدا ہے وہ اس کے حصول کی فکر میں مشغول ہیں' اور جنہیں محبوب کا قرب میسر ہے وہ اس کی حفاظت' اور اس کی قربت سے زیادہ سے زیادہ لطف اندوز ہونے میں لگے ہوئے ہیں۔

مال اور پانی کو برابر سمجھنے والا غنی اگر کوئی ایسا شخص فرض کیا جائے جو مال کی محبت سے خالی ہو اس طرح کہ اس کے نزدیک مال اور پانی دونوں برابر ہوں یعنی مال کی صرف اسی قدر ضرورت سمجھتا ہو جو زندگی کے لئے ناگزیر ہے' باقی مال خواہ موجود ہو یا نہ ہو' اسے نہ اس کے وجود کی پروا ہے' اور نہ اس کے عدم سے دلچسپی ہے' یہ غنا یقیناً افضل ہے' پھر مقدار حاجت کا موجود ہونا اس کے نہ ہونے سے بہتر اس لئے ہے کہ فاقہ زدہ شخص موت کی طرف قدم بڑھاتا ہے' معرفت کا راستہ طے نہیں کرتا۔ تاہم اکثر لوگوں کے حق میں فقر ہی افضل ہے' کیوں کہ فقیر خطرے سے زیادہ دور ہوتا ہے' جب کہ خوشحالی کا فتنہ مفلسی کے فتنے سے سخت تر ہے' اور اس فتنے سے محفوظ رہنے کا طریقہ یہی ہے کہ اس پر قدرت نہ ہو' اسی لئے حضرات صحابہؓ فرمایا کرتے تھے کہ ہم مفلسی کے امتحان میں ثابت قدم رہے' مالداری کی آزمائش میں صبر نہ کرسکے' یہ ہر انسان کا فطری تقاضا ہے' شاذ و نادر ہی کوئی شخص ایسا ہوگا جسے اس کلیے سے مستثنیٰ کیا جاسکتا ہو' جب کہ شریعت کے مخاطب عام انسان ہیں' وہ شاذ و نادر شخصیتیں نہیں ہیں جو کبھی کبھی ظاہر ہوتی ہیں' اس لئے مفلسی اور غریبی سب کے لئے مناسب ہے' اگرچہ بعض نادر لوگوں کے لئے تونگری مناسب ہو' اسی لئے شریعت نے غنی سے منع فرمایا ہے' اس کی مذمت کی ہے' اور فقر کی مدحت بیان کی ہے' چنانچہ حضرت عیسٰی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ اہل دنیا کی دولت کی طرف مت دیکھو' اس کی چمک تمہارے ایمان کا نور سلب کرلے گی' کسی صاحب علم کا قول ہے کہ اموال کی آمد و رفت سے ایمان کی حلاوت ضائع ہوجاتی ہے' حدیث شریف میں ہے:۔

لِكُلِّ اُمَّةٍ عِجْلٌ وَعِجْلُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ الدِّيْنَارُ وَالدِّرْهَمُ۔
(ابو منصور دیلمی۔ ابو عبدالرحمٰن السلمیؒ)

ہر امت کا ایک بچھڑا ہے' میری امت کا بچھڑا درہم و دینار ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم نے اپنا بچھڑا سونے چاندی سے تراشا تھا۔ مال اور پانی' سونے اور پتھر میں مساوات صرف انبیاء علیہم السلام اور اولیاء اللہ ہی کے نزدیک ممکن ہے' اور ان حضرات کو بھی اس درجے تک پہنچنا اللہ تعالیٰ کے فضل سے اور طول طویل مجاہدے کے بعد ہی نصیب ہوتا' سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے فرمایا کرتے تھے:۔

اِلَيْكَ عَنِّىْ (حاکم)

مجھ سے دور رہ۔

آپ یہ بات اس وقت فرمایا کرتے تھے جب دنیا مجسم زینت بن کر آپ کے سامنے آتی تھی۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرمایا کرتے تھے اے زرد رو میرے علاوہ کسی اور کو فریب دے' اے سفید رو میرے سوا کسی اور کو دھوکا دے' زرد رو سے مراد سونا ہے اور سفید رو سے مراد چاندی ہے' یہ بات آپ اس وقت فرماتے جب اپنے نفس میں سیم و زر سے فریب کے آثار ملاحظہ فرمایا کرتے تھے۔

غناء مطلق کیا ہے؟ غناء مطلق مال اور پانی کے برابر ہونے کو کہتے ہیں' چنانچہ حدیث شریف میں ہے کہ آدمی ساز و سامان کی کثرت سے مالدار نہیں ہوتا بلکہ اصل غناء یہ ہے کہ آدمی کا نفس غنی ہو (بخاری و مسلم۔ ابو ہریرہؓ) لیکن کیوں کہ یہ درجہ حاصل کرنا نہایت مشکل ہے' اس لئے عام مخلوق کے حق میں مناسب تر یہ ہے کہ وہ مال سے محروم ہوں' اگرچہ مال کی موجودگی میں اسے خیر کے کاموں میں صرف بھی کرتے ہوں' اس کے باوجود مال کا نہ ہونا ہی بہتر ہے' کیوں کہ مال پر قدرت رکھنے کے بعد اس سے انسیت ہونا' اس سے مستفید ہونے کی خواہش کرنا' اور اسے وسیلۂ راحت بنانے کا متمنی ہونا ناگزیر ہے اور یہ تمام امور دل میں دنیائے دنی سے محبت اور تعلق پیدا کرتے ہیں' پھر جس قدر وہ اپنی صفت سے قریب ہوتا ہے اسی قدر وہ اللہ تعالیٰ سے اور اس کی

دوستی سے وحشت کرتا ہے، آدمی دنیا کے اسباب سے جس قدر لاتعلق ہو گا اسی قدر اس کا دل دنیا سے متنفر ہو گا، پھر جب دل دنیا کی محبت سے خالی ہوتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی محبت کی آماجگاہ بن جاتا ہے بشرطیکہ اللہ پر ایمان رکھتا ہو، اور اس کی محبت کو سرمایۂ آخرت تصور کرتا ہو، دل خالی نہیں رہتا، اس میں دنیا کی محبت رہتی ہے، یا اللہ کی، جس کا دل غیر کی طرف متوجہ ہوتا ہے اس میں اللہ کی محبت جگہ نہیں پاتی، اور جو اللہ تعالیٰ کی طرف مائل ہوتا ہے اس میں غیر کے لئے گنجائش نہیں ہوتی۔ پھر آدمی جس قدر ایک کی طرف متوجہ ہو گا اسی قدر وہ دوسرے سے منحرف ہو گا، اور جتنا ایک کے قریب ہو گا اتنا ہی دوسرے سے دور ہو گا، ان دونوں کی مثال ایسی ہے جیسے مشرق و مغرب، یہ دو مخالف جہتیں ہیں، اب جو شخص ان دونوں کے درمیان ہے وہ جس قدر ایک جہت سے دور ہو گا اسی قدر دوسری جہت سے قریب ہو گا، بلکہ ان میں سے ایک کے ساتھ عین قرب دوسرے سے عین بُعد ہو گا، اس مثال کی روشنی میں دیکھا جائے تو عین حب دنیا عین بغض الٰہی ہے۔ عارف کی نگاہ اپنے دل پر ہونی چاہیے کہ وہ دنیا سے منحرف ہے یا اس کے ساتھ مانوس ہے۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ فقیر اور غنی کی فضیلت مال کے ساتھ ان کے قلوب کے تعلق کے لحاظ سے ہو گی۔ اگر وہ دونوں مال سے تعلق رکھنے میں برابر ہیں تو ان کا درجہ بھی برابر ہو گا، لیکن یہ دھوکے کی جگہ ہے، یہاں قدم لغزش کھا جاتے ہیں اس لئے کہ غنی کبھی یہ گمان کرتا ہے کہ اس کا دل مال سے لاتعلق ہے، حالانکہ دل میں اس کی محبت پوشیدہ رہتی ہے، اگرچہ اسے اس کے وجود کا علم نہیں ہوتا، اور علم اس وقت ہوتا ہے جب وہ مال کسی وجہ سے اسکی ملکیت میں باقی نہیں رہتا۔ اس لئے غنی کو چاہیے کہ وہ اپنے قلب کی آزمائش کرے، یا تو اس طرح کہ اپنا تمام مال راہ خدا میں دیدے، یا اس وقت جب وہ چوری ہو جائے، اگر اس صورت میں دل کو مال کی طرف ملتفت پائے تو سمجھ لے کہ میں غلط فہمی میں مبتلا تھا، اور یہ سمجھ بیٹھا تھا کہ میرا دل مال سے متنفر ہے، اس کے ضائع جانے سے احساس ہوا کہ دل کو مال سے کتنی انسیت تھی، بعض لوگ اس خیال سے اپنی باندی فروخت کر دیتے ہیں کہ ان کے دل میں باندی کی ذرا چاہت نہیں ہے، لیکن جب وہ اسے فروخت کر دیتے ہیں تب دل میں حزن و ملال کی چنگاری بھڑکتی ہے، یہ محبت کی چنگاری پہلے سے دل کے اندر پوشیدہ تھی، اس وقت یہ خیال ہوتا ہے کہ ہمارے دل میں باندی کی محبت نہیں ہے، اور یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس کا عشق دل میں اس طرح پوشیدہ تھا جس طرح آگ کی چنگاری راکھ کے ڈھیر میں پوشیدہ رہتی ہے۔ تمام اغنیاء کا یہی حال ہے، صرف انبیاء اور اولیاء اس حکم سے مستثنیٰ ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ مطلق غنا کا حاصل ہونا محال یا انتہائی دشوار ہے اس لئے ہم مطلقاً یہ کہتے ہیں کہ فقر تمام مخلوق کے لئے موزوں تر اور افضل ہے، اس لئے کہ دنیا کے ساتھ فقیر کا تعلق اور اس کی انسیت ضعیف ہوتی ہے، اور اسی ضعف کی نسبت سے اس کی تسبیحات، اور عبادات کا ثواب بھی بڑھتا رہتا ہے، کیوں کہ محض زبان کو حرکت دینا مقصود نہیں ہے، بلکہ مقصود یہ ہے کہ جو ذکر زبان پر ہے اس سے انس پختہ ہو جائے، ظاہر ہے یہ انس اسی صورت میں زیادہ ہو سکتا ہے جب دل خالی ہو، مشغول دل پر ذکر اتنا اثر انداز نہیں ہوتا۔ اسی لئے بعض بزرگان دین فرماتے ہیں جو شخص عبادت کرے اور اس کا دل دنیا کی طلب میں مشغول ہو اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص گھاس ڈال کر آگ بجھانے کی کوشش کرے، یا چربی زائل کرنے کے لئے گھی سے ہاتھ دھوئے، حضرت ابو سلیمان دارانیؒ فرماتے ہیں کہ فقیر کا ایسی شہوت کے بغیر جس پر اسے قدرت نہ ہو سانس لینا غنی کی ہزار برس کی عبادت سے افضل ہے، ضحاکؒ فرماتے ہیں جو شخص بازار جائے اور وہاں کوئی من پسند چیز دیکھ کر صبر کرے اور ثواب کا طالب ہو اس کو اللہ کی راہ میں ہزار دینار خرچ کرنے کا ثواب ملے گا۔ ایک شخص نے بشر ابن حارث کی خدمت میں عرض کیا کہ مجھے میرے عیال نے پریشان کر رکھا ہے آپ میرے لئے دعا فرمائیں آپ نے فرمایا کہ جس وقت تجھے تیرے عیال پریشان کریں اور روٹی وغیرہ کا تقاضا کریں اس وقت اللہ سے دعا کرنا، تیری اس وقت کی دعا میری دعا سے ہزار درجہ افضل ہو گی، فرمایا کرتے تھے کہ غنی متعبد کی مثال ایسی ہے جیسے گھورے پر سبزہ اگ آئے، اور فقیر متعبد کی مثال ایسی ہے جیسے بیش قیمت موتیوں کا ہار کسی نازک اندام حسینہ کے گلے میں ڈال دیا جائے۔ اکابرین سلف

مالداروں سے معرفت کی باتیں سننا پسند نہیں کرتے تھے۔ حضرت ابوبکر الصدیقؓ کی دعا یہ تھی :۔

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْاَلُکَ الذُّلَّ عِنْدَ النِّصْفِ مِنْ نَفْسِیْ وَالزُّھْدَ فِیْمَا جَاوَزَ الْکَفَافَ۔

اے اللہ! میں تجھ سے ذلت کا سوال کرتا ہوں اس صورت میں کہ میرا نفس پورا حق مانگے' اور زہد کا اس مقدار میں جو قدر کفایت سے آگے بڑھ جائے۔

جب حضرت صدیق جیسی بزرگ ہستی کو اپنے کمال زہد کے باوجود دنیا سے خوف تھا تو یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ مال کا ہونا نہ ہونے سے بہتر ہے' علاوہ ازیں مالداری کے لئے اہم ترین شرط یہ ہے کہ تمام مال حلال و طیب ہو' اور جائز و مباح مواقع پر خرچ کیا جائے' اس شرط پر عمل پیرا ہونے کے باوجود اغنیاء کو میدان قیامت میں حساب و کتاب کے جس طویل مرحلے سے گذرنا ہوگا اس کی شدت کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا' یہ انتظار کا ایک سخت ترین مرحلہ ہوگا' اسی لئے کہا جاتا ہے کہ جس کو حساب میں الجھایا جائے گا' اس کو عذاب دیا جائے گا' حضرت عبدالرحمٰن ابن عوف کو جنت کے اندر پہنچنے میں دیر لگی' اس کی وجہ یہی تھی کہ وہ اپنے اموال کا حساب دینے میں مشغول تھے' حضرت ابوالدرداء فرماتے ہیں کہ میری خواہش یہ ہے کہ مسجد کے دروازے پر میری ایک دوکان ہو' اور وہاں رہ کر میری کوئی نماز اور ذکر فوت نہ ہو مجھے اس دکان سے ہر روز پچاس دینار کا نفع ہو جنہیں میں اللہ کی راہ میں صدقہ کردوں' لوگوں نے سوال کیا اس میں آپ کس چیز سے خائف ہیں' فرمایا حساب کی سختی سے' حضرت سفیان ثوریؒ فرماتے ہیں کہ فقراء نے تین چیزیں اختیار کی ہیں' اور اغنیاء نے بھی تین ہی چیزوں کو ترجیح دی ہے' فقراء جن تین چیزوں کو پسند کرتے ہیں وہ یہ ہیں نفس کا سکون' قلب کی یکسوئی' اور حساب کی خفت' اور اغنیاء نے یہ تین چیزیں اختیار کی ہیں نفس پر مشقت' دل کی مشغولیت' اور حساب کی شدت' ابن عطاء نے غنی کو اللہ تعالیٰ کا وصف کہا ہے' اور اسی لحاظ سے اس کو فقر کے مقابلے میں افضل بھی کہا ہے' لیکن ان کی یہ بات اسی وقت صحیح ہوسکتی ہے جب کہ بندوں کی نظر میں مال کا وجود اور عدم دونوں برابر ہوں' یعنی وہ دونوں سے غنی ہو' لیکن اگر وہ مال کے وجود کی صورت میں غنی ہے' اور عدم کی صورت میں محتاج ہے تو یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ اس کا غنی باری تعالیٰ کے غنا سے مشابہ ہے' اللہ تعالیٰ اپنی ذات سے غنی ہے' وہ کسی ایسی شئے سے غنی نہیں ہے جو زوال پذیر ہو' مال کا تعلق ان اشیاء سے ہے جو چوری کی وجہ سے یا کسی آفت ناگہانی کے باعث' یا خرچ کرنے کی بناء پر ضائع ہوجاتی ہیں' کسی نے ابن عطاء کے قول پر اعتراض کرتے ہوئے کہا تھا کہ اللہ تعالیٰ اعراض یعنی اموال و اسباب کے باعث غنی نہیں ہے۔ یہ ایسی غنا کی مذمت میں صحیح ہے جس کا مقصد مال کی بقا ہو' بعض لوگوں نے ابن عطاء کے قول کا جواب دیتے ہوئے یہ کہا ہے کہ بندے کے لئے صرف وہی صفات مناسب ہیں جن سے عبودیت پر دلالت ہوتی ہے۔ جو صفات باری تعالیٰ کے لئے ہیں وہ بندے کے شایان شان نہیں۔ لیکن یہ درست معلوم نہیں ہوتا' اس لئے کہ علم بھی باری تعالیٰ کی ایک صفت ہے' اور صفت سے متصف ہونا بھی بندے کے لئے انتہائی محمود ہے' بلکہ بندے کی عبدیت کا انتہائی درجہ یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اخلاق کا حامل ہو' بعض مشائخ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی راہ کا سالک اس وقت تک راستہ مکمل نہیں کرتا جب تک کہ اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام اس کے اوصاف نہ ہوجائیں' یعنی اللہ تعالیٰ کے ہر وصف میں سے اسکو کچھ حصہ نہ مل جائے البتہ تکبر بندے کے لائق نہیں ہے' یعنی غیر مستحق پر تکبر کرنا باری تعالیٰ کا وصف نہیں ہے' البتہ وہ تکبر بندے کے شایان شان ہوسکتا ہے جو مستحق پر ہو' جیسے مومن کا تکبر کافر پر' عالم کا تکبر جاہل پر' اور مطیع کا تکبر گنہگار پر۔ بعض اوقات آدمی تکبر سے فخر' دعویٰ' اور ایذا رسانی تک جا پہنچا ہے یہ تکبر اللہ تعالیٰ کا وصف نہیں ہے' اللہ تعالیٰ کا وصف تکبر تو صرف یہ ہے کہ وہ ہر شئے سے بڑا ہے' اور اسے خود اپنی بڑائی کا علم ہے' بندے کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اعلیٰ مرتبے کی جستجو کرے اگر اس پر قدرت رکھتا ہو' اور اس اعلیٰ مرتبہ کا مستحق بھی ہو' جھوٹ' فریب' اور غلط بیانی سے اپنے آپ کو مستحق نہ بنائے' گویا بندے کو یہ اعتقاد رکھنے کا حق حاصل ہے کہ مومن کافر سے بڑا ہے' مطیع عاصی سے بڑھ کر ہے' عالم جاہل سے بڑا ہے' انسان حیوان' جماد اور نبات سے اعلا و ارفع ہے اور اللہ تعالیٰ سے قریب تر ہے' اگر بندے کو اپنے کسی وصف کا یقینی طور پر علم ہو تو بلاشبہ

اسے تکبر کا وصف حاصل ہو گا۔ اور یہ وصف اس کے لائق بھی ہو گا' اور اس کے حق میں فضیلت بھی قرار پائے گا' لیکن اپنے لئے کسی ایسے وصف کے معلوم ہونے کی کوئی صورت نہیں ہے' کیوں کہ انسان کو اپنے خاتمے کا حال معلوم نہیں ہے' اسے کیا پتا خاتمہ اس وصف پر ہو سکے گا یا نہیں جس پر تکبر کرتا ہے' اس لئے انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے لئے کسی ایسے مرتبے کا اعتقاد نہ کرے جو کافر کے مرتبے سے بڑھ کر ہو' اس لئے کہ یہ ممکن ہے کافر کا خاتمہ ایمان پر ہو اور وہ خود کفر پر موت پائے ایسے شخص کے لئے جسے اپنے انجام کی خبر نہ ہو تکبر کرنا مناسب نہیں ہے۔

علم کا کمال یہ ہے کہ آدمی شئی کو اس کی حقیقت اور ماہیت کے ساتھ جان لے' اس طرح کا علم بھی اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ہے' لیکن کیوں کہ بعض اشیاء کی معرفت سے اسے نقصان پہنچ سکتا ہے۔ اس لئے یہ علم بھی اس کے حق میں نقص ہے۔ اللہ تعالیٰ جس علم سے موصوف ہے وہ ایسا نہیں ہے کہ ضرر کا باعث بن سکے۔ اس سے ثابت ہوا کہ بندے کو جن امور کی معرفت سے کسی ضرر کا اندیشہ نہیں ہو سکتا وہ اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں' گویا منتہائے فضیلت یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اوصاف کی معرفت حاصل کی جائے' انبیاء' اولیاء اللہ اور علماء کو اسی بناء پر فضیلت حاصل ہے۔

گذشتہ سطور سے یہ بات اچھی طرح واضح ہو چکی ہے کہ اگر آدمی کے نزدیک مال کا وجود اور عدم دونوں برابر ہوں تو یہ حقیقی غنا ہے' اور اس غنا سے مشابہ ہو سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ کا وصف ہے' اسی غنا کی فضیلت ہے' وہ غنا افضل نہیں ہے جو صرف مال کے وجود سے حاصل ہو۔ اب تک ہم فقیر قانع اور غنی شاکر کے فرق' اور ایک کی دوسرے پر فضیلت کو موضوع سخن بنائے ہوئے تھے' اب ہم دوسرا موضوع لیتے ہیں۔

فقیر حریص اور غنی حریص یہاں بھی یہی گفتگو ہے کہ ان دونوں میں سے کون افضل ہے' چنانچہ ہم ایک شخص فرض کرتے ہیں جو مال کے لئے جدوجہد کرتا ہے اور حاصل نہیں کرپاتا' پھر وہ مال پالیتا ہے' اس کے لئے دونوں حالتیں ثابت ہیں مال کے وجود کی بھی' اور اس کے فقدان کی بھی' سوال یہ ہے کہ ان دونوں حالتوں میں سے کون سی حالت افضل ہے؟ اس کے جواب کی تفصیل یہ ہے کہ اگر اس کا مطلوب صرف اس قدر مال ہے جو معیشت کے لئے ناگزیر ہے' اور اس کا منشاء یہ ہے کہ وہ اس کے ذریعہ دین کا راستہ طے کرے گا' اور اللہ تک پہنچنے میں اس سے مدد حاصل کرے گا تو مال کا وجود افضل ہے' کیوں کہ فقر انسان کو طلب میں مشغول کرتا ہے' اور رزق کا طالب ذکر و فکر پر قادر نہیں ہوتا' اگر ذکر و فکر ہوتا ہے تو اس میں دوسرے امور بھی مداخلت کر بیٹھتے ہیں' یعنی وہ فارغ البالی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ نہیں ہو پاتا' بلکہ اسے فکر معاش بے چین اور مضطرب رکھتا ہے' جب کہ ذکر و فکر کے لئے بقدر کفایت قوت ضروری ہے' اسی لئے سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا فرمایا کرتے تھے :-

اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ قُوْتَ آلِ مُحَمَّدٍ كَفَافًا (۱ تا ۳)

اے اللہ! محمد کی اولاد کا رزق بقدر کفایت فرما۔

ایک مرتبہ ارشاد فرمایا :-

كَادَ الْفَقْرُ اَنْ يَكُوْنَ كُفْرًا (۲) قریب ہے کہ فقر کفر ہو جائے۔

اس میں فقر سے مراد یہ ہے کہ آدمی ضروریات زندگی کے لئے مضطر ہو' اور اگر اس شخص کا مطلوب ضرورت سے زائد مال حاصل کرنا ہے' یا بقدر ضرورت مال پاتا ہے' لیکن زائد از ضرورت یا بقدر ضرورت مال سے یہ مقصود نہیں ہے کہ اس سے دین کا راستہ طے کرنے پر مدد لے تو اس صورت میں فقر کی حالت افضل اور اصلح ہے۔ اس لئے کہ اس صورت میں فقیر اور غنی دونوں حرص' اور مال کی محبت میں برابر ہیں' اسی طرح وہ دونوں اس امر میں بھی برابر ہیں کہ ان میں سے کسی کا مقصد بھی دین پر مدد لینا نہیں ہے۔ اور نہ ان میں سے کوئی کسی معصیت سے متعرض ہے' لیکن ان دونوں میں ایک فرق ہے' اور وہ یہ ہے کہ جس کے پاس موجود ہے وہ

(۱ تا ۳) یہ تینوں روایتیں پہلے بھی گذری ہیں۔

اس سے انس بھی رکھتا ہے' اسی طرح موجود مال کی محبت اس کے دل میں راسخ ہو جاتی ہے' وہ دنیا پر اطمینان کرنے لگتا ہے اور جس کے پاس نہیں ہوتا وہ مجبوراً ہی سہی دنیا سے کنارہ کش رہتا ہے' اس کے نزدیک دنیا ایک قید خانے کی طرح ہوتی ہے جس سے آزاد ہونا چاہتا ہے' اس مثال میں یہ دونوں شخص متعدد امور میں برابر ہیں' لیکن دنیا سے انس اور میل کے معاملے میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں' ظاہر ہے جو شخص دنیا کی طرف مائل ہو گا اس کا دل دوسرے کی بہ نسبت سخت تر ہو گا' جس قدر اسے دنیا سے انسیت اور محبت ہو گی اسی قدر آخرت سے وحشت اور نفرت ہو گی' حدیث شریف میں ہے' رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :-

اِنَّ رُوْحَ الْقُدُسِ نَفَثَ فِي رَوْعِي اَحْبِبْ مَنْ اَحْبَبْتَ فَاِنَّكَ مُفَارِقُهُ (۳)

روح القدس نے میرے دل میں یہ بات ڈالی ہے کہ جس سے چاہے محبت کر لے تو اس سے جدا ضرور ہو گا۔

اس حدیث میں یہ بتلایا گیا ہے کہ محبوب کا فراق بڑا جاں گسل اور شدید تر واقعہ ہوتا ہے' اس لئے تو ایسے شخص سے محبت کر جس سے جدا نہ ہونا پڑے' اور ایسا محبوب صرف اللہ تعالیٰ ہی ہو سکتا ہے جو کبھی جدا نہ ہو گا' اور ایسے شئے سے محبت نہ کر جسے ہر حال میں تجھ سے جدا ہونا ہے' اور وہ دنیا ہے' اگر تو نے دنیا سے محبت کی تو تجھے اللہ سے ملنا پسند نہیں ہو گا' اسی طرح تیری موت اس حال پر ہو گی جسے تو برا سمجھتا ہو گا' اور موت کی وجہ سے تیرا تعلق تیرے محبوب سے منقطع ہو جائے گا۔

پھر محبوب کی جدائی سے اسی قدر تکلیف ہوتی ہے جس قدر دل میں انس اور محبت ہوتی ہے' جسے دنیا میسر ہے' اور وہ اس سے مانوس بھی ہے ظاہر ہے اسے اس شخص کی بہ نسبت دنیا کی جدائی سے زیادہ تکلیف اور درد ہو گا' جس کے پاس دنیا موجود ہی نہیں ہے' اگرچہ وہ اس کی طلب پر حریص ہے۔ اس تفصیل سے ہمارا یہ مطلوب اچھی طرح واضح ہو چکا ہے کہ فقر ہی اشرف و افضل' اور تمام مخلوق کے لئے مناسب تر ہے' الا یہ کہ دو مواقع اس سے مستثنیٰ کئے جا سکتے ہیں' ایک تو یہ کہ کسی کا غنا حضرت عائشہؓ کے غنا کی طرح ہو کہ ان کے نزدیک مال کا وجود اور عدم دونوں برابر ہیں۔ یہ غنا زیادتی کا باعث بنتی ہے' یعنی اس کی وجہ سے فقراء اور مساکین کی دعائیں حاصل ہوتی ہیں' اور ان کی ہمتیں عبادت میں مجتمع رکھنے کا شرف حاصل ہوتا ہے' دوسرا موقع جسے مستثنیٰ کیا جا سکتا ہے یہ ہے کہ آدمی قدر ضرورت بھی مفلس ہو' ایسے ہی فقر کے سلسلے میں یہ حدیث بھی وارد ہوئی ہے کادالفقر ان یکون کفرًا قریب ہے کہ فقر کفر ہو جائے' اس فقر میں کوئی چیز نہیں ہے مگر اس وقت یہ فقر خیر ہو سکتا ہے جب کہ آدمی ضرورت کے بقدر رزق سے بقائے حیات میں مدد لے' اور اس حیات کو کفر و معصیت میں بسر نہ کرے' اگر اس فقر میں مبتلا ہو کر وہ شخص مر جائے تو یہ بات اس کے حق میں زیادہ بہتر ہے' یہ فقر و غنا میں افضلیت کی بحث ہے' اب صرف یہ صورت رہ گئی ہے کہ ایک فقیر ایسا جو ہمہ تن طلب میں مشغول ہو' اور اس ایک کام کے سوا اس کے پاس دوسرا کوئی کام نہ ہو' دوسری طرف ایک ایسا غنی ہو جسے مال کی حرص فقیر کی بہ نسبت کم ہو' اور نہ اس کی حفاظت میں اتنا منہمک ہو جتنا حریص مال نہ ملنے پر محسوس کرتا ہے' ان دونوں کے حال میں اختلاف ہے بظاہر ایسا لگتا ہے کہ ان دونوں کو اللہ تعالیٰ سے اسی قدر بعد ہو گا جس قدر وہ مال کے نہ ہونے سے تکلیف محسوس کریں گے اور جس قدر درد کم ہو گا اسی قدر دوری بھی کم ہو گی۔

حالت فقر میں فقیر کے آداب فقیر کے لئے کچھ باطنی اور کچھ ظاہری آداب ہیں' ان کا تعلق اس کے افعال سے بھی ہے' اور لوگوں کے ساتھ اجتماع اور مخالطت سے بھی' ہر فقیر کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان آداب کی رعایت کرے۔

باطنی آداب : باطن کا ادب یہ ہے کہ اس حال کو دل سے مکروہ نہ جانے' جس میں اسے مبتلا کیا گیا ہے' یعنی اللہ تعالیٰ کے فعل کو برا نہ سمجھے' اس حیثیت سے کہ وہ اسکا فاعل ہے' نفس فعل یعنی فقر کو برا سمجھ سکتا ہے' جیسے پچھنے لگوانے والا پچھنے لگانے کے

عمل کو اس لئے برا سمجھتا ہے کہ اس سے تکلیف ہوتی ہے' اس لئے برا نہیں سمجھتا کہ یہ پچھنے لگانے والے کا عمل ہے' یا پچھنے لگانے والا برا ہے' بلکہ بسا اوقات اس کا احسان مند ہوتا ہے' یہ کم سے کم درجہ ہے' اور فقیر کے لئے اس پر عمل کرنا واجب ہے' اور اس کے خلاف پر عمل کرنا حرام ہے' اور فقر کے ثواب کو ضائع کردیتا ہے۔

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد مبارک کے یہی معنی ہیں :-

يَا مَعْشَرَ الْفُقَرَاءِ اَعْطُوا اللّٰهَ الرِّضَا بِقُلُوْبِكُمْ تَظْفَرُوْا بِثَوَابِ فَقْرِكُمْ وَاِلَّا فَلَا۔

اے گروہ فقراء تم اللہ کو اپنے دلوں سے رضامندی دو تاکہ اپنے فقر کا اجر و ثواب پاؤ' ورنہ نہیں۔

اس سے بلند تر درجہ یہ ہے کہ اپنے فقر پر راضی ہو' اور اس سے بھی اونچا درجہ یہ ہے کہ فقر کا طالب ہو اور اس سے خوش ہو' فقر کی طلب' اور اسے پاکر خوش ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ مال کی آفات اور اس کے نقصانات سے واقف ہوتا ہے' اور اسے اللہ تعالی کی ذات پر پورا بھروسا ہوتا ہے' اور یہ یقین رکھتا ہے کہ اسے اس کے حصے کا رزق ضرور ملے گا' نہ وہ ضرورت سے زیادہ طلب کرتا ہے' اور نہ اسے پسند کرتا ہے کہ اس کے پاس مقدار ضرورت سے زائد مال ہو۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ ارشاد فرماتے ہیں کہ اللہ تعالی فقر سے عذاب بھی دیتا ہے اور ثواب بھی' اگر کسی فقر سے ثواب دینا منظور ہو تو اس کی علامات یہ ہیں کہ اس کے اخلاق اچھے ہوتے ہیں' وہ اللہ تعالی کی اطاعت کرتا ہے' اپنے حال کا شکوہ نہیں کرتا' بلکہ اللہ تعالی کا شکر ادا کرتا ہے کہ اس نے اسے فقیر بنایا' اور کسی کو فقر کے ذریعے عذاب دیا جاتا ہے تو اس کی علامات یہ ہوتی ہیں کہ وہ بد خلق' اور تند خو ہو جاتا ہے' اپنے رب کی اطاعت ترک کرکے اس کی نافرمانی کرتا ہے' اپنی حال پر شکوہ کرتا ہے' اللہ تعالی کے فیصلے پر اپنی ناراضگی اور ناپسندیدگی کا اظہار کرتا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر فقیر اچھا نہیں ہوتا' بلکہ صرف وہ فقیر قابل تعریف ہوتا ہے جو اپنے فقر پر ناراض نہ ہو' بلکہ خوش ہو اور اس کے ثمرات پر مطمئن ہو۔ یہ قول مشہور ہے کہ جب بندے کو دنیا کی کوئی چیز عطا کی جاتی ہے تو اس سے کہا جاتا ہے کہ اسے تین باتوں کے ساتھ قبول کر' مصروفیت' فکر و تردد' اور طول حساب۔

ظاہری آداب

فقیر کو جن ظاہری آداب کی رعایت کرنی چاہئیں وہ یہ ہیں کہ کسی کے سامنے دست سوال دراز نہ کرے' اپنے ظاہر کو اچھا رکھے تاکہ لوگ ضرورت مند تصور نہ کریں' کسی سے اپنے حال کی شکایت نہ کرے' نہ اپنے افلاس کا مظاہرہ کرے بلکہ جہاں تک ممکن ہو اسے پوشیدہ رکھے' اور یہ بات بھی چھپائے کہ میں اپنا فقر پوشیدہ رکھتا ہوں۔ حدیث شریف میں ہے :-

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْفَقِيْرَ الْمُتَعَفِّفَ اَبَا الْعِيَالِ۔

اللہ تعالی سوال نہ کرنے والے عیالدار فقیر کو دوست رکھتا ہے۔

ایسے لوگوں کے بارے میں اللہ تعالی کا ارشاد ہے :-

يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَاءَ مِنَ التَّعَفُّفِ۔

(پ ۳ ر ۵ آیت ۲۷۳)

ناواقف ان کو تونگر خیال کرتا ہے ان کے سوال سے بچنے کی وجہ سے۔

حضرت سفیان ثوری ارشاد فرماتے ہیں کہ بہترین عمل احتیاج کی حالت میں تحمل ہے' ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ فقر کی پردہ پوشی کرنا نیکی کا خزانہ ہے' اعمال میں ادب یہ ہے کہ کسی مالدار کے سامنے اس لئے تواضع اور عاجزی نہ کرے کہ وہ صاحب ثروت ہے' بلکہ اس سے اکڑ کر رہے' حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا ارشاد ہے کہ فقیر کے لئے ثواب کی رغبت سے مالدار کا متواضع ہونا بہت عمدہ ہے' اور اس سے بھی عمدہ تر بات یہ ہے کہ فقیر غنی پر اللہ کے فضل پر بھروسہ رکھتے ہوئے تکبر کرے۔ فقیر کا اگر یہ حال ہو تو یہ ایک بلند درجہ ہے' لیکن اس کا کم سے کم درجہ یہ ہے کہ نہ اغنیاء کے پاس بیٹھے' اور نہ انہیں اپنے پاس بٹھانے کی آرزو کرے' طمع و

حرص کے مبادی یہی چیزیں ہیں' حضرت سفیان ثوری ارشاد فرماتے ہیں اگر فقیر مالداروں سے ملاقات کے لئے جائے تو سمجھو کہ وہ ریا کار ہے' اور بادشاہوں کے پاس جائے تو سمجھو کہ وہ چور ہے۔ ایک بزرگ کا قول ہے کہ جب فقیر اغنیاء کی ہم نشینی اختیار کرتا ہے تو اس کا اعتماد مجروح ہو جاتا ہے' اور جب ان سے لالچ کرنے لگتا ہے تو آبرو کھو دیتا ہے' اور جب انہی میں بود و باش اختیار کرلیتا ہے تو گمراہ ہو جاتا ہے' فقیر کو چاہیے کہ وہ مالداروں کی خوشامد میں یا ان کے عطایا کی خاطر حق کہنے سے باز نہ رہے' بلکہ جو بات حق ہو وہی کہے' خواہ تمام دولتمند ناراض ہو جائیں' یہ بھی اعمال ہی کا ادب ہے کہ فقر کے باعث عبادت میں سستی نہ کرے' اور اگر کچھ مال بچ جائے تو اسے خرچ کرنے سے دریغ نہ کرے' کیوں کہ غریب کا صدقہ یہی ہے' اور اسے اس معمولی صدقہ کا جس قدر اجر و ثواب ملتا ہے اس قدر ثواب مالداروں کو بہت سا مال خرچ کرنے میں نہیں ملتا۔ حضرت زید ابن اسلمؓ روایت کرتے ہیں' رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا : صدقہ کا ایک درہم اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایک لاکھ درہموں سے افضل ہے' صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ کس طرح؟ فرمایا ایک شخص اپنے وسیع خزانے سے ایک لاکھ درہم نکالتا ہے' اور خیرات کرتا ہے' دوسرا شخص اپنے دو درہموں میں سے اک درہم خرچ کرتا ہے' اس کی ملکیت میں صرف یہی دو درہم ہیں' اور خوشی خوشی ان میں سے ایک صدقہ کر دیتا ہے' یہ ایک درہم والا شخص ایک لاکھ درہم والے سے بہتر ہے۔ (۱) فقیر کو چاہیے کہ وہ مال ذخیرہ نہ کرے' اول ضرورت سے زائد مال نہ لے' اگر مل جائے تو اسے اٹھا کر نہ رکھے' بلکہ صدقہ کردے۔

ذخیرہ کرنے کے تین درجے : پھر ذخیرہ کرنے کے بھی تین درجے ہیں' ایک درجہ تو یہ ہے کہ ایک دن اور ایک رات کے لئے بھی ذخیرہ نہ کرے' یہ صدیقین کا درجہ ہے' دوسرا درجہ یہ ہے کہ چالیس روز کے لئے ذخیرہ کرے' اس کے بعد کی مدّت طول امل میں داخل ہے۔ علماء نے چالیس دن کی مدّت کا تعین حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعے کی روشنی میں کیا ہے' اللہ تعالیٰ نے آپ کے لئے چالیس دن کی مدّت متعین کی' اس سے علماء نے یہ مفہوم نکالا ہے کہ چالیس دن تک زندہ رہنے کی توقع کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے' یہ متقین کا درجہ ہے' اور تیسرا درجہ یہ ہے کہ ایک سال کے لئے ذخیرہ کرے یہ صالحین کا درجہ ہے' اور ادنیٰ درجہ ہے' ایک سال سے زیادہ عرصے کے لئے ذخیرہ کرنے والا عوام میں داخل ہے' خواص سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے' صلحاء کی غنا یہ ہے کہ وہ ایک سال کی مدّت کے لئے ذخیرہ کرلیں' اور خواص کی غنا یہ ہے کہ وہ چالیس دن کے لئے ذخیرہ کرلیں' خواص میں جو لوگ انتہائی خاص ہیں ان کی غنا ایک دن ایک رات کے ذخیرے میں ہے۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ازواج مطہرات میں غذا اسی طرح تقسیم فرمایا کرتے تھے' بعض ازدواج مطہرات کو سال بھر کی غذا عطا فرماتے تھے' بعض کو چالیس دن کی اور بعض کو ایک دن ایک رات کی' ایک دن ایک رات کی غذا جن ازواج مطہرات کو ملا کرتی تھی وہ ہیں حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ

بلا طلب عطایا قبول کرنے میں فقیر کے آداب اگر فقیر کے پاس کہیں سے کوئی ہدیہ وغیرہ آئے تو اسے چاہیے کہ وہ قبول کرنے سے پہلے تین امور پر توجہ دے' ایک یہ کہ نفس مال کیسا ہے' دوسرے یہ کہ دینے والے کا مقصد کیا ہے' تیسرے یہ کہ لینے والے کی غرض کیا ہے۔ نفس مال پر توجہ دینے کا مطلب یہ دیکھنا ہے کہ وہ مال حلال ذرائع سے حاصل کیا ہوا ہے یا نہیں' اور تمام شبہات سے خالی ہے یا نہیں' اگر یقین ہو کہ مال جائز ہے' اور ہر طرح کے شبہات سے خالی ہے تو قبول کرلے' ورنہ لینے سے منع کردے' کتاب الحلال والحرام میں ہم اس موضوع پر تفصیل سے لکھ چکے ہیں۔

معطی کی اغراض مال دینے والے کی کئی اغراض ہو سکتی ہیں' ہو سکتا ہے اس نے محض فقیر کا دل خوش کرنے اور اس کی محبت حاصل کرنے کے لئے کچھ دیا ہو' یہ ہدیہ ہے' یا بہ نیت ثواب دیا ہو یہ صدقہ اور زکوٰۃ ہے' یا شہرت' ناموری اور ریاکاری کے

(۱) یہ روایت کتاب الزکوٰۃ میں بھی گذری ہے۔

لئے دیا ہو، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دینے والے کا مقصد محض ریا ہو، اور یہ بھی ممکن ہے کہ ریا کاری کے ساتھ اس کی دوسری اغراض بھی ہوں۔

ہدیہ جہاں تک ہدیے کا سوال ہے، اس کے قبول کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، ہدیہ قبول کرنا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت طیبہ ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ ہدیہ دینے میں احسان کا پہلو پیش نظر نہ ہو، اگر یہ معلوم ہو جائے کہ ہدیے کے بعض اجزاء میں احسان ہے تو اس قدر اجزاء واپس کر دے باقی قبول کر لے، چنانچہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں گھی، پنیر اور مینڈھا ہدیہ میں پیش کیا گیا، آپ نے گھی اور پنیر رکھ لیا، اور مینڈھا واپس کر دیا (احمد۔ یعلی ابن مرۃ)۔ اسی طرح سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ بھی منقول ہے کہ آپ بعض لوگوں کے ہدایا قبول کر لیتے تھے اور بعض لوگوں کے ہدایا واپس فرما دیا کرتے تھے (ابوداؤد، ترمذی۔ ابو ہریرہ) ایک حدیث میں ہے آپ نے ارشاد فرمایا :۔

لَقَدْ هَمَمْتُ أَنْ لَا أَتَّهِبَ إِلَّا مِنْ قُرَشِيٍّ أَوْ ثَقَفِيٍّ أَوْ أَنْصَارِيٍّ أَوْ دَوْسِيٍّ۔
(ترمذی۔ ابو ہریرہ)

میں نے ارادہ کیا ہے کہ میں قرشی، ثقفی، انصاری اور دوسی کے علاوہ کسی سے ہدیہ نہ لوں۔

بعض تابعین کا بھی یہی معمول رہا ہے، چنانچہ فتح موصلی کے پاس ایک تھیلی آئی جس میں پچاس درہم تھے آپ نے فرمایا، ہم سے عطاء نے حدیث بیان کی ہے، وہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں، آپ نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص کے پاس بغیر مانگے رزق آئے، اور وہ اسے لوٹا دے تو گویا اللہ کو لوٹاتا ہے (۱) اس کے بعد آپ نے تھیلی لی، اس میں سے ایک درہم نکال کر رکھا، باقی درہم واپس کر دیے۔ حضرت حسن بصریؒ بھی یہ روایت بیان فرماتے تھے، لیکن ایک مرتبہ کسی شخص نے ان کی خدمت میں ایک تھیلی، اور خراسان کے بنے ہوئے باریک کپڑوں کا ایک تھان پیش کیا، آپ نے اس شخص کا یہ ہدیہ لوٹا دیا اور فرمایا جو شخص میری جگہ بیٹھے اور اس طرح کے ہدایا قبول کرے، وہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملاقات کرے گا کہ اس کے پاس برائے نام بھی اجر و ثواب نہ ہو گا۔ حضرت حسنؒ کے اس ارشاد سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عطایا قبول کرنے کے باب میں عالم اور واعظ کا معاملہ سخت تر ہے۔ حضرت حسن اپنے رفقاء کے ہدایا قبول کر لیا کرتے تھے، اسی طرح حضرت ابراہیم التیمی اپنے ساتھیوں سے ایک درہم یا دو درہم مانگ لیا کرتے تھے، لیکن اگر کوئی دوسرا شخص انہیں سیکڑوں درہم دیتا تو قبول نہ کرتے۔ بعض حضرات کا معمول یہ تھا کہ اگر کوئی دوست انہیں کچھ دیتا تو وہ اس سے فرماتے کہ یہ چیز اپنے پاس رکھو اور یہ دیکھو کہ اب تمہارے دل میں میرے لئے کیا جگہ ہے۔ اگر میں تمہارے نزدیک پہلے سے افضل ہوں تو مجھ سے کہہ دینا میں تمہارا ہدیہ قبول کر لوں گا، ورنہ انکار کر دوں گا، اور اس کی علامت یہ ہے کہ دینے والے پر ہدیہ واپس کر دینا گراں گذرے، اور قبول کرنے پر خوش ہو، اور اسے اپنے اوپر احسان تصور کرے، اگر ہدیہ لینے والے کو یہ علم ہو جائے کہ اس میں کسی قدر احسان کی آمیزش بھی ہے تو ہدیہ قبول کرنا مباح ہے، لیکن فقرائے صالحین کے نزدیک اس طرح کے ہدایا قبول کرنے میں کراہت ہے۔ حضرت بشرؒ فرماتے ہیں کہ میں نے سری سقطی کے علاوہ کسی سے کچھ نہیں مانگا، سری سقطی سے بھی اس لئے مانگا کہ میرے نزدیک ان کا زہد صحیح ہے، اگر کوئی چیز ان کے پاس سے چلی جاتی تھی تو اس پر خوش ہوتے تھے، اور باقی رہتی تھی تو بددل رہا کرتے تھے، چنانچہ وہ جس بات کو پسند کرتے تھے میں اس پر ان کی مدد کرتا تھا، ایک خراسانی کچھ مال لے کر حضرت جنید بغدادی کے پاس آیا، اور ان سے درخواست کی کہ آپ اسے اپنے اوپر خرچ کریں، حضرت جنید نے فرمایا فقراء میں تقسیم کر دوں گا۔ انہوں نے فرمایا میں یہ نہیں چاہتا کہ آپ فقراء میں تقسیم کریں، آپ نے فرمایا میں کب تک زندہ رہوں گا کہ اس مال کو اپنے اوپر صرف کروں اس نے کہا میں یہ کب کہتا ہوں کہ آپ یہ مال سبزی اور سرکے میں خرچ کریں بلکہ مٹھائی اور عمدہ عمدہ چیزوں میں صرف کریں، حضرت جنید نے خراسانی کا ہدیہ قبول کر لیا، خراسانی نے کہا بغداد میں

(۱) یہ روایت ان الفاظ میں نہیں ملی

آپ سے زیادہ کسی نے مجھ پر احسان نہیں کیا' آپ نے فرمایا تیرے ہی جیسے شخص کے ہدایا قبول کرنے چاہئیں۔

صدقہ و زکواۃ معطی کی ایک غرض یہ ہو سکتی ہے کہ وہ ثواب کے لئے کچھ دے' ایسا مال صدقہ ہے یا زکواۃ ہے' اگر کوئی شخص کسی فقیر کو اس طرح کا مال دیتا ہے تو اسے اپنے نفس کی صفات پر نظر ڈالنی چاہیے کہ وہ زکواۃ کا مستحق ہے یا نہیں' اگر استحقاق یقینی ہے تو کوئی مضائقہ نہیں' اور مشتبہ ہے تو یہ صورت محل شبہ میں ہے اس کے احکام ہم کتب الزکواۃ میں بیان کر چکے ہیں' اور اگر وہ مال صدقہ ہو' اور دینے والا اس کے تدین کے پیش نظر دے رہا ہو تو فقیر کو اپنے باطن کی طرف دیکھنا چاہیے' اگر وہ چھپ کر کوئی ایسا گناہ کرتا ہے جس کے بارے میں اسے یہ یقین ہو کہ اس گناہ کا علم معطی کو ہو جائے تو وہ اس سے نفرت کرنے لگے' اور اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرنے کے لئے اسے صدقات نہ دے' اگر ایسا ہو تو یہ صدقہ قبول کرنا حرام ہے یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص کسی کو عالم' یا علوی سمجھ کر کچھ دے اور وہ ایسا نہ ہو' اس صورت میں اگر وہ ہدیہ قبول کرے گا تو یہ جائز نہ ہوگا۔

طلب شہرت اور ریا کاری معطی کی ایک غرض یہ ہو سکتی ہے کہ وہ طلب شہرت' ناموری اور ریا کاری کے لئے کسی کو کچھ دے' اس صورت میں فقیر کو چاہیے کہ اس کا دیا ہوا مال واپس کر دے اور اسے اس کے غلط مقصد میں کامیاب نہ ہونے دے' اگر قبول کرے گا تو اس کی غرض فاسد پر مددگار ہونا لازم آئے گا' حضرت سفیان ثوری کی خدمت میں اگر کوئی ہدیہ پیش کیا جاتا تو آپ اسے واپس کر دیتے اور فرماتے اگر مجھے یہ علم ہو تا کہ دینے والے اپنے عطایا کا تذکرہ بطور فخر نہیں کرتے ہیں تو میں قبول کر لیتا۔ ایک بزرگ کا یہی معمول تھا' بعض لوگوں نے انہیں ملامت کی' اور ان کے اس فعل کو اچھا نہیں سمجھا کہ وہ خلوص سے دیے گئے ہدایا رد کر دیتے ہیں' انہوں نے جواب دیا کہ میں دینے والوں پر منفعت اور ان سے تعلق خاطر کی بنا پر ایسا کرتا ہوں کیوں کہ وہ مال دے کر ذکر کر دیتے ہیں اس طرح ان کا اجر و ثواب ضائع چلا جاتا ہے' میں نہیں چاہتا کہ ان کا مال ضائع ہو۔

لینے والے کی اغراض لینے والے کو بھی اپنی اغراض پر نظر رکھنی چاہیے' اگر کوئی شخص کچھ دے تو لینے سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ اس کا محتاج ہے یا نہیں' اگر وہ اس کا محتاج ہو اور ان شبہات و آفات سے خالی ہو جن کا ذکر ابھی ہوا ہے تو اس کا قبول کرنا بہتر ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

مَا الْمُعْطِي مِنْ سَعَةٍ بِأَعْظَمَ أَجْرًا مِنَ الْآخِذِ إِذَا كَانَ مُحْتَاجًا۔

(طبرانی۔ ابن عمرؓ)

دینے والا وسعت کے باوجود لینے والے سے زیادہ اجر والا نہیں ہے اگر وہ محتاج ہو۔

ایک حدیث میں فرمایا:

مَنْ أَتَاهُ شَيْءٌ مِنْ هٰذَا الْمَالِ مِنْ غَيْرِ مَسْأَلَةٍ وَلَا اِسْتِشْرَافٍ فَإِنَّمَا هُوَ رِزْقٌ سَاقَهُ اللّٰهُ إِلَيْهِ (ابو یعلی۔ طبرانی۔ خالد ابن عدیؓ)

جس شخص کے پاس اس مال میں سے بغیر سوال اور بلا انتظار کے کچھ آئے تو وہ رزق ہے جسے اللہ نے اس کی طرف بھیجا ہے۔

ایک روایت میں ہے کہ اسے واپس نہ کرے۔ بعض علماء کہتے ہیں اگر کسی کو کچھ دیا جائے اور وہ نہ لے تو ایک وقت ایسا آئے گا کہ وہ سوال کرے گا اور اسے دیا نہ جائے گا۔ سری سقطیؒ حضرت امام احمدؒ کے پاس ہدایا بھیجا کرتے تھے' ایک مرتبہ کوئی ہدیہ بھیجا تو انہوں نے واپس کر دیا' سری سقطیؒ نے ان سے فرمایا اے احمد! ہدیہ رد کرنے کی آفت سے ڈرو' یہ قبول کرنے کی آفت سے سخت تر ہے' امام صاحب نے فرمایا آپ دوبارہ کہیں' سری سقطی نے یہ بات پھر دوہرائی' امام صاحب نے فرمایا کہ میں نے آپ کا ہدیہ اس لئے واپس کر دیا تھا کہ میرے پاس ایک ماہ کے بقدر غذا موجود تھی' آپ اسے اپنے پاس رہنے دیں' مجھے ابھی اس کی ضرورت نہیں ہے' ایک ماہ بعد بھیج دینا' بعض علماء کہتے ہیں کہ ضرورت کے باوجود آیا ہوا مال واپس کر دینے میں اس کا خطرہ ہے کہ کہیں حرص

میں یا مشتبہات میں جتلا نہ کردیا جائے۔

اگر کسی کو ضرورت سے زائد مال مل رہا ہے تو وہ دو حال سے خالی نہیں ہے' یا تو وہ خود اپنے حال میں مشغول ہو' یا فقراء کا کفیل اور ان کے اخراجات کا ذمہ دار ہو' اور اسے اپنی نرم مزاجی اور سخاوت کی بنا پر ضرورت مندوں پر خرچ کرتا ہو' پہلی صورت میں کچھ لینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا بشرطیکہ آخرت کا طالب' اور اس کی راہ کا مسافر ہو' اس لئے کہ اس صورت میں کچھ لینا محض خواہش نفس کی اتباع ہے' اور جو عمل اللہ کے لئے نہیں ہوتا وہ شیطان کے لئے ہوتا ہے۔ پھر اس لینے کی بھی دو صورتیں ہیں' ایک تو یہ کہ اعلانیہ لے لے' اور خفیہ طور پر واپس کردے' یا پوشیدہ طور پر فقراء میں تقسیم کردے یہ صدیقین کا مقام ہے' اور نفس پر انتہائی شاق ہے' صرف وہی لوگ ایسا کرسکتے ہیں جن کے قلوب ریاضت پر مطمئن ہوں' دوسری صورت یہ ہے کہ نہ لے' تاکہ مالک کسی دوسرے ضرورت مند کو دیدے' یا خود لے کر کسی ایسے شخص کو دیدے جو اس سے زیادہ ضرورت مند ہو' یہ دونوں کام یا تو اعلانیہ کرے' یا پوشیدہ طور پر کرے۔ کتاب اسرار الزکوٰۃ میں ہم نے اس سلسلے کے کچھ احکام بیان کئے ہیں' وہاں یہ موضوع بھی زیر بحث آیا ہے کہ اس صورت میں اظہار افضل ہے یا اخفاء۔ وہاں فقر کے کچھ احکام لکھے گئے ہیں' وہ بھی دیکھ لئے جائیں۔

حضرت امام احمد ابن حنبلؒ نے سری سقطیؒ کا ہدیہ واپس کردیا' اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ انہیں اس کی ضرورت نہیں تھی کیوں کہ ایک ماہ کی غذا ان کے پاس موجود تھی' انہوں نے اپنے لئے یہ صورت پسند نہیں کی کہ وہ یہ ہدیہ قبول کرلیں' اور پھر دوسرے مستحقین کو دیدیں' کیوں کہ اس میں بہت سے خطرات اور آفات تھیں' جب کہ ورع کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی آفات کے امکانات سے بھی احتراز کرے' اگر یہ خیال ہو کہ وہ شیطان سے اپنی حفاظت نہیں کرسکتا' اور شیطان سے بچنا بڑا دشوار ہے۔ مکہ مکرمہ کے ایک مجاور کہتے ہیں کہ میرے پاس چند دراہم تھے' جو میں نے اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کے لئے محفوظ کر رکھے تھے۔ ایک دن میں طواف کررہا تھا کہ ایک فقیر کی آواز آئی' وہ طواف سے فارغ ہو کر آہستہ آہستہ یہ کہہ رہا تھا اے اللہ تو دیکھ رہا ہے میں بھوکا ہوں' تو دیکھ رہا ہے میں ننگا ہوں' اس صورت حال میں تجھے کیا منظور ہے' اے اللہ! تو میرے بارے میں سب کچھ جانتا ہے' مگر نظرانداز کرتا ہے' راوی کہتے ہیں میں نے اس پر نظر ڈالی اس کے جسم پر پھٹے پرانے کپڑے تھے جن سے جسم بھی نہیں چھپتا تھا' میں نے اپنے دل میں سوچا کہ مجھے ان دراہم کو خرچ کرنے کے لئے جو میرے پاس ہیں اس سے بہتر موقع نہیں مل سکتا' چنانچہ میں نے وہ تمام دراہم اس کے سامنے پیش کردیے' اس نے پانچ درہم اٹھالئے اور کہنے لگا کہ یہ چار درہم لباس کے لئے کافی ہیں' اور ایک درہم سے تین دن تک کھانا پینا ہو جائے گا' باقی کی مجھے ضرورت نہیں ہے' چنانچہ وہ درہم اس نے مجھے واپس کردیے' دوسری شب میں نے اسے دیکھا اس کے بدن پر دو نئی چادریں تھیں' اس وقت میرے دل میں اس کی طرف سے کچھ بدگمانی پیدا ہوئی' اچانک وہ شخص میری طرف متوجہ ہوا اور میرا ہاتھ پکڑ کر طواف کرنے لگا' اسی حالت میں ہم نے سات طواف کئے' ہمارا ہر طواف زمین کے مختلف جواہر میں سے ایک جوہر پر ہوتا تھا' اور وہ جوہر ہمارے پاؤں سے ٹخنوں تک آجاتا تھا' چنانچہ ہم سونے' چاندی' یاقوت' موتی اور گو وغیرہ پر سے گزرے کہ دوسرے لوگوں کو پتا بھی نہیں چل سکا۔ پھر کہنے لگا یہ تمام خزانے اللہ تعالیٰ نے مجھے عطا کئے ہیں' لیکن میں ان میں زہد کرتا ہوں' اور مخلوق کے ہاتھوں سے لینا پسند کرتا ہوں' یہ خزانے بوجھ ہیں' اور فتنہ ہیں' جب کہ لوگوں کے ذریعہ پہنچنے والا مال رحمت اور نعمت ہے' اس پوری تفصیل کا حاصل یہ ہے کہ اگر تمہیں ضرورت سے زیادہ کوئی چیز ملتی ہے تو وہ تمہارے لئے فتنہ اور ابتلاء ہے' اللہ تعالیٰ تمہیں زائد از ضرورت مال دے کر یہ دیکھتا ہے کہ تم اس میں کیا کرتے ہو' اور جو مال مقدار ضرورت کے مطابق ملتا ہے وہ رزق ہے' تمہیں رزق اور ابتلاء کے فرق سے غفلت نہ کرنی چاہیے' اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :-

اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا۔

(پ ۱۵ ر ۱۳ آیت ۷)

ہم نے زمین کی چیزوں کو اس لئے باعث رونق بنایا تاکہ ہم لوگوں کی آزمائش کریں کہ ان میں زیادہ اچھا عمل کون کرتا ہے۔

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں :۔

لَاحَقَّ لِابْنِ آدَمَ اِلَّا فِی ثَلٰثٍ طَعَامٍ يُقِيْمُ صُلْبَهُ وَثَوْبٍ يُوَارِيْ عَوْرَتَهُ وَبَيْتٍ يُكِنُّهُ فَمَا زَادَ فَهُوَ حِسَابٌ۔ (ترمذی۔ عثمان ابن عفانؓ)

ابن آدم کا حق صرف تین چیزوں میں ہے' اتنا کھانا جس سے کمر سیدھی رہ سکے' اتنا کپڑا جس سے ستر عورت ہو اور ایسا گھر جس میں سکونت اختیار کرے' اس سے زائد کا محاسبہ ہوگا۔

ان نصوص کا مطلب یہ ہے کہ اگر آدمی ان تینوں چیزوں میں سے بقدر ضرورت لے گا تو ثواب پائے گا' اور زیادہ لینے کی صورت میں اگر اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کرتا تو اپنے آپ کو حساب کے لئے پیش کرتا ہے' اور نافرمانی کرتا ہے تو سزا کا مستحق قرار دیتا ہے' امتحان اور آزمائش کی ایک صورت یہ ہے کہ آدمی اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور اس کے تقرّب کے لئے کوئی لذت ترک کرے' اس کا عزم مصمم کرے' اور اپنے نفس کو توڑ ڈالے' پھر وہ لذت بلا طلب' صاف' بے کدورت اس کے پاس آئے تاکہ اس کی عقل کا امتحان لیا جاسکے۔ اس صورت میں بہتر یہی ہے کہ اس لذت سے باز رہے' اس لئے کہ اگر اس نے اپنے نفس کو عہد شکنی کی اجازت دی تو وہ عہد شکنیوں کا عادی بن جائے گا' پھر اسے دبانا مشکل ہو جائے گا' اس لئے بہتر یہی ہے کہ ایسی لذت کو اپنے سے دور کر دے' یہی زہد ہے' اور غایت زہد یہ ہے کہ وہ لذت لے کر کسی محتاج کو دیدے' لیکن اس پر صرف صدیقین ہی قادر ہیں' لیکن اگر کسی شخص کی طبیعت میں جود و سخاء ہو' اور وہ فقراء کے حقوق ادا کرتا ہو' صلحاء کی جماعت کے طعام وغیرہ کا متکفل ہو تو اپنی ضرورت سے زائد بھی لے سکتا ہے یہ اگرچہ اس کی ضرورت سے زائد ہوگا لیکن ان فقراء کی ضرورت سے زائد نہیں ہوگا جن کا وہ کفیل ہے' تاہم اس صورت میں مال لے کر خرچ کرنے میں سبقت کرنی چاہیے' اسے بچا کر نہ رکھے' ایک رات کے لئے بھی اپنے پاس مال روکنا فتنے کا باعث بن سکتا ہے اور آزمائش میں ڈال سکتا ہے' شاید دل میں یہ خیال پیدا ہو جائے کہ اس مال کو اپنے پاس رکھنا چاہیے' خرچ نہ کرنا چاہیے' بعض لوگوں نے ابتداءً یہ عہد کیا کہ وہ فقراء کی خدمت کریں گے' اور ان کے اخراجات کا تکفل کریں گے' لیکن بعد میں انہوں نے اسے اپنی معیشت' رہن سہن' اور کھانے پینے میں توسع کا وسیلہ بنا لیا' اور ہلاکت کے راستہ پر چل پڑے' جس شخص کا مقصد رفق اور اس کے ذریعے اجر و ثواب کی طلب ہو وہ اللہ کے ساتھ حسن ظن رکھتے ہوئے قرض بھی لے سکتا ہے' بس شرط یہ ہے کہ وہ اس سلسلے میں ظالم بادشاہوں پر بھروسہ نہ کرے' بعد میں اگر اللہ تعالیٰ اسے حلال رزق عطا کر دے تو وہ قرض اس میں سے ادا کرے' اور اگر ادائیگی سے پہلے مرجائے تو اللہ تعالیٰ اس کی طرف سے ادا کر دے گا' اور اس کے قرض خواہ کو راضی کردے گا' بشرطیکہ وہ اپنے قرض خواہ کی نظر میں کھلی کتاب کی طرح ہو' قرض لینے کے لئے انہیں فریب نہ دے' اور نہ جھوٹے وعدے کرے' بلکہ اپنا حال من و عن بیان کردے' تاکہ قرض دینے والے سوچ سمجھ کر اقدام کریں' ایسے شخص کے قرض کی ادائیگی بیت المال کے ذمے ہے' اور وہ زکوٰۃ کے اموال سے بھی ادا کیا جاسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :۔

وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهُ فَلْيُنْفِقْ مِمَّا آتَاهُ اللّٰهُ
(پ ۲۸ ر ۱۷ آیت ۷)

اور جس کی آمدنی کم ہو اس کو چاہیے کہ اللہ نے جتنا اس کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرے۔

اس آیت کی تفسیر میں بعض علماء یہ کہتے ہیں کہ اپنے کپڑے فروخت کردے' اور بعض یہ کہتے ہیں کہ اپنے اعتماد پر قرض حاصل کرے' قرض بھی اللہ تعالیٰ ہی کا عطیہ ہے۔ ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے بعض بندے اپنے مال کے مطابق خرچ کرتے ہیں' اور بعض ایسے بھی ہیں جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنے حسن ظن کے مطابق صرف کرتے ہیں۔ ایک بزرگ نے مرنے سے پہلے یہ وصیت فرمائی کہ ان کا مال اقویاء' اسخیاء اور اغنیاء میں تقسیم کردیا جائے' لوگوں نے سوال کیا' یہ کون لوگ ہیں؟ فرمایا اقویاء سے مراد وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ پر توکّل کرتے ہیں' اسخیاء سے مراد وہ لوگ ہیں جو اللہ پر حسن ظن رکھتے ہیں' اور اغنیاء وہ ہیں جو صرف اللہ کے ہو کر رہ گئے ہیں۔

یہ ہیں ہدایا اور صدقات وغیرہ قبول کرنے کی شرائط' دینے والے اور لینے والے کے آداب' اور مال کی مقدار۔ یہاں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ جو مال ملے اسے یہ نہ سمجھے کہ معطی نے دیا ہے' بلکہ یہ سمجھے کہ اس مال کا عطا کرنے والا اللہ ہے' معطی صرف واسطہ ہے' اور دینے کے لئے مسخر کیا گیا ہے' کیوں کہ اس پر دواعی' ارادے اور اعتقادات مسلط کئے گئے ہیں اس لئے وہ دینے پر مجبور ہے' حضرت شقیق بلخیؒ کا واقعہ ہے' کسی شخص نے ان کو ان کے پچاس رفقاء سمیت کھانے پر مدعو کیا' اور عمدہ عمدہ کھانے بنوائے' اور دعوت کا زبردست اہتمام کیا' جب تمام مہمان دستر خوان پر بیٹھ گئے' اور کھانا چن دیا گیا تو شقیق بلخیؒ نے اپنے مریدین سے فرمایا کہ جس شخص نے دعوت کی ہے اس کا خیال یہ ہے کہ کھانا میں نے تیار کیا ہے' اور میں نے سامنے رکھا ہے' جو شخص میرے اس خیال سے اتفاق نہیں کرتا اس کے لئے میرا کھانا حرام ہے' یہ سن کر ان کے تمام مریدین کھانا چھوڑ کر چلے گئے' صرف ایک نوجوان باقی رہ گیا جو درجے میں ان سے کم تھا' میزبان نے شقیق سے دریافت کیا کہ آپ نے ایسا کیوں کیا' انہوں نے کہا کہ میں رفقاء کی توحید کا امتحان کرنا چاہتا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کیا' یا اللہ! آپ نے میرا رزق بنی اسرائیل کے ہاتھوں میں کردیا ہے' آج یہ کھلا رہا ہے' کل وہ کھلا رہا ہے' صبح ایک شخص کے یہاں کھاتا ہوں' شام کو دوسرے شخص کے یہاں۔ اللہ تعالیٰ نے وحی نازل فرمائی کہ میں اپنے دوستوں کے ساتھ ایسا ہی کرتا ہوں میں اپنے بندوں میں سے خراب لوگوں کے ذریعے انہیں رزق بہم پہنچاتا ہوں تاکہ اس بہانے انہیں ثواب حاصل ہو جائے۔ بہرحال اگر کسی فقیر کو اللہ کے کسی بندے کے ذریعہ کچھ ملے تو اسے بندے کی عطا نہ سمجھے' بلکہ یہ اعتقاد کرے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کام کے لئے اسے مسخر کیا ہے۔

بلا ضرورت سوال کی حرمت اور سوال کے سلسلے میں فقیر مضطر کے آداب

جاننا چاہیے کہ سوال کے سلسلے میں بہت سی روایات ایسی وارد ہیں جن میں سختی کے ساتھ کسی کے سامنے دست سوال دراز کرنے سے منع کیا گیا ہے' دوسری طرف بعض احادیث ایسی بھی وارد ہیں جن میں سوال کی اجازت ہے۔ چنانچہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں :۔

لِلسَّائِلِ حَقٌّ وَلَوْ جَاءَ عَلٰى فَرَسٍ۔ (ابوداؤد۔ حسین ابن علیؓ)

مانگنے والے کا ایک حق ہے اگرچہ وہ گھوڑے پر سوار ہو کر آئے۔

ایک جگہ ارشاد فرمایا :۔

رُدُّوا السَّائِلَ وَلَوْ بِظِلْفٍ مُحْتَرَقٍ۔ (ابوداؤد' ترمذی' نسائی۔ ام عبدؓ)

سائل کو ہٹاؤ اگرچہ جلی ہوئی لکڑی دے کر ہٹانا پڑے۔

ان دونوں روایتوں سے اجازت ثابت ہوتی ہے' اس لئے کہ اگر سوال مطلقاً حرام ہوتا تو دینے والے کو ہرگز دینے کی اجازت نہ دی جاتی کیوں کہ حرمت پر اعانت بھی حرام ہے' اس سے ثابت ہوا کہ سوال اصلاً حرام ہے' صرف ضرورت' یا اہم حاجت کی بنا پر اس کی اجازت دی گئی ہے اگر سوال کے بغیر کام چل سکتا ہو تو سوال کرنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ سوال کے اصلاً حرام ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس میں تین باتیں حرام ہوتی ہیں' اول اللہ تعالیٰ کی شکایت کرنا' کیونکہ سوال کا مطلب یہ ہے کہ سائل مسئول کے سامنے اپنے فقر کا اظہار کرتا ہے' اور یہ شکایت کرتا ہے کہ مجھ پر اللہ کی نعمتیں نہایت کم ہیں' جس طرح کوئی غلام اپنے آقا کے علاوہ کسی دوسرے شخص سے کچھ مانگتا ہے تو یہ اس کے آقا کی توہین ہوتی ہے' اسی طرح بندہ کا اپنے مولیٰ کے علاوہ کسی دوسرے کے سامنے ہاتھ پھیلانا بھی باری تعالیٰ کی بے ادبی ہے' ظاہر ہے یہ حرام ہے' اور صرف ضرورت کے وقت اس کی اجازت دی جاسکتی ہے' ضرورت کے وقت تو مردار بھی حلال ہے' دوسرے یہ کہ مانگنے میں سائل کا اپنے نفس کو ذلیل کرنا ہے' اور کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں کہ وہ اپنے نفس کو غیر اللہ کے سامنے ذلیل کرے' بلکہ اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ صرف اللہ تعالیٰ کے سامنے ذلیل اور رسوا ہو' اسی میں اس کی عزت ہے' باقی تمام افراد انسانی اسی کی طرح بندگان خدا ہیں' اس لئے ان کے سامنے بلا ضرورت خود کو ذلیل کرنا جائز نہیں سوال کرنے میں سائل کے لئے مسئول کے مقابلے میں جو ذلت ہے وہ کسی پر مخفی نہیں ہے' تیسرے یہ کہ سوال کرنے سے بعض اوقات مسئول کو تکلیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے' ضروری نہیں کہ سائل مسئول کے سامنے ضرورت رکھے تو وہ

بخوشی اس کی ضرورت پوری کرنے کے لئے تیار ہو جائے ہو سکتا ہے وہ دل سے نہ چاہتا ہو' اور سائل کی شرم' خوف یا اپنی ریا کی وجہ سے دینے پر مجبور ہو جائے' اس صورت میں اگر مسئول نے کچھ دیا تو وہ حرام ہے' نہ دینے کی صورت میں اسے ندامت ہوتی ہے' اور وہ اپنے دل میں یہ سوچ کر اذیت محسوس کرتا ہے کہ خواہ مخواہ اسے بخیل کہا جائے گا' اس بچارے کو دینے میں مال کا نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے' اور نہ دینے میں جاہ کا۔ دونوں ہی صورتیں تکلیف کا باعث ہیں اور کسی مسلمان کو بلا ضرورت ایذا پہنچانی حرام ہے۔

بہرحال سوال کرنے میں یہ تین برائیاں ہیں' آپ ان تینوں برائیوں کی روشنی میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد مبارک کے معنی بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ فرمایا :-

مَسْأَلَةُ النَّاسِ مِنَ الْفَوَاحِشِ مَا اَحَلَّ مِنَ الْفَوَاحِشِ (۱)

لوگوں سے مانگنا بڑا گناہ ہے' اور بڑے گناہوں میں سے صرف یہی گناہ جائز ہے۔

آپ نے اس کا نام فاحشہ رکھا ہے' جس کے معنی ہیں گناہ کبیرہ' اور کبائر بلا ضرورت مباح نہیں ہیں' جیسے شراب پینا اس شخص کے لئے جائز ہے جس کے حلق میں لقمہ اٹک جائے اور اسے شراب کے علاوہ کوئی چیز پینے کے لئے نہ ملے۔ ایک حدیث میں ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا :-

مَنْ سَأَلَ عَنْ غِنًى فَإِنَّمَا يَسْتَكْثِرُ مِنْ جَمْرِ جَهَنَّمَ۔

(ابو داؤد۔ ابن حبان۔ سہل ابن حنظلیہ)

جو شخص تونگری کے باوجود سوال کرتا ہے وہ جہنم کے انگارے اپنے لئے زیادہ کرتا ہے۔

ایک حدیث میں ہے آپ نے ارشاد فرمایا :-

وَمَنْ سَأَلَ وَلَهُ مَا يُغْنِيهِ جَاءَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَوَجْهُهُ عَظْمٌ يَتَقَعْقَعُ وَلَيْسَ عَلَيْهِ لَحْمٌ۔ (اصحاب السنن۔ ابن مسعودؓ)

جو شخص غنا کے باوجود سوال کرتا ہے وہ قیامت کے روز اس حال میں آئے گا کہ اس کا چہرہ ایک ہلتی ہوئی ہڈی ہوگا اور اس پر گوشت نہیں ہوگا۔

ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں "كَانَتْ مَسْأَلَتُهُ خُدُوشًا وَكُدُوحًا فِي وَجْهِهِ" اس کا سوال اس کے چہرے پر خراشوں کا نشان اور داغ ہوگا۔ ان روایات سے سوال کی قطعی حرمت اور ممانعت ثابت ہوتی ہے۔ روایت ہے کہ ایک مرتبہ آپ نے کچھ لوگوں کو مسلمان کیا' اور ان سے سمع و طاعت پر بیعت لی اسی ضمن میں آپ نے ارشاد فرمایا :-

لَا تَسْأَلُوا النَّاسَ شَيْئًا (مسلم۔ عوف ابن مالکؓ)

لوگوں سے کچھ مت مانگنا۔

متعدد روایات سے ثابت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو عفت اختیار کرنے یعنی سوال سے باز رہنے کی تلقین فرمائی' چنانچہ ایک مرتبہ آپ نے سوال سے منع کرتے ہوئے ارشاد فرمایا :-

مَنْ سَأَلَنَا أَعْطَيْنَاهُ وَمَنِ اسْتَغْنَى أَغْنَاهُ اللّٰهُ وَمَنْ لَمْ يَسْأَلْنَا فَهُوَ أَحَبُّ إِلَيْنَا۔

(ابن ابی الدنیا۔ ابو سعید الخدریؓ)

جو ہم سے مانگے گا ہم اسے دیں گے' اور جو استغناء کرے گا اللہ اسے مستغنی بنا دے گا اور جو ہم سے نہیں مانگے گا وہ ہمیں زیادہ محبوب ہوگا۔

---

(۱) یہ روایت مجھے نہیں ملی۔

ایک حدیث میں ارشاد فرمایا :۔

اِسْتَغْنُوْا عَنِ النَّاسِ وَمَاقَلَّ مِنَ السُّوَالِ فَهُوَ خَيْرٌ۔

(بزار، طبرانی۔ ابن عباسؓ)

لوگوں سے سوال مت کرو، سوال جتنا کم ہو اتنا ہی بہتر ہے۔

لوگوں نے عرض کیا آپ سے سوال کریں تو اس کا حکم کیا ہے؟ فرمایا مجھ سے بھی سوال کم کرنا بہتر ہے۔

حضرت عمر کا ایک اہم اقدام : حضرت عمرؓ نے نماز مغرب کے بعد ایک شخص کو آواز لگاتے سنا، آپ نے فرمایا اگر اس کی قوم کا کوئی شخص اسے کھانا کھلا سکے تو بہتر ہے، چنانچہ ایک شخص نے اسے کھانا کھلا دیا، آپ نے دوبارہ اس کی آواز سنی، لوگوں سے فرمایا میں نے تم سے کہا تھا اسے کھانا کھلا دو، ایک شخص نے عرض کیا میں نے آپ کے حکم کی تعمیل میں اسے کھانا کھلا دیا ہے، آپ نے سائل کو بلایا، دیکھا تو اس کی جھولی روٹیوں سے بھری ہوئی تھی، آپ نے فرمایا تو سائل نہیں تاجر ہے، پھر اس کی جھولی لی، اور تمام روٹیاں صدقے کے اونٹوں کے آگے ڈال دیں، اور اس کی دُرّہ سے خبر لی اور فرمایا آئندہ یہ حرکت مت کرنا۔ اس سے ثابت ہوا کہ بلا ضرورت سوال کرنا جرم ہے، اگر سوال حرام نہ ہوتا تو آپ کبھی سائل کو زدو کوب نہ کرتے، اور نہ اس کی روٹیاں چھین کر اونٹوں کو کھلاتے، یہاں بعض ضعیف کم عقل، اور تنگ نظر فقہاء حضرت عمرؓ کے اس موقف پر تنقید کرسکتے ہیں، اور کہہ سکتے ہیں کہ تادیب کے لئے سائل کو مارنا صحیح ہو سکتا ہے، سیاسی مصالح کے لئے شریعت نے اس کی اجازت دی ہے، لیکن اس کا مال چھیننا ایک تاوان ہے، اور شریعت نے اس طرح کے تاوان وصول کرنے کی اجازت نہیں دی ہے، ان فقہاء کو یہ اشکال ان کی کم علمی کے باعث ہو سکتا ہے، ورنہ حضرت عمر کا تفقہ اتنا عمیق، اور علم اتنا وسیع ہے کہ تمام فقہاء مل کر بھی ان کی گرد کو نہیں پہنچ سکتے، آپ کو جس قدر دین الٰہی کے اسرار و رموز اور بندگان خدا کی مصالح کا علم تھا اتنا علم انہیں کہاں ہو سکتا ہے، کیا حضرت عمرؓ کو معلوم نہیں تھا کہ کسی کا مال ضبط کرنا اور تاوان لینا جائز نہیں ہے، یقیناً آپ شریعت کے اس حکم سے واقف تھے، اس کے باوجود آپ نے سائل کی روٹیاں ضبط کرلیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ نے اسے سوال سے مستغنی پایا، اور اچھی طرح تحقیق کرکے یہ بات جان لی کہ جن لوگوں نے اسے کھانا دیا ہے یہ سمجھ کر دیا ہے کہ وہ محتاج ہے حالانکہ وہ سچ نہیں بول رہا تھا، اسکا مطلب یہ ہوا کہ اس شخص نے فریب دے کر مال حاصل کیا تھا اور فریب دے کر حاصل کیا جانے والا ملک نہیں بن سکتا، پھر کیوں کہ وہ روٹیاں مختلف گھروں سے حاصل کی گئی تھیں اور یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ کون سی روٹی کس کے گھر کی ہے اس لئے یہ مال لاوارث ٹھہرا، اور ایسے مال کا اہل اسلام کی مصالح میں خرچ کرنا واجب ہے، زکواۃ کے اونٹوں کی غذا اسلام کے مصالح میں سے ہے، اس لئے حضرت عمرؓ نے وہ روٹیاں اس سائل سے لے کر زکواۃ کے اونٹوں کے سامنے ڈال دیں۔ سائل نے اپنی ضرورت کے اظہار میں کذب بیانی کی تھی۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص یہ جھوٹا دعویٰ کرے کہ میں حضرت علی کی اولاد ہوں، اور لوگ اسے کچھ مال دیدیں، اس صورت میں وہ مال اس کی ملکیت میں نہیں آتا، اسی طرح وہ صوفی بھی ان عطایا کا مالک نہیں بنتا جو اسے نیک، دیندار اور متقی سمجھ کر دیئے جاتے ہیں، جب کہ وہ باطن میں ایسا نہیں ہوتا، ایسے لوگوں کو مال لینا حرام ہے، اور جو مال جس سے لیا ہو اسے واپس کرنا واجب ہے، حضرت عمرؓ کے اسوہ سے اس مسئلے کا علم ہوا ہے، بہت سے فقہاء اس مسئلے سے واقفیت نہیں رکھتے، اور اپنی جہالت کے باعث حضرت عمرؓ کے اس اقدام پر شک کرتے ہیں۔

ضرورت کے لئے سوال کی اباحت جیسا کہ بیان کیا گیا ہے کہ سوال صرف ضرورت کے لئے مباح ہے۔ یہاں یہ جاننا چاہیے کہ یا تو آدمی کسی چیز کی طرف مضطر ہوتا ہے، یا اس چیز کی اسے شدید حاجت ہوتی ہے، یا خفیف ہوتی ہے، یا بالکل نہیں ہوتی، اور پورے طور پر مستغنی ہوتا ہے، یہ چار صورتیں ہیں۔ اب ہم انہیں الگ الگ بیان کرتے ہیں، اضطرار کی صورت یہ ہے کہ کوئی

اس قدر بھوکا ہو کہ اگر کھانا میسر نہ ہو تو ہلاک ہو جائے یا بیمار پڑ جائے' یا اس قدر کپڑے نہ رکھتا ہو کہ بدن ڈھانپ سکے۔ اس صورت میں سوال کرنا جائز ہے بشرطیکہ تمام شرائط پائی جائیں' مثلاً یہ کہ جس چیز کے بارے میں سوال کیا جائے وہ مباح ہو' جس سے سوال کیا جائے وہ دل سے راضی ہو' اور سوال کرنے والا اکتساب سے عاجز ہو' اس لئے کہ اگر کوئی شخص کسب پر قدرت رکھتا ہو' اس کے لئے سوال کرنا جائز نہیں ہے' اِلّایہ کہ تحصیل علم میں مشغول ہو' اور علم کی طلب نے اسکے تمام اوقات گھیر لئے ہوں' جو شخص لکھنا جانتا ہو وہ کتابت کے ذریعے کمانے پر قادر ہے' مستغنی وہ ہے جو ایسی چیز مانگے جس کی ایک مثل یا کئی مثل اس کے پاس ہوں' مثلاً کوئی شخص ایک روپیہ مانگے اور اس کے پاس ایک روپیہ یا کئی روپے موجود ہوں' یہ سوال بھی قطعی طور پر حرام ہے' جہاں تک ان دونوں صورتوں کا سوال ہے ان کی حرمت بالکل واضح ہے۔ جس شخص کی حاجت اہم ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص مریض ہو' وہ دوا کی احتیاج رکھتا ہو' اور یہ احتیاج ایسی ہو کہ اگر نہ ملے تو زیادہ خوف نہیں' لیکن کچھ نہ کچھ خوف ضرور ہے' یا کوئی شخص ہے جس نے جبّہ پہن رکھا ہو لیکن اس کے پاس سردی سے بچاؤ کے لئے قمیض نہ ہو' اسے خالی جبّے میں سردی اذیت دیتی ہے' لیکن خطرناک حد تک نہیں' اسی طرح وہ شخص بھی جو کرائے کے لئے پیسوں کا سوال کرے' حالانکہ اگر وہ چاہے تو اتنا فاصلہ پیدل چل کر بھی طے کر سکتا ہے اگرچہ اس میں مشقت ہے' لیکن اتنی نہیں کہ برداشت نہ کی جا سکے اگر اس طرح کی حاجتیں ہوں تو ان میں بھی سوال کرنے کی گنجائش ہے' لیکن صبر کرنا زیادہ بہتر ہے' سوال کرنے سے ترک اولیٰ لازم آتا ہے' اگر کوئی شخص اپنی حاجت میں سچا ہے تو اس کے سوال کو مکروہ نہیں کہا جائے گا' مثلاً" اگر وہ یہ کہے کہ میرے جبّے کی قمیص نہیں ہے' اور مجھے سردی تکلیف دیتی ہے' اگرچہ میں اسے برداشت کر سکتا ہوں' لیکن برداشت کرنے کا عمل مشقت طلب ہے تو اس کی تصدیق کی جائے گی' اور اس کی صداقت اس کے سوال کا کفارہ بن جائے گی۔ معمولی حاجت کی مثال یہ ہے کہ کوئی شخص قمیص کا سوال کرے تاکہ اسے اپنے پیوند زدہ کپڑوں کے اوپر پہن لیا کرے' اور لوگوں سے اپنی خستہ حالی چھپا سکے' یا کسی شخص کے پاس روٹی موجود ہے اور وہ سالن کے لئے سوال کرے' یا اس قدر کرایہ کی رقم موجود ہے کہ گدھے پر بیٹھ کر اپنی منزل تک پہنچ سکتا ہے' لیکن جلدی پہنچنے کے لئے گھوڑے کے کرائے کا سوال کرے' یا کرایہ کی رقم موجود ہے مگر محمل وغیرہ کے لئے سوال کرے' تاکہ آرام سے سفر کر سکے' یہ تمام حاجتیں معمولی ہیں' اگر کوئی شخص اپنی ان حاجتوں کو صحیح صحیح بیان نہیں کرتا اور مسئول کو فریب میں مبتلا کرتا ہے تو یہ قطعاً حرام ہے' اور اگر غلط بیانی نہیں کرتا' فریب نہیں دیتا مگر مذکورہ بالا تین برائیاں پائی جاتی ہیں یعنی باری تعالیٰ کی شکایت' اپنی تذلیل' اور مسئول کی تکلیف' اس صورت میں بھی سوال حرام ہے' کیوں کہ یہ حاجتیں اتنی شدید نہیں ہیں کہ ان کی وجہ سے مذکورہ امور مباح کر دیے جائیں' لیکن اگر فریب نہ ہو' اور مذکورہ خرابیوں میں سے بھی کوئی خرابی نہ پائی جائے تو کراہت کے ساتھ سوال کرنے کی اجازت دی جا سکتی ہے۔

سوال کو مذکورہ بالا عیوب سے محفوظ رکھنے کا طریقہ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ سوال کو مذکورہ بالا تین خرابیوں سے کس طرح محفوظ رکھا جا سکتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ پہلی خرابی یعنی باری تعالیٰ کی شکایت کا ازالہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لئے شکر کا اظہار کرے' مخلوق سے استغناء برتے' اور کسی محتاج کی طرح دست سوال دراز نہ کرے' بلکہ یہ کہے کہ جو کچھ میرے پاس ہے میں اس کی موجودگی میں مستغنی ہوں' لیکن میرے نفس کی رعونت مجھ سے ایک ایسے کپڑے کا مطالبہ کرتی ہے جسے میں اپنے موجودہ لباس کے اوپر پہن سکوں' حالانکہ یہ کپڑا ضرورت سے زائد ہو گا' یہ صرف نفس کی فضولیات میں سے ہے' اس طرح مانگنے سے یہ سوال شکایت نہ کرے' بلکہ خود اپنے نفس کی شکایت بن جائے گا کہ وہ قانع ہے' اور جو کچھ اسے میسر ہے اس پر صبر نہیں کرتا۔ ذلت کی خرابی اس طرح دور کی جا سکتی ہے کہ ہر کس و ناکس سے سوال نہ کرے' بلکہ اپنے باپ' دوست یا کسی ایسے قریبی عزیز سے مانگے جس کے بارے میں یہ یقین ہو کہ وہ اپنی نظروں سے نہیں گرائے گا' اور نہ سوال کرنے کے باعث اسے حقیر سمجھے گا' یا کسی ایسے سخاوت پیشہ شخص سے سوال کرے جس نے اپنی تمام دولت اس طرح کے بیش قیمت کاموں کے لئے وقف کر

رکھی ہو جو لوگوں کی حاجت بر آری کرکے خوش ہوتا ہو' اور حاجتمندوں کا اپنی ذات پر احسان سمجھتا ہو کہ وہ اس کے عطایا قبول کر لیتے ہیں' ذلت انہی دو صورتوں میں ساقط ہو سکتی ہے' کیوں کہ ان دونوں صورتوں میں احسان نہیں ہے' احسان جہاں ہوتا ہے وہاں ذلت پائی جاتی ہے۔ ایذا سے بچنے کا طریقہ یہ ہے کہ اپنا سوال کسی متعین شخص سے نہ کرے' بلکہ اپنا حال سب کو سنا دے' سننے والوں میں جو شخص بھی نیک دل' اور صاحب سخاء ہو گا وہ اعانت پر سبقت کرے گا' ایسی مجلس میں کسی متعین فرد کی طرف نگاہ بھی نہ اٹھائے ورنہ نہ دینے پر وہ ہدف ملامت بنے گا' اور دل ہی دل میں خفت محسوس کرے گا' یا دینے پر مجبور ہو گا اور ایذا پائے گا۔ اور اگر کسی وجہ سے شخص متعین سے ہی مانگنا پڑ جائے تو اس کے نام کی صراحت نہ کرے بلکہ کنایۃً کہہ دے' تاکہ اگر وہ تغافل برتنا چاہے تو برت سکے' اگر دینے والا اس صورت میں دے گا تو یہ اس بات کی علامت ہو گی کہ وہ دینے پر خوش ہے' حالانکہ وہ چاہتا تو اس کا سوال نظر انداز بھی کر سکتا تھا۔ بہتر یہ ہے کہ کسی ایسے شخص سے سوال کرے جسے انکار کرنے پر شرمندگی نہ ہو' اس لئے کہ شرمندگی سے بھی اذیت ہوتی ہے۔

اب اگر سائل یہ بات جان لے کہ دینے والے نے محض انکار کی ندامت سے بچنے کے لئے سوال پورا کیا ہے' ورنہ اگر مجلس خالی ہوتی' اور سائل نے اسے مخاطب نہ کیا ہوتا تو وہ نہ دیتا اس صورت میں دینے والے نے کچھ دیا ہے تو اس کا لینا قطعی طور پر حرام ہے' امت کے کسی طبقے کو اس پر شبہ نہیں ہے۔ اور اس طرح مال لینا ایسا ہے جیسے کسی کو زدو کوب کرکے مال لے لیا جائے' یا اس سے زبردستی تاوان وصول کیا جائے' ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے' خواہ ظاہری) جسم پر کوڑے لگائے جائیں یا باطن پر ندامت اور خوف ملامت کے تازیانے برسائے جائیں' بلکہ عقلمندوں کے نزدیک باطن کی چوٹ زیادہ خطرناک ہوتی ہے' وہ ظاہری جسم کے زخموں کی اس قدر پروا نہیں کرتے۔

ایک اعتراض کا جواب

یہاں تم یہ اعتراض کرو گے کہ جب دینے والا دیتا ہے تو اس سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ وہ شخص ظاہر میں دینے پر راضی ہے' اور شریعت میں ظاہر کا اعتبار ہوتا ہے' جیسا کہ حدیث شریف میں ہے:-

إِنَّمَا أَحْكُمُ بِالظَّاهِرِ وَاللهُ يَتَوَلَّى السَّرَائِرَ (۱)

میں ظاہر پر حکم لگاتا ہوں' باطن کا مالک اللہ تعالیٰ ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ظاہر پر حکم لگانا خصومات کے باب میں قاضیوں کی ضرورت ہے' اس لئے کہ وہ باطنی امور پر' اور قرائن احوال پر نظر کرکے فیصلہ کرنے پر قادر نہیں ہوتے' چنانچہ وہ لوگ مجبوراً زبانی قول کے ظاہر پر حکم لگا دیتے ہیں' حالانکہ زبان بسا اوقات دل کی صحیح ترجمانی نہیں کرتی' لیکن ضرور اس پر مجبور کرتی ہے کہ زبان کا اعتبار کیا جائے' اور زیر بحث معاملہ بندے اور اس کے خالق کے درمیان ہے' وہی اس معاملے میں احکم الحاکمین ہے' دل اس کے نزدیک ایسے ہیں جیسے دنیاوی حکام کے نزدیک زبانیں' یعنی وہ دلوں کا اعتبار کرتا ہے' اور دنیا کے حکام زبانوں پر اعتماد کرتے ہیں' اس لئے تم اس طرح کے معاملات میں صرف اپنے دل کو ٹٹولو' اگرچہ مفتیان کرام تمہیں فتویٰ دیدیں' تم دل کے فتویٰ پر عمل کرو' مفتی قاضی اور سلطان کو پڑھانے والے ہیں تاکہ وہ عالم ظاہر کے رہنے والوں پر حکم کریں' دلوں کے مفتی علمائے آخرت ہیں جس طرح فقیہ کے فتووں سے دنیا کے بادشاہ کی گرفت سے نجات ملتی ہے' اسی طرح علمائے آخرت کے فتووں سے آخرت کے شہنشاہ کی پکڑ سے نجات حاصل ہوتی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اگر تم نے کسی سے کوئی چیز اس طرح حاصل کی ہے کہ وہ دل سے دینے پر راضی نہیں تھا تو فیما بینہ اور بین اللہ اس کا مالک نہیں بنے گا' ایسی چیز کا مالک کو لوٹا دینا واجب ہے اور اگر دینے والا واپس لینے میں خفت محسوس کرے' اور واپس نہ لے تو اسی مالیت کی کوئی چیز اس کی دی ہوئی چیز کے عوض میں ہدیہ کر دینی چاہیے' تاکہ اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو جائے' اور اگر وہ

---

(۱) اس کی اصل مجھے نہیں ملی۔

ہدیہ بھی قبول نہ کرے تو اس کے ورثاء کو دیدے' اگر اس نے وہ چیز واپس نہیں کی اور اس کے قبضے میں ضائع ہو گئی تو فیمابینہ و بین اللہ اس کا ضامن ہو گا' اور اس میں تصرف کرنے اور سوال کے ذریعے مسئول کو اذیت پہنچانے کا مجرم قرار دیا جائے گا۔

اگر تم یہ کہو کہ یہ ایک باطنی معاملہ ہے' اور اس پر مطلع ہونا نہایت دشوار ہے' اس صورت میں نجات کیسے حاصل کی جائے گی' عام طور پر لینے والا یہی سمجھتا ہے کہ دینے والے نے دل کی رضامندی کے ساتھ دیا ہے' جب کہ وہ دل میں راضی نہیں ہوتا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ متقین نے اسی لئے سوال سے مکمل اجتناب کیا ہے' وہ کسی سے قطعاً کوئی چیز قبول نہیں کرتے' چنانچہ حضرت بشر کا کسی کا ہدیہ بھی قبول نہیں کرتے تھے' صرف سری سقطی اس سے مستثنیٰ تھے' اور ان کے ہدایا بھی اس یقین کے بعد قبول کرتے تھے کہ وہ اپنے قبضے سے مال نکلنے پر خوش ہوتے ہیں' احادیث میں سختی کے ساتھ سوال کرنے سے منع کیا گیا ہے' اور متعفف بننے کی تاکید کی گئی ہے' اس کی وجہ یہی ہے کہ سوال سے مسئول کو اذیت ہوتی ہے' اور یہ صرف ضرورت کے لئے مباح قرار دی گئی ہے' اور ضرورت یہ ہے کہ سائل موت کے قریب پہنچ گیا ہو اور اس کے لئے سوال کے سوا بچاؤ کا کوئی راستہ باقی نہ رہا ہے' اور نہ کوئی ایسا شخص موجود ہو جو کراہت کے بغیر اسے کچھ دے سکتا ہو' اور دینے میں اذیت محسوس نہ کرتا ہو' اس صورت میں سوال مباح ہے' یہ اباحت ایسی ہی ہے جیسے کسی مضطر کو خنزیر اور مردار کا گوشت کھانے کی اجازت دے دی جائے۔ بہرحال سوال نہ کرنا متقین کا معمول رہا ہے' ارباب قلوب میں بعض لوگوں کو اپنی اس بصیرت پر اعتماد تھا کہ وہ قرائن احوال پر مطلع ہو جاتے تھے اور دلوں کے احساسات کا اندازہ کر لیا کرتے تھے' اسی لئے وہ حضرات بعض لوگوں کے ہدایا قبول کر لیتے تھے' اور بعض کے ہدایا واپس کر دیتے تھے' بعض حضرات ایسے بھی تھے جو صرف دوستوں سے قبول کرتے تھے' اور بعض حضرات دی ہوئی چیز میں سے کچھ رکھ لیا کرتے تھے' اور کچھ واپس کر دیتے تھے' جیسا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گھی اور پنیر رکھ لیا' اور مینڈھا لوٹا دیا' اور یہ صورت ان ہدایا میں تھی جو بلا طلب ملا کرتے تھے' اور کسی کو مانگے بغیر کچھ دینا رغبت کے بغیر ہو ہی نہیں سکتا' لیکن بعض مرتبہ دینے والا طلب جاہ' حصول شہرت' ریا' تفاخر یا کسی اور غرض کی تکمیل کے لئے دیتا ہے اس لئے ارباب قلوب ان امور میں شدید احتیاط کرتے تھے' اور سوال سے قطعاً گریز فرماتے تھے' صرف دو مواقع پر سوال کرتے تھے ایک ضرورت پر جیسا کہ تین انبیائے کرام حضرات سلیمان' موسیٰ' اور خضر علیہم السلام نے سوال کیا' اس میں شک نہیں کہ ان حضرات نے صرف ان لوگوں سے سوال کیا جن کے بارے میں انہیں علم تھا کہ وہ انہیں دینے میں رغبت رکھتے ہیں' اور دوسرا بے تکلفی میں' اور بے تکلفی صرف دوستوں اور بھائیوں سے ہو سکتی ہے' اہل دل اپنے دوستوں اور بھائیوں سے ان کی چیزیں خود ہی لے لیا کرتے تھے' مانگنا اور اجازت لینا بھی ضروری نہیں سمجھتے تھے اس لئے کہ وہ یہ بات جانتے تھے کہ مطلوب دل کی رضا ہے' زبان سے اظہار نہیں ہے' انہیں یہ بھی یقین تھا کہ ان کے دوست اس بے تکلفی پر خوش ہوں گے برا نہیں مانیں گے' اور اگر یہ احساس ہوتا تھا کہ اجازت کے بغیر لینے پر ان کے بھائی ناراض ہو جائیں گے تو اجازت سے لے لیا کرتے تھے یا مانگ لیا کرتے تھے۔

اباحت سوال کی حد : سوال کے مباح ہونے کی حد یہ ہے کہ سوال کرنے والا یہ بات جان لے کہ میں جس شخص سے سوال کر رہا ہوں اگر اسے میری ضرورت کا علم ہو جائے تو سوال کی نوبت ہی نہ آئے' اور میرے سوال کے بغیر ہی میری ضرورت پوری کر دے' ایسے شخص سے صرف سوال کرنا کافی ہے' حیاء سے حیلے سے تحریک دینے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔

سوال کے بعد اگر مسئول نے کچھ دیدیا تو سائل کے تین احوال ہو سکتے ہیں' ایک یہ کہ اسے یقین ہو کہ دینے والے نے دل کی مکمل رضا سے دیا ہے' اور دوسری یہ کہ قرائن سے اس کے باطن کی ناراضگی ظاہر ہو جائے' اور یہ یقین ہو جائے کہ دینے والے نے خوف ملامت' یا شرم کی وجہ سے دیا ہے خوش ہو کر نہیں دیا' ان میں پہلی صورت جائز ہے' اور دوسری صورت حرام ہے۔ اب رہی تیسری صورت' اور وہ یہ ہے کہ اسے دینے والے کے بارے میں تردد ہو' اور یہ بات واضح نہ ہو سکی ہو کہ وہ دینے سے خوش ہے' یا ناراض' اس صورت میں اپنے دل سے فتویٰ لے' اور اس تردد سے نکلے اور دل جو فیصلہ دے اس کے مطابق عمل کرے' اس

تردّد میں مبتلا رہنا گناہ ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ قرائن احوال سے دل کی رضامندی کیسے معلوم کی جائے' تو یہ کوئی مشکل بات نہیں ہے' اگر تمہاری عقل پختہ اور حرص کمزور ہے' اور شہوت کا داعیہ ضعیف ہے تو بآسانی صحیح کیفیت دریافت کرسکتے ہو' اور اگر اس کے برعکس معاملہ ہو کہ شہوت پختہ' حرص مضبوط اور عقل کمزور ہو تو وہی فیصلہ کرو گے جو تمہاری غرض کے مطابق' اور تمہاری منشاء سے ہم آہنگ ہوگا' اور تمہاری غرض یہ ہوگی کہ مال حاصل ہو اس صورت میں تمہیں دینے والے کی ناراضگی کا علم ہو ہی نہیں سکے گا' یہ وہ باریک نکات ہیں جن سے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد مبارک کے رموز سمجھ میں آتے ہیں' ارشاد فرمایا :۔

إِنَّ أَطْيَبَ مَا أَكَلَ الرَّجُلُ مِنْ كَسْبِهِ (۱)

آدمی کا اپنی آمدنی میں سے کھانا کتنا عمدہ ہے۔

یہ حدیث آپ کے جوامع الکلم میں سے ہے' غور کیجئے اس میں کس قدر حکمت پوشیدہ ہے' جس شخص کے پاس اس کا کمایا ہوا مال نہیں ہوتا اور نہ ایسا مال ہوتا ہے جو اس کے باپ کی کمائی سے' یا کسی قرابت دار کی آمدنی سے بطور وراثت ملا ہو' تو وہ لوگوں کے ہاتھوں کی کمائی کھاتا ہے' اگر اسے کوئی بلا طلب مال دیتا ہے تو اس کی دینداری کی وجہ سے دیتا ہے' اگر اسے معلوم ہوجائے کہ اس کا باطن ایسا نہیں ہے جیسا وہ خیال کرتا ہے تو کبھی نہ دے' اس صورت میں جو کچھ لے گا حرام ہوگا' اور اگر سوال کرنے سے ملے تو ایسا شخص کہاں ہے جو سوال کرنے پر خوش ہو کر دے۔ اور ایسا سائل کہاں ملے گا جو سوال میں حد ضرورت پر اکتفا کرے' اگر تم ان لوگوں کے حالات کی تفتیش کرو جو دوسروں کی کمائی کھاتے ہیں تو تمہیں معلوم ہوجائے کہ وہ تمام یا اکثر غذا جو ان کے جزو بدن بنتی ہے۔ حرام ہے' حلال اور پاکیزہ تر غذا وہی ہے جسے تم یا تمہارے مورث حلال ذرائع سے حاصل کریں۔ بظاہر کھانے کے ساتھ ورع و احتیاط کا اجتماع بے حد دشوار لگتا ہے' ہم اللہ تعالیٰ سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ غیر سے ہماری طمع منقطع فرمائے' اور حلال رزق عطا کرکے حرام سے دور رکھے۔

غنا کی وہ مقدار جس سے سوال حرام ہوجاتا ہے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی پہلے بھی نقل کیا جاچکا ہے' فرمایا :۔

مَنْ سَأَلَ عَنْ ظَهْرِ غِنًى فَإِنَّمَا يَسْأَلُ جَمْرًا فَلْيَسْتَقِلَّ مِنْهُ أَوْ يَسْتَكْثِرْ۔

جو شخص مالداری کے باوجود سوال کرتا ہے وہ گویا آگ کے شعلے مانگتا ہے' اب چاہے کم مانگے یا زیادہ مانگے۔

یہ حدیث سوال کی حرمت میں بالکل واضح ہے' بشرطیکہ آدمی غنی ہو' یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ غنا کیا ہے' اور اس کی حد کیا ہے' لیکن ہم اس کا جواب اپنی جانب سے نہیں دے سکتے نہ یہ بات ہمارے اختیار کی ہے کہ ہم غنا کی حدود مقرر کریں اس لئے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات میں اس کا جواب تلاش کرتے ہیں' ایک حدیث میں ہے' فرمایا :۔

اِسْتَغْنُوْا بِغِنَى اللّٰهِ تَعَالٰى عَنْ غَيْرِهِ قَالُوْا وَمَا هُوَ قَالَ غَدَاءُ يَوْمٍ وَعَشَاءُ لَيْلَةٍ

(ابو منصور دیلمی۔ ابو ہریرہؓ)

اللہ تعالیٰ سے غیر سے استغناء مانگو' صحابہ نے عرض کیا استغناء کیا ہے؟ فرمایا ایک دن اور ایک رات کا کھانا۔

ایک حدیث میں یہ ارشاد فرمایا :۔

عَنْ سَأَلَ وَلَهُ خَمْسُوْنَ دِرْهَمًا أَوْ عِدْلُهَا مِنَ الذَّهَبِ فَقَدْ سَأَلَ إِلْحَافًا (۲)

---

(۱) یہ روایت پہلے گذری ہے۔ (۲) یہ روایت بھی پہلے گذری ہے۔

جو شخص پچاس درہم یا اس کے برابر سونا رکھنے کے باوجود سوال کرے تو وہ لپٹ کر سوال کرتا ہے۔
ایک روایت میں خمسون کے بجائے اربعون ہے' روایات میں تعداد وغیرہ کا اختلاف مختلف اوقات پر محمول ہو سکتا ہے' تاہم ان سب سے ایک تخمینی مقدار کا علم ہوتا ہے جس کی موجودگی میں مانگنے کو برا سمجھا گیا ہے' پچاس اور چالیس درہم تو ایک علامت ہیں ورنہ اس سے مراد یہ ہے کہ جس کے پاس ضرورت کی چیزیں موجود ہیں اس کو سوال نہ کرنا چاہیے' یعنی اگر وہ محتاج نہ ہو تو اس کا مانگنا اچھا نہیں ہے' پھر بھی کیوں کہ حدیث شریف میں پچاس اور چالیس درہم کے الفاظ ہیں اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ اس مقدار میں کیا حکمت ہے۔ ایک حدیث میں ہے :۔

لَاحَقَّ لِابْنِ آدَمَ اِلَّا فِیْ ثَلٰثٍ طَعَامٌ یُقِیْمُ صُلْبَهٗ وَثَوْبٌ یُوَارِیْ بِهٖ عَوْرَتَهٗ وَبَیْتٌ یُکِنُّهٗ فَمَا زَادَ فَهُوَ حِسَابٌ (۱)

آدمی کا حق صرف تین چیزوں میں ہے' ایسے کھانے میں جو اس کی کمر سیدھی رکھ سکے' اتنا کپڑا جو اس کا ستر ڈھانپ سکے' اور ایک گھر جس میں وہ رہ سکے' اس سے زائد کا محاسبہ ہوگا۔

اس حدیث میں تین چیزیں مذکور ہیں ہم ان تینوں کو حاجات کی اصل قرار دیتے ہیں' تاکہ حاجات کی اجناس ذکر کریں' پھر مقادیر اور اوقات بیان کریں' جہاں تک حاجات کی اجناس کا سوال ہے وہ یہی تین چیزیں ہیں' اور جو اس طرح کی ہیں وہ بھی ان ہی تین چیزوں کے ساتھ ملحق کردی جائیں گی' جیسے مسافر کے لئے کرایہ بشرطیکہ وہ پیدل چلنے پر قادر نہ ہو' اسی طرح کی دوسری ضروری حاجتیں بھی انہیں تین میں داخل ہوں گی' پھر آدمی سے تنہا ایک فرد مراد نہیں ہے بلکہ اس کا خاندان یعنی بیوی' بچے' اور وہ تمام افراد مراد ہیں جن کی کفالت کا بوجھ اس کے کاندھوں پر ہے سواری کے جانور بھی اسی کے زیر کفالت تصور کئے جائیں گے۔

اب مقدار کا حال سنیئے' کپڑے میں اس مقدار کو ملحوظ رکھا جائے گا جو دیندار' اور متدین حضرات کے لئے موزوں ہو' یعنی کرتا' رومال (یا ٹوپی اور ڈوپٹہ) پاجامہ اور جوتے' صرف ایک ایک عدد کافی ہیں' اس جنس کا دوسرا فرد ہونا ضروری نہیں ہے' اسی پر گھر کے دوسرے ساز و سامان کو قیاس کیا جاسکتا ہے' کپڑے میں باریک کپڑا تلاش نہ کرنا چاہیے' اسی طرح اگر مٹی کے بنے ہوئے برتن کافی ہو جائیں تو تانبے اور پیتل کے برتن غیر ضروری ہیں' گویا عدد میں ایک پر' اور نوع میں ادنیٰ جنس پر اکتفا کیا جائے گا بشرطیکہ عادت سے نہایت درجے دوری نہ ہو جائے' اب غذا کی مقدار لیجئے' ایک انسان کو شب و روز میں ایک مد یعنی ڈیڑھ پاؤ کے قریب کھانا چاہیے' شریعت میں یہی مقدار وارد ہوئی ہے' غذا کی نوع وہ ہونی چاہیے جسے کھاتے ہیں خواہ جو کی روٹی ہو' سالن کا ہونا ضروری نہیں ہے' کیوں کہ یہ حاجت سے زائد ہے' ہر کھانے کے وقت موجود ہونا بھی ضروری نہیں ہے' کیوں کہ یہ حاجت سے زائد ہے۔ تاہم اسے پورے طور پر چھوڑنا بھی ضرر کا باعث ہے' اس لئے اگر کبھی کبھی روٹی سالن سے کھالی جائے تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ مسکن کی کم سے کم مقدار یہ ہے کہ رہنے کے لئے کافی ہو' اس میں آرائش کی قید نہیں ہے' چنانچہ مکان کی آرائش یا کشادگی کے لئے دست سوال دراز کرنا زائد از حاجت سوال ہے' اور اس کی حرمت حدیث سے منصوص ہے۔

جہاں تک اوقات کا سوال ہے تو آدمی کو فوری طور پر جس چیز کی ضرورت ہے وہ ایک دن ایک رات کا کھانا' ستر ڈھانپنے کے لئے لباس' اور سر چھپانے کے لئے ٹھکانا ہے' اور اس ضرورت میں کوئی شک نہیں ہو سکتا' اب اگر کوئی شخص مستقبل کے لئے سوال کرتا ہے تو اس کے تین درجے ہیں ایک تو یہ کہ اس چیز کا سوال کرے جس کا وہ آنے والے کل میں محتاج ہے' دوسرا یہ کہ وہ چیز مانگے جس کا وہ چالیس پچاس دن میں محتاج ہوگا تیسرا یہ کہ اس چیز کا سوال کرے جس کی ضرورت سال بھر میں پیش آئے گی۔ یہاں قطعی طور پر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ جس شخص کے پاس اس قدر مال ہے کہ اسے اور اس کے افراد خاندان کو ایک برس کے

---

(۱) یہ روایت بھی گذر چکی ہے۔

لئے کافی ہو تو اس کے لئے سوال کرنا جائز نہیں ہے' کیوں کہ یہ انتہائی درجے کا غنا ہے' حدیث میں پچاس درہم کی مقدار سے یہی غنا مراد ہے' چنانچہ تنہا آدمی کے لئے غنا پچاس درہم بعض پانچ دینار پورے سال کفایت کر جائیں گے' عیالدار آدمی شاید اس مقدار میں گذر نہ کرپائے' اب اگر کسی کے پاس اتنا مال ہے کہ سال گذرنے سے پہلے ہی سوال کرنے کی ضرورت پیش آسکتی ہے تو دیکھنا چاہیے کہ وہ شخص اس وقت سوال کر سکتا ہے یا نہیں جس وقت ضرورت پیش آئے گی' اگر اس وقت سوال کا موقع اور گنجائش ہے تو اس وقت سوال نہ کرے کیوں کہ اس وقت وہ اس سے مستغنی ہے اور کل کے متعلق اسے معلوم نہیں کہ وہ زندہ بھی رہے گا یا نہیں' اگر وہ سوال کرے گا' تو اسکا سوال ایسی چیز کے متعلق ہو گا جس کا وہ محتاج نہیں ہے' گویا اس کے پاس اگر ایک دن رات کی غذا موجود ہے تو بہت کافی ہے' ایک حدیث میں غنا کی مقدار ایک دن رات کی غذا بھی بیان کی گئی ہے' اور اگر وہ سائل ایسا ہے کہ اسے پھر سوال کرنے کا موقع نہیں ملے گا تو اس صورت میں اس کے لئے سوال کرنا مباح ہے' کیوں کہ ایک سال تک زندہ رہنے کی توقع کرنا خلاف عقل نہیں ہے' اور سوال نہ کرنے سے یہ اندیشہ ہے کہ مضطر اور عاجز رہ جائے گا' کوئی اعانت کرنے والا نہیں ملے گا' اگر مستقبل میں سوال سے عاجز رہ جانے کا خوف ضعیف ہو' اور جس چیز کا سوال کر رہا ہو وہ محل ضرورت سے خارج ہو تو سوال کرنا کراہیت سے خالی نہیں ہو گا' اور کراہت قوت و ضعف میں اسی قدر کم و بیش ہو گی جس قدر اضطرار کا خوف' موقع سوال کے فوت ہونے کا ڈر' اور زمانۂ سوال میں تاخیر کم و بیش ہو گی۔ یہ تمام باتیں تحریر میں درج نہیں کی جاسکتیں' بلکہ ان امور میں بندے کو خود اپنے قیاس پر عمل کرنا چاہیے' یعنی اپنے نفس کا جائزہ لے اور یہ دیکھے کہ اس کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان کیا معاملہ ہے' دل سے فتویٰ لے اور اس کے مطابق عمل کرے' بشرطیکہ اس کی منزل آخرت ہو' جس شخص کا یقین قوی ہوتا ہے اور وہ مستقبل میں اللہ کے رزق کی آمد پر پختہ اعتماد رکھتا ہے' اور ایک وقت کی غذا پر قناعت کا حوصلہ رکھتا ہے اس کا درجہ اللہ تعالیٰ کے یہاں انتہائی بلند ہے' وہ مستقبل کے خوف سے پریشان نہیں ہوتا' اگر تم اپنے لئے' اور اپنے اہل و عیال کے لئے ایک وقت کا رزق رکھنے کے باوجود دوسرے وقت کے لئے پریشان ہو تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ تمہارا یقین کمزور ہے' اور شیطان تم پر حاوی ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :۔

فَلَا تَخَافُوهُمْ وَخَافُونِ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ۔ (پ ۴ ر ۹ آیت ۱۷۵)

سو تم ان سے مت ڈرنا اور مجھ ہی سے ڈرنا اگر ایمان والے ہو۔

اَلشَّيْطَانُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَأْمُرُكُم بِالْفَحْشَاءِ وَاللَّهُ يَعِدُكُم مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا۔ (پ ۳ ر ۵ آیت ۲۶۸)

شیطان تم کو فقر سے ڈراتا ہے' اور تم کو بری بات (بخل) کا مشورہ دیتا ہے' اور اللہ تم سے وعدہ کرتا ہے اور اپنی طرف سے گناہ معاف کر دینے کا اور زیادہ دینے کا۔

سوال فحشاء ہے' ایک برائی ہے' جسے صرف ضرورت کے لئے مباح قرار دیا گیا ہے' جو شخص اپنی کسی ایسی ضرورت کے لئے سوال کرے جو اس روز نہ رکھتا ہو' بلکہ سال بھر کے اندر کسی وقت اس کی ضرورت پیش آسکتی ہے اس کا حال اس شخص سے بھی بدتر ہے جو مال موروث کا مالک بنے اور اسے سال بھر کی ضرورتوں کے لئے ذخیرہ کرلے' اگرچہ یہ دونوں باتیں ظاہر شریعت کے فتویٰ کے رو سے صحیح ہیں' لیکن ان سے دنیا کی محبت' اور طول آرزو کا پتا چلتا ہے' اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں کو اللہ کے فضل پر اعتماد نہیں ہے' اور یہ خصلت مہلکات میں سرفہرست ہے۔ ہم اللہ سے حسن توفیق کے خواہاں ہیں۔

سائلین کے احوال

حضرت بشر فرماتے ہیں کہ فقراء تین طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ فقیر ہے جو سوال نہیں کرتا اور اگر اسے کچھ دیا جائے تو قبول نہیں کرتا' یہ شخص علیین میں روحانیت والوں کے ساتھ ہو گا' دوسرا فقیر وہ ہے جو سوال تو نہیں کرتا لیکن اگر کوئی شخص اسے کچھ دیتا ہے تو لے لیتا ہے' یہ شخص مقربین کے ساتھ جنات الفردوس میں ہو گا' تیسرا فقیر وہ ہے جو ضرورت کے

وقت سوال کرتا ہے یہ شخص اصحاب یمین میں سے صادقین کے ساتھ ہوگا' تمام بزرگوں کا اتفاق اس پر ہے کہ سوال کرنا مذموم ہے' اور یہ کہ فاقے کے ساتھ مرتبہ اور درجہ کم ہو جاتا ہے' شقیق بلخی نے ابراہیم ابن ادہمؒ سے جب وہ خراسان سے تشریف لائے دریافت کیا کہ تم نے اپنے ساتھی فقراء کو کس حال پر چھوڑا' انہوں نے کہا میں نے انہیں اس حال پر چھوڑا کہ جب انہیں کوئی شخص کچھ دیتا ہے تو شکر کرتے ہیں اور نہیں دیتا تو صبر کرتے ہیں۔ شقیق بلخی نے گویا یہ بات اپنے رفقاء کی تعریف میں کہی' اور یہ ہے بھی کہ ایک قابل تعریف وصف کہ وہ سوال سے گریز کرتے ہیں' اور شکر و صبر سے کام لیتے ہیں' شقیق نے کہا تم نے بلخ کے کتوں کو ہمارے لئے اس طرح چھوڑا ہے' ابراہیم نے ان سے دریافت کیا کہ آپ کے یہاں فقراء کا کیا حال ہے' انہوں نے جواب دیا ہمارے فقراء تو ایسے ہیں کہ اگر انہیں کوئی کچھ نہیں دیتا تو وہ شکر کرتے ہیں اور دیتا ہے تو اپنی ذات پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں' یہ سن کر حضرت ابراہیم ابن ادہم نے ان کے سر کو بوسہ دیا اور عرض کیا کہ استاذ محترم آپ سچ کہتے ہیں فقراء کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔

ارباب احوال کے مختلف احوال رضا' صبر' شکر اور سوال وغیرہ کے باب میں ارباب احوال کے بہت سے درجات ہیں' راہ آخرت کے سالک کو ان تمام درجات کی معرفت حاصل کرنی چاہیے' اور ان درجات کی مختلف قسموں کا علم حاصل کرنا چاہیے' اگر اسے ان امور کی معرفت نہیں ہے تو وہ کبھی پستی سے بلندی تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا' انسان کو پہلے احسن تقویم میں پیدا کیا گیا' پھر اسفل سافلین میں اتار گیا' اس کے بعد اسے حکم دیا گیا کہ وہ اعلا علیین تک ترقی کرے' جو شخص پستی اور بلندی میں تمیز نہیں کر سکتا وہ کسی بھی طرح بلندی تک نہیں پہنچ سکتا' بلکہ یہاں تو وہ لوگ بھی پیچھے رہ جاتے ہیں جو ان درجات کی معرفت رکھتے ہیں' اور مسائل سلوک پر ان کی گہری نظر ہوتی ہے۔ ارباب احوال کے حالات مختلف ہیں' بعض اوقات ان پر ایسی حالت غالب ہوتی ہے جس کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ سوال کرنا ان کے درجات میں ترقی کا باعث ہو' اصل میں اس کا مدار نیتوں پر ہوتا ہے' چنانچہ ایک بزرگ نے حضرت ابو اسحاق نوریؒ کو دیکھا کہ وہ بعض مواقع پر لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلا دیتے ہیں' وہ بزرگ کہتے ہیں کہ مجھے ان کی یہ حرکت پسند نہیں آئی' اور میں نے اسے بہت زیادہ برا سمجھا' ایک مرتبہ میں حضرت جنیدؒ کی خدمت میں حاضر ہوا تو میں نے یہ قصہ ان کے سامنے بھی رکھا' حضرت جنیدؒ نے فرمایا تم نوری کی اس بات کو برامت جانو' وہ لوگوں کے سامنے اس لئے ہاتھ نہیں پھیلاتے کہ انہیں کچھ ملے بلکہ اس لئے ہاتھ پھیلاتے ہیں کہ ان کی وجہ سے دینے والوں کو اجر و ثواب مل جائے۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ارشاد گرامی میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا :-

يَدُ الْمُعْطِي هِيَ الْعُلْيَا۔ (مسلم۔ ابو ہریرہؓ) دینے والے کا ہاتھ بلند ہے۔

اس حدیث میں معطی سے بعض لوگوں نے وہ شخص مراد نہیں لیا ہے جو مال دیتا ہے' بلکہ لینے والا مراد لیا ہے' اور کہا ہے کہ اگرچہ وہ ظاہر میں لینے والا ہے' لیکن حقیقت میں اجر و ثواب میں دینے والا ہے' ظاہر میں اس کا ہاتھ نیچے ہے' لیکن حقیقت میں اس کا ہاتھ اوپر ہے' اعتبار ثواب کا ہے' مال کا نہیں۔ اتنا کہنے کے بعد حضرت جنیدؒ نے ترازو منگوائی' اور جب ترازو آگئی تو آپ نے سو درہم تولے' اور ان میں کچھ درہم بغیر تولے ملا دیے' اور مجھ سے فرمایا کہ یہ درہم نوریؒ کے پاس لے جاؤ' اور انہیں دیدو' میں دل میں سوچ رہا تھا کہ انہوں نے سو درہم تولے ہیں' اور اس طرح مقدار معین کی ہے' لیکن پھر اس میں کچھ درہم بغیر تولے ملا دیے۔ حضرت جنیدؒ حکیم ہیں' اور ان کا یہ عمل بھی حکمت سے خالی نہ ہوگا' مگر مجھے ان سے پوچھتے ہوئے شرم محسوس ہوئی' اس لئے میں وہ درہم لے کر حضرت نوریؒ کی خدمت میں پہنچا' انہوں نے فرمایا ترازو لاؤ' میں نے ترازو پیش کر دی' انہوں نے سو درہم وزن کر کے علیحدہ کئے' اور فرمایا یہ واپس لے جاؤ' ان سے کہہ دینا کہ میں تم سے کچھ لینا نہیں چاہتا' جو درہم سو سے زائد تھے وہ رکھ لیتا ہوں' راوی کہتے ہیں مجھے نوری کی یہ بات سن کر بڑا تعجب ہوا' اور عرض کیا کہ مجھے بتلائیں کہ اس میں کیا مصلحت ہے' فرمایا جنید ایک مرد دانا ہے وہ رسّی کو دونوں سروں سے پکڑنا چاہتا ہے' اس نے سو درہم اس لئے تولے تھے کہ وہ ان سے آخرت کا ثواب اپنے لئے چاہتا تھا' اور بلا وزن درہم اس نے اللہ کے لئے ڈالے تھے' سو میں نے اس کے درہم واپس کر دیے' اور جو درہم اللہ کے لئے تھے وہ رکھ

لئے' چنانچہ میں وہ درہم حضرت جنید کے پاس لے آیا' آپ واپس شدہ درہم دیکھ کر رونے لگے' اور فرمایا اپنے درہم لے لئے اور ہمارے واپس کردیئے۔

ان واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان بزرگوں کے قلوب صاف تھے' اور احوال اللہ کے لئے خاص تھے' یہی وجہ ہے کہ وہ حضرات کسی گفتگو اور اظہار کے بغیر ہی ایک دوسرے کے اسرار پر مطلع ہوجاتے تھے' یہ نتیجہ تھا اس بات کا کہ وہ لوگ حلال غذا کی طرف متوجہ رہتے تھے' جو شخص اس راہ میں قدم رکھے بغیر ان حقائق کا انکار کرے وہ جاہل محض ہے' اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص مسہل شربت پینے سے پہلے ہی یہ فیصلہ کردے کہ یہ شربت مسہل نہیں ہے' بعض لوگ طویل مجاہدہ کے بعد بھی اس منزل تک نہیں پہنچ پاتے یہ لوگ بھی ان امور میں انکار ہی کرتے نظر آتے ہیں' ان کی مثال ایسی ہے جیسے کسی شخص کو مسہل دوا دی جائے اور وہ استعمال بھی کرلے' لیکن کسی اندرونی بیماری کے باعث وہ دوا اس کے حق میں مفید ثابت نہ ہو' اس صورت میں وہ یہ کہنے لگے کہ دوا مسہل نہیں ہے یہ شخص اگرچہ جہالت میں پہلے شخص سے کم ہے' لیکن ایسا بھی نہیں کہ اسے جہالت سے خالی کہا جاسکے' بلکہ صاحب بصیرت ان دو شخصوں میں سے ایک ہے' ایک وہ جو سلوک کا راستہ طے کرے اور اس پر وہ باتیں ظاہر ہوں جو ان بزرگوں پر ظاہر ہوئی تھیں' یہ شخص صاحب ذوق و معرفت ہے' اور عین الیقین کے درجے کو پہنچا ہوا ہے' دوسرا شخص وہ ہے جو راہ تو نہیں چلا' یا چلا تو ہے مگر منزل تک نہیں پہنچا' لیکن اس منزل کا یقین رکھتا ہے اور اس مرتبے کی تصدیق کرتا ہے جس پر وہ حضرات پہنچتے ہیں' یہ شخص صاحب علم یقین ہے' اور اگرچہ عین یقین تک نہیں پہنچ سکا' مگر علم یقین کا بھی ایک مرتبہ ہے اگرچہ وہ عین یقین سے کم ہے' جو شخص عین یقین اور علم یقین دونوں سے محروم ہے وہ مومنین کے زمرے سے خارج ہے' قیامت کے روز اس کا حشر منکر متکبرین کے ساتھ ہوگا' ان کے دل مردہ ہیں' اور شیطان کے تابع ہیں' ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ہمیں ان لوگوں میں سے کردے جو علم میں رسوخ رکھتے ہیں اور یہ کہتے ہیں :-

آمَنَّا بِهِ كُلٌّ مِنْ عِنْدِ رَبِّنَا وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُوا الْأَلْبَابِ (پ ۳ ر ۹ آیت ۷)

ہم اس پر یقین رکھتے ہیں (یہ) سب ہمارے پروردگار کی طرف سے ہیں اور نصیحت وہی لوگ قبول کرتے ہیں جو اہل عقل ہیں۔

زہد کا بیان

زہد کی حقیقت : جاننا چاہیے کہ زہد سالکین کے مقامات میں سے ایک اہم مقام ہے' اور یہ مقام بھی' دوسرے مقامات کی طرح' علم' حال اور عمل سے ترتیب پاتا ہے' اس لئے کہ سلف کے قول کے مطابق ایمان کے تمام ابواب عقد' قول' اور عمل ہی کی طرف راجع ہیں' یہاں حال کی جگہ قول رکھا گیا ہے' کیوں کہ یہ ظاہر ہوتا ہے' اور اس سے باطن کا حال منکشف ہوجاتا ہے' ورنہ قول خود مقصود بالذات نہیں ہے' اور اگر قول حال کے ساتھ صادر نہ ہو یعنی باطن سے نہ ہو تو اسے اسلام کہتے ہیں ایمان نہیں کہتے' علم حال کا سبب ہوتا ہے' یعنی حال اس کا ثمرہ بنتا ہے' اور حال کا ثمرہ عمل ہوتا ہے' گویا حال کی دو طرف ہیں' ایک طرف علم اور دوسری طرف عمل ہے۔

حال کے معنی حال سے مراد وہ کیفیت ہے جسے زہد کہتے ہیں' اور زہد کے معنی یہ ہیں کہ کسی چیز سے رغبت باقی نہ رہے' اور کسی ایسی چیز میں ہوجائے جو اس سے بہتر ہو' ایک شئے سے رغبت ختم کرکے دوسری شئی کی طرف راغب ہونے کا عمل کبھی معاوضہ سے ہوتا ہے اور کبھی بیع وغیرہ کے ذریعے' جس چیز سے آدمی رغبت ختم کرتا ہے اس سے منہ پھیر لیتا ہے' اور جس چیز میں خواہش رکھتا ہے اس کی طرف راغب ہوتا ہے' اس شئی کے اعتبار سے جس سے اس نے انحراف کیا ہے اس کے حال کو زہد کہیں گے' اور اس شئی کی نسبت سے جس کی طرف وہ راغب ہوا ہے اس کے حال کو محبت کہیں گے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ زہد کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہے' ایک اس چیز کی جس سے انحراف کیا جائے' اور دوسری اس چیز کی جس کی طرف رغبت کی جائے' اور یہ

بھی ضروری ہے کہ جس چیز سے رغبت ختم کی جائے وہ اس لائق ہو کہ اس کی رغبت کی جاسکے' چنانچہ اس شخص کو زاہد نہیں کہہ سکتے جو غیر مطلوب شئی سے منحرف ہو' جیسے اینٹ پتھر سے انحراف کرنے کو زہد نہیں کہہ سکتے' زاہد صرف وہ ہو گا جو درہم و دینار کا تارک ہو' اینٹ پتھر کی طرف رغبت ہو ہی نہیں سکتی۔ یہاں یہ بھی ضروری ہے کہ دوسری چیز پہلی سے بہتر ہو' تاکہ رغبت غالب ہو سکے' چنانچہ بائع اس وقت تک بیع پر راضی نہیں ہوتا جب تک مشتری (قیمت) مبیع (فروخت کی جانے والی چیز) سے بہتر نہ ہو' اس طرح بیع کے تعلق سے بائع کی حالت کو زہد کہہ سکتے ہیں' اور مبیع کے عوض کی نسبت سے رغبت اور محبت کہہ سکتے ہیں۔ اسی لئے قرآن حکیم میں ارشاد فرمایا گیا ہے:۔

وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ دَرَاهِمَ مَعْدُودَةٍ وَكَانُوا فِيهِ مِنَ الزَّاهِدِينَ۔ (پ ۱۲ ر ۱۲ آیت ۲۰)

اور ان کو بہت ہی کم قیمت میں فروخت کر ڈالا' اور وہ لوگ ان میں زہد کرنے والوں میں سے تھے۔

اس آیت میں لفظ شراء کا اطلاق بیع پر ہوا ہے' قرآن کریم نے اس آیت کریمہ کے ذریعے حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کا حال بیان کیا ہے کہ انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام میں زہد کیا تھا' یعنی یہ طمع کی تھی کہ یوسف کہیں چلے جائیں اور انہیں ان کے والد کی تمام توجہات حاصل ہو جائیں' ان لوگوں کو یوسف سے زیادہ باپ کی توجہ میں دل چسپی تھی' اسی عوض کی طمع میں انہوں نے یوسف کو چند سکوں میں فروخت کر ڈالا۔ اس تعریف سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص دنیا کو آخرت کے عوض فروخت کردے وہ دنیا کا زاہد ہے' اور جو شخص آخرت کے عوض دنیا خرید لے وہ بھی زاہد ہے' مگر دنیا کا' لیکن عادتاً زہد کا لفظ صرف اس شخص کے ساتھ مخصوص ہے جو دنیا میں زہد کرتا ہے جیسے الحاد کا لفظ اس شخص کے ساتھ خاص ہے جو باطل کی طرف مائل ہو' اگرچہ لغت میں مطلق میلان کو زہد کہتے ہیں' جب یہ بات ثابت ہوئی کہ زہد محبوب کو چھوڑنا ہے تو یہ بات خود بخود ثابت ہوتی ہے کہ چھوڑنے والے کو اس محبوب سے بھی زیادہ دل پسند چیز حاصل ہوتی ہے' ورنہ یہ بات کیسے ممکن تھی کہ وہ محبوب تر کو پائے بغیر محبوب کو ترک کر دیتا۔

زاہد کے مختلف درجات جو شخص اللہ تعالیٰ کے سوا ہر چیز سے کنارہ کش ہے' یہاں تک کہ اسے جنات الفردوس کی بھی طمع نہیں ہے' وہ صرف اللہ تعالیٰ سے محبت کرتا ہے' ایسے شخص کو زاہد مطلق کہا جائے گا' اور جو شخص دنیا کی ہر لذت سے کنارہ کش رہتا ہے' لیکن آخرت کے لذائذ میں رغبت رکھتا ہے' یعنی حور' قصور' نہروں اور میووں کی طمع کرتا ہے ایسا شخص بھی زاہد ہے لیکن اس کا درجہ پہلے کے مقابلے میں کم ہے' اور جو شخص دنیا کی بعض لذتیں ترک کرتا ہے بعض نہیں کرتا' مثلاً مال کی طمع نہیں کرتا جاہ کی حرص کرتا ہے' یا کھانے میں توسع نہیں کرتا' بلکہ زیب و زینت خوب کرتا ہے' ایسا شخص مطلق زاہد کہلانے کا مستحق نہیں ہے' زاہدین میں اس کا درجہ ایسا ہے جیسے تائبین میں اس شخص کا درجہ جو بعض معاصی سے توبہ کرلے اور بعض سے نہ کرے' یہ زہد بھی صحیح ہے' جیسے بعض معاصی سے توبہ صحیح ہے اس لئے کہ توبہ کے معنی ہیں محظورات ترک کرنا اور زہد کے معنی ہیں وہ مباحات ترک کرنا جن سے نفس حظ پاتا ہے' جس طرح یہ بات بعید از قیاس نہیں کہ آدمی بعض ممنوعہ امور چھوڑ دے اسی طرح یہ بھی خلاف عقل نہیں ہے کہ وہ بعض مباحات ترک کردے' البتہ صرف محظورات پر اکتفا کرنے والے کو زاہد نہیں کہا جاسکتا' اگرچہ اس نے محظورات میں زہد کیا ہے' اور ان سے انحراف کیا ہے' لیکن عادتاً یہ لفظ ترک مباحات کے ساتھ مخصوص ہے اس سے معلوم ہوا کہ اصطلاح میں زہد کے معنی ہیں دنیا سے رغبت ہٹا کر آخرت کی طرف مائل ہونا' یا غیر اللہ سے تعلق منقطع کرکے اللہ سے تعلق قائم کرنا یہ درجہ بہت بلند ہے۔

ہم نے پہلے کہیں یہ بات لکھی ہے کہ جس چیز کی طرف رغبت کی جائے وہ زاہد کے نزدیک اس چیز سے بہتر ہو جس سے رغبت ختم کی گئی ہے' اسی طرح یہ بات بھی ضروری ہے کہ جس چیز سے رغبت منقطع کی جائے اس پر زاہد کو قدرت بھی ہو' اس لئے کہ جس چیز پر قدرت ہی نہ ہو اسے چھوڑنے کے کوئی معنی ہی نہیں ہیں' اور رغبت کا زوال اسی وقت ہوتا ہے جب کوئی چیز چھوڑی جائے۔ ابن المبارک کو کسی نے زاہد کہہ کر مخاطب کیا' آپ نے ارشاد فرمایا زاہد تو عمر ابن عبدالعزیز ہیں کہ ان کے پاس دنیا دست بستہ آئی مگر انہوں نے اس کی طرف رخ بھی نہیں کیا بھلا میں نے کس چیز میں زہد کیا ہے۔

علم کے معنی علم جو حال کا سبب ہے' اور حال جس کا ثمرہ ہے وہ یہ ہے کہ زاہد اس حقیقت سے واقف ہو کہ جو چیز ترک کی جا رہی ہے وہ اس چیز کے مقابلے میں جس کی رغبت کی جا رہی ہے حقیر ہے' جیسے تاجر یہ بات جانتا ہے کہ مبیع کی بہ نسبت عوض بہتر ہے' یہی جاننے کے بعد وہ مبیع میں دل چسپی لیتا ہے' اگر اسے تحقیق سے یہ بات معلوم نہ ہو تو یہ تصور ہی نہیں کیا جاسکتا کہ وہ مبیع سے دست بردار ہو جائے گا اسی طرح جو شخص یہ جان لیتا ہے کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ کے پاس ہے وہ باقی رہنے والا ہے' یہ کہ آخرت بہتر اور پائدار ہے' یعنی اس کی لذتیں اپنی ذات سے عمدہ ہیں' اور باقی رہنے والی ہیں جیسے جواہر عمدہ ہوتے ہیں اور برف کے خوبصورت ٹکڑوں کے مقابلے میں پائدار ہوتے ہیں' اور برف کے مالک کے لئے یہ بات مشکل نہیں ہے کہ وہ جواہر اور لآلی کے عوض برف کے ٹکڑے فروخت کر ڈالے' مطلب یہ ہے کہ اگر اسے یہ پیش کش کی جائے کہ وہ جواہر قبول کرلے اور برف کے ٹکڑے دیدے تو وہ بخوشی تیار ہو جائے گا' دنیا اور آخرت کی یہی مثال ہے' دنیا اس برف کی طرح ہے جو دھوپ میں رکھا ہوا ہو' اور پگھل پگھل کر ختم ہونے کے قریب ہو' اور آخرت اس جوہر کی طرح ہے جسے فنا نہیں ہے' جو شخص جس قدر دنیا و آخرت میں اس فرق کی حقیقت سے واقف ہے وہ اسی قدر بیع اور معاملات میں رغبت رکھتا ہے' یہاں تک کہ جو شخص اس آیت کے مطابق اپنے مال اور نفس کو فروخت کرنے پر یقین رکھتا ہے :۔

اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ (پ ۱۱ ر ۳ آیت ۱۱۱)

بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے ان کی جانوں اور مالوں کو اس بات کے عوض خرید لیا ہے کہ ان کو جنت ملے گی۔

اسے یہ خوشخبری سنادی گئی ہے :۔ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَیْعِکُمُ الَّذِیْ بَایَعْتُمْ بِہٖ (پ ۱۱ ر ۳ آیت ۱۱۱)

تو تم لوگ اپنی اس بیع پر جس کا تم نے اس سے معاملہ ٹھہرایا ہے خوشی مناؤ۔

زہد میں علم کی اسی قدر ضرورت ہے' یعنی یہ بات جان لینا کافی ہے کہ آخرت بہتر اور پائیدار رہنے والی ہے' بعض اوقات اس حقیقت سے وہ لوگ بھی واقف ہوتے ہیں جو اپنے علم و یقین کے ضعف' یا غلبۂ شہوت کے باعث' یا شیطان کے ہاتھوں مقہور ہونے' اور اس کے وعدوں سے فریب کھانے کی بنا پر دنیا چھوڑنے پر قادر نہیں ہوتے' یہ لوگ شیطان کے دیے ہوئے مغالطوں میں رہتے ہیں یہاں تک کہ موت انہیں اچک لیتی ہے' اور پھر اس کے علاوہ کوئی راستہ باقی نہیں رہتا کہ حسرت کریں' اور جو کچھ کھو چکے ہیں اس پر ماتم کریں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں جابجا دنیا کی حقارت بیان فرمائی ہے' ارشاد فرمایا :۔

قُلْ مَتَاعُ الدُّنْیَا قَلِیْلٌ ۔ (پ ۵ ر ۷ آیت ۷۷) آپ فرمادیجئے کہ دنیا کا تمتع محض چند روزہ ہے۔

اور آخرت کی بہتری پر اس آیت کریمہ میں اشارہ فرمایا گیا ہے :۔

وَقَالَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَیْلَکُمْ ثَوَابُ اللّٰہِ خَیْرٌ ۔ (پ ۲۰ ر ۱۱ آیت ۸۰)

اور جن لوگوں کو فہم عطا ہوئی تھی وہ کہنے لگے ارے تمہارا ناس ہو اللہ تعالیٰ کے گھر کا ثواب ہزار درجہ بہتر ہے۔

اس آیت میں اس حقیقت پر تنبیہ کی گئی ہے کہ جسے آخرت کی عمدگی کا علم ہوتا ہے اس کا دل اس کے عوض سے منحرف ہوتا ہے کیوں کہ زہد کا تصور اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ محبوب تر چیز محبوب کا عوض نہ بنے' چنانچہ روایات میں ہے کہ ایک صحابی یہ دعا کیا کرتے تھے :۔

اَللّٰھُمَّ اَرِنِی الدُّنْیَا کَمَا تَرَاھَا ۔ اے اللہ! میرے نزدیک دنیا ایسی کردے جیسی تیرے نزدیک ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے ارشاد فرمایا :۔

لَا تَقُلْ ھٰکَذَا وَلٰکِنْ قُلْ اَرِنِی الدُّنْیَا کَمَا اَرَیْتَھَا الصَّالِحِیْنَ مِنْ عِبَادِکَ ۔

(صاحب الفردوس۔ ابوالنعیم)

ایسا مت کہو' بلکہ اس طرح کہو کہ مجھے دنیا اس طرح دکھا جس طرح تو اپنے نیک بندوں کو دکھاتا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ دنیا کو ایسی سمجھتا ہے جیسی وہ حقیقت میں ہے' ہر مخلوق اس کی عظمت کے مقابلے میں حقیر ہے' اور بندہ اسے اس شئے کی بہ نسبت حقیر سمجھتا ہے جو اس سے بہتر ہے چنانچہ اگر گھوڑے بیچنے والے کو گھوڑے میں رغبت نہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ گھوڑوں کو حشرات الارض کی طرح حقیر سمجھتا ہے' یہ شخص اگرچہ حشرات الارض سے مستغنی ہے' لیکن گھوڑوں سے مستغنی نہیں ہو سکتا' اور اللہ تعالیٰ بذاتہ ہر چیز سے بے نیاز ہے اس لئے اپنی عظمت کے مقابلے میں سب کو ایک ہی درجے میں رکھتا ہے' اگرچہ ایک دوسرے کی بہ نسبت ان میں تفاوت ہو' زاہد وہی ہے جو اشیاء کا تفاوت اپنے نفس کے اعتبار سے جانتا ہو' نہ کہ دوسرے کے اعتبار سے۔

عمل کے معنی اب وہ عمل بیان کیا جاتا ہے جو زہد کی حالت سے صادر ہوتا ہے' اس عمل کا حاصل ایک چیز کو چھوڑنا ہے' اور ایک چیز کو اختیار کرنا ہے جو چھوڑی ہوئی چیز کے مقابلے میں بہتر ہے' زہد دراصل مبیع اور معاملات کی ایک صورت ہے' جس طرح اس عمل کے معنی جو عقد بیع سے صادر ہو یہ ہیں کہ مبیع ترک کردی جائے' اور اسے اپنے قبضے سے نکال دیا جائے' اور اس کا عوض لے لیا جائے' اسی طرح زہد کا تقاضا یہ ہے کہ جس چیز میں زہد کیا جائے' اسے بالکلیہ طور پر ترک کردیا جائے' اور وہ چیز جس میں زہد کرنا چاہیے دنیا ہے اپنے تمام تر اسباب' مقدمات اور علامات سمیت' زاہد کو اس دنیا کی محبت اپنے دل سے نکال دینی چاہیے اور اس کی جگہ طاعات کی محبت داخل کرنی چاہیے' پھر جو چیز دل سے نکالے وہی چیز آنکھ' ہاتھ اور باقی تمام اعضاء سے نکال دے' اور ان تمام اعضاء کے ذریعہ اطاعت پر مواظبت کرے' محض دنیا کی محبت نکالنا کافی نہیں ہے' بلکہ اطاعت بھی ضروری ہے' ورنہ اس بیع کو بیع سلم کہیں گے جس میں مبیع دیدی جاتی ہے' اور ثمن نہیں لیا جاتا۔ اگر جانبین سے لین دین کی تمام شرائط مکمل ہو جائیں تو عاقد کو اس بات پر خوش ہونا چاہیے کہ اس نے نفع کا معاملہ کیا ہے۔ یہاں زہد کے باب میں اگرچہ بیع سلم کی صورت ہے لیکن جس ذات سے معاملہ ہے وہ اپنے عہد کا پکا اور وعدے کا سچا ہے' اور دینے پر قادر ہے' اس لئے معاملہ کرنے والے کو مطمئن ہو کر معاملہ کرنا چاہیے اور سمجھنا چاہیے کہ ثمن قبضے میں آچکا ہے' جیسے دنیاوی کاروبار میں ایک فریق دوسرے فریق کی دیانت اور راستی پر اعتماد کرتے ہوئے مال دیتا ہے' اور ثمن کی پروا نہیں کرتا' وہ یہ سمجھتا ہے کہ ثمن اس سے قریب ہے' جب چاہے گا اپنے قبضے میں لے لے گا' جب دنیاوی معاملات میں باہمی اعتماد اور اس سے حاصل ہونے والے منافع کا یہ حال ہے تو اس تجارت کے نفع میں کیسے شبہ ہو سکتا ہے جسے زہد کہتے ہیں۔

یہاں اس حقیقت کی وضاحت ضروری ہے کہ جو شخص دنیا کو اپنے پاس رکھے گا وہ کبھی زہد کی صفت سے متصف نہیں ہو سکے گا' چنانچہ برادران یوسف کے قصے میں اللہ تعالیٰ نے انہیں صرف حضرت یوسف علیہ السلام کے سلسلے میں زاہد کہا' ان کے بھائی ابن یامین کے باب میں زاہد نہیں کہا' حالانکہ جس طرح وہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو حضرت یوسف علیہ السلام کی قربت سے محروم کرنا چاہتے تھے اسی طرح وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ بن یامین بھی دور چلے جائیں' لیکن انہوں نے صرف حضرت یوسف علیہ السلام کی دوری پر اتفاق کیا' اور اکثریت کی خواہش کے باوجود بن یامین کو دور نہ کر سکے' اس لئے ان کے باب میں زاہد نہیں کہلائے' اسی طرح وہ لوگ اس وقت کے زہد کے وصف سے متصف نہیں ہوئے' جب انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو نکالنے کا ارادہ کیا تھا' بلکہ جب نکال چکے تب ان پر زاہدین کا اطلاق ہوا' اسی طرح دنیا کا زہد بھی ہے' اگر تمہارے پاس دنیا ہے تو تم زاہد نہیں ہو' اور اگر دنیا فروخت کر چکے ہو تو زاہد ہو' اس سے معلوم ہوا کہ رغبت کی علامت روکنا ہے' اور زہد کی علامت نکالنا ہے۔ اگر تم نے دنیا کی بعض چیزیں نکال دیں اور بعض روک لیں تو تم ان بعض چیزوں میں زاہد کہلاؤ گے جو تم نے نکالی ہیں' مطلق زاہد نہیں کہلاؤ گے' اسی طرح اگر تمہارے پاس مال نہیں ہے' اور دنیا تمہاری ہمنوا نہیں ہے تو تم زاہد نہیں کہلا سکتے' اس لئے کہ جس چیز پر تمہیں قدرت نہیں تم اس کے ترک پر بھی قادر نہیں ہو' تمہیں شیطان اس فریب میں مبتلا کر سکتا ہے کہ اگرچہ تمہارے پاس دنیا نہیں ہے اس کے باوجود تم زاہد ہو۔ یہ ایک شیطانی وسوسہ ہے' اور اس کا خوب صورت فریب ہے' تمہیں اس فریب میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے

زہد میں اصل چیز قدرت کا امتحان ہے' جب تمہیں قدرت ہی نہیں ہے تو اس کا امتحان کیا دو گے' بہت سے لوگ ایسے ہیں جو معاصی کو اس وقت تک برا سمجھتے ہیں جب تک وہ ان کی دسترس میں نہیں ہوتے' اور جب ان کے اسباب مہیا ہو جاتے ہیں' اور کسی کا خوف یا ڈر باقی نہیں رہتا تو گناہوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں' جب گناہوں میں اس فریب کا شکار ہوتے ہیں تو مباحات میں ان کے وعدوں کا اعتبار کیسے کیا جا سکتا ہے۔ نفس پر صرف اس صورت میں اعتماد کیا جا سکتا ہے جب وہ بار بار تجربات کی بھٹی سے گزر کر کندن بن جائے' پہلے اسے مباحات پر قدرت دو' پھر دیکھو کہ وہ ترک کرتا ہے یا نہیں' اگر ترک کر دیتا ہے' اور ہر بار قدرت ملنے پر ترک کرنا ہی اس کی عادت بن جاتا ہے تو اس پر کچھ اعتماد کر لو' لیکن اس کے بدلنے سے ڈرتے بھی رہو' اس لئے کہ یہ بہت جلد عہد شکنی کر بیٹھتا ہے' اور طبیعت کے مقتضیٰ کی طرف سرعت کے ساتھ رجوع کرتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ نفس سے آدمی صرف اسی وقت مامون رہ سکتا ہے جب کہ وہ کسی چیز کو ترک کر دے اور یہ امن بھی صرف اس چیز میں ہو گا جسے اس نے قدرت پانے کے بعد ترک کیا ہو۔

ابن ابی لیلیٰؒ نے ابن شبرمہؒ سے کہا کہ تم اس جولاہے کے بیٹے کو دیکھتے ہو ان کی مراد امام ابو حنیفہ سے تھی۔ جب ہم کسی مسئلے میں کوئی فتویٰ دیتے ہیں تو یہ رد کر دیتا ہے' ابن شبرمہؒ نے فرمایا : میں نہیں جانتا کہ ابو حنیفہ جولاہے کے بیٹے ہیں یا نہیں لیکن اتنی بات جانتا ہوں کہ دنیا ان کے پاس آئی تو وہ اس سے بھاگے' اور ہم سے دور بھاگی تو ہم اس کی طلب میں پیچھے پیچھے دوڑے گویا امام ابو حنیفہ کی دنیا پر قدرت تھی' مگر انہوں نے زہد کیا۔ چند صحابہؓ نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ ہم اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہیں' اگر ہمیں یہ پتا چل جائے کہ فلاں کام اللہ تعالیٰ کی محبت کی علامت ہے تو وہی کام کریں' اسی وقت قرآن کریم کی یہ آیت نازل ہوئی :-

وَلَوْ اَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ اَنِ اقْتُلُوْا اَنْفُسَكُمْ اَوِ اخْرُجُوْا مِنْ دِيَارِكُمْ مَا فَعَلُوْهُ اِلَّا قَلِيْلٌ مِّنْهُمْ (پ ۵ ر ۶ آیت ۶۶)

اور ہم اگر لوگوں پر یہ بات فرض کر دیتے کہ تم خودکشی کیا کرو یا اپنے وطن سے بے وطن ہو جایا کرو' تو بجز معدودے چند لوگوں کے اس حکم کو کوئی بھی نہ بجا لاتا۔

حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے ارشاد فرمایا تو انہیں تھوڑے لوگوں میں سے ہے۔ (۱) حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ سے مروی ہے فرماتے ہیں مجھے یہ بات معلوم نہیں تھی کہ ہم میں سے بعض لوگ دنیا سے محبت کرنے والے بھی ہیں' جب یہ آیت نازل ہوئی تب مجھے اس کا علم ہوا :-

مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ۔ (پ ۴ ر ۷ آیت ۱۵۲)

تم میں سے بعض وہ تھے جو دنیا چاہتے تھے اور بعض وہ تھے جو آخرت کے طلبگار تھے۔

زہد سخاوت نہیں : یہاں یہ بات بھی جان لینی چاہیے کہ ہمت اور سخاوت کے ساتھ مال خرچ کرنا' لوگوں کے دلوں کو رجھانے کے لئے' اور کسی چیز کی طمع میں مال چھوڑنا زہد نہیں ہے' یہ سب امور اگرچہ محاسن میں شمار ہوں گے' لیکن زہد سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے' زہد یہ ہے کہ تم دنیا کو حقیر سمجھ کر ترک کر دو' اور آخرت کی نفاست کو پیش نظر رکھو' زہد کے علاوہ ہر نوع کا ترک ان لوگوں سے بھی ممکن ہے جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے' اس ترک کو شرافت' سخاوت' بہادری' اور خوش خلقی کہہ سکتے ہیں' لیکن زہد نہیں کہہ سکتے' اس لئے کہ ناموری' اور لوگوں کے دلوں کا رجحان دنیاوی حظوظ ہیں' اور مال سے زیادہ لذیذ ہیں' جس طرح مال کو سلم کے طور پر ترک کرنا اور عوض کی طمع رکھنا زہد نہیں ہے' اسی طرح یہ بھی زہد نہیں کہ ذکر' تعریف' اور جرات و سخاوت کی شہرت کے لالچ میں مال چھوڑنا بھی زہد نہیں ہے' اسی طرح یہ بھی زہد نہیں ہے کہ مال اس لئے چھوڑ دے کہ اسے سنبھال

(۱) مجھے اس روایت کی اصل نہیں ملی۔

کر رکھنے میں مشقت ہے' یا اسے حاصل کرنے میں دشواری ہوتی ہے' بادشاہوں اور امیروں کے دروازوں پر جانے' اور ان کے سامنے سر جھکانے کی ذلت برداشت کرنی پڑتی ہے' کیوں کہ اس میں ایک لذت چھوڑی جا رہی ہے' اور اس کے عوض میں دوسری لذت حاصل کی جا رہی ہے' حقیقت میں زاہد وہ شخص ہے جس کے پاس دنیا ذلیل و خوار ہو کر آئے' اور وہ اس سے جاہ کے نقصانات' یا بدنامی کے بغیر متمتع ہونے پر قادر ہو' اور یہ سوچ کر ترک کر دے کہ اگر میں اس سے مانوس ہو گیا تو یہ غیر اللہ سے انسیت ہوگی' اور ماسوی اللہ سے محبت یا انسیت اللہ کی محبت میں شرک ہے' یا آخرت کے ثواب کی امیدیں ترک کر دے گویا اس امید میں کہ جنت میں شرابیں ملیں گی دنیا کے خوش ذائقہ شربت چھوڑ دے' اور اس امید میں کہ جنت میں حوریں عطا کی جائیں گی' عورتوں اور باندیوں کی طرف راغب نہ ہو' اور اس توقع پر کہ جنت میں باغات ہوں گے' ان میں خوبصورت اور سرسبز و شاداب درخت ہوں گے دنیا کے باغوں سے دل نہ بہلائے اور اس لالچ میں کہ جنت میں آرائش اور زیب و زینت کا سامان ہو گا دنیا میں زینت نہ کرے' جنت کے پھلوں اور میووں کے شوق میں دنیا کے لذیذ کھانے ترک کر دے' اور یہ سوچ کر کہ کہیں قیامت کے روز اس سے یہ نہ کہدیا جائے :-

اَذْهَبْتُمْ طَيِّبَاتِكُمْ فِي حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا۔ (پ۲۶ ر۲ آیت ۲۰)

تم اپنی لذت کی چیزیں اپنی دنیوی زندگی میں حاصل کر چکے۔

جنت کی موعودہ چیزوں کو ان تمام راحتوں پر ترجیح دے جو اسے دنیا میں میسر ہیں' کیوں کہ وہ یہ بات جانتا ہے کہ آخرت بہتر اور باقی رہنے والی ہے۔

زہد کے فضائل

آیات اللہ تعالیٰ نے متعدد مواقع پر زہد کی تعریف کی ہے' اور اپنے بندوں کو اس کی ترغیب دی ہے' فرمایا :-

وَقَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَيْلَكُمْ ثَوَابُ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّمَنْ آمَنَ۔ (پ۲۰ ر۱۱ آیت ۸۰)

اور جن لوگوں کو فہم عطا ہوئی تھی وہ کہنے لگے ارے تمہارا ناس ہو اللہ کا ثواب ہزار درجہ بہتر ہے اس شخص کے لئے جو ایمان لایا۔

اس آیت میں زہد کو علماء کی طرف منسوب کیا ہے' اور زاہدین کو علم کے وصف سے متصف قرار دیا ہے' یہ انتہائی تعریف ہے' ایک جگہ ارشاد فرمایا :-

اُولٰٓئِكَ يُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوْا۔ (پ۲۰ ر۹ آیت ۵۴)

ان لوگوں کو ان کے صبر کی وجہ سے دوہرا ثواب ملے گا۔

مفسرین نے اس کی تفسیر اس طرح کی ہے کہ جن لوگوں نے دنیا میں زہد کرنے پر صبر کیا ایک جگہ ارشاد فرمایا :-

اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا۔ (پ۱۵ ر۱۳ آیت ۷)

ہم نے زمین کے اوپر کی چیزوں کو اس کے لئے باعث رونق بنایا تاکہ ہم لوگوں کی آزمائش کریں کہ ان میں زیادہ اچھا عمل کون کرتا ہے۔

بعض مفسرین کے نزدیک اس کے معنی یہ ہیں کہ جو دنیا میں زیادہ زہد کرنے والا ہے' پھر اس کے زہد کو احسن اعمال قرار دیا گیا۔ ایک موقع پر ارشاد فرمایا :-

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ۔ (پ۲۵ ر۴ آیت ۲۰)

اور جو آخرت کی کھیتی چاہے گا ہم اس کی کھیتی میں اضافہ کریں گے اور جو دنیا کی کھیتی کا طالب ہو تو ہم اس کو

کچھ دنیا (اگر چاہیں) دے دیں گے اور آخرت میں اس کا کچھ حصہ نہیں ہے۔

وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا لِنَفْتِنَهُمْ فِيهِ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَأَبْقَىٰ۔ (پ ۱۶ ر ۱۷ آیت ۱۳۱)

اور ہرگز ان چیزوں کی طرف آپ آنکھ اٹھا کر نہ دیکھئے جن سے ہم نے ان کے مختلف گروہوں کو ان کی آزمائش کے لئے متمتع کر رکھا ہے کہ وہ (محض) دنیوی زندگی کی رونق ہے' اور آپ کے رب کا رزق بدرجہا بہتر اور پائدار ہے۔

اَلَّذِينَ يَسْتَحِبُّونَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا عَلَى الْآخِرَةِ۔ (پ ۱۳ ر ۱۳ آیت ۳)

ان کو جو دنیوی زندگی کو آخرت پر ترجیح دیتے ہیں۔

اس آیت میں کفار کا وصف بیان کیا گیا ہے' اس سے معلوم ہوا کہ مومن وہ ہے جو اس وصف کے برعکس ہو' یعنی دنیا کے مقابلے میں آخرت سے محبت کرتا ہو۔

روایات : دنیا کی مذمت میں بے شمار روایات وارد ہیں' ان میں سے بہت سی روایات ہم نے کتاب ذم الدنیا میں ذکر کی ہیں' دنیا کی محبت مہلکات میں سے ہے' اور احیاء العلوم جلد ثالث میں مہلکات کا بیان ہے' یہاں ہم دنیا سے بغض رکھنے کے فضائل ذکر کرتے ہیں' بغض دنیا منجیات میں سے ہے' اور اس جلد میں منجیات ہی مذکور ہیں' بغض دنیا سے یہی مراد ہے۔ اس سلسلے میں بہت سی احادیث وارد ہیں' ان میں سے چند حسب ذیل ہیں :۔

وَمَنْ أَصْبَحَ وَهَمُّهُ الدُّنْيَا شَتَّتَ اللّٰهُ عَلَيْهِ أَمْرَهُ وَفَرَّقَ عَلَيْهِ ضَيْعَتَهُ وَجَعَلَ فَقْرَهُ بَيْنَ عَيْنَيْهِ وَلَمْ يَأْتِهِ مِنَ الدُّنْيَا إِلَّا مَا كُتِبَ لَهُ وَمَنْ أَصْبَحَ وَهَمُّهُ الْآخِرَةُ جَمَعَ اللّٰهُ لَهُ هَمَّهُ وَحَفِظَ عَلَيْهِ ضَيْعَتَهُ وَجَعَلَ غِنَاهُ فِي قَلْبِهِ وَأَتَتْهُ الدُّنْيَا وَهِيَ رَاغِمَةٌ

(ابن ماجہ۔ زید ابن ثابتؓ)

جو شخص دنیا کی فکر میں مستغرق رہتا ہے اللہ تعالیٰ اس کا کام منتشر' اور اس کا نظام معیشت درہم برہم کر دیتا ہے' اور اس کے فقر کو اس کی آنکھوں کے سامنے کر دیتا ہے اور اسے دنیا میں سے صرف اسی قدر ملتا ہے جتنا اس کے لئے لکھا ہوا ہے' اور جو شخص فکر آخرت میں مستغرق رہتا ہے اللہ اس کی ہمت مجتمع کر دیتا ہے' اور اس کی معیشت محفوظ رکھتا ہے' اور اس کے دل میں مالداری ڈال دیتا ہے' اور دنیا اس کے پاس ذلیل و خوار ہو کر آتی ہے۔

إِذَا رَأَيْتُمُ الْعَبْدَ وَقَدْ أُعْطِيَ صَمْتًا وَزُهْدًا فِي الدُّنْيَا فَاقْتَرِبُوا مِنْهُ فَإِنَّهُ يُلَقَّى الْحِكْمَةَ (ابن ماجہ۔ ابو خلادؓ)

جب تم بندے کو دیکھو کہ اسے سکوت' اور دنیا میں زہد عطا ہوا ہے تو تم اس سے قریب ہو جاؤ اس لئے کہ اسے حکمت سکھلائی جاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :۔

وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا۔ (پ ۳ ر ۵ آیت ۲۶۹)

اور جس کو دین کا فہم مل جائے اس کو بڑے خیر کی چیز مل گئی۔

اسی لئے یہ مقولہ مشہور ہے کہ جو شخص چالیس برس تک دنیا میں زہد کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے دل میں حکمت کے چشمے جاری کر دیتا ہے' اور وہی حکمت کی باتیں اس کی زبان سے ظاہر کرتا ہے۔ بعض اصحاب رسول روایت کرتے ہیں کہ ہم نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں عرض کیا : یا رسول اللہ! کونسا شخص بہتر ہے؟ فرمایا :۔

كُلُّ مُؤْمِنٍ مَخْمُومُ الْقَلْبِ صَدُوقُ اللِّسَانِ۔
ہر وہ مومن جو دل کا صاف اور زبان کا سچا ہو۔

ہم نے عرض کیا : یارسول اللہ! مخموم القلب سے کون مراد ہے؟ آپ نے ارشاد فرمایا : وہ پرہیزگار' اور صاف دل انسان ہے جس میں نہ خیانت ہو' نہ فریب ہو' نہ کھوٹا پن ہو' نہ سرکشی ہو' اور نہ حسد ہو' ہم نے عرض کیا اس کے بعد کون شخص زیادہ اچھا ہے؟ فرمایا :۔

الَّذِي يَشْنَأُ الدُّنْيَا وَيُحِبُّ الْآخِرَةَ۔ (ابن ماجہ۔ عبداللہ ابن عمرؓ)
جو دنیا سے نفرت کرتا ہے اور آخرت سے محبت کرتا ہے۔

اس حدیث کا مفہوم مخالف یہ ہے کہ جو شخص دنیا سے محبت کرے وہ برا آدمی ہے۔ ایک حدیث میں ارشاد فرمایا :۔

إِنْ أَرَدْتَ أَنْ يُحِبَّكَ اللّٰهُ فَازْهَدْ فِي الدُّنْيَا۔ (ابن ماجہ۔ سہل ابن سعدؓ)
اگر تم یہ چاہتے ہو کہ اللہ تم سے محبت کرے تو تم دنیا میں زہد کرو۔

اس حدیث میں زہد کو محبت کا سبب قرار دیا ہے' اور یہ حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ کے محبوبین کے لئے بلند درجات ہیں' اس لئے دنیا میں زہد کرنا افضل ترین مقامات میں سے ایک مقام ہے' اس حدیث کا مفہوم مخالف یہ ہے کہ دنیا سے محبت کرنے والا اللہ تعالیٰ کے بغض کا نشانہ بنتا ہے۔ اہل بیت سے مروی ایک روایت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ الفاظ ہیں :۔

الزُّهْدُ وَالْوَرَعُ يَجُولَانِ فِي الْقَلْبِ كُلَّ لَيْلَةٍ فَإِنْ صَادَفَا قَلْبًا فِيهِ الْإِيمَانُ وَالْحَيَاءُ أَقَامَا فِيهِ وَإِلَّا ارْتَحَلَا (۱)
زہد اور ورع ہر شب دل میں گشت کرتے ہیں' اگر انہیں کوئی ایسا دل مل جاتا ہے جس میں ایمان اور حیاء ہو تو وہ اس میں قیام کرتے ہیں' ورنہ کوچ کر جاتے ہیں۔

حضرت حارثہؓ نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ میں یقیناً مومن ہوں آپ نے ان سے دریافت فرمایا تمہارے ایمان کی حقیقت کیا ہے؟ عرض کیا میں نے اپنے دل کو دنیا سے علیحدہ کر لیا ہے' چنانچہ میرے نزدیک دنیا کا پتھر اور سونا دونوں برابر ہیں' اور مجھے ایسا لگتا ہے گویا میں جنت اور دوزخ میں ہوں' اور گویا میں اپنے رب کے عرش کے قریب ظاہر ہوں' سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تم نے (اپنا ایمان) پہچان لیا' اس لئے اسے لازم پکڑے رہو (اس کے بعد صحابہ سے مخاطب ہو کر فرمایا) اس بندے کا دل اللہ تعالیٰ نے ایمان سے منور کر دیا ہے (بزار۔ انسؓ طبرانی۔ حارث ابن مالک) دیکھئے اس حدیث میں پہلے حارثہ نے دنیا سے اپنی دوری کی وضاحت کی۔ اور اسے یقین کا لباس پہنایا اس کے بعد سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تعریف فرمائی' اور ارشاد فرمایا کہ اس بندے کا دل اللہ تعالیٰ نے ایمان سے روشن کر دیا ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :۔

فَمَنْ يُرِدِ اللّٰهُ أَنْ يَهْدِيَهُ يَشْرَحْ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ۔ (پ ۸ ر ۲ آیت ۱۲۶)
سو جس شخص کو اللہ تعالیٰ رستے پر ڈالنا چاہتا ہے اس کا سینہ اسلام کے لئے کشادہ کر دیتا ہے۔

صحابہؓ نے عرض کیا : یارسول اللہ! شرح صدر سے کیا مراد ہے؟ فرمایا :۔

إِنَّ النُّورَ إِذَا دَخَلَ فِي الْقَلْبِ انْشَرَحَ لَهُ الصَّدْرُ وَانْفَسَحَ قِيلَ : يَارَسُولَ اللّٰهِ وَهَلْ لِذٰلِكَ مِنْ عَلَامَةٍ؟ قَالَ : التَّجَافِي عَنْ دَارِ الْغُرُورِ وَالْإِنَابَةُ إِلَى دَارِ الْخُلُودِ وَالْاِسْتِعْدَادُ لِلْمَوْتِ قَبْلَ نُزُولِهِ (حاکم)

---

(۱) مجھے اس روایت کی اصل نہیں ملی۔

جب دل میں نور داخل ہوتا ہے تو اس کے لئے سینہ کھل جاتا ہے' اور کشادہ ہو جاتا ہے' عرض کیا گیا :
یا رسول اللہ! کیا اس کی کوئی علامت بھی ہے؟ فرمایا : دھوکے کے گھر سے دور رہنا اور موت آنے سے پہلے اس کے لئے مستعد رہنا۔

اس حدیث میں زہد کو اسلام کے لئے شرط قرار دیا گیا ہے' یعنی صحیح معنی میں اسلام کے لئے اسی کا دل کشادہ ہوتا ہے جو دنیا سے کنارہ کش رہتا ہے' ایک مرتبہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام سے ارشاد فرمایا :-

اِسْتَحْيُوْا مِنَ اللّٰهِ حَقَّ الْحَيَاءِ' قَالُوْا اِنَّا نَسْتَحْيِيْ مِنْهُ تَعَالٰى' فَقَالَ لَيْسَ كَذٰلِكَ تَبْنُوْنَ مَا لَا تَسْكُنُوْنَ وَتَجْمَعُوْنَ مَا لَا تَاْكُلُوْنَ۔ (طبرانی۔ ام ولید)

اللہ سے شرم کرو جیسا کہ اس سے شرم کرنے کا حق ہے' صحابہ نے عرض کیا ہم تو اللہ تعالیٰ سے شرم کرتے ہی ہیں' فرمایا یہ بات نہیں ہے تم وہ عمارتیں بناتے ہو جن میں رہنا نہیں ہے' اور وہ اموال جمع کرتے ہو جو کھانے نہیں ہیں۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مکانات کی تعمیر' اور اموال کی ذخیرہ اندوزی دونوں حیاء کے منافی ہیں۔ ایک روایت میں ہے کہ کچھ لوگ وفد کی صورت میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے' اور کہنے لگے کہ ہم لوگ مومن ہیں' آپ نے دریافت فرمایا کہ تمہارے ایمان کی کیا علامت ہے؟ عرض کیا : مصیبت پر صبر' فراخی پر شکر' قضائے الٰہی پر رضا' اور دشمنوں پر نزول مصیبت کے وقت شماتت نہ کرنا' سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :-

اِنْ كُنْتُمْ كَذٰلِكَ فَلَا تَجْمَعُوْا مَا لَا تَاْكُلُوْنَ وَلَا تَبْنُوْا مَا لَا تَسْكُنُوْنَ وَلَا تَنَافَسُوْا فِيْمَا عَنْهُ تَرْحَلُوْنَ۔ (خطیب' ابن عساکر۔ جابرؓ)

اگر تم ایسے ہی ہو تو جو چیزیں کھانی نہیں وہ جمع مت کرو' جن مکانوں میں رہنا نہیں ہے وہ مت بناؤ' اور جن چیزوں کو چھوڑنا ہے ان میں منافست مت کرو۔

اس حدیث میں زہد کو ایمان کے لئے تکمیل کی شرط قرار دیا گیا ہے۔ حضرت جابر روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبے کے دوران ارشاد فرمایا کہ جو شخص لا الٰہ الا اللہ کہے گا اور اس میں کسی چیز کی آمیزش نہیں کرے گا اس کے لئے جنت واجب ہو گی' یہ سن کر حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے کھڑے ہو کر عرض کیا : یا رسول اللہ! میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں' آپ ہمارے لئے اپنے اس ارشاد کی وضاحت فرمائیں (کہ لا الٰہ الا اللہ میں کسی چیز کی آمیزش کس طرح ہو سکتی ہے؟) سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :-

حُبُّ الدُّنْيَا طَلَبًا لَهَا وَاتِّبَاعًا لَهَا' وَقَوْمٌ يَقُوْلُوْنَ قَوْلَ الْاَنْبِيَاءِ وَيَعْمَلُوْنَ عَمَلَ الْجَبَابِرَةِ فَمَنْ جَاءَ بِلَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ لَيْسَ فِيْهَا شَيْءٌ مِنْ هٰذَا وَجَبَتْ لَهُ الْجَنَّةُ (۱)

دنیا کی محبت اس کی طلب اور اتباع کے لئے' اور بعض لوگ باتیں انبیاء کی سی کرتے ہیں' اور عمل ظالموں جیسے جو شخص اس طرح کلمہ لا الٰہ الا اللہ کہے کہ اس میں ان امور میں سے کچھ نہ ہو تو اس کے لئے جنت واجب ہے۔

حدیث شریف میں ہے' سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :-

اَلسَّخَاءُ مِنَ الْيَقِيْنِ وَلَا يَدْخُلُ النَّارَ مُؤْمِنٌ' وَالْبُخْلُ مِنَ الشَّكِّ وَلَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ شَكَّ۔ (مسند الفردوس۔ ابو الدرداءؓ)

سخاوت یقین میں سے ہے' اور کوئی صاحب یقین دوزخ میں نہیں جائے گا' اور بخل شک میں سے ہے اور

---

(۱) مجھے یہ روایت حضرت جابرؓ سے نہیں ملی' البتہ حکیم ترمذی نے "نوادر" میں اسے زید ابن ارقم سے نقل کیا ہے۔

کوئی شک کرنے والا جنت میں داخل نہیں ہوگا۔

اَلسَّخِیُّ قَرِیْبٌ مِّنَ اللّٰہِ قَرِیْبٌ مِّنَ النَّاسِ قَرِیْبٌ مِّنَ الْجَنَّۃِ وَالْبَخِیْلُ بَعِیْدٌ مِّنَ اللّٰہِ بَعِیْدٌ مِّنَ النَّاسِ قَرِیْبٌ مِّنَ النَّارِ۔ (ترمذی۔ ابو ہریرہؓ)

سخی اللہ سے قریب ہوتا ہے' لوگوں سے قریب ہوتا ہے' اور جنت سے قریب ہوتا ہے' اور بخیل اللہ سے دور ہوتا ہے' لوگوں سے دور ہوتا ہے اور دوزخ سے قریب ہوتا ہے۔

اس حدیث میں بخل کی مذمت کی گئی ہے جو دنیا میں رغبت کا ثمرہ ہے' اور سخاوت کی تعریف کی گئی ہے جو زہد فی الدنیا کا ثمرہ ہے' اور ثمرہ کی مدح و مذمت سے لامحالہ مثمر کی مدح و مذمت ہوتی ہے۔ ابن المسیبؓ ابوذرؓ سے روایت کرتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جو شخص دنیا میں زہد کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے دل میں حکمت داخل کر دیتا ہے' اور اس کی زبان سے حکمت ہی ظاہر فرماتا ہے' اسے دنیا کا مرض اور اس کی دوا دونوں سے آگاہ کر دیتا ہے' اور اسے دنیا سے دار السلام کی طرف سلامتی کے ساتھ نکالتا ہے (۱)۔ ایک روایت میں ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب کے ساتھ ایسی اونٹنیوں کے پاس سے گزرے جو دودھ بہت دیتی تھیں اور حاملہ تھیں' عرب کے لوگ ان اونٹنیوں کو بے حد پسند کرتے تھے' اور نہایت نفیس جانتے تھے' کیوں کہ ان سے متعدد فائدے تھے' سواری کے کام بھی آتی تھی' ان سے گوشت اور دودھ کا فائدہ بھی تھا' عربوں کے قلوب میں اونٹنیوں کی اسی عظمت کے پیش نظر اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا:۔

وَاِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ۔ (پ ۳۰ ر ۶ آیت ۴) اور جب دس مہینے کی گابھن اونٹنیاں چھٹی پھریں گی۔

راوی کہتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان اونٹنیوں سے اعراض فرمایا' اور نگاہیں نیچی کرلیں' صحابہ نے عرض کیا: یارسول اللہ! یہ تو ہماری بہترین دولت ہیں' آپ ان کی طرف کیوں نہیں دیکھ رہے ہیں؟ آپ نے ارشاد فرمایا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے اس سے منع فرمادیا ہے پھر آپ نے قرآن کریم کی یہ آیت تلاوت فرمائی:۔

وَلَا تَمُدَّنَّ عَیْنَیْکَ اِلٰی مَا مَتَّعْنَا بِہٖ (۲) (پ ۱۶ ر ۱۷ آیت ۱۳۱)

اور ہرگز ان چیزوں کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھئے جن سے ہم نے (کفار کو) متمتع کر رکھا ہے۔

حضرت مسروقؓ ام المومنین حضرت عائشہؓ سے نقل کرتے ہیں' فرماتی ہیں: میں نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا یارسول اللہ! آپ اللہ تعالیٰ سے کھانے کی درخواست کیوں نہیں کرتے کہ وہ آپ کو کھلا دے' میں بھوک میں آپ کی حالت دیکھ کر رونے لگی' آپ نے ارشاد فرمایا: اے عائشہؓ! اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے اگر میں اپنے رب سے یہ درخواست کرتا کہ وہ دنیا کے پہاڑوں کو سونا بنا کر میرے مقدم کردے تو وہ زمین پر جہاں چاہتا انہیں میرے ساتھ کر دیتا' لیکن میں نے دنیا کی بھوک کو اس کی شکم سیری پر' اس کے فقر کو اس کی مالداری پر' اور اس کے غم کو اس کی خوشی پر ترجیح دی' اے عائشہؓ! دنیا نہ محمد کے لئے مناسب ہے اور نہ آل محمد کے لئے' اے عائشہؓ! اللہ تعالیٰ اپنے اولوالعزم پیغمبروں کے لئے صرف یہ پسند کرتا ہے کہ وہ دنیا کے مصائب پر بھی صبر کریں' اور اس کی محبوب چیزوں سے بھی صبر کریں' پھر میرے لئے بھی یہی بات پسند کی کہ جن چیزوں کا انہیں مکلف بنایا ہے انہی چیزوں کا مجھے بھی مکلف بنائے' چنانچہ فرماتا ہے:۔

فَاصْبِرْ کَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ۔ (پ ۲۶ ر ۴ آیت ۳۵)

تو آپ صبر کیجئے جس طرح ہمت والے پیغمبروں نے صبر کیا تھا۔

خدا کی قسم میرے لئے اس کی اطاعت کے علاوہ کوئی چارۂ کار نہیں ہے' میں بخدا اپنی طاقت کے بقدر صبر ضرور کروں گا' اور قوت کی توفیق بھی اللہ ہی کی طرف سے ہے۔ (۳)

---

(۱) مجھے یہ روایت ابوذر سے نہیں ملی' ابن ابی الدنیا نے صفوان ابن سلیم سے اس مضمون کی ایک حدیث نقل کی ہے۔ (۲) مجھے اس روایت کی اصل نہیں ملی۔ (۳) مجھے اس روایت کی کوئی اصل نہیں ملی۔

روایت ہے کہ جب حضرت عمرؓ پر فتوحات کے دروازے کھلے تو ان کی صاحبزادی حضرت حفصہؓ نے عرض کیا کہ جب دنیا بھر سے وفود آپ کے پاس آیا کریں تو آپ نرم کپڑے پہن لیا کریں' اور کھانے کے لئے کچھ بنوالیا کریں' آپ بھی کھایا کریں اور حاضرین کو بھی کھلایا کریں' حضرت عمرؓ نے ان سے فرمایا : اے حفصہ کیا تم یہ بات جانتی ہو کہ بیوی اپنے شوہر کے حال سے زیادہ واقف ہوتی ہے' انہوں نے عرض کیا : جی ہاں! فرمایا میں تمہیں اللہ تعالیٰ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں' کیا تم جانتی ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اتنے برس نبی رہے اور آپ نے اور آپ کے گھر والوں نے اگر صبح کا کھانا کھالیا تو رات کو بھوکے رہے' اور رات کو کھالیا تو صبح کو بھوکے رہے' تم جانتی ہو کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اتنا عرصہ پیغمبری کا دنیا میں گذارا' مگر آپ نے یا آپ کے گھر والوں نے کبھی کھجوروں سے پیٹ نہیں بھرا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے خیبر پر فتح عطا فرمائی' تم جانتی ہو کہ ایک روز تم نے قدرے بلندی پر دسترخوان بچھا دیا' آپ کو یہ بات ناگوار گذری' اور آپ کے چہرۂ انور کا رنگ متغیر ہو گیا' اس کے بعد آپ نے وہ دسترخوان اٹھوا دیا اور کھانا اس سے قدرے نیچے یا زمین پر رکھا گیا' تم جانتی ہو کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم عباء کی دو تہہ کر کے اس پر آرام فرمایا کرتے تھے' ایک روز کسی نے اس کی چار تہیں کر دیں' اور آپ نے اس پر آرام فرمایا' جب بیدار ہوئے تو ارشاد فرمایا کہ تم نے اس عباء کے ذریعے مجھے تہجد کی نماز سے روک دیا' تم اس کی دو تہہ کرو جیسا کہ کرتے رہے ہو' تم جانتی ہو کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے کپڑے دھونے کے لئے اتارتے تھے' اتنے میں بلال آپ کو نماز کے لئے اطلاع دیتے تو آپ کے پاس کوئی دوسرا کپڑا نہیں ہوتا تھا جسے پہن کر نماز کے لئے تشریف لے جاسکیں' جب وہ کپڑے سوکھتے تھے تو انہیں پہن کر تشریف لے جاتے' تم جانتی ہو کہ بنی ظفر کی ایک عورت نے آپ کے لئے دو کپڑے تیار کئے' ایک ازار' اور ایک چادر' اور ان میں سے ایک کپڑا پہلے بھیج دیا' آپ' وہی ایک کپڑا پہن کر نماز کے لئے تشریف لے گئے' اور اس کپڑے کے دونوں کناروں میں گردن کے پاس گرہ لگائی' اور اسی ایک کپڑے میں نماز ادا فرمائی' غرضیکہ حضرت عمرؓ نے اس قدر واقعات بیان فرمائے کہ حضرت حفصہ رونے لگیں' اور خود آپ بھی روئے' اور اتنا روئے کی چیخیں نکل گئیں یہاں تک کہ ہم یہ سمجھے کہ شاید اسی حالت میں فوت ہو جائیں گے[1]

بعض روایات میں حضرت عمرؓ کی طرف اس قول کی نسبت بھی کی گئی ہے کہ میرے دو ساتھی تھے' جو ایک مخصوص نہج پر چلے' اگر میں ان سے مختلف راستے پر چلا تو بھٹک جاؤں گا' خدا کی قسم! میں ان حضرات کی پرُمشقت زندگی پر صبر کروں گا تاکہ ان کے ساتھ پرُ آسائش زندگی پاؤں۔ حضرت ابو سعید الخدریؓ روایت کرتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا : مجھ سے پہلے بعض انبیاء فقر میں مبتلا کئے جاتے تھے' اور ان کا لباس صرف ایک کملی ہوتی تھی' اور جوؤں سے ان کی آزمائش کی جاتی تھی' اور ان کے جسم میں اس قدر جوئیں ہو جاتی تھیں کہ ان کے کاٹنے سے ہلاکت کا اندیشہ ہو جاتا تھا' مگر یہ زندگی ان حضرات کے نزدیک اس زندگی سے جسے تم پسند کرتے ہو زیادہ محبوب تھی (ابن ماجہ)۔ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام مدین کے پانی پر پہنچے تو لاغری کی بنا پر سبزی کا رنگ ان کے پیٹ سے جھلکتا تھا' اصل میں حضرات انبیائے کرام اللہ تعالیٰ سے اس کے دوسرے بندوں کی بہ نسبت زیادہ واقف تھے' اور یہ بات جانتے تھے کہ آخرت کی فلاح کس زندگی میں مضمر ہے' اسی لئے ان کے زہد کا یہ عالم تھا۔

حضرت عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ جب قرآن کریم کی یہ آیت نازل ہوئی۔

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (پ ۱۰ر ۱۱ آیت ۳۴)

اور جو لوگ سونا چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں اور ان کو اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔

تو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا : دنیا کے لئے ہلاکت ہو' درہم و دینار کے لئے تباہی ہو' ہم نے عرض

---

(۱) یہ روایت اس شرح و بسط کے ساتھ کہیں نہیں ملی' البتہ اس کے تمام اجزاء مختلف کتابوں میں متعدد صحابہ سے منقول ہیں' خاص طور پر شمائل ترمذی میں اس نوع کے متعدد واقعات منقول ہیں۔

کیا : یارسول اللہ! ہمیں اللہ تعالی نے سونا چاندی ذخیرہ کرنے سے منع کردیا ہے' اب ہم کیا چیز ذخیرہ کریں؟ آپ نے ارشاد فرمایا : تم ذکر کرنے والی زبان' شکر کرنے والا دل' اور آخرت پر مدد کرنے والی نیک بیوی اختیار کرو
(ترمذی' ابن ماجہ۔ ثوبان)

حضرت حذیفہؓ کی روایت میں ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :

مَنْ آثَرَ الدُّنْيَا عَلَى الْآخِرَةِ ابْتَلَاهُ اللّٰهُ بِثَلَاثٍ هَمًّا لَا يُفَارِقُ قَلْبَهُ أَبَدًا وَفَقْرًا لَا يَسْتَغْنِي أَبَدًا وَحِرْصًا لَا يَشْبَعُ أَبَدًا (۱)

جو شخص دنیا کو آخرت پر ترجیح دیتا ہے اللہ تعالی اسے تین چیزوں میں مبتلا کردیتا ہے' ایسے غم میں جو کبھی دل سے جدا نہیں ہوتا' ایسی مفلسی میں جو کبھی مالداری میں تبدیل نہ ہو' اور ایسے حرص میں جو کبھی شکم سیر نہ ہونے دے۔

ایک روایت میں ہے آپ نے ارشاد فرمایا :۔ بندے کا ایمان اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک کہ اسے گمنامی شہرت سے زیادہ' قلت شئی کثرت شئی سے زیادہ محبوب نہ ہو (مسند الفردوس۔ علی ابن طلحہ مرسلاً بتغییر یسیر۔) حضرت عیسی علیہ الصلاۃ والسلام ارشاد فرماتے ہیں کہ دنیا ایک پل ہے اس کے اوپر سے گذر جاؤ' اس پر عمارت مت بن بناؤ' لوگوں نے عرض کیا : اے اللہ کے نبی! ہمیں اجازت دیجئے کہ ہم اللہ کی عبادت کے لئے کوئی مکان تعمیر کرلیں' فرمایا : جاؤ! پانی پر گھر بناؤ' لوگوں نے عرض کیا پانی پر گھر کیسے بنائیں گے' فرمایا اللہ کی محبت کے ساتھ دنیا کی محبت کیسے جمع ہوگی۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میرے اللہ نے مجھے اس اختیار سے نوازا تھا کہ اگر میں چاہوں تو مکہ کی وادی بطحاء کو سونے کا بنا دیا جائے' میں نے عرض کیا : یا اللہ میں چاہتا ہوں کہ ایک دن بھوکا رہوں' اور ایک دن پیٹ بھروں' جس دن بھوکا رہوں' اس دن تیری بارگاہ میں تضرع کروں' اور جس دن پیٹ بھروں اس دن تیری حمد و ثنا کروں۔ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے منقول ہے کہ ایک روز سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کہیں تشریف لے جارہے تھے' حضرت جبرئیلؑ آپ کے ہمراہ تھے' جب آپ کوہ صفا پر پہنچے تو حضرت جبرئیلؑ سے ارشاد فرمایا کہ اے جبرئیل! اس ذات کی قسم جس نے تمہیں حق کے ساتھ بھیجا ہے آل محمد نے اس حال میں بھی شام کی ہے کہ نہ اس کے پاس مٹھی بھر ستو تھا اور نہ آٹا' ابھی آپ اتنا ہی کہہ پائے تھے کہ آسمان کی جانب سے ایک کڑکدار آواز آئی جسے سن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خوف زدہ ہوگئے' آپ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام سے دریافت کیا (یہ کیسی آواز ہے) کیا اللہ تعالی نے قیامت بپا ہونے کا حکم دیدیا ہے' حضرت جبرئیل نے عرض کیا : نہیں' بلکہ یہ اسرافیل علیہ السلام ہیں جو آپ کا کلام سن کر نیچے آئے ہیں' چنانچہ حضرت اسرافیل علیہ السلام نے آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا : آپ نے جو کچھ فرمایا ہے وہ اللہ عزوجل نے سنا ہے اور مجھے زمین کی کنجیاں لے کر بھیجا ہے اور مجھے حکم دیا ہے کہ میں آپ سے یہ عرض کروں کہ اگر آپ چاہیں تو میں تہامہ کے پہاڑوں کو زمرد' یاقوت اور سونے چاندی کا بنا کر آپ کے ساتھ چلادوں' اور آپ چاہیں تو پیغمبر بادشاہ بن جائیں' اور چاہیں تو پیغمبر بندے بنے رہیں' حضرت جبرئیلؑ نے اشارہ کیا کہ اللہ کے لئے تواضع فرمائیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مرتبہ ارشاد فرمایا : میں نبی اور بندہ رہنا چاہتا ہوں (۲)

ارشاد نبوی ہے :۔

إِذَا أَرَادَ اللّٰهُ بِعَبْدٍ خَيْرًا زَهَّدَهُ فِي الدُّنْيَا وَرَغَّبَهُ فِي الْآخِرَةِ وَبَصَّرَهُ بِعُيُوبِ نَفْسِهِ

(مسند الفردوس۔ بحذف و زیادۃ)

---

(۱) مجھے یہ روایت حضرت حذیفہؓ سے نہیں ملی' البتہ اسی مضمون کی ایک حدیث طبرانی نے ابن مسعودؓ سے روایت کی ہے۔ (۲) یہ حدیث مختصرا پہلے بھی گذری ہے۔

جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کے لئے خیر کا ارادہ کرتا ہے تو اسے دنیا میں زاہد اور آخرت میں راغب کر دیتا ہے' اور اس کے نفس کے عیوب سے آگاہ فرما دیتا ہے۔

اسی طرح ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں :۔

اِزْهَدْ فِي الدُّنْيَا يُحِبُّكَ اللّٰهُ وَازْهَدْ فِيمَا اَيْدِي النَّاسِ يُحِبُّكَ النَّاسُ۔ (۱)

دنیا میں زہد کرو اللہ تم سے محبت کرے گا اور لوگوں کے اموال میں زہد کرو لوگ تم سے محبت کریں گے۔

ایک روایت میں ہے آپ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص تعلّم کے بغیر علم' اور رہنمائی کے بغیر ہدایت چاہتا ہے اسے دنیا میں زہد اختیار کرنا چاہیے (۲) ایک حدیث میں آپ سے یہ الفاظ نقل کیے گئے ہیں :۔

مَنِ اشْتَاقَ اِلَى الْجَنَّةِ سَارَعَ اِلَى الْخَيْرَاتِ وَمَنْ خَافَ مِنَ النَّارِ لَهَا عَنِ الشَّهَوَاتِ وَمَنْ تَرَقَّبَ الْمَوْتَ تَرَكَ اللَّذَّاتِ وَمَنْ زَهَدَ فِي الدُّنْيَا هَانَتْ عَلَيْهِ الْمُصِيبَاتِ۔

(ابن حبان۔ علی ابن ابی طالبؓ)

جو جنت کا مشتاق ہوتا ہے خیر کے امور کی طرف سبقت کرتا ہے' اور جو دوزخ سے ڈرتا ہے وہ شہوات فراموش کر دیتا ہے اور جو موت کا منتظر رہتا ہے وہ لذات ترک کر دیتا ہے' اور جو دنیا میں زہد کرتا ہے اس پر مصیبتیں سہل ہو جاتی ہیں۔

ہمارے نبی سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عیسیٰ علیہ الصلاۃ والسلام سے مروی ہے :۔

اَرْبَعٌ لَا يُدْرَكْنَ اِلَّا بِتَعَبٍ اَلصَّمْتُ وَهُوَ اَوَّلُ الْعِبَادَةِ وَالتَّوَاضُعُ وَكَثْرَةُ الذِّكْرِ وَقِلَّةُ الشَّيْءِ۔ (طبرانی۔ حاکم۔ انسؓ)

چار چیزیں مشقت کے بغیر حاصل نہیں ہوتیں ایک سکوت جو عبادت کی ابتدا ہے' دوسرے تواضع' تیسرے ذکر کی کثرت' چوتھے کسی شئی کی قلت۔

حب دنیا کی مذمت' اور بغض دنیا کی مدحت میں اس قدر روایات و اخبار وارد ہیں کہ ان سب کا استقصاء نہیں کیا جا سکتا' اس لئے کہ انبیائے کرام کی بعثت کا اول و آخر مقصد ہی یہ تھا کہ وہ لوگوں کو دنیا سے آخرت کی طرف پھیریں' ان کا اکثر کلام اسی مقصد کی تکمیل کرتا ہے۔ ہم نے جو کچھ بیان کر دیا ہے وہ صاحب عقل کے لئے بہت کافی ہے' اور اللہ ہی توفیق دینے والا ہے۔

آثار : ایک اثر میں وارد ہے کہ کلمہ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ بندوں سے اللہ تعالیٰ کا غیظ و غضب برابر دور کرتا رہتا ہے' جب تک کہ بندے وہ چیز نہ مانگیں جو ان کی دنیا میں سے کم ہو گئی ہو۔ اور ایک روایت ہے کہ جب تک وہ دنیا کے کاروبار کو دین پر ترجیح نہ دیں' جب وہ ایسا کرتے ہیں اور اس کے بعد لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان سے فرماتا ہے تم نے جھوٹ کہا' تم یہ کلمہ کہنے میں سچے نہیں ہو۔ بعض صحابہؓ سے منقول ہے کہ ہم نے تمام اعمال کا جائزہ لیا' ہمیں آخرت کے باب میں زہد فی الدنیا سے زیادہ کوئی عمل مؤثر نظر نہیں آیا۔ بعض صحابہؓ نے کبار تابعین سے فرمایا کہ تم اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ عمل کرنے والے اور محنت کرنے والے ہو' حالانکہ وہ تم سے زیادہ اچھے تھے' تابعین نے اس کی وجہ دریافت کی' فرمایا اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ تم سے زیادہ دنیا میں زہد کرنے والے تھے۔ حضرت عمرؓ ارشاد فرماتے ہیں کہ دنیا میں زہد دل اور جسم دونوں کے لئے باعث راحت ہے' بلال ابن سعدؒ فرماتے ہیں کہ ہمارے گناہ گار ہونے کے لئے صرف اتنی بات کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں دنیا میں زہد کا حکم دیتا ہے اور ہم اس کی رغبت کرتے ہیں' ایک شخص نے حضرت سفیانؒ کی خدمت میں عرض کیا کہ میں ایک زاہد عالم دیکھنے کا متمنی ہوں' انہوں نے

---

(۱) یہ حدیث بھی پہلے گذری ہے (۲) اس روایت کی اصل نہیں ملی۔

فرمایا کم بخت! یہ ایک گم شدہ چیز ہے جو ملتی نہیں ہے۔ وہب ابن منبہؒ فرماتے ہیں کہ جنت کے آٹھ دروازے ہیں، جب اہل جنت ان دروازوں سے داخل ہونا چاہیں گے تو دربان فرشتے ان سے کہیں گے رب کریم کی قسم! دنیا کے زاہدین اور جنت کے عاشقین سے پہلے کوئی شخص جنت میں نہیں جائے گا۔ یوسف ابن اسباط کہتے ہیں کہ میں اللہ تعالیٰ سے تین باتوں کا خواہشمند ہوں ایک یہ کہ میں اس حالت میں مروں کہ میری ملکیت میں ایک بھی درہم نہ ہو، دوسرے یہ کہ میرے اوپر قرض نہ ہو، تیسرے یہ کہ میری ہڈی پر گوشت نہ ہو، راوی کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ تینوں خواہشیں پوری فرمائی۔ روایت ہے کہ کسی خلیفہ نے فقہاء کو نذرانے بھجوائے، سب نے قبول کر لئے، فضیل ابن عیاضؒ کی خدمت میں بھی دس ہزار درہم کا ہدیہ آیا، لیکن انہوں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا، بیٹوں نے عرض کیا فقہاء نے نذرانے قبول کر لئے ہیں، اور آپ اپنی مفلسی کے باوجود رد کر رہے ہیں، فضیل نے یہ سنا تو خوب روئے اور کہنے لگے کہ میری اور تمہاری مثال ان لوگوں کی سی ہے جن کے پاس ایک گائے تھی، مدتوں وہ اس سے کھیتی میں فائدہ اٹھاتے رہے، جب وہ بوڑھی ہو گئی اور کھیت جوتنے کے قابل نہ رہی تو انہوں نے اسے ذبح کر ڈالا، تاکہ اس کی کھال سے نفع اٹھا سکیں، یہی حال تمہارا ہے، تم لوگ بھی مجھے اس بڑھاپے میں ذبح کرنا چاہتے ہو، بچو تمہارے لئے بھوک سے مرجانا فضیل کو ذبح کرنے سے بہتر ہے۔

فضیل ابن عمیر کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اون پہنتے تھے، اور درختوں کے پتے کھاتے تھے، ان کا کوئی بیٹا نہ تھا جو مرتا، نہ گھر تھا جو ویران ہوتا، وہ آنے والے کل کے لئے کچھ بچا کر نہ رکھتے تھے، جہاں رات ہوتی سو جاتے، ابو حازم کی اہلیہ نے اپنے شوہر سے کہا شدید سردی ہو رہی ہے، اس موسم میں ہمیں کھانوں، کپڑوں اور لکڑیوں کی ضرورت پیش آئے گی، ابو حازم نے بیوی کی اس فرمائش کے جواب میں کہا کہ ہم ان چیزوں سے چھٹکارا پاسکتے ہیں لیکن موت سے رستگاری نہیں ہے، پہلے موت آئے گی، پھر قبروں سے اٹھنا ہو گا، پھر اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑا ہونا پڑے گا، اس کے بعد جنت ہو گی یا دوزخ۔ کسی نے حضرت حسنؓ سے کہا کہ آپ اپنے کپڑے کیوں نہیں دھولیتے، فرمایا موت اس سے بھی زیادہ جلد آسکتی ہے۔ ابراہیم ابن ادہمؒ کہتے ہیں کہ ہمارے دلوں پر تین پردے پڑے ہوئے ہیں، یہ پردے اس وقت تک پڑے رہیں گے جب تک بندے پر یقین منکشف نہیں ہوتا۔ ایک موجود چیز سے خوش ہونا، دوسرے مفقود پر غمگین ہونا، تیسرے تعریف پر خوش ہونا، اگر تم موجود پر خوش ہوتے ہو تو حریص ہو، مفقود پر غمگین ہوتے ہو تو غصہ کرنے والے ہو، اور غصہ کرنے والے کو عذاب ہوتا ہے، اور جب تعریف پر خوش ہوتے ہو تو عجب کرتے ہو، اور عجب سے عمل باطل ہو جاتا ہے، حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ ایسے شخص کی دو رکعتیں جس کا دل زاہد ہو اللہ کے نزدیک ان متعبدین کی عبادتوں سے بہتر اور پسندیدہ ہیں جو وہ مدتوں کرتے ہیں، ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں ہمیں نہیں دیں وہ ان چیزوں کے مقابلے میں ہمارے لئے زیادہ باعث رحمت ہیں جو ہمیں دی گئی ہیں۔ ان بزرگ کے پیش نظر سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے :۔

إِنَّ اللّٰهَ يَحْمِي عَبْدَهُ الْمُؤْمِنَ مِنَ الدُّنْيَا وَهُوَ يُحِبُّهُ كَمَا تَحْمُونَ مَرِيضَكُمُ الطَّعَامَ وَالشَّرَابَ تَخَافُونَ عَلَيْهِ

(گذر چکی)

اللہ تعالیٰ اپنے بندۂ مومن کو دنیا سے اس طرح بچاتا ہے جس طرح تم اپنے مریض کو کھانے اور پینے سے بچاتے ہو، اس پر (زیادتی مرض یا موت کے) خوف کی وجہ سے۔

اگر مریض یہ جان لے کہ وہ ممانعت جو صحت کا باعث ہے اس عطا سے زیادہ بہتر ہے جس کا نتیجہ مرض ہے تو وہ ممانعت کو ترجیح دے۔ حضرت سفیان ثوری فرمایا کرتے تھے کہ دنیا پیچیدگی کا گھر ہے، راستی کا گھر نہیں، غم کا گھر ہے خوشی کا گھر نہیں، جو یہ بات جان لیتا ہے وہ دنیا کی خوشحالی سے خوش نہیں ہوتا، اور یہاں کے مصائب پر غم زدہ نہیں ہوتا۔ حضرت سہل فرماتے ہیں کہ کسی

عبادت گذار کا عمل اس تک وقت خالص نہیں ہوتا جب کہ وہ چار چیزوں سے فارغ نہ ہو' بھوک' برہنگی' فقر اور ذلت۔ حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ میں ایسے لوگوں کی صحبت میں رہا ہوں' اور ایسے افراد کے ساتھ میں نے وقت گذارا ہے جو دنیا کی کسی چیز کو پاکر خوش نہ ہوتے تھے' اور کسی چیز کو کھو کر رنجیدہ نہ ہوتے تھے' ان کی نظروں میں دنیا کی حیثیت اتنی بھی نہیں تھی جتنی مٹی کی ہوتی ہے' ان میں سے بعض حضرات پچاس پچاس سال' یا ساٹھ ساٹھ برس اس حالت میں زندہ رہے کہ نہ ان کے لئے کپڑا تہہ کیا گیا' نہ دیگچی چڑھائی گئی' اور نہ ان کے اور زمین کے مابین کوئی چیز بچھائی گئی' نہ انہوں نے اپنے گھر والوں سے کھانا بنانے کی فرمائش کی' جب رات آتی تو وہ حضرات اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جاتے' اپنی پیشانیاں زمین پر بچھا لیتے' ان کی آنکھوں سے ان کے رخساروں پر آنسو بہتے رہتے' اور وہ اپنے رب کے سامنے اس طرح آہ و زاری کرتے کہ سننے والے کا جگر پھٹ پھٹ جاتا' اگر کوئی اچھا عمل کرتے تو اس کا شکر ادا کرتے' اور اللہ تعالیٰ سے یہ درخواست کرتے کہ وہ ان کے اس عمل کو قبول کرلے' اور اگر کوئی غلطی سرزد ہو جاتی تو غمگین ہوتے' اور اللہ تعالیٰ سے عفو و مغفرت کی درخواست کرتے' ان کا یہی معمول تھا۔ بخدا وہ اللہ کی رحمت کے بغیر گناہوں سے محفوظ نہیں رہے' اور نہ انہوں نے اللہ کی مغفرت کے بغیر نجات پائی۔

زہد کے درجات اور اقسام

زہد کی تین تقسیمیں کی جاسکتی ہیں' ایک نفس زہد کی' دوسری اس چیز کے اعتبار سے جس کی رغبت سے زہد ہوتا ہے' تیسری اس چیز کے اعتبار سے جس سے زہد کرتے ہیں۔

پہلی تقسیم۔ نفس زہد کے اعتبار سے : جاننا چاہیے کہ زہد فی نفسہ اپنی قوت میں تفاوت کے لحاظ سے تین درجے رکھتا ہے پہلا درجہ جو سب سے ادنیٰ درجہ ہے یہ ہے کہ دنیا میں زہد کرے' مگر اس کی خواہش بھی رکھے' نفس کا اس کی طرف میلان بھی ہو' دل دنیا کی طرف راغب بھی ہو' اگرچہ وہ اپنے مجاہدے کے ذریعہ نفس کو قابو میں رکھتا ہے اور اسے دنیا میں مشغول ہونے سے روکتا ہو' ایسے شخص کو متزہد کہتے ہیں' یہ درجہ اس شخص کے حق میں زہد کا نقطۂ آغاز ہے جو کسب و اجتہاد سے درجۂ زہد تک پہنچنا چاہے' متزہد پہلے اپنے نفس کو پگھلاتا ہے' پھر اپنے کیسۂ زر کو' جب کہ زاہد پہلے کیسۂ زر کو پگھلاتا ہے پھر طاعات میں اپنے نفس کو' ایسا نہیں ہے کہ جو چیز اس سے جدا ہو گئی ہو اس کے فراق میں نفس کو گلائے' متزہد ہر وقت خطرے میں گھرا رہتا ہے' کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس کا نفس اس پر غالب آجاتا ہے' اور شہوت اسے اپنی طرف کھینچتی ہے' اور وہ دنیا کی طرف اس سے راحت پانے کے لئے مراجعت کرتا ہے خواہ تھوڑی چیز میں یا زائد میں۔

دوسرا درجہ اس شخص کا ہے جو دنیا کو اپنی رضا و رغبت سے چھوڑ دیتا ہے' اور اسے آخرت کے مقابلے میں حقیر سمجھتا ہے' ایسا ہے جیسے کوئی شخص دو درہموں کی وجہ سے ایک درہم چھوڑ دے' اس لئے کہ ایسا کرنا اس کے لئے دشوار نہیں ہوتا' اگرچہ اسے کچھ انتظار ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ یہ زاہد اپنے زہد سے اچھی طرح واقف ہوتا ہے' اور اس کی طرف ملتفت رہتا ہے جیسے بائع اپنی مبیع کی طرف متوجہ رہتا ہے' اس صورت میں یہ ہو سکتا ہے کہ اس کے نفس میں عجب پیدا ہو جائے اور یہ گمان کرے کہ میں نے ایک قابل قدر چیز اس سے گراں قدر چیز کے لئے ترک کردی' یہ درجہ بھی نقصان کا ہے۔

تیسرا درجہ جو انتہائی اعلا ہے یہ ہے کہ اپنی رغبت سے زہد کرے' اور اپنے زہد میں بھی زہد اختیار کرے' یعنی یہ خیال نہ کرے کہ اس نے کوئی چیز ترک کی ہے' لیکن یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ اس کی نظر میں دنیا کی کوئی حیثیت نہ ہو' اس درجے پر فائز زاہد کی مثال ایسی ہوگی جیسے کوئی ٹھیکرا دے کر موتی لے لے' ظاہر ہے موتی کے مقابلے میں ٹھیکرے کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے' یہ کمال زہد ہے' اور اس کا سبب کمال معرفت ہے' یہ زاہد دنیا کی طرف التفات کے خوف سے مامون ہو سکتا ہے' جیسے وہ شخص بیع میں اقالہ کا تصور بھی نہیں کرتا جس نے موتی کے عوض ٹھیکرا دیا ہو' ابویزید نے موسیٰ عبدالرحیم سے پوچھا تم کس موضوع پر گفتگو کررہے ہو انہوں نے کہا زہد کے متعلق' ابویزید نے پوچھا کس چیز میں زہد کے متعلق' انہوں نے کہا دنیا میں زہد کے متعلق' ابویزید نے اپنے دونوں ہاتھ جھاڑتے ہوئے فرمایا میں سمجھ رہا تھا

کہ تم کسی چیز کے متعلق گفتگو کر رہے ہوں گے دنیا تو لا شئی ہے اس میں زہد کیا ہو گا۔ اہل معرفت' اور مشاہدات سے معمور قلوب رکھنے والے بزرگوں کے نزدیک اس شخص کی مثال جو آخرت کے لئے دنیا ترک کردے ایسی ہے جیسے کوئی شخص بادشاہ کے دربار میں داخل ہونا چاہے' اور دروازے پر ایک کتا موجود ہو جو اسے اندر نہ جانے دے تو وہ اس کے آگے روٹی کا ٹکڑا ڈال دے کتا اس میں مشغول ہو جائے اور وہ دربار شاہی میں پہنچ کر بادشاہ سلامت کے تقرب سے مستفید ہو۔ یہاں تک کہ انتظام سلطنت میں اسے ایک خاص مقام حاصل ہو جائے' بلکہ تمام امور سلطنت ہی اس کے سپرد کردیے جائیں' یقینی طور پر یہ شخص بادشاہ کے بے کراں انعامات اور توجہات کا مرکز بنا ہے' لیکن کیا اسے ان وسیع تر انعامات کے مقابلے میں بطور احسان یہ کہنے کا حق حاصل ہے کہ میں نے کتے کو روٹی کا ٹکڑا دے کر یہ منصب حاصل کیا ہے۔ اسی طرح شیطان بھی اللہ تعالیٰ کے دروازے کا کتا ہے' وہ لوگوں کو اندر جانے سے روکتا ہے' حالانکہ دروازہ کھلا ہوا ہے' دنیا روٹی کے ایک ٹکڑے کی طرح ہے' اس کی لذت صرف اس وقت تک محدود رہتی ہے جب تک تم اسے دانتوں سے چباتے ہو' حلق سے نیچے اترنے کے بعد اس کا کوئی ذائقہ برقرار نہیں رہتا بلکہ وہ معدے کے لئے ایک بوجھ بن جاتا ہے' اور ایک بدبودار نجاست کی شکل اختیار کرلیتا ہے یہاں تک کہ اسے جسم سے باہر نکالنے کی ضرورت پیش آتی ہے' جو شخص اسے بادشاہ کے یہاں عزت اور مرتبت حاصل کرنے کے لئے روٹی ترک کردے گا اس کی نگاہوں میں اس ایک ٹکڑے کی کیا قیمت ہو سکتی ہے۔ دنیا کی حقیقت اگر وہ کسی شخص کو سو برس تک سلامتی کے ساتھ حاصل رہی ہو آخرت کی نعمتوں کے مقابلے میں ایک لقمے سے بھی کم ہے اس لئے کہ متناہی کو اس شئی سے کوئی نسبت نہیں ہوتی جو لامتناہی ہو' دنیا ہر حال میں متناہی ہے اگرچہ کوئی شخص ہزار برس تک زندہ رہے' اور بلا کم و کاست دنیا پائے' اس دنیا کو آخرت سے جو ایک عالم پائدار ہے کوئی نسبت نہیں ہے' دنیا کی زندگی اپنی طوالت کے باوجود مختصر اور محدود ہے' اور اس کی نعمتیں بھی کدورت سے خالی نہیں ہیں' پھر اسے آخرت کی نعمتوں کے ساتھ کیا نسبت ہو سکتی ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ زاہد اپنے زہد کو اسی وقت اہمیت دیتا ہے جب وہ اس شئے کی طرف التفات کرے جس میں زہد کرتا ہے' اور یہ التفات اسی وقت ہو گا جب اس شئے کی اس کے نزدیک کوئی قدر و قیمت اسی وقت ہو گی جب معرفت میں نقصان ہو گا' اس کا مطلب یہ ہوا کہ زہد میں نقص کا سبب معرفت کا نقص بنتا ہے' یہ ہیں زہد کے درجات' ان میں سے ہر درجہ کے متعدد درجات ہیں' اس لئے کہ متزہد کا صبر مشقت میں کم و بیش کے اعتبار سے متفاوت ہوتا ہے' اسی درجہ میں اگر کوئی زاہد معجب ہو تو اس کا اعجاب بھی زہد کی طرف اس کے التفات کے اعتبار سے مختلف اور متفاوت ہو گا۔

دوسری تقسیم۔ مرغوب فیہ کے اعتبار سے زہد کی ایک تقسیم مرغوب فیہ کے اعتبار سے ہو گی' یعنی اس چیز کے اعتبار سے جس کی رغبت کے باعث زہد کیا جاتا ہے' اس تقسیم کی رو سے بھی زہد کے تین درجے ہیں۔

پہلا درجہ جو ادنیٰ درجہ ہے یہ ہے کہ مرغوب فیہ دوزخ کا عذاب' اور تمام تکالیف سے نجات ہو جیسے عذاب قبر' حساب کتاب' پل صراط' اور وہ تمام احوال جن کا روایات میں ذکر ہے' چنانچہ ایک حدیث میں مذکور ہے کہ آدمی کو حساب کے لئے اتنی دیر کھڑا کیا جائے گا کہ اگر اس کے پسینے سے سو اونٹ پیاس بجھانا چاہیں تو سب کا پیٹ بھر جائے (احمد۔ ابن عباس) ان احوال سے نجات پانے کی رغبت زہد ہے' لیکن یہ خائفین کا زہد ہے' وہ لوگ گویا عدم پر راضی ہیں اگر انہیں نیست و نابود کردیا جائے' کیوں کہ تکلیف سے نجات محض عدم سے حاصل ہو جاتی ہے۔

دوسرا درجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ثواب اور اس کی ان نعمتوں' اور لذتوں کی رغبت کی وجہ سے زہد کی جائے جن کا اس نے اپنی جنت میں عطا کرنے کا وعدہ کر رکھا ہے' یہ امید رکھنے والوں کا خوف ہے' انہوں نے عدم پر اور الم سے نجات پر قناعت کرتے ہوئے دنیا ترک نہیں کی' بلکہ وہ وجود ابدی اور حیات سرمدی کی طمع بھی رکھتے ہیں۔

تیسرا درجہ انتہائی اعلا ہے اور وہ یہ ہے کہ زاہد کی رغبت صرف اللہ تعالیٰ کی ذات' اور اس کے دیدار و ملاقات میں ہو' اس

کا دل نہ آلام سے نجات کی طرف ملتفت ہوتا ہے' اور نہ لذات کے حصول کی طرف متوجہ ہوتا ہے' بلکہ وہ اپنے تمام فکر و ہمت کے ساتھ اللہ تعالیٰ میں مستغرق رہتا ہے' اس کے تمام افکار کا مرکز اور منتہیٰ صرف ایک ذات ہوتی ہے' یہ شخص موحد حقیقی ہے' اس کے یہاں غیراللہ کی طلب نہیں ہے' کیوں کہ وہ یہ بات جانتا ہے کہ جو شخص غیراللہ کا طالب ہوتا ہے وہ اس کی عبادت کرتا ہے' ہر طالب عابد ہے' اور ہر مطلوب معبود ہے' اور ہر طالب اپنے مطلوب کی نسبت سے عبد ہے' اس کے نزدیک غیراللہ کی طلب شرک خفی ہے' یہ محسنین کا زہد ہے' اور یہی لوگ حقیقی معنی میں عارف ہیں' کیوں کہ اللہ تعالیٰ سے وہی لوگ محبت کرتے ہیں جو اس کی معرفت رکھتے ہیں' جو شخص درہم و دینار سے واقف ہوتا ہے اور یہ بات جانتا ہے کہ میں ان دونوں کو جمع نہیں کر سکتا تو وہ دینار سے محبت کرتا ہے' اسی طرح جو شخص اللہ کی ذات اور اس کے رب کریم کے دیدار کی لذت کی معرفت رکھتا ہے اور یہ بات جانتا ہے کہ لذت دیدار' اور لذت حور و قصور میں اجتماع ناممکن ہے تو وہ صرف لذت دیدار الٰہی کو ترجیح دیتا ہے۔ یہاں یہ گمان نہ کرنا چاہیے کہ اہل جنت کے دلوں میں جس وقت وہ دیدار الٰہی کی لذت سے ہم کنار ہوں گے' حور و قصور کی لذت بھی ہوگی' ایسا ہرگز نہیں ہے' دیدار الٰہی کی لذت کو جنت کی نعمتوں اور لذتوں سے وہی نسبت ہے جو ایک کمزور پرندے پر قابو پانے اور اس سے کھیل کر لطف اندوز ہونے کو زمین کے وسیع تر رقبوں' اور ان میں رہنے والوں پر اقتدار سے ہے۔ جو لوگ جنت کے طالب ہیں وہ اہل دل کے نزدیک اس بچے کی طرح ہیں جو سلطنت کی لذت چھوڑ کر پرندے کے ساتھ کھیلنے کو ترجیح دیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اقتدار کی لذت سے ناواقف ہے' یہ بات نہیں کہ پرندے کے ساتھ کھیلنے میں لذت زیادہ ہے' اور اقتدار میں کم ہے۔

تیسری تقسیم۔ مرغوب عنہ کے اعتبار سے : زہد کی ایک تقسیم مرغوب عنہ کے اعتبار سے ہے' یعنی ان چیزوں کے اعتبار سے جن سے زہد کرتے ہیں' اس سلسلے میں علماء سے بہت سے اقوال منقول ہیں' اگر ان کا احاطہ کیا جائے تو غالباً ان کی تعداد سو سے تجاوز کر جائے گی' یہاں ہم اقوال نقل کرنے میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہتے' بلکہ ایک ایسی جامع گفتگو کرنا چاہتے ہیں جو ان تمام اقاویل کو محیط ہو' اس سے یہ بات بھی ظاہر ہو جائے گی کہ ان اقوال میں سے کوئی قول ایسا نہیں ہے جو نقص سے خالی ہو' اور تمام امور کا احاطہ کرتا ہو۔

اصل میں جس چیز سے زہد کیا جائے وہ یا تو مجمل ہے' یا مفصّل' اور مفصّل میں بھی چند مراتب ہیں' ان میں سے بعض میں افراد کی تفصیل زیادہ ہے' اور بعض میں اجمال کے ساتھ تفصیل ہے۔

درجہ اول میں اجمال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا ہر چیز سے زہد کیا جائے' یہاں تک کہ اپنے نفس میں بھی زہد کیا جائے' اور دوسرے درجے میں اجمال یہ ہے کہ اپنے نفس کو ہر ایسی صفت میں زہد کیا جائے جس میں نفس کو نفع ہو' اس میں طبیعت کے تمام مقتضیات جیسے شہوت' غضب' کبر' اقتدار' مال اور جاہ وغیرہ شامل ہیں' تیسرے درجے کا اجمال یہ ہے کہ مال اور جاہ اور ان کے لوازم و اسباب میں زہد کرے کیوں کہ تمام نفسانی حظوظ کا مرجع یہی دو چیزیں ہیں' چوتھے درجے میں اجمال یہ ہے کہ علم' قدرت' دینار' درہم اور جاہ میں زہد کرے' کیوں کہ اموال کی خواہ جتنی قسمیں ہوں سب درہم و دینار میں آجاتی ہیں' اور جاہ کے خواہ بہت سے اسباب ہوں وہ سب علم اور قدرت کے ضمن میں آجاتے ہیں' اور علم و قدرت سے ہماری مراد وہ ہے جس کا مقصود دلوں کا مالک بننا ہو' جاہ کا مقصد بھی یہی ہوا ہے کہ دلوں کا مالک بن جائے اور ان پر قدرت حاصل ہو جائے۔ اب اگر اس اجمال کی تفصیل کی جائے تو یہ چیزیں شمار سے باہر بھی ہو سکتی ہیں۔ قرآن کریم کی آیت میں یہ چیزیں سات بیان کی گئی ہیں :-

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِينَ وَالْقَنَاطِيرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْأَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ذَٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا۔

(پ ۳ ر ۱۰ آیت ۱۴)

خوشنما معلوم ہوتی ہے (اکثر) لوگوں کو مرغوب چیزوں کی محبت (مثلاً) عورتیں ہوئیں' بیٹے ہوئے' لگے ہوئے

ڈھیر ہوئے' سونے اور چاندی کے نمبر (نشان) لگے ہوئے گھوڑے (یا دو سرے) مواشی ہوئے اور زراعت ہوئی' یہ سب استعمالی چیزیں ہیں دنیوی زندگی کی۔

اس کے بعد ایک آیت میں پانچ چیزیں بیان کی ہیں :-

اِعْلَمُوْا اَنَّمَا الْحَیَاۃُ الدُّنْیَا لَعِبٌ وَّلَھْوٌ وَّزِیْنَۃٌ وَّتَفَاخُرٌ بَیْنَکُمْ وَتَکَاثُرٌ فِی الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ۔ (پ ۲۷ ر ۱۹ آیت ۲۰)

تم خوب جان لو کہ دنیوی زندگی محض لہو و لعب اور (ظاہری) زینت اور باہم ایک دو سرے پر فخر کرنا اور اموال و اولاد میں ایک کا دو سرے سے اپنے کو زیادہ بتلانا ہے۔

ایک جگہ دو کا ذکر ہے' فرمایا :-

اِنَّمَا الْحَیَاۃُ الدُّنْیَا لَعِبٌ وَّلَھْوٌ۔ (پ ۲۶ ر ۸ آیت ۳۶)

دنیوی زندگی تو محض ایک لہو و لعب ہے۔

پھر ایک آیت میں ان سب کو ایک ہی چیز میں منحصر کر کے فرمایا :-

وَنَھَی النَّفْسَ عَنِ الْھَوٰی فَاِنَّ الْجَنَّۃَ ھِیَ الْمَاْوٰی۔

(پ ۳۰ ر ۴ آیت ۴۰-۴۱)

اور (جس نے) نفس کو حرام کی خواہش سے روکا سو جنت اس کا ٹھکانہ ہو گا۔

لفظ "ہوی" تمام نفسانی حظوظ کو شامل ہے' اس لئے جو شخص "ہوی" میں زہد کرتا ہے وہ گویا تمام نفسانی خواہشات اور لذات میں زہد کرتا ہے' اس اجمال اور اس کے بعد تفصیل سے تمہیں یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیے کہ ان میں سے بعض چیزیں بعض کی مخالف ہیں یہ سب امور ایک ہیں' ایک فرق ہے تو صرف اس قدر کہ کہیں یہ امور مفصل مذکور ہیں' اور کہیں مجمل۔ خلاصہ یہ ہے کہ بندے کو تمام حظوظ نفسانی سے اپنا رشتہ منقطع کر لینا چاہیے' نفسانی حظوظ سے قطع تعلق کے ساتھ ہی دل سے یہ خواہش بھی نکل جاتی ہے کہ دنیا میں باقی رہے' اس طرح لامحالہ امیدیں مختصر ہو جائیں گی' بلکہ ان کا وجود ہی نہیں رہے گا' آدمی کو اپنی زندگی کی بقاء اسی لئے مطلوب ہوتی ہے کہ دنیا سے مستفید ہو' اور اس کی نعمتوں سے تمتع حاصل کرے' زندگی کی محبت کے معنی یہی ہیں ہمیشہ دل میں رہے' اگر اس کی محبت باقی نہیں رہے گی تو زندگی کی محبت بھی باقی نہیں رہے گی' اسی لئے جب لوگوں پر جہاد فرض ہوا تو انہوں نے کہا :-

رَبَّنَا لِمَ کَتَبْتَ عَلَیْنَا الْقِتَالَ لَوْلَآ اَخَّرْتَنَآ اِلٰٓی اَجَلٍ قَرِیْبٍ۔

(پ ۵ ر ا آیت ۷۷)

اے ہمارے پروردگار آپ نے ہم پر جہاد کیوں فرض فرمایا ہم کو اور تھوڑی مدت مہلت دے دی ہوتی۔

اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا :-

قُلْ مَتَاعُ الدُّنْیَا قَلِیْلٌ (پ ۵ ر ۴ آیت ۷۷)

آپ کہہ دیجئے کہ دنیا کا تمتع محض چند روزہ ہے۔

اس جواب کا حاصل یہ ہے کہ تم اس لئے بقا چاہتے ہو کہ دنیا کی لذات سے فائدہ اٹھا سکو' اور وہ بہت مختصر ہیں' بہت معمولی ہیں' اس آیت کے نزول کے بعد زاہدین اور منافقین کھل کر سامنے آگئے' وہ زاہدین جو اللہ سے محبت رکھتے تھے اللہ کی راہ میں پوری جانبازی کے ساتھ لڑے' اور کفار کے مقابلے میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن گئے' اور دو عمدہ باتوں میں سے ایک کے متمنی ہوئے' ان حضرات کا یہ حال تھا کہ جب انہیں جہاد کی دعوت دی جاتی تھی تو ان کے دل و دماغ میں جنت کی خوشبو بس جاتی تھی' اور وہ میدان جہاد کی

طرف اس طرح دوڑے تھے جس طرح پیاسا کنویں کی طرف دوڑتا ہے' انہیں اللہ کے دین کے لئے نصرت' اور شہادت حاصل کرنے کا جذبہ کفار کے ساتھ لڑنے پر مجبور کرتا تھا' اگر ان میں سے کوئی عام انسانوں کی طرح بستر پر مرجاتا تو اسے شہادت نصیب نہ ہونے کی حسرت رہتی تھی' چنانچہ جب حضرت خالد ابن الولید کی وفات کا وقت قریب آیا' اور نزع کا عالم طاری ہوا تو کہنے لگے کہ میں شہادت کی توقع میں اپنی جان ہتھیلی پر لئے پھرا' اور کفار کی صفوں پر حملہ آور ہوا' لیکن آج بوڑھیوں کی طرح مر رہا ہوں' روایت ہے کہ جب آپ کی وفات ہوئی تو آپ کے جسموں پر زخموں کے آٹھ سو نشانات تھے' یہ حال تھا پختہ یقین' اور سچے ایمان والوں کا۔ دوسری طرف منافقین تھے' یہ لوگ موت کے خوف سے جہاد کا نام سن کر لرزنے لگتے تھے' چنانچہ ان سے کہا گیا :-

إِنَّ الْمَوْتَ الَّذِي تَفِرُّونَ مِنْهُ فَإِنَّهُ مُلَاقِيكُمْ (پ ۲۸ ر ۱۱ آیت ۸)

آپ کہہ دیجئے کہ جس موت سے تم بھاگتے ہو وہ تم کو آپکڑے گی۔

ان لوگوں نے زندہ رہنے کو شہادت پر ترجیح دی گویا اعلا کے بدلے میں ادنیٰ چیز قبول کی' قرآن کریم میں ایسے ہی لوگوں کے متعلق کہا گیا ہے :-

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ فَمَا رَبِحَت تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ۔
(پ ۱ ر ۲ آیت ۱۶)

یہ وہ لوگ ہیں کہ انہوں نے گمراہی لے لی بجائے ہدایت کے تو سودمند نہ ہوئی ان کی یہ تجارت اور نہ یہ ٹھیک طریقے پر چلے۔

جب کہ مخلصین اللہ تعالیٰ کے ہاتھ اپنی جان اور مال اس وعدے پر فروخت کرچکے ہیں کہ ان کے لئے جنت ہے' جب وہ یہ دیکھیں گے کہ بیس اور تیس برس تک دنیاوی لذات چھوڑنے کے نتیجے میں انہیں ہمیشہ ہمیشہ کی زندگی' اور عیش ملی ہے تو اپنے اس معاملے سے خوش ہوں گے جو انہوں نے اللہ تعالیٰ کے ساتھ کیا تھا۔

زہد کے سلسلے میں مختلف اقوال : اس وضاحت کے بعد تم زہد کی تفصیل جان چکے ہو اور یہ بات بھی تمہارے علم میں آگئی ہے کہ زہد کے سلسلے میں بزرگوں کے جتنے بھی اقوال وارد ہیں وہ زہد کی بعض اقسام پر مشتمل ہیں' ہر شخص نے زہد کی تعریف بیان کرنے میں یا تو مخاطب کے احوال کی رعایت کی ہے' یا نفس پر جس وصف کا غلبہ دیکھا ہے وہ بیان کردیا ہے' چنانچہ حضرت بشرؒ فرماتے ہیں دنیا کا زہد یہ ہے کہ دنیا میں زہد کرو' اس قول میں انہوں نے خاص طور پر جاہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ قاسم جوعیؒ کہتے ہیں کہ زہد پیٹ کا زہد ہے' جس قدر تم اپنے پیٹ پر قادر ہوگے اسی قدر تمہارے پاس زہد ہوگا' اس میں ایک مخصوص خواہش کی طرف اشارہ ہے' حقیقت میں پیٹ کی شہوت تمام شہوات سے زیادہ شر انگیز ہے' اور اکثر شہوات کا سرچشمہ یہی ایک شہوت ہے۔ حضرت فضیلؒ فرماتے ہیں کہ زہد سے مراد قناعت ہے۔ اس قول میں مال کے زہد کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ حضرت سفیان ثوریؒ فرماتے ہیں کہ زہد امیدوں کو مختصر کرنے کا نام ہے' یہ قول تمام شہوات کو محیط ہے' کیوں کہ جب کسی شخص کے دل میں کوئی شہوت پیدا ہوتی ہے تو وہ اس کی بقاء کا آرزومند ہوتا ہے' جس کے دل میں کوئی آرزو نہیں ہوتی وہ شہوات سے محفوظ رہتا ہے' حضرت اویسؒ فرماتے ہیں کہ زاہد کے زہد کے لئے طلب معیشت ستم قاتل ہے' اس قول میں زہد کے لئے توکل کی شرط لگائی گئی ہے۔ محدثین کے نزدیک دنیا رائے اور عقل کے بموجب عمل کرنے کا نام ہے' اور زہد علم اور سنت کی اتباع کو کہتے ہیں' اس قول میں اگر رائے سے فاسد رائے' اور عقل سے وہ عقل مراد لی جائے جس سے دنیا میں جاہ طلب کی جاتی ہے تو یہ قول درست ہے' لیکن اس میں جاہ کے صرف بعض اسباب کی طرف اشارہ کیا گیا ہے' یا ایسی شہوات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو فضول ہیں' مثلاً بعض علوم سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا' اور لوگوں نے انہیں اتنا مفصل کردیا ہے کہ اگر تمام عمر ان علوم کی تحصیل میں مصروف رہا جائے تو عمر تمام ہوجائے' علوم حاصل نہ ہوں' ظاہر ہے کہ یہ علوم فضول ہیں' اور زاہد کا ان سے بچنا ضروری ہے۔ حضرت حسن بصریؒ کہتے ہیں کہ زاہد وہ ہے جو

اپنے علاوہ کسی کو دیکھے تو یہ کہے کہ مجھ سے بہتر ہے۔ گویا انہوں نے تواضع کو زہد کہا ہے' اس قول میں عجب اور جاہ پسندی کی ممانعت ہے جو زہد کی ایک قسم ہے۔ بعض لوگوں کا قول ہے کہ زہد طلب حلال کا نام ہے' اس قول کی نسبت حضرت اویس کی طرف کی گئی ہے' حالانکہ ان کے قول سے اس کو ذرا مناسبت نہیں ہے' ان کا کہنا یہ ہے کہ زہد ترک طلب کو کہتے ہیں ان کا منشاء یہ ہے کہ زاہد کو طلب حلال میں بھی مشغول نہ ہونا چاہیے۔ یوسف ابن اسباط کہتے ہیں کہ جو شخص اذیت پر صبر کرے' شہوات ترک کردے' اور حلال ذرائع سے رزق حاصل کرے وہ حقیقت میں زاہد ہے۔

اقوال میں اختلاف کی نوعیت زہد کے سلسلے میں ان کے علاوہ بھی بے شمار اقوال ہیں۔ یہاں ان کا احاطہ کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہے' بلکہ نقصان ہے' کیوں کہ جو شخص حقائق امور کی طلب میں مشغول ہے وہ اتنے بہت سے اقوال دیکھ کر حیران اور پریشان ہو جائے گا' اور یہ نہیں جان پائے گا کہ ان میں سے کون سا قول زہد کی حقیقت کو جامع ہے' الا یہ کہ کوئی شخص مشاہدۂ باطنی سے حقیقت واقعہ کا ادراک کرلے' اس صورت میں سنی سنائی باتیں اس کے حق میں مفید ثابت نہیں ہوں گی' وہ امر حق دریافت کر چکا ہے' تاہم یہ ہو سکتا ہے کہ وہ ان اقوال کی نشاندہی کردے جن میں کہنے والوں نے کوتاہی کی ہے' یا اس قدر بیان کیا ہے جس قدر بیان کرنے کی حاجت تھی' اگرچہ انہیں کمال معرفت تھا اور وہ زہد کی حقیقت بیان کرسکتے تھے۔ لیکن انہوں نے اختصار پر اکتفا کیا' اس کی وجہ یہی تھی کہ وہ مخاطب کے حالات کی رعایت کرتے ہوئے گفتگو کرتے تھے' اور ان کے سامنے ضرورت ہوتی تھی' اور ضرورتیں مختلف اوقات میں مختلف ہو سکتی ہیں' اس لئے ان کے اقوال مختلف نظر آتے ہیں۔

بعض اوقات ان بزرگوں کے اقوال میں اس لئے بھی اختصار ہوتا ہے کہ ان کا مقصد ان اقوال کے ذریعے اس حال کی خبر دینا ہے جو دائمی ہوتا ہے' یہ حال بھی بندے کا ایک مقام ہے اور ہر بندہ کا حال مختلف ہوتا ہے' اس لئے جن کلمات کے ذریعے اس حال کی خبر دی جائے گی وہ بھی مختلف ہوں گے۔ لیکن حقیقت میں امر حق ایک ہوگا' اس کا مختلف ہونا ممکن نہیں ہے۔

امر حق کیا ہے؟ ان مختلف اقوال میں جامع ترین قول حضرت ابو سلیمان دارانیؒ کا ہے' اگرچہ اس قول میں تفصیل نہیں ہے' لیکن یہ اپنے موضوع کے تمام گوشوں کا محیط ہے' فرماتے ہیں کہ ہم نے زہد کے متعلق بہت کچھ باتیں سنی ہیں لیکن ہمارے نزدیک زہد ہر ایسی چیز کو ترک کردینا ہے جو اللہ تعالیٰ سے دور کرے' ایک مرتبہ انہوں نے اس اجمال کی تفصیل بھی فرمائی کہ جو شخص شادی کرتا ہے' یا طلب معیشت کے لئے سفر کرتا ہے یا حدیث لکھتا ہے وہ دنیا کی طرف مائل ہوتا ہے' گویا انہوں نے ان تمام امور کو زہد کی ضد قرار دیا ہے' ایک مرتبہ انہوں نے قرآن کریم کی یہ آیت تلاوت کی :-

إِلَّا مَنْ أَتَى اللَّهَ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ (پ۱۹ ر۹ آیت ۸۹)

مگر ہاں جو اللہ کے پاس پاک دل لے کر آئے گا۔

اور فرمایا کہ اس آیت میں دل سے مراد وہ دل ہے جس میں اللہ تعالیٰ کے سوا کچھ نہ ہو' انہوں نے یہ بھی کہا کہ جن لوگوں نے زہد کیا ہے ان کا مقصد یہ تھا کہ ان کے قلوب تمام دنیوی افکار اور خیالات سے آزاد ہو کر آخرت کی فکر میں مشغول ہو جائیں۔

زہد کے احکام : اب تک زہد کی تین تقسیمیں کی گئی ہیں' اور ہر تقسیم کے مختلف درجات بیان کئے گئے ہیں' اب اس کی ایک اور تقسیم بیان کی جاتی ہے' اس کا تعلق زہد کے احکام سے ہے۔ چنانچہ احکام کی رو سے بھی زہد کی تین قسمیں ہیں' فرض' نفل اور سلامت۔ یہ تقسیم حضرت ابن ادہم سے منقول ہے۔ فرض زہد کا تعلق حرام سے ہے' اور نفل کا تعلق حلال سے ہے' اور سلامت کا تعلق مشتبہات سے ہے۔ اس کی تفصیل حلال و حرام کے باب میں درجات ورع کے ضمن میں لکھی گئی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ورع بھی زہد ہے۔ جیسا کہ حضرت مالک ابن انسؓ سے دریافت کیا گیا کہ زہد کیا چیز ہے؟ فرمایا : تقویٰ ہے۔ اگر زہد کو مخفی امور کے لحاظ سے دیکھا جائے تو ان کی کوئی انتہا نہیں ہے' نفس جن خطرات' لحظات اور حالات سے متمتع ہوا ہے وہ بے شمار ہیں'

خاص طور پر ریا کے مخفی امور نہ صرف یہ کہ لامتناہی ہیں' بلکہ انتہائی پیچیدہ اور دقیق بھی ہیں' ان پر صرف اونچے درجے کے علماء ہی مطلع ہو سکتے ہیں' ظاہری اموال میں بھی زہد کے درجات بے شمار ہیں اور ان میں اعلا ترین درجہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زہد کا ہے وہ ایک مرتبہ سر کے نیچے پتھر رکھ کر سو گئے تو شیطان نے ان پر دنیا ترک نہ کرنے کا الزام لگایا اور کہنے لگا کہ آپ نے تو دنیا ترک کر دی تھی' پھر یہ کیا ہے؟ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس سے دریافت کیا کہ تو نے میرے کس عمل سے یہ اندازہ لگایا کہ میں طالب دنیا ہوں؟ اس نے کہا کہ اس پتھر سے جو آپ نے سر کے نیچے رکھ لیا ہے' کیا یہ دنیا طلبی نہیں ہے کہ سر اونچا رہے اور آرام ملے' آپ نے فوراً پتھر نکال کر دور پھینک دیا اور فرمایا کہ اپنی دنیا اور پتھر دونوں کو لے جا۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ وہ ٹاٹ کے کپڑے پہنا کرتے تھے' یہاں تک کہ ان کے جسم پر ٹاٹ کے نشان بن گئے تھے' بلکہ وہ نشان زخم کی صورت اختیار کر گئے تھے۔ ٹاٹ کے لباس کو وہ اس لئے پسند کرتے تھے کہ جسم سختی کا عادی رہے' اور لباس کی نرمی سے جسم کو راحت نہ ملے ایک روز ان کی والدہ نے کہا کہ تم اون کیوں نہیں پہن لیتے' حضرت یحییٰ نے ماں کے حکم پر اون کا لباس پہن لیا' اسی وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی آئی کہ تو نے مجھ پر دنیا کو ترجیح دی ہے یہ سن کر حضرت یحییٰ رونے لگے' انہوں نے اونی لباس اتار پھینکا' اور حسب سابق ٹاٹ کے کپڑے پہن لئے' حضرت امام احمد فرماتے ہیں کہ زہد تو اویس کا تھا کہ برہنگی سے یہ عالم ہو گیا تھا کہ ستر چھپانے کے لئے ٹاٹ کی ایک بوری میں پناہ لینی پڑی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایک دیوار کے سائے میں کچھ دیر کے لئے بیٹھ گئے' دیوار کے مالک نے انہیں وہاں سے اٹھا دیا' حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ تو نے مجھے نہیں اٹھایا بلکہ اس نے اٹھایا ہے جسے یہ منظور نہیں کہ میں سائے کی راحت حاصل کروں۔

بہرحال ظاہر و باطن میں زہد کے بے شمار درجات ہیں' ان میں سے اعلا ترین درجہ ابھی بیان کیا گیا ہے' زہد کا کم سے کم درجہ یہ ہے کہ آدمی حرام اور مشتبہ چیزوں میں زہد کرے۔ بعض لوگ حلال چیزوں میں زہد کو معتبر جانتے ہیں' حرام اور مشتبہ چیزوں میں زہد کو زہد نہیں کہتے' اس کے بعد انہوں نے یہ دیکھا کہ اس زمانے میں حلال کا وجود نہیں ہے اس لئے ان کے نزدیک زہد ناممکن ہے۔

ماسوی اللہ کے ترک کا مطلب جیسا کہ حضرت ابو سلیمان دارانی کے حوالے سے بیان کیا گیا ہے کہ ماسوی اللہ کو ترک کر دینا زہد ہے ہم نے زہد کی اس تعریف کو مکمل اور جامع کہا ہے۔ اس پر یہ اعتراض وارد ہو سکتا ہے کہ تمہاری تعریف کی رو سے کھانے پینے میں' لباس پہننے میں' اور لوگوں کے ساتھ بات چیت کرنے میں مشغول ہونا غیر اللہ کے ساتھ مشغول ہونا ہے' اور یہ چیزیں ناگزیر ہیں' اس سے معلوم ہوا کہ کوئی شخص زاہد نہیں ہو سکتا' کیوں کہ کسی ایسے شخص کا تصور ممکن نہیں جو کھائے پئے بغیر زندہ رہ سکے' لباس پہنے بغیر اپنی عریانی چھپا سکے' اور لوگوں سے گفتگو کئے بغیر زندہ رہ سکے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ دنیا سے منحرف ہو کر اللہ تعالیٰ کی طرف سے دل کی پوری توجہ کے ساتھ ذکر اور فکر کے ذریعے متوجہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی ماسوی اللہ کا تارک اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ مشغول ہے' اور یہ ترک و اشتغال بغیر زندگی کے ممکن نہیں ہے' اور زندگی کے لئے ضروریات زندگی ناگزیر ہیں' چنانچہ اگر تم بدن کو مہلکات بدن سے محفوظ رکھتے ہو' اور تمہارا مقصد اس بدن سے عبادت پر مدد لینا ہے تو یہ نہیں کہا جائے گا کہ تم غیر اللہ میں مشغول ہو' اس لئے کہ جو چیز ایسی ہو کہ اس کے بغیر مقصد کا حصول ممکن نہ ہو تو اسے مقصود ہی کہا جائے گا۔ مثلاً اگر ایک شخص حج کے راستے میں ہے اور اپنی سواری کے دانہ پانی میں مشغول ہوتا ہے تو یہ نہیں کہا جائے گا کہ وہ حج کے علاوہ کسی دوسری چیز میں مشغول ہے' بلکہ سواری کی نگہداشت بھی حج ہی کا ایک جزء ہے۔ لیکن اللہ کے راستے میں تمہارا بدن ایسا ہی ہونا چاہیے جیسے اونٹنی حج کے سفر میں' اونٹنی کی نگہداشت سے تمہارا مقصد حصول تنعم نہیں ہے' بلکہ قطع مسافت ہے' اسی طرح تمہیں اپنے جسم کی اسی حد تک نگہداشت کرنی چاہیے کہ تم اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ کا راستہ طے کر سکو۔ سواری کو تم طرح طرح کی غذائیں نہیں کھلاتے' بلکہ صرف اسی حد تک اس کا آب و دانہ کرتے ہو کہ وہ زندہ رہ کر تمہاری مدد کر سکے' اسی طرح تمہیں اپنی ضروریات زندگی یعنی کھانے' پینے' پہننے' اور رہنے میں بھی مقدار ضرورت پر اکتفا

کرنا چاہیے۔ مقصد لذت اندوزی اور حصول آسائش نہ ہو' صرف اطاعت الٰہی پر قوت کا حصول مقصود ہو' اور یہ چیز زہد کے خلاف نہیں ہے' بلکہ زہد کے لئے شرط ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ جب آدمی بھوک کے وقت کھانا کھائے گا تو اسے لامحالہ لذت حاصل ہوگی' ہم یہ کہتے ہیں کہ اس طرح کی لذت مضر نہیں ہے' چنانچہ اگر کوئی ٹھنڈا پانی پیتا ہے اور اسے اس میں لذت ملتی ہے تو یہ نہیں کہا جائے گا کہ اس کا مقصد لذت ہے بلکہ پیاس کی تکلیف دور کرنا اس کا مقصد ہے' جیسے کوئی شخص قضائے حاجت کرتا ہے اس میں بھی راحت ملتی ہے' لیکن اس راحت کو مقصود نہیں سمجھا جاسکتا' اسی لئے دل اس کی طرف مائل نہیں ہوتا' اسی طرح اگر کوئی شخص تہجد کے لئے اٹھتا ہے' اور اس وقت کی خوشگوار اور تازہ ہوا اسے اچھی لگتی ہے' یا پرندوں کے دل کش نغمے اس کے کانوں کو بھلے معلوم ہوتے ہیں تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے' بشرطیکہ مقصد ٹھنڈی ہوا کھانا اور پرندوں کے نغمے سننا نہ ہو' یہ چیزیں اس وقت مقصد میں داخل ہوں گی جب تہجد کے لئے اٹھنے والا خاص طور پر ایسی جگہ منتخب کرے گا جہاں کی ہوا خوشگوار ہو' اور جہاں پرندوں کے نغمے گونجتے ہوں' اگر قصد و ارادے کے بغیر کوئی ایسی جگہ ہاتھ آجائے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے حالانکہ خائفین میں ایسے لوگ بھی تھے جنہوں نے تہجد کی نماز کے لئے ایسی جگہ منتخب کی جہاں خوش گوار ہوا' اور خوش الحانی پرندوں کا گذر نہ ہو' اس خوف سے کہ کہیں دل ان چیزوں سے مانوس نہ ہوجائیں' ان کے ساتھ دل کا مانوس ہونا دنیا کے ساتھ مانوس ہونا ہے' اور جس قدر آدمی غیر اللہ سے مانوس ہوتا ہے اسی قدر اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس کی انسیت میں خلل واقع ہوتا ہے۔ حضرت داؤد طائی اپنے لئے پینے کا پانی کھلے ہوئے منہ کے گھڑے میں رکھتے' اور اسے دھوپ میں رہنے دیتے' گرم پانی پینا ان کے معمولات میں داخل تھا' فرماتے تھے کہ جو شخص ٹھنڈا پانی پیتا ہے اس کے لئے دنیا ترک کرنا مشکل ہوجاتا ہے۔ یہ خوف صرف احتیاط پسند حضرات کے ساتھ مخصوص ہے' یہ احتیاط عقلمندی کی دلیل ہے' اگرچہ اس میں سخت دشواریاں ہیں' ہر شخص ان دشواریوں کا متحمل نہیں ہوسکتا' لیکن جو شخص طبیعت پر جبر کرکے دشواریوں کا عادی ہوجاتا ہے وہ فائدے میں رہتا ہے' کیوں کہ اس میں چند روزہ لذت کا ترک ہے' اور اسکے نتیجے میں عیش جاوداں حاصل ہوتی ہے' اہل معرفت ان مشکلات کو انگیز کرتے ہیں' اور نفس کو شریعت کے بتلائے ہوئے طریقہ تدبیر سے دبائے رکھتے ہیں' اور یقین کی مضبوط رسی تھامے رہتے ہیں۔

ضروریات زندگی میں زہد کی تفصیل

جاننا چاہیے کہ جن چیزوں میں لوگ مشغول رہتے ہیں وہ دو طرح کی ہیں' بعض فضول ہیں' اور بعض اہم' فضول کی مثال ایسی ہے جیسے فربہ و توانا گھوڑے' عام طور پر لوگ سواری میں راحت پانے کے لئے گھوڑوں کی پرورش کرتے ہیں' حالانکہ وہ چاہیں تو پیدل چل کر بھی اپنی ضرورتیں پوری کرسکتے ہیں' اور اہم چیزوں کی مثال کھانا پینا ہے۔ جہاں تک فضولیات کا تعلق ہے ہم ان کی تفصیل نہیں کرسکتے' اس لئے کہ یہ بے شمار ہیں' البتہ ضروری چیزوں کا شمار سہولت سے ہوسکتا ہے' ان ضروری چیزوں کی مقادیر' اجناس اور اوقات میں فضولیات کا دخل ممکن ہے' لہٰذا ان میں زہد کا طریقہ بیان کرتے ہیں۔

ضروریات زندگی زندگی کے لئے جن چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے وہ چھ ہیں' غذا' لباس' مسکن' خانہ داری کے اسباب' اہل و عیال اور مال۔ پھر ان چھ چیزوں کے حصول کے لئے جاہ کی بھی ضرورت ہے' یہاں جاہ سے کیا مراد ہے' اور وہ کون سے اسباب ہیں جن کی وجہ سے مخلوق کو محبت ہوتی ہے اور وہ اغراض کی تکمیل میں تعاون کرتے ہیں' اس موضوع پر ہم نے تیسری جلد کی کتاب الریاء میں گفتگو کی ہے۔ اس لئے یہاں صرف مذکورہ بالا چھ چیزوں پر گفتگو کرتے ہیں۔

پہلی ضرورت غذا ان میں پہلی ضرورت غذا ہے' اور آدمی کے لئے اسی قدر غذا کی ضرورت ہے جو اس کی جسمانی طاقت و توانائی بحال رکھ سکے' لیکن زہد کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی اس کا طول و عرض کم کرے' طول عمر کے اعتبار سے ہے' عام طور پر یہ دیکھا

جاتا ہے کہ جو شخص ایک دن کی غذا رکھتا ہے وہ اس پر قناعت نہیں کرتا' بلکہ مزید کی ہوس کرتا ہے' عرض کی تعلق غذا کی مقدار' نوعیت اور وقت سے ہے۔

غذا کا طول امیدوں کو مختصر کر کے کم کیا جا سکتا ہے' اور زہد کا کم سے کم درجہ یہ ہے کہ جب شدّت کی بھوک محسوس ہو اور مرض کا اندیشہ ہو تو مقدار کفایت پر اکتفا کر کے بھوک کا تدارک کرے' جس شخص کا یہ حال ہو گا وہ دن کی غذا میں سے رات کے لئے بچا کر نہیں رکھے گا' یہ درجہ انتہائی اعلا درجہ ہے' دوسرا درجہ یہ ہے کہ ایک مہینے یا چالیس دن کے لئے غذا کا ذخیرہ کرے' اور تیسرا درجہ یہ ہے کہ ایک سال کے لئے ذخیرہ کرے' یہ کمزور قسم کے زاہدین کا حال ہے' جو لوگ ایک برس سے بھی زیادہ مدّت کے لئے ذخیرہ کرتے ہیں انہیں کسی بھی درجے میں زاہد نہیں کہا جا سکتا۔ اس لئے کہ وہ ایک سال سے زیادہ جینے کی توقع رکھتا ہے' یہ طول امل ہے' اور طول امل رکھنے والا شخص زاہد نہیں ہو سکتا۔ ہاں اگر کسی شخص کے پاس مستقل آمدنی کا ذریعہ نہیں ہے' اور لوگوں کا مال لینے پر اس کی طبیعت آمادہ نہ ہو تب ایک برس سے زائد عرصے کے لئے بھی مال لینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے' جیسے حضرت داؤد طائی کو وراثت میں بیس دینار ملے' آپ نے وہ دینار ایک طرف رکھ دیے' بیس برس کے بعد انہیں اپنی ضرورت میں استعمال کیا' ان کا یہ فعل نفس زہد کے خلاف نہیں ہے' البتہ وہ لوگ اسے صحیح نہیں کہتے جو زہد میں توکل کی شرط لگاتے ہیں۔

جیسا کہ بیان کیا گیا ہے کہ عرض کا تعلق مقدار' جنس اور وقت سے ہے' مقدار میں کمی کی صورت یہ ہے کہ ایک دن رات میں نصف رطل (پاؤ سیر) سے زیادہ نہ کھائے' یہ مقدار غذا کا کم تر درجہ ہے' اور اوسط درجہ ایک رطل ہے۔ اور اعلا درجہ ایک مد ہے یہ وہ مقدار ہے جو اللہ تعالیٰ نے کفارے وغیرہ میں مساکین کو کھلانے کے لئے مقرر فرمائی ہے اگر کسی کی خوراک اس سے زیادہ ہے تو یہ شکم پرستی' ہوس گیری اور بسیار خوری ہے جو شخص ایک مد پر قناعت نہیں کر سکتا اسے پیٹ کا زہد نصیب نہیں ہو سکتا' جنس کے اعتبار سے کم تر غذا بھوسی کی روٹی بھی ہو سکتی ہے' اور اوسط درجے کی غذا جو اور چنے کی روٹی ہے' اور اعلا درجے میں بغیر چھنے آٹے کی روٹی ہے' اگر کسی نے چھنے ہوئے آٹے کی روٹی کھائی تو یہ عیش کوشی ہوگی' اور اسے زہد کا ابتدائی حصہ بھی نصیب نہیں ہو گا' چہ جائیکہ اعلا حصہ ملے۔ سالن میں اقل درجہ نمک' سبزی اور سرکہ ہے' اوسط درجہ میں زیتون یا دوسری چکنائی ہے جو مقدار میں برائے نام ہو اور اعلیٰ درجے میں گوشت ہے' خواہ کسی بھی قسم کا ہو' لیکن یہ ہفتے میں ایک دو روز ہونا چاہیے' اس سے زیادہ ہو گا تو زہد کی تمام قسموں سے خارج کر دیا جائے گا۔ وقت کی کمی کا کم سے کم درجہ یہ ہے کہ رات دن میں صرف ایک بار کھائے' اور اس پر عمل اس صورت میں ہو سکتا ہے کہ دن میں روزے سے رہے اور اوسط درجہ یہ ہے کہ ایک دن روزہ رکھے رات کو کھانا نہ کھائے پانی پی لے' اور دوسرے دن بھی روزہ رکھے' اس دن کھانا کھائے پانی نہ پیئے' اور اعلا درجہ یہ ہے کہ تین دن' یا ہفتہ بھر' یا اس سے زیادہ مدّت تک کے لئے روزہ رکھے' ہم نے جلد ثالث میں اس موضوع پر گفتگو کی ہے کہ خوراک کی مقدار کیسے کم کی جائے اور اس کی حرص کا خاتمہ کس طرح کیا جائے۔ زاہدین کو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے حالات بھی اپنے سامنے رکھنے چاہئیں کہ انہوں نے کھانے میں کس طرح زہد کیا' اور کس طرح سالن کا استعمال ترک کیا' حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ ہم پر چالیس راتیں اس طرح گذر جاتی تھیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں نہ چراغ جلتا تھا' اور نہ آگ روشن ہوتی تھی' لوگوں نے سوال کیا پھر آپ کیا چیز کھا کر زندہ رہتے تھے؟ انہوں نے جواب دیا دو سیاہ چیزوں۔ کھجور اور پانی۔ سے زندگی گذارتے تھے (ابن ماجہ۔ عائشہؓ) اس حدیث سے گوشت' شوربا اور سالن کا ترک ثابت ہوتا ہے' حضرت حسنؓ فرماتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم گدھے کی سواری کرتے تھے' اون پہنتے تھے' پیوند لگے ہوئے جوتے پہنا کرتے تھے' کھانے کے بعد اپنی انگلیاں چاٹتے تھے' زمین پر بیٹھ کر کھانا تناول فرمایا کرتے تھے' اور ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ میں بندہ ہوں' بندوں کی طرح کھاتا ہوں' اور بندوں کی طرح بیٹھتا ہوں (۱)

---

(۱) (۲) (۳) یہ تینوں روایات پہلے بھی گذری ہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں کہ میں تم سے سچ کہتا ہوں جو شخص جنت کا طلبگار ہو اس کے لئے جو کی روٹی اور کتوں کے ساتھ نالیوں پر سونا بہت ہے۔ حضرت فضیلؒ فرماتے ہیں جب سے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ تشریف لائے آپ نے کبھی تین روز تک شکم سیر ہو کر گیہوں کی روٹی نہیں کھائی۔ (۲) (یہ روایت گزشتہ صفحہ کے حاشیہ پر ملاحظہ فرمائیں) (حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنی قوم سے ارشاد فرماتے تھے : اے بنی اسرائیل! خالص پانی پیو، جنگل کی سبزی کھاؤ، جو کی روٹی استعمال کرو، گیہوں کی روٹی ہرگز نہ کھاؤ اس لئے کہ تم اس کا شکر ادا نہ کر سکو گے، ہم نے کھانے پینے میں انبیاء صادقین اور سلف صالحین کے حالات اور واقعات تیسری جلد میں لکھے ہیں، یہاں ان کا اعادہ غیر ضروری ہے، روایات میں ہے کہ جب سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم قباء میں تشریف لائے تو لوگوں نے آپ کی خدمت میں شہد کا شربت پیش کیا، آپ نے شربت کا پیالہ ہاتھ سے رکھ دیا، اور فرمایا کہ میں اسے حرام نہیں کرتا، البتہ اللہ تعالیٰ کے لئے بطور تواضع اس کا پینا ترک کرتا ہوں۔ (۳) (یہ روایت گزشتہ صفحہ کے حاشیہ پر ملاحظہ فرمائیں) ایک مرتبہ کچھ لوگوں نے حضرت عمرؓ کی خدمت میں شہد کا ٹھنڈا شربت پیش کیا، گرمی کے دن تھے، آپ نے شربت لانے والوں سے فرمایا کہ اس کا حساب مجھ سے دور کرو۔ حضرت یحییٰ ابن معاذ رازی فرماتے ہیں کہ زاہد صادق وہ ہے جو میسر غذا پر قناعت کرے، ستر عورت کے بقدر لباس پہنے، اور جہاں جگہ ملے وہاں رہے، دنیا اس کے لئے قید خانہ ہو، قبر کو آرام گاہ تصور کرے، خاک کو بستر اور تقویٰ کو زاد راہ سمجھے، سکوت کو غنیمت، صبر کو تکیہ، توکل کو حسب، عقل کو راہ نما، عبادت کو پیشہ اور جنت کو منزل قرار دے۔

دوسری ضرورت لباس انسان کی دوسری ضرورت لباس ہے، اس میں کم سے کم درجہ اس لباس کا ہے جو سردی اور گرمی سے حفاظت کرے، ستر عورت کے لئے کافی ہو، ان دونوں مقاصد کے لئے ایک چادر ہونی چاہیے جو پورا جسم ڈھانپ سکے، اور اوسط درجہ یہ ہے کہ ایک قمیص، ایک ٹوپی، اور ایک جوڑا جوتوں کا ہو، اعلا درجہ یہ ہے کہ ان تینوں چیزوں کے ساتھ ایک رومال، اور پاجامے کا بھی اضافہ کرلیا جائے۔ جو کپڑا اس مقدار سے زائد ہو گا وہ زہد کی حدود سے متجاوز سمجھا جائے گا۔ زہد کی شرط یہ ہے کہ جب وہ کپڑے دھوئے تو ان کی جگہ پہننے کے لئے اس کے پاس دوسرے کپڑے نہ ہوں، بلکہ جب تک کپڑے نہ سوکھیں وہ گھر میں مقید رہنے پر مجبور ہو۔ اگر کسی شخص کے پاس دو قمیصیں، دو پاجامے اور دو عمامے ہوں تو وہ مقدار لباس میں زہد کے تمام ابواب سے خارج ہے۔ جنس لباس میں ادنیٰ درجہ کھردرا ٹاٹ ہے، اور متوسط درجہ موٹا کمبل ہے، اور اعلا درجہ روئی کا موٹا کپڑا ہے، اور وقت کے اعتبار سے اعلا درجہ یہ ہے کہ ایک برس کی مدّت کے لئے کافی ہو جائے، اور کم سے کم درجہ یہ ہے کہ ایک دن کے لئے کافی ہو، چنانچہ بعض لوگ اپنے کپڑوں میں پتوں کا پیوند لگایا کرتے تھے، یہ اگرچہ بہت جلد خشک ہو کر ٹوٹ جاتے ہیں، لیکن وقتی طور پر ان سے جسم چھپایا جا سکتا ہے، اوسط درجے میں وہ لباس ہے جو جسم پر تقریباً ایک ماہ تک برقرار رہ سکے۔ ایسا لباس تلاش کرنا جو سال بھر سے زیادہ چلے طول امل ہے، اور زہد کے خلاف ہے۔ الاّ یہ کہ مقصود موٹا کپڑا ہو، اور موٹا کپڑا واقعتہً دیرپا ہوتا ہے، جس شخص کے پاس اس مقدار سے زائد کپڑا آئے اسے صدقہ کر دینا چاہیے، اگر اس نے یہ کپڑا اپنے پاس باقی رکھا تو یہ زہد نہیں ہو گا، بلکہ دنیا سے محبت ہو گی، تمہیں انبیائے کرام اور صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے حالات پر نظر رکھنی چاہیے کہ انہوں نے عمدہ لباس کس طرح ترک کر دیئے تھے۔ ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت عائشہ ہمارے سامنے نمدے کی ایک چادر اور ایک موٹا تہبند نکال کر لائیں اور فرمانے لگیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دو کپڑوں میں انتقال فرمایا (بخاری و مسلم) ایک حدیث میں ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا : اللہ تعالیٰ مبتذل سے محبت کرتا ہے جسے یہ پروا نہ ہو کہ وہ کیا پہن رہا ہے (۱) حضرت عمرو ابن الاسود العنسی فرماتے ہیں کہ میں کبھی مشہور کپڑا نہیں پہنوں گا اور نہ رات میں کپڑے پر آرام کروں گا، نہ عمدہ سواری پر سوار ہوں گا اور نہ کبھی پیٹ بھر کر کھانا کھاؤں گا، حضرت عمرؓ نے یہ سن کر ارشاد فرمایا کہ جو شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت و کردار کا مشاہدہ کرنا چاہتا ہو وہ عمرو ابن الاسود کو دیکھ لے (احمد)۔ ایک روایت میں ہے، ارشاد

---

(۱) مجھے اس روایت کی اصل نہیں ملی۔

فرمایا :-

مَامِنْ عَبْدٍ لَبِسَ ثَوْبَ شُهْرَةٍ إِلَّا أَعْرَضَ اللّٰهُ عَنْهُ حَتّٰى يَنْزِعَهُ وَإِنْ كَانَ عِنْدَهُ حَبِيْبًا۔
(ابن ماجہ۔ ابوذرؓ)

جو بندہ شہرت کا لباس پہنتا ہے اللہ تعالیٰ اس سے منہ پھیر لیتا ہے یہاں تک کہ وہ اسے جسم سے نہ اتار ڈالے خواہ اسے وہ لباس محبوب ہی کیوں نہ ہو۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے چار درہم کا ایک کپڑا خریدا (ابو یعلی۔ ابو ہریرہؓ) آپ کے دو کپڑوں کی قیمت دس درہم تھی (۱) آپ کا ازار ساڑھے چار ہاتھ کا تھا (ابو الشیخ۔ عروۃ ابن الزبیر مرسلاً) آپ نے ایک پاجامہ تین درہم میں خرید فرمایا (۲) آپ دو شملے سفید اون کے پہنا کرتے تھے ان دو کپڑوں کا نام حلہ تھا کیوں کہ دونوں ایک ہی جنس سے تھے (بخاری و مسلم ۔ براءؓ) بعض اوقات دو یمانی یا کوئی چادرین جو موٹی بھی ہوتی تھیں پہنا کرتے تھے (ترمذی' نسائی۔ ابو رمثہؓ) ایک حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قمیص ایسی لگتی تھی جیسے تیلی کی قمیص ہو (ترمذی۔ انسؓ) اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ سر اور داڑھی کے بالوں میں کثرت سے تیل لگایا کرتے تھے' اور اس کے اثرات قمیص پر نمایاں رہتے تھے) ایک دن سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے سندس کا ایک ریشمی کپڑا جس پر زرد رنگ کی دھاریاں تھیں زیب تن فرمایا' اس کی قیمت دو سو درہم تھی' صحابہ کرام اس کپڑے کو چھو چھو کر دیکھتے تھے اور حیرت سے کہتے یا رسول اللہ! کیا یہ کپڑا آپ کے پاس جنت سے آیا ہے' اس کو یہ کپڑا اسکندریہ کے بادشاہ مقوقس نے ہدیے میں بھیجا تھا' آپ نے یہ ارادہ کیا کہ اسے پہن کر بادشاہ کا اعزاز کریں' پھر آپ نے وہ کپڑا اتارا اور مشرکین میں سے ایک ایسے شخص کو بھیج دیا جس کے ساتھ صلہ رحمی کرنا منظور تھا' پھر ریشم اور دیباج کو (مردوں کے لئے) حرام کردیا (مسلم۔ جابرؓ)۔ گویا اولاً آپ نے حرمت کی تاکید کے لئے یہ لباس پہنا' جیسے آپ نے ایک مرتبہ سونے کی انگوٹھی پہنی' پھر اسے اتار ڈالی اور مردوں کے لئے اس کا پہننا حرام فرما دیا (بخاری و مسلم) یا جیسے حضرت عائشہؓ سے ان کی باندی بریرہ کے متعلق پہلے تو یہ ارشاد فرمایا کہ مالک کے لئے ولاء کی شرط لگالو' جب انہوں نے شرط لگائی تو آپ منبر پر چڑھے اور آپ نے اس عمل کو حرام قرار دے دیا (بخاری و مسلم۔ عائشہؓ) اسی طرح آپ نے ابتداء میں تین دن کے لئے متعہ مباح فرمایا' اس کے بعد نکاح کی تاکید کے لئے اس کو حرام قرار دے دیا (مسلم۔ سلمۃ ابن الاکوعؓ) ایک مرتبہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے سیاہ رنگ کی دھاری دار چادر میں نماز پڑھی' سلام پھیرنے کے بعد فرمایا کہ اس چادر کی طرف دیکھنے نے مجھے نماز سے مشغول کیا ہے' اسے ابو جہم کے پاس جاؤ اور اس کی چادر مجھے لادو (بخاری و مسلم) گویا آپ نے اپنی عمدہ اور خوبصورت چادر ابو جہم کو دیدی اور ان کی معمولی چادر خود اوڑھی۔ ایک مرتبہ آپ کے جوتے کا تسمہ پرانا ہو گیا تو آپ نے نیا تسمہ لگا کر نماز پڑھی' نماز کے بعد فرمایا اس میں وہی پرانا تسمہ لگادو' اور یہ نیا تسمہ نکال دو' نماز کے دوران میری نگاہ اس پر پڑتی ہے (۳) تا (۵) ایک مرتبہ آپ نے سونے کی انگوٹھی پہنی' اس کے بعد منبر پر تشریف لے گئے' انگوٹھی پر نظر پڑی تو اسے نکال کر دور پھینک دیا اور فرمایا کہ اس نے مجھے تم سے روک دیا ہے' کبھی اسے دیکھتا ہوں اور کبھی تمہیں دیکھتا ہوں (۴) ایک مرتبہ آپ نے نئے جوتے پہنے' آپ کو پھر جوتے اچھے معلوم ہوئے' (چنانچہ بطور شکر آپ نے سجدہ فرمایا' اور لوگوں سے کہا کہ مجھے یہ جوتے اچھے لگے اس لئے میں نے اس خوف سے سجدہ کیا کہ خدا تعالیٰ مجھ سے ناراض نہ ہو' اس کے بعد آپ نے وہ جوتے اتارے اور جو پہلا مسکین نظر پڑا اسے دیدیے (۵) سنان ابن سعد کہتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ایک اونی جبہ جس پر سیاہ اور سفید دھاریاں تھیں تیار کیا گیا' اس کے کنارے سیاہ رکھے گئے' جب آپ نے یہ جبہ زیب تن فرمایا تو لوگوں سے ارشاد فرمایا دیکھو یہ کس قدر عمدہ اور نرم ہے' ابن سعد کہتے ہیں کہ ایک اعرابی

---

(۱) اس کی اصل نہیں ملی۔ (۲) مشہور یہ ہے کہ چار درہم میں خریدا' جیسا کہ مسند ابی یعلی میں ہے' سنن اربعہ میں پاجامہ کی خریداری کا ذکر ہے' لیکن قیمت کا تذکرہ نہیں ہے۔ (۳) تا (۵) یہ سب روایتیں کتاب الصلوۃ میں گذری ہیں۔

نے کھڑے ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ! یہ جبّہ مجھے عطا کر دیجئے' آپ کا معمول یہ تھا کہ جب کوئی شخص آپ سے کوئی چیز مانگتا تو آپ اسے دینے میں بخل نہ فرماتے' چنانچہ آپ وہ جبّہ اعرابی کو دیدیا' اور صحابہ سے کہا کہ ایسا ہی ایک جبہ اور تیار کیا جائے' ابھی وہ جبہ تیاری کے مراحل میں تھا کہ آپ نے دنیا سے پردہ فرما لیا (طبرانی۔ سہل ابن سعد) حضرت جابرؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت فاطمہ کے گھر تشریف لے گئے' وہ اس وقت اونٹ کے بالوں کی چادر اوڑھے ہوئے چکی سے آٹا پیس رہی تھیں' آپ نے اپنی لخت جگر کو اس حال میں دیکھا تو رونے لگے' اور فرمایا اے فاطمہؓ عیش جاوداں کے لئے دنیا کے تلخ گھونٹ پی لے' اس کے بعد یہ آیت نازل ہوئی :۔ (ابو بکر ابن لال مکارم اخلاق)

وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَىٰ۔ (پ ۳۰ ر ۱۸ آیت ۵)

اور عنقریب اللہ تعالیٰ آپ کو (بکثرت نعمتیں) دے گا سو آپ خوش ہو جائیں گے۔

ایک حدیث میں ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مجھے ملأ اعلیٰ نے خبر دی ہے کہ میری امت میں بہترین لوگ وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی وسعت رحمت کے باعث ظاہر میں ہنستے ہیں اور اس کے عذاب کے خوف سے دل میں روتے ہیں' لوگوں پر ان کا بوجھ کم اور خود ان کے اوپر بھاری ہے' پرانے کپڑے پہنتے ہیں' اور راہبین کی اتباع کرتے ہیں' ان کے جسم زمین پر ہیں اور دل عرش بریں پر (حاکم' بیہقی) یہ تھا لباس کے سلسلے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ' آپ نے اپنی امت کو اپنے اسوے کی اتباع کی بار بار وصیت فرمائی ہے' چنانچہ ارشاد فرمایا :

مَنْ أَحَبَّنِي فَلْيَسْتَنَّ بِسُنَّتِي عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ مِنْ بَعْدِي عَضُّوا عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِذِ۔ (ابو داؤد' ترمذی' ابن ماجہ۔ العرباض ابن ساریہؓ)

جو مجھ سے محبت کرتا ہے اسے چاہیے کہ وہ میری سنت کی پیروی کرے اپنے اوپر میری سنت اور میرے بعد میرے خلفائے راشدین کی سنت لازم پکڑ لو' اور اسے دانتوں سے تھام لو۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :۔

قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ (پ ۳ ر ۱۲ آیت ۳۱)

آپ کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری اتباع کرو اللہ تم سے محبت کرے گا۔

ایک مرتبہ آپ نے حضرت عائشہؓ کو بطور خاص یہ نصیحت فرمائی کہ اگر تو مجھ سے ملنا چاہے تو مالداروں کی ہم نشینی سے گریز کر' اور کوئی کپڑا اس وقت تک نہ اتار جب تک تو اس میں پیوند نہ لگا لے (ترمذی' حاکم) روایت بھی ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ کی قمیص میں لگے ہوئے پیوند شمار کئے گئے تو ان کی تعداد بارہ تھی' ان میں بعض پیوند چمڑے کے تھے' حضرت علی ابن ابی طالبؓ نے ایک کپڑا تین درہم میں خریدا اور اسے خلافت کے زمانے میں زیب تن کیا' اور اس کی آستینیں کہنیوں کے اوپر سے کاٹ ڈالیں' اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس نے مجھے اس لباس کی صورت میں اپنے خلعت سے سرفراز فرمایا۔ حضرت سفیان ثوریؒ فرماتے ہیں کہ لباس ایسا پہننا جس سے علماء کے نزدیک شہرت نہ ہو اور جہلاء کے نزدیک ذلت نہ ہو' یہ بھی فرماتے تھے کہ فقیر میرے قریب سے گذر جائے اور میں نماز میں ہوں تو اسے گذر جانے دیتا ہوں' اور اگر دنیا داروں میں سے کوئی شخص گذرتا ہے اور اس کے جسم پر عمدہ لباس ہوتا ہے تو میں اس سے ناراض ہوتا ہوں اور اسے اپنے قریب سے نہیں گذرنے دیتا۔ ایک بزرگ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت سفیان ثوری کے دونوں کپڑوں اور جوتوں کی قیمت کا اندازہ کیا تو وہ ایک درہم اور چار دانق سے زیادہ کے نہیں تھے' ابن شبرمہؒ کہتے ہیں کہ میرا بہترین لباس وہ ہے جو میری خدمت کرے' اور بدترین لباس وہ ہے جس کی میں خدمت کروں۔ بعض بزرگان دین کہتے ہیں کہ لباس ایسا پہننا چاہیے جس سے تمہارا شمار بازاری لوگوں میں ہو' ایسا لباس مت پہنو جس سے تمہیں شہرت ملے اور لوگ تمہیں دیکھیں۔ ابو سلیمان دارانیؒ فرماتے ہیں کہ کپڑے تین طرح کے ہوتے ہیں' ایک جو صرف اللہ کے لئے ہو' یہ وہ کپڑا ہے

جس سے ستر پوشی کی جاتی ہے دوسرا وہ جو نفس کے لئے جو' اس سے وہ کپڑا مراد ہے جس کی نرمی مقصود ہو اور تیسرا کپڑا وہ ہے جو لوگوں کے لئے ہو اس سے وہ کپڑا مراد ہے جس کا ظاہری حسن' خوبصورتی' اور دل کشی مقصود ہو' ایک بزرگ کا مقولہ ہے کہ جس کا کپڑا پتلا ہوتا ہے اس کا دین بھی پتلا ہوتا ہے۔ اکثر علماء تابعین کے لباس کی قیمت بیس سے تیس درہم تک ہوتی تھی۔ حضرت خواص دو کپڑوں سے زیادہ نہیں پہنتے تھے' ایک قمیص' دوسرا لنگی' اور کبھی اپنی قمیص کا دامن موڑ کر سر پر ڈال لیا کرتے تھے' کسی بزرگ کا مقولہ ہے کہ اولین زہد لباس کا زہد ہے' ایک حدیث میں ہے اَلْبَذَاذَةُ مِنَ الْإِيْمَانِ کپڑوں کا پرانا ہونا ایمان میں سے ہے۔ ایک اور روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ جو شخص خوبصورت لباس پہننے کی قدرت رکھنے کے باوجود محض تواضع کے لئے اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے چھوڑ دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ پر یہ حق ہوتا ہے کہ وہ اس کے لئے جنت کے خلعت یاقوت کی جامہ دانیوں میں محفوظ رکھے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک پیغمبر پر وحی نازل فرمائی کہ میرے دوستوں سے کہدو کہ وہ میرے دشمنوں کا لباس نہ پہنا کریں' اور نہ دشمنوں کے گھروں میں جایا کریں' اگر ایسا کریں گے تو ان کی طرح وہ بھی میرے دشمن ہو جائیں گے' رافع ابن خدیج نے بر ابن مروان کو کوفے کے منبر پر وعظ کرتے ہوئے دیکھ کر کہا کہ اپنے امیر کو دیکھو کہ فساق کا لباس پہن کر لوگوں کو وعظ و نصیحت کرتا ہے' بشر ابن مروان اس وقت نہایت باریک لباس پہنے ہوئے تھا۔ عبد اللہ ابن عامر ابن ربیعہ اپنے مخصوص عمدہ لباس میں حضرت ابوذر غفاریؓ کی خدمت میں پہنچا اور ان سے زہد کے سلسلے میں گفتگو کرنے لگا' ابوذرؓ نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسی اڑائی' ابن عامر کو ان کا یہ رویہ ناگوار گذرا اور اس نے حضرت عمرؓ سے اس کی شکایت کی' حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ تم نے خود ہی ایسی حرکت کی ہے کہ یہ لباس پہن کر ان کے سامنے زہد کے متعلق گفتگو کرنے بیٹھ گئے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ائمہ ہدیٰ سے یہ عہد لیا ہے کہ وہ لوگوں کی حالتوں میں سے ادنیٰ حالت پر رہا کریں' تاکہ مالدار ان کی تقلید کریں' اور فقراء کی فقر کی وجہ سے اہانت نہ ہو' حضرت علی کرم اللہ وجہ سے کسی نے عرض کیا کہ آپ ایسا سخت اور کھردرا لباس کیوں پہنتے ہیں' فرمایا یہ لباس تواضع سے قریب تر اور متواضع کے لئے انتہائی موزوں ہے' مسلمان کو چاہیے کہ اس لباس کی اتباع کرے۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے راحت طلبی اور عیش کوشی سے منع فرمایا' اور ارشاد فرمایا :-

إِنَّ لِلّٰهِ تَعَالٰى عِبَادًا لَيْسُوْا بِالْمُتَنَعِّمِيْنَ۔ (احمد۔ معاذ)

اللہ تعالیٰ کے کچھ بندے ایسے ہیں جو آرام طلبی نہیں کرتے۔

روایت میں ہے کہ فضالہ ابن عبید والی مصر ہونے کے باوجود پراگندہ بال اور برہنہ پا رہا کرتے تھے' کوئی شخص ان سے کہتا کہ آپ امیر ہونے کے باوجود اس حال میں رہتے ہیں' وہ جواب میں کہتے کہ ہمیں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ترفہ (آرام طلبی) سے منع فرمایا ہے اور حکم دیا ہے کہ ہم کبھی برہنہ پا بھی پھرا کریں (ابوداؤد) حضرت علیؓ نے حضرت عمرؓ سے فرمایا کہ اگر آپ اپنے دونوں ساتھیوں سے ملنا چاہتے ہوں تو اپنے کرتے میں پیوند لگایئے' اور تہبند کو سرنگوں رکھیے' اور ٹکی لگی ہوئی جوتی پہنئے' اور خواہش سے کم کھانا کھایئے۔ حضرت عمر ارشاد فرماتے ہیں کہ موٹا اور کھردرا کپڑا پہنا کرو' اور عجمیوں کے لباس سے پرہیز کرو' حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ جو شخص کسی قوم کا لباس اختیار کرتا ہے وہ انہی میں سے ہو جاتا ہے۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :- إِنَّ مِنْ شِرَارِ أُمَّتِي الَّذِيْنَ غُذُّوْا بِالنَّعِيْمِ يَطْلُبُوْنَ أَلْوَانَ الطَّعَامِ وَأَلْوَانَ الثِّيَابِ وَيَتَشَدَّقُوْنَ فِي الْكَلَامِ۔ (طبرانی۔ ابوامامہ)

میری امت کے بدترین لوگ وہ ہیں جو دولت میں پلتے ہیں' طرح طرح کے کھانوں' اور مختلف قسم کے کپڑوں کے متلاشی رہتے ہیں' اور (اظہار فصاحت کے لئے) منہ پھاڑ پھاڑ کر بولتے ہیں۔

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :-

اِزْرَةُ الْمُؤْمِنِ اِلٰی اَنْصَافِ سَاقَیْهِ وَلَا جُنَاحَ عَلَیْهِ فِیْمَا بَیْنَهُ وَبَیْنَ الْکَعْبَیْنِ وَمَا اَسْفَلَ مِنْ ذٰلِکَ فَفِی النَّارِ وَلَا یَنْظُرُ اللّٰهُ یَوْمَ الْقِیَامَةِ اِلٰی مَنْ جَرَّ اِزَارَهٗ بَطَرًا۔

(مالک' ابوداؤد' نسائی' ابن حبان۔ ابو سعیدؓ)

مومن کا ازار نصف ساق تک ہونا چاہیے' اگر ٹخنوں اور پنڈلی کے درمیان ہو تب بھی کوئی گناہ نہیں لیکن اس کے نیچے ہو تو دوزخ میں ہے' اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس شخص پر نظر نہیں ڈالے گا جو اپنے ازار کو تکبر کے طور پر لٹکائے۔

ابو سلیمان دارانیؒ کہتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :۔

لَا یَلْبَسُ الشَّعْرَ مِنْ اُمَّتِیْ اِلَّا مُرَاءٍ اَوْ اَحْمَقُ۔

میری امت میں سے ریاکار اور بے وقوف کے علاوہ کوئی شخص بال نہیں پہنے گا۔

اس سے مراد بالوں کا بنا ہوا قیمتی کپڑا ہے' اوزاعیؒ فرماتے ہیں کہ اون پہننا سفر میں سنت ہے اور حضر میں بدعت ہے' محمد ابن واسع قتیبہ ابن مسلمؒ کے پاس گئے' وہ اس وقت اونی جبہ پہنے ہوئے تھے' قتیبہؒ نے ان سے کہا کہ اس جبے کی تمہیں کیا ضرورت پیش آگئی؟ وہ یہ سوال سن کر خاموش رہے' قتیبہ نے کہا کہ میں تم سے گفتگو کر رہا ہوں اور تم خاموش ہو' انہوں نے جواب دیا کہ اگر میں اس کے جواب میں یہ کہوں کہ میں نے زہد کے لئے یہ جبہ پہنا ہے تو یہ اپنے نفس کی پاکیزگی کا اظہار ہوگا' اور اگر یہ کہوں کہ فقر کی وجہ سے پہنا ہے تو یہ اپنے رب کی شکایت ہوگی' ابو سلیمان کہتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنا دوست بنایا تو یہ وحی نازل فرمائی کہ زمین سے اپنا ستر پوشیدہ رکھ' چنانچہ آپ کا معمول یہ تھا کہ ہر چیز میں سے ایک لیتے تھے' مگر پاجامے دو بناتے تھے۔ جب ایک دھو کر ڈالتے تو دوسرا پہن لیتے' تاکہ کوئی لمحہ ایسا نہ گزرے کہ آپ کا ستر کھلا ہوا ہو۔ حضرت سلمان الفارسیؓ سے کسی شخص نے دریافت کیا کہ آپ عمدہ لباس کیوں نہیں پہنتے' انہوں نے جواب دیا کہ بھلا غلام کو اچھے کپڑوں کی کیا ضرورت ہے البتہ جب وہ آزاد ہوگا تو خدا کی قسم اسے ایسے عمدہ کپڑے عطا کئے جائیں گے جو کبھی پرانے نہیں ہوں گے حضرت عمر ابن عبدالعزیز کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ ان کے پاس بالوں کا بنا ہوا ایک جبہ اور ایک چادر تھی' یہ دونوں کپڑے آپ رات کو تہجد کے لئے اٹھنے پر استعمال کرتے تھے' حضرت حسن بصری نے فرقد سنجی سے کہا کہ تم یہ سمجھتے ہوں گے کہ کمبل پوشی کی وجہ سے لوگوں پر فضیلت رکھتے ہو' حالانکہ مجھے یہ خبر پہنچی ہے کہ اکثر اہل دوزخ کمبل پوش ہوں گے اپنے نفاق کے باعث۔ یحییٰ ابن معین کہتے ہیں کہ میں نے ابو معاویہ الاسود کو دیکھا کہ وہ کوڑیوں کے ڈھیر میں پھٹے پرانے کپڑے تلاش کرتے ہیں' انہیں دھوتے ہیں' اور انہیں جوڑ کر لباس تیار کرتے ہیں' میں نے ان سے کہا کہ آپ اس سے بہتر کپڑے پہنا کریں' انہوں نے فرمایا اس لباس میں ہمارا کیا نقصان ہے دنیا میں فقیروں کو جو مصیبت اٹھانی پڑتی ہے جنت میں اس کا صلہ انہیں مل جائے گا' یحییٰ ابن معین ابو معاویہ کا یہ قول بیان کر کے رویا کرتے تھے۔

تیسری ضرورت۔ مسکن اس میں بھی زہد کے تین درجے ہیں' ان میں اعلا ترین درجہ یہ ہے کہ اپنے لئے کوئی مخصوص جگہ تلاش نہ کرے' بلکہ مساجد کے گوشوں پر قناعت کرے' جیسا کہ اصحاب صفّہ کیا کرتے تھے' اوسط درجہ یہ ہے کہ اپنے کے لئے کوئی خاص جگہ تلاش کرلے جیسے جھونپڑی یا چھپر وغیرہ' اور ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ کوئی کمرہ خرید لے یا کرائے پر حاصل کرلے۔ اگر مسکن کی وسعت ضرورت کے بقدر ہے' اور اس میں کوئی آرائش نہیں ہے تو ایسا مسکن اختیار کرنے سے زہد کے آخری درجات سے نہیں نکلے گا۔ لیکن مکان کا پختہ ہونا' ضرورت سے زائد کشادہ ہونا' اور چھت کا چھ ہاتھ سے زیادہ لمبا ہونا آدمی کو زہد کی حدود سے خارج کر دیتا ہے۔

مکان کی جنس میں اختلاف ہو سکتا ہے کہ وہ گچ کا ہو' یا گھاس کا ہو' یا مٹی کا ہو' یا پختہ اینٹ کا ہو۔ اسی طرح وسعت میں بھی اختلاف ہو سکتا ہے' اور املاقات کے لحاظ سے بھی ملکیت کا اختلاف ہو سکتا ہے مثلاً یہ کہ اپنی ملک میں ہو' یا کرایہ پر ہو' یا مستعار ہو'

زہد کو ان تمام قسموں میں دخل ہے۔

بطور خلاصہ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ جس کی طلب ضرورت کے لئے ہو اسے ضرورت کی حدود سے متجاوز نہ ہونا چاہیے، دنیا کی جتنی چیزیں بھی قدر ضرورت میں داخل ہیں وہ دین کا آلہ اور اس کا وسیلہ ہیں، اور جو ضرورت سے زائد ہیں وہ دین کے مخالف ہیں، اس اصول کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو مسکن کا مقصد یہ ہے کہ آدمی گرمی، سردی اور بارش سے محفوظ رہے، لوگوں کی نگاہوں سے پوشیدہ رہے، اور ان کی ایذاء سے بچے، جس قدر مکان اس مقصد کی تکمیل کے لئے ضروری ہے وہ معلوم ہے اس سے زیادہ فضول ہے، اور تمام فضولیات دنیا میں داخل ہیں، اور جو شخص فضولیات کا طالب ہے، یا اس کے لئے کوشاں ہے وہ زہد سے بہت دور ہے، کہتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے پردہ فرمانے کے بعد لوگوں میں جو طول آرزو رونما ہوئی وہ عمدہ سلائی اور پختہ تعمیر کی صورت میں ہوئی، پہلے لمبے لمبے ٹانکوں سے کپڑے سیئے جاتے تھے، اور گھاس پھوس اور نرکل وغیرہ سے مکانات بنائے جاتے تھے، ایک حدیث میں ہے کہ ایک دور ایسا آئے گا کہ لوگ اپنے کپڑوں میں ایسی چنا کاری کریں گے جیسے آج کل یمن کی چادروں پر کی جاتی ہے۔ مروی ہے کہ حضرت عباسؓ نے اپنے مکان کی بالائی منزل تعمیر کی تو آپ نے اسے منہدم کرنے کا حکم فرمایا (طبرانی۔ ابو العالیہؒ) ایک مرتبہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا گذر ایک گنبد نما (اونچے مکان) کے پاس سے ہوا، آپ نے دریافت فرمایا یہ مکان کس کا ہے؟ صحابہ نے عرض کیا فلاں شخص کا ہے۔ جب وہ شخص سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا تو آپ نے اس سے اعراض فرمایا، اور اس کی طرف اس طرح توجہ نہیں فرمائی جس طرح پہلے فرمایا کرتے تھے، اس شخص نے صحابہ سے آپ کی ناراضگی کا سبب دریافت کیا، صحابہ نے واقعہ کی خبر دی، چنانچہ اس شخص نے جاکر اپنا مکان منہدم کر دیا، اس واقعے کے بعد آپ پھر ادھر سے گذرے تو وہ مکان نظر نہیں آیا، صحابہ نے بتلایا کہ اس شخص نے وہ مکان گرا دیا ہے، یہ سن کر آپ نے اس شخص کے لئے دعائے خیر فرمائی (ابو داؤد۔ انسؓ) حضرت حسنؓ فرماتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم زندگی میں نہ کبھی اینٹ پر اینٹ رکھی اور نہ نے پر نے (ابن حبان مرسلاً) مراد یہ ہے کہ آپ نے کبھی مکان نہیں بنایا، ایک حدیث میں ہے، سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :۔

اِذَا اَرَادَ اللّٰہُ بِعَبْدٍ شَرًّا اَھْلَکَ مَالَہُ فِی الْمَاءِ وَالطِّیْنِ۔ (ابو داؤد۔ عائشہؓ)

جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کی برائی چاہتا ہے تو اس کے مال کو پانی اور مٹی میں ضائع کر دیتا ہے۔

حضرت عبد اللہ ابن عمرؓ روایت کرتے ہیں : ہم ایک چھپر کی مرمت میں مصروف تھے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے، آپ نے دریافت فرمایا یہ کیا ہے؟ ہم نے عرض کیا ہمارا چھپر ٹوٹ گیا تھا (ہم اس کی اصلاح کر رہے ہیں) آپ نے فرمایا میں امر (قیامت) کو اس سے بھی جلد دیکھتا ہوں (ابو داؤد، ترمذی، ابن ماجہ) حضرت نوح علیہ السلام نے نرکل کا ایک جھونپڑا بنایا، لوگوں نے عرض کیا اگر آپ پختہ مکان بنالیں تو زیادہ اچھا ہے، فرمایا مرنے والے شخص کے لئے یہ بہت کافی ہے۔ حضرت حسن کہتے ہیں کہ ہم صفوان ابن محیریز کی خدمت میں حاضر ہوئے، وہ اس وقت نرکل کے ایک ایسے جھونپڑے میں مقیم تھے جو نیچے جھک رہا تھا ہم نے عرض کیا کہ آپ اسے ٹھیک کرالیں، فرمایا بہت سے آدمی آکر جاچکے ہیں اور یہ جھونپڑا اسی حالت پر قائم ہے۔ ایک حدیث میں ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :۔

مَنْ بَنٰی فَوْقَ مَا یَکْفِیْہِ کُلِّفَ یَوْمَ الْقِیَامَةِ اَنْ یَّحْمِلَہُ (طبرانی۔ ابن مسعودؓ)

جو شخص قدر کفایت سے زیادہ تعمیر کرے گا اسے قیامت کے دن اس تعمیر کو اٹھانے کا پابند کیا جائے گا۔

حدیث میں ہے کہ بندہ کو اس کے نفقے پر اجر دیا جائے گا، لیکن جو پیسہ اس نے پانی اور مٹی میں خرچ کیا ہے اس پر کوئی اجر نہیں ملے گا (ابن ماجہ۔ خباب ابن الارتؓ)

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :۔

تِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِينَ لَا يُرِيدُونَ عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ وَلَا فَسَادًا۔ (پ ۲۰ ر ۱۲ آیت ۸۳)

یہ عالم آخرت ہم ان ہی لوگوں کے لئے خاص کرتے ہیں جو دنیا میں نہ بڑا بننا چاہتے ہیں اور نہ فساد کرنا۔

مفسرین کے بقول اس آیت میں علو سے مراد جاہ و اقتدار کے مکانات کی بلندی ہے۔ ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :-

كُلُّ بِنَاءٍ وَبَالٌ عَلَى صَاحِبِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِلَّا مَا أَكَنَّ مِنْ حَرٍّ وَبَرْدٍ۔ (ابوداؤد۔ انس)

ہر تعمیر قیامت کے دن اپنے مالک کے لئے وبال ہے مگر وہ تعمیر جو سردی اور گرمی سے بچائے۔

ایک شخص نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے مکان کی تنگی کا شکوہ کیا۔ آپ نے فرمایا "اتسع فی السماء" آسمان میں وسعت طلب کر۔ حضرت عمر ابن الخطاب نے ایک مرتبہ شام کے راستے میں ایک قلعہ دیکھا جو چونے اور اینٹ کا بنا ہوا تھا' آپ نے اللہ اکبر کہا' اور فرمایا : مجھے اندازہ بھی نہ تھا کہ اس امت میں ایسے لوگ بھی ہوں گے جو ہامان کی طرح فرعون کے لئے پختہ عمارتیں بنائیں گے' انہوں نے قرآن کریم کی اس آیت کی طرف اشارہ فرمایا :-

فَأَوْقِدْ لِي يَا هَامَانُ عَلَى الطِّينِ۔ (پ ۲۰ ر ۷ آیت ۳۸)

تو اے ہاماں تم ہمارے لئے مٹی (کی اینٹیں بنوا کر ان) کو آگ میں پکواؤ۔

کہتے ہیں کہ فرعون پہلا شخص ہے جس کے لئے چونے اور اینٹ سے عمارت بنائی گئی' اور سب سے پہلے یہ کام ہامان نے انجام دیا' اس کے بعد دوسرے جابر بادشاہوں اور ظالم حکمرانوں نے اس کی اتباع کی' یہ سب تعیش ہے' اور فضول خرچی ہے' ایک بزرگ نے کسی شہر میں واقع جامع مسجد دیکھ کر کہا کہ پہلے یہ مسجد کھجور کی ٹہنیوں سے بنی ہوئی تھی' اس کے بعد یہ گارے مٹی سے تعمیر کی گئی' اور اب پختہ اینٹوں سے بنائی گئی ہے' لیکن ٹہنیوں والے گارے والوں سے بہتر تھے اور گارے والے اینٹوں والوں سے اچھے تھے' بہت سے اکابرین سلف اپنے مکانات زندگی میں کئی بار بنایا کرتے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہوتی تھی کہ وہ حضرات ان مکانات کو کمزور رکھتے تھے تاکہ تعمیرات کے باب میں زہد کے تقاضوں پر عمل پیرا ہو سکیں' ان میں بہت سے حضرات ایسے بھی تھے کہ جو حج کے لئے یا جہاد میں شرکت کے لئے پابہ رکاب ہونے سے پہلے اپنے مکانات خالی کر دیتے یا اپنے پڑوسیوں کو ہبہ کر دیتے' وہاں سے واپس آکر دوسرا بنا لیتے ان کے گھر گھاس پھوس اور چمڑے کے ہوا کرتے تھے' جیسا کہ آج بھی یمن میں لوگ اسی طرح کے مکانات بناتے ہیں' ان مکانات کی بلندی آدمی کے قد سے ایک بالشت اونچی ہوتی تھی۔ حضرت حسنؓ فرماتے ہیں کہ جب میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے مکانات میں جاتا تھا تو اپنا ہاتھ چھت سے لگا دیا کرتا تھا' عمرو ابن دینار کہتے ہیں کہ جب بندہ اپنا مکان چھ ہاتھ سے زیادہ بلند کرتا ہے تو ایک فرشتہ اس سے کہتا ہے کہ اے فاسقوں کے فاسق تو اسے کہاں تک لے جائے گا۔ حضرت سفیان بلند عمارات کی طرف دیکھنے سے منع فرمایا کرتے تھے' اور کہتے تھے کہ اگر لوگ دیکھنا چھوڑ دیں تو یہ عمارتیں بلند نہ ہوں گویا ان کی طرف دیکھنا تعمیر پر اعانت کرنے کے برابر ہے' حضرت فضیل کہتے ہیں کہ مجھے اس شخص پر حیرت نہیں ہوتی جو عمارت بناتا ہے اور رخصت ہو جاتا ہے' بلکہ اس شخص پر حیرت ہوتی ہے جو بلند عمارتیں دیکھ کر عبرت حاصل نہیں کرتا' حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ کچھ لوگ ایسے آئیں گے جو مٹی کو اونچا کریں گے' ترکی گھوڑے استعمال کریں گے' تمہارے قبلے کی طرف رخ کر کے نماز پڑھیں گے اور تمہارے دین کے علاوہ دین پر مریں گے۔

چوتھی ضرورت۔ گھریلو سامان اس میں بھی زہد کے بہت سے درجے ہیں' اعلا ترین درجے میں وہ حال ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا تھا کہ ان کے پاس صرف کنگھی اور پیالہ رہتا تھا' ایک مرتبہ کسی شخص کو دیکھا کہ وہ اپنی داڑھی میں انگلیوں سے کنگھی کر رہا ہے' آپ نے کنگھی پھینک دی' دوسری مرتبہ کسی شخص کو دیکھا کہ وہ نہر سے چلو بھر بھر کر پانی پیتا ہے' آپ نے پیالہ بھی پھینک دیا' آپ کے خیال میں ان کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی' چنانچہ گھریلو زندگی سے متعلق تمام ساز و سامان کا یہی حال ہے' ہر

چیز کسی نہ کسی مطلوب کے لئے مقصود ہوتی ہے، اگر کسی چیز سے کوئی مقصد وابستہ نہ ہو اور اس کے بغیر بھی ضرورت پوری ہو سکتی ہو تو وہ اس کے لئے دنیا اور آخرت دونوں جہانوں کے لئے باعث مصیبت ہے اور جس سامان کے بغیر چارہ کار نہیں ہے اس میں ادنیٰ درجے پر اکتفا کیا جاسکتا ہے، اور ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ مٹی کے برتن استعمال کئے جائیں، اور اس بات کی پروا نہ کی جائے کہ انکے کنارے ٹوٹے ہوئے ہیں، صرف یہ دیکھا جائے کہ وہ مقصد کے لئے کافی ہیں یا نہیں، اور اوسط درجہ یہ ہے کہ آدمی کے پاس ضرورت کے بقدر سامان ہو اور صحیح حالت میں ہو، لیکن ایک چیز سے بہت کام لئے جائیں، مثلاً اگر کسی کے پاس صحیح سالم پیالہ موجود ہو تو اس میں سالن ڈال کر بھی کھانا چاہیے پانی بھی پینا چاہیے، اور اپنی چھوٹی موٹی چیزیں بھی اس میں رکھ لینی چاہئیں، چنانچہ سلف صالحین آسانی اور سہولت کے لئے بہت سی چیزوں میں ایک آلے کا استعمال پسند کرتے تھے۔ اور اعلا درجہ یہ ہے کہ ہر کام کے لئے الگ آلہ ہو، لیکن یہ آلہ ادنیٰ جنس سے ہونا چاہیے اگر ایک مطلب کے لئے متعدد آلے ہوئے، یا عمدہ جنس سے ہوئے تو زہد کے تمام ابواب سے خارج ہو گا، اور فضولیات میں جتلا سمجھا جائے گا۔ اس سلسلے میں بھی سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے گرامی قدر اصحاب کے اسوۂ حسنہ پر نظر رکھنی چاہیے، اور اسی پر عمل کرنا چاہیے چنانچہ حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم جس بستر پر آرام فرماتے تھے وہ چمڑے کا بنا ہوا تھا، اور اس میں کھجور کی درخت کی چھال بھری ہوئی تھی (ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ) حضرت فضیل فرماتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا بستر دوہری عباء اور کھجور کی درخت کی چھال سے بھرے ہوئے گدے پر مشتمل تھا (شمائل ترمذی)۔ روایت ہے کہ حضرت عمر ابن الخطابؓ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ اس وقت کھجور کی چھال سے بنی ہوئی چارپائی پر سو رہے تھے، حضرت عمرؓ نے چھال کے نشانات آپ کے پہلوئے مبارک پر دیکھے، یہ دیکھ کر آپ رونے لگے، سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے دریافت کیا اے ابن الخطاب! تم کس لئے روتے ہو؟ انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! مجھے کسریٰ و قیصر کا خیال آگیا کہ ان کے پاس کتنے بڑے بڑے ملک ہیں، پھر آپ کا خیال آگیا کہ آپ اللہ کے مقدس پیغمبر اور محبوب دوست ہو کر کھجور کی چھال سے بنی ہوئی چارپائی پر سوتے ہیں، سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے دریافت کیا کہ اے عمر کیا تم اس بات سے خوش نہیں ہو کہ قیصر و کسریٰ کے لئے دنیا ہو، اور ہمارے لئے آخرت ہو، حضرت عمرؓ نے عرض کیا : کیوں نہیں یا رسول اللہ! آپ نے فرمایا پھر یہ بات ایسی ہی ہے (بخاری و مسلم) ایک شخص حضرت ابوذر غفاری کے گھر میں داخل ہوا، اور ادھر ادھر دیکھ کر کہنے لگا کہ ابوذر تمہارے گھر میں کوئی ساز و سامان نظر نہیں آتا، حضرت ابوذر نے جواب دیا کہ ہمارا ایک اور گھر ہے وہاں ہم نے اپنا اچھا سامان منتقل کر دیا ہے، اس شخص نے کہا کہ جب تک تم یہاں ہو گھر میں کچھ نہ کچھ ضرور ہونا چاہیے، انہوں نے فرمایا کہ صاحب خانہ ہمیں اس گھر میں نہیں رہنے دے گا، حمص کے امیر حضرت عمیر ابن سعید حضرت عمر کی خدمت میں حاضر ہوئے آپ نے ان سے دریافت کیا کہ دنیا کی چیزوں میں سے تمہارے پاس کیا کیا ہے، انہوں نے جواب دیا ایک لاٹھی جس سے میں سہارا لیتا ہوں، اور اگر راستے میں سانپ مل جائے تو اسے ہلاک کر دیتا ہوں، ایک تھیلا ہے جس میں اپنا کھانا رکھتا ہوں، ایک پیالہ ہے جس میں کھانا کھاتا ہوں، اپنا سر اور کپڑے دھوتا ہوں، ایک لوٹا ہے جس میں پینے کے لئے اور وضو کے لئے پانی رکھتا ہوں، ان کے علاوہ دنیا میں جتنی بھی چیزیں ہیں وہ انہی کے تابع ہیں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا تم سچ کہتے ہو۔

روایت ہے کہ ایک مرتبہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کسی سفر سے واپسی پر حضرت فاطمہؓ کے گھر تشریف لے گئے، آپ نے دیکھا کہ ان کے دروازے پر ایک پردہ پڑا ہے، اور ان کے ہاتھوں میں چاندی کے دو کڑے ہیں، آپ یہ دیکھ کر واپس تشریف لے گئے، کچھ دیر بعد حضرت ابو رافع حضرت فاطمہؓ کے گھر آئے تو دیکھا کہ وہ بیٹھی ہوئی رو رہی ہیں، ابو رافع کے پوچھنے پر انہوں نے بتلایا کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم واپس تشریف لے گئے، انہوں نے پوچھا کس لئے؟ حضرت فاطمہ نے جواب دیا کہ اس پردے اور ان دو کنگنوں کی وجہ سے، پھر حضرت فاطمہ نے وہ پردہ اور دونوں کنگن اتارے اور حضرت بلال کے ذریعے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیج دیئے اور عرض کیا کہ میں نے یہ دونوں چیزیں صدقہ کر دی ہیں آپ جہاں چاہیں خرچ فرمادیں آپ نے

ارشاد فرمایا کہ انہیں لے جاکر فروخت کردو' اور ان کی قیمت اہل صفہ کو دیدو' چنانچہ دونوں کنگن ڈھائی درہم کے فروخت ہو گئے' آپ نے انہیں صدقہ کردیا' اور حضرت فاطمہ کے پاس تشریف لے گئے اور ان سے فرمایا کہ یہ تو نے اچھا کیا ہے (۱)

ایک مرتبہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہؓ کے دروازے پر پردہ لٹکا ہوا دیکھا تو اسے پھاڑ ڈالا' اور فرمایا جب میں اسے دیکھتا ہوں تو مجھے دنیا یاد آتی ہے' یہ فلاں کی اولاد کو دیدو (ترمذی' نسائی) ایک شب حضرت عائشہؓ نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے نیا بستر بچھا دیا جب کہ آپ کا معمول دوہری عباء پر سونے کا تھا' آپ رات بھر اس بستر پر کروٹیں بدلتے رہے' صبح ہوئی تو آپ نے حضرت عائشہؓ سے ارشاد فرمایا ہمارا وہی پرانا بستر لاؤ' اور یہ بستر ہٹاؤ کہ اس نے مجھے رات بھر جگایا ہے (ابن حبان۔ عائشہؓ) ایک رات آپ کے پاس سات یا چھ دینار آئے' آپ نے رات میں یہ دینار یونہی رہنے دیئے' لیکن آپ کو نیند نہیں آئی' یہاں تک کہ آخر رات میں آپ نے انہیں مستحقین میں تقسیم کروادیا۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ دینار نکالنے کے بعد آپ سو گئے یہاں تک کہ میں نے آپ کے خراٹوں کی آواز سنی' پھر فرمایا میرا گمان اپنے رب کے ساتھ کیا ہوتا اگر میں (وفات پاکر) اپنے رب سے اس حال میں ملتا کہ یہ دینار میرے پاس ہوتے (احمد۔ عائشہؓ قریباً منہ) حضرت حسنؒ فرماتے ہیں کہ میں نے تقریباً ستر بزرگوں کو دیکھا ہے کہ ان کے پاس ایک کپڑے کے علاوہ دوسرا کپڑا نہ تھا' اور انہوں نے کبھی اپنے اور زمین کے درمیان کوئی کپڑا نہیں بچھایا' جب نیند آتی تو زمین پر لیٹ جاتے اور جسم پر کپڑا ڈال لیتے۔

پانچویں ضرورت۔ نکاح کچھ لوگوں کی رائے ہے کہ اصل نکاح اور کثرت نکاح میں زہد کے کوئی معنی نہیں ہیں' یہ رائے حضرت سہیل ابن عبداللہ کی ہے' وہ کہتے ہیں کہ سید الزاہدین سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو عورتیں محبوب تھیں' ہم ان میں زہد کیوں کریں' ابن عیینہ نے بھی ان کی اس رائے کی موافقت کی ہے' وہ کہتے ہیں کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی جو زاہدین صحابہ میں سرفہرست تھے چار بیویاں' اور اس سے زائد باندیاں تھیں۔ اس سلسلے میں ابو سلیمان دارانیؒ کا قول صحیح ہے' وہ کہتے ہیں کہ جو چیز تمہیں اللہ تعالیٰ سے روک دے خواہ وہ بیوی ہو' یا مال ہو یا اولاد ہو بری ہے۔ عورت بھی کبھی تمہیں اللہ سے غافل کردیتی ہے۔ حق بات یہ ہے کہ بعض حالات میں نکاح نہ کرنا افضل ہے' جیسا کہ ہم نے کتاب النکاح میں اس کی تفصیل بیان کی ہے' اس صورت میں نکاح نہ کرنا ہی زہد ہے۔ اور جہاں شہوت غالب ہو' اور نکاح کے بغیر اس کا تدارک نہ ہوسکے تو نکاح کرنا واجب ہے' اس صورت میں نکاح نہ کرنا زہد کیسے ہوگا' البتہ اگر نکاح نہ کرنے میں کوئی قباحت نہ ہو اور نہ نکاح کرنے پر کوئی مصیبت نازل ہو' محض اس لئے نکاح نہ کرے کہ خواہ مخواہ دل عورتوں کی طرف مائل ہوگا' اور ان سے مانوس ہوگا اور اللہ کے ذکر سے غافل ہوگا اس صورت میں نہ کرنا زہد ہے۔ اگر یہ یقین ہو کہ عورت اسے اللہ کے ذکر سے غافل نہیں کرے گی' لیکن وہ نظر' صحبت اور ہم بستری کی لذت سے بچنے کے لئے نکاح نہیں کرتا' ایسا کرنا قطعاً زہد نہیں ہے۔ اس لئے کہ اولاد چلانے' نسل' اور امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں تکثیر کے لئے نہ صرف مقصود ہے' بلکہ عبادت ہے' اور وہ لذت جو انسان کو ہم بستری میں ملتی ہے نقصان دہ نہیں ہے' بشرطیکہ وہی لذت مطلوب اور مقصود نہ ہو' یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص کھانا پینا چھوڑ دے کہ کھانے پینے سے لذت ملتی ہے' ظاہر ہے یہ زہد نہیں ہے' کیوں کہ اس میں بدن کا ضیاع ہے۔ جس طرح نکاح نہ کرنے میں نسل انسانی کا ضیاع ہے۔ اس لئے یہ جائز نہیں کہ محض صحبت کی لذت سے بچنے کے لئے نکاح نہ کیا جائے' ہاں اگر کسی اور آفت کا خوف ہو تو بات دوسری ہے' یقینی طور پر حضرت سہل کا مقصود بھی یہی ہوگا' اور اسی لئے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی نکاح کئے ہیں۔

چنانچہ اگر کوئی شخص ایسا ہے' جس کا حال سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے حال سے مشابہ ہو کہ عورتوں کی کثرت سے آپ

---

(۱) یہ روایت اس تفصیل کے ساتھ کہیں نہیں ملی' البتہ ابو داؤد اور ابن ماجہ نے سفینہ کی حدیث بیان کی ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت فاطمہؓ کے مکان پر تشریف لائے' آپ نے گھر کے ایک کونے میں ایک منقش کپڑا دیکھا اور واپس تشریف لے گئے' اسی طرح نسائی نے ثوبانؓ سے روایت کیا ہے کہ آپ نے حضرت فاطمہؓ کے ہاتھ میں سونے کی زنجیر دیکھ کر فرمایا کہ لوگ کہیں گے محمد کی بیٹی نے آگ پہن رکھی ہے' آپ یہ کہہ کر واپس تشریف لے گئے' حضرت فاطمہؓ نے زنجیر فروخت کر کے اس کی قیمت سے ایک غلام آزاد کیا۔

کا قلب ذکر اللہ سے غافل نہیں ہوتا تھا' اور ان کی اصلاح اور ان کے نان نفقہ کے مسائل آپ کے لئے اس حد تک پریشان کن نہیں تھے کہ آپ اپنے فرائض سے چشم پوشی کرنے لگیں' اگر کوئی شخص ایسا ہے تو اس کے لئے نکاح میں زہد کرنے کے کوئی معنی نہیں ہیں' اس خیال سے کہ عورتوں کو دیکھنے اور ان سے ہم بستر ہونے میں لذت ہے' البتہ انبیاء اور اولیاء کے علاوہ یہ حالت کسے نصیب ہو سکتی ہے' اکثر لوگوں کا حال یہ ہے کہ عورتوں کی کثرت انہیں مشغول کر دیتی ہے اگر محض عورت کا وجود اسے اللہ سے غافل کر دے تو اسے نکاح کرنا ہی نہیں چاہیے اور اگر عورتوں کی کثرت یا ان کی خوبصورت سے غفلت کا اندیشہ ہو تو کسی ایک عورت سے نکاح کرنا چاہیے بشرطیکہ وہ حسین نہ ہو' اس سلسلے میں اپنے دل کا جائزہ لینا چاہیے اور اس کے فیصلے پر عمل کرنا چاہیے' اس لئے کہ یہ خالصتاً اس کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان معاملہ ہے' ابو سلیمان دارانی کہتے ہیں کہ عورتوں میں زہد یہ ہے کہ حقیر اور یتیم اور معمولی شکل و صورت رکھنے والی عورت سے شادی کرے اور اسے شریف اور خوبصورت عورت پر ترجیح دے۔ حضرت جنید بغدادیؒ ارشاد فرماتے ہیں کہ مبتدی مرید کے لئے یہ پسند کرتا ہوں کہ وہ اپنا دل تین چیزوں میں نہ لگائے ورنہ اس کا حال بدل جائے گا' ایک پیشے میں' دوسرے طلب حدیث میں' تیسرے نکاح میں۔ یہ بھی فرماتے ہیں کہ میں صوفی کے لئے یہ بات پسند کرتا ہوں کہ نہ وہ لکھے اور نہ پڑھے' کیوں کہ اس نے ہمت مجتمع رہتی ہے۔ اس تفصیل سے ثابت ہوا کہ نکاح کی لذت غذا کی لذت جیسی ہے۔ اسی لئے جس طرح اس میں بقدر ضرورت کی اجازت ہے اسی طرح اس میں بھی ہے' اور جس طرح وہ لذت غذا جو اللہ تعالیٰ سے روکنے والی ہو ممنوع ہے اسی طرح وہ لذت نکاح بھی ممنوع ہے جو اللہ سے دور کرنے والی ہو۔

چھٹی ضرورت۔ مال اور جاہ : یہ دونوں چیزیں سابقہ پانچوں ضرورتوں کے لئے وسیلے کی حیثیت رکھتی ہیں' جاہ کے معنی ہیں دلوں کا مالک ہونا' یعنی لوگوں کے دلوں میں اپنے لئے جگہ بنانا تاکہ وہ اس کے اعمال و اغراض میں معاون ہو سکیں' جو شخص اپنی تمام ضرورتیں خود پوری کرنے پر قادر نہیں ہوتا اسے لامحالہ خادم کی ضرورت پڑتی ہے' اور اسے خدمت پر مائل کرنے کے لئے اس کے دل میں جگہ بنانے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اگر خادم کے دل میں مخدوم کے لئے قدر و منزلت نہیں ہوگی تو وہ اس کی خدمت نہ کر سکے گا' خادم کے دل میں قدر و منزلت کا ہونا ہی جاہ ہے' جاہ کی ابتدا ایسی نہیں کہ مہلک ہو سکے' لیکن اس کا انجام ایسے گڑھے پر ہوتا ہے جس میں گر کر بچ نکلنے کی صورت نہیں ہے اور جو کنوئیں کے گرد منڈلاتا ہے اگر اس میں گر جائے تو یہ کوئی تعجب خیز بات نہیں ہے۔

جاہ یعنی دلوں میں جگہ بنانے کی ضرورت یا تو جلب منفعت کے لئے پیش آتی ہے' یا دفع مضرت کے لئے' یا کسی کے ظلم سے نجات پانے کے لئے۔ جہاں تک نفع اٹھانے کا معاملہ ہے اگر کسی شخص کے پاس مال ہے تو اس مقصد کے لئے اسے جاہ کی ضرورت نہیں ہے' کیوں کہ وہ اپنی تمام ضرورتوں کی تکمیل کے لئے خدام اجرت اور معاوضے پر حاصل کر سکتا ہے' خواہ ان کے دلوں میں اسکی منزلت ہو یا نہ ہو وہ معاوضہ حاصل کرنے کے لئے اس کی خدمت ضرور کریں گے' ان لوگوں کے دلوں میں جاہ کی حاجت ہے جو بغیر اجرت کے خدمت کرتے ہیں' اب دفع مضرت کا مسئلہ ہے یعنی جاہ کا اس لئے محتاج ہونا کہ متوقع نقصانات سے اپنی حفاظت کر سکے دفع مضرت کی ضرورت اس ملک میں پڑتی ہے جہاں عدل و انصاف کے تقاضوں پر عمل نہ کیا جاتا ہو' یا ایسے پڑوسیوں کے درمیان گھرا ہوا ہو جو اس پر ظلم کرتے ہوں' اور جن کے ظلم سے بچنا اس کے لئے دشوار ہو' خاص طور پر جب کہ ضرورت میں انجام کا خوف اور سوءِ ظن کی آمیزش بھی ہو۔ جاہ کی طلب میں مشغول ہونے والا شخص ہلاکت کے راستے کا مسافر ہے' زاہد کا حق یہ ہے کہ وہ کسی کے دل میں بھی جگہ بنانے کے لئے جدوجہد نہ کرے' عبادت اور دین میں اس کی مسلسل مشغولیت خود لوگوں کو اس کی طرف متوجہ کرے گی' اور ان کے دلوں میں اس کی عزت اور منزلت پیدا کرے گی اور وہ لوگوں کی اذیت اور ان کے ظلم و ستم سے محفوظ رہے گا' مسلمانوں کی تو خیر بات ہی اور ہے غیر مسلموں کے دلوں میں بھی اس کے لئے محبت اور احترام کے جذبات ہوں گے' جہاں تک ان توہمات اور خیالات کا تعلق ہے جو طلب جاہ میں زیادتی پر اکساتے ہیں وہ محض مفروضہ خیالات اور بدگمانیاں ہیں' یوں

بھی کوئی شخص ایسا نہیں ہے جو عزت اور جاہ رکھنے کے باوجود لوگوں کی ایذا رسانی سے پوری طرح محفوظ ہو' ظاہر ہے اس صورت میں تحمل اور صبر کے بغیر چارۂ کار نہیں ہے' بلکہ اذیت پر صبر کرنا جاہ کے ذریعے اسے دور کرنے سے بہتر ہے۔ اس لئے کہ دلوں میں جگہ بنانے کی اجازت نہیں ہے اور جاہ کی تھوڑی مقدار زیادہ کی متقاضی ہوتی ہے' بلکہ اس کا نشہ شراب کے نشے سے زیادہ بہتر ہے' اور اس کی عادت شراب نوشی کی عادت سے زیادہ سخت تر ہے' اس لئے اس کی قلت اور کثرت دونوں سے اجتناب کرنا چاہیے۔

اب مال کا معاملہ لیجئے' معیشت کے لئے اس کا وجود ناگزیر ہے' مگر اس کے لئے اتنا مال کافی ہے جو متعلقہ ضرورتوں کی (جن کی تفصیل گذر چکی ہے) تکمیل کرسکے۔ چنانچہ اگر کوئی شخص پیشہ ور ہے اور اس نے ایک روز کی ضرورت کے بقدر مال حاصل کرلیا ہے تو اب اسے اگلے روز کے لئے کمانے کی ضرورت نہیں ہے' بعض اکابر اگر دو حبے کما لیتے تو کام چھوڑ کر کھڑے ہو جاتے ہیں' یہ زہد کی شرط ہے' اگر کوئی شخص اس قدر مال کماتا ہے جو ایک سال کی ضرورت سے بھی زائد ہو تو وہ ضعیف زاہدوں میں بھی شمار نہیں کیا جاسکتا چہ جائیکہ اسے اعلا زاہدین میں شمار کیا جائے' اگر اس کے پاس زمین جائیداد ہو' اور وہ توکل پر کامل یقین نہ رکھتا ہو اور اس زمین کی پیداوار میں سے اتنا غلہ وغیرہ بچا کر رکھ لے جو ایک سال کے لئے کافی ہو جائے تو یہ زہد کے خلاف نہیں ہے' بشرطیکہ سال بھر کی ضرورت پوری کرنے کے بعد جو غلہ وغیرہ بچ جائے اس صدقہ کردے' لیکن اس کا شمار ضعیف زاہدین میں ہوگا' بلکہ اگر حضرت اویس القرنیؓ کے قول پر عمل کیا جائے اور زہد کے لئے توکل کو شرط قرار دیا جائے تو اسے زاہد نہیں کہا جاسکتا۔ لیکن اس کے زاہد نہ ہونے کے معنیٰ یہ ہیں کہ زاہدین کے لئے آخرت میں جن اعلا مقامات کا وعدہ کیا گیا ہے وہ اسے حاصل نہیں ہوں گے' ورنہ وہ ان فضولیات کی نسبت سے زائد کہلانے کا مستحق ہے جنہیں اس نے چھوڑا ہے۔ زہد کے باب میں منفرد کا معاملہ صاحب عیال کے مقابلے میں زیادہ سہل ہے' اس لئے کہ تنہا شخص نہایت آسانی سے زہد کے تقاضے پورا کرسکتا ہے' جب کہ عیالدار پر دوسرے نفوس کی ذمہ داریوں میں ضروری نہیں ہے کہ وہ بھی اسی کی طرح زہد پر مائل ہوں۔ ابو سلیمان دارانیؒ کہتے ہیں کہ کسی شخص کے لئے یہ مناسب نہ ہوگا کہ وہ اپنے بیوی بچوں کو زہد پر مجبور کرے' البتہ وہ انہیں زہد کی ترغیب دے سکتا ہے' اگر وہ اس کی بات مان لیں تو ٹھیک ہے ورنہ انہیں ان کے حال پر چھوڑ دے' اور خود جو چاہے کرے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ زہد میں یہ تنگی خود زاہد کی ذات کے ساتھ مخصوص ہے' اپنے عیال کے لئے تنگی کرنا اس کے لئے ضروری نہیں ہے' تاہم ان کا ایسا مطالبہ تسلیم کرنا بھی مناسب نہیں ہے جو اعتدال کی حدود سے متجاوز ہو' چنانچہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوہ سے سبق حاصل کرنا چاہیے کہ آپ پردہ' اور کنگن دیکھ کر حضرت فاطمہؓ کے مکان سے واپس تشریف لے گئے' اس لئے کہ یہ دونوں چیزیں زینت میں داخل ہیں' ضرورت میں داخل نہیں ہیں۔

اس تفصیل کا حاصل یہ ہے کہ آدمی مال اور جاہ کی جس مقدار کے لئے مضطر ہے وہ ممنوع نہیں ہے بلکہ ضرورت سے زائد مال اور جاہ دونوں مہلک زہر ہیں' ان دونوں چیزوں کا نفع اسی صورت میں ہے یا ان دونوں کو دوائے نافع اسی وقت کہا جاسکتا ہے جب کہ وہ ضرورت کی حدود سے متجاوز نہ ہوں' البتہ وہ مال اور جاہ جو زیادتی سے قریب وہ زہر قاتل تو نہیں ہے لیکن نقصان دہ ضرور ہے' اگرچہ اس کا ضرر کم ہے۔ زہر پینا حرام ہے اور دوا پینا فرض ہے' اور ان دونوں کے درمیان جو درجات ہیں وہ مشتبہ ہیں' اب اگر کوئی شخص احتیاط کرنا چاہے تو اس احتیاط کا نفع خود اسے ہوگا' اور جو سستی کرے وہ خود اس کا خمیازہ بھگتے گا جو شخص اپنے دین کو خالص رکھتا ہے اور مشتبہات سے پہلو تہی کرکے نفسیات پر عمل کرتا ہے اور اپنے نفس کو ضرورتوں کے تنگنائے میں محصور رکھتا ہے وہ حزم و احتیاط کی روش پر ہے اور بالیقین نجات پانے والے فرقے میں سے ہے۔

جو شخص اہم ترین ضرورتوں پر قدر ضرورت کے مطابق اکتفا کرتا ہے دنیا کی طرف اس کی نسبت کرنا صحیح نہیں ہے' بلکہ یہ تو عین دین ہے' کیوں کہ دین کے لئے شرط ہے' اور شرط مشروط میں داخل ہوتی ہے' اور اس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ کو ایک مرتبہ ضرورت پیش آئی تو آپ اپنے کسی دوست کے پاس قرض لینے کے لئے تشریف لے گئے' لیکن اس نے قرض نہیں دیا' غم زدہ' پریشان اور متفکر واپس تشریف لائے' اللہ تعالیٰ نے وحی نازل فرمائی کہ اگر آپ خلیل (اللہ تعالیٰ) سے مانگتے تو وہ ضرور

آپ کو دیتا' آپ نے عرض کیا یا اللہ! تو دنیا کو پسند نہیں کرتا اس لئے دنیا کی چیز طلب کرتے ہوئے مجھے خوف محسوس ہوا' اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ مقدار ضرورت دینا نہیں ہے' اس سے ثابت ہوا کہ ضرورت کے مطابق مال دین ہے' البتہ مقدار ضرورت سے زائد مال آخرت میں وبال کا باعث ہوگا' بلکہ ایسا مال تو دنیا میں بھی باعث مصیبت بن جاتا ہے' جو لوگ اغنیاء کے احوال سے اچھی طرح واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ انہیں مال کمانے کے لئے کتنی مشقت برداشت کرنی پڑتی ہے' پھر مال کی حفاظت بھی مسئلہ ہے۔ غرضیکہ اس راہ میں بڑی ذلتیں' رسوائیاں اور آفتیں ہیں' اور انجام یہ ہوتا ہے کہ تمام جمع شدہ سرمایہ ورثاء کے ہاتھ لگتا ہے' وہ کھاتے ہیں' اور موج اڑاتے ہیں' بلکہ بعض اوقات مال حاصل کرنے کے لئے اس کی موت کے درپے ہوتے ہیں' بہت سے ورثاء اس کے مال کا غلط استعمال کرتے ہیں' اور اسے معاصی میں خرچ کرتے ہیں' اس طرح گویا وہ معاصی پر ان کا معین ومددگار بن جاتا ہے۔ اسی لئے دنیا جمع کرنے والے اور شہوات کی اتباع کرنے والے شخص کو ریشم کے کیڑے سے تشبیہ دی گئی ہے کہ وہ اپنے اردگرد ریشم بنتا جاتا ہے اور جب اس میں سے نکلنا چاہتا ہے تو نکل نہیں پاتا' اور اسی ریشمی جال میں پھنس کر ہلاک ہو جاتا ہے' گویا وہ خود اپنی ہلاکت کا سامان کرتا ہے۔ یہی حال ان لوگوں کا ہے جو شہوات کی اتباع کرتے ہیں' یہ لوگ اپنے قلب کی خواہشات کی زنجیروں میں جکڑے ہیں' مال' جاہ' بیوی' بچے' دشمنوں سے دشمنی' دوستوں سے ریاکاری اور تمام دنیاوی حظوظ زنجیریں ہیں' انسان لمحہ بہ لمحہ ان زنجیروں میں گرفتار ہوتا جاتا ہے' اب اگر کسی وقت خطرات کا احساس ہوا' اور اس نے قید سے آزاد ہونا چاہا تو آزاد نہ ہو پائے گا' اس کا دل خواہشات کی زنجیروں میں اتنا جکڑا جا چکا ہو گا کہ وہ کوشش کے باوجود انہیں کاٹ نہیں پائے گا' اگر اس نے خود اپنے اختیار و ارادے سے کوئی محبوب چیز ترک کی تو خود اپنے ہاتھوں ہلاک ہو گا کیوں کہ وہ اپنے محبوب کی جدائی برداشت نہ کرپائے گا' اور اس کے فراق میں گھل گھل کر مرجائے گا' یا اس کی یاد میں ماہی بے آب کی طرح تڑپے گا' یہاں تک کہ ملک الموت اسے تمام محبوب چیزوں سے جدا کردے۔ اس وقت حالت یہ ہو گی کہ دل دنیا کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہو گا' فطری طور پر وہ اسے اپنی طرف کھینچے گی' اور موت کے زبردست ہاتھ اسے آخرت کی طرف کھینچیں گے۔ موت کے وقت اس کی کم سے کم حالت اس شخص کے مشابہ ہوتی ہے جسے آرے سے چیرا جاتا ہے پہلے تکلیف اس کے جسم کو ہوتی ہے' پھر جسم سے دل میں سرایت کرتی ہے' تمہارا اس شخص کے بارے میں کیا خیال ہے جسکے دل پر درد و غم براہ راست اثر انداز ہوتا ہو' جسم کے واسطے سے سرایت نہ کرتا ہو۔ پہلا عذاب جو دنیا دار شخص کو ہو گا' اعلا علیین اور جوار رب العلمین میں جگہ نہ ملنے کی حسرت اس کے بعد عذاب ہے۔

دنیا میں رغبت رکھنے کی وجہ سے بندہ اللہ تعالیٰ کی ملاقات اور اس کے دیدار سے محجوب ہوتا ہے' اور جب وہ لقاء خداوندی سے محجوب ہوتا ہے تو اس پر دوزخ کی آگ مسلط کردی جاتی ہے' اس لئے کہ دوزخ صرف محجوبین پر مسلط ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :-

كَلَّآ إِنَّهُمْ عَن رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوبُونَ ثُمَّ إِنَّهُمْ لَصَالُوا الْجَحِيمِ (پ ۳۰ ر ۸ آیت ۱۵-۱۶)

ہرگز (ایسا) نہیں یہ لوگ اس روز اپنے رب کے دیدار سے روک دیئے جائیں گے پھر یہ دوزخ میں داخل ہوں گے۔

یہاں حجاب کا عذاب ہی کیا کم تھا کہ اس پر دوزخ کا عذاب مستزاد ہے۔ جس شخص پر یہ دونوں عذاب ایک ساتھ نازل ہوں گے اس کا کیا حال ہو گا' ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ ہمارے دلوں میں وہی بات راسخ کردے جو تو نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمائی تھی :-

أَحْبِبْ مَنْ أَحْبَبْتَ فَإِنَّكَ مُفَارِقُهُ جس سے چاہے محبت کرلو تم اس سے جدا ضرور ہو گے۔

اوپر ریشم کے کیڑے کی مثال بیان کی گئی ہے' ایک شاعر نے بھی اچھے انداز میں یہ مفہوم ادا کیا ہے :-

كَدُودِ كُدُودِ الْقَزِّ يَنْسِجُ دَائِمًا وَيَهْلِكُ غَمًّا وَسْطَ مَا هُوَ نَاسِجُهُ

(دنیا دار آدمی ریشم کے کیڑے کی طرح ہے جو ہمیشہ بنتا رہتا ہے' اور اپنے بنے ہوئے ریشم میں پھنس کر

ہلاک ہو جاتا ہے)۔

اولیاء اللہ پر یہ بات منکشف ہو گئی تھی کہ بندہ اپنے اعمال کے باعث' اور خواہش نفس کی اتباع کی وجہ سے خود اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالتا ہے' اور اس سلسلے میں اسکی مثال ریشم کے کیڑے کی طرح ہے' اسی لئے انہوں نے دنیا کو بالکلیہ طور پر ترک کر دیا تھا۔ حضرت حسن بصری فرماتے ہیں کہ میں نے ستر اصحاب بدر ایسے دیکھے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی حلال کردہ چیزوں میں اس قدر زہد کرتے تھے کہ تم اس کی حرام کی ہوئی چیزوں میں بھی اتنا زہد نہیں کرتے' ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ وہ مصائب پر اس قدر خوش ہوتے تھے کہ تم خوشحالی اور فارغ البالی پر اتنے خوش نہیں ہوتے' اگر تم انہیں دیکھتے تو مجنوں اور پاگل قرار دیتے' اور اگر وہ تمہارے اچھوں کو دیکھ لیں تو یہ کہیں کہ انہیں دین سے ذرا بھی واسطہ نہیں ہے' اور بروں کو دیکھ لیں تو کہیں کہ انہیں قیامت کے دن امن نصیب نہ ہو گا' وہ لوگ ایسے تھے کہ اگر کوئی انہیں حلال مال بھی دیتا تو لینے سے انکار کر دیتے' اور کہتے کہ ہم اپنے قلب کے فساد سے ڈرتے ہیں۔ اور یہ حقیقت بھی ہے جو لوگ دل رکھتے ہیں وہ ان کے بگڑنے سے خائف رہتے ہیں' اور جن کے دل دنیا کی محبت نے فنا کر ڈالے ہوں ان کا حال تو قرآن کریم کے الفاظ میں یہ ہے :۔

وَرَضُوا بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَاطْمَأَنُّوا بِهَا وَالَّذِينَ هُمْ عَنْ آيَاتِنَا غَافِلُونَ۔ (پ ۱۱ ر ۲ آیت ۷)

اور وہ دنیوی زندگی پر راضی ہو گئے ہیں اور اس میں جی لگا کر بیٹھے ہیں اور جو لوگ ہماری آیتوں سے بالکل غافل ہیں۔

ایک جگہ ارشاد فرمایا :۔

وَلَا تُطِعْ مَنْ أَغْفَلْنَا قَلْبَهُ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوَاهُ وَكَانَ أَمْرُهُ فُرُطًا۔ (پ ۱۵ ر ۱۲ آیت ۲۸)

اور ایسے شخص کا کہنا نہ مانئے جس کے قلب کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر رکھا ہے۔

ایک جگہ فرمایا گیا :۔

فَأَعْرِضْ عَنْ مَنْ تَوَلَّىٰ عَنْ ذِكْرِنَا وَلَمْ يُرِدْ إِلَّا الْحَيَاةَ الدُّنْيَا ذَٰلِكَ مَبْلَغُهُمْ مِنَ الْعِلْمِ
(پ ۲۷ ر ۲ آیت ۲۹-۳۰)

تو آپ ایسے شخص سے اپنا خیال ہٹا لیجئے۔ جو ہماری نصیحت کا خیال نہ کرے اور بجز دنیوی زندگی کے اس کو کوئی (اخروی طلب) مقصود نہ ہو' ان لوگوں کی فہم کی رسائی کی حد بس یہی ہے۔

ان تمام آیتوں میں دنیا کی طرف ان کی توجہ اور میلان کو ان کی غفلت اور جہالت پر محمول کیا گیا ہے۔ روایت یہ ہے کہ ایک شخص نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا کہ آپ مجھے اپنی ہمراہی کا موقع عنایت فرمائیں' حضرت عیسیٰ نے فرمایا اپنا تمام مال خیرات کر دو' اور میرے ساتھ آ جاؤ' اس نے عرض کیا ایسا کرنا میرے لئے مشکل ہے' فرمایا : مجھے غنی کے جنت میں جانے پر حیرت ہے' ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ مالدار آدمی سختی کے ساتھ جنت میں داخل ہو گا' ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ ہر روز طلوع آفتاب کے وقت چار فرشتے آواز بلند کرتے ہیں' ان میں سے دو مشرق کی جہت میں ہوتے ہیں' اور دو مغرب کی طرف۔ مشرق کے فرشتوں میں سے ایک کہتا ہے اے طالب خیر آگے بڑھ' اور اے طالب شر پیچھے ہٹ' دوسرا کہتا ہے اے اللہ! دینے والے کو بہترین عوض عطا فرما' اور مغرب کے فرشتوں میں سے ایک کہتا ہے موت کے واسطے پیدا ہو' اور اجڑنے کے لئے تعمیر کرو' اور دوسرا کہتا ہے طویل حساب کے لئے کھاؤ پیو اور دنیا کی لذات سے فائدہ اٹھاؤ۔

زہد کی علامات

بعض اوقات یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ مال کا تارک زاہد ہے' حالانکہ یہ کوئی قاعدہ کلیہ نہیں ہے' اس لئے کہ جو شخص زہد پر تعریف کا خواہاں ہوتا ہے اس کے لئے مال کا ترک کرنا اور تنگ زندگی گذارنا سہل ہو جاتا ہے' بہت سے راہب ایسے نظر آئیں گے

جنہوں نے اپنے آپ کو انتہائی معمولی غذا کا عادی بنا لیا ہے' اور خود کو ایسے عبادت خانوں میں مقید کر لیا ہے جہاں سے باہر آنے کا کوئی راستہ نہیں ہے' لیکن وہ اس مسرت کے سہارے زندہ ہیں جو انہیں اس وقت میسر آتی ہے جب لوگ ان کے نزل و ریافت کرتے ہیں' عقیدت و محبت کے ساتھ ان کی زیارت کرتے ہیں' اور ان پر تعریف و توصیف کے پھول برساتے ہیں' مال ترک کر کے یکسو ہو جانا زہد کی قطعی دلیل نہیں ہے' بلکہ زہد مال اور جاہ دونوں میں ہونا چاہیے' تاکہ تمام دنیاوی حظوظ سے لاتعلق ہونا ثابت ہو سکے' ورنہ ایسے ایسے لوگ زہد کا دعویٰ کرتے دیکھے گئے ہیں جو عمدہ قسم کے اونی لباس اور قیمتی پوشاکیں زیب تن کرتے ہیں' جیسا کہ خواص نے ان لوگوں کی حقیقت بیان فرمائی ہے' فرماتے ہیں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو زہد کا دعویٰ کرتے ہیں' اور بہترین لباس پہنتے ہیں' اس طرح وہ لوگوں کو دھوکا دیتے ہیں اور انہیں خاموش طریقے پر یہ ہدایت کرنا چاہتے ہیں کہ اگر انہیں ہدایا دیے جائیں تو اسی نوعیت کے ہوں' انہیں فقیر تصور نہ کیا جائے' اور نہ ان کے ساتھ یتیموں اور مسکینوں جیسا سلوک کیا جائے' بلکہ انہیں فقر کی اقلیم کا بے تاج بادشاہ سمجھا جائے' اور ان کے ساتھ احترام کا وہی معاملہ کیا جائے جو بادشاہوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ یہ لوگ اپنے آپ کو علم کا متبع کہتے ہیں اور یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ سنت پر عمل پیرا ہیں' دنیا ہمارے پاس دست بستہ حاضر رہتی ہے ہم اس سے کوئی تعلق نہیں رکھتے اور نہ اس کے پیچھے دوڑتے ہیں۔ یہ سب دین کے بدلے دنیا کمانے والے ہیں' نہ انہیں اپنے باطنی اوصاف کی تطہیر کا خیال ہے' اور نہ ظاہری اخلاق کی تہذیب کا' یہ لوگ دنیا کی طرف مائل اور ہوائے نفس کے متبع ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ زہد کی معرفت ایک مشکل مرحلہ ہے' بلکہ خود زاہد بھی اپنی حالت زہد پر صحیح طریقے سے مطلع نہیں ہو پاتا۔ اس لئے ہم ذیل میں زہد کی علامات بیان کرتے ہیں' زاہد کو اپنے زہد کی معرفت کے لئے ان علامات پر اعتماد کرنا چاہیے' یہ کل تین علامتیں ہیں۔

پہلی علامت یہ ہے کہ موجود پر خوش نہ ہو' اور مفقود سے غمگین نہ ہو' جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا :۔

لِكَيْلَا تَأْسَوْا عَلَىٰ مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوا بِمَا آتَاكُمْ (پ ۲۷ ر ۱۹ آیت ۲۳)

تاکہ جو چیز تم سے جاتی رہے تم اس پر رنج نہ کرو اور تاکہ جو چیز تم کو عطا فرمائی ہے اس پر اتراؤ نہیں۔

بلکہ معاملہ اس کے برعکس ہونا چاہیے کہ مال کے وجود سے غمگین ہو' اور اس کے فقدان سے خوش ہو' دوسری علامت یہ ہے کہ اس کے نزدیک مذمت کرنے والا اور مدح کرنے والا دونوں برابر ہوں' ان دونوں میں سے پہلی علامت زہد فی المال کی ہے اور دوسری علامت زہد فی الجاہ کی ہے' تیسری علامت یہ ہے کہ اسے اللہ تعالیٰ سے انسیت ہو' اس کے دل پر اطاعت کی حلاوت غالب ہو' دل محبت کی حلاوت سے خالی نہیں رہتا' یا تو اس میں دنیا کی محبت رہتی ہے یا اللہ کی محبت۔ ان دونوں کی مثال دل کے لئے ایسی ہے جیسے پیالے کے لئے پانی اور ہوا کہ اگر پیالے میں پانی بھر جائے تو ہوا باقی نہیں رہ سکتی' یہ ممکن نہیں ہے کہ ہوا اور پانی دونوں کا اجتماع ہو جائے۔ چنانچہ جو شخص اللہ تعالیٰ سے مانوس ہوتا ہے وہ اسی کے ساتھ مشغول رہتا ہے' غیر کے ساتھ مشغول نہیں ہوتا۔ کسی بزرگ سے دریافت کیا گیا کہ زہد نے زاہدوں کو کس حال پر پہنچا دیا۔ انہوں نے جواب دیا اللہ کے ساتھ انس تک۔ بہرحال انس باللہ اور انس بالدنیا دونوں ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتے' اہل معرفت کہتے ہیں کہ جب ایمان ظاہر قلب سے متعلق ہوتا ہے تو آدمی دنیا اور آخرت دونوں سے محبت کرتا ہے' اور دونوں کے لئے عمل کرتا ہے' اور جب دل کے سیاہ نقطے میں مرتکز ہو جاتا ہے تو وہ خود بخود دنیا سے متنفر ہو جاتا ہے' اس کے حسن و جمال کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ اور نہ اس کے لئے عمل کرتا ہے۔ چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام یہ دعا کیا کرتے تھے کہ اے اللہ مجھے ایسا ایمان عطا فرما جو میرے قلب کے ساتھ رہے۔ حضرت ابو سلیمان دارانی کہتے ہیں جو شخص اپنے نفس میں مشغول رہتا ہے اسے لوگوں کی خبر نہیں رہتی' یہ عمل کرنے والوں کا مقام ہے' اور جو اپنے رب میں مشغول ہوتا ہے وہ اپنے نفس کی خبر نہیں رکھتا' یہ عارفین کا مقام ہے۔ زاہد کے لئے ضروری ہے کہ وہ ان دونوں مقاموں میں سے ایک میں رہے۔

پہلا مقام یہ ہے کہ اپنے نفس میں مشغول رہے' اس صورت میں اس کے نزدیک مدح و ذم' اور مال کا عدم و وجود دونوں برابر

ہوتے ہیں' لیکن اگر اس کے پاس تھوڑا مال موجود ہے تو یہ اس کے عدم زہد کی دلیل نہیں ہوگی۔ ابن ابی الحواری کہتے ہیں کہ میں نے ابو سلیمان دارانی سے پوچھا کہ کیا داؤد طائی زاہد تھے' انہوں نے جواب دیا ہاں! میں نے کہا مجھے یہ بتلایا گیا ہے کہ انہیں ان کے باپ کی وراثت میں بیس دینار ملے تھے' انہوں نے یہ دینار بیس برس کے بعد خرچ کئے' وہ کیسے زاہد تھے کہ دینار رکھتے تھے' ابو سلیمان نے کہا کہ تمہارا مطلب یہ ہے کہ وہ زہد کی حقیقت تک پہنچے' حقیقت زہد سے انہوں نے زہد کی انتہا مرادلی ہے' اور زہد کی کوئی انتہا نہیں ہے' کیوں کہ نفس کے بے شمار اوصاف ہیں' اور زہد اسی وقت مکمل ہوتا ہے جب ان تمام اوصاف میں زہد کیا جائے۔

درحقیقت جو شخص دنیا کی کوئی چیز اس پر قدرت رکھنے کے باوجود محض اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے دل اور دین پر خوف کے باعث چھوڑ دیتا ہے اسے زہد میں اتنا ہی دخل ہے۔ جتنا اس نے چھوڑا ہے' اور آخری درجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا ہر چیز چھوڑ دے' یہاں تک کہ سر کے نیچے رکھا ہوا پتھر بھی اٹھا کر پھینک دے جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کیا تھا' ہم اللہ تعالیٰ سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ ہمیں زہد کے ابتدائی درجات ہی نصیب فرما دے ہم جیسے گنہگار اور حرص و ہوس کے بندے انتہائی درجات کی طمع کیسے کر سکتے ہیں' اگرچہ ناامید ہونا بھی صحیح نہیں ہے' اگر اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے عجائب پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہو گا کہ اللہ کے لئے بڑی سے بڑی چیز بھی معمولی ہے اور حقیر ہے' اگر ہم اس کے فضل و احسان اور جود و کرم پر اعتماد کرتے ہوئے اس سے کسی بڑی چیز کا سوال کر بیٹھیں تو یہ کوئی تعجب خیز بات نہ ہوگی۔

اس تفصیل سے یہ بات ثابت ہوئی کہ زہد کی علامت یہ ہے کہ زاہد کے نزدیک فقر و غنا' عزت و ذلت اور مدح و ذم برابر ہوں' اور ایسا اس وقت ہوتا ہے جب دل پر اللہ تعالیٰ کی انسیت غالب ہو جاتی ہے۔ ان علامات سے دوسری علامات بھی متفرع ہوتی ہیں' مثلاً" یہ کہ دنیا ترک کر دے اور یہ پروا نہ کرے کہ کس نے لی ہے' بعض لوگ کہتے ہیں کہ زہد یہ ہے کہ دنیا جیسی بھی ہے چھوڑ دے' یہ نہ کہے کہ میں سرائے تعمیر کروں گا' یا مسجد بناؤں گا۔ یحییٰ ابن معاذؒ کہتے ہیں کہ زہد کی علامت موجود مال میں سخاوت کرنا ہے۔ ابن خفیف کہتے ہیں کہ زہد کی علامت یہ ہے کہ دنیا ہاتھ سے نکل جائے تو راحت کا احساس ہو' ان کا ایک قول یہ بھی ہے کہ دنیا سے بلا تکلف کنارہ کش ہونے کا نام زہد ہے' ابو سلیمان دارانی فرماتے ہیں کہ اون زہد کی علامتوں میں سے ایک علامت ہے' لیکن یہ مناسب نہیں کہ تین درہم کی کملی پہنے اور دل میں پانچ درہم کی کملی کی رغبت ہو' حضرت امام احمد ابن حنبلؒ اور حضرت سفیان ثوریؒ فرماتے ہیں کہ زہد کی علامت آرزو کو مختصر کرنا ہے۔ سری کہتے ہیں کہ زاہد کی زندگی اچھی نہیں گذرتی جب کہ وہ اپنے نفس سے غافل ہو' اور عارف کو سکون نہیں ملتا جب کہ وہ اپنے نفس میں مشغول ہو' نصر آبادی کہتے ہیں کہ زاہد دنیا میں مسافر ہے اور عارف آخرت میں مسافر ہے' یحییٰ ابن معاذؒ فرماتے ہیں کہ زہد کی تین علامتیں ہیں' علاقے کے بغیر عمل' طمع کے بغیر قول اور ریاست کے بغیر عزت۔ یہ بھی فرماتے ہیں کہ زاہد تمہیں سرکہ اور رائی سنگھاتا ہے اور عارف مشک و عنبر۔ ایک شخص نے ان سے دریافت کیا کہ میں توکل کی دوکان میں داخل ہو کر زہد کی چادر کب اوڑھوں گا' اور زاہدین کے ساتھ کب بیٹھوں گا' انہوں نے جواب دیا جب تم اپنے باطن کی ریاضت میں اس حد تک پہنچ جاؤ گے کہ اگر اللہ تعالیٰ تمہیں تین دن تک رزق عطا نہ کرے' تو تمہارا یقین کمزور نہ ہو' اگر تم اس درجے تک نہیں پہنچ پاتے تو زاہدین کی مسند پر بیٹھنا تمہیں زیب نہیں دے گا' بلکہ مجھے اندیشہ ہے کہ اگر تم بیٹھ گئے تو رسوا نہ ہو جاؤ۔ انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ دنیا کی مثال ایک دلہن کی سی ہے جو اسے طلب کرتا ہے وہ اس کے لئے مشاطہ کی مانند ہے کہ اس کی زلفیں سنوارتی ہے' اور جو اس میں زہد کرتا ہے وہ اس کے چہرے پر سیاہی ملنے والا' اس کے بال نوچ کر پھینکنے والا' اور اس کے کپڑے پھاڑنے والا ہے۔ عارف اللہ تعالیٰ میں مشغول رہتا ہے وہ اس کی طرف ملتفت نہیں ہوتا۔ سری سقطیؒ کہتے ہیں کہ میں نے زہد میں جو چیز چاہی وہ مجھے حاصل ہوئی' لیکن لوگوں میں زہد کرنا نصیب نہ ہو سکا' نہ مجھے اس کی طاقت ہے کہ لوگوں میں زہد کر سکوں۔ فضیلؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے تمام برائیوں کو ایک کمرے میں مقفل کر دیا ہے' اور حب دنیا کو اس کی چابی قرار دیدیا ہے' اسی طرح خیر کو ایک کمرے میں مقفل کر کے زہد کو اس کی کنجی بنا دیا ہے۔

یہ ہے زہد کی حقیقت' اور اس کے احکام و اقسام پر ایک مختصر کلام۔ اب ہم توکل کی بحث شروع کرتے ہیں کیوں کہ توکل کے بغیر زہد مکمل نہیں ہوتا۔

کتاب التوحید والتوکل

توحید اور توکل کے بیان میں جاننا چاہیے کہ توکل دین کے منازل میں سے ایک منزل' اور مؤقنین کے مقامات میں سے ایک مقام ہے۔ بلکہ یہ مقربین کے بلند درجات میں سے ایک ہے' توکل علم کی رو سے نہایت غامض اور عمل کے اعتبار سے انتہائی دشوار ہے۔ فہم کی رو سے اس کے اغماض کی وجہ یہ ہے کہ اسباب کا لحاظ کرنا اور ان پر اعتماد کرنا توحید میں شرک ہے' اور ان سے بالکلیہ طور پر تغافل برتنا سنّت اور شریعت پر طعن ہے' اور یہ بات مشکل ہی سے سمجھ میں آتی ہے کہ آدمی اسباب پر اعتماد بھی کرے اور ان کا لحاظ بھی نہ کرے۔

توکل کا مفہوم اس طرح سمجھنا کہ وہ توحید کے تقاضوں کے مطابق بھی ہو اور عقل و شرع کے خلاف بھی نہ ہو نہایت دشوار اور دقیق ہے' اس کے اسی دقت اور خفاء کی وجہ سے وہی لوگ اس کی حقیقت پر مطلع ہو سکتے ہیں جو علم کی دولت سے مالا مال ہوں اور جن کی آنکھوں میں حق کا نور ہو' دوسرے لوگوں کو اس کی طاقت نہیں کہ وہ ان امور کے حقائق کا ادراک کر سکیں' کبار علماء پر حقائق منکشف ہوتے ہیں' اور وہ اللہ کے دوسرے بندوں سے بیان کرتے ہیں۔

اس باب میں پہلے ہم مقدمے کے طور پر توکل کے فضائل بیان کرتے ہیں۔ اس کے بعد اس کتاب کے پہلے باب میں ہم توحید کا ذکر کریں گے اور دوسرے باب میں توکل کے موضوع پر گفتگو کریں گے۔

توکل کے فضائل آیات اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں :۔

وَعَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۔

(پ ۶ ر ۸ آیت ۲۳) اور اللہ تعالیٰ پر بھروسا کرو اگر تم ایمان رکھتے ہو۔

وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ۔ (پ ۱۳ ر ۱۳ آیت ۱۲)

اور اللہ ہی پر بھروسا کرنے والوں کو بھروسا کرنا چاہیے۔

وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ (پ ۲۸ ر ۱۷ آیت ۳)

اور جو شخص اللہ پر توکل کرے گا تو اللہ اس کے لئے کافی ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ۔ (پ ۴ ر ۸ آیت ۱۵۹)

بے شک اللہ تعالیٰ اعتماد کرنے والوں سے محبت فرماتے ہیں۔

اس مقام کی عظمت کا کیا کہنا جس پر فائز ہونے والے شخص کو اللہ تعالیٰ کی محبت حاصل ہوتی ہے' اور اللہ تعالیٰ اس کا کفیل ہوتا ہے' جس شخص کے لئے اللہ کافی ہو' محبت کرنے والا اور محافظ ہو وہ بڑا کامیاب ہے' اس لئے کہ محبوب کو نہ عذاب دیا جائے گا' نہ دور کیا جائے گا' نہ وہ محجوب ہوگا' قرآن کریم میں ہے :۔

اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ (پ ۲۴ ر ۱ آیت ۳۶)

کیا اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے لئے کافی نہیں ہے۔

جو شخص غیر اللہ سے کفایت طلب کرتا ہے وہ توکل کا تارک ہے' اور اس آیت کی تکذیب کرنے والا ہے' اس لئے کہ یہ سوال استفہام اقراری کے طور پر واقع ہوا ہے' جیسا کہ ذیل کی آیت میں وارد ہے :۔

هَلْ اَتٰى عَلَى الْاِنْسَانِ حِيْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُنْ شَيْئًا مَّذْكُوْرًا۔ (پ ۲۹ ر ۱۹ آیت ۱)

بے شک انسان پر زمانے میں ایک ایسا وقت بھی آچکا ہے جس میں وہ کوئی چیز قابل تذکرہ نہ تھا۔
ایک جگہ ارشاد فرمایا :-

وَمَن يَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ فَإِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ (پ ۱۰ ر ۲ آیت ۴۹)

اور جو شخص اللہ تعالیٰ پر بھروسا کرتا ہے تو بلاشبہ اللہ تعالیٰ زبردست ہیں اور حکمت والے ہیں۔

یعنی ایسا عزیز ہے کہ جو اس کی پناہ میں آجاتا ہے اسے ذلیل نہیں کرتا' اور جو اس کی بارگاہ میں التجا کرتا ہے اسے رد نہیں فرماتا' اور ایسا حکیم ہے کہ جو شخص اس کی تدبیر پر اعتماد کرتا ہے اس کی تدبیر سے تغافل نہیں کرتا۔ ایک موقع پر ارشاد فرمایا :-

إِنَّ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ عِبَادٌ أَمْثَالُكُمْ (پ ۹ ر ۱۴ آیت ۱۹۴)

واقعی تم خدا کو چھوڑ کر جن کی عبادت کرتے ہو وہ بھی تم ہی جیسے بندے ہیں' سو تم ان کو پکارو۔

اس آیت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا ہر شئی مسخر ہے' تمام بندے اسی طرح اس کے محتاج ہیں جس طرح تم ہو' اس لئے ان پر بھروسا کیسے کیا جاسکتا ہے' ایک آیت میں ہے :-

إِنَّ الَّذِينَ تَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ لَا يَمْلِكُونَ رِزْقًا فَابْتَغُوا عِندَ اللَّهِ الرِّزْقَ وَاعْبُدُوهُ (پ ۲۰ ر ۱۴ آیت ۱۷)

تم خدا کو چھوڑ کر جن کو پوج رہے ہو وہ تم کو کچھ بھی رزق دینے کا اختیار نہیں رکھتے سو تم رزق خدا کے پاس تلاش کرو' اور اس کی عبادت کرو۔

وَلِلَّهِ خَزَائِنُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَلَٰكِنَّ الْمُنَافِقِينَ لَا يَفْقَهُونَ۔ (پ ۲۸ ر ۱۳ آیت ۷)

اور اللہ ہی کے ہیں سب خزانے آسمانوں کے اور زمین کے لیکن منافقین جانتے نہیں۔

يُدَبِّرُ الْأَمْرَ مَا مِن شَفِيعٍ إِلَّا مِن بَعْدِ إِذْنِهِ (پ ۱۱ ر ۶ آیت ۳)

وہ ہر کام کی تدبیر کرتا ہے کوئی سفارش کرنے والا نہیں بغیر اس کی اجازت کے۔

قرآن پاک میں توحید کے موضوع پر جو کچھ فرمایا گیا ہے اس میں اس امر پر تنبیہ کی گئی ہے کہ اغیار کا لحاظ نہ کیا جائے' اور صرف الواحد القہار پر بھروسا کیا جائے۔

روایات ابن مسعودؓ کی روایت میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مبارک نقل کیا گیا ہے : "مجھے حج کے موسم میں امتیں دکھلائی گئیں' میں نے اپنی امت کو دیکھا کہ ان سے زمین کے نشیبی اور پہاڑی علاقے بھر گئے ہیں' مجھے ان کی کثرت و ہیئت سے خوشی ہوئی' مجھ سے کہا گیا کہ کیا تم اس سے خوش ہوئے' میں نے کہا ہاں! حکم ہوا کہ ان کے ساتھ اور ستر ہزار افراد جنت میں بلا حساب داخل ہوں گے صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! وہ کون لوگ ہوں گے؟ فرمایا یہ وہ لوگ ہوں گے جو نہ داغ لگواتے ہیں نہ شگون لیتے ہیں' نہ منتر پڑھتے پڑھاتے ہیں' اور اپنے رب پر توکل کرتے ہیں' یہ سن کر عکاشہ کھڑے ہوئے' اور انہوں نے عرض کیا : یارسول اللہ! اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ وہ مجھے انہی میں سے کردے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی کہ اے اللہ! عکاشہ کو ان میں سے کردے' اس کے بعد دوسرا شخص کھڑا ہوا' اور اس نے بھی دعا کی درخواست کی' آپ نے ارشاد فرمایا عکاشہ تم پر سبقت لے گئے (بخاری و مسلم۔ ابن عباسؓ) ایک حدیث میں ہے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا : اگر تم اللہ تعالیٰ پر ایسا توکل کرو جیسا کہ اس کا حق ہے تو خدا تعالیٰ تمہیں اس طرح رزق عطا کرے گا جس طرح وہ پرندوں کو رزق دیتا ہے کہ صبح کو بھوکے اٹھتے ہیں' اور شام کو شکم سیر ہو جاتے ہیں (ترمذی' حاکم۔ عمرؓ) ایک مرتبہ ارشاد فرمایا کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کا ہو کر رہتا ہے اسے اللہ تعالیٰ ہر تکلیف اور مشقت سے بچا دیتا ہے' اور اسے ایسی جگہ سے روزی دیتا ہے جہاں سے اسے روزی ملنے کا گمان بھی نہیں ہوتا' اور جو شخص دنیا کا ہو کر رہ جاتا ہے اسے اللہ تعالیٰ دنیا کے سپرد کر دیتا ہے (طبرانی صغیر۔ عمران ابن الحصین) فرمایا : جو شخص یہ چاہے کہ وہ لوگوں میں سب سے زیادہ مالدار بنے تو اسے اپنے سامنے کی چیز سے زیادہ اللہ تعالیٰ پر اعتماد کرنا

چاہیے (حاکم، بیہقی۔ ابن عباسؓ) روایت ہے کہ جب سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل خاندان کو (فقر و فاقہ کی) تنگی کا سامنا ہوتا تو آپ انہیں نماز پڑھنے کا حکم دیتے، اور فرماتے کہ اس کا حکم مجھے میرے پروردگار نے دیا ہے، چنانچہ ارشاد خداوندی ہے (طبرانی اوسط۔ محمد ابن حمزہ عن عبداللہ ابن سلام)۔

وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلَاةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا۔
(پ۱۶ر۱۷ آیت ۱۳۲)

اور اپنے اہل خاندان کو بھی نماز کا حکم کرتے رہیے، اور خود بھی اس کے پابند رہئے۔

ایک حدیث میں ارشاد فرمایا :۔ جس شخص نے منتر پڑھوایا یا داغ لگوایا اس نے توکل نہیں کیا۔ (ترمذی، نسائی، طبرانی، مغیرہ ابن شعبہؓ) روایت ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو منجنیق کے ذریعے آگ میں پھینکا گیا تو حضرت جبرئیل علیہ السلام نے عرض کیا کہ آپ کو کوئی ضرورت تو نہیں؟ انہوں نے جواب فرمایا : حَسْبِيَ اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ (میرے لئے اللہ کافی ہے اور وہ بہترین کفیل ہے) حضرت ابراہیم علیہ السلام سے یہی کہلوانا تھا، اور اس قول کے ذریعہ کوئی وعدہ وفا کرانا تھا، قرآن کریم کی اس آیت میں اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے :۔

وَإِبْرَاهِيمَ الَّذِي وَفَّىٰ۔ (پ۲۷ر۷ آیت ۳۷)

اور ابراہیم (کے صحیفے) جنہوں نے احکام کی پوری بجا آوری کی۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام پر وحی نازل فرمائی کہ جو بندہ مخلوق کے بجائے میری رسّی تھامتا ہے تو میں اسے زمین و آسمان کے مکر و فریب سے نجات دیتا ہوں۔

آثار حضرت سعید ابن جبیرؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میرے ہاتھ میں بچھو نے کاٹ لیا، میری ماں نے مجھ سے قسم دے کر کہا کہ میں جھاڑ پھونک کرنے والے سے اپنا ہاتھ جھڑوالوں، میں ماں کی خاطر اس کے پاس گیا لیکن اس کے ہاتھ میں اپنا وہ ہاتھ پکڑا دیا جس میں بچھو نے نہیں کاٹا تھا۔ حضرت خواصؒ نے قرآن کریم کی یہ آیت تلاوت کی :۔

وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِي لَا يَمُوتُ۔ (پ۱۹ر۳ آیت ۵۸)

اور اس حی لایموت پر توکل رکھئے۔

اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ بندے کو اس آیت کی روشنی میں صرف اللہ تعالیٰ پر بھروسا کرنا چاہیے، اللہ کے سوا کسی سے التجا کرنا اسے زیب نہیں دیتا، ایک بزرگ نے خواب میں کسی شخص کو یہ جملہ کہتے ہوئے سنا کہ جس نے اللہ تعالیٰ پر اعتماد کیا اس نے اپنے لئے رزق جمع کرلیا۔ ایک عالم کہتے ہیں ایسا نہ ہو کہ آدمی اس رزق کی تلاش میں جس کا اس سے وعدہ کیا گیا ہے فرائض سے غافل ہو جائے، اور آخرت کے معاملات نظر انداز کردے، حالانکہ اسے دنیا میں اسی قدر ملے گا جتنا اس کی قسمت میں لکھا گیا ہے۔ یحییٰ ابن معاذ فرماتے ہیں کہ آدمی کے پاس بلا طلب رزق آنے کا مطلب یہ ہے کہ رزق کو یہ حکم دیا جاتا ہے کہ وہ آدمی تلاش کرے اور اس کے پاس جائے۔ حضرت ابراہیم ابن ادہم فرماتے ہیں کہ میں نے ایک راہب سے دریافت کیا کہ تو کہاں سے کھاتا ہے، اس نے جواب دیا یہ میرا درد سر نہیں، تم میرے پروردگار سے دریافت کرو کہ وہ مجھے کہاں سے کھلاتا ہے۔ ہرم ابن حیان نے حضرت اویس القرنی سے دریافت کیا کہ میں کہاں رہوں؟ انہوں نے شام کی طرف اشارہ کردیا، انہوں نے دریافت کیا اور کس چیز کو وسیلۂ معاش بناؤں؟ حضرت اویس نے ارشاد فرمایا : ان قلوب پر افسوس ہوتا ہے جن میں شک کی آمیزش ہے، ایسے دلوں کو وعظ و نصیحت سے کوئی فائدہ نہ ہوگا، ایک بزرگ کا قول ہے کہ جب میں نے اللہ تعالیٰ کو اپنا وکیل بنالیا تو ہر خیر کی راہ پالی۔

اصل توکل توحید کی حقیقت

جاننا چاہیے کہ توکل ایمان کے ابواب میں سے ہے' اور ایمان کے تمام ب جیسا کہ پہلے بھی بیان کیا جاچکا ہے تین چیزوں سے ترتیب پاتے ہیں' علم' حال' اور عمل۔ اسی طرح توکل بھی انہی تین چیزوں سے حاصل ہوتا ہے' علم سے جو اصل ہے' عمل سے جو ثمرہ ہے' اور حال سے جو لفظ توکل کی مراد ہے۔

علم پہلے ہم علم کا بیان شروع کرتے ہیں' جو اصل ہے' اور لغت کی رو سے اسی کو ایمان کہا جاتا ہے' کیوں کہ ایمان کے معنی ہیں تصدیق' اور قلوب کی ہر تصدیق کو علم کہتے ہیں' اور اگر یہ علم قوی ہو جائے تو اسے یقین کا نام دیا جاتا ہے' یقین کی بہت سی قسمیں ہیں' لیکن ہم یہاں صرف وہی قسم زیر بحث لائیں گے جس پر توکل کا مدار ہے' اور وہ قسم ہے توحید جو تمہارے اس قول سے مفہوم ہوتی ہے "لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ" اس میں باری تعالیٰ کی وحدانیت کا اعتراف ہے' اسی قسم میں قدرت باری کی تصدیق بھی ہے جس پر یہ قول دلالت کرتا ہے "وَلَہُ الْمُلْکُ" اور اسی میں باری تعالیٰ کے وجود اور حکمت پر ایمان بھی ہے' اس کا ثبوت "ولہ الحمد" سے ملتا ہے۔ چنانچہ اگر کسی شخص نے یہ کلمہ کہا "لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ لَہُ الْمُلْکُ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ" تو اس کا وہ ایمان جو توکل کی اصل ہے پورا ہو گیا۔ یہاں ایمان کے پورا ہونے کے معنی یہ ہیں کہ یہ قول اس کے قلب کا ایک وصف لازم ہے اور وصف غالب بن جائے۔ جہاں تک توحید کا تعلق ہے وہ اصل اصول ہے' لیکن اس میں بہت طویل گفتگو ہے' اور اس کا تعلق علم مکاشفہ سے ہے' لیکن کیوں کہ بعض علوم مکاشفہ احوال کے واسطے سے اعمال کے ساتھ متعلق ہیں' اور ان کے بغیر علوم معاملہ مکمل نہیں ہوتے اس لئے ہم صرف توحید کا اسی قدر بیان کریں گے جو علم معاملہ سے متعلق ہے' ورنہ توحید تو ایک ناپید کنار سمندر ہے۔

توحید کے چار مراتب اب ہم کہتے ہیں کہ توحید کے چار مراتب ہیں' پہلا مرتبہ مغز کا ہے' دوسرا مرتبہ مغز کے مغز کا ہے' تیسرا اندرونی چھلکے کا ہے' اور چوتھا بیرونی چھلکے کا ہے' کم فہموں کے لئے ہم اخروٹ کی مثال بیان کرتے ہیں' اس کے اوپر دو چھلکے ہوتے ہیں' پھر مغز ہوتا ہے' پھر مغز میں روغن ہوتا ہے جسے مغز کا مغز کہنا چاہیے۔ توحید کا پہلا مرتبہ یہ ہے کہ بندہ زبان سے لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہے اور اس کا دل اس سے غافل ہو یا اس کا منکر ہو' جیسے منافقین کی توحید' دوسرا مرتبہ یہ ہے کہ اس کلمہ کے معنی کی تصدیق کرے جیسا کہ عام مسلمان اس کی تصدیق کرتے ہیں۔ یہ عوام کی توحید اور ان کا اعتقاد ہے' تیسرا مرتبہ یہ ہے کہ نور حق کے ذریعے اس کے معنی منکشف ہو کر مشاہدے میں آجائیں' یہ مقربین کا مقام ہے' اور اس انکشاف کے معنی یہ ہیں کہ بہت سی اشیاء دیکھے اور ان کا علم حاصل کرے' لیکن ان سب کا منبع واحد قہار کی ذات کو سمجھے' اور چوتھا مرتبہ یہ ہے کہ وہ صرف واحد۔ واحد کے وجود کا مشاہدہ کرے' تمام اشیاء میں اسے صرف اسی کا وجود نظر آئے' یہ صدیقین کی توحید ہے' اور صوفیاء اسے فنا فی التوحید کہتے ہیں' یعنی یہ لوگ اپنے نفوس کو اور مخلوق کو باری تعالیٰ کے وجود کے سامنے فانی سمجھتے ہیں' ان میں سے پہلا شخص محض زبان کا موحد ہے' اور ایسا شخص یہ کلمہ کہہ کر دنیا میں سیف وسنان سے محفوظ رہتا ہے' اور دوسرا شخص اس اعتبار سے موحد ہے کہ اس کا دل لفظ کے مفہوم کی تصدیق کرتا ہے' اور قلب میں جو اعتقادات موجود ہیں ان کی تکذیب سے خالی ہے اس طرح کی توحید قلب کے لئے ایک گرہ ہے' اس میں انشراح اور کشادگی نہیں ہوتی' لیکن جس شخص کے دل میں یہ گرہ ہوتی ہے وہ شہوت کے عذاب سے مامون اور محفوظ رہتا ہے بشرطیکہ اسی گرہ پر خاتمہ ہو' اور گناہوں کی وجہ سے وہ ڈھیلی نہ پڑ گئی ہو۔

پھر بعض اوقات اس گرہ کو ڈھیلا کر دیا جاتا ہے' اور اس کے لئے مختلف تدبیریں اختیار کی جاتی ہیں' ان تدبیروں کو بدعت کہتے ہیں' اور بعض تدبیروں کے ذریعے اس گرہ کو مضبوط بنایا جاتا ہے' ان تدبیروں کو علم کلام کہتے ہیں' جو شخص علم کلام جانتا ہے وہ متکلم کہلاتا ہے' اور اس کے مقابل کو مبتدع کہتے ہیں' متکلم کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ مبتدع عوام کے دلوں سے یہ گرہ کھولنے نہ پائے نہ اسے کسی درجے میں کمزور کر سکے۔ متکلم کے لئے کبھی خاص طور پر موحد کا لفظ بھی استعمال ہوتا ہے' اس لحاظ سے کہ وہ عوام

دلوں میں کلمہ لا الہ الا اللہ کا مفہوم و معنی کی حفاظت کرتا ہے ' یہاں تک کہ اس کے اعتقاد کی گرہ کھل نہیں پاتی۔ تیسرا مرتبہ اس موحد کا ہے جو صرف ایک فاعل کا مشاہدہ کرتا ہے ' یعنی اس پر امر حق واضح ہوتا ہے اور اسے تمام اشیاء کا ایک ہی فاعل نظر آتا ہے ' اور جو حقیقت ہوتی ہے وہی ظاہر ہوتی ہے ' لیکن وہ اپنے دل کو لفظ حقیقت کے معنی و مفہوم کے اعتقاد کا پابند بناتا ہے ' یہ مرتبہ بھی عوام اور متکلمین کا ہے ' اعتقاد کے معاملے میں عام آدمی اور متکلم میں کوئی فرق نہیں ہوتا ' فرق صرف یہ ہوتا ہے کہ عامی مبتدع کے ان حیلوں سے دفاع کرنے پر قادر ہے جو اس کے اعتقاد کی گرہ کھولنے کے درپے ہوتا ہے۔ چوتھا مرتبہ اس شخص کا ہے جو ہر چیز میں ایک ہی ذات کا مشاہدہ کرتا ہے ' اسے اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی وجود نظر نہیں آتا ' وہ دنیا کی اشیاء کو کثرت کی راہ سے نہیں دیکھتا ' بلکہ وحدت کی راہ سے دیکھتا ہے ' یہ توحید کا انتہائی اعلا مرتبہ ہے۔

چنانچہ ان مراتب میں ایسا مرتبہ پہلا ہے جیسے اخروٹ کا خارجی چھلکا ' اور دوسرا مرتبہ باطنی چھلکے کے مانند ہے جو مغز کے ساتھ متصل رہتا ہے ' اور تیسرا مرتبہ مغز کی حیثیت رکھتا ہے ' اور چوتھا مرتبہ مغز کے مغز کا ہے ' یعنی وہ روغن جو اخروٹ کے مغز سے کشید کیا جاتا ہے۔ جس طرح اخروٹ کا خارجی چھلکا بیکار محض ہے کہ اگر کھایا جائے تو کڑوا معلوم ہو ' دیکھا جائے تو آنکھوں کو برا لگے ' اور آگ جلانے میں استعمال کیا جائے تو بجائے آگ جلانے کے اسے بجھادے ' یا دھواں کردے ' اور اگر کسی جگہ رکھا جائے تو محض جگہ گھیرنے کے علاوہ کسی کام میں مفید نہ ہو ' سوائے اس کے کہ وہ چند روز مغز کی حفاظت کرتا ہے ' اور اسے ہوا اور بارش وغیرہ کی دست و برد سے محفوظ رکھتا ہے ' اسی طرح محض زبان سے اللہ تعالیٰ کی الوہیت اور وحدانیت کا اقرار کرنا بھی مفید نہیں ہے ' بلکہ اس میں بہت زیادہ نقصانات ہیں ' اور ظاہر و باطن ہر اعتبار سے مذموم ہے۔ اس ظاہری تصدیق کا صرف یہ فائدہ ہو سکتا ہے کہ چند روز تک نیچے کے چھلکے یعنی قلب اور بدن کو سیف و سنان سے محفوظ رکھے یہاں تک کہ موت آکر فنا کر ڈالے ' چنانچہ مجاہدین کی تلواریں منافقین کے جسموں پر نہیں اٹھیں ' کیوں کہ انہیں دل چیر کر دیکھنے کا حکم نہیں ہے ' وہ ظاہر کے اسلام پر نظر رکھتے ہیں ' جب موت آجاتی ہے تو جسم خود بخود فنا ہوجاتا ہے ' اور ظاہری توحید کا فائدہ بھی باقی نہیں رہتا۔ پھر جس طرح اندرونی چھلکا بیرونی چھلکے کے مقابلے میں زیادہ نفع پہنچاتا ہے کہ مغز کی حفاظت کرتا ہے ' ذخیرہ کئے جانے کے دوران سڑنے اور خراب ہونے سے بچاتا ہے ' اور اگر اس چھلکے کو مغز سے جدا کردیا جائے تو جلانے کے کام بھی آتا ہے ' ان تمام منافع کے باوجود اس چھلکے کی حیثیت مغز کے مقابلے میں بہت کم ہے ' یہی حال کشف حقائق کے بغیر اعتقاد قلب کا ہے۔ اگرچہ یہ اعتقاد زبانی قول کی بہ نسبت بہت سی منفعتوں کا حامل ہے ' لیکن کشف و مشاہدہ کے مقابلے میں جو دل کے انشراح اور اس میں نور حق کی تجلی کے نتیجے میں حاصل ہوتا ہے اس اعتقاد کی کوئی حیثیت نہیں ہے ' ان آیات میں یہی "شرح" مراد ہے :۔

فَمَنْ يُرِدِ اللّٰهُ أَنْ يَهْدِيَهُ يَشْرَحْ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ (پ ۸ ر ۲ آیت ۱۲۶)

سو جس شخص کو اللہ تعالیٰ ہدایت دینا چاہتا ہے اس کے سینے کو اسلام کے لئے کشادہ کردیتا ہے۔

أَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُورٍ مِنْ رَبِّهِ (پ ۲۳ ر ۱۷ آیت ۲۲)

سو جس شخص کا سینہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کے لئے کھول دیا ہے وہ اپنے پروردگار کے نور پر ہے۔

اگرچہ مغزیات خود نہایت عمدہ اور نفیس چیز اور دیکھا جائے تو مقصود و مطلوب بھی یہی مغز ہے ' لیکن پھر بھی کچھ نہ کچھ زائد عناصر اس میں موجود ہیں جو روغن کشید کرنے کی صورت میں سامنے آتے ہیں ' اس لئے روغن مغز کے مقابلے میں زیادہ خالص اور عمدہ ہوتا ہے ' اسی طرح فاعل کو ایک جاننا بھی سالکین کے حق میں ایک اعلا ترین مقصد ہے ' لیکن کیوں کہ اس میں کچھ نہ کچھ التفات غیر کی طرف پایا جاتا ہے ' اور وہ اس شخص کے مقابلے میں کم موحد ہے جو صرف ایک ذات کو دیکھتا ہے کیونکہ اس کی نظر کثرت سے وحدت کی طرف جاتی ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ صرف ایک ذات کا مشاہدہ کرنا کیسے ممکن ہے ' جب کہ انسان آسمان زمین اور تمام محسوس اجسام کا مشاہدہ

کرتا ہے' اور یہ محسوس اجسام ناقابل شمار ہیں' اس لئے یہ ایک کیسے ہو جائیں گے' اور دیکھنے والا ہر شئی کو ایک کیسے سمجھے گا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ علوم مکاشفات کی انتہا ہیں' اور اس کے علم کے اسرار و رموز کا کسی کتاب میں درج کرنا جائز نہیں' عارفین کہتے ہیں کہ ربوبیت کا راز افشاء کرنا کفر ہے' پھر کیوں کہ اس امر کا تعلق علم معاملہ سے نہیں ہے' اس لئے ہم مناسب نہیں سمجھتے کہ اس سوال کا مفصل جواب دیا جائے اور یہ بتلایا جائے کہ آدمی بہت سی چیزوں کو ایک کیسے سمجھ لیتا ہے' تاہم ایک بدیہی مثال کے ذریعے ہم صرف اشارہ کئے دیتے ہیں' دیکھئے دنیا میں بہت سی چیزیں ایسی ہیں کہ اگر انہیں کسی خاص طریقے سے دیکھا جائے تو بہت معلوم ہوں' اور دوسرے نہج سے دیکھا جائے تو ایک لگیں' مثلاً انسان ہی کو لیجئے' اگر اس کی روح' جسم' اعضاء' رگوں' ہڈیوں اور آنتوں کے اعتبار سے دیکھا جائے تو وہ بہت ہے' اور اگر انسانیت کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو وہ ایک ہے' بہت سے لوگ ایسے ہیں جو انسان کو دیکھتے ہیں مگر ان کے دلوں میں اس کی رگوں' ہڈیوں اور دوسرے اعضاء کا خیال تک نہیں آتا' نہ وہ روح اور جسم کے متعلق سوچتے ہیں' اور نہ ان دونوں میں فرق کرتے ہیں' وہ ایک کی حالت میں مستغرق رہتا ہے' اور اس حالت میں اس کے دل پر صرف ایک ہی کا خیال حاوی رہتا ہے' وہ ان میں افتراق اور جدائی کا تصور نہیں کرتا۔ جتنے بھی موجودات ہیں خواہ وہ خالق ہو یا مخلوق سب کے لئے متعدد اور مختلف اعتبارات ہیں' کسی اعتبار سے وہ ایک ہیں' اور کسی دوسرے اعتبار سے کثیر ہیں' پھر بعض کی کثرت بعض کے مقابلے میں زیادہ ہے' انسان کی مثال سے ان اعتبارات کا فرق واضح ہو جاتا ہے' اگرچہ یہ مثال ہماری غرض سے پوری طرح مطابق نہیں ہے' لیکن اس مثال سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ بعض اوقات مشاہدے سے کثرت وحدت میں بدل جاتی ہے۔

اس گفتگو سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس مقام کا انکار نہیں کیا جاسکتا جو تمہاری پہنچ سے باہر ہے' یا جو تمہاری منزل نہیں بنا' اگر تمہیں کوئی مقام میسر نہ ہو اور تم اس کی تصدیق کرو تو اس تصدیق کی بدولت تمہیں اعلا مرتبہ کی توحید سے اسی قدر بہرہ ہو گا جس قدر تمہارا ایمان قوی ہو گا اگرچہ وہ چیز جس پر تم ایمان لائے ہو تمہارا وصف یا صفت نہ بنی ہو' جیسے اگر تم نبوت پر ایمان لائے تو یہ ضروری نہیں ہے کہ تم نبی بھی ہو' لیکن اسے نبوت سے اسی قدر بہرہ ہو گا جس قدر نبوت پر اس کا ایمان قوی ہو گا۔ یہ مشاہدہ جس میں بندہ کو واحد مطلق کی ذات کے سوا کچھ نظر نہیں آتا کبھی ہمیشہ رہتا ہے' اور کبھی اتنا مختصر اور لحاتی ہوتا ہے جیسے پلک جھپک جائے یا بجلی کوند جائے' اکثر ایسا ہی ہوتا ہے' اس حالت کا دوام بہت کم واقع ہوتا ہے۔

حسین ابن منصور حلاج نے حضرت ابراہیم خواص کو سفر میں سرگرداں دیکھ کر پوچھا کہ تم کس فکر میں مبتلا ہو' انہوں نے جواب دیا کہ میں توکل کے سلسلے میں اپنے حال کی اصلاح کے لئے پابہ رکاب پھرتا ہوں' حضرت خواص کا تعلق بلاشبہ متکلمین میں سے تھا' حسین ابن منصور نے ان سے کہا کہ تم نے تمام عمر اپنے باطن کی تعمیر میں صرف کی ہے' فنا فی التوحید رہے ہو' وہ ریاضت کہاں گئی' گویا خواص توحید کے تیسرے مقام کی تعمیر و اصلاح میں مصروف رہے' ابن منصور نے ان سے چوتھے مقام کا مطالبہ کیا۔

توحید اور موحدین کے یہ چار مراتب اور مقامات ہیں' اب ہم اس توحید پر گفتگو کرتے ہیں جس پر توکل مبنی ہے' جہاں تک چوتھے مقام کا تعلق ہے اسے موضوع بحث بنانا ہی بیکار ہے' وہ علم معاملہ سے خارج ہے' اور توکل اس پر مبنی بھی نہیں ہے' بلکہ توکل کی حالت تیسری قسم کی توحید سے حاصل ہوتی ہے۔ پہلی قسم کی توحید نفاق ہے' اور دوسری محض تصدیق ہے اور عام مسلمانوں میں پائی جاتی ہے' کلام کے ذریعے اسے مضبوط بنانے کا طریقہ اور مبتدعین کے حیلوں سے بچنے کی تدبیریں علم الکلام میں مذکور ہیں' اور کتاب الاقتصاد فی الاعتقاد میں ہم نے اس سلسلے کے بعض اہم نکات بیان بھی کئے ہیں' اب صرف تیسری قسم باقی رہ جاتی ہے' توکل اسی پر مبنی ہے' اس لئے کہ توکل کے لئے محض تصدیق قلبی کافی نہیں ہے بلکہ کچھ کشف و مشاہدہ بھی ضروری ہے' لیکن ہم یہاں زیر بحث توحید کا صرف اسی قدر حصہ بیان کریں گے جو ہمارے موضوع توکل کے ساتھ براہ راست متعلق ہے' ہم ایسی تفصیل کے درپے نہیں ہیں جس کی اس کتاب میں گنجائش نہیں ہے۔

بہرحال تیسرے درجے کی توحید یہ ہے کہ تم پر یہ بات منکشف ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی فاعل نہیں ہے' اور خلق' رزق' عطاء منع' حیات' موت' غنی اور فقر وغیرہ امور جنہیں کوئی نام دیا جا سکتا ہے ان کا ایجاد کرنے والا اور پیدا کرنے والا صرف اللہ ہے' اللہ کے سوا کوئی نہیں ہے' اگر تم پر یہ امر منکشف ہو جائے تو پھر تم اللہ کے سوا کسی کی طرف نہیں دیکھو گے' اسی سے ڈرو گے' اسی سے امید رکھو گے' اسی پر اعتماد کرو گے' اسی پر بھروسا رکھو گے' اس لئے کہ وہ فاعل ہے' وہی مبدع اور موجد ہے اس کے سوا تمام موجودات مسخر ہیں' ان میں یہ طاقت نہیں کہ وہ اپنے خالق کی مرضی کے علی الرغم زمین و آسمان کے ملکوت میں سے ایک حقیر ذرہ کو بھی حرکت دے سکیں۔ جب کسی شخص پر مکاشفات کے دروازے کھل جاتے ہیں تو اس پر یہ اور مشاہدے سے بھی زیادہ واضح ہو جاتے ہیں۔ یہاں یہ بات بھی جان لینی چاہیے کہ شیطان انسان کو توحید سے ایسے مقام پر روک دیتا ہے جہاں وہ یہ دیکھتا ہے کہ اس کے دل پر شک کا وار مؤثر ہو سکتا ہے' اور یہ شک دو صورتوں سے ڈالتا ہے' ایک حیوانات کے اختیار کی طرف التفات کرانے کے باعث' اور دوسرے جمادات کی طرف متوجہ کرنے کی وجہ سے' جمادات کی طرف التفات کی صورت یہ ہے کہ تم کھیتی کی نشوونما میں بارش پر اعتماد کرو' اور بارش کے لئے بادلوں پر نظر رکھو' اور بادلوں کے لئے سردی پر بھروسا کرو' سمندر کے سینے پر کشتی چلنے اور سیدھی رکھنے کے سلسلے میں ہوا پر اعتماد کرو' یہ تمام امور توحید میں شرک ہیں' اور حقائق امور سے جہل کی علامت ہیں' اسی لئے اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے :۔

فَإِذَا رَكِبُوا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ فَلَمَّا نَجَّاهُمْ إِلَى الْبَرِّ إِذَا هُمْ يُشْرِكُونَ۔ (پ ۲۱ ر ۳ آیت ۶۵)

پھر جب یہ لوگ کشتی پر سوار ہوتے ہیں تو خالص اعتقاد کر کے اللہ ہی کو پکارنے لگتے ہیں' پھر جب ان کو نجات دے کر خشکی کی طرف لے آتا ہے تو وہ فوراً ہی شرک کرنے لگتے ہیں۔

بعض مفسرین نے اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ بعض کشتی سوار منزل پر صحیح سلامت پہنچنے کے بعد یہ کہتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ اگر ہوا موافق نہ ہوتی تو ہم ہرگز ساحل پر نہ پہنچتے' لیکن جس شخص پر عالم کے حقائق منکشف ہیں' اور وہ یہ جانتا ہے کہ موافق ہوا بھی ہوا ہے' اور یہ خود متحرک نہیں ہوتی' بلکہ اسے ایک محرک حرکت دیتا ہے' پھر اس محرک کے لئے ایک محرک ہے' اگر اس طرح دیکھا جائے تو یہ سلسلہ محرک حقیقی پر جا کر ختم ہوتا ہے' جس کا نہ کوئی محرک ہے' اور نہ بذات خود متحرک ہے۔ بندہ کا ہوا کی طرف التفات ایسا ہے جیسے کسی شخص کے متعلق یہ فیصلہ کیا گیا ہو کہ اسے قتل کر دیا جائے' اچانک بادشاہ اس کے لئے معافی کا حکم نامہ جاری کر دے' اور اس کے نتیجے میں قتل کے فیصلے پر عمل رک جائے' وہ شخص بادشاہ کی قدرت اور عظمت کا قائل ہونے کے بجائے قلم' دوات' اور کاغذ کو اس کا ذمہ دار قرار دے' اور ان بے جان اور معمولی چیزوں کو اپنا محسن تصور کرے' اور یہ کہے کہ اگر قلم نہ ہوتا تو مجھے نجات حاصل نہ ہوتی' یا کاغذ نہ ہوتا تو مجھے قتل کر دیا جاتا' یہ انتہائی نادانی اور جہالت کی بات ہے' جو شخص یہ بات جانتا ہے کہ حقیقت میں قلم کو ذرا بھی قدرت نہیں ہے وہ محض کاتب کے قلم میں مسخر ہے' وہ جس طرح چاہتا ہے اسے استعمال کرتا ہے' ایسا شخص قلم کی طرف التفات نہیں کرتا اور نہ کاتب کے سوا کسی کا شکر گذار ہوتا ہے' بعض اوقات اسے نجات سے اس قدر خوشی ہوتی ہے کہ بادشاہ اور کاتب کے شکر میں دل کو قلم' کاغذ اور روشنائی کا خیال بھی نہیں ہوتا۔ چاند' سورج' ستارے' ابر و باراں' زمین' اور تمام حیوانات اور جمادات باری تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں اس طرح مسخر ہیں جیسے قلم کاتب کے ہاتھ میں مسخر ہوتا ہے' یہ مثال تمہیں سمجھانے کے لئے دی گئی ہے' کیوں کہ عام طور پر تم یہی سمجھتے ہو کہ بادشاہ صرف دستخط کرتا ہے' کاتب حقیقی اللہ تعالیٰ ہے' جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے خود بھی ارشاد فرمایا :۔

وَمَا رَمَيْتَ إِذْ رَمَيْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ رَمَىٰ۔ (پ ۹ ر ۲ آیت ۱۷)

اور آپ نے نہیں پھینکی (خاک) جس وقت پھینکی تھی' بلکہ اللہ تعالیٰ نے پھینکی۔

بہرحال اگر تم پر یہ حقیقت منکشف ہو جائے کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے' وہ سب اللہ کے لئے مسخر ہے تو شیطان تم سے مایوس ہو کر بھاگ جائے' اور یہ یقین کرلے کہ وہ تمہارے عقیدۂ توحید میں شرک کی آمیزش نہیں کرسکتا۔ یہ جمادات کی طرف التفات کی صورت ہے۔ اب حیوانات کے اختیار کی طرف التفات کا حال سنئے' اس صورت میں شیطان تم سے کہتا ہے کہ یہ بات تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ تمام افعال اللہ کے ہیں' اس انسان کو دیکھو وہ تمہیں اپنے اختیار سے رزق دیتا ہے' اگر وہ چاہے تو تمہیں رزق دیدے اور چاہے تو محروم کردے' اور یہ شخص تیری گردن پر قدرت رکھتا ہے' چاہے تو اپنی تلوار سے تیری گردن اڑا دے' اور چاہے تو تجھے معاف کردے' اس لئے تجھے پہلے شخص سے رزق کی امید رکھنی چاہیے' اور دوسرے شخص سے خوف کرنا چاہیے' انہیں پورا پورا اختیار ہے' جیسا کہ تم اس کا مشاہدہ بھی کرتے ہو' اور اس کا یقین رکھتے ہو کہ رزق دینے اور معاف کرنے کے اعمال ان لوگوں سے صادر ہو رہے ہیں' شیطان اس سے یہ بھی کہتا کہ اگر تم قلم کو کاتب نہیں سمجھتے' بلکہ اسے لکھنے والے کے ہاتھ میں مسخر قرار دیتے ہو تو لکھنے والے کو کاتب کیوں نہیں کہتے جب کہ وہ خود اپنے اختیار سے لکھنے والا ہے۔ اس معاملے میں اللہ تعالیٰ کے ان مخلص بندوں کے علاوہ جن پر شیطان کا بس نہیں چلتا اکثر لوگ لغزش کھا جاتے ہیں' چنانچہ یہ بندگان خدا اپنی بصیرت کی آنکھوں سے دیکھ لیتے ہیں کہ بظاہر کاتب اپنے اختیار سے لکھتا ہوا نظر آتا ہے' لیکن فی الحقیقت وہ مسخر اور مجبور ہے' ان کا مشاہدہ ایسا ہی ہے جیسے کم فہم اور ضعیف نظر لوگوں کا یہ مشاہدہ کہ قلم کاتب کے ہاتھ میں مسخر ہے' اس معاملے میں ضعفاء کی مثال اس چیونٹی کی سی ہے جو کاغذ پر پھرتی ہو اور اس کی نگاہ قلم کی نوک پر ہو' وہ اپنی کم نظری کے باعث کاتب کی انگلیوں اور ہاتھ کو نہ دیکھ سکے' ظاہر ہے یہ چیونٹی اس کے علاوہ کچھ نہیں سمجھ سکتی کہ کاغذ کو سیاہ کرنے میں نوک قلم ہی مؤثر ہے' اس چیونٹی کی نظر قلم کی نوک سے تجاوز کر کے ہاتھ اور انگلیوں تک نہیں پہنچتی' کیوں کہ اس کی نگاہ کا دائرہ نہایت تنگ اور محدود ہے' یہی حال اس شخص کا ہے جس کا سینہ اللہ کے نور سے روشن اور منور نہ ہو' وہ زمین و آسمان کے جبار کو نہیں دیکھ پاتا' اور نہ یہ سمجھ پاتا ہے کہ وہ قہار واحد تمام موجودات پر غالب ہے' اس کی نگاہ کاتب پر ٹھہر جاتی ہے اس سے آگے نہیں بڑھ پاتی' یہ صرف نادانی اور جہالت ہے ارباب قلوب اور اصحاب مشاہدات کے علم اور مشاہدے کے لئے اللہ تعالیٰ نے آسمان و زمین کے ذرہ ذرہ کو نطق و گویائی بخشی ہے' چنانچہ وہ ہر ذرہ کی زبان سے اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تقدیس سنتے ہیں' اور ان کے عجز کا مشاہدہ کرتے ہیں' ہر شئی اپنی عاجزی' مقہوری' اور درماندگی کا اعتراف کرتی نظر آتی ہے' اگرچہ وہ اس اعتراف کے لئے کوئی حرف استعمال نہیں کرتی نہ صورت کو ذریعۂ اظہار بناتی ہے' جنہیں اللہ تعالیٰ نے دوربیں نگاہیں نہیں دی ہیں وہ اس کا مشاہدہ نہیں کرسکتے اور جنہیں حق سننے والے کان نہیں بخشے وہ ان کا اعتراف اور تقدیس و تحمید کی آوازیں نہیں سن سکتے۔ کان سے ہماری مراد یہ کان نہیں یہ کان تو صرف آوازوں کا ادراک کرتے ہیں' ان کانوں میں انسان ہی کی کیا تخصیص ہے' ایسے کان تو گدھوں کے بھی ہوتے ہیں' ایسی چیزوں کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہوتی جن میں حیوان بھی تمہارے شریک ہوں۔ ہم وہ کان مراد لے رہے ہیں جو ایسا کلام سنیں جس میں نہ حرف ہو' نہ صورت ہو' نہ وہ کلام عربی ہو اور نہ عجمی ہو۔

اشیاء کی تسبیح و تقدیس کوربیں اور کم فہم لوگ ہماری اس بات پر تعجب کا اظہار کرسکتے ہیں' اور اسے عقل کے لئے ناقابل قبول قرار دے سکتے ہیں' اور یہ سوال کرسکتے ہیں کہ اگر ان اشیاء کا کلام حرف و صورت سے عبارت نہیں ہے تو پھر یہ کیسے بولتی ہیں' اللہ تعالیٰ کی تسبیح و تقدیس کس طرح کرتی ہیں' اور اپنے نفسوں پر عجز و قصور کی گواہی کس طرح دیتی ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ آسمان اور زمین کا ہر ذرہ ارباب قلوب کے ساتھ مخفی طور پر راز و نیاز کرتا ہے' اور اس کی کوئی انتہا نہیں ہے' یہ مناجات ایسے کلمات پر مشتمل ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ کے کلام کے ناپید کنار سمندر سے حاصل کئے جاتے ہیں' اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :-

قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمَاتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمَاتُ رَبِّيْ

وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهِ مَدَدًا۔ (پ ۱۶ ر ۳ آیت ۱۰۹)

آپ کہہ دیجئے کہ اگر میرے رب کی باتیں لکھنے کے لئے سمندر (کا پانی) روشنائی ہو تو میرے رب کی باتیں ختم ہونے سے پہلے سمندر ختم ہو جائے' اگرچہ اس جیسا (ایک اور سمندر) مدد کے لئے لایا جائے۔

یہ ذرات ملک اور ملکوت کے اسرار بیان کرتے ہیں' اور راز افشاء کرنا کینگی ہے' شریفوں کے سینے اسرار کی قبریں ہوتی ہیں' تم نے کبھی کوئی ایسا شخص نہ دیکھا ہو گا جسے بادشاہ نے اپنا رازدار مقرر کیا ہو' اور وہ لوگوں سے بادشاہ کے راز بیان کرتا پھرتا ہو۔ اگر راز افشاء کرنا جائز ہوتا تو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم یہ ارشاد نہ فرماتے :۔

لَوْ تَعْلَمُوْنَ مَا اَعْلَمُ لَضَحِكْتُمْ قَلِيْلًا وَلَبَكَيْتُمْ كَثِيْرًا (۱)

اگر تم وہ باتیں جان لیتے جو میں جانتا ہوں تو کم ہنستے اور زیادہ روتے۔

بلکہ بیان فرما دیتے تاکہ زیادہ روتے اور کم ہنستے۔ اسی طرح آپ صحابہ کرام کو تقدیر کا راز افشاء کرنے سے بھی منع نہ فرماتے اور نہ یہ ارشاد فرماتے :۔ (۲)

اِذَا ذُكِرَ النُّجُوْمُ فَاَمْسِكُوْا وَاِذَا ذُكِرَ الْقَدَرُ فَاَمْسِكُوْا۔

(طبرانی۔ ابن حبان)

جب ستاروں کا ذکر ہو تو خاموش رہو' جب تقدیر کا ذکر ہو تو خاموش رہو۔

حضرت حذیفہؓ وہ واحد صحابی ہیں جنہیں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض اسرار کے ساتھ مخصوص فرمایا تھا۔ (۳) اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ تمام لوگوں کا اسرار پر مطلع ہونا مناسب نہیں ہے۔ بہرحال آسمان و زمین کے ذرات ارباب قلوب سے جو راز و نیاز کی باتیں کرتے ہیں وہ دو وجوہ سے بیان نہیں کی جا سکتیں۔ ایک تو یہ کہ افشائے راز محال ہے' اور دوسرے یہ کہ راز و نیاز کی باتیں اور حکایتیں لامحدود ہیں۔ ہم نے ماقبل کے صفحات میں قلم کی مثال بیان کی ہے' ہم بطور مثال اس کی مناجات اور ارباب قلوب کے ساتھ اس کی گفتگو کا اس قدر حصہ بیان کرتے ہیں جس سے بطور اجمال یہ سمجھا جا سکے کہ اس پر توکل کس طرح بنی ہے' اگرچہ یہ گفتگو حروف اور آواز کے متعلق نہیں ہے' لیکن ہم ضرورت تفہیم کے لئے حروف اور آواز فرض کئے لیتے ہیں۔

قلم کی اہل دل سے گفتگو ایک سالک نے جس کے دل میں نور الٰہی کی شمع روشن تھی کاغذ کو دیکھا کہ وہ پہلے سفید تھا' پھر سیاہ ہو گیا اس نے کاغذ سے پوچھا کہ تیرا چہرہ سفید سے سیاہ کیوں ہو گیا' اس نے جواب دیا تمہارا یہ سوال انصاف پر مبنی نہیں ہے' میں نے اپنا چہرہ خود سیاہ نہیں کیا' تم روشنائی سے دریافت کرو' وہ دوات میں قیام پذیر تھی جو اس کا مسکن اور وطن ہے' پھر اس نے وطن سے کوچ کیا' اور میرے چہرے کو اپنی منزل ٹھہرایا' اور قلم و زبردستی کے ساتھ اس میں قیام پذیر ہو گئی' سالک نے کہا تو سچ کہتی ہے' اس کے بعد اس نے روشنائی سے دریافت کیا کہ تو نے کاغذ کو سیاہ کیوں کر دیا' اس نے جواب دیا کہ تم نے میرے ساتھ انصاف نہیں کیا' میں دوات میں پُرسکون بیٹھی ہوئی تھی' اور اس سے باہر نکلنے کا میرا کوئی ارادہ نہیں تھا' قلم نے مجھ پر اپنی طمع فاسد کی بنا پر ظلم کیا' اور مجھے اپنے وطن سے نکلنے پر مجبور کر دیا' مجھے بے گھر کر دیا' میرا شیرازہ بکھیر دیا' اور مجھے اس سفید میدان میں بکھیر کر تباہ و برباد کر دیا' اس لئے تم میرے بجائے قلم سے سوال کرو' سالک نے کہا تو سچ کہتی ہے' اس کے بعد اس نے قلم سے اس کے ظلم و ستم کے متعلق دریافت کیا اور پوچھا کہ تو نے روشنائی کو اس کے وطن سے کیوں نکالا' اور اسے اپنوں سے کس لئے جدا کیا؟ اس نے جواب دیا کہ تم ہاتھ اور انگلیوں سے سوال کرو' میں تو ایک سبز نرسل کے روپ میں نہروں کے کنارے کھڑا ہوا تھا' ایک شخص ہاتھ میں

---

(۱) یہ روایت پہلے گزری ہے۔ (۲) ابن عدی' ابو نعیم' ابن عمرؓ (۳) یہ روایت پہلے گزر چکی ہے۔

چھری لے کر میرے پاس پہنچا' میرا چھلکا اتارا' میرے کپڑے پھاڑے' مجھے جڑ سے اکھاڑا اور مجھے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا' پھر ایک ٹکڑا لیا' اسے تراشا' اس کا سر چیرا' پھر مجھے تلخ اور سیاہ روشنائی میں ڈبویا' وہ مجھ سے خدمت لیتا ہے' اور مجھے سر کے بل چلنے پر مجبور کرتا ہے' یہاں تو پہلے ہی پورا بدن اس ہاتھ کی نوازشوں سے چھلنی ہے اب تم اپنے سوالات کا نمک چھڑک کر اس میں اور زیادہ سوزش پیدا کر رہے ہو' اس لئے مجھ سے دور رہو' اور یہ سوال اس شخص سے کرو جس نے مجھے بے دست و پا کیا ہے' سالک نے قلم کی بھی تصدیق کی' پھر ہاتھ سے پوچھا کہ آخر وہ قلم پر اس قدر مظالم کیوں ڈھاتا ہے اور اسے اس کی مرضی کے علی الرغم اپنی خواہشات میں کیوں استعمال کرتا ہے' ہاتھ نے جواب دیا کہ میں صرف گوشت' ہڈی اور خون کا مجموعہ ہوں۔ کیا تم نے گوشت کا کوئی ایسا لوتھڑا دیکھا ہے جو ظلم کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو' یا کوئی ایسا جسم دیکھا ہے جو خود بخود حرکت کرتا ہو' میں تو محض ایک سواری ہوں جس پر ایک شہسوار سوار ہے' جسے قدرت اور عزت کہتے ہیں' وہ شہسوار مجھے پھراتا ہے' اور زمین کے مختلف گوشوں میں گشت لگانے پر مجبور کرتا ہے' دیکھو شجر و حجر اپنی جگہ سے خود نہیں ہلتے اور نہ حرکت کرتے ہیں جب تک کوئی انہیں حرکت نہ دے' میرے ہاتھ اور مردوں کے ہاتھ شکل و صورت اور طول و عرض میں یکساں ہیں' پھر کیا بات ہے کہ مردوں کے ہاتھ قلم نہیں اٹھاتے' اور میرا ہاتھ اٹھاتا ہے' اس سے معلوم ہوا کہ میرا قلم سے کوئی رشتہ نہیں ہے' تم یہ سوال قدرت سے کرو' میں محض سواری ہوں' جسے سوار اپنے چابک کے زور پر چلنے پر مجبور کرتا ہے' سالک قلم کے جواب پر یقین کرتا ہے' اور قدرت سے پوچھتا ہے کہ آخر اسے ہاتھ کو استعمال کرنے کا کیا حق ہے' وہ اسے اپنی اغراض میں کیوں استعمال کرتی ہے' اور کیوں اسے حرکت پر مجبور کرتی ہے' قدرت نے جواب دیا کہ مجھے مطعون نہ کرو' بسا اوقات ملامت کرنے والا خود اس قابل ہوتا ہے کہ اس پر ملامت کی جائے' اور جس پر ملامت کی جاتی ہے وہ بے گناہ ثابت ہوتا ہے' تم پر میری حالت منکشف نہیں ہے' تم یہ بات کیسے کہہ سکتے ہو کہ میں نے ہاتھ پر سوار ہو کر زیادتی کی ہے' میں تو اس پر حرکت سے پہلے بھی سوار تھی' مگر خاموش سو رہی تھی' میری خاموشی اور نیند کا عالم یہ تھا کہ لوگ مجھے مردہ یا معدوم تصور کرتے تھے' یعنی میں نہ خود متحرک تھی' اور نہ دوسرے کو حرکت دیتی تھی' یہاں تک کہ ایک مؤکل آیا' اس نے مجھے حرکت دی' اور زبردستی اس کام پر مجبور کیا جس پر تم مجھے ملامت کا ہدف بنا رہے ہو' میرے اندر یہ طاقت نہیں تھی کہ میں اس کے حکم سے سرتابی کروں' میں اس کی مرضی کے مطابق کام کرنے پر مجبور تھی' اس مؤکل کا نام ارادہ ہے' میں اسے صرف اس کے نام سے جانتی ہوں اور اس کے اس عمل سے جانتی ہوں کہ ایک روز وہ مجھ پر حملہ آور ہوا' اور مجھے گہری نیند سے بیدار کر کے مجبور کیا کہ میں ہاتھ کو حرکت دوں' مجھے اس کے حکم پر عمل کرنے کے سوا کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔ سالک نے کہا تو سچ کہتی ہے' اس کے بعد اس نے ارادہ سے پوچھا کہ تجھے کیا ہوا تھا کہ تو نے پُرسکون اور مطمئن قدرت کو پریشان کیا' اور اسے حرکت کرنے پر اس طرح مجبور کیا کہ اس کے سامنے تیرے حکم کی تعمیل کے سوا کوئی راہ باقی نہیں رہی ارادے نے کہا کہ مجھ پر حکم لگانے میں جلدی نہ کرو' ہو سکتا ہے میں ایسا کرنے میں معذور ہوں' اور تم بلاوجہ ہی مجھے ملامت کر رہے ہو' میں خود نہیں اٹھا بلکہ اٹھایا گیا ہوں' میں خود بیدار نہیں ہوا بلکہ مجھے ایک زبردست قوت نے اٹھایا ہے' ورنہ میں اس سے پہلے پُرسکون تھا اور اپنی جگہ ٹھہرا ہوا تھا' میرے پاس قلب کی بارگاہ سے عقل کی زبانی علم کا قاصد آیا' اور اس نے مجھے حکم دیا کہ میں قدرت کو اٹھاؤں' چنانچہ میں نے مجبوراً قدرت کو اٹھا دیا' میں تو علم اور عقل کے لئے مسخر ہوں' اور مجھے معلوم نہیں کہ کس جرم کی سزا میں مجھے علم و عقل کا تابع اور اس کے زیردست قرار دیا گیا' اور مجھے اس کی اطاعت پر مجبور کیا گیا جب تک یہ زبردست قاصد میرے پاس نہیں آیا تھا میں خاموش اور پُرسکون تھا' اب یہی میرا حاکم ہے خواہ عادل ہے یا ظالم ہے' میں اس کا حکم ماننے پر مجبور ہوں' جب یہ کوئی حکم کرتا ہے تو میرے اندر یہ طاقت نہیں رہتی کہ میں اس کی مخالفت کر سکوں' میں اپنی جان کی قسم کھا کر کہتا ہوں جب تک وہ کسی معاملے میں متردد اور پریشان رہتا ہے میں خاموش رہتا ہوں' لیکن میرا دھیان اسی کی طرف لگا رہتا ہے' اور جب وہ کوئی قطعی فیصلہ کر دیتا ہے تو میں اپنی فطرت کے تقاضوں کے تحت اس کی اطاعت کے لئے مجبور ہو جاتا ہوں' اور قدرت کو اشارہ دیتا ہوں اب تم علم سے استفسار کرو' اور اپنا عتاب

مجھ سے دور رکھو' جیسا کہ ایک شاعر کہتا ہے:

مَتٰی تَرْحَلْتَ عَنْ قَوْمٍ وَقَدْ قَدَرُوْا أَنْ لَا تُفَارِقَهُمْ فَالرَّاحِلُوْنَ هُمْ

سالک نے کہا تو سچ کہتا ہے' پھر وہ علم' عقل اور قلب کی طرف متوجہ ہوا' اور انہیں اس بات پر لعنت ملامت کی کہ وہ ارادہ کو قدرت کی تحریک کے لئے مسخر کئے ہوئے ہیں' عقل نے جواب دیا کہ میں ایک چراغ ہوں' جو خود روشن نہیں ہوا ہے بلکہ اسے کسی دوسرے نے روشن کیا ہے' دل نے جواب دیا کہ میں ایک لوح ہوں جو خود نہیں پھیلی بلکہ اسے کسی اور نے پھیلایا ہے' علم نے کہا کہ میں ایک نقش ہوں جو لوح قلب کی سفیدی پر عقل کا چراغ روشن ہونے کے بعد منقوش ہو جاتا ہے' میں خود بخود منقوش نہیں ہوتا بلکہ کوئی دوسرا نقش کرتا ہے' اس لئے تم اس قلم سے پوچھو جس نے مجھے نقش کیا ہے۔ اس تگ و دو کے باوجود سالک کو کوئی ایسا جواب نہیں ملتا جس پر وہ قانع ہو سکے' چنانچہ حیران پریشان رہ جاتا ہے' اور کہتا ہے کہ میں اس راہ پر بڑی دیر سے گامزن ہوں' اور بہت سی منزلیں طے کرتے ہوئے یہاں تک پہنچا ہوں' راستے میں مجھے جو بھی ملا میں نے اسی سے سوال کیا' ہر ایک نے مجھے دوسرے کے حوالے کیا' اگرچہ میں اس تگ و دو سے خوش تھا اس لئے کہ ہر جواب معقول تھا' اور دل میں گھر کرنے والا تھا' لیکن یہ آخری جواب میری سمجھ سے باہر ہے' علم کہتا ہے کہ میں ایک نقش ہوں' جو قلم کے نتیجے میں ظہور پذیر ہوا ہے' حالانکہ میں قلم صرف بانس کا سمجھتا ہوں' تختی لوہے یا لکڑی کی ہوتی ہے' اور نقش سیاہ یا سرخ روشنائی کا ہوتا ہے' اور چراغ آگ سے روشن ہوتا ہے یہاں میں لوح' چراغ اور نقش کی گفتگو سن رہا ہوں' حالانکہ ان میں سے کوئی چیز مجھے نظر نہیں آتی' چکی کی آواز سنتا ہوں مگر چکی نظر نہیں آتی' اس کے جواب میں علم کہتا ہے تو جو کچھ کہہ رہا ہے سچ ہے' تیرا راس المال کم ہے' اور زاد راہ مختصر ہے' تیری سواری کمزور ہے' اور تو جس راستے کا مسافر ہے اس کے خطرات بے شمار ہیں' اس لئے تیرے حق میں بہتر یہی ہے کہ تو یہ راستہ چھوڑ دے' اور دوسرا راستہ اختیار کر' تو اس کا اہل نہیں ہے' جو جس چیز کا اہل ہوتا ہے اسے اس تک پہنچنے کے وسائل فراہم کئے جاتے ہیں' اگر تم واقعتاً" اس راہ کا سفر پورا ہی کرنا چاہتے ہو تو کان لگا کر سنو۔

تین عالم یاد رکھو کہ تمہارے اس سفر کے تین عالم ہیں' ایک عالم ملک و شہادت ہے کاغذ' روشنائی' قلم اور ہاتھ وغیرہ کا تعلق اسی عالم سے ہے' تم ان چیزوں سے بتدریج بڑھ آئے' اور دوسرا عالم ملکوت ہے' وہ میرے بعد ہے' جب تم مجھ سے تجاوز کرو گے تو اس عالم کی منزلوں میں پہنچ جاؤ گے' اس عالم میں وسیع تر جنگل بڑے بڑے دریا اور بلند و بالا پہاڑ ہیں' مجھے نہیں معلوم کہ تم ان میں سلامت کیسے رہو گے تیسرا عالم جبروت ہے' یہ ملک اور ملکوت کے مابین ایک عالم ہے' تم نے ان کی تین ابتدائی منزلیں طے کی ہیں' یعنی قدرت' ارادہ اور علم۔ یہ عالم عالم ملک اور عالم ملکوت کے درمیان واسطے کی حیثیت رکھتا ہے' عالم ملک کا راستہ اس کی نسبت سے سہل اور عالم ملکوت کا راستہ اس کے لحاظ سے دشوار گذار ہے۔ عالم ملک اور عالم ملکوت کے درمیان عالم جبروت ایسی کشتی سے مشابہت رکھتا ہے جو پانی اور زمین کے درمیان حرکت کرتی ہو۔ یعنی نہ تو وہ پانی کی طرح مضطرب ہوتی ہے' اور نہ زمین کی طرح ساکن۔ جو شخص زمین پر چلتا ہے وہ عالم ملک والشہادۃ میں چلنے والا ہے' اور اگر اسکی قوت تجاوز ہو' یہاں تک کہ وہ کشتی پر سوار ہونے پر قادر ہو جائے تو ایسا ہو گا جیسے وہ عالم جبروت کی سیر کر رہا ہو' اور اگر اس کی قوت یہاں تک پہنچ جائے کہ کشتی کے بغیر پانی پر چلنے لگے تو کہا جائے گا کہ یہ شخص عالم ملکوت کی سیر کرنے والا ہے' اگر تم کشتی کے بغیر پانی پر سفر نہیں کر سکتے تو جاؤ' تم زمین سے تجاوز کر چکے ہو' اور کشتی کو پیچھے چھوڑ چکے ہو' اب تمہارے سامنے صرف پانی رہ گیا ہے' اب دیکھو تم اس پر چل سکتے ہو یا نہیں۔

عالم ملکوت کی ابتدا عالم ملکوت کی ابتدا یہ ہے کہ تم اس قلم کا مشاہدہ کرلو جس سے دل کی تختی پر لکھا جاتا ہے' اور وہ یقین حاصل کرلو جس کی مدد سے پانی پر چلا جاتا ہے۔ تم نے حضرت عیسٰی علیہ السلام کے متعلق سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد

ضرور سنا ہو گا کہ جب آپ کے سامنے یہ بیان کیا گیا کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام پانی پر چلا کرتے تھے تو آپ نے ارشاد فرمایا :۔

لَوِ ازْدَادَ يَقِيْنًا لَمَشٰى عَلَى الْهَوَاءِ (۱)

اگر ان کو اور زیادہ یقین ہوتا تو ہوا پہ چلتے۔

علم کی یہ تقریر سننے کے بعد سالک نے کہا کہ میں اپنے معاملے میں حیران ہوں' اور تو نے راستے کے جن خطرات کی نشاندہی کی ہے ان سے میرا دل لرزہ براندام ہے' تو نے جن دہشت ناک اور وسیع ترین جنگلوں کی نشاندہی کی ہے مجھے نہیں معلوم میں انہیں قطع کر سکتا ہوں یا نہیں' کیا تو اس کی کوئی علامت بیان کر سکتا ہے؟ علم نے کہا اس کی علامت بھی ہے' اور وہ یہ ہے کہ تم اپنی آنکھیں کھولو' اور ان کی روشنی مجتمع کرکے میری طرف غور سے دیکھو' اگر تمہیں وہ قلم نظر آجائے جس سے دل کی تختی پر کوئی عبارت رقم کی جاتی ہے تو تم عالم ملکوت کے اہل قرار پاؤ گے' کیوں کہ جو شخص عالم جبروت سے تجاوز کرکے عالم ملکوت میں قدم رکھتا ہے' اسے وہ قلم نظر آنے لگتا ہے' چنانچہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت کی ابتدا میں جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی اس قلم کا مشاہدہ فرمایا تھا :۔

اِقْرَأْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِىْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ

(پ ۳۰ ر ۲۱ آیت ۳-۴)

آپ قرآن پڑھا کیجئے' اور آپ کا رب بڑا کریم ہے' جس نے قلم سے تعلیم دی' جن سے وہ واقف نہیں تھا۔

سالک نے کہا میں نے خوب اچھی طرح آنکھیں کھولی ہیں' اور غور سے دیکھنے کی کوشش کی ہے مجھے نہ قلم نظر آیا' اور نہ لکڑی' میں نے اگر قلم دیکھے ہیں تو یہی ظاہری قلم دیکھے ہیں جن سے لکھا جاتا ہے' علم نے کہا تم عجیب بات کہتے ہو' کیا تم نے نہیں سنا کہ جیسا مالک مکان ہوتا ہے ویسا ہی اس کے مکان کا سامان ہوتا ہے۔ کیا تم نہیں جانتے کہ نہ اللہ تعالیٰ کی ذات کسی کی ذات سے مشابہ ہے' نہ اس کا ہاتھ دوسرے ہاتھوں جیسا ہے' اور نہ اس کا قلم دوسرے قلموں سے مشابہت رکھتا ہے' اور نہ اس کے کلام کو دوسرے کے کلام سے کوئی مناسبت ہے' اور نہ اس کا خط دوسرے خطوط جیسا ہے' یہ امور الٰہی ہیں اور ان کا تعلق عالم ملکوت سے ہے' اللہ تعالیٰ نہ جسم ہے' اور نہ وہ کسی مکان میں ہے' جب کہ باقی تمام چیزیں اجسام بھی ہیں' اور مکان میں بھی ہیں۔ اس کا ہاتھ نہ گوشت ہے' نہ خون ہے اور نہ ہڈی' برخلاف دوسرے ہاتھوں کے کہ وہ گوشت' خون اور ہڈی کا مجموعہ ہیں' نہ اس کا قلم نرسل کا ہے' نہ اس کی تختی لکڑی کی ہے' نہ اس کا کلام حرف و صوت سے عبارت ہے نہ اس کا خط نقش و نگار ہے' اور نہ اس کی روشنائی پھٹکری اور مازو سے مرکب ہے اگر تم ان امور کو ایسا نہیں دیکھتے جیسا کہ وہ واقع میں ہیں تو تم نامرد ہو' حقیقت میں مرد وہی ہیں جو اللہ تعالیٰ کو اجسام سے منزہ اور پاک سمجھتے ہیں' اور مؤنث وہ ہیں جو اسے اجسام سے تشبیہ دیتے ہیں' اور تم ان دونوں کے درمیان مخنث ہو' نہ ادھر ہو اور نہ ادھر ہو' تم یہ بتلاؤ کہ تم نے اللہ تعالیٰ کو اجسام و صفات سے کس طرح منزہ کیا' اور اس کے کلام کو حرف و صوت سے کیسے پاک سمجھا' تم تو اس کے ہاتھ' قلم اور لوح میں توقف کرتے ہو' اگر تم سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد مبارک سے :۔

اِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ اٰدَمَ عَلٰى صُوْرَتِهٖ

اللہ تعالیٰ نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا ہے۔

یہ سمجھتے ہو کہ اللہ تعالیٰ نے آدم کو جس ظاہری شکل و صورت پر پیدا کیا ہے وہ اس کی شکل و صورت ہے تو یہ تشبیہ مطلق ہے' جیسے کہتے ہیں صرف یہودی ہو جاؤ ورنہ توراۃ سے مت کھیلو' اس کا مطلب یہ ہے کہ توراۃ سے کھیلنا خالص یہودی ہونے پر دلالت کرتا

---

(۱) یہ روایت پہلے بھی گذر چکی ہے۔

ہے اسی طرح جو شخص اللہ تعالیٰ کو اجسام ظاہری جیسا سمجھتا ہے وہ محض تشبیہ دینے والا ہے' اور جو شخص اس سے وہ باطنی صورت مراد لیتا ہے جو صرف چشم بصیرت سے مشاہدہ میں آتی ہے تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو پاک اور منزّہ سمجھتا ہے' اور تنزیہہ و تقدیس کے میدان کا راہ رو ہے' اب اسے راستہ طے کرنا چاہیے کہ وہ وادئ مقدس طویٰ میں ہے' اور سرّ قلبی سے اللہ کے احکامات سننے چاہیں ہو سکتا ہے کہ اسے تجلّی کی راہ مل جائے' اور بارگاہ حق سے اسے بھی وہی آواز سنائی دے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سنی تھی :-

إِنِّيٓ أَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ (پ ۱۶ ر ۱۰ آیت ۲)

میں ہی تمہارا رب ہوں پس تم اپنی جوتیاں اتار ڈالو۔

جب سالک نے یہ علم کی بصیرت انگیز گفتگو سنی تو اپنی غلطی پر آگاہ ہوا' اور اسے پتا چلا کہ وہ تشبیہ اور تنزیہہ کے درمیان معلّق ہے' یعنی مخنّث ہے' اس اطلاع کے ساتھ ہی اس کے دل میں اپنے آپ پر غیظ و غضب کی آگ بھڑکی' اور کیوں کہ اس کے دل کے چراغ میں اس قدر صاف و شفاف اور پاکیزہ تر تیل تھا جو آگ کے بغیر ہی جلنے کے لئے تیار تھا' اس لئے جب اسے علم کی آگ لگی تو نورٌ علیٰ نور بن گیا' یہ دیکھ کر علم نے کہا کہ اس موقع کو غنیمت سمجھو' اور اپنی آنکھیں کھول کر دیکھ لو' ہو سکتا ہے تمہیں آگ پر ہدایت مل جائے' چنانچہ اس نے آنکھیں کھولیں' تو اس پر اللہ تعالیٰ کا قلم ان تمام تر اوصاف کے اعتبار سے منکشف ہو گیا جو تنزیہہ کے لئے ناگزیر ہیں' نہ وہ نرسل سے بنایا گیا ہے' اور نہ لکڑی سے نہ اس کی نوک ہے' اور نہ سرا ہے' وہ انسانی دلوں میں ہر وقت مختلف نوع کے علوم تحریر کرنے میں مشغول رہتا ہے' اس کی نوک ہر دل کی سطح پر ہے اگرچہ بظاہر اس کی کوئی نوک نہیں ہے' سالک کو یہ سن کر حیرت ہوئی' اور اس نے کہا واقعتہً علم بہترین رفیق ہے' اللہ تعالیٰ اسے میری طرف سے جزائے خیر عطا کرے' اس نے قلم کے جو اوصاف مجھے بتلائے تھے وہ سب ظاہر ہو گئے اب میرے نزدیک وہ قلم عام قلموں جیسا نہیں ہے' اس کے بعد سالک نے علم کو الوداع کہتے ہوئے اس کا شکریہ ادا کیا' اور اس سے کہا کہ میں تیرے پاس دیر تک ٹھہرا رہا' اب میں قلم کی بارگاہ میں پہنچنے کا عزم رکھتا ہوں' اور کچھ اس کا حال پوچھنا چاہتا ہوں۔

سالک اور قلم کی گفتگو چنانچہ سالک قلم کے پاس پہنچا' اور اس سے کہنے لگا کہ اے قلم! تو کیوں ہر وقت لوگوں کے دلوں میں علوم رقم کرتا رہتا ہے' یہاں تک کہ ان علوم سے ارادوں کو تحریک ہوتی ہے' اور قدرت بیدار ہوتی ہے' اور اختیاری افعال سرزد ہونے لگتے ہیں؟ قلم نے جواب دیا کہ کیا تم وہ منظر بھول گئے ہو جو عالم ملک و شہادت میں تم نے دیکھا تھا' اور وہ جواب فراموش کر بیٹھے جو قلم سے سنا تھا' جہاں تک مجھے یاد ہے اس نے تحریر کی ذمہ داری قبول نہیں کی تھی' بلکہ اسے اللہ تعالیٰ پر محول کر دیا تھا' سالک نے کہا میں وہ منظر بھولا نہیں ہوں' اور نہ میں نے قلم کا جواب فراموش کیا ہے' قلم نے کہا تب میرا جواب وہی ہے' سالک نے کہا تیرا یہ جواب کیسے ہو سکتا ہے جب کہ تو اس سے مشابہت نہیں رکھتا' قلم نے کہا کیا تو نے یہ نہیں سنا کہ اللہ تعالیٰ نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا کیا ہے' سالک نے جواب دیا ہاں میں نے سنا ہے' قلم نے کہا تم میرا حال بادشاہ کے دائیں ہاتھ سے دریافت کرو' میں اسی کے قبضۂ قدرت میں رہتا ہوں' وہی مجھے چلاتا ہے' میں اس کی دسترس میں ہوں' اور وہ ہر طرح مجھ پر قابو پائے ہوئے ہے' مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے قلم اور آدمی کے قلم میں اس اعتبار سے کوئی فرق نہیں کہ دونوں مسخّر ہیں' اگر فرق ہے تو صرف ظاہری صورت کا ہے' سالک نے دریافت کیا کہ بادشاہ کے دائیں ہاتھ سے کیا مراد ہے؟ قلم نے جواب دیا کہ اس سے وہ مراد ہے جو مندرجہ ذیل آیت کریمہ میں مذکور ہے :-

وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌۢ بِيَمِيْنِهٖ (پ ۲۴ ر ۴ آیت ۲۷)

اور آسمان اس کے داہنے ہاتھ میں لپٹے ہوں گے۔

اسی طرح قلم بھی اس کے دائیں ہاتھ میں ہیں' وہ جس طرح چاہتا ہے انہیں پھیرتا ہے۔

سالک کا سفر یمین کی طرف اس گفتگو کے بعد سالک نے یمین کی طرف رخت سفر باندھا' وہاں اس نے محیّر العقول عجائبات دیکھے' قلم میں ان کا عشر عشیر بھی نہیں تھا' اور یہ تمام عجائبات ایسے تھے کہ الفاظ میں ان کا وصف بھی نہیں ہو سکتا تھا' بلکہ اگر ہزار ہا دفتروں میں ان کی شرح کی جائے تو ان کے سوویں حصے میں بھی شرح نہ ہو سکے۔ غرض یہ کہ وہ دایاں ہاتھ ہے لیکن ایسا نہیں ہے جیسے اور دائیں ہاتھ ہوتے ہیں اس کا بازو ہے مگر عام بازوؤں کی طرح نہیں' انگلیاں ہیں لیکن عام انگلیوں سے انہیں ذرا بھی مشابہت نہیں ہے' سالک نے قلم کو دائیں ہاتھ میں حرکت کرتے ہوئے دیکھا تو یہ بات سمجھ میں آئی کہ قلم جو اعذار بیان کرتا ہے وہ درست ہیں' اصل میں یہ سارا تماشا دائیں ہاتھ کا ہے' چنانچہ اس نے دائیں ہاتھ سے سوال کیا کہ تو قلم کو کیوں حرکت دیتا ہے' اس نے جواب دیا کہ میرا وہی جواب ہے جو عالم شہادت کے ہاتھ نے دیا تھا' یعنی اس نے اس حرکت کو قدرت پر محول کیا تھا' میں بھی یہی کہتا ہوں کہ یہ تمام کھیل قدرت کا ہے' سالک یہ سن کر قدرت کے پاس گیا وہاں اس نے وہ عجائبات دیکھے کہ اس سے پہلے ان کا عشر عشیر بھی نہیں دیکھا تھا' ڈرتے ڈرتے قدرت سے پوچھا کہ آخر تو یمین کو کیوں حرکت دیتی ہے' اس نے جواب دیا کہ میں تو ایک صفت ہوں' تم موصوف یعنی قادر سے پوچھو' موصوف ہی تمہیں اس کے سبب سے آگاہ کر سکتا ہے' صفت بیچاری تو تابع ہوا کرتی ہے' قریب تھا کہ قدرت کا یہ جواب سن کر سالک کے قدم لڑکھڑا جاتے' اور قادر مطلق سے سوال کرنے کی جرأت کر بیٹھتا کہ اسے ثبات قدمی نصیب ہوئی' اور قادر مطلق کی بارگاہ سے یہ آواز آئی :۔

لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْئَلُوْنَ۔ (پ ۱۷ ر ۲ آیت ۲۳)

وہ جو کچھ کرتا ہے اس سے کوئی باز پرس نہیں کر سکتا اور اوروں سے باز پرس کی جا سکتی ہے۔

یہ آواز سن کر سالک پر لرزہ طاری ہو گیا' اس کے دل پر دہشت چھا گئی' اور وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا' دیر تک اسی عالم میں تڑپتا رہا' جب ہوش آیا تو کہنے لگا کہ اے اللہ! تو پاک ہے' تیری شان عظیم ہے' میں تیری بارگاہ میں توبہ کرتا ہوں' اور تجھ پر بھروسا کرتا ہوں' اور اس حقیقت پر ایمان لاتا ہوں کہ تو ملک جبار اور واحد قہار ہے' نہ میں تیرے سوا کسی سے ڈرتا ہوں' اور نہ کسی سے امید کرتا ہوں' میں تیرے عتاب سے تیرے عفو کی' اور تیرے غیظ و غضب سے تیری رضا کی پناہ کا طلب گار ہوں' اب میرے سامنے اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں کہ تیرے سامنے نہایت عاجزی کے ساتھ یہ دعا کروں کہ اے اللہ! میرا سینہ کھول دے تاکہ میں تجھے پہچان لوں' اور میری زبان کی گرہ دور کر دے تاکہ میں تیری حمد و ثنا کر سکوں' اس کے جواب میں حضرت حق سے اعلان ہوا کہ خبردار! اس سے آگے مت بڑھو' حمد و ثنا میں طمع مت کر' فخر الانبیاء سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری دے جو کچھ وہ تجھے عطا کریں لے لے' اور جس چیز سے وہ تجھے منع فرمائیں اس سے باز آ' اور جو تجھ سے فرمائیں وہ کہہ' دیکھ انہوں نے بارگاہ الٰہی میں یہ التجا کی ہے :۔

سُبْحَانَكَ لَا أُحْصِيْ ثَنَاءً عَلَيْكَ أَنْتَ كَمَا أَثْنَيْتَ عَلٰى نَفْسِكَ۔

پاک ہے تو میں تیری پوری تعریف نہیں کر سکتا' تو ایسا ہے جیسا کہ تو نے خود اپنے نفس کی تعریف کی ہے۔

سالک نے عرض کیا! یا رب العالمین! اگر زبان کو اس حد سے تجاوز کرنے کی اجازت نہیں تو کیا دل تیری معرفت کی طمع کر سکتا ہے۔ ارشاد ہوا کہ کیا تو صدیقین سے سبقت کرنا چاہتا ہے' صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہو' اور ان کی اقتداء کر' سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے تمام اصحاب ستاروں کی طرح ہیں' تو ان میں سے جس ستارے کی بھی اتباع کرے گا ہدایت کی راہ پائے گا۔ کیا تو نے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا یہ مقولہ نہیں سنا :۔

اَلْعِجْزُ عَنْ دَرْكِ الْإِدْرَاكِ إِدْرَاكٌ۔

ادراک کی دریافت سے عاجز رہنا ہی ادراک ہے۔

ہمارے دربار میں تیرا حصہ صرف اس قدر ہے کہ تو یہ جان لے کہ تو اس دربار سے محروم ہے اور تجھے اتنی طاقت نہیں کہ جلال اور جمال کا مشاہدہ کرسکے۔ یہ سن کر سالک اپنے راستے پر واپس چلا' قلم' علم' ارادہ اور قدرت وغیرہ سے اس نے جو سوالات کئے تھے ان پر عذر خواہی کی اور اپنے قصور کا اعتراف کیا اور کہنے لگا کہ مجھے معاف کردو میں اس راہ میں اجنبی تھا' جو اجنبی ہوتا ہے اسے دہشت ہو ہی جاتی ہے' میں نے تمہارا انکار کیا' یہ محض میرا قصور تھا اور میری جہالت تھی' اب میں تمہارے اعذار پر اطلاع پاچکا ہوں' اور اس حقیقت سے آگاہ ہوچکا ہوں ملک و ملکوت اور عزت و جبوت میں صرف قہار واحد کا حکم چلتا ہے تم سب اسی کے حرکت دینے سے متحرک ہوتے ہو' اور اسی کے قبضۂ قدرت میں مسخر ہو' وہی اول ہے' وہی آخر ہے' وہی ظاہر ہے وہی باطن ہے۔

اول و آخر اور ظاہر و باطن میں تضاد جب سالک نے عالم ملک و شہادت یعنی عالم ظاہر سے تعلق رکھنے والوں کے سامنے یہ تفصیلات بیان کیں تو وہ حیرت زدہ رہ گئے اور کہنے لگے کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ وہی اول ہو اور وہی آخر ہو' یا وہی باطن ہو اور وہی ظاہر ہو' کیوں کہ یہ دونوں وصف ایک دوسرے کی ضد ہیں' جو اول ہو گا وہ آخر نہ ہو گا اور جو باطن ہو گا وہ ظاہر نہ ہو گا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ وہ موجودات کی بہ نسبت افضل ہے' اس لئے کہ تمام موجودات بالترتیب یکے بعد دیگرے اسی ذات واحد کے وجود میں آئی ہیں' اور آخر اس اعتبار سے ہے کہ چلنے والوں کی انتہائی منزل اسی کی ذات ہے' اگرچہ وہ راستے میں ایک منزل سے دوسری منزل تک ترقی کرتے چلے جاتے ہیں' لیکن انتہا اسی پر ہوتی ہے' سفر کا اختتام اسی کی ذات پر ہوتا ہے' اس طرح وہ گویا مشاہدے میں آخر ہے' اور وجود میں اول ہے' یہی حال اس کے باطن و ظاہر ہونے کا ہے' جو لوگ عالم شہادت میں رہ کر حواس خمسہ سے اس کا ادراک کرنا چاہتے ہیں' ان کے لئے وہ باطن ہے اور جو لوگ اسے اپنے دل کے چراغ کی روشنی میں تلاش کرتے ہیں ان کے لئے وہ ظاہر ہے۔ یہ ہے سالکین کی توحید فعلی کی حقیقت۔ یعنی جن لوگوں پر یہ حقیقت منکشف ہوگئی تھی کہ فاعل صرف ایک ذات ہے ان کی توحید کا طریقہ یہ تھا۔

تم یہ کہہ سکتے ہو کہ اس توحید کا حاصل عالم ملکوت پر ایمان لانا ہے' اب اگر کوئی شخص اس عالم کی حقیقت سے ناواقف ہو' یا اس کا انکار کرتا ہو تو اس کا کیا طریقہ ہو گا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ انکار کرنے والے کا کوئی علاج نہیں ہے۔ اس سے تو صرف اتنا کہا جائے گا کہ تیرا عالم ملکوت سے منکر ہونا ایسا ہے جیسے فرقہ' سمنیہ عالم جبوت کا منکر ہے' یہ فرقہ عالم کو حواس خمسہ میں منحصر سمجھتا ہے' اور قدرت' ارادہ اور علم کا انکار کرتا ہے۔ کیوں کہ حواس خمسہ سے ان کا ادراک نہیں ہوتا گویا وہ عالم شہادت کے پست پہلوؤں کو لازم پکڑے ہوئے ہے' اسی کی چیزوں کی معرفت رکھتا' اور عالم شہادت سے ماوراء کی چیزوں سے واقف نہیں ہوتا۔ اگر منکر یہ کہے کہ میں بھی انہی لوگوں میں سے ہوں' یعنی صرف عالم شہادت کو جانتا ہوں' یہی حواس خمسہ سے بھی معلوم ہوتا ہے' اس سے یہ کہا جائے گا کہ تو ماوراء حواس چیزوں کا انکار کرتا ہے جب کہ ہم نے ان کا مشاہدہ کرلیا ہے' تیرا انکار ایسا ہے جیسے سوفسطائی فرقہ کا انکار' یہ فرقہ حواس خمسہ کا انکار کرتا ہے' اور کہتا ہے کہ جو کچھ ان سے محسوس ہوتا ہے وہ قابل اعتبار نہیں ہے' ہوسکتا ہے ہم خواب دیکھتے ہیں' اگر منکر یہ کہے کہ میں بھی سوفسطائی ہوں' اور مجھے بھی محسوسات میں شک ہے تو کہا جائے گا کہ اس شخص کا مزاج فاسد ہوچکا ہے' اور اب اس کے لئے کوئی علاج کارگر نہیں ہو گا' اسے چند روز اس کے حال پر چھوڑ دینا چاہیے' بہت سے مریض ایسے ہوتے ہیں کہ اطباء تمام تر کوششوں کے باوجود ان کے علاج میں ناکام رہ جاتے ہیں' یہ معاملہ اس شخص کے ساتھ ہو گا جو جامد یا منکر ہے' اور جو شخص منکر تو نہیں ہے' لیکن عالم ملکوت کی حقیقت اس کی سمجھ میں نہیں آتی تو سالکین کا اس کے ساتھ یہ موقف ہونا چاہیے کہ اس کی وہ آنکھ دیکھی جائے جس سے عالم ملکوت کا مشاہدہ ہوتا ہے' اگر وہ صحیح یا تندرست ہے' یا اس میں سیاہ پانی کی صرف معمولی مقدار ہے اور اس کا ازالہ یا تنقیہ ممکن ہے تو اس کی آنکھ کی اصلاح کی جائے گی' جیسے ماہرین امراض چشم

ظاہری آنکھوں کے امراض کا علاج کرتے ہیں' جب اس کی بینائی درست اور آنکھ روشن اور مجلّی ہو جاتی ہے تو اسے عالم ملکوت تک پہنچنے کا راستہ بتلا دیا جاتا ہے۔ چنانچہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مخصوص صحابہ کے سلسلے میں یہ تدبیر استعمال فرمائی ہے۔ اگر اس کا مرض ناقابل علاج ہے تو توحید کے باب میں جو طریقہ ہم نے لکھا ہے اس پر اس کا چلنا ممکن نہیں ہے' اور نہ یہ ممکن ہے کہ وہ توحید پر ملک اور ملکوت کے ذرات کی شہادت سنے' ایسے شخص کو حروف اور آواز کے ذریعے توحید کی حقیقت سمجھانی چاہیے' اور ایسی معمولی درجے کی تقریر کرنی چاہیے جو اس کی فہم کے مطابق ہو' چنانچہ اس سے کہا جائے کہ ہر شخص یہ بات جانتا ہے کہ ایک گھر دو سربراہوں' اور ایک شہر دو حاکموں سے تباہ ہو جاتا ہے' اس سے یہ ثابت ہوا کہ عالم کا معبود اور اس کا مدبّر اور منتظم ایک ہی ہے' اس لئے کہ اگر آسمان و زمین میں ایک سے زیادہ خدا ہوتے تو آسمانوں اور زمین کی تباہی لازمی تھی۔ یہ تقریر عالم شہادت میں اس کے دل میں راسخ ہو جائے گی۔ حضرات انبیائے کرام علیہم السلام کو اسی لئے یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ لوگوں سے ان کی عقلوں کے مطابق گفتگو کریں۔ اور یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم اس زبان میں نازل ہوا جو مخاطبوں کی زبان تھی۔

اب اگر یہ سوال کیا جائے توکّل اس اعتقادی توحید پر مبنی ہو سکتا ہے' بالفاظ دیگر کیا اس طرح کی توحید میں یہ صلاحیت ہے کہ اس پر توکّل کی بنا رکھی جاسکے۔ ہم کہیں گے کہ اس اعتقاد کے اندر بھی یہ صلاحیت موجود ہے کہ توکّل کا مبنیٰ قرار پاسکے۔ اس لئے کہ یہ اعتقاد جب اپنی پوری قوت کے ساتھ برپا ہوتا ہے تو احوال کو اسی طرح برانگیختہ کرتا ہے جس طرح کشف سے برانگیختہ ہوتے ہیں' لیکن ایسا بہت کم ہوتا ہے' عام طور پر اس طرح کے اعتقادات ضعیف ہوتے ہیں' اور وہ متزلزل بھی ہو جاتے ہیں' اسی لئے اس طرح کی اعتقادی توحید رکھنے والوں کو ہمیشہ ایک متکلم کی ضرورت رہتی ہے جو اپنی تقریر کے ذریعے اس کے ان اعتقادات کا تحفظ کرتا ہے' جو اس نے اپنے استاذ' اپنے والدین' اور اپنے ہم وطنوں سے حاصل کئے ہیں' البتہ جو شخص اپنا راستہ خود دیکھ کر چلے گا اسے تزلزل کا خوف نہیں ہوگا' لیکن اگر اس شخص کی نگاہوں سے پردہ اٹھا لیا جائے تو اس کا یقین بدستور رہے گا' تاہم وضاحت میں زیادتی ہو سکتی ہے' جیسے اگر کوئی شخص کسی کو طلوع آفتاب کے وقت دیکھے اور دوسری بار اس وقت دیکھے جب کہ آفتاب طلوع ہو چکا ہو تو دوسری بار دیکھنے سے اس آدمی کے آدمی ہونے کے یقین میں اضافہ نہ ہوگا' البتہ اس کے خدوخال زیادہ وضاحت کے ساتھ سامنے آجائیں گے گویا اہل مکاشفہ کی توحید کا یقین ایسا ہوتا ہے کہ اس میں تزلزل نہیں ہوتا' اہل کشف اور عام معتقدین کی مثال ایسی ہے جیسے فرعون کے جادوگر اور سامری کے پیروکار فرعون کے جادوگر اپنے طویل مشاہدے اور تجربے کے باعث یہ بات جانتے تھے کہ سحر کے اثرات کی انتہا کیا ہے' جب انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے وہ بات دیکھی جو سحر کی حدود سے متجاوز تھی تو ان پر امر حق واضح ہو گیا' اور انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے میں فرعون کی اس دھمکی کی پروا نہیں کی :-

فَلَأُقَطِّعَنَّ أَيْدِيَكُمْ وَأَرْجُلَكُم مِّنْ خِلَافٍ وَلَأُصَلِّبَنَّكُمْ فِي جُذُوعِ النَّخْلِ۔

(پ۱۶ ر۱۲ آیت ۱۷)

سو میں تم سب کے ہاتھ پاؤں کٹواتا ہوں ایک طرف کا ہاتھ اور ایک طرف کا پاؤں اور تم سب کو کھجوروں کے درختوں پر ٹنگواتا ہوں۔

بلکہ انہوں نے پوری جرأت کے ساتھ یہ اعلان کر دیا :-

لَن نُّؤْثِرَكَ عَلَىٰ مَا جَاءَنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالَّذِي فَطَرَنَا فَاقْضِ مَا أَنتَ قَاضٍ إِنَّمَا تَقْضِي هَٰذِهِ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا۔ (پ۱۶ ر۱۲ آیت ۷۲)

ہم تجھ کو کبھی ترجیح نہ دیں گے ان دلائل کے مقابلے میں جو ہم کو ملے ہیں اور اس ذات کے مقابلے میں جس نے ہم کو پیدا کیا ہے' تجھ کو جو کچھ کرنا ہو کر ڈال تو اس کے سوا کہ دنیاوی زندگی ختم کر دے اور کیا کر سکتا ہے۔

حاصل یہ ہے کہ کشف و وضاحت کے بعد آدمی جس نتیجے تک پہنچتا ہے اس میں تغیر نہیں ہوتا' یہی حال اہل کشف کی توحید کا بھی ہے' اس میں تزلزل واقع نہیں ہوتا' اس کے برخلاف توحید اعتقادی میں بہت جلد تغیر ہو جاتا ہے جیسے سامری کے پیروکار تھے' انہوں نے کیوں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس معجزہ کو دیکھ کر ایمان قبول کیا تھا کہ جیسے ہی انہوں نے اپنا عصا زمین میں ڈالا وہ سانپ گیا' ان کا ایمان کشف کے نتیجے میں نہیں تھا' بلکہ صرف ظاہری مشاہدے پر تھا' اس لئے جب سامری نے ایک خوبصورت بچھڑا بنا کر یہ اعلان کیا :۔

هٰذَآ اِلٰهُكُمْ وَاِلٰهُ مُوْسٰى۔ (پ ۱۶ ر ۱۳ آیت ۸۸)

تمہارا اور موسیٰ کا معبود تو یہ ہے۔

تو وہ اس کی بات کو سچ سمجھ بیٹھے' انہوں نے یہ نہ دیکھا کہ یہ بچھڑا نہ کسی بات کا جواب دیتا ہے نہ نفع پہنچاتا ہے' اور نہ نقصان پہنچانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ غرض یہ ہے کہ جو شخص صرف سانپوں کو دیکھ کر ایمان لاتا ہے وہ بچھڑے کو دیکھ کر اپنے ایمان سے منحرف ہو سکتا ہے' کیوں کہ ان دونوں چیزوں کا تعلق عالم شہادت سے ہے' اور عالم شہادت کی چیزوں میں اختلاف و تغیر کی بڑی گنجائش ہے' اور کیوں کہ عالم ملکوت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اس لئے اس میں نہ اختلاف پایا جاتا ہے اور نہ تضاد کی گنجائش ہے۔

انسان کس طرح مسخر ہے؟ یہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ تم نے جس توحید کا ذکر کیا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اسباب اور وسائط سب مسخر ہیں' ہم یہ بات تسلیم کر سکتے ہیں' لیکن انسان کے علاوہ دوسری چیزوں میں جہاں تک انسان کا تعلق ہے ہم دیکھتے ہیں کہ اس کی حرکات اختیاری ہوتی ہیں وہ جب چاہتا ہے حرکت کرتا ہے اور جب چاہتا ہے پُرسکون ہو جاتا ہے' اس لئے انسان مسخر کیسے ہو سکتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر صورت حال یہ ہوتی کہ اسے اپنی خواہشات پر کنٹرول ہوتا یعنی جب چاہتا کوئی خواہش کرتا' اور جب چاہتا کسی خواہش کا ارادہ نہ کرتا تو غلطی کا امکان تھا' اور قدم ڈگمگا سکتے تھے' لیکن تم یہ بات جان چکے ہو کہ انسان فعل جب کرتا ہے جب چاہتا ہے' مگر چاہنا اس کے اختیار میں نہیں ہوتا' اگر مشیت اس کے اختیار میں ہوتی تو اس کے لئے دوسری مشیت کی ضرورت ہوتی ہے' اور دوسری کے لئے تیسری مشیت کی' یہاں تک کہ یہ سلسلہ اسی طرح دراز ہوتا' کیوں کہ انسان کی مشیت اس کے اختیار میں نہیں ہے' اس لئے جب وہ قدرت کو مقدور کی طرف مائل کرتی ہے تو قدرت وہی عمل کرے گی جو اس کے سپرد کیا جائے گا' اس کے خلاف کرنے کی طاقت اس میں نہیں ہوگی۔ اس سلسلے میں ایک ترکیب ہے' اور یہ تمام امور اسی ترتیب کے ساتھ ظہور پذیر ہوتے ہیں قدرت ہوگی تو حرکت ضرور ہوگی' اور مشیت مکمل ہوگی تو قدرت میں تحریک ضروری ہوگی' پھر مشیت کا دل میں بے اختیار پیدا ہونا بھی ضروری ہے' کسی بندے کے اختیار میں نہیں ہے کہ وہ خواہش کو روک دے نہ یہ اختیار ہے کہ مشیت کے بعد قدرت کو مقدور کی طرف مائل ہونے سے منع کردے' نہ یہ اختیار ہے کہ جب مشیت قدرت کو حرکت دے تو اس میں حرکت نہ ہونے دے' ان تمام امور میں بندہ مجبور محض ہے اور یہی اس کی تسخیر ہے۔

جبر و اختیار کی بحث یہاں تم یہ کہہ سکتے ہو کہ یہ جبر محض ہے' اور جبر اختیار کے خلاف ہے' جب کہ ہم اختیار کو مسترد نہیں کرتے' بلکہ انسان کو مختار مانتے ہیں' اس لئے یہ کیسے ممکن ہے کہ بندہ اس قدر مجبور ہونے کے باوجود مختار کہلائے۔ ہم اس کے جواب میں کہیں گے کہ اگر حقیقت منکشف کردی جائے تو معلوم ہو کہ بندہ عین اختیار میں مجبور ہے' لیکن یہ بات وہی شخص سمجھ سکتا ہے جو اختیار کو سمجھتا ہے اس لئے پہلے ہم متکلمین کے اسلوب میں اختیار کی تشریح کرتے ہیں۔

فعل کے تین اطلاقات اصل میں لفظ فعل انسان میں تین طرح سے بولا جاتا ہے' مثلاً کہتے ہیں انسان انگلیوں سے لکھتا

ہے گلے اور پھیپھڑے سے سانس لیتا ہے' اور جب پانی پر کھڑا ہوتا ہے تو اسے چیر دیتا ہے' یہاں انسان کی طرف تین چیزوں کی نسبت کی گئی ہے' پانی چیرنے کی' سانس لینے کی' اور لکھنے کی۔ اور یہ تینوں فعل جبر و اضطرار میں برابر ہیں' مگر اس کے علاوہ دوسری باتوں میں الگ الگ ہیں' جنھیں ہم تین عبارتوں میں بیان کرتے ہیں' اس کے اس فعل کو کہ وہ پانی کی سطح پر کھڑا ہو کر اسے چیر دیتا ہے طبیعی کہتے ہیں' اور سانس لینے کے فعل کو ارادی کہتے ہیں اور کتابت کو فعل اختیار کہتے ہیں۔ جہاں تک فعل طبیعی کا تعلق ہے اس میں جبر بالکل واضح ہے' اس لئے کہ جب کوئی انسان پانی کی سطح پر کھڑا ہو گا' یا ہوا میں چلے گا تو پانی اور ہوا دونوں پھٹیں گی۔ سانس لینا بھی ایسا ہی ہے اس لئے کہ گلے کی حرکت کو سانس لینے کے ارادہ کی طرف وہی نسبت ہے جو بدن کے بوجھ سے پانی کے پھٹنے کو ہے' چنانچہ جب پانی کی سطح پر بوجھ ہو گا تو وہ پھٹے گا ضرور لیکن یہ بوجھ اور ثقل آدمی کے اختیار میں نہیں ہے' اسی طرح فعل ارادی کا ارادہ بھی آدمی کے اختیار سے باہر ہے' اسی لئے تم یہ دیکھتے ہو کہ جب کوئی شخص کسی کی آنکھوں کی طرف سوئی لے کر بڑھتا ہے تو بے اختیار اس کی آنکھیں بند ہو جاتی ہیں' وہ انھیں کھلی رکھنا بھی چاہے تو نہیں رکھ سکتا' حالانکہ بند کرنا فعل ارادی ہے' کیوں کہ جب سوئی کی صورت اور اس کے چبھنے سے ہونے والی تکلیف ادراک میں آجاتی ہے تو آنکھ بند کرنے کا ارادہ ضرور پیدا ہوتا ہے اور اسی ارادے سے حرکت پیدا ہوتی ہے' لیکن اگر کوئی شخص اس حرکت کو روکنا چاہے تو یہ ممکن نہیں ہے' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس طرح کے افعال بھی افعال طبعیہ میں داخل ہیں۔

اب صرف فعل اختیاری باقی رہ جاتا ہے اور وہی محل شبہ میں ہے' جیسے لکھنا اور بولنا وغیرہ' کہ چاہے تو لکھے اور چاہے تو نہ لکھے' چاہے تو کلام کرے اور چاہے تو نہ کرے' کبھی آدمی ان افعال کی خواہش کرتا ہے اور کبھی خواہش نہیں کرتا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ افعال انسان کو تفویض کردیے گئے ہیں لیکن یہ گمان اختیار کے معنی سے ناواقف ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ اس لئے ہم اس کی وضاحت کرتے ہیں۔

فعل اختیار میں جبر: جاننا چاہیے کہ ارادہ اس علم کے تابع ہوتا ہے جو انسان کے لئے یہ حکم کرتا ہے کہ فلاں چیز اس کے موافق ہے' اور فلاں موافق نہیں ہے۔ اس اعتبار سے اشیاء کی دو قسمیں ہیں۔ ایک قسم میں وہ چیزیں شامل ہیں کہ آدمی کا ظاہری یا باطنی مشاہدہ کسی تردّد کے بغیر ان کے متعلق یہ رائے قائم کرلیتا ہے کہ یہ موافق ہیں' اور دوسری قسم میں وہ چیزیں ہیں جن کے موافق ہونے یا نہ ہونے کے متعلق عقل متردّد رہتی ہے۔ پہلی کی مثال یہ ہے جیسے کوئی شخص تمہاری آنکھ میں سوئی چبھونے کا ارادہ کرے یا تلوار سونت کر تمہاری طرف بڑھے تو تمہارے ذہن میں فوراً یہ خیال آجائے گا کہ اس مصیبت سے دفاع میرے لئے مناسب اور موافق ہے' چنانچہ تم اس دفاع میں کوئی تردّد نہ کروگے اور اس کے ساتھ ہی تمہارے دل میں ارادہ پیدا ہو گا۔ اس کے باعث قدرت متحرک ہو گی' اور سوئی سے آنکھ کو بچانے کے لئے پلکیں بند ہو جائیں گی اور تلوار سے جسم کو محفوظ رکھنے کے لئے ہاتھ اٹھ جائیں گے اگرچہ ان باتوں کا تعلق ارادے سے ہے' لیکن یہ تفکر اور تأمل کے بغیر واقع ہوتی ہیں' اور جن امور میں عقل اور تمیز کو دخل ہوتا ہے وہاں تأمل کی ضرورت پڑتی ہے' تاکہ عقل پر یہ واضح ہو جائے کہ وہ امور موافق ہیں یا نہیں' اور ان کا کرنا اچھا ہے یا نہیں۔ چنانچہ جب فکر و تدبر سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ فلاں امر بہتر ہے تو وہ بھی پہلی قسم کے ادراک کے ساتھ ملحق ہو جاتا ہے' اور یہاں بھی علم سے ارادے کو تحریک ہوتی ہے' جیسے وہاں تلوار اور سوئی سے مدافعت کے لئے ارادے کو تحریک ہوئی تھی بہرحال جب یہ ارادہ کسی ایسے فعل کے لئے اٹھتا ہے جس کی بہتری عقل کو معلوم ہو چکی ہو تو اس کے ارادے کو اختیار کہتے ہیں اور یہ خیر سے مشتق ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ مذکورہ فعل اس کے حق میں بہتری کا باعث ہے' اگرچہ یہ خیر تلوار سے دفاع کرنے میں بداہۃً ظاہر ہو جاتا ہے' اور یہاں فکر و تأمل کا محتاج ہے' اس سے ثابت ہوا کہ عقل ایک مخصوص ارادے کا نام ہے' اور وہ ان امور میں متحرک ہوتا ہے جن میں عقل تأمل کرتی ہے' اسی لئے یہ کہا گیا ہے کہ اختیار میں عقل کے لئے یہ بات ضروری ہوتی

ہے کہ وہ دو بہتر چیزوں میں سے زیادہ بہتر چیز کو اختیار کرے اور دو بری چیزوں میں سے کم بری چیز کو۔

ارادہ کب حرکت کرتا ہے یہاں یہ بات بھی واضح رہے کہ ارادہ حس و خیال کے حکم' اور ناطق عقل کے امر کے بغیر حرکت نہیں کر سکتا' چنانچہ اگر کوئی شخص اپنے ہاتھ سے اپنی گردن کاٹنا چاہے تو ایسا نہیں کر سکے گا۔ اس لئے نہیں کہ اس کے ہاتھ میں چھری نہیں ہے' یا وہ کاٹنا نہیں جانتا' یا ہاتھ میں قوت نہیں ہے' بلکہ اس لئے نہیں کاٹ سکتا کہ یہاں وہ ارادہ موجود نہیں ہے جو قوت کو تحریک دیتا ہے۔ اور ارادے کے نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ارادہ اس وقت ہوتا ہے جب حس اور عقل سے یہ بات معلوم ہو جائے کہ فلاں فعل موافق اور بہتر ہے۔ کیوں کہ خود کشی موافق نہیں ہوتی اس لئے اعضاء کی قوت کے باوجود انسان اپنا سرتن سے جدا نہیں کرپاتا' اِلاّ یہ کہ کوئی شخص ناقابل برداشت اذیت سے دوچار ہو' یہاں عقل کوئی فیصلہ کرنے میں متردّد رہتی ہے' اور یہ تردد دو برائیوں میں ہوتا ہے یعنی خود کشی بھی بری ہے' اور اس مصیبت میں گرفتار رہنا بھی برا ہے۔ اب اگر غور و فکر کے بعد یہ واضح ہو جائے کہ خود کشی نہ کرنے میں برائی کم ہے تو وہ اپنے آپ کو قتل نہیں کرے گا' اور اگر عقل یہ فیصلہ کرے کہ قتل نفس میں برائی کم ہے' اور یہ حکم قطعی اور آخری ہو تو اس کے نتیجے میں ارادہ اور قوت پیدا ہوگی اور وہ شخص اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالے گا۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص کسی کے پیچھے تلوار لے کر دوڑے اور وہ خوف کی وجہ سے بھاگ کھڑا ہو یہاں تک کہ چھت سے گر کر مر جائے یا کنویں میں ڈوب کر ہلاک ہو جائے' حالانکہ جان دونوں صورتوں میں ضائع ہوتی ہے' مگر وہ اس کی پروا نہیں کرتا' اور چھت سے گر کر مر جاتا ہے' لیکن اگر کوئی شخص محض ہلکی مار مار رہا ہو' اور وہ پٹتا ہوا چھت کے اس حصے تک جا پہنچے جہاں سے نیچے گر سکتا ہے تو وہاں عقل یہ فیصلہ کرتی ہے کہ پٹنا گر کر ہلاک ہو جانے کے مقابلے میں معمولی ہے' عقل کے اس فیصلے کے بعد اس کے اعضاء ٹھہر جاتے ہیں' پھر یہ ممکن نہیں رہتا کہ وہ خود اپنے آپ کو نیچے گرا دے۔ اس کا ارادہ بھی پیدا نہیں ہوتا۔ کیوں کہ ارادہ عقل اور حس کے حکم کے تابع ہوا کرتا ہے' اور قدرت ارادے کی اتباع کرتی ہے' اور اعضاء کی حرکت قدرت کے تابع ہوتی ہے۔ یہ تمام امور آدمی میں اسی ترتیب سے پائے جاتے ہیں' اور اسے اس کی خبر بھی نہیں ہوتی' آدمی ان امور کا محل ہے' یہ امور اس سے صادر نہیں ہوتے۔

اس تفصیل سے ثابت ہوتا ہے کہ آدمی کے اندر یہ تمام افعال غیر سے حاصل ہوتے ہیں' خود اس سے نہیں ہوتے' اور مختار ہونے کے معنی یہ ہیں کہ وہ اس ارادے کا محل ہے جو اس کے اندر عقل کے فیصلے کے بعد کہ فلاں کام خیر محض اور موافق ہے جبراً پیدا ہوا ہے' یہ حکم جبراً ہوا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ آدمی اختیار پر مجبور ہے۔ یہ بات اس طرح زیادہ واضح طریقے سے سمجھ میں آئے گی کہ آگ کا فعل جلانا جبر محض ہے' اور اللہ تعالیٰ کا فعل اختیار محض ہے' اور انسان کا فعل دونوں کے درمیان ہے یعنی اس کا فعل اختیار پر جبر ہے کیوں کہ یہ تیسری قسم ہے اسلئے اہل حق نے اس کا نام بھی الگ رکھا ہے اور اس سلسلے میں قرآن کریم کی اتباع کی ہے' اور انسان کے فعل کو کسب کہا ہے۔ اس میں نہ جبر کی مخالفت ہے اور نہ اختیار کی' بلکہ اہل عقل کے نزدیک کسب میں دونوں باتوں کا اجتماع ہے۔ جہاں تک اللہ تعالیٰ کا اختیار ہے وہ اللہ تعالیٰ کا مخصوص فعل ہے اور اس میں شرط یہ ہے کہ وہ اختیار نہ ہو جو حیرت و تردّد کے بعد ارادے کی صورت میں ہوتا ہے' اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کے حق میں ایسا اختیار محال ہے۔ اللہ تعالیٰ کے لئے لغت میں جس قدر الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں وہ مجاز اور استعارے کے طور پر ہیں' یہ موضوع تفصیلی ہے اور اس مقام کے قابل نہیں ہے اس لئے ہم یہاں صرف اشارہ کئے دیتے ہیں۔

قدرت ازلیہ کے شاخسانے اگر یہ کہا جائے کہ علم ارادہ پیدا کرتا ہے' ارادہ قدرت' اور قدرت حرکت' یعنی ہر دوسری چیز پہلی چیز سے پیدا ہوتی ہے' اگر اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے اذن و قدرت کے بغیر ایک چیز نے دوسری چیز کو پیدا کیا ہے تو یہ

ممکن نہیں' اور اگر یہ مقصد نہیں تو پھر یہ ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح کیوں مرتب نہیں' اور اگر یہ مقصد نہیں تو پھر ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح کیوں مرتب ہیں؟ اس کا جواب یہ دیا جائے گا کہ اگر اس ترتیب سے تم یہ گمان کرتے ہو کہ بعض نے بعض کو پیدا کیا ہے تو یہ جہالت ہے' بلکہ یہ تمام امور دراصل قدرت ازلیہ کے شاخسانے ہیں' اس سلسلے میں اصل وہی ہے' بلکہ یہ تمام رسوخ رکھنے والے لوگ اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں' عوام یہ بات نہیں سمجھتے' عوام صرف ظاہری لفظ میں پھنسے رہتے ہیں' لفظ قدرت سے دھوکا کھاتے ہیں' اور اس میں انسانی قدرت سے ایک نوع کی مشابہت پاکر غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں امر حق کیا ہے؟ یہ ایک تفصیلی بحث ہے' یہاں صرف اتنا جان لینا کافی ہے کہ بعض مقدورات بعض پر اس طرح مرتب ہوتے ہیں جس طرح مشروط شرط پر مرتب ہوتا ہے' چنانچہ قدرت ازلیہ سے ارادہ کا صدور اسی وقت ہوتا ہے جب علم آجاتا ہے' اور علم حیات کے بعد آتا ہے' اور حیات محل کے بعد پائی جاتی ہے' لیکن یہ نہیں کہہ سکتے کہ حیات کا حصول جسم کے وجود پر موقف ہے' جو حیات کی شرط ہے' ترتیب کے تمام درجات میں یہی صورت ہے۔ پھر بعض شرطیں تو ایسی ہیں جو اکثر لوگوں پر ظاہر ہو جاتی ہیں' اور بعض صرف ان لوگوں پر ظاہر ہوتی ہیں جو خواص کے دائرے میں آتے ہیں' اور حق کے نور سے مشاہدہ کرتے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہر متقدم حق کے ساتھ متقدم ہوتا ہے' اور ہر متاخر حق کے ساتھ متاخر ہوتا ہے' خود سے نہ کوئی چیز پہلے ہوتی ہے اور نہ بعد میں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو افعال میں تاخیر و تقدیم پاگلوں کے افعال جیسی ہوتی' جن میں کوئی ترتیب نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ نے صاف لفظوں میں اس کی تمہید فرمائی ہے :-

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ' مَاخَلَقْنٰهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ۔ (پ ۲۵ ر ۱۵ آیت ۳۹)

اور ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان میں ہے اس طرح پیدا نہیں کیا کہ ہم کھیل کرنے والے ہوں ہم نے ان دونوں کو کسی حکمت سے ہی بنایا ہے۔

گویا آسمان اور زمین میں جتنی بھی چیزیں ہیں سب کی سب ایک ترتیب واجب' اور حق لازم کے ساتھ ظہور پذیر ہوئی ہیں' ان کے بارے میں یہ تصور ہی نہیں کیا جاسکتا کہ وہ کسی دوسری ترتیب کے ساتھ بھی معرض وجود میں آسکتی تھیں جو چیز متاخر ہے وہ اپنے شرط کی انتظار میں ہے' اور مشروط کا وجود شرط سے پہلے محال ہے' اور مشروط مقدور سے متصف نہیں کیا جاسکتا۔ علم نطفے کے بعد اس لئے ہوتا ہے کہ حیات کی شرط مفقود ہوتی ہے' اور ارادہ اس لئے پیچھے رہتا ہے کہ علم کی شرط نہیں پائی جاتی۔ یہ تمام چیزیں اپنی اپنی شرطوں کے ساتھ اسی ترتیب کے ساتھ موجود ہوتی ہیں' اس ترتیب کو اتفاقی نہیں کہہ سکتے' بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت اور تدبیر کے تمام تقاضے پوری کرتی ہے۔ اگرچہ یہ سمجھنا بے حد دشوار کام ہے کہ شرط کے بغیر مشروط نہیں پایا جاسکتا' تاہم کم نظروں کے لئے ہم ایک مثال بیان کرتے ہیں اس سے معلوم ہوگا کہ قدرت کے باوجود فعل مقدور اپنی شرط پر موقوف رہتا ہے۔

اور وہ مثال یہ ہے کہ ایک بے وضو آدمی گردن تک پانی میں ڈوبا ہوا ہے' حالانکہ پانی ملنے اور اسے استعمال کرنے سے آدمی بے وضو نہیں رہتا' لیکن کیوں کہ شرط کی تکمیل نہیں ہوئی اس لئے وہ اپنی سابقہ حالت پر رہے گا' اور وہ شرط یہ ہے کہ منہ دھویا جائے۔ اسلئے جب تک منہ نہیں دھلے گا اس کے اعضاء سے حدث دور نہیں ہوگا' اسی طرح یہ بات بھی جاسکتی ہے کہ تمام مقدرات کے ساتھ قدرت ازلیہ کا اتصال اسی طریقے پر ہے جس طریقے پر بے وضو آدمی کے جسم سے پانی کا اتصال تھا' مگر مقدور اسی وقت وجود میں آئے گا جب اس کی شرط پائی جائے گی جیسے مذکورہ بالا مثال میں ازالہ حدث کا وجود منہ دھلنے پر موقوف ہے۔

شرط کے بغیر مشروط کا وجود ممکن نہیں اب اگر کوئی شخص پانی میں کھڑا ہوا ہے اور وہ اپنا چہرہ پانی کی سطح پر رکھ دے اور پانی تمام اعضاء میں مؤثر ہو کر حدث زائل کردے تو جہلاء یہ گمان کرتے ہیں کہ ہاتھوں سے حدث اس لئے دور ہوا کہ چہرے سے

دور ہو گیا تھا، یہ لوگ چہرے سے رفع حدث کو ہاتھوں میں مؤثر سمجھتے ہیں، پانی کو رافع حدث نہیں کہتے کیوں کہ ان کے بقول پانی تو پہلے بھی ان اعضاء سے متصل تھا، اس وقت رافع حدث نہیں تھا، جب چہرہ دھل گیا تو ان اعضاء سے بھی حدث جاتا رہا، حالانکہ پانی اب بھی وہی ہے جو پہلے تھا، پہلے اس سے حدث دور نہیں ہو سکا تو اب کیسے ہو گا، مگر کیوں کہ چہرہ دھلنے سے حدث دور ہوا ہے اس لئے ہم یہی کہیں گے کہ چہرہ کا دھلنا ہی رافع حدث ہے، پانی سے رفع حدث نہیں ہوا یہ خیال محض جہالت اور کم علمی پر مبنی ہے، یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی یہ خیال کرے کہ حرکت قدرت سے حاصل ہوتی ہے، اور قدرت ارادے سے، اور ارادہ علم سے، حالانکہ یہ خیال غلط ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جب چہرے سے حدث دور ہوا تو ہاتھوں کا حدث بھی اس پانی سے دور ہو گیا جو ہاتھوں سے ملا ہوا تھا، محض منہ دھونے سے دور نہیں ہوا۔ ان لوگوں کی یہ بات صحیح ہے کہ پانی پہلے بھی وہی تھا اور اب بھی وہی ہے، اور ہاتھوں میں تبدیلی نہیں ہوئی، مگر ہم یہ کہتے ہیں کہ جو شرط مفقود تھی وہ وجود میں آگئی، اور اپنے اثرات کے ساتھ وجود میں آئی۔ قدرت ازلیہ سے تمام مقدورات اسی طرح صادر ہوتے ہیں، حالانکہ قدرت ازلیہ قدیم ہے، اور تمام مقدورات حادث ہیں۔ یہ ایک نئی بحث ہے، اس بحث میں پڑیں گے تو یہ ایسا ہو گا جیسے عالم مکاشفات کے دروازے پر دستک دے رہے ہیں، اس لئے یہ بحث ہم یہیں ختم کرتے ہیں۔ ہمارا مقصد صرف فعلی توحید کے حقائق بیان کرنا ہے اور یہ واضح کرنا ہے کہ فاعل حقیقی صرف ایک ذات ہے، وہی خوف کے قابل ہے، اور وہی رجاء کا اہل ہے، اسی پر توکل کرنا چاہیے۔ اس عنوان کے تحت ہم نے جو کچھ لکھا ہے وہ توحید کے ناپیدا کنار سمندروں میں سے بھی تیسری قسم کے سمندروں کا ایک معمولی قطرہ ہے، توحید کے مکمل بیان کے لئے تو عمر نوح بھی کافی نہ ہو گی۔ توحید کے مضامین اور حقائق بیان کرنا ایسا ہے جیسے سمندر سے قطرہ قطرہ کر کے پانی لیا جائے، ظاہر ہے عمریں ختم ہو جائیں گی، لیکن سمندر اپنی جگہ باقی رہے گا۔ یہ تمام سمندر کلمۂ لا الٰہ الا اللہ میں موجود ہیں، زبان پر یہ کلمہ انتہائی ہلکا ہے، قلب کے اعتقاد کے لئے سہل ہے، لیکن علماء راسخین ہی جانتے ہیں کہ اس ایک کلمے میں کتنے حقائق پوشیدہ ہیں۔

اللہ اور بندہ دونوں فاعل ہیں ہم نے سابق میں یہ لکھا ہے کہ توحید کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی فاعل نہیں ہے، اس پر یہ اعتراض وارد ہو سکتا ہے کہ ایک طرف تم صرف اللہ کے لئے فاعلیت ثابت کرتے ہو، اور دوسری طرف شرع سے ثابت ہوتا ہے کہ بندہ بھی فاعل ہے۔ بظاہر ان دونوں باتوں میں تضاد ہے۔ کیوں کہ اگر بندہ فاعل ہو گا تو اللہ تعالیٰ کیسے فاعل ہو گا، اور اگر اللہ کو فاعل کہو گے تو پھر بندہ فاعل کیسے قرار پائے گا۔ اور اگر دونوں فاعل ہیں تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک ہی فعل کے دو فاعل ہوں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اگر فاعل کے ایک ہی معنی لئے جائیں تو یہ اعتراض وارد ہو سکتا ہے اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک فعل کے دو فاعل نہیں ہو سکتے، لیکن اگر فاعل کے دو معنی ہوں، اور لفظ میں اجمال ہو، یہاں تک کہ اس کا اطلاق دونوں معنوں پر ہو سکتا ہے، تو اس اعتراض کی گنجائش نہیں رہے گی۔ چنانچہ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ حاکم نے فلاں شخص کو قتل کر ڈالا۔ اور یہ بھی کہتے ہیں کہ جلاد نے فلاں شخص کو قتل کر ڈالا۔ یہاں حاکم ایک اعتبار سے قاتل ہے، اور جلاد دوسرے اعتبار سے۔ اسی طرح بندہ اپنے فعل کا ایک اعتبار سے فاعل ہے، اور اللہ تعالیٰ اس فعل کا دوسرے اعتبار سے فاعل ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فاعل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ فعل کا موجود اور مخترع ہے، اور بندے کے فاعل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ محل ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے قدرت پیدا فرمائی، اس سے پہلے ارادہ پیدا فرمایا اور ارادہ سے پہلے علم پیدا کیا۔ مطلب یہ ہے کہ قدرت، ارادہ اور حرکت کا ارتباط قدرت سے ایسا ہے جیسے شرط کا ارتباط مشروط سے ہوتا ہے، اور قدرت الٰہی سے ایسا ہے جیسے معلول کا ارتباط علت سے اور موجد کا ارتباط اس چیز سے ہوتا ہے جسے اس نے ایجاد کیا ہو۔ قدرت کے ساتھ ارتباط ہونے کی صورت میں محل قدرت کو بھی فاعل کہہ دیا جاتا ہے، خواہ وہ ارتباط کسی بھی طرح کا ہو، جیسا کہ مذکورہ بالا مثال میں حاکم اور جلاد دونوں کی طرف قتل کی نسبت کی گئی ہے، کیوں کہ قتل

دونوں کی قدرت سے مرتبط ہے اگرچہ یہ ارتباط ایسا نہیں ہے مگر فعل دونوں کا کہلاتا ہے اسی طرح کا ارتباط مقدورات کا دو قدرتوں سے ہوتا ہے اسی لئے اللہ تعالٰی نے قرآن کریم میں بعض افعال کو بھی فرشتوں کی طرف اور کبھی بندوں کی طرف اور کبھی خود اپنی طرف منسوب فرمایا ہے چنانچہ موت کے سلسلہ میں ارشاد فرمایا :۔

قُلْ يَتَوَفّٰكُمْ مَلَكُ الْمَوْتِ۔ (پ۲۱ ر۱۴ آیت ۱۱)

آپ فرما دیجئے کہ تمہاری جان موت کا فرشتہ قبض کرتا ہے۔

ایک جگہ اس فعل کی نسبت اپنی طرف فرمائی ہے :۔

اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا۔ (پ۲۴ ر۲ آیت ۴۲)

اللہ ہی قبض کرتا ہے جانوں کو ان کی موت کے وقت۔

ایک جگہ کاشتکاری کی نسبت بندوں کی طرف کی گئی ہے چنانچہ فرمایا :۔

اَفَرَاَيْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ ءَاَنْتُمْ تَزْرَعُوْنَهٗ۔ (پ۲۷ ر۱۵ آیت ۶۳)

اچھا پھر یہ بتلاؤ کہ تم جو کچھ بوتے ہو کیا تم اسے اگاتے ہو۔

دوسری جگہ اس فعل کو اپنی طرف منسوب فرمایا ہے :۔

اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا حَبًّا وَّعِنَبًا۔ (پ۳۰ ر۵ آیت ۲۸)

ہم نے عجیب طور پر پانی برسایا پھر عجیب طور پر زمین کو پھاڑا پھر ہم نے اس میں غلّہ اور انگور اگائے۔

ایک جگہ ارشاد فرمایا :۔

فَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا۔ (پ۱۶ ر۵ آیت ۱۷)

ہم نے ان کے پاس اپنے فرشتے کو بھیجا اور وہ ان کے سامنے ایک پورا آدمی بن کر ظاہر ہوا۔

اس کے بعد ارشاد فرمایا :۔

فَنَفَخْنَا فِيْهَا مِنْ رُّوْحِنَا۔ (پ۱۷ ر۶ آیت ۹۱)

پھر ہم نے ان میں روح پھونک دی۔

حالانکہ پھونکنے والے حضرت جبرئیل علیہ السلام تھے۔ ایک جگہ ارشاد فرمایا :۔

فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ (پ۲۹ ر۱۷ آیت ۱۸)

تو جب ہم اس کو پڑھنے لگا کریں تو آپ اس کے تابع ہو جایا کیجئے۔

مفسرین نے اس کے یہ معنی لکھے ہیں کہ جب جبرئیل تم پر قرآن کریم پڑھیں۔ ایک موقع پر اللہ تعالٰی نے ارشاد فرمایا :۔

قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ (پ۱۰ ر۸ آیت ۱۴)

ان سے لڑو اللہ تعالٰی انھیں تمہارے ہاتھوں سزا دے گا۔

اس آیت میں قتل کی نسبت مسلمانوں کی طرف کی گئی ہے اور عذاب دینے کے فعل کو اپنی طرف منسوب فرمایا ہے اور یہ تعذیب کیا ہے عین قتل ہی تو ہے جیسا کہ ایک آیت میں اس کی صراحت کی گئی ہے :۔

فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ۔ (پ۹ ر۱۶ آیت ۱۷)

سو تم نے ان کو قتل نہیں کیا لیکن اللہ تعالٰی نے ان کو قتل کیا ہے۔

ایک جگہ ارشاد فرمایا :-

وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى۔ (پ۹ ر۱۶ آیت ۱۷)

اور آپ نے (خاک کی مٹھی) نہیں پھینکی جس وقت آپ نے پھینکی تھی، لیکن اللہ تعالیٰ نے پھینکی تھی۔

اس آیت میں بظاہر نفی اور اثبات کا اجتماع ہے مگر حقیقت میں نفی اس لحاظ سے ہے کہ اللہ تعالیٰ فاعل ہو اور اثبات اس لحاظ سے کہ بندہ فاعل ہو کیوں کہ یہ دونوں دو مختلف امر ہیں۔ اس سلسلے میں کچھ قرآنی آیات یہ ہیں :-

اَلَّذِىْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ (پ۳۰ ر۲۱ آیت ۴-۵)

جس نے قلم سے تعلیم دی انسان کو ان چیزوں کی تعلیم دی جن کو وہ جانتا نہیں تھا۔

اَلرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ خَلَقَ الْاِنْسَانَ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ۔ (پ۲۷ ر۱۱ آیت ۱-۴)

رحمٰن نے قرآن کی تعلیم دی اس نے انسان کو پیدا کیا، اس کو گویائی سکھائی۔

ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ (پ۲۹ ر۱۷ آیت ۱۹)

پھر اس کا بیان کرا دینا بھی ہمارے ذمے ہے۔

اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تُمْنُوْنَ ءَاَنْتُمْ تَخْلُقُوْنَهٗ اَمْ نَحْنُ الْخٰلِقُوْنَ۔ (پ۲۷ ر۱۵ آیت ۵۹)

اچھا پھر یہ بتلاؤ کہ تم جو (عورتوں کے رحم میں) منی پہنچاتے ہو اس کو تم آدمی بناتے ہو یا ہم بنانے والے ہیں۔

ارحام کے فرشتوں کے متعلق سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ وہ رحم میں جاتے ہیں اور نطفے کو ہاتھ میں لے کر جسم کی صورت ڈھالتے ہیں، اور باری تعالیٰ کی خدمت میں عرض کرتے ہیں، یا اللہ! اسے موٹا بنائیں یا عورت، ٹیڑھا بنائیں یا سیدھا۔ اللہ تعالیٰ اس کے جواب میں اپنی مرضی سے آگاہ فرما دیتا ہے، اور فرشتے اس نطفے کو اسی طرح ڈھال دیتے ہیں جس طرح وہ چاہتا ہے (بخاری و مسلم۔ ابن مسعودؓ) ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ فرشتہ صورت بنا کر اس میں روح پھونک دیتا ہے سعادت کے ساتھ یا شقاوت کے ساتھ۔ ایک بزرگ کا ارشاد ہے کہ جس فرشتے کا نام روح ہے وہ جسموں میں روح ڈالتا ہے، وہ اپنے خاص انداز میں سانس لیتا ہے، اور اس کا ہر سانس روح بن کر جسم میں داخل ہو جاتا ہے، اسی لئے اس فرشتے کا نام روح رکھا گیا ہے۔ ان بزرگ نے اس فرشتے کے متعلق جو کچھ ارشاد فرمایا ہے وہ درست ہے، اور بعض ارباب قلوب نے اپنی بصیرت کے آئینے میں اس کا مشاہدہ بھی کیا ہے، مگر ان کا یہ کہنا کہ اس فرشتے کا نام روح ہے نقلی ثبوت کا محتاج ہے، کسی نقلی دلیل کے بغیر اسے روح کہہ دینا صرف قیاس آرائی ہے۔ ایک جگہ اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان میں اپنی نشانیوں کا ذکر فرمایا اور اس کے بعد ارشاد فرمایا :-

اَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ شَهِيْدٌ۔ (پ۲۵ ر۱ آیت ۵۳)

کیا آپ کے رب کی بات کافی نہیں ہے کہ وہ ہر چیز کا شاہد ہے۔

ایک موقع پر یہ ارشاد فرمایا :-

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ۔ (پ۳ ر۱۰ آیت ۱۸)

گواہی دی اللہ تعالیٰ نے اس کی بجز اس ذات کے کوئی معبود نہیں۔

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کو اپنی دلیل قرار دیا ہے، اور یہ کوئی حیرت کی بات نہیں ہے، بلکہ استدلال کے بے شمار طریقے ہیں، اور مختلف انداز کے ہیں۔ چنانچہ بہت سے طالبان خدا اللہ تعالیٰ کو موجودات کے مشاہدے سے پہچانتے ہیں، اور بہت سے تمام موجودات کو اللہ تعالیٰ کے ذریعے پہچانتے ہیں۔ ایک بزرگ نے اس کا اعتراف بھی کیا ہے کہ میں نے اپنے رب کو اس کی ذات سے پہچانا، اگر میرا رب نہ ہوتا تو میں اسے ہرگز نہ پہچانتا، اس آیت میں یہی مراد ہے اَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ

شَہِیْدٌ ایک طرف قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نفس کا یہ وصف بیان فرمایا ہے کہ میں مارنے والا ہوں' میں زندہ کرنے والا ہوں' دوسری طرف موت و حیات کو دو فرشتوں کے سپرد فرمایا ہے' جیسا کہ ایک حدیث میں مروی ہے کہ موت و حیات کے دو فرشتوں نے آپس میں مناظرہ کیا' موت کے فرشتے نے کہا کہ میں زندوں کو مارتا ہوں' اور زندگی کے فرشتے نے کہا کہ میں مردوں کو زندہ کرتا ہوں (گویا یہ دونوں فرشتے بطور فخر اپنے اپنے اعمال بیان کر رہے تھے) اللہ تعالیٰ نے وحی نازل فرمائی کہ تم دونوں اپنے اپنے کام میں مشغول رہو' اور جس کام کے لئے میں نے تمہیں مسخر کیا ہے وہ کرتے رہو' موت اور زندگی دینے والا میں ہوں' نہ میرے سوا کوئی مارتا ہے اور نہ کوئی جلاتا ہے (۱) اس سے ثابت ہوتا ہے کہ فعل کا استعمال کئی طرح سے ہوتا ہے' اگر گہرائی سے دیکھا جائے تو ان مختلف استعمالات میں کوئی تناقض نہیں ہے۔ ایک مرتبہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو کھجور عنایت کرتے ہوئے فرمایا :-

خُذْهَا لَوْ لَمْ تَأْتِهَا لَأَتَتْكَ (طبرانی۔ ابن عمرؓ)

اسے لے لو' اگر تم اس کے پاس نہ آتے تو یہ تمہارے پاس آتی۔

اس روایت میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے آنے کو کھجور اور انسان دونوں کی طرف منسوب فرمایا ہے' حالانکہ یہ بات بالکل واضح ہے کہ جس طرح انسان کھجور کے پاس آتا ہے' اس طرح کھجور اس کے پاس نہیں آتی۔ ایک روایت میں ہے کہ کسی صحابی نے توبہ کے دوران یہ الفاظ کہے أَتُوبُ إِلَى اللّٰهِ لَا إِلَى مُحَمَّدٍ (میں اللہ کی طرف توبہ کرتا ہوں نہ کہ محمد کی طرف) یہ سن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اس شخص نے حق کو صاحب حق کے لئے جان لیا (۲) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص تمام امور کی رضاعت اللہ تعالیٰ کی طرف کرتا وہ محقق ہے' اس نے حق اور حقیقت کی معرفت حاصل کرلی ہے اور جو غیر کی طرف کرتا ہے وہ اپنے کلام میں مجاز اور استعارہ استعمال کرنے والا ہے' اس استعمال کی بھی کوئی نہ کوئی وجہ ہوتی ہے جس طرح حقیقت کی وجہ ہوتی ہے۔ لفظ فاعل لغویین نے ایجاد اور اختراع کرنے والے کے لئے وضع کیا ہے' لیکن کیوں کہ اس نے یہ خیال کیا کہ انسان بھی اپنی قدرت سے مخترع اور موجد ہے اس لئے اسے بھی اپنی حرکت اور اپنے فعل کا فاعل کہہ دیا' اور اس کے معنی کو حقیقی معنی پر محمول کر بیٹھا' اور اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گیا کہ اس فعل کو خدا کی طرف مجازاً منسوب کیا جاتا ہے' جیسے حاکم کی طرف قتل کی نسبت مجازاً کی جاتی ہے اور جلاد کی طرف حقیقت میں۔ مگر ارباب قلوب نے معاملہ اس کے بالکل برخلاف دیکھا' اور واضعین لغت سے کہا کہ تم نے لفظ فاعل مخترع کے لئے وضع کیا ہے' اور فاعل صرف اللہ تعالیٰ ہے' اللہ کے سوا کوئی نہیں ہے۔ ان کے نزدیک فاعل حقیقی کے معنی صرف اللہ تعالیٰ کے لئے خاص ہیں' اور دوسرے پر اس کا اطلاق مجاز کے طور پر ہے' اور اس کے حقیقی معنی کسی عربی کی زبان سے قصداً یا اتفاقاً ظاہر ہو گئے تو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تحسین و تصدیق فرمائی' چنانچہ ارشاد فرمایا کہ شاعروں نے جو کچھ کہا ہے اس میں بے حد سچا شعر لبید کا یہ قول ہے۔

أَلَا كُلُّ شَيْءٍ مَا خَلَا اللّٰهَ بَاطِلُ وَكُلُّ نَعِيْمٍ لَا مُحَالَةَ زَائِلُ

(جان لو کہ اللہ کے سوا ہر چیز باطل ہے' اور ہر نعمت لامحالہ زائل ہونے والی ہے)

یعنی جس چیز کو اپنی ذات سے قیام نہیں ہے' بلکہ وہ دوسرے کے ساتھ قائم ہے وہ اپنی ذات سے باطل ہے اس کی حقیقت اور حقیقت غیر سے ہے' خود اس سے نہیں ہے بلکہ حقیقت کا زیادہ حقدار حی قیوم کے سوا کوئی نہیں ہے' اس کے سوا کسی کو حق نہیں ہے کہ وہ اپنی ذات سے قائم ہو' باقی تمام چیزیں اسی کی قدرت سے قائم ہیں' وہی حق ہے باقی تمام چیزیں باطل ہیں۔ حضرت سہیل

---

(۱) مجھے اس روایت کی اصل نہیں ملی۔ (۲) یہ روایت پہلے بھی گزر چکی ہے۔

فرماتے ہیں اے مسکین! اللہ تعالیٰ موجود تھا اور تو موجود نہیں تھا اور وہ باقی رہے گا اور تو باقی نہیں رہے گا۔ اب جب کہ تو ہو گیا تو یہ کہنے لگا ہے میں میں! تو اب بھی ویسا ہی ہو جا جیسا کہ نہیں تھا' اس لئے کہ تو آج بھی ویسا ہی ہے جیسے پہلے تھا یعنی نہ تیرا پہلے کوئی وجود تھا اور نہ حقیقت میں آج ہے۔

ثواب و عقاب چہ معنی دارد؟ اس پوری گفتگو کے بعد یقیناً یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ اگر بندہ اس قدر مجبور ہے کہ ہم اس کے جس عمل کو اختیار سمجھتے ہیں وہ بھی جبر ہے تو پھر اس عذاب اور ثواب کے کیا معنی ہیں جو بندوں کے ان گناہوں پر یا اعمال خیر پر دیا جاتا ہے' اور اس سے بڑھ کر یہ کہ غیظ و رضا کے کیا معنی ہیں' کہ اللہ تعالیٰ خود ہی اپنے فعل پر ناراض اور خود اپنے ہی فعل سے راضی ہو جاتا ہے؟ اس کا جواب ہم کتاب الشکر میں پوری وضاحت سے لکھ چکے ہیں۔ وہاں دیکھ لیا جائے۔ اب یہاں دوبارہ لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔

یہ ہے وہ مقدار توحید جو ہم نے بطور رمز بیان کی ہے اور جس سے توکّل کا حال پیدا ہوتا ہے' اور یہ توحید رحمت و حکمت پر ایمان کے بغیر مکمل نہیں ہوتی' اس لئے کہ توحید سے یہ لازم آتا ہے کہ مسبب الاسباب پر نظر ہو' اور وسعت رحمت پر ایمان کا حاصل یہ ہے کہ مسبب الاسباب پر اعتماد اور بھروسا ہو۔ توکّل کا حال اسی وقت مکمل ہوتا ہے جیسا کہ آئندہ صفحات میں اس کا بیان ہوگا جب وکیل پر متوکل کا پورا پورا اعتماد ہوتا ہے' اور اس کا دل وکیل کی شفقت اور مہربان پر پورے طور پر مطمئن ہوتا ہے۔ ایمان کی یہ قسم بھی انتہائی اعلا ہے۔ اور اس میں اہل کشف کے طریقے کی حکایت بہت زیادہ تفصیل طلب ہے' اس لئے ہم اس کا حاصل بیان کئے دیتے ہیں تاکہ طالبان توکل اس مقام کا اس طرح اعتقاد کر سکیں تو انھیں کسی قسم کا کوئی شک باقی نہ رہے۔

متوکّل کا وکیل پر اعتماد کامل اور وہ یہ ہے کہ پورے پورے یقین کے ساتھ اس امر کی تصدیق کرے کہ اگر اللہ تعالیٰ اپنی تمام مخلوق کو سب سے زیادہ عقلمند شخص کے برابر عقل اور سب سے بڑے عالم کے برابر علم عطا کرتا' اور انھیں اس قدر علم سے نوازتا جتنیں ان کے نفوس برداشت کر سکتے' اور انھیں اس قدر حکمت عطا کرتا جس کی کوئی انتہا نہ ہوتی' پھر جیسے جیسے ان کی تعداد بڑھتی ان کے علم' عقل اور حکمت میں بھی اسی قدر اضافہ فرماتا' پھر ان امور کے عواقب منکشف فرماتا' انھیں ملکوت کے اسرار سے آگاہ کرتا' اور عقوبات کے مخفی پہلوؤں' اور لطیف دقائق سے واقف فرماتا یہاں تک کہ وہ خیر و شر اور نفع و ضرر سے آگاہ ہو جاتے پھر ان سے ارشاد فرماتا کہ وہ ان علوم و حکم کے ذریعے جو انھیں عطا کئے گئے ہیں ملک و ملکوت کا نظام چلائیں' اگر وہ تمام لوگ اپنے باہمی تعاون اور مکمل منصوبہ بندی کے ساتھ اس عالم کا نظام سنبھالتے تو اللہ تعالیٰ کی اس تدبیر کی حد کو بھی نہ پہنچتے جو اس نے دنیا و آخرت میں روا رکھی ہے' اور اس نظام میں نہ ایک مچھر کے پر کے برابر کمی کر پاتے اور نہ ایک ذرہ کے برابر زیادتی کر پاتے' نہ مریض کا مرض دور کرتے' نہ عیب دار کا عیب زائل کر پاتے' نہ فقیر کا فقر ختم کرتے' اور نہ مصیبت زدہ کو راحت پہنچاتے' نہ کسی کی صحت زائل کرتے' نہ کسی مالدار کو تنگدست بناتے' نہ کسی شخص سے اللہ کی نعمتیں سلب کر پاتے۔ غرض یہ کہ اللہ تعالیٰ نے زمین اور آسمان میں جو کچھ پیدا کیا ہے اس میں ایک نقطے کی گنجائش بھی نہ پاتے' اگرچہ وہ اس پورے نظام میں عیب یا نقص یا فرق تلاش کرنے کے لئے اپنی تمام عمریں' اپنے تمام علوم اور اپنے تمام تجربے ضائع کر دیتے۔ آخر میں اسی نتیجے پر پہنچتے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں میں رزق' عمر' خوشی' غم' عجز' قدرت' ایمان' کفر' طاعت اور معصیت کی جو تقسیم روا رکھی ہے وہ سراسر عدل پر مبنی ہے' حق ہے' اس میں کوئی ظلم یا ناانصافی نہیں ہے' ہر چیز اسی ترتیب پر قائم ہے جس پر اسے ہونا چاہیے تھا' اور اسی مقدار کے ساتھ ہے جو اس کے لئے مناسب ہے' کسی چیز کا اس سے بہتر ہونا جیسی وہ ہے یا اس سے زیادہ مکمل ہونا جیسی وہ نظر آتی ہے ممکن ہی نہیں ہے' اور اگر یہ فرض کیا جائے کہ کوئی چیز اس سے بہتر اسلوب میں مل سکتی تھی اور اللہ تعالیٰ نے قدرت کے باوجود اسے اس اسلوب میں

پیدا نہیں فرمایا تو یہ بخل ہے' جود نہیں ہے' ظلم ہے عدل نہیں ہے' اور اگر یہ کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ کو قدرت نہ تھی تو اس سے عجز لازم آتا ہے' اور معبود عاجز نہیں ہوتا۔

اصل میں فقر و ضرر دنیا کے لئے نقصان یا عیب ہیں' مگر آخرت میں باعث فضیلت ہیں' اسی طرح آخرت میں اگر کوئی چیز کسی کے لئے نقصان ہے تو دوسرے کے لئے باعث راحت ہے' مثال کے طور پر اگر اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے رات پیدا نہ فرماتا تو دن کی قدر کیسے معلوم ہوتی' اور مرض نہ ہوتا تو تندرست لوگ صحت کی لذت سے کیسے ہم کنار ہوتے' اگر دوزخ نہ ہوتی تو جنت والے اس نعمت کی قدر کہاں کرتے جو انہیں عطا ہوئی ہے' جس طرح انسانوں کی بقا و تحفظ کے لئے جانوروں کا خون بہانا ظلم نہیں ہے' بلکہ کامل کو ناقص پر ترجیح دینا عدل ہے' اسی طرح اہل جنت کی نعمتوں میں اضافہ کرنے کے لئے اہل دوزخ کو عذاب دینا اور کافروں کو مومنوں کا فدیہ بنانا بھی عدل ہے' اگر ناقص نہ ہوتا تو کامل کی معرفت کیسے ہوتی' اسی طرح اگر بہائم نہ پیدا کئے جاتے تو انسان کے شرف کا اظہار کیسے ہوتا' کمال اور نقص ایک دوسرے کی نسبت سے نمایاں ہوتے ہیں۔ جود و کرم اور حکمت و دانش کا تقاضا یہی ہے کہ کامل اور ناقص دونوں طرح کی چیزیں پیدا کی جائیں بعض اوقات آدمی کے جسم کے تحفظ کے لئے اس کا ہاتھ کاٹ دیا جاتا ہے' یعنی ناقص کو کامل پر قربان کردیا جاتا ہے' اور کوئی ذی ہوش اسے ظلم نہیں کہتا۔ یہی حال دنیا و آخرت میں مخلوق کے درمیان تفاوت کا ہے' یہ فرق بہرحال عدل ہے' ظلم نہیں ہے' حق ہے کھیل نہیں ہے۔

یہ بیان بھی نہایت مہتم بالشان ہے' انتہائی وسیع ہے' اور ایک ایسا ناپیدا کنار سمندر ہے جس کی موجیں مضطرب ہیں' یہ سمندر بھی توحید کے سمندر سے کم نہیں ہے' بہت سے کم عقل' کم فہم اور نادان لوگ اس کی لہروں میں ایسے الجھے کہ نام و نشان کھو بیٹھے' وہ اس سمندر میں اترنے سے پہلے یہ نہیں سمجھے تھے کہ اس کی موجیں انتہائی سرکش ہے' یہ بات صرف اہل عقل ہی سمجھ سکتے تھے۔ اس سمندر کے اس طرف تقدیر کے راز ہیں' جن کے سلسلے میں اکثر لوگ پریشان ہیں' صرف اہل کشف ان پر مطلع ہیں' لیکن انہیں افشائے راز سے منع کردیا گیا ہے۔

حاصل گفتگو یہ ہے کہ خیر و شر دونوں کا فیصلہ ازل میں ہوچکا ہے' اور جن چیزوں کا فیصلہ ہوجاتا ہے وہ ہر حال میں واقع ہوتی ہیں انہیں روکا نہیں جاسکتا۔ تقدیر ایک ان مٹ نقش' اور ایک ابدی تحریر ہے' کوئی اسے مٹا نہیں سکتا' دنیا میں جتنی بھی چیزیں واقع ہوں گی' یا ہوچکی ہیں خواہ وہ چھوٹی ہوں یا بڑی سب کی تحریر کی قید میں ہیں' ہر چیز اپنی مدت معینہ پر واقع ہوگی' ہر واقعہ اپنی مدت کا منتظر ہے' جو چیز تجھے پہنچنے والی ہے وہ پہنچ کر رہے گی' خواہ اس کی راہ میں رکاوٹیں کیوں نہ کھڑے کردی جائیں' اور جو چیز تجھے ملنے والی نہیں ہے وہ کسی حال میں نہیں ملے گی' خواہ تو اس کے لئے کتنی ہی جدوجہد کیوں نہ کرے۔

دوسرا باب

توکّل کے احوال و اعمال

توکّل کا حال ہم نے کتاب التوکل کی ابتدا میں یہ بات بیان کی ہے کہ توکل کا مقام علم' حال اور عمل سے ترتیب پاتا ہے' ان میں سے علم کا ذکر ہوچکا ہے' اب حال کا حال سنئے جو واقع میں توکل ہے' علم اس کی اصل ہے اور عمل اس کا ثمرہ ہے۔

توکل کی تعریف میں لوگوں نے بہت کچھ کہا ہے' اس سلسلے میں ان کے اقوال بڑی حد تک مختلف بھی ہیں' اور اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ ہر شخص نے اپنے اپنے نفس کا حال لکھا ہے' اور اسی کو توکل کی تعریف قرار دیا ہے' ان ابواب میں صوفیا کی یہی عادت

رہی ہے۔ ہم یہ اقوال نقل کرکے گفتگو کو طول نہیں دینا چاہتے' اس لئے صرف امرواقعہ بیان کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔

توکّل کی حقیقت جاننا چاہیے کہ توکل وکالت سے مشتق ہے' کہتے ہیں وکل امرہ الی فلان یعنی اس نے اپنا کام فلاں شخص کے سپرد کیا' اور اس معاملے میں اس پر اعتماد کیا' جس کے سپرد کام کیا جاتا ہے اس کو وکیل کہتے ہیں' اور جو کام سپرد کرتا ہے اس کو مؤکل اور متوکل کہتے ہیں' لیکن اس سلسلے میں شرط یہ ہے کہ متوکل کو وکیل پر پورا اطمینان اور اس کا پورا اعتقاد ہو' اور اسے عاجز نہ سمجھتا ہو۔ گویا توکل میں وکیل پر قلبی اعتماد ضروری ہے۔ دنیاوی خصومات میں عام طور پر جو وکلاء مقرر کیے جاتے ہیں ان کے لئے بھی یہی شرط ہے' چنانچہ اگر کوئی شخص تم پر کوئی جھوٹا الزام عائد کرے' یا زبردستی تمہاری کوئی چیز ہتھیا لے تو تم اس کے فریب اور ظلم کے ازالے کے لئے اپنا وکیل مقرر کرتے ہو' یہ وکیل قاضی کی عدالت میں تمہاری زبان بنتا ہے' اور تمہیں مدعاعلیہ کے ظلم و فریب سے نجات دلانے کی کوشش کرتا ہے۔ تم اس وقت تک اپنے وکیل پر اعتماد کرنے والے اور اس کی وکالت پر مطمئن نہیں کہلاؤ گے جب تک کہ اس کے سلسلے میں چار امور کا اعتقاد نہیں کرو گے ایک اعلا درجے کی ہدایت' دوم قدرت' سوم انتہائی درجے کی فصاحت' اور چہارم تمام شفقت و رحمت۔ ہدایت اس لئے ضروری ہے تاکہ فریب کے مواقع سے آگاہ رہے' یہاں تک کہ وہ باریک حیلے بھی اس کی نظر میں آجائیں جو عام طور پر نگاہوں سے اوجھل ہوتے ہیں' قدرت اور قوت اس لئے ضروری ہے تاکہ پوری جرأت کے ساتھ حق بات کا اعلان کرسکے اور اس سلسلے میں کسی مداہنت سے کام نہ لے' نہ کسی سے ڈرے' نہ کسی سے شرم کرے' اور نہ بزدلی سے کام لے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ وکیل کو فریق ثانی کے فریب کی وجہ معلوم ہو جاتی ہے' لیکن وہ خوف' بزدلی' حیا یا کسی اور سبب سے اس کا اظہار نہیں کرپاتا' اور حق کے اعلان میں کمزور پڑ جاتا ہے۔ فصاحت اس لئے ضروری ہے کہ اس سے اپنی بات مؤثر انداز میں بیان کی جاسکتی ہے' یہ بھی ایک طرح کی قدرت ہی ہے' اگرچہ اس کا تعلق زبان سے ہے' فصاحت کے ذریعے انسان اپنے دل کی بات اس طرح بیان کرسکتا ہے کہ سامع متاثر ہو' ورنہ ضروری نہیں ہے کہ کوئی شخص فریق مخالف کے فریب سے آگاہ ہو کر اس کے فریب کا پردہ چاک کرسکے' اور حق بات اس اسلوب سے کرسکے کہ سننے والا قائل ہو جائے۔ شفقت اس لئے ضروری ہے کہ وکیل اپنے مؤکل کے حق میں پوری پوری کوشش کرسکے۔ اور جو کچھ اس سے ہوسکتا ہے اس سے دریغ نہ کرے' کیوں کہ صرف مواقف فریب سے آگاہ ہونا' اظہار حق پر قادر ہونا اور فصاحت و بلاغت کے گوہر بکھیرنا مقدمے کی کامیابی کے لئے کافی نہیں ہے جب تک وکیل کو اپنے مؤکل کی ذات اور حالات سے انتہائی دلچسپی نہ ہو' اور اس کے معاملات کو اپنے معاملات نہ سمجھے' اگر مقصد صرف حصول زر ہے تو اسے یہ پروا نہیں ہوگی کہ اس کا مؤکل فتح پاتا ہے یا ہزیمت اٹھاتا ہے یا اس کا حق ملتا ہے یا اپنا حق گنواتا ہے۔

اگر مؤکل کو ان چاروں میں سے ایک امر میں بھی شک ہے' اور یہ سمجھتا ہے کہ اس کا وکیل اس امر میں کمزور ہے' یا فریق ثانی ان چاروں امور میں اس کے وکیل سے آگے ہے تو اسے اپنے وکیل پر اچھی طرح اطمینان نہیں ہوسکتا۔ وہ ہر وقت دل میں متردّد رہے گا' اور یہ کوشش کرے گا کہ کس طرح اس کے وکیل کا یہ عیب دور ہو جائے' اور فریق ثانی کا تفوق باقی نہ رہے۔ مؤکل کو ان چاروں امور میں اپنے وکیل کا جس قدر اعتقاد ہوگا اسی قدر اس کے دل میں اعتماد اور اطمینان ہوگا۔ جہاں تک لوگوں کے اعتقادات اور ظنون کا تعلق ہے وہ قوت و ضعف میں یکساں نہیں رہتے' بلکہ ان میں ناقابل بیان تفاوت رہتا ہے' اسی لئے اگر متوکلین کے اعتقاد' اور اس کے نتیجے میں حاصل ہونے والے اعتماد اور طمانیت میں بھی تفاوت ہو تو یہ کوئی حیرت انگیز بات نہیں ہے' ہوسکتا ہے کسی کو اپنے وکیل پر ذرا اعتماد نہ ہو' اور کسی کا یقین اس درجے کو پہنچ جائے کہ اس میں کسی طرح کا کوئی ضعف باقی نہ رہے۔ مثلاً اگر مؤکل کا وکیل اس کا باپ ہے' اور وہ اپنے بیٹے کے لئے ذخیرہ کرنے میں حلال و حرام میں بھی فرق نہیں کرتا تو ظاہر ہے کون بیٹا ہوسکتا ہے جو ایسے باپ کی شفقت و محبت میں شبہ کرے گا' اس طرح ان چار امور میں سے ایک امر قطعی ہو جائے گا۔ باقی اور بھی اسی

طرح قطعی ہو سکتے ہیں' مثلاً اگر مؤکل کو طویل تجربات کے بعد یا تواتر سے سن کر یہ بات معلوم ہو کہ فلاں شخص انتہائی فصیح اللسان' خوش بیان' اور حق پرست ہے' تو وہ اس کی اس خصلت کو قطعی سمجھ کر اسے اپنا وکیل بنالیتا ہے۔

اگر تم اس مثال کے ذریعے توکل کی حقیقت جان گئے ہو تو اسی پر اللہ تعالیٰ پر توکل کو بھی قیاس کرلو' اگر اعتقاد یا کشف کے ذریعے تمہارے دل میں یہ بات راسخ ہو جائے کہ اللہ کے سوا کوئی فاعل نہیں ہے' اور اس کے ساتھ ہی تم یہ اعتقاد بھی کرو کہ اللہ تعالیٰ بندوں کے احوال پر اچھی طرح مطلع ہے' اور ان کے لئے کافی ہونے پر قادر ہے' اور اس کی رحمت تمام مخلوقات کو محیط اور آسمان و زمین کے ذرے ذرے کو شامل اور عام ہے' اور یہ اعتقاد بھی رکھو کہ اس کی منتہائے قدرت کے بعد کوئی قدرت نہیں' اس کے منتہائے علم کے بعد کوئی علم نہیں' اس کے منتہائے رحمت و عنایت کے بعد کوئی رحمت و عنایت نہیں ہے' اگر اللہ تعالیٰ کے بارے میں تمہارے یہ پختہ خیالات اور اعتقادات ہیں تو تم اس پر یقیناً توکل کرو گے' اور ہر حال میں اسی کی طرف توجہ کرتے رہو گے' نہ غیر کی طرف توجہ کرو گے' نہ اپنی ذات پر' اور نہ اپنی قوت اور طاقت پر بھروسا کرو گے' اس لئے کہ حول و قوت صرف اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے' جیسا کہ ہم بار بار یہ اعلان کرتے ہیں۔

لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰہِ

نہیں ہے گناہ سے باز رہنے کی طاقت' اور عبادت کی قوت مگر اللہ سے۔

اس میں حول سے حرکت مراد ہے' اور قوت سے حرکت پر قدرت۔

عدم توکل کے دو سبب اگر کسی شخص کے دل میں توکل کا یہ حال نہ ہو تو اس کے دو سبب ہو سکتے ہیں' یا تو یہ کہ ان چاروں امور میں سے کسی پر اس کا یقین کمزور ہو گا' یا اس کے سبب قلب کا ضعف' بزدلی اور پریشان خیالی ہو گی' بعض اوقات یقین کمزور نہیں ہوتا لیکن دل پر اوہام غالب ہوتے ہیں' اور وہ اس کی طبیعت میں انحراف اور کجی پیدا کرتے ہیں' جیسے اگر کوئی شخص شہد کھا رہا ہو اور اس کے سامنے اسے پاخانے سے تشبیہ دیدی جائے تو اس کے دل میں نفرت پیدا ہو جائے گی' اور کھا نہیں پائے گا۔ اسی طرح اگر کسی صاحب عقل انسان سے کہا جائے کہ وہ کسی مردے کے ساتھ اس کی قبر میں' یا اس کے کمرے میں یا اس کے بستر پر لیٹ جائے تو وہ اسکے لئے کبھی آمادہ نہیں ہوتا' حالانکہ وہ یہ بات اچھی طرح جانتا ہے کہ مردہ پتھر کی طرح بے جان اور بے حس ہے' اور نقصان پہنچانے پر قادر نہیں ہے' اور نہ یہ اللہ تعالیٰ کی عادت ہے کہ وہ کسی شخص کو مارنے کے بعد زندہ فرمادے۔ اگرچہ زندہ کرنے پر قدرت رکھتا ہے' یہ ایسا ہی ہے جیسے اللہ تعالیٰ کاتب کے ہاتھ میں قلم کو سانپ نہیں بناتا' یا کسی بلّی کو شیر نہیں بناتا' حالانکہ وہ قلم کو سانپ اور بلّی کو شیر بنانے پر قدرت رکھتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگرچہ ہر صاحب عقل کو یہ یقین ہے کہ مردہ نقصان نہیں پہنچا سکتا مگر وہ اس کے ساتھ اس کے بستر پر' یا اس کی قبر میں تنہا رہ کر رات گذارنے پر آمادہ نہیں ہے حالانکہ اسے باقی تمام جمادات سے خوف نہیں آتا' دراصل یہ بزدلی اور نامردی ہے' اور ایک طرح کا ضعف ہے' بہت کم لوگ اس طرح کے ضعف سے خالی ہوتے ہیں' بعض لوگ کچھ زیادہ ہی بزدل ہوتے ہیں' یہاں تک کہ بزدلی ان کے لئے مرض کی صورت اختیار کرلیتی ہے' اور وہ تنہائی کے تصور سے بھی متوحش ہو جاتے ہیں چہ جائیکہ کسی مردے کے ساتھ تنہا ہوں۔

اطمینان اور یقین حاصل کلام یہ ہے کہ کمال توکل کے لئے دل اور یقین دونوں کی قوت ضروری ہے' اسی وقت دل کو اطمینان اور سکون نصیب ہوتا ہے' پھر محض یقین کی قوت کافی نہیں ہے' اور نہ وہ تنہا باعث اطمینان ہو سکتا ہے جب تک کہ دل میں قوت ہو' دراصل دل کا اطمینان ایک الگ چیز ہے' اور یقین ایک الگ چیز ہے' بعض اوقات آدمی میں یقین ہوتا ہے لیکن اسے اطمینان نہیں ہوتا' جیسے حضرت ابراہیم علیہ الصلاۃ والسلام نے بارگاہ ایزدی میں یہ دعا کی کہ انھیں مردوں کو زندہ کرنے کی کیفیت

دکھلا دی جائے' باری تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اولم تومن؟ (کیا آپ نے یقین نہیں کیا) حضرت ابراہیم نے جواب میں عرض کیا :۔

بَلٰی وَلٰکِنْ لِّیَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ۔ (پ ۳ ر ۳ آیت ۲۶)

کیوں نہیں! لیکن تاکہ میرا دل مطمئن ہو جائے۔

مطلب یہ ہے کہ یقین تو ہے' لیکن مشاہدے سے دل کو جو قرار اور اطمینان حاصل ہوتا ہے وہ میسر نہیں ہے' ابتداً میں یقین اطمینان کا باعث نہیں بنتا' لیکن آہستہ آہستہ اس سے نفس مطمئنہ تشکیل پاتا ہے۔ بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جنہیں یقین نہیں ہوتا' لیکن اطمینان ہوتا ہے۔ جیسے یہودی اور عیسائی اپنے اپنے مذہب پر مطمئن ہیں حالانکہ اس کی حقانیت پر یقین نہیں رکھتے' صرف ہٹ دھرمی کی بنیاد پر اپنے مذہب کی پیروی کرتے ہیں' اور ان احکامات سے انحراف کرتے ہیں جو ان کے مذہب کی تنسیخ سے متعلق خدا کے پاس سے نازل ہو چکے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ بزدلی اور جرأت انسانی طبائع میں داخل ہیں اور ان کی موجودگی میں یقین مفید نہیں ہوتا' یہ بھی توکل کے مخالف اسباب میں سے ایک سبب ہے' جیسے ایک سبب یہ ہے کہ مذکورہ بالا چار امور میں سے کسی ایک پر یقین کمزور ہو' جب یقین اور اطمینان کے تمام اسباب مجتمع ہو جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ پر یقین کامل ہو جاتا ہے۔

توراۃ میں یہ روایت بیان کی گئی ہے کہ جو شخص اپنے جیسے کسی انسان پر توکل کرتا ہے وہ لعنت کا مستحق ہے' ایک حدیث میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص بندوں سے عزت چاہتا ہے' اللہ اسے ذلیل و رسوا کرتا ہے (ابو نعیم۔ عمر فاروقؓ)

حالت توکل کے تین درجے گذشتہ صفحات میں توکل کی حقیقت بیان کی گئی ہے' اور توکل کے حال پر روشنی ڈالی گئی ہے' اب ہم اس حال کے درجات بیان کرتے ہیں' یہ کل تین درجے ہیں' اور حالت توکل کی قوت و ضعف پر مبنی ہیں۔ پہلا درجہ وہ ہے جو ابھی بیان کیا گیا ہے کہ بندہ کا توکل اپنے مولیٰ پر ایسا ہو جیسے متوکل کا اپنے وکیل پر ہوتا ہے' اور دوسرا درجہ جو اس سے اعلا ہے یہ ہے کہ متوکل کا حال اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایسا ہو جیسے بچے کا اپنی ماں کے ساتھ ہوتا ہے' نہ وہ اپنی ماں کے علاوہ کسی کو جانتا پہچانتا ہے' نہ اس کے سوا کسی سے فریاد کرتا ہے' اور نہ اس کے علاوہ کسی پر اعتماد کرتا ہے' جب اسے دیکھتا ہے تو اس کے بدن سے لپٹ جاتا ہے' وہ مارتی بھی ہے تو اسی کے دامن میں پناہ لینے کی کوشش کرتا ہے' اس کی موجودگی میں یا عدم موجودگی میں کوئی تکلیف دہ واقعہ پیش آتا ہے تو زبان پر سب سے پہلے ماں ہی کا نام آتا ہے' اور سب سے پہلے اسی کا خیال دل میں آتا ہے' ماں کی گود ہی اس کا ٹھکانہ ہے' بچے کو ماں کی کفالت' کفایت اور شفقت پر جو اعتماد اور یقین ہوتا ہے وہ ادراک سے خالی نہیں ہوتا' جس قدر اسے تمیز ہوتی ہے اسی قدر وہ ادراک کرتا ہے' ایسا لگتا ہے کہ ماں پر اعتماد اور یقین بچے کی فطرت بن چکی ہے' لیکن اگر اس سے اس کی عادت اور فطرت کے متعلق پوچھا جائے تو وہ اس کی وضاحت نہیں کر سکتا' اور نہ اس کی تفصیل ذہن میں حاضر کر سکتا ہے' جس شخص کا دل اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو گا' اور اس کی نظر صرف اسی کے کرم پر ہو گی' اور اس کی عطاو بخشش پر اعتماد رکھتا ہو گا وہ اس سے اسی طرح عشق کریگا جس طرح بچہ اپنی ماں سے کرتا ہے' حقیقت میں یہی شخص متوکل ہو گا' بچہ بھی اپنی ماں پر متوکل ہوتا ہے۔ اس درجے اور سابقہ درجے میں فرق یہ ہے کہ اس درجے والا اس حد تک توکل پر عمل پیرا ہے کہ توکل میں فنا ہو کر رہ گیا ہے' وہ توکل اور اس کی حقیقت کی طرف ملتفت نہیں ہوتا' بلکہ صرف اس ذات کی طرف ملتفت رہتا ہے جس پر توکل کیا جاتا ہے' اس کے سوا اس کے دل میں کسی کی گنجائش نہیں ہوتی' جب کہ پہلے درجے والا شخص بتکلف توکل کرتا ہے' یہ شخص کسب سے متوکل ہے جب کہ پہلا شخص فطرتاً متوکل ہے' یہ شخص اپنے توکل سے فنا نہیں ہے' اس لئے کہ اس کے دل میں توکل کی طرف التفات اور اس کا شعور ہوتا ہے' اور یہ امر محض متوکل علیہ کی ذات پر نظر کرنے سے مانع ہے حضرت سہیل تستریؒ نے اپنے قول میں اسی درجے کی

طرف اشارہ فرمایا ہے' جب ان سے دریافت کیا گیا کہ توکل کا ادنیٰ درجہ کیا ہے انہوں نے فرمایا آرزو ترک کرنا' سائل نے دریافت کیا اور اوسط درجہ کیا ہے؟ انہوں نے فرمایا اختیار ترک کرنا' یہ دوسرے درجے کی طرف اشارہ تھا' سائل نے پھر پوچھا کہ اعلا درجہ کیا ہے' انہوں نے اس کا ذکر نہیں کیا اور فرمایا اسے وہی جانتا ہے جو اوسط درجے پر ہے۔

توکل کا تیسرا درجہ جو سب سے اعلا ہے یہ ہے کہ متوکل اپنی حرکات و سکنات میں اللہ تعالیٰ کے سامنے ایسا ہو جیسے مردہ غسل دینے والے کے ہاتھوں میں ہوتا ہے' یعنی اپنے نفس کو مردہ تصور کرلے جسے قدرت ازلیہ سے تحریک ملتی ہے جس طرح غسل دینے والے کا ہاتھ مردے کو حرکت دیتا ہے' اس متوکل کو اس امر کا پختہ یقین ہوتا ہے کہ حرکت' قدرت' ارادہ' علم اور تمام صفات کا سرچشمہ صرف ایک ذات ہے۔ اور یہ کہ ہر چیز جبرا پیدا ہوتی ہے' یہ شخص اس انتظار میں رہتا ہے کہ نہ جانے کیا پیش آنے والا ہے' ایسا شخص اس بچے سے مختلف ہے جو اپنی ماں کے پیچھے دوڑتا ہے' اس کا دامن پکڑ کر کھینچتا ہے' اور اس سے فریاد کرتا ہے' جب کہ یہ شخص اس بچے کی طرح ہے جسے یہ آس ہو کہ اسے اس کی ماں خود ڈھونڈ لے گی' اور اگر وہ اسکا دامن نہ تھامے گا تب بھی وہ اسے گود میں اٹھالے گی' اور اگر دودھ نہ مانگے گا تو ماں خود پہل کرکے اسے دودھ پلا دے گی' توکل کے اس درجے کا تقاضا یہ ہے کہ متوکل اللہ تعالیٰ کے کرم اور اس کی توجہات پر اعتماد کرکے اپنے لئے کوئی سوال نہ کرے' اور یقین رکھے کہ وہ مانگے بغیر ہی عطا کرنے والا ہے' بلکہ جو چیز مانگی جاتی ہے وہ بلا مانگے اس سے بہتر عطا کرتا ہے۔ چنانچہ اس نے پہلے ہی بے شمار نعمتیں بلا طلب اور بلا استحقاق عطا کر رکھی ہیں۔ یہ آخری اور انتہائی درجے کا تقاضا ہے' جبکہ دوسرے درجے کا تقاضا یہ ہے کہ غیر اللہ کے سامنے دست سوال پھیلانے سے باز رہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ توکل کے ان اعلا احوال اور درجات کا وجود بھی ہے یا نہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ان احوال کا وجود ناممکن اور محال نہیں ہے' البتہ انتہائی نادر اور کم یاب ضرور ہے' جبکہ دوسرے اور تیسرے درجے کو تو عنقا ہی کہا جائے تو بہتر ہے' البتہ پہلا درجہ امکان سے زیادہ قریب ہے' دوسرا اور تیسرا درجہ اگر پایا بھی جائے تو اس کا باقی رہنا انتہائی دشوار ہے۔ بلکہ تیسرے درجے کا حال وجود میں ایسا ہے جیسے چہرے پر خوف سے پیدا ہونے والی زردی کہ لمحہ بھر کے لئے پیدا ہوتی ہے اور ختم ہو جاتی ہے' دل کا اپنی حرکت اور قدرت سے کشادہ رہنا ایک طبعی امر ہے' اور سمٹنا سکڑنا ایک عارضی امر ہے' اسی طرح جسم کے تمام اطراف میں خون کا گردش کرنا ایک طبعی معاملہ ہے' اور اسکا ٹھہر جانا ایک عارضی معاملہ ہے' خوف کے معنی یہ ہیں کہ آدمی کی ظاہری جلد سے خون باطن میں سمٹ جائے۔ یہاں تک کہ وہ سرخی جو جلد کے مہین پردے سے جھلکتی ہے ختم ہو جائے' اور اس کی جگہ زردی آجائے۔ یہ صورت ہمیشہ یا دیر تک برقرار نہیں رہتی' بلکہ لمحاتی اور وقتی ہوتی ہے' جیسے ہی انسان کے ذہن سے خوف کے اثرات کا ازالہ ہوتا ہے زردی ختم ہو جاتی ہے اور اس کی جگہ حسب سابق سرخی آجاتی ہے۔ اسی طرح یہ امر بھی عارضی ہے کہ دل اپنی حرکت و قدرت سے سمٹ جائے' اور کبھی اسباب کی طرف التفات نہ کرے۔ دوسرے درجے کا دوام ایسا ہے جیسے بخار زدہ کے جسم پر چھا جانے والی زردی' یہ زردی دو چار روز برقرار رہ جاتی ہے' زیادہ دن باقی نہیں رہتی' اور پہلے درجے کا دوام اس بیمار کی زردی کی طرح ہے' جس کا مرض پرانا ہو گیا ہے' اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ مرض ہمیشہ برقرار رہے اور یہ بھی ناممکن نہیں کہ مرض ختم ہو جائے۔

احوال توکل میں مدبر' اور اسباب ظاہر سے تعلق

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ان احوال میں بندہ کا تعلق تدبیر اور اسباب ظاہری سے باقی رہتا ہے یا نہیں' اس کا جواب یہ ہے کہ تیسرے درجے میں تدبیر بالکل نہیں رہتی' جب تک یہ حالت برقرار رہتی ہے اس کی حالت دیوانوں کی سی رہتی ہے' دوسرے مقام میں بھی بظاہر کوئی تدبیر نہیں ہوتی' البتہ بندہ اس حالت میں اللہ تعالیٰ سے التجا کرتا ہے' اور اس کے سامنے اپنی احتیاج رکھتا ہے' جیسے بچہ اپنی ماں سے صرف لپٹنے وغیرہ کی تدبیر کرتا ہے'

پہلے درجے میں اصل تدبیر اور اختیار باقی رہتا ہے' البتہ بعض تدبیرات کی اجازت نہیں رہتی' جیسے متوکل مقدمات میں اپنے وکیل پر اعتماد کرتے ہوئے وہ تدابیر نہیں کرتا جو غیر وکیل سے متعلق ہوں۔ لیکن اس تدبیر سے گریز بھی نہیں کرتا جو وکیل بتلاتا ہے' یا اس کے تجربے اور عادت کی روشنی میں معلوم ہوتی ہے۔ مثلاً اگر وکیل یہ کہے کہ میں تیری وکالت اسی وقت کروں گا جب تو مقدمہ کی سماعت کے وقت عدالت میں موجود رہے گا' چنانچہ مؤکل حاضر رہنے کی تدبیر کرتا ہے' اس طرح کی تدابیر پر عمل کرنے کو وکالت کے خلاف نہیں کہا جاسکتا' یعنی یہ نہیں کہا جاسکتا کہ مؤکل اپنے وکیل سے منحرف ہے' اور اظہار حجت میں محض عزت و حشمت پر بھروسا کرتا ہے' بلکہ تمام توکل کے لئے ضروری ہے کہ وکیل نے جو راہ اس کے لئے متعین کردی ہے اس پر چلے' اگر بالفرض اسے اپنے وکیل پر توکل اور اعتماد نہ ہوتا تو اس کے کہنے سے عدالت میں کیوں حاضر ہوتا۔ وکیل کی سابقہ عادتیں بھی رہنما ہوتی ہیں' اور ان سے بھی مؤکل کو ہدایات ملتی ہیں جن پر عمل کرنا مقدمہ کی کامیابی کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ مثلاً اگر متوکل کو یہ معلوم ہو کہ میرا وکیل دستاویز کے بغیر مقدمہ نہیں لڑتا۔ اس صورت میں توکل کی تکمیل کے لئے ضروری ہے کہ اپنے وکیل کی عادت کے مطابق دستاویز تیار کرے' اور اس طرح اس پر اپنے اعتماد کا اظہار کرے۔ خلاصہ یہ ہے کہ پہلی صورت میں وکیل کے کہنے پر حاضر ہونا اور دوسری صورت میں وکیل کی عادت کے مطابق دستاویز تیار کرکے لے جانا تدبیر میں داخل ہے' اگر ان میں سے کوئی صورت اختیار نہیں کرے گا تو یہ امر توکل میں نقصان کا باعث ہوگا۔

بعض اوقات وکیل کے کہنے پر حاضر ہونے اور اس کی عادت کے پیش نظر دستاویز ساتھ رکھنے' اور اس کی بحث پر دھیان دینے سے متوکل دوسرے اور تیسرے مقام تک بھی پہنچ جاتا ہے' یہاں تک کہ پیشی کے وقت حیران و پریشان رہ جاتا ہے' اپنی حرکت اور قوت پر اعتماد باقی نہیں رہتا' بلکہ حرکت و قدرت ہی باقی نہیں رہتی' ہاں یہ بات ذہن میں رہتی ہے کہ میری حرکت و قدرت کی انتہا یہی تھی کہ جو کچھ وکیل نے مجھ سے کہا میں نے اس پر عمل کیا۔ اب وہ وقت آپہنچا ہے کہ صرف وکیل پر اعتماد اور نفس کا اطمینان باقی رہ گیا ہے یا یہ انتظار باقی رہ گیا ہے کہ عدالت میرے حق میں کیا فیصلہ کرتی ہے۔

تدابیر خلاف توکل نہیں اس تفصیل سے توکل پر ہونے والے اعتراضات خود بخود ختم ہوجاتے ہیں۔ اور یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ توکل کے لئے تمام تدابیر ترک کرنا شرط نہیں ہے۔ ویسے یہ بحث الگ ہے کہ کون سے اعمال یا تدابیر توکل کے منافی ہیں' اور کون سے جائز اور ضروری ہیں' توکل کے اعمال کے باب میں ہم یہ بحث کریں گے۔ یہاں صرف یہ بات واضح کرنی ہے کہ اگر متوکل اپنے وکیل کے کہنے پر عدالت میں حاضر ہو' یا اس کی عادت کے پیش نظر دستاویزات ساتھ لے کر آئے تو یہ امر توکل کے خلاف نہیں ہے' کیوں کہ وہ اس حقیقت سے واقف ہے کہ اگر وکیل نہ ہوتا تو میرا حاضر ہونا اور دستاویزات ساتھ لے کر آنا کسی بھی طرح مفید نہیں تھا' وہ ان دونوں باتوں کو اپنی تدبیر' یا اپنی قوت و قدرت سے مؤثر و مفید نہیں سمجھتا' بلکہ اس اعتبار سے مفید سمجھتا ہے کہ وکیل نے ان دونوں کو مقدمے کے لئے مفید سمجھا ہے'

' اگر وہ مفید نہ سمجھتا تو ہرگز مفید نہ ہوتیں' اس لئے قوت و قدرت جو کچھ ہے وہ صرف وکیل کے لئے ہے' مگر دنیاوی وکیل کے لئے یہ جملہ کہنا اچھا نہیں ہے' اور نہ وکیل کے حق میں اس کلے کے معنی پورے ہوتے ہیں' کیوں کہ وہ وکیل کی اس قوت و قدرت کا خالق نہیں ہے' بلکہ انہیں مفید بنانے میں مؤثر ہے' اور اگر وہ مفید نہ بناتا تو کبھی مفید نہ ہوتیں' البتہ ہم یہ کلمہ وکیل مطلق خدائے برحق کی شان میں استعمال کرسکتے ہیں' اور وہاں اس کے معنی مکمل ہوں گے' کیوں کہ قوت و قدرت کا خالق وہی ہے جیسا کہ توحید کے بیان میں یہ بحث گذر چکی ہے' اور اسی نے ان دونوں صفتوں کو مفید اور مؤثر بھی بنایا' اور ان فوائد کے لئے شرط بھی جو ان دونوں کے بعد معرض وجود میں آنے والے ہیں۔

اس گفتگو سے کلمہ لاحول ولا قوۃ الا باللہ کی صداقت پوری طرح واضح ہوجاتی ہے' چنانچہ اگر کوئی شخص ان الفاظ کی روشنی میں

مذکورہ بالا امور کا مشاہدہ کرے گا اسے بالیقین وہ اجر و ثواب ملے گا جس کا وعدہ احادیث میں کیا گیا ہے' یہ اجر و ثواب انتہائی عظیم ہے' اور ایسے ہی کسی عمل پر دیا جا سکتا ہے جو مہتم بالشان ہو' ورنہ محض زبان سے یہ کلمات ادا کرنا' اور دل میں سہولت کے ساتھ ان کا اعتقاد کرلینا اتنے عظیم ثواب کا باعث نہیں ہو سکتا' معلوم ہوتا ہے کہ یہ ثواب اس مشاہدے پر ملتا ہے جس کا بیان توحید میں ہوا۔

یہ ایک کلمہ ہے' اور کلمہ لاالٰہ الاّ اللہ کے لفظ و معنی کے ساتھ اس کے ثواب کی نسبت ایسی ہے جیسے ایک کے معنی کو دوسرے کے معنی سے نسبت ہے' چنانچہ کلمہ لاحول ولا قوۃ الاّ باللہ میں صرف دو چیزوں یعنی حول اور قوت کی نسبت سے اللہ تعالیٰ کی طرف کی گئی ہے' جب کہ کلمہ لاالٰہ الاّ اللہ میں تمام چیزوں کی نسبت اسی کی طرف کی گئی ہے۔ ان دونوں کلموں میں کل اور جزء کا فرق ہے۔ بعینہ یہی فرق ان دونوں کے اجر و ثواب میں بھی ہے۔ ہم نے پہلے بھی تفصیل کے ساتھ لکھا ہے کہ توحید کے دو چھلکے اور دو مغز ہوتے ہیں۔ اس کلمے اور تمام کلمات کے لئے بھی یہی بات ہے۔ لیکن عام طور پر لوگ دونوں چھلکوں میں الجھ کر رہ جاتے ہیں' مغز تک نہیں پہنچ پاتے' حالانکہ اصل مغز ہے' اور احادیث میں اجر و ثواب کا وعدہ ان ہی لوگوں کے لئے ہے جو مغز اختیار کرتے ہیں۔ جیسا کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :-

مَنْ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ صَادِقًا مِنْ قَلْبِهٖ مُخْلِصًا وَجَبَتْ لَهُ الْجَنَّةُ (طبرانی۔ زید ابن ارقم)

جس شخص نے دل کی سچائی اور خلوص کے ساتھ لاالٰہ الاّ اللہ کہا اس کے لئے جنت واجب ہو گئی۔

بعض روایات میں کلمہ لاالٰہ الاّ اللہ کے ساتھ اخلاص اور صدق کی قید نہیں ہے' وہاں مطلق سے مقید مراد ہے' بعض جگہ مغفرت کو ایمان اور عمل صالح پر موقوف فرمایا ہے' اور بعض جگہ صرف ایمان ہی کو مدار مغفرت قرار دیا گیا ہے' ایسے تمام مواقع پر ایمان سے مطلق ایمان مراد نہیں ہے' بلکہ عمل صالح کی قید ہر جگہ موجود تصور کی جائے گی (۱) اخلاص اور صدق کی قید اس لئے لگائی گئی ہے کہ آخرت محض زبانی گفتگو سے ملنے والی نہیں ہے' زبانی گفتگو کیا ہے محض زبان ہلانا دل کا اعتقاد بھی ایک گفتگو ہے گو نفس کی گفتگو ہے' لیکن صدق و اخلاص زبان اور دل کی گفتگو سے الگ چیز ہے۔ سلطنت اخروی کے تخت پر صرف مقربین جلوہ افروز ہوں گے' اور مقربین وہ لوگ ہیں جن میں اخلاص ہو' مرتبے میں ان سے قریب تر اصحاب یمین ہوں گے' ان کے لئے بھی اللہ تعالیٰ کے یہاں بے شمار اعلا ترین درجات ہیں مگر مقربین مخلصین کا درجہ انہیں نصیب نہ ہو گا' چنانچہ قرآن کریم کی سورۂ واقعہ میں اللہ تعالیٰ نے جہاں مقربین سابقین کا ذکر فرمایا ہے وہاں اس تخت کا بھی ذکر ہے جس پر وہ متمکن ہوں گے :-

عَلٰى سُرُرٍ مَّوْضُوْنَةٍ مُّتَّكِـِٕيْنَ عَلَيْهَا مُتَقٰبِلِيْنَ (پ ۲۷ ر ۱۴ آیت ۱۵-۱۶)

سونے کے تاروں سے بنے ہوئے تختوں پر تکیہ لگائے ہوئے آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے۔

اور جہاں اصحاب یمین کا ذکر فرمایا گیا وہاں اس تخت کا بیان نہیں ہے' البتہ دوسری بہت سی نعمتوں کا ذکر ہے' یعنی یہ کہ وہ جنات نعیم میں اکل و شرب' نکاح' میوؤں' پانی' سایہ' باغات اور حوروں سے لطف اندوز ہوں گے' یہ لذات تو بہائم کو بھی میسر رہتی ہیں بھلا ان لذات کو جن میں حیوانات بھی شریک ہیں اخروی سلطنت اور قرب خداوندی کی لازوال نعمت سے کیا نسبت۔ اگر یہ لذات کچھ ایسی قابل قدر چیز ہوتیں تو بہائم کو نصیب نہ ہوتیں' اور فرشتوں کو ان سے محروم نہ کیا جاتا' اور نہ انہیں بہائم کے مقابلے میں اعلا درجات سے نوازا جاتا۔ بہائم کو یہ تمام نعمتیں عموماً حاصل رہتی ہیں' باغات کی سیر کرتے ہیں' چشمۂ آب رواں سے سیراب ہوتے ہیں' درختوں کی سرسبزی اور شادابی کا مشاہدہ کرتے ہیں' طرح طرح کی غذائیں کھاتے ہیں' اور مادہ بہائم سے مجامعت کرتے ہیں۔

---

(۱) یہ بحث کتاب العقائد میں گزر چکی ہے۔

کیا یہ لذات اتنی اعلا اور عمدہ ہیں کہ اہل کمال انھیں ملائکہ پر ترجیح دیں' اور اس لذت کے درپے نہ ہوں جو فرشتوں کو قرب الٰہی میں میسر رہتی ہے' بلکہ بہائم کی لذات کے طالب ہوں' کیا کسی ذی ہوش سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو گدھے کے روپ میں دیکھنا پسند کرے گا اگر اسے دو باتوں میں سے ایک کو اختیار کرنے کے لئے کہا جائے کہ وہ چاہے تو گدھا بن جائے اور چاہے تو وہ مرتبہ پالے جو حضرت جبرئیل علیہ السلام کو حاصل ہے۔

یہاں یہ امر بھی واضح کردینا خالی از فائدہ نہیں ہے کہ جو شخص کسی چیز کے مشابہ ہوتا ہے وہ اسی کی طرف مائل ہوتا ہے' مثلاً اگر کسی شخص کا میلان کتابت کے بجائے کفش دوزی کی طرف زیادہ ہوگیا تو وہ اپنے جوہر کی رو سے کفش دوزی کی صفت سے زیادہ مشابہ ہوگا' یعنی اس پر وہی پیشہ جچے گا' اسی طرح جس شخص کا میلان بہائم کے لذات کی طرف ہوگا وہ انہی کے زیادہ مشابہ ہوگا' اسی لئے قرآن کریم میں ایسے لوگوں کے متعلق ارشاد فرمایا گیا :۔

اُولٰٓئِکَ کَالْاَنْعَامِ بَلْ ھُمْ اَضَلُّ۔ (پ ۹ ر ۲ آیت ۱۷۹)

یہ چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ یہ لوگ زیادہ بے راہ ہیں۔

ان لوگوں کو اضل اس لئے کہا گیا ہے کہ جانور تو بیچارے جانور ہیں' ان میں یہ صلاحیت کہاں ہے کہ ملائکہ کے درجات تلاش کریں' اور ان کے حصول کی کوشش کریں' انسان کو اس کی قوت دی گئی ہے' وہ اس شرف و کمال کے حصول پر قادر ہے۔ اس لئے وہ اس بات کا زیادہ مستحق ہے کہ اس کی مذمت کی جائے' وہ گمراہی سے زیادہ قریب ہے۔ یہ ایک جملہ معترضہ تھا۔ اب ہم اصل مقصد کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

ہم نے لا الٰہ الا اللہ اور لاحول ولا قوۃ کے معنی بیان کئے ہیں' اور یہ واضح کیا ہے کہ جو شخص اس مشاہدے کے بغیر جس کی تفصیل گذر چکی ہے یہ کلمات کہتا ہے وہ متوکل نہیں ہوسکتا۔ اگر تم یہ کہو کہ لاحول ولا قوۃ الا باللہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف دو چیزوں کی نسبت کی گئی ہے۔ اگر کوئی شخص یہ کلمہ نہیں کہتا' اس کے بجائے یہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان پیدا کئے ہیں' کیا اس شخص کو بھی اتنا ہی اجر و ثواب ملے گا جتنا ثواب لاحول ولا قوۃ کہنے والے کو ملتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ثواب اس چیز کے مرتبے کے مطابق ملتا ہے جس پر ثواب دینا مقصود ہے۔ اور یہاں کلمہ لاحول کہنے اور خدا تعالیٰ کو ارض و سماء کا خالق کہنے میں کوئی مساوات نہیں ہے' دونوں درجے بالکل الگ الگ ہیں' اگر درجات کی بلندی پستی کا مدار ضخامت' اور حجم پر ہوتا تو یقیناً آسمان و زمین کے خالق ہونے کا اعتراف بلند درجے کا باعث ہوتا' کیوں کہ آسمان انتہائی عظیم الشان ہے' زمین انتہائی کشادہ اور وسیع ہے' جب کہ حول اور قوۃ دو مختصر لفظ ہیں' لیکن عظمت کا مدار ضخامت پر نہیں ہے۔ یہ تو ہر شخص جانتا ہے کہ زمین و آسمان کی تخلیق انسانی کارنامہ نہیں ہے' بلکہ اللہ تعالیٰ ان کا خالق ہے' جب کہ حول اور قوت کو ہر شخص نہیں سمجھتا' معتزلہ اور فلاسفہ نے اس معاملے کو کچھ زیادہ ہی الجھا دیا ہے۔ حالانکہ وہ خود کو بڑا دقیقہ رس اور نکتہ سنج سمجھتے ہیں' مگر ان کی عقلیں اس معاملے میں دنگ ہیں' اس سے معلوم ہوا کہ یہ دونوں انتہائی مہلک ہیں خطرناک ہیں' اچھے خاصے لوگ یہاں لغزش کھا سکتے ہیں' چنانچہ بہت سے غافل لوگ اسی لئے تباہ و برباد ہوئے کہ انہوں نے اپنے لئے حول اور قوت ثابت کی' حالانکہ یہ توحید میں شرک ہے' اور غیر اللہ کو خالق ٹھہرانا ہے۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کی حسن توفیق سے اس گھاٹی کو عبور کرتا ہے' اس کا رتبہ بلند اور عظمت دوچند ہوتی ہے' اور یہی شخص لاحول ولا قوۃ الا باللہ کا صدق دلانہ اعتراف بھی کرتا ہے۔

توحید کی دو گھاٹیاں

ہم یہ بات پہلے بھی بیان کرچکے ہیں کہ توحید کی دو گھاٹیاں ہیں ایک گھاٹی یہ ہے کہ زمین' آسمان' چاند' سورج' ستاروں' ابروباراں اور تمام جمادات پر نظر کی جائے' اور دوسری گھاٹی یہ ہے کہ حیوانات کے اختیار پر نظر کی جائے' یہ گھاٹی زیادہ مہلک اور خطرناک ہے۔ جو شخص اسے عبور کرلیتا ہے وہ سرِّ توحید سے آشنا ہوجاتا ہے۔ اسی لئے اس کلمے کا بڑا ثواب ہے'

ثواب صرف الفاظ کا نہیں ہے بلکہ اس مشاہدہ کا ہے جو اس کلمے کے معنی و مفہوم کی روشنی میں ہوتا ہے۔

توکل کے سلسلے میں مشائخ کے اقوال

اس سلسلے میں بزرگان دین نے جو کچھ فرمایا ہے وہ تمام ان درجات میں مذکور ہے' جو ہم نے گذشتہ صفحات میں بیان کئے ہیں۔ اب ہم ان میں سے بعض اقوال لکھتے ہیں' تاکہ ہمارے اس دعوئی کا ثبوت ہو سکے کہ ہر قول میں توکل کے کسی نہ کسی حال کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے۔ ابو موسیٰ دیلمیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے ابو یزید بسطامیؒ سے پوچھا کہ توکل کیا ہے؟ انہوں نے فرمایا : تم اس سلسلے میں کیا کہتے ہو' میں نے کہا کہ ہمارے اصحاب فرمایا کرتے تھے کہ اگر درندے اور اژدہے تیرے دائیں بائیں ہوں تو تیرے باطن میں ذرا حرکت نہ ہو' انہوں نے کہا ہاں توکل اسی کے قریب ہے' اور فرض کرو کہ متوکل اس امر میں تمیز کرے کہ دوزخ والوں کو عذاب دیا جاتا ہے' اور جنت والے راحت و آرام پاتے ہیں تو قطعاً متوکل کہلانے کا مستحق نہیں رہے گا۔ یہاں ابو موسیٰ دیلمیؒ نے توکل کے احوال میں سے عمدہ حال بیان فرمایا ہے جسے ہم نے تیسرے درجے میں رکھا ہے' اور ابو یزید بسطامی نے علم کی وہ بہترین قسیم بیان فرمائی ہے جو توکل کے اصول میں سے ہے' اور وہ علم حکمت ہے اور یہ بات جاننا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو فعل جس طرح کیا ہے وہ اسی طرح ہونا چاہیے تھا۔ اس لئے اس کے عدل اور حکمت کی رو سے دوزخیوں اور جنتیوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ یہ انتہائی غامض اور پیچیدہ علم ہے' اس کے بعد سرّ تقدیر کی حدود ہیں۔ حضرت ابو یزید عام طور پر مقامات کی بلندیوں پر بولتے تھے' ان سے کم تر درجات کے متعلق کم ہی سنا گیا ہے۔ توکل کے ابتدائی درجے میں یہ شرط نہیں ہے کہ سانپوں سے حفاظت کی تدبیر نہ کرے' اس لئے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے غار ثور میں سانپوں کی راہیں مسدود فرمائی تھیں' اگر سانپوں سے احتیاط نہ کرنا داخل توکل نہ ہوتا تو آپ ان کے راستے بند کیوں فرماتے' البتہ اتنا کہا جا سکتا ہے کہ یہ ممکن ہے کہ انہوں نے پاؤں سے راستہ بند کر دیا ہو' اور باطن میں ان کے خوف سے کوئی تغیر رونما نہ ہوا ہو' یا یہ کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور شفقت کے نقطۂ نظر سے ایسا کیا ہو۔ اپنے نفس کا حق ان کے پیش نظر نہ رہا ہو' توکل باطن کی ایسی تحریک یا تغیر سے ضائع ہو جاتا ہے جس سے صرف اپنے نفس کی منفعت مقصود ہو۔ بہر حال حضرت ابوبکر کے واقعے میں تاویلات کی جا سکتی ہیں۔ لیکن ہم یہ کہتے ہیں کہ اس طرح کے امور توکل کے خلاف نہیں ہیں۔ اس لئے کہ سانپوں کو دیکھ کر باطن کا جنبش کرنا خوف ہے' اور متوکل کو سانپوں کو مسلط کرنے والے سے ڈرنے کا حق پہنچتا ہے' اس لئے کہ سانپوں کو صرف اللہ ہی سے حرکت و قدرت ملی ہے۔ اس لئے اگر کوئی شخص سانپوں سے احتراز کرے تو اپنی تدبیر' حول اور قدرت پر بھروسا نہ کرے' بلکہ اللہ تعالیٰ کے حول و قوت اور تدبیر پر اعتماد کرے' حضرت ذوالنون مصریؒ سے توکل کے متعلق دریافت کیا گیا تو انہوں نے فرمایا ارباب سے لاتعلقی' اور اسباب کا ترک۔ ارباب سے لاتعلقی کے ذریعے علم التوحید کی طرف اشارہ کیا گیا ہے' اور ترک اسباب سے اعمال کی طرف اشارہ ہے۔ اس قول میں صراحت کے ساتھ حال کا ذکر نہیں ہے' اگرچہ ضمناً اس کی تعریف بیان کی گئی ہے۔ اس کے بعد لوگوں نے ان سے عرض کیا کہ کچھ اور زیادہ بیان کیجئے' انہوں نے فرمایا نفس کو عبودیت میں ڈالنا اور ربوبیت سے نکالنا' اس قول میں ہر طرح کے حول اور قوت سے براءت کا اظہار ہے۔

حمدون قصار سے توکل کے متعلق دریافت کیا گیا' انہوں نے فرمایا کہ اگر کسی شخص کے پاس دس ہزار درہم موجود ہوں اور اس پر ایک دمڑی قرض ہو تو اس بات سے بے خوف نہ رہے کہ مرجاؤں گا اور یہ قرض ادا نہ ہو پائے گا' اور اگر دس ہزار درہم کا قرض ہو اور ملکیت میں ایک دمڑی بھی نہ ہو تو اللہ تعالیٰ سے اسکی ادیگی کی امید رکھے۔ اس قول میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی وسیع ترین قدرت پر ایمان لاؤ' اور یہ یقین رکھو کہ مقدورات کے لئے ظاہری اسباب کے علاوہ مخفی اسباب بھی ہیں' عبداللہ القرشی سے توکل کے متعلق دریافت کیا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ ہر حال میں اللہ تعالیٰ سے تعلق رکھنا توکل ہے' سائل نے مزید کی

درخواست کی' جواب میں فرمایا کہ ہر اس سبب کا ترک جو تمہیں کسی سبب تک پہنچا دے اور صرف یہ اعتقاد کہ تمہارے تمام معاملات کا متولی صرف ایک ہے۔ عبداللہ القرشی کا پہلا جواب تینوں مقامات کے لئے عام ہے' اور دوسرا جواب صرف تیسرے مقام کی طرف خاص طور سے اشارہ کرتا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسی حضرت ابراہیم علیہ الصلاۃ والسلام کا توکل کہ جب ان سے حضرت جبرئیل علیہ السلام نے دریافت کیا کہ کیا آپ کوئی حاجت رکھتے ہیں' اس کے جواب میں آپ نے فرمایا حاجت تو ہے لیکن تمہاری طرف نہیں ہے۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام کی درخواست ایک ایسا سبب تھی جو دوسرے سبب کا باعث بنتی' اور وہ یہ کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام آپ کے تحفظ کے لئے اقدامات کریں' لیکن حضرت ابراہیم نے اپنی ضرورت کو اس اعتقاد کی وجہ سے اظہار نہیں کیا کہ اگر اللہ تعالیٰ کو میری حفاظت منظور ہوگی تو جبرئیل کو مسخر فرمادے گا' اور منظور نہیں ہوگی تو میرے کہنے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا' اللہ ہی اس معاملے کا ذمہ دار ہے۔ یہ حال ہر شخص کا نہیں ہوتا' بلکہ مبہوتین کا ہوتا ہے' یعنی ان لوگوں کا جو اللہ تعالیٰ کے اعتماد کی بنا پر اپنے نفس سے غافل ہو جاتے ہیں' لیکن اول تو اس حال کا وجود مشکل ہے' اور اگر اس حال کا وجود ہے بھی تو بڑی مشکل سے اور بہت کم۔

حضرت ابوسعید خرازؒ فرماتے ہیں کہ توکل دو چیزوں کا نام ہے اضطراب بلا سکون' اور سکون بلا اضطراب۔ غالباً انہوں نے توکل کے مقام ثانی کی طرف اشارہ فرمایا ہے اضطراب بلا سکون سے مراد یہ ہے کہ التجاء' تضرع' اور فریاد صرف اللہ ہی سے ہو جیسے بچہ اپنے ہاتھوں سے ماں کا دامن پکڑ کر اپنے اضطراب کا اظہار کرتا ہے' اور دل اس کی کمال شفقت سے پُر سکون ہوتا ہے' اور سکون بلا اضطراب سے مراد یہ ہے کہ متوکل کو اپنے وکیل پر قلبی اطمینان و اعتماد ہو۔ ابو علی دقاق کہتے ہیں کہ توکل کے تین درجے ہیں توکل' تسلیم' تفویض' متوکل اللہ تعالیٰ کے وعدے پر پُرسکون ہو جاتا ہے' صاحب تسلیم اس کی معرفت پر ہی قناعت کرتا ہے اور مفوض اس کے فیصلے پر راضی رہتا ہے۔ اس قول میں متوکل کے ان احوال کا بیان ہے جو وکیل کی شخصیت کے مشاہدے سے اس کے دل پر طاری ہوتے ہیں' ان میں علم اصل ہے' وعدہ اس کے تابع ہے' اور حکم وعدے کے بعد ہے' ان میں سے کوئی نہ کوئی حالت متوکل کے دل پر غالب رہتی ہی ہے۔

توکل کے باب میں مشائخ اور بزرگوں کے اور بھی بہت سے اقوال ہیں' مگر ان کا لکھنا طوالت سے خالی نہیں ہے' اس لئے جو کچھ عرض کیا گیا ہے اسی پر اکتفا کرتے ہیں' اور یہی مفید بھی ہے۔

متوکل کے اعمال

جاننا چاہیے کہ علم کا ثمرہ حال ہے' اور حال کا ثمرہ عمل ہے' یہ گمان کیا جاتا ہے کہ توکل بدن کے ذریعے ترک کسب' قلب کے ذریعے ترک تدبیر' اور زمین پر چیتھڑے کی طرح پڑے رہنے کا نام ہے' یہ جاہلوں کا گمان ہے' شرع میں ایسا کرنا حرام ہے' اللہ تعالیٰ نے متوکلین کی تعریف فرمائی ہے' اگر وہ محظورات اور محرمات کے ارتکاب سے توکل کے مقامات پر فائز ہوتے تو ان کی تعریف کیوں کی جاتی۔ اب ہم حقیقت واقعہ عرض کرتے ہیں۔

بندے کی حرکت و سعی میں توکل کے اثرات اس وقت نمایاں ہوتے ہیں جب اسے مقاصد کا علم ہوتا ہے' بندہ اپنے اختیار سے جو کوشش کرتا ہے اس کا دائرہ کار چار مقاصد تک محدود ہے' یا تو وہ جلب منفعت کے لئے کرتا ہے جو اس کے پاس موجود نہ ہو جیسے کسب' یا حفظ منفعت کے لئے کرتا ہے جو اس کے پاس موجود ہو جیسے ذخیرہ کرنا' یا دفع مضرت کے لئے کرتا ہے جو اس پر ابھی واقع نہیں ہوئی' جیسے ڈاکوؤں' چوروں اور درندوں سے دفاع' یا دفع مصیبت کے لئے کرتا ہے جو اس پر نازل ہو چکی ہو جیسے علاج معالجہ' بندے کی حرکات کا دائرہ کار ان چار مقاصد سے تجاوز نہیں کرتا یعنی جلب منفعت' حفظ منفعت' دفع مضرت' اور قطع مضرت۔ اب ہم ان چاروں میں توکل کی شرائط اور درجات کا الگ الگ جائزہ لیتے ہیں' اور ہر دعوی کے لئے شرعی دلائل پیش

کرتے ہیں۔

پہلا مقصد۔ جلب منفعت جن اسباب کے ذریعے آدمی تک نافع چیز پہنچتی ہے وہ تین طرح کے ہیں' ایک وہ جو یقینی ہیں' دوسرے وہ جن میں قابل اعتماد ظن کا غلبہ ہے' اور تیسرے وہ جو موہوم ہیں' نفس ان سے پوری طرح مطمئن نہیں ہوتا۔

پہلی قسم۔ قطعی اسباب یہ وہ اسباب ہیں جن کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے حکم و مشیت سے مسببات کا ارتباط ہے' ہمیشہ اسی طرح ہوتا ہے اس کے خلاف نہیں ہوتا' جیسے تمہارے سامنے کھانا رکھا ہوا ہو' اور تم بھوکے اور حاجت مند بھی ہو' لیکن اس لئے ہاتھ نہیں بڑھاتے ہو کہ خود کو متوکل کہتے ہو' اور یہ سمجھتے ہو کہ ترک سعی توکل کی شرط ہے' اور کھانے کی طرف ہاتھ بڑھانا سعی و حرکت ہے' اسی طرح دانتوں سے چبانا' اور نگلنا وغیرہ بھی حرکات ہیں' اور توکل کے منافی ہیں' حالانکہ یہ محض پاگل پن ہے' توکل سے اسے کوئی مناسبت نہیں ہے' اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ اللہ تعالیٰ بغیر روٹی کے تمہارا پیٹ بھردے گا' یا روٹی کے اندر حرکت پیدا فرمائے گا کہ وہ تمہارے منہ کی طرف بڑھے اور لقمہ بن کر تمہارے معدے میں پہنچ جائے' یا کوئی فرشتہ مسخر کیا جائے گا جو تمہارے لئے روٹی چبائے اور تمہارے معدے میں پہنچائے تو ان میں سے کچھ ہونے والا نہیں ہے۔ یہ سب امور اللہ تعالیٰ کی سنّت جاریہ کے خلاف ہیں' یہ مسبّبات اسی طرح واقع ہوتے رہیں گے جس طرح واقع ہوتے رہے ہیں' اسی طرح اگر تم کاشت نہیں کرتے' اور یہ توقع کرتے ہو کہ اللہ تعالیٰ تمہارے لئے غلہ پیدا فرمائے گا' یا تم بیوی سے ہم بستر نہیں ہوگے' اور یہ امید کرتے ہو کہ تمہاری بیوی بچہ جنے گی جس طرح حضرت مریم علیہا السلام نے شوہر کے بغیر بچہ جنا تھا تو یہ تمام باتیں جنون اور پاگل پن ہیں۔ ان مواقع پر عمل ترک کرنے کا نام توکل نہیں ہے' بلکہ توکل علم اور حال دونوں سے عبارت ہونا چاہیے۔ علم اس بات کا ہو کہ اللہ تعالیٰ نے کھانا' ہاتھ' دانت اور حرکت کی قوت پیدا کی ہے' اور وہی ہے جو تمہیں کھلاتا اور پلاتا ہے' اور عمل یہ ہے کہ تمہارے قلب کا قرار اور اعتماد اللہ تعالیٰ پر ہو' ہاتھ اور کھانے پر نہ ہو' تم اپنے ہاتھ کی صحت پر کیسے اعتماد کرسکتے ہو' ہو سکتا ہے وہ فی الحال خشک ہو جائے یا فالج کا شکار ہو جائے اسی طرح تم اپنی قوت و قدرت پر کیسے اعتماد کرسکتے ہو ہو سکتا ہے تم پر کوئی ایسی کیفیت طاری ہو جس سے تمہاری عقل زائل ہو جائے' اور تمہاری حرکت کرنے کی قوت ختم ہو جائے اسی طرح تم کھانے کی موجودگی پر اطمینان کیسے کرسکتے ہو' ہو سکتا ہے اللہ تعالیٰ تم پر کوئی ایسی مصیبت مسلط کردے جو کھانے سے تمہیں غافل کردے' یا سانپ بھیج کر تمہیں بھاگنے پر مجبور کر دے اور اس طرح تمہارے اور کھانے کے درمیان دوری واقع ہو جائے۔ یہ احتمالات ہیں' اور ان سے محفوظ رہنا فضل خداوندی کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ جب یہ صورت حال ہو تو آدمی کو اسی ذات پر بھروسا کرنا چاہیے جو اسے محفوظ رکھتا ہے' اگر اس کے علم اور حال کا عالم یہ ہے تو اسے کھانے کی طرف ہاتھ بڑھانا چاہیے' اس حرکت سے بھی وہ متوکل ہی رہے گا۔

دوسری قسم۔ ظنّی اسباب دوسری قسم میں وہ اسباب شامل ہیں جو یقینی نہیں ہیں' لیکن غالب یہ ہے کہ مسبّبات ان کے بغیر حاصل نہیں ہوتے' اور ان کے بغیر مسبّبات کا حصول بسا اوقات مشکل ہو جاتا ہے' مثلاً اگر کوئی شخص شہروں اور قافلوں سے جدا ہو کر ایسے جنگلوں میں سفر کرے جن میں انسانوں کی آمد و رفت بہت کم ہو' اور اس سفر میں زاد راہ ساتھ نہ لے۔ زاد راہ ساتھ لے کر اس طرح کے اسفار کرنا توکل کے لئے شرط نہیں ہے' بلکہ بزرگوں کا اسوہ یہ رہا ہے کہ وہ اپنے ساتھ توشہ رکھتے تھے اور اسے توکل کے خلاف نہیں سمجھتے تھے بشرطیکہ مسافر کو اپنے اللہ کے فضل پر کامل اعتماد ہو' تاہم اگر کوئی توشہ لے کر نہ چلے تو اس میں بھی کوئی مضائقہ نہیں' اور یہ توکل کے مقامات میں سے انتہائی اعلا مقام ہے خواص وغیرہ بزرگان دین اسی مقام پر فائز تھے۔

یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ توشہ نہ لے کر چلنا اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا' اور موت کی طرف قدم بڑھانا' اور یہ حرام ہے۔ ہم اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ اگر دو شرطیں پائی جائیں تو ایسا کرنا حرام نہیں ہوگا۔ ایک تو یہ کہ اس شخص نے اپنے نفس کی ریاضت اور مجاہدے سے یہ عادت بنالی ہو کہ ہفتہ دس روز کھانے سے صبر کرسکتا ہو' اور صبر کرنے میں اس کا دل مشوش اور قلب پریشان نہ ہوتا

ہو' اور نہ ذکر الٰہی سے مانع بنتا ہو' اور دوسری شرط یہ ہے کہ گھاس پھوس اور اسی جیسی دوسری چیزیں کھا کر بھی پیٹ بھر سکتا ہو' اگر کوئی شخص یہ دو شرطیں پوری کرتا ہو' اور اس نے توشہ لئے بغیر سفر شروع کردیا ہے تو امید یہی ہے کہ اسے ہفتہ میں ایک بار کسی انسان کا سامنا ضرور ہو گا یا کسی گاؤں اور بستی سے گذر ہو گا' یا جنگل میں ایسی گھاس اور سبزی مل جائے گی جسے کھا کر زندہ رہ سکے گا' لیکن یہ عادت مجاہدے سے بنتی ہے' اور مجاہدہ ہی توکل کا ستون ہے۔ خواص اور ان جیسے لوگ اسی پر اعتماد کرتے تھے' اور اس کی دلیل یہ کہ خواص اپنے ساتھ سوئی' قینچی' رسّی' اور ڈول ضرور رکھتے تھے' اور فرماتے تھے کہ اس سے توکل میں فرق نہیں آیا' اور یہ چیزیں ساتھ رکھنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ جانتے تھے کہ جنگلوں میں زمین کے اوپر پانی نہیں ملتا گہرے کنوؤں میں ہوتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی سنّت یہ نہیں ہے کہ کنویں سے پانی خود بخود چڑھ کر اوپر آجائے' اور ڈول رسّی کے استعمال کی ضرورت نہ پڑے' پھر جنگلوں میں عام طور پر ڈول اور رسّی نہیں پائے جاتے' ہاں گھاس عادتاً پائی جاتی ہے' پھر پانی کے لئے اس اہتمام کی ضرورت یوں بھی ہے کہ مسافر کو وضو کے لئے شب و روز میں کئی بار' اور پینے کے لئے ایک دن یا دو دن میں کم از کم ایک بار پانی کی ضرورت ضرور پڑتی ہے' حرکت سے جسم میں حرارت پیدا ہوتی ہے' اور حرارت کی موجودگی میں آدمی کھانے سے صبر کرسکتا ہے' لیکن پانی سے صبر نہیں کرسکتا۔ اسی طرح اگر کسی کے پاس ایک کپڑا ہو اور وہ پھٹ جائے تو اس کا ستر کھل جائے گا اور جنگل میں سوئی قینچی نہیں ملے گی۔ جن کے ذریعے ستر عورت کے بقدر کپڑا سی کر نماز ادا کرسکے' اور نہ کوئی ایسی چیز مل سکے گی جو سینے اور کاٹنے میں سوئی اور قینچی کے قائم مقام بن سکے۔

اس گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ جو چیزیں ان چاروں جیسی ہیں' یعنی ان سے وہی ضرورت پوری ہوتی ہو جو ڈول اور سوئی اور قینچی سے پوری ہوتی ہے' انہیں پہلی قسم سے ملحق قرار دیا جائے گا۔ ملحق اس لئے کہا ہے کہ ان میں احتمالات ہوسکتے ہیں : مثلاً یہ کپڑا نہ پھٹے' یا کوئی شخص مل جائے' اور دوسرا کپڑا دیدے' یا کنویں کی منڈیر پر کوئی ایسا شخص مل جائے جو اسے پانی پلادے' جب کہ پہلی قسم میں اس طرح کے احتمالات نہیں ہیں مثلاً یہ کہ کھانا خود بخود تمہارے منہ میں اور منہ سے معدے میں نہیں پہنچ سکتا' اس لئے ان دونوں میں بڑا فرق ہے' اور اسی بنا پر ہم نے سوئی وغیرہ کو اس قسم میں داخل نہیں کیا بلکہ تابع اور ملحق کہا ہے۔ اس دوسری قسم کی چیزیں معنی پہلی قسم کے ساتھ شریک ہیں' اس لئے ان چیزوں کو توکل کی وجہ سے ترک کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ اور اسی سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ اگر کوئی شخص پہاڑ کی کسی ایسی کھوہ میں جاکر رہنے لگے جہاں نہ دانہ پانی ہو اور نہ کوئی ایسا ذریعہ جس سے کھانے پینے کی اشیاء فراہم ہوسکیں تو یہ فعل جائز نہ ہو گا' اور ایسا شخص خود کشی کا مرتکب ہو گا کسی زاہد کا واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ آبادی سے نکل کر پہاڑی کی کھوہ میں جا بیٹھا' اور سات روز تک بھوکا پیاسا وہیں مقیم رہا' اس نے یہ عہد کیا تھا کہ میں کسی سے کچھ نہیں مانگوں گا' وہاں رہ کر اپنے رزق کا انتظار کروں گا' لیکن رزق نہیں آتا' اور بھوک پیاس کی شدت نے اسے بے حال کردیا' قریب تھا کہ ہلاک ہوجائے' اچانک اس کے دل میں دعا کا خیال آیا اور کہنے لگا یا اللہ! اگر تو مجھے زندہ رکھنا چاہتا ہے تو وہ رزق بھیج جو تو نے میری قسمت میں لکھا ہے ورنہ میری روح قبض کرلے' ندا آئی کہ مجھے میری عزت کی قسم ہے میں تجھے اس وقت تک رزق نہیں دوں گا جب تک تو آبادی کا رخ نہیں کرے گا اور لوگوں میں جاکر نہیں بیٹھے گا۔ چنانچہ وہ شخص شہر گیا اور لوگوں کے پاس جاکر بیٹھا' کوئی اس کے لئے کھانا لے کر آیا' کسی نے پانی پیش کیا' اس نے کھایا پیا' اور دل میں وسوسے کا شکار ہو گیا' آواز آئی کہ کیا تو اپنے زہد سے میری حکمت ضائع کرنا چاہتا ہے۔ کیا تجھے یہ بات معلوم نہیں ہے کہ میں اپنے بندوں کو بندوں ہی کے ذریعے رزق پہنچانا اس سے بہتر سمجھتا ہوں کہ اپنے دست قدرت سے پہنچاؤں۔

خلاصہ یہ ہے کہ اسباب سے دوری باری تعالیٰ کی حکمت کے خلاف ہے' اور اللہ تعالیٰ کی سنّت سے ناواقفیت ہے' اور اللہ تعالیٰ کی سنّت مقررہ کے مطابق اس طرح عمل کرنا کہ اس پر اعتماد ہو اسباب پر نہ ہو توکل کے خلاف نہیں ہے' جیسا کہ ہم نے مقدمات کے وکیل کی مثال دے کر یہ بات واضح کردی ہے۔

اسباب ظاہری اور مخفی اسباب لیکن یہاں اسباب کی دو قسمیں ہیں ظاہری اور مخفی' بندہ کو چاہئے کہ وہ ظاہری اسباب سے اعراض کرے' اور مخفی اسباب پر اکتفا کرے' ساتھ ہی اس کا دل مسبّب الاسباب پر مطمئن ہو' اسباب پر مطمئن نہ ہو۔

کسب اور توکل یہاں ایک بحث اور پیدا ہوتی ہے' اور وہ یہ کہ آدمی کا بغیر کسی پیشے اور ذریعہ آمدنی کے شہر میں بیٹھے رہنے کا حکم ہے' حرام ہے یا مباح ہے یا مستحب ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ایسا کرنا حرام نہیں ہے اس لئے کہ جب جنگل میں زادِ راہ کے بغیر گھومنے والا اپنی جان تلف کرنے والا نہیں مانا گیا تو یہ شخص اپنے نفس کو ہلاک کرنے والا کیسے کہا جائے گا' اور اس کے عمل کو حرام کس لئے کہا جائے گا' ہو سکتا ہے اسے کسی ایسی جگہ سے رزق مل جائے جس کا اسے گمان بھی نہ ہو تاہم اس میں تاخیر ہو سکتی ہے' اور اس کے لئے اس وقت تک صبر کرنا ممکن ہے کہ کوئی اسے کھانے پینے کا سامان دے۔ لیکن اگر کوئی شخص گھر کا دروازہ اس طرح بند کر کے بیٹھ جائے کہ نہ خود باہر نکلے اور نہ کسی دوسرے کو اندر آنے دے تو یہ حرام ہے۔ البتہ اگر وہ گھر کا دروازہ کھولے بیکار بیٹھا ہے' عبادت میں مشغول نہیں ہے تو اس سے بہتر یہ ہے کہ باہر نکلے اور کوئی ذریعۂ آمدنی تلاش کرے' حرام اس کے فعل کو بھی نہیں کہا جا سکتا' الاّ یہ کہ موت سے قریب ہو جائے' اس صورت میں گھر سے باہر نکل کر سوال کرنا اور کمانا ضروری ہے۔ اگر کوئی شخص اپنے قلب کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے مشغول ہو' اور لوگوں پر نظر نہ رکھتا ہو' اور نہ کسی ایسے شخص کا منتظر ہو جو اس کے لئے کھانا لے کر آئے' بلکہ اس کی نظر صرف اللہ تعالیٰ پر ہو' اور اس کی عبادت میں مشغول ہو' یہ توکل کے مقامات میں سے افضل ترین مقام ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ذکر و فکر میں مشغول بعض علماء نے بڑی صحیح بات کہی ہے کہ جو بندہ اپنے رزق سے راہ فرار اختیار کرتا ہے رزق اسے تلاش کر لیتا ہے جیسے موت سے فرار ہونے والے کو موت ڈھونڈ لیتی ہے۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ جو شخص یہ دعا کرے گا کہ اے اللہ مجھے رزق عطا نہ کر' اس کی دعا قبول نہیں ہوگی گناہ گار ہو گا اور بارگہ ایزدی سے اسے یہ خطاب ہو گا کہ اے جاہل یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تجھے پیدا کروں اور رزق نہ دوں۔ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ لوگ ہر معاملے میں مختلف نظر آتے ہیں' لیکن رزق اور موت کے سلسلے میں ان کا اتفاق ہے کہ وہی رزق دینے والا ہے اور وہی موت دینے والا ہے۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں :-

لَوْ تَوَكَّلْتُمْ عَلَى اللّٰهِ حَقَّ تَوَكُّلِهِ لَرَزَقَكُمْ كَمَا يَرْزُقُ الطَّيْرَ تَغْدُوْ خِمَاصًا وَ تَرُوْحُ بِطَانًا وَلَزَالَتْ بِدُعَائِكُمُ الْجِبَالُ۔ (امام محمد ابن نصر۔ معاذ ابن جبلؓ)

اگر تم اللہ تعالیٰ پر ایسا توکل کرو جیسا کہ اس کا حق ہے تو تم کو ایسی روزی دے جیسے پرندوں کو دیتا ہے کہ صبح کو بھوکے اٹھتے ہیں اور شام کو شکم سیر ہو جاتے ہیں' اور تمہاری دعا سے پہاڑ ٹل جائیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں کہ پرندوں کی طرف دیکھو کہ نہ یہ بوتے ہیں' نہ کاٹتے ہیں اور نہ ذخیرہ کرتے ہیں' لیکن اللہ تعالیٰ انھیں ہر روز رزق عطا فرماتا ہے' اگر تم یہ کہو کہ تمہارے پیٹ بڑے ہیں تو ان چوپایوں کو دیکھ لو کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو رزق بہم پہنچانے کے لئے اس مخلوق کو مقرر فرما دیا ہے۔ ابو یعقوب موسیٰ کہتے ہیں کہ توکل کرنے والوں کا رزق ان کی مشقت کے بغیر بندوں کے ہاتھوں میں گردش کرتا رہتا ہے' اور دوسرے لوگ رزق کی فکر میں مشغول رہتے ہیں اور مشقت اٹھاتے ہیں۔ ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ تمام بندوں کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے رزق ملتا ہے' لیکن بعض لوگ سوال کی ذلت اٹھا کر رزق پاتے ہیں' بعض لوگوں کو تاجروں کی طرح تعب اور انتظار کرنا پڑتا ہے۔ بعض خون پسینہ ایک کر کے کماتے ہیں جیسے دست کار' اور مزدور' اور بعض لوگ عزت کے ساتھ رزق حاصل کرتے ہیں جیسے صوفیاء کہ حاکم وقت کے پاس گئے' اور اس سے اپنا رزق لے کر چلے آئے' درمیانی واسطوں کی ان کے یہاں کوئی اہمیت نہیں ہے۔

تیسری قسم۔ وہمی اسباب یہ وہ اسباب ہیں کہ ان سے مسببات تک پہنچنا وہمی ہوتا ہے۔ ضروری نہیں کہ تم کوئی تدبیر

اختیار کرو اور اس میں کامیاب ہو جاؤ' عام طور پر لوگ مال کے حصول کے لئے بڑی بڑی تدبیریں کرتے ہیں' اور وسیع تر منصوبے بناتے ہیں' حالانکہ یہ ضروری نہیں ہو تا کہ انہیں ان کے منصوبے اور تدبیر کے مطابق مال مل جائے' ان اسباب کو استعمال کرنے والا قطعی طور پر توکل کے درجات سے نکل جاتا ہے' اکثر لوگ اس میں مبتلا ہیں مباح مال حاصل کرنے کے لئے زبردست جدوجہد کرتے ہیں' اور ہزاروں تدبیریں کرتے ہیں' مشتبہ مال لینے' یا مشتبہ ذرائع سے مال حاصل کرنے سے توکل بدرجہ اولیٰ باطل ہو جاتا ہے' کیوں کہ یہ اس بات کی علامت ہے کہ بندہ دنیا میں اپنی امیدیں دراز رکھتا ہے اور اسباب پر پورا بھروسا کرتا ہے۔ جلب منفعت سے ان اسباب کو وہی نسبت ہے' جو جادو' فال اور داغ لگانے کو دفع مضرت سے ہے۔ یعنی جس طرح دفع مضرت کے لئے جادو منتر استعمال کرنا صحیح نہیں ہے بلکہ بد عقیدگی ہے اسی طرح جلب منفعت کے لئے اس تیسری قسم کے اسباب کا استعمال بھی صحیح نہیں ہے اور توکل کے روح کے منافی ہے' سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے متوکلین کا یہ وصف بیان فرمایا ہے کہ وہ ان اسباب پر بھروسا نہیں کرتے' لیکن کہیں بھی یہ ارشاد نہیں فرمایا کہ وہ کسب نہیں کرتے یا وہ شہروں میں نہیں رہتے' یا لوگوں سے کچھ نہیں لیتے' بلکہ روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ متوکلین یہ تمام کام کرتے ہیں۔

تیسری قسم کے اسباب جن سے مسببات کا حصول یقینی' یا غالب ظنی نہیں ہوتا بے شمار ہیں۔ حضرت سہیل تستری فرماتے ہیں کہ تدبیر نہ کرنا توکل ہے' اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا فرمایا اور انہیں اپنے نفس سے محجوب نہیں رکھا' ان کا حجاب ان کی تدبیر ہی تو ہے' غالباً حضرت سہیل تستری کی مراد بعید ترین اسباب کی تدبیر ہے' انہی میں فکر و تدبیر کی ضرورت ہوتی ہے' ظاہری اسباب میں اس کی ضرورت نہیں پڑتی۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اسباب کی دو قسمیں ہیں' بعض اسباب وہ ہیں کہ ان پر عمل کرنے سے آدمی متوکل نہیں رہتا' اور بعض وہ ہیں جن پر عمل پیرا ہونے سے توکل پر اثر نہیں پڑتا اس دوسری قسم کی پھر دو قسمیں ہیں قطعی' اور ظنی۔ قطعی قسم کے اسباب پر عمل کرنے سے آدمی توکل سے نہیں نکلتا بشرطیکہ توکل کا حال اور علم دونوں موجود ہوں' اور صرف مسبب الاسباب پر اعتماد ہو۔ گویا اس قسم میں توکل حال اور علم کے اعتبار سے ہے' عمل کے اعتبار سے نہیں' اور ظنی میں حال' علم اور عمل سب کے اعتبار سے ہے۔

متوکلین کے تین درجات مذکورہ بالا اسباب پر عمل کرنے کے اعتبار سے متوکل کے تین مقامات ہیں :۔

پہلا مقام خواص اور ان جیسے بزرگوں کا ہے' یہ لوگ زاد راہ لئے بغیر محض فضل الٰہی پر اعتماد کے ساتھ جنگلوں میں گھومتے پھرتے تھے' اور یہ یقین رکھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں ایک ہفتہ یا اس سے زیادہ صبر کرنے کی طاقت عطا فرمائے گا' اور اس دوران جنگل میں کوئی گھاس یا سبزی ایسی مل جائے گی جس سے ہم اپنا پیٹ بھر سکیں گے' اور اگر کوئی چیز نہ ملی تو ثبات قدمی اور رضا کے ساتھ مر جائیں گے' بعض اوقات وہ لوگ بھی فاقے سے مر جاتے ہیں جو توشہ لے کر چلتے ہیں' کبھی توشہ ضائع ہو جاتا ہے' اور کبھی راہ رو رستے سے بھٹک جاتے ہیں' اور توشہ ختم ہو جاتا ہے' موت اٹل حقیقت ہے' وہ ان لوگوں پر بھی آتی ہے جو توشہ رکھتے ہیں' اور وہ لوگ بھی مرتے ہیں جو توشہ نہیں رکھتے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کے فضل پر تکیہ کر کے مرا جائے تو یہ زیادہ بہتر ہے۔

دوسرا مقام یہ ہے کہ اپنے گھر کے اندر یا مسجد میں محصور ہو جائے' اور وہیں رہ کر ذکر و فکر میں مشغول ہو' لیکن یہ صورت کسی گاؤں یا شہر میں ہونی چاہیے' یہ مقام مرتبے میں پہلے مقام سے کم ہے' لیکن یہ بھی توکل ہی ہے' کیوں کہ وہ شخص معیشت اور رزق کے ظاہری اسباب ترک کر کے محض اللہ کے فضل پر اعتماد کرتا ہے' اور یہ یقین رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ خفی اسباب سے میری ضرورتیں پوری فرمائے گا' اگرچہ یہ شخص آبادی کے درمیان بیٹھا ہوا ہے' اور معیشت کے ظاہری اسباب کا تارک ہے' حالانکہ آبادی میں قیام پذیر ہونا بھی حصول رزق کا ایک سبب ہے' تاہم ایسا کرنے سے اس شخص کا توکل باطل نہیں ہوتا' بشرطیکہ اس کی نظر شہر کے لوگوں پر نہ ہو' بلکہ اس ذات پر ہو جو اسے شہر کے لوگوں سے رزق دلواتا ہے' یہ بھی ممکن تھا کہ لوگ اس سے غافل ہو

جاتے اور کوئی شخص بھی اسے رزق فراہم نہ کرتا' یہ بھی تو اللہ ہی کا فضل ہے کہ وہ لوگوں کو اس کی طرف متوجہ رکھتا ہے' اسی لئے وہ اس کی خبر گیری کرتے ہیں۔

تیسرا مقام یہ ہے کہ گھر میں مقید ہو کر نہ رہے' باہر نکلے' ان تمام شرائط کے مطابق کمائے جو کتاب آداب الکسب کے تیسرے اور چوتھے باب میں مذکور ہیں' اس کسب و سعی سے بھی وہ توکل کے مقامات سے خارج نہیں ہوگا' بشرطیکہ اسے اپنی کفایت' قوت' وجاہت اور بضاعت پر بھروسا نہ ہو' اس لئے کہ یہ چیزیں تو ایک لمحے میں فنا ہو جاتی ہیں' بلکہ اس کی نظر کفیل برحق پر ہو کہ اسی نے ان چیزوں کی حفاظت کی ہے' اور اس کے لئے یہ اسباب آسان فرمائے ہیں' اور اللہ تعالیٰ کی نسبت سے اپنی کفایت' قدرت اور کسب کی قوت کو ایسا سمجھے جیسے قلم بادشاہ کے ہاتھ میں ہوا کرتا ہے' بادشاہ کے مصاحب کی نظر اس کے قلم پر نہیں ہوتی بلکہ اس کے دل پر ہوتی ہے کہ نہ جانے اس کے دل میں کیا خیال آئے گا' وہ کس کی طرف مائل ہوگا اور کیا فیصلہ کرے گا۔

اولاد اور فقراء کے لئے کسب معیشت جو شخص اولاد کے لئے کماتا ہے یا فقراء اور مساکین پر خرچ کرنے کے لئے کماتا ہے وہ جسم سے کمانے والا اور دل سے لا تعلق ہے۔ اس کا حال اس شخص سے بہتر اور قابل تعریف ہے جو اپنے گھر میں بیٹھا رہتا ہے' اور اس کی دلیل یہ ہے کہ کسب خلاف توکل نہیں ہے اگر اس میں شرائط کی رعایت کی جائے' اور علم و معرفت کا لحاظ رکھا جائے۔ روایات میں ہے کہ جب حضرت ابو بکر الصدیقؓ خلیفہ مقرر کیے گئے تو کپڑوں کی پوٹلی بغل میں دبا کر اور گز ہاتھ میں لے کر بازار تشریف لے گئے' یہ بات مسلمانوں کو بری معلوم ہوئی اور وہ کہنے لگے کہ اب آپ نبوت کی خلافت پر متمکن ہیں : بازار نہ جایا کریں' حضرت ابو بکر الصدیقؓ نے ارشاد فرمایا کہ اگر میں اولاد کے لئے کوئی شغل نہ کروں گا تو انھیں ضائع کر دوں گا' اور جب اپنی اولاد کو تباہ کروں گا تو دوسروں کو ضرور تباہ کرنے والا ہوں گا' مسلمانوں نے ان کے لئے مسلم گھرانوں کے مطابق روزینہ مقرر کر دیا' جب حضرت ابو بکرؓ نے دیکھا کہ لوگ مجھے بازار کے کاموں میں مشغول دیکھنا پسند نہیں کرتے تو انھوں نے روزینہ قبول فرما لیا اور خود کو مسلمانوں کی مصالح کے لئے وقف کر دیا' یہاں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ حضرت ابو بکر توکل کے مقام پر فائز نہ تھے بھلا ان سے بڑھ کر امت محمدیہ میں متوکل کون ہو سکتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ حضرت ابو بکر الصدیق کا توکل یہ نہیں تھا کہ وہ کسب و سعی ترک کر دیتے' بلکہ ان کا توکل غیر اللہ سے قطع التفات کی صورت میں تھا' وہ اپنی قوت' اور کفایت پر ملتفت نہیں تھے' صرف اللہ تعالیٰ کو مسبب الاسباب اور مقسم الارزاق جانتے تھے کسب کی شرائط ملحوظ رکھتے تھے یعنی وہ صرف مقدار ضرورت پر اکتفا کرتے تھے' نہ زیادہ کی ہوس تھی' اور نہ اس پر فخر تھا' نہ ذخیرہ اندوزی کا خیال تھا' اور نہ یہ تصور تھا کہ میرا مال غیر کے مال سے بہتر ہے' کیوں کہ یہ تصور ہی دنیا کی حرص اور محبت کو جنم دیتا ہے۔ توکل دنیا میں زہد کے بغیر نہیں ہو سکتا' جب کہ زہد کے لئے توکل ضروری نہیں ہے۔ توکل کا مقام زہد کے بعد ہے۔

حضرت ابو جعفر الحداد جو حضرت جنید کے پیر و مرشد تھے' اور جن کا شمار انتہائی متوکلین میں کیا جاتا ہے فرمایا کرتے تھے کہ میں نے بیس برس تک اپنا توکل مخفی رکھا' میں ہر روز بازار جایا کرتا تھا' اور ایک درہم کما کر لایا کرتا تھا' لیکن رات میں ایک دمڑی بھی باقی نہیں رکھتا تھا' اور نہ اپنی راحت کے لئے اس میں سے کچھ خرچ کرتا تھا کہ کچھ سکے دے کر حمام میں غسل ہی کر لوں' رات آنے سے پہلے پہلے وہ درہم خرچ کر دیا کرتا تھا۔ حضرت جنیدؒ ان کی موجودگی میں توکل کے سلسلے میں گفتگو نہیں کرتے تھے' فرماتے تھے کہ مجھے شرم آتی ہے کہ وہ تشریف فرما ہوں اور میں توکل کے باب میں گفتگو کروں۔

خانقاہوں میں توکل صوفیاء کی خانقاہوں میں نقد رقم لے کر بیٹھنا اور اس کے بھروسے پر توکل کرنا درست نہیں ہے' یہی حال وقف جائدادوں کا ہے' ہاں اگر نقد رقم بھی نہ ہو' اور وقف بھی نہ ہو' صرف خدام ہوں جو باہر جا کر کما لایا کریں۔ اس صورت میں توکل ضعف کے ساتھ درست ہو جاتا ہے اور علم و حال سے مضبوط بھی ہو جاتا ہے' جیسے کمانے والے کا توکل۔ اگر صوفیاء

خانقاہوں میں بیٹھ جائیں اور سوال نہ کریں بلکہ جو انھیں میسر آجائے اس پر قناعت کریں تو یہ ان کے توکل کے لئے نہایت مضبوط امر ہے' لیکن اب تو خانقاہوں کو اس قدر شہرت ملی ہے کہ یہ خانقاہیں نہیں رہتیں بلکہ بازار بن جاتی ہیں۔ اس لئے جو شخص اس طرح کی مشہور خانقاہوں میں جائے' وہ ایسا ہے جیسے کوئی شخص کسب کے لئے بازار میں داخل ہو' جس طرح بازار جانے والا شخص بہت سی شرائط کی تکمیل کے بعد متوکل بنتا ہے اسی طرح یہ شخص بھی اسی وقت متوکل بنے گا جب کسب و سعی کی تمام شرائط پوری کرے گا۔

ترک کسب افضل ہے یا کسب؟ رہا یہ سوال کہ آدمی کے لئے گھر میں بیٹھ رہنا افضل ہے' یا بازار جاکر کمانا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر کسی شخص کو ترک کسب سے فکر' ذکر' اخلاص اور عبادت میں استغراق کے لئے وقت مل جائے اور کسب سے دل مشوش ہو اور ان امور کو صحیح طور پر انجام دینے سے مانع ہو تو گھر میں بیٹھنا بہتر ہے' بشرطیکہ اس کے دل میں لوگوں کی آمد اور ان کے ذریعے پہنچنے والی اشیاء کا انتظار نہ ہو' بلکہ صبر کرنے اور اللہ تعالیٰ پر متوکل رہنے میں مضبوط دل رکھتا ہو' اور اگر گھر میں بیٹھ کر دل گھبراتا ہو' اور معیشت کی طرف سے بے چین و مضطرب رہتا ہو' اور لوگوں کا انتظار کرتا ہو تو کمانا بہتر ہے اس لئے کہ دل سے لوگوں کا منتظر رہنا ایسا ہے جیسے دل سے سوال کرنا۔ اور یہ کیفیت ترک کسب سے زیادہ بہتر ہے۔ متوکلین کا حال یہ تھا کہ اگر انھیں کوئی ایسی چیز ملتی جس کے وہ منتظر تھے' اور لوگوں سے توقع رکھتے تھے تو لینے سے انکار کردیتے۔ ایک مرتبہ حضرت امام احمد ابن حنبل نے ابوبکر مروزی سے فرمایا کہ فلاں فقیر کو مقررہ مقدار سے زائد اجرت دینا' انھوں نے حکم کی تعمیل میں فقیر کو زائد اجرت دینی چاہی تو اس نے نہیں لی اور چھوڑ کر چلا گیا' امام احمد نے فرمایا اب جاکر دیدو' چنانچہ وہ پیچھے پیچھے گئے اور اسے وہ زائد اجرت دیدی' اس نے لے لی' ابوبکر المروزی کو اس پر بڑی حیرت ہوئی کہ پہلی مرتبہ لینے سے انکار کردیا' اور دوسری مرتبہ لینے سے انکار نہیں کیا' حضرت ابن حنبل نے فرمایا کہ پہلی مرتبہ جب تم نے اسے زائد اجرت دی تھی تو اسے اس کا انتظار تھا' اور اس کی طمع تھی' اس لئے اس نے لینے سے انکار کردیا' جب تم نے دوبارہ دی تو اس کا نفس مایوس اور ناامید ہوچکا تھا اس لئے اس نے وہ اجرت قبول کرلی۔ حضرت خواص اپنے نفس کو کسی شخص کی طرف مائل اور اس کی عطا کی طرف راغب دیکھتے یا یہ دیکھتے کہ فلاں شخص کی عطاء قبول کرنے سے ان کا نفس عادی ہوجائے گا تو وہ کوئی چیز قبول نہ فرماتے' کسی شخص نے ان سے دریافت کیا کہ انھیں ان کے سفر میں عجیب ترین بات کون سی پیش آئی' انھوں نے جواب دیا کہ میں نے حضرت خضر علیہ السلام کو دیکھا کہ وہ میری رفاقت اور صحبت پر راضی تھے' لیکن میں نے یہ سوچ کر ان سے جدائی اختیار کی کہ کہیں ان کی رفاقت میں میرے نفس کو قرار نہ ملنے لگے' اور اس طرح ان کی صحبت میرے توکل کے لئے نقصان کا باعث نہ بن جائے۔

بہرحال اگر کوئی شخص کسب کے ان تمام آداب اور شرائط کی رعایت کرتا ہے جو کتاب آداب الکسب میں مذکور ہیں' یعنی اس کا مقصود مال کی کثرت نہ ہو' اور نہ اسے اپنی بضاعت اور کفایت پر اعتماد ہو تو ایسا شخص بھی متوکل ہوگا' رہا یہ سوال کہ اس بات کی علامت کیا ہے کہ اسے اپنی بضاعت اور کفایت پر بھروسا نہیں ہے؟ اس کی علامت یہ ہے کہ اگر اس کا مال چوری چلا جائے' یا تجارت میں نقصان ہوجائے یا کوئی اور دشواری پیش آجائے تو اس پر راضی رہے' اس کا سکون اپنی جگہ برقرار رہے' اور قلب مضطرب نہ ہو' بلکہ مال کے چوری ہونے یا تجارت میں نقصان ہونے سے پہلے دل کی جو حالت تھی وہی رہے۔ اس لئے کہ جو شخص کسی چیز میں دل نہیں لگاتا وہ اس کے ضائع ہوجانے سے پریشان نہیں ہوتا' اور جو شخص کسی چیز کے ضائع ہونے سے پریشان ہوتا ہے وہ اس سے دل لگانے والا ہوتا ہے۔ بشر سوت کاتنے کے چرخے بنایا کرتے تھے' پھر انھوں نے یہ کام ترک کردیا اس لئے کہ معلول نے انھیں لکھا تھا میں نے سنا ہے تم چرخے بناکر اپنے رزق پر مدد لیتے ہو' ذرا یہ بتلاؤ کہ اگر اللہ تعالیٰ تمہیں اندھا بہرا کردے تو تمہارے رزق کی ذمہ داری کس پر ہوگی"۔ معلول کی بات ان کے دل کو لگ گئی' اور انھوں نے چرخہ بنانے والے آلات ضائع کرکے یہ پیشہ ترک کردیا' بعض روایات میں یہ ہے کہ انھوں نے یہ مشغلہ اس وقت ترک کیا جب ان کی اس صنعت کو شہرت ملنے لگی اور

لوگ چرخے بنوانے کے لئے ان کے پاس آنے لگے' اور بعض لوگ کہتے ہیں کہ جب ان کے عیال مرگئے تو انھوں نے یہ کام چھوڑ دیا۔ حضرت سفیان ثوری کے پاس پچاس دینار تھے جن سے وہ تجارت کرتے تھے' جب ان کے گھر والوں کا انتقال ہوا تو انھوں نے یہ تمام دینار تقسیم فرمادئیے۔

تم یہ کہہ سکتے ہو کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ آدمی کے پاس مال ہو اور اس سے دل بستگی یا تعلق نہ ہو؟ اس کا جواب یہ دیا جائے کہ جس شخص کا مال ضائع ہو جائے اسے یہ سوچنا چاہیے کہ دنیا میں بے شار لوگ ایسے ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ بضاعت کے بغیر رزق عطا کرتا ہے' اور ایسے لوگوں کی تعداد بھی کچھ کم نہیں جن کے پاس بضاعت تھی مگر چوری ہو گئی یا ضائع ہو گئی' اس کے باوجود وہ رزق سے محروم نہیں رکھے گئے' اللہ تعالیٰ میرے ساتھ وہی سلوک کرے گا جو اس کے نزدیک میرے حق میں بہتر ہو گا' اگر اس نے میرا مال ضائع کر دیا تو یقیناً اس میں میرے لئے بھلائی ہے' ہو سکتا ہے کہ یہ مال میرے دین کے لئے فساد کا موجب بن جاتا۔ یہ اللہ کا احسان ہے کہ اس نے میرے دین کو تباہی سے محفوظ رکھا' اسی طرح اگر وہ انتہائی مفلس ہے' اور قریب ہے کہ مفلسی کے باعث جان سے ہاتھ دھو بیٹھے تب بھی یہی اعتقاد رکھے کہ مفلس ہونا اور بھوک کے باعث ہلاک ہو جانا یقیناً میرے حق میں بہتر ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے میری کسی تقصیر کے بغیر میرے لئے اس کا فیصلہ فرمایا ہے۔ اگر یہ شخص ان امور کا اعتقاد رکھے گا تو اس کے نزدیک بضاعت کا ہونا نہ ہونا برابر ہو گا۔ ایک حدیث میں ہے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ بندہ رات کو اپنے تجارتی معاملات میں سے کسی معاملے میں غور کرتا ہے' اور وہ معاملہ ایسا ہوتا ہے کہ اگر اسے انجام دے تو ہلاک ہو جائے' اللہ تعالیٰ اسے عرش کے اوپر سے دیکھتا ہے اور اس پر عمل کرنے سے روک دیتا ہے' وہ شخص غمگین اور کبیدہ خاطر ہوتا ہے' اور اپنی اس ناکامی کو اپنے پڑوسی' یا اپنے چچازاد بھائی پر ڈال دیتا ہے کہ یہ مصیبت ان کی وجہ سے نازل ہوئی ہے حالانکہ وہ اللہ کی رحمت ہوتی ہے (ابو نعیم۔ ابن عباسؓ) حضرت عمر ابن الخطاب فرمایا کرتے تھے کہ مجھے اس کی کوئی پروا نہیں کہ میں مالدار رہوں یا فقیر' اس لئے کہ میں نہیں جانتا کہ میرے حق میں مالداری بہتر ہے یا تنگدستی۔ جو شخص ان امور پر یقین نہیں رکھتا وہ توکل نہیں کر سکتا' توکل کی وادی انتہائی خار دار ہے' بڑے بڑے متوکلین اس وادی میں اپنے آپ کو بہت پیچھے سمجھتے ہیں۔ چنانچہ حضرت ابو سلیمان دارانیؒ نے احمد ابن الحواریؒ سے فرمایا کہ مجھے ہر مقام سے کچھ نہ کچھ تعلق ہے لیکن توکل کے مقام سے ذرا بھی بہرہ نہیں' میں نے اس کی خوشبو بھی نہیں سونگھی یہ قول ان کی تواضع کا مظہر ہے ورنہ وہ اس میدان میں بھی بہت آگے تھے' انھوں نے مقام توکل کو ناممکن الحصول نہیں فرمایا' بلکہ یہ کہا کہ میں نے یہ مقام حاصل نہیں کیا' غالباً ان کی مراد توکل کے اعلا درجات سے ہے۔

بہر حال اس وقت تک توکل کا حال مکمل نہیں ہو گا جب تک بندہ کا ایمان اس بات پر نہ ہو کہ اللہ کے سوا نہ کوئی فاعل ہے' اور نہ رازق ہے' جو کچھ اس کی تقدیر میں لکھا ہوا ہے خواہ وہ فقر ہو یا مالداری' زندگی ہو یا موت اس کے حق میں وہی بہتر ہے' جو تمنا وہ رکھتا وہ بظاہر خوب صورت ہو سکتی ہے لیکن اگر وہ اللہ کی مرضی کے خلاف ہے تو اس کے لئے بہتر نہیں ہے۔ اس تفصیل کا حاصل یہ ہے کہ توکل ان امور پر مکمل ایمان کے ساتھ مربوط ہے' اس کے علاوہ بھی دین کے جتنے مقامات ہیں وہ بھی اپنے اصول ایمان کے ساتھ اسی طرح مرتبط ہوتے ہیں۔ توکل کا مقام ناقابل فہم نہیں ہے مگر اس کے لئے دل کی قوت' اور یقین کی طاقت ضروری ہے' حضرت سہیل تستری فرماتے ہیں کہ جو شخص کسب کو برا کہتا ہے وہ سنت کو برا کہتا ہے' اور جو ترک کسب کو برا کہتا ہے وہ توحید کو برا کہتا ہے۔

دل کو اسباب ظاہری سے اسباب باطنی کی طرف مائل کرنے کا طریقہ

اب ہم وہ طریقہ بیان کرتے ہیں جس سے دل ظاہری اسباب سے منحرف ہو کر باطنی اسباب کی طرف مائل ہو جائے' اور اس میں یہ یقین پیدا ہو جائے کہ جو کچھ باطنی اسباب کے ذریعے ہوتا ہے وہی حق ہوتا ہے اس سلسلے میں دل کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ حسن ظن بھی ہونا چاہیے۔ اور حسن ظن پیدا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ یہ خیال کرے کہ سوءِ ظن شیطانی تعلیم ہے' اور حسن ظن خدائی تعلیم ہے' چنانچہ ارشاد ربانی ہے :۔

اَلشَّيْطَانُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَأْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَاءِ وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَغْفِرَةً مِنْهُ وَفَضْلًا۔
(پ ۳ ر ۵ آیت ۲۶۸)

شیطان تم کو فقر سے ڈراتا ہے' اور تم کو بری بات (بخل) کا مشورہ دیتا ہے' اور اللہ تم سے وعدہ کرتا ہے اپنی طرف سے گناہ معاف کردینے کا اور زیادہ دینے کا۔

انسان طبعی طور پر شیطان کے ڈرانے کو زیادہ اہمیت دیتا ہے اور اس کی باتیں زیادہ غور سے سنتا ہے۔ کہتے ہیں کہ جو شخص سوءِ ظن کی بنیاد پر ڈرے وہ حریص ہے۔ اور اگر سوءِ ظن کے ساتھ بزدلی' اور ضعفِ قلب بھی ہو' اور ان متکلمین کا مشاہدہ بھی جو ظاہری اسباب کے پابند ہیں اور انہی کی ترغیب دینے والے ہیں تو توکل بالکل ختم ہو جاتا ہے' اور سوءِ ظن غالب آجاتا ہے' بلکہ رزق کو مخفی اسباب سے مربوط سمجھنا بھی توکل کو باطل کر دیتا ہے۔ ایک بزرگ کا واقعہ ہے کہ وہ اللہ کی عبادت کے لئے کسی مسجد میں جا بیٹھے' ان کے پاس مال نہیں تھا' مسجد کے امام نے ان سے کہا کہ اگر تم کماؤ تو یہ زیادہ بہتر ہے' وہ خاموش رہے' دوسری مرتبہ بھی امام صاحب نے انھیں کمانے کی ترغیب دی' وہ اس بار بھی خاموشی کے ساتھ اپنے کام میں لگے رہے' جب تیسری دفعہ بھی امام صاحب نے یہی کہا تو انہوں نے فرمایا کہ مسجد کے برابر میں ایک یہودی رہتا ہے اس نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ وہ ہر روز دو روٹی مجھے پہنچایا کرے گا' یہ سن کر امام صاحب نے کہا کہ اگر وہ یہ ذمہ داری صدق دلی کے ساتھ قبول کرلیتا ہے تو تمہارے مسجد میں معتکف رہنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے' بزرگ نے فرمایا کہ اگر تم امامت نہ کرو تو زیادہ بہتر ہے' تم اس ناقص توحید کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے اور بندوں کے سامنے کھڑے ہوتے ہو' تم نے یہودی کے وعدۂ رزق کو اللہ تعالیٰ پر ترجیح دی ہے۔ کسی مسجد کے امام نے ایک نمازی سے دریافت کیا کہ تم کہاں سے کھاتے ہو' نمازی نے جواب دیا ذرا ٹھہرو' پہلے میں یہ نماز دوبارہ پڑھ لوں جو میں نے تمہارے پیچھے ادا کی ہے' پھر جواب دوں گا۔

عطائے رزق اور منعِ رزق کے عجیب و غریب واقعات مخفی اسباب کے ذریعے رزق بھیجنے کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم پر حسنِ ظن کے لئے ان حکایات اور واقعات کا سننا مفید رہے گا جن میں عطائے رزق کے متعلق اللہ تعالیٰ کے عجیب و غریب الطاف مذکور ہیں' کہ بعض تنگدستوں کو لمحوں میں مالا مال فرما دیا' اور بعض تاجروں اور مالداروں سے ان کی دولت چھین کر بھوکوں ہلاک کر دیا۔ حذیفہ مرعشی سے جو ابراہیم ابن ادہم کے خدام میں سے ہیں کہا گیا کہ اگر انہوں نے کوئی عجیب تر واقعہ دیکھا ہو تو بیان کریں' انہوں نے کہا کہ ایک مرتبہ ہم مکہ معظمہ کے راستے میں چند روز تک بھوکے رہے اس دوران ہم کوفے میں پہنچے' اور ایک ویران مسجد میں داخل ہوئے' حضرت ابراہیم نے میری طرف دیکھا اور فرمایا اے حذیفہ غالباً تجھے بھوک لگ رہی ہے' میں نے عرض کیا کہ آپ کا خیال صحیح ہے' انہوں نے فرمایا مجھے کاغذ قلم دو' چنانچہ میں نے دونوں چیزیں پیش کیں' انہوں نے کاغذ پر یہ عبارت تحریر فرمائی "اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان اور نہایت رحم والا ہے' تو ہر حال میں مقصود ہے' اور ہر بات میں مطلوب ہے۔" اس کے بعد آپ نے یہ تین شعر لکھے :-

أَنَا حَامِدٌ أَنَا شَاكِرٌ أَنَا ذَاكِرٌ۔ أَنَا جَائِعٌ أَنَا ضَائِعٌ أَنَا عَارِي
هِيَ سِتَّةٌ وَأَنَا الضَّمِيْنُ لِنِصْفِهَا۔ فَكُنِ الضَّمِيْنَ لِنِصْفِهَا يَا بَارِيْ
مَدْحِي لِغَيْرِكَ لَهَبُ نَارٍ خُضْتُهَا۔ فَاجِرْ عُبَيْدَكَ مِنْ دُخُوْلِ النَّارِ

(میں تعریف کرنے والا ہوں' شکر کرنے والا ہوں اور ذکر کرنے والا ہوں' میں بھوکا' پیاسا ہوں' اور برہنہ ہوں' یہ کل چھ چیزیں ہیں' جن میں سے تین کا میں ضامن ہوں اے اللہ! باقی تین کا ضامن تو بن جا۔ غیر کے لئے میری تعریف آگ کی لپٹ ہے' اپنے حقیر بندے کو آگ میں جلنے سے بچا)۔

اس کے بعد آپ نے یہ تحریر مجھے دی' اور فرمایا اسے لے کر جاؤ' اور غیر خدا کے ساتھ اپنے قلب کو قطعاً وابستہ نہ کرو' باہر نکلنے کے

بعد سب سے پہلے جو شخص تمہیں نظر آئے اسے یہ دیدو' چنانچہ میں مسجد سے باہر نکلا' سب سے پہلے جو شخص مجھے ملا وہ ایک خچر پر سوار تھا' میں نے اسے یہ رقعہ دیدیا' وہ یہ رقعہ دیکھ کر رونے لگا' اور مجھ سے پوچھنے لگا کہ جنھوں نے یہ رقعہ لکھا ہے وہ کہاں ہیں' میں نے کہا کہ وہ فلاں مسجد میں ہیں' اس نے مجھے ایک تھیلی دی جس میں چھ سو دینار تھے' اس کے بعد میری ملاقات ایک اور شخص سے ہوئی جس سے میں نے پوچھا کہ وہ خچر سوار کون تھا' اس نے بتلایا کہ یہ ایک نصرانی تھا' میں تھیلی لے کر حضرت ابراہیم کے پاس آیا اور انھیں پورا واقعہ سنایا' انھوں نے فرمایا کہ یہ تھیلی مت چھونا' جس شخص نے تمہیں تھیلی دی ہے وہ ابھی آنے والا ہے' چنانچہ تھوڑی دیر کے بعد نصرانی آیا' اور اس نے ابراہیمؒ کے سر کو بوسہ دیا اور اسلام لے آیا۔ ابو یعقوب الاقطع بصری کہتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ حرم شریف میں دس دن تک بھوکا رہا' مسلسل بھوکا رہنے کی وجہ سے مجھے ضعف لاحق ہو گیا' اس وقت دل میں خیال آیا کہ مجھے باہر نکلنا چاہیے' چنانچہ میں جنگل کی طرف یہ سوچ کر نکلا کہ شاید کوئی ایسی چیز مل جائے جس سے یہ کمزوری رفع ہو سکے' میں نے جنگل کے اندر زمین پر ایک شلجم پڑا ہوا دیکھا' میں نے اسے اٹھالیا' لیکن دل میں عجیب سی وحشت پیدا ہوئی' اور ایسا لگا کہ جیسے کوئی شخص یہ کہہ رہا ہوں کہ تو دس روز تک بھوکا رہا' اور اب اس بھوک کا خاتمہ ایک سڑے ہوئے شلجم سے کرنا چاہتا ہے' میں نے وہ شلجم وہیں ڈالا اور حرم شریف میں آکر بیٹھ گیا' ابھی اس واقعہ کو تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ ایک عجمی شخص نظر آیا جس کے ہاتھوں میں خوان پوش تھا' وہ میرے قریب آکر بیٹھ گیا اور کہنے لگا کہ یہ تمہارے لئے ہے' میں نے اس سے پوچھا کہ آخر تم نے میری تخصیص کیوں کی ہے' اس شخص نے جواب دیا کہ ہم دس روز سے سمندر میں سفر کر رہے تھے' اچانک طوفان آیا' قریب تھا کہ ہماری کشتی غرق ہو جاتی' اس وقت میں نے یہ عہد کیا تھا کہ اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے اس طوفان سے محفوظ رکھا تو میں یہ چیزیں حرم شریف کے مجاورین میں سے اس شخص کو دوں گا جو مجھے سب سے پہلے نظر آئے گا' چنانچہ میری نگاہ سب سے پہلے تم پر پڑی' ابو یعقوب کہتے ہیں کہ میں نے اس سے کہا کہ یہ خوان ہٹاؤ' اس نے خوان ہٹادیا' اس میں مصری حلوہ' چھلے ہوئے بادام اور برفی کے ٹکڑے تھے' میں نے تینوں چیزوں میں سے ایک ایک مٹھی لے لی' اور باقی چیزیں اسے واپس کردیں' اور اس سے کہا کہ وہ یہ چیزیں اپنے ساتھیوں میں تقسیم کردے' میں نے تمہارا صدقہ قبول کرلیا ہے اس کے جانے کے بعد میں نے دل میں سوچا کہ تیرا رزق دس منزل کی دوری سے تیرے پاس آرہا تھا اور تو جنگل میں اسے تلاش کر رہا تھا۔

ممشاد دینوری کہتے ہیں کہ مجھ پر کچھ قرض تھا' جس کی وجہ سے میری طبیعت پریشان رہتی تھی' ایک رات میں نے خواب میں دیکھا کہ کوئی شخص کہہ رہا ہے کہ اے بخیل! تو نے ہم پر اتنا قرض کردیا ہے' لیتا رہ' تیرا کام لینا ہے' اور ہمارا کام دینا ہے' اس واقعے کے بعد میں نے کسی بقال یا قصاب کا حساب نہیں کیا' بنان الحمال کہتے ہیں کہ میں مصر سے عازم مکہ تھا' اور اپنے ساتھ زاد راہ لے کر سفر کر رہا تھا' ایک روز ایک عورت میرے پاس آئی' اور کہنے لگی کہ اے بنان تو حمال (بوجھ اٹھانے والا) ہے' اپنی پیٹھ پر زاد راہ لے کر چل رہا ہے' اور یہ گمان رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تجھے رزق نہ دے گا' بنان کہتے ہیں کہ میں نے اپنا زاد راہ پھینک دیا' پھر مجھ پر تین دن ایسے گذرے کہ میں نے کچھ نہیں کھایا تین دن کے بعد میری نگاہ ایک پازیب پر پڑی' دل میں خیال آیا کہ مجھے یہ پازیب اٹھا لینی چاہئے' ہو سکتا ہے کہ اس پازیب کا مالک مل جائے اور میں کچھ لے کر اسے یہ پازیب دیدوں' ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ وہی عورت پھر آئی اور کہنے لگی کہ کیا تو تاجر ہے جو یہ کہتا ہے کہ شاید اس پازیب کا مالک مل جائے اور تو کچھ رقم کے عوض یہ پازیب اسے دیدے اس کے بعد اس عورت نے کچھ درہم میری طرف پھینکے اور کہنے لگی کہ انھیں خرچ کر' میں نے وہ درہم لے لئے اور مکہ مکرمہ پہنچنے تک انھیں خرچ کرتا رہا۔ ایک مرتبہ بنان کو خدمت کے لئے ایک باندی کی ضرورت پیش آئی' انھوں نے اپنے دوستوں سے ذکر کیا' سب نے مل کر چندہ کیا' اور کہنے لگے کہ قافلہ آنے والا ہے' ان کی باندیوں میں سے جو باندی مناسب ہو وہ لے لیں گے۔ جب قافلہ آیا تو وہ سب باندی کی تلاش میں نکلے' اور ایک باندی پر متفق ہو گئے' انھوں نے اس باندی کے مالک سے قیمت دریافت کی' مالک نے کہا یہ باندی فروخت کے لئے نہیں ہے' بلکہ یہ بنان الحمال کے لئے ہے' سمرقند کی ایک خاتون نے یہ

باندی انھیں ہدیے میں بھیجی ہے' چنانچہ وہ باندی لے کر بنان الحمال کے پاس پہنچے' اور ان سے پورا واقعہ بیان کیا۔

ایک شخص کے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ وہ ایک روٹی لے کر سفر میں نکلا' اور یہ سوچتا رہا کہ اگر میں نے یہ روٹی کھالی تو ہلاک ہو جاؤں گا' اللہ تعالیٰ نے اس پر ایک فرشتہ مقرر فرمادیا' اور اسے حکم دیا کہ اگر یہ شخص روٹی کھالے' تو اسے رزق دینا' اور نہ کھائے تو اس روٹی کے علاوہ کوئی روٹی مت دینا' وہ روٹی اس شخص کے پاس رہی' یہاں تک کہ وہ کھائے بغیر مرگیا' ابو سعید الخراز کہتے ہیں کہ میں زاد راہ لئے بغیر جنگل میں سفر کررہا تھا' اسی دوران مجھے فاقے سے دوچار ہونا پڑا' ایک روز مجھے دور سے منزل نظر آئی' اسے دیکھ کر بہت زیادہ خوشی ہوئی۔ اس کے بعد دل میں خیال پیدا ہوا کہ میں نے غیر پر بھروسا کیا' اور اس کے ملنے پر خوش ہوا' چنانچہ میں نے قسم کھائی کہ میں اس منزل میں داخل نہیں ہوں گا' یہاں تک کہ اگر کوئی آکر مجھے لے جائے' میں نے اپنے لئے ریت میں ایک گڑھا کھودا' اور اپنا جسم سینے تک اس میں چھپالیا' میں نے آدھی رات گذرنے پر ایک بلند آواز سنی' کوئی شخص گاؤں والوں سے کہہ رہا تھا : اے لوگو! اللہ کے ایک دوست نے اپنے آپ کو اس ریت میں محبوس کرلیا ہے' اس سے ملو' چنانچہ کچھ لوگ آئے اور مجھے نکال کر گاؤں میں لے گئے' ایک شخص کا واقعہ بیان کیا گیا ہے کہ اس نے حضرت عمر کا دروازہ لازم پکڑلیا تھا' رات دن وہاں پڑا رہتا' ایک روز اس نے سنا کہ کوئی شخص اس سے کہہ رہا تھا کہ اے شخص تو نے حضرت عمرؓ کی طرف ہجرت کی ہے یا اللہ کی طرف' یہاں سے اٹھ' اور قرآن کی تعلیم حاصل کر' قرآن تجھے عمر کے دروازے سے بے نیاز کردے گا' وہ شخص یہ سن کر غائب ہوگیا' حضرت عمرؓ نے اسے ڈھونڈا' معلوم ہوا کہ وہ گوشہ نشین ہوگیا ہے' اور عبادت میں مشغول ہے' حضرت عمرؓ اس کے پاس آئے اور فرمانے لگے کہ میں تجھے دیکھنے کا متمنی تھا' تجھے ہم سے کس چیز نے غافل کردیا' اس نے عرض کیا کہ قرآن کریم کی تلاوت نے مجھے عمر اور آل عمر سے بے نیاز کردیا ہے' حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ تو نے قرآن میں کیا پایا' اس نے عرض کیا کہ میں نے قرآن کریم میں یہ آیت تلاوت کی ہے :-

وَفِي السَّمَاءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوعَدُونَ (پ۲۶ر۱۸ آیت ۲۲)

اور تمہارا رزق اور جو تم سے وعدہ کیا جاتا ہے آسمان میں ہے۔

یہ آیت پڑھ کر میں نے سوچا کہ میرا رزق آسمان میں ہے' اور میں زمین میں تلاش کررہا ہوں۔ حضرت عمرؓ یہ سن کر رونے لگے اور کہنے لگے کہ تو سچ کہتا ہے' اس واقعے کے بعد حضرت عمرؓ اس کے پاس تشریف لے جاتے تھے' اور کچھ دیر اس کے پاس بیٹھا کرتے تھے۔ ابو حمزہ الخراسانی فرماتے ہیں کہ میں نے ایک سال حج کیا' سفر کے دوران میں ایک جگہ سے گذر رہا تھا کہ راہ میں کنواں آیا' میرا پاؤں پھسلا اور میں اس میں گرپڑا' دل میں خیال آیا کہ مجھے مدد کے لئے کسی کو آواز دینی چاہیے' پھر میں نے کہا کہ نہیں میں کسی کو آواز نہیں دوں گا' اور اس بات پر قسم بھی کھائی' میں ابھی اسی ادھیڑبن میں تھا کہ اچانک دو آدمی کنویں کی منڈیر پر آئے' ان میں سے ایک دوسرے سے کہنے لگا آؤ اس کنویں کو بند کردیں' ایسا نہ ہو کہ کوئی آنے جانے والا اس میں گر کر ہلاک ہوجائے' چنانچہ وہ دونوں بانس اور چٹائی لے کر آئے' اور کنویں کا دہانہ بند کرنے لگے' اس وقت میرا ارادہ ہوا کہ میں چیخ کر آواز دوں' پھر میں نے دل میں سوچا کہ میں جس ذات سے فریاد کروں گا وہ ان دونوں سے زیادہ قریب ہے' چنانچہ میں پُرسکون بیٹھا رہا' کچھ دیر بعد کوئی چیز آئی' اور کنویں کا منہ کھول کر اس میں پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئی' اور کچھ گنگناہٹ کے سے انداز میں مجھ سے کہنے لگی کہ میرے پاؤں پکڑلے' میں سمجھ گیا کہ وہ چیز کیا چاہتی ہے چنانچہ میں اس کے پاؤں سے لپٹ گیا' اور اس نے مجھے کنویں سے باہر کھینچ لیا' میں نے دیکھا کہ وہ ایک درندہ تھا' ہاتف غیبی سے آواز آئی کہ اے ابو حمزہ کیا یہ اچھا نہیں ہوا کہ ہم نے تجھے موت (درندے) کے ذریعے موت سے نجات دی' میں یہ آواز سن کر وہاں سے چل پڑا' میری زبان پر یہ اشعار خود بخود جاری ہوگئے۔

نَهَانِي حَيَائِي مِنْكَ أَنْ أَكْشِفَ الْهَوَى ۔ وَأَغْنَيْتَنِي بِالْفَهْمِ مِنْكَ عَنِ الْكَشْفِ

تَلَطَّفْتَ فِي أَمْرِي فَأَبْدَيْتَ شَاهِدِي ۔ إِلَى غَائِبِي وَاللُّطْفُ يُدْرَكُ بِاللُّطْفِ

تَرَأَیْتَ لِیْ بِالْغَیْبِ حَتّٰی کَأَنَّمَا تُبَشِّرُنِیْ بِالْغَیْبِ أَنَّکَ فِی الْکَفِّ
أَرَاکَ وَبِیْ مِنْ هَیْبَتِیْ لَکَ وَحْشَةٌ فَتُؤْنِسُنِیْ بِاللُّطْفِ مِنْکَ وَبِالْعَطْفِ
وَتُحْیِیْ مُحِبًّا أَنْتَ فِی الْحُبِّ حَتْفُهُ وَذَا عَجَبٌ کَوْنُ الْحَیَاةِ مَعَ الْحَتْفِ

(مجھے اس بات سے شرم آئی کہ میں اپنی خواہش کا اظہار کروں' میں اس لئے بھی بے پروا رہا کہ تجھ پر میرا حال منکشف ہے' تو نے مجھ پر مہربانی کی' اور میرا حال اس پر ظاہر کردیا جو مجھ سے اوجھل تھا' یہ مہربانی تیرے لطف و کرم کی مظہر ہے' تو میرے لئے غیب سے ظاہر ہوا گویا مجھے یہ بشارت دے رہا ہو کہ تو محفوظ ہے' میں تجھے دیکھ کر گھبرا جاتا ہوں' اور وحشت زدہ ہو جاتا ہوں' تو مجھے اپنے لطف و کرم سے انسیت بخشتا ہے' اور میری وحشت دور کرتا ہے' تو اپنے دوست کو زندگی دیتا ہے' اور اس کی موت بھی تیری محبت میں ہے (یعنی اور زندگی تیرے ہی ہاتھ میں ہے) کس قدر حیرت کی بات ہے کہ تو موت سے زندگی دیتا ہے۔

اس طرح کے واقعات بے شمار ہیں' اگر کسی شخص کے پاس مضبوط ایمان ہو' اور وہ کسی پریشانی اور تنگدلی کے ساتھ ایک ہفتہ کے بقدر بھوکا رہنے پر قدرت بھی رکھتا ہو' اور اس کا اس بات پر مکمل اعتقاد ہو کہ اگر مجھے ہفتہ گذرنے کے بعد بھی رزق نہیں ملا تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک میرا مرنا میرے جینے سے بہتر ہے' اس لئے تو اس نے مجھ پر اپنے رزق کے دروازے بند کردیئے ہیں' امید یہ ہے کہ ایسے شخص کا توکل مکمل اور دیرپا ہو گا۔

عیال دار کا توکل جاننا چاہیے کہ توکل کے باب میں عیالدار کا حکم تنہا شخص کے حکم سے مختلف ہے' اس لئے کہ تنہا شخص کا توکل دو باتوں سے مکمل ہوتا ہے' ایک یہ کہ وہ کسی انتظار' اور ضیق نفس کے بغیر ہفتہ بھر تک بھوکا رہنے پر قادر ہو' اور دوسرے یہ کہ ایمان کے ان شعبوں پر عمل پیرا ہو جو ابھی مذکور ہوئے' جن میں سے ایک یہ ہے کہ اگر رزق میسر نہ ہو تو موت پر راضی رہے' اور یہ جانے کہ موت اور بھوک ہی اس کا رزق ہے' یہ اگرچہ دنیا کے اعتبار سے نقص ہے' لیکن آخرت میں زیادتی اور اجر کا باعث ہے' یہ اعتقاد کرے کہ اسے دو رزقوں میں سے بہتر رزق دیا گیا ہے' اور وہ آخرت کا رزق ہے' بھوک اس کے لئے مرض الموت ہے' اسے اس پر راضی رہنا چاہیے' تقدیر میں اسی طرح لکھا ہے' ان دو باتوں پر عمل کرنے سے تنہا شخص کا توکل مکمل ہو جائے گا۔
لیکن اہل و عیال کو بھوک پر صبر کرنے کا مکلّف بنانا صحیح نہیں ہے' اور نہ یہ بات درست ہے کہ ان کے روبرو توحید پر لکچر دیا ہے' اور انہیں بتلایا جائے کہ بھوک ایک ایسا رزق ہے جس پر رشک کرنا چاہیے' یہ رزق شاذ و نادر ہی کسی کو ملتا ہے۔ ایمان کے باقی ابواب کے لئے بھی یہی حکم ہے' اہل و عیال کے دل و دماغ میں یہ اعتقادات زبردستی راسخ نہیں کیے جاسکتے' اس لئے عیالدار آدمی کا توکل کمانے والے کا توکل ہو گا۔ یہ توکل کا تیسرا مقام ہے۔ اور اس کی مثال حضرت ابوبکر الصدیقؓ کا توکل ہے کہ وہ کمانے کے لئے بازار تشریف لے جایا کرتے تھے۔ عیالدار شخص کے لئے جائز نہیں کہ وہ اپنے عیال کو متوکل بنانے کے لئے جنگل کا رخ کرے اور ان پر توجہ نہ دے' اور نہ ان کے رزق کا اہتمام کرے' اس کا یہ عمل انہیں ہلاک کرسکتا ہے' اس صورت میں ان کی موت کی ذمہ داری اس پر ہو گی' اور وہ آخرت میں مواخذے سے بچ نہیں پائے گا۔

تحقیقی بات یہ ہے کہ اس سلسلے میں عیالدار اور عیال دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے' اگر اس کی عیال میں کچھ روز بھوکا رہنے اور بھوک پر صبر کرنے کی قوت ہو اور وہ بھوک کی وجہ سے حاصل ہونے والی موت کو گلے لگانے کے لئے تیار ہوں' اور اس موت کو آخرت کا رزق اور اجر تصور کرتے ہوں تو اس کے لئے ان کے حق میں بھی توکل کرنا جائز ہے' جس طرح بیوی بچے عیال ہوتے ہیں' اسی طرح آدمی کا نفس بھی اس کے لئے عیال ہے' اس کے لئے یہ جائز نہ ہو گا کہ وہ اپنے نفس کو ہلاک کرڈالے' الایہ کہ وہ بھوک پر صبر کرکے اس کے ساتھ تعاون پر آمادہ ہو' لیکن اگر بھوک کی وجہ سے دل میں اضطراب پیدا ہوتا ہے' اور عبادت میں خلل واقع ہوتا ہو تو' تنہا شخص کے لئے بھی توکل جائز نہ ہو گا' روایت ہے کہ ابو تراب نخشی نے ایک صوفی کو دیکھا جو تین دن بھوکا رہنے

کے بعد خربوزے کے چھلکے کی طرف ہاتھ بڑھا رہا تھا' انہوں نے فرمایا کہ یہ تصوف تجھے زیب نہیں دیتا' تجھے تو بازار میں ہونا چاہیے' ان کا مطلب یہ تھا کہ تصوف توکل کے ساتھ صحیح ہوتا ہے' اور توکل اس وقت تک درست نہیں ہوتا جب تک آدمی تین دن سے زائد عرصے تک بھوک پر صبر نہ کرسکتا ہو' ابو علی الروزباری کہتے ہیں کہ اگر کوئی فقیر پانچ دن کے بعد بھوک کی شکایت کرے تو اسے بازار کی راہ دکھلاؤ اور یہ کہو کہ وہ محنت کرے' اور رزق کمائے' اس کا جسم اس کا عیال ہے' ایسا توکل درست نہیں ہے جس سے عیال کو نقصان ہو' اور عیال میں صرف ایک فرق ہے' اور وہ یہ کہ آدمی اپنے نفس پر تشدد کرسکتا ہے' اور اسے صبر کا عادی بنا سکتا ہے' لیکن عیال پر تشدد نہیں کرسکتا۔

اس تفصیل سے تم پر یہ بات واضح ہو چکی ہوگی کہ توکل اسباب سے لاتعلق ہونے کا نام نہیں ہے' بلکہ کچھ عرصے تک بھوک پر صبر کرنے اور موت پر راضی رہنے کا نام ہے' رزق میں تاخیر شاذ و نادر ہی ہوتی ہے' شہروں اور بستیوں میں رہنا یا جنگلوں میں بود و باش اختیار کرنا جہاں عادتاً گھاس اور سبزیاں مل جاتی ہیں بقا کے اسباب میں سے ہے۔ تاہم اس زندگی میں تھوڑی سی اذیت ہے' کیوں کہ ہمیشہ گھاس کھانے پر نفس راضی نہیں ہو سکتا' الا یہ کہ صبر کرے' اور شہروں میں توکل کرنا جنگل میں توکل کرنے کے مقابلے میں اسباب سے قریب تر ہے' بہرحال شہری زندگی ہو یا جنگلی زندگی یہ سب بقا کے اسباب ہیں' لیکن لوگ ان اسباب کی طرف زیادہ مائل ہیں جو واضح حیثیت رکھتے ہیں' ان اسباب کو وہ اسباب ہی نہیں سمجھتے' اس لئے کہ ان کا ایمان کمزور ہے' ان کی حرص زیادہ ہے' آخرت کے لئے دنیا میں تکلیف اٹھانے پر صبر کرنے کی طاقت کم ہے' طول امل' اور سوء ظنی کے باعث ان کے دلوں پر بزدلی غالب ہے' جو شخص آسمان و زمین کے ملکوت پر نظر ڈالتا ہے اس پر یہ بات اچھی طرح منکشف ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ملک اور ملکوت کا نظام ایسا رکھا ہے کہ کوئی بندہ اپنے رزق سے محروم نہیں رہ سکتا خواہ وہ اس کی فکر کرے یا نہ کرے۔ دیکھو ماں کے پیٹ میں رہنے والا بچہ اپنی غذا فراہم نہیں کرسکتا' اور نہ وہ اس کی فکر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے' لیکن اللہ نے اس کی ناف ماں کی ناف سے مربوط کرکے کچھ ایسا نظام بنا دیا ہے کہ ماں کی غذا کا ایک حصہ بچے کو بھی ملتا ہے۔ پھر جب وہ ماں کے پیٹ سے باہر آتا ہے تب بھی فکر و تردد کے بغیر رزق پاتا ہے' ماں کے دل میں اس کی محبت اس طرح ڈال دی گئی ہے کہ وہ خواہ مخواہ اس کی فکر کرتی ہے' اور وہ اس کے لئے مجبور ہے اس کے دل میں اللہ تعالیٰ نے محبت کی ایسی آگ روشن کردی ہے جو بجھ نہیں سکتی' پھر جب بچہ پیدا ہو جاتا ہے تو اس کی غذا ماں کا دودھ ہوتی ہے' جب تک کہ اس کے دانت نہیں نکلتے اور وہ روٹی چبا کر کھانے کا عادی نہیں ہوتا' اس عمر کے لئے دودھ کو اس لئے بھی غذا بنایا گیا کہ وہ اپنے ضعف اور نرمی کے باعث ثقیل غذا کا متحمل نہیں ہو سکتا' بتلاؤ ماں کی چھاتی سے دودھ پیدا کرنے اور حسب ضرورت باہر نکالنے میں بچے کی کسی تدبیر کو دخل ہے' یا ماں اس سلسلے میں کوئی تدبیر کرتی ہے؟ پھر جب بچہ اس قابل ہو جاتا ہے تو ثقیل غذا ہضم کرسکے تو اس کے منہ میں دانت کچلیاں اور ڈاڑھیں پیدا کردی جاتی ہیں' چنانچہ جب کچھ اور بڑا ہو جاتا ہے تو اس کے لئے تعلیم اور راہ آخرت پر سلوک کے اسباب پیدا کردیے جاتے ہیں' اب بلوغ کے بعد نامرد بننا عین جہالت ہے۔ بلوغ سے اسباب معیشت کچھ کم نہیں ہوتے بلکہ زیادہ ہی ہوتے ہیں پہلے کمانے پر قادر نہیں تھا' اب قادر ہو گیا' یعنی قدرت بطور سبب معیشت زیادہ عطا کی گئی' البتہ پہلے اس پر ایک مشفق شخص کا سایہ تھا ماں یا باپ کا۔ اور اس کی شفقت واقعتہً زیادہ تھی' وہ اسے دن میں ایک یا دو بار کھلاتا پلاتا تھا' اور یہ اس لئے تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے دل میں شفقت اور محبت پیدا کر دی تھی' اب یہ شفقت اور محبت ایک دل سے نکال کر مسلمانوں بلکہ تمام اہل شہر کے دلوں میں پیدا کردی گئی ہے' یہاں تک کہ جب ان میں سے کوئی کسی محتاج اور تنگدست کو دیکھتا ہے تو اس کا دل رنجیدہ ہوتا ہے' اور اس کے باطن میں یہ داعیہ پیدا ہوتا ہے کہ کسی طرح اس کی یہ حاجت دور کردی جائے' پہلے ایک مشفق تھا اب ہزاروں مشفق پیدا ہو گئے' پہلے یہ لوگ اس پر اس لئے شفیق نہیں تھے کہ اسے ماں باپ کی کفالت میں پرورش پاتے ہوئے دیکھتے تھے' ان کے لئے ان کی شفقت مخصوص تھی' اس لئے عام لوگوں نے یہ ضرورت محسوس نہیں کی کہ اس پر خود بھی شفقت کریں اگر وہ یتیم ہوتا تو یقیناً اللہ تعالیٰ اس کے لئے لوگوں کے دلوں میں جذبۂ

پیدا کرتا' یا کسی ایک کو یا چند مسلمانوں کو اس کی دستگیری اور کفالت پر مجبور کرتا۔ اس ارزانی کے دور میں آج تک کہیں یہ نہیں سنا کہ فلاں جگہ کوئی یتیم بچہ بھوک کی وجہ سے ہلاک ہو گیا ہو' حالانکہ وہ بچارہ اپنے لئے متفکر بھی نہیں ہو سکتا' نہ اس کا کوئی مشفق کفیل ہوتا' ہے' صرف اللہ تعالیٰ اس شفقت کے واسطے سے اس کا کفیل ہوتا ہے جو اس نے اپنے بندوں کے دلوں میں پیدا فرمائی ہے۔

جب صورت حال یہ ہے تو پھر کیا ضرورت ہے کہ بلوغ کے بعد رزق کے لئے فکر مند ہو' جب کہ بچپن میں کوئی فکر نہ تھا' حالانکہ پہلے صرف ایک مشفق تھا' اب ہزاروں مشفق موجود ہیں' اگرچہ ماں کی شفقت مضبوط اور وسیع تھی مگر ایک تھی' اور اب ہزاروں کی شفقتیں ہیں' جو بظاہر تھوڑی تھوڑی ہیں' لیکن بحیثیت مجموعی نہایت وسیع اور قوی تر ہیں' بہت سے یتیم اس قدر خوش گوار زندگی گذارتے ہیں کہ وہ بچے بھی نہیں گذار پاتے جن کے سروں پر والدین کا سایہ ہے۔ بہرحال لوگوں کی شفقت میں کمی کا ازالہ ان کی کثرت' اور مقدار ضرورت کے مطابق تنعم سے ہو جاتا ہے۔ شاعر کے یہ دو شعر کتنے عمدہ ہیں۔

جَرَیٰ قَلَمُ الْقَضَاءِ بِمَا یَکُوْنُ۔ فَسِیَّانِ التَّحَرُّکُ وَالسُّکُوْنُ
جُنُوْنٌ مِنْکَ اَنْ تَسْعٰی لِرِزْقٍ۔ وَیُرْزَقُ فِی غِشَاوَتِہِ الْجَنِیْنُ

(جو ہونے والا ہے اس کے لئے فیصلے کا قلم چل چکا ہے' اب حرکت و سکون دونوں برابر ہیں' یہ تیرا پاگل پن ہے کہ تو رزق کے لئے کوشاں ہے' حالانکہ بچے کو رحم مادر میں رزق عطا کیا جاتا ہے)۔

کیا یتیم اور بالغ برابر ہیں یہاں یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ لوگ یتیم کی اس لئے کفالت کرتے ہیں کہ اس کی کم عمری کے باعث اسے کسب و سعی سے عاجز سمجھتے ہیں' جب کہ یہ شخص بالغ ہے اور کسب پر قدرت رکھتا ہے' ایسے شخص کی طرف عوام التفات نہیں کریں گے' بلکہ یہ کہیں گے کہ یہ شخص تو ہماری طرح ہے' اسے خود جدوجہد کرنی چاہیے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ لوگ اس طرح کی باتیں اس وقت کریں گے جب یہ شخص بیکار بیٹھے گا' اس صورت میں ان کا کہنا صحیح ہو گا' واقعۃً اس شخص کو کمانا چاہیے' بیکاری اور توکل میں کوئی مناسبت نہیں ہے' توکل تو دین کے مقامات میں سے ایک اہم ترین مقام ہے' اس سے اللہ تعالیٰ کے لئے فارغ ہونے پر مدد لی جاتی ہے۔ ہاں اگر وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ مشغول ہو' گھر یا مسجد کو لازم پکڑے' علم اور عبادت پر مواظبت کرے تو لوگ اسے ترک کسب پر ملامت نہیں کریں گے' اور نہ اسے کمانے کا مکلّف کریں گے۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس کا اشتغال لوگوں کے دلوں میں اس کے لئے محبت اور عظمت پیدا کر دے گا' یہاں تک کہ وہ اس کی ضرورت سے زیادہ لے کر آئیں گے۔ تاہم یہ ضروری ہے کہ وہ گھر کے دروازے بند نہ کرے اور نہ لوگوں سے راہ فرار اختیار کر کے پہاڑوں پر پناہ گزیں ہو۔ آج تک کسی ایسے عالم یا عابد کے بارے میں جس نے اپنے اوقات اللہ تعالیٰ کے لئے وقف کر دئیے ہوں یہ نہیں سنا گیا کہ وہ بھوک سے بے تاب ہو کر مر گیا ہو' اور نہ ایسی بات کوئی سنے گا' بلکہ اسے لوگ اس قدر دیتے ہیں کہ اگر وہ ایک بڑی جماعت کو کھلانے کا ارادہ کرے تو بآسانی ایسا کر سکے جو شخص اللہ کے لئے ہوتا ہے اللہ اس کے لئے ہوتا ہے' اور جو اللہ کے ساتھ مشغول ہوتا ہے اللہ تعالیٰ لوگوں کے دلوں میں اس کی محبت پیدا کر دیتا ہے' اور انہیں اس کے لئے مسخر کر دیتا ہے جیسے ماں کا دل بچے کے لئے مسخر کر دیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت و قدرت سے ملک اور ملکوت کے لئے ایسا نظام ترتیب دیا ہے جو ملک اور ملکوت والوں کو پوری طرح کفایت کرتا ہے' جو شخص اس نظام کا مشاہدہ کرتا ہے وہ منتظم اور مدبّر کی عظمت پر اعتماد کرتا ہے اس کے ساتھ اشتغال رکھتا ہے' اس پر ایمان رکھتا ہے' اس کی نظر مدبّر اسباب پر رہتی ہے' اسباب پر نہیں رہتی' یہ صحیح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایسا نظام جاری نہیں کیا کہ جو بندہ اس کے ساتھ اشتغال رکھتا ہے اسے ہمیشہ حلوے پرندوں کے گوشت' عمدہ لباس' اور بہترین گھوڑے عطا کئے جائیں' اگرچہ کبھی کبھی یہ چیزیں عطا بھی کر دی جاتی ہیں' تاہم اس نے جو نظام بنایا ہے' اس کے مطابق ہر اس شخص کو جو اللہ کی عبادت میں مشغول رہتا ہو' ہفتہ میں ایک مرتبہ جَو کی ایک روٹی یا گھاس کی چند پتیاں کھانے کے لئے ضرور ملتی ہیں۔ یہ تو کم سے کم درجہ ہے'

ورنہ عموماً اس مقدار سے کچھ زیادہ ہی ملتا ہے' بلکہ بعض اوقات اس قدر مل جاتا ہے جو قدر حاجت سے بھی زیادہ ہوتا ہے' جو لوگ توکل نہیں کرتے اس کا سبب سوائے اس کے کیا ہو سکتا ہے کہ ان کے نفس عیش کوشی کی طرف مائل ہیں' اور وہ یہ چاہتے ہیں وہ انہیں ہمیشہ عمدہ اور نرم لباس اور مرغن غذائیں ملتی رہیں۔ یہ چیزیں راہ آخرت سے تعلق نہیں رکھتیں' اور نہ تردد اور اضطراب کے بغیر حاصل ہوتی ہیں' بلکہ بعض اوقات تردد و اضطراب سے بھی حاصل نہیں ہوتیں' شاذ و نادر ہی ایسا ہوتا ہے کہ لوگوں کو یہ تمام نعمتیں حاصل ہو جائیں۔ جس شخص کی چشم بصیرت وا ہے وہ اپنی سعی و تردد پر مطمئن نہیں ہوتا' بلکہ یہ سمجھتا ہے کہ اس کے اثرات ضعیف ہیں' یہ شخص صرف ملک اور ملکوت کے مدبر پر اطمینان کرتا ہے جس نے اپنی مخلوق کے لئے ایسا نظام قائم کر رکھا ہے کہ کوئی بندہ رزق سے محروم نہیں رہتا' اگرچہ تاخیر ہو جاتی ہے' اور یہ تاخیر بھی بہت کم ہوتی ہے۔

بہرحال جس شخص پر یہ امور منکشف ہوں گے' اور ساتھ ہی اس کے دل میں قوت اور نفس میں شجاعت ہوگی تو اس کا وہ شمو ہو گا جس کی طرف حضرت امام حسن بصریؒ نے اپنے اس قول میں ارشاد فرمایا ہے کہ میرا دل یہ چاہتا ہے کہ تمام اہل بصرہ میرے عیال ہوں اور ایک ایک دانہ ایک ایک اشرفی کا ملتا ہو۔ وہیب ابن الورد کہتے ہیں کہ اگر آسمان تانبے کا بن جائے اور زمین سیسے کی اور میں رزق کے لئے کوشش کروں تو یہ میرے خیال میں شرک ہے۔

اس تفصیل سے ثابت ہو چکا ہے کہ توکل ایک سمجھ میں آنے والا مقام ہے' اور اس مقام تک پہنچنا ہر اس شخص کے لئے ممکن ہے جو جدوجہد کرے اور نفس پر سختی روا رکھے۔ اس تفصیل سے تم نے یہ بات بھی جان لی ہے کہ جو شخص اصل توکل یا اس کے امکان کا منکر ہے وہ جاہل محض ہے' اور اس کا انکار عناد پر مبنی ہے۔ جس طرح ذوق کی راہ سے مقام توکل تک نہ پہنچنا افلاس ہے' اسی طرح یہ بھی افلاس ہے کہ تم اس مقام کا انکار کرو' تم ان دونوں باتوں کو جمع نہ کرو یعنی ایسا نہ کرو کہ اس مقام تک بھی نہ پہنچ پاؤ' اور اس کو ممکن بھی نہ سمجھو۔ اگر تم نے یہ مباحث غور سے سنے ہیں' اور عمل کرنے کا ارادہ رکھتے ہو تو تھوڑے پر قناعت کرو' بقدر ضرورت پر راضی رہو' یہ چیز تمہیں ضرور ملے گی' اگرچہ تم اس سے فرار ہی کیوں نہ اختیار کرو' اگر تم نے ان ہدایات پر عمل کیا جو توکل کے باب میں لکھی گئی ہیں تو تمہارا رزق ایسے ذرائع سے تم تک پہنچے گا کہ تمہیں اس کا گمان بھی نہ ہو گا۔ تقویٰ اور توکل کو اپناؤ' تمہیں خود اس آیت کی صداقت کا تجربہ ہو جائے گا:-

وَمَنْ يَتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ۔

(پ ۲۸ ر ۱۷ آیت ۳)

اور جو شخص اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لئے نجات کی شکل نکال دیتا ہے اور اس کو ایسی جگہ سے رزق پہنچاتا ہے' جہاں اس کا گمان بھی نہیں ہوتا۔

اللہ تعالیٰ اس امر کا متکفل نہیں ہے کہ تمہیں مرغ و ماہی عطا کرے' بلکہ اس نے اس رزق کا وعدہ کیا ہے جس سے زندگی قائم رہے یہ رزق ہر اس شخص کو عطا کیا جاتا ہے جو اپنے کفیل سے متعلق رہے' اور اس پر ایمان رکھے۔ تمہیں یہ بات جان لینی چاہیے کہ رزق کے وہ اسباب جو بظاہر تمہیں نظر آتے ہیں ان سے کہیں زیادہ وہ اسباب ہیں جو تمہاری نظروں سے اوجھل ہیں' رزق کے بے شمار راستے ہیں' اور لامحدود راہیں ہیں' ان کی نشاندہی نہیں کی جا سکتی' کیوں کہ یہ راہیں آسمان سے نکلتی ہیں' اور تمام روئے زمین پر پھیلتی ہیں۔ قرآن کریم میں ہے:-

وَفِي السَّمَاءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوْعَدُوْنَ۔

(پ ۲۶ ر ۱۸ آیت ۲۲)

اور تمہارا رزق اور جو تم سے وعدہ کیا جاتا ہے آسمان میں ہے۔

آسمان کے اسرار سے کوئی واقف نہیں ہے۔ روایت ہے کہ کچھ لوگ حضرت جنید بغدادیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے' آپ نے ان

سے دریافت فرمایا کہ تم کسی چیز کی تلاش میں ہو' انہوں نے عرض کیا کہ ہم رزق تلاش کر رہے ہیں فرمایا : اگر تمہیں رزق ملنے کی جگہ معلوم ہو تو تلاش کرو' ہم نے عرض کیا کہ ہم اللہ سے مانگیں گے' فرمایا : اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ وہ تمہیں بھول گیا ہے تو ضرور مانگو' انہوں نے عرض کیا : اگر یہ بات ہے تو ہم گھر میں جا کر بیٹھتے ہیں اور توکل کرتے ہیں' اور دیکھتے ہیں کہ رزق کہاں سے آئے گا۔ حضرت جنیدؒ نے فرمایا : تجربے کے لئے توکل کرنا مشکوک ہے' انہوں نے عرض کیا : اچھا آپ ہی کوئی تدبیر بتلائیں فرمایا : تدبیر نہ کرو' احمد ابن عیسٰی الخراز کہتے ہیں کہ میں جنگل میں تھا' مجھے بہت زیادہ بھوک لگی' میرے نفس نے شدت سے اس امر کا تقاضا کیا کہ میں اللہ تعالیٰ سے کھانے کی درخواست کروں' مگر پھر مجھے خیال آیا کہ یہ متوکلین کا شیوہ نہیں ہے' تب نفس نے یہ خواہش کی کہ اللہ تعالیٰ سے صبر کی درخواست کروں' ابھی میں دعا کے الفاظ زبان پر لانا ہی چاہتا تھا کہ کسی غیبی آواز نے مجھ سے اس طرح خطاب کیا :۔

وَيَزْعَمُ أَنَّهُ مِنَّا قَرِيبٌ - وَإِنَّا لَانُضِيعُ مَنْ أَتَانَا
وَيَسْأَلُنَا عَلَى الْإِقْتَارِ جُهْدًا - كَأَنَّا لَانَرَاهُ وَلَا يَرَانَا

(وہ ہم سے قریب ہونے کا گمان کرتا ہے' جو ہمارے پاس آجاتا ہے ہم اسے تباہ نہیں کرتے' وہ مفلسی میں صبر کا سوال کرتا ہے' گویا نہ ہم اسے دیکھ رہے ہیں اور نہ وہ ہمیں دیکھ رہا ہے)۔

تم نے یہ بات جان لی ہو گی کہ جس شخص کا دل منکسر اور قلب مضبوط ہوتا ہے' اور جس کا باطن بزدلی کے باعث ضعیف نہیں ہوتا' اور جو اللہ تعالیٰ کی تدبیر پر پختہ یقین اور اعتقاد رکھتا ہے اس کا نفس ہمیشہ مطمئن رہتا ہے' اس کا حال یہ ہے کہ اسے موت آئے گی اور موت کسی سے رک نہیں سکتی' اس شخص کو بھی موت کے حادثے سے دوچار ہونا ہے جسے اللہ تعالیٰ پر اطمینان نہیں ہے۔

بہرحال تمام توکل یہ ہے کہ بندے کی طرف سے قناعت ہو' اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس وعدۂ رزق کی تکمیل جو اس نے اپنے بندوں سے کیا ہے۔ اس نے قناعت کرنے والوں تک رزق پہنچانے کا ایک نظام بنایا ہے' اور اس کی ضمانت لی ہے' جو تجربہ کرنا چاہے اس کا تجربہ کرلے وہ اپنی ضمانت میں سچا ہے' تم قانع بن کر تو دیکھو اس ضمانت کی صداقت کا مشاہدہ کرلو گے' ایسی ایسی جگہوں سے رزق پاؤ گے کہ تمہارے وہم و گمان میں بھی نہ ہو گا کہ فلاں جگہ سے رزق پہنچ سکتا ہے' مگر شرط یہی ہے کہ آدمی توکل میں اسباب کا منتظر نہ رہے' نہ ان سے امید وابستہ کرے' اس کا تمام تر التفات مسبّب الاسباب کی طرف ہو' جیسے لکھنے میں قلم پر نظر نہیں کی جاتی' بلکہ لکھنے والوں کے دل کا خیال کیا جاتا ہے' قلم کی اصل حرکت کا تعلق دل سے ہے' اور کیوں کہ وہی اصل محرک ہے اس لئے یہ مناسب نہیں کہ اسے چھوڑ کر کسی دوسرے محرک کی طرف التفات کیا جائے' توکل کی یہ شرط اس شخص کے لئے جو زاد راہ لئے بغیر جنگلوں میں گھومتا ہے یا شہروں میں گمنامی کی زندگی گذارتا ہے۔ لیکن وہ لوگ جو علم اور عبادت میں شہرت رکھتے ہیں جب دن رات میں ایک مرتبہ کھانے پر قناعت کریں اگرچہ وہ لذیذ نہ ہو' اور وہ موٹا کپڑا پہنیں جو اہل دین کی شان کے مطابق ہے تو انہیں یہ چیزیں ایسی جگہوں سے ملتی رہتی ہیں جہاں سے انہیں گمان بھی نہیں ہوتا بلکہ بسا اوقات یہ چیزیں مقدار میں کئی گنی زیادہ ملتی ہیں ایسے لوگوں کا توکل نہ کرنا' اور حصول رزق کے لئے جدوجہد کرنا نہایت ضعف اور کوتاہی کی بات ہے۔ ان کی شہرت حصول رزق کا ایک بڑا ظاہری سبب ہے' انہیں اپنی شہرت کے باعث اتنا رزق مل جاتا ہے کہ اگر کوئی گمنام آدمی شہروں میں جا کر رہے اور رزق کمائے تو اسے اتنا رزق نہیں مل پاتا اس سے معلوم ہوا کہ اہل دین کے لئے رزق کا اہتمام کرنا برا ہے' اور اس سے بھی زیادہ برا اہتمام رزق ان علماء اور عابدین کا ہے جو علم و عبادت کے باعث شہرت رکھتے ہیں' انہیں تو قانع ہونا چاہیے' قانع عالم کو نہ صرف اس کا رزق ملتا ہے' بلکہ ان لوگوں کا بھی رزق ملتا ہے جو اس کے ساتھ رہتے ہیں۔

اگر کوئی عالم لوگوں سے لینا پسند نہیں کرتا' بلکہ اپنے دست و بازو سے کما کر کھانا چاہتا ہے تو یہ صورت اس عالم کی شان کے مطابق ہے جو علم و عمل کے ظاہر پر عمل پیرا ہے' اور باطنی سیر سے محروم ہے۔ اس لئے کہ کسب کی مشغولیت بندہ کو باطن کی سیر سے

روک دیتی ہے' اس لئے علماء کے لئے بہتر یہی ہے کہ وہ سیر باطن میں مشغول ہوں' اور اپنی ضرورت کے لئے ان لوگوں کے ہدایا قبول کرلیا کریں جو ان ہدایا کے ذریعے اللہ کے تقرب کے خواہاں ہیں۔ اس طرح فکر معیشت سے یکسوئی رہے گی' اور اللہ کے لئے ہو کر رہنے میں کوئی چیز مانع نہیں ہوگی' اور ان لوگوں کے اجر و ثواب پر بھی اعانت ہوگی جو ان کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی قربت چاہتے ہیں۔

جو شخص اللہ تعالیٰ کی عادات جاریہ پر نظر رکھتا ہے وہ یہ بات جانتا ہے کہ رزق بقدر اسباب و وسائل عطا نہیں کیا جاتا' چنانچہ کسی بادشاہ نے ایک دانشور سے پوچھا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے کہ احمق کو رزق عطا کردیا جاتا ہے اور عقلمند محروم رہتا ہے۔ دانشور نے جواب دیا کہ اس طرح اللہ تعالیٰ اپنے وجود کا ثبوت دینا چاہتا ہے۔ اگر ہر عقلمند کو رزق عطا کیا جاتا ہے اور ہر احمق کو محروم رکھا جاتا تو لوگ یہ کہہ سکتے تھے کہ عقلمند کو اس کی عقل نے رزق دلایا ہے' اور جب معاملہ اس کے برعکس ہے تو ثابت ہوا کہ رازق عقل نہیں ہے' بلکہ کوئی اور ہی ہے' یہاں ظاہری اسباب معتبر نہیں ہیں بقول شاعر :-

وَلَوْ كَانَتِ الْأَرْزَاقُ تَجْرِيْ عَلَى الْحِجَا هَلَكْنَ إِذًا مِنْ جَهْلِهِنَّ الْبَهَائِمُ

(اگر رزق عقل پر عطا کئے جاتے تو بیچارے بہائم تو اپنی جہالت کی وجہ سے ہلاک ہی ہو گئے ہوتے)۔

اسباب سے تعلق میں متوکلین کے احوال کی مثال جاننا چاہیے کہ مخلوق کی مثال اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایسی ہے جیسے کچھ سائل قصر شاہی کے دروازے سے متصل میدان میں جمع ہو جائیں' ان سب کو کھانے کی ضرورت ہو' اور اسی ضرورت کی تکمیل کے لئے وہاں اکٹھے ہوئے ہیں' چنانچہ بادشاہ بہت سے غلاموں کو روٹیاں دے کر دروازے پر بھیجے' اور انہیں حکم دے کہ وہ بعض لوگوں کو دو دو روٹیاں دیں' اور بعض کو ایک ایک روٹی دیں' اور کوشش یہ کریں کہ ان سائلین میں سے کوئی محروم نہ رہ جائے' پھر ایک شخص کو بھیج کر یہ اعلان کرائے کہ تمام سائلین پُر سکون رہیں' جب میرے غلام روٹیاں لے کر آئیں تو ان سے نہ چھینیں' بلکہ ہر شخص اپنی جگہ اطمینان کے ساتھ کھڑا رہے' تمام غلام مسخر ہیں' اور حکم کے پابند ہیں' انہیں حکم دیا گیا ہے کہ وہ تم تک روٹیاں پہنچائیں' وہ لامحالہ اس حکم پر عمل کریں گے۔ تم میں سے جو شخص غلاموں سے چھینے گا' اور انہیں تکلیف پہنچا کر دو روٹیاں لے گا اور میدان کا دروازہ کھلنے پر باہر نکلے گا تو میں اس پر ایک غلام مقرر کروں گا' یہاں تک کہ میں اسے اس دن سزا دوں جو میں نے اپنے نزدیک مقرر کرلیا ہے' وہ دن مجھے معلوم ہے لیکن میں اسے پوشیدہ رکھتا ہوں' اور جو شخص غلاموں کو تکلیف نہیں دے گا بلکہ خاموشی کے ساتھ ان کے ہاتھوں سے ایک روٹی لے لے گا اور اسی پر قناعت کرے گا میں اسے اسی مقرر دن پر جس میں دوسرے کو سزا دوں گا ایک قیمتی خلعت سے سرفراز کروں گا' اور جو سائل اپنی جگہ ٹھہرا رہے گا اور دو روٹیاں حاصل کرے گا نہ اسے سزا ہوگی اور نہ خلعت عطا کیا جائے گا' اور جو شخص محروم رہے گا' اور رات بھر بھوکا سوئے گا' نہ میرے غلاموں پر ناراض ہو گا' نہ بھوک کا شکوہ کرے گا میں اسے اپنا وزیر بناؤں گا' اور سلطنت کا نظم و نسق اس کے حوالے کروں گا۔

اس اعلان کے بعد سائلین کی چار قسمیں ہوگئیں' ایک قسم ان لوگوں کی ہے جن پر پیٹ کی شہوتیں غالب ہیں' جب غلام روٹیاں لے کر آتے ہیں تو یہ لوگ اس عقوبت کی پروا نہیں کرتے جن سے انہیں ڈرایا گیا ہے' بلکہ ان پر ٹوٹ پڑتے ہیں' اور لڑ جھگڑ کر دو روٹیاں حاصل کرلیتے ہیں' اور کہتے ہیں کہ کل میں بڑا فاصلہ ہے' ہمیں اب بھوک لگ رہی ہے چنانچہ یہ دو روٹیاں لے کر نکل جاتے ہیں اور موعودہ سزا سے بچ نہیں پاتے' اس وقت حسرت و ندامت سے ہاتھ ملتے ہیں' لیکن اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ دوسری قسم میں وہ لوگ ہیں جنہوں نے سزا کے خوف سے غلاموں کو تکلیف نہیں پہنچائی' لیکن جب انہیں دو روٹیاں دی گئیں تو انہوں نے قبول کرلیں' کیوں کہ ان پر بھوک کا غلبہ تھا' یہ لوگ سزا سے تو محفوظ رہے' لیکن خلعت نہ پاسکے۔ تیسری قسم میں وہ لوگ ہیں جنہوں نے یہ سوچا کہ ہمیں کھلی جگہ پر بیٹھنا چاہیے' تاکہ جب غلام روٹیاں لے کر آئیں تو ہمیں نظرانداز نہ کر سکیں' تاہم جب وہ روٹی لے کر آئیں گے تو ہم دو کے بجائے ایک روٹی لیں گے اور اسی پر قناعت کریں گے' شاید ہم خلعت فاخرہ

سے سرفراز کردیے جائیں۔ چوتھی قسم میں وہ لوگ ہیں جو میدان کے کونوں میں چھپ گئے' اور لوگوں سے ہٹ کر ایسی جگہ جا بیٹھے جہاں نظر نہ آسکیں' انہوں نے کہا کہ اگر غلاموں نے ہمیں ڈھونڈ نکالا اور روٹیاں دینی چاہیں تو ہم صرف ایک روٹی لیں گے اور اسی پر قناعت کریں گے' اور اگر وہ لوگ ہمیں نہ پاسکے تو ہم بھوک کی تکلیف برداشت کریں گے اور اس پر صبر کریں گے' شاید رات کٹ جائے اور غلاموں پر غصہ بھی نہ آئے تو وزارت کے منصب پر فائز ہو جائیں گے اور بادشاہ کا تقرب حاصل کرلیں گے۔ لیکن ان کا منصوبہ کامیاب نہیں ہوا' اور غلاموں نے انہیں ڈھونڈ نکالا' اور جہاں جہاں بھی وہ پائے گئے انہیں ایک ایک روٹی دیدی' مسلسل کئی روز تک ایسا ہی ہوتا رہا' ایک دن تین افراد کسی ایسی جگہ جا چھپے جہاں غلاموں کی نظر نہیں پہنچ سکی۔ اور اس طرح وہ روٹی سے محروم رہے۔ انہیں اسی بھوک کے عالم میں رات گذارنی پڑی۔ ان تین میں سے دو افراد نے رات کو بھوک کا شکوہ کیا' اور غلاموں کی اس کوتاہی پر خفگی ظاہر کی کہ وہ انہیں تلاش نہ کرسکے' اور خواہ مخواہ انہیں بھوکا سونا پڑ رہا ہے' صرف ایک شخص خاموش رہا۔ یہاں تک کہ صبح ہو گئی اس شخص کو قرب اور وزارت کا منصب ملا۔

اس مثال میں میدان سے مراد دنیوی زندگی ہے' میدان کا دروازہ موت ہے' اور نامعلوم مدت قیامت ہے' اور منصب وزارت وہ وعدۂ شہادت ہے جو متوکل کے لئے کیا گیا ہے' اگر وہ بھوک سے مرجائے' اور اس موت پر راضی ہو' اس وعدے کی تکمیل میں قیامت تک تاخیر نہیں ہوگی کیونکہ شہداء اللہ تعالیٰ کے پاس زندہ رہتے ہیں اور انہیں رزق عطا کیا جاتا ہے' جو لوگ دست و گریباں ہوتے ہیں وہ ہیں جو اسباب میں حدود سے تجاوز کرتے ہیں' اور منتظر غلاموں سے مراد اسباب ہیں' اور میدان کے کھلے حصے ہیں' غلاموں کی نظروں کے سامنے بیٹھنے والے وہ لوگ ہیں جو شہروں کی مسجدوں اور خانقاہوں میں خاموش اور پرسکون بیٹھے رہتے ہیں' اور گوشوں میں چھپنے والے لوگ وہ ہیں جو زاد راہ لئے بغیر جنگلوں میں گشت لگاتے ہیں اسباب ان کی جستجو میں رہتے ہیں' اکثر ایسا ہوتا ہے کہ انہیں رزق مل جاتا ہے' کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ رزق نہیں مل پاتا' وہ اس حال پر بھی راضی رہتے ہیں' اور کسی شکوے کے بغیر موت کو گلے لگا لیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو شہادت اور قرب الٰہی کی سعادت نصیب ہوتی ہے۔

مخلوق ان چار طبقوں پر منقسم ہے' اگر دیکھا جائے تو سو میں سے نوّے ایسے ہیں جو اسباب کے پیچھے پڑے رہتے ہیں' اور سات ایسے ہیں جو شہروں میں مقیم رہ کر' یا اپنی شہرت سے فائدہ اٹھا کر رزق پالیتے ہیں' اور تین ایسے ہیں جو جنگلوں میں پھرتے ہیں' ان تین میں سے دو رزق سے محرومی پر شکوہ کرتے ہیں' اور اسباب سے بدظن ہوتے ہیں' صرف ایک شخص ایسا رہ جاتا ہے جو بھوک کی اذیت پر صبر کرتا ہے' اور اس حالت میں مرنا پسند کرتا ہے۔ یہی شخص قرب کے مرتبے تک پہنچتا ہے۔ سو میں ایک کی یہ نسبت بھی گذشتہ دور میں رہی ہوگی' اب تو دس ہزار میں ایک شخص بھی ایسا نہیں ملے گا جو اسباب کا تارک ہو اور محض اللہ تعالیٰ پر اعتماد کرتا ہو۔

دوسرا مقصد۔ حفظ منفعت جس شخص کو وراثت' کسب یا سوال یا کسی اور ذریعے سے مال حاصل ہو' ہے اس کے لئے اس مال کو ذخیرہ کرنے میں تین حال ہیں۔ پہلی حالت یہ ہے کہ فی الوقت ضرورت کے بقدر لے لے' یعنی اگر بھوکا ہو تو کھالے ننگا ہو تو پہن لے' اور مکان کی ضرورت ہو تو مختصر مکان خرید لے' اور باقی مال اسی وقت تقسیم کرڈالے' اس میں سے اور کچھ نہ لے نہ اس مقدار کے علاوہ بچا کر رکھے جس کی کسی کو ضرورت یا استحقاق ہے' اسی نیت کے ساتھ بچا کر رکھے۔ ایسا شخص حقیقت توکل کے مقتضیٰ پر عمل کرنے والا ہے' اور یہ درجہ سب سے اعلا ہے۔ دوسری حالت جو اس کے بالکل برعکس ہے اور توکل کی حدود سے خارج ہے یہ ہے کہ ایک سال یا اس سے زائد کے لئے بچا کر رکھے' ایسا شخص کسی بھی حالت میں متوکل نہیں مانا جائے گا' چنانچہ کہا جاتا ہے کہ صرف تین جانور ذخیرہ کرتے ہیں چوہا' چیونٹی اور انسان۔ تیسری حالت یہ ہے کہ چالیس روز یا اس سے کم مدت کے لئے ذخیرہ کرے' لیکن اس سلسلے میں علماء کا اختلاف ہے کہ یہ حالت آدمی کو اس درجے سے محروم کرتی ہے یا نہیں جس کا وعدہ متوکلین سے کیا گیا ہے۔ سہیل تستریؒ فرماتے ہیں کہ یہ شخص توکل کی حدود سے خارج ہو جائے گا' خواصؒ فرماتے ہیں کہ اگر اس نے چالیس روز کے لئے ذخیرہ کیا تو توکل کی حدود سے خارج نہیں گا' ابو طالب مکی فرماتے ہیں کہ چالیس روز کی مدت سے زیادہ ذخیرہ کرنے سے بھی بندہ توکل سے خارج نہیں ہوتا۔ جب اصل ادخار (ذخیرہ کرنا) جائز ہے تو پھر اس اختلاف کے کوئی معنی نہیں

ہیں، مثلاً کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ ذخیرہ کرنا ہی توکل کے منافی ہے' اس صورت میں میعاد مقرر کرنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی' اللہ تعالیٰ نے جو ثواب جس مرتبے پر رکھا ہے وہ اسی پر متفرع ہوتا ہے' اس کا ایک آغاز ہے' اور ایک انجام ہے درمیان میں بہت سے درجات ہیں' جو لوگ اس کے انجام پر ہیں وہ سابقین اور آغاز والے اصحاب یمین کہلاتے ہیں' پھر اصحاب یمین کے بھی بہت سے درجات ہیں' اسی طرح سابقین کے بھی درجات ہیں' اصحاب یمین کا بلند ترین درجہ وہاں سے شروع ہوتا ہے جہاں سابقین کے کم تر درجے کی انتہا ہوتی ہے اس صورت میں مدت مقرر کرنے کے کیا معنی ہیں۔

تحقیقی بات یہ ہے کہ ذخیرہ نہ کرنے سے توکل اس وقت پورا ہوتا ہے جب اَمل کوتاہ ہو' لیکن یہ قید لگانا صحیح نہ ہوگا کہ زیست کی بالکل امید نہ ہو' اس لئے کہ ایسا ہونا ممکن نہیں ہے' زیست کی امید ضرور ہوگی خواہ ایک ہی لمحے کے لئے کیوں نہ ہو' پھر طول امل اور قصر امل میں لوگ متفاوت ہیں۔ امل کا کم تر درجہ ایک دن رات یا اس سے کم ساعتیں ہیں' اور انتہائی درجہ اس قدر ہے جس قدر انسان کی عمر ہوتی ہے۔ ان دونوں کے درمیان بیشمار درجات ہیں۔ جو شخص ایک مہینے سے زیادہ جینے کی توقع نہ رکھے وہ اس شخص کے مقابلے میں مقصود سے قریب تر ہے جو ایک سال سے زیادہ جینے کی امید رکھتا ہے۔ جن لوگوں نے چالیس دن کی قید لگائی ہے ان کے پیش نظر اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی میعاد ہے تو یہ غلط ہے' اس لئے کہ ان کی میعاد سے وہ مقدار بیان کرنی مقصود نہیں تھی جس میں امل کی رخصت ہے' بلکہ یہ میعاد اس لئے مقرر کی گئی تھی تاکہ وہ اس موعودہ شئی کے مستحق ہو جائیں جو چالیس دن گذرے بغیر نہیں مل سکتی۔ چالیس روز کے بعد اس موعودہ شئی کے استحقاق کی بات ایک ایسا راز ہے جو اللہ تعالیٰ عادتاً ایسے امور میں رکھتا ہے۔ چنانچہ حدیث شریف میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی مٹی کو اپنے ہاتھ سے چالیس روز تک خمیر کیا (ابو منصور دیلمی۔ ابن مسعود۔ سلمان) گویا اس مٹی کو خمیر کا استحقاق پانے میں چالیس روز کی مدت درکار تھی۔

جو شخص ایک برس سے زیادہ کے لئے جمع کرے گا وہ ضعیف القلب ہوگا' اور ظاہری اسباب کی طرف میلان رکھتا ہوگا ایسا شخص توکل کے مقام سے بہت دور ہے' اور اس نظام الٰہی کا معتقد نہیں ہے جو اس نے رزق کے لئے مخفی اسباب کی صورت میں قائم کر رکھا ہے' ایک سال سے زیادہ مدت کے لئے ذخیرہ کرنا اس لئے خلاف توکل ہے کہ پیداوار اور زکوٰۃ وغیرہ میں داخلی اسباب سال مؤثر ہوتے ہیں' جو شخص ایک سال سے کم کے لئے ذخیرہ کرتا ہے اس کے لئے اس کے قصر امل کے مطابق درجہ ہے' جس کا امل دو مہینوں کا ہوتا ہے اس کا درجہ اس شخص سے کم ہوتا ہے جس کا امل ایک ماہ کا ہوتا ہے' اور اس سے زیادہ ہوتا ہے جس کا امل تین ماہ کا ہوتا ہے' گویا اس کا درجہ ان دونوں کے درمیان ہوگا' کوتاہی امل کے علاوہ کوئی چیز ذخیرہ اندوزی سے مانع نہیں ہے۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ آدمی بالکل ذخیرہ نہ کرے' اگر قلب ضعیف ہو تو جس قدر ذخیرہ کم کرے گا اسی قدر افضل ہوگا۔ اس فقیر کا قصہ قابل غور ہے جس کو غسل دینے کے لئے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور حضرت اسامہؓ کو حکم دیا تھا' چنانچہ ان دونوں حضرات نے اسے غسل دیا' اور ایک چادر میں کفنا دیا' جب اسے قبر میں اتارا گیا تو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب سے فرمایا کہ یہ شخص قیامت کے دن اس حال میں اٹھے گا کہ اس کا چہرہ چودھویں رات کے چاند کی طرح چمکتا ہوگا' اور اگر اس میں ایک خصلت نہ ہوتی تو یہ شخص اس حالت میں اٹھتا کہ اس کا چہرہ آفتاب کی طرح روشن ہوتا' ہم (صحابہ) نے عرض کیا یا رسول اللہ! وہ خصلت کیا ہے؟ آپ نے ارشاد فرمایا وہ بہت زیادہ روزے رکھتا تھا' بڑا تہجد گذار تھا' اللہ تعالیٰ کا بہت زیادہ ذکر کرنے والا تھا' مگر اس میں یہ عادت تھی کہ جب سردی کا موسم آتا تو گرمی کے کپڑے آنے والی گرمی کے لئے رکھ دیتا' اور گرمی کا موسم آتا تو سردی کے کپڑے آنے والی سردی کے لئے اٹھا کر رکھ دیتا۔ اس کے بعد سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔ مِنْ اَقَلِّ مَا اُوْتِیْتُمُ الْیَقِیْنُ وَعَزِیْمَةُ الصَّبْرِ (۱)

جو چیزیں تمہیں کم عطا کی گئی ہیں ان میں یقین اور صبر کی عزیمت ہے۔

---

(۱) یہ روایت اس تفصیل کے ساتھ کہیں نہیں ملی' البتہ اس کا آخری حصہ ابھی گذرا ہے۔

کوزہ' دستر خوان' اور اسی طرح وہ چیزیں جن کی عام طور پر ضرورت رہتی ہے اس حکم میں نہیں ہے۔ ان چیزوں کو ذخیرہ کرنے سے توکل کا درجہ کم نہیں ہو گا' البتہ سردی کے کپڑوں کی ضرورت گرمی میں باقی نہیں رہتی' اس لئے انہیں اٹھا کر رکھنا توکل کے درجے کو کم کر دیتا ہے' لیکن یہ اس شخص کے حق میں ہے جس کا دل ذخیرہ نہ کرنے سے پریشان نہ ہوتا ہو' اس کی نظر لوگوں کے ہاتھوں پر نہ رہتی ہو' بلکہ اس کا نفس وکیل برحق کے علاوہ کسی کی طرف ملتفت نہ ہوتا ہو لیکن اگر ذخیرہ نہ کرنے سے دل مضطرب اور پریشان ہوتا ہو' اور عبادت کرنے یا ذکر و فکر کرنے میں خلل واقع ہوتا ہو تو اس کے لئے ذخیرہ کرنا ہی بہتر ہے' بلکہ اگر اس کے پاس کوئی ایسی جائیداد ہو جس کی آمدنی اس کی گذر بسر کے لئے کافی ہو' اور اس کا دل اس کے بغیر عبادت کے لئے فارغ نہ ہوتا ہو تو اس جائیداد کو باقی رکھنا ہی اس کے حق میں بہتر ہے۔ اس لئے کہ مقصد قلب کی اصلاح ہے تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کے ذکر کے لئے فارغ ہو جائے۔ مختلف مزاج کے لوگ ہیں بعض لوگ مال رکھ کر پریشان ہوتے ہیں' اور بعض لوگ مال نہ رکھنے کے باعث مضطرب رہتے ہیں' ممنوع وہ امر ہے جو دل کو اللہ کی عبادت سے غافل کردے' ورنہ دنیا فی نفسہا ممنوع نہیں ہے۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم مخلوق کی تمام اصناف کی طرف مبعوث ہوئے ہیں' ان میں تاجر بھی ہیں' پیشہ ور بھی ہیں' اور اہل صنعت بھی ہیں۔ آپ نے نہ کسی تاجر کو ترک تجارت کا حکم دیا' نہ پیشہ ور کو اپنا پیشہ چھوڑنے کے لئے فرمایا' اور نہ ان لوگوں سے تجارت کرنے یا پیشہ اختیار کرنے کے لئے کہا جو ان میں مشغول نہیں تھے' بلکہ ان تمام طبقوں کو اللہ کی طرف بلایا اور انہیں بتلایا کہ ان کی کامیابی اور نجات صرف اس بات میں مضمر ہے کہ ان کے قلوب دنیا سے منحرف ہو کر اللہ تعالیٰ کی طرف مائل ہوں' اور اس کے ذکر و فکر میں مشغول ہوں۔ اشتغال کا بہترین ذریعہ قلب ہے۔ اس لئے جس شخص کا دل کمزور ہے اس کے لئے ضرورت کے بقدر ذخیرہ کرلینا بہتر ہے' اور جس کا دل قوی ہے اسکے لئے ذخیرہ نہ کرنا اچھا ہے' لیکن یہ تنہا آدمی کا حکم ہے' عیالدار کا حکم یہ ہے کہ اگر اس نے اپنے عیال کے ضعف قلوب کے پیش نظر' اور ان کی تسکین و تسلی کے لئے سال بھر کے لئے رزق کا ذخیرہ کیا تو توکل کی حد سے خارج نہیں ہو گا۔ البتہ ایک برس سے زائد مدّت کے لئے ذخیرہ کرنا توکل کے منافی ہے' کیوں کہ ہر سال اسباب مکرر ہوتے ہیں۔ اس سے زیادہ ذخیرہ کرنا قلب کے انتہائی ضعف پر دلالت کرتا ہے جو توکل کی قوت کے خلاف ہے' متوکل اس شخص کو کہتے ہیں جو موحد ہو' مضبوط دل رکھتا ہو' اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم پر مطمئن ہو۔ اور ظاہری اسباب کے بجائے اس کے انتظام پر یقین رکھتا ہو' روایات میں ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عیال کے لئے ایک سال کی غذا جمع فرمائیں (بخاری و مسلم) دوسری طرف آپ نے حضرت ام ایمنؓ وغیرہ کو فرمایا کہ وہ کل کے لئے کوئی چیز اٹھا کر نہ رکھیں (۱) ایک مرتبہ حضرت بلال حبشیؓ نے روٹی کا ایک ٹکڑا افطار کے لئے بچا کر رکھ دیا' آپ نے ان سے ارشاد فرمایا :۔

أَنْفِقْ بِلَالًا وَلَا تَخْشَ مِنْ ذِي الْعَرْشِ إِقْلَالًا۔ (بزار۔ ابن مسعودؓ' ابو ہریرہؓ)

اے بلال! اسے خرچ کردے اور عرش والے سے مفلسی کا خوف نہ کر۔

ایک مرتبہ آپ نے انہی سے یہ ارشاد فرمایا :۔

إِذَا سُئِلْتَ فَلَا تَمْنَعْ وَإِذَا أُعْطِيْتَ فَلَا تَخْبَأْ۔ (طبرانی' حاکم۔ ابو سعید تمیمہ)

جب تجھ سے مانگا جائے تو انکار مت کر' اور جب تجھ کو دیا جائے تو پوشیدہ مت رکھ۔

ہم لوگوں کو سید المتوکلین سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتدا کرنی چاہیے' ایک طرف آپ کے توکل کا یہ عالم تھا کہ پیشاب کرنے کے بعد فوراً تیمم فرما لیتے' حالانکہ پانی قریب ہوتا ارشاد فرماتے کیا معلوم میں پانی تک پہنچ بھی پاؤں گا (ابن ابی الدنیا۔ ابن عباس) دوسری طرف آپ نے ذخیرہ فرمایا' اس سے آپ کے توکل میں کمی واقع نہیں ہوئی' اس لئے کہ آپ کو اپنے ذخیرے پر اعتماد نہ تھا' بلکہ اس ذات پر اعتماد تھا جو رزق عطا کرتا ہے' اگر آپ نے ذخیرہ فرمایا تو اس لئے تاکہ امت کے لئے اس عمل کی گنجائش نکل آئے' ہو سکتا ہے آپ کی امت میں قوت رکھنے والے لوگ بھی ہوں' لیکن وہ بہرحال آپ کے مقابلے میں ضعیف تر ہوں گے۔

(۱) یہ روایت پہلے بھی گذری ہے۔

آپ نے ایک برس کا ذخیرہ اس لئے نہیں فرمایا تھا کہ آپ میں یا آپ کے عیال میں ضعف تھا' یا آپ کا اور آپ کے عیال کا اعتقاد کمزور تھا' بلکہ ذخیرہ کرنے کی وجہ یہی تھی کہ امت کے ضعیف اور کمزور لوگوں کے لئے یہ طریقہ مسنون ہو جائے اور وہ اپنے قلوب کی تسلی کے لئے ذخیرہ کر سکیں۔ ایک حدیث میں ہے :۔

إِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى يُحِبُّ أَنْ تُؤْتٰى رُخْصَةُ كَمَا يُحِبُّ أَنْ تُؤْتٰى عَزَائِمُهُ۔ (احمد' طبرانی' بیہقی۔ ابن عمرؓ)

اللہ تعالیٰ جیسے یہ پسند کرتا ہے کہ عزائم پر عمل کیا جائے اسی طرح یہ بھی پسند کرتا ہے کہ رخصت پر عمل کیا جائے۔

یہ ارشاد بھی دراصل ضعفاء کی دل جوئی اور تسلی کے لئے ہے' تاکہ ان کا ضعف یاس اور ناامیدی پر منتج نہ ہو' اور وہ یہ سوچ کر اعمال خیر سے باز نہ رہیں کہ اعلا درجات تک پہنچنا ان کے بس میں نہیں ہے۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم تمام جہانوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ یاس اور ناامیدی پیدا کرنے کے لئے مبعوث نہیں فرمائے گئے۔

اس پوری گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ ذخیرہ کرنا بعض لوگوں کے لئے مضر ہے' اور بعض لوگوں کے لئے مضر نہیں ہے۔ اور اس پر حضرت ابو امامہ الباہلی کی یہ روایت دلالت کرتی ہے کہ اصحاب صفہ میں سے ایک صحابی کی وفات ہوئی تو انکے لئے کفن کا انتظام نہ ہو سکا۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے ارشاد فرمایا کہ ان کے کپڑوں کی تلاشی لو۔ لوگوں نے جیبیں ٹٹولیں تو ان میں دو دینار تھے' آپ نے ارشاد فرمایا یہ دو داغ ہیں (احمد۔ شہر ابن حوشب) یہ بات آپ نے صرف ان صحابی کے متعلق ارشاد فرمائی' حالانکہ بہت سے صحابہ کرام کافی مال و دولت چھوڑتے ہیں' آپ نے کسی کے متعلق بھی یہ بات ارشاد نہیں فرمائی' کیوں کہ ان صحابی کا حال دو احتمال رکھتا ہے اس لئے ارشاد نبوی کے بھی دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک معنی تو یہ ہو سکتے ہیں کہ یہ دو دینار دوزخ کی آگ کے دو داغ ہیں' قرآن کریم میں اس کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے :۔

تُكْوٰى بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوبُهُمْ وَظُهُورُهُمْ۔ (پ ۱۰ ر ۱۱ آیت ۳۵)

ان سے ان لوگوں کی پیشانیوں اور ان کی کروٹوں اور ان کی پشتوں کو داغ دیا جائے گا۔

یہ معنی اس صورت میں ہیں جب کہ وہ اپنے حال سے زہد' فقر' اور توکل کا اظہار کریں' حالانکہ حقیقت میں وہ ایسے نہیں تھے؛ بلکہ دو دینار رکھتے تھے' یہ ایک طرح کا فریب تھا اور اس کی سزا وہ ہو سکتی ہے جس کی طرف مذکورہ بالا حدیث شریف میں اشارہ کیا گیا' اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ تلبیس اور فریب نہ ہو' اس صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ ان کا درجہ کمال ناقص تھا' جیسے اگر خوبصورت چہرے پر دو داغ لگا دیے جائیں تو چہرہ کا کمال ناقص ہو جاتا ہے۔ دنیا میں انسان جو کچھ چھوڑتا ہے وہ اس کے اخروی درجات میں نقصان کا باعث ہوتا ہے' اسلئے کہ کسی شخص کو جس قدر دنیا عطا کی جاتی ہے اسی قدر اس کی آخرت میں سے کم کر دیا جاتا ہے۔

رہا یہ سوال کہ اگر آدمی فارغ قلبی اور سکون دلی کے باوجود ذخیرہ کرے تو اس سے توکل کیوں نہیں باطل ہوتا؟ اس کی دلیل وہ روایت ہے جو حضرت بشر کے متعلق منقول ہے' حسین المغازلی جو آپ کے رفقاء میں سے ہیں روایت کرتے ہیں کہ میں چاشت کے وقت حضرت بشر کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ ایک بزرگ آپ کے پاس تشریف لائے' وہ ادھیڑ عمر کے تھے' انکا رنگ گندمی اور عارض پچکے ہوئے تھے' حضرت بشر انہیں دیکھ کر اپنی جگہ سے کھڑے ہو گئے' میں نے نہیں دیکھا کہ آپ کسی شخص کی تعظیم میں کھڑے ہوئے ہوں' اس کے بعد آپ نے مجھے چند درہم دیئے اور فرمایا کہ تم ہمارے لئے بہترین کھانا اور خوشبو خرید کر لاؤ' آپ نے اس سے پہلے کبھی اس طرح کا کوئی حکم نہیں دیا تھا' چنانچہ میں کھانا لے کر آیا' اور آپ کے سامنے رکھا' آپ نے ان بزرگ کے ساتھ کھانا تناول فرمایا' میں نے نہیں دیکھا کہ آپ نے کسی دوسرے کے ساتھ اس طرح کھانا کھایا ہو' جب کھانے سے فراغت ہو گئی' اور کھانا بچ گیا تو وہ بزرگ کھڑے ہوئے اور جس قدر کھانا بچا تھا اپنے ساتھ باندھ کر لے گئے' مجھے یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا' اور ان کا یہ طریقہ برا معلوم ہوا' حضرت بشر نے مجھ سے فرمایا : ایسا لگتا ہے کہ تمہیں ان کی یہ حرکت پسند نہیں آئی' میں نے عرض کیا جی

ہاں! یہی بات ہے' وہ آپ کی اجازت کے بغیر کھانا لے گئے' حضرت بشرؒ نے فرمایا یہ ہمارے بھائی فتح موصلی ہیں' ہم سے ملاقات کرنے کے لئے موصل سے تشریف لائے ہیں' انہوں نے اپنے اس عمل سے لوگوں کو یہ تعلیم دی ہے کہ اگر توکل صحیح ہو تو ذخیرہ کرنا نقصان دہ نہیں ہوتا۔

تیسرا مقصد دفع مضرت جاننا چاہیے کہ بعض اوقات نفس یا مال میں ضرر کا خوف ہوتا ہے' توکل کی شرط یہ نہیں ہے کہ دافع ضرر اسباب اختیار ہی نہ کئے جائیں مثلاً کسی ایسی جگہ سونا یا رہنا جہاں درندے بہت ہوں' یا سیلاب آتا ہو' یا دیوار شکستہ ہو' یا ٹوٹی ہوئی چھت ہو توکل نہیں ہے' بلکہ یہ تمام امور ممنوع ہیں' جو شخص ایسا کرتا ہے وہ بلا فائدہ اپنی جان کو ہلاکت میں ڈالتا ہے۔

اسباب واقعہ کی قسمیں یہ اسباب واقعہ بھی تین طرح کے ہیں' قطعی' ظنی' وہمی۔ ان میں سے وہمی اسباب کا ترک کرنا توکل کے لئے شرط ہے' اور وہمی اسباب وہ ہیں جن کی نسبت دفع ضرر کی طرف ایسی ہو جیسے داغ اور منتر وغیرہ کو ہے۔ یہ دونوں چیزیں بعض اوقات کسی خوفناک چیز کی آمد سے پہلے کی جاتی ہیں' اور بعض اوقات ان کی آمد کے بعد' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے متوکلین کا وصف اس کے علاوہ کچھ بیان نہیں فرمایا کہ وہ داغ اور منتر وغیرہ نہیں کرتے' یہ نہیں فرمایا کہ جب وہ لوگ کسی ٹھنڈے علاقے میں جاتے ہیں تو گرم کپڑے یا جبہ وغیرہ نہیں پہنتے' حالانکہ جبہ وغیرہ سردی سے تحفظ کے لئے پہنا جاتا ہے۔ اسی طرح کی اور چیزوں کا بھی یہی حکم ہے' ہاں اگر کوئی شخص سردی کے موسم میں باہر نکلنے سے پہلے لہسن وغیرہ اس لئے کھائے کہ جسم میں جاکر گرمی پیدا کرے گا تو یہ امر داغ کے قریب ہو سکتا ہے' جب کہ جبہ اس معنی میں نہیں ہے' تاہم انسان کے ضرر پہنچنے کی صورت میں اسباب واقعہ کا ترک کرنا بہتر ہے' اور داخل توکل ہے' کیوں کہ ان اسباب کا ترک کرنا دراصل اذیت پر صبر کرنا ہے' اور صبر کرنا توکل کی اہم شرط ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :۔

وَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيلًا۔ (پ۲۹ ر۱۳ آیت ۱۰)

اور یہ لوگ جو باتیں کرتے ہیں ان پر صبر کرو اور خوبصورتی کے ساتھ ان سے الگ رہو۔

وَلَنَصْبِرَنَّ عَلَىٰ مَا آذَيْتُمُونَا وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُونَ۔ (پ۱۳ ر۱۳ آیت ۱۲)

اور تم نے جو کچھ ہم کو ایذا پہنچائی ہم اس پر صبر کریں گے' اور اللہ ہی پر بھروسہ کرنے والوں کو بھروسہ کرنا چاہیے۔

وَدَعْ أَذَاهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ (پ۲۲ ر۳ آیت ۴۸)

اور ان کی طرف سے جو ایذا پہنچے اس کا خیال نہ کیجئے' اور اللہ پر توکل کیجئے۔

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُو الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ۔ (پ۲۶ ر۴ آیت ۳۵)

آپ صبر کیجئے جیسے اور ہمت والے پیغمبروں نے کیا تھا۔

نِعْمَ أَجْرُ الْعَامِلِينَ الَّذِينَ صَبَرُوا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ۔ (پ۲۱ ر۲ آیت ۵۹)

(نیک) کام کرنے والوں کا کیا اچھا اجر ہے جنہوں نے صبر کیا اور وہ اپنے رب پر توکل کیا کرتے تھے۔

اذیت پر صبر کرنا انسان کے سلسلے میں ہے' سانپ' بچھو اور درندوں وغیرہ کی اذیت پر صبر کرنا توکل نہیں ہے' کیوں کہ اس میں کوئی فائدہ نہیں ہے' سالک جب بھی کسی شئی کے ترک یا عمل کا ارادہ کرتا ہے اس کا مقصد دین پر اعانت ہوتا ہے' یہاں دفع ضرر میں اسباب کا ترتب ایسا ہی ہے جیسے پہلے مقصد کا ذیل میں کسب معیشت اور مفید اشیاء کے حصول کے اسباب پر گفتگو کے دوران مذکور ہوا ہے۔ اس لئے یہاں دوبارہ لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔

اسی طرح مال کو محفوظ رکھنے کے اسباب بھی ہیں' ان کا بھی یہی حکم ہے' چنانچہ اگر کوئی شخص کمرہ سے باہر نکلتے ہوئے تالا لگا دے' یا جانور کو زنجیر پہنا دے تو یہ توکل کے خلاف نہیں ہے' کیوں کہ اللہ تعالیٰ کی سنت جاریہ سے ان اسباب کا قطعی یا ظنی ہونا معلوم ہو چکا ہے' اس لئے اگر کوئی شخص ان اسباب پر عمل پیرا ہو تو اسے حد توکل سے خارج قرار نہیں دیا جائے گا۔ چنانچہ ایک اعرابی

نے جب اپنا اونٹ کھلا چھوڑ دیا اور یہ کہا کہ میں اللہ پر توکل کرتا ہوں تو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :۔

اِعْقِلْهَا وَتَوَكَّلْ۔ (ترمذی۔ انس) اسے باندھ دے اور توکل کر۔

قرآن کریم میں ہے :۔

خُذُوْا حِذْرَكُمْ (پ ۵ ر ۲ آیت ۱۰۲) اور اپنا بچاؤ لے لو۔

نماز خوف کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :۔

وَلْيَأْخُذُوْا حِذْرَهُمْ وَاَسْلِحَتَهُمْ (پ ۵ ر ۲ آیت ۱۰۲)

اور یہ لوگ بھی اپنے بچاؤ کا سامان اور ہتھیار لے لیں۔

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ۔ (پ ۱۰ ر ۲ آیت ۶۰)

اور جس قدر تم سے ہو سکے قوت (ہتھیار) سے اور پلے ہوئے گھوڑوں سے سامان درست رکھو۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو خطاب فرمایا گیا :۔

فَاَسْرِ بِعِبَادِيْ لَيْلًا۔ (پ ۲۵ ر ۱۳ آیت ۲۳) تو اب میرے بندوں کو تم رات ہی رات میں لے کر چلے جاؤ۔

رات کو جانے میں مصلحت یہ ہے کہ دشمنوں کی نظروں سے بچ کر نکلا جا سکتا ہے' گویا یہ بھی دفع ضرر کا ایک سبب ہے' سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے دشمنوں سے تحفظ کے لئے غار ثور میں قیام فرمایا' نماز خوف کے ذکر میں یہ بیان کیا گیا کہ اپنے اپنے اسلحے لے کر نماز ادا کی جائے' اسلحہ لے کر نماز پڑھنا قطعی سبب دافع نہیں ہے' جیسے سانپ بچھو کو مارنا قطعی سبب ہے' تاہم ہتھیاروں کا لینا ایک ظنی سبب ہے' اور ہم پہلے مقصد کے ضمن میں یہ بیان کر چکے ہیں کہ ظنی بھی قطعی کی طرح ہے۔ اب صرف وہمی اسباب باقی رہ جاتے ہیں' توکل کا تقاضا یہی ہے کہ آدمی ان اسباب کو ترک کر دے۔ ایک بزرگ کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ ان کے شانے پر ایک شیر نے اپنا پنجہ رکھ دیا اور انہوں نے حرکت بھی نہیں کی' ایک اور بزرگ کے متعلق مشہور ہے کہ انہوں نے شیر کو مسخر کر کے اپنا تابع بنا لیا تھا اور وہ اس پر سواری کرتے تھے۔ اب اگر کوئی شخص ان روایات کو سامنے رکھے اور یہ کہے کہ شیر سے اپنا دفاع کرنا بھی ضروری ہے' پھر کیا وجہ ہے کہ ان بزرگوں نے شیر سے اپنا تحفظ نہیں کیا' اس کا جواب یہ ہے کہ یہ روایات اگرچہ صحیح ہیں' لیکن ان کی اقتداء کرنا صحیح نہیں ہے' اس لئے کہ یہ قوت ہر شخص کو نصیب نہیں ہوتی کہ وہ درندوں کو اپنا تابع بنا سکے' یہ کرامات کا ایک اعلا مقام ہے' اور توکل کی شرائط سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے' یہ مقام بھی ایک سر الٰہی ہے' اس پر صرف وہی شخص مطلع ہوتا ہے جو اس کی سیر کرتا ہے' رہا یہ سوال کہ اس مقام تک پہنچنے کی علامات کیا ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جو شخص اس مقام تک پہنچ جاتا ہے اسے کسی علامت کی ضرورت باقی نہیں رہتی وہ خود یہ بات جان لیتا ہے کہ میں اس مقام پر پہنچ گیا ہوں۔ البتہ اس مقام سے پہلے کی ایک علامت ہے وہ ہم ذکر کئے دیتے ہیں اور وہ علامت یہ ہے کہ جو کتا ہر وقت انسان کے پہلو میں رہتا ہے' اور جو خود مالک کو' اور دوسروں کو کاٹتا ہے وہ مسخر اور تابع بن جائے' یہ غضب کا کتا ہے' اگر یہ کتا آدمی کا فرمانبردار اور مطیع ہو جائے' یہاں تک کہ اس کی مرضی اور اشارے کے بغیر اپنی جگہ سے جنبش بھی نہ کرے تو یہ ممکن ہے کہ یہ شخص ترقی کرتے کرتے ایسے درجے پر پہنچ جائے کہ خارجی درندے اس کے تابع ہو جائیں' اور درندوں کا بادشاہ شیر جسے ہم جنگل کا کتا بھی کہہ سکتے ہیں اس کی مرضی پر چلنے لگے۔ کمال کی بات یہ نہیں ہے کہ جنگلی کتے تمہارے تابع ہو جائیں کمال کی بات یہ ہے کہ گھر کے کتے تمہارے تابع رہیں چنانچہ اگر باطن کا کتا تمہارے تابع نہیں ہے تو تمہیں یہ توقع نہ کرنی چاہیے کہ ظاہر کا کتا تمہاری اتباع کرے گا۔

حفاظتی تدابیر کے بعد توکل: یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ چور کے خوف سے گھر میں تالا ڈالنے' یا اونٹ کو بھاگنے سے بچانے کے لئے کھونٹے سے باندھنے' اور دشمن کے ڈر سے ہتھیار لینے میں توکل کی کیا صورت ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ شخص علم اور حال کی رو سے متوکل کہلائے گا۔ علم کی صورت یہ ہے کہ متوکل اس کا یقین کرے کہ چور سے مکان اس لئے محفوظ نہیں رہا کہ میں

نے اس میں قفل لگا دیا تھا' بلکہ صرف خدا تعالیٰ کی حفاظت کام آئی' اور چور اس کے دفع کرنے سے دفع ہوئے' ورنہ بہت سے واقعات ایسے ہوتے ہیں کہ چور مضبوط سے مضبوط تالے توڑ کر سامان لے جاتے ہیں' اسی طرح اونٹ کا باندھنا موثر نہیں ہے' بسا اوقات اونٹ رسی توڑ کر بھاگ جاتے ہیں' یا ہلاک ہو جاتے ہیں' صرف اللہ ہی اونٹ کی کھونٹے پر حفاظت کرتا ہے۔ اسی طرح ہتھیار پہننا بھی کافی نہیں ہے' بہت سے لوگ ہتھیار پہن کر بھی دشمن کے ہاتھوں مقتول یا مغلوب ہو جاتے ہیں' اس لئے میں نے ان اسباب پر بھروسا نہیں کیا بلکہ میرا بھروسا مسبّب الاسباب پر ہے' جیسے وکیل خصومت کی مثال دی گئی ہے' کہ اگر متوکل اس کے کہنے سے عدالت میں حاضری دیتا ہے یا دستاویز لے کر آتا ہے تو اپنی حاضری اور دستاویز پر اعتماد نہیں کرتا بلکہ وکیل کی قوت اور کفایت پر بھروسا کرتا ہے' حال کی صورت یہ ہے کہ اس کے گھر اور نفس میں اللہ تعالیٰ جو فیصلہ فرمائے اس پر راضی رہے' اور یہ کہے کہ اے اللہ اگر تو نے میرے گھر کے سامان پر کسی ایسے شخص کو مسلط کر دیا جو اسے لے جائے تو یہ تیری راہ میں ہے' میں تیرے فیصلے پر راضی ہوں' میں نہیں جانتا کہ جو چیزیں تو نے مجھے دے رکھی ہیں وہ میرے لئے ہبہ ہیں جو تو مجھ سے واپس نہیں لے گا۔ یا امانت اور عاریت ہیں کہ واپس لے لے گا' مجھے نہیں معلوم کہ یہ چیزیں میرا رزق ہیں' یا میری قسمت ہیں یا ازل میں کسی اور کے لئے ان کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ بہرحال تو نے جو فیصلہ بھی کیا ہو میں اس پر راضی ہوں' میں نے دروازہ اس لئے بند نہیں کیا کہ میں تیرے فیصلے سے بچنا چاہتا تھا یا اس کی مخالفت پر آمادہ تھا' بلکہ میں ترتیب اسباب میں تیری سنن جاریہ کے تقاضوں پر عمل کرنا چاہتا تھا' میرا بھروسا اسباب پر نہیں ہے' اے مسبّب الاسباب میں تیری ذات پر بھروسا رکھتا ہوں۔

اگر کسی شخص کا علم یا حال یہ ہو تو امید یہ ہے کہ وہ اونٹ کو پابہ زنجیر کرنے' دروازے کو مقفل کرنے اور ہتھیار لینے سے توکل کی حدود سے خارج نہیں ہو گا' پھر اگر گھر واپس آکر یہ دیکھے کہ گھر کا سامان اپنی سابقہ حالت پر موجود ہے تو اسے اللہ تعالیٰ کی ایک نئی نعمت تصور کرے' اور اگر یہ دیکھے کہ سامان اپنی جگہ موجود نہیں ہے بلکہ چوری ہو گیا ہے تو اپنے دل پر نظر ڈالے' اگر وہ اس واقعے پر شاداں و فرحاں ہو' اور یہ سمجھتا ہو کہ اللہ تعالیٰ نے میرا یہ دنیاوی رزق اس لئے لیا ہے تاکہ آخرت کے رزق میں اضافہ فرمائے۔ اگر دل کی حالت واقعی یہ ہو' کسی طرح کا کوئی ملال اور تکلیف دل میں نہ ہو تو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ توکل میں اس کا مقام صحیح ہے اور وہ اپنے دعوئی توکل میں سچا ہے' اور اگر اس کا دل تکلیف محسوس کرے' اور اس پر صبر کرے تو کہا جائے گا کہ یہ شخص توکل کے دعوئی میں سچا نہیں ہے اس لئے کہ توکل کا مقام زہد کے بعد ہے اور زہد اس شخص کا صحیح ہوتا ہے جسے نہ کوئی چیز پا کر خوشی ہوتی ہے' اور نہ کھو کر رنج ہوتا ہے۔ بلکہ کبھی کبھی معاملہ برعکس بھی ہوتا ہے کہ کھو کر خوشی ہوتی ہے اور پا کر رنج ہوتا ہے چنانچہ اس شخص کا تو زہد بھی صحیح نہیں چہ جائیکہ توکل درست ہو' ہاں ایسے شخص کو صبر کا مقام ضرور حاصل ہو سکتا ہے' بشرطیکہ اپنا رنج اور تکلیف پوشیدہ رکھے' مال چوری جانے پر کسی سے شکوہ نہ کرے' نہ تلاش و جستجو میں بہت زیادہ دوڑ دھوپ کرے' اگر کوئی شخص ان امور پر قادر نہیں ہے' بلکہ چوری پر دل میں تکلیف بھی محسوس کرتا ہے' زبان سے اظہار بھی کرتا ہے' اور بہت زیادہ تلاش کرتا ہے ایسے شخص کے بارے میں کہا جائے گا کہ چوری اس کے گناہ میں زیادتی کا سبب بن رہی ہے' کیوں کہ اس کے عمل سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ صبر' زہد' توکل وغیرہ مقامات سے عاجز ہے' اور اپنے تمام دعووں میں جھوٹا ہے۔ ایسے شخص کو اپنے نفس پر زیادہ سے زیادہ مجاہدہ کرنے کی ضرورت ہے' اسے چاہیے کہ وہ اپنے نفس کی کوئی بات تسلیم نہ کرے' اور نہ اس کے مکر و فریب کے جال میں پھنسے' اس لئے کہ نفس دھوکا دینے والا ہے' برائی کا حکم کرنے والا ہے' اور خیر کا دعوئی کرنے والا ہے' حالانکہ وہ خیر سے باز رکھتا ہے' اور شر کی دعوت دیتا ہے۔

ایک اشکال کا جواب رہا یہ اشکال کہ متوکل کہتے ہی اس شخص کو ہیں جس کے پاس مال نہ ہو' اور آپ چوری کے مفروضے سے اس کے لئے ایسا مال فرض کئے لے رہے ہیں جو چوری ہو سکے' متوکل کے پاس مال ہوتا ہی کہاں ہے جو چوری ہو سکے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ متوکل کے گھر میں بھی کچھ نہ کچھ سامان ضرور ہوتا ہے جیسے کھانے کا پیالہ' پانی پینے کا گلاس' وضو کا لوٹا' تھیلا جس میں زادِ راہ محفوظ رکھا جا سکے' عصا جس کے ذریعے دشمن سے دفاع کیا جا سکے اور اسی طرح ضرورت کی دوسری چیزیں'

اور گھریلو سامان بعض اوقات متوکل کے پاس مال آتا ہے تو وہ اپنی ذات پر خرچ کرنے کے لئے نہیں بلکہ محتاج اور ضرورت مند لوگوں پر خرچ کرنے کے لئے محفوظ کرلیتا ہے۔ جیسا کہ پہلے بھی بیان کیا جاچکا ہے کہ اس نیت کے ساتھ ذخیرہ کرنے سے توکل باطل نہیں ہوتا۔ توکل کی شرط یہ نہیں ہے کہ کھانے پینے کے برتن' وضو کا لوٹا اور عصا وغیرہ بھی ضرورت مندوں کو دیدئے جائیں' کھانے پینے کی ان چیزوں کو دینے کا حکم ہے جو ضرورت سے زائد ہوں اور کھانے پینے کے بعد بچ گئی ہوں' اللہ تعالیٰ کی عادت یہ ہے کہ وہ متوکل فقراء کو گھروں میں' اور مسجدوں میں روٹی پہنچاتا ہے' لیکن یہ عادت نہیں ہے کہ وہ ہر روز انہیں پلیٹ' گلاس اور لوٹے بھی مہیا کرتا ہے' توکل میں یہ ضروری نہیں ہے کہ آدمی عادت الٰہی سے نکل جائے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت خواص سفر کے دوران رسی' ڈول اور سوئی دھاگا لے کر چلتے تھے' کھانے پینے کی اشیاء لے کر نہیں چلتے تھے' کیوں کہ اللہ تعالیٰ عادتاً ان دونوں چیزوں میں فرق کرتا ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آدمی کی ضرورت کی چیز چوری ہو جائے یا ضائع چلی جائے اور وہ اس پر تکلیف بھی محسوس نہ کرے' اگر وہ چیز اس کی خواہش اور پسند کی نہیں تھی تو اس نے گھر میں کیوں رکھی تھی' اور دروازے کو کس لئے مقفل کیا تھا' اور اگر وہ ضرورت کے باعث پسندیدہ تھی تو یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ چیز چھن جائے اور دل رنجیدہ نہ ہو' اس کا جواب یہ ہے کہ متوکل ان چیزوں کی حفاظت اس لئے کرتا ہے کہ وہ انہیں اپنے دین پر بذریعہ اعانت تصور کرتا ہے' اور یہ گمان کرتا ہے کہ اس سامان میں میرے لئے خیر اور بہتری ہے' کیوں کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو اللہ تعالیٰ مجھے یہ سامان عطا نہ فرماتا۔ بہرحال اس نے اس خیر کے ملنے سے خیر پر استدلال کیا' اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ حسن ظن کیا کہ میری بہتری ہی کی وجہ سے یہ چیز مجھے عطا کی گئی ہے' ساتھ ہی اس نے یہ گمان بھی کیا کہ یہ سامان میرے دین پر معین و مددگار بھی ہے' لیکن اس کا یہ ظن قطعی نہیں تھا۔ کیوں کہ یہ احتمال اپنی جگہ موجود تھا کہ ہو سکتا ہے اس سامان کا وجود اس کے حق میں بہتر نہ ہو' بلکہ اس کا فقدان بہتر ہو' اور اس کی بھلائی اسی میں ہو کہ یہ سامان ضائع چلا جائے' اور جو ضرورتیں اس سامان کے ذریعے تکمیل پا رہی تھیں وہ اب مشقت اور تکلیف کے ساتھ تکمیل پائیں' اور اس مشقت و تکلیف پر اسے ثواب بھی ملے۔ جب اللہ تعالیٰ نے چور کے ذریعے اس کا سامان واپس لے لیا تو اس کا پہلا ظن ختم ہو گیا' اور اس کی جگہ اس ظن نے لے لی کہ میرے لئے اس سامان کا نہ ہونا بہتر ہے' اگر مجھ سے یہ سامان واپس لینا اللہ تعالیٰ بہتر نہ سمجھتا تو واپس نہ لیتا' متوکل وہ ہے جو ہر حال میں اللہ کے ساتھ حسن ظن رکھتا ہے' اور عجب نہیں کہ جس کا حال یہ ہو اسے سامان کی چوری سے تکلیف نہ ہو کیوں کہ وہ اس لئے خوش نہیں ہوتا کہ اس کے پاس سامان ہے' بلکہ اس لئے خوش ہوتا ہے کہ مسبب الاسباب کی مرضی یہی ہے کہ یہ سامان میرے پاس رہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی بیمار کسی مہربان حکیم کے زیر علاج ہو' اور مریض اپنے معالج کے متعلق یہ حسن ظن رکھتا ہو کہ وہ جو کچھ دوا یا غذا اس کے لئے تجویز کرے گا اسی میں اسکی بہتری ہوگی۔ چنانچہ جب معالج اس کے لئے کوئی غذا تجویز کرتا ہے تو اس سے خوش ہوتا ہے' اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ یہی غذا میرے لئے مفید ہے' اگر حکیم اسے میرے لئے مفید نہ سمجھتا' یا میرے جسم میں اس غذا کو برداشت کرنے کی طاقت نہ ہوتی تو ہرگز نہ دیتا' اور اگر کوئی غذا دے کر واپس لے لے تب بھی خوش ہو اور یہ کہے کہ اگر یہ غذا میرے لئے بہتر نہ ہوتی تو میرا معالج اسے کبھی واپس نہ لیتا۔ اگر کوئی شخص اللہ کے لطف و کرم تو حکیم کے لطف و کرم کے برابر بھی نہ سمجھے جس کا اعتقاد اس کا مریض رکھتا ہے تو اس کا توکل کسی بھی حالت میں درست نہیں ہو سکتا۔

جو شخص بندوں کی اصلاح کے باب میں اللہ تعالیٰ کی سنن' افعال اور عادات سے واقفیت رکھتا ہے وہ اسباب سے خوش نہیں ہوتا' کیوں کہ وہ یہ نہیں جانتا کہ کون سا سبب اس کے لئے باعث خیر ہے' چنانچہ حضرت عمر ابن الخطاب ارشاد فرماتے ہیں کہ میں فقیر ہو جاؤں یا مالدار مجھے اس کی پروا نہیں' اور نہ میں یہ جانتا ہوں کہ میرے لئے فقر بہتر ہے یا غنا' اسی طرح متوکل کو چاہیے کہ نہ وہ اس کی پروا کرے کہ اس کا مال چوری چلا گیا' اور نہ اس بات کی کہ اس کا سامان اپنی جگہ موجود ہے اس لئے کہ وہ یہ نہیں جانتا کہ دنیا و آخرت میں اس کے لئے کیا بہتر ہے اور کیا نہیں ہے دنیا کا بہت سا ساز و سامان انسان کی ہلاکت کا باعث بن جاتا ہے' اور بہت

سے دولت مند اپنی دولت کی وجہ سے ایسی مصیبتوں کا شکار ہو جاتے ہیں کہ وہ فقر و افلاس کی آرزو کرنے لگتے ہیں۔

سامان کی چوری کے بعد متوکلین کے آداب

گھر سے نکلنے پر سامان کے سلسلے میں متوکلین کو چند آداب کی رعایت کرنی چاہیے۔ اور وہ آداب یہ ہیں :-

پہلا ادب یہ ہے کہ دروازہ مقفل کردے، لیکن سامان کی حفاظت کے لئے بہت زیادہ اہتمام نہ کرے، مثلاً یہ کہ پڑوسیوں سے تالا لگانے کے بعد گھر کی نگرانی اور خیال رکھنے کی درخواست نہ کرے، اور نہ کئی تالے لگائے۔ حضرت مالک ابن دینار اپنے گھر کے دونوں دروازے رسّی سے باندھ دیا کرتے تھے، اور فرماتے تھے کہ اگر کتّے نہ ہوتے تو یہ رسّی بھی نہ باندھتا۔

دوسرا ادب یہ ہے کہ گھر میں کوئی ایسی چیز نہ چھوڑے جسے دیکھ کر چوروں کے دل میں چوری کی خواہش پیدا ہو، اور اس طرح ان کی معصیت کا سبب بنے، چنانچہ جب حضرت مغیرہ ابن شعبہؓ نے حضرت مالک ابن دینارؒ کی خدمت میں ایک لوٹا بطور ہدیہ پیش کیا تو آپ نے ان سے فرمایا کہ اسے واپس لے لو، مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے، مغیرہ نے پوچھا آپ یہ لوٹا کس لئے واپس کر رہے ہیں، فرمایا میرے دل میں دشمن یہ وسوسہ ڈال رہا ہے کہ یہ لوٹا چور لے گئے، گویا حضرت مالک ابن دینار نے یہ مناسب نہیں سمجھا کہ وہ چوروں کی معصیت کا سبب بنیں، یا انہوں نے یہ بات اپنے لئے نقصان کا باعث سمجھی کہ ان کے دل میں وسوسہ رہے کہ لوٹا چوری چلا جائے گا، حضرت ابو سلیمان دارانی نے یہ واقعہ سنا تو فرمایا کہ یہ صوفیوں کے قلوب کا ضعف ہے، انہوں نے تو زہد کیا تھا، انہیں اس کی فکر کیوں لاحق ہوئی کہ اسے چور لے کر جائیں گے۔

تیسرا ادب اگر کسی چیز کو بحالت مجبوری گھر میں چھوڑ کر جانا پڑے تو جانے سے پہلے یہ نیت کرلینی چاہیے کہ اس چیز کے بارے میں اللہ تعالیٰ جو فیصلہ فرمائے گا میں اس پر راضی ہوں۔ اگر اس نے کسی چور کو اس پر مسلط کیا اور وہ اسے چرا کر لے گیا تو یہ چیز اس کے لئے حلال ہے، یا یہ چیز اللہ کے لئے وقف ہے، اگر لینے والا فقیر ہے تو اس پر صدقہ ہے، اور اگر فقر کی شرط نہ لگائے تو بہتر ہے، اس صورت میں اسے دو نیتیں کرنی چاہئیں، ایک یہ کہ اس مال کو فقیر لے یا غنی لے تو وہ اس مال کے باعث معصیت سے بچا رہے، یعنی اگر چوری سے اتنا مال مل جائے اور وہ اسے ذریعۂ آمدنی بنا لے یہاں تک کہ وہی چوری کا مال اس کے لئے ذریعۂ معاش بن جائے تو یہ مال ہمیشہ ہمیشہ کے لئے حرام نہ رہے، بلکہ حلال بن جائے، اور حرام مال کھانے کی معصیت سے محفوظ رہے، اور دوسری نیت یہ ہے کہ وہ مجھ پر ظلم کرنے کے بعد کسی دوسرے مسلمان کو اپنے ظلم کا نشانہ نہیں بنائے گا، گویا اس کا مال دوسرے مسلمان کے حق میں زرِ فدیہ بن گیا۔ بہرحال نیت کوئی بھی ہو، دونوں عمدہ ہیں، ایک نیت کی رو سے وہ اپنے مال کو دوسرے شخص کے مال کی حفاظت کا ذریعہ سمجھے گا، اور دوسری نیت کی رو سے فقیر کو معصیت سے بچانے کا سبب تصور کرے گا، یہ دونوں ہی باتیں خیر خواہی پر دلالت کرتی ہیں، اور اس حدیث شریف پر عمل کراتی ہیں :-

اُنْصُرْ اَخَاکَ ظَالِماً اَوْ مَظْلُوْماً۔ (بخاری و مسلم۔ انسؓ) اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔

مظلوم کی مدد بالکل واضح ہے، ظالم کی مدد یہ ہے کہ اسے ظلم سے باز رکھے، ظلم معاف کردینا بھی ایک اعتبار سے اس کو آئندہ ظلم سے باز رکھنے کی کوشش ہے، اور اس میں سزا سے بچانا بھی ہے، اس سے بڑھ کر نصرت اور مدد کیا ہو سکتی ہے۔ متوکل کے لئے یہ نیت کسی بھی حالت میں مضر نہیں ہے، خواہ مال چوری جائے یا نہ جائے، کیوں کہ نیت قضائے الٰہی کو بدلنے میں مؤثر نہیں ہوتی، البتہ نیت کا ثواب الگ ملتا ہے، اگر مال چوری چلا جائے تو ہر درہم کے عوض سات درہم ملیں گے، کیوں کہ اس نے اس اجر و ثواب کی نیت کی ہے، اور چوری نہ بھی ہوا، تب بھی یہ اجر ضائع نہ ہوگا۔ کیوں کہ نیتوں پر ہی اعمال کا مدار ہوتا ہے۔ جیسا کہ ایک روایت میں ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے عزل نہ کرے اور نطفہ اپنے مقام میں گرے تو اس کے لئے اتنا اجر و ثواب ہے کہ بالفرض اس صحبت کے نتیجے میں ایک لڑکا پیدا ہو، اور وہ بڑا ہو کر جہاد کرے یہاں تک کہ اللہ کی راہ میں شہید ہو جائے (۱) اگرچہ واقع

---

(۱) مجھے اس روایت کی سند نہیں ملی۔

میں اس کا لڑکا نہ ہو' یا ہو تو وہ بڑا ہو کر مجاہد نہ بنے مگر اسے اس کے جہاد اور شہادت کا ثواب ملے گا۔ کیوں کہ باپ کا کام صرف صحبت ہے تخلیق' حیات' رزق اور بقا اس کے اختیار میں نہیں ہے' اگر لڑکا نہ ہوتا تب بھی اسے اس فعل کا ثواب ملتا۔

چوتھا ادب یہ ہے کہ جب مال چوری ہونے کا علم ہو تو اس پر غمگین نہ ہو' بلکہ خوش ہونے کی کوشش کرے' اور یہ کہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کو مال چوری ہونے میں میری بھلائی مقصود نہ ہوتی تو مال اپنی جگہ باقی رہتا۔ اب اگر اس نے جانے سے پہلے مال وقف نہیں کیا تھا تو اس کی زیادہ جستجو نہ کرے' اور بلاوجہ مسلمانوں سے بد ظن نہ ہو' اور نہ کسی مخصوص فرد کو متہم کرے' اور اگر وقف کر دیا تھا تو بالکل تلاش نہ کرے' کیوں کہ وہ پہلے ہی اسے وقف کر کے اپنے لئے ذریعۂ نجات اور ذریعۂ آخرت بنا چکا ہے' اب اگر وہ چیز بھی مل جائے تو نہ لے' کیوں کہ وہ اس میں وقف کی نیت کر چکا تھا۔ لیکن اگر واپس لے لے تب بھی وہ چیز اس کی ملکیت میں آ جائے گی' کیوں کہ اس طرح کی مشروط نیتوں سے ظاہر شریعت میں ملکیت باطل نہیں ہوتی تاہم متوکلین اسے پسند نہیں کرتے کہ موقوفہ شئی کو پھر اپنی ملکیت بنا لیا جائے۔ چنانچہ حضرت عمر ابن الخطاب سے مروی ہے کہ ان کی اونٹنی گم ہو گئی' آپ نے بہت زیادہ تلاش و جستجو کی یہاں تک کہ تھک کر بیٹھ گئے' اس کے بعد فرمایا کہ یہ اونٹنی اللہ کی راہ میں ہے' یہ کہہ کر مسجد میں چلے گئے اور دو رکعت نماز ادا کی اس کے بعد ایک شخص نے آکر یہ اطلاع دی کہ آپ کی اونٹنی فلاں جگہ موجود ہے' آپ اپنی جگہ سے کھڑے ہوئے' جوتے پہن کر چلنے کا ارادہ کیا' اس کے بعد اپنی جگہ بیٹھ گئے لوگوں نے دریافت کیا کہ آپ اونٹنی لینے نہیں چلیں گے' فرمایا میں نے اس کے بارے میں یہ کہہ دیا تھا کہ وہ اللہ کی راہ میں صدقہ ہے' ایک بزرگ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے ایک بھائی کو ان کی وفات کے بعد خواب میں دیکھا' اور ان سے دریافت کیا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا؟ انہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے میری مغفرت فرمائی اور مجھے جنت میں داخل کیا' میرے لئے اس میں جو مکانات ہیں وہ مجھے دکھلائے' راوی کہتے ہیں کہ اس کے باوجود میں نے انہیں غمگین اور رنجیدہ پایا' میں نے ان سے پوچھا کہ آخر اس کی کیا وجہ ہے اللہ تعالیٰ نے آپ کی بخشش فرما دی اور آپ کو جنت میں داخل فرما دیا اس کے باوجود آپ غمگین اور پریشان نظر آتے ہیں۔ انہوں نے ایک سرد آہ بھر کر کہا کہ میں قیامت تک اسی طرح مضطرب اور غمگین رہوں گا' میں نے دریافت کیا کہ اس کی کیا وجہ ہے؟ فرمایا اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے جنت میں اپنے مکانات دیکھے علیین میں میرے مقامات اس قدر بلند کئے گئے تھے کہ میں نے اس سے پہلے اتنے بلند مقامات نہیں دیکھے تھے' میں یہ مقامات دیکھ کر بے حد خوش ہوا' لیکن جب میں ان میں داخل ہونے کے لئے آگے بڑھا تو اوپر سے کسی شخص نے کہا کہ اسے روکو' اندر نہ جانے دو' یہ مکانات اس کے لئے نہیں ہیں' بلکہ اس شخص کے لئے ہیں جو سبیل کو پورا کرتا ہے' میں نے پوچھا سبیل کو پورا کرنے کے کیا معنی ہیں' انہوں نے کہا کہ تم پہلے تو کسی چیز کو اللہ کی راہ میں دے دیا کرتے تھے اور پھر اسے واپس لے لیتے تھے اگر تم بھی سبیل کو پورا کرتے تو ہم تمہارا راستہ نہ روکتے۔

ایک شخص کا قصہ ہے کہ وہ مکہ مکرمہ میں کسی شخص کے برابر میں سو رہا تھا' اس کے پاس دینار کی ایک تھیلی تھی' جب نیند سے بیدار ہوا تو وہ تھیلی موجود نہیں تھی' اس نے برابر والے شخص کو اس کا ذمہ دار قرار دیا اور اس سے مطالبہ کیا کہ وہ اس کی تھیلی واپس کرے اس شخص نے دریافت کیا کہ اس کی تھیلی میں کس قدر مال موجود تھا' اس نے مال کی مقدار بتلائی وہ اسے اپنے گھر لے گیا' اور جو مقدار اس نے بتلائی تھی وہ دے دی' بعد میں اس شخص کے دوستوں نے جس کی تھیلی گم ہوئی تھی بتلایا کہ ہم نے مذاق میں تھیلی غائب کی تھی' وہ شخص بڑا نادم ہوا' اور اپنے دوستوں کے ساتھ اس شخص کے پاس آیا جس پر اس نے تھیلی چرانے کا الزام لگایا تھا' اور جو مال اس نے دیا تھا وہ اسے واپس کرنا چاہا' لیکن اس نے لینے سے انکار کر دیا اور کہنے لگا کہ یہ مال حلال طیب ہے لے پاس رکھو' میں تمہیں خوشی سے دیتا ہوں' اور جو مال میں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے نکالتا ہوں اسے واپس نہیں لیتا' جب ان لوگوں نے واپسی پر بہت زیادہ اصرار کیا تو انہوں نے اپنے بیٹے سے کہا کہ وہ اس مال کو مختلف تھیلیوں میں رکھ کر فقراء کو بھجوا دے' اس نے حکم کی تعمیل کی یہاں تک کہ تمام مال ختم ہو گیا۔ سلف صالحین کا معمول اور طریقہ یہی تھا کہ وہ جس چیز کو اللہ تعالیٰ کی راہ

میں خرچ کرنے کی نیت کر لیتے تھے وہ اسے واپس نہیں لیتے تھے' چنانچہ اگر وہ فقیر کو دینے کے لئے ایک روٹی لے کر گھر سے نکلتے اور فقیر روٹی لئے بغیر آگے بڑھ جاتا تو انہیں یہ بات بری معلوم ہوتی تھی کہ روٹی لے کر واپس آئیں' چنانچہ وہ روٹی کسی اور فقیر کو دیدیتے تھے' ان کا یہ طریقہ صرف روٹی وغیرہ ہی میں نہیں تھا' بلکہ درہم و دینار اور دوسرے اموال میں بھی وہ لوگ یہی کرتے تھے۔

پانچواں ادب یہ ہے کہ چور کے خلاف بددعا نہ کرے' اگر بددعا کرے گا تو اس کا توکل باطل ہو جائے گا' اور اس سے ثابت ہو گا کہ اسے مال چوری ہونے کا افسوس ہے' یا اسے یہ بات بری معلوم ہوتی ہے کہ کوئی شخص اس کا مال چوری کر لے' اس بددعا سے زہد بھی باطل ہو جاتا ہے' اور اگر اس معاملے میں بہت زیادہ مبالغے سے کام لے گا تو یہ اندیشہ بھی ہے کہ کہیں اس مصیبت پر ملنے والا اجر و ثواب ہی ضائع نہ ہو جائے۔ حدیث شریف میں ہے :۔

مَنْ دَعَا عَلٰی ظَالِمِہٖ فَقَدِ انْتَصَرَ (۱) جو شخص اپنے ظالم کے خلاف بددعا کرتا ہے وہ بدلہ لے لیتا ہے۔

ربیع ابن خیثمؒ کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ ان کا ایک گھوڑا جس کی قیمت چوبیس ہزار درہم تھی چوری ہو گیا' آپ اس وقت نماز میں مشغول تھے' نہ آپ نے نماز منقطع کی' نہ اس کی تلاش میں نکلے' نہ کسی اضطراب اور بے چینی کا اظہار کیا' کچھ لوگ تسلی اور تعزیت کے لئے آپ کے پاس آئے' آپ نے ان سے کہا کہ جس وقت چور گھوڑا کھول رہا تھا میں اس کو دیکھ رہا تھا' لوگوں نے عرض کیا کہ اگر یہ بات ہے تو آپ نے اسے ٹوکا کیوں نہیں' فرمایا میں اس سے زیادہ بہتر اور محبوب چیز میں مشغول تھا یعنی نماز پڑھ رہا تھا' لوگ چور کے خلاف بددعا کرنے لگے آپ نے فرمایا اسے کچھ مت کہو' اگر کہنا ہے تو اس کے حق میں بہتر کلمات کہو' اس لئے کہ میں نے وہ گھوڑا اسے صدقہ کر دیا ہے۔ ایک بزرگ کی کوئی چیز چوری ہو گئی' کسی نے ان سے کہا کہ میں یہ بات اچھی نہیں جانتا کہ اس پر شیطان کی اعانت کروں' لوگوں نے کہا کہ اگر وہ شخص آپ کی مسروقہ چیز واپس لے کر آیا تو قبول کریں گے یا نہیں' انہوں نے فرمایا قبول کرنا تو دور کی بات ہے میں اس کی طرف دیکھوں گا بھی' میں نے وہ چیز اسے معاف کر دی ہے۔ ایک بزرگ سے کسی نے کہا کہ اس شخص کے خلاف بددعا کیجئے جس نے آپ پر ظلم کیا ہے انہوں نے کہا کہ مجھ پر کسی نے ظلم نہیں کیا' اس بیچارے نے تو اپنے آپ پر ظلم کیا ہے' اب میں اس کے خلاف بددعا کر کے اس بیچارے پر مزید ظلم ڈھاؤں' یہ مجھ سے نہ ہو گا' کسی شخص نے ایک بزرگ کے سامنے حجاج ابن یوسف کو بہت زیادہ برا بھلا کہا' انہوں نے فرمایا کہ تو حجاج کو برا مت کہہ' قیامت کے روز جس طرح اللہ تعالیٰ حجاج سے ان مظالم کا بدلہ لے گا جو اس نے لوگوں پر ڈھائے ہیں اسی طرح لوگوں سے ان برائیوں کا بدلہ بھی لے گا جو وہ حجاج ابن یوسف کے خلاف کرتے ہیں۔ حدیث شریف میں ہے :۔

إِنَّ الْعَبْدَ لَيُظْلَمُ الْمَظْلَمَةَ فَلَا يَزَالُ يَشْتُمُ ظَالِمَهُ وَيَسُبُّهُ حَتّٰى يَكُوْنَ بِمِقْدَارِ مَا ظَلَمَهُ ثُمَّ يَبْقٰى لِلظَّالِمِ عَلَيْهِ مُطَالَبَةٌ بِمَا زَادَ عَلَيْهِ يُقْتَصُّ لَهُ مِنَ الْمَظْلُوْمِ (۲)

بندہ پر ظلم کرتا ہے کہ اپنے ظالم کو برا بھلا کہتا رہتا ہے اور گالیاں دیتا رہتا ہے' یہاں تک کہ وہ گالیاں اس ظلم سے سوا ہو جاتی ہیں' پھر اس کے ذمے ظالم کا مطالبہ باقی رہ جاتا ہے' ظالم کو اس کا عوض مظلوم سے دیدیا جائے گا۔

چھٹا ادب یہ ہے کہ چور اس عمل پر غمگین ہو کہ اس نے چوری کی ہے گناہ کا ارتکاب کیا ہے' اور اللہ تعالیٰ کے عذاب کا مستحق بنا ہے' اور اس بات پر اللہ کا شکر ادا کرے کہ اس نے مجھے مظلوم بنایا' ظالم نہیں بنایا' میری دنیا کا نقصان ہوا دین کا نقصان نہیں ہوا' ایک شخص نے کسی عالم سے شکایت کی کہ راہزنوں نے اس کا مال و اسباب لوٹ لیا ہے' عالم نے کہا تمہیں اپنے مال و متاع سے زیادہ غم اس کا ہونا چاہیے کہ مسلمانوں میں رہزنی کرنے والے' اور لوٹ کے مال کو حلال سمجھنے والے بھی ہیں اگر تمہیں صرف اپنے مال کا غم ہے' اور مسلمان گنہگاروں کا غم نہیں ہے تو تم مسلمانوں کے ہی خواہ نہیں ہو' علی ابن فضیل کے کچھ دینار عین اس وقت چوری ہو گئے جب وہ طواف میں مصروف تھے' جب انہیں دینار کی چوری کا علم ہوا تو رونے لگے' ان کے والد نے حیرت

(۱) یہ روایت پہلے بھی گذری ہے۔ (۲) یہ روایت بھی گذر چکی ہے۔

سے پوچھا کہ اے علی! کیا تم دیناروں کی وجہ سے رو رہے ہو' انہوں نے کہا مجھے اس کا کوئی غم نہیں کہ دینار چوری ہو گئے' بلکہ مجھے اس بیچارے کے حال پر ترس آتا ہے جس سے قیامت کے دن اس چوری کے متعلق باز پرس کی جائے گی اور وہ کوئی جواب نہ دے پائے گا' ایک بزرگ سے کسی شخص نے ظالم کے خلاف بددعا کرنے کے لئے کہا انہوں نے کہا کہ مجھے اس پر غم کرنے ہی سے فرصت نہیں بددعا کے لئے فرصت کہاں سے لاؤں ہمارے بزرگ اس قدر بلند پایہ اخلاق کے حامل تھے' اللہ تعالیٰ ان پر اپنی رحمت کاملہ نازل فرمائے۔

چوتھا مقصد ازالۂ مضرت (موجودہ)

جاننا چاہیے کہ جن اسباب سے مضرت کا ازالہ ہوتا ہے ان کی بھی تین قسمیں ہیں' اول یقینی جیسے پانی کے ذریعے پیاس کا ضرر زائل ہوتا ہے' اور روٹی سے بھوک کی مضرت کا ازالہ ہوتا ہے' دوم ظنی جیسے فصد کھلوانا' پچھنے لگوانا' مسہل دوا پینا اور دوسرے طبی معالجات یعنی برودت سے حرارت کا ازالہ' اور حرارت سے برودت کا۔ طب میں انہیں اسباب ظاہرہ کہا جاتا ہے۔ سوم وہمی جیسے منتر' جادو اور داغ وغیرہ' جہاں تک قطعی اسباب کا تعلق ہے ان کا ترک کرنا توکل نہیں ہے' بلکہ موت کا خوف ہو تو ان کا ترک کرنا حرام ہیں ہے۔ اور وہمی اسباب کا ترک کرنا توکل کے لئے شرط ہے' اس لئے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے متوکلین کا یہی وصف بیان فرمایا ہے کہ وہ ان اسباب کے تارک ہیں۔ ان اسباب میں قوی تر داغ ہے' اس کے قریب منتر ہے' اور آخری درجے میں فال اور بدشگونی ہے۔ اب صرف ظنی اسباب باقی رہ جاتے ہیں' جیسے ان اسباب کے ذریعے امراض کا علاج کرانا جو اطباء کی اصطلاح میں اسباب ظاہری کہلاتے ہیں' ان اسباب پر عمل کرنا توکل کے منافی نہیں ہے برخلاف وہمی اسباب کے ان پر عمل کرنا توکل کے خلاف ہے' اور ان کا ترک کرنا بھی ممنوع نہیں ہے' اس کے برعکس قطعی اسباب کا ترک کرنا ممنوع ہے بلکہ بعض حالات میں اور بعض اشخاص کے لئے ان پر عمل کرنا افضل ہوتا ہے' گویا ظنی اسباب کا حکم وہمی اور قطعی اسباب کے مابین ہے۔

دوا کے استعمال کا حکم دواؤں کے ذریعے امراض کا معالجہ توکل کے خلاف نہیں ہے' روایات سے اس کا ثبوت ملتا ہے' سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے دوا استعمال بھی کی ہے' اور لوگوں کو اس کا حکم بھی دیا ہے' چنانچہ چند قولی روایات یہ ہیں' فرمایا :- مَا مِنْ دَاءٍ إِلَّا وَلَهُ دَوَاءٌ عَرَفَهُ مَنْ عَرَفَهُ وَجَهِلَهُ مَنْ جَهِلَهُ إِلَّا السَّامَ

(احمد' طبرانی۔ ابن مسعودؓ)

کوئی مرض ایسا نہیں ہے جس کی دوا نہ ہو جو اسے جانتا ہے وہ جانتا ہے' اور جو نہیں جانتا وہ نہیں جانتا' سوائے موت کے۔

تَدَاوَوْا عِبَادَ اللّٰهِ فَإِنَّ الَّذِيْ أَنْزَلَ الدَّاءَ أَنْزَلَ الدَّوَاءَ (ترمذی' ابن ماجہ۔ اسامہ ابن شریک)

اللہ کے بندو! دوا کرو' اس لئے کہ جس نے مرض اتارا ہے اس نے دوا بھی اتاری ہے۔

ایک شخص نے دوا اور تعویذ کے متعلق دریافت کیا کہ یہ دونوں چیزیں خدا کے حکم کو ٹال دیتی ہیں یعنی امراض کے ازالے میں مفید ہیں۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :- هِيَ مِنْ قَدَرِ اللّٰهِ (ترمذی' ابن ماجہ۔ ابو خزامہ)

یہ بھی خدا کے حکم سے ہیں۔

ایک حدیث میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :-

مَا مَرَرْتُ بِمَلَإٍ مِنَ الْمَلَائِكَةِ إِلَّا قَالُوْا مُرْ أُمَّتَكَ بِالْحِجَامَةِ (ترمذی۔ ابن مسعودؓ)

میں فرشتوں کی جس جماعت کے پاس سے بھی گذرا اس نے یہی کہا کہ اپنی امت کو پچھنے لگوانے کا حکم دیجئے۔

ایک حدیث میں واضح طور پر پچھنے لگوانے کا حکم دیا اور اس کی علت بھی بیان فرمائی' چنانچہ ارشاد فرمایا :-

اِحْتَجِمُوا السَّبْعَ عَشْرَةَ، وَتِسْعَ عَشْرَةَ وَاِحْدیٰ وَعِشْرِیْنَ لَایَتَبَیَّغُ بِکُمُ الدَّمُ فَیَقْتُلَکُمْ۔ (بزار۔ ابن عباس۔ ترمذی نحوہ)

سترہ، انیس، اور اکیس برس کی عمر میں پچھنے لگواؤ تاکہ خون جوش میں آکر تمہیں ہلاک نہ کردے۔

اس ارشاد مبارک میں دو باتیں بطور خاص قابل غور ہیں، ایک تو یہ کہ خون کے ہیجان کو اللہ کے حکم سے مہلک اور قاتل قرار دیا گیا ہے، اور دوسری یہ ہے کہ جسم سے خون کا اخراج اس ہلاکت سے بحکم الٰہی نجات دیتا ہے، جسم سے مہلک خون نکالنے، کپڑوں سے بچھو جھاڑنے، اور گھر میں سانپ کو باہر نکالنے میں کوئی فرق نہیں ہے اور نہ ان تدابیر کا ترک داخل توکل ہے، یہ ایسا ہے جیسے گھر میں آگ لگ جائے اور اسے بجھانے کے لئے پانی ڈال دیا جائے، وکیل برحق کی سنن جاریہ کے خلاف کرنا توکل نہیں ہے۔ ایک حدیث میں ہے :۔

مَنِ احْتَجَمَ یَوْمَ الثُّلَثَاءِ لِسَبْعَ عَشْرَۃَ مِنَ الشَّھْرِ کَانَ لَہٗ دَوَاءٌ مِّنْ دَاءِ سَنَۃٍ طبرانی۔ معقل ابن یسار)

جو شخص مہینے کی سترہویں تاریخ منگل کے روز پچھنے لگوائے، اس کے لئے (یہ طریقہ) ایک سال کی بیماری کا علاج ہو گا۔

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان عمومی خطابات کے علاوہ بعض صحابۂ کرام کو بطور خاص بھی دواء کرنے کا حکم دیا ہے، چنانچہ حضرت سعد ابن معاذ کی فصد کھلوائی۔ (مسلم۔ جابرؓ) سعد ابن زرارہؓ کے داغ لگوایا (طبرانی۔ سہیل ابن حنیفؓ) حضرت علیؓ آشوب چشم میں مبتلا تھے ان سے فرمایا کہ وہ کھجور نہ کھائیں (اور جو کے آٹے میں ملا کر پکائے گئے ساگ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ) یہ چیز کھاؤ یہ چیز تمہارے مزاج کے مناسب ہے (ابو داؤد، ترمذی، ابن ماجہ۔ اُمّ المنذر) حضرت صہیب کی آنکھ میں درد تھا، اور وہ کھجوروں سے شوق کر رہے تھے۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ تم کھجوریں کھا رہے ہو اور تمہاری آنکھ میں درد ہے، صہیبؓ نے عرض کیا کہ میں اس آنکھ کی طرف سے کھا رہا ہوں جس میں درد نہیں ہے آپ یہ سن کر مسکرا دیے۔ (۱)

اب کچھ فعلی روایات ملاحظہ کیجیے۔ ایک حدیث میں جو اہل بیت سے مروی ہے یہ بیان کیا گیا ہے کہ آپ ہر شب سرمہ لگایا کرتے تھے، ہر مہینے پچھنے لگواتے تھے، اور ہر سال سنا کا جلاب لیا کرتے تھے (ابن عدی۔ عائشہؓ) کئی مرتبہ آپ نے بچھو کے کاٹے کا علاج بھی کروایا (طبرانی۔ جبلۃ ابن الازرقؓ) ایک روایت میں ہے کہ نزول وحی کے وقت آپ کے سر مبارک میں شدید درد ہو جاتا تھا، آپ نے اس کے ازالے کے لئے کئی مرتبہ مہندی کا لیپ کرایا (بزار، ابن عدی۔ ابو ہریرہؓ) ایک روایت میں ہے کہ جب کبھی آپ کے جسم مبارک کے کسی حصے میں کوئی پھنسی یا پھوڑا نکل آتا تھا تو آپ اس پر مہندی لگا لیتے تھے (ترمذی، ابن ماجہ) بعض روایات میں وارد ہے کہ آپ زخم پر مٹی لگاتے تھے (بخاری و مسلم۔ عائشہؓ)

اس سلسلے میں بے شمار روایات ہیں، ہم نے بطور نمونہ صرف چند روایات بیان کی ہیں اس موضوع پر کتابیں بھی لکھی گئی ہیں، جن میں ایک کتاب بہت زیادہ مشہور ہے جس کا نام "طب نبوی" ہے۔ بنی اسرائیل کی روایات میں مذکور ہے کہ ایک مرتبہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کوئی مرض لاحق ہو گیا۔ آپ کے پاس بنی اسرائیل میں سے کچھ لوگ آئے اور انہوں نے آپ کے مرض کی تشخیص کی، اور ایک دواء تجویز کرنے کے بعد کہا کہ اگر آپ یہ دوا استعمال کریں گے تو صحت یاب ہو جائیں گے، آپ نے فرمایا میں یہ دواء ہرگز استعمال نہیں کروں گا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ مجھے بغیر دواء کے اچھا کر دے، وہ مرض بڑھ گیا، لوگوں نے پھر اصرار کیا کہ آپ یہ دوا ضرور استعمال کریں، اس کی یہی دوا ہے، نہایت مؤثر اور مفید ہے اور ہم نے متعدد بار اس کا تجربہ کیا ہے، آپ نے اس کے باوجود انکار فرما دیا، وحی آئی اللہ تعالیٰ نے فرمایا مجھے اپنی عزت و جلال کی قسم ہے میں تمہیں صحت یاب نہیں کروں گا، یہاں تک

(۱) یہ روایت پہلے بھی گذری ہے۔

کہ تم یہی دواء استعمال نہ کرو جو لوگوں نے تمہارے لئے تجویز کی ہے' چنانچہ آپ نے لوگوں کو بلایا اور ان سے وہ دوا لے کر کھائی' صحت یاب ہو گئے' لیکن دل میں ایک کانٹا کھٹکتا رہا۔ وحی آئی کہ اے موسیٰ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ میری ذات پر اس طرح کا توکل کر کے میرا انتظام حکمت درہم برہم کردو' ذرا یہ تو بتاؤ کہ اس دواء میں جسے کھا کر تم صحت یاب ہوئے ہو شفا کس نے رکھی ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ کسی پیغمبر نے اپنے مرض کی شکایت کی' انہیں بذریعہ وحی مطلع کیا گیا کہ وہ انڈے کھایا کریں۔ ایک نبی نے ضعف باہ کی شکایت کی ان کے لئے دودھ اور گوشت تجویز کیا گیا ہے کہ ان میں قوت ہوتی ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ کسی قوم نے اپنے نبی سے شکایت کی کہ ہمارے بچے خوبصورت نہیں ہوتے' انہیں بذریعہ وحی اطلاع دی گئی کہ وہ اپنی حاملہ عورتوں کو بہی کھلایا کریں' اس سے بچے خوبصورت ہوں گے۔ لیکن اس پر عمل اس وقت کرنا چاہیے جب ان کی عورتیں تین چار ماہ کی حاملہ ہو جائیں' بچوں کے چہرے اللہ تعالیٰ انہی مہینوں میں بناتے ہیں' چنانچہ وہ لوگ حاملہ عورتوں کو بہی کھلاتے تھے' اور بچے کی پیدائش کے بعد تازہ کھجوریں کھلاتے تھے۔

اس تفصیل سے ثابت ہوا کہ مسبب الاسباب کی سنت یہی ہے کہ اس نے اپنی حکمت کے اظہار کے لئے مسببات کو اسباب کے ساتھ مربوط کر دیا ہے' دوائیں بھی اسباب ہیں اور باقی تمام اسباب کی طرح اللہ تعالیٰ کے لئے مسخر ہیں' جس طرح روٹی بھوک کی دواء ہے' اور پانی پیاس کی دوا ہے اسی طرح سکنجبین صفراء کی دواء ہے' اور سقمونیا دستوں کی دواء ہے' اگر ان دونوں میں کوئی فرق ہے تو صرف دو باتوں میں' ایک یہ کہ روٹی سے بھوک اور پانی سے پیاس کا علاج ایک بدیہی امر ہے' سب لوگ اس علاج کا علم رکھتے ہیں جب کہ سکنجبین سے صفراء کا علاج صرف خاص خاص لوگوں کے علم میں ہوتا ہے' پھر جو لوگ تجربے کے ذریعے اس حقیقت کو پا لیتے ہیں کہ صفراء کے مرض میں سکنجبین مفید ہے ان کے لئے سکنجبین بھی روٹی اور پانی کے حکم میں ہوتی ہے' دوسرا فرق یہ ہے کہ مسہل دواء' اور صفراوی مادّے کو تسکین دینے والی سکنجبین کے لئے باطن میں کچھ اور شرطیں بھی ہیں' اور ان کی افادیت کے لئے کچھ مزاجی اسباب بھی مطلوب ہیں' بعض اوقات انسان ان شرائط اور اسباب سے آگاہ نہیں ہو پاتا تو سناوست نہیں لاتی' اور سکنجبین صفراویت کو قابو میں نہیں کرتی' لیکن پیاس کو دور کرنے کے لے سوائے پانی کے نہ کوئی شرط ہے اور نہ سبب' ہاں بعض اوقات آدمی بہت زیادہ پانی پی کر بھی سیراب نہیں ہوتا' لیکن ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ بہرحال اسباب میں انہی دو باتوں سے خلل واقع ہوتا ہے' ورنہ مسبب کے بعد سبب ضرور ہو گا۔ بشرطیکہ تمام شرطیں اپنی جگہ موجود ہوں۔ مسبب اور سبب کا یہ باہمی ارتباط مسبب الاسباب کی حکمت' تدبیر' قدرت' تسخیر اور ترتیب کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے۔ اس لئے اگر متوکل اس اعتقاد کے ساتھ مذکورہ اسباب سے استفادہ کرتا ہے تو یہ توکل کے خلاف نہیں ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی خدمت میں عرض کیا پروردگار عالم! مرض اور دواء کس کے ہاتھ میں ہے' اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا میرے ہاتھ میں ہے' آپ نے عرض کیا پھر طبیبوں کا مصرف کیا ہے ارشاد ہوا کہ اپنا رزق کماتے ہیں' اور میرے بندوں کا دل خوش کرتے ہیں' یہاں تک کہ میرے بندوں میں کسی پر شفا یا قضا آ جائے۔ بہرحال دواء کے ساتھ علم اور حال میں توکل مطلوب ہے' عمل کا توکل مطلوب نہیں' چنانچہ دواء نہ کرنا توکل کے لئے شرط نہیں ہے۔

دواء اور داغ میں فرق یہاں تم یہ کہہ سکتے ہو کہ داغ بھی ایک طریقۂ علاج ہے اور اس کی افادیت بھی مسلم ہے' پھر اس سے کیوں منع کیا جاتا ہے' اس کا جواب یہ ہے کہ داغ ایسا نہیں ہے' جیسے اور طرح طرح کے علاج ہیں' جیسے فصد کھلوانا' پچھنے لگوانا' مسہل دوا پینا' حرارت کو برودت سے اور برودت کو حرارت سے دور کرنا' یہ تمام اسباب ظاہری ہیں' اگر داغ بھی ان ہی جیسا ہوتا تو تقریباً تمام ہی ملکوں میں اس کا رواج ہوتا حالانکہ یہ طریقۂ علاج صرف عربوں اور ترکوں میں مروج ہے' یہ بھی منتر اور جادو ٹونے کی طرح وہمی سبب ہے۔ اگر فرق ہے تو صرف اس قدر کہ داغ آگ سے لگایا جاتا ہے' اور بظاہر اس کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی' کیوں کہ آگ کا داغ لگانے سے جس درد کا علاج کیا جاتا ہے' اس کے لئے اور بھی دوائیں ہیں' اور علاج کے دوسرے طریقے

ہیں جن میں جلانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ آگ سے جلانا جسم کو خراب کرنا اور زخم کو پھیلانا ہے۔ اس میں یہ اندیشہ رہتا ہے کہ کہیں اس کے اثرات جسم کے دوسرے حصوں میں سرایت نہ کرجائیں۔ اس کے برعکس فصد اور حجامت کے زخم پھیلتے نہیں ہیں' اور نہ ان سے غلط اثرات مرتب ہوتے ہیں' پھر ان دونوں کے قائم مقام کوئی اور طریقہ بھی نہیں ہے۔ اسی لئے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے داغ دینے سے منع فرمایا (بخاری۔ ابن عباسؓ) منتر (جھاڑ پھونک شرعی حدود میں رہ کر) سے منع نہیں فرمایا (بخاری و مسلم۔ عائشہؓ) حالانکہ توکل سے دونوں بعید ہیں۔

حضرت عمران ابن حصین کے بارے میں روایت ہے کہ جب وہ کسی مرض میں گرفتار ہوئے تو لوگوں نے ان سے کہا کہ آپ داغ لگوالیں' مگر انہوں نے ان لوگوں کا یہ مشورہ قبول کرنے سے انکار کردیا' لوگوں نے اصرار کیا' یہاں تک کہ امیر نے قسم دے کر کہا کہ آپ داغ ضرور لگوائیں' مجبوراً آپ نے داغ لگوالیا' اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ میں نور دیکھا کرتا تھا' اور آوازیں سنا کرتا تھا' یہاں تک کہ فرشتے بھی مجھے سلام کیا کرتے تھے' داغ لگوانے کے بعد یہ تمام باتیں ختم ہوگئیں' چند داغ لگوانے تھے وہ لگوالئے' تکلیف اٹھائی اور ہاتھ کچھ نہ آیا' جو کچھ پاس تھا وہ بھی چھن گیا' اس کے بعد آپ نے توبہ و استغفار کیا' اور الحاح وزاری کے ساتھ دعا کی' اللہ تعالیٰ نے وہ معاملات ان کے ساتھ پھر جاری فرمادیے اس واقعے کے بعد انہوں نے مطرف ابن عبداللہ سے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے جس دولت سے پہلے نواز رکھا تھا وہ پھر عطا فرمادی ہے' وہ ان کے علم میں یہ بھی لاچکے تھے کہ داغ لگوانے سے ان کی کون سی دولت ختم ہوئی ہے۔

بہرحال داغ اور اس طرح کی دوسری چیزیں متوکل کی شان کے خلاف ہیں' کیوں کہ ان میں تدبیر کی ضرورت پیش آتی ہے' اور متوکل کے لئے تدبیر مناسب نہیں ہے' اس میں اسباب کی طرف زیادہ التفات اور میلان بھی پایا جاتا ہے۔

بعض حالات میں دواء نہ کرنا جاننا چاہیے کہ سلف صالحین میں سے بے شمار افراد نے دواؤں کے ذریعے اپنے امراض کا علاج کیا ہے بعض اکابرین سلف ایسے بھی ہیں جنہوں نے کبھی دواء نہیں کی' اس سے یہ گمان نہ کرنا چاہیے کہ دوا نہ کرنا ان کے لئے باعث نقص ہے' اس لئے کہ اگر ترک ادویہ کمال ہوتا تو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم بھی ایسا کرتے' اس لئے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں کسی دوسرے کا حال زیادہ مکمل نہیں ہوسکتا۔ حضرت ابوبکر الصدیقؓ کی خدمت میں کسی نے بیماری کے دوران یہ عرض کیا کہ اگر آپ کا حکم ہو تو آپ کے لئے حکیم کو بلالیا جائے' آپ نے فرمایا مجھ پر حکیم کی نظر ہے اور وہ یہ کہتا ہے :- فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ (پ ۳۰ ر ۱۰ آیت ۱۶) جو چاہتا ہے کر گذرتا ہے۔

حضرت ابوالدرداءؓ سے کسی نے پوچھا کہ آپ کو کیا مرض لاحق ہوگیا ہے' انہوں نے فرمایا گناہوں کا مرض۔ لوگوں نے عرض کیا کہ اب آپ کس چیز کی خواہش رکھتے ہیں' فرمایا مغفرت کی' لوگوں نے کہا اگر آپ کی مرضی ہو تو ہم حکیم کو بلا کر لے آئیں' فرمایا مجھے حکیم ہی نے بیمار کیا ہے۔ حضرت ابوذر کی آنکھیں دکھ رہی تھیں' لوگوں نے ان سے کہا کہ آپ اس مرض کا علاج کرائیں' انہوں نے جواب دیا کہ میں ان کی پروا نہیں کرتا' لوگوں نے کہا تب آپ اللہ تعالیٰ سے دعائے صحت کریں' فرمایا میں اس سے زیادہ اہم اور مفید دعا مانگوں گا۔ ربیع ابن خثیم فالج میں مبتلا ہوگئے' لوگوں نے ان سے دواء کے لئے کہا' انہوں نے فرمایا کہ میں نے ارادہ تو کیا تھا کہ کسی حکیم کو دکھاؤں' اور اس سے کوئی دوا لے لوں' مگر پھر عاد اور ثمود اور دوسری قوموں کا خیال آگیا' ان میں بڑے بڑے ماہر اور حاذق طبیب تھے' لیکن آج نہ طبیب موجود ہیں' نہ اور مریض باقی ہیں' نہ دوا کارگر ہوئی اور نہ جھاڑ پھونک ہی کام آئی۔ حضرت امام احمد ابن حنبلؒ فرماتے ہیں کہ جو شخص توکل کا راستہ اختیار کرنا چاہتا ہے میں اس کے لئے دواء سے زیادہ ترک دواء پسند کرتا ہوں۔ امام صاحب بعض بیماریوں میں مبتلا تھے لیکن طبیب کے پوچھنے پر بھی اپنے یہ امراض نہ بتلاتے۔ حضرت سہل تستریؒ سے دریافت کیا کہ بندے کا توکل کب مکمل ہوتا ہے' فرمایا جب اس کے جسم اور مال میں ضرر لاحق ہو اور وہ ان کی طرف التفات نہ کرے' اپنے حال میں مشغول رہے' اور یہ خیال رکھے کہ اللہ میرے احوال کا نگراں ہے۔ بہرحال دواء ترک کرنے والوں کی تعداد

بھی اچھی خاصی ہے اور ان کا یہ طریقہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے افعال و ارشادات سے متناقض ہے' اس لئے ذیل میں ہم مانع دوا سبب بیان کرتے ہیں' تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ یہ حضرات دوا کیوں ہیں کرتے تھے اور یہ کہ ان کا دوا نہ کرنا سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد و عمل سے مطابقت رکھتا ہے' بہر حال دوا نہ کرنے کے چند اسباب ہیں۔

مانع اسباب۔ پہلا سبب یہ ہے کہ مریض اہل کشف میں سے ہو' اور اس پر بذریعۂ کشف یہ حقیقت منکشف ہو گئی ہو کہ ان کا وقت قریب آچکا ہے' اور اب کوئی دواء انہیں فائدہ نہیں دے گی' بعض اوقات موت کا قرب رویاءِ صادقہ سے' کبھی غلبۂ ظن سے' اور کبھی حقیقت کشف کے ذریعہ معلوم ہو جاتا ہے۔ غالباً حضرت ابو بکر صدیقؓ نے علاج اسی لئے نہیں کرایا تھا کہ آپ صاحب کشف تھے' چنانچہ آپ نے وراثت کے سلسلے میں ایک مرتبہ حضرت عائشہؓ سے فرمایا کہ تیری دو بہنیں ہیں' حالانکہ اس وقت ایک ہی بہن تھی' البتہ آپ کی اہلیہ حمل سے تھیں اور بعد میں لڑکی پیدا ہوئی۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپ نے پیدائش سے پہلے ہی بذریعۂ کشف یہ بات معلوم کرلی تھی کہ لڑکی پیدا ہو گی' ہو سکتا ہے آپ پر موت کا وقت بھی منکشف ہو گیا ہو' اور اسی بنا پر دواء کرنے سے منع کر دیا ہو' ورنہ یہ کیسے ممکن تھا کہ آپ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو دوا استعمال کرتے ہوئے اور دوسروں کو اس کا حکم کرتے ہوئے دیکھتے اور خود انکار فرمادیتے' حضرت ابو بکر الصدیقؓ سے یہ امر بعید معلوم ہوتا ہے۔

دوسرا سبب یہ ہے کہ مریض اپنے حال میں' خوف عاقبت میں' اور اپنے حال پر خدا تعالیٰ کے علم و اطلاع میں اس قدر مستغرق اور مشغول ہو کہ مرض کی تکلیف کا احساس ہی نہ رہے' اور حال میں اشتغال کے بعد قلب کو دواء علاج کی فرصت نہ ہو چنانچہ حضرت ابوذرؓ نے واضح طور پر یہ اعلان کر دیا تھا کہ مجھے اپنی آنکھوں کے علاج کی فرصت نہیں ہے۔ حضرت ابو الدرداءؓ فرماتے تھے کہ مجھے گناہوں کا مرض لاحق ہے' اور ان کی وجہ سے دل میں جو تکلیف اور اذیت ہوتی ہے وہ اتنی زیادہ ہے کہ جسم کو مرض کی تکلیف کا احساس ہی نہیں رہتا۔ ایسے مریض کو اس شخص سے تشبیہ دی جا سکتی ہے جس کا کوئی عزیز دوست یا رشتہ دار ہلاک ہو گیا ہو' یا اس شخص سے جس کے بارے میں دربار شاہی سے یہ حکم جاری ہو چکا ہو کہ اسے پھانسی دیدی جائے' اب اگر ان دونوں سے یہ کہا جائے کہ تم کھانا کیوں نہیں کھاتے' تم بھوکے ہو' ظاہر ہے وہ اس کے جواب میں یہی کہیں گے ہم اس غم اور صدمے سے اس قدر نڈھال ہیں کہ بھوک اور پیاس کا احساس ہی باقی نہیں رہا۔ ظاہر ہے ان کے جواب کو ان کی حالت کی روشنی میں دیکھا جائے گا' یہ نہیں کہا جائے گا کہ وہ شخص بھوک کی حالت میں کھانے کی ضرورت اور منفعت کا انکار کر رہا ہے' اور کھانے والوں پر طعن کر رہا ہے۔ حضرت سہل تستریؒ نے بعض سوالات کے جواب میں جو کچھ فرمایا دراصل وہ بھی ایک خاص استغراقی کیفیت کا آئینہ دار ہے' وہ اس وقت اپنے حال میں مشغول تھے جب ان سے کسی نے سوال کیا کہ قوت کیا چیز ہے؟ فرمایا حیؒ قیوم کا ذکر کرنا قوت ہے' سائل نے عرض کیا کہ میرا سوال قوام انسانی کے متعلق ہے' انہوں نے جواب دیا کہ قوام انسانی علم ہے' سائل نے کہا کہ میں غذا کے متعلق دریافت کرتا ہوں انہوں نے جواب دیا کہ غذا ذکر ہے' سائل نے زچ ہو کر کہا کہ میں ظاہری جسم کے کھانے کے بارے میں سوال کر رہا ہوں' انہوں نے فرمایا تو جسم ظاہر کے متعلق کیوں فکر مند ہے' اسے اسی کے حوالے کر جس نے اسے پیدا کیا ہے' اور جس نے پہلے بھی اس کی کفالت کی ہے اور آئندہ بھی وہی اس کی کفالت کرے گا' اگر اس میں کوئی مرض آجائے تب بھی اسے اس کے بنانے والے کے حوالے کردے کیا تو نہیں جانتا کہ جب کسی چیز میں کوئی نقص پیدا ہو جاتا ہے تو اسے اس کے صانع کے حوالے کر دیا جاتا ہے تاکہ وہ اصلاح کردے اور اس کا عیب دور کردے۔

تیسرا سبب یہ ہے کہ بیماری انتہائی پرانی ہو' اور اس کے لئے لوگ جو دوائیں تجویز کرتے ہوں ان کی افادیت وہمی ہو' جیسے داغ اور منتر کا فائدہ وہمی ہوا کرتا ہے' اس صورت میں بھی متوکل دواء نہیں کرتا۔ ربیع ابن خیثم کے اس قول میں غالباً اسی امر کی طرف اشارہ ہے کہ مجھے عاد اور ثمود کی قومیں یاد آئیں' جن میں بے شمار ماہر طبیب تھے لیکن اب نہ طبیب باقی ہیں اور نہ مریض۔ غالباً وہ یہ کہنا چاہتے تھے کہ دواء کوئی زیادہ قابل اعتماد چیز نہیں ہے' اور یہ امر کبھی تو واقع میں ایسا ہی ہوتا ہے اور کبھی مریض کے

نزدیک متحقق ہوتا ہے' کیوں کہ اسے علم طب میں مہارت نہیں ہوتی' اور دواؤں کی افادیت میں اس کے تجربات بہت کم ہوتے ہیں' اسی لئے اس دواء کی افادیت کے متعلق ظن غالب نہیں ہوتا' جب کہ طبیب کو زیادہ تجربہ اور اس کی افادیت کا زیادہ اعتقاد ہوتا ہے جن بزرگوں نے دواء استعمال نہیں کی ان میں سے بیشتر کے نزدیک دواء ایک وہمی اور ناقابل اعتبار و اعتماد چیز رہی ہے' جو لوگ علوم طب میں مہارت رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ بعض دوائیں واقعی ایسی ہی ہیں کہ ان کی منفعت یقینی نہیں ہوتی' صرف وہمی ہوتی ہے' اور بعض دوائیں مؤثر اور مفید ہیں' لیکن ان میں اطباء کو جس قدر اعتماد اور ظن غالب ہوتا ہے اتنا عوام کو نہیں ہوتا اس لئے وہ مفید اور مجرب دواؤں کے متعلق بھی اچھی رائے نہیں رکھتے۔

چوتھا سبب اللہ کے نیک بندوں کو یہ خواہش ہوتی ہے کہ ان کا مرض باقی رہے اور وہ اس کی اذیت پر صبر کرکے اجر و ثواب کے مستحق ہوں' یا وہ اپنے نفس کا امتحان لیتے ہیں اور یہ دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جو مصیبت اس پر نازل کی ہے اس میں وہ ثابت قدم بھی رہتا ہے یا نہیں۔

جہاں تک مرض پر ثواب ملنے کی بات ہے اس سلسلے میں بہت سی روایات وارد ہیں۔ ایک حدیث میں ہے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ہم انبیاء کی جماعت پر دوسرے لوگوں کے مقابلے میں سخت مصیبت نازل ہوتی ہے' پھر درجہ بہ درجہ کم ہوتی رہتی ہے بندے پر اس کے ایمان کے بقدر مصیبت نازل ہوتی ہے' اگر اس کا ایمان مضبوط اور پختہ ہوتا ہے تو مصیبت بھی انتہائی سخت اور شدید ہوتی ہے' اور ایمان میں ضعف ہوتا ہے تو مصیبت بھی ہلکی اور معمولی ہوتی ہے (طبرانی۔ ابو امامہؓ) ایک حدیث میں وارد ہے :-

إِنَّ اللّٰهَ تَعَالَى يُجَرِّبُ عَبْدَهُ بِالْبَلَاءِ كَمَا يُجَرِّبُ أَحَدُكُمْ ذَهَبَهُ بِالنَّارِ، فَمِنْهُمْ مَنْ يَخْرُجُ كَالذَّهَبِ الْإِبْرِيزِ لَا يَرِيْبُدُ وَمِنْهُمْ دُوْنَ ذٰلِكَ وَمِنْهُمْ مَنْ يَخْرُجُ أَسْوَدَ مُحْتَرِقًا۔ (طبرانی۔ ابو امامہؓ)

اللہ تعالیٰ مصیبت کے ذریعے اپنے بندے کو اس طرح آزماتا ہے جیسے تم میں سے کوئی اپنے سونے کو آگ سے پرکھتا ہے' بعض لوگ کندن بن کر نکلتے ہیں' بعض اس سے کم' اور بعض سیاہ اور جلے ہوئے نکلتے ہیں۔

ایک حدیث میں جو اہل بیت سے مروی ہے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو اسے مصیبت میں مبتلا کردیتا ہے اگر وہ اس مصیبت پر صبر کرتا ہے تو اسے جنتی کرتا ہے اور وہ اس پر راضی رہتا ہے تو مصطفیٰ کرتا ہے (طبرانی۔ ابو عینیہؓ) ایک حدیث شریف میں ہے تم یہ چاہتے ہو کہ آوارہ گدھوں کی طرح ہو جاؤ' نہ تم بیمار پڑو' اور نہ علیل ہو' (ابو نعیم۔ ابن عبد البر' بیہقی۔ ابو فاطمہؓ) حضرت عبد اللہ ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ جب تم کسی مومن کو دیکھو گے تو اسے قلب کے اعتبار سے صحیح اور جسم کے اعتبار سے مریض پاؤ گے' اور منافق کو جسم کے اعتبار سے صحت مند اور قلب کے اعتبار سے بیمار پاؤ گے۔ جب لوگوں نے مرض اور مصیبت کی اس قدر تعریف سنی تو انہوں نے مرض کو پسند کیا اور اسے غنیمت جانا تاکہ اس پر صبر کا ثواب حاصل کر سکیں۔ بعض بزرگان دین کا حال یہ تھا کہ اگر انہیں کوئی مرض ہوتا تو اسے چھپانے کی کوشش کرتے' یہاں تک کہ طبیب سے بھی ذکر نہ کرتے' مرض کی اذیت برداشت کرتے' اللہ کے حکم پر راضی رہتے' اور جانتے کہ دل پر حق اتنا غالب ہے کہ اسے جسم پر اثر انداز ہونے والے مرض کا احساس ہی نہیں ہوتا' مرض سے صرف جوارح متاثر ہو سکتے ہیں' اور جوارح کا متاثر ہونا دل کو مشغول نہیں کرتا' صرف یہ ہو سکتا ہے کہ بیٹھ کر نماز پڑھیں' اور اللہ کے فیصلے پر صبر کے ساتھ بیٹھ کر نماز ادا کرنا صحت و عافیت کے ساتھ کھڑے ہو کر نماز پڑھنے سے بہتر ہے۔ ایک حدیث میں ہے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :

إِنَّ اللّٰهَ تَعَالَى يَقُوْلُ لِلْمَلَائِكَةِ اُكْتُبُوْا لِعَبْدِيْ صَالِحَ مَا كَانَ يَعْمَلُهُ فَإِنَّهُ فِيْ وَثَاقِيْ إِنْ أَطْلَقْتُهُ أَبْدَلْتُهُ لَحْمًا خَيْرًا مِنْ لَحْمِهِ وَدَمًا خَيْرًا مِنْ دَمِهِ وَإِنْ تَوَفَّيْتُهُ تَوَفَّيْتُهُ إِلَى رَحْمَتِيْ۔ (طبرانی۔ عبد اللہ ابن عمرؓ)

اللہ تعالیٰ ملائکہ سے کہتا ہے کہ میرے بندے کے لئے وہی نیک اعمال لکھو جو وہ کرتا تھا' اس لئے کہ یہ میری قید میں ہے' اگر میں اسے رہا کروں گا تو گوشت کے بدلے اچھا گوشت اور خون کے بدلے اچھا خون دوں گا' اور اگر وفات دوں گا تو اپنی رحمت کی طرف دوں گا۔

ایک روایت میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی مذکور ہے :۔

أَفْضَلُ الْأَعْمَالِ مَا أُكْرِهَتْ عَلَيْهِ النُّفُوسُ۔ بہترین عمل وہ ہے جس پر نفس مجبور کئے جائیں۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ ان پر بہت زیادہ مصائب اور امراض نازل ہوں۔ قرآن کریم کی اس آیت میں اسی کی طرف اشارہ ہے :۔

وَعَسَىٰ أَن تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ (پ ۲ ر ۱۰ آیت ۲۱۶)

اور یہ بات ممکن ہے کہ تم کسی امر کو گراں سمجھو اور وہ تمہارے حق میں خیر ہو۔

حضرت سہل تستریؒ فرماتے ہیں کہ اگرچہ آدمی طاعات سے ضعیف اور فرائض کی ادائیگی سے قاصر ہو جائے مگر دوا نہ کرنا طاعات کے لئے دوا کرنے سے بہتر ہے۔ انہیں ایک سنگین مرض لاحق تھا' لیکن وہ اس کا علاج نہیں کرتے تھے' تاہم اگر کوئی دوسرا شخص اس مرض میں مبتلا ہوتا تو اسکا علاج ضرور کرتے۔ اگر کسی شخص کو بیٹھ کر نماز پڑھتے ہوئے دیکھتے اور انہیں یہ پتا چلتا کہ یہ شخص کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کے لئے علاج کرا رہا ہے تو بڑا تعجب کرتے' اور کہتے کہ اس شخص کا بیٹھ کر نماز پڑھنا اور اپنے حال پر راضی رہنا اس سے بہتر ہے کہ صرف کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کی قوت پانے کے لئے دواء کرے۔ کسی شخص نے ان سے دوا و پینے کے متعلق سوال کیا' انہوں نے جواب دیا کہ جو شخص دوا کرتا ہے تو اس میں بہرحال اللہ تعالیٰ نے ضعیفوں کے لئے گنجائش رکھی ہے' لیکن افضل یہی ہے کہ دوا نہ کرے' اس لئے کہ اگر وہ کوئی چیز دوا کے بطور استعمال کرے گا خواہ وہ ٹھنڈا پانی ہی کیوں نہ ہو' اس سے اس کے متعلق سوال کیا جائے گا اور جو استعمال ہی نہیں کرے گا اس سے کوئی سوال بھی نہ ہو گا' حضرت سہل اور علماء بصریین کا مسلک یہ تھا کہ نفس کو بھوک سے کمزور کرنا اور شہوات کی قوت ختم کرنا بہتر ہے' اس لئے کہ اعمال قلوب یعنی صبر' رضا اور توکل وغیرہ کا ایک ذرہ جوارح کے پہاڑ برابر اعمال سے افضل ہے اور مرض قلوب کے اعمال کے لئے مانع نہیں ہے' الا یہ ہے کہ وہ مرض اس قدر شدید اور تکلیف دہ ہو کہ آدمی بے ہوش ہو جائے۔

پانچواں سبب یہ ہے کہ بندے کے سابقہ گناہ بہت ہوں' اور وہ ان سے خائف ہو اور اپنے آپ کو ان ذنوب کی تکفیر سے عاجز سمجھتا ہو' اس کے خیال میں ان گناہوں کی تکفیر کی ایک صورت یہی ہے کہ مرض طویل ہو جائے' اس لئے وہ اپنے مرض کا علاج نہیں کرتا کہ کہیں دوا کے استعمال سے مرض جلد زائل نہ ہو جائے۔ مرض سے گناہوں کے ازالے کا ثبوت حدیث شریف سے ملتا ہے' سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :۔

لَا تَزَالُ الْحُمَّى وَالْمَلِيلَةُ بِالْعَبْدِ حَتَّى يَمْشِيَ عَلَى الْأَرْضِ كَالْبَرَدَةِ عَلَيْهِ ذَنْبٌ وَلَا خَطِيئَةٌ (طبرانی۔ ابو الدرداء' ابو یعلی' ابن عدی۔ ابو ہریرہ)

بندہ پر بخار اور تپ لرزہ ہمیشہ اس لئے رہتے ہیں کہ وہ زمین پر ایسا ہو جائے جیسے اولہ کہ نہ اس پر کوئی گناہ ہو نہ خطاء۔

ایک حدیث میں ہے :۔

حُمَّى يَوْمٍ كَفَّارَةُ سَنَةٍ (مسند الشہاب۔ ابن مسعودؓ) ایک دن کا بخار ایک سال کا کفارہ ہے۔

بعض لوگوں نے اس کی یہ حکمت بیان کی ہے کہ ایک دن کے بخار سے انسان کی ایک سال کی قوت ضائع ہو جاتی ہے' بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ انسان کے تین سو ساٹھ جوڑ ہیں اور بخار ان سب میں گھس جاتا ہے' تمام جوڑ تکلیف محسوس کرتے ہیں' چنانچہ ہر جوڑ کی تکلیف ایک دن کے گناہوں کا کفارہ بن جاتی ہے۔ ایک مرتبہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بخار ذنوب کا کفارہ ہے' حضرت زید ابن ثابت نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی کہ مجھے ہمیشہ کے لئے بخار عطا کیجئے' چنانچہ وہ زندگی بھر بخار میں مبتلا رہے یہاں

تک کہ اسی مرض میں وفات پاگئے' بعض انصاری صحابہ نے بھی یہی دعا کی وہ بھی ہمیشہ بخار میں مبتلا رہے (احمد' ابو یعلی۔ ابو سعید الخدریؓ) ایک مرتبہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :-

مَنْ اَذْهَبَ اللّٰهُ كَرِيْمَتَيْهِ لَمْ يَرْضَ لَهُ ثَوَابًا دُوْنَ الْجَنَّةِ قَالَ فَلَقَدْ كَانَ مِنَ الْاَنْصَارِ مَنْ يَتَمَنَّى الْعَمٰى (۱)

اللہ تعالیٰ جس شخص کی دونوں آنکھیں سلب کرلیتا ہے اس کے لئے جنت سے کم ثواب پر راضی نہیں ہوتا' راوی کہتے ہیں کہ انصار میں بعض لوگ ایسے بھی تھے جو نابینا ہونے کی تمنا کیا کرتے تھے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں کہ جو شخص مال میں مصائب اور جسم میں امراض پاکر خوش نہ ہو اور یہ نہ جانے کہ مصائب اور امراض اس کے گناہوں کے لئے کفارہ ہیں وہ عالم نہیں ہو سکتا' روایت ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک شدید مصیبت زدہ انسان کو دیکھ کر اس کے لئے رحم کی دعا کی' وحی آئی کہ اے موسیٰ! اس پر اور کیسے رحم کروں' جس مصیبت میں یہ مبتلا ہے یہ بھی اس کے لئے رحم ہی ہے' میں اس کے درجات اسی مصیبت کی وجہ سے بلند کروں گا۔

چھٹا سبب یہ ہے کہ اس کے نفس کو زیادہ دیر تک صحت مند اور تندرست رہنے سے کبر' غرور' اور سرکشی کا خوف ہو' اس لئے وہ مرض کا علاج نہیں کراتا کہ کہیں مرض کے زوال کے بعد نفس میں غفلت' اٰل' عناد اور تکبر نہ پیدا ہو جائے' اور مافات کے تدارک کے لئے وہ لیت و لعل نہ کرنے لگے' اور خیر کے کاموں کو ٹالنے نہ لگے' صحت صفات انسانی کی قوت کا نام ہے' اور جب صفات قوی ہوتی ہے تو جسم میں شہوات اور خواہشات کو تحریک ہوتی ہے' اور معاصی کی طرف میلان ہوتا ہے' اگر یہ سب کچھ نہیں ہوتا تب بھی اتنا ضرور ہوتا ہے کہ مباحات سے لطف اندوزی کی خواہش پیدا ہوتی ہے' اس خواہش پر عمل کرنے سے وقت بھی ضائع ہوتا ہے' اور نفس کی مخالفت' اور اسے طاعت کا پابند بنانے میں جو عظیم فائدہ ہونے والا تھا وہ بھی ختم ہو جاتا ہے' اللہ تعالیٰ جب کسی بندے کے لئے خیر کا ارادہ کرتا ہے تو اسے امراض اور مصائب کے ذریعے تنبیہ کرتا رہتا ہے' اسی لئے یہ کہا جاتا ہے کہ مومن' علت' قلت یا ذلت سے خالی نہیں ہوتا۔ ایک حدیث قدسی میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ مفلسی میرا قید خانہ ہے' اور مرض میری زنجیر ہے' میں (مرض کی زنجیر سے مفلسی کے قید خانے میں) اس شخص کو قید کرتا ہوں جسے میں اپنی مخلوق میں سب سے زیادہ پسند کرتا ہوں۔ اس سے معلوم ہوا کہ مرض اور مفلسی سے بڑھ کر بندہ مومن کے لئے خیر کی بات کوئی دوسری نہیں ہے' کیوں کہ وہ دونوں کے ذریعے سرکشی اور ارتکاب معصیت سے بچا رہتا ہے' جس شخص کو اپنے نفس پر خوف ہو اسے اپنے مرض کا علاج نہ کرانا چاہیے اس لئے کہ اصل عافیت یہ ہے کہ آدمی گناہوں سے بچا رہے۔ ایک بزرگ نے کسی شخص سے دریافت کیا کہ تم میرے بعد کیسے رہے' اس نے کہا خیریت سے' بزرگ نے کہا اگر تم نے کسی معصیت کا ارتکاب نہیں کیا تو واقعی خیریت سے رہے ہو' اور اگر تم نے گناہ کیا ہے تو اس سے بڑھ کر اور مرض کیا ہو سکتا ہے' اس مرض کے بعد تم خیریت سے رہنے کا دعویٰ کیسے کر سکتے ہو۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے عراق میں دیکھا کہ عید کے دن چہل پہل' زیب و زینت' اور خوشی و مسرت کے آثار ہیں' آپ نے لوگوں سے دریافت کیا کہ ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے' لوگوں نے عرض کیا کہ ان کی عید کا دن ہے' حضرت علیؓ نے فرمایا جس دن ہم کوئی نافرمانی کریں گے وہ دن ہمارے لئے عید کا دن ہوگا' اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :-

وَعَصَيْتُمْ مِّنْ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ۔ (پ ۴ ر ۷ آیت ۱۵۲)

اور تم کہنے پر نہ چلے اس کے بعد کہ تم کو تمہاری دل خواہ بات دکھلا دی تھی۔

ما تحبون سے مراد عافیت ہے۔ ایک جگہ ارشاد فرمایا :-

اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰى اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى۔ (پ ۳۰ ر ۲۱ آیت ۷)

سچ مچ بے شک (کافر) آدمی حد (آدمیت) سے نکل جاتا ہے اس واسطے کہ اپنے آپ کو مستغنی دیکھتا ہے۔

---

(۱) اس روایت کا پہلا حصہ مرفوع ہے' اور اس کا حوالہ پہلے گذر چکا ہے البتہ فلقد کان الخ کی زیادتی کی سند مجھے نہیں ملی۔

اس میں اگرچہ مال کا استغناء مراد ہے لیکن صحت کے استغناء سے بھی آدمی سرکش ہو جاتا ہے بعض علماء کی رائے ہے کہ فرعون نے أَنَا رَبُّكُمُ الْأَعْلَىٰ (میں تمہارا خدائے برتر ہوں) اسی لئے کہا تھا کہ وہ ایک طویل زمانے سے راحت و سکون کے ساتھ زندگی گزار رہا تھا چار سو برس تک زندہ رہا اور اس عرصے میں نہ اس کے سر میں درد ہوا نہ جسم گرم ہوا اور نہ نبض تیز چلی اس لئے خدائی کا دعویٰ کر بیٹھا اللہ تعالیٰ اس پر لعنت کرے اگر ایک ہی روز کے لئے اس کے آدھے سر میں درد ہو جاتا تو دعویٰ خدائی تو کیا دوسری لغویات سے بھی باز رہتا۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں :-

أَكْثِرُوا مِنْ ذِكْرِ هَادِمِ اللَّذَّاتِ۔ (ترمذی نسائی ابن ماجہ۔ ابو ہریرہؓ)

لذتوں کو ڈھانے والے کا ذکر بکثرت کیا کرو۔

کہتے ہیں کہ بخار موت کا قاصد ہے اس لئے کہ وہ دوا تمہ موت کو یاد دلانے والا ہے اور اطاعات میں ٹال مٹول کو دور کرنے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :-

أَوَلَا يَرَوْنَ أَنَّهُمْ يُفْتَنُونَ فِي كُلِّ عَامٍ مَّرَّةً أَوْ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ لَا يَتُوبُونَ وَلَا هُمْ يَذَّكَّرُونَ۔ (پ ۱۱ ر ۵ آیت ۱۲۶)

اور کیا ان کو دکھلائی نہیں دیتا کہ یہ لوگ ہر سال میں ایک بار یا دو بار کسی نہ کسی آفت میں پھنسے رہتے ہیں پھر بھی باز نہیں آتے اور نہ وہ کچھ سمجھتے ہیں۔

اس آیت کی تفسیر میں بعض علماء یہ کہتے ہیں کہ امراض میں مبتلا کر کے ان کا امتحان لیا جاتا ہے کہتے ہیں کہ جب بندہ دو مرتبہ بیمار ہونے کے باوجود توبہ نہیں کرتا تو ملک الموت اس سے کہتے ہیں کہ اے غافل میرا قاصد تیرے پاس دو مرتبہ آیا لیکن تو نے میرے پیغام کا جواب نہیں دیا۔ پچھلے دور میں اگر کوئی ایسا سال گذر جاتا جس میں جان و مال پر کوئی مصیبت نازل ہوتی تو سلف صالحین وحشت زدہ ہو جاتے اور فرماتے کہ ہر مومن پر ہر چالیس دن میں کوئی نہ کوئی مصیبت ایسی ضرور آتی ہے جس سے وہ خوف زدہ ہو جائے۔ ایک روایت میں ہے کہ حضرت عمار ابن یاسرؓ نے ایک عورت سے نکاح کیا وہ کبھی بیمار نہیں ہوتی تھی آپ نے اسے طلاق دیدی۔ ایک مرتبہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کسی عورت کا تذکرہ ہوا بعض صحابہ نے اس کی بڑی تعریف کی یہاں تک کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے شرف زوجیت بخشنے کا ارادہ فرمالیا اسی دوران کسی صحابی نے عرض کیا کہ وہ کبھی بیمار نہیں ہوئی آپ نے ارشاد فرمایا اگر ایسا ہے تو مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے (احمد۔ انسؓ) ایک مرتبہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں مرض اور درد کا موضوع زیر بحث تھا اسی اثناء میں آپ نے ارشاد فرمایا کہ درد سر ایسا ہے اور فلاں مرض ایسا ہے حاضرین میں سے ایک شخص نے عرض کیا یارسول اللہ درد سر کسے کہتے ہیں میں تو اس سے واقف ہی نہیں آپ نے ارشاد فرمایا : تو مجھ سے دور رہ۔ اس کے بعد لوگوں سے ارشاد فرمایا کہ جو شخص کسی دوزخی کو دیکھنا چاہے وہ اسے دیکھ لے (ابو داؤد۔ عامرؓ)۔ آپ نے اس شخص کو دوزخی اس لئے کہا کہ ایک حدیث میں یہ مذکور ہے :-

اَلْحُمّٰى حَظُّ كُلِّ مُؤْمِنٍ مِنَ النَّارِ۔ (بزار۔ عائشہؓ احمد۔ ابو امامہؓ)

بخار دوزخ میں سے ہر مومن کا حصہ ہے۔

حضرت انس اور حضرت عائشہؓ کی روایت میں ہے کہ کسی شخص نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ قیامت کے دن شہداء کے ساتھ اور بھی کوئی ہو گا فرمایا : ہاں وہ شخص جو ہر روز موت کو بیس مرتبہ یاد کیا کرے ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ جو شخص اپنے گناہ یاد کر کے دل گیر ہوتا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ موت بیماری میں زیادہ یاد آتی ہے۔ بہرحال یہ فوائد ہیں جن کی بنا پر بعض اکابرین سلف نے یہ بہتر سمجھا کہ دوا استعمال نہ کی جائے ان کے خیال میں بیماری سے درجات بلند ہوتے ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ دوا کرنا نقص ہے یہ بات وہ کس طرح کہہ سکتے ہیں جب کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی دوا کی ہے اور دوسروں کو بھی دوا کرنے کا حکم دیا ہے۔

دوا نہ کرنا ہر حال میں افضل نہیں اگر کوئی شخص یہ کہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے دوا اس لئے کی ہے کہ دوسروں کے لئے سنت بن جائے' ورنہ دوا کرنا ضعفاء کا حال ہے' اقویاء کے درجے میں ترک دوا کے ساتھ توکل واجب ہے۔ اس کے جواب میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس طرح تو جوشش خون کے وقت ترک حجامت اور ترک فصد کو بھی توکل کی شرط ہونا چاہیے۔ اگر کہنے والا اسے بھی شرط قرار دے تو ہم یہ کہیں گے کہ اس طرح تو متوکل کے لئے یہ بھی ضروری ہوگا کہ اگر اسے بچھو' اور سانپ وغیرہ کاٹ لے تو اس کے اثرات زائل نہ کرے کیوں کہ خون باطن جسم کو ڈستا ہے' اور بچھو ظاہر جسم پر کاٹتا ہے' بظاہر ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اگر کہنے والا اسے بھی داخل توکل کرے تو اس سے کہا جائے گا کہ پھر تو یہ بھی ضرور ہوا کہ آدمی پیاس کے کاٹے کو پانی سے' بھوک کے کاٹے کو روٹی سے اور سردی کے کاٹے کو جبہ سے دفع نہ کرے' حالانکہ اس کا کوئی بھی قائل نہیں ہے' پانی روٹی اور جبّے کے استعمال کو سب لوگ توکل سے الگ سمجھتے ہیں' جب کہ ہمارے نزدیک ان درجات میں کوئی فرق نہیں ہے۔ بلکہ یہ تمام اسباب ہیں جنہیں مسبّب الاسباب نے اسی طرح مرتب کیا ہے اور اسی طرح اپنی سنّت قرار دی ہے۔

حضرت عمرؓ کا واقعہ اپنے اس دعویٰ کی دلیل میں کہ اس طرح کے امور داخل توکّل نہیں ہم حضرت عمر ابن الخطاب کا یہ واقعہ پیش کرسکتے ہیں' آپ نے ایک مرتبہ حضرات صحابہ کے ساتھ شام کا سفر کیا' جب دمشق کے قریب جابیہ تک پہنچے تو صحابہ کو معلوم ہوا کہ شام میں سخت وبا اور طاعون پھیلا ہوا ہے' اب یہاں یہ سوال پیدا ہوا کہ آیا شام میں داخل ہوا جائے یا نہیں' اس سوال کو لے کر دو گروہ ہوگئے' ایک گروہ نے کہا کہ ہم وبا اور طاعون میں نہیں جائیں گی' کیوں کہ یہ ایسا ہے جیسے کوئی شخص اپنے آپ کو جلتی ہوئی آگ میں گرادے' ایک گروہ نے کہا کہ ہم جائیں گے' اللہ پر توکل کریں گے' اور جو کچھ ہماری تقدیر میں ہے اس سے گریز نہیں کریں گے' نہ موت سے خوف کھائیں گے' اور نہ ان لوگوں کے زمرے میں داخل ہوں گے جن کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ خَرَجُوا مِن دِيَارِهِمْ وَهُمْ أُلُوفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ۔ (پ ۲ ر ۱۶ آیت ۲۴۳)

کیا تجھ کو ان لوگوں کا قصّہ معلوم نہیں جو کہ اپنے گھروں سے نکل گئے تھے اور وہ لوگ ہزاروں تھے موت سے بچنے کے لئے۔

دونوں گروہ حضرت عمر کی خدمت میں حاضر ہوئے' اور اس سلسلے میں آپ کی رائے دریافت کی' جو لوگ شام میں داخلے پر مصر تھے' انہوں نے کہا کہ کیا ہمیں اللہ تعالیٰ کی تقدیر سے بھی بھاگنا چاہیے' حضرت عمرؓ نے جواب دیا ہاں! ہم اللہ کی تقدیر سے اللہ ہی کی تقدیر کی طرف فرار اختیار کریں گے۔ اس کے بعد آپ نے ایک مثال بیان کی کہ فرض کرو کہ تم میں سے کسی شخص کے پاس بکریاں ہوں اور انہیں چرانے کے لئے دو وادیاں موجود ہوں۔ ان میں سے ایک سرسبز و شاداب ہو' اور دوسری بے آب و گیاہ ہو' اب اگر اس شخص نے سبز و شاداب وادی اختیار کی تب بھی وہ اللہ کی تقدیر اور حکم پر چرانے والا ہوگا' اور خشک و بنجر وادی میں گیا تب بھی اللہ کے حکم اور تقدیر سے جانے والا ہوگا۔ صحابہ نے اس کی تصدیق کی۔ اس کے بعد آپ نے حضرت عبدالرحمٰن ابن عوف کو قاصد بھیج کر بلوایا وہ ایک روز بعد تشریف لائے' ان کے سامنے بھی یہ اختلافی موضوع رکھا گیا' حضرت عبدالرحمٰن ابن عوف نے فرمایا کہ اس معاملے میں میری رائے وہ ہے جو میں نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہے' حضرت عمرؓ نے فرمایا سبحان اللہ! اگر آپ کا ارشاد موجود ہے تو پھر اس اختلاف کی گنجائش نہیں ہے۔ آپ بیان کریں' ابن عوف نے فرمایا کہ میں نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے یہ ارشاد سنا ہے:۔

إِذَا سَمِعْتُمْ بِالْوَبَاءِ فِي أَرْضٍ فَلَا تَقْدَمُوا عَلَيْهِ' وَإِذَا وَقَعَ وَأَنْتُمْ بِهَا فَلَا تَخْرُجُوا فِرَارًا مِنْهَا۔ (۱)

(۱) بخاری۔ اس روایت سے پہلے حضرت عمرؓ کا واقعہ تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

جب تم یہ سنو کہ کسی جگہ وبا پھیلی ہوئی ہے تو اس پر اقدام مت کرو' اور اگر کسی ایسی جگہ جہاں تم پہلے سے موجود ہو وبا واقع ہو جائے تو اس سے فرار اختیار مت کرو۔

یہ حدیث سن کر حضرت عمرؓ بے حد خوش ہوئے' اور انہوں نے حدیث سے اپنی رائے کی مطابقت پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا' اور صحابہ کو جابیہ سے واپس لے آئے۔

دیکھئے یہاں تمام صحابہ کرام نے ترک توکّل پر اتفاق کیا' معلوم ہوا کہ اس طرح کے امور توکل کے لئے شرط نہیں ہیں ورنہ صحابہ کرام اس پر اتفاق کیسے کرتے' کیوں کہ اس سے ترک توکل لازم آتا ہے جو اعلا مقامات میں سے ہے۔

وبائی علاقوں سے فرار نہ ہونے کا حکم یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر مضر چیزوں سے بچنا داخل توکل نہیں تو پھر اس زمین سے نکلنے کی ممانعت کیوں کی گئی جہاں تم مقیم ہو اور وبا پھوٹ پڑے' طب میں وباء کا باعث ہوا کو قرار دیا گیا ہے' ظاہر ہے ہوا مضر ہے' اور مضر چیز سے گریز کرنا ہی بہترین علاج ہے' پھر اس کی اجازت کیوں نہیں دی گئی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ مضر چیزوں سے بچنا بالاتفاق خلاف توکل نہیں ہے جیسے مضر چیزوں سے بچنے کے لئے پچھنے لگوائے جاتے ہیں' اور فصد کھلوائی جاتی ہے' لیکن ایسا لگتا ہے کہ وبائی علاقے سے باہر نکلنے کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ یہ صحیح ہے کہ وباء کا سبب ہوا ہے' لیکن محض ظاہر جسم کو ہوا لگنا اس کا سبب نہیں ہو سکتا' بلکہ جب متعفن اور بدبودار ہوا سانس کے ذریعے جسم میں جاتی ہے' تو دل' پھیپھڑوں اور اندرونی جسم کے پردوں پر اپنے مضر اثرات چھوڑتی ہے' اس سے معلوم ہوا کہ وباء جسم کے ظاہری حصوں پر اثر انداز نہیں ہوتی' بلکہ جسم کے اندرونی نظام کو متاثر کرتی ہے۔ اس لئے اگر کوئی شخص کسی شہر میں رہتا ہے' اور وہاں وباء پھیلتی ہے تو غالب گمان یہی ہے کہ وہ اس کے اثرات سے محفوظ نہ رہ سکا ہو گا' تاہم یہ احتمال بھی ہے کہ اس پر یہ وباء اس قدر اثر انداز نہ ہوئی ہو' اس صورت میں وباء سے فرار اختیار کرنا تحفظ کا ایک وہمی سبب ہوا جیسے جھاڑ پھونک اور فال وغیرہ۔ تاہم اگر صرف یہی بات وہاں سے نکلنے کا سبب ہوتی تب بھی کوئی مضائقہ نہ تھا' لیکن اس کی ممانعت ایک اور وجہ سے بھی کی گئی ہے' اور وہ یہ ہے کہ اگر تندرست اور صحتمند لوگوں کو وبائی علاقے سے نکلنے کی اجازت دیدی جائے تو شہر میں سوائے بیماروں' اور مریضوں کے اور کوئی باقی نہیں رہے گا۔ اور کوئی شخص ایسا نہیں بچ سکے گا جو انہیں کھانا' پانی اور دوا دے سکے' اور وہ خود اپنی بیماری کے باعث یہ ضرورتیں پوری نہیں کر سکتے' اس صورت میں صحت مند لوگوں کا اس شہر سے نکلنا مریضوں کو ہلاک کرنا ہے' اس لئے کہ ان کی زندگی کا احتمال موجود ہے بشرطیکہ صحت مند وہاں رہیں' اور ان کی مناسب نگہداشت کریں۔ مسلمانوں کو ایک عمارت کی مثال کہا گیا ہے کہ ایک کی تقویت دوسرے سے ہوتی ہے یا ایک جسم کے اعضاء قرار دیا گیا ہے کہ اگر ایک عضو کو تکلیف ہوتی ہے تو باقی تمام اعضاء اس کی تکلیف محسوس کرتے ہیں۔ ہمارے نزدیک نکلنے کی ممانعت کی وجہ یہی باہمی تعاون' ہمدردی' اور اخوت ہے' ہو سکتا ہے اور بھی وجوہات ہوں جو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

البتہ جو لوگ ابھی شہر میں داخل نہیں ہوئے ان کے لئے یہی حکم ہے کہ وہ باہر ہی رہیں کیوں کہ ابھی تک متعفن اور زہریلی ہوا ان پر حملہ آور نہیں ہوئی ہے' اور نہ شہر کے بیماروں کو ان کی ضرورت ہے کہ اگر یہ لوگ داخل نہ ہوئے تو وہ لوگ ہلاک ہو جائیں گے' وہاں پہلے ہی سے ان کی دیکھ بھال کرنے والے موجود ہیں' ہاں اگر شہر میں کوئی ایسا نہ بچا ہو کہ مریضوں کی دیکھ بھال کر سکے' اور ان کے کھانے' پانی اور دوا کا کفیل ہو سکے' اور اس صورت میں کچھ لوگ ان بیماروں کی اعانت کے لئے شہر میں داخل ہوں تو عجب نہیں ان کا یہ عمل مستحب قرار پائے' کیوں کہ ضرر کا لاحق ہونا ایک وہمی امر ہے' اور مسلمانوں کو ضرر سے بچانا ایک یقینی معاملہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث شریف میں طاعون اور وباء کے علاقوں سے بھاگنے کو میدان جہاد سے فرار ہونا قرار دیا گیا ہے۔ (احمد۔ عائشہؓ) کیوں کہ جس طرح میدان جہاد سے بھاگنا مسلمانوں کو تباہ کرنا اور انہیں دشمنوں کے سپرد کر دینا ہے اسی طرح شہر وبا سے فرار اختیار کرنا بھی مسلمانوں کو تباہ کرنا اور ہلاک کرنا ہے۔

یہ دقیق امور ہیں' جو شخص انہیں نظر انداز کرتا ہے اور صرف احادیث و آثار کے ظواہر پر نظر رکھتا ہے اسے اکثر ان امور میں

مغالطہ ہو جاتا ہے' عابدوں اور زاہدوں کو اس طرح کے مغالطوں سے بڑا سابقہ پڑتا ہے' اسی لئے وہ اپنی کم علمی اور کم نظری کے باعث غلطی کر بیٹھتے ہیں' علم کا شرف یہی ہے کہ اس طرح کے معاملات میں صاحب علم فریب نظر کا شکار نہیں ہوتا' بلکہ وہ بظاہر مختلف باتوں کو ایک کر کے صحیح راہ تلاش کر لیتا ہے۔

اس تفصیل سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا اسباب اور وجوہات کی بنا پر دوا کرنا افضل ہے' اس پر اگر کوئی شخص یہ شبہ وارد کرے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے دوا کیوں ترک نہیں فرمائی' تاکہ اور فضائل کی طرح یہ فضیلت بھی آپ کو حاصل ہو جاتی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ دوا نہ کرنے کی فضیلت ان لوگوں کے لئے ہے جو مرض کو معاصی کا کفارہ بنانا چاہتے ہوں' یا صحت کی حالت میں نفس کی سرکشی اور شہوات کے تسلط سے خوف زدہ ہوں' یا غفلت سے نجات پانا اور موت کو یاد رکھنا چاہتے ہوں' یا راضین اور متوکلین کے مقامات سے عاجز ہونے کے بعد صابرین کا ثواب حاصل کرنا چاہتے ہوں' یا ان لطائف اور فوائد پر مطلع نہ ہوں جو اللہ تعالیٰ نے دواؤں میں ودیعت فرمائے ہیں' بلکہ اس کے نزدیک دوائیں بھی جھاڑ پھونک کی طرح وہمی ہوں' یا ایسے احوال میں مشغول ہوں کہ دوا نہ کر سکتے ہوں' کیوں کہ دوا کریں گے تو یہ احوال باقی نہ رہ جائیں گے اور ضعف کے باعث ان دونوں۔ صحت اور بقائے احوال۔ میں جمع کرنا ان کے بس میں نہیں ہے۔ لیکن یہ تمام امور جنہیں ہم دوا کے استعمال کے لئے مانع اسباب کہہ سکتے ہیں' عام لوگوں کے لئے وجہ کمال ہیں' جب کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کے لئے باعث نقصان ہیں' کیوں کہ آپ کی ذات گرامی ان تمام مقامات سے بلند اور برتر تھی' آپ کی شان کے لائق یہی امر تھا کہ اسباب کے وجود اور عدم دونوں میں آپ کا مشاہدہ یکساں رہے' کیوں کہ آپ کا التفات صرف مسبّب الاسباب کی طرف تھا۔ جس شخص کا یہ مرتبہ ہوتا ہے اسے اسباب سے نقصان نہیں پہنچتا' جیسے مال کی رغبت ایک نقص ہے' اور اس سے نفرت کرنا کمال ہے لیکن اس شخص کے لئے نقص ہے جس کے نزدیک مال کا وجود اور عدم دونوں برابر ہوں' سونے اور پتھر کو برابر سمجھنے کا مقام اس سے زیادہ مکمل ہے کہ سونے سے بچا جائے پتھر سے نہ بچا جائے۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک سونا اور پتھر دونوں برابر تھے' لیکن مخلوق کو زہد کی تعلیم دینے کے لئے آپ اپنے پاس سونا نہیں رکھتے تھے' کیوں کہ مخلوق کی منتہائے قوت زہد ہے آپ کو سونا رکھنے سے اپنے نفس پر خوف نہیں تھا' کیوں کہ آپ کا مرتبہ اس سے بلند تھا کہ دنیا آپ کو فریب دے سکے چنانچہ آپ پر زمین کے خزانے پیش کیے گئے لیکن آپ نے قبول کرنے سے انکار فرما دیا۔ بہرحال اسباب کے عدم و وجود کے اسی یکساں مشاہدے کی بنا پر آپ کے نزدیک اسباب کا استعمال کرنا یا استعمال نہ کرنا دونوں برابر تھے۔ لیکن آپ نے دوا اس لئے استعمال فرمائی کہ اللہ تعالیٰ کی سنت و عادت اسی طرح جاری ہے' آپ نے امت کے لئے بھی اس کی گنجائش رکھی تھی' کیوں کہ اس میں کوئی ضرر بھی نہیں تھا' مال اس لئے جمع نہ فرمایا کہ اس میں بے شمار نقصانات ہیں۔

تاہم دوا کرنا اس صورت میں ضرر ہو سکتا ہے کہ خالق دوا کے بجائے صرف دوا کو نافع سمجھا جائے' یا دوا اس لئے استعمال کی جائے کہ اس سے حاصل ہونے والی صحت کو معاصی کے ارتکاب کا ذریعہ بنایا جائے گا۔ اور یہ دونوں صورتیں ممنوع ہیں' لیکن ان دونوں ہی صورتوں کا وقوع شاذ و نادر ہوتا ہے' اکثر مومنین معصیت کے لئے صحت حاصل نہیں کرتے' اور نہ محض دوا کو مفید و مؤثر سمجھتے ہیں' بلکہ اس لئے مفید سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان میں افادیت' تاثیر اور نفع مضمر کر دیا ہے' جس طرح پانی بذات خود پیاس زائل کرنے والا یا روٹی اپنی ذات سے بھوک مٹانے والی نہیں ہے۔ دوا کا حکم کسب کے حکم کی طرح ہے' اگر کوئی شخص طاعت یا معصیت پر مدد حاصل کرنے کے لئے کماتا ہے تو اس کا حکم الگ ہے' اور مباحات سے تنعم حاصل کرنے کے لئے کماتا ہے تو اس کا حکم جدا ہے۔

ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ بعض حالات میں دوا نہ کرنا افضل ہے' اور بعض میں دوا کرنا بہتر ہے' اور افضلیت کا یہ اختلاف احوال' اشخاص اور نیات کے اختلاف پر مبنی ہے' توکل میں دوا کا استعمال شرط ہے' اور نہ ترک دوا شرط ہے۔ صرف وہمیات کا ترک شرط ہے جیسے داغ لگوانا اور جھاڑ پھونک کرانا کیونکہ وہمیات پر عمل کرنا ایسی تدبیرات اختیار کرنا ہے جو متوکلین کے شایان

شان نہیں ہیں۔

مرض کے اظہار اور کتمان میں متوکلین کے احوال جاننا چاہیے کہ مرض کا کتمان' فقر' اور دوسرے تمام مصائب کا اخفاء نیکی کے خزانوں میں سے ایک بڑا خزانہ ہے' اور یہ ایک اعلا مقام ہے' کیوں کہ اللہ کے حکم پر راضی رہنا' اور اس کی عطا کردہ مصیبتوں پر صبر کرنا ایک ایسا معاملہ ہے جو صرف اس کے اور اللہ کے درمیان ہوتا ہے' اس لئے اگر اپنا حال پوشیدہ رکھا جائے تو اس میں بہت سی آفات سے سلامتی ہے' تاہم اگر نیت اور مقصد صحیح ہو تو اظہار میں کوئی مضائقہ بھی نہیں ہے۔

اظہار کے تین مقاصد پہلا مقصد علاج کرانا ہے' ظاہر ہے اس صورت میں طبیب کو اپنے حال سے آگاہ کرنا ہوگا' یہ آگاہی بطور شکایت نہیں ہوتی' بلکہ بطور حکایت ہوتی ہے کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ کی قدرت اس پر واقع ہوتی ہے اسے من و عن نقل کر دیتا ہے۔ چنانچہ حضرت بشر حکیم عبدالرحمٰن کے روبرو اپنا حال کہہ دیا کرتے تھے اسی طرح حضرت امام احمد ابن حنبلؒ بھی اپنا مرض بیان کر دیا کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت مجھ میں جو اثر کرتی ہے میں صرف وہ بیان کرتا ہوں' دوسرا مقصد یہ ہے کہ مریض مقتدیٰ ہو اور معرفت میں کامل ہو' اور وہ طبیب کے علاوہ دوسرے لوگوں سے اس لئے اظہار کرتا ہو کہ انہیں مرض میں حسن صبر بلکہ حسن شکر کی تعلیم دے سکے' اور یہ بتلا سکے کہ مرض بھی ایک نعمت ہے' جس طرح اور نعمتوں پر شکر ادا کیا جاتا ہے' اسی طرح اس پر بھی شکر کرنا چاہیے' حسن بصریؒ کہتے ہیں کہ اگر مریض اللہ تعالیٰ کی تعریف اور شکر نعمت کے بعد اپنی تکلیف اور درد کا اظہار کرے تو یہ شکوہ نہیں ہے۔ تیسرا مقصد یہ ہے کہ مرض کے اظہار سے اپنا عجز' اور اللہ تعالیٰ کی طرف اپنی احتیاج ظاہر کرے' اور یہ صورت اس شخص کے لئے زیادہ مناسب ہے جو قوت اور شجاعت رکھتا ہو' اور جس سے عجز و انکسار مستبعد ہو' جیسے کسی شخص نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے ان کی بیماری کے دوران پوچھا کہ آپ کیسے ہیں' فرمایا : میں برا ہوں۔ لوگ یہ جواب سن کر ایک دوسرے کو دیکھنے لگے' گویا انہوں نے اس جواب کو اچھا تصور نہیں کیا بلکہ شکایت جانا۔ آپ نے فرمایا کیا میں اپنے رب کے سامنے بہادر بنوں' حضرت علیؓ نے اپنی قوت اور شجاعت کے باوجود یہ بہتر سمجھا کہ اپنے عجز' اور اللہ تعالیٰ کی طرف اپنی احتیاج ظاہر کریں' اس سلسلے میں آپ نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم اور ہدایت کے مطابق عمل کیا تھا۔ ایک مرتبہ آپ بیمار ہوئے تو یہ دعا مانگی کہ اے اللہ! مجھے مصیبت پر صبر عطا کر' سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مصیبت کا سوال تم خود کر رہے ہو صحت کی دعا کرو (۱) یہ تین مقاصد ہو سکتے ہیں جن کی بنیاد پر مرض کے اظہار کی اجازت دی جا سکتی ہے' اظہار کے لئے ان مقاصد کی شرط اس لئے ضروری ہے کہ مرض کا ذکر کرنا شکایت ہے' اور اللہ تعالیٰ کی شکایت کرنا حرام ہے جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ بلا ضرورت سوال کرنے میں اللہ تعالیٰ کی شکایت ہے' اس لئے ضرورت کے بغیر مانگنا جائز نہیں ہے۔

مرض کا ذکر جس میں خفگی بھی پائی جاتی ہو' اور اللہ تعالیٰ کے فعل پر ناپسندیدگی بھی شکایت بن جاتی ہے' لیکن اگر مذکورہ بالا مقاصد بھی نہ ہوں' اور خفگی بھی نہ ہو' یونہی ذکر کیا کرتا ہو تو اسے ناجائز نہیں کہا جائے گا' لیکن یہ کہا جائے گا کہ اگر ذکر نہ کرتا تو بہتر تھا' کیوں کہ بلاوجہ ذکر کرنے میں بھی شکایت کا وہم ہو جاتا ہے' مثلاً جس قدر مرض ہوتا ہے اس سے کہیں زیادہ بیان کر دیا جاتا ہے' یا دوا نہ کرنے میں توکل کو جس قدر دخل ہوتا ہے اس سے کہیں زیادہ بیان کیا جاتا ہے' ان مقاصد کے علاوہ اظہار کی کوئی اور وجہ سمجھ میں نہیں آتی' اظہار سے بہتر تو یہ ہے کہ دوا کرے اور صحت پائے۔ ایک بزرگ کہتے ہیں کہ جس نے مرض ظاہر کر دیا اس نے صبر نہیں کیا۔ بعض مفسرین نے قرآن کریم کی اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے کہ یہاں وہ صبر مراد ہے جس میں شکوہ نہ ہو :

فَصَبْرٌ جَمِيلٌ (پ ۱۲ ر ۱۲ آیت ۱۸) سو صبر ہی کروں گا جس میں شکایت کا نام نہ ہوگا۔

حضرت یعقوب علیہ السلام سے کسی شخص نے دریافت کیا کہ آپ کی آنکھیں کس چیز سے ضائع ہو گئیں فرمایا زمانے کے غم و اندوہ سے' وحی آئی کہ اے یعقوب تم ہمارے بندوں کے سامنے ہماری شکایت کر رہے ہو' حضرت یعقوب علیہ السلام نے عرض کیا اے

(۱) یہ روایت پہلے گذری ہے۔

اللہ! میں اپنی غلطی پر نادم ہوں اور توبہ کرتا ہوں۔ طاؤس اور مجاہد کہتے ہیں کہ بیمار پر اس کا آہ آہ کرنا لکھا جاتا ہے۔ اکابرین سلف بیمار کی آہ کو برا سمجھتے تھے' کیوں کہ اس میں بھی ایک طرح کی شکایت کی جاتی ہے۔ بعض لوگوں کا قول ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام پر شیطان صرف اس لئے حاوی ہوا کہ انہوں نے اپنے مرض میں آہ کی تھی۔ ایک حدیث میں ہے کہ جب بندہ بیمار ہوا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے دونوں فرشتوں سے فرماتا ہے کہ دیکھو یہ اپنے عیادت کرنے والوں سے کیا کہتا ہے' چنانچہ اگر وہ عیادت کرنے والوں سے خدا کا شکر اور تعریف کرتا ہے تو فرشتے اس کے لئے دعائے خیر کرتے ہیں' اور اگر وہ شکایت کرتا ہے' یا برائی کرتا ہے تو فرشتے کہتے ہیں کہ تو ایسا ہی رہے گا (۱) بعض بزرگان دین اس خوف سے کہ کہیں کوئی حرف شکایت زبان سے نہ نکل جائے' یا اظہار مرض میں مبالغہ نہ ہو جائے یہ مناسب نہ سمجھتے تھے کہ ان کی عیادت کی جائے' چنانچہ وہ لوگ بیمار پڑتے تو اپنے گھر کا دروازہ بند کر لیتے تاکہ کوئی ان کے پاس نہ آئے' جب صحت یاب ہوتے' تو خود باہر نکل کر لوگوں سے ملاقات کرتے۔ فضیل ابن عیاض' وہیب ابن الورد اور بشر ابن الحارث کا یہی معمول تھا۔ حضرت فضیل فرمایا کرتے تھے کہ میں بیمار ہونا چاہتا ہوں' مگر مجھے یہ اچھا نہیں لگتا کہ لوگ عیادت کے لئے آئیں' میں بیماری کو صرف عیادت کرنے والوں کے باعث ناپسند کرتا ہوں۔

کتاب المحبۃ والشوق والانس والرضا

محبت' شوق' انس اور رضا کے بیان میں

محبت تمام مقامات میں انتہائی بلند مرتبہ رکھتی ہے' اس لئے کہ محبت کے بعد جتنے بھی مقامات ہیں وہ سب اس کے توابع ہیں جیسے شوق' انس اور رضا' اور اس سے پہلے جتنے مقامات ہیں وہ سب محبت کے مقدمات ہیں جیسے توبہ' صبر' اور زہد۔ محبت کے علاوہ جتنے بھی مقامات ہیں اگرچہ ان کا وجود نادر ہے لیکن مومنین کے قلوب ان پر ایمان کے امکان سے خالی نہیں ہوتے۔ لیکن محبت الٰہی پر ایمان لانا مشکل ہے' اسی لئے بعض علماء نے اس کے امکان کی نفی کی ہے اور محبت الٰہی کے یہ معنی بیان کئے ہیں کہ اس کی اطاعت و عبادت پر مواظبت کی جائے' جہاں تک حقیقی محبت کا سوال ہے وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ محال ہے' کیوں کہ ایسی محبت صرف اپنی جنس اور مثل سے کی جاتی ہے' ان علماء نے صرف محبت ہی کا انکار نہیں کیا بلکہ انس' شوق' لذت مناجات' اور محبت کے باقی تمام لوازم کی نفی بھی کی ہے' اس لئے یہ ضروری ہوا کہ ہم حقیقت حال بیان کریں۔

اس کتاب میں پہلے ہم محبت کے شرعی شواہد بیان کریں گے' پھر اس کی حقیقت اور اسباب پر روشنی ڈالیں گے' اس کے بعد یہ بتلائیں گے کہ محبت کا استحقاق صرف اللہ تعالیٰ کے لئے ہے' اور سب سے بڑی لذت اللہ تعالیٰ کے دیدار کی لذت ہے' اور یہ لذت آخرت میں ان لوگوں کے لئے دوچند ہو گی جو دنیا میں اس کی معرفت رکھتے ہیں اس کے بعد یہ بیان کریں گے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت میں قوت پیدا کرنے والے اسباب کون سے ہیں' اور اس کی وجہ کیا ہے کہ لوگ محبت کے باب میں مختلف نظر آتے ہیں' پھر یہ بیان کیا جائے گا کہ لوگ اللہ تعالیٰ کی معرفت سے قاصر ہیں' محبت پر اس تفصیلی بحث کے بعد ہم شوق کے معنی بتلائیں گے' اور اللہ تعالیٰ سے بندے کی محبت کی علامات بیان کریں گے' پھر انس باللہ کے معنی مذکور ہوں گے' اس کے بعد رضا کے معنی اور اس کے فضائل کا ذکر ہو گا۔ آخر میں محبین کی حکایات اور ان کے اقوال تحریر کئے جائیں گے۔

محبت الٰہی کے شرعی دلائل تمام امت اس امر پر متفق ہے کہ بندے پر اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت فرض ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر محبت فرض ہے تو اس کے وجود کا انکار کیسے کیا جا سکتا ہے' اور جن لوگوں نے محبت کی تفسیر اطاعت پر مواظبت سے کی ہے وہ کیسے صحیح ہو سکتی ہے' اس لئے کہ طاعت تو محبت کا ثمرہ ہے اور اس کا تابع ہے' پہلے محبت ہوتی ہے' پھر

(۱) یہ روایت پہلے گذری ہے۔

محبوب کی اطاعت ہوتی ہے۔ پہلے ہم دلائل بیان کرتے ہیں :-

آیات و روایات

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :-

یُحِبُّھُمْ وَیُحِبُّوْنَہٗ (پ ۶ ر ۱۲ آیت ۵۴) جن سے اس کو محبت ہوگی اور ان کو اس سے محبت ہوگی۔

وَالَّذِیْنَ آمَنُوْا اَشَدُّ حُبًّا لِلّٰہِ (پ ۲ ر ۴ آیت ۱۵۶) اور جو مومن ہیں ان کو اللہ کے ساتھ قوی محبت ہے۔

ان دونوں آیات سے نہ صرف یہ کہ محبت کا وجود ثابت ہوتا ہے' بلکہ اسمیں شدت اور خفت کے تفاوت کا ثبوت بھی ملتا ہے۔ بہت سی روایات میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے محبت الٰہی کو ایمان کی شرط قرار دیا ہے۔ ایک روایات میں ہے کہ ابو زرین عقیلی نے عرض کیا یا رسول اللہ! ایمان کیا ہے۔ فرمایا :-

اَنْ یَکُوْنَ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَحَبَّ اِلَیْہِ مِمَّا سِوَاھُمَا۔ (احمد)

یہ کہ اللہ اور اس کا رسول بندہ کے نزدیک ان دونوں کے سواسے محبوب تر ہوں۔

ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں :-

لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یَکُوْنَ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ اَحَبَّ اِلَیْہِ مِمَّا سِوَاھُمَا۔ (بخاری و مسلم۔ انسؓ بلفظ آخر)

تم میں سے کوئی اس وقت تک مومن نہ ہو گا جب تک اللہ اور اس کا رسول اس کے نزدیک غیر سے محبوب تر نہ ہوں۔

ایک جگہ یہ حقیقت ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے :-

لَا یُؤْمِنُ الْعَبْدُ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْہِ مِنْ اَھْلِہٖ وَمَالِہٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ۔ (بخاری و مسلم۔ انسؓ)

بندہ اس وقت تک مومن نہیں ہوتا جب تک میں اس کے نزدیک اس کے اہل' مال اور تمام لوگوں سے محبوب تر نہ ہوں۔

ایک روایت میں ومن نفسہ کے الفاظ بھی ہیں۔ قرآن کریم میں ہے' اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا :-

قُلْ اِنْ کَانَ اٰبَاؤُکُمْ وَاَبْنَاؤُکُمْ وَاِخْوَانُکُمْ وَاَزْوَاجُکُمْ وَعَشِیْرَتُکُمْ وَاَمْوَالُ اقْتَرَفْتُمُوْھَا وَتِجَارَۃٌ تَخْشَوْنَ کَسَادَھَا وَمَسَاکِنُ تَرْضَوْنَھَا اَحَبَّ اِلَیْکُمْ مِنَ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَجِھَادٍ فِیْ سَبِیْلِہٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰی یَاْتِیَ اللّٰہُ بِاَمْرِہٖ (پ ۱۰ ر ۹ آیت ۲۴)

آپ کہہ دیجئے کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارا کنبہ اور وہ مال جو تم نے کمائے ہیں اور وہ تجارت جس کی کساد بازاری کا تم کو اندیشہ ہو' اور وہ گھر جن کو تم پسند کرتے ہو' تم کو اللہ سے اور اس کے رسول سے اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ پیارے ہوں تو تم منتظر رہو یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم بھیج دے۔

یہ خطاب تہدید اور انکار کے اسلوب میں ہے۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی محبت کا حکم فرمایا ہے' ارشاد ہے :-

اَحِبُّوا اللّٰہَ لِمَا یَغْذُوْکُمْ بِہٖ مِنْ نِعَمِہٖ وَاَحِبُّوْنِیْ بِحُبِّ اللّٰہِ اِیَّایَ۔ (ترمذی۔ ابن عباسؓ)

اللہ سے محبت کرو اس نعمت کے لئے جو وہ تمہیں ہر صبح عطا کرتا ہے' اور مجھ سے محبت کرو اللہ بھی مجھ سے محبت کرتا ہے۔

ایک شخص نے آپ کی خدمت میں عرض کیا یا رسول اللہ! میں آپ سے محبت کرتا ہوں' آپ نے ارشاد فرمایا مفلسی کے لئے تیار رہو' اس نے عرض کیا کہ میں اللہ سے محبت رکھتا ہوں' آپ نے فرمایا مصیبت کے لئے تیار رہو (ترمذی۔ عبداللہ ابن مغفلؓ) حضرت عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے مصعب ابن عمیر کو دیکھا جو مینڈھے کی کھال اپنی کمر سے لپیٹے ہوئے آرہے ہیں' آپ نے لوگوں سے ارشاد فرمایا کہ اس شخص کو دیکھو اللہ نے اس کا دل روشن کر دیا ہے' میں نے اسے اس کے

والدین کے پاس دیکھا ہے جو اسے عمدہ عمدہ چیزیں کھلایا پلایا کرتے تھے۔ اور اب اللہ اور اس کے رسول کی محبت نے اس کا یہ حال بنا دیا ہے (ابو نعیم) ایک مشہور حدیث میں ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ملک الموت سے اس وقت تک جب وہ ان کی روح قبض کرنے کے لئے آئے کہا کہ کیا تم نے کوئی ایسا دوست دیکھا ہے جو اپنے دوست کو ہلاک کر دیتا ہو' اللہ تعالیٰ نے وحی نازل فرمائی کہ اے ابراہیم کیا تم نے کوئی ایسا محب دیکھا ہے جو اپنے محبوب سے ملاقات کرنا پسند نہ کرتا ہو۔ حضرت ابراہیم نے ملک الموت سے فرمایا کہ اب تم روح قبض کر لو (۱) لیکن یہ امر صرف انہی بندگان خدا کے قلوب پر منکشف ہوتا ہے جو دل سے اللہ تعالیٰ کو چاہتے ہیں' اور اس سے محبت کرتے ہیں' جب انہیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ موت ملاقات کا سبب ہے تو ان کا دل اس کی طرف کھنچتا ہے' ان کا کوئی اور محبوب نہیں ہوتا کہ اس کی کشش محسوس کریں۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعا میں فرمایا :۔

اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنِیْ حُبَّکَ وَحُبَّ مَنْ اَحَبَّکَ وَحُبَّ مَایُقَرِّبُنِیْ اِلٰی حُبِّکَ وَاجْعَلْ حُبَّکَ اَحَبَّ اِلَیَّ مِنَ الْمَاءِ الْبَارِدِ (۲)

اے اللہ! مجھے اپنی محبت عطا کر' اور ان لوگوں کی محبت عطا کر جو تجھ سے محبت کرتے ہیں' اور ان چیزوں کی محبت بھی جو مجھے تیری محبت سے قریب کردیں اور اپنی محبت کو میرے نزدیک ٹھنڈے پانی سے بھی زیادہ محبوب کر۔

ایک اعرابی آپ کی خدمت میں حاضر ہوا' اور اس نے عرض کیا یا رسول اللہ قیامت کب آئے گی' آپ نے اس سے دریافت فرمایا کہ تو نے قیامت کے لئے کیا تیاری کی ہے' اس نے عرض کیا کہ نہ میں نے بہت زیادہ نمازیں پڑھی ہیں' اور نہ بہت زیادہ روزے رکھے ہیں' لیکن مجھے اللہ اور اس کے رسول سے محبت ہے۔ آپ نے فرمایا :۔

اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ۔

آدمی اس کے ساتھ ہے جس سے وہ محبت کرے۔

حضرت انس فرماتے ہیں کہ میں نے مسلمانوں کو اتنا خوش کبھی نہیں دیکھا' جتنا خوش وہ یہ سن کر ہوئے (بخاری و مسلم۔ انس) حضرت ابوبکر الصدیق کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ سے محبت کرنے والے کو جو ذائقہ ملتا ہے وہ اسے دنیا کی طلب سے روک دیتا ہے' اور تمام انسانوں سے اسے وحشت زدہ کر دیتا ہے۔ حضرت حسن فرماتے ہیں کہ جو شخص اللہ کی معرفت رکھتا ہے اس سے محبت کرتا ہے' اور جو دنیا کی معرفت رکھتا ہے وہ اس میں زہد کرتا ہے مومن لہو میں مشغول نہیں ہوتا کہ دنیا سے غافل ہو جائے' وہ جب فکر کرتا ہے غم کرتا ہے۔ حضرت ابو سلیمان دارانی کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جنہیں جنت اور اس کی نعمتیں اللہ تعالیٰ سے نہیں روک سکتیں' دنیا کے باعث وہ کیسے رک سکتے ہیں' حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا گذر تین ایسے شخصوں پر ہوا جن کے بدن کمزور اور رنگ متغیر تھا' آپ نے دریافت کیا کہ تمہارا یہ حال کیسے ہوا' انہوں نے عرض کیا کہ دوزخ کے عذاب کے خوف سے' آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ خائفین کو ضرور محفوظ رکھے گا' آپ کچھ اور آگے بڑھے' وہاں تین ایسے شخص ملے جو پہلے والوں سے بھی کمزور لاغر و زرد رو تھے' حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان سے دریافت کیا کہ تمہارا یہ حال کیسے ہو گیا انہوں نے عرض کیا کہ جنت کے شوق میں ہم لوگوں کا یہ حال ہو گیا ہے' آپ نے ان سے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں وہ چیز ضرور عنایت فرمائے گا جس کے تم مشتاق ہو' آپ اور آگے بڑھے وہاں تین ایسے شخص ملے جو پچھلے لوگوں سے زیادہ کمزور تھے' اور جن کا رنگ پہلوں سے زیادہ متغیر تھا' نور کا یہ عالم ہو گیا تھا گویا چہروں پر آئینے لگے ہوئے ہیں' آپ نے ان سے پوچھا کہ تمہارا یہ حال کیسے ہوا' انہوں نے جواب دیا کہ ہم اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتے ہیں' آپ نے فرمایا تم ہی لوگ مقرب ہو' تم ہی لوگ مقرب ہو۔ عبدالواحد ابن زید کہتے ہیں کہ میں نے ایک شخص کو دیکھا جو برف پر سویا کرتا تھا' میں نے اس سے پوچھا کہ تجھے سردی محسوس نہیں ہوتی۔ اس نے کہا کہ جو شخص محبت

---

(۱) مجھے اس کی اصل روایت نہیں ملی (۲) یہ روایت کتاب الدعوات میں گذری ہے۔

الٰہی میں گرم ہو اس پر سردی کا اثر نہیں ہوتا۔ سری سقطیؒ فرماتے ہیں کہ قیامت کے روز امتوں کو ان کے انبیاء کے ناموں کے ساتھ پکارا جائے گا یعنی اس طرح کہا جائے گا اے امت موسیٰ' اے امت عیسیٰ' اے امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم' لیکن جو لوگ اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہیں انہیں اس طرح آواز دی جائے گی کہ اے اللہ کے دوستو! اللہ کی طرف آؤ' یہ آواز سن کران کے دل خوشی سے جھوم اٹھیں گے۔ ہرم ابن حیان کہتے ہیں کہ مومن جب اپنے رب کو پہچان لیتا ہے تو اس سے محبت کرتا ہے' اور جب محبت کرتا ہے تو اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے' اور جب اس توجہ کی حلاوت پاتا ہے تو پھر نہ دنیا پر خواہش کی نگاہ ڈالتا ہے' اور نہ آخرت پر کاہلی کی نگاہ ڈالتا ہے' وہ اپنے جسم سے دنیا میں رہتا ہے اور روح سے آخرت میں۔ یحیٰ ابن معاذؒ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا عفو تمام گناہوں کو سمیٹ لیتا ہے' اس کی رضا کا کیا حال ہو گا' اور رضا تمام امیدوں پر محیط ہوتی ہے' اس کی محبت کا عالم کیا ہو گا' اس کی محبت عقل و خرد سے بیگانہ کر دیتی ہے اس کی مودّت کا عالم کیا ہو گا' اس کی مودّت غیر اللہ کو بھلا دیتی ہے' اس کے لطف کا کیا عالم ہو گا۔ بعض آسمانی کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ اے میرے بندے! مجھے تیرے حق کی قسم ہے میں تجھ سے محبت کرتا ہوں' اور تجھے میرے حق کی قسم ہے تو بھی مجھ سے محبت کر۔ یحیٰ ابن معاذؒ فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک اللہ تعالیٰ کی ذرہ بھر محبت ستر برس کی اس عبادت سے بہتر ہے جو محبت سے خالی ہو' یہ بھی فرماتے ہیں کہ اے اللہ میں تیرے صحن میں مقیم اور تیری ثنا میں مشغول ہوں' تو نے مجھے کم عمری ہی سے اپنی طرف کھینچ رکھا ہے اور اپنی معرفت کا لباس پہنا رکھا ہے' اور اپنے لطف سے نواز رکھا ہے' اور تو مجھے احوال' اعمال' ستر' توبہ' زہد' شوق' رضا اور محبت میں بدلتا رہا ہے' تو مجھے اپنی حوضوں سے سیراب کرتا ہے' اپنے باغوں میں گھماتا ہے' میں تیرے حکم کا پابند ہوں' اب جب کہ میری مونچھیں نکل آئی ہیں' اور کچھ قدرت حاصل ہو گئی ہے تو میں آج بڑا ہو کر تجھ سے کیسے منحرف ہو جاؤں جب کہ تو بچپن ہی سے مجھے اپنا مانوس بنائے ہوئے ہے' اور اب میں ان امور کا عادی ہو گیا ہوں' جب تک زندہ رہوں گا تیرے ہی گرد منڈلاؤں گا' اور تیرے ہی سامنے آہ و زاری کروں گا' کیوں کہ میں محب ہوں' اور ہر محب کو اپنے حبیب سے شغف ہوتا ہے' اور غیر سے نفرت ہوتی ہے' اللہ تعالیٰ کی محبت میں بے شمار آیات' روایات اور آثار ہیں۔ اور اتنی واضح ہیں کہ بیان کی محتاج نہیں' اگر کچھ پیچیدگی ہے تو محبت کے معنی میں ہے۔ اس لئے اب ہم محبت کی حقیقت پر گفتگو کرتے ہیں۔

محبت کی حقیقت' اس کے اسباب اور اللہ کے لئے بندے کی محبت کے معنی یہ موضوع اس وقت تک پوری طرح واضح اور قابل فہم نہیں ہو گا جب تک یہ بیان نہ کیا جائے کہ محبت کی حقیقت کیا ہے' اس کے اسباب اور شرائط کیا ہیں' اور اللہ کے لئے بندے کی محبت کے معنی کیا ہیں' پہلے ہم کچھ بنیادی امور لکھتے ہیں۔

محبت کی حقیقت پہلی بات تو یہ ہے کہ محبت کا تصور اس وقت تک ممکن نہیں جب تک معرفت اور ادراک نہ ہو' اس لئے کہ انسان صرف اس چیز سے محبت کر سکتا ہے جس کا ادراک رکھتا ہو' اسی لئے یہ وصف جمادات میں نہیں پایا جاتا' کیونکہ نہ ان میں ادراک ہوتا ہے اور نہ معرفت' بلکہ یہ زندہ اور ادراک رکھنے والے کا وصف ہے پھر مدرکات یا تو مدرک کی طبیعت کے موافق اور مطابق ہوتے ہیں اور اسے لذت دیتے ہیں یا اس کی طبیعت کے مخالف ہوتے ہیں' اور اسے نقصان پہنچاتے ہیں' یا مدرک پر نہ لذت کے اعتبار سے اثر انداز ہوتے ہیں اور نہ اذیت کے اعتبار سے۔ اس طرح مدرکات کی تین قسمیں ہو جاتی ہیں' پہلی قسم کے مدرکات سے جو مدرک کی طبیعت کے موافق اور اس کے لئے لذت بخش ہوتے ہیں۔ مدرک کو محبت ہوتی ہے' اور جن کے ادراک سے مدرک کو نفرت یا تکلیف ہوتی ہے' وہ اس کے نزدیک مبغوض ہوتے ہیں' اور جن مدرکات سے نہ لذت ملتی ہے اور نہ تکلیف ہوتی ہے وہ نہ محبوب ہوتے ہیں اور نہ مبغوض۔۔۔ خلاصہ یہ ہے کہ جس چیز سے مدرک کو لذت ملتی ہے وہ اس کے نزدیک محبوب ہوتی ہے۔ اور اس کے محبوب ہونے کے معنی یہ ہیں کہ طبیعت میں اس کی طرف رغبت اور میلان ہوتا ہے' اور مبغوض ہونے کے معنی یہ ہیں کہ طبیعت کو اس سے نفرت ہے گویا محبت یہ ہے کہ طبیعت اس چیز کی طرف مائل ہو جس سے اسے لذت ملتی ہے' اگر یہ

میلان شدید اور پختہ ہو جاتا ہے تو اسے عشق کہتے ہیں' اسی طرح بغض یہ ہے کہ طبیعت اس چیز سے متنفر ہو جس سے اسے تکلیف پہنچتی ہے' اور جب یہ نفرت شدید ہو جاتی ہے تو اسے مقت کہتے ہیں۔

مدرکات حواس اور محبت دوسری بات یہ ہے کہ جب محبت ادراک اور معرفت کے تابع ہوئی تو اس کی تقسیم بھی اسی طرح ہو گی جس طرح مدرکات اور حواس کی ہوتی ہے' اس لئے کہ ہر حس کے لئے مدرکات میں سے مخصوص چیز کا ادراک ہے' اور ہر حس کو بعض مدرکات سے لذت ملتی ہے' اور اسی لذت کی بناء پر طبیعت اس کی طرف مائل ہوتی ہے' اور طبع سلیم کے نزدیک وہ مدرکات محبوب ہوتی ہیں' مثلاً آنکھ کی لذت ان مدرکات سے ہے جو آنکھ سے محسوس ہوتی ہے جیسے خوبصورت چیزیں اور حسین و جمیل چہرے' اور کان کی لذت ان مدرکات سے ہے جو کان سے محسوس ہوتی ہیں جیسے مسور کن نغمے' اور فرحت بخش آوازیں' ناک کی لذت ان مدرکات سے ہے جو ناک سے محسوس ہوتی ہیں جیسے عمدہ خوشبوئیں' اسی طرح ذائقے کی لذت غذاؤں میں ہے لمس کی لذت گداز اور نرم چیزوں میں ہے' کیوں کہ یہ مدرکات حواس کو لذت دیتے ہیں اس لئے محبوب سمجھے جاتے ہیں اور طبع سلیم کو ان کی طرف رغبت ہوتی ہے' چنانچہ ایک حدیث میں ہے۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :-

حُبِّبَ اِلَیَّ مِنْ دُنْیَاکُمْ ثَلٰثٌ اَلطِّیْبُ وَالنِّسَاءُ وَقُرَّۃُ عَیْنِیْ فِی الصَّلٰوۃِ۔ (نسائی۔ انسؓ)

میرے نزدیک تمہاری تین چیزیں محبوب ہیں خوشبو' عورتیں اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔

اس حدیث شریف میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے خوشبو کو محبوب قرار دیا' جس کا تعلق صرف سونگھنے سے ہے' آنکھ اور کان کو اس سے کوئی واسطہ نہیں ہے' اسی طرح آپ نے نماز کو آنکھوں کی ٹھنڈک قرار دیا ہے' اور اسے انتہائی محبوب فرمایا ہے' ظاہر ہے کہ نماز کا ادراک حواس خمسہ سے نہیں ہوتا بلکہ اس کے لئے چھٹی حس کی ضرورت پڑتی ہے' اس کا ادراک وہی کر سکتا ہے جس کے پاس دل ہو۔ جہاں تک حواس خمسہ کی لذات کا تعلق ہے ان میں حیوانات بھی انسان کے شریک ہیں' اس لئے اگر کوئی شخص محبت کو حواس خمسہ کے مدرکات پر منحصر کر کے یہ کہے کہ اللہ تعالیٰ کا حواس سے ادراک نہیں ہوتا اس لئے اس کی محبت بھی نہیں ہو سکتی' اس صورت میں ہم انسان کے لئے جو خصوصیت فرض کر رہے ہیں وہ غلط ہو گی' اور چھٹی حس لغو ہو جائے گی جس کی بنیاد پر انسان حیوانات سے ممتاز ہے' اور جس کو عقل' نور' قلب یا کسی اور لفظ سے تعبیر کر سکتے ہیں' لیکن ایسا کہنا صحیح نہ ہو گا کیوں کہ باطن کی بصیرت ظاہر کی بصیرت سے زیادہ مضبوط اور قوی ہوتی ہے' آنکھ کی بہ نسبت قلب زیادہ ادراک کر لیتا ہے' اور ان معانی کا جمال جن کا ادراک عقل سے ہوتا ہے' ان صورتوں کے جمال سے کہیں زیادہ ہے جو آنکھ سے محسوس کی جاتی ہیں۔ اس لئے قلب کو ان امور شریفہ الہیہ کے ادراک سے زیادہ مکمل لذت ملے گی جو حواس کے دائرہ ادراک سے خارج ہیں' اور ان کی طرف طبع سلیم' اور عقل صحیح کا میلان زیادہ قوی ہو گا' اور محبت کے معنی ہی یہ ہیں کہ قلب اس چیز کی طرف مائل ہو جس کے ادراک میں لذت ہوتی ہے' اس کی تفصیل ہم عنقریب بیان کریں گے' حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت سے صرف وہی شخص انکار کر سکتا ہے جو بہائم کے درجے میں ہو' اور حواس کے ادراک سے تجاوز نہ کر سکتا ہو۔

محبت کے اسباب تیسری بات یہ ہے کہ انسان اپنے نفس سے محبت کرتا ہے اور کبھی اپنے نفس کی خاطر غیر سے بھی محبت کرتا ہے' اب رہا یہ سوال کہ کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی شخص غیر سے اس کی ذات کی خاطر محبت کرے' اپنے نفس کے لئے نہ کرے؟ جہاں تک ضعفاء کا سوال ہے وہ اس کا جواب نفی میں دیتے ہیں' ان کے نزدیک یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ کوئی انسان غیر سے صرف اس کی ذات کے لئے محبت کرے اور اپنی ذات سے اس کی محبت کا کوئی تعلق نہ ہو' لیکن حق بات یہ ہے کہ ایسی محبت ممکن بھی ہے اور موجود بھی ہے۔ اس لئے ہم محبت کے اسباب اور اس کی اقسام بیان کرتے ہیں۔

جاننا چاہیے کہ ہر زندہ کے نزدیک اس کا پہلا محبوب خود اس کا نفس اور اس کی ذات ہے اور نفس سے محبت کے معنی یہ ہیں کہ

اس کی طبیعت اپنے وجود کے دوام کی طرف مائل ہے' اور اپنے عدم اور ہلاکت سے متنفر ہے۔ فطرتاً محبوب وہی چیز ہوتی ہے جو محبت کرنے والے کے لئے مناسب ہو' اور نفس کے لئے دوام وجود سے زیادہ کیا چیز موافق ہو سکتی ہے اور عدم وہلاکت سے بڑھ کر کیا چیز مخالف ہو سکتی ہے۔ اس لئے انسان کو زندگی سے محبت ہے' اور موت سے نفرت ہے' نفرت کی وجہ یہ نہیں ہوتی کہ اسے مرنے کے بعد ہونے والے عذاب کا خوف ہوتا ہے یا اس تکلیف سے ڈرتا ہے جو روح نکلنے کے وقت ہوتی ہے' بلکہ اگر کوئی شخص اس طرح مرے کہ جاں کنی کی کوئی اذیت نہ ہو' اور نہ عذاب کا خوف ہو' تب بھی وہ موت پر آمادہ نہیں ہوگا' اور موت ہی کو برا سمجھے گا۔ ہاں اگر کوئی شخص زندگی میں سختیاں اور مصیبتیں برداشت کرتا ہے تو وہ واقعتہً موت کو محبوب رکھتا ہے لیکن یہ محبت اس لئے نہیں ہوتی کہ وہ مرنے کو محبوب رکھتا ہے' بلکہ اس لئے ہوتی ہے کہ اس کے ذریعے اپنے مصائب اور شدائد کا خاتمہ کرنا چاہتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ انسان بالطبع ہلاکت اور عدم سے نفرت کرتا ہے' اور دوام وجود سے محبت کرتا ہے' اور جس طرح دوام وجود محبّ ہے اسی طرح کمال وجود بھی محبوب ہے' اس لئے کہ ناقص میں کمال نہیں ہوتا' اور نقصان بھی کمال کی بہ نسبت عدم ہے' اور عدم خواہ صفات کا ہو یا وجود کا' قابل نفرت چیز ہے۔ جس طرح اصل وجود کا دوام محبوب ہے اسی طرح صفات کمال کا وجود بھی محبوب ہے۔ یہ ایک فطری امر ہے' جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی سنّت کے مطابق انسانی سرشت میں ودیعت فرمادیا ہے' اور اللہ کی سنّت بدلنے والی چیز نہیں ہے۔

حاصل یہ ہے کہ انسان کا محبوب اول اس کی ذات ہے' پھر اعضاء کی سلامتی' مال' اولاد' اہل خاندان' اور احباب کی سلامتی محبوب ہوتی ہے' اعضاء کی سلامتی اس لئے محبوب ہوتی ہے کہ کمال وجود اور دوام وجود ان پر موقوف ہے' مال اس لئے محبوب ہوتا ہے کہ یہ دوام وجود کا آلہ ہے' باقی تمام چیزوں کو بھی اسی طرح قیاس کیا جاسکتا ہے۔

اصولی بات یہ ہے کہ انسان ان اشیاء سے خود ان کی ذات کی وجہ سے محبت نہیں کرتا' بلکہ اس لئے محبت کرتا ہے کہ ان کا تعلق اس کے دوام وجود اور کمال وجود سے ہے' اپنے لڑکے سے محبت کرتا ہے' اگرچہ اسے کوئی فائدہ نہیں ہوتا' بلکہ اس کی خاطر مشقتیں اٹھانی پڑتی ہیں' اس کے باوجود محبت کرتا ہے' کیوں کہ وہ اس کے مرنے کے بعد وجود میں اس کا قائم مقام بننے والا ہے' نسل کا باقی رہنا بھی ایک طرح سے وجود کا بقا ہے' اور کیوں کہ دائمی بقا ملنے والی شئی نہیں ہے' اور وہ اس کی بہت زیادہ خواہش رکھتا ہے' اس نے اپنی نسل کی بقا میں اس خواہش کی تکمیل کی صورت تلاش کی' اور ایسے شخص کی بقا کو محبوب جانا جو آئندہ اس کا قائم مقام ہوگا' اور وہ اس کا لڑکا ہے' اسے جسم کا ٹکڑا بھی کہہ سکتے ہیں۔ تاہم اگر اس شخص کو اپنے نفس' اور لڑکے کے قتل میں اختیار دیا جائے تو وہ اپنے نفس کی بقا کو لڑکے کی بقا پر ترجیح دے گا' بشرطیکہ اس کی طبیعت معتدل ہو' اس لئے کہ لڑکے کی بقا بظاہر اس کی بقا ہے لیکن حقیقت میں اس کی بقا نہیں ہے' یہی حال اقارب اور اہل خاندان کا ہے وہ ان سے صرف اپنے نفس کے کمال کی خاطر محبت کرتا ہے' کیوں کہ وہ ان کے ذریعے اپنے نفس کو بہت اور قوی سمجھتا ہے' اور ان کے کمال کو اپنے لئے باعث فخر' مال' عیال اور خارجی اسباب انسان کے لئے بازوؤں کی طرح ہیں جن سے انسان کی تکمیل ہوتی ہے' اور وجود کا کمال اور دوام طبعاً محبوب ہوتا ہے۔ اس گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ ہر شخص کو اپنی ذات' اپنی ذات کا کمال اور دوام محبوب ہوتا ہے' اور ان امور کے برعکس امور مکروہ ہیں۔ یہ ہے محبت کے اسباب میں سے پہلا سبب۔

محبت کا دوسرا سبب احسان ہے' انسان بندۂ احسان ہے' اور قلوب کی سرشت میں یہ بات داخل کردی گئی ہے کہ وہ اپنے احسان کرنے والوں سے محبت کرتے ہیں' اور ظلم کرنے والوں سے نفرت کرتے ہیں۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی دعا میں ارشاد فرماتے ہیں:۔

اَللّٰهُمَّ لَا تَجْعَلْ لِفَاجِرٍ عَلَيَّ يَدًا فَيُحِبَّهُ قَلْبِيْ۔ (ابو منصور دیلمی۔ معاذ ابن جبل)

اے اللہ! مجھ پر کسی فاجر کا احسان نہ رکھنا کہ میرا دل اس سے محبت کرنے لگے۔

اس حدیث میں اس امر کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ محسن کے لئے دل کی محبت فطری اور اضطراری ہوتی ہے' نہ اسے دفع کر سکتے ہیں' اور نہ اس کو نفرت سے تبدیل کر سکتے ہیں۔ اس لئے انسان کبھی ایسے شخص سے محبت کرتا ہے جس سے اس کا کوئی رشتہ یا تعلق نہیں ہوتا۔ وہ اس کے لئے اجنبی ہوتا ہے' مگر اس کا احسان اس سے محبت کرنے پر مجبور کرتا ہے' اگر دیکھا جائے تو محبت کے اس سبب کا مال بھی وہی ہے جو پہلے سبب کا ہے' اس لئے کہ محسن اس شخص کو کہتے جو کسی کی مال یا دوسرے ایسے اسباب سے اعانت کرے جو دوام وجود یا کمال وجود تک پہنچانے والے ہوں' یا ان لذائذ کے حصول میں معین ہو جن سے وجود تیار ہوتا ہے۔ ہاں اگر فرق ہے تو صرف یہ کہ اعضاءِ انسان اس لئے محبوب ہوتے ہیں کہ ان سے کمال وجود ہوتا ہے' اور یہی مطلوب عین کمال ہے' جب کہ محسن مطلوب عین کمال نہیں ہے' بلکہ کبھی کبھی وہ اس کا سبب بنتا ہے' جیسے طبیب صحت اعضاء کے دوام کا سبب بنتا ہے' یہاں دو محبتیں ہیں ایک صحت اعضاء کی محبت' اور دوسرے اس طبیب کی محبت جو صحت اعضاء کا باعث ہے' اور ان دونوں محبتوں میں فرق ہے' اس لئے کہ صحت اپنی ذات سے محبوب ہوتی ہے' اور طبیب اپنی ذات سے محبوب نہیں ہوتا بلکہ اس لئے محبوب ہوتا ہے کہ وہ صحت کا سبب ہے' اسی طرح علم اور استاذ دونوں محبوب ہوتے ہیں' مگر علم اپنی ذات سے محبوب ہوتا ہے' اور استاذ اسلئے محبوب ہوتا ہے کہ وہ محبوب علم کے حصول کا سبب ہے۔ اسی طرح کھانے پینے کی اشیاء بھی محبوب ہوتی ہے' اور درہم و دینار بھی محبوب ہوتے ہیں' لیکن کھانے پینے کی اشیاء سے محبت ذاتی ہوتی ہے' اور درہم و دینار سے محبت اس لئے کی جاتی ہے کہ وہ ان اشیاء کے حصول کا ذریعہ ہیں۔ ان دونوں میں صرف مرتبے کا فرق ہے ایک پہلے ہے' اور دوسری بعد میں' جہاں تک اپنے نفس کی محبت کا سوال ہے وہ دونوں میں پائی جاتی ہے' مطلب یہ ہے کہ جو شخص محسن سے اس کے احسان کے باعث محبت کرتا ہے وہ اس کی ذات سے محبت نہیں کرتا بلکہ اس کے احسان سے محبت کرتا ہے' احسان محسن کا ایک فعل ہے' اگر محسن یہ فعل انجام نہ دے تو محبت باقی نہ رہے' اگرچہ محسن کی ذات اپنی جگہ موجود ہے۔ پھر جس قدر احسان کم ہوتا ہے اسی قدر محبت بھی کم ہوتی ہے' اور جس قدر زیادہ ہوتا ہے اسی قدر محبت بھی زیادہ ہو جاتی ہے' گویا محبت کی کمی یا زیادتی احسان کی کمی یا زیادتی پر موقوف ہے۔

محبت کا تیسرا سبب یہ ہے کہ کسی چیز سے اس کی ذات کی وجہ سے محبت کی جائے' نہ کہ کسی ایسے حظ اور منفعت کے لئے جو اس کی ذات سے حاصل ہونے والا ہے' بلکہ اس کی ذات ہی عین منفعت ہو' اور یہی وہ حقیقی اور دائمی محبت ہے جس کے متعلق پورے وثوق کے ساتھ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ یہ محبت دائمی رہنے والی ہے' اور یہ ایسا ہے جیسے حسن و جمال کی محبت' ہر جمال جمال کا ادراک کرنے والے کے نزدیک محبوب ہوتا ہے' اور یہ محبت صرف عین جمال سے ہوتی ہے' کیوں کہ اس میں جمال کا ادراک ہی عین لذت ہے' اور لذت اپنی ذات سے محبوب ہوتی ہے' غیر سے محبوب نہیں ہوتی' تم یہ گمان مت کرو کہ اچھی صورتوں کی محبت صرف قضاءِ شہوت کے لئے ہوتی ہے' اس کے علاوہ کسی چیز کے لئے نہیں ہوتی' تمہارا یہ خیال غلط ہے قضائے شہوت ایک الگ لذت ہے۔ بعض اوقات اس کے لئے بھی اچھی صورتوں سے محبت کی جاتی ہے' اور خود جمال کا ادراک بھی لذیذ ہے' اس لئے یہ ممکن ہے کہ وہ لذاتہ بھی محبوب ہو' اس کا انکار اس لئے نہیں کیا جا سکتا کہ سبزہ زار اور آب رواں کے مناظر محبوب ہوتے ہیں اس لئے نہیں کہ سبزہ کھایا جاتا ہے' اور پانی پیا جاتا ہے یا دیکھنے کے علاوہ بھی ان سے کوئی منفعت حاصل کی جاتی ہے' چنانچہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو سبزہ اور آب رواں اچھا لگتا تھا۔ (ابو نعیم۔ ابن عباس) تمام طبائع سلیمہ خوبصورت پھولوں' غنچوں' عمدہ تصویروں' اور خوش رنگ' خوش آواز پرندوں سے لذت حاصل کرتی ہیں' اور بہت سے ان کے ذریعے اپنا دل بہلاتے ہیں' اور انہیں دیکھ کر لطف اندوز ہوتے ہیں' بہرحال یہ تمام چیزیں لذیذ ہیں' اور ہر لذیذ چیز محبوب ہوتی ہے' ہر حسن و جمال کے ادراک میں لذت ہے' کوئی شخص اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ جمال بالطبع محبوب نہیں' اس لئے اگر یہ ثابت ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ جمیل ہے تو لامحالہ وہ اس شخص کے نزدیک محبوب ہو گا جس پر اس کا جلال و جمال منکشف ہو۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں :۔

اِنَّ اللّٰہَ جَمِیْلٌ یُحِبُّ الْجَمَالَ (مسلم۔ ابن مسعودؓ)
اللہ تعالیٰ جمیل ہے جمال کو محبوب رکھتا ہے۔

چوتھا سبب۔ حسن و جمال حسن و جمال بھی محبت کا ایک اہم سبب ہے لیکن حسن و جمال ہے کیا چیز؟ اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم حسن و جمال کی صحیح تفسیر کریں۔ جو لوگ ظاہر پر نظر رکھتے ہیں' اور محسوسات و مدرکات کے اسیر ہیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ حسن یہ ہے کہ آدمی کے اعضاء متناسب ہوں' شکل عمدہ ہو' رنگ سرخ و سفید ہو' قدو قامت رکھتا ہو' عام طور پر لوگ ایسے ہی انسان کو حسین اور خوبصورت کہتے ہیں' کیوں کہ یہ اوصاف انہیں آنکھوں سے نظر آتے ہیں' اسی لئے ان کا گمان یہ ہوتا ہے کہ جو چیز آنکھ سے محسوس نہ ہو' خیال کے دائرے میں نہ آئے' اور رنگ و روپ سے محروم ہو وہ حسین نہیں ہوتی اسے درجۂ محبوبیت بھی حاصل نہیں ہوتا۔ حالانکہ یہ ایک غلط خیال ہے' حسن آنکھ سے نظر آنے والی چیزوں میں منحصر نہیں ہے اور نہ خلقت کے تناسب پر منحصر ہے' اور نہ سفیدی میں سرخی کی آمیزش پر' ہم کہتے ہیں یہ تحریر خوبصورت ہے' یہ آواز حسین ہے' یہ گھوڑا عمدہ ہے' بلکہ یہاں تک کہتے ہیں کہ یہ خوبصورت کپڑا ہے' یہ حسین برتن ہے' آخر آواز' تحریر اور دوسری تمام چیزوں کے حسین ہونے کے معنی کیا ہیں؟ اگر حسن صرف صورت میں ہوتا ہے۔ حالانکہ یہ بات سب جانتے ہیں کہ اچھی تحریر سے آنکھ لذّت حاصل کرتی ہے' اور خوبصورت نغمات سے کان لذت اندوز ہوتے ہیں' دنیا میں جتنے بھی مدرکات ہیں وہ اچھے ہوتے ہیں یا برے' آخر حسن کے وہ معنی کون سے ہیں جس میں یہ تمام اشیاء مشترک ہوتی ہیں' یہ ایک طویل بحث ہے' اور علم معاملہ کے مناسب نہیں ہے۔ تاہم حق کی تصریح کے لئے ہم اس پر کچھ روشنی ڈالتے ہیں۔

ہر شئی کا حسن و جمال اس امر میں ہوتا ہے کہ جس قدر کمال اس کے لائق ہو یا اس کے لئے ممکن ہو وہ اس میں جمع ہو جائے' اگر کسی چیز میں اس کے تمام ممکن کمالات جمع ہو جائیں تو وہ انتہائی حسین اور جمیل کہلانے کا مستحق ہے' اور اگر بعض کمالات ہوں' بعض نہ ہوں تو وہ اسی قدر حسین ہوگی جس قدر اس میں کمالات ہوں گے۔ مثال کے طور پر ہر گھوڑے کو خوبصورت نہیں کہا جا سکتا' بلکہ اس گھوڑے کو حسین کہا جائے گا جس میں وہ تمام اوصاف پائے جائیں جو ایک اچھے گھوڑے کے لئے ضروری ہیں' شکل' ہیئت' رنگ' تیز رفتاری' خوش لگامی وغیرہ' اور خوبصورت تحریر وہ ہے جس میں خط سے متعلق تمام کمالات جمع ہوں' جیسے حروف کا تناسب اور توازن' استقامت ترتیب اور حسن انتظام۔ ہر چیز کے لئے ایک کمال ہے جو صرف اسی کے لائق ہوتا ہے' کسی دوسری چیز کے لائق نہیں ہوتا' بلکہ دوسری چیز میں اس کمال کا نہ ہونا حسن کہلاتا ہے' اس سے معلوم ہوا کہ ہر چیز کا حسن اسی کمال میں ہوگا جو اس کے شایانِ شان ہو' چنانچہ جن کمالات کی وجہ سے گھوڑے کو اچھا کہتے ہیں ان کی وجہ سے آدمی کو اچھا نہیں کہیں گے' اور جن اوصاف کے باعث تحریر اچھی کہلائے گی ان کی وجہ سے گھوڑے کو عمدہ نہیں کہیں گے' جن امور کی وجہ سے برتن اچھے کہلائیں گے ان کی وجہ سے کپڑے اچھے نہیں کہلائیں گے۔ تمام امور کو اسی اصل پر قیاس کرنا چاہیے۔

یہاں تم یہ کہہ سکتے ہو کہ جو چیزیں تم نے بیان کی ہیں وہ سب اگرچہ آنکھ سے محسوس نہیں ہوتیں جیسے آواز اور ذائقہ وغیرہ سے متعلق اشیاء' لیکن کسی نہ کسی حس سے مدرک ہوتی ہیں' مثلاً آواز کان سے' اور ذائقہ منہ سے' اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حسن و جمال کا تعلق محسوسات سے ہے' اور ہم اس سے انکار نہیں کرتے اور نہ اس بات سے انکار کرتے ہیں کہ محسوسات کے ادراک سے لذت نہیں ہوتی' تاہم ان اشیاء کا جمال سمجھ میں نہیں آتا جو حواس سے مدرک نہ ہوں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حسن و جمال صرف محسوسات ہی میں منحصر نہیں ہے' بلکہ غیر محسوسات میں بھی حسن و جمال ہوتا ہے' مثال کے طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ یہ خلق حسن ہے' یہ علم عمدہ ہے' یہ خصلت اچھی ہے' یہ اخلاق بہترین ہیں' اور اخلاق جمیلہ سے مراد علم' عقل' عفت' شجاعت' تقویٰ' کرم' مروّت اور دوسری بہترین عادات ہیں۔ اور ان میں سے کسی صفت یا عادت کا ادراک حواس خمسہ سے نہیں ہوتا' بلکہ باطنی نور بصیرت سے ہوتا ہے' یہ تمام عادات حسنہ محبوب ہیں' اور جو ان عادات کا حامل ہوتا ہے وہ بھی محبوب ہوتا ہے' اس شخص

کے نزدیک جوان عادات سے واقف ہو۔ اور اس کی دلیل یہ ہے کہ انسانی طبائع میں یہ بات داخل کردی گئی ہے کہ وہ اپنے انبیاء علیہم الصلاۃ والسلام اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے محبت کریں' حالانکہ انہوں نے ان کا مشاہدہ نہیں کیا' یہی نہیں بلکہ لوگوں کو اپنے ائمہ مذاہب شافعیؒ' ابو حنیفہؒ' اور مالکؒ سے بھی محبت ہوتی ہے' یہاں تک کہ بعض لوگوں کو اپنے امام سے اس قدر محبت ہوتی ہے کہ اسے عشق کہہ سکتے ہیں' اس عشق کی وجہ سے وہ لوگ اپنے مذہب کی نصرت اور دفاع میں اپنا تمام مال خرچ کر دیتے ہیں' اور اس شخص سے مقاتلہ کرنے میں' سر دھڑ کی بازی لگا دیتے ہیں جو ان کے امام پر طعن کرتا ہے' ارباب مذاہب کی تائید و نصرت کے لئے کافی خون بہایا گیا ہے' میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جو شخص۔ مثلاً۔ امام شافعیؒ سے محبت کرتا ہے وہ ان سے کیوں محبت کرتا ہے جب کہ اس نے انہیں دیکھا نہیں ہے' بلکہ اگر دیکھ لیتا تو شاید اسے ان کی شکل و صورت پسند نہ آتی اس سے معلوم ہوا کہ اس شخص نے ان سے ظاہری شکل و صورت کی وجہ سے محبت نہیں کی' بلکہ باطنی صورت کے مشاہدے نے اسے اس عشق پر مجبور کیا' ان کی ظاہری صورت تو مٹی میں مل کر مٹی ہو گئی ہے' وہ ان کے باطنی اوصاف یعنی دین' تقویٰ' وسعت علم' مدارک دین سے ان کی واقفیت' علوم شرعیہ کی اشاعت کے لئے ان کی جدوجہد پر فدا ہے' یہ تمام امور خوبصورت اور تمام اوصاف عمدہ ہیں' ان کے حسن و جمال کا ادراک صرف نور بصیرت سے ہوتا ہے' حواس ان کے ادراک سے قاصر ہیں۔ یہی حال ان لوگوں کا ہے جو حضرت ابوبکر الصدیق سے محبت کرتے ہیں' اور انہیں دوسرے اصحاب پر فضیلت دیتے ہیں' یا ان کے سلسلے میں تعصّب کرتے ہیں' یا ان لوگوں کا ہے جو حضرت علیؓ سے محبت کرتے ہیں' اور انہیں حضرات شیخین اور دوسرے صحابہ کرام پر فوقیت دیتے ہیں۔ ان کی یہ محبت اور تعصّب صرف باطنی امور کی وجہ سے ہے یعنی علم' دین' تقویٰ' شجاعت' کرم وغیرہ اوصاف نے انہیں ان حضرات سے محبت پر مجبور کیا ہے' ظاہر ہے جو شخص حضرت ابوبکر الصدیقؓ سے محبت کرتا ہے وہ ان کی ہڈی' گوشت' جلد' اعضاء اور شکل و صورت سے محبت نہیں کرتا' اس لئے کہ یہ چیزیں زائل ہو چکی ہیں' تبدیل ہو چکی ہیں اور فنا ہو چکی ہیں' لیکن وہ چیزیں باقی ہیں جن کی وجہ سے حضرت ابوبکرؓ مرتبۂ صدیقیت پر فائز ہوئے یعنی صفات محمودہ اور عادات حسنہ باقی ہیں' اور ان کی محبت انہی صفات کے باقی رہنے کی وجہ سے ہے' اگرچہ صورتیں فنا ہو چکی ہیں۔

ان تمام صفات حسنہ کا مخرج اور جوہر علم اور قدرت ہے' یعنی ان حضرات نے حقائق امور کا علم حاصل کیا' اور اپنے نفس کی شہوات کو قابو میں کرنے کے بعد اسے صفات حسنہ سے مزیّن کرنے پر قادر ہوئے' باقی تمام عادات حسنہ اسی علم اور قدرت کے پہلو سے جنم لیتی ہیں' اور یہ دونوں کسی ظاہری حس سے مدرک نہیں ہوتے' ان کا محل تمام بدن میں ایک جزء لا یتجزیٰ ہے جو حقیقت میں محبوب ہے' اور اس جزء کی جو تجزی نہیں ہوتا کوئی شکل و صورت یا رنگ نہیں ہوتا کہ آنکھ پر اس کا اظہار ہو' اور اسی وجہ سے وہ محبوب قرار پائے' معلوم ہوا کہ یہ جزء کسی حس ظاہر سے مدرک نہیں ہوتا۔ خلاصہ یہ ہے کہ سیرت اور عادات میں جمال موجود ہے اگر علم اور قدرت سیرت جمیلہ کا سرچشمہ نہ ہوتے تو یہ بات موجب محبت نہ ہوتی' اس سے ثابت ہوا کہ اصل محبوب سیرت جمیلہ کا مصدر ہے جسے اخلاق حمیدہ' اور اوصاف حسنہ کہتے ہیں' اور جن کا مرجع کمال علم اور کمال قدرت ہے' اور یہ مصدر طبعاً محبوب ہوتا ہے جب کہ حواس کے ذریعے اس کا ادراک نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ اگر ہم خالی الذہن' اور خالی الطبع بچے کے دل میں کسی غائب' یا حاضر' کسی زندہ یا مردہ کی محبت پیدا کرنا چاہیں تو ہمارے سامنے اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں ہوتا کہ ہم اس کی شجاعت' کرم' علم اور دوسرے اوصاف حسنہ کی تعریف میں مبالغے سے کام لیں' جب وہ بچہ ہمارے کہنے سے اس کا اعتقاد کر لیتا ہے تو اس کے سامنے اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں رہتا کہ وہ اس شخص سے محبت کرے۔ چنانچہ ہمارے دلوں میں صحابہ کی محبت و عظمت' اور شیطان لعین سے نفرت و عداوت اسی لئے راسخ ہوتی ہے کہ ہم نے صحابہ کی تعریف اور شیطان کی مذمت میں بہت کچھ سنا ہے' اس حسن و قبح کا ادراک حواس خمسہ سے نہیں ہوتا۔ بلکہ جب لوگ حاتم کے لئے سخاوت اور خالدؓ کے لئے شجاعت ثابت کرتے ہیں تو سننے والوں کو لامحالہ ان سے محبت ہو جاتی ہے' حالانکہ نہ حاتم کا وصف سخاوت آنکھ سے محسوس ہوتا ہے اور نہ خالدؓ کا

وصف شجاعت آنکھ سے نظر آتا ہے، اور نہ یہ محبت ظاہری صورت دیکھ کر ہوتی ہے اور نہ کسی اپنے نفع کے لئے جو محب کو ان سے پہنچنے والا ہو، یہی نہیں بلکہ جب کسی حاکم یا بادشاہ کے عدل، احسان، صدقہ وخیرات اور بہادری کے کارنامے بیان کئے جاتے ہیں تو خواہ مخواہ دل میں اس کی انسیت اور محبت پیدا ہو جاتی ہے، خواہ وہ نہایت دوری پر واقع ہو کہ اس تک پہنچنا دشوار ہو، اور نہ کبھی اس کی صورت دیکھی، اس سے ثابت ہوا کہ محبت کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ محب پر محبوب کا کوئی احسان ضرور ہو، بلکہ محبوب اپنی ذات سے بھی محبوب ہوتا ہے، اگرچہ محب کا احسان اس تک کبھی نہ پہنچے۔ محبوب کی ذات اس لئے محبوب ہوتی ہے کہ ہر حسن و جمال محبوب ہے، اور صورت کی دو قسمیں ہیں ظاہری و باطنی۔ ظاہری صورت ظاہری آنکھ سے نظر آتی ہے اور باطنی صورت باطنی بصیرت سے محسوس ہوتی ہے، جس شخص کے پاس باطنی بصیرت نہ ہو وہ اس کا ادراک نہیں کرتا اور نہ اس سے لذت اور حظ پاتا ہے، نہ اس سے محبت کرتا ہے، اور نہ اس کی طرف مائل ہوتا ہے۔ اور جس کی باطنی بصیرت ظاہری حواس کی بہ نسبت زیادہ ہوتی ہے وہ ظاہری معانی کے بجائے باطنی معانی ہی کو ترجیح دیتا ہے اور انہیں ہی محبوب سمجھتا ہے۔ اور ان دو شخصوں میں بہت فرق ہے جن میں سے ایک دیوار پر بنے ہوئے کسی نقش سے اس کے جمال ظاہری کی بنا پر محبت کرے، اور دوسرا شخص کسی نبی سے اس کے جمال باطنی کی بنا پر محبت رکھتے ہیں۔

مناسبت خفیہ: محبت کا پانچواں سبب ایک ایسی مخفی مناسبت بھی ہے جو محب اور محبوب کے درمیان ہوتی ہے۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ دو انسانوں میں محبت کا مضبوط رشتہ استوار ہو جاتا ہے، حسن یا کسی اور فائدے کی وجہ سے نہیں، بلکہ روحوں کی مناسبت کی بنا پر، جیسا کہ حدیث شریف میں وارد ہے:

فما تعارف منها ائتلف وما تناكر منها اختلف (مسلم۔ ابی ہریرة)

ان میں سے جو متعارف ہوں وہ یکجا ہو جائیں اور جو اجنبی ہوں وہ جدا ہو جائیں۔

اس سبب پر ہم نے کتاب آداب الصحبۃ میں حب فی اللہ کے ذکر کے تحت روشنی ڈالی ہے، اور یہ موضوع نہایت تحقیق سے بیان کیا ہے، یہ محبت کا عجیب سبب ہے، ہم یہاں اس کی تفصیل نہیں کرنا چاہتے جنہیں دلچسپی ہو وہ اس کتاب میں دیکھ لیں۔

حاصل یہ ہے کہ محبت کے پانچ اسباب ہیں، ایک یہ کہ انسان اپنے نفس اور کمال کے وجود اور بقا سے محبت کرے، دوسرے یہ کہ اپنے ان محسنین سے محبت کرے جو اس کے وجود و بقا میں اس کی اعانت کرتے ہوں، اور مہلکات سے اس کی مدافعت کرتے ہوں، تیسرے یہ کہ اس شخص سے محبت کرے جو لوگوں کا محسن ہو، خواہ اس کا محسن نہ ہو، بلکہ دوسرے لوگوں نے اس پر احسان کیا ہو، چوتھے یہ کہ اس شخص سے محبت کرے جو بذات خود حسین و جمیل ہو خواہ ظاہری صورت میں ہو یا باطنی صورت میں۔ پانچویں ایسے شخص سے کہ اس میں اور محب میں کوئی مخفی مناسبت موجود ہو۔ اگر یہ پانچوں اسباب کسی ایک فرد میں جمع ہو جائیں تو اس کی محبت اپنے پورے عروج اور بلندی پر ہوگی، مثلاً اگر کسی شخص کا لڑکا خوب رو، خوش اخلاق، صاحب علم، مدبر، لوگوں کے ساتھ حسن سلوک کرنے والا، اور نہایت خوبصورت ہو اور باپ کا ہمدرد و مددگار ہو تو ظاہر ہے باپ کو اس سے بے پناہ محبت ہوتی ہے، پھر یہ محبت اسی قدر زیادہ قوی اور راسخ ہوگی جس قدر یہ اوصاف بالا مادہ میں پائے جاتے ہوں گے۔ اب ہم یہ بیان کریں گے کہ ان تمام اسباب کا کمال اور اجتماع صرف اللہ تعالیٰ کے حق میں متصور ہو سکتا ہے، اور وہی حقیقت میں محبت کا مستحق ہو سکتا ہے۔

محبت کا مستحق صرف اللہ ہے: جو شخص اللہ کے علاوہ کسی سے محبت کرتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کی طرف ملتفت نہیں ہوتا تو یہ اس کی کم فہمی، اور معرفت الٰہی سے اس کی ناواقفیت کی دلیل ہے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت بھی ایک محمود اور قابل تعریف وصف ہے، کیوں کہ آپ کی محبت بھی خدا ہی کی محبت ہے، اور یہی حکم علمائے دین اور متقین کی محبت کا ہے، کیوں کہ محبوب کا محبوب، اس کا قاصد، اور اس کا محب سب محبوب ہوتے ہیں، اور ان سب محبتوں کی انتہا ایک اصل پر ہوتی ہے، اور وہ ہے اللہ تعالیٰ کی محبت حقیقت یہ ہے کہ اہل بصیرت کے نزدیک اللہ کے سوا کوئی محبت کا مستحق نہیں ہے، اور نہ کوئی محبوب کہلانے کا اہل ہے۔ اور یہ

دعویٰ بلا دلیل نہیں ہے، ہم آنے والے صفحات میں یہ ثابت کریں گے کہ محبت کے پانچوں اسباب کا اجتماع صرف اللہ تعالیٰ کی ذات میں ہے، غیر اللہ میں ان کا اجتماع متصور نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ ایک یا دو سبب پائے جاتے ہیں، اور وہ بھی بطور مجاز، بلکہ بطور وہم و خیال۔ جب کہ اللہ تعالیٰ میں ان اسباب کا وجود اور اجتماع حقیقی ہے جب ہم اس امر کو پوری شرح و بسط کے ساتھ بیان کردیں گے تو اہل بصیرت پر واضح ہو جائے گا کہ بے وقوفوں اور نادانوں کا یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ محبت الٰہی محال ہے، بلکہ اس کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے محبت نہ کی جائے۔ اب ہم تمام اسباب کا الگ الگ جائزہ لیتے ہیں۔

<u>پہلا سبب</u> پہلا سبب یہ بیان کیا گیا ہے کہ انسان اپنے نفس کو محبوب سمجھتا ہے، اور اس کے لئے دوام و بقا اور کمال کی خواہش رکھتا ہے، اسے ہلاکت، عدم، نقص، اور موانع کمال سے نفرت ہے، زندہ شخص کی فطرت میں یہ باتیں پائی جاتی ہیں، کسی کا ان سے خالی رہنا ممکن نہیں ہے، جو شخص اپنے نفس کی معرفت رکھتا ہے اور اپنے رب کو پہچانتا ہے وہ یہ بات اچھی طرح جانتا ہے کہ اس کا وجود ذاتی نہیں ہے، بلکہ اس کی ذات کا وجود، دوام اور کمال سب کچھ اللہ سے ہے، اسی کے باعث ہے، وہی وجود کا خالق ہے، وہی اس کو باقی رکھنے والا ہے، وہی کمال کی صفات پیدا کر کے اسے مکمل بناتا ہے، اور وہ اسباب پیدا کرتا ہے جو کمال کی طرف لے جانے والے ہیں، اور وہ ہدایت پیدا کرتا ہے جس سے اسباب کے استعمال میں رہنمائی حاصل کی جاسکے، ورنہ بندے کا اپنا وجود کچھ نہیں ہے، وہ محض عدم ہے، اگر اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے پیدا نہ کرے، اور پیدا کرنے کے بعد اس کا فضل شامل حال نہ ہو تو ہلاک ہو جائے اور اپنے فضل و کرم سے مکمل نہ کرے تو ناقص رہے۔ حاصل یہ ہے کہ دنیا میں کوئی ایسا وجود نہیں ہے جو اپنی ذات سے قائم ہو، ہر وجود اسی حی قیوم سے قائم ہے جس کا وجود ذاتی ہے، اگر عارف کو اپنی ذات سے محبت ہوگی تو اس ذات سے بھی ہوگی جس سے اس کا وجود مستفاد ہے اور جس سے اس کے وجود کو بقا ملی ہے، بشرطیکہ وہ اسے خالق، موجود، مخترع، مبقی، اور قائم بنفسہ اور مقوم غیرہ مانے، اور اگر ایسی ذات سے محبت نہ رکھے تو یہ کہا جائے گا کہ نہ اسے اپنے نفس کی معرفت حاصل ہے اور نہ اپنے رب کی۔

محبت معرفت ہی کا تو ثمرہ ہے، جب محبت نہ ہوگی تو معرفت بھی نہیں ہوگی، اور جس قدر معرفت ضعیف ہوگی اسی قدر محبت بھی ضعیف ہوگی، اور جس قدر معرفت قوی ہوگی اور اسی قدر محبت بھی قوی ہوگی۔ اسی لئے حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کو پہچانتا ہے وہ اس سے محبت کرتا ہے، اس میں زہد کرتا ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ آدمی کو اپنے نفس سے محبت ہو، اور اپنے رب سے نہ ہو، دیکھو جو شخص دھوپ کی سختی برداشت کرتا ہے اسے سائے سے محبت ہوتی ہے، اور جو سائے سے محبت کرتا ہے اسے ان درختوں سے بھی محبت ہوتی ہے، جن سے سایہ قائم ہے، اور جن سے سائے کا وجود ہے، ہر موجود شئی کی نسبت اللہ تعالیٰ کی قدرت کی طرف ایسی ہے جیسے سائے کو درختوں سے ہوتی ہے، سائے کا وجود درختوں سے ہے، اور نور کا وجود آفتاب سے ہے، یعنی سایہ اپنے وجود میں درختوں کے تابع ہے اور نور کا وجود آفتاب کے تابع ہے، اسی طرح تمام موجودات کا وجود اسی ذات واحد کے تابع ہے، سب اسی کی قدرت اور صنعت کے نمونے ہیں۔

نور و آفتاب کی مثال عوام کے فہم سے زیادہ قریب ہے، کیوں کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ نور آفتاب کا اثر ہے، اور اسی سے ظہور پذیر ہوتا ہے، حالانکہ حقیقت میں یہ خیال صحیح نہیں ہے، ارباب قلوب پر جو چشم بصیرت سے دیکھتے ہیں یہ بات ان لوگوں سے زیادہ منکشف ہے جو ظاہر کی آنکھوں سے مشاہدہ کرتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ نور کا مبداء اور مصدر بھی اللہ تعالیٰ کی قدرت ہے، پہلے اللہ تعالیٰ نے آفتاب بنایا، اس کو موجودہ شکل و صورت عطا کی، اور اس میں نور پیدا کیا، جب یہ آفتاب اجسام کثیفہ کے مقابل آتا ہے تو اس کا نور دوسری اشیاء پر منعکس ہوتا ہے، یہ سب اللہ تعالیٰ کی اختراع، ایجاد اور قدرت سے ہوتا ہے۔ لیکن کیوں کہ ہم سہولت تفہیم کے لئے مثالیں پیش کرتے ہیں، اس لئے یہاں حقائق سے بحث نہیں ہے۔ یہاں صرف یہ بیان کرنا ہے کہ اگر انسان کے لئے اپنے نفس کی محبت ضروری ہے تو اس ذات کی محبت بھی ضروری ہے۔ جس سے اس کو پہلے قیام ملا، پھر اصل، صفات، ظاہر و باطن اور جواہر و اعراض میں دوام عطا ہوا، لیکن یہ محبت اسی شخص کو ہو سکتی ہے جو مذکورہ بالا حقائق کو اسی طرح جان لے جس طرح وہ بیان کئے گئے ہیں۔ جس شخص کا دل نفس کی شہوات میں مشغول ہوتا ہے، اور وہ اپنے خالق اور رب سے غافل ہوتا ہے اس کے دل میں

اللہ تعالیٰ کی محبت نہیں ہوتی' وہ صرف شہوات اور محسوسات پر نظر رکھتا ہے' یعنی عالم شہادت میں اسیر رہتا ہے' جس میں اس کی کوئی خصوصیت نہیں ہوتی۔ بلکہ بہائم بھی شریک رہتے ہیں' عالم ملکوت کی زمین اپنے پاؤں سے وہی شخص روند سکتا ہے جس کو فرشتوں سے مشابہت ہوتی ہے' جو شخص عالم بہائم میں جس قدر کم ہو گا اسی قدر عالم ملکوت سے دور ہو گا۔

دوسرا سبب محبت کا دوسرا سبب یہ تھا کہ اس شخص سے محبت کی جائے جو اس پر احسان کرتا ہے' مال سے اس کی مدد کرتا ہے' نرم گفتگو کرتا ہے' اور ہر معاملے میں اس کی اعانت کرتا ہے' ہروقت اس کی مدد کے لئے تیار رہتا ہے' دشمنوں سے اس کی حفاظت کرتا ہے حاسدوں کے شر سے بچاتا ہے' اور نفس' اولاد اور اقارب سے متعلق تمام اغراض اور حظوظ کی تکمیل میں مدد کرتا ہے' ایسا شخص بہرحال محبوب ہوتا ہے' اور اس سبب کا تقاضا بھی یہ ہے کہ اللہ کے سوا کسی سے محبت نہ کی جائے' اگر اللہ تعالیٰ کے حق کی اس طرح معرفت حاصل کی جائے جیسا کہ اس کا حق ہے تو صاف ظاہر ہو جائے کہ احسان کرنے والا صرف وہی ہے' جہاں تک بندوں پر اس کے احسانات کا تعلق ہے۔ یہاں انہیں احاطۂ تحریر میں لانا مقصود نہیں ہے' یہ احسانات بے شمار اور لاتعداد ہیں' جیسا کہ اللہ تعالیٰ خود ارشاد فرماتا ہے :۔

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا۔ (پ ۱۳ ر ۱۷ آیت ۳۴)

اور اللہ تعالیٰ کی نعمتیں اگر شمار کرنے لگو تو شمار میں نہیں آسکتیں۔

کتاب الشکر میں ہم یہ بات بیان بھی کر چکے ہیں کہ ایک ایک چیز میں اللہ تعالیٰ کے اتنے احسانات ہیں کہ انہیں شمار نہیں کیا جاسکتا' یہاں صرف یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ بندوں کی طرف صرف مجازاً ہی احسان کی نسبت کی جاسکتی ہے' حقیقی محسن صرف اللہ تعالیٰ ہے' فرض کرو کسی شخص نے تمہیں اپنے تمام خزانے دے دیئے' اور انہیں خرچ کرنے کا مکمل اختیار دے دیا' اب اگر تم یہ سمجھنے لگو کہ خزانے سپرد کردینے' اور اختیارات تفویض کرنے میں اس شخص کے تم پر زبردست احسانات ہیں تو یہ خیال غلط ہو گا' پہلے تم ان چار امور پر غور کرلو' تم پر اس کے احسان کی حقیقت واضح ہو جائے گی۔

اول اس شخص کا وجود جو تمہیں خزانہ دے رہا ہے' دوم اس کے پاس مال کا ہونا' سوم اس پر قادر ہونا' چہارم اس کے دل میں یہ ارادہ پیدا ہونا کہ مال تمہیں دے دیا جائے۔ اب ہم تم سے یہ پوچھتے ہیں کہ اس کو کس نے پیدا کیا' اسے مال کس نے عطا کیا' پھر مال پر قدرت کس نے بخشی اور اس کے دل میں یہ ارادہ کس نے پیدا کیا کہ وہ مال دینے کے لئے تمہارا انتخاب کرے' تمہارے لئے اس کے دل میں محبت کس نے پیدا کی' اسے یہ خیال کیسے آیا کہ اس کے دین اور دنیا کی بھلائی تمہارے ساتھ احسان کرنے میں پوشیدہ ہے' وہ تمہیں مال دینے کے اپنے قلبی تقاضے پر عمل کرنے کا پابند ہے' اس کی مخالفت نہیں کر سکتا آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ اگر غور کرو تو تمہیں ان تمام سوالات کا جواب مل جائے۔ اور یہ بات واضح ہو جائے کہ اصل محسن وہی ہے۔ جس نے اسے احسان کرنے پر مجبور کیا ہے' تمہارے لئے مسخر کیا ہے' اور وہ اس پر فعل احسان کے دواعی مسلط کئے ہیں' اس کا ہاتھ صرف ایک واسطہ ہے' اس کے ذریعے وہ بندوں تک اللہ کے احسانات پہنچاتا ہے اس معاملے میں وہ اس طرح مجبور ہے جیسے پرنالا پانی بہانے پر مجبور ہے کیا کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے پانی بہانے میں اصل پرنالا ہے' یقیناً نہیں پرنالا تو ایک واسطہ ہے یہی حال یہاں ہے' اب اگر تم اس درمیانی شخص کو محسن سمجھ بیٹھو' اور اس کا شکر کرنے لگو تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ تم حقیقت سے ناواقف ہو' انسان جب بھی احسان کرتا ہے اپنے نفس پر کرتا ہے' کسی مخلوق پر اس کا احسان کرنا ممکن نہیں ہے' اگر بظاہر وہ احسان کی صورت اپناتا ہے تو اس کا عوض پہلے تلاش کرلیتا ہے خواہ دنیا میں کہ وہ اس کے لئے مسخر اور تابع ہو جائے اور اس کی تعریف میں رطب اللسان ہو' اس کی سخاوت کے چرچے ہوں' اور لوگ اپنی اطاعت اور محبت کے پھول اس پر نچھاور کریں' یا آخرت میں کہ زیادہ سے زیادہ اجر و ثواب حاصل ہو۔ جس طرح کوئی شخص اپنا مال کسی مقصد کے بغیر دریا میں نہیں ڈالتا' اسی طرح کسی غرض کے بغیر کسی آدمی کے ہاتھ میں نہیں ڈالتا' اور وہی غرض اس کا مقصود ہوتی ہے' اگر تمہیں کسی شخص نے کچھ مال دیا ہے تو تم اس کے مقصود نہیں ہو' بلکہ مقصود کچھ اور ہے' تم صرف اس مقصود کی تکمیل کا وسیلہ ہو' خواہ اس کا مقصود دنیا میں ذکر و شہرت اور عزت و عظمت ہو یا آخرت میں اجر و ثواب'

تمہیں اس شخص نے اپنے مال پر قابض کرنے سے اپنا یہ مقصد پورا کیا ہے' اس لئے وہ تمہارا محسن نہیں ہے' بلکہ خود اپنے نفس کا محسن ہے' وہ مال کے عوض میں ایسی چیز لینا چاہتا ہے جو اس کے خیال میں اس سے عمدہ ہے' اگر عمدہ نہ ہوتی تو تمہارے لئے اپنا مال ہرگز خرچ نہ کرتا' اس لئے دیکھا جائے تو وہ اس بات کا مستحق نہیں کہ تم اس کا شکر کرو' یا اس سے محبت کرو اور اس کی دو وجہیں ہیں۔

ایک وجہ تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دواعی مسلط ہو جانے کے بعد وہ یہ مال تمہیں دینے پر مجبور تھا' وہ مخالفت کر ہی نہیں سکتا تھا' اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی بادشاہ کا خازن' ظاہر ہے اگر بادشاہ کسی شخص سے خلعت عطا کئے جانے کا حکم جاری کرے تو خلعت پانے والا اسے اپنا محسن نہیں سمجھ سکتا' کیوں کہ خازن بادشاہ کا حکم پانے کے بعد اطاعت پر مجبور تھا' اس میں مخالفت کی بات نہیں تھی' اگر بادشاہ اس معاملے کو خازن کی مرضی پر چھوڑ دے تو ہرگز نہ دے۔ اسی طرح اگر اللہ تعالیٰ بھی محسن کو اس کی طبیعت پر چھوڑ دے تو ایک کھوٹا سکہ بھی خرچ کرنے پر آمادہ نہ ہو' لیکن پہلے اس نے محسن کے دل میں مال دینے کے بواعث اور لوازم پیدا کئے' پھر اس کے دل میں یہ خیال پیدا کیا کہ اس کا دینی اور دنیوی فائدہ مال دینے میں مضمر ہے' اس لئے وہ مال دیتا ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ مال دیتا ہے اور اس کے عوض میں وہ چیز لیتا ہے جو اس کے نزدیک مال سے زیادہ بہتر ہے' اس کی مثال تو بائع کی سی ہے' جس طرح ہم بائع کو محسن نہیں کہہ سکتے کہ وہ مال لے کر مبیع دیتا ہے ایسے ہی اس شخص کو بھی محسن نہیں کہہ سکتے اس لئے کہ عوض لے کر مال دے رہا ہے' اب یہ الگ بات ہے کہ اس نے عوض میں حمد و ثنا قبول کی ہے یا اجر و ثواب کو ترجیح دی ہے' عوض کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ مال محسوس ہو' بلکہ لذائذ اور فوائد بھی مال کے قائم مقام بن جاتے ہیں' بلکہ بعض اوقات مال کا بہترین عوض بن جاتے ہیں۔

حقیقت میں احسان یہ ہے کہ اس سے کوئی عوض منظور نہ ہو' یعنی دینے والا مال اس طرح دے کہ نہ وہ اس کے عوض میں کوئی لذّت اٹھائے' نہ کوئی حظ پائے اور نہ کسی قسم کا فائدہ حاصل کرے' اور یہ احسان کسی انسان سے وجود میں آنا ممکن نہیں ہے' صرف اللہ تعالیٰ ہی اس کا مصدر اور منبع ہے' مخلوق پر اس نے جس قدر احسانات کئے ہیں ان میں اس کا کوئی فائدہ پوشیدہ نہیں ہے تمام فوائد مخلوق کو حاصل ہوتے ہیں۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ غیر اللہ کے لئے احسان کا لفظ استعمال کرنا یا کذب ہے یا مجاز۔ غیر اللہ میں حقیقی احسان کا وجود محال اور ممتنع ہے جس طرح سیاہی اور سفیدی کا یکجا ہونا محال ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنی تمام صفات ہی کی طرح اس صفت میں بھی یکتا و یگانہ ہے۔ معلوم ہوا کہ عارف کو اس ظاہری محسن کے بجائے اللہ تعالیٰ سے محبت کرنی چاہیے' کیوں کہ وہ احسان کر ہی نہیں سکتا' اس سے احسان کا معرض وجود میں آنا محال ہے' صاحب احسان صرف اللہ تعالیٰ ہے' وہی اس محبت کا مستحق بھی ہے' اگر کوئی شخص غیر اللہ کو محسن سمجھ کر اس کے احسان سے محبت کرتا ہے تو یہ اس کی جہالت اور احسان کے معنی و مقتضٰی سے اس کی ناواقفیت کی دلیل ہے۔

تیسرا سبب یہ تھا کہ انسان محسن سے محبت کرے اگرچہ اس کا احسان خود اس پر نہ ہو' بلکہ غیر پر ہو' یہ چیز طبیعتوں میں پائی جاتی ہے' مثلاً اگر تمہیں کسی ایسے بادشاہ کے بارے میں بتلایا جائے جو عدل کرتا ہو' باخبر ہو' لوگوں کے ساتھ نرمی اور مہربانی سے پیش آتا ہو ان کے ساتھ تواضع کرتا ہو' اگرچہ وہ بادشاہ تم سے ہزاروں میل کے فاصلے پر کسی جگہ ہوتا ہے' لیکن تم اس سے دل ہی دل میں محبت کرنے لگتے ہو' دوسری طرف تمہیں کسی بادشاہ کی اطلاع ملتی ہے جو ظلم و ستم میں معروف ہو' متکبر' فاسق اور فتنہ پرداز ہو' اور وہ بھی تم سے کسی بعید ترین ملک کا حکمراں ہو تو تم اس دوری اور فاصلے کے باوجود اس سے نفرت کرتے ہو' تمہارے دل میں ان دونوں بادشاہوں کے لئے مختلف جذبات ہوتے ہیں' اور یہ اختلاف انتہائی نمایاں ہوتا ہے' تم پہلے بادشاہ کی طرف انتہائی میلان رکھتے ہو' اور دوسرے سے انتہائی نفرت کرتے ہو' اور محبت و نفرت کا یہ حال اس وقت ہے جب کہ تم پہلے بادشاہ کی عنایات سے محروم ہو' اور دوسرے بادشاہ کے مظالم سے مامون ہو' بظاہر تمہارا اس ملک میں جانا بھی مشکل ہی نظر آتا ہے جہاں وہ عادل بادشاہ یا جابر بادشاہ حکومت کرتا ہے' لیکن رحم دل بادشاہ سے تمہاری یہ محبت محض اس لئے تھا کہ وہ محسن ہے' اس لئے نہیں کہ اس نے

تم پر کوئی احسان کیا ہے' یہ سبب بھی اس بات کا متقاضی ہے کہ تم اللہ سے محبت کرو' بلکہ اس کے سوا کسی سے محبت نہ کرو' الایہ کہ وہ غیر اللہ سے تعلق کا کوئی سبب رکھتا ہو' اس لئے کہ تمام مخلوق پر احسان کرنے والا' اور ہر وجود کو اپنے فضل و انعام سے نوازنے والا وہی ہے' اس کے علاوہ کوئی نہیں ہے' پہلے انہیں وجود کی دولت بخشی' پھر انہیں اعضاء دے کر' اور ان اسباب سے نواز کر مکمل کیا' جو ان کے لئے ضروری ہیں' پھر انہیں آرام و آسائش کے وہ اسباب عطا کئے جو ضرورت کے دائرے میں نہیں آتے تاہم ان میں حاجت کا شائبہ پایا جاتا ہے' پھر انہیں زوائد سے مزین کیا جو نہ ان کی ضرورتوں میں داخل تھے اور نہ حاجتوں میں ان کا شمار تھا۔ انسانی جسم میں ضروری چیزوں کی مثال دل' جگر اور سر ہے' اور حاجت کے اعضاء آنکھ' پاؤں اور ہاتھ ہیں' اور زینت کی چیزیں یہ ہیں کہ ابرو خم دار ہوں' لب و رخسار شفق گوں ہوں' آنکھیں بادامی ہوں' وغیرہ وغیرہ۔ یہ وہ چیزیں ہیں کہ اگر ان میں سے کوئی چیز موجود نہ ہو تو حاجت یا ضرورت پر اس کا اثر نہیں پڑتا یہ چیزیں صرف آرائش سے متعلق ہیں' غیر جسمانی نعمتوں میں ضروری کی مثال پانی اور غذا ہے' اور حاجت کی مثال دوا' گوشت' اور میوے ہیں اور زوائد کی مثال درختوں کی سرسبزی اور شادابی' شگوفوں' اور پھولوں کی خوبصورتی' غذاؤں' اور میووں کی لذت ہے' یہ وہ چیزیں ہیں کہ اگر موجود نہ ہوں تو ان سے نہ حاجت پوری ہوتی ہے اور نہ ضرورت۔ نعمتوں کی یہ تینوں قسمیں ہر جاندار میں پائی جاتی ہیں' بلکہ فرش کے ذرّے سے عرش کی انتہا تک پائی جانے والی تمام مخلوق میں موجود ہیں اس لئے محسن صرف اللہ ہے' اس کے سوا کوئی دوسرا شخص محسن ہو ہی نہیں سکتا' اگر کوئی انسان محسن ہے تو اس کا احسان بھی اللہ ہی کی قدرت کے حسنات میں سے ایک حسنہ ہے' وہی حسن کا خالق ہے اور وہی محسن کا خالق ہے' وہی اسباب احسان کا خالق ہے' اس لحاظ سے غیر خدا سے محبت کرنا محض جہالت اور نادانی ہے' جو شخص یہ بات جانتا ہے وہ اللہ کے سوا کسی سے محبت نہیں کرتا۔

چوتھا سبب یہ ہے کہ آدمی کسی چیز سے محض اس لئے محبت کرے کہ وہ جمیل ہے' جمال کے علاوہ بھی اس کا کوئی دوسرا مقصد نہیں ہوتا۔ جیسا کہ ہم نے سابق میں بیان کیا ہے کہ یہ بھی مخلوق کی سرشت میں داخل ہے' جمال کی دو قسمیں کی گئی ہیں' ایک وہ جمال جس کا ادراک آنکھ سے کیا جاتا ہے' اور دوسرا وہ جمال جس کے لئے نور بصیرت کا ہونا ضروری ہے' پہلے جمال کا ادراک بچّے حتی کہ جانور اور پرندے بھی کر لیتے ہیں' جب کہ دوسرے جمال کا ادراک صرف وہی لوگ کرتے ہیں جن پر اہل دل کا اطلاق ہوتا ہے' اس میں ان کے ساتھ وہ لوگ شریک نہیں ہوتے ہیں جو صرف دنیوی زندگی کے ظاہری پہلوؤں پر نظر رکھتے ہیں' اور ظاہر کے علاوہ کسی چیز کو نہیں دیکھتے۔ جمال ہر اس شخص کے نزدیک محبوب ہوتا ہے جو اس کا ادراک کرتا ہے' جو لوگ قلب سے جمال کا ادراک کرتے ہیں' وہ قلب سے اس جمال کو محبوب جانتے ہیں' اس کی مثال انبیائے کرام' علماء اور اعلیٰ اخلاق و اوصاف کے حامل لوگوں کی محبت ہے' ان کی محبت دلوں میں ہوتی ہے' ان کی صورتیں اور دیگر ظاہری اعضاء نگاہوں سے او جھل ہوتے ہیں' باطنی صورت کے حسن سے یہی مراد ہے' حس سے اس کا ادراک نہیں ہوتا' ہاں ان آثار کا ادراک ضرور ہوتا ہے جو ان کے اخلاق پر دلالت کرتے ہیں' پھر جب قلب کی ان پر دلالت ہوتی ہے تب قلب ان کی طرف مائل ہوتا ہے' اور ان سے محبت کرتا ہے' چنانچہ جو شخص سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرتا ہے' یا حضرت ابوبکر الصدیقؓ سے محبت کرتا ہے یا حضرت امام شافعیؒ سے محبت کرتا ہے وہ اس امر کی وجہ سے کرتا ہے جو اسے اچھا معلوم ہوتا ہے' ان کے حسن صورت یا حسن سیرت کی بنا پر محبت نہیں کرتا' البتہ ان کے اعمال کا حسن ان صفات عالیہ پر دلالت کرتا ہے جس سے وہ افعال ظہور پذیر ہوئے ہیں' چنانچہ جو شخص کسی مصنّف کی تصنیف' یا کسی شاعر کا شعر یا کسی مصور کی تصویر یا کسی معمار کی تعمیر دیکھتا ہے تو اس پر اس مصنف شاعر' مصور اور معمار کی وہ صفات باطنہ منکشف ہو جاتی ہیں جن سے یہ افعال صادر ہوئے ہیں' اور جن کا حاصل علم و قدرت ہے' پھر معلوم جس قدر اعلا اشرف اور جمال و عظمت کے اعتبار سے مکمل ہو گا اسی قدر اس کا علم بھی اشرف و مکمل ہو گا' یہی حال مقدور کا ہے' مقدور جس قدر اعلا مرتبت اور منزلت کا حامل ہو گا اسی قدر قدرت بھی اعلا و اکمل ہو گی۔ کیوں کہ معلومات میں اعلا ترین معلوم اللہ تعالیٰ کی ذات ہے' اس لئے علوم میں سب سے اعلا و اشرف اللہ تعالیٰ کی معرفت ہے' پھر درجہ بدرجہ وہ چیزیں شرف و فضیلت رکھتی ہیں جو

معرفت الٰہی کے ساتھ مخصوص یا اس سے قریب تر ہیں' جو چیز اللہ تعالیٰ کی معرفت کے ساتھ جس قدر متعلق ہوگی اسی قدر وہ عظیم ہوگی۔

صدیقین کی ان صفات کا جمال جن سے طبعی طور پر قلوب محبت کرتے ہیں' تین امور کی طرف راجع ہے' ایک تو یہ کہ وہ لوگ اللہ تعالیٰ' ملائکہ' کتب سماویہ' رسل' اور شرائع الٰہیہ کا علم رکھتے ہیں' دوسرے یہ کہ انہیں اپنے اور بندگان خدا کے نفوس کی اصلاح و رہنمائی پر قدرت حاصل ہے' تیسرے یہ کہ وہ ان رذائل' خبائث اور شہوات سے پاک ہیں جو انسان کو خیر کی راہوں سے ہٹا کر شر کے راستوں پر چلنے پر مجبور کردیتی ہیں۔ انہی امور کے باعث لوگ انبیاء' علماء' خلفاء' اور عادل اور سخی بادشاہوں سے محبت کرتے ہیں۔

علم' قدرت' اور پاکیزگی آیئے اب ہم ان تینوں امور کو اللہ تعالیٰ کی صفات کی نسبت سے دیکھتے ہیں۔ علم کا حال یہ ہے کہ اولین و آخرین کے تمام علوم کو اللہ تعالیٰ کے علم سے کوئی نسبت نہیں ہے' اس کا علم تو تمام اشیاء کو اس قدر محیط ہے کہ کوئی چیز اس سے باہر نہیں ہے' قرآن کریم میں ہے :۔

لَا يَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ۔ (پ ۲۲ ر ۷ آیت ۳)

اس (کے علم) سے کوئی ذرہ برابر بھی غائب نہیں نہ آسمانوں میں اور نہ زمین میں۔

ایک آیت میں تمام مخلوق کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا :۔

وَمَا أُوتِيتُم مِّنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا۔ (پ ۱۵ ر ۱۰ آیت ۸۵) اور تم کو بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے۔

بلکہ اگر تمام اہل آسمان اور تمام اہل زمین متحد ہو کر چیونٹی یا مچھر کی تخلیق میں اس کے علم و حکمت کا احاطہ کرنے کی کوشش کریں تو اس کے عشر عشیر پر بھی مطلع نہ ہوں' اور صرف اسی قدر علم حاصل کرپائیں جتنا وہ چاہتا ہے' مخلوق کو جو تھوڑا بہت علم ملا ہے وہ اسی کی تعلیم سے ہے قرآن کریم میں فرمایا :۔

خَلَقَ الْإِنسَانَ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ۔ (پ ۲۷ ر ۱۱ آیت ۳-۴) اس نے انسان کو پیدا کیا (پھر) اس کو گویائی سکھائی۔

حاصل یہ ہے کہ اگر علم کا جمال اور شرف کوئی امر محبوب ہے' یا وہ فی نفسہ اس شخص کے حق میں زینت و کمال ہے جو اس سے متصف ہے تو اس لحاظ سے بھی انسان کو صرف اللہ ہی سے محبت کرنی چاہیے' علماء کے علوم اس کے علم کی نسبت سے جہل محض ہیں' اگر کوئی شخص اپنے زمانے کے سب سے بڑے عالم سے بھی واقف ہے' اور سب سے بڑے جاہل کو بھی جانتا ہے تو یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ اجہل کو اس کے علم کے باعث محبوب جانے اور اعلم کو چھوڑ دے' ظاہر ہے اجہل بھی کچھ نہ کچھ علم ضرور رکھتا ہے خواہ وہ اسباب معیشت ہی کا علم کیوں نہ ہو' ان دونوں شخصوں کے علم میں جو فرق ہے اس سے کہیں زیادہ فرق اللہ تعالیٰ کے اور مخلوق کے علم میں ہے۔ اس لئے کہ اعلم اجہل کے مقابلے میں محض ان چند محدود اور متناہی معلومات کی بنا پر فضیلت رکھتا ہے جن کا حصول کسب اور اجتہاد کے ذریعے اجہل کے لئے بھی ممکن ہے اور اللہ تعالیٰ کے علم کو تمام خلائق کے علوم پر ناقابل تصور فضیلت حاصل ہے۔ اس لئے کہ اس کی معلومات کی کوئی انتہا نہیں ہے جب کہ مخلوق کی معلومات محدود اور متناہی ہیں۔

قدرت بھی ایک صفت کمال ہے' اور اس کے مقابلے میں عجز نقص ہے' ہر کمال' عظمت' فضیلت اور برتری محبوب ہوتی ہے اور اس کے ادراک میں لذت پائی جاتی ہے' چنانچہ انسان حضرت علی اور حضرت خالد رضی اللہ عنہما وغیرہ کی بہادری' دلیری' جوانمردی' اور ہمسروں پر ان کے تفوق اور غلبے کے قصے سنتا ہے' اور اس کے دل میں خوشی و مسرت کے جذبات مچل مچل جاتے ہیں' وہ شخص محض واقعات سن کر اتنا مسرور ہوتا ہے اگر اپنی آنکھوں سے ان کے بہادرانہ کارناموں کا مشاہدہ کرلیتا تو اس کی خوشی کا کیا ٹھکانہ ہوتا۔ وہ یہ واقعات سن کر ان لوگوں کے لئے اپنے دل میں محبت کے جذبات امنڈتے ہوئے دیکھتا ہے جن کی طرف وہ واقعات منسوب ہیں' اب ذرا بندوں کی قدرت اور شجاعت کا مقابلہ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے کیجئے' مخلوق میں اس شخص کو لیجئے جو سب سے

زیادہ قوت رکھتا ہو، ملک اور اقتدار کے اعتبار سے وسیع تر ہو، شہوات کا قلع قمع کرنے، اور خباثت نفس کا ازالہ کرنے پر تمام لوگوں میں سب سے زیادہ قدرت رکھتا ہو، اپنے اور دوسروں کے نفوس کے معاملات پر وسیع تر نظر رکھتا ہو، اور انہیں قابو میں کرنے پر پوری طرح قدرت رکھتا ہو، ایسے شخص کو لیجئے، اور پھر دیکھئے کہ وہ اپنی انتہائی طاقت، قوت، وسعت اور قدرت کے باوجود نہ اپنی موت کا اختیار رکھتا ہے، اور نہ زندگی کا، نہ بعث بعد الموت پر قادر ہے، نہ نفع و نقصان پر قدرت رکھتا ہے، یہاں تک کہ وہ اپنی آنکھ کی بینائی باقی رکھنے، اپنی زبان کو گونگے پن سے بچانے، اپنے کان کی سماعت کو برقرار رکھنے، اور جسم کو امراض سے دور رکھنے پر بھی قادر نہیں ہے۔ بے شمار معاملات ایسے ہیں کہ انسان ان میں نہ اپنے لئے کچھ کرسکتا ہے اور نہ غیر کے لئے، اور یہ معاملات وہ ہیں جو اس کی قدرت سے متعلق ہیں، اور جن کا تعلق اس کی قدرت سے نہیں ہے ان میں وہ مکھی کے پر کے برابر بھی کچھ نہیں کرسکتا، جیسے آسمانوں کے ملکوت، کواکب، زمین کے پہاڑ، سمندر، ہوائیں، بجلیاں، معدنیات، نباتات، اور ان کے تمام اجزاء، پھر جو قدرت اسے اپنے نفس پر یا غیر پر حاصل ہے وہ بھی نہ اس سے ہے، اور نہ اس کے ساتھ قائم ہے، بلکہ جس طرح اللہ نے اسے پیدا فرمایا ہے اسی طرح اس کی قدرت، اور اسباب کو بھی پیدا کیا ہے، اسی نے اس کو متعلقہ کاموں پر قادر کیا ہے، اس کی قدرت کا عالم یہ ہے کہ اگر وہ کسی زبردست بادشاہ، یا قوی تر انسان پر ایک حقیر مچھر کو مسلط کردے تو وہ مچھر اسے ہلاک کردے، بندے کو جس قدر قوت یا قدرت حاصل ہے وہ سب اسی کی بخشش اور عطا ہے، جیسا کہ اس نے خود دنیا کے عظیم ترین بادشاہ کے بارے میں ارشاد فرمایا :

اِنَّا مَكَّنَّا لَهٗ فِى الْاَرْضِ۔ (پ ۱۶ ر ۲ آیت ۸۴) ہم نے ان کو روئے زمین پر حکومت دی تھی۔

ذوالقرنین کو دنیا کی حکومت اور سلطنت صرف اللہ تعالیٰ کے کرم سے ملی تھی، انہیں اللہ نے زمین کے ایک معمولی جزو پر قادر کردیا تھا، ورنہ زمین انتہائی وسیع ہے، اور دوسرے اجسام عالم کی بہ نسبت یہ زمین ایک ڈھیلے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی، اور وہ تمام ولایتیں جو روئے زمین پر انسان کو حاصل ہوتی ہیں اس ڈھیلے کے مقابلے میں ایک کنکری ہیں، اور یہ کنکری بھی اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کی قدرت سے بندوں کے تصرف میں آتی ہے۔ اس لئے یہ محال ہے کہ کوئی شخص اللہ تعالیٰ کے بندوں میں سے کسی بندے سے اس لئے محبت کرے کہ وہ قدرت، سیاست، غلبہ، اقتدار، اور کمال قوت رکھتا ہے، اور اللہ تعالیٰ سے محبت نہ کرے، حالانکہ قوت اور طاقت صرف اللہ ہی کو زیب دیتی ہے جو برتر اور عظیم ہے، وہی جبار، قہار، علیم اور قادر ہے، آسمان اس کے دائیں ہاتھ میں لپٹے ہوئے ہیں، زمین اور جو کچھ زمین کے اوپر یا اندر ہے وہ سب اس کے قبضۂ تصرف میں ہے، تمام مخلوق کی لگام اس کے دست قدرت میں ہے، اگر وہ روئے زمین پر بسنے والی تمام مخلوق کو ہلاک کردے تو اس کی سلطنت اور ملک سے ایک ذرہ کم نہ ہو، اور اگر اس جیسی مخلوق ہزار بار پیدا کرے تو ان کی تخلیق سے عاجز نہ ہو، بندوں میں جہاں بھی قدرت ہے، یا جو شخص بھی قادر ہے وہ سب اسی کی قدرت کے آثار میں سے ہے، اسی کے لئے جمال، حسن، جلال، عظمت، کبریائی، قہر برتری ہے، اس لئے اگر کسی شخص کو اس کے کمال قدرت کے باعث محبوب رکھا جانا ممکن ہے تو اس محبت کا مستحق صرف قادر مطلق اللہ ہے۔

عیوب سے نفس کا پاک ہونا اور رذائل و خباثت سے دور ہونا بھی ایک صفت ہے جو محبت کی مقتضی ہے، یہ بھی حسن و جمال ہے، اور باطنی صورتوں سے تعلق رکھتی ہے، اگرچہ تمام انبیائے کرام اور صدیقین عیوب، معاصی اور رذائل سے منزہ تھے مگر تقدس اور تنزہ کا کمال صرف اسی ذات واحد کے لئے ممکن ہے جو قدوس ہے، اور صاحب الجلال والاکرام ہے، ورنہ باقی تمام مخلوق میں کوئی نہ کوئی نقص پایا جاتا ہے، بلکہ بیشتر مخلوق نقائص کا مجموعہ نظر آتی ہے، بلکہ اس کا مخلوق ہونا، عاجز، مسخر اور مجبور ہونا بھی عیب اور نقص ہی ہے، اس لئے کمال صرف اللہ کے لئے ہے، غیر کو اگر کوئی کمال حاصل ہے تو وہ اسی کا عطا کردہ ہے، اس کے اختیار میں نہیں ہے کہ منتہائے کمال تک پہنچ سکے، اس لئے کہ انتہائے کمال کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ بندہ مسخر اور قائم بالغیر نہ ہو، اور یہ وصف باری تعالیٰ کے علاوہ کسی کو حاصل نہیں، بلکہ غیر خدا کے حق میں اس وصف کا حصول محال ہے، وہی کمال کے ساتھ منفرد ہے، وہی نقائص سے منزہ ہے، وہی عیوب سے پاک ہے، لیکن تقدس اور تنزہ کی وجوہ کا بیان نہ صرف یہ کہ انتہائی طویل ہے بلکہ علوم

مکاشفات کے اسرار میں سے ہے' اس لئے ہم اس موضوع پر مزید کوئی گفتگو نہیں کریں گے۔ اگر تقدس اور تنزہ بھی جمال و کمال ہے' اور یہ وصف بھی باعث محبوبیت بن سکتا ہے تو اس کی حقیقت بھی صرف اللہ ہی کے لئے مخصوص ہے اگر غیر کو اس وصف کا کوئی حصہ ملا ہے تو وہ دوسروں کی بہ نسبت فضل و کمال کہا جا سکتا ہے' جیسے گھوڑا گدھے کی بہ نسبت کمال رکھتا ہے' اور انسان گھوڑے کے مقابلے میں مکمل ہے' لیکن اصل نقص سب میں مشترک ہے' صرف نقص کے درجات میں تفاوت ہو سکتا ہے' بعض میں نقص کم ہوتا ہے' اور بعض میں زیادہ۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ جمیل محبوب ہوتا ہے' اور جمیل مطلق اللہ کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا جو یکتا ہے' اس کا کوئی شریک نہیں' جو یگانہ ہے جس کی کوئی ضد نہیں' جو پاک ہے جس کا کوئی مزاحم نہیں' جو بے نیاز ہے جس کی کوئی حاجت نہیں' وہ قادر ہے جو چاہتا ہے کرتا ہے اور جس چیز کا چاہتا ہے حکم دیتا ہے' کوئی اس کا حکم رد کرنے والا نہیں ہے' نہ کوئی اس کے فیصلے کو پس پشت ڈالنے والا ہے' وہ عالم ہے جس کے علم سے زمین و آسمان کی ذرہ برابر چیز بھی باہر نہیں ہے' وہ قاہر ہے اس کے دست قدرت میں دنیا کی انتہائی جابر اور سرکش مخلوق کی گردنیں ہیں' بڑے بڑے بادشاہ' اور سلاطین اس کی گرفت میں ہیں' وہ ازلی ہے اس کے وجود کی انتہا نہیں' وہ اپنی ذات میں ایسا ضروری ہے کہ فنا کا تصور بھی اس کے لئے ممکن نہیں' وہ قیوم ہے یعنی خود قائم ہے جب کہ تمام موجودات اس سے قائم ہیں' وہ آسمانوں اور زمین کا جبّار ہے' جمادات و حیوانات و نباتات کا خالق ہے' وہ عزت و جبروت میں منفرد ہے' ملک اور ملکوت میں وحید ہے' فضل' جلال' کبریائی اور جمال تمام اوصاف اسی کے لئے ہیں' اس کی جلال کی معرفت میں عقلیں حیران ہیں' اس کی تعریف کے باب میں زبانیں گونگی ہو جاتی ہیں' عارفین کی معرفت کا کمال یہی ہے کہ اس کی معرفت سے اپنے عجز کا اعتراف کریں' اور انبیاء کی نبوت کی انتہا یہی ہے کہ اس کی تعریف سے اپنی عاجزی کے معترف ہوں' جیسا کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :-

لَا اُحْصِیْ ثَنَاءً عَلَیْکَ اَنْتَ کَمَا اَثْنَیْتَ عَلٰی نَفْسِکَ (۱)
میں تیری تعریف پوری نہیں کر سکتا تو ایسا ہے جیسا کہ تو نے خود اپنی تعریف کی ہے۔

حضرت ابوبکر الصدیق فرماتے ہیں :-

اَلْعِجْزُ عَنْ دَرْکِ الْاِدْرَاکِ اِدْرَاکٌ ادراک کے ادراک سے عاجز رہنا ہی ادراک ہے۔

پاک ہے وہ ذات جس نے اپنی معرفت کا طریقہ یہی بتلایا ہے کہ اس کی معرفت سے عاجز رہا جائے ہمیں نہیں معلوم کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی محبت کو حقیقی نہیں سمجھتے بلکہ مجازی کہتے ہیں' ان کے نزدیک یہ اوصاف جمال اور کمال کے اوصاف ہیں' یا وہ اس بات کے منکر ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان اوصاف سے متصف ہے' یا وہ یہ کہتے ہیں کہ کمال' جمال' اور عظمت و بلندی طبعاً محبوب نہیں ہوتی' پاک ہے وہ ذات جو اپنی غیرت' جمال اور جلال کے باعث اندھوں کی نگاہوں سے اوجھل رہتا ہے' صرف ان لوگوں پر اس کی تجلی ہوتی ہے جن کی قسمت میں نیکی اور آتش نار سے دوری لکھ دی گئی ہے' اس نے خسارہ اٹھانے والوں کو تاریکیوں میں چھوڑ دیا ہے' جن میں وہ بھٹکتے پھرتے ہیں' اور بہیمانہ شہوات و محسوسات میں گرفتار رہتے ہیں' وہ دنیاوی زندگی کو زندگی سمجھتے ہیں' اور آخرت سے غفلت و اعراض برتتے ہیں' افسوس یہ لوگ کچھ نہیں جانتے۔ اس سبب سے محبت احسان کے باعث محبت سے قوی تر ہوتی ہے' اس لئے کہ احسان کم و بیش ہوتا رہتا ہے' اسی لئے اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام پر وحی بھیجی کہ میرے نزدیک سب سے زیادہ محبوب وہ شخص ہے جو مجھ سے کسی عطاء کے بغیر محبت کرے' لیکن ربوبیت اپنا حق ضرور ادا کرتی ہے زبور میں ہے کہ اس شخص سے بڑا ظالم کوئی نہیں جو مجھ سے جنت یا دوزخ کے لئے محبت کرے' اگر میں جنت اور دوزخ پیدا نہ کرتا تو کیا میں اطاعت کا مستحق نہ ہوتا' حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا گذر چند ایسے افراد کے پاس سے ہوا جن کے جسم کمزور ہو گئے تھے' انہوں نے عرض کیا کہ ہم دوزخ سے ڈرتے ہیں' اور جنت کی امید رکھتے ہیں' فرمایا تم ایک مخلوق سے ڈرتے ہو' اور ایک مخلوق سے امید رکھتے ہو' اس کے بعد آپ کا

(۱) یہ روایت پہلے گذر چکی ہے۔

گذر ایک ایسی قوم پر ہوا جنہوں نے عرض کیا کہ ہم اللہ کی محبت اور عظمت کے لئے اس کی عبادت کرتے ہیں' آپ نے فرمایا کہ تم حقیقت میں اللہ کے دوست ہو' مجھے تمہارے ہی ساتھ رہنے کا حکم دیا گیا ہے' ابو حازم فرماتے ہیں کہ مجھے ثواب و عذاب کے لئے عبادت کرنے میں شرم آتی ہے' میں نہیں چاہتا کہ بد ترین غلام بنوں جو اگر ڈر محسوس نہیں کرتا تو عمل بھی نہیں کرتا' اور نہ میں برا مزدور بننا پسند کرتا ہوں کہ اگر مزدوری نہ دی جائے تو کام نہ کرے ایک حدیث شریف میں بھی یہ مضمون وارد ہے' فرمایا :-

لَا يَكُوْنَنَّ اَحَدُكُمْ كَالْاَجِيْرِ السُّوْءِ اِنْ لَمْ يُعْطَ اَجْرًا لَمْ يَعْمَلْ وَلَا كَالْعَبْدِ السُّوْءِ اِنْ لَمْ يَخَفْ لَمْ يَعْمَلْ (۱)

تم میں سے کوئی شخص بد ترین مزدور نہ بنے جسے اگر اجرت نہ دی جائے تو وہ کام نہ کرے۔ اور نہ بد ترین غلام بنے کہ اگر اسے ڈر نہ ہو تو وہ کام ترک کر دے۔

پانچواں سبب محبت کا پانچواں سبب مناسبت اور ہم شکلی ہے۔ اس لئے کہ جو چیز جس کے مشابہ ہوتی ہے' اسی کی طرف مائل ہوتی ہے' چنانچہ تم دیکھتے ہو کہ بچہ بچے کی طرف مائل ہوتا ہے' اور بڑا بڑے کی طرف' ہر جانور اپنی جنس کی طرف کھنچتا ہے اور غیر جنس سے بھاگتا ہے' ہر صاحب علم اپنے ہی جیسے تعلیم یافتہ شخص سے زیادہ مانوس ہوتا ہے' بڑھئی کاشتکار کی بہ نسبت اپنے ہی جیسے دوسرے بڑھئی سے مانوس ہوتا ہے' یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس پر کوئی دلیل قائم کرنے کی ضرورت نہیں ہے' بلکہ تجربہ اور مشاہدہ اس کا واضح ثبوت ہے اور اخبار و آثار سے بھی اس کی شہادت ملتی ہے۔ ہم نے کتاب آداب الصحبۃ کے باب الاخوۃ فی اللہ میں اس سلسلے کے بعض آثار اور روایات جمع کی ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ مناسبت بھی محبت کا ایک سبب ہے تاہم مناسبت کبھی ظاہر میں ہوتی ہے' جیسے بچپن میں بچہ کو دوسرے بچے سے مناسبت ہوتی ہے' اور کبھی یہ مناسبت کسی ایسے مخفی امر میں ہوتی ہے جس پر دوسرے کو اطلاع نہیں ہوتی۔ جیسے دو شخصوں میں اتفاقاً اتحاد ہو جاتا ہے' حالانکہ نہ وہ ایک دوسرے کے جمال کا مشاہدہ کرتے ہیں' اور نہ ایک دوسرے کے مال کی طمع کرتے ہیں' جیسا کہ ایک حدیث میں ہے' سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :-

اَلْاَرْوَاحُ جُنُوْدٌ مُجَنَّدَةٌ فَمَا تَعَارَفَ مِنْهَا اِئْتَلَفَ وَمَا تَنَاكَرَ مِنْهَا اِخْتَلَفَ (۲)

روحیں ایک مجتمع لشکر ہیں' ان میں سے جو آشنائی رکھتی ہیں وہ اکٹھی ہو جاتی ہیں' اور جو نا آشنا ہوتی ہیں وہ جدا رہتی ہیں۔

اس حدیث میں تعارف سے تناسب مراد ہے' اور تناکر سے غیر تناسب۔ بہر حال مناسبت بھی بندے اور خدا تعالیٰ کے مابین محبت کا ایک اہم سبب ہے' یہ مناسبت ظاہری نہیں ہوتی کہ دونوں کی شکل و صورت یکساں ہو' بلکہ دونوں کے مابین ایک باطنی مناسبت ہوتی ہے' اور یہ مناسبت کبھی ایسے امور میں ہوتی ہے جو کتابوں میں لکھے جاسکتے ہیں اور کبھی ایسے امور میں جن کا کتابوں میں لکھنا اور درج کرنا ممکن نہیں ہوتا' بلکہ وہ پردۂ غیرت میں چھپے رہتے ہیں اور ان کا مخفی رہنا ہی درست ہے' تاکہ جب راہ معرفت کے سالکین اپنی منزل پر پہنچ جائیں تو ان پر یہ امور از خود منکشف ہو جائیں۔

وہ امور جن میں باری تعالیٰ اور بندے کے درمیان مناسبت ہے اور کتابوں میں لکھے جاسکتے ہیں ان میں سے ایک مراد یہ ہے کہ بندہ ان صفات میں اللہ تعالیٰ سے قریب ہو جن میں اس کے لئے اقتداء کا حکم ہے' جیسا کہ حدیث شریف میں ہے :-

تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰهِ (۳)

اللہ تعالیٰ کے اخلاق اختیار کرو۔

یعنی وہ عمدہ اوصاف اختیار کئے جائیں جو اوصاف الٰہی میں سے ہیں' جیسے علم' نیکی' احسان' مہربانی دوسروں کے ساتھ بھلائی اور رحم کا معاملہ کرنا' ان کو نصیحت کرنا' ہدایت کی راہ دکھلانا' باطل سے روکنا' یہ سب مکارم شریعت ہیں' اور ان کے حصول سے بندہ اللہ

(۱) مجھے اس روایت کی اصل نہیں ملی۔ (۲) یہ روایت بھی پہلے گذری ہے۔ (۳) یہ روایت پہلے بھی گذری ہے۔

تعالیٰ کی قربت حاصل کرتا ہے' یہ قربت مکان اور جسم کی نہیں ہوتی بلکہ ان صفات کی ہوتی ہے جن سے اللہ تعالیٰ متصف ہے اور مناسبت کے جن امور کا کتابوں میں لکھنا جائز نہیں ہے ان کی طرف اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ارشاد میں اشارہ فرمایا ہے۔

وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي۔ (پ ۱۵ ر ۱۰ آیت ۸۵)

اور یہ لوگ آپ سے روح کے بارے میں پوچھتے ہیں آپ فرما دیجئے روح میرے رب کے حکم سے بنی ہے۔

اس آیت میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ روح ایک ربانی امر ہے' اور مخلوق کی حد عقل سے خارج ہے' اور اس سے زیادہ واضح آیت یہ ہے :-

فَإِذَا سَوَّيْتُهُ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُوحِي۔ (پ ۱۴ ر ۳ آیت ۲۹)

پس جب میں اس کو پورا بنا چکوں اور اس میں اپنی طرف سے جان ڈال دوں۔

اسی لئے آدم کو فرشتوں کا مسجود بنایا' جیسا کہ قرآن کریم کی اس آیت میں فرمایا گیا :-

إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ۔ (پ ۲۳ ر ۱۱ آیت ۲۶) ہم نے تم کو زمین پر حاکم بنایا ہے۔

اس لئے کہ آدمی صرف اسی مناسبت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی خلافت کا مستحق بنا' اور اسی امر کی طرف سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد میں اشارہ کیا گیا ہے :-

إِنَّ اللّٰهَ خَلَقَ آدَمَ عَلَىٰ صُورَتِهِ۔ اللہ تعالیٰ نے آدم کو اپنی صورت پر پیدا فرمایا ہے۔

اس حدیث کی بنا پر کم عقلوں نے یہ خیال کیا کہ صورت صرف ظاہری شکل کو کہتے ہیں' اور ظاہری شکل حواس سے مدرک ہوتی ہے' اپنے اس گمان کی بنیاد پر انہوں نے اللہ تعالیٰ کے لئے جسم اور اعضاء تصور کر لئے' اور اسے دوسری اشیاء سے تشبیہ دینے لگے' اللہ تعالیٰ ہمیں اس کم عقلی سے اپنی پناہ میں رکھے' اور انہیں ہدایت دے' اسی مناسبت کی طرف اس حدیث قدسی میں اشارہ ہے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا کہ میں بیمار ہوا تو نے میری عیادت نہیں کی' حضرت موسیٰ نے عرض کیا : یا اللہ! تیری عیادت کیسے کرتا؟ فرمایا : میرا فلاں بندہ بیمار ہوا تو نے اس کی عیادت نہیں کی' اگر تو اس کی عیادت کرتا تو مجھے اس کے پاس پاتا۔ لیکن یہ مناسبت اسی وقت ظاہر ہوتی ہے جب آدمی فرائض کی بجا آوری کے بعد نوافل کی پابندی کرتا ہے' ایک حدیث قدسی میں وارد ہے' اللہ فرماتا ہے :-

لَا يَزَالُ الْعَبْدُ يَتَقَرَّبُ إِلَيَّ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰى أُحِبَّهُ فَإِذَا أَحْبَبْتُهُ كُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِي يَسْمَعُ بِهِ وَبَصَرَهُ الَّذِي يُبْصِرُ بِهِ وَلِسَانَهُ الَّذِي يَنْطِقُ بِهِ۔ (بخاری۔ ابو ہریرہ)

بندہ نوافل کے ذریعے میرا تقرب حاصل کرتا رہتا ہے' یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں' جب میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں تو اس کا کان بن جاتا ہوں' جس سے وہ سنتا ہے' اور آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے' اور زبان بن جاتا ہوں جس سے وہ بولتا ہے۔

اب ہم اس مقام پر پہنچ گئے ہیں جہاں عنان قلم کو روک دینا ضروری ہے' اس لئے کہ اس مقام پر بڑا اختلاف واقع ہوا ہے' بعض کم فہم اور کور چشم لوگ ظاہری تشبیہ کی طرف مائل ہو گئے اور بعض غلو پسند حضرات مناسبت کی حد سے تجاوز کر کے اتحاد کا دعویٰ کر بیٹھے' اور یہ کہنے لگے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں حلول کرتا ہے' ان میں سے بعض انا الحق کہنے لگے' نصاریٰ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سلسلے میں گمراہ ہوئے کہ انہیں معبود بنا بیٹھے' بعض لوگ کہنے لگے کہ عالم ناسوت نے لاہوت کا لباس پہن لیا ہے' اور بعض یہ کہنے لگے کہ عالم لاہوت اور عالم ناسوت دونوں متحد ہیں' جن لوگوں پر یہ امر منکشف ہے کہ تشبیہ و تمثیل محال ہے' اور اتحاد و حلول ممتنع ہیں اور اس کے باوجود ان پر حقیقت سرّ واضح ہے ایسے لوگ بہت کم ہیں۔ شاید ابو الحسن نوری کو یہ مقام حاصل تھا' اس لئے کہ جب آپ کے سامنے یہ شعر پڑھا گیا :

لَا زِلْتُ أَنْزِلُ مِنْ وِدَادِكَ مَنْزِلًا ۔ تَتَحَيَّرُ الْأَلْبَابُ عِنْدَ نُزُولِهِ

(میں تیری محبت میں ہر دم ایک ایسی منزل پر اترتا ہوں جہاں اتر کر عقلیں دنگ رہ جاتی ہیں)
تو ان پر اس قدر وجد غالب ہوا کہ جنگل کی راہ لی' کھیتوں میں دوڑتے پھرتے تھے' اسی عالم میں ایسے کھیتوں میں نکل گئے جن کے گنّے توڑے جاچکے تھے لیکن ان کی جڑیں باقی تھیں' پاؤں میں یہ جڑیں چبھیں' اور انہیں زخمی کرگئیں' دونوں پاؤں ورم آلود ہوگئے' اسی عالم میں انتقال ہوگیا۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ مناسبت بھی محبت کے اسباب میں ایک اہم ترین سبب ہے' اگرچہ یہ سبب بہت عمدہ اور بڑا مضبوط ہے لیکن اس کا وجود بہت کم ہے۔ غور کیا جائے تو یہ پانچوں اسباب اللہ تعالیٰ میں حقیقتہً جمع ہیں' نہ کہ بطور مجاز و کنایہ۔ اور تمام اسباب اعلا درجات میں ہیں نہ کہ ادنیٰ درجات میں' اس لئے اہل بصیرت کے نزدیک معقول اور مقبول محبت صرف اللہ تعالیٰ کی ہے' جب کہ کور چشموں کے نزدیک غیر اللہ ہی کی محبت اصل ہے۔

یہاں یہ امر بھی قابل غور ہے کہ مخلوق کی محبت میں شرکت ہوسکتی ہے' کیوں کہ یہ ممکن ہے کہ تم کسی شخص کو کسی خاص سبب کے باعث محبوب رکھو' اور اس سبب میں کوئی دوسرا شخص بھی اس کا شریک ہو اس لئے اسے بھی محبوب جانو' محبت میں شرکت ایک طرح کا نقصان ہے' اور محبوب کے کمال سے اعراض کا ثبوت ہے' یہ بھی ممکن ہے کہ تمہارا محبوب کسی وصف میں یکتا ہو' اور بظاہر کوئی شخص اس وصف میں اس کا شریک نظر نہ آتا ہو' اگر کوئی شخص ایسا موجود بھی ہے تب بھی یہ ممکن ہے کہ اس کا شریک موجود ہو اور تمہیں اس کی خبر نہ ہو' یا آئندہ پایا جانا ممکن نہ ہو' لیکن اللہ تعالیٰ کی تمام صفات اعلا درجے کی ہیں' اور ان صفات جلال و جمال میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے' نہ فی الوقت موجود ہے اور نہ آئندہ اس کا امکان ہے' اس سے معلوم ہوا کہ اس کی محبت میں شرکت نہیں ہوسکتی' اسی لئے وہ نقصان سے بھی خالی ہے یہ ایسا ہی ہے جیسے اس کی صفات عالیہ میں بھی شرکت نہیں ہوسکتی' اس سے معلوم ہوا کہ اصل محبت' اور کمال محبت کا مستحق صرف اللہ ہے' اور یہ استحقاق ایسا ہے جس میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔

معرفت الٰہی اور دیدار الٰہی کی لذّت

اس عنوان کے تحت ہم یہ بیان کریں گے کہ اعلا ترین لذت اللہ تعالیٰ کی معرفت' اور اس کے وجہ کریم کا دیدار ہے' اور یہ کہ اس پر کسی دوسری لذت کو ترجیح دینا ممکن نہیں ہے' یہ ترجیح صرف وہ شخص دے سکتا ہے جو اس لذت سے محروم ہو۔

انسانی طبائع اور ان کی لذتیں جاننا چاہیے کہ تمام لذتیں ادراکات کے تابع ہیں اور انسان میں بہت سی قوتیں اور طبیعتیں جمع ہیں' اور ہر قوت و لذت کے لئے جداگانہ لذت ہے' اور اس لذت کے معنی ہیں کہ ہر طبیعت کو اس کا وہ مقتضیٰ حاصل ہوجائے جس کے لئے وہ تخلیق کی گئی ہے' انسان کے اندر یہ طبیعت بیکار اور عبث پیدا نہیں کی گئیں' بلکہ ہر طبیعت ایسے امر کے لئے وضع کی گئی ہے جو اس کا مقتضا ہے مثلاً غضب کی طبیعت تشفی اور انتقام کے لئے پیدا کی گئی ہے' بلاشبہ اس کی لذت یہ ہے کہ وہ غلبہ پائے اور انتقام حاصل کرے' یہی غلبہ اور انتقام اس کا مقتضیٰ ہے' خواہش طعام کی طبیعت اس لئے پیدا کی گئی ہے کہ غذا حاصل کرے' اور اس سے وجود کی بقا پائے' لامحالہ اس کی لذت اسی غذا میں ہوگی جو اس کا مقتضیٰ ہے' یہی حال سننے' دیکھنے' اور سونگھنے کی طبیعتوں کا ہے' ہر طبع کو اپنے مقتضیٰ کے حصول میں لذت ملتی ہے' ان طبائع میں کوئی ایسی طبیعت نہیں ہے جسے اپنی مدرکات سے تکلیف یا لذت نہ ملتی ہو۔ اسی طرح دل کی بھی ایک طبیعت ہے جسے نور الٰہی کہتے ہیں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :۔

أَفَمَن شَرَحَ اللَّهُ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ فَهُوَ عَلَىٰ نُورٍ مِّن رَّبِّهِ (پ ۲۳ ر ۱۷ آیت ۲۲)
سو جس شخص کا سینہ اللہ تعالیٰ نے اسلام کے لئے کھول دیا اور وہ اپنے پروردگار کے نور پر ہے۔

اس طبیعت کو بصیرت باطنہ' نور ایمانی' اور یقین بھی کہتے ہیں' لیکن ناموں میں کیا رکھا ہے' اصطلاحات مختلف ہوسکتی ہیں' ضعیف عقل کے لوگ اس اختلاف کو معانی اور حقائق کے اختلاف پر محمول کرتے ہیں' کیوں کہ یہ لوگ الفاظ سے معانی طلب کرتے ہیں'

اور یہ عکس واجب ہے معانی اصل ہیں' الفاظ تابع ہوا کرتے ہیں۔ بہرحال دل اپنی ایک ایسی صفت کی بنا پر جس سے وہ معانی کا ادراک کرتا ہے' بدن کے تمام دوسرے اعضاء سے مختلف حیثیت رکھتا ہے' یہ معانی نہ خیالی ہوتے ہیں' اور نہ محسوس کئے جاسکتے ہیں' مثلاً عالم کی تخلیق' اور ایک خالق قدیم اور مدبّر حکیم کی طرف اس کی احتیاج جو صفات الٰہیہ کے ساتھ متصف ہو' اس طبیعت کو ہم عقل بھی کہتے ہیں بشرطیکہ کوئی شخص عقل سے وہ قوت نہ سمجھے جس سے مجادلے اور مناظرے کے طریقوں کا ادراک ہوتا ہے' کیوں کہ عام طور پر لوگ عقل کو انہی معنوں میں استعمال کرتے ہیں۔ اسی لئے بعض صوفیاء عقل کو برا کہتے ہیں' ورنہ ایسی صفت کو کیسے برا کہا جاسکتا ہے جس کے باعث انسان بہائم سے ممتاز ہو جائے' اور اس کے ذریعے معرفت الٰہی کا ادراک کرے' ظاہر ہے یہ ایک عمدہ صفت ہے' اور ایسی عمدہ صفت کو برا نہیں کہا جاسکتا۔

طبع قلب یہ طبیعت اس لئے پیدا کی گئی ہے کہ اس کے ذریعے تمام امور کے حقائق کا ادراک کرسکے۔ اس طبیعت کا مقتضی معرفت اور علم ہے' اور اسی میں اس کی لذت ہے' جیسے اور طبائع کی لذت ان امور میں ہے جو ان کے مقتضی ہیں۔ جہاں تک علم و معرفت کی لذت کا معاملہ ہے کوئی شخص بھی اس سے انکار نہیں کرسکتا یہاں تک کہ اگر کوئی شخص کسی معمولی بات کی معرفت یا علم حاصل کرلیتا ہے وہ اس پر خوش ہوتا ہے' اور کسی امر سے ناواقف رہ جانے والا اگرچہ وہ معمولی ہی کیوں نہ ہو رنجیدہ ہوتا ہے' لوگ حقیر امور کی معرفت پر اتراتے ہیں' شطرنج جاننے والے اس کھیل کی خست کے باوجود فخر کرتے ہیں' اور اس سلسلے میں تعلیم سے سکوت اختیار نہیں کرپاتے بلکہ ان کی زبان وہ تمام باتیں ظاہر کرہی دیتی ہے جو وہ جانتے ہیں' اور یہ اس لئے ہوتا ہے کہ وہ اس علم میں بڑی لذت پاتے ہیں اور اسے اپنی ذات کا کمال سمجھتے ہیں' علم ربوبیت کی صفات میں سے اعلا ترین صفت ہے' اور انتہائے کمال ہے اسی لئے جب کسی شخص کی علم کے حوالے سے تعریف کی جاتی ہے تو وہ بڑا خوش ہوتا ہے' کیوں کہ اس طرح وہ اپنے کمال ذات اور کمال علم کی تعریف سنتا ہے' اپنے اوپر ناز کرتا ہے' اور اس میں لذت پاتا ہے۔ پھر یہ لذت ملکی اور سیاسی تدابیر کے علم میں جس قدر ہوتی ہے اتنی لذت زراعت' اور باغبانی کے علم میں نہیں ہوتی' اسی طرح اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات' ملائکہ اور زمین و آسمان کے اسرار کے علم میں جس قدر لذت ہوتی ہے اس قدر لذت نحو اور شعر کے علم میں نہیں ہوتی' اس سلسلے میں اصل بات یہ ہے کہ علم کی لذت اس کے شرف و فضیلت کے اعتبار سے ہے' اور علم کا شرف معلوم کے شرف سے پہچانا جاتا ہے' جو شخص لوگوں کے باطنی احوال کا تجسس کرتا ہے' اور انہیں بتلاتا ہے اس میں اسے بڑی لذت ملتی ہے' اور اگر وہ احوال دریافت نہیں کرتا تو اس کی طبیعت کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ تجسس کرے' پھر کاشتکار اور جولاہے کے دل کے احوال جاننے میں اس قدر لذت نہیں ملتی جتنی لذت اسے حاکم شہر کے دل کا حال جاننے میں ملتی ہے' خاص طور پر اس وقت کے احوال جب کہ وہ ملکی تدابیر' اور انتظامی امور میں مصروف ہو' پھر وزیر مملکت کے احوال جاننے میں اسے جس قدر لذت نصیب ہوتی ہے اس قدر لذت حاکم شہر کے احوال جاننے میں نہیں ملتی' اور اگر خوش قسمتی سے بادشاہ کے دل کے اسرار جان لے تو پھر اس کی خوشی کا کیا ٹھکانہ۔ اس واقفیت پر وہ اپنی زیادہ سے زیادہ تعریف اور مدح پسند کرے گا' اور زیادہ سے زیادہ اس معاملے میں بحث کرنا چاہے گا' اسی ذکر کو محبوب سمجھے گا' کیوں کہ اسے اسی ذکر میں لذت ملے گی حاصل یہ ہے کہ علوم و معارف میں اشرف ترین معرفت یا علم وہ ہے جس میں لذت زیادہ ہو' اور علوم و معارف کا شرف معلومات کے شرف پر مبنی ہے' اگر معلومات میں کوئی معلوم اشرف و اعلا ہے تو اس کا علم دوسرے علوم سے زیادہ لذیذ تر ہوگا۔

ہم نہیں جانتے کہ دنیا میں کوئی چیز اللہ تعالیٰ سے زیادہ اشرف' اعلا' اکرم' اور اجل ہو سکتی ہے جو تمام اشیاء کا خالق ہے' انہیں مکمل کرنے والا ہے' انہیں زینت بخشنے والا ہے' اس نے انہیں از سر نو پیدا کیا' پھر فنا کیا' پھر پیدا کرے گا' ان تمام اشیاء کا مدبّر اور مرتب وہی ہے کیا یہ ممکن ہے کہ دربار الٰہی کے علاوہ بھی کوئی دربار ایسا ہو جو ملک' جمال' کمال اور جلال کی تمام بلندیوں کو جامع ہو' نہ اس کے مبادی جلال کا تصور ممکن ہے' اور نہ عجائب احوال کا احاطہ ممکن ہے تعریف کرنے والوں کی زبانیں خاموش اور قلم تھکے تھکے نظر آتے ہیں۔ اگر تم اس حقیقت میں شک نہیں کرتے تو تمہیں اس امر میں شک نہیں کرنا چاہیے کہ ربوبیت کے اسرار کی

اطلاع' اور ان تمام امور الٰہیہ کے ترتب کا علم جو تمام موجودات عالم کو محیط ہیں معارف میں سب سے اعلا سب سے زیادہ لذیذ اور سب سے زیادہ پاکیزہ ہے' اگر کسی شخص کو یہ علم حاصل ہو جائے تو اسے بجا طور پر حق ہے کہ وہ اپنی ذات کو فضل و کمال سے متصف سمجھے اور اس پر فخر کرے' خوش ہو' معلوم ہوا کہ علم لذیذ ہے' اور علوم میں سب سے زیادہ لذیذ اللہ تعالیٰ کی ذات' صفات' افعال اور عرش سے فرش تک پھیلی ہوئی وسیع تر مملکت کی تدبیر کا علم ہے۔ معرفت کی لذت تمام لذتوں سے زیادہ قوی ہے' یعنی شہوت' غضب اور دوسرے حواس کی لذتوں سے کہیں زیادہ مؤثر' پختہ' اور دیرپا۔

لذات میں تفاوت ہے جہاں تک لذات کا سوال ہے ان میں نوعیت کا اختلاف بھی ہے' جیسے جماع کی لذت سماع کی لذت سے مختلف ہے' اور معرفت کی لذت اقتدار کی لذت سے جداگانہ ہے' نوعیت کے علاوہ ضعف و قوت کے اعتبار سے بھی یہ لذتیں مختلف ہوتی ہیں جیسے مجرّد اور کامل الشہوت نوجوان کو جماع میں جو لذت ملتی ہے وہ اس شخص کو نہیں ملتی جو جماع پر حریص نہیں ہوتا' اسی طرح جو شخص نہایت خوبصورت اور حسین ہوتا ہے اس کی طرف دیکھنے کی لذت اس شخص کی طرف دیکھنے کی لذت سے مختلف ہوتی ہے جو زیادہ خوبصورت نہیں ہوتا لذات میں قوت و ضعف کی علامت یہ ہے کہ کسی مخصوص لذت کی موجودگی میں دوسری لذت کی طرف دھیان نہ جائے' اور نہ اسے اختیار کرنے کی خواہش ہو' مثال کے طور پر اگر کسی شخص کو یہ اختیار دیا جائے کہ وہ یا تو خوشبو سونگھے یا حسین چہرے کی طرف دیکھے' اور وہ ان دونوں میں سے دوسری صورت اختیار کرے تو کہا جائے گا کہ اس کے نزدیک حسین صورت خوشبو سے زیادہ لذت بخشتی ہے' اسی طرح اگر کھانا حاضر ہو' اور شطرنج کا کھلاڑی ہر چیز سے بے نیاز اپنے کھیل میں مصروف ہو تو کہا جائے گا کہ اس کے نزدیک کھیل کی لذت کھانے کی لذت سے زیادہ ہے۔ لذات میں ترجیح کا یہ ایک کھرا معیار ہے۔

لذات کی قسمیں اب ہم پھر اپنے موضوع کی طرف واپس چلتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ لذات ظاہری بھی ہوتی ہیں جیسے حواس خمسہ کی لذت' اور باطنی بھی جیسے اقتدار غلبے' شرافت اور علم کی لذت۔ یہ لذت نہ آنکھ کو حاصل ہوتی ہے' اور نہ کان لطف اندوز ہوتا ہے نہ ناک کو لذت ملتی ہے' اور نہ ذائقہ اور لمس کو۔ باطنی لذات اہل کمال پر ظاہری لذات کے مقابلے میں زیادہ غالب ہوتی ہیں' اگر کسی شخص کو یہ اختیار دیا جائے کہ وہ یا تو مرغ مسلّم اور حلوئی کھائے یا ریاست و اقتدار کے ذریعے دشمنوں پر غلبہ پائے' اب اگر وہ شخص حوصلہ مند' اور عالی ہمت ہوگا تو مرغ اور حلوئی کے بجائے اقتدار کو ترجیح دے گا' اور پیٹ کی لذت پر صبر کرنا اس کے لئے آسان ہوگا' اور سمجھا جائے گا کہ اس کے نزدیک ریاست و اقتدار میں عمدہ غذاؤں کی بہ نسبت زیادہ لذت ہے' البتہ وہ ناقص شخص جس کے باطنی معانی ہنوز مکمل نہ ہوئے ہوں' اور وہ بچے کے مانند ہو' یا ایسے شخص کے مانند ہو جس کے باطنی قوی بیکار ہو چکے ہوں بلکہ فنا ہو چکے ہوں' یقیناً باطنی لذات کے مقابلے میں کھانے کی لذت کو ترجیح دے گا' جو شخص بچپنے کی کم عقلی' نادانی اور نقص سے تجاوز کرکے دانائی کی حدود میں قدم رکھ چکا ہو جس طرح اس پر غذاؤں کے بجائے ریاست و اقتدار کی لذت غالب ہوتی ہے اسی طرح اس شخص پر جو ظاہر سے تجاوز کرکے باطن تک پہنچ چکا ہو' معرفت الٰہی' جمال حضرت ربوبیت کے مشاہدے' اور اسرار الٰہی کی دریافت کی لذت زیادہ غالب ہوتی ہے' اور وہ اسے ریاست و اقتدار کی لذت پر بھی ترجیح دیتا ہے' حالانکہ یہ لذت مخلوق پر غالب ہے۔ جمال الٰہی کی لذت کیا ہے اس کی تعبیر اس آیت کریمہ سے کی جاسکتی ہے :۔

فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِیَ لَهُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْیُنٍ (پ۲۱ ر۱۵ آیت ۱۷)

سو کسی شخص کو خبر نہیں جو آنکھوں کی ٹھنڈک کا سامان خزانہ غیب میں کیا گیا ہے۔

ایسے لوگوں کے لئے وہ لذتیں ہیں جو آنکھوں نے دیکھی ہیں" نہ کانوں نے سنی ہیں" اور نہ کسی انسان کے دل میں ان کا خیال گذرا ہے۔ ان لذتوں کا صحیح ادراک وہی کرسکے گا جس نے دونوں طرح کی لذتیں چکھی ہوں' وہ شخص یقیناً تجرّد' خلوت' اور ذکر و فکر میں مشغول ہونے اور بحر معرفت میں غوطہ زن ہونے کو ترجیح دے گا' اور اس لذت کے مقابلے میں ریاست و اقتدار کی تمام لذتوں کو حقیر سمجھ کر ترک کردے گا۔ کیوں کہ وہ یہ بات جانتا ہے کہ ریاست پائدار رہنے والی چیز نہیں ہے' اور یہ کہ جس پر اس کی ریاست قائم

ہے وہ بھی فنا ہونے والی ہے' پھر اس لذت میں بے شمار کدورتیں ہیں اور ان کدورتوں سے لذت کا خالی ہونا ممکن نہیں ہے' اگر یہ ریاست دیر تک باقی رہی تب بھی ہمیشہ باقی رہنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ بالآخر اسے موت پر فنا ہونا ہے' اور موت یقینی ہے' قرآن کریم میں ہے:-

حَتّٰٓى اِذَآ اَخَذَتِ الْاَرْضُ زُخْرُفَهَا وَازَّيَّنَتْ وَظَنَّ اَهْلُهَآ اَنَّهُمْ قٰدِرُوْنَ عَلَيْهَآ اَتٰىهَآ اَمْرُنَا لَيْلًا اَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنٰهَا حَصِيْدًا كَاَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْاَمْسِ۔ (پ۱۱ ر۸ آیت ۲۴)

یہاں تک کہ جب وہ زمین اپنی رونق کا (پورا حصہ) لے چکی اور اس کی پوری زیبائش ہو گئی اور اس کے مالکوں نے سمجھ لیا کہ اب ہم اس پر بالکل قابض ہو چکے تو دن میں یا رات میں اس پر ہماری طرف سے کوئی حادثہ آپڑا' سو ہم نے اس کو ایسا صاف کر دیا گویا وہ کل یہاں موجود ہی نہ تھی۔

یہ دنیاوی لذت ہے' اور اس لذت کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ کی معرفت' اس کی صفات' افعال اور اعلا علیین سے اسفل سافلین تک اس کی مملکت کے نظام کے مشاہدے اور سیر باطنی کی لذت کو بہرحال ترجیح حاصل ہے۔ اس لئے کہ اس لذت میں کسی سے مزاحمت نہیں ہے' نہ کسی قسم کی کوئی کدورت ہے۔ جو اس نظام کی سیر کرنا چاہے یہ جہاں اس کے لئے انتہائی وسیع ہے آسمان سے زمین تک پھیلا ہوا ہے' اور آسمان و زمین کے حدود سے تجاوز کرے تو بھی ایک لامحدود دنیا آباد ہے۔ جو عارف ہمیشہ اس دنیا کے مطالعے میں رہتا ہے وہ اس جنت میں رہتا ہے جس کا طول و عرض آسمان و زمین کے برابر ہے' اس کے باغوں کی سیر کرتا ہے اس کے پھل توڑتا ہے' اس کے چشموں سے سیراب ہوتا ہے' اسے یہ غم نہیں ہوتا کہ ان پھلوں کا سلسلہ موقوف ہو جائے گا' یا وہ باغ مرجھا جائیں گے' یا چشمے خشک ہو جائیں گے جنت اپنی تمام تر راحتوں اور آسائشوں کے ساتھ ایک ابدی اور سرمدی حقیقت ہے' یہ موت سے منقطع نہیں ہوگی' اس لئے کہ موت معرفت الٰہی کے محل کو منہدم نہیں کرتی' معرفت الٰہی کا محل روح ہے' اور روح ایک امر ربانی ہے' موت اس کے احوال بدلتی ہے' اس کے مشاغل منقطع کرتی ہے' اسے جسم کے قید خانے سے آزاد کرتی ہے' اس کی راہ کی رکاوٹیں دور کرتی ہے' لیکن اسے فنا نہیں کرتی' ارشاد باری تعالیٰ ہے:-

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ۔ (پ ۴ ر ۸ آیت ۱۶۹)

اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کئے گئے ان کو مردہ مت خیال کرو بلکہ وہ تو زندہ ہیں اپنے پروردگار کے مقرب ہیں ان کو رزق بھی ملتا ہے' وہ خوش ہیں اس چیز سے جو ان کو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے عطا فرمائی ہے اور جو لوگ ان کے پاس نہیں پہنچے ان سے پیچھے رہ گئے ہیں ان کی بھی اس حالت پر وہ خوش ہوتے ہیں کہ ان پر بھی کسی طرح کا خوف واقع ہونے والا نہیں اور نہ وہ مغموم ہوں گے۔

رہا یہ اعتراض مذکورہ بالا آیت ان لوگوں کے متعلق ہے جو کفار کے خلاف معرکے میں شہید ہو گئے ہوں تو اس کا جواب یہ ہے کہ عارف حقیقی بھی کسی شہید سے کم نہیں ہے' بلکہ ایسے ہر لمحے ایک ہزار شہداء کا ثواب ملتا ہے' جیسا کہ حدیث شریف میں وارد ہے:-

اِنَّ الشَّهِيْدَ يَتَمَنّٰى اَنْ يُّرَدَّ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَى الدُّنْيَا لِيُقْتَلَ مَرَّةً اُخْرٰى لِعَظِمِ مَا يَرَاهُ مِنْ ثَوَابِ الشَّهَادَةِ وَاِنَّ الشُّهَدَاءَ يَتَمَنَّوْنَ لَوْ كَانُوْا عُلَمَاءَ لِمَا يَرَوْنَهُ مِنْ عُلُوِّ دَرَجَةِ الْعُلَمَاءِ (۱)

شہید آخرت میں یہ تمنا کرے گا کہ وہ دنیا میں واپس بھیج دیا جائے اس عظیم ثواب کی وجہ سے جو وہ دیکھے گا اور شہداء یہ تمنا کریں گے کہ کاش وہ علماء ہوتے کیوں کہ وہ علماء کے درجات کی بلندی دیکھیں گے۔

(۱) یہ روایت بخاری و مسلم میں حضرت انس سے ہے لیکن اس میں وان الشہداء الی آخرہ نہیں ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ آسمان و زمین کے تمام ملکوت عارف کے میدان ہیں' وہ جہاں چاہے سیر کر سکتا ہے' گھوم پھر سکتا ہے' اپنے جسم کو حرکت دیئے بغیر وہ جہاں دل چاہے پہنچ سکتا ہے' وہ جمال ملکوت کے مطالعے سے ایک ایسی جنت میں آباد ہوتا ہے' جس کی وسعت وزمین و آسمان کے برابر ہے' اور ہر عارف کو اتنی ہی کشادہ جنت ملے گی' ایسا نہیں ہو گا کہ کسی کے حصے کی جنت تنگ کر کے کسی کی وسیع کر دی جائے۔ البتہ اگر وسعت میں کوئی فرق ہو گا تو وہ اس لئے ہو گا کہ ان کی معرفتیں بھی ایک دوسرے سے مختلف اور متفاوت ہوں گی' جس قدر جس کی معرفت وسیع ہو گی اسی قدر اسے وسیع جنت ملے گی' اللہ تعالیٰ کے یہاں ان کے درجات مختلف ہوں گے' اور یہ درجات اتنے ہوں گے کہ انہیں شمار نہیں کیا جاسکتا۔

بہرحال ریاست کی لذت باطنی ہے' اور صرف اہل کمال کو ملتی ہے' جانوروں اور بچوں کو نصیب نہیں ہوتی' اہل کمال کے نزدیک یہ لذت تمام لذتوں سے زیادہ ہے' اگرچہ ان میں محسوسات اور خواہشات کی لذتیں بھی ہوتی ہیں' مگر وہ ان تمام لذتوں پر قدار کی لذت کو ترجیح دیتے ہیں' یہی حال اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات' اور آسمانوں کے ملکوت و اسرار کی معرفت کا ہے' یہ لذت صرف ان لوگوں کو ملتی ہے جو معرفت کا مرتبہ حاصل کر لیتے ہیں' اور اس کا ذائقہ چکھ لیتے ہیں' اس لذت کا اثبات ان لوگوں کے لئے ممکن نہیں جن کے پاس دل نہ ہو' اس لئے کہ قلب ہی اس قوت کا معدن ہے' جس کے پاس دل نہ ہو گا وہ کبھی اس لذت کو دوسری لذتوں پر ترجیح نہ دے سکے گا' یہ ایسا ہی ہے جیسے کسی بچے سے یہ توقع نہیں رکھی جا سکتی کہ وہ جماع کو کھیل کود پر ترجیح دے گا' یا نامرد ہم بستری کو عطر سونگھنے پر ترجیح دے گا۔ کیوں کہ بچے اور نامرد میں وہ قوت ہی نہیں ہے جس سے وہ جماع کی لذت پا سکیں' البتہ وہ شخص ان دونوں لذتوں میں واضح فرق محسوس کرے گا جو نامردی کے عذاب سے بھی محفوظ ہو' اور اس کی سونگھنے کی قوت بھی سلامت ہو' بس یہی کہنا چاہیے کہ اس لذت کی کیفیت بیان نہیں کی جاسکتی۔ جو یہ لذت چکھتا ہے وہی اسے پہچانتا ہے۔ البتہ طالب علم اگر امور الٰہیہ کی تحصیل میں مشغول نہیں ہوتے پھر بھی وہ معرفت الٰہیہ کی لذت سے آشنا ہو جاتے ہیں' کیوں کہ انہیں مشکلات اور شبہات کا سامنا کرنا پڑتا ہے' اور جب وہ ان کے حل کے۔ لئے جدوجہد کرتے ہیں تب ان پر حل منکشف ہوتے ہیں' یہ بھی علوم و معارف ہی ہیں' اگرچہ یہ علوم اتنے اعلا نہیں ہیں جتنے اعلا معرفت الٰہی سے تعلق رکھنے والے علوم ہوتے ہیں۔

جو شخص اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی ذات و صفات میں ہمیشہ فکر کرتا ہے' اور اس فکر کے نتیجے میں اس پر ملک الٰہی کے کچھ اسرار منکشف ہو جاتے ہیں تو وہ خوشی سے پھولا نہیں سماتا' اس کا دل بلیّوں اچھلتا ہے' اور وہ اپنے دل کی اس کیفیت پر تعجب کرتا ہے کہ اسرار الٰہی کے سامنے کیسے ثابت قدم رہا' اور اس کے اندر برداشت کی قوت کہاں سے آئی' یہ لذتیں ادراک سے تعلق رکھتی ہیں جن کا مزید بیان کچھ زیادہ مفید نہیں ہے' اس گفتگو سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت لذیذ ترین شئے ہے' اور اس سے بڑھ کر کوئی دوسری لذت نہیں ہو سکتی۔ حضرت ابو سلیمان دارانی کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے بعض بندے ایسے ہیں جنہیں اللہ سے نہ جنت کی امید روکتی ہے' اور نہ دوزخ کا خوف بھلا انہیں دنیا کیسے روک سکتی ہے' حضرت معروف کرخی کے کسی بھائی نے ان سے دریافت کیا کہ تمہیں کس چیز نے عبادت پر اکسایا ہے اور کس چیز نے دنیا سے لاتعلقی اختیار کرنے پر مجبور کیا ہے' آپ خاموش رہے' سائل نے خود ہی کہا کیا موت کے خوف نے؟ فرمایا موت کی حقیقت کیا ہے؟ اس نے پوچھا قبر اور برزخ کے تصور نے؟ فرمایا قبر کیا چیز ہے' اس نے دریافت کیا کیا دوزخ کے خوف اور جنت کی امید میں؟ انہوں نے جواب دیا یہ جنت دوزخ کیا چیز ہے' یہ تمام چیزیں جن کا تم نے حوالہ دیا ہے ایک بادشاہ کے قبضے میں ہیں' اگر تم اس بادشاہ کو یاد رکھو تو تمہیں ان میں سے کوئی چیز یاد نہ رہے' اور اگر تمہیں اس کی معرفت حاصل ہو جائے پھر تمہیں کسی چیز کی ضرورت نہ رہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں کہ جب تم کسی شخص کو اللہ تعالیٰ کی جستجو میں سرگرداں دیکھو تو یہ سمجھ لو کہ اس نے اسے تمام چیزوں سے بے نیاز کر دیا ہے' کسی بزرگ نے حضرت بشر ابن الحارث کو خواب میں دیکھا اور ان سے دریافت کیا کہ ابو نصر تمار' اور عبدالوہاب وراق کا کیا حال ہے فرمایا میں نے انہیں ابھی اللہ تعالیٰ کے سامنے اس حالت میں چھوڑا ہے کہ وہ کھا پی رہے تھے' انہوں نے پوچھا اور آپ کا کیا حال ہے' فرمایا

کہ اللہ تعالیٰ نے میرے اندر کھانے پینے کی رغبت کم پائی تو مجھے اس کے عوض اپنے دیدار کی اجازت عطا فرمادی' علی ابن الموفق کہتے ہیں کہ میں نے خواب میں دیکھا گویا جنت میں داخل ہوا ہوں وہاں میں نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ دسترخوان پر بیٹھا ہوا ہے' اور فرشتے اس کے دائیں بائیں جانب کھڑے ہیں اور اسے لقمے بنا بنا کر کھلا رہے ہیں' اور ان کے ہاتھوں سے طرح طرح کی نعمتیں کھا رہا ہے' ایک شخص جنت کے دروازے پر کھڑا ہوا لوگوں کے چہرے دیکھ رہا تھا بعض لوگوں کو وہ اندر آنے کی اجازت دے دیتا تھا' اور بعض کو واپس کردیتا تھا' پھر میں ان دونوں آدمیوں سے گذر کر حظیرۃ القدس کی طرف چلا' وہاں عرش کے شامیانوں میں میں نے ایک شخص کو دیکھا کہ مسلسل اللہ تعالیٰ کی طرف دیکھ رہا ہے' وہ کسی طرف نہیں دیکھتا تھا' میں نے رضوان سے پوچھا کہ یہ شخص کون ہے اس نے جواب دیا کہ یہ معروف کرخی ہیں' ان کی یہ حالت دوزخ کے خوف سے یا جنت کے شوق میں نہیں ہے' بلکہ اس کی محبت کی وجہ سے ہے' اللہ نے انہیں اپنے وجہ کریم کی طرف دیکھنے کی اجازت دیدی ہے' راوی نے یہ بھی بیان کیا کہ باقی دونوں آدمیوں میں سے ایک بشر ابن الحارثؒ تھے اور دوسرے احمد ابن حنبلؒ۔ حضرت ابو سلیمان دارانیؒ فرماتے ہیں کہ جو شخص آج اپنے نفس میں مشغول ہو گا وہ کل کو بھی اسی میں مشغول رہے گا' اور جو آج اپنے رب میں مشغول ہو گا وہ کل کو بھی اسی میں مشغول ہو گا۔ حضرت سفیان ثوریؒ نے حضرت رابعہ بصریہؒ سے پوچھا کہ تیرے ایمان کی حقیقت کیا ہے' انہوں نے جواب دیا کہ میں نے تو اللہ کی عبادت نہ دوزخ کے خوف سے کی ہے اور نہ جنت کے شوق میں۔ اگر میں ایسا کرتی تو میری مثال برے مزدور کی سی ہوتی' میں نے تو اس کی عبادت اس کی محبت اور شوق میں کی ہے' انہوں نے محبت کے سلسلے میں یہ چند اشعار بھی کہے تھے۔

أُحِبُّكَ حُبَّيْنِ حُبَّ الْهَوٰى ۔۔۔ وَحُبًّا لِأَنَّكَ أَهْلٌ لِذَاكَا
فَأَمَّا الَّذِيْ هُوَ حُبُّ الْهَوٰى ۔۔۔ فَشُغْلِيْ بِذِكْرِكَ عَمَّنْ سِوَاكَا
وَأَمَّا الَّذِيْ أَنْتَ أَهْلٌ لَهُ ۔۔۔ فَكَشْفُكَ لِيَ الْحُجُبَ حَتّٰى أَرَاكَا
فَلَا الْحَمْدُ فِيْ ذَا وَلَا ذَاكَ لِيْ ۔۔۔ وَلٰكِنْ لَكَ الْحَمْدُ فِيْ ذَا وَ ذَاكَا

(میں تجھ سے دو طرح کی محبتیں کرتی ہوں' ایک محبت عشق کی وجہ سے ہے' اور دوسری محبت اس لئے ہے کہ تو اس کا اہل ہے' عشق کی بنا پر جو محبت ہے اس کے باعث میں تیرے سوا ہر چیز سے بے نیاز ہو کر تیرے ذکر میں مشغول ہوں' اور وہ محبت جو تیرے شایان شان ہے اس کے باعث تو نے پردے کھول دیے ہیں تاکہ میں تجھے دیکھ سکوں' میرے لئے نہ اس محبت میں کوئی تعریف ہے اور نہ اس محبت میں' دونوں محبتوں میں تعریف تیرے ہی لئے ہے)

شاید حضرت رابعہ نے محبت عشق سے وہ محبت مراد لی ہو جو اس کے احسانات' اور انعامات کے باعث بندے کو اللہ سے ہونی چاہیے' اور دوسری محبت سے وہ محبت مراد لی ہو جو صرف اس کے جلال و جمال کے باعث ہو' اور یہ جلال و جمال دوام ذکر کے باعث ان پر منکشف ہو گیا ہو' یہ دونوں محبتوں میں اعلا و ارفع محبت ہے۔

دیدار الٰہی کی لذت اللہ تعالیٰ کے جمال کے مشاہدے میں جو لذت پنہاں ہے وہ اللہ تعالیٰ نے اس حدیث قدسی میں بیان فرمائی ہے:۔

أَعْدَدْتُ لِعِبَادِيَ الصَّالِحِيْنَ مَا لَا عَيْنٌ رَأَتْ وَلَا أُذُنٌ سَمِعَتْ وَلَا خَطَرَ عَلٰى قَلْبِ بَشَرٍ (بخاری۔ مسلم۔ ابو ہریرہؓ)

میرے نیک بندوں کے لئے وہ (لذت) تیار کی گئی ہے جسے نہ کسی آنکھ نے دیکھا نہ کان نے سنا' اور نہ کسی انسان کے دل پر اس کا گذر ہوا۔

جس شخص کا قلب نہایت مجلی اور انتہائی روشن اور پاکیزہ ہو جاتا ہے وہ بعض لذتوں کا ادراک دنیا ہی میں کرلیتا ہے' ایک بزرگ

فرماتے ہیں کہ میں اپنے اللہ کو کبھی یا اللہ! یارب نہیں کہتا کیوں کہ ان الفاظ سے میرے دل پر زبردست بوجھ پڑتا ہے' آواز تو اسے دی جاتی ہے جو آڑ میں ہو' یا دور ہو' کیا تم نے کوئی ایسا شخص دیکھا ہے جو اپنے ہم نشین کو آواز دیتا ہو۔ ایک بزرگ کا مقولہ ہے کہ جب آدمی اس علم میں انتہا کو پہنچ جاتا ہے تو لوگ اس کو پتھر مارنے لگتے ہیں' اس کی گفتگو ان کی سمجھ سے باہر ہوتی ہے' اور جب اس کی کوئی بات ان کے سمجھ میں نہیں آتی تو وہ اسے دیوانہ اور پاگل کہنے لگتے ہیں' یا اس کے قول کو کفر کہہ دیتے ہیں۔ بہرحال تمام عارفین کا مقصد اللہ تعالیٰ سے وصال اور ملاقات ہے' وہی ان کے دلوں کی راحت' اور آنکھوں کی ٹھنڈک ہے' وہ نہیں جانتے کہ اس میں ان کے لئے کیا چھپا ہوا ہے' جب یہ مقصد پورا ہوجاتا ہے تو پھر کسی لذت کی طرف دل مائل نہیں ہوتا۔ تمام افکار' شہوات اور لذات فنا ہو جاتی ہیں' دل اسی ایک لذت میں مستغرق ہو جاتا ہے' یہاں تک کہ اگر اسے آگ میں ڈال دیا جائے تو اسے اس کا احساس نہیں ہوتا کہ وہ ایک خوفناک اور دردناک عذاب میں مبتلا کیا جارہا ہے' اور اگر اسے جنت کی نعمتیں عطا کی جاتی ہیں تو یہ احساس نہیں ہوتا کہ اسے آرام و آسائش سے نوازا جارہا ہے' وہ تو ایک لذت میں مگن ہے' اور اس لذت کے سامنے تمام تکالیف اور تمام نعمتیں ہیچ سمجھتا ہے' مجھے نہیں معلوم کہ جو لوگ صرف محسوسات کی محبت کو محبت سمجھتے ہیں وہ اس عقیدے پر کیسے ایمان لاتے ہیں کہ قیامت کے دن باری تعالیٰ کے دیدار کی سعادت عطا کی جائے گی۔ اس کی کوئی شکل و صورت نہیں ہے' پھر اس وعدے کے کیا معنی ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے کیا ہے' اور اسے عظیم ترین نعمت قرار دیا ہے' اصل بات یہ ہے کہ جو شخص اللہ کی معرفت رکھتا ہے وہ یہ بات بھی جانتا ہے کہ یہ ایک لذت تمام لذات کو جامع ہے' جیسا کہ اک شاعر کہتا ہے:

كَانَتْ لِقَلْبِيْ أَهْوَاءٌ مُفَرَّقَةٌ ۔۔۔ فَاسْتَجْمَعَتْ مُذْرَأَتْكَ الْعَيْنُ أَهْوَائِيْ

فَصَارَ يَحْسُدُنِيْ مَنْ كُنْتُ أَحْسُدُهُ ۔۔۔ وَصِرْتُ مَوْلَى الْوَرٰى مُذْصِرْتَ مَوْلَائِيْ

تَرَكْتُ لِلنَّاسِ دُنْيَاهُمْ وَدِيْنَهُمْ ۔۔۔ شُغْلًا بِذِكْرِكَ يَا دِيْنِيْ وَدُنْيَائِيْ

(میرے دل کی مختلف خواہشیں تھیں' جب آنکھ نے تجھے دیکھا تو میں نے اپنی تمام خواہشیں سمیٹ لیں' اور وہ شخص مجھ سے حسد کرنے لگا جس سے میں حسد کرتا تھا' اور میں مخلوق کا آقا بن گیا جب سے تو میرا آقا بنا' میں نے لوگوں کے لئے ان کی دنیا اور دین سب کچھ چھوڑ دیا' تاکہ اے میری دنیا و دین! میں تیرے ساتھ مشغول رہ سکوں)۔

ایک شاعر کہتا ہے:

وَهَجْرُهُ أَعْظَمُ مِنْ نَارِهِ ۔۔۔ وَوَصْلُهُ أَطْيَبُ مِنْ جَنَّتِهِ

(اس کا ہجر آتش دوزخ سے زیادہ ہولناک ہے' اور اس کا وصال جنت سے زیادہ عمدہ ہے)۔

ان تمام مقولوں کا حاصل یہ ہے کہ وہ لوگ کھانے' پینے اور نکاح کرنے کی لذتوں پر اللہ تعالیٰ کی معرفت میں قلب کو حاصل ہونے والی لذت کو ترجیح دیتے ہیں' جنت حواس کے لطف اندوز ہونے کی جگہ ہے جب کہ قلب کو صرف اللہ کی ملاقات میں لذت ملتی ہے۔

لذت کے سلسلے میں اخلوق کے حالات لذت کے سلسلے میں مختلف لوگوں کے مختلف احوال کو اس مثال کے ذریعے سمجھنا چاہیے کہ ابتدا میں بچے کے اندر حرکت اور تمیز کی ایک قوت رونما ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ کھیل کود میں لذت پاتا ہے' یہاں تک کہ وہ کھیل کود اس کے نزدیک تمام چیزوں سے زیادہ لذت بخش بن جاتا ہے' بچپن کا دور گذرنے کے بعد لڑکے کو زینت' لباس' جانور کی سواری میں لذت ملتی ہے' اس وقت وہ کھیل کود کی لذت کو تصور کرتا ہے' اس کے بعد جماع اور عورتوں کی شہوت کی لذت سے آشنا ہوتا ہے' اور اس وقت سابقہ تمام لذتیں ترک کردیتا ہے اور انہیں ہیچ تصور کرتا ہے پھر اقتدار' بالادستی' کثرت پسندی میں لذت ملتی ہے۔ یہ دنیا کی لذتوں میں آخری لذت ہے اور نہایت اعلا و ارفع ہے' اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اِعْلَمُوْا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ۔ (پ ۲۷ ر ۱۹ آیت ۲۰)

تم خوب جان لو کہ (آخرت کے مقابلے میں) دنیوی زندگی محض لہو و لعب اور زینت اور ایک دوسرے پر فخر

کرنا اور (اموال اور اولاد میں ایک دوسرے سے اپنے کو) زیادہ بتلانا ہے۔
اس کے بعد ایک اور قوت پیدا ہوتی ہے جس سے وہ معرفت الٰہی کی لذت کا ادراک کرتا ہے' اس لذت کے بعد وہ تمام لذتوں کو حقیر سمجھتا ہے' اور انہیں ترک کردیتا ہے' گویا بار آنے والی لذت اپنے سے پہلے کی لذت سے زیادہ قوی اور دیرپا ہوتی ہے' اور معرفت الٰہی کی لذت کیوں کہ سب کے بعد ہے اس لئے یہ تمام لذتوں سے زیادہ پختہ ہوگی۔ کھیل کی محبت سن تمیز میں پیدا ہوتی ہے' عورتوں' اور زیب و زینت کی محبت بلوغ کے وقت پیدا ہوتی ہے' ریاست و اقتدار کی خواہش بیس سال کے بعد پیدا ہوتی ہے' اور علوم کی محبت چالیس برس کی عمر میں پیدا ہوا کرتی ہے۔ یہ انتہائی درجہ ہے۔ جس طرح بچہ اس شخص کی ہنسی اڑاتا ہے جو کھیل کود چھوڑ کر لباس اور زینت میں منہمک ہو' یا عورتوں میں دلچسپی لے' اسی طرح رؤسا بھی ان لوگوں پر ہنستے ہیں جو ریاست ترک کرکے اللہ تعالیٰ کی معرفت میں مشغول ہوتے ہیں' اور عارف انہیں بڑا معقول جواب دیتے ہیں :۔

إِن تَسْخَرُوا مِنَّا فَإِنَّا نَسْخَرُ مِنكُمْ كَمَا تَسْخَرُونَ فَسَوْفَ تَعْلَمُونَ۔ (پ ۱۲ ر ۴ آیت ۳۸)

اگر تم ہم پر ہنستے ہو تو ہم تم پر ہنستے ہیں جیسا تم (ہم پر) ہنستے ہو۔

دیدار الٰہی کی لذت معرفت الٰہی سے زیادہ ہوگی آیئے اب ہم اس سوال کا جائزہ لیتے ہیں دنیاوی معرفت کے مقابلے میں آخرت میں ہونے والے دیدار الٰہی کی لذت زیادہ کیوں ہوگی؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ مدرکات کی دو قسمیں ہیں' بعض وہ ہیں جو خیال کے دائرے میں آجاتی ہیں جیسے خیالی صورتیں' رنگا رنگ اجسام' اور شکل رکھنے والے حیوانات اور نباتات' اور بعض وہ ہیں جو خیال میں نہیں آتے جیسے اللہ تعالیٰ کی ذات' اور وہ تمام چیزیں جو جسم نہیں رکھتیں جیسے علم' قدرت' اور ارادہ وغیرہ۔ اس تقسیم کو ایک مثال کے ذریعے سمجھئے' اگر کوئی شخص کسی انسان کو دیکھ کر اپنی آنکھیں بند کرلے تو اس کی صورت خیال میں موجود ملے گی' اور ایسا محسوس ہوگا گویا وہ اسے دیکھ رہا ہے' اور جب آنکھ کھول کر دیکھے گا تب بھی کوئی فرق نہیں ہوگا' کیوں کہ رویت اور خیال دونوں حالتوں میں اس شخص کی صورت یکساں ہوگی' اگر کچھ فرق ہوگا تو صرف اس قدر کہ آنکھ بند کرکے دیکھنے میں انکشاف اور وضوح خوب نہیں ہوتا' جب اسے آنکھ سے دیکھا تو وضوح خوب ہوگیا' یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص سورج کی روشنی پھیلنے سے پہلے اسفار کے وقت دیکھے پھر اس وقت دیکھے جب دھوپ پوری طرح پھیل چکی ہو' دونوں مرتبہ دیکھنے میں اس کے علاوہ کوئی فرق نہیں ہوگا کہ دوسری صورت میں انکشاف اور وضوح زیادہ ہوگا۔

خیال اور رویت اصل میں خیال پہلے ادراک کو کہتے ہیں' اور رویت ادراک خیال کی تکمیل کا نام ہے' اور یہی کشف کی انتہا ہے' اس کا نام رویت اس لئے رکھا گیا ہے کہ اس میں غایت درجے کا کشف ہوتا ہے' اس لئے نہیں کہ رویت کا تعلق آنکھ سے ہے۔ بلکہ اگر اللہ تعالیٰ اس مکمل اور مکشوف ادراک کو سینے یا پیشانی میں رکھ دیتا تب بھی اسے رویت ہی کہا جاتا۔ اس تقریر کے بعد یہ جان لینا بہتر ہوگا کہ ان معلومات کے ادراک کی بھی دو صورتیں ہیں جو خیال میں نہیں آتیں' ایک کو ادراک اول اور دوسرے کو ادراک ثانی کہہ سکتے ہیں' دوسرا ادراک پہلے کے لئے تکمیل کا درجہ رکھتا ہے' ان دونوں ادراکات میں کشف اور وضوح کی زیادتی کا اتنا ہی فرق ہے جتنا فرق کسی صورت کے خیال کے دائرے میں آنے اور آنکھ سے دیکھنے میں ہوتا ہے' اسی لئے دوسرے ادراک کو پہلے ادراک کے مقابلے میں مشاہدہ' لقاء اور رویت کہتے ہیں' اور یہ نام بالکل صحیح ہے' کیوں کہ رویت کو رویت اسی لئے کہتے ہیں کہ اس میں کشف و وضوح کی زیادتی ہوتی ہے۔ پھر جس طرح اللہ تعالیٰ کی سنت جاریہ یہ ہے کہ اگر آنکھیں بند کرلی جائیں تو پوری طرح انکشاف نہیں ہوتا' بلکہ رویت کے لئے ضروری ہے کہ آنکھ اور مرئی (جس چیز کو دیکھا جارہا ہے) کے درمیان سے حجاب دور ہو' اگر حجاب باقی رہا تو اس ادراک کو تخیل کہیں گے' رویت نہیں کہیں گے' اسی طرح یہ بھی سنت الٰہیہ ہے کہ جب تک نفس جسم کے عوارض' شہوات کے مقتضیات' اور بشری صفات میں محجوب رہے گا اس وقت تک اسے ان معلومات کا مشاہدہ نہیں

ہو گا جو خیال سے باہر ہیں' بلکہ یہ زندگی بذات خود ایک حجاب ہے' جیسے پلکوں کا بند ہونا دیکھنے کے لئے حجاب ہوتا' زندگی حجاب کیوں ہے؟ اس کے اسباب طوالت طلب ہیں' اور یہ بات اس موضوع کے لئے مناسب نہیں ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے باری تعالیٰ سے رویت کی استدعا کی تو جواب میں ارشاد فرمایا گیا :۔

لَنْ تَرَانِیْ۔ (پ ۹ ر ۷ آیت ۱۴۳)

تو ہرگز مجھے نہیں دیکھے گا۔

مطلب یہی ہے کہ تمہاری حیات ہماری رویت سے مانع ہے۔ اسی طرح ایک جگہ ارشاد فرمایا گیا :۔

لَا تُدْرِکُہُ الْاَبْصَارُ۔ (پ ۷ ر ۱۹ آیت ۱۰۴)

اس کو تو کسی کی نگاہ محیط نہیں ہو سکتی۔

اس آیت سے بھی یہی مراد ہے کہ دنیا میں رویت الٰہی نہیں ہے' چنانچہ صحیح ترین قول کے مطابق معراج کی رات میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے رویت الٰہی کا شرف حاصل نہیں کیا (۱) البتہ جب موت کی وجہ سے زندگی کا حجاب دور ہو جاتا ہے' تب رویت ہوتی ہے۔ لیکن کیونکہ نفس کے کدورتوں میں پڑنے کے باعث آلودگی باقی رہ جاتی ہے' بعض دل زیادہ آلودہ ہوتے ہیں' اور ان کی مثال ایسی ہوتی ہے جیسے آئینہ ایک عرصہ دراز تک زنگ آلود رہے' اور اس قابل ہی نہ رہے کہ اس میں عکس دیکھا جاسکے' خواہ اسے کتنا ہی صیقل کیوں نہ کیا جائے' اور کتنا ہی کیوں نہ چمکایا جائے' ایسے لوگ اللہ تعالیٰ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محجوب رہیں گے۔ ہم اس حجاب سے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں' اور بعض قلوب پر آلودگی اتنی نہیں ہوتی کہ دور نہ ہو سکے' بلکہ ان میں یہ صلاحیت رہتی ہے کہ اگر صیقل کیا جائے تو وہ پھر اپنی سابقہ حالت پر واپس آجائیں' ایسے لوگ کچھ عرصے کے لئے دوزخ پر پیش کئے جائیں گے' اور انہیں اسی قدر دوزخ کا سامنا کرنا ہو گا جس قدر تزکیہ کی ضرورت ہوگی' مومنین کے نے اس کی کم سے کم مدّت ایک لمحہ اور زیادہ سے زیادہ مدّت سات ہزار سال ہے' جیسا کہ روایات سے ثابت ہوتا ہے (حکیم ترمذی فی نوادر الاصول۔ ابو ہریرہؓ) اس دنیا سے کوئی شخص ایسا نہیں جاتا جس کے دل میں کدورت نہ ہو' چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :۔

وَاِنْ مِّنْکُمْ اِلَّا وَارِدُھَا کَانَ عَلٰی رَبِّکَ حَتْمًا مَّقْضِیًّا ثُمَّ نُنَجِّی الَّذِیْنَ اتَّقَوْا وَّنَذَرُ الظّٰلِمِیْنَ فِیْھَا جِثِیًّا۔ (پ ۱۶ ر ۸ آیت ۷۱)

اور تم میں سے کوئی بھی نہیں جس کا اس پر سے گذر نہ ہو اور یہ آپ کے رب پر لازم ہے جو پورا ہو کر رہے گا۔ پھر ہم ان لوگوں کو نجات دے دیں گے جو خدا سے ڈرتے تھے' اور ظالموں کو اس میں ایسی حالت میں رہنے دیں گے کہ (مارے غم کے) گھٹنوں کے بل گر پڑیں گے۔

تجلّیٔ باری تعالیٰ اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر آدمی کا گذر آگ پر ہو گا' یہ ایک یقینی امر ہے' البتہ آگ سے نجات یقینی نہیں ہے' نجات اسی صورت میں ملے گی جب دل ہر طرح کی آلودگی سے پاک و صاف ہو جائے گا' اور تزکیہ اسی مدّت میں ہو گا جو اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمادی ہے' اور اس صورت میں دوزخ سے نجات ملے گی جب وہ وعدے پورے ہو چکے ہوں گے جو شریعت میں مذکور ہیں یعنی حساب' کتاب' اور باری تعالیٰ کے حضور میں پیشی' نیز جنت کا مستحق بھی ہو گا' یہ ایک مبہم مدّت ہے' اس پر اللہ تعالیٰ نے کسی کو مطلع نہیں کیا ہے' یہ واقعہ قیامت کے بعد ظہور پذیر ہو گا اور قیامت کا وقت نامعلوم ہے' ان تمام مراحل سے گذرنے کے بعد نفس کدورتوں سے پاک اور آلائشوں سے صاف ہو گا' اور اس میں کسی طرح کا کوئی داغ یا غبار باقی نہیں رہے گا' اس کے بعد یہ نفس اس لائق ہو گا کہ اس میں اللہ تعالیٰ تجلّی فرمائے' اور یہ تجلّی بالکل واضح اور نمایاں ہو گی' جیسے آنکھ سے دیکھی ہوئی چیز خیالی چیز سے زیادہ واضح اور نمایاں ہوتی ہے' اسی تجلّی کا نام دیدار اور مشاہدہ ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ رویت ضرور ہو گی لیکن یہ رویت

(۱) بخاری و مسلم میں حضرت عائشہؓ کی روایت میں "من حدثک ان محمدا رای ربہ فقد کذب۔"

ایسی نہیں ہوگی جیسے خیالی صورتوں کی جو کسی جہت یا مکان میں مخصوص ہوتی ہیں' اس لئے کہ اللہ تعالیٰ خیال' جہت اور مکان سے بلند تر ہے' ہم تو یہ کہتے ہیں کہ دنیا میں جو معرفت ہوتی ہے وہی معرفت مکمل اور تمام ہو کر کشف کے درجے کو پہنچ جاتی ہے اور اسی کو مشاہدہ اور رویت کہتے ہیں' جیسے یہاں تخیل' تصور تقدیر' شکل اور صورت نہیں ہوتی' اسی طرح آخرت میں بھی نہیں ہوگی' دنیا و آخرت کی رویتوں میں فرق صرف یہ ہے کہ دنیا کی رویت میں کشف و وضوح ناقص ہوتا ہے اور آخرت میں کامل' خیال و رویت میں کشف و وضوح کے فرق کی مثال ہم پہلے بیان کرچکے ہیں' جب اللہ تعالیٰ کی معرفت میں صورت و جہت کا اثبات نہیں ہوتا تو اس کی معرفت کی تکمیل میں جہت و صورت کیسے ممکن ہے' اس لئے کہ یہ رویت معرفت ہی کا مکمل روپ ہے' صرف کشف و وضوح کی زیادتی کا فرق ہے' جیسے دیکھی جانے والی صورت میں اور خیال میں آنے والی صورت میں کشف و وضوح کی کمی بیشی کا فرق ہوتا ہے' قرآن کریم کی اس آیت میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے :۔

نُورُهُمْ يَسْعَىٰ بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَبِأَيْمَانِهِمْ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَتْمِمْ لَنَا نُورَنَا۔ (پ ۲۸ ر ۲۰ آیت ۸)

ان کا نور ان کے داہنے اور ان کے سامنے دوڑتا ہوگا اور (یوں) کہتے ہوں گے کہ اے ہمارے رب ہمارے لئے ہمارے اس نور کو آخر تک رکھئے۔

یہاں تمام نور سے مراد زیادتی کشف ہے' آخرت میں دیدار الٰہی کی سعادت وہی لوگ حاصل کریں گے جو دنیا میں عارف ہوں گے کیوں کہ معرفت ہی ایک ایسا پودا ہے جو بڑھتے بڑھتے تناور درخت بن جاتا ہے' اور رویت کی شکل اختیار کرلیتا ہے' اور جب پودا نہ ہوگا تو درخت ہی کیسے بنے گا' اسی طرح جو شخص دنیا میں اللہ کو نہ جانے گا وہ آخرت میں کیسے پہچانے گا' اور کس طرح اس کے دیدار سے شرف یاب ہوگا۔

تجلّی کے مختلف درجات جس طرح معرفت کے مختلف درجات ہیں اسی طرح تجلّی بھی مختلف ہوگی' جیسے بیج کے اختلاف سے سبزیاں مختلف ہوتی ہیں' اسی طرح تجلّی بھی قلت و کثرت' حسن و قوت اور ضعف کے اعتبار سے مختلف ہوگی' اسی لئے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :۔

إِنَّ اللَّهَ يَتَجَلَّىٰ لِلنَّاسِ عَامَّةً وَلِأَبِي بَكْرٍ خَاصَّةً (ابن عدی۔ جابرؓ)

اللہ تعالیٰ لوگوں کے لئے عام تجلّی فرمائے گا اور ابوبکر کے لئے خاص۔

اس کا مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ کے دیدار میں جو لذت حضرت ابوبکر کو حاصل ہوگی وہ لذت ان سے کم درجہ رکھنے والوں کو نہیں ملے گی' بلکہ حضرت ابوبکر کی لذت کا سوواں حصہ بھی انہیں نہیں ملے گا بشرطیکہ ان کی معرفت آپ سے سو درجہ کم ہو' کیوں کہ حضرت ابوبکر سِرّ الٰہی کے ساتھ مخصوص تھے' اور آپ کے سینے میں یہ راز گھر کئے ہوئے تھا' اس لئے آخرت میں اسی عظیم تجلّی کے مستحق ہوں گے جو اس راز کی حفاظت کرنے والوں کے لئے مخصوص ہے۔ جس طرح دنیا میں تم یہ دیکھتے ہو کہ بعض لوگ اقتدار کی لذت کو کھانے پینے اور نکاح کرنے کی لذت پر ترجیح دیتے ہیں اور بعض لوگ علم کی لذت' آسمان و زمین کے اسرار و ملکوت کے انکشاف کی لذت کو اقتدار' مطعومات اور نکاح وغیرہ تمام لذات پر ترجیح دیتے ہیں اسی طرح آخرت میں بھی بعض لوگ ایسے ہوں گے جو اللہ تعالیٰ کے دیدار کی لذت کو جنت کی تمام نعمتوں پر ترجیح دیں گے' وہاں بھی دنیا کی طرح کھانے پینے اور نکاح وغیرہ کی لذتیں موجود ہوں گی' اور یہ لوگ وہی ہوں گے جو دنیا میں علم و معرفت' اور اسرار ربوبیت پر اطلاع کی لذت کو تمام لذتوں پر ترجیح دیتے ہیں اسی لئے جب حضرت رابعہ بصریہؒ سے دریافت کیا گیا کہ جنت کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے' فرمایا "اَلْجَارُ ثُمَّ الدَّارُ" (پہلے صاحب خانہ ہے اس کے بعد گھر ہے) گویا انہوں نے اپنے اس ارشاد کے ذریعے یہ بیان فرمایا کہ میری توجہ کا مرکز اللہ تعالیٰ ہے' جو جنت کا مالک ہے' میں جنت کی طرف ملتفت نہیں ہوں۔

حقیقت یہ ہے کہ جو شخص دنیا میں اللہ کو نہیں پہچانتا وہ آخرت میں بھی اسے نہیں دیکھ پائے گا اور جو اس کی معرفت سے دنیا

میں حظ نہیں اٹھاتا وہ آخرت میں بھی دیدار الٰہی سے لطف اندوز نہیں ہو سکے گا' اس لئے کہ اگر دنیا میں کسی کے ساتھ کچھ نہیں گیا تو وہاں کوئی نہیں بات نہیں ہو سکے گی' جب تک کوئی شخص بوئے گا نہیں کاٹے گا کیسے؟ ہر شخص کا حشر اسی حال پر ہو گا جس حال پر وہ مرے گا' اور اسی حال پر مرے گا جس حال پر زندگی گذارے گا' اس لئے اس کے پاس معرفت کا جس قدر توشہ ہو گا وہ اسی قدر لذت پائے گا' اور وہی معرفت مشاہدے پر منتہی ہو گی' اور مشاہدے سے لذت دوچند ہو جائے گی' یہ ایسا ہی ہے جیسے عاشق کی لذت معشوق کے دیدار سے دوبالا ہو جائے' پہلے وہ خیال میں مستغرق تھا' اور اس میں لذت پا رہا تھا' اچانک صورت سامنے آ گئی' اب جو لذت اسے ملے گی وہ پہلی لذت کے مقابلے میں دوچند ہو گی' بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ یہ دیدار اس کے لئے منتہائے لذت ہے تو بجا نہ ہو گا' جنت کا حال یہ ہے کہ اس میں جانے والے ہر شخص کو وہ تمام نعمتیں حاصل ہوں گی جن کا وہ متمنی ہو گا' لیکن جو شخص صرف اللہ تعالیٰ سے ملاقات کا متمنی ہے' اسے اس کے علاوہ کسی چیز میں لذت نہیں ملے گی' وہ ہر نعمت کو اپنے لئے اذیت کا باعث تصور کرے گا۔ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ جنت کی نعمتیں اسی قدر حاصل ہوں گی جس قدر اس کا دل محبت الٰہی کے نور سے معمور ہو گا' اور محبت بقدر معرفت ہوتی ہے' اس کا مطلب یہ ہے کہ اصل سعادت معرفت ہے' شریعت نے اسے ایمان سے تعبیر کیا ہے۔

ایک شبہ کا جواب یہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ تم نے لذت دیدار کو لذت معرفت سے نسبت دی ہے اور کہا ہے کہ آخرت میں دیدار کی لذت دراصل معرفت دنیاوی کی لذت میں اضافے کی صورت ہے' اگر یہ بات ہے تو دیدار کی لذت بہت کم ہو گی' اگرچہ وہ لذت معرفت سے دوگنی چوگنی ہو' کیوں کہ دنیا میں معرفت کی لذت نہایت ضعیف ہوتی ہے' اگر ہم اس لذت کو دوگی چوگنی بھی کریں تب بھی وہ اتنی قوی نہیں ہو گی کہ جنت کی نعمتیں اور لذتیں اس کے سامنے ہیچ نظر آئیں' اور آدمی ان سے لاتعلق ہو جائے' اس کا جواب یہ ہے کہ معرفت کی لذت کو وہی شخص کم سمجھتا ہے جو اس لذت سے محروم ہوتا ہے' ظاہر ہے جو شخص معرفت سے خالی ہو وہ اس کی لذت کیسے پا سکتا ہے' اسی طرح اگر کسی کے دل میں تھوڑی معرفت ہو اور باقی تمام دنیاوی علائق بھرے ہوئے ہوں' تو اسے کیا لطف ملے گا' اور کیا لذت حاصل ہو گی۔ یہ مقام صرف حقیقی عارفین کا ہے' وہ معرفت' فکر اور مناجات میں وہ لذت پاتے ہیں کہ اگر اس لذت کے بدلے انہیں جنت کی نعمتیں دی جائیں تو قبول نہ کریں' پھر معرفت کی لذت کتنی ہی مکمل کیوں نہ ہو دیدار کی لذت کے مقابلے میں اس کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی' جیسے معشوق کی دید کے مقابلے میں اس کے تصور کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی' یا خوش ذائقہ غذائیں کھانے کے مقابلے میں ان کی خوشبو سونگھنے کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی' یا جماع کرنے کے مقابلے میں محض ہاتھ سے چھونے کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی' لذت دیدار' اور لذت معرفت میں جو عظیم فرق ہے وہ ایک مثال کے بغیر واضح نہیں ہو گا۔ اور وہ مثال یہ ہے کہ دنیا میں معشوق کے دید کی لذت کئی اسباب سے مختلف و متفاوت ہوتی ہے' اول معشوق کے جمال کا ناقص یا کامل ہونا' ظاہر ہے مکمل جمال کی طرف دیکھنے میں جو لذت ہو گی وہ ناقص میں کب ہو گی' دوسرے محبت' شہوت اور عشق میں کمال' جس شخص کا عشق شدید ہو گا وہ اس شخص کے مقابلے میں زیادہ لذت پائے گا جس کی محبت کمزور ہو گی' تیسرے ادراک کا مکمل ہونا' چنانچہ معشوق کو خوب روشنی میں بغیر حجاب کے قریب سے دیکھنے میں جو لذت ملتی ہے وہ لذت معشوق کو اندھیرے میں باریک پردے کے پیچھے سے یا دور سے دیکھنے میں نہیں ملتی' اسی طرح معشوقہ کے ساتھ برہنہ جسم لیٹنے میں جو مزہ ہے وہ لباس پہن کر لیٹنے میں نہیں ہے' چوتھے ان موانع کا دور ہونا جو قلب کو تردد اور تشویش میں مبتلا کرتے ہیں' چنانچہ ایک تندرست' بے فکر اور پریشانی سے آزاد شخص معشوق کو دیکھ کر جو لطف پا سکتا ہے اس قدر لطف وہ شخص نہیں اٹھا سکتا' جو پریشان ہو' خوف زدہ ہو' یا کسی دردناک مرض میں مبتلا ہو' یا اس کا دل کسی فکر میں مشغول ہو' یا تم ایک ایسا عاشق تصور کرو جس کا عشق کمزور ہے' اور وہ اپنے معشوق کو دور سے ایک باریک چلمن کے پیچھے سے دیکھتا ہے' یہاں تک کہ معشوق کا ایک ہیولیٰ اسے نظر آتا ہے' اس کے چہرے کے نقوش یا رنگ واضح نہیں ہے' اس پر غضب یہ ہے کہ چاروں طرف سانپ اور بچھو ہیں' جو اسے ڈس رہے ہیں' اور ڈنک مار رہے ہیں' ظاہر ہے ایسا شخص اپنے معشوق کے دیدار کی لذت سے کیا خاک لطف اندوز ہو گا' اب اگر اس کی نگاہوں کے سامنے سے وہ پردہ ہٹ جائے'

فاصلہ ختم ہو جائے' خوب روشنی ہو' سانپ اور بچھو کا کوئی خطرہ نہ ہو' اور ہر طرح سے مامون و محفوظ ہو' عشق کا غلبہ ہو' شہوت پوری طرح دل و دماغ پر محیط ہو' اب دیکھو اسے معشوق کو دیکھ کر کتنی لذت ملے گی' کیا یہ لذت پہلے جیسے شخص کی لذت کے برابر ہو گی' ہرگز نہیں! اس لذت کو پہلی لذت سے ذرا بھی نسبت نہ ہو گی بلکہ اسے لذت کہنا ہی مشکل ہو گا۔

اس مثال کی روشنی میں تمہیں لذت دیدار اور لذت معرفت کا فرق سمجھنا چاہیے۔ یہاں باریک پردہ بدن اور اس کے ساتھ اشتغال کی مثال ہے' سانپ بچھو کی مثال وہ شہوات ہیں جو انسانی حواس پر چھائے ہوئے ہیں' جیسے بھوک' پیاس' غصہ' غم وغیرہ' محبت اور عشق کے ضعف کی مثال یہ ہے کہ نفس دنیا میں مشغول ہو' اور ملاء اعلا کی طرف بہت کم رغبت رکھتا ہو' اور اسفل السافلین کی طرف مائل ہو' یہ ایسا ہی ہے جیسے بچہ اپنی کم فہمی کے باعث ریاست کی لذت سے اعراض کرتا ہے' اور چڑیوں کے ساتھ کھیلنا پسند کرتا ہے۔ عارف کی معرفت دنیا میں کتنی ہی قوی کیوں نہ ہو مگر یہ مکدرات اس کا دامن نہیں چھوڑتے' عارف کا ان سے خالی ہونا ناممکن ہے' تاہم یہ موانع بعض حالات میں کمزور ہو جاتے ہیں' اور بظاہر ایسا لگتا ہے کہ اب کوئی مانع باقی نہیں رہا۔ اس وقت نگاہیں معرفت کے جمال کی چمک دمک سے خیرہ ہو جاتی ہیں' یہاں تک کہ عقل حیران رہ جاتی ہے' بعض اوقات یہ لذت اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ دل میں برداشت کا حوصلہ نہیں رہتا' ایسا لگتا ہے کہ دل پھٹ جائے گا' ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جائے گا۔ لیکن لذت اندوزی کی یہ حالت ہمیشہ برقرار نہیں رہتی' بلکہ اس طرح دل پر وارد ہوتی ہے جیسے آسمان پر بجلی چمک جائے' بسا اوقات عارف کے دل و دماغ پر افکار و حوادث کا حملہ ہوتا ہے' اور وہ اس کا تمام لطف خاک میں ملا دیتے ہیں' اس حیات ناپائدار میں یہ صورت حال اکثر پیش آتی رہتی ہے' اس لئے کہ کوئی عارف یہ دعویٰ مشکل ہی سے کر سکتا ہے کہ وہ معرفت الٰہی سے پوری طرح لطف اندوز ہوا ہے' موت تک یہ سلسلہ یوں ہی دراز رہتا ہے۔ بہتر اور تمام لذات کی جامع زندگی موت کے بعد کی زندگی ہے' اسی لئے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :-

لَا عَيْشَ إِلَّا عَيْشَ الْآخِرَةِ (۱) آخرت کی زندگی کے علاوہ کوئی زندگی نہیں ہے۔

قرآن کریم میں ہے :-

وَإِنَّ الدَّارَ الْآخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ۔ (پ ۲۱ ر ۳ آیت ۲۴)

اور اصل زندگی عالم آخرت ہے' اگر ان کو اس کا علم ہوتا تو ایسا نہ کرتے۔

عارف موت کو پسند کرتا ہے جو شخص اس بلند درجے تک پہنچ جاتا ہے وہ لقائے خداوندی کی خواہش کرتا ہے' اور اس خواہش کی تکمیل کے لئے موت کو پسند کرتا ہے' اگر کبھی موت کو پسند نہیں کرتا تو اس کی وجہ یہ نہیں ہوتی کہ وہ موت سے خوف زدہ ہے یا اللہ تعالیٰ سے ملنا نہیں چاہتا' بلکہ وہ چاہتا ہے کہ اگر اسے دنیا میں کچھ دیر رہنے کا موقع مل جائے تو وہ معرفت میں مزید کمال حاصل کرے گا' اس لئے کہ معرفت کی مثال ایک بیج کی سی ہے تم اس کی جس قدر آبیاری اور نگہداشت کرو گے اسی قدر وہ تناور درخت بنے گا اور تمہیں شیریں پھل دے گا۔ معرفت ایک ناپید اکنار سمندر ہے جو شخص اس سمندر میں اپنے فکر کی کشتی ڈالتا ہے' وہ کبھی پار نہیں لگتا' اور نہ اس سمندر کی تہہ تک پہنچ پاتا ہے۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ کے جمال و جلال کے حقائق کا مکمل ادراک محال ہے لیکن اس کے افعال صفات اور اسرار کی معرفت جتنی زیادہ ہو گی اسی قدر آخرت کی لذت بھی بڑھے گی' معرفت کا بیج بونے کے لئے دنیا ناگزیر ہے' دل اس کی زمین ہے' اور پھل آخرت میں ملتے ہیں۔ اسی لئے اگر کوئی شخص زیادتی معرفت کے لئے طول عمر کا متمنی ہو تو یہ کوئی عیب نہیں ہے۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں :-

أَفْضَلُ السَّعَادَاتِ طُولُ الْعُمُرِ فِي طَاعَةِ اللَّهِ (ابراہیم الحربی۔ ابن لہیعہ)

بہترین سعادت اللہ کی اطاعت میں عمر کا زیادہ ہونا ہے۔

(۱) یہ روایت پہلے گذر چکی ہے۔

بہرحال معرفت طول عمر کی وجہ سے زیادہ ہوتی ہے' کامل اور وسیع ہوتی ہے' کیوں کہ آدمی فکر و عمل پر جس قدر مداومت کرے گا' اور دنیاوی علائق سے لاتعلق رہنے میں جس قدر مجاہدہ کرے گا اسی قدر اس کی معرفت زیادہ ہوگی۔ اگر کسی عارف نے اپنے لئے موت پسند کی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس درجے پر سمجھتا ہے کہ اب اس سے آگے بڑھنا اس کے لئے ممکن نہیں ہے' اہل معرفت موت کو اچھا سمجھتے ہوں یا برا تصور کرتے ہوں دونوں صورتوں میں ان کا مطمح نظر معرفت الٰہی ہے' جب کہ تمام لوگوں کی نظر دنیا کی شہوات پر رہتی ہے' اگر دنیاوی شہوات وسیع ہوں تو وہ یہ تمنا کرتے ہیں کہ زندگی طویل ہو جائے اور تنگ ہوں تو وہ موت کی خواہش کرتے ہیں' اور یہ دونوں باتیں ہی نقصان اور محرومی کا باعث ہیں' اور ان کا سرچشمہ جہالت اور غفلت ہے' تمام شقاوتیں اور بدبختیاں جہالت اور غفلت کے پہلو سے جنم لیتی ہیں' اور تمام سعادتوں کی بنیاد علم و معرفت پر ہے۔

اس تفصیل سے تم محبت اور عشق کے معنیٰ جان گئے ہو' معرفت اور دیدار کی لذتوں کا مطلب سمجھ گئے ہو' اور یہ بات بھی تم پر واضح ہو گئی ہے کہ تمام عقلمند اور اصحاب کمال ان لذتوں کو باقی تمام لذتوں پر کیوں ترجیح دیتے ہیں' اگرچہ وہ ناقص العقل لوگوں کے نزدیک لائق ترجیح نہیں ہیں' جیسے بچے کے نزدیک ریاست کی لذت کھیل کی لذت کے مقابلے میں لائق ترجیح نہیں ہوتی۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخرت میں رویت کا محل دل ہے یا آنکھ؟ اس سلسلے میں لوگوں کا اختلاف ہے' اہل بصیرت اس اختلاف پر نظر نہیں کرتے' اور نہ اسے کوئی اہمیت دیتے ہیں' وہ یہ کہتے ہیں کہ عقلمند وہ ہے جو آم کھائے پیڑ نہ گنے' اور یہ ایک حقیقت بھی ہے کہ جو شخص اپنے معشوق کے دیدار کا مشتاق ہوتا ہے' وہ یہ نہیں سوچتا کہ یہ دیدار آنکھوں میں ہوگا یا پیشانی میں' بلکہ اس کا مقصد صرف رویت اور اس کی لذت ہے خواہ وہ آنکھ کے واسطے سے حاصل ہو یا کسی دوسرے ذریعے سے۔ آنکھ صرف محل اور ظرف ہے اس کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت نہایت وسیع ہے' اس لئے ہم یہ حکم نہیں لگا سکتے کہ رویت کسی ایک ہی ذریعہ سے ہوگی' دوسرے ذریعے سے نہیں ہو سکتی' ہو سکتا ہے آنکھ اور دل دونوں کو اس کی قوت عطا کی جائے' یہ تو امکان اور جواز کی بات ہے' آخرت میں فی الواقع کیا ہونے والا ہے؟ اس کا قطعی جواب ہم شارع علیہ السلام سے سنے بغیر کیسے دے سکتے ہیں۔ اہل سنت والجماعت کا عقیدہ جس کی بنیاد شرعی شواہد پر ہے یہ ہے کہ آنکھ میں رویت کی قوت پیدا کی جائے گی' تاکہ رویت' نظر' اور دوسرے تمام الفاظ جو اس ضمن میں وارد ہوئے ہیں اپنے ظاہر پر محمول ہو سکیں' ظواہر سے قطع نظر کرنا صرف ضرورت کے لئے جائز ہوا کرتا ہے۔

محبت الٰہی کو پختہ کرنے والے اسباب آخرت میں سب سے زیادہ خوشحال اور صاحب سعادت وہ شخص ہوگا جو اللہ کی محبت میں سب سے زیادہ پختہ ہوگا' اس لئے آخرت کے معنی ہیں اللہ کے پاس آنا اس کی ملاقات کا شرف حاصل کرنا۔ عاشق کے لئے اس سے بڑھ کر کیا نعمت ہو سکتی ہے کہ وہ اپنے طویل شوق ملاقات کے بعد معشوق کے پاس آئے' اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس کے مشاہدے کی سعادت حاصل کرے' نہ کوئی رکاوٹ ہو' نہ مزہ مکدر کرنے والا ہو' نہ رقیب ہو' نہ حاسد اور مخالف ہو' نہ یہ خوف ہو کہ مشاہدہ منقطع ہو جائے گا۔ لیکن یہ نعمت محبت کی قوت کے بقدر حاصل ہوگی' جتنی محبت زیادہ ہوگی اسی قدر لذت بھی زیادہ ہوگی' بندہ اللہ تعالیٰ کی محبت سے صرف دنیا میں بہرہ ور ہوتا ہے' جہاں تک اصل محبت کا تعلق ہے اس سے کوئی صاحب ایمان خالی نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ کچھ نہ کچھ معرفت ہر مومن کے دل میں ہوتی ہے' لیکن انتہائی محبت جسے عشق کہتے ہیں ہر شخص میں نہیں ہوتی' بلکہ اکثر میں نہیں ہوتی' محبت کی یہ معراج دو طریقوں سے حاصل ہو سکتی ہے۔

پہلا سبب۔ دنیاوی علائق سے انقطاع پہلا سبب یہ ہے کہ بندہ دنیاوی علائق سے اپنا ناتا توڑ لے' اور غیر اللہ کی محبت دل سے نکال ڈالے' دل ایک برتن کی طرح ہے' جس میں اس وقت تک سرکے کی گنجائش نہیں ہوتی جب تک پانی نہ نکال دیا جائے یہ توقع نہ رکھنی چاہیے کہ بیک وقت اللہ تعالیٰ کی محبت بھی ہو سکتی ہے' اور دنیا سے وابستگی بھی۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی انسان کے سینے میں دو دل نہیں بنائے۔ کمال محبت یہ ہے کہ آدمی اپنے پورے دل کے ساتھ اللہ سے محبت کرے' جب تک وہ کسی

غیر کی طرف ملتفت رہے گا اس کے دل کا ایک گوشہ غیر میں مشغول رہے گا' اور اسی قدر اس کی محبت ناقص ہوگی جس قدر وہ غیر اللہ میں مشغول ہوگا' چنانچہ برتن میں جس قدر پانی رہے گا اسی قدر کم سرکہ آئے گا' سرکے سے برتن کو لبالب بھرنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے اس کا پانی گرا دیا جائے۔ دل کو اس طرح کی تمام آلائشوں سے پاک کرنے' اور ہر طرح کی محبتوں سے خالی کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا :-

قُلِ اللّٰهُ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِي خَوْضِهِمْ يَلْعَبُونَ۔ (پ ۷ ر ۱۷ آیت ۹۱)

آپ کہہ دیجئے اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا ہے پھر ان کو ان کے مشغلے میں بے ہودگی کے ساتھ لگا رہنے دیجئے۔

إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا۔ (پ ۲۴ ر ۱۸ آیت ۳۰)

جن لوگوں نے اقرار کرلیا کہ ہمارا رب اللہ ہے پھر ثابت قدم رہے۔

بلکہ کلمہ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ کے معنی بھی یہی ہیں کہ اللہ کے سوا نہ کوئی معبود ہے' اور نہ کوئی محبوب ہے کیوں کہ محبوب ہی معبود ہوا کرتا ہے' اس لئے کہ عبد کے معنی ہیں مقید کے' اور معبود وہ ہے جس کی قید میں ہو' ہر عاشق اپنے معشوق کا قیدی ہوا کرتا ہے' اسی لئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :- أَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلٰهَهُ هَوَاهُ (پ ۱۹ ر ۲ آیت ۴۳)

اے پیغمبر آپ نے اس شخص کی حالت بھی دیکھی ہے جس نے اپنا خدا اپنی خواہش نفسانی کو بنا رکھا ہے۔

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں :-

أَبْغَضُ إِلٰهٍ عُبِدَ فِي الْأَرْضِ الْهَوَى۔ بدترین معبود جس کی زمین میں پرستش کی جاتی ہے خواہش نفس ہے۔

ایک حدیث میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :-

مَنْ قَالَ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ مُخْلِصًا دَخَلَ الْجَنَّةَ

جس شخص نے اخلاص کے ساتھ لا الہ الا اللہ کہا وہ جنت میں داخل ہوگا۔

اخلاص کے معنی یہ ہیں کہ بندہ اپنے دل کو اللہ کے لئے حاصل کرلے' اس میں غیر اللہ کے لئے کوئی شرک باقی نہ رہے' اللہ ہی اس کے دل کا معبود ہو' وہی اس کے دل کا محبوب ہو' وہی اس کے دل کا مقصود ہو' جس کی حالت یہ ہوتی ہے اس کے لئے دنیا قید خانہ سے کم نہیں ہوتی' کیوں کہ وہ اس کے اور مشاہدۂ محبوب کے درمیان رکاوٹ ہے' موت اس کے لئے قید سے رہائی کا پروانہ ہے۔ تم ایسے شخص کا تصور کرو جس کا صرف ایک محبوب ہو' اور وہ ایک عرصے سے اس کی ملاقات کا مشتاق اور اس کے دیدار کے لئے بے چین ہو' لیکن قید خانے کی دیواریں اور سلاخیں اس کے راستے میں مزاحم ہوں' اچانک اسے آزاد کردیا جائے' اسے کیا کچھ خوشی نہیں ہوگی' اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محبوب کے قریب رہنے کا تصور اس کے لئے کس قدر فرحت بخش ہوگا۔

بہرحال دنیا کی محبت کا دل میں قوی ہونا بھی محبت الٰہی کے ضعف کا ایک اہم سبب ہے' دنیا کی محبت میں بیوی' بچوں' اقارب' زمین' جانوروں' باغوں' اور تفریحات وغیرہ کی محبت داخل ہے' یہاں تک کہ اگر کوئی شخص پرندوں کی خوش الحانی پر خوش ہو یا صبح کی ٹھنڈی ہوا سے لطف اندوز ہو تو کہا جائے گا کہ وہ دنیا کی محبت میں گرفتار ہے' اس کی نعمتوں کی طرف ملتفت ہے' اور اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی محبت میں نقصان اٹھا رہا ہے' جس قدر اس کا دنیا سے انس زیادہ ہوگا اسی قدر اللہ سے اس کی انسیت میں کمی واقع ہوگی' آدمی کو دنیا میں جس قدر حصہ ملتا ہے اسی قدر آخرت میں اس کا حصہ کم کردیا جاتا ہے جیسے انسان مغرب سے جتنا قریب ہوتا ہے اتنا ہی مشرق سے دور ہوتا ہے' یا جیسے ایک شوہر اپنی بیوی کو جتنا خوش کرے گا اسی قدر دوسری بیوی اس سے ناراض ہوگی' دنیا و آخرت بھی دو سوتنوں کی طرح ہیں یا ان میں سے ایک مشرق ہے اور دوسرا مغرب۔ اہل دل نے اپنی آنکھوں سے اس کا مشاہدہ کیا ہے' دل سے دنیا کی محبت کا قلع قمع کرنے کے لئے ضروری ہے کہ زہد کا راستہ اختیار کیا جائے' صبر پر مواظبت کی جائے' اور خوف و رجاء کے ذریعے ان کی اطاعت کی جائے' ہم نے سابقہ ابواب میں توبہ' صبر' زہد' خوف اور رجاء کے مقامات بیان کئے ہیں' ان مقامات پر عمل کرنا

دراصل محبت کے دو رکنوں میں سے ایک کے حاصل کرنے کا ذریعہ ہے' اور وہ رکن غیر اللہ سے دل کو خالی کرنا ہے' اس کی ابتداء اللہ پر' یوم آخرت پر' جنت اور دوزخ پر ایمان لانے سے ہوتی ہے' پھر اس سے خوف اور رجاء جنم لیتے ہیں' اس کے بعد توبہ اور صبر کا ظہور ہوتا ہے' اور آہستہ آہستہ قلب کی یہ حالت ہو جاتی ہے کہ اس میں مال و جاہ اور دوسری دنیاوی لذتوں کی طرف ذرا بھی رغبت نہیں رہتی' بلکہ وہ تمام نجاستوں سے پاک و صاف ہو جاتا ہے' اس میں اللہ تعالیٰ کی پاکیزہ محبت کے چراغ روشن ہو جاتے ہیں' اس کے بعد معرفت الٰہی اور محبت الٰہی کے لئے گنجائش پیدا ہوتی ہے۔ توبہ اور صبر وغیرہ مقامات دل کی تطہیر کے لئے مقدمات کی حیثیت رکھتے ہیں' اور یہ تطہیر محبت کے دو ارکان میں سے ایک رکن ہے' حدیث شریف میں اسی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے :۔

اَلطُّهُوْرُ شَطْرُ الْاِيْمَانِ۔ (مسلم۔ ابو مالک اشعری) پاکی نصف ایمان ہے۔

کتاب الطہارت کی ابتدا میں اس موضوع پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔

دوسرا سبب۔ معرفت الٰہی کو پختہ کرنا دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت کو قوی کرنے کا دوسرا سبب معرفت الٰہی کو تقویت دینا اور دل میں اسے اچھی طرح پھیلانا ہے' اور یہ اس وقت ممکن ہے جب کہ دل تمام دنیاوی مشاغل اور علائق سے پاک و صاف ہو' اس کی مثال ایسی ہے جیسے زمین کو تمام غیر ضروری گھاس سے پاک و صاف کرکے بیج ڈالا جاتا ہے۔ یہ محبت کا دوسرا رکن ہے' جب یہ بیج ڈال دیا جاتا ہے اور اس کی نگہداشت کی جاتی ہے تب محبت اور معرفت کا پودا اُگتا ہے' اور بڑھتے بڑھتے ایک تناور درخت کی حیثیت اختیار کرلیتا ہے' اسی کا نام کلمۂ طیبہ ہے' اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں بطور مثال فرمایا ہے :۔

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُهَا فِي السَّمَآءِ (پ ۱۳ ر ۱۷ آیت ۲۴)

اللہ تعالیٰ نے مثال بیان فرمائی ہے کلمۂ طیبہ کی کہ وہ ایک پاکیزہ درخت کے مشابہ ہے جس کی جڑ خوب گڑی ہوئی ہے اور اس کی شاخیں اونچائی میں جا رہی ہوں۔

اسی کلمے کی طرف قرآن کریم کی اس آیت میں اشارہ فرمایا گیا ہے :۔

اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهٗ (پ ۲۲ ر ۱۳ آیت ۱۰)

اچھا کلام اسی تک پہنچتا ہے اور اچھا کام اس کو پہنچاتا ہے۔

کلمۂ طیبہ سے مراد یہاں معرفت ہے' اور اعمال صالحہ اس کے لئے حمال اور خادم کی حیثیت رکھتے ہیں' اعمال صالحہ کے ذریعے ہی قلب کی تطہیر ہوتی ہے' اور اس طہارت کو بقا نصیب ہوئی ہے مگر اعمال صالحہ کا سلسلہ منقطع ہو جائے تو قلب کی طہارت بھی باقی نہ رہے۔ عمل کا مقصد ہی معرفت ہے اور علم عمل کی کیفیت جاننے کا نام ہے' اس کا مطلب یہ ہے کہ علم ہی اول ہے' اور علم ہی آخر ہے۔ اول علم علم معاملہ ہے' اور اس کا مقصد عمل ہے' علم معاملہ کے ذریعے قلب کو گندگی سے پاک کیا جاتا ہے تاکہ اس میں حضرت حق کی تجلی ہو سکے' اور وہ علم معرفت سے مزین ہو سکے' علم معرفت کا دوسرا نام علم مکاشفہ ہے' اور یہی دوسرا علم ہے' جب علم معرفت حاصل ہوتا ہے تو محبت ضرور حاصل ہوتی ہے' یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص معتدل مزاج ہو' اور کسی خوبصورت شئی کو دیکھے' اور جب مائل ہو گا تو اس میں لذت بھی پائے گا' لذت فطری طور پر محبت کے تابع ہے' اور محبت معرفت کے۔ اور اس معرفت تک بندہ اسی وقت تک پہنچ سکتا ہے جب کہ دنیاوی مشغولیات سے اپنا تعلق منقطع کرلے' اور انقطاع تعلق صفائے فکر' دوام ذکر' اور اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات' ملکوت اور تمام مخلوقات میں دوام نظر کے بغیر ممکن نہیں۔ معرفت و محبت کے اس مرتبے پر پہنچنے والوں کی دو قسمیں ہیں' ایک قسم اقویاء کی ہے' اقویاء وہ لوگ ہیں جو پہلے اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کرتے ہیں' اور اللہ کے ذریعے دوسروں کو پہچانتے ہیں' اور ضعفاء وہ ہیں جن کی معرفت کا آغاز افعال سے ہوتا ہے' پھر وہ افعال سے ترقی کرکے فاعل تک پہنچتے ہیں' پہلی قسم کی طرف اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے :۔

اَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ۔ (پ ۲۵ ر ۱ آیت ۵۳)

کیا آپ کے رب کی یہ بات کافی نہیں کہ وہ ہر چیز کا شاہد ہے۔

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ۔ (پ ۳ ر ۱۰ آیت ۱۸) گواہی دی اللہ نے اس کی بجز اس کے کوئی معبود ہونے کے لائق نہیں۔

کسی عارف سے دریافت کیا گیا کہ آپ نے اپنے رب کو کس طرح پہچانا' انہوں نے جواب دیا میں نے اپنے رب کو اسی سے پہچانا' اگر میرا رب نہ ہوتا تو میں اسے نہ پہچانتا' اور دوسری قسم کی طرف ان آیات میں اشارہ کیا گیا ہے:۔

سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ۔ (پ ۲۵ ر ۱ آیت ۵۳)

ہم عنقریب ان کو اپنی (قدرت کی) نشانیاں ان کے گردو نواح میں بھی دکھا دیں گے اور خود ان کی ذات میں بھی' یہاں تک کہ ان پر ظاہر ہو جائے گا کہ وہ قرآن حق ہے۔

اَوَلَمْ يَنْظُرُوْا فِيْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ (پ ۹ ر ۱۳ آیت ۱۸۵)

اور کیا ان لوگوں نے غور نہیں کیا آسمانوں اور زمین کے عالم میں۔

قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ (پ ۱۱ ر ۱۵ آیت ۱۰۱)

آپ کہہ دیجئے کہ تم غور کرو کہ کیا کیا چیزیں آسمانوں اور زمین میں ہیں۔

اَلَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا مَا تَرٰى فِيْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ۔ (پ ۲۹ ر ۱ آیت ۴)

جس نے سات آسمان اوپر تلے پیدا کئے' تو خدا کی صنعت میں خلل نہ دیکھے گا سو تو پھر نگاہ ڈال کر دیکھ لے کہیں تجھ کو کوئی خلل نظر آتا ہے' پھر بار بار نگاہ ڈال کر دیکھ (آخر کار) نگاہ ذلیل اور درماندہ ہو کر تیری طرف لوٹ آئے گی۔

اکثر لوگوں پر یہ طریقہ زیادہ سہل ہے' اور اس میں گنجائش بھی زیادہ ہے' قرآن کریم نے بھی اپنی ان بے شمار آیات کے ذریعہ جن میں تفکر' تدبر اور نظر و اعتبار کی دعوت دی گئی ہے اسی طریقے کی طرف رہنمائی کی ہے۔ اب اگر تم یہ کہو کہ یہ دونوں ہی طریقے تمہیں مشکل نظر آتے ہیں' اور یہ چاہو کہ تمہارے لئے کوئی ایک طریقہ آسان کر کے بیان کر دیا جائے تو ہم یہ کہیں گے کہ پہلا طریقہ جس میں اللہ تعالیٰ کے ذریعے مخلوق کی معرفت حاصل کی جاتی ہے وہ "واقعتہً مشکل" دقیق اور عام لوگوں کے لئے ناقابل فہم ہے۔ اب صرف دوسرا طریقہ باقی رہ جاتا ہے' اکثر لوگوں کی عقلیں اسے سمجھ سکتی ہیں' اگر لوگ اس طریقے کو مشکل سمجھتے ہیں تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ یہ طریقہ واقعتہً مشکل ہے' بلکہ اصل وجہ یہ ہے کہ وہ لوگ تدبر ہی نہیں کرتے' دنیاوی شہوات' اور نفسانی حظوظ میں مبتلا رہتے ہیں۔ ہم اس طریقے پر تفصیلی گفتگو اس لئے نہیں کر سکتے کہ یہ ایک طویل موضوع ہے' اس میں بڑا پھیلاؤ ہے' بڑی وسعت ہے' اس کی اتنی قسمیں ہیں کہ انہیں شمار نہیں کیا جاسکتا' اس لئے کہ آسمان کی بلندیوں سے زمین کی پستیوں تک کوئی ذرہ ایسا نہیں ہے جو اللہ تعالیٰ کے کمال قدرت' کمال حکمت' انتہائے جلال' اور غایت عظمت پر دلالت نہ کرتا ہو' یہ بے شمار ذرات ہیں' اور ہر ذرہ اپنے اندر لاتعداد دلالتیں سموئے ہوئے ہے۔

قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ۔ (پ ۱۶ ر ۳ آیت ۱۰۹)

آپ ان سے کہہ دیجئے کہ اگر میرے رب کی باتیں لکھنے کے لئے سمندر (کا پانی) روشنائی (کی جگہ) ہو تو میرے رب کی باتیں ختم ہونے سے پہلے سمندر ختم ہو جائے۔

ویسے بھی اس علم میں مشغول ہونے کا مطلب علم مکاشفہ کے سمندر میں غوطہ لگانا ہے' اور یہ بھی مناسب نہیں کہ اسے علوم معاملہ کے ضمن میں غیر اہم طریقے پر لکھ دیا جائے' البتہ ہم ایک مثال کے ذریعہ بطور اختصار کچھ عرض کرتے ہیں تاکہ اس جیسی دوسری باتوں پر تنبیہ ہو جائے۔

معرفت افعال سے معرفت خالق فی الحقیقت مذکورہ بالا دونوں طریقوں میں سے سہل ترین طریقہ افعال کی معرفت سے اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل کرنا ہے' آیئے پہلے افعال الٰہی پر نظر ڈالیں' اور ان میں سے بھی وہ افعال لیں جو دیگر افعال کے مقابلے میں معمولی اور حقیر ہیں' اور اس کے باوجود عجائب قدرت سے معمور ہیں' زمین اور اس کے اوپر بسنے والی مخلوق اور پائی جانے والی اشیاء ملائکہ' اور آسمانی ملکوت کے مقابلے میں نہایت معمولی اور حقیر ہیں' زمین کے جسم اور حجم ہی کو لیجئے بظاہر یہ اس قدر وسیع و عریض ہے مگر آفتاب جو ہمیں چھوٹا نظر آتا ہے اس سے ہزاروں گنا بڑا ہے' ایک طرف آفتاب کی وسعت دیکھئے' اور دوسری طرف اس آسمان کی وسعت دیکھئے جس سے وہ جڑا ہوا ہے۔ آفتاب اور آسمان میں وسعت کی کوئی مناسبت ہی نہیں ہے' آفتاب کا مرکز چوتھا آسمان ہے اور یہ آسمان اوپر کے آسمانوں کے مقابلے میں نہایت مختصر ہے' پھر یہ ساتوں آسمان کرسی کے سامنے ایسے ہیں جیسے کسی وسیع و عریض صحرا میں لوہے کا کڑا ل ڈال دیا جائے' اور کرسی عرش میں ایسی ہے جیسے ساتوں آسمان کرسی کے مقابلے میں ہیں' آفتاب' آسمان' اور عرش و کرسی کی وسعتوں کو سامنے رکھ کر دیکھئے' زمین کتنی مختصر اور کتنی حقیر ہے' بلکہ زمین تو دنیا کے سمندروں کے مقابلے میں بھی بہت چھوٹی ہے جیسا کہ ایک روایت میں ہے :۔

اَلْاَرْضُ فِی الْبَحْرِ کَالْاِصْطَبَلِ فِی الْاَرْضِ (۱) زمین سمندر میں ایسی ہے جیسے زمین میں اصطبل۔

مچھر کی تخلیق تجربے اور مشاہدے سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے کہ زمین کا جس قدر حصہ پانی سے بچا ہوا ہے وہ اس حصے کے مقابلے میں جو پانی سے لبریز ہے ایک مختصر جزیرہ معلوم ہوتا ہے' زمین کے بعد اب آپ اس پر بسنے والی مخلوق پر نظر ڈالیں' آدمی کو دیکھئے جو مٹی سے پیدا کیا گیا ہے' تمام حیوانات کا جائزہ لیجئے' تمام روئے زمین کے مقابلے میں وہ کس قدر حقیر اور معمولی نظر آتے ہیں' تمام حیوانات سے قطع نظر کر کے صرف وہ حیوانات تلاش کیجئے جو سب سے چھوٹے' اور کم جسامت رکھنے والے ہوں' عام طور پر مچھر اور مکھی کو سب سے چھوٹا اور حقیر حیوان تصور کیا جاتا ہے' ان دونوں حقیر جانوروں کو دیکھئے' مچھر اپنے مختصر ترین جسم کے باوجود جسیم و عریض جانور ہاتھی کے مشابہ ہے' اللہ تعالیٰ نے اس کے ہاتھی کی طرح سونڈ پیدا کی ہے' اور اسی کی ہیئت کے تمام اعضاء بنائے ہیں' سوائے ان بازوؤں کے جو ہاتھی کو بطور خاص عطا کئے گئے ہیں' اتنے مختصر جسم میں تمام اعضاء ظاہری موجود ہیں' آنکھ' کان' ناک' بازو' منہ' اور پیٹ باطنی اعضاء بھی تخلیق فرمائے ہیں' اور ان میں غاذیہ' جاذبہ' دافعہ' ماسکہ اور ہاضمہ قوتیں بھی رکھی ہیں' یہ تو مچھر کی شکل و صورت اور ہیئت کی بات ہوئی۔ یہ بھی تو دیکھئے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے عقل بھی عطا فرمائی' اور غذا کی طرف رہنمائی بھی کی' یعنی اس کے ننھے سے دماغ میں یہ بات ڈال دی کہ تیری غذا انسان کا خون ہے' پھر اس میں اڑنے کی قوت عطا کر کے انسان کی طرح اڑنے کی طاقت اور حوصلہ بھی عطا فرمایا' مچھر کی سونڈ نوکیلی ہے' جس کے ذریعے وہ آسانی کے ساتھ انسانی خون چوس لیتا ہے' اس کی نگاہ اتنی تیز ہے کہ وہ رات کی تاریکی میں انسانی اعضاء کے ان حصوں پر اپنی سونڈ رکھتا ہے جہاں خون موجود ہے' اس کی سونڈ مختصر ہونے کے باوجود سخت ہے کہ آدمی کا خون پتلا ہو کر اس میں سے گذر جاتا ہے اور اس کے پیٹ میں پہنچ جاتا ہے' اور اس کے تمام اعضاء میں پھیل کر غذا بہم پہنچاتا ہے' اس کے معدے اور اندرونی اعضاء کے بارے میں تصور کیجئے کہ وہ کس قدر چھوٹے چھوٹے ہوں گے' اور کس طرح اسے زندہ رہنے میں مدد دیتے ہوں گے پھر اللہ تعالیٰ نے اسے انسان سے بچنے کی تدبیر بھی سکھلائی ہے کہ انسان کا ہاتھ پہنچ بھی نہیں پاتا ہے کہ وہ اپنی جگہ چھوڑ کر اڑ جاتا ہے' اس کی سماعت اس قدر تیز بنائی کہ ادھر انسان کے ہاتھ نے حرکت کی ادھر اسے یہ احساس ہوا کہ اب اڑ جانا ہی بہتر ہے' پھر جب وہ یہ دیکھتا ہے کہ ہاتھ اپنی جگہ پُرسکون ہو گیا ہے تب اچانک دوبارہ حملہ کر دیتا ہے' اس کی آنکھوں کے ڈھیلے دیکھئے کتنے ننھے ننھے ہیں' لیکن بینائی کس قدر تیز ہے کہ اپنی غذا کی جگہ دیکھ لیتا ہے' اور وہیں حملہ کرتا ہے' کیوں کہ مچھر اور مکھی جیسے جانوروں کے چہرے اتنے ذرا ذرا سے ہیں کہ ان کی آنکھیں پپوٹوں کی متحمل نہیں ہو سکتیں اور پلکیں نگاہوں کے شیشوں کی صفائی اور غبار اور گندگی سے ان کی حفاظت کے لئے ضروری ہیں اس لئے اللہ

---

(۱) اس روایت کی اصل مجھے نہیں ملی۔

تعالیٰ نے انہیں دو بازو عنایت فرمائے مکھی کو دیکھیے وہ ہر وقت اپنے ان دونوں بازوؤں کو منہ پر پھیرتی رہتی ہے' انسان اور دیگر بڑے حیوانات کو آنکھوں کے ساتھ ساتھ پلکوں کی نعمت بھی دی ہے' اور نیچے اوپر پپوٹے بھی عطا کئے ہیں' یہ دونوں ایک دوسرے سے مل جاتے ہیں تو آنکھیں بند ہو جاتی ہیں' ان کے کنارے باریک بنائے ہیں تاکہ جو غبار وغیرہ ان پر جمع ہو جائے اسے پلکوں کی طرف منتقل کر دیں' پھر پلکوں کو سیاہ بنایا تاکہ آنکھ کی روشنی جمع رہے' اور دیکھنے میں معاون ہو آنکھ خوبصورت لگے' اور غبار کے وقت آنکھوں کے سامنے جال سا بن جائے جال بھی ایسا بنے کہ باہر کا غبار آنکھ کے اندر نہ آجائے' اور دیکھنے کا سلسلہ برقرار رہے۔ مچھر کے دو صاف ڈھیلے بنائے' ان کے ساتھ پپوٹے نہیں ہیں' لیکن وہ اپنی آنکھوں کی صفائی کے لئے اپنے دونوں بازو استعمال کرتا ہے' لیکن کیوں کہ اس کی بینائی کمزور ہے اس لئے وہ چراغ کی لو پر گر پڑتا ہے' نگاہ کے ضعف کی بنا پر وہ دن کی روشنی کا طالب ہے' چراغ کی روشنی اس کے لئے ناکافی ہے' چنانچہ جب وہ چراغ کی روشنی دیکھتا ہے تو یہ سمجھتا ہے کہ وہ کسی تاریک کمرے میں ہے' اور چراغ اس تاریک کمرے کا روشندان یا روشنی میں پہنچنے کا دروازہ ہے' بیچارہ روشنی کی تلاش میں جان دے دیتا ہے' اگر ایک مرتبہ بچ گیا تو یہ سمجھ کر اڑ جاتا ہے کہ میں غلطی سے تاریکی میں ہی ٹھوکریں کھا رہا ہوں مجھے باہر نکلنے کا راستہ نظر نہیں آسکا' دوبارہ پھر کوشش کرنی چاہیے' اسی کوشش میں' اور بار بار چراغ پر گرنے پڑنے میں بیچارہ اپنے ننھے سے وجود کو آگ کی نذر کر دیتا ہے۔

اب اگر تم یہ کہو کہ بینائی کا یہ ضعف مچھر کا نقص اور جہالت ہے' ہم یہ کہیں گے کہ انسان تو مچھر سے بھی بڑا جاہل اور ناقص ہے' انسان جب شہوات پر گرتا ہے تو وہ اس مچھر سے کسی بھی طرح کم نہیں ہوتا جو چراغ کی لو پر گرتا ہے' انسان کو شہوات کے ظاہری انوار متاثر کرتے ہیں' اور وہ یہ نہیں سمجھ پاتا کہ ان انوار کے پیچھے زہر قاتل چھپا ہوا ہے' بیچارہ بار بار شہوتوں پر ٹوٹتا ہے گرتا ہے یہاں تک کہ از سرتاپا ڈوب جاتا ہے' اور ہمیشہ کے لئے ہلاک ہو جاتا ہے' کاش انسان کا جہل بھی ایسا ہی ہوتا جیسا اس مچھر کا جہل ہے' یہ صحیح ہے کہ مچھر روشنی سے دھوکا کھاتا ہے' لیکن وہ ہلاک ہو کر آزاد ہو جاتا ہے' جب کہ آدمی اس ہلاکت کے ذریعے دائمی ہلاکت پاتا ہے' اسی لئے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اعلان فرمایا :۔

إِنِّي مُمْسِكٌ بِحُجَزِكُمْ عَنِ النَّارِ وَأَنْتُمْ تَتَهَافَتُونَ فِيهَا تَهَافُتَ الْفَرَاشِ۔ (بخاری و مسلم۔ ابو ہریرہ)

میں آگ سے تمہاری کمر تھامتا ہوں' اور تم اس میں پروانے کی طرح گرتے ہو۔

یہ اس چھوٹے سے جانور کے بے شمار عجائب میں سے ایک چھوٹا سا عجوبہ ہے۔ اس میں اتنے عجائب پوشیدہ ہیں کہ اگر تمام اولین و آخرین جمع ہو کر اس کی حقیقت دریافت کرنا چاہیں تو ناکام رہ جائیں' اس کی حقیقت کا تو وہ کیا ادراک کر سکیں گے جو ظاہری امور ہیں ان کا جاننا بھی ممکن نہیں ہے۔ مخفی امور کا علم صرف اللہ کو ہے۔

مکھی کے عجائبات یہ عجائب تمام حیوانات اور نباتات میں ہیں' بلکہ ہر حیوان و نبات میں کوئی نہ کوئی عجوبہ ایسا ہے جس میں اسے خصوصیت حاصل ہے' کوئی دوسرا اس میں شریک نہیں ہے۔ اب مکھی کا جائزہ لیجئے' اللہ تعالیٰ نے اسے بتلایا اور اس نے پہاڑوں' درختوں اور چھتوں پر چھتے بنائے' مکھی کے لعاب سے موم اور شہد بنتا ہے' اور شہد میں شفا رکھی گئی ہے' عجیب بات یہ ہے کہ وہ اپنے مقصد کے حصول کے لئے پھولوں' پھلوں اور کلیوں پر بیٹھتی ہے' نجاست اور گندگی پر نہیں بیٹھتی' اپنے حاکم کی اطاعت کرتی ہے' ان کا حاکم جسم میں عام مکھیوں سے بڑا ہوتا ہے' اللہ تعالیٰ نے اسے اتنی سمجھ عطا کی ہے کہ اگر کوئی مکھی گندگی لے کر چھتے میں جانا چاہتی ہے تو وہ اسے فوراً ہلاک کر دیتا ہے' کس قدر حیرت انگیز نظام ہے' لیکن اس نظام میں وہی شخص اپنے لئے کام کی باتیں دیکھ سکتا ہے جسے بصیرت حاصل ہو اور پیٹ اور شرمگاہ کی شہوات سے فراغت نصیب ہو' سب سے زیادہ تعجب خیز معاملہ اس کے مکان کا ہے' یہ مکان موم سے بناتی ہے' اس کی شکل مسدّس ہوتی ہے' نہ گول' نہ مربع نہ مخمّس' نہ اس کے پاس پیمائش کے آلات ہوتے ہیں' نہ انجینئروں کی سی عقل و خرد' مگر اس کا مکان دیکھ کر اچھے اچھے انجینئر انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں' اس کا مکان چھ گوشہ اس لئے ہوتا ہے کہ یہی شکل دائرے کی وسیع ترین شکل ہے' اور یہی اس کے لئے موزوں ہے' اس لئے کہ مربع

بنانے کی صورت میں کونے بیکار ہو جاتے ہیں مکھی کی شکل کیوں کہ گول ہوتی ہے' مربع میں رہنے سے زاویے بیکار جاتے' اور اگر گول بناتی تو گھر سے باہر فرجے بیکار رہ جاتے' اس لئے کہ جب گول چیزیں ایک دوسرے سے جوڑی جاتی ہیں تو اچھی طرح مل نہیں پاتیں' بہرحال زاویہ رکھنے والی شکلوں میں مسدس کے علاوہ کوئی شکل ایسی نہیں ہے جو گول جسم کے لئے موزوں ہو' اور اس میں فرجہ بھی باقی نہ رہے' دیکھئے اللہ تعالیٰ نے مکھی کو اس کے مختصر جسم کے باوجود اپنی عنایت اور مہربانی سے کس قدر عمدہ تدبیر سکھلائی تاکہ وہ سکون سے زندگی بسر کر سکے' اللہ پاک ہے' بڑی شان والا ہے' اس کا لطف وسیع اور احسان عام ہے۔

ان مختصر جانوروں کے یہ مختصر عجائب دیکھئے اور ان سے عبرت لیجئے' آسمان و زمین کے ملکوت کو چھوڑیے کہ اس کے اسرار کا ادراک ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہے' مکھی' مچھر کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ بھی موضوع کا پورا احاطہ نہیں ہے' اگر ہم ان دونوں جانوروں کے ایک ایک پہلو پر لکھنا چاہیں تو عمریں گذر جائیں' اور مقصد حاصل نہ ہو' حالانکہ ہم جو کچھ لکھیں گے وہ ہمارے علم اور فہم کے مطابق ہو گا جب کہ ہمارے علم کو علماء اور انبیاء کے علوم سے کوئی نسبت نہیں ہے' اور تمام مخلوق کو جو علم حاصل ہے اسے اللہ تعالیٰ کے علم سے ادنیٰ نسبت نہیں ہے' بلکہ مخلوق کو جو علم حاصل ہے اللہ تعالیٰ کے علم کے مقابلے میں اسے علم کہنا ہی غلط ہو گا۔

حال اگر آدمی اللہ تعالیٰ کے عجائبات پر اسی طرح غور کرتا ہے تو اسے وہ معرفت حاصل ہو جاتی ہے جو دونوں طریقوں میں سے زیادہ آسان ہے' اور جب معرفت زیادہ ہوتی ہے تو محبت بھی زیادہ ہوتی ہے' اگر تمہیں اللہ تعالیٰ سے ملنے کی تمنا ہے' اور تم اس سے شوق ملاقات رکھتے ہو' اور آخرت میں دیدار کی سعادت حاصل کرنا چاہتے ہو تو دنیا کی طلب سے اعراض کرو ذکر و فکر کو لازم پکڑلو' ممکن ہے مسلسل مجاہدہ کرنے سے تمہیں معرفت و محبت کا کچھ حصہ مل جائے یاد رکھو دنیا کی لذات چھوڑنے سے تمہیں جو سلطنت ملے گی وہ تمہارے تصور سے زیادہ وسیع اور ابدی ہو گی۔

محبت میں لوگوں کے تفاوت کے اسباب اصل محبت میں تمام مومنین شریک ہیں' کیوں کہ ان کا ایمان مشترک ہے' مگر محبت کے درجات میں مختلف ہیں' اور یہ تفاوت اس لئے ہے کہ وہ معرفت اور حبّ دنیا میں مختلف ہیں' دراصل اشیاء کا تفاوت اپنے اسباب و علل کے تفاوت پر مبنی ہوتا ہے محبت الٰہی کا سبب معرفت ہے' اگر معرفت کم زیادہ ہو گی تو محبت میں بھی یقینی طور پر کمی یا زیادتی ہو گی' اکثر لوگ اللہ تعالیٰ کے بارے میں ان اسماء اور صفات سے زیادہ نہیں جانتے جو انہوں نے اپنے کانوں سے سن رکھی ہیں' یہ اسماء اور صفات انہوں نے یاد کرلی ہیں۔ اور کم فہمی کے باعث بعض اوقات ان کے ایسے معانی و مطالب تصور کر لیتے ہیں جن سے اللہ تعالیٰ نہایت بلند ہے۔ بعض لوگ ایسے ہیں جو ان اسماء و صفات کے حقائق پر مطلع نہیں ہوتے' اور نہ ان کے کوئی فاسد معنیٰ تصور کرتے ہیں بلکہ سنتے ہیں اور تسلیم و تصدیق کے طور پر ایمان لے آتے ہیں' اور عمل میں مشغول ہو جاتے ہیں' مزید کسی بحث میں نہیں پڑتے' یہ لوگ اصحاب یمین میں سے سلامتی والے ہیں' اور فاسد معنیٰ وضع کرنے والے گمراہ ہیں' اور حقائق کے جاننے والے مقرّب ہیں' اللہ تعالیٰ نے ان تینوں اصناف کا ذکر مندرجہ ذیل آیت کریمہ میں کیا ہے :۔

فَأَمَّا إِنْ كَانَ مِنَ الْمُقَرَّبِينَ فَرَوْحٌ وَرَيْحَانٌ وَجَنَّتُ نَعِيمٍ وَأَمَّا إِنْ كَانَ مِنْ أَصْحَابِ الْيَمِينِ فَسَلَامٌ لَكَ مِنْ أَصْحَابِ الْيَمِينِ وَأَمَّا إِنْ كَانَ مِنَ الْمُكَذِّبِينَ الضَّالِّينَ فَنُزُلٌ مِنْ حَمِيمٍ وَتَصْلِيَةُ جَحِيمٍ (پ ۲۷ ر ۱۶ آیت ۹۴)

پھر جو شخص مقربین میں سے ہو گا اس کے لئے تو راحت ہے اور غذائیں ہیں' اور آرام کی جنت ہے' اور جو شخص داہنے والوں میں سے ہو گا تو اس سے کہا جائے گا کہ تیرے لئے امن و امان ہے کہ تو داہنے والوں میں سے ہے' اور جو شخص جھٹلانے والوں اور گمراہوں میں سے ہو گا تو کھولتے ہوئے پانی سے اس کی دعوت ہو گی۔

کیوں کہ تم عام طور پر ایسی اہم باتیں مثال کے ذریعے سمجھتے ہو' اس لئے ہم پہلے مثال بیان کرتے ہیں' اس سے سمجھ میں آئے گا کہ

ایک ہی شئی کی محبت میں لوگ مختلف کیسے ہوتے ہیں' مثال یہ ہے کہ شافعی مذہب کے ماننے والے تمام کے تمام حضرت امام شافعی کی محبت میں شریک ہیں' ان میں فقہاء بھی ہیں' عوام بھی ہیں' یہ سب لوگ امام شافعیؒ کے فضل و کمال' سیرت و کردار' اور عمدہ خصلتوں سے واقف ہیں' لیکن عام آدمی کی واقفیت اجمالی ہے' جب کہ فقیہ پورے طور پر آپ کی خصوصیات پر مطلع ہے' اس لئے قدرتی طور پر فقیہ کی معرفت مکمل ہوگی' اور وہ اپنی محبت میں بھی شدید تر ہوگا۔ اسی طرح اگر ایک شخص کسی مصنّف کو اس کی کسی تصنیف کے باعث اچھا سمجھتا ہے' اور اس کے فضل و کمال کا اعتراف کرتا ہے' اب اگر اس کے سامنے اس مصنّف کی کوئی دوسری تصنیف آجائے' اور یہ تصنیف پہلی تصنیف کے مقابلے میں زیادہ اچھی ہو تو یقیناً" اس کی محبت میں اضافہ ہوگا' اور وہ اپنے محبوب کے فضل و کمال کا پہلے سے زیادہ معترف ہوگا۔ یہی حال اس شخص کا ہے جو کسی شاعر کی قادر الکلامی سے متاثر ہے' اور اس کے حسن تخیل کا معترف ہے' اب اگر اس کو اپنے پسندیدہ شاعر کے کچھ اور اشعار سننے کو ملیں جو اس سے پہلے نہیں سنے تھے' اور جو پچھلے اشعار کے مقابلے میں لفظی اور معنوی صنائع کا نادر مجموعہ ہیں تو یقیناً" شاعر سے اس کی محبت پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ جائے گی' تمام علوم و فنون کا یہی حال ہے' جو معرفت رکھتا ہے وہ اپنی معرفت میں بڑھتا رہتا ہے' اور اسی اعتبار سے محبت میں بھی' دوسری طرف عامی ہے وہ اگر سنتا بھی ہے تو صرف اس قدر کہ فلاں شخص مصنّف ہے' اور اس کی تصانیف عمدہ ہیں' وہ یہ نہیں جانتا کہ اس کی تصانیف میں کون کون سے علوم پوشیدہ ہیں' اس کی معرفت اجمالی ہوتی ہے' اور اسی اعتبار سے اس کی محبت بھی اجمالی ہوتی ہے' صاحب بصیرت انسان محض سننے پر اکتفا نہیں کرتا' بلکہ تصانیف کی ورق گردانی کرتا ہے' علم کے آبدار موتی تلاش کرتا ہے' اور اپنی جدوجہد سے ان عجائب پر مطلع ہونا چاہتا ہے جو ان تصانیف میں بکھرے ہوئے ہیں' اور جب وہ اپنی جدوجہد میں کامیاب ہو جاتا ہے تو اس کی محبت دوچند ہو جاتی ہے۔ کیوں کہ صنعت' شعر اور تصنیف کے عجائب فن کار اور مصنّف کے فضل و کمال پر دلالت کرتے ہیں۔ اسے بھی ایک مثال کی روشنی میں دیکھو' یہ دنیا اللہ تعالیٰ کی تخلیق و تصنیف ہے' عام انسان اس کا علم اور اعتقاد رکھتا ہے' لیکن اجمالی' جب کہ صاحب بصیرت انسان اس کی تفاصیل جانتا ہے' ان میں غور کرتا ہے' یہاں تک کہ حقیر چیزوں میں ایسے عجائب تلاش کرتا ہے جنہیں دیکھ کر عقل دنگ رہ جائے۔ اس تفصیلی مطالعے سے اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کی عظمت' جلال اور صفات کا کمال بڑھتا ہے' اور اسی اعتبار سے دل میں اس کی محبت بڑھتی ہے' پھر جس قدر اس کی معلومات وسیع ہوتی ہیں اسی قدر اس کی معرفت اور محبت بڑھتی ہے' اللہ تعالیٰ کے عجائب صنعت کا سمندر ایک ناپیدا کنار سمندر ہے' اس لئے اگر اس معرفت کے حاملین محبت میں متفاوت ہوں تو یہ کوئی حیرت انگیز امر نہیں ہے' محبت ان پانچ اسباب کی وجہ سے بھی مختلف ہوتی ہے جو ہم نے پہلے بیان کئے ہیں' یعنی بعض لوگ اللہ تعالیٰ سے اس لئے محبت کرتے ہیں کہ وہ ان پر احسان و انعام کرنے والا ہے' ظاہر ہے یہ محبت اس کی ذات سے نہیں ہوتی' اس لئے ضعیف ہوتی ہے' اور ضعف کی علامت یہ ہے کہ احسان کے تغیر سے اس میں بھی تغیر آتا رہتا ہے' چنانچہ مصیبت کے وقت اس کی محبت کا عالم اور ہوگا اور راحت کے وقت اور' اور جو شخص اس کی ذات سے محبت کرتا ہے' یا اس لئے کہ وہ اپنے کمال' جمال' اور غیرت و جلال کے باعث اس محبت کا مستحق ہے اس کی محبت میں احسان کے تفاوت سے کوئی فرق نہیں آتا۔ یہ ہیں محبت میں تفاوت کے اسباب۔ اور یہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں کہ آخرت کی سعادت بھی محبت کے اختلاف کے اعتبار سے مختلف ہوگی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :۔

وَلَلْاٰخِرَةُ اَكْبَرُ دَرَجٰتٍ وَّاَكْبَرُ تَفْضِيْلًا۔ (پ ۱۵ ر ۲ آیت ۲۱)

اور البتہ آخرت درجوں کے اعتبار سے بھی بہت بڑی ہے اور فضیلت کے اعتبار سے بھی بہت بڑی ہے۔

معرفت الٰہیہ میں مخلوق کے قصور فہم کے اسباب اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ موجودات میں سب سے زیادہ ظاہر اور واضح اللہ تعالیٰ کا وجود ہے' اس لحاظ سے ہونا یہ چاہیے تھا کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت معارف میں سرفہرست ہوتی' ذہن اس کی طرف زیادہ سبقت کرتے' فہم کے اعتبار سے اس سے زیادہ آسان معرفت کوئی دوسری نہ ہوتی' لیکن معاملہ اس کے برعکس

ہے' اللہ تعالیٰ کی معرفت جس قدر مشکل ہے اس قدر مشکل دوسرے موجودات کی معرفت نہیں ہے آخر اس کی وجہ کیا ہے؟
جاننا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کا اظہر ہونا جس اعتبار سے ہے وہ بغیر مثال کے سمجھ میں نہیں آسکتا' اس لئے پہلے ہم مثال بیان کرتے ہیں' اور وہ مثال یہ ہے کہ اگر ہم کسی انسان کو لکھتے ہوئے یا سیتے ہوئے دیکھیں تو اس کا زندہ ہونا ہمارے نزدیک باقی تمام موجودات تمام ظاہری اور باطنی صفات کے مقابلے میں زیادہ واضح اور ظاہر ہے' اس لئے کہ باطنی صفات جیسے شہوت' غضب' خلق' صحت' مرض وغیرہ ہماری نگاہوں سے مخفی ہیں' اور ہم ان کے وجود سے بے خبر ہیں' اور ظاہری صفات میں سے بعض سے ہم واقف ہیں' اور بعض میں ہمیں شک ہے جیسے لمبائی' چہرہ کا رنگ وغیرہ۔ البتہ اس کی زندگی' قدرت' ارادہ' علم اور اس کا حیوان ہونا ہمارے نزدیک واضح ہے' حالانکہ ان صفات سے ہماری حسّ بصر بھی متعلق نہیں ہے' گویا یہ چیزیں حواس خمسہ میں سے کسی حس سے ظاہر نہیں ہوتیں' لیکن ان صفات کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم اس کے سینے کے عمل یا حرکت کو دیکھیں۔ اس مثال کو سامنے رکھو' اور یہ دیکھو کہ اگر ہم تمام عالم پر نظر ڈالیں تو ہمیں اللہ تعالیٰ کی صفت کا علم کیوں نہیں ہو سکتا' دونوں صورتوں میں دلیل ایک ہی ہے' ہم جتنی چیزوں کا مشاہدہ کرتے ہیں اور ظاہری و باطنی حواس سے جن اشیاء کا ادراک کرتے ہیں خواہ وہ شجر ہو یا حجر' انسان ہو یا حیوان' آسمان ہو یا زمین' چاند ستارے ہوں یا سورج' خشکی ہو یا تری' آگ ہو یا پانی' جوہر ہو یا عرض۔ ان میں سے ہر چیز اللہ تعالیٰ کے وجود پر دلالت کرتی ہے' بلکہ اس کے وجود پر پہلی شہادت خود ہمارے نفوس' ہمارے اجسام' ہمارے اوصاف' ہمارے احوال کے تغیر' ہمارے قلوب کے انقلاب' اور ہماری حرکات و سکنات سے ملتی ہے۔

ہمارے محدود علم کی رو سے ہمارے نزدیک سب سے زیادہ واضح خود ہمارے نفوس ہیں' پھر وہ اشیاء ہیں جنہیں ہم اپنے حواس خمسہ سے محسوس کرتے ہیں' پھر وہ چیزیں ہیں جن کا ادراک ہم اپنی عقل و بصیرت سے کرتے ہیں۔ ان مدرکات میں سے ہر شئی کا ایک مدرک' ہر ایک کے لئے ایک دلیل اور ہر ایک کا ایک شاہد ہے' اس عالم میں جتنے بھی موجودات ہیں وہ سب اس حقیقت پر واضح اور کامل دلیل ہیں کہ ان کا خالق' ان کا مدبّر' ان کا محرک اور معرّف موجود ہے' یہ موجودات اس کے علم' قدرت' لطف اور حکمت پر بھی دلالت کرتے ہیں' یہ موجودات جن کا ہم ادراک کرتے ہیں یا کر سکتے ہیں بیشمار ہیں' اگر کاتب کی زندگی محض اس لئے ہمارے نزدیک ظاہر ہے کہ اس کی حرکت ہمارے مشاہدے میں ہے' اس کے علاوہ کوئی دوسرا شاہد نہیں ہے' پھر ہم اس وجود کا تصور کیوں نہیں کرتے جس پر بے شمار شواہد دلالت کرتے ہیں' اور یہ شواہد ہمارے نفوس کے اندر بھی ہیں اور نفوس سے باہر بھی۔ ہر ذرّہ زبان حال سے پکار پکار کر کہتا ہے کہ وہ خود بخود وجود پذیر نہیں ہوا ہے' اور نہ اس کی حرکت ذاتی ہے۔ بلکہ وہ اپنے وجد میں بھی ایک موجد کا محتاج رہا۔ اب حرکت میں بھی ایک محرک کا محتاج ہے۔ اللہ تعالیٰ کے وجود پر سب سے پہلے خود ہمارے جسمانی نظام سے شہادت ملتی ہے' اعضاء ایک دوسرے سے مربوط ہیں' ہڈیاں جڑی ہوئی ہیں' گوشت کے اجزاء ایک دوسرے میں پیوستہ ہیں' پٹھے ایک دوسرے سے منسلک اور وابستہ ہیں' ان کے علاوہ مسامات' ہاتھ پاؤں اور دیگر اعضاء کی بناوٹ' ظاہری شکل و صورت اور باطنی نظام' یہ سب چیزیں کیا خود بخود پیدا ہو سکتی ہیں' ہرگز نہیں' ہمارا جسمانی نظام زبان حال سے کہہ رہا ہے کہ یہ نظام خود بخود تشکیل نہیں پاتا' بلکہ اس کا ایک بنانے والا بھی ہے' جیسے کاتب کا ہاتھ خود بخود حرکت نہیں کرتا' بلکہ اسے حرکت دی جاتی ہے' تب حرکت کرتا ہے' بہرحال موجودات میں سے کوئی چیز خواہ وہ مدرک ہو' یا محسوس' یا معقول' حاضر ہو یا غائب ایسی نہیں ہے جو اللہ تعالیٰ کے وجود پر شاہد نہ ہو' اور اس کی عظمت پر دلالت نہ کرتی ہو' اس کا ظہور ان شہادتوں اور دلالتوں سے اتنا واضح اور نمایاں ہے کہ عقلیں حیران نظر آتی ہیں' اور ذہن عاجز۔ اور بظاہر عجز و قصور کے دو سبب ہیں۔ ایک تو یہ کہ کوئی شئی اتنی مخفی اور باریک ہو کہ نظر نہ آسکے' اس کی مثال بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے' ہر شخص اس سے واقف ہے۔ اور دوسرا سبب یہ ہے کہ کوئی شئی حد سے زیادہ واضح ہو' جیسے شپرک رات کو دیکھتی ہے' دن کو نہیں دیکھ پاتی' اس لئے کہ دن نہایت اجلا اور روشن ہے' اور وہ اپنی کمزور آنکھوں سے اس اجالے کی متحمل نہیں ہو سکتی' چنانچہ جب سورج چمکتا ہے تو اس کی آنکھیں شدّت کی دھوپ برداشت نہیں کر

باتیں بلکہ خود بخود بند ہو جاتی ہیں' البتہ جب روشنی میں تاریکی کا امتزاج ہو جاتا ہے اور سورج کی روشنی کمزور پڑ جاتی ہے تب اس کی بینائی کام کرتی ہے' یہی حال ہماری عقلوں کا ہے' ہماری عقلیں ضعیف ہیں' اور اللہ تعالیٰ کا جمال نہایت روشن اور جلی ہے' اور چاروں طرف پھیلا ہوا ہے' یہاں تک کہ زمین و آسمان کے ملکوت کا کوئی ذرّہ ایسا نہیں ہے جس پر اس کے جمال کا پرتو نہ ہو' اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا ظہور ہی اس کے حجاب کا باعث بن گیا۔ پاک ہے وہ جو اپنے نور سے پوشیدہ ہوا' اور اپنے ظہور کی بنا پر نگاہوں سے مخفی ہوا۔

ظہور کے سبب مخفی رہنے پر حیرت نہ کرنی چاہیے' اس لئے کہ اشیاء اپنی اضداد سے پہچانی جاتی ہیں' ہاں اگر کوئی چیز ایسی عام ہو کہ اس کی ضد ہی نہ ہو تو اس کا ادراک یقیناً مشکل ہو گا' یا اشیاء مختلف نوع کی ہوں کہ بعض دلالت کرتی ہوں اور بعض نہ کرتی ہوں تو ان میں آسانی سے فرق کیا جا سکتا ہے' اور اگر وہ دلالت میں ایک ہی طرز پر مشترک ہوں تب یقیناً مشکل پیش آئے گی' جیسے آفتاب کی روشنی زمین پر پڑتی ہے' ہم اس کے بارے میں جانتے ہیں کہ یہ ایک عرض ہے جو آفتاب کے ساتھ قائم ہے' اور آفتاب غروب ہونے پر نظروں سے او جھل ہو جاتا ہے اسی کے ساتھ اس کی روشنی بھی چھپ جاتی ہے' اگر یہ آفتاب ہمیشہ روشن رہتا' اور کبھی غروب نہ ہوتا تو ہم یہ سمجھتے کہ اجسام میں ان کے رنگوں سیاہی اور سفیدی وغیرہ کے علاوہ کوئی اور رنگ ہی نہیں ہے' کیوں کہ ہر وقت یہی رنگ نظر آتے ہیں' سیاہ میں سیاہی' اور سفید میں سفیدی' روشنی جسم نہیں ہے کہ ہم تنہا اس کا ادراک کر سکیں' لیکن جب سورج غروب ہو جاتا ہے اور ہر جگہ تاریکی اپنا قبضہ جما لیتی ہے تب ہم ان دونوں حالتوں میں نمایاں فرق محسوس کرتے ہیں اور اس وقت یہ بات جانتے ہیں کہ جیسا دھوپ سے روشن تھے' اور ایک ایسے وصف سے متصف تھے جو غروب کے وقت نہیں ہے' گویا ہم روشنی کے وجود کو اس کے عدم سے جانتے ہیں' اگر روشنی معدوم نہ ہوتی تو ہم ہرگز یہ نہ جانتے کہ روشنی کا وجود ہے' اس لئے کہ دھوپ کی روشنی میں اجسام یکساں نظر آتے ہیں' اندھیرے اجالے کا کوئی فرق نہ ہوتا۔ اب دیکھئے نور سے ایک چیز کا حال کس طرح مشتبہ ہو جاتا ہے' حالانکہ نور محسوسات میں سب سے واضح ہے' اور اس کے ذریعے دوسری چیزیں بھی واضح ہوتی ہیں' مگر ایک اندھیرے کے نہ ہونے سے وہ تمام چیزیں مشتبہ ہو جاتی ہیں جن پر روشنی کا اثر ہوتا ہے' اس مثال کو ذہن میں رکھ کر سوچئے اللہ تعالیٰ موجودات میں ظاہر تر ہے' تمام چیزیں اسی سے ظاہر ہوتی ہیں' اگر اس کا معدوم و غائب ہونا یا متغیر ہونا ممکن ہوتا تو زمین و آسمان گر پڑتے' اور ملک و ملکوت بیکار ہو جاتے' اس وقت دونوں حالتوں کا فرق محسوس ہوتا۔ اسی طرح اگر بعض اشیاء کا وجود اس سے ہوتا' اور بعض کا غیر سے تب بھی یہ فرق معلوم کیا جا سکتا تھا' لیکن اللہ تعالیٰ کی دلالت تو تمام اشیاء میں یکساں ہے' اور اس کا وجود ہر حالت میں دائمی ہے' اس کے خلاف ہونا محال ہے' بہرحال اللہ تعالیٰ کا شدّتِ ظہور اس کے خفا کا باعث بن گیا' اسی لئے عقلیں فہم سے قاصر رہ جاتی ہیں' البتہ جس شخص کی بصیرت قوی اور عقل پختہ ہوتی ہے وہ اس معاملے میں اعتدال پر رہتا ہے' وہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو نہیں دیکھتا' اور نہ غیر کو پہچانتا ہے' وہ یہ جانتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی موجود نہیں ہے' تمام افعال اس کی قدرت کے آثار اور اس کے وجود کے تابع ہیں' حقیقی وجود صرف اس کا ہے' جس شخص کی بصیرت کا یہ حال ہو وہ ہر فعل میں فاعل کی جستجو کرتا ہے' اس کی نظر فعل پر نہیں ٹھہرتی کہ یہ آسمان ہے' یہ زمین ہے' یا یہ حیوان ہے یا درخت ہے' بلکہ وہ یہ دیکھتا ہے کہ یہ تمام چیزیں واحد برحق کی کاریگری کا نمونہ ہیں' اس کی نگاہ واحد برحق پر ہی ٹھہرتی ہے' اس سے تجاوز نہیں کرتی' یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص کسی انسان کا شعر یا اس کی تحریر یا تصنیف دیکھے' ظاہر ہے وہ اس میں شاعر' خطاط یا مصنّف کا پرتو اور اثر دیکھتا ہے' اس لئے اگر اس کی زبان سے تعریفی الفاظ ادا ہوتے ہیں تو وہ صرف مصنّف شاعر یا خطاط کے لئے ہوتے ہیں وہ کسی تصنیف کو اس نقطۂ نظر سے نہیں دیکھتا کہ اس میں روشنائی ہے یا یہ الفاظ کاغذ پر لکھے ہوئے ہیں' ظاہر ہے ایسے شخص کی نظر صرف مصنّف پر ہو گی اس سے تجاوز نہیں کرے گی۔

یہ عالم اللہ تعالیٰ کی تصنیف ہے' جو شخص اس عالم کو اس لحاظ سے دیکھتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کا فعل ہے' اور اسی اعتبار سے اسے

پہچانتا ہے' اور اسی خیال سے اس کو پسند کرتا ہے تو اس کی نظر کبھی اللہ تعالیٰ سے تجاوز نہیں کرے گی' نہ وہ کسی غیر کو پہچانے گا' نہ کسی غیر سے محبت کرے گا' حقیقت میں موحد وہی ہے جس کی نظر اللہ کے سوا کسی پر نہ ہو' حتیٰ کہ وہ اپنی طرف بھی دیکھے تو یہ سوچ کر دیکھے کہ میں اللہ کا بندہ ہوں' ایسے شخص کے بارے میں یہ کہنا صحیح ہوگا کہ یہ شخص توحید میں فنا ہو چکا ہے' اور اپنے نفس سے بھی فنا ہو گیا ہے' جس شخص نے بھی کہا ہے صحیح کہا ہے کہ ہم اپنے آپ سے فنا ہو گئے' اب بغیر "اپنے آپ" کے باقی ہیں۔ یہ باتیں اہل عقل اور اصحاب بصیرت اچھی طرح جانتے ہیں' البتہ وہ لوگ ان حقائق کا ادراک نہیں کر پاتے جن میں قوت فہم نہیں ہے' یا جن کی عقل کمزور ہے' یا اسے علماء کا قصور قرار دے لیجئے کہ وہ یہ باتیں عوام کو مناسب تشریح و توضیح کے ساتھ سمجھا نہیں پاتے' یا وہ اپنے نفس میں مشغول رہتے ہیں اور یہ گمان کرتے ہیں کہ عوام کو اس طرح کی باتیں بتلانے میں کوئی فائدہ نہیں ہے' بہرحال وجہ خواہ ان کا عجز و قصور ہو یا علماء کی طرف سے غفلت و تساہل ہو کچھ بھی ہو عام طور پر لوگ اللہ تعالیٰ کی معرفت سے عاجز رہ جاتے ہیں۔

یوں تو انسان ان مدرکات کا بچپن ہی میں ادراک کر لیتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے وجود اور وحدانیت پر دلالت کرتے ہیں' لیکن جب اس میں عقل آتی ہے اور شعور پیدا ہوتا ہے تو اپنی شہوات میں غرق ہو جاتا ہے' اور ان مدرکات سے مانوس ہو جاتا ہے جنہیں وہ بچپن سے دیکھتا آ رہا تھا' یہاں تک کہ دل سے ان کی اہمیت نکل جاتی ہے' یہی وجہ ہے کہ اگر کسی شخص کی نظر اچانک کسی عجیب و غریب جانور یا پودے پر پڑ جائے' یا اللہ تعالیٰ کے عجائب افعال میں سے کوئی فعل سامنے آ جائے تو وہ بے ساختہ سبحان اللہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے' جب کہ وہ رات دن اپنے نفس کو' اپنے جسمانی نظام کو' اور ارد گرد پھیلی ہوئی چیزوں کو دیکھتا ہے مگر اسے یہ توفیق نہیں ہوتی کہ وہ انہیں دیکھ کر سبحان اللہ کہہ دے' حالانکہ یہ تمام چیزیں اللہ تعالیٰ کے وجود پر یقینی شہادت کا درجہ رکھتی ہیں' مگر وہ ان کے ساتھ اپنے طول انس کی وجہ سے ان کی شہادت محسوس نہیں کرتا' البتہ اگر کوئی شخص مادر زاد اندھا ہو' اور اچانک اسے بینائی مل جائے اور وہ پہلی بار آسمان' زمین' درخت' سبزہ' حیوان اور دوسری مخلوقات و موجودات کا مشاہدہ کرے تو اس کے متعلق یہ اندیشہ کیا جاتا ہے کہ کہیں اس کی عقل خبط نہ ہو جائے' اور اپنے خالق کی اس قطعی شہادت پر اس قدر حیرت زدہ ہو کہ اپنی حیرت کا اظہار بھی نہ کر سکے۔

مذکورہ اسباب کے علاوہ بھی بہت سے امور ایسے ہیں جنہوں نے مخلوق پر انوار معرفت سے فیضیاب ہونے' اور بحر معرفت میں غوطہ لگانے کے دروازے بند رکھے ہیں' اور وہ امور ہیں شہوات میں مستغرق ہونا' دنیاوی مال و متاع کی محبت میں گرفتار رہنا وغیرہ۔ جو لوگ معرفت کی جستجو اور طلب میں سرگرداں نظر آتے ہیں ہمیں ان کے حال پر حیرت ہوتی ہے کہ کیا وہ بالکل ہی عقل و خرد سے بیگانہ ہیں' یا اس شخص کی طرح ہیں جو گدھے پر بیٹھا ہوا ہے' اور گدھے کی تلاش میں پریشان پھر رہا ہے' اصل میں جب واضح اور بدیہی امور مطلوب ہو جاتے ہیں تو مشکل بن جاتے ہیں' کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے :-

لَقَدْ ظَهَرْتَ فَمَا تَخْفٰى عَلٰى اَحَدٍ ... اِلَّا عَلٰى اَكْمَهٍ لَا يَعْرِفُ الْقَمَرَا

لٰكِنْ بَطَنْتَ بِمَا اَظْهَرْتَ مُحْتَجِبًا ... فَكَيْفَ يُعْرَفُ مَنْ بِالْعُرْفِ قَدْ سُتِرَا

(تو ظاہر ہے' کسی پر مخفی نہیں ہے' الا یہ کہ کوئی شخص مادر زاد اندھا ہو کہ چاند بھی نہ دیکھ سکے' لیکن تو اپنے طور سے پردۂ خفا میں ہے وہ کیسے پہچانا جائے جس کی شہرت ہی حجاب سے ہو)۔

شوق خداوندی کے معنی جو شخص اللہ تعالیٰ کے لئے محبت کا منکر ہو' اسے حقیقت شوق کا بھی انکار کرنا چاہیے' اس لئے کہ شوق صرف محبوب کے لئے متصور ہے۔ اس عنوان کے تحت ہم یہ بیان کرنا چاہتے ہیں کہ عارف کو اللہ تعالیٰ کا شوق ضرور ہوتا ہے' بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کا مشتاق ہونے پر مجبور ہے۔ ہم اپنے اس دعویٰ کو دو طرح ثابت کریں گے' ایک تجربے' اور نظر و اعتبار کے طریقے سے' اور دوسرے اخبار و آثار کے ذریعے۔

پہلا طریقہ نظر و اعتبار پہلے طریقے کے لئے ہمیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے' بلکہ محبت کے اثبات میں ہم نے جو کچھ لکھا ہے وہ اس سلسلے میں بھی کافی ہو گا' محبوب اگر نگاہوں سے اوجھل ہو تو اس کی دید کا مشتاق ہونا ایک فطری امر ہے' ہاں اگر سامنے موجود ہو' یا حاصل ہو تب اشتیاق نہیں ہوتا' اس لئے کہ شوق طلب کا نام ہے' اور جو چیز حاصل ہو اس کی طلب نہیں ہوتی' اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ شوق کسی ایسی ہی چیز میں ہو سکتا ہے جو من وجہ مدرک ہو اور من وجہ غیر مدرک ہو' جس چیز کا ادراک نہیں کیا جا سکتا اس کا اشتیاق بھی نہیں ہوتا' چنانچہ جس نے کسی شخص کو نہ دیکھا ہو اور نہ اس کے متعلق کچھ سنا ہو تو اس کے بارے میں یہ تصور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اس خاص شخص کا مشتاق ہو گا' اسی طرح جو شئی مکمل طور پر مدرک ہو اس کا بھی اشتیاق نہیں ہو سکتا' کمال ادراک کا معیار رویت ہے' اگر کسی شخص کا محبوب اس کے مشاہدے میں ہو اور اسے مسلسل دیکھ رہا ہو تو یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ اسے اپنے محبوب کا شوق ہو گا۔ اس لئے ہم یہ کہتے ہیں کہ شوق اسی محبوب شئی سے متعلق ہوتا ہے جو من وجہ مدرک ہو اور من وجہ غیر مدرک ہو۔ ہم ایک مثال کے ذریعے اس کی توضیح کرتے ہیں' اگر کسی شخص سے اس کا محبوب غائب ہو' اور اس کے دل میں صرف اس کا خیال موجود ہو تو وہ دیدار کے ذریعے اپنے خیال کو مکمل کرنے کا مشتاق ہو گا۔ لیکن اگر اس کے دل سے خیال ختم ہو جائے' اس کی یاد' معرفت ذکر کچھ بھی باقی نہ رہے بلکہ نسیاً منسیا ہو جائے تو اب اس کے اشتیاق کے کوئی معنی نہیں ہیں' اور یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے دیکھ کر دل میں پھر سے اشتیاق پیدا ہو گا' اس لئے کہ شوق کے معنی یہ ہیں کہ دل میں پائے جانے والے خیال کی تکمیل کے لئے رویت کا طالب ہو' اور یہاں یہ بات کہاں پائی جاتی ہے' اسی طرح بعض اوقات کوئی شخص اپنے محبوب کو تاریکی میں دیکھتا ہے' اس وقت دل میں یہ شوق پیدا ہوتا ہے کہ وہ اپنی رویت کو مکمل کرنے کے لئے روشنی میں دیکھے' یہ بھی ہو سکتا ہے کہ محبوب کا چہرہ دیکھے' اس کے بال اور دوسرے محاسن نہ دیکھ سکے' اس صورت میں بھی دیکھنے کا اشتیاق ہو سکتا ہے' خواہ اس نے وہ محاسن پہلے نہ دیکھے ہوں' اور نہ دل میں ان کے دیکھنے کا خیال پیدا ہوا ہو' مگر کیوں کہ وہ یہ بات جانتا ہے کہ اس کے محبوب کے بعض اعضاء خوبصورت ہیں اس لئے دل میں دیکھنے کا شوق پیدا ہوتا ہے' تاکہ جو محاسن پہلے نظر نہیں آئے وہ اب منکشف ہو جائیں۔

اللہ تعالیٰ کے سلسلے میں یہ دونوں صورتیں تصور کی جا سکتی ہیں' بلکہ عارف کے لئے ان دونوں وجہوں سے اللہ تعالیٰ کا مشتاق ہونا لازم ہے' اس لئے کہ اصحاب معرفت پر جو کچھ امور الٰہی واضح یا منکشف ہوتے ہیں وہ بظاہر پوری طرح واضح اور روشن نظر آتے ہیں لیکن حقیقت میں وہ اب بھی نہایت غامض ہیں' اور ان کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ گویا انہیں باریک پردے کے پیچھے سے دیکھا ہو کہ کچھ نہ کچھ خفا باقی رہ گیا' اور کمال وضوح حاصل نہ ہو سکا' بلکہ تخیلات میں مخلوط ہو گیا' کیوں کہ اس عالم میں خیالات تمثیل و مشابہت سے الگ نہیں ہو پاتے' اور عارف کو اسی طرح کی باتوں سے تکدر ہوا کرتا ہے' اور اگر ان پر دنیاوی کاروبار حیات کا عکس بھی پڑ جائے تو پھر سارا لطف خاک میں مل جاتا ہے۔ کمال وضوح مشاہدے اور تجلّی کے تکمل اشراق سے ہو گا' اور یہ واقعہ آخرت سے پہلے ممکن نہیں' اور عارف کا مقصد مشاہدہ اور تجلّی ہے' اس لئے یہ ضروری ہے کہ اس کے دل میں شوق پیدا ہو' یعنی اس چیز کی تکمیل کا شوق جس کے مبادی کی معرفت اسے دنیا میں حاصل ہوئی ہے۔ یہ شوق کی پہلی شق تھی' اور باری تعالیٰ کے سلسلے میں اس کا تصور اس طرح ممکن ہے جیسے بیان کیا گیا۔ اب دوسری شق باقی رہ جاتی ہے کہ بعض چیزیں دیکھ کر بعض کا شوق پیدا ہو باری تعالیٰ کے باب میں یہ بھی ممکن ہے۔ امور الٰہی بے شمار ہیں' ان کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ ہر بندے پر یہ تمام امور منکشف نہیں ہو پاتے' بلکہ بعض امور منکشف ہو جاتے ہیں' اور بعض اپنی وقت اور غموض کی بنا پر نامعلوم رہ جاتے ہیں' عارف کو ان امور کے وجود کا علم ہوتا ہے اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ان امور کا علم ہے' نیز وہ اس حقیقت کا اعتراف بھی کرتا ہے کہ اس کے علم سے جس قدر معلومات غائب ہیں وہ ان معلومات کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہیں جو وہ جانتا ہے' اس لئے وہ ان باقی معلومات کو اپنے دائرۂ علم میں لانے اور ان کی معرفت حاصل کرنے کا مشتاق رہتا ہے' جہاں تک پہلے شوق کا تعلق ہے کہ معرفت

الٰہی پورے وضوح کے ساتھ ہو تو اس کی تکمیل آخرت میں ہوگی' اس معنیٰ میں جسے رویت' لقاء اور مشاہدہ کہتے ہیں' اور یہ ممکن نہیں کہ دنیا میں اس شوق کی تکمیل ہو جائے' حضرت ابراہیم ابن ادہمؒ مشتاقین میں سے تھے' کہتے ہیں ایک دن میں نے عرض کیا یا اللہ! اگر تو اپنے عاشقوں میں سے کسی کو کوئی ایسی چیز عطا کرتا ہو جس سے اس کا دل پُرسکون ہو جاتا ہو تو مجھے بھی عطا فرما اس لئے کہ مجھے قلب کے اضطراب نے بے چین کر دیا ہے' حضرت ابراہیم ابن ادہم کہتے ہیں کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنے سامنے کھڑا کر رکھا ہے' اور فرماتا ہے کہ اے ابراہیم تجھے وصال سے پہلے کوئی ایسی چیز مانگتے ہوئے شرم نہیں آئی جو تیرے دل کو پُرسکون کر دے؟ کیا کوئی مشتاق اپنے محبوب کی ملاقات سے پہلے بھی پُرسکون ہو سکتا ہے' میں نے عرض کیا یا اللہ! میں تیری محبت میں اس قدر حیرت زدہ ہو گیا کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ مجھے کیا کہنا چاہیے' اب میرا قصور معاف فرما' اور مجھے بتلا کہ میں کیا کہوں' فرمایا اے ابراہیم یوں کہا کر :۔

اَللّٰهُمَّ رَضِّنِي بِقَضَائِكَ وَصَبِّرْنِي عَلَى بَلَائِكَ وَاَوْزِعْنِي عَلَى شُكْرِ نِعْمَائِكَ۔

اے اللہ مجھے اپنے فیصلے پر راضی کر' اپنی مصیبت پر صبر دے' اور مجھے اپنی نعمتوں پر شکر عطا فرما۔

شوق کی دوسری شق۔ کہ تمام معلومات حاصل ہو جائیں۔ کی تکمیل نہ دنیا میں ممکن ہے اور نہ آخرت میں اس کا امکان ہے' اس لئے کہ اس شوق کی تکمیل اس طرح ہوگی کہ بندہ پر آخرت میں اللہ تعالیٰ کے جمال' جلال' صفات' حکمت اور افعال کے متعلق وہ تمام امور منکشف ہو جائیں جو اللہ تعالیٰ کو معلوم ہیں' اور یہ محال ہے' اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی معلومات لامتناہی ہیں' بندہ ہمیشہ یہی جانے گا کہ اللہ تعالیٰ کے جمال و جلال میں سے بہت سے ایسے امور باقی رہ گئے ہیں جو ابھی اس پر منکشف نہیں ہوئے' چنانچہ اس کا شوق کبھی مکمل نہیں ہوگا' خاص طور پر وہ شخص جو اپنے درجے سے بلند درجات کا مشاہدہ کرتا ہے وہ یقیناً مزید درجات کا متمنی ہوگا' لیکن یہ شوق اصل وصال کے بعد وصال کی تکمیل کا ہوگا' اس لئے اس شوق میں لذت ہوگی' رنج و الم نہیں ہوگا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ کے الطاف کشف و نظر مسلسل جاری رہیں' اور نعمتیں اور لذتیں بیش از بیش حاصل ہوتی رہیں اور ان لذتوں میں کھو کر آدمی ان چیزوں کے شوق سے غافل ہو جائے جو ابھی حاصل نہیں ہوئی ہیں' اور یہ اس شرط کے ساتھ ہے کہ ان امور میں حصول کشف ممکن ہو جن میں دنیا میں کشف نہیں ہوا تھا' ورنہ نعمتوں کی لذت کسی ایک نقطے پر ٹھہر کر بڑھنے والی نہیں ہے' ہاں اس کے دائمی ہونے میں کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ جہاں تک اس آیت کا سوال ہے :۔

نُورُهُمْ يَسْعَى بَيْنَ اَيْدِيهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ يَقُولُونَ رَبَّنَا اَتْمِمْ لَنَا نُورَنَا۔ (پ ۲۸ ر ۲۰ آیت ۸)

ان کا نور ان کے سامنے اور ان کے داہنے دوڑتا ہو گا اور وہ یوں دعا کرتے ہوں گے کہ اے ہمارے رب! ہمارے لئے ہمارے اس نور کو آخر تک رکھئے۔

اس میں بھی یہ دونوں احتمال موجود ہیں' ایک یہ کہ وہی نور تمام ہو جو دنیا میں ساتھ تھا' اور یہ بھی احتمال ہے کہ ان امور میں نور کی تکمیل و اشراق مراد ہو جو دنیا میں روشن نہیں ہوئے تھے' قرآن کریم کی اس آیت سے پہلے معنی ثابت ہوتے ہیں :۔

اُنْظُرُونَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُورِكُمْ قِيلَ ارْجِعُوا وَرَاءَكُمْ فَالْتَمِسُوا نُورًا۔
(پ ۲۷ ر ۱۸ آیت ۳)

ہمارا انتظار کر لو کہ ہم بھی تمہارے نور سے کچھ روشنی حاصل کر لیں ان کو جواب دیا جائے گا کہ تم اپنے پیچھے لوٹ جاؤ پھر روشنی تلاش کرو۔

اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ انوار اصلاً دنیا سے ساتھ جائیں گے' آخرت میں انہی کی چمک زیادہ کی جائے گی' کوئی نیا نور عطا نہیں کیا جائے گا۔ یہ موضوع نازک ہے' اس سلسلے میں محض اندازے سے کچھ کہنا خطرناک ہو سکتا ہے' ہمیں اب تک کوئی ایسی بات نہیں ملی جس پر کلی اعتماد کیا جا سکے ہم اللہ تعالیٰ سے زیادتی علم' زیادتی ہدایت' اور احقاق حق کی درخواست کرتے ہیں۔

دوسرا طریقہ اخبار و آثار شوق کے اثبات کا دوسرا طریقہ اخبار و آثار ہیں' اس سلسلے میں بے شمار روایات و آثار ملتے ہیں' چنانچہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی دعاؤں میں ارشاد فرماتے تھے :۔

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْأَلُکَ الرِّضَا بَعْدَ الْقَضَاءِ وَبَرْدَ الْعَیْشِ بَعْدَ الْمَوْتِ وَلَذَّةَ النَّظْرِ اِلٰی وَجْهِکَ الْکَرِیْمِ وَالشَّوْقِ اِلٰی لِقَائِکَ (۱)

اے اللہ میں تجھ سے فیصلے پر راضی رہنے' موت کے بعد عیش کی زندگی' تیرے وجہ کریم کے دیدار کی لذت' اور تیرے ملاقات کے شوق کی درخواست کرتا ہوں۔

حضرت ابوالدرداءؓ نے حضرت کعب احبار سے کہا کہ میرے سامنے توراۃ کی کوئی خاص آیت بیان کیجئے' انہوں نے یہ روایت بیان کی' اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ نیک لوگوں کو میری ملاقات کا بڑا شوق ہے' اور میں ان کی ملاقات کا بہت زیادہ مشتاق ہوں' حضرت کعب احبار نے فرمایا کہ توراۃ میں اسی مضمون کی ایک اور آیت ان الفاظ میں ہے کہ جو شخص میرا طالب ہو گا وہ مجھے پائے گا اور جو میرے غیر کا طالب ہو گا وہ غیر کو پائے گا۔ حضرت ابوالدرداءؓ نے یہ روایات سن کر فرمایا کہ میں شہادت دیتا ہوں کہ میں نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے یہ مضامین سنے ہیں۔ حضرت داؤد علیہ السلام کی روایات میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے فرمایا : اے داؤد زمین والوں کو یہ پیغام پہنچا دے کہ میں اس شخص کا حبیب ہوں جو مجھ سے محبت کرے گا' اور اس شخص کا ہم نشین ہوں جو میرا ہم نشین ہو گا' اور اس کا مونس ہوں جو میرے ذکر سے مانوس ہو گا' اور اس شخص کا دوست ہوں جو میرا دوست ہو گا' اور اس شخص کو پسند کرنے والا ہوں جو مجھے پسند کرے گا اور اس شخص کا مطیع ہوں جو میری اطاعت کرے گا' جو شخص مجھ سے محبت کرتا ہے میں اس کے دل کا حال اچھی طرح جانتا ہوں' اور اسے اپنے لئے قبول کرلیتا ہوں' اس سے ایسی محبت کرتا ہوں کہ میری مخلوق سے کوئی اس پر مقدم نہیں ہوتا' جو شخص حق کے ساتھ میری جستجو کرتا ہے وہ مجھے پاتا ہے' اور جو غیر کا طالب ہوتا ہے وہ مجھے نہیں پاتا' اے زمین والو' تم دنیا کے غرور کا پردہ چاک کر دو' اور میری کرامت' محبت اور ہم نشینی کی طرف قدم بڑھاؤ' میرے ساتھ انس کرو میں تمہارے ساتھ انس کروں گا' اور تمہاری محبت کی طرف سبقت کروں گا' میں نے اپنے دوستوں کا خمیر اپنے خلیل ابراہیم' اپنے کلیم موسیٰ اور اپنے صفی محمدؐ کے خمیر سے بنایا ہے' اور اپنے مشتاقین کے دل اپنے نور سے پیدا کئے ہیں' اور اپنے جلال سے ان کی پرورش کی ہے۔

ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کسی دوست پر وحی نازل فرمائی کہ میرے بعض بندے ایسے ہیں جو مجھ سے محبت کرتے ہیں' اور میں ان سے محبت کرتا ہوں' وہ میرا اشتیاق رکھتے ہیں اور میں ان کا اشتیاق رکھتا ہوں' وہ میرا ذکر کرتے ہیں اور میں ان کا ذکر کرتا ہوں' وہ میری طرف دیکھتے ہیں' میں ان کی طرف دیکھتا ہوں' اگر تو ان کی راہ چلا تو میں تجھ سے محبت کروں گا اور ان کی راہ سے ہٹا تو میں تجھ سے ناراض ہوں گا' اس شخص نے عرض کیا یا اللہ ان کی علامت کیا ہے؟ فرمایا وہ دن کے سائے کو اس طرح دیکھتے ہیں جیسے کوئی شفیق چرواہا اپنی بکریوں کو دیکھتا ہے اور سورج ڈوبنے کے ایسے مشتاق رہتے ہیں جیسے پرندہ شام کے وقت اپنے آشیانے کا مشتاق ہوتا ہے' جب رات اپنے بازو پھیلا دیتی ہے' اور تاریکی چھا جاتی ہے' بستر بچھ جاتے ہیں' راز آشکار ہوتے ہیں حبیب اپنے محبوب کے پہلو میں پہنچتا ہے تب یہ لوگ میرے لئے قدم اٹھاتے ہیں' اپنا سر ٹیکتے ہیں' اور میرے کلام کے ذریعے مجھ سے سرگوشی کرتے ہیں' اور میرے انعام کے حوالے سے میری خوشامد کرتے ہیں' ان میں سے بعض چیخ چیخ کر روتے ہیں' بعض گھٹ گھٹ کر روتے ہیں' کوئی واویلا کرتا ہے' کوئی شکوہ بہ لب کھڑا ہوتا ہے' کوئی بیٹھا ہوا ہے' کوئی کھڑا ہوا ہے' کوئی رکوع میں ہے' کوئی سجدے میں ہے' ان کے تمام شکوے' مشقتیں اور مجاہدے سر آنکھوں پر۔ سب سے پہلے میں انہیں تین چیزیں دوں گا۔ ایک تو

---

(۱) یہ روایت کتاب الدعوات میں گزر چکی ہے۔

یہ کہ میں اپنے نور سے ان کے دل میں ڈال دوں گا کہ وہ میرے بارے میں خبریں جیسے میں ان کے بارے میں خبر دیتا ہوں' دوسری یہ کہ آسمان و زمین اور ان کے مابین جو کچھ ہے اگر ان کے مقابلے میں آئے تو ان کی خاطر ان چیزوں کو حقیر سمجھوں گا' تیسری یہ کہ میں اپنا مقدس چہرہ ان کی طرف کروں گا' اور تو جانتا ہے کہ میں جس کی طرف اپنا چہرہ کرتا ہوں وہ سمجھتا ہے کہ میں اسے کیا دینا چاہتا ہوں' حضرت داؤد علیہ السلام کی روایات میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے وحی نازل فرمائی کہ اے داؤد تم کب تک جنت کو یاد کرتے رہو گے' اور مجھ سے ملنے کے اشتیاق کا اظہار نہ کرو گے' حضرت داؤد علیہ السلام نے عرض کیا : یا اللہ تیرے مشتاق کون لوگ ہیں؟ ارشاد ہوا کہ میرے مشتاق وہ لوگ ہیں جنہیں میں نے ہر کدورت سے صاف کر دیا ہے' اور خوف سے آگاہ کر دیا ہے' ان کے دل میں میری طرف ایک سوراخ ہے جس سے وہ مجھے دیکھتے ہیں' میں ایسے لوگوں کے قلوب اپنے ہاتھ سے اٹھاؤں گا اور انہیں اپنے آسمان پر رکھوں گا' پھر اپنے منتخب فرشتوں کو بلاؤں گا' جب وہ جمع ہو کر میرے سامنے سجدہ ریز ہوں گے تو میں ان سے کہوں گا کہ میں نے تمہیں اس لئے نہیں بلایا کہ تم مجھے سجدہ کرو' بلکہ اس لئے بلایا ہے تاکہ میں تمہیں ان لوگوں کے دل دکھاؤں جو میرا اشتیاق رکھتے ہیں' اور تمہارے سامنے ان اہل شوق پر فخر کروں' ان کے قلوب آسمان میں میرے ملائکہ کے لئے ایسے روشن ہوں گے جیسے سورج زمین والوں کے لئے روشن ہوتا ہے' اے داؤد میں نے اپنے مشتاقین کے قلوب اپنی رضا سے بنائے ہیں' اور اپنے چہرے کے نور سے ان کی تربیت کی ہے' میں نے انہیں اپنے آپ سے بات کرنے والا بنایا' اور ان کے جسموں کو اپنی نگاہ کا مرکز قرار دیا' ان کے دلوں میں ایک ایسا راستہ بنایا جس کے ذریعے وہ مجھے دیکھتے ہیں' اور دن بدن ان کا شوق زیادہ ہوتا رہتا ہے' حضرت داؤد علیہ السلام نے عرض کیا : یا اللہ! مجھے اپنے عشاق کے دیدار کی سعادت عطا فرما' ارشاد ہوا : اے داؤد! کوہ لبنان پر جاؤ' وہاں چودہ آدمی رہتے ہیں' ان میں جوان بھی ہیں' بوڑھے بھی' اور ادھیڑ عمر کے بھی۔ جب تم ان کے پاس پہنچو تو ان کو میرا سلام پہنچاؤ' اور یہ کہو کہ تمہارا رب تمہیں سلام کہتا ہے' اور فرماتا ہے کہ کیا تمہیں مجھ سے کوئی حاجت نہیں ہے تم میرے منتخب احباب ہو' نیکوکار دوست ہو' میں تمہاری خوشی سے خوش ہوتا ہے' اور تمہاری محبت کی طرف سبقت کرتا ہوں' چنانچہ داؤد علیہ السلام کوہ لبنان پر ان کے پاس پہنچے' وہ چودہ آدمی اس وقت ایک چشمے کے قریب بیٹھے ہوئے اللہ تعالیٰ کی عظمت میں غور و فکر کر رہے تھے' حضرت داؤد کو دیکھ کر وہ لوگ اٹھ کر چل دیے' حضرت داؤد نے ان سے کہا کہ میں تمہارے پاس اللہ تعالیٰ کا پیغامبر بن کر آیا ہوں تاکہ تمہیں تمہارے رب کا پیغام پہنچاؤں' چنانچہ وہ لوگ حضرت داؤد کی طرف متوجہ ہو گئے' نگاہیں نیچی کر لیں' اور کان ان کی طرف لگا دیے حضرت داؤد نے فرمایا کہ اللہ تمہیں سلام کہتا ہے' اور فرماتا ہے کہ کیا تم مجھ سے اپنی حاجت کے متعلق کوئی سوال نہیں کرو گے' میں تمہاری آواز اور تمہارا کلام سنتا ہوں' تم میرے منتخب احباب اور نیکوکار دوست ہو' میں تمہاری خوشی سے خوش ہوتا ہوں' اور تمہاری محبت کی طرف سبقت کرتا ہوں' اور تمہاری طرف ہر وقت اس طرح دیکھتا ہوں جس طرح مہربان مشفق ماں (اپنے بیٹے کو) دیکھتی ہے' حضرت داؤد فرماتے ہیں کہ یہ پیغام سن کر وہ لوگ رونے لگے' ان کے شیخ نے کہا پاک ہے تیری ذات' پاک ہے تیری ذات ہم تیرے غلام ہیں' اور تیرے غلاموں کے بیٹے ہیں' گذری ہوئی عمر کے ماہ و سال میں اگر ہماری زبان نے تیرے ذکر سے رکنے کا گناہ کیا ہو تو اسے معاف فرما' دوسرے شخص نے کہا تو پاک ہے' ہم تیرے بندے ہیں' اور تیرے بندوں کے بیٹے ہیں' جو معاملہ ہمارے اور تیرے درمیان ہے اس میں حسن نظر کے ساتھ احسان فرمانا' تیسرے شخص نے کہا ہم تیرے بندے ہیں اور تیرے بندوں کے بیٹے ہیں کیا ہم تجھ سے سوال کی جسارت کر سکتے ہیں' تو جانتا ہے کہ ہمیں اپنے امور میں مزید اب کوئی حاجت نہیں ہے' ہاں اتنا کرم کر کہ اپنے راستے پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ثابت قدم رکھ کر ہم پر احسان فرما' چوتھے شخص نے کہا کہ ہم تیری رضا کی طلب میں کوتاہ ہیں' حصول رضا میں ہماری اعانت کر۔ پانچویں شخص نے کہا اے اللہ! تو نے ہمیں منی کے ایک قطرے سے پیدا کیا ہے' اور ہم پر یہ احسان کیا ہے کہ ہم تیری عظمت میں غور و فکر کر سکیں' کیا وہ شخص تیرے سامنے بولنے کی جرأت کر سکتا ہے جو تیری عظمت و جلال میں تفکر کر رہا ہو' اور اولیاء سے تیرا قرب' اور اہل محبت پر تیرے احسانات کی وجہ سے ہم دعا کے لئے زبان نہیں

کھول سکتے' ساتویں شخص نے کہا کہ تو نے ہمارے قلوب کو اپنے ذکر کے لئے ہدایت سے نوازا ہے' اور ہمیں اپنے ساتھ مشغول رہنے کے لئے فارغ کیا ہے۔ اس لئے اگر شکر میں ہم سے کوتاہی سرزد ہوئی ہو تو ہمیں معاف کر۔ آٹھویں شخص نے کہا اے اللہ! تو ہماری حاجت سے واقف ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم تیرے وجہ کریم کی زیارت سے مشرف ہوں۔ نویں شخص نے کہا اے اللہ! بندہ میں یہ جرأت نہیں ہوتی کہ وہ اپنے آقا کے سامنے زبان کھولے' مگر کیوں کہ تو نے ہمیں حکم دیا ہے اس لئے ہماری درخواست ہے کہ ہمیں وہ نور عطا کر جس سے آسمانی طبقات کے اندھیروں میں روشنی پھیل جائے دسویں شخص نے کہا اے اللہ! تجھ سے دعا کرتے ہیں کہ ہماری طرف توجہ کر اور ہمیشہ ہمارے پاس رہ۔ گیارہویں شخص نے کہا اے اللہ! جو نعمت تو نے ہمیں عطا کی ہے ہم اسے پورا کرنے کی تجھ سے درخواست کرتے ہیں' بارہویں شخص نے کہا اے اللہ! ہمیں تیری مخلوق میں سے کسی چیز کی حاجت نہیں ہے' بس ہم پر اپنے جمال کی طرف نظر کرنے کا احسان کر' تیرھویں شخص نے کہا اے اللہ دنیا کی طرف دیکھنے سے میری آنکھوں کی بینائی دور کر' اور آخرت کی طرف دیکھنے کے لئے میری آنکھوں کو روشنی عطا فرما' چودھویں شخص نے کہا اے اللہ! میں یہ بات جانتا ہوں کہ تو اپنے اولیاء سے محبت کرتا ہے' ہم پر اتنا احسان کر کہ ہمارے قلوب کو ہر چیز سے ہٹا کر اپنی ذات میں مشغول رکھ۔

ان چودہ اشخاص کی دعاؤں کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام پر وحی نازل فرمائی کہ اے داؤد! ان سے کہو کہ میں نے تمہارا کلام سن لیا ہے' اور جو تم چاہتے ہو وہ کر دیا ہے۔ اب تم میں سے ہر شخص ایک دوسرے سے جدا ہو جائے' اور اپنے لئے زمین میں ایک تہہ خانہ بنا کر رہے' اس لئے کہ اب میں اپنے اور تمہارے درمیان سے حجاب اٹھانا چاہتا ہوں' یہاں تک کہ تم میرے نور کو دیکھ لو' اور میری عظمت کا مشاہدہ کر لو' حضرت داؤد علیہ السلام نے عرض کیا یا اللہ! ان لوگوں نے یہ مرتبہ کیسے حاصل کیا ہے؟ ارشاد ہوا کہ میرے ساتھ حسن ظن' دنیا اور اہل دنیا سے کنارہ کشی' خلوت اور مناجات سے وہ اس مرتبے تک پہنچے ہیں' اور یہ مرتبہ صرف وہ شخص حاصل کر سکتا ہے جو دنیا اور اہل دنیا کو ٹھکرا دے' اور ان میں سے کسی چیز کا ذکر اپنی زبان پر نہ لائے۔ اپنے دل کو میرے لئے فارغ رکھے' اور تمام مخلوق پر مجھے ترجیح دے' جو شخص ایسا کرتا ہے میں اس پر شفقت کرتا ہوں' اس کے نفس کو اپنے لئے فارغ کرتا ہوں' اور اپنے اور اس کے درمیان سے حجاب اٹھا دیتا ہوں یہاں تک کہ وہ مجھے اس طرح دیکھ لے جیسے آنکھ سے کوئی چیز دیکھی جاتی ہے' میں اسے ہر گھڑی اپنی کرامت کا مشاہدہ کراتا ہوں جس طرح مہربان والدہ اپنے لاڈلے بیٹے کی تیمارداری کرتی ہے' جب اسے پیاس لگتی ہے تو میں اسے اپنے ذکر کا شربت پلا کر سیراب کر دیتا ہوں' جب میں اس کے ساتھ یہ سلوک کرتا ہوں تو اے داؤد اسے دنیا' اور اہل دنیا سے اندھا کر دیتا ہوں' دنیا کو اس کی نظروں میں محبوب نہیں کرتا' وہ ہر وقت میرے ذکر و فکر میں مشغول رہتا ہے' کسی وقت غافل نہیں ہوتا' میں اسے موت دینا پسند نہیں کرتا' اس لئے کہ مخلوق کے درمیان وہ میرا مرکز نظر ہوتا ہے' وہ میرے سوا کسی کو نہیں دیکھتا' اور میں اس کے سوا کسی پر نظر نہیں کرتا' اے داؤد اس کا نفس گھل گیا ہے جسم لاغر ہو گیا ہے' اعضا بکھر گئے ہیں' وہ جب میرا ذکر سنتا ہے تو اس کا دل پارہ پارہ ہو جاتا ہے' میں اپنے فرشتوں میں اس پر فخر کرتا ہوں' تب اس کا خوف فزوں ہو جاتا ہے' اور وہ میری عبادت کثرت سے کرنے لگتا ہے اے داؤد مجھے اپنی عزت و جلال کی قسم میں اسے بالیقین جنت الفردوس میں جگہ دوں گا' اور اس کا سینہ اپنے دیدار سے ٹھنڈا کروں گا یہاں تک کہ وہ راضی ہو جائے' بلکہ مقام رضا سے زیادہ ہی آگے بڑھ جائے۔

حضرت داؤد علیہ السلام کے اخبار میں یہ بھی ہے کہ اے داؤد میرے ان بندوں سے کہہ دو جو میری محبت میں غرق ہیں کہ اگر میں مخلوق کی نگاہوں سے اوجھل رہوں اور تمہارے اور اپنے درمیان سے حجاب اٹھا لوں تو تمہیں کوئی نقصان نہیں ہو گا' تم مجھے اپنے دل کی آنکھوں سے دیکھو گے اس طرح اس میں بھی تمہارا کوئی نقصان نہیں اگر میں تم سے دنیا کو دور کر دوں' اور دین کو فراخ کر دوں' تمہیں اہل دنیا کی ناراضگی سے کیا نقصان ہو سکتا ہے اگر تم میری رضا کے متلاشی ہو' حضرت داؤد علیہ السلام کے اخبار میں یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر وحی نازل فرمائی کہ اے داؤد تم یہ گمان کرتے ہو کہ تمہیں مجھ سے محبت ہے' اگر واقعتہً تمہیں مجھ

سے محبت ہے تو دنیا کی محبت کو اپنے دل سے نکال دو' اس لئے کہ میری اور دنیا کی محبت ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتیں' اے داؤد! میرے محبین سے خلوص کے ساتھ مل' اور اہل دنیا سے ظاہرداری کا برتاؤ کر' دین میں میری تقلید کر' لوگوں کی تقلید نہ کر' اگر اس میں کوئی بات تجھے' ایسی ملے جو میری محبت کے موافق ہو تو اسے لازم پکڑ' اور جو مشکل معلوم ہو اسے میرے حوالے کر دے' میں تیری سیاست اور دوستی کی طرف سبقت کرتا ہوں' میں تیرا قائد اور رہنما ہوں' میں تجھے بغیر مانگے دوں گا' اور مصائب پر تیری اعانت کروں گا میں نے اپنے آپ پر قسم کھائی ہے کہ ایسے بندے کے علاوہ کسی کو ثواب نہ دوں گا جس کا میرے سامنے عاجزانہ مطلب اور ارادہ ظاہر نہ ہو جائے اور جو مجھ سے بے نیازی نہ برتے' اگر تو ایسا ہو جائے تو میں تجھ سے ذلت اور وحشت دور کردوں گا' اور تیرے دل میں غنا بھر دوں گا' میں نے اپنے آپ پر قسم کھائی ہے کہ جو بندہ اپنے نفس پر مطمئن ہو' اور اپنے افعال کا خود نگراں ہو تو میں اسے اس کے نفس کے حوالے کردوں گا' تو تمام اشیاء کی نسبت میری طرف کر' پھر تیرے اعمال تیرے اس فعل کے خلاف نہ ہوں' ورنہ تو سرکش اور گناہگار ٹھہرے گا' نہ تو خود اپنی ذات سے نفع پائے گا اور نہ تیرے رفقاء تجھ سے استفادہ کرسکیں گے' اور نہ تجھے میری معرفت کی حد ملے گی' اس لئے کہ میری معرفت کی کوئی انتہا نہیں ہے' جب تو مجھ سے زیادہ مانگے گا تو میں زیادہ عطا کروں گا' اس لئے کہ میری زیادتی کی کوئی انتہا نہیں ہے' بنی اسرائیل سے کہہ دے کہ مجھ میں اور مخلوق میں کوئی رشتہ نہیں ہے' اس لئے مجھ میں ان کی رغبت اور ارادت زیادہ ہونی چاہیے اگر وہ اس طرح اپنے اور میرے درمیان رشتہ استوار کریں گے تو میں انہیں وہ چیز عطا کروں گا جو نہ کسی آنکھ نے دیکھی ہو' نہ کسی کان نے سنی ہو' اور نہ کسی شخص کے دل پر اس کا خیال گذرا ہو' مجھے اپنی آنکھوں کے سامنے رکھ' اور اپنے دل کی نگاہ سے میری طرف دیکھ' ان آنکھوں سے جو تیرے سر میں ہیں' ان لوگوں کی طرف مت دیکھ جن کے دل و نگاہ پر میری جانب سے حجاب پڑا ہوا ہے' ان سے میرا ثواب منقطع ہو چکا ہے' میں نے اپنی عزت و جلال کی قسم کھائی ہے کہ میں کسی ایسے بندے کے لئے ثواب کا در وا نہیں کروں گا جو میری اطاعت کے حلقے میں محض تجربے یا مسخرے پن کے لئے آیا ہے' جو شخص تجھے کچھ سکھلائے اس کے لئے متواضع رہ' اہل ارادت پر ظلم مت کر' اگر میرے محبین اہل ارادت کے مرتبے سے واقف ہو جائیں تو ان کے لئے زمین بن جائیں' اور اہل ارادت ان پر پاؤں رکھ کر چلیں' اے داؤد اگر تو نے کسی ایک صاحب ارادت کو غفلت کے نشے سے نکال دیا تو تجھے میں اپنے یہاں مجاہد لکھوں گا اور جس شخص کو میں مجاہد لکھ دیتا ہوں اس پر وحشت طاری نہیں کرتا' اور نہ اسے مخلوقین کا محتاج بناتا ہوں' اے داؤد میری نصیحت پر کان دھر' اور اپنے نفس کے لئے نفس سے ہی عبرت پکڑ' اس میں سے کچھ ضائع نہ کر' ورنہ میں تجھے اپنی محبت سے محجوب کروں گا' میرے بندوں کو اپنی رحمت سے مایوس مت کر' اور میری خاطر اپنی شہوت کا سلسلہ منقطع کر' میں نے شہوات مخلوق میں ضعفاء کے لئے مباح کی ہیں' قوت رکھنے والوں کو کیا ہوا کہ وہ شہوات میں پڑنا چاہتے ہیں' ان کے اس عمل سے میری مناجات کی لذت ختم ہو جاتی ہے اگر وہ ایسا کرتے ہیں تو ان کو میری طرف سے ادنیٰ سزا یہ ملتی ہے کہ شہوات میں ابتلاء کے وقت میں ان کی عقلوں پر اپنی طرف سے حجاب ڈال دیتا ہوں میں اپنے احباء کے لئے دنیا پسند نہیں کرتا ان کو دنیا کی گندگی سے پاک و صاف رکھتا ہوں۔ اے داؤد تو میرے اور اپنے درمیان کسی ایسے عالم کو وسیلہ مت بنا جو اپنی غفلت سے تجھے میری محبت سے محجوب کر دے' ایسے لوگ میرے مرید بندوں کے لئے راہزن سے کم نہیں ہیں' اے داؤد ترک شہوات پر تو مسلسل روزوں سے مدد لے' اور افطار کے تجربے سے پرہیز کر' اس لئے کہ میں انہی لوگوں سے محبت کرتا ہوں جو مسلسل روزے رکھتے ہیں' اے داؤد تو میرے نزدیک اپنے نفس سے دشمنی کر کے محبوب بن' اور اسے شہوات سے باز رکھ' تب ہی تجھے دیکھوں گا' اور تو یہ بھی دیکھے گا کہ جو حجاب تیرے اور میرے درمیان واقع ہے وہ دور ہو گیا' میں تیری خاطرداری اس لئے کرتا ہوں کہ تاکہ تو تقویٰ کے حصول پر قادر ہو جائے' کیوں کہ میں تجھ پر عطائے ثواب کا احسان کرنا چاہتا ہوں' اور جب تک تو میری اطاعت پر ثابت قدم رہے گا میں تجھ سے ثواب کا سلسلہ منقطع نہیں کروں گا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام پر یہ وحی بھی نازل فرمائی کہ اے داؤد! جو لوگ مجھ سے اعراض کرتے ہیں' اور میری اطاعت سے راہ فرار اختیار کرتے ہیں اگر انہیں

معلوم ہو جائے کہ مجھے ان کا کس قدر انتظار ہے' اور میں ان سے کتنی نرمی اور مہربانی کا معاملہ کرنا چاہتا ہوں' اور مجھے کس قدر شوق ہے کہ وہ گناہوں سے بچے رہیں' اگر انہیں یہ تمام باتیں معلوم ہو جائیں تو وہ مجھ سے ملنے کے اشتیاق میں اس قدر بے چین ہوں کہ جان سے ہاتھ دھو بیٹھیں' اور میری محبت کی تپش سے ان کے اعضاء ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں اے داؤد! اعراض کرنے والوں کے لئے میرا ارادہ یہ ہے۔ اس سے اندازہ لگالو کہ میری طرف لَو لگانے والوں کے لئے میرا ارادہ کیا ہو گا' اے داؤد جب بندہ مجھ سے مستغنی ہوتا ہے تو وہ رحم و کرم کا زیادہ محتاج ہوتا ہے' اور جب وہ میری طرف سے اعراض کرتا ہے تو مجھے اس پر زیادہ رحم آتا ہے' اور جب وہ میری طرف لوٹتا ہے تو مجھے بہت بڑا معلوم ہوتا ہے۔

یہ اخبار و روایات اور اس طرح کی بے شمار حدیثیں اور آثار انس' محبت اور شوق کے ثبوت پر دلالت کرتی ہیں۔

بندے کے لئے اللہ کی محبت کے معنی قرآن کریم کی بے شمار آیات اس حقیقت پر دلالت کرتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے سے محبت کرتا ہے۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ ہم اللہ کی محبت کے معنی بیان کریں' لیکن اس سے پہلے بندے کے لئے اللہ کی محبت پر شواہد پیش کرنا بھی ضروری ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :۔

يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ (پ۶ ر۱۲ آیت ۵۴)

جن سے اللہ تعالیٰ کو محبت ہو گی' اور ان کو اللہ تعالیٰ سے محبت ہو گی۔

إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِهِ صَفًّا۔ (پ۲۸ ر۹ آیت ۴)

اللہ تعالیٰ تو ان لوگوں کو پسند کرتا ہے جو اس کی راہ میں مل کر لڑتے ہیں۔

إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ۔ (پ۲ ر۱۲ آیت ۲۲۲)

یقیناً اللہ تعالیٰ محبت رکھتے ہیں توبہ کرنے والوں سے اور محبت رکھتے ہیں پاک و صاف رہنے والوں سے۔

ایک شخص کے جواب میں جس نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کا محبوب ہے ارشاد فرمایا :۔

قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ بِذُنُوبِكُمْ (پ۶ ر۷ آیت ۱۸)

آپ یہ پوچھئے کہ اچھا تو پھر تم کو تمہارے گناہوں کے عوض عذاب کیوں دیں گے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :۔

إِذَا أَحَبَّ اللَّهُ تَعَالَى عَبْدًا لَمْ يَضُرَّهُ ذَنْبٌ وَالتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَا ذَنْبَ لَهُ (ثُمَّ تَلَا) إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ۔ (مسند الفردوس' ابن ماجہ۔ ابن مسعودؓ)

جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو اسے کوئی گناہ ضرر نہیں پہنچاتا' اور گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہے جیسے اس نے کوئی گناہ نہ کیا ہو (اس کے بعد آپ نے آیت پڑھی) اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ جب اللہ کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو موت سے پہلے اس کی توبہ قبول کر لیتا ہے' اور ماضی کے گناہ اسے کوئی نقصان نہیں پہنچاتے اگرچہ زیادہ ہی کیوں نہ ہوں' یہ ایسا ہی ہے جیسے اسلام لانے کے بعد نصرانی کو کوئی نقصان نہیں پہنچاتا' ایک جگہ اللہ تعالیٰ سے محبت کے لئے گناہوں سے مغفرت کی شرط لگائی گئی ہے' اور فرمایا گیا ہے :۔

إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ (پ۳ ر۱۲ آیت ۳۱)

اگر تم خدا تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو تو میری اتباع کرو خدا تعالیٰ تم سے محبت کرنے لگیں گے اور تمہارے سب گناہوں کو معاف کر دیں گے۔

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں :۔

اِنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی یُعْطِی الدُّنْیَا مَنْ یُّحِبُّ وَمَنْ لَّا یُحِبُّ، وَلَا یُعْطِی الْاِیْمَانَ اِلَّا مَنْ یُّحِبُّ۔ (حاکم، بیہقی، ابن مسعودؓ)

اللہ ہر شخص کو دنیا دیتا ہے وہ اللہ سے محبت کرتا ہو یا نہ کرتا ہو، لیکن ایمان صرف اسے دیتا ہے جو اللہ سے محبت کرتا ہے۔

مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰہِ رَفَعَہُ اللّٰہُ، وَمَنْ تَکَبَّرَ وَضَعَہُ اللّٰہُ، وَمَنْ اَکْثَرَ ذِکْرَ اللّٰہِ اَحَبَّہُ اللّٰہُ۔
(ابن ماجہ۔ ابو سعید الخدری باختصار)

جو شخص اللہ کے لئے تواضع کرتا ہے اللہ اسے بلند کرتا ہے، جو تکبّر کرتا ہے اللہ اسے گرا دیتا ہے، اور جو اللہ کا ذکر زیادہ کرتا ہے اللہ اس سے محبت کرتا ہے۔

لَا یَزَالُ الْعَبْدُ یَتَقَرَّبُ اِلَیَّ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰی اُحِبَّہُ فَاِذَا اَحْبَبْتُہُ کُنْتُ سَمْعَہُ الَّذِیْ یَسْمَعُ بِہٖ وَبَصَرُہُ الَّذِیْ یُبْصِرُ بِہٖ۔ (بخاری۔ ابو ہریرہؓ)

بندہ نوافل کے ذریعے مجھ سے تقرب حاصل کرتا رہتا ہے، یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں، اور جب میں اس سے محبت کرتا ہوں تو اس کا کان آنکھ بن جاتا ہوں جن سے وہ سنتا ہے اور دیکھتا ہے۔

زید ابن اسلم فرماتے ہیں کہ بندہ اللہ تعالیٰ سے محبت کرتا ہے یہاں تک کہ اس کی محبت اس درجے کو پہنچ جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سے فرماتا ہے کہ جو چاہے کر میں نے تجھے بخش دیا۔ محبت کے سلسلے میں جس قدر روایات وارد ہیں وہ حصر سے باہر ہیں۔

اللہ سے بندے کی محبت ہم پہلے بھی بیان کرچکے ہیں کہ بندے سے اللہ کی محبت حقیقی ہے، نہ کہ مجازی، اس لئے کہ محبت لغت میں اس شی کی طرف نفس کے میلان کو کہتے ہیں جو اس کے موافق ہو، اور عشق اسی میلان کے غلبے اور افراط کا نام ہے، اور یہ بیان کیا جاچکا ہے کہ احسان اور جمال دونوں نفس کے موافق ہیں، اور یہ دونوں چیزیں کبھی آنکھ سے مدرک ہوتی ہیں، اور کبھی بصیرت سے ان کا ادراک کیا جاتا ہے، اور محبت بصر اور بصیرت دونوں کے تابع ہے، صرف بصر کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، لیکن بندے سے اللہ تعالیٰ کی محبت کی یہ صورت نہیں ہوسکتی، بلکہ جو الفاظ اللہ اور بندوں پر مشترک بولے جاتے ہیں، وہ معنی میں مشترک نہیں ہوتے، حتّٰی کہ لفظ وجود جو اسماء میں نہایت عام ہے اور خالق اور مخلوق دونوں پر ایک معنی میں نہیں بولا جاتا، بلکہ جو کچھ اللہ تعالیٰ کے سوا موجود ہے اس کا وجود اللہ کے وجود سے مستفاد ہے، اور تابع کا وجود متبوع کے وجود کے برابر نہیں ہوسکتا۔ البتہ وجود میں دونوں کی شرکت ہے یعنی دونوں پر لفظ وجود کا اطلاق کیا جاسکتا ہے، یہ ایسا ہی ہے جیسے گھوڑے اور درخت پر لفظ جسم کا اطلاق ممکن ہے، کیوں کہ دونوں جسمیت میں شریک ہیں، لیکن حقیقت میں وہ ایک دوسرے کے مشابہ نہیں ہیں، اور نہ ان میں سے کسی ایک کے متعلق یہ کہنا ممکن ہے کہ اس کی جسمیت اصل ہے اور دوسرے کی جسمیت تابع ہے، کیوں کہ نہ درخت اپنی جسمیت میں گھوڑے کے جسم کے تابع ہے، اور نہ گھوڑا اپنی جسمیت میں درخت کے تابع ہے، لفظ وجود میں جو خالق اور مخلوق دونوں کے لئے بولا جاتا ہے۔ یہ بات نہیں ہے، اور یہ صورت تمام الفاظ میں یکساں ہے، جیسے علم، ارادہ، قدرت وغیرہ۔ ان الفاظ میں بھی خالق اور مخلوق دونوں یکساں نہیں ہیں، بلکہ دونوں پر الگ الگ معنوں میں ان الفاظ کا اطلاق ہوتا ہے، واضعین لغت نے اولاً یہ الفاظ مخلوق کے لئے وضع کئے تھے، کیوں کہ خالق کے اوصاف انسانی عقل و فہم سے بالاتر ہیں اس لئے وہ الفاظ جو مخلوق کے لئے خاص تھے خالق کے لئے بھی بطور استعارہ و مجاز بولے جانے لگے۔ گویا خالق کے لئے ان الفاظ کا استعمال حقیقی نہیں ہے اور نہ ان معنی میں ہے جو بندوں کے لئے خاص ہے۔ اس وضاحت کے بعد لفظ محبت پر نظر ڈالئے، محبت اصل لغت کے اعتبار سے اس شی کی طرف نفس کے میلان کا نام ہے جو اس کے موافق ہو، لیکن اس کا تصور اس نفس کے لئے ممکن ہے جو شی موافق کے نہ ملنے سے ناقص رہ جاتا ہو، اور اسے پاکر کمال حاصل کرتا ہو، اور کمال سے لطف اندوز ہوتا ہو، اور یہ اللہ تعالیٰ کے حق میں محال ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کو جو

کمال، جمال اور جلال حاصل ہے وہ اس وقت بھی حاصل ہے، اور وہ ابدی اور ازلی ہر اعتبار سے واجب الحصول ہے، نہ اس کا تجدد متصور ہے اور نہ زوال ممکن ہے، اس لئے اگر وہ کسی کی طرف نظر کرے گا تو اس کے معنی یہ نہیں ہوں گے کہ وہ غیر کی طرف نظر کر رہا ہے، بلکہ یہ کہا جائے گا کہ اس کی نظر اپنی ذات اور افعال پر ہے، اور موجودات میں اس کی ذات و افعال کے علاوہ کوئی چیز موجود نہیں ہے۔ اسی لئے جب شیخ ابو سعید فہمی کے سامنے یہ آیت پڑھی گئی :-

یُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ (پ ۶ ر ۳ آیت ۵۴)

جن سے اللہ تعالیٰ کو محبت ہوگی، اور جن کو اللہ تعالیٰ سے محبت ہوگی۔

تو انہوں نے فرمایا حقیقت میں وہ خود اپنے آپ سے محبت کرتا ہے، ان کی مراد یہ تھی کہ وہی کل ہے اور موجودات میں اس کے علاوہ کوئی نہیں ہے، جو شخص صرف اپنے نفس سے، اپنے افعال نفس اور اپنی تصانیف سے محبت کرتا ہے اس کی محبت اپنی ذات اور توابع ذات سے متجاوز نہیں ہوتی اور اس کے بارے میں یہی کہا جاتا ہے کہ وہ صرف اپنی ذات سے محبت کرتا ہے، جو الفاظ بندوں سے اللہ تعالیٰ کی محبت پر دلالت کرتے ہیں وہ سب مئوول ہیں، اور اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے دل پر سے حجاب اٹھا دیتا ہے، یہاں تک کہ وہ اسے اپنے دل سے دیکھنے لگتا ہے یا وہ اسے اپنی قربت کے حصول پر قادر کر دیتا ہے، یا ازل میں اس کو قادر کرنے کا ارادہ تھا۔ اگر محبت کی نسبت ارادہ ازلی کی طرف جائے تو بندے سے اللہ تعالیٰ کی محبت ازلی ہوگی، اور اگر اس فعل کی طرف جائے تو بندے کے دل سے حجاب دور کر دیتا ہے تو یہ محبت حدوث کے سبب سے حادث ہوگی، گزشتہ سطور میں جو حدیث بیان کی گئی ہے (لَا يَزَالُ عَبْدِيْ يَتَقَرَّبُ إِلَيَّ بِالنَّوَافِلِ) اس کے معنی یہی ہیں کہ نوافل کے ذریعے تقرب حاصل کرنے سے باطن صاف ہو جاتا ہے اور دل سے حجاب دور ہو جاتا ہے، اور بندہ اللہ تعالیٰ سے قربت کے درجے پر پہنچ جاتا ہے، یہ سب اللہ تعالیٰ کے فضل اور اس کے لطف و کرم سے ہوتا ہے، اور محبت کے یہی معنی ہیں، اور یہ بات ایک مثال کے ذریعے سمجھی جاسکتی ہے اور وہ مثال یہ ہے کہ بادشاہ اپنے کسی خادم کو اپنے آپ سے قریب کرتا ہے، اور اسے ہر وقت اپنی خدمت میں حاضر رہنے کی اجازت دیتا ہے، بادشاہ اس کی طرف کبھی تو اس لئے مائل ہوتا ہے کہ وہ اپنی طاقت کے ذریعے اس کی مدد کرے گا، اس کے مشاہدے سے راحت پائے گا، یا کسی معاملے میں اس کی رائے لے گا، یا اس کے لئے کھانے پینے کا سامان تیار کرے گا، اس صورت میں یہ کہا جائے گا کہ بادشاہ اس سے محبت کرتا ہے کیوں کہ اس میں وہ چیز موجود ہے جو اس کی غرض کے موافق ہے، اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بادشاہ اپنے کسی غلام کو اپنے قریب کرتا ہے اور اسے اپنے پاس آنے جانے سے نہیں روکتا اس لئے نہیں کہ وہ اس سے کوئی فائدہ اٹھانا چاہتا ہے، یا اس کی مدد کا خواہاں ہے، بلکہ اس لئے کہ غلام بذات خود ایسے اخلاق حسنہ اور اوصاف حمیدہ سے متصف ہے کہ ان کی موجودگی میں اسے بادشاہ کے دربار میں بلا روک ٹوک آنے جانے سے منع نہیں کیا جا سکتا۔ اس لئے نہیں کہ بادشاہ کو غلام سے کسی طرح کی کوئی تقویت حاصل ہوگی، یا نفع ملے گا، بلکہ اس لئے کہ غلام میں وہ اچھے اوصاف اور عمدہ اخلاق پائے جاتے ہیں کہ ان کی موجودگی میں اسے دربار شاہی کی حاضری زیب دیتی ہے، اور اس کے شایان شان یہی ہے کہ وہ بادشاہ کے قرب سے متمتع ہو، اگرچہ بادشاہ کو اس سے ذرا غرض نہیں ہوتی، اس صورت میں اگر بادشاہ اپنے اور اس کے درمیان سے حجاب اٹھا دے گا تو یہی کہا جائے گا کہ اسے اپنے غلام سے محبت ہے، اور اگر غلام نے اخلاق حمیدہ اور خصائل حسنہ میں سے صرف وہی خصائل اور اخلاق حاصل کئے ہوں جو بادشاہ کی محبت حاصل کرنے میں مؤثر ہوں تو یہ کہا جائے گا کہ اس نے ذریعہ بنا کر بادشاہ کی محبت حاصل کی ہے۔

اس مثال میں دو طرح کی محبتیں ہیں، اللہ کو اپنے بندے سے دوسرے معنی کی محبت ہوتی ہے، پہلے معنی کی نہیں، اور دوسرے معنی کے اعتبار سے بھی اللہ تعالیٰ کی محبت کو بادشاہ کی محبت سے حقیقی مشابہت نہیں ہے، بلکہ اس میں بھی یہ شرط ہے کہ تمہارے ذہن میں یہ خیال نہ آئے کہ اس قربت سے اللہ تعالیٰ پر تغیر واقع ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کے سلسلے میں کسی تغیر کا امکان نہیں ہے، بلکہ ہر تغیر اس کے حق میں محال ہے، اللہ تعالیٰ سے بندے کی قربت کے معنی حقیقت میں یہ ہیں کہ بندہ درندوں اور بہائم کی صفات سے دور

ہو کر ان مکارم اخلاق سے آراستہ ہو گیا جو الٰہی اخلاق ہیں گویا یہ قربت صفت میں ہوتی ہے، مکان میں نہیں ہوتی۔ صفت کی قربت کیسی ہوتی ہے، اس کے لئے بھی ایک مثال بیان کرتے ہیں، اور وہ مثال یہ ہے کہ دو شخص کبھی تو ایک دوسرے سے اس طرح قریب ہوتے ہیں کہ دونوں ایک دوسرے کی طرف چلتے ہیں، اور کبھی ایک حرکت کرتا ہے، اور دوسرا اپنی جگہ ساکن رہتا ہے، اس صورت میں متحرک میں کچھ تغیر واقع ہوتا ہے، جب کہ دوسرے میں کوئی تغیر نہیں ہوتا، صفات میں بھی اس طرح کا قرب پایا جاتا ہے، چنانچہ شاگرد اپنے استاذ کے جمال و کمال کے درجے سے قرب حاصل کرنے کے لئے جدوجہد کرتا ہے، استاذ اپنی جگہ ٹھہرا ہوا ہے، وہ اپنے درجے سے اتر کر شاگرد کے درجے تک نہیں پہنچتا، اور شاگرد اس درجے تک رسائی حاصل کرنے کے لئے، اور جہالت کی تاریکی سے نکل کر علم کی روشنی تک پہنچنے کے لئے مسلسل حرکت کرتا رہتا ہے، یہاں تک کہ استاذ کے درجے تک رسائی حاصل کرلیتا ہے، یہی حال اللہ تعالیٰ سے بندوں کی قربت کا ہے، جس قدر کوئی بندہ اوصاف حسنہ میں کامل، علم میں مکمل، اشیاء کے حقائق کی معرفت میں یگانہ، شیطانی طاقتوں کو مقہور کرنے میں پختہ، اور رذائل سے محفوظ رہنے میں مضبوط کردار کا حامل ہوگا اسی قدر درجۂ کمال سے قریب تر ہوگا، کمال کی انتہا صرف اللہ کے لئے ہے، ہر بندہ اللہ تعالیٰ سے اسی قدر قریب ہوگا جس قدر اسے ان امور میں کمال حاصل ہوگا، البتہ شاگرد اور استاذ اور اللہ تعالیٰ اور بندے کے درمیان یہ فرق ہے کہ شاگرد بعض اوقات اپنی جدوجہد سے استاذ کے برابر اور کبھی اس سے بھی سبقت لے جاتا ہے، جب کہ اللہ تعالیٰ کے باب میں یہ امر محال ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا کمال متناہی ہے، اور بندہ درجات کمال میں اپنی متعین حدود سے تجاوز کرنے پر قادر نہیں ہے اس لئے بندہ اللہ تعالیٰ کے کمال کی برابری بھی نہیں کرسکتا ہے چہ جائیکہ وہ اس پر فوقیت حاصل کرلے، پھر قرب کے درجات میں بھی لا متناہی تفاوت ہے کیوں کہ کمال کی کوئی انتہا نہیں ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ بندے کے ساتھ اللہ کی محبت یہ ہے کہ اسے دنیاوی شواغل اور معاصی سے دور کرکے، اس کے باطن کو دنیا کی کدورتوں سے پاک کرکے، اور اس کے قلب سے حجاب اٹھا کر اپنے آپ سے قریب کرلے یہاں تک کہ وہ بندہ یہ محسوس کرے گا گویا وہ اپنے دل سے اللہ کا مشاہدہ کر رہا ہے، اور اللہ تعالیٰ سے بندے کی محبت یہ ہے کہ اس کمال کے حصول کی طرف مائل ہو جس سے وہ محروم ہے، ظاہر ہے آدمی جس چیز سے محروم ہوتا ہے اس کے حصول کا شوق رکھتا ہے، اور جب وہ چیز پالیتا ہے تو اس سے لذت پاتا ہے، اس معنی میں محبت اور شوق اللہ تعالیٰ کے لئے محال ہے۔

اب اگر تم یہ کہو کہ بندے سے اللہ تعالیٰ کی محبت ایک مشکوک معاملہ ہے، بندے کو کیسے معلوم ہوسکتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا حبیب ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ محبت کی کچھ علامات ہیں، ان علامات سے استدلال کرے گا، چنانچہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:۔

إِذَا أَحَبَّ اللّٰهُ عَبْدًا ابْتَلَاهُ فَإِذَا أَحَبَّهُ الْحُبَّ الْبَالِغَ اقْتَنَاهُ (۱)

اللہ تعالیٰ کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو اسے مبتلا کردیتا ہے اور جب شدید محبت کرتا ہے تو اسے اپنے ساتھ خاص کرلیتا ہے۔

آپ سے "خاص کرنے" کی تفسیر دریافت کی گئی، آپ نے ارشاد فرمایا اس کے معنی یہ ہیں کہ اپنے محبوب بندے کے پاس نہ مال باقی رہنے دے، اور نہ اہل و عیال باقی رکھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ بندے سے اللہ تعالیٰ کی محبت کی علامت یہ ہے کہ اسے غیر سے متنفر کردے، یہاں تک کہ اس میں اور غیر میں حجاب حائل کردے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی خدمت میں کسی شخص نے عرض کیا کہ آپ اپنی سواری کے لئے کوئی گدھا کیوں نہیں خرید لیتے، فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کو یہ بات گوارا نہیں کہ میں اسے چھوڑ کر گدھے کا

---

(۱) یہ روایت پہلے گذر چکی ہے۔

شغل اختیار کروں۔ ایک حدیث میں یہ مضمون وارد ہے :۔

اِذَا اَحَبَّ اللّٰهُ عَبْدًا اِبْتَلَاهُ فَاِنْ صَبَرَ اِجْتَبَاهُ فَاِنْ رَضِیَ اِصْطَفَاهُ

جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو اسے مبتلا کر دیتا ہے' اگر وہ اس ابتلاء پر صبر کرتا ہے تو اسے برگزیدہ کرتا ہے اور راضی ہوتا ہے تو منتخب کر لیتا ہے۔

بعض علماء کا مقولہ ہے کہ جب تو اللہ تعالیٰ سے محبت کرے اور یہ دیکھے کہ وہ تجھے کسی مصیبت میں مبتلا کرنا چاہتا ہے تو یہ سمجھ لے کہ وہ تجھے برگزیدہ بنانا چاہتا ہے' کسی مرید نے اپنے استاذ سے کہا کہ مجھے محبت کے کچھ آثار نظر آتے ہیں' انہوں نے دریافت کیا بیٹے! کیا تم اس کے علاوہ کسی اور محبوب میں مبتلا کئے گئے ہو' اس نے عرض کیا نہیں! فرمایا تب تم محبت کی توقع مت رکھو' اس لئے کہ ابتلاء و آزمائش کے بغیر کسی شخص کو محبت نہیں ملتی۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :۔

اِذَا اَحَبَّ اللّٰهُ عَبْدًا جَعَلَ لَهُ وَاعِظًا مِنْ نَفْسِهِ وَزَاجِرًا مِنْ قَلْبِهِ يَأْمُرُهُ وَيَنْهَاهُ

(مسند الفردوس۔ انس)

جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو اس کے نفس میں ایک نصیحت کرنے والا مقرر کر دیتا ہے' اور اس کے دل میں ایک روکنے والا پیدا کر دیتا ہے وہ اسے حکم دیتے ہیں اور منع کرتے ہیں۔

ایک حدیث میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں' فرمایا :۔

اِذَا اَرَادَ اللّٰهُ بِعَبْدٍ خَيْرًا بَصَّرَهُ بِعُيُوْبِ نَفْسِهِ (مسند الفردوس۔ انس)

جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کے ساتھ خیر کا ارادہ کرتا ہے تو اسے اس کے عیوب نفس پر مطلع کر دیتا ہے۔

ان تمام علامات میں سب سے اہم اور خاص علامت یہ ہے کہ بندہ کو اللہ تعالیٰ سے محبت ہو' اسی سے یہ سمجھ میں آسکتا ہے کہ اللہ کو اپنے اس بندے سے محبت ہے' اور وہ فعل جس سے بندے کا محبوب خدا ہونا ثابت ہو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے تمام ظاہری اور باطنی' پوشیدہ اور کھلے امور کا کفیل ہو' وہی اسے مشورہ دیتا ہو' وہی اسے تدبیر سوجھاتا ہو' وہی اسے زیور اخلاق سے آراستہ کرتا ہو' وہی اس کے اعضاء کو نیک کاموں میں استعمال کرتا ہو' وہی اس کے ظاہر و باطن کو درست رکھتا ہو' وہی اس کے افکار کا ایک مرکز بناتا ہو' وہی اس کے دل میں دنیا سے نفرت پیدا کرتا ہو' وہی اسے غیر سے متوحش کرتا ہو' اور خلوتوں میں مناجات کی لذت بخش کر خود سے مانوس کرتا ہو' وہی اپنی معرفت اور اس کے درمیان سے پردے اٹھانے والا ہو' یہ اور اس طرح کی دوسری علامات بندے کے لئے اللہ تعالیٰ کی محبت پر دلالت کرتی ہیں' اب ہم اللہ سے بندے کی محبت پر دلالت کرنے والی کچھ علامات بیان کرتے ہیں۔ یہ بھی بندے سے اللہ کی محبت کی علامات ہیں۔

اللہ سے بندے کی محبت کی علامات محبت کا دعویٰ ہر شخص کرتا ہے' اور وہ دعویٰ کرنا مشکل نہیں ہے' لیکن اس دعویٰ پر عمل کرنا نہایت دشوار ہے انسان کو چاہیے کہ جب اس کا نفس محبت کا دعویٰ کرے تو اس وقت تک شیطان کے فریب میں مبتلا نہ ہو جب تک اس کی آزمائش نہ کرے' اور دلائل سے اس کے دعویٰ کی صداقت کا حال نہ کھل جائے' محبت ایک شجرۂ طوبیٰ ہے' اس کی جڑیں زمین میں نہایت گہری ہیں' اور شاخیں آسمان میں ہیں' اور اس کے پھل دل' زبان اور جوارح میں ظاہر ہوتے ہیں' اور ان آثار سے جو دل و جوارح پر نمایاں ہوتے ہیں محبت کا وجود اس طرح ثابت ہوتا ہے جس طرح دھویں سے آگ کے وجود کا علم ہوتا ہے' یا پھلوں سے درختوں پر دلالت ہوتی ہے۔

آثار محبت اس طرح کے آثار بے شمار ہیں' ان میں سے ایک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ملاقات کو آخرت میں کشف اور مشاہدے کے طریقے پر اچھا سمجھے' اس لئے کہ یہ ممکن نہیں ہے کہ کوئی شخص دل سے کسی کو چاہتا ہو اور اس کے مشاہدے اور ملاقات کی

خواہش نہ رکھتا ہو اور کیوں کہ یہ بات سب جانتے ہیں کہ دنیا سے جدا ہوئے بغیر اور موت کو گلے لگائے بغیر یہ خواہش پوری نہیں ہو گی اس لئے موت سے محبت رکھنا بھی انہی آثار میں سے ایک اثر ہے' اسے چاہیے کہ وہ موت سے فرار اختیار نہ کرے' محبت کرنے والا کبھی اپنے وطن سے محبوب کے مستقر تک سفر کرنے میں کوئی مشقت یا تعب محسوس نہیں کرتا' کیوں کہ وہ یہ بات جانتا ہے کہ اس سفر کا انجام محبوب کے مشاہدے پر منتج ہے' سفر (موت) اس ملاقات کی کنجی' اور اس مشاہدے کا باب الداخلہ ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں :۔

مَنْ اَحَبَّ لِقَاءَ اللّٰہِ اَحَبَّ اللّٰہُ لِقَاءَہُ (بخاری و مسلم۔ ابو ہریرہؓ)

جو شخص اللہ تعالیٰ کی ملاقات پسند کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی ملاقات پسند کرتا ہے۔

موت کے وقت حضرت حذیفہؓ نے فرمایا ایک حبیب احتیاج کے وقت آیا جو اس سے شرمندہ ہو وہ کبھی فلاح یاب نہ ہو' بعض سلف صالحین فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ سے ملاقات کی محبت کے بعد اللہ تعالیٰ کے نزدیک کثرت سجود سے زیادہ کوئی عمل پسندیدہ نہیں ہے' دیکھئے یہاں انہوں نے اللہ تعالیٰ سے ملاقات کی محبت کو سجدوں پر فوقیت دی' اسی طرح اللہ تعالیٰ نے محبت میں صداقت کے لئے راہ خدا میں شہید ہونے کی شرط لگائی ہے' چنانچہ جب لوگوں نے اللہ سے محبت کا دعویٰ کیا تو اللہ تعالیٰ نے اپنے راستے میں قتل ہونے کو اس دعوئ میں سچائی کی علامت قرار دے دیا' اور فرمایا :۔

اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِہٖ صَفًّا۔

(پ ۲۸ ر ۹ آیت ۴)

بے شک اللہ تعالیٰ ان لوگوں سے محبت کرتا ہے جو اس کی راہ میں مل کر جہاد کرتے ہیں۔

یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَیَقْتُلُوْنَ وَیُقْتَلُوْنَ۔ (پ ۱۱ ر ۳ آیت ۱۱۱)

وہ لوگ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں جس میں قتل کرتے ہیں اور قتل کیے جاتے ہیں۔

حضرت عمرؓ کے لئے اپنی وصیت میں حضرت ابو بکر الصدیقؓ نے ارشاد فرمایا : حق گراں ہوتا ہے اور اس گرانی کے باوجود خوش گوار ہوتا ہے' اور باطل ہلکا پڑتا ہے' اس کے باوجود بڑا تلخ ہوتا ہے' اگر تم نے میری وصیت کی حفاظت کی تو موت سے زیادہ کوئی غائب چیز تمہیں محبوب نہ ہو گی' اور وہ تمہارے پاس آئے گی' اور اگر تم نے یہ وصیت ضائع کر دی تو موت سے زیادہ غائب چیز تمہارے نزدیک مبغوض نہیں ہو گی' حالانکہ تم اسے ٹالا نہ سکو گے۔ اسحٰق ابن سعد ابن ابی وقاص سے روایت ہے' فرماتے ہیں کہ میرے باپ نے مجھ سے بیان کیا کہ عبداللہ ابن جحش نے جنگ احد کے موقع پر کہا آؤ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں' سب لوگ ایک گوشے میں چلے گئے' اور عبداللہ نے یہ دعا کی اے اللہ! میں تجھے قسم دیتا ہوں کہ جب کل میں دشمن سے نبرد آزما ہوں تو میرا مقابلہ کسی بہادر جواں مرد' اور شدید الغضب شخص سے ہو' جس سے میں لڑوں' اور وہ مجھ سے لڑے' پھر وہ مجھے پکڑ لے اور میرے کان ناک کاٹ ڈالے' میرا پیٹ چیر دے' اور جب میں قیامت کے دن اس حال میں تجھ سے ملوں تو تو یہ کہے اے عبداللہ تیری ناک کس نے کاٹی ہے' تیرے کان کس نے کاٹے ہیں' میں عرض کروں گا اے اللہ! تیری اور تیرے رسول کی راہ میں کٹے ہیں۔ تو کہے گا اے عبداللہ! تو سچ کہتا ہے' سعد کہتے ہیں میں نے لڑائی کے دن بالکل آخری وقت میں دیکھا کہ ان کے ناک کان ان کے جسم میں اس طرح لٹکے ہوئے تھے جیسے کوئی چیز دھاگے میں لٹکی رہتی ہے۔ سعید ابن المسیبؒ فرماتے ہیں میری دعا ہے اللہ تعالیٰ ابن جحش کی قسم کا آخری حصہ بھی اسی طرح پورا فرمائے جس طرح اس نے پہلا حصہ پورا فرمایا ہے۔ سفیان ثوری اور بشر الحافی فرمایا کرتے تھے کہ موت کو صرف وہی شخص ناپسند کرتا ہے جو شک میں گرفتار ہوتا ہے' اس لئے کہ حبیب کسی حال میں بھی اپنے محبوب کی ملاقات کو ناپسند نہیں کرتا۔ بویطی نے کسی زاہد سے دریافت کیا کہ کیا آپ موت کو پسند کرتے ہیں' زاہد نے جواب دینے میں توقف کیا' بویطی نے

کہا اگر تم سچے ہوتے تو موت کو ضرور پسند کرتے۔ اس کے بعد انہوں نے یہ آیت تلاوت کی :۔

فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صَادِقِيْنَ۔ (پ ارا آیت ۹۴)

موت کی تمنا کر (کے دکھلا دو) اگر تم سچے ہو۔

زاہد نے کہا سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں :۔

لَا يَتَمَنَّيَنَّ اَحَدُكُمُ الْمَوْتَ۔ (بخاری و مسلم۔ انس)

تم میں سے کوئی موت کی تمنا نہ کرے۔

انہوں نے فرمایا یہ ممانعت اس شخص کے لئے ہے جو کسی مصیبت سے پریشان ہو کر موت کی تمنا کرتا ہے کیوں کہ اللہ کی قضاء پر راضی رہنا اس سے فرار حاصل کرنے سے افضل ہے۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر کوئی شخص موت کو پسند نہ کرے تو آیا یہ کہا جائے گا کہ وہ اللہ سے محبت کرنے والا نہیں ہے' اس کے جواب کی تفصیل یہ ہے کہ موت کی کراہت کبھی دنیا کی محبت' اور اہل' مال اور اولاد سے فرقت پر افسوس کے باعث ہوتی ہے' یہ امر اللہ تعالیٰ کی کمال محبت کے منافی ہے' اس لئے کہ کامل محبت وہ ہوتی ہے جو تمام دل کو مستغرق ہو' تاہم یہ امر کچھ بعید نہیں کہ اہل' مال اور اولاد کی محبت کے ساتھ اللہ کی محبت کا معمولی شائبہ بھی موجود ہو' اس لئے کہ لوگ محبت میں متفاوت ہوتے ہیں' اور تفاوت پر یہ روایت دلالت کرتی ہے کہ ابو حذیفہ ابن عتبہ ابن ربیعہ ابن عبد شمس نے جب اپنی بہن فاطمہ کا نکاح اپنے آزاد غلام سالم سے کیا تو قریش نے انہیں کافی برا بھلا کہا' اور یہ طعنہ دیا کہ انہوں نے قریش کی ایک شریف خاتون کو ایک غلام سے بیاہ دیا' ابو حذیفہ نے کہا کہ بخدا میں نے اپنی بہن کا نکاح اس شخص سے یہ سوچ کر کیا ہے کہ یہ ہر حال میں اس سے بہتر ہے' ان کا یہ قول ان کے فعل سے بھی زیادہ خطرناک ثابت ہوا' لوگوں نے ان سے پوچھا یہ کیسے ہو سکتا ہے فاطمہ تیری بہن ہے' اور سالم تیرا آزاد کردہ غلام ہے' انہوں نے جواب دیا کہ میں نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ جو شخص کسی ایسے آدمی کو دیکھنا چاہے جو اللہ تعالیٰ سے اپنے پورے دل کے ساتھ محبت کرتا ہو اسے چاہیے کہ وہ سالم کو دیکھے (ابو نعیم۔ عمران) اس روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ لوگوں میں ایسے بھی ہیں جو پورے دل کے ساتھ اللہ سے محبت نہیں کرتے' بلکہ دوسروں سے بھی محبت کرتے ہیں' اس لئے یہ ضروری ہے کہ جب وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضر ہوں تو انہیں ان کی محبت کے بقدر دیدار الٰہی کی لذت حاصل ہو' اور دنیا سے محبت کے بقدر عذاب ملے۔

موت کو برا سمجھنے کا ایک اور سبب یہ ہو سکتا ہے کہ بندہ مقام محبت کا مبتدی ہو' اور موت کا جلدی آنا اس لئے برا سمجھتا ہو کہ اس طرح اسے اللہ تعالیٰ کی ملاقات کے لئے تیاری کا موقع نہیں مل سکے گا' اگر کراہت موت کا سبب یہ ہو تو اس سے ضعف محبت پر دلالت نہیں ہوتی' اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی شخص کو یہ اطلاع ملے کہ اس کا محبوب فلاں دن آرہا ہے' اور وہ یہ چاہے کہ اس کی آمد میں کچھ تاخیر ہو جائے تاکہ وہ اس کے شایان شان استقبال کی تیاری کر سکے' اس کے لئے اپنا گھر آراستہ کرے' اور خانہ داری کے تمام اسباب فراہم کرے' اور اس طرح اس سے ملاقات کرے کہ دل ہر طرح کے افکار و خیالات سے فارغ ہو' اور ملاقات کی راہ میں کوئی رکاوٹ موجود نہ ہو' بہرحال اس سبب سے موت کو مکروہ سمجھنا کمال محبت کے منافی نہیں ہے اور اس کی علامت یہ ہے کہ وہ شخص مسلسل عمل کرتا ہو' اللہ تعالیٰ سے ملاقات کے لئے ہمہ وقت تیاری کرتا ہو۔

محبت کی ایک علامت یہ ہے کہ جس چیز کو اللہ تعالیٰ پسند کرے اسے اپنی پسند پر ظاہر و باطن میں ترجیح دے' اس کے لئے سخت سے سخت عمل انجام دے' ہوائے نفس کی اتباع سے گریز کرے' اور سستی چھوڑ دے' اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر مواظبت کرے' نوافل کے ذریعے اس کا تقرب حاصل کرتا رہے' اور جس طرح محب اپنے محبوب کے دل میں مزید درجۂ قرب کا متلاشی رہتا ہے' اسی طرح اعلا سے اعلا درجات کا طالب رہے' اللہ تعالیٰ نے ایثار پسند لوگوں کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے :۔

يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِي صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّا اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (پ ۲۸ ر ۴ آیت ۹)

جو ان کے پاس ہجرت کر کے آتا ہے اس سے یہ لوگ محبت کرتے ہیں' اور مہاجرین کو جو کچھ ملتا ہے اس سے یہ (انصار) اپنے دلوں میں کوئی رشک نہیں پاتے' اور اپنے سے مقدم رکھتے ہیں اگرچہ ان پر فاقہ ہی ہو۔

جو شخص ہوائے نفس کی متابعت پر کمربستہ رہتا ہے اس کا محبوب وہی ہوتا ہے جسے وہ چاہتا ہے حقیقت یہ ہے کہ عاشق اپنے معشوق کی مرضی کا پابند ہوتا ہے' جو معشوق کی مرضی ہوتی ہے اسے ہی عاشق بھی اپنی رضا قرار دیتا ہے' جیسا کہ ایک شاعر کہتا ہے :-

اُرِيْدُ وِصَالَهُ وَيُرِيْدُ هَجْرِيْ ۔۔۔ فَاَتْرُكُ مَا اُرِيْدُ لِمَا يُرِيْدُ

(میں اس کا وصال چاہتا ہوں اور وہ میری جدائی کا خواہشمند ہے' اس لئے میں اس کی خواہش کے لئے اپنی خواہش چھوڑتا ہوں)

جب کسی پر محبت غالب ہوتی ہے تو پھر اسے کسی چیز کی خواہش نہیں رہتی' سوائے محبوب کے اس کا کوئی مطمح نظر نہیں رہتا' جیسا کہ بیان کیا جاتا ہے کہ جب حضرت زلیخا ایمان لے آئیں' اور حضرت یوسف علیہ السلام سے ان کا نکاح ہو گیا تو عبادت کے لئے گوشہ نشیں ہو گئیں' اور اللہ کی ہو کر رہ گئیں' حضرت یوسف علیہ السلام انہیں دن میں اپنے قریب بلاتے تو وہ رات پر ٹلا دیتیں اور رات میں بلاتے تو دن پر محول کر دیتیں' اور فرماتیں اے یوسف میں تجھ سے اس وقت محبت کرتی تھی جب مجھے اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل نہیں تھی' اب میرے دل میں اس کی محبت کے سوا کوئی محبت باقی نہیں رہی ہے' اور میں اسے کسی اور چیز سے بدلنا بھی نہیں چاہتی' حضرت یوسف علیہ السلام نے ان سے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے تیری قربت کا حکم دیا ہے' اور بتلایا ہے کہ اس قربت کے نتیجے میں وہ تیرے بطن سے دو بیٹے پیدا کرے گا اور انہیں نبی بنائے گا' حضرت زلیخا نے کہا اگر یہ بات ہے تو میں حکم خداوندی کی اطاعت کے لئے تیار ہوں اور آپ کی قربت پر آمادہ ہوں' اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص اللہ تعالیٰ سے محبت کرتا ہے وہ اس کی نافرمانی نہیں کر سکتا' اسی لئے ابن المبارک فرماتے ہیں :-

تَعْصِي الْاِلٰهَ وَاَنْتَ تُظْهِرُ حُبَّهُ ۔۔۔ هٰذَا لَعَمْرِيْ فِي الْفِعَالِ بَدِيْعٌ
لَوْ كَانَ حُبُّكَ صَادِقًا لَاَطَعْتَهُ ۔۔۔ اِنَّ الْمُحِبَّ لِمَنْ يُحِبُّ مُطِيْعٌ

(تو اللہ تعالیٰ سے محبت کا دعویٰ کرتا ہے اور اس کی حکم عدولی کرتا ہے' بخدا تیرا یہ عمل نہایت عجیب ہے' اگر تیری محبت سچی ہوتی تو اس کی اطاعت کرتا' اس لئے کہ محب اپنے محبوب کا مطیع ہوتا ہے)

اسی مضمون میں یہ شعر کہا گیا ہے :-

وَاَتْرُكُ مَا اَهْوٰى لِمَا قَدْ هَوِيْتَهُ ۔۔۔ فَاَرْضٰى بِمَا تَرْضٰى وَاِنْ سَخِطَتْ نَفْسِيْ

(تیری خواہش کے آگے میں اپنی خواہش ترک کر دیتا ہوں' اور تیری رضا پر راضی رہتا ہوں اگرچہ میرا نفس گرانی محسوس کرے)۔

سہل تستری فرماتے ہیں محبت کی علامت یہ ہے کہ تم محبوب کو اپنے نفس پر ترجیح دو' پھر اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرنے سے کوئی شخص حبیب نہیں بن جاتا بلکہ حبیب وہ ہے جو مناہی اور منکرات سے بھی احتراز کرے' ان کا یہ قول درست ہے' اللہ تعالیٰ سے بندے کی محبت' بندے سے اللہ تعالیٰ کی محبت کا سبب ہوتی ہے' جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :-

يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗ (پ ۶ ر ۱۲ آیت ۵۴)

جن سے اللہ تعالیٰ کو محبت ہو گی' اور اللہ تعالیٰ سے جن کو محبت ہو گی۔

جب اللہ تعالیٰ کسی سے محبت کرتا ہے تو اس کا کفیل ہوتا ہے' اور اسے دشمنوں پر غلبہ دیتا ہے' اس کا دشمن خود اس کا نفس' اور

خواہشات نفس ہیں، چنانچہ اگر اللہ اسے اپنا محبوب بنالے گا تو کبھی ایسے دشمن کے سامنے ذلیل و خوار نہیں کرے گا، اور نہ اس کے نفس کے سپرد کرے گا، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:۔

وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاَعْدَائِكُمْ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَلِيًّا وَّكَفٰى بِاللّٰهِ نَصِيْرًا۔ (پ ۵ ر ۴ آیت ۴۵)

اور اللہ تعالیٰ تمہارے دشمنوں کو خوب جانتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کافی رفیق ہے اور اللہ تعالیٰ کافی مددگار ہے۔

اگر تم یہ سوال کرو کہ کیا نافرمانی اور گناہ اصل محبت کے مخالف ہے تو ہم یہ کہیں گے کہ معصیت اصل محبت کے خلاف نہیں ہے، بلکہ کمال محبت کے خلاف ہے، بہت سے لوگ ایسے ہیں جو اپنے آپ سے محبت کرتے ہیں، اور کسی نہ کسی مرض میں گرفتار رہتے ہیں، صحت پسند کرتے ہیں لیکن یہ جاننے کے باوجود کہ بسیار خوری صحت کے لئے مضر ہے زیادہ کھاتے ہیں، اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ انہیں اپنی جان عزیز نہیں ہے یا وہ تندرست رہنا پسند نہیں کرتے، لیکن حفظان صحت کے اصولوں پر وہ اس لئے عمل نہیں کر پاتے کہ ان کی معرفت ضعیف ہوتی ہے، اور شہوت غالب ہوتی ہے، اور اس پر یہ روایت دلالت کرتی ہے کہ نعیمان صحابیؓ کو بہت جلد جلد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لایا جاتا تھا، اور آپ ان پر حد جاری کیا کرتے تھے، ایک دن وہ کسی معصیت میں پکڑے گئے اور حد کے لئے لائے گئے، کسی شخص نے انہیں اس بات پر ملامت کی وہ اتنی جلدی جلدی حد کے لئے لائے جاتے ہیں، یہ سن کر سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اسے برا مت کہو، اس لئے کہ یہ شخص اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہے (بخاری) دیکھئے نعیمان معصیت کے ارتکاب کی بنا پر محبت سے خارج نہیں ہوئے، البتہ معصیت آدمی کو کمال محبت سے خارج کر دیتی ہے، بعض عارفین کہتے ہیں کہ جب ایمان کسی آدمی کے قلب کے ظاہری حصے میں ہوتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ سے معتدل محبت کرتا ہے، اور جب دل کی گہرائی میں پہنچ جاتا ہے تو انتہائی محبت کرتا ہے اور معاصی ترک کر دیتا ہے۔

حاصل یہ ہے کہ محبت کا دعویٰ ایک مشکل اور خطرناک دعویٰ ہے، اسی لئے حضرت فضیل ابن عیاضؒ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص تجھ سے یہ سوال کرے کہ کیا تو اللہ تعالیٰ سے محبت کرتا ہے تو خاموش رہ، اس لئے کہ اگر تو نے جواب میں کہا "نہیں" تو یہ کفر ہوگا اور کہا "ہاں" تو تیرا حال محبین کا سا نہیں ہے، اس لئے اللہ کی ناراضگی سے بچنے کے لئے سکوت اختیار کر بعض علماء کہتے ہیں کہ جنت میں اہل معرفت اور اہل محبت کے درجات سے بلند کوئی دوسرا درجہ نہ ہوگا، اور نہ جہنم میں کسی شخص کو اس شخص سے زیادہ عذاب ہوگا جو معرفت اور محبت کا دعویٰ کرے، اور دل میں نہ معرفت ہو اور نہ محبت۔

اللہ تعالیٰ سے محبت کی ایک علامت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ذکر کا شدت سے حریص ہو، نہ زبان تھکے، نہ دل خالی ہو، اس لئے کہ جو شخص کسی سے محبت کرتا ہے، اس کا اور اس کی متعلق چیزوں کا ذکر کثرت سے کرتا ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ کی محبت کی علامت یہ قرار پائی کہ بندہ اللہ کا ذکر کرے، قرآن کریم کی تلاوت کرے جو اس کا کلام ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرے، اور ہر اس چیز کو چاہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہو، جو شخص کسی انسان سے محبت کرتا ہے اس کی گلی کے کتے کو بھی چاہتا ہے، جب محبت قوی ہوتی ہے تو محبوب سے متعدی ہو کر ان تمام چیزوں تک جا پہنچتی ہے جو اسے گھیرے ہوئے ہوں، اس کا احاطہ کئے ہوئے ہوں، یا اس سے متعلق ہوں، اسے محبت میں شرکت نہیں کہہ سکتے، اس لئے کہ محبوب کے قاصد سے یا اس کے کلام سے محبت کرنا بھی محبوب سے محبت کرنا ہے، بلکہ یہ کمال محبت کی دلیل ہے، چنانچہ جس شخص پر اللہ تعالیٰ کی محبت غالب ہوتی ہے، جو شخص اللہ کی مخلوق سے محبت کر سکتا ہے بھلا وہ قرآن کریم سے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے، اور اللہ کے تمام نیک بندوں سے کیسے محبت نہیں کرے گا، اس کی تحقیق ہم نے کتاب الاخوۃ والصحبۃ میں بیان کی ہے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (پ ۳ ر ۲ آیت ۳۱)

آپ کہہ دیجئے اگر تم خدا تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو تو میری اتباع کرو خدا تعالیٰ تم سے محبت کرنے لگیں گے۔

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:۔

أَحِبُّوا اللّٰهَ لِمَا يَغْذُوكُمْ مِنْ نِعَمِهِ وَأَحِبُّونِي لِلّٰهِ تَعَالٰى (۱)
اللہ سے ان نعمتوں کے لئے محبت کرو جو وہ تمہیں عنایت کرتا ہے اور مجھ سے اللہ کے لئے محبت کرو۔

حضرت سفیان ثوریؒ ارشاد فرماتے ہیں کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے محب سے محبت کرتا ہے وہ گویا اللہ سے محبت کرتا ہے' اور جو شخص اللہ تعالیٰ کا اکرام کرنے والے سے محبت کرتا ہے وہ گویا اللہ تعالیٰ کا اکرام کرتا ہے۔ بعض مریدین سے یہ واقعہ نقل کیا گیا ہے' کہتے ہیں کہ مجھے ارادت کے دنوں میں مناجات کی لذت ملی' چنانچہ میں نے رات دن قرآن کی تلاوت کو اپنا مشغلہ بنالیا' پھر کچھ وقفہ ایسا گذرا کہ میں تلاوت نہ کرسکا' ایک دن میں نے خواب میں دیکھا کہ کوئی کہنے والا یہ کہہ رہا ہے کہ اگر تجھے ہماری محبت کا دعویٰ ہے تو ہماری کتاب قرآن کریم پر کیوں ظلم کرتا ہے' کیا تو نے ہمارے اس لطیف عتاب میں تدبّر نہیں کیا جو قرآنی آیات میں موجود ہے' جب میں اس خواب کے بعد نیند سے بیدار ہوا تو دل قرآن کریم کی محبت سے لبریز تھا' حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ تم میں سے کوئی شخص قرآن کریم کے علاوہ اپنے نفس سے کسی چیز کی درخواست نہ کرے' اس لئے کہ جو شخص قرآن کریم سے محبت کرتا ہے وہ اللہ سے محبت کرتا ہے' اور جو شخص قرآن پاک سے محبت نہیں کرتا وہ اللہ سے بھی محبت نہیں کرتا۔ حضرت سہیل تستریؒ فرماتے ہیں محبت الٰہی کی علامت محبت قرآن ہے' اور محبت الٰہی اور محبت قرآن کی علامت محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے' اور محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی علامت سنّت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ہے' اور محبت سنّت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی علامت آخرت کی محبت ہے اور محبت آخرت کی علامت دنیا سے نفرت ہے' اور بغض دنیا کی علامت یہ ہے کہ دنیا میں سے صرف اس قدر لے جو طریق آخرت میں زادِ راہ بن سکے۔

محبت الٰہی کی ایک علامت یہ ہے کہ بندے کی خلوت اللہ کے ساتھ مناجات' اور قرآن کریم کی تلاوت سے انس ہو' چنانچہ وہ نماز تہجد کی پابندی کرے' اور رات کے پُرسکون لمحات کو جو دنیاوی کدورتوں سے خالی ہوتے ہیں۔ غنیمت سمجھے' محبت کا کم سے کم درجہ یہ ہے کہ حبیب کے ساتھ تنہائی میں لذت پائے' اور اس کی مناجات سے لطف اندوز ہو' جس شخص کے نزدیک خلوت و مناجات سے زیادہ نیند' اور گفتگو پیاری ہو وہ محبت کے دعوے میں سچا نہیں ہو سکتا۔ ابراہیم ابن ادہمؒ پہاڑ سے اتر کر نیچے تشریف لائے تو کسی نے ان سے دریافت کیا کہ آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں' انہوں نے جواب دیا کہ انس باللہ سے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کے اخبار میں ہے کہ مخلوق میں سے کسی سے مانوس مت ہو' میں دو شخصوں کو اپنے سے علیحدہ رکھوں گا' ایک وہ شخص جس نے یہ سمجھا کہ میرے ثواب میں تاخیر ہے اس لئے عمل کی کیا ضرورت ہے' اور دوسرا وہ شخص جس نے مجھے فراموش کیا اور اپنے حال پر راضی ہوا۔ اور اس کی علامت یہ ہے کہ میں اسے اس کے نفس کے سپرد کردیتا ہوں' اور دنیا میں حیران و پریشان چھوڑ دیتا ہوں۔ آدمی جس قدر اللہ تعالیٰ سے نامانوس ہوتا ہے اسی قدر غیر سے مانوس ہوتا ہے' اور جس قدر غیر سے مانوس ہوتا ہے اسی قدر اللہ سے وحشت میں مبتلا ہوتا ہے' اور محبت سے بعید ہوتا ہے۔ برخ نامی غلام جس کے واسطے سے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے باران رحمت کی دعا کی تھی۔ کے متعلق یہ مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے بارے میں بیان فرمایا کہ برخ میرا اچھا بندہ ہے' مگر اس میں ایک عیب ہے' حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا یا اللہ وہ عیب کیا ہے؟ فرمایا: اسے نسیم سحری پسند ہے' اور وہ اس سے لطف اندوز ہوتا ہے' اور جس شخص کو مجھ سے محبت ہوتی وہ کسی دوسری چیز سے لطف اندوز نہیں ہوتا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ پہلی امتوں میں ایک نیک شخص تھا' جو دور دراز جنگل میں تھا ایک مقام پر اللہ کی عبادت کیا کرتا تھا' ایک روز اس نے دیکھا کہ ایک پرندے نے درخت کی شاخوں میں اپنا آشیانہ بنالیا ہے' اور اس میں بیٹھ کر اپنی سریلی آواز میں نغمے بکھیرتا ہے' اس نے دل میں خیال کیا کہ اگر میں اس درخت کے سائے میں اپنی عبادت گاہ بنالوں تو پرندے کی چہچہاہٹ سے دل لگا رہے گا' چنانچہ اس نے اس درخت کے سائے میں عبادت شروع کردی' اللہ تعالیٰ نے اس وقت کے پیغمبر پر وحی بھیجی کہ فلاں شخص سے کہہ دو کہ اس نے مخلوق سے انسیت کی ہے' اس کی پاداش میں اس کا درجۂ تقرب کم کروں گا اور وہ یہ درجہ اپنے کسی عمل سے کبھی حاصل نہ کرسکے

(۱) یہ روایت پہلے گذر چکی ہے۔

گا۔ بہرحال محبت کی علامت یہ ہے کہ آدمی اپنے محبوب کے ساتھ مناجات میں کمال انس حاصل کرے' اور اس کے ساتھ تنہائی میں کمال لذت پائے' اور جو چیز اس کی خلوت کو متاثر کرے' یا لذت مناجات سے دور رکھے اس سے متوحش ہو' انس کی علامت یہ ہے کہ بندے کی عقل اور فہم مناجات کی لذت میں اس طرح غرق ہو جائے جس طرح کوئی شخص اس وقت اپنے ہوش و خرد سے بیگانہ ہو جاتا ہے جب وہ اپنے معشوق سے ہم کلام ہوتا ہے۔ بعض بزرگان دین اس لذت میں اس طرح ڈوبے کہ وہ لوگ نماز میں تھے اور ان کے گھر میں آگ لگ گئی لیکن انہیں اس کی خبر تک نہیں ہوئی۔ اسی طرح ایک بزرگ کا پاؤں جو کسی بیماری کی وجہ سے گل گیا تھا نماز کے دوران کاٹ دیا گیا لیکن انہیں اس سانحے کا علم بھی نہ ہو سکا' حقیقت یہ ہے کہ جب آدمی پر محبت اور انس غالب ہو جاتا ہے تو خلوت اور مناجات اس کی آنکھوں کی ٹھنڈک بن جاتی ہے' اور وہ اس کے ذریعے اپنے تمام افکار و ہموم دفع کرتا ہے بلکہ انس و محبت اس کے دل پر اس طرح چھاتی ہے کہ وہ دنیاوی امور کا ادراک نہیں پاتا' جب تک کہ وہ امور اس کی سماعت سے بار بار نہ ٹکرائیں۔ جیسے کوئی عاشق بظاہر لوگوں سے گفتگو کرتا ہے' لیکن اس کا باطن اپنے محبوب کی یاد میں مشغول ہوتا ہے' اور اسی سے انسیت حاصل کرتا ہے' محب حقیقی وہ ہے جسے اپنے محبوب کے علاوہ کسی چیز سے اطمینان اور سکون حاصل نہ ہو' اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :- اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ۔ (پ ۱۳ ر ۱۰ آیت ۲۸)

جو ایمان لائے اور اللہ کے ذکر سے ان کے دلوں کو اطمینان ہوتا ہے' خوب سمجھ لو اللہ کے ذکر سے دلوں کو اطمینان ہو جاتا ہے۔

حضرت قتادہؒ فرماتے ہیں کہ میں اس کے ذکر سے خوشی حاصل کرتا ہوں' اور انس پاتا ہوں' گویا انہوں نے یہ واضح فرمایا کہ اطمینان سے مراد دلوں کی خوشی اور قلوب کا انس ہے۔ حضرت ابوبکر الصدیقؓ فرماتے ہیں کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کی خالص محبت کا ذائقہ چکھتا ہے وہ طلب دنیا سے بے پروا' اور انسانوں سے متوحش ہو جاتا ہے۔ مطرف ابن ابی بکر کہتے ہیں کہ عاشق کو کبھی اپنے محبوب کے ذکر سے اکتاہٹ نہیں ہوتی' اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام پر وحی نازل فرمائی کہ وہ شخص دروغ گو ہے جو میری محبت کا دعویٰ کرے' اور جب رات اپنے بازو پھیلائے تو وہ نیند کی آغوش میں چلا جائے' کیا کوئی عاشق ایسا ہو سکتا ہے جو اپنے معشوق کی ملاقات کا متمنی نہ ہو' میں یہاں موجود ہوں جو چاہے مجھے پالے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا یا اللہ! تو کہاں ہے' میں تیرے پاس آنا چاہتا ہوں' ارشاد فرمایا جیسے ہی تو نے میرے پاس آنے کا قصد کیا میرے پاس پہنچ گیا' یحییٰ ابن معاذ کہتے ہیں کہ جو شخص اللہ سے محبت کرتا ہے وہ اپنے نفس سے نفرت کرتا ہے' وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ جس شخص میں یہ تین خصلتیں نہ ہوں وہ محب حقیقی نہیں کہلا سکتا' وہ یہ ہیں کہ اللہ کے کلام کو مخلوق کے کلام پر' اللہ کی ملاقات کو مخلوق کی ملاقات پر' اور عبادت کو مخلوق کی خدمت پر ترجیح دے۔

محبت کی ایک علامت یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی چیز فوت ہو جائے تو اس پر متاسف نہ ہو بلکہ ہر لمحے پر زیادہ سے زیادہ افسوس کرے جو اللہ تعالیٰ کے ذکر اور اس کی اطاعت سے خالی گذر گیا ہو' اور اگر غفلت کی بناء پر ایسا ہو گیا تو بکثرت توبہ و استغفار کرے' اور رحم و کرم کا طالب ہو' بعض عارفین کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے کچھ بندے ایسے ہیں جو اللہ سے محبت کرتے ہیں' اور اسی کے ساتھ خلوت میں سکون محسوس کرتے ہیں' اگر کوئی چیز ان سے فوت ہو جائے تو وہ اس کا غم نہیں کرتے نہ وہ اپنے نفس کی لذت میں مصروف ہوتے ہیں' اس لئے کہ ان کے مالک کا ملک وسیع اور مکمل ہے جو وہ چاہتا ہے مملکت میں وہی ہوتا ہے' جو انہیں ملنے والا ہے وہ ان کے پاس پہنچے گا' اور جو انہیں ملنے والا نہیں ہے اس سے وہ محروم رہیں گے' ان کا مالک ان کے لئے اچھی تدبیریں کرتا ہے' محب کا حق اگر اس سے کوئی غفلت یا کوتاہی سرزد ہو جائے یہ ہے کہ اپنے محبوب کی طرف متوجہ ہو' اور اس کا عتاب دور کرنے کی تدبیر کرے' اور یہ عرض کرے : اے اللہ! میں نے کیا قصور کیا ہے جس کے باعث تیرے احسان کا سلسلہ مجھ سے منقطع ہو گیا ہے' اور تو نے مجھے اپنی بارگاہ کی حاضری سے محروم کر دیا ہے' اور مجھے اپنے نفس اور شیطان کی اتباع میں مشغول کر دیا ہے' اس تدبیر سے ذکر الٰہی کے لئے دل صاف اور نرم ہو گا' اور گذشتہ کوتاہی کی تلافی ہو گی' گویا یہ غفلت تجدید صفائے قلب' اور

تجدید رقت قلب کا سبب بن جائے گی۔ جب محب اپنے محبوب کے علاوہ کوئی چیز نہیں دیکھتا' صرف اپنے محبوب کو دیکھتا ہے تو کسی چیز کا افسوس نہیں ہوتا' اور نہ کسی بات میں شک کرتا ہے' بلکہ ہر حالت کو پوری رضا سے قبول کرلیتا ہے' اور یہ یقین رکھتا ہے کہ میری تقدیر میں وہی لکھا گیا ہے جو میرے حق میں بہتر ہے۔

وَعَسٰى أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ (پ ۲ ر ۱۰ آیت ۲۱۶)

اور یہ بات ممکن ہے کہ تم کسی امر کو گراں سمجھو اور وہ تمہارے حق میں خیر ہو۔

محبت کی ایک علامت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے راحت پائے' اس سے گرانی یا تعب محسوس نہ کرے' بلکہ ایسا حال ہو جائے جیسا ایک بزرگ کا تھا' فرماتے تھے کہ ہم نے بیس برس رات کو مشقت برداشت کی' اور اب بیس سال سے لذت حاصل کر رہے ہیں' حضرت جنید بغدادیؒ فرماتے ہیں کہ محبت کی علامت دائمی نشاط' اور ایسا مسلسل عمل ہے جس سے جسم تھک جائے لیکن دل نہ تھکے' بعض بزرگان دین فرماتے ہیں کہ محبت کے ساتھ کیئے گئے عمل سے تعب نہیں ہوتا۔ ایک بزرگ کہتے ہیں کہ کسی محب کو اللہ کی اطاعت سے سیری نہیں ہوتی اگرچہ بڑے وسائل حاصل کرلے۔ یہ امور مشاہد بھی ہیں' دیکھئے عاشق اپنے معشوق کی محبت میں کسی بھی کوشش سے گریز نہیں کرتا' اور اس کی خدمت کرکے لذت پاتا ہے' اگرچہ وہ خدمت بدن پر شاق ہی کیوں نہ ہو' اور جب جسم محنت و خدمت سے عاجز ہو جاتا ہے تو اس کی بڑی تمنا یہ ہوتی ہے کہ اسے دوبارہ قدرت مل جائے' اور اس کا عجز دور ہو جائے' یہاں تک کہ وہ اپنے محبوب کی خدمت میں اسی طرح مشغول ہو جائے جس طرح وہ پہلے تھا' یہی حال اللہ کی محبت کا ہے' آدمی پر جو محبت غالب ہوتی ہے وہ اس سے کم تر جذبے کو فنا کردیتی ہے' چنانچہ جس شخص کو سستی اور کسلمندی سے زیادہ اپنے محبوب سے محبت ہوگی وہ اس کے مقابلے میں سستی اور کسلمندی کو ترک کرنے پر مجبور ہوگا' اور اگر مال سے زیادہ محبوب ہوا تو اس کی محبت میں مال چھوڑنے پر مجبور ہوگا۔ ایک محب جس نے اپنا تمام مال قربان کردیا تھا یہاں تک کہ اس کے پاس کوئی چیز باقی نہیں رہی تھی کسی نے کہا کہ محبت میں تیرا یہ حال کیسے ہوگیا ہے؟ اس نے کہا کہ میں نے ایک دن ایک عاشق کو سنا کہ وہ خلوت میں اپنے معشوق سے کہہ رہا تھا کہ میں بخدا تجھے دل سے چاہتا ہوں' اور تو مجھ سے اعراض کرتا ہے' معشوق نے اس سے کہا اگر تو مجھے دل سے چاہتا ہے تو مجھ پر کیا خرچ کرے گا؟ اس نے کہا کہ پہلے تو جو کچھ میری ملکیت میں ہے میں وہ سب تجھے دیدوں گا' پھر میرے اوپر اپنی جان قربان کردوں گا تاکہ تیرا دل مجھ سے خوش ہو جائے' ان دونوں کی گفتگو سن کر میں نے دل میں سوچا کہ جب مخلوق کا تعلق کے ساتھ' اور بندے کا بندے کے ساتھ یہ معاملہ ہے تب بندے کا اپنے معبود کے ساتھ کیا معاملہ ہونا چاہیے' جب کہ سب کچھ اسی کے باعث ہے' یہی سوچ کر محبت میں میرا یہ حال ہوا۔

محبت کی ایک علامت یہ ہے کہ اللہ کے تمام بندوں کے ساتھ رحمت و شفقت کا معاملہ کرے اور ان لوگوں کے خلاف ہو جو اللہ تعالیٰ کے دشمن ہیں' اور اس کی مرضی کے خلاف عمل کرتے ہیں' اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :۔

أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ (پ ۲۶ ر ۱۲ آیت ۲۹)

کافروں کے مقابلے میں سخت ہیں آپس میں مہربان ہیں۔

ایسا کرنے سے اسے کسی ملامت گر کی ملامت نہ روکے' اور نہ اللہ تعالیٰ کے لئے غصہ کرنے میں کوئی چیز رکاوٹ بنے' ایک حدیث قدسی میں اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب بندوں کا یہی وصف بیان کیا ہے یعنی وہ لوگ جو میری محبت میں اس طرح فریفتہ ہیں جیسے بچہ کسی چیز پر فریفتہ ہوتا ہے' اور میرے ذکر پر اس طرح گرتے ہیں جس طرح پرندہ اپنے گھونسلے پر گرتا ہے' اور میرے محرمات کے ارتکاب کے منظر سے اس قدر برا فروختہ ہوتے ہیں جیسے چیتا اپنے شکار کو دیکھ کر غراتا ہے' پھر اسے یہ پروا نہیں ہوتی کہ آدمی کم ہیں یا زیادہ۔ اس مثال پر غور کرنا چاہیے' جب بچہ کسی چیز پر فریفتہ ہو جاتا ہے تو اس سے جدائی گوارہ نہیں کرتا' اور اگر وہ چیز اس سے چھن جاتی ہے تو وہ روتا چلاتا ہے' اور شور مچاتا ہے' اور یہ عمل اس وقت تک جاری رکھتا ہے جب تک وہ چیز دوبارہ اسے نہ مل

جائے' جب وہ سوتا ہے تو اس من پسند چیز کو اپنے کپڑوں میں چھپا کر سوتا ہے' اور اگر اتفاقاً آنکھ کھل جاتی ہے تو سب سے پہلے اسی کی طرف لپکتا ہے' اور اگر وہ چیز اپنی جگہ موجود نہ ہو تو روتا ہے' مل جائے تو خوش ہوتا ہے' جو اس سے چھیننے کی کوشش کرتا ہے اس سے ناراض ہو جاتا ہے' اور جو دیتا ہے اس سے خوش ہوتا ہے' چھا منتے سے اس قدر بے قابو ہوتا ہے کہ بعض اوقات وہ خود اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالتا ہے۔

شراب خالص کی جزاء یہ ہیں محبت کی علامات۔ جس شخص میں یہ علامات پورے طور پر ہوتی ہیں' اس کی محبت مکمل اور خالص ہوتی ہے' آخرت میں اس کی شراب خالص اور اس کا ذائقہ شیریں ہوگا' اور جس شخص کی محبت میں غیر اللہ کی محبت کا امتزاج ہو جاتا ہے وہ آخرت میں اپنی محبت کے بقدر مزہ حاصل کرے گا' یعنی اس کی شراب میں مقربین کی شراب کی کچھ مقدار بھی ملادی جائے گی' مقربین کی شراب کیا ہے؟ قرآن کریم میں اس کے متعلق ارشاد فرمایا گیا ہے :۔

إِنَّ الْأَبْرَارَ لَفِي نَعِيمٍ۔ (پ ۳۰ ر ۷ آیت ۲۲) نیک لوگ بے شک آسائش میں ہوں گے۔

اس کے بعد ارشاد فرمایا :۔

يُسْقَوْنَ مِن رَّحِيقٍ مَّخْتُومٍ خِتَامُهُ مِسْكٌ وَفِي ذَٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُونَ وَمِزَاجُهُ مِن تَسْنِيمٍ عَيْنًا يَشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُونَ۔ (پ ۳۰ ر ۸ آیت ۲۸)

اور ان کو پینے کے لئے شراب خالص جس پر مشک کی مہر ہوگی ملے گی' اور حرص کرنے والوں کو ایسی چیز کی حرص کرنی چاہیے اور اس (شراب میں) تسنیم کی آمیزش ہوگی' یعنی ایک ایسا چشمہ جس سے مقرب بندے پئیں گے۔

ابرار کی شراب اس لئے خالص ہوگی کہ اس میں اس خالص شراب کی آمیزش ہوگی جو مقربین کے لئے مخصوص ہے' شراب کسی مخصوص پینے والی چیز کا نام نہیں ہے' بلکہ اس کا اطلاق جنت کی تمام نعمتوں پر ہوتا ہے' جیسا کہ لفظ کتاب تمام اعمال کو شامل ہے' قرآن کریم میں فرمایا گیا :۔

إِنَّ كِتَابَ الْأَبْرَارِ لَفِي عِلِّيِّينَ۔ (پ ۳۰ ر ۸ آیت ۱۸) نیک لوگوں کا نامۂ اعمال علیین میں ہوگا۔

اس کے بعد ارشاد فرمایا :۔

يَشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُونَ۔ (پ ۳۰ ر ۸ آیت ۲۱) جس کو مقرب فرشتے شوق سے دیکھتے ہیں۔

یعنی ان کی کتاب اتنی بلند و بالا ہوگی کہ مقربین بھی اس کا مشاہدہ کریں گے' جس طرح ابرار مقربین کی قربت اور ان کے مشاہدے سے اپنی معرفت اور اپنے حال میں اضافہ کرتے ہیں ایسا ہی حال ان کا آخرت میں ہوگا جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :۔

مَّا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ إِلَّا كَنَفْسٍ وَاحِدَةٍ۔ (پ ۲۱ ر ۲ آیت ۲۸)

تم سب کا پیدا کرنا اور زندہ کرنا بس ایسا ہی ہے جیسا ایک شخص کا۔

كَمَا بَدَأْنَا أَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيدُهُ۔ (پ ۱۷ ر ۷ آیت ۱۰۴)

ہم نے جس طرح اول بار پیدا کرنے کے وقت ہر چیز کی ابتدا کی تھی اسی طرح (آسانی سے) اسے دوبارہ پیدا کریں گے۔

جَزَاءً وِفَاقًا۔ (پ ۳۰ ر ۱ آیت ۲۶) اور ان کو پورا پورا بدلہ ملے گا۔

یعنی جزاء اعمال کے موافق ملے گی' خالص عمل کے عوض میں خالص شراب عطا کی جائے گی' اور مخلوط عمل کی جزاء میں مخلوط شراب دی جائے گی' اور یہ اختلاط اسی قدر ہوگا جس قدر اللہ تعالیٰ کی محبت اور عمل میں غیر کی محبت مخلوط رہی ہوگی' ارشاد باری تعالیٰ ہے :۔ فَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ وَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ۔ (پ ۳۰ ر ۲۵ آیت ۷' ۸)

سو جو شخص دنیا میں ذرہ برابر نیکی کرے گا وہ اس کو دیکھ لے گا' اور جو شخص ذرہ برابر بدی کرے گا وہ اس کو دیکھ لے گا۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ۔ (پ ۱۳ ر ۸ آیت ۱۱)
واقعی اللہ تعالیٰ کسی قوم کی (اچھی) حالت میں تغیر نہیں کرتا جب تک وہ لوگ خود اپنی حالت کو نہیں بدل دیتے۔
اِنَّ اللّٰہَ لَا یَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّۃٍ وَاِنْ تَکُ حَسَنَۃً یُّضٰعِفْہَا۔ (پ ۵ ر ۳ آیت ۴۰)
بلاشبہ اللہ تعالیٰ ایک ذرہ برابر بھی ظلم نہ کریں گے۔
وَاِنْ کَانَ مِثْقَالَ حَبَّۃٍ مِّنْ خَرْدَلٍ اَتَیْنَا بِہَا وَکَفٰی بِنَا حَاسِبِیْنَ۔ (پ ۱۷ ر ۴ آیت ۴۷)
اور اگر کسی کا عمل رائی کے دانے کے برابر بھی ہو گا تو ہم اس کو (وہاں) حاضر کر دیں گے اور ہم حساب لینے والے کافی ہیں۔

جس شخص کا مقصد محبت دنیا میں یہ تھا کہ وہ آخرت کی زندگی میں جنت کی نعمتوں اور حور عین کی لذتوں سے ہم کنار ہو گا اور اس کی توقع کے مطابق جنت میں ٹھکانہ دیا جائے گا' وہ جہاں چاہے گا رہے گا' لڑکوں کے ساتھ کھیلے گا' اور عورتوں سے لطف اندوز ہو گا' بس آخرت میں اس کی لذت کی انتہا یہی نعمتیں اور راحتیں ہوں گی' اس لئے کہ محبت میں ہر انسان کو وہی ملے گا جس کا وہ متمنی ہو گا' اور جس کا مقصود دار آخرت کا مالک' ربّ الارباب اور ملک الملوک ہو گا' اور جس پر صرف اس کی خالص اور سچی محبت غالب ہو گی اسے وہ خاص مقام عطا کیا جائے گا جس کا ذکر قرآن کریم میں ہے :۔
فِیْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِیْکٍ مُّقْتَدِرٍ۔ (پ ۲۷ ر ۵ آیت ۵۵)
ایک عمدہ مقام میں قدرت والے بادشاہ کے پاس۔

اس تفصیل سے ثابت ہوا کہ ابرار باغوں میں گھومیں گے' اور جنت کے عالیشان محل میں حور و غلمان سے چہلیں کریں گے' اور مقربین اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں معتکف رہیں گے' اس کے مشاہدے میں ہمہ تن مصروف رہیں گے' اور انہیں اس انہماک اور عکوف میں جو لذت حاصل ہو گی اس کا ایک حقیر ذرّہ بھی وہ جنت کی نعمتوں کے لئے چھوڑنے پر راضی نہیں ہوں گے' گویا جو لوگ شکم اور شرمگاہ کی شہوات پوری کرنے میں مشغول ہوں گے وہ ان لوگوں سے مختلف ہوں گے جو رب کریم کی بارگاہ میں بیٹھ کر رب کریم کے دیدار کا شرف حاصل کرتے رہیں گے۔ اسی لئے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :۔
اَکْثَرُ اَہْلِ الْجَنَّۃِ الْبُلْہُ وَعِلِّیُّوْنَ لِذَوِی الْاَلْبَابِ۔ (بزار۔ انس۔ اسناد الاوّل)
اکثر اہل جنت سادہ لوح ہوں گے' اور مقام علیین پر ارباب دانش فائز ہوں گے۔

علیین کیا ہے؟ علیین ایک اعلا مقام ہے' عقلیں اس کی تحسین سے قاصر ہیں' اسی لئے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا :۔
وَمَا اَدْرٰکَ مَا عِلِّیُّوْنَ۔ (پ ۳۰ ر ۸ آیت ۱۹)
آپ کو کچھ معلوم ہے کہ علیین میں رکھا ہوا نامۂ اعمال کیا ہے۔
جیسا کہ قارعہ کے متعلق بھی یہی ارشاد فرمایا گیا :۔
اَلْقَارِعَۃُ مَا الْقَارِعَۃُ وَمَا اَدْرٰکَ مَا الْقَارِعَۃُ۔ (پ ۳۰ ر ۲۶ آیت ۱ تا ۳)
وہ کھڑکھڑانے والی چیز! کیسی کچھ ہے وہ کھڑکھڑانے والی چیز' اور آپ کو معلوم ہے کیسی کچھ ہے وہ کھڑکھڑانے والی چیز۔

محبت کی ایک علامت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے خوف اور اس کی ہیبت سے دل لرزاں رہے' اور جسم لاغر ہو جائے' بعض لوگوں کا خیال یہ ہے کہ خوف اور محبت دو متضاد جذبے ہیں' یہ ایک غلط خیال ہے ہرگز ایسا نہیں ہے' بلکہ عظمت کے ادراک سے دل میں خود بخود ہیبت پیدا ہوتی ہے جیسے جمال کے ادراک سے محبت پیدا ہوتی ہے' خاص محبین کے لئے محبت میں بھی خوف کے بڑے مواقع ہیں' محبت نہ کرنے والے یہ مواقع کیا جانیں' بعض خوف بعض سے زیادہ شدید ہیں' پہلا خوف اعراض ہے' اس سے شدید تر خوف حجاب کا ہے' پھر ابعاد کا ہے' سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد مبارک میں یہی خوف ابعاد مراد ہے کہ مجھے سورۂ ہود نے

پھٹکارا کردیا (ترمذی) کیوں کہ سورۂ ہود میں جا بجا اس طرح کی آیات وارد ہیں اَلَا بُعْدًا لِّثَمُوْدَ (سن لو پھٹکار ہو ثمود پر) اَلَا بُعْدًا لِّمَدْيَنَ كَمَا بَعِدَتْ ثَمُوْدُ (سن لو پھٹکار ہو مدین پر جیسے پھٹکار ہوئی ثمود پر) بعد کا خوف اور ڈر اسی شخص کے دل میں زیادہ ہوگا جو قربت سے مانوس ہوگا اور جس نے وصال کا ذائقہ چکھا ہوگا اس لئے جب بعد مدین کے لئے بھی بعد کی بات ہوتی ہے تو مقربین لرز اٹھتے ہیں اور خوف سے پیلے پڑ جاتے ہیں اور جو شخص بعد سے مانوس ہوتا ہے وہ قرب کا مشتاق نہیں ہوتا اور نہ وہ شخص بعد کے خوف سے روتا ہے جو قرب کے بستر پر فروکش نہ ہوا ہو ان تین مخاوف کے بعد وقوف (قیامت کے دن حساب کے لئے کھڑے ہونے) کا خوف ہے پھر مراتب میں زیادتی نہ ہونے کا خوف ہے جیسا کہ ہم پہلے بیان کرچکے ہیں کہ درجات قرب کی کوئی انتہا نہیں ہے اور بندہ کا حق یہ ہے کہ ہر لمحہ اپنے مراتب میں زیادتی کے لئے کوشاں رہے تاکہ زیادہ سے زیادہ قربت حاصل کرسکے۔ اسی لئے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :۔

مَنِ اسْتَوٰى يَوْمَاهُ فَهُوَ مَغْبُوْنٌ وَمَنْ كَانَ يَوْمُهُ شَرًّا مِّنْ اَمْسِهِ فَهُوَ مَلْعُوْنٌ۔ (بیہقی)

جس کے دونوں دن برابر ہوں وہ خسارے میں ہے اور جس کا آج کل سے برا ہو وہ ملعون ہے۔

نیز یہ بھی ارشاد فرمایا :۔

اِنَّهُ لَيُغَانُ عَلٰى قَلْبِيْ فَاَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ فِي الْيَوْمِ وَاللَّيْلَةِ سَبْعِيْنَ مَرَّةً۔ (بخاری و مسلم)

میرے دل پر میل آجاتا ہے تو میں دن اور رات میں ستر مرتبہ استغفار کرتا ہوں۔

آپ راہ سلوک کے مسافر تھے اور مسلسل سفر میں تھے اس لئے ہر قدم پر استغفار فرماتے تھے کیونکہ ہر پچھلا قدم اگلے قدم کے مقابلے میں بُعد اور دوری تھا سالکین کا راہ سلوک میں کہیں ٹھہرجانا بھی کسی عذاب سے کم نہیں ہے جیسا کہ ایک حدیث قدسی میں وارد ہے :۔ "اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب کوئی عالم میری اطاعت کے مقابلے میں دنیا کی محبت اور شہوات کو ترجیح دیتا ہے تو میں اسے کم سے کم سزا یہ دیتا ہوں کہ اس سے مناجات کی لذت سلب کرلیتا ہوں۔ عام سالکین زیادتی درجات سے محض دعویٰ عجب یا ان مبادی لطف کی طرف میلان سے محجوب کردیے جاتے ہیں جو ان پر ظاہر ہوتے ہیں یہی مکر خفی ہے اور اس سے صرف وہی شخص بچ سکتا ہے جو راہ سلوک میں راسخ قدم ہو اس کے بعد اس چیز کی محرومی کا خوف ہے جو ضائع جانے کے بعد دوبارہ حاصل نہیں ہوتی حضرت ابراہیم ابن ادہم اپنے سفر کے دوران کسی پہاڑ پر تھے کہ کسی نے یہ شعر پڑھے :۔

كُلُّ شَيْءٍ مِّنْكَ مَغْفُوْرٌ سِوَى الْاِعْرَاضِ عَنَّا
قَدْ وَهَبْنَا لَكَ مَا فَا تَ فَهَبْ مَا فَاتَ مِنَّا

(تیرا ہر گناہ معاف ہوسکتا ہے سوائے ہم سے اعراض کے تو تجھ سے جو فوت ہوا وہ ہم نے عطا کردیا اور جو ہم سے فوت ہوا وہ تو دے)۔

یہ شعر سن کر آپ مضطرب ہوگئے اور بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑے چوبیس گھنٹے بے ہوشی طاری رہی اس کے بعد پہاڑوں کی طرف سے ایک آواز سنی کہ اے ابراہیم! بندہ بن چنانچہ میں بندہ بن گیا اور اضطراب سے کچھ راحت پائی۔

اس کے بعد محبوب سے بے فکر اور لاپروا ہوجانے کا خوف ہے عاشق ہمیشہ شوق اور طلب و جستجو میں رہتا ہے اور مزید کی طلب میں سستی نہیں کرتا اور ہر دم لطف تازہ کا منتظر رہتا ہے اگر اس جستجو و طلب سے بے پروا ہوجائے تو پھر سالک ایک مقام پر ٹھہر جائے گا یا اس مقام پر پہنچ کر واپسی شروع کردے گا اور یہ دونوں ہی باتیں بری ہیں بے پروائی آدمی کے اندر اس طرح سرایت کرتی ہے کہ اسے احساس بھی نہیں ہوتا اسی طرح محبت بھی بعض اوقات چپکے سے دل میں داخل ہوجاتی ہے اور آدمی کو اس کا احساس بھی نہیں ہوتا ان تبدیلیوں کے مخفی آسمانی اسباب ہیں انسان کے لئے ممکن نہیں کہ وہ ان کا ادراک کرسکے جب اللہ تعالیٰ کسی انسان کے ساتھ مکر و استدراج کرنا چاہتا ہے تو اس کے قلب پر وارد ہونے والے خیالات اور آثار مخفی کردیتا ہے

یہاں تک کہ بندہ رجاء میں مبتلا رہتا ہے' اور حسن ظن سے دھوکا کھاتا ہے' یا اس پر غفلت اور نسیان کا غلبہ ہو جاتا ہے' یہ تمام امور شیطانی لشکر ہیں' اور علم' عقل' ذکر' بیان وغیرہ کے فرشتوں پر غلبہ حاصل کر لیتے ہیں۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کے اوصاف مختلف ہیں' اسی طرح ان کے آثار و مظاہر بھی مختلف ہیں' چنانچہ رحمت' لطف' اور حکمت کے اوصاف کا تقاضا یہ ہے کہ بندے میں محبت کے جذبات برپا ہوں' اور جباریت' عزت' اور استغناء کے اوصاف کا مقتضی یہ ہے کہ بندے میں بے فکری اور لاپروائی کے آثار پیدا ہوں' بہرحال اللہ تعالیٰ سے بے فکری' اور ترقی درجات سے بے نیازی بدبختی' اور حرماں نصیبی کا پیش خیمہ ہے۔

اس کے بعد سالک کو یہ خوف دامن گیر رہتا ہے کہ کہیں اللہ تعالیٰ کی محبت غیر کی محبت سے تبدیل نہ ہو جائے' یہ مقام مقت ہے' یعنی جب بندہ اس مقام تک پہنچ جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے شدید غضب کا مستحق ٹھہرتا ہے' اس مقام کا مقدمہ محبوب حقیقی سے بے پروا ہونا ہے' اور اس سے پہلے اعراض و حجاب کے مقدمات ہیں' اور ان سے پہلے یہ کیفیات طاری ہوتی ہیں کہ اچھے کاموں میں دل نہیں لگتا' ذکر پر مداومت سے طبیعت اکتاتی ہے' اور اوراد و وظائف سے جی چراتا ہے' ان مقدمات و اسباب کے ظہور کا مطلب یہ ہے کہ آدمی محبت کے مقام سے غضب کے مقام تک پہنچ گیا' ہم اس سے اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہتے ہیں' اور ان امور سے خائف رہنا اور اجتناب کرنا صدق محبت کی علامت ہے اس لئے کہ جو شخص کسی چیز سے محبت کرتا ہے اس کے ضائع ہو جانے کے خوف سے مضطرب رہتا ہے' عاشق کا خوف سے خالی ہونا ممکن نہیں' بشرطیکہ اس کی پسندیدہ اور محبوب چیز کا ضائع ہو جانا ممکن ہو' چنانچہ بعض عارفین کہتے ہیں کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے خوف سے خالی محبت کے ساتھ اللہ کی عبادت کرتا ہے وہ ناز کرنے' اور اترانے کے باعث اور اپنی حیثیت سے جاہل رہنے کے سبب ہلاک ہو جاتا ہے' اور جو شخص محبت سے خالی خوف کے ساتھ عبادت کرتا ہے وہ بُعد اور وحشت سے اپنا تعلق منقطع کر لیتا ہے' لیکن جو شخص محبت اور خوف دونوں کے ساتھ عبادت کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس سے محبت کرتے ہیں' اور اسے اپنے قریب کرتے ہیں' اور اسے علم عطا کرتے ہیں غرض یہ ہے کہ عاشق بھی خوف سے خالی نہیں ہوتا' اور خائف محبت سے خالی نہیں ہوتا' البتہ جس شخص پر محبت غالب رہتی ہے' اور وہ اس جذبے میں یہاں تک پہنچ جاتا ہے کہ اسے زیادہ خوف باقی نہیں رہتا' اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ شخص مقام محبت میں ہے' اس شخص کو محبین میں شمار کیا جاتا ہے' خوف کی یہ معمولی مقدار محبت کے نشے کو قابو میں رکھتی ہے' محبت اور معرفت کی زیادتی کا تحمل انسانی طاقت سے باہر ہے' البتہ خوف سے ان میں اعتدال پیدا ہو جاتا ہے' اور دل پر سہولت کے ساتھ ان کا گزر ہو جاتا ہے' روایات میں ہے کہ بعض ابدال نے کسی صدیق سے درخواست کی کہ وہ اس کے لئے اللہ تعالیٰ سے ذرہ بھر معرفت عطا کئے جانے کی دعا کر دیں' انہوں نے دعا کی' وہ بزرگ اس دعا کے بعد اس قدر بے چین و مضطرب ہوئے کہ جنگلوں اور پہاڑوں میں نکل گئے' ہوش و حواس گم کر دیئے' یہ حال دیکھ کر صدیق نے دعا کی کہ اے اللہ! ذرہ بھر معرفت سے کچھ کم معرفت عطا فرما' وحی آئی کہ ہم نے اپنی ذرہ بھر معرفت کا لاکھواں جزء عطا کیا تھا' اور اس کی وجہ یہ تھی جب آپ نے اس بندے کے لئے دعا کی اسی وقت ایک لاکھ بندوں نے ہم سے ذرہ بھر معرفت عطا کئے جانے کی دعا کی تھی' میں نے ان کی دعا قبول کرنے میں تاخیر کی یہاں تک کہ آپ نے اس بندے کے لئے سفارش فرمائی' تب میں نے ان لاکھ بندوں کو بھی شرف قبولیت بخشا' اور اپنی ذرہ بھر معرفت کو ان ایک لاکھ بندوں میں تقسیم کر دیا' اس ایک جزء سے اس بندے کا یہ حال ہوا اگر آپ کی دعا کے مطابق پورا ذرہ عطا کر دیا جاتا تو کیا حال ہوتا' صدیق نے عرض کیا: الٰہی تو پاک ہے' تو احکم الحاکمین ہے' جو کچھ تو نے عطا کیا ہے اس میں سے کم کر لے' اللہ تعالیٰ نے یہ جزء اتنا کم کیا کہ صرف اس کا دس ہزارواں حصہ باقی رہ گیا' تب جا کر ان کے ہوش ٹھکانے آئے' محبت' خوف' معرفت اور رجاء میں اعتدال پیدا ہوا' اور دل پُرسکون ہوا' اور عارفوں میں شامل ہوئے' یہ شعر عارف کے احوال کے بہترین عکاس ہیں:

قَرِيْبُ الْوَجْدِ ذُوْ مَرْمًى بَعِيْدٍ عَنِ الْأَحْرَارِ مِنْهُمْ وَالْعَبِيْدِ
غَرِيْبُ الْوَصْفِ ذُوْ عِلْمٍ غَرِيْبٍ كَأَنَّ فُؤَادَهُ زُبُرُ الْحَدِيْدِ

لَقَدْ عَزَّتْ مَعَانِيهِ وَجَلَّتْ عَنِ الْأَبْصَارِ إِلَّا لِلشَّهِيدِ
يَرَى الْأَعْيَادَ فِي الْأَوْقَاتِ تَجْرِي لَهُ فِي كُلِّ يَوْمٍ أَلْفُ عِيدِ
وَلِلْأَحْبَابِ أَفْرَاحٌ بَعِيدٌ وَلَا يَجِدُ السُّرُورَ لَهُ بَعِيدِ

(قریب الوجد ہے' اس کا مقصد تمام آزاد و غلام لوگوں سے جدا ہے' اس کے اوصاف جدا' اور اس کا علم اجنبی ہے' اس کا دل لوح حدید کی طرح مضبوط و محکم ہے' اس کے مقاصد بلند اور لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہیں' صرف اس شخص پر ظاہر ہیں جو دیدۂ بیدار رکھتا ہے' وہ ہر لمحہ پر آن عید کا مشاہدہ کرتا ہے' اس کے لئے ہر روز ہزاروں عیدیں ہوتی ہیں' احباب کے لئے جو باتیں باعث مسرت ہیں وہ ان سے خوش نہیں ہوتا)۔

حضرت جنید بغدادیؒ بھی عارفین کے احوال سے متعلق کچھ اشعار پڑھا کرتے تھے' اگرچہ ان کے مشمولات کا اظہار مناسب نہیں ہے' وہ اشعار یہ ہیں :-

سِرْتُ بِأُنَاسٍ فِي الْغُيُوبِ قُلُوبُهُمْ فَحَلُّوا بِقُرْبِ الْمَاجِدِ الْمُتَفَضِّلِ
عِرَاصًا بِقُرْبِ اللّٰهِ فِي ظِلِّ قُدْسِهِ تَجُولُ بِهَا أَرْوَاحُهُمْ وَتَنَقَّلُ
مَوَارِدُهُمْ فِيهَا عَلَى الْعِزِّ وَالنُّهَى وَمَصْدَرُهُمْ عَنْهَا لِمَا هُوَ أَكْمَلُ
تَرُوحُ بِعِزٍّ مُفْرَدٍ مِنْ صِفَاتِهِ وَفِي حُلَلِ التَّوْحِيدِ تَمْشِي وَتَرْفُلُ
وَمِنْ بَعْدِ هٰذَا مَا تَدِقُّ صِفَاتُهُ وَمَا كَتْمُهُ أَوْلَى لَدَيْهِ وَأَعْدَلُ
سَأَكْتُمُ مِنْ عِلْمِي بِهِ مَا يَصُونُهُ وَأَبْذُلُ مِنْهُ مَا أَرَى الْحَقَّ يَبْذُلُ
وَأُعْطِي عِبَادَ اللّٰهِ مِنْهُ حُقُوقَهُمْ وَأَمْنَعُ مِنْهُ مَا أَرَى الْمَنْعَ أَفْضَلُ
عَلَى أَنَّ لِلرَّحْمٰنِ سِرًّا يَصُونُهُ إِلَى أَهْلِهِ فِي السِّرِّ وَالصَّوْنِ أَجْمَلُ

(میں ایسے لوگوں کے ساتھ چلا جن کے دل غیب کی بات جانتے ہیں' اور وہ بزرگ و برتر کے قرب میں واقع ایسے میدانوں میں قدم رکھتے ہیں جو اس کے سایۂ اقدس میں ہیں' وہاں ان کی روحیں اِدھر اُدھر گھومتی پھرتی ہیں' عزت و حکمت ان کے وارد ہونے کی جگہ اور صفات کمال ان کے نکلنے کے مقامات ہیں' اس کی صفات کے زیور سے آراستہ' اور توحید کے لباس فاخرہ میں وہ آتے جاتے ہیں' ان مقامات کے بعد جو مقامات ہیں وہ ناقابل بیان ہیں' بلکہ ان کا کتمان زیادہ بہتر اور مناسب ہے' میں اپنے علم میں سے وہ باتیں چھپاتا ہوں جنہیں یہ دیکھتا ہوں کہ خدائے برحق چھپاتا ہے' اور وہ باتیں ظاہر کرتا ہوں جن کی حق اجازت دیتا ہے' بندگان خدا کو صرف اتنا دیتا ہوں جتنا دینا ان کا حق ہے' اور انہیں اس چیز سے روک دیتا ہوں جس سے روکنا افضل ہے' حق تعالیٰ کے کچھ راز ہیں جنہیں وہ ان لوگوں پر آشکار کرتا ہے جو ان رازوں کے امین اور اہل ہیں' باقی لوگوں سے ان رازوں کا مخفی رکھنا ہی بہتر ہے)۔

ان اشعار میں جن معارف کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ان میں تمام لوگوں کا شریک ہونا ممکن نہیں ہے' اور نہ یہ جائز ہے کہ اگر کسی پر ان معارف میں سے کچھ منکشف ہو جائے تو وہ ان لوگوں کو آگاہ کردے جن پر کچھ منکشف نہیں ہوا' بلکہ اگر تمام لوگ ان معارف میں شریک ہو جاتے تو یہ دنیا تباہ و برباد ہو جاتی' دنیا کی تعمیر اور آبادی کے لئے ضروری ہے کہ ان معارف سے غفلت عام رہے' حقیقت تو یہ ہے کہ گر تمام لوگ صرف چالیس روز تک یہ تہیہ کرلیں کہ وہ حلال کے علاوہ کچھ نہ کھائیں گے تو دنیا ان کے باعث تباہ ہو جائے گی' بازار ویران ہو جائیں گے' اور معیشت کے ذرائع مسدود ہو جائیں گے' بلکہ اگر علماء اکل حلال کا عزم کرلیں تو انہیں اپنے نفس کی مشغولیت کے علاوہ کوئی مشغولیت باقی نہ رہے' اور اپنے قلم و قدم کے ذریعے جو علوم وہ دنیا بھر میں پھیلاتے ہیں ان کا

سلسلہ موقوف ہو جائے، لیکن اللہ تعالیٰ کا نظام حکمتوں سے خالی نہیں ہے، بظاہر تمہیں جو چیز شر نظر آتی ہے وہ بھی اسرار و حکم سے خالی نہیں ہے، جس طرح خیر میں بھی بے شمار اسرار و حکمتیں ہیں، جس طرح اس کی قدرت کی کوئی انتہا نہیں ہے اسی طرح اس کی حکمت بھی لامتناہی ہے۔

محبت کی ایک علامت یہ ہے کہ اپنی محبت کو پوشیدہ رکھے، دعووں سے اجتناب کرے، محبت اور وجد کے اظہار سے بچے، اس لئے کہ محبت کو چھپانے ہی میں محبوب کا احترام اور تعظیم ہے، اور اسے مخفی رکھنا ہی اس کی جلالت و ہیبت کا مقتضی ہے، اس کے راز کو دوسروں پر ظاہر کرنے سے اسے غیرت آئے گی، محبت محبوب کا ایک راز ہے، راز ہر کس و ناکس کو نہیں بتلائے جاتے، پھر بعض اوقات دعوی میں مبالغہ ہو جاتا ہے، اور زبان سے وہ بات نکل جاتی ہے جو حقیقت میں نہیں ہوتی، یہ افتراء اور بہتان ہے، اور آخرت میں شدید ترین عذاب کا باعث ہے، بلکہ اس افتراء کی سزا دنیا میں بھی مل سکتی ہے، تاہم کبھی عاشق اپنی محبت میں اس قدر مستغرق اور اس کے نشے میں اتنا چور ہوتا ہے کہ اسے یہ ہوش باقی نہیں رہتا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے، اور کیا کر رہا ہے، اگر وہ محبت کا اظہار کر دے تو اُسے معذور سمجھا جائے اس لئے کہ وہ جذبۂ محبت سے مغلوب ہے، اور دل کی بات زبان پر لانے پر مجبور ہے، کبھی آتش محبت اس قدر بھڑکتی ہے کہ ارد گرد کی چیزوں کو خاکستر کر دیتی ہے، اور کبھی محبت ایک سیلاب کی طرح وارد ہوتی ہے، یہاں تک کہ آدمی اس میں غرق ہو جاتا ہے، جو شخص محبت چھپانے پر قادر ہے وہ اپنے حال کی عکاسی اس طرح کرتا ہے :۔

وَقَالُوْا قَرِیْبٌ قُلْتُ مَا اَنَا صَانِعٌ بِقُرْبِ شُعَاعِ الشَّمْسِ لَوْ کَانَ فِیْ حِجْرِیْ
فَمَالِیْ مِنْہُ غَیْرُ ذِکْرٍ بِخَاطِرٍ یُھَیِّجُ نَارَ الْحُبِّ وَالشَّوْقِ فِیْ صَدْرِیْ

(لوگ کہتے ہیں محبوب قریب ہے، میں کہتا ہوں اگر سورج کی شعاع میرے پہلو میں ہو تو میں کیا کروں گا؟
میرے لئے تو دل میں اس کی اس قدر یاد کافی ہے جو سینے میں محبت اور شوق کی آگ بھڑکاتی رہے)۔

جو شخص محبت کا راز چھپانے سے عاجز ہے وہ یہ کہتا ہے :۔

یُخْفِیْ فَیُبْدِی الدَّمْعُ اَسْرَارَہٗ وَیُظْھِرُ الْوَجْدُ عَلَیْہِ النَّفَسْ

(وہ چھپاتا ہے، لیکن آنسو اس کے راز آشکار کر دیتے ہیں، اور وجد کی کیفیت اس کے باطن کو نمایاں کر دیتی ہے)۔

وہ اس شعر کے ذریعے بھی اپنی کیفیت کی ترجمانی کرتا ہے :۔

وَمَنْ قَلْبُہٗ مَعَ غَیْرِہٖ کَیْفَ حَالُہٗ وَمَنْ سِرُّہٗ فِیْ جَفْنِہٖ کَیْفَ یَکْتُمُ

(جس کا دل غیر کے ساتھ ہو اس کا حال کیا، اور جس کا راز اس کی پلکوں پر رکھا ہوا ہو وہ اسے کیسے چھپا سکتا ہے؟)۔

بعض عارفین کہتے ہیں کہ لوگوں میں اللہ تعالیٰ سے بعید ترین شخص وہ ہے جو اس کی طرف اشارہ کرے اس سے مراد وہ شخص ہے جو خواہ مخواہ تکلف سے کام لے کر ہر جگہ اللہ تعالیٰ کی طرف اشارہ کرے، ایسا شخص محبین خدا اور عارفین باللہ کے نزدیک مغضوب ہے، ذوالنون مصری اپنے ایک دوست کے پاس گئے جو محبت الٰہی کا ذکر کیا کرتے تھے، آپ نے انہیں کسی مصیبت میں مبتلا دیکھا اور فرمایا جو شخص اس کی عطا کردہ مصیبت میں لذت پاتا ہے اسے حقیقی محبت نہیں ہوتی، دوست نے جواب دیا کہ میرے خیال سے تو وہ شخص حبیب نہیں ہو سکتا جو محبت میں اپنے نفس کی تشہیر کرے، اس شخص نے اپنی حرکت پر ندامت کا اظہار کیا، اور اللہ تعالیٰ سے مغفرت چاہی۔

اگر یہ کہا جائے کہ محبت منتہائے مقامات ہے، اور اس کا اظہار ایک مقام خیر کا اظہار ہے، اس لئے اظہار محبت سے کیسے انکار کیا جا سکتا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ محبت ایک وصف محمود ہے، اور اس کا خود بخود ظاہر ہو جانا بھی محمود ہے، لیکن اس کا مظاہرہ کرنا مذموم ہے، مظاہرے میں دعوی اور استکبار دونوں پائے جاتے ہیں، محبت کا حق یہ ہے کہ اس کی مخفی محبت پر اس کے افعال اور احوال دلالت کریں، نہ کہ اس کے اقوال سے اس کی محبت کا حال ظاہر ہو، محبت ایسی ہونی چاہیے کہ اس کے کسی فعل یا عمل سے یہ ثابت نہ ہو کہ وہ اپنی محبت ظاہر کرنا چاہتا ہے، بلکہ اس کا مقصد ہمیشہ یہی ہو کہ محبت کا علم محبوب کے علاوہ کسی اور کو نہ ہونے

پائے۔ یہ خواہش کہ محبوب کے علاوہ بھی کوئی دوسرا اس کی محبت کا رازداں بن جائے شرک فی المحبت ہے' اور محبت کے خلاف ہے' جیسا کہ انجیل میں ہے کہ جب تم صدقہ کرو تو اس طرح کرو کہ تمہارے بائیں ہاتھ کو یہ معلوم نہ ہو کہ دائیں ہاتھ نے کیا کیا ہے اس کا بدلہ تمہیں اعلانیہ طور پر وہ دے گا جو پوشیدہ باتیں جان لیتا ہے' اور جب تم روزہ رکھو تو منہ دھویا کرو اور سر پر تیل مل لیا کرو (تاکہ تر و تازہ نظر آؤ) اور تمہارے رب کے سوا کسی دوسرے کو تمہارے روزے کا علم نہ ہونے پائے' بہرحال قول و فعل دونوں سے محبت کا اظہار مذموم ہے' الاّ یہ کہ محبت کا نشہ غالب ہو' اور زبان چل پڑے اعضاء مضطرب ہو جائیں تو ایسا شخص اظہار محبت میں قابل ملامت نہیں ہوتا۔

ایک شخص نے کسی مجنوں کو کسی ایسے حال میں دیکھا جس میں وہ جاہل تھا' انہوں نے حضرت معروف کرخیؒ سے اس کا ذکر کیا' معروف کرخیؒ یہ سن کر ہنسے اور کہنے لگے کہ اے بھائی اس کے بیشمار محبت کرنے والے ہیں' ان میں چھوٹے بھی ہیں اور بڑے بھی' عقلمند بھی ہیں' اور مجنوں بھی' جس شخص کو تم نے دیکھا ہے وہ مجنونوں میں سے ہے۔ اظہار محبت میں اس لئے بھی قباحت ہے کہ اگر محب عارف ہو گا' اور دائمی محبت اور مسلسل شوق کے متعلق فرشتوں کے احوال سے واقف ہو گا' اور یہ بات اس کے سامنے ہو گی :- يُسَبِّحُوْنَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ لَا يَفْتُرُوْنَ۔ (پ ۱۷ ر ۲ آیت ۲۰)

شب و روز (اللہ کی) تسبیح کرتے ہیں (کسی وقت) موقوف نہیں کرتے۔

لَا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَا اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ۔ (پ ۲۸ ر ۱۹ آیت ۶)

وہ نافرمانی نہیں کرتے کسی بات میں جو کچھ ان کو حکم دیا جاتا ہے' اور جو کچھ ان کو حکم دیا جاتا ہے وہ فوراً بجا لاتے ہیں۔

تو اسے اپنے نفس کے عجز' اور محبت کے دعوئی میں شرمندگی ہو گی' اور یہ جان لے گا کہ میں محبین میں معمولی درجہ رکھتا ہوں' اور میری محبت دوسرے محبین خدا کے مقابلے میں انتہائی ناقص ہے' ایک صاحب کشف محب خدا فرماتے ہیں کہ میں نے تیس برس تک اللہ تعالیٰ کی اپنی تمام تر قوت اور طاقت کے بقدر عبادت کی' یہاں تک کہ مجھے یہ گمان ہو چلا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک میرا کچھ مرتبہ ہے' اتنا کہہ کر انہوں نے اپنے طویل مکاشفات بیان کئے' اور آسمانی اسرار کے انکشاف کی تفصیل بتلائی' اور آخر میں کہا کہ فرشتوں کی ایک جماعت میں پہنچا جن کی تعداد تمام مخلوق کی تعداد کے برابر تھی' میں نے ان سے پوچھا کہ تم کون ہو' انہوں نے جواب دیا ہم محبین خدا ہیں' یہاں تین لاکھ برس سے اللہ کی عبادت کر رہے ہیں' ہمارے دلوں میں آج تک اس کے سوا کسی کا خیال نہیں آیا' اور نہ ہم نے اس کے سوا کسی کا ذکر کیا' وہ بزرگ کہتے ہیں' میں ان کا یہ جواب سن کر سخت شرمندہ ہوا' میں نے اپنے تمام اعمال ان لوگوں کو ہبہ کر دیئے جو عذاب کے مستحق ہیں' تاکہ ان کے عذاب میں تخفیف ہو' اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص اپنے رب اور اپنے نفس کی معرفت رکھتا ہے' اور اس سے ایسی شرم کرتا ہے جیسی شرم کرنا اس کا حق ہے اس کی زبان دعوئ محبت سے گونگی ہو جاتی ہے' البتہ اس کی حرکات و سکنات' اور اقدام و اعراض سے محبت کا پتا چلتا رہتا ہے' حضرت جنید بغدادیؒ نے اپنے شیخ حضرت سری سقطیؒ کا حال بیان کیا کہ ایک دفعہ وہ بیمار ہو گئے' لیکن نہ ہم ان کی بیماری کا سبب جان پائے اور نہ دوا سے واقف ہو سکے' کسی نے ہم سے بتلایا کہ فلاں شخص نہایت تجربہ کار اور حاذق حکیم ہے' ہم اس سے رابطہ کریں' میں اپنے شیخ کا قارورہ لے کر اس حکیم کے پاس گیا' حکیم نے قارورہ دیکھا اور دیر تک دیکھنے کے بعد مجھ سے کہا کہ یہ قارورہ تو کسی عاشق کا معلوم ہوتا ہے' میں یہ سن کر رونے لگا' اور بے ہوش ہو کر گر پڑا' شیشی بھی ہاتھ سے چھوٹ کر گر گئی ہوش آنے کے بعد میں نے اپنے مرشد کی خدمت میں تمام واقعہ عرض کیا' یہ واقعہ سن کر مسکرائے اور فرمایا واقعۃً وہ حکیم قارورہ خوب پہچانتا ہے' اللہ اسے ہلاک کردے' میں نے عرض کیا کیا قارورے میں بھی عشق ظاہر ہو جاتا ہے' فرمایا ہاں قارورے میں بھی ظاہر ہو جاتا ہے' ایک مرتبہ حضرت سقطیؒ نے فرمایا : میں چاہوں تو کہہ دوں کہ اسی کی محبت نے میرا گوشت گھلا گھلا کر ہڈیوں سے لگا دیا ہے' یہ کہہ کر بے ہوش ہو گئے' بے ہوشی سے پتا چلتا ہے کہ آپ نے اپنا راز غلبۂ وجد میں ظاہر کر دیا تھا۔ یہ ہیں محبت کی علامات اور اس کے ثمرات۔ انس و رضا بھی محبت کے ثمرات

ہیں' ان کا بیان عنقریب آئے گا' حقیقت تو یہ ہے کہ تمام محاسن دین اور مکارم اخلاق محبت کے ثمرات ہیں اگر محبت کا کوئی ثمر نہیں تو وہ اتباع ہوی ہے' اور اتباع ہوی رذائل اخلاق میں سے ہے۔

اللہ تعالیٰ کے ساتھ دو طرح کی محبت ہوتی ہے' کوئی اس لئے محبت کرتا ہے کہ اس پر اللہ تعالیٰ کا احسان ہے' اور کوئی صرف اس کے جلال و جمال کے باعث محبت کرتا ہے' اگرچہ اس پر کوئی احسان نہ ہو۔ حضرت جنید بغدادیؒ نے فرمایا کہ محبت میں آدمی دو طرح کے ہیں' ایک عام' اور دوسرے خاص' عام آدمی اللہ تعالیٰ سے محبت اس لئے کرتا ہے کہ وہ اس کے عظیم تر احسانات اور بے پایاں انعامات کا مشاہدہ کرتا ہے' اور اس کی محبت کے علاوہ کوئی چارہ نہیں پاتا' تاہم عوام الناس کی محبت میں احسان میں کمی بیشی کے اعتبار سے کمی بیشی ہوتی رہتی ہے' اور خواص اس لئے محبت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی شان عظیم ہے' وہ علم' قدرت' اور حکمت والا ہے' اور سلطنت میں یکتا ہے' جب وہ اس کی صفات کمال اور اسمائے حسنیٰ کا مشاہدہ کرتے ہیں تو اس سے محبت کئے بغیر نہیں رہتے' کیوں کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس محبت کا مستحق ہے' اگرچہ اس نے انھیں اپنی کسی نعمت کا اہل نہ سمجھا ہو' اور تمام احسانات سے الگ رکھا ہو' بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو خواہشات نفس' اور دشمن خدا ابلیس سے محبت کرتے ہیں' اور بربنائے جہالت یہ سمجھتے ہیں کہ ہم محبین خدا ہیں' یہ وہ لوگ ہیں جن میں محبت کی مذکورہ بالا علامات نہیں ہوتیں' یا نفاق' ریاء اور ناموری کے لئے وہ خدا اور دشمن خدا کی محبت میں تلبیس کردیتے ہیں' ان کا مقصد دنیوی حظوظ کا حصول ہے' حالانکہ وہ اس کے برخلاف ظاہر کرتے ہیں' جیسے علمائے سوء' اور قراء سوء' یہ لوگ زمین میں اللہ کے مبغوض ہیں۔ سہل تستری جب کسی انسان سے گفتگو کرتے ہیں تو اسے اے دوست! اے حبیب! کہتے' کسی نے ان سے دریافت کیا کہ آپ ہر شخص کو حبیب کیوں کہتے ہیں' ہو سکتا ہے وہ شخص آپ کا حبیب نہ ہو' آپ نے سائل کے کان میں فرمایا اگر وہ مومن ہے تو اللہ کا دوست ہے' اور منافق ہے تو ابلیس کا دوست ہے' ابو تراب نخشبی محبت کی علامات کے سلسلے میں فرماتے ہیں۔

لَا تُخْدَعَنَّ فَلِلْحَبِيْبِ دَلَائِلٌ ... وَلَدَيْهِ مِنْ تُحَفِ الْحَبِيْبِ وَسَائِلُ
مِنْهَا تَنَعُّمُهُ بِمُرِّ بَلَائِهِ ... وَسُرُوْرُهُ فِيْ كُلِّ مَا هُوَ فَاعِلُ
فَالْمَنْعُ مِنْهُ عَطِيَّةٌ مَقْبُوْلَةٌ ... وَالْفَقْرُ إِكْرَامٌ وَبِرٌّ عَاجِلُ
وَمِنَ الدَّلَائِلِ أَنْ تُرَى مِنْ عَزْمِهِ ... طَوْعَ الْحَبِيْبِ وَإِنْ أَلَحَّ الْعَاذِلُ
وَمِنَ الدَّلَائِلِ أَنْ يُرَى مُتَبَسِّمًا ... وَالْقَلْبُ فِيْهِ مِنَ الْحَبِيْبِ بَلَابِلُ
وَمِنَ الدَّلَائِلِ أَنْ يُرَى مُتَقَشِّفًا ... مُتَحَفِّظًا مِنْ كُلِّ مَا هُوَ قَائِلُ

(تم دھوکے میں مت آنا حبیب کے لئے دلائل اور علامات ہیں' اور اس کے پاس حبیب کی جانب سے وسائل کے تحفے ہیں' ان میں سے ایک دلیل مصیبت کی تلخی سے مزہ لینا ہے' اور محبوب کے ہر کام سے خوش ہونا' اگر محبوب سے کچھ نہیں ملتا تو اسے ہی عطیہ سمجھ کر قبول کرلیتا ہے' فقر کو اکرام اور بھلائی تصور کرتا ہے' ان دلائل میں سے ایک یہ ہے کہ تم اطاعت محبوب کے لئے اس کا عزم رکھتے ہو' اگرچہ لوگ ملامت کے تیروں سے چھلنی کرتے ہوں' ایک دلیل یہ ہے کہ وہ ہنستا مسکراتا نظر آتا ہے' اگرچہ دل محبوب کی جدائی سے خون کے آنسو رو رہا ہو اور ایک دلیل یہ ہے کہ تم اسے زبان سے نکلنے والے ہر لفظ میں محتاط اور خستہ حال دیکھتے ہو۔)

یحییٰ ابن معاذ نے محب خدا کی چند علامات ان اشعار میں بیان فرمائی ہیں۔

وَمِنَ الدَّلَائِلِ أَنْ تَرَاهُ مُشَمِّرًا ... فِيْ خِرْقَتَيْنِ عَلَى شُطُوْطِ السَّاحِلِ
وَمِنَ الدَّلَائِلِ حُزْنُهُ وَنَحِيْبُهُ ... جَوْفَ الظَّلَامِ فَمَا لَهُ مِنْ عَاذِلِ
وَمِنَ الدَّلَائِلِ أَنْ تَرَاهُ مُسَافِرًا ... نَحْوَ الْجِهَادِ وَكُلِّ فِعْلٍ فَاضِلِ

وَمِنَ الدَّلَائِلِ زُهْدُهُ فِيمَا يَرَى ... مِنْ كُلِّ ذُلٍّ وَالنَّعِيمِ الزَّائِلِ
وَمِنَ الدَّلَائِلِ أَنْ تَرَاهُ مُسْلِمًا ... كُلَّ الْأُمُورِ إِلَى الْمَلِيكِ الْعَادِلِ
وَمِنَ الدَّلَائِلِ أَنْ تَرَاهُ بَاكِيًا ... أَنْ قَدْ رَآهُ عَلَى قَبِيحِ فَعَائِلِ
وَمِنَ الدَّلَائِلِ أَنْ تَرَاهُ رَاضِيًا ... بِمَلِيكِهِ فِي كُلِّ حُكْمٍ نَازِلِ
وَمِنَ الدَّلَائِلِ ضِحْكُهُ بَيْنَ الْوَرَى ... وَالْقَلْبُ مَحْزُونٌ كَقَلْبِ الثَّاكِلِ

(علامات محبت میں سے ایک علامت یہ ہے کہ تم اسے دو چیتھڑوں میں لپٹا ہوا ساحل سمندر پر چست قدم اٹھاتا ہوا دیکھتے ہو' اور ایک علامت رات کی تاریکی میں جب کہ کوئی ملامت گر نہ ہو اس کا حزن اور آہ و زاری ہے' اور ایک یہ کہ تم اسے جہاد اور ہر نیک عمل کے لئے پابہ رکاب دیکھتے ہو' اور ایک علامت ذلت کے گھر' اور فنا ہو جانے والی نعمتوں سے اس کا زہد ہے' اور ایک علامت یہ ہے کہ وہ تمام امور کو شہنشاہ عادل کے سپرد کرتا ہے' اور ایک دلیل یہ ہے کہ تم اسے برائی کے مناظر پر روتے ہوئے دیکھتے ہو' اور ایک علامت یہ ہے کہ تم اسے ہر فیصلے میں اپنے مالک اور آقا سے راضی پاتے ہو' اور ایک علامت یہ ہے کہ وہ لوگوں کے مجمع میں ہنستا ہے جب کہ غم سے اس کا دل پھٹا جاتا ہے)۔

انس باللہ کے معنی

ہم نے بیان کیا ہے کہ انس' خوف' اور شوق محبت کے آثار ہیں' تاہم یہ مختلف آثار ہیں' اور محب پر ان کا وقوع اس کی نظر' اور غلبہ کیفیت کے باعث مختلف ہوا کرتا ہے' بعض اوقات محب حجاباتِ غیب سے منتہائے جمال کے ظہور کا متمنی ہوتا ہے' اور اپنے آپ کو کنہ جلال پر مطلع ہونے سے عاجز سمجھتا ہے' اس وقت دل طلب میں مشغول ہوتا ہے' اور قلب میں کچھ پانے کی ایک ایسی کیفیت پیدا ہوتی ہے جسے شوق کہتے ہیں' اور بعض اوقات محب پر قربت کی خوشی غالب ہوتی ہے' اور دل پر اس قربت سے جمال و جلال کی جو کیفیات مکشوف ہوتی ہیں ان میں مشغول ہوتا ہے' انہی کیفیات سے لذت حاصل کرتا ہے' جو چیز اب تک حاصل نہیں ہوئی اس کی طرف التفات نہیں کرتا' اس سرور کو انس کہتے ہیں' بعض اوقات محب کی نظر محبوب کی صفات عزت' استغناء اور بے نیازی پر ہوتی ہے' اور یہ خیال بھی دامن گیر ہوتا ہے کہ قربت زائل ہو سکتی ہے' اور بُعد واقع ہو سکتا ہے' اس خیال سے دل کو تکلیف ہوتی ہے' اس کیفیت کو شوق کہتے ہیں۔ یہ تمام احوال ملاحظات کے تابع ہیں' اور یہ ملاحظات ان اسباب کے تابع ہیں جو ان ملاحظات کے مقتضی ہیں' اور یہ اسباب بے شمار ہیں۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ مطالعۂ جمال سے قلب کے خوش ہونے کا نام انس ہے' جب یہ سرور غالب ہوتا ہے اور جو چیز غائب ہوتی ہے اس کا خیال نہیں رہتا' اور نہ دل پر بُعد یا سلب کا کوئی خوف گزرتا ہے اس وقت یہ سرور نہایت لذت اور الفت بخشتا ہے۔ ایک بزرگ سے سوال کیا گیا کہ کیا تم مشتاق ہو' فرمایا شوق تو ان چیزوں کا ہوتا ہے جو نگاہوں سے اوجھل ہوں' اور جب کسی کے لئے غائب حاضر ہو تو پھر وہ کس چیز کا مشتاق ہو گا' اس سے ثابت ہوا کہ وہ بزرگ ان چیزوں کو پا کر اس قدر خوش تھے' اور اس خوشی میں اس قدر مدہوش تھے کہ جو چیزیں انہیں حاصل نہ تھیں ان کی طرف بھی التفات نہ تھا' جس شخص پر انس کی حالت غالب ہوتی ہے وہ صرف تنہائی اور خلوت کا مشتاق ہوتا ہے' جیسا کہ حضرت ابراہیم ابن ادہم سے کسی نے پوچھا کہ آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟ وہ اس وقت پہاڑ سے اتر کر آئے تھے' انہوں نے جواب میں فرمایا کہ میں انس باللہ کی طرف سے آیا ہوں' انس کی حالت رکھنے والے تنہائی اس لئے چاہتے ہیں کہ انہیں غیر اللہ سے وحشت ہوتی ہے' بلکہ ہر اس چیز سے توحش ہوتا ہے جو خلوت کے مانع ہو' روایت ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ نے گفتگو فرمائی تو کچھ عرصے تک آپ کی یہ کیفیت رہی کہ اگر کانوں میں کوئی بشری آواز پڑ جاتی تو بے ہوش ہو جاتے' اس لئے کہ محبت کی وجہ سے محبوب کا کلام اس قدر لذیذ اور شیریں معلوم ہوتا ہے کہ

دوسرے کلام کی لذت و حلاوت باقی نہیں رہتی۔ اسی لئے بعض حکماء اپنی دعا میں کہا کرتے تھے :۔ اے وہ ذات جس نے مجھے اپنے ذکر سے انس بخشا' اور جس نے مجھے اپنی مخلوق سے متوحش کیا' اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام سے فرمایا میرا مشتاق بن' مجھ سے مانوس ہو جا اور میرے غیر سے وحشت کر۔ حضرت رابعہ بصریہ سے پوچھا گیا کہ آپ نے یہ مرتبہ کیسے حاصل کیا ہے؟ فرمایا غیر ضروری امور ترک کر کے اور خدائے لم یزل سے مانوس ہو کر' عبدالواحد ابن زید کہتے ہیں کہ میرا گذر ایک راہب کے پاس سے ہوا' میں نے اس سے کہا اے راہب تجھے تنہائی بہت زیادہ پسند ہے' راہب نے جواب دیا اگر تو بھی تنہائی کا مزہ چکھ لے تو اپنے آپ سے بھی متوحش ہو جائے تنہائی اصل عبادت ہے' میں نے پوچھا اے راہب تنہائی میں تجھے کم سے کم کیا فائدہ محسوس ہوتا ہے' راہب نے کہا تنہائی میں کم سے کم فائدہ یہ ہے کہ' میں لوگوں کی خوشامد اور ان کے شر سے محفوظ رہتا ہوں' میں نے اس سے دریافت کیا کہ بندہ انس باللہ کی حالت کب پاتا ہے' اس نے جواب دیا جب محبت خالص ہو' اور معاملہ صاف ہو' میں نے پوچھا محبت کب خالص ہوتی ہے؟ اس نے جواب دیا جب تمام افکار کا مرکز اللہ کی اطاعت بن جائے۔ بعض حکماء کا قول ہے لوگوں پر تعجب ہوتا ہے کہ وہ کیسے تیرا عوض چاہتے ہیں' لوگوں کے دلوں پر حیرت ہوتی ہے کہ وہ تجھ سے اعراض کر کے تیرے غیر سے مانوس ہوتے ہیں۔

انس کی علامت انس کی مخصوص علامت یہ ہے کہ لوگوں کے ساتھ ملنے جلنے' اٹھنے بیٹھنے میں دل تنگی محسوس کرے' اور ان سے پریشان ہو' ذکر الٰہی کی حلاوت کا متلاشی' اور یاد الٰہی کی لذت کا حریص ہو' اس صورت میں اگر وہ لوگوں سے ملے جلے گا بھی تو ایسا ہو گا جیسے کوئی جماعت میں تنہا ہو' تنہائی میں لوگوں کے ساتھ ہو' وطن میں مسافر ہو' اور سفر میں مقیم ہو' غائب ہونے کی حالت میں موجود ہو' اور موجود ہوتے ہوئے غائب ہو یعنی جسم کے ساتھ لوگوں میں ہے' محو گفتگو ہے' لیکن دل اللہ کی یاد میں مستغرق ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے ایسے لوگوں کے متعلق فرمایا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جن پر حقائق امور ہجوم کئے ہوئے ہیں جو یقین کی دولت سے مالا مال ہیں' مالداروں نے جس امر کو دشوار تصور کیا اسے ان لوگوں نے سہل سمجھا' یہ لوگ اس ذات سے مانوس ہوئے جس سے جہلاء وحشت کرتے ہیں' وہ دنیا میں صرف جسموں کے ساتھ ہیں' ان کی روحیں ملاء اعلا میں معلق ہیں' یہ لوگ زمین میں اللہ کے خلیفہ' اور اس کے دین کی دعوت دینے والے ہیں۔ یہ ہیں انس کے معنی' اس کی علامت' اور اس کے شواہد۔ بعض متکلمین انس' شوق اور محبت کا انکار کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں اللہ کے لئے انس' شوق اور محبت ثابت کرنا تشبیہ پر دلالت کرتا ہے' یہ لوگ دراصل اس جہل میں مبتلا ہیں کہ بصائر کا ادراک بصیرت کے ادراک سے زیادہ مکمل ہوتا ہے' ان منکرین میں سرفہرست احمد ابن غالب ہیں جو غلام خلیل کے نام سے شہرت رکھتے ہیں یہ شخص حضرت جنید بغدادیؒ اور حضرت ابوالحسن نوری کے شوق' محبت اور عشق کا انکار کیا کرتا تھا۔ اسی قسم کے بعض سرپھرے لوگوں نے مقام رضا کا بھی انکار کر دیا' اور کہنے لگے کہ صبر کے علاوہ کوئی مقام نہیں ہے' رضا کا تصور نہیں کیا جا سکتا' حالانکہ یہ ایک ناقص خیال ہے' اور کسی ایسے ہی شخص کا ہو سکتا ہے جو مقامات دین پر مطلع نہیں ہے' اور صرف ظاہری خول کو دین سمجھے ہوئے ہے' اور یہ سمجھتا ہے کہ ظاہری چھلکا ہی سب کچھ ہے' یہ لوگ محسوسات کے اسیر ہیں' اور محسوسات دین کے نقطۂ نظر سے صرف چھلکے ہیں' مغز ان چھلکوں کے بعد ہے' جو شخص اخروٹ کو محض چھلکا تصور کرتا ہے اس کے نزدیک اخروٹ کی حیثیت ایک لکڑی سے زیادہ نہیں ہے' اگر کوئی شخص اس سے یہ کہے کہ اس سے تیل نکلتا ہے تو یہ انکشاف اس کے نزدیک حیرت انگیز ہے' یہ شخص معذور ہے' اگرچہ اس کا عذر قبول نہیں کیا جا سکتا۔ ایک شاعر کے بقول :۔

اَلْاِنْسُ بِاللّٰهِ لَا يَحْوِيْهِ بَطَّالٌ وَلَيْسَ يُدْرِكُهُ بِالْحَوْلِ مُحْتَالٌ
وَالْاٰنِسُوْنَ رِجَالٌ كُلُّهُمْ نُجُبٌ وَكُلُّهُمْ صَفْوَةُ اللّٰهِ عُمَّالٌ

(انس باللہ اہل باطل کے شایان شان نہیں ہے' اور نہ کوئی حیلہ گر طاقت کے بل پر انس حاصل کر سکتا ہے' انس والے تمام کے تمام لوگ شریف ہیں' اور تمام کے تمام اہل صدق و صفا ہیں۔)

غلبۂ انس کے نتیجے میں ہونے والا انبساط اور ادلال جب انس دائمی ہو جاتا ہے اور غلبہ و استحکام حاصل کر لیتا ہے' اور اسے شوق مضطرب نہیں کرتا' اور نہ تغیر و حجاب کا خوف اس کا مزہ خراب کرتا ہے تو اس وقت قول و فعل اور اللہ کے ساتھ مناجات میں ایک طرح کا انبساط اور کشادگی پیدا ہوتی ہے' بعض اوقات یہ انبساط اس لئے برا لگتا ہے کہ اس میں جرأت پائی جاتی ہے' اور معلوم ہوتا ہے کہ صاحب انبساط کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی ہیبت کم ہے' لیکن جو شخص مقام انس میں مقیم ہوتا ہے اس کی یہ جرأت برداشت کرلی جاتی ہے' اور جو شخص اس مقام پر نہیں ہوتا اور وہ محض اہل انس کی تقلید میں ایسا کرتا ہے تو وہ ہلاک ہو جاتا ہے اور کفر کے قریب پہنچ جاتا ہے' اس کی مثال میں برخ اسود کی مناجات ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ بنی اسرائیل سے قحط کا عذاب دور کرانے کے لئے برخ اسود سے دعا کی درخواست کریں' بنی اسرائیل تقریباً سات سال سے اس قحط میں گرفتار تھے' اس حکم سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام ستر ہزار نفوس کا ایک کارواں لے کر جنگل میں پہنچے تھے' اور باری تعالیٰ سے باران رحمت کی دعا کی تھی' اللہ تعالیٰ نے جواب میں ارشاد فرمایا تھا اے موسیٰ! میں ان لوگوں کی دعا کیسے قبول کروں گا۔ گناہوں کی تاریکی انہیں گھیرے ہوئے ہے' ان کے دل سیاہ' باطن خبیث ہیں' وہ مجھ سے بے یقینی کے ساتھ دعا کرتے ہیں' اس کے باوجود وہ میری پکڑ سے محفوظ ہیں' جاؤ میرے ایک بندے کے پاس جاؤ اس کا نام برخ ہے' اس سے نکلنے کے لئے کہو تب میں دعا قبول کروں گا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کے متعلق لوگوں سے دریافت کیا' کسی کو اس کے حال کی خبر نہ تھی' ایک دن حضرت موسیٰ علیہ السلام کسی رستے سے گذر رہے تھے کہ اچانک ایک سیاہ رو غلام نظر آیا' اس کی پیشانی پر دونوں آنکھوں کے درمیان سجدوں کے اثر سے مٹی لگی ہوئی تھی' اور اس نے ایک چادر گلے میں باندھ رکھی تھی' حضرت موسیٰ علیہ السلام نے نور الٰہی کے ذریعے معلوم کرلیا کہ یہ شخص برخ اسود ہے' آپ نے اسے سلام کیا' اور اس سے اس کا نام دریافت کیا' اس نے کہا میرا نام برخ ہے' آپ نے فرمایا تو ایک مدت سے ہمارا مطلوب بنا ہوا ہے' ہمارے ساتھ چل' اور بارش کی دعا کر' چنانچہ وہ شخص حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ گیا اور اس نے یہ دعا کی اے اللہ! نہ تیرا یہ کام ہے' اور نہ یہ تیرا علم ہے' تجھے کیا ہوا کہ تو نے اپنے چشمے خشک کر دیے ہیں' یا ہواؤں نے تیری اطاعت سے انکار کر دیا ہے' یا تیرے پاس جو ذخیرۂ آب ہے وہ ختم ہو گیا ہے' یا گناہ گاروں پر تیرا غضب شدید ہو گیا ہے کیا تو گناہگاروں کی تخلیق سے پہلے غفار نہیں تھا' کیا تو نے رحمت پیدا نہیں کی' اور شفقت کا حکم نہیں دیا' کیا تو ہمیں دکھلانا چاہتا ہے کہ تجھ تک کسی کی رسائی نہیں ہے' یا تجھے مخلوق کے بھاگ جانے کا اندیشہ ہے' اور اس خوف سے جلد از جلد سزا دینا چاہتا ہے' غرض وہ شخص اسی طرح کی باتیں کہتا رہا' یہاں تک کہ بارش برسنے لگی' اور اللہ تعالیٰ نے صرف آدھے دن میں اس قدر گھاس پیدا کردی کہ لوگوں کے گھٹنے چھونے لگی' برخ اس دعا کے بعد واپس چلا گیا' جب حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ملاقات ہوئی تو اس نے پوچھا کہ آپ کو اللہ تعالیٰ سے میرا جھگڑا اور میرے ساتھ اس کا انصاف پسند آیا' حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کچھ کہنے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ برخ مجھ سے دن میں تین مرتبہ ہنسی مذاق کرتا ہے۔

حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ بصرے میں چند جھونپڑے جل کر راکھ ہو گئے' صرف ایک جھونپڑا باقی رہ گیا جو ان جلے ہوئے جھونپڑوں کے درمیان واقع تھا' ان دنوں حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ بصرے کے حکمراں تھے' آپ کو اس واقعے کی خبر دی گئی' آپ نے اس جھونپڑے کے مالک کو بلا کر پوچھا کہ تیرا جھونپڑا کیوں نہیں جلا' اس نے جواب دیا کہ میں نے اللہ تعالیٰ کو یہ قسم دی تھی کہ وہ میرا جھونپڑا نہ جلائے' حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے فرمایا کہ میں نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے' فرمایا کرتے تھے :۔

يَكُوْنُ فِيْ أُمَّتِيْ قَوْمٌ شُعْثَةٌ رُؤُوْسُهُمْ دَنِسَةٌ ثِيَابُهُمْ لَوْ أَقْسَمُوْا عَلَى اللّٰهِ لَأَبَرَّهُمْ۔ (ابن ابی الدنیا)

میری امت میں ایسے لوگ ہوں گے جن کے بال الجھے ہوئے اور لباس میلا ہوگا' اگر وہ لوگ اللہ کو قسم دیں گے تو اللہ ان کی قسم ضرور پوری کرے گا۔

حضرت حسن بصریؒ نے یہ واقعہ بھی نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ بصرے میں آگ لگ گئی' ابو عبیدہ خواص آئے' اور آگ پر چلنے لگے بصرے کے امیر نے ان سے کہا کہ آپ آگ سے دور رہیں' کہیں آگ آپ کو جلا نہ ڈالے' ابو عبیدہ نے جواب دیا کہ میں نے اللہ تعالیٰ کو قسم دی ہے' مجھے کہ آگ جلانے نہ پائے' امیر نے کہا اب آپ اللہ کو یہ قسم بھی دیں کہ آگ بجھ جائے' آپ نے قسم دی' اور آگ بجھ گئی۔ ایک دن ابو حفصؒ کہیں جا رہے تھے' راستے میں ایک دیہاتی شخص نظر آیا جو اپنے حواس میں نہیں تھا' آپ نے اس سے پوچھا کہ تجھے کیا ہوا؟ اس نے عرض کیا کہ میرا گدھا گم ہو گیا ہے' اور اس کے علاوہ میرے پاس کوئی دوسرا گدھا نہیں ہے' راوی کہتے ہیں کہ ابو حفصؒ یہ سن کر ٹھہر گئے' اور کہنے لگے' اے اللہ! تیری عزت کی قسم! میں اس وقت تک اگلا قدم نہیں اٹھاؤں گا جب تک اس شخص کا گدھا واپس نہیں مل جائے گا' راوی کہتے ہیں کہ اسی وقت وہ گدھا نظر آگیا' اور ابو حفص آگے بڑھ گئے' اس طرح کے واقعات اہل انس کو پیش آتے ہیں' دوسروں کو یہ اجازت نہیں ہے کہ وہ اہل انس کی تقلید میں اپنی زبان سے جراتمندانہ کلمات نکالیں اور کفر کے قریب ہو جائیں حضرت جنید بغدادی کہتے ہیں کہ اہل انس اپنی گفتگو میں' اپنی مناجات میں' اور اپنی تنہائیوں میں ایسی باتیں کر جاتے ہیں کہ وہ عام لوگوں کے حق میں کفر ہوتی ہیں' ایک مرتبہ یہ فرمایا کہ اگر عوام الناس اہل انس کی باتیں سن لیں تو انہیں کافر کہہ دیں' حالانکہ وہ اس طرح کی باتوں سے درجات میں ترقی پاتے ہیں' یہ باتیں انہیں کو زیب دیتی ہیں۔ اور یہ امر مستبعد نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک ہی بات پر اپنے کسی بندے سے راضی ہو' اور کسی بندے سے ناراض' لیکن اس سلسلے میں شرط یہ ہے کہ دونوں کے مقامات مختلف ہوں' قرآن کریم کی بہت سی آیات میں اس موضوع پر اشارات ملتے ہیں' اگر تم فہم و بصیرت سے کام لو تو قرآن کریم کے تمام قصوں میں تمہارے لئے تنبیہات ہیں' تاکہ تم ان سے عبرت حاصل کر سکو' اور غلط فہمی میں مبتلا لوگوں کے لئے صرف داستانیں ہیں' چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام اور ابلیس کا قصہ لیجئے' دونوں معصیت اور مخالفت میں شریک تھے' لیکن ابلیس اس معصیت کی بنا پر راندۂ درگاہ ٹھہرا' اور رحمت حق سے دور ہوا' اور حضرت آدم علیہ السلام کے متعلق ارشاد فرمایا :-

وَعَصَىٰ آدَمُ رَبَّهُ فَغَوَىٰ ثُمَّ اجْتَبَاهُ رَبُّهُ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدَىٰ۔ (پ ۱۶ ر ۱۶ آیت ۱۲۱' ۱۲۲)

اور آدم سے اپنے رب کا قصور ہو گیا' سو غلطی میں پڑ گئے' پھر ان کو ان کے رب نے (زیادہ) مقبول بنا لیا سو اس پر توجہ فرمائی' اور راہ (راست) پر (ہمیشہ) قائم رکھا۔

ایک شخص کی طرف توجہ کرنے' اور دوسرے شخص سے منہ موڑنے پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عتاب فرمایا گیا' حالانکہ بندگی میں دونوں برابر تھے مگر احوال دونوں کے مختلف تھے' چنانچہ ایک شخص سے اعراض کرنے پر ان الفاظ میں تنبیہہ فرمائی :-

وَأَمَّا مَنْ جَاءَكَ يَسْعَىٰ وَهُوَ يَخْشَىٰ فَأَنْتَ عَنْهُ تَلَهَّىٰ۔ (پ ۳۰ ر ۵ آیت ۸ تا ۱۰)

اور جو شخص آپ کے پاس (دین کے شوق میں) دوڑتا ہوا آتا ہے اور وہ (خدا سے) ڈرتا ہے آپ اس سے بے اعتنائی کرتے ہیں۔

اور دوسرے شخص پر پوری توجہ مبذول کرنے پر یہ تنبیہہ فرمائی :-

أَمَّا مَنِ اسْتَغْنَىٰ فَأَنْتَ لَهُ تَصَدَّىٰ۔ (پ ۳۰ ر ۵ آیت ۵' ۶)

(اور) جو شخص (دین سے) بے پروائی کرتا ہے آپ اس کی تو فکر میں پڑتے ہیں۔

اسی طرح بعض لوگوں کے ساتھ آپ کو ہم نشینی کا حکم دیا گیا :-

وَإِذَا جَاءَكَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِآيَاتِنَا فَقُلْ سَلَامٌ عَلَيْكُمْ (پ ۷ ر ۱۳ آیت ۵۴)

اور یہ لوگ جب آپ کے پاس آویں جو کہ ہماری آیتوں پر ایمان رکھتے ہیں تو یوں کہہ دیجئے کہ تم پر سلامتی ہو۔

وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِينَ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهَهُ (پ ۱۵ ر ۱۶ آیت ۲۸)

اور آپ اپنے کو ان لوگوں کے ساتھ مقید رکھا کیجئے جو صبح و شام اپنے رب کی عبادت محض اس کی رضا جوئی کے لئے کرتے ہیں۔

اور بعض دوسرے لوگوں سے اعراض کرنے کا حکم دیا :۔

وَإِذَا رَأَيْتَ الَّذِينَ يَخُوضُونَ فِي آيَاتِنَا فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتَّىٰ يَخُوضُوا فِي حَدِيثٍ غَيْرِهِ وَإِمَّا يُنسِيَنَّكَ الشَّيْطَانُ فَلَا تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرَىٰ مَعَ الْقَوْمِ الظَّالِمِينَ۔ (پ ۷ ر ۱۴ آیت ۶۸)

اور جب تو ان لوگوں کو دیکھے جو ہماری آیات میں عیب جوئی کر رہے ہیں تو ان لوگوں سے کنارہ کش ہو جا یہاں تک کہ وہ کسی اور بات میں لگ جائیں' اور اگر تجھ کو شیطان بھلا دے تو یاد آنے کے بعد پھر ایسے ظالم لوگوں کے ساتھ مت بیٹھ۔

انبساط اور ناز بھی بعض بندوں سے برداشت کیا جاتا ہے' بعض سے نہیں کیا جاتا' چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حالت انس کے انبساط میں عرض کیا تھا :۔

إِنْ هِيَ إِلَّا فِتْنَتُكَ تُضِلُّ بِهَا مَنْ تَشَاءُ وَتَهْدِي مَنْ تَشَاءُ۔ (پ ۹ ر ۹ آیت ۱۵۵)

یہ واقعہ آپ کی طرف سے محض ایک امتحان ہے' ایسے امتحانات سے جس کو چاہیں آپ گمراہی میں ڈال دیں اور جس کو چاہیں آپ ہدایت پر قائم رکھیں۔

جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ حکم دیا :۔

اِذْهَبْ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ۔ (پ ۱۶ ر ۱۰ آیت ۲۴) فرعون کی طرف جا۔

تو حضرت موسیٰ نے اس کے جواب میں یہ عذر پیش کئے :۔

وَلَهُمْ عَلَيَّ ذَنْبٌ فَأَخَافُ أَنْ يَقْتُلُونِ۔ (پ ۱۹ ر ۶ آیت ۱۴)

اور میرے ذمے ان لوگوں کا ایک جرم بھی ہے سو مجھ کو اندیشہ ہے کہ وہ لوگ مجھ کو قتل نہ کر دیں۔

إِنِّي أَخَافُ أَنْ يُكَذِّبُونِ۔ (پ ۱۹ ر ۶ آیت ۱۲) مجھے اندیشہ ہے کہ وہ مجھ کو جھٹلانے لگیں۔

وَيَضِيقُ صَدْرِي وَلَا يَنْطَلِقُ لِسَانِي۔ (پ ۱۹ ر ۶ آیت ۱۳)

اور میرا دل تنگ ہونے لگتا ہے اور میری زبان (اچھی طرح) نہیں چلتی۔

إِنَّنَا نَخَافُ أَنْ يَفْرُطَ عَلَيْنَا أَوْ أَنْ يَطْغَىٰ۔ (پ ۱۶ ر ۱۱ آیت ۴۵)

ہم کو اندیشہ ہے کہ کہیں وہ ہم پر زیادتی نہ کر بیٹھے یا یہ کہ زیادہ شرارت نہ کرنے لگے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے علاوہ اگر یہ اعذار کوئی دوسرا پیش کرتا تو یہ بے ادبی ہوتی' لیکن کیوں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام مقام انس میں تھے اس لئے ان کے یہ اقوال برداشت کئے گئے' جو شخص اس مقام میں ہوتا ہے اس کے ساتھ نرمی برتی جاتی ہے' اور اس کی بہت سی باتیں برداشت کی جاتی ہیں۔ دوسری طرف حضرت یونس علیہ السلام ہیں' یہ بھی ایک جلیل القدر پیغمبر ہیں' مگر آپ کا مقام انس کا مقام نہیں تھا' بلکہ ہیبت و قبض کا مقام تھا' چنانچہ ان کی ایک معمولی بات بھی برداشت نہیں کی گئی' اور انہیں تین دن تین رات مچھلی کے تاریک پیٹ میں مقید رکھا گیا' اور قیامت تک کے لئے ان کے حق میں یہ اعلان کر دیا گیا :

لَوْلَا أَنْ تَدَارَكَهُ نِعْمَةٌ مِنْ رَبِّهِ لَنُبِذَ بِالْعَرَاءِ وَهُوَ مَذْمُومٌ۔ (پ ۲۹ ر ۴ آیت ۴۹)

اگر احسان خداوندی سے ان کی دستگیری نہ ہوتی تو وہ میدان میں بدحالی کے ساتھ ڈالے جاتے۔

حضرت حسن بصریؒ کی رائے کے مطابق عراء سے قیامت کا میدان مراد ہے' سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت یونس علیہ

السلام کی اقتداء کرنے سے منع فرمایا گیا :۔

فَاصْبِرْ لِحُکْمِ رَبِّکَ وَلَا تَکُنْ کَصَاحِبِ الْحُوْتِ اِذْ نَادٰی وَھُوَ مَکْظُوْمٌ۔(پ ۲۹ ر ۴ آیت ۴۸)

تو آپ اپنے رب کی (اس) تجویز پر صبر سے بیٹھے رہئے اور مچھلی والے پیغمبر کی طرح نہ ہوئیے جب کہ انہوں نے دعا کی تھی اور وہ غم سے گھٹ رہے تھے۔

ان اختلافات میں سے بعض احوال اور مقامات کے اختلاف کی وجہ سے ہوتے ہیں' اور بعض اس لئے کہ ازل میں بندوں کے لئے ایک دوسرے پر فضیلت رکھی گئی ہے' اور قسمتوں میں فرق رکھا گیا ہے' اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :۔

وَلَقَدْ فَضَّلْنَا بَعْضَ النَّبِیِّیْنَ عَلٰی بَعْضٍ۔(پ ۱۵ ر ۶ آیت ۵۵)

اور ہم نے بعض نبیوں کو بعض پر فضیلت دی ہے اور ہم داؤد علیہ السلام کو زبور دے چکے ہیں۔

مِنْھُمْ مَنْ کَلَّمَ اللّٰہُ وَرَفَعَ بَعْضَھُمْ دَرَجَاتٍ۔(پ ۳ ر ۱ آیت ۲۵۳)

بعض ان میں سے وہ ہیں جو اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہوتے ہیں' اور بعضوں کو ان میں سے بہت سے درجوں پر سرفراز کیا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا شمار انہی برگزیدہ پیغمبروں میں ہوتا ہے جنہیں فضیلت عطا کی گئی ہے اور اسی لئے انہوں نے بطور ناز اپنے اوپر سلام بھیجا' قرآن کریم نے ان کے سلام کی ان الفاظ میں حکایت کی ہے :۔

وَالسَّلَامُ عَلَیَّ یَوْمَ وُلِدْتُّ وَیَوْمَ اَمُوْتُ وَیَوْمَ اُبْعَثُ حَیًّا۔(پ ۱۶ ر ۵ آیت ۳۴)

اور مجھ پر سلام ہے جس روز میں پیدا ہوا' جس روز مروں گا اور جس روز زندہ کر کے اٹھایا جاؤں گا۔

یہ بات ان کی زبان مبارک سے اس انبساط کے بعد نکلی جو انہیں مقام انس میں پہنچنے کے بعد اللہ تعالیٰ کی مہربانی اور لطف و عنایت سے حاصل ہوا تھا' دوسری طرف حضرت یحییٰ ابن زکریا علیہ السلام ہیں' یہ اولو العزم ہیبت و حیا کے مقام پر تھے' اس لئے ان کی زبان خاموش رہی یہاں تک کہ خالق تعالیٰ نے خود ہی ان کی توصیف فرمائی۔

وَسَلَامٌ عَلَیْہِ یَوْمَ وُلِدَ وَیَوْمَ یَمُوْتُ وَیَوْمَ یُبْعَثُ حَیًّا۔(پ ۱۶ ر ۴ آیت ۱۵)

اور ان کو (اللہ تعالیٰ کا سلام) پہنچے جس دن کہ وہ پیدا ہوئے اور جس دن کہ وہ انتقال کریں گے اور جس دن کہ زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے۔

یہ بھی غور کرو کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کی خطائیں' اور اپنے پیغمبر بھائی کے ساتھ ان کا رویّہ کیسے برداشت کیا' بعض علماء نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد "وَاِذْ قَالُوْا لَیُوْسُفُ وَاَخُوْہُ اَحَبُّ اِلٰی اَبِیْنَا مِنَّا" سے "کَانُوْا مِنَ الزَّاھِدِیْنَ" تک برادران یوسف کی تقریباً چالیس خطائیں شمار کی ہیں' ان میں سے بعض خطائیں بعض سے بڑی ہیں' اور ایک ایک کلمے میں تین تین چار چار خطائیں جمع ہو گئی ہیں' لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی تمام خطائیں معاف فرمائیں' اور ان کو مغفرت سے نوازا۔ لیکن حضرت عزیر علیہ السلام نے تقدیر کے متعلق ایک سوال کر لیا تھا' اس پر ان کی سخت پکڑ کی گئی' یہاں تک کہا گیا ہے کہ اس سوال کے باعث وہ انبیاء کے صف میں نہیں رہے' اسی طرح بلعام ابن باعوراء ایک زبردست عالم تھا' لیکن اس کا یہ عمل برداشت نہیں کیا گیا کہ وہ دین کے ذریعے دنیا کماتا ہے' حضرت سلیمان علیہ السلام کا ایک وزیر اسراف پسند شخص تھا' اور اصحاء کی معصیت میں مبتلا تھا' لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کی مغفرت فرمائی' روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام پر وحی نازل فرمائی کہ اے عابدوں کے سردار' اور زاہدوں کے رہنما کے فرزند تمہارا خالہ زاد بھائی کب تک میری معصیت میں مبتلا رہے گا' میں ہر بار تحمل کرتا ہوں اور اس کے ہر گناہوں سے صرف نظر کرتا ہوں' میں اپنی عزت و جلال کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر میری آندھیوں میں سے کوئی آندھی چل پڑی تو میں اسے اس کے ساتھ والوں کے لئے عبرت اور بعد والوں کے لئے عذاب بنا کے

چھوڑوں گا۔ آصف حضرت سلیمان علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے ان سے وحی کا ذکر فرمایا: یہ سن کر آصف اٹھے اور باہر نکل کر ایک اونچے ٹیلے پر پہونچے' اپنا چہرہ اور منھ آسمان کی طرف کیا' اور عرض کیا اے اللہ! تو تو ہے' اور میں میں ہوں اگر تو نے مجھے توبہ کی توفیق نہ بخشی تو میں کیسے توبہ کروں گا' اور اگر تو نے مجھے گناہوں سے نہ بچایا تو میں کیسے گناہوں سے بچ سکوں گا اللہ تعالیٰ نے وحی بھیجی کہ اے آصف! تو نے سچ کہا' تو تو ہے' اور میں میں ہوں' تو توبہ کی طرف متوجہ ہو' میں نے تیری توبہ قبول کرلی ہے' اور میں توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا ہوں۔ آصف کا یہ کلام ایسا ہے جیسے کوئی ناز کے طور پر کہتا ہو' ایک حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے کو بچانے کے لئے وحی بھیجی' وہ بندہ اپنے گناہوں کے باعث ہلاکت کے قریب پہنچ چکا تھا' اللہ تعالیٰ نے اس سے فرمایا کہ اے میرے بندے! تو نے بہت سے ایسے گناہ میرے سامنے کئے ہیں جنہیں میں نے معاف کردیا ہے' جب کہ ان سے کم تر گناہوں کے باعث بعض امتوں کو تباہ و برباد کردیا ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ بندوں میں تفضیل' تقدیم اور تاخیر کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ کی یہی سنّت ہے' اور یہ اس کی مشیت ازلی کے مطابق ظہور پذیر ہوا کرتی ہے' قرآن کریم میں قصص اسی لئے وارد ہوئے ہیں کہ تم ان کے ذریعے سابقہ امتوں کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ کی سنّت کا علم حاصل کرو' قرآن کریم میں کوئی آیت ایسی نہیں ہے جو ہدایت' نور' اور تعارف نہ ہو' کبھی اللہ تعالیٰ ان آیات کے ذریعے اپنی تقدیس کا تعارف کراتا ہے' اور فرماتا ہے :-

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ اَللّٰهُ الصَّمَدُ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ (پ ۳۰ ر ۳۷ آیت ۱-۲-۳-۴)

آپ کہہ دیجئے کہ وہ یعنی اللہ ایک ہے' اللہ بے نیاز ہے اس سے نہ اولاد ہے اور نہ وہ کسی کی اولاد ہے' اور نہ کوئی اس کے برابر ہے۔

اور کبھی ان سے اپنی صفات جلال کا تعارف کراتا ہے :-

اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلَامُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ۔ (پ ۲۸ ر ۶ آیت ۲۳)

وہ بادشاہ ہے' پاک ہے' سالم ہے' امن دینے والا ہے' نگہبانی کرنے والا ہے' زبردست ہے' خرابی کا درست کرنے والا ہے' بڑی عظمت والا ہے۔

کبھی ان کے سامنے اپنے وہ افعال رکھتا ہے جو خوف و رجاء کے حامل ہیں' انہیں انبیاء اور اعداء کے سلسلے میں اپنی سنّت سے واقف کراتا ہے :-

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ (پ ۳۰ ر ۱۴ آیت ۶-۷)

کیا آپ کو معلوم نہیں کہ آپ کے پروردگار نے قوم عاد یعنی قوم ارم کے ساتھ کیا معاملہ کیا جن کے قدو قامت ستونوں جیسے تھے۔

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ۔ (پ ۳۰ ر ۳۰ آیت ۱)

کیا آپ کو معلوم نہیں کہ آپ کے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا سلوک کیا۔

قرآن کریم انہی تین اقسام کے مضامین پر مشتمل ہے' یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات اور تقدیس ذات کی معرفت اس کی صفات اور اسماء کی معرفت اور بندوں کے ساتھ اس کے افعال اور سنت کی معرفت' کیوں کہ سورۂ اخلاص ان تین قسموں میں سے ایک یعنی تقدیس پر مشتمل ہے' اسی لئے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے تہائی قرآن قرار دیا' اور فرمایا :-

مَنْ قَرَاَ سُوْرَةَ الْاِخْلَاصِ فَقَدْ قَرَاَ ثُلُثَ الْقُرْاٰنِ۔ (احمد۔ ابی ابن کعب)

جس شخص نے سورۂ اخلاص کی تلاوت کی اس نے تہائی قرآن کی تلاوت کی۔

سورۂ اخلاص تقدیس باری تعالیٰ کا مکمل تعارف ہے' اس لئے کہ منتہائے تقدیس یہ ہے کہ وہ تین امور میں یکتا و منفرد ہو' ایک تو یہ

کہ اس سے پیدا ہونے والا کوئی اس کا مثل نہ ہو' اس پر کلمہ لَمْ یَلِدْ دلالت کرتا ہے' اور دوسرا یہ کہ وہ اپنے مثل سے حاصل نہ ہوا ہو' اس پر کلمہ لَمْ یُولَدْ سے دلالت ہوتی ہے' اور تیسرا یہ کہ کوئی اس کے درجے میں نہ ہو' اس امر پر لَمْ یَکُنْ لَّهٗ کُفُوًا سے روشنی پڑتی ہے' یہ تینوں امور ایک آیت میں جمع ہو گئے قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ۔ حقیقت میں سورۂ اخلاص کلمہ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کی تفسیر و توضیح ہے۔

یہ قرآن کریم کے اسرار و رموز ہیں' اور ان کی کوئی انتہا نہیں ہے' اللہ تعالیٰ خود ارشاد فرماتا ہے :۔

وَلَا رَطْبٍ وَّلَا یَابِسٍ اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ مُّبِیْنٍ۔ (پ ۷ ر ۱۳ آیت ۵۹)

اور نہ کوئی تر اور خشک چیز مگر یہ سب کتاب مبین میں ہیں۔

اسی لئے حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ نے ارشاد فرمایا قرآنی علوم کی جستجو کرو' اور اس کے عجائب تلاش کرو' اس میں اولین و آخرین کے علوم موجود ہیں' ان کا یہ قول بالکل صحیح ہے' جو شخص قرآن کریم کے ایک ایک کلمے کو نہایت غور سے پڑھتا ہے اور اسے سمجھنے کی کوشش کرتا ہے وہی اس قول کی صداقت کا اعتراف کر سکتا ہے' بشرطیکہ اس کا فہم صاف ہو' اس صورت میں قرآن کریم کا ہر لفظ یہ شہادت دیتا ہے کہ وہ قادر مطلق' خدائے جبار' اور ملک قہار کا کلام ہے' اور انسانی طاقت سے باہر ہے' عام طور پر یہ اسرار قرآنی قصص و حکایات میں پوشیدہ ہیں' تمہیں ان کے استنباط کا حریص ہونا چاہیے' تاکہ تم پر وہ عجائب منکشف ہو جائیں جن کے سامنے دنیا کے علوم ہیچ نظر آتے ہیں۔ یہ ہے انس کی تفصیل اور اس انبساط کا بیان جو انس کا ثمرہ ہے اس ضمن میں ہم نے بندوں کے تفاوت کا ذکر بھی کیا ہے۔ صحیح علم اللہ ہی کو ہے۔

اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر راضی ہونا' رضا کی حقیقت اور فضائل

رضا بھی محبت کے ثمرات میں سے ایک ثمرہ ہے' مقام رضا مقربین کے اعلا مقامات میں سے ایک مقام ہے' لیکن اکثر لوگوں پر اس کی حقیقت منکشف نہیں ہے' اس کے معنی و مفہوم میں جو تشابہ اور ابہام ہے اس پر صرف وہ لوگ مطلع ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے تاویل کا علم دیا ہے اور دین کی سمجھ عطا فرمائی ہے' بعض لوگ رضا کا انکار کرتے ہیں' ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ آدمی اس امر پر کیسے راضی ہو سکتا ہے جو اس کی خواہش کے خلاف ہو' وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر ہر حکم' ہر فیصلے' اور ہر چیز سے راضی ہونا اس لئے ضروری ہے کہ وہ اللہ کا فعل ہے تو یہ بھی ضروری ہے کہ بندہ کفر اور معصیت پر بھی راضی ہو' بعض نادان لوگ منکرین رضا کے اس قول سے دھوکا کھا گئے ہیں' اور یہ سمجھنے لگے ہیں کہ فسق و فجور پر راضی رہنا' اور کفر و معصیت پر انکار و اعتراض نہ کرنا تسلیم و رضا کا مقام ہے' یہ اسرار الٰہی ہیں' اگر دین کے یہ اسرار محض ظاہر احکام کی سماعت یا قرأت سے واضح ہو جایا کرتے تو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کے حق میں یہ دعا نہ فرماتے :۔

اَللّٰهُمَّ فَقِّهْهُ فِی الدِّیْنِ وَعَلِّمْهُ التَّاوِیْلَ۔ (بخاری و مسلم واحمد)

اے اللہ اسے دین کی سمجھ اور تاویل کا علم عطا کیجئے۔

پہلے ہم رضا کے فضائل بیان کریں گے' پھر اصحاب رضا کے واقعات اور احوال ذکر کریں گے پھر حقیقت رضا پر روشنی ڈالیں گے' اور یہ بتلائیں گے کہ خواہش کے خلاف ہونے والے فیصلے پر آدمی کیسے راضی ہو سکتا ہے' آخر میں بعض ایسے امور کا ذکر کریں گے جو رضا کا تتمہ سمجھے جاتے ہیں جیسے دعا نہ کرنا' یا معاصی پر خاموش رہنا۔ حالانکہ یہ امور رضا میں داخل نہیں ہیں۔

رضا کے فضائل قرآن کریم میں جابجا رضا کے فضائل بیان کئے گئے ہیں' مثال کے طور پر :۔

رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ (پ ۳۰ ر ۲۳ آیت ۸)

اللہ تعالیٰ ان سے خوش رہے گا اور وہ اللہ سے خوش رہیں گے۔

هَلْ جَزَاۗءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ۔ (پ ۲۷ ر ۱۳ آیت ۶۰)

بھلا غایت اطاعت کا بدلہ بجز عنایت کے اور بھی کچھ ہو سکتا ہے۔
احسان کی انتہا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بندے سے راضی ہو' اور یہ اللہ تعالیٰ سے بندے کی رضا کا اجر ہے۔ ایک جگہ ارشاد فرمایا :۔
وَمَسٰکِنَ طَیِّبَۃً فِیۡ جَنّٰتِ عَدۡنٍ۔ (پ ۲۸ ر ۹ آیت ۴)
اور عمدہ مکانوں میں جو ہمیشہ رہنے کے باغوں میں ہوں گے۔
اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے رضا کو جنات عدن سے اعلا قرار دیا ہے' ایک جگہ ذکر کو نماز پر فوقیت دی گئی ہے۔ فرمایا :۔
اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنۡہٰی عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَ الۡمُنۡکَرِ وَ لَذِکۡرُ اللّٰہِ اَکۡبَرُ۔ (پ ۲۱ ر ۱ آیت ۴۵)
بے شک نماز بے حیائی اور ناشائستہ کاموں سے روکتی ہے' اور اللہ کی یاد بہت بڑی چیز ہے۔
چنانچہ جس طرح نماز میں ذات مذکور کا مشاہدہ نماز سے اعلا و ارفع ہے' اسی طرح خالق جنت کی رضا جنت سے اعلا ہے' بلکہ یہی رضا اہل جنت کی غایت اور ان کا اصل مقصود ہے' حدیث شریف میں ہے کہ اللہ تعالیٰ مومنین کے لئے تجلی فرمائے گا' اور ان سے کہے گا مجھ سے مانگو! وہ عرض کریں گے ہمیں اپنی رضا عطا کر (بزار' طبرانی۔ انس) دیدار کے بعد رضا کا سوال اس کی فضیلت پر اہم دلیل ہے' جہاں تک رضائے عبد کا تعلق ہے ہم عنقریب اس کی حقیقت بیان کریں گے' اس وقت ہم رضائے الٰہی پر گفتگو کرتے ہیں' رضائے الٰہی کے تقریباً وہی معنی ہیں جو محبت الٰہی کے ضمن میں بیان کئے جاچکے ہیں' جہاں تک اس کی اصل حقیقت کا سوال ہے اس کا انکشاف جائز نہیں ہے کیونکہ مخلوق اس کے سمجھنے سے قاصر ہے' اور جو شخص سمجھنے پر قادر ہے' اسے خود بخود اس حقیقت کا علم ہو جاتا ہے' اسے بتلانے کی ضرورت نہیں ہے' اہل جنت کے لئے باری تعالیٰ کے دیدار سے بڑی کوئی نعمت نہیں ہے' اس کے باوجود انہوں نے رضا کا سوال کیا' اس کی وجہ یہ ہے کہ رضائے الٰہی سے وہ نعمت دائمی ہو سکتی ہے جو انہیں میسر ہے' دیدار الٰہی کو انہوں نے اپنا مقصود' اور مطلوب جانا' اور جب ان سے کہا گیا کہ وہ جو مانگنا چاہیں مانگیں تو انہوں نے ایسی چیز مانگی جو ان کے مطلوب کو دائمی بنا سکے' وہ یہ بات جان گئے کہ رضا ہی سے دائمی طور پر حجاب مرتفع ہو سکتا ہے' اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :۔
وَلَدَیۡنَا مَزِیۡدٌ۔ (پ ۲۶ ر ۱۷ آیت ۳۵)
اور ہمارے پاس اور بھی بہت زیادہ (نعمت) ہے۔
بعض مفسرین کہتے ہیں کہ وقت مزید میں اہل جنت کے پاس رب العالمین کی طرف سے تین تحفے آئیں گے' ایک تحفہ ایسا ہو گا کہ اس جیسا کوئی تحفہ باشندگان جنت کے پاس نہیں ہو گا' اس تحفے کا ذکر قرآن کریم کی اس آیت میں ہے :۔
فَلَا تَعۡلَمُ نَفۡسٌ مَّاۤ اُخۡفِیَ لَہُمۡ مِّنۡ قُرَّۃِ اَعۡیُنٍ۔ (پ ۲۱ ر ۱۵ آیت ۱۷)
سو کسی شخص کو خبر نہیں جو آنکھوں کی ٹھنڈک کا سامان ایسے لوگوں کے لئے خزانۂ غیب میں موجود ہے۔
دوسرا تحفہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے سلام کا ہو گا' یہ پہلے ہدیے سے افضل ہے' اس کا ذکر قرآن کریم کی اس آیت میں ہے :۔
سَلٰمٌ ۟ قَوۡلًا مِّنۡ رَّبٍّ رَّحِیۡمٍ۔ (پ ۲۳ ر ۳ آیت ۵۸)
ان کو پروردگار کی طرف سے سلام فرمایا جائے گا۔
تیسرا تحفہ یہ ہو گا کہ اللہ تعالیٰ اہل جنت سے ارشاد فرمائے گا کہ میں تم سے راضی ہوں' یہ تحفہ پہلے اور دوسرے دونوں تحفوں سے افضل ہو گا' قرآن کریم میں ہے :۔
وَرِضۡوَانٌ مِّنَ اللّٰہِ اَکۡبَرُ۔ (پ ۱۰ ر ۱۵ آیت ۷۲)
اور اللہ تعالیٰ کی رضامندی سب سے بڑی چیز ہے۔
یعنی اللہ تعالیٰ کی رضا ان تمام نعمتوں سے افضل ہے جو انہیں میسّر ہے' اس سے معلوم ہوا کہ رضائے الٰہی ایک افضل ترین نعمت ہے' اور رضائے الٰہی بندہ کی رضا کا ثمرہ ہے۔

روایات میں بھی رضا کی فضیلت وارد ہے' ایک حدیث میں ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض صحابہ سے دریافت کیا کہ تم لوگ کیا ہو؟ انہوں نے عرض کیا کہ ہم مومن ہیں' آپ نے ان سے دریافت کیا کہ تمہارے ایمان کی علامت کیا ہے؟ انہوں نے عرض کیا کہ ہم مصیبت کے وقت صبر کرتے ہیں' اور فراخی پر شکر کرتے ہیں' اور قضاء کے موقع پر راضی رہتے ہیں' آپ نے فرمایا: رب کعبہ کی قسم! تم مومن ہو۔ (۱) بعض روایات یہ ہیں:۔

حُكَمَاءُ عُلَمَاءُ كَادُوا مِنْ فِقْهِهِمْ اَنْ يَّكُوْنُوْا اَنْبِيَاءَ (۲) طُوْبٰى لِمَنْ هُدِيَ لِلْاِسْلَامِ وَكَانَ رِزْقُهُ كَفَافًا وَرَضِيَ بِهِ (۳)

حکیم عالم ایسے ہیں قریب ہے کہ اپنی سمجھ سے انبیاء ہو جائیں خوش خبری ہو اس شخص کے لئے جو اسلام کے لئے ہدایت کیا گیا' اور اس کا رزق بعد اور کفایت ہے' اور وہ اس پر راضی ہے۔

مَنْ رَضِيَ مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰى بِالْقَلِيْلِ مِنَ الرِّزْقِ رَضِيَ اللّٰهُ تَعَالٰى مِنْهُ بِالْقَلِيْلِ مِنَ الْعَمَلِ۔ (محاملی۔ علی ابن ابی طالبؓ)

جو شخص تھوڑے رزق پر اللہ تعالیٰ سے راضی ہو جاتا ہے اس سے اللہ تعالیٰ تھوڑے عمل پر راضی ہو جاتا ہے۔

اِذَا اَحَبَّ اللّٰهُ عَبْدًا اِبْتَلَاهُ فَاِنْ صَبَرَ اِجْتَبَاهُ فَاِنْ رَضِيَ اِصْطَفَاهُ (۴)

جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے محبت کرتا ہے تو اسے مصیبت میں مبتلا کرتا ہے اگر وہ صبر کرتا ہے تو اس کو برگزیدہ کرتا ہے اور راضی ہوتا ہے تو مصطفیٰ کرتا ہے۔

ایک طویل حدیث میں ہے' سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: جب قیامت کا دن ہو گا تو اللہ تعالیٰ میری امت کے ایک گروہ کو بال و پر عطا فرمائے گا اور وہ اپنی قبروں سے اڑ کر جنت میں پہنچ جائیں گے' وہاں عیش کریں گے اور مزے اڑائیں گے' فرشتے ان سے دریافت کریں گے کہ کیا تم نے حساب دیکھا ہے' وہ کہیں گے ہم نے کوئی حساب نہیں دیکھا' فرشتے کہیں گے کہ کیا تم نے پل صراط عبور کر لیا' وہ جواب دیں گے ہم نے پل صراط نہیں دیکھا' وہ پوچھیں گے کیا تم نے دوزخ دیکھی ہے' وہ کہیں گے ہم نے کچھ نہیں دیکھا' فرشتے سوال کریں گے کہ تم کس پیغمبر کی امت میں سے ہو' وہ کہیں گے ہم سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں سے ہیں' فرشتے کہیں گے ہم تمہیں قسم دیتے ہیں تم ہمیں یہ بتلاؤ کہ دنیا میں تمہارے اعمال کیسے تھے' وہ کہیں گے ہم میں دو خصلتیں تھیں' جن کی وجہ سے ہم نے یہ بلند درجہ حاصل کیا' ایک یہ کہ جب ہم تنہا ہوتے تو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے حیا کرتے' دوسری یہ کہ ہماری تقدیر میں جو کچھ لکھ دیا گیا تھا ہم اس پر راضی رہتے' فرشتے کہیں گے اگر تمہارے اندر یہ دو خصلتیں تھیں تو تمہارا حال یہی ہونا چاہیے (ابن حبان۔ انسؓ) ایک حدیث میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

يَا مَعْشَرَ الْفُقَرَاءِ اَعْطُوا اللّٰهَ الرِّضَا مِنْ قُلُوْبِكُمْ تَظْفَرُوْا بِثَوَابِ فَقْرِكُمْ وَاِلَّا فَلَا (۵)

اے گروہ فقراء! اللہ تعالیٰ کو اپنے دلوں سے رضا دو' تاکہ تمہیں اپنے فقر کا ثواب ملے' اگر ایسا نہ کرو گے تو ثواب نہ پاؤ گے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی روایات میں ہے کہ بنی اسرائیل نے ان سے درخواست کی کہ ہمارے لئے اپنے رب سے کوئی ایسا کام معلوم کر لیجئے کہ جب ہم وہ کام کریں تو اللہ ہم سے راضی ہو' حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی خدمت میں عرض کیا اے

(۱ تا ۳) یہ تینوں روایتیں پہلے گزر چکی ہیں۔ (۴) یہ روایت پہلے گزر چکی ہے۔ (۵) یہ روایت بھی پہلے گزری ہے۔

اللہ! جو کچھ یہ کہتے ہیں آپ نے سنا اللہ نے فرمایا اے موسیٰ! ان سے کہہ دو کہ مجھ سے راضی رہیں تاکہ میں ان سے راضی رہوں' سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ارشاد سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ فرمایا :۔

مَنْ اَحَبَّ اَنْ یَّعْلَمَ مَالَهُ عِنْدَ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ فَلْيَنْظُرْ مَا لِلّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ عِنْدَهُ فَاِنَّ اللّٰهَ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى يُنْزِلُ الْعَبْدَ مِنْهُ حَيْثُ اَنْزَلَهُ الْعَبْدُ مِنْ نَفْسِهِ (حاکم۔ جابرؓ)

جو شخص یہ جاننا چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کا کیا مرتبہ ہے وہ یہ دیکھے کہ اس کے یہاں اللہ کی کیا منزلت ہے' اس لئے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ بندہ کو اپنے یہاں اسی مرتبے پر رکھتا ہے' جو مرتبہ بندہ اللہ تعالیٰ کو اپنے یہاں دیتا ہے۔

حضرت داؤد علیہ السلام کے اخبار میں ہے' اللہ تعالیٰ نے فرمایا : میرے اولیاء کو دین کا غم نہیں ہوتا' اس لئے کہ دنیاوی تفکرات ان کے دلوں سے مناجات کی لذت و حلاوت ضائع کردیتے ہیں' اے داؤد! میں اپنے دوستوں سے یہ چاہتا ہوں کہ وہ روحانی بنیں' دنیا کے فکر میں مبتلا نہ ہوں' روایات میں ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا : یا اللہ! مجھے کوئی ایسا کام بتلایئے جس میں تیری رضا پوشیدہ ہو' تاکہ میں وہ کام کروں اور تیری رضا پاؤں' اللہ تعالیٰ نے ان پر وحی بھیجی کہ اے موسیٰ! میری رضا تیری ناپسندیدگی میں ہے' یعنی تو اس بات پر صبر نہیں کرسکتا جس پر تیرا دل آمادہ نہ ہو' حضرت موسیٰ نے عرض کیا الٰہی! وہ کون سی بات ہے' فرمایا : میری رضا اس امر میں ہے کہ تو میری قضا پر راضی رہے' ایک مرتبہ حضرت موسیٰ نے باری تعالیٰ کی خدمت میں عرض کیا یا اللہ! وہ کون شخص ہے جو مخلوق میں تجھے سب سے زیادہ محبوب ہے' فرمایا : وہ شخص جس سے اگر کوئی محبوب چیز چھین لوں تو وہ مجھ سے اپنا تعلق منقطع نہ کرے' حضرت موسیٰ نے عرض کیا کہ وہ کون شخص ہے جس پر تو ناراض ہوتا ہے' فرمایا وہ شخص جو مجھ سے کسی کام میں خیر چاہتا ہے' اور جب میں کوئی فیصلہ کردیتا ہوں تو وہ میرے فیصلے پر ناراض ہوتا ہے' ایک روایات میں اس سے بھی زیادہ سخت الفاظ وارد ہیں' اللہ تعالیٰ نے فرمایا : میرے سوا کوئی معبود نہیں ہے' جو شخص میری مصیبت پر صبر نہیں کرتا' اور میری نعمتوں پر شکر ادا نہیں کرتا' اور میرے فیصلے پر راضی نہیں ہوتا' اسے چاہیے کہ وہ میرے سوا کسی اور کو اپنا معبود بنالے (طبرانی۔ ابن حبان۔ ابو ہند الداریؓ) اسی طرح کی ایک شدید وعید سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں ہے' فرمایا : میں نے تمام مقادیر کو مقدر کیا' تمام تدابیر کیں' اور تمام امور محکم کئے جو شخص مجھ سے ناراض ہے اس سے میں بھی ناراض ہوں' یہاں تک کہ وہ مجھ سے ملاقات کرے' اور جو شخص مجھ سے راضی رہے اس سے میں بھی راضی ہوں' یہاں تک کہ وہ مجھ سے ملاقات کرے (۱) ایک مشہور حدیث قدسی میں ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا : میں نے خیر اور شر دونوں پیدا کئے' خوشخبری ہو اس شخص کے لئے جس کو میں نے خیر کے لئے پیدا کیا' اور جس کے ہاتھوں خیر جاری کیا' اور ہلاکت ہو اس شخص کے لئے جسے میں نے شر کے لئے پیدا کیا' اور جس کے ہاتھوں شر جاری کیا' اور شدید ترین ہلاکت ہے اس شخص کے لئے جس نے کیا اور کیوں کے سوالات اٹھائے (ابن شاہین فی شرح السنہ) سابقہ امتوں کے احوال میں مذکور ہے کہ ایک پیغمبر نے دس سال تک بھوک' افلاس اور کھٹملوں کی شکایت کی' مگر ان کی شکایت نہیں سنی گئی' اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے وحی بھیجی کہ تم اس طرح کب تک شکایت کرتے رہو گے' میرے یہاں امّ الکتاب میں آسمان و زمین کی تخلیق سے پہلے تمہارا یہی حال رہے گا' میں نے دنیا پیدا کرنے سے پہلے تمہارے لئے یہی فیصلہ کیا تھا' اب کیا تم یہ چاہتے ہو کہ تمہاری وجہ سے دنیا دوبارہ بناؤں' یا جو کچھ میں نے تمہارے مقدر میں لکھ دیا ہے اس میں تبدیلی کروں' تمہاری پسند میری پسند سے بہتر ہو' اور تمہاری خواہش میری خواہش سے بڑھ کر ہو' مجھے اپنی عزت و جلال کی قسم ہے اگر تمہارے دل میں یہ خیال بھی آیا تو میں دفتر نبوت سے تمہارا نام حذف کردوں گا' روایت ہے کہ حضرت آدم علیہ

---

(۱) مجھے یہ روایت ان الفاظ میں نہیں ملی۔

السلام کا کوئی چھوٹا لڑکا آپ کی پسلیوں کو سیڑھی بنا کر سر تک پہنچتا' اور اسی طرح نیچے اترتا' آپ اس کی یہ حرکت برداشت کرتے رہے' اور سر جھکائے بیٹھے رہے' آپ کے ایک صاحبزادے نے عرض کیا ابا جان! آپ اس کو منع کیوں نہیں کرتے یہ آپ کے ساتھ اس طرح کی حرکتیں کر رہا ہے' حضرت آدم علیہ السلام نے جواب دیا بیٹے! میں وہ دیکھتا ہوں جو تم نے نہیں دیکھتے' میں نے ایک حرکت کی تھی' اور اس کی سزا میں عزت کے گھر سے ذلت کے گھر میں' مسرتوں کے گہوارے سے مصیبتوں کے جنگل میں پھینکا گیا تھا۔ اب میں کوئی حرکت نہیں کرنا چاہتا' ایسا نہ ہو کہ پھر کسی ان دیکھی مصیبت میں مبتلا کر دیا جاؤں۔ حضرت انس بن مالکؓ فرماتے ہیں کہ میں نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی دس سال تک خدمت کی ہے' اس دوران اگر میں نے کوئی کام کیا تو آپ نے یہ نہیں پوچھا کہ تو نے یہ کام کیوں کیا' اسی طرح آپ نے ہونے والی چیز کے متعلق یہ نہیں فرمایا کہ کاش نہ ہوتی' اور نہ ہونے والی چیز کے متعلق یہ نہیں فرمایا کاش ہوتی' اور اگر آپ کے گھر والوں میں سے کوئی شخص مجھ سے جھگڑتا تو آپ فرماتے جانے دو یہ کام اسی طرح مقدر تھا (۱) روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام پر وحی بھیجی کہ اے داؤد' تم بھی ارادہ کرتے ہو اور میں بھی ارادہ کرتا ہوں' ہوتا وہی ہے جو میں چاہتا ہوں' اگر تم وہ بات مان لو جو میں چاہتا ہوں تو میں اس بات کے لئے تمہارا کفیل ہو جاؤں گا' جو تم چاہتے ہو' اور اگر تم نے وہ بات تسلیم نہیں کی جو میں چاہتا ہوں تو اس کام میں تمہیں تھکاؤں گا جو تم چاہتے ہو' پھر وہی ہو گا جو میں چاہتا ہوں۔

رضا کی فضیلت سے متعلق کچھ آثار یہ ہیں' حضرت عبد اللہ ابن عباسؓ فرماتے ہیں قیامت کے دن سب سے پہلے جنت میں وہ لوگ بلائے جائیں گے جو ہر حال میں اللہ تعالیٰ کی تعریف کرتے ہیں حضرت عمر ابن عبد العزیزؒ فرماتے ہیں کہ مجھے حکم الٰہی کے علاوہ کسی موقع پر خوشی حاصل نہیں ہوتی' کسی نے ان سے پوچھا کہ آپ کیا چاہتے ہیں' فرمایا جو اللہ فیصلہ کرے' میمون ابن مہران کہتے ہیں جو شخص قضاء پر راضی نہیں ہوتا اس کی حماقت کا کوئی علاج نہیں ہے' فضیل ابن عیاض کہتے ہیں اگر تو نے حکم الٰہی پر صبر نہیں کیا تو اپنے نفس کے فیصلے پر بھی صبر نہ کر سکے گا' عبد العزیز ابن ابی رواد کہتے ہیں کہ جَو کی روٹی اور سرکہ کھانے' اون اور بالوں کا لباس پہننے میں شان نہیں ہے' درویشی کی شان اللہ تعالیٰ کے ساتھ راضی رہنے میں ہے۔ عبد اللہ ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ میرے لئے آگ کی چنگاری منہ میں رکھ لینا چاہے وہ میری زبان کا کچھ حصہ جلا دے اور کچھ حصہ چھوڑ دے اس سے بہتر ہے کہ میں ہو جانے والی چیز کے متعلق یہ کہوں کہ کاش نہ ہوتی' اور نہ ہونے والی چیز کے متعلق کہوں کاش ہو جاتی' ایک شخص نے محمد ابن الواسع کے پاؤں میں ایک زخم دیکھ کر کہا کہ مجھے اس زخم کی بنا پر آپ کی حالت قابل رحم معلوم ہوتی' محمد ابن الواسع نے جواب دیا کہ جب سے یہ زخم ہوا میں مسلسل اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کر رہا ہوں کہ یہ زخم میری آنکھ میں نہیں ہوا۔ اسرائیلی روایت میں ہے کہ ایک عابد مدتوں اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول رہا' ایک رات اسے خواب میں بتلایا گیا کہ فلاں عورت بکریاں چراتی ہے جنت میں تیری رفیق ہو گی' عابد نے اس کے متعلق معلومات حاصل کیں' اور اسے تلاش کر لیا' اور اس کے گھر پر تین دن تک مہمان رہا تاکہ اس کے اعمال کا مشاہدہ کر سکے' عابد تو رات کو نماز کے لئے کھڑا ہو جاتا اور وہ سوتی رہتی' عابد دن میں روزہ رکھتا' اور وہ افطار کرتی' عابد نے ایک روز دریافت کیا کہ جو کچھ میں نے دیکھا ہے اس کے علاوہ بھی تیرا کوئی عمل ہے' اس نے عرض کیا اس کے علاوہ میرا کوئی عمل نہیں ہے' عابد نے کہا یاد کر شاید کوئی عمل تو ایسا کرتی ہو جس کی اہمیت کا احساس نہ ہو' عورت نے کہا کہ میرے اندر ایک معمولی خصلت ہے' اور وہ یہ کہ جب میں کسی مصیبت میں گرفتار ہوتی ہوں تو یہ تمنا نہیں کرتی کہ اس مصیبت سے نجات پا جاؤں' اور اگر کسی مرض میں مبتلا ہوتی ہوں تو یہ تمنا نہیں کرتی کہ اس مرض سے شفایاب ہو جاؤں' اور اگر دھوپ میں ہوتی ہوں تو یہ تمنا نہیں کرتی کہ مجھے سایہ مل جائے' یہ سن کر عابد نے اپنے سر پر ہاتھ رکھا' اور کہنے لگا کہ کیا یہ چھوٹی خصلت ہے' بخدا یہ اتنی عظیم خصلت ہے کہ بڑے بڑے

---

(۱) یہ روایت پہلے بھی گذری ہے۔

عابد و زاہد بھی اسے پانے سے عاجز رہتے ہیں۔ بعض سلف صالحین سے مروی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ آسمانوں میں کوئی فیصلہ کردیتا ہے تو اہل زمین سے یہ چاہتا ہے کہ وہ اس کے فیصلے پر راضی رہیں' حضرت ابوالدرداءؓ فرماتے ہیں ایمان کی بلندی تقدیر پر راضی رہنا اور حکم الٰہی پر صبر کرنا ہے۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ مجھے اس کی پروا نہیں ہوتی کہ میں تنگی میں ہوں یا خوشحالی میں۔ حضرت سفیان ثوریؒ نے ایک دن حضرت رابعہ بصریہ کے سامنے یہ دعا کی "اے اللہ! ہم سے راضی رہئے۔" حضرت رابعہ نے فرمایا کیا تمہیں اللہ تعالیٰ سے رضا مانگنے میں شرم نہیں آتی' جب کہ تم اس سے ناراض ہو' حضرت سفیان ثوری نے فرمایا میں اللہ سے مغفرت کا طلبگار ہوں۔ جعفر ابن سیمان الضبعی نے عرض کیا کہ بندہ اللہ تعالیٰ سے کب راضی ہوتا ہے' حضرت رابعہ نے فرمایا وہ مصیبت پر بھی اسی طرح خوش ہو جس طرح راحت پر خوش ہوتا ہے' حضرت فضیل ابن عیاض فرماتے ہیں کہ جب بندے کے نزدیک منع و عطا دونوں برابر ہو جائیں تب اس کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ اللہ سے راضی ہے۔ حضرت سلیمان دارانیؒ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اپنے بندوں سے اسی بات پر راضی ہوتا ہے جس بات سے غلام اپنے آقا سے راضی ہوتا ہے' احمد ابن الحواری نے ان سے دریافت کیا کہ یہ کس طرح ممکن ہے؟ فرمایا کہ کیا دنیا میں غلام یہ نہیں چاہتا کہ اس کا آقا خوش رہے' انہوں نے کہا ہاں غلام یہی چاہتا ہے' سلیمان دارانی نے فرمایا اللہ تعالیٰ بھی اپنے بندوں سے یہی چاہتا ہے کہ وہ اس سے راضی رہیں۔ حضرت سہل تستری فرماتے ہیں کہ بندہ کو اسی قدر یقین ملتا ہے جس قدر وہ اللہ سے راضی رہتا ہے' سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :-

إِنَّ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ بِحِكْمَتِهِ وَجَلَالِهِ جَعَلَ الرَّوْحَ وَالْفَرَحَ فِي الرِّضَا وَالْيَقِيْنِ، وَجَعَلَ الْغَمَّ وَالْحُزْنَ فِي الشَّكِّ وَالسَّخَطِ۔ (طبرانی۔ ابن مسعودؓ)

اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت و جلالت سے راحت اور سرور کو رضا اور یقین میں رکھا ہے' اور غم و حزن کو شک و ناراضگی میں رکھا ہے۔

<u>رضا کی حقیقت' اور اس کا خواہش کے خلاف ہونا</u> جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ خواہش کے مخالف امور اور مصائب وغیرہ میں صرف صبر ہی ممکن ہے" رضا ممکن نہیں وہ گویا محبت کا انکار کرتے ہیں' جب اللہ تعالیٰ کی محبت کا تصور ثابت ہو گیا' اور یہ بات واضح ہو گئی کہ آدمی اپنی تمام ہمت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی محبت میں مستغرق ہو سکتا ہے تو یہ بات مخفی نہیں رہی کہ محب اپنے محبوب کے ہر فعل یا قول سے راضی رہنے پر مجبور ہے' اور یہ رضا دو طرح سے ہوتی ہے' ایک تو یہ کہ رنج اور تکلیف کا قطعاً احساس نہ ہو' حتی کہ اگر کوئی زخم لگے' یا کسی اور طرح اذیت پہنچے تو اسے درد اور تکلیف بالکل محسوس نہ ہو' اور اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی لڑنے والا جب غصے یا خوف کی حالت میں لڑتا ہے اور جسم زخمی ہو جاتا ہے تو اسے اپنے زخم کی ذرا تکلیف نہیں ہوتی' بلکہ یہ خیال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ کوئی زخم لگا ہے' جب زخم سے خون بہتا ہے اور زمین یا کپڑے پر لگتا ہے تب اسے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا جسم زخمی ہے' یہ تو خیر لڑائی کا معاملہ ہے جس میں آدمی اپنے دل و دماغ اور پوری جسمانی اور ذہنی قوت کے ساتھ مشغول ہوتا ہے ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ جب آدمی کسی معمولی کام میں مصروف ہوتا ہے' اور اتفاقاً جسم میں کوئی کانٹا وغیرہ چبھ جاتا ہے تو وہ اپنے قلب کی مشغولیت کے باعث اس تکلیف کا احساس بھی نہیں کرتا جو کانٹا چبھنے کی وجہ سے اس کے پاؤں کو ہوتی ہے' اسی طرح اگر کسی شخص کے بال کند استرے سے مونڈے جائیں یا کند چھری سے پچھنے لگائے جائیں تو اس کو بے حد اذیت کا سامنا کرنا پڑتا ہے' لیکن اگر وہ کسی اہم کام میں مشغول ہو تو حجام یا حلاق اپنا کام انجام دے کر چلا بھی جاتا ہے اور اسے احساس بھی نہیں ہوتا' اس کی وجہ یہی ہے کہ جب آدمی کا دل کسی امر میں پوری طرح مشغول ہوتا ہے تو اسے اس کے علاوہ کسی چیز کا ادراک نہیں ہوتا' یہی حال اس عاشق کا ہے جو اپنے محبوب کی محبت یا اس کے مشاہدے میں پوری طرح مشغول ہو' اسے ایسے واقعات پیش آتے ہیں جو اس کے لئے نہایت اذیت بخش ہوتے اگر وہ اس محبت میں مستغرق نہ ہوتا' پھر عاشق کو اس تکلیف اور اذیت کا احساس اس وقت نہیں ہوتا جب اس کا مصدر محبوب کے علاوہ کوئی دوسرا شخص یا دوسری چیز ہو' اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اگر محبوب اپنے عاشق کو خود کوئی تکلیف

پہنچائے یا کسی اذیت میں مبتلا کرے تو اسے کیسے احساس ہو سکتا ہے۔

محبت و عشق میں قلب کی مشغولیت بڑی اہم مشغولیت ہے۔ جب معمولی محبتوں میں معمولی درد کا احساس نہیں ہوتا تو بڑی محبت میں بڑے درد کا احساس کیوں ہونے لگا' جس طرح درد کی زیادتی ممکن ہے' اسی طرح محبت کی زیادتی بھی ممکن ہے' اور جس طرح حاسۂ بصر سے محسوس ہونے والی خوب صورتی کی محبت قوی ہوتی ہے اسی طرح وہ محبت بھی قوی ہوتی ہے جو بصیرت کے ذریعے باطن کی خوبصورتی کے مشاہدے کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے۔ جہاں تک باطنی صورتوں کے حسن کا تعلق ہے ان میں اللہ تعالیٰ کا جمال و جلال ایسا ہے کہ اس پر کسی اور جمال یا جلال کو قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ جس شخص پر اس جلال و جمال کا کچھ حصہ منکشف ہو جاتا ہے وہ اپنے ہوش و حواس کھو دیتا ہے' اور کچھ ایسا مدہوش ہوتا ہے کہ اپنی کسی کیفیت کا احساس نہیں کرتا' روایت ہے کہ فتح موصلی کی بیوی ٹھوکر کھا کر گر پڑیں' ٹھوکر لگنے سے ان کے انگوٹھے کا ناخن اکھڑ گیا' وہ ہنسنے لگیں' لوگوں نے عرض کیا آپ کو تکلیف نہیں ہو رہی ہے' فرمایا : اس کے ثواب کی لذت نے درد کی تکلیف کا احساس مٹا دیا ہے' حضرت سہل تستری دوسروں کا علاج کیا کرتے تھے' انہوں نے اپنا علاج کبھی نہیں کیا' ان سے اس کے متعلق پوچھا گیا تو انہوں نے جواب دیا اے دوست! محبوب کی مار میں تکلیف نہیں ہوتی۔

محبوب کے فعل پر راضی رہنے کی دوسری صورت یہ ہے کہ تکلیف کا ادراک ہو' لیکن اس تکلیف پر راضی ہو' بلکہ اس کی خواہش اور ارادہ رکھتا ہو' اور یہ رغبت و خواہش عقل سے ہو اگرچہ طبیعت نہ چاہتی ہو' یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص فاسد خون کے اخراج کے لئے پچھنے لگواتا ہے' ظاہر ہے اس عمل میں تکلیف ہوتی ہے' لیکن وہ اس تکلیف پر راضی رہتا ہے' اور خود اپنی رغبت و خواہش سے یہ اذیت برداشت کرتا ہے' اور حجام کا ممنون احسان ہوتا ہے' یہی حال اس شخص کا ہوتا ہے جو تکلیف پر راضی رہے' حصول منفعت کے لئے سفر کرنے والا بھی سفر کی مشقت برداشت کرتا ہے' اور تعب اٹھاتا ہے' لیکن سفر کی مشقت کی اسے اس لئے پروا نہیں ہوتی کہ اس کے نتیجے میں حاصل ہونے والا نفع اسے عزیز ہوتا ہے' اور ہر مشقت و تعب پر راضی رہتا ہے' یہی حال ان بندگان خدا کا ہے جن پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی مصیبت نازل ہوتی ہے' اور وہ یقین رکھتے ہیں کہ اس کے بدلے میں جو ثواب ہمیں دیا جائے گا وہ ذخیرہ کرلیا گیا ہے' اس یقین کی وجہ سے وہ اس مصیبت پر راضی رہتے ہیں' اس میں رغبت کرتے ہیں' بلکہ اس مصیبت سے محبت کرتے ہیں' اور اس پر اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں۔ یہ اس صورت میں ہے جب کہ آدمی اس ثواب اور احسان کو ملحوظ رکھے جو مصیبت کے عوض اسے ملنے والا ہے' اور مطمح نظر اجر و ثواب نہ ہو' بلکہ محبت اس درجے غالب ہو کہ محبوب کی رضا حاصل کرنا ہی اس کا منشاء ہو' وہی مطلوب اور محبوب ہو تب اسے کسی اجر کی تمنا نہیں رہتی' بلکہ اس کا خیال بھی نہیں آتا' اور محبوب کی رضا جوئی اس کا نصب العین بن جاتا ہے۔ مخلوق کی محبت میں یہ تمام مشاہدات موجود ہیں' اور لوگوں نے نظم و نثر کے اسلوب میں یہ مشاہدات بیان کئے ہیں' مخلوق کی محبت آنکھ کے ذریعے ظاہری صورت کے جمال کے مشاہدے پر مبنی ہوتی ہے' یہ جمال کوئی انوکھی شئی نہیں ہے' بلکہ کھال' گوشت اور خون کے مجموعے کا نام حسن ہے' جس میں نجاستیں بھی ہیں' خباثتیں بھی ہیں' جس کی ابتدا ایک ناپاک نطفے سے ہوتی ہے' اور جس کا انجام ایک مردار گندے جسم کے روپ میں ہوگا' یہ شخص جسے تم صاحب حسن کہتے ہو اپنے پیٹ میں غلاظت اٹھائے پھرتا ہے' اور اگر مدرک کو دیکھا جائے تو وہ ایک خسیس آنکھ ہے' جو دیکھنے میں اکثر غلطی کرتی ہے' چھوٹے کو بڑا دیکھتی ہے' اور بڑے کو چھوٹا' دور کو نزدیک' اور بد صورت کو خوبصورت۔ جب اس ظاہری' فانی' اور بے حقیقت حسن میں محبت کے غلبے کا عالم یہ ہے تو ازلی اور ابدی جمال کی محبت میں یہ صورت کیسے محال ہو سکتی ہے' جس کے کمال کی کوئی انتہا نہیں ہے' اور جس کا ادراک چشم بصیرت سے کیا جاتا ہے' جو غلطی نہیں کرتی' نہ موت کے ساتھ مرتی ہے' بلکہ موت کے بعد بھی اللہ تعالیٰ کے یہاں زندہ رہتی ہے' اس کے رزق سے فرحت حاصل کرتی ہے' اور موت سے مزید تنبیہہ اور کشف پاتی ہے' یہ ایک واضح امر ہے' اگر چشم عبرت سے دیکھا جائے' اور اس کے وجود پر محبین کے اقوال و احوال سے شہادت ملتی ہے۔

محبین کے اقوال و احوال حضرت شقیق بلخی فرماتے ہیں کہ جو شخص مصیبت میں ثواب دیکھتا ہے وہ اس سے نجات پانا نہیں چاہتا۔ جنید بغدادی کہتے ہیں کہ میں نے سری سقطی سے پوچھا کہ کیا محبت کرنے والوں کو مصیبت پر تکلیف ہوتی ہے' انہوں نے جواب دیا : نہیں! میں نے کہا اگرچہ اسے تلوار کی ضرب لگائی جائے' انہوں نے فرمایا ہاں اگرچہ اسے ستر بار تلوار کی ضرب لگائی جائے' اور ضرب پر ضرب لگائی جائے' بعض اکابر فرماتے ہیں کہ میں اس کی محبت کی وجہ سے ہر چیز سے محبت کرتا ہوں' یہاں تک کہ اگر وہ آگ سے محبت کرے تو میں آگ میں کود جاؤں' بشر ابن الحارث کہتے ہیں کہ میں نے ایک ایسے شخص کو دیکھا جس کے جسم پر بغداد کے محلہ شرقیہ میں ایک ہزار کوڑے لگائے گئے' لیکن اس نے اف تک نہیں کیا' پھر اسے قید خانے میں لے جایا گیا' میں اس کے پیچھے پیچھے چلا' اور اس سے پوچھا کہ تمہیں یہ کوڑے کیوں لگائے گئے ہیں' اس نے جواب دیا کہ میں ایک عاشق ہوں' میں نے اس سے پوچھا کہ تم اس کیفیت پر خاموش کیوں رہے' اس نے کہا کیوں کہ میرا معشوق میری نظروں کے سامنے تھا' اور مجھے دیکھ رہا تھا' میں نے اس سے کہا کاش تم سب سے بڑے معشوق کو دیکھتے' یہ سن کر اس نے ایک زبردست چیخ ماری' اور مر گیا۔ یحییٰ ابن معاذ رازی کہتے ہیں جب اہل جنت اللہ تعالیٰ کا دیدار کریں گے تو اس لذت دیدار کی وجہ سے ان کی آنکھیں ان کے دلوں میں چلی جائیں گی اور آٹھ سو برس تک واپس نہیں آئیں گی' ان دلوں کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے جو اللہ تعالیٰ کے جمال و جلال میں مشغول ہوں' جب جلال کا مشاہدہ کرتے ہیں تو خوف زدہ ہو جاتے ہیں' اور جمال کا مشاہدہ کرتے ہیں تو متحیر ہو جاتے ہیں۔ بشر کہتے ہیں کہ میں ابتدائے سلوک میں جزیرۂ عبادان گیا' وہاں میں نے ایک جذامی کو دیکھا جو نابینا اور پاگل تھا' اور زمین پر پڑا ہوا تھا' چیونٹیاں اس کا گوشت کھا رہی تھیں' میں نے اس کا سر اٹھا کر اپنی گود میں رکھا' اور اس سے اس کا حال دریافت کرنے لگا' میں ایک ایک لفظ بار بار کہتا تھا' جب اسے ہوش آیا تو کہنے لگا یہ فضولی کون ہے جو میرے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان مداخلت کر رہا ہے' اگر میرے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے جائیں تب بھی میری محبت منقطع نہ ہو' بلکہ کچھ زیادہ ہی ہو' بشر کہتے ہیں اس واقعے کے بعد جب بھی میں نے کسی بندے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان اس طرح کا کوئی معاملہ دیکھا تو میں نے برا نہیں سمجھا۔ ابو عمرو محمد ابن الاشعث کہتے ہیں کہ اہل مصر پر چار ماہ ایسے گزرے کہ انہیں حضرت یوسف علیہ السلام کے چہرے کی طرف دیکھنے کے علاوہ کوئی کام نہیں تھا' انہیں جب بھی بھوک محسوس ہوتی حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف متوجہ ہو جاتے' گویا حضرت یوسف علیہ السلام کے جمال نے ان سے بھوک کا احساس مٹا دیا تھا' قرآن کریم نے ان کی اس کیفیت کے لئے بلیغ تعبیر استعمال کی ہے کہ عورتیں حضرت یوسف علیہ السلام کو دیکھ کر کچھ ایسی بے خود ہوئیں کہ چھریوں سے اپنے ہاتھ کاٹ بیٹھیں' سعید ابن یحییٰ کہتے ہیں کہ میں نے بصرے میں واقع عطاء ابن مسلم کی سرائے میں ایک نوجوان کو دیکھا جس کے ہاتھ میں ایک چھرا تھا' لوگ اس کے ارد گرد جمع تھے اور وہ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا :-

يَوْمَ الْفِرَاقِ مِنَ الْقِيَامَةِ أَطْوَلُ ... وَالْمَوْتُ مِنْ أَلَمِ التَّفَرُّقِ أَجْمَلُ

قَالُوا الرَّحِيلُ فَقُلْتُ لَسْتُ بِرَاحِلٍ ... لٰكِنْ بُهْجَتِي الَّتِي تَتَرَحَّلُ

(جدائی کا دن قیامت سے زیادہ طویل ہے' اور موت جدائی کے غم سے زیادہ بہتر ہے لوگ کہنے لگے روانگی ہے' میں نے کہا روانگی نہیں ہے' بلکہ میری روح سفر کرتی ہے)

اس کے بعد اس شخص نے چھرا اپنے پیٹ میں گھونپ لیا اور مر گیا' میں نے اس شخص کے بارے میں دریافت کیا تو لوگوں نے بتلایا کہ یہ شخص فلاں بادشاہ کے غلام پر عاشق تھا' ایک روز وہ اس سے دور ہوا' اس صدمے نے اس کا یہ حال بنا دیا۔ حضرت یونس علیہ السلام نے حضرت جبرئیل علیہ السلام سے کہا کہ مجھے ایسے شخص کا پتا بتلاؤ جو زمین والوں میں سب سے زیادہ عبادت کرتا ہو' انہوں نے ایک ایسے شخص کا حوالہ دیا جس کے دونوں ہاتھ اور دونوں پاؤں جذام نے گلا دیے تھے' اور اس کی آنکھیں بھی ضائع کر دی تھیں' حضرت یونس علیہ السلام جس وقت اس کے پاس پہنچے وہ یہ کہہ رہا تھا اے اللہ! تو نے مجھے جو چاہا عطا کیا' اور جو چاہا مجھ سے سلب کر لیا' اور میرے لئے اپنی امید باقی رکھی' اے احسان کرنے والے! اور مقصد پر لانے والے! روایت ہے کہ حضرت عبداللہ

ابن عمرؓ کے ایک صاحبزادے سخت بیمار ہوئے' حضرت ابن عمرؓ کو ان کی بیماری سے اتنا شدید غم ہوا کہ لوگ یہ اندیشہ کرنے لگے کہ اس لڑکے کی وجہ سے آپ کو کچھ نہ ہو جائے' اس لڑکے کا انتقال ہو گیا' آپ اس کے جنازے کے ساتھ چلے' اس وقت وہ جس قدر خوش نظر آرہے تھے اتنا خوش کوئی دوسرا شخص نہ تھا' لوگوں نے اس کی وجہ دریافت کی' فرمایا میں اس کی بیماری کے دوران ازراہ شفقت و رحم آرزدہ تھا' اور جب اللہ تعالیٰ نے اسے اپنے پاس بلایا تو میں اس سے راضی ہوں' حضرت مسروق فرماتے ہیں کہ جنگل میں ایک شخص کے پاس تین جانور تھے' کتا' گدھا' اور مرغا۔ مرغا لوگوں کو نماز کے لئے بیدار کرتا تھا' گدھا ان کے لئے پانی لانے' اور خیمے وغیرہ منتقل کرنے میں کام آتا تھا' اور کتا ان کی رکھوالی کرتا تھا' ایک دن ایک لومڑی آئی اور مرغے کو کھا گئی' اس کے بعد ایک دن بھیڑیا آیا اور گدھے کو اس کا پیٹ چیر کر ہلاک کر گیا' لوگوں کو اس کا بھی بے حد ملال ہوا' لیکن اس شخص نے یہی کہا شاید اس میں بھی کوئی خیر ہو' اس کے بعد کتا ہلاک ہو گیا' اس شخص نے تب بھی یہی کہا شاید اس میں بھی کوئی خیر ہو' پھر ایک دن اس شخص کے گھر والوں نے یہ منظر دیکھا کہ ان کے ارد گرد کے تمام لوگ گرفتار کر لئے گئے' صرف وہ باقی رہ گئے' ان لوگوں کو اس لئے گرفتار کیا گیا کہ ان کے پاس گدھے' کتے اور مرغے تھے' ان جانوروں کی آوازوں نے گرفتار کرنے والوں کو ان کی موجودگی سے باخبر کیا' اور کیوں کہ اس نیک شخص کا گھرانہ جانوروں سے محروم ہو گیا تھا اس لئے وہ گرفتاری سے محفوظ رہا' گویا اللہ نے ان جانوروں کی ہلاکت میں ان لوگوں کے لئے خیر رکھ دی تھی' جو شخص اللہ تعالیٰ کے مخفی الطاف سے واقف ہوتا ہے وہ ہر حال میں اس کے فعل سے راضی رہتا ہے۔

روایت ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایک ایسے شخص کے پاس سے گذرے جو آنکھوں سے محروم تھا' برص زدہ تھا' اور جس کے دونوں پہلو فالج کے حملے سے بیکار ہو چکے تھے' اور جذام کی وجہ سے اس کا گوشت کٹ کٹ کر گر رہا تھا' اور وہ شخص ان تمام مصائب و آلام کے باوجود یہ کہہ رہا تھا "تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جس نے مجھے ان بہت سے مصائب سے عافیت بخشی' جن میں اس کی بے شمار مخلوق مبتلا ہے۔" حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس شخص سے دریافت کیا تیرے خیال میں کون سی مصیبت ایسی ہے جو تیرے پاس نہیں ہے' اس شخص نے کہا اے روح خدا! میں ان لوگوں سے بہتر ہوں جن کے دلوں میں اللہ تعالیٰ نے وہ معرفت نہیں رکھی جو میرے دل میں رکھی ہے' حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تو سچ کہتا ہے' اپنا ہاتھ بڑھا' اس شخص نے اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ میں دیا' اچانک وہ ایک خوب رو شخص بن گیا' اس کی شخصیت نکھر گئی' اور جن بیماریوں میں وہ مبتلا تھا اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے ان تمام بیماریوں سے شفا عطا فرمائی' اس واقعے کے بعد وہ شخص حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ہمراہ رہا اور انہی کے ساتھ عبادت خدا میں مصروف رہا' حضرت عروہ ابن الزبیر نے اپنا پاؤں گھٹنے تک کٹوا دیا تھا' کیونکہ ان کا ایک زخم سڑ گیا تھا جس کی وجہ سے پاؤں گل رہا تھا' اس کے باوجود انہوں نے کہا "تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جس نے مجھ سے میرا ایک پاؤں لے لیا' تیری ذات کی قسم ہے کہ اگر تو نے لے لیا تو تو نے ہی عطا کیا تھا' اگر تو نے بیمار کیا تو تو نے ہی عافیت دی تھی۔" وہ تمام رات یہی ورد کرتے رہے۔
حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ فقر و غنیٰ دو سواریاں ہیں' مجھے یہ پروا نہیں کہ میں ان میں سے کس سواری پر سوار ہوں گا' اگر فقر پر سواری کروں گا تو اس میں صبر ہے' اور اگر غنیٰ پر سواری کروں گا تو اس میں اللہ کی راہ میں خرچ کرنا ہے۔ ابو سلیمان دارانی کہتے ہیں کہ میں نے ہر مقام سے ایک کیفیت حاصل کی ہے' سوائے مقام رضا کے۔ اس مقام میں سے مجھے صرف ہوا میں پھیلی ہوئی خوشبو ہی ملی ہے' اب اگر اللہ تعالیٰ اس جرم میں مجھے دوزخ میں' اور تمام مخلوق کو جنت میں داخل کر دے تو میں اس پر راضی ہوں۔ ایک عارف سے کسی نے پوچھا کہ کیا تم نے اللہ تعالیٰ کی غایت رضا حاصل کر لی ہے' اس نے جواب دیا نہیں' البتہ مقام رضا حاصل کر چکا ہوں' اب اگر اللہ تعالیٰ مجھے دوزخ کا پل بنا دے' اور لوگ میری کمر عبور کر کے جنت میں جائیں' پھر اپنی قسم پوری کرنے کے لئے اور تمام مخلوق کے بدلے صرف مجھے دوزخ میں ڈال دے تو میں اس کے فیصلے کو پسند کروں اور اس کی اس تقسیم پر راضی ہوں۔ یہ اس شخص کا کلام ہے جو اپنی تمام تر ہمت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی محبت میں غرق ہوتا ہے' یہاں تک کہ اسے جہنم کی

آگ سے ذرا تکلیف نہیں ہوتی' اور اگر ہوتی بھی ہے تو وہ رضائے محبوب کے حصول کی لذت سے مغلوب ہو جاتی ہے' حقیقت میں اس حالت کا غالب آنا محال نہیں ہے' اگرچہ ہم جیسے ضعیف حالات رکھنے والے اس پر یقین نہیں رکھتے' جو لوگ ضعیف ہوں' اور اس طرح کی کیفیات کے حصول سے عاجز ہوں ان کے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ قوت رکھنے والوں کے حالات کا انکار کریں' اور یہ گمان کریں کہ جن احوال سے ہم عاجز ہیں اللہ کے نیک بندے بھی ان سے عاجز ہوں گے۔ رودباری کہتے ہیں کہ میں نے ابو عبداللہ ابن جلاء دمشقی سے دریافت کیا کہ فلاں شخص کے اس قول کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے کہ میں یہ پسند کرتا ہوں کہ میرا جسم قینچیوں سے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جائے' اور تمام مخلوق اس کی اطاعت کرے' انہوں نے فرمایا اگر یہ قول اجلال و تعظیم کے طور پر ہے تو میں اس سے واقف نہیں ہوں' اور اگر لوگوں کی خیر خواہی اور ان پر شفقت کے طور پر ہے تو تو اسے سمجھتا ہے' راوی کہتے ہیں وہ یہ کہہ کر بے ہوش ہو گئے' عمران ابن الحصین استسقاء کے مرض میں مبتلا تھے' اور تیس برس تک بستر پر پڑے رہے' نہ اٹھ سکتے تھے اور نہ بیٹھ سکتے تھے' پاخانے وغیرہ کی حاجت کے لئے چارپائی کے بان کاٹ دئے گئے تھے' ایک مرتبہ ان کے پاس مطرف اور ان کے بھائی ابو العلاء آئے' اور ان کا یہ حال دیکھ کر رونے لگے' حضرت عمران ابن الحصین نے فرمایا کیوں روتے ہیں' انہوں نے عرض کیا میں آپ کو اس زبردست مرض میں گرفتار دیکھ کر روتا ہوں' فرمایا مت روؤ۔ اس لئے کہ جو چیز اللہ تعالیٰ کو زیادہ محبوب ہے وہی چیز مجھے بھی زیادہ پسند ہے' اس کے بعد فرمایا میں تم سے ایک بات کہتا ہوں شاید تمہیں کچھ نفع ہو' لیکن تم میرے مرنے تک یہ بات کسی پر ظاہر مت کرنا' اور وہ بات یہ ہے کہ فرشتے میری زیارت کرتے ہیں' میں ان سے انس حاصل کرتا ہوں' وہ مجھے سلام کرتے ہیں اور میں ان کے سلام کی آواز سنتا ہوں' اس سے میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ مصیبت سزا کے طور پر نہیں ہے' بلکہ اس عظیم نعمت کے باعث ہے جو مجھے عطا کی گئی ہے' جس شخص کا مصائب میں یہ حال ہو وہ کیسے اس پر راضی نہیں ہو گا' راوی کہتے ہیں کہ ہم سوید ابن متعبہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دیکھا کہ ایک جگہ لپٹا ہوا کپڑا پڑا ہوا ہے' ہمیں گمان ہوا کہ شاید اس کپڑے کے نیچے کچھ نہیں ہے' ان کے چہرے سے کپڑا اٹھایا گیا' اور زوجہ محترمہ نے عرض کیا ہم آپ پر قربان ہوں آپ کو کیا کھلائیں' اور کیا پلائیں' انہوں نے فرمایا کہ لیٹے لیٹے کمر دکھنے لگی ہے' اور سرین چھل گئی ہے' اور ایک مدت سے کھانا پینا ترک کرنے کی وجہ سے لاغر ہو گیا ہوں' لیکن مجھے یہ پسند نہیں کہ میں اپنی اس حالت میں ذرا سی بھی کمی کروں' جب حضرت سعد ابی ابی وقاص مکہ مکرمہ تشریف لائے تو آپ کی آنکھوں کی بینائی باقی نہیں تھی' لوگ ان کے آنے کی خبر سن کر دوڑے آتے تھے اور ہر شخص ان سے اپنے لئے دعا کی درخواست کرتا تھا' آپ ہر شخص کے لئے دعا کرتے تھے' اور دعائیں قبولیت سے بھی سرفراز ہوتی تھیں' کیوں کہ مستجاب الدعوات تھے' عبداللہ ابن السائب فرماتے ہیں کہ میں اس وقت نو عمر تھا' آپ کی شہرت سن کر خدمت میں حاضر ہوا' اور اپنا تعارف کرایا' آپ نے مجھے پہچان لیا' اور فرمایا تو مکہ والوں کا قاری ہے' میں نے کہا جی ہاں! اس کے بعد کچھ اور گفتگو ہوئی' آخر میں میں نے ان سے عرض کیا اے محترم! آپ لوگوں کے لئے دعائیں کرتے ہیں' اپنے لئے بھی تو دعا کیجئے تاکہ اللہ تعالیٰ آپ کو دوبارہ بینائی عطا فرمائے' آپ میری بات سن کر مسکرائے اور فرمایا: بیٹے اللہ تعالیٰ کا فیصلہ میرے نزدیک بینائی سے بہتر ہے' ایک صوفی کا بچہ گم ہو گیا' اور تین دن تک اس کی کوئی خبر نہیں ملی' ان سے کہا کہ آپ اپنے بچے کی واپسی کے لئے خدا تعالیٰ سے دعا کریں' فرمایا اس کے فیصلے پر میرا معترض ہونا بچے کی گم شدگی سے زیادہ سخت ہے' ایک نیک شخص کہا کرتے تھے کہ میں نے ایک سخت گناہ کیا ہے' اور میں اس پر ساٹھ برس سے رو رہا ہوں' یہ بزرگ عبادت میں نہایت شدید مجاہدہ کرتے تھے' اور مسلسل توبہ و استغفار کیا کرتے تھے' لوگوں نے ان سے دریافت کیا کہ آخر وہ کون سا گناہ ہے جس پر آپ کو ساٹھ برس سے افسوس ہے' انہوں نے کہا کہ میں نے ایک مرتبہ یہ کہہ دیا تھا کہ کاش یہ بات ایسے نہ ہوتی۔ ایک بزرگ فرماتے ہیں اگر میرا جسم قینچیوں سے چھلنی کر دیا جائے تو یہ امر میرے نزدیک اس سے زیادہ بہتر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کسی فیصلے کے متعلق یہ کہوں کہ کاش یہ فیصلہ نہ ہوا کرتا۔ عبدالواحد ابن زید سے بتلایا گیا کہ یہاں ایک صاحب رہتے ہیں جو پچاس برس سے عبادت کر رہے ہیں' عبدالواحد ابن زید ان سے ملاقات کے لئے تشریف

لے گئے اور ان سے پوچھا محترم! یہ بتلایئے کہ کیا آپ اس عبادت کو کافی سمجھتے ہیں' انہوں نے کہا نہیں' انہوں نے پوچھا کیا آپ نے اس عبادت کے ذریعے انس حاصل کیا ہے' کہا : نہیں' پوچھا کیا آپ اس سے راضی ہیں' کہا : نہیں' آپ نے فرمایا اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ کی عبادت ظاہری اعمال پر منحصر ہے' اور نماز روزے سے تجاوز نہیں ہے' انہوں نے جواب دیا' جی ہاں! فرمایا مجھے شرم آتی ہے' ورنہ میں یہ کہتا کہ پچاس برس پر پھیلی ہوئی تیری یہ عبادت بیکار رہی' اتنی مدت گزرنے کے باوجود تیرے دل کا دروازہ نہ کھلا' اور تو نے قلب کے اعمال کو ترقی درجات کا وسیلہ نہیں بنایا' تو اب تک اصحاب یمین کے طبقے میں ہے' اور تجھے اعمال ظاہری سے صرف اسی قدر حاصل ہوا جس قدر عوام کو ہوتا ہے۔

کچھ لوگ شبلی کی خدمت میں حاضر ہوئے' وہ اس وقت ایک قید خانے میں قید و بند کی زندگی گزار رہے تھے' جس وقت یہ لوگ ملاقات کے لئے پہنچے آپ ڈھیلے اکٹھے کرنے میں مصروف تھے' آپ نے آنے والوں سے دریافت کیا کہ تم لوگ کون ہو' اور کیوں آئے ہو' لوگوں نے عرض کیا ہم آپ کے چاہنے والے ہیں' آپ ان پر پتھر برسانے لگے' وہ لوگ اِدھر اُدھر بھاگ گئے' فرمایا ابھی تو تم میری محبت کا دعویٰ کر رہے تھے' اگر تم میری محبت کے دعوے میں سچے ہو تو بھاگتے کیوں ہو' میری دی ہوئی مصیبت پر صبر کیوں نہیں کرتے' شبلی کا ایک شعر یہ ہے۔

اِنَّ الْمَحَبَّةَ لِلرَّحْمٰنِ اَسْكَرَنِيْ وَهَلْ رَاَيْتَ مُحِبًّا غَيْرَ سَكْرَانِ

(رحمٰن کی محبت نے مجھے مدہوش کردیا ہے' کیا تو نے کوئی ایسا محب دیکھا ہے جو مدہوش نہ ہو)۔

ایک شامی عابد نے فرمایا کہ تم سب اللہ تعالیٰ سے اس کی تصدیق کرتے ہوئے ملوگے' اور غالباً تم نے اس کی تکذیب بھی کی ہوگی' اور وہ تکذیب یہ ہے کہ تم میں سے کسی کے ہاتھ کی انگلی میں سونا ہوتا ہے اور وہ اس سے اشارہ کرتا ہے' یا اس میں کوئی خلل ہوتا ہے تو اسے چھپاتا پھرتا ہے' اس قول سے ان کی مراد یہ ہے کہ سونا اللہ تعالیٰ کے نزدیک برا ہے' اور لوگ اس سے ایک دوسرے پر فخر کرتے ہیں' اور مصائب اہل آخرت کے لئے باعث زینت ہیں' لوگوں نے حضرت سری سقطی کی خدمت میں عرض کیا کہ پورا بازار خاکستر ہوگیا ہے' لیکن آپ کی دکان حیرت انگیز طریقے سے بچ گئی ہے' آپ نے فرمایا الحمد للہ' سائل نے عرض کیا کہ آپ نے اپنی دکان کی سلامتی پر الحمد للہ کیسے فرمایا جب کہ تمام مسلمانوں کی دکانیں جل گئیں' یہ سن کر آپ نے تجارت سے توبہ کی' دکان چھوڑ دی' اور اس ایک کلمے کو اس قدر بڑا جانا کہ تمام عمر توبہ و استغفار میں مشغول رہے۔

اگر تم ان واقعات میں غور کرو تو یہ بات واضح ہوجائے گی کہ خواہش کے خلاف کسی فعل پر راضی ہوجانا محال نہیں ہے' بلکہ یہ اہل دین کے مقامات میں سے ایک عظیم ترین مقام ہے' اور جب یہ مخلوق کی محبت اور دنیاوی حظوظ میں ممکن ہے تو اللہ تعالیٰ کی محبت اور آخرت کے حظوظ میں کیسے ممکن نہ ہوگی' اور اس امکان کی دو وجہیں ہیں' ایک وجہ یہ ہے کہ تکلیف پر آدمی اس امید پر راضی ہوتا ہے کہ اس سے اجر و ثواب اور نفع حاصل ہوگا' جیسے آدمی شفاء کی توقع میں دوا پیتا ہے' پچھنے لگواتا ہے' اور فصد کھلواتا ہے' دوسری وجہ یہ ہے کہ آدمی تکلیف پر اس لئے راضی نہیں ہوتا کہ اس میں کوئی منفعت ہے' بلکہ اس لئے راضی ہوتا ہے کہ وہ تکلیف محبوب کی رضا' اس کی مراد اور اس کی خواہش' بعض اوقات محبت اس قدر غالب ہوتی ہے کہ محبوب کی مراد اور خواہش اس کی مراد اور خواہش بن جاتی ہے' یہاں تک کہ اس کے نزدیک لذیذ ترین عمل یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے محبوب کے دل کو خوشی سے ہم کنار کرے' اس کے ارادے کو نافذ کرے' اور اس کی خواہش پوری کرے اگرچہ اسے اپنی جان کو ہلاکت میں ڈالنا پڑ جائے۔ چنانچہ کسی شاعر کا یہ مصرعہ مشہور ہے : ع فَمَا لِجُرْحٍ اِذَا اَرْضَاكُمُ اَلَمٌ (اگر زخم سے تمہیں خوشی ہو تو اس میں تکلیف کہاں؟) پھر اگر زخم سے تکلیف بھی ہو تب بھی یہ ممکن ہے کہ بعض اوقات محبت اس درجہ غالب ہوتی ہے کہ تکلیف کا احساس ہی باقی نہیں رہتا' قیاس' تجربے اور مشاہدے سے اس کا ثبوت ملتا ہے' اگر کسی شخص کو یہ مقام حاصل نہیں تو اسے اس مقام کے وجود کا انکار نہ کرنا چاہیے کیونکہ یہ اس مقام سے اس کی محرومی کی دلیل ہے' نہ کہ اس مقام کے عدم وجود کی۔ جو شخص

محبت کا ذائقہ نہیں چکھتا وہ اس کے عجائب بھی نہیں دیکھ پاتا' محبین کے تو ایسے ایسے محیّر العقول واقعات ہیں کہ ہم بیان نہیں کر سکتے۔ عمرو ابن الحرث الرافعی سے روایت ہے' فرماتے ہیں کہ میں رقہ میں اپنے ایک دوست کے پاس بیٹھا ہوا تھا' ہماری مجلس میں ایک نوجوان شخص بھی تھا جو ایک مغنّیہ باندی پر عاشق تھا' وہ مغنّیہ بھی اتفاق سے مجلس میں موجود تھی' اور ساز کے ساتھ اپنی آواز کے جادو جگا رہی تھی۔ اس نے یہ دو شعر سنائے :۔

عَلَامَةُ ذُلِّ الْهَوَىٰ عَلَى الْعَاشِقِيْنَ الْبُكَىٰ
وَلَا سِيَّمَا عَاشِقٌ إِذَا لَمْ يَجِدِ الْمُشْتَكَىٰ

(عاشقین کے لئے ذلّت عشق کی پہچان آہ و بکا ہے' خاص طور پر عاشق کے لئے جو اپنے لئے کوئی ایسا شخص پائے جس سے اپنے درد کا اظہار کر سکے)۔

نوجوان نے اس سے کہا بخدا تو نے بڑے اچھے شعر کہے ہیں' کیا تو نے مجھے اجازت دے دی کہ میں مر جاؤں' اس نے کہا اگر تو عشق میں سچا ہے تو تجھے مر جانا چاہیے' یہ سن کر اس نوجوان نے تکیہ پر اپنا سر رکھا' منہ اور آنکھیں بند کیں' تھوڑی دیر بعد ہم نے اسے ہلا کر دیکھا تو وہ شخص مر چکا تھا' حضرت جنید بغدادی کہتے ہیں میں نے ایک شخص کو دیکھا جو ایک لڑکے کی آستین تھامے نہایت عاجزی سے باتیں کر رہا ہے' اور اپنے آپ کو اس کا عاشق بتلا رہا ہے' اس کی تمام باتیں سن کر لڑکے نے کہا کہ تیرا یہ جھوٹ کب تک جاری رہے گا' عاشق نے کہا اللہ جانتا ہے میں جو کچھ کہہ رہا ہوں سچ کہہ رہا ہوں۔ میرا حال تو یہ ہے کہ اگر تو مجھ سے مرنے کے لئے کہہ دے تو میں مر جاؤں لڑنے نے کہا اگر تو سچا ہے تو مرجا' وہ شخص ایک طرف کو گیا' آنکھیں بند کیں' اور مر گیا' سمنون عاشق کہتے ہیں ہمارے پڑوس میں ایک شخص رہتا تھا' اس کے پاس ایک باندی تھی جس سے اسے بے پناہ محبت تھی' ایک دن باندی بیمار پڑ گئی' وہ شخص اس کے لئے حلویٰ بنا رہا تھا' اچانک باندی کی زبان سے نکلا آہ' یہ آواز سن کر اس کے ہوش گم ہو گئے' چمچہ ہاتھ سے گر پڑا' اور شدّت اضطراب کی وجہ سے دیگچی میں چمچے کی جگہ انگلیاں ہی ڈال دیں' یہاں تک کہ اس کی انگلیاں جل کر گر گئیں' باندی نے پوچھا یہ کیا ہوا' کہنے لگا یہ تیری آہ کا نتیجہ ہے۔ محمد ابن عبداللہ بغدادی سے روایت ہے کہتے ہیں کہ میں نے بصرے میں ایک بلند پہاڑ پر ایک نوجوان کو دیکھا جو نیچے جھانک کر یہ شعر پڑھ رہا تھا :۔

مَنْ مَاتَ عِشْقًا فَلْيَمُتْ هٰكَذَا لَا خَيْرَ فِي عِشْقٍ بِلَا مَوْتٍ

(جو شخص عشق میں مرے وہ اس طرح مرے موت کے بغیر عشق میں کوئی بہتری نہیں ہے)۔

یہ شعر پڑھ کر اس نے اپنے آپ کو نیچے گرا دیا' اور مر گیا۔ یہ اور اس طرح کے دوسرے واقعات سے پتا چلتا ہے کہ مخلوق میں اس طرح کی محبت موجود ہے جسے غلبۂ عشق کہہ سکتے ہیں اور جب یہ مخلوق کے باب میں ہو سکتی ہے تو خالق کے باب میں کیوں نہیں ہو سکتی' جب کہ باطن کی بصیرت ظاہر کی بصارت سے زیادہ راست ہے' اور حق تعالیٰ کا جمال ہر جمال سے اعلا اور مکمل ہے' بلکہ جس قدر جمال موجود ہے وہ سب اسی کے جمال کا پرتو اور عکس ہے۔ جس طرح وہ شخص صورتوں کے حسن کا انکار کرتا ہے جس کی آنکھ نہیں ہوتی' اور وہ شخص آواز کی نغمگی پر یقین نہیں رکھتا' جو کانوں سے محروم ہوتا ہے اسی طرح وہ شخص بھی قلب کے ذریعے ادراک کئے جانے والی لذتوں کا منکر ہو گا جو قلب نہ رکھتا ہو۔

دعا رضا کے خلاف نہیں یہاں یہ بحث بھی ہے کہ دعا کرنے والا مقام رضا پر قائز رہتا ہے یا نہیں؟ اسی طرح وہ شخص مقام رضا سے خارج ہے یا نہیں جو گناہوں کو برا سمجھتا ہو' مجرموں سے ناراض رہتا ہو' اور گناہ کے اسباب کو معیوب سمجھتا ہو؟ نیز وہ شخص بھی اس مقام پر متمکن سمجھا جائے گا یا نہیں جو معروف کا حکم کرتا ہو' اور منکر سے روکتا؟ اس بحث کا حاصل یہ ہے کہ بعض اہل باطل اور اصحاب فریب کو بڑا دھوکا ہوا ہے' وہ یہ کہتے ہیں کہ گناہ' فسق و فجور اور کفر رب کے فیصلے اور اس کی تقدیر سے ہیں' اس لئے ان پر راضی رہنا واجب ہے' یہ قول اس بات کی علامت ہے کہ جس شخص نے بھی یہ دعویٰ کیا ہے وہ تاویل کے علم سے

ناواقف ہے' اور اسرار شریعت سے غفلت میں مبتلا ہے۔ جہاں تک دعا کا سوال ہے اسے اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے عبادت قرار دیا ہے۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور انبیائے کرام کا کثرت سے دعا کرنا اس کی دلیل ہے' جیسا کہ ہم نے کتاب الدعوات میں اس نوع کی بے شمار روایات نقل کی ہیں۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم رضا کے اعلا ترین مقام پر تھے' نیز اللہ تعالیٰ نے اپنے بہت سے بندوں کی ان الفاظ میں تعریف کی ہے :۔

يَدْعُونَنَا رَغَبًا وَّرَهَبًا۔ (پ آیت)

اور وہ ہمیں رجاء و خوف دونوں حالتوں میں پکارتے تھے۔

دوسری طرف معاصی کا انکار کرنا' انہیں برا سمجھنا' اور ان پر راضی نہ رہنا بھی اللہ تعالیٰ کی عبادت کا ایک اہم پہلو ہے' چنانچہ جو لوگ معاصی پر راضی رہتے ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کی مذمت اس طرح فرمائی ہے :۔

وَرَضُوا بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَاطْمَأَنُّوا بِهَا۔ (پ ۱۱ ر ۶ آیت ۷)

اور دنیا کی زندگی پر راضی اور اس پر مطمئن ہوئے۔

وَرَضُوا بِأَنْ يَكُونُوا مَعَ الْخَوَالِفِ وَطَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوبِهِمْ۔ (پ ۱۰ ر ا آیت ۹۳)

اور انہیں یہ بات اچھی لگی کہ وہ پچھلی عورتوں کے ساتھ رہ جائیں' اور اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر مہر کر دی۔

ایک مشہور حدیث میں وارد ہے' فرمایا :۔

مَنْ شَهِدَ مُنْكَرًا فَرَضِيَ بِهِ فَكَأَنَّهُ قَدْ فَعَلَهُ

جو شخص کسی برائی کو دیکھتا ہے اور خوش ہوتا ہے وہ ایسا ہوتا ہے گویا وہ برائی خود اس سے سرزد ہوئی ہو۔

اسی طرح ایک حدیث میں یہ الفاظ وارد ہیں :۔

اَلدَّالُّ عَلَى الشَّرِّ كَفَاعِلِهِ۔ (ابو منصور دیلمی۔ انس)

شر کی رہنمائی کرنے والا ایسا ہے جیسے شر کا ارتکاب کرنے والا۔

حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ سے روایت ہے کہ بندہ برائی سے دور ہوتا ہے' لیکن اتنا ہی گنہگار ہوتا ہے جتنا گناہ گار مرتکب ہوتا ہے' لوگوں نے عرض کیا وہ کیسے' فرمایا وہ اس طرح کہ جب اسے اس گناہ کی خبر پہنچے تو خوش ہو' ایک حدیث میں ہے کہ اگر کوئی شخص مشرق میں قتل کر دیا جائے اور مغرب میں رہنے والا دوسرا شخص اس واقعے سے خوش ہو تو وہ بھی قتل میں شریک تصور کیا جائے گا (۱) اللہ تعالیٰ نے خیر کے کاموں' اور شر سے بچنے کے سلسلے میں حسد اور منافست کا حکم دیا ہے' ارشاد فرمایا :۔

فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُونَ۔ (پ ۳۰ ر ۸ آیت ۲۶)

اور حرص کرنے والوں کو حرص کرنا چاہیے۔

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں :۔

لَا حَسَدَ إِلَّا فِي اثْنَتَيْنِ رَجُلٌ آتَاهُ اللّٰهُ حِكْمَةً فَهُوَ يَبُثُّهَا فِي النَّاسِ وَيُعَلِّمُهَا وَرَجُلٌ آتَاهُ اللّٰهُ مَالًا فَسَلَّطَهُ عَلٰى هَلَكَتِهِ فِي الْحَقِّ۔ (بخاری و مسلم۔ ابن مسعودؓ)

حسد صرف دو شخصوں پر (جائز) ہے' ایک وہ شخص جسے اللہ تعالیٰ نے علم و حکمت سے نوازا ہو اور وہ اسے لوگوں میں پھیلاتا ہو اور سکھلاتا ہو اور دوسرا وہ شخص جسے اللہ نے مال دیا ہو اور اسے حق کے راستے میں

---

(۱) مجھے یہ روایت ان الفاظ میں نہیں ملی' البتہ ابن عدی نے ابو ہریرہ سے قدرے مختلف روایت نقل کی ہے۔

ہلاکت پر مسلط کر دیا ہو۔

ایک حدیث میں یہ الفاظ ہیں :۔

وَرَجُلٌ آتَاهُ اللّٰهُ الْقُرْآنَ فَهُوَ يَقُوْمُ بِهِ آنَاءَ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ فَيَقُوْلُ الرَّجُلُ لَوْ آتَانِيَ اللّٰهُ مِثْلَ مَا أَتَى هٰذَا لَفَعَلْتُ مِثْلَ مَا يَفْعَلُ۔ (مسلم۔ ابن مسعود)

اور وہ شخص جسے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم عطا کیا ہو اور وہ رات دن اس کی تلاوت کرتا ہو، اسے دیکھ کر کوئی شخص یہ کہے کہ اگر یہ چیز جو اسے عطا کی گئی ہے مجھے بھی عطا کی جاتی تو میں بھی ایسا ہی کرتا جیسا یہ کرتا ہے۔

قرآن کریم کی بے شمار آیات میں کافروں، فاجروں اور بدکاروں سے دور رہنے، ان سے نفرت کرنے اور بغض رکھنے کی تلقین کی گئی ہے، اس ضمن میں بعض آیات یہ ہیں :۔

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكَافِرِيْنَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ۔ (پ ۳ ر ۱۲ آیت ۲۸)

مسلمانوں کو چاہیے کہ کفار کو دوست نہ بنائیں مسلمانوں کو چھوڑ کر۔

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصَارٰى أَوْلِيَاءَ (پ ۶ ر ۱۲ آیت ۵۱)

اے ایمان والو! تم یہود و نصاریٰ کو دوست مت بناؤ۔

وَكَذٰلِكَ نُوَلِّيْ بَعْضَ الظَّالِمِيْنَ بَعْضًا۔ (پ ۸ ر ۲ آیت ۱۲۹)

اور اسی طرح ہم بعض کفار کو بعض کے قریب رکھیں گے۔

ایک حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر مسلمان سے عہد لیا ہے کہ وہ ہر منافق سے بغض رکھے، اور ہر منافق سے یہ عہد لیا ہے کہ وہ ہر مومن سے بغض رکھے (۱) بعض احادیث یہ ہیں :۔

اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ أَحَبَّ (۲) آدمی اس کے ساتھ ہے جس سے وہ محبت کرے۔

مَنْ أَحَبَّ قَوْمًا وَوَالَاهُمْ حُشِرَ مَعَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ (طبرانی۔ ابو قرصافہ۔ ابن عدی۔ جابر)

جو شخص کسی قوم سے محبت کرتا ہے اور ان سے دوستی رکھتا ہے قیامت کے دن اس کا حشر انہی کے ساتھ ہوگا۔

أَوْثَقُ عُرَى الْإِيْمَانِ الْحُبُّ فِي اللّٰهِ وَالْبُغْضُ فِي اللّٰهِ (احمد)

ایمان کی مضبوط گرہ اللہ کے لئے محبت اور اللہ کے لئے بغض ہے۔

بغض فی اللہ اور حب فی اللہ کے سلسلے میں بے شمار روایتیں وارد ہیں، اور ہم نے کتاب آداب الصحبۃ میں ان کا ذکر کیا ہے، اور بعض روایات کتاب الامر بالمعروف والنہی عن المنکر میں بھی آئی ہیں، اس لئے ہم یہاں ان کا اعادہ نہیں کرنا چاہتے، اب اگر تم یہ کہو کہ بہت سی آیات اور روایات سے پتا چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا کے بغیر معاصی کا وجود محال ہے، اور اس کا تصور بھی عقیدۂ توحید کے منافی ہے، اس لئے گناہوں کو برا سمجھنا گویا اللہ تعالیٰ کی رضا اور قضا کو برا سمجھنا ہے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہاں دو متضاد اور مختلف قسم کی روایات موجود ہیں، اس لئے ان میں مطابقت کی کوئی صورت ہونی چاہیے، یعنی ایک ہی شی میں رضا اور کراہت کا اجتماع ممکن ہونا چاہیے۔ جاننا چاہیے کہ یہ امر ان ضعیف العقل لوگوں پر مشتبہ ہے جو علوم کے اسرار و رموز پر مطلع ہونے کی قدرت نہیں رکھتے اور یہ سمجھتے ہیں کہ منکرات پر خاموش رہنا بھی رضا کے مقامات میں سے ایک مقام ہے، بلکہ اسے انہوں نے حسن خلق قرار دیا ہے، حالانکہ یہ ان کی جہالت اور نادانی ہے، بلکہ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ رضا اور کراہت دو متضاد امر ہیں، اگر کسی ایک چیز پر ایک ہی جہت سے ایک ہی طریقے پر وارد ہوں، لیکن اگر کراہت کی وجہ رضا کی وجہ سے مختلف ہو، تب کوئی تضاد نہیں ہے، مثال کے طور پر اگر تمہارا کوئی دشمن مرجائے، اور وہ تمہارے کسی دوسرے شخص کا بھی دشمن ہو، اور اسے ہلاک کرنے کے درپے ہو، تم اس کی موت اس لئے ناپسند کرتے ہو کہ وہ تمہارے دشمن کا دشمن تھا، اور اس لئے پسند کرتے ہو کہ وہ خود تمہارا دشمن تھا، یہی حال معصیت کا

(۱) یہ روایت مجھے نہیں ملی۔ (۲) یہ روایت پہلے گذر چکی ہے

ہے' اس کے بھی دو پہلو ہیں' ایک پہلو تو یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا فعل' اس کا اختیار اور ارادہ ہے اس لئے اس پر راضی رہنا مالک الملک کی ملوکیت کو تسلیم کرنا اور اس کے فعل پر سر تسلیم خم کرنا ہے' اور دوسرا پہلو یہ ہے کہ وہ بندے کا کسب' اس کا وصف اور اس کی علامت ہے' اور اس لحاظ سے وہ اللہ کا ایک مبغوض اور ناپسندیدہ بندہ ہے کہ اس پر بعد اور غضب کے دواعی مسلط کئے گئے ہیں' اور تمہیں بھی وہ اسی لئے ناپسند ہونا چاہیے۔ آیئے اسے ایک مثال کی روشنی میں دیکھتے ہیں' فرض کیجئے بندوں میں ایک معشوق صفت شخص ہے جس کے بے شمار عشاق ہیں' اس نے اپنے عاشقوں کے روبرو یہ اعلان کیا کہ ہم اپنے دوستوں اور دشمنوں میں امتیاز کرنے کے لئے ایک معیار مقرر کرنا چاہتے ہیں۔ جو اس معیار پر پورا اترے گا ہم اسے اپنا عاشق صادق تصور کریں گے' ہم پہلے فلاں عاشق کی طرف چلتے ہیں' اسے اس قدر اذیت دیں گے' اور اس قدر ماریں گے ستائیں گے کہ وہ ہمیں گالی دینے پر مجبور ہو جائے' اور جب وہ گالیاں دینے لگے تو ہم اس سے بغض کریں گے' ہم اسے اپنا دشمن تصور کریں گے' اور جس سے وہ محبت کرے گا ہم اسے بھی اپنا دشمن سمجھیں گے' اور جس سے وہ نفرت کرے گا اسے ہم اپنا دوست اور عاشق سمجھیں گے۔ چنانچہ اس نے اپنے اعلان کے مطابق اقدام کیا' اور اس کی وہ مراد بھی پوری ہو گئی جو وہ چاہتا تھا کہ اس کا ایک عاشق اذیت پر صبر نہ کرسکا' اور اس نے گالیاں شروع کردیں' گالیوں سے دل میں بغض پیدا ہوا' اور بغض نے عداوت کی صورت اختیار کرلی' اس صورت میں اس شخص کو جو عاشق صادق ہو اور محبت کی شرائط سے واقفیت رکھتا ہو یہ کہنا چاہیے کہ اپنے فلاں عاشق کو تکلیف پہنچانے' اور اسے زدوکوب کرکے اپنے سے دور کرنے کے لئے جو تدبیر تو نے اختیار کی تھی' میں اس سے راضی ہوں' اور اسے پسند کرتا ہوں' کیوں کہ یہ تیری رائے' تدبیر' فعل اور ارادہ ہے' اور اس شخص نے تیری اذیت کے جواب میں جو گالی دی وہ سراسر اس کی زیادتی اور ظلم ہے' اسے چاہیے تھا کہ وہ ہر اذیت پر صبر کرتا' اور گالی دینے سے گریز کرتا' لیکن کیوں کہ تیرا منشاء یہی تھا' اور تو یہی چاہتا تھا کہ تیری اذیت کے جواب میں وہ گالی دے اور تیرے دل میں اس کی طرف سے بغض پیدا ہو جائے' اس لئے اس نے تیری تدبیر اور ارادے کے مطابق کیا' میں تیری مراد کی تکمیل پر راضی ہوں' اگر ایسا نہ ہوتا تو تیری تدبیر ناقص رہتی' اور تیری مراد پوری نہ ہوتی' اور میں اسے پسند نہیں کرتا کہ تیری مراد پوری نہ ہو' یہ تو اس کے فعل کی ناپسندیدگی کا پہلو ہوا' لیکن دوسری طرف میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس عاشق نے گالی دے کر بڑی جسارت کی ہے' تیرے جیسا حسین و جمیل انسان اسے مارتا ہو تو اسے اپنی خوش بختی پر نازاں ہونا چاہیے تھا' اور تیرا شکر گزار ہونا چاہیے تھا کہ تو نے اسے اپنی عنایات کا مستحق گردانا' اور تیرے جسم پر اپنے نرم و نازک ہاتھ لگائے' اس عاشق کے نزدیک اپنے رقیب کا یہ فعل پسندیدہ بھی ہے' اس لئے کہ معشوق یہی چاہتا تھا کہ وہ زدوکوب کے جواب میں گالیاں دے' اور دل میں بغض پیدا ہو جائے اور ناپسندیدہ بھی ہے کہ معشوق کی مار برداشت نہیں کی' وہ اپنے رقیب سے اس لئے نفرت کرتا ہے کہ معشوق کو اس سے نفرت ہے' اس لئے کہ محبت کی علامت ہی یہ ہے کہ محبوب کے حبیب کو اپنا دوست سمجھے' اور اس کے دشمن کو اپنا دشمن تصور کرے' گویا یہ شخص ایک ہی فعل کو معشوق کی طرف منسوب کرکے اچھا تصور کرتا ہے' اور مبغوض عاشق کی طرف منسوب کرکے برا سمجھتا ہے' اور اس میں کوئی تضاد نہیں ہے' تضاد کی صورت تو یہ ہے کہ کسی امر سے اس لئے راضی ہو کہ معشوق کی مراد یہی ہے' اور اس لئے ناراض ہو کہ معشوق کا منشاء یہی ہے۔ آدمی کا کسی چیز کو ایک وجہ سے برا سمجھنا' اور ایک وجہ سے اچھا جاننا ممکن ہے اور اس کی بے شمار نظیریں ہیں۔

اب ہم اپنے اصل مقصود کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ مثال مذکورہ میں مبغوض عاشق سے مراد وہ شخص ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے شہوت کے دواعی مسلط کردیے ہوں یہاں تک کہ وہ معصیت کو محبوب جانتا ہو اور اس کا ارتکاب کرتا ہو' اللہ تعالیٰ اپنی نافرمانی کرنے والے سے خفا ہوتا ہے' اگرچہ یہ نافرمانی اسی کی تدابیر اور تقدیر سے ظہور پذیر ہوتی ہے' لیکن اس کا نافرمانی پر ناراض ہونا ایسا ہے جیسے معشوق اپنے عاشق کی گالیوں سے بغض کرتا ہے' حالانکہ وہ گالیاں خود اسی کی تدبیر کا نتیجہ تھیں' نہ وہ ایسے اسباب اختیار کرتا اور نہ وہ بندہ مسکین گالیوں پر اترتا' اللہ تعالیٰ اپنے جن بندوں پر معصیت کے دواعی مسلط کرتا ہے ان کے متعلق یہ یقین کرلینا چاہیے کہ مشیت ایزدی اسی میں ہے کہ وہ بندے مرتکب معصیت ہوں' اور اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور غضب کے مستحق ٹھہریں جو

بندہ اپنے اللہ سے بھی محبت رکھتا ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ ہر اس شخص سے بغض رکھے جس سے اللہ بغض رکھتا ہے' اور اس شخص پر خفا ہو جس پر اللہ خفا ہوتا ہے' اور اس سے دور رہے جسے اس نے اپنے دربار سے نکال دیا ہو' اور اپنی قربت سے محروم کردیا ہو' اگرچہ وہ اللہ تعالیٰ کی قدرت اور قہر سے اس درجے پر پہنچا ہے' لیکن اس کے باوجود وہ ملعون' مذموم اور مردود ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ کے جس قدر محبین اور مقربین ہیں ان سب کی نظروں میں اس کا مبغوض' اور مردود ہونا ضروری ہے' تاکہ محبوب کی موافقت پائی جائے' یعنی اس پر عاشق کو بھی اپنی ناراضگی ظاہر کرنی چاہیے جس پر معشوق ناراض ہو' اوپر جن روایات و اخبار کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ان سے بغض فی اللہ' اور حب فی اللہ کی تاکید ہوتی ہے' اور یہ ثابت ہوتا ہے کہ کفار کے معاملے میں تشدید وارد ہے' ان سے اعراض کرنا چاہیے اور ناراض رہنا چاہیے' اگرچہ اللہ تعالیٰ کے فیصلوں پر راضی رہنا بھی روایات سے ثابت ہے' معلوم ہوا کہ رضا کسی اور اعتبار سے مقصود ہے اور ناراضگی کسی اور اعتبار سے۔ چنانچہ رضا اس اعتبار سے ضروری ہے کہ ان افعال کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہے' اور کراہت اس اعتبار سے کہ وہ بندے کی طرف بھی منسوب ہیں' یہ سب امور تقدیر سے وابستہ ہیں اور ایک راز ہے جس کا افشاء کرنا جائز نہیں ہے' زیادہ سے زیادہ اتنا کہہ سکتے ہیں کہ شر اور خیر دونوں مشیّت اور ارادے میں داخل ہیں' لیکن شر ایک مکروہ مراد ہے' اور خیر ایک پسندیدہ مراد ہے' جو شخص یہ کہتا ہے کہ شر امر مراد نہیں ہے' وہ جاہل ہے اور جو یہ کہتا ہے کہ خیر و شر دونوں صرف اللہ سے ہیں اور ان میں کراہت و رضا کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں ہے وہ بھی جاہل ہے' لیکن اس کی تفصیل بیان نہیں کی جاسکتی۔ اس لئے بہتر سکوت ہے' اور شریعت کے ادب کا تقاضا بھی یہی ہے' چنانچہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں :-

اَلْقَدْرُ سِرُّ اللّٰہِ فَلَا تُفْشُوْہُ (ابو نعیم۔ عائشہ) تقدیر اللہ کا راز ہے اسے ظاہر مت کرو۔

تقدیر علم مکاشفہ سے متعلق ہے' اور یہاں ہم یہ بیان کرنا چاہتے ہیں کہ اللہ کی قضاء پر راضی ہونا' اور گناہوں کو برا سمجھنا جب کہ گناہ خود بھی قضاء الٰہی سے ہوتے ہیں ممکن ہے' اور ان دونوں کے اجتماع میں کوئی تناقض نہیں ہے' گذشتہ سطور میں اس پر کافی گفتگو ہو چکی ہے' ہمارے خیال میں یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ سرّ تقدیر افشاء کئے بغیر رضا اور کراہت کا اجتماع ممکن ہے' اسی تقریر سے یہ بات بھی ثابت ہو گئی ہے کہ گناہوں کے ارتکاب' اور ان کی عفو و مغفرت کے لئے دعا کرنا' اور خیر کی راہ پر استقامت کی طلب قضائے الٰہی پر رضا کے خلاف نہیں' اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے دعا کو اسلئے عبادت قرار دیا ہے کہ وہ صفائے ذکر' خشوع قلب' اور تضرع و عاجزی کے ساتھ دعا کریں' اور وہ دعا ان کے دل کے لئے باعث جلا بن جائے' اور موجب کشف بن جائے' اور اس کے باعث اللہ تعالیٰ کے بے پایاں الطاف کا مرکز ٹھہرے' جس طرح پیاس دور کرنے کے لئے گلاس ہاتھ میں لینا' یا پانی تلاش کرنا قضائے الٰہی کے خلاف نہیں ہے اور نہ اس بات کا اختیار کرنا رضا کے خلاف ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے کسی اور چیز کے لئے بنایا ہو اسی طرح دعا بھی ایک سبب ہے' اور اللہ تعالیٰ نے اسے جلائے قلب کے لئے کنجی اور صفائے قلب کا باعث بنایا ہے' اب اگر کوئی دعا کرتا ہے تو یہ رضائے الٰہی کے خلاف کیسے ہو گا' ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی سنّت جاریہ کے مطابق اسباب اختیار کرنا توکل کے منافی نہیں ہے' یہ بحث باب التوکل میں گذر چکی ہے' اسی طرح دعا بھی رضا کے منافی نہیں ہے' کیوں کہ رضا مقام کے اعتبار سے توکل کے نہایت قریب ہے۔

البتہ معصیت کا اظہار کرنا' اور شکایت کے طور پر پریشانیوں کا تذکرہ کرنا اور دل میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے انہیں برا سمجھنا رضا کے خلاف ہے' اور شکر کے طور پر مصائب کا اظہار اور اللہ تعالیٰ کی قدرت و عظمت کے بیان کے لئے اپنی پریشانیوں کا ذکر رضا کے مخالف نہیں ہے' چنانچہ بعض سلف صالحین کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی قضا پر حسن رضا یہ ہے کہ کبھی شکایت کے طور پر گرمی کے دنوں میں یہ نہ کہے کہ یہ گرم دن ہے' ہاں اگر موسم سرما میں کہے گا تو اسے شکر سمجھا جائے گا' شکایت ہر حال میں رضا کے خلاف ہے' اسی طرح کھانوں کی برائی کرنا اور ان میں عیب نکالنا بھی اللہ تعالیٰ کی قضا کے خلاف ہے' کیوں کہ صنعت کی مذمت صانع کی مذمت ہے'

اور تمام چیزیں اللہ تعالیٰ ہی کی بنائی ہوئی ہیں' کہنے والے کا یہ کہنا کہ فقر مصیبت اور آزمائش ہے' اور اولاد رنج و پریشانی ہے' اور پیشہ تکلیف و مشقت ہے' تو یہ بھی رضا کے خلاف سمجھا جائے گا' بلکہ تدبیر کو مدبّر کے سپرد کرنا اور ملک کو صاحب ملک کے حوالے کرنا ہی رضا ہے' کہنے والے کو وہی کہنا چاہیے جو حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا "مجھے یہ پروا نہیں کہ میں مالدار ہوں' یا فقیر' نہ مجھے یہ معلوم کہ ان میں سے کون سی چیز میرے لئے بہتر ہے۔"

بلادِ معصیت سے فرار اور اس کی مذمت بعض کمزور عقل رکھنے والے لوگ یہ کہتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کے بموجب جس میں آپ نے طاعون زدہ شہر سے نکلنے سے منع فرمایا ہے' یہ بھی ضروری ہے کہ اس شہر سے بھی راہ فرار اختیار نہ کی جائے جہاں معاصی ظہور پذیر ہو رہے ہوں اس لئے کہ جس طرح طاعون زدہ علاقے سے بھاگنا اللہ تعالیٰ کی قضاء سے فرار ہے' اسی طرح شہر معصیت سے فرار ہونا بھی اللہ تعالیٰ کے فیصلے کے خلاف کرنا ہے' شہر معصیت کو بلدۂ طاعون پر قیاس کرنا صحیح نہیں ہے' بلکہ طاعون زدہ علاقے سے بھاگنا اس لئے ممنوع ہے کہ بالفرض تندرست لوگ شہر سے کوچ کر جائیں' اور وہ لوگ باقی رہ جائیں جو مرض میں گرفتار ہیں تو ان کی خبر گیری کون کرے گا' بیچارے کس مپرسی کے عالم میں ہلاک ہو جائیں گے' اسی لئے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے طاعون سے بھاگنے کو میدان جہاد سے بھاگنے کے مشابہ قرار دیا ہے' اگر اس کی وجہ یہی ہوتی جو ضعیف العقل نے تصور کی ہے یعنی قضائے الٰہی کے خلاف ہے تو اس شخص کو واپسی کی اجازت کیوں دی جاتی جو شہر کے قریب پہنچ چکا ہو' اور ابھی شہر میں داخل نہ ہو سکا ہو' ہم نے اس موضوع پر کتاب التوکل میں بحث کی ہے' اس سے معلوم ہوا کہ طاعون زدہ علاقوں سے بھاگنے کی علّت شہر معصیت سے فرار ہونے کی علّت سے مختلف ہے' اور یہ رضا سے فرار نہیں ہے' بلکہ جس چیز سے بھاگنا ضروری ہے اس سے بھاگنا بھی حکم الٰہی میں داخل ہے۔ اسی طرح ان مواقع کی مذمت بھی جو بے حیائی کے جذبات کو مہمیز کریں' یا ان اسباب کی برائی کا ذکر جو معصیت کا باعث ہوں رضائے الٰہی کے خلاف نہیں ہے۔ بشرطیکہ مقصد محض مذمت نہ ہو بلکہ ان مواقع اور اسباب سے لوگوں کو دور رکھنا ہو۔ اکثر سلف صالحین کا عمل ایسا ہی تھا' ایک زمانے میں تقریباً تمام اہل فضل و کمال بغداد کی مذمت پر متفق ہو گئے تھے' اسی لئے وہ لوگ وہاں رہنا پسند نہیں کرتے تھے' بلکہ دور بھاگنا چاہتے تھے' حضرت عبداللہ ابن المبارک فرماتے ہیں کہ میں مشرق و مغرب میں پھرا میں نے بغداد سے زیادہ کوئی شہر برا نہیں دیکھا' لوگوں نے عرض کیا آپ نے اس شہر کی کیا برائی دیکھی' فرمایا وہاں اللہ کی نعمتوں کی بے حرمتی ہوتی ہے اور معصیت الٰہی کو معمولی سمجھا جاتا ہے' جب آپ خراسان تشریف لائے تو لوگوں نے آپ سے دریافت کیا کہ آپ نے بغداد میں کیا دیکھا' فرمایا میں نے وہاں غضب ناک سپاہی' حسرت زدہ تاجر اور حیران و پریشان قاری کے علاوہ کسی شخص کو نہیں دیکھا' یہ گمان نہ کرنا چاہیے کہ حضرت عبداللہ ابن المبارک نے غیبت کی ہے' یہ غیبت نہیں ہے' کیوں کہ آپ نے کسی خاص متعین شخص کا نام نہیں لیا' اور نہ اس کی برائی کر کے اسے نقصان پہنچایا' بلکہ آپ کا مقصد لوگوں کو متنبہ کرنا تھا کہ وہ بغداد کی رہائش سے بچیں۔ جب آپ مکہ مکرمہ کا قصد فرماتے تو بغداد میں صرف سولہ روز ٹھہرتے تاکہ قافلہ تیار ہو سکے اور سولہ روز کی مدت کے عوض سولہ دینار خیرات فرماتے تاکہ ایک دینار ان کے ایک روز کے قیام کا کفارہ بن سکے' بزرگوں کے ایک گروہ نے جس میں حضرت عمر ابن عبدالعزیز' کعب الاحبار وغیرہ ہیں عراق کی مذمت کی ہے' حضرت عبداللہ ابن عمرؓ نے اپنے ایک آزاد کردہ غلام سے دریافت کیا کہ تو کہاں رہتا ہے؟ اس نے عرض کیا عراق میں' فرمایا : تو وہاں کیا کرتا ہے' مجھے بتلایا گیا ہے کہ جو لوگ وہاں رہائش پذیر ہیں وہ کسی نہ کسی معصیت میں مبتلا ہوتے ہیں' کعب الاحبار نے ایک مرتبہ عراق کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ شر کے دس حصوں میں سے نو حصے عراق میں ہیں' اور ان میں سے ایک لاعلاج درد ہے۔ ایک بزرگ کا یہ قول بھی نقل کیا گیا ہے کہ خیر کے دس حصے ہیں ان میں سے نو حصے شام میں ہیں' اور ایک حصہ عراق میں۔ ایک بزرگ محدّث فرماتے ہیں کہ ایک روز ہم لوگ حضرت فضیل ابن عیاض کی مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک شخص آیا جس نے عبا پہن رکھی تھی' حضرت فضیل ابن عیاض نے اس کا اعزاز فرمایا اور اسے اپنے قریب جگہ دی' اور دریافت فرمایا کہ تم کہاں رہتے ہو اس نے کہا میں عراق میں سکونت پذیر ہوں' یہ سن کر آپ نے منہ پھیر لیا' اور فرمایا کہ لوگ ہمارے پاس راہبوں کا لباس پہن کر آتے ہیں اور

جب ہم ان سے پوچھتے ہیں کہ وہ کہاں رہتے ہیں تو ان کا جواب یہ ہوتا ہے کہ ظالموں کے آشیانے میں۔ حضرت بشر ابن الحارث فرماتے ہیں کہ بغداد کے عابدوں کی مثال ایسی ہے جیسے پاخانے میں بیٹھ کر "عابد" بنے ہوں' آپ یہ بھی فرماتے تھے کہ یہاں رہنے میں میری اقتدا مت کرو جو باہر جانا چاہے وہ جا سکتا ہے۔ حضرت امام احمد حنبل فرماتے ہیں کہ اگر ان بچوں کا تعلق ہم سے نہ ہوتا تو یہ شہر چھوڑ دیتے' لوگوں نے دریافت کی کہ یہ شہر چھوڑ کر آپ کہاں تشریف لے جاتے' فرمایا غاروں میں' ایک بزرگ سے کسی نے بغداد کے متعلق دریافت کیا فرمایا بغداد کا زاہد بھی پختہ ہے اور بدکار بھی پکا ہے' ان روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر کسی شہر میں معاصی کی کثرت ہو جائے تو وہاں ٹھہرنا ضروری نہیں ہے' بلکہ اس شہر سے ہجرت کر کے کسی اور جگہ قیام کرنے کی گنجائش ہے' اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :۔

اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا۔ (پ۵ ر۱۱ آیت ۹۷)

وہ کہتے ہیں کیا خدا تعالیٰ کی زمین وسیع نہ تھی تم کو جو ترک وطن کر کے اس میں چلا جانا چاہیے تھا۔

اگر اہل و عیال کے باعث ہجرت نہ کر سکے تو بادل ناخواستہ رہے' اور اس شہر میں رہ کر قلبی سکون محسوس نہ کرے' اور دل بردا شتگی کے ساتھ یہ دعا کرتا ہے :۔

رَبَّنَا اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا۔ (پ۵ ر۷ آیت ۷۵)

اے ہمارے پروردگار ہم کو اس بستی سے باہر نکال جس کے رہنے والے سخت ظالم ہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ جب ظلم عام ہوتا ہے تو مصیبتیں نازل ہوتی ہیں اور تمام رہنے والوں کو تباہ و برباد کر دیتی ہیں' اور وہ لوگ بھی زنغے میں آجاتے ہیں جو بے قصور ہوتے ہیں' اور جن کا شمار اللہ تعالیٰ کے اطاعت گذار بندوں میں ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :۔ وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَاصَّةً۔ (پ۹ ر۱۷ آیت ۲۵)

اور تم ایسے وبال سے بچو کہ جو خاص انہی لوگوں پر واقع نہ ہو گا جو تم میں ان گناہوں کے مرتکب ہوتے ہیں۔

بہرحال نقص دین کے اسباب میں رضائے مطلق مقصود نہیں ہے' بلکہ صرف اس اعتبار سے رضا مقصود ہے کہ ان کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہے۔

کونسا شخص افضل ہے اہل علم کا ان تین شخصوں کی فضیلت کے سلسلے میں اختلاف ہے' جو تین مختلف مقامات پر فائز ہوں' ایک وہ شخص جو دیدار الٰہی کے لئے موت کا اشتیاق رکھتا ہو' اور دوسرا شخص وہ جو اپنے آقا کی خدمت و اطاعت کے لئے زندگی کو محبوب سمجھتا ہو' اور تیسرا وہ شخص جو یہ کہتا ہو کہ میری اپنی پسند کچھ نہیں' ہے میں وہ پسند کرتا ہوں جو اللہ تعالیٰ میرے لئے پسند کرتا ہے' اور میں اس امر پر راضی ہوں جس پر اللہ تعالیٰ راضی ہے' یہ سوال بعض اہل معرفت کے سامنے رکھا گیا' انہوں نے فرمایا صاحب رضا افضل ہے' کیوں کہ وہ ان میں سب سے کم فضولیات میں مبتلا ہے' ایک دن وہیب ابن الورد' سفیان ثوری' اور یوسف ابن اسباط کا اجتماع ہوا' حضرت سفیان ثوری نے فرمایا کہ میں آج سے پہلے موت کو برا جانتا تھا' لیکن اب میں مرجانا چاہتا ہوں' یوسف ابن اسباط نے اس اچانک خواہش کی وجہ دریافت کی' فرمایا میں فتنے سے ڈرتا ہوں' یوسف نے کہا میں تو طول بقا کو برا نہیں سمجھتا حضرت سفیان نے پوچھا کیوں؟ فرمایا تاکہ مجھے کسی دن عمل صالح اور حسن توبہ کی توفیق ہو سکے۔ وہیب ابن الورد سے پوچھا گیا آپ کیا کہتے ہیں فرمایا میں کچھ نہیں چاہتا' میرے نزدیک محبوب تر بات وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کو محبوب ہے' حضرت سفیان ثوری نے ان کی دونوں آنکھوں کے درمیان بوسہ دیا اور فرمایا رب کعبہ کی قسم یہی روحانیت ہے۔

محبین خدا کی حکایات' اقوال اور مکاشفات

کسی عارف سے پوچھا گیا کہ آپ محب ہیں' انہوں نے جواب دیا نہیں میں محب نہیں ہوں' بلکہ محبوب ہوں' محب تو متعوب

ہوتا ہے' انہی بزرگ سے کسی نے عرض کیا کہ آپ سات میں سے ایک ہیں' انہوں نے فرمایا میں سات میں سے ایک نہیں ہوں بلکہ سات کا مجموعہ ہوں' یہ بھی فرمایا کرتے تھے اگر تم نے مجھے دیکھ لیا تو سمجھ لو کہ چالیس ابدال کو دیکھ لیا' لوگوں نے عرض کیا یہ کیسے ممکن ہے؟ آپ فرد واحد ہیں' آپ کو دیکھنا چالیس افراد کے دیکھنے کے برابر کیسے ہو سکتا ہے؟ انہوں نے جواب دیا اس لئے کہ میں نے چالیس ابدال کی زیارت کی ہے اور ہر شخص سے اس کا ایک مخصوص علق اور خاص تعلیم حاصل کی ہے' ان سے پوچھا گیا کہ ہمیں بتلایا گیا ہے کہ آپ حضرت خضر علیہ السلام کی زیارت سے مشرف ہوئے ہیں' یہ سن کر آپ مسکرائے اور فرمایا خضر کو دیکھنے پر حیرت کیسی' حیرت اس شخص پر ہونی چاہیے خضر جس کی زیارت کی تمنا کرتے ہوں' اور وہ ان سے اوجھل رہتا ہو' حضرت خضر علیہ السلام سے نقل کیا گیا ہے فرماتے ہیں کہ جس دن بھی میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اب روئے زمین پر اللہ کا کوئی ولی ایسا نہیں رہا جسے میں نہ جانتا ہوں اسی دن میری ملاقات کسی ایسے ولی سے ہوئی ہے جسے میں نہیں جانتا تھا۔ حضرت بایزید بسطامی سے عرض کیا گیا کہ آپ کو اللہ تعالیٰ کا مشاہدہ ہوتا ہے' آپ ہمیں اس کے متعلق کچھ بتلائیں' یہ سن کر وہ چیخ پڑے' کم بختو! تمہارے لئے مناسب نہیں ہے کہ ان مشاہدات کا علم حاصل کرو' لوگوں نے عرض کیا اچھا آپ ہمیں اللہ کے سلسلے میں اپنے سخت ترین مجاہدہ نفس سے باخبر کریں' فرمایا یہ بھی جائز نہیں ہے' لوگوں نے کہا تب آپ ہمیں اپنی ابتدائی ریاضت ہی کے متعلق کچھ بتلائیں' فرمایا ہاں یہ بتلاتا ہوں' پہلے میں نے اپنے نفس کو اللہ تعالیٰ کی طرف بلایا' اور اس پر زبردستی کی' اور اپنے آپ کو یہاں تک مجبور کیا کہ میں ایک سال تک پانی نہیں پیوں گا' اور نہ ایک برس تک سوؤں گا' میرے نفس نے اس عہد کی پابندی کی۔

یحییٰ ابن معاذؒ سے مروی ہے کہ انہوں نے بایزید بسطامی کو عشاء کی نماز کے بعد سے فجر تک اپنے بعض مشاہدات کے دوران اس حال میں دیکھا ہے کہ وہ پنجوں کے بل بیٹھے ہوئے ہیں' ایڑیاں زمین سے اٹھی ہوئی ہیں' ٹھوڑی سینے پر ہے' آنکھیں مسلسل کھلی ہوئی ہیں' اس کے بعد انہوں نے صبح کے وقت سجدہ کیا' اور دیر تک سجدے میں پڑے رہے' پھر سجدے سے اٹھے اور یہ دعا کی:

اے اللہ بعض لوگوں نے تجھ سے پانی پر چلنے اور ہوا میں اڑنے کی طاقت مانگی' تو نے انہیں یہ طاقت بخشی' وہ اسے پاکر خوش ہوئے' میں اس طرح کی خواہشات سے تیری پناہ چاہتا ہوں' بعض لوگوں نے یہ چاہا کہ وہ زمین کو لپیٹ کر رکھ دیں' تو نے انہیں اس قوت سے نوازا' وہ اس سے خوش ہوئے' میں اس خواہش سے تیری پناہ کا خواستگار ہوں' بعض لوگوں نے تجھ سے زمین کے خزانوں کا مطالبہ کیا' تو نے ان کا مطالبہ پورا فرمایا' اور انہیں زمین کے خزانے عطا کئے' میں ان خزانوں سے تیری پناہ مانگتا ہوں' راوی کہتے ہیں انہوں نے اولیاء اللہ کی تقریباً بیس کرامات شمار کرائیں' پھر اپنا رخ پھیرا' اور مجھے دیکھ کر فرمایا اے یحییٰ! میں نے عرض کیا' فرمایئے جناب والا' فرمایا تم یہاں کب سے ہو' میں نے عرض کیا کچھ عرصے سے' آپ یہ سن کر خاموش ہو گئے' میں نے عرض کیا محترم! آپ اس سلسلے میں کچھ بیان فرمائیں' فرمایا میں تمہیں اسی قدر بتلاؤں گا جس قدر تمہارے لئے مفید ہو گا' اللہ تعالیٰ نے مجھے فلک اسفل میں داخل کیا' پھر اسفل ملکوت میں پھرایا' اور مجھے زمینوں اور تحت الثریٰ کی سیر کرائی' پھر فلک اعلا میں داخل کیا' اور مجھے آسمانوں کی سیر کرائی' اور جنتوں سے عرش تک جو کچھ آسمانوں میں موجود ہے' مجھے اس کی زیارت کرائی' اس کے بعد مجھے اپنے سامنے کھڑا کیا' اور فرمایا جو نعمتیں تم نے دیکھی ہیں ان میں سے جو نعمت چاہو مانگ سکتے ہو' میں تمہیں عطا کروں گا' میں نے عرض کیا: پروردگار عالم! میں نے ایسی کوئی چیز نہیں دیکھی جسے اچھا سمجھ کر میں تجھ سے مانگوں' اللہ تعالیٰ نے فرمایا تو میرا سچا بندہ ہے' تو صرف میری رضا کے لئے عبادت کرتا ہے' میں تیرے ساتھ ایسا ایسا معاملہ کروں گا' یحییٰ ابن معاذؒ کہتے ہیں مجھے یہ سن کر شدید وحشت ہوئی' اور دل بے چین ہو گیا' چنانچہ میں نے اپنی وحشت دور کرنے کے لئے عرض کیا کہ آپ نے معرفت الٰہی کا سوال کیوں نہ کر لیا' آپ کو تو ملک الملوک نے سوال کا حکم دیا تھا' آپ کو اس کا حکم مانتے ہوئے کچھ نہ کچھ ضرور مانگنا چاہیے تھا' حضرت بایزید بسطامی یہ سن کر مجھ پر سخت برہم ہوئے اور ڈانٹنے کے انداز میں فرمایا' خاموش رہ' مجھے اپنے نفس پر اللہ تعالیٰ سے غیرت آئی کہ اسے اس کے سوا بھی کوئی پہچانے' مجھے یہ بات اچھی نہیں لگتی کہ کسی دوسرے کو بھی اس کی معرفت ہو۔

روایت ہے کہ ابو تراب نخشبی اپنے کسی مرید پر بہت زیادہ ناز کرتے تھے' اسے اپنے قریب بٹھلاتے تھے' اس سے محبت کرتے

تھے' اور اس کی خدمت کرتے تھے اور وہ عبادت میں مشغول رہتا تھا' ایک دن ابو تراب نے ان سے فرمایا کہ بایزید بسطامی کی خدمت میں حاضری دیا کر' اس نے کہا کہ مجھے ان کی ضرورت نہیں ہے' جب ابو تراب نے بہت زیادہ اصرار کیا اور کہا کہ کاش تو بایزید بسطامی سے تعلق پیدا کرتا' یہ سن کر وہ مرید جوش میں آگیا' اور کہنے لگا کہ میں ابو یزید کا کیا کروں گا' میں نے اللہ تعالیٰ کو دیکھا کہ اس نے مجھے بایزید بسطامی سے بے نیاز کر دیا ہے' ابو تراب فرماتے ہیں کہ اس کی اس بات سے میری طبیعت مکدر ہو گئی' میں اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا' اور کہنے لگا کہ کیا تو اللہ تعالیٰ کو دیکھنے پر مغرور ہو گیا ہے' اگر تو بایزید کو ایک بار دیکھے گا تو یہ اللہ تعالیٰ کو ستر بار دیکھنے کے مقابلے میں تیرے لئے زیادہ مفید ہے۔ یہ سن کر وہ مرید حیران رہ گیا' اور کہنے لگا یہ کیسے ممکن ہے' ابو تراب نے کہا کم بخت تجھے معلوم نہیں کہ جب تو اللہ تعالیٰ کو اپنے پاس دیکھتا ہے تو وہ تیری مقدار کے مطابق ظاہر کرتا ہے' اور جب بایزید بسطامی کے پاس ظہور کرتا ہے تو اس کی مقدار کے مطابق کرتا ہے' میری یہ بات اس کی سمجھ میں آگئی' اور کہنے لگا کہ مجھے ان کے پاس لے کر چلئے' یہ پورا واقعہ نقل کرنے کے بعد ابو تراب نے فرمایا کہ ہم ایک ٹیلے پر جاکر کھڑے ہو گئے' اور یہ انتظار کرنے لگے کہ ابو یزید بسطامی اپنے ٹھکانے سے باہر تشریف لائیں' آپ کا قیام ایک ایسے مقام پر تھا جہاں درندوں کی کثرت تھی' اسی دوران موصوف اپنی پوستین کمر پر ڈالے ہوئے گذرے' میں نے نوجوان سے کہا یہ ابو یزید ہیں ان کی زیارت کر لو' نوجوان نے دیکھا' اور چیخ مار کر گر پڑا' ہم نے اسے حرکت دینا چاہا تو معلوم ہوا کہ وہ مر چکا ہے' ابو یزید بسطامی نے اس کی تدفین میں ہمارے ساتھ تعاون کیا' میں نے حضرت سے عرض کیا محترم! آپ کے دیدار نے اسے ہلاک کر ڈالا۔ موصوف نے فرمایا نہیں بلکہ تمہارا دوست سچا تھا' اس کے دل میں ایک راز پنہاں تھا جس پر وہ مطلع نہیں ہو سکا تھا' جب اس نے ہمیں دیکھا تو وہ راز اس پر آشکار ہو گیا' اور اس کا بوجھ برداشت نہ کر سکا کیوں کہ ابھی اس کی ارادت ضعیف تھی۔

جب زنگی لشکر بصرے میں داخل ہوا' اور اس نے وہاں تباہی و بربادی پھیلا دی' قتل و غارت گری کی تو حضرت سہیل تستری کے کچھ مریدان کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ آپ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ یہ لوگ اس شہر سے دفع ہو جائیں' آپ یہ سن کر کچھ دیر خاموش رہے' اس کے بعد فرمایا کہ اس شہر میں اللہ تعالیٰ کے کچھ بندے ایسے ہیں کہ اگر وہ ظالموں کے لئے بد دعا کر دیں تو اللہ تعالیٰ ایک ہی رات میں ان کا خاتمہ کر دے' اور کوئی ظالم زندہ نہ بچے' مگر وہ بد دعا نہیں کرتے' لوگوں نے پوچھا کیوں؟ فرمایا جو چیز اللہ تعالیٰ کو اچھی معلوم نہیں ہوتی وہ انہیں بھی اچھی نہیں لگتی' اس کے بعد انہوں نے قبولیت دعا سے متعلق چند باتیں بیان فرمائی جن کے ذکر کی یہاں گنجائش نہیں ہے' یہاں تک کہ آپ نے فرمایا اگر یہ لوگ اللہ تعالیٰ سے قیامت برپا نہ ہونے کی دعا مانگیں تو ان کی یہ دعا بھی قبولیت سے سرفراز ہو۔

یہ حقائق ہیں' ان کا انکار نہیں کیا جا سکتا' جس شخص کو ان امور سے کچھ بہرہ نہ ہو اس کو کم از کم ان کی تصدیق اور ایمان سے خالی نہ ہونا چاہیے' یعنی ان کے امکان کی تصدیق ضرور کرے' اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت وسیع' فضل عام' اور ملک و ملکوت کے عجائب بے شمار ہیں' اس کی مقدورات کی کوئی انتہا نہیں ہے اور برگزیدہ بندوں پر اس کا فضل و احسان بے پایاں ہے' اسی لئے حضرت ابو یزید فرمایا کرتے تھے کہ اگر تجھے حضرت موسیٰؑ کی مناجات' حضرت عیسیٰؑ کی روحانیت اور حضرت ابراہیمؑ کی دوستی عطا کر دی جائے تب بھی تو ان سے زائد کی دعا کر سکتا ہے' اس لئے کہ اس کے پاس ان درجات سے بھی بڑھ کر درجات ہیں' اگر تو کسی درجے پر پہنچ کر ٹھہر گیا تو باقی درجات خود بخود تجھ سے محجوب ہو جائیں گے' لیکن یہ حجاب ان لوگوں کے لئے ہے جو ان بزرگوں کا سا حال رکھتے ہیں اس لئے کہ یہ عظیم درجات ہیں' ایک صاحب معرفت کہتے ہیں کہ مجھے کشف کے ذریعہ ایسا معلوم ہوا جیسے چالیس حوریں ہوا میں اڑ رہی ہوں' ان کے بدن پر سونے چاندی کے لباس اور زیورات ہیں جن سے جھنکار کی آوازیں آرہی ہیں' میں نے ایک نظر ان پر ڈالی تو مجھے چالیس روز تک اس کی سزا دی گئی' اس کے بعد مجھے ایسی حوریں نظر آئیں' جو سابقہ حوروں سے زیادہ حسین و جمیل تھیں' اور مجھ سے کہا گیا کہ ان کی طرف دیکھو' میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں' اور سر بسجود ہو کر عرض کیا اے اللہ! میں تیرے غیر سے تیری پناہ چاہتا ہوں' مجھے ان کی ضرورت نہیں ہے' میں اسی طرح آہ و زاری کرتا رہا' اور گڑگڑاتا رہا یہاں تک کہ

اللہ تعالٰی نے انہیں مجھ سے دور کر دیا۔ مومن کو ان مکاشفات کا انکار نہ کرنا چاہیے' اور نہ یہ سمجھنا چاہیے کہ اگر مجھ پر یہ امور منکشف نہیں ہوتے تو ان کا کوئی وجود ہی نہیں ہے' اگر صورت یہ بن جائے کہ ہر شخص اسی امر کا یقین کرے جو اس پر منکشف ہو تو ایمان کی راہ تنگ ہو کر رہ جائے' یہ حقائق ہر کس و ناکس پر منکشف نہیں ہوتے' بلکہ اللہ کے مخصوص بندوں پر منکشف ہوتے ہیں' اور ان پر بھی پہلے مرحلے میں نہیں ہوتے بلکہ اس وقت تک منکشف نہیں ہوتے جب تک کہ وہ دشوار ترین گھاٹیاں عبور نہ کرلیں' اور بہت سے مقامات سے نہ گذر جائیں' ان مقامات سے بالکل ابتدائی اور ادنیٰ مقام یہ ہے کہ بندہ مخلص ہو' نفسانی حظوظ اور مخلوق کے ساتھ تمام ظاہری و باطنی علائق سے منقطع ہو' اس کے بعد یہ ضروری ہے کہ وہ ان امور کو لوگوں سے مخفی رکھے' اور گمنامی کی زندگی پسند کرے' یہ راہ سلوک کا پہلا پڑاؤ ہے' بلکہ نقطۂ آغاز ہے' اور بہت سے بڑے بڑے پرہیزگار اور متقی بھی اس سے دور نظر آتے ہیں' جب بندہ کا دل مخلوق کی طرف التفات کی کدورتوں سے خالی ہو جاتا ہے تو اس پر نور یقین کا آفتاب طلوع ہو جاتا ہے اور حق کے مبادی منکشف ہوتے ہیں' تجربے اور راستے پر چلے بغیر ان امور کا انکار کرنا ایسا ہے جیسے کوئی شخص زنگ آلود لوہے میں اپنی صورت نہ دیکھ کر یہ کہنے لگے کہ اگر اسے مجلّٰی کردیا جائے' اور زنگ دور کردیا جائے تب بھی اس میں صورت نظر نہیں آسکتی' کیوں کہ اس کے ہاتھ میں ایک سیاہ ٹکڑا ہے جس پر تہ بہ تہ زنگ چڑھا ہوا ہے' اور اس میں فی الحال کوئی عکس نظر نہیں آتا' ظاہر ہے یہ انکار نہایت درجے کا جہل اور قبیح درجے کی گمراہی ہے' یہی حال ان تمام لوگوں کا ہے' جو اولیاء اللہ کی کرامات کا انکار کرتے ہیں' وہ بچارے مشاہدے سے عاجز ہیں' جیسے یہ شخص زنگ آلود آئینے میں اپنا چہرہ دیکھنے سے عاجز ہے' اللہ تعالیٰ کی قدرت کے انکار کی یہ بدترین بنیاد ہے' مکاشفات کی خوشبو تو وہ شخص بھی سونگھ لیتا ہے جو راستے کے مبادی میں چند قدم اٹھاتا ہے' چنانچہ کسی شخص نے حضرت بشر ابن الحارث سے پوچھا کہ اس مرتبے تک آپ کی رسائی کس طرح ہوئی' آپ نے فرمایا میں اللہ تعالیٰ سے اپنا حال مخفی رکھنے کی درخواست کیا کرتا تھا' روایت ہے کہ آپ نے حضرت خضر علیہ السلام کو دیکھا اور ان سے عرض کیا کہ آپ میرے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائیں' انہوں نے کہا اللہ تمہارے لئے اپنی اطاعت کی راہ آسان کرے' میں نے عرض کیا مزید دعا کریں' فرمایا اللہ تعالیٰ تیری پردہ پوشی کرے' کہا گیا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ تجھے مخلوق سے پوشیدہ رکھے' اور بعض یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو تجھ سے دور رکھے' یہاں تک کہ تو کسی کی طرف التفات نہ کرپائے' ایک بزرگ سے منقول ہے کہ انہیں حضرت خضر علیہ السلام کی زیارت کا بڑا اشتیاق تھا' ایک روز انہوں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی انہیں حضرت خضر علیہ السلام مل جائیں تاکہ وہ ان سے کوئی اہم بات سیکھ سکیں' چنانچہ ان کی دعا قبول ہوئی' ملاقات کے موقع پر انہوں نے حضرت خضر علیہ السلام سے عرض کیا اے ابو العباس! آپ مجھے ایسا ورد بتلا دیں کہ جب میں اسے پڑھوں تو لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاؤں' انہوں نے مجھے اس دعا کی تلقین فرمائی:-

اَللّٰهُمَّ اَسْبِلْ عَلَيَّ كَثِيْفَ سَتْرِكَ وَحُطَّ عَلَيَّ سُرَادِقَاتِ حُجُبِكَ وَاجْعَلْنِيْ فِيْ مَكْنُوْنِ غَيْبِكَ وَاحْجُبْنِيْ عَنْ قُلُوْبِ خَلْقِكَ

اے اللہ مجھ پر اپنا گہرا پردہ ڈال' اور میرے اوپر اپنے حجابات کے شامیانے تان' اور مجھے اپنے غیب میں پوشیدہ کر' اور مجھے اپنی مخلوق کے دلوں سے محجوب کر۔

اس کے بعد آپ غائب ہو گئے' پھر میں نے کبھی آپ کو نہیں دیکھا' اور نہ کبھی دل میں دیکھنے کا اشتیاق پیدا ہوا' تاہم میں نے اس ورد کا التزام رکھا جس کی انہوں نے تلقین فرمائی تھی' اس دعا کی مجھ پر یہ تاثیر ہوئی کہ زمانے بھر میں ذلیل و خوار ہوا' یہاں تک کہ بعض ذمّی بھی میرا مذاق اڑانے سے نہیں چوکتے تھے' اور زبردستی مجھے اپنا مزدور بنا دیتے تھے' بچے الگ میرا مذاق اڑاتے' لیکن مجھے اسی ذلت و رسوائی میں' اور گمنامی کی زندگی میں سکون ملتا تھا۔

اولیاء اللہ کے احوال کا کچھ اور ذکر یہ تھا اولیاء اللہ کا حال' اور ایسے ہی لوگوں میں اللہ تعالیٰ کے محبوب بندوں کی جستجو

ہونی چاہیے، فریب خوردہ لوگ انہیں پیوند زدہ بوسیدہ گدڑیوں اور عباؤں میں ڈھونڈتے پھرتے ہیں، اور انہیں اللہ کا دوست گردانتے ہیں جو علم و ورع میں معروف ہوں، اور جاہ و ریاست میں بلند مرتبہ رکھتے ہوں، حالانکہ اولیاء پر اللہ تعالیٰ کی غیرت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ انہیں لوگوں سے مخفی رکھے، چنانچہ ایک حدیث قدسی میں وارد ہے کہ میرے اولیاء میری قبا کے نیچے ہیں، انہیں میرے علاوہ کوئی نہیں جانتا، سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

رُبَّ اَشْعَثَ اَغْبَرَ ذِی طِمْرَیْنِ لَا یُؤْبَهُ لَهٗ لَوْ اَقْسَمَ عَلَى اللّٰهِ لَاَبَرَّهٗ (مسلم۔ ابوہریرہؓ)

بہت سے پراگندہ بال، غبار آلود، اور دو چادروں والے ایسے ہیں جو ذرا قابل توجہ نہیں ہوتے، لیکن اگر وہ اللہ تعالیٰ کو قسم دیں تو اللہ تعالیٰ ان کی قسم ضروری پوری کرے۔

ان معانی کی خوشبوؤں سے وہ محروم رہتے ہیں جو متکبر ہوں، خود پسند ہوں، اپنے علم و عمل پر نازاں اور مفتخر ہوں، اور وہ لوگ ان خوشبوؤں سے زیادہ قریب ہوتے ہیں جو منکسر ہوں۔ اپنے نفوس کی ذلت سے آشنا ہوں، اور خود کو اس قدر ذلیل تصور کرتے ہوں کہ اگر ذلیل و رسوا کئے جائیں تو انہیں ذلت و رسوائی کا احساس نہ ہو جیسے وہ غلام کوئی ذلت محسوس نہیں کرتا جس سے اس کا آقا بلند مقام پر بیٹھا ہوا ہو، جب بندے کا یہ حال ہو جاتا ہے کہ وہ ذلت کو ذلت نہیں سمجھتا، اور اس کے دل میں ذلت کی طرف کوئی التفات باقی نہیں رہتا، بلکہ اس کے نزدیک اس کا مرتبہ تمام ذلتوں سے بھی کم تر ہو، حتی کہ تواضع اور انکساری اس کی طبیعت ثانیہ اور مزاج کی خصوصیت بن جائے تو یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ ان خوشبوؤں کے مبادی سے آشنا ہوسکے گا، اگر ہمارے پاس ایسا دل نہ ہو، اور ہم اس روح سے محروم ہوں تو یہ مناسب نہیں ہے کہ ہم ان لوگوں کو بھی ان کرامات کا اہل سمجھیں جو ان کے مستحق ہیں، اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کا ولی نہیں ہو سکتا تو کیا وہ اللہ کے ولی کو دوست بھی نہیں بنا سکتا۔ اگر ہم اولیاء اللہ نہیں بن سکے تو ہمیں اولیاء اللہ سے محبت کرنے والا ضرور بننا چاہیے تاکہ اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ کی رو سے ہمارا حشر انہیں لوگوں کے ساتھ ہو، کچھ پانے کے لئے کچھ کھونا پڑتا ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک مرتبہ اپنی قوم بنی اسرائیل سے پوچھا کہ کھیتی کہاں ہوتی ہے لوگوں نے عرض کیا زمین میں، فرمایا کہ میں تم سے سچ کہتا ہوں حکمت بھی انہی دلوں میں پیدا ہوتی ہے جو زمین جیسے ہو جائیں اللہ تعالیٰ کی ولایت کے طالب شرائط ولایت کی تلاش میں اس طرح سرگرداں رہے کہ انہوں نے اپنے نفسوں کو ذلت و خست کی انتہا پر پہنچا دیا، چنانچہ حضرت جنید بغدادی کے استاد ابن الکرینی کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ ایک مرتبہ کسی شخص نے انہیں اپنے گھر پر مدعو کیا، جب وہ اس شخص کے دروازے پر پہنچے تو اس نے انہیں بھگا دیا آپ تھوڑی ہی دور چلے تھے کہ اس نے پھر بلایا جب وہ قریب آئے تو پھر دھتکار دیا، اس نے تین بار یہی عمل کیا، چوتھی مرتبہ آپ کو اپنے گھر میں لے گیا اور عرض کیا کہ میں نے آپ کی تواضع کا امتحان لینے کے لئے یہ حرکت کی تھی، انہوں نے فرمایا تیس برس تک میرے نفس نے ذلت پر راضی رہنے کی ریاضت کی ہے، یہاں تک کہ اب میں ایک پالتو کتے کی طرح ہو گیا ہوں جسے دھتکارا جائے تو بھاگ جائے، اور ہڈی ڈال دی جائے تو واپس آجائے، اگر تم مجھے پچاس مرتبہ دھتکار کر بھی بلاتے تو میں آتا۔ انہی بزرگ نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ ایک مرتبہ میں نے ایک محلے میں سکونت اختیار کی، وہاں لوگ نیکی، اور فضل و کمال میں میرا نام لینے لگے، میرا دل اس صورت حال سے سخت مضطرب اور بے چین ہوا، چنانچہ میں نے اپنے نیک نامی کا "داغ" دھونے کے لئے یہ تدبیر کی کہ ایک حمام میں گیا، اور وہاں رکھا ہوا ایک خوب صورت لباس پہنا، اس پر اپنی بوسیدہ گدڑی ڈال کر باہر نکلا، لوگوں نے میری گدڑی کے نیچے قیمتی لباس کی جھلک دیکھی تو مجھے پکڑ لیا، میرا لباس اتارا اور مجھے اس قدر مارا کہ بے حال کر دیا تب جا کر میرے دل کو قرار آیا۔

غور کیجئے یہ لوگ اپنے نفسوں کے ساتھ کس طرح کی ریاضتیں کیا کرتے تھے، اور کتنی مشقت اٹھاتے تھے، ان کا مقصد یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ انہیں مخلوق کی طرف دیکھنے سے محفوظ رکھے، اور خود اپنی طرف دیکھنے سے بھی بچائے، اس لئے کہ اپنے نفس کی طرف التفات کرنے والا بھی اللہ تعالیٰ سے محجوب ہوتا ہے، اور نفس کے ساتھ اشتغال اس کے لئے حجاب بن جاتا ہے، اللہ تعالیٰ کے

اور دل کے درمیان کوئی حجاب نہیں ہے' بلکہ دلوں کی دوری یہ ہے کہ وہ غیر اللہ کے ساتھ یا اپنے ساتھ مشغول ہوں' اور نفس کے ساتھ اشتغال سب سے بڑا حجاب ہے۔ روایت ہے کہ اہل بسطام میں سے ایک خوبصورت اور مالدار شخص بایزید بسطامی کی مجلس میں حاضرباش تھا' وہ کبھی ان کی مجلس سے جدا نہیں ہوتا تھا' ایک دن اس شخص نے بایزید کی خدمت میں عرض کیا کہ میں تیس برس سے مسلسل روزے رکھ رہا ہوں' کبھی افطار نہیں کرتا' رات بھر نوافل پڑھتا ہوں' کبھی سوتا نہیں ہوں مگر میرے دل میں اس علم کی معمولی سی خوشبو بھی اثر انداز نہیں ہوتی جو آپ بیان کرتے ہیں' حالانکہ میں آپ کے بیان کردہ علم کی تصدیق کرتا ہوں' اور اس سے محبت کرتا ہوں' بایزیدؒ نے فرمایا اگر تم تین سو برس تک دن میں روزے رکھتے رہے' اور رات کو نوافل پڑھتے رہے تو تمہیں اس علم کا ایک ذرہ بھی حاصل نہ ہو سکے گا۔ اس شخص نے عرض کیا کیوں! آپ نے فرمایا اس لئے کہ تم اپنے نفس کی وجہ سے محجوب ہو' اس نے عرض کیا کہ اس کا کوئی علاج بھی ہے' فرمایا ہاں: عرض کیا مجھے بتلایئے تاکہ میں اس پر عمل کر سکوں' فرمایا اس علاج پر تم عمل نہ کر سکو گے' اس نے عرض کیا آپ بتلائیں میں ضرور عمل کروں گا فرمایا اسی وقت حجام کے پاس جاؤ' اپنا سر اور داڑھی منڈاؤ' یہ لباس اتار کر گدڑی پہنو' اور اپنے گلے میں اخروٹ سے لبریز جھولی لٹکا کر بچوں سے کہو کہ وہ تمہیں ایک تھپڑ لگائیں' اور اس کے عوض ایک اخروٹ حاصل کرلیں' اپنا یہ حلیہ بنا کر بازاروں میں جاؤ' جہاں لوگوں کا اژدحام ہو وہاں پہنچو' خاص طور پر ان لوگوں کے پاس ضرور جاؤ جو تمہارے شناسا ہوں' اس نے کہا سبحان اللہ! آپ مجھ سے ایسا کہتے ہیں' فرمایا اس موقع پر تمہارا سبحان اللہ کہنا شرک ہے' اس نے سوال کیا: کیسے؟ فرمایا: تم نے اپنے نفس کو عظیم تصور کر کے سبحان اللہ کہا ہے' اللہ تعالیٰ کی عظمت کے اظہار کے لئے سبحان اللہ نہیں کہا ہے' اس نے عرض کیا یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا' آپ کوئی اور عمل بتلائیں' فرمایا تمام تدبیروں سے پہلے اسی تدبیر پر عمل کرنا ہوگا' اس شخص نے کہا میں ایسا نہیں کر سکتا' فرمایا میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ جو علاج میں بتلاؤں گا وہ تم قبول نہیں کرپاؤ گے۔ حضرت بایزید بسطامی نے یہ علاج اس شخص کے لئے تجویز کیا ہے جو صرف اپنے نفس کی طرف التفات رکھتا ہو' اور یہ چاہتا ہو کہ لوگ اس کی طرف ملتفت ہوں' اس بیماری کا علاج اس کے علاوہ ممکن نہیں جو حضرت بایزید نے تجویز کیا ہے' جو شخص اس علاج کی طاقت نہیں رکھتا اس کے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ ان لوگوں پر نکیر کرے جو اس مرض میں مبتلا نہیں ہوئے یا ہوئے تو انہوں نے اس تدبیر سے اپنا مرض دور کیا جو ابو یزید بسطامی نے بتلائی ہے' یا یہ ہے کہ اس مرض سے شفا پانا ممکن نہیں ہے' صحت کا کم سے کم درجہ یہ ہے کہ اس کے امکان پر ایمان رکھتا ہو' جو شخص اس درجے سے بھی محروم ہے اس کے لیے خرابی ہی خرابی ہے شریعت میں یہ امور بالکل واضح طور پر بیان کیے گئے ہیں لیکن ان لوگوں پر مخفی رہ جاتے ہیں جو اپنے آپ کو علمائے شریعت کے زمرے میں سمجھتے ہیں۔

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:۔

لَا يَسْتَكْمِلُ الْعَبْدُ الْإِيمَانَ حَتّٰى تَكُوْنَ قِلَّةُ الشَّيْءِ اَحَبَّ اِلَيْهِ مِنْ كَثْرَتِهِ وَحَتّٰى يَكُوْنَ اَنْ لَا يُعْرَفَ اَحَبَّ اِلَيْهِ مِنْ اَنْ يُعْرَفَ (مسند الفردوس۔ علی ابن ابی طالبؓ)

بندہ کا ایمان اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک کہ کم چیز زیادہ سے محبوب نہ ہو' اور جب تک کہ عدم شہرت شہرت سے زیادہ محبوب نہ ہو۔

ثَلَاثٌ مَنْ كُنَّ فِيْهِ اِسْتَكْمَلَ اِيْمَانَهُ لَا يَخَافُ فِي اللّٰهِ لَوْمَةَ لَائِمٍ وَلَا يُرَائِي بِشَيْءٍ مِنْ عَمَلِهِ وَاِذَا عُرِضَ عَلَيْهِ اَمْرَانِ اَحَدُهُمَا لِلدُّنْيَا وَالْاٰخَرُ لِلْاٰخِرَةِ اٰثَرَ اَمْرَ الْاٰخِرَةِ عَلَى الدُّنْيَا۔ (مسند الفردوس۔ ابو ہریرہؓ)

جس شخص میں تین باتیں ہوتی ہیں اس کا ایمان مکمل ہوتا ہے ایک تو یہ کہ وہ اللہ کے معاملے میں کسی ملامت گر کی ملامت کا خوف نہ کرے' دوسرے یہ کہ اپنے کسی عمل سے ریاکاری نہ کرے' اور جب اس پر دو ایسے امر پیش کیے جائیں جن میں سے ایک دنیا کے لئے ہو اور دوسرا آخرت کے لئے تو وہ آخرت کے معاملے

کو دنیا پر ترجیح دے۔

لَا یَکْمُلُ اِیْمَانُ الْعَبْدِ حَتّٰی یَکُوْنَ فِیْهِ ثَلٰثُ خِصَالٍ اِذَا غَضِبَ لَمْ یُخْرِجْهُ غَضَبُهُ عَنِ الْحَقِّ وَاِذَا رَضِیَ لَمْ یُدْخِلْهُ رِضَاهُ فِیْ بَاطِلٍ وَاِذَا قَدَرَ لَمْ یَتَنَاوَلْ مَا لَیْسَ لَهُ (طبرانی صغیر)

بندے کا ایمان اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک کہ اس میں تین خصلتیں نہ ہوں ایک تو یہ کہ جب غصہ کرے تو اس کا غصہ اسے حق سے دور نہ کرے' اور جب خوش ہو تو اس کی خوشی اسے باطل میں مبتلا نہ کرے اور جب (کسی چیز پر) قادر ہو تو وہ چیز نہ لے جو اس کی نہیں ہے۔

ثَلٰثٌ مَنْ اُوْتِیَهُنَّ فَقَدْ اُوْتِیَ مِثْلَ مَا اُوْتِیَ آلُ دَاوٗدَ الْعَدْلُ فِی الرِّضٰی وَالْغَضَبِ وَالْقَصْدُ فِی الْغِنٰی وَالْفَقْرِ وَخَشْیَةُ اللّٰهِ فِی السِّرِّ وَالْعَلَانِیَةِ (۱)

جس شخص میں یہ تین باتیں پائی جائیں اسے (گویا) آل داؤد کے برابر عطا ہوا' خوشی و ناخوشی میں اعتدال' غنا اور فقر میں میانہ روی' خلوت و جلوت میں اللہ کا خوف۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایمان کے لئے مذکورہ بالا شرائط بیان فرمائی ہیں' ہمیں اس شخص پر حیرت ہوتی ہے جو علم دین کا دعویٰ کرتا ہو اور اس کے دل میں ان شرائط کا ایک ذرہ بھی نہ پایا جائے پھر اس کے پاس علم و عقل بھی ایسی ہو کہ جو بات ایمان کے بعد بہت سے دشوار گذار مقامات طے کرنے سے حاصل ہوتی ہے اس کا انکار کرتا ہو' روایات میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک نبی پر وحی نازل فرمائی کہ میں اس شخص کو اپنی دوستی کے لئے پسند کرتا ہوں جو میرے نزدیک سستی نہیں کرتا' اور جسے میرے سوا کوئی فکر نہیں ہوتا' اور جو میرے اوپر میری کسی مخلوق کو ترجیح نہیں دیتا' اگر اسے آگ میں جلایا جائے تو آگ کی سوزش محسوس نہ کرے' اور آرے سے چیرا جائے تو اس کی اذیت کا احساس نہ کرے' جس شخص پر محبت کا اس قدر غلبہ نہ ہو تو وہ کرامات اور مکاشفات کے درجے تک کیسے پہنچ سکتا ہے' یہ درجہ کمال محبت کے بعد حاصل ہوتا ہے' اور محبت میں کمال ایمان میں کمال سے پیدا ہوتا ہے' ایمان کے مقامات میں کمی بیشی کا اس قدر تفاوت ہے کہ شمار نہیں ہو سکتا۔ اسی لئے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر الصدیق سے ارشاد فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی قَدْ اَعْطَاکَ مِثْلَ اِیْمَانِ کُلِّ مَنْ اٰمَنَ بِیْ مِنْ اُمَّتِیْ وَاَعْطَانِیْ مِثْلَ اِیْمَانِ کُلِّ مَنْ اٰمَنَ مِنْ وُلْدِ اٰدَمَ (ابو منصور دیلمی۔ علیؓ)

اللہ تعالیٰ نے تمہیں ان تمام لوگوں کے ایمان کے برابر ایمان عطا کیا ہے جو میری امت میں سے ایمان لائے ہیں' اور مجھے ان تمام لوگوں کے ایمان کے برابر ایمان عطا کیا ہے جو حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد میں سے ایمان لائے ہیں۔

ایک حدیث میں مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تین سو اخلاق ہیں جو شخص توحید کے ساتھ ان میں سے ایک خلق لے کر بھی اس سے ملے گا وہ جنت میں داخل ہو گا (طبرانی۔ انسؓ) حضرت ابوبکر نے عرض کیا یا رسول اللہ! میرے پاس بھی ان اخلاق میں سے کچھ ہے' فرمایا: اے ابوبکر! تمہارے اندر یہ تمام اخلاق موجود ہیں' ان میں سے سخاوت اللہ تعالیٰ کو زیادہ محبوب ہے' ایک حدیث میں ہے' سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میں نے خواب میں دیکھا کہ آسمان سے ایک ترازو لٹکائی گئی' اس کے ایک پلڑے میں مجھے رکھا گیا اور ایک پلڑے میں میری امت کو رکھا گیا' یہ پلڑا بھاری ہو گیا (پھر) ایک پلڑے میں ابوبکر کو رکھا گیا اور ایک پلڑے میں میری امت کو رکھا گیا تو ابوبکر کا پلڑا بھاری رہا (احمد۔ ابو امامہؓ) ان تمام باتوں کے باوجود اللہ تعالیٰ کے ساتھ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس طرح کا استغراق تھا کہ اس میں سے کسی دوسرے کے لئے کوئی گنجائش نہیں تھی' آپ نے خود ارشاد فرمایا:

(۱) یہ روایت ان الفاظ میں غریب ہے مشہور روایت کی ابتدا یوں ہوتی ہے ثلاث منجیات۔

لَوْ كُنْتُ مُتَّخِذًا مِنَ النَّاسِ خَلِيْلًا لَاتَّخَذْتُ أَبَابَكْرٍ وَلٰكِنْ صَاحِبُكُمْ خَلِيْلُ اللّٰهِ تَعَالٰى۔ (بخاری و مسلم)

اگر میں لوگوں میں سے کسی کو دوست بناتا تو ابو بکر کو بناتا، لیکن میں تو اللہ تعالیٰ کا دوست ہوں۔

محبت سے متعلق کچھ اور مفید اختتامی گفتگو حضرت سفیان ثوریؒ فرماتے ہیں کہ محبت سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع سنت ہے، بعض لوگوں نے دوام ذکر کو، بعض نے ایثار محبوب کو اور بعض نے دنیا میں بقا کی کراہیت کو محبت قرار دیا ہے، یہ تمام امور محبت کے ثمرات ہیں، اگرچہ انہوں نے نفس محبت کا نام نہیں لیا، مگر اس کے ثمرات کی طرف اشارہ کردیا۔ ایک بزرگ یہ کہتے ہیں کہ محبت محبوب کی وہ بات ہے جو دلوں پر غالب ہو جائے، اور زبان کو اس کے اظہار سے عاجز رکھے، حضرت جنید بغدادیؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے علاقہ رکھنے والے پر محبت حرام فرمائی ہے، یہ بھی فرمایا کہ جس محبت کے پیچھے کوئی غرض ہوتی ہے وہ دیرپا نہیں ہوتی، جب وہ غرض زائل ہو جاتی ہے تو محبت بھی باقی نہیں رہتی، حضرت ذوالنون مصریؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی محبت ظاہر کرنے والے سے کہہ دو کہ کہیں وہ غیر اللہ کے لئے ذلیل نہ ہو جائے، حضرت شبلیؒ سے کسی نے عارف اور محب کے بارے میں پوچھا آپ نے فرمایا عارف بولنے سے ہلاک ہوتا ہے اور محب چپ رہنے سے ہلاک ہوتا ہے۔ حضرت شبلی سے یہ دو شعر بھی منقول ہیں۔

يَا أَيُّهَا السَّيِّدُ الْكَرِيْمُ ... حُبُّكَ بَيْنَ الْحَشَا مُقِيْمُ
يَا رَافِعَ النَّوْمِ عَنْ جُفُوْنِيْ ... أَنْتَ بِمَا مَرَّبِيْ عَلِيْمُ

(اے پروردگار عظیم! تیری محبت میرے دل میں گھر کئے ہوئے ہے، اے میری آنکھ سے نیند اڑانے والے! جو کچھ مجھ پر گذرتا ہے تو اس سے واقف ہے)

ایک اور بزرگ نے اسی مضمون کے چند شعر کہے ہیں۔

عَجِبْتُ لِمَنْ يَقُوْلُ ذَكَرْتُ اِلٰفِيْ ... وَهَلْ اَنْسٰى فَاَذْكُرُ مَا نَسِيْتُ
اَمُوْتُ اِذَا ذَكَرْتُكَ ثُمَّ اَحْيَا ... وَلَوْلَا حُسْنُ ظَنِّيْ مَا حَيِيْتُ
فَاَحْيَا بِالْمُنٰى وَاَمُوْتُ شَوْقًا ... فَكَمْ اَحْيَا عَلَيْكَ وَكَمْ اَمُوْتُ
شَرِبْتُ الْحُبَّ كَاْسًا بَعْدَ كَاْسٍ ... فَمَا نَفِدَ الشَّرَابُ وَمَا رَوِيْتُ
فَلَيْتَ خَيَالَهُ نَصْبُ لِعَيْنِيْ ... فَاِنْ قَصَّرْتُ فِيْ نَظَرِيْ عَمِيْتُ

(مجھے اس شخص پر حیرت ہوتی ہے جو یہ کہے کہ مجھے محبوب یاد آیا، کیا میں اسے بھول گیا ہوں کہ یاد کروں، میں اس کی یاد میں مرتا ہوں پھر جیتا ہوں، اگر میرا حسن ظن نہ ہوتا تو میں زندہ نہ رہتا، میں آرزوؤں میں جیتا ہوں، اور شوق میں مرتا ہوں، میں بار بار تجھ پر مرتا ہوں، اور بار بار تیرے لئے جیتا ہوں، میں نے محبت کے گلاس پہ گلاس پئے ہیں، لیکن نہ شراب ختم ہوئی اور نہ میں سیراب ہوا، کیا خوب ہو اگر میری آنکھوں کے سامنے اس کا خیال ہو، پھر اگر میں دیکھنے میں کوتاہی کروں تو اندھا ہو جاؤں)۔

ایک مرتبہ حضرت رابعہ بصریہؒ نے فرمایا کوئی ہے جو ہمیں ہمارے حبیب کا پتا بتلائے، خادمہ نے عرض کیا ہمارا حبیب ہمارے ساتھ ہے، لیکن دنیا نے ہمیں اس سے دور کر رکھا ہے، ابن الجلاءؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر وحی نازل فرمائی کہ جب میں کسی بندے کے راز پر مطلع ہوتا ہوں اور اس دنیا میں آخرت کی محبت نہیں پاتا تو اسے اپنی محبت سے لبریز کر دیتا ہوں، اور اسے اپنی حفاظت میں لے لیتا ہوں، کہتے ہیں ایک روز سمنونؒ محبت کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے کہ اچانک ایک پرندہ آپ کے سامنے آکر بیٹھ گیا، اور زمین پر اپنی ٹھونگیں مارنے لگا، یہاں تک کہ اس کی چونچ سے اس قدر خون بہا کہ ہلاک ہو گیا،

حضرت ابراہیم ابن ادہم نے ایک دن بارگاہ الٰہی میں عرض کیا: اے اللہ! تو جانتا ہے جنت میرے نزدیک اس محبت کے مقابلے میں جو تو نے مجھے از راہ عنایت بخشی ہے' اور اس ذکر کے سامنے جس سے میں انس حاصل کرتا ہوں' اور اس فراغت کے مقابلے میں جو تو نے مجھے اپنی عظمت میں تدبر کرنے کے لئے عطا کی ہے ایک مچھر کے حقیر پر کے برابر بھی وقعت نہیں ہے۔ حضرت سری سقطیؒ فرماتے ہیں جو شخص اللہ سے محبت کرتا ہے زندہ رہتا ہے' اور جو دنیا کی طرف مائل ہوتا ہے ہلاک ہوتا ہے' احمق وہ ہے جو صبح و شام لغویات میں پڑا رہے اور عقلمند وہ ہے جو اپنے عیوب کی جستجو کرتا ہو' کسی نے حضرت رابعہؒ سے دریافت کیا کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کی محبت کا کیا حال ہے' فرمایا بخدا میں آپ سے بے پناہ محبت کرتی ہوں لیکن خالق کی محبت نے مجھے مخلوق کی محبت سے روک دیا' کسی نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے افضل اعمال کے بارے میں دریافت کیا' آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ سے راضی رہنا' اور محبت کرنا۔ بایزید بسطامیؒ فرماتے ہیں کہ محب نہ دنیا سے محبت کرتا ہے اور نہ آخرت سے' وہ صرف اپنے مولی سے محبت کرتا ہے اور مولی سے مولی ہی کو چاہتا ہے' شبلیؒ فرماتے ہیں کہ لذت میں مدہوشی اور تعظیم میں حیرت کا نام محبت ہے' ایک بزرگ کہتے ہیں کہ محبت یہ ہے کہ اپنا نام و نشان مٹا ڈالے یہاں تک کہ تیرے اندر کوئی چیز ایسی باقی نہ رہے جو تجھ سے تیری طرف راجع ہو' یہ بھی کہا گیا ہے کہ خوشی و مسرت کے ساتھ محبوب سے دل کی قربت کو محبت کہتے ہیں' خواصؒ فرماتے ہیں کہ محبت ارادوں کو مٹا دینے اور تمام صفات و حاجات کو جلا دینے کا نام ہے' حضرت سہل سے محبت کے بارے میں پوچھا گیا' آپ نے جواب دیا کسی بندے کی مراد سمجھنے کے بعد اللہ تعالیٰ کا کسی قلب کو اپنے مشاہدے کی طرف منعطف کرنا محبت ہے' ایک بزرگ کہتے ہیں کہ محب کا گذر چار مقامات پر ہوتا ہے' محبت' ہیبت' حیا اور تعظیم' ان میں سے افضل تعظیم اور محبت ہے' اس لئے کہ دونوں مقامات جنت میں اہل جنت کے ساتھ باقی رہیں گے' اور باقی مقامات فنا کردیئے جائیں گے۔ ہرم ابن حبان کہتے ہیں کہ مومن جب اپنے رب کو پہچانتا ہے تو اس سے محبت کرتا ہے' اور جب محبت کرتا ہے تو اس کی طرف متوجہ ہوتا ہے' اور جب متوجہ ہونے میں لذت پاتا ہے تو دنیا کی طرف شہوت کی آنکھ سے نہیں دیکھتا' اور نہ آخرت کی طرف کاہلی کی نگاہ سے دیکھتا ہے' وہ جسم کے ساتھ دنیا میں رہتا ہے' اور اس کی روح آخرت میں ہوتی ہے۔ عبداللہ بن محمدؒ کہتے ہیں کہ میں نے ایک عبادت گذار عورت کو گریہ وزاری کے دوران یہ کہتے ہوئے سنا کہ بخدا میں زندگی سے تنگ آگئی' اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ کسی جگہ موت فروخت ہو رہی ہے تو میں اسے اللہ تعالیٰ کی محبت میں اور اس کی ملاقات کے شوق میں خرید لوں راوی کہتے ہیں کہ میں نے اس سے پوچھا کیا تجھے اپنے عمل پر اطمینان ہے اس نے کہا اطمینان تو نہیں ہے' لیکن مجھے اس سے محبت ہے' اور میں اس سے حسن ظن رکھتی ہوں کیا اس صورت میں وہ مجھے عذاب دے گا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام پر وحی نازل فرمائی کہ اگر مجھ سے روگردانی کرنے والوں کو معلوم ہو جائے کہ میں ان کا منتظر ہوں' اور یہ جان لیں کہ میں ان کے ساتھ نرمی و محبت کا کیا معاملہ کرنے والا ہوں' اور یہ کہ میں ان کے معاصی ترک کرنے کا کس قدر مشتاق ہوں تو وہ لوگ مجھ سے ملنے کے شوق میں مرجائیں اور میری محبت میں ان کے جسم کا جوڑ جوڑ الگ ہو جائے اے داؤد! روگردانی کرنے والوں کے سلسلے میں جب میرا ارادہ یہ ہے تو ان لوگوں کے سلسلے میں میرا کیا ارادہ ہوگا جو میری طرف متوجہ ہیں' اے داؤد! بندہ کو میری حاجت اس وقت شدید ہوتی ہے جب وہ مجھ سے بے نیازی برتتا ہے' اور اس وقت وہ انتہائی قابل رحم ہوتا ہے جب مجھ سے منہ موڑتا ہے' اور اس وقت نہایت قابل تعظیم ہوتا ہے جب میری طرف لوٹتا ہے' ابو خالد الصفار کہتے ہیں کہ ایک نبی کی ملاقات کسی عابد سے ہوئی' آپ نے فرمایا تم لوگ جس بات پر عمل کرتے ہو ہم اس پر نہیں کرتے' تم خوف اور رجاء پر عمل کرتے ہو اور ہم محبت و شوق پر' حضرت شبلیؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کو وحی بھیجی کہ اے داؤد! میرا ذکر ذاکرین کے لئے ہے' میری جنت اطاعت گذاروں کے لئے ہے' اور میرا دیدار اہل شوق کے لئے ہے اور میں محبت کرنے والوں کے لئے خاص ہوں' خواصؒ اپنے سینے پر ہاتھ مار کر کہتے ہائے اس سے ملنے کا شوق جو مجھے دیکھتا ہے' اور جسے میں نہیں دیکھتا' حضرت جنید بغدادیؒ فرماتے ہیں کہ حضرت یونس علیہ السلام اس قدر روئے کہ نابینا ہوگئے' اور اس قدر کھڑے ہوئے کہ

کمر جھک گئی' اور اتنی نماز پڑھی کہ قوت باقی نہ رہی' اور فرمایا تیری عزت و جلال کی قسم ہے اگر میرے اور تیرے درمیان آگ کا سمندر ہوتا تو تجھ سے ملاقات کے شوق میں اس میں بھی کود پڑتا۔ حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ میں نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کا طریق دریافت کیا' آپ نے ارشاد فرمایا:۔

اَلْمَعْرِفَةُ رَأْسُ مَالِيْ وَالْعَقْلُ اَصْلُ دِيْنِيْ وَالْحُبُّ اَسَاسِيْ وَالشَّوْقُ مَرْكَبِيْ وَذِكْرُ اللّٰهِ اَنِيْسِيْ وَالثِّقَةُ كَنْزِيْ وَالْحُزْنُ رَفِيْقِيْ وَالْعِلْمُ سِلَاحِيْ وَالصَّبْرُ رِدَائِيْ وَالرِّضَا غَنِيْمَتِيْ وَالْعِجْزُ فَخْرِيْ وَالزُّهْدُ حِرْفَتِيْ وَالْيَقِيْنُ قُوَّتِيْ وَالصِّدْقُ شَفِيْعِيْ وَالطَّاعَةُ حُبِّيْ وَالْجِهَادُ خُلُقِيْ وَقُرَّةُ عَيْنِيْ فِي الصَّلٰوةِ۔(۱)

معرفت میرا سرمایہ ہے' عقل میرے دین کی اصل ہے' محبت میری اساس ہے' شوق میری سواری ہے' ذکر خدا میرا انیس ہے' اعتماد میرا خزانہ ہے' غم میرا رفیق ہے' علم میرا ہتھیار ہے' صبر میری چادر ہے' رضا میری غنیمت ہے' عجز میرا فخر ہے' زہد میرا پیشہ ہے' یقین میری قوت ہے' صدق میرا سفارشی ہے' طاعت میری محبت ہے' جہاد میرا خلق ہے' اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز ہے۔

حضرت ذوالنون مصریؒ فرماتے ہیں کہ ہے وہ ذات جس نے ارواح کے لشکر بنائے' عارفین کی روحیں جلالی اور قدسی ہیں' اسی لئے وہ اللہ کی طرف مشتاق ہوتی ہیں' اور مومنین کی روحیں روحانی ہیں اس لئے وہ جنت کی طرف مائل ہوتی ہیں' اور غافلین کی روحیں ہوائی ہیں' اس لئے وہ دنیا کی طرف راغب ہوتی ہیں' ایک بزرگ کہتے ہیں کہ میں نے گندمی رنگ کا ایک لاغر و نحیف شخص کو دیکھا جو کوہ لکام کے پتھروں پر کودتا پھرتا تھا' اور کہتا تھا۔

اَلشَّوْقُ وَالْهَوٰى صَيَّرَانِيْ كَمَا تَرٰى

(شوق اور خواہش نفس نے مجھے ایسا کر دیا ہے جیسا کہ تو دیکھتا ہے)

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ شوق اللہ تعالیٰ کی آگ ہے جسے وہ اپنے دوستوں کے دلوں میں روشن کرتا ہے' یہاں تک کہ دلوں میں موجود ارادے' خیالات' عوارض اور حاجات اس آگ سے جل جاتے ہیں' اور ان کا کوئی وجود باقی نہیں رہتا۔ محبت' انس' شوق' رضا کی اس قدر تفصیل کافی ہے' ہم اس پر اکتفا کرتے ہیں۔ واللّٰہ الموفق الصواب۔

كِتَابُ النِّيَّةِ وَالْاِخْلَاصِ وَالصِّدْقِ

نیت' اخلاص اور صدق کا بیان

جاننا چاہیے کہ ارباب قلوب پر ایمان کی بصیرت اور قرآن کے نور سے یہ امر منکشف ہو چکا ہے کہ علم و عمل کے بغیر سعادت کا حصول ممکن نہیں ہے' اس لئے کہ تمام لوگ ہلاک ہونے والے ہیں سوائے اہل علم کے' اور تمام اہل علم ہلاک ہونے والے ہیں سوائے اصحاب عمل کے' اور تمام عمل والے ہلاک ہونے والے ہیں سوائے مخلصین کے' اور مخلصین بڑے خطرے میں ہیں' عمل بغیر نیت کے مشقت ہے' اور نیت بغیر اخلاص کے ریاء نفاق اور معصیت ہے' اور اخلاص تصدیق و تحقیق کے بغیر فریب نظر ہے' چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس عمل کے بارے میں جو غیر کے ارادے کے ساتھ مخلوط ہو قرآن کریم میں ارشاد فرمایا ہے:۔

وَقَدِمْنَا اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا۔ (پ۱۹ ر۱ آیت ۲۳)

ہم ان کے ان کاموں کی طرف جو وہ (دنیا میں) کر چکے تھے متوجہ ہوں گے سو ان کو ایسا بیکار کر دیں گے جیسے پریشان غبار۔

ہمیں نہیں معلوم کہ جو شخص نیت کی حقیقت سے واقف نہیں وہ اپنی نیت کیسے درست کر سکتا ہے' اور وہ شخص جس نے اپنی

(۱) مجھے اس کی سند نہیں ملی' قاضی عیاض نے اس روایت کی نسبت حضرت علی ابن ابی طالب کی طرف کی ہے۔

نیت صحیح کرلی ہو کیسے مخلص ہو سکتا ہے جو اخلاص کی معرفت نہیں رکھتا' یا وہ شخص جو صدق کے معنی نہیں جانتا اپنے نفس سے صدق کا مطالبہ کیسے کر سکتا ہے۔ ہر بندہ کی جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت و عبادت کرنا چاہے پہلی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ پہلے نیت کا علم حاصل کرے' پھر صدق و اخلاص کی معرفت حاصل کرے' جو نجات اور سلامتی کا باعث ہیں' اس کے بعد عمل کے ذریعے نیت کی تصحیح کرے۔ ہم تین الگ الگ ابواب میں ان تینوں امور پر گفتگو کرتے ہیں۔

پہلا باب

نیت کی فضیلت اور حقیقت

نیت کی فضیلت اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهُ (پ ۷ ر ۲ آیت ۵۲)

اور ان لوگوں کو نہ نکالئے جو صبح و شام اپنے پروردگار کی عبادت کرتے ہیں جس سے خاص اس کی رضا مندی کا قصد رکھتے ہیں۔

اس آیت میں ارادے سے نیت مراد ہے' سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

إِنَّمَا الْأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ وَلِكُلِّ امْرِئٍ مَا نَوَىٰ فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ إِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ فَهِجْرَتُهُ إِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ وَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ إِلَىٰ دُنْيَا يُصِيْبُهَا أَوِ امْرَأَةٍ يَتَزَوَّجُهَا فَهِجْرَتُهُ إِلَىٰ مَا هَاجَرَ إِلَيْهِ (بخاری و مسلم۔ عمرؓ)

اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے' ہر شخص کو اس کی نیت کے مطابق ملے گا' جس شخص کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہوگی تو اس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہوگی' اور جس شخص کی ہجرت دنیا کی طرف ہو کہ اسے ملے یا کسی عورت کی طرف ہو کہ اس سے شادی کرے تو اس کی ہجرت اس چیز کی طرف ہوگی جس کی طرف اس نے ہجرت کی ہے۔

ایک حدیث میں ہے' آپ نے ارشاد فرمایا:

أَكْثَرُ شُهَدَاءِ أُمَّتِيْ أَصْحَابُ الْفِرَاشِ' وَرُبَّ قَتِيْلٍ بَيْنَ الصَّفَّيْنِ اللّٰهُ أَعْلَمُ بِنِيَّتِهِ (احمد۔ ابن مسعودؓ)

میری امت کے اکثر شہداء بستر والے ہوں گے اور میدان جنگ میں بہت سے قتل ہونے والوں کی نیت کا حال اللہ زیادہ جانتا ہے۔

قرآن کریم میں ارشاد فرمایا:

إِنْ يُرِيْدَا إِصْلَاحًا يُوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا (پ ۵ ر ۳ آیت ۳۵)

اگر ان دونوں آدمیوں کو اصلاح منظور ہوگی تو اللہ تعالیٰ ان میاں بیوی میں اتفاق فرمادیں گے۔

اس آیت کریمہ میں نیت کو توفیق کا سبب قرار دیا ہے۔ ایک حدیث میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

إِنَّ اللّٰهَ لَا يَنْظُرُ إِلَىٰ صُوَرِكُمْ وَأَمْوَالِكُمْ وَإِنَّمَا يَنْظُرُ إِلَىٰ قُلُوْبِكُمْ وَأَعْمَالِكُمْ (مسلم۔ ابو ہریرہؓ)

اللہ تعالیٰ تمہاری صورتوں اور مالوں کو نہیں دیکھتا بلکہ تمہارے دلوں اور اعمال کو دیکھتا ہے۔

دلوں کو اس لئے دیکھتا ہے کہ وہ نیت کا محل ہیں۔ ایک روایت میں ہے:

إِنَّ الْعَبْدَ لَيَعْمَلُ أَعْمَالًا حَسَنَةً فَتَصْعَدُ بِهَا الْمَلَائِكَةُ فِيْ صُحُفٍ مُخَتَّمَةٍ فَتُلْقَىٰ بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ تَعَالَىٰ' فَيَقُوْلُ أَلْقُوْا هٰذِهِ الصَّحِيْفَةَ فَإِنَّهُ لَمْ يُرِدْ بِمَا فِيْهَا وَجْهِيْ' ثُمَّ يُنَادِي الْمَلَائِكَةَ اُكْتُبُوْا لَهُ كَذَا وَكَذَا' اُكْتُبُوْا لَهُ كَذَا وَكَذَا' فَيَقُوْلُوْنَ: يَا رَبَّنَا إِنَّهُ لَمْ

يَعْمَلُ شَيْئًا مِنْ ذٰلِكَ فَيَقُولُ اللّٰهُ تَعَالٰى اِنْتَوَاهُ (دار قطنی۔ انس)

بندہ اچھے عمل کرتا ہے' فرشتے اس کے سربمہر اعمال نامے لے کر اوپر جاتے ہیں' اور انہیں اپنے رب کے سامنے پیش کرتے ہیں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یہ صحیفہ دور پھینکو' اس نے اپنے اعمال سے میری خوشنودی کا ارادہ نہیں کیا تھا پھر ملائکہ سے فرماتا ہے اس شخص کے لیے ایسا ایسا لکھو' اس کے لیے یہ یہ لکھو' فرشتے عرض کریں گے اے پروردگار اس نے یہ عمل نہیں کئے' اللہ تعالیٰ فرمائے گا اس نے ان اعمال کی نیت کی تھی۔

ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ آدمی چار طرح کے ہوتے ہیں' ایک وہ شخص جسے اللہ تعالیٰ نے علم اور مال عطا کیا ہو اور وہ شخص اپنے مال میں اپنے علم کی روشنی میں تصرف کرتا ہو اور دوسرا وہ جو یہ کہے کہ اگر مجھے بھی اللہ تعالیٰ علوم اور مال عطا کرتا تو میں بھی ایسا ہی کرتا جیسا اس نے کیا ہے یہ دونوں شخص اجر میں برابر ہیں' ایک شخص وہ ہے جسے اللہ نے مال عطا کیا ہو علم نہ دیا ہو اور وہ اپنے جہل کے باعث اپنے مال میں بیجا تصرف کرتا ہو' اور دوسرا شخص یہ کہتا ہو کہ اگر اللہ تعالیٰ مجھے بھی مال عطا کرتا تو میں بھی ایسا ہی کرتا جیسا یہ شخص کرتا ہے' یہ دونوں شخص گناہ میں برابر ہیں (ابن ماجہ۔ ابو کبشہ الانماری) دیکھئے محض نیت کی بنا پر کیسے دو شخص دوسرے دو شخصوں کے حسن و قبح میں شریک قرار دئے گئے' ایسی ہی ایک روایت حضرت انس ابن مالک سے منقول ہے کہ جب سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ تبوک میں تشریف لے گئے تو فرمایا کہ مدینے میں کچھ لوگ ایسے ہیں کہ جو سفر ہم کر رہے ہیں' اور کافروں کی آتش انتقام کو بھڑکانے والی جو زمینیں ہم اپنے پاؤں سے روند رہے ہیں' یا جو کچھ ہم خرچ کرتے ہیں یا جو فاقے ہم برداشت کرتے ہیں وہ لوگ ان تمام چیزوں میں ہمارے شریک ہیں' حالانکہ وہ مدینے میں ہیں لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! یہ کیسے ممکن ہے جب کہ وہ ہمارے ساتھ نہیں ہیں فرمایا وہ لوگ عذر کے باعث وہاں رہ گئے' اور اپنی حسن نیت کی وجہ سے ہمارے اعمال میں شریک ہیں (بخاری و ابوداؤد) حضرت عبد اللہ ابن مسعودؓ کی حدیث میں ہے کہ جو شخص کسی چیز کے لئے ہجرت کرے تو وہ اسی کا ہے' چنانچہ ایک شخص نے ہماری ایک خاتون سے نکاح کرنے کے لیے ہجرت کی تو اس شخص کو اُمّ قیس کا مہاجر کہا جانے لگا (طبرانی) ایک روایت میں ہے کہ ایک شخص اللہ کی راہ میں مارا گیا اور قتیل حمار کے نام سے مشہور ہوا کیونکہ وہ شخص اپنے حریف سے اس لیے لڑا تھا کہ اس سے اس کا گدھا چھین لے' چنانچہ مارا گیا' اور اسی کی طرف منسوب ہوا(۱) حضرت عبادہ کی روایت میں ہے آپ نے ارشاد فرمایا جس شخص نے محض حصول مال کے لیے جہاد کیا اسے اس کی نیت کے مطابق ملے گا (نسائی۔ عبادۃ ابن الصامتؓ) حضرت ابی ابن کعبؓ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک شخص سے کہا کہ وہ غزوہ میں میری مدد کے لیے چلے' اس شخص نے کہا اگر تم میری اجرت مقرر کردو تو میں تمہارے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہوں چنانچہ میں نے اجرت مقرر کردی (اور وہ میری مدد کے لیے غزوہ میں شریک ہوا) میں نے اس کا تذکرہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی جناب میں کیا آپ نے ارشاد فرمایا: اس شخص کو دنیا و آخرت میں سے اسی قدر ملا ہے جس قدر تم نے مقرر کردیا تھا (طبرانی) ایک اسرائیلی روایت میں ہے کہ ایک شخص قحط کے زمانے میں ریت کے ایک ٹیلے کے پاس سے گذرا' اس نے دل میں سوچا اگر یہ ریت غلہ بن جائے تو میں لوگوں کو تقسیم کروں' اللہ تعالیٰ نے اس زمانے کے پیغمبر پر وحی نازل فرمائی کہ اس شخص سے کہہ دو کہ اللہ تعالیٰ نے تیرا صدقہ قبول کرلیا ہے' اور اس نے تیری حسن نیت کا شکریہ ادا کیا ہے' اور تجھے اسی غلے کے مطابق اجر و ثواب عطا کیا ہے جو تو نے صدقہ کرنے کا ارادہ کیا تھا' ایک روایت میں وارد ہوا ہے۔

مَنْ هَمَّ بِحَسَنَةٍ وَلَمْ يَعْمَلْهَا كُتِبَتْ لَهُ حَسَنَةٌ (بخاری و مسلم)

جس شخص نے کسی نیکی کا ارادہ کیا اس کے لیے وہ نیکی لکھ دی گئی۔

حضرت عبد اللہ ابن عمرؓ سے مروی ہے ایک روایت میں ہے کہ جس شخص کی نیت صرف دنیا ہوتی ہے اللہ تعالیٰ فقر و افلاس

(۱) مجھے یہ روایت موصولات میں نہیں ملی' البتہ ابو اسحاق فزاری نے سنن میں بطریق ارسال نقل کیا ہے۔

اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان رکھ دیتا ہے' اور وہ دنیا میں زیادہ راغب ہو کر دنیا سے جدا ہوتا ہے اور جس شخص کی نیت آخرت ہوتی ہے اللہ تعالیٰ اس کے دل میں استغناء پیدا کردیتا ہے' اس کا سامان اس کے لیے جمع کردیتا ہے اور وہ دنیا میں زاہد ہو کر رخصت ہوتا ہے (ابن ماجہ۔ زید ابن ثابت) حضرت ام سلمہؓ کی ایک روایت میں ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایسے لشکر کا ذکر کیا جو جنگل میں زیر زمین دھنستا ہوگا۔ حضرت ام سلمہؓ نے عرض کیا ان میں وہ شخص بھی ہوگا جو زبردستی یا اجرت دے کر لشکر میں شامل کیا گیا تھا؟ آپ نے فرمایا ان کا حشر ان کی نیتوں پر ہوگا (مسلم' ابوداؤد) حضرت عمرؓ کی ایک روایات میں ہے' سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

اِنَّمَا یَقْتَتِلُ الْمُقْتَتِلُوْنَ عَلَی النِّیَّاتِ (ابن ابی الدنیا)

آپس میں لڑنے والے اپنی اپنی نیتوں پر ایک دوسرے کو مارتے ہیں۔

ایک روایت میں ہے کہ جب دو لشکر برسرپیکار ہوتے ہیں تو فرشتے اترتے ہیں اور مخلوق کے لیے ان کے درجات کے مطابق لکھتے ہیں کہ فلاں شخص دنیا کے لیے لڑتا ہے' اور فلاں غیرت و حمیت کے لیے' فلاں تعصب کے لیے' خبردار! کسی شخص کو شہید مت کہو' جو شخص اللہ تعالیٰ کا کلمہ بلند کرنے کے لیے لڑتا ہے صرف وہ شخص شہید ہے (ابن المبارک۔ ابن مسعودؓ مرسلاً" بخاری و مسلم۔ ابو موسیٰ) حضرت جابر ابن عبداللہؓ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ ہر شخص کو اسی حالت پر مبعوث کیا جائے گا جس حالت پر وہ مرا ہے (مسلم) احنف ابن ابی بکرہؓ کہتے ہیں' سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جب دو مسلمان لڑتے ہیں تو قاتل مقتول دونوں جہنم میں جاتے ہیں' صحابہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ قاتل کا جہنم میں جانا سمجھ میں آتا ہے لیکن مقتول کیوں جہنم میں جائے گا' فرمایا اس لیے کہ اس نے اپنے حریف کو قتل کرنے کا ارادہ کیا تھا (بخاری و مسلم) حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت میں ہے فرمایا: جو شخص کسی عورت سے مہر پر نکاح کرے اور اس کی ادائیگی کا ارادہ نہ رکھتا ہو تو وہ زانی ہے' اور جس شخص نے قرض لیا اور اس کی ادائیگی کی نیت نہ کی وہ چور ہے (احمد۔ صہیبؓ) ایک حدیث میں ہے کہ جس شخص نے اللہ کے لیے خوشبو لگائی وہ قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ اس کی خوشبو مشک سے بھی زیادہ عمدہ ہوگی' اور جس شخص نے غیر اللہ کے لیے خوشبو لگائی وہ قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ اس کی بو مردار کی بدبو سے زیادہ کریہہ ہوگی (ابو الولید الصفار۔ اسحاق ابن ابی طلحہؓ)

حضرت عمر ابن الخطابؓ فرماتے ہیں کہ بہترین عمل یہ ہے کہ اللہ کے فرائض ادا کیے جائیں اس کے محرمات سے اجتناب کیا جائے' اور جو کچھ خدا تعالیٰ کے پاس ہے اس میں نیت درست رکھی جائے۔ سالم ابن عبداللہ نے حضرت عمر ابن عبدالعزیز کو اپنے ایک خط میں لکھا جاننا چاہیے اللہ تعالیٰ بندے کی مدد اس کی نیت کے مطابق کرتا ہے' جس کی نیت مکمل ہوتی ہے اس کی مدد بھی پوری ہوتی ہے' اور جس کی نیت ناقص ہوتی ہے اس کی مدد بھی ناقص ہوتی ہے' ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ بہت سے چھوٹے اعمال کو نیت بڑا کردیتی ہے' اور بہت سے بڑے اعمال کو نیت چھوٹا کردیتی ہے' داؤد طائی فرماتے ہیں جس نیک شخص کی نیت درست ہوتی ہے اگر اس کے تمام اعضاء دنیا سے متعلق ہوجائیں تو اسے اس کی نیت نیک بختی کی طرف بڑھا دیتی ہے' اور جاہل کا حال اس کے برعکس ہے' حضرت سفیان ثوری فرماتے ہیں پچھلے لوگ عمل کے لیے نیت سیکھتے تھے جس طرح تم آج عمل سیکھتے ہو' بعض علماء فرماتے ہیں کہ عمل سے پہلے عمل کے لیے نیت تلاش کرو' جب تک تم خیر کی دعا کرتے رہو گے خیر پر رہو گے' ایک ارادت مند مختلف علماء کی مجلسوں کے چکر لگاتا تھا اور کہتا تھا کہ کوئی مجھے ایسے عمل کی نشاندہی کرسکتا ہے جو میں اللہ کے لئے کرتا رہوں' میں نہیں جانتا تھا کہ مجھ پر شب و روز میں کوئی لمحہ ایسا آئے کہ میں اس میں اللہ کے لیے عمل نہ کرسکوں' علماء نے کہا تیرا مقصد حاصل ہے' جہاں تک ممکن ہو تو عمل خیر کر' اور جب ہمت نہ پائے تو دل میں اس کی نیت رکھ' نیت سے بھی تجھے اعمال خیر ہی کا ثواب ملے گا۔ بعض سلف صالحین فرماتے ہیں کہ تم پر اللہ تعالیٰ کی اس قدر نعمتیں ہیں کہ تم ان کا شمار نہیں کرسکتے' اور تمہارے بہت سے گناہ اس قدر مخفی ہیں کہ خود تم ان پر مطلع نہیں ہو' لیکن اگر تم صبح و شام توبہ کرتے رہے تو تمہارے گناہ معاف کردیئے

جائیں گے' حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ارشاد ہے اس آنکھ کے لیے خوشخبری ہو جو سوئے اور معصیت کا قصد نہ کرے' اور معصیت پر بیدار نہ ہو' حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں قیامت کے دن لوگ اپنی نیتوں پر اٹھائے جائیں گے' حضرت فضیل ابن عیاض جب یہ آیت تلاوت کرتے تو بے تحاشا روتے' اور بار بار اس آیت کو دہراتے' اور فرماتے کہ اگر تو نے ہمارا امتحان لیا تو ہم رسوا ہوں گے' اور ہمارا راز فاش ہو جائے گا۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتّٰى نَعْلَمَ الْمُجَاهِدِيْنَ مِنْكُمْ وَالصَّابِرِيْنَ وَنَبْلُوَا اَخْبَارَكُمْ (پ ۲۶ ر ۸ آیت ۳۱)

اور ہم ضرور تم سب کی آزمائش کریں گے تاکہ ہم ان لوگوں کو معلوم کرلیں جو تم میں مجاہد ہیں اور جو ثابت قدم رہنے والے ہیں اور تاکہ تمہاری حالتوں کی جانچ کرلیں۔

حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ جنت والے جنت میں' اور دوزخ والے دوزخ میں اپنی نیتوں کی وجہ سے ہمیشہ کے لیے رہیں گے' حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ توراۃ میں لکھا ہوا ہے کہ جس عمل سے میری رضامندی مطلوب ہوتی ہے وہ تھوڑا بھی بہت ہے' اور جس عمل سے غیر کی نیت کی جاتی ہے وہ بہت بھی تھوڑا ہے' بلال ابن سعد ان کہتے ہیں کہ بندہ مومنین کی سی باتیں کرتا ہے' لیکن اللہ تعالیٰ اسے نہیں چھوڑتا جب تک کہ وہ اس کے اعمال نہ دیکھ لے' اور محض اعمال نہیں دیکھتا جب تک تقویٰ نہ ہو' اور محض تقویٰ کافی نہیں سمجھتا جب تک نیت درست نہ ہو' جس شخص کی نیت صحیح ہوتی ہے اس کے تمام کام درست ہوتے ہیں' خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اعمال کا مدار نیات پر ہے' نیتوں ہی سے اعمال اعمال خیر بنتے ہیں' نیت بذات خود خیر ہے' اگرچہ وہ کسی مانع کی وجہ سے عملی شکل اختیار نہ کرسکے۔

نیت کی حقیقت : جاننا چاہیے کہ نیت' ارادہ' اور قصد ایک ہی معنی کے حامل مختلف الفاظ ہیں' اور وہ دل کی ایک ایسی حالت یا کیفیت سے عبارت ہے جسے دو امر گھیرے ہوئے ہیں' ایک علم' اور دوسرا عمل' علم پہلے ہوتا ہے کیونکہ یہ اس حالت کی اصل اور شرط ہے' اور عمل اس کے بعد ہوتا ہے کیوں کہ وہ اس کی فرع اور ثمرہ ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر عمل یعنی ہر اختیاری حرکت وسکون تین امور سے پایۂ تکمیل کو پہنچتا ہے علم' ارادے اور قدرت سے' کیوں کہ انسان کسی ایسی چیز کا ارادہ نہیں کرسکتا جسے وہ نہ جانتا ہو اور نہ کوئی ایسا عمل کرسکتا ہے جس کا ارادہ نہ کیا ہو' اس سے معلوم ہوا کہ ارادہ ضروری ہے۔ ارادے کے معنی ہیں دل میں کسی ایسے امر کی تحریک ہونا جو حال' یا مآل میں غرض کے موافق ہو' انسان کی تخلیق کچھ اس طرح عمل میں آتی ہے کہ بعض امور اس کے موافق بنائے گئے ہیں' اور بعض مخالف۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ وہ ان امور کے حصول کی طرف راغب ہو جو اس کے موافق ہیں' اور ان امور کو رفع کرے جو اس کے مخالف ہیں' موافق اور مخالف میں تمیز کے لیے مفید اور مضر اشیاء کے ادراک اور معرفت کی ضرورت ہے چنانچہ جو شخص کسی غذا سے واقف نہیں ہوتا' یا آنکھوں سے نہیں دیکھتا اس کے لیے غذا کا استعمال ممکن نہیں ہے' اس طرح یہ بھی ممکن نہیں کہ کوئی شخص آگ کو دیکھے بغیر فرار ہو جائے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے معرفت اور ہدایت پیدا کی ہے' اور اس کے لیے اسباب بنائے ہیں' جنہیں ظاہری اور باطنی حواس کہتے ہیں' پھر یہ کافی نہیں ہے کہ آدمی محض غذا سے واقف ہو جائے' اور اس کی موافقت پر مطلع ہو جائے یا اسے آنکھوں سے دیکھ لے' بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ اس غذا کی طرف رغبت بھی ہو' نفس کا میلان اور شہوت بھی ہو' چنانچہ مریض غذا کا مشاہدہ بھی کرتا ہے' اور یہ بھی جانتا ہے کہ غذا اس کی غرض کے موافق ہے مگر اس کے باوجود وہ کھاتا نہیں ہے' کیوں کہ قوت محرک موجود نہیں ہے اور دل میں رغبت کا فقدان ہے' پھر یہ رغبت اور تحریک بھی کافی نہیں ہے' بلکہ بعض اوقات آدمی کھانے کا مشاہدہ بھی کرتا ہے' اور اسے کھانا بھی چاہتا ہے' لیکن معذور ہونے کے باعث کھا نہیں پاتا' اس کے لیے قدرت اور محرک اعضاء پیدا کیے گئے' تاکہ غذا کے تناول کا عمل مکمل ہو سکے۔ اعضاء قدرت سے حرکت کرتے ہیں' اور قدرت محرک کی منتظر رہتی ہے' محرک علم و معرفت' یا ظن و اعتقاد کے تابع ہے'

یعنی جب یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ فلاں امر میرے موافق ہے اور اس کا کرنا ضروری ہے اور کوئی معارض محرک موجود نہیں ہوتا تب ارادہ پیدا ہوتا ہے' اور میلان ظاہر ہوتا ہے' اور جب ارادہ ہوتا ہے تو قدرت اعضاء کو حرکت دیتی ہے' گویا قدرت ارادے کی خادم ہے' اور ارادہ اعتقاد اور معرفت کے حکم کے تابع ہے' اس تفصیل سے ثابت ہوا کہ نیت ایک درمیانی وصف کا نام ہے' اور اس کا حاصل یہ ہے کہ غرض کے موافق امور کی طرف نفس کا میلان' اور رغبت کا دل میں پیدا ہونا خواہ وہ امور حال میں موافق ہوں یا مآل میں۔ یہاں پہلا محرک غرض مطلوب ہے' اسی کو باعث کہتے ہیں' اور یہی غرض نیت کیا ہوا مقصد ہے' اور ابھرنے کے عمل کو مقصد اور نیت کہتے ہیں' اور ارادے کی خدمت کے لیے قدرت کا اعضاء کو حرکت دینا عمل ہے' تاہم عمل کے لیے قدرت کبھی ایک باعث سے برانگیختہ ہوتی ہے' اور کبھی ایسے دو باعثوں سے جو ایک ہی فعل میں جمع ہو جاتے ہیں' اور اگر دو باعثوں سے قدرت برانگیختہ ہو تو کبھی یہ صورت ہوتی ہے کہ ہر باعث تنہا قدرت کو برانگیختہ کرنے پر قادر ہوتا ہے' اور کبھی عاجز ہوتا ہے' یہاں تک کہ دونوں کا اجتماع نہ ہو' کبھی ایک باعث کافی ہو جاتا ہے مگر دوسرا باعث اس کا معاون بنتا ہے' اس طرح کل چار قسمیں بنتی ہیں' ہم ان چاروں کی الگ الگ مثال اور نام بیان کرتے ہیں۔

پہلی قسم۔ نیت خالص : پہلی قسم یہ ہے کہ تنہا ایک باعث ہو' جیسے کسی انسان پر کوئی درندہ حملہ کردے' چنانچہ جب وہ اسے دیکھتا ہے ایک دم اپنی جگہ سے اٹھ جاتا ہے' یہاں درندے سے بھاگنے کے علاوہ کوئی دوسرا محرک موجود نہیں ہے کیوں کہ اس نے درندے کو دیکھا ہے' اور اسے اپنے لیے مضر جانا ہے' چنانچہ درندے کو دیکھ کر اس کے دل میں فرار کا داعیہ پیدا ہوا ہے' اور اس کے رغبت نے جنم لیا ہے' اسی داعیے اور رغبت کے بموجب قدرت نے بھی اپنا عمل کیا۔ اس صورت میں یہی کہا جائے گا کہ اس شخص کی نیت محض درندے سے فرار ہے' کھڑے ہونے میں دوسری کوئی نیت نہیں ہے' ایسی نیت کو خالص کہتے ہیں اور اس نیت کے مطابق عمل کرنے کو اخلاص سے تعبیر کیا جاتا ہے' یعنی یہ ایک ایسا عمل ہے جس میں غیر کی شرکت اور امتزاج نہیں ہے۔

دوسری قسم۔ رفاقت بواعث : دوسری قسم یہ ہے کہ دو بواعث یکجا ہو جائیں' اور دونوں اپنی جداگانہ حیثیت میں محرک ہوں' اور اس میں ایک دوسرے کے محتاج نہ ہوں' محسوسات میں اس کی مثال یہ ہے کہ دو آدمی کسی وزن کو اٹھانے پر اپنی وہ قوت استعمال کریں کہ اگر تنہا ہوتے تب بھی اتنی قوت صرف کر کے اٹھا سکتے تھے' اور پیش نظر بحث کے مطابق مثال یہ ہے کہ کسی شخص سے اس کا کوئی تنگدست عزیز کچھ مانگے' اور وہ اس کے فقر اور قرابت کے باعث اس کی حاجت روائی کردے' جب کہ وہ یہ بات جانتا ہے کہ اگر مانگنے والا تنگدست نہ ہوتا تب بھی قرابت کے باعث میں اس کی حاجت روائی ضرور کرتا' یا قریب نہ ہوتا تو محض تنگدستی کے باعث اس کی ضرورت پوری کرتا' اور دل میں اس امر کا یقین ہو کہ اگر اس سے کسی مالدار رشتے دار نے بھی کچھ مانگا تو وہ اسے ضرور دے گا' اور اگر کسی مفلس اجنبی نے کچھ طلب کیا تو وہ اسے منع نہیں کرے گا۔ اس کی مثال یہ بھی ہے جیسے کسی شخص کو ڈاکٹر کھانے کا پرہیز بتلائے' اور اتفاق سے عرفے کا دن ہو' جس میں وہ روزہ رکھتا ہے' چنانچہ اس نے روزہ رکھ لیا' اور دل میں یہ خیال ہے کہ اگر عرفہ نہ ہوتا تب بھی وہ بطور پرہیز کھانا ترک کرتا' اور اگر حکیم پرہیز تجویز نہ کرتا تب بھی وہ عرفہ کا روزہ ضرور رکھتا' اب اتفاق سے دونوں باعث جمع ہو گئے ہیں' اس لیے اس نے فعل پر اقدام کیا۔ یہاں دوسرا باعث پہلے باعث کا مددگار اور رفیق ہے' اس لیے ہم اس قسم کو مرافقت بواعث کہہ سکتے ہیں۔

تیسری قسم۔ مشارکت : تیسری قسم یہ ہے کہ دونوں میں سے کوئی تنہا کسی عمل کا محرک نہ ہو' بلکہ ان دونوں کے مجموعے سے قدرت کو تحریک ہوتی ہو' محسوسات میں اس کی مثال یہ ہے کہ دو کمزور و ناتواں انسان ایک دوسرے کی مدد سے کوئی ایسی چیز اٹھائیں کہ اگر دونوں الگ الگ اٹھانے کی کوشش کرتے تو اٹھا نہ پاتے۔ اور زیر نظر معاملے میں یہ مثال ہے کہ کسی شخص کے پاس اس کا کوئی مالدار رشتہ دار آئے اور ایک درہم مانگے اور وہ دینے سے منع کردے' پھر مفلس اجنبی آکر ایک درہم طلب کرے وہ

شخص اسے بھی نہ دے اس کے بعد ایک تنگدست رشتہ دار آئے اور ایک درہم مانگے' وہ شخص اسے انکار نہ کرے' گویا اس کی اندر دونوں باعثوں کے اجتماع سے تحریک ہوئی ہے' یعنی قرابت اور فقر کے اجتماع سے اس کی ایک مثال یہ ہے کہ کوئی شخص لوگوں کے سامنے ثواب اور تعریف دونوں غرضوں کے لیے صدقہ کرے' اگر تنہا ہوتا تو محض ثواب کی نیت سے ہرگز نہ دیتا' یا محض تعریف مقصد ہوتی اور کوئی ایسا فاسق دست طلب دراز کرتا جسے صدقہ دینے میں کوئی فائدہ نہ ہوتا تو وہ محض تعریف کے لیے اسے ہرگز نہ دیتا' بلکہ جب یہ دونوں مقصد جمع ہوئے تب دل میں صدقہ کی تحریک ہوئی۔ اس قسم کو ہم مشارکت کہہ سکتے ہیں۔

چوتھی قسم۔ معاونت : چوتھی قسم یہ ہے کہ دونوں باعثوں میں سے ایک مستقل ہو کہ اگر تنہا بھی ہو تب بھی محرک بن سکے' اور دوسرا مستقل نہ ہو' تاہم جب اسے پہلے سے ملا دیا جائے تب اعانت اور سہولت دینے میں مؤثر ضرور ہو' محسوسات میں اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی ناتواں شخص وزن اٹھانے میں کسی طاقت ور انسان کی اعانت کرے اگر طاقت ور انسان تنہا ہوتا تب بھی وہ وزن اٹھا سکتا تھا' جب کہ کم زور آدمی بذات خود اس قابل نہیں کہ وہ تنہا وزن اٹھا سکے' تاہم وہ اس قابل ضرور ہے کہ قوی کی مدد کر سکے' اور اس کا کچھ بوجھ ہلکا کر سکے' اس موقع کے لیے مثال یہ ہے کہ جیسے کسی شخص کا نماز یا صدقات میں کوئی معمول ہو اور اس مخصوص وقت میں کچھ لوگ آجائیں' اور وہ ان کی موجودگی میں اپنا معمول ادا کرے اگر وہ لوگ نہ آتے تب بھی یہ شخص اپنا معمول ادا کرتا اگرچہ طبیعت پر کچھ گرانی ہوتی' لیکن لوگوں کے آنے اور دیکھنے سے کچھ تخفیف اور سہولت پیدا ہو گئی ہے' وہ معمول سخت تر ہونے کے باوجود ہلکا پھلکا ہو گیا ہے' حالانکہ وہ یہ یقین رکھتا ہے کہ اگر آنے والے نہ آتے تب بھی میں یہ معمول اپنے وقت پر ادا کرتا' اور اگر میرا معمول نہ ہوتا تو آنے والوں کی خاطر میں ہرگز کوئی ایسا کام نہ کرتا جس سے ناموری مطلوب ہو' اس کو ہم معاونت کہہ سکتے ہیں۔ اس تقسیم کا حاصل یہ ہے کہ دوسرا باعث یہ رفیق ہو گا' یا شریک ہو گا یا معین ہو گا۔ ہم ان اقسام کی مزید تفصیلات کتاب الاخلاص میں بیان کریں گے' یہاں صرف نیات کی قسمیں بیان کرنا مقصود ہے' کیوں کہ عمل نیت کے تابع ہوتا ہے اور اسی سے حکم پاتا ہے جیسے کہ حدیث شریف میں ہے:۔ اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ اعمال کا مدار نیتوں پر ہے۔

گویا اعمال نیات کے تابع ہیں' اور تابع کی کوئی حیثیت نہیں ہے' حکم متبوع پر لگتا ہے۔

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک قول کی حقیقت : ایک روایت میں ہے' سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

نِیَّۃُ الْمُؤْمِنِ خَیْرٌ مِنْ عَمَلِہٖ (طبرانی۔ ابن سعد)
مؤمن کی نیت اس کے عمل سے بہتر ہے۔

آئیے اس حدیث کے مفہوم پر گفتگو کریں' اور یہ دیکھیں کہ عمل سے نیت کے بہتر ہونے کی وجہ کیا ہے' بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ نیت کو اس لیے ترجیح دی گئی ہے کہ یہ ایک مخفی جذبہ ہے' اور اللہ تعالیٰ کے سوا اس پر کوئی مطلع نہیں ہو سکتا' جب کہ عمل ظاہر ہے' ہر شخص اس کا مشاہدہ کر سکتا ہے' اسی لیے پوشیدہ اعمال کو بھی فضیلت دی گئی ہے' ہم یہ کہتے ہیں کہ ان لوگوں کی اس قدر بات صحیح ہے کہ پوشیدہ اعمال افضل ہیں' مگر یہاں یہ مراد نہیں ہے' اس لیے کہ اس سے تو یہ لازم آتا ہے کہ اگر کوئی شخص دل سے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے' اور مسلمانوں کی مصالح میں غور و فکر کرنے کی نیت کرے تو یہ نیت نفس ذکر' اور نفس فکر سے افضل ہو؟ حالانکہ ایسا نہیں ہے' بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ نیت کو اس لیے ترجیح دی گئی ہے کہ یہ عمل کے آخر تک باقی رہتی ہے' جب کہ اعمال کو دوام نہیں ہوتا' لیکن یہ وجہ بھی صحیح نہیں ہے' اس لیے کہ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ تھوڑا عمل زیادہ سے بہتر ہو' حالانکہ ایسا نہیں ہے' پھر یہ قابل غور ہے کہ نماز کے اعمال کی نیت۔ مثلاً۔ صرف چند لمحوں تک رہتی ہے اور اعمال زیادہ دیر تک باقی رہتے ہیں۔ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ اگر محض نیت ہو تو وہ عمل بلا نیت سے افضل ہے' یہ بات بھی صحیح ہے' مگر یہاں یہ مراد نہیں ہو سکتی'

اس لیے کہ بلانیت کے عمل 'یا غفلت کے ساتھ کئے گئے عمل میں قطعاً" کوئی خیر نہیں ہے' جب کہ تنہا نیت خیر ہے' لیکن ترجیح ان امور میں ہونی چاہیے جو اصل خیر میں مشترک ہوں' جب تنہا نیت پائی گئی عمل نہیں پایا گیا تو خیر میں اشتراک کہاں رہا' بلکہ اس حدیث میں ہروہ طاقت یا عمل مراد ہے جو نیت اور عمل دونوں سے مرکب ہو' نیت بھی خیر ہو' اور عمل بھی خیر ہو یہاں کہا جائے گا کہ اس اطاعت میں نیت عمل سے بہتر ہے اگرچہ مقصود میں دونوں اپنی اپنی جگہ مؤثر ہیں' لیکن نیت کی تاثیر عمل کی تاثیر سے بہتر ہے۔ گویا حدیث کے معنی یہ ہوئے مومن کی نیت جو منجملہ اطاعت ہو اس عمل سے بہتر ہے جو خود بھی منجملہ اسی اطاعت کے ہو' حاصل یہ ہے کہ بندے کو عمل میں بھی اختیار ہے' اور نیت میں بھی' کیوں کہ دونوں عمل ہیں' ایک ظاہری اعضاء سے متعلق ہے' اور دوسرا قلب سے' لیکن بہتری نیت کا حاصل ہے۔

نیت عمل سے کیوں افضل ہے : یہ حدیث کے معنی و مفہوم کی تفصیل ہوئی' اب رہا یہ سوال کہ نیت کے بہتر ہونے' اور عمل پر راجح ہونے کی وجہ کیا ہے؟ اس وجہ کو صحیح طریقہ پر وہی شخص سمجھ سکتا ہے جو دین کے مقاصد' اس کے طریقۂ کار' اور مقصد تک پہنچنے میں اس کے طریقۂ کار کے مؤثر ہونے کی حقیقت سے واقف ہو' اور بعض آثار کو بعض پر قیاس کرنے کی اہلیت رکھتا ہو' ایسے ہی شخص پر یہ امر منکشف ہو سکتا ہے کہ مقصود کے اعتبار سے کس عمل کے اثر کو فضیلت دی جانی چاہیے' مثال کے طور پر اگر کوئی شخص یہ کہے کہ روٹی میوے سے بہتر ہے تو اس کا مقصد یہ ہے کہ قوت اور غذائیت کے اعتبار سے روٹی بہتر ہے' اور یہ بات وہی کہہ سکتا ہے جو جانتا ہو کہ غذا کا ایک مقصد ہوتا ہے اور وہ ہے صحت اور بقا' اور تاثیر کے لحاظ سے غذائیں مختلف نوع کی ہیں' چنانچہ وہ تمام غذاؤں کے اثرات سے واقف ہو' اور انہیں ایک دوسرے پر قیاس کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو' اطاعات بھی قلوب کی غذا ہیں' اور ان غذاؤں کا مقصد اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ قلوب کو شفا ہو' اور وہ آخرت میں بقا و سلامتی پائیں' اور اللہ تعالیٰ کی لقاء کی نعمت و سعادت سے سرفراز ہوں' گویا اصل مقصد اللہ تعالیٰ کی ملاقات سے سعادت کی لذت کا حصول ہے' اور اللہ کی ملاقات سے وہی شخص سرفراز ہو سکتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی محبت اور معرفت پر مرے' اور اللہ سے محبت وہی کر سکتا ہے جو اس کی معرفت رکھتا ہو' اور وہی شخص انس حاصل کر سکتا ہے جو اس کا خوب خوب ذکر کرتا ہو' انس دوام ذکر سے حاصل ہوتا ہے' اور معرفت دوام فکر و محبت سے۔ گویا محبت بدایۃً" معرفت کے تابع ہے' قلب دوام ذکر و فکر کے لئے اس وقت تک فارغ نہیں ہو سکتا جب تک کہ دنیا کے شواغل سے فارغ نہ ہو' اور اس وقت تک دنیوی مشاغل سے لا تعلق نہیں ہو سکتا جب تک شہوات نفس کا سلسلہ اس سے منقطع نہ ہو' یہاں تک وہ خیر کی طرف مائل ہو جائے' اس کا ارادہ کرنے والا بن جائے شر سے متنفر ہو' اور اسے بغض کرے' صرف وہی شخص خیر و طاعت پر منحصر ہے جیسے عقلمند انسان فصد و حجامت پر اس لئے مائل ہوتا ہے کہ اس کی سلامتی صحت اور بقائے جسم فصد و حجامت پر موقوف ہے' جب معرفت سے اصل میلان حاصل ہو جاتا ہے تو عمل سے اس کو تقویت ملتی ہے' اس لئے کہ صفات قلب کے مقتضی پر عمل کرنا ان صفات کے لئے غذا اور قوت کے قائم مقام ہیں' اعمال کے ذریعے یہ صفات قلب میں گہرائی تک راسخ ہوتی ہیں' اور اچھی طرح جم جاتی ہیں۔ چنانچہ طلب علم' یا طلب جاہ کی طرف مائل ہونے والے شخص کا میلان ابتدا میں ضعیف ہوتا ہے لیکن جب وہ میلان کے تقاضوں پر عمل کرتا ہے اور علم میں مشغول ہوتا ہے' یا حصول اقتدار کے لئے تدابیر کرتا ہے تو وہ میلان راسخ ہو جاتا ہے' اور اس کے لئے اس سے چھٹکارا پانا دشوار ہو جاتا ہے' اور اگر ابتدا ہی میں میلان کے خلاف کرتا ہے تو وہ بتدریج کمزور پڑنے لگتا ہے' یہاں تک کہ ختم بھی ہو جاتا ہے' چنانچہ اگر کوئی شخص کسی خوب صورت انسان کو دیکھے تو پہلی بار دیکھنے سے اس کی رغبت ضعیف ہو جاتی ہے' لیکن اگر اس رغبت کے موجب پر عمل کرتے ہوئے اس کے پاس بیٹھنے' اس سے ملنے جلنے' گفتگو کرنے' اور اسے دیکھنے پر مواظبت کرے تو وہ رغبت اتنی پختہ ہو جائے گی کہ اپنے اختیار سے بھی باہر نکل جائے گی' لیکن اگر ابتدا ہی میں نفس کو رغبت سے الگ رکھے گا' اور اس کے موجب پر عمل نہیں کرے گا تو یہ ایسا ہو گا جیسے کوئی شخص غذا کا سلسلہ موقوف کردے' ظاہر ہے کہ اس سے جسم نحیف نزار اور کمزور ہی ہو گا یہی حال قلب کے میلان کا ہوتا

ہے جب اسے عمل کی غذا نہیں ملتی تو وہ آہستہ آہستہ کمزور ہو کر معدوم ہو جاتا ہے تمام صفات کا یہی حال ہے۔
تمام اعمال خیر' اور تمام طاعات سے آخرت مطلوب ہوتی ہے' اور تمام شرور سے دنیا مطلوب ہوتی ہے' آخرت مطلوب نہیں ہوتی' اخروی خیرات کی طرف نفس کے میلان اور دنیاوی شرور سے اس کے انحراف سے قلب ذکر و فکر کے لیے فارغ ہو جاتا ہے' لیکن اسے دوام اس وقت حاصل ہوتا ہے جب اعمال خیر اور طاعات پر مواظبت ہوتی ہے' اور اعضاء معاصی سے اجتناب کرتے ہیں' اس لیے کہ جوارح اور قلب کے درمیان ایک رشتہ ہے' اس رشتے کی بنا پر ایک کا اثر دوسرے تک پہنچتا ہے' چنانچہ جب کسی عضو میں کوئی تکلیف ہوتی ہے یا زخم لگتا ہے تو دل میں تکلیف ہوتی ہے' اور جب دل کو کسی عزیز قریب کے مرنے یا کسی خوفناک واقعے سے تکلیف ہوتی ہے تو اعضاء بھی متاثر ہوتے ہیں۔ کبھی بدن لرزنے لگتا ہے' کبھی رنگ متغیر ہو جاتا ہے' کبھی بھوک پیاس اڑ جاتی ہے' اعضاء اور دل میں صرف اس قدر فرق ہے کہ دل ایک امیر اور حاکم کی حیثیت رکھتا ہے' اور اعضاء اور دل میں صرف اس قدر فرق ہے کہ دل ایک امیر اور حاکم کی حیثیت رکھتا ہے' اور اعضاء خادم اور رعایا کی طرح ہیں' ان کی خدمت اور اطاعت سے دل کی صفات راسخ اور پختہ ہوتی ہیں۔ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ دل مقصود ہے' اور اعضاء آلات ہیں' ان کے ذریعے مقصد تک پہنچا جاتا ہے۔ چنانچہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:۔

إِنَّ فِي الْجَسَدِ مُضْغَةً إِذَا صَلُحَتْ صَلُحَ لَهَا سَائِرُ الْجَسَدِ (بخاری و مسلم۔ نعمان ابن بشیر)

جسم میں ایک لوتھڑا ہے اگر وہ صحیح ہوتا ہے تو اس کی وجہ سے تمام جسم صحیح ہوتا ہے۔

اَللّٰهُمَّ أَصْلِحِ الرَّاعِيَ وَالرَّعِيَّةَ (۱)

اے اللہ راعی اور رعیت کو درست رکھئے۔

یہاں راعی سے مراد قلب ہے' اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَاؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ (پ ۱۷ ر ۱۲ آیت ۲۷)

اللہ تعالیٰ کے پاس نہ ان کا گوشت پہنچتا ہے اور نہ ان کا خون' لیکن اس کے پاس تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے۔

تقویٰ قلب کی صفت ہے' اس لیے یہ ضروری ہوا کہ قلب کے اعمال اعضاء کی حرکات سے افضل ہوں پھر یہ ضروری ہوا کہ نیت ان سب سے افضل ہو' لیکن نیت سے مراد خیر کی طرف قلب کی رغبت اور ارادہ ہے' اور اعمال جوارح سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ قلب ارادۂ خیر کا عادی بن جائے' اور اس میں خیر کی رغبت پختہ ہو جائے تاکہ وہ دنیاوی شہوات سے خالی ہو کر ذکر و فکر میں پوری طرح منہمک ہو سکے' اعمال میں افضلیت کا مدار غرض پر ہے' اور کیوں کہ نیت سے یہ غرض حاصل ہو رہی ہے اس لیے فضیلت نیت ہی کے حق میں ہوگی۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی شخص کے معدے میں درد ہو' اور طبیب اس کے لیے معدے کے ظاہری حصے پر مالش کرنے کے لیے روغن' اور پینے کے لیے دوا تجویز کرے جو براہ راست معدے میں پہنچتی ہے' ظاہر ہے یہاں پینے والی دوا روغن مالش سے بہتر ہوگی' اگرچہ روغن سے بھی درد کا ازالہ مقصود ہے لیکن جو دوا براہ راست معدے میں پہنچ کر مؤثر ہو گی اور درد زائل کرے گی وہ زیادہ نافع قرار دی جائے گی اور مقصود کے لحاظ سے زیادہ مفید ہونے کی بنا پر اسے روغن کے مقابلے میں بہتر کہا جائے گا' یہی حال اطاعات کی تاثیر کا ہے' تمام طاعات سے قلوب کا تغیر' اور ان کے اوصاف کی تبدیلی مقصود ہے کہ پیشانی اور زمین کا اتصال ہو' بلکہ اس کا مقصد دل میں تواضع کا وصف راسخ کرنا ہے' جو شخص اپنے نفس میں تواضع پاتا ہے' جب وہ اپنے اعضاء کے ذریعے متواضعین کی صورت بناتا ہے تو نفس میں تواضع پختہ ہو جاتی ہے' اسی طرح جس شخص کے دل میں ترحم کا جذبہ ہوتا ہے اور وہ یتیم کے سر پر ہاتھ پھیرتا ہے' اور اس کی پیشانی کو بوسہ دیتا ہے تو اس عمل سے اس کی صفت ترحم مزید پختہ ہو جاتی ہے' عمل بغیر نیت کے اسی لیے قطعاً مفید نہیں ہوتا' کیوں کہ جو شخص یتیم کے سر پر ہاتھ پھیرتا ہے اور اس کا دل غافل ہوتا ہے' یا وہ

---

(۱) یہ روایت پہلے بھی گزری ہے۔

مقلب ہے کہ اس کا ہاتھ کپڑے کے اوپر ہے اس کا اثر اعضاء سے منتشر ہو کر قلب تک نہیں پہنچتا۔ اسی طرح جو شخص غفلت کے ساتھ سجدہ کرتا ہے، اور اس کا دل دنیاوی مال و متاع میں مشغول ہوتا ہے تو محض زمین پر پیشانی رکھ دینے سے دل پر کوئی اثر نہیں ہوتا، بلکہ اس طرح کے سجدوں کا ہونا نہ ہونا برابر ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ نیت کے بغیر عبادت باطل ہے، یہ بطلان بھی اس صورت میں ہے جب کہ سجدہ غفلت میں کیا ہو، اگر ریا کے طور پر کیا یا اس سے کسی شخص کی تعظیم مقصود تھی تو نہ صرف یہ کہ سجدے باطل ہوں گے بلکہ ایک اور خرابی بھی لازم آئے گی گویا جس صفت کی تاکید مقصود تھی وہ سرے سے حاصل ہی نہیں ہوئی، اور جس صفت کا ازالہ مطلوب تھا وہ اور راسخ ہو گئی۔

عمل سے نیت اسی لیے بہتر ہوتی ہے، امید ہے کہ اس تفصیل سے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کی علت بخوبی واضح ہو گئی ہوگی، اس گفتگو سے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد گرامی کی حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے:۔

مَنْ هَمَّ بِحَسَنَةٍ فَلَمْ يَعْمَلْهَا كُتِبَتْ لَهُ حَسَنَةٌ

جس شخص نے کسی نیکی کا ارادہ کیا اور اس پر عمل نہیں کیا تو اس کے لیے ایک نیکی لکھی جائے گی۔

اس لیے کہ قلب کسی نیکی کا اسی وقت ارادہ کرتا ہے جب وہ خیر کی طرف مائل ہوتا ہے، اور ہوائے نفس وحب دنیا سے انحراف کرتا ہے، اور یہ اعلیٰ درجے کی نیکی ہے، عمل کے ذریعے اس نیکی کی تکمیل اور تاکید ہو جاتا ہے، چنانچہ قربانی کا خون اس لیے نہیں بہایا جاتا کہ اللہ تعالیٰ کو گوشت یا خون مطلوب ہے، بلکہ مقصود یہ ہے کہ دل دنیا کی محبت سے خالی ہو، اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے دنیاوی مال و متاع خرچ کر سکتا ہے، اور یہ صفت اس وقت حاصل ہو جاتی ہے جب دل میں نیت اور ارادہ پیدا ہوتا ہے، اگرچہ عمل اور نیت کے درمیان کوئی رکاوٹ پیدا ہو جائے۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے:۔

لَنْ يَنَالَ اللّٰهَ لُحُومُهَا وَلَا دِمَاؤُهَا وَلٰكِنْ يَنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ (پ ۱۷ ر ۱۲ آیت ۳۷)

اللہ کے پاس نہ ان کا گوشت پہنچتا ہے اور نہ ان کا خون، لیکن اس کے پاس تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے۔

جیسا کہ روایات میں مذکور ہے تقویٰ کا محل قلب ہے، اور اس حدیث سے بھی یہی مراد ہے جو پہلے گزری ہے، اور جس میں مدینے میں مقیم کچھ ایسے افراد کا ذکر ہے جو بعض اعذار کی بنا پر سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں جہاد کے لیے سفر نہ کر سکے، لیکن انھیں بھی مجاہدین کے برابر ثواب ملا، کیوں وہ جہاد میں شرکت کی نیت رکھتے تھے، اور اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لیے شہادت پانے کے متمنی تھے، کفار و مشرکین سے برسرپیکار ہونے کے سلسلے میں جو جذبات سفر جہاد میں جانے والوں کے دلوں میں تھے بالکل وہی جذبات ان لوگوں کے دلوں میں بھی موجزن تھے جو جسموں کے ذریعے شرکت نہ کر سکے، اور شرکت نہ کرنے کے سلسلے میں جو اسباب رکاوٹ بنے وہ قلب سے خارج تھے۔ اس گفتگو سے وہ تمام احادیث سمجھ میں آجائیں گی جن میں نیت کی فضیلت وارد ہے، تمہیں ان احادیث کو ہماری گفتگو کی روشنی میں ان معانی سے مطابق کر کے دیکھنا چاہیے جو ہم نے بیان کئے ہیں انشاء اللہ تم پر ان احادیث کے اسرار منکشف ہو جائیں گے۔

نیت کے اعمال کی تفصیل : اعمال کی بہت سی قسمیں ہیں جیسے فعل، قول، حرکت و سکون، جلب منفعت، دفع مضرت اور فکر و ذکر وغیرہ یہ قسمیں اتنی زیادہ ہیں کہ ان کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا، لیکن بحیثیت مجموعی ان کی تین قسمیں کی جا سکتی ہیں، معاصی، طاعات، اور مناجات، نیت کی بنا پر ان تینوں اقسام میں جو تغیر واقع ہوتا ہے یہاں اس پر گفتگو کی جاتی ہے۔

پہلی قسم معاصی : نیت سے معاصی میں کوئی تغیر واقع نہیں ہوتا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد مبارک اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ" (اعمال کا دارومدار نیات پر ہے) سے جاہل کو یہ گمان نہ کرنا چاہیے کہ مذکورہ بالا حدیث شریف عموم پر محمول ہے، اور یہ کہ اگر نیک نیتی کے ساتھ کوئی گناہ کیا جائے تو اس پر مواخذہ نہیں ہوگا یا وہ معصیت اطاعت میں تبدیل ہو جائے

گی' اگر کوئی شخص ایسا سوچتا ہے تو یہ اس کی بہت بڑی غلطی ہے' مثلاً ایک شخص کی دل جوئی کے لیے کسی دوسرے کی غیبت کرنا' یا کسی فقیر کو غیر کا مال دیدینا' یا حرام مال سے مسجد' مدرسہ اور سرائے تعمیر کرانا' اور یہ سمجھنا کہ میں اچھے کام کر رہا ہوں' اور مجھے ان پر ثواب عطا کیا جائے گا۔ یہ تمام باتیں جہالت کی ہیں' نیت سے کوئی ظلم انصاف میں نہیں بدلتا' اور نہ حرمت حلت میں تبدیل ہوتی ہے' بلکہ مقتضائے شرع کے خلاف ان اعمال پر خیر کی نیت کرنا ایک الگ معصیت ہوگی' اور اس پر دوہرا عذاب ہوگا' اگر کوئی شخص جان بوجھ کر ایسا کرتا ہے تو اسے شریعت کا مخالف' معاند اور دشمن تصور کیا جائے گا' اور اگر نادانستگی میں اس سے یہ فعل سرزد ہوتا ہے تو اسے جہالت کی معصیت کا مرتکب قرار دیا جائے گا۔ کیوں کہ علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔

شریعت ہمیں خیر و شر کا فرق بتلاتی ہے' اور ان اعمال کی نشاندہی کرتی ہے جو خیر ہیں' یا شر ہیں دونوں میں بڑا فرق ہے' پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ شر خیر میں بدل جائے' اصل میں آدمی کے دل میں مخفی شہوتیں' اور باطنی خواہشات اس طرح کے خیالات پیدا کرتی ہیں' جب وہ جاہ کا طالب ہوتا ہے' اور یہ چاہتا ہے کہ لوگوں کے قلوب اپنی طرف مائل کرے تو شیطان اس موقع سے بڑا فائدہ اٹھاتا ہے' اور اس کے دل میں یہ خیال القا کرتا ہے کہ اگر نیت اچھی رکھی جائے تو برے اعمال بھی اچھے ہو جاتے ہیں' اسی لیے حضرت سہل تستری فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ کی کوئی معصیت جہالت کی معصیت سے بڑھ کر نہیں ہے' لوگوں نے عرض کیا اے ابو محمد! کیا آپ کوئی ایسی چیز بھی جانتے ہیں جو جہل سے بڑی ہو' فرمایا اپنی جہالت سے جاہل ہونا جہل سے بھی سخت تر معصیت ہے سہل تستری کا یہ ارشاد برحق ہے' اس لیے کہ جہل کی جہالت تعلیم و تعلم کا دروازہ قطعی طور پر مسدود کر دیتی ہے۔ چنانچہ جو شخص اپنے بارے میں اس غلط فہمی کا شکار ہے کہ وہ تعلیم یافتہ ہے وہ علم کیوں حاصل کرے گا؟ اسی طرح علم کو خدا تعالیٰ کی اطاعت کا وسیلہ بنانا تمام اطاعتوں میں افضل ہے' اور علم کا علم اصل علم ہے جیسے جہل کا جہل اصل جہل ہے' جو شخص یہ نہیں جانتا کہ علم نافع کیا ہے اور علم ضار کیا ہے وہ انہی علوم میں مشغول ہوتا ہے جن میں لوگ مصروف ہیں' اور وہ لغو علوم ہیں' جو صرف دنیا کا وسیلہ بن سکتے ہیں' آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہے' ان لغو اور بیکار علوم میں مشغول ہونا جہالت کی اصل' اور فساد عالم کا نقطۂ آغاز ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اگر کوئی شخص جہالت کی وجہ سے معصیت کا ارتکاب کرے اور خیر کی نیت کرے تو اس کا یہ عذر تسلیم نہیں کیا جائے گا کہ وہ جاہل ہے' تاہم اگر کوئی شخص نیا نیا اسلام میں داخل ہوا ہو اور اسے علم دین سیکھنے کی مہلت نہ ملی ہو تو اس کا عذر قابل قبول ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

فَاسْئَلُوْا أَهْلَ الذِّكْرِ إِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ۔ (پ ۱۴ ر ۱۲ آیت ۴۳)

سو اگر تم کو علم نہیں تو اہل علم سے پوچھ لو۔

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں۔

لَا يُعْذَرُ الْجَاهِلُ عَلَى الْجَهْلِ، وَلَا يَحِلُّ لِلْجَاهِلِ أَنْ يَسْكُتَ عَلَى جَهْلِهِ وَلَا لِلْعَالِمِ أَنْ يَسْكُتَ عَلَى عِلْمِهِ (طبرانی' ابونعیم۔ جابر)

جاہل اپنے جہل پر معذور نہیں سمجھا جائے گا' اور نہ جاہل کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ اپنے جہل پر خاموش رہے اور نہ عالم کے لیے جائز ہے کہ وہ اپنے علم پر سکوت اختیار کرے۔

جس طرح حرام مال سے مسجدیں اور مدرسے بنوا کر بادشاہوں اور حکمرانوں کا تقرّب حاصل کرنا ممنوع ہے اسی طرح یہ بھی ممنوع ہے کہ ہمارے علماء ان لوگوں کو اللہ کا پاکیزہ دین سکھلائیں جو بے وقوف ہوں' شرارت پسند ہوں' فسق و فجور میں مبتلا ہوں' اور ان کا مطمح نظر یہ ہو کہ وہ علماء حق سے مجادلہ کریں' فقہاء کو بہکائیں' لوگوں کی غیر شرعی امور میں دلدہی کریں' بادشاہوں' یتیموں اور مسکینوں کے مال و متاع پر نظر رکھیں' اس لیے کہ ایسے لوگ علم سیکھ کر اللہ تعالیٰ کی راہ کے ڈاکو بن جاتے ہیں' اور دجال کے نائب بن کر اپنے شہروں میں اس قدر فساد بپا کرتے ہیں کہ شیطان شرمانے لگتا ہے' یہ لوگ نفسانی خواہشات کے اسیر ہوتے ہیں'

تقویٰ سے دور ہوتے ہیں' جو لوگ انھیں دیکھتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کی معصیت پر جری ہو جاتے ہیں' اور جو ان سے علم حاصل کرتے ہیں وہ بھی استاد کی اتباع کرتے ہیں اور ان کے نقش قدم پر چل کر اس سلسلۂ فساد کو دراز کرنے کا باعث بنتے ہیں' اور اپنے علم کو شر کا وسیلہ بناتے ہیں' بعد میں آنے والوں کا تمام وبال اسی شخص پر رہتا ہے جو ان سب کا متبوع اور معلم اول ہے جس نے اپنی فساد نیت کے باوجود انھیں علم سکھلایا' اور اپنے اقوال' افعال' لباس' طعام اور مسکن میں خدا تعالیٰ کی نافرمانی کا مشاہدہ کرکے انھیں معصیت میں مبتلا کرتا ہے' یہ عالم مرجاتا ہے لیکن اس کے آثار دنیا میں ہزاروں سال تک منتشر رہتے ہیں' وہ شخص نہایت خوش قسمت ہے جس کے ساتھ اس کے گناہ بھی مرجائیں۔

حیرت ہے ایسے علماء یہ کہتے ہیں کہ ہماری نیت صحیح ہے' اعمال کا مدار نیتوں پر ہے' ہم تو علم دین پھیلانا چاہتے ہیں' اب اگر کوئی شخص اسے غلط مقاصد کے لیے استعمال کرتا ہے' اور وسیلۂ فساد بناتا ہے' یا ہم سے علم حاصل کرکے خود گمراہ ہوتا ہے' یا دوسروں کو گمراہ کرتا ہے تو اس میں ہمارا کیا قصور ہے' گناہ گار وہ ہے' ہم نہیں ہیں' ہماری نیت تو یہ ہے کہ وہ ہمارے سکھلائے ہوئے دین سے راہ خیر پر مدد لے۔ ان علماء کا یہ عذر صحیح نہیں ہے' بلکہ ان کی جاہ طلبی' خواہش اقتدار' اور جذبہ حب ریاست پر دلالت کرتا ہے' وہ مخدوم بننا چاہتے ہیں' انھیں اپنے علم کی زیادتی پر تکبر ہے' شیطان ان امور کو اس پرانے فریب سے مشتبہ کردیتا ہے' لیکن کیا یہ لوگ ہمارے اس سوال کا جواب دے سکتے ہیں کہ اگر کوئی شخص کسی راہزن کو تلوار دے' گھوڑا اور دوسرے تمام لوازمات مہیا کرے' اور اسے اس کے مقصود پر پوری مدد دے' اور یہ کہے کہ میں سخاوت کی نیت سے دے رہا ہوں' اور سخاوت ان اخلاق کریمہ میں سے ہے جو اللہ تعالیٰ کو محبوب ہیں' اور میں یہ چاہتا ہوں کہ یہ شخص اس تلوار سے' اور اس گھوڑے سے اور جو کچھ ساز و سامان میں نے اسے دیا ہے اس سے جہاد فی سبیل اللہ میں مدد لے۔ ظاہر ہے اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والوں کو اگر یہ سامان دیا جائے تو اس میں بڑا ثواب ہے' اب اگر وہ شخص اس سامان کو رہزنی میں استعمال کرے تو یہ اس کا قصور ہے' وہ خود اس کی سزا بھگتے گا؟ ظاہر ہے ہر صاحب علم اس کا جواب یہی دے گا کہ اس شخص کا عمل غلط ہے' کیونکہ تمام فقہاء بالاتفاق رہزنوں کو رہزنی کے وسائل مہیا کرنے کو حرام کہتے ہیں' اگرچہ سخاوت اللہ تعالیٰ کا سب سے زیادہ محبوب خلق ہے' جیسا کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:۔

إِنَّ لِلّٰهِ تَعَالَىٰ ثَلٰثَمِائَةِ خُلُقٍ مَنْ تَقَرَّبَ إِلَيْهِ بِوَاحِدٍ مِنْهَا دَخَلَ الْجَنَّةَ وَاَحَبُّهَا إِلَيْهِ السَّخَاءُ (۱)

اللہ تعالیٰ کے تین سو اخلاق ہیں جو شخص ان میں سے کسی ایک سے بھی تقرب حاصل کرتا ہے وہ جنت میں جاتا ہے' ان میں اللہ تعالیٰ کا محبوب ترین خلق سخاوت ہے۔

اس کے باوجود سخاوت کو حرام قرار دیا' اور یہ ضروری قرار دیا کہ پہلے اس شخص کے حال کا قرینہ دیکھ لیا جائے جو تمہاری سخاوت کا مستحق بن رہا ہے' اگر تم یہ جان گئے ہو کہ وہ رہزن ہے' اور ہتھیار لے کر رہزنی کرے گا تو تم پر اس کا ہتھیار چھیننا واجب ہے بجائے اس کے کہ تم اسے اور مسلح کرو' علم بھی ایک ہتھیار ہے' اس کی مدد سے شیطان کا خون کیا جاتا ہے' اور دشمنان خدا کی زبانیں خاموش کی جاتی ہیں' بعض اوقات اہل علم اپنی نفسانی خواہشات کے باعث دشمنان خدا کی مدد کر بیٹھتے ہیں' علم سکھلانے سے پہلے تمہیں یہ دیکھ لینا چاہیے کہ وہ شخص اس کا اہل ہے یا نہیں' اگر کوئی شخص دنیا کو دین پر ترجیح دیتا ہو' اور نفسانی خواہشات کے حصول دنیا اور تکمیل خواہشات کا وسیلہ بنالے۔ پہلے زمانے کے بزرگوں کا طریقہ یہ تھا کہ وہ اپنے مسترشدین' تلامذہ' اور مجالس میں آمد و رفت رکھنے والوں کے حالات کا تفحص کرتے تھے' اور ان کے کردار کے نگراں رہتے تھے' اگر کبھی کسی سے نفل میں بھی

---

(۱) یہ روایت کتاب المحبت والشوق میں گذری ہے۔

کوئی غلطی سرزد ہو جاتی تو اس کا اعتبار چھوڑ دیتے تھے' خاطرداری اور تعظیم ترک کردیتے تھے' اور اگر یہ دیکھتے کہ وہ شخص بدکاری کا مرتکب ہوا ہے' یا حرام کھاتا ہے تو اسے اپنی مجلس سے نکال دیتے تھے' اور اس سے اپنا ہر تعلق منقطع کرلیا کرتے تھے' چہ جائیکہ اس بدقماش اور بداطوار شخص کو علم دین کے ہتھیار سے مسلح کرتے' کیونکہ وہ جانتے تھے کہ جو شخص کوئی مسئلہ سیکھتا ہے' اور اس پر عمل نہیں کرتا' اور اسے غیر کا ذریعہ بناتا ہے' وہ علم کو صرف وسیلۂ شر بنانا چاہتا ہے' اکابرین سلف بدکار علماء سے پناہ مانگتے تھے' جاہل بدکاروں سے انہوں نے پناہ نہیں مانگی۔

حضرت امام احمد ابن حنبل کی خدمت میں ایک شخص اکثر حاضری دیا کرتا تھا' ایک مرتبہ وہ شخص آیا تو آپ نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی' بلکہ اس سے اعراض فرمایا' اور منہ پھیرلیا' اس شخص نے اعراض کا سبب دریافت کیا' آپ نے کافی اصرار کے بعد بتایا کہ میں نے سنا ہے تو نے اپنے گھر کی دیوار اپنے قد کے برابر بلند کرلی ہے' اور سڑک سے مٹی لی ہے جو مسلمانوں کی ملکیت ہے اس لیے اب تیرے لیے یہ جائز نہیں کہ تو علم کی نقل میں مشغول ہو' بزرگان سلف اپنے تلامذہ کے احوال پر اس طرح نظر رکھتے تھے' یہ امور شیطان پر' اور اس کے متبعین پر مخفی رہتے ہیں' اگرچہ وہ سر سے پیر تک عبائیں زیب تن کئے ہوئے ہیں' اور ان کی آستینیں نہایت کشادہ ہیں زبانیں دراز ہیں' خوش گلو اور خوش گفتار ہیں' علم کے خزانے رکھتے ہیں' اگرچہ ان کے پاس وہ علوم نہیں جن سے مخلوق خدا کو دنیا سے ڈرایا جاتا ہے' اور آخرت کی ترغیب دی جاتی ہے' البتہ ان کے پاس ان علوم کے وافر خزانے موجود ہیں جو دنیا میں مروّج ہیں' اور جن کے ذریعے حرام مال جمع کیا جاتا ہے' اور لوگوں سے احترام کرایا جاتا ہے' ہمسروں اور ہم عصروں پر برتری حاصل کی جاتی ہے۔

اس تمام گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ معاصی سے حدیث "اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَاتِ" کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ بلکہ اعمال کی باقی دو قسموں طاعات اور مباحات سے ہے۔ کیوں کہ طاعت نیت سے معصیت بن جاتی ہے' اسی طرح مباح عمل بھی نیت سے معصیت اور طاعت بن جاتا ہے' لیکن معصیت نیت سے اطاعت نہیں بنتی' البتہ معصیت میں نیت کی تاثیر اس کے برعکس ہے' اور وہ یہ ہے کہ جو شخص معصیت سے خیر کی نیت کرتا ہے اسے معصیت کا گناہ الگ ہوتا ہے' اور نیت کا وبال الگ۔ اس کا بیان کتاب التوبہ میں گذر چکا ہے۔

دوسری قسم۔ طاعات : طاعات میں نیت کا دو باتوں سے تعلق ہے' ایک اصول صحت سے' اور دوسرے ثواب کی زیادتی سے۔ اصل صحت میں نیت کے معنی یہ ہیں کہ عمل سے اللہ تعالیٰ کی عبادت کی نیت کرے' اس کے علاوہ کسی شئے کی نیت نہ کرے' چنانچہ اگر کسی نے عبادت سے ریاء کی نیت کی تو وہ معصیت بن جائے گی اور ثواب کی زیادتی کی صورت یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ اچھی نیتیں کرے' ایک عمل سے بہت سی نیتیں کی جاسکتی ہیں' ہر نیت کا ثواب الگ ہوگا' کیوں کہ ہر نیت بجائے خود نیکی ہوگی' پھر ہر نیکی کا اجر دس گنا ہوگا' جیسا کہ حدیث شریف میں اس کی خوشخبری دی گئی ہے' مثال کے طور پر مسجد میں بیٹھنا ایک عبادت ہے' اس عبادت میں بہت سی نیتیں کی جاسکتی ہیں' یہاں تک کہ اس کا یہ عمل متقین کے فضائل اعمال میں شامل ہو جائے' اور وہ متقین کے درجات حاصل کرسکے چنانچہ ایک نیت یہ کی جاسکتی ہے کہ مسجد اللہ کا گھر ہے' اور اس میں داخل ہونے والا خدا کا زائر ہے' چنانچہ وہ مسجد میں بیٹھنے سے زیارت الٰہی کی نیت بھی کرے۔ اس وعدے کی امید پر جو اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا ہے' فرمایا:۔

مَنْ قَعَدَ فِي الْمَسْجِدِ فَقَدْ زَارَ اللّٰهَ تَعَالٰى وَحَقٌّ عَلَى الْمَزُوْرِ إِكْرَامُ زَائِرِهِ۔ (ابن حبان۔ سلمان)

جو شخص مسجد میں بیٹھا اس نے اللہ تعالیٰ کی زیارت کی' زیارت کئے جانے والے پر ضروری ہے کہ وہ زائر کا اعزاز کرے۔

دوسری یہ کہ ایک نماز کے بعد دوسری نماز کی نیت کرے' کیوں کہ نماز کے انتظار میں بیٹھنے کا ثواب ایسا ہی ہے جیسے نماز کا ثواب۔ قرآن کریم میں کلمۂ رابطوا سے یہی مراد ہے' تیسری نیت یہ کرے کہ میں فواحش سے کان اور آنکھ اور دیگر اعضاء کو محفوظ رکھتا ہوں' اعتکاف بھی روزے کی طرح ایک عبادت ہے' اور اس میں ایک طرح کی رہبانیت پائی جاتی ہے' جیسا کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:۔

رَهْبَانِيَّةُ أُمَّتِي الْقُعُوْدُ فِي الْمَسَاجِدِ (۱)

میری امت کی رہبانیت مساجد میں بیٹھنا ہے۔

چوتھی نیت یہ کرے کہ میں اپنی ہمت کو اللہ تعالیٰ پر' اور آخرت کی فکر پر مجتمع کرتا ہوں' اور جو امور ذکر الٰہی اور ذکر آخرت سے مانع ہیں ان کے تصور سے بھی دور رہنا چاہتا ہوں' پانچویں نیت اللہ تعالیٰ کے ذکر کے لیے تنہائی کی کرے' خواہ ذکر کرنے میں مشغول ہو' یا ذکر سننے میں' یا اس کی یاد میں مستغرق ہو' ایک حدیث میں ہے:۔

مَنْ غَدَا إِلَى الْمَسْجِدِ لِيَذْكُرَ اللّٰهَ تَعَالٰى أَوْ يُذَكِّرَ بِهِ كَانَ كَالْمُجَاهِدِ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (۲)

جو شخص اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے کے لیے' یا اس کے ذکر کی نصیحت کرنے کے لیے مسجد میں جائے وہ اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والوں کی طرح ہے۔

چھٹی نیت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ہو سکتی ہے' چنانچہ مسجدوں میں ایسے لوگ ہوتے ہیں جو نماز میں غلطی کرتے ہیں' یا ایسی حرکتوں کے مرتکب ہوتے ہیں جن کا مساجد میں ارتکاب کرنا جائز نہیں ہوتا' ایسے لوگوں کو راہ راست کی ہدایت کی جاسکتی ہے' اور انہیں صحیح طریقے بتلائے جاسکتے ہیں' یہ بھی ایک خیر ہے' جب تک وہ اس کے بتلائے ہوئے راستے پر گامزن رہے گا' بتلانے والے کو بھی اجر و ثواب ملتا رہے گا' ساتویں نیت کسی دینی بھائی سے کچھ سیکھنے کی بھی ہو سکتی ہے' مساجد میں عام طور پر ایسے لوگ جاتے ہیں جو دیندار ہوں' اللہ تعالیٰ سے محبت کرنے والے' اور اس کے لیے رشتۂ صداقت استوار کرنے والے ہوں' اگر مسجد میں جانے والا ان لوگوں سے استفادے کی نیت کرے تو یہ اس کے حق میں غنیمت اور ذخیرہ ہوگا' آٹھویں نیت اس صورت سے کرے کہ اللہ تعالیٰ کی شرم میں گناہ چھوڑ دے' اور یہ سوچے کہ اللہ تعالیٰ کے گھر میں کوئی ایسی بات نہ ہونی چاہیے جو اس کے حرمت اور تقدس کے منافی ہو' حسن ابن علی بصریؒ کہتے ہیں جو شخص بکثرت مسجدوں میں آتا جاتا ہے اسے اللہ تعالیٰ سات خصلتوں میں سے ایک خصلت ضرور عنایت کرتا ہے' یا تو اسے کوئی ایسا بھائی ملتا ہے جس سے وہ دین کے معاملات میں رہنمائی حاصل کرسکے' یا اس پر رحمت نازل ہوتی ہے' یا کوئی عجیب علم حاصل ہوتا ہے یا ایک کوئی ایسا کلمہ سیکھتا ہے جو اسے ہدایت کی راہ بتلائے' یا اسے برائی سے روکے' یا وہ اللہ کے خوف سے یا اس کی حیاء سے گناہ ترک کرتا ہے۔ کسی ایک عبادت میں بہت سی نیتیں کرنے کا یہ طریقہ ہے' اسی ایک مثال پر باقی تمام عبادتوں اور طاعتوں کو قیاس کیا جاسکتا ہے' کوئی اطاعت ایسی نہیں ہے جس میں بہت سی نیتیں نہ کی جاسکتی ہوں' بلکہ بندہ طلب خیر میں جس قدر کوشش کرتا ہے' اور راہ حق میں جس قدر تیز گامی سے چلتا ہے' اور امور آخرت میں جتنا فکر کرتا ہے اسی قدر اس کے دل پر نیات منکشف ہوتی ہے' اور ان نیتوں سے اس کے اعمال پاکیزہ ہوتے ہیں' اور نیکیاں بڑھتی ہیں۔

تیسری قسم۔ مباحات : کوئی مباح فعل ایسا نہیں ہے جو ایک یا ایک سے زائد نیتوں کا متحمل نہ ہو' اور ان نیتوں کی بنا پر

---

(۱) مجھے اس روایت کی اصل نہیں ملی۔

(۲) کعب ابن الاحبار کا ایک قول اسی مضمون کا نقل کیا گیا ہے' البتہ صحیحین میں ابو امامہ وغیرہ کی روایتیں اس سے ملتی جلتی ہیں۔

بہترین عمل بننے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو' اور فاعل کو اعلیٰ درجات کا مستحق نہ بناتا ہے' کس قدر عظیم خسارے میں ہے وہ شخص جو نیتوں سے غافل رہے' اور مباح افعال اس طرح انجام دیتا رہے جس طرح بہائم انجام دیتے ہیں' بندے کے لیے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ کسی خیال' فکر' اقدام' حرکت اور لمحے کو حقیر جانے' قیامت کے دن ہر چیز کے بارے میں سوال کیا جائے گا کہ اس نے فلاں کام کیوں کیا' اور اس کام سے اس کا قصد وارادہ کیا تھا۔ یہ محاسبہ ان مباح امور میں ہوگا جن میں کراہت کا شائبہ بھی نہیں ہوتا۔ اسی لیے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

حَلَالُهَا حِسَابٌ وَحَرَامُهَا عِقَابٌ (۱)

اس کے حلال میں حساب ہے اور اس کے حرام میں عذاب ہے۔

حضرت معاذ ابن جبل کی روایت میں ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:۔

إِنَّ الْعَبْدَ لَيُسْأَلُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَنْ كُلِّ شَيْءٍ حَتَّى عَنْ كُحْلِ عَيْنَيْهِ وَعَنْ فُتَاتِ الطِّينَةِ بِإِصْبَعَيْهِ وَعَنْ لَمْسِهِ ثَوْبَ أَخِيهِ (۲)

قیامت کے روز بندے سے ہر چیز کے بارے میں سوال کیا جائے گا یہاں تک کہ آنکھ کے سرمے کے متعلق بھی' اور انگلیوں سے مٹی کریدنے کے بارے میں بھی' اور اپنے بھائی کا کپڑا چھونے کے بارے میں بھی۔

ایک حدیث میں ہے کہ جو شخص اللہ کے لیے خوشبو لگائے گا وہ قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ اس کی خوشبو مشک سے زیادہ عمدہ ہوگی' اور جو شخص غیر اللہ کے لیے خوشبو لگائے گا اس کی یہ خوشبو مردار کی بدبو سے بھی زیادہ کریہہ ہوگی' دیکھئے خوشبو لگانا مباح ہے' لیکن اس میں بھی نیت ضروری ہے' اب اگر یہ کہا جائے کہ خوشبو میں کیا نیت کی جاسکتی ہے' یہ تو نفس کی لذتوں میں سے ایک لذت ہے' آدمی اللہ کے لیے خوشبو کیسے لگائے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جو شخص جمعہ کے دن مثلاً یا کسی اور وقت میں خوشبو لگاتا ہے اسکا مقصد یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ دنیاوی لذات سے راحت پائے' یا اپنے مال کی کثرت پر فخر کا مظاہرہ کرے تاکہ ہم عصر مرعوب ہوں' یا لوگوں کو دکھلانا مقصد ہو تاکہ ان کے دلوں میں اس کی عظمت اور احترام پیدا ہو' اور جہاں کہیں اس کا ذکر ہو لوگ خوشبو کے حوالے سے اسے یاد کریں' یا یہ مقصد ہوسکتا ہے کہ نامحرم اجنبی عورتوں میں مقبول ہوجائے' اگر ان کی طرف دیکھنا جائز سمجھتا ہو' اسی طرح اور بہت سے مقاصد ہوسکتے ہیں' یہ تمام مقاصد خوشبو لگانے کے عمل کو معصیت بنادیتے ہیں' اور اس طرح وہ خوشبو قیامت کے دن مردار کی بدبو سے زیادہ کریہہ ہوگی' سوائے پہلے مقصد کے' یعنی محض تلذذ پانا اور راحت حاصل کرنا یہ معصیت نہیں ہے' لیکن اس کا حساب بھی ہوگا' اور جس سے حساب کیا جائے گا اسے عذاب دیا جائے گا' اور جو شخص دنیا میں مباحات اختیار کرے گا اسے آخرت میں عذاب نہیں دیا جائے گا لیکن ان مباحات کے بقدر اس کی اخروی نعمتیں کم کردی جائیں گی' اس سے بڑا نقصان اور کیا ہوسکتا ہے کہ جو چیز فنا ہونے والی ہے وہ تم حاصل کرلو' اور جو باقی رہنے والی ہے اس سے محروم رہ جاؤ' خوشبو لگانے میں اچھی نیتیں یہ ہوسکتی ہیں کہ جمعہ کے دن سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کی نیت کرے' اور مسجد کی تعظیم' اور اللہ تعالیٰ کے گھر کے احترام کی نیت کرے اور یہ سوچے کہ اللہ تعالیٰ کے گھر کی زیارت کرنے والے کو خوشبو لگائے بغیر مسجد میں داخل نہ ہونا چاہیے یا یہ نیت کرے کہ میں خوشبو لگا کر اپنے قریب بیٹھنے والوں کو راحت پہنچانا چاہتا ہوں' یا میں خود اپنے نفس کو بدبو سے محفوظ کرنا چاہتا ہوں' یا میرا مقصد یہ ہے کہ میرے پاس بیٹھنے والے میرے جسم کی بدبو سے اذیت نہ پائیں یا یہ نیت کرے کہ میں لوگوں کو غیبت کے گناہ سے باز رکھنا چاہتا ہوں کیوں کہ جب وہ میری بدبو سے اذیت پائیں گے تو میری برائی کریں

---

(۱) یہ روایت پہلے گذر چکی ہے (۲) اس کی سند مجھے نہیں ملی

گے' اور گنہگار رہوں گے' میں چاہتا ہوں کہ لوگ میرے باعث اللہ کی نافرمانی کے مرتکب نہ ہوں۔ ایک شاعر کہتا ہے۔

إِذَا تَرَحَّلْتَ عَنْ قَوْمٍ وَقَدْ قَدَرُوا أَنْ لَا تُفَارِقَهُمْ فَالرَّاحِلُونَ هُمُ

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ فَيَسُبُّوا اللَّهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ (پ ۷ ر ۱۹ آیت ۱۰۸)

اور گالی مت دو ان کو جن کی یہ لوگ خدا کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہیں پھر وہ لوگ براہ جہل حد سے گزر کر اللہ تعالیٰ کی شان میں گستاخی کریں گے۔

اس آیت کریمہ میں بتلایا گیا ہے کہ شر کا سبب ہونا بھی شر ہے' خوشبو لگانے والے کو چاہیے کہ وہ اپنے دماغ کی نیت کرکے خوشبو لگائے تاکہ ذہانت اور ذکاوت میں زیادتی ہو' دینی مسائل کا سمجھنا سہل ہو اور ان میں آسانی کے ساتھ غور و فکر کرسکے' چنانچہ حضرت امام شافعی ارشاد فرماتے ہیں کہ جس کی خوشبو عمدہ ہوتی ہے اس کی عقل بھی تیز ہوتی ہے' جس شخص پر فکر آخرت غالب ہوتی ہے اور وہ خیر کا طالب ہوتا ہے' یا دنیا سے اعراض کرکے آخرت کی تجارت کرنا چاہتا ہے وہ اس طرح کی نیتوں کے ذریعے نہ صرف یہ کہ گناہوں سے محفوظ رہ سکتا ہے بلکہ اپنے اجر و ثواب میں اضافہ کا سبب بھی بن سکتا ہے لیکن اگر دل پر دنیاوی خواہشات اور لذات کا غلبہ ہوتا ہے تو اس طرح کی نیتوں کا تصور بھی نہیں آتا' اگر کوئی شخص یاد بھی دلاتا ہے تب بھی دل میں خیال نہیں آتا' اور اگر کوئی بھولے سے اس طرح کی نیتیں کر بھی لیتا ہے تو ان کی اہمیت "منظرات" سے زیادہ نہیں ہوتی' بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ انھیں نیت کہا ہی نہیں جاسکتا۔ مباح اعمال بے شمار ہیں اور ان میں بہت سی نیتیں ہوسکتی ہیں' ہم نے ایک مباح عمل کی مثال دی ہے' باقی تمام اعمال کو اسی پر قیاس کیا جاسکتا ہے۔

ایک صاحب معرفت بزرگ فرماتے ہیں میرا دل چاہتا ہے کہ میں اپنے تمام اعمال میں ایک نیت کرلیا کروں' یہاں تک کہ کھانے' پینے' سونے' قضائے حاجت کرنے اور دوسرے تمام اعمال میں میری ایک نیت ہو' اور وہ نیت تقرّب الی اللہ کی ہوسکتی ہے' یہ تمام اعمال بدن کی حفاظت کرتے ہیں' اور بدن کی سلامتی سے دل تمام تفکرات سے خالی رہتا ہے' اور اللہ تعالیٰ کے ذکر و فکر کے لیے فارغ رہتا ہے' مثال کے طور پر اگر کوئی شخص کھانے سے عبادت پر قوت حاصل کرنے کی نیت کرے' اور صحبت سے یہ نیت کرے کہ دین صحیح رہے' اور بیوی کا دل خوش ہو' اور اولاد صالح پیدا ہو تاکہ میرے بعد اللہ کی عبادت کرے' اور اس سے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں اضافہ ہو' اگر کسی شخص کی کھانے یا جماع کرنے سے یہ نیت ہو تو اس کے یہ دونوں عمل اطاعت قرار دیئے جائیں گے' نفسانی حظوظ میں کھانا اور جماع کرنا ہی سرفہرست ہیں اور جس شخص کے دل پر فکر آخرت کا غلبہ ہو اس کے لیے ان دونوں میں خیر کی نیت کرنا مشکل نہیں ہے' اسی طرح اگر کسی کا مال ضائع ہوجائے وہ بھی یہ نیت کرسکتا ہے کہ یہ مال اللہ کی راہ میں ہے اگر یہ سنے کہ فلاں شخص میری غیبت کرتا ہے تو اس کا اسوہ نہ اپنائے بلکہ دل میں خوش ہو' اور یہ کہے کہ وہ شخص میرا محسن ہے کہ اپنی نیکیاں میرے نامۂ اعمال میں جمع کررہا ہے۔ ایک حدیث میں ہے۔

إِنَّ الْعَبْدَ لَيُحَاسَبُ فَتَبْطُلُ أَعْمَالُهُ لِدُخُولِ الْآفَةِ فِيهَا حَتَّى يَسْتَوْجِبَ النَّارَ، ثُمَّ يُنْشَرُ لَهُ مِنَ الْأَعْمَالِ الصَّالِحَةِ مَا يَسْتَوْجِبُ بِهِ الْجَنَّةَ فَيَتَعَجَّبُ وَيَقُولُ يَارَبِّ هٰذِهِ أَعْمَالٌ مَا عَمِلْتُهَا قَطُّ، فَيُقَالُ هٰذِهِ أَعْمَالُ الَّذِينَ اغْتَابُوكَ وَآذَوْكَ وَظَلَمُوكَ

(ابو منصور دیلمی۔ ثیث ابن سعد البلوی)

بندہ کا محاسبہ کیا جائے گا اور اس کے اعمال کسی آفت کے باعث باطل قرار دے دیئے جائیں گے' یہاں تک کہ اس کے لیے دوزخ واجب کردی جائے گی' پھر اس کے لیے ان اعمال کا دفتر کھولا جائے گا جس سے وہ

جنت کا مستحق ٹھہرے گا' اس پر وہ تعجب کرے گا' اور کہے گا یا اللہ! یہ اعمال میں نے بالکل نہیں کئے' اس سے کہا جائے گا یہ ان لوگوں کے اعمال ہیں جنہوں نے تیری غیبت کی' تجھے تکلیف پہنچائی' اور تیرے اوپر ظلم کیا۔

ایک حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن بندہ پہاڑوں کے برابر نیکیاں لے کر آئے گا' اگر وہ نیکیاں اس کے لیے خالص ہوں تو جنت میں داخل ہو جائے' لیکن وہ اس حال میں آئے گا کہ اس نے اس پر ظلم کیا ہے' اسے برا کہا ہے' اس شخص کو گالیاں دی ہیں' ان تمام لوگوں کو اس کی نیکیاں عوض میں دی جائیں گی' یہاں تک کہ اس کے پاس کوئی نیکی باقی نہیں رہے گی' فرشتے کہیں گے اس کے نیکیاں ختم ہو چکی ہیں' اور مطالبہ کرنے والے بہت ہیں' اللہ تعالیٰ فرمائے گا ان کے گناہ اس شخص پر ڈال دو' اور اس کے لیے دوزخ کے نام ایک رقعہ لکھ دو۔ (۱) خلاصۂ کلام یہ ہے کہ تمہیں اپنے کسی بھی فعل کو حقیر نہ سمجھنا چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ تم کسی حرکت کو معمولی تصور کرو' اور اس کا شر زیادہ ہو' اور تم قیامت کے دن اس کی باز پرس سے محفوظ نہ رہ سکو' اللہ تعالیٰ تمہارے ہر عمل کا نگراں' اور تمہارے ہر راز پر مطلع ہے۔ قرآن کریم میں ہے۔

مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ (پ۲۶ر۱۶ آیت ۱۸)

وہ کوئی لفظ زبان سے نہیں نکالنے پاتا مگر اس کے پاس ہی ایک تاک لگانے والا تیار ہے۔

ایک بزرگ کہتے ہیں کہ میں نے ایک خط لکھا اور یہ ارادہ کیا کہ اس پر پڑوسی کی دیوار سے مٹی لے کر ڈال دوں' تاکہ روشنائی خشک ہو جائے' مگر میرا دل نہیں مانا' لیکن پھر یہ خیال آیا کہ مٹی ایک حقیر شئے ہے' اسے لینے میں کیا حرج ہے' چنانچہ میں نے مٹی لی' اور خط کے اوپر ڈال دی' اسی وقت پردۂ غیب سے یہ آواز آئی' جو شخص مٹی کو حقیر سمجھتا ہے وہ قیامت کے دن اس کا عذاب پائے گا' ایک شخص نے حضرت سفیان ثوری کے ساتھ نماز پڑھی' اس نے دیکھا کہ آپ الٹا کپڑا پہنے ہوئے ہیں' اس نے آپ کی توجہ اس طرف مبذول کرائی' آپ نے سیدھا کرنے کے لیے ہاتھ بڑھایا اور ایک دم روک لیا' اس شخص نے پوچھا آپ کپڑا سیدھا کرتے کرتے کیوں رک گئے' آپ نے فرمایا میں نے یہ کپڑے اللہ تعالیٰ کے لیے پہنے ہیں' پھر میں غیر کے لیے انہیں کیوں سیدھا کروں' حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ قیامت کے دن ایک شخص دوسری شخص کا دامن پکڑ کر کہے گا کہ میرے اور تیرے درمیان اللہ ہے وہ کہے گا بخدا میں تجھ سے واقف نہیں ہوں' پہلا شخص کہے گا تو مجھے کیسے نہیں جانتا تو نے میری دیوار سے ایک اینٹ لی تھی' اور میرے کپڑے میں سے ایک دھاگا کھینچا تھا یہ اور اس طرح کی روایات اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والوں کے دل ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی ہیں اگر تم حوصلہ مند اور عقل والے ہو' اور ان لوگوں میں سے نہیں ہو جو فریب کھاتے ہیں تو اپنے احوال پر نظر رکھو' اور اپنے نفس کا باریک بینی سے احتساب کرتے رہو' اس سے پہلے کہ باریکی کے ساتھ تمہارا مواخذہ ہو اور تمہارے احوال کی چھان بین کی جائے تمہیں اپنی ہر حرکت اور ہر سکون سے پہلے یہ غور کرنا چاہیے کہ تم متحرک کیوں ہونا چاہتے ہو تمہاری نیت کیا ہے اور تمہیں اس حرکت سے دنیا میں کیا نفع پہنچ سکتا ہے اور آخرت میں کیا نقصان ہو سکتا ہے' اور اگر غور و فکر کے بعد تم یہ نتیجہ اخذ کرو کہ اس حرکت سے تمہارا مقصد صرف دین ہے تب تم اپنے ارادے کے مطابق عمل کرو' ورنہ وہیں ٹھہر جاؤ' آگے بڑھنے کی کوشش مت کرو۔ پھر رکنے میں بھی تمہیں اپنے دل کا جائزہ لینا چاہیے کہ فعل سے باز رہنے میں اس کی نیت کیا ہے؟ ترک عمل بھی عمل ہے اور اس میں بھی نیت صحیح ضروری ہے' ایسا نہ ہو کہ تمہارا دل کسی ایسے مخفی امر کی بنا پر ترک عمل کر رہا ہو جو ہوائے نفس ہو' اور تم اس کے کید پر مطلع نہ ہو سکو ظاہری باتوں سے فریب مت کھاؤ' باطن کا تفحص کرتے رہو تاکہ شیطان تم پر غلبہ نہ پا سکے حضرت زکریا علیہ السلام سے مروی ہے کہ وہ مٹی سے ایک دیوار تعمیر کر رہے تھے کچھ لوگوں نے آپ کو اجرت پر مامور کیا تھا ان لوگوں نے آپ کی خدمت میں روٹیاں پیش کیں' آپ کا طریقہ یہ تھا کہ صرف اپنی محنت کی روٹی کھایا کرتے تھے چنانچہ آپ کھانا

---

(۱) یہ روایت کچھ اختلاف کے ساتھ پہلے بھی گذری ہے

کھانے بیٹھ گئے' کچھ لوگ آئے آپ نے انہیں کھانے پر مدعو نہیں کیا' یہاں تک کہ کھانے سے فارغ ہو گئے' لوگوں کو اس پر بڑی حیرت ہوئی کیوں کہ آپ کا زہد اور سخاوت مشہور تھی انہوں نے سوچا کہ کھانے کی دعوت دینے میں کوئی مضائقہ نہ تھا یہ ایک طرح کی تواضع ہے حضرت زکریا علیہ السلام نے فرمایا کہ میں اجرت پر کام کررہا ہوں یہ لوگ مجھے اس لیے روٹی کھلاتے ہیں کہ مجھ میں توانائی پیدا ہو' اور میں ان کی مزدوری صحیح طور پر کرسکوں' اگر تم میرے ساتھ کھانا کھاتے تو یہ کھانا نہ تمہارے لئے کافی ہوتا اور نہ میرے لیے اور نتیجہ یہ ہوتا کہ میں ان لوگوں کا کام جنہوں نے مجھے اجرت میں روٹی دی ہے صحیح طور پر انجام نہ دے پاتا۔

صاحب بصیرت انسان باطن میں اللہ کے نور سے اسی طرح دیکھتا ہے' دیکھئے اس واقعہ میں غور کیجئے' اگر کام میں سستی واقع ہوتی تو فرض میں نقصان ہوتا' اور کھانے کی تواضع نہ کرنے میں صرف نفل اور استحباب کا نقصان ہے' اور فرائض کی موجودگی میں نوافل کی کوئی اہمیت نہیں ہے ایک شخص کہتے ہیں کہ میں حضرت سفیان ثوری کی خدمت میں حاضر ہوا وہ اس وقت کھانا تناول فرما رہے تھے' آپ نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی' یہاں تک کہ آپ انگلیاں چاٹ کر کھانے سے فارغ ہو گئے اس کے بعد فرمایا اگر میں نے یہ کھانا قرض نہ لیا ہوتا تو میری یہ خواہش ہوتی کہ تم بھی میرے ساتھ شریک ہوتے حضرت سفیان ثوری ارشاد فرماتے ہیں کہ جو شخص کسی کو کھانے کی دعوت دے اور اس کا دل یہ چاہتا ہو کہ وہ کھانے کی دعوت قبول نہ کرے' اب اگر اس نے دعوت قبول کرلی تو دعوت دینے والے پر دو گناہ ہوں گے' اور اگر کھانا نہیں کھایا تو ایک گناہ ہوگا' دو گناہوں میں سے ایک نفاق ہے' اور دوسرا یہ کہ اپنے بھائی کو ایسے فعل کی ترغیب دیتا ہے کہ اگر وہ اس کی حقیقت پر مطلع ہوجائے تو برا محسوس کرے' بندے کو چاہیے کہ وہ اسی طرح تمام اعمال میں اپنی نیت کا جائزہ لیتا رہے' اس کا ہر اقدام ہر نیت کے ساتھ ہونا چاہیے' اگر نیت اس وقت نہ ہوسکے تو توقف کرے' اس لیے کہ نیت اپنے اختیار میں نہیں ہوتی

نیت غیر اختیاری ہے: بعض اوقات جاہل انسان نیت کے سلسلے میں ہماری معروضات' اور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد مبارک "اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ" کو سن کر اپنی تدریس' تجارت یا کھانے کے وقت دل میں کہتا ہے کہ میں اللہ کے لیے کھانے کی نیت کرتا ہوں' یا اللہ کے لیے تدریس کی یا تجارت کی نیت کرتا ہوں۔ یہ کم عقل انسان سمجھتا ہے کہ نیت ہوگئی' اب مجھے اس کا ثواب ملے گا یہ سراسر حماقت ہے' اسے معلوم ہونا چاہیے کہ یہ نیت حدیث ہے یا زبانی بات ہے یا ایک خیال ہے یا ایک فکر سے دوسرے فکر کی طرف انتقال ہے' نیت کا ان امور سے کوئی تعلق نہیں ہے نیت نفس کے میلان اور رغبت کا نام ہے یعنی نفس کا ایسی چیز کی طرف مائل ہونا جس میں اس کی کوئی غرض ہو' خواہ اس وقت' یا بعد میں اگر یہ میلان نہیں ہے تو صرف ارادے یا نیت سے اس کا حاصل کرنا ناممکن ہے اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ نیت یا ارادے سے رغبت حاصل کی جاسکتی ہے تو پھر یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ ایک شخص جس کا پیٹ بھرا ہوا ہو یہ کہے کہ میں کھانے کی نیت کرتا ہوں یا کوئی بے فکر شخص یہ کہے کہ میں فلاں شخص پر عاشق ہونے اور اسے اپنے دل میں بڑا اور محبوب سمجھنے کی نیت کرتا ہوں ظاہر ہے اس طرح کہنے سے نہ دل میں کھانے کی رغبت پیدا ہوگی' اور نہ کسی کا عشق دل میں کسی چیز کی خواہش اور رغبت پیدا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے اس کے اسباب حاصل کئے جائیں' پھر یہ اسباب بعض اوقات اختیاری ہوتے ہیں اور بعض اوقات قدرت و اختیار سے خارج ہوتے ہیں' اصل میں انسان کا نفس کسی فعل پر اسی وقت آمادہ ہوتا ہے جب وہ اس کی غرض کے موافق ہوتا ہے' اور جب تک اسے یہ یقین نہیں ہوجاتا کہ فلاں عمل سے میری غرض پوری ہوسکتی ہے' اور یہ بات اختیاری نہیں ہے پھر یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ دل ہر وقت کسی چیز کی طرف مائل ہونے کے لیے تیار رہے کیوں کہ میلان کا تعلق فراغت سے ہوسکتا ہے وہ اس غرض سے زیادہ قوی غرض کی طرف مائل ہو پھر رغبت دلانے والے اور رغبت سے منحرف کرنے والے اسباب کا معاملہ ہے جب اسباب مجتمع ہوتے ہیں تب کسی چیز کی رغبت دل میں پیدا ہوتی ہے اور اسباب ہر شخص کے احوال کے اعتبار سے مختلف ہوتے ہیں مثلاً ایک شخص پر نکاح کی شہوت غالب ہو لیکن نکاح سے اس کی غرض اولاد نہ ہو تو یہ شخص جماع کے وقت اولاد کی نیت ہی نہیں کرسکتا بلکہ

اس کی صحبت قضائے شہوت کی نیت سے ہوگی' اس لیے کہ نیت کا مدار غرض پر ہے اور یہاں غرض صرف قضائے شہوت ہے ظاہر ہے اگر کوئی شخص زبان سے ولد کی نیت کرے تو کیا اس کی یہ نیت صحیح ہوگی' اسی طرح اگر کسی شخص کے دل میں نکاح کے وقت اتباع سنّت کا خیال نہیں اور نہ وہ اس کا اعتقاد رکھتا ہے کہ نکاح میں اتباع سنت کی نیت کرنے سے ثواب ملتا ہے اب اگر اس نے زبان سے یہ کہہ لیا کہ میں اتباع سنت کی نیت کرتا ہوں تو کیا اس کی یہ نیت صحیح ہوگی' یہ کہنا صرف گفتگو ہے اسے کسی بھی حال میں نیت نہیں کہا جاسکتا۔

نکاح میں اتباع سنّت کی نیت کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ پہلے شریعت الٰہی پر اپنا ایمان پختہ کرے پھر دل میں یہ یقین پیدا کرے کہ جو شخص امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم میں تکثیر کا سبب بنتا ہے اسے زبردست ثواب ملتا ہے پھر دل سے وہ تمام خیالات دور کرے جو اولاد سے نفرت پر دلالت کرتے ہیں مثلاً اولاد کو مشقت اور پریشانی کا سبب جاننا اور ان کی پرورش میں پیش آنے والی دشواریوں سے گھبرانا وغیرہ اگر ایسا کرے گا تو یہ ممکن ہے کہ دل میں اولاد کی خواہش پیدا ہو' اور اولاد کی پیدائش کو باعث ثواب سمجھے اور اس سے دل میں نکاح کی رغبت پیدا ہو اور وہ رغبت الفاظ بن کر زبان پر آئے ایسا شخص اگر یہ کہے کہ میں نکاح سے اولاد صالح کی نیت کرتا ہوں تو یہ کہا جائے گا کہ اس کی نیت صحیح ہے اور اسے اس نیت پر ثواب ملے گا لیکن اگر کسی شخص نے یہ تمام اسباب مہیا نہیں کئے اور وہ محض زبان سے یہ کہتا ہے کہ میں اولاد صالح کی نیت کرتا ہوں تو کہا جائے گا کہ یہ اس شخص کی بکواس ہے کیوں کہ اس کے دل میں اس غرض صحیح کی طرف میلان نہیں ہے۔ بزرگان سلف نیت صحیح کے موجود نہ ہونے کے باعث بعض اوقات نیک عمل سے گریز کرتے تھے' اور صاف کہہ دیا کرتے تھے کہ کیوں کہ ہماری اس میں کوئی نیت نہیں ہے اس لیے ہم یہ عمل نہیں کرسکتے' حضرت ابن سیرینؒ نے حسن بصریؒ کے جنازے کی نماز اس لیے نہیں پڑھی کہ اس وقت ان کی نیت حاضر نہیں تھی' ایک بزرگ نے اپنی اہلیہ سے کنگھا طلب کیا' اہلیہ نے عرض کیا کہ آئینہ بھی لاؤں' آپ کچھ دیر خاموش رہے' پھر فرمایا: ہاں! لوگوں نے پوچھا آپ نے ہاں کہنے میں اتنی دیر کیوں کی' فرمایا پہلے آئینے کے سلسلے میں میری نیت حاضر ہی نہیں تھی' اس لیے میں نے کچھ دیر سکوت اختیار کیا' اور جب دل میں نیت حاضر ہوگئی تب میں نے اس سے آئینہ لانے کی لیے کہا' حماد ابن سلیمان کوفے کے ایک ممتاز عالم تھے جب ان کا انتقال ہوا تو لوگوں نے حضرت سفیان ثوریؒ کی خدمت میں عرض کیا کہ کیا آپ ان کے جنازے میں شریک نہیں ہوں گے فرمایا اگر میری نیت ہوتی تو میں ضرور جاتا۔ اکابرین سلف سے اگر کسی عمل خیر کی درخواست کی جاتی تو فرماتے اگر اللہ تعالیٰ ہمیں نیت عطا فرمائے گا تو ہم ضرور یہ عمل کریں گے حضرت طاؤسؒ نیت کئے بغیر حدیث بیان نہ فرماتے اگر کوئی شاگرد حدیث سنانے کی درخواست بھی کرتا تو خاموشی اختیار فرماتے' اور جب نیت ہوتی تو کہے بغیر حدیث بیان کرنا شروع کردیتے' لوگوں نے عرض کیا اس کی کیا وجہ ہے جب ہم درخواست کرتے ہیں تو آپ حدیث بیان نہیں فرماتے' اور جب درخواست نہیں کرتے تو بیان فرماتے ہیں' فرمایا کیا تم لوگ یہ چاہتے ہو کہ میں بلانیت حدیث بیان کردیا کروں جب میری نیت حاضر ہوتی ہے تو میں حدیث بیان کرتا ہوں' روایت ہے کہ جب داؤد ابن المجر نے کتاب العقل تصنیف کی تو حضرت امام احمد ابن حنبلؒ آپ کے پاس تشریف لائے اور کتاب المجر طلب کی' اور ایک صفحہ پر نظر ڈال کر واپس کردی ابن المجر نے عرض کیا کہ آپ نے کتاب لے کر واپس کیوں کردی' فرمایا اس میں ضعیف سندیں ہیں' حضرت داؤدؒ نے فرمایا میں نے اس کی بنیاد اسناد پر نہیں رکھی ہے' آپ امتحان کی غرض سے ملاحظہ کریں' اور تنقیدی نظر ڈالیں میں نے عملی نقطۂ نظر سے کتاب لکھی ہے' اور میں نے اس سے فائدہ اٹھایا ہے' امام احمدؒ نے فرمایا لاؤ مجھے دوبارہ دو' میں بھی اسی نظر سے اس کا مطالعہ کروں گا جس نظر سے تم نے مطالعہ کیا ہے' چنانچہ آپ نے کتاب لی' اور مدت تک اسے اپنے پاس رکھ کر استفادہ کیا اور فرمایا اللہ تعالیٰ تمہیں جزائے خیر دے میں نے اس سے بھرپور فائدہ اٹھایا ہے۔ کسی نے حضرت طاؤس سے دعا کی درخواست کی فرمایا اگر نیت حاضر ہوئی تو میں دعا کروں گا ایک بزرگ نے فرمایا کہ میں فلاں شخص کی عیادت کے لیے ایک ماہ سے نیت حاضر کرنے کی کوشش کررہا ہوں عیسیٰ ابن کثیر کہتے ہیں کہ میں میمون ابن مہران کے ہمراہ چلا یہاں تک کہ ہم

لوگ ان کے گھر کے دروازے پر پہنچ گئے' جب وہ گھر میں داخل ہوئے تو میں واپس ہونے لگا' ان کے صاحبزادے نے عرض کیا کہ کیا آپ انھیں رات کا کھانا نہیں کھلائیں گے' فرمایا میری نیت نہیں ہے۔

اصل میں نیت نظر کے تابع ہوتی ہے جب نظر بدل جاتی ہے تو نیت بھی بدل جاتی ہے' اسی لیے اکابرین اسلام نیت کے بغیر کوئی کام نہیں کرتے تھے' وہ لوگ جانتے تھے کہ نیت عمل کی روح ہے' اور نیت صادقہ کے بغیر عمل ریا اور تصنع ہے ایسا عمل ناراضگی کا سبب بنتا ہے' تقرب کا باعث نہیں بنتا' وہ یہ بھی جانتے تھے کہ نیت محض زبان سے نویت (میں نے نیت کی) کہنے کا نام نہیں ہے' بلکہ یہ قلب کی آمادگی کا نام ہے جو غیبی فتوح کے قائم مقام ہے' اور یہ فتوح غیبی اللہ تعالیٰ کی طرف سے بعض اوقات عطا کی جاتی ہیں اور بعض اوقات عطا نہیں کی جاتیں' البتہ جس شخص پر دین غالب ہوتا ہے اسے اکثر اوقات فتوح غیبی میسّر رہتی ہیں یعنی خیر کے لیے ان کی نیت حاضر رہتی ہے' کیوں کہ ایسے شخص کا دل بحیثیت مجموعی خیر کی طرف مائل رہتا ہے اس لیے جب بھی کسی عمل خیر کا موقع ہوتا ہے خود بخود دل میں اس کی تحریک اور داعیہ پیدا ہوتا ہے' اور جس شخص پر دنیا کا غلبہ ہوتا ہے وہ اپنی نیت صحیح نہیں کرپاتا' مباح اعمال میں تو خیر کیا نیت کرسکتا ہے فرائض میں بھی نہیں کرپاتا' اگر کسی شخص میں یہ مرض ہے تو اس کا علاج یہ ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ دوزخ کے عذاب کو یاد کرے' اور نفس کو اس کی ہولناکیوں سے ڈرائے' اور جنت کی نعمتوں کا تصور کرتا رہے' اور دل کو ان کے پانے کی ترغیب دیتا رہے' اس صورت میں یہ ممکن ہے کہ دل میں خیر کے لیے آمادگی پیدا ہوجائے' دل میں عمل خیر کے لیے جس قدر رغبت اور میلان ہوگا اسی قدر اس کا ثواب ہوگا' اللہ تعالیٰ کی عبادت محض اس کی جلالت و عظمت کے لیے کرنے کی نیت دنیا میں رغبت رکھنے والوں کو میسّر نہیں ہوتی' یہ نیت کا اعلیٰ اور کمیاب درجہ ہے روئے زمین پر ایسے لوگ بہت کم ہیں جو اللہ کی جلالت شان اور عظمت و برتری کے لیے اس کی اطاعت کریں۔

طاعات میں لوگوں کی مختلف نیتیں : اطاعات میں لوگوں کی نیتیں مختلف ہوتی ہیں بعض لوگ کسی خوف کی بنا پر عمل کرتے ہیں' یعنی ان کے ذہن میں دوزخ کے عذاب کا تصور ہوتا ہے' اور بعض لوگ جنت کی رغبت سے عمل کرتے ہیں یہ نیت پہلے درجہ کی نیت کے مقابلے میں کم تر ہے' پہلا درجہ تو یہی ہے کہ اللہ کی عبادت محض اس کی جلالت و عظمت کے لیے کی جائے' خوف و رجاء سے اللہ کی عبادت کرنے کا درجہ کم ہے' لیکن اس کا شمار بھی صحیح نیت کی قسموں میں ہوتا ہے' کیوں کہ اس میں ان چیزوں کا خوف یا رغبت ہے جن کا تعلق آخرت سے ہے اور ان میں سے بعض چیزیں وہ ہیں جن سے دنیا میں بھی محبت ہوتی ہے جیسے شکم اور شرم گاہ کی شہوتیں آدمی دنیا میں بھی ان ہی شہوتوں کی تکمیل کے درپے رہتا ہے' اور جنت کا طالب بھی اسی لیے ہے کہ آخرت میں یہ دونوں شہوتیں جنت حاصل کرنے ہی سے پوری ہوں گی' جیسے برا مزدور' صرف مزدوری کی خاطر پسینہ بہاتا ہے' اسی لیے جنت والوں کو بے وقوف کہا گیا ہے' جیسا کہ ایک حدیث میں ہے اکثر اہل جنت بے وقوف ہوں گے' اس کی وجہ یہی ہے کہ صرف بے وقوف ہی جنت کی نعمتوں کو آخرت کی دوسری لازوال سعادتوں پر ترجیح دے سکتے ہیں' ورنہ اصحاب بصیرت کی عبادت کا محور اللہ تعالیٰ کا ذکر و فکر ہوتا ہے' وہ اسی کے جلال و جمال میں مستغرق رہتے ہیں' اور تمام اعمال سے اسی محبت اور استغراق کی تاکید ہوتی ہے' ان کا درجہ اس سے کہیں بلند تر ہے کہ وہ جنت میں نکاح اور طعام کی لذّات کی طرف ملتفت ہوں' وہ دنیا میں حصول جنت کے لیے عبادت نہیں کرتے' بلکہ یہ وہ لوگ ہیں جن کے بارے میں قرآن کریم کا ارشاد ہے۔

يَدْعُونَ رَبَّهُم بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيدُونَ وَجْهَهُ (پ ۱۵ ر ۱۹ آیت ۲۸)

جو صبح و شام اپنے رب کی عبادت محض اس کی رضاجوئی کے لیے کرتے ہیں۔

لوگوں کو ان کی نیت کے بقدر ثواب ملتا ہے' اس لیے جن لوگوں کی نیت رضائے الٰہی ہے وہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے دیدار سے متمتع ہوں گے' اور ان لوگوں کا مذاق اڑائیں گے جو حور و غلمان کی دید سے لطف اندوز ہوں گے' یہ ایسا ہی ہے جیسے حوروں کو دیکھنے والے ان لوگوں پر ہنستے ہیں جو مٹی سے بنی ہوئی تصویروں سے لطف اندوز ہوتے ہیں' بلکہ حوروں کو دیکھنے والے زیادہ مذاق کا

نشانہ بنیں گے کیوں کہ اللہ تعالیٰ کے جمال اور حوروں کے جمال میں اس سے کہیں زیادہ فرق ہے جو حوروں کے جمال اور مٹی سے بنی ہوئی تصویروں کے جمال میں ہے بلکہ نفوس بہیمہ کا تقاضائے شہوت کے لیے حوروں کی طرف ملتفت ہونا اور اللہ تعالیٰ کی وجہ کریم کے جمال سے اعراض کرنا ایسا ہے جیسے خنفساء اپنے جوڑے سے انس رکھتا ہے اور اس کی طرف راغب ہوتا ہے اور عورتوں کی طرف سے اعراض کرتا ہے اکثر قلوب اللہ تعالیٰ کے جمال کے مشاہدے سے اسی طرح محروم ہیں جیسے خنفساء عورتوں کے جمال کے ادراک سے محروم رہتا ہے اگر وہ عقل و شعور رکھتا اور اس کے سامنے عورتوں کا ذکر کیا جاتا تو وہ ان لوگوں پر ہنستا جو ان کی طرف ملتفت ہوتے ہیں کہ حقیقت وہ ہے جو قرآن کریم نے بیان فرمائی ہے۔

كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ (پ ۱۸ ر ۳ آیت ۵۳) ہر گروہ کے پاس جو دین ہے وہ اسی سے خوش ہے۔

اور اسی لیے انھیں پیدا بھی کیا گیا ہے' جیسا کہ فرمایا: "وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ" (اور اسی لیے انھیں پیدا کیا ہے) اس طرح لوگوں میں ہمیشہ تفاوت رہے گا' اور یہ تفاوت اخروی زندگی میں بھی برقرار رہے گا روایت ہے کہ احمد ابن خضرویہ نے اللہ تعالیٰ کو خواب میں دیکھا اللہ تعالیٰ نے ان سے فرمایا کہ تمام لوگ مجھ سے جنت مانگتے ہیں سوائے ابو یزید کے' وہ میرا طالب ہے' ابو یزید نے اللہ تعالیٰ کو خواب میں دیکھا اور عرض کیا یا اللہ! آپ تک پہنچنے کا راستہ کیا ہے؟ فرمایا اپنے نفس کو ترک کردو اور میرے پاس آجاؤ' شبلی کو ان کی وفات کے بعد خواب میں دیکھا گیا' اور ان سے پوچھا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیا معاملہ کیا' فرمایا اللہ تعالیٰ نے میرے دعووں پر دلیل طلب نہیں فرمائی' البتہ صرف ایک دعوے پر دلیل کا مطالبہ فرمایا' میں نے ایک روز کہہ دیا تھا کہ جنت کے خسارے سے بڑھ کر کوئی خسارہ نہیں ہے' اللہ تعالیٰ نے فرمایا میری ملاقات کے خسارے سے بڑھ کر کوئی خسارہ نہیں۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ یہ نیات مختلف درجات کی ہیں' جس شخص کے دل پر ان میں سے ایک غالب ہوجاتی ہے وہ دوسری کی طرف آسانی سے التفات نہیں کرپاتا۔ ان حقائق و معارف سے واقف ہونے کے بعد کچھ ایسے اعمال و افعال رونما ہوتے ہیں کہ فقہائے ظاہر انھیں تسلیم نہیں کرپاتے ہم یہ کہتے ہیں کہ جس شخص کی نیت امر مباح میں موجود ہے' امر مستحب میں نہیں ہے تو اس کے لیے مباح بہتر ہے' وہی اس کے حق میں مستحب بھی ہے' خود مستحب اس کے لیے نیت نہ ہونے کے باعث نقصان کا باعث ہوگا' کیوں کہ اعمال کا دارومدار نیات پر ہے یہ ایسا ہی ہے جیسے فقہ کی رو سے معاف کرنا انتقام لینے سے افضل ہے' لیکن کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انتقام لینے میں نیت حاضر ہوتی ہے' معاف کرنے میں نہیں ہوتی' اس صورت میں انتقام لینا افضل ہوگا اسی طرح اگر کسی مستحق کی نیت کھانے' پینے' اور نفس کو آرام دینے کے لیے سونے' اور اس طریقے سے مستقبل میں عبادت کے لیے مستعد ہونے میں ہو' فی الوقت روزے نماز کے لیے دل میں نیت کا استحضار نہ ہو پا رہا ہو تو اس کے لیے کھانا اور سونا افضل ہے' اسی طرح اگر کوئی شخص مسلسل عبادت کرنے سے اکتا جائے' طبعی نشاط باقی نہ رہے' اور رغبت ضعیف پڑجائے گا اور بھرپور رغبت کے ساتھ عبادت میں مصروف رہ سکے گا تو اس کے لیے کھیل میں مشغول ہونا نماز سے افضل ہے۔ حضرت ابوالدرداء فرماتے ہیں میں اپنے نفس کو تھوڑے سے کھیل سے راحت دیتا ہوں اس سے مجھے حق پر بڑی مدد ملتی ہے' حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ اپنے قلوب کو راحت دو اگر انھیں مجبور کروگے تو وہ اندھے ہوجائیں گے۔

یہ وہ دقیق امور ہیں جن کا ادراک صرف کبار علماء کرسکتے ہیں' معمولی علم رکھنے والے لوگ ان سے بہت دور ہیں بعض ماہر اطباء بخار زدہ کا علاج گوشت سے کرتے ہیں' حالانکہ گوشت گرم ہوتا ہے طب سے ناواقف یا کم جاننے والے لوگ اسے حیرت انگیز قرار دیتے ہیں' حالانکہ طبیب کا مقصد گوشت کھلانے سے یہ ہوتا ہے کہ اس کی اصل قوت بحال ہوجائے تاکہ اس میں ضد سے علاج کرنے کی طاقت پیدا ہوجائے' اسی طرح شطرنج کا ماہر کھلاڑی بھی جان بوجھ کر اپنے رخ اور گھوڑے کو پٹوا دیتا ہے' اور مقصد یہ ہوتا ہے کہ کسی چال سے اپنے حریف کو شکست دے دے مگر جس شخص کو اس کھیل سے واقفیت نہیں ہوتی اور وہ کھلاڑیوں کے بعید ترین منصوبوں پر نظر نہیں رکھ سکتا وہ ماہر کھلاڑی کی اس حرکت کو حیرت سے دیکھتا ہے' اور اس پر ہنستا ہے' اسی طرح تجربہ کار سپاہی کبھی اپنے حریف سے دور بھاگ جاتا ہے' بظاہر اس کی یہ حرکت بزدلی پر محمول کی جاتی ہے لیکن اصل میں اس کا

مقصد فرار سے یہ ہوتا ہے کہ وہ حریف کو دم لینے کا موقع دے' اور جب وہ غافل ہو جائے تو اس پر ایک دم حملہ آور ہو' راہ سلوک کے مسافروں کا بھی یہی حال ہے' یہ لوگ بھی شیطان سے برسرپیکار ہیں' اس لیے جنگی لطائف الحیل سے کام لے سکتے ہیں' جو شخص صاحب بصیرت ہوتا ہے وہ لطیف تدبیروں سے گریز نہیں کرتا' ضعفاء ان تدبیروں کو تعجب سے دیکھتے ہیں' اور انہیں شریعت کے منافی تصور کرتے ہیں مرید کے لیے یہ مناسب نہیں کہ اگر وہ اپنے شیخ کا کوئی حیرت انگیز عمل دیکھے تو اس کا انکار کر بیٹھے اور نہ شاگرد کو استاذ کے کسی فعل پر نکتہ چینی کا حق ہے' بلکہ اسے اپنی بصیرت کی حد پر توقف کرنا چاہیے اور جو احوال منکشف نہ ہوں انہیں صاحب احوال کے سپرد کر دینا چاہیے یہاں تک کہ وہ خود بھی ان کا اہل بن جائے' اور ان کے مرتبے تک پہنچ کر اس پر بھی یہ احوال طاری ہو سکیں اللہ ہی حسن توفیق دینے والا ہے۔

دوسرا باب

اخلاص فضائل' حقیقت' درجات

اخلاص کے فضائل : خداوند قدوس کا ارشاد ہے:

وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ (پ ۳۰ ر ۲۳ آیت ۵)

حالانکہ ان لوگوں کو یہی حکم ہوا تھا کہ اللہ کی اس طرح عبادت کریں کہ عبادت اسی کے لیے خاص رکھیں۔

أَلَا لِلَّهِ الدِّينُ الْخَالِصُ (پ ۲۳ ر ۱۵ آیت ۳) یاد رکھو عبادت خالص اللہ ہی کے لیے ہے۔

إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا وَأَصْلَحُوا وَاعْتَصَمُوا بِاللَّهِ وَأَخْلَصُوا دِينَهُمْ لِلَّهِ (پ ۵ ر ۱۸ آیت ۱۴۶)

لیکن جو لوگ توبہ کرلیں' اور اصلاح کرلیں' اور اللہ تعالیٰ پر وثوق رکھیں' اور اپنے دین کو خالص اللہ ہی کے لیے کیا کریں۔

فَمَنْ كَانَ يَرْجُو لِقَاءَ رَبِّهِ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهِ أَحَدًا
(پ ۱۶ ر ۳ آیت ۱۱۰)

سو جو شخص اپنے رب سے ملنے کی آرزو رکھے تو نیک کام کرتا رہے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک مت کرے۔

یہ آیت ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی جو اللہ تعالیٰ کے لیے عمل کرتے ہیں اور اس پر لوگوں کی تعریف کے خواہش مند رہتے ہیں۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

ثَلَاثٌ لَا يَغِلُّ عَلَيْهِنَّ قَلْبُ رَجُلٍ مُسْلِمٍ إِخْلَاصُ الْعَمَلِ لِلَّهِ وَالنَّصِيحَةُ لِلْوُلَاةِ وَلُزُومُ الْجَمَاعَةِ (ترمذی۔ نعمان ابن بشیرؓ)

تین چیزیں ایسی ہیں کہ کسی مسلمان آدمی کا دل ان میں خیانت نہیں کرتا' عمل کو اللہ کے لیے خالص کرنا' حکام کو نصیحت کرنا' اور جماعت کے ساتھ رہنا۔

مصعب ابن سعد اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ میرے والد کو یہ خیال ہوا کہ وہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض کم درجے کے اصحاب پر فضیلت رکھتے ہیں۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

إِنَّمَا نَصَرَ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ هٰذِهِ الْأُمَّةَ بِضُعَفَائِهَا وَدَعْوَتِهِمْ وَإِخْلَاصِهِمْ (نسائی)

اللہ تعالیٰ نے اس امت کو کمزوروں سے اور ان کی دعا و اخلاص سے مدد فرمائی ہے۔

حضرت حسن فرماتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حدیث قدسی ارشاد فرمائی کہ اخلاص میرے اسرار میں سے

ایک سر ہے، اسے میں اپنے بندوں میں سے اس شخص کے دل میں ودیعت کرتا ہوں جسے میں چاہتا ہوں (ابو القاسم قشیری۔ علی ابن ابی طالب) حضرت علی رضی اللہ عنہ ارشاد فرماتے ہیں کہ تھوڑے عمل کا فکر مت کرو قبول عمل کا فکر کرو، اس لیے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ ابن جبل سے ارشاد فرمایا:۔

أَخْلِصِ الْعَمَلَ يُجْزِكَ مِنْهُ الْقَلِيْلُ (ابو منصور دیلمی۔ معاذ)

عمل میں اخلاص برتو تمہیں تھوڑا عمل کافی ہو جائے گا۔

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:۔

مَا مِنْ عَبْدٍ يُخْلِصُ لِلّٰهِ الْعَمَلَ أَرْبَعِيْنَ يَوْمًا إِلَّا ظَهَرَتْ يَنَابِيْعُ الْحِكْمَةِ مِنْ قَلْبِهِ عَلٰى لِسَانِهِ (ابن عدی۔ ابو موسیٰ)

جو بندہ چالیس دن تک عمل کو اللہ کے لیے خالص کرتا ہے اس کے دل سے اس کی زبان پر حکمت کے چشمے پھوٹتے ہیں۔

ایک حدیث میں ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: قیامت کے دن سب سے پہلے تین آدمیوں سے سوال کیا جائے گا، ایک وہ جسے اللہ تعالیٰ نے علم دیا ہے، اس سے اللہ تعالیٰ یہ سوال کرے گا کہ تو نے اپنے علم سے کیا کیا، وہ عرض کرے گا یا اللہ میں دن رات اس کی خدمت کیا کرتا تھا اللہ تعالیٰ فرمائے گا تو جھوٹ کہتا ہے، ملائکہ کہیں گے تو جھوٹ کہتا ہے بلکہ تیرا ارادہ یہ تھا کہ لوگ کہیں فلاں شخص عالم ہے چنانچہ تجھے عالم کہا گیا، دوسرا وہ شخص جسے اللہ نے مال عطا کیا ہے اللہ تعالیٰ اس سے فرمائے گا میں نے تجھے نعمتیں بخشیں تو نے کیا کیا، وہ عرض کرے گا الٰہی میں رات دن صدقہ دیا کرتا تھا اللہ تعالیٰ فرمائے گا تو جھوٹ کہتا ہے، فرشتے کہیں گے تو جھوٹ بولتا ہے، تیرا مقصد تو یہ تھا کہ لوگ تجھے سخی کہیں چنانچہ تجھے سخی کہہ کر پکارا گیا، تیسرا وہ شخص جو اللہ کی راہ میں قتل کیا گیا، اللہ تعالیٰ اس سے دریافت فرمائے گا کہ تو نے کیا کیا، وہ عرض کرے گا اے اللہ! تو نے مجھے جہاد کا حکم دیا تھا میں لڑا اور قتل ہوا، اللہ تعالیٰ فرمائے گا تو جھوٹ کہتا ہے، فرشتے بھی اسے جھوٹا کہیں گے، اس سے کہا جائے گا کہ تیرا مقصد یہ تھا کہ لوگ کہیں فلاں شخص بہادر ہے، کیا تجھے بہادر نہیں کہا گیا[1] ابو ہریرہؓ بیان فرماتے ہیں کہ اس کے بعد سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے میری ران پر ایک خط کھینچا اور فرمایا اے ابو ہریرہ! سب سے پہلے انہی تین آدمیوں سے دوزخ کی آگ بھڑکائی جائے گی، اس حدیث کے راوی حضرت معاویہ کے پاس گئے، اور ان سے یہ حدیث بیان کی، آپ یہ حدیث سن کر اس قدر روئے کہ ایسا محسوس ہونے لگا کہ شاید روتے روتے دم نکل جائے۔ اس کے بعد فرمایا اللہ تعالیٰ اپنے کلام میں سچ فرماتا ہے۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا نُوَفِّ إِلَيْهِمْ أَعْمَالَهُمْ وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ (پ ۱۲ ر ۲ آیت ۱۵)

جو شخص محض حیات دنیوی اور اس کی رونق چاہتا ہے ہم ان کو ان کے اعمال (کی جزا) دنیا ہی میں پورے طور پر بھگتا دیتے ہیں اور ان کے لیے دنیا میں کچھ کمی نہیں ہوتی۔

بنی اسرائیل کے حالات میں لکھا ہے کہ ایک عابد بڑی مدت سے اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مصروف تھا ایک مرتبہ اس کے پاس کچھ لوگ آئے اور انہوں نے کہا کہ یہاں ایک قوم ایسی بھی ہے جو خدا تعالیٰ کے بجائے درختوں کی پرستش کرتی ہے، اس عابد کو یہ سن کر بڑا غصہ آیا، اور وہ اسی عالم میں کندھے پر کلہاڑی رکھ کر چلا تاکہ درخت کو جڑ سے کاٹ ڈالے، راستے میں اسے ایک بوڑھے آدمی کے روپ میں شیطان ملا، شیطان نے اس سے پوچھا اللہ تجھ پر رحم کرے کہاں کا ارادہ ہے، اس نے کہا میں یہ درخت کاٹ ڈالنا چاہتا ہوں، شیطان نے کہا تجھے اس سے کیا مطلب؟ تو نے خواہ مخواہ اپنی عبادت چھوڑی، اپنی مشغولیت ختم کی، اور بلاوجہ دوسرے کاموں میں پڑ گیا عابد نے کہا یہ بھی عبادت ہے شیطان نے کہا میں تجھے ہرگز اس کی اجازت نہیں دے سکتا کہ تو درخت

[1] یہ روایت پہلے بھی گزری ہے۔

کاٹنے' یہ کہہ کر وہ برسرپیکار ہوگیا' عابد نے اسے گرالیا اور اس کے سینے پر چڑھ بیٹھا' شیطان نے کہا اچھا مجھے چھوڑ میں کچھ کہنا چاہتا ہوں' چنانچہ عابد کھڑا ہوگیا' ابلیس نے اس سے کہا اللہ تعالیٰ نے تجھ پر درخت کاٹنا فرض نہیں کیا ہے' اور نہ اس قوم کی ذمہ داری تجھ پر ہے جو درخت کی پرستش کرتی ہے' دنیا میں اللہ تعالیٰ کے بے شمار نبی ہیں' اگر وہ چاہے گا تو اپنے کسی نبی کو بھیج کر یہ درخت کٹوا دے گا عابد نے کہا میں یہ درخت ضرور کاٹوں گا' جب ابلیس نے دیکھا کہ الہام و تفہیم کارگر نہیں ہے تو اس نے مقابلے کا اعلان کردیا چنانچہ دونوں میں جنگ شروع ہوگئی' عابد نے دوبارہ اسے شکست دی' اور زمین پر گرا کر سینے پر چڑھ بیٹھا' جب ابلیس نے یہ دیکھا کہ اب نجات کی کوئی صورت نہیں ہے تو کہنے لگا کہ میں ایک بات بتانا چاہتا ہوں جو تیرے لیے بہت بہتر ہے عابد نے کہا بتا' ابلیس نے کہا پہلے مجھے آزاد کر عابد اس کے اوپر سے ہٹ گیا' ابلیس نے کہا تو ایک محتاج اور تنگدست انسان ہے' تیرے پاس کچھ نہیں ہے' تو لوگوں پر بوجھ ہے وہ تیری کفالت کرتے ہیں اور تیری دلی خواہش یہ ہے کہ تیرے پاس اس قدر زرومال ہو کہ تو اپنے بھائیوں کے ساتھ سلوک کرسکے' اور پڑوسیوں کے ساتھ اچھا معاملہ کرسکے' اور تو اتنا شکم سیر ہو کہ تجھے لوگوں کی ضرورت نہ رہے اور ان کی کفالت سے بے نیاز ہوجائے عابد نے کہا یقیناً یہ میری دلی خواہش ہے' ابلیس نے کہا اگر یہ بات ہے تو اپنے گھر جا میں تیرے سرہانے ہر رات دو دینار رکھ دیا کروں گا' تو وہ دینار اپنے اوپر اور اپنے اہل خاندان پر خرچ کرنا تیرے حق میں اور دیگر مسلمانوں کے حق میں درخت کاٹنے سے بہتر یہ تجویز ہے جو میں نے پیش کی ہے' درخت اپنی جگہ لگا ہوا ہے' اس کے کاٹنے سے پرستش کرنے والوں کو کوئی نقصان نہ ہوگا' اور اس کے باقی رہنے سے مسلمانوں کو کوئی فائدہ نہ ہوگا' عابد نے شیطان کی اس تجویز پر غور کیا اور کہنے لگا کہ واقعی یہ بوڑھا صحیح کہتا ہے' میں نبی نہیں ہوں کہ میرے لئے اس درخت کا کاٹنا ضروری ہو' اور نہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس کے کاٹنے کا حکم دیا ہے کہ اگر نہیں کاٹوں گا تو گنہگار رہوں گا' بوڑھے نے جو تجویز رکھی ہے وہ زیادہ نفع بخش ہے' چنانچہ اس نے بوڑھے کے ساتھ معاہدہ کرلیا' اور درخت نہ کاٹنے پر حلف اٹھالیا' اس کام سے فارغ ہونے کے بعد وہ اپنی عبادت گاہ میں واپس آیا' رات گذاری صبح ہوئی تو اس نے دیکھا کہ حسب وعدہ دو دینار سرہانے رکھے ہوئے ہیں دوسرے دن بھی ایسا ہی ہوا' تیسرے دن وہاں کچھ نہ ملا' بڑا غصہ آیا' اور اسی عالم میں کندھے پر کلہاڑی رکھ کر چلا' راستے میں ابلیس نے اسی بوڑھے شخص کے روپ میں ملاقات کی اور پوچھا کہاں کا ارادہ ہے عابد نے کہا میں درخت کاٹنے جارہا ہوں' ابلیس نے کہا بخدا تو جھوٹا ہے' نہ تو وہاں تک پہنچ سکتا ہے' اور نہ کاٹ سکتا ہے' یہ سن کر عابد نے چاہا کہ پہلے کی طرح پھر بوڑھے کو پکڑے اور زمین پر گرادے' ابلیس نے کہا اب اس گمان میں مت رہنا' یہ کہہ کر ابلیس نے عابد کو پکڑا اور زمین پر پٹخ کر اس کے سینے پر چڑھ بیٹھا عابد اس کی دونوں ٹانگوں کے درمیان ایک چڑیا کی طرح پھڑپھڑانے لگا' عابد نے بڑا زور مارا لیکن آزاد نہ ہوسکا' عاجز آکر بولا کہ مجھے چھوڑ دے اور یہ بتلا کہ پہلے میں تجھ پر کیسے غالب آگیا تھا' اور اس مرتبہ تو کیسے مجھ پر غالب ہوگیا ہے' ابلیس نے کہا پہلی مرتبہ تو اللہ کے لیے غضب ناک ہوکر چلا تھا' اور تیری نیت آخرت تھی' اس لیے اللہ تعالیٰ نے مجھے تیرا مسخر کردیا' اور اس مرتبہ تو اپنے نفس اور دنیا کے لیے غضب ناک ہوا ہے' اس لیے میں تجھ پر غالب آگیا۔ یہ واقعہ اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی تصدیق ہے۔

وَلَاُغۡوِيَنَّهُمۡ اَجۡمَعِيۡنَ ۙ اِلَّا عِبَادَكَ مِنۡهُمُ الۡمُخۡلَصِيۡنَ (پ ۱۴ ر ۳ آیت ۳۹-۴۰)

اور ان سب کو گمراہ کروں گا بجز آپ کے ان بندوں کے جو ان میں منتخب کیے گئے ہیں۔

بندہ شیطان سے اخلاص کے ذریعہ ہی چھٹکارا پاتا ہے' اسی لیے حضرت معروف کرخیؒ اپنے آپ کو پیٹتے تھے اور کہتے تھے اے نفس اخلاص کر تاکہ مجھے خلاصی (رہائی) ملے' یعقوب مکفوف کہتے ہیں مخلص وہ ہے جو اپنی نیکیوں کو بھی اسی طرح چھپائے جس طرح اپنی برائیوں کو چھپاتا ہے' ابوسلیمان کہتے ہیں اس شخص کے لیے خوشخبری ہو جو اپنے ہر صحیح قدم سے اللہ کی رضا کا طالب ہو' حضرت عمر ابن الخطابؓ نے ابو موسیٰ اشعریؓ کو لکھا جس کی نیت خالص ہوتی ہے اللہ تعالیٰ اس کے لیے ان امور میں کافی ہوجاتا ہے جو اس میں اور لوگوں میں ہو' ایک بزرگ نے اپنے کسی بھائی کو لکھا کہ اپنے اعمال میں نیت خالص کرو تھوڑا سا عمل بھی کافی ہوجائے گا' ایوب سختیانیؒ فرماتے ہیں کہ عمل والوں کے لیے سب سے زیادہ دشوار عمل نیتوں کا خالص کرنا ہے مطرف کہتے ہیں جو

شخص صاف ہوتا ہے اس کے لیے صفائی کی جاتی ہے' اور جو شخص خلط ملط کرتا ہے اس کے لیے خلط ملط کیا جاتا ہے کسی شخص نے ایک بزرگ کو خواب میں دیکھا اور ان سے دریافت کیا آپ نے اپنے اعمال کو کیسا پایا انہوں نے جواب دیا مجھے ہر اس عمل کا صلہ مل گیا جو میں نے اللہ کے لیے کیا تھا' یہاں تک کہ انار کے اس دانے کا بھی جو میں نے رہ گذر سے اٹھایا تھا اور میں نے اپنی مردہ بلی کو بھی نیکیوں کے پلڑے میں دیکھا' میری ٹوپی میں ریشم کا ایک دھاگا تھا وہ مجھے برائیوں کے پلڑے میں ملا' مجھے اپنے ایک گدھے کا جس کی قیمت سو دینار تھی ثواب نہیں ملا' خواب دیکھنے والے نے عرض کیا کہ آپ نے بلی کو تو نیکیوں کے پلڑے میں دیکھا اور گدھے کو نہیں دیکھا' فرمایا مجھ سے فرمایا گیا تیرا گدھا وہاں ہے جہاں تو نے اسے بھیجا تھا میں نے گدھے کے مرنے کی خبر سن کر کہا تھا خدا کی لعنت میں گیا' اس لیے مجھ سے کہا گیا کہ گدھے میں تیرا ثواب ضائع ہو گیا اگر تو یہ کہتا اللہ کی راہ میں گیا تو تجھے تیرا ثواب ملتا' میں نے ایک مرتبہ لوگوں کے سامنے صدقہ دیا تھا' اس وقت لوگوں کا دیکھنا مجھے اچھا لگا تھا' اس صدقے کا نہ مجھے ثواب ملا اور نہ عذاب۔ حضرت سفیان ثوریؒ نے یہ واقعہ سن کر فرمایا وہ خوش قسمت ہے کہ اس صدقے کی سزا نہیں ملی' بلکہ یہ تو اس پر بڑا احسان ہوا یحییٰ ابن معاذؒ کہتے ہیں کہ اخلاص عمل کو عیوب سے اس طرح صاف کرتا ہے جیسے دودھ گوبر اور خون سے صاف ہوتا ہے۔

ایک ایسے شخص کا واقعہ بیان کیا گیا ہے جسے عورتوں کا لباس پہننے اور ان کی ہیئت اختیار کرنے کا بہت شوق تھا وہ ہر اس جگہ پہنچا کرتا تھا جہاں کسی خوشی یا غم کے لیے عورتوں کا اجتماع ہوتا' ایک مرتبہ وہ ایک ایسے ہی اجتماع میں شریک تھا اچانک شور ہوا کہ ایک قیمتی موتی چوری ہو گیا' پھر یہ اعلان کیا گیا کہ تمام دروازے بند کر کے تلاشی لی جائے گی' چنانچہ لوگ آئے اور ایک ایک شخص کی تلاشی لی جانے لگی' یہاں تک کہ وہ لوگ ایک ایسی خاتون تک پہنچ گئے جو یہ شخص اس کے قریب موجود تھی' یہ صورت حال دیکھ کر وہ شخص اپنا راز افشاء ہونے کے خوف سے بڑا گھبرایا' اور اس نے صدق دل کے ساتھ یہ دعا کی کہ اگر مجھے اس رسوائی سے محفوظ رکھا گیا تو میں آئندہ کبھی ایسی حرکتیں نہیں کروں گا چنانچہ موتی قریب میں بیٹھی ہوئی عورت کے پاس سے مل گیا' اس کے بعد دروازے کھول دیئے گئے' اور خواتین کو باہر جانے کی اجازت دے دی گئی۔ ایک بزرگ کہتے ہیں کہ میں عرفے کے دن عصر کی نماز کے بعد ابو عبید تستری کے ہمراہ ان کے کھیت میں کھڑا ہوا تھا' ابو عبید اس وقت اپنے کھیت میں ہل چلا رہے تھے' اچانک ایک ابدال وہاں آئے' اور ان سے آہستہ سے کچھ کہنے لگے' ابو عبید نے جواب میں کہا نہیں' وہ یہ جواب سن کر بادل کی طرح اٹھے اور ہوا میں تحلیل ہو گئے' میں نے ابو عبید سے پوچھا یہ بزرگ آپ سے کیا کہہ رہے تھے' ابو عبید نے کہا یہ کہہ رہے تھے میرے ساتھ حج کو چلو' میں نے انکار کر دیا' راوی کہتے ہیں میں نے پوچھا آپ نے حج کیوں نہ کر لیا' فرمایا میری نیت حج کی نہیں تھی' بلکہ میں نے یہ نیت کی تھی کہ میں آج رات تک اس زمین میں ہل چلاؤں گا اور یہ کام مکمل کروں گا' مجھے یہ ڈر ہوا کہ اگر میں ان کے ساتھ حج کو چلا گیا تو کہیں اللہ تعالیٰ کے غضب کا نشانہ بن جاؤں اور مجھ سے یہ سوال نہ کیا جائے کہ تو نے اللہ کے عمل میں غیر کا اختلاط کیوں کیا تھا' میں اس وقت جس کام میں مشغول ہوں اس میں میرے نزدیک ستر حج سے بھی زیادہ کا ثواب ہے' کیوں کہ اس عمل میں میری نیت اللہ کے لیے خالص ہے۔ ایک بزرگ کہتے ہیں کہ مجھے بحری راستے سے جہاد میں شرکت کا موقع ملا' راستے میں ایک شخص نے اپنا توشہ دان فروخت کرنے کا ارادہ کیا' میں نے سوچا کہ یہ توشہ دان خرید لینا چاہیے راستے میں بھی کام دے گا' اور ضرورت پر فلاں شہر میں آسانی سے زیادہ قیمت پر فروخت بھی کیا جا سکے گا۔ چنانچہ میں نے اسے خرید لیا اسی دن رات کو میں نے خواب میں دیکھا کہ دو شخص آسمان سے اترے' ان میں سے ایک نے اپنے ساتھی سے کہا کہ نمازیوں کے بارے میں لکھ لو میں تمہیں بتلاتا ہوں' فلاں شخص تفریح کے لیے' فلاں شخص ریا کے لیے شریک ہوا' فلاں تجارت کی غرض سے جہاد میں شامل ہوا' فلاں شخص اللہ کی راہ میں ہے' پھر میری طرف دیکھ کر کہا یہ شخص تجارت کے لیے آیا ہے' میں نے کہا میرے بارے میں ایسا کہتے ہوئے اللہ کا خوف کھاؤ میں تجارت کے لیے نہیں نکلا ہوں' اور نہ میرے پاس کوئی ایسا سامان ہے جس میں تجارت کروں گا' وہ شخص بولا' بڑے میاں! تم نے کل ایک توشہ دان نفع اٹھانے کے لیے خریدا ہے' میں یہ سن کر رونے لگا' اور میں نے ان سے کہا کہ وہ میرا نام تاجروں میں نہ لکھیں لکھنے والے نے اپنے ساتھی کی طرف دیکھ کر پوچھا بولو کیا کہتے ہو' لکھوں یا نہ لکھوں؟ اس نے کہا اس شخص کے بارے میں یوں لکھو کہ

یہ شخص غزوے کے لیے گھر سے چلا' مگر اس نے راستے میں ایک توشہ دان خریدا ہے جس کے ذریعے وہ نفع کمانے کے امید رکھتا ہے' اللہ تعالیٰ جو چاہے گا اس کے بارے میں فیصلہ کردے گا۔ سری سقطی فرماتے ہیں کہ تنہائی میں اخلاص کے ساتھ دو رکعت نماز پڑھنا عالی اسناد کی حامل ستر یا سات سو روایات نقل کرنے سے افضل ہے۔ ایک بزرگ کہتے ہیں ایک لمحے کے اخلاص میں ابدی نجات ہے' لیکن اخلاص کا ملنا دشوار ہے' کہا جاتا ہے علم بیج ہے' عمل کھیتی ہے' اور اخلاص اس کا پانی ہے' ایک بزرگ کہتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کو مبغوض رکھتا ہے تو اسے تین چیزیں عطا کرتا ہے اور تین چیزوں سے روک دیتا ہے' اسے نیک لوگوں کی صحبت عطا کرتا ہے' لیکن ان سے استفادے کی صلاحیت سے محروم کردیتا ہے' اسے اعمال صالح سے نوازتا ہے' لیکن ان میں اخلاص سے محروم کردیتا ہے' اسے حکمت عطا کرتا ہے اور اس میں صدق سے روک دیتا ہے' سوسیؒ کہتے ہیں کہ مخلوق کے اعمال سے اللہ تعالیٰ کی مراد صرف اخلاص ہے' حضرت جنیدؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے کچھ بندے ایسے ہیں کہ عاقل ہوتے ہیں' اور جب عاقل ہوتے ہیں تو عمل کرتے ہیں اور جب عمل کرتے ہیں تو اخلاص اختیار کرتے ہیں' اور اخلاص انھیں نیکیوں کی تمام قسموں کی طرف بلاتا ہے' محمد ابن سعید المروزیؒ کہتے ہیں کہ تمام معاملات کی دو اصل ہیں' ایک اس کا فعل تیرے ساتھ' اور دوسرا تیرا فعل اس کے لیے' جو فعل وہ تیرے ساتھ کرے تجھے اس پر راضی رہنا چاہیے' اور جو فعل تو کرے تجھے اس میں مخلص رہنا چاہیے' اگر تو نے ایسا کیا تو ان دونوں اصلوں میں کامیاب رہے گا' اور دارین کی سعادت حاصل کرے گا۔

اخلاص کی حقیقت: ہر شئی میں غیر کے اختلاط کا تصور کیا جاسکتا ہے' جب کوئی شئی غیر کے اختلاط سے خالی اور صاف ہو تو اسے خالص کہتے ہیں' اور جس فعل سے وہ صاف ہوتی ہے اسے اخلاص کہا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

مِنْ بَيْنِ فَرْثٍ وَّدَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشَّارِبِيْنَ۔ (پ ۱۴ ر ۱۵ آیت ۶۶)

گوبر اور خون کا جو (مادہ) ہے اس کے درمیان سے صاف اور گلے میں آسانی سے اترنے والا دودھ (ہم تم کو پینے کے لیے دیتے ہیں)

لبن کا خالص ہونا یہ ہے کہ اس میں گوبر اور خون کی آمیزش نہ ہو' اخلاص کی ضد شرک ہے' جو شخص مخلص نہیں ہوتا وہ مشرک ہوتا ہے تاہم شرک کے کچھ درجات ہیں' توحید میں اخلاص کی ضد الوہیت میں شرک ہے' شرک میں خفی درجات بھی ہیں اور جلی بھی' یہی حال اخلاص کا ہے' اخلاص اور شرک دونوں قلب پر وارد ہوتے ہیں گویا ان دونوں کا محل قلب ہے' اور ان کا ورود قصد و نیت سے ہوتا ہے' چنانچہ ہم نیت کی حقیقت بیان کرچکے ہیں جس کا حاصل یہ ہے کہ نیت کسی ایسے باعث کی تحریک کا نام ہے جو غرض کے موافق ہو' اگر باعث ایک ہو' اور فعل اسی باعث کی وجہ سے صادر ہوا ہو تو اسے اخلاص کہتے ہیں' بشرطیکہ وہ باعث غرض مقصود کے موافق بھی ہو' چنانچہ اگر کسی شخص نے صدقہ دیا اور اس کی غرض محض ریا ہے' تو وہ مخلص ہے' اور اگر اس کا مقصد محض اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرنا ہے تب بھی مخلص ہے' لیکن عادتاً لفظ اخلاص اسی عمل کے ساتھ مخصوص قرار دیا جاتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے تقرب کے لیے کیا گیا ہو اور جو غیر اللہ کی تمام کدورتوں سے پاک و صاف ہو' یہ ایسا ہی ہے جیسے الحاد میلان کو کہتے ہیں' لیکن عادتاً حق سے اعراض کو الحاد کہا جاتا ہے' جس شخص کے فعل کا باعث محض ریا ہو وہ معرض ہلاکت میں ہے' ہم یہاں ریا پر گفتگو کرنا نہیں چاہتے' اس کا تفصیلی بیان کتاب الریا میں گذر چکا ہے' ریا کی کم سے کم سزا وہ ہوگی جو حدیث شریف میں مذکور ہے:

اِنَّ الْمُرَائِيْ يُدْعٰى يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِاَرْبَعِ اَسَامٍ يَامُرَائِيْ يَامُخَادِعُ يَامُشْرِكُ يَاكَافِرُ۔ (ابن ابی الدنیا)

قیامت کے دن ریا کار کو چار ناموں سے پکارا جائے گا اے ریا کار! اے دھوکا دینے والے! اے مشرک! اے کافر!

یہاں ہم اس باعث پر گفتگو کرنا چاہتے ہیں جو تقرب کی نیت سے برانگیختہ ہو' پھر اس باعث میں کوئی دوسرا باعث مخلوط ہوجائے' خواہ وہ دوسرا باعث ریا سے ہو' یا غیر ریا سے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص روزے سے بھی تقرب کی نیت کرے

اور اس کا مقصد پرہیز کرنا بھی ہو' یا غلام آزاد کرے' اور ثواب کے علاوہ یہ نیت بھی ہو کہ اس کے مصارف اور غلط عادات سے بچا رہے' یا حج کرے تاکہ حج میں سفر کی حرکت سے اس کے مزاج میں اعتدال آجائے' یا اس شر سے محفوظ رہے جو وطن میں اس کے درپے ہے' یا دشمن سے دور رہے' یا اپنے بیوی بچوں سے تنگ آگیا ہو' اور حج کے ذریعے ان سے دور رہنے کا خواہشمند ہو' یا کسی مشغولیت کے باعث تھک گیا ہو' اور اب آرام کرنا چاہتا ہو' یا کوئی شخص اس لیے جہاد کرتا ہو کہ فن حرب میں مہارت حاصل کرسکے' یا لشکر کی تیاری اور جنگی سامان کی فراہمی کا طریقہ آجائے' اور دشمن پر حملہ کرنے کے فن سے واقف ہو جائے' یا کوئی شخص اپنے گھر کی حفاظت کے لیے بیدار رہنے کی غرض سے تہجد کی نماز پڑھے' یا کوئی شخص علم اس لیے حاصل کرے کہ اس طرح اس کا مال و متاع محفوظ رہے گا' اور طمع پیشہ لوگوں کے دست و برد سے بچا رہے گا۔ یا اس لیے وعظ و تدریس کی محفل سجائے کہ خاموشی سے اکتا گیا ہو' اور بولنے کی لذّت حاصل کرنا چاہتا ہو' یا صوفیاء اور علماء کی کفالت اس لیے کرتا ہو کہ ان کے دل میں اس کی قدر و منزلت زیادہ ہو جائے اور لوگ بھی اسے احترام کی نظروں سے دیکھیں' اور اس کے ساتھ نرمی کا معاملہ کریں کیوں کہ وہ اللہ والوں کا کفیل ہے' یا قرآن کریم کی کتابت اس لیے کرے کہ مسلسل لکھنے سے خط اچھا ہو جاتا ہے یا پیدل چل کر حج کرے تاکہ کرایہ کے بوجھ سے نجات پاسکے' یا وضو اس لیے کرے کہ ٹھنڈے پانی سے جسم کو راحت ملتی ہے' اور میل کچیل دور ہوتا ہے' یا اس لیے غسل کرے کہ اس سے جسم کی بدبو دور ہوتی ہے یا حدیث اس لیے بیان کرے کہ لوگ عالی سندوں میں اس کا نام لیں گے یا مسجد میں اس لیے معتکف ہو کہ گھر کے کرائے سے بچا رہے' یا روزہ اس لیے رکھے کہ کھانا پکانے کی مشقت سے بچنا چاہتا ہو' یا یہ سوچتا ہو کہ اگر میں کھانا کھاؤں گا تو اس سے کام میں حرج ہوگا' یا کسی سائل کا سوال اس لیے پورا کرے کہ اس کے مانگنے سے تنگ آگیا ہو' یا مریض کی عیادت اس خیال سے کرے کہ وہ یا اس کے متعلقین اس کی عیادت کریں گے' یا کسی کے جنازے میں اس لیے شریک ہو کہ مرحوم کے اعزّہ اس کے اہل خانہ ان کے جنازوں میں شرکت کریں گے' یا ان میں سے کوئی کام اس لیے کرے کہ لوگ ان اعمال کے حوالے سے اس کا ذکر کریں گے' اور اس کی تعریف کریں گے' اور نیک کاموں میں اس کی شہرت ہوگی' اور لوگ اسے احترام اور عزت دیں گے۔ ان تمام صورتوں میں اگر تقرّب الی اللہ کی نیت بھی ہوگی اور ان مقاصد میں سے کوئی مقصد بھی ہوگا تو اس کا عمل اخلاص کی تعریف سے نکل جائے گا' اور یہ نہیں کہا جائے گا کہ اس کا عمل خالص اللہ تعالیٰ کے لیے ہے' بلکہ اس میں شرک کو جگہ مل جائے گی' اور اللہ تعالیٰ ایک حدیث قدسی میں ارشاد فرماتا ہے کہ میں تمام شرکاء میں شرک سے سب سے زیادہ بے نیاز ہوں' خلاصہ یہ ہے کہ دنیاوی حظوظ میں سے اگر کوئی حظ ایسا ہے کہ نفس اس کی طرف مائل ہو اور رغبت رکھتا ہو اور وہ کسی عمل میں جگہ پاجائے تو اس حظ کی وجہ سے اس عمل کا اخلاص متاثر ہوگا' کیوں کہ انسان ہر وقت اپنے حظوظ نفس' اور خواہشات میں مستغرق رہتا ہے اس لیے ایسا کم ہوتا ہے کہ اس کا کوئی فعل یا عبادت ان حظوظ اور خواہشات سے خالی ہو' اور اس کا عمل یا عبادت خالص قرار دی جاسکے' اسی لیے یہ کہا گیا ہے کہ جس شخص کو زندگی میں ایک لمحہ بھی ایسا مل جائے جو اللہ کے لیے خالص ہو' وہ لمحہ اس کی نجات اور سلامتی کے لیے کافی ہوگا' اور یہ اس لیے کہ اخلاص کا وجود انتہائی کمیاب ہے' اور دل کو ان شوائب اور مخلوط ہونے والی چیزوں سے' پاک و صاف کرنا نہایت دشوار ہے' بلکہ خالص عمل وہ ہے جس کا باعث تقرّب الی اللہ کے علاوہ کوئی دوسرا نہ ہو' اگر یہ حظوظ اور لذات تنہا اعمال کا باعث ہوں تو صاحب اعمال پر ان اعمال کی وجہ سے انتہائی سختی ہوگی' اور یہ بالکل ظاہریات ہے' لیکن اگر اعمال سے نیت تقرّب الی اللہ کی ہو' اور ان میں ان حظوظ کی آمیزش بھی ہو جائے تو عمل اللہ کے لیے خالص نہیں رہتا۔ اعمال میں حظوظ نفس کی زیادتی کی تین صورتیں ہیں' یا تو رفاقت کے طور پر زیادتی ہوگی یا شرکت کے طریقے پر یا معاونت کے اعتبار سے نیت میں بھی اسی طرح کی تقسیم تھی' اور وہاں ان تینوں صورتوں کی وضاحت ہو چکی ہے' یہاں ایک تقسیم یہ بھی ہے کہ نفسانی باعث دینی باعث کے برابر ہو' یا کم ہو یا زائد ہو' اور ان میں سے ہر ایک کا جداگانہ حکم ہے' ہم عنقریب اس کا ذکر کریں گے انشاء اللہ تعالیٰ۔

اخلاص کے معنی یہ ہیں کہ اعمال ہر طرح کے شوائب سے پاک ہوں' خواہ وہ تھوڑے ہوں' یا بہت' اور اس میں صرف تقرب

الی اللہ کی نیت ہو' اس کے علاوہ کوئی اور باعث نہ ہو' اور اس طرح کے اعمال کا تصور صرف ان لوگوں سے ممکن ہے جو اللہ تعالی سے محبت کرنے والے اور آخرت میں ڈوبے ہوئے ہیں' اور دنیا کی محبت کے لیے ان کے دل میں کوئی جگہ نہیں ہے' یہاں تک کہ وہ کھانا پینا بھی پسند نہیں کرتے' بلکہ کھانے پینے میں ان کی رغبت ایسی ہوتی ہے جیسے قضائے حاجت میں جس طرح سے بشری ضرورت اور انسانی جسم کا تقاضا سمجھا جاتا ہے اسی طرح کھانا پینا بھی انسانی حاجت اور بشری تقاضا ہے۔ وہ کھانے کی طرف اس لیے مائل نہیں ہوتے کہ وہ کھانا ہے' یا اس سے لذت حاصل ہوتی ہے' بلکہ اس لیے راغب ہوتے ہیں کہ کھانے سے جسم میں قوت اور توانائی آتی ہے' اور اللہ تعالی کی عبادت و اطاعت پر اسے قدرت ملتی ہے۔ ان لوگوں کی آرزو یہ ہوتی ہے کہ کاش انھیں بھوک کے شر سے نجات مل جائے' اور کھانے کی کوئی ضرورت باقی ہی نہ رہے' ان کے قلوب میں زائد از ضرورت حظوظ کی طرف کوئی میلان نہیں ہوتا بلکہ وہ قدر ضرورت ہی پر قناعت کرتے ہیں' اور اسے بھی دین کی ضرورت سمجھتے ہیں' ایسا شخص جس کے تمام افکار اور اشغال کا محور اللہ تعالی کی ذات ہو جب کوئی عمل کرتا ہے خواہ وہ کھانا پینا ہو' یا قضائے حاجت کرنا تو اس کا عمل خالص ہوتا ہے' اور اس کی تمام حرکات و سکنات میں نیت صحیح ہوتی ہے۔ چنانچہ یہ شخص عبادت پر تقویت حاصل کرنے اور جسم کو آئندہ کی اطاعت کے لیے راحت دینے کی خاطر سوتا ہے تو اس کا سونا بھی عبادت ہے اور اسے مخلصین کا درجہ عطا کیا جاتا ہے' اور جس شخص کا حال یہ نہیں ہوتا' اعمال میں اخلاص کا دروازہ اس پر بند کر دیا جاتا ہے' صرف شاذ و نادر ہی اس سے اخلاص ظاہر ہوتا ہے ورنہ عام طور پر اس کی ہر عبادت کسی نہ کسی دنیوی مقصد کے لیے ہوتی ہے' پھر جس شخص پر اللہ تعالی کی اور آخرت کی محبت غالب ہوتی ہے اس کی تمام حرکات و سکنات بھی اسی کے غلبے کے اثر سے اخلاص بن جاتی ہیں' اور اس کا ہر عمل خلوص کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے' دوسری طرف وہ شخص ہے جس پر دنیا کی' اور اقتدار و حکومت کی محبت غالب ہے' اور مجموعی حیثیت سے وہ غیر اللہ کی رغبت رکھتا ہے اس کی تمام حرکات و سکنات پر یہی صفت غالب آجاتی ہے' اور اس کی کوئی عبادت روزہ' نماز اور صدقہ بچ نہیں پاتا۔ شاذ و نادر کا ضرور استثناء کیا جاسکتا ہے۔

عدم اخلاص کا علاج : اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ اخلاص کا نہ ہونا ایک مرض ہے' اور اس کا علاج یہ ہے کہ نفسانی حظوظ کا قلع قمع کیا جائے' دنیا سے طمع منقطع کی جائے' اور آخرت کے لیے اس طرح خاص ہوا جائے کہ دل پر آخرت غالب ہو جائے' اس طرح اخلاص یقیناً آسان ہو جائے گا' کتنے اعمال ایسے ہیں کہ انسان ان میں تعب اور مشقت برداشت کرتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ میں خالص اللہ کی رضا کے لیے یہ عمل کر رہا ہوں' لیکن اس کا خیال غلط ہوتا ہے' مغالطے کی وجہ یہ ہے کہ اسے آفت کی وجہ معلوم نہیں ہوتی' اور وہ اپنے اعمال کو شوائب سے پاک تصور کرنے کی غلط فہمی میں مبتلا رہتا ہے' ایک بزرگ نے اپنی تیس برس کی نمازیں محض اس لیے دہرائیں کہ ایک دن جب وہ مسجد میں پہنچے تو جماعت کھڑی ہو چکی تھی' اور صف اول میں جگہ باقی نہیں رہی تھی' مجبوراً انھیں دوسری صف میں نماز پڑھنی پڑی' اور اس پر انھوں نے شرم محسوس کی' اس واقعہ کے بعد ان کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ میں صف اول میں محض اس لیے نماز پڑھتا تھا کہ لوگ مجھے دیکھتے تھے' اور مجھے ان کے دیکھنے سے خوشی ملتی تھی' اسی لیے آج دوسری صف میں کھڑا ہونے پر مجھے شرم محسوس ہوئی' اس خیال کے ساتھ ہی انھیں یہ احساس ہوا کہ ان کی تیس برس کی نمازیں ضائع ہو گئیں' اب ان کا اعادہ کرنا چاہیے' یہ ایک دقیق آفت ہے' ہر شخص اسے سمجھنے کا اہل بھی نہیں ہے۔ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ اعمال اس طرح کی آفتوں سے محفوظ رہیں' اور بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو ان آفتوں سے محفوظ ہو جائیں' صرف وہی لوگ آگاہ ہو پاتے ہیں' اور سلامتی کی تدبیریں کرتے ہیں جنھیں اللہ اس کی توفیق عطا کرتا ہے' غافل دیکھیں گے کہ آخرت میں ان کی تمام نیکیاں گناہوں کا پیکر اختیار کر چکی ہیں' قرآن کریم کی ان آیات میں یہی لوگ مراد ہیں:۔

وَبَدَا لَهُمْ مِنَ اللَّهِ مَا لَمْ يَكُونُوا يَحْتَسِبُونَ (پ ۲۴ ر ۲ آیت ۴۷)

اور خدا کی طرف سے ان کو وہ معاملہ پیش آئے گا جس کا ان کو گمان بھی نہ تھا۔

وَبَدَا لَهُمْ سَيِّئَاتُ مَا كَسَبُوا (پ ۲۴ ر ۲ آیت ۴۸)

اور اس وقت ان پر ان کے تمام برے اعمال ظاہر ہو جائیں گے۔

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْأَخْسَرِينَ أَعْمَالًا الَّذِينَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا (پ ۱۶ ر ۳ آیت ۱۰۳-۱۰۴)

آپ کہئے کہ کیا ہم تم کو ایسے لوگ بتائیں جو اعمال کے اعتبار سے بالکل خسارے میں ہیں یہ لوگ ہیں جن کی دنیا میں کی کرائی محنت سب گئی گذری ہوئی اور وہ اسی خیال میں ہیں کہ اچھا کام کر رہے ہیں۔

اس فتنے کا سب سے بڑا نشانہ علماء بنتے ہیں' اس لیے کہ اکثر علماء دین کی اشاعت اس لیے کرتے ہیں کہ انھیں دوسروں پر برتری میں لذت ملتی ہے' اقتدار اور پیروی میں خوشی ہے' اور تعریف و توصیف سے دل بلیوں اچھلتا ہے' شیطان ان پر یہ معاملہ ملتبس کر دیتا ہے' اور یہ کہتا ہے کہ تمہارا مقصد اللہ کے دین کی اشاعت اور اس شریعت کا دفاع ہے جو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی ہے بہت سے واعظ ایسے بھی نظر آتے ہیں جو مخلوق کی اصلاح کرنے اور بادشاہوں کو وعظ و نصیحت کرنے کے عمل کو اپنا احسان تصور کرتے ہیں' اور جب لوگ ان کی بات سن لیتے ہیں یا ان کی نصیحت پر عمل کرتے ہیں تو خوشی سے پھولے نہیں سماتے' ان کا دعویٰ یہ ہوتا ہے کہ وہ اس لیے خوش ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں اپنے دین کی نصرت اور تائید کے لیے منتخب کیا ہے' اور اصلاح خلق کی توفیق ارزانی کی ہے' حالانکہ ان کا حال یہ ہے کہ اگر اللہ کے سادہ لوح بندے اس کے بجائے اسی جیسے کسی دوسرے عالم کے پاس چلے جائیں' اور اس سے استفادہ کریں تو حسد اور غم انھیں ہلاک کر ڈالے' حالانکہ اگر ان کا مقصد محض وعظ و نصیحت ہوتا تو وہ لوگوں کے اس رجحان پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے کہ اس نے یہ ذمہ داری دوسروں کے سپرد کر کے ایک بڑی مشقت سے بچالیا ہے' اور ایک نازک اور پر خطر فریضے سے محفوظ رکھا ہے۔ شیطان اس وقت بھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑتا اور یہ کہتا ہے کہ تو اس لیے غم گین نہیں ہے کہ مخلوق خدا تیرے بجائے کسی اور عالم کی طرف رجوع کیے ہوئے ہے' بلکہ تیرے غم کی اصل وجہ یہ ہے کہ تو اس طرح اشاعت دین' حفاظت علم' اور اصلاح مخلوق کے اجر و ثواب سے محروم رہ گیا ہے۔ اس بیچارے کو معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر سر تسلیم خم کرنے میں اس سے کہیں زیادہ اجر و ثواب ہے جو مخلوق کی رہنمائی میں اسے حاصل ہوتا۔ اگر اس طرح کے معاملات میں غم کرنا محمود ہوتا تو جس وقت حضرت ابوبکرؓ نے بار خلافت سنبھالا تھا حضرت عمرؓ کو ضرور غم ہونا چاہیے تھا' اس لیے کہ تمام مسلمانوں کا امام بننا' اور ان کے دین و دنیا کے امور کا متکفل ہونا ایک بڑا کار خیر' اور زبردست سعادت ہے' اس کے برعکس حضرت عمرؓ کو اس واقعے سے بڑی خوشی ہوئی کہ حضرت ابوبکرؓ نے بار امامت اپنے کاندھوں پر اٹھایا' اور وہی اس کے مستحق بھی تھے۔ آج کل کے علماء کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ اس طرح کے واقعات سے خوش نہیں ہوتے' بعض اہل علم شیطان کے اس فریب میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ اگر ہم سے افضل کوئی شخص ہوگا تو ہم بھی خوش ہوں گے یہ محض دعویٰ ہے' جب عملی شکل میں اس دعویٰ کی آزمائش کی جاتی ہے تو یہ لوگ ناکام رہ جاتے ہیں' اور ان کا عمل دعویٰ کے مطابق نہیں ہو پاتا' دراصل انسان بہت جلد اپنے وعدے اور دعوے فراموش کرنے والا ہے' صرف وہی لوگ اس آزمائش میں ثابت قدم رہتے ہیں جو شیطان اور نفس کے مکر سے واقف ہوتے ہیں' اور نفس کا امتحان کرتے رہتے ہیں۔

بہرحال اخلاص کی حقیقت کا جاننا اور اس پر عمل کرنا ایک گہرا سمندر ہے' اس میں اکثر لوگ غرق ہو جاتے ہیں' شاذ و نادر ہی بچ پاتے ہیں' اور یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جن کا اس آیت میں استثناء کیا گیا ہے۔

إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِينَ (پ ۱۴ ر ۳ آیت ۴) بجز آپ کے ان بندوں کے جو ان میں منتخب کئے گئے ہیں۔

بندے کو چاہیے کہ وہ ان دقیق امور پر گہری نظر رکھے' ایسا نہ ہو کہ غفلت میں شیطان کا تبع بن جائے۔

اخلاص کے سلسلے میں مشائخ کے اقوال: سوسیؒ فرماتے ہیں کہ اخلاص یہ ہے کہ اخلاص پر نظر نہ ہو' اس لیے کہ جو شخص اپنے اخلاص پر نظر رکھے گا اسے اس اخلاص کی صحت کے لیے دوسرے اخلاص کی ضرورت ہوگی اس قول میں یہ اشارہ کیا گیا ہے کہ اپنے عمل پر نظر کرنا عجب ہے' اور عجب کا شمار آفات میں ہوا کرتا ہے' اور خالص عمل وہ ہے جو تمام آفتوں سے محفوظ ہو'

جس اخلاص میں عجب ہوگا وہ آفت سے محفوظ نہیں ہوگا اس لیے اسے اخلاص نہیں کہا جائے گا' حضرت سہل تستری فرماتے ہیں کہ اخلاص یہ ہے کہ بندہ کی ہر حرکت' ہر سکون اللہ تعالیٰ کے لیے ہو' یہ ایک جامع قول ہے' اور ہمارے مقصد کو پوری طرح حاوی ہے' اسی کے قریب قریب ابراہیم ابن ادہم کا یہ قول ہے کہ اخلاص یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ صادق نیت ہو۔ حضرت سہل تستری سے کسی نے پوچھا کہ نفس پر سب سے زیادہ دشوار چیز کیا ہے' فرمایا اخلاص۔ اس لیے کہ نفس کو اس سے کوئی مناسبت نہیں ہوتی۔ رویمؒ فرماتے ہیں کہ عمل میں اخلاص یہ ہے کہ مخلص دنیا و آخرت میں کسی عوض کی امید نہ رکھے' اس قول میں یہ بتلایا گیا ہے کہ تمام حظوظ نفس آفت ہیں خواہ وہ دنیا سے تعلق رکھتے ہوں یا آخرت سے متعلق ہوں چنانچہ جو شخص آخرت میں جنت کے نعمتوں کے حصول کے لیے عبادت کرتا ہے وہ آفت زدہ ہے صحیح تر بات یہ ہے کہ عمل سے صرف اللہ تعالیٰ کی رضا مقصود ہونی چاہیے' یہ صدیقین کا اخلاص ہے' اسے اخلاص مطلق کہتے ہیں جو شخص جنت کی امید اور دوزخ کے خوف سے عمل کرتا ہے اسے دنیوی لذات کے اعتبار سے مخلص کہہ سکتے ہیں' ورنہ حقیقت میں وہ شکم اور شرمگاہ کے حظوظ کا طالب ہے' اہل حق کے نزدیک صرف رضائے حق مطلوب ہوتی ہے' انھیں دنیا یا آخرت کی کسی لذت سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔

رہا یہ قول کہ ہر انسان کسی نہ کسی حظ کے لیے متحرک ہوتا ہے' حظوظ سے خالی ہونا اللہ تعالیٰ کی صفت ہے' اگر کوئی انسان یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ حظوظ سے خالی ہے تو اس کا یہ دعویٰ غلط ہے بلکہ وہ شخص کفر سے قریب تر ہے' جیسا کہ قاضی ابو بکر باقلانیؒ نے اس شخص پر حکم لگایا ہے جو حظوظ نفس سے برأت کا اظہار کرے' وہ یہ کہتے ہیں کہ حظوظ سے دور ہونا اللہ تعالیٰ کی صفت ہے' انسان کو اس طرح کے دعوے زیب نہیں دیتے۔ بظاہر یہ قول صحیح معلوم ہوتا ہے' لیکن اصل میں جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ انسان کو دنیا و آخرت کے حظوظ سے خالی ہونا چاہیے ان کی مراد وہ حظوظ ہیں جنھیں لوگ حظ کہتے ہیں یعنی جنت کی نعمتیں' اور ان لوگوں کی مراد معرفت' مناجات اور دیدار الٰہی کی لذت ہے' لوگ اسے حظ نہیں سمجھتے' حالانکہ یہ اتنا بڑا حظ ہے کہ اگر اس کے عوض میں جنت کی تمام لذتیں عطا کی جائیں تو وہ انھیں حقیر سمجھ کر ٹھکرا دیں' گویا محبین خدا اس ابدی حظ کے لیے عبادت کرتے ہیں جنت کی طمع میں' اور اس کی لذتوں کے حصول کے لیے نہیں کرتے' ان کا حظ صرف معبود برحق ہے' اس کے علاوہ وہ کسی نعمت کو حظ نہیں سمجھتے' ابو عثمانؒ کہتے ہیں کہ اخلاص یہ ہے کہ مخلوق سے نظر ہٹا کر ہمیشہ کے لیے خالق کو اپنی نگاہ کا مرکز بنالے۔ اس قول میں ریاء کی آفت سے بچنے کی طرف اشارہ ہے ایک بزرگ کہتے ہیں کہ عمل میں اخلاص اس طرح ہونا چاہیے کہ شیطان بھی اس پر مطلع نہ ہو سکے' ورنہ وہ اخلاص میں فساد پھیلانے کی کوشش کرے گا' حد یہ ہے کہ فرشتے کو بھی خبر نہ ہونی چاہیے تاکہ وہ لکھ نہ سکے' اس قول میں عمل کو پوشیدہ کرنے پر تنبیہہ ہے۔ ایک بزرگ کہتے ہیں کہ اخلاص وہ ہے کہ خلائق سے مخفی' اور علائق سے پاک ہو' یہ مقاصد اخلاص کو جامع قول ہے۔ محاسبیؒ کہتے ہیں کہ اخلاص یہ ہے کہ اپنے اور رب کے درمیان سے مخلوق کی مداخلت کی راہ مسدود کردے' اس میں ریا کی طرف اشارہ کیا گیا ہے' خواصؒ کہتے ہیں کہ جو شخص اقتدار کا نشہ کرلیتا ہے وہ عبودیت کے اخلاص سے آزاد ہو جاتا ہے' حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ان کے بعض حواریین نے دریافت کیا کہ عمل خالص کیا ہے' انھوں نے جواب دیا کہ عمل خالص وہ ہے جو صرف اللہ کے لیے کیا جائے اور اس پر مخلوق کی ستائش یا صلے کی تمنا نہ ہو' اس میں بھی ترک ریا کی تاکید کی گئی ہے ریا کو بطور خاص اس لیے بیان فرمایا کہ جن امور سے اخلاص باطل ہوتا ہے ان میں یہ امر زیادہ مؤثر اور قوی ہے حضرت جنیدؒ فرماتے ہیں کہ اخلاص عمل کو کدورتوں سے پاک کرتا ہے حضرت فضیل ابن عیاضؒ کہتے ہیں کہ لوگوں کی وجہ سے عمل نہ کرنا ریا ہے' اور ان کی وجہ سے عمل کرنا شرک ہے' اور اخلاص یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تجھے ریا اور شرک دونوں سے محفوظ رکھے۔ ایک بزرگ کا قول ہے کہ اخلاص دوام مراقبہ' اور حظوظ نفس کو قطعی طور پر فراموش کردینے کا نام ہے۔ اخلاص کے سلسلے میں بزرگوں کے بے شمار اقوال ہیں' لیکن ان اقوال کے بعد اب مزید اقوال کی ضرورت نہیں رہتی کیوں کہ اخلاص کی حقیقت واضح ہو چکی ہے۔ بلکہ اخلاص کے سلسلے میں تو ہمیں۔ ان تمام اقوال سے قطع نظر کرتے ہوئے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کو حرز جاں بنالینا چاہیے۔ کسی شخص نے آپ سے اخلاص کے بارے میں دریافت کیا' آپ نے فرمایا:۔

أَنْ تَقُوْلَ رَبِّيَ اللّٰهُ ثُمَّ تَسْتَقِيْمُ كَمَا أُمِرْتَ (۱)

یہ کہ تو کہے اللہ میرا رب ہے' پھر ثابت قدم رہے جیسا کہ تجھے حکم دیا گیا ہے۔

یعنی نہ اپنی خواہش نفس کی عبادت کر' اور نہ نفس کی پرستش کر' صرف اپنے رب کی عبادت کر' اور اس میں ثابت قدم رہ جس طرح ثابت قدم رہنے کا حکم ہوا ہے' اس حدیث میں ماسوی اللہ سے قطع نظر کی طرف اشارہ ہے' اور حقیقت میں اخلاص یہی ہے۔

اخلاص کو مکدر کرنے والی آفات اور شوائب: اخلاص کو مکدر کرنے والی آفتیں بہت سی ہیں' ان میں سے بعض جلی ہیں اور بعض خفی' اور بعض میں جلاء کے ساتھ ضعف ہے' اور بعض میں خفا کے ساتھ قوت ہے لیکن خفاء اور جلاء میں ان آفتوں کے درجات کا اختلاف مثال کے بغیر سمجھنا ممکن نہیں ہے' اس لیے ہم پہلے ایک مثال بیان کرتے ہیں' مثال میں ہم ریا کا ذکر کریں گے' اخلاص کو ریاء ہی سے زیادہ خطرہ لاحق ہوتا ہے' مثلاً ایک نمازی نماز پڑھنے میں مشغول ہے اور پورے اخلاص کے ساتھ نماز پڑھ رہا ہے اتنے میں چند لوگ یا ایک شخص اس جگہ آیا جہاں وہ نماز ادا کر رہا تھا' شیطان نے موقع غنیمت سمجھا اور بلا تاخیر اس کے پاس پہنچ گیا' اور اس سے کہنے لگا کہ اچھی طرح نماز پڑھ تاکہ دیکھنے والوں پر اچھا اثر ہو' اور وہ تجھے نیک صالح سمجھ کر تیرا احترام کریں' تجھے نظر حقارت سے نہ دیکھیں' اور نہ تیری غیبت کریں' یہ سن کر وہ شخص اپنے اعضاء میں خشوع پیدا کر لیتا ہے' اور مزید پرسکون ہو کر نماز میں مشغول رہتا ہے' اور نماز میں زیادہ سے زیادہ حسن پیدا کرتا ہے' یہ ریائے ظاہر ہے' اور مبتدی مریدوں پر بھی مخفی نہیں رہتا یہ ریاء کا پہلا درجہ ہے' دوسرا درجہ یہ ہے کہ مرید نے اس آفت کا ادراک کر لیا ہو اور اس سے محفوظ رہنے کی تدبیر بھی کر لی ہو چنانچہ یہ مرید اس آفت میں شیطان کی اطاعت نہیں کرتا' اور نہ اس کی طرف التفات کرتا ہے۔ بلکہ اپنی نماز میں اسی طرح مشغول رہتا ہے جس طرح لوگوں کی آمد سے پہلے مشغول تھا ایسے شخص کے پاس شیطان خیر کا لبادہ پہن کر آتا ہے' اور اس سے کہتا ہے کہ لوگ تیری اتباع کرتے ہیں تیری تقلید کرتے ہیں' تیری ہر حرکت پر نظر رکھتے ہیں' تو جو کچھ کرتا ہے وہ ان کے اعمال پر اثر انداز ہوتا ہے' وہ تیرے ہر ہر عمل کو قابل تقلید نمونہ تصور کرتے ہیں' اگر تو نے اچھی طرح عمل کیا تو تجھے ان کے اعمال کا ثواب بھی ملے گا' اور اگر تو نے عمل میں کوتاہی کی تو ان کے اعمال کا وبال بھی تیری گردن پر رہے گا' اس لیے لوگوں کے سامنے اچھی طرح عمل کر' ہو سکتا ہے یہ لوگ خشوع و خضوع اور تحسین اعمال میں تیری تقلید کریں یہ درجہ پہلے کے مقابلے میں زیادہ غامض ہے بعض اوقات جو لوگ شیطان کی تدبیر سے فریب نہیں کھاتے وہ اس دوسری تدبیر کے فریب میں آجاتے ہیں یہ بھی ریا ہے' اور اخلاص کو باطل کرنے والا ہے اس لیے کہ اگر خشوع و خضوع اور تحسین عبادت میں اس کے نزدیک کوئی خیر ہے اور وہ نہیں چاہتا کہ لوگ اس خیر سے محروم رہیں تو تنہائی میں ایسا کیوں نہیں کرتا' اور یہ بات تسلیم نہیں کی جا سکتی کہ اس کے نزدیک اپنے نفس کے مقابلے میں دوسرے کا نفس زیادہ عزیز ہو' اور وہ اپنی بہتری کے بجائے دوسرے شخص کی بہتری کا زیادہ خواہاں ہو یہ محض شیطانی تلبیس ہے وہ اسے تقلید کا فریب دے کر ریا میں مبتلا کر رہا ہے مقتدی بننے کا اہل وہ ہے جو اپنے نفس میں مستقیم ہو' جس کا قلب منور ہو اور اس نور کی شعاعیں دوسروں تک بھی پہنچتی ہوں اور انھیں بھی روشن کرتی ہوں' اس صورت میں اسے یقیناً دوسروں کی تقلید اور اتباع کا ثواب ہوگا' لیکن یہ صورت محض فریب اور تلبیس کی ہے تاہم اس اتباع سے متبع کو ضرور ثواب ملے گا' اور متبوع سے اس تلبیس پر باز پرس کی جائے گی' اور اسے اس حرکت کی سزا دی جائے گی کہ وہ جس وصف سے متصف نہیں تھا اس کا اظہار کیوں کیا تیسرا درجہ اس دوسرے درجے سے بھی زیادہ غامض اور مغلق ہے اور وہ یہ ہے کہ بندہ اس سلسلے میں اپنے نفس کو آزمانے اور شیطان کے مکر سے آگاہ رہے اور یہ جانے کہ خلوت و جلوت میں حالات کا اختلاف محض ریا ہے' اور یہ کہ اس کی نمازیں خلوت میں ایسی ہی ہونی چاہئیں جیسی لوگوں کے سامنے ہوتی ہیں اور عادت سے ہٹ کر محض لوگوں کے لیے خشوع کرنے میں اپنے نفس اور رب سے شرم محسوس کرے' تنہائی میں اپنے نفس پر متوجہ ہو' اور وہاں بھی اپنی نماز کے افعال میں وہی خوبی اور حسن پیدا کرنے کی کوشش کرے جو خوبی اور حسن مجمع عام کی نمازوں میں پیدا کرتا ہے' یہ بھی ریائے خفی کی ایک صورت ہے اگرچہ

(۱) مجھے یہ روایت ان الفاظ میں نہیں ملی' البتہ ترمذی وغیرہ میں کچھ مختلف الفاظ ہیں۔

بظاہر اس کا احساس نہیں ہوتا اس لیے کہ خلوت میں وہ نماز اس لیے اچھی طرح ادا کرتا ہے تاکہ لوگوں کے سامنے بھی اچھی طرح پڑھ سکے گویا خلوت اور جلوت دونوں حالتوں میں اس کی نظر مخلوق پر رہی ہے اخلاص اس وقت ہوتا جب اس کی نظر میں بہائم اور مخلوق کی حیثیت یکساں ہوجاتی یعنی جس طرح وہ بہائم کے لئے تحسین عبادت نہیں کرتا اسی طرح لوگوں کے لئے بھی نہ کرتا اور یہاں یہ صورت ہے کہ یہ شخص لوگوں کی سامنے خشوع وخضوع کے ساتھ نماز نہ پڑھنے کو برا سمجھتا ہے لیکن یہ سوچ کر شرماتا ہے کہ کہیں لوگوں کے سامنے ایسا کرنے سے اس کا فعل ریا نہ بن جائے پھر وہ اپنے دل میں یہ فیصلہ کرتا ہے کہ اگر میں تنہائی میں بھی اسی طرح نماز پڑھوں گا تو ریاء سے دور رہوں گا حالانکہ اس کا یہ خیال قطعاً غلط ہے ریا سے دور رہنے کی صرف ایک صورت ہے اور وہ یہ کہ مخلوق کی طرف اس کا التفات ایسا ہی ہو جیسا جمادات کی طرف ہوتا ہے خواہ تنہائی میں ہو یا مجمع میں ورنہ یہ شخص دونوں حالتوں میں مخلوق کے ساتھ مشغول تصور کیا جائے گا۔ یہ شیطان کا انتہائی مخفی مکر ہے بہت کم اس پر اطلاع ہوپاتی ہے۔

چوتھا درجہ ان تمام درجات سے زیادہ مخفی ہے اور وہ یہ ہے کہ جب کوئی شخص مجمع عام میں نماز پڑھ رہا ہو تو شیطان اسے خشوع کرنے کی ترغیب نہ دے کیوں کہ وہ یہ بات جانتا ہے کہ یہ شخص اس فریب میں آنے والا نہیں ہے مجبور ہو کر شیطان اس سے یہ کہتا ہے کہ اللہ کی عظمت وجلالت اور اس ذات گرامی کے تقدس میں غور وفکر کر جس کے سامنے تو دست بستہ کھڑا ہوا ہے اور اس بات سے ڈر کہ اللہ تعالیٰ تیرے دل پر نظر ڈالے اور وہ اس سے غافل ہو یہ سن کر وہ فوراً دل سے حاضر ہوجاتا ہے جوارح پر خشوع وخضوع طاری کرلیتا ہے اور سمجھتا ہے کہ میرا یہ عمل عین اخلاص ہے حالانکہ یہ عین مکروفریب ہے اس لیے کہ اگر اس پر اللہ تعالیٰ کی جلالت وعظمت میں غور کرنے کے وقت خشوع وخضوع طاری ہوتا تو اس میں مجمع عام کی تخصیص کیوں ہوتی تنہائی میں اس کا قلب اسی طرح حاضر ہوتا اور اللہ تعالیٰ کی جلالت شان میں اسی طرح تفکر کرتا اس فریب سے بچنے کی صورت یہ ہے کہ تنہائی میں بھی اس کا دل اللہ تعالیٰ کے ذکر و فکر میں اسی طرح مشغول ہو جس طرح مجمع عام میں رہتا ہے ایسا نہ ہو کہ لوگوں کے آنے پر اس کے دل کا حال تنہائی کے حال سے مختلف ہوجائے جیسے بہائم کی موجودگی میں یا ان کی آمد پر کسی شخص کے حال میں تغیر واقع نہیں ہوتا گویا اس وقت تک آدمی کو مخلص نہیں کہا جاسکتا جب تک اس کا دل لوگوں کو دیکھنے اور بہائم کے دیکھنے میں فرق محسوس کرتا ہے ایسا شخص صفائے اخلاص سے دور ہے اور اس کا باطن ریا کے شرک خفی سے آلودہ ہے یہ شرک انسان کے دل میں رات کی تاریکی میں سخت پتھر پر سیاہ چیونٹی کے چلنے سے بھی زیادہ مخفی ہے جیسا کہ ایک حدیث میں اس کی یہی مثال دی گئی ہے شیطان سے صرف وہی شخص محفوظ رہ سکتا ہے جس کی نظر دقیق ہو اور جو اللہ تعالیٰ کی حفاظت عنایت توفیق اور ہدایت سے سرفراز ہو ورنہ شیطان ان لوگوں کے پیچھے پڑا رہتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے کمر ہمت کستے ہیں ان سے ایک لمحے کے لیے بھی غافل نہیں ہوتا اور اس وقت تک اپنی جدوجہد میں مصروف رہتا ہے جب تک کہ انھیں ریا پر مجبور نہیں کردیتا پھر وہ بڑے اعمال ہی میں ایسا نہیں کرتا بلکہ بندگان خدا کی ہر حرکت پر نظر رکھتا ہے یہاں تک کہ آنکھوں میں سرمہ ڈالنے مونچھوں کے بال کٹوانے جمعہ کے دن کپڑے تبدیل کرنے اور خوشبو لگانے میں بھی اپنے فریب سے باز نہیں آتا یہ مخصوص اوقات کی سنتیں ہیں اور نفس کو ان میں ایک خفی حظ ہے کیوں کہ ان کا تعلق مخلوق کے مشاہدے سے ہے اور طبع ان سے مانوس ہوتی ہے اس لیے شیطان اسے ان افعال کی دعوت دیتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ سنتیں ہیں انھیں ترک نہ کرنا چاہیے حالانکہ ان افعال پر قلب میں تحریک اس لیے نہیں ہوتی کہ یہ سنتیں ہیں بلکہ اس شہوت کی بنا پر ہوتی ہے جو قلب میں مخفی ہے اور عمل اس کے باعث حد اخلاص سے نکل جاتا ہے۔ جو عمل ان تمام آفات سے خالی ہو وہ خالص نہیں ہوتا۔ بعض لوگ اعتکاف کرتے ہیں اور شیطان انھیں ایسی مساجد کی طرف متوجہ کرکے جو نفاست سے تعمیر کی گئی ہوں اور اندر سے آراستہ پیراستہ ہوں اعتکاف کا شوق دلاتا ہے اور اعتکاف کے فضائل بیان کرتا ہے بعض بندے ایسی مساجد میں اعتکاف کرتے ہیں اور اس اعتکاف کی تحریک مسجد کی خوبصورتی سے ہوتی ہے چنانچہ انھیں اگر ایسی مساجد میں اعتکاف کے لیے کہا جائے جو کم خوبصورت ہوں تو دل مائل نہیں ہوتا یہ تمام امور اعمال میں طبیعت کے شوائب اور اعمال کی کدورتوں کے امتزاج کا باعث بنتے ہیں اور ان سے اخلاص باطل ہوجاتا ہے بعض اعمال میں اخلاص کم باطل

ہوتا ہے اور بعض میں زیادہ۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے خالص سونے میں کھوٹ کی آمیزش ہو' کبھی یہ آمیزش اتنی ہوتی ہے کہ اصل سونے کا پتا ہی نہیں چلتا' اور کبھی کم ہوتا ہے' اور کبھی اتنا کم ہوتا ہے کہ ماہر جوہری کے علاوہ کوئی اسے پرکھ ہی نہیں سکتا' دامامیں غیر اللہ کی آمیزش' شیطان کی مداخلت' اور نفس کا فریب' اس سے کہیں زیادہ دقیق ہے اسی لیے کہا جاتا ہے کہ عالم کی دو رکعتیں جاہل کی سال بھر کی عبادتوں سے افضل ہے' یہاں عالم سے مراد وہ شخص ہے جو آفات اعمال کے دقائق سے واقف ہو' اور ان سے محفوظ رہنے پر قدرت رکھتا ہو' جاہل کی نظر ظاہر عبادت پر رہتی ہے' اور وہ اس سے اس طرح فریب کھاتا ہے جس طرح ایک گنوار کھوٹی اشرفی کے چمکدار اور روشن رخ کو دیکھ کر فریب میں مبتلا ہو جاتا ہے' حالانکہ کندن کا تھوڑا سونا بھی اس اشرفی سے زیادہ قیمتی ہے جسے کم عقل لوگ غلطی سے سونا سمجھ لیتے ہیں' یہی حال عبادات کا ہے' بلکہ عبادات کا معاملہ کچھ زیادہ ہی سخت ہے' اعمال میں جس قدر آفتیں پیدا ہوتی ہیں اس مختصر گفتگو میں ان کا احاطہ نہیں کیا جاسکتا' اور نہ ان کا احاطہ کرنا ممکن ہے' ہم اسی مثال پر اکتفا کرتے ہیں' ذہین آدمی کو یہ مختصر بیان بہت سی تفصیلی بحثوں سے بے نیاز کر دیتا ہے' اور کند ذہن کے لیے لمبی چوڑی بحث بھی لاحاصل ہے۔ اس لیے تفصیل میں فائدہ نہیں ہے۔

مخلوط اعمال کا ثواب : جاننا چاہیے کہ جب عمل اللہ تعالیٰ کے لیے خالص نہیں ہوتا' اور اس میں ریا اور دیگر حظوظ نفس کا امتزاج ہو جاتا ہے تو لوگ اس سلسلے میں مختلف ہو جاتے ہیں کہ آیا اس عمل کا ثواب ملے گا یا عمل کرنے والے کو عذاب ہوگا؟ یا نہ عذاب ہوگا اور نہ ثواب؟ جہاں تک اس عمل کا تعلق ہے جس میں صرف ریا ہو اس میں کسی کا اختلاف نہیں کہ ایسا عمل عذاب اور غضب کا موجب ہے' اور جس عمل سے صرف اللہ کی نیت کی گئی ہو وہ ثواب کا باعث ہے۔ اب گفتگو صرف مخلوط اعمال میں رہ جاتی ہے جہاں تک ظاہری روایات کا تعلق ہے ان سے پتا چلتا ہے کہ مخلوط عمل کا ثواب نہیں ہوگا۔ (۱) تاہم ان روایات میں تعارض پایا جاتا ہے۔ (۲) ہماری رائے یہ ہے' صحیح علم اللہ ہی کو ہے کہ قوت باعث کی مقدار دیکھی جائے گی' اگر باعث دینی اور باعث نفسی دونوں برابر برابر ہوں گے تو دونوں ایک دوسرے کا ازالہ کردیں گے اس طرح اس عمل پر نہ عذاب ہوگا اور نہ ثواب' اور اگر باعث ریا غالب تر اور قوی تر ہوگا تو اس میں کوئی نفع نہ ہوگا بلکہ وہ مضر ہوگا' اور عتاب کا باعث ہوگا' تاہم اس عمل کا عذاب خالص ریاکارانہ عمل کے عذاب سے کم ہوگا' اور اگر تقرب کی نیت غالب ہوگی تو اسے اسی قدر ثواب ملے گا جس قدر نیت غالب ہوگی قرآن کریم میں یہی اصول بیان کیا گیا ہے۔

فَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ ۝ وَمَنْ يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَرَهُ ۝ (پ ۳۰ ر ۲۲ آیت ۸-۷)

سو جو شخص ذرہ برابر نیکی کرے گا وہ (وہاں) اس کو دیکھ لے گا' اور جو شخص ذرہ برابر بدی کرے گا وہ اس کو دیکھ لے گا۔

إِنَّ اللَّهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ وَإِنْ تَكُ حَسَنَةً يُضَاعِفْهَا (پ ۵ ر ۳ آیت ۴۰)

بلاشبہ اللہ تعالیٰ ایک ذرہ برابر بھی ظلم نہ کریں گے اور اگر ایک نیکی ہوگی تو اس کو کئی گنا کردیں گے۔

اس سے معلوم ہوا کہ خیر کی نیت۔ خواہ کسی مقدار میں ہو ضائع نہیں ہوگی' اگر قصد ریا سے زیادہ ہے تو جو مقدار ریا کے برابر ہے وہ ضائع ہو جائے گی' اور زیادتی باقی رہے گی' اور اگر کم ہے تو جس قدر قصد ریا سے عذاب ہونا ہے اس میں اسی قدر تخفیف ہو جائے گی۔ اس امر کی تحقیق یہ ہے کہ اعمال کا قلوب میں یہ اثر ہوتا ہے کہ جس وصف کے باعث وہ اعمال صادر ہوتے ہیں ان اعمال سے اس وصف میں استحکام پیدا ہوتا ہے' چنانچہ داعیہ ریا کا تعلق مہلکات سے ہے' اور اس مہلک کی غذا اور قوت رسانی کا

---

(۱) چنانچہ ابوداؤد میں حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ! ایک شخص اللہ کے راستے میں جہاد کرتا ہے اور اس کی نیت دنیوی مال ومتاع کی بھی ہوتی ہے؟ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایسے شخص کے لیے کوئی اجر نہیں ہے

(۲) ابن حبان میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ ایک شخص خفیہ عمل کرتا ہے اور اگر کسی پر ظاہر ہو جائے تو اس سے اسے خوشی ہوتی ہے' آپ نے فرمایا: اس کے لیے دو اجر ہیں ایک چھپانے کا اجر اور ایک ظاہر ہونے کا۔

ذریعہ اس داعیے کے مطابق عمل کرتا ہے' اور داعیۂ خیر کا تعلق منجیات سے ہے' اور اس کو ان اعمال سے تقویت ملتی ہے جو اس داعیے کے مطابق صادر ہوتے ہیں' اب اگر قلب میں یہ دونوں متضاد صفتیں جمع ہو جائیں تو ایک مقتضی پر کیے جانے والے عمل سے صفت ریا کو قوت ملے گی اور تقرب کے مقتضی پر عمل کرنے سے صفت خیر کو تقویت حاصل ہو گی' ان میں سے ایک مہلک ہے' اور ایک نجات دلانے والا' اگر ایک کی قوت دوسرے کی قوت کے بقدر ہو گی تو دونوں برابر ہوں گی مثلاً اگر کسی شخص کو گرم چیزیں کھانے سے ضرر ہوتا ہے' اور اس نے گرم چیزوں کی ایک خاص مقدار استعمال کی اب اگر اسی مقدار کے مطابق اس نے سرد چیزیں بھی کھائیں تو یہ ایسا ہو گا جیسے اس نے کوئی چیز نہیں کھائی' اور اگر ایک چیز ان میں سے غالب ہوئی تو وہ اپنا اثر ضرور چھوڑے گی' چنانچہ جس طرح اللہ تعالیٰ کی سنت جاریہ کے مطابق کھانے کا ایک ذرہ' یا پانی کا ایک قطرہ' یا دوا کی معمولی سی مقدار جسم میں اپنا اثر ضرور چھوڑتی ہے اسی طرح خیر و شر کا ذرہ بھی قلب کو سیاہ کرنے یا منور کرنے میں اللہ سے دور کرنے یا نزدیک کرنے میں اپنا کردار ضرور ادا کرے گا' اگر کسی شخص نے کوئی ایسا عمل کیا جس سے بالشت بھر قربت ملتی' پھر اس عمل میں ایسا عمل ملا دیا جس سے بالشت بھر دوری ہوتی ہے تو گویا اس نے کوئی عمل ہی نہیں کیا' جہاں تھا وہیں رہ گیا' اور اگر اس نے ایسا عمل کیا جو دو بالشت کے بقدر قربت دیتا ہے' پھر اس میں ایسا عمل ملا دیا جس سے ایک بالشت دوری ہوتی ہے تو ایک بالشت کی برتری حاصل رہے گی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں۔ اَتْبِعِ السَّيِّئَةَ الْحَسَنَةَ تَمْحُهَا گناہ کے بعد نیک عمل کر لو' اس سے گناہ کا اثر زائل ہو جائے گا۔

جیسا کہ یہ بات واضح ہے کہ ریائے محض کو اخلاص محض ضائع کر دیتی ہے' اگر اخلاص محض ریائے محض کے بعد واقع ہو' لیکن اگر دونوں بیک وقت جمع ہوئے تو قدرتی طور پر ایک دوسرے کو ہٹائیں گے' اور ان کا اثر پہلے کے برعکس ہو گا' ہمارے اس دعویٰ کی دلیل اس امر پر اجماع امت بھی ہے کہ جو شخص حج کے لیے نکلے اور اس کے ہمراہ سامان تجارت بھی ہو تو اس کا حج صحیح ہو گا اور اسے اس پر ثواب دیا جائے گا' حالانکہ اس عمل میں نفسانی غرض تجارت کی آمیزش ہے۔ تاہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس شخص کو ثواب اس وقت ہوتا ہے جب وہ مکہ مکرمہ میں داخل ہو جاتا ہے اور حج کے ارکان ادا کرتا ہے اور تجارت کا تعلق سفر سے ہے' حج پر موقوف نہیں ہے' اس لیے حج خالص ہے' البتہ راستے کا سفر مشترک رہا' اور اس سفر میں کوئی ثواب نہ ہو گا' کیوں کہ تجارت کی نیت تھی' صحیح بات یہ ہے کہ اگر حج اصل محرک ہو' اور تجارت محض معین اور تابع ہو تو نفس سفر میں بھی ثواب ہو گا' ہمارے خیال میں وہ غازی جو کثرت غنائم کی جہت سے اللہ کی راہ میں کفار سے نبرد آزما ہوتے ہیں ان غازیوں سے مختلف ہیں جو صرف اللہ کے لیے غزوات میں شرکت کرتے ہیں مال غنیمت ان کا مقصد نہیں ہوتا لیکن اس فرق کا یہ مطلب نہیں کہ جو لوگ مال غنیمت کا قصد بھی رکھتے ہوں وہ ثواب سے یکسر محروم رہیں گے بلکہ انصاف کی بات یہ ہے کہ اگر اصل باعث اور قوی محرک اللہ تعالیٰ کا کلمہ بلند کرنا ہے' اور مال غنیمت میں بطور تبعیت رغبت ہے تو اس سے ثواب ضائع نہ ہو گا تاہم اس کا ثواب اس شخص کے برابر نہیں ہو گا جو محض اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے جنگ میں شرکت کرتا ہے' اور اس کا قلب غنیمت کی طرف ذرا التفات نہیں کرتا' اس میں شک نہیں یہ التفات نقص ہے' اور اجر میں کمی کا باعث بنتا ہے' روایات سے پتا چلتا ہے کہ ریا کی آمیزش سے ثواب باطل ہو جاتا ہے' اس معنی میں مال غنیمت کی طلب' تجارت اور دیگر حظوظ کی بھی آمیزش ہے' چنانچہ طاؤس' اور بعض دوسرے تابعین روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے اس آدمی کے بارے میں دریافت کیا جو عمل خیر کرتا ہے' یا اس نے یہ کہا کہ وہ صدقہ کرتا ہے اور یہ چاہتا ہے کہ لوگ اس عمل پر اس کی تعریف بھی کریں' اور وہ ثواب سے بھی حظ اٹھائے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا' یہاں تک کہ مندرجہ ذیل آیت کریمہ نازل ہوئی۔

فَمَنْ كَانَ يَرْجُو لِقَاءَ رَبِّهِ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهِ أَحَدًا (۲) (پ ۱۶ ر ۳ آیت ۱۱۰)

سو جو شخص اپنے رب سے ملنے کی آرزو رکھے تو نیک کام کرتا رہے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے۔

حضرت معاذ ابن جبل روایت کرتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

(۱) یہ روایت پہلے بھی گذری ہے (۲) ابن ابی الدنیا والحاکم نحوہ مرسلاً

أَدْنَى الرِّيَاءِ شِرْكٌ (طبرانی' حاکم) کم سے کم ریا بھی شرک ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص نے اپنے عمل میں شرک کیا اس سے کہا جائے گا کہ وہ اپنے عمل کا اجر اس سے لے جس کے لیے اس نے شرک کیا ہے۔ (۱) حضرت عبادہ ابن الصامتؓ ایک حدیث قدسی بیان کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا میں تمام شریکوں کی بہ نسبت شرک سے بے نیاز ہوں' جو شخص میرے لیے عمل کرتا ہے اور اس میں دوسرے کو میرے ساتھ شریک کرلیتا ہے تو میں اپنا حصہ بھی شریک کے لیے چھوڑ دیتا ہوں۔ (۲) حضرت ابوموسیٰ روایت کرتے ہیں کہ ایک اعرابی نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ! ایک شخص غیرت سے جہاد کرتا ہے ایک شخص اظہار شجاعت کے لیے لڑتا ہے اور ایک شخص اللہ کی راہ میں اپنا مرتبہ دریافت کرنے کے لیے جنگ کرتا ہے (ان میں سے کون سا شخص راہ خدا میں افضل ہے) سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا وہ شخص جو اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لیے لڑا اللہ کی راہ میں ہے' (۳) حضرت عمرؓ نے ارشاد فرمایا کہ تم کہتے ہو فلاں شخص شہید ہے' کیا معلوم اس نے اپنی اونٹنی کے دونوں تھیلے (سیم و زر سے) بھر لیے ہوں۔ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ روایت کرتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس شخص نے دنیا کا مال حاصل کرنے کے لیے ہجرت کی تو وہ اسی کے لیے ہے۔ (۴) ہماری رائے میں یہ روایات اس دعوے کے خلاف نہیں ہیں جو ہم نے گزشتہ سطور میں کیا ہے' بلکہ ان سے وہ شخص مراد ہے جو صرف دنیا کا طالب ہو' جیسا کہ مذکورہ بالا روایت سے پتا چلتا ہے کہ جس شخص نے طلب دنیا کے لیے ہجرت کی ظاہر ہے ایسے شخص کی ہجرت دنیا کے لیے ہوگی' اور اسے اس ہجرت کا ثواب نہیں ملے گا' بلکہ گناہگار ہوگا' چنانچہ ہم نے یہ بات پہلے بھی واضح طور پر لکھی ہے کہ دنیا کے لیے عمل کرنا معصیت ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ طلب دنیا حرام ہے' بلکہ اعمال دین کے بدلے میں دنیا طلب کرنا حرام ہے' کیوں کہ اس میں ریا پائی جاتی ہے' اور عبادت کے مقصد میں شرکت پائی جاتی ہے' اور شرکت برابری پر دلالت کرتی ہے' اور ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ جب دونوں قصد برابر ہوں گے تو ساقط ہوجائیں گے ایسے عمل پر نہ ثواب ہوگا اور نہ عذاب ہوگا' جو لوگ مشترک اعمال پر ثواب کی امید رکھتے ہیں وہ حماقت میں مبتلا ہیں۔

مشترک اعمال والے یوں بھی خطرے میں ہوتے ہیں' اس لیے کہ اگر کسی عمل میں دونوں قصد پائے گئے تو کیا ضروری ہے کہ وہ دونوں برابر ہوں گے' ہوسکتا ہے ان میں سے ایک غالب ہو' ہوسکتا ہے قصد ریا غالب ہوجائے اور وہ عمل اس کے لیے وبال بن جائے' اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْ لِقَاءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖ اَحَدًا (پ۱۶ر۳ آیت ۱۰)

سو جو شخص اپنے رب سے ملنے کی آرزو رکھے تو نیک کام کرتا رہے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرے۔

اس کا حاصل یہ ہے کہ اگر عمل میں نیتوں کا اشتراک ہو تو ثواب کی توقع نہ رکھنی چاہیے' شرکت کا بہترین حال یہ ہے کہ عمل ساقط ہوجائے' یہاں یہ کہا جاسکتا ہے کہ جہاد میں شہادت کا مرتبہ اخلاص کے بغیر حاصل نہیں ہوتا' اس کے ساتھ ساتھ یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ جس شخص نے جہاد میں محض دینی داعیے کی تحریک پر شرکت کی' اور وہ دل سے جہاد پر آمادہ ہے' اور مفلس اور مالدار دونوں طرح کے دشمنوں سے لڑنے کے لیے تیار ہے' لیکن مالداروں سے لڑنے میں وہ اس لیے زیادہ دلچسپی رکھتا ہے کہ اصل مقصد اعلائے کلمۃ اللہ کے ساتھ ساتھ مال غنیمت بھی حاصل ہوجائے تو اسے جہاد کا ثواب نہیں ملے گا۔ خدانخواستہ معاملہ ایسا ہو اس سے تو دین میں بڑی تنگی واقع ہوگی' اور مسلمان مایوسی کا شکار ہوجائیں گے اس لیے کہ اس طرح کے تابع مقاصد اور شوائب سے بہت کم انسان خالی ہوتے ہیں' ان مقاصد سے ثواب میں کمی ہوسکتی ہے' لیکن یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ اس صورت میں ثواب بالکل ہی ضائع ہوجاتا ہے' البتہ دو قصد رکھنے والا شخص زبردست خطرے سے دوچار رہتا ہے اس لیے کہ کبھی وہ شخص یہ گمان کرتا ہے کہ تقرب الی اللہ کا قصد قوی باعث ہے' جب کہ اس کے باطن پر نفسانی حظوظ کا باعث غالب ہوتا ہے' اور یہ ایک نہایت مخفی امر ہے' گویا اجر

(۱-۲-۳-۴) یہ روایتیں پہلے بھی گزری ہیں

اخلاص سے حاصل ہے' اور اپنے اخلاص کا یقین بندے کو بہت کم ہوتا ہے' اگرچہ وہ احتیاط میں انتہائی مبالغہ کیوں نہ کرے' اس لیے بندے کو چاہیے کہ وہ اپنی پوری کوشش کے باوجود تردد و قبول میں متردد رہے اور اپنی عبادت کے سلسلے میں ایسی آفات سے خائف رہے جو اس کے لیے اجر و ثواب کے بجائے باعث وبال بن جائیں' اہل بصیرت خائفین کا یہی حال تھا' اور ہر صاحب بصیرت کو ایسا ہی ہونا چاہیے' حضرت سفیان ثوریؒ فرماتے ہیں جو اعمال میں نے کیے ہیں میں انھیں قابل اعتناء نہیں سمجھتا' عبدالعزیز ابن ابی رواد کہتے ہیں کہ میں تیس برس تک خانہ کعبہ کے جوار میں رہا ہوں اور میں نے تیس حج کیے ہیں' لیکن جب بھی میں نے کوئی عمل خیر کیا اور اس میں اپنے نفس کا احتساب کیا تو مجھے شیطان کا حصہ زیادہ ملا' اگر میرے تمام اعمال نہ باعث عذاب ہوں اور نہ موجب ثواب تو یہ میرے لیے بہت غنیمت ہے۔

اگرچہ ریا جیسی آفتیں بندے کے اعمال ضائع کردیتی ہیں' لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ریاء کے خوف سے عمل ترک کردیا جائے' عمل ترک کرنا شیطان کی عین تمنا ہے' وہ یہی چاہتا ہے کہ انسان اللہ کے لیے کوئی عمل نہ کرلے۔ اصل مقصد یہ ہونا چاہیے کہ اخلاص ضائع نہ ہو' اگر عمل ترک کردیا تو عمل اور اخلاص دونوں ضائع ہوں گے' بیان کیا گیا ہے ایک فقیر ابو سعید خراز کی خدمت کیا کرتا تھا' اور ان کے کاموں میں اعانت کرتا تھا' ایک دن ابو سعید نے اخلاص پر کلام کیا' مقصد یہ تھا کہ بندے کو اپنی ہر حرکت میں اخلاص رکھنا چاہیے' چنانچہ اس خادم فقیر نے ہر عمل اور ہر حرکت کے وقت اخلاص کی خاطر اپنے قلب کی سخت نگرانی شروع کردی' اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اپنے ضروری امور انجام دینے سے بھی قاصر ہوگیا' شیخ کو بھی تکلیف پہنچی' انہوں نے خادم سے صورت حال دریافت فرمائی خادم نے بتلایا کہ میں اپنے نفس سے ہر عمل میں اخلاص کا مطالبہ کرتا ہوں' اور نفس کو اس سے عاجز پاتا ہوں' اس لیے وہ عمل ترک کردیتا ہوں' ابو سعید نے فرمایا ایسا مت کرو' اخلاص عمل کو منقطع نہیں کرتا' عمل پر مواظبت کرو' اور اخلاص کے حصول کے لیے کوشش کرتے رہو' میں نے تم سے یہ نہیں کہا کہ عمل ترک کردو' بلکہ میں نے یہ کہا ہے کہ عمل کو خالص کرو' فضیل ابن عیاضؒ کہتے ہیں کہ مخلوق کی وجہ سے عمل ترک کرنا ریا ہے' اور مخلوق کے لیے عمل کرنا شرک ہے۔

تیسرا باب

صدق کی فضیلت اور حقیقت

صدق کے فضائل: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ (پ ۲۱ ر ۱۹ آیت ۲۳)

کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ انہوں نے جس بات کا اللہ سے عہد کیا تھا اس میں سچے اترے۔

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:۔

إِنَّ الصِّدْقَ يَهْدِيْ إِلَى الْبِرِّ وَالْبِرُّ يَهْدِيْ إِلَى الْجَنَّةِ وَإِنَّ الرَّجُلَ لَيَصْدُقُ حَتّٰى يُكْتَبَ عِنْدَ اللّٰهِ صِدِّيْقًا وَإِنَّ الْكَذِبَ يَهْدِيْ إِلَى الْفُجُوْرِ وَالْفُجُوْرُ يَهْدِيْ إِلَى النَّارِ وَإِنَّ الرَّجُلَ لَيَكْذِبُ حَتّٰى يُكْتَبَ عِنْدَ اللّٰهِ كَذَّابًا (بخاری و مسلم۔ ابن مسعودؓ)

سچائی نیکی کی راہ بتلاتی ہے' اور نیکی جنت کی طرف رہنمائی کرتی ہے اور آدمی سچ بولتا ہے یہاں تک کہ اللہ کے یہاں صدیق لکھا جاتا ہے اور جھوٹ بدی کی راہ بتلاتا ہے اور بدی دوزخ کی طرف لے جاتی ہے' اور آدمی جھوٹ بولتا ہے یہاں تک کہ اللہ کے نزدیک جھوٹا لکھا جاتا ہے۔

صدق کی فضیلت کے لیے اتنا عرض کردینا کافی ہے کہ صدیق اسی لفظ سے مشتق ہے' اور اللہ تعالیٰ نے اسی لفظ کے ذریعے انبیائے کرام کی مدح فرمائی ہے' چنانچہ ارشاد فرمایا:۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ إِبْرَاهِيْمَ إِنَّهُ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا (پ ۱۶ ر ۶ آیت ۴۱)

اور اس کتاب میں ابراہیم کا ذکر کیجئے وہ بڑی راستی والے پیغمبر تھے۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ إِسْمَاعِيلَ إِنَّهُ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُولًا نَبِيًّا (پ ۱۶ ر ۷ آیت ۵۴)

اور اس کتاب میں اسماعیل کا ذکر بھی کیجئے بلاشبہ وہ وعدے کے سچے تھے اور وہ رسول بھی تھے نبی بھی تھے۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ إِدْرِيسَ إِنَّهُ كَانَ صِدِّيقًا نَبِيًّا (پ ۱۶ ر ۶ آیت ۵۶)

اور اس کتاب میں ادریس کا بھی ذکر کیجئے بے شک وہ بڑے راستی والے نبی تھے۔

حضرت عبداللہ ابن عباسؓ فرماتے ہیں چار خصلتیں جس میں ہوں وہ فلاح یاب ہے صدق' حیا' حسن خلق اور شکر۔ بشر ابن الحارثؒ کہتے ہیں جو شخص اللہ تعالیٰ سے صدق کا معاملہ کرتا ہے وہ لوگوں سے متوحش ہو جاتا ہے' ابو عبداللہ الرملی کہتے ہیں میں نے منصور دینوریؒ کو خواب میں دیکھا اور ان سے دریافت کیا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا ہے' انہوں نے جواب دیا اللہ تعالیٰ نے مجھے معاف کر دیا ہے' مجھ پر رحم فرمایا ہے' اور مجھے وہ رتبہ عطا کیا ہے جس کی مجھے امید بھی نہیں تھی میں نے ان سے دریافت کیا بندہ جن اعمال کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے ان میں سب سے اچھی چیز کیا ہے؟ فرمایا صدق' اور بدترین چیز کذب ہے' ابو سلیمان دارانیؒ کہتے ہیں صدق کو اپنی سواری بناؤ اور حق کو اپنی تلوار کا روپ دو' اللہ تعالیٰ کو اپنا مطلوب اعلیٰ قرار دو۔ ایک شخص نے کسی دانشمند سے پوچھا کہ آپ صدق کے متعلق کیا کہتے ہیں فرمایا اگر میں صادق ہوتا تو صادقین کی معرفت حاصل کر لیتا' محمد ابن علی کتانی کہتے ہیں کہ ہم نے اللہ تعالیٰ کے دین کو تین ارکان پر مبنی پایا ہے' ایک صدق' دوم حق' سوم عدل' عدل کا تعلق دلوں سے ہے' حق کا اعضاء سے' اور صدق کا عقلوں سے۔ حضرت سفیان ثوریؒ نے قرآن کریم کی اس آیت کریمہ وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ تَرَى الَّذِينَ كَذَبُوا عَلَى اللَّهِ وُجُوهُهُمْ مُسْوَدَّةٌ (پ ۲۴ ر ۳ آیت ۴۰)

اور آپ قیامت کے دن ان لوگوں کے چہرے سیاہ دیکھیں گے جنہوں نے خدا پر جھوٹ بولا تھا۔

کی تفسیر میں ارشاد فرمایا ہے کہ یہ لوگ وہ ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ کی محبت کا دعویٰ کیا' لیکن وہ اس دعویٰ میں سچے نہیں تھے' اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام پر وحی نازل فرمائی کہ جو شخص اپنے باطن میں میری تصدیق کرتا ہے میں مخلوق کے سامنے کھلم کھلا اس کی تصدیق کرتا ہوں۔ ایک شخص شبلیؒ کی مجلس میں چیخ اٹھا اور دیکھتے ہی دیکھتے دجلہ میں کود گیا' شبلیؒ نے فرمایا اگر یہ شخص سچا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے اسی طرح نجات عطا کرے گا جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نجات دی تھی' اور اگر جھوٹا ہے اللہ تعالیٰ اسے غرق فرما دے جس طرح فرعون کو غرق کیا تھا' بعض لوگ کہتے ہیں کہ تمام فقہاء اور علماء کا تین خصلتوں پر اتفاق ہے کہ اگر وہ صحیح ہوں تو ان میں نجات ہے' اور وہ خصلتیں ایک دوسرے سے مل کر مکمل ہوتی ہیں بدعت و ہوی سے پاک اسلام' اعمال میں اللہ تعالیٰ کے لئے صدق' اور اکل حلال' وہب ابن منبہ کہتے ہیں کہ میں نے تورات کے حاشیے پر بائیس جملے ایسے لکھے ہوئے دیکھے ہیں جنہیں بنی اسرائیل کے صلحاء اجتماعی طور پر پڑھا کرتے تھے' وہ جملے یہ ہیں کوئی خزانہ علم سے زیادہ نفع بخش نہیں ہے' کوئی مال علم سے زیادہ سودمند نہیں ہے' کوئی حسب غصے سے کم تر نہیں ہے' کوئی ساتھی عمل سے زیادہ زینت دینے والا نہیں ہے' کوئی رفیق جہل سے زیادہ عیب لگانے والا نہیں ہے' تقویٰ سے بڑھ کر کوئی شرف نہیں ہے' کوئی کرم ترک ہوی سے بڑھ کر نہیں ہے' کوئی عمل فکر سے افضل نہیں ہے' کوئی نیکی صبر سے اعلیٰ نہیں ہے' کوئی برائی کبر سے زیادہ رسوا کرنے والی نہیں ہے' کوئی دوا نرمی سے زیادہ نرم نہیں ہے کوئی مرض حماقت سے زیادہ تکلیف دینے والا نہیں ہے۔ کوئی رسول حق سے زیادہ عدل پرور نہیں ہے' کوئی دلیل صدق سے زیادہ نصیحت کرنے والی نہیں ہے' کوئی فقیری طمع سے زیادہ ذلیل نہیں ہے' کوئی مالداری جمع کرنے سے زیادہ ذلیل نہیں ہے' کوئی زندگی صحت سے زیادہ عمدہ نہیں ہے' کوئی معیشت پاکیزگی سے زیادہ خوش گوار نہیں ہے' کوئی عبادت خشوع سے زیادہ اچھی نہیں ہے' کوئی زہد قناعت سے بہتر نہیں ہے' کوئی نگہبان خاموشی سے زیادہ حفاظت کرنے والا نہیں ہے کوئی غائب موت سے زیادہ قریب نہیں ہے۔ محمد ابن سعید المروزی کہتے ہیں کہ جب تو اللہ تعالیٰ سے صدق کے ساتھ طلب کرتا ہے تو وہ تیرے ہاتھوں میں ایک آئینہ دے دیتا ہے' اس میں تو دنیا و آخرت کے تمام عجائب کا مشاہدہ کرتا ہے۔ ابوبکر الوراقؒ کہتے ہیں اپنے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان صدق کی حفاظت کر' ذوالنون مصریؒ سے دریافت کیا گیا کہ کیا بندہ کے

پاس اپنے امور کی اصلاح کی کوئی سبیل ہے؟ انہوں نے جواب میں یہ دو شعر پڑھے۔

قَدْ بَقِيْنَا مِنَ الذُّنُوْبِ حَيَارٰى ۔ نَطْلُبُ الصِّدْقَ مَا اِلَيْهِ سَبِيْلُ

فَدَعَاوِى الْهَوٰى تَخِفُّ عَلَيْنَا ۔ وَخِلَافُ الْهَوٰى عَلَيْنَا ثَقِيْلُ

(ہم گناہوں کی وجہ سے حیران پریشان کھڑے ہیں صدق کے متلاشی ہیں مگر اس کا راستہ نہیں پاتے، عشق کے دعوے ہم پر بہت آسان ہیں، لیکن ہوائے نفس کی مخالفت بڑی مشکل ہے)۔

سہل تستری سے کسی نے دریافت کیا کہ اس امر کی اصل کیا ہے جس کے ہم مشتاق ہیں، فرمایا صدق، سخاوت اور شجاعت، سائل نے عرض کیا کچھ اور زیادہ کیجئے فرمایا تقویٰ، حیاء، اور پاکیزہ غذا۔ حضرت عبداللہ ابن عباس روایت کرتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے کمال کے متعلق دریافت کیا گیا، فرمایا حق بات کہنا، اور صدق پر عمل کرنا۔ حضرت جنید بغدادی اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے متعلق ارشاد فرماتے ہیں:۔

لِيَسْئَلَ الصّٰدِقِيْنَ عَنْ صِدْقِهِمْ (پ ۲۱ر ۱۷ آیت ۸) تاکہ ان سچوں سے ان کے سچ کی تحقیقات کرلے۔

جو لوگ اپنے آپ کو صادق تصور کرتے ہیں ان کے صدق کا حال اللہ تعالیٰ کے یہاں کھلے گا، یہ معاملہ بڑا پُر خطر ہے۔

صدق کی حقیقت، اس کے معنی اور مراتب: لفظ صدق کا اطلاق چھ معانی پر ہوتا ہے، قول میں صداقت، نیت میں صداقت، ارادے میں صداقت، عزم میں صداقت، عزم پورا کرنے میں صداقت، عمل میں صداقت، اور دین کے تمام مقامات کی تحقیق میں صداقت۔ جو شخص ان چھ معانی میں صدق کے ساتھ متصف ہو وہ صدیق ہے، اس لیے کہ لفظ صدیق صدق میں مبالغے پر دلالت کرتا ہے پھر صادقین کے بہت سے درجات ہیں جس شخص کو کسی خاص چیز میں صدق حاصل ہو گا وہ اس خاص چیز کے اعتبار سے صادق کہلائے گا جس میں اس کا صدق پایا جائے گا اب ہم ان تمام قسموں کی وضاحت کرتے ہیں۔

پہلا صدق لسان: یہ صدق اخبار میں، اور ان اقوال میں ہوتا ہے جو اخبار کو متضمن ہوں خبر کا تعلق زمانۂ ماضی سے بھی ہے، اور زمانۂ مستقبل سے بھی، اس میں وفائے عہد، اور نقض عہد بھی داخل ہے، ہر بندے پر واجب ہے کہ وہ اپنے الفاظ کی حفاظت کرے، جب بھی زبان سے کوئی لفظ ادا کرے سچائی کے ساتھ ادا کرے، یہ صدق کی انتہائی منور اور واضح ترین قسم ہے، جو شخص اپنی زبان کی حفاظت کرے گا اور حقائق اشیاء کے خلاف نہ کہے گا وہ صادق کہلائے گا، لیکن اس صدق کے لیے کمال کے دو پہلو ہیں، ایک یہ کہ کنایات سے احتراز کرے، بعض لوگ کہتے ہیں کہ کنایات کا جھوٹ جھوٹ نہیں ہوتا کنایات سے بچنا کمال صدق اس لیے ہے کہ یہ جھوٹ کے قائم مقام ہے، جھوٹ سے اس لیے منع کیا جاتا ہے کہ اس میں کسی چیز کو خلاف واقعہ بیان کیا جاتا ہے، لیکن کبھی اس کی ضرورت پڑتی ہے، اور مصالح کا تقاضا ہوتا ہے کہ جھوٹ بولا جائے جیسے بچوں اور عورتوں کی تادیب و تہذیب کے لیے، ظالموں سے دفاع کرنے اور دشمنوں سے جنگ کرنے میں، یا ملک کے رازوں سے ان لوگوں کو دور رکھنے میں، اگر کسی شخص کو ان مواقع پر جھوٹ بولنا پڑ جائے اور اس کے علاوہ بچاؤ کا کوئی راستہ نہ ہو تو صدق کی صورت یہ ہے کہ اللہ کے لیے وہ بات کہے جس کا حق حکم کرے، اور دین جس کا مقتضی ہو، جب اس طرح کہے گا تو صادق ہو گا، اگرچہ اس کے کلام سے غیر واقع مضمون سمجھا جائے، اصل میں صدق بذات خود مقصود نہیں ہے، بلکہ امر حق پر دلالت کرنے کی وجہ سے، اور اس لیے مقصود ہے کہ وہ حق کی طرف داعی ہے، اس لیے کسی کلام کے ظاہر پر نظر نہ رکھنی چاہیے، بلکہ معنی پر نظر رہنی چاہیے، تاہم ایسے مواقع پر اگر کنایات استعمال کئے جائیں تو یہ زیادہ بہتر ہے تاکہ صریح جھوٹ سے احتراز ہو سکے۔ چنانچہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم جب (جہاد کے لیے) کسی سفر کا ارادہ فرماتے تو دوسروں سے چھپاتے تاکہ دشمنوں کو آپ کے ارادے کی خبر نہ ہو جائے (بخاری و مسلم۔ کعب ابن مالک) اور یہ جھوٹ نہیں ہے جیسا کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

لَيْسَ بِكَذَّابٍ مَنْ اَصْلَحَ بَيْنَ اثْنَيْنِ فَقَالَ خَيْرًا اَوْ اَنْمٰى خَيْرًا (بخاری و مسلم۔ ام کلثوم بنت عقبہ ابن ابی معیط)

وہ شخص جھوٹا نہیں ہے جو دو شخصوں کے درمیان صلح کرائے تو اچھی بات کہے' اور اچھی خبر پہنچائے۔
سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے تین افراد کو مصلحت کے مطابق جھوٹ بولنے کی اجازت دی ہے ایک اس شخص کو جو دو آدمیوں کے درمیان مصالحت کرائے' دوسرا وہ شخص جس کی دو بیویاں ہوں تیسرا وہ جو جنگ کے مصالح میں ہو' ان مواقع پر صدق سے صدق نیت مراد لیا جاتا ہے' اور نیت ہی کا لحاظ بھی کیا جاتا ہے' الفاظ کا اعتبار نہیں کیا جاتا' خواہ الفاظ کیسے ہی ہوں' ہمارے نزدیک تو وہ شخص صدیق کہلانے کا مستحق ہوگا جس کا ارادہ صحیح اور نیت صادق ہو' اور وہ اپنے ارادہ و نیت سے خیر کا طالب ہو' تاہم ایسے مواقع پر بھی صریح جھوٹ نہ بولا جائے تو بہتر ہے بلکہ اشارۃً اپنا مقصد واضح کرنا چاہیے جیسا کہ ایک بزرگ نے کیا تھا ظالم ان کی تلاش میں تھے ایک روز وہ لوگ اس وقت ان کے گھر پہنچے جب بزرگ اندر موجود تھے انہوں نے اہلیہ سے کہا کہ وہ ایک دائرہ کھینچے اور اس میں انگلی رکھ کر کہہ دے کہ تم لوگ جس کی تلاش میں آئے ہو وہ یہاں نہیں ہے اس طرح وہ دشمنوں سے اپنی حفاظت کرتے' اور جھوٹ سے بھی محفوظ رہتے' اور ان کا قول سچ ہوتا تھا اور دشمن یہ سمجھ لیتا تھا کہ وہ گھر پر موجود نہیں ہیں' بہرحال صدق لسان میں پہلا کمال یہ ہے کہ صریح جھوٹ سے بھی بچے' اور کنایات سے بھی احتراز کرے' اور بلا ضرورت ان دونوں کے قریب بھی نہ جائے' اور دوسرا کمال یہ ہے کہ جو الفاظ زبان سے ادا کرے ان کے معنی کی بھی رعایت کرے' مثلاً اگر وہ زبان سے یہ آیت پڑھے۔

وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ (پ ۷ ر ۱۵ آیت ۸۰)

میں یکسو ہو کر اپنا رخ اس کی طرف کرتا ہوں جس نے آسمانوں اور زمینوں کو پیدا کیا۔

اور اس کا دل اللہ تعالیٰ سے منحرف ہو' اور دنیا کی خواہشات اور آرزوؤں میں مشغول ہو تو یہ شخص جھوٹا ہے' اسی طرح اگر کوئی شخص زبان سے اِيَّاكَ نَعْبُدُ (ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں) کہے یا یہ کہے کہ میں تیرا بندہ ہوں' اور اس کے اندر بندگی والی کوئی بات نہ ہو بلکہ وہ اپنے نفس کو یا دنیا کو یا شہوات دنیا کو اپنا معبود سمجھتا ہو تو ایسا شخص اپنے قول میں سچا نہیں کہا جائے گا' جو شخص کسی چیز کی غلامی کرتا ہے وہ اسی کا بندہ بن جاتا ہے' حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کے سرکشوں کو ان الفاظ میں خطاب فرمایا کرتے تھے کہ اے دنیا کے بندو! اور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

تَعِسَ عَبْدُ الدِّيْنَارِ' تَعِسَ عَبْدُ الدِّرْهَمِ وَعَبْدُ الْحُلَّةِ' وَعَبْدُ الْخَمِيْصَةِ (بخاری۔ ابو ہریرہؓ)

ہلاک ہو بندۂ دینار' ہلاک ہو بندۂ درہم' اور بندۂ لباس اور بندۂ طعام۔

اس حدیث میں ان لوگوں کی نسبت اسی چیز کی طرف کی گئی ہے جس کے وہ پابند ہیں اللہ تعالیٰ کا سچا بندہ وہ ہے جو پہلے غیر اللہ سے آزادی حاصل کرے' اس آزادی کے بعد دل خالی ہو جائے گا اور اس میں اللہ تعالیٰ کی عبدیت کا اعتقاد راسخ ہو جائے گا' یہ اعتقاد اسے اللہ تعالیٰ کی محبت میں مشغول کر دے گا اور اس کا ظاہر و باطن غیر اللہ کی ہر قید و بندش سے آزاد ہو کر اللہ کی اطاعت میں منہمک ہو جائے گا' اور اللہ کے سوا اس کی کوئی مراد باقی نہیں رہے گی اس مرتبے کے بعد بندہ اس سے اعلیٰ تر مقامات تک پہنچ جاتا ہے جسے حریت کہتے ہیں' یعنی اس بات سے آزاد ہو جاتا ہے کہ از خود اللہ کے لیے کوئی ارادہ کرے' بلکہ جو کچھ اللہ تعالیٰ اس کے لیے ارادہ کرتا ہے خواہ ابعاد کا یا تقریب کا' اسی پر قانع ہو جاتا ہے اس کا ارادہ اللہ تعالیٰ کے ارادے میں فنا ہو جاتا ہے' ایسا شخص دو مرتبہ آزاد ہوتا ہے' ایک مرتبہ اس وقت جب وہ غیر سے آزاد ہوتا ہے' اور دوسری مرتبہ اس وقت جب وہ اپنے نفس سے آزاد ہوتا ہے' اس وقت وہ اپنے نفس کے اعتبار سے مفقود اور اپنے آقا کے اعتبار سے موجود ہوتا ہے' اگر وہ اسے حرکت دیتا ہے تو حرکت کرتا ہے' ساکن کرتا ہے تو ساکن ہو جاتا ہے' اور اگر کسی مصیبت میں مبتلا کرتا ہے تو اس پر راضی رہتا ہے' اس میں کسی طلب' آرزو' درخواست' اور التماس و اعتراض کی گنجائش باقی نہیں رہتی بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے ایسا ہو جاتا ہے جیسے مردہ غسال کے سامنے' یہ صدق فی العبودیت کی انتہا ہے' بندۂ حق وہ ہے جس کا وجود معبود کے لیے ہو' اپنے نفس کے لیے نہ ہو' یہ صدیقین کا درجہ ہے' اور غیر اللہ سے حریت صادقین کے درجات میں سے ہے' اس کے بعد اللہ تعالیٰ کی عبودیت حاصل ہوتی ہے' اس درجے سے پہلے نہ کسی

شخص کو صادق کہا جا سکتا ہے اور نہ صدیق۔

دوسرا صدق نیت و ارادہ : صدق نیت اور صدق ارادہ کا حاصل اخلاص ہے 'یعنی بندہ اپنے ہر ہر عمل 'اور ہر حرکت و سکون میں صرف اللہ تعالیٰ کی نیت کرے 'اگر اس میں حظوظ نفس کا اختلاط ہوگیا تو صدق نیت باطل ہوجائے گا اور ایسے شخص کو جس کے اعمال میں حظوظ نفس کا اختلاط ہو جھوٹا کہا جا سکتا ہے جیسا کہ ہم نے اخلاص کے فضائل کے ضمن میں تین افراد سے متعلق ایک روایت نقل کی ہے جن میں سے ایک عالم ہے 'قیامت کے دن اس سے پوچھا جائے گا کہ اس نے علم کے مطابق کیا عمل کیا ہے؟ وہ جواب میں کہے گا کہ میں نے فلاں فلاں عمل کیا ہے 'اللہ تعالیٰ فرمائے گا تو جھوٹ کہتا ہے بلکہ تو نے یہ چاہا ہے کہ لوگ تجھے عالم کہیں 'دیکھئے یہاں اس کے اعمال کی تردید نہیں کی گئی 'بلکہ اس کی نیت کو جھٹلایا گیا ایک بزرگ کہتے ہیں کہ نیت میں صحت توحید کا نام صدق ہے۔ قرآن کریم میں ہے۔

وَاللّٰہُ یَشْھَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ لَکٰذِبُوْنَ (پ ۲۸ ر ۱۳ آیت ۱)

اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ یہ منافقین جھوٹے ہیں۔

یہ شہادت اس وقت دی گئی جب منافقین نے یہ کہا تھا۔

اِنَّکَ لَرَسُوْلُ اللّٰہِ (پ ۲۸ ر ۱۳ آیت ۱) بے شک آپ اللہ کے رسول ہیں۔

اگرچہ منافقین صحیح کہہ رہے تھے کہ محمد اللہ کے رسول ہیں 'مگر ان کی زبانی شہادت کا اعتبار نہیں کیا گیا 'بلکہ ان کے ارادے اور نیت کو دیکھتے ہوئے ان کے دروغ گو ہونے کا اعلان کیا گیا اور جو اعتقاد ان کے دل میں تھا اس کی تکذیب کی گئی 'کیوں کہ تکذیب خبر کی ہوتی ہے 'اور کفار کا یہ قول حال کے قرینے سے خبر پر مشتمل ہے 'گویا کہنے والے اپنی زبان سے دل کے اعتقاد کی خبر دیتے ہیں 'اور کہتے ہیں کہ جو کچھ ہم زبان سے کہہ رہے ہیں وہی ہمارے دل میں ہے 'ان کے اس دعوے کی تکذیب کی گئی کہ حال کے قرینے سے تم اپنے عقائد پر استدلال کرتے ہو 'یہ جھوٹ ہے 'گویا ان کی تکذیب اعتقاد میں کی گئی 'الفاظ میں نہیں کی گئی 'صدق کے ایک معنی کا حاصل یہی ہے کہ نیت خالص ہو 'اور یہی اخلاص ہے 'ہر صادق کا مخلص ہونا ضروری ہے۔

تیسرا صدق عزم : بعض اوقات انسان کسی چیز کا عزم کرتا ہے 'اور اپنے دل میں کہتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے مال عطا کیا تو میں وہ تمام مال صدقہ کروں گا یا اس کا نصف اللہ کی راہ میں خرچ کروں گا 'یا اگر میں نے کسی دشمن خدا کا سامنا کیا 'تو میں اس سے جہاد کروں گا 'اور اس کی بھی پروا نہیں کروں گا کہ قتل کردیا جاؤں 'اور اگر اللہ تعالیٰ نے مجھے حکومت عطا کی تو میں عدل و انصاف کے ساتھ حکمرانی کے فرائض انجام دوں گا 'اور ظلم و ستم 'یا مخلوق کے ساتھ جانبدارانہ رویہ رکھ کر میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کروں گا 'یہ عزم کبھی تو دل پر اس طرح وارد ہوتا ہے کہ کسی خارجی یا داخلی اثر سے اس میں واقع نہیں ہوتا یہ ایک عزم جازم ہوتا ہے 'اور کبھی اس میں تردد 'انحراف یا ضعف ہوتا ہے 'یہ صدق فی العزیمت نہیں ہے 'صدق فی العزیمت یہ ہے کہ آدمی اپنے عزم میں راسخ 'ارادے میں پختہ ہو جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص کو شہوت صادقہ ہے یعنی اس کی اشتہا مکمل ہے 'اور کبھی کسی مریض کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کی شہوت کاذبہ ہے 'یہ اس وقت کہا جاتا ہے جب اس کی شہوت کسی مضبوط 'اور پختہ سبب سے نہ ہو 'یا ضعیف ہو 'گویا جب ہم ان معنوں میں لفظ صدق بولتے ہیں تو صادق یا صدیق سے ہماری مراد وہ شخص ہوتا ہے جس کا عزم خیر کے سلسلے میں مکمل اور قوی ہو 'نہ اس میں انحراف ہو 'نہ ضعف اور تردد ہو 'اس عزم کی مثال حضرت عمر ابن الخطابؓ کا یہ ارشاد ہے کہ اگر میری گردن کٹوا دی جائے تو یہ میرے نزدیک ایسی قوم کا امیر بننے سے بہتر ہے جس میں حضرت ابو بکرؓ ہوں 'گویا ان کے دل نے یہ عہد کرلیا تھا کہ وہ حضرت ابو بکر کی موجودگی میں منصب امارت نہیں سنبھالیں گے 'اس عہد کی انہوں نے اپنے قتل کئے جانے کو ترجیح دے کر تاکید کردی عزم کے سلسلے میں صادقین کے مختلف مراتب ہیں 'کبھی عزم ہوتا ہے لیکن اس درجے کا نہیں ہوتا کہ قتل کیا جانا پسند ہو 'لیکن عزم کر کے پیچھے ہٹنا پسند نہ ہو 'اور کبھی عزم ہوتا ہے لیکن اس حد تک نہیں کہ قتل کی پروا بھی نہ کرے 'ایسے شخص کا عزم قتل کے ذکر سے باقی نہیں رہتا 'ان مومنین صادقین میں ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں جنہیں اگر یہ اختیار

دیا جائے کہ وہ اپنے یا حضرت ابوبکر الصدیقؓ میں سے کس کی زندگی پسند کرتے ہیں تو اپنی زندگی کی پروا نہ کریں اور حضرت ابوبکر کی زندگی کو ترجیح دیں۔

چوتھا صدق وفائے عزم: بعض اوقات آدمی عزم کرلیتا ہے کیوں کہ عزم کرنے میں کچھ نہیں جاتا لیکن جب امر عزم کے مطابق عمل کرنے کا موقع آتا ہے' اور قدرت بھی حاصل ہوتی ہے' اور شہوات زور کرتی ہیں تو تمام عزم دھرے رہ جاتے ہیں' شہوات غالب آجاتی ہیں اور عزم پورا ہونا مشکل ہوجاتا ہے یہ صورت حال صدق وفائے عزم کے خلاف ہے۔ خداوند کریم کا ارشاد ہے:۔ رِجَالٌ صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ (پ ۲۱ ر ۱۹ آیت ۲۳)

کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ انہوں نے جس بات کا اللہ سے عہد کیا تھا اس میں سچے اترے۔

حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ ان کے چچا انس ابن النضرؓ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ غزوۂ بدر میں شرکت نہ کرسکے' اس کا ان کے دل پر بڑا اثر ہوا' اور وہ کہنے لگے کہ یہ شہادت کا پہلا موقع تھا جس میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم تو شریک ہوئے اور میں غائب رہا' اگر مجھے اب ایسا کوئی موقع جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ملا تو اللہ دیکھ لے گا میں کیا کروں گا' راوی کہتے ہیں کہ اگلے سال وہ جنگ احد میں شریک ہوئے' اسی دوران ان کی ملاقات حضرت سعد ابن معاذ سے ہوئی' سعد نے ان سے پوچھا کہ ابو عمر کدھر چل دیئے' فرمایا جنت کی خوشبو دلآویز ہے' یہ خوشبو احد کی طرف سے آرہی ہے (راوی کہتے ہیں کہ) انہوں نے احد میں شرکت کی اور اس قدر لڑے کہ شہید ہوگئے' آپ کے جسم پر تیر' تلوار اور نیزے کے اسی سے زائد زخم تھے' آپ کی بہن کہتی ہیں کہ میرے بھائی کے جسم پر اتنے زخم تھے کہ میں انہیں پہچان نہ سکی' میں نے انہیں انگلیوں کے پوروں سے پہچانا' اس واقعہ پر مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی۔ (ترمذی' نسائی) احد کے دن مصعب ابن عمیرؓ جو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی فوج کے علم بردار تھے شہید ہوگئے' آپ ان کے قریب کھڑے ہوئے اور یہ آیت تلاوت فرمائی۔ (ابو نعیم فی الحلیہ۔ عبید ابن عمیر مرسلاً) رِجَالٌ صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَنْ يَنْتَظِرُ (پ ۲۱ ر ۱۹ آیت ۲۳)

کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ انہوں نے جس بات کا اللہ سے عہد کیا تھا اس میں سچے اترے پھر بعض ان میں وہ ہیں جو اپنی نذر پوری کرچکے اور بعض ان میں مشتاق ہیں۔

فضالہ ابن عبیدؓ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عمر ابن الخطاب سے سنا' وہ فرماتے ہیں کہ میں نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا شہداء چار طرح کے ہوتے ہیں' ایک وہ صاحب ایمان شخص جس کا ایمان پختہ ہوتا ہے اور جو دشمن کا مقابلہ کرکے اللہ کی تصدیق کرتا ہے اور شہادت سے ہم کنار ہوجاتا ہے' یہ ایسا شخص ہے کہ قیامت کے دن لوگ اسے اس طرح سر اٹھا اٹھا کر دیکھیں گے (یہ کہہ کر آپ نے اپنا سر مبارک اتنا اوپر اٹھایا کہ کلاہ مبارک نیچے گر پڑی) راوی کہتے ہیں کہ میں نہیں جانتا کہ سر اٹھانے سے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی کلاہ مبارک نیچے گری یا حضرت عمرؓ کی۔ دوسرا وہ مومن ہے جس کا ایمان عمدہ ہے' جب اس نے دشمن کا سامنا کیا تو گویا اس کی آنکھوں میں تیر گھونپ دیئے' اس پر ایک تیر آکر لگا اور وہ شہید ہوگیا' یہ دوسرے درجے میں ہے' تیسرا وہ مومن ہے جس کے اعمال میں اچھے اور برے دونوں طرح کے اعمال ہوں' جب وہ دشمن خدا سے ملا تو اس نے اللہ تعالیٰ کی تصدیق کی اور شہید ہوگیا' یہ تیسرے درجے میں ہے' چوتھا وہ مومن ہے جس نے اپنے نفس پر ظلم کیا ہے' وہ دشمن سے ملا اور اس نے اللہ کی تصدیق کی یہاں تک کہ قتل ہوگیا یہ چوتھے درجے میں ہے (ترمذی) حضرت مجاہد کہتے ہیں کہ دو شخص مجمع عام میں آئے' اور کہنے لگے کہ اگر اللہ تعالیٰ ہمیں مال عطا کرے گا تو ہم صدقہ دیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں مال عطا کیا مگر انہوں نے بخل کیا' اس پر یہ آیت نازل ہوئی:۔

وَمِنْهُمْ مَنْ عَاهَدَ اللّٰهَ لَئِنْ آتَانَا مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُوْنَنَّ مِنَ الصَّالِحِيْنَ (پ ۱۰ ر ۱۴ آیت ۷۵)

اور ان (منافقین) میں بعض آدمی ایسے ہیں کہ خدا تعالیٰ سے عہد کرتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ ہم کو اپنے

فضل سے (بہت سا مال) عطا فرمائے تو ہم خوب خیرات کریں' اور ہم خوب نیک کام کیا کریں۔

بعض لوگ کہتے ہیں انہوں نے زبان سے یہ عہد نہیں کیا تھا' بلکہ اللہ تعالٰی نے ان کے دلوں میں روشن کردیا تھا' جب انہیں مال دیا گیا اور انہوں نے بخل کرکے عہد کی خلاف ورزی کی تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔

وَمِنْهُم مَّنْ عَاهَدَ اللَّهَ لَئِنْ آتَانَا مِن فَضْلِهِ بَخِلُوا بِهِ وَتَوَلَّوا وَّهُم مُّعْرِضُونَ فَأَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِي قُلُوبِهِمْ إِلَىٰ يَوْمِ يَلْقَوْنَهُ بِمَا أَخْلَفُوا اللَّهَ مَا وَعَدُوهُ وَبِمَا كَانُوا يَكْذِبُونَ

(پ ۱۰ ر ۱۶ آیت ۷۵-۷۷)

اور ان (منافقین) میں بعض آدمی ایسے ہیں کہ خدا تعالٰی سے عہد کرتے ہیں کہ اگر اللہ تعالٰی ہم کو اپنے فضل سے (بہت سا مال) عطا فرمائے تو ہم خوب خیرات کریں اور ہم خوب نیک کام کیا کریں' سو جب اللہ تعالٰی نے ان کو اپنے فضل سے (مال) دے دیا تو وہ اس میں بخل کرنے لگے اور وہ روگردانی کے عادی ہیں' سو اللہ تعالٰی نے اس کی سزا میں ان کے دلوں میں نفاق (قائم) کردیا (جو) خدا کے پاس جانے تک رہے گا' اس سبب سے کہ انہوں نے خدا تعالٰی سے اپنے وعدے میں خلاف کیا اور اس سبب سے کہ وہ جھوٹ بولتے تھے۔

یہاں عزم کو عہد' خلاف عہد کو کذب' اور وفائے عہد کو صدق کہا گیا ہے' یہ صدق تیسرے صدق سے زیادہ سخت ہے' اس لیے کہ بعض اوقات نفس عزم تو کرلیتا ہے' لیکن جب عمل کا وقت آتا ہے تو شہوات کا ہیجان' اور اسباب کی فراہمی اسے عمل سے باز رکھتی ہے۔ اسی لیے حضرت عمرؓ نے استثناء کیا تھا جب یہ فرمایا تھا کہ مجھے اس قوم کا امیر بننے کے مقابلے میں جس میں حضرت ابوبکر موجود ہیں قتل کئے جانا پسند ہے' اسی وقت آپ نے یہ بھی فرمایا تھا بشرطیکہ اللہ تعالٰی اس وقت میرے دل میں کوئی بات ایسی پیدا نہ کرے جو اس وقت میرے دل میں موجود نہیں ہے' کیوں کہ میں اپنے نفس سے مامون نہیں ہوں' ہوسکتا ہے جب قتل کا وقت آئے تو اپنے عزم سے پھر جائے گویا حضرت عمرؓ نے اپنے اس ارشاد کے ذریعے وفائے عزم کی شدّت کی طرف اشارہ فرمایا۔ ابوسعید الخراز کہتے ہیں کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ دو فرشتے آسمان سے اترے ہیں' اور وہ مجھ سے پوچھ رہے ہیں کہ صدق کیا ہے؟ میں نے کہا وفائے عہد کا نام صدق ہے' فرشتوں نے میری تائید کی اور آسمان کی طرف چلے گئے۔

پانچواں صدق اعمال : صدق اعمال یہ ہے کہ وہ اس امر کے لیے کوشاں رہے کہ اس کے ظاہری اعمال باطن کی کسی ایسی بات پر دلالت نہ کریں جو واقع میں نہ ہو صدق اعمال کا یہ مطلب نہیں کہ اعمال ترک کردیئے جائیں' بلکہ بندہ کا باطن ایسا ہونا چاہیے جس سے ظاہر کی تصدیق ہو' یہ بات ترک ریا کے خلاف ہے۔ جس کا ذکر ہم پہلے کرچکے ہیں ریا کار وہ شخص ہے جو یہ چاہتا ہے کہ اس کے اعمال کی بناء پر لوگ اسے ان صفات حمیدہ سے متصف سمجھیں جو ان اعمال سے ظاہر ہوتی ہیں' بہت سے نمازی اپنی نماز میں خشوع و خضوع کی ہیئت اختیار کرتے ہیں' اگرچہ ان کا مقصد یہ نہیں ہوتا کہ لوگ انہیں دیکھیں' تاہم ان کا دل نماز میں غافل رہتا ہے' دیکھنے والا یہ سمجھتا ہے کہ وہ اللہ تعالٰی کے سامنے کھڑا ہوا ہے حالانکہ وہ باطن سے بازار میں کھڑا ہوا ہے' اور اپنی کسی شہوت میں مشغول ہے' یہ اعمال زبان حال سے باطن کا حال کہتے ہیں' اور حقیقت میں باطن ایسا نہیں ہوتا' اس لیے وہ جھوٹ سے متصف ہوتے ہیں' اور ان سے صداقت اعمال کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ بعض لوگ بڑے سکون اور وقار کے ساتھ چلتے ہیں حالانکہ ان کے باطن میں نہ وقار ہوتا ہے اور نہ سکون' یہ لوگ بھی اپنے اعمال میں صادق نہیں ہوتے' اگرچہ وہ نہ مخلوق کی طرف التفات رکھتے ہیں' اور نہ ان کا مقصد ریا ہوتا ہے' اعمال کے جھوٹ سے وہی شخص محفوظ رہ سکتا ہے جس کا ظاہر و باطن یکساں ہو' یا جس کا باطن ظاہر سے بہتر ہو' اسی ڈر سے بعض لوگ اپنا ظاہر ابتر' اور لباس پراگندہ رکھتے تھے تاکہ کوئی شخص ان کے ظاہر سے باطن کے خیر پر استدلال نہ کرے' اگر باطن ظاہر کے مطابق اچھا نہ ہوا اور لوگ اچھا سمجھے تو یہ کذب ہوگا۔ اگر ظاہر باطن سے قصداً مخالف ہوگا تو اس کا نام ریا رکھا جائے گا اور اس کی وجہ سے اخلاص فوت ہوجائے گا' اور اگر بلا قصد ہو تو اس سے صدق ضائع ہوجاتا ہے' اسی لیے سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا فرمایا کرتے تھے۔

اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ سَرِيْرَتِيْ خَيْرًا مِّنْ عَلَانِيَتِيْ وَاجْعَلْ عَلَانِيَتِيْ صَالِحَةً

اے اللہ میرے باطن کو میرے ظاہر سے اچھا کر' اور میرے ظاہر کو اچھا بنا

یزید ابن الحرث کہتے ہیں کہ اگر بندہ کا باطن ظاہر کے مطابق ہو تو یہ عدل ہے' اور اگر باطن ظاہر سے بہتر ہو تو یہ کمال ہے' اگر ظاہر باطن سے بہتر ہو تو یہ ظلم ہے' اس کے بعد آپ نے یہ تین شعر پڑھے۔

إِذَا السِّرُّ وَالْإِعْلَانُ فِي الْمُؤْمِنِ اسْتَوَى ... فَقَدْ عَزَّ فِي الدَّارَيْنِ وَاسْتَوْجَبَ الثَّنَا

فَإِنْ خَالَفَ الْإِعْلَانُ سِرًّا فَمَا لَهُ ... عَلٰى سَعْيِهٖ فَضْلٌ سِوَى الْكَدِّ وَالْعَنَا

فَمَا خَالِصُ الدِّيْنَارِ فِي السُّوْقِ نَافِقٌ ... وَمَغْشُوْشُهُ الْمَرْدُوْدُ لَا يَقْتَضِي الْمُنَا

(اگر مومن کا ظاہر و باطن یکساں ہو تو یہ اس کے لیے دنیا و آخرت میں عزت کا باعث ہے' اور اس سے اس کی تعریف ہوتی ہے' اگر ظاہر باطن کے خلاف ہوا تو اس کی تمام کاوشیں بیکار اور برباد ہیں' بازار میں کھرا سکہ چلتا ہے' اور کھوٹا رد کردیا جاتا ہے)۔

عطیۃ ابن الغافر کہتے ہیں کہ جب مومن کا باطن ظاہر کے مطابق ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی وجہ سے ملائکہ پر فخر کرتا ہے' اور فرماتا ہے کہ یہ میرا سچا بندہ ہے' معاویہ ابن قرۃ کہتے ہیں کہ کون ہے جو مجھے ایسے شخص کا پتا بتلائے جو راتوں کو روتا ہو' اور دن میں ہنستا ہو' عبدالواحد ابن زید کہتے ہیں کہ حضرت حسن بصریؒ جب کسی کو کوئی بات بتلاتے تو اس پر سب سے زیادہ عمل کرتے' اور جب کسی کو کسی بات سے روکتے تو خود پہلے وہ کام ترک کرتے' میں نے کوئی ایسا شخص نہیں دیکھا جس کے ظاہر و باطن میں اس قدر مشابہت ہو' ابو عبدالرحمن کہا کرتے تھے اے اللہ تو نے میرے اور لوگوں کے درمیان امانت کا معاملہ کیا اور میں نے تیرے اور اپنے درمیان خیانت کا معاملہ کیا' وہ یہ کہہ کر رویا کرتے تھے' ابو یعقوب نہرجوری کہتے ہیں کہ صدق یہ ہے کہ ظاہر و باطن حق کے باب میں ایک دوسرے سے موافقت رکھتے ہوں۔ معلوم ہوا کہ باطن اور ظاہر کی مساوات بھی صدق کی ایک قسم ہے۔

چھٹا صدق مقامات : یہ صدق کا انتہائی اعلیٰ اور کمیاب درجہ ہے' اس کا تعلق دین کے مقامات سے ہے جیسے خوف و رجاء' تعظیم' زہد' رضا' توکل' اور محبت وغیرہ میں صدق' ان امور کے کچھ مبادی ہیں' جب یہ ظاہر ہوتے ہیں تو ان پر مذکورہ بالا الفاظ کا اطلاق ہوتا ہے' اور کچھ غایات اور حقائق ہیں محقق صادق وہ ہے جو ان امور کی حقیقت تک پہنچ جائے' جب کوئی چیز غالب اور اس کی حقیقت مکمل ہوجاتی ہے تو اس سے متصف ہونے والے شخص کو صادق کہتے ہیں' چنانچہ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص لڑائی میں سچا ہے یعنی لڑائی اس پر غالب ہے' یا فلاں شخص خوف میں سچا ہے' یعنی خوف کی حقیقت اس پر تمام ہوتی ہے' یا یہ شہوت بچی ہے وغیرہ۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ آمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجَاهَدُوْا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ أُولٰئِكَ هُمُ الصَّادِقُوْنَ (پ ر آیت)

پورے مومن وہ ہیں جو اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لائے پھر شک نہیں کیا اور اپنے مال و جان سے خدا کے راستے میں جہاد کیا یہ لوگ ہیں سچے۔

وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّيْنَ وَآتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتَامٰى وَالْمَسَاكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّائِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكٰوةَ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ إِذَا عَاهَدُوْا وَالصَّابِرِيْنَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَحِيْنَ الْبَأْسِ أُولٰئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا۔ (پ ۲ ر ۶ آیت ۱۷۷)

(کچھ) کمال اسی میں نہیں کہ تم اپنا منہ مشرق کو کرلو یا مغرب کو' لیکن (اصل) کمال تو یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ تعالیٰ پر یقین رکھے اور قیامت کے دن پر اور فرشتوں پر اور کتابوں پر اور پیغمبروں پر اور مال دیتا ہو اللہ کی

محبت میں رشتہ داروں کو' اور یتیموں کو اور محتاجوں کو' اور (بے خرچ) مسافروں کو' اور سوال کرنے والوں کو' اور گردن چھڑانے میں' اور نماز کی پابندی رکھتا ہو' اور زکوٰۃ بھی ادا کرتا ہو' اور جو اشخاص اپنے عہدوں کو پورا کرنے والے ہیں جب عہد کرلیں اور (وہ لوگ) مستقل رہنے والے ہوں تنگدستی میں' اور بیماری میں اور قتال میں' یہ لوگ ہیں جو سچے ہیں۔

حضرت ابوذر غفاریؓ سے کسی نے ایمان کے بارے میں سوال کیا' آپ نے جواب میں یہی آیت پڑھ کر سنادی' سائل نے کہا ہم تو آپ سے ایمان کے متعلق دریافت کرنا چاہتے ہیں' فرمایا میں نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایمان کا حال دریافت کیا تھا' آپ نے بھی یہی آیت تلاوت فرمائی تھی (محمد ابن نصر المروزی باسناد منقطعۃ) اب ہم خوف کی مثال بیان کرتے ہیں' جو بندہ اللہ تعالیٰ پر' اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے اسے اللہ کا خوف ہوتا ہے' لیکن یہ خوف اتنا ہوتا ہے کہ اس پر لفظ خوف کا اطلاق ہوسکے' خوف کی حقیقت اس پر صادق نہیں آتی' یہاں تک کہ یہ کہا جاسکے کہ وہ خوف خدا میں صادق ہے' اور ہمارے اس دعویٰ کی دلیل یہ ہے کہ جب کوئی انسان کسی بادشاہ سے ڈرتا ہے' یا سفر کے دوران اسے کسی رہزن کا خوف ہوتا ہے تو اس کا رنگ زرد پڑ جاتا ہے' ہاتھ پاؤں لرزنے لگتے ہیں' زندگی کا لطف مکدر ہوجاتا ہے' کھانا پینا حرام ہوجاتا ہے' نیند اڑجاتی ہے' حواس معطل ہوجاتے ہیں' یہاں تک کہ بیوی بچوں کے کام کا بھی نہیں رہتا' ہروقت پریشان' مضمحل' آزردہ خاطر' اور پراگندہ مزاج نظر آتا ہے' کبھی نوبت یہاں تک پہنچتی ہے کہ خوف کی وجہ سے وطن ترک کردیتا ہے' اور گھر کے عیش و آرام کو غیر مانوس سرزمین کی مشقت اور تکلیف پر قربان کردیتا ہے' ایک طرف ہمارے سامنے آدمی پر خوف کی یہ مثال ہے۔ دوسری طرف ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ایک شخص دوزخ سے ڈرتا ہے' لیکن نہ وہ کانپتا ہے' نہ کھانا پینا اور سونا ترک کرتا ہے' نہ گھبرا کر بیوی بچوں سے جدائی اختیار کرتا ہے' معاصی کا مرتکب ہوتا ہے' اور اس کے حال سے کسی پریشانی یا خوف کا اظہار نہیں ہوتا' اسی لیے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

لَمْ اَرَ مِثْلَ النَّارِ نَامَ هَارِبُهَا وَلَا مِثْلَ الْجَنَّةِ نَامَ طَالِبُهَا (۱)

میں نے دوزخ جیسی کوئی چیز نہیں دیکھی جس سے فرار اختیار کرنے والا سورہا ہو اور نہ جنت جیسی کوئی چیز دیکھی جس کا طالب خواب غفلت میں ہو۔

ان امور کی تحقیق نہایت دشوار ہے' اور ان مقامات کی انتہا نامعلوم ہے' اس لیے ان کا بتام و کمال حصول ناممکن ہے' تاہم ان امور میں سے ہر شخص کو اس کے حال کے مطابق حصہ ملتا ہے' خواہ ضعیف ہو یا قوی' اگر قوی ہوا تو کہا جائے گا کہ یہ بندہ صادق ہے۔ بہرحال اللہ تعالیٰ کی معرفت' اس کی عظمت اور اس کے خوف کی کوئی انتہا نہیں ہے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ حضرت جبرئیل علیہ السلام سے فرمایا کہ میں تمہیں تمہاری اصل صورت میں دیکھنا چاہتا ہوں' انہوں نے کہا آپ دیکھ نہیں سکیں گے' فرمایا نہیں مجھے دکھلاؤ' حضرت جبرئیل نے چاندنی رات میں بقیع کا وعدہ کیا' چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم (وعدے پر) تشریف لے گئے اور حضرت جبرئیل علیہ السلام کو دیکھا کہ انہوں نے آسمان کے کناروں یعنی افق کو ڈھانپ رکھا ہے' آپ یہ منظر دیکھ کر بے ہوش ہوگئے جب افاقہ ہوا تو حضرت جبرئیل علیہ السلام اپنی پہلی صورت پر واپس آگئے' سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اگر آپ اسرافیل (علیہ السلام) کو دیکھ لیں تو کیا ہو' عرش معلیٰ ان کے کاندھوں پر ہے اور ان کے دونوں پاؤں زمین کی نچلی سطح میں اترے ہوئے ہیں' اس کے باوجود اللہ کی عظمت سے اس قدر سکڑتے ہیں کہ ایک چھوٹی چڑیا بن جاتے ہیں۔ (۲) دیکھئے حضرت اسرافیل علیہ السلام پر اللہ تعالیٰ کی کس قدر عظمت اور ہیبت طاری ہوتی ہوگی کہ وہ سمٹ سکڑ کر چھوٹی چڑیا کے برابر ہوجاتے تھے' لیکن تمام فرشتے ایسے نہیں ہوتے' کیوں کہ درجات میں بڑا تفاوت ہے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں معراج کی شب میں گذرا تو میں نے دیکھا کہ جبرئیلؑ اللہ کے خوف سے ایسے تھے جیسے پرانی چادر یعنی وہ کپڑا جو

---

(۱) یہ روایت پہلے بھی گذری ہے۔ (۲) یہ روایت پہلے بھی گذری ہے

اونٹ کی پشت پر ڈالا جاتا ہے (بیہقی۔ انس) اسی طرح صحابہ بھی خوف و خشیت سے لرزاں رہتے تھے' لیکن ان کا خوف اس درجے کا نہیں تھا جس درجے کا خوف سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا' حضرت عبداللہ ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ جب تک تم لوگوں کو اللہ کے دین میں احمق نہیں جانو گے تب تک ایمان کی حقیقت تک رسائی حاصل نہ کرو گے مطرف کہتے ہیں کہ کوئی شخص ایسا نہیں جو اپنے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان احمق نہ ہو تاہم بعض لوگ بعض کی بہ نسبت کم احمق ہیں' سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ کوئی بندہ اس وقت تک ایمان کی حقیقت تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا جب تک کہ لوگوں کو اللہ کے سامنے اونٹوں کے مانند نہ دیکھے پھر اپنے نفس کی طرف رجوع کرے اور اسے سب سے زیادہ حقیر پائے۔ (۱)

<u>صادقین کے درجات</u> : اس پوری گفتگو کا حاصل یہ ہے کہ ان مقامات میں صدق کے بے شمار درجات ہیں' بعض اوقات بندے کو بعض امور میں صدق ہوتا ہے' اور بعض میں نہیں ہوتا' اگر وہ تمام امور میں صادق ہو تو ایسا شخص حقیقت میں صدیق ہے' حضرت سعد ابن معاذ فرماتے ہیں کہ میں تین باتوں میں پختہ ہوں' اور ان تین کے علاوہ میں کمزور ہوں' ان میں سے ایک یہ ہے کہ اسلام لانے کے بعد میں نے کبھی کوئی نماز ایسی نہیں پڑھی کہ دل میں یہ تصور پیدا ہوا ہو کہ میں اس سے کب فارغ ہوں گا دوسرے یہ کہ جب بھی کسی جنازے کے ساتھ گیا دل میں یہی خیال رہا کہ اس مردہ شخص سے قبر میں یہ سوالات ہوں گے' اور وہ یہ جوابات دے گا' دفن سے فراغت تک اس خیال کے علاوہ دل میں کوئی دوسرا خیال نہیں آیا' تیسری یہ ہے کہ جب بھی میں نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے کچھ سنا اس یقین کے ساتھ سنا کہ حق یہی ہے جو آپ فرماتے ہیں' حضرت ابن المسیبؒ نے یہ سن کر فرمایا کہ میرے خیال میں یہ تینوں خوبیاں بیک وقت نبی کے علاوہ کسی شخص میں جمع نہیں ہوتیں ان امور مذکورہ میں حضرت سعد ابن معاذ کی صداقت تھی کتنے ہی صحابہ ایسے ہیں جنہوں نے نمازیں بھی پڑھیں' اور جنازوں کی بھی مشایعت کی' لیکن وہ اس درجے تک نہیں پہنچے' یہ ہیں صدق کے درجات' اس کے معانی' صدق کے سلسلے میں مشائخ سے جو اقوال منقول ہیں ان میں سے اکثر مذکورہ معانی میں سے ایک سے تعرض کرتے ہیں' البتہ ابوبکر وراقؒ کہتے ہیں کہ صدق کی تین قسمیں ہیں صدق توحید' صدق اطاعت' اور صدق معرفت۔ صدق توحید کا تعلق عام مومنین سے ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ (پ ۲۷ ر ۱۸ آیت ۱۹)

اور جو لوگ اللہ پر اور اس کے رسولوں پر ایمان رکھتے ہیں ایسے ہی لوگ اپنے رب کے نزدیک صدیق ہیں۔

صدق اطاعت اہل علم اور اصحاب تقویٰ سے تعلق رکھتا ہے' اور صدق معرفت ان اہل ولایت کے ساتھ مخصوص ہے جو زمین کی میخیں ہیں۔ یہ تینوں قسمیں گھوم پھر کر انہی چھ قسموں میں مدغم ہو جاتی ہیں جو ہم نے بیان کی ہیں۔ ویسے بھی انہوں نے وہ چیزیں لکھی ہیں جن میں صدق ہوتا ہے' مگر ان کا احاطہ نہیں کیا۔ حضرت جعفر صادق فرماتے ہیں کہ صدق مجاہدہ ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ تو اللہ پر غیر کو اختیار نہ کرے جیسے اس نے تجھ پر غیر کو اختیار نہیں کیا' چنانچہ ارشاد فرماتا ہے:۔

هُوَ اجْتَبٰىكُمْ (پ ۱۷ ر ۱۷ آیت ۷۸) اس نے تم کو (اور) امتوں سے ممتاز فرمایا۔

بیان کیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وحی نازل فرمائی کہ میں جب کسی بندے کو اپنا محبوب بنا لیتا ہوں تو اس پر ایسی مصیبتیں اور آفتیں نازل کرتا ہوں جو اگر پہاڑوں پر نازل کی جائیں تو برداشت نہ کر سکیں' میں یہ دیکھتا ہوں کہ وہ میری مصیبتوں میں کیسے صدق اختیار کرتا ہے' اگر وہ صبر کرتا ہے تو میں اسے اپنا دوست اور محبوب بناتا ہوں' اور اگر واویلا مچا کر مخلوق سے میری شکایت کرتا ہے تو میں اسے رسوا کرتا ہوں اور کوئی پروا نہیں کرتا صدق کی علامت یہ ہے کہ مصائب اور اطاعات دونوں کی پردہ پوشی کی جائے' اور مخلوق کی ان پر اطلاع کو برا تصور کیا جائے۔

---

(۱) مجھے یہ روایت مرفوع نہیں ملی۔

کتاب المراقبة والمحاسبة

مراقبے اور محاسبے کا بیان

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:-

وَنَضَعُ الْمَوَازِيْنَ الْقِسْطَ لِيَوْمِ الْقِيَامَةِ فَلَا تُظْلَمُ نَفْسٌ شَيْئًا وَإِنْ كَانَ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ أَتَيْنَا بِهَا وَكَفَىٰ بِنَا حَاسِبِيْنَ (پ ۱۷ ر ۴ آیت ۴۷)

اور قیامت کے روز ہم میزان عدل قائم کریں گے، سو کسی پر اصلاً ظلم نہ ہوگا، اور اگر (کسی کا عمل) رائی کے دانے کے برابر بھی ہوگا تو ہم اس کو (وہاں) حاضر کردیں گے، اور ہم حساب لینے والے کافی ہیں۔

وَوُضِعَ الْكِتَابُ فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا فِيْهِ وَيَقُوْلُوْنَ يَا وَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتَابِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً إِلَّا أَحْصَاهَا وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا وَّلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ أَحَدًا (پ ۱۵ ر ۱۸ آیت ۴۵)

اور نامۂ اعمال رکھ دیا جائے گا تو آپ مجرموں کو دیکھیں گے کہ اس میں جو کچھ لکھا ہوگا اس سے ڈرتے ہوں گے اور کہتے ہوں گے کہ ہائے ہماری کم بختی اس نامۂ اعمال کی عجیب حالت ہے کہ بلا قلمبند کئے ہوئے نہ کوئی چھوٹا گناہ چھوڑا نہ بڑا گناہ اور جو کچھ انہوں نے کیا وہ (لکھا ہوا) موجود پائیں گے، اور آپ کا رب کسی پر ظلم نہ کرے گا۔

يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا أَحْصَاهُ اللّٰهُ وَنَسُوْهُ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ (پ ۲۸ ر ۱ آیت ۱)

جس روز ان سب کو اللہ تعالیٰ دوبارہ زندہ کرے گا پھر ان کا سب کیا ہوا ان کو بتلا دے گا (کیوں کہ) اللہ تعالیٰ نے وہ محفوظ کر رکھا ہے اور یہ لوگ اس کو بھول گئے اور اللہ ہر چیز پر مطلع ہے۔

يَوْمَئِذٍ يَّصْدُرُ النَّاسُ أَشْتَاتًا لِّيُرَوْا أَعْمَالَهُمْ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهُ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهُ (پ ۳۰ ر ۲۴ آیت ۶-۷-۸)

اس روز لوگ مختلف جماعتیں ہو کر واپس ہوں گے تاکہ اپنے اعمال کو دیکھ لیں، سو جو شخص (دنیا میں) ذرہ برابر نیکی کرے گا وہ (وہاں) اس کو دیکھ لے گا، اور جو شخص ذرّہ برابر بدی کرے گا وہ اس کو دیکھ لے گا۔

ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ (پ ۳ ر ۶ آیت ۲۸۱)

پھر ہر شخص کو اس کا کیا ہوا (بدلہ) پورا پورا ملے گا اور ان پر کسی قسم کا ظلم نہ ہوگا۔

يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا وَّمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْءٍ تَوَدُّ لَوْ أَنَّ بَيْنَهَا وَبَيْنَهُ أَمَدًا بَعِيْدًا وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهُ (پ ۳ ر ۱۱ آیت ۳۰)

جس روز (ایسا ہوگا) کہ ہر شخص اپنے اچھے کئے ہوئے کاموں کو سامنے لایا ہوا پائے گا اور اپنے برے کئے ہوئے کاموں کو بھی (اور) اس بات کی تمنا کرے گا کہ کیا خوب ہوتا جو اس شخص کے اور اس روز کے درمیان دور دراز کی مسافت (حائل) ہوتی اور اللہ تعالیٰ تم کو اپنی (عظیم الشان) ذات سے ڈراتے ہیں۔

وَاعْلَمُوْا أَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِيْ أَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوْهُ (پ ۲ ر ۱۴ آیت ۲۳۵)

اور یقین رکھو اس کا کہ اللہ تعالیٰ کو اطلاع ہے تمہارے دلوں کی بات کی۔

ان آیات کریمہ کی روشنی میں اہل بصیرت نے جان لیا ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کی گھات میں ہے اور یہ کہ ان سے حساب میں

مناقشہ کیا جائے گا' اور ذرہ ذرہ کے بارے میں باز پرس ہوگی' ان لوگوں نے یہ بات بھی جان لی ہے کہ ان خطرات سے نجات کی واحد صورت یہ ہے کہ اپنے نفس کا مسلسل احتساب کیا جائے' اور سچائی کے ساتھ اعمال کی نگرانی کی جائے' اور نفس سے ہر سانس اور ہر حرکت کا محاسبہ کیا جائے' اس لیے کہ جو شخص محاسبے سے پہلے اپنے نفس کا احتساب کرے گا قیامت کے دن اس کے حساب میں تخفیف کی جائے گی' اور ہر سوال کا جواب اس کے ذہن میں مستحضر ہوگا' وہاں اس کا انجام بہترین ہوگا' اور جو شخص اپنے نفس کا محاسبہ نہیں کرے گا وہ ہمیشہ حسرتوں کا شکار رہے گا' اور قیامت کے میدان میں اس کے ٹھہرنے کی مدت طویل ہوگی' اور اسے اس کے گناہ رسوائی میں مبتلا کریں گے' اور اللہ تعالیٰ کے غیظ و غضب تک پہنچائیں گے' یہ اہل بصیرت جانتے ہیں کہ قیامت کے دن کی رسوائی اور ذلت سے بچنے کا واحد راستہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے' ہر اس معاملے میں جس میں اس نے اطاعت کا حکم دیا ہے' اور اللہ تعالیٰ صبر' اور نگرانی کا حکم دیتا ہے' فرمایا:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اصْبِرُوا وَصَابِرُوا وَرَابِطُوا (پ ۴ ر ۱۱ آیت ۲۰۰)

اے ایمان والو! خود صبر کرو اور مقابلے میں صبر کرو' اور مقابلے کے لیے مستعد رہو۔

انہوں نے اپنے نفس کی اس طرح نگرانی کی کہ پہلے اس سے شرطیں لگائیں' پھر اس کے احوال پر نظر رکھی' اس کے بعد احتساب کیا' پھر اسے سزا دی' پھر مجاہدہ کیا' پھر عتاب کیا' گویا نگرانی کے چھ مقامات سے گزرے' آیئے ہم ان چھ مقامات کی شرح و تفصیل کریں' اور بتلائیں کہ مراطے (نگرانی) کی کیا حقیقت ہے؟ کیا فضیلت ہے؟ اور اس کے لیے کن اعمال کا ہونا ضروری ہے' ان سب مقامات کی اصل محاسبہ ہے' اور محاسبہ شرطیں لگانے اور احوال کی نگرانی کے بعد حاصل ہوتا ہے' اور حساب کے بعد اگر نقصان محسوس ہو تو عتاب اور عقاب کی باری آتی ہے۔

پہلا مقام نفس سے شرط لگانا: جو لوگ تجارت میں مشغول ہیں' اور سامان تجارت میں شریک ہیں ان کا مقصد اس کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا کہ انہیں کچھ نفع مل جائے' پھر جس طرح تاجر اپنے شریک سے مدد لیتا ہے اولاً سامان تجارت اس کے سپرد کرتا ہے تاکہ اس میں تجارت کرسکے' اس کے بعد حساب کرتا ہے اسی طرح عقل بھی آخرت کی تاجر ہے' اس کا مقصد جسے نفع بھی کہہ سکتے ہیں تزکیۂ نفس ہے' اسی پر اس کی فلاح کا دارومدار ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكَّاهَا ۝ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسَّاهَا (پ ۳۰ ر ۱۶ آیت ۹-۱۰)

یقیناً وہ مراد کو پہنچا جس نے اس کو پاک کرلیا اور نامراد ہوا جس نے اس کو (فجور میں) دبا دیا۔

نفس اعمال صالحہ سے فلاح یاب ہوتا ہے' اور عقل نفس سے اس تجارت میں مدد لیتی ہے یعنی اسے استعمال کرتی ہے' اور اسے ان اعمال کے لیے مسخر کرتی ہے جن پر اس کا تزکیہ موقوف ہے' جیسے تاجر اپنے شریک یا اس نوکر سے مدد لیتا ہے جو اس مال میں تجارتی لین دین کا ذمہ دار ہے' اور جس طرح شریک تاجر کے لیے ایک فریق کی حیثیت اختیار کرلیتا ہے' اور وہ مدعی بن کر حصول منفعت کے لیے یہ چاہتا ہے کہ پہلے کچھ شرطیں عائد کرلی جائیں' پھر اس پر نظر رکھی جائے' پھر اس سے حساب لیا جائے' اور اس کے بعد عقاب یا عتاب کا معاملہ اگر ہر حساب میں خیانت پائی جائے' اسی طرح عقل بھی نفس سے ان چاروں باتوں کی طالب ہے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ اس سے کچھ شرطیں مقرر کرلے' اور اس کے کچھ فرائض متعین کردے' اور اسے کامیابی کی راہ دکھلا دے' اور یہ ہدایت کردے کہ وہ راہ سے منحرف نہ ہو' اسی پر ثابت قدمی سے چلتا رہے' دوسری یہ کہ کسی بھی وقت اس کی نگرانی سے غافل نہ رہے' اس لیے کہ اگر اس سے ذرا بھی غفلت کی گئی تو وہ خیانت کرے گا' اور اصل سرمایہ بھی ضائع کردے گا چہ جائیکہ کچھ کما کردے' یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی بے ایمان ملازم مال کے ساتھ تنہا ہو' اور میدان خالی ہو تو خیانت سے باز نہیں آتا' پھر فراغت کے بعد اس سے حساب لینا چاہیے' اور یہ دیکھنا چاہیے کہ اس نے وہ تمام شرائط پوری کی ہیں یا نہیں جو اس پر عائد کی گئی تھیں' یہ ایک ایسی تجارت ہے جس کا نفع جنت الفردوس کی صورت میں عطا کیا جائے گا' اور سدرۃ المنتہیٰ پر انبیاء و شہداء کی رفاقت

نصیب نہ ہوگی' اس کاروبار کا حساب کتاب نہایت باریکی سے ہونا چاہیے اور دنیاوی منافع سے اس تجارت کے منافع پر نظر رکھنی چاہیے کیوں کہ دنیاوی تجارت کے منافع اخروی منافع کے مقابلے میں نہایت حقیر ہیں' پھر دنیا کے منافع خواہ کتنے ہی ہوں باقی نہیں رہتے بھلا ایسے خیر میں کیا خیر ہے جو دائمی نہ ہو' اس سے بہتر تو وہ شر ہے جسے دوام نہ ہو' اس لیے کہ اس کے زوال سے راحت تو ہوگی' اور شر کا ازالہ تو ہوگا' جب کہ خیر کے جانے سے خیر الگ جائے گا اور اس کے جانے کا رنج الگ ہوگا' کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

اَشَدُّ الْغَمِّ عِنْدِیْ فِیْ سُرُوْرٍ تَیَقَّنَ عَنْہُ صَاحِبُہُ انْتِقَالاً

(مجھے اس خوشی پر سخت ملال ہے جس کی جدائی کا یقین ہوتا ہے)۔

اس لیے ہر اس شخص پر جو اللہ تعالیٰ پر' اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے ضروری ہے کہ وہ اپنے نفس کا محاسبہ کرے' اور اس سے تمام حرکات' سکنات' خطرات اور حظوظ میں سختی برتے' اس لیے کہ انسانی زندگی کا ہر سانس ایک ایسا قیمتی جوہر ہے جس کا کوئی عوض نہیں ہو سکتا' اور اس سے ایک ایسا گراں قدر خزانہ خریدا جاسکتا ہے جو ابد الآباد تک ختم نہ ہو' ان قیمتی سانسوں کو ضائع کرنا' یا ہلاک کرنے والے اعمال میں صرف کرنا ایک ایسا زبردست خسارہ ہے جو کوئی عقلمند انسان برداشت نہیں کر سکتا جب بندہ صبح سویرے نیند سے بیدار ہو اور صبح کے فرائض سے فراغت حاصل کرلے تو ایک گھڑی اپنے نفس کے ساتھ شرطیں لگانے کے لیے خلوت اختیار کرے' جیسے تاجر اپنے شریک کو مال دینے سے پہلے ایک مخصوص نشست منعقد کرتا ہے' اور اس سے شرائط پر گفتگو کرتا ہے' اس مجلس میں عقل کو نفس سے یہ کہنا چاہیے کہ میرے پاس عمر کے علاوہ کوئی سرمایہ نہیں ہے' اگر یہ ضائع ہوگیا تو میرا تمام سرمایہ ضائع ہوجائے گا اور میں مفلس اور تہی دست رہ جاؤں گا' تجارت کرنے اور نفع کمانے کی کوئی امید باقی نہیں رہے گی' آج ایک نیا دن ہے' اللہ نے مجھے پھر مہلت عطا کی ہے' اور میری زندگی میں کچھ مدّت اور بڑھائی ہے' اور اس طرح ایک بڑے انعام سے نوازا ہے' اگر میں مرجاتا تو یہ تمنا کرتا کہ کاش مجھے ایک دن کے لیے دنیا میں واپس کردیا جائے' تاکہ وہاں جاکر میں نیک عمل کروں' بس تم یہ سمجھو کہ گویا میں مرچکا ہوں اور مجھے دوبارہ دنیا میں بھیجا گیا ہے' خبردار! یہ دن ضائع نہ ہونے پائے' ہر سانس ایک ایسا نفیس جوہر ہے جس کی کوئی قیمت نہیں ہو سکتی' اے نفس! تجھے یہ بات جان لینی چاہیے کہ دن و رات میں چوبیس ساعتیں ہیں' جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ بندے کے لیے دن و رات میں چوبیس خزانے پھیلائے جاتے ہیں' اور ان میں سے ایک خزانہ اس کے لیے کھول دیا جاتا ہے' اس خزانے کو وہ اپنی نیکیوں کے نور سے لبریز دیکھتا ہے' یہ وہ نیکیاں ہوتی ہیں جو اس نے اس ساعت میں کی تھیں' ان انوار کے مشاہدے سے جو ملک جبار کی قربت کا وسیلہ ہیں انھیں اس قدر خوشی حاصل ہوتی ہے کہ اگر وہ خوشی اہل جہنّم پر تقسیم کردی جائے تو ان کے حصے میں اس قدر خوشی آئے کہ آگ کی تکلیف بھول جائیں پھر اس کے لیے ایک تاریک سیاہ خزانے کا منھ کھول دیا جاتا ہے' اس کی بُو انتہائی بری ہوتی ہے اور اس کی تاریکی نہایت شدید ہوتی ہے' یہ اس ساعت کا خزانہ ہوتا ہے جس میں اس نے گناہوں کا ارتکاب کیا تھا' اس خزانے کو دیکھ کر اس پر اس قدر وحشت طاری ہوتی ہے کہ اگر وہ اہل جنّت پر تقسیم کردی جائے تو ان کا مزہ مکدّر ہوجائے پھر اس پر ایک اور خزانہ کھولا جاتا ہے جس میں وہ سویا ہو' یا غافل رہا ہو' یا دنیا کے مباحات میں مشغول رہا ہو' اس وقت وہ اس خزانے کے خالی رہ جانے پر حسرت کرتا ہے' اور اسے اس قدر افسوس ہوتا ہے جیسے اسے کسی بہت بڑی تجارت میں اپنی غفلت سے کوئی بڑا خسارہ ہوگیا ہو' یا کسی بادشاہ کو قدرت رکھنے کے باوجود زبردست نقصان اٹھانا پڑ گیا ہو' حالانکہ اگر وہ چاہتا تو اس نقصان سے بچ سکتا تھا۔ اس کی ساعتوں کے یہ خزانے اس پر زندگی بھر کھولے جاتے ہیں' اس لیے اپنے نفس سے کہے کہ آج تو اپنا خزانہ بھرنے کے لیے کوشش کر اور انھیں اپنے اعمال کی قیمتی جوہروں سے خالی مت چھوڑ جو تیری سلطنت کے اسباب ہیں' سستی' کاہلی' آرام پسندی چھوڑدے ایسا نہ ہو کہ یہ سلطنت تجھ سے چھین کر کسی اور کے سپرد کردی جائے' اور تیرے حصے میں ہمیشہ ہمیشہ کی حسرت آئے' اگر تو جنت میں بھی داخل ہوگیا تب بھی سستی اور کاہلی کے نتیجے میں حاصل ہونے والا خسارہ تجھے چین سے نہیں رہنے دے گا' اگرچہ وہ بے چینی دوزخ کے عذاب کی بے چینی سے کم ہوگی' ایک بزرگ فرماتے ہیں ہمیں یہ تسلیم ہے کہ گناہ گاروں کے گناہ معاف کردیے جائیں گے مگر انھیں نیکو کاروں کے درجات تو حاصل نہیں ہوں

گے'اس قول سے انہوں نے اسی خسارے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

يَوْمَ يَجْمَعُكُمْ لِيَوْمِ الْجَمْعِ ذَٰلِكَ يَوْمُ التَّغَابُنِ (پ ۲۸ ر ۱۵ آیت ۹)

(اور اس دن کو یاد کرو) کہ جس دن تم سب کو ایک جمع ہونے کے دن جمع کرے گا (یہی دن) ہے سود و زیاں کا۔

یہ نفس کو اوقات کے باب میں وصیت تھی' اس کے بعد اسے ساتوں اعضاء کے سلسلے میں وصیت کرے اور وہ ساتوں اعضاء یہ ہیں آنکھ 'کان' زبان' شکم' شرمگاہ' ہاتھ اور پاؤں۔ اور ان اعضاء کی باگ ڈور نفس کے حوالے کردے' اور اس سے کہے کہ یہ اعضاء تیری رعایا ہیں' اور اس تجارت میں تیرے خادم ہیں' اس تجارت کی تکمیل انہی کے تعاون سے ہوگی' دوزخ کے سات دروازے ہیں' جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے ہر دروازے کے لیے ایک جز منقسم ہوگا' یہ دروازے اس شخص کے لیے متعین ہوں گے جو ان اعضاء سے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتا ہے' پھر جس عضو سے وہ اللہ کی نافرمانی کرے گا' اس عضو کے ساتھ مخصوص دروازے سے جہنم میں داخل ہوگا' نفس کو وصیت کرے کہ وہ ان اعضاء کو گناہوں سے بچائے' مثلاً آنکھ سے کہے کہ وہ غیر محرم کی طرف نہ دیکھے کسی مسلمان کے ستر پر نظر نہ ڈالے' اور نہ کسی مومن کو حقارت کی نظر سے دیکھے' بلکہ ہر اس چیز کو دیکھنے سے بچے جس کی ضرورت نہ ہو' اس لیے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے فضول نظر کے بارے میں بھی باز پُرس کرے گا' جیسے وہ فضول کلام کے متعلق باز پُرس کرے گا' پھر آنکھ کو ان امور سے روکنا ہی کافی نہیں ہے' بلکہ اسے ان امور میں بھی مشغول کرنا ضروری ہے جو اس تجارت کے لیے مفید ہوں' اور یہ امور وہ ہیں جن کے لیے آنکھ کی تخلیق کی گئی ہے یعنی اللہ کی عجائب صنعت کو چشم عبرت سے دیکھنا' یا اعمال خیر پر اس اعتبار سے نظر رکھنا کہ ان کی اقتدا کرنی ہے اللہ کی کتاب' اللہ کے رسول کی سنت' اور وعظ و نصیحت اور استفادے کی نیت سے حکیمانہ کتابوں کا مطالعہ کرنا آنکھ کی طرح باقی تمام اعضاء کو بھی ان کے فرائض سے آگاہ کرنا چاہیے' اور ان امور سے روکنا چاہیے جن سے تجارت دین میں نقصان ہوتا ہے' خاص طور پر زبان اور شکم کے سلسلے میں نہایت محتاط رہے' اس لیے کہ زبان فطری طور پر چلتی رہتی ہے' اور اسے حرکت کرنے میں کسی مشقت کا سامنا نہیں کرنا پڑتا' اور غیبت' چغلخوری' تزکیۂ نفس' مذمت مخلوق' مذمت طعام' لعنت' بددعا اور سب و شتم میں اس کا گناہ نہایت سخت ہے' یہ تمام امور ہم کتاب آفات اللسان میں بیان کرچکے ہیں۔ زبان عام طور پر انہی کے درپے رہتی ہے' جب کہ اس کی تخلیق کا مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرے' مخلوق کو ذکر کی نصیحت کرے' علمی مباحث میں حصہ لے' بندگان خدا کو دین کی تعلیم دے' اور ہدایت کا راستہ بتلائے' ان دو مسلمانوں میں مصالحت کرائے جو کسی معاملے میں خصومت رکھتے ہوں' اور اسی طرح کے دوسرے امور خیر انجام دے' نفس سے یہ شرط بھی ہونی چاہیے کہ وہ زبان کو دن بھر ذکر الٰہی کے علاوہ کسی بات کے لیے حرکت نہ دے اس لیے کہ مومن کا کلام ذکر ہونا چاہیے' اس کی نظر عبرت ہونی چاہیے' اس کی خاموشی عبادت ہونی چاہیے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ (پ ۲۶ ر ۱۷ آیت ۱۸)

وہ کوئی لفظ منہ سے نکالنے نہیں پاتا مگر اس کے پاس ہی ایک تاک لگانے والا تیار ہے۔

شکم کو ترک حرص کی تلقین کرے' اور اسے حلال غذاؤں میں سے کم کھانے کا پابند کرے' مشتبہ چیزوں سے باز رکھے' اور شہوات سے روکے' اور قدر ضرورت پر اکتفا کرنے کی نصیحت کرے اس سلسلے میں نفس کو یہ دھمکی بھی دی جاسکتی ہے کہ اگر تو نے شکم کے سلسلے میں ان احکام کی خلاف ورزی کی تو تجھے پیٹ سے متعلق تمام شہوات سے روک دوں گا تاکہ جتنی شہوات تو نے حاصل کی ہیں ان سے زیادہ فوت ہوجائیں۔ تمام اعضاء کے سلسلے میں اسی طرح کی شرائط ہونی چاہئیں' ان شرائط کا احاطہ کرنا تفصیل طلب ہے' نہ اعضاء کے معاصی مخفی ہیں' اور نہ طاعات پوشیدہ ہیں' اسی لیے بڑی آسانی سے شرائط طے کی جاسکتی ہیں' اور ہر عضو کو ترک معاصی اور عمل صالح کا پابند کیا جاسکتا ہے' اس کے بعد نفس کو ان اطاعات کی تلقین کرے جو دن میں کئی کئی مرتبہ ہوتی ہیں پھر ان نوافل کے سلسلے میں نفس کو وصیت کرے جن پر وہ قدرت رکھتا ہے' اور جنہیں کثرت سے انجام دے سکتا ہے' نوافل کی تفصیل کیفیت اور ان کے لیے اسباب کی تیاری کی کیفیت واضح طور پر بیان کردے' ان شرائط کی ہر دن ضرورت پڑتی ہے' لیکن جب انسان

اس کا عادی ہو جاتا ہے' اور نفس بھی شرائط کی تکمیل میں اس کے ساتھ تعاون کرتا ہے تو پھر شرطیں لگانے کی ضرورت باقی نہیں رہتی' اور اگر بعض شرطوں کی پابندی کرے اور بعض کی نہ کرے تو ان امور میں شرط لگانے کی ضرورت رہ جاتی ہے جن کی پابندی نہیں کرتا تاہم ہر روز کوئی نہ کوئی نیا واقعہ یا نیا حادثہ پیش آتا رہتا ہے' اس کا حکم الگ ہے' اور اس میں اللہ تعالیٰ کا حق جداگانہ طریقے پر ہوتا ہے' یہ صورت حال ان لوگوں کو بھی اکثر پیش آتی ہے جو دنیاوی اعمال میں مشغول ہوتے ہیں خواہ وہ حکومت کے کاموں میں لگے ہوئے ہوں' یا تجارت و تعلیم میں مصروف ہوں شاید ہی کوئی دن ایسا ہوتا ہو جس میں کوئی نیا واقعہ پیش نہیں آتا اور اس میں اللہ تعالیٰ کا حق ادا کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی' اس لیے نفس کے ساتھ یہ شرط لگانی بھی ضروری ہے کہ وہ ایسے واقعات میں ثابت قدم رہے' اور حق کی پیروی کرے' اور نفس کو غفلت اور بیکاری سے ڈرائے' اور اسے اس طرح نصیحت کرتا رہے جس طرح بھگوڑے اور سرکش غلام کو نصیحت کی جاتی ہے' اس لیے کہ نفس فطری طور پر سرکش' اطاعات سے متنفر' اور عبودیت سے منحرف ہے' لیکن وعظ و تادیب اس پر اثر انداز ہوتی ہے' قرآن کریم میں ہے۔

وَذَكِّرْ فَإِنَّ الذِّكْرَىٰ تَنفَعُ الْمُؤْمِنِينَ (پ ۲۷ ر ۲ آیت ۵۵) اور سمجھاتے رہیے کیوں کہ سمجھانا ایمان والوں کو نفع دے گا۔

بہر حال اس طرح کی شرائط عائد کرنا نفس کی نگہداشت کا ابتدائی مرحلہ ہے' یہ عمل سے پہلے کا محاسبہ ہے' اور محاسبہ کبھی عمل کے بعد ہوتا ہے اور کبھی ڈرانے کے لیے عمل سے پہلے بھی ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا فِي أَنفُسِكُمْ فَاحْذَرُوهُ (پ ۲ ر ۱۴ آیت ۲۳۵)

اور یقین رکھو اس کا کہ اللہ تعالیٰ کو اطلاع ہے تمہارے دلوں کی بات کی' سو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو۔

اس حذر کا تعلق مستقبل سے ہے' کثرت اور مقدار پر زیادتی اور نقصان کی معرفت حاصل کرنے کے لیے جو نظر ڈالی جاتی ہے اسے محاسبہ کہتے ہیں' اسی طرح اگر بندہ اپنے اعمال پر یہ جاننے کے لیے نظر رکھے گا کہ ان میں کوئی کمی بیشی تو نہیں ہوتی' یہ بھی محاسبے میں داخل ہے' اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا ضَرَبْتُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَتَبَيَّنُوا (پ ۵ ر ۱۰ آیت ۹۴)

اے ایمان والو جب تم اللہ کی راہ میں سفر کیا کرو تو تحقیق کر لیا کرو۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوا (پ ۲۶ ر ۱۳ آیت ۶)

اے ایمان والو اگر کوئی شریر آدمی تمہارے پاس کوئی خبر لائے تو خوب تحقیق کر لیا کرو۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهِ نَفْسُهُ (پ ۲۶ ر ۱۶ آیت ۱۶)

اور ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے اور اس کے جی میں جو خیالات آتے ہیں ہم ان کو جانتے ہیں۔

یہ اس لیے فرمایا تاکہ نفس ان چیزوں سے ڈرے' اور ان سے بچنے کی کوشش کرے عبادۃ ابن الصامت کہتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایسے شخص سے جس نے وصیت اور وعظ و نصیحت کی درخواست کی تھی ارشاد فرمایا۔

إِذَا أَرَدْتَ أَمْرًا فَتَدَبَّرْ عَاقِبَتَهُ فَإِنْ كَانَ رُشْدًا فَامْضِهِ وَإِنْ كَانَ غَيًّا فَانْتَهِ عَنْهُ (۱)

جب تو کسی امر کا ارادہ کرے تو اس کے انجام پر نظر رکھ' اگر انجام بہتر ہو تو اسے کر' اور اگر گمراہی ہو تو اس سے باز رہ۔

ایک دانشور کہتے ہیں اگر تو یہ چاہتا ہے کہ عقل خواہش نفس پر غالب ہو تو شہوت کے تقاضے پر اس وقت تک عمل نہ کر جب تک کہ عاقبت پر نظر نہ ڈال لے' اس لیے کہ دل میں ندامت کا باقی رہنا خواہش نفس کے پورا ہونے سے زیادہ برا ہے۔ حضرت لقمان علیہ السلام فرماتے ہیں کہ جب مومن عاقبت پر نظر رکھتا ہے تو ندامت سے محفوظ رہتا ہے' شداد ابن اوس روایت کرتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

الْكَيِّسُ مَنْ دَانَ نَفْسَهُ وَعَمِلَ لِمَا بَعْدَ الْمَوْتِ وَالْأَحْمَقُ مَنْ أَتْبَعَ نَفْسَهُ هَوَاهَا وَتَمَنَّى عَلَى اللَّهِ (۲)

(۱-۲) یہ دونوں روایتیں پہلے بھی گذری ہیں

عقلمند وہ ہے جس کا نفس اس کا مطیع ہو اور جو موت کے بعد کی زندگی کے لیے عمل کرے' اور احمق وہ ہے جو اپنے نفس کو خواہشات کا تابع کردے' اور اللہ پر تمنا کرے۔

دَانَ نَفْسَہٗ کے معنی یہ ہیں کہ نفس سے حساب لے' او رپوم حساب کو اسی لیے یَوْمُ الدِّیْنِ کہتے ہیں' قرآن پاک میں وارد ہے "اِنَّا لَمَدِیْنُوْنَ" یعنی ہم محاسبہ کرنے والے ہیں' حضرت عمرؓ ارشاد فرماتے ہیں کہ اپنے نفسوں کا احتساب کرتے رہو اس سے پہلے کہ تمہارا احتساب ہو' اور اس کو تولو اس سے پہلے کہ خود تولے جاؤ' اور بڑی پیشی کے لیے تیار رہو حضرت عمرؓ نے ابو موسیٰ اشعری کو لکھ کر بھیجا کہ اپنے نفس کا فراخی میں محاسبہ کرو اس سے پہلے کہ سختی کے ساتھ محاسبہ ہو' آپ نے حضرت کعب الاحبارؓ سے دریافت کیا کہ تم نے محاسبہ کے متعلق کتاب اللہ میں کیا دیکھا ہے' انہوں نے کہا: آسمان کے حساب کرنے والے کی طرف سے زمین کے حساب کرنے والے کے لئے ہلاکی ہو' آپ نے ان پر کوڑا اٹھالیا اور فرمایا کہ اس شخص کے علاوہ جس نے اپنے نفس کا محاسبہ کیا ہو' کعب نے عرض کیا اتوریت میں یہ استثناء پہلو بہ پہلو وارد ہے' درمیان میں کوئی فاصلہ بھی نہیں ہے۔ یہ تمام روایات اور اقوال مستقبل کے لیے محاسبے پر دلالت کرتے ہیں' من دان نفسہ عمل لما بعد الموت کا حاصل یہ ہے کہ پہلے امور کو وزن کرے' اور ان میں اچھی طرح تامل اور تدبّر کرے' پھر عمل پیرا ہو۔

دوسرا مقام مراقبہ: جب انسان اپنے نفس کو وصیت کرنے سے فارغ ہو جائے' اور اس سے وہ شرائط طے کرلے جو مذکورہ بالا سطور میں بیان کی گئی ہیں تو مراقبے کی طرف متوجہ ہو' یعنی اپنے اعمال میں غور و خوض کرے' اور ان پر گہری نظر ڈالے اور حفاظت کے خیال سے نفس پر سخت نظر رکھے' اس لیے کہ اگر نفس کو چھوڑ دیا گیا تو وہ سرکش ہو جائے گا' اور فساد اعمال کا موجب ہو گا' مراقبے پر مزید گفتگو سے پہلے آیئے اس کے فضائل بیان کرتے ہیں۔

مراقبے کے فضائل: سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبرئیل علیہ السلام سے احسان کے بارے میں دریافت کیا' آپ نے فرمایا:-

اَنْ تَعْبُدَ اللّٰہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ (بخاری و مسلم۔ ابو ہریرہؓ)

احسان یہ ہے کہ تو اللہ کی عبادت اس طرح کرے گویا اسے دیکھ رہا ہے۔

ایک حدیث میں یہ الفاظ وارد ہیں:-

اُعْبُدِ اللّٰہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ فَاِنْ لَّمْ تَکُنْ تَرَاہُ فَاِنَّہٗ یَرَاکَ

اللہ کی عبادت اس طرح کر گویا تو اسے دیکھ رہا ہو' اور اگر تو اسے نہیں دیکھ رہا ہے تو وہ تجھے دیکھ رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:-

اَفَمَنْ ھُوَ قَآئِمٌ عَلٰی کُلِّ نَفْسٍ بِمَا کَسَبَتْ (پ ۱۳ ر ۱۱ آیت ۳۳)

پھر کیا (خدا) ہر شخص کے اعمال پر مطلع ہو (ان کے شرکاء کے برابر ہو سکتا ہے)۔

اَلَمْ یَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰہَ یَرٰی (پ ۳۰ ر ۲۱ آیت ۱۴)

کیا اس شخص کو یہ خبر نہیں کہ اللہ تعالیٰ (اسے) دیکھ رہا ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلَیْکُمْ رَقِیْبًا (پ ۴ ر ۱۲ آیت ۱)

بالیقین اللہ تعالیٰ تم سب کی اطلاع رکھتے ہیں۔

وَالَّذِیْنَ ھُمْ لِاَمٰنٰتِھِمْ وَعَھْدِھِمْ رَاعُوْنَ وَالَّذِیْنَ ھُمْ بِشَھٰدٰتِھِمْ قَآئِمُوْنَ (پ ۲۹ ر ۳۲ آیت ۳۳)

اور جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا خیال رکھنے والے ہیں' اور جو اپنی گواہیوں کو ٹھیک ٹھیک ادا کرتے ہیں۔

حضرت ابن المبارک نے ایک شخص سے فرمایا رَاقِبِ اللّٰہ اس نے اس جملے کے معنی دریافت کیے فرمایا ہمیشہ اس طرح رہو گویا تم اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہے ہو' عبدالواحد ابن زید کہتے ہیں جب میرا آقا مجھے دیکھتا ہے تو میں کسی دوسرے کی پروا نہیں کرتا' ابو عثمان مغربی کہتے ہیں کہ راہ سلوک میں انسان کے لیے سب سے ضروری چیز مراقبہ' محاسبہ اور علم سے عمل کی سیاست ہے' ابن عطاء کہتے ہیں کہ بہترین عبادت ہمہ وقت حق تعالیٰ کا مراقبہ ہے' جریری کہتے ہیں کہ ہمارا یہ امر (سلوک و تصوف) دو اصلوں پر مبنی ہے' ان میں سے ایک یہ ہے کہ تو اپنے نفس پر اللہ تعالیٰ کا مراقبہ لازم کرے' اور دوسری یہ کہ تیرا علم ظاہر اعمال پر حجت ہو' ابو عثمان مغربی کہتے ہیں کہ ابو حفص نے مجھ سے فرمایا کہ جب تو لوگوں میں بیٹھے تو اپنے نفس اور قلب کا واعظ بن کر بیٹھ' اور اپنی مجلس میں لوگوں کی آمد سے فریب مت کھا' اس لیے کہ وہ تیرے ظاہر کو دیکھتے ہیں اور اللہ تیرے باطن کو دیکھتا ہے۔

ایک بزرگ سے منقول ہے کہ ان کا ایک نوجوان مرید تھا' جس کی وہ تعظیم کرتے تھے' اور اسے دوسروں پر ترجیح دیتے تھے' ایک مرتبہ ان کے بعض دوستوں اور مریدوں نے عرض کیا کہ آپ اس لڑکے کی اس قدر عزت کرتے ہیں حالانکہ وہ نوعمر ہے' جب کہ ہم بوڑھے ہو چکے ہیں' انہوں نے چند پرندے منگوائے' اور ہر مرید کو ایک پرندہ اور ایک چاقو دے کر کہا کہ اسے کسی ایسی جگہ لے جا کر ذبح کرو جہاں کوئی دیکھنے والا نہ ہو' ان مریدین میں وہ نوجوان بھی تھا' اور بزرگ نے اس نوجوان سے بھی یہی فرمائش کی تھی' تھوڑی دیر بعد ہر شخص ذبح شدہ پرندوں کو لے کر واپس آگیا' جب کہ وہ نوجوان زندہ پرندہ لے کر آیا' بزرگ نے اس سے پوچھا کہ تو نے اپنا پرندہ کیوں نہیں ذبح کیا' نوجوان نے کہا کہ مجھے ایسی کوئی جگہ نہیں ملی جہاں کوئی دیکھنے والا نہ ہو' اللہ تعالیٰ ہر جگہ مجھے دیکھتا ہے تمام لوگوں کو اس کا یہ مراقبہ اچھا لگا' انہوں نے اپنے شیخ سے عرض کیا واقعی یہ نوجوان قابل تعظیم ہے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جب زلیخا حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ خلوت میں تھیں تو انہوں نے اٹھ کر ایک بت کے منہ پر کپڑا ڈھانپ دیا حضرت یوسف نے فرمایا کہ تو ایک پتھر سے حیا کرتی ہے' پھر میں ملک جبار کے دیکھنے سے شرم نہ کروں' ایک نوجوان نے کسی باندی سے خواہش پوری کرنی چاہی' باندی نے کہا تجھے شرم نہیں آتی' نوجوان نے کہا میں کس سے شرم کروں ہمیں ستاروں کے علاوہ کون دیکھ رہا ہے' باندی نے کہا اور ستاروں کو پیدا کرنے والا کہاں گیا؟ کسی شخص نے جنید بغدادیؒ سے دریافت کیا کہ میں غض بصر کس چیز سے مدد لوں' فرمایا اس علم سے کہ منظور کی طرف تیری نظر بعد میں پہنچتی ہے' اور ناظر حقیقی کی نظر تجھ پر پہلے پہنچ جاتی ہے' ایک مرتبہ فرمایا مراقبے میں وہی شخص پختہ ہوتا ہے جو پروردگار سے اس لیے خوف کھاتا ہو کہ کہیں اس کا حظ فوت نہ ہو جائے' مالک ابن دینار کہتے ہیں جنات فردوس میں جنات عدن ہیں' اور ان میں ایسی حوریں ہیں جو جنت کے گلاب سے پیدا کی گئی ہیں' سائل نے پوچھا ان میں کون رہے گا' فرمایا اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ جنات عدن میں وہ لوگ رہیں گے جنہیں معاصی کے تصور کے ساتھ میری عظمت کا خیال آجائے' اور وہ میری حیاء سے باز رہیں' یہ وہ لوگ ہیں کہ ان کی کمریں میرے خوف سے جھک گئی ہیں' میں اپنی عزت و جلال کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں زمین والوں کو عذاب دینا چاہتا ہوں مگر میری نظر ان لوگوں پر پہنچتی ہے جو میرے خوف سے نہ کھاتے ہیں نہ پیتے ہیں تب میں اہل دنیا سے عذاب ہٹا لیتا ہوں۔ محاسبی سے مراقبے کے بارے میں دریافت کیا گیا' انہوں نے جواب دیا اس کی ابتدا یہ ہے کہ دل کو اللہ تعالیٰ کی قربت سے آگاہی ہو مرتعش کہتے ہیں کہ مراقبہ یہ ہے کہ غیب کے ملاحظے کے لیے ہر لمحے اور ہر کلمے میں باطن کی رعایت رکھے' روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فرشتوں سے فرمایا کہ تم ظاہر پر متعین ہو' اور میں باطن کا نگراں ہوں محمدؐ ابن علی ترمذی کہتے ہیں کہ اپنا مراقبہ اس ذات کے لیے کر جس کی نظروں سے تو اوجھل نہ ہو' اور اپنا شکر اس کے لیے مخصوص کر جس کی نعمتوں کا سلسلہ تجھ سے منقطع نہ ہو' اور اپنی طاعت کا تعلق اس شخص سے رکھ جس سے تو مستغنی نہ ہو' اور اس شخص کے لیے انکساری کر جس کی سلطنت اور حکومت سے تو باہر نہ ہو' سہل تستری کہتے ہیں کہ اللہ

تعالیٰ نے بندے کے دل کو اس علم سے زیادہ کسی چیز سے مزین نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ اسے دیکھنے والا ہے خواہ وہ کہیں بھی ہو بعض لوگوں سے اللہ تعالیٰ کے اس قول "رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهُ" کے متعلق دریافت کیا گیا' انہوں نے جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں سے راضی ہوں گے جو اپنے قلب کی نگرانی کرتے ہیں' اپنے نفس کا محاسبہ کرتے ہیں' اور اپنی آخرت کے لیے زاد راہ لیتے ہیں' حضرت ذوالنون مصریؒ سے کسی نے پوچھا کہ بندہ کو جنت کس طرح حاصل ہوگی' فرمایا پانچ چیزوں سے' استقامت سے جس میں انحراف نہ ہو' کوشش سے جس میں غفلت نہ ہو' خلوت و جلوت میں اللہ تعالیٰ کے مراقبے سے' تیاری کے ساتھ موت کے انتظار سے' اور محاسبے سے پہلے نفس کے احتساب سے۔ ایک شاعر کہتا ہے۔

اِذَا مَا خَلَوْتَ الدَّهْرَ يَوْماً فَلَا تَقُلْ ۔ خَلَوْتُ وَلٰكِنْ قُلْ عَلَيَّ رَقِيْبُ
وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ يَغْفُلُ سَاعَةً ۔ وَلَا اَنَّ مَا تُخْفِيْهِ عَنْهُ يَغِيْبُ
اَلَمْ تَرَ اَنَّ الْيَوْمَ اَسْرَعُ ذَاهِبٍ ۔ وَ اِنَّ غَدًا لِلنَّاظِرِيْنَ قَرِيْبُ

(کسی روز اگر تو تنہا ہو تو یہ نہ کہہ کہ میں تنہا ہوں بلکہ یہ کہہ کہ مجھ پر ایک نگرانی کرنے والا ہے' اور نہ یہ گمان کر کہ اللہ تعالیٰ کبھی تجھ سے غافل ہوگا' اور نہ یہ کہ تو جو بات اس سے چھپائے گا وہ چھپ جائے گی' کیا تجھے یہ احساس نہیں ہوتا کہ آج زمانہ بہت تیزی سے گذر رہا ہے اور کل دیکھنے والوں کے لیے نہایت قریب ہے)۔

حمید الطویل نے سلیمان ابن علی سے کہا کہ مجھے کچھ نصیحت کیجئے' انہوں نے کہا کہ جب تم کوئی گناہ کرتے ہو تو یا تو تمہارا خیال یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں دیکھ رہا ہے تب تو یہ بڑی جسارت کی بات ہے' یا یہ خیال ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں دیکھ نہیں رہا ہے تب یہ کفر ہے۔ حضرت سفیان ثوریؒ فرماتے ہیں کہ اس ذات کا مراقبہ کرو جس پر کوئی پوشیدہ سے پوشیدہ چیز مخفی نہیں رہتی' اور اس ذات سے توقع رکھو جو وفاء کی مالک ہے' اور اس ذات سے ڈرو جسے عقوبت کا اختیار ہے فرقد سنجی کہتے ہیں کہ منافق منتظر رہتا ہے' جب یہ دیکھتا ہے کہ کوئی اس کی طرف متوجہ نہیں ہے تو گناہ میں پڑ جاتا ہے' وہ صرف لوگوں کو دیکھتا ہے' اس کی نظر اللہ تعالیٰ پر نہیں رہتی۔ عبد اللہ ابن دینار کہتے ہیں کہ میں حضرت عمر ابن الخطابؓ کے ہمراہ مکہ مکرمہ کے لیے پابہ رکاب تھا راستے میں ہم نے ایک جگہ قیام کیا پہاڑ کے اوپر سے آپ کے پاس ایک چرواہا آیا' آپ نے اس سے کہا کہ ان بکریوں میں سے ایک بکری میرے ہاتھ فروخت کردے اس نے کہا میں غلام ہوں' حضرت عمر نے فرمایا اپنے مالک سے کہہ دینا کہ بھیڑیئے نے ایک بکری کھالی' غلام نے کہا اور اللہ تعالیٰ سے کیا کہوں گا' یہ سن کر حضرت عمرؓ رونے لگے' صبح کو آپ غلام کے آقا کے پاس گئے اور اسے خرید کر آزاد کردیا اور فرمایا کہ تجھے اس کلمے نے دنیا میں آزادی دی ہے' امید ہے کہ آخرت میں بھی اسی کلمے کی بدولت تجھے آزادی نصیب ہوگی۔

مراقبے کی حقیقت اور اس کے درجات : مراقبے کی حقیقت یہ ہے کہ رقیب کا لحاظ کیا جائے' اور اپنی توجہ کا رخ اس کی طرف پھیرا جائے چنانچہ اگر کوئی شخص غیر کے باعث کسی چیز سے احتراز کرتا ہے تو یہ کہتے ہیں کہ فلاں شخص نے فلاں کے لحاظ میں ایسا کیا ہے' صوفیاء کے نزدیک مراقبہ قلب کی اس حالت کو کہتے ہیں جو ایک قسم کی معرفت سے حاصل ہوتی ہے' اور اس حالت کی وجہ سے کچھ اعمال اعضاء میں اور کچھ قلب میں پیدا ہوتے ہیں۔ حالت یہ ہے کہ قلب رقیب کی طرف آتا رہے' اس کی طرف مشغول ہو' اس سے التفات رکھے' اور اس کی طرف متوجہ ہو' اور جس معرفت سے یہ حالت پیدا ہوتی ہے وہ یہ جاننا ہے کہ اللہ تعالیٰ دلوں کے بھید اور مخفی امور پر مطلع ہے' اور بندوں کے اعمال کا نگراں ہے' اور تمام نفوس کے اعمال سے واقف ہے' دل کا راز اس پر اس طرح عیاں ہے جیسے ظاہری جلد انسان پر مکشوف ہوتی ہے بلکہ اللہ پر اس سے زیادہ ہی واضح ہے جب یہ معرفت یقین بن جاتی ہے' یعنی ہر طرح کے شک سے خالی ہو جاتی ہے پھر دل پر غالب ہو کر اسے دبا لیتی ہے اور غلبہ اس لیے ضروری ہے کہ بہت سے امور ایسے ہیں جن کا انسان یقین رکھتا ہے لیکن وہ اس کے دل پر غالب نہیں ہوتے' جیسے موت کا علم یقینی ہے' لیکن دل پر

غالب نہیں ہے اس لیے جب کسی چیز کی معرفت دل پر غالب ہو جاتی ہے تو اسے رقیب کا لحاظ کرنے پر مائل کرتی ہے اور اس کی سمت کا رخ رقیب کی طرف پھیر دیتی ہے اس معرفت پر یقین رکھنے والے مقرب ہیں۔

مقربین کے درجے : اور مقربین کی دو قسمیں ہیں صدیق اور اصحاب یمین۔ اس لیے ان کا مراقبہ بھی دو درجوں کا ہوتا ہے ایک درجہ ان مقربین کا ہے جو صدیقین ہیں اور یہ عظمت و جلالت کا مراقبہ ہے اس مراقبے کا حاصل یہ ہے کہ قلب اس جلال کے مشاہدے میں مستغرق ہو جاتا ہے اور اس کی ہیبت سے شکستہ ہو جاتا ہے اور اس میں غیر کی طرف التفات کی ذرا بھی گنجائش باقی نہیں رہتی اس مراقبے کے اعمال کی تفصیل پر ہم زیادہ نظر نہیں کرتے اس لیے کہ اس کے اعمال صرف دل میں منحصر رہتے ہیں جہاں تک اعضاء کا سوال ہے وہ مباحات کی طرف بھی التفات نہیں کرتے چہ جائیکہ ممنوعات اور محرمات کی طرف ملتفت ہوں اور جب طاعات کے لیے متحرک ہوتے ہیں تو ایسا لگتا ہے گویا وہ معمول اور پابند ہوں اس لیے انھیں راہ راست پر قائم رکھنے کے لیے کسی تدبیر کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ جو شخص راعی کا مالک ہوتا ہے وہ رعیت کو خود درست کر دیتا ہے قلب راعی ہے جب وہ معبود میں مستغرق ہوتا ہے تو اعضاء بلا تکلف اسی کے راستے پر چلتے ہیں لیکن ہر شخص کا یہ حال نہیں ہوتا ایسا وہ ہوتا ہے جسے صرف ایک فکر ہو اور باقی تمام فکرات سے اسے اللہ تعالیٰ نے بچا دیا ہو جو شخص یہ درجہ پالیتا ہے وہ مخلوق سے اس حد تک غافل ہو جاتا ہے کہ بعض اوقات اپنے پاس موجود لوگوں کو بھی نہیں دیکھ پاتا حالانکہ اس کی آنکھیں کھلی ہوئی ہوتی ہیں اور نہ ان کی باتیں سن پاتا ہے حالانکہ وہ بہرہ نہیں ہوتا تمہیں اس طرح کی کیفیات ان دلوں میں بھی مل جائیں گی جو بادشاہان دنیا کی تعظیم سے لبریز ہوتے ہیں بعض شاہی خدام اپنے بادشاہوں کی تعظیم میں اس قدر مستغرق رہتے ہیں کہ ان پر کچھ بھی گذر جائے مگر انھیں اس کا احساس بھی نہیں ہوتا اور ان ہی لوگوں پر کیا موقوف ہے ان لوگوں کا بھی یہی حال ہوتا ہے جو کسی دنیاوی کام میں پوری طرح منہمک ہوں یا کسی خیال میں ڈوبے ہوئے ہوں حتیٰ کہ بعض لوگ سوچتے ہوئے اپنے راستے سے بھٹک جاتے ہیں یا منزل سے دور نکل جاتے ہیں اور انھیں یہ یاد نہیں آتا کہ وہ کہاں جارہے تھے اور کس کام کی غرض سے نکلے تھے عبدالواحد ابن زید سے کسی شخص نے سوال کیا کہ آپ اس زمانے میں بھی کسی ایسے شخص سے واقف ہیں جو مخلوق سے بے خبر ہو اور اپنے حال میں مشغول ہو فرمایا ہاں ایک شخص ایسا ہے اور وہ ابھی یہاں آنے والا ہے ابھی یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ عتبہ غلام وہاں آئے عبدالواحد ابن زید نے ان سے پوچھا اے عتبہ تم کہاں سے آرہے ہو انہوں نے کہا فلاں جگہ سے اس جگہ کا راستہ بازار کی سمت سے تھا آپ نے پوچھا تمہیں راستے میں کون کون ملا تھا انہوں نے کہا میں نے تو کسی کو نہیں دیکھا۔

حضرت یحییٰ ابن زکریا علیہما السلام سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ وہ کسی عورت کے پاس سے گذرے اور اس سے ٹکرا گئے وہ عورت زمین پر گر پڑی لوگوں نے عرض کیا آپ نے اس بیچاری کو دھکا کیوں دے دیا فرمایا میں دیوار سمجھا تھا ایک بزرگ کہتے ہیں کہ میں چند لوگوں کے پاس سے گذرا وہ تیر اندازی کر رہے تھے ایک شخص ان لوگوں سے کچھ دوری پر بیٹھا ہوا تھا میں اس کی طرف بڑھا اور میں نے یہ ارادہ کیا کہ اس سے کچھ گفتگو کروں اس نے کہا مجھے اللہ کا ذکر زیادہ مرغوب ہے میں نے کہا آپ تنہا ہیں کہنے لگا میرے ساتھ میرا رب ہے اور دونوں فرشتے ہیں میں نے پوچھا ان لوگوں میں سے جو تیر اندازی کر رہے ہیں کون سبقت لے جاسکتا ہے کہنے لگا جس کی اللہ تعالیٰ مغفرت فرمادے میں نے پوچھا راستہ کدھر ہے اس نے آسمان کی طرف اشارہ کیا اور اٹھ کر چل دیا اور کہنے لگا کہ تیری اکثر مخلوق تجھ سے بے پروا ہے یہ اس شخص کا کلام ہے جو اللہ تعالیٰ کے مشاہدے میں مستغرق ہو صرف اسی سے گفتگو کرتا ہو اور اسی کے بارے میں سنتا ہو ایسے شخص کو زبان اور اعضاء کے مراقبے کی ضرورت نہیں ہے اس لیے کہ اعضاء تو دل کے حکم پر حرکت کرتے ہیں۔ حضرت شبلیؒ حضرت علی ابن الحسین نوریؒ کے پاس آئے وہ ایک گوشے میں معتکف تھے اور بے حس و حرکت بیٹھے ہوئے تھے آپ نے ان سے پوچھا کہ تم نے یہ مراقبہ اور سکون کہاں سے حاصل کیا ہے انہوں نے جواب دیا اپنی بلی سے جب وہ شکار کرنا چاہتی تھی تو چوہوں کے بلوں کے پاس تاک لگا کر بیٹھ جاتی تھی اور اپنا بال تک

نہیں ہلاتی تھی ابو عبداللہ خفیف کہتے ہیں کہ میں مصر سے ابو علی الرودباری سے ملنے کے لیے رملہ کی طرف چلا مجھ سے عیسیٰ ابن یونس مصری نے جو زاہد نام سے مشہور تھے کہا کہ موضع صور میں ایک نوجوان اور ایک ادھیڑ عمر کا شخص مراقبے کی حالت میں ہیں' اگر تم ایک نظر انہیں دیکھ لو تو شاید کچھ نفع ہو' میں انہیں دیکھنے کی غرض سے اس حال میں صور پہنچا کہ بھوک پیاس سے بدحال تھا' اور میرے جسم کے درمیان میں ایک کپڑا تھا' اوپر اور نیچے کا حصہ برہنہ تھا میں وہاں کی مسجد میں داخل ہوا میں نے دیکھا کہ وہ آدمی قبلے کی طرف رخ کئے ہوئے بیٹھے ہیں' میں نے انھیں سلام کیا انہوں نے جواب نہیں دیا' میں نے دوبارہ اور سہ بارہ بھی سلام لیا مگر وہ خاموش ہی رہے میں نے کہا میں تمہیں اللہ کی قسم دیتا ہوں تمہیں میرے سلام کا جواب دینا چاہیے نوجوان نے اپنا سر اٹھایا اور میری طرف دیکھ کر کہنے لگا اے خفیف کے بیٹے! دنیا بہت مختصر ہے' اور اس مختصر میں سے بھی بہت کم باقی رہ گئی ہے مگر تو اس سے بہت کچھ حاصل کر سکتا ہے اے خفیف کے بیٹے! تیری مشغولیات کم ہیں تب ہی تو تجھے ہم سے ملنے کی فرصت مل گئی' اس کے بعد اس نے اپنا سر جھکا لیا' میں ان کے پاس دیر تک ٹھہرا یہاں تک کہ میں نے ظہر اور عصر کی نمازیں بھی انہی کے ساتھ ادا کیں' معلوم نہیں ان کی نظر میں کیا تاثیر تھی میری بھوک پیاس سب اڑ گئی' اور تمام تھکن دور ہو گئی' جب عصر کا وقت آیا تو میں نے اس نوجوان سے کہا کہ مجھے کچھ نصیحت کیجئے' نوجوان نے کہا ہم خود مصیبت میں ہیں تجھے کیا نصیحت کریں' اس کے بعد میں ان کے پاس تین دن تک ٹھہرا رہا' نہ میں کچھ کھاتا تھا' اور نہ پیتا تھا اور نہ سوتا تھا اور نہ میں نے انھیں کھاتے پیتے ہوئے دیکھا جب تیسرا دن ہوا تو میں نے اپنے دل میں کہا کہ مجھے نصیحت کرنے کے لیے انھیں قسم دینی چاہیے شاید مجھے ان کے وعظ و نصیحت سے کچھ نفع ہو' نوجوان نے اپنا سر اٹھایا اور کہنے لگا اے خفیف کے بیٹے! اس شخص کی صحبت اختیار کرنی چاہیے جسے دیکھ کر خدا یاد آجائے' اور تیرے دل میں اس کی ہیبت جم جائے' جو تجھے زبان حال سے نصیحت کرے' زبان قال سے نصیحت نہ کرے' سلام علیکم اب تم یہاں سے جاؤ' یہ ہے ان مراقبین کا درجہ جن کے دلوں پر اللہ کی عظمت و جلالت اس قدر غالب ہوتی ہے کہ غیر کی گنجائش نہیں رہتی۔

دوسرا درجہ اصحاب یمین میں سے اہل ورع کا ہے' یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں پر یہ یقین تو غالب رہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے تمام ظاہری و باطنی حالات پر مطلع ہے' لیکن اس کی عظمت و جلال کا مشاہدہ انھیں مدہوش نہیں کرتا' بلکہ ان کے قلوب حد اعتدال پر رہتے ہیں' اور ان میں اعمال و احوال کی طرف التفات رہتا ہے تاہم وہ اعمال پر مواظبت کے ساتھ ساتھ مراقبے سے خالی نہیں رہتے' لیکن ان پر اللہ سے حیا غالب رہتی ہے اس لیے وہ تامل کے بغیر نہ کسی کام کی جرأت کرتے ہیں اور نہ کسی کام سے توقف کرتے ہیں اور ہر اس عمل سے رکتے ہیں جو قیامت کے دن انھیں رسوائی میں مبتلا کرے گا' وہ قیامت کے منتظر نہیں رہتے' بلکہ دنیا ہی کو میدان قیامت سمجھتے ہیں' اور اللہ تعالیٰ کو اپنے احوال پر مطلع سمجھتے ہیں' ان دونوں درجوں کا اختلاف مشاہدات سے واضح ہو جاتا ہے' چنانچہ اگر کوئی شخص تنہائی میں کوئی عمل کر رہا ہو' اور اس وقت وہاں کوئی بچہ یا عورت آجائے اور عمل کرنے والے کو یہ معلوم ہو جائے کہ آنے والا اس کے حال پر مطلع ہے تو وہ اس سے حیا کرے گا اور اپنی نشست صحیح کرے گا' اور اپنے احوال کو درست کرے گا' ایسا عورت یا بچے کی تعظیم کے لیے نہیں کرتا' بلکہ حیاء کی وجہ سے کرتا ہے' ان کا مشاہدہ اگرچہ اسے مدہوش نہیں کرتا نہ استغراق کی کیفیت میں مبتلا کرتا ہے لیکن حیا میں جوش پیدا کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے باب میں بندوں کے مراقبے کے یہ مختلف درجات ہیں جس شخص کا یہ درجہ ہوتا ہے جو اوپر ذکر کیا گیا وہ اس امر کا محتاج ہوتا ہے کہ اپنی تمام حرکات' سکنات' خطرات' لحظات اور اختیارات پر نگاہ رکھے' اور یہ نگاہ دو مرتبہ ہونی چاہیے' ایک عمل سے پہلے' اور دوسرے عمل کے بعد' عمل سے پہلے یہ دیکھے کہ جو کچھ میرے لیے ظاہر ہوا ہے' اور جس فعل کے لیے میرے خاطر نے حرکت کی ہے آیا وہ اللہ تعالیٰ کے لیے خاص ہے' یا نفسانی خواہش' اور شیطان کی اتباع کے لیے ہے' یہاں کچھ دیر رک کر غور و فکر کرے یہاں تک کہ اس پر نور حق سے صحیح بات منکشف ہو جائے' اگر اس کی حرکت اللہ کے لیے ہو تو اسے آگے بڑھائے اور ہوائے نفس کے لیے ہو تو اللہ سے حیا کرے اور اس سے رک جائے پھر اپنے نفس کو اس میں رغبت کرنے اور اس کی طرف

مائل ہونے پر ملامت کرے' اور اس عمل کی برائی کرے' اور اللہ کے سامنے رسوا کرنے کی کوشش کی مذمت کرے' اور اسے بتلائے کہ تو خود اپنا دشمن ہے' اگر اللہ تعالیٰ اپنی حفاظت سے تیری برائی کا تدارک نہ کرے تو تو کہیں کا نہ رہے۔ ابتدائے امر میں یہ توقف اس وقت تک قطعی طور پر واجب ہے جب تک کہ پوری بات واضح نہ ہو جائے' اس سے کسی کو مفر نہیں ہے حدیث شریف میں ہے کہ بندے کے سامنے اس کی ہر حرکت سے متعلق خواہ وہ کتنی ہی چھوٹی کیوں نہ ہو تین دیوان کھولے جائیں گے' پہلا دیوان لِمَ کا ہو گا' دوسرا دیوان کَیفَ کا ہو گا' اور تیسرا دیوان لِمَن کا ہو گا۔ لم کے معنی یہ ہیں کہ تو نے یہ فعل کیوں کیا' کیا تجھ پر اس کا کرنا اپنے مولیٰ کے لیے واجب تھا یا تو اپنی شہوت اور خواہش نفس کی بنا پر اس کی طرف مائل ہوا اور اگر اس سوال سے بچ گیا' یعنی یہ ثابت ہو گیا کہ اس نے فلاں عمل اللہ ہی کے لیے کیا تھا تو اس سے دوسرا سوال یہ ہو گا کہ یہ عمل کس طرح کیا' یعنی علم یقین کے ساتھ کیا' یا جہل اور ظن کے ساتھ' اگر اس سوال سے بچ گیا تو تیسرا سوال اخلاص کے لیے ہو گا' یعنی یہ پوچھا جائے گا کہ تو نے یہ عمل صرف اللہ کی رضا اور خوشنودی کے لیے کیا ہے اور اپنے دعوئ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کو پورا کرنے کی خاطر کیا ہے' اور اگر جواب اثبات میں ہے تو تیرا اجر اللہ پر ہے' اور اگر اپنی جیسی مخلوق کو دکھانے کے لیے کیا ہے تو اپنا اجر اسی سے لے لے' اور اگر دنیا کی نعمتیں حاصل کرنے کے لیے کیا ہے تو ہم تجھے یہ نعمتیں پہلے ہی دے چکے ہیں' یا سہو اور غفلت کے ساتھ کیا ہے' اگر ایسا ہے تو تو نے میرا غضب اور میرا عتاب واجب کر لیا ہے' تو میرا بندہ تھا' میرا رزق کھاتا تھا' اور میری نعمتوں سے عیش کرتا تھا پھر تو نے غیر کے لیے عمل کیوں کیا' کیا تو نے میرا یہ قول نہیں سنا تھا۔

اِنَّ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ (پ ۹ ر ۱۴ آیت ۱۹۴)

واقعی تم خدا کو چھوڑ کر جن کی عبادت کرتے ہو وہ بھی تم ہی جیسے بندے ہیں۔

اِنَّ الَّذِیْنَ تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَا یَمْلِكُوْنَ لَكُمْ رِزْقًا فَابْتَغُوْا عِنْدَ اللّٰهِ الرِّزْقَ وَاعْبُدُوْهُ وَاشْكُرُوْا لَهٗ (پ ۲۰ ر ۱۴ آیت ۱۷)

تم خدا کو چھوڑ کر جن کو پوج رہے ہو وہ تم کو کچھ بھی رزق دینے کا اختیار نہیں رکھتے سو تم رزق خدا کے پاس تلاش کرو اور اسی کی عبادت کرو اور اسی کا شکر کرو۔

تیرا برا ہو کیا تو نے میرا یہ قول نہیں سنا تھا۔

اَلَا لِلّٰهِ الدِّیْنُ الْخَالِصُ (پ ۲۳ ر ۱۵ آیت ۳)

یاد رکھو عبادت (جو کہ شرک سے) خالص ہو اللہ ہی کے لیے ہے۔

جب بندہ یہ جان لیتا ہے کہ اسے مختلف سوالات کا سامنا کرنا ہو گا' اور نفس سے زبردست باز پرس ہو گی اور جواب دیئے بغیر چھٹکارہ نہیں ہو گا تو وہ اس سے پہلے ہی سوال و جواب کے لیے تیاری شروع کر دیتا ہے' ہر سوال کے جواب کی تیاری کرتا ہے تاکہ وقت پر صحیح جواب دے سکے بہرحال بندے کو چاہیے کہ وہ اپنے ہر کام سے پہلے تأمل کرے خواہ وہ نیا کام کر رہا ہو یا کسی عمل کا اعادہ کر رہا ہو یہاں تک کہ انگلی ہلانے اور پلک جھپکنے کا عمل بھی سوچے سمجھے بغیر نہیں ہونا چاہیے۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ ابن جبلؓ سے ارشاد فرمایا تھا کہ انسان سے اس کی آنکھوں کے سرمے' انگلی سے مٹی کھرچنے' اور اپنے بھائی کا کپڑا چھونے کے متعلق بھی باز پرس کی جائے گی' حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ پچھلے زمانے کے لوگ صدقہ دینے سے پہلے کچھ دیر توقف کرتے تھے اور سوچتے تھے اگر یہ دیکھتے کہ ان کا صدقہ اللہ کے لیے ہے تو ارادہ پورا کرتے انہی کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے پر رحم فرمائے جو ارادہ کرے تو ٹھہر جائے' اور جب یہ دیکھے کہ اس کا ارادہ اللہ کے لیے ہے تو اسے پورا کرے اور اگر غیر کے لیے ہے تو ملتوی کر دے حضرت سعدؓ کی روایت میں ہے کہ انہیں حضرت سلمان فارسیؓ نے یہ نصیحت کی کہ جب بھی کوئی قصد کرے تو اللہ سے خوف کیا کر (احمد' حاکم موقوفاً) محمد ابن علیؒ کہتے ہیں کہ صاحب ایمان توقف کرنے والا اور ٹھہرنے والا ہوتا ہے' وہ اپنے

قصد کے وقت توقف کیا کرتا ہے وہ رات میں لکڑیاں جمع کرنے والا نہیں ہوتا (یعنی وہ اس شخص کی طرح نہیں ہوتا جو رات کی تاریکی میں خشک و تر اور غبار آلود ہر طرح کی لکڑیاں سمیٹ لے)۔

مراقبے کی پہلی نظر: یہ اس مراقبے کی پہلی نظر کا حال ہے' اس سے حفاظت کی صورت یہ ہے کہ آدمی پختہ علم رکھتا ہو' اعمال کے اسرار پر مطلع ہو' نفس کے مکائد اور شیطان کے مکر کی معرفت رکھتا ہو' اگر کوئی شخص نہ اپنے رب کو پہچانتا ہے' اور نہ اپنے نفس سے واقف ہے نہ اپنے دشمن شیطان سے واقفیت رکھتا ہے اور نہ یہ جانتا ہے کہ کون سے امور ہوائے نفس کے موافق ہیں اور نہ وہ اللہ تعالیٰ کی پسندیدہ اور غیر پسندیدہ چیزوں میں تمیز کر سکتا ہے اور نہ یہ دیکھتا ہے کہ اس کے ارادے' قصد' نیت' اور حرکت و سکون میں سے کیا چیز رضائے الٰہی کے مطابق ہے وہ اس مراقبے میں صحیح سلامت نہیں رہ سکتا' بلکہ اکثر لوگ اللہ تعالیٰ کے ناپسندیدہ افعال کا ارتکاب کرتے ہیں اور اپنی جہالت کی بناء پر یہ سمجھتے ہیں کہ ہم اچھا کام کر رہے ہیں' اور ہمارے اعمال اللہ تعالیٰ کی رضا کے مطابق ہیں۔

پھر جہالت کوئی عذر نہیں' اگر کوئی شخص علم حاصل کر سکتا ہے تو اس سے کہا جائے گا کہ وہ علم حاصل کرے' اس کا یہ عذر قبول نہیں کیا جائے گا کہ وہ جاہل ہے' اس لیے کہ علم طلب کرنا تمام مسلمانوں پر فرض ہے' اسی لیے عالم کی دو رکعتیں جاہل کی ہزار رکعتوں سے افضل ہیں' کیوں کہ عالم نفوس کی آفات' شیطان کے مکاید' اور مواقع فریب سے واقف ہوتا ہے اور ان سے بچ سکتا ہے جب کہ جاہل اپنی جہالت کی بناء پر ان سے اجتناب نہیں کر سکتا' اس لیے وہ ہمیشہ مشقت اور پریشانی میں رہے گا' جب کہ شیطان اس سے خوش رہے گا' اللہ تعالیٰ جہالت اور غفلت سے محفوظ رکھے' بد بختی کی اصل اور نقصان کی جڑ یہی ہے' اس لیے ہر بندے پر واجب ہے کہ جب وہ کسی کام کا ارادہ کرے یا کسی اقدام کے لیے سعی کرے تو کچھ دیر ارادے اور سعی میں توقف کرے' یہاں تک کہ نور علم سے اس پر یہ امر منکشف ہو جائے کہ اس کا ارادہ اور سعی اللہ تعالیٰ کے لیے ہے' اس صورت میں اقدام کرے اور اگر یہ واضح ہو کہ اللہ کے لیے نہیں ہے تو اس سے باز آئے اور قلب کو اس میں غور و فکر کرنے سے روکے کیوں کہ اگر باطل امور میں پہلے ہی مرحلے پر احتساب نہیں کیا گیا اور خیال و فکر کو باقی رہنے دیا گیا تو اس سے رغبت پیدا ہو گی' اور رغبت سے ارادے کو قطعیت ملے گی' اور ارادے سے عمل ہو گا' اور عمل سے ہلاکت اور بربادی ملے گی اس لیے شر کے مادّے کو اس کے منبع ہی میں ختم کر دینا بہتر ہے' اور مادۂ شر فکر باطل ہے بعد کے تمام امور اسی فکر باطل کے تابع ہوتے ہیں' اور اگر بندے پر کوئی امر مشکل ہو جائے اور کوئی واضح پہلو سامنے نہ آئے تو نور علم سے غور و فکر میں مدد لے شیطان کے مکر سے اللہ کی پناہ مانگے اگر اس کے باوجود مقصد حاصل نہ ہو تو علمائے دین کے نور سے روشنی حاصل کرے' اور ان گمراہ علماء سے دور بھاگے جو دنیا پر کتوں کی طرح گرتے ہیں' ان سے اس طرح پناہ مانگے جیسے شیطان لعین سے پناہ مانگتے ہیں' بلکہ ان سے کچھ زیادہ ہی اللہ کی پناہ مانگے' اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام پر وحی نازل فرمائی تھی کہ میرے بارے میں اس عالم سے سوال مت کرنا جو دنیا کے نشے میں مدہوش ہو' ایسا شخص تجھے میری محبت سے دور کر دے گا' یہ لوگ میرے بندوں کے لیے رہزنوں سے کم نہیں ہیں۔

بہرحال جن دلوں پر دنیا کی محبت اور کثرت طمع اور شدت ہوس کے باعث تاریکی چھا جاتی ہے وہ اللہ کے نور سے روشنی حاصل نہیں کر پاتے' اس لیے کہ دلوں کو حق تعالیٰ سے روشنی ملتی ہے' جو شخص اس سے اعراض کرے گا اس کے دشمن سے تعلق رکھے گا' اس کی مبغوض اور ناپسندیدہ چیزوں یعنی دنیاوی شہوات سے عشق رکھے گا وہ یہ نور کیسے حاصل کر سکے گا۔ گویا سالک راہ طریقت کو چاہیے کہ وہ سب سے پہلے علم حاصل کرے' یا کوئی ایسا عالم تلاش کرے جو دنیا سے نفرت کرتا ہو یا دنیا میں اس کی رغبت ضعیف ہو' بشرطیکہ کوئی ایسا عالم نہ مل سکے جو بالکلیہ طور پر دنیا سے لاتعلق ہو۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْبَصَرَ النَّاقِدَ عِنْدَ وُرُوْدِ الشُّبُهَاتِ وَالْعَقْلَ الْكَامِلَ عِنْدَ هُجُوْمِ الشَّهَوَاتِ (ابو نعیم۔ عمران ابن حصین)

اللہ تعالیٰ شبہات کے مواقع پر چشم بینا کو اور ہجوم شہوات کے وقت عقل کامل کو پسند کرتا ہے۔

دیکھئے یہاں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے دونوں باتوں کو جمع فرمادیا' حقیقت میں یہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ لازم و ملزوم بھی ہیں' چنانچہ جس شخص کے پاس شہوات سے روکنے والی عقل نہ ہوگی اس کے پاس شبہات کو رد کرنے والی آنکھ بھی نہیں ہوگی' اسی لیے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

مَنْ قَارَفَ ذَنْبًا فَارَقَهُ عَقْلٌ لَا يَعُوْدُ إِلَيْهِ أَبَدًا (۱) جو شخص گناہ کرتا ہے اس کی عقل ہمیشہ کے لیے رخصت ہو جاتی ہے۔

اس بیچارے کے پاس عقل ہے ہی کتنی کہ اسے گناہ کرکے ضائع کردے۔ آج کے دور میں اعمال کی آفتوں کا علم باقی نہیں رہا ہے' اصل میں لوگوں نے اس طرح کے علوم سے دلچسپی ترک کردی ہے' اب عام طور پر ایسے علوم کا چرچا ہے جو لوگوں کے ان خصومات میں ثالثی کا رول ادا کرنے کی صلاحیت پیدا کرتے ہیں جو اتباع شہوات کی بنا پر رونما ہوتے ہیں ان علوم کا نام لوگوں نے فقہ رکھا ہے' اور علم دین کے فقہ کو بالائے طاق رکھ دیا ہے' بلکہ اسے علم کی فہرست سے ہی خارج کردیا ہے اس فقہ کا تعلق صرف دنیا سے رہ گیا ہے حالانکہ اس کا اصلی مقصد یہ تھا کہ لوگ ان امور میں مشغول نہ ہوں جن سے قلب کی فراغت متاثر ہو تاکہ فقیہ دین میں منہمک ہو سکیں فقہ کو دینی علوم میں اسی لیے جگہ دی گئی کہ یہ فقہ دین کا ذریعہ تھا' لیکن لوگوں نے اس کا مقصد ہی بدل دیا۔ اب فقہ اس لیے حاصل کیا جاتا ہے کہ خوب خوب جھگڑے اٹھائے جائیں' باریکیاں نکالی جائیں' اور مذہب کے نام پر سب و شتم کیا جائے' آج وہ زمانہ آگیا ہے جس کی پیش گوئی اس حدیث میں کی گئی تھی کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تم لوگ ایسے زمانے میں ہو کہ جو تم میں سب سے زیادہ عمل کی طرف سبقت کرنے والا ہے وہی سب سے زیادہ خیر والا ہے عنقریب ایسا زمانہ آئے گا کہ جو توقف کرے گا وہ سب سے بہتر ہوگا۔ (۲) اسی بنا پر بعض صحابہ کرام نے شامیوں اور عراقیوں سے جنگ کرنے کے معاملے میں توقف کیا تھا' کیوں کہ ان پر معاملہ مشتبہ ہوگیا تھا' ان صحابہ میں حضرات سعد ابن ابی وقاص' عبداللہ ابن عمر' اسامہ' محمد ابن مسلمہ رضوان اللہ علیہم اجمعین تھے۔ جو شخص شبہ کے موقع پر توقف نہیں کرتا وہ خواہش نفس کا متبع ہے' اور اپنی رائے کو فوقیت دینے والا ہے' یہ شخص ان لوگوں میں سے ہے جن کے متعلق سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

فَإِذَا رَأَيْتَ شُحًّا مُطَاعًا وَهَوًى مُتَّبَعًا وَإِعْجَابَ كُلِّ ذِيْ رَأْيٍ بِرَأْيِهِ فَعَلَيْكَ بِخَاصَّةِ نَفْسِكَ (۳)

جب تو یہ دیکھے کہ بخل کی پیروی ہو رہی ہے اور ہوائے نفس کی اتباع کی جارہی ہے اور ہر صاحب رائے اپنی رائے پر نازاں ہے تو تجھے خاص طور پر اپنے نفس کو لازم پکڑنا چاہیے۔

جو شخص بلا تحقیق کسی مشتبہ امر میں اپنی رائے کا اظہار کرتا ہے یا غور و خوض کرتا ہے وہ اللہ و رسول کے ان احکام کی خلاف ورزی کرتا ہے۔

لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ (پ۱۵ ر۴ آیت ۳۶)

اور جس بات کی تجھ کو تحقیق نہ ہو اس پر عملدرآمد مت کیا کر

إِيَّاكُمْ وَالظَّنَّ فَإِنَّ الظَّنَّ أَكْذَبُ الْحَدِيْثِ (۴)

ظن سے بچو' اس لیے کہ ظن بڑا جھوٹ ہے۔

---

(۱) یہ روایت پہلے بھی گزر چکی ہے' مجھے اس کی اصل نہیں ملی (۲) مجھے یہ روایت نہیں ملی (۳) یہ روایت پہلے گزر چکی ہے (۴) یہ حدیث پہلے بھی گزر چکی ہے

اس حدیث میں ظن سے مراد وہ ظن ہے جس کی کوئی دلیل نہ ہو، بعض عوام مشتبہ مسائل میں اپنے قلب سے فتویٰ لیتے ہیں، اور اپنے ظن پر عمل کرتے ہیں، اس معاملے کی نزاکت اور شدت کے پیش نظر حضرت ابوبکر الصدیقؓ نے یہ دعا کی تھی کہ:

اَللّٰهُمَّ اَرِنِيْ الْحَقَّ حَقًّا وَارْزُقْنِيْ اِتِّبَاعَهُ وَاَرِنِيْ الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَارْزُقْنِيْ اِجْتِنَابَهُ وَلَا تَجْعَلْ مُتَشَابِهًا عَلَيَّ فَاَتَّبِعُ الْهَوٰى

اے اللہ! مجھے حق کو حق کی صورت میں دکھلا، اور مجھے اتباع حق کی توفیق دے، اور باطل کو باطل کی صورت میں دکھلا اور اس سے بچنے کی توفیق عطا کر، اور مجھ پر امر حق مشتبہ مت کر کہ میں خواہش نفس کی پیروی کروں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں کہ امور تین طرح کے ہیں، ایک وہ جس کا اچھا ہونا ظاہر ہو، اس کی اتباع کرو، دوسرا وہ کہ اس کا برا ہونا واضح ہو، اس سے اجتناب کرو، اور تیسرا وہ جس کا معاملہ مشکل ہو، یعنی اسکے حق یا ناحق ہونے کا فیصلہ نہ ہو سکتا ہو اسے عالم کے سپرد کردو۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا یہ تھی:

اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُبِكَ اَنْ اَقُوْلَ فِي الدِّيْنِ بِغَيْرِ عِلْمٍ

اے اللہ میں اس بات سے تیری پناہ چاہتا ہوں کہ دین کے معاملات میں علم کے بغیر کچھ کہوں۔

بندوں پر اللہ کی سب سے بڑی نعمت علم، اور امر حق کا انکشاف ہے، ایمان بھی ایک نوع کا کشف اور علم ہے اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اس کو اس موقع پر ذکر فرمایا جہاں بندوں پر اپنے احسانات کا حوالہ دیا گیا ہے، فرمایا:

وَكَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا (پ۵ ر۱۴ آیت ۱۱۳)

اور آپ پر اللہ کا بڑا فضل ہے۔

یہاں فضل سے علم مراد ہے، اس سلسلے کی کچھ آیتیں حسب ذیل ہیں:

فَاسْئَلُوْا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (پ۱۴ ر۱۲ آیت ۴۳)

سو اگر تم کو علم نہیں تو اہل علم سے پوچھ لو۔

اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى (پ۳۰ ر۱۷ آیت ۱۲)

واقعی ہمارے ذمے راہ کا بتلا دینا ہے۔

ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ (پ۲۹ ر۱۷ آیت ۱۹)

پھر اس کا بیان کرا دینا بھی ہمارا ذمہ ہے۔

وَعَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِيْلِ (پ۱۴ ر۷ آیت ۹)

اور سیدھا راستہ اللہ تک پہنچتا ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں ہوائے نفس اندھے پن میں شریک ہے، اور حیرانی، پریشانی کے وقت توقف کرنا توفیق کی بات ہے، اور یقین کے ذریعے بہتر طور پر غم دور ہوتا ہے، کذب کا انجام ندامت ہے، صدق میں سلامتی ہے، بہت سے بیگانے اپنوں سے زیادہ قریب ہوتے ہیں جس کا کوئی دوست نہ ہو وہ اجنبی ہے، اور صدیق وہ ہے جو غائب کی تصدیق کرے سوءِ ظن تجھے کسی حبیب سے محروم نہ کرے، کرم بہترین وصف ہے، حیاء ہر احسان کا سبب ہے، تقویٰ سے بڑھ کر کوئی چیز مضبوطی سے تھامی جانے والی نہیں ہے، اور زیادہ مستحکم سبب وہ ہے جو تیرے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ہو، دنیا میں تیرے لیے اسی قدر ہے جس سے تو نے اپنی آخرت سدھاری ہے، رزق دو طرح کے ہوتے ہیں، ایک وہ رزق ہے جسے تم تلاش کرو، اور دوسرا وہ رزق ہے جو تمہیں تلاش کرے، اگر تم اس تک نہیں پہنچ پاتے تو وہ خود تمہارے پاس آجاتا ہے، اگر تمہارے پاس کوئی چیز ہو، اور وہ ضائع ہو جائے اور تم

اس پر واویلا کرو تو اس پر واویلا نہ کرو جو تمہیں نہیں ملی اور اسے اس پر قیاس کرلو جو تمہیں مل گئی ہے۔ اس لیے کہ تمام چیزیں یکساں ہوتی ہیں جو چیز آدمی سے فوت نہ ہو اس کے ملنے سے خوش ہوتا ہے' اور جس چیز کو کبھی حاصل نہیں کرسکتا اس کے نہ ملنے پر رنجیدہ ہوتا ہے' تمہیں دنیا میں سے جو کچھ مل جائے اس پر خوش مت ہو' اور جو نہ ملے اس پر غم نہ کرو' بلکہ اس بات پر خوش ہو جو تم نے آخرت کے لیے توشہ کرلیا ہو' اور ایسی چیز پر افسوس کرو جو پیچھے رہ گئی ہو' آخرت میں مشغول رہو' اور موت کے بعد کی زندگی کے لیے فکر کرو۔ یہ حضرت علیؓ کی نصائح ہیں' ہم نے یہ قیمتی نصائح اس ایک جملے کے لیے نقل کی ہیں کہ حیرت کے وقت توقف کرنا ایک توفیقی امر ہے۔

بہرحال مراقب کی نظر سب سے پہلے اپنی فکر اور ارادے پر ہونی چاہیے کہ وہ اللہ کے لیے ہے یا ہوائے نفس کے لیے چنانچہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

ثَلٰثٌ مَنْ كُنَّ فِيْهِ اسْتَكْمَلَ اِيْمَانَهُ لَا يَخَافُ فِي اللّٰهِ لَوْمَةَ لَائِمٍ وَلَا يُرَائِيْ بِشَيْءٍ مِنْ عَمَلِهِ وَاِذَا عُرِضَ لَهُ اَمْرَانِ اَحَدُهُمَا لِلدُّنْيَا وَالْاٰخِرُ لِلْاٰخِرَةِ اٰثَرَ الْاٰخِرَةَ عَلَى الدُّنْيَا (ابو منصور دیلمی۔ ابو ہریرہؓ)

تین باتیں ایسی ہیں کہ اگر کسی شخص میں پائی جائیں تو اس کا ایمان مکمل ہو ایک تو یہ کہ اللہ کے سلسلے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈرے' دوسرے یہ کہ اپنے کسی عمل سے ریا نہ کرے' اور تیسرے یہ کہ جب اس پر دو معاملے پیش ہوں' ایک دنیا کا اور دوسرا آخرت کا تو وہ آخرت کو دنیا پر ترجیح دے۔

اگر غور و فکر کے بعد کسی عمل کے بارے میں یہ نتیجہ نکلے کہ عمل مباح ہے' لیکن اس میں کوئی فائدہ نہیں ہے تو اسے ترک کردے' اس لیے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْكُهُ مَا لَا يَعْنِيْهِ (۱)

آدمی کے اسلام کی خوبی یہ ہے کہ وہ بے فائدہ امور ترک کردے۔

مراقبے کی دوسری نظر: مراقبے کی دوسری نظر اس وقت ہو جب عمل شروع کرے' یعنی عمل کی کیفیت کا طالب ہو' اور یہ دیکھے کہ میں اس میں اللہ تعالیٰ کا حق ادا کررہا ہوں یا نہیں' اور اس کی تکمیل میں میری نیت درست ہے یا نہیں پھر اس عمل کو پورے طور پر انجام دے' اور اسے مکمل طریقے سے بجالانے کی کوشش کرے' یہ بات تمام احوال میں لازم ہے' اس لیے کہ آدمی کا کوئی لمحہ حرکت و سکون سے خالی نہیں ہے' اسے چاہیے کہ وہ اپنی ہر حرکت اور سکون میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کی نیت کرے اس طرح وہ اپنے تمام احوال میں آداب شرعیہ کی رعایت پر قادر ہو جائے گا۔ مثال کے طور اگر کوئی شخص بیٹھا ہوا ہو تو بہتر یہ ہے کہ قبلے کی طرف رخ کرکے بیٹھے۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

خَيْرُ الْمَجَالِسِ مَا اسْتُقْبِلَ بِهِ الْقِبْلَةُ

بہترین نشست وہ ہے جس میں قبلے کا استقبال ہو۔

چار زانو ہو کر نہ بیٹھے' اس لیے کہ بادشاہوں کے سامنے اس طرح نہیں بیٹھا جاتا' اور اللہ تعالیٰ تو تمام بادشاہوں کا بادشاہ ہے' اور تمہاری نشست و برخاست پر مطلع ہے۔ حضرت ابراہیم ابن ادہم کہتے ہیں کہ میں ایک دن چار زانو ہو کر بیٹھ گیا' اچانک ایک غیبی آواز آئی کہ تو بادشاہوں کے سامنے اس طرح بیٹھتا ہے' اس کے بعد میں کبھی چار زانو نہیں بیٹھا۔ سونے میں بھی اس کے آداب کی رعایت کرنی چاہیے مثلاً یہ کہ دائیں ہاتھ پر قبلے کی طرف رخ کرکے سوئے' ہم شب و روز کے تمام آداب اپنی اپنی جگہوں پر لکھ

---

(۱) یہ روایت پہلے گذری ہے

آئے ہیں' ان سب کا لحاظ رکھنا چاہیے' اور ان سب کا تعلق مراقبے سے ہے۔ یہاں تک کہ بیت الخلاء کے آداب کی رعایت کرنا بھی مراقبے سے متعلق ہے۔

بندے کی تین حالتیں : اصل میں بندے کی عام طور پر تین حالتیں ہوتی ہیں' یا وہ طاعت میں ہوتا ہے' یا معصیت میں' یا کسی امر مباح میں' ان تینوں حالتوں کا مراقبہ الگ الگ ہے' چنانچہ پہلی حالت' طاعت کا مراقبہ یہ ہے کہ اخلاص کے ساتھ کرے' پورے طور پر کرے' اس کے آداب کا لحاظ رکھے' اسے آفات سے بچائے' معصیت کا مراقبہ یہ ہے کہ توبہ کرے' اپنی حرکت پر نادم ہو' اس سے باز رہنے کا عزم کرے' شرمسار ہو' اور اس کا کفارہ ادا کرے' حالت مباح کا مراقبہ یہ ہے کہ اس کے آداب کی رعایت کرے' اور ان نعمتوں کا شکر کرے جو منعم نے عطا کی ہیں' بندہ ان تمام حالتوں میں مصائب اور راحتوں سے خالی نہیں رہتا' اسے مصائب پر صبر کرنا چاہیے' اور نعمتوں پر شکر ادا کرنا چاہیے' یہ صبرو شکر بھی مراقبے ہی میں داخل ہیں۔ بندے پر ہر حال میں اللہ کا ایک فرض ہے' خواہ وہ فعل ہو جس کا کرنا اس پر واجب ہے' یا امر ممنوع ہو جس سے باز رہنا اس کے لیے ضروری ہے' یا مستحب ہو جس پر اسے اس لیے برانگیختہ کیا جائے تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کی مغفرت کے حصول میں سبقت کر سکے' اور بندگان خدا سے آگے بڑھ سکے' یا امر مباح ہو جس میں اس کے قلب و جسم کی بھلائی ہے' اور اس سے طاعت الٰہی پر مدد ملتی ہے۔ ان تمام امور کی حدود ہیں' دوام مراقبہ کے ذریعے ان حدود کی رعایت کرنی چاہیے' اس لیے کہ۔

وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللّٰهِ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ (پ ۲۸ ر ۱۷ آیت ۱)

اور جو شخص احکام خداوندی سے تجاوز کرے گا اس نے اپنے اوپر ظلم کیا۔

بندے کو چاہیے کہ وہ ان تینوں قسموں میں ہر وقت اپنے نفس کی حالت اور کیفیت کا جائزہ لیتا رہے' اگر کسی وقت فرائض سے فارغ ہو' اور فضائل کی طرف متوجہ ہو تو اسے افضل ترین عمل کی جستجو کرنی چاہیے تاکہ اس میں مشغول ہو سکے' اس لیے کہ جو شخص قدرت رکھنے کے باوجود زائد نفع سے محروم رہ جاتا ہے وہ زبردست خسارے میں ہے' منافع فضائل اعمال سے حاصل ہوتے ہیں انہی منفعتوں کے ذریعے بندہ اپنی آخرت سنوارتا ہے' اور دنیوی زندگی سے اخروی زندگی کے لئے کما کر لے جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَلَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا (پ ۲۰ ر ۱۱ آیت ۷۷)

اور دنیا سے اپنا حصہ فراموش مت کر۔

اور یہ تمام باتیں ایک ساعت کے صبر سے حاصل ہو سکتی ہیں' اس لیے کہ ساعتیں تین ہیں' ایک وہ ہے جو گزر گئی' اس میں بندے پر کچھ مشقت نہیں ہے' وہ جیسی بھی تھی اب گزر چکی ہے' ایک وہ ہے جو آئندہ آئے گی' اس کا حال بندے کو معلوم نہیں' نہ وہ یہ جانتا ہے کہ کب تک زندہ رہے گا اور نہ اسے یہ معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس ساعت میں اس کے لیے کیا فیصلہ کیا ہے' ایک موجودہ ساعت ہے' اس میں محنت کرنے' اور اپنے رب کا مراقبہ کرنے کی ضرورت ہے' اگر دوسری ساعت نہ آئی تو اسے اس ساعت کے ضائع جانے پر حسرت نہ ہوگی' اور اگر دوسری ساعت مل گئی تو اس میں سے بھی اپنا حق پورا حاصل کرے جس طرح پہلی ساعت سے حاصل کیا گیا تھا' یہ ہرگز تصور نہ کرے کہ میں پچاس برس تک زندہ رہوں گا' اور یہ سوچ کر گھبرا جائے کہ پچاس برس ایک طویل مدّت ہے میں اس میں کیسے مراقبہ کر سکتا ہوں' ہر شخص کو چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو اسی ساعت کا مہمان سمجھے جس ساعت میں وہ موجود ہے' اور یہ سوچے کہ گویا میں آخری سانس لے رہا ہوں' اور یہ کوئی تعجب کی بات بھی نہیں کہ اس کی سانسیں آخری ہوں' اور اسے معلوم نہ ہو' جب وہ سمجھتا ہے کہ میری ساعت آخری ہو سکتی ہے تو اس میں ایسے حال پر رہنا چاہیے کہ بالفرض موت آجائے تو وہ اسے خوش آمدید کہہ سکے۔ یا اس کے تمام احوال ایسے ہوں جیسے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث میں مذکور ہیں' فرمایا کہ مومن کو تین ہی باتوں کی حرص ہوتی ہے' توشۂ آخرت کی' اصلاح معاش کی' یا جائز اور مباح امور

سے لطف اندوز ہونے کی۔ (احمد' ابن حبان' حاکم۔ ابوذرؓ) اسی طرح کی ایک روایت یہ بھی ہے کہ ہر عقلمند کے لیے چار ساعتیں ہونی چاہییں' ایک وہ جس میں اپنے رب سے مناجات کرے' دوسری وہ جس میں اپنے نفس کا احتساب کرے' تیسری وہ جس میں اللہ تعالیٰ کی صنعتوں میں غور و فکر کرے' اور چوتھی وہ جس میں اسے کھانے پینے کے لیے فراغت ہو' یہ ساعت اس کی باقی تین ساعتوں کی مددگار ہے (حوالۂ سابق) پھر وہ ساعت بھی جو کھانے پینے میں گذرتی ہے' افضل اعمال یعنی ذکر و فکر سے خالی نہ ہونی چاہیے' چنانچہ جو کھانا وہ کھاتا ہے اس میں اتنے عجائب ہیں کہ اگر آدمی انہی میں غور کرنے بیٹھ جائے تو یہ اس کے لیے جوارح کے بہت سے اعمال سے افضل ہے اس سلسلے میں لوگوں کی کئی قسمیں ہیں' بعض لوگ وہ ہیں جو کھانے کو چشم عبرت سے دیکھتے ہیں کہ کیسی عجیب صنعت ہے' اور کس طرح حیوانات کی زندگی اس سے متعلق کردی گئی ہے' نیز اللہ تعالیٰ نے اس کے کیسے کیسے اسباب پیدا کئے ہیں' پھر کھانے کی شہوات پیدا کی ہیں' اور ان شہوتوں کو مسخر کرنے کے آلات تخلیق فرمائے ہیں ہم نے اس طرح کے بعض امور کتاب الشکر میں بیان کردیئے ہیں یہ عقلمندوں کا مقام ہے' ایک قسم ان لوگوں کی ہے جو کھانے کو غصے اور نفرت سے دیکھتے ہیں اور اسے اپنے مشاغل کے لیے مانع سمجھتے ہیں' اور یہ چاہتے ہیں کہ کسی طرح انھیں اس سے بے نیاز کردیا جائے' لیکن وہ خود کو مجبور اور شہوات کے مسخر پاتے ہیں یہ زاہدین کا مقام ہے بعض لوگ وہ ہیں جو صانع کی صنعت پر نظر ڈالتے ہیں' اور اس کے ذریعے خالق کی صفات تک ترقی کرتے ہیں گویا غذا کے مشاہدے سے ان پر فکر و تدبّر کے دروازے کھلتے ہیں' یہ اعلیٰ مقام ہے اور اس پر عارفین اور محبّین فائز ہیں' اس لیے کہ عارف اور محب حقیقی ہی صنعت سے صانع تک ترقی کرتا ہے وہ جب اپنے محبوب کا خط یا اس کی کوئی کتاب دیکھتا ہے تو اسی میں مشغول نہیں رہتا بلکہ مصنّف کے تصور میں کھو جاتا ہے' بندے پر جو کچھ گذرتا ہے' یا جن چیزوں سے بندے کو سابقہ پیش آتا ہے وہ سب اللہ تعالیٰ ہی کی صنعت کے نمونے ہیں' انھیں صانع میں غور و فکر کا ذریعہ بناتے ہیں اس کے لیے بڑی گنجائش ہے بشرطیکہ اس پر ملکوت کے دروازے وا ہو جائیں یہ ایک کمیاب قسم ہے' کچھ لوگ وہ ہیں جو اسے حرص اور رغبت کی آنکھ سے دیکھتے ہیں جو ان سے رہ جاتا ہے اس پر حسرت کرتے ہیں' اور جو حاضر ہوتا ہے اس پر خوش ہوتے ہیں' جو ان کی مرضی کے مواقف نہیں ہوتا اس کی مذمت کرتے ہیں' اس میں عیب نکالتے ہیں' پکانے والے کو برا کہتے ہیں' اور یہ نہیں سمجھتے کہ پکانے والے کو قدرت دینے والا اللہ ہی ہے' اور یہ کہ جو شخص اللہ کی اجازت کے بغیر اللہ کی کسی مخلوق کو برا کہتا ہے وہ اللہ کو برا کہتا ہے۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:۔

لَا تَسُبُّوا الدَّهْرَ فَإِنَّ اللّٰهَ هُوَ الدَّهْرُ (مسلم۔ ابوہریرہؓ)

زمانے کو برا مت کہو اس لیے کہ اللہ ہی زمانہ ہے۔

یہ دوسرا مقام ہے اس کی شرح بڑی طویل ہے' ہم نے مختصر طریقے پر جو کچھ بیان کردیا ہے اس سے مراقبے کی اصول سے واقفیت ہو جاتی ہے بشرطیکہ وہ ان پر عمل کرنا چاہے۔

تیسرا مقام عمل کے بعد نفس کا محاسبہ : اس عنوان پر گفتگو کرنے سے پہلے ہم محاسبے کے فضائل اور اس کی حقیقت بیان کریں گے۔

محاسبے کے فضائل : اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَلْتَنظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ (پ ۲۸ ر ۶ آیت ۱۸)

اے ایمان والو اللہ سے ڈرتے رہو' بیشک اللہ تعالیٰ کو تمہارے اعمال کی سب خبر ہے۔

اس آیت میں ماضی کے اعمال پر محاسبہ کرنے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ حضرت عمرؓ اسی لیے لوگوں سے فرمایا کرتے تھے کہ اس سے پہلے کہ تمہارا حساب لیا جائے تم خود اپنے نفسوں کا احتساب کرلو' اور اس سے پہلے کہ انھیں پرکھا جائے تم خود پرکھ کر دیکھ

لو' حدیث شریف میں ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں ایک شخص حاضر ہوا اور اس نے عرض کیا یا رسول اللہ! مجھے وصیت فرمائیے' آپ نے ارشاد فرمایا کیا تو (واقعی) وصیت چاہتا ہے' اس نے عرض کیا جی ہاں یا رسول اللہ! فرمایا جب تو کسی کام کا قصد کرے تو اس کے انجام پر نظر ڈال لے' اگر بہتر ہو تو اسے کر ورنہ توقف کر (۱) ایک حدیث میں ہے کہ عقلمند انسان کے لیے چار ساعتیں ہونی چاہئیں' ان میں سے ایک ساعت وہ ہے جس میں وہ اپنے نفس کا محاسبہ کرے۔ (۲)

قرآن کریم میں ہے: وَتُوبُوا إِلَى اللَّهِ جَمِيعًا أَيُّهَ الْمُؤْمِنُونَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ (پ ۱۸ ر ۱۰ آیت ۳۱)

تم سب اللہ کے سامنے توبہ کرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔

اور توبہ کے معنی یہ ہیں کہ فعل پر اس سے فارغ ہونے کے بعد ندامت کے ساتھ نظر ڈالی جائے' سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں اللہ تعالیٰ سے دن میں سو مرتبہ استغفار کرتا ہوں قرآن کریم میں ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ اتَّقَوْا إِذَا مَسَّهُمْ طَائِفٌ مِّنَ الشَّيْطَانِ تَذَكَّرُوا فَإِذَا هُم مُّبْصِرُونَ (پ ۹ ر ۱۴ آیت ۲۰۱)

جو لوگ خدا ترس ہیں جب ان کو کوئی خطرہ شیطان کی طرف سے آجاتا ہے تو وہ یاد میں لگ جاتے ہیں۔

حضرت عمرؓ رات کے وقت اپنے پیروں پر کوڑے لگاتے اور نفس سے خطاب کرکے فرماتے کہ تو نے آج کیا کیا۔ میمون ابن ابی مہران کہتے ہیں کہ بندہ متقین میں سے نہیں ہوتا جب تک کہ اپنے نفس سے اس طرح حساب نہ لے جس طرح تاجر اپنے شریک تجارت سے کیا کرتا ہے یعنی دونوں شریک عمل تجارت سے فراغت کے بعد حساب کرتے ہیں' اور نفع و نقصان کا اندازہ کرتے ہیں حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ نے اپنے انتقال کے وقت ان سے فرمایا کہ لوگوں میں مجھے عمرؓ سے زیادہ کوئی محبوب نہیں ہے' پھر آپ نے ان سے پوچھا میں نے کیا کہا' حضرت عائشہؓ نے آپ کا قول دہرا دیا پھر فرمایا کہ عمرؓ سے زیادہ مجھے کوئی عزیز نہیں ہے' دیکھئے کہ انہوں نے بات کہہ کر اس پر کیسے غور کیا' اور ایک کلمے کی جگہ دوسرا کلمہ رکھا' حضرت ابو طلحہؓ سے مروی ہے کہ جب انھیں نماز میں اپنے باغ کے پرندے کا خیال آیا تو انہوں نے اپنے اس تصوّر پر ندامت کے اظہار کے طور پر اور اللہ سے عفو و مغفرت کی امید میں اپنا وہ باغ صدقہ کردیا۔ ابن سلام کی روایت میں ہے کہ انہوں نے لکڑیوں کا ایک گٹھر اٹھایا' لوگوں نے ان سے کہا کہ آپ کے بیٹے بھی تو ہیں اور نوکروں کی بھی کمی نہیں ہے' وہ لوگ آپ کو اس مشقت سے بچاسکتے تھے' فرمایا میں اپنے نفس کو آزما رہا ہوں کہ کیا وہ وزن اٹھانے کو برا نہیں سمجھتا' حضرت حسن بصریؒ کہتے ہیں کہ مومن اپنے نفس کا نگراں ہوتا ہے' اور اللہ کے لیے اس کا محاسبہ کرتا ہے' ان لوگوں پر حساب کا عمل ہلکا ہوگا جو دنیا ہی میں اپنے نفسوں کا حساب کرلیتے ہیں اور ان لوگوں پر شدید ہوگا جنہوں نے دنیا میں اپنے نفسوں کا احتساب نہیں کیا' اس کے بعد آپ نے محاسبے کی تفسیر فرمائی کہ مومن کو اچانک کوئی بات اچھی لگتی ہے' اور وہ کہتا ہے کہ تو مجھے اچھی لگتی ہے اور میرے کام کی ہے' لیکن میرے اور تیرے درمیان ایک رکاوٹ کھڑی کردی گئی ہے یہ حساب عمل سے پہلے ہوتا ہے' اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ بعض اوقات مومن سے کوئی خطا ہوجاتی ہے اور وہ اپنے نفس کی طرف رجوع کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اس عمل سے تیری کیا نیت ہے خدا کی قسم اس سلسلے میں میرا کوئی عذر تسلیم نہیں کیا جائے گا' اور اللہ نے چاہا تو میں کبھی اس کا اعادہ نہیں کروں گا' حضرت انس ابن مالکؓ کہتے ہیں کہ میں اور حضرت عمر ابن الخطابؓ ایک روز ایک باغ میں سو گئے' وہاں میں نے حضرت عمر کو یہ کہتے ہوئے سنا۔ اس وقت میرے اور ان کے درمیان ایک دیوار حائل تھی کہ عمر ابن الخطابؓ امیر المومنین ہے' تجھے اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہنا چاہیے ورنہ وہ تجھے سخت عذاب دے گا' حضرت حسن بصریؒ نے قرآن کریم کی اس آیت کریمہ کی تفسیر میں فرمایا:

(۱-۲) یہ دونوں روایتیں گذر چکی ہیں

وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ (پ۲۹ر۱۷آیت۲)
اور قسم کھاتا ہوں اپنے نفس کی جو اپنے اوپر ملامت کرے۔

کہ مومن اپنے نفس پر عتاب کرتا رہتا ہے کہ تیرا اس کلمہ سے کیا ارادہ تھا' اور تو اس کھانے سے کیا نیت رکھتا تھا' اور اس شربت سے تیرا مقصد کیا تھا' اس کے برعکس فاجر و فاسق آدمی آگے بڑھ جاتا ہے' اپنے نفس کو کسی بھی معاملے میں عتاب نہیں کرتا' حضرت مالک ابن دینار کہتے ہیں اللہ تعالیٰ اس بندے پر رحم کرے جو اپنے نفس سے یوں کہا کرتا ہے کہ کیا تجھ سے فلاں غلطی سرزد نہیں ہوئی کیا تو نے فلاں قصور نہیں کیا' پھر اسے برا بھلا کہتا ہے' اور اسے لگام دے کر کتاب اللہ کا پابند کر دیتا ہے' اور کتاب اللہ کو اس کا قائد بنا دیتا ہے' یہ بھی معاتبۂ نفس کی ایک شکل ہے جیسا کہ اس کا ذکر عنقریب آئے گا' میمون ابن مہران کہتے ہیں کہ متقی انسان اپنے نفس کا حساب ظالم بادشاہ اور بخیل شریک سے بھی سخت لیتا ہے' ابراہیم التیمی کہتے ہیں کہ میں نے اپنے آپ کو جنت میں تصور کیا' اس کے پھل کھائے' اس کی نہروں سے پانی پیا' اور اس کی حوروں سے گلے ملا' پھر میں نے خود کو جہنم میں تصور کیا' وہاں کی غذا کھائی' پیپ پی' اس کا طوق اور زنجیریں پہنیں' پھر میں نے اپنے نفس سے پوچھا کہ اے نفس! تو ان میں سے کیا چاہتا ہے' اس نے کہا میں دنیا میں واپس جا کر نیک عمل کرنا چاہتا ہوں' میں نے کہا تیری آرزو پوری ہوئی' جا اور نیک اعمال کر' مالک ابن دینار کہتے ہیں کہ میں نے حجاج ابن یوسف کو ایک خطبے کے دوران یہ کہتے ہوئے سنا اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحم کرے جو اپنے نفس کا حساب اس سے پہلے کرلے کہ اس کا حساب غیر کے حوالے کیا جائے اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحم کرے جو اپنے عمل کی لگام پکڑ کر یہ دیکھے کہ اس کا مقصد کیا ہے' اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحم کرے جو اپنے پیمانے پر نظر رکھے' اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحم کرے جو اپنی میزان پر نظر رکھے' وہ اسی طرح کی باتیں کرتا رہا یہاں تک کہ میں رونے لگا۔ احنف ابن قیس کے ایک رفیق کہتے ہیں کہ میں ان کے ساتھ رہا کرتا تھا آپ کا عام طور پر معمول یہ تھا کہ رات میں نماز کے بجائے زیادہ تر دعائیں کرتے' اور چراغ کے پاس آکر اس کی لو میں اپنی انگلی رکھتے یہاں تک کہ اس کی حرارت کا احساس ہوتا' اس کے بعد اپنے نفس سے کہتے اے حنیف! تو نے فلاں دن یہ کام کیوں کیا تھا' تو نے اس روز فلاں عمل کس لیے کیا تھا۔

عمل کے بعد محاسبے کی حقیقت : جس طرح بندہ کا دن کے آغاز میں کوئی وقت ایسا خاص ہونا چاہیے جس میں وہ اپنے نفس کو خیر کی وصیت کرے' اسی طرح دن کے آخر میں بھی اس کا کوئی مخصوص وقت متعین ہونا ضروری ہے جس میں وہ اپنے نفس سے مطالبہ کرے' اور اس کی تمام حرکات و سکنات کا حساب لے' جیسے تجارت پیشہ لوگ اپنے شرکاء کے ساتھ سال کے آخر میں یا مہینے کے ختم پر' یا دن گذرنے کے بعد حساب فہمی کرتے ہیں' محض دنیا کی حرص سے' اور اس خوف کی بناء پر کہ کہیں وہ دنیاوی مال و متاع سے محروم نہ ہو جائیں حالانکہ اگر ضائع ہو جائے تو اس کا ضائع ہو جانا بہتر ہے' دنیا کا مال اگر کسی کو ملتا بھی ہے تو محض چند روز کے لیے ملتا ہے بالآخر اس سے چھین لیا جاتا ہے جب دنیا کے معاملات میں' اور اس کی عاری منفعتوں میں بندوں کا یہ عالم ہے تو ان معاملات میں نفس سے حساب فہمی کیسے نہ کرے گا جن سے آخرت کی سعادت اور شقاوت متعلق ہے اور آخرت دائمی زندگی ہے' اگر کوئی شخص اس میں سستی کرتا ہے تو یہ اس کی غفلت اور ذلت کے مترادف ہے' اور قلت توفیق کی علامت ہے ہم اس سے اللہ کی پناہ چاہتے ہیں۔

شریک کے محاسبہ کا مطلب یہ ہے کہ رأس المال کا جائزہ لیا جائے' اور یہ دیکھا جائے کہ اس میں کتنا نفع ہوا ہے یا کس قدر نقصان پہنچا ہے تاکہ نفع و نقصان دونوں الگ الگ ہو جائیں اگر نفع ہو تو اسے لے لیا جائے' اور شریک کا شکر ادا کیا جائے کہ اس نے نفع کمانے میں محنت کی' اور اگر نقصان پہنچے تو اس سے تاوان کا مطالبہ کرے' اور مستقبل میں تدارک کا پابند قرار دے' بندے کے دین میں فرائض رأس المال ہیں' اور نوافل و فضائل نفع ہیں اور معاصی نقصان ہیں' اس تجارت کا وقت شب و روز کی تمام ساعتیں ہیں' شریک تجارت نفس امّارہ اس لیے پہلے اس سے فرائض کا حساب لینا چاہیے کہ راس المال جتنا ہونا چاہیے اتنا موجود

ہے یا نہیں' اگر اس نے فرائض بالکل ادا ہی نہیں کئے تو اس سے قضا کا مطالبہ کرے' اور اگر ناقص ادا کئے ہیں تو اس سے نقص کے تلافی کا مطالبہ کرے' اور یہ تلافی نوافل سے ہونی چاہیے' اور اگر معاصی کے ذریعے نقصان پہنچا ہے تو اس پر عتاب کرے' اسے قرار واقعی سزا دے تاکہ نقصان کی تلافی اچھی طرح ہو سکے جس طرح تاجر اپنے شریک سے پیسہ پیسہ کا حساب کرتا ہے' اور نفع و نقصان کے تمام پہلوؤں پر نظر رکھتا ہے' اور شریک کی ہر حرکت پر نگاہ رکھتا ہے' اسی طرح دینی معاملات میں بھی نفس کے فریب و مکر سے احتیاط کرنی چاہیے کیوں کہ یہ بڑا فریب کار اور دھوکہ باز ہے۔

حساب کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے اس سے مفصّل رپورٹ طلب کرے اور یہ معلوم کرے کہ اس نے دن بھر کس سے کیا گفتگو کی ہے' اس سلسلے میں اس کے ساتھ وہی موقف اختیار کرے جو قیامت کی میدان میں حساب کتاب کے وقت بندے کے ساتھ اختیار کیا جائے گا پھر نظر کا حساب لے یہاں تک کہ تمام افکار و خیالات اٹھنے بیٹھنے کھانے پینے اور سونے کے اعمال کا احتساب کرے' اگر چپ رہا ہو تو یہ دریافت کرے کہ وہ چپ کیوں رہا' اور ساکن رہا ہو تو یہ پوچھے کہ اس نے سکون کیوں اختیار کیا جب نفس پر واجب تمام امور کے سلسلے میں باز پُرس کرے' اور یہ واضح ہو جائے کہ اس نے واجبات کا کس قدر حصہ ادا کیا ہے تو جو حصہ ادا ہونے سے رہ جائے وہ صفحۂ دل پر نقش کرلے' جس طرح شریک کے ذمے باقی رہ جانے والی رقم کاپیوں پر لکھ لی جاتی ہے' اور اس کے حساب میں درج کردی جاتی ہے' اور قرض خواہی کے وقت اس کی ادائیگی کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ اسی طرح نفس سے بھی مواخذہ کرے' اور اگر واجبات کی ادائیگی میں اس نے کچھ تساہل کیا ہو تو وہ نقصان اسی کے حساب میں لکھ دے' اور نفس کو مقروض ٹھہرا کر اس سے وصولیابی کی کوشش کرے' کچھ قرض جرمانے کے ذریعے وصول ہو سکتا ہے' کچھ جوں کا توں واپس طلب کیا جاسکتا ہے' اور کچھ کے لئے سزا دی جاسکتی ہے' لیکن یہ تمام صورتیں حساب فہمی کے بعد اس وقت اختیار کی جاسکتی ہیں جب بقایا واجب کی صحیح مقدار متعین ہو جائے' اس کے بعد ہی اپنے حق کی ادائیگی کا مطالبہ کرے۔ یہ ایک روز کا حساب نہیں ہے' بلکہ زندگی بھر ہر روز اپنے تمام ظاہری و باطنی اعضاء سے اسی طرح محاسبہ کرنا چاہیے' جیسا کہ توبہ ابن الصمہ سے منقول ہے' وہ رقہ میں تھے اور ایک دن اپنے نفس کا محاسبہ کر رہے تھے' انھوں نے اپنی عمر کا حساب کیا تو معلوم ہوا کہ وہ ساٹھ سال کے ہو چکے ہیں' اور ساٹھ برس میں اکیس ہزار پانچ سو دن ہوئے ہیں' اس خیال کے ساتھ ہی انھوں نے ایک زبردست چیخ ماری' اور کہا افسوس میں شاہ حقیقی سے اکیس ہزار پانچ سو گناہوں کے ساتھ ملاقات کروں گا' اور اگر ہر دن کے دس ہزار گناہ ہوئے تو میرا انجام کیا ہوگا' پھر وہ بے ہوش ہو کر گر پڑے' اور اسی حالت میں اپنے حقیقی مولیٰ سے جاملے' لوگوں نے ان کے انتقال کے بعد ایک غیبی آواز سنی' کوئی شخص کہہ رہا تھا اب فردوس بریں کی طرف جاؤ' بندے کو اپنی سانسوں کا اسی طرح حساب کرنا چاہیے' قلب اور اعضاء سے جو معاصی سرزد ہوئے ہیں نفس سے ان کا حساب بھی لینا چاہیے' اگر بندہ اپنے ہر گناہ کے عوض ایک پتھر گھر میں ڈالے تو تھوڑی ہی سی مدّت میں تمام گھر پتھروں سے بھر جائے' لیکن بندہ معاصی سے بچنے میں سستی کرتا ہے' حالانکہ فرشتے سستی نہیں کرتے وہ اس کے تمام گناہ لکھتے رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

أَحْصَاهُ اللَّهُ وَنَسُوهُ (پ۲۸ ر۱ آیت ۶)

اللہ تعالیٰ نے اسے محفوظ کر رکھا ہے اور یہ اسے بھول گئے ہیں۔

چوتھا مقام قصور کے بعد نفس کی تعذیب : جب بندہ اپنے نفس کا احتساب کرے' اور یہ دیکھے کہ وہ معصیت کے ارتکاب سے بچ نہیں سکا ہے' اور اس نے اللہ تعالیٰ کا حق پوری طرح ادا نہیں کیا ہے تو اسے اسی حال پر نہ چھوڑے۔ اس لیے کہ اگر اس نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا تو اس کے لیے گناہ کا ارتکاب اور سہل ہو جائے گا' اور نفس معاصی سے مانوس ہو جائے گا' یہاں تک کہ ان سے بچنا اس کے لیے نہایت دشوار ہو جائے گا' اور یہ سراسر ہلاکت اور تباہی کی بات ہے کہ نفس گناہ کا عادی بن جائے گا' اس لیے یہ ضروری ہے کہ نفس کو اس کی غلطی پر سزا دی جائے' چنانچہ اگر کوئی شخص شہوت نفس کے ساتھ کوئی مشتبہ

لقمہ کھالے تو اس کی سزا یہ ہے کہ بھوکا رہے' اور اگر غیر محرم کی طرف دیکھے تو آنکھ کو یہ سزا دے کہ وہ کسی چیز کی طرف نہ دیکھے' اسی طرح تمام اعضاء بدن کو ان کی غلطیوں پر یہ سزا دے کر انھیں ان کی شہوات سے روک دے' سا لکین راہ آخرت کا یہی طریقہ تھا' چنانچہ منصور ابن ابراہیم سے مروی ہے کہ ایک شخص نے ایک اجنبی عورت سے بات کی' اور اس کی باتوں میں کچھ ایسا مدہوش ہوا کہ اپنا ہاتھ اس کی ران پر رکھ دیا' بعد میں اس غلطی پر نہایت شرمندہ ہوا' اور ہاتھ کو آگ کے شعلوں پر رکھ کر سزا دی یہاں تک کہ ہاتھ جل کر کوئلہ ہو گیا' روایت ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک شخص اپنے معبد میں عبادت کیا کرتا تھا' ایک زمانے تک وہ اپنی عبادت میں مشغول رہا' ایک دن اس نے باہر جھانکا تو ایک فتنہ طراز حسین عورت پر نظر پڑی۔ دل مچل اٹھا' اور یہ خواہش ہوئی کہ باہر نکلے اور اس عورت سے ملاقات کرے' چنانچہ اس نے معبد سے باہر قدم نکالا' لیکن رحمت الٰہی اس کے ساتھ ساتھ تھی' اچانک اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا' اور کہنے لگا میں یہ کیا کر رہا ہوں' تھوڑی دیر پس و پیش کرنے کے بعد اس کا دل پُرسکون ہو گیا' اور اس گناہ سے محفوظ رہا' لیکن اس واقعے پر وہ اس قدر شرمندہ ہوا کہ جو پاؤں عورت سے ملنے کے لیے عبادت خانے سے باہر نکلا تھا اسے اپنے ساتھ عبادت خانے لے جانے پر راضی نہ ہوا' چنانچہ وہ اپنا پاؤں باہر کی طرف لٹکا کر بیٹھ گیا' بارش اور برف گرتی رہی' اور دھوپ پڑتی رہی' لیکن اس نے اپنا پاؤں نہیں ہٹایا' یہاں تک کہ وہ پاؤں گل کٹ کر گر گیا' اس کے بعد اس نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا' بعد کی بعض آسمانی کتابوں میں اس واقعے کا ذکر موجود ہے۔ حضرت جنید بغدادیؒ روایت کرتے ہیں کہ ابن الکریبی نے فرمایا کہ ایک رات مجھے غسل کی ضرورت ہو گئی' وہ ایک سرد رات تھی' میں نے اپنے نفس میں کچھ سستی پائی' اور یہ ارادہ ہوا کہ صبح تک غسل کو مؤخر کر دوں' صبح اٹھ کر پانی گرم کروں گا یا حمام میں جا کر غسل کروں گا' خواہ مخواہ نفس کو مشقت میں مبتلا کرنے سے کیا فائدہ' اس کے بعد میں نے اپنے دل میں کہا میں نے زندگی بھر اللہ کا کام کیا ہے' اس کا مجھ پر ایک واجب حق ہے' جلدی کرنے میں تو مجھ کو نہ ملے گا' کیا تاخیر کرنے میں مل جائے گا' مجھے بھی قسم ہے کہ میں اسی گدڑی سمیت نہاؤں گا' اور نہانے کے بعد بھی اسے جسم سے جدا نہ کروں گا' نہ دھوپ میں سکھاؤں گا' اور نہ نچوڑوں گا' یہاں تک کہ وہ جسم ہی پر سوکھ جائے۔

روایت ہے کہ غزوان اور ابو موسیٰ کسی غزوے میں شریک تھے کہ ایک عورت ظاہر ہوئی غزوان نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا' اور اس زور سے اپنے منہ پر طمانچہ مارا کہ آنکھ پر ورم آگیا اور کہا کہ تو ایسی چیز کی طرف دیکھتی ہے جو تیرے لیے مضر ہے' ایک شخص نے کسی نامحرم عورت کو دیکھا' اور اس غلطی پر نفس کو یہ سزا دی کہ زندگی بھر کے لیے ٹھنڈا پانی نہ پینے کا عہد کیا' وہ بزرگ جب تک زندہ رہے انھوں نے گرم پانی پیا' اور بڑی بے لطفی کے ساتھ زندگی بسر کی' ایک مرتبہ حسان ابن ابی سنان کسی نئی عمارت کے پاس سے گزرے اور یہ پوچھ بیٹھے کہ یہ عمارت کب بنی ہے' اس کے بعد اپنے نفس کی طرف متوجہ ہوئے اور کہنے لگے کہ تم نے ایک لایعنی سوال کیا ہے' میں تجھے ایک سال کے روزوں کی سزا دوں گا' چنانچہ انھوں نے سال بھر تک روزے رکھے' مالک ابن ضیغم کہتے ہیں کہ ایک روز عصر کی نماز کے بعد رباح القیسی ہمارے یہاں آئے اور ہمارے والد کو معلوم کرنے لگے' ہم نے کہا کہ وہ سو رہے ہیں' یہ سن کر انھوں نے کہا کیا یہ سونے کا وقت ہے' وہ اس وقت سو رہے ہیں؟ یہ کہہ کر چلے گئے' ہم نے ان کے پیچھے پیچھے ایک آدمی بھیج کر یہ کہلایا کہ اگر آپ فرمائیں تو انھیں جگا دیا جائے' وہ آدمی واپس آیا' اور کہنے لگا کہ وہ تو کسی فکر میں غلطاں تھے' میری بات انھوں نے سنی ان سنی کر دی' میں نے دیکھا کہ وہ قبرستان گئے' اور اپنے نفس پر عتاب کرنے لگے اور کہنے لگے تو نے یہ کیوں کہا کہ وہ اس وقت سوتے ہیں' کیا تیرے ذمے ایسا کہنا واجب تھا' آدمی جس وقت چاہے سوئے' تو کون ہوتا ہے کسی سے بازپرس کرنے والا' تجھے کیا معلوم یہ سونے کا وقت ہے یا نہیں' تو نے ایسے معاملے میں اپنی زبان کیوں کھولی جس سے تو اچھی طرح واقف نہیں ہے' تو نے ایک بھیانک غلطی کی ہے' اور میں تجھے اس کی سزا ضرور دوں گا' اور وہ سزا یہ ہے کہ میں ایک برس تک سونے کے وقت زمین سے کمر نہیں لگاؤں گا' الا یہ کہ کوئی مرض آپڑے' یا عقل میں فتور پیدا ہو جائے' کم بخت تجھے شرم نہیں آئی تو کب تک لوگوں کو ڈانٹ ڈپٹ کرے گا' اور اپنی گمراہی سے غافل رہے گا' یہ کہہ کر وہ رونے لگے' انھوں نے مجھے نہیں

دیکھا' میں انھیں اسی حالت پر چھوڑ کر واپس آگیا' ایک رات تمیم داری تہجد کی نماز کے لیے نہ اٹھ سکے' انھوں نے اس کی سزا یہ تجویز کہ ایک سال تک رات کو نہیں سوئے' اور پوری رات نماز میں گذاری۔

حضرت طلحہؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص چلا' اور اس نے اپنے کپڑے اتارے اور گرم پتھروں پر لوٹ لگائی' وہ شخص اپنے نفس کو خطاب کر کے کہہ رہا تھا کہ اے رات کے مردار اور دن کے بیکار لے مزہ چکھ' جہنم کی حرارت اس سے بھی زیادہ شدید ہے' وہ اسی حال میں تھا کہ اس کی نظر سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر پڑی' آپ اس وقت ایک درخت کے سائے میں تشریف فرما تھے' وہ شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا رسول اللہ میرا نفس مجھ پر غالب آگیا ہے' آپ نے فرمایا کیا اس کی علاوہ کوئی صورت نہیں تھی جو تو نے اپنے نفس کے ساتھ اختیار کی' بہر حال تیرے لیے آسمان کے دروازے کھول دیئے گئے ہیں' اور اللہ تعالیٰ تجھ پر فرشتوں میں فخر کرتا ہے' پھر آپ نے اپنے اصحاب سے ارشاد فرمایا' اپنے بھائی سے توشہ لو' یہ سن کر ہر شخص کہنے لگا کہ اے فلاں! میرے لیے دعا کر' میرے لیے دعا کر' سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ان سب کے لیے دعا کر' چنانچہ اس شخص نے دعا کی: اے اللہ تقویٰ کو ان کا توشہ بنا' اور ان کو ہدایت پر جمع رکھ' سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے اللہ! اسے راہ راست پر کر' اس شخص نے یہ دعا کی اے اللہ جنت کو ان سب کا ٹھکانہ بنا (ابن ابی الدنیا۔ لیث ابن سلیم) حذیفہ ابن قتادہ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے کسی نیک آدمی سے دریافت کیا کہ شہوات نفس کے باب میں تم اپنے نفس سے کیا معاملہ کرتے ہو' اس نے جواب دیا کہ روئے زمین پر مجھے اپنے نفس سے زیادہ کسی نفس سے بغض نہیں ہے' میں اس کی خواہش کیسے پوری کر سکتا ہوں۔ ابن السماکؒ حضرت داؤد طائی کے گھر تشریف لے گئے' آپ کا کچھ دیر قبل ہی انتقال ہوا تھا' اور اس وقت لاش زمین پر رکھی ہوئی تھی' آپ نے ان سے مخاطب ہو کر فرمایا اے داؤد تم نے اپنے نفس کو قید کر دیا تھا اس سے پہلے کہ وہ قید کیا جاتا' اور اپنے نفس کو عذاب دیا تھا اس سے پہلے کہ اسے عذاب دیا جاتا' آج تم اپنا ثواب اس کے یہاں دیکھ لوگے جس کے لیے عمل کرتے تھے۔ وہب ابن منبہؒ کہتے ہیں کہ ایک شخص کو جو طویل عرصے سے عبادت کر رہا تھا اللہ تعالیٰ سے کوئی حاجت پیش آئی' اس نے ستر ہفتے تک اس کے لیے اس طرح مجاہدہ کیا کہ ایک ہفتے میں صرف سات چھوارے کھاتا تھا' اور شب و روز عبادت کرتا تھا' ستر ہفتے گزرنے کے بعد اس نے اپنی حاجت کے بارے میں دعا کی' مگر دعا قبول نہیں ہوئی' اس نے اپنے نفس سے کہا کہ اگر تجھ میں کوئی بات ہوتی تو تیری دعا ضرور قبول کی جاتی' اسی وقت ایک فرشتہ آیا اور اس نے کہا اے ابن آدم تیری یہ ساعت ماضی کی تمام عبادتوں سے بہتر ہے' اللہ تعالیٰ نے تیری حاجت پوری کر دی ہے۔

عبداللہ ابن قیسؒ کہتے ہیں کہ ہم ایک جہاد میں تھے' اچانک دشمن کی آمد کا شور ہوا' ہم سب جنگ کے لیے مستعد ہو گئے' اس روز بڑی سخت ہوا چل رہی تھی' میں نے دیکھا ایک شخص لوگوں سے الگ ہٹ کر اپنے نفس سے کہہ رہا ہے اے نفس! تو نے فلاں جہاد کے موقع پر بیوی بچوں کا حوالہ دے کر مجھے شرکت سے باز رکھنے کی کوشش کی تھی' اور میں نے تیرا مشورہ قبول کر لیا تھا' پھر فلاں جہاد کے موقع پر بھی تو نے مجھے بیوی بچوں کا خوف دلا کر روکا اور میں رک گیا' لیکن آج میں تیرا کہنا نہیں مانوں گا' اور تجھے آگے بڑھا دوں گا خواہ اللہ تجھے پکڑے یا نہ پکڑے' میں نے اپنے دل میں کہا کہ میں اس شخص پر نظر رکھوں گا' چنانچہ میں نے اس پر مسلسل نظر رکھی' جب جنگ شروع ہوئی تو وہ مجاہدین کی صف اول میں تھا' پھر دشمن نے مجاہدین پر زبردست حملہ کیا اس حملے سے وہ لوگ منتشر ہو گئے مگر وہ شخص اپنی جگہ ڈٹا رہا' لوگ کئی بار منتشر ہوئے' لیکن وہ شخص اپنی جگہ جما ہوا اور ڈٹا ہوا نظر آیا' اور جب تک وہ شہید نہیں ہو گیا یہی صورت حال رہی' میں نے اس کے جسم پر اور گھوڑے کے بدن پر ساٹھ سے زائد زخم شمار کیئے' ہم نے حضرت ابو طلحہؓ کی روایت نقل کی ہے کہ نماز کے دوران ان کے دل میں اپنے باغ کے ایک پرندے کا خیال آگیا تھا' آپ نے نماز سے فارغ ہونے کے بعد وہ باغ ہی صدقہ کر دیا تاکہ یہ صدقہ ان کی تقصیر کا کفارہ بن سکے' حضرت عمرؓ ہر روز اپنے پاؤں پر کوڑے لگاتے تھے اور کہتے تھے کہ تو نے آج کون سا عمل کیا ہے' مجمع روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے اوپر نظر اٹھائی تو دیکھا ایک عورت

کھڑی ہوئی ہے' آپ نے اس کی یہ سزا مقرر کی کہ آئندہ کبھی آسمان کی طرف نظر نہیں اٹھائیں گے احنف ابن قیس رات میں چراغ کی لو پر اپنی انگلی رکھ دیتے تھے اور کہتے تھے اے نفس تو نے فلاں دن فلاں گناہ کیوں کیا تھا' وہیب ابن الورد کو اپنے نفس کا کوئی فعل برا لگا' آپ نے اپنے سینے کے چند بال اکھاڑ لئے' اس سے بڑی تکلیف ہوئی' وہیب نے کہا اے نفس! میں تو تیرا ہی بھلا چاہتا ہوں' محمد ابن بشر نے داؤد طائی کو دیکھا کہ وہ روٹی کے ساتھ روزہ افطار کر رہے ہیں' آپ نے ان سے کہا اگر آپ نمک کے ساتھ روٹی کھا لیتے تو اچھا تھا' انھوں نے فرمایا میرا نفس مجھے ایک سال سے نمک پر اکسا رہا ہے' اور داؤد نے یہ عہد کر لیا ہے کہ وہ باقی زندگی نمک نہیں استعمال کرے گا' سمجھدار اور دور اندیش لوگ اس طرح اپنے نفسوں کو عذاب دیا کرتے تھے' ہمیں حیرت ہے کہ تم اپنے غلاموں' باندیوں' اور بیوی بچوں کو ان کی خطاؤں پر سزا دیتے ہو' اور یہ سمجھتے ہو کہ اگر تم نے انھیں معاف کر دیا تو وہ سرکش ہو جائیں گے اور ان کا معاملہ تمہارے اختیار سے باہر ہو جائے گا' وہ تیرے خلاف بغاوت کر دیں گے' ایک طرف غلاموں اور باندیوں کے ساتھ تیرا یہ سلوک ہے' دوسری طرف تو اپنے نفس کو ڈھیل دئے ہوئے ہے' حالانکہ یہ تیرا بدترین دشمن ہے' اس کی سرکشی زیادہ ہے' اور اس کی بغاوت کا نقصان ان کی بغاوت کے نقصان سے بڑا ہے' وہ لوگ زیادہ سے زیادہ تیری دنیوی زندگی میں پریشانیاں پیدا کر سکتے ہیں' جب کہ نفس تیری اخروی زندگی برباد کرنے والا ہے' اگر تو عقل کی دولت سے مالا مال ہے تو یہ بات اچھی طرح سمجھتا ہے کہ آخرت کی زندگی کے علاوہ کوئی زندگی نہیں ہے' اس میں ختم نہ ہونے والی نعمتیں ہیں' نفس اس زندگی کو تباہ کرنے والا ہے۔ اس لیے سزا کا زیادہ مستحق ہے۔

پانچواں مقام مجاہدہ : مجاہدہ یہ ہے کہ جب تو اپنے نفس کا حساب کرے اور یہ دیکھے کہ اس نے کسی معصیت کا ارتکاب کیا ہے تو اسے وہ سزائیں دے جو گذشتہ سطور میں بیان کی جا چکی ہیں' اور اگر یہ دیکھے کہ وہ فضائل یا اوراد میں سستی کرتا ہے تو اسے اوراد کے بوجھ سے گرانبار کر دے' اور مختلف وظائف کا پابند کر دے تاکہ پچھلی کوتاہیوں کی تلافی اور گذشتہ نقصان کا تدارک ہو سکے۔ عاملین خدا اسی طرح عمل کیا کرتے تھے چنانچہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نماز عصر جماعت سے نہیں پڑھ سکے' آپ نے اپنے نفس کو اس کی یہ سزا دی کہ اپنی وہ زمین صدقہ کر دی جس کی قیمت دو لاکھ درہم تھی' اگر حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کوئی نماز جماعت سے نہ پڑھ پاتے تو وہ رات جاگ کر گذارتے' ایک مرتبہ آپ نے مغرب کی نماز اتنی تاخیر سے پڑھی کہ دو ستارے طلوع ہو گئے' اس کی سزا میں آپ نے دو غلام آزاد کئے' ایک بار ابن ابی ربیعہ فجر کی دو سنتیں نہ پڑھ سکے اس کی سزا آپ نے ایک غلام آزاد کر کے دی' بعض لوگ معمولی معمولی خطاؤں پر اپنے نفس کو سال بھر کے روزوں' یا پیدل حج' یا اپنا تمام مال راہ خدا میں صدقہ کرنے کا پابند بنا لیا کرتے تھے' اور وہ صورتیں اختیار کرتے جن سے ان کی نجات ہو جائے۔ یہ تمام اعمال نفس کے مراقبے کے طور پر کیا کرتے تھے۔

رہا یہ سوال کہ اگر تمہارا نفس تمہاری اتباع نہیں کرتا' یا وہ مجاہدے اور اوراد کی پابندی پر آمادہ نہیں ہے تو اس کے علاج کی کیا صورت ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ تم اسے وہ روایات سناؤ جو مجاہدین کی فضیلت میں وارد ہوئی ہیں' اور سب سے زیادہ نفع بخش علاج یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کے بندوں میں سے کسی ایسے بندے کی صحبت اختیار کرو جو عبادت میں محنت کرنے والا ہو اس کی باتیں غور سے سنو اور ان پر عمل کرو' اس کے اعمال کا مشاہدہ کرو اور ان کی اقتدا کرو' ایک بزرگ کہتے ہیں کہ جب عبادت کے باب میں مجھ پر کچھ سستی چھانے لگتی تو میں محمد ابن الواسع کے احوال اور مجاہدات کا مشاہدہ کرتا' ایک ہفتے کے عمل سے میری سستی غائب ہو جاتی' لیکن آج کل یہ عمل بڑا دشوار ہو گیا ہے' اس لیے کہ اب ایسے لوگ کہاں باقی رہے جو عبادت میں مجاہدہ کیا کرتے تھے' پہلے لوگوں کے مجاہدے اب قصۂ پارینہ بن چکے ہیں' اس لیے اب مشاہدے کے بجائے سننے پر زیادہ زور دینا چاہیے' ہمارے خیال میں ان کے احوال سننے' اور ان کے واقعات کا مطالعہ کرنے سے زیادہ کوئی چیز نفع بخش نہیں ہے' واقعہ مجاہدہ ان لوگوں کا تھا اب ان کی مشقتوں کا دور ختم ہو چکا ہے' ابدالآباد کے لیے ثواب اور نعمتیں باقی رہ گئی ہیں' یہ سلسلہ کبھی ختم ہونے والا نہیں ہے' ان کی سلطنت کس قدر وسیع ہے' اور ان لوگوں کا خیال کس قدر افسوسناک ہے جو ان کی اقتداء نہیں کرتے' یہ لوگ چند روز تک دنیاوی

لذات سے متمتع ہوں گے، پھر موت آئے گی، اور ان کے اور شہوتوں کے درمیان ہمیشہ ہمیشہ کے لیے حائل ہو جائے گی، ہم اس سے اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہتے ہیں۔

یہاں ہم مجتہدین کے اوصاف اور ان کے فضائل بیان کرتے ہیں، تاکہ سالک طریقت کے دل میں ان کی اقتداء کرنے کا جذبہ پیدا ہو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ ان قوموں پر رحم فرمائے جنہیں لوگ مریض تصور کریں، حالانکہ وہ مریض نہ ہو۔ (۱) حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ بظاہر مریض نظر آنے والے لوگ وہ ہیں جنہیں عبادت کی مشقت مضمحل کر دے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:۔

وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ (پ۱۸ ر۴ آیت ۶۰)

اور جو لوگ دیتے ہیں جو کچھ دیتے ہیں اور (دینے کے باوجود) ان کے دل خوف زدہ رہتے ہیں۔

حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں وہ لوگ مراد ہیں جو اعمال صالحہ کے باوجود اللہ کے عذاب سے ڈریں، اور یہ سوچیں کہ ان کی وجہ سے ہم عذاب الٰہی سے محفوظ نہ رہ سکیں گے، ایک حدیث میں ہے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

طُوْبٰى لِمَنْ طَالَ عُمْرُهُ وَحَسُنَ عَمَلُهُ (طبرانی۔ عبداللہ ابن بشر)

اس شخص کے لیے خوشخبری ہے۔ جس کی عمر لمبی ہو اور عمل اچھے ہوں۔

ایک روایت میں ہے اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں سے دریافت فرمائیں گے کہ آخر میرے بندوں کو کیا ہوا ہے وہ اس قدر مجاہدہ کیوں کرتے ہیں، فرشتے عرض کریں گے "یا اللہ آپ نے انھیں ایک چیز سے ڈرا دیا ہے اس سے وہ ڈرتے ہیں اور ایک چیز کا مشتاق بنا دیا ہے اس کا وہ شوق رکھتے ہیں اللہ تعالیٰ فرمائے گا اگر میرے بندے مجھے دیکھ لیں تو ان کا کیا حال ہو، فرشتے عرض کریں گے تب وہ اور زیادہ جدوجہد کریں گے۔ حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ میں نے ایسے لوگوں کو دیکھا ہے اور ان میں سے بعض کی مجلسوں میں بھی حاضر رہا ہوں جو دنیا کی کوئی چیز پا کر خوش نہیں ہوتے تھے، اور نہ دنیا کی کوئی چیز کھو کر انھیں رنج ہوتا تھا، دنیا ان کی نظروں میں اس مٹی سے بھی زیادہ حقیر تھی جسے تم اپنے پاؤں سے روندتے ہو، وہ لوگ پوری زندگی گذار جاتے تھے مگر ان کے متعلق کبھی یہ نہیں سنا گیا کہ کبھی ان کے لیے کپڑے طے کیے گئے، یا انھوں نے اپنے گھر والوں سے کسی خاص کھانے کی فرمائش کی، یا زمین اور اس کے درمیان کوئی کپڑا بچھایا گیا، میں نے انھیں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کاربند پایا، جب رات اپنے بازو پھیلاتی تو وہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جاتے، اپنا چہرہ زمین پر رکھتے، وہ لوگ اگر کوئی اچھا عمل کرتے تو اس سے خوش ہوتے، اور اس پر اللہ کا شکر ادا کرتے اور دعا کرتے کہ اللہ تعالیٰ ان کا یہ عمل قبول فرمائے اور اگر ان سے کوئی غلطی سرزد ہو جاتی تو غمگین ہوتے، اور اللہ تعالیٰ سے مغفرت کی دعا مانگتے، یقین کرو ان کا ہمیشہ یہی حال رہا، مگر اس کے باوجود نہ وہ گناہوں سے بچ سکے، اور نہ اللہ کی مغفرت کے بغیر نجات پا سکے۔

بندگان رب کے کچھ اور حالات : کچھ لوگ حضرت عمر ابن عبدالعزیزؒ کی عیادت کے لئے حاضر ہوئے، آپ نے ان میں ایک نوجوان کو دیکھا جو انتہائی نحیف و نزار تھا، آپ نے اس نوجوان سے پوچھا کہ تیری یہ حالت کیوں ہے؟ اس نے عرض کیا امیر المومنین! مجھے بیماری نے اس حال کو پہنچا دیا ہے، حضرت عمر ابن عبدالعزیزؒ نے فرمایا میں تجھے اللہ کی قسم دیتا ہوں مجھ سے سچ سچ بتلا، اس نے عرض کیا: امیر المومنین! صحیح بات یہ ہے کہ میں نے دنیا کا مزہ چکھا، اور اسے تلخ پایا، اور میرے نزدیک اس کی رونق اور حلاوت حقیر ہو گئی، اور میری نظروں میں اس کا سونا اور پتھر برابر ہو گئے، اور اب میرا یہ حال ہے کہ میں خود کو عرش معلیٰ کے مشاہدے میں محو پاتا ہوں، لوگ میرے سامنے جنت اور دوزخ کی طرف لے جائے جا رہے ہیں، میں اسی لئے دن کو بھوکا پیاسا رہتا ہوں، اور

---

(۱) یہ روایت مرفوع نہیں ملی۔ البتہ امام احمد نے کتاب الزہد میں مرفوعاً نقل کی ہے۔

راتوں کو جاگتا ہوں' اور اللہ تعالیٰ کے ثواب وعذاب کے مقابلے میں مجھے اپنا ہر حال اور ہر عمل ہیچ نظر آتا ہے۔ ابو نعیم کہتے ہیں کہ داؤد طائی روٹی پانی میں گھول کر پی لیا کرتے تھے' روٹی نہیں کھاتے تھے' کسی نے ان سے اس کی وجہ دریافت کی' فرمایا روٹی کھانے میں دیر بہت لگتی ہے' اس عرصے میں قرآن کریم کی پچاس آیتیں پڑھی جاسکتی ہیں' ایک روز ان کے پاس کوئی شخص آیا اور کہنے لگا کہ آپ کی چھت کی ایک کڑی ٹوٹ رہی ہے' آپ نے فرمایا' میں اس گھر میں بیس برس سے ہوں میں نے آج تک چھت کی طرف نہیں دیکھا' ان حضرات کو جس طرح بیکار گفتگو ناپسند تھی اسی طرح بیکار دیکھنا بھی پسند نہیں تھا' محمد ابن عبدالعزیز کہتے ہیں کہ ایک روز ہم احمد ابن رزین کے پاس چاشت کے وقت سے عصر تک بیٹھے رہے' اس دوران نہ انہوں نے دائیں دیکھا نہ بائیں' کسی نے ان کے اس رویے پر حیرت ظاہر کی' آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے آنکھیں اس لیے پیدا کی ہیں کہ ان سے اس کی عظمت کا مشاہدہ کیا جائے' اگر کوئی شخص دوسرے مقصد کے لیے نظر اٹھاتا ہے اس کے لیے گناہ لکھا جاتا ہے' حضرت مسروق کی اہلیہ کہتی ہیں کہ مسروق کی دو پنڈلیاں دیر تک نماز میں کھڑے رہنے کے باعث سوج گئی تھیں' بخدا میں انھیں دیکھ دیکھ کر رویا کرتی تھی کہ انہوں نے اپنا کیا حال بنالیا ہے' حضرت ابوالدرداءؓ فرماتے ہیں کہ اگر تین چیزیں نہ ہوتیں تو میں ایک دن بھی زندہ رہنا پسند نہ کرتا' اللہ کے لیے دوپہر میں پیاسا رہنا' آدھی رات کو اس کے سامنے سربسجود ہونا' اور ایسے لوگوں کے ساتھ بیٹھنا جو اچھی اچھی باتیں چھانٹتے ہیں جیسے اچھے اچھے پھل چھانٹے جاتے ہیں' اسود ابن یزید عبادات میں سخت مجاہدہ کرتے تھے' اور گرمی کے دنوں میں روزہ رکھتے تھے یہاں تک کہ ان کا جسم سبز یا زرد ہوجاتا' علقمہ ابن قیس ان سے فرماتے کہ تم کیوں اپنے نفس کو عذاب دے رہے ہو' فرماتے میں اسی کی خیر خواہی کے لیے ایسا کررہا ہوں وہ اس قدر روزے رکھتے کہ جسم سبز ہوجاتا اور اس قدر نمازیں پڑھتے کہ تھک کر گر جاتے' ایک مرتبہ حضرت انس ابن مالکؓ اور حضرت حسنؒ ان کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں ان تمام باتوں کا حکم نہیں دیا ہے' آپ نے فرمایا میں تو ایک غلام ہوں' میں کسی ایسی چیز سے دریغ نہیں کرتا جس سے عاجزی ظاہر ہو' ایک بزرگ دن میں ایک ہزار رکعتیں پڑھ لیتے تھے' اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں پاؤں سے معذور ہوجاتے' پھر بیٹھ کر ایک ہزار رکعت پڑھتے اور عصر کی نماز کے بعد آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاتے اور کہتے کہ مجھے بندوں پر حیرت ہوتی ہے کہ وہ تیرے بجائے دوسرے کا ارادہ کیوں کرتے ہیں' اور تیرے غیر سے کس طرح مانوس ہوتے ہیں' مجھے اس بات پر حیرت ہوتی ہے کہ تیرے غیر کے ذکر سے ان کے دل کیسے روشن ہوتے ہیں' ثابت البنانیؒ کو نماز سے عشق تھا' وہ یہ دعا کیا کرتے تھے کہ اے اللہ اگر تو کسی شخص کو قبر میں نماز پڑھنے کی اجازت دے تو مجھے دینا تاکہ میں بھی قبر میں نماز ادا کرسکوں۔

حضرت جنید بغدادیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے سری سقطیؒ سے زیادہ عبادت کرنے والا نہیں دیکھا وہ اٹھانوے برس کے ہوگئے تھے مگر انھیں مرض وفات کے علاوہ کبھی لیٹے ہوئے نہیں دیکھا گیا' حرث ابن سعد کہتے ہیں کہ کچھ لوگ ایک راہب کے پاس سے گزرے اور دیکھا کہ اس نے عبادت میں شدید محنت سے خود کو بے حال بنالیا ہے' لوگوں نے اس مجاہدے کے بارے میں پوچھا' اس نے کہا کہ جن خطرات اور مصائب سے مخلوق کو گزرنا ہے ان کے سامنے اس مشقت کی کیا حقیقت ہے؟ لیکن لوگ غفلت میں مبتلا ہیں' اور نفسانی لذات میں غرق ہیں' اور اپنے رب کے پاس سے جو حظ انھیں ملنے والا ہے اسے بھول گئے ہیں' تمام لوگ اس کا یہ جواب سن کر رونے لگے۔

ابو محمد المغازلیؒ کہتے ہیں کہ ابو محمد جریری ایک سال تک مکہ مکرمہ میں مقیم رہے' اس دوران نہ وہ سوئے' نہ انہوں نے کوئی کلام کیا' نہ کسی ستون سے ٹیک لگائی' نہ کسی دیوار کا سہارا لیا' اور نہ پاؤں پھیلائے' ابوبکر الکتانی ان سے ملے تو پوچھا کہ آپ نے اس قدر سخت اعتکاف کیسے کرلیا' فرمایا اس علم کی وجہ سے جس نے میرے باطن کو سچا بنا رکھا ہے' میرے ظاہر پر اسی کا پرتو ہے' کتانی نے یہ سن کر سر جھکایا اور سوچتے ہوئے چل دیئے' ایک بزرگ کہتے ہیں کہ میں فتح موصلی کی خدمت میں حاضر ہوا' میں نے دیکھا کہ وہ اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے رو رہے ہیں' اور آنسو ان کے ہاتھوں پر گر رہے ہیں میں نے قریب جاکر دیکھا ان کے آنسو

سرخی مائل تھے، میں نے کہا اے فتح خدا کی قسم کیا تم خون کے آنسو بہاتے ہو، انہوں نے کہا اگر تم مجھے خدا کی قسم نہ دیتے تو میں ہرگز نہ بتلاتا کہ ہاں واقعی میں خون کے آنسو روتا ہوں، میں نے پوچھا تم کیوں روتے ہو، فرمایا اس بات پر کہ میں اللہ تعالیٰ کے واجبات ادا نہیں کرپاتا ہوں، اور خون اس لیے رویا کہ کہیں آنسو بے موقع نہ نکلے ہوں، راوی کہتے ہیں کہ میں نے انہیں خواب میں دیکھ کر پوچھا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے ساتھ کیا معاملہ کیا ہے؟ فرمایا اللہ تعالیٰ نے میری مغفرت فرمادی ہے، میں نے پوچھا اور تمہارے خونیں آنسوؤں کا کیا رہا، فرمایا: اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنے قریب کیا اور فرمایا کہ اے فتح تم نے آنسو کیوں بہائے؟ میں نے عرض کیا تیرا حق صحیح طور سے ادا نہ کرنے پر فرمایا اور خون کیوں بہایا؟ میں نے عرض کیا اس خوف سے کہ کہیں آنسو بے موقع نہ نکلے ہوں، اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے فتح تو اس سے کیا چاہتا تھا میں اپنی عزت و جلال کی قسم کھا کر کہتا ہوں تیرے دونوں نگہبان فرشتے چالیس برس تک تیرے اعمال نامے لائے اور ان میں کوئی خطا نہیں تھی۔ روایت ہے کہ کچھ لوگ سفر کررہے تھے، کسی جگہ راستہ بھول گئے اور ایک ایسے راہب تک جا پہنچے جو لوگوں سے الگ تھلگ ہو کر عبادت میں لگا ہوا تھا، لوگوں نے آواز دی، اس راہب نے اپنی خلوت گاہ سے جھانک کر دیکھا، لوگوں نے کہا اے راہب! ہم راستہ بھول گئے ہیں، ہمیں راستہ بتلادے، اس نے آسمان کی طرف اشارہ کیا، لوگ سمجھ گئے کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے، انہوں نے کہا اے راہب ہم تیرے سائل ہیں کیا تو ہمارا سوال پورا کرے گا، راہب نے کہا سوال کرو لیکن زیادہ مت پوچھنا اس لیے کہ دن کبھی واپس نہیں ہوگا، اور عمر کبھی نہیں لوٹے گی، اور موت جلدی میں ہے، لوگ اس جواب سے حیرت میں پڑ گئے انہوں نے کہا اے راہب قیامت کے دن مخلوق کا حشر کس بات پر ہوگا، کہا نیت پر! انہوں نے کہا ہمیں کچھ وصیت کر، کہنے لگا اپنے سفر کے بقدر توشہ لو، اس لیے کہ بہترین زاد راہ وہ ہے جو مقصد پورا کرے، پھر انہیں راستہ بتلایا اور اپنے عبادت خانے میں چلا گیا عبدالواحد ابن زید کہتے ہیں کہ میں چین کے ایک راہب کی خانقاہ کے پاس سے گذرا، میں نے اسے آواز دی اے راہب! مگر اس نے کوئی جواب نہیں دیا، میں نے دوبارہ پھر آواز دی، وہ بدستور خاموش رہا، میں نے تیسری مرتبہ آواز دی، اس نے اپنی عبادت گاہ سے جھانک کر دیکھا اور کہنے لگا کہ میں راہب نہیں ہوں، راہب تو وہ ہے جو اللہ تعالیٰ سے ڈرے اور اس کی تعظیم کرے، اس کے دیئے ہوئے مصائب پر صبر کرے اور اس کی قضا پر راضی ہو، اس کی نعمتوں پر تعریف کرے اور اس کے انعامات کا شکر ادا کرے، اس کی عظمت کے آگے سرنگوں ہو، اس کی قدرت کے تابع ہو، اس کی ہیبت سے خضوع کرے، اس کے حساب اور عقاب میں غور و فکر کرتا ہو، اس کا دن روزے میں اور رات نماز میں گذرتی ہو، دوزخ کے خوف، اور اللہ تعالیٰ کے سوالات کے ڈر نے اس کی آنکھوں سے نیند اڑادی ہو، ایسا شخص راہب ہوتا ہے، میں تو ایک کٹکھنا کتا ہوں اپنے آپ کو اس قید خانے میں اس خوف سے قید کئے ہوئے ہوں کہ کہیں لوگوں کو کاٹنے نہ لگوں میں نے پوچھا اے راہب! لوگوں کو کس چیز نے اللہ سے دور کر رکھا ہے اور وہ اسے پہچاننے کے بعد کیوں منکر ہوگئے ہیں، راہب نے جواب دیا اے بھائی لوگوں کو اللہ سے دنیا کی محبت اور اس کی زینت نے دور کردیا ہے دنیا خطاؤں اور گناہوں کی جگہ ہے، اور عقلمند وہ ہے جو اپنے دل سے دنیا کی محبت نکال پھینکے اور اپنے گناہوں سے توبہ کرے، اور ان اعمال کی طرف متوجہ ہو جو اللہ سے قریب کریں، داؤد طائی سے کسی نے کہا کہ آپ اپنی داڑھی میں کنگھی کرلیں، فرمایا اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں بیکار ہوں، حضرت اویس قرنیؒ کا معمول یہ تھا کہ وہ نماز کے لیے کھڑے ہوتے اور فرماتے یہ رات رکوع کی ہے، اور تمام رات رکوع ہی میں گذار دیتے، دوسری رات کے متعلق فرماتے کہ یہ رات سجدے کی ہے، اور تمام رات سجدے ہی میں گذار دیتے، روایت ہے کہ عتبہ غلام جب گناہوں سے تائب ہو کر اللہ کی طرف متوجہ ہوئے تو ان کی بھوک پیاس سب اڑگئی، ان کی والدہ محترمہ کہتیں بیٹے اپنے نفس کو آرام دو، وہ کہتے کہ میں آرام ہی کی تلاش میں ہوں، مجھے نفس پر کچھ مشقت کرلینے دو پھر ہمیشہ ہمیشہ آرام کروں گا، حضرت مسروق حج کے لیے تشریف لے گئے، آپ کبھی لیٹ کر نہیں سوئے، بلکہ سجدے کی حالت میں سوئے حضرت سفیان ثوریؒ فرماتے ہیں کہ لوگ رات کے سفر کی تعریف صبح کو کرتے ہیں، اور تقویٰ کے بعد موت کو اچھا سمجھیں گے۔ عبداللہ ابن داؤد کہتے ہیں کہ بزرگان دین میں سے جب کوئی شخص چالیس برس کا ہوتا

تو اپنا بستر طے کر دیتا، یعنی رات کو سونا ختم کر دیتا تھا۔
کہمس ابن الحسن ہر روز ایک ہزار رکعت نماز پڑھا کرتے تھے، اور بعد میں اپنے نفس سے کہتے تھے اے سرچشمۂ شر کھڑا ہو، جب بہت زیادہ کمزور ہو گئے تو پانچ سو رکعت پڑھنے لگے، وہ یہ سوچ کر رویا کرتے تھے کہ میں اپنے نصف عمل سے محروم ہو گیا، ربیع ابن خیثم کی صاحبزادی ان سے کہا کرتی تھیں کہ ابا جان! لوگ سوتے ہیں اور آپ جاگتے ہیں، آپ نے جواب دیا کہ بیٹی تیرا باپ آگ سے ڈرتا ہے، آپ کی والدہ محترمہ بھی ان کی اس حالت پر سخت مضطرب رہتی تھیں، ایک مرتبہ آپ نے انہیں انتہائی گریہ وزاری کرتے ہوئے اور شب بیداری کرتے ہوئے دیکھا تو کہنے لگیں اے بیٹا شاید تو نے کسی کو قتل کر دیا ہے اسی لیے اس قدر روتا ہے، اور عفو و مغفرت کی دعائیں مانگتا ہے، انہوں نے عرض کیا امّی جان آپ کا خیال صحیح ہے، وہ کہنے لگیں اگر ایسا ہے تو ہمیں بتلاؤ وہ کون ہے، ہم اس کے اعزّہ کو تلاش کریں گے، اور ان سے درخواست کریں گے کہ وہ تجھے معاف کر دیں، بخدا اگر انہیں پتا چل جائے کہ تیرا کیا حال ہو گیا ہے تو وہ تجھ پر ضرور رحم کریں گے اور تجھے معاف کر دیں گے ربیع نے کہا امّی جان میں نے اپنے نفس کو قتل کیا ہے۔ بشر ابن الحرث کے بھانجے کہتے ہیں کہ میرے ماموں جان ایک روز میری امّی سے کہنے لگے کہ اے بہن میری پسلیاں میرے پیٹ کے خالی حصے میں گھس رہی ہیں میری امّی کہنے لگیں اگر تم اجازت دو تو میں تھوڑے سے میدے کا حریرہ بنا دوں تاکہ تم اسے پی کر کچھ طاقت پاؤ، ماموں جان نے کہا نہیں! مجھے ڈر ہے کہ کہیں اللہ تعالیٰ یہ نہ پوچھ لیں کہ تیرے پاس میدہ کہاں سے آیا تھا، مجھے نہیں پتا میں اس کا کیا جواب دوں گا، یہ سن کر میری امّی رونے لگیں، ماموں جان بھی رونے لگے، اور انہیں روتا ہوا دیکھ کر میں بھی رونے لگا، عمر (بشر ابن الحرث کے بھانجے) کہتے ہیں کہ میری امّی نے ایک دن دیکھا کہ وہ بھوک کی وجہ سے سخت نڈھال ہیں، اور ضعف کی وجہ سے تنفّس کا نظام کمزور پڑ گیا ہے، یہ حالت دیکھ کر میری امّی ان سے کہنے لگیں کہ اے بھائی کیا اچھا ہوتا اگر تیری ماں نے مجھے نہ جنا ہوتا تیرا حال دیکھ کر میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہوا جاتا ہے، ماموں جان نے کہا میں بھی یہی کہتا ہوں کہ کاش میری ماں نے مجھے نہ جنا ہوتا، اور اگر جنا ہوتا تو مجھے دودھ نہ پلایا ہوتا، راوی کہتے ہیں کہ میری امّی اپنے بھائی کے لیے ہر وقت روتی تھیں۔
ربیع کہتے ہیں کہ میں حضرت اویسؓ کی خدمت میں حاضر ہوا وہ اس وقت نماز فجر سے فارغ ہونے کے بعد بیٹھے ہوئے تھے، میں بھی بیٹھ گیا، اور دل میں یہ سوچنے لگا کہ مجھے ان کی تسبیحات میں حارج نہ ہونا چاہیے، چنانچہ وہ اپنی جگہ بیٹھے رہے یہاں تک کہ انہوں نے ظہر کی نماز پڑھی، پھر عصر تک نوافل پڑھتے رہے، اس کے بعد عصر کی نماز ادا کی، اور مغرب تک اسی جگہ رہے، اس کے بعد مغرب کی نماز پڑھی اور اپنی جگہ سے نہیں ہلے اس کے بعد عشا کی نماز پڑھی اور صبح تک نوافل میں مشغول رہے، یہاں تک کہ فجر کا وقت ہو گیا، اس کے بعد آپ نے فجر کی نماز ادا کی، نماز کے بعد آپ پر کچھ دیر کے لیے نیند کا غلبہ ہو گیا، بیدار ہوئے تو آپ کی زبان پر یہ الفاظ تھے اے اللہ! میں سونے والی آنکھ اور سیر نہ ہونے والے پیٹ سے تیری پناہ چاہتا ہوں، میں نے دل میں کہا کہ مجھے ان سے اسی قدر کافی ہے، اس کے بعد میں واپس چلا آیا۔
ایک شخص نے حضرت اویسؓ کو دیکھ کر پوچھا کہ آپ بیمار سے کیوں لگ رہے ہیں، فرمایا میں بیمار کیوں نہ ہوں مریض کھاتا ہے میں نہیں کھاتا، مریض سوتے ہیں میں نہیں سوتا۔ احمد ابن حرب کہتے ہیں مجھے اس شخص کے سونے پر حیرت ہوتی ہے جس کے اوپر جنت آراستہ ہو، اور نیچے دوزخ دہکتی ہو، ایک متقی پرہیزگار شخص کہتے ہیں کہ میں ابراہیم ابن ادہم کی خدمت میں حاضر ہوا وہ اس وقت نماز عشاء پڑھ چکے تھے، میں انہیں دیکھنے کے لیے بیٹھ گیا اتنے میں آپ نے اپنے اوپر کمبل لپیٹا اور لیٹ گئے رات میں کروٹ بھی نہیں ہوئی، یہاں تک کہ صبح ہوئی، مؤذن نے فجر کی اذان دی، آپ نے اٹھ کر نماز پڑھی اور وضو نہیں کیا، میں نے ان سے کہا کہ آپ تمام رات سوتے رہے اور صبح اٹھ کر بلا وضو نماز پڑھ لی، کہنے لگے میں تو تمام رات جنت کے باغوں میں گھومتا رہا، اور کبھی دوزخ کی ہولناک وادیوں میں چکراتا رہا، کیا اس حالت میں کسی شخص کو نیند آسکتی ہے، ثابت بنانی کہتے ہیں کہ میں نے بعض لوگوں کو اس قدر نماز پڑھتے ہوئے دیکھا ہے کہ وہ (کمزوری اور تھکن کے باعث) گھٹنوں کے بل چل کر اپنے بستر پر آیا

کرتے تھے' ابوبکرابن عیاش نے چالیس برس اس طرح گذاری کہ بستر سے کمر نہیں لگائی' ان کی ایک آنکھ میں پانی اتر آیا تھا مگر بیس برس تک ان کے گھر والوں کو اس کا علم نہ ہو سکا۔ کہتے ہیں کہ سمنون کا معمول ہر روز پانچ سو رکعت پڑھنے کا تھا' ابوبکر المطوعی کہتے ہیں کہ میں اپنی جوانی کے دنوں میں اکتیس ہزار دفعہ قل ہو اللہ پڑھا کرتا تھا یا چالیس ہزار مرتبہ' راوی کو اس میں شک ہے' منصور ابن المعتمر کا عالم یہ تھا کہ اگر کوئی شخص انھیں دیکھتا تو کہتا کہ ان پر کوئی مصیبت آپڑی ہے' آنکھیں نیچی' آواز پست' ہر وقت آنکھیں نم رہتیں' ذرا حرکت کرتے آنسو بہنے لگتے' ان کی والدہ کہا کرتی تھیں بیٹا تو یہ کیا کرتا ہے' تمام رات روتا ہے' کسی بھی وقت چپ نہیں ہوتا شاید تو نے کسی کو قتل کردیا ہے' یا کسی پر بڑا ظلم کیا ہے' وہ کہتے اماں جان میں ہی جانتا ہوں کہ میں نے اپنے نفس پر کیا ظلم کیا ہے؟

کسی شخص نے عامرابن عبداللہ سے دریافت کیا کہ تم دوپہر کی پیاس پر' اور رات کے جاگنے پر کیسے صبر کرلیتے ہو' کہنے لگے اس طرح کہ دن کے کھانے کو رات پر ملتوی کردیتا ہوں' اور رات کے کھانے کو دن پر' اور اس میں کوئی زیادہ مشکل بھی پیش نہیں آئی' فرمایا کرتے تھے کہ میں نے جنت جیسی کوئی چیز نہیں دیکھی جس کے طلبگار میٹھی نیند سوتے ہوں' اور نہ دوزخ جیسی کوئی چیز دیکھی جس سے بھاگنے والے خواب خرگوش کے مزے لوٹتے ہوں' جب رات آتی تو فرماتے کہ آگ کی حرارت نے رات کی نیند ضائع کر دی' پھر صبح تک جاگتے رہتے' صبح ہوتی تو فرماتے کہ آگ کی حرارت نے دن کی نیند خراب کردی ہے' پھر دن بھر جاگتے رہتے یہاں تک کہ رات آجاتی' رات کے آنے پر فرماتے کہ جو شخص ڈرتا ہوا ہے رات ہی کو چل دینا چاہیے' صبح کے وقت رات کا چلنا اچھا لگتا ہے' ایک بزرگ کہتے ہیں کہ میں عامرابن قیس کے ساتھ چار ماہ تک رہا' میں نے انھیں نہ رات میں سوتے ہوئے دیکھا اور نہ دن میں سوتے ہوئے پایا۔ حضرت علی ابن ابی طالبؓ کے ایک ساتھی بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت علیؓ کے پیچھے فجر کی نماز پڑھی' آپ نے سلام پھیرا اور دائیں طرف کو رخ کرکے بیٹھ گئے' اس وقت آپ پر کچھ غم کا اثر تھا' آپ سورج نکلنے تک اسی طرح بیٹھے رہے' اس کے بعد اپنا ہاتھ الٹا اور فرمایا بخدا میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب کو دیکھا ہے' اب مجھے کوئی شخص ایسا نظر نہیں آتا جو ان سے مشابہت رکھتا ہو' وہ لوگ بکھرے بالوں اور زرد چہروں کے ساتھ صبح کرتے' ان کی راتیں سجود و قیام اور تلاوت کتاب اللہ میں گزرتی تھیں' وہ اپنے قدموں اور پیشانیوں پر زور دیا کرتے تھے' یہ لوگ جب اللہ کا ذکر کرتے تو اس طرح لرزتے جیسے ہوا کے تیز و تند جھکڑوں سے درخت لرزتے ہیں' ان کی آنکھیں اس قدر آنسو برساتیں کہ کپڑے تر ہوجاتے' اب لوگ غفلت کے ساتھ سوتے ہیں' ابو مسلم الخولانی نے اپنے گھر کی مسجد میں ایک کوڑا لٹکا رکھا تھا' اس کوڑے سے وہ اپنے نفس کو ڈرایا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ کھڑا ہوجا ورنہ میں تجھے اس قدر رگیدوں گا کہ تو تھک جائے گا' میرا کچھ نقصان نہ ہوگا' اگر نفس کی طرف سے کچھ سستی دیکھتے تو کوڑا اٹھا کر اپنی پنڈلیوں پر مارتے' اور کہتے کہ میرے جانور سے زیادہ تو مار کا مستحق ہے' فرمایا کرتے تھے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب یہ سمجھتے ہوں گے کہ دین صرف ہم نے ہی اختیار کیا ہے' بخدا ہم اس قدر محنت کریں گے کہ صحابہ کرام کو معلوم ہوجائے گا کہ صرف ہم ہی نے دین کو اختیار نہیں کیا ہے بلکہ ہمارے پیچھے بھی کچھ لوگ آرہے ہیں' صفوان ابن سلیم طویل قیام کے باعث دونوں ٹانگوں سے معذور ہوگئے تھے' ان کا مجاہدہ اس درجے پر پہنچ گیا تھا کہ اگر کوئی شخص ان سے کہتا کہ قیامت کل ہوگی تو ان کے اعمال میں ذرا بھی زیادتی نہ ہوپاتی' یعنی وہ پہلے ہی اتنے زیادہ ہوتے کہ ان میں مزید زیادتی کی گنجائش نہ ہوتی' سردی کے موسم میں وہ چھت پر جا بیٹھتے تاکہ جسم کو سرد ہوا کے تھپیڑے کھلائیں' اور گرمی کے دنوں میں تنگ و تاریک کمروں میں پہنچ جاتے تاکہ اپنے نفس کو حبس اور گھٹن کا مزہ چکھائیں' وہ رات بھر سوتے نہیں تھے' یہاں تک کہ سجدے کی حالت میں وفات پائی' اپنی موت سے کچھ لمحے پہلے وہ یہ کہہ رہے تھے اے اللہ! میں تیری ملاقات پسند کرتا ہوں' تو بھی مجھ سے ملنا پسند کر۔ قاسم ابن محمد کہتے ہیں کہ میں صبح اٹھ کر سب سے پہلے حضرت عائشہؓ کی خدمت میں حاضر ہوتا' اور انھیں سلام کرتا' اس کے بعد اپنے کاموں میں مشغول ہوتا' ایک روز حسب معمول میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا' آپ اس وقت چاشت کی

نماز پڑھ رہی تھیں اور یہ آیت پڑھ پڑھ کر رو رہی تھیں:۔

فَمَنَّ اللّٰہُ عَلَیْنَا وَوَقَانَا عَذَابَ السَّمُوْمِ (پ ۲۷ ر ۳ آیت ۲۷)

سو خدا نے ہم پر بڑا احسان کیا اور عذاب دوزخ سے بچالیا۔

میں دیر تک کھڑے رہنے کے باعث تھکن محسوس کرنے لگا' لیکن وہ اس طرح آیت کی تلاوت کرتی رہیں' اور روتی رہیں' میں نے سوچا پہلے بازار ہو آؤں' چنانچہ میں بازار گیا اور اپنی ضرورت سے فارغ ہو کر واپس آیا تو آپ اسی طرح آیت کی تلاوت اور گریہ و زاری میں مشغول تھیں' محمد ابن اسحاق کہتے ہیں کہ جب عبدالرحمٰن ابن اسود حج کے ارادے سے ہمارے پاس آئے تو ان کے پاؤں میں کچھ تکلیف تھی' مگر ہم نے انہیں دیکھا کہ وہ ایک پاؤں پر کھڑے ہو کر عشاء کے وضو سے صبح کی نماز ادا کرتے تھے' ایک بزرگ کہتے ہیں کہ میں موت سے صرف اس لیے ڈرتا ہوں کہ وہ میرے اور رات کی نماز کے درمیان حائل ہو جائے گی' علی ابن ابی طالبؓ کہتے ہیں کہ نیک لوگوں کی علامت یہ ہے رات بھر جاگنے کے باعث ان کے چہرے زرد پڑ گئے ہوں' اور رونے کی وجہ سے ان کی آنکھیں چندھیا گئی ہوں' اور روزے کی وجہ سے ہونٹ خشک ہو گئے ہوں' ان پر خاشعین کا سا غبار چھایا ہوا ہو' حضرت حسن سے کسی شخص نے دریافت کیا کہ آخر تہجد پڑھنے والوں کے چہرے اس قدر عمدہ کیوں ہوتے ہیں' فرمایا اس لیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تنہا ہوتے ہیں' اللہ انہیں اپنے نور کا لباس پہنا دیتا ہے' عامر ابن عبدالقیس کہتے تھے "اے اللہ تو نے مجھے پیدا کیا' اور مجھ سے مشورہ نہیں لیا' اور مجھے موت دے گا' اس وقت بھی مجھ سے مشورہ نہیں لے گا' اور میرے ساتھ ایک ایسا دشمن پیدا کر دیا ہے جو میری رگوں میں خون کے ساتھ ساتھ گردش کرتا ہے' اور اس دشمن کو پیدا کر کے تو مجھ سے کہتا ہے اس سے اجتناب کر بھلا میں اس سے کیسے اجتناب کر سکتا ہوں' اگر تو مجھے اس کا حوصلہ نہ بخشے' میرا دشمن مجھے دیکھتا ہے اور میں اسے نہیں دیکھ پاتا' اے اللہ! دنیا میں آلام اور مصائب ہیں' اور آخرت میں حساب و عذاب ہے پھر راحت و مسرت کہاں ہے؟

جعفر ابن محمد کہتے ہیں کہ عتبہ غلام تین چیخوں میں رات پوری کیا کرتے تھے' اوّلاً عشاء کی نماز پڑھ کر گھٹنوں میں سر رکھتے اور سوچنے بیٹھ جاتے' جب رات کا تہائی حصہ گزر جاتا تو ایک چیخ مارتے پھر گھٹنوں پر سر رکھ کر بیٹھ جاتے' اور جب رات کا دوسرا تہائی حصہ گذر جاتا پھر ایک چیخ مارتے' اس کے بعد پھر اپنے گھٹنوں پر سر رکھ کر سوچنے میں مصروف ہو جاتے' جب صبح ہوتی تو پھر ایک چیخ مارتے' جعفر ابن محمد کہتے ہیں کہ میں نے بصرے کے بعض لوگوں سے ان کی چیخوں کا ذکر کیا' وہ کہنے لگے تم چیخوں کو نہ دیکھو' بلکہ یہ سوچو کہ آخر وہ ان چیخوں کے درمیان کیا سوچا کرتے تھے' قاسم ابن راشد شیبانی کہتے ہیں کہ زمعہ محصب میں ہمارے گھر مہمان تھے' ان کی ساتھ ان کی بیوی اور لڑکیاں بھی تھیں ان کا دستور تھا کہ وہ رات میں دیر تک نماز پڑھا کرتے تھے' جب صبح ہوتی تو آواز بلند کہتے اے آرام کرنے والوں کیا تم رات اسی طرح سوتے رہو گے' اٹھو کیا چلنے کا ارادہ نہیں ہے' ان کی آواز سن کر تمام لوگ بیدار ہو جاتے' کوئی رونے لگتا' کوئی قرآن کریم کی تلاوت شروع کر دیتا' اور کوئی وضو کرنے بیٹھ جاتا' جب فجر کا وقت ہوتا تو بلند آواز سے کہتے کہ صبح کے وقت رات کا چلنا پسند کیا جاتا ہے۔ ایک دانشور کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے بعض بندے ایسے ہیں کہ اللہ نے انہیں اپنی معرفت کا انعام دیا ہے' اور اطاعت کے لیے ان کے سینے کھول دیئے ہیں' وہ اس پر توکل کرتے ہیں' اور مخلوق کو اور تمام معاملات کو اس پر رکھتے ہیں' یہی وجہ ہے کہ ان کے دل صفائے یقین کے معدن' حکمت کے گھر' عظمت کے صندوق' اور قدرت کے خزانے بن گئے ہیں' وہ لوگ بظاہر لوگوں میں آتے جاتے گھومتے پھرتے نظر آتے ہیں مگر ان کے دل ملکوت کی سیر کرتے رہتے ہیں' اور غیب کے حجوب میں پناہ لیتے ہیں' اور جب واپس آتے ہیں تو ان کے پاس فوائد کے خزینے اور لطائف کے جواہر ہوتے ہیں' ان خزینوں اور جوہروں کا وصف بیان نہیں کیا جا سکتا' وہ اپنے باطنی امور میں ایسے ہیں جیسے ریشم' اور ظاہر میں ایسے جیسے استعمال شدہ رومال' ہر شخص کے ساتھ تواضع سے پیش آتے ہیں' اور یہ ایک ایسی منہاج ہے جس پر بتکلف نہیں چلا جا سکتا۔ یہ تو اللہ کا فضل ہے وہ جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔

ایک بزرگ بیان کرتے ہیں کہ میں بیت المقدس کے پہاڑوں میں گھوم رہا تھا' اسی دوران میرا گذر ایک وادی سے ہوا وہاں میں نے ایک بلند آواز سنی' جس کا جواب پہاڑ دے رہے تھے' یعنی اس جگہ آواز زبردست طریقے سے گونجتی تھی' مجھے اس آواز کا پتا لگانے کا تجسس ہوا' اور کشاں کشاں ایک ایسے خطے میں پہنچا جہاں بکثرت درخت تھے' میں نے وہاں ایک شخص کو دیکھا جو یہ آیت بار بار پڑھ رہا تھا۔

يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا وَمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْءٍ تَوَدُّ لَوْ أَنَّ بَيْنَهَا وَبَيْنَهُ أَمَدًا بَعِيدًا وَيُحَذِّرُكُمُ اللَّهُ نَفْسَهُ (پ ۳ ر ۱۱ آیت ۳۰)

جس روز ہر شخص اپنے اچھے کئے ہوئے کاموں کو سامنے لایا ہوا پائے گا' اور اپنے برے کئے ہوئے کاموں کو بھی' اور اس بات کی تمنا کرے گا کہ کیا خوب ہوتا کہ اس شخص کے اور اس کے درمیان دور دراز کی مسافت حائل ہوتی اور اللہ تم کو اپنی ذات (عظیم) سے ڈراتا ہے۔

میں اس کے پیچھے بیٹھ گیا اور اس کی تلاوت سننے لگا' وہ کافی دیر تک تلاوت کرتا رہا' یہاں تک کہ اس نے ایک زبردست چیخ ماری اور بے ہوش ہو کر گر پڑا' میں نے کہا یہ میری بد قسمتی ہے کہ میں اس کی زبان سے تلاوت نہ سن سکا' پھر میں اس کے ہوش میں آنے کا منتظر بیٹھا رہا کچھ دیر بعد وہ یہ کہتا ہوا ہوش میں آیا کہ میں جھوٹوں کے مقام سے اللہ کی پناہ چاہتا ہوں' میں بیکاروں کے مقام سے اللہ کی پناہ چاہتا ہوں' میں غافلوں کے اعراض سے اللہ کی پناہ چاہتا ہوں' پھر اس نے یہ کہا کہ ڈرنے والوں کے قلوب تیرے لیے خاشع ہیں' کوتاہ عملوں کی امیدیں تیری ذات سے وابستہ ہیں عارفین کے دل تیری عظمت کے آگے سرنگوں ہیں' پھر اس نے اپنے ہاتھ جھاڑے اور کہنے لگا گذرے ہوئے زمانے کہاں گئے' اور پچھلے وقتوں کے لوگ کہاں ہیں' وہ مٹی میں سڑتے ہیں' اور تھوڑی سی مدت میں فنا ہو جاتے ہیں' راوی کہتے ہیں کہ میں نے اس شخص کو آواز دی اور کہنے لگا کہ اے اللہ کے بندے میں آج تمام دن سے تیرے پیچھے بیٹھا ہوا ہوں' اور تیری فراغت کا منتظر ہوں' اس نے کہا بھلا اس شخص کو فراغت کیسے ملے گی جو اوقات سے سبقت کرتا ہے' اور اوقات اس سے سبقت کرتے ہیں اور ڈرتا ہے کہ کہیں موت اس کے نفس پر سبقت نہ کر جائے' یا وہ شخص کیسے فارغ ہو گا جس کی زندگی کے دن گزر گئے ہوں اور گناہ باقی رہ گئے ہوں' پھر اس نے میری طرف سے اپنی توجہ ہٹائی اور اللہ تعالیٰ سے عرض کرنے لگا کہ ان گناہوں کے لیے تو ہی ہے' اور ہر مصیبت اور شدت کے لیے تو ہی ہے' اور مجھے اس کے آنے کی توقع ہے' اسکے بعد اس نے یہ آیت تلاوت کی۔

وَبَدَا لَهُمْ مِنَ اللَّهِ مَا لَمْ يَكُونُوا يَحْتَسِبُونَ پ ۲۴ ر ۲ آیت ۴۸)

اور (اس وقت) ان کو تمام برے اعمال ظاہر ہو جائیں گے۔

پھر وہ پہلے سے بھی زیادہ زور سے چیخا اور بے ہوش ہو کر گر پڑا' مجھے خیال ہوا کہ شاید اس کی روح نے جسم کا ساتھ چھوڑ دیا ہے' میں اس کے قریب گیا' اور دیکھا کہ وہ سخت مضطرب اور بے چین ہے کچھ دیر بعد اس کی حالت بہتر ہوئی' اس مرتبہ ہوش میں آنے کے بعد اس کی زبان پر یہ الفاظ تھے میں کون ہوں؟ میرا خاطر کیا ہے؟ اپنے فضل سے میرے گناہ معاف فرما' مجھے اپنے پردۂ رحمت میں چھپالے' اپنی عظمت و کرم کے صدقے سے میری خطاؤں سے درگذر کرنا اس وقت جب کہ میں تیرے سامنے حاضر ہوں' راوی کہتے ہیں میں نے اس شخص سے کہا کہ میں اس ذات کی قسم دے کر کہتا ہوں جس سے تو امید رکھتا ہے' اور جس پر بھروسا کرتا ہے کیا مجھ سے گفتگو نہیں کرے گا' اس نے جواب دیا اس شخص سے کلام کرو جس کے کلام سے تمہیں کچھ نفع ہو' اور اس شخص کے کلام سے بچو جسے اس کے گناہوں نے ہلاک کر دیا ہو' میں اس جگہ طویل مدت سے۔ اللہ ہی جانتا ہے وہ کس قدر طویل ہے ابلیس سے جہاد کر رہا ہوں اور ابلیس مجھ سے جہاد کر رہا ہے' آج تک کوئی ایسا شخص' یہاں نہیں آیا' جو اس کے خلاف جہاد میں میری اعانت کرتا۔ اب تو آیا ہے' میں کہتا ہوں تیرا مجھ سے دور رہنا ہی بہتر ہے' تو نے میری زبان معطل کر دی ہے' اور

میرے دل کو اپنی بات کی طرف مائل کرلیا ہے' میں شرک سے اللہ کی پناہ چاہتا ہوں' اور یہ امید کرتا ہوں کہ وہ مجھے اپنے غصے سے محفوظ رکھے گا' اور مجھ پر اپنی رحمت کی نظر فرمائے گا۔ راوی کہتے ہیں کہ مجھے خیال ہوا یہ شخص اللہ کا ولی ہے' میں نے اسے اپنی باتوں میں مشغول کردیا ہے' ایسا نہ ہو اس کی وجہ سے مجھ پر عذاب ہو' یہ سوچ کر میں وہاں سے چلا آیا۔

ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ میں کسی راستے سے گزرتا ہوا ایک درخت تک پہنچا تاکہ کچھ دیر اس کے سائے میں آرام کرلوں' کچھ ہی لمحوں کے بعد میں نے ایک بوڑھے شخص کو دیکھا جو مجھ پر چڑھے چلے آرہے تھے' اور کہہ رہے تھے اے شخص! اٹھ اور یہاں سے جا' اس لیے کہ موت مری نہیں ہے' یہ کہہ کر وہ بڑے میاں واپس ہوگئے' میں بھی ان کے پیچھے پیچھے چلا' وہ یہ کہتے ہوئے جا رہے تھے:۔

كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ۔ (پ۷ار ۳ آیت ۳۵)

ہر نفس کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔

اے اللہ! میرے لیے موت میں برکت عطا فرما' میں نے کہا اور موت کے بعد کی زندگی میں بھی وہ کہنے لگے جو شخص موت کے بعد پیش آنے والے واقعات و حالات کا یقین رکھتا ہے وہ احتیاط اور خوف کی بنا پر دامن اٹھا کر چلتا ہے' دنیا میں اس کا ٹھکانہ نہیں ہوتا' اے پروردگار! تیری ذات عظیم کے لیے تمام چہرے ذلیل ہیں' میرے چہرے کو اپنے دیدار سے روشن کر' اور میرے دل کو اپنی محبت سے لبریز فرما' قیامت کے دن اپنی بارگاہ میں ہر رسوائی اور ذلت سے محفوظ رکھنا' اب تجھ سے شرمانے کا وقت آگیا ہے' اب تجھ سے اعراض نہ کرنے کا وقت آپہنچا ہے' اگر تیرا حلم نہ ہوتا تو موت بھی مجھ سے گریزاں رہتی' اور اگر تیرا عفو نہ ہوتا تو میری امید کا دامن تیرے بے پایاں عنایات تک وسیع نہ ہوتا' پھر وہ مجھے تنہا چھوڑ کر چل دیا' اس مضمون میں یہ اشعار کہے گئے ہیں:۔

نَحِيْلُ الْجِسْمِ مُكْتَئِبُ الْفُؤَادِ۔ تَرَاهُ بِقِمَّةٍ أَوْ بَطْنِ وَادِي
يَنُوْحُ عَلٰى مَعَاصٍ فَاضِحَاتٍ۔ يُكَدِّرُ ثِقْلُهَا صَفْوَ الرُّقَادِ
فَإِنْ هَاجَتْ مَخَاوِفُهُ وَ زَادَتْ۔ فَدَعْوَتُهُ أَغِثْنِيْ يَا عِمَادِي
فَأَنْتَ بِمَا أُلَاقِيْهِ عَلِيْمٌ۔ كَثِيْرُ الصَّفْحِ عَنْ زَلَلِ الْعِبَادِ

(کمزور جسم ہے' اور دل غم و اندوہ سے لبریز ہے' ایسے شخص کو تم کسی پہاڑ کی چوٹی پر یا کسی وادی میں دیکھتے ہو' کہ وہ اپنے ان رسوا کن گناہوں پر نوحہ کرتا ہے' جن کا ثقل خواب راحت کا مزہ مکدّر کردیتا ہے' جب خوف زیادہ ہیجان پر ہوتا ہے تو اس کی دعا یہ ہوتی ہے کہ اے میرے پروردگار میری مدد کر' جس حال میں میں ہوں تو اس سے اچھی طرح واقف ہے' اور بندے کی لغزشوں سے بہت زیادہ درگزر کرنے والا ہے)۔

أَلَذُّ مِنَ التَّلَذُّذِ بِالْغَوَانِي۔ إِذَا أَقْبَلْنَ فِي حُلَلٍ حِسَانٍ
مُنِيْبٌ فَرَّ مِنْ أَهْلٍ وَ مَالٍ۔ يَسِيْحُ إِلَى مَكَانٍ مِنْ مَكَانٍ
لِيَخْمُلَ ذِكْرُهُ وَ يَعِيْشَ فَرْدًا۔ وَيَظْهَرُ فِي الْعِبَادَةِ بِالْأَمَانِ
تَلَذُّذُهُ التِّلَاوَةُ أَيْنَ وَلّٰى۔ وَذِكْرٌ بِالْفُؤَادِ وَ بِاللِّسَانِ
وَعِنْدَ الْمَوْتِ يَأْتِيْهِ بَشِيْرٌ يُبَشِّرُ بِالنَّجَاةِ مِنَ الْهَوَانِ
فَيُدْرِكُ مَا أَرَادَ وَ مَاتَمَنّٰى مِنَ الرَّاحَاتِ فِي غُرَفِ الْجِنَانِ

(اگر حسین و جمیل پوشاک پہن کر خوبصورت مغنیائیں آجائیں تو اس میں وہ لذّت نہ ملے جو اسے میسّر ہے' وہ اہل و عیال سے منہ موڑ کر اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہے اور ایک جگہ سے دوسری جگہ پھرتا ہے' تاکہ وہ گوشۂ گمنامی میں چلا جائے' اور تنہا رہ کر اپنے

مولیٰ کی خاطر خواہ عبادت کر سکے' جہاں بھی وہ جاتا ہے تلاوت کلام پاک کا ذوق اور دل و زبان سے ذکر الٰہی کی لذت اس کے ساتھ جاتی ہے' موت کے وقت ایک خوشخبری سنانے والا آتا ہے اور اسے نجات اور راحت کی بشارت سناتا ہے' تب وہ (موت کے بعد) اپنی امیدوں کے مطابق اجر و ثواب پالیتا ہے اور جنت کے محلوں میں آسائشیں اور لذتیں حاصل کرلیتا ہے۔)

کرز ابن وبرہ ہر روز تین قرآن پاک ختم کرلیا کرتے تھے اور عبادات میں شدید مجاہدہ فرماتے تھے کسی نے ان سے کہا کہ آپ بہت سخت مجاہدہ کرتے ہیں۔ انہوں نے پوچھا کہ دنیا کی عمر کیا ہے؟ سائل نے جواب دیا سات ہزار سال انہوں نے سوال کیا اور قیامت کے دن کی مقدار کیا ہے۔ سائل مذکور۔ نے عرض کیا پچاس ہزار برس فرمایا تم اس بات سے کیسے عاجز ہو کہ سات دن عمل کرکے اس ایک دن سے بے خوف ہو جاؤ۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ اگر تم دنیا کی عمر کے برابر یعنی سات ہزار برس تک زندہ رہو اور اس مدّت میں سخت مجاہدہ کرو۔ محض ایک دن سے نجات پانے کے لئے تو یہ بڑے نفع کی بات ہے تمہیں اس نفع کے حصول کی کوشش کرنی چاہیے اور یہاں تو عمر بھی بہت مختصر ہے اور آخرت کی انتہا بھی نامعلوم ہے تو مجاہدہ کیسے نہ کیا جائے۔

نفس کے ساتھ شرط لگانے اور اس کا مراقبہ کرنے میں سلف صالحین کا یہ معمول تھا اگر تیرا نفس سرکش ہو جائے اور عبادت پر مواظبت کے لئے تیار نہ ہو تو ان بزرگوں کے احوال کا مطالعہ کر۔ اب یہ لوگ تقریباً ناپید ہوگئے ہیں۔ اگر خوش بختی سے تجھے کوئی ایسا شخص مل جائے جو ان بزرگوں کا اتباع کرتا ہو تو اسے غنیمت جان۔ اس کا دیکھنا اقتداء کے لئے زبردست محرک کا کام دیتا ہے اور نفس کو راغب کرنے میں بیش بہا کردار ادا کرتا ہے۔ اس لئے کہ سننا مشاہدے جیسا نہیں ہوتا۔ اگر تم کسی ایسے شخص کو نہ دیکھ سکو تو ان کے حالات کے مطالعے اور سماع سے غفلت مت کرو اگر اونٹ نہ ہو تو بکری بہتر ہے۔ بہرحال اپنے نفس کو اختیار دو کہ وہ یا تو عقلمندوں اور دانشوروں اور دینی بصیرت رکھنے والے کی اقتداء کرے یا اپنے زمانے کے جاہل غافلوں کی۔ لیکن اس پر ہرگز راضی مت ہو کہ تم ان احمقوں کی فہرست میں شامل ہو جاؤ اور ان بے وقوفوں سے مشابہت اختیار کرلو اور دانشمندوں کی مخالفت پر آمادہ ہو جاؤ۔ اگر تمہارا نفس یہ کہے کہ ان لوگوں کی اقتداء نہایت دشوار ہے کیونکہ وہ مجاہدے کی زبردست قوت سے مالامال تھے تو ان عورتوں کے احوال کا مطالعہ کرو جو عبادات میں مجاہدہ کرتی تھیں اور نفس سے کہو کہ کیا تجھے اس بات سے شرم نہیں آتی کہ تیرا درجہ عورتوں سے بھی کم ہو۔ وہ مرد انتہائی ذلیل ہے جو دین یا دنیا کے معاملات میں کسی صورت سے کم ہو۔

نیک سیرت عورتوں کا ذکر

اب ہم کچھ عابدہ زاہدہ عورتوں کے حالات بیان کرتے ہیں حبیبہ عدویہ سے مروی ہے کہ جب وہ عشاء کی نماز پڑھ لیتی تھیں تو اپنے مکان کی چھت پر پہنچ جایا کرتی تھیں اور اپنے جسم کے اردگرد کرتا اور دوپٹہ کس کر کہتی تھیں اے اللہ ستارے نکل آئے ہیں۔ آنکھیں نیند سے بوجھل ہوگئی ہیں' بادشاہوں نے اپنے دروازے بند کرلئے ہیں' عاشق اپنے معشوق کے ساتھ خلوت میں چلا گیا اور میں تیری بارگاہ میں حاضر ہوگئی ہوں۔ پھر وہ اپنی نماز میں مشغول ہو جاتیں۔ جب فجر کا وقت ہو جاتا تو کہتیں۔ اے اللہ! یہ رات رخصت ہوگئی ہے اور دن نکل آیا ہے' مجھے نہیں معلوم کہ میری یہ رات تو نے قبول کی ہے یا نہیں؟ اگر قبول کرلی ہے تو میں اپنے آپ کو مبارکباد دوں ورنہ تعزیت کروں' تیری عزت کی قسم یہ میرا معمول رہے گا جب تک تو مجھے زندہ رکھے گا۔ اگر تو نے مجھے اپنے در سے جھڑک دیا تب بھی میں تیرا در نہ چھوڑوں گی۔ اس لئے کہ میرا دل تیرے جود و کرم کے انوار سے روشن ہے۔ عجوہ کے بارے میں روایت ہے کہ وہ رات بھر عبادت کرتی تھیں حالانکہ آنکھوں سے معذور تھیں مگر جب سحر کا وقت ہوتا تو اونچی اور غمگین آواز میں کہتیں عابدوں نے تجھ تک پہنچنے ہی کے لئے رات کی مسافت طے کی۔ وہ تیری رحمت اور فضل و مغفرت کی طرف سبقت کرتے ہیں اے اللہ! میں تجھ ہی سے مانگتی ہوں تیرے غیر سے نہیں مانگتی کہ مجھے سبقت کرنے والوں میں سرفہرست کر اور مجھے علیین میں مقربین کا درجہ عطا کر اور مجھے اپنے نیک بندوں میں شامل کر' تو انتہائی رحم اور کرم والا ہے' تو تمام بڑوں سے بڑا اور تمام بلندیوں سے بلند ہے۔ یہ دعا مانگ کر وہ سجدے میں گر جاتیں۔ یہاں تک کہ ان کے سجدے میں گرنے کی آواز آس پاس میں سنی

جاتی۔ پھر وہ سجدے ہی میں صبح کی نماز تک دعائیں مانگتی رہتیں اور روتی رہتیں۔

یحییٰ بن بسطام کہتے ہیں کہ میں شعوانہ کی مجلس میں حاضر ہوتا تھا اور دیکھتا تھا کہ وہ کس قدر روتی ہیں اور کس شدت سے گریہ و زاری کرتی ہیں۔ ایک دن میں نے اپنے ایک ساتھی سے کہا کہ کسی دن تنہائی میں ملاقات کر کے ہم ان سے کہیں گے کہ وہ اپنے نفس کے ساتھ تھوڑی نرمی کا معاملہ کریں ساتھی نے میری اس تجویز سے اتفاق کیا' چنانچہ ایک موقع تلاش کر کے ہم لوگ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ کیا اچھا ہو اگر آپ نفس کے ساتھ نرمی برتیں اور اس گریہ و زاری میں کچھ کمی کریں۔ جو آپ چاہتی ہیں اس نرمی سے اس پر بڑی مدد ملے گی۔ یہ بات سنکر وہ رونے لگیں اور کہنے لگیں بخدا میں اس قدر رونا چاہتی ہوں کہ میرے آنسو خشک ہو جائیں۔ پھر خون کے آنسو روؤں' یہاں تک کہ میرے جسم سے خون کا ایک ایک قطرہ آنسو بن کر آنکھ سے بہہ جائے لیکن میں کہاں روتی ہوں۔ مجھے رونا کب نصیب ہوتا ہے؟ یہ جملے انہوں نے کئی مرتبہ کہے اور بے ہوش ہو گئیں۔ محمد ابن معاذؒ کہتے ہیں کہ مجھ سے ایک عبادت گذار خاتون۔ نے بیان کیا کہ میں نے خواب دیکھا گویا مجھے جنت میں داخل کیا گیا ہے۔ تمام اہل جنت اپنے اپنے دروازوں پر کھڑے ہیں۔ میں نے کہا جنت والوں کو کیا ہو گیا یہ دروازوں میں کیوں کھڑے ہوئے ہیں' کسی کہنے والے نے کہا کہ جنت والے اس عورت کو دیکھنے کے لئے اپنے محلوں سے باہر نکل آئے ہیں جس کے لئے جنتیں سجائی گئی ہیں۔ میں نے کہا کہ وہ کون عورت ہے جس کا زبردست اعزاز منظور ہے۔ جواب دیا گیا کہ وہ ایلہ کی ایک سیاہ فام باندی ہے جسے شعوانہ کہتے ہیں' میں نے کہا واللہ وہ تو میری بہن ہے۔ میں ابھی یہ گفتگو کر رہی تھی کہ وہ ایک اونٹنی پر سوار ہو کر ہوا کے دوش پر اڑتی ہوئی آئی۔ میں نے اس سے کہا کہ اے بہن شعوانہ میرے لئے اللہ تعالیٰ سے دعا کر۔ وہ مجھے تیرے ساتھ ملا دے۔ اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا کہ ابھی تیرے یہاں آنے کا وقت نہیں آیا۔ البتہ میری دو باتیں یاد رکھ' ایک تو یہ کہ دل کو ہمیشہ غم زدہ رکھنا اور دوسرے یہ کہ اللہ کی محبت کو اپنی خواہش نفس پر مقدم رکھنا۔ پھر انشاء اللہ تجھے کوئی نقصان نہیں ہو گا۔ خواہ کسی بھی وقت تیری موت آئے۔

عبداللہ ابن الحسن کہتے ہیں کہ میری ایک رومی باندی تھی اور میں اسے پسند کرتا تھا۔ ایک شب وہ میرے پہلو میں لیٹی ہوئی تھی۔ میری آنکھ لگ گئی۔ رات کے کسی پہر آنکھ کھلی تو میں نے محسوس کیا کہ وہ بستر پر نہیں ہے۔ میں اسے تلاش کرنے کے لئے بستر سے اٹھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ سجدے میں پڑی ہوئی یہ کہہ رہی ہے کہ اے اللہ! اس محبت کی وجہ سے جو تجھے میرے ساتھ ہے میری مغفرت فرما۔ میں نے کہا یوں مت کہہ کہ جو محبت تجھے میرے ساتھ ہے بلکہ یوں کہہ کہ جو محبت مجھے تیرے ساتھ ہے' وہ کہنے لگی اے میرے آقا! اسی محبت کی وجہ سے اس نے مجھے شرک سے نکال کر اسلام تک پہنچایا اور اسی محبت کی وجہ سے اس نے میری آنکھ کو جاگنے کی قوت بخشی جبکہ اس کی مخلوق خواب راحت میں مست ہے۔ ابوہاشم القرشی کہتے ہیں کہ یمن سے ایک عورت ہمارے یہاں آئی اس کا نام سریہ تھا۔ وہ ہمارے گھروں میں سے ایک گھر میں مقیم ہوئی۔ میں رات کو اس کے چیخنے چلانے اور گریہ و زاری کرنے کی آوازیں سنا کرتا تھا۔ ایک دن میں نے اپنے نوکر سے کہا جا کر دیکھو یہ عورت کیا کرتی ہے۔ نوکر نے جا کر دیکھا۔ وہ کچھ بھی نہیں کر رہی تھی سوائے اس کے کہ اس کا چہرہ آسمان کی طرف تھا اور قبلہ رخ کھڑی ہوئی یہ کہہ رہی تھی کہ تو نے سریہ کو پیدا کیا' پھر اس کو اپنی نعمتوں سے غذا دی اور ایک حال سے دوسرے حال کی طرف منتقل کیا تیرے تمام احوال اس کے حق میں اچھے ہیں اور تیرے مصائب اس کے نزدیک حسن سلوک ہیں۔ اس کے باوجود وہ خود کو تیرے غضب کا ہدف بناتی ہے اور معاصی پر جرأت کر کے تیری ناراضگی مول لیتی ہے کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ وہ یہ گمان رکھتی ہے کہ تو اس کے افعال نہ دیکھتا ہو گا۔ حالانکہ تو علیم و خبیر ہے اور ہر چیز پر قادر ہے۔

ذوالنون مصریؒ کہتے ہیں کہ میں ایک روز وادئ کنعان سے اوپر کی طرف چلا۔ جب میں اوپر پہنچا تو دیکھا کہ سامنے کی جانب سے ایک سیاہ چیز چلی آرہی ہے اور یہ کہہ رہی ہے اور رو رہی ہے۔

وَبَدَا لَهُمْ مِنَ اللّٰهِ مَا لَمْ يَكُوْنُوْا يَحْتَسِبُوْنَ (پ ۲۴' ر ۲' آیت ۴۸)

(ترجمہ) اور (اس وقت) ان کو تمام برے اعمال ظاہر ہو جائیں گے۔

جب وہ تاریک چیز میرے قریب آئی تو میں نے دیکھا کہ وہ عورت ہے جس کے بدن پر اونی جبہ ہے اور ہاتھ میں ڈولچی ہے۔ اس نے مجھے دیکھ کر پوچھا تو کون ہے جو مجھ سے ڈر نہیں رہا ہے۔ میں نے کہا میں ایک اجنبی مسافر ہوں۔ وہ عورت کہنے لگی اللہ کے ہوتے ہوئے غربت اور سفر کے کیا معنی؟ میں اس کی یہ بات سن کر رونے لگا۔ اس نے کہا تو کیوں روتا ہے؟ میں نے جواب دیا کہ میرے زخم میں تکلیف تھی۔ تیری باتوں نے اس پر مرہم رکھ دیا اس لئے روتا ہوں۔ اس نے کہا اگر تو سچا ہے تو کیوں روتا ہے۔ میں نے کہا کیا سچے رویا نہیں کرتے؟ وہ کہنے لگی نہیں۔ میں نے پوچھا کیوں؟ اس نے جواب دیا اس لئے کہ رونا دل کی راحت میں ہوتا ہے۔ میں اس کی یہ بات سن کر تعجب میں رہ گیا۔ احمد ابن علی کہتے ہیں کہ ہم نے عفیرہ کے پاس حاضری کی اجازت چاہی مگر انہوں نے اجازت نہ دی لیکن ہم دروازے پر ہی ٹھہرے رہے۔ وہاں سے نہیں ہلے۔ مجبوراً وہ دروازہ کھولنے کے لئے اٹھیں اور یہ کہتے ہوئے دروازہ کھولا کہ اے اللہ! میں ان لوگوں سے تیری پناہ چاہتی ہوں جو تیرے ذکر میں رکاوٹ بنیں۔ ہم نے ان کے حجرے میں پہنچ کر عرض کیا کہ ہمارے لئے دعا فرمایئے۔ انہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ میرے گھر میں تمہاری ضیافت اس طرح کرے کہ تمہاری مغفرت فرمائے۔ پھر وہ ہم سے کہنے لگیں کہ عطاء السلمی نے چالیس برس تک آسمان کی طرف نظر نہیں اٹھائی۔ ایک مرتبہ آنکھ نے خیانت کی اور آسمان کی طرف دیکھ لیا تو شرمندگی کے باعث بے ہوش ہو کر گر پڑے اور پیٹ کا کوئی عضو خوف سے پھٹ گیا۔ کاش عفیرہ سر نہ اٹھائے' کاش اگر وہ کوئی نافرمانی کرلے تو دوبارہ نہ کرے۔ ایک بزرگ کہتے ہیں کہ میں ایک دن بازار کی طرف گیا۔ میرے ساتھ ایک حبشن باندی بھی تھی میں نے اسے بازار کے ایک گوشے میں ٹھہرنے کے لئے کہا اور اپنی ضرورت پوری کرنے چلا گیا۔ میں نے اسے تاکید کردی تھی کہ وہ اپنی جگہ سے اس وقت تک نہ ہلے جب تک میں واپس نہ آجاؤں لیکن جب میں واپس پہنچا تو وہ اپنی جگہ موجود نہ تھی۔ میں گھر واپس آگیا اس وقت مجھے شدید غصہ تھا۔ باندی نے میرے چہرے سے اندازہ کرلیا کہ میں سخت غصے میں ہوں۔ وہ کہنے لگی آقائے محترم! سزا دینے میں جلدی نہ کیجئے۔ جس جگہ آپ نے مجھے انتظار کرنے کے لئے کہا تھا۔ وہاں کوئی اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والا نہیں تھا اس لئے مجھے ڈر ہوا کہ کہیں وہ جگہ زمین کے اندر نہ دھنس جائے اس لئے میں اس ڈر سے چلی آئی۔ راوی کہتے ہیں کہ مجھے اس کی یہ گفتگو سن کر سخت تعجب ہوا اور میں نے اس سے کہا کہ آج سے تو آزاد ہے۔ اس نے کہا یہ آپ نے برا کیا میں آپ کی خدمت کیا کرتی تھی تو مجھے دوہرا اجر ملتا تھا اب میں ایک اجر سے محروم ہو گئی۔

ابن العلاء السعدی کہتے ہیں کہ میری چچازاد بہن بریرہ بڑی عبادت گذار و نہایت پرہیزگار خاتون تھیں۔ وہ کثرت سے تلاوت کلام اللہ کیا کرتی تھیں اور تلاوت کے دوران مسلسل روتی رہتیں۔ زیادہ رونے کے باعث ان کی آنکھیں ضائع ہو گئی تھیں۔ ایک مرتبہ ہم سب چچازاد بھائیوں نے پروگرام بنایا کہ بریرہ کے پاس جائیں گے اور اس قدر رونے پر اسے ملامت کریں گے۔ چنانچہ ہم سب اس کے یہاں پہنچے اور اس کی خیروعافیت دریافت کی۔ اس نے کہا ہم اجنبی مہمان زمین پر پڑے ہوئے ہیں اور منتظر ہیں کہ کوئی ہمیں بلائے اور ہم جائیں۔ ہم نے اس سے کہا کہ اس طرح کب تک روتی رہو گی۔ اب تو آنکھیں بھی چلی گئیں اس نے کہا اگر اللہ تعالیٰ کے یہاں میری آنکھوں کے لئے کچھ بہتری ہے تو مجھے ان کے ضائع جانے پر کوئی ملال نہیں ہے اور اگر اللہ کے یہاں ان کی کچھ برائی ہے تو پھر انہیں اور رونا چاہیے۔ ہم میں سے کسی شخص نے کہا یہاں سے چلو اس کا حال دوسرا ہے۔ اس کا حال ہمارے جیسا نہیں ہے۔ معاذ عدویہ دن نکلنے پر کہتیں یہ وہ دن ہے جس میں مجھے مرنا ہے۔ پھر وہ شام تک کچھ نہ کھاتیں۔ یہاں تک کہ رات آجاتی۔ وہ رات کے متعلق بھی یہی کہتیں کہ مجھے آج رات مرنا ہے۔ یہ کہہ کر نماز شروع کردیتیں اور صبح تک پڑھتی رہتیں۔ ابو سلیمان دارانی کہتے ہیں کہ میں نے ایک رات حضرت رابعہ عدویہ کے یہاں گذاری۔ رات شروع ہوتے ہی وہ اپنی عبادت گاہ میں جاکر کھڑی ہو گئیں۔ میں بھی ایک گوشے میں جاکھڑا ہوا۔ وہ صبح

تک نماز میں مصروف رہیں۔ میں نے صبح کو ان سے کہا کہ اس ذات گرامی کا شکریہ کس طرح ادا کیا جائے جس نے ہمیں آج کی رات قیام پر قوت بخشی ہے۔ انہوں نے فرمایا اس کا شکریہ اس طرح ہوگا کہ ہم کل صبح کو اس کی خاطر روزہ رکھیں گے۔

شعوانہ اپنی دعا میں یوں کہا کرتی تھیں اے اللہ! مجھے تیری ملاقات کا کتنا شوق ہے اور تیری جزاء پانے کی کس قدر امید ہے۔ تیری ذات کریم سے امید کرنے والوں کی امیدیں مایوسی سے نہیں بدلتیں اور نہ مشتاقین کا شوق ضائع جاتا ہے۔ اے اللہ! اگر میری موت کا وقت آچکا ہے اور میرے کسی عمل نے مجھے تجھ سے قریب نہ کیا ہو تو میں اپنے گناہوں کا اعتراف کرتی ہوں۔ اگر تو مجھے معاف کردے گا تو اس سلسلے میں تجھ سے بہتر کون ہے اور اگر مجھے عذاب دے گا تو تجھ سے زیادہ عادل کون ہے۔ اے اللہ! میں نے اپنے نفس کے لئے نظر کی جسارت کی۔ اب تیرے حسن نظر کی امید ہے۔ اگر تو نے اس پر نظر کرم نہیں فرمائی تو یہ تباہ و برباد ہوجائے گی۔ اے اللہ! تو نے تمام زندگی مجھ پر احسانات فرمائے ہیں مرنے کے بعد بھی مجھ سے اپنے احسانات کا سلسلہ منقطع نہ کرنا۔ جس ذات نے زندگی میں مجھے اپنے کرم و احسان کا مستحق سمجھا ہے اسی ذات سے مجھے یہ امید ہے کہ وہ موت کے بعد بھی مجھ پر بخشش کا دروازہ کھولے گا۔ اے اللہ! جب تو زندگی میں میرا ذمہ دار رہا تو مرنے کے بعد میں کیسے تیری نظر کرم سے مایوس ہوں! اے اللہ! ایک طرف مجھے میرے گناہ ڈراتے ہیں دوسری طرف جو محبت تجھ سے ہے اس سے دل مطمئن ہوتا ہے۔ میرے معاملے پر اپنی شان کے مطابق نظر کر اور اس شخص کو بھی اپنے فضل و احسان سے محروم نہ کر جو جہالت کے نشے میں مدہوش ہے۔ اے اللہ! اگر تو میری رسوائی چاہتا تو مجھے ہدایت کیوں دیتا اور اگر میری ذلت چاہتا تو میرے گناہوں کی پردہ پوشی کیوں فرماتا؟ اے اللہ! جس سبب سے تو نے مجھے ہدایت دی ہے اسے باقی رکھ اور جس سبب سے تو میری پردہ پوشی کرتا ہے اسے دائم رکھ۔ اے اللہ! میں نہیں سمجھتی کہ جس مقصد کے لئے میں نے عمر لگائی ہے اسے تو نامنظور کردے گا۔ اگر میں نے گناہ نہ کئے ہوتے تو مجھے تیرے عذاب کا خوف نہ ہوتا اور اگر مجھے تیرے کرم کا علم نہ ہوتا تو میں تیرے اجر اور ثواب کی امیدوار نہ ہوتی۔

حضرت خواص فرماتے ہیں کہ ہم رحلہ عابدہ کے یہاں گئے۔ انہوں نے اتنے روزے رکھے تھے کہ سیاہ پڑگئی تھیں اور اس قدر آنسو بہائے تھے کہ آنکھوں سے محروم ہوگئی تھیں اور اس قدر نمازیں پڑھی تھیں کہ چلنے پھرنے سے معذور ہوگئی تھیں۔ جس وقت ہم لوگ ان کے پاس پہنچے وہ بیٹھی ہوئی نماز پڑھ رہی تھیں۔ ہم نے انہیں سلام کیا اور اللہ تعالیٰ کے عفو و کرم اور فضل و احسان پر کچھ گفتگو کی تاکہ وہ اپنے نفس پر قدرے نرمی کریں۔ ہماری بات سن کر انہوں نے ایک چیخ ماری اور کہنے لگیں کہ میں اپنے نفس سے زیادہ واقف ہوں۔ اس لئے میرا دل زخمی ہے اور کلیجہ چھلنی ہے۔ سوچتی ہوں کاش اللہ تعالیٰ مجھے پیدا نہ فرماتا اور میں کوئی قابل ذکر چیز نہ ہوتی پھر وہ نماز پڑھنے لگیں۔

اگر تم نفس کے ساتھ شرط لگانے والوں میں سے ہو اور مراقبہ کرنے والوں سے تعلق رکھتے ہو تو تمہیں ان بزرگ مردوں اور عورتوں کے حالات زندگی کا مطالعہ کرنا چاہیے تاکہ تمہیں عمل پر نشاط حاصل ہو اور عبادت کی حرص پیدا ہو تمہیں اپنے زمانے کے لوگوں کی طرف نہ دیکھنا چاہیے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِى الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (پ ۸' ر ۱' آیت ۱۱۷)

(ترجمہ) اور دنیا میں اکثر لوگ ایسے ہیں کہ اگر آپ ان کا کہنا ماننے لگیں تو وہ آپ کو اللہ کی راہ سے بے راہ کردیں۔

مجتہدین کے واقعات اتنے زیادہ ہیں کہ ان کا احاطہ نہیں کیا جاسکتا۔ ان صفحات میں ہم نے جو کچھ ذکر کردیا ہے وہ عبرت پکڑنے والوں کے لئے بہت کافی ہے۔ اگر تمہیں مزید کی ضرورت ہو تو حلیۃ الاولیاء نامی کتاب کا مطالعہ کرو۔ اس میں صحابہ کرام' تابعین عظام اور بعد کے بزرگان دین کے احوال مذکور ہیں۔ اس کتاب کے مطالعے سے واضح ہوگا کہ تم اور

تمہارے ابنائے زمانہ ان بزرگوں سے کتنے دور ہیں۔ اب اگر تمہارا نفس یہ کہے کہ اپنے زمانے کے لوگوں کو دیکھو کیونکہ اسی زمانے میں خیر ہے اور دین کے مددگاروں کی کثرت ہے۔ نیز اگر تم دوسرے زمانے کے لوگوں کی اتباع کروگے تو لوگ تمہاری ہنسی اڑائیں گے اور دیوانہ کہیں گے۔ نفس یہ دلیل بھی دیتا ہے کہ تم اس زمانے کے لوگوں کی تقلید کرو۔ اس لئے جس مصیبت میں تمہارے زمانے والے مبتلا ہوں گے اسی میں تم بھی مبتلا ہوگے اور جس عذاب سے وہ دوچار ہوں گے اسی سے تم بھی دوچار ہوگے۔ تم تنہا اس مصیبت اور عذاب میں مبتلا نہیں ہوگے پھر کیا پریشانی ہے۔ دیکھو نفس کے فریب میں مت آنا اور نہ اس کی دلیل سے متاثر ہونا۔ نفس سے تمہیں یہ پوچھنا چاہیے کہ اگر کسی شہر میں زبردست سیلاب آنے کا خطرہ ہو اور یہ اندیشہ ہو کہ اس سیلاب میں شہر کی تمام آبادی بہہ جائے گی لیکن تم کشتی وغیرہ کے ذریعہ اس سے بچ نکل سکتے ہو تو کیا یہ بات عقل کے مطابق ہوگی کہ تم اسی شہر میں مقیم رہو اور یہ سوچ کہ جو سب کا حال ہوگا وہی میرا ہوگا پھر مجھے کیا ضرورت ہے کہ میں سیلاب سے بچنے کی تدبیر کروں اور کشتی وغیرہ کھینے کی مشقت جھیلوں۔ ظاہر ہے کوئی بھی سلیم العقل انسان اسے دانائی نہیں کہہ سکتا بلکہ ہر عقلمند انسان اس سے بچنے کی کوشش کرتا ہے۔ جب ایک عارضی اذیت کے سلسلے میں۔ جو چند لمحوں سے زیادہ باقی نہیں رہتی۔ لوگوں کا عالم یہ ہے کہ وہ اس سے بہرصورت بچنے کی کوشش کرتے ہیں تو تم اس عذاب سے کیوں نہیں بچتے۔ جو ہمیشہ کے لئے ہوگا اور نفس کا یہ کہنا کہ مصیبت عام ہو تو اچھی لگتی ہے ایک بے بنیاد بات ہے۔ ہوسکتا ہے دنیا میں مصیبتیں عام ہونے سے اچھی ہوجاتی ہوں مگر آخرت میں ایسا نہیں ہوگا۔ وہاں دوزخیوں کو اس قدر فرصت کب ہوگی کہ وہ ایک دوسرے کو دیکھیں اور ان کے مصائب دیکھ کر اپنے مصائب پر خوش ہوں۔ دیکھو کفار محض اسی لئے ہلاک ہوئے ہیں کہ انہوں نے اپنے زمانے کے لوگوں کی تقلید کی تھی اور انہیں اسوۂ بنایا تھا جیسا کہ قرآن کریم نے ان کا قول نقل کیا ہے۔

إِنَّا وَجَدْنَا آبَاءَنَا عَلَىٰ أُمَّةٍ وَإِنَّا عَلَىٰ آثَارِهِم مُّقْتَدُونَ (پ ۲۵، ر ۸، آیت ۲۳)

(ترجمہ) ہم نے اپنے باپ دادوں کو ایک طریقے پر پایا ہے اور ہم بھی ان کے پیچھے چلے جاتے ہیں۔

بہرحال اگر تم اپنے نفس کو عتاب نہ کرو اور اسے مجاہدہ پر اکساؤ اور وہ تمہاری نافرمانی کرے تو تمہیں زجر و توبیخ اور عتاب و ملامت کا سلسلہ منقطع نہ کرنا چاہئے بلکہ اسے اس کی سوء عاقبت سے ڈراتے رہنا چاہیے ہوسکتا ہے وہ کسی دن اپنی سرکشی سے باز آجائے۔

چھٹا مقام نفس کو عتاب کرنا

تمہارا سب سے بڑا دشمن خود تمہارے دونوں پہلوؤں کے درمیان واقع نفس ہے۔ اس کی تخلیق میں یہ بات رکھ دی گئی ہے کہ وہ بدی کا حکم کرتا ہے، شر کی طرف مائل ہوتا ہے اور خیر سے راہ فرار اختیار کرتا ہے اس کے متعلق یہ حکم دیا گیا ہے کہ اس کا تزکیہ کیا جائے اور اس کا ٹیڑھا پن دور کیا جائے اور اسے جبر و اکراہ سے روکا جائے۔ اگر تم نے اسے ڈھیل دی تو وہ سرکش بن جائے گا اور تمہارے قابو سے باہر ہوجائے گا۔ اس کے بعد تم اسے پا نہ سکوگے اور اگر تم اس کو ڈانٹتے ڈپٹتے رہے اور اللہ کے عذاب سے ڈراتے رہے تو وہی نفس نفس لوامہ بن جاتا ہے جس کی اللہ تعالیٰ نے قسم کھائی ہے اور یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ یہ نفس بتدریج نفس مطمئنّہ بن جائے گا جسے یہ دعوت دی گئی ہے کہ وہ اللہ کے مخلص بندوں کے زمرے میں شامل ہوجائے اس طرح کہ وہ خود بھی اللہ تعالیٰ سے راضی ہو اور اللہ بھی اس سے راضی ہو۔ اس لئے تم کسی بھی لمحے نفس کی طرف سے غافل مت رہو بلکہ اسے سمجھاتے رہو وعظ و نصیحت کرتے رہو اور لعنت و ملامت کرتے رہو تمہیں کسی دوسرے کو اس وقت تک وعظ و نصیحت نہ کرنی چاہیے جب تک تم خود اپنے نفس کو وعظ و نصیحت نہ کرلو۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰؑ پر وحی نازل فرمائی کہ اے مریم کے بیٹے! پہلے اپنے نفس کو نصیحت کرو جب اسے نصیحت کرچکو تب لوگوں کو نصیحت کرو ورنہ مجھ سے شرماؤ۔ ارشاد خداوندی ہے۔

وَذَكِّرْ فَإِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ (پ ۲۷ ' ر ۲ ' آیت ۵۵)
(ترجمہ) اور سمجھاتے رہئے کیونکہ سمجھانا ایمان والوں کو (بھی) نفع دے گا۔

اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے اپنے نفس پر متوجہ ہو اور اس سے کہو کہ تو کتنا بے وقوف اور کس قدر نادان ہے کہ اپنے آپ کو ذہین' دانا اور حکیم تصور کرتا ہے لیکن آنے والی زندگی کے متعلق کچھ نہیں سوچتا۔ جنت اور دوزخ تیرے سامنے ہیں اور تجھے ان میں سے ایک میں عنقریب جانا ہے۔ اس کے باوجود تو خوش ہوتا ہے قہقہے لگاتا ہے اور لہو و لعب میں مشغول ہوتا ہے حالانکہ تو ایک خطرناک مرحلے سے دوچار ہونے والا ہے' موت تیری منتظر ہے' ہوسکتا ہے آج یا کل موت تجھے اپنے پنجوں میں جکڑ لے۔ تو سمجھتا ہے کہ موت تجھ سے دور ہے ہوسکتا ہے وہ اللہ کے علم میں نہایت قریب ہو ویسے بھی جو چیز آنے والی ہے وہ قریب ہی ہوتی ہے اور جو آنے والی نہیں ہوتی اسے بعید کہا جاتا ہے۔ کیا تو نہیں جانتا کہ موت تجھے اچانک آپکڑے گی۔ نہ اس سے پہلے کوئی قاصد آئے گا۔ نہ اطلاع آئے گی۔ نہ تاریخ اور وقت مقرر ہوگا نہ موت کی آمد کسی خاص موسم کے ساتھ مخصوص ہے کہ یہ کہا جاسکے کہ گرمی میں آئے گی۔ سردی میں نہیں آئے گی۔ یا سردی میں آئے گی۔ گرمی میں نہیں آئے گی۔ نہ موت کے لئے رات اور دن کی قید ہے' نہ بڑھاپے اور جوانی کی تخصیص بلکہ انسان کا ہر سانس آخری ہوسکتا ہے اور ہر لمحہ موت کا پیغامبر بن سکتا ہے اگر اچانک موت نہیں آتی تو مرض اچانک آجاتا ہے اور وہ موت کی طرف لے جاتا ہے۔ پھر کیا بات ہے تو موت کے لئے تیاری نہیں کرتا حالانکہ وہ تیری رگ جاں سے بھی قریب ہے۔ کیا تو اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں غور نہیں کرتا۔

اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِيْ غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ مَا يَأْتِيْهِمْ مِّنْ ذِكْرٍ مِّنْ رَّبِّهِمْ مُّحْدَثٍ اِلَّا اسْتَمَعُوْهُ وَهُمْ يَلْعَبُوْنَ لَاهِيَةً قُلُوْبُهُمْ (پ ۱۷' ر ۱' آیت ۳)
(ترجمہ) ان لوگوں سے ان کا وقت حساب قریب آپہنچا اور یہ (ابھی) غفلت (ہی) میں (پڑے ہیں) اور اعراض کئے ہوئے ہیں۔ ان کے پاس ان کے رب کی طرف سے جو نصیحت تازہ آتی ہے یہ اس کو اس طور سے سنتے ہیں کہ اس کے ساتھ ہنسی کرتے ہیں ان کے دل متوجہ نہیں ہوتے۔

اگر تو اللہ تعالیٰ کی معصیت پر اس لئے جرأت کرتا ہے کہ تیرا اعتقاد یہ ہے کہ اللہ تیرے اعمال کا نگراں نہیں ہے تو یہ تیرا کفر ہے اور اگر تو اللہ کو اپنے اعمال کا نگراں سمجھ کر بھی معصیت کرتا ہے تو یہ بڑی بے شرمی اور بے حیائی کی بات ہے' اے نفس! اگر تیرے سامنے تیرا کوئی غلام نافرمانی کرتا ہے' یا تیرا بھائی حکم عدولی کرتا ہے تو تو کس قدر غضب ناک ہوتا ہے' اور اسے کتنا برا سمجھتا ہے' پھر تو کس جسارت کی بنا پر اللہ تعالیٰ کے غضب شدید' سخط عظیم اور عقاب الیم کا سامنا کرنے پر تیار ہے' کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ اس کا عذاب برداشت کرے گا' ہرگز نہیں' یہ تیری خام خیالی ہے' اگر تو ہماری بات پر یقین نہیں کرتا تو تجربہ کرلے اور کچھ دیر کے لئے سخت دھوپ میں کھڑا ہوجا' یا گرم حمام میں کچھ لمحوں کے لئے اپنے آپ کو محبوس کرلے' یا اپنی انگلی آگ کے شعلے پر رکھ اور دیکھ کہ تیرے اندر یہ تکلیف برداشت کرنے کی کس قدر قوت ہے' ایسا تو نہیں کہ تجھے اللہ کے فضل و کرم اور تیری عبادت و اطاعت سے اس کی بے نیازی کا فریب ہو' اگر ہمارا خیال صحیح ہے تو ہم پوچھتے ہیں کہ تو دنیاوی معاملات میں اللہ تعالیٰ کے کرم پر بھروسا کیوں نہیں کرتا' اور کس لئے ذاتی تدبیریں بروئے کار لاتا ہے مثلاً" جب کوئی دشمن تجھ پر حملہ آور ہوتا ہے تو تو اس خیال سے خاموش نہیں بیٹھتا کہ اللہ تعالیٰ کی مدد اور فضل و کرم پر یقین رکھتا ہے جبکہ اس کے شر سے محفوظ رہنے کے لئے اپنی پوری قوت اور طاقت استعمال کرتا ہے۔ اسی طرح جب تجھے کوئی ایسی دنیاوی ضرورت پیش آتی ہے جس کی تکمیل درہم و دینار کے بغیر ممکن نہ ہو تو درہم و دینار کے حصول کے لئے سردھڑ کی بازی لگادیتا ہے۔ ہم پوچھتے ہیں کہ اس وقت تو اللہ تعالیٰ کے کرم پر بھروسا کیوں نہیں کرتا کہ وہ تجھے کسی خزانے کا علم دیدے یا تیری

اعانت کے لئے اپنے کسی بندے کو مسخر کردے اور تیری کسی کاوش و سعی کے بغیر تیری مطلوبہ شئے فراہم کردے۔ کیا تو سمجھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ صرف دنیا میں کریم ہے۔ آخرت میں کریم نہیں ہے۔ تو یہ بات اچھی طرح جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی سنّت اور طرز عمل میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ دنیا و آخرت کا مالک اور پروردگار ایک ہے تو یہ بھی جانتا ہے کہ انسان کو کوشش کے بغیر کچھ نہیں ملتا۔ اے ملعون نفس! ہمیں تیرے نفاق پر حیرت ہوتی ہے اور تیرے باطل دعووں پر تعجب ہوتا ہے تو اپنی زبان سے ایمان کا دعویٰ کرتا ہے اور نفاق کا اثر تجھ پر ظاہر ہے۔ کیا تیرے آقا و مولیٰ نے تجھ سے یہ نہیں فرمایا۔

وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا۔ (پ ۱۲' ر ۱' آیت ۶)

اور کوئی جانور روئے زمین پر چلنے والا ایسا نہیں کہ اس کا رزق اللہ تعالیٰ کے ذمے نہ ہو۔

اور کیا آخرت کے متعلق یہ ارشاد نہیں فرمایا۔

وَأَنْ لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ (پ ۲۷' ر ۷' آیت ۳۹)

اور نہیں ہے انسان کے لئے وہ مگر جو کوشش کرے۔

ان دونوں آیتوں سے پتا چلتا ہے کہ اس نے دنیاوی امور میں تیرے تکفل کا وعدہ کیا ہے لیکن آخرت کے باب میں تیری سعی اور جدوجہد کو مدار قرار دیا ہے لیکن تو نے اپنے افعال سے ان آیات کی تکذیب کردی ہے اب تو طلب دنیا میں ایسے مشغول ہے جیسے کوئی کتا اردگرد کے ماحول سے بے خبر ہڈی بھنبھوڑنے میں مصروف ہو اور آخرت سے نہایت مغرورانہ انداز میں روگرداں ہو اور مابعد الموت کے واقعات کو حقیر سمجھ کر نظرانداز کئے ہوئے ہو۔ یہ ایمان کی علامت نہیں ہے۔ اگر ایمان کا تعلق محض زبان سے ہوتا تو منافقین دوزخ کے نچلے طبقے میں کیوں ہوتے۔ ہمیں تو ایسا لگتا ہے کہ تجھے یوم حساب کا یقین نہیں ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ مرنے کے بعد تو ہر طرح کے قید و بند سے آزاد ہو جائے گا۔ تیرا یہ گمان غلط ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ أَيَحْسَبُ الْإِنْسَانُ أَنْ يُتْرَكَ سُدًى ۔ أَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِنْ مَنِيٍّ يُمْنَىٰ ۔ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوَّىٰ فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْأُنْثَىٰ أَلَيْسَ ذَٰلِكَ بِقَادِرٍ عَلَىٰ أَنْ يُحْيِيَ الْمَوْتَىٰ۔ (پ ۲۹' ر ۱۸' آیت ۳۶-۴۰)

کیا انسان یہ خیال کرتا ہے کہ یوں ہی مہمل چھوڑ دیا جائے گا کیا یہ شخص (ابتداء ہی میں محض) ایک قطرۂ منی نہ تھا جو (عورت کے رحم میں) ٹپکایا گیا تھا پھر وہ خون کا لوتھڑا ہو گیا پھر اللہ تعالیٰ نے (اس کو انسان) بنایا پھر اعضاء درست کئے۔ پھر اس کی دو قسمیں کردیں' مرد اور عورت (تو) کیا (خدا) اس بات پر قدرت نہیں رکھتا کہ (قیامت میں) مردوں کو زندہ کرے۔

اگر تیرا خیال یہ ہے کہ تجھے ویسے ہی چھوڑ دیا جائے گا تو یہ تیرا جہل اور کفر ہے تو اپنے متعلق سوچ کہ کیا تو شروع ہی سے ایسا تھا جیسا اس وقت ہے۔ تیری حقیقت ہی کیا تھی۔ تو منی کا ایک قطرہ تھا' اسی سے تجھے وجود ملا' پھر کیا یہ ناممکن ہے کہ اللہ تجھے موت دینے کے بعد دوبارہ زندگی دے' وہ خود فرماتا ہے۔

قُتِلَ الْإِنْسَانُ مَا أَكْفَرَهُ ۔ مِنْ أَيِّ شَيْءٍ خَلَقَهُ ۔ مِنْ نُطْفَةٍ خَلَقَهُ فَقَدَّرَهُ ۔ ثُمَّ السَّبِيلَ يَسَّرَهُ ۔ ثُمَّ أَمَاتَهُ فَأَقْبَرَهُ ۔ ثُمَّ إِذَا شَاءَ أَنْشَرَهُ (پ ۳۰' ر ۵' آیت ۱۷-۲۲)

خدا کی مار وہ کیسا ناشکر ہے' اللہ تعالیٰ نے اس کو کیسی (حقیر) چیز سے پیدا کیا نطفے سے پیدا کیا' اس کی صورت بنائی' پھر اس (کے اعضاء) کو اندازے سے بنایا پھر اس کو (نکلنے کا) راستہ آسان کردیا۔ پھر موت دی' پھر اس کو قبر میں لے گیا پھر جب اللہ چاہے گا اسے دوبارہ زندہ کرے گا۔

اگر تو موت کے بعد کی زندگی پر یقین رکھتا ہے تو اس کے لئے تیاری کیوں نہیں کرتا۔ دنیاوی معاملات میں تو تیرا حال یہ ہے کہ اگر یہودی تجھے یہ بتلائے کہ فلاں لذیذ ترین غذا تیری صحت کے لئے سخت نقصان دہ ہے تو اس سے صبر کرتا ہے اسے ہاتھ نہیں لگاتا اور نفس کو اس کے ترک پر مجبور کرتا ہے۔ خواہ تجھے اس سلسلے میں کتنا ہی مجاہدہ کیوں نہ کرنا پڑے مگر دوسری طرف تیرا عالم یہ ہے کہ انبیائے کرام' جن کی تائید و توثیق معجزات کے ذریعے کی گئی ہے کے اقوال کو نظرانداز کر دیتا ہے اور آسمانی کتابوں میں لکھے ہوئے احکام الٰہی پر ایک سرسری نظر ڈال کر گذر جاتا ہے' کیا اللہ و رسول کے ارشادات کی تیرے نزدیک اتنی بھی اہمیت نہیں جتنی ایک بے دین یہودی کی ہے جو محض ظن و تخمین اور قیاس و استقراء کو بنیاد بنا کر حکم لگاتا ہے جس کے پاس یقینی حکم لگانے کا کوئی ذریعہ بھی نہیں ہے پھر وہ یہودی بھی ایسا جس کا علم بھی ناقص ہے اور سمجھ بھی ناقص ہے۔ یہودی کی بات تو پھر دوسری ہے ہمیں تو اس وقت حیرت کا شدید جھٹکا لگتا ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اگر کوئی بچہ تجھے یہ بتلائے کہ تیرے کپڑوں میں بچھو ہے تو تو اسی لمحے کپڑے اتار کر پھینک دیتا ہے۔ یہ اس سے کسی دلیل کا مطالبہ کرتا ہے' اور نہ حجت کا طالب ہوتا ہے' کیا تیرے نزدیک انبیاء' علماء' حکماء اور اولیاء کے ارشادات کی وقعت اتنی بھی نہیں جتنی ایک بچے کے قول کی ہے' جسے ساری دنیا کے لوگ ناتجربہ کار اور کم عقل کہتے ہیں۔ کیا دنیا کے ایک حقیر بچھو کی تیرے نزدیک اس قدر اہمیت ہے کہ جہنم کی تپش' اس کے طوق و سلاسل' گرز' خون' پیپ' باد سموم اور سانپ بچھوؤں کی اتنی اہمیت نہیں ہے' اسی لئے تو دنیا کے بچھو کا احساس کرتے ہی کپڑے اتار پھینکتا ہے' اور ایک بچے کے کہنے پر اس سے بچنے کی سعی کرتا ہے' جبکہ انبیائے کرام تجھے دوزخ کے ہولناک بچھوؤں' خطرناک سانپوں اور اژدہوں سے ڈراتے ہیں مگر تیرے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی۔ کیا یہ دانائی ہے' کیا اسے کسی ہوشمند انسان کا طرز عمل کہا جاسکتا ہے۔ ہم تو یہاں تک کہتے ہیں کہ اگر بہائم پر تیرا حال منکشف ہوجائے تو وہ تیرا مذاق اڑائیں اور تیری عقل و فہم کا ماتم کریں۔

اے بدبخت نفس! اگر تو ان تمام باتوں پر یقین رکھتا ہے اور انہیں سچ مانتا ہے تو پھر عمل میں ٹال مٹول کیوں کرتا ہے حالانکہ موت گھات لگائے بیٹھی ہے' ہوسکتا ہے وہ تجھے توبہ کی مہلت دیئے بغیر اچک لے۔ اگر تجھے موت کا یقین ہے اور یہ بھی جانتا ہے کہ موت دفعتاً" بھی آسکتی ہے تو پھر کس خوش فہمی میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا ہے۔ اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ تجھے اللہ تعالیٰ نے سو برس کی مہلت عطا کی ہے لیکن کیا یہ سو برس کی مدّت بغیر طے کئے پوری ہوجائے گی اور کیا کوئی کام کئے بغیر خود بخود ہوجائے گا۔ کیا کوئی شخص سواری کو چارہ دیئے بغیر اس پر سوار ہوسکتا ہے اور دشوار گذار راہیں طے کرسکتا ہے اگر تو ایسا سمجھتا ہے تو یہ تیری بھول ہے۔ ہم تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ایک مسافر کسی غیر وطن میں فقہ کا علم حاصل کرنے کے لئے جاتا ہے اور وہاں چند برس اس حال میں گذارتا ہے کہ نہ اس نے کسی استاذ سے رابطہ قائم کیا' نہ کوئی کتاب ہاتھ میں لی' نہ کسی مدرسے میں داخلہ لیا بس اپنے آپ کو یہ تسلی دیتا رہا کہ بس کل سے حصول علم کا سفر شروع کروں گا لیکن اس کی کل کبھی نہیں آتی۔ یہاں تک کہ وطن واپسی کا وقت آجاتا ہے۔ کیا تجھے اس کم عقل انسان پر ہنسی نہیں آئے گی کہ وہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھا رہا اور یہ سمجھتا رہا کہ مجھے فقہاء کا منصب خود بخود حاصل ہوجائے گا اور جب یہاں سے رخصت ہوں گا تو ایک بڑا فقیہہ بن کر رخصت ہوں گا مگر کیونکہ یہ ممکن نہیں ہے اس لئے خالی ہاتھ رخصت ہوتا ہے۔

پھر اگر یہ مان لیا جائے کہ مجاہدہ یا کوشش آخر عمر میں مفید ہوتی ہے اور یہ کہ آخری ایام کا مجاہدہ اعلیٰ درجات تک پہنچاتا ہے لیکن تو یہ کیسے کہہ سکتا ہے کہ جس دن کو تو نے خوش آمدید کہا ہے وہ تیری زندگی کا آخری دن نہیں ہے اور ابھی تیری زندگی کے شب و روز باقی ہیں۔ ہوسکتا ہے یہی دن آخری ہو اور یہی لمحے موت کو لبیک کہنے پر مجبور ہوجائیں۔ چلئے مان لیتے ہیں کہ تجھ پر مہلت کی وحی نازل ہوئی ہے لیکن آخر عمل کی طرف سبقت کرنے میں کیا مضائقہ ہے۔ ہم تو یہی سمجھتے ہیں کہ تو شہوات سے رکنا نہیں چاہتا کیونکہ ان سے رکنے میں تجھے مشقت محسوس ہوتی ہے اور تو اپنی شہوات کی مخالفت پر قادر نہیں ہے۔ اگر تو عمل کے لئے کسی ایسے دن کا انتظار کررہا ہے جس میں شہوت کی مخالفت تکلیف دہ نہ ہو تو ایسا دن آنے والا نہیں ہے۔ نہ اللہ نے کوئی ایسا دن

پیدا کیا ہے اور نہ پیدا کرے گا۔ جنت ناپسندیدہ چیزوں، مصیبتوں اور مشقتوں سے گھری ہوئی ہے اور یہ چیزیں نفوس پر کبھی سہل نہیں ہوتیں۔

اے نفس! تیرا یہ وعدہ کوئی نیا نہیں ہے۔ تو ایک عرصہ دراز سے اعمال کو کل پر ٹلا رہا ہے۔ نہ جانے کتنے کل آکر آج میں تبدیل ہو گئے لیکن تو نے کوئی جنبش نہیں کی اور آج بھی اسی وعدۂ فردا میں مصروف ہے۔ ہمارے خیال سے تو کسی بھی "کل" میں عمل نہیں کر سکتا بلکہ تو عمل سے عاجز ہی نظر آتا ہے۔ اس لئے کہ شہوت ایک درخت کی طرح ہے جس کی جڑیں روز بروز مضبوط ہوتی چلی جاتی ہیں۔ اگر اسے اسی وقت اکھاڑ پھینکا جائے جس وقت وہ ایک پودا ہو یا ایک کمزور درخت ہو تو اس میں کوئی خاص دشواری نہیں ہوتی لیکن جب وہ ایک تناور درخت بن جاتا ہے اور اس کی جڑیں زمین میں اور شاخیں آسمان میں وسیع ہو جاتی ہیں تو اسے اکھاڑنا آسان نہیں ہوتا۔ جیسے کوئی شخص نوجوانی کی حالت میں ایک درخت کو اکھاڑنے کا ارادہ کرے پھر اسے امروز فردا پر ٹلاتے ٹلاتے بوڑھا ہو جائے اور بڑھاپے میں اکھاڑنے کی کوشش کرے تو اسے اکھاڑ نہیں پاتا۔ اول تو اس لئے کہ وہ خود بھی ضعیف ہو گیا ہے، دوسرے اس لئے کہ درخت زمین میں راسخ ہو چکا ہے۔ معلوم ہوا جس درخت کو تم جوانی میں نہیں اکھاڑ سکے اسے بڑھاپے میں بھی نہ اکھاڑ پاؤ گے۔ حقیقت یہ ہے کہ بڑھاپے کی ریاضت ایک زبردست مشقت ہے چنانچہ مثالیں مشہور ہیں کہ کلر ملوطے نہیں پڑھتے یا بھیڑئیے کو تہذیب سکھلانا عذاب مول لینا ہے یا نرم شاخ جھک سکتی ہے۔ جب وہ سوکھ جاتی ہے تو اس کا موڑنا یا جھکانا مشکل ہو جاتا ہے۔

نفس کو کچھ اور قیمتی نصیحتیں :

اے نفس! اگر تو یہ واضح امور نہیں سمجھ سکتا، اور ٹال مٹول کرنا اپنا شیوہ بناتا ہے تو خود کو دانشمند کیوں سمجھتا ہے بھلا اس سے بڑھ کر کیا حماقت ہوگی کہ روز روشن کی طرح واضح باتیں بھی نہ سمجھ پائے، شاید تو یہ بھی کہے کہ میں عمل صالح پر مواظبت اس لئے نہیں کر سکتا کہ مجھے لذات شہوت کی حرص ہے، اور تکلیفوں اور مشقتوں پر صبر کرنا میرے لئے نہایت دشوار ہے، تیرا یہ قول بھی نہایت احمقانہ ہے، اگر تجھے لذات و شہوات کی حرص ہے تو وہ لذتیں اور شہوتیں کیوں تلاش نہیں کرتا جو ہمیشہ رہنے والی ہیں، اور ہر طرح کی کدورتوں سے صاف ہیں، مگر یہ شہوتیں جنت میں ملتی ہیں، دنیا میں نہیں ملتیں، اور ان کے ملنے کی صورت یہ ہے کہ تو دنیا کی شہوات سے صرف نظر کرے، ورنہ بسا اوقات ایک لقمے کی وجہ سے بہت سے لقموں سے محروم رہنا پڑتا ہے، ہم تجھ سے پوچھتے ہیں کہ اگر کوئی حکیم کسی مریض سے یہ کہے کہ تین دن ٹھنڈا پانی مت پینا، اگر تم نے میری ہدایت کی خلاف ورزی کی تو تمام عمر ٹھنڈے پانی سے محروم رہو گے، اور اگر میری بات مان لی تو زندگی بھر ٹھنڈے پانی سے لطف لو گے، کیونکہ تین دن کے دوران ٹھنڈے پانی کے استعمال سے تمہیں ایک سنگین مرض لاحق ہو جائے گا بھلا اس صورت میں عقل رکھنے والا مریض حکیم کی ہدایت پر عمل کرے گا یا ٹھکرا دے گا، ظاہر ہے عقل کا تقاضا یہی ہے کہ وہ زندگی بھر کی لذت حاصل کرنے کے لئے تین دن کی لذت سے دستبردار ہو جائے، محض اس خوف سے حکیم کی ہدایت پر عمل نہ کرنا کہ تین دن تک صبر کرنا مشکل ہو جائے گا اور یہ کہ شہوت کے خلاف کرنے کی طاقت نہیں ہے، اگر دیکھا جائے تو اخروی زندگی کے مقابلے میں دنیوی زندگی کی مثال ایسی ہی ہے جیسے انسان کی تمام زندگی کے مقابلے میں تین دن بلکہ آخرت کی عیش جاودانی کے مقابلے میں دنیا کی حیات ناپائدار ان تین دن سے بھی زیادہ حقیر اور بے حقیقت ہے، خواہ کوئی کی عمر کتنی ہی طویل کیوں نہ ہو، کیوں کہ دنیا و آخرت کے تقابل میں محدود کی نسبت لا محدود کی طرف کی گئی ہے، ظاہر ہے دنیا محدود ہے، اور آخرت لا محدود، جبکہ آدمی کی عمر اور تین دن کے تقابل میں محدود کی نسبت محدود ہی کی طرف کی گئی ہے۔

اے نفس! تو شہوات اور لذات سے صبر نہیں کر سکتا کیونکہ اس میں تکلیف ہے، ہم پوچھتے ہیں کیا شہوات سے رکنے کی تکلیف دوزخ کی دائمی اذیت سے زیادہ ہے؟ جو شخص مجاہدہ کی تکلیف برداشت نہیں کر سکتا وہ جہنم کی تکلیف کیسے برداشت کر سکتا ہے، ہمارا خیال تو یہ ہے کہ تیرا مجاہدے سے اعراض کرنا اور اپنے اوپر سختی نہ کرنا دو حال سے خالی نہیں ہے، یا تو اس کی وجہ وہ کفر ہے جو تو نے اپنے اندر مخفی رکھا ہے، یا وہ حماقت ہے جو بالکل واضح ہے، کفر خفی تو یہ ہے کہ یوم حساب پر تیرا ایمان کمزور ہے،

اور تو ثواب و عتاب کی مقدار کی صحیح معرفت نہیں رکھتا' اور واضح حماقت یہ ہے کہ تو اللہ کے کرم اور اس کے فضل و مغفرت پر اعتماد رکھتا ہے' لیکن اس پر یقین نہیں رکھتا کہ وہ اپنے بعض بندوں کو نافرمانی کے باعث فوری سزا نہیں دیتا بلکہ انہیں ڈھیل دیتا ہے' اور نہ تجھے اس کا یقین ہے کہ وہ تیری عبادت سے بے نیاز ہے' پھر تجھے اللہ کے عفو و کرم پر تو بھروسا ہے لیکن روٹی کے ایک نوالے میں یا سیم و زر کے حقیر ٹکڑے میں یا مخلوق سے کوئی کلمہ سننے میں اس پر اعتماد نہیں ہے' بلکہ انکی حصول کے لئے ہزار حیلے بہانے کرتا ہے' اور اپنی تمام تر تدبیریں بروئے کار لاتا ہے' اسی جہالت کی بناء پر تجھے دربار نبوت سے احمق کا خطاب ملا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :۔

اَلْكَيِّسُ مَنْ دَانَ نَفْسَهُ وَعَمِلَ لِمَا بَعْدَ الْمَوْتِ وَالْاَحْمَقُ مَنْ اَتْبَعَ نَفْسَهُ هَوَاهَا وَتَمَنّٰى عَلَى اللّٰهِ الْاَمَانِىَّ۔

عقل مند وہ ہے جس کا نفس مطیع ہو' اور جو موت کے بعد کی زندگی کے لئے عمل کرے' اور احمق وہ ہے کہ اپنے نفس کو اس کی خواہشوں کا تابع کردے اور اللہ تعالیٰ سے امیدیں رکھیں۔

اے بدبخت نفس! تجھے دنیا کی زندگی سے دھوکا نہ کھانا چاہیے' اور نہ اللہ تعالیٰ سے کسی چیز میں غلط فہمی کا شکار ہونا چاہیے' بلکہ تو اپنی فکر خود کر' تجھے کسی دوسرے سے کوئی مطلب نہ ہونا چاہیے' اور نہ کسی دوسرے کے لئے تیری ذات اہم ہو سکتی ہے' اپنے اوقات ضائع مت کر' سانسیں بہت محدود ہیں' تیرے ایک سانس کے ساتھ تجھ میں کمی واقع ہو جاتی ہے' بیماری سے پہلے صحت کو' مصروفیت سے پہلے فراغت کو' تنگدستی سے پہلے مالداری کو' بڑھاپے سے پہلے جوانی کو اور موت سے پہلے زندگی کو قیمت سمجھ' اور آخرت کی اسی قدر تیاری کر جس قدر تجھے وہاں رہنا ہے' کیا تو دنیا میں دنیا کے لئے تیاری نہیں کرتا' چنانچہ تو سردی کے لئے اسی قدر تیاری کرتا ہے جس قدر وہ ہوتی ہے یا جتنی مدّت کے لئے ہوتی ہے' اس موسم کے لئے غذا' لباس اور لکڑیاں اور دوسرے اسباب جمع کرتا ہے' اور اس باب میں اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم پر بھروسا نہیں کرتا کہ وہ تیری سردی جبّوں اور اونی کپڑوں اور لکڑیوں کے بغیر دور کردے' حالانکہ وہ اس پر قادر ہے۔ کیا تو سمجھتا ہے کہ جہنم کے طبقۂ زمہریر میں سردی کم ہوگی' یا اس کی مدّت دنیا کے موسم سرما سے کم ہوگی' یا تیرا خیال یہ ہے کہ وہاں کی سردی سے تحفظ کے لئے کسی تدبیر کی ضرورت نہیں ہے' جس طرح دنیا کی سردی جبّوں اور آگ کی حرارت کے بغیر زائل نہیں ہوتی' اسی طرح دوزخ کی حرارت و برودت سے بھی توحید کے قلعے اور طاعات کی خندقوں کے بغیر بچنا بے حد مشکل ہے' یہ تو اللہ کا کرم ہے کہ اس نے حفاظت کا طریقہ سکھلا دیا ہے' اور وہ تمام اسباب تیرے لئے سہل کردیئے ہیں جن کے ذریعے تو عذاب سے نجات حاصل کر سکتا ہے' جس طرح اس نے دنیا کی سردی سے بچنے کا طریقہ بتلا دیا ہے کہ آگ پیدا کی' اور لوہے یا پتھر وغیرہ سے آگ نکالنے کی تدبیر سکھلائی تاکہ تو اس سے اپنی سردی دور کرسکے' جس طرح جبّوں کی فراہمی' اور لکڑیاں وغیرہ جمع کرنا اللہ کا کام نہیں' بلکہ یہ چیزیں تیری راحت و آسائش کے لئے اس نے پیدا کردی ہیں اور ان کے حاصل کرنے کا طریقہ بتلا دیا ہے اسی طرح آخرت میں راحت پانے کے لئے مجاہدات اور طاعات سے بھی بے نیاز ہے' اس نے ان مجاہدات کا طریق بھی بتلا دیا ہے اب تو ان پر کاربند ہوتا ہے یا نہیں اللہ اس سے بے پروا ہے۔ جو اچھا کرے گا اپنے نفس کے لئے کرے گا' اور جو برا کرے گا وہ خود اس کی سزا بھگتے گا' اللہ تمام مخلوق سے مستغنی ہے۔

اے نفس! اپنی جہالت سے باز آ' اور اپنی آخرت پر قیاس کر' اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :۔

مَا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ اِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ (پ ۲۱ ر ۱۲ آیت ۲۸)

تم سب کا پیدا کرنا اور زندہ کرنا بھی ایسا ہی ہے جیسے ایک شخص کا۔

كَمَا بَدَاْنَا اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِيْدُهٗ (پ ۱۷ ر ۷ آیت ۱۰۴)

ہم نے جس طرح اول بار پیدا کرنے کے وقت (ہر چیز کی) ابتدا کی تھی اسی طرح اس کو دوبارہ پیدا کردیں گے۔

كَمَا بَدَاَكُمْ تَعُوْدُوْنَ (پ ۸ ر ۱۰ آیت ۲۹)

جس طرح تم کو اللہ تعالیٰ نے شروع میں پیدا کیا تھا اسی طرح پھر تم دوبارہ پیدا ہو گے۔

اللہ تعالیٰ کی سنت میں تبدیلی نہیں ہوتی' اے نفس! میں تجھے دنیا کی محبت میں گرفتار' اور اس سے مانوس پاتا ہوں' تیرا حال یہ ہے کہ تو اس سے جدائی اختیار نہیں کر سکتا' بلکہ دن بدن اس کے قریب ہوتا جارہا ہے' اور اپنے نفس میں اس کی محبت راسخ کر رہا ہے' میرے خیال سے تو اللہ کے عذاب و ثواب' اور قیامت کے اہوال و احوال سے غافل ہے' اور نہ تجھے موت کا یقین ہے جو تیرے اور تیری محبوب اور پسندیدہ چیزوں کے درمیان تفریق کرنے والی ہے' تیرے نزدیک وہ شخص عقل مند کہلانے کا مستحق ہے یا احمق جو قصر شاہی میں ایک دروازے سے جاتا ہو اور دوسرے سے نکلتا' اور وہ محل کی کسی خوبصورت چیز پر فریفتہ ہو جائے' حالانکہ وہ اسے ملنے والی نہیں ہے' بلکہ بہت جلد جدا ہو جانے والی ہے' دنیا بھی ملک الملوک کا گھر ہے' تیری حیثیت اس گھر میں محض گزرنے والے کی سی ہے' تو مسافر ہے' تجھے اپنی منزل پر پہنچنے کا خیال رکھنا چاہیے' نہ کہ ان چیزوں سے دل لگانا چاہیے جو اس رہ گزر میں ہیں' اور میرے ساتھ منزل تک نہیں جائیں گے' تو منزل پر پہنچ جائے گا' اور یہ چیزیں راستے میں تیرا ساتھ چھوڑ دیں گی' سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:۔

إِنَّ رُوحَ الْقُدُسِ نَفَثَ فِي رُوْعِي أَحْبِبْ مَا أَحْبَبْتَ فَإِنَّكَ مُفَارِقُهُ وَاعْمَلْ مَاشِئْتَ فَإِنَّكَ مَجْزِيٌّ بِهِ وَعِشْ مَاشِئْتَ فَإِنَّكَ مَيِّتٌ۔

روح القدس (جبرئیل) نے میرے دل میں یہ بات القاء کی ہے کہ آپ جس چیز سے چاہے محبت کرلیں اس سے جدا ضرور ہوں گے' اور جو چاہیں عمل کریں اس کی جزا ضرور ملے گی' اور رہنا چاہے جتنیں مرنا ضرور ہے۔

اے نفس! کیا تو یہ نہیں جانتا کہ جو شخص دنیا سے مانوس' اور اس کی طرف ملتفت رہتا ہے اور یہ جاننے کے باوجود کہ موت اس کے تعاقب میں ہے دنیاوی لذات میں مستغرق رہتا ہے وہ جب دنیا سے جدا ہوتا ہے تو حسرتیں سمیٹ کر لے جاتا ہے' اور زہر ہلاہل کو زاد راہ بنا کر لے جاتا ہے' اور اسے اس کا احساس بھی نہیں ہوتا کہ وہ کیا لے جارہا ہے' کیا تجھے جانے والے یاد نہیں رہے' انہوں نے کتنے اونچے عالیشان محل بنائے' اور رخصت ہو گئے' اور گوشۂ گمنامی میں جاسوئے' اور اللہ تعالیٰ نے ان کی زمین' ان کے گھر بار اور مال و متاع دشمنوں کو دے دیا' کیا تو نہیں دیکھتا کہ لوگ وہ مال کس طرح جمع کرتے ہیں جسے استعمال نہیں کرپاتے' اور وہ مکانات کس طرح تعمیر کرتے ہیں جن میں رہ نہیں پاتے' اور ان چیزوں کی کس طرح آرزو کرتے ہیں جنہیں حاصل نہیں کرپاتے' آدمی آسمان سے باتیں کرتا ہوا محل بناتا ہے اور زمین کے ایک تنگ و تاریک گڑھے میں جاکر سوجاتا ہے' کیا دنیا میں اس سے بڑی بھی کوئی حماقت ہو سکتی ہے کہ ایک شخص اس دنیا کو آباد کرتا ہے جس سے یقینی طور پر جدا ہونا ہے' اور اس آخرت کو تباہ و برباد کرتا ہے جو مستقل ٹھکانہ بننے والی ہے' اے نفس! کیا تجھے شرم نہیں آتی کہ تو ان بے وقوفوں کی مدد کرتا ہے' یہ بات تسلیم ہے کہ تو صاحب بصیرت نہیں ہے' اور نہ تیرے اندر اس کی اہلیت ہے کہ تو خود کسی راستے کا تعین کرسکے اور اس پر چل سکے' اس لئے تو اپنی طبیعت سے مجبور ہو کر کسی شخص کی طرف مائل ہوتا ہے' اور افعال میں اس کی اقتدا کرتا ہے' اگر تجھے اقتدا کرنی ہے تو ان بے وقوفوں کی کیوں کرتا ہے' انبیاء' علماء اور حکماء کو اپنا مقتدی کیوں نہیں کرتا' جو عقل و دانش اور علم و حکمت میں بہت آگے ہیں' اگر تجھے عقل اور ذہانت پسند ہے تو تجھے ان لوگوں کی اقتدا کرنی چاہیے' مگر تیرا حال عجیب ہے' اور تیری جہالت سخت ہے اور تو انتہائی سرکش اور متمرد ہے' اسی لئے تو ان واضح امور سے اعراض کرتا ہے' ہو سکتا ہے جاہ کی محبت نے تیری آنکھوں پر پردہ ڈال دیا ہو' یا خواہشات کی محبت نے تیری عقل سلب کرلی ہو' جاہ کے معنی اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ لوگوں کے قلوب تیری طرف مائل ہوں' لیکن تجھے سوچنا چاہیے کہ اگر روئے زمین کے تمام افراد تجھے سجدہ کریں' اور تیری اطاعت کرنے لگیں تو نہ یہ سجود ابدی ہو سکتے ہیں اور نہ اطاعت' پچاس سو برس کے بعد نہ تو اس زمین پر باقی رہے گا' اور نہ وہ لوگ جنہوں نے تجھے سجدہ کیا ہے یا تیری اطاعت کی ہے' اور ایک زمانہ وہ آئے گا کہ دنیا میں کوئی شخص تجھے یاد کرنے والا یا نام لینے والا باقی نہیں رہے گا' تجھ سے پہلے بہت سے زبردست بادشاہ اور مطلق العنان حکمراں اس دور سے گزر چکے ہیں' قرآن نے ایسے ہی لوگوں کے بارے میں یہ سوال کیا ہے:۔

فَهَلْ تُحِسُّ مِنْهُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَوْ تَسْمَعُ لَهُمْ رِكْزًا ۔ (پ۱۶ر۹ آیت ۹۸)

آپ ان میں سے کسی کو دیکھتے ہیں یا آہستہ آواز سنتے ہیں۔

جو چیز ہمیشہ رہنے والی ہے تو اسے اس چیز کے عوض کیوں فروخت کرتا ہے جو سو پچاس برس سے زیادہ باقی نہیں رہ سکتی' اور پھر جاہ کی محبت بھی ایسے شخص کو "زیبا" دیتی ہے جو مشرق و مغرب کا بادشاہ ہو' اور بے شمار گردنیں اس کے سامنے خم ہوتی ہوں' اور تمام دنیاوی لوازم اس کے پاس ہوں' لیکن تجھ جیسا شخص جس کی بدبختی اور شقاوت کا عالم یہ ہے کہ ایک محلّے بلکہ ایک گھر کے رہنے والے بھی اسے اپنا امیر تسلیم نہ کریں' کیا ایسے شخص کے لئے جاہ کی محبت مناسب ہے۔ پھر تو اگر آخرت کی رغبت کے لئے اپنے جہل کے باعث دنیا نہیں چھوڑ سکتا تو یہی سمجھ کر چھوڑ دے کہ دنیا کے شریک خسیس ہوتے ہیں' اور اس میں مصائب و آلام کی کثرت ہے' اور اس کی ہر چیز بہت جلد فنا ہونے والی ہے' تجھے بہت کم دنیا حاصل ہے' ہم پوچھتے ہیں کہ جب تجھے بہت سی دنیا نے چھوڑ رکھا ہے تو اس تھوڑی سی دنیا کو بھی کیوں نہیں چھوڑ دیتا جو تجھے حاصل ہے' پھر اگر تجھے دنیا حاصل بھی ہے تو اس میں خوشی کی کیا بات ہے' تیرے ہی شہر میں بہت سے یہودی اور مجوسی ایسے ہوں گے جو مال و زر میں تجھ سے آگے ہوں گے' اور جنہیں دنیا کی نعمتیں اور لذتیں تجھ سے زیادہ میسر ہوں گی' لعنت ہو ایسی دنیا پر جس میں یہ خسیس اور کمین تجھ سے آگے ہوں تو بڑا جاہل' انتہائی بدبخت' خسیس اور کم حوصلہ ہے' اسی لئے انبیاء' صدیقین اور مقربین ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رب العالمین کے جوار میں رہیں گے' اور یہ بدباطن لوگ جہنم کے نچلے طبقے میں ٹھکانہ پائیں گے' افسوس صد افسوس نہ تجھے دین حاصل ہے اور نہ دنیا۔

اے نفس! موت قریب ہے' ذرا سبقت کر' ڈرانے والا آچکا ہے' جو کرنا ہے کرلے' اب بھی عمل کے چند لمحے باقی ہیں پھر وقت نہیں ملے گا' موت کے بعد عمل کی فرصت نہ ہوگی' نہ تیرے بعد کوئی تیری طرف سے نماز پڑھنے والا ہوگا' اور نہ روزہ رکھنے والا' نہ کوئی ایسا شخص جو تجھ سے اللہ تعالیٰ کو راضی کرسکے تیری زندگی کے چند روز باقی رہ گئے ہیں' یہی تیرا سرمایہ ہیں' بشرطیکہ تو انہیں سرمایہ سمجھے' اور ان میں تجارت کرے' زندگی کا اکثر سرمایہ تونے پہلے ہی برباد کردیا ہے' اگر تو اس ضائع شدہ سرمائے پر تمام عمر بھی روتا تب بھی اپنے نقصان کی تلافی نہ کرسکے گا بھلا اس صورت میں کیسے تلافی کرسکتا ہے جبکہ باقی عمر بھی ضائع ہوجائے گی۔

اے نفس! موت تیرے وعدے کی جگہ ہے' قبر تیرا گھر ہے' مٹی تیرا بستر ہے' اور زبردست خوف تیرے سامنے ہے' کیا تو نہیں جانتا کہ مُردوں کی فوج شہر کے باہر تیری منتظر ہے' ان سب نے ایمان مغلظہ کی قسمیں کھائی ہیں کہ وہ اس وقت تک اپنی جگہ سے نہیں ہلیں گے جب تک تجھے اپنے ساتھ نہیں لے لیں گے' تجھے معلوم نہیں کہ ان منتظرین میں سے ہر شخص کی تمنا یہ ہے کہ وہ ایک روز ہی کے لئے صحیح دنیا میں واپس جائے اور جو نقصان ماضی میں ہوچکا ہے اس کی تلافی کرلے' تجھے تمنا کرنے کی ضرورت نہیں ہے' اللہ تعالیٰ نے یہ موقع تجھے دے رکھا ہے اور تو آسانی سے گزشتہ کی تلافی کرسکتا ہے' تیرے پاس ایک قیمتی دن ہے اگر تو اسے ان مُردہ لوگوں کے ہاتھ فروخت کرنا چاہے تو وہ اپنا کل سرمایہ تجھے سونپنے کے لئے تیار ہوجائیں بشرطیکہ وہ اس پر قادر ہوں تو اپنے شب و روز غفلت اور بے کاری میں ضائع کررہا ہے' کم بخت نفس! تجھے شرم نہیں آتی کہ تو مخلوق کے لئے اپنے نفس کو آراستہ کررہا ہے' اور باطن میں گناہوں کا ارتکاب کرکے خالق کائنات سے برسرپیکار ہے' کیا تو مخلوق سے شرماتا ہے' خالق سے نہیں شرماتا' کیا وہ تجھے اتنا بھی نہیں دیکھتا جتنا مخلوق دیکھتی ہے' تو لوگوں کو خیر اور تقویٰ کا حکم دیتا ہے' اور خود رذائل میں ملوث ہے' لوگوں کو اللہ کی طرف بلاتا ہے' اور خود اس سے دور بھاگتا ہے' لوگوں کو اللہ کے ذکر کی تلقین کرتا ہے اور خود اسے بھولے ہوئے ہے' تجھے یہ بات معلوم ہونی چاہیے کہ گناہ گار پاخانے سے بھی زیادہ بدبودار ہے' کیا پاخانے سے کوئی چیز پاک ہوسکتی ہے؟ ظاہر ہے نہیں! پھر تو کیوں دوسروں کو پاک کرنا چاہتا ہے' حالانکہ خود ناپاک ہے' اگر تجھے اپنی صحیح معرفت حاصل ہوجائے تو یہ بات اچھی طرح جان لے کہ لوگوں پر نازل ہونے والی تمام مصائب تیری وجہ سے ہیں' تونے اپنے آپ کو ابلیس کا گدھا بنالیا ہے' وہ تجھے جہاں چاہتا ہے لے جاتا ہے' اور جس طرح چاہتا ہے تجھے ہنکا دیتا ہے' ان تمام باتوں کے باوجود تجھے اپنے اعمال پر ناز ہے' حالانکہ وہ آفتوں سے لبریز ہیں' اگر تو ان سے بچا رہے تو یہ ممکن ہے کہ تیرے اعمال سلامت رہ جائیں' اور نجات کا ذریعہ بنیں مگر تجھے اپنی خطاؤں اور گناہوں کے

باوجود اپنے عمل کا غرور ہے' کیا تو یہ نہیں جانتا کہ شیطان نے دو لاکھ برس تک اللہ تعالیٰ کی عبادت کی 'مگر صرف ایک خطا نے اسے ملعون خدا بنا دیا حضرت آدم علیہ السلام کو صرف ایک غلطی کے باعث جنت سے نکلنے کا حکم ملا' حالانکہ وہ اللہ کے حبیب اور نبی تھے' اے نفس! تو کتنا فریبی ہے' تو کس قدر بے شرم ہے' تو کتنا بڑا جاہل ہے' اپنے انجام سے بے خبر ہے' اور معاصی پر کس قدر جری ہے' تو کب تک معاملہ کرکے بگاڑے گا' اور کب تک عہد شکنی کا مرتکب رہے گا۔

اے نفس! کیا تو ان خطاؤں کے ساتھ دنیا آباد کرنا چاہتا ہے' گویا تجھے یہاں سے رخصت ہی نہیں ہونا' کیا تو قبر والوں کی طرف نہیں دیکھتا' انہوں نے کتنا مال جمع کیا تھا' اور اس کے ذریعے کتنے اونچے اونچے محل بنوائے تھے' اور دنیا سے کیا کچھ امیدیں رکھی تھیں' کیا تو ان سے عبرت حاصل نہیں کرسکتا' کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ وہ لوگ آخرت میں طلب کرلئے گئے' اور تو ابد تک یہیں رہنے والا ہے' تیرا خیال کتنا ناقص' اور تیرا فہم کس قدر افسوسناک ہے' تو جب سے اپنی ماں کے پیٹ سے باہر آیا ہے اپنی عمر کی دیوار ڈھاتا جارہا ہے' اور زمین پر اپنے مکان کی دیواریں بلند کررہا ہے' حالانکہ بہت جلد زمین تجھے اپنے پیٹ میں رکھنے والی ہے' کیا تجھے اس وقت سے خوف نہیں آتا جب سانس گلے میں آجائے گا' اور پروردگار کے قاصد اپنے سیاہ اور خوفناک چہروں کے ساتھ' عذاب الیم کی بشارت لے کر تیرے پاس پہنچیں گے' کیا اس وقت تجھے ندامت سے کوئی فائدہ ہوگا' یا تیرا غم قبول کیا جائے گا' یا تیرے رونے پر رحم کیا جائے گا' تعجب کی بات یہ ہے کہ تو ان تمام باتوں کے باوجود بصیرت اور ذہانت کا مدعی ہے' تیری ذہانت کا عالم یہ ہے کہ تو ہر آنے والے دن میں مال کی زیادتی پر خوش ہوتا ہے' اور عمر کے نقصان پر غم نہیں کرتا' بھلا اس سے کیا فائدہ کہ مال بڑھے اور عمر کم ہو' اے نفس! تو آخرت سے اعراض کرتا ہے' حالانکہ وہ بہت جلد آنے والی ہے' اور دنیا کی طرف ملتفت ہے جبکہ وہ بہت جلد تجھ سے پیٹھ موڑنے والی ہے' کتنے ہی لوگ ایسے ہیں جو نئے دن کا استقبال کرتے ہیں لیکن اسے مکمل نہیں کرپاتے' اور کتنے ہی ایسے ہیں جو کل کی امید رکھتے ہیں لیکن کل تک نہیں پہنچ پاتے' تو رات دن اپنے بھائیوں' رشتہ داروں' اور پڑوسیوں میں اس کا مشاہدہ کرتا ہے' تو موت کے وقت ان کی حسرت دیکھتا ہے مگر اس سے عبرت نہیں پکڑتا' اور نہ اپنی جہالت سے باز آتا ہے' اے نفس اس دن سے ڈر جس دن کے بارے میں اللہ نے یہ قسم کھائی ہے کہ میں اپنے ان بندوں کا جنہیں امر و نہی کی گئی ہے حساب لوں گا' اور ان کے اعمال کا مواخذہ کروں گا' خواہ وہ جلی ہوں' یا خفی' پوشیدہ ہوں یا ظاہر۔ اے نفس! ذرا سوچ تو کس جسم کے ساتھ اللہ رب العزت کے دربار میں کھڑا ہوگا' اور کس زبان سے اس کے سوالوں کا جواب دے گا' ذرا سوالات کے جواب کی تیاری کرلے' اور درست جواب ڈھونڈ لے' اور اپنی باقی زندگی کے مختصر دنوں میں طویل دنوں کے لئے دار فانی میں دار مقامہ کے لئے' اور دار حزن و غم میں دار نعیم کے لئے عمل کر' عمل کر کہ پھر عمل کا موقع نہ ہوگا' دنیا سے شرفاء کی طرح اپنے اختیار سے نکلنے کے لئے تیار نہ' اس سے پہلے کہ تجھے زبردستی نکالا جائے' دنیا کی نعمتوں' اور مسرتوں پر نازاں نہ ہو' اس لئے کہ اکثر خوش ہونے والے نقصان اٹھاتے ہیں اور اکثر نقصان اٹھانے والوں کو اس کا اندازہ نہیں ہوتا کہ وہ نقصان اٹھانے والے ہیں۔ خرابی ہو اس شخص کے لئے جس کے لئے خرابی ہے' اور اسے خبر نہیں' وہ اپنے حال میں مست ہنستا ہے' خوش ہوتا ہے' کھیل کود کرتا ہے' اتراتا ہے اٹھلاتا ہے کھاتا ہے اور پیتا ہے' حالانکہ کتاب اللہ میں اس کے متعلق یہ فیصلہ ہوچکا ہے کہ وہ جہنم کا ایندھن ہے۔

اے نفس! دنیا کو عبرت کی نظر سے دیکھ کر بحالت مجبوری حاصل کر' اختیار سے ٹھکرا' اور آخرت کی طرف سبقت کر' ان لوگوں میں سے مت ہو جو عطائے خداوندی کا شکر ادا کرنے کے بجائے زیادہ کی ہوس رکھتے ہیں' لوگوں کو برائی سے روکتے ہیں اور خود نہیں رکتے' یہ بات جان لے کہ دین کا کوئی عوض نہیں ہے' اور نہ ایمان کا کوئی بدل ہے اور نہ کوئی چیز جسم کے قائم مقام بن سکتی ہے' جو شخص رات دن کے گھوڑے پر سوار ہے وہ منزل کی طرف رواں دواں ہے' اگرچہ وہ سفر نہ کرنا چاہے مگر اسے منزل پر پہنچنا ہے' خواہ وہ اس پر راضی ہو یا نہ ہو۔

اے نفس! تو میری یہ نصیحت قبول کر اور اس پر عمل کر' جو شخص نصیحت سے اعراض کرتا ہے وہ گویا آگ پر راضی ہوتا ہے' میں نہیں سمجھتا کہ تو آگ پر راضی ہونے والوں میں سے ہے' یا نصیحت قبول کرنے والوں میں سے' اگر قلب کی قساوت تجھے وعظ و

نصیحت سننے سے روکتی ہے تو قیام لیل سے مدد لے اگر یہ تدبیر بھی کارگر نہ ہو تو روزوں کا التزام کر اس سے بھی نفع نہ ہو تو کم آمیزی اور کم گوئی کو اپنا شیوہ بنا یہ صورت بھی نفع نہ دے تو صلہ رحمی کر یتیموں کے ساتھ نرمی اور محبت کا معاملہ کر اس سے بھی کام نہ بنے تو یہ سمجھ لے کہ اللہ تعالیٰ نے تیرے دل پر مہر لگادی ہے اور اس کے ظاہر و باطن پر گناہوں کی سیاہی چھا چکی ہے اب نور کی کرن اندر نہیں پہنچ سکتی تب تو دوزخ کے راستے پر چل اللہ نے جنت پیدا کی ہے اور اس کے اہل بھی پیدا کئے ہیں دوزخ پیدا کی ہے اور اس کے اہل بھی پیدا کئے ہیں ہر شخص کے لئے وہی راہ سہل کردی گئی ہے جس کے لئے وہ پیدا کیا گیا ہے تجھ میں وعظ و نصیحت قبول کرنے کی صلاحیت نہیں رہی اب تجھے مایوس ہو جانا چاہیے اور مایوسی کبیرہ گناہ ہے پھر کیا کرے نہ مایوس ہو سکتا ہے اور نہ خیر کی راہیں مسدود ہونے کی بنا پر امید ہی کر سکتا ہے اگر تو رجاء کرے گا بھی تو دھوکا ہوگا فریب اور مغالطہ ہوگا۔

اے نفس! جس مصیبت میں تو مبتلا ہے اس پر تجھے صدمہ ہے یا نہیں یا اپنے آپ پر ترس کھا کر آنکھ سے کوئی آنسو بہاتا ہے یا نہیں اگر آنکھ سے آنسو بہتا ہے تو یہ سمجھ کہ آنسوؤں کا منبع بحر رحمت سے ہے اور تیرے اندر رجاء کی گنجائش ہے اس لئے گریہ و زاری کا التزام کر ارحم الراحمین سے رحم کی بھیک مانگ اکرم الاکرمین سے شکایت کر پھر نہ اس آہ و زاری سے اکتا نہ شکوہ و شکایتوں سے طول ہو بلکہ اسے اپنا معمول بنالے شاید اسے تیرے ضعف پر تیری بے بسی اور بے کسی پر رحم آجائے اور وہ تیری مدد کردے کیونکہ تیری مصیبت شدید ہو چکی ہے تیری سرکشی حد سے تجاوز کر چکی ہے اب نہ کوئی تدبیر تجھے اس مصیبت عظمیٰ سے بچا سکتی ہے اور نہ کوئی حیلہ نجات دے سکتا ہے تیرے لئے اگر کوئی ٹھکانہ ہے تو صرف اللہ کا ٹھکانہ ہے اگر نجات کا کوئی راستہ ہے تو وہ اللہ تک جاتا ہے وہی تیرا ملجا و ماویٰ ہے۔ وہی تیری مقصد برآری کر سکتا ہے وہی تیری فریاد رسی کر سکتا ہے اسی کے سامنے سرنگوں کر اسی سے عجز و نیاز اور خشوع و خضوع کر جتنی زیادہ تیری جہالت ہے اور جس قدر تیرے معاصی ہیں اسی قدر اس کے سامنے تضرع کر اس لئے کہ تضرع کرنے والے اور اپنے آپ کو اس کے سامنے ذلیل کرنے والے پر رحم کرتا ہے وہ مدد کی بھیک مانگنے والے کی مدد کرتا ہے وہ مجبور و مضطر کی دعا قبول کرتا ہے آج تو اسی کی طرف مضطر ہے اور اسی رحمت کا محتاج ہے باقی تمام راستے مسدود اور تمام راہیں تنگ ہیں تدبیریں بیکار ہو چکی ہیں وعظ و نصیحت سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا زجر و توبیخ تجھ پر اثر انداز نہیں ہوتی تو جس سے مانگتا ہے وہ کریم ہے جس کے سامنے دست سوال دراز کرتا ہے وہ غنی ہے جس سے مدد چاہتا ہے وہ رحم کرنے والا ہے اس کی رحمت لامحدود وسعتوں کی حامل ہے اس کا کرم لامتناہی ہے اس کا عفو عام ہے اب تو اپنے دونوں ہاتھ پھیلا اور یہ عرض کر:- یَاأَرْحَمَ الرَّاحِمِیْنَ! یَارَحِیْمُ! یَاحَلِیْمُ! یَاعَظِیْمُ! یَاکَرِیْمُ! میں گنہگار سیاہ کار خطاکار ہوں میری سرکشی حد سے بڑھ چکی ہے میں بے شرمی کی حد تک گناہوں پر جری ہوں اے اللہ! میں ہر طرف سے مایوس ہو کر تیری بارگاہ میں انتہائی تضرع اور مسکنت ذلت و حقارت اور عاجزی کے ساتھ اپنے ضعف کمزوری بے کسی اور بے بسی کا اعتراف کرتے ہوئے حاضر ہوں میری مدد کرنے میں جلدی کر میری مشقت دور فرما مجھے اپنی رحمت کے آثار دکھلا مجھے اپنے عفو و مغفرت کا جام پلا مجھے اپنی حفاظت کی قوت نصیب کر۔ اے نفس! آہ و زاری کرنے میں اور اپنی ندامت کے اظہار میں اپنے باپ حضرت آدم علیہ السلام کی تقلید کر حضرت وہب ابن منبہ کہتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو جنت سے زمین پر اتارا تو کئی روز تک ان کے آنسو نہ رکے ساتویں دن اللہ تعالیٰ نے ان پر رحم کیا اور جس وقت وہ انتہائی حزن و ملال اور اضطراب کی کیفیت سے دوچار سر جھکائے بیٹھے تھے تو اللہ تعالیٰ نے ان پر وحی نازل فرمائی کہ اے آدم! یہ تم نے اپنا کیا حال بنالیا ہے عرض کیا یا اللہ! میری مصیبت بڑھ گئی ہے خطاؤں نے مجھے گھیر لیا ہے اپنے رب کے ملکوت سے نکالا گیا ہوں عزت کے گھر سے ذلت کے گھر میں آگیا ہوں سعادت کے بعد شقاوت ملی ہے راحت کے بعد غم اٹھانا پڑا ہے عافیت کے بعد مصیبت کے گھر میں آیا ہوں دار قرار سے دار ناپائدار میں ڈالا گیا ہوں خلود و بقا کے عالم سے موت اور فنا کے عالم میں پہنچا ہوں اپنی غلطی پر کیسے نہ روؤں یہ سب اسی غلطی کی وجہ سے ہوا اللہ تعالیٰ نے وحی نازل فرمائی کہ اے آدم کیا میں نے تجھے اپنے لئے منتخب نہیں کیا تھا کیا میں نے تجھے اپنے گھر میں نہیں اتارا تھا کیا میں نے تجھے اپنی کرامت کے ساتھ مخصوص نہیں کیا تھا اور اپنے غضب سے نہیں ڈرایا تھا؟ کیا میں نے تجھے

اپنے ہاتھ سے پیدا نہیں کیا تھا' اور تیرے اندر اپنی روح نہیں پھونکی تھی' اور فرشتوں سے تیرا سجدہ نہیں کرایا تھا' مگر تو نے میری نافرمانی کی' میرا عہد فراموش کیا' میری ناراضگی مول لی' مجھے اپنی عزت و جلال کی قسم ہے اگر میں زمین کو تیرے جیسے انسانوں سے بھر دوں پھر وہ میری عبادت کریں اور میری تسبیح بیان کریں' پھر میری نافرمانی کریں تو میں انہیں گنہگاروں کے مقام پر اتاروں گا' حضرت آدم علیہ السلام یہ سن کر رونے لگے' اور تین سو برس تک روتے رہے۔

عبید اللہ البجلی بہت زیادہ رویا کرتے تھے' اور رات بھر رو رو کر یہ کہا کرتے تھے اے اللہ! میں وہ ہوں جس کی عمر جوں جوں بڑھتی جاتی ہے اس کے گناہ زیادہ ہوتے جاتے ہیں' میں وہ ہوں کہ جب بھی کسی گناہ کے چھوڑنے کا قصد کرتا ہوں کوئی دوسری شہوت سامنے آجاتی ہے' افسوس تیرا ایک گناہ پرانا نہیں ہوپاتا کہ دوسرا گناہ سامنے آجاتا ہے' افسوس اگر تیرا ٹھکانہ جہنم میں ہوا تو تو کیا کرے گا' شاید تیرے سر کے لئے گرز بن رہے ہوں' ہو سکتا ہے قیامت کے دن تمام حاجت مندوں کی حاجتیں پوری ہو جائیں اور تیری حاجت باقی رہ جائے۔ منصور ابن عمار کہتے ہیں کہ ایک رات کوفے میں کسی عابد کو اللہ تعالیٰ سے اس طرح مناجات کرتے ہوئے سنا : اے اللہ! تیری عزت کی قسم ہے' میں نے تیری نافرمانی سے تیری مخالفت کا ارادہ نہیں کیا' اور نہ میں نے تیری معصیت اس لئے کی ہے کہ مجھے تیرا مرتبہ معلوم نہیں ہے' یا میں تیرا عذاب چاہتا تھا' یا مجھے تیری ناراضگی مقصود تھی' یا میں یہ سمجھتا تھا کہ تو مجھے دیکھ نہیں رہا ہے' لیکن حقیقت یہ ہے کہ میرے نفس نے ایک عمل کو میری نظر میں اچھا بنا کر پیش کیا' اور میری بدبختی نے اس کی تائید کی' اور تیری پردہ پوشی نے مجھے جرأت دی' میں نے اپنی جہالت کے باعث تیری نافرمانی کی ہے' اور اپنے فعل سے تیری مخالفت کی ہے' اب تیرے عذاب سے مجھے کون بچائے گا' اور اگر تو نے میری رسی توڑ دی تو میں کس کی مضبوط رسی تھاموں گا' کس قدر افسوس کا مقام ہوگا جب کل لوگ تیرے سامنے کھڑے ہوں گے' اور ہلکے پھلکے لوگوں سے کہا جائے گا کہ وہ آگے بڑھ جائیں' اور گناہوں سے بوجھل لوگوں سے کہا جائے گا کہ ٹھہر جائیں' معلوم نہیں میں ان ہلکے لوگوں کے ساتھ ہوں گا یا بھاری لوگوں کے ساتھ' میرا ناس ہو' جوں جوں میرے ماہ و سال زیادہ ہوتے جاتے ہیں گناہ بھی بڑھتے جاتے ہیں' میں کب تک تیری بارگاہ میں توبہ کروں گا اور کب تک واپس ہوتا رہوں گا۔ اب وہ وقت آگیا ہے کہ اپنے رب سے شرم کروں۔

یہ ہے باری تعالیٰ سے مناجات اور اپنے نفوس کی معاتبت کا وہ طریقہ جس پر بزرگان سلف کاربند تھے' مناجات سے ان کا مقصد یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کو راضی کریں' اور معاتبت سے ان کا مقصد تنبیہہ اور نفس کی رعایت تھا' جو شخص مناجات اور معاتبت سے غفلت کرتا ہے وہ اپنے نفس کی رعایت کرنے والا نہیں ہے' اور قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی بھی اس پر عیاں ہو جائے گی۔

کتاب التفکر

فکر و تدبر کے بیان میں

حدیث شریف میں ہے کہ ایک ساعت غور و فکر کرنا سال بھر کی عبادت سے افضل ہے' اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں فکر و تدبر اور نظر و اعتبار پر کثرت سے زور دیا ہے' واضح ہو کہ فکر انوار کی کنجی ہے' اور بصیرت کا مبداء ہے' وہ علوم کا جال' اور معارف و معانی اور مطالب کے شکار کا ذریعہ ہے' عام طور پر لوگ اس کے فضل اور مرتبے سے واقف ہیں لیکن اس کی حقیقت' ثمرے' مصدر' منبع' طریقے اور کیفیت سے واقف نہیں ہیں' یعنی یہ نہیں جانتے کہ فکر کیسے کرتے ہیں' کس امر میں کرتے ہیں' کیوں کرتے ہیں' اور فکر کس لئے مطلوب ہوتا ہے' آیا وہ بذات خود مطلوب ہے' یا کسی ثمرے کے لئے مقصود ہے' اگر وہ ثمرے کے لئے ہے تو وہ ثمرہ کیا ہے' علوم ہیں یا احوال' یا دونوں۔ ان تمام حقائق کو واضح کرنا ایک امر مہم ہے' ہم پہلے فکر کی فضیلت بیان کرتے ہیں' پھر تفکر کی حقیقت بیان کریں گے' اس کے بعد اس کے ثمرات پر گفتگو کریں گے' پھر ان امور پر روشنی ڈالیں گے جن میں فکر کیا جاتا ہے۔

تفکر کی فضیلت : اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب عظیم میں بے شمار مواقع پر تدبر اور تفکر کا حکم دیا ہے' اور فکر کرنے والوں کی

تعریف کی ہے' چنانچہ ارشاد ہے :۔

اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیَامًا وَّ قُعُوْدًا وَّ عَلٰی جُنُوْبِھِمْ وَیَتَفَکَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ ھٰذَا بَاطِلًا ۔ (پ ۴ ر ۱۱ آیت ۱۹۱)

جن کی حالت یہ ہے کہ وہ لوگ اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں کھڑے بھی' بیٹھے بھی' لیٹے بھی' اور آسمانوں اور زمین کے پیدا ہونے میں غور کرتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار آپ نے اس کو لایعنی پیدا نہیں کیا۔

حضرت عبد اللہ ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ کچھ لوگ اللہ تعالیٰ کے بارے میں غور و فکر کر رہے تھے آپ نے ان سے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں فکر کرو' اس لئے کہ تم اس کا صحیح اندازہ کرنے پر قادر نہیں ہو (ابو نعیم فی الحلیہ) روایت میں ہے کہ ایک دن سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم چند ایسے لوگوں کے پاس سے گذرے جو فکر کر رہے تھے' آپ نے ان سے دریافت فرمایا کیا بات ہے تم بول کیوں نہیں رہے ہو؟ انہوں نے عرض کیا ہم اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں فکر کر رہے ہیں' آپ نے ارشاد فرمایا ایسا ہی کرو' اس کی مخلوقات میں فکر کرو' اس میں فکر مت کرو' یہاں سے قریب ایک سفید زمین ہے جس کی سفیدی روشنی ہے' اور روشنی سفیدی ہے' اس کا فاصلہ مغرب کی طرف کو چالیس دن کا ہے اس کے باشندے کسی بھی وقت اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کرتے' لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ شیطان ان سے کہاں رہتا ہے؟ آپ نے فرمایا وہ نہیں جانتے شیطان پیدا بھی ہوا ہے یا نہیں' لوگوں نے کہا وہ لوگ حضرت آدم کی اولاد ہیں؟ آپ نے فرمایا وہ لوگ نہیں جانتے کہ آدم پیدا بھی ہوئے ہیں یا نہیں۔ حضرت عطاء فرماتے ہیں کہ ایک دن میں اور عبید ابن عمیر حضرت عائشہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے' اور ہم نے ان سے پردے کے پیچھے سے گفتگو کی' آپ نے فرمایا کہ اے عبید! تم ہم سے ملنے کے لئے کیوں نہیں آتے' عبید نے کہا اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی بنا پر کہ کبھی کبھی ملو اس سے محبت زیادہ ہوگی' عبید نے عرض کیا کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی عجیب ترین بات بیان فرمایئے' حضرت عائشہؓ یہ سن کر رونے لگیں اور فرمایا کہ آپ کی تمام باتیں ہی عجیب تھیں' ایک رات میرے پاس تشریف لائے' یہاں تک کہ میرا بدن آپ کے جسم مبارک سے مس ہو گیا' پھر فرمایا مجھے چھوڑو میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کروں گا' اس کے بعد آپ نے ایک مشکیزے سے پانی لے کر وضو کیا' پھر نماز کے لئے کھڑے ہوئے' اور اس قدر روئے کہ آپ کی داڑھی مبارک تر ہو گئی' اس کے بعد سجدے میں روئے یہاں تک کہ زمین تر ہو گئی' پھر کروٹ لے کر لیٹ گئے' یہاں تک کہ بلال صبح کی نماز کے لئے اطلاع دینے حاضر ہوئے' انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ کیوں روتے ہیں؟ اللہ تعالیٰ نے آپ کے اگلے پچھلے گناہ معاف فرما دیئے ہیں' آپ نے فرمایا اے بلال! میں کیوں نہ روؤں؟ اللہ تعالیٰ نے آج رات مجھ پر یہ آیت نازل فرمائی ہے :۔

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّھَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ

(پ ۴ ر ۱۱ آیت ۱۹۰)

بلاشبہ آسمانوں کے اور زمین کے بنانے میں اور یکے بعد دیگرے رات اور دن کے آنے جانے میں اہل عقل کے لئے دلائل ہیں۔

پھر فرمایا اس شخص کے لئے تباہی ہو جو یہ آیت پڑھے اور اس میں فکر نہ کرے (صحیح ابن حبان۔ عطاء) کسی شخص نے اوزاعیؒ سے دریافت کیا کہ ان آیات میں تفکر کی حد کیا ہے؟ فرمایا انہیں پڑھنا اور سمجھنا' محمد ابن الواسع کہتے ہیں کہ بصرے کا ایک شخص ابوذرؓ کی وفات کے بعد امّ ذر کے پاس آیا' اور ان سے ابوذرؓ کی عبادت کی کیفیت دریافت کی' انہوں نے فرمایا کہ ابوذرؓ دن بھر گھر کے ایک کونے میں بیٹھے فکر کیا کرتے تھے' حضرت حسنؓ کہتے ہیں کہ ایک ساعت کا فکر رات بھر کی عبادت سے بہتر ہے' فضیل ابن عیاضؒ کہتے ہیں کہ فکر ایک آئینہ ہے جس میں تو اپنی نیکیاں اور برائیاں دیکھتا ہے' حضرت ابراہیم سے کسی نے عرض کیا کہ آپ بہت زیادہ غور و فکر کرتے ہیں' انہوں نے فرمایا کہ فکر عقل کا مغز ہے' حضرت سفیان ابن عیینہ مثال میں بکثرت یہ شعر پڑھا کرتے تھے

اذ المرء کانت لہ فکرۃ ففی کل شئی لہ عبرۃ
(اگر انسان کو فکر میسر ہو تو وہ ہر چیز سے عبرت حاصل کر سکتا ہے)۔

طاؤس فرماتے ہیں کہ حواریین نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے عرض کیا کہ یا روح اللہ! آج روئے زمین پر کوئی شخص آپ جیسا بھی ہے۔ فرمایا ہاں وہ شخص میری طرح ہے جس کی گفتگو ذکر ہو' جس کا سکوت فکر ہو' اور جس کی نظر عبرت ہو' حضرت حسنؒ فرماتے ہیں کہ جس کے کلام میں حکمت نہ ہو وہ لغو ہے' جس کے سکوت میں فکر نہ ہو وہ سہو ہے' اور جس کی نظر میں عبرت نہ ہو وہ لہو ہے' اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :۔

سَاَصْرِفُ عَنْ آيَاتِيَ الَّذِيْنَ يَتَكَبَّرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ۔ (پ ۹ ر ۷ آیت ۱۴۶)

میں ایسے لوگوں کو اپنے احکام سے برگشتہ ہی رکھوں گا جو دنیا میں تکبر کرتے ہیں جس کا ان کو کوئی حق حاصل نہیں ہے۔

اس آیت کی تفسیر میں حضرت حسن بصری نے ارشاد فرمایا کہ "میں ان کے دلوں کو فکر سے باز رکھتا ہوں" حضرت ابو سعید الخدریؓ روایت کرتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ آنکھوں کو عبادت میں سے ان کا حصہ دو' لوگوں نے عرض کیا آنکھوں کا عبادت میں کیا حصہ ہے؟ فرمایا قرآن کریم میں دیکھنا' اس میں غور و فکر کرنا اور اس کے عجائبات سے عبرت حاصل کرنا (ابن ابی الدنیا) ایک عورت جو مکہ مکرمہ کے قریب واقع ایک جنگل میں رہا کرتی تھی کہتی تھی کہ اگر متکبرین کے قلوب اپنے فکر کے ذریعے اس خیر کا مشاہدہ کرلیں جو آخرت کے حجابوں میں ان کے لئے مخفی ہے تو دنیا کی کوئی لذت ان کے لئے معاف نہ ہو' اور نہ دنیا میں ان کی آنکھ کو قرار ہو' حضرت لقمان علیہ السلام دیر تک تنہائی میں بیٹھے رہتے' ان کا آقا ان کے پاس آتا اور کہتا کہ تو ہمیشہ تنہا بیٹھا رہتا ہے' اگر لوگوں کے ساتھ بیٹھے تو کچھ دل لگے' حضرت لقمان جواب دیتے کہ دیر تک تنہا بیٹھنے سے اچھی طرح فکر کرنے کا موقع ملتا ہے' اور طول فکر سے جنت کی طرف رہنمائی ہوتی ہے وہب ابن منبہؒ کہتے ہیں کہ جس شخص نے بھی دیر تک فکر کیا اس نے علم حاصل کیا' اور جس نے علم حاصل کیا اس نے عمل کیا' حضرت عمر ابن عبدالعزیزؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں فکر کرنا افضل عبادت ہے' ایک دن عبداللہ ابن المبارکؒ نے سہل ابن علی سے پوچھا کہ کہاں تک پہنچے وہ اس وقت خاموش بیٹھے فکر کر رہے تھے انہوں نے جواب دیا صراط تک۔ بشر کہتے ہیں کہ اگر لوگ اللہ تعالیٰ کی عظمتوں میں غور کریں تو کبھی اس کی نافرمانی کے مرتکب نہ ہوں' حضرت عبداللہ ابن عباس کہتے ہیں فکر کے ساتھ دو معتدل رکعتیں بے دلی کے ساتھ تمام رات کے قیام سے افضل ہیں ابو شریح کہیں جا رہے تھے' اچانک راستے میں ایک جگہ بیٹھ گئے' اور منہ پر چادر ڈال کر رونے لگے' لوگوں نے پوچھا کیوں روتے ہیں' فرمایا مجھے اپنی عمر کے ضیاع' اعمال کی قلت' اور موت کی قربت کا خیال آگیا تھا' حضرت ابو سلیمان کہتے ہیں کہ اپنی آنکھوں کو رونے کا' اور قلوب کو فکر کا عادی بناؤ' ابو سلیمان دارانی کہتے ہیں کہ دنیا کی فکر کرنا آخرت سے حجاب ہے' اور اہل ولایت کے لئے عذاب ہے' اور فکر آخرت سے حکمت حاصل ہوتی ہے اور قلوب کو زندگی ملتی ہے' حاتم کہتے ہیں کہ عبرت سے علم زیادہ ہوتا ہے' ذکر سے محبت بڑھتی ہے' اور فکر سے خوف زیادہ ہوتا ہے' حضرت عبداللہ ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ خیر میں فکر عمل کا باعث ہوتا ہے' اور شر پر ندامت اس کے ترک کا سبب ہوتی ہے' روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کسی آسمانی کتاب میں یہ کلمات نازل فرمائے ہیں کہ میں کسی حکیم کا کلام قبول نہیں کرتا بلکہ اس کے ارادے اور خواہش کو دیکھتا ہوں' اگر اس کا ارادہ اور خواہش میرے لئے ہوتا ہے تو میں اس کی خاموشی کو فکر' اور اس کے کلام کو حمد بنا دیتا ہوں اگرچہ وہ زبان سے کچھ نہ بولے' حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ اہل عقل ذکر سے فکر کے اور فکر سے ذکر کے عادی ہوتے ہیں' یہاں تک کہ ان کے قلوب حکمت کی باتیں کرتے ہیں۔ اسحٰق ابن خلف کہتے ہیں کہ ایک رات جب کہ چاند پوری طرح روشن تھا حضرت داؤد طائی گھر کی چھت پر تھے' وہ آسمان کی جانب دیکھنے لگے' اور زمین و آسمان کے ملکوت میں غور کرنے لگے اور رونے لگے' اور روتے روتے اپنے ایک پڑوسی کے گھر میں جا گرے' آپ کا پڑوسی برہنہ جسم اپنے بستر سے کود کر کھڑا ہوا' اس کے ہاتھ میں تلوار تھی' اس نے یہ خیال کیا کہ کوئی چور

گھر میں گھس آیا ہے، مگر جب اس کی نظر داؤد طائی پر پڑی تو تلوار میان میں رکھ لی، اور کہنے لگا کہ آپ کو کس نے گرا دیا ہے، انھوں نے فرمایا مجھے گرنے کا احساس تک نہیں ہوا۔ جنید بغدادیؒ کہتے ہیں کہ بہترین اور اعلا مجلس وہ ہے جس میں میدان توحید میں فکر کے گھوڑے دوڑائے جائیں، نسیم معرفت کا لطف لیا جائے، اور بحر محبت سے شراب محبت پی جائے، اور اللہ تعالیٰ پر حسن ظن کے ساتھ نظر کی جائے، اس کے بعد فرمایا کہ ان مجالس کی کیا تعریف کی جائے وہ نہایت اعلا ہیں اور وہ شراب نہایت لذیذ شیریں ہے، حضرت امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ کلام پر خاموشی سے، اور استنباط پر فکر سے مدد لو، یہ بھی فرمایا کہ امور میں صحیح طور پر نظر کرنا مغالطہ سے بچاتا ہے رائے میں پختگی ندامت سے محفوظ رکھتی ہے، غور و فکر سے آدمی کی دانائی اور احتیاط ظاہر ہوتی ہے عقلمندوں سے مشورہ کرنا مستقل مزاجی، اور پختہ بصیرت پیدا کرتا ہے، اس لئے عزم کرنے سے پہلے فکر کرو، اور عمل سے پہلے غور کرو، اور اقدام سے پہلے مشورہ کرلو، آپ نے یہ بھی فرمایا کہ فضائل چار ہیں ایک حکمت، اس کا قوام فکر ہے، دوسری غفلت، اس کا قوام شہوت ہے، تیسری قوت، اس کا قوام غضب ہے، اور چوتھی عدل اس کا قوام نفسانی قوتوں میں اعتدال ہے، فکر کے متعلق علماء کے یہ اقوال ہیں، لیکن ان میں سے کسی نے بھی فکر کی حقیقت، اور امور فکر پر روشنی نہیں ڈالی۔

فکر کی حقیقت اور اس کا ثمرہ : فکر کے معنی یہ ہیں کہ دل میں دو معرفتیں حاضر ہوں تاکہ ان سے تیسری معرفت پیدا ہو، اور اس کی مثال یہ ہے کہ جو شخص دنیا کی طرف مائل ہوتا ہے، اور دنیوی زندگی کو ترجیح دیتا ہے، اور یہ چاہتا ہے کہ اسے کسی طرح اس امر کی معرفت حاصل ہو جائے کہ آخرت کا اختیار کرنا دنیا سے بہتر ہے، تو اس معرفت کے طریقے یہ ہیں، ایک تو یہ ہے کہ کسی دوسرے سے سنے کہ آخرت کو ترجیح دینا دنیا کو ترجیح دینے سے بہتر ہے، اس کی تقلید کرے، اور حقیقت امر سے واقف ہوئے بغیر اس کی تصدیق کرے، اور اپنے عمل سے محض کہنے والے پر اعتماد کرتے ہوئے ترجیح آخرت کی طرف مائل ہو، اسے تقلید کہتے ہیں، معرفت نہیں کہتے، اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ پہلے یہ جانے کہ جو چیز باقی رہنے والی ہے اسے ترجیح دینا بہتر ہے، پھر یہ جانے کہ آخرت باقی رہنے والی ہے، ان دونوں معرفتوں سے تیسری معرفت یہ حاصل ہوگی کہ آخرت کو ترجیح دینا بہتر ہے، اس معرفت کا تحقق سابقہ دونوں معرفتوں کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ ان دونوں معرفتوں کا قلب میں اس لئے حاضر کرنا کہ ان سے تیسری معرفت حاصل ہوگی تفکر، اعتبار، تذکر، نظر، تامل اور تدبر کہلاتا ہے۔ جہاں تک تدبر، تامل، تفکر کا سوال ہے یہ ایک ہی معنی کے لئے مختلف الفاظ ہیں، اور تذکر، اعتبار اور نظر کے معانی الگ الگ ہیں، اگرچہ مسمی ایک ہے جیسے صارم مہند اور سیف کا اطلاق ایک ہی چیز پر ہوتا ہے، لیکن اعتبارات مختلف ہوتے ہیں، چنانچہ صارم اس تلوار کو کہتے ہیں جو کاٹنے والی ہو، اور مہند اس تلوار کو جو ہندوستان میں بنی ہو، اور سیف مطلق تلوار کو کہتے ہیں کوئی زائد امر اس سے سمجھا نہیں جاتا۔ اسی طرح لفظ اعتبار کا اطلاق ان دو معرفتوں پر اس لحاظ سے ہوتا ہے کہ ان سے تیسری معرفت تک پہنچا جائے اور اگر تیسری معرفت تک پہنچنا ممکن نہ ہو، بلکہ دونوں معرفتوں پر ٹھہر جائے تو اسے تذکر کہتے ہیں، اعتبار نہیں کہتے، اور نظر و تفکر کا اطلاق اس اعتبار سے ہوتا ہے کہ آدمی میں تیسری معرفت کی طلب ہو، جس شخص میں تیسری معرفت کی طلب نہیں ہوتی اسے ناظر یا متفکر نہیں کہہ سکتے، چنانچہ ہر متفکر متذکر ہوتا ہے لیکن ہر متذکر متفکر نہیں ہو سکتا۔

تذکار کا فائدہ یہ ہے کہ قلب پر معارف کی تکرار ہو تاکہ وہ اچھی طرح راسخ ہو جائیں اور قلب سے محو نہ ہوں، تفکر کا فائدہ یہ ہے کہ علم زیادہ ہو اور ایسی معرفت حاصل ہو جو پہلے سے موجود نہیں تھی، تذکر اور تفکر میں یہ فرق ہے، جب معارف قلب میں جمع ہو جاتے ہیں اور ایک مخصوص ترتیب کے ساتھ ترکیب پاتے ہیں تو ان سے ایک نئی معرفت حاصل ہوتی ہے یعنی ایک معرفت دوسری معرفت کا ثمرہ ہوتی ہے اور جب وہ نئی معرفت کسی دوسری معرفت کے ساتھ ملتی ہے تو اس سے ایک اور ثمرہ حاصل ہوتا ہے۔ یہ نتائج و ثمرات علوم، و معارف اور فکر اسی طرح بڑھتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ موت اس سلسلے کو منقطع کر دیتی ہے، یا موانع سے یہ راہ مسدود ہو جاتی ہے یہ طریقہ اس شخص کے لئے مفید ہے جو علوم سے ثمرہ حاصل کرتا ہو اور طریق تفکر سے واقفیت رکھتا ہو، اکثر لوگ علم کی کثرت سے محروم ہیں، کیوں کہ ان کے پاس راس المال نہیں ہے۔ یعنی وہ معارف نہیں ہیں جن سے دوسرے معارف پیدا ہوتے ہیں، اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی شخص کے پاس سامان تجارت نہ ہو، اور وہ نفع

حاصل کرنے سے محروم رہ جائے، کبھی آدمی کے پاس راس المال بھی ہوتا ہے لیکن وہ فن تجارت سے اچھی طرح واقف نہیں ہوتا اس لئے نفع نہیں کماپاتا اس طرح بعض لوگوں کے پاس معارف و علوم کا راس المال ہوتا ہے، لیکن وہ ان کے صحیح استعمال سے واقف نہیں ہوتے، اور نہ یہ جانتے ہیں کہ ان معارف کو ایک دوسرے کے ساتھ کس طرح ترکیب دیا جائے کہ دوسرے معارف حاصل ہوں اس لئے اپنے راس المال میں زیادتی نہیں کرپاتے راس المال کو استعمال کرنے کا طریقہ اور ایک معرفت سے دوسری معرفت اخذ کرنے کا طریقہ بھی نور الٰہی کے ذریعے دل میں فطری طور پر منکشف ہوجاتا ہے جیسے انبیاء علیہم الصلاۃ والسلام پر منکشف تھا، لیکن یہ صورت اب بہت کم یاب اور نادر الوقوع ہے، اور کبھی مشق کرنے اور سیکھنے سے آجاتا ہے، عام طور پر یہی صورت پائی جاتی ہے، کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ متفکر کو معارف حاصل ہوتے ہیں، اور وہ ان کے ثمرات بھی رکھتا ہے، لیکن اسے حاصل کرنے کی کیفیت معلوم نہیں ہوتی، اور نہ وہ اسے بیان کرنے پر قادر ہوتا ہے، کیوں کہ اسے بیان کا فن نہیں آتا، چنانچہ بہت سے انسان ایسے ہیں جو یہ جانتے ہیں کہ آخرت کو ترجیح دینی چاہیے، لیکن اگر ان سے اس معرفت کا سبب دریافت کیا جائے تو وہ اسے بیان نہ کرسکیں، حالانکہ یہ معرفت سابقہ دونوں معرفتوں کے بعد ہی حاصل ہوتی ہے، یعنی باقی رہنے والی چیز کو ترجیح ملنی چاہیے، اور آخرت باقی رہنے والی ہے، اور ان دونوں معرفتوں کے بعد یہ معرفت سامنے آئی کہ آخرت کو ترجیح ملنی چاہیے۔

فکر کے ثمرات: خلاصۂ کلام یہ ہے کہ فکر کے معنی دل میں دو معرفتوں کا حاضر کرنا ہے تاکہ ان سے تیسری معرفت حاصل ہو، فکر کے ثمرات علوم، احوال اور اعمال تینوں ہی ہوسکتے ہیں، لیکن اس کا خاص ثمرہ صرف علم ہی ہے، ہاں جب علم قلب میں حاصل ہوتا ہے تو قلب کی حالت بدل جاتی ہے، اور جب قلب کی حالت بدلتی ہے تو جوارح کے اعمال بھی بدل جاتے ہیں، گویا عمل حال کے تابع ہے، اور حال علم کے تابع ہے، اور علم فکر کے تابع ہے، فکر ہی تمام خیرات کا مبداء اور ان کی کنجی ہے، اس سے فکر کی فضیلت بھی واضح ہوتی ہے، اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ فکر ذکر سے افضل ہے کیوں کہ فکر میں ذکر بھی ہے، اور ذکر سے زائد بھی ہے، تاہم ذکر قلب عمل جوارح سے بہتر ہے، بلکہ اشرف ترین عمل وہ ہوتا ہے جس میں عمل بھی ہو، بہر حال فکر تمام اعمال سے افضل ہے، اسی لئے یہ کہا گیا ہے کہ ایک ساعت کا فکر سال بھر کی عبادت سے افضل ہے، بعض اکابر کہتے ہیں کہ فکر وہ ہے، جو قلب کو بری چیزوں سے پسندیدہ چیزوں کی طرف منتقل کردے، اور حرص سے زہد اور قناعت کی طرف پھیر دے، بعض کہتے ہیں کہ فکر مشاہدے اور تقویٰ کو کہتے ہیں قرآن کریم میں ہے۔

لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ أَوْ يُحْدِثُ لَهُمْ ذِكْرًا۔ (پ۱۶ ر۱۵ آیت ۱۱۳)

شاید وہ لوگ ڈر جائیں اور یہ (قرآن) ان کے لئے کسی قدر (تو) سمجھ پیدا کردے۔

اگر تم فکر کے ذریعہ تغیر حال کی کیفیت جاننا چاہتے ہو تو اس کی مثال وہی ہے جو ہم آخرت کے سلسلے میں پہلے لکھ چکے ہیں، اس مثال میں غور کرنے سے پتا چلتا ہے کہ آخرت کو ترجیح دینا بہتر ہے، جب یہ معرفت یقینی طور پر ہمارے قلوب میں راسخ ہوجاتی ہے تو وہ خود بخود آخرت کی محبت اور دنیا میں زہد کی طرف مائل ہوتے ہیں، اسی میلان کو ہم نے حال سے تعبیر کیا ہے، اس معرفت سے پہلے دل کا حال یہ تھا کہ وہ عاجلہ (دنیا) کو پسند کرتا تھا، اس کی طرف مائل تھا، اور آخرت سے متنفر تھا، اور اس کی طرف بہت کم التفات کرتا تھا لیکن جب یہ معرفت حاصل ہوئی تو دل کا حال یکسر بدل گیا، اس کے ارادے اور رغبت میں تغیر ہوگیا، پھر ارادے کے تغیر نے جوارح کو مجبور کیا کہ وہ دنیا کو ایک طرف ڈالیں، اور آخرت کے اعمال پر راغب ہوں۔

فکر کے پانچ درجات: یہاں پانچ درجات ہیں، ایک تذکر اس کے معنی ہیں قلب میں دونوں معرفتوں کو حاضر کرنا، دوسرا تفکر یعنی وہ معرفت حاصل کرنا جو پہلی دونوں معرفتوں سے مقصود ہے، تیسرا درجہ یہ ہے کہ معرفت مطلوبہ حاصل کی جائے اور اس کے ذریعے قلب کو منور کیا جائے، چوتھا درجہ یہ ہے کہ قلب نور معرفت کے بعد سابقہ حالت سے متغیر ہوجائے، اور پانچواں درجہ یہ ہے کہ جوارح قلب کی اس کے تغیر پذیر احوال کے مطابق خدمت کریں، جس طرح پتھر لوہے پر مارا جاتا ہے تو اس سے آگ نکلتی ہے،

اور آگ سے تاریک جگہ میں روشنی پھیلتی ہے' اور آنکھ دیکھنے لگتی ہے' جب کہ اس سے پہلے اسے کوئی چیز نظر نہیں آرہی تھی' اور اعضاء عمل کے لئے بیدار ہوجاتے ہیں یہی حال نور معرفت کے چقماق کا ہے' اور اس چقماق کا نام فکر ہے یہ فکر دو معرفتوں کو جمع کرتا ہے' جیسے وہاں آگ اور پتھر دونوں جمع ہوتے ہیں' اور ان دونوں کے درمیان ایک مخصوص ترکیب پیدا کی جاتی ہے' جس طرح لوہے پر پتھر کو مخصوص طریقے پر مارا جاتا ہے' اس سے معرفت کا نور پیدا ہوتا ہے جس طرح لوہے سے آگ پیدا ہوتی ہے' اور اس نور کی وجہ سے قلب متغیر ہوجاتا ہے' اور اس طرف مائل ہوجاتا ہے جس طرف پہلے مائل نہیں تھا' جیسے آگ کی روشنی میں آنکھ ان چیزوں کو دیکھتی ہے جنھیں روشنی سے پہلے نہیں دیکھتی تھی۔

بہرحال فکر کے ثمرات علوم اور احوال دونوں ہیں' یہ علوم کی کوئی انتہا ہے' اور نہ ان احوال کی کوئی حد ہے جو قلب پر وارد ہوتے ہیں' اسی لئے اگر کوئی سالک یہ چاہے کہ وہ ان امور کا احاطہ کرسکے جن میں فکر کی گنجائش ہے تو ایسا کرنا اس کے لئے ممکن نہ ہو' اس لئے کہ مواقع فکر بے شمار ہیں' اور اس کے ثمرات کی کوئی انتہا نہیں ہے' تاہم ہماری کوشش یہ ہوگی کہ وہ تمام مواقع فکر ضبط تحریر میں آجائیں جو مہمات علوم دین سے متعلق ہیں' یا ان احوال سے جن کا تعلق سالکین کے مقامات سے ہے' لیکن یہ ایک اجمالی ضبط ہوگا' کیوں کہ تفصیل کے لئے ضروری ہے کہ ہم تمام علوم کی شرح کریں۔ اس کتاب کے مختلف ابواب دراصل انہی علوم و احوال میں سے بعض کی شرح میں ہیں' کیوں کہ ان میں وہ علوم بیان کئے گئے ہیں جو مخصوص افکار سے مستفاد ہوتے ہیں۔ ہم بطور اشارہ بیان کریں گے تاکہ فکر کے مواقع پر اطلاع ہوجائے۔

مواقع فکر یا فکر کی راہیں : جاننا چاہیے کہ فکر کبھی ایسے امر میں ہوتا ہے جس کا تعلق دین سے ہوتا ہے اور کبھی ایسے امر میں جس کا تعلق دین سے نہیں ہوتا۔ ہماری غرض متعلقات دین سے ہے' اس لئے ہم غیر متعلق چیزوں کو نظر انداز کرتے ہیں' اور دین سے ہماری مراد وہ معاملہ ہے جو بندے اور اس کے رب کے درمیان ہوتا ہے۔

بندے کے تمام افکار یا تو خود بندے سے' اس کی صفات اور احوال سے متعلق ہوتے ہیں' یا معبود اور اس کی صفات و افعال سے متعلق ہوتے ہیں' یہ ممکن ہی نہیں کہ افکار ان دو قسموں سے تجاوز کرسکیں' جن افکار کا تعلق بندے سے ہے ان کی بھی دو قسمیں ہیں یا تو وہ ان احوال و صفات میں ہوتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کو پسند ہیں' یا ایسے احوال و صفات میں جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک مبغوض ہیں' ان دونوں قسموں کے علاوہ کسی میں فکر کی حاجت ہی نہیں ہے' اور جن افکار کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہے یا تو وہ اس کی ذات و صفات اور اسماء حسنیٰ میں ہوتے ہیں' یا اس کے افعال' ملک و ملکوت اور زمین و آسمان اور ان چیزوں میں ہوتے ہیں' گویا فکر ان چار قسموں میں منحصر ہے' اس کی کیفیت ذیل کی مثال سے بخوبی واضح ہوسکتی ہے۔

جو لوگ اللہ تعالیٰ کی طرف چل رہے ہیں اور اس کی ملاقات کے مشتاق ہیں ان کا حال عشاق کے حال سے زیادہ مشابہ ہے' ہم ایک عاشق صادق فرض کیے لیتے ہیں' اور کہتے ہیں کہ جو شخص عشق میں اپنے پورے وجود سے مستغرق ہوتا ہے اس کا فکر یا تو معشوق سے متعلق ہوتا ہے یا اپنے نفس سے' اگر معشوق کا فکر کرتا ہے تو اس کے جمال اور خوبصورتی میں فکر کرتا ہے' یا اس کی ذات میں فکر کرتا ہے تاکہ اس فکر سے لذت حاصل کرے' یا اس کے ان اوصاف میں فکر کرتا ہے جو اس کی خوبی اور کمال تصور کیے جاتے ہیں تاکہ اس فکر سے لذت اور بڑھ جائے' اور اگر اپنے نفس میں فکر کرتا ہے تو یہ دو حال سے خالی نہیں ہوتا' یا تو اپنے ان اوصاف میں فکر کرتا ہے جو محبوب کے نزدیک اچھے نہیں ہیں اور ان کی وجہ سے وہ اس کی نظروں میں ذلیل و خوار ہوتا ہے' یا ان اوصاف میں فکر کرتا ہے جو محبوب کو پسند ہیں' اور ان کے باعث محبوب کا زیادہ التفات حاصل کیا جاسکتا ہے ان امور کے علاوہ کسی امر میں فکر کرنا عشق سے خارج ہے' اور نقصان کا باعث ہے' اس لئے کہ عاشق صادق وہ ہے جو معشوق کی محبت میں پوری طرح ڈوبا رہے' یہاں تک کہ اس کے دل میں کسی دوسرے خیال و فکر کی گنجائش ہی باقی نہ رہے' اللہ تعالیٰ کے عاشق کو بھی ایسا ہی ہونا چاہیے' اس کی نظر و فکر بھی محبوب سے متجاوز نہ ہونی چاہیے۔

پہلی قسم۔ متعلقات نفس : جب تک بندے کا فکر کورہ بالا چاروں قسموں میں منحصر رہتا ہے وہ محبت کے مقتضی سے جدا نہیں ہوتا' اب ہم ان چاروں قسموں کا الگ الگ جائزہ لیتے ہیں۔ پہلے قسم اول پر نظر ڈالئے یعنی اپنے نفس کے احوال اور صفات میں فکر کرنا تاکہ اچھے اور برے میں تمیز کر سکے' اس فکر کا تعلق علم معاملہ سے ہے جو اس کتاب میں مقصود ہے' اور دوسری قسم کا تعلق علم مکاشفہ سے ہے۔ پھر وہ تمام امور جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ یا ناپسندیدہ ہوں دو طرح کے ہیں' ظاہری جیسے طاعات اور معاصی اور باطنی جیسے نجات دینے والی یا ہلاک کرنے والی صفات ان کا محل قلب ہے' اس کی تفصیل ہم نے احیاء العلوم کی تیسری اور چوتھی جلد میں کی ہے' پھر طاعات اور معاصی میں سے بعض وہ ہیں جن کا تعلق انسان کے سات اعضاء سے ہے' اور بعض کا تعلق پورے بدن سے ہے' جیسے میدان جنگ سے فرار' والدین کی نافرمانی' حرام جگہ پر رہنا۔ جو باتیں اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہیں ان میں تین طرح سے فکر کرنا چاہیے' ایک تو اس طرح کہ یہ باتیں اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہیں یا نہیں' بسا اوقات آدمی پر کسی چیز کی کراہت ایک دم واضح نہیں ہوتی' بلکہ دقت نظر سے کام لینا پڑتا ہے' دوسرا فکر یہ کرے کہ اگر یہ امور اللہ کے نزدیک مکروہ ہیں تو ان سے بچنے کا طریقہ کیا ہے؟ اور تیسرا فکر یہ کہ اس مکروہ کے ساتھ وہ فی الحال متصف ہے کہ اسے چھوڑ دے' یا مستقبل میں متصف ہونے والا ہے کہ اس سے باز رہے' یا ماضی میں رہ چکا ہے کہ اس کی تلافی کرے۔ اسی طرح محبوب چیزوں میں بھی تین طرح سے فکر کرنا چاہیے' اگر ان تمام قسموں کو جمع کیا جائے تو فکر کی راہیں سو سے تجاوز کر جاتی ہیں' اور بندہ کو ان سب میں یا ان میں سے اکثر میں فکر کرنے کی ضرورت پڑتی ہے' ان قسموں کا الگ الگ جائزہ لینا طوالت طلب ہے' ہم نے اس قسم کو چار انواع میں منحصر کر دیا ہے' طاعات معاصی' مہلک صفات' اور نجات دینے والی صفات۔ ہم ہر نوع میں ایک مثال ذکر کریں گے تاکہ مرید ان پر تمام اقسام کو قیاس کر سکے' اور اس پر فکر کا دروازہ وا ہو سکے' اور اس کا میدان وسیع ہو سکے۔

نوع اول معاصی : انسان کو چاہیے کہ وہ ہر روز صبح کو اپنے ساتوں اعضاء میں تفصیلی اور باقی جسم میں اجمالی تفتیش کرے' اگر وہ فی الحال معصیت میں ملوث ہوں تو اسے ترک کر دے' اور اگر کل ملوث ہو چکے ہیں تو اس کا تدارک کرے' اور اگر کل کو اس میں ملوث ہونے والے ہیں تو اس سے بچنے اور دور رہنے کی تیاری کرے' مثال کے طور پر زبان کا جائزہ لے' اور یہ تصور کرے کہ زبان غیبت' جھوٹ' خود ستائی' دوسروں کے استہزاء' قطع کلامی' دوسروں کو برا کہنے' اور لایعنی امور میں دخل دینے میں لگی رہتی ہے' سب سے پہلے اپنے دل میں یہ اعتقاد راسخ کرلے کہ یہ تمام باتیں اللہ تعالیٰ کو سخت ناپسند ہیں' پھر قرآن وسنت کی آیات و روایات پر غور کرے جو شدید عذاب پر دلالت کرتی ہیں' پھر یہ دیکھے کہ وہ اپنے گناہوں کے باعث اس عذاب شدید کا مستحق بننے والا ہے' اس کے بعد یہ فکر کرے کہ وہ ان گناہوں سے کیسے بچ سکتا ہے' اور یہ جانے کہ ان گناہوں سے بچنے کا اس کے علاوہ کوئی طریقہ نہیں ہے کہ گوشہ نشینی' خلوت' اور تنہائی اختیار کرے' اور ایسے نیک اور متقی شخص کی ہم نشینی اختیار کرے جو ہر اس کلام پر تیری گرفت کر سکے جو اللہ کو ناپسند ہے' یا دوسروں کے ساتھ بیٹھنے سے پہلے اپنے منہ میں کنکر رکھ لے' تاکہ زبان غلط باتوں سے رکی رہے' اور یہ یاد رہے کہ زبان کی آفات سے بچنے کے لئے یہ کنکر منہ میں رکھا گیا ہے' زبان کے گناہوں سے بچنے کے لئے یہ تدبیریں کی جاسکتی ہیں۔

اسی طرح کان کے متعلق فکر کرے کہ اس کے ذریعے غیبت' جھوٹ' لغو گفتگو' بے ہودہ اور بدعت کی باتیں سنی جاتی ہیں یہ باتیں عام ہیں' اور زید وعمر کسی سے بھی سننے میں آسکتی ہیں' ان سے بچنا چاہیے' خلوت نشیں ہو کر یا نہی عن المنکر کے ذریعے' یعنی اگر کسی کو کان کی برائی میں مبتلا دیکھے تو اسے منع کر دے' پیٹ کے بارے میں یہ فکر کرے کہ اس کی معصیت کھانے پینے کے باب میں ہوتی ہے' کبھی تو زیادہ کھا کر اگرچہ وہ غذا حلال ہو' کیوں کہ زیادہ کھانا بھی اللہ کو ناپسند ہے' اس سے شہوت کو تقویت ملتی ہے' اور شہوت دشمن خدا شیطان کا ہتھیار ہے' اور کبھی حرام اور مشتبہ غذا کھا کر پیٹ معصیت کا مرتکب ہوتا ہے' کھانے سے پہلے یہ دیکھ لینا چاہیے کہ اس کی غذا کہاں سے حاصل ہو رہی ہے' پیٹ کی برائی سے اسی طرح بچا جاسکتا ہے' پھر یہ بات صرف غذا ہی کے ساتھ خاص نہیں ہے' بلکہ لباس اور مکان کے سلسلے میں بھی سوچنا چاہیے کہ یہ چیزیں اسے حلال ذرائع سے میسر ہوئی ہیں یا حرام و مشتبہ

ذرائع سے' اپنے ذرائع آمدنی کے متعلق بھی فکر کرے کہ وہ جائز ہیں یا نہیں' اگر ناجائز ہوں تو جائز ذرائع آمدنی کے باب میں فکر کرے اور ان ذرائع سے اپنا رزق حاصل کرنے کی تدبیر سوچے' اور یہ دیکھے کہ وہ حرام امور سے کس طرح بچ سکتا ہے' اپنے نفس کو باور کرائے کہ اکل حرام کی موجودگی میں تمام عبادتیں ضائع ہو جاتی ہیں' عبادات کی بنیاد اکل حلال پر ہے' چنانچہ ایک حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی ایسے بندے کی نماز قبول نہیں کرتا جس کے کپڑے کی قیمت ایک درہم حرام ہو (احمد۔ ابن عمرؓ) تمام اعضاء میں اسی طرح فکر کرے۔ جو کچھ یہاں بیان کر دیا گیا ہے وہ بہت کافی ہے' امید ہے جو شخص فکر کے ذریعے ان احوال کی صحیح اور حقیقی معرفت حاصل کرے گا وہ دن بھر اعضاء کی نگرانی رکھے گا' اور اس نگرانی کی وجہ سے اعضاء گناہوں سے محفوظ رہیں گے۔

نوع ثانی طاعات : سالک کو چاہیے کہ وہ پہلے ان اعمال میں فکر کرے جو اس پر فرض کئے گئے ہیں' یعنی وہ انہیں کس طرح ادا کرے' نقص اور کوتاہی سے کس طرح محفوظ رکھے' اور اگر ان میں نقص پیدا ہو جائے تو نوافل کے ذریعے ان کی تلافی کس طرح کرے' پھر ہر ہر عضو کا الگ الگ جائزہ لے اور ان اعمال میں فکر کرے جو اللہ کو پسند ہیں اور جن کا تعلق اس کے اعضاء سے ہے' مثال کے طور پر یہ سوچے کہ آنکھ عبرت کے مناظر دیکھنے کے لئے پیدا کی گئی ہے' اس کے ذریعے آسمان و زمین کے ملکوت کا مشاہدہ کرنا چاہیے' اور اللہ تعالیٰ کی کتاب اور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام کا مطالعہ کرنا چاہیے' میں اس پر قادر ہوں کہ آنکھ کو کتاب اللہ و سنت رسول اللہ کے مطالعے میں مشغول کر سکوں' پھر میں ایسا کیوں نہیں کرتا' میں اس پر بھی قادر ہوں کہ فلاں اطاعت گزار بندے کو تعظیم کی نظروں سے دیکھوں اور اس کے دل میں خوشی پیدا کروں' اور اس پر بھی قادر ہوں کہ فلاں فاسق کو حقارت کی نظر سے دیکھوں اور اس طرح اسے معصیت سے باز رکھنے کی کوشش کروں' پھر میں ایسا کیوں نہیں کرتا۔ اسی طرح اپنے کانوں کے متعلق یہ کہے کہ میں ان کے ذریعے مظلوم کی فریاد بھی سن سکتا ہوں' حکمت' علم' اور قرأت و ذکر بھی سننے پر قادر ہوں' پھر میں کیوں انہیں بیکار کئے ہوئے ہوں' اللہ نے مجھے کانوں کی نعمت اس لئے دی ہے کہ میں انہیں نیکی کا ذریعہ بنا کر اس نعمت پر اس کا شکر ادا کروں' لیکن میں انہیں ضائع یا معطل کر کے کفران نعمت کرتا ہوں' اسی طرح زبان میں فکر کرے' اور یہ کہے کہ میں تعلیم' وعظ' اہل صلاح سے اظہار تعلق' فقراء کے احوال کے بارے میں سوال کرنے پر قادر ہوں' اور مجھے اللہ نے اس کی قدرت بھی عطا کی ہے کہ اچھی بات کہہ کر نیک زید' اور عالم عمر کے قلوب کو خوش کر سکوں' ہر اچھی بات ایک صدقہ ہے اسی طرح اپنے مال کے متعلق بھی فکر کرے کہ میں اپنا مال فلاں کو صدقہ دے سکتا ہوں' میں فی الوقت اس کا محتاج نہیں ہوں' جب مجھے ضرورت ہو گی اللہ تعالیٰ مجھے اسی طرح کا دوسرا مال عطا کر دے گا اور اگر مجھے فی الحال بھی اس مال کی ضرورت ہے تب بھی یہ مال دوسرے کو صدقہ کر دینا ہی زیادہ بہتر ہے' کیونکہ ضرورت کے ہوتے ہوئے ایثار کرنا بڑے ثواب کا کام ہے اور میں مال سے زیادہ اس ثواب کا محتاج ہوں۔

اپنے تمام اعضاء' تمام جسم' تمام مال و دولت بلکہ اپنے تمام جانوروں' غلاموں اور بچوں کا اسی طرح جائزہ لے' کیونکہ یہ تمام چیزیں اس کے اسباب و آلات ہیں' اور وہ ان کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کر سکتا ہے' اپنی دقت فکر کے ذریعے اطاعت کی ممکنہ صورتیں تلاش کرے' پھر ان امور کی جستجو کرے جن کی وجہ سے اطاعات کی ترغیب ہو' پھر نیت کے خلوص میں فکر کرے تاکہ عمل ہر طرح سے پاکیزہ اور ستھرا ہو۔

نوع ثالث۔ صفات مہلک : تیسری نوع میں وہ مہلک صفات ہیں جن کا محل قلب ہے' جلد سوم میں ہم ان کا ذکر کر چکے ہیں' اور وہ ہیں غلبۂ شہوت' غضب' بخل' کبر' عجب' ریاء' حسد' بد ظنی' غفلت اور غرور وغیرہ۔ اپنے دل کا جائزہ لے کر یہ دیکھے کہ اس میں یہ صفات پائی جاتی ہیں یا نہیں' اگر یہ خیال ہو کہ اس کا قلب ان صفات سے پاک ہے تو اس کی آزمائش کا طریقہ سوچے' اور ان علامات کی جستجو کرے جو اس کے اس خیال کی تصدیق کر سکیں' نفس اکثر و بیشتر اپنے متعلق خیر کا گمان رکھتا ہے وہ خیر ہی کا وعدہ کرتا ہے' لیکن بہت جلد وعدہ خلافی بھی کر بیٹھتا ہے' اس لئے اگر کسی شخص کا نفس تواضع' اور کبر سے برأت کا مدعی ہو تو بازار میں لکڑیوں کا گٹھر سر پر رکھ کر اس کی آزمائش کرنی چاہیے جیسا کہ پچھلے لوگ اپنے نفس کا اسی طرح امتحان لیا کرتے تھے' اگر کسی شخص کا نفس حلم کا دعویٰ کرے تو اسے غصہ میں مبتلا کرنے کی کوشش کرو' اور کوئی ایسی بات کہہ کر دیکھو جس سے اسے غصہ آجائے' پھر یہ

دیکھو کہ وہ اپنا غصہ پیتا ہے یا نہیں تمام صفات میں اسی طرح کرنا چاہیے' اس فکر کا مطلب یہ دیکھنا ہے کہ اس کا دل ناپسندیدہ صفات سے متصف ہے یا نہیں؟ اس کی کچھ علامات ہیں جو ہم نے تیسری جلد میں بیان کی ہیں' اگر علامات سے ان صفات کی موجودگی ثابت ہوتی ہو تو ان امور میں فکر کرے جن سے یہ صفات بری معلوم ہوں' اور یہ واضح ہو جائے کہ ان صفات کا منبع جہالت' غفلت اور باطن کی خباثت ہے' مثلاً" کوئی شخص اپنے اعمال کے عجب میں مبتلا ہو' اسے اس طرح فکر کرنا چاہیے کہ میرا عمل میرے جسم' اعضاء' قدرت اور ارادے سے ظہور پذیر ہوا ہے' اور ان تمام چیزوں کا تعلق نہ مجھ سے ہے' اور نہ یہ چیزیں میرے اختیار کی ہیں' بلکہ میری طرح ان چیزوں کو بھی اللہ تعالیٰ نے پیدا ہے' اور مجھ پر اپنا فضل و احسان فرمایا ہے' گویا اسی نے مجھے پیدا کیا ہے' اور اسی نے میرے اعضاء پیدا کئے ہیں' اسی نے میری قدرت اور ارادہ کو پیدا کیا ہے' اسی نے اپنی قدرت سے میرے اعضاء کو حرکت دی ہے' میں نہ اپنے آپ پر عجب کر سکتا ہوں اور نہ اپنے عمل پر' میرے اندر اتنی بھی طاقت نہیں کہ میں از خود کھڑا ہو سکوں۔ اگر کسی شخص کو اپنے نفس میں کبر کا احساس ہو تو اسے اس کی حماقت پر مطلع کرے اور اسے سمجھائے کہ تو اپنے نفس کو بڑا سمجھتا ہے' بڑا تو وہ ہے جو اللہ کے نزدیک بڑا ہے' اور یہ بات موت کے بعد معلوم ہو گی کہ اللہ کے نزدیک کون بڑا ہے' بہت سے کافر موت سے کچھ پہلے مشرف بایمان ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے مقرب بندے بن کر موت سے ہم کنار ہوتے ہیں' اور بہت سے مسلمان ایسے ہیں جو مرنے سے پہلے بدبختی کا شکار ہو جاتے ہیں' اور ان کا خاتمہ برائی پر ہوتا ہے' جب یہ بات معلوم ہو جائے کہ کبر مہلک ہے' اور اس کی اصل حماقت ہے تو اس کے علاج کی فکر کرے' اور اس مرض کے ازالے کے لئے یہ تدبیر کرے کہ متواضعین کے طور پر طریقے اپنائے' اسی طرح اگر کسی شخص کے نفس میں کھانے کی شہوت اور اس کی حرص ہو تو یہ سوچے کہ یہ بہائم کی صفت ہے' اگر شہوت طعام یا شہوت جماع میں کوئی کمال ہوتا تو یہ اللہ تعالیٰ اور ملائکہ کی صفت ہوتی جیسے علم اور قدرت' بہائم کو اس کے ساتھ متصف نہ کیا جاتا۔ جس شخص پر یہ شہوت جس قدر غالب ہو گی اسی قدر وہ بہائم کے ساتھ مشابہ ہو گا' اور ملائکہ مقربین سے دور ہو گا' اسی طرح غضب کے سلسلے میں اپنے نفس کو سمجھائے' اور اس کے علاج کا طریقہ سوچے' ہم نے یہ تمام باتیں متعلقہ ابواب میں بیان کردی ہیں' جو شخص اپنا دامن فکر وسیع کرنا چاہے اسے ان ابواب کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

نوع رابعہ۔ صفات منجیہ : نجات دینے والی صفات ہیں توبہ' گناہوں پر ندامت' مصائب پر صبر' نعمتوں پر شکر' خوف' رجاء' زہد فی الدنیا' اخلاص' اطاعات میں صدق' اللہ کی محبت اس کی تعظیم' اس کے افعال پر رضا' شوق' خشوع اور تواضع۔ یہ تمام صفات ہم نے اس جلد میں بیان کی ہیں' اور ان صفات کے اسباب و علامات پر بھی روشنی ڈالی ہے' بندہ کو چاہیے کہ وہ ہر روز اپنے دل پر نظر ڈالے' اور یہ دیکھے کہ اللہ تعالیٰ سے قریب تر کرنے والی صفات میں سے کون سی صفت کی اسے ضرورت ہے' اگر یہ معلوم ہو جائے کہ اسے فلاں صفت کی ضرورت ہے تو یہ سوچے کہ یہ صفات احوال ہیں' اور احوال علوم کا ثمرہ ہوتے ہیں' اور علوم افکار کا۔ چنانچہ اگر وہ اپنے نفس کے لئے توبہ اور ندامت کے احوال کا ارادہ کرے تو پہلے اپنے گناہوں کا جائزہ لے' ان میں فکر کرے' اور نفس پر ان سب کو مجتمع کردے' اور دل میں ان کو بڑا جانے' پھر اس وعید اور تشدید پر نظر ڈالے جو گناہوں کے سلسلے میں شریعت میں وارد ہوئی ہیں' اور اپنے دل میں یہ یقین رکھے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی مول لینے والا ہے' یہ فکر اس وقت تک کرے جب تک دل میں ندامت کا حال پیدا نہ ہو جائے' اور اگر دل میں شکر کا حال پیدا کرنا چاہے تو پہلے اللہ تعالیٰ کے احسانات اور اس کے انعامات کا مطالعہ کرے' اور یہ سوچے کہ اللہ نے اس کے گناہوں پر اپنا "ستر جمیل" ڈالے رکھا ہے' اس فکر کی تشریح ہم نے کتاب الشکر میں کی ہے' وہاں مطالعہ کرنا چاہیے جب محبت اور شوق کا حال پیدا کرنا چاہتا ہو تو اللہ کے جلال و جمال اور عظمت و کبریائی میں فکر کرے' اور وہ اس طرح پہلے اللہ تعالیٰ کی عجیب و غریب حکمتوں پر نظر ڈالے' اور اس کی عمدہ صنعتوں کو دیکھے' پھر اس کے جلال و جمال میں غور کرے' کتاب الفکر کے دوسرے باب میں اس موضوع پر کچھ روشنی ڈالی جائے گی' خوف کا حال پیدا کرنا ہو تو پہلے اپنے ظاہری اور باطنی گناہوں پر نظر ڈالے' پھر موت اور مابعد الموت کے واقعات و مناظر میں فکر کرے کہ موت سے پہلے سکرات موت طاری ہوتے ہیں' مرنے کے بعد منکر نکیر کے سوالات کا سامنا کرنا پڑے گا' قبر کے عذاب' اس کے سانپ' بچھوؤں' اور کیڑوں

مکوڑوں کے بارے میں سوچے، پھر صور پھونکا جائے گا اور محشر بپا ہوگا اس دن کی وحشت اور حساب کتاب کی شدت کے متعلق فکر کرے، وہاں ذرہ ذرہ کے بارے میں مواخذہ ہوگا اس کے بعد پل صراط سے گذارا جائے گا جو بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہے اس پر سے گذرنے میں یہ خطرہ ہے کہ اگر بائیں طرف کو گرا تو سیدھا دوزخ میں جائے گا اور دائیں طرف کو گیا تو جنت والوں میں سے ہوگا۔ قیامت کے احوال کے بعد جہنم کا تصور کرے کہ اس کے مختلف طبقات ہیں۔ ان میں گنہگاروں اور نافرمانوں کے لئے گرز، طوق و سلاسل، اور پیپ، اور مختلف قسم کے عذاب ہیں، مزید برآں فرشتوں کی خوفناک اور وحشت زدہ کرنے والی صورتیں ہیں، یہ فرشتے دوزخیوں کی کھالیں بدلنے پر مامور ہیں جب وہ گل سڑجاتی ہیں، اگر کوئی دوزخ سے نکلنا چاہے گا تو وہ فرشتے اسے پھر اندر دھکیل دیں گے، اور دور کھڑے ہو کر اس کی چیخیں اور آہ و بکا کی آوازیں سنیں گے، دوزخ کے متعلق قرآن کریم نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ ذہن میں حاضر کرے، اگر رجاء کا حال پیدا کرنا ہو تو جنت کی نعمتوں، راحتوں، باغوں، درختوں، نہروں، حوروں اور غلاموں کے متعلق سوچے کہ وہاں کی ہر نعمت لازوال اور ہر آسائش ابدی ہے۔

اس فکر کا یہی طریقہ ہے جس سے دل میں عمدہ احوال پیدا ہوتے ہیں اور وہ صفات ذمیمہ سے پاک ہوتا ہے، ہم نے ان احوال میں سے ہر حال پر الگ الگ گفتگو کی ہے، اس سے تفصیل فکر پر مدد لی جاسکتی ہے، اگر کوئی شخص ان تمام احوال کو کسی ایک مجموعۂ کتاب میں دیکھنے کا خواہاں ہو تو اسے قرآن کریم کی تلاوت کرنی چاہیے، اس سے زیادہ کوئی کتاب جامع اور نفع دینے والی نہیں ہے، اس میں تمام مقامات اور حالات کا ذکر ہے، یہ کتاب لوگوں کے لئے شفا ہے، کیونکہ اس میں وہ تمام باتیں ہیں جن سے خوف، رجاء، صبر، شکر، محبت، شوق اور دوسرے احوال پیدا ہوتے ہیں، اور جو انسان کو اوصاف ذمیمہ سے روکتی ہیں، بندے کو چاہیے کہ وہ اس عظیم، نافع اور جامع کتاب کا مطالعہ کرے، اور ان آیات کو بار بار پڑھے جن میں اسے ہر لمحہ فکر کرنے کی ضرورت ہے، اگرچہ ایک آیت سو بار پڑھنی پڑے، فکر کے ساتھ ایک آیت کا پڑھنا اس سے بہتر ہے کہ تدبّر و تفکر کے بغیر پورا قرآن کریم پڑھ لیا جائے، ہر ہر آیت پر ٹھہرے اور تامل کرے، اگرچہ تامل کرنے میں پوری رات گزر جائے، اس کے ہر کلمے میں بے شمار اسرار و رموز پنہاں ہیں، اور ان پر صرف وہی شخص مطلع ہو سکتا ہے جو صدق معاملہ کے بعد صفائے قلب کے ساتھ فکر دقیق سے کام لے، قرآن کریم کی طرح سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات مبارکہ، اور احادیث مقدسہ کا بھی مطالعہ کرنا بے حد ضروری ہے، اس لئے کہ آپ کو جوامع الکلم عطا کئے گئے ہیں، آپ کا ہر کلمہ حکمتوں کا سمندر ہے اگر کوئی عالم ان میں صحیح طور پر تامل کرے تو وہ زندگی بھر اپنا سلسلہ فکر و تدبّر منقطع نہیں کر سکتا، ایک آیت یا ایک حدیث شریف کی شرح کے لئے ضخیم دفاتر ناکافی ہیں۔ چنانچہ ایک حدیث میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:-

اِنَّ رُوْحَ الْقُدُسِ نَفَثَ فِيْ رُوْعِيْ اَحْبِبْ مَا اَحْبَبْتَ فَاِنَّكَ مُفَارِقُهُ وَعِشْ مَاشِئْتَ فَاِنَّكَ مَيِّتٌ وَاعْمَلْ مَاشِئْتَ فَاِنَّكَ مُجْزِيٌّ بِهِ

جبرئیل نے میرے دل میں یہ بات ڈالی کہ آپ جس چیز کو چاہیں محبوب رکھیں اس سے جدا ضرور ہوں گے، اور جتنا چاہیں زندہ رہیں انتقال ضرور فرمائیں گے، اور جو چاہیں عمل کریں اس کا بدلہ ضرور پائیں گے۔

یہ کلمات اولین و آخرین کی حکمتوں کو جامع ہیں، اور ان لوگوں کو کافی ہیں جو زندگی بھر ان میں فکر و تامل کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں، اس لئے کہ اگر وہ ان کلمات کے معانی پر مطلع ہو جائیں، اور ان کے دل پر یقین کی طرح غالب آجائیں تو وہ دنیا کی طرف ذرا بھی التفات نہ کرسکیں گے۔

علوم معاملہ میں، اور بندے کی اچھی یا بری صفات میں فکر کرنے کا یہ طریقہ ہے، نو آموز سالک طریقت کو چاہیے کہ وہ اپنے اوقات کو ان افکار میں مستغرق رکھے، یہاں تک کہ اس کا قلب اخلاق محمودہ، اور مقامات شریفہ سے منور ہو جائے، اور اس کا ظاہر و باطن مکروہات سے پاک ہو جائے، یہاں یہ بات بھی یاد رہنی چاہیے کہ ان امور میں فکر کرنا اگرچہ بہترین عبادت ہے، لیکن اصل مطلوب نہیں ہے، بلکہ جو شخص ان امور میں مشغول ہوتا ہے وہ صدیقین کے مطلوب سے محجوب ہوتا ہے، صدیقین کا مطلوب اللہ

تعالیٰ کے جلال وجمال میں فکر کرنا اور اس فکر میں اس طرح مستغرق ہونا ہے کہ اپنے آپ سے بھی فنا ہو جائیں' یعنی اپنے نفس' اپنے احوال' اپنے مقامات' اور صفات سب کچھ فراموش کردیں' محبوب کے فکر میں ان کا عالم ایسا ہو جیسا کسی عاشق صادق کا اس وقت ہوتا ہے جب وہ اپنے معشوق کا دیدار کرتا ہے' اس وقت اسے یہ ہوش ہی نہیں رہتا کہ وہ اپنے حال پر نظر ڈالے' اور اپنے اوصاف پر غور کرے' بلکہ وہ تو مبہوت رہ جاتا ہے' اور اپنا سب کچھ فراموش کردیتا ہے' عشاق کی لذت کا یہ اعلیٰ ترین درجہ ہے۔ زیر بحث فکر کا تعلق ان امور سے ہے جو قلب کو اخلاق حسنہ سے آباد کریں' تاکہ اس سے قربت اور وصال کی لذت حاصل ہو' اب اگر کوئی شخص تمام عمر اپنے قلب کی اصلاح ہی میں مصروف رہا تو اسے قرب ووصال کی لذت کب حاصل ہوگی' اسی لئے حضرت خواص جنگلوں میں چکراتے پھرتے تھے' ایک مرتبہ حسین ابن منصور نے ان سے پوچھا کہ تم کس حال میں ہو' انہوں نے کہا میں اپنا حال اچھا بنانے کے لئے جنگلوں میں گھومتا پھرتا ہوں' حسین ابن منصور نے فرمایا کہ تم نے اپنی تمام عمر باطن کی اصلاح میں ضائع کردی' توحید میں فنا کا درجہ کب حاصل کرو گے اس سے معلوم ہوا کہ واحد برحق میں فنا ہو جانا ہی طالبین کا اصل مقصود' اور صدیقین کی لذت کا منتہیٰ ہے' مہلک صفات سے بچنے کا عمل ایسا ہے جیسے کوئی عورت نکاح کی عدت گزار کر آزاد ہو جائے' اور نجات دلانے والی صفات اختیار کرنے اور اطاعت کرنے کا عمل ایسا ہے جیسے کوئی عورت اپنے خاوند کے استقبال کے لئے تیار ہو' ہاتھ منہ دھوئے' بال سنوارے تاکہ اپنے شوہر سے ملنے کے قابل ہو جائے' اب اگر وہ تمام عمر غیر کے نطفے سے رحم کی صفائی' اور چہرے کی آرائش میں مصروف رہی تو اپنے شوہر سے کب ملے گی' طریق دین کو بھی اسی طرح سمجھنا چاہیے' بشرطیکہ تم میں ہم نشینی کی صلاحیت ہو' اور اگر تم کسی شریر غلام کی طرح ہو کہ وہ زجر وتوبیخ اور مار پیٹ کے بغیر اطاعت نہیں کرتا تو اپنے بدن پر اعمال کی مشقت مت ڈالو' اس لئے کہ تمہارے اور قلب کے درمیان ایک دبیز پردہ حائل ہے' اعمال سے تم صرف جنت کے مستحق بن سکتے ہو' لیکن اس منصب کے اہل دوسرے ہیں جسے ہم نشین کہتے ہیں۔

بندے اور اس کے رب کے درمیان جو علوم معاملہ ہیں ان میں فکر کا طریقہ وہ ہے جو گزشتہ سطور میں مذکور ہوا' سالک کو چاہیے کہ وہ اسے اپنا دستور بنالے' اور صبح وشام اس پر عمل کرے' اور ہر وقت اپنے نفس پر' اور ان صفات پر جو اللہ تعالیٰ سے دور کرتی ہیں' اور ان احوال پر جو اللہ سے قریب کرتے ہیں غافل نہ رہے' بلکہ ہر مرید کو اپنے پاس ایک کاپی رکھنی چاہیے جس میں تمام اچھی بری صفات' تمام معاصی اور طاعات درج ہوں' اور وہ ہر دن ان پر نظر ڈال کر اپنے نفس کی آزمائش کیا کرے۔

<u>صفات مہلکہ اور صفات منجیہ</u>: یوں تو مہلکات بھی بے شمار ہیں' اور منجیات بھی' لیکن اگر دس ہلاک کرنے والی' اور دس نجات دلانے والی صفات پر نظر رکھی جائے تو بہت کافی ہے' وہ دس مہلکات یہ ہیں' بخل' کبر' عجب' ریاء' حسد' شدت غضب' حرص طعام' کثرت شہوت' حب مال' اور حب جاہ' امید ہے جو شخص ان چیزوں سے بچا رہے گا وہ تمام برائیوں سے محفوظ رہے گا' اور دس منجیات یہ ہیں گناہوں پر ندامت' مصائب پر صبر' قضاء پر رضا' نعمتوں پر شکر' خوف ورجاء میں اعتدال' دنیا میں زہد' اعمال میں اخلاص' مخلوق خدا کے ساتھ اچھا برتاؤ' اللہ تعالیٰ سے محبت اور اس کے لئے خشوع' اگر یہ تمام بیس باتیں سالک کی کاپی میں درج ہوں تو علاج کچھ مشکل نہیں رہتا' اور طریقۂ علاج یہ ہے کہ ان بیس باتوں میں سے ایک میں فکر کرے' جب ایک بری بات مثلاً دور ہو جائے تو اپنی کاپی میں اس بات پر خط کھینچ دے' اور اس کے متعلق فکر کرنا چھوڑ دے' اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے کہ اس نے اسے اس برائی سے نجات عطا فرمائی' اور اس کے قلب کو صاف کیا' اور یہ بات جانے کہ میں نے اپنے قلب کو اس صفت سے محض اللہ کی توفیق اور اس کی مدد سے پاک کیا ہے' اگر اس نے یہ معاملہ میرے نفس پر چھوڑ دیا ہوتا تو میں اپنے قلب سے معمولی رزیلہ بھی مٹانے پر قادر نہ ہوتا' اس کے بعد باقی امور کی طرف متوجہ ہو' ایک ایک میں فکر کرے' اسے دور کرے' اور کاپی میں اس پر خط کھینچ دے' یہاں تک کہ تمام رذائل سے پاک ہو جائے' پھر منجیات کے سلسلے میں اسی طرح کرے کہ ایک ایک عمدہ صفت اختیار کرے' اور اس پر خط کھینچتا جائے' یہاں تک کہ تمام اوصاف حسنہ حاصل ہو جائیں' مستعد مرید کا یہی طور ہونا چاہیے۔

جو لوگ صلحاء میں شمار کئے جاتے ہیں انہیں اپنی کاپیوں میں ظاہری گناہ بھی لکھ لینے چاہئیں' جیسے مشتبہ مال کھانا' غیبت' چغلی' خصومت' خود ستائی' دشمنوں کی عداوت میں مبالغہ' دوستوں کی دوستی میں افراط' امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ترک کرنے میں خلق خدا کے ساتھ مداہنت وغیرہ اکثر وہ لوگ بھی ان گناہوں سے بچ نہیں پاتے جنہیں صلحاء کہا جاتا ہے' حالانکہ جب تک آدمی کے اعضاء گناہوں سے پاک نہیں ہوتے وہ اپنے قلب کی تعمیر و تطہیر میں مصروف نہیں ہو سکتا' پھر مختلف آدمیوں پر مختلف قسم کے معاصی کا غلبہ ہوتا ہے' ہر شخص پر ایک ہی نوع کے معاصی غالب نہیں ہوتے' اس لئے ہر شخص کو چاہیے کہ وہ انہی معاصی میں فکر کرے جو اس پر غالب ہیں' ان معاصی میں فکر نہ کرے جس سے وہ دور ہے' مثال کے طور پر اکثر متقی پرہیزگار علماء وعظ و تدریس کے ذریعے خود نمائی' خود ستائی' یا نام و نمود کی خواہش سے محفوظ نہیں ہوتے' یہ بھی ایک زبردست فتنہ ہے' اور جو شخص اس فتنہ میں مبتلا ہو جاتا ہے وہ نجات نہیں پاتا' صرف صدیقین ہی اس سے محفوظ رہتے ہیں' ورنہ عام علمائے امت کا حال تو یہ ہے کہ اگر ان کا خطاب لوگوں میں مقبول اور ان کے قلوب پر اثر انداز ہونے والا ہو تو وہ فخر و مسرت سے پھولے نہیں سماتے' اور عجب و خود پسندی میں مبتلا ہو جاتے ہیں' حالانکہ یہ امور مہلکات میں سے ہیں' اور اگر لوگ ان کا کلام قبول نہیں کرتے تو پھر ان کے غصہ' نفرت اور حسد کا عالم قابل دید ہوتا ہے حالانکہ اگر وہ لوگ کسی دوسرے عالم کا کلام ٹھکراتے ہیں تو اسے ذرا غصہ نہیں آتا' صرف اپنا کلام ٹھکرانے پر زیادہ غصہ آتا ہے' اس کی وجہ یہ ہے کہ شیطان اس پر یہ امر ملتبس کر دیتا ہے اور کہتا ہے کہ تیرا غصہ اس لئے نہیں ہے کہ لوگوں نے تیرا کلام ٹھکرایا ہے' بلکہ اس لئے ہے کہ انہوں نے حق کو ٹھکرایا ہے' اور اسے قبول کرنے سے انکار کیا ہے' ظاہر ہے وہ شخص شیطان کے فریب میں آگیا' ورنہ اس کے اور دوسرے عالم کے کلام میں کیا فرق ہے' وہ بھی دین کی تبلیغ کرتا ہے اور یہ بھی' پھر کیا وجہ ہے کہ اسے اپنے کلام کے ٹھکرائے جانے پر غصہ آتا ہے اور دوسرے عالم کے ٹھکرائے جانے پر غصہ نہیں آتا' بلکہ خوشی ہوتی ہے' پھر وہ شخص اپنے کلام کی مقبولیت صرف اترانے اور خوش ہونے پر ہی اکتفا نہیں کرتا' بلکہ مزید مقبولیت حاصل کرنے کے لئے تصنع اور تکلف سے کام لیتا ہے' اور الفاظ کی ادائیگی کو خوبصورت بنانے میں وقت ضائع کرتا ہے' مقصد یہ نہیں ہوتا کہ لوگوں کے دلوں پر اس کا کلام اثر انداز ہو' اور وہ دل جمعی اور توجہ کے ساتھ سن کر قبول کر سکیں' بلکہ اسے تعریف کی طلب ہوتی ہے' حالانکہ اسے معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ کو تکلف کرنے والے پسند نہیں ہیں' شیطان یہاں بھی اسے بہکانے آجاتا ہے اور کہتا ہے کہ تجھے تحسین الفاظ کی حرص اسلئے ہے کہ تو حق پھیلا سکے' لوگوں کے قلوب میں دین کی باتیں اچھے انداز میں اثر کریں' اور اللہ کا کلمہ بلند ہو' حالانکہ اگر یہ بات ہوتی تو اسے دوسرے علماء کی تعریف سے خوشی بھی ہوتی' جس طرح اپنی تعریف سے ہوتی ہے مگر حقیقت میں ایسا نہیں ہوتا' بلکہ دوسرے علماء کی مقبولیت سے اس کے سینے پر سانپ لوٹتے ہیں' معلوم ہوا یہ شخص مبتلائے فریب' اور حریص عز و جاہ ہے اگرچہ اس کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ دین سے غرض رکھتا ہے۔

پھر جب یہ صفات اس کے دل میں پیدا ہوتی ہیں تو ظاہر پر بھی اثر انداز ہوتی ہیں' چنانچہ اگر اس کے سامنے دو ایسے شخص ہوں جن میں سے ایک اس کا احترام کرتا ہو' اس کے علم و فضل کا معتقد ہو' اور دوسرا شخص وہ ہو جو اس کے کسی حریف کا معتقد اور اس کا احترام کرنے والا ہو تو اسے پہلے آدمی سے مل کر زیادہ خوشی ہوتی ہے اور وہ مجلس میں زیادہ تر اسی کی طرف توجہ دیتا ہے' اور اسی کا احترام کرتا ہے' خواہ دوسرا شخص بھی اس کے احترام اور عزت افزائی کا مستحق ہو' بعض اوقات ان علماء کا یہ حال ہوتا ہے کہ وہ سوکنوں کی طرح لڑتے ہیں' اور انہیں یہ گوارا نہیں ہوتا کہ ان کا کوئی شاگرد کسی دوسرے عالم کے پاس جائے' اگرچہ وہ یہ جانتا ہے کہ اس کا شاگرد دوسرے عالم سے بھی استفادہ کرتا ہے' اور دین حاصل کرتا ہے۔

ان تمام امور کا مبداء وہی صفات مہلکہ ہیں جن کے متعلق عالم یہ گمان کرتا ہے کہ میں ان سے محفوظ ہوں' حالانکہ وہ فریب خوردہ ہے' یہ علامتیں اس کے دل میں پائی جانے والی صفات پر واضح دلالت کرتی ہیں' عالم کا فتنہ بڑا زبردست ہے' یہ شخص یا تو اپنے تقویٰ و طہارت سے بادشاہ بن جاتا ہے' یا اپنے حرص و طمع سے ہلاک ہو جاتا ہے' جو شخص اپنے دل میں یہ صفات محسوس کرے اس پر گوشہ نشینی' عزلت' گمنامی واجب ہے' اس کی کوشش یہ ہونی چاہیے کہ لوگ اس سے مسائل بھی دریافت نہ کریں۔ ایک دو روہ

بھی تھا کہ مسجد نبوی میں ایسے صحابہ کا اجتماع رہتا تھا جو فتویٰ دینے کے اہل تھے' لیکن جب ان سے کوئی فتویٰ دریافت کیا جاتا تو وہ ایک دوسرے پر ٹال دیا کرتے تھے' اور اگر کوئی فتویٰ دے بھی دیتا تھا تو وہ یہ سوچا کرتا تھا کہ کاش کوئی دوسرا مجھے اس مشقت سے بچالیتا۔ عزلت کے وقت آدمی کو اپنی ہی جنس کے شیاطین سے احتیاط کرنی چاہیے' وہ یہ کہتے ہیں کہ تم گوشہ نشینی اختیار مت کرو' اس لئے کہ اگر عزلت کا دروازہ کھول دیا گیا تو علوم مٹ جائیں گے' اگر کوئی شخص اس عذر کے ساتھ تجھے عزلت سے روکنے کی کوشش کرے تو تجھے کہنا چاہیے کہ دین اسلام مجھ سے بے نیاز ہے' اسے میری ضرورت نہیں ہے' یہ دین مجھ سے پہلے بھی آباد تھا اور میرے بعد بھی آباد رہے گا' میرے مرنے سے ارکان اسلام منہدم نہیں ہوں گے' دین اسلام مجھ سے تو مستغنی ہے' لیکن میں خود اپنے قلب کی صلاح سے مستغنی نہیں ہوں' یہ کہنا کہ اس سے علم مٹ جائے گا ایک بے بنیاد اور غلط خیال ہے' اور جہالت پر دلالت کرتا ہے' اگر لوگ قید خانے میں ڈال دیئے جائیں اور زنجیروں میں جکڑ دیئے جائیں' اور ان سے کہا جائے کہ اگر انہوں نے علم حاصل کیا تو انہیں آگ میں ڈال دیا جائے گا تو وہ زنجیریں توڑ کر اور قید خانے کی دیواریں پھاند کر باہر نکل جائیں' اور جاہ و ریاست کی محبت انہیں تحصیل علم میں مشغول رکھے جب تک شیطان انسان کو ریاست و اقتدار کی طمع دلاتا رہے گا علم کا دروازہ بند نہیں ہوگا' اور یہ ظاہر ہے کہ شیطان کبھی بھی اپنے کام میں سستی نہیں کرے گا' اس طرح علوم کو میری عزت سے کوئی خطرہ نہیں ہے' علوم ان لوگوں کی وجہ پھیلیں گے جن کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے' سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:۔

إِنَّ اللَّهَ يُؤَيِّدُ هَذَا الدِّينَ بِأَقْوَامٍ لَا خَلَاقَ لَهُمْ وَإِنَّ اللَّهَ لَيُؤَيِّدُ هَذَا الدِّينَ بِالرَّجُلِ الْفَاجِرِ (۱)

اللہ تعالیٰ اس دین کی تائید ایسے لوگوں سے کرے گا جن کو دین میں کچھ بہرہ نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ اس دین کی تائید بدکار آدمی سے کرے گا۔

عالم کو ان تلبیسات سے فریب نہیں کھانا چاہیے' ایسا نہ ہو کہ وہ مخلوق کے ساتھ اختلاط میں مشغول ہو جائے' اور اس کے دل میں جاہ و ثناء کی محبت پروان چڑھنے لگے' مال و جاہ کی محبت نفاق کا بیج ہے' سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:۔

حُبُّ الْجَاهِ وَالْمَالِ يُنْبِتُ النِّفَاقَ فِي الْقَلْبِ كَمَا يُنْبِتُ الْمَاءُ الْبَقْلَ (۲)

جاہ اور مال کی محبت دل میں اس طرح نفاق پیدا کرتی ہے جس طرح پانی سبزی اگاتا ہے۔

ایک حدیث میں ہے:۔

مَا ذِئْبَانِ ضَارِيَانِ أُرْسِلَا فِي زَرِيبَةِ غَنَمٍ بِأَكْثَرَ إِفْسَادًا فِيهَا مِنْ حُبِّ الْجَاهِ وَالْمَالِ فِي دِينِ الْمَرْءِ الْمُسْلِمِ (۳)

دو خونخوار بھیڑیئے جو کسی گلے میں چھوڑ دیئے جائیں اتنے نقصان کا باعث نہیں ہوتے جتنا نقصان مال و جاہ کی محبت سے مومن کے دین کو لاحق ہوتا ہے۔

جاہ کی محبت دل سے اس وقت تک زائل نہیں ہوتی جب تک لوگوں سے کنارہ کشی اختیار نہ کی جائے' اور ان کے ساتھ ملنے جلنے سے اجتناب نہ کیا جائے' اور وہ تمام چیزیں ترک نہ کی جائیں جو لوگوں کے دلوں میں اس کی محبت اور جاہ بڑھاتی ہوں' عالم کو اپنے دل کی ان مخفی صفات کی جستجو کرنی چاہیے' اور ان سے بچنے کا طریقہ اختیار کرنا چاہیے' یہ ایک متقی اور پرہیزگار عالم کا فریضہ ہے' اور ہم جیسے لوگوں کو یہ چاہیے کہ ان امور میں فکر کریں جو یوم حساب پر ہمارے ایمان کو پختہ کریں' اگر سلف صالحین ہمیں دیکھ لیتے تو وہ قطعیت کے ساتھ یہ بات کہتے کہ یہ لوگ یوم حساب پر ایمان نہیں رکھتے' کیا ہمارے اعمال ان لوگوں کے سے ہیں جو جنت اور دوزخ پر ایمان رکھتے ہیں اس لئے کہ جو شخص کسی چیز سے ڈرتا ہے اس سے دور بھاگتا ہے' اور جو شخص کسی چیز کی امید کرتا ہے اسے طلب کرتا ہے' اور ہم یہ بات جانتے ہیں کہ آگ سے فرار کا مطلب ہے مشتبہ اور حرام امور ترک کرنا اور معاصی سے کنارہ

---

(۱) یہ دونوں روایتیں پہلے بھی گزری ہیں (۲) یہ حدیث بھی گزر چکی ہے۔ (۳) یہ حدیث بھی پہلے گزر چکی ہے۔

کشی اختیار کرنا' حالاں کہ ہم ان میں منہمک ہیں۔ اور جنت نفلی عبادات کی کثرت سے حاصل ہوتی ہے' جب کہ ہم فرائض میں بھی کوتاہی کرتے ہیں۔ ہمارے نزدیک تو علم کا صرف یہ ثمرہ ہے کہ لوگ دنیا کی حرص وہوس میں ہماری اقتداء کریں اور یہ کہا جائے کہ اگر حرص دنیا مذموم ہوتی تو علماء اس سے بچنے اور اجتناب کرنے کے زیادہ مستحق ہوتے' کیا اچھا ہوتا کہ ہم جاہل عوام کی طرح ہوتے جن کے مرنے سے ان کے گناہ بھی مرجاتے ہیں' کتنا بڑا فتنہ ہے جس میں ہم مبتلا ہیں' کاش ہم سوچ سکتے' دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہماری اصلاح فرمائے' اور ہمارے ذریعے دوسروں کی بھی' اور ہمیں موت سے پہلے توبہ کی توفیق عطا فرمائے وہ مہربان ہے' کریم ہے' منعم ہے۔

علوم معاملہ میں فکر کرنے کا یہ طریقہ تھا جو علماء اور صلحاء نے اختیار کررکھا تھا' جب وہ لوگ اس طریقہ سے فارغ ہوتے تو پھر اپنے نفسوں کی طرف ان کا التفات باقی نہیں رہتا تھا' بلکہ ان افکار سے ترقی کرکے وہ اللہ تعالیٰ کی عظمت وجلال اور قلب کی آنکھوں سے اس کے مشاہدۂ جمال کی لذت میں فکر کرنے لگتے تھے' لیکن یہ فکر اسی وقت حاصل ہوتا ہے جب آدمی تمام مہلکات سے دور رہو' اور تمام منجیات سے متصف ہو' اگر اس سے پہلے یہ ظاہر بھی ہوا تو ناقص اور عارضی ہوگا' اور اس کی مثال ایسی ہوگی جیسے بجلی چمک کر معدوم ہوجائے' مہلکات سے برأت اور منجیات سے اتصاف کے بغیر جو شخص فکر الٰہی میں مشغول ہوتا ہے وہ اس عاشق کی طرح ہے جسے اپنے معشوق کے ساتھ تنہائی میسر آئی ہو' اور اس کے کپڑوں میں سانپ اور بچھو رینگ رہے ہوں' اور اسے کاٹ رہے ہوں' ظاہر ہے ان کیڑوں کے کاٹنے کی تکلیف سے اس خلوت کی تمام لذت ضائع ہوجائے گی' اور تمام لطف غارت ہوجائے گا' صفات مذمومہ مہلکہ بھی سانپ بچھو کی طرح ایذا دینے والی ہیں' اور جمال الٰہی کے مشاہدے کی لذت کو مکدّر کرنے والی ہیں' قبر میں ان سے جو تکلیف ہوگی وہ سانپ بچھوؤں کے کاٹنے سے زیادہ ہوگی۔ اس تفصیل سے ثابت ہوتا ہے کہ بندے کو اپنے نفس کی پسندیدہ اور ناپسندیدہ صفات میں کس طرح فکر کرنا چاہیے۔

دوسری قسم۔ اللہ تعالیٰ کی جلالت' عظمت اور کبریائی میں فکر: فکر کی دوسری قسم یہ ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ کی جلالت' عظمت اور کبریائی میں فکر کرے اس فکر کے دو مقام ہیں' پہلا مقام جو اعلیٰ ہے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات اور اس کے اسماء کے معانی میں فکر کیا جائے اور یہ وہ مقام ہے جس سے منع کیا گیا ہے اس لئے کہ کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں فکر کرو' اس کی ذات میں فکر مت کرو' منع اس لئے کیا گیا ہے کہ عقلیں اس میں حیران رہ جاتی ہیں' صرف صدیقین ہی اس کی طرف نگاہ اٹھانے کی جرأت کرسکتے ہیں' مگر دوام نظر کا حوصلہ ان میں بھی نہیں ہے' اللہ تعالیٰ کے جلال کی نسبت مخلوق کی آنکھوں کا حال ایسا ہے جیسے شپرک کی آنکھوں کا حال آفتاب کی روشنی کے مقابلے میں ہوتا ہے' شپرک آفتاب کی روشنی برداشت نہیں کرپاتی' اس لئے وہ دن میں چھپی رہتی ہے' اور رات کے وقت آفتاب کی باقی رہ جانے والی روشنی میں اڑتی پھرتی ہے' اور صدیقین کا حال ایسا ہے جیسے دھوپ میں عام آدمی کا حال ہوتا ہے کہ وہ سورج کی طرف دیکھ سکتا ہے' لیکن اسے دوام نظر کی تاب نہیں ہوتی' بلکہ یہ خطرہ رہتا ہے کہ کہیں مسلسل دیکھنے سے بصارت زائل نہ ہوجائے' خوب گہری نظر سے دیکھنا بھی۔ خواہ وہ مختصر وقفے کے لئے ہو۔ آنکھوں کے لئے نقصان کا باعث ہے' اسی طرح اللہ تعالیٰ کی ذات کی طرف دیکھنے سے بھی حیرت اور استعجاب پیدا ہوتا ہے' اور عقل مضطرب ہوجاتی ہے اس لئے بہتر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کو اپنے فکر کی جولا نگاہ نہ بنائے کیونکہ اکثر عقلیں اس فکر کا تحمل نہیں کرسکتیں' بلکہ فکر کی وہ معمولی مقدار جس کی علماء نے صراحت کے ساتھ اجازت دی ہے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مکان' اطراف اور جہات سے پاک ہے' نہ وہ عالم کے اندر ہے اور نہ باہر ہے' نہ اس سے متصل ہے اور نہ اس سے جدا ہے' بعض لوگوں کی عقلیں اس سلسلے میں اس قدر حیران وپریشان ہوئیں کہ اس سے انکار کربیٹھے' کیونکہ نہ ان میں ان باتوں کے سننے کی طاقت تھی' اور نہ سمجھنے کی' بعض لوگ اس سے کم درجے کی تنزیہہ بھی برداشت نہ کرسکے' چنانچہ جب ان سے کہا گیا کہ اللہ تعالیٰ اس سے بلند تر ہے کہ اس کے سر ہو' پاؤں' ہاتھ یا آنکھ ہو' یا کوئی دوسرا عضو ہو' یا کوئی ایسا جسم مشخص ہو جو کسی مقدار یا حجم میں سما سکتا ہو ان

لوگوں نے اس کا بھی انکار کیا اور کہنے لگے کہ یہ تو اللہ تعالیٰ کی عظمت و جلالت میں نقصان کی بات ہے' بعض احمق عوام تو یہاں تک کہنے لگے کہ تم اللہ تعالیٰ کی جو تعریف کر رہے ہو وہ ایک ہندوستانی خربوزے کی تعریف معلوم ہوتی ہے' ان احمقوں کا خیال یہ تھا کہ بزرگی اور عظمت اعضاء میں ہوتی ہے' اس کی یہ وجہ ہے کہ انسان صرف اپنے جسم کو جانتا ہے اور اسی کو بڑا سمجھتا ہے' جو چیز صفات میں اس کے نفس کے برابر نہیں ہوتی اسے عظیم نہیں سمجھتا' چنانچہ جو شخص تمام تر عظمت اور بڑائی اس میں سمجھتا ہے کہ کسی مرصع تخت پر بیٹھا ہوا ہو' اور سامنے دست بستہ غلاموں کی قطار ہو' اور وہ انہیں حکم دے رہا ہو' چنانچہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں بھی اس کا یہی تصور ہے کہ وہ ایک تخت پر بیٹھا ہوا اپنے ہزاروں لاکھوں نوکروں پر حکم چلاتا ہے' اور اس تصور کو وہ اللہ تعالیٰ کی عظمت کا اعتراف قرار دیتا ہے اور اس بے چارے پر کیا موقوف ہے اگر مکھی کو عقل ہوتی اور اس سے کہا جاتا کہ تیرے خالق کے بازو نہیں ہیں' اور نہ وہ اسی طرح اڑتا ہے جس طرح تو اڑتی ہے تو کبھی یقین نہ کرتی کہ اس کے خالق کے بازو ٹوٹے ہوئے ہیں یا وہ معذور ہے' بھلا مجھے تو اس نے اڑنے کی قدرت اور اس کا آلہ دیا' اور خود نہ یہ قدرت رکھتا ہے اور نہ یہ آلہ حالانکہ وہ میرا خالق ہے' مجھے بنانے والا ہے' اکثر لوگوں کی عقلوں کا حال یہی ہے' واقعی انسان بڑا ظالم' جاہل اور ناشکرا ہے' اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک نبی سے فرمایا کہ میرے بندوں کو میری صفات مت بتلاؤ وہ انکار کر دیں گے' بلکہ انہیں وہ باتیں بتلاؤ جو ان کی سمجھ میں آجائیں' ادب شرع اور اصلاح خلق کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی ذات میں فکر کے درپے نہ ہوں' اسی لئے ہم پہلے مقام سے عدول کرکے دوسرے مقام پر گفتگو کرتے ہیں۔

دوسرا مقام یہ ہے کہ ہم اس کے افعال' اس کی قدرت اور صناعی کے عجائبات' اور مخلوق کے سلسلے میں اس کے عجیب و غریب معاملات میں فکر کریں' یہ امور اس کی جلالت' کبریائی' تقدس اور برتری پر بھی دلالت کرتے ہیں' اور اس کے کمال علم' کمال حکمت' کمال قدرت' اور نفوذ مشیت پر بھی دلالت کرتے ہیں' معلوم ہوا کہ ہمیں اس کی صفات پر نظر نہ کرنی چاہیے بلکہ ان صفات کے آثار پر نظر کرنی چاہیے' کیونکہ ہم صفات کی طرف دیکھنے کی طاقت نہیں رکھتے جس طرح ہم سورج کو نہیں دیکھ سکتے لیکن جب سورج کی روشنی سے زمین روشن ہو جاتی ہے تو ہم اسے دیکھ سکتے ہیں' اور اس سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ چاند اور دوسرے کواکب کی روشنی کے مقابلے میں سورج کی روشنی بہت زیادہ ہے' زمین کا نور سورج کے نور کا اثر ہے اور اثر سے مؤثر پر دلالت ہوتی ہے' اگرچہ مؤثر کا مشاہدہ نہ ہو سکے' دنیا کی تمام موجودات اللہ تعالیٰ کی قدرت کے آثار میں سے ایک اثر اور اس کی ذات کے انوار میں سے ایک نور ہے' بلکہ کوئی تاریکی عدم سے بڑھ کر نہیں ہوتی' اور نہ کوئی نور وجود سے زیادہ واضح ہوتا ہے' تمام اشیاء کا وجود اللہ تعالیٰ کی ذات کا نور ہے' کیونکہ تمام اشیاء اس کی ذات کے ساتھ قائم ہیں اور وہ خود بخود قائم ہے' جیسے جسموں کا نور آفتاب سے ہے' اور آفتاب خود روشن ہے' اور جب آفتاب قدرے روشن ہو جاتا ہے تو ایک طشت میں پانی ڈال کر اس کا عکس دیکھا جاتا ہے کیونکہ اس پر نظر ٹھہر جاتی ہے' گویا پانی کے ذریعے سورج کی روشنی کچھ کم کر دی جاتی ہے' اسی طرح افعال الٰہی بھی فاعل کے مشاہدے کا ایک ذریعہ ہیں' ہم اس کی صفتوں کا مشاہدہ کرتے ہیں' اس کے نور ذات سے حیران نہیں ہوتے' اسی لئے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

تَفَكَّرُوا فِي خَلْقِ اللّٰهِ وَلَا تَتَفَكَّرُوا فِي ذَاتِ اللّٰهِ

اللہ کی مخلوق میں فکر کرو اس کی ذات میں فکر مت کرو۔

خلق خدا میں تفکر کا طریقہ: جاننا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا جو چیز بھی موجود ہے وہ اس کا فعل اور اس کی مخلوق ہے' اور ہر ذرّہ میں جوہر و عرض اور موصوف و صفت کے ایسے عجائب و غرائب ہیں جن سے اللہ تعالیٰ کی حکمت' قدرت جلالت اور عظمت کا اظہار ہوتا ہے' ان عجائبات کا شمار ممکن نہیں ہے' اگر سمندر کو روشنائی بنا دیا جائے اور اس کے ذریعے عجائبات لکھنے شروع کئے جائیں تو روشنائی ختم ہو جائے' اور عجائبات کا دسواں حصہ بھی تحریر کی قید میں نہ آسکے۔ لیکن ہم بطور نمونہ کچھ لکھ رہے ہیں' ان کی

روشنی میں باقی عجائبات کو قیاس کیا جاسکتا ہے۔

موجودات کی قسمیں : دنیا میں اللہ تعالیٰ کی مخلوق موجودات جس قدر بھی ہیں دو قسموں میں منحصر ہیں' ایک وہ ہیں جن کی اصل کا ہمیں علم نہیں' اس قسم کی موجودات میں ہم تفکر نہیں کرسکتے' اور اس طرح کی موجودات بے شمار ہیں جن کا ہمیں علم نہیں ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام میں ارشاد فرمایا ہے:۔

وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُونَ۔ (پ ۱۴ر ۷ آیت ۸)

اور وہ ایسی ایسی چیزیں بناتا ہے جن کی تم کو خبر بھی نہیں۔

سُبْحَانَ الَّذِي خَلَقَ الْأَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْبِتُ الْأَرْضُ وَمِنْ أَنْفُسِهِمْ وَمِمَّا لَا يَعْلَمُونَ۔ (پ ۲۳ ر ۲ آیت ۳۶)

پاک ہے وہ ذات جس نے تمام مقابل قسموں کو پیدا کیا نباتات زمین کے قبیل سے بھی اور ان آدمیوں میں سے بھی اور ان چیزوں میں سے بھی جن کو لوگ نہیں جانتے۔

وَنُنْشِئَكُمْ فِيمَا لَا تَعْلَمُونَ۔ (پ ۲۷ ر ۱۵ آیت ۶۱)

اور تم کو ایسی صورت میں بنادیں جن کو تم جانتے ہی نہیں۔

دوسری قسم میں وہ موجودات ہیں جن کی اصل ہمیں معلوم ہے' اور جو اجمالی طور پر معروف ہیں' لیکن انکی تفصیل ہمیں معلوم نہیں ہے' ایسی اشیاء کی تفصیل میں ہم فکر کرسکتے ہیں' ان اشیاء کی بھی دو قسمیں ہیں' کچھ وہ ہیں جو آنکھ سے نظر آتی ہیں اور کچھ وہ ہیں جو آنکھ سے نظر نہیں آتیں' جو چیزیں آنکھ سے نظر نہیں آتیں وہ فرشتے' جن' شیاطین' عرش اور کرسی وغیرہ ہیں' لیکن ان میں فکر کا دائرہ بہت تنگ اور محدود ہے' اس لئے ہم صرف وہی قسم لکھتے ہیں جو فہم سے قریب تر ہے' اور اس قسم میں وہ اشیاء ہیں جو آنکھ سے نظر آتی ہیں جیسے آسمان' زمین' اور ان کے درمیان کی چیزیں' آسمان میں ستارے' چاند' اور سورج نظر آتے ہیں' اور ان کی حرکت اور طلوع و غروب کے لئے ان کی گردش محسوس ہوتی ہے' زمین میں پہاڑ' کانیں' نہریں' سمندر' حیوانات اور نباتات نظر آتے ہیں' اور آسمان و زمین کے درمیان فضا ہے جس میں بادل' بارش' برف' بجلی' ہوا اور ستاروں کے ٹوٹنے کا مشاہدہ ہوتا ہے' بہرحال آسمان و زمین میں ان اجناس کا مشاہدہ ہوتا ہے' پھر ہر جنس مختلف انواع میں منقسم ہوتی ہے' اور ہر نوع کی مختلف قسمیں نکلتی ہیں' اور ہر قسم کی اصناف ہوجاتی ہیں' صفت' ہیئت' اور ظاہری و باطنی معنی کے لحاظ سے یہ اصناف ناقابل شمار ہیں' اور ان تمام اصناف میں فکر کی گنجائش ہے۔

آسمان و زمین کا کوئی ذرہ خواہ اس کا تعلق جمادات' نباتات' یا حیوانات کسی بھی چیز سے ہو ایسا نہیں ہے جس کو حرکت دینے والا اللہ تعالیٰ نہ ہو' اور اس کی حرکت میں ایک یا دو' یا دس' یا ہزار حکمتیں ایسی نہ ہوں جن سے اللہ کی وحدانیت' اس کی جلالت اور عظمت پر دلالت ہوتی ہو یہ تمام چیزیں گویا اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی دلائل اور جلالت کی نشانیاں ہیں' قرآن کریم میں ان آیات و دلائل میں فکر کرنے کی ترغیب دی گئی ہے' ارشاد ہے:۔

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيَاتٍ لِأُولِي الْأَلْبَابِ۔ (پ ۴ ر ۱۱ آیت ۱۹۰)

بلاشبہ آسمانوں اور زمین کے بنانے میں اور یکے بعد دیگرے رات اور دن کے آنے جانے میں دلائل ہیں اہل عقل کے لئے۔

قرآن کریم میں متعدد مواقع پر من آیاتہ کے الفاظ آئے ہیں' اور اللہ تعالیٰ کی نشانیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہاں ہم بعض آیات میں فکر کرنے کا طریقہ بیان کرتے ہیں۔

انسانی نطفے کا ذکر: انسان کا نطفہ اس کی بے شمار آیات میں سے ایک آیت ہے' جس سے انسان پیدا ہوا ہے' جو چیز تجھ سے انتہائی قریب ہے وہ خود تیرا نفس ہے' اور اس میں اتنے عجائب مخفی ہیں کہ عمریں فنا ہو جائیں مگر تجھے ان عجائبات کا سوواں حصہ بھی معلوم نہ ہو' لیکن تو ان عجائبات سے غافل ہے بھلا جو شخص خود اپنے نفس سے غافل ہو گا وہ غیر کی معرفت کیسے حاصل کر سکے گا' اللہ تعالیٰ نے بے شمار مواقع پر انسان کو اپنے نفس میں غور و فکر کرنے کی دعوت دی ہے' ارشاد ربانی ہے۔

وَفِیْ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ۔ (پ۲۶ ر۱۸ آیت ۲۱)

اور خود تمہاری ذات میں بھی کیا تم کو دکھائی نہیں دیتا۔

قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَا اَکْفَرَهٗ مِنْ اَیِّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ مِنْ نُّطْفَةٍ خَلَقَهٗ فَقَدَّرَهٗ ثُمَّ السَّبِیْلَ یَسَّرَهٗ ثُمَّ اَمَاتَهٗ فَاَقْبَرَهٗ ثُمَّ اِذَا شَآءَ اَنْشَرَهٗ۔ (پ۳۰ ر۵ آیت ۱۷ تا ۲۲)

خدا کی مار وہ کیسا ناشکرا ہے' اللہ تعالیٰ نے اس کو کیسی حقیر چیز سے پیدا کیا' نطفے سے (پیدا کیا) اس کی صورت بنائی پھر اندازے اس (کے اعضاء) بنائے' پھر اس کو (نکلنے کا) راستہ آسان کر دیا' پھر اس کو موت دی' پھر اس کو قبر میں لے گیا' پھر جب اللہ چاہے گا اس کو دوبارہ زندہ کرے گا۔

وَمِنْ اٰیٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَکُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ اِذَآ اَنْتُمْ بَشَرٌ تَنْتَشِرُوْنَ۔ (پ۲۱ ر۶ آیت ۲۰)

اور اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا' پھر تھوڑے ہی روزوں بعد تم آدمی بن کر پھیلے ہوئے پھرتے ہو۔

اَلَمْ یَکُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِیٍّ یُّمْنٰی ثُمَّ کَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوّٰی۔ (پ۲۹ ر۱۸ آیت ۳۷-۳۸)

کیا یہ شخص ایک قطرۂ منی نہ تھا جو (رحم میں) ٹپکایا گیا تھا' پھر وہ خون کا لوتھڑا ہو گیا پھر اللہ نے (اس کو انسان) بنایا' پھر اعضاء درست کئے۔

اَلَمْ نَخْلُقْکُّمْ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِیْنٍ فَجَعَلْنٰهُ فِیْ قَرَارٍ مَّکِیْنٍ اِلٰی قَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ۔ (پ۲۹ ر۲۱ آیت ۲۰ تا ۲۲)

کیا ہم نے تم کو ایک بے قدر پانی سے نہیں بنایا۔ پھر ہم نے اس کو ایک وقت مقرر تک ایک محفوظ جگہ میں رکھا۔

اَوَلَمْ یَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِیْمٌ مُّبِیْنٌ۔ (پ۲۳ ر۴ آیت ۷۷)

کیا آدمی کو معلوم نہیں کہ ہم نے اس کو نطفے سے پیدا کیا' سو وہ اعلانیہ اعتراض کرنے لگا۔

اِنَّا خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ اَمْشَاجٍ۔ (پ۲۹ ر۱۹ آیت ۲)

ہم نے اس کو مخلوط نطفے سے پیدا کیا۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِیْنٍ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِیْ قَرَارٍ مَّکِیْنٍ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَکَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا۔ (پ ۱۸ ر ۱ آیت ۱۲-۱۴)

اور ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصہ سے بنایا' پھر ہم نے اس کو نطفے سے بنایا جو ایک محفوظ مقام میں رہا' پھر ہم نے اس نطفہ کو خون کا لوتھڑا بنا دیا۔ پھر ہم نے اس خون کے لوتھڑے کو بوٹی بنا دیا۔ پھر ہم نے اس بوٹی (کے بعض اجزاء) کو ہڈیاں بنا دیا۔ پھر ہم نے ان ہڈیوں پر گوشت چڑھا دیا۔

قرآن کریم میں لفظ نطفہ بار بار اس لئے ذکر نہیں کیا گیا کہ محض اس کا سنانا مقصود ہے اس کے معنی میں غور کرنا ضروری نہیں ہے بلکہ اس لفظ کے تکرار میں دعوت فکر موجود ہے۔ مثلاً" تم نطفے کے بارے میں اس طرح فکر کر سکتے ہو کہ یہ پانی کا ایک ناپاک

قطرہ ہے۔ اگر کچھ دیر کے لئے ہوا میں چھوڑ دیا جائے تو سڑ جائے اور بدبو دینے لگے لیکن دیکھو اللہ نے کس طرح یہ قطرہ مردوں کی پشت اور عورتوں کے سینے سے نکالا۔ کس طرح مردوں اور عورتوں میں اجتماع کیا اور ان کے دلوں میں محبت اور الفت پیدا فرمائی اور انہیں محبت و شہوت کی زنجیروں میں قید کر کے یکجا کیا پھر کس طرح جماع کی حرکت کے باعث مردسے منی نکال کر عورت کے رحم میں پہنچائی۔ پھر کیسے عورت کی رگوں میں سے حیض کا خون اکٹھا کر کے اس کے رحم میں ذخیرہ کیا۔ پھر منی کے اس قطرہ سے بچہ بنایا اور اسے حیض کی غذا دی۔ یہاں تک کہ اس نے نشوونما پائی اور بڑا ہوا۔ دیکھو منی کا قطرہ نہایت سفید اور چمکتا ہوا تھا لیکن اسے سرخ پھٹکی بنایا' پھر پھٹکی کو لوتھڑا کیا' پھر نطفے کے حصے کردیئے حالانکہ یہ تمام حصے ایک ہی چیز کے تھے' لیکن حکمت دیکھو کہ کسی حصے سے ہڈیاں بنائیں' کسی سے پٹھے بنائے' کسی سے رگیں اور گوشت بنایا۔ پھر گوشت' پٹھوں اور رگوں کے ذریعہ ظاہری اعضاء بنائے' سر کو گول بنایا' کان' آنکھ ناک' منہ اور دوسرے منفذ بنائے۔ ہاتھ اور پاؤں کو لمبا کیا' ان کے سروں میں انگلیاں بنائیں اور انگلیوں کے سرے میں پورے بنائے' پھر اندرونی اعضاء بنائے جن میں دل' جگر' معدہ' تلی' پھیپھڑا' رحم' مثانہ اور آنتیں وغیرہ ہیں۔ ہر عضو کی اپنی مخصوص شکل' مخصوص سائز اور مخصوص عمل ہے۔ پھر ان اعضاء میں سے ہر عضو کو دوسری قسموں میں تقسیم کیا مثلاً آنکھ کے سات طبقے بنائے۔ ہر طبقے کا ایک خاص وصف اور مخصوص ہیئت ہے۔ اگر ان میں سے ایک طبقہ بھی مفقود ہو جائے یا اس کی صفات میں سے کوئی صفت زائل ہو جائے تو آنکھ بینائی سے محروم ہو جائے' اگر ہم ان اعضاء کو الگ الگ لیں اور جو کچھ عجائبات اور آیات ان میں پوشیدہ ہیں بیان کرنا شروع کردیں تو عمریں تمام ہو جائیں بیان ختم نہ ہو۔

مثال کے طور پر ہڈیوں پر نظر ڈالو' یہ سخت اور مضبوط اجسام ہیں' مگر ان کی تخلیق ایک نرم اور بہتے ہوئے مادّے سے عمل میں آئی ہے۔ پھر ان ہڈیوں کو جسم کے قیام' ٹھہراؤ اور راست رہنے کا سبب قرار دیا گیا ہے' پھر تمام ہڈیاں یکساں نہیں ہیں بلکہ مختلف شکلوں اور مختلف مقداروں کی ہیں' بعض بڑی ہیں' بعض چھوٹی ہیں' بعض لمبی ہیں' بعض گول ہیں' بعض کھوکھلی ہیں' بعض ٹھوس ہیں' بعض چپٹی ہیں اور بعض پتلی ہیں۔ غرضیکہ ہر طرح کی ہڈیاں ہیں۔ انسان کو اپنے تمام جسم سے بھی حرکت کرنی پڑتی ہے اور اپنے بعض اعضاء سے بھی' اس لئے اس کے جسم میں مختلف ہڈیاں بنائی گئیں اور ان کو ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح جوڑا گیا کہ ایک ہڈی دوسرے کے بغیر اور ایک عضو دوسرے عضو کے بغیر حرکت کر سکے۔ پھر ہر ہڈی کو وہی ساخت عطا کی گئی ہے جو اس کی حرکت کے مطابق ہو۔ ہڈیوں کو ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح جوڑا ہے کہ ایک ہڈی میں سے نکلے ہوئے ریشے دوسری ہڈی میں پیوست ہو گئے' نیز ایک ہڈی کا سرا کچھ آگے کو نکلا ہوا بنایا ہے اور دوسری ہڈی میں اتنا خلاء بنایا ہے کہ پہلی ہڈی کا زائد حصہ اس میں سما سکے۔ اس طرح انسان کو یہ سہولت حاصل ہو گئی ہے کہ اگر وہ اپنے جسم کا کوئی حصہ ہلانا چاہے تو ہلا سکے' اگر یہ جوڑ نہ ہوتے تو اس کے لئے اپنے جسم کے کسی مخصوص حصے کو حرکت دینا آسان نہ ہوتا۔ سر کی ہڈیوں کا معاملہ بھی کچھ کم حیرت ناک نہیں ہے۔ انہیں ایک دوسرے سے پیوست کر کے گول شکل دی' یہ مختلف شکلوں اور مختلف صورتوں کی تقریباً "پچپن ہڈیاں ہیں' یہ تمام ہڈیاں ملتی ہیں تو سر بنتا ہے۔ ان میں سے چھ ہڈیاں کھوپڑی کے ساتھ مخصوص ہیں اور چودہ ہڈیاں اوپر کے جبڑے کی ہیں اور بارہ نیچے کے جبڑے کی ہیں اور باقی دانت ہیں۔ ان میں سے بھی بعض دانت چوڑے ہیں جو کھانے کو پیسنے کی صلاحیت رکھتے ہیں' بعض دانت تیز ہیں جن سے غذا کاٹی جاتی ہے۔ بعض نوکیلے ہیں' بعض داڑھیں ہیں اور بعض کچلیاں ہیں اور بعض سادہ دانت ہیں۔ پھر گردن کو سر کی سواری بنایا اور اسے سات منکوں سے مرکب کیا جو بیچ میں سے خالی اور گول ہیں۔ ان میں سے بعض چھوٹے اور بعض بڑے ہیں' تاکہ ایک دوسرے میں اچھی طرح پیوست ہو سکیں۔ اس کی حکمت کا بیان بڑا تفصیل طلب ہے۔ پھر کمر کو پیٹھ پر سوار کیا اور پیٹھ کو گردن کے نچلے حصے سے سرین کی ہڈی تک چوبیس منکوں سے بنایا اور سرین کی ہڈی کے تین مختلف حصے کئے' نیچے کی طرف سے وہ ہڈی ریڑھ کی ہڈی سے وابستہ ہے اور یہ بھی تین اجزاء پر مشتمل ہے' پھر پیٹھ کی ہڈیوں کو سینے' مونڈھوں' ہاتھوں' زیر ناف اور سرین کی ہڈیوں کے ساتھ جوڑا' پھر رانوں' پنڈلیوں اور انگلیوں کی ہڈیاں ہیں۔ ہم الگ الگ شمار کر کے گفتگو کو طول نہیں دینا چاہتے۔ تمام

بدن میں دو سو اڑتالیس ہڈیاں ہیں۔ ان میں وہ چھوٹی ہڈیاں داخل نہیں ہیں جن سے جوڑوں کے خالی حصے بھرے گئے ہیں۔ دیکھو اللہ تعالیٰ نے یہ تمام اعضاء کس طرح ایک رقیق اور نرم مادّے سے پیدا کئے ہیں۔ ہڈیوں کی تعداد بیان کرنے سے یہ مقصود نہیں ہے کہ ہم ہڈیاں شمار کرنا چاہتے ہیں۔ یہ علم اطباء سے متعلق ہے اور وہ ان کی تعداد خوب جانتے ہیں۔ ہم تو صرف اس کے بنانے والے' اس کے خالق سے غرض رکھتے ہیں کہ اس نے انہیں کیسے بنایا' کس طرح ان کی شکلیں اور مقداریں ایک دوسرے سے مختلف بنائیں اور پھر انہیں اس مخصوص عدد میں منحصر رکھا ورنہ اگر ایک ہڈی بھی زیادہ ہوجاتی تو انسان کے لئے وبال بن جاتی اور اسے ضرورت پیش آتی کہ وہ زائد ہڈی اس کے جسم سے نکال دی جائے اور اگر ایک ہڈی بھی کم ہوجاتی تو جسم میں عیب رہ جاتا اور اس کے تدارک کی ضرورت ہوتی۔ طبیب ہڈیوں پر اس لئے غور کرتا ہے کہ وہ ان کا علاج کرسکے اور عقلمند انسان اس لئے نظر ڈالتا ہے کہ ان کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی جلالت اور عظمت پر استدلال کرے' دونوں کے نقطۂ نظر میں زبردست فرق ہے۔

پھر یہ بھی دیکھو کہ اللہ تعالیٰ نے ہڈیوں کو حرکت دینے کے آلات پیدا کئے' انہیں پٹھے کہہ سکتے ہیں۔ انسان کے بدن میں پانچ سو انتیس پٹھے ہیں اور ہر پٹھا گوشت' بند اور جھلیوں سے مل کر بنتا ہے۔ یہ تمام پٹھے مختلف شکلوں اور مقداروں کے ہیں اور جس جگہ سے متعلق ہیں اسی کی مناسبت سے بنائے گئے ہیں' ان میں چوبیس پٹھے تو آنکھ اور پلکوں کو حرکت دینے کے لئے بنائے گئے ہیں' اگر ان میں سے ایک بھی کم ہوجائے تو آنکھ کا نظام درہم برہم ہوجائے۔ اسی طرح ہر عضو کے لئے مخصوص تعداد میں عضلات ہیں۔ پٹھوں' رگوں اور شریانوں کی تعداد ان کے نکلنے اور پھیلنے کی جگہوں کا حال اس سے کہیں زیادہ عجیب تر ہے جو بیان کیا گیا ہے' اس کی تفصیل طوالت کا باعث ہوگی۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ آدمی کے لئے ان اجزاء میں سے ایک میں یا ان اعضاء میں سے کسی ایک میں اور پھر تمام جسم کے مقام میں فکر کرنے کی گنجائش ہے۔ اس طرح آدمی جسم کے ان عجائبات' معانی اور صفات میں فکر کرسکتا ہے جو حواس سے معلوم نہیں ہوتے۔ پھر آدمی کے اندرونی جسمانی نظام سے گذر کر اس کے ظاہر پر نظر ڈالو' اس کے باطن میں غور کرو اور اس کی صفات میں تامل کرو تو یہ بھی عجائبات سے خالی نہیں ہے اور یہ تمام چیزیں اسی ایک ناپاک قطرے سے وجود پذیر ہوئی ہیں۔ جب ایک ناپاک قطرے میں اس کی صناعی کا یہ عالم ہے تو آسمانوں کے ملکوت اور کواکب میں اس کی صنعت اور حکمت کا کیا عالم ہوگا۔ ان کے احوال' اشکال' مقادیر' تعداد اور بعض کے ساتھ بعض کے اجتماع اور افتراق اور غروب و طلوع کے اختلاف میں کیا کیا راز پنہاں ہوں گے اور کس قدر حکمتیں پوشیدہ ہوں گی۔

تمہیں یہ گمان نہ کرنا چاہیے کہ آسمانی ملکوت کا کوئی ذرّہ حکمت یا حکمتوں سے خالی ہے بلکہ آسمانی ملکوت صفت کے اعتبار سے محکم' تخلیق کے اعتبار سے پختہ اور عجائبات کے لحاظ سے جامع تر ہے۔ انسان کے جسم سے اس کا کسی بھی اعتبار سے کوئی مقابلہ نہیں ہے بلکہ آسمانی ملکوت کا مقابلہ زمین کی کسی بھی چیز سے نہیں کیا جاسکتا۔ آسمان اور زمین کی چیزوں میں کوئی مناسبت ہی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

أَأَنتُمْ أَشَدُّ خَلْقًا أَمِ السَّمَاءُ بَنَاهَا ۚ رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوَّاهَا ۚ وَأَغْطَشَ لَيْلَهَا وَأَخْرَجَ ضُحَاهَا۔ (پ ۳۰' ر ۴' آیت ۲۷ تا ۲۹)

بھلا تمہارا (دوسری بار) پیدا کرنا زیادہ سخت ہے یا آسمان کا' اللہ نے اس کو بنایا' اس کی چھت کو بلند کیا اور اس کو درست بنایا اور اس کی رات کو تاریک اور اس کے دن کو ظاہر کیا۔

اب پھر نطفے کی طرف واپس چلو اور غور کرو کہ پہلے اس کا کیا حال تھا اور اب کیا ہوگیا ہے۔ اگر تمام جن اور انس اس امر پر متفق ہوجائیں کہ وہ نطفے کو کان' آنکھ' عقل' قدرت' علم اور روح دیں یا اس میں ہڈی' رگ' پٹھا' کھال اور بال پیدا کریں تو وہ اپنے ارادے میں کبھی کامیاب نہ ہوں بلکہ وہ یہ بھی نہیں جان سکتے کہ اس نطفے سے لمبا چوڑا انسان کس طرح پیدا ہوجاتا ہے۔ اب تم

اپنے دل پر نظر ڈالو' بعض اوقات تم کسی دیوار' کاغذ یا پردے پر کسی مصور کی بنائی ہوئی کوئی خوبصورت تصویر دیکھتے ہو اور اس تصویر کی خوبصورتی تمہارے دل و دماغ پر اپنا اثر چھوڑتی ہے' تم بے ساختہ واہ کہہ اٹھتے ہو اور مصور کی نقاشی' چابکدستی اور کمال فن کی داد دیئے بغیر نہیں رہتے' دل میں بھی اس کی عظمت کا اعتراف کرتے ہو اور زبان سے بھی اس کا اظہار کرتے ہو حالانکہ تم یہ بات اچھی طرح جانتے ہو کہ وہ تصویر محض ایک نقل ہے۔ ہاتھ' دیوار' قدرت' علم' ارادے' قلم اور رنگ کی مدد سے مصور نے ان اعضاء کی نقالی کی ہے جنہیں وہ حقیقت میں بنانے کی صلاحیت نہیں رکھتا بلکہ ایک اور قوت ان اعضاء کی خالق ہے مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ تم یہ تمام باتیں جاننے کے باوجود اس مصور کے فعل کو تعجب کی نظر سے دیکھتے ہو اور یہ نہیں دیکھتے کہ ایک مصور حقیقی بھی ہے جس نے محض ایک قطرے سے انسان کو پیدا کیا۔ پہلے قطرہ بھی نہیں تھا' پھر اسے پشت اور سینے میں مخصوص جگہوں پر پیدا کیا' پھر اسے وہاں سے نکالا' پھر اسے اچھی شکل دی اور عمدہ صورت بنائی اس کے مشابہ اجزاء کو مختلف اجزاء پر تقسیم کیا' پھر ان میں مضبوط ہڈیاں بنائیں' اچھے اعضاء بنائے' ظاہر و باطن کو خوبصورت کیا' رگوں اور پٹھوں کو ایک خاص ترتیب سے بنایا اور انہیں غذا کی گذرگاہ قرار دیا تاکہ جسم باقی رہ سکے۔ پھر اس جسم کو سننے' دیکھنے' جاننے اور بولنے والا بنایا' اس کی پشت کو بدن کی بنیاد قرار دیا اور پیٹ کو غذائی آلات کا جامع اور سر کو حواس کا مخزن بنایا' پھر دو آنکھیں کھولیں' ان کے طبقات ایک دوسرے پر رکھے' ان کی شکلیں اچھی بنائیں' اچھا رنگ دیا پھر پپوٹے پیدا کئے تاکہ آنکھوں کی حفاظت کریں' ان میں جلاء پیدا کریں اور خس و خاشاک سے بچائیں' پھر آنکھوں کی پتلیوں میں جس کا حجم تل سے بڑا نہیں ہے' زمین و آسمان کی وسعتیں سمودیں' وہ آنکھ کے نہایت مختصر شیشے کے ذریعے دور دور تک دیکھ لیتا ہے اور حد نظر تک پھیلی ہوئی کوئی چیز اس سے بچ کر نہیں رہ سکتی' پھر دو کان بنائے اور ان میں ایک تلخ پانی ودیعت کیا تاکہ سماعت کی حفاظت ہو اور کیڑے مکوڑے اندر نہ جاسکیں' پھر کان کو ایک سیپ جیسے چمڑے سے گھیر دیا تاکہ باہر سے آنے والی آواز پہلے اس چمڑے میں جمع ہو پھر وہاں سے اندر کان میں پہنچے' اس کی تخلیق میں ایک حکمت یہ بھی ہے کہ اگر کوئی کیڑا کان کے اندر جانا چاہے تو اس چمڑے پر رینگنے سے پتا چل جائے' کان کے سوراخ میں متعدد نشیب و فراز اور ٹیڑھے میڑھے راستے رکھے تاکہ اگر کوئی کیڑا کان کے اندر گھسنے کی کوشش کرے تو انسان کو خبر ہوجائے خواہ وہ اس وقت سو رہا ہو' کیڑے کی مسلسل حرکت اسے بیدار کرسکتی ہے' پھر چہرے کے بیچوں بیچ ایک اونچی سی ناک بنائی' یہ انسان کی خوبصورتی کی علامت ہے' ناک کے دو نتھنے رکھے' ان میں سونگھنے کی قوت پیدا کی تاکہ سونگھ کر کھانے پینے کی چیزوں کے اچھے یا برے ہونے کا اندازہ کرسکے اور تر و تازہ ہوا کھینچ کر قلب کو راحت دے سکے اور باطن کی حرارت سے سکون پائے' پھر منہ پیدا کیا اور اس میں زبان رکھی جو بولتی ہے' دل کی باتیں ظاہر کرتی ہے اور دماغ کی ترجمانی کرتی ہے' منہ کو دانتوں سے زینت دی' دانت پیسنے' توڑنے اور کاٹنے میں کام آتے ہیں۔ ان کی جڑیں مضبوط' سرنوکیلے اور رنگ سفید ہے' ان کی صفیں سیدھی اور سر کے برابر بنائیں' ان میں ایک ترتیب رکھی گویا لڑی میں پروئے ہوئے موتی ہوں' دو ہونٹ پیدا کئے' انہیں اچھا رنگ اور شکل دیا' یہ دونوں ہونٹ ایک دوسرے پر آکر منہ کا راستہ بند کردیتے ہیں' ان کے بند ہونے سے کلام کے بہت سے حروف مکمل ہوتے ہیں' نرخرہ پیدا کیا اور اسے آواز نکالنے کی قدرت دی۔ زبان میں بولنے اور علیحدہ کرنے کی قوت رکھی تاکہ آواز کو الگ الگ مخرج سے باہر نکال سکے اور بہت سے حروف بول سکے' پھر بعض نرخرے تنگ اور بعض فراخ بنائے گئے' بعض میں نرمی اور بعض میں سختی ہے' بعض صاف ہیں اور بعض کھردرے ہیں' بعض طویل اور بعض حقیر ہیں۔ اسی لئے آوازیں الگ الگ ہوتی ہیں' کسی کی عمدہ اور دل کو لبھانے والی' کسی کی سخت اور کھردری کہ کان نفرت کریں' سب کی آوازیں الگ الگ بنائیں تاکہ آوازوں میں اختلاط نہ ہو اور آواز کی مدد سے اندھیرے میں بھی ایک دوسرے کو پہچانا جاسکے' پھر [illegible] بالوں سے زینت دی اور چہرے کو داڑھی اور بھنوؤں سے سجایا اور بھنوؤں کو باریک بالوں سے کمان کی صورت بخشی' آنکھوں کو پلکوں کی جھالر دی۔ پھر باطنی اجزاء پیدا کئے اور ان سب کو مخصوص اعمال کے لئے مسخر کیا' چنانچہ معدہ غذا کو پکانے کے لئے مسخر ہے' جگر غذا کو خون بنانے پر مامور ہے' تلی' پتا اور گردے جگر کے خادم بنائے گئے ہیں۔ تلی کی خدمت یہ ہے

کہ وہ جگر سے سوداوی مادّے کو جذب کرلیتی ہے۔ پتا صفراوی مادّہ کو جذب کرتا ہے اور گردے آبی رطوبت کو جذب کرتے ہیں۔ مثانہ گردے کا خادم ہے' وہ پانی جو گردے میں جمع ہوتا ہے مثانہ اسے قبول کرلیتا ہے اور پیشاب کے راستے سے باہر نکال دیتا ہے۔ رگیں بھی جگر کی خدمت پر مامور ہیں۔ ان کی خدمت یہ ہے کہ وہ خون کو بدن کے ہر حصے میں پہنچاتی ہیں۔ اس کے بعد دونوں ہاتھ پیدا کئے۔ انہیں لمبا بنایا تاکہ مقصود چیزوں کی طرف بڑھ سکیں۔ ہتھیلی کو کشادہ بنایا اور اسے پانچ انگلیوں میں تقسیم کردیا اور ہر انگلی کو تین تین پوروں پر تقسیم کیا۔ چار انگلیوں کو ایک طرف رکھا اور انگوٹھے کو ایک طرف تاکہ انگوٹھا سب انگلیوں پر گھوم سکے۔ اگر اگلے اور پچھلے زمانے کے تمام لوگ متفق ہو کر نہایت غور و خوض کے ساتھ انگلیوں کی موجودہ ترتیب سے ہٹ کر کوئی اور ترتیب تجویز کریں تو وہ مقاصد حاصل نہ ہوں جو موجودہ ترتیب سے حاصل ہوتے ہیں۔ موجودہ ترتیب میں چاروں انگلیوں سے انگوٹھے دور ہونے' چاروں انگلیوں کی لمبائی میں تفاوت اور ان کے ایک مرتب صف میں ہونے کے اندر وہ حکمتیں پوشیدہ ہیں جو کسی دوسری ترتیب سے حاصل نہیں ہوسکتیں۔ اس ترتیب کے ذریعے ہاتھ پکڑنے اور دینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اگر انگلیوں کو پھیلالیا جائے تو ایک طشتری بن جائے۔ اس پر جو چیز چاہو رکھ لو اور بند کرلیا جائے تو گھونسا بن جائے جو مارنے کا ایک آلہ ہے اور اگر نامکمل طور پر سے بند کیا جائے تو چلو بن جائے اور اگر انگلیوں کو ملا کر کھول دیا جائے تو کرچی یا بیلچے کی شکل اختیار کرلے۔ پھر انگلیوں کے سروں پر ان کی زیبائش کے لئے ناخن پیدا کئے گئے۔ ان ناخنوں کی وجہ سے پشت کی جانب انگلیوں کو سہارا بھی ملتا ہے۔ ناخنوں کا ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ جو باریک چیزیں انگلیوں سے نہیں اٹھ پاتیں وہ ناخنوں سے اٹھائی جاسکتی ہیں۔ نیز بدن کو کھجانے کے لئے بھی ناخن کی ضرورت پڑتی ہے۔ بظاہر یہ ایک حقیر ترین عضو بدن ہے مگر اس وقت اس کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے جب بدن میں کھجلی پیدا ہو اور ناخن موجود نہ ہوں۔ تب پتا چلتا ہے کہ یہ کس قدر قیمتی چیز ہے اور اس کے بغیر انسان کتنا محتاج اور عاجز ہے۔ کھجانے میں کوئی چیز ناخنوں کے قائم مقام نہیں بن سکتی ہے پھر ہاتھ خود بخود اس جگہ پہنچ جاتا ہے جہاں کھجلی ہو۔ خواہ آدمی نیند میں ہو یا غفلت میں ہو۔ اگر کھجلانے میں کسی دوسرے آدمی کی مدد لی جائے تو وہ سکون حاصل نہیں ہوتا جو خود اپنے ہاتھ سے کھجانے میں ملتا ہے۔ علاوہ ازیں خود اپنا ہاتھ جس آسانی سے کھجلی کی جگہ تک پہنچ جاتا ہے اتنی آسانی سے دوسرے کا ہاتھ نہیں لے جایا جاسکتا۔ یہ تمام امور نطفے میں پیٹ کے اندر تین تہ بہ تہ تاریکیوں کے بعد یکے بعد دیگرے وقوع پذیر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ بالفرض اگر یہ تہ بہ تہ تاریکیاں دور کردی جائیں اور رحم کے اندر بچہ صاف نظر آجائے تو دیکھنے والا خود دیکھ لے کہ یہ امور ایک دوسرے کے بعد خود بخود بنتے چلے جاتے ہیں۔ نہ مصور نظر آتا ہے نہ اس کے آلات نظر آتے ہیں۔ کیا تم نے کوئی ایسا مصور دیکھا ہے جو نہ اپنے آلات کو ہاتھ لگائے اور نہ اپنی مصنوعات کو مگر ان میں اس کا تصرف جاری ہے۔ یہ صرف اسی کی شان ہے اور یہی اس کی عظمت کی دلیل ہے۔

اس کمال قدرت کے بعد اس کی وسیع تر رحمت دیکھو کہ جب رحم تنگ ہوگیا اور وہ نطفہ بچہ بن کر بڑا ہوگیا تو اسے ہدایت کی کہ وہ رحم میں اوندھا ہوجائے اور اس تنگ جگہ سے نکلنے کی راہ تلاش کرے اور اس سے باہر نکلے۔ اس نے اپنی راہ تلاش کی گویا وہ سمجھتا بوجھتا اور دانا بینا ہے۔ پھر جب رحم مادر سے باہر آیا اور اسے غذا کی حاجت ہوئی تو اسے اپنی ماں کی چھاتیوں کا پتا بتایا اور ان سے اپنی غذا حاصل کرنے کا طریقہ سکھلایا۔ پھر غذا بھی ایسی نرم اور لطیف پیدا کی جو اس کے مزاج اور جسم سے مطابقت رکھتی ہو۔ یعنی دودھ جو ماں کی چھاتیوں میں سے خون اور غلاظت سے الگ ہو کر نکلتا ہے۔ چھاتیوں پر غور کرو' انہیں کیسا بنایا اور ان میں کس طرح دودھ جمع کیا اور چھاتیوں کے سرے ایسے گول بنائے کہ بچے کے منہ میں سماسکیں اور ان سروں میں ایک تنگ سوراخ بنایا جس کے ذریعے دودھ دبائے بغیر نہیں نکلتا اور نکلتا بھی ہے تو آہستہ آہستہ' کیوں کہ بچہ صرف تھوڑا تھوڑا ہی پی سکتا ہے۔ بچے کو چوسنے کی صلاحیت بخشی۔ وہ اس تنگ سوراخ سے اتنا دودھ برآمد کرلیتا ہے کہ پیٹ بھر سکے۔ پھر اس کی بے پایاں رحمت' وسیع تر شفقت اور لطف و کرم دیکھو کہ پیدائش کے ساتھ ہی دانت نہیں نکلتے بلکہ دو سال کے بعد دانت نکلتے ہیں کیونکہ دو سال تک اس کی غذا

دودھ ہوتی ہے جسے چبانے میں دانتوں کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ پھر جب وہ بڑا ہو جاتا ہے تو پتلا دودھ اس کے مزاج کے موافق نہیں رہتا۔ اس وقت اسے گاڑھی غذا کی ضرورت ہوتی ہے اور اس غذا کو پیسنا یا چبانا پڑتا ہے۔ اس کے لئے دانت پیدا کئے جاتے ہیں۔ اللہ تعالٰی کی قدرت کے قربان جائیے کہ اس نے نرم مسوڑھوں سے سخت دانت کیسے پیدا کئے۔

اس تمام تخلیقی حکمتوں سے ہٹ کر والدین کے دلوں میں اس کی محبت اور شفقت پیدا کی تاکہ وہ لوگ اس زمانے میں اس کی دیکھ بھال کر سکیں جس زمانے میں وہ خود اپنی دیکھ بھال نہیں کر سکتا۔ اللہ تعالٰی والدین کے دلوں پر اس کی محبت مسلط نہ کرتا تو وہ مخلوق میں انتہائی عاجز ہوتا۔ پھر جب وہ بڑا ہو جاتا ہے تو اس کو بتدریج قدرت' تمیز' عقل اور ہدایت عطا کی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ سن بلوغ کو پہنچ جاتا ہے۔ پہلے نوجوان بنتا ہے پھر جوان ہوتا ہے پھر ادھیڑ عمر ہو جاتا ہے۔ پھر بوڑھا ہو جاتا ہے۔ کوئی ناشکرا بندہ ہوتا ہے کوئی شکر گزار' کوئی گنہگار ہوتا ہے کوئی اطاعت گزار' کوئی مومن' کوئی کافر اسی لئے اللہ تعالٰی کے اس ارشاد کی تصدیق ہوتی ہے۔ جیسا کہ فرمایا۔

هَلْ أَتَىٰ عَلَى الْإِنسَانِ حِينٌ مِّنَ الدَّهْرِ لَمْ يَكُن شَيْئًا مَّذْكُورًا إِنَّا خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن نُّطْفَةٍ أَمْشَاجٍ نَّبْتَلِيهِ فَجَعَلْنَاهُ سَمِيعًا بَصِيرًا إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا (پ ۲۹' ر ۱۹' آیت ۱-۳)

بے شک انسان پر زمانے میں ایک ایسا وقت بھی آچکا ہے جس میں وہ کوئی قابل تذکرہ چیز نہ تھا۔ ہم نے انسان کو مخلوط نطفے سے پیدا کیا۔ اس طور پر کہ ہم اس کو مکلّف بنائیں تو ہم نے اس کو سنتا' دیکھتا بنایا۔ ہم نے اس کو راستہ بتلایا یا تو وہ شکر گزار ہو گیا یا ناشکرا ہو گیا۔

بہرحال پہلے اس کے لطف و کرم پر نظر ڈالو۔ پھر اس کی قدرت و حکمت پر غور کرو۔ اس کے عجائبات تمہیں حیران کر دیں گے۔ حیرت اس شخص پر ہوتی ہے جو کوئی اچھا خط یا عمدہ نقش دیکھ کر حیران ہوتا ہے اور اس کی تعریف و توصیف کرتا ہے اور اپنی تمام تر فکری توانائی نقاش یا خطاط پر مرکوز کر دیتا ہے کہ اس کو کتنی زبردست قوت حاصل ہے اور اس نے کتنا خوبصورت اور دلکش نقش بنایا ہے وہ دیر تک اس کے فن کی داد دیتا ہے اور دل و زبان سے اس کی مشاقی اور چابکدستی کو سراہتا ہے لیکن یہی شخص اپنے نفس کے عجائبات دیکھتا ہے مگر ان کے صانع اور مصور سے غفلت برتتا ہے۔ نہ اسے اس کی عظمت کا احساس ہوتا ہے نہ اسے اس کی جلالت و حکمت حیران کرتی ہے۔

یہ ہیں تمہارے جسم کے کچھ عجائبات' ان کا احاطہ کرنا بے حد دشوار ہے بلکہ ناممکن ہے۔ ہاں! ان میں فکر کا میدان بڑا وسیع ہے۔ اگر کوئی فکر کرنا چاہے اور یہ عجائبات خالق تعالٰی کی عظمت پر واضح حجت ہیں۔ اگر کوئی ان سے استدلال کرنا چاہے لیکن تم اپنے پیٹ اور شرمگاہ کی شہوت میں اس قدر منہمک ہو کہ تمہیں اس کے علاوہ کچھ معلوم نہیں کہ بھوک محسوس ہو تو کھانا کھالیا جائے اور پیٹ بھر جائے تو نیند کی آغوش میں پہنچ جاؤ۔ شہوت ہو تو جماع کر لو' غصہ آئے تو بر سر پیکار ہو جاؤ۔ بہائم بھی ان امور میں تمہارے شریک ہیں۔ وہ بھی کھانے پینے' سونے اور جماع کرنے کے بارے میں وہی معرفت رکھتے ہیں جو تمہیں حاصل ہے۔ انسان کی وہ خصوصیت جس میں وہ بہائم سے ممتاز ہے یہ ہے کہ اسے اللہ نے آسمانوں اور زمین کے ملکوت اور آفاق اور نفس کے عجائبات میں غور و فکر کرنے کی صلاحیت بخشی ہے۔ اسی خصوصیت کی بناء پر وہ ملائکہ مقربین کے زمرے میں داخل ہو جاتا ہے اور انہی خصوصیت کے باعث وہ قیامت کے روز اللہ تعالٰی کا مقرب بندہ بن کر نبیین اور صدیقین کے ساتھ اٹھے گا۔ یہ مرتبہ بہائم کو حاصل نہیں ہے اور نہ اس شخص کو حاصل ہے جو دنیا میں بہائم کی شہوات پر راضی ہو گیا بلکہ ایسا شخص تو بہائم سے بھی بدتر ہے اس لئے کہ بہائم کو تو فکر کی قوت ہی میسر نہیں ہے۔ انسان کو تو یہ قدرت عطا کی گئی ہے مگر اس نے اس سے فائدہ نہیں اٹھایا بلکہ اللہ تعالٰی کی نعمتوں کی ناشکری کی۔ ایسے لوگ واقعی چوپایوں سے بھی بدتر اور ان سے زیادہ گمراہ ہیں۔

زمین میں فکر

جب تم اپنے نفس میں فکر کرلو تو اس زمین پر بھی نظر ڈالو جو تمہارا ٹھکانہ ہے۔ پھر اس کی نہروں سمندروں، پہاڑوں اور کانوں میں فکر کرو۔ پھر آسمانوں کے ملکوت تک پہنچو۔ زمین میں اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے زمین کو فرش اور بستر بنایا، اس میں سڑکیں اور راستے بنائے، اسے نرم کیا تاکہ تم اس کے اطراف میں پھرسکو، اسے ساکن بنایا تاکہ وہ حرکت نہ کرے، اس میں پہاڑوں کی میخیں گاڑیں تاکہ وہ اپنی جگہ سے نہ ہلے، پھر اسے اتنا وسیع کیا کہ لوگ اس کے اطراف میں پھرنے سے عاجز نظر آتے ہیں، خواہ ان کی عمریں کتنی ہی لمبی کیوں نہ ہوں اور وہ کتنا ہی کیوں نہ گھومیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَالسَّمَاءَ بَنَيْنَاهَا بِأَيْدٍ وَإِنَّا لَمُوسِعُونَ وَالْأَرْضَ فَرَشْنَاهَا فَنِعْمَ الْمَاهِدُونَ۔
(پ ۲۷، ر ۲، آیت ۴۷-۴۸)

اور ہم نے آسمان کو (اپنی) قدرت سے بنایا اور ہم وسیع القدرت ہیں اور ہم نے زمین کو فرش (کے طور پر) بنایا سو ہم اچھے بچھانے والے ہیں۔

اَلَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ فِرَاشًا۔ (پ ۱، ر ۳، آیت ۲۲)

جس نے تمہارے لئے زمین کو بستر بنایا۔

هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ ذَلُولًا فَامْشُوا فِیْ مَنَاكِبِهَا (پ ۲۹، ر ۲، آیت ۱۵)

وہ ایسا ہے جس نے تمہارے لئے زمین کو مسخر کردیا سو تم اس کے راستوں میں چلو۔

قرآن کریم میں متعدد مواقع پر زمین کا ذکر کیا گیا ہے تاکہ لوگ اس کے عجائبات میں فکر کریں اور یہ سوچیں کہ زندہ لوگ اس کی پشت پر رہتے ہیں اور مرنے کے بعد اس کے پیٹ میں آرام کرتے ہیں اسی لئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے۔

اَلَمْ نَجْعَلِ الْأَرْضَ كِفَاتًا أَحْيَاءً وَّأَمْوَاتًا (پ ۲۹، ر ۲۱، آیت ۲۵) کیا ہم نے زمین کو زندوں اور مردوں کو سمیٹنے والا نہیں بنایا۔

پھر زمین پر اس پہلو سے بھی غور کرو کہ یہ بظاہر مردہ ہوتی ہے لیکن جب اس پر پانی پڑتا ہے تو یہ جی اٹھتی ہے اور طرح طرح کی سبزیاں اگاتی ہے۔ اس کے پیٹ سے عجیب و غریب کیڑے کوڑے نکلتے ہیں۔ پھر دیکھو اللہ تعالیٰ نے سخت اور بلند و بالا پہاڑوں کے ذریعے زمین کو کس قدر مستحکم بنایا اور ان کے نیچے شیریں اور صاف ستھرے پانی کے چشمے رکھے اور نہریں نکالیں جو روئے زمین پر رواں دواں ہیں۔ خشک پتھروں کے نیچے سے نکلنے والے پانی کے ذریعے ہر جاندار اپنی پیاس بجھاتا ہے اور زندہ رہتا ہے۔ اس سے طرح طرح کے درخت اور سبزیاں پیدا ہوتی ہیں جیسے اناج، انگور، زیتون، کھجور اور انار وغیرہ۔ ہر پھل کا الگ ذائقہ اور جداگانہ شکل و صورت اور خوشبو، کھانے میں ایک دوسرے پر فضیلت رکھنے والے یہ انواع و اقسام کے میوے اور پھل پانی ہی کے باعث زمین کے سینے سے نکلتے ہیں، ان کی شکلیں دیکھو کتنی مختلف ہیں، ان کے ذائقے کتنے جدا جدا ہیں، ان کی خوشبوؤں پر نظر ڈالو کس قدر ایک دوسرے سے مختلف ہیں لیکن یہ سب ایک ہی زمین سے نکلتے ہیں اور ایک ہی پانی سے سیراب ہوتے ہیں، اگر تم یہ کہو کہ یہ اختلاف اس لئے ہے کہ ان پھلوں اور میووں کی گٹھلیاں اور بیج ایک دوسرے سے مختلف ہیں، ہم کہیں گے کہ گٹھلی میں کھجوروں کے خوشے کہاں تھے اور گیہوں کے ایک دانے میں سات بالیاں کب تھیں اور ہر بالی میں سو دانے کب تھے، جنگلوں میں جاکر دیکھو ہر جگہ کی زمین کا ظاہر و باطن یکساں نظر آتا ہے، ہر جگہ کا پانی ایک ہی قسم کا ہے لیکن جب وہ خشک زمین پر پڑتا ہے تو عجیب و غریب چیزیں اس کے باطن سے باہر نکلتی ہیں، کسی کا رنگ کچھ ہوتا ہے اور کسی کا کچھ، ذائقے اور بو بھی ایک جیسی نہیں ہوتی، ان میں بظاہر ایک جیسی نظر آنے والی سبزیاں ہوتی ہیں، پہلے تم ان سبزیوں کی کثرت اور ان کی اشکال کے اختلاف پر نظر ڈالو، پھر ان کے طبائع کے اختلاف

اور منافع کی کثرت پر غور کرو' اللہ تعالیٰ نے حقیر سبزیوں میں کتنے زبردست منافع ودیعت فرمائے ہیں' یہ سبزی غذا بہم پہنچاتی ہے یہ طاقت اور توانائی فراہم کرتی ہے' یہ زندگی دیتی ہے' یہ ہلاک کرتی ہے' یہ بارد ہے' یہ حار ہے۔ یہ معدہ میں پہنچ کر رگوں کی جڑوں سے صفراوی مادّہ باہر نکال دیتی ہے' یہ صفراوی مادہ پیدا کرتی ہے' یہ بلغم اور سوداوی مادّہ ختم کرنے والی ہے' یہ سبزی ان دونوں مادّوں کو جنم دیتی ہے' یہ خون صاف کرتی ہے' یہ خون بناتی ہے' یہ فرحت بخش ہے' یہ نیند لانے والی ہے' اس سے کمزوری لاحق ہوتی ہے' اللہ نے زمین کے جسم سے کوئی ذرّہ کوئی تنکا ایسا پیدا نہیں فرمایا جس میں بے شمار منافع نہ ہوں' کسی انسان کے بس کی بات نہیں ہے کہ ان منافع پر پوری طرح مطلع ہو سکے۔

پھر ہر سبزی کے لئے کاشتکار کو عمل کے ایک مخصوص مرحلے سے گزرنا پڑتا ہے۔ مثلاً کھجوروں میں نر و مادہ کا پانی ملایا جاتا ہے' انگوروں کو صاف کیا جاتا ہے' کھیتی کو خودرو گھاس کی آلودگی سے بچایا جاتا ہے۔ کسی کا بیج بویا جاتا ہے' کسی کی ٹہنیاں لگائی جاتی ہیں' کسی کی پود لگاتے ہیں' اگر ہم نباتات کی جنسوں کا اختلاف' ان کی قسمیں' منافع' احوال اور عجائبات بیان کرنے بیٹھ جائیں تو عمریں گذر جائیں اور بیان ختم نہ ہو لیکن ہم صرف اسی بیان پر اکتفا کرتے ہیں' تم اسی کی روشنی میں مزید عجائبات پر فکر کر سکتے ہو۔

جواہر اور معدنیات

زمین میں پہاڑ ہیں اور کانیں ہیں' پہاڑوں میں سے سونے' چاندی' فیروزہ' لعل وغیرہ جیسے نفیس جواہر نکلتے ہیں۔ ان میں سے بعض ہتھوڑوں سے پٹتے ہیں' جیسے سونا' چاندی' تانبا' رانگ اور لوہا اور بعض نہیں پٹتے' جیسے فیروزہ اور لعل وغیرہ' پھر یہی نہیں کہ اللہ نے پہاڑوں کے سینے میں جواہر پیدا کر دیئے بلکہ لوگوں کو ان کے نکالنے کا طریقہ بھی بتایا اور یہ بھی سکھلایا کہ انہیں کس طرح صاف کیا جائے اور کس طرح ان سے برتن' آلات' سکے اور زیورات بنائے جائیں' پھر معادن کو دیکھو' ان میں پٹرول' گندھک اور قیر ہیں' معدنیات میں سب سے ادنیٰ نمک ہے اس کی ضرورت کھانے میں ہوتی ہے اگر کھانے میں نمک نہ ہو تو مرغن غذائیں بیکار ہو جائیں اور کوئی کھانے کا نام نہ لے بلکہ اگر کسی شہر میں نمک نہ رہے تو لوگ مرنے لگیں' اللہ تعالیٰ کی رحمت واسعہ پر نظر کرو کہ بعض زمینوں کے جواہر شوریدہ بنائے ان میں بارش کا صاف پانی جمع ہوتا ہے اور ان شوریدہ جواہر سے مل کر نمک بنتا ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ کوئی شخص تنہا کسی چیز میں ملائے بغیر ایک تولہ نمک کھالے۔ نمک صرف کھانے کی اصلاح کے لئے بنایا۔ غرض یہ کہ کوئی جماد' کوئی حیوان' کوئی نبات ایسی نہیں ہے۔ جس میں ایک یا ایک سے زائد حکمتیں نہ ہوں' اللہ تعالیٰ نے کوئی بھی چیز بیکار نہیں بنائی' نہ کسی چیز کو لہو و لعب کے طور پر پیدا کیا بلکہ تمام مخلوق حق کے ساتھ اسی طرح پیدا ہوئی ہے جس طرح اسے پیدا ہونا چاہیے تھا اور جس طرح پیدا کرنا اللہ تعالیٰ کی عظمت و جلالت کے شایان شان ہے چنانچہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَا لٰعِبِیْنَ مَا خَلَقْنٰهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ۔
(پ ۲۵' ر ۱۵' آیت ۳۸)

اور ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان میں ہے اس کو اس طور پر نہیں بنایا کہ ہم فعل عبث کرنے والے ہوں۔ ہم نے ان دونوں کو کسی حکمت ہی سے بنایا ہے۔

حیوانات

حیوانات بھی اللہ تعالیٰ کی زبردست نشانیوں میں سے ایک نشانی ہیں' ان کی بے شمار قسمیں ہیں' بعض ہوا میں اڑتے ہیں' بعض زمین پر چلتے ہیں' پھر زمین پر چلنے والے جانوروں کی بھی متعدد قسمیں ہیں' بعض جانور دو پاؤں پر چلتے ہیں' بعض چار پر' بعض دس پر اور بعض سو ٹانگوں پر چلتے ہیں جیسا کہ بہت سے حشرات ارض میں اس طرح کے جانوروں کے چلنے کا مشاہدہ ہوتا ہے' پھر منافع' اشکال' اخلاق اور صورتوں کے اعتبار سے بھی بے شمار جانور ایک دوسرے سے مختلف نظر آتے ہیں' فضا میں منڈلانے والے پرندوں' خشکی کے وحشی درندوں اور گھروں میں پائے جانے والے جانوروں کو دیکھو' تم ان میں ایسے عجائبات کا مشاہدہ کرو گے کہ ان کی موجودگی میں خالق کائنات کی قدرت اور حکمت سے منکر نہیں ہو سکتے اور یہ عجائبات اتنے زیادہ ہیں کہ ان کا احاطہ نہیں کیا

جاسکتا' بلکہ اگر ہم مچھر' چیونٹی' مکھی اور مکڑی کے عجائبات بیان کرنے لگیں تو یہ سلسلہ کبھی ختم نہ ہو' یہ ننھے ننھے جانور ہیں مگر تم رات دن دیکھتے ہو کہ یہ جانور اپنے عجز اور بے کسی کے باوجود گھر بھی تعمیر کرتے ہیں غذائی مواد بھی جمع کرتے ہیں اپنی مادہ سے الفت کا اظہار بھی کرتے ہیں اور اس کے تقاضے بھی پورے کرتے ہیں' ان کے گھر دیکھو کس قدر مہارت اور خوش سلیقگی سے بنائے جاتے ہیں گویا کسی انجینئر نے مقررہ نقشے کے مطابق تعمیر کئے ہوں۔ اپنی ضرورت کی تمام چیزوں کی طرف وہ کسی خارجی رہنمائی اور ہدایت کے بغیر متوجہ ہو جاتے ہیں' انہیں حاصل کرتے ہیں' مکڑی کے حال پر نظر ڈالو وہ اپنا گھر نہر کے کنارے پر بناتی ہے' پہلے وہ ایک ہاتھ لمبی جگہ خالی جگہ تلاش کرتی ہے اور اس خالی جگہ میں اپنے تار بچھاتی ہے۔ ایک جانب سے اپنی تعمیر کا آغاز اپنے منہ کے لعاب پھینک کر کرتی ہے' یہی لعاب دھاگے کی شکل اختیار کرلیتا ہے' وہ یہ دھاگا دوسری جانب لے جاکر کسی چیز پر چپکا دیتی ہے اور اسی طرح لعاب سے دھاگے کی لکیر بناتی ہوئی اس جانب بڑھتی ہے جہاں سے آغاز کیا تھا' یہ عمل کئی بار کرتی ہے' دو دھاگوں کے درمیان مناسب فاصلہ برقرار رکھتی ہے جب دونوں جانب کے سرے مضبوط ہو جاتے ہیں اور دھاگے تانے کی شکل اختیار کرلیتے ہیں تب بانے میں مصروف ہوتی ہے اور بانے کو تانے پر رکھتی ہے۔ جہاں جہاں بانے کا تار تانے کے تار سے ملتا ہے وہاں وہاں گرہ لگادیتی ہے۔ اس میں بھی تناسب اور مہندسانہ اصولوں کی رعایت کرتی ہے۔ بالآخر اس کی یہ جدوجہد ایک جال کی صورت اختیار کرلیتی ہے۔ جس میں مچھر' مکھی وغیرہ چھوٹے چھوٹے اڑنے والے کیڑے کوڑے آسانی سے پھنس جاتے ہیں' اس عمل سے فارغ ہونے کے بعد وہ ایک ایسے کونے میں چھپ کر بیٹھ جاتی ہے جہاں سے وہ اپنے شکار پر نظر رکھ سکے اور شکار اسے نہ دیکھ پائے۔ جب کوئی شکار جال میں پھنستا ہے تو وہ تیزی سے اس کی طرف دوڑتی ہے اور اسے کھالیتی ہے' اگر اس طرح شکار کرنے سے تھک جاتی ہے تو اپنے لئے دیوار کا کوئی گوشہ تلاش کرتی ہے اور اس گوشے کے دونوں جانب ایک تار کھینچ دیتی ہے' پھر اس میں ایک دھاگا نیچے کی جانب لٹکا کر خود اس میں لٹک جاتی ہے اور کسی مکھی' مچھر کی منتظر رہتی ہے کہ وہ ادھر سے گذرے اور اسے اس دھاگے میں قید کرلے جو نیچے لٹکا ہوا ہے اور اسے اپنی خوراک بنالے۔

بہرحال کوئی چھوٹا یا بڑا جانور ایسا نہیں ہے جس میں ناقابل شمار عجائبات نہ ہوں۔ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ مکڑی نے شکار کرنے کا یہ فن خود بخود سیکھا ہے یا وہ خود بخود وجود پذیر ہو گیا ہے یا کسی آدمی نے اسے اس فن کی تعلیم دی ہے اور اس طریقے کی طرف رہنمائی کی ہے' ہر صاحب بصیرت جانتا ہے کہ یہ ننھی مکڑی نہایت عاجز اور کمزور و بے کس ہے' اس مکڑی ہی پر کیا موقوف ہے بلکہ ہاتھی جو اپنے تن و توش میں پہاڑ جیسا عظیم ہے اور دوسرے جانوروں سے بلند ہے عجز و ضعف میں مکڑی سے کم نہیں ہے' کیا مکڑی کی یہ مہارت اور شکار کرنے کا یہ فن اس عظیم قادر مطلق کی گواہی نہیں دیتا جس نے اسے یہ فن سکھلایا ہے اور اپنی غذا حاصل کرنے کے طریقے کی طرف رہنمائی کی ہے اور اسے قدرت بخشی ہے' عقلمند انسان اس ننھے جانور سے وہ سبق حاصل کرتا ہے جو بڑے جانوروں سے حاصل نہیں کرپاتا' اسی جانور کے عجائبات میں اس کی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ باقی جانوروں تک وہ اپنے فکر کا دائرہ وسیع نہیں کرپاتا۔

فکر کا یہ پہلو بھی بڑا وسیع ہے۔ اس لئے کہ حیوانات اپنی اشکال' اخلاق اور طبائع کے لحاظ سے بے شمار ہیں۔ اصل میں ان سے حیرت اس لئے نہیں ہوتی کہ اکثر نظر آتے ہیں اور کثرت مشاہدہ کے باعث دل ان سے مانوس ہو جاتے ہیں۔ البتہ جب کسی شخص کی نظر کسی نامانوس اور عجیب و غریب جانور پر پڑتی ہے تو حیرت کرتا ہے اور کہتا ہے کہ سبحان اللہ کس قدر عجیب جانور ہے دور کیوں جایئے خود انسان کس قدر حیرت ناک حیوان ہے لیکن وہ خود اپنے آپ پر حیرت نہیں کرتا۔

بہرحال جانوروں میں فکر کا یہ انداز ہونا چاہیے کہ ان کی شکلوں اور صورتوں پر نظر ڈالے' پھر ان کے منافع اور فوائد میں غور کرے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے چمڑوں' بالوں اور اون میں بے شمار فوائد رکھ چھوڑے ہیں' جن میں سے ایک اہم ترین فائدہ یہ ہے کہ ان چیزوں سے انسان اپنا لباس اور سفر و حضر میں اپنا مکان بناتا ہے' کھانے' پینے کے برتن وضع کرتا ہے' اپنے پاؤں کے لئے حفاظتی موزے تیار کرتا ہے' ان کا دودھ اور گوشت بطور غذا استعمال کرتا ہے' ان میں سے بعض جانور ایسے بھی ہیں جو سواری کے

کام آتے ہیں' بعض بوجھ اٹھاتے ہیں اور دور دراز کے جنگلوں اور صحراؤں کی مسافت طے کرتے ہیں' دیکھنے والوں کو ان کی تخلیق سے جس قدر بھی حیرت ہو کم ہے' اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس علم سے پیدا کیا ہے جو ان کے منافع کو پہلے ہی سے جامع تھا' پاک ہے وہ ذات جس کے علم میں تمام امور کسی تفکر' تأمل اور تدبر کے بغیر اور کسی وزیر یا مشیر سے مشورہ حاصل کئے بغیر واضح ہیں' وہ نہایت حکمت والا اور نہایت قدرت والا اور نہایت علم والا ہے' جس نے اپنے عارفین کے دلوں میں ادنیٰ مخلوق کے مشاہدے سے اپنی توحید کی شہادت القاء کی مخلوق کے لئے اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں ہے کہ وہ اس کی قدرت و قہر کا یقین کریں' اس کی ربوبیت کا اقرار کریں اور اس کی عظمت و جلالت کی معرفت سے اپنے عجز کے معترف ہوں' کون ہے جو اس کی ثناء کا احاطہ کر سکتا ہے' وہ ایسا ہے جیسا کہ خود اس نے اپنی تعریف کی ہے' ہماری معرفت کی انتہا تو یہی ہے کہ ہم اس کی معرفت سے اپنے عجز کا اعتراف کریں۔ ہماری دعا ہے اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی ہدایت' اپنے کرم و احسان سے نوازے۔

وسیع اور گہرے سمندر

زمین کے چاروں طرف پھیلے ہوئے وسیع اور گہرے سمندر بھی اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہیں۔ تمہیں جتنی زمین خشک نظر آتی ہے اور جس قدر پہاڑ حد نظر تک پھیلے ہوئے دکھائی دیتے ہیں وہ وسیع تر سمندروں کے مقابلے میں ایسے ہیں جیسے دور تک پھیلے ہوئے کسی سمندر میں کوئی مختصر جزیرہ۔ جیسا کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں۔

اَلْاَرْضُ فِی الْبَحْرِ کَالْاِصْطَبْلِ فِی الْاَرْضِ۔[1]

سمندر میں زمین ایسی ہے جیسے زمین میں اصطبل۔

تم اچھی طرح جانتے ہو کہ اصطبل کو زمین سے کیا نسبت ہے' اسی پر زمین کو سمندر کے مقابلے میں قیاس کر لو' تم نے زمین کے عجائبات کا مشاہدہ کیا' اب سمندر کے عجائبات میں فکر کرو' سمندر میں حیوانات اور جواہرات کے جس قدر عجائبات ہیں وہ زمین کے عجائبات سے کہیں زیادہ ہیں' جس طرح سمندر کی وسعت زمین سے کہیں زیادہ ہے۔ اسی وسعت کی وجہ سے سمندر میں اتنے بڑے بڑے جانور ہیں کہ اگر ان کی پشت پانی کی سطح سے اونچی ہو تو تم یہ سمجھو کہ شاید یہ کوئی جزیرہ ہے اور اسی مغالطے میں اس پر لنگر انداز ہو جاؤ اور یہ صرف تصوراتی مفروضہ نہیں ہے بلکہ حقیقت میں ایسے حادثات ہو چکے ہیں کہ لوگ جزیرہ دیکھ کر اتر پڑے اور جب وہاں آگ جلائی گئی تو جزیرے نے حرکت شروع کر دی' اس وقت معلوم ہوا کہ ہم خشکی پر نہیں ہیں بلکہ کسی عظیم الجثہ جانور کی پشت پر سوار ہیں' خشکی پر کوئی حیوان بشمول انسان ایسا نہیں ہے جس کی نظیر سمندر میں نہ ہو' اس کے برعکس اس میں بے شمار ایسے حیوانات ہیں جن کی نظیر خشکی پر نہیں ملتی' ان کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے' خاص طور پر ان لوگوں نے بڑی ضخیم کتابیں لکھی ہیں جنہوں نے سمندر کے سینے پر سفر کیا اور اس کے عجائبات کی جستجو کی۔

سمندر کی ایک چھوٹی سی پیداوار موتی ہی پر نظر ڈالو' یہ پانی کے نیچے سیپی میں پیدا ہوتا ہے اور اسی میں رہ کر گول شکل اختیار کرتا ہے' مونگے کو دیکھو یہ کیسے پانی کے نیچے پتھر کے اندر سے نکلتا ہے' دیکھنے میں ایک سبزہ لگتا ہے جس نے پتھر کے پہلو سے سر نکالا ہو' ان کے علاوہ عنبر اور اسی جیسی بے شمار نفیس چیزیں ہیں جنہیں سمندر کی لہریں کنارے پر ڈالتی ہیں' یا وہ سمندر کی تہوں سے نکالی جاتی ہے' کشتیوں کے عجائبات پر غور کرو' اللہ تعالیٰ نے پانی کے سینے پر انہیں کس طرح ٹھہرایا ہے' مال و دولت کے طالب' تجارت پیشہ اور سیاحت کرنے والے ان کے ذریعے دور دراز کے ملکوں کا سفر کرتے ہیں' دیکھو اس نے پہلے کشتیوں کو مسخر کیا کہ وہ لوگوں کا بوجھ اٹھائیں' پھر ہواؤں کو حکم دیا کہ وہ کشتیوں کو ہنکائیں' ملاحوں کو ہواؤں کی معرفت دی کہ وہ کس رخ کو کب اور کیسے چلتی ہیں اور ان کی سواری کے لئے کون سی ہوا مفید اور کون سی نقصان دہ ہے' صاف ظاہر ہے کہ سمندر کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ کے جس قدر عجائبات ہیں وہ ضخیم ترین جلدوں میں بھی نہیں سما سکتے' سب سے زیادہ حیرت انگیز چیز وہ ہے جو سب سے زیادہ ظاہر ہے' یعنی پانی کا وہ

---

[1] اس روایت کی سند مجھے نہیں ملی۔

فضا میں محبوس ہوائے لطیف

آسمان اور زمین کے درمیان ٹھہری ہوئی لطیف ہوا بھی اللہ تعالیٰ کی ایک بڑی نشانی ہے' جب ہوا چلتی ہے تو نہ تم اسے ہاتھ لگا سکتے ہو اور نہ اس کو مجسم شکل میں سما سکتے ہو' ہوا کی مثال سمندر کی سی ہے جس طرح آبی جانور سمندر میں تیرتے پھرتے ہیں اسی طرح بے شمار پرندے اپنے پروں اور بازوؤں کی مدد سے ہوا کے دوش پر اڑتے نظر آتے ہیں' جب ہوائیں چلتی ہیں تو سمندر میں مدوجزر پیدا ہوتا ہے اور لہریں بے چین ہو کر اپنا سر پٹکتی ہیں' اسی طرح تیز ہواؤں کی گردش سے اس فضائے آسمانی میں بھی تموج ہوتا ہے' اللہ تعالیٰ ہوا کو حرکت دیکر رحمت کا سبب بھی بنا دیتا ہے یعنی وہ بادلوں کو ہنکاتی ہے اور پیاسی زمین پر بارش برساتی ہے جیسا کہ ارشاد فرمایا۔ وَاَرْسَلْنَا الرِّيَاحَ لَوَاقِحَ۔ (پ ۱۴' ر ۲' آیت ۲۲)

اور ہم ہی ہواؤں کو بھیجتے ہیں جو کہ بادلوں کو پانی سے بھرتی ہیں۔

اس طرح یہ ہوا حیوانات اور نباتات کی زندگی کا سبب ہوتی ہے اور وہ جب چاہتا ہے اس ہوا کو عذاب بنا دیتا ہے ان لوگوں کے لئے جو اس کی نافرمانی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا۔

اِنَّا اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا صَرْصَرًا فِي يَوْمِ نَحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ تَنْزِعُ النَّاسَ كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ مُّنْقَعِرٍ۔ (پ ۲۷' ر ۸' آیت ۱۹-۲۰)

ہم نے ان پر ایک تند ہوا بھیجی۔ ایک نحوست کے دن میں وہ ہوا لوگوں کو اس طرح اکھاڑتی ہے گویا وہ اکھڑے ہوئے کھجوروں کے تنے ہوں۔

ہوا لطیف بھی ہے اور شدید بھی' تم اس کی لطافت اور شدّت کا اس طرح مشاہدہ کر سکتے ہو کہ اگر کسی مشکیزے میں ہوا بھر کر دریا میں ڈال دو اور یہ کوشش کرو کہ وہ مشکیزہ ڈوب جائے تو یہ ممکن نہیں ہوگا' خواہ اسے ڈبونے کے لئے کتنا ہی طاقت ور شخص اپنی تمام تر قوت کیوں نہ صرف کردے' اس کے برعکس اگر تم لوہے کا کوئی ٹکڑا پانی کی سطح پر رکھو تو وہ فوراً تہہ میں چلا جائیگا' غور کرو کہ ہوا اپنی نزاکت اور لطافت کے باوجود پانی کی شدّت سے کس طرح مقابلہ کرتی ہے' اللہ تعالیٰ کی یہی حکمت ہے جس کے باعث کشتیاں پانی کی سطح پر ٹھہری رہتی ہیں اور اپنے تمام تر بوجھ کے باوجود ڈوبتی نہیں ہیں' یہ مشکیزے اور کشتی ہی پر کیا موقوف ہے ہر کھوکھلی چیز کا جس میں ہوا بھر جائے یہی حال ہے کیونکہ ہوا میں پانی سے روکنے کی قوت ہے' اسی ہوا کی قوت کے سہارے بھاری بھرکم کشتی اپنی قوت اور صلابت کے ساتھ پانی کی سطح پر برقرار رہتی ہے' جیسے کوئی شخص کنوئیں میں گر جائے اور ایک ایسے آدمی کا دامن تھامے رہے جو اس میں گرنے سے خود کو اس کے بوجھ کے ساتھ بچا سکتا ہو' ظاہر ہے ایسا شخص ڈوبتا نہیں ہے' پاک ہے وہ ذات جس نے ہماری کشتی کو لطیف ہوا پر معلّق کیا' نہ دونوں میں نظر آنے والا کوئی رابطہ ہے نہ کوئی گرہ ہے۔

اس کے بعد فضا کے عجائبات پر نظر ڈالو' اس میں بادل منڈلاتے ہیں' بادلوں میں بجلیاں چمکتی کڑکتی ہیں' بارشیں برستی ہیں' شبنم پڑتی ہے اور برف گرتی ہے' یہ سب آسمان اور زمین کے درمیان رونما ہونے والے عجائبات ہیں' قرآن کریم نے اس آیت میں بطور اجمال اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ۔ (پ ۲۵' ر ۱۵' آیت ۳۸)

اور ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان میں ہے اس کو اس طور پر نہیں بنایا کہ ہم فعل عبث کرنے والے ہوں۔

پھر اس کی تفصیل مختلف مواقع پر فرمائی ہے۔ چنانچہ ایک جگہ ارشاد فرمایا۔

وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ۔ (پ ۲' ر ۴' آیت ۱۶۴)

اور ابر میں جو آسمان و زمین کے درمیان مفید رہتا ہے۔

دوسری بے شمار آیات میں رعد' برق' بادل اور بارش کا ذکر کیا گیا ہے اگر ان تمام امور میں فکر نہیں کرسکتے تو صرف بارش ہی میں فکر کرلو' جس کا تم اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرتے ہو اور بجلی کی کڑک پر غور کرو' جسے تم اپنے کانوں سے سنتے ہو' ان دونوں چیزوں کی معرفت تو بہائم کو بھی حاصل ہے' تمہیں تو عالم بہائم سے اٹھ کر عالم ملاء اعلیٰ تک پہنچنا چاہیے' تم نے اپنی کھلی آنکھوں سے ان چیزوں کے ظاہر کو دیکھا ہے' اب ذرا ظاہر کی آنکھیں بند کرو اور باطن کی آنکھیں کھول کر ان چیزوں کے عجائب دیکھو اور ان کے اسرار پر غور کرو' یہ بھی ایک طویل باب ہے' جس میں تم اپنے فکر کا دائرہ دور تک وسیع کرسکتے ہو' اگرچہ احاطہ کرنا ممکن نہیں ہے دیکھو گھنا سیاہ بادل کس طرح اچانک صاف فضا میں جمع ہو جاتا ہے' اللہ تعالیٰ جب چاہتا ہے اور جہاں چاہتا ہے اسے پیدا کردیتا ہے' پھر یہ دیکھو کہ بادل اپنی نرمی کے باوجود پانی کا بوجھ اٹھائے ادھر سے ادھر دوڑتا ہے اور اس وقت تک آسمان کی فضاؤں میں گردش کرتا رہتا ہے جب تک اللہ تعالیٰ اسے یہ حکم نہیں دیتا کہ وہ اپنا مشکیزہ خالی کردے' پھر وہ اپنے قطرات اس قدر انڈیلتا ہے جس قدر اللہ اس کی اجازت دیتا ہے اور اسی شکل میں گراتا ہے جس شکل میں اللہ کی مرضی ہے تم دیکھتے ہو کہ بادل زمین پر پانی برساتا ہے اور اپنے قطرات انڈیلتا ہے' اگرچہ یہ قطرات مسلسل ہوتے ہیں لیکن ہر قطرہ اپنی جگہ الگ ہوتا ہے' مجال نہیں کہ ایک قطرہ دوسرے قطرے سے مل جائے' ہر قطرہ اسی راستے سے زمین پر پہنچتا ہے جو اس کے لئے متعین کردیا گیا ہے' مجال نہیں کہ وہ راستے سے ہٹ جائے یا متاخر پر مقدم یا مقدم پر متاخر ہو جائے' اگر اولین و آخرین کے تمام لوگ جمع ہو کر بارش کا ایک قطرہ پیدا کرنے کی کوشش کریں یا وہ ایک شہر میں پڑنے والے قطرات کی صحیح تعداد بیان کرنے کے درپے ہوں تو انہیں ناکامی کے سوا کچھ ہاتھ نہ لگے' ان کی صحیح تعداد وہی جانتا ہے جس نے انہیں پیدا کیا ہے' پھر ہر قطرہ ایک مخصوص قطعۂ زمین کے لئے متعین کیا گیا ہے اور اسی پر پڑتا ہے اور اسی کے استعمال میں آتا ہے' جس کے لئے وہ زمین پر اتارا گیا ہے خواہ وہ کوئی جانور ہو یا انسان' پرندہ ہو یا درندہ' ہر قطرہ پر خط الٰہی سے اس جانور یا کیڑے مکوڑے کا نام لکھا جاتا ہے' جس کے لئے وہ برسا ہے' اگرچہ ظاہر کی آنکھوں سے وہ تحریر نظر نہیں آتی لیکن اللہ تعالیٰ کو علم ہے کہ یہ قطرہ فلاں کیڑے کا رزق ہے جو فلاں پہاڑ کے فلاں گوشے میں پڑا ہوا ہے' جب اسے پیاس لگے گی تو یہ قطرہ اس کے پاس پہنچے گا اور اس کی پیاس دور کرے گا' یہ تو پانی کے ان قطرات کی باتیں ہیں جو زمین پر گرتے ہیں' یہاں ان کا ذکر نہیں جو فضائی آسمان پر منجمد ہو جاتے ہیں اور برف یا اولے کی صورت میں زمین کا رخ کرتے ہیں اور زمین پر ایسے بچھ جاتے ہیں جیسے سفید دھنی ہوئی روئی پھیلی ہو' برف اور اولوں میں بھی بے شمار عجائبات ہیں' یہ سب کچھ جبّار قادر کا فضل اور خلّاق قاہر کا قہر ہے۔ مخلوق میں سے کسی کو اس میں کوئی دخل ہے نہ شرکت' بلکہ مومن بندوں کے لئے خشوع و خضوع اور اس کے جلال و عظمت کے آگے سرنگوں کرنے کے علاوہ کوئی چارۂ کار نہیں ہے اور جو اس کی عظمت کے منکر ہیں ان کے لئے بھی اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ وہ حقیقت اسباب پر مطلع ہوئے بغیر محض اندازے سے کچھ کہیں' چنانچہ فریب خوردہ جاہل کہا کرتا ہے کہ بارش اس لئے نازل ہوتی ہے کہ یہ طبعاً ثقیل ہے' یہی بارش کا سبب ہے' وہ سمجھتا ہے کہ یہ ایک ایسی معرفت ہے جو اس پر منکشف ہوئی ہے' اس معرفت کے انکشاف پر وہ اتراتا ہے اگر کوئی اس سے پوچھ بیٹھے کہ طبع کیا چیز ہے طبع کو کس نے پیدا کیا اور وہ کون ہے جس نے پانی کی طبع کو ثقیل بنایا اور اس کے باوجود وہ درختوں کی جڑوں میں ڈالنے سے ان کی شاخوں تک پہنچ جاتا ہے بھلا یہ ثقیل چیز اوپر سے نیچے کیسے اتری اور نیچے سے اوپر کیسے چڑھی' درختوں کی شاخوں اور پتوں میں جذب ہو کر اور اس طرح اوپر چڑھتی ہے کہ آنکھوں سے نظر بھی نہیں آتی اور درخت کے ہر ہر جز میں سرایت کرجاتی ہے' ہر ہر پتے کو غذا فراہم کرتی ہے اور ان رگوں میں سے گذرتی ہے جو بال سے زیادہ باریک ہیں' پانی پہلے بڑی رگ میں جاتا ہے جو پتے کی جڑ ہے پھر اس بڑی رگ سے جو تمام پتے کے طول میں پھیلی ہوئی ہے اردگرد کی چھوٹی چھوٹی رگوں میں منتقل ہوتا ہے' گویا بڑی رگ نہر کی مانند ہے اور چھوٹی رگیں ندیوں کی طرح ہیں' ان ندیوں سے نالے اور نالیاں پھوٹتی ہیں اور نالیوں سے مکڑی کے جالے جیسے باریک دھاگے نکلتے ہیں جو آنکھ سے نظر نہیں آتے' اسی طرح یہ پانی لمبے چوڑے درخت کے تمام پتوں میں اور ہر پتے کے تمام اطراف میں پھیل جاتا ہے' اسے بڑھاتا ہے' سرسبز و شاداب

کرتا ہے' اس کی طراوت اور شادابی باقی رکھتا ہے' پتوں کی طرح یہ پانی پھلوں اور میووں میں سرایت کرتا ہے' اس غافل سے یہ پوچھا جاسکتا ہے کہ اگر پانی اپنے ثقل کے باعث زمین کی طرف حرکت کرتا ہے تو اوپر کی طرف کس لئے حرکت کرتا ہے' اگر وہ یہ کہے کہ اوپر کی طرف ایک قوت جاذبہ ہے جو پانی کو نیچے سے اوپر کی طرف جذب کرتی ہے تو اس سے پوچھا جائے کہ آخر وہ قوت کون سی ہے جس نے جاذب کو مسخر کیا' اگر انتہا میں معاملہ اللہ تعالیٰ پر ختم ہو جو سموات و ارض کا حقیقی خالق اور ملک و ملکوت کا جبار ہے تو ابتدا ہی میں تمام معاملات اسی پر کیوں محول نہیں کئے جاتے' صحیح بات یہ ہے کہ جاہل جہاں پہنچ کر ٹھہرتا ہے وہاں سے عاقل اپنی ابتدا کرتا ہے۔

آسمان و زمین کے ملکوت اور کواکب

اصل یہی چیزیں ہیں جس شخص کو تمام باتیں معلوم ہوں اور آسمانوں کے عجائبات کا علم نہ ہو اسے گویا کچھ معلوم نہیں ہے' زمین' سمندر' ہوا اور آسمانوں کے علاوہ تمام اجسام آسمانوں کے مقابلے میں ایسے ہیں' جیسے سمندر کا ایک قطرہ بلکہ اس سے بھی کم' دیکھو اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور ستاروں کا معاملہ اپنی کتاب عظیم میں کتنا عظیم بیان کیا ہے' اس میں کوئی سورت ایسی نہیں ہے جس میں متعدد مواقع پر آسمانوں کے ملکوت کا بیان نہایت شاندار طریقے پر نہ ہو' اللہ تعالیٰ نے بے شمار مواقع پر ان کی قسمیں کھائی ہیں۔

وَالسَّمَاءِ ذَاتِ الْبُرُوجِ۔ (پ ٣٠' ر ١٠' آیت ١)

قسم ہے برجوں والے آسمان کی۔

وَالسَّمَاءِ وَالطَّارِقِ۔ (پ ٣٠' ر ١١' آیت ١)

قسم ہے آسمان کی اور اس چیز کی جو رات میں نمودار ہونے والی ہے۔

وَالسَّمَاءِ ذَاتِ الْحُبُكِ۔ (پ ٢٦' ر ١٨' آیت ٧)

قسم ہے آسمان کی جس میں راستے ہیں۔

وَالسَّمَاءِ وَمَا بَنَاهَا۔ (پ ٣٠' ر ١٦' آیت ٥)

اور قسم ہے آسمان کی اور اس کی جس نے اسے بنایا۔

وَالشَّمْسِ وَضُحٰهَا وَالْقَمَرِ إِذَا تَلَاهَا۔ (پ ٣٠' ر ١٦' آیت ١۔٢)

قسم ہے سورج کی اور اس کی روشنی کی اور چاند کی جب سورج سے پیچھے آئے۔

فَلَا أُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ الْجَوَارِ الْكُنَّسِ۔ (پ ٣٠' ر ١٦' آیت ٥)

تو میں قسم کھاتا ہوں ان ستاروں کی جو پیچھے کو ہٹنے لگتے ہیں اور چلتے رہتے ہیں اور (اپنے مطالع میں) جا چھپتے ہیں۔

وَالنَّجْمِ إِذَا هَوٰى۔ (پ ٢٧' ر ٥' آیت ١)

قسم ہے ستارے کی جب وہ غروب ہونے لگے۔

فَلَا أُقْسِمُ بِمَوَاقِعِ النُّجُومِ وَإِنَّهُ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُونَ عَظِيمٌ (پ ٢٧' ر ١٦' آیت ٧٥۔٧٦)

سو میں قسم کھاتا ہوں ستاروں کے چھپنے کی اور اگر تم غور کرو تو یہ ایک بڑی قسم ہے۔

گزشتہ صفحات میں تم نے ناپاک نطفے کے عجائب پڑھے لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کی قسم نہیں کھائی حالانکہ اس کے عجائب بھی کچھ کم نہیں ہیں۔ اس سے اندازہ لگالو کہ جس چیز کی اللہ نے قسم کھائی ہے اس کے عجائب کیا کچھ ہوں گے۔ آسمانوں کا یہ عجوبہ بھی کچھ کم

نہیں کہ تمام مخلوق کا رزق آسمان میں ہے جیسا کہ فرمایا۔

وَفِي السَّمَاءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوعَدُونَ۔ (پ ۲۶' ر ۱۸' آیت ۲۲)

اور تمہارا رزق اور جو کچھ تم سے وعدہ کیا جاتا ہے آسمان میں ہے۔

جو لوگ آسمانوں کی فکر کرتے ہیں اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں ان کی تعریف فرمائی ہے۔

وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ (پ۴ ر۱۱ آیت ۱۹۱)

اور آسمانوں اور زمین کے پیدا ہونے میں غور کرتے ہیں۔

اس آیت کے متعلق سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں۔

وَيْلٌ لِمَنْ قَرَأَهٰذِهِ الْآيَةَ ثُمَّ مَسَحَ بِهَا سُبْلَتَهُ (۱)

بڑی خرابی ہے اس شخص کے لئے جو یہ آیت پڑھے اور اپنی مونچھوں کو تاؤ دے کر گذر جائے۔

یعنی اس میں فکر کئے بغیر آگے بڑھ جائے۔ اللہ تعالیٰ نے اعراض کرنے والوں کی مذمت کی ہے۔ فرمایا۔

وَجَعَلْنَا السَّمَاءَ سَقْفًا مَحْفُوظًا وَهُمْ عَنْ آيَاتِهَا مُعْرِضُونَ۔ (پ ۱۷' ر ۳' آیت ۳۲)

اور ہم نے آسمان کو چھت (کی طرح) بنایا جو محفوظ ہے اور یہ لوگ (آسمان کی) نشانیوں سے اعراض کرنے والے ہیں۔

اول تو آسمان کو زمین اور اس کے خشک و تر حصوں' دریاؤں' سمندروں اور پہاڑوں سے ادنیٰ درجے کی بھی نسبت نہیں ہے دوسرے زمین عنقریب فنا ہونے والی ہے جبکہ آسمان اپنی جگہ محکم رہے گا اور اس وقت تک تغیر سے محفوظ رہے گا جب تک کہ تغیر کا وقت مقرر نہ آپہنچے۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے انہیں محفوظ فرمایا ہے۔ جیسا کہ مذکورہ بالا آیت میں مذکور ہے۔ آسمان کے متعلق کچھ اور آیات یہ بھی ہیں۔ فرمایا۔

وَبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا۔ (پ ۳۰' ر ۱' آیت ۱۲)

اور ہم نے تمہارے اوپر سات مضبوط آسمان بنائے۔

أَأَنْتُمْ أَشَدُّ خَلْقًا أَمِ السَّمَاءُ بَنَاهَا رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوَّاهَا۔ (پ ۳۰' ر ۳' آیت ۲۷)

بھلا تمہارا (دوسری بار) پیدا کرنا زیادہ سخت یا آسمان کا۔ اللہ نے اس کو بنایا۔

ملکوت کی طرف نظر کرو تاکہ تمہیں عزت و جبروت کے عجائب کا علم ہو۔ ملکوت کی طرف نظر کرنے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ تم آنکھ اٹھا کر ان کی طرف دیکھ لو اور آسمان کے نیلگوں رنگ اور ستاروں کی روشنی کا مشاہدہ کر لو اس لئے کہ اس میں تو بہائم بھی تمہارے شریک ہیں۔ وہ بھی آسمان کے رنگ اور ستاروں کی چمک کا مشاہدہ کر لیتے ہیں۔ اس لئے کہ اگر صرف دیکھنا مقصود ہوتا تو اللہ تعالیٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعریف کیوں فرماتے۔

وَكَذٰلِكَ نُرِي إِبْرَاهِيمَ مَلَكُوتَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ۔ (پ ۷' ر ۱۵' آیت ۷۶)

اور ہم نے ایسے ہی طور پر ابراہیم کو آسمانوں اور زمین کی مخلوقات دکھلائیں۔

آنکھوں سے نظر آنے والی تمام چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے عالم ملک و شہادت سے تعبیر فرمایا ہے اور جو چیزیں پردۂ غیب میں ہیں

(۱) یہ حدیث پہلے بھی گزر چکی ہے۔

اور آنکھوں سے نظر نہیں آتیں' ان کے لئے عالم ملکوت کی تعبیر ہے۔ اللہ تعالیٰ غیب و شہادت ہر چیز کا عالم ہے' دوسرا کوئی شخص ان عالموں میں اپنے عالم ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا' اگر کسی کو ان دونوں عالموں کا علم ہے تو صرف اس قدر ہے جتنا اللہ نے اس کے لئے پسند کیا ہے۔ قرآن کریم میں ہے۔

عَالِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلَىٰ غَيْبِهِ أَحَدًا إِلَّا مَنِ ارْتَضَىٰ مِن رَّسُولٍ (پ ۲۹ ر ۱۲ سورۂ جن آیت ۲۶)

اور غیب کا جاننے والا وہی ہے سو وہ اپنے غیب پر کسی کو مطلع نہیں کرتا ہاں مگر اپنے کسی برگزیدہ پیغمبر کو۔

اے عقلمند انسان! ملکوت میں تیرا سیر کرنا ممکن ہے اگر تو ... اور تیرا دل ان کے اطراف میں گشت لگائے' یہاں تک کہ تو عرش الٰہی کے سامنے کھڑا ہو ... اور تیرا یہ سلسلہ سفر حضرت عمر کے اعلیٰ مرتبے تک پہنچ جائے جنہوں نے ارشاد فرمایا تھا کہ میرے دل نے میرے رب کو دیکھا۔

ہم نے اللہ تعالیٰ کی جو آیات ذکر کی ہیں' ان میں با ترتیب غور کرو' ترتیب کی ضرورت اس لئے ہے کہ آدمی ابتدائی مراحل طے کرنے کے بعد ہی اعلیٰ منزل تک رسائی حاصل کرتا ہے اور قریب کی چیز سے گزر کر دور کی چیز تک پہنچتا ہے' آدمی کے سب سے قریب چیز خود اس کا نفس ہے' پھر زمین ہے' جس پر اس کا مسکن ٹھکانہ ہے' اس کے بعد وہ چیزیں ہیں جو اس کے جسم سے متصل ہیں' پھر نباتات' حیوانات اور زمین کی دوسری چیزیں ہیں' پھر زمین سے اوپر کی چیزیں ہیں' پھر ساتوں آسمان اور کواکب ہیں' پھر کرسی' عرش ہے اور عرش کو اٹھانے والے فرشتے اور آسمان کے خزانوں ... پھر عرش و کرسی اور ساتوں آسمانوں اور زمین کا خالق ہے اور وہ ... ان سب کا مالک ہے' صاف ظاہر ہے کہ بندے اور اس کے معبود کے درمیان ... گھاٹیاں حائل ہیں' جب تک وہ یہ تمام منزلیں اور ... عبور نہیں کرے گا ... اور بندے کا حال یہ ہے کہ وہ ابھی پہلی منزل بھی عبور نہیں کر سکا اور اپنے نفس کی کمالی ... اور بے شرمی کے ساتھ معرفت الٰہی کا دعویٰ کرتا ہے جبکہ خود اپنے نفس کی معرفت بھی اسے حاصل نہیں ہے' وہ کہتا ہے میں اپنے رب کو جان چکا ہوں اور میں نے مخلوق کی حقیقت اور معرفت حاصل کر لی ہے' اب کیا سوچوں؟ ... معرفت کے درپے ہو' اس سے کہو کہ وہ آسمان کی طرف نظر اٹھائے' اس کے کواکب میں' کواکب کی ... طلوع و غروب میں' چاند سورج میں' مشارق و مغارب کے اختلاف میں' ان کی دائمی حرکت میں غور کرے اور دیکھے کہ ان کی حرکت میں کبھی سستی نہیں آتی' رفتار میں فرق نہیں پڑتا' ہر ستارہ اپنی مقررہ منازل میں محدود وقت کے اندر گردش کرتا ہے' نہ کبھی مقررہ وقت سے زائد ہوتا ہے اور نہ کم' یہ گردش جاری رہے گی' یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ انہیں کتاب کی طرح تہہ کر دے گا' ان کواکب کی تعداد کثرت اور رنگ کے اختلاف پر بھی غور کرے' بعض سرخی مائل ہیں' بعض میں سفیدی کی جھلک ہے' بعض سیاہی کی طرف مائل ہیں' ان کی شکلیں دیکھے' بعض بچھو کی شکل کے ہیں' بعض بکری کے بچے کی صورت ہیں' بعض ایسے ہیں جیسے بیل اور شیر' انسان کی شکل کے بھی کواکب ہیں' حد یہ ہے کہ زمین پر کوئی ایسی صورت نہیں ہے جس کی نظیر آسمان پر نہ ہو' پھر یہ دیکھے کہ آفتاب اپنے فلک میں ایک سال کے اندر گردش کرتا ہے اور ہر دن ایک نئی چال کے ساتھ طلوع ہوتا ہے اور نئی چال کے ساتھ غروب ہوتا ہے' اللہ تعالیٰ نے جو اس کا خالق ہے اسے اپنے لئے مسخر کر لیا ہے' اگر سورج کا طلوع و غروب نہ ہوا کرتا تو رات دن کا وجود نہ ہوتا اور نہ اوقات کی معرفت ہوتی' یا تو دنیا پر ہمیشہ تاریکی کا تسلط رہتا یا روشنی کا اور نہ یہ پتا چلتا کہ آرام کا وقت کون سا ہے اور معیشت کا وقت کیا ہے' دیکھو اللہ تعالیٰ نے رات کو لباس اور آرام کا وقت اور دن کو معاش کے لئے بنایا ہے' دن رات کے اندر کس طرح داخل ہوتا ہے اور رات دن کے اندر کیسے داخل ہوتی ہے' کبھی دن مختصر ہوتا ہے اور رات لمبی ہوتی ہے' کبھی رات چھوٹی اور دن طویل ہو گیا ہے' پھر آفتاب کی رفتار

آسمان کے درمیان سے ہٹتی ہے تو موسم بدلتے ہیں گرمی و سردی اور ربیع و خریف کے موسم پیدا ہوتے ہیں' جب آفتاب خط استواء سے نیچے اتر جاتا ہے تو ہوا سرد ہو جاتی ہے اور سردی کا موسم ظاہر ہو جاتا ہے اور جب ٹھیک خط استواء پر رہتا ہے تو گرمی سخت پڑتی ہے اور جب ان دونوں کے درمیان میں ہوتا ہے تو موسم معتدل ہو جاتا ہے۔

غرض یہ ہے کہ آسمانوں کے عجائبات بے شمار ہیں۔ اگر کوئی شخص ان کے سوویں حصے کی معرفت بھی حاصل کرنا چاہے تو یہ اس کے لئے ممکن نہیں ہے' ہم نے جو کچھ بیان کیا اس سے عجائبات کا شمار مقصود نہیں ہے' بلکہ طریق فکر پر تنبیہہ کرنا مقصود ہے اور اس اعتقاد کی طرف توجہ دلانا ہے کہ کوئی ستارہ ایسا نہیں ہے جس کی تخلیق بے شمار حکمتوں کے ساتھ نہ ہوئی ہو' یہ حکمتیں اس کی شکل' رنگ' آسمان میں ان کے محل وقوع' خط استواء سے ان کے بعد و قرب' دوسرے کواکب سے ان کی نزدیکی اور دوری غرضیکہ ہر چیز میں ہیں' اسی پر اپنے اعضائے بدن کو قیاس کرو' تمہارا کوئی جزو بدن ایسا نہیں ہے جس میں ایک یا بہت سی حکمتیں نہ ہوں' آسمان کا معاملہ عظیم تر ہے بلکہ زمین کو آسمان سے کوئی نسبت ہی نہیں ہے' نہ جسامت میں اور نہ معنوی اوصاف میں' ظاہر ہے آسمان جس قدر عظیم ہے اسی قدر اس کے معنوی اوصاف بھی عظیم ہیں' تم جانتے ہو کہ زمین ایک وسیع ترین سیارہ ہے یہاں تک کہ کوئی انسان اس کے اطراف میں گھومنے کی طاقت نہیں رکھتا لیکن اہل علم اس حقیقت پر متفق ہیں کہ سورج زمین سے ایک سو ساٹھ گنا سے بھی زائد ہے' ایسی بہت سی روایتیں موجود ہیں جن سے سورج کی وسعت کا علم ہوتا ہے پھر وہ کواکب جنہیں تم بہت مختصر دیکھتے ہو زمین سے کم از کم آٹھ گنا بڑے ہیں اور ان میں جو سیارہ سب سے بڑا ہے وہ زمین سے ایک سو بیس گنا بڑا ہے' اس سے تم ان کواکب کی دوری اور بلندی کا اندازہ کر سکتے ہو اسی دوری کے باعث وہ تمہیں بہت چھوٹے نظر آتے ہیں' قرآن کریم کی اس آیت میں اسی بعد کی طرف اشارہ ہے۔

وَرَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوَّاهَا۔ (پ ۳۰' ر ۴' آیت ۲۸) اس کی چھت کو بلند کیا اور اس کو درست بنایا۔

روایات میں ہے کہ ایک آسمان سے دوسرے آسمان کے درمیان پانچ سو سال کی مسافت ہے۔ (ترمذی ابو ہریرہؓ) یہ معلوم ہو چکا ہے کہ ایک ستارہ زمین سے کئی گنا بڑا ہے اور تم بے شمار ستارے آسمان پر چمکتے ہوئے دیکھتے ہو' پہلے تم ان کواکب کی کثرت پر نظر کرو پھر اس آسمان پر نظر ڈالو جس میں یہ کواکب جڑے ہوئے ہیں' پھر اس کی وسعت پر غور کرو' پھر سرعت رفتار پر نظر کرو' تم اس کی حرکت بھی محسوس نہیں کرتے' چہ جائیکہ اس کی سرعت اور تیز رفتاری محسوس کر سکو لیکن تمہیں اس میں شک نہ کرنا چاہیے کہ آسمان ایک ستارے کے عرض کی مقدار ایک لحظے میں حرکت کرتا ہے' گویا اگر ایک ستارے کا عرض زمین سے سو گنا زائد ہے تو آسمان ایک لحظے میں زمین کے عرض سے سو گنا چلتا ہے' اس کی یہ رفتار ہمیشہ رہتی ہے' اگرچہ تم اس سے غافل رہتے ہو' اس سرعت رفتار کی تعبیر حضرت جبرئیل علیہ السلام نے اپنے ان الفاظ سے فرمائی "ہاں نہیں" یہ واقعہ معراج کے موقع پر پیش آیا' سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ سے دریافت کیا تھا کہ کیا سورج ڈھل گیا۔ آپ نے جواب دیا "ہاں نہیں" سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "ہاں نہیں" کے کیا معنی ہیں۔ حضرت جبرئیل نے عرض کیا "ہاں" کہنے سے "نہیں" کہنے کے درمیان جو وقفہ ہوا اس میں آفتاب نے پانچ سو برس کی مسافت طے کر لی ہے[1] دیکھو آسمان کس قدر وسیع ہے اور کتنا بڑا ہے لیکن اس کی رفتار کس قدر سریع اور حرکت کس قدر خفیف ہے' پھر اللہ تعالیٰ کی قدرت دیکھو کہ اس کی تصویر تمام تر وسعتوں کے باوجود آنکھ کے چھوٹے سے ڈھیلے میں منعکس کر دی ہے' تم زمین پر بیٹھ کر اس کی طرف دیکھتے رہو اور تمام آسمان اور اس کے کواکب تمہیں نظر آجاتے ہیں' اس میں شک نہیں کہ آسمان عظیم ہے اور اس کے کواکب وسیع ہیں لیکن تم ان کی طرف مت دیکھو بلکہ ان کے خالق کی طرف دیکھو کہ اس نے انہیں کیسے پیدا کیا ہے' پھر کیسے بغیر ستون اور بغیر کسی بالائی رابطے کے روکا ہے' تمام عالم ایک گھر کی طرح ہے' آسمان اس کی چھت ہے' ہمیں تم پر تعجب ہوتا ہے کہ جب تم کسی مالدار کے گھر جاتے ہو اور اس کے در و دیوار کو دلکش' سنہرے رنگوں سے آراستہ دیکھتے ہو تو حیرت سے منہ میں انگلی دے لیتے ہو اور اس مکان کی خوبصورتی کی تعریف کئے بغیر نہیں

(۱) مجھے اس روایت کی اصل نہیں ملی۔

تھکتے، جبکہ تم اس زمینی گھر کو رات دن دیکھتے ہو، اس کی زمین، اس کی چھت، اس کی ہوا، اس کا عجیب و غریب ساز و سامان، اس کے محیر العقول حیوانات، اس کے عمدہ نقوش یہ تمام چیزیں ہر وقت تمہاری نظر میں رہتی ہیں لیکن نہ تم ان کے متعلق کوئی گفتگو کرتے ہو نہ دل سے ان کی طرف ملتفت ہوتے ہو، کیا یہ گھر اس گھر سے کسی اعتبار سے کم ہے، جس کی تعریف میں تم رطب اللسان رہتے ہو حالانکہ وہ گھر تو اس عظیم الشان گھر کا ایک جز ہے بلکہ اس کا معمولی حصہ ہے، اس کے باوجود تم اصل گھر کی طرف نہیں دیکھتے اس کی وجہ اس کے علاوہ کچھ نہیں ہے کہ یہ گھر رب کریم نے تنہا بنایا ہے اور یہ کہ تم اپنے نفس، اپنے رب اور اپنے رب کے گھر کو بھول چکے ہو اور اپنے شکم اور شرمگاہ میں معروف ہو، تمہیں شہوت اور حشمت کے علاوہ کسی چیز سے غرض نہیں ہے، تمہاری شہوت کی غایت یہ ہے کہ اپنے پیٹ کو لبریز کرلو، تمہارا بس نہیں چلتا کہ چوپایہ سے دس گنا کھا سکو، اگر کھانا ہی معیار فضیلت ہے تو چوپایہ تم سے دس گنا زیادہ افضل ہے کیونکہ وہ تم سے دس گنا زیادہ کھاتا ہے اور غایت حشمت یہ ہے کہ تمہارے اردگرد دس بیس سو آدمی جمع ہو جائیں اور زبان سے تمہاری تعریف کریں اور دل میں تمہارے لئے مخلوط اعتقادات رکھیں، اگر وہ تمہاری محبت اور عقیدت میں سچے بھی ہیں، تو تمہیں ان سے کیا واسطہ، نہ وہ تمہارے لئے اور نہ خود اپنے لئے کسی نفع و نقصان کے مالک ہیں، نہ موت، حیات اور حشر ان کے ہاتھ میں ہے، تمہارے شہر میں نہ جانے کتنے یہود و نصاریٰ ایسے ہوں گے جن کا سماجی مرتبہ تم سے کہیں زیادہ بلند ہوگا۔

تم شہوت و حشمت کے فریب میں پڑ کر آسمانوں اور زمین کے ملکوت کی طرف دیکھنے سے غافل ہو گئے ہو اور اب تمہاری نظر میں مالک ملک و ملکوت کے جمال کی بھی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ تمہاری مثال تو ایسی ہے جیسے چیونٹی جس نے کسی عالی شان محل میں اپنا گھر بنا رکھا ہو، وہ محل نہایت بلند و بالا، حسین و جمیل اور مضبوط ہو، اس کے خوبصورت غرفوں میں حوریں، غلام ہوں اور اس کے کمرے قیمتی سامان سے بھرے ہوئے ہوں، اگر وہ چیونٹی اپنے بل سے باہر نکلے اور اپنی کسی بہن سے ملے اور اسے بولنے کی قدرت حاصل ہو جائے تو وہ اپنے تنگ و تاریک مکان اور معمولی غذا کی فراہمی اور معیشت کی کیفیت کے علاوہ کسی اور موضوع پر گفتگو نہ کر سکے، حالانکہ اس کا مسکن ایک خوبصورت محل میں ہے چاہیے تو یہ کہ وہ اپنی بہن کو بتلائے کہ وہ ایک عظیم الشان محل میں رہتی ہے جس کی دیواریں سونے کی ہیں، جس کی زمین چاندی کی ہے، جس میں مہ وشوں کا ہجوم ہے اور جو نفیس اور قیمتی سامان سے آراستہ ہے مگر وہ بے چاری محل کے متعلق کچھ جانتی ہی نہیں ہے نہ اس کی نظر اپنے مسکن اور غذا سے تجاوز کرپاتی ہے کیونکہ وہ کوتاہ نظری کے باعث ان امور سے متجاوز نہیں ہو سکتی لیکن تمہاری کیا مجبوری ہے تم کیوں اپنے تنگ اور معمولی مکان میں رہ کر اللہ تعالیٰ کے وسیع ترین محل، اس کی بلند و بالا چھت اور خوبصورت ساز و سامان سے غافل ہو، نہ اس کے ملائکہ سے واقف ہو جو اس کے آسمانوں میں رہتے ہیں، آسمان کے بارے میں بس تم اتنا جانتے ہو جتنا چیونٹی اپنے مسکن کی چھت سے واقف ہے اور ملائکہ سے تمہاری واقفیت صرف اس قدر ہے جس قدر چیونٹی کو تم سے ہے اور تمہارے گھر کے دوسرے باشندوں سے ہے مگر چیونٹی کو تو اس سے زیادہ معرفت کی قدرت ہی نہیں ہے نہ اس کی مختصر عقل میں تمہارے محلوں کے عجائب سما سکتے ہیں، اس کے برعکس تمہیں ملکوت میں فکر کے گھوڑے دوڑانے اور اس کے عجائب کی معرفت حاصل کرنے پر قدرت ہے۔ پھر اس قدرت سے فائدہ کیوں نہیں اٹھاتے۔

اب ہم اپنے قلم کو فکر کے مزید ذکر سے روکتے ہیں۔ یہ ایک ایسا موضوع ہے جس کی کوئی انتہا نہیں ہے مگر ہم طویل ترین عمریں بھی اس کے ذکر میں کھپا دیں تو جو معرفت اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے ہمیں عطا کی ہے اس کی شرح و تفصیل بھی نہ کر پائیں حالانکہ جو کچھ ہمیں معلوم ہے وہ علماء اور اولیاء کے علم کے مقابلے میں نہایت کم ہے اور جو کچھ تمام علماء اور اولیاء جانتے ہیں وہ انبیائے کرام کے علوم کے مقابلے میں نہایت حقیر ہے اور جو معرفت تمام انبیائے کرام کو حاصل ہے وہ ملائکہ مقربین کی معرفت کے سامنے کچھ بھی نہیں ہے۔ پھر تمام ملائکہ اور تمام جنوں اور انسانوں کے علم کو اگر اللہ تعالیٰ کے علم کے سامنے رکھا جائے تو اسے علم کہنا ہی صحیح نہ ہو بلکہ اسے دہشت، تحیر، قصور اور عجز کے علاوہ کوئی نام نہ دیا جا سکے۔ پاک ہے وہ ذات جس نے اپنے بندوں کو معرفت عطا کی اور اسے آگاہ کر دیا کہ۔

وَمَآ اُوْتِیْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِیْلًا۔ (پ ۱۵' ر ۱۰' آیت ۸۶) اور تم کو بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے۔

یہ ان طریقوں پر اجمالی گفتگو تھی جن میں لوگوں کو فکر کرنی چاہیے۔ یہاں اللہ تعالیٰ کی ذات میں فکر کرنے کا طریقہ مذکور نہیں ہے بلکہ صرف مخلوق میں فکر کا ذکر ہے تاکہ خالق کی معرفت حاصل ہو اور اس کی عظمت' ہیبت اور قدرت کا فہم پیدا ہو۔ جس قدر اللہ تعالیٰ کے عجائب صنعت کی معرفت زیادہ ہوگی اسی قدر تمہیں اس کی جلالت و عظمت کی معرفت زیادہ حاصل ہوگی۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے تم کسی عالم سے اس کے علم کی بناء پر محبت کرتے ہو اور اس کے علم کی تمہیں معرفت حاصل ہے۔ اب اگر تم پر اس کے کچھ اور علوم منکشف ہوں کوئی اچھوتا شعر' یا خوبصورت تصنیف دیکھو یا کسی نئی تحقیق سے تمہارے کان آشنا ہوں تو تمہیں اس عالم سے کچھ اور محبت ہو جاتی ہے اور تم اس کی توقیر' تعظیم اور احترام میں کچھ اور آگے بڑھ جاتے ہو۔ اس کا ہر کلمہ' ہر شعر' ہر تحقیق تمہارے دل میں اس کا وقار بڑھاتی ہے اور مرتبہ زیادہ کرتی ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں غور کرنا چاہیے۔ یہ آسمان و زمین اور ان دونوں کے درمیان جو کچھ موجود ہے سب اسی کی تالیف اور تصنیف ہے اور یہ ایک عظیم تصنیف ہے۔ تم زندگی بھر اس کا مطالعہ کرو کبھی ختم نہیں ہوگی اور ہر روز تم پر نئے انکشافات' نئی معرفتوں کے دروازے کھلیں گے لیکن صحیح بات یہ ہے کہ ہر شخص کے لئے فکر و نظر میں اتنا ہی حصہ ہے جتنا اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کیا گیا ہے۔

اس گفتگو کو ہم یہیں پر ختم کرتے ہیں۔ اس بیان میں کتاب الشکر کے مضامین بھی شامل کرلئے جائیں۔ کتاب الشکر میں بھی ہمارا موضوع اللہ تعالیٰ کی مخلوق تھا لیکن وہاں اس اعتبار سے تھا کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے ہمیں عطا کیا ہے وہ اس کا احسان' انعام اور فضل ہے اور یہاں اس اعتبار سے ہے کہ یہ اس کا فعل ہے اور ہمیں اس میں فکر کرنا چاہیے' یہاں ہم نے جن چیزوں میں فکر کیا ہے ایک فلسفی بھی ان چیزوں میں فکر کرتا ہے لیکن اس کا فکر بدبختی اور گمراہی کا باعث بنتا ہے اور توفیق یافتہ شخص کی فکر ہدایت اور سعادت کا سبب بنتی ہے' آسمان و زمین میں کوئی ذرّہ ایسا نہیں ہے جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ کسی کو گمراہ اور کسی کو ہدایت یافتہ نہ کرے۔ بہرحال جو شخص ان امور میں اس نقطۂ نظر سے غور کرتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے افعال ہیں اس کی صفت ہیں وہ ان سے اللہ تعالیٰ کے جلال اور عظمت کی معرفت حاصل کرتا ہے اور ان سے ہدایت پاتا ہے اور جس شخص کی نظر اس پر رہتی ہے کہ یہ امور ایک دوسرے کے لئے مؤثر اور ایک دوسرے کا سبب ہیں' مسبّب الاسباب سے ان کا کوئی علاقہ نہیں ہے وہ گمراہ ہوتا ہے' ہم گمراہی سے اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہتے ہیں' دعا ہے اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے کرم و فضل اور رحمت سے ان مواقع سے بچائے جہاں جہلاء کے قدم ڈگمگا جاتے ہیں۔

کتاب ذکر الموت وما بعده

موت اور مابعد الموت کا بیان

جس شخص کو موت سے شکست کھانی ہے' جس کی آرام گاہ قبر ہوگی' جس کے مونس و دمساز سانپ' بچھو اور کیڑے مکوڑے ہوں گے' جسے منکر نکیر کی ہم نشینی ملے گی' قیامت اس کے وعدے کی جگہ ہوگی اور جس کا ٹھکانہ جنت یا دوزخ ہوگا' اس کے لئے اس کے علاوہ کچھ مناسب نہیں کہ وہ صرف موت کے متعلق سوچے' صرف موت کا ذکر کرے' صرف اسی کے لئے تیاری کرے' اسی میں تدبّر کرے' اسی کا مشتاق ہو' اس کے علاوہ کسی چیز کا اہتمام نہ ہو' اس کے سوا کسی کا انتظار نہ ہو' ایسے شخص کے لئے مناسب یہ ہے کہ وہ زندگی ہی میں اپنے نفس کو مردہ تصور کرنے لگے اور خود کو قبر کے گہرے گڑھے میں لیٹا ہوا تصور کرے' اس لئے کہ جو چیز آنے والی ہے وہ قریب ہے' بعید وہ ہے جسے آنا نہیں ہے' سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

اَلْکَیِّسُ مَنْ دَانَ نَفْسَہٗ وَعَمِلَ لِمَا بَعْدَ الْمَوْتِ (۱)

---

(۱) یہ حدیث پہلے بھی گذر چکی ہے

عقلمند وہ ہے جو اپنے نفس کو دبائے اور موت کے بعد کی زندگی کے لئے عمل کرے۔

یہ حقیقت ہے کہ اگر کسی چیز کا بار بار ذکر نہ ہو تو اس کی صحیح طریقے پر تیاری نہیں ہو سکتی' اور بار بار ذکر اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک موت کی یاد دلانے والی باتیں سننے پر دھیان نہیں دیا جاتا' یہاں ہم اسی لئے موت' اس کے مقدمات' اس کے ملحقات' آخرت' قیامت' دوزخ اور جنت کے احوال کے ذکر کرتے ہیں' تاکہ بندہ اس کے لئے تیاری کر سکے' کیونکہ سفر کا وقت آپہنچا ہے' زندگی مختصر ہوتی جارہی ہے' اب بہت تھوڑی عمر باقی رہ گئی ہے' لیکن لوگ اس سے غافل ہیں۔

اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِي غَفْلَةٍ مُّعْرِضُونَ۔ (پ ۱۷' ر ۱' آیت ۱)

ان لوگوں سے ان کا (وقت) حساب نزدیک آپہنچا اور یہ غفلت میں پڑے ہیں۔

پہلا باب

ہم موت کے متعلقات کو دو بابوں میں بیان کرتے ہیں' پہلے باب میں موت سے پہلے کے واقعات اور توابع سے لے کر صور پھونکنے تک کے حالات بیان کئے گئے ہیں' یہ پہلا باب آٹھ بیانات پر مشتمل ہے۔

موت کا ذکر اور اسے کثرت سے یاد کرنا جاننا چاہیے کہ جو شخص دنیا میں منہمک ہوتا ہے اس کے فریب میں مبتلا ہوتا ہے اور اس کی شہوات کی محبت میں غرق رہتا ہے' اس کا قلب یقینی طور پر موت سے غافل ہوتا ہے' کبھی اس کی زبان پر موت کا ذکر نہیں آتا' نہ دل میں اس کا خیال پیدا ہوتا ہے' اگر کوئی اس کے سامنے ذکر بھی کرتا ہے تو نفرت سے منہ موڑلیتا ہے' اور اس ذکر کو سخت ناپسند کرتا ہے' یہی لوگ ہیں جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔

قُلْ إِنَّ الْمَوْتَ الَّذِي تَفِرُّونَ مِنْهُ فَإِنَّهُ مُلَاقِيكُمْ ثُمَّ تُرَدُّونَ إِلَىٰ عَالِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ۔ (پ ۲۸' ر ۱۱' آیت ۸)

آپ کہہ دیجئے کہ جس موت سے تم بھاگتے ہو وہ تم کو آپکڑے گی' پھر تم پوشیدہ اور ظاہر جاننے والے (خدا) کے پاس لے جائے جاؤ گے' پھر وہ تم کو تمہارے سب کئے ہوئے کام بتلادے گا۔

پھر آدمی تین طرح کے ہیں' بعض وہ ہیں جو دنیا میں ڈوبے ہوتے ہیں' بعض وہ ہیں جو ابتداءً توبہ کررہے ہیں اور بعض وہ ہیں جو انتہائی معرفت رکھتے ہیں' پہلی قسم میں جو لوگ ہیں وہ موت کا ذکر نہیں کرتے اور کبھی ذکر بھی کرتے ہیں تو اس کے ذکر کو دنیا کی جدائی کے افسوس کے ساتھ مقید کردیتے ہیں اور اس کی خدمت کرنے بیٹھ جاتے ہیں' موت کا اس انداز میں ذکر ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ سے اور دور کردیتا ہے اور توبہ کرنے والے موت کا ذکر کثرت سے اس لئے کرتے ہیں تاکہ ان کے دل سے خوف و خشیت نکل جائے اور توبہ کی تکمیل کر سکیں' بعض اوقات یہ لوگ بھی موت کو ناپسند کرتے ہیں' محض اس لئے کہ کہیں موت انہیں توبہ کی تکمیل اور زاد راہ لینے سے پہلے ہی نہ اچک لے' ایسا شخص موت کو ناپسند کرنے میں معذور ہے اور سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کے تحت نہیں ہے۔

مَنْ كَرِهَ لِقَاءَ اللَّهِ كَرِهَ اللَّهُ لِقَاءَهُ۔ (بخاری و مسلم۔ ابو ہریرہؓ)

جو شخص اللہ سے ملنا پسند نہیں کرتا اللہ اس سے ملنا پسند نہیں کرتا۔

اگر کوئی شخص اس لئے موت کو پسند نہیں کرتا تو یہ مطلقاً موت کو مکروہ سمجھنا نہیں ہے' بلکہ اپنے گناہوں کی بناء پر اللہ تعالیٰ کی ملاقات سے محروم رہ جانے کا خوف ہے' یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص محض اس لئے محبوب کی ملاقات سے محروم رہ جائے کہ وہ اس ملاقات کے لئے تیاری کررہا تھا اور خود کو محبوب کی پسند کے مطابق آراستہ کررہا تھا' ایسے شخص کے متعلق یہ نہیں کہا جائے گا کہ وہ اپنے محبوب سے ملنا پسند نہیں کرتا' اور اس کی علامت یہ ہے کہ وہ ہر وقت اس ملاقات کی تیاری میں مشغول رہے' اس کے علاوہ

اس کے لئے کوئی دوسری مشغولیت نہ ہو' ورنہ وہ بھی پہلی قسم میں داخل ہو جائے گا' عارف وہ ہے جو ہمیشہ موت کو یاد کرتا ہو اور اسے اس حیثیت سے یاد کرتا ہو کہ موت کے بعد محبوب سے ملاقات ہوگی' عاشق کبھی اپنے معشوق سے ملنے کا وقت نہیں بھولتا' ایسا شخص اکثر موت کی آمد میں جلدی چاہتا ہے اور اس کے آنے پر خوش ہوتا ہے تاکہ گناہوں کے گھر سے نجات پاسکے' اور ربّ العالمین کے جوار میں منتقل ہو سکے' جیسا کہ حضرت حذیفہؓ سے مروی ہے کہ جب ان کی وفات کا وقت قریب آیا تو انہوں نے فرمایا کہ حبیب وفات کے وقت آیا' جو نادم ہوا سے فلاح نصیب نہ ہو' اے اللہ! اگر تو جانتا ہے کہ مجھے مالداری سے زیادہ مفلسی پسند ہے اور صحت سے زیادہ مرض پسند ہے اور زندگی سے زیادہ موت پسند ہے تو مجھ پر موت کو آسان کر تاکہ میں تجھ سے ملاقات کرسکوں' گویا توبہ کرنے والا موت کو ناپسند کرنے میں معذور ہے' اور یہ شخص موت کو پسند کرنے اور اس کی تمنا کرنے میں معذور ہے' ان دونوں اشخاص سے مرتبے میں اعلیٰ وہ ہے جو اپنا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کردے' یعنی ایسا ہو جائے کہ نہ اپنے لئے موت کو پسند کرے اور نہ زندگی کو بلکہ اس کے نزدیک وہی چیز محبوب تر ہو جو اس کے پروردگار کو محبوب ہو' ایسا شخص اپنے فرط محبت سے تسلیم و رضا کے اعلیٰ مقام تک پہنچ جاتا ہے' یہی غایت اور انتہا ہے۔

بہرحال موت کے ذکر میں بڑی فضیلت اور ثواب ہے' دنیا میں مستغرق شخص بھی موت کے ذکر سے یہ فائدہ اٹھاتا ہے کہ اس سے کنارہ کشی اختیار کرتا ہے اور اس ذکر سے اس کی لذات میں کدورت پیدا ہو جاتی ہے اور لذات و شہوات کا مکدر ہونا اسباب نجات میں سے ہے۔

موت کی یاد کے فضائل سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں۔

اَكْثِرُوا مِنْ ذِكْرِ هَادِمِ اللَّذَّاتِ۔ (ترمذی' نسائی' ابن ماجہ' ابو ہریرہؓ) لذتوں کو مٹانے والے کی یاد زیادہ کرو۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ موت کی یاد سے لذات کو مکدر کرو' یہاں تک کہ تمہارا دل ان سے اعراض کرنے لگے اور تم اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو جاؤ' ایک حدیث میں ہے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

لَوْ تَعْلَمُ الْبَهَائِمُ مِنَ الْمَوْتِ مَا يَعْلَمُ ابْنُ آدَمَ مَا أَكَلْتُمْ مِنْهَا سَمِيْنًا۔ (بیہقی' ام حبیبہؓ)
اگر بہائم موت کے بارے میں وہ باتیں جان لیں جو تم جانتے ہو تو تم ان میں سے کوئی (فربہ) جانور نہ کھاؤ۔

حضرت عائشہؓ نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں عرض کیا' یا رسول اللہ! کیا کوئی شخص شہداء کے ساتھ بھی اٹھے گا؟ فرمایا! ہاں' وہ شخص جو دن اور رات میں بیس مرتبہ موت کا ذکر کرے[1]' موت کی یاد کی فضیلت اس لئے ہے کہ اس سے آدمی دنیا سے علیحدگی اختیار کرتا ہے' اور آخرت کے لئے تیاری کرتا ہے' اور موت سے غفلت دنیاوی شہوات میں انہماک کی دعوت دیتی ہے۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں۔

تُحْفَةُ الْمُؤْمِنِ الْمَوْتُ۔ (ابن ابی الدنیا' طبرانی' حاکم' عبداللہ ابن عمرؓ) مومن کا تحفہ موت ہے۔

موت کو مومن کا تحفہ اس لئے قرار دیا گیا کہ دنیا مومن کے لئے قید خانہ ہے' جب تک وہ دنیا کے قید خانے میں محبوس رہتا ہے' اپنے نفس کی ریاضت' شیطان سے مدافعت اور شہوات سے دور ہونے میں طرح طرح کی مشقتیں برداشت کرتا ہے' موت اسے اس عذاب سے چھٹکارہ دلاتی ہے' گویا یہ آزادی اس کے لئے تحفہ بن جاتی ہے' ایک حدیث میں موت کو مسلمان کے لئے کفارہ قرار دیا گیا ہے' (ابو نعیم' انسؓ) یہاں مسلمان سے مومن حقیقی مراد ہے' یعنی جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں' جس میں مومنوں کے اخلاق پائے جائیں' سوائے لغزشوں اور صغائر کے اس کا دامن گناہوں سے آلودہ نہ ہو' موت اس کے تمام گناہوں کا کفارہ بن جاتی ہے' بشرطیکہ وہ فرائض پر کاربند ہو اور کبائر کا ارتکاب نہ کرتا ہو' عطاء خراسانی کہتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایسی مجلس کے پاس سے گذرے جہاں قہقہے بلند ہو رہے تھے آپ نے فرمایا اس مجلس میں لذات کو مکدر

(۱) یہ روایت پہلے گزری ہے

کرنے والی چیز شامل کرلو' لوگوں نے عرض کیا وہ کیا چیز ہے؟ فرمایا موت ہے (ابن ابی الدنیا) حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ موت کا کثرت سے ذکر کرو' اس لئے کہ وہ گناہوں کو مٹادیتی ہے اور دنیا میں زاہد بناتی ہے (ابن ابی الدنیا) ایک حدیث میں ہے۔

کَفٰی بِالْمَوْتِ مُفَرِّقًا۔ (مسند حارث ابن ابی الدنیا' انسؓ) موت جدا کرنے کے اعتبار سے کافی ہے۔

ایک حدیث میں واعظاً کا لفظ ہے یعنی موت باعتبار نصیحت کے کافی ہے (طبرانی' بیہقی' عمار ابن یاسرؓ) ایک مرتبہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف لے گئے' آپ نے دیکھا کہ وہاں کچھ لوگ بیٹھے ہوئے ہنس رہے ہیں اور باتیں کررہے ہیں' آپ نے ارشاد فرمایا موت کا ذکر کرو' بخدا جس کے قبضے میں میری جان ہے' اگر تم وہ باتیں جان لو جو میں جانتا ہوں تو کم ہنسو اور زیادہ روؤ (ابن ابی الدنیا' ابن عمرؓ) سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں ایک شخص کا ذکر کیا گیا' لوگوں نے اس کی بے حد تعریف کی' آپ نے دریافت فرمایا کہ تمہارے ساتھی کا ذکر کیسا ہے؟ لوگوں نے عرض کیا کہ ہم نے اسے موت کا ذکر کرتے ہوئے نہیں سنا' فرمایا تب وہ ایسا نہیں ہے جیسا تم سمجھتے ہو (ابن ابی الدنیا' انسؓ) حضرت عبداللہ ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں عشرہ کے دسویں کو سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا' ایک انصاری شخص نے آپ کی خدمت میں عرض کیا یا رسول اللہ! لوگوں میں سب سے زیادہ عقلمند اور سب سے زیادہ بزرگ کون ہے؟ فرمایا! جو شخص موت کا زیادہ ذکر کرتا ہو اور موت کے لئے زیادہ تیاری کرتا ہو وہی عقلمند ہے اور وہی دنیا کا شرف اور بزرگی حاصل کئے ہوئے ہے (ابن ماجہ' ابن ابی الدنیا)

حضرت حسن بصری فرماتے ہیں کہ موت نے دنیا کو رسوا کردیا' کسی عقلمند کے لئے خوشی میں کوئی حصہ نہیں چھوڑا' ربیع ابن خیثم کہتے ہیں کہ مومن اگر کسی غائب کا انتظار کرے تو موت سے بہتر کوئی چیز انتظار کے قابل نہیں ہے' یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ جب میں مرجاؤں تو کسی کو میری موت کی اطلاع مت دینا اور مجھے آہستہ سے میرے پروردگار کی طرف بھیج دینا' ایک دانشور نے اپنے ایک بھائی کو لکھا کہ اے بھائی اس دنیا میں موت کی آرزو کر' اس سے پہلے کہ تو ایسے گھر میں جائے جہاں تو موت کی تمنا کرے اور موت نہ ملے' حضرت ابن سیرینؒ کے سامنے جب موت کا ذکر ہوتا تو ان کا ہر عضو مرجاتا' حضرت عمرابن عبدالعزیزؒ ہر شب فقہاء کو جمع کرتے اور سب مل کر موت' قیامت اور آخرت کا ذکر کرتے اور اس طرح روتے گویا ان کے سامنے کوئی جنازہ رکھا ہو' ابراہیم التیمی کہتے ہیں کہ دو چیزوں نے مجھ سے دنیا کی لذت منقطع کردی ہے' موت کی یاد اور اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑا ہونے کا خیال' کعب فرماتے ہیں جو شخص موت کی معرفت رکھتا ہے اس پر دنیا کے مصائب اور اس کی پریشانیاں آسان ہوجاتی ہیں' مطرف کہتے ہیں میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک شخص بصرے کی مسجد کے درمیان کھڑا ہوا یہ کہہ رہا ہے کہ موت کی یاد نے ڈرنے والوں کے دل ٹکڑے ٹکڑے کردیئے ہیں' بخدا وہ اس کے خوف کی بناء پر ہوش و خرد سے بیگانہ نظر آتے ہیں' اشعث کہتے ہیں کہ ہم جب بھی حسن بصری کی خدمت میں حاضر ہوتے وہ دوزخ' آخرت اور موت کا ذکر کرتے ہوئے ملتے' حضرت صفیہؓ روایت کرتی ہیں کہ ایک عورت نے حضرت عائشہؓ سے اپنے قلب کی شقاوت کا ذکر کیا' آپ نے فرمایا کہ موت کو کثرت سے یاد کر' تیرا دل نرم ہوجائے گا' چنانچہ اس عورت نے آپ کی ہدایت پر عمل کیا اور اس کا دل نرم ہوگیا' حضرت عیسیٰؑ کے سامنے موت کا ذکر ہوتا تو خوف کی وجہ سے جلد پھٹ جاتی اور خون بہنے لگتا' حضرت داؤد علیہ السلام کی موت اور قیامت کے ذکر سے یہ کیفیت ہوتی کہ جسم کے جوڑ جوڑ اکھڑ جاتے' پھر جب رحمت الٰہی کا ذکر ہوتا تب اپنی حالت پر واپس آتے' حضرت حسنؓ فرماتے ہیں کہ میں نے کوئی ایسا دانا نہیں دیکھا جو موت سے خوف زدہ اور دل گرفتہ نہ ہو' حضرت عمرابن عبدالعزیزؒ نے کسی عالم سے نصیحت کی درخواست کی' انہوں نے کہا کہ تم پہلے خلیفہ نہیں ہو جو مروگے یعنی تم سے پہلے خلفاء بھی موت سے ہمکنار ہوچکے ہیں' حضرت عمرابن عبدالعزیزؒ نے کہا کچھ اور بھی کہیے' فرمایا تمہارے آباء و اجداد میں حضرت آدم علیہ السلام تک کوئی ایسا شخص نہیں ہے جس نے موت کا ذائقہ نہ چکھا ہو؟ اور اب تمہاری باری ہے' حضرت عمرابن عبدالعزیزؒ عالم کی یہ بات سن کر رونے لگے' ربیع ابن خیثم نے اپنے گھر کے ایک حصے میں قبر

کھود رکھی تھی، وہ دن میں متعدد بار قبر میں لیٹتے اس طرح موت کی یاد ان کے دل میں ہر وقت تازہ رہتی، فرمایا کرتے تھے کہ اگر میرا دل ایک لمحے کے لئے بھی موت سے غافل ہو جائے تو فاسد ہو جائے، مطرف ابن عبداللہ الشخیر کہتے ہیں کہ اس موت نے تو اہل دنیا کی لذّات مکدّر کردیں، ایسی نعمتیں تلاش کرو جن کے لئے موت نہ ہو، حضرت عمر ابن عبدالعزیزؒ نے عنبسہ سے فرمایا کہ موت کو کثرت سے یاد کر، اگر تجھے عیش میں وسعت حاصل ہے تو اسے تنگ کر اور اگر تنگی ہے تو اسے وسیع کر، ابو سلیمان دارانی کہتے ہیں کہ میں نے امّ ہارون سے پوچھا کہ کیا تم موت کو پسند کرتی ہو، انہوں نے کہا نہیں، میں نے کہا کیوں؟ انہوں نے جواب دیا کہ اگر میں کسی انسان کی نافرمانی کروں تو اس سے منہ چھپائے پھرتی ہوں، پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اپنے رب کی نافرمانی کروں اور اس سے ملنا پسند کروں۔

دل میں موت کی یاد راسخ کرنے کا طریقہ: جاننا چاہیے کہ موت ایک خوفناک شئی ہے، اس کا خطرہ عظیم ہے، لوگ اس سے اس لئے غفلت کرتے ہیں کہ اس کے فکر و ذکر میں مشغول نہیں ہوتے اور اگر کوئی موت کا ذکر کرتا بھی ہے تو فارغ دلی کے ساتھ نہیں کرتا، بلکہ ایسے قلب کے ساتھ کرتا ہے جو دنیا کی شہوت میں مشغول ہو، اس لئے موت کے ذکر سے اس کے دل پر کوئی اثر مرتب نہیں ہوتا، موت کی یاد دل میں راسخ کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ بندہ اپنے دل کو موت کی یاد کے علاوہ ہر شئی سے فارغ کرلے اور ہر وقت یہ خیال کرے گویا موت اس کے سامنے موجود ہے، جیسے کوئی مسافر اگر خطرناک وادی طے کر رہا ہو، یا سمندر کے سینے پر محو سفر ہو تو اس کی تمام تر توجہ سفر پر رہتی ہے، چنانچہ اگر دل میں موت کی یاد اس طرح رہے گی تو امید ہے کہ اثر انداز بھی ہوگی، اس صورت میں اس کا دل دنیا کی خوشیوں اور مسرتوں سے اعراض کرنے لگے گا، موت کی یاد کا مفید ترین طریقہ یہ ہے کہ ان لوگوں کے متعلق سوچے جو اس کے ہم عصر، ہم عمر اور ہمسر تھے اور اب موت کی آغوش میں چلے گئے ہیں، ان کی موت کا تصور کرے، پہلے وہ اسی کی طرح ایک زندہ وجود کے مالک تھے اور کاروبار حیات میں مشغول نظر آتے تھے، لیکن اب خاک کے بستر پر محو خواب ہیں، وہ لوگ کتنے اونچے مناصب پر فائز تھے، کتنے خوشحال اور فارغ البال تھے لیکن مٹی نے ان کے تمام مناصب اور مراتب مٹادیے ہیں، ان کی حسین صورتیں مسخ کردی ہیں، ان کے اعضاء بکھیر دیئے ہیں اور اب وہ خود مٹی بن چکے ہیں، ان کی بیویاں بیوگی کی زندگی گذارنے پر مجبور ہیں، بچے یتیم ہیں، مال و جائیداد تباہ و برباد ہوگئی ہے، مساجد اور مجالس ان سے خالی ہیں، حتیٰ کہ اب ان کا کوئی ذکر بھی نہیں کرتا گویا وہ پیدا ہی نہیں ہوئے تھے، اگر ایک ایک شخص کا اس طرح جائزہ لیا جائے اور اپنے دل میں اس کا حال، اس کے مرنے کی کیفیت، اس کی صورت، اس کی سرگرمیاں اور دوسری مصروفیات ذہن میں حاضر کی جائیں اور یہ سوچا جائے کہ وہ کس طرح زندگی میں غرق تھا اور موت کو فراموش کرچکا تھا اور یہ سمجھتا تھا کہ مجھے اسباب حاصل ہیں، میری قوت اور جوانی کبھی ختم نہیں ہوگی، اسی لئے وہ ہر وقت لہو و لعب میں مشغول رہتا تھا اور موت سے غافل رہتا تھا جو اس کی طرف تیزی سے بڑھ رہی تھی، زندگی میں وہ پہلے ادھر سے ادھر خرمستیاں کرتا نظر آتا تھا اور اب اس کے پاؤں ٹوٹ چکے ہیں، جسم کے تمام جوڑ ٹوٹ پھوٹ کر بکھر گئے ہیں، زندگی میں وہ خوب زبان چلاتا تھا اور قہقہے بکھیرتا تھا اور آج کیڑوں نے اس کی زبان کھالی ہے اور مٹی نے اس کے دانت خاک کردیئے ہیں، اپنے لئے عمدہ سے عمدہ تدبیریں کرتا تھا اور ان چیزوں کا بھی بہتر سے بہتر انتظام کرتا تھا جن کی آنے والے دس برسوں میں بھی ضرورت نہیں ہوتی حالانکہ اس وقت اس کے اور موت کے درمیان صرف ایک ماہ کا فاصلہ تھا اور اسے اس کا احساس بھی نہیں تھا، یہاں تک کہ ایسے وقت میں اسے موت نے آلیا جبکہ اسے اس کے آنے کی توقع بھی نہیں تھی، اچانک موت کا فرشتہ اس کے سامنے آگیا اور اس کے کانوں میں جنت اور دوزخ کا اعلان گونجا۔

یہاں پہنچ کر اپنے آپ پر نظر ڈالے کہ وہ بھی تو انہی لوگوں جیسا ہے اور اس کی غفلت کا عالم بھی وہی ہے جو ان کا ہے۔ لامحالہ اس کا انجام بھی ایسا ہی ہوگا جیسا ان کا ہوا۔ حضرت ابو الدرداءؓ فرماتے ہیں کہ جب مرنے والوں کا ذکر ہو تو اپنے آپ کو مردوں میں شمار کر، حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ سعادت مند وہ ہے جو دوسروں سے عبرت پکڑے۔ حضرت عمر ابن عبدالعزیزؒ فرماتے ہیں کیا تم نہیں جانتے کہ ہر دن صبح میں یا شام میں کسی نہ کسی مسافر کو آخرت کی طرف الوداع کہتے ہو اور اسے مٹی کے ایک گڑھے

میں چھوڑ آتے ہو' وہ مٹی کو اپنا تکیہ بناتا ہے۔ احباب کو پیچھے چھوڑ جاتا ہے اور اسباب دنیا سے اپنا تعلق منقطع کرلیتا ہے۔

اگر ان افکار کے ساتھ قبرستانوں میں آنے جانے اور مریضوں کی مزاج پُرسی کرنے کا معمول بھی ہو تو موت کا خیال ہر وقت دل میں تازہ رہے گا بلکہ اتنا غالب آجائے گا کہ اس کا نصب العین بن جائے گا۔ اس صورت میں یہ امید کی جاسکتی ہے کہ وہ موت کی تیاری کرے گا اور اس دنیائے فریب سے کنارہ کش ہوگا۔ محض زبان سے موت کا ذکر کرنا یا اوپرے دل سے یاد کرلینا زیادہ سودمند نہیں ہے۔ جب بھی دل میں کسی اچھی چیز کا خیال پیدا ہو یہ سوچ لو کہ تمہیں اس سے جدا ہونا پڑے گا۔ ایک دن ابن مطیع کی نظر اپنے گھر پر پڑی۔ انہیں یہ کچھ اچھا محسوس ہوا۔ اس احساس کے ساتھ ہی ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور کہنے لگے بخدا اگر موت نہ ہوتی تو میں تجھ سے خوش ہوتا اور اگر ہمیں تنگ قبروں میں نہ جانا ہوتا تو ہم دنیا سے اپنی آنکھیں ٹھنڈی کرتے' پھر اس قدر روئے کہ بے اختیار چیخیں لگ گئیں۔

طول امل' قصر امل' طول امل کے اسباب اور طریق علاج

سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے فرمایا۔

اِذَا اَصْبَحْتَ فَلَا تُحَدِّثْ نَفْسَكَ بِالْمَسَاءِ وَاِذَا اَمْسَيْتَ فَلَا تُحَدِّثْ نَفْسَكَ بِالصَّبَاحِ وَخُذْ مِنْ حَيَاتِكَ لِمَوْتِكَ وَمِنْ صِحَّتِكَ لِسُقْمِكَ فَاِنَّكَ يَا عَبْدَ اللّٰهِ لَا تَدْرِي مَا اسْمُكَ غَدًا۔ (ابن حبان) جب تو صبح کرے تو اپنے نفس سے شام کا ذکر نہ کر اور اگر شام کرے تو صبح کا ذکر نہ کر اور اپنی موت کے لئے اپنی زندگی سے اور اپنے مرض کے لئے اپنی صحت سے کچھ لے۔ اس لئے کہ اے عبداللہ تجھے یہ معلوم نہیں آنے والے کل میں تیرا نام کیا ہوگا۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ روایت کرتے ہیں کہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

اِنَّ اَشَدَّ مَا اَخَافُ عَلَيْكُمْ خَصْلَتَانِ اتِّبَاعُ الْهَوَىٰ وَطُولُ الْاَمَلِ فَاَمَّا اتِّبَاعُ الْهَوَىٰ فَاِنَّهُ يَصُدُّ عَنِ الْحَقِّ وَاَمَّا طُولُ الْاَمَلِ فَاِنَّهُ الْحُبُّ لِلدُّنْيَا ثُمَّ قَالَ اَلَا اِنَّ اللّٰهَ تَعَالَىٰ يُعْطِي الدُّنْيَا مَنْ يُحِبُّ وَيُبْغِضُ وَاِذَا اَحَبَّ عَبْدًا اَعْطَاهُ الْاِيْمَانَ اَلَا اِنَّ لِلدِّيْنِ اَبْنَاءً وَلِلدُّنْيَا اَبْنَاءً فَكُوْنُوْا مِنْ اَبْنَاءِ الدِّيْنِ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنْ اَبْنَاءِ الدُّنْيَا اَلَا اِنَّ الدُّنْيَا قَدِ ارْتَحَلَتْ مُوَلِّيَةً اَلَا اِنَّ الْاٰخِرَةَ قَدِ ارْتَحَلَتْ مُقْبِلَةً اَلَا وَاِنَّكُمْ فِي يَوْمِ عَمَلٍ لَيْسَ فِيْهِ حِسَابٌ اَلَا وَاِنَّكُمْ تُوْشِكُوْنَ فِي يَوْمِ حِسَابٍ لَيْسَ فِيْهِ عَمَلٌ۔ (ابن ابی الدنیا)

سب سے زیادہ مجھے تم پر دو خصلتوں کا خوف ہے' ایک اتباع ہوی کا اور دوسرے طول امل کا' اتباع ہوی (آدمی کو) راہ حق سے روک دیتی ہے اور طول امل کے معنی ہیں دنیا کی محبت (اس کے بعد آپؐ نے فرمایا) آگاہ رہو اللہ تعالیٰ ہر شخص کو دنیا عطا کرتا ہے خواہ اس سے محبت کرتا ہو یا نفرت کرتا ہو اور جب کسی شخص سے محبت کرتا ہے تو اسے ایمان عطا کرتا ہے۔ آگاہ رہو کچھ لوگ دین کے بیٹے ہیں اور کچھ دنیا کے بیٹے ہیں' تم دین کے بیٹوں میں سے ہو جاؤ' دنیا کے بیٹوں میں سے مت ہو' آگاہ رہو دنیا پیٹھ پھیر کر رخصت ہو چکی ہے' آگاہ رہو آخرت سامنے چلی آرہی ہے' تم آج عمل کے دن میں ہو اس میں کوئی حساب نہیں ہے' عنقریب تم حساب کے دن میں ہوگے' اس میں کوئی عمل نہیں ہوگا۔

اُمّ المنذر فرماتی ہیں کہ ایک شام سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کے پاس تشریف لائے اور فرمایا اے لوگو! کیا تم اللہ سے شرم نہیں کرتے؟ لوگوں نے عرض کیا وہ کیا ہے یا رسول اللہ! فرمایا تم ایسی چیزیں جمع کرتے ہو جو کھاتے نہیں ہو اور ان چیزوں کی آرزو کرتے ہو جو حاصل نہیں کرتے اور ایسے مکانات تعمیر کرتے ہو جن میں رہتے نہیں ہو (ابن ابی الدنیا) حضرت ابو سعید

خدریؓ فرماتے ہیں کہ اسامہ ابن زید نے زید ابن ثابت سے ایک مہینے کے وعدے پر ایک باندی خریدی، میں نے سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ کیا تمہیں اسامہ پر حیرت نہیں ہوتی جس نے ایک مہینے کے وعدے پر باندی کی خریداری کی ہے، بلاشبہ اسامہ طول امل رکھتا ہے، اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے میں نے جب بھی آنکھیں کھولیں اس گمان کے ساتھ کھولیں کہ پلکیں بند کرنے سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ میری روح قبض کرلے گا اور جب بھی میں نے آنکھیں اوپر اٹھائیں یہ سوچ کر اٹھائیں کہ انہیں نیچے کرنے سے پہلے میری روح قبض کرلی جائے گی اور میں نے جب بھی کوئی نوالہ اٹھایا اس خیال کے ساتھ اٹھایا کہ اس کے نگلنے سے پہلے موت آجائے گی اس کے بعد فرمایا کہ اے اولاد آدم! اگر تم عقل رکھتے ہو تو تمہیں اپنے آپ کو مُردوں میں شمار کرنا چاہیے، اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے۔ جس چیز کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے وہ آنے والی ہے اور تم اسے عاجز نہ کرسکو گے (ابن ابی الدنیا، طبرانی، بیہقی) حضرت عبداللہ ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم پیشاب گاہ سے نکلتے ہی تیمم فرمالیتے، میں آپ کی خدمت اقدس میں عرض کرتا یا رسول اللہ! پانی آپ سے قریب ہے، آپ ارشاد فرماتے کون جانتا ہے میں پانی تک پہنچ بھی سکوں گا یا نہیں (ابن المبارک، ابن ابی الدنیا) روایت ہے کہ ایک مرتبہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے تین لکڑیاں لیں، ایک لکڑی اپنے سامنے گاڑی، دوسری اس کے برابر اور تیسری اس سے کچھ فاصلے پر۔ اس کے بعد فرمایا کیا تم جانتے ہو یہ کیا چیز ہے۔ لوگوں نے عرض کیا اللہ و رسول زیادہ جانتے ہیں، فرمایا قریب کی دونوں لکڑیوں میں سے ایک انسان ہے اور دوسری اس کی موت ہے اور دور کی لکڑی انسان کا امل ہے، آدمی اس کا معاملہ کرتا ہے اور موت اس کے اور امل کے درمیان رکاوٹ بن جاتی ہے (ابن ابی الدنیا، ابوسعید الخدریؓ) ایک مرتبہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ آدمی کی مثال یہ ہے کہ اس کے ارد گرد ننانویں موتیں ہیں۔ اگر ان سب سے محفوظ رہتا ہے تو بڑھاپے کا شکار ہوجاتا ہے (ترمذی، عبداللہ الشخیر) حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ فرماتے ہیں یہ آدمی ہے، یہ موتیں ہیں جو اس کی طرف بڑھ رہی ہیں، بڑھاپا ان موتوں کے بعد ہے اور امل بڑھاپے کے بعد ہے، آدمی امل کرتا ہے اور موتیں اس کی طرف بڑھتی ہیں جس کو حکم دیا جاتا ہے وہ اسے اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ اگر موت سے بچ جاتا ہے تو اسے بڑھاپا قتل کردیتا ہے حالانکہ وہ امل کا منتظر ہوتا ہے، حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک چوکور خط کھینچا اور اس کے درمیان میں بھی ایک خط کھینچا، پھر خط کے برابر میں بہت سے خطوط کھینچے اور ایک خط باہر کی طرف کھینچا، پھر فرمایا کیا تم جانتے ہو یہ کیا ہے؟ لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! اللہ اور اس کا رسول زیادہ جانتے ہیں، فرمایا یہ درمیانی خط انسان ہے اور یہ چوکور خط اس کی موت ہے جو چاروں طرف سے اس کو اپنے گھیرے میں لئے ہوئے ہے اور یہ خطوط مصائب ہیں جو اسے نوچتے کھسوٹتے ہیں، اگر ایک سے بچ جائے تو دوسرا اپنا عمل کرتا ہے اور بیرونی خط امل ہے (بخاری) حضرت انسؓ فرماتے ہیں ابن آدم بوڑھا ہوجاتا ہے اور اس کے ساتھ دو چیزیں باقی رہ جاتی ہیں، ایک حرص اور دوسری امل اور ایک روایت میں ہے کہ اس کے ساتھ دو چیزیں جوان ہوجاتی ہیں۔ مال کی حرص اور طول عمر کی ہوس (ابن ابی الدنیا، مسلم) سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں اس امت کے پہلے لوگوں نے یقین اور زہد کی وجہ سے نجات پائی اور اس امت کے آخری لوگ بخل اور طول امل کی وجہ سے ہلاک ہوں گے (ابن ابی الدنیا) روایت ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تشریف فرما تھے اور ایک بوڑھا شخص اپنی کدال سے زمین کھود رہا تھا، آپ نے دعا فرمائی اے اللہ! اس شخص سے اس کا امل دور کردے، وہ شخص اسی وقت کدال پھینک کر زمین پر لیٹ گیا اور ایک گھنٹے تک لیٹا رہا، اس کے بعد آپ نے دعا فرمائی اے اللہ! اس کا امل واپس لوٹا دے، اس دعا کے بعد وہ شخص کدال تھام کر کھڑا ہوگیا اور زمین کھودنے لگا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دریافت کرنے پر اس شخص نے بتلایا کہ کام کرتے کرتے اچانک میرے دل نے کہا کب تک کام کرے گا تو بوڑھا ہوچکا ہے، اس خیال کے آتے ہی میں نے کدال پھینک دی اور آرام کرنے لیٹ گیا، پھر میرے دل نے کہا کہ جب تک تجھے زندہ رہنا ہے معیشت ضروری ہے، یہ سوچ کر میں کدال لے کر کھڑا ہوگیا، حسنؓ کہتے ہیں کہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ

وسلم نے دریافت فرمایا کیا تم سب جنت میں جانا چاہتے ہو؟ لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ کیوں نہیں! فرمایا امل کو تاہ کرو اور اپنی موت اپنی آنکھوں کے سامنے جمالو اور اللہ تعالیٰ سے ایسی شرم کرو جیسا کہ اس کا حق ہے (ابن ابی الدنیا) سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی دعا میں فرمایا کرتے تھے اے اللہ! میں ایسی دنیا سے تیری پناہ چاہتا ہوں جو آخرت کے خیر سے روک دے اور ایسی زندگی سے تیری پناہ چاہتا ہوں جو موت کے خیر سے روک دے اور ایسے امل سے تیری پناہ چاہتا ہوں جو عمل کے خیر سے تجھے روک دے (ابن ابی الدنیا' حوشب)

آثار صحابہ و تابعین مطرف ابن عبداللہ کہتے ہیں اگر مجھے یہ معلوم ہو جائے کہ میری موت کب ہے تو مجھے اپنے پاگل ہو جانے کا اندیشہ ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر موت سے غفلت دیکر احسان فرمایا ہے' اگر غفلت نہ ہوتی تو وہ زندگی کا لطف حاصل نہ کرپاتے اور نہ ان کے درمیان خرید و فروخت ہوتی' حضرت حسن بصری کہتے ہیں کہ سہو اور امل بنی آدم پر اللہ تعالیٰ کی دو بڑی نعمتیں ہیں' اگر یہ دونوں نعمتیں نہ ہوتیں تو مسلمان راستوں پر چلتے پھرتے نظر نہ آتے' حضرت سفیان ثوری فرماتے ہیں مجھے معلوم ہوا ہے کہ انسان احمق پیدا کیا گیا ہے' اگر احمق نہ ہوتا تو اس کی زندگی کا تمام لطف غارت ہو جاتا' ابو سعید ابن عبدالرحمٰن فرماتے ہیں کہ دنیا اس کے رہنے والوں کی کم عقلی سے آباد کی گئی ہے' حضرت سلمان الفارسی کہتے ہیں کہ تین آدمی مجھے اتنے حیرت انگیز لگتے ہیں کہ ان پر ہنسی آتی ہے ایک تو دنیا کا حریص حالانکہ موت اس کی تلاش میں ہے' دوسرا غافل حالانکہ اس سے غفلت نہیں کی جاتی' تیسرا قہقہے لگانے والا جسے یہ علم نہ ہو کہ پروردگار عالم اس سے ناراض ہے یا راضی ہے اور تین چیزوں نے مجھے اتنا غمزدہ کیا ہے کہ میں رونے لگا ہوں' ایک تو دوستوں یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی جماعت کا فراق' دوسری قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑے ہونے کا خوف' تیسری یہ کہ میں نہیں جانتا کہ مجھے جنت کا حکم دیا جائے گا یا دوزخ کا؟ ایک بزرگ کہتے ہیں کہ میں نے زرارہ ابن ابی اوفی کو ان کی وفات کے بعد خواب میں دیکھ کر کہا کہ آپ کے نزدیک کون سا عمل زیادہ پہنچنے والا ہے' انہوں نے جواب دیا توکل اور قصر امل' حضرت سفیان ثوریؒ کہتے ہیں کہ دنیا میں زہد کرنے کے معنی ہیں امل کو مختصر کرنا' موٹا کھانا اور کمبل پہننا زہد نہیں ہے' مفضل ابن فضالہ نے اپنے رب سے درخواست کی کہ ان سے امل اٹھالیا جائے' یہ دعا مقبول ہوئی اور ان سے کھانے پینے کی خواہش رخصت ہوگئی' پھر انہوں نے امل کی واپسی کے لئے دعا مانگی' اس دعا کے بعد ان میں کھانے پینے کی خواہش دوبارہ پیدا ہوئی' کسی شخص نے حضرت حسن بصری کی خدمت میں عرض کیا کہ اے ابو سعید! کیا آپ اپنے کپڑے نہیں دھوئیں گے؟ فرمایا معاملہ اس سے بھی زیادہ جلدی آنے والا ہے' حضرت حسن بصری فرماتے ہیں کہ موت تمہاری پیشانیوں سے بندھی ہوئی ہے اور دنیا تمہارے پیچھے لپٹی جارہی ہے' ایک بزرگ کہتے ہیں کہ میں اس شخص کی طرح ہوں جس نے اپنی گردن لمبی کر رکھی ہو اور اس پر تلوار ہو اور یہ انتظار کر رہا ہو کہ کب اس کی گردن ماری جائے گی' داؤد طائی کہتے ہیں کہ اگر میں ایک ماہ تک زندہ رہنے کی امید کروں تو یہ ایسا ہے جیسے گناہ کبیرہ کا ارتکاب کر بیٹھوں اور میں ایک ماہ تک جینے کی توقع کس طرح کر سکتا ہوں جبکہ میں یہ دیکھتا ہوں کہ شب و روز کی ہر ساعت میں مخلوق خدا پر مصائب چھائے رہتے ہیں۔

شقیق بلخیؒ اپنے شیخ ابو ہاشم الرمانی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ان کی چادر کے ایک گوشے میں کوئی چیز بندھی ہوئی تھی۔ شیخ نے پوچھا یہ کیا چیز بندھی ہوئی ہے۔ انہوں نے جواب دیا تھوڑے سے بادام ہیں۔ میرے ایک بھائی نے یہ کہہ کر دیئے ہیں کہ تم شام کو ان سے افطار کرنا' شیخ نے فرمایا اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم شام تک زندہ رہنے کی امید رکھتے ہو؟ جاؤ میں تم سے کبھی کلام نہیں کروں گا' یہ کہہ کر شیخ نے اپنا دروازہ بند کر لیا اور اندر جا کر بیٹھ گئے' حضرت عمر ابن عبدالعزیزؒ نے اپنے ایک خطبے میں ارشاد فرمایا کہ ہر سفر کے لئے بالیقین کوئی نہ کوئی توشہ ہوا کرتا ہے' تم دنیا سے آخرت تک کے سفر کے لئے تقویٰ کا زاد راہ اختیار کرو' اللہ تعالیٰ نے تمہیں اپنے عذاب و ثواب ۔ کے جو مظاہر دکھائے ہیں ان میں خوف و رغبت رکھو' حرص کو طول مت دو' ورنہ تمہارے دل سخت ہو جائیں گے اور تم اپنے دشمن کے تابع ہو جاؤ گے' خدا کی قسم وہ شخص طول امل میں مبتلا نہیں ہوتا جو یہ جانتا ہے کہ ہو سکتا ہے کہ

میں صبح کے بعد شام نہ کروں اور شام کے بعد صبح کا منہ نہ دیکھوں' ان دونوں وقتوں کے درمیان اکثر موت کے حملے ہوا کرتے ہیں' میں نے اور تم نے بے شمار لوگوں کو دنیا کے فریب میں مبتلا دیکھا ہے لیکن آنکھیں اس شخص کی ٹھنڈی ہوا کرتی ہیں جو اللہ تعالیٰ کی نجات پر اعتماد رکھتا ہو اور وہ شخص خوش ہوتا ہے جو قیامت کی دہشتوں سے محفوظ و مامون ہو اور جس شخص کا حال یہ ہو کہ ابھی زخم کا علاج صحیح طریقہ پر نہیں ہو سکا اور دوسرا زخم ہو گیا بھلا وہ شخص کیسے خوش رہ سکے گا' میں اس بات سے اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہتا ہوں کہ جو کام خود نہ کروں اس کا دوسرے کو حکم دوں پھر میری تجارت کا نقصان' میرا عیب اور مسکنت اس دن ظاہر ہو جس دن مالداری اور غربت کی صحیح حقیقت سامنے آئے گی اور ترازوئیں کھڑی ہو جائیں گی' تم ایسے امر کی تکلیف میں مبتلا کئے گئے ہو کہ اگر ستاروں کو یہ تکلیف ہوتی تو ان کی روشنی زائل ہو جاتی اور اگر پہاڑوں کو اس تکلیف میں مبتلا کیا جاتا تو وہ پگھل کر بہہ جاتے اور اگر زمین کو یہ تکلیف دی جاتی تو اس کا سینہ پھٹ جاتا' کیا تم نہیں جانتے کہ جنت اور دوزخ کے درمیان کوئی منزل نہیں ہے' تم ان دونوں میں سے کسی ایک کی طرف جانے والے ہو' ایک شخص نے اپنے بھائی کو لکھا "سلام و دعا کے بعد واضح ہو کہ دنیا ایک خواب ہے اور آخرت بیداری ہے اور ان دونوں کے درمیان موت ہے اور ہم پراگندہ خوابوں میں ہیں' فقط والسّلام" ایک اور شخص نے اپنے بھائی کو لکھا کہ "دنیا پر غم بہت طویل ہے اور موت انسان سے قریب ہے اور ہر روز کچھ نہ کچھ کمی ہوتی رہتی ہے اور جسم میں مصائب گردش کرتے رہتے ہیں اس سے پہلے کہ کوچ کا نقارہ بجے تمہیں سفر کی تیاری کرنی چاہیے" حضرت حسنؒ کہتے ہیں کہ خطاء کرنے سے پہلے امل حضرت آدم علیہ السلام کی پشت کے پیچھے تھی اور موت آنکھوں کے سامنے اور جب خطاء کے مرتکب ہوئے تو امل کو آنکھوں کے سامنے کر دیا گیا اور موت پیٹھ کے پیچھے' عبد اللہ ابن سمیط کہتے ہیں کہ میں نے اپنے والد کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ اے طول صحت سے فریب کھانے والے کیا تو نے کوئی شخص نہیں دیکھا جو بغیر مرض کے موت کی آغوش میں پہنچ گیا ہو' اے وہ شخص جسے زیادہ ڈھیل ملنے سے غلط فہمی ہو گئی ہے کیا تو نے کوئی ایسا شخص نہیں دیکھا جو بغیر سامان کے گرفتار کر لیا گیا ہو اگر تو اپنی طول عمر میں فکر کرے تو اپنی تمام پچھلی لذتیں فراموش کر دے' کیا تم صحت سے فریب کھا رہے ہو' کیا طویل تندرستی سے خوش ہو' کیا موت سے محفوظ ہو' کیا ملک الموت پر جری ہو؟ اگر ملک الموت آگئے تو انہیں نہ تیری مالداری روک سکے گی اور نہ دوستوں کی کثرت' کیا تو نہیں جانتا کہ موت کی گھڑی تکلیف' اذیت اور ندامت کی گھڑی ہے' اس کے بعد وہ یہ کہا کرتے تھے اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحم کرے جو موت کے بعد کی زندگی کے لئے عمل کرے' اللہ تعالیٰ اس شخص پر رحم فرمائے جو موت کی آمد سے پہلے اپنے اوپر نظر ڈال لے' ابو زکریا سلیمان التیمی کہتے ہیں کہ سلیمان ابن عبد الملک مسجد حرام میں بیٹھے ہوئے تھے اسی دوران کوئی شخص ایک ایسا پتھر لے کر آیا جس پر کچھ عبارت کندہ تھی انہوں نے ایسے شخص کو طلب کیا جو یہ عبارت پڑھ کر سنا سکے' چنانچہ وہب ابن منبہ کو پڑھنے کے لئے لایا گیا' اس پتھر پر یہ عبارت نقش تھی اے ابن آدم! اگر تجھے معلوم ہو جائے کہ موت کس قدر قریب ہے تو تو طول امل ترک کر دے اور کثرت عمل کی طرف راغب ہو' اپنی حرص اور حیلے کم کر دے' اگر تیرے قدموں نے لغزش کھائی تو تجھے آنے والے کل میں ندامت کا سامنا کرنا ہو گا' تیرے گھر والے اور خدم و حشم تجھے قبر کے حوالے کر دیں گے' تیرے والد اور قریبی عزیز تجھ سے جدا ہو جائیں گے' تیرے بیٹے اور داماد تجھے چھوڑ دیں گے پھر نہ تجھے دنیا میں واپس آنے کا موقع ملے گا اور نہ تیرے اعمال میں زیادتی ہو گی' تجھے حیرت اور ندامت سے پہلے قیامت کے لئے عمل کرنا چاہیے' یہ عبارت سن کر سلیمان ابن عبد الملک بہت روئے۔

ایک بزرگ کہتے ہیں کہ میں نے محمد ابن یوسف کا ایک خط دیکھا جو عبد الرحمٰن ابن یوسف کے نام تھا' اس خط میں لکھا ہوا تھا کہ میں اس ذات کی حمد و ثناء بیان کرتا ہوں جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے حمد و ثناء کے بعد! میں تجھے اس وقت سے ڈراتا ہوں جب تو اپنے مہلت کے گھر سے اپنے قیام اور جزاء اعمال کے گھر کی طرف منتقل ہو اور زمین کے سینے پر رہنے کے بعد اس کے باطن میں منتقل ہو جائے' پھر تیرے پاس منکر نکیر آئیں تجھے قبر میں بٹھائیں اور ڈانٹ ڈپٹ کریں اب اگر اللہ تیرے ساتھ ہوا تو پھر تجھے کسی

قسم کا خوف نہ ہوگا نہ وحشت ہوگی اور نہ کسی چیز کی ضرورت ہوگی اور اگر تیرے ساتھ اللہ کے سوا کوئی ہوا تو میری دعا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تجھے اور مجھے برے ٹھکانے اور تنگ مسکن سے محفوظ رکھے پھر حشر برپا ہوگا' قیامت کا صور پھونکا جائے گا' جبار مطلق مخلوق کے مقدمات فیصل کرے گا' زمین اپنے باشندوں سے خالی ہوجائے گی اور آسمان اپنے رہنے والوں سے خالی ہوجائے گا' تب اسرار سے پردے اٹھیں گے' آگ سلگائی جائے گی ترازوئیں کھڑی کی جائیں گی' انبیاء اور شہداء بلائے جائیں گے اور لوگوں کے معاملات میں صحیح فیصلہ کیا جائے گا اور کہا جائے گا کہ تمام تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لئے ہیں جو تمام جہانوں کا پالنے والا ہے' بہت سے رسوا ہوں گے' بہت سوں کے عیوب پر پردہ ڈالا جائے گا' بہت سوں کی قسمت میں ہلاکت ہوگی' بہت سے نجات پائیں گے' بہت سوں کو عذاب ہوگا' بہت سوں کے ساتھ رحم و کرم کا معاملہ کیا جائے گا' میں نہیں جانتا کہ اس دن میرا اور تیرا کیا حال ہوگا' اگر اس دن کا تصور کرلیا جائے تو لذتیں فنا ہوجائیں' شہوات ترک کردی جائیں اور امل کوتاہ ہوجائیں' سونے والے بیدار ہوں اور غفلت میں پڑے ہوئے لوگ ہوشیار ہوں' اللہ تعالیٰ اس عظیم خطرے پر ہماری اور تمہاری مدد فرمائے اور میرے تیرے دل میں دنیا و آخرت کے لئے وہ جگہ کرے جو ان دونوں کے لئے متقین کے دلوں میں ہوتی ہے' ہم اسی کے ہیں اور اسی کے باعث موجود ہیں۔ والسّلام۔"

حضرت عمر ابن عبد العزیزؒ نے ایک دن تقریر فرمائی اور حمد و ثناء کے بعد ارشاد فرمایا۔ اے لوگو! تم بلاوجہ پیدا نہیں کئے گئے ہو اور نہ تمہاری تخلیق بلامقصد عمل میں آئی ہے بلکہ تمہارے لئے ایک یوم معاد ہے جس میں اللہ تعالیٰ تمہیں حکم اور فیصلے کے لئے اکٹھا کرے گا' کل وہ شخص ناکام اور بدبخت رہے گا جسے اللہ تعالیٰ اپنی اس رحمت سے محروم کردے جو ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے اور اپنی جنت سے نکال دے جس کا عرض آسمانوں اور زمین کے برابر ہے' کل کے دن امان اسی شخص کو حاصل ہوگا جو ڈرے گا' تقویٰ کی راہ پر چلے گا اور بہت سی چیز کو تھوڑی سی چیز کے عوض اور پائیدار شئی کو ناپائیدار کے عوض اور سعادت کو شقاوت کے عوض خرید لے' کیا تم یہ نہیں دیکھتے کہ تم مرنے والوں کے بعد باقی رہ گئے ہو اور تمہارے مرنے کے بعد اور لوگ باقی رہ جائیں گے' کیا تم ہر روز اللہ تعالیٰ کی طرف جانے والوں کی مشایعت نہیں کرتے جنہوں نے اپنا وقت پورا کرلیا ہے اور جن کے امل کا سلسلہ منقطع ہوچکا ہے' تم انہیں زمین کے ایک ایسے گڑھے میں رکھ آتے ہو جس میں نہ کوئی فرش ہوتا ہے اور نہ تکیہ ہوتا ہے نہ ان کے ساتھ کوئی سامان ہوتا ہے اور نہ دوستوں کا ساتھ ہوتا ہے' حساب و کتاب کا مرحلہ درپیش ہوتا ہے' میں یہ باتیں تم سے کررہا ہوں' بخدا میں اپنے نفس میں جتنے گناہ پاتا ہوں اتنے گناہ تم میں سے کسی شخص کے اندر نہیں دیکھتا لیکن اللہ کی سنن عادلانہ ہیں' میں ان میں اس کی اطاعت کا حکم کرتا ہوں اور نافرمانی سے منع کرتا ہوں اور اللہ سے مغفرت مانگتا ہوں اتنا کہہ کر حضرت عمر ابن عبد العزیزؒ نے آستین اپنے منہ پر رکھ لی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے' یہاں تک کہ آپ کی داڑھی آنسوؤں سے بھیگ گئی اور اپنی نشست گاہ تک پہنچنے سے پہلے وفات پاگئے' قعقاع ابن حکیم کہتے ہیں کہ میں نے تیس برس سے موت کی تیاری کر رکھی ہے' جب موت آئے گی تو میں یہ پسند نہ کروں گا کہ ایک شئے دوسری شئے سے مؤخر ہوجائے' سفیان ثوریؒ کہتے ہیں کہ میں نے کوفے کی مسجد میں ایک بوڑھے کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ میں اس مسجد میں تیس برس سے موت کا منتظر ہوں جب بھی وہ آئے گی تو نہ میں کسی چیز کا حکم کروں گا اور نہ کسی چیز سے منع کروں گا' نہ میرے پاس کسی کی کوئی چیز ہے اور نہ کسی کے پاس میری' عبد اللہ ابن ثعلبہ کہتے ہیں کہ تم ہنس رہے ہو' ہوسکتا ہے تمہارا کفن دھوبی کے یہاں سے آچکا ہو' ابو محمد ابن علی الزاہد کہتے ہیں کہ ہم کوفے میں ایک جنازے کے ساتھ چلے' حضرت داؤد طائی بھی ہمارے ساتھ تھے' جب میت کی تدفین عمل میں آگئی تو داؤد طائی ایک گوشے میں جا بیٹھے' میں بھی ان کے قریب جاکر بیٹھ گیا' انہوں نے فرمایا جو شخص عذاب کی وعید سے ڈرتا ہے وہ دور کی چیز کو قریب سمجھتا ہے' جس کا امل طویل ہوتا ہے' اس کا عمل ضعیف ہوتا ہے' جو چیز آنے والی ہے وہ نہایت قریب ہے' اے بھائی یہ بات جان لو کہ جو چیز تمہیں رب سے مشغول کردے وہ نہایت منحوس ہے' یاد رکھو تمام دنیا والے قبر میں جائیں گے اس وقت ان اعمال پر ندامت ہوگی جو ان سے پیچھے رہ جائیں گے اور ان اعمال پر خوشی ہوگی جو آگے چلے جائیں گے' قبر والے جن چیزوں پر نادم ہوں گے دنیا والے انہی پر لڑتے مرتے ہیں' انہی میں

مسابقت کرتے ہیں اور انہی میں قاضیوں کے پاس انصاف کی تلاش میں جاتے ہیں' روایت ہے کہ معروف کرخیؒ نے تکبیر کہی اور محمد ابن ابی توبہ سے کہا کہ تم امامت کرو' انہوں نے کہا کہ اگر میں نے یہ نماز پڑھادی تو دوسری نماز نہیں پڑھاؤں گا' معروف کرخیؒ نے ان سے فرمایا کیا تم یہ سوچ رہے ہو کہ دوسری نماز نہیں پڑھاسکو گے' ہم طول امل سے اللہ کی پناہ چاہتے ہیں' وہ آدمی کو عمل خیر سے روکتا ہے' حضرت عمر ابن عبدالعزیزؒ نے اپنے خطبے کے دوران فرمایا دنیا رہنے کی جگہ نہیں ہے' بہت سے گھر ایسے ہیں جن پر اللہ تعالیٰ نے فنا کا حکم لکھدیا ہے اور ان گھروں کے باشندوں پر ان سے جدائی لکھ دی ہے' بہت سے وہ لوگ جو خوب آباد ہوتے ہیں چند روز میں برباد ہوجاتے ہیں اور بہت سے ایسے قیام کرنے والے کہ لوگ ان کے قیام کی خواہش کریں' رخت سفر باندھ لیتے ہیں' اللہ تعالیٰ تم پر رحم فرمائے' تم ان سے اچھی طرح سفر کرنا اور اچھا سامان سفر اور عمدہ زاد راہ لے لینا' بہترین زاد راہ تقویٰ ہے' دنیا ایک سائے کی طرح ہے جو گھٹتا چلا جاتا ہے' بندہ کا حال تو یہ ہے کہ ابھی دنیا میں رغبت و حرص رکھے ہوئے اور اس کے مال و دولت پر نازاں و شاداں بیٹھا ہوا ہے' اتنے میں اللہ تعالیٰ نے اسے اپنے حکم سے بلالیا اور اس کے سر پر اس کی موت نازل کردی' اس کے تمام آثار مٹاڈالے' اس کی دنیا فنا کردی اور اس کا تمام اثاثہ تمام آثار اور مال و دولت دوسروں کے لئے کردی' دنیا جتنا نقصان پہنچاتی ہے اتنا نفع نہیں پہنچاتی' خوشی کم دیتی ہے اور رنج و غم زیادہ بخشتی ہے' حضرت ابوبکر الصدیقؓ اپنے خطبے میں ارشاد فرمایا کرتے تھے "وہ لوگ کہاں گئے جن کے چہرے روشن اور خوبصورت تھے' جنہیں اپنی جوانی پر غرور تھا' وہ بادشاہ کہاں رخصت ہوگئے جنہوں نے بڑے بڑے شہر آباد کئے اور ان کے اردگرد بلند و بالا دیواریں کھڑی کیں' وہ لوگ کہاں چلے گئے جو میدان جنگ میں دشمنوں پر غلبہ پاتے تھے' زمانے نے انہیں شکست دیدی اب وہ قبر کی تاریکیوں کا حصہ بن گئے ہیں' اس لئے جلدی کرو اور اپنے لئے نجات کا وسیلہ ڈھونڈو۔"

طول امل کے اسباب اور علاج : طول امل کے دو سبب ہیں۔ ایک جہالت اور دوسرا حب دنیا۔ حب دنیا کے معنی یہ ہیں کہ جب آدمی اس سے اس کی شہوات' لذات اور علائق سے مانوس ہوجاتا ہے تو اس کے دل پر دنیا سے مفارقت اختیار کرنا گراں گذرتا ہے اور وہ اسے موت میں فکر کرنے سے روک دیتا ہے کیونکہ موت ہی مفارقت کا سبب ہے۔ آدمی اس شئی کو فطرتاً خود سے دور کرتا ہے جو اسے پسند نہیں ہوتی۔ انسان کی فطرت یہ ہے کہ وہ ہمیشہ جھوٹی آرزوؤں میں مبتلا رہتا ہے اور ایسی چیز کی تمنا کرتا ہے جو اس کی مراد کے موافق ہو۔ چنانچہ دنیا میں باقی رہنا اس کی مراد کے عین مطابق ہے۔ اس لئے وہ ہر وقت اسی کے متعلق سوچتا ہے اور ان تمام چیزوں کو اپنے لئے فرض کرلیتا ہے جو بقاء کے توابع ہیں جیسے مال' بیوی بچے' گھر' دوست' احباب' جانور اور دوسرے تمام اسباب دنیا۔ اس کا دل اس فکر میں اس قدر مستغرق رہتا ہے کہ موت سے غافل بن جاتا ہے اس کا قرب پسند نہیں کرتا' اگر کبھی دل میں یہ خیال بھی پیدا ہوتا ہے کہ اسے مرنا ہے اور اب ضرورت موت کے لئے تیار رہنے کی ہے تو ٹال مٹول سے کام لیتا ہے اور نفس کو وعدۂ فردا پر ٹرخا دیتا ہے اور کہتا ہے کہ ابھی بہت دن باقی ہیں۔ پہلے بڑا تو ہوجاؤں۔ پھر توبہ کرلوں گا' جب بڑا ہوجاتا ہے تو اسے بڑھاپے پر معلق کردیتا ہے۔ جب بوڑھا ہوجاتا ہے تو اس سے یہ کہتا ہے کہ پہلے مکان کی تعمیر سے فراغت حاصل کرلوں یا فلاں سفر سے واپس آجاؤں یا اس بچے کے مستقبل کے لئے کچھ کرلوں یا فلاں دشمن سے نمٹ لوں پھر توبہ کروں گا۔ نفس کو اسی طرح ٹلاتا ہے اور توبہ میں تاخیر پر تاخیر کرتا چلا جاتا ہے اور یہ سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوتا کیونکہ جس کام میں مشغول ہوتا ہے اس میں دس کام نئے پیدا ہوجاتے ہیں' یہاں تک کہ توبہ میں تاخیر کا سلسلہ دراز سے دراز تر ہوجاتا ہے' نئی نئی مشغولیات سامنے آتی رہتی ہیں اور ان کی تکمیل کے دوامی شدت کے ساتھ ابھرتے رہتے ہیں' بالآخر وقت موعود آپہنچتا ہے اور موت اسے ایسے وقت میں اچک لیتی ہے جب اسے اس کا وہم و گمان بھی نہیں ہوتا' اس وقت اس کی حسرت دیکھنے کے قابل ہوتی ہے' اکثر لوگوں کو اس ٹال مٹول کی بناء پر دوزخ کا عذاب دیا جائے گا' چنانچہ اکثر اہل دوزخ چیخ چیخ کر کہیں گے ہائے افسوس ہم نے توبہ میں تاخیر کی' اعمال صالحہ میں تاخیر کی' یہ بیچارہ انسان یہ نہیں سمجھ پاتا کہ آج میں جس سبب سے توبہ کو کل پر معلق کررہا ہوں کل بھی وہ سبب اپنی

جگہ برقرار رہے گا بلکہ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ اس میں مزید قوت اور مزید رسوخ ہوجائے گا وہ یہ سمجھتا ہے کہ دنیا میں مشغول رہنے والے کو کسی نہ کسی وقت فرصت ضرور نصیب ہوگی' یہ اس کی خام خیالی ہے' فراغت صرف اسے میسر آسکتی ہے جو بالکلیہ طور پر دنیا سے اپنے آپ کو لاتعلق کرلے' چنانچہ اسی مضمون کا ایک شعر ہے۔

فَمَا قَضَى اَحَدٌ لُبَانَتَهُ۔ وَمَا اِنْتَهَى اَرَبٌ اِلاَّ اِلَى اَرَبٍ

(کوئی اپنی حاجت پوری نہیں کرسکا۔ اس لئے کہ حاجتوں کی کوئی انتہا نہیں ہوتی)

ان تمام آرزوؤں کی اصل دنیا کی محبت' اس کا انس اور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان سے غافل ہونا ہے "اَحْبِبْ مَنْ اَحْبَبْتَ فَاِنَّکَ مُفَارِقُہٗ" (تو جس سے چاہے محبت کرلے تجھے اس سے لازماً جدا ہونا ہے)۔

جہالت یہ ہے کہ انسان کو اپنی جوانی پر بڑا بھروسا ہوتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ اسے عالم شباب میں موت نہیں آسکتی' حالانکہ یہ سراسر نادانی اور جہالت ہے اگر وہ اپنے گردوپیش پر نظر ڈالے تو بوڑھوں کی تعداد بہت کم پائے گا' جس کی وجہ یہ ہے کہ بڑھاپے سے پہلے اموات بہت ہوتی ہیں' جب تک ایک بوڑھا موت کے دروازے پر دستک دیتا ہے ہزاروں جوان اور بچے موت کی آغوش میں چلے جاتے ہیں' کبھی موت کو اپنی صحت کے نقطۂ نظر سے بعید تصور کرتا ہے اور اچانک موت کو اہمیت ہی نہیں دیتا' وہ یہ نہیں جانتا کہ اچانک موت مستبعد نہیں ہے' اگر اچانک موت کو مستبعد فرض کرلیا جائے تو اچانک مرض کو مستبعد نہیں کہا جاسکتا بلکہ مرض اچانک ہی ظاہر ہوتا ہے اور جب آدمی بیمار ہوجائے تو کون کہہ سکتا ہے کہ موت اس سے بعید ہے اگر یہ غافل سوچے اور سمجھے کہ موت کا کوئی مخصوص اور متعین وقت نہیں ہے بلکہ وہ بچپن جوانی' بڑھاپے' سردی' گرمی' بہار' خزاں' دن اور رات میں کسی بھی وقت آسکتی ہے تو امید ہے کہ موت اس کی نظر میں اہمیت اختیار کرلے گی اور وہ اس کی تیاری میں مکمل ہوسکے گا' لیکن ان امور سے عدم واقفیت' اور دنیا کی محبت اس کے سامنے ہے لیکن اسے یہ خیال نہیں آتا کہ اس پر واقع بھی ہوسکتی ہے' وہ جنازوں کی مشایعت کرتا ہے لیکن یہ نہیں سمجھتا کہ میرے جنازے میں بھی لوگ اسی طرح چلیں گے' اصل میں جنازوں کی مشایعت ایک عادت سی بن گئی ہے' دوسروں کو مردہ دیکھنے کا عمل اتنی بار ہوچکا ہے کہ اب اس سے بھی طبیعت مانوس ہوگئی ہے' اب کسی میّت کو دیکھ کر دل میں اپنی موت کا احساس نہیں جاگتا اور نہ اس کا خیال آتا ہے نہ طبیعت اس سے مانوس ہوتی ہے کیونکہ اس کی موت ایک ہی بار آئے گی' وہ ہی اول ہوگی وہی آخر ہوگی بھلا ایک مرتبہ کے حادثے سے طبیعت کو کیسے انس ہوسکتا ہے؟ اصل میں جب بھی کسی جنازے کی مشایعت کرے خود کو مردہ تصور کرے اور یہ سوچے کہ خود اس کا جنازہ بھی اسی طرح لوگ کاندھوں پر لے کر چلیں گے اور اسے بھی قبر میں دفن کردیں گے' شاید وہ اینٹیں بنائی جاچکی ہوں جو اس کی لحد بند کرنے میں استعمال ہوں گی۔ حالانکہ اسے اس کا علم بھی نہیں' بہرحال ٹال مٹول سے کام لینا محض جہالت اور نادانی ہے۔

جب یہ بات واضح ہوگئی کہ تاخیر کا سبب جہل اور دنیا کی محبت ہے تو اس کا علاج بھی جاننا ضروری ہے۔ کسی مرض کا علاج اس کا سبب دور کرکے کیا جاتا ہے۔

جہل کا علاج قلب حاضر میں صفائے فکر اور قلوب طاہرہ سے حکمت کی باتیں سننے سے کیا جاسکتا ہے البتہ دنیا کی محبت کا علاج مشکل ہے' یعنی قلب سے اس کا نکالنا نہایت سخت ہے' یہ ایک ایسی سنگین بیماری ہے جس کے علاج نے اگلوں اور پچھلوں سب کو تھکا دیا ہے اور اس کا علاج اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ بندہ یوم آخرت پر اور جو کچھ اس میں عذاب و ثواب ہے اس پر ایمان لائے اور جب یوم آخرت پر یقین کامل ہوجائے گا تو دنیا کی محبت قلب سے رخصت ہوجائے گی کیونکہ عظیم چیز کی محبت دل سے حقیر چیز کی محبت زائل کردیتی ہے۔ یہاں ایک طرف دنیا اپنی تمام حقارتوں کے ساتھ ہے اور دوسری طرف آخرت اپنی تمام ترنفاستوں کے ساتھ ہے' جب آدمی صفائے قلب کے ساتھ ان دونوں میں فکر کرے گا تو وہ دنیا کی طرف ذرا بھی التفات نہیں رکھے گا' اگرچہ اسے مشرق سے مغرب تک کی حکومت ہی کیوں نہ دیدی جائے' اس لئے کہ آدمی کو اس وسیع دنیا میں سے نہایت معمولی حصہ ملتا ہے اور

وہ بھی تکدر سے خالی نہیں ہوتا بھلا ایک شخص جس کے دل میں آخرت کا ایمان راسخ ہو اس معمولی دنیا پر کیسے خوش ہو سکتا ہے اور کسطرح اس کی محبت اپنے دل میں پختہ کر سکتا ہے' دعا ہے اللہ ہمیں دنیا کو اسی طرح دکھلائے جس طرح صالحین امت دیکھا کرتے تھے۔

موت کا تصور اپنے دل میں راسخ کرنے کی اس سے بہتر کوئی اور صورت نہیں ہے کہ ہم شکلوں اور ہمسروں میں سے جو لوگ موت کی آغوش میں پہنچ گئے ہیں' ان کی یاد اپنے دل میں تازہ رکھے اور یہ سوچے کہ ان بیچاروں کو موت نے کسطرح اپنے پنجوں کی گرفت میں لے لیا' حالانکہ انھیں اس کی آمد کا گمان بھی نہیں تھا' ہاں جو شخص ہر طرح مستعد ہوتا ہے وہ زبردست کامیابی حاصل کرتا ہے اور جو شخص طول امل کے فریب میں رہتا ہے وہ سخت نقصان اٹھاتا ہے' انسان کو ہر گھڑی اپنے اعضاء و جوارح پر نظر ڈالنی چاہیے' اس وقت یہ کتنے خوبصورت' جاندار اور مضبوط ہیں لیکن عنقریب قبر کے کیڑے انہیں اپنی خوراک بنالیں گے' ہڈیاں بکھر جائیں گی' کیڑے پہلے دائیں آنکھ یا بائیں آنکھ کے ڈھیلے کو اپنا لقمہ بنائیں گے۔ میرے جسم کا کوئی عضو ایسا نہیں ہے جسے کیڑے نہیں کھائیں گے' اگر میرے ساتھ کچھ جائے گا تو وہ صرف علم صحیح یا عمل صالح ہو گا' اس فکر کے ساتھ ساتھ ان امور پر بھی فکر کرے جو عنقریب بیان کئے جائیں گے' جیسے عذاب قبر' منکر نکیر کے سوال' حشر' نشر' احوال قیامت اور بڑے دن کی پیشی کے لئے آواز' یہ امور ایسے ہیں کہ اگر ان میں فکر کیا جائے تو موت کی یاد تازہ رہتی ہے اور اس کے لئے تیاری کی خواہش ہوتی ہے۔

طول امل اور قصر امل کے سلسلے میں لوگوں کے مراتب : لوگ اس سلسلے میں مختلف قسم کے ہیں' بعض لوگ بقاء کی آرزو کرتے ہیں اور ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دنیا میں رہنا چاہتے ہیں' اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کے متعلق ارشاد فرمایا ہے۔

يَوَدُّ أَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ أَلْفَ سَنَةٍ (پ ۱' ر ۱۱' آیت ۹۶)

ان میں سے کوئی چاہتا ہے کہ اگر اسے ایک ہزار برس کی عمر دی جائے۔

بعض لوگ بڑھاپے تک زندہ رہنا چاہتے ہیں' یہ وہ انتہائی عمر ہے جو مشاہدہ میں آتی رہتی ہے' یہ لوگ دنیا کی شدید محبت میں گرفتار ہوتے ہیں' چنانچہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں۔

الشَّيْخُ شَابٌّ فِي حُبِّ طَلَبِ الدُّنْيَا وَإِنِ الْتَفَّتْ تَرْقُوَتَاهُ مِنَ الْكِبَرِ إِلَّا الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَقَلِيْلٌ مَّا هُمْ (بخاری و مسلم' ابو ہریرہ' بلفظ آخر)

بوڑھا آدمی طلب دنیا کی محبت میں جوان ہوتا ہے۔ اگرچہ بڑھاپے سے اس کی ہنسلیاں مڑ گئی ہوں مگر وہ لوگ ایسے نہیں ہوتے جو متقی ہیں۔ تاہم متقی بہت کم ہیں۔

بعض لوگوں کو ایک سال سے زیادہ کی توقع نہیں ہوتی' اسی لئے وہ صرف ایک سال کی ضروریات کا اہتمام کرتے ہیں اور سردی میں گرمی کے لئے اور گرمی میں سردی کے لئے جمع کرتے ہیں' چنانچہ جب ایک سال کی ضروریات جمع ہو جاتی ہیں تو عبادت میں مشغول ہو جاتے ہیں' بعض لوگ ایک سال سے بھی کم جینے کی توقع رکھتے ہیں' ایسے لوگ ایک موسم میں دوسرے موسم کی تدبیر نہیں کرتے' بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو ایک دن سے زیادہ کا امل نہیں کرتے' صرف آج کی تیاری کرتے ہیں' کل کی فکر میں مشغول نہیں ہوتے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں کہ کل کے رزق کی فکر مت کرو' اگر تمہاری زندگی میں کل آنے والا ہے تو اس کے ساتھ کل کا رزق بھی ضرور آئے گا اور اگر تمہاری زندگی میں کل کا وجود نہیں ہے تو تم دوسروں کی زندگی کے لئے فکر مت کرو' بعض لوگ وہ ہیں جن کا امل ایک ساعت سے تجاوز نہیں کرتا' جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اے عبداللہ! جب تو صبح کرے تو اپنے دل میں شام کا خیال نہ کر اور شام کرے تو اپنے دل میں صبح کا تصور نہ کر۔" اور بعض لوگ ایک ساعت کا بھی بھروسا نہیں کرتے تھے' چنانچہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم استنجے سے فراغت کے بعد اسی ساعت میں تیمم فرمالیتے تھے

حالانکہ پانی زیادہ دور نہیں ہوتا تھا' فرماتے تھے کہ شاید میں پانی تک نہ پہنچ سکوں اور بعض ایسے ہوتے ہیں گویا موت ان کے سامنے ہے اور اب واقع ہوا ہی چاہتی ہے' ایسا ہی شخص رخصت کرنے والے کی سی نماز پڑھا کرتا ہے' معاذ ابن جبل کا یہی حال تھا' چنانچہ جب سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے ان کے ایمان کی حقیقت دریافت کی تو انہوں نے عرض کیا کہ میں نے کوئی قدم ایسا نہیں رکھا کہ یہ گمان کیا ہو کہ اب اس کے بعد دوسرا قدم رکھ سکوں گا (ابو نعیم فی الحلیہ) اسود حبشی کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ وہ رات کو نماز پڑھتے تھے اور ادھر ادھر دیکھتے تھے کسی کہنے والے نے ان سے کہا کہ آپ یہ کیا کرتے ہیں' انہوں نے فرمایا میں یہ دیکھتا ہوں کہ ملک الموت کس طرف سے آرہے ہیں۔

یہ ہے لوگوں کے مختلف مراتب اور درجات کی تفصیل۔ اللہ تعالیٰ کے یہاں ان تمام درجات کے مطابق جزاء ہے' جس شخص کا امل ایک مہینے کا ہے وہ اس شخص سے مختلف ہے جس کا امل ایک مہینے سے زائد کا ہے خواہ وہ زیادتی ایک ہی دن کی کیوں نہ ہو دونوں کا ایک مرتبہ نہیں ہے' اللہ تعالیٰ کے یہاں عدل ہے' وہ دونوں کو برابر درجہ کر کے ناانصافی نہیں کرتا' فرمایا۔

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ (پ ۳۰' ر ۲۴' آیت ۸)

سو جو شخص ذرہ برابر نیکی کرے گا وہ اس کو لکھ لے گا۔

قصر امل کا اثر عمل کی طرف مبادرت کرنے میں ظاہر ہوتا ہے' اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ میرا امل کوتاہ ہے تو اس کا یقین نہ کرو' پہلے اس کے اعمال دیکھو' اگر وہ ایسے اسباب میں مشغول نظر آتا ہے جس کی حاجت اسے سال بھر میں بھی پڑنے والی نہیں ہے تو یہ عمل طول امل پر دلالت کرتا ہے' توفیق کی علامت یہ ہے کہ موت آنکھوں کے سامنے ہو اور اس سے ایک ساعت کے لئے بھی غافل نہ ہوتا ہو اور موت کے لئے ہر وقت مستعد نظر آتا ہو اور اگر شام تک زندہ رہ جائے تو اللہ کا شکر ادا کرے کہ اس نے اپنی طاعت کا موقع نصیب فرمایا اور خوش ہو کہ اس کا دن رائیگاں نہیں گیا بلکہ اس نے اس میں سے اپنا حصہ وصول کرلیا ہے اور جو کچھ وصول کیا ہے اسے آخرت کے لئے ذخیرہ کرلیا ہے' پھر صبح کی ابتدا بھی اسی شکر اور سمع و طاعت کے ساتھ کرے' یہ کام صرف وہی شخص سہولت سے انجام دے سکتا ہے جس کا قلب آنے والے کل سے فارغ ہو اور اسے یہ فکر نہ ہو کہ کل کیا ہوگا؟ ایسا شخص مرنے کے بعد سعادت پائے گا اور زندگی میں موت کی تیاری اور مناجات کی لذت سے خوش رہے گا' موت اس کے لئے ذریعۂ سعادت ہے اور زندگی زیادتی سعادت ہے' اے شخص تو ہر وقت دل میں موت کا تصور رکھ' زندگی تجھے اڑائے لے جارہی ہے اور تو اپنے نفس سے غفلت میں مبتلا ہے' ہو سکتا ہے تیرا سفر ختم ہونے والا ہو اور منزل قریب آچکی ہو عمل کی طرف مبادرت کرنے ہی سے تو منزل کی راحتیں حاصل کر سکتا ہے۔

اعمال کی طرف سبقت کرنا اور تاخیر سے بچنا: دیکھو جس شخص کے دو بھائی گھر سے باہر ہوں اور ان میں سے ایک کی آمد ایک دن کے بعد اور دوسرے کی آمد ایک مہینے یا سال بھر کے بعد متوقع ہو تو وہ اس بھائی کے استقبال کی تیاری نہیں کرتا جو ایک مہینے یا ایک سال کے بعد آنے والا ہے بلکہ اس بھائی کے استقبال کی تیاری کرتا ہے جو کل آنے والا ہے' معلوم ہوا کہ تیاری انتظار کے قرب کی بناء پر ہوا کرتی ہے' چنانچہ جو شخص یہ تصور کرتا ہے کہ میری موت ایک ماہ یا ایک سال بعد آنے والی ہے وہ اسی مدت پر دھیان دیتا ہے اور درمیانی دنوں کو فراموش کر دیتا ہے' ہر صبح کو وہ سوچتا ہے کہ ابھی ایک سال باقی ہے اور سال کا آغاز اسی دن سے کرتا ہے جس میں وہ آج موجود ہے۔ اس صورت میں وہ شخص اعمال کی طرف سبقت کرہی نہیں سکتا کیونکہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ ابھی بڑی گنجائش ہے' سال میں بارہ مہینے اور تین سو پینسٹھ دن ہوتے ہیں' وہ کسی بھی دن عمل میں مشغول ہو سکتا ہے۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ تم میں سے کوئی انتظار نہیں کرتا مگر ایسی مالداری کا جو سرکش بنادے یا ایسی مفلسی کا جو اطاعت فراموش کرادے یا ایسے مرض کا جو آدمی کو ناکارہ بنادے یا ایسے بڑھاپے کا جو عقل کو خبط کردے یا ایسی موت کا جو جلدی آنے والی

ہو' یا دجال کا' اور دجال بدترین غائب ہے جس کا انتظار کیا جاتا ہے یا قیامت کا' اور قیامت نہایت سخت اور کڑوی ہے (ترمذی' ابو ہریرہؓ) حضرت عبداللہ ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو یہ نصیحت فرمائی۔

اِغْتَنِمْ خَمْسًا قَبْلَ خَمْسٍ شَبَابَكَ قَبْلَ هَرَمِكَ وَصِحَّتَكَ قَبْلَ سُقْمِكَ' وَغِنَاكَ قَبْلَ فَقْرِكَ وَفَرَاغَكَ قَبْلَ شُغْلِكَ وَحَيَاتَكَ قَبْلَ مَوْتِكَ۔ (ابن ابی الدنیا)

پانچ چیزوں کو پانچ چیزوں سے پہلے غنیمت سمجھ' اپنی جوانی کو اپنے بڑھاپے سے پہلے' اپنی صحت کو اپنی بیماری سے پہلے' اپنی مالداری کو اپنے فقر سے پہلے' اپنی فرصت کو اپنی مشغولیت سے پہلے اور اپنی زندگی کو موت سے پہلے۔

ایک حدیث میں سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

نِعْمَتَانِ مَغْبُوْنٌ فِيْهِمَا كَثِيْرٌ مِنَ النَّاسِ' اَلصِّحَّةُ وَالْفَرَاغُ۔ (بخاری' ابن عباسؓ)

دو نعمتیں ایسی ہیں کہ ان میں اکثر لوگ خسارے میں ہیں۔ صحت اور فرصت۔

اس حدیث کے معنی یہ ہیں کہ آدمی کو یہ دونوں نعمتیں عطا کی جاتی ہیں لیکن وہ ان سے فائدہ نہیں اٹھاپاتا اور جب سلب ہو جاتی ہیں تب ان کی قدر پہچانتا ہے۔ بعض روایات یہ ہیں۔

مَنْ خَافَ اَدْلَجَ' وَمَنْ اَدْلَجَ بَلَغَ الْمَنْزِلَ اَلَا اِنَّ سِلْعَةَ اللّٰهِ غَالِيَةٌ' اَلَا اِنَّ سِلْعَةَ اللّٰهِ جَنَّةٌ۔ (ترمذی' ابو ہریرہؓ)

جو (منزل تک نہ پہنچنے سے) ڈرتا ہے وہ ابتدائی شب میں (سفر کے لئے) چل دیتا ہے اور جو ابتدائے شب میں چل دیتا ہے وہ منزل تک پہنچ جاتا ہے۔ سن لو کہ متاع خداوندی نہایت گراں قیمت ہے۔ جان لو متاع خداوندی جنت ہے۔

جَاءَتِ الرَّاجِفَةُ تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ وَجَاءَ الْمَوْتُ بِمَا فِيْهِ۔ (ترمذی' ابی ابن کعبؓ)

آئی ہلانے والی' اس کے پیچھے آئی پیچھے آنے والی اور موت ان چیزوں کے ساتھ آئی جو اس میں ہیں۔

سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول یہ تھا کہ جب اپنے اصحاب میں سستی یا غفلت ملاحظہ فرماتے تو بلند آواز سے اعلان فرماتے۔

اَتَتْكُمُ الْمَنِيَّةُ رَاتِبَةً لَازِمَةً اِمَّا بِشَقَاوَةٍ وَاِمَّا بِسَعَادَةٍ۔ (ابن ابی الدنیا' زید السلمی مرسلاً)

موت تمہارے پاس آئی لازم وظیفہ بن کر یا تو بد بختی کے ساتھ یا نیک بختی کے ساتھ۔

حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میں ڈرانے والا ہوں اور موت حملہ کرنے والی ہے اور قیامت وعدے کی جگہ ہے (ابن ابی الدنیا)۔ حضرت عبداللہ ابن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت باہر تشریف لائے جب سورج کی شعاعیں کھجور کی ٹہنیوں پر پہنچ چکی تھیں اور فرمایا دنیا صرف اسی قدر باقی رہ گئی ہے جتنا یہ دن اس مقدار کے مقابلے باقی رہ گیا ہے جو گذر چکا ہے۔ (ابن ابی الدنیا) ایک حدیث میں ارشاد فرمایا کہ دنیا ایک ایسے کپڑے کی طرح ہے جو شروع سے آخر تک پھٹ گیا ہو اور صرف ایک دھاگہ باقی رہ گیا ہو۔ عجب نہیں کہ یہ دھاگہ بھی ٹوٹ جائے (ابن ابی الدنیا' انسؓ) حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم جب خطبہ کے دوران قیامت کا ذکر فرماتے تو آپ کی آواز بلند ہو جاتی۔ رخسار مبارک سرخ ہو جاتے گویا آپ کسی لشکر سے ڈرا رہے ہوں فرماتے کہ صبح بھی گذری اور شامیں بھی گذریں' میں اور قیامت دونوں اس طرح بھیجے گئے ہیں جیسے یہ۔ یہ ارشاد فرما کر آپ اپنی دو انگلیاں ایک دوسرے سے

ملا لیتے (مسلم' ابن ابی الدنیا) حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ روایت کرتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔

فَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ۔ (پ ۸' ر ۲' آیت ۱۲۶)

سو جس شخص کو اللہ تعالیٰ راستے پر ڈالنا چاہتے ہیں اس کے سینے کو اسلام کے لئے کشادہ کر دیتے ہیں۔

اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ جب نور سینے میں داخل ہوتا ہے تو کھل جاتا ہے۔ لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہؐ! اس کی کوئی علامت بھی ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا ہاں! دار غرور سے کنارہ کش ہونا' دار خلود کی طرف متوجہ ہونا اور موت کے آنے سے پہلے اس کے لئے تیار رہنا (ابن ابی الدنیا) قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

اَلَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوةَ لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا۔ (پ ۲۹' ر ۱' آیت ۲)

جس نے موت اور حیات کو پیدا کیا تاکہ تمہاری آزمائش کرے کہ تم میں کون شخص عمل میں زیادہ اچھا ہے۔

اس آیت کی تفسیر سدی نے اس طرح کی ہے کہ کون شخص موت کو زیادہ یاد کرتا ہے اور کون اس کی اچھی تیاری کرتا ہے اور کون اس سے بہت زیادہ خوف کرتا ہے۔ حذیفہؓ فرماتے ہیں کہ ہر صبح و شام ایک منادی یہ اعلان کرتا ہے (اے لوگو! کوچ کرو' کوچ کرو) اس کی تصدیق قرآن کریم کی اس آیت سے ہوتی ہے۔

اِنَّهَا لَاِحْدَی الْكُبَرِ نَذِیْرًا لِّلْبَشَرِ لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ یَّتَقَدَّمَ اَوْ یَتَاَخَّرَ۔ (پ ۲۹' ر ۱۶' آیت ۳۵-۳۶)

دوزخ بڑی بھاری چیز ہے۔ جو انسان کے لئے بڑا ڈراوا ہے۔ تم میں جو آگے کو بڑھے اس کے لئے اور جو (خیر سے) پیچھے کو ہٹے اس کے لئے بھی۔

سحیم مولی بنی تمیم کہتے ہیں کہ میں عامر ابن عبداللہ کی خدمت میں حاضر ہوا' آپ نے مختصر نماز پڑھی' نماز کے بعد میری طرف متوجہ ہوئے اور ارشاد فرمایا کہ اپنی ضرورت بیان کرو' میں انتظار میں ہوں' میں نے عرض کیا کہ آپ کس کے انتظار میں ہیں' فرمایا ملک الموت کے' راوی کہتے ہیں کہ میں ان کا یہ جواب سن کر جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا اور وہ نماز میں مشغول ہو گئے داؤد طائی کہیں سے گذر رہے تھے کہ ایک شخص نے کوئی حدیث دریافت کی' داؤد طائی نے فرمایا مجھے جانے دو' میں جان نکلنے تک کے موقع کو غنیمت سمجھتا ہوں' حضرت عمرؓ ارشاد فرماتے ہیں کہ تاخیر ہر چیز میں عمدہ ہے لیکن آخرت کے لئے کئے جانے والے اعمال صالحہ میں بہتر نہیں ہے' منذر کہتے ہیں کہ میں نے مالک ابن دینار کو یہ کہتے ہوئے سنا کم بخت عمل کے لئے سبقت کر' کم بخت عمل کے لئے سبقت کر۔ آپ نے یہ جملہ ساٹھ مرتبہ ارشاد فرمایا' میں ایسی جگہ سے ان کا یہ قول سن رہا تھا جہاں سے وہ مجھے نہیں دیکھ رہے تھے' حضرت حسن بصری نے اپنے خطبے میں ارشاد فرمایا اعمال کی طرف سبقت کرو' سبقت کرو' یہ چند سانسیں ہیں' اگر رک گئیں تو ان اعمال کا سلسلہ منقطع ہو جائے گا جن سے تم اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرتے ہو' اللہ تعالیٰ اس بندے پر رحم فرمائے جو اپنے نفس پر نظر ڈالے اور اپنے گناہوں کی تعداد پر روئے' اس کے بعد آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔

اِنَّمَا نَعُدُّ لَهُمْ عَدًّا۔ (پ ۱۶' ر ۹' آیت ۸۴)

ہم ان کی باتیں خود شمار کر رہے ہیں۔

یہاں گنتی سے مراد سانسوں کی گنتی ہے' آخری سانس پر آدمی کی جان نکلتی ہے' اس کے بعد اپنے اعمال کی مفارقت ہے' پھر قبر میں داخل ہونا ہے' حضرت ابو موسیٰ اشعری نے اپنی وفات سے پہلے سخت ترین ریاضتیں اور مجاہدے کئے' لوگوں نے عرض کیا آپ اس قدر سخت مجاہدہ نہ کیا کریں یا اپنے نفس پر کچھ نرمی فرمائیں' فرمایا گھڑ دوڑ میں گھوڑا جب آخری نشان تک پہنچنے والا ہوتا

ہے تو دوڑنے میں اپنی پوری قوت صرف کردیتا ہے' میری عمر تو اس سے بھی کم باقی رہ گئی ہے' حضرت ابو موسیٰ نے موت کے وقت تک مجاہدے جاری رکھے' اپنی اہلیہ سے فرمایا کرتے تھے اپنی سواری تیار رکھ' جہنم میں کوئی پل نہیں ہوگا ایک خلیفہ نے بر سر منبر ارشاد فرمایا بندگان خدا! جس قدر ممکن ہو اللہ سے ڈرو اور ایسے لوگ بن جاؤ جنہیں چیخیں سنائی دیں اور وہ ہوشیار ہو جائیں اور جان لیں کہ دنیا ان کا گھر نہیں ہے اور اسے آخرت کے عوض دیدیں' موت کے لئے تیار رہو اس لئے کہ وہ سر پر کھڑی ہوئی ہے اور سفر کی تیاری کرو' اس لئے کہ سفر بڑا کٹھن ہے' جو موت ایسی ہو کہ لمحے اور ساعت سے کم ہو اسے واقعی کم ترمدت کہا جانا چاہیے۔ جس غائب پر رات دن گذر رہے ہوں وہ بس آیا ہی چاہتا ہے' اور جو آنے والا یہ نہ جانتا ہو کہ اسے سعادت کا سامنا کرنا ہوگا یا شقاوت کا اسے بہترین تیاری کرنی چاہیے۔ اللہ کے نزدیک متقی وہ ہے جو اپنے نفس کا خیر خواہ ہو' توبہ کو مقدم کرچکا ہو اور اپنی شہوت پر غالب ہو کیونکہ موت اس سے مخفی ہے اور امل اسے فریب دیتا ہے اور شیطان اس پر مقرر ہے جو توبہ کی آرزو اس لئے دلاتا ہے کہ اسے ٹلاتا ہے اور معصیت کو مزین کرکے پیش کرتا ہے تاکہ ارتکاب کر بیٹھے' یہاں تک کہ اس کی موت سبقت کرے اور اسے اچک کرلے جائے اور وہ انتہائی غفلت میں مبتلا ہو' تمہارے اور جنت اور دوزخ کے درمیان صرف موت واقع ہے' اس غافل پر بڑی حیرت ہوتی ہے جس کی زندگی اس پر حجت بنے اور اس کے شب و روز اسے بدبختی کی طرف لے جائیں' اللہ تعالیٰ ہمیں اور تمہیں ان لوگوں میں شامل فرمائیں' جو نعمتیں پاکر اتراتے نہ ہوں اور گناہوں کے باعث اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں کوتاہی نہ کرتے ہوں اور مرنے کے بعد حسرت میں مبتلا نہ ہوں۔ بلاشبہ وہ دعاؤں کا سننے والا ہے' اسی کے قبضے میں خیر ہے وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ قرآن کریم میں ہے۔

فَتَنْتُمْ اَنْفُسَكُمْ وَ تَرَبَّصْتُمْ وَ ارْتَبْتُمْ وَ غَرَّتْكُمُ الْاَمَانِيُّ حَتّٰى جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ وَ غَرَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ۔ (پ ۲۷' ر ۱۸' آیت ۱۴)

لیکن تم نے اپنے کو گمراہی میں پھنسا رکھا تھا اور تم منتظر رہا کرتے تھے اور تم شک رکھتے اور تم کو تمہاری بے ہودہ تمناؤں نے دھوکے میں ڈال رکھا تھا یہاں تک کہ تم پر خدا کا حکم آپہنچا اور تم کو دھوکہ دینے والے نے اللہ کے ساتھ دھوکے میں ڈال رکھا ہے۔

اس آیت کی تفسیر میں بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ فَتَنْتُمْ اَنْفُسَكُمْ سے مراد یہ ہے کہ تم نے لذات اور شہوات کی وجہ سے اپنے آپ کو گمراہی میں ڈالا اور تَرَبَّصْتُمْ سے مراد توبہ کو مؤخر کرنا اور انتظار کرنا اور ارتبتم سے مراد یہ ہے کہ تم نے موت کی آمد میں شک کیا۔ امر اللہ سے موت مراد ہے۔ حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ صبر کرو اور امر حق پر ثابت قدم رہو' یہ چند روز ہیں جو بہت جلد گذر جائیں گے' تم ایک ایسے قافلے کی طرح ہو جس نے کہیں پڑاؤ ڈال رکھا ہے۔ جب تم میں سے کسی کی طلبی ہوتی ہے وہ چلا جاتا ہے اور مڑ کر نہیں دیکھتا' تم یہاں سے عمدہ چیزیں لے کر رخصت ہو' حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ تم میں سے کوئی شخص ایسا نہیں ہے جو مہمان نہ ہو اور جو کچھ تمہارے پاس مال ہے وہ مستعار ہے' مہمان جانے والا ہے اور عاریت کی چیز واپس کی جانے والی ہے' ابو عبیدۃ الباجی کہتے ہیں کہ ہم حضرت حسن بصری کی خدمت میں حاضر ہوئے آپ اس وقت مرض وفات میں مبتلا تھے ہمیں دیکھ کر فرمایا' خوش آمدید اللہ تعالیٰ تمہیں سلامتی کے ساتھ زندہ رکھے اور ہمیں اور تمہیں جنت میں داخل فرمائے یہ ایک واضح نیکی ہے' اگر تم نے صبر کیا' سچا جانا اور تقویٰ اختیار کیا' ایسا نہ ہو کہ تم اسے ایک کان سے سنو اور دوسرے کان سے نکال دو' جس شخص نے بھی سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے اس نے یہ دیکھا ہے کہ آپ کے پاس ایک چیز صبح کو آئی اور شام کو چلی گئی' آپ نے کبھی اینٹ پر اینٹ نہیں رکھی اور نہ بانس پر بانس' بلکہ آپ کے لئے علم بلند کیا گیا' آپ اس کی طرف متوجہ ہوئے' جلدی کرو جلدی کرو' تم کس چیز کی طرف مائل ہوتے ہو' خدا کی قسم تم اور موت گویا ایک ساتھ آئے ہو' اللہ تعالیٰ اس بندے پر رحم فرمائے جو آخرت کو اپنی زندگی بنالے' ایک ٹکڑا کھائے' پرانا لباس پہنے' زمین پر سوئے' عبادت میں مجاہدہ کرے'

خطاؤں پر آنسو بہائے عذاب سے راہ فرار اختیار کرے اور رحمت کا متلاشی ہو یہاں تک کہ اس کی موت آجائے عاصم الاحول کہتے ہیں کہ فضیل الرقاشی سے میں نے ایک سوال کیا اس کے جواب میں انہوں نے فرمایا لوگوں کی کثرت کے باعث تمہیں اپنے نفس سے غافل نہ ہونا چاہیے اس لئے کہ معاملۂ آخرت تم سے متعلق ہوگا نہ کہ ان سے یہ نہ کہو کہ ذرا وہاں چلا جاؤں یا وہاں سے آجاؤں اس طرح دن بلا عمل کے گذر جائے گا موت کا وقت مقرر ہے۔ وہ کسی بھی وقت آسکتی ہے نیکی سے زیادہ کوئی چیز نہایت سرعت سے پرانے گناہ کو نہیں مٹاتی۔

موت کے سکرات اور شدت اور موت کے وقت مستحب احوال

اگر بندۂ مسکین کو موت کے وقت سکرات موت کے علاوہ کسی اذیت ہول اور عذاب کا سامنا نہ ہوتا تب بھی اس کے شایان شان بات یہ تھی کہ اس کی زندگی تلخ اور مزہ مکدر ہوتا اور وہ سہو و غفلت سے دور رہتا اور اس کے لئے مناسب یہ تھا کہ وہ موت کے باب میں طویل فکر کرتا اور اس کے لئے زبردست تیاری کرتا خاص طور پر اس صورت میں جب کہ وہ ہر لمحے تیرے پیچھے ہے بعض حکماء کہتے ہیں کہ اذیت تیرے ہاتھ میں نہیں ہے بلکہ کسی اور کے ہاتھ میں ہے اور تو نہیں جانتا کہ تجھے اس کا کب سامنا کرنا ہوگا حضرت لقمان علیہ السلام نے اپنے بیٹے سے فرمایا موت کے بارے میں تجھے معلوم نہیں کہ وہ کب آکر تیرا گلا دبادے گی تو اس کے لئے تیاری کر اس سے پہلے کہ وہ تجھے اچانک آدبوچے حیرت کی بات یہ ہے کہ اگر آدمی کسی لذت کے حصول میں مشغول ہو یا لہو و لعب کی کسی خاص مجلس سے لطف اندوز ہو رہا ہو اور اچانک اسے کسی سپاہی کا خیال آجائے کہ وہ یہاں آسکتا ہے اور دس پانچ ڈنڈے رسید کر سکتا ہے اس خیال کے ساتھ ہی اس کا تمام مزہ اور لطف غارت ہو جاتا ہے دوسری طرف وہ یہ جانتا ہے کہ موت اس کے پیچھے لگی ہوئی ہے اور ملک الموت کسی بھی وقت سکرات موت کے ساتھ اس کے پاس آسکتا ہے لیکن اس کے باوجود وہ موت سے غافل رہتا ہے اور ملک الموت کا خیال اس کی زندگی کا مزہ مکدر نہیں کرتا اس کا سبب جہل اور فریب کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔

سکرات موت کی تکلیف

جاننا چاہیے کہ سکرات موت میں تکلیف کا صحیح اندازہ وہی شخص کر سکتا ہے جو اس مرحلہ سے گذرا ہے جس شخص نے اس تکلیف کا ذائقہ نہیں چکھا وہ اسے ان تکالیف پر قیاس کر سکتا ہے جو وقتاً فوقتاً اسے پہنچتی رہتی ہیں یا شدت نزع کے وقت لوگوں کے حالات کا مشاہدہ کر کے اس کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے۔

قیاس سے اس طرح استدلال کر سکتا ہے کہ جس عضو میں روح نہیں ہوتی اس میں تکلیف کا احساس نہیں ہوتا اور روح ہوتی ہے تو تکلیف کا احساس ہوتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ تکلیف کا ادراک روح کو ہوتا ہے چنانچہ جب کوئی زخم لگتا ہے یا کوئی عضو جل جاتا ہے تو اس کا اثر روح تک پہنچتا ہے اور جس قدر روح کو اثر پہنچتا ہے اسی قدر اسے تکلیف ہوتی ہے کیونکہ درد گوشت خون اور دوسرے اجزائے بدن میں پھیل جاتا ہے۔ اسی لئے روح کو تھوڑی تکلیف ہوتی ہے لیکن اگر صورت یہ ہو کہ درد اور تکلیف کا مرکز خاص طور پر روح ہو اور روح کے علاوہ کوئی اور شئے نہ ہو تو خود اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ یہ درد کس قدر شدید ہوگا۔

نزع کے معنی اسی تکلیف کے ہیں جو نفس روح پر وارد ہوتی ہے اور اس کے تمام اجزاء میں پھیل جاتی ہے حتی کہ پورے جسم میں پھیلی ہوئی روح کا کوئی حصہ ایسا باقی نہیں رہتا جس میں یہ تکلیف سرایت نہ کرتی ہو۔ اگر کسی شخص کے کانٹا چبھ جائے تو اسے روح کے اسی حصے میں تکلیف ہوتی ہے جس میں وہ کانٹا چبھا ہے اس کے برعکس آگ کی تکلیف بہت زیادہ ہوتی ہے کیوں کہ اس کے اجزاء تمام اجزائے بدن میں گھس جاتے ہیں اور جلے ہوئے عضو کا کوئی ظاہری یا باطنی جزء ایسا باقی نہیں رہتا جس پر آگ اثر انداز نہ ہوئی ہو جو روح ان تمام اجزاء میں منتشر ہوتی ہے وہ یہ تکلیف برداشت کرتی ہے اور زخم کی تکلیف اسی جگہ تک محدود رہتی ہے جہاں لوہا لگا ہو یا کانٹا چبھا ہو اس اعتبار سے زخم کی تکلیف آگ کی تکلیف سے کم ہوئی ہے نزع کی تکلیف نفس روح پر حملہ کرتی ہے اور اس کے تمام اجزاء پر چھا جاتی ہے کیوں کہ اسے ہر ہر رگ ہر ہر پٹھے اور ہر ہر جزو ہر جوڑ اور ہر بن موسے غرضیکہ سر

سے پاؤں تک ہر حصے سے کھینچ کر باہر نکالا جاتا ہے اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ روح کو کس قدر اذیت اور تکلیف برداشت کرنی ہوتی ہے' اسی لئے بعض لوگ کہتے ہیں کہ موت تلوار سے کاٹنے اور آری سے چیرنے اور قینچی سے تراشنے سے زیادہ سخت ہے' کیوں کہ تلوار سے بدن کٹتا ہے تو اسے اس لیے تکلیف ہوتی ہے کہ روح اس سے متعلق ہے' لیکن اگر خاص طور پر روح ہی کو تکلیف ہو تو درد والم کا کیا عالم ہو گا؟

موت کے وقت انسان کیوں نہیں چیختا: رہا یہ سوال کہ آدمی اس وقت تو بہت چلاتا ہے جب اسے زخمی کیا جاتا ہے یا مارا پیٹا جاتا ہے' لیکن موت کے وقت چیخ و پکار نہیں کرتا' حالانکہ تم یہ کہتے ہو کہ نزع میں تکلیف زیادہ ہوتی ہے' اس کا جواب یہ ہے کہ شدتِ الم کی بنا پر مرنے والے کی زبان بند ہو جاتی ہے' اور وہ چیخ نہیں پاتا' تکلیف اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ اس کا دل' دماغ اور جسم سب کچھ اس کے حملے سے بیکار ہو جاتا ہے' تمام قوت سلب ہو جاتی ہے' اور تمام اعضا کمزور پڑ جاتے ہیں' فریاد کی قوت ہی باقی نہیں رہتی' عقل الگ ہو جاتی ہے' زبان سے گویائی چھن جاتی ہے' اعصاب بے حس و حرکت ہو جاتے ہیں' وہ چاہتا ہے کہ چیخ کر دل کی بھڑاس نکالے اور درد والم سے کچھ راحت پائے' لیکن وہ چیخ نہیں سکتا' اگر اس وقت کچھ طاقت باقی رہ جاتی ہے تو روح نکلنے کے وقت حلق اور سینے سے غرغر کی آواز نکلتی ہے' رنگ بدل کر مٹیالا ہو جاتا ہے' گویا وہ مٹی ظاہر ہو جاتی ہے جو اس کی اصل ہے' تمام رگیں کھنچنے لگتی ہیں' کیوں کہ اندر اور باہر ہر جگہ درد ہوتا ہے' آنکھیں اوپر کو چڑھ جاتی ہیں' ہونٹ سکڑ جاتے ہیں' زبان اندر کو چلی جاتی ہے' خصیتین اوپر کی جانب چڑھ جاتے ہیں' انگلیاں سبز ہو جاتی ہیں' ایسے بدن کا کیا حال پوچھتے ہو جس کی ہر رگ کھنچتی ہو' اگر جسم کی ایک رگ کھنچ جائے تو آدمی شدت درد سے چیخنے چلانے پر مجبور ہوتا ہے' یہاں تو تمام رگیں کھنچ رہی ہیں' پھر تمام اعضا بتدریج مردہ ہوتے ہیں' پہلے دونوں پاؤں ٹھنڈے ہوتے ہیں' پھر پنڈلیاں' پھر رانیں' ہر عضو کو سکرات کے بعد سکرات' اور شدت کے بعد شدت کا سامنا کرنا ہوتا ہے' یہاں تک کہ روح کھنچ کر حلق تک آجاتی ہے' اس وقت اس کی نظر دنیا اور اہل دنیا سے پھرتی ہے' توبہ کا دروازہ بند ہو جاتا ہے' اور حسرت و ندامت چھا جاتی ہے' سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:۔

تُقْبَلُ التَّوْبَةُ مَالَمْ يُغَرْغِرْ۔ (ترمذی' ابن ماجہ۔ ابن عمرؓ)

توبہ اس وقت تک قبول کی جاتی ہے جب تک غرغرہ نہ ہو۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ حَتّٰى اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّىْ تُبْتُ الْاٰنَ (پ ۴' ر ۱۴' آیت ۱۸)

اور ایسے لوگوں کی توبہ نہیں جو گناہ کرتے رہتے ہیں یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کے سامنے موت آکھڑی ہوئی تو کہنے لگا کہ میں اب توبہ کرتا ہوں۔

حضرت مجاہدؒ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ یہاں وہ وقت مراد ہے جب ملک الموت اور فرشتے نظر آنے لگتے ہیں' خلاصہ یہ ہے کہ موت کی سختی' اس کا کرب' اور سکرات کی تلخی بیان نہیں کی جاسکتی' اسی لیے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی دعاؤں میں ارشاد فرماتے تھے:۔

اَللّٰهُمَّ هَوِّنْ عَلٰى مُحَمَّدٍ سَكَرَاتِ الْمَوْتِ

اے اللہ محمد پر موت کی سختیاں آسان فرما۔

عام لوگ نہ ان سکرات کو اہمیت دیتے ہیں' اور نہ ان سے پناہ مانگتے ہیں' کیوں کہ وقوع سے پہلے اشیاء کا ادراک نبوت اور ولایت کے نور سے ہوا کرتا ہے' اسی لیے انبیائے کرام و اولیائے عظام کو موت کا زیادہ خوف ہوتا ہے' چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام

اپنے حواریین سے ارشاد فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ مجھ پر موت کی تکلیف آسان فرمائے' اس لیے کہ میں موت کے خوف سے مرا جاتا ہوں' روایت ہے کہ بنی اسرائیل کے کچھ لوگ ایک قبرستان کے پاس سے گزرے' ان میں سے بعض سے کہا کہ کاش تم اللہ تعالیٰ سے دعا کرو' اور وہ اس قبرستان کا کوئی مردہ تمہارے لیے زندہ کردے' اور تم اس سے کچھ دریافت کرسکو' چنانچہ انہوں نے دعا کی' اور اس دعا کے نتیجے میں ایک شخص اپنی قبر سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا' اس کی دونوں آنکھوں کے درمیان میں سجدے کا نشان تھا' وہ شخص کہنے لگا کہ اے لوگو! تم مجھ سے کیا پوچھنا چاہتے ہو میں نے پچاس برس پہلے موت کا ذائقہ چکھا تھا' لیکن آج تک اس کی تلخی دل سے نہیں گئی' حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی موت کی سختی دیکھ کر مجھے کسی کی موت کی آسانی پر رشک نہیں آتا' روایت ہے کہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشا فرمایا کرتے تھے:۔

اَللّٰهُمَّ اِنَّکَ تَاْخُذُ الرُّوْحَ مِنْ بَیْنِ الْعَصَبِ وَالْقَصَبِ وَالْاَنَامِلِ اَللّٰهُمَّ فَاَعِنِّیْ عَلَی الْمَوْتِ وَهَوِّنْهُ عَلَیَّ۔ (ابن ابی الدنیا۔ معمر ابن غیلان الجعفی)

اے اللہ! تو پٹھوں' ہڈیوں اور انگلیوں کے درمیان سے روح نکالتا ہے' اے اللہ موت پر میری مدد فرما اور میرے لیے اسے آسان کر۔

حضرت حسنؒ بیان کرتے ہیں کہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے موت کی تکلیف اور سختی کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ اس کی تکلیف تلوار کے تین سو گھاؤ کے برابر ہے (ابن ابی الدنیا۔ مرسلاً) ایک حدیث میں ہے کہ کسی نے سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم سے موت کی سختی کے متعلق دریافت کیا' آپ نے فرمایا اس کی مثال ایسی ہے جیسے گوکھرو اون میں ہو' اگر اس میں سے گوکھرو نکالا جائے تو وہ تنہا نہیں نکلتا بلکہ اس کے ساتھ اون بھی آتا ہے (ابن ابی الدنیا مرسلاً) ایک مرتبہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کسی مریض کے پاس گئے' اور فرمایا میں جانتا ہوں اسے کس قدر تکلیف ہورہی ہے اس کی کوئی رگ ایسی نہیں ہے جو الگ الگ موت کی اذیت برداشت نہ کررہی ہو (ابن ابی الدنیا) حضرت علی کرم اللہ وجہہ لوگوں کو جہاد میں شرکت کی ترغیب دیتے ہوئے فرماتے کہ اگر تم نہ لڑے تب بھی مروگے' اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے بستر پر مرنے سے زیادہ آسان میرے نزدیک تلوار کے ہزار زخم برداشت کرنا ہے' اوزاعیؒ فرماتے ہیں کہ مردے کو موت کی اذیت اس وقت تک ہوتی ہے جب تک اسے قبر سے نہیں اٹھایا جاتا' شداد ابن اوس کہتے ہیں کہ موت مومن کے لیے دنیا اور آخرت میں سب سے بڑی دہشت ہے' اور اس اذیت سے زیادہ خطرناک ہے جو آری سے جسم کو چیرنے میں یا قینچیوں سے تراشنے میں یا دیگوں میں ابالنے میں ہوتی ہے' اگر وہ زندہ ہوتا تو وہ دنیا والوں کو موت کی سختی سے آگاہ کرتا اور لوگ زندگی کا تمام لطف بھول جاتے' یہاں تک کہ آنکھوں سے نیند بھی اڑ جاتی' زید ابن اسلم اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ جب مومن کے کچھ درجات باقی رہ جاتے ہیں' جن تک وہ اپنی کوتاہی کے باعث پہنچ نہیں پاتا تو اس پر موت سخت کردی جاتی ہے' تاکہ وہ موت کے سکرات اور اس کی اذیت میں مبتلا ہوکر جنت میں اپنے درجے تک رسائی حاصل کرے' اور اگر کافر کے پاس کوئی ایسا نیک عمل ہوتا ہے جس کا بدلہ نہ عطا کیا گیا ہو تو اس کے لیے موت آسان کردی جاتی ہے' تاکہ دنیا میں اپنی نیکی کا عوض حاصل کرلے اور دوزخ میں جائے۔ ایک بزرگ لوگوں سے ان کے مرض وفات میں پوچھا کرتے تھے کہ تم موت کو کیسی پاتے ہو' جب وہ خود مرض وفات میں مبتلا ہوئے تو لوگوں نے ان سے دریافت کیا کہ آپ موت کو کیسی پاتے ہیں' انہوں نے جواب دیا ایسا لگ رہا ہے کہ گویا آسمان زمین سے آملا ہو' اور گویا میری روح سوئی کے ناکے سے نکل رہی ہو' سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

مَوْتُ الْفُجَاءَةِ رَاحَةٌ لِلْمُؤْمِنِ وَاَسَفٌ عَلَی الْفَاجِرِ۔ (احمد۔ عائشہؓ)

اچانک موت مومن کے لیے راحت ہے اور فاجر کے لیے باعث افسوس۔

حضرت مکحولؒ کی روایت میں ہے کہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر مردے کا ایک بال آسمانوں اور زمین

والوں پر رکھ دیا جائے تو اللہ تعالیٰ کے حکم سے سب مرجائیں کیوں کہ ہر بال میں موت ہے' اور جس چیز پر موت واقع ہوتی ہے وہ مرجاتی ہے (ابن ابی الدنیا۔ ابو میسرہ) روایت ہے کہ اگر موت کی تکلیف کا ایک قطرہ دنیا کے پہاڑوں پر رکھ دیا جائے تو تمام کے تمام پگھل جائیں(۱) بیان کیا جاتا ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وفات ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے ان سے فرمایا: اے دوست! تم نے موت کو کیسی پایا؟ حضرت ابراہیم نے عرض کیا اے اللہ! جیسے گرم سیخ تر روئی میں داخل کی جائے اور پھر اسے کھینچا جائے' اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہم نے تمہارے اوپر آسان موت نازل کی ہے' حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا کہ میں نے تو خود کو ایسا پایا جیسے زندہ چڑیا آگ میں رکھی ہوئی دیگچی میں ڈال دی جائے کہ نہ مرتی ہے اور نہ اڑپاتی ہے' حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ایک قول یہ نقل کیا گیا ہے کہ میں نے اپنے نفس کو ایسا پایا جیسے زندہ بکری قصاب کے ہاتھوں میں ہو اور وہ اس کی کھال کھینچ رہا ہو' روایت ہے کہ وفات شریف کے وقت سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب پانی سے بھرا ہوا ایک پیالہ رکھا ہوا تھا' آپ اس میں ہاتھ ڈالتے تھے اور اپنے چہرہ مبارک پر ملتے تھے' اور فرماتے تھے: اے اللہ مجھ پر موت کی سختیاں آسان فرما (بخاری و مسلم۔ عائشہؓ) حضرت فاطمہ آپ کی یہ تکلیف دیکھ کر کہنے لگیں: ابا جان! آپ کس قدر تکلیف میں ہیں؟ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں ارشاد فرمایا آج کے بعد تیرے باپ کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی (بخاری۔ انسؓ) حضرت عمر بن الخطابؓ نے حضرت کعب الاحبار سے کہا کہ ہم سے موت کے متعلق کچھ بیان کرو' حضرت کعب الاحبار نے عرض کیا کہ امیر المومنین موت ایک ایسی کانٹوں بھری شاخ ہے جو کسی شخص کے پیٹ میں داخل کردی گئی ہو اور اس شاخ کے ہر کانٹے نے ایک ایک رگ اپنی گرفت میں لے لی ہو' پھر کوئی شخص اسے بری طرح کھینچنے لگے اور جو کچھ نکلنا ہو وہ نکل جائے اور جو باقی رہنا ہو وہ باقی رہ جائے' سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ بندہ موت کی سختی برداشت کرتا ہے اور اس کے جوڑ ایک دوسرے سے سلام کرکے کہتے ہیں کہ اب ہم قیامت کے دن تک کے لئے جدا ہوتے ہیں۔ (الاربعین لابی ہدبہ' انسؓ) یہ ہیں موت کی وہ سختیاں جن کا سامنا اولیاء اللہ اور محبین خدا کو کرنا پڑتا ہے' ہم کس شمار میں ہیں' ہمارا حال تو یہ ہے کہ گناہوں میں سر سے پاؤں تک ڈوبے ہوئے ہیں' ہمارے اوپر سکرات موت کے علاوہ بھی سختیاں آئیں گی۔

موت کی مصیبتیں موت کی مصیبتیں تین طرح کی ہیں' ایک تو نزع کے وقت کی سختی' اس کا ذکر ابھی ختم ہوا ہے' دوسری مصیبت یہ ہوتی کہ مرنے والے کو ملک الموت کی صورت نظر آجائے گی اور دل پر ان کا خوف اور رعب چھائے گا اور اگر ان کی وہ صورت نظر آجائے جس سے وہ گناہگاروں کی روح قبض کرتا ہے تو مضبوط سے مضبوط دل رکھنے والا شخص بھی خوف سے گنگ ہوجائے' حضرت ابراہیمؑ نے ملک الموت سے فرمایا کہ کیا تم اپنی وہ صورت دکھلا سکتے ہو جس میں تم گنہگاروں کی روح نکالتے ہو' انہوں نے عرض کیا جی ہاں دکھلا سکتا ہوں لیکن آپ برداشت نہیں کرسکیں گے' حضرت ابراہیم نے فرمایا برداشت کیوں نہیں کرسکتا؟ ملک الموت نے عرض کیا تب آپ دوسری طرف منہ کرلیجئے' آپ نے دوسری طرف رخ کرلیا اور جب ادھر دیکھا جہاں ملک الموت موجود تھے تو دیکھا کہ ایک سیاہ آدمی ہے' اس کے بال کھڑے ہوئے ہیں' جسم سے تعفن پھوٹ رہا ہے' سیاہ کپڑے پہنے ہوئے ہے' اس کے منہ اور نتھنوں سے آگ کے شعلے اور دھواں نکل رہا ہے' یہ منظر دیکھ کر حضرت ابراہیم علیہ السلام بے ہوش ہوگئے' جب ہوش میں آئے تو ملک الموت اپنی اصل صورت پر واپس آچکے تھے' حضرت ابراہیمؑ نے ان سے فرمایا کہ اگر تم فاجر کے سامنے صرف یہی صورت لے کر جاؤ اور اس کے علاوہ اسے کوئی تکلیف نہ پہنچے تو یہ سزا بہت کافی ہے' حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ حضرت داؤد علیہ السلام غیرت مند آدمی تھے جب آپ باہر تشریف لے جاتے تو گھر کے دروازے بند کردیا کرتے تھے۔ چنانچہ ایک دن آپ نے دروازہ بند کرلیا اور باہر تشریف لے گئے ان کی اہلیہ نے گھر میں جھانکا تو دیکھا ایک شخص گھر کے اندر موجود ہے' انہوں نے کہا اس آدمی کو یہاں کون لے کر آیا ہے؟ اگر حضرت داؤد علیہ السلام واپس آگئے تو اس شخص پر مصیبت آجائے گی' چنانچہ حضرت داؤد علیہ السلام تشریف لے آئے اور انہوں نے اس آدمی سے

---

(۱) مجھے اس روایت کی اصل نہیں ملی۔

دریافت کیا کہ تو کون ہے' اس نے کہا کہ میں وہ ہوں جو نہ بادشاہوں سے ڈرتا ہے اور نہ پہرہ داروں سے رکتا ہے' حضرت داؤد علیہ السلام نے فرمایا معلوم ہوتا ہے تم ملک الموت ہو' یہ کہہ کر آپ نے کملی اوڑھ لی (احمد نحوہ) روایت ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایک کھوپڑی کے پاس سے گذرے' اس میں ٹھوکر لگا کر کہا خدا کے حکم سے بول' اس کھوپڑی سے آواز آئی اے روح اللہ! میں فلاں دور کا بادشاہ ہوں' ایک روز میں اپنے قصر میں تاج شاہی سر پر رکھے ہوئے تخت شاہی پر بیٹھا ہوا تھا' میرے چاروں طرف حاشیہ بردار' مصاحب اور سپاہی تھے' اچانک میری نگاہ ملک الموت پر پڑی انہیں دیکھ کر میرا جوڑ جوڑ ہل گیا اور روح نکل کر ان کے پاس پہنچ گئی' کاش لوگوں کا ہجوم نہ ہوتا اور اس انس و تعلق کے بجائے وحشت اور تنہائی ہوتی' یہ ہے وہ مصیبت جس کا سامنا گنہگاروں کو کرنا پڑتا ہے۔

مومنین کی روح قبض کرنے والا فرشتہ انبیاء علیہم السلام نے نزع کی تکلیف بیان فرمائی ہے' لیکن ملک الموت کو دیکھ کر دل میں جو خوف اور دہشت پیدا ہوتی ہے وہ بیان نہیں فرمائی' اگر کوئی شخص اسے خواب میں بھی دیکھ لے تو باقی زندگی بے لطف ہو جائے اور کھانے' پینے اور عیش کرنے کا تمام مزہ جاتا رہے' مگر ملک الموت اتنی کریہہ اور خوفناک صورت میں صرف گنہگار بندوں کی روح قبض کرنے کے لئے آتے ہیں' مطیع اور فرمانبردار بندوں کے لئے ملک الموت خوبصورت اور حسین قالب میں آتے ہیں' چنانچہ عکرمہؒ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے روایت کرتے ہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام ایک غیرت مند انسان تھے' ان کا ایک مخصوص مکان تھا جس میں وہ عبادت کیا کرتے تھے اور جب باہر تشریف لے جاتے تو اس کا دروازہ بند کر دیتے' ایک دن واپس تشریف لائے تو دیکھا کہ ایک شخص گھر کے اندر موجود ہے' آپ نے اس سے دریافت کیا کہ تجھے گھر میں کس نے داخل کیا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ مجھے اس گھر میں اس گھر کے مالک نے داخل کیا ہے۔ حضرت ابراہیم نے کہا کہ اس کا مالک تو میں ہوں' اس نے کہا کہ مجھے اس نے داخل کیا ہے جو میرے اور آپ سے بڑا مالک ہے' حضرت ابراہیم نے پوچھا ملائکہ میں تمہاری کیا حیثیت ہے؟ اس نے کہا میں ملک الموت ہوں' حضرت ابراہیم نے ملک الموت سے پوچھا کہ کیا تم مجھے اپنی وہ شکل دکھلا سکتے ہو جس میں مومن کی روح قبض کرتے ہو؟ ملک الموت نے کہا میں ضرور دکھلاؤں گا مگر آپ رخ پھیر لیجئے۔ حضرت ابراہیمؑ نے اپنا رخ دوسری طرف کر لیا' تھوڑی دیر بعد ادھر دیکھا جہاں ملک الموت موجود تھے تو ایک ایسے نوجوان کو پایا جو انتہائی خوبصورت تھا' بہترین لباس پہنے ہوئے تھا اور عمدہ خوشبوؤں میں بسا ہوا تھا' حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان سے کہا اے ملک الموت! اگر مومن کو تمہاری زیارت میسر آجائے اور کچھ نہ ملے تو یہ اس کے لئے کافی ہے' موت کے وقت دو محافظ فرشتے بھی نظر آتے ہیں' وہیب کہتے ہیں کہ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ کوئی شخص اس وقت تک نہیں مرتا جب تک اسے وہ دونوں فرشتے نظر نہیں آجاتے جو اس کے اعمال لکھنے پر مامور تھے' اگر وہ شخص مطیع و فرماں بردار ہوتا ہے تو اس سے کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ تجھے ہماری طرف سے بہترین جزا دے۔ تو نے ہمیں بہت سی عمدہ مجلسوں میں بٹھایا ہے اور ہمارے سامنے اچھے اچھے عمل کئے ہیں اور اگر مرنے والا بدکار ہوتا ہے تو اس سے کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ تجھے ہماری جانب سے جزائے خیر نہ دے تو نے ہمیں بری مجلسوں میں بٹھایا ہے' ہمارے سامنے برے اعمال کئے ہیں اور ہمیں بری باتیں سنائی ہیں' یہ واقعہ اس وقت پیش آتا ہے جب مرنے والے کی نگاہیں ہر طرف سے منقطع ہو کر ان پر پڑتی ہیں اور پھر کبھی دنیا کی طرف نہیں لوٹتیں۔

گنہگاروں پر موت کے وقت تیسری مصیبت یہ نازل ہوتی ہے کہ انہیں دوزخ میں ان کا ٹھکانہ دکھایا جاتا ہے اور دیکھنے ہی سے پہلے خوف کے مارے ان کا برا حال ہو جاتا ہے' سکرات کی حالت میں ان کے قویٰ کمزور پڑ جاتے ہیں اور روحیں بدن کا ساتھ چھوڑنے لگتی ہیں لیکن وہ اس وقت تک بدن کا ساتھ نہیں چھوڑتیں جب تک ملک الموت کی زبان سے بشارت کا نغمہ نہ سن لیں' گنہگار کو وہ یہ بشارت دیتے ہیں کہ اے دشمن خدا دوزخ کی خوشخبری سن اور مومن سے یہ کہتے ہیں کہ اے اللہ کے دوست جنت کی بشارت سن' ارباب عقل کو نزع کے وقت کے اسی لمحے کا خوف ستاتا ہے' سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم

میں سے کوئی شخص اس وقت تک دنیا سے نہیں نکلے گا جب تک وہ اپنا انجام نہ جان لے گا اور یہ نہ دیکھ لے گا کہ جنت یا دوزخ میں اس کا ٹھکانہ کہاں ہے؟ (ابن ابی الدنیا موقوفاً) ایک روایت میں ہے کہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص اللہ سے ملنا پسند کرتا ہے اللہ اس سے ملنا پسند کرتا ہے اور جو شخص اللہ تعالیٰ سے ملنا پسند نہیں کرتا اللہ تعالیٰ اس سے ملنا پسند نہیں کرتا' صحابہ کرام نے عرض کیا مگر ہم سب ہی لوگ موت کو ناپسند کرتے ہیں' سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اس کا یہ مطلب نہیں' بلکہ مومن پر جو چیز (موت) آنے والی ہے اگر اسے آسان کردیا جائے تو وہ اللہ تعالیٰ سے ملنا پسند کرے اور اللہ اس سے ملنا پسند کرے (بخاری و مسلم' عبادۃ الصامت) روایت ہے کہ حذیفہ ابن الیمان نے حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ سے رات کے آخری حصے میں کہا کہ اٹھ کر دیکھو کیا وقت ہوا ہے' چنانچہ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ باہر اٹھ کر گئے اور واپس آکر بتلایا کہ سرخ رنگ کا ستارہ طلوع ہوچکا ہے' حضرت حذیفہ نے کہا کہ میں صبح کو دوزخ میں جانے سے اللہ کی پناہ چاہتا ہوں' مروان ایسے وقت میں حضرت ابوہریرہؓ کے پاس گیا جب آپ عالم نزع میں تھے اور کہنے لگا اے اللہ! ان پر موت کو آسان کیجئے' حضرت ابوہریرہؓ نے کہا اے اللہ! سخت کیجئے' یہ کہہ کر حضرت ابوہریرہؓ رونے لگے' پھر فرمایا بخدا میں دنیا کے غم میں یا تم سے جدا ہونے کے رنج میں نہیں روتا ہوں بلکہ میں اللہ کی طرف سے جنت یا دوزخ میں سے کسی ایک بشارت کا منتظر ہوں' حدیث شریف میں ہے کہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے سے راضی ہوتا ہے تو ملک الموت سے کہتا ہے کہ فلاں بندے کے پاس جا اور اس کی روح لے کر آ تاکہ میں اسے راحت دوں' بس اس کے یہ اعمال کافی ہیں' میں نے اس کی آزمائش کی اور جیسا میں چاہتا تھا اسے ویسا پایا' یہ حکم سن کر ملک الموت نیچے اترتے ہیں اور ان کے ساتھ پانچ سو فرشتے ہوتے ہیں' ان کے پاس پھولوں کے گلدستے اور زعفران کی خوشبودار جڑیں ہوتی ہیں اور ان میں سے ہر ایک اپنے ساتھیوں سے مختلف خوشخبری سناتا ہے اور ملائکہ اس کی روح کے استقبال کے لئے گلدستے لے کر دو قطاروں میں کھڑے ہوجاتے ہیں' جب شیطان انہیں دیکھتا ہے تو دھاڑیں مار مار کر رونے لگتا ہے' اس کا لشکر پوچھتا ہے کہ کیوں روتے ہو؟ کیا حادثہ پیش آیا؟ وہ کہتا ہے کہ کیا تم نہیں دیکھا کہ اس بندے کو کس قدر عزت دی جارہی ہے۔ تم نے اس پر اپنے تیر کیوں نہیں چلائے' تم نے اسے کیوں چھوڑا؟ وہ کہیں گے ہم نے بڑی کوشش کی مگر وہ محفوظ رہ گیا' حضرت حسن بصریؒ کہتے ہیں کہ مومن کو صرف بقائے خداوندی میں راحت ملتی ہے اور جسے اللہ کی ملاقات میں راحت ملتی ہے اس کے لئے موت کا دن خوشی' حسرت' امن' عزت اور شرف کا دن ہوتا ہے' موت کے وقت جابر ابن زید نے کسی سے پوچھا کہ آپ کس چیز کی خواہش رکھتے ہیں' انہوں نے کہا حضرت حسن کی زیارت کرنا چاہتا ہوں' لوگ حضرت حسن بصری کو بلا کر لائے' جابر ابن زید نے آنکھ کھول کر انہیں دیکھا اور کہا اے بھائی اب ہم تمہیں چھوڑ کر جنت یا دوزخ کی طرف جاتے ہیں' محمد ابن الواسع نے انتقال کے وقت فرمایا دوستو! تم پر سلامتی ہو' دوزخ کی تیاری ہے مگر اس صورت میں کہ اللہ تعالیٰ ہم سے درگذر فرمائے' بعض بزرگان دین یہ تمنا کرتے تھے کہ ہمیشہ عالم نزع میں رہیں' نہ ثواب کے لئے اٹھائے جائیں اور نہ عذاب کے لئے' عارفین خدا کے قلوب سوء خاتمہ کے خوف سے ٹکڑے ٹکڑے ہوجاتے تھے' سوء خاتمہ ایک زبردست مصیبت ہے' کتاب الخوف الرجاء میں ہم نے سوء خاتمہ کے خوف اور عارفین کے شدّت خوف پر روشنی ڈالی ہے' یہاں بھی کچھ گفتگو ہونی چاہیے تھی لیکن طوالت کے خوف سے ہم اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔

موت کے وقت مردے کے حق میں کون سے اعمال بہتر ہیں؟

مرنے کے وقت عمدہ بات یہ ہے کہ مرنے والا پُرسکون ہو' اس کی زبان پر کلمۂ شہادت جاری ہو اور دل میں اللہ تعالیٰ کے لئے حسن ظن کے جذبات ہوں' موت کے وقت صورت کیسی ہو اس کے بارے میں سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ مرنے والے کے لئے تین باتوں میں خیر کی امید رکھو' اس کی پیشانی عرق آلود ہو' آنکھوں میں آنسو ہوں اور ہونٹ خشک ہوں' اگر ایسا ہو تو رحمت خداوندی کی علامت ہے اور اگر اس کے منہ سے ایسی آوازیں نکل رہی ہوں جیسے اس شخص کے منہ سے نکلتی

ہیں جس کا گلا گھونٹا جارہا ہو اور رنگ سرخ ہوجائے اور ہونٹ مٹیالے ہوجائیں تو یہ اللہ کے عذاب کی علامت ہے[1]' زبان سے کلمۂ شہادت کا ادا ہونا خیر کی علامت ہے۔ حضرت ابو سعید الخدریؓ فرماتے ہیں۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔

لَقِّنُوا مَوْتَاكُمْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ

اپنے مرنے والوں کو لا الٰہ الا اللہ کی تلقین کرو۔

حضرت حذیفہ کی روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں۔

فَاِنَّهَا تَهْدِمُ مَا قَبْلَهَا مِنَ الْخَطَايَا[2]

اس لئے کہ کلمہ لا الٰہ الا اللہ پچھلے گناہوں کو ختم کردیتا ہے۔

حضرت عثمان روایت کرتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص مرے اور یہ جانتا ہو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے وہ جنت میں داخل ہوتا ہے[3] اور حضرت عبداللہ کی روایت میں یعلم کی جگہ یشھد ہے۔ حضرت عمر ابن الخطاب فرماتے ہیں کہ اپنے مرنے والوں کے پاس جاؤ' انہیں نصیحت کرو' اس لئے کہ وہ ان امور کا مشاہدہ کرتے ہیں جن کا تم نہیں کرتے اور انہیں لا الٰہ الا اللہ کی تلقین کرو' حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ میں نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ ملک الموت ایک شخص کے پاس گئے اور اس کے دل کو دیکھا مگر اس میں کچھ نہ تھا' پھر اس کے جبڑے چیر کر دیکھے تو ان کو تالو سے چپکا ہوا پایا اور دیکھا کہ زبان لا الٰہ الا اللہ کا ورد کررہی ہے' چنانچہ اس کی کلمۂ اخلاص کی وجہ سے بخشش کردی گئی' (ابن ابی الدنیا' طبرانی' بیہقی) تلقین کرنے والے کو چاہیے کہ وہ تلقین میں اصرار نہ کرے بلکہ نرمی سے کام لے۔ اس لئے کہ بعض اوقات مریض کی زبان اٹھتی نہیں ہے' اس صورت میں اصرار کرنے سے وہ جھنجلاہٹ میں مبتلا ہوسکتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ غصے میں انکار کردے اور یہ انکار اس کے سوء خاتمہ کا سبب ہو۔

اس تفصیل کا حاصل یہ ہے کہ آدمی موت سے ہم آغوش ہو تو اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کے سوا کچھ نہ ہو' اگر اس کے دل میں واحد برحق کے سوا کوئی مطلوب باقی نہ رہا تو اس کا مرنا محبوب کے پاس جانا ہوگا اور اس کے لئے اس سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں ہوسکتی کہ وہ اپنے محبوب کے پاس جائے اور اگر دل دنیا میں مشغول اور اس کی لذات کے فراق پر مغموم ہو اور کلمہ لا الٰہ الا اللہ محض اس کی زبان پر ہو' دل سے اس کی تصدیق نہ کرتا ہو تو اس کا معاملہ خطرے سے خالی نہیں ہے' اس لئے کہ محض زبان کو حرکت دینا کافی نہیں ہے' الا یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنا فضل فرمائے اور محض قول کو قبولیت سے سرفراز کرے' البتہ اس وقت حسن ظن رکھنا بہتر ہے جیسا کہ ہم نے کتاب الرجاء میں بیان کیا ہے' اس سلسلے میں حسن ظن رکھنے کے متعلق بے شمار روایات وارد ہیں' روایت ہے کہ واثلہ ابن الاسقع ایک مریض کے پاس گئے اور اس سے پوچھا کہ تم اس وقت اللہ تعالیٰ سے کیسا حسن ظن رکھتے ہو؟ اس نے جواب دیا کہ میرے گناہوں نے مجھے غرق کردیا ہے اور مجھے ہلاکت کے قریب کردیا ہے لیکن مجھے اللہ کی رحمت سے امید ہے' یہ سن کر واثلہ نے اللہ اکبر کہا اور ان کے ساتھ گھر والوں نے بھی اللہ اکبر کہا' اس کے بعد واثلہ نے فرمایا کہ میں نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے فرمایا کرتے تھے کہ میں اپنے بندے کے گمان کے قریب ہوں' وہ جیسا چاہے مجھ سے گمان رکھے (ابن حبان' احمد' بیہقی) نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک ایسے نوجوان کے پاس گئے جو مرنے والا تھا' آپ نے اس سے دریافت فرمایا کہ اس وقت تم اپنے آپ کو کیسا پاتے ہو' اس نے جواب دیا کہ میں اللہ تعالیٰ سے امید رکھتا ہوں اور گناہوں سے ڈرتا ہوں' سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ یہ دونوں باتیں جس بندے کے دل میں جمع ہوتی ہیں اس کو وہی عطا کرتا ہے جس کی وہ توقع رکھتا ہے اور اس چیز سے نجات دیتا ہے جس سے وہ خوف کرتا ہے[4] ثابت البنانی کہتے ہیں کہ ایک نوجوان بڑا تیز مزاج تھا اس کی ماں اسے اکثر یہ نصیحت کرتی تھی کہ اے بیٹے! تجھے ایک دن مرنا ہے' اس دن کو یاد رکھ' جب اس کی موت کا وقت قریب آیا تو اس کی

---

(۱) یہ روایت حکیم ترمذی نے نوادر الاصول میں سلمان سے روایت کی ہے مگر اس کی سند صحیح نہیں ہے (۲-۳) پہلے گزر چکی ہیں (۴) یہ حدیث پہلے گزر چکی ہے

ماں اس کے اوپر گر پڑی اور رو رو کر کہنے لگی بیٹے میں تجھے اسی دن سے ڈرایا کرتی تھی اور کہتی تھی کہ تجھے ایک دن مرنا ہے' اس نے کہا اماں! میرا رب بڑے احسان والا ہے اور مجھے امید ہے کہ وہ آج کے دن بھی مجھے اپنے احسان سے محروم نہیں کرے گا' ثابت کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے حسن ظن کی وجہ سے اس پر رحم فرمایا' جابر ابن وداعہ کہتے ہیں کہ ایک نوجوان بڑا مغرور تھا جب اس کی موت کا وقت آیا تو ماں نے پوچھا کہ بیٹے کیا تو کچھ وصیت کرنی چاہتا ہے۔ اس نے کہا ہاں! میری انگلی سے انگوٹھی مت نکالنا۔ اس میں اللہ کا نام ہے۔ جب اسے دفن کردیا گیا تو لوگوں نے اسے خواب میں دیکھا کہ وہ کہہ رہا تھا میری ماں سے جاکر کہہ دو کہ کلمہ نے مجھے نفع دیا ہے اور اللہ نے میری مغفرت فرمادی ہے' ایک اعرابی بیمار ہوا تو لوگوں نے اس سے کہا کہ تو مرجائے گا' اس نے کہا مرنے کے بعد میں کہاں جاؤں گا؟ لوگوں نے جواب دیا اللہ کے پاس' اس نے کہا اگر ایسا ہے تو مجھے کوئی پریشانی نہیں ہے۔ اس لئے کہ مجھے خیر اسی کے پاس سے ملتا ہے' ابو المعتمر ابن سلیمان کہتے ہیں کہ میرے والد نے وفات کے وقت مجھ سے فرمایا اے معتمر! مجھ سے رخصت کی حدیثیں بیان کر تاکہ میں اللہ تعالیٰ سے حسن ظن کے ساتھ ملوں۔ مستحب یہ ہے کہ بندے کے سامنے موت کے وقت اس کے اچھے اعمال بیان کئے جائیں تاکہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ وہ اچھا ظن رکھے۔

ملک الموت کی آمد پر حیرت ظاہر کرنے والے واقعات: اشعث ابن اسلم کہتے ہیں کہ ابراہیم علیہ السلام نے ملک الموت سے جن کا نام عزرائیل ہے اور جن کی دو آنکھیں ہیں' ایک چہرے پر اور دوسری گدی پر۔ دریافت کیا کہ اگر ایک آدمی مشرق میں ہو اور دوسرا مغرب میں اور دونوں کی موت کا وقت ایک ہو یا کسی جگہ روحیں قبض کرنی ہوں جہاں وبا پھیلی ہوئی ہو یا جنگ ہو رہی ہو تو تم کیا کرتے ہو؟ انہوں نے کہا کہ میں اللہ کے حکم سے روحوں کو بلاتا ہوں اور وہ میری ان انگلیوں کے درمیان سما جاتی ہیں' راوی کہتے ہیں کہ زمین ملک الموت کے لئے ایک طشت کی طرح ہے وہ جسے چاہتا ہے اس میں سے لے لیتا ہے' یہ بھی راوی کا قول ہے کہ ملک الموت حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بشارت دیا کرتے تھے کہ آپ خلیل اللہ ہیں' حضرت سلیمان ابن داؤد علیہ السلام نے ملک الموت سے فرمایا کہ تم لوگوں میں انصاف کیوں نہیں کرتے' اسے لے جاتے ہو اور اسے چھوڑ دیتے ہو' ملک الموت نے جواب دیا کہ میں اس کے متعلق تم سے زیادہ نہیں جانتا' مجھے تو صحیفے دیئے جاتے ہیں اور ان صحیفوں میں مرنے والوں کے نام لکھے رہتے ہیں' وہب ابن منبہؒ کہتے ہیں کہ ایک بادشاہ نے کسی جگہ جانے کا ارادہ کیا اور پہننے کے لئے کپڑے منگوائے' وہ اچھے نہ لگے' دوسرا لباس منگوایا وہ بھی ناپسند کردیا' یہاں تک کہ سب سے عمدہ لباس پہنا' اسی طرح اس نے سواری کے لئے بہترین گھوڑا منتخب کیا اور اس پر سوار ہو کر چلا'۔ اس کے ہمراہ ایک لشکر بھی تھا' شیطان نے اس کے نتھنوں میں نہ جانے کیا پھونکا کہ اس کا دل کبر و غرور سے بھر گیا اور اس طرح چلا کہ اس کی نظر میں کسی آدمی کی کوئی اہمیت نہیں رہی۔ اسی دوران اس کے پاس ایک بدحال اور پراگندہ بال شخص آیا اور اسے سلام کیا لیکن بادشاہ نے سلام کا جواب نہیں دیا' آنے والے نے اس کے گھوڑے کی لگام پکڑلی۔ بادشاہ نے کہا لگام پکڑ کر تو نے ایک خوفناک غلطی کی ہے' اس شخص نے کہا میں تمہارے پاس ایک ضرورت سے آیا ہوں' بادشاہ نے کہا میرے اترنے کا انتظار کر' اس نے کہا نہیں اسی وقت کام ہے' یہ کہہ کر اس نے لگام کو جھٹکا دیا' بادشاہ نے کہا ٹھیک ہے اپنی ضرورت بیان کر' اس شخص نے کہا یہ ایک راز کی بات ہے' بادشاہ نے اپنا چہرہ اس کے قریب کیا' اس نے کان میں سرگوشی کی' میں ملک الموت ہوں' یہ سن کر بادشاہ کا رنگ متغیر ہو گیا اور زبان لڑکھڑا گئی اور کہنے لگا مجھے اتنی مہلت دو کہ میں گھر واپس جاؤں اور اپنی بعض ضروریات پوری کرلوں اور انہیں الوداع کہہ دوں' ملک الموت نے کہا اب اس کی اجازت نہیں' اب تو کبھی اپنے گھر والوں کو اور مال و متاع کو نہ دیکھ سکے گا' یہ کہہ کر ملک الموت نے اس کی روح قبض کرلی اور وہ سواری سے بے جان لکڑی کی طرح زمین پر گر پڑا' پھر ملک الموت آگے بڑھے اور اسی حال میں ایک مومن بندے سے ملاقات کی اور اسے سلام کیا' بندۂ مومن نے ان کے سلام کا جواب دیا' ملک الموت نے کہا مجھے تم سے ایک راز کی بات تمہارے کان میں کہنی ہے' اس شخص نے کہا ضرور کہو' ملک الموت نے کہا میں ملک الموت ہوں' اس شخص نے کہا خوش آمدید' میں بڑے دنوں سے آپ کا منتظر تھا' بخدا روئے زمین پر کسی

غائب سے ملنے کا اتنا اشتیاق کسی کو نہ ہو گا جتنا شوق مجھے آپ سے ملنے کا تھا' ملک الموت نے کہا کہ تم جس کام کے لئے نکلے ہو وہ پورا کرلو' اس شخص نے کہا مجھے اللہ کی ملاقات سے زیادہ کوئی کام محبوب نہیں ہے' آپ روح قبض کرلیں' ملک الموت نے کہا تم کس حالت میں مرنا پسند کرو گے؟ اس شخص نے پوچھا کیا آپ کو اس کا اختیار ہے؟ ملک الموت نے کہا ہاں تم جو حالت پسند کرو گے میں اسی میں تمہاری روح قبض کروں گا' چنانچہ ملک الموت نے اس کی نیک روح سجدے کی حالت میں قبض کی۔

ابو بکر ابن عبد اللہ المزنیؒ کہتے ہیں کہ بنی اسرائیل کے ایک شخص نے کافی دولت جمع کرلی' جب اس کی موت کا وقت قریب آگیا تو اس نے اپنے بچوں سے کہا کہ مجھے میری دولت دکھلاؤ' اس کے بیٹوں نے گھوڑوں' اونٹ' غلام اور دوسری قیمتی چیزیں اس کے سامنے رکھ دیں' وہ یہ دولت دیکھ کر رونے لگا' ملک الموت نے کہا اب کیوں روتا ہے؟ اس ذات کی قسم جس نے تجھے اس قدر نعمتیں دی ہیں میں تیرے گھر سے تیری روح لئے بغیر نہیں جاؤں گا' اس آدمی نے درخواست کی کہ اسے اتنی مہلت دیدی جائے کہ وہ یہ مال اللہ کی راہ میں خرچ کردے' ملک الموت نے کہا اب مہلت کا وقت ختم ہوچکا ہے' تجھے اس سے پہلے یہ خیال کیوں نہیں آیا؟ یہ کہہ کر ملک الموت نے اس کی روح قبض کرلی' روایت یہ ہے کہ ایک شخص نے بہت سا مال جمع کیا' کوئی قیمتی شئے ایسی نہیں تھی جو اس کے خزانے میں نہ ہو' اس نے ایک عالیشان اور مضبوط محل بنوایا اور اس کے دو بڑے دروازے بنوائے اور ان دروازوں پر پہریدار مقرر کئے' پھر اپنے اہل و عیال کو جمع کیا اور ان کے لئے کھانا پکوایا اور اپنے تخت پر اس طرح بیٹھ گیا کہ اس کا ایک پاؤں دوسرے پاؤں پر تھا' سب لوگوں نے مل کر کھانا کھایا' جب کھانے سے فارغ ہوگئے تو اس نے اپنے نفس سے کہا اے نفس! اب تو چند برسوں تک عیش کر' میں نے تیرے لئے اتنا سرمایہ جمع کردیا ہے جو تجھے لمبے عرصے تک کافی رہے گا' ابھی وہ اس کلام سے فارغ بھی نہیں ہوا تھا کہ ملک الموت اس کے محل کے دروازے پر اس حال میں پہنچے کہ ان کے کپڑے بوسیدہ اور پھٹے پرانے تھے اور گلے میں فقیروں جیسا ایک کشکول لٹکا ہوا تھا' وہاں پہنچتے ہی انہوں نے دروازے پر دستک دی' دستک سن کر وہ شخص ڈر گیا' نوکر جاکر باہر کی طرف دوڑے اور دیکھا کہ ایک بدہیئت شخص وہاں موجود ہے اور ان کے آقا سے ملنا چاہتا ہے' نوکروں نے اسے ڈانٹ دیا اور یہ کہہ کر دروازہ بند کرلیا کہ کیا ہمارا آقا اس جیسے حقیر شخص سے ملنا پسند کرے گا؟ ملک الموت نے دروازے پر دوبارہ دستک دی' اس مرتبہ آواز پہلے سے زیادہ شدید تھی' نوکر پھر دوڑے اور ملک الموت کو ڈانٹنے کا ارادہ کیا' ملک الموت نے کہا اپنے آقا سے جاکر کہو میں ملک الموت ہوں' یہ سن کر نوکر گھبرائے اور دہشت زدہ ہوکر مالک کے پاس پہنچے اور اسے بتلایا کہ باہر ملک الموت موجود ہے' اس شخص نے کہا ملک الموت کے ساتھ نرمی سے بات کرو' اس سے کہو کہ وہ میرے بجائے کسی اور کو لے جائے' ملک الموت محل میں داخل ہوگئے اور اس کے سامنے جاکر کہنے لگے کہ تو اپنے مال میں جو کچھ کرنا چاہے کرلے اب میں تجھے لئے بغیر نہیں جاؤں گا' اس نے اپنا تمام مال منگوایا اور کہنے لگا اے مال تجھ پر اللہ کی لعنت ہو' تو نے ہی مجھے اللہ کی عبادت سے روکا ہے' مال کو اللہ نے گویائی بخشی اس نے جواب دیا کہ مجھے کیوں برا کہتا ہے تو ہی مجھے لے کر بادشاہوں کے پاس جاتا تھا اور نیکوں کو اپنے دروازے سے دھکے دلوا دیتا تھا' میرے ذریعہ طرح طرح کے مزے لوٹتا تھا' بادشاہوں کی مجلسوں میں بیٹھتا تھا اور مجھے برے کاموں میں صرف کرتا تھا' اب میں تجھے کس طرح بچا سکتا ہوں' اگر تو مجھے خیر کی راہ میں خرچ کرتا تو آج میں تجھے نفع پہنچا سکتا تھا' اے ابن آدم! تو مٹی سے پیدا ہوا ہے' چاہے نیکی کر چاہے گناہ تجھے فنا ضرور ہونا ہے' اس گفتگو کے بعد ملک الموت نے اس شخص کی روح قبض کرلی۔

وہب ابن منبہ کہتے ہیں کہ ملک الموت نے ایک ایسے زبردست بادشاہ کی روح قبض کی دنیا میں جس کی شوکت کے ڈنکے بجتے تھے اور جس کی عظمت کے ہر سو چرچے تھے اور اس کی روح کو آسمان پر لے کر پہنچے۔ ملائکہ نے ان سے پوچھا تمہیں کس شخص کی روح قبض کرتے ہوئے زیادہ رحم آیا' ملک الموت نے کہا ایک مرتبہ مجھے ایک ایسی عورت کی روح قبض کرنے کا حکم دیا گیا جو جنگل میں تنہا تھی اور اس نے ایک بچے کو جنم دیا تھا' مجھے اس کی غریب الوطنی اور بچے کی تنہائی کا خیال آیا کہ وہ اس جنگل میں اکیلی ہے کوئی اس کی دیکھ بھال کرنے والا بھی نہیں' فرشتوں نے کہا جس بادشاہ کی روح لے کر تم یہاں آئے ہو وہ یہی بچہ تھا جس پر تم نے

رحم کیا تھا' ملک الموت نے کہا وہ جس پر چاہے کرم فرمائے اور جس پر چاہے رحم کرے' عطاء ابن یسار کہتے ہیں کہ شعبان کی پندرھویں شب میں ملک الموت کو ایک صحیفہ دیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اس سال تمہیں ان سب لوگوں کی روحیں قبض کرنی ہیں' جن کے نام اس صحیفے میں درج ہیں' عطاء کہتے ہیں آدمی درخت لگاتا ہے' نکاح کرتا ہے' عمارتیں بناتا ہے اور اسے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اس کا نام ملک الموت کے صحیفے میں لکھا جاچکا ہے' حسن بصری کہتے ہیں کہ ملک الموت ہر روز تین مرتبہ تمام گھروں کی تلاشی لیتے ہیں اور ہر اس شخص کی روح قبض کرلیتے ہیں جسے یہ دیکھتے ہیں کہ اس نے اپنا رزق وصول کرلیا اور عمر تمام کرلی ہے' جب اس کے مرنے پر اعزہ و اقرباء روتے چلاتے ہیں تو ملک الموت دروازے کے دونوں پہلو تھام کر کہتے ہیں کہ بخدا نہ میں نے اس کا رزق کھایا' نہ اس کی عمر ضائع کی' نہ اس کے کچھ دن کم کئے' میں تو تمہارے گھر میں اسی طرح آتا رہوں گا' یہاں تک کہ تم میں سے ایک بھی باقی نہیں رہے گا' حسن کہتے ہیں بخدا اگر گھر والے ملک الموت کی یہ باتیں سن لیں اور ان کے کھڑے ہونے کی جگہ دیکھ لیں تو بخدا میت پر رونا بھول کر اپنے نفسوں پر رونے بیٹھ جائیں' یزید الرقاشی کہتے ہیں کہ بنی اسرائیل کا ایک ظالم جابر بادشاہ اپنے مکان میں اپنی بیوی کے ساتھ تنہا تھا' اچانک اس نے دیکھا کہ ایک شخص گھر کے دروازے سے اندر چلا آرہا ہے' بادشاہ اسے دیکھ کر آگ بگولا ہوگیا اور اس کی طرف بڑھ کر پوچھا تو کون ہے اور تجھے میرے گھر میں کس نے داخل کیا ہے' آنے والے نے جواب دیا کہ مجھے اس گھر کے مالک نے گھر میں داخل کیا ہے اور میں وہ ہوں جسے اندر داخل ہونے کے لئے کسی رکاوٹ کا سامنا نہیں کرنا پڑتا' نہ میں بادشاہوں سے اجازت لیتا ہوں اور نہ سلاطین کی طاقت سے ڈرتا ہوں' نہ کوئی ظالم اور سرکش آدمی مجھے روک سکتا ہے اور نہ شیطان ملعون میرے راستے کی دیوار بن سکتا ہے' بادشاہ یہ سن کر کانپ اٹھا اور سر کے بل زمین پر گر گیا' اس نے نہایت ذلت و مسکنت کے ساتھ اپنا سر اٹھایا اور کہنے لگا کہ تم ملک الموت ہو' انہوں نے کہا ہاں میں ملک الموت ہوں' اس شخص نے کہا کیا تم مجھے اتنی مہلت دوگے کہ میں تجدید عہد کرلوں۔ ملک الموت نے کہا ہرگز نہیں! اب فرصت کی مدت ختم ہوگئی ہے' تیرے سانس پورے ہوچکے ہیں اور عمر تمام ہوچکی ہے' اب میں تیری بھلائی کے لئے کچھ نہیں کرسکتا' بادشاہ نے پوچھا اب تم مجھے کہاں لے کر جاؤگے' ملک الموت نے جواب دیا تیرے ان اعمال کی طرف جو تو نے آگے بھیج دیئے ہیں اور اس گھر کی طرف جو تو نے اپنے لئے تیار کر رکھا ہے' اس نے کہا میں نے اچھے اعمال آگے نہیں بھیجے اور نہ کوئی اچھا مکان بنایا ہے' ملک الموت نے کہا تب تجھے میں دوزخ میں لے جاؤں گا' جس کی آگ تیری کھال اور گوشت سب کچھ جلاڈالے گی' یہ کہہ کر ملک الموت نے اس کی روح قبض کرلی' بادشاہ کی بے جان لاش زمین پر گر پڑی اور گھر والے رونے چلانے لگے' یزید الرقاشی کہتے ہیں اگر انہیں اپنے انجام کی خبر ہوتی تو وہ اس سے بھی زیادہ روتے چلاتے' اعمش خیثمہ سے روایت کرتے ہیں کہ ملک الموت سلیمان ابن داؤد علیہما السلام کی مجلس میں آئے اور ان کے مصاحبین میں سے ایک شخص کو گھورنے لگے' جب مجلس برخاست ہوگئی تو اس شخص نے حضرت سلیمان سے پوچھا یہ شخص کون تھا جو مجھے اس طرح گھور گھور کر دیکھ رہا تھا' حضرت سلیمان نے جواب دیا یہ ملک الموت تھے' وہ شخص یہ سن کر بہت گھبرایا اور کہنے لگا شاید وہ میری روح قبض کرنا چاہتے ہیں' حضرت سلیمان نے اس سے دریافت کیا اب تم کیا چاہتے ہو' اس شخص نے جواب دیا کہ میں چاہتا ہوں آپ مجھے ان سے بچائیں اور ہوا کو حکم دیں کہ وہ مجھے اڑا کر کہیں دور لے جائے' سلیمان علیہ السلام نے ایسا ہی کیا' تھوڑی دیر بعد ملک الموت دوبارہ مجلس میں آئے' سلیمان علیہ السلام نے ان سے پوچھا کہ تم میرے فلاں مصاحب کو کیوں گھور رہے تھے' ملک الموت نے کہا مجھے اس شخص کو یہاں دیکھ کر حیرت ہورہی تھی' اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا تھا کہ میں ہند کے انتہائی حصے میں اس کی روح قبض کروں' چنانچہ وہ شخص وقت مقررہ پر وہاں پہنچ گیا اور میں نے اس کی روح قبض کرلی۔

سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات شریف : جاننا چاہیے کہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات' وفات' فعل' قول اور تمام احوال میں امت کے لئے اسوۂ حسنہ' ناظرین کے لئے عبرت اور اصحاب فہم کے لئے بصیرت ہے' اس لئے کہ اللہ کے نزدیک آپ سے بڑھ کر کوئی مکرم نہیں تھا' آپ اللہ کے خلیل' حبیب' نجیب' صفی' رسول اور نبی تھے' اس کے باوجود

جب آپ کی عمر شریف پوری ہوئی تو اللہ نے ایک لمحے یا ایک لمحے کی بھی مہلت نہیں دی بلکہ وقت مقررہ پر اپنے ان معزز فرشتوں کو جو لوگوں کی روحیں قبض کرنے کے کام پر مامور ہیں آپ کی روح پر فتوح قبض کرنے کے لئے بھیجا' انہوں نے آپ کی مبارک اور پاکیزہ روح آپ کے اطہر و مقدس جسم سے حاصل کرکے ایسے مکان کی طرف منتقل کردی جو اللہ کے جوار میں سب سے بہتر جگہ ہے اور جہاں رحمت و رضائے خداوندی کا جلوہ ہوتا ہے' آپ اللہ کے محبوب دوست اور برگزیدہ پیغمبر تھے لیکن اس کے باوجود عالم نزع میں آپ کو تکلیف اور کرب کے ایک سخت مرحلے سے گذرنا پڑا' زبان سے آہ نکلی' شوق کے کلمات زبان پر آئے' چہرۂ مبارک کا رنگ متغیر ہوا' پیشانی مبارک عرق آلود ہوئی' اضطراب کی حالت میں دونوں ہاتھوں نے دائیں بائیں گردش کی' آپ کی یہ حالت دیکھ کر وہ لوگ رونے لگے جو اس وقت آپ کے قریب موجود تھے' آپ منصب نبوت پر فائز تھے لیکن کیا اس منصب کی بناء پر حکم الٰہی میں کوئی تبدیلی ہوئی یا آپ کے اہل خانہ کے غم و اندوہ کا خیال کیا گیا یا آپ کی اس لئے رعایت کی گئی کہ آپ دین کے حامی و نصیر اور مخلوق کے بشیر و نذیر تھے؟ نہیں! بلکہ وہ سب کچھ ظہور پذیر ہوا جو حکم الٰہی سے لوح محفوظ میں لکھا ہوا تھا' یہ تھا آپ کا حال' حالانکہ اللہ کے یہاں آپ کا مقام و مرتبہ نہایت بلند ہے' آپ حوض کوثر پر وارد ہونے والے ہیں' آپ ہی سب سے پہلے اپنی قبر سے باہر تشریف لائیں گے' آپ ہی قیامت کے دن گناہگاروں کے لئے شفاعت فرمائیں گے۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ ہم آپ کے حالات مبارکہ سے عبرت حاصل نہیں کرتے اور جو کچھ ہمارے ساتھ پیش آنے والا ہے اس پر یقین نہیں رکھتے بلکہ ہم شہوات میں گرفتار اور معاصی و سیئات میں پڑے رہتے ہیں' ہمیں کیا ہو گیا ہے۔ ہم سید المرسلین' امام المتقین اور حبیب ربّ العالمین کی کیفیت وفات سے نصیحت کیوں نہیں پکڑتے؟ شاید ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہمیں ہمیشہ یہاں رہنا ہے یا ہمیں یہ غلط فہمی ہے کہ ہم اپنی تمام تر بد اعمالیوں کے باوجود اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندے ہیں۔ اگرچہ ہمیں یہ یقین ہے کہ ہم سب کو دوزخ سے گذرنا ہے اور یہ بھی یقین ہے کہ صرف متقین دوزخ میں گرنے سے بچیں گے لیکن ہمیں یہ وہم ہو گیا ہے کہ ہم متقی ہیں اور دوزخ سے بچنا یقینی ہے۔ حالانکہ ہم نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا ہے۔ ہم کسی بھی طرح متقین میں شامل نہیں ہو سکتے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَإِنْ مِنْكُمْ إِلَّا وَارِدُهَا كَانَ عَلَىٰ رَبِّكَ حَتْمًا مَقْضِيًّا ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِينَ اتَّقَوْا وَنَذَرُ الظَّالِمِينَ فِيهَا جِثِيًّا۔ (پ ۱۶' ر ۸' آیت ۷۱-۷۲)

اور تم میں سے کوئی بھی نہیں جس کا اس پر سے گذر نہ ہو۔ یہ آپ کے رب کے اعتبار سے لازم ہے جو پورا ہو کر رہے گا۔ پھر ہم ان لوگوں کو نجات دیں گے جو خدا سے ڈرتے تھے اور ظالموں کو اس میں ایسی حالت میں رہنے دیں گے کہ (مارے غم کے) گھٹنوں کے بل گر پڑیں گے۔

ہر بندے کو یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ ظلم کرنے والوں سے زیادہ قریب ہے یا اصحاب تقویٰ سے' پہلے تم اکابرین سلف کے احوال پر نظر ڈالو کہ وہ توفیق ایزدی میسر آنے کے باوجود خائفین میں سے تھے' پھر اپنے نفس پر نظر ڈالو کہ توفیق سے محرومی کے باوجود غلط فہمی میں مبتلا ہو' پھر سرور کائنات اور سید المرسلین کی سیرت طیبہ میں غور کرو کہ بحیثیت نبی کے آپ کی آخرت محفوظ تھی مگر اس کے باوجود آپ کو دنیا سے رخصت ہونے کے وقت نزع کا کرب ہوا اور جنت ماویٰ کی طرف منتقل ہونے سے پہلے کس قدر سخت مرحلے سے گذرنا ہوا۔

حضرت عبد اللہ ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ ہم اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے حجرۂ طیبہ میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے لئے اس وقت حاضر ہوئے جب فراق کے لمحات قریب آچکے تھے۔ آپ نے ہمیں دیکھا' آپ کی آنکھوں میں آنسو آگئے' پھر آپ نے فرمایا آؤ آؤ' اچھا ہوا تم آگئے' اللہ تعالیٰ تمہیں زندگی عطا کرے' اپنی پناہ میں رکھے اور تمہاری مدد فرمائے' میں تمہیں اللہ سے ڈرنے کی وصیت کرتا ہوں اور تمہارے باب میں اللہ سے وصیت کرتا ہوں' بلاشبہ میں اس کی طرف

سے تمہیں کھلے طور پر ڈرانے والا ہوں' میری وصیت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے اس کے ملک اور اس کے بندوں پر برتری اختیار مت کرو' موت کا وقت قریب آچکا ہے اور اللہ کی طرف' سدرۃ المنتہیٰ کی' جنت الماویٰ اور بھرپور جام کی طرف جانا ہے' پھر میری طرف سے خود اپنے آپ کو اور ان لوگوں کو سلام پہنچاؤ جو میرے بعد تمہارے دین میں داخل ہوں گے (بزار) روایت ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی وفات شریف کے وقت حضرت جبرئیل سے ارشاد فرمایا کہ میرے بعد میری امت کا کون ہوگا؟ اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرئیل سے فرمایا کہ میرے حبیب کو خوشخبری سنادو کہ میں انہیں ان کی امت کے سلسلے میں رسوا نہ کروں گا اور یہ بھی بشارت دیدو کہ حشر کے دن آپ لوگوں میں سب سے پہلے زمین سے اٹھیں گے اور جب سب جمع ہوں گے تو آپ ان کے سردار ہوں گے اور یہ خوشخبری بھی دیدو کہ جب تک آپ کی امت جنت میں داخل نہیں ہوگی۔ تمام امتوں پر جنت حرام رہے گی' (طبرانی' جابرؓ' ابن عباسؓ) حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں حکم دیا کہ ہم سات کنوؤں سے سات مشکیزے پانی منگوا کر آپ کے جسم اطہر کو غسل دیدیں' چنانچہ ہم نے ایسا ہی کیا' اس سے آپ کو کچھ راحت ہوئی' اس کے بعد آپ باہر تشریف لے گئے اور لوگوں کو نماز پڑھائی اور شہدائے احد کے لئے دعائے مغفرت فرمائی' پھر انصار کے سلسلے میں وصیت فرمائی اور ارشاد فرمایا! اے مہاجرین کے گروہ! تم لوگ بڑھتے جارہے ہو اور انصار اپنی اس ہیئت سے نہیں بڑھ رہے ہیں جس پر وہ آج ہیں' یہ لوگ میرے خاص ہیں۔ میں نے انکے پاس آکر پناہ لی' تم ان میں سے اس شخص کا احترام کرنا جو اچھا کرے اور اس شخص سے تجاوز کرنا جو برائی کرے۔ پھر فرمایا ایک بندے کو دنیا میں اور اللہ تعالیٰ کے پاس جو چیز ہے اس میں اختیار دیا گیا ہے۔ چنانچہ بندے نے وہ چیز اختیار کرلی جو اللہ تعالیٰ کے پاس ہے' یہ سن کر حضرت ابوبکر رونے لگے' آپ نے سمجھ لیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ہی متعلق ارشاد فرمارہے ہیں' آپ نے فرمایا اے ابوبکر تسلی رکھو' پھر فرمایا یہ تمام دروازے جو مسجد میں کھلے ہوئے ہیں بند کردینا مگر ابوبکر کا دروازہ مت بند کرنا' اس لئے کہ میں رفاقت میں اپنے نزدیک ابوبکر سے بہتر کسی کو نہیں پاتا۔ (مسند دارمی) حضرت عائشہؓ یہ بھی روایت فرماتی ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے گھر میں میری باری کے دن میں اور میری گود میں انتقال فرمایا اور اللہ تعالیٰ نے آپ کی وفات کے وقت میرے اور آپ کے لعاب دہن کو یکجا فرمایا اور وہ اس طرح کہ میرے پاس میرے بھائی عبدالرحمٰن آئے ان کے ہاتھ میں ایک مسواک تھی' آپ مسواک کی طرف دیکھنے لگے اس سے میں یہ سمجھی کہ شاید آپ کو مسواک پسند آگئی' چنانچہ میں نے عرض کیا کیا میں آپ کے لئے لے لوں' آپ نے اثبات کا اشارہ فرمایا' چنانچہ میں نے عبدالرحمٰن سے مسواک لے کر آپ کے دہن مبارک میں داخل کی' آپ کو وہ سخت معلوم ہوئی' میں نے عرض کیا کیا میں اسے نرم کردوں' آپ نے سر مبارک سے اشارہ فرمایا ہاں! میں نے اسے (دانتوں سے چبا کر) نرم کردیا' آپ کے سامنے پانی کا ایک پیالہ تھا' آپ اپنا دست مبارک اس میں ڈالتے تھے اور فرماتے تھے لا الٰہ الا اللہ موت کے لئے سکرات ہیں' پھر آپ نے اپنا دست مبارک بلند فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ رفیق اعلیٰ' رفیق اعلیٰ' میں نے اپنے دل میں سوچا بخدا اب آپ ہمیں پسند نہ فرمائیں گے (بخاری و مسلم) سعید ابن عبداللہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ جب انصار نے یہ محسوس کیا کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی طبیعت زیادہ ناساز ہوگئی ہے تو انہوں نے مسجد کا طواف شروع کردیا (یہ دیکھ کر) حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ انصار (اضطراب کے عالم میں) مسجد کے اردگرد پھر رہے ہیں اور ڈرتے ہیں پھر فضلؓ حاضر ہوئے اور انہوں نے بھی یہی خبر دی' پھر علیؓ حاضر ہوئے اور انہوں نے بھی یہی بتلایا' تب آپ نے اپنا دست مبارک بڑھایا اور فرمایا لو پکڑو' چنانچہ لوگوں نے اپنے ہاتھوں میں آپ کا دست مبارک لے لیا' پھر آپ نے فرمایا تم لوگ کیا کہتے ہو؟ عرض کیا ہم لوگوں کو آپ کی وفات کا اندیشہ ہے اور آپ کی خدمت میں لوگوں کے اجتماع سے ان کی عورتیں چیخنے چلانے لگی ہیں' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم (یہ سنکر) اٹھے اور حضرت علیؓ کے سہارے باہر تشریف لائے' حضرت ابن عباسؓ آپ کے آگے آگے چل رہے تھے' آپ کا سر مبارک کپڑے سے بندھا ہوا تھا اور آپ گھسیٹ کر قدم رکھ رہے تھے' یہاں تک کہ آپ منبر کی پہلی سیڑھی پر

تشریف فرما ہو گئے' لوگ آپ کی طرف متوجہ ہوئے' آپ نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کی اور ارشاد فرمایا' لوگو! مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم میری موت سے ڈرتے ہو' گویا موت سے نفرت کرتے ہو اور پھر تم اپنے نبی کی موت کا انکار کیوں کرتے ہو' کیا میں نے تمہیں اپنی موت کی خبر نہیں دی تھی اور کیا تمہیں خود تمہارے مرنے کی خبر نہیں پہنچی' کیا مجھ سے پہلے مبعوث ہونے والے انبیاء ہمیشہ زندہ رہے ہیں کہ میں ہمیشہ زندہ رہوں گا' آگاہ رہو! میں اپنے رب سے ملنے والا ہوں اور تم خود بھی اس سے ملنے والے ہو' میں تمہیں وصیت کرتا ہوں کہ جو لوگ پہلے ہجرت کر کے آئے ہیں' ان سے بہتر سلوک کرنا اور میں مہاجرین کو بھی یہ وصیت کرتا ہوں کہ وہ آپس میں اچھی طرح رہیں۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔

وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ۔ (پ ۳۰' ر ۲۸' آیت ۱-۳)

قسم ہے زمانے کی انسان بڑے خسارے میں ہے مگر جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اچھے کام کئے اور ایک دوسرے کو اعتقاد حق کی فہمائش کرتے رہے اور ایک دوسرے کو پابندی کی فہمائش کرتے رہے۔

تمام امور اللہ تعالیٰ کے حکم سے انجام پذیر ہوتے ہیں ایسا نہ ہو کہ کسی امر کی تاخیر تمہیں اس کی تعجیل پر اکسادے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کسی کے جلدی کرنے سے جلدی نہیں کرتا' جو شخص اللہ تعالیٰ پر غالب ہونا چاہے گا اللہ اسے مغلوب کردے گا اور جو اللہ تعالیٰ کو دھوکہ دے گا اللہ تعالیٰ اسے دھوکا دے گا۔

فَهَلْ عَسَیْتُمْ اِنْ تَوَلَّیْتُمْ اَنْ تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ وَتُقَطِّعُوْا اَرْحَامَكُمْ (پ ۲۶' ر ۷' آیت ۲۲)

سو اگر تم کنارہ کش رہو تو تم کو یہ احتمال بھی ہے کہ تم دنیا میں فساد مچادو اور آپس میں قطع رقابت کرو۔

میں تمہیں انصار کے بارے میں خیر کی وصیت کرتا ہوں کیونکہ انہوں نے ہی تم سب سے پہلے مدینہ میں اقامت اختیار کی اور ایمان میں اخلاص حاصل کیا' تم ان کے ساتھ اچھا سلوک کرنا' کیا انہوں نے تمہیں آدھے پھل نہیں دیئے' کیا انہوں نے تمہارے لئے گھروں میں وسعت نہیں کی' کیا انہوں نے تم کو اپنے آپ پر ترجیح نہیں دی حالانکہ وہ خود ضرورت مند تھے' دیکھو! اگر کوئی دو شخصوں پر بھی حکومت پائے تو اسے چاہئے کہ وہ احسان کرنے والے کا احسان قبول کرے اور برائی کرنے والے کی برائی سے درگذر کرے' خبردار ان پر اپنے آپ کو ترجیح مت دینا' آگاہ رہو میں تم سے آگے جارہا ہوں اور تم میرے بعد آنے والے ہو اور تمہارے وعدے کی جگہ حوض ہے (یعنی) میری وہ حوض جس کی وسعت شام کے بصرے اور یمن کے صنعاء کا درمیانی فاصلہ ہے' اس میں کوثر کا آبشار گرتا ہے۔ اس کا پانی دودھ سے زیادہ سفید' مکھن سے زیادہ لطیف اور شہد سے زیادہ شیریں ہے جو اس کا پانی پی لے گا وہ کبھی پیاسا نہ ہو گا' اس کے سنگریزے موتی ہیں اور اس کی مٹی مشک ہے' جو کل کے دن وہاں کھڑا ہونے سے محروم رہا وہ ہر چیز سے محروم رہے گا' دیکھو! جو شخص کل کے دن اس حوض پر میرے پاس آنا چاہے وہ اپنی زبان اور ہاتھ کو مناسب باتوں سے روکے' حضرت عباسؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ! قریش کو بھی کچھ وصیت فرمایئے' آپ نے فرمایا میں قریش کے لئے امر خلافت کی وصیت کرتا ہوں' باقی لوگ قریش کے تابع ہیں' ان کے نیک نیک کے تابع ہیں اور بد بد کے' اے قریش! لوگوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا' اے لوگو! گناہ نعمتیں بدل دیتے ہیں اور قسمتوں میں تغیر کردیتے ہیں' اگر لوگ نیک ہوں گے تو ان کے آئمہ بھی ان کے ساتھ اچھا سلوک کریں گے اور اگر وہ برے ہوں گے تو ان کے ائمہ بھی ان پر ظلم ڈھائیں گے' اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَكَذٰلِكَ نُوَلِّیْ بَعْضَ الظّٰلِمِیْنَ۔ (پ ۸' ر ۲' آیت ۱۳۰)

اور اسی طرح ہم بعض کفار کو بعض کے قریب رکھیں گے۔

حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ روایت کرتے ہیں کہ سرکار دو عالم نے حضرت ابوبکر الصدیق سے ارشاد فرمایا اے ابوبکر کچھ پوچھو!

انہوں نے عرض کیا! یا رسول اللہ کیا اجل قریب آگئی؟ آپ نے فرمایا اجل قریب آئی اور لٹک آئی' ابو بکر نے عرض کیا یا رسول اللہ! اللہ تعالیٰ کی نعمتیں آپ کو مبارک ہوں ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ آپ کہاں تشریف لے جائیں گے؟ فرمایا! اللہ تعالیٰ کی طرف' سدرۃ المنتہیٰ کی طرف' پھر جنت الماویٰ' ملاء اعلا' جام لبریز' رفیق اعلا اور خوشگوار زندگی کی جانب' حضرت ابو بکر نے عرض کیا یا رسول اللہ آپ کو غسل کون دے گا؟ فرمایا میرے خاندان کے وہ مرد جو قریب تر ہوں۔ پھر جو ان سے ذرا دور ہوں' حضرت ابو بکر نے عرض کیا یا رسول اللہ! ہم آپ کو کن کپڑوں میں کفنائیں؟ فرمایا میرے ان کپڑوں میں' یمانی حلے اور مصر کے سفید کپڑے میں' حضرت ابو بکر نے عرض کیا ہم آپ پر کس طرح نماز (جنازہ) پڑھیں؟ ہم لوگ رونے لگے' سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم بھی روئے' اس کے بعد آپ نے فرمایا بس چپ ہو جاؤ' اللہ تعالیٰ تمہاری مغفرت فرمائے اور تمہارے نبی کی طرف سے تمہیں جزائے خیر عطا فرمائے' جب تم مجھے غسل دیکر اور کفنا کر فارغ ہو جاؤ تو مجھے میرے اس حجرے میں میری قبر کے کنارے میری چارپائی پر لٹا دینا' پھر کچھ دیر کے لئے تنہا چھوڑ دینا' سب سے پہلے مجھ پر اللہ تعالیٰ نماز پڑھیں گے وہ اور اس کے فرشتے تم پر رحمت بھیجتے رہتے ہیں' پھر اللہ تعالیٰ ملائکہ کو میرے اوپر نماز پڑھنے کی اجازت دیں گے' چنانچہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سے پہلے جبرئیل میرے پاس آئیں گے اور میرے اوپر نماز پڑھیں گے' پھر میکائیل پڑھیں گے پھر اسرافیل پھر ملک الموت بہت سے لشکروں کے ساتھ' پھر تمام ملائکہ (اللہ ان سب پر اپنی رحمت نازل فرمائے) پھر تم لوگ ٹولی بنا بنا کر آنا اور مجھ پر انفرادی اور اجتماعی طور پر صلوٰۃ و سلام کہنا' مجھے میری تعریف کر کے یا چیخ کر چلا کر ایذا مت دینا' تم میں سے پہلے امام نماز پڑھے' پھر میرے گھر کے افراد جو قریب تر ہوں پھر دور کے اہل خاندان' مردوں کے بعد عورتوں کی جماعتیں پھر بچے' حضرت ابو بکر نے دریافت کیا کہ قبر مبارک کے اندر کون اترے' آپ نے فرمایا کہ میرے خاندان کے کچھ لوگ جو قریب تر ہوں' بہت سے فرشتوں کے ساتھ تم انہیں دیکھ نہیں پاؤ گے اور وہ تمہیں دیکھیں گے' اب یہاں سے اٹھو اور میرے بارے میں بعد کے لوگوں کو بتلاؤ' (طبقات ابن سعد) عبد اللہ ابن زمعہ روایت کرتے ہیں' حضرت بلال ربیع الاول کی ابتدائی تاریخوں میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور نماز کی اطلاع دی' آپ نے فرمایا ابو بکر سے نماز پڑھانے کے لئے کہو۔ ابن زمعہ کہتے ہیں کہ میں باہر نکلا' دروازے کے سامنے چند لوگوں کے ساتھ حضرت عمرؓ موجود تھے' میں نے حضرت عمرؓ سے کہا کہ اے عمر! آپ کھڑے ہو جائیں اور لوگوں کو نماز پڑھا دیں' حضرت عمرؓ نے نماز کی نیت باندھی اور اللہ اکبر کہا کیونکہ آپ کی آواز بلند تھی' اس لئے اللہ اکبر کہنے کی آواز سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی سنی اور فرمایا ابو بکر کہاں ہیں' عمر کا نماز پڑھانا نہ اللہ کو پسند آئے گا اور نہ مسلمانوں کو' آپ نے یہ جملہ تین مرتبہ ارشاد فرمایا' ابو بکر سے کہو کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائیں' حضرت عائشہؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ! ابو بکر نرم دل انسان ہیں اگر وہ آپ کی جگہ کھڑے ہوئے تو ان پر گریہ غالب آجائے گا' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا کہ تم حضرت یوسف کے ساتھ والی ہو' ابو بکر سے کہو کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائیں' راوی کہتے ہیں کہ عمر کے نماز پڑھانے کے بعد وہی نماز حضرت ابو بکر نے دوبارہ پڑھائی' حضرت عمر عبد اللہ ابن زمعہؓ سے کہا کرتے تھے کہ کم بخت تو نے میرے ساتھ یہ کیا ظلم کیا' بخدا اگر مجھے یہ خیال نہ ہوتا کہ تجھے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے تو میں کبھی نماز نہ پڑھاتا' عبد اللہ کہتے ہیں کہ میں نے اس وقت آپ سے بہتر کسی کو نہ پایا' حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں نے حضرت ابو بکرؓ کی طرف سے اس لئے عذر کیا تھا کہ آپکو دنیا کی رغبت نہ تھی۔ نیز خلافت میں خطرہ اور ہلاکت بھی ہے' مگر جسے اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے اور مجھے یہ ڈر بھی تھا کہ لوگ ہرگز یہ بات پسند نہیں کریں گے کہ آپ کی حیات میں کوئی بھی آپ کی جگہ نماز پڑھائے' الا یہ کہ خدا ہی اس بات کو چاہے' حضرت ابو بکر کے نماز پڑھانے سے لوگ حسد کریں گے اور ان سے سرکشی اختیار کریں اور برا بھلا کہیں گے لیکن ہوتا وہی ہے جو اللہ چاہتا ہے' اللہ نے انہیں دنیا و دین کی ہر اس بات سے محفوظ رکھا جس سے میں ڈرا کرتی تھی' (ابوداؤد نحوہ مختصراً)

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جس دن آپ نے دنیا سے پردہ فرمایا اس دن ابتدائی وقت میں آپ کی طبیعت ہلکی تھی' لوگ یہ دیکھ

کر خوش خوش اپنے گھر چلے گئے اور اپنی ضروریات میں مشغول ہو گئے' سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس صرف عورتیں رہ گئیں' ہم اس روز جس قدر پُرامید اور خوش تھے اتنے پہلے کبھی نہ ہوئے تھے' سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے (عورتوں سے) فرمایا تم لوگ میرے پاس سے جاؤ' فرشتہ میرے پاس آنے کی اجازت مانگ رہا ہے' میرے علاوہ تمام عورتیں باہر چلی گئیں' آپ کا سر مبارک میری گود میں تھا' آپ اٹھ کر بیٹھ گئے' میں بھی کمرے کے ایک گوشے میں ہو گئی' آپ نے فرشتے سے دیر تک سرگوشی کی پھر آپ نے مجھے آواز دی اور دوبارہ میری گود میں اپنا سر مبارک رکھا' آپ نے عورتوں سے اندر آنے کے لئے فرمایا' میں نے عرض کیا یہ حضرت جبرئیل علیہ السلام تو نہ تھے' آپ نے فرمایا' اے عائشہ صحیح کہتی ہو' یہ ملک الموت تھے جو میرے پاس آئے تھے اور کہہ رہے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے آپ کی خدمت میں بھیجا ہے اور حکم دیا ہے کہ میں آپ کی اجازت کے بغیر آپ کی خدمت میں حاضر نہ ہوں اور اگر آپ اجازت نہ دیں تو واپس چلا جاؤں اور اگر اجازت دیں تو حاضر ہوں اور اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں آپ کی روح اس وقت تک قبض نہ کروں جب تک آپ قبض کرنے کی اجازت نہ دیں' اب آپ حکم فرمائیں؟ میں نے کہا مجھ سے دور ہو یہاں تک کہ جبرئیل میرے پاس آئے' اب جبرئیل کے آنے کا وقت ہو گیا ہے' حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے سامنے ایسا معاملہ رکھا کہ اس کا ہمارے پاس نہ کوئی جواب تھا اور نہ کسی قسم کی رائے تھی' چنانچہ ہم نے سکوت اختیار کیا اور ہمیں ایسا محسوس ہوا کہ گویا کوئی سخت آواز ہمیں پریشان کر گئی ہے' گھر والوں میں سے بھی کوئی معاملے کی اہمیت کے پیش نظر کچھ نہیں بولا' اس امر کی ہیبت ہم سب کے دلوں پر چھا گئی' حضرت عائشہ کہتی ہیں اسی وقت حضرت جبرئیل علیہ السلام تشریف لائے اور انہوں نے سلام کیا' میں نے ان کی آہٹ محسوس کر لی' گھر والے حجرے سے باہر چلے گئے اور وہ اندر تشریف لے آئے اور کہنے لگے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو سلام کہتا ہے اور آپ کی مزاج پُرسی کرتا ہے حالانکہ وہ آپ سے زیادہ آپ کی حالت سے باخبر ہے لیکن وہ مزاج پرسی کر کے آپ کے شرف و کرامت میں اضافہ کرنا چاہتا ہے اور مخلوق پر آپ کی شرافت و کرامت مکمل کرنا چاہتا ہے اور اسے آپ کی امت کے لئے سنت بنانا چاہتا ہے سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں درد محسوس کرتا ہوں' حضرت جبرئیل علیہ السلام نے فرمایا آپ کو خوشخبری ہو اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ آپ کو اس مقام تک پہنچائے جو اس نے آپ کے لئے تیار کر رکھا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے جبرئیل! ملک الموت میرے پاس آئے تھے اور اجازت مانگ رہے تھے (آپ نے پوری گفتگو کی نقل فرمائی) حضرت جبرئیل علیہ السلام نے فرمایا یا محمد! آپ کا رب آپ کا مشتاق ہے اور جو کچھ وہ چاہتا ہے وہ آپ کو معلوم ہو چکا ہے' بخدا ملک الموت نے آج تک کسی سے اجازت نہیں لی اور نہ آئندہ کبھی لیں گے مگر کیونکہ اللہ آپ کے شرف کی تکمیل چاہتا ہے (اس لئے اجازت لی ہے) اور آپ کا مشتاق ہے' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تو اب تم ملک الموت کے آنے تک یہاں سے مت جانا اس کے بعد آپ نے عورتوں کو اندر بلالیا اور فرمایا اے فاطمہؓ میرے قریب آؤ' وہ آپ کے اوپر جھک گئیں آپ نے ان کے کان میں کچھ فرمایا' حضرت فاطمہ نے سر اٹھایا تو ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ آپ نے دوبارہ انہیں اپنے قریب آنے کے لئے فرمایا' وہ آپ کے اوپر جھک گئیں۔ آپ نے ان کے کان میں کچھ فرمایا اس کے بعد انہوں نے سر اٹھایا تو ہنس رہی تھیں' اور ہنسی کے مارے بات نہیں کر پا رہی تھیں' ہمیں ان کی یہ حالت دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی' بعد میں ہمارے پوچھنے پر انہوں نے بتلایا کہ پہلی مرتبہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا تھا میں آج انتقال کرنے والا ہوں' میں یہ سن کر رونے لگی' دوبارہ یہ فرمایا کہ میں نے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کی ہے کہ وہ میرے اہل و عیال میں سب سے پہلے تمہیں مجھ سے ملائے اور میرے ساتھ رکھے' میں یہ سن کر ہنسنے لگی' پھر حضرت فاطمہؓ نے اپنے دونوں بیٹوں کو آپ کے قریب کیا' آپ نے انہیں پیار کیا' حضرت عائشہؓ کہتی ہیں ملک الموت آئے انہوں نے سلام کیا اور اجازت عطا فرمائی' ملک الموت نے اندر آکر عرض کیا اے محمدؐ! آپ ہمیں کیا حکم دیتے ہیں' آپ نے فرمایا مجھے میرے رب سے ابھی ملادو' ملک الموت نے عرض کیا آج ہی ملادوں گا' آپ کا رب آپ کا مشتاق ہے اور اسے آپ کے علاوہ کسی کا اتنا خیال نہیں ہے اور مجھے کسی کے پاس آپ کے علاوہ اجازت کے بغیر

جانے سے نہیں روکا لیکن آپ کی ساعت آپ کے سامنے ہے۔ یہ کہہ کر وہ چلے گئے' حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں حضرت جبرئیلؑ آئے اور سلام کر کے کہنے لگے یا رسول اللہ یہ میرا آخری مرتبہ آنا ہے' آج کے بعد میں کبھی زمین پر نہیں اتروں گا' وحی لپیٹ دی گئی ہے اور دنیا بھی تہہ کر دی گئی ہے' مجھے دنیا میں آپ کے علاوہ کسی سے حاجت نہیں تھی اور نہ آپ کی خدمت میں حاضری کے علاوہ کوئی کام تھا' اب میں اپنی جگہ ٹھہرا رہوں گا حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ اس ذات کی قسم جس نے محمد کو حق کے ساتھ مبعوث کیا گھر میں کسی کو تاب سخن نہ تھی اور حضرت جبرئیل کی گفتگو کی ہیبت اور خوف ہم لوگوں پر اس قدر حاوی تھا کہ ہم مردوں کو بھی بلا نہ پا رہے تھے پھر میں سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچی اور آپ کا سر مبارک اپنی گود میں رکھ لیا یہاں تک کہ آپ پر بے ہوشی طاری ہونے لگی اور پیشانی مبارک پر پسینے کے قطرے نمودار ہوئے اور اس قدر پسینہ بہا کہ میں نے کسی انسان سے اتنا پسینہ بہتا ہوا نہیں دیکھا' میں اپنی انگلی سے آپ کا پسینہ پونچھ رہی تھی' آپ کے پسینے میں جس قدر خوشبو تھی اس قدر خوشبو میں نے کسی چیز میں نہیں پائی' جب آپ کو بے ہوشی سے کچھ افاقہ ہوتا تھا تو میں کہتی تھی میرے ماں باپ' میری جان اور رشتے دار سب آپ پر قربان ہوں' آپ کی پیشانی سے اس قدر پسینہ کیوں نکل رہا ہے' آپ نے ارشاد فرمایا' اے عائشہ مومن کی جان پسینے کی راہ سے نکلتی ہے اور کافر کی جان باچھوں کی راہ سے گدھے کی جان کی طرح نکلتی ہے' اس وقت ہم گھبرا گئے اور ہم نے اپنے گھر والوں کو بلانے کے لئے بھیجا' سب سے پہلے جو شخص ہمارے پاس آیا وہ میرا بھائی تھا جس کو میرے والد نے میرے پاس بھیجا تھا' مگر وہ آپ کو دیکھ نہیں پایا کیونکہ اس کے آنے سے پہلے ہی سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی روح پاک جسم اطہر کا ساتھ چھوڑ چکی تھی اور اللہ ہی نے مردوں کو آنے سے روکا تھا کیونکہ اللہ نے آپ کا معاملہ حضرت جبرئیل اور میکائیل کے سپرد کر دیا تھا جب آپ پر بے ہوشی طاری ہوتی تو آپ فرماتے بلکہ رفیق اعلا' اس سے معلوم ہوتا تھا گویا آپ کو بار بار اختیار دیا جا رہا ہے' جب آپ کو کلام کی سکت ہوتی تو آپ ارشاد فرماتے نماز نماز' تم لوگ نماز جماعت سے پڑھو گے تو ہمیشہ متحد رہو گے' نماز نماز' آپ بار بار نماز کی وصیت فرماتے رہے' یہاں تک کہ نماز نماز کہتے ہوئے جان جان آفریں کے سپرد فرمائی۔ (طبرانی کبیر' ابن عباس' جابر باختلاف)

حضرت عائشہؓ کی ایک روایت میں ہے کہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے چاشت اور دوپہر کے درمیانی وقت میں انتقال فرمایا (ابن عبدالبر) حضرت فاطمہؓ فرماتی ہیں کہ پیر کے دن سے مجھے مصیبت ملی' بخدا امت کو اس دن بڑے مصیبت ہوا کرے گی' حضرت ام کلثوم نے کوفہ میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے انتقال پر فرمایا کہ دو شنبے میں میرے لئے خیر نہیں ہے' اس دن سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات پائی' حضرت علی شہید ہوئے اور میرے شوہر شہید ہوئے' اس لئے اس دن سے مجھے خیر نہیں ملا'۔

حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ جب سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات پائی تو لوگ مصیبت میں پڑ گئے یہاں تک کہ رونے کی آواز بلند ہوئی' آپ کو فرشتوں نے آپ کے کپڑوں میں ڈھانپ دیا' لوگوں کا مختلف حال ہو گیا' بعض لوگوں نے آپ کی وفات کی تکذیب کی بعض گونگے ہو گئے اور عرصہ دراز تک نہ بولے اور بعض مہمل باتیں کرنے لگے' بعض لوگوں کی عقل باقی رہی' بعض بیٹھے کے بیٹھے رہ گئے' حضرت عمر ابن الخطاب ان لوگوں میں تھے جنہوں نے آپ کی وفات کو جھٹلایا' علیؓ ان لوگوں میں سے تھے جو بیٹھے رہ گئے اور عثمانؓ گونگے ہو گئے تھے' حضرت عمرؓ لوگوں کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے انتقال نہیں فرمایا' اللہ تعالیٰ انہیں واپس فرما دے گا اور ان منافقین کے ہاتھ پاؤں کاٹ ڈالے گا جو سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے موت کی تمنا کرتے ہیں' ہمارے حضور سے اللہ نے ایسا ہی وعدہ کیا ہے جیسا حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کیا تھا' اب وہ تمہارے پاس آنے والے ہیں' ایک روایت میں ہے کہ حضرت عمر نے یہ کہا کہ لوگوں کو سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کچھ کہنے سے اپنی زبان کو روکو' بخدا آپ نے وفات نہیں پائی اب اگر کسی نے ایسی بات کہی تو میں تلوار سے اس کی گردن اڑا دوں گا' حضرت علیؓ گھر میں بیٹھے رہ گئے' حضرت عثمانؓ کسی سے کچھ نہ بولتے تھے' لوگ ان کا ہاتھ پکڑ لاتے تھے اور لے جاتے تھے کسی مسلمان کا حال ایسا نہیں تھا جیسا حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عباسؓ کا تھا' اللہ تعالیٰ نے ان دونوں حضرات کو توفیق اور راستی عطا فرمائی تھی اگرچہ

لوگوں نے صرف حضرت ابوبکرؓ کے کہنے کی رعایت کی' حضرت عباسؓ لوگوں کے پاس تشریف لائے اور کہنے لگے خدائے وحدہٗ لاشریک کی قسم سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے موت کا ذائقہ چکھا ہے اور آپ اپنی زندگی میں ارشاد فرمایا کرتے تھے۔(۱)

اِنَّکَ مَیِّتٌ وَّاِنَّھُمْ مَّیِّتُوْنَ ثُمَّ اِنَّکُمْ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ عِنْدَ رَبِّکُمْ تَخْتَصِمُوْنَ (پ ۲۳' ر ۱۷' آیت ۳۰-۳۱)

آپ کو بھی مرنا ہے اور انہیں بھی مرنا ہے پھر قیامت کے روز مقدمات اپنے رب کے سامنے پیش کرو گے۔

حضرت ابوبکر الصدیق اس وقت قبیلہ حرث بنو الخزرج میں تھے جب آپ کو سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے حادثۂ وفات کی اطلاع ہوئی آپ تشریف لائے۔ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی اور آپ کے اوپر جھک کر بوسہ دیا' اس کے بعد فرمایا میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں یا رسول اللہ! اللہ تعالیٰ آپ کو دوبارہ موت نہیں دے گا' بخدا آپ وفات پاچکے ہیں' پھر لوگوں کے پاس تشریف لائے اور ارشاد فرمایا' اے لوگو! جو شخص محمد کی عبادت کرتا تھا تو محمد انتقال فرماچکے ہیں اور جو ربّ محمد کی عبادت کرتا تھا تو وہ زندہ ہے مرے گا نہیں' اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِہِ الرُّسُلُ اَفَاِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰی اَعْقَابِکُمْ وَمَنْ یَّنْقَلِبْ عَلٰی عَقِبَیْہِ فَلَنْ یَّضُرَّ اللّٰہَ شَیْئًا (پ ۴' ر ۶' آیت ۱۴۴)

اور محمد نرے رسول ہی تو ہیں آپ سے پہلے اور بھی بہت سے رسول گذر چکے ہیں' سو اگر آپ کا انتقال ہوجاوے یا آپ شہید ہی ہوجائیں تو کیا تم الٹے پھر جاؤ گے اور جو شخص الٹا پھر بھی جاوے گا تو خدا تعالیٰ کا کوئی نقصان نہ کرے گا۔

اس وقت لوگوں کا حال ایسا ہوا گویا انہوں نے یہ آیت اسی دن سنی ہے (بخاری و مسلم' عائشہؓ) ایک روایت میں ہے کہ جب حضرت ابوبکر کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی اطلاع ہوئی تو آپ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے حجرۂ مبارکہ میں درود پڑھتے ہوئے تشریف لائے' اس حال میں کہ آپ کی آنکھوں سے اشک بہہ رہے تھے اور شدت لرزش سے دانت بج رہے تھے اس کے باوجود آپ قول و فعل میں مضبوط تھے' چنانچہ آپ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے جسد مبارک پر جھکے' آپ کے چہرۂ مبارک پر سے کپڑا ہٹایا۔ آپ کی پیشانی اور رخساروں کو بوسہ دیا' آپ کے چہرۂ مبارک پر ہاتھ پھیرتے جاتے تھے اور روتے ہوئے کہتے جاتے تھے کہ میرے ماں باپ' میری جان اور گھربار سب کچھ آپ پر فدا ہو' آپ زندہ بھی اچھے تھے اور انتقال فرماکر بھی اچھے ہیں' آپ کی وفات سے وہ بات ختم ہوگئی جو دوسرے انبیاء کی وفات سے ختم نہیں ہوئی تھی' یعنی نبوت' آپ کا مرتبہ ناقابل بیان ہے' رونے سے برتر ہے' آپ مخصوص ہوئے تو ایسے کہ سب کے لئے ذریعۂ تسلی بن گئے اور عام ہوئے تو ایسے کہ ہم سب آپ کے باب میں برابر ہوگئے' اگر آپ کی وفات آپ کے اختیار سے ہوتی تو ہم مارے غم کے اپنے آپ کو ہلاک کرڈالتے اور اگر آپ نے ہمیں رونے سے منع نہ فرمایا ہوتا تو ہم آپ کے غم میں آنکھوں کا سارا پانی بہادیتے لیکن جو بات ہم خود سے دور نہیں کرسکتے وہ جدائی اور فراق کا رنج ہے' اے اللہ! تو یہ باتیں ہمارے حضور تک پہنچادے' اے محمد! آپ اپنے پروردگار کے پاس ہمیں یاد رکھیں اور ہمیں اپنے دل میں جگہ دیں' اگر آپ اپنے پیچھے سکون نہ چھوڑ جاتے تو کون تھا جو آپ کی جدائی کی وحشت سے نجات پاتا' اے اللہ! اپنے نبی تک ہمارا حال پہنچادے اور آپ کی (یاد اور اتباع کو) ہم میں محفوظ فرما (ابن ابی الدنیا' ابن عمرؓ) حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ جب حضرت ابوبکر الصدیق حجرۂ مبارکہ میں تشریف لائے اور آپ نے درود پڑھا' آپ کی ثناء کی تو گھر والوں نے زور سے رونا شروع کیا جس کی آواز باہر تک سنی گئی' جیسے ہی حضرت ابوبکر کچھ فرماتے گھر والوں کے شور میں اضافہ ہوجاتا' ان کا گریہ کسی طرح رکتا ہی نہیں تھا' یہاں تک کہ ایک شخص دروازے پر آیا اور اس نے گھر والوں کو سلام کرکے یہ آیت پڑھی۔

---

(۱) مجھے اس روایت کی اصل نہیں ملی۔

كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ (پ ' ر ' آیت)
ہر نفس کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔

اور کہنے لگا کہ اے گھر والو! اللہ ہر جانے والے کا خلیفہ ہے اور ہر رغبت کے لئے ملتا ہے اور ہر خوف کے لئے نجات ہے' بس اللہ ہی سے امید رکھو' اسی پر اعتماد رکھو' جب لوگوں نے یہ آواز سنی تو عجیب معلوم ہوئی۔ سب گھر والے یہ آواز سن کر چپ ہو گئے' جب رونے کا سلسلہ منقطع ہو گیا تو آواز بھی معدوم ہو گئی' کسی نے باہر جا کر دیکھا کوئی موجود نہ تھا' گھر والے پھر رونے لگے' دوبارہ کسی نے جس کی آواز معروف نہیں تھی ان الفاظ میں خطاب کیا' اے گھر والو اللہ کا ذکر کرو اور ہر حال میں اس کی حمد و ثناء بیان کرو تاکہ تم مخلصین میں سے ہو جاؤ' اللہ تعالیٰ کے پاس ہر مصیبت کے لئے راحت ہے اور ہر مرغوب چیز کا عوض ہے' بس اللہ ہی کی اطاعت کرو' اسی کے احکام پر عمل کرو' حضرت ابوبکر نے فرمایا یہ دونوں خضر اور الیاس علیہما السلام تھے اور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے جنازے پر حاضر ہوئے تھے (ابن ابی الدنیا' انس)

قعقاع ابن عمرو نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبہ کی پوری تفصیل بیان کی ہے۔ فرماتے ہیں کہ حضرت ابوبکر الصدیق خطبے کے لئے کھڑے ہوئے اور ایسا خطبہ دیا کہ لوگ بے اختیار ہو کر روتے رہے' ان کے خطبے کا بیشتر حصہ درود و سلام کے مضامین پر مشتمل تھا' ابتدا میں آپ نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء بیان کی اور کہا میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے' وہ یکتا ہے' اس نے اپنا وعدہ سچا کیا' اس نے اپنے بندے کی مدد کی اور تنہا کفار کے لشکروں کو شکست دی اور یہ بھی گواہی دیتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندے' اس کے رسول اور خاتم الانبیاء ہیں اور یہ بھی گواہی دیتا ہوں کہ کتاب ایسی ہی ہے جیسی اتری' دین ایسا ہی ہے جیسے شروع ہوا اور حدیث ایسی ہی ہے جیسی بیان فرمائی اور قول ایسا ہی ہے جیسا کہ فرمایا اور اللہ تعالیٰ کھلا ہوا حق ہے' اے اللہ! رحمت نازل کر محمد پر جو تیرے بندے' تیرے رسول' تیرے نبی' تیرے حبیب' تیرے امین' تیرے منتخب اور برگزیدہ ہیں' ایسی رحمت نازل کر کہ تو نے اپنی مخلوق میں سے کسی پر نازل نہ کی ہو' اے اللہ! اپنی رحمتیں' عفو و کرم اور برکتیں سید المرسلین' خاتم النبیین' امام المتقین کے ساتھ مخصوص فرما جو قائد خیر' امام خیر اور رسول رحمت ہیں۔ اے اللہ تو ان کا قرب زیادہ کر' ان کی حجت بڑی کر' ان کا مقام بلند کر اور انہیں ایسے مقام محمود پر مبعوث فرما جس پر اولین و آخرین سب رشک کریں اور آپ کے مقام محمود پر فائز ہونے سے قیامت کے دن ہمیں نفع پہنچا اور دنیا و آخرت میں آپ کے عوض تو ہمارے درمیان رہ اور آپ کو جنت میں درجے اور وسیلے پر پہنچا' اے اللہ محمد اور آل محمد پر اپنی رحمت اور برکت نازل فرما۔ جیسا کہ تو نے حضرت ابراہیم علیہ السلام پر اپنی رحمت و برکت نازل فرمائی۔ بلاشبہ تو لائق تعریف اور بزرگ ہے اے لوگو! جو شخص محمد کی عبادت کرتا تھا سو آپ کا انتقال ہو چکا ہے اور جو اللہ کی عبادت کرتا تھا سو اللہ تعالیٰ زندہ ہے مرا نہیں ہے' اللہ تعالیٰ نے سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے باب میں پہلے ہی تم کو آگاہ کر دیا تھا۔ اس لئے تم آپ کو بے صبری سے مت پکارو' اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے جو چیز تمہارے پاس ہے اس کے بجائے وہ چیز پسند فرمائی جو اس کے پاس ہے۔ اپنا ثواب عطا کرنے کے لئے انہیں اپنے پاس بلایا اور تم میں اپنی کتاب اور اپنے نبی کی سنت کو قائم مقام بنایا جو شخص ان دونوں پر کاربند ہو گا وہ عارف ہو گا اور جو شخص ان دونوں میں فرق کرے گا وہ اس آیت شریفہ کا منکر ہو گا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ (پ ۵' ر ۱۷' آیت ۳۵)
اے ایمان والو! انصاف پر خوب قائم رہنے اور اللہ کے لئے گواہی دینے والے رہو۔

تمہیں شیطان تمہارے نبی کی وفات سے غافل نہ کر دے اور تمہیں تمہارے دین سے گمراہ نہ کر دے' تم شیطان پر خیر کے ساتھ جلدی کرو اس طرح تم اسے عاجز کر دو گے' اسے مہلت نہ دو ورنہ وہ تم سے آملے گا اور تمہیں فتنے میں ڈال دے گا' حضرت

عبداللہ ابن عباس کہتے ہیں کہ حضرت ابوبکر اپنے خطبے سے فارغ ہوئے تو حضرت عمر سے ارشاد فرمایا اے عمر مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم یہ کہتے ہو کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات نہیں پائی' کیا تمہیں یاد نہیں کہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فلاں دن یہ ارشاد فرمایا تھا اور فلاں دن یہ بات ارشاد فرمائی تھی اور اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں فرمایا ہے۔

اِنَّکَ مَیِّتٌ وَّاِنَّھُمْ مَّیِّتُوْنَ۔ (پ ۲۳' ر ۱۷' آیت ۳۰-۳۱)

آپ کو بھی مرنا ہے اور انہیں بھی مرنا ہے۔

حضرت عمر نے فرمایا بخدا مجھے معیبت کی وجہ سے ایسا محسوس ہوا گویا میں نے آج سے پہلے یہ آیت نہیں سنی تھی۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ کتاب حق ہے جیسی نازل ہوئی ہے اور حدیث حق ہے جیسی بیان کی گئی ہے اور اللہ زندہ ہے' مرے گا نہیں' ہم اللہ کے لئے ہیں اور اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں' اللہ تعالیٰ کی رحمتیں اس کے رسول پر نازل ہوں اور ہم جدائی کا ثواب اللہ کے پاس پاتے ہیں' یہ کہہ حضرت عمرؓ حضرت ابوبکرؓ کے قریب جاکر بیٹھ گئے' حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جب لوگ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی نعش مبارک کو غسل دینے کے لئے جمع ہوئے تو آپس میں کہنے لگے کہ بخدا ہمیں معلوم نہیں کہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کو کیسے غسل دیں' آیا آپ کے کپڑے اتار کر غسل دیں جیسے ہم اپنے مردوں کو نہلاتے ہیں یا آپ کے کپڑوں ہی میں غسل دیں' ابھی اسی تردّد میں تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر نیند نازل فرمائی' یہاں تک کہ ان میں کوئی شخص ایسا نہیں تھا جو اپنی داڑھی سینے پر ڈالے سویا نہ ہو' پھر کسی کہنے والے نے کہا معلوم نہیں وہ کون تھا کہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کو انہی کپڑوں میں غسل دو جو آپ پہنے ہوئے ہیں' یہ سن کر سب لوگ بیدار ہوگئے اور انہوں نے سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کی قمیص ہی میں غسل دیا' جب غسل سے فارغ ہوگئے تو آپ کو کفن پہنایا گیا' حضرت علی کرم اللہ وجہہ کہتے ہیں کہ ہم نے آپ کی قمیص نکالنے کا ارادہ کیا' اچانک آواز آئی' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کپڑے مت اتارو' چنانچہ ہم نے آپ کو قمیص پہنے ہوئے نہلایا' جس طرح اپنے مردوں کو لٹاکر نہلاتے ہیں' اگر ہم کسی عضو کو الٹنا پلٹنا چاہتے تھے تو کسی دشواری کے بغیر اس کا رخ تبدیل ہوجاتا تھا' یہاں تک کہ ہم اس عضو کو غسل دے کر فارغ ہوجاتے تھے۔ غسل کے دوران ہم پورے گھر میں ہوا کی سی سنسناہٹ محسوس کرتے تھے اور ہمیں یہ آواز سنائی دیتی تھی کہ رسول اللہ کے ساتھ نرمی کرو۔ اس لئے کہ تمہیں کچھ کرنا نہیں پڑے گا یہ تھے سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے کچھ واقعات۔ آپ کے بعد نہ بالوں سے بنا ہوا کوئی کپڑا باقی رہا اور نہ اون کا' سب آپ ہی کے ساتھ دفن ہوگئے۔

ابوجعفر کہتے ہیں کہ قبر شریف میں لحد کے اندر آپ کا بستر اور چادر بچھائی گئی اور اس کے اوپر ان کپڑوں کا فرش کیا گیا جو آپ پہنا کرتے تھے۔ پھر آپ کفن میں لپیٹ کر اس میں لٹائے گئے' گویا آپ نے اپنی وفات کے بعد کوئی مال نہیں چھوڑا اور نہ اپنی زندگی میں اینٹ پر اینٹ اور بانس پر بانس رکھا' آپ کی وفات میں مسلمانوں کے لئے مکمل عبرت اور اسوۂ حسنہ ہے۔

حضرت ابوبکر الصدیقؓ کی وفات : جب حضرت ابوبکرؓ کی وفات کا وقت قریب آیا تو حضرت عائشہؓ آئیں اور آپ نے یہ شعر پڑھا۔

لَعَمْرُکَ مَا یُغْنِی الثَّرَاءُ عَنِ الْفَتٰی۔ اِذَا حُشْرِجَتْ یَوْمًا وَضَاقَ بِھَا الصَّدْرُ

(خدا کی قسم' دولت آدمی کے کام نہیں آتی' جب سانس بولتا ہے اور سینہ تنگ ہوجاتا ہے)

یہ سن کر آپ نے اپنا چہرہ کھول دیا اور فرمایا ایسا مت کہو بلکہ یوں کہو۔

وَجَاءَتْ سَکْرَۃُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ذٰلِکَ مَا کُنْتَ مِنْہُ تَحِیْدُ (پ ۲۶' ر ۱۵' آیت ۱۹)

اور موت کی سختی آپہنچی حق کے ساتھ یہ وہ چیز ہے جس سے تو بدکتا تھا۔

میرے یہ دونوں کپڑے دیکھو' مجھے ان دونوں میں غسل دینا اور انہی دونوں کپڑوں میں کفنانا اس لئے کہ نئے کپڑے کی ضرورت مردوں کی بہ نسبت زندوں کو زیادہ ہے' حضرت عائشہؓ نے ان کی وفات کے وقت یہ شعر پڑھا۔

وَاَبْیَضُ یَسْتَسْقِیْ الْغَمَامُ بِوَجْھِہٖ رَبِیْعُ الْیَتَامٰی عِصْمَۃٌ لِلْاَرَامِلِ

(روشن چہرہ جس سے بادل پانی لیتا تھا جو یتیموں کی بہار اور بیواؤں کی حفاظت تھا)

حضرت ابوبکر نے فرمایا کہ اس شعر کے مصداق سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں' اس وقت لوگ حضرت ابوبکر کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ ہم آپ کے لئے طبیب کو بلائیں جو آپ کو دیکھ لے فرمایا مجھے میرے طبیب نے دیکھ لیا ہے وہ کہتا ہے۔

فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ۔ (پ ۳۰' ر ۱۰' آیت ۱۶)

وہ جو چاہتا ہے سب کچھ کر گذرتا ہے۔

حضرت سلمان الفارسیؓ آپ کی عیادت کے لئے گئے اور کہنے لگے اے ابوبکر! ہمیں کچھ وصیت کیجئے' فرمایا اللہ تعالیٰ تم پر دنیا فتح کرنے والے ہیں' تم اس میں سے صرف اس قدر لینا جس سے گذر بسر ہو جائے' دیکھو جو شخص صبح کی نماز ادا کرتا ہے وہ اللہ کے ذمے میں ہو جاتا ہے' تم عہد شکنی کرکے اس کی تحقیر مت کرو ورنہ تم منہ کے بل دوزخ میں جا پڑو گے اور جب حضرت ابوبکر زیادہ بیمار ہو گئے اور لوگوں نے ان سے درخواست کی وہ خلیفہ مقرر کردیں تو انہوں نے حضرت عمر ابن الخطاب کو خلیفہ مقرر کردیا' لوگوں نے کہا آپ نے ایک سخت دل اور درشت مزاج آدمی کو اپنا خلیفہ مقرر کیا ہے' آپ اس سلسلے میں اپنے رب کو کیا جواب دیں گے؟ فرمایا میں یہ کہوں گا کہ میں نے تیری مخلوق پر تیری مخلوق میں سے بہتر شخص کو خلیفہ مقرر کیا ہے' پھر آپ نے حضرت عمرؓ کو بلایا' وہ آئے' آپ نے ان سے فرمایا میں تمہیں ایک وصیت کرتا ہوں یاد رکھو کہ اللہ کا ایک حق دن میں ہے' اگر کوئی رات میں وہ حق ادا کرے تو اللہ اسے قبول نہیں کرتا اور ایک حق رات میں ہے اگر کوئی رات میں ادا کرے تو وہ قبول نہیں ہوتا' نوافل اس وقت تک قبول نہیں ہوتے جب تک فرائض ادا نہ کئے جائیں' قیامت کے روز جن لوگوں کے پلڑے بھاری ہوں گے وہ ان کے ہوں گے جنہوں نے دنیا میں حق کا اتباع کیا ہوگا اور اسے بھاری سمجھا ہوگا اور اس ترازو کا حق جس میں صرف حق ہو یہ ہے کہ اس کا وزن زیادہ ہو اور قیامت کے دن جن لوگوں کے پلڑے ہلکے ہوں گے وہ ان کے ہوں گے جنہوں نے باطل کا اتباع کیا ہوگا اور اسے ہلکا سمجھا ہوگا اور اس ترازو کا حق جس میں باطل کے علاوہ کچھ نہ رکھا جائے یہ ہے کہ وہ ہلکی ہو' اللہ تعالیٰ نے اہل جنت کا ذکر ان کے اچھے اعمال کے ساتھ کیا ہے اور ان کے برے اعمال سے درگذر فرمایا ہے' کہنے والا کہتا ہے کہ میں ان سے کم ہوں اور ان کے درجے تک میری رسائی نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ نے اہل دوزخ کا ذکر برے اعمال کے ساتھ کیا ہے اور جو نیک اعمال انہوں نے کئے ہیں وہ انہی پر رد کردیئے ہیں' کہنے والا یوں کہتا ہے کہ میں ان سے افضل ہوں اور اللہ تعالیٰ نے آیات رحمت اور آیات عذاب بیان فرمائی ہیں تاکہ مومن کو رغبت بھی ہو اور ڈر بھی ہو اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالے اور اللہ سے حق کے سوا کسی چیز کی تمنا نہ کرے' اگر تم نے میری یہ وصیت یاد رکھی تو موت سے زیادہ کوئی غائب تمہیں محبوب نہ ہوگا اور موت سے تمہیں کوئی مفر نہیں ہے' اگرچہ تم میری وصیت پر عمل نہ کرو لیکن اس صورت میں موت سے زیادہ کوئی غائب تمہارے نزدیک مبغوض نہیں ہوگا حالانکہ موت آکر رہے گی تم اسے عاجز نہیں کرسکتے۔

حضرت سعید ابن المسیبؒ کہتے ہیں کہ جب حضرت ابوبکرؓ کی وفات کا وقت قریب آیا تو کچھ صحابہ آپ کے پاس آئے اور کہنے لگے اے خلیفۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں کچھ توشہ عطا فرمائیں' ہم دیکھ رہے ہیں جو آپ کا حال ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے ارشاد فرمایا جو شخص یہ کلمات کہہ کر مرجائے گا اللہ تعالیٰ اس کی روح کو افق مبین میں جگہ دے گا۔ لوگوں نے عرض کیا افق مبین کیا چیز ہے؟ فرمایا عرش کے سامنے ایک میدان کا نام افق مبین ہے۔ اس میں اللہ کے باغ' نہریں اور درخت ہیں۔ اسے ہر روز سو مرتبہ

اللہ کی رحمت ڈھانپ لیتی ہے۔ جو شخص یہ کلمات سو مرتبہ کہے گا اللہ تعالیٰ اس کی روح کو اس میدان میں رکھے گا وہ کلمات یہ ہیں۔ اے اللہ! تو نے مخلوق کو پیدا کیا ہے حالانکہ تجھے ان کی حاجت نہیں تھی' پھر انہیں دو گروہوں میں تقسیم کردیا' ایک گروہ جنت کے لئے اور دوسرا گروہ دوزخ کے لئے' اے اللہ! تو مجھے جنت والے گروہ میں کر اور دوزخ والے گروہ میں نہ کر' اے اللہ! تو نے مخلوق کو مختلف گروہوں میں پیدا کیا ہے اور انہیں پیدائش سے پہلے ہی الگ کردیا ہے' ان میں سے تو نے بعض کو بدبخت بنایا اور بعض کو نیک بخت' بعض کو گمراہ بنایا اور بعض کو راہ یاب' بس تو مجھے اپنی نافرمانیوں سے بدبخت نہ بنا' اے اللہ! تو ہر نفس کو پیدا کرنے سے پہلے جانتا ہے کہ یہ کیا کرے گا' جو تو جانتا ہے اس سے کسی کو مفر نہیں ہوسکتا' مجھے ان لوگوں میں کر جنہیں تو اپنی طاعت میں استعمال کرے' اے اللہ! جب تو نہ چاہے کوئی نہیں چاہتا' اس لئے تو اپنی مشیت اس میں کر' میں وہ باتیں چاہوں جو مجھے تجھ سے قریب کردیں' اے اللہ! تو نے بندوں کی حرکات مقرر کردی ہیں' اب کوئی چیز تیری اجازت کے بغیر حرکت نہیں کرسکتی' میری حرکات کو اپنے تقویٰ میں مخصوص کر' اے اللہ! تو نے خیر اور شر دونوں پیدا کئے ہیں اور ان میں سے ہر ایک کے لئے عامل پیدا کئے ہیں جو ان پر عمل کرتے ہیں' تو مجھے ان دونوں میں سے بہتر کے ساتھ کر' اے اللہ! تو نے جنت اور دوزخ دونوں پیدا کی ہیں اور دونوں کے اہل پیدا کئے ہیں' تو مجھے جنت کے رہنے والوں میں شامل کر' اے اللہ! تو نے ایک قوم کو گمراہ کرنے کا ارادہ کیا ہے اور گمراہی کے ساتھ ان کے سینے تنگ کردیئے ہیں' تو میرے سینے کو ایمان کے لئے کھول دے اور اسے میرے قلب کی زینت بنادے' اے اللہ! تو نے امور کی تدبیر کی اور ان کا مرجع اپنی ذات کو بنایا' تو مجھے مرنے کے بعد پاک زندگی دے اور مجھے اپنی قربت سے نواز' اے اللہ! جو شخص تیرے غیر پر امید اور اعتماد کے صبح و شام کرے مجھے اس سے غرض نہیں' میرا اعتماد تو ہے' میری امید تو ہے' تجھ ہی سے طاقت اور قوت ہے' حضرت ابوبکر نے فرمایا یہ تمام باتیں کتاب اللہ میں ہیں۔

حضرت عمر ابن الخطابؓ کی وفات : عمرو ابن میمون کہتے ہیں کہ میں بھی اسی دن صبح جماعت میں شریک تھا جس دن حضرت عمرؓ زخمی ہوئے' میرے اور ان کے درمیان صرف عبداللہ ابن عباسؓ تھے' جب حضرت عمرؓ دو صفوں کے درمیان سے گذرتے تو کچھ دیر کے لئے ٹھہر جاتے' اگر کوئی خلل دیکھتے تو ارشاد فرماتے سیدھے ہوجاؤ اور اگر کوئی خلل نہ پاتے تو آگے بڑھ جاتے' اور نماز شروع فرماتے' اکثر اوقات پہلی رکعت میں سورۂ یوسف اور سورۂ نحل وغیرہ پڑھتے' یہاں تک کہ لوگ نماز کے لئے جمع ہوجاتے' ابھی انہوں نے تکبیر تحریمہ ہی کہی تھی کہ میں نے انہیں یہ کہتے ہوئے سنا کہ مجھے کسی کتے نے قتل کردیا ہے' یا کاٹ کھایا ہے' یہ اس وقت کہا جب ابو لولوہ نے آپ کو دو دھاری تلوار سے زخمی کیا' وہ بدبخت دونوں صفوں کے درمیان میں سے تلوار لے کر بھاگا اور صفوں میں دونوں سمت کھڑے ہوئے لوگوں کو زخمی کیا' اس واقعے میں تیرہ آدمی زخمی ہوئے' ان میں سے نو اور ایک روایت کے مطابق سات آدمی جاں بحق ہوگئے' جب ایک مسلمان نے اسے بھاگتے ہوئے دیکھا تو اپنی چادر اس کے اوپر ڈال دی' اس بدبخت نے یہ محسوس کرنے کے بعد کہ اب میں پکڑا جاچکا ہوں خودکشی کرلی' ادھر حضرت عمر ابن الخطاب نے حضرت عبدالرحمٰن ابن عوف کا ہاتھ پکڑ کر آگے کردیا تاکہ وہ نماز پڑھادیں' جو لوگ حضرت عمر کے قریب تھے انہوں نے اس تمام واقعہ کا مشاہدہ کیا لیکن جو لوگ مسجد کے مختلف گوشوں میں تھے یا پیچھے تھے انہیں پتا ہی نہیں چلا کہ کیا واقعہ ہوا ہے' بس اچانک انہیں یہ معلوم ہوا کہ حضرت عمرؓ کی آواز آنی بند ہوگئی ہے' چنانچہ انہوں نے زور زور سے سبحان اللہ سبحان اللہ کہنا شروع کیا' عبدالرحمٰن ابن عوف نے مختصر نماز پڑھی' جب سب لوگ نماز سے فارغ ہوگئے تو حضرت عمر ابن الخطابؓ نے حضرت عبداللہ ابن عباس سے فرمایا جاکر دیکھو' مجھے کس نے مارا ہے۔ راوی کہتے ہیں کہ ابن عباس کچھ دیر کے لئے غائب ہوئے اور واپس آکر بتلایا کہ مغیرہ ابن شعبہ کے غلام نے یہ حرکت کی ہے' حضرت عمرؓ نے ارشاد فرمایا اللہ اسے ہلاک کرے' میں نے تو اس کے لئے سلوک کا حکم دیا تھا' پھر فرمایا' اللہ کا شکر ہے کہ اس نے میری موت کسی مسلمان کے ہاتھ سے نہیں لکھی' تو اور تیرا باپ ہی چاہتے ہیں کہ مدینہ میں کافروں کی کثرت ہوجائے' حضرت عباسؓ کے پاس بہت سے کافر غلام تھے' حضرت عبداللہ ابن عباسؓ نے عرض کیا اگر حکم ہو تو ان غلاموں کو قتل

کردیا جائے' فرمایا! اب قتل کرتے ہو جب وہ تمہارا کلمہ پڑھنے لگے' تمہارے قبلے کی طرف رخ کرکے نماز پڑھنے لگے اور تمہاری طرح حج کرنے لگے' اس کے بعد انہیں گھر لایا گیا' ہم بھی ساتھ تھے' لوگوں کا حال یہ تھا کہ گویا ان پر اس سے بڑی مصیبت کبھی نازل نہیں ہوئی تھی' بعض لوگ یہ کہہ رہے تھے کہ اس زخم سے جانبر نہ ہو سکیں گے' بعض لوگوں کی رائے یہ تھی کہ کوئی نقصان نہیں ہوگا' کھجور کا شربت لایا گیا' آپ نے پیا لیکن زخم کے راستے سے باہر نکل گیا' پھر دودھ پلایا گیا وہ بھی باہر نکل گیا' اس وقت لوگوں کو یہ یقین ہوگیا کہ اب بچ نہیں سکیں گے۔

راوی کہتے ہیں کہ ہم حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے' لوگ آپ کی تعریف میں رطب اللّسان تھے' ایک نوجوان نے کہا اے امیرالمومنین آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے خوشخبری ہو' آپ کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مصاحبت کا شرف حاصل ہے' آپ ان لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے سب سے پہلے اسلام قبول کیا' پھر آپ منصب خلافت پر فائز ہوئے اور آپ نے عدل و انصاف سے کام لیا' اب یہ شہادت آپ کو عطا کی گئی ہے' حضرت عمرؓ نے فرمایا میری خواہش ہے کہ یہ تمام امور میرے لئے کافی ہوجائیں' نہ ان سے مجھے نفع پہنچے اور نہ ضرر ہو' جب وہ نوجوان یہ باتیں کرکے واپس چلا گیا تو اس کا تہبند ٹخنوں سے نیچے لٹک کر زمین کو چھو رہا تھا' آپ نے لوگوں سے فرمایا اس نوجوان کو واپس لے کر میرے پاس آؤ' وہ نوجوان آیا آپ نے اس سے فرمایا بھتیجے! اپنا تہبند اوپر اٹھالو! اس طرح یہ کپڑا بھی دیر تک چلے گا اور یہ فعل تقویٰ سے بھی بہت قریب ہے' اس کے بعد اپنے صاحبزادے سے فرمایا اے عبداللہ! مجھ پر کتنا قرض ہے' چنانچہ حساب لگایا گیا' معلوم ہوا کہ کم و بیش چھیاسی ہزار ہے' آپ نے فرمایا اگر عمر کے گھرانے کے مال سے یہ قرض ادا ہوسکے تو اس کے مال سے ادا کرنا ورنہ بنوعدی ابن کعب سے مانگنا' اگر ان کا مال بھی کافی نہ ہو تو قریش سے درخواست کرنا' بس ان سے آگے مت بڑھنا اور میرا یہ قرض ادا کردینا اور اب ام المومنین حضرت عائشہؓ کی خدمت میں جاؤ اور ان سے کہو کہ عمر آپ کو سلام کہتا ہے' امیرالمومنین مت کہنا' اس لئے کہ آج میں مسلمانوں کا امیر نہیں ہوں اور کہنا کہ عمر ابن الخطاب اپنے دونوں ساتھیوں کے ساتھ دفن ہونے کی اجازت چاہتا ہے' حضرت عبداللہ ابن عمرؓ گئے' سلام کیا اور اجازت مانگی پھر اندر داخل ہوئے دیکھا کہ وہ بیٹھی ہوئی رو رہی ہیں' آپ نے عرض کیا عمر ابن الخطابؓ آپ کو سلام کہتے ہیں اور اپنے دونوں ساتھیوں کے ساتھ دفن کی اجازت چاہتے ہیں' حضرت عائشہؓ نے فرمایا یہاں میں خود اپنی تدفین چاہتی تھی لیکن میں آج عمر کو اپنے آپ پر ترجیح دیتی ہوں' جب آپ واپس پہنچے تو لوگوں نے کہا عبداللہ ابن عمر آگئے ہیں' حضرت عمر نے فرمایا مجھے اٹھاؤ' چنانچہ ایک شخص نے سہارا دیکر بٹھایا' آپ نے پوچھا کیا خبر ہے؟ عبداللہؓ نے عرض کیا آپ کو جو بات محبوب ہے وہ پوری ہوئی۔ اُمّ المومنین نے آپ کو اجازت دیدی ہے' فرمایا اَلْحَمْدُ لِلّٰہ! میرے لئے اس سے زیادہ اہم بات کوئی دوسری نہ تھی' جب میں مرجاؤں تو میرا جنازہ لے کر جانا' پھر سلام کرنا اور کہنا عمر اجازت مانگتا ہے' اگر اجازت مل جائے تو مجھے اندر لے جانا اور اگر انکار کردیں تو مسلمانوں کے قبرستان میں لے جانا۔

راوی کہتے ہیں کہ اسی دوران اُمّ المومنین حضرت حفصہؓ تشریف لائیں' عورتیں انہیں ڈھارہی ہوئی تھیں' جب ہم نے دیکھا تو اٹھ کھڑے ہوئے' وہ اندر تشریف لے گئیں اور کچھ دیر ان کے پاس روتی رہیں' پھر لوگوں نے اجازت مانگی' حضرت حفصہؓ گھر کے اندر چلی گئیں' ہم نے اندر سے ان کے رونے کی آواز سنی' لوگوں نے عرض کیا امیرالمومنین! آپ کچھ وصیت فرمایئے اور اپنا جانشین مقرر کردیجئے' فرمایا! میرے خیال میں اس ذمہ داری کے لئے ان لوگوں سے زیادہ کوئی شخص اہل نہیں ہے جن سے سرور دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم ہم سے پردہ فرمانے تک راضی رہے' آپ نے حضرت علیؓ' عثمانؓ' زبیرؓ' طلحہؓ' سعدؓ اور عبدالرحمٰنؓ کے نام بھی لئے اور فرمایا کہ عبداللہ ابن عمر تمہارے پاس آئے گا لیکن اس معاملے سے اسے کوئی واسطہ نہیں ہے' یہ بات آپ نے کچھ اس انداز سے فرمائی کہ عبداللہ ابن عمر کی دلجوئی ہوجائے اگر امارت سعد کی طرف منتقل ہوجائے تو فبہا ورنہ جو بھی امیر بنے اسی سے مدد چاہے' میں نے اسے خیانت اور عجز کی بناء پر معزول نہیں کیا ہے اور فرمایا کہ میں اپنے بعد آنے والے خلیفہ کو اولین مہاجرین

کے لئے وصیت کرتا ہوں کہ ان کا مرتبہ پہچانا جائے' ان کے ناموس کی حفاظت کی جائے' میں انصار کے ساتھ بھی خیر کی وصیت کرتا ہوں' یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے یہاں اور ایمان میں سب سے پہلے جگہ بنائی ہے' ان کے نیکو کار کی نیکی قبول کی جائے اور خطاکار کی خطاء سے درگذر کیا جائے اور میں دوسرے شہروں کے باشندوں کے لئے بھی خیر کی وصیت کرتا ہوں کیونکہ وہ لوگ اسلام کے معاون' بیت المال کے لئے سرمایہ اکٹھا کرنے والے اور دشمنوں کے لئے باعث غیظ ہیں' ان سے اس مال کے علاوہ کچھ نہ لیا جائے جو ان سے زائد ہو اور وہ بھی ان کی رضامندی سے' میں اعراب سے بھی خیر کی وصیت کرتا ہوں' اس لئے کہ یہی اصل عرب ہیں اور یہی لوگ اسلام کی اصل ہیں' ان کے زائد اموال میں سے لے کر انہی کے فقراء میں تقسیم کردیا جائے اور میں اللہ اور اس کے رسول کے عہد کا حوالہ دیتے ہوئے یہ وصیت کرتا ہوں کہ وہ مسلمانوں کا عہد پورا کرے اور ان کی حفاظت کے لئے دشمنوں سے جنگ کرے اور اپنی استطاعت سے زیادہ کسی امر کا مکلف نہ کرے۔

راوی کہتے ہیں کہ جب آپ وفات پاگئے تو ہم آپ کا جنازہ لے کر چلے' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مزار مبارک پر پہنچ کر عبداللہ ابن عمرؓ نے سلام کیا اور عرض کیا کہ عمر ابن الخطابؓ اجازت چاہتے ہیں' حضرت عائشہؓ نے فرمایا انہیں اندر لے آؤ' چنانچہ لوگ انہیں اندر لے گئے اور صاحبین کے برابر میں جو جگہ خالی تھی وہاں دفن کردیا' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جبرئیل علیہ السلام نے مجھ سے کہا کہ عمر کی موت پر اسلام روئے گا (ابوبکر الآجری فی کتاب الشرط' ابی ابن کعبؓ) حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کی میت کو چارپائی پر رکھ دیا گیا' لوگوں نے انہیں چاروں طرف سے گھیر لیا اور آپ کے لئے مغفرت و رحمت کی دعائیں کرنے لگے' میں بھی ان لوگوں میں تھا' اچانک ایک شخص نے میرے کاندھے زور سے پکڑ کر مجھے ڈرایا' میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہ حضرت علی ابن ابی طالب تھے' انہوں نے حضرت عمر کی وفات پر اظہار افسوس کیا اور فرمایا آپ نے کوئی ایسا شخص اپنے بعد نہیں چھوڑا جس کے عمل پر میں اللہ سے ملنا پسند کروں' جیسے میں آپ کے عمل پر مرنا پسند کرتا ہوں' بخدا میں یہ سوچا کرتا تھا کہ اللہ آپ کو آپ کے دونوں رفیقوں کے ساتھ کردے گا کیونکہ میں نے سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم سے بارہا سنا ہے کہ میں' ابوبکر اور عمر گئے' میں' ابوبکر اور عمر نکلے' میں' ابوبکر اور عمر داخل ہوئے۔ میں یہ امید کرتا تھا اور یہ سوچا کرتا تھا کہ اللہ تعالیٰ (مرنے کے بعد بھی) آپ کو ان دونوں کے ساتھ رکھے گا۔ (بخاری و مسلم)

حضرت عثمان ذوالنورینؓ کی وفات : آپ کے قتل کی روایت مشہور ہے۔ عبداللہ ابن سلامؓ کہتے ہیں کہ جب عثمانؓ اپنے گھر میں محصور ہوگئے تو میں ان کو سلام کرنے کے لئے پہنچا' انہوں نے مجھ کو دیکھ کر کہا خوش آمدید' اے بھائی! آج رات میں نے سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس (خوخہ) میں دیکھا' آپ فرمارہے تھے اے عثمان! لوگوں نے تجھے محصور کردیا ہے' میں نے عرض کیا جی ہاں! فرمایا کیا تجھے پانی سے محروم کردیا ہے' میں نے عرض کیا جی ہاں! یہ سن کر آپ نے پانی کا ایک ڈول نیچے لٹکایا' میں نے سیراب ہوکر پانی پیا' میں اب بھی اپنے سینے میں اس پانی کی ٹھنڈک محسوس کرتا ہوں' پھر فرمایا اگر تو چاہے تو تجھے ان پر غلبہ دیا جائے ورنہ تو ہمارے پاس افطار کرنا' میں نے آپ کے پاس افطار کرنا پسند کیا ہے' چنانچہ آپ کو اسی دن شہید کردیا گیا' حضرت عبداللہ ابن سلام نے ان لوگوں سے پوچھا جنہوں نے حضرت عثمان کو زخمی حالت میں تڑپتے دیکھا تھا کہ جب آپ زخمی ہوکر خون میں تڑپ رہے تھے تو آپ نے کیا فرمایا تھا' لوگوں نے کہا ہم نے ان کی زبان سے تین بار یہ کلمات سنے' اے اللہ! امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو متفق رکھئے' عبداللہ ابن سلامؓ کہتے ہیں بخدا اگر وہ یہ فرمادیتے کہ امت محمدیہ کو کبھی متفق نہ کرنا تو قیامت تک کبھی ان میں اتفاق و اتحاد نہ ہوتا۔

ثمامہ ابن حزن القشیری کہتے ہیں کہ اس وقت میں بھی وہاں موجود تھا جب حضرت عثمان نے اپنے مکان سے نیچے جھانکا تھا اور لوگوں سے فرمایا تھا کہ میرے پاس ان دو آدمیوں کو لاؤ جنہوں نے تمہیں یہاں جمع کیا ہے۔ چنانچہ وہ آئے ایسے لگ رہے تھے جیسے دو اونٹ یا دو گدھے چلے آرہے ہوں' حضرت عثمان نے لوگوں سے کہا کہ میں تمہیں اللہ کی قسم دیکر پوچھتا ہوں' تم جانتے ہو کہ جب

سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ منورہ تشریف لائے تو یہاں بیئر رومہ کے علاوہ کہیں میٹھا پانی نہیں تھا' آپ نے فرمایا تھا کون ہے جو رومہ کا کنواں خریدے اور اپنے ڈول کو مسلمانوں کے ڈولوں کے ساتھ جمع کرے اور جنت میں اپنے لئے اس سے بہتر پائے' میں نے خاص اپنے مال سے یہ کنواں خریدا اور آج تم مجھے اس کا پانی اور نہر کا پانی پینے سے روکتے ہو' لوگوں نے کہا واقعی آپ سچ کہتے ہیں' حضرت عثمان نے فرمایا کہ میں تم کو اللہ کی قسم اور اسلام کا واسطہ دیکر پوچھتا ہوں کہ کیا میں نے مفلس لشکر اسلام کو اپنے مال سے اسلحہ خرید کر نہیں دیا تھا' لوگوں نے عرض کیا یہ سچ ہے۔ پھر فرمایا میں تمہیں اللہ کی قسم دیکر پوچھتا ہوں تم جانتے ہو کہ مسجد مسلمانوں کے لئے تنگ پڑ گئی تھی اور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اعلان فرمایا تھا کہ کون شخص فلاں خاندان کی زمین خرید کر مسجد میں اضافہ کریگا اور جنت میں اس سے بہتر پائے گا' کیا میں نے وہ زمین اپنے مال سے نہیں خریدی تھی اور آج تم مجھے اس مسجد میں دو رکعت نماز پڑھنے سے روکتے ہو' لوگوں نے عرض کیا آپ سچ کہتے ہیں' پھر فرمایا میں تمہیں اللہ کی قسم اور اسلام کا واسطہ دیکر پوچھتا ہوں کیا تم جانتے ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کے ثبیر پہاڑ پر رونق افروز تھے' آپ کے ہمراہ اس وقت میں اور ابوبکر اور عمر بھی تھے' اچانک پہاڑ نے حرکت کی' کچھ پتھر لڑھک کر نیچے گرے' آپ نے پہاڑ کو ایک ٹھوکر ماری اور ارشاد فرمایا اے ثبیر ٹھہر جا کیا تو نہیں جانتا کہ اس وقت تیرے اوپر ایک نبی' ایک صدیق اور دو شہید ہیں۔ لوگوں نے کہا یہ سچ ہے' فرمایا اللہ اکبر' رب کعبہ کی قسم ان لوگوں نے میری گواہی دی۔ بلاشبہ میں شہید ہوں۔

عرب کے ایک شیخ روایت کرتے ہیں کہ جب حضرت عثمان کو زخمی کیا گیا اور خون آپ کی داڑھی پر بہنے لگا تو آپ کی زبان پر یہ الفاظ تھے "لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحَانَكَ اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظَّالِمِيْنَ" اے اللہ میں ان لوگوں سے تیرے ہی ذریعے انتقام چاہتا ہوں اور اپنے تمام معاملات میں تجھ سے مدد مانگتا ہوں اور جس امر میں تو نے مجھے مبتلا کیا ہے میں اس پر تجھ ہی سے صبر کا خواہاں ہوں۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی شہادت : اصبغ حنظلی کہتے ہیں کہ جس رات کی صبح کو حضرت علی کرم اللہ وجہہ زخمی ہوئے آپ طلوع فجر کے وقت آرام کر رہے تھے' ابن النباح آپ کو نماز کی اطلاع دینے کے لئے آیا' آپ کی طبیعت کچھ بھاری تھی' اس لئے آرام کرتے رہے' دوبارہ وہ شخص پھر آیا' آپ نے اس مرتبہ بھی تاخیر کی اور لیٹے رہے' تیسری مرتبہ آیا تو آپ اٹھ کر چل دیئے' اس وقت یہ اشعار آپ کی زبان پر تھے۔

اُشْدُدْ حَيَازِيْمَكَ لِلْمَوْتِ فَاِنَّ الْمَوْتَ لَاقِيْكَا
وَلَا تَجْزَعْ مِنَ الْمَوْتِ اِذَا حَلَّ بِوَادِيْكَا

موت کی تیاری کر' اس لئے کہ موت تجھ سے ملاقات کرنے والی ہے' جب وہ تیرے آنگن میں قدم رکھے تو اس سے گھبرانا مت۔

جب آپ چھوٹے دروازے پر پہنچے تو ابن ملجم نے آپ پر حملہ کیا اور آپ کو شہید کر دیا' آپ کی صاحبزادی حضرت ام کلثوم باہر نکلیں اور کہنے لگیں کہ صبح کی نماز کو کیا ہو گیا ہے کہ میرے شوہر کو بھی اسی میں قتل کیا گیا اور میرے والد بھی اسی میں شہید ہوئے' قریش کے ایک شیخ کی روایت ہے' فرماتے ہیں کہ جب ابن ملجم نے حضرت علیؓ پر حملہ کیا تو انہوں نے بے ساختہ فرمایا رب کعبہ کی قسم میں کامیاب ہو گیا' حضرت محمد ابن علیؓ فرماتے ہیں کہ جب حضرت علی کو زخمی کیا گیا تو انہوں نے اپنے بیٹوں کو وصیت کی اور مرتے دم تک سوائے لا الٰہ الا اللہ کے کچھ نہیں کہا۔

جب حضرت امام حسنؓ کو ہر طرف سے گھیر لیا گیا اور زندگی کی کوئی امید باقی نہیں رہی تو ان کے بھائی حضرت امام حسینؓ نے کہا اے بھائی تم کیوں گھبرا رہے ہو' تم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور علی ابن ابی طالب کی طرف بڑھو' یہ دونوں تمہارے باپ ہیں اور خدیجہ بنت خویلد اور فاطمہ بنت محمد کی طرف بڑھو' یہ دونوں تمہاری مائیں ہیں' حمزہ اور جعفر کی طرف بڑھو یہ دونوں تمہارے چچا ہیں' حضرت حسنؓ نے جواب دیا بھائی! میں اس لئے گھبراتا ہوں کہ ایک ایسے امر سے سابقہ ہے کہ اس سے پہلے کبھی اس سے سابقہ

نہیں پڑا' محمد ابن الحسنؒ بیان کرتے ہیں کہ جب لوگوں نے حضرت حسینؓ کو گھیر لیا اور یہ یقین ہو گیا کہ وہ لوگ قتل کئے بغیر نہیں رہیں گے تو انہوں نے اپنے ساتھیوں سے خطاب کرتے ہوئے حمد و ثناء کے بعد ارشاد فرمایا جو حالات ہیں وہ تمہارے سامنے ہیں' دنیا بدل چکی ہے اور اس میں تغیر واقع ہو چکا ہے' اب نیکی کا دور ختم ہو چکا ہے' دنیا صرف اتنی باقی رہ گئی ہے جتنی تری برتن میں پانی گرانے کے بعد باقی رہ جاتی ہے' ایسی زندگی سے موت بہتر ہے کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اب حق پر عمل نہیں کیا جاسکتا اور باطل سے باز نہیں رہا جاتا' یہ اس لئے ہوا کہ مومن صادق اللہ سے ملاقات کی خواہش کرے' میں موت کو سعادت سمجھتا ہوں اور ظالموں کے ساتھ زندگی کو جرم تصور کرتا ہوں۔

موت کے وقت خلفائے اسلام' امرائے کرام اور صحابہ عظام کے اقوال : جب حضرت معاویہ ابن ابی سفیان کی وفات کا وقت قریب آیا تو آپ نے فرمایا مجھے اٹھا کر بٹھادو' لوگوں نے بٹھادیا' آپ اللہ کا ذکر کرتے رہے اور تسبیح بیان کرتے رہے' پھر رونے لگے اور ارشاد فرمایا اے معاویہ بوڑھاپے میں اللہ کی یاد آئی اور دور انحطاط میں ذکر خدا زبان پر آیا' اس وقت خیال کیوں نہیں آیا جب جوانی کا درخت سرسبز و شاداب تھا' یہ کہہ کر اس قدر روئے کہ آواز بلند ہونے لگی۔ ساتھ میں یہ دعا بھی کرتے رہے اے اللہ! سخت دل گنہگار بوڑھے پر رحم فرما' اے اللہ! لغزشیں معاف کر اور خطاؤں سے صرف نظر فرما اور اس شخص کے ساتھ حلم کا معاملہ کر' جو تیرے سوا کسی سے امید نہیں رکھتا اور تیرے علاوہ کسی پر بھروسا نہیں کرتا' قریش کے ایک شیخ بیان کرتے ہیں کہ وہ کچھ لوگوں کے ساتھ مرض وفات کے دوران حضرت معاویہ کی خدمت میں حاضر ہوئے' ہم نے ان کے جسم میں جھرّیاں دیکھیں' آپ نے حمد و ثناء کے بعد فرمایا' دنیا تمام وہی ہے جو ہم نے دیکھی ہے اور جس کا ہم نے تجربہ کیا ہے' ہم نے اس کی رونق کا استقبال کیا اور عیش کی زندگی سے لطف اندوز ہوئے لیکن ابھی کچھ ہی لمحے گذرے تھے کہ دنیا نے تمام رونقوں اور عیش کوشیوں کو سمیٹ لیا' اس کے بعد رسّی کاٹ ڈالی' اب دنیا نے ہمیں کھوکھلا اور بوسیدہ کر دیا ہے اور اب وہ ہمیں ملامت کرنے لگی ہے' لعنت ہے ایسی دنیا پر' اور تف ہے ایسے گھر پر' روایت ہے کہ حضرت معاویہؓ نے اپنے آخری خطبے میں ارشاد فرمایا' اے لوگو! جو کھیتی کرتا ہے وہ کاٹتا ہے' میں نے تمہاری امارت کا بار سنبھالا' اب جو شخص میرے بعد تمہارا امیر بنے گا' وہ مجھ سے زیادہ برا ہوگا' جیسے مجھ سے پہلے کے امراء مجھ سے بہتر تھے' اے یزید! جب میں مرجاؤں تو مجھے کسی سمجھدار اور عقلمند انسان سے نہلوانا' اس لئے کہ عقلمند انسان کو اللہ کے نزدیک ایک مرتبہ حاصل ہے اور زور زور سے تکبیر کہنا' پھر خزانے میں سے ایک رومال نکالنا اس میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ کپڑے ہیں آپ کے کچھ بال اور ناخن ہیں' بال اور ناخن میری ناک' منہ' کان اور آنکھ میں رکھ دینا اور کپڑے کفن کے اندر میرے جسم کے اوپر رکھ دینا' اے یزید والدین کے بارے میں میری وصیت پر دھیان دینا۔ جب تم میری تکفین اور تدفین سے فارغ ہو جاؤ تو مجھے اور ارحم الراحمین کو تنہا چھوڑ دینا' محمد ابن عقبہ کہتے ہیں کہ جب حضرت معاویہ کی وفات کا وقت قریب آیا تو آپ نے فرمایا کاش! میں قریش کا ایک بھوکا شخص ہوتا اور اس منصب خلافت پر فائز نہ ہوتا۔

عبدالملک ابن مروان نے انتقال سے پہلے دمشق کے اطراف میں ایک دھوبی کو کپڑے دھوتے ہوئے دیکھ کر کہا کاش! میں ایک دھوبی ہوتا اور ہر روز اپنے ہاتھ سے کما کر کھاتا اور مجھے دنیاوی چیزوں میں سے (مراد خلافت و حکومت ہے) کچھ حاصل نہ ہوتا' ابو حازم کو جب اس قول کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے فرمایا اللہ کا شکر ہے کہ ہمارے خلفاء اور حکام موت کے وقت اس حال کی تمنا کرتے ہیں جس میں ہم ہیں اور ہم موت کے وقت ان کے حال کی آرزو نہیں کرتے کسی شخص نے عبدالملک ابن مروان سے مرض وفات میں مزاج پرسی کی اور پوچھا اے امیرالمومنین! آپ خود کو کیسا پاتے ہیں' جواب دیا میں خود کو ایسا پاتا ہوں جیسا اس آیت میں مذکور ہے۔

وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّ تَرَكْتُمْ مَّا خَوَّلْنٰكُمْ وَرَآءَ ظُهُوْرِكُمْ۔ (پ ۷' ر ۱۷' آیت ۹۵)

اور تم ہمارے پاس تنہا تنہا آگئے جس طرح ہم نے تمہیں اول بار پیدا کیا تھا اور جو کچھ ہم نے تم کو دیا تھا اس کو

اپنے پیچھے ہی چھوڑ آئے۔

حضرت عمر ابن عبدالعزیز کی اہلیہ محترمہ فاطمہ بنت عبدالملک کہتی ہیں کہ میرے شوہر اپنے مرض وفات میں یہ دعا کرتے رہتے تھے کہ اے اللہ! میری موت کو لوگوں پر ظاہر مت کرنا گو کچھ ہی دیر کے لئے مخفی رہے' چنانچہ جس روز آپ نے وفات پائی میں آپ کے پاس سے اٹھ کر چلی گئی اور دوسرے کمرے میں جا کر بیٹھ گئی جس کا ایک دروازہ ان کے کمرے میں بھی کھلا ہوا تھا' میں نے آپ کو یہ آیت پڑھتے ہوئے سنا۔

تِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِينَ لَا يُرِيدُونَ عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ وَلَا فَسَادًا وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ۔ (پ ۲۰' ر ۲' آیت ۸۳)

یہ عالم آخرت ہم ان ہی لوگوں کے لئے خاص کرتے ہیں جو دنیا میں نہ بڑا بننا چاہتے ہیں اور نہ فساد کرنا اور نیک نتیجہ متقی لوگوں کو ملتا ہے۔

اس کے بعد آپ خاموش ہو گئے' جب میں نے دیر تک آواز نہیں سنی تو تشویش ہوئی اور ایک غلام کو بھیجا کہ وہ یہ جا کر دیکھے کہ کیا آپ سو گئے ہیں؟ غلام نے جا کر دیکھا اور زور سے ایک چیخ ماری' میں بھی تیزی سے کمرے میں داخل ہوئی' دیکھا تو آپ ہمیشہ کے لئے سو چکے تھے' کسی نے انتقال سے پہلے آپ سے وصیت کی درخواست کی' آپ نے فرمایا میرے اس حال سے ڈرو' تمہیں بھی ایک دن اس حال میں پہنچنا ہے' روایت ہے کہ جب آپ کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی تو ایک طبیب کو بلایا گیا' اس نے معائنہ کرنے کے بعد کہا میرے خیال سے انہیں زہر دیا گیا ہے' مجھے ان کی موت کا خوف ہے' حضرت عمر ابن عبدالعزیز نے فرمایا جسے زہر نہیں دیا جاتا کیا تم اس کی موت سے بے خوف ہو جاتے ہو' طبیب نے پوچھا! امیر المومنین کیا آپ کو زہر کا احساس ہو گیا تھا' فرمایا مجھے اسی وقت معلوم ہو گیا تھا جب زہر میرے پیٹ میں پڑا تھا' طبیب نے کہا آپ کو علاج کرانا چاہیے۔ مجھے آپ کے نفس کے چلے جانے کا اندیشہ ہے' فرمایا کہاں جائے گا۔ یقیناً" میرے رب کے پاس جائے گا جو جانے کی بہترین جگہ ہے' بخدا اگر مجھے معلوم ہوتا کہ میری شفا میرے کان کی لو کے پاس ہے میں تب بھی ہاتھ نہ بڑھاتا' اے اللہ! عمر کے لئے اپنی ملاقات میں خیر کر' اس واقعے کے بعد آپ چند دن حیات رہے' کہتے ہیں کہ وفات سے پہلے آپ رونے لگے' لوگوں نے عرض کیا امیر المومنین کیوں روتے ہیں؟ آپ کو تو خوش ہونا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے ذریعے سنتیں زندہ کی ہیں اور انصاف کا بول بالا فرمایا ہے' آپ نے فرمایا کیا مجھے کھڑا نہیں کیا جائے گا اور اس مخلوق کے متعلق سوال نہیں کیا جائے گا' بخدا اگر میں نے ان میں عدل کیا ہو گا' تب بھی مجھے اپنے نفس پر خوف ہو گا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی حجت پیش نہیں کر سکے گا۔ الا یہ کہ اللہ تعالیٰ ہی اسے حجت کی تعلیم دے اور اس صورت میں ہمارا کیا حال ہو گا۔ جب ہم نے عدل سے دامن بچایا ہو گا اور انصاف کی بیخ کنی کی ہو گی' یہ کہہ کر ان کی آنکھیں چھلک آئیں' اس کے بعد کچھ ہی دیر زندہ رہے' جب وفات کا وقت ہوا فرمایا مجھے بٹھا دو' لوگوں نے انہیں بٹھا دیا' اس کے بعد کہنے لگے اے اللہ میں وہ ہوں جسے حکم دیا گیا مگر اس نے کوتاہی سے کام لیا جسے منع کیا گیا مگر اس نے حکم عدولی کی لیکن لا الہ الا اللہ کے باب میں میں نے کوتاہی نہیں کی' پھر اپنا سر اٹھایا اور دیر تک ایک طرف دیکھتے رہے' لوگوں نے پوچھا کیا دیکھتے ہیں؟ فرمایا میں کچھ سبز پوشوں کو دیکھ رہا ہوں جو نہ انسان ہیں اور نہ جن۔

ہارون رشید سے منقول ہے کہ انہوں نے موت کے وقت اپنا کفن خود پسند کیا اور اسے دیکھتے تھے اور یہ آیت تلاوت کرتے تھے۔

مَا أَغْنَىٰ عَنِّي مَالِيَهْ هَلَكَ عَنِّي سُلْطَانِيَهْ (پ ۲۹' ر ۵' آیت ۲۸-۲۹)

میرا مال میرے کچھ کام نہ آیا۔ میری جاہ بھی مجھ سے گذر گئی۔

مامون نے راکھ بچھائی اور اس پر لیٹ گیا اور کہنے لگا اے وہ ذات جس کے ملک کو زوال نہیں اس شخص پر رحم کر جس کا ملک زوال پذیر ہو چکا ہے' معتصم اپنی موت کے وقت کہتا تھا کہ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ میری عمر اتنی مختصر ہے تو میں کبھی وہ کام نہ کرتا جو

میں نے کیے ہیں، معتمر باللہ وفات کے وقت سخت بے چین اور مضطرب تھا، لوگوں نے کہا امیر المومنین آپ گھبرائیں نہیں، آپ کو کوئی خطرہ نہیں ہے، اس نے کہا اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ دنیا رخصت ہو گئی ہے اور آخرت آپہنچی ہے، عمرو ابن عاص نے وفات کے وقت صندوقوں کو دیکھتے ہوئے اپنے بیٹوں سے کہا کہ ان صندوقوں کو اندر کی چیز کے ساتھ کون لے گا، پھر فرمایا، کاش! اس میں مینگنیاں ہوتیں، حجاج نے اپنی موت کے وقت کہا اے اللہ! میری مغفرت فرما، لوگ کہتے ہیں کہ تو میری مغفرت نہیں کرے گا، عمر ابن عبدالعزیز حجاج کے اس کلمہ پر حیرت اور رشک کیا کرتے تھے جب حضرت حسن بصری کے سامنے اس کا یہ مقولہ نقل کیا گیا تو انہوں نے دریافت کیا کہ کیا واقعی اس نے ایسا کہا تھا، کہنے والے نے عرض کیا جی ہاں! فرمایا ہو سکتا ہے اللہ تعالیٰ نے اس کی مغفرت فرمادی ہو۔

اجلۂ صحابہ اور تابعین اور دوسرے بزرگان امت کے اقوال: حضرت معاذ ابن جبلؓ نے وفات کے وقت ارشاد فرمایا، اے اللہ! میں تجھ سے ڈرتا تھا اور آج تجھ سے امید رکھتا ہوں، اے اللہ! تو جانتا ہے کہ میں دنیا کو اور اس میں دیر تک رہنے کو اس لئے پسند نہیں کرتا تھا کہ نہریں جاری کروں یا درخت لگاؤں بلکہ دوپہر کی سخت دھوپ میں پیاسا رہنے، مصائب جھیلنے اور ذکر کے حلقوں میں علماء کے سامنے دوزانو ہو کر بیٹھنے کے لئے پسند کرتا تھا، جب آپ پر نہایت سخت نزع اور جاں کنی کا عالم طاری ہوا یہاں تک کہ کسی اور پر نہ ہوا تھا تو جب کچھ طبیعت میں ٹھہراؤ ہوتا تو عرض کرتے اے اللہ! تو چاہے میرا گلا کتنا ہی کیوں نہ گھونٹ لے تیری عزت کی قسم تو جانتا ہے میں تجھ سے محبت کرتا ہوں، جب حضرت سلمان الفارسی کا وقت وفات ہوا تو رونے لگے، لوگوں نے عرض کیا کیوں روتے ہیں، فرمایا، میں دنیا کے فراق میں نہیں روتا ہوں بلکہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے عہد لیا تھا کہ دنیا میں سے توشے کی مقدار ہمارے پاس اتنا ہی ہو جتنا مسافر کے پاس زادِ راہ ہوتا ہے۔ (احمد، حاکم) جب حضرت سلمان نے وفات پائی تو ان کا مال دیکھا گیا۔ ان کا ترکہ دس بارہ درہم کا تھا، جب حضرت بلال حبشی کی وفات کا وقت ہوا تو ان کی اہلیہ کہنے لگیں ہائے افسوس! فرمایا ہائے افسوس نہ کہہ بلکہ واہ کس قدر خوشی کی بات ہے کہ کل ہم اپنے احباء یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی جماعت سے ملاقات کریں گے، کہتے ہیں کہ وفات کے وقت حضرت عبداللہ! ابن المبارکؒ نے اپنی آنکھیں کھولیں اور یہ آیت پڑھتے ہوئے ہنسنے لگے۔

لِمِثْلِ هٰذَا فَلْيَعْمَلِ الْعَامِلُوْنَ۔ (پ ۲۳، ر ۶، آیت ۶)
ایسی ہی کامیابی کے لئے عمل کرنے والوں کو عمل کرنا چاہئے۔

حضرت ابراہیم نخعیؒ اپنی وفات سے پہلے رونے لگے لوگوں نے عرض کیا کیوں روتے ہیں، فرمایا میں اللہ کے قاصد کا منتظر ہوں جو مجھے جنت یا دوزخ کی بشارت دے، حضرت ابن المنکدر بھی وفات کے وقت رونے لگے، یہ پوچھنے پر کہ آپ کیوں روتے ہیں انہوں نے جواب دیا بخدا میں کسی ایسے گناہ کی وجہ سے نہیں روتا ہوں جس پر میں نے معمولی سمجھ کر اقدام کیا ہو اور وہ اللہ کے نزدیک غیر معمولی ہو، عامر ابن عبدالقیس بھی وفات سے پہلے روئے، لوگوں نے پوچھا کیوں روتے ہیں، فرمایا میں دنیا کی حرص میں اور موت کے خوف سے نہیں روتا بلکہ اس لئے روتا ہوں کہ میں گرمیوں کی دوپہر میں پیاسا نہ رہ سکا اور سردیوں کی راتوں میں اپنے رب کے سامنے کھڑا نہیں ہو سکا، حضرت فضیل ابن عیاض وفات کے وقت بے ہوش ہو گئے، جب ہوش آیا تو آنکھیں کھولیں اور فرمایا ہائے افسوس سفر کتنا طویل ہے اور زادِ سفر کس قدر قلیل ہے، حضرت عبداللہ ابن المبارک نے وفات سے پہلے اپنے آزاد کردہ غلام نصر سے فرمایا کہ میرا سر مٹی پر رکھدے، نصر یہ سن کر رونے لگا، فرمایا کیوں روتا ہے؟ اس نے عرض کیا کہ مجھے آپ کی وہ آسائشیں اور راحتیں یاد آگئیں جن میں آپ نے پوری زندگی بسر کی اور آج فقر، افلاس اور غریب الوطنی کے عالم میں انتقال کر رہے ہیں، فرمایا خاموش رہ، میں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی تھی کہ مجھے مالداروں کی طرح زندہ رکھنا اور فقراء کی موت دینا، اس کے بعد نصر سے فرمایا مجھے کلمۂ طیبہ کی تلقین کر اور جب تک میں دوسرا کلام نہ کروں اس سے پہلے دوبارہ مت کہنا، عطاء ابن یسار کہتے ہیں کہ شیطان ایک

شخص کے سامنے اس کی موت کے وقت آیا اور کہنے لگا کہ تم نے نجات پالی' اس نے کہا میں تجھ سے اب بھی خطرہ محسوس کرتا ہوں۔ ایک بزرگ وفات کے وقت رونے لگے' لوگوں نے پوچھا کیوں رو رہے ہیں؟ فرمایا! یہ آیت رونے پر مجبور کررہی ہے۔

اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ (پ ۶' ر ۹' آیت ۲۷) خدا تعالیٰ متقیوں ہی کا عمل قبول کرتے ہیں۔

حضرت حسنؓ ایک ایسے شخص کے پاس تشریف لے گئے جو نزع کے عالم میں تھا بس جان سپرد ہی کرنے والا تھا اور فرمایا! جس کام کی ابتدا ایسی ہو اس کی انتہا سے ڈرنا چاہئے اور جس کی انتہا ایسی ہو اس کی ابتدا میں زہد کرنا چاہیے۔ جریریؒ کہتے ہیں کہ میں نزع کے وقت حضرت جنید بغدادیؒ کی خدمت میں حاضر تھا۔ اس دن جمعہ تھا اور نوروز بھی تھا' نزع کے وقت بھی وہ قرآن پڑھتے رہے یہاں تک کہ انہوں نے پورا قرآن پڑھا' میں نے عرض کیا ابوالقاسم! اس حالت میں بھی آپ نے ختم کرلیا' فرمایا مجھ سے زیادہ اس کا مستحق کون ہے' خاص طور پر اس وقت جب کہ میرا صحیفہ لپیٹا جانے والا ہے ادیم کہتے ہیں کہ ابوسعید الخراز نے یہ اشعار پڑھتے ہوئے جان جاں آفریں کے سپرد کردی۔

حَنِيْنُ قُلُوْبِ الْعَارِفِيْنَ اِلَى الذِّكْرِ
وَتِذْكَارُهُمْ وَقْتَ الْمُنَاجَاةِ لِلسِّرِّ
اُدِيْرَتْ كُؤُوْسٌ لِلْمَنَايَا عَلَيْهِمْ
فَاَغْفَوْا عَنِ الدُّنْيَا كَاِغْفَاءِ ذِي الشُّكْرِ
هُمُوْمُهُمُوْ جَوَّالَةٌ بِمُعَسْكَرٍ
بِهٖ اَهْلُ وُدِّ اللّٰهِ كَالْاَنْجُمِ الزُّهْرِ
فَاَجْسَامُهُمْ فِي الْاَرْضِ قَتْلٰى بِحُبِّهٖ
وَاَرْوَاحُهُمْ فِي الْحُجْبِ نَحْوَ الْعُلَا تَسْرِيْ
فَمَا عَرَّسُوْا اِلَّا بِقُرْبِ حَبِيْبِهِمْ
وَمَا عَرَجُوْا مِنْ مَسِّ بُؤْسٍ وَلَا ضُرٍّ

(عارفین کے دل خفیہ مناجات کے وقت ذکر و تذکار کے مشتاق رہتے ہیں' فنا کے جام ان پر گردش کرتے ہیں اور وہ دنیا سے اس طرح غافل ہوجاتے ہیں جس طرح نشے میں مبتلا شخص تمام باتیں بھول جاتا ہے' ان کے افکار ایسے میدان کو اپنی جولانگاہ بناتے ہیں جہاں اللہ کے محبین روشن ستاروں کی طرح جلوہ بکھیرتے ہیں' ان کے جسم زمین میں بے جان نظر آتے ہیں اور روحیں بلندیوں کی طرح محو سفر' وہ اسی جگہ ٹھہرتے ہیں جہاں حبیب قریب ہوتا ہے' پھر انہیں کسی مصیبت یا ضرر کا احساس نہیں ہوتا۔)

حضرت جنید بغدادیؒ سے کہا گیا کہ ابوسعید الخراز پر موت کے وقت وجد کا زبردست غلبہ تھا' فرمایا عجب نہیں کہ ان کی روح شدت اشتیاق کے باعث پرواز کرجاتی' ذوالنون سے موت کے وقت پوچھا گیا کہ آپ کیا چاہتے ہیں' فرمایا! میں موت سے ایک لحظہ پہلے اللہ کی معرفت چاہتا ہوں' ایک بزرگ سے عالم نزع میں کہا گیا اللہ کہو' کہنے لگے کب تک؟ میں تو اس کے درد سے خاکستر ہوا جاتا ہوں' ایک بزرگ کہتے ہیں کہ میں ممشاد الدینوری کے پاس تھا اتنے میں ایک فقیر آیا اور سلام کرکے کہنے لگا کہ یہاں کوئی ایسی صاف ستھری جگہ ہے جہاں انسان مرسکے' لوگوں نے اسے ایک جگہ بتلادی' وہاں پانی کا ایک چشمہ بھی تھا' اس شخص نے تجدید وضو کیا اور کچھ رکعتیں پڑھیں اور اس جگہ پہنچا جو اسے بتلائی گئی تھی' پاؤں پھیلا کر لیٹا اور مرگیا' ابوالعباس الدینوری کی مجلس میں ایک عورت کو حال آگیا اور وہ چیخنے لگی' ابوالعباس نے اس سے فرمایا مرجا' وہ عورت اٹھ کر دروازے کی طرف چلی' دروازے پر پہنچ کر مڑی اور ابوالعباس کی طرف دیکھ کر کہنے لگی لو میں مرتی ہوں اور یہ کہہ کر زمین پر گر پڑی' دیکھا تو بے جان ہوچکی تھی' ابوعلی

الروذباری کی ہمشیرہ فاطمہ سے مروی ہے کہ جب ابو علی الروذباری کی وفات کا وقت قریب آیا تو ان کا سر میری گود میں تھا' انہوں نے آنکھیں کھولیں اور کہنے لگے کہ یہ آسمان کے دروازے کھول دیئے گئے ہیں' یہ جنتیں سجادی گئی ہیں اور یہ کہنے والا کہہ رہا ہے اے ابو علی ہم نے تجھے ایک بلند مرتبے پر فائز کردیا ہے اگرچہ تو اس مرتبے کا خواہشمند نہ ہو' پھر وہ یہ شعر پڑھنے لگے۔

وَ حَقِّکَ لَا نَظَرْتُ اِلٰی سِوَاکَا
بِعَیْنِ مَوَدَّةٍ حَتّٰی اَرَاکَا
اَرَاکَ مُعَذِّبِیْ بِفُتُوْرِ لَحْظٍ
وَ بِالْخَدِّ الْمُوَرَّدِ مِنْ حَیَاکَا

(اور تیرا حق یہ ہے کہ میں تیرے سوا کسی پر الفت کی نظر نہ ڈالوں۔ یہاں تک کہ تجھے دیکھ لوں۔ میں دیکھتا ہوں کہ تو چشم بیمار اور حیاء کے باعث سرخ ہوجانے والے رخساروں سے سزا دیتا ہے)

حضرت جنید بغدادیؒ سے کسی نے کہا لا الٰہ الاّ اللہ کہو' انہوں نے جواب دیا کیا میں بھول گیا ہوں کہ اسے یاد کروں؟ جعفر ابن نصیر نے بکران الدینوری سے جو شبلی کے خادم تھے دریافت کیا کہ موت کے وقت شبلی کا کیا حال تھا؟ انہوں نے جواب دیا کہ شبلیؒ نے فرمایا کہ میرے اوپر ایک شخص کا ایک درہم ہے جو ظلم کی راہ سے میرے پاس آیا تھا حالانکہ میں نے اس کی تلافی کے لئے مالک درہم کے ثواب کی نیت سے ہزاروں درہم صدقہ کئے ہیں لیکن وہ درہم آج بھی میرے دل میں پھانس کی طرح چبھتا ہے' پھر فرمایا کہ مجھے نماز کے لئے وضو کرادو۔ میں نے وضو کرادیا لیکن داڑھی میں خلال کرنا بھول گیا' اس وقت آپ بول نہیں پا رہے تھے' اس لئے آپ نے میرا ہاتھ پکڑا اور اپنی داڑھی میں خلال کردیا' پھر انتقال فرماگئے' جعفر یہ واقعہ سن کر رونے لگے اور کہنے لگے کہ تم ایسے شخص کے بارے میں کیا کہو گے جس سے عمر کے آخری لمحے میں بھی شریعت کے آداب فوت نہیں ہوئے' بشر ابن الحارث پر جاں کنی سخت تھی' کسی نے کہا کہ تم جو موت سے اس قدر پریشان ہو' شاید دنیا چھوڑ کر جانا نہیں چاہتے' کہنے لگے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی خدمت میں حاضر ہونا ایک بہت مشکل کام ہے' صالح ابن مسمار سے کسی نے کہا کہ کیا آپ اپنے بیوی بچوں کے بارے میں کوئی وصیت نہیں کریں گے؟ فرمایا! مجھے شرم آتی ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر اپنے بچوں کو کسی اور کے سپرد کروں' جب ابو سلیمان دارانی کی وفات کا وقت قریب ہوا تو آپ کے ساتھی آپ کے پاس آئے اور کہنے لگے آپ لوش ہو اس لئے کہ آپ رب غفور رحیم کے پاس جارہے ہو' آپ نے فرمایا کیا تم یہ نہیں کہتے کہ ڈرو اس لئے کہ تم رب کے پاس جارہے ہو' جو معمولی غلطیوں کا حساب لے گا اور بڑے گناہوں پر عذاب دے گا' ابوبکر الواسطی سے لوگوں نے عرض کیا کہ ہمیں وصیت فرمائیں' ارشاد فرمایا تم سے اللہ تعالیٰ کی جو مراد ہے اس کی حفاظت کرو' ایک بزرگ کے انتقال کا وقت قریب ہوا تو ان کی بیوی رونے لگیں' آپ نے ان سے فرمایا کیوں روتی ہو؟ بیوی نے جواب دیا میں آپ پر روتی ہوں' فرمایا اگر رونا ہی ہے تو اپنے آپ پر روؤ' میں تو اس دن کے لئے چالیس برس سے رو رہا ہوں' حضرت جنید کہتے ہیں کہ میں سری سقطی کی عیادت کے لئے گیا وہ اس وقت مرض وفات میں مبتلا تھے' میں نے ان سے پوچھا کیسی طبیعت ہے۔ جواب میں انہوں نے یہ شعر پڑھا۔

کَیْفَ اَشْکُوْ اِلٰی طَبِیْبِیْ مَابِیْ
وَالَّذِیْ اَصَابَنِیْ مِنْ طَبِیْبِیْ

(میں اپنے طبیب سے اپنے حال کا کیا شکوہ کروں۔ اس لئے کہ میرا یہ حال میرے طبیب ہی کی وجہ سے ہوا ہے۔)

حضرت جنیدؒ کہتے ہیں کہ میں انہیں پنکھا کرنے لگا' کہنے لگے وہ شخص پنکھے کی ہوا سے کیا لطف اندوز ہوگا جو اندر سے جل رہا ہو۔ پھر یہ تین اشعار پڑھے۔

اَلْقَلْبُ مُحْتَرِقٌ وَالدَّمْعُ مُسْتَبِقٌ
وَالْكَرْبُ مُجْتَمِعٌ وَالصَّبْرُ مُفْتَرِقٌ
كَيْفَ الْقَرَارُ عَلٰى مَنْ لَا قَرَارَ لَهُ
مِمَّا جَنَاهُ الْهَوٰى وَالشَّوْقُ وَالْقَلَقُ
يَارَبِّ اِنْ يَّكُ شَيْئٌ فِيْهِ لِيْ فَرَجٌ
فَامْنُنْ عَلَيَّ بِهٖ مَادَامَ بِيْ رَمَقٌ

(دل جل رہا ہے اور آنکھیں اشک بہارہی ہیں درد جمع ہے اور صبر منتشر ہے' اس شخص کو قرار کیسے حاصل ہو جسے شوق' محبت اور قلق نے بے قرار کر رکھا ہو۔ اے اللہ! اگر کسی چیز میں میرے لئے کشادگی ہو تو مجھ پر اس کا فضل فرما جب تک مجھ میں زندگی کی رمق ہے۔)

روایت ہے کہ شبلی کے کچھ احباب ان کی خدمت میں اس وقت حاضر ہوئے جب کہ وہ موت کی جاں کنی میں مبتلا تھے۔ انہوں نے عرض کیا کہ آپ کلمہ لا الٰہ الاّ اللہ پڑھیں۔ جواب میں انہوں نے یہ اشعار پڑھے۔

اِنَّ بَيْتًا اَنْتَ سَاكِنُهُ
غَيْرُ مُحْتَاجٍ اِلَى السُّرُجِ
وَجْهُكَ الْمَامُوْلُ حُجَّتُنَا
يَوْمَ يَاْتِى النَّاسُ بِالْحُجَجِ
لَا اَتَاحَ اللّٰهُ لِيْ فَرَجًا
يَوْمَ اَدْعُوْ مِنْكَ بِالْفَرَجِ

(وہ گھر جس میں تو رہتا ہے کسی چراغ کا محتاج نہیں ہے' تیری ذات کریم جو ہماری امیدوں کا مرکز ہے ہماری حجت ہوگی جس دن لوگ حجتیں لے کر آئیں گے۔ جس دن میں تجھ سے اس حال سے کشائش چاہوں اللہ تعالیٰ مجھے کشادگی عطا نہ کرے۔)

بیان کیا جاتا ہے کہ ابو العباس ابن عطاء حضرت جنید کے پاس نزع کے عالم میں پہنچے اور سلام کیا' حضرت جنید نے اس وقت تو جواب نہیں دیا لیکن کچھ دیر بعد وعلیکم السلام کہا' پھر فرمایا بھائی! میں وظیفہ پڑھ رہا تھا اس لئے جواب نہیں دے سکا' پھر اپنا رخ قبلے کی طرف کیا اور تکبیر کہہ کر وفات پاگئے' کتانی سے وفات کے وقت پوچھا گیا کہ آپ کا عمل کیا تھا' فرمایا! اگر موت کا وقت قریب نہ ہوتا تو میں تمہیں کبھی اپنے عمل کے متعلق کچھ نہ بتلاتا' میں اپنے دل کے دروازے پر چالیس برس تک کھڑا رہا' جب بھی کسی غیر نے اندر گھسنے کی کوشش کی میں رکاوٹ بن کر کھڑا ہوگیا' معتمر کہتے ہیں کہ جب حکم ابن عبد الملک کی وفات ہوئی تو میں وہاں موجود تھا' اس وقت میں نے یہ دعا کی اے اللہ! اس پر موت کے سکرات آسان فرما کیونکہ یہ ایسا تھا ویسا تھا' میں نے اس کے کچھ محاسن ذکر کئے' حکم نے آنکھیں کھولیں اور پوچھا یہ کون شخص بول رہا ہے۔ میں نے اپنا نام بتلایا' اس نے کہا ملک الموت مجھ سے کہہ رہے ہیں کہ میں ہر سخی کے ساتھ نرمی کا معاملہ کرتا ہوں یہ کہہ کر جاں بحق ہوگیا' جب یوسف ابن اسباط مرض الوفات میں مبتلا ہوئے تو حذیفہ ان کے پاس آئے اور کہنے لگے اے ابو محمد! یہ گھبراہٹ اور پریشانی کا وقت ہے؟ یوسف نے کہا میں کیوں نہ گھبراؤں اور کس لئے پریشان نہ ہوں؟ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ میں نے اپنے کسی عمل سے اللہ تعالیٰ کی تصدیق نہیں کی' حذیفہ نے کہا اس نیک آدمی پر حیرت ہوتی ہے کہ وہ موت کے وقت یقین کے ساتھ اس بات کا دعویٰ کرتا ہے کہ اس نے اپنے کسی عمل سے اللہ تعالیٰ کی تصدیق

نہیں کی' مغازلیؒ کہتے ہیں کہ میں ایک بزرگ صوفی کی خدمت میں حاضر ہوا وہ اس وقت بیمار تھے' میں نے سنا وہ یہ کہہ رہے تھے کہ اے اللہ! تو سب کچھ کرسکتا ہے' مجھ پر رحم فرما' ایک بزرگ ممشاد دینوری کے پاس بوقت وفات پہنچے اور ان کے لئے دعا کی' اے اللہ! ان کے ساتھ ایسا سلوک کیجئے ویسا معاملہ کیجئے' یہ دعا سن کر وہ ہنسنے لگے اور کہنے لگے کہ تیس برس سے مجھ پر جنت اور اس کی نعمتیں پیش کی جارہی ہیں لیکن میں انہیں نگاہ بھر کر دیکھتا بھی نہیں' رویم سے موت کے وقت کہا گیا کہ لا الہ الا اللہ کہو' انہوں نے کہا میں اس سے بہتر کوئی بات نہیں کہہ سکتا' حضرت سفیان ثوری کو بھی وفات سے پہلے کلمۂ لا الہ الا اللہ کی تلقین کی گئی۔ انہوں نے فرمایا کیا وہاں کوئی اور بات نہیں' مزنیؒ امام شافعی کی خدمت میں آپ کے مرض وفات کے دوران حاضر ہوئے اور دریافت کیا اے ابو عبداللہ! آپ نے کس حال میں صبح کی' آپ نے فرمایا میں نے اس حال میں صبح کی کہ دنیا سے رخصت ہو تا ہوں' دوستوں سے جدا ہوں' اپنے برے اعمال سے ملتا ہوں اور جام فنا پیتا ہوں اور اللہ کے پاس جاتا ہوں اور یہ نہیں جانتا کہ میری روح جنت کی طرف جائے گی کہ میں اسے مبارکباد دوں یا دوزخ میں جائے گی کہ اس سے تعزیت کروں۔ پھر یہ اشعار پڑھے۔

لَمَّا قَسَتْ قَلْبِيْ وَضَاقَتْ مَذَاهِبِيْ ۔۔۔ جَعَلْتُ رَجَائِيْ نَحْوَ عَفْوِكَ سُلَّمَا
تَعَاظَمَنِيْ ذَنْبِيْ فَلَمَّا قَرَنْتُهُ ۔۔۔ بِعَفْوِكَ رَبِّيْ كَانَ عَفْوُكَ اَعْظَمَا
فَمَا زِلْتَ ذَا عَفْوٍ عَنِ الذَّنْبِ لَمْ تَزَلْ ۔۔۔ تَجُوْدُ وَ تَعْفُوْ مِنَّةً وَ تَكَرُّمَا
وَلَوْلَاكَ لَمْ يُغْوِيْ بِاِبْلِيْسَ عَابِدٌ ۔۔۔ فَكَيْفَ وَقَدْ اَغْوٰى صَفِيَّكَ آدَمَا

(جب میرا دل سخت ہوا اور میری راہیں مسدود ہوگئیں' تو میں نے تیرے عفو سے اپنی امید کو سیڑھی بنالیا' میں نے اپنے گناہوں کو برائی کے اعتبار سے نہایت بڑا سمجھا' لیکن جب تیرے عفو سے موازنہ کیا تو تیرے عفو کو بڑا پایا' تو ہمیشہ اپنے عفو و کرم اور فضل و عنایت سے گناہوں کی بخشش کرتا ہے۔ اگر تو نہ ہوتا تو کوئی عابد کسی ابلیس سے گمراہ نہ ہوتا' اس نے تو تیرے پاکباز بندے آدم کو گمراہ کیا)

احمد ابن الخضرویہ سے وفات کے وقت ایک مسئلہ دریافت کیا گیا' سوال سن کر ان کی آنکھیں بھر آئیں اور کہنے لگے اے بیٹے! اس دروازے پر پچانوے برس سے دستک دے رہا تھا' اب کھلنے کا وقت آیا ہے' معلوم نہیں سعادت کے ساتھ کھلے گا یا شقاوت کے ساتھ' اب مجھے جواب کی فرصت کہاں؟

یہ ہیں بزرگان دین کے اقوال' جو ان کے احوال کے اعتبار سے مختلف ہوتے ہیں' اصل میں بعض لوگوں پر وفات کا خوف غالب رہا۔ بعض پر رجاء' بعض پر شوق اور محبت' اس لئے ہر شخص نے اپنے حال کے اعتبار سے گفتگو کی' اس لئے یہ تمام اقوال اپنی اپنی جگہ صحیح ہیں اور ان میں کوئی تضاد نہیں ہے۔

جنازوں اور قبرستانوں میں عارفین کے اقوال۔ اور زیارت قبور کا حکم۔ : جنازوں میں اہل بصیرت کے لئے عبرت ہے' اور اہل غفلت کے لئے تنبیہہ اور تذکیر ہے' بشرطیکہ وہ فکر و تدبر کریں' ورنہ اکثر اہل غفلت کے قلوب جنازوں کے مشاہدے سے سخت ہوتے ہیں' کیوں کہ وہ سمجھتے ہیں کہ وہ لوگ ہمیشہ دوسروں کے جنازے دیکھتے رہیں گے' یہ خیال نہیں کرتے کہ خود انھیں بھی جنازے کی صورت لوگوں کے کاندھوں پر جانا ہے' اور اگر اس کا خیال ہوتا بھی ہے تو یہ نہیں سمجھتے کہ انھیں جلد جانا ہے' اور نہ یہ سوچتے ہیں کہ جو لوگ آج جنازوں کی صورت قبرستان جارہے ہیں وہ خود بھی اسی غلط فہمی میں مبتلا تھے' اور یہی سوچا کرتے تھے کہ انھیں مرنا نہیں ہے' یا مرنا ہے تو اتنی جلدی نہیں مرنا ہے' مگر ان کا خیال غلط نکلا' اور ان کی مدت بہت جلد پوری ہوگئی ہے' اسلئے جب بھی کوئی شخص جنازہ دیکھے اسے یہ سوچنا چاہیے گویا وہ خود اس جنازے میں ہے' اور اگر آج نہیں ہے تو بہت جلد اس جگہ آنے والا ہے' یا تو آج ہی یا کل اور کل نہیں تو پرسوں' حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہیکہ آپ جب کوئی جنازہ دیکھتے تو ارشاد فرماتے جاؤ ہم تمہارے پیچھے آرہے ہیں' مکحول الدمشقی جنازہ دیکھ کر فرماتے تم صبح کو جارہے ہو ہم شام کو آنے والے ہیں'

نصیحت مؤثر ہے' اور غفلت تیزی سے آنے والی ہے' پہلا جاتا ہے' اور دوسرے کو کوئی عقل نہیں ہے' السید ابن حضیر کہتے ہیں کہ میں کسی جنازے پر اس طرح نہیں گیا کہ میرے دل میں اسکے علاوہ کسی اور چیز کا خیال آیا ہو' اور اسکے علاوہ بھی کوئی بات سوچی ہو کہ اسکے ساتھ کیا ہونے والا ہے' اور وہ کن حالات سے دوچار ہوگا' جب مالک ابن دینار کے بھائی کا انتقال ہوا تو مالک ابن دینار ان کے جنازے کے لئے باہر نکلے' اور یہ کہتے ہوئے رونے لگے کہ بخدا میری آنکھیں اس وقت تک ٹھنڈی نہیں ہوں گی جب تک مجھے یہ معلوم نہ کہ اس کا انجام کیا ہوا ہے' اور یہ بات مجھے مرتے دم تک معلوم نہیں ہوسکے گی۔ اعمش کہتے ہیں کہ ہم جنازوں میں شریک ہوتے تھے' اور یہ نہیں جانتے تھے کہ کس شخص سے تعزیت کریں' کیوں کہ اس مجمع میں ہر شخص غم و حزن کی تصویر نظر آتا تھا' ثابت البنانی کہتے ہیں کہ ہم جنازوں میں شریک ہوتے تھے' اور ہمیں کوئی شخص ایسا نظر نہیں آتا تھا جو اپنے چہرہ پر کپڑا ڈالے ہوئے روتا نہ ہو' یہ تھا ہمارے بزرگوں کا خوف۔ اور آج یہ حال ہیکہ جنازے میں شریک ہونے والے اکثر لوگ ہنستے' بولتے اور کھیلتے نظر آتے ہیں' اگر وہ مردے کے بارے میں کوئی گفتگو کرتے بھی ہیں تو یہ کہ اس نے کتنا ترکہ چھوڑا' اور اسکی میراث کس کو ملے گی' اگر کوئی قریبی عزیز ہوتا ہے تو وہ یہ نہیں سوچتا کہ اپنے مرنے والے عزیز کی بخشش کا کیا سامان کیا جائے بلکہ یہ سوچتا ہے کہ مرحوم نے جو مال چھوڑا ہے اسے اس میں سے کتنا حصہ کس حیلے اور تدبیر سے حاصل ہوسکتا ہے' ان میں شاید ہی کوئی شخص ایسا ہوگا جو اپنے جنازے میں غور کرتا ہوگا اور مرنے کے بعد اپنے انجام کے متعلق سوچتا ہوگا۔ اس غفلت کا سبب اسکے علاوہ کچھ نہیں کہ معاصی اور گناہوں کی کثرت سے دل سخت ہوجاتے ہیں' اور لایعنی امور میں پڑجاتے ہیں۔ دعا یہ ہے کہ اللہ ہم کو اس غفلت سے بیدار فرمائے۔

جنازوں میں حاضر ہونے والوں کا بہترین ادب یہ کہ وہ مرنے والوں پر روئیں' بلکہ اگر عقل رکھتے ہوں تو خود اپنے اوپر روئیں' نہ کہ میت پر۔ ابراہیم الزیات نے لوگوں کو دیکھا کہ وہ میت پر رحم کررہے ہیں' آپ نے ان سے فرمایا کہ اگر تم اپنے اوپر رحم کرو تو یہ زیادہ بہتر ہے' اس لئے کہ یہ شخص تو تین دہشتناک امور سے نجات پاگیا' ملک الموت کا چہرہ دیکھ چکا ہے' موت کی تلخی چکھ چکا ہے' اور خوف خاتمے کے خوف سے مامون ہوچکا ہے۔ ابو عمر ابن العلاء کہتے ہیں کہ میں جریر شاعر کے پاس بیٹھا ہوا تھا اور وہ اپنے کاتب کو شعر املاء کرارہا تھا' اچانک ایک جنازہ سامنے آیا' جریر شعر کہتے کہتے رک گیا' اور کہنے لگا واللہ مجھے ان جنازوں نے بوڑھا کردیا ہے۔ پھر اس نے یہ دو شعر پڑھے:

تُرَوِّعُنَا الْجَنَائِزُ مُقْبِلَاتٍ وَنَلْهُوحِيْنَ تَذْهَبُ مُدْبِرَاتٍ
كَرَوْعَةِ ثَلَّةٍ لِمَغَارِ ذِئْبٍ فَلَمَّا غَابَ عَادَتْ رَاتِعَاتٍ

(جنازے جب سامنے آتے ہیں تو ہمیں خوف زدہ کردیتے ہیں' اور جب وہ اوجھل ہوجاتے ہیں تو ہم کھیل میں لگ جاتے ہیں جس طرح بکریاں بھیڑیئے کو دیکھ کر ڈر جاتی ہیں اور جب وہ غائب ہوجاتا ہے تو پھر چرنے لگتی ہیں)

جنازے میں شرکت کے آداب: جنازوں میں حاضری کے بھی کچھ آداب ہیں' مثلاً یہ کہ فکر کرے' غفلت سے بھی اجتناب کرے' تیار ہو' اور متواضع بن کر اس کے ہمراہ چلے' ہم نے فن فقہ میں اس کے کچھ آداب اور سنن بیان کئے ہیں' ایک ادب یہ ہیکہ میت کے متعلق اچھا گمان رکھے' خواہ وہ فاسق ہی کیوں نہ رہا ہو' اور اپنے متعلق اچھا گمان نہ رکھے' اگرچہ ظاہری حالت نیکی اور تقوی پر دلالت کرتی ہو' اس لئے کہ خاتمہ خطرناک ہے' اسکی حقیقت معلوم نہیں ہے' چنانچہ عمر ابن ذر روایت کرتے ہیں کہ ان کے ایک پڑوسی کا انتقال ہوگیا' وہ نہایت گناہ گار شخص تھا' بے شمار لوگوں نے اس برائی کے باعث اسکی نماز جنازہ نہیں پڑھی' لیکن انھوں نے اس کے جنازے میں شرکت کی' اسکی نماز پڑھی' جب اسے قبر کے اندر لٹادیا گیا تو انھوں نے اسکی قبر پر کھڑے ہوکر فرمایا کہ اللہ تجھ پر رحم فرمائے تو نے اپنی زندگی توحید میں بسر کی' اور سجدوں سے اپنی پیشانی کو گرد آلود کیا' اگرچہ لوگ تجھے گناہ گار کہتے ہیں بھلا ہم میں سے کون شخص ایسا ہے جس نے گناہ نہیں کیا' اور خطاء کا ارتکاب نہیں کیا' روایت ہیکہ بصرے کے نواح میں ایک ایسے شخص کا انتقال ہوگیا جو فساد اعمال میں مبتلا تھا' اسکی بیوی کو کوئی ایسا شخص نہیں مل سکا جو جنازہ اٹھانے میں

اسکی مدد کرتا کیوں کہ کثرت فسق کی وجہ سے کوئی شخص اس کے قریب نہیں آتا تھا مجبوراً اس نے بوجھ ڈھونے والے بلائے اور ان کی مدد سے جنازہ لے گئی کسی شخص نے نماز پڑھی اور کرائے کے مزدور اسے دفن کے لئے جنگل میں لے گئے مقام تدفین سے قریب ایک پہاڑ واقع تھا اور اس پر ایک بڑے بزرگ معتکف تھے عورت نے دیکھا گویا وہ جنازے کے منتظر بیٹھے ہوئے ہیں جونہی جنازہ وہاں پہنچا وہ بزرگ پہاڑ سے اتر کر نیچے تشریف لائے اور اس پر نماز پڑھنے کا ارادہ کیا آناً فاناً یہ خبر شہر میں پھیل گئی کہ فلاں بزرگ پہاڑ سے اتر کر جنازہ کی نماز پڑھنا چاہتے ہیں لوگ یہ خبر سن کر جوق در جوق وہاں پہنچے اور بزرگ کے ساتھ نماز جنازہ ادا کی لوگوں کو اس واقعے پر بڑی حیرت ہوئی انھوں نے بزرگ سے پوچھا کہ وہ کس خیال سے نیچے تشریف لائے بزرگ نے جواب دیا کہ مجھ سے خواب میں کہا گیا تھا کہ فلاں جگہ جاؤ وہاں تمہیں ایک جنازہ ملے گا جس کے ساتھ اسکی بیوی کے علاوہ کوئی نہیں ہے اس پر نماز پڑھو اسلئے کہ اسکی مغفرت کردی گئی ہے لوگوں کو یہ سن کر بڑا تعجب ہوا بزرگ نے اسکی بیوی کو بلایا اور اسکے حالات معلوم کئے بیوی نے بتلایا کہ وہ تمام دن شراب کے نشے میں رہتا تھا بزرگ نے پوچھا کیا تم سوچ کر بتلا سکتی ہو کہ وہ کبھی نیک عمل کرلیا کرتا تھا بیوی نے کہا ہاں اس میں تین باتیں تھیں ایک تو یہ جس دن وہ شراب کے نشے میں نہیں ہوتا تھا صبح کے وقت کپڑے بدلتا تھا اور وضو کرکے باجماعت نماز ادا کرتا تھا دوسری بات یہ کہ اسکے گھر میں ایک دو یتیم بچے ہر وقت موجود رہتے تھے جن پر وہ اپنی اولاد سے زیادہ شفقت کرتا تھا اور ہر وقت ان کے بارے میں پوچھتا رہتا تھا تیسری یہ کہ وہ رات کی تاریکی میں رو رو کر کہا کرتا تھا اے اللہ! تو اس خبیث سے (مجھ سے) دوزخ کا کون سا گوشہ بھرنا چاہتا تھا بزرگ یہ سن کر واپس چلے گئے اور ان کے ذہن میں جو خلجان تھا وہ رفع ہوگیا صلہ ابن اشیم سے منقول ہے کہ انھوں نے اپنے بھائی کی تدفین کی بعد قبر پر یہ شعر پڑھا :-

فَاِنْ تَنْجُ مِنْهَا تَنْجُ مِنْ ذِیْ عَظِیْمَةٍ وَاِلَّا فَاِنِّیْ لَا اَخَالُکَ نَاجِیًا

(اگر تونے نجات پالی تو ایک زبردست مرحلے سے نجات پائے گا ورنہ مجھے خیال نہیں کہ تو نجات پاسکے گا)۔

قبر کا حال اور قبور پر بزرگوں کے اقوال : ضحاکؒ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ! لوگوں میں سب سے زیادہ زاہد کون ہے؟ فرمایا وہ شخص جو قبر کو اور اپنے جسم کے گلنے سڑنے کو فراموش نہ کرے اور دنیا کی زائد زینت ترک کردے اور باقی رہنے والی چیز کو فنا ہوجانے والی چیز پر ترجیح دے اور اپنی زندگی میں آنے والے کل کو شمار نہ کرے اور خود کو قبر والوں میں تصور کرے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے کسی نے دریافت کیا کہ آپ قبرستان کے پڑوس میں کیوں آباد ہیں فرمایا: وہ بہترین اور سچے پڑوسی ہیں اپنی زبانیں روکتے ہیں اور آخرت کا ذکر کرتے ہیں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں :-

مَا رَاَیْتُ مَنْظَرًا اِلَّا وَالْقَبْرُ اَفْظَعُ مِنْهُ (۱) میں نے کوئی چیز قبر سے زیادہ خوف ناک نہیں دیکھی

حضرت عمر ابن الخطابؓ فرماتے ہیں کہ ہم سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ قبرستان گئے آپ ایک قبر کے پاس بیٹھ گئے میں آپ سے لوگوں میں سب سے نزدیک تھا آپ رونے لگے میں بھی رویا اور دوسرے لوگ بھی روئے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیوں روتے ہو؟ ہم نے عرض کیا آپ کو دیکھ کر روتے ہیں فرمایا یہ میری والدہ آمنہ بنت وہب کی قبر ہے میں نے اپنے رب سے والدہ محترمہ کی قبر کی زیارت کی اجازت مانگی تھی چنانچہ مجھے اجازت دیدی گئی میں نے اللہ سے دعائے مغفرت کے لئے بھی اجازت چاہی تھی مگر اس سے منع کردیا گیا اس لئے مجھ پر وہ رقت غالب ہوگئی جو اولاد کو والدین کے لئے ہوتی ہے (۲) حضرت عثمان ابن عفانؓ ایک قبر پر کھڑے ہوئے اور اس قدر روئے کہ آپ کی داڑھی مبارک تر ہوگئی کسی نے عرض کیا کہ آپ جنت دوزخ کے ذکر پر نہیں روتے اور جب قبر پر کھڑے ہوتے ہیں تو روتے ہیں فرمایا میں نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ قبر آخرت کی پہلی منزل ہے اگر آدمی اس سے نجات پالیتا ہے تو بعد کی منزلیں آسان ہوجاتی ہیں اور اگر نجات نہیں پاتا تو بعد کی منزلیں دشوار رہتی ہیں (ترمذی ابن ماجہ حاکم) روایت ہیکہ حضرت عمرو ابن العاصؓ ایک قبرستان دیکھ کر سواری سے اترے اور دو رکعت نماز پڑھی لوگوں نے کہا ایسا تو آپ نے پہلے کبھی نہیں کیا تھا؟ فرمایا میں نے قبر والوں کو اور اس

(۱) یہ روایت پہلے بھی گزر چکی ہے) (۲) یہ روایت پہلے بھی گزری ہے

چیز کو جو انکے درمیان واقع ہے یاد کیا تو یہ بہتر جانا کہ دو رکعت نماز پڑھ کر اللہ کی قربت حاصل کروں' حضرت مجاہد فرماتے ہیں کہ ابن آدم سے سب سے پہلے اسکی قبر گفتگو کرتی ہے' اور کہتی ہے میں کیڑوں کا گھر ہوں' تنہائی' اجنبیت' اور تاریکی کا مکان ہوں' یہ تو میں نے تیرے لئے تیار کر رکھا ہے' تو نے میرے لئے کیا تیاری کی ہے۔ حضرت ابوذرؓ نے لوگوں سے فرمایا میں تمہیں اپنی مفلسی کے دن کے متعلق نہ بتلاؤں' یہ وہ دن ہے جس میں میں قبر کے اندر رکھا جاؤں گا' ابو الدرداءؓ قبروں کے پاس بیٹھتے تھے' لوگوں نے پوچھا آپ ایسا کیوں کرتے ہیں فرمایا میں ایسے لوگوں کے پاس بیٹھتا ہوں جو مجھے میری آخرت یاد دلاتے ہیں' اور جب میں ان کے پاس نہیں ہوتا تو میری غیبت نہیں کرتے' جعفر ابن محمد رات کو قبرستان میں جایا کرتے تھے' اور کہتے تھے کہ اے قبر والو! جب میں تمہیں پکارتا ہوں تو تم جواب کیوں نہیں دیتے' پھر فرماتے بخدا ان کے اور جواب کے درمیان کوئی شئی حائل ہے' اور گویا میں بھی ان جیسا نہیں ہوں' پھر صبح تک نماز پڑھتے رہتے' حضرت عمر ابن عبد العزیز نے اپنے ایک ہم نشین سے ارشاد فرمایا اے فلاں! میں تمام رات قبر اور اسکے رہنے والے کے متعلق سوچتا رہا اور جاگتا رہا' اگر تو مردے کو تین دن کے بعد قبر میں دیکھ لے تو اسکے قرب سے وحشت زدہ ہو جائے جب کہ زندگی میں تو اس سے مانوس تھا' تو ایک ایسا گھر دیکھے جس میں کیڑے دوڑتے ہیں' پیپ بہتی ہے' اور کیڑے اس کا جسم کھاتے ہیں' گھر بدل گیا ہے' کفن پرانا ہو گیا ہے' جب کہ وہ بہترین خوشبوؤں میں بسا ہوا' صاف ستھرا اور پاکیزہ تھا' راوی کہتے ہیں کہ یہ کہہ کر آپ نے ایک زبردست چیخ ماری اور بے ہوش ہو کر گر پڑے' یزید الرقاشیؒ کہتے تھے اے وہ شخص جو اپنی قبر میں مدفون ہے' اور اپنے مدفن میں تنہا ہے' اگر اس کے ساتھ کوئی ہے تو اسکے اعمال ہیں میں نہیں جانتا کہ تجھے کون سے اعمال سے خوشخبری ملی ہے' اور اپنے کن بھائیوں پر رشک کیا ہے؟ یہ کہہ کر اس قدر روتے کہ عمامہ تر ہو جاتا' پھر بخدا تو اپنے اعمال صالحہ سے بشارت حاصل کر' اور ان بھائیوں پر رشک کر جو اللہ کی اطاعت پر ایک دوسرے سے معاونت کرتے ہوں' قبر دیکھ کر آپ اس قدر ڈکراتے جیسے ذبح ہوتا ہوا بیل ڈکراتا ہے' حاتم اصم کہتے ہیں کہ جو شخص قبرستان کے پاس سے گزرے اور اپنے متعلق نہ سوچے اور نہ مردوں کے لئے دعائے مغفرت کرے وہ اپنے نفس کے ساتھ بھی خیانت کرنے والا ہے' اور مردوں کی ساتھ بھی' بکر العابد اپنی ماں سے کہتے ہیں امی جان! کاش آپ میری پیدائش سے بانجھ رہتیں' اسلئے کہ آپ کے بیٹے کو قبر میں طویل قید ہونے والی ہے' اس کے بعد اگلا سفر درپیش ہے' یحییٰ ابن معاذؒ کہتے ہیں اے ابن آدم! تجھے تیرا رب سلامتی کے گھر کی طرف بلاتا ہے' اب تو یہ دیکھ کر تو اپنے رب کی دعوت کہاں سے قبول کرتا ہے' اگر دنیا میں قبول کرتا ہے' اور سفر کی تیاری کرتا ہے تو تجھے جنت میں داخلہ نصیب ہو گا' اور اگر قبر میں کرتا ہے تو تجھے اس سے روک دیا جائے گا۔ حسن ابن صالح جب قبروں کے پاس سے گزرتے تو کہتے تمہارے ظاہر اچھے ہیں' لیکن مصیبتیں تمہارے اندر ہیں' عطاء سلمیؒ کا دستور یہ تھا کہ جب رات ہو جاتی تو قبرستان تشریف لے جاتے' اور کہتے اے قبر والو! تم مر گئے ہو' ہائے افسوس! تم نے اپنے اعمال کا مشاہدہ کر لیا ہے وائے افسوس! پھر کہتے کل کے دن قبر میں عطاء ہو گا' ثوریؒ فرماتے ہیں جو شخص بکثرت موت کا ذکر کرتا ہے اسے جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ملتا ہے' اور جو موت سے غافل رہتا ہے اسے دوزخ کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا دیا جاتا ہے۔ ربیع ابن خثیمؒ نے اپنے گھر میں ایک قبر نما گڑھا کھود رکھا تھا' جب کبھی اپنے دل میں سختی محسوس کرتے اس میں لیٹ جاتے اور جب تک چاہتے لیٹے رہتے' پھر یہ آیت پڑھتے۔

رَبِّ ارْجِعُونِ لَعَلِّي أَعْمَلُ صَالِحًا فِيمَا تَرَكْتُ (پ ۱۸ ر ۶ آیت ۹۹-۱۰۰)

اے میرے رب مجھ کو پھر واپس بھیج دیجئے تاکہ جس (دنیا) کو میں چھوڑ آیا ہوں' اس میں پھر جا کر نیک کام کروں۔

پھر یہ کہتے ہوئے اٹھ جاتے اے ربیع! تیرے رب نے تجھے واپس کر دیا ہے' اب عمل کر' احمد ابن حرب کہتے ہیں کہ زمین ایسے شخص پر تعجب کرتی ہے جو اپنے لیٹنے کی جگہ درست کرتا ہے' اور اس پر سونے کے لئے بستر بچھاتا ہے' اور کہتی ہے کہ اے ابن آدم! تو اپنے دیر تک سڑتے رہنے کو کیوں یاد نہیں کرتا تیرے اور میرے درمیان کوئی چیز خالی نہیں ہو گی' میمون ابن مہران کہتے ہیں کہ میں حضرت عمر ابن عبد العزیز کے ساتھ قبرستان گیا' آپ قبریں دیکھ کر رو پڑے' پھر مجھ سے فرمانے لگے کہ اے میمون! یہ ہمارے آباء و اجداد بنو امیہ کی قبریں ہیں' اب ایسے ہو گئے ہیں گویا دنیا والوں کے ساتھ ان کی لذتوں میں شریک ہی نہیں تھے' دیکھو

کیسے شکست خوردہ پڑے ہوئے ہیں' ان پر مصائب ٹوٹ پڑے ہیں' اور بوسیدگی پختہ ہوگئی ہے' کیڑے ان کے جسموں میں آرام کرتے ہیں' اس کے بعد روئے' اور کہنے لگے بخدا میں ان قبر والوں میں سے کسی کو ایسا نہیں جانتا کہ وہ اللہ کے عذاب سے محفوظ رہ گیا ہو' ثابت البنانی کہتے ہیں کہ میں ایک قبرستان میں گیا' جب وہاں سے واپس آنے لگا تو ایک آواز آئی کہ اے ثابت! تو قبرستان والوں کی خاموشی سے فریب مت کھانا' ان میں سے بہت سے نفوس مغموم ہیں' روایت ہے کہ فاطمہ بن حسینؓ نے اپنے شوہر حسن ابن الحسن کا جنازہ دیکھا' اور اپنے چہرے پر کپڑا ڈال کر یہ شعر پڑھا۔

وَكَانُوا رَجَاءً ثُمَّ أَمْسَوا رَزِيَّةً لَقَدْ عَظُمَتْ تِلْكَ الرَّزَايَا وَجَلَّتِ

(پہلے امید تھے پھر مصیبت (کا باعث) بن گئے' یہ مصیبتیں کس قدر عظیم اور زبردست ہیں)۔

روایت ہے کہ انہوں نے اپنے شوہر کی قبر پر ایک خیمہ لگالیا تھا' سال بھر تک وہاں مقیم رہیں اسکے بعد خیمہ اکھاڑ کر مدینہ منورہ واپس چلی آئیں' جس وقت واپس ہو رہی تھیں' جنت البقیع کی طرف سے آواز آئی کیا کھوئی ہوئی چیز واپس مل گئی' دوسری جانب سے آواز آئی بلکہ مایوس ہو کر واپس ہوئی' ابو موسیٰ التمیمیؒ کہتے ہیں کہ فرزدق شاعر کی بیوی کا انتقال ہوگیا' اس کے جنازے میں بصرے کے بڑے بڑے لوگ شریک تھے' ان میں حضرت حسنؒ بھی تھے' حضرت حسنؒ نے فرزدق سے پوچھا اے ابو فراس! تو نے اس دن کے لئے کیا تیاری کر رکھی ہے' فرزدق نے کہا ساٹھ برس سے اللہ کی وحدانیت کی گواہی اسی دن کے لئے دے رہا ہوں' جب تدفین مکمل ہوگئی تو اس نے اپنی بیوی کی قبر پر کھڑے ہو کر یہ شعر پڑھے۔

أَخَافُ وَرَاءَ الْقَبْرِ إِنْ لَمْ تُعَافِنِي أَشَدَّ مِنَ الْقَبْرِ الْتِهَابًا وَأَضْيَقَا
إِذَا جَاءَنِي يَوْمَ الْقِيَامَةِ قَائِدٌ عَنِيفٌ وَسَوَّاقٌ يَسُوقُ الْفَرَزْدَقَا
لَقَدْ خَابَ مِنْ أَوْلَادِ آدَمَ مَنْ مَشَى إِلَى النَّارِ مَغْلُولَ الْقِلَادَةِ أَزْرَقَا

(اگر تیرا عفو و کرم شامل حال نہ ہوا تو میں قبر کے بعد اس سے بھی سخت تنگی اور سوزش سے ڈرتا ہوں' جب قیامت کے دن کوئی سخت گیر قائد اور ہنکانے والا آئے گا اور فرزدق کو ہنکا کر لے جائے گا' بلاشبہ آدم کی اولاد میں وہ شخص ناکام ہے جو پابہ زنجیر اور نیلگوں رنگ کے ساتھ دوزخ کی جانب بڑھے گا)

قبر والوں کے سلسلے میں لوگوں نے یہ شعر بھی کہے ہیں :-

قِفْ بِالْقُبُورِ وَقُلْ عَلَى سَاحَاتِهَا مَنْ مِنْكُمُ الْمَغْمُورُ فِي ظُلُمَاتِهَا
وَمَنِ الْمُكَرَّمُ مِنْكُمُ فِي قَعْرِهَا قَدْ ذَاقَ بَرْدَ الْأَمْنِ مِنْ رَوْعَاتِهَا
أَمَّا السُّكُونُ لِذِي الْعُيُونِ فَوَاحِدٌ لَا يَسْتَبِينُ الْفَضْلُ فِي دَرَجَاتِهَا
لَوْجَاوَبُوكَ لَأَخْبَرُوكَ بِأَلْسُنٍ تَصِفُ الْحَقَائِقَ بَعْدُ مِنْ حَالَاتِهَا
أَمَّا الْمُطِيعُ فَنَازِلٌ فِي رَوْضَةٍ يُفْضِي إِلَى مَاشَاءَ مِنْ دَوْحَاتِهَا
وَالْمُجْرِمُ الطَّاغِي بِهَا مُتَقَلِّبٌ فِي حُفْرَةٍ يَأْوِي إِلَى حَيَّاتِهَا
وَعَقَارِبُ تَسْعَى إِلَيْهِ فَرُوحُهُ فِي شِدَّةِ التَّعْذِيبِ مِنْ لَدَغَاتِهَا

(قبروں پر کھڑے ہو اور انکے میدانوں میں پہنچ کر پوچھو کہ تم میں سے کون ان کی تاریکیوں میں گرفتار ہے اور کون ان کی گہرائی میں مکرم و معزز ہے' اور اس کی دہشتوں سے امن کی ٹھنڈک محسوس کر رہا ہے' بظاہر سب پر یکساں سکون نظر آتا ہے' اور ان کے درجات میں کوئی فرق معلوم ہی نہیں ہوتا' لیکن اگر انہوں نے تجھے جواب دیا تو وہ ایسی زبانوں سے تجھے خبریں دیں گے جو قبور کے تمام حالات و حقائق بیان کر دیں' اطاعت گزار ایک باغ میں ٹھہرے گا' اور اس باغ میں جہاں چاہے گا جائے گا' اور مجرم و سرکش بندہ آگ کے گڑھے میں تڑپے گا اور اسکے سانپوں کی پناہ لے گا' بچھو اس کی طرف بڑھیں گے اور اسکی روح انکے ڈسنے سے شدید

عذاب میں مبتلا ہوگی)

داؤد طائی ایک ایسی عورت کے پاس گزرے جو کسی قبر پر بیٹھی ہوئی ہے یہ شعر پڑھ رہی تھی۔

کَرِمْتَ الْحَیَاۃَ وَلَا نِلْتَھَا ۔۔۔ اِذَا کُنْتَ فِی الْقَبْرِ قَدْ اَلْحَدُوْکَا

فَکَیْفَ اَذُوْقُ لِطَعْمِ الْکَرٰی ۔۔۔ وَاَنْتَ بِیُمْنَاکَ قَدْ وَسَّدُوْکَا

(تو زندگی سے محروم ہوا اور اسے دوبارہ نہ پاسکا کیوں کہ لوگوں نے تجھے قبر میں دفن کردیا بھلا میری آنکھوں میں نیند کہاں سے آئے کہ تو زمین کو تکیہ بنائے لیٹا ہوا ہے)

اسکے بعد وہ عورت کہنے لگی اے بیٹے! کیڑے نے تیرا کون سا رخسار کھانا شروع کیا ہے؟ داؤد نے یہ سن کر ایک چیخ ماری اور بے ہوش ہو کر گر پڑے۔

مالک ابن دینار کہتے ہیں کہ میں ایک قبرستان کے پاس گزرا اور میں نے شعر پڑھے۔

اَتَیْتُ الْقُبُوْرَ فَنَادَیْتُھَا ۔۔۔ فَاَیْنَ الْمُعَظَّمُ وَ الْمُحْتَقَرُ

وَاَیْنَ الْمُدِلُّ بِسُلْطَانِہٖ ۔۔۔ وَاَیْنَ الْمُزَکِّیُّ اِذَا مَاافْتَخَرُ

(میں قبروں پر گیا اور قبر والوں کو آواز دی کہ کہاں ہیں عزت دار اور حقیر لوگ اور کہاں ہیں وہ جو اپنی سلطنت پر نازاں تھے اور کہاں ہیں وہ جو فخر و غرور میں مبتلا تھے)

مالک ابن دینار کہتے ہیں کہ ابھی یہ شعر پڑھ ہی رہا تھا کہ مجھے ایک آواز سنائی دی' لیکن جس شخص کی یہ آواز تھی وہ مجھے نظر نہیں آرہا تھا' وہ کہہ رہا تھا:۔

تَفَانُوْا جَمِیْعًا فَمَا مُخْبِرٌ ۔۔۔ وَمَاتُوْا جَمِیْعًا وَمَاتَ الْخَبَرُ

تَرُوْحُ وَتَغْدُوْ بَنَاتُ الثَّرٰی ۔۔۔ فَتَمْحُوْ مَحَاسِنَ تِلْکَ الصُّوَرُ

فَیَا سَائِلِیْ عَنْ اُنَاسٍ مَضَوْا ۔۔۔ اَمَا لَکَ فِیْمَا تَرٰی مُعْتَبَرُ

(سب لوگ فنا ہوگئے' اب کوئی خبر دینے والا نہیں ہے' تمام لوگ مرگئے اور خبر بھی مرگئی' زمین کے کیڑے صبح و شام آتے ہیں' اور ان صورتوں کے محاسن مٹاتے ہیں' اے وہ شخص جو گزر جانے والے لوگوں کا حال پوچھتا ہے جو کچھ تو دیکھ رہا ہے کیا اس میں تیرے لئے عبرت نہیں ہے)۔

راوی کہتے ہیں کہ میں یہ شعر سن کر روتا ہوا واپس آیا۔

کتبوں پر لکھے ہوئے شعر: ایک قبر کے کتبے پر یہ دو شعر درج تھے:۔

تُنَاجِیْکَ اَجْدَاثٌ وَھُنَّ صُمُوْتٌ ۔۔۔ وَسُکَّانُھَا تَحْتَ التُّرَابِ خُفُوْتٌ

اَیَا جَامِعَ الدُّنْیَا لِغَیْرِ بَلَاغَۃٍ ۔۔۔ لِمَنْ تَجْمَعُ الدُّنْیَا وَاَنْتَ تَمُوْتُ

(قبریں خاموش ہیں' لیکن زبان حال سے تجھے اپنے راز سے آگاہ کررہی ہیں' اور ان میں رہنے والے مٹی کے نیچے سوئے ہوئے ہیں' اے وہ شخص! جو لامحدود دنیا جمع کرتا ہے' تو یہ دنیا کس لئے جمع کررہا ہے جب کہ تجھے مرنا ہے)

ایک قبر کے کتبے پر یہ دو شعر لکھے ہوئے تھے۔

اَیَا غَانِمُ اَمَّا ذَرَاکَ فَوَاسِعٌ ۔۔۔ وَقَبْرُکَ مَعْمُوْرُ الْجَوَانِبِ مُحْکَمُ

وَمَا یَنْفَعُ الْمَقْبُوْرَ عِمْرَانُ قَبْرِہٖ ۔۔۔ اِذَا کَانَ فِیْہِ جِسْمُہٗ یَتَھَدَّمُ

اے غنیمت لوٹنے والے اگرچہ تیرا گھر کشادہ ہے' اور تیری قبر ہر جانب سے آباد اور مستحکم ہے' مگر قبر کے اندر جو شخص موجود ہے اسکو قبر کی آبادی سے کیا نفع ہوسکتا ہے جب کہ اس میں اس کا جسم گر رہا ہو)۔

ابن السماک کہتے ہیں کہ میں ایک قبرستان میں گیا' وہاں ایک قبر پر یہ شعر کندہ تھے۔

يَمُرُّ اَقَارِبِىْ جُنُبَاتِ قَبْرِىْ كَاَنَّ اَقَارِبِىْ لَمْ يَعْرِفُوْنِىْ
ذَوُو الْمِيْرَاثِ يَقْتَسِمُوْنَ مَالِىْ وَمَا يَالُوْنَ اَنْ جَحَدُوْا دُيُوْنِىْ
وَقَدْ اَخَذُوْا سِهَامَهُمْ وَعَاشُوْا فَيَا لِلّٰهِ اَسْرَعَ مَا نَسُوْنِىْ

(میرے اقارب میری قبر کے برابر سے اس طرح گزر جاتے ہیں گویا مجھے جانتے ہی نہیں ہیں' میراث والے میرا مال تقسیم کر لیتے ہیں' اور ذرا سی دیر میں میرے قرضوں کا انکار کر دیتے ہیں' اپنے اپنے حصے لے کر الگ ہو جاتے ہیں' اور زندگی گزارتے ہیں' حالانکہ جتنی جلد انہوں مجھے فراموش کیا ہے' اس سے کہیں جلد امر الٰہی ان تک پہنچنے والا ہے)

ایک قبر پر انہوں نے یہ چند اشعار لکھے ہوئے دیکھے:

اِنَّ الْحَبِيْبَ مِنَ الْاَحْبَابِ مُخْتَلَسٌ لَا يَمْنَعُ الْمَوْتَ بَوَّابٌ وَلَا حَرَسُ
فَكَيْفَ تَفْرَحُ بِالدُّنْيَا وَلَذَّتِهَا يَامَنْ يَعُدُّ عَلَيْهِ اللَّفْظُ وَ النَّفَسُ
اَصْبَحْتَ يَا غَافِلًا فِى النَّقْصِ مُنْغَمِسًا وَاَنْتَ دَهْرَكَ فِى اللَّذَّاتِ مُنْغَمِسُ
لَا يَرْحَمُ الْمَوْتُ ذَاجَهْلٍ لِغُرَّتِهِ وَلَا الَّذِىْ كَانَ مِنْهُ الْعِلْمُ يَقْتَبِسُ
كَمْ اَخْرَسَ الْمَوْتُ فِىْ قَبْرٍ وَقَفْتَ بِهِ عَنِ الْجَوَابِ لِسَانًا مَابِهِ خَرَسُ
قَدْ كَانَ قَصْرُكَ مَعْمُوْرًا لَهُ شَرَفٌ فَقَبْرُكَ الْيَوْمَ فِى الْاَجْدَاثِ مُنْدَرِسُ

(احباب میں سے ایک حبیب اچک لیا جاتا ہے' موت کو کوئی دربان یا پہرہ دار روک نہیں سکتا' تو دنیا اور اس کی لذت پر کیسے خوش ہوتا ہے' جبکہ تیرے الفاظ اور سانس کم ہوتے جا رہے ہیں' اور تو لذات میں غرق ہو رہا ہے' موت نہ کسی جاہل پر رحم کرتی ہے' اور نہ کسی ایسے شخص پر جس سے علم کی روشنی حاصل کی جاتی ہے' موت نے کتنی ہی زبانوں کو قبر میں جواب سے ساکت کر دیا حالانکہ وہ گونگی نہیں تھیں' تیرا محل آباد تھا' اسکی عظمت تھی' اور آج تیری قبر کے آثار مٹ رہے ہیں)

ایک قبر پر یہ اشعار درج تھے۔

وَقَفْتُ عَلَى الْاَحِبَّةِ حِيْنَ صُفَّتْ قُبُوْرُهُمْ كَاَفْرَاسِ الرِّهَانِ
فَلَمَّا اَنْ بَكَيْتُ وَفَاضَ دَمْعِىْ رَاَتْ عَيْنَاىَ بَيْنَهُمْ مَكَانِىْ

میں احباب کے پاس سے اس وقت گزرا جب انکی قبریں گھڑ دوڑ کے گھوڑوں کی طرح برابر ہو گئیں' جب میری آنکھوں نے انکے درمیان اپنی جگہ دیکھی تو میں رو پڑا)

ایک حکیم کی قبر کے کتبے پر مندرجہ ذیل اشعار کندہ تھے :-

قَدْ قُلْتُ لَمَّا قَالَ لِىْ قَائِلٌ قَدْ صَارَ لُقْمَانُ اِلَى رَمْسِهِ
فَاَيْنَ مَا يُوْصَفُ مِنْ طِبِّهِ وَحِذْقُهُ فِى الْمَاءِ مَعَ جَسِّهِ
هَيْهَاتَ لَا يَدْفَعُ عَنْ غَيْرِهِ مَنْ كَانَ لَا يَدْفَعُ عَنْ نَفْسِهِ

(جب مجھ سے کسی کہنے والے نے کہا کہ لقمان اپنی قبر میں جا سویا ہے تو میں نے اس سے پوچھا اب وہ طب کہاں گئی جس میں وہ مشہور تھا' اور قارورہ شناسی میں اس کی مہارت کہاں گئی' وہ دوسروں کو امراض سے کیسے بچا سکتا تھا جب کہ وہ خود سے امراض دور نہیں کر سکتا)

ایک قبر پر یہ چند اشعار لکھے ہوئے تھے :-

يَا أَيُّهَا النَّاسُ كَانَ لِيْ أَمَلٌ قَصَرَ بِيْ عَنْ بُلُوْغِهِ الْأَجَلُ
فَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهُ رَجُلٌ أَمْكَنَهُ فِيْ حَيَاتِهِ الْعَمَلُ
مَا أَنَا وَحْدِيْ نُقِلْتُ حَيْثُ تَرَىٰ كُلٌّ إِلَىٰ مِثْلِهِ سَيَنْتَقِلُ

(اے لوگو! میری بھی ایک آرزو تھی' جس تک پہنچنے سے میری موت مانع رہی ہے' جو شخص دنیا میں عمل کر سکتا ہو اسے اپنے رب سے ڈرنا چاہئے' تنہا میں ہی یہاں منتقل نہیں ہوا ہوں' بلکہ ہر شخص کو یہیں پہنچنا ہے)

یہ اشعار قبروں پر اسلئے لکھے گئے ہیں کہ ان کے رہنے والے موت سے پہلے عبرت پکڑنے میں کوتاہ تھے' عقلمند انسان وہ ہے جو دوسرے کی قبر کو دیکھ کر خود کو اسی میں تصور کرے اور قبر والوں کے ساتھ ملنے کی تیاری کرے' اور یہ بات جان لے کہ وہ لوگ اپنی جگہ سے اس وقت تک نہیں ہلیں گے جب تک وہ ان میں شامل نہیں ہو جائے گا' اسے یہ بات جان لینی چاہئے کہ اگر قبر والوں کو وہ ایک دن دیدیا جائے جسے وہ ضائع کر رہا ہے تو ان کے نزدیک یہ دن دنیا کی سب سے زیادہ قیمتی شئی ہو' کیوں کہ اب انھیں عمر کی قدر و منزلت کا علم ہوا ہے اور اب ان پر حقائق امور منکشف ہوئے ہیں' انھیں عمر کے ایک دن پر حسرت اسلئے ہے تاکہ کوتاہی کرنے والا اس ایک دن کے ذریعے گزشتہ کوتاہیوں کی تلافی کر سکے' اور عذاب سے محفوظ رہ سکے' اور توفیق یافتہ شخص یہ چاہتا ہے کہ اس کا مرتبہ بلند ہو' اور ثواب زیادہ ملے' گویا انھیں عمر کی قدر کا علم اس وقت ہوا ہے جب وہ پوری ہو چکی ہے' اور زندگی کی ایک ساعت ضائع جانے پر افسوس اس وقت ہوا ہے جب اسکی واپسی کی کوئی صورت نہیں ہے' اور تجھے یہ ساعت حاصل ہے' ہو سکتا ہے تجھے اس جیسی بے شمار ساعتیں ملیں' اور تو انھیں ضائع کر دے' اگر تو نے سبقت کر کے اپنی ساعتوں سے اپنا حصہ وصول نہیں کیا تو اس وقت حسرت کے علاوہ کچھ ہاتھ نہیں آئے گا' جب یہ ساعتیں گزر جائیں گی' اور معاملہ اختیار سے باہر نکل جائے گا۔ ایک بزرگ کہتے ہیں کہ' میں نے اپنے ایک بھائی کو خواب میں دیکھ کر کہا الحمد للہ رب العالمین تو زندہ ہے اس نے کہا اگر یہ کلمہ جو تو نے ادا کیا ہے میں کہنے پر قادر ہو جاؤں تو یہ بات میرے لئے دنیا اور اسکی تمام چیزوں سے بہتر ہوگی' کیا تجھے وہ وقت یاد نہیں جب مجھے دفن کیا جا رہا تھا' اور ایک شخص نے وہاں سے اٹھ کر دو رکعت نماز پڑھی تھی' اگر مجھے دو رکعت پڑھنے کی قدرت مل جائے تو یہ دو رکعت میرے لئے دنیا بھر کی نعمتوں سے زیادہ محبوب ہو۔

اولاد کے مرنے پر بزرگوں کے اقوال : جس شخص کا بچہ یا عزیز قریب مرجائے تو اس کے پہلے مرجانے کو ایسا تصور کرے جیسے وہ دونوں سفر میں تھے' دونوں کی منزل ایک ہی شہر تھی' بچہ نے سبقت کی' اور وہ مجھ سے پہلے منزل پہنچ گیا' میں بھی کچھ عرصے کے بعد اس سے جاملوں گا' دونوں میں تقدیم و تاخیر کا فرق ہے' منزل دونوں کی ایک ہی ہے' اگر اس طرح سوچے گا تو افسوس اور غم کم ہو گا' اور اگر وہ ثواب بھی ذہن میں مختصر کر لے' تو شاید غم بالکل ہی نہ ہو' جو بچے کے مرنے پر روایات میں وارد ہے۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں پیٹ سے گرا ہوا بچہ آگے بھیجنا میرے نزدیک اس سے بہتر ہے کہ میں اپنے پیچھے سو سوار چھوڑ جاؤں' جو اللہ کی راہ میں جہاد کریں۔ (۱) ساقط بچے کا ذکر آپ نے اسلئے فرمایا تاکہ ادنیٰ سے اعلا پر تنبیہ ہو جائے' ورنہ ثواب اس قدر ملتا ہے جس قدر دل میں بچے کے لئے محبت ہوتی ہے' زید ابن اسلم کہتے ہیں کہ حضرت داؤد علیہ السلام کے ایک بیٹے کا انتقال ہو گیا' آپ کو اس کے مرنے کا بے حد رنج ہوا' دریافت کیا گیا کہ آپ کے نزدیک بچے کی کیا حیثیت تھی' فرمایا زمین کے برابر سونے کی حیثیت رکھتا تھا' ان سے کہا گیا تمہیں آخرت میں اسی قدر اجر ملے گا' سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جس مسلمان کے تین بچے مرجاتے ہیں' اور وہ ان پر صبر کرتا ہے تو وہ بچے اسکے لئے دوزخ سے ڈھال بن جاتے ہیں' ایک عورت نے جو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھی' عرض کیا کہ اگر دو مرجائیں' آپ نے فرمایا اگر دو مرجائیں تب بھی ایسا ہی ہے' والد کو چاہئے کہ وہ اپنے بچے کیلئے موت کے وقت دعا کرے اسلئے کہ یہ زیادہ امید والی' اور قبولیت سے قریب تر ہوتی ہے۔ (۲)

---

(۱) ابن ماجہ۔ ابو ہریرہؓ۔ مگر سو سواروں کا ذکر نہیں ہے۔ (۲) یہ روایت کتاب النکاح میں گزری ہے۔

محمد ابن سلیمان نے اپنے بیٹے کی قبر پر کھڑے ہو کر کہا اے اللہ! میں تجھ سے اس کے لئے امید رکھتا ہوں اور تجھ سے اس پر خوف کرتا ہوں' میری امید پوری فرما اور خوف سے مامون کر ابوسنان نے بیٹے کی قبر پر کھڑے ہو کر کہا اے اللہ! میں نے وہ حقوق معاف کردئے ہیں جو میرے اس کے اوپر تھے' تو بھی وہ حقوق معاف فرمادے جو تیرے اس پر واجب ہیں بلاشبہ تو نہایت سخی اور بڑے احسان والا ہے' ایک اعرابی نے اپنے بیٹے کی قبر پر کہا اے اللہ! اس نے میری فرماں برداری میں جو کوتاہی کی وہ میں نے معاف کردی ہے' تو بھی وہ قصور معاف کردے جو اس نے تیری اطاعات کی باب میں کیا ہے' جب عمر ابن ذر کے بیٹے ذر کا انتقال ہوا تو عمر ابن ذر نے ان کی تدفین کے بعد کہا' اے ذر! تیری عاقبت کے خوف نے ہمیں تیرے غم سے بے نیاز کردیا ہے' ہمیں نہیں معلوم کہ تجھ سے کیا کہا جائے گا' اور تو کیا جواب دے گا' پھر کہنے لگے! اے اللہ! یہ ذر ہے' تو نے مجھے اس سے نفع دیا جب تک تو نے نفع دینا چاہا' اور اب تو نے اس کا رزق پورا اور عمر تمام کردی ہے' اور یہ کوئی ظلم نہیں ہے' اے اللہ! تو نے اس پر میری اور اپنی اطاعت لازم کی تھی' اے اللہ! تو نے مصیبت پر صبر کرنے کے سلسلے میں جس ثواب کا وعدہ کیا ہے' وہ میں اسے ہبہ کرتا ہوں' اور تو اس کا عذاب مجھے دیدے' اسے عذاب نہ دینا' لوگ ان کی یہ دعا سن کر رونے لگے' جب تدفین کے بعد واپس ہونے لگے تو فرمایا' اے ذر تیرے بعد ہمیں کسی اور کی حاجت نہیں ہے' اور نہ اللہ کے ہوتے ہوئے ہمیں کسی انسان کی ضرورت ہے' اب ہم چلتے ہیں' اور تجھے یہاں چھوڑتے ہیں' اگر ہم یہاں کھڑے بھی رہے تو تجھے کیا نفع دے پائیں گے' ایک شخص نے بصرے میں ایک عورت کو دیکھا وہ چہرے سے نہایت تروتازہ لگ رہی تھی' اس شخص نے کہا کہ تو انتہائی شگفتہ نظر آتی ہے' معلوم ہوتا ہے تجھے کوئی غم نہیں ہے' اس نے کہا مجھے تو اتنا غم ہے کہ شاید ہی کسی دوسرے کو اس قدر غم ہو' اس نے پوچھا وہ کیا' عورت نے بتلایا کہ میرے شوہر نے عید الاضحیٰ کے دن ایک بکری ذبح کی' میرے دو خوبصورت بچے وہاں کھیل رہے تھے' انھوں نے یہ منظر دیکھا' اور کھیل ہی کھیل میں بڑے لڑکے نے چھوٹے سے کہا کیا میں تجھے دکھلاؤں کہ ابّا جان نے بکری کیسے ذبح کی ہے' چھوٹے بچے نے کہا ہاں' بڑے لڑکے نے اپنے بھائی کو لٹایا' اور اسکے گلے پر چھری پھیردی' ہمیں اس وقت یہ واقعہ معلوم ہوا جب چھوٹا لڑکا خون میں لت پت ہو گیا' جب بہت زیادہ چیخ و پکار اور آہ و بکا ہوئی تو بڑا لڑکا خوف زدہ ہو کر پہاڑ کی طرف بھاگ گیا' وہاں ایک بھیڑیا موجود تھا' اس نے بچے کو کھالیا' جب میرا شوہر بچے کی تلاش میں گیا تو دھوپ اور پیاس کی شدّت سے بے تاب ہو کر مرگیا' اب میں اس دنیا میں بالکل تنہا رہ گئی ہوں'۔

اولاد کی موت کے وقت اسی طرح کی مصائب پر نظر رکھنی چاہیے' تاکہ شدّت رنج و غم میں ان کے ذریعہ تسلّی حاصل کی جاسکے' کوئی مصیبت ایسی نہیں ہے جس سے بڑی مصیبت موجود نہ ہو' اور اللہ اسے دور نہ فرماتا ہو۔

زیارت قبور' میت کے لئے دعا اور اسکے متعلقات : زیارت قبور نصیحت حاصل کرنے اور عبرت پکڑنے کے لئے مستحب ہے' خواہ وہ قبریں عام لوگوں کی ہوں' یا عزیز و اقارب کی' یا صلحاء کی' تاہم صلحاء کی قبروں کی زیارت کرنے سے عبرت کے علاوہ برکت بھی حاصل ہوتی ہے' سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے زیارت قبور سے منع فرمایا تھا اسکے بعد اجازت عطا کی تھی (مسلم۔ بریدۃ) حضرت علیؓ روایت کرتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :۔

كُنْتُ نَهَيْتُكُمْ عَنْ زِيَارَةِ الْقُبُوْرِ فَزُوْرُوْهَا فَإِنَّهَا تُذَكِّرُكُمُ الْآخِرَةَ غَيْرَ أَنْ لَا تَقُوْلُوْا هُجْرًا (احمد' ابو یعلی' ابن ابی الدنیا)

میں نے تمہیں زیارت قبور سے منع کیا تھا' (اب) تم ان کی زیارت کرو' اسلئے کہ زیارت قبور تمہیں آخرت کی یاد دلائے گی' تاہم کوئی غلط بات مت کرنا۔

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ہزار مسلح صحابہ کرام کے ساتھ اپنی والدہ محترمہ کی قبر کی زیارت کی' اس دن آپ جس قدر روئے' اس سے پہلے کبھی نہیں روئے تھے (ابن ابی الدنیا۔ بریدۃ) اس دن کے متعلق آپ نے ارشاد فرمایا کہ مجھے زیارت کی اجازت دی گئی' لیکن استغفار کی اجازت نہیں دی گئی۔ (مسلم۔ ابو ہریرہؓ) ابن ابی ملیکہؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک دن ام المومنین حضرت عائشہؓ قبرستان سے تشریف لائیں' میں نے پوچھا یا ام المومنین! آپ کہاں سے تشریف لارہی ہیں' آپ نے فرمایا

میں اپنے بھائی عبدالرحمٰن کی قبر پر گئی تھی' میں نے عرض کیا کیا سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع نہیں فرمایا تھا' آپ نے فرمایا ہاں منع فرمایا تھا پھر اجازت دیدی تھی (ابن ابی الدنیا) لیکن اس روایت کو بنیاد بنا کر عورتوں کو قبرستان میں جانے کی اجازت دینا مناسب نہ ہو گا' کیوں کہ عورتیں قبرستان میں جاکر بہت زیادہ لغو اور بے ہودہ حرکتیں کرتی ہیں' اس لئے ان کی زیارت میں جتنا شر ہے' اسکی تلافی اس خیر سے نہیں ہو سکتی جو قبرستان جانے میں مضمر ہے' علاوہ ازیں عورتیں راستے میں بے پردہ ہو جاتی ہیں' اور بن سنور کر نکلتی ہیں' یہ سخت گناہ کی باتیں ہیں جب کہ زیارت قبور محض سنت ہے' صرف سنّت کے لئے ان گناہوں کو برداشت نہیں کیا جاسکتا' ہاں اگر کوئی عورت پھٹے پرانے' اور بوسیدہ کپڑے پہن کر اس طرح نکلے کہ مردوں کی نظریں اس کا طواف نہ کریں' تو کوئی مضائقہ نہیں' بشرطیکہ وہ صرف دعا پر اکتفا کرے' اور قبر پر کھڑے ہو کر کوئی گفتگو نہ کرے۔ حضرت ابوذرؓ کہتے ہیں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

زُرِ الْقُبُوْرَ تَذْكُرُ بِهَا الْآخِرَةَ وَاغْسِلِ الْمَوْتٰى فَإِنَّ مُعَالَجَةَ جَسَدٍ خَاوٍ مَوْعِظَةٌ بَلِيْغَةٌ وَصَلِّ عَلَى الْجَنَائِزِ لَعَلَّ ذٰلِكَ أَنْ يُحْزِنَكَ فَإِنَّ الْحَزِيْنَ فِيْ ظِلِّ اللّٰهِ (ابن ابی الدنیا۔ الحاکم)

قبروں کی زیارت کر' اس سے آخرت یاد رہے گی' مردے کو غسل دے' اسلئے کہ بے جان جسم کو ہلانے جلانے میں زبردست نصیحت ہے' اور جنازوں پر نماز پڑھ' شاید اس سے تو غمگین ہو' اسلئے کہ غمگین انسان اللہ کے سائے میں ہوتا ہے۔

ابن ابی ملیکہ کہتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

زُوْرُوْا مَوْتَاكُمْ وَسَلِّمُوْا عَلَيْهِمْ فَإِنَّ لَكُمْ فِيْهِمْ عِبْرَةً (ابن ابی الدنیا)

اپنے مردوں کی زیارت کرو' اور ان پر سلامتی بھیجو اسلئے کہ تمہارے لئے ان میں عبرت ہے۔

نافع روایت کرتے ہیں کہ حضرت عبداللہ ابن عمرؓ اگر کسی قبر کے پاس سے گزرتے تو اس پر کھڑے ہوتے اور سلام کرتے' جعفر ابن محمد اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ اپنے چچا حضرت حمزہؓ کی قبر کی زیارت کیلئے تھوڑے تھوڑے دنوں کے بعد جایا کرتی تھیں' وہاں نماز پڑھتی تھیں اور رویا کرتی تھیں' سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

مَنْ زَارَ قَبْرَ أَبَوَيْهِ أَوْ أَحَدِهِمَا فِيْ كُلِّ جُمُعَةٍ غُفِرَ لَهُ وَكُتِبَ بَرًّا (طبرانی۔ ابوہریرہؓ)

جو شخص ہر جمعہ کو اپنے والدین یا ان دونوں میں سے ایک کی قبر کی زیارت کرتا ہے' اس کے گناہ بخش دئے جاتے ہیں' اور اسے نیک لکھا جاتا ہے۔

ابن سیرین روایت کرتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر کسی شخص کے والدین انتقال کر جائیں' اور وہ زندگی میں انکی نافرمانی کرتا ہو' اب اگر انتقال کے بعد ان کے لئے دعائے مغفرت کرے تو اللہ اسے فرماں برداروں میں لکھتا ہے (ابن ابی الدنیا مرسلاً) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

مَنْ زَارَ قَبْرِيْ فَقَدْ وَجَبَتْ لَهُ شَفَاعَتِيْ

جس شخص نے میری قبر کی زیارت کی اسکے لئے میری شفاعت واجب ہو گئی۔

ایک موقع پر ارشاد فرمایا:۔

مَنْ زَارَنِيْ بِالْمَدِيْنَةِ مُحْتَسِبًا كُنْتُ لَهُ شَفِيْعًا وَشَهِيْدًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ

جس شخص نے ثواب کی نیت سے مدینے میں میری زیارت کی میں قیامت کے روز اس کے لئے سفارشی اور گواہ ہوں گا۔

حضرت کعب الاحبارؓ فرماتے ہیں کہ ہر دن طلوع فجر کے وقت ستّر ہزار فرشتے آسمان سے اترتے ہیں' اور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر شریف کو ڈھانپ لیتے ہیں' اور اپنے بازو پھڑپھڑاتے ہیں' اور آپ پر درود پڑھتے ہیں' جب شام آجاتی ہے تو یہ فرشتے آسمان پر چلے جاتے ہیں' اور ان جیسے دوسرے فرشتے اترتے ہیں' اور (صبح تک) ایسا ہی کرتے ہیں جیسا انھوں نے کیا تھا' یہاں تک کہ جب زمین شق ہوگی تو آپ ستر ہزار فرشتوں کے جلو میں باہر تشریف لائیں گے' اور یہ سب آپ کا اعزاز کریں گے۔

زیارت قبور کے آداب : زیارت قبور میں مستحب یہ ہے کہ قبلہ کی طرف پشت کرے اور میت کی طرف رخ کرکے کھڑا ہو' اور اسے سلام کرے' نہ قبر کے اوپر ہاتھ پھیرے نہ اسے چھوئے' نہ بوسہ دے' اسلئے کہ یہ تمام باتیں نصاریٰ کی ہیں' نافع کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کو سو سے زائد بار دیکھا کہ آپ روضۂ اطہر پر حاضر ہوتے اور کہتے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام' ابوبکر کو سلام' اور میرے والد کو سلام' اور یہ کہہ کر واپس ہو جاتے' ابو امامہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت انس ابن مالکؓ کو دیکھا کہ آپ روضۂ اقدس پر حاضر ہوئے' اور اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے' یہاں تک کہ میں نے یہ گمان کیا کہ شاید انھوں نے نماز شروع کی ہے' مگر آپ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کرکے واپس ہو گئے' حضرت عائشہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتی ہیں کہ جو شخص اپنے بھائی کی قبر کی زیارت کرتا ہے اور اس کے پاس بیٹھتا ہے صاحب قبر اس سے مانوس ہوتا ہے اور اسکے سلام کا جواب دیتا ہے یہاں تک کہ وہ کھڑا ہو (ابن ابی الدنیا)۔ سلیمان ابن سحیم کہتے ہیں کہ میں نے خواب میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی' اور آپ سے عرض کیا یا رسول صلی اللہ علیہ وسلم! یہ لوگ آپ کے پاس آتے ہیں اور سلام کرتے ہیں کیا آپ ان کا سلام سمجھتے ہیں؟ آپ نے ارشاد فرمایا ہاں اور میں جواب بھی دیتا ہوں' حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ جب آدمی اپنے کسی جاننے والے کی قبر کے پاس سے گزرتا ہے' اور اسے سلام کرتا ہے تو صاحب قبر بھی اسے پہچان لیتا ہے' اور سلام کا جواب دیتا ہے' اور جب کسی انجان آدمی کی قبر کے پاس سے گزرتا ہے تو اسے پہچانتا نہیں ہے لیکن سلام کا جواب دیتا ہے' عاصم الجحدری کی اولاد میں سے ایک شخص کہتا ہے کہ میں نے عاصم کو ان کے انتقال کے دو سال بعد خواب میں دیکھا' اور پوچھا کہ آپ کا انتقال نہیں ہو گیا؟ انھوں نے کہا ہاں! میں نے پوچھا اب آپ کہاں رہتے ہیں؟ انھوں نے جواب دیا بخدا میں جنت کے باغوں میں سے ایک باغ میں ہوں' میں اور میرے رفقاء ہر جمعہ کی شب اور صبح میں ابوبکر ابن عبد المزنی کے یہاں جمع ہوتے ہیں اور تم لوگوں کی خبریں سنتے ہیں' میں نے پوچھا اپنے جسموں کے ساتھ یا روحوں کے ساتھ؟ عاصم نے جواب دیا' اجسام گل چکے ہیں' صرف روحیں ملتی ہیں' میں نے دریافت کیا کہ ہم آپ کی قبروں پر جاتے ہیں کیا آپ کو ہماری زیارت کا علم ہوجاتا ہے' کہنے لگے ہاں ہمیں شب جمعہ' یوم جمعہ' اور شنبے کے دن طلوع شمس تک کی زیارتوں کی اطلاع ہوجاتی ہے' میں نے کہا دوسرے دنوں میں کیوں نہیں ہوتی' انھوں نے کہا اسلئے کہ جمعہ کا دن افضل ہے' محمد ابن الواسع جمعہ کے دن قبرستان جایا کرتے تھے' کسی نے ان سے کہا کہ آپ پیر کے دن بھی جاسکتے ہیں' فرمایا میں نے سنا ہے کہ جمعہ کے دن اور اس سے ایک دن پہلے' اور ایک دن بعد مردوں کو زیارت کرنے والوں کی اطلاع ہوتی ہے' ضحاکؒ کہتے ہیں کہ جو شخص جمعہ کے دن سورج نکلنے سے پہلے کسی قبر کی زیارت کرتا ہے' تو مرنے والے کو اسکا علم ہوجاتا ہے' لوگوں نے پوچھا اسکی کیا وجہ ہے' انھوں نے جواب دیا کہ جمعہ کی عظمت کی وجہ سے۔ بشر ابن منصور کہتے ہیں کہ طاعون کے زمانے میں ایک شخص بکثرت قبرستانوں میں جاتا تھا' اور جنازوں کی نماز پڑھا کرتا تھا' جب شام کے وقت وہ گھر واپس ہوتا تو قبرستان کے دروازے پر کھڑا ہو کر کہتا کہ اللہ تمہاری وحشت کو انس سے بدلے' تمہاری غریب الوطنی پر رحم کرے' اور تمہارے گناہوں کو معاف فرمائے' اور تمہاری نیکیاں قبول فرمائے' ان کلمات سے زائد کچھ نہ کہتا تھا' یہ شخص کہتا ہے کہ ایک دن میں قبرستان نہ جاسکا' رات کو میں نے خواب میں دیکھا کہ بہت سے لوگ میرے پاس آئے' میں نے ان سے دریافت کیا تم لوگ کون ہو' اور میرے پاس کیوں آئے ہو' انھوں نے کہا ہم قبرستان سے آئے ہیں' جب تم ہمارے پاس سے شام کو واپس آتے تھے' تو ہمیں ایک تحفہ دے کر آتے تھے' میں نے پوچھا تحفہ کیا ہوتا تھا' انھوں نے کہا وہ دعاؤں کا تحفہ تھا' آج ہم تمہارے

تحفے سے محروم رہے' میں نے کہا آج کے بعد میں کبھی قبرستان جانا ترک نہیں کروں گا' اور تمہیں تحفہ ملتا رہے گا۔

بشار ابن غالب نجرانیؒ کہتے ہیں کہ میں نے مشہور عابدہ رابعہ عدویہ بصریہ کو خواب میں دیکھا میں ان کے لئے بہت زیادہ دعائیں مانگا کرتا تھا' انھوں نے مجھ سے فرمایا اے بشار! تیرے ہدایا ہمیں ریشمی رومال سے ڈھانپے ہوئے نورانی طباق میں ملتے ہیں' میں نے عرض کیا وہ کیسے؟ کہنے لگیں جو زندہ مومن اپنے مرنے والوں کے حق میں خیر کی دعا کرتے ہیں وہ قبول ہو جاتی ہے' اور نور کے طباق میں رکھ کر اسکے اوپر ریشم کا رومال ڈالا جاتا ہے' اور مردے کو یہ طباق دے کر کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص نے تجھے یہ ہدیہ بھیجا ہے' سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ قبر میں مردے کا حال ایسا ہوتا ہے جیسے فریاد خواہ ڈوبنے والے کا' مردہ ایسی دعا کا منتظر رہتا ہے جو اسے باپ' بھائی دوست سے ملنے والی ہو' جب اسے یہ دعا ملتی ہے تو اس کے نزدیک دنیا اور اسکی تمام چیزوں سے محبوب تر ہو جاتی ہے' مرنے والوں کے لئے زندوں کے تحفے دعا اور استغفار ہیں (ابو منصور دیلمی۔ ابن عباسؓ) ایک بزرگ کہتے ہیں کہ میرے بھائی کا انتقال ہو گیا تھا' تدفین کے بعد رات کو میں نے اسے خواب میں دیکھا اور پوچھا کہ جب تجھے دفنا دیا گیا تو قبر میں تیرے ساتھ کیا معاملہ ہوا' اس نے کہا ایک شخص میرے پاس آگ کی شہاب لے کر آیا' اگر کوئی شخص میرے لئے دعائے مغفرت نہ کرتا تو یقیناً وہ آگ مجھے جلا دیتی۔

اسی لئے دفن کے بعد میت کو تلقین کرنا' اور اس کے لئے دعا کرنا مستحب ہے' سعید ابن عبداللہ ازدی کہتے ہیں کہ میں ابو امامہ باہلی کی خدمت میں حاضر ہوا' اس وقت وہ نزع کے عالم میں تھے' انھوں نے فرمایا اے ابو سعید! جب میں مر جاؤں تو میرے ساتھ وہ معاملہ کرنا جس کا حکم سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جب تم میں سے کوئی مر جائے اور تم اس کی مٹی برابر کر چکو تو تم میں سے ایک شخص قبر کے سرہانے کھڑا ہو اور یہ کہے کہ اے فلاں ابن فلاں' وہ (تمہارا یہ خطاب سنے گا جواب نہیں دے گا) پھر کہے اے فلاں ابن فلان (یہ آواز سن کر) وہ سیدھا ہو کر بیٹھ جائے گا' تیسری مرتبہ بھی یہی کہے' اس وقت وہ کہے گا رہنمائی کر' اللہ تجھ پر رحم فرمائے' تم اسکا یہ جواب سن نہیں سکو گے' پھر اس سے کہے کہ وہ بات یاد کر جس پر تو دنیا سے نکلا ہے' یعنی اس بات کی شہادت کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے' اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں' اور یہ کہ تو اس پر راضی ہے کہ رب ہے' دین اسلام ہے' محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں' قرآن امام ہے (اگر تم نے اسے یہ تلقین کی تو) منکر نکیر اسکے پاس سے ہٹ جائیں گے اور ایک دوسرے سے کہیں گے یہاں سے چلو' ہمیں اسکے پاس بیٹھنے کی کیا ضرورت ہے' اسے تو حجت سکھلادی گئی ہے' اور اللہ اس کی طرف سے منکر نکیر کو جواب دے گا' ایک شخص نے عرض کیا یا رسول! اگر اس کی ماں کا نام معلوم نہ ہو تو؟ آپ نے فرمایا اسے حوا کا بیٹا کہہ کر پکارے (طبرانی نحوہ۔ سعید ابن عبداللہ) قبروں پر قرآن کریم کی تلاوت کرنے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے' علی ابن موسیٰ حداد کہتے ہیں کہ میں ایک جنازے میں امام احمد ابن حنبل کے ہمراہ تھا' محمد ابن قدامہ جوہری بھی ہمارے ساتھ تھے' جب میت کو دفنا دیا گیا تو ایک نابینا شخص آیا اور قبر کے پاس کھڑا ہو کر قرآن کریم پڑھنے لگا' امام احمد ابن حنبلؒ نے فرمایا یہ کیا کرتے ہو' قبر پر قرآن پڑھنا بدعت ہے' جب ہم قبرستان سے باہر آگئے تو محمد ابن قدامہ نے امام صاحب سے پوچھا کہ آپ مبشر ابن اسماعیل الحلبی کے متعلق کیا کہتے ہیں' فرمایا ثقہ ہے' انھوں نے پوچھا کیا آپ نے اس سے کچھ لکھا ہے' آپ نے فرمایا ہاں لکھا ہے' محمد ابن قدامہ نے کہا کہ مجھے مبشر ابن اسماعیل نے خبر دی ہے' وہ عبدالرحمٰن ابن العلاء اللجلاج سے روایت کرتے ہیں' اور وہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے وصیت فرمائی کہ جب مردے کو دفن کر دیا جائے تو اسکے سرہانے سورۂ بقرہ کی ابتدائی اور آخری آیتیں پڑھی جائیں' اور وہ کہتے ہیں کہ میں نے ابن عمرؓ کو بھی اسکی وصیت کرتے ہوئے سنا ہے' امام احمد نے ان سے کہا تب اس نابینا شخص کے پاس جاؤ اور اس سے کہو کہ وہ قرآن پڑھے۔ محمد ابن احمد المروزی کہتے ہیں کہ میں نے امام احمد ابن حنبلؒ سے سنا ہے کہ جب تم قبرستان جاؤ تو سورۂ فاتحہ' معوذتین اور سورۂ اخلاص پڑھو' اور اس کا ثواب مردوں کو بخش دیا کرو' اسلئے کہ ثواب ان تک پہنچ جاتا ہے' ابو قلابہ کہتے ہیں کہ میں شام سے بصرے آیا' اور میں نے ایک خندق میں اتر کر وضو کیا' اور رات میں دو رکعت نماز پڑھی' پھر میں ایک قبر پر سر رکھ کر سو گیا' خواب میں دیکھا کہ صاحب قبر مجھ سے بطور شکایت کہہ رہا ہے کہ تو نے تمام رات مجھے اذیت میں

جتلا رکھا' پھر کہا تم نہیں جانتے' ہم جانتے ہیں' اور ہم عمل پر قادر نہیں ہیں' تم نے جو درود کتنیں رات پڑھی ہیں وہ ہمارے نزدیک دنیا و مافیہا سے بہتر ہیں' اللہ دنیا والوں کو ہماری طرف سے جزائے خیر عطا فرمائے' تم انہیں سلام پہنچا دینا کبھی کبھی ان کی دعا کی وجہ سے ہمیں پہاڑ کے برابر نور مل جاتا ہے۔

بہرحال زیارت قبور سے مقصود یہ ہے کہ زائر کو عبرت حاصل ہو' اور صاحب قبر کو خیر و برکت ملے' اس لئے زائر کو اپنے لئے میت کے لئے دعا کرنے سے غافل نہ ہونا چاہئے اور عبرت حاصل کرنے کا کوئی موقع گنوانا نہ چاہئے' عبرت اس طرح حاصل ہو سکتی ہے کہ اپنی دل میں میت کا تصور کرے کہ کس طرح اس کے اجزاء بکھر گئے' اور وہ کس طرح قبر سے اٹھایا جائے گا' اور خود اسے بھی اس انجام کو بہت جلد پہنچنا ہے' مطرف ابن ابی بکر الہذلیؒ روایت کرتے ہیں کہ بنو عبد قیس میں ایک عبادت گزار بوڑھی عورت تھی' جب رات آتی تو وہ کمر ہمت کس کر نماز کے لئے کھڑی ہو جاتی' اور دن نکلتا تو قبرستان چلی جاتی' لوگوں نے اس کثرت سے قبرستان آنے جانے پر ملامت بھی کی' اس نے اپنے ملامت گروں سے کہا کہ پتھر دل کو یہ پرانے اور شکستہ کھنڈر نرم کرتے ہیں میں قبروں پر آئی ہوں' اور مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے گویا ان کے اندر سے لوگ اٹھ کھڑے ہوئے ہیں' ان کے چہرے خاک آلود ہیں' جسم متغیر ہے' اور کفن بوسیدہ ہے' اگر کسی کے پاس یہ دیدۂ بینا ہو تو اس کا کیا کہنا' اگر بندوں کو یہ نظر حاصل ہو جائے تو ان کے نفس کس قدر تلخی محسوس کریں' اور انکے جسموں پر کیا کچھ نہ بن آئے' دل میں میت کی وہ تصویر واضح ہونی چاہئے جو حضرت عمر ابن عبد العزیزؒ نے بیان کی ہے' ایک مرتبہ انکے پاس کوئی فقیہ آئے اور کہنے لگے کہ مسلسل عبادت اور شدید مجاہدے کی بناء پر آپ کا چہرہ تبدیل ہو گیا ہے' حضرت عمر ابن عبد العزیزؒ نے جواب دیا اے شخص! تو تدفین کے تین دن بعد مجھے دیکھنا آنکھیں اپنی جگہ چھوڑ کر رخساروں پر آ جائیں گی' ہونٹ دانتوں سے چمٹ جائیں گے' کھلے ہوئے منہ سے پیپ بہہ رہی ہوگی' پیٹ پھول کر سینے سے اونچا ہو جائے گا اور پشت پاخانے کے راستے سے نکل جائے گی' ناک کے سوراخوں سے کیڑے اور پیپ بہتی ہوگی' وہ منظر اس منظر سے زیادہ تعجب خیز ہوگا جو اس وقت تیرے سامنے ہے۔

مردے کی تعریف کرنا مستحب ہے' اسکا ذکر اچھائی کے علاوہ نہ کرے' حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

إِذَا مَاتَ صَاحِبُكُمْ فَدَعُوهُ وَلَا تَقَعُوا فِيهِ (ابوداؤد)

جب تمہارا ساتھی مر جائے تو اسے چھوڑ دو اسکی برائی مت کرو۔

ایک حدیث میں ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:۔

لَا تَسُبُّوا الْأَمْوَاتَ فَإِنَّهُمْ قَدْ أَفْضَوْا إِلَى مَا قَدَّمُوا (بخاری۔ عائشہؓ)

مرنے والوں کو برا مت کہو' اس لئے کہ وہ اپنے اعمال کو پہنچ گئے ہیں۔

ایک حدیث میں یہ مضمون وارد ہے۔

لَا تَذْكُرُوا مَوْتَاكُمْ إِلَّا بِخَيْرٍ' فَإِنَّهُمْ إِنْ يَكُونُوا مِنْ أَهْلِ الْجَنَّةِ تَأْثَمُوا وَإِنْ يَكُونُوا مِنْ أَهْلِ النَّارِ فَحَسْبُهُمْ مَا هُمْ فِيهِ (نسائی۔ عائشہؓ)

اپنے مردوں کا ذکر بجز خیر کے نہ کرو' اسلئے اگر وہ جنتی ہیں تو تمہیں خواہ مخواہ گناہ ہوگا' اور اگر وہ دوزخی ہیں تو انہیں وہ مصیبت کافی ہے' جس میں وہ مبتلا ہیں۔

حضرت انس ابن مالکؓ روایت کرتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک جنازہ گزرا' لوگوں نے اسکی برائی کی' آپ نے فرمایا واجب ہو گئی۔ اس کے بعد دوسرا جنازہ گذرا' لوگوں نے اس کی تعریف کی آپ نے فرمایا واجب ہو گئی' حضرت عمرؓ نے اس سلسلے میں سوال کیا' فرمایا تم نے اس شخص کی تعریف کی ہے' اسلئے اس کیلئے جنت

واجب ہو گئی، اور اسکی برائی کی ہے، اسلئے کہ اس کے لئے دوزخ واجب ہو گئی، تم لوگ زمین میں اللہ کے گواہ ہو (بخاری و مسلم) حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب بندہ مرجاتا ہے اور لوگ اسکی وہ تعریف کرتے ہیں جو کے علم حقیقی میں نہیں ہوتی، تو اللہ تعالیٰ فرشتوں سے فرماتا ہے میں تمہیں گواہ بناتا ہوں کہ میں نے اپنے بندے کے لئے اپنے بندوں کی شہادت قبول کرلی ہے اور اسکے جو گناہ میں جانتا ہوں وہ معاف کردیئے (احمد)۔

موت کی حقیقت: موت کی حقیقت کے متعلق لوگوں کے مختلف جھوٹے خیالات و نظریات ہیں، اور وہ لوگ غلطی پر ہیں، بعض لوگوں نے یہ گمان کیا ہے کہ موت عدم ہے، اور یہ کہ کوئی حشر نشر نہیں ہوگا، اور نہ خیر و شر کا انجام ہوگا گویا ان کے نزدیک انسان کی موت ایسی ہے جیسے حیوانات کی موت، یا گھانس کی خشکی، یہ ملحدین کی اور ان لوگوں کی رائے ہے جو اللہ پر اور یوم آخرت پر ایمان نہیں رکھتے کچھ لوگوں نے یہ گمان کیا ہے کہ انسان موت سے معدوم ہوجاتا ہے، اور قبر میں نہ کسی عذاب کی تکلیف اٹھاتا ہے، اور نہ کسی ثواب سے راحت پاتا ہے، یہاں تک کہ حشر کے دن دوبارہ پیدا کیا جائے گا، دوسرے لوگ کہتے ہیں کہ روح باقی رہتی ہے، موت سے معدوم نہیں ہوتی اور ثواب و عذاب صرف روحوں کو ہوتا ہے، جسموں کو نہیں، اور جسم دوبارہ نہیں اٹھائے جائیں گے، یہ تمام خیالات فاسد ہیں، اور حق سے منحرف ہیں، بلکہ جو بات عقل کے معیار پر پوری اترتی ہے، اور آیات و روایات سے جس کا ثبوت ملتا ہے یہ ہے کہ موت صرف تغیر حال کا نام ہے، اور روح جسم سے جدا ہونے کے بعد باقی رہتی ہے، یا تو عذاب کی تکلیف جھیلتی ہے، یا ثواب سے لطف اندوز ہوتی ہے، جسم سے روح کی مفارقت کے معنی یہ ہیں کہ جسم پر روح کا تصرف اور اختیار نہیں رہتا یعنی جسم اس کی اطاعت سے منحرف ہوجاتا ہے، انسانی جسم کے اعضاء اسکی روح کے لئے آلات کی حیثیت رکھتے ہیں، اور وہ انھیں استعمال کرتی ہے، یہاں تک کہ وہ ہاتھ کے ذریعے پکڑتی ہے، کان کے ذریعے سنتی ہے، آنکھ کے ذریعے دیکھتی ہے، اور قلب کے ذریعے حقیقت اشیاء کا ادراک کرتی ہے، دل سے یہاں روح مراد ہے، اور روح اشیاء کا علم خود بخود بغیر آلے کے حاصل کرلیا کرتی ہے، اسلئے وہ غم، رنج اور مصیبت سے خود تکلیف اٹھاتا ہے، اور خوشی اور مسرت سے لطف پاتا ہے، اور یہ تمام چیزیں اعضاء سے متعلق نہیں ہیں، روح کا یہ وصف کہ وہ کسی آلے کی مدد کے بغیر تکلیف اور راحت کا ادراک کرتی ہے جسم سے مفارقت کے بعد بھی باقی رہتا ہے، اور جو اختیارات اسے اعضاء کے ذریعے حاصل تھے، وہ جسم کی موت سے باطل ہوجاتے ہیں، یہاں تک کہ روح دوبارہ جسم میں ڈالی جائے۔

پھر یہ امر بعید نہیں ہے کہ روح قبر کے اندر جسم میں لوٹائی جائے، اور نہ اس میں کچھ اشکال ہے کہ روح کی واپسی قیامت کے دن پر مؤخر کردی جائے، اللہ ہی جانتا ہے کہ اس نے اپنے بندے کے لئے کیا فیصلہ کیا ہے، موت کی وجہ سے جسم کا معطل ہوجانا ایسا ہے جیسے معذور آدمی کے اعضاء فساد مزاج کے باعث، یا اعصاب میں کسی خلل کی وجہ سے بیکار ہوجاتے ہیں، اور روح ان کے اندر نفوذ نہیں کرپاتی، اس صورت میں روح کے اوصاف علم، ادراک اور عقل تو باقی رہتے ہیں، اور بعض اعضاء بھی اختیار میں رہتے ہیں، لیکن بعض اعضاء اختیار سے نکل جاتے ہیں، اور اس کی نافرمانی کرتے ہیں، جب کہ موت یہ ہے کہ تمام اعضاء روح کا ساتھ چھوڑدیں، اور اسکے نافرمان ہوجائیں، اعضاء روح کے آلات تھے، ان کے ذریعے وہ اپنے کام نکالتی تھی، اور روح سے انسان کی وہ قوت مراد ہے جن سے وہ علوم، غموں کی تکالیف، اور راحتوں کی لذت کا ادراک کرتا ہے اگرچہ اعضاء میں اسکا تصرف ختم ہوجاتا ہے، لیکن علوم و ادراکات، اور حسرت و الم کے احساسات کی قوت فنا نہیں ہوتی، انسان حقیقت میں اسی قوت کا نام ہے جو علوم، آلام اور لذات کا ادراک کرتی ہے، اور یہ قوت نہ مرتی ہے اور نہ فنا ہوتی ہے، موت کے معنی یہ ہیں بدن سے انسان کا تصرف ختم ہوجائے، اور وہ اس کا آلہ باقی نہ رہنے، اس سے معلوم ہوا کہ موت تمام اعضاء کو اپاہج اور ناکارہ کردیتی ہے، لیکن انسان کی حقیقت جسے اس کا نفس یا روح بھی کہہ سکتے ہیں اپنے حال پر باقی رہتی ہے، صرف انسان کا ظاہری وجود حقیر ہوتا ہے، اور یہ تغیر دو طرح واقع ہوجاتا ہے۔

تغیّر کے حال کی دو نوعیتیں : ایک تو اس طرح کہ اس کی آنکھیں، کان، زبان، ہاتھ پاؤں اور دوسرے تمام اعضاء سلب کرلئے جاتے ہیں، اور اس کے اہل و عیال، عزیز و اقارب اور تمام شناسا لوگوں سے جدا کردیا جاتا ہے، اسکے گھوڑے جانور، غلام، گھر، زمین اور دوسری تمام مملوکہ چیزیں چھین لی جاتی ہیں، پھر اس میں کوئی فرق نہیں کہ یہ چیزیں انسان سے چھینی جائیں یا انسان کو ان چیزوں سے چھینا جائے، اصل تکلیف وہ چیز جدائی اور فراق ہے، فراق اس صورت میں بھی ہے کہ آدمی سے اس کا مال چھین لیا جائے، اور اس صورت میں بھی ہے کہ مال اپنی جگہ رہے اور مالک مال کو قید کردیا جائے، دونوں صورتوں میں تکلیف برابر ہے، موت کے معنی بھی یہی ہیں کہ اسے مال سے چھین کر، اور عزیز و اقارب اور اہل و عیال سے جدا کرکے ایک ایسے عالم میں بھیج دیا جائے جو اس عالم کے مشابہ نہ ہو، اب اگر دنیا میں کوئی ایسی چیز باقی رہ گئی جس سے اسے انسیت تھی، یا وہ اس سے راحت پاتا تھا، یا اسکے وجود کو اہمیت دیتا تھا تو موت کے بعد اسے زبردست حسرت ہوگی اور اس چیز سے جدائی کے سلسلے میں زبردست مصیبت اور شقاوت کا سامنا ہوگا، بلکہ اگر بہت سی چیزیں ہوئیں تو اسکا دل ہر ایک چیز کی طرف الگ الگ ملتفت ہوگا، مال کی طرف بھی، جاہ اور جائداد کی طرف بھی یہاں تک کہ اس قمیص میں بھی اس کا دل اٹکا رہے گا جو وہ پہنا کرتا تھا اور اسے پہن کر خوش ہوتا تھا، اور اگر وہ صرف اللہ کے ذکر سے خوش ہوتا تھا اور صرف اسی سے مانوس تھا تو اسے عظیم ترین نعمتیں میسر ہوں گی سعادت کی تکمیل کا بہترین ذریعہ یہ ہے کہ اپنے محبوب کے درمیان تخلیہ رکھے، اور تمام موانع و شواغل کا سلسلہ منقطع کرے، کیوں کہ دنیا کے تمام شواغل اللہ کے ذکر سے روکنے والے ہیں، زندگی اور موت کی حالتوں میں اختلاف کی ایک نوعیت تو یہ ہے جو مذکور ہوئی، اور دوسری نوعیت تغیر حال کی یہ ہے کہ اس پر موت سے وہ امور منکشف ہوتے ہیں جو زندگی میں منکشف نہیں تھے، دنیا میں لوگ سونے والوں کی طرح ہیں جب مرجائیں گے تب بیدار ہوں گے اور سب سے پہلے ان پر وہ اعمال منکشف ہوں گے جو انھیں نفع دینے والے ہیں یا نقصان پہنچانے والے، یہ تمام سیئات و حسنات ایک بند کتاب میں رقم ہیں، اور یہ کتاب قلب کے باطن میں محفوظ ہے، آدمی ان پر اپنے دنیاوی مشاغل کے باعث مطلع نہیں ہوپاتا، جب یہ مشاغل منقطع ہوجاتے ہیں تب تمام اعمال منکشف ہوجاتے ہیں، جب اسے اس کی برائی نظر آتی ہے۔ تو اس پر انتہائی حسرت و افسوس کرتا ہے اور اس سے بچنے کے لئے اپنے آپ کو آگ میں ڈالنا اختیار کرسکتا ہے، اس وقت اس سے کہا جاتا ہے :-

كَفَىٰ بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيبًا (پ ۱۵ ر ۲ آیت ۱۴) آج تو خود اپنا آپ ہی محاسب کافی ہے۔

اور یہ بات اس وقت منکشف ہوتی ہے جب سانس کی ڈور ٹوٹ جاتی ہے، اور ابھی دفن بھی نہیں ہوپاتا کہ دل میں ان چیزوں سے جدائی کی آگ بھڑکنے لگتی ہے جو اس دنیائے فانی میں عزیز تھیں، ان چیزوں کے فراق پر کوئی رنج نہیں ہوتا جو زادِ راہ کے طور پر اختیار کی تھیں، کیونکہ جو شخص منزل تک رسائی حاصل کرنے کے لئے زادِ راہ طلب کرتا ہے، وہ مقصد حاصل کرنے کے بعد باقی رہ جانے والے زادِ راہ سے جدائی پر خوش ہوتا ہے، بشرطیکہ خاص زادِ راہ مقصود نہ رہا ہو، یہ حال اس شخص کا ہے جو دنیا سے صرف بقدر ضرورت لیتا ہے، اور یہ چاہتا ہے کہ ضرورت جلد از جلد ختم ہوجائے تاکہ دنیا سے مستغنی ہوسکے، موت کے ساتھ ہی وہ اپنا مقصود حاصل کرلیتا ہے، اور زاد لینے سے مستغنی ہوجاتا ہے، یہ عظیم و شدید عذاب اس پر دفن سے پہلے نازل ہوتا ہے، پھر جب وہ دفن کردیا جاتا ہے تو کبھی روح جسم کی طرف دوسرے نوع کے عذاب کی تکلیف جھیلنے کے لئے عود کرتی ہے، اور کبھی یہ عذاب معاف کردیا جاتا ہے، دنیا کی لذتوں سے لطف اٹھانے والے، اور اسکی نعمتوں پر مطمئن ہوجانے والے شخص کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص کسی بادشاہ کے محل میں اس کی عدم موجودگی میں قیام پذیر ہو، اور اسکے اہل و عیال اور خدم و حشم کے ساتھ مزے اڑاتا ہو، اور یہ سمجھتا ہو کہ میں بادشاہ کا مقرب ہوں، بادشاہ میری ان حرکتوں سے چشم پوشی کرے گا، یا اسے معلوم ہی نہیں ہوپائے گا کہ میں اس کی عدم موجودگی میں کیا کرتا ہوں، اچانک بادشاہ آجاتا ہے، اور اسے فردِ جرم تھمادیتا ہے، جس میں اس کے تمام فواحش اور تمام جرم لکھے ہوتے ہیں، بلکہ ایک ایک حرکت اور ایک ایک لفظ درج رہتا ہے، پھر بادشاہ زبردست اقتدار اور قوت رکھتا ہے، وہ اپنے جرم کے سلسلے میں غیرت مند بھی ہے، اور ظالموں سے انتقام لیتا، اور مجرموں کو سزا دینا بھی خوب جانتا ہے، اور ان کے سلسلے میں بڑے

بڑے شخص کی سفارش قبول نہیں کرتا' غور کرو اس مجرم کا بادشاہ کا عتاب نازل ہونے سے پہلے کیا عالم ہوگا' اور وہ خوف' ندامت' شرمندگی' اور حسرت کے کتنے تکلیف دہ اور اذیت ناک احساسات سے دوچار ہوگا' یہی حال اس بدکار میت کا عذاب قبر بلکہ موت سے پہلے ہوتا ہے جو دنیا سے فریب خوردہ ہو' اور اسکی راحتوں پر تکیہ کرتا ہو' ہم اس سے اللہ کی پناہ چاہتے ہیں' رسوائی فضیحت اور راز آشکار ہونے میں جس قدر تکلیف ہے وہ مار پیٹ اور زخم وغیرہ کی تکلیف سے کہیں زیادہ ہے جس کا محل جسم ہے۔

بہرحال موت کے وقت مرنے والے کا یہ حال ہوتا ہے' اہل بصیرت نے باطنی قوت کے ذریعے اس کا مشاہدہ بھی کیا ہے' اور باطن کی بصیرت آنکھ کی بصارت سے زیادہ پختہ اور قوی ہوتی ہے' کتاب و سنت کے شواہد سے بھی اس عذاب کا ثبوت ملتا ہے' البتہ موت کی حقیقت پر مطلع ہونا ممکن نہیں ہے' کیونکہ موت کی حقیقت وہی جان سکتا ہے' جو زندگی کی حقیقت سے واقف ہو اور زندگی کی حقیقت روح پر اطلاع کے بغیر معلوم نہیں ہو سکتی' اور روح ایک ایسا موضوع ہے جس پر سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے کلام کرنے کی اجازت نہیں دی ہے' اور نہ آپ نے روح کے سلسلے میں کئے گئے سوال کے جواب میں اسکے علاوہ کچھ ارشاد فرمایا کہ "یہ روح میرے رب کے حکم سے ہے" (بخاری و مسلم۔ ابن مسعودؓ) اسلئے کسی عالم دین کے لئے جائز نہیں کہ وہ روح کا راز آشکار کرے اگرچہ اس پر مطلع ہی کیوں نہ ہو جائے' اگر اجازت ہے تو صرف اس قدر کہ مرنے کے بعد روح کا جو حال ہوتا ہے وہ بیان کر دیا جائے' اس حقیقت پر کہ موت روح کے معدوم ہونے یا اسکے ادراکات کے فنا ہونے کا نام نہیں ہے' بے شمار آیات اور روایات دلالت کرتی ہیں' چنانچہ شہداء کے متعلق اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا :۔

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ (پ ۴ ر ۸ آیت ۱۶۹)

اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کئے گئے ان کو مردہ مت خیال کر' بلکہ وہ تو زندہ ہیں اپنے پروردگار کے مقرب ہیں ان کو رزق بھی ملتا ہے' وہ خوش ہیں اس چیز سے جو ان کو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے عطا فرمائی ہے۔

بدر کے دن جب قریش کے بڑے بڑے سردار قتل کر دئے گئے تو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں نام بنام آواز دی' اور فرمایا :۔

قَدْ وَجَدْتُّ مَا وَعَدَنِيْ رَبِّيْ حَقًّا فَهَلْ وَجَدْتُّمْ مَا وَعَدَ رَبُّكُمْ حَقًّا (پ ۸ ر ۲ آیت ۴۴)

میرے رب نے مجھ سے جس چیز کا حق کے ساتھ وعدہ کیا تھا وہ میں نے پالیا ہے' کیا تم نے وہ چیز پالی ہے جس کا تمہارے رب نے حق کے ساتھ وعدہ کیا تھا۔

صحابہ کرام نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ انہیں آواز دیتے ہیں حالانکہ وہ مر چکے ہیں' سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا' اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے وہ تم سے زیادہ اس کلام کو سننے والے ہیں' لیکن وہ جواب دینے پر قدرت نہیں رکھتے (مسلم۔ عمر ابن الخطابؓ) اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ بدبخت کی روح اور اس کا ادراک اور معرفت باقی رہتی ہے' اور مذکورہ بالا آیت سے شہداء کی روحوں کے باقی رہنے کا علم ہوتا ہے' اور مرنے والا دو حال سے خالی نہیں ہوتا' یا تو وہ بدبخت ہوتا ہے اور یا سعادت مند۔ جیسا کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :۔

اَلْقَبْرُ اِمَّا حُفْرَةٌ مِّنْ حُفَرِ النَّارِ اَوْ رَوْضَةٌ مِّنْ رِّيَاضِ الْجَنَّةِ (ترمذی۔ ابو سعید)

قبر یا تو آگ کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہے یا جنت کے باغوں میں سے ایک باغ۔

اس حدیث سے صاف واضح ہوتا ہے کہ موت تغیر حال کا نام ہے' اور یہ کہ میت کیلئے تقدیر الٰہی نے سعادت یا شقاوت کا جو فیصلہ صادر کیا ہے' اس پر بلا تاخیر عمل ہوتا ہے' اگرچہ عذاب و ثواب کی بعض انواع پر اس وقت عمل نہیں ہوتا' مگر ان کی اصل پر اسی وقت عمل ہوتا ہے ایک حدیث میں حضرت انس ابن مالکؓ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں :۔

اَلْمَوْتُ الْقِيَامَةُ مَنْ مَاتَ فَقَدْ قَامَتْ قِيَامَتُهُ (ابن ابی الدنیا)
موت قیامت ہے جو مرجاتا ہے اس کی قیامت قائم ہو جاتی ہے۔
ایک حدیث میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :
اِذَا مَاتَ اَحَدُكُمْ عُرِضَ عَلَيْهِ مَقْعَدُهُ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ اِنْ كَانَ مِنْ اَهْلِ الْجَنَّةِ فَمِنَ الْجَنَّةِ وَاِنْ كَانَ مِنْ اَهْلِ النَّارِ فَمِنَ النَّارِ وَيُقَالُ هٰذَا مَقْعَدُكَ حَتّٰى تُبْعَثَ اِلَيْهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ (بخاری و مسلم۔ ابن عمرؓ)
جب تم میں سے کوئی شخص مرجاتا ہے تو صبح و شام اس پر اس کا ٹھکانہ پیش کیا جاتا ہے اگر وہ جنتی ہوتا ہے تو جنت میں سے' اور دوزخی ہوتا ہے تو دوزخ میں سے' اور کہا جاتا ہے یہ تیرا ٹھکانہ ہے' یہاں تک کہ تو قیامت کے دن اسکی طرف بھیجا جائے۔

ظاہر ہے قبر میں صبح و شام اپنے اپنے ٹھکانے دیکھ کر سعادت مندوں کو خوشی اور بدبختوں کو تکلیف ہوگی' ابو قیس کہتے ہیں کہ ہم حضرت علقمہؓ کے ساتھ ایک جنازے میں شریک تھے' آپ نے فرمایا اسکی قیامت تو ہوگئی' حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ نفس پر اس وقت تک دنیا سے نکلنا حرام ہوتا ہے جب تک اسے اپنے جنتی یا دوزخی ہونے کا علم نہ ہو جائے۔ حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "جو شخص حالت سفر میں مرجاتا ہے وہ شہید مرتا ہے' اور قبر کے دو فتنے میں ڈالنے والوں سے محفوظ رہتا ہے اور اسے صبح و شام جنت سے رزق حاصل ہوتا ہے (ابن ماجہ) حضرت مسروقؒ فرماتے ہیں کہ مجھے اتنا رشک کسی پر نہیں آتا جتنا اس مومن پر آتا ہے جو قبر میں دنیا کی مصیبتوں سے محفوظ اور اللہ کے عذاب سے مامون ہو چکا ہو۔ یعلی ابن الولید کہتے ہیں کہ میں ایک دن ابوالدرداء کے ساتھ جارہا تھا' میں نے ان سے پوچھا آپ اس شخص کے لئے کیا چیز پسند کریں گے جس سے آپ محبت کرتے ہیں؟ فرمایا موت' میں نے کہا اگر وہ مرے نہیں تب؟ کہنے لگے تب میں اس کے لیے یہ پسند کروں گا کہ اسکے پاس مال و دولت کم سے کم ہو' میں اپنے محبوب کے لئے موت اسلئے پسند کرتا ہوں کہ موت صرف مومن محبوب جانتا ہے' کیونکہ موت مومن کے لئے قید خانے سے آزادی کا پروانہ ہے' اور مال و اولاد کی کمی اسلئے مطلوب ہے کہ ان چیزوں کا وجود فتنہ ہے' اور دنیا کے ساتھ انس کا سبب ہے' اور ان چیزوں سے مانوس ہونا جن سے بہرحال جدا ہونا ہے' انتہائی بدبختی ہے' اللہ اور اسکے ذکر کے سوا جتنی چیزوں سے بھی مانوس ہوتا ہے ان سے ہر حال میں موت کے وقت جدا ہونا ہے' اسی لئے حضرت عبداللہ ابن عمرؓ نے ارشاد فرمایا کہ مومن کی مثال جس وقت اسکی جان نکلے یا روح پرواز کرے اس شخص کی طرح ہے جو قید خانے میں رہ کر باہر نکلا ہو' اب وہ زمین کو کشادہ پاکر اس میں لوٹ لگاتا پھرتا ہے' لیکن یہ اس مومن کی مثال ہے جو دنیا سے کنارہ کش' اور اس سے دل برداشتہ ہو' اور اسے ذکر الہی کے علاوہ کسی چیز سے انس نہ ہو' لیکن دنیاوی مشاغل نے اسے محبوب سے محبوس کر رکھا ہو' اور شہوات کی سختی اسے گراں گزرتی ہو' ظاہر ہے ایسے شخص کیلئے موت ان تمام اذیت دینے والی چیزوں سے چھٹکارے کا باعث ہے' اور اس محبوب کے ساتھ تنہا رہنے کا ایک بہترین موقع ہے جس سے اسے انس تھا' لیکن موانع کے باعث تنہائی سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا تھا' موت کے ساتھ ہی ہر طرح کی رکاوٹیں دور ہو جاتی ہیں' یقیناً ان شہداء کیلئے موت میں مکمل اور اعلاًلذات مخفی ہیں' جو اللہ کی راہ میں شہید ہوئے' کیونکہ انھوں نے کفار کے ساتھ قتال پر اقدام محض اسلئے کیا تھا کہ وہ دنیا سے اپنے رشتے منقطع کرنا چاہتے تھے' اور لقائے خداوندی کے مشتاق تھے' اور اس کی رضاجوئی کے لئے جان دینے پر راضی تھے' اگر دنیا کے اعتبار سے دیکھا جائے تو انھوں نے آخرت کے عوض دنیا فروخت کی تھی' اور بائع کا قلب مبیع کی طرف کبھی التفات نہیں کرتا' اور اگر آخرت کے لحاظ سے دیکھا جائے تو انھوں نے دنیا کے عوض آخرت خریدی تھی' اور خریدار کا قلب اس چیز کا مشتاق رہتا ہے' جو انھوں نے خریدی ہے' جب وہ آخرت کو دیکھے گا تو اسے کس قدر خوشی ہوگی' اور دنیا کو دیکھے گا تو اس کی طرف کتنا کم التفات ہوگا' بلکہ التفات ہی نہیں ہوگا' حب الہی کیلئے قلب کبھی کبھی مخصوص بھی ہو جاتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ موت بھی اسی

حالت پر واقع ہو' لیکن جو شخص خدا کی راہ میں شہید ہوتا ہے اسکے دل میں یہی خیال ہوتا ہیکہ وہ اللہ کی راہ میں ہے' اسی پر شہادت پاتا ہے' اسی لئے اسکی نعمتیں اور لذتیں بھی زیادہ ہوتی ہیں' منتہائے نعمت ولذت یہ ہیکہ آدمی کو اسکی مراد حاصل ہو جائے۔ قرآن کریم میں ہے :-

وَلَهُمْ فِيهَا مَا يَشْتَهُونَ

اور ان کے لئے جنتوں میں من چاہی چیزیں ہیں

یہ کلام نہایت جامع ہے' اور جنت کی تمام لذات کو حاوی ہے' سب سے بڑا عذاب یہ ہیکہ انسان کو اسکی مراد حاصل نہ ہو' جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا :-

وَحِيلَ بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ مَا يَشْتَهُونَ (پ ۲۲ ر ۱۲ آیت ۵۴)

اور ان میں اور ان کی آرزو میں ایک آڑ کر دی جائیگی۔

یہ عبارت اہل دوزخ کی سزاؤں کو پورے طور پر جامع ہے' اور ہم نے جن نعمتوں اور لذتوں کا ذکر کیا ہے وہ شہداء کو جام شہادت نوش کرنے کے بعد بلا تاخیر ملتی ہیں' ارباب قلوب پر یہ امر نور یقین سے منکشف ہوا ہے' مگر تم اسکی کوئی نقلی دلیل چاہتے ہو تو تمہیں شہداء کے فضائل سے متعلق تمام روایات دیکھنی چاہئیں' ہر روایت میں انکی نعمتوں کی انتہا مختلف الفاظ اور عبارت میں بیان کی گئی ہے' چنانچہ حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جابرؓ سے ارشاد فرمایا کہ کیا میں تمہیں خوشخبری سناؤں' حضرت جابرؓ کے والد غزوۂ احد میں شہید ہو گئے تھے' حضرت جابرؓ نے عرض کیا ضرور سنائیں اللہ تعالیٰ آپ کو خیر کی بشارت دے' آپ نے ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ نے تیرے باپ کو زندہ کیا اور اسے اپنے سامنے بٹھا کر ارشاد فرمایا اے میرے بندے! تو مجھ سے جس چیز کی چاہے تمنا کرے میں تجھے وہی چیز عطا کروں گا' انھوں نے عرض کیا یا اللہ! میں نے تیری عبادت کا حق ادا نہیں کیا ہے' میں چاہتا ہوں کہ مجھے دنیا میں واپس بھیج دے اور میں (وہاں جاکر) تیرے پیغمبر کے ہمراہ (کفّاروں سے) جہاد کروں' اور تیری خاطر دوبارہ قتل کیا جاؤں' اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا یہ بات میری طرف سے پہلے طے ہو چکی ہے کہ تو دنیا میں دوبارہ واپس نہیں جائے گا (ترمذی' ابن ماجہ) حضرت کعبؓ فرماتے ہیں کہ جنت میں ایک شخص روتا ہوا پایا جائے گا' اس سے پوچھا جائے گا کہ وہ کیوں روتا ہے' حالانکہ اسے جنت عطا کی گئی ہے وہ عرض کرے گا کہ میں اسلئے روتا ہوں کہ مجھے راہ خدا میں صرف ایک مرتبہ قتل ہونے کی سعادت ملی ہے' میری خواہش ہیکہ میں بار بار واپس جاؤں اور بار بار قتل کیا جاؤں۔

جاننا چاہیے کہ موت کے بعد مومن پر اللہ تعالیٰ کی جلالت وعظمت اس قدر وسیع ہوگی کہ تمام دنیا اس کے مقابلے میں ایک قید خانہ اور تنگ مکان سے زیادہ نہ ہوگی' اور اسکی مثال ایسی ہوگی جیسے کوئی شخص کسی تاریک مکان میں قید ہو' اچانک اسکے لئے ایک ایسے باغ کا دروازہ کھول دیا جائے جو نہایت وسیع وعریض ہو' یہاں تک کہ ایک سمت کھڑے ہو کر دوسری جانب کی حدود دیکھنے سے قاصر ہو' اس میں طرح طرح کے درخت' پھل' پھول' اور پرندے ہوں' ظاہر ہے وہ شخص اس باغ میں اس تاریک مکان میں کیوں جانا پسند کرے گا' سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے شخص کی ایک عمدہ مثال فرمائی ہے' ایک شخص کے متعلق جس کا انتقال ہو گیا تھا ارشاد فرمایا کہ یہ شخص دنیا سے جاتا ہے اور دنیا کو دنیا والوں کے لئے چھوڑتا ہے' اگر یہ راضی ہے تو اسے کبھی دنیا میں آنا پسند نہیں ہوگا' جیسے تم میں سے کوئی شخص دوبارہ اپنی ماں کے پیٹ میں جانا پسند نہیں کرتا (ابن ابی الدنیا۔ عمرو ابن دینار مرسلاً) اس سے معلوم ہوا کہ آخرت کی وسعت کو دنیا کی وسعت سے وہی نسبت ہے جو دنیا کی وسعت کو رحم مادر کی وسعت سے ہے' ایک حدیث میں ارشاد فرمایا گیا کہ دنیا میں مومن کی مثال ایسی ہے جیسے ماں کے پیٹ میں بچہ' جب ماں کے پیٹ سے نکلتا ہے تو اپنے نکلنے پر روتا ہے' لیکن جب روشنی دیکھتا ہے تو اپنی جگہ واپس جانا پسند نہیں کرتا (ابن ابی الدنیا) یہی حال مومن کا ہے' جب وہ اپنے پروردگار کے پاس جاتا ہے تو روتا ہے' لیکن وہاں پہنچ کر جب اسکی بے پایاں رحمتیں دیکھتا ہے تو دنیا میں واپس ہونا نہیں چاہتا' جیسے

تو مولود بچہ اپنی ماں کے پیٹ میں جانا نہیں چاہتا' ایک مرتبہ کسی صحابی نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فلاں شخص مرگیا ہے' فرمایا وہ راحت پانے والا ہے یا لوگ اس سے راحت پانے والے ہیں (بخاری و مسلم۔ ابو قتادہؓ) یہاں راحت پانے والے سے مراد مومن ہے' اور اس شخص سے مراد جس سے لوگ راحت پاتے ہیں فاجر ہے کہ اسکے مرنے سے لوگوں کو راحت ملی' ابو عمر جو پانی پلایا کرتے تھے کہتے ہیں کہ ہم نو عمر تھے' ایک دن حضرت عمر ہمارے پاس سے گزرے اور ایک قبر کو دیکھا جس میں سے ایک کھوپڑی جھانک رہی تھی' آپ نے کسی شخص سے کہا کہ' اس پر مٹی ڈال دے اس نے تعمیل حکم کی' آپ نے فرمایا ان جسموں کو مٹی کوئی نقصان نہیں پہنچاتی' اصل روحیں ہیں جنہیں قیامت تک عذاب یا ثواب دیا جائے گا' عمرو ابن دینار کہتے ہیں کہ ہر شخص مرنے کے بعد یہ جانتا ہے کہ اس کے اہل و عیال بعد میں کیا کریں گے' وہ اسے غسل دیتے ہیں' کفن پہناتے ہیں اور وہ یہ تمام عمل دیکھتا رہتا ہے' مالک ابن بشیرؓ کہتے ہیں کہ مومن کی روحوں کو چھوڑ دیا جائے گا وہ جہاں چاہیں جائیں' نعمان ابن بشیرؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو منبر پر یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے' آگاہ رہو کہ دنیا میں سے صرف اس قدر حصہ باقی رہ گیا ہے جیسے اسکی فضا میں اڑنے والی مکھی' اپنے مردہ بھائیوں کے باب میں اللہ تعالیٰ سے ڈرو' اسلئے کہ تمہارے اعمال ان پر پیش کئے جاتے ہیں' (ابن ابی الدنیا) حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ جناب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اپنے مردوں کو اپنے برے اعمال سے رسوانہ کرو' اسلئے کہ تمہارے اعمال تمہارے مردہ دوستوں کے سامنے رکھے جاتے ہیں' (ابن ابی الدنیا) چنانچہ حضرت ابو الدرداءؓ یہ دعا کیا کرتے تھے' کہ اے اللہ! میں ایسے اعمال سے تیری پناہ چاہتا ہوں جن سے عبداللہ ابن رواحہؓ کے سامنے رسوائی ہو' عبداللہ ابن رواحہؓ کا انتقال ہوگیا تھا' اور یہ بزرگ حضرت ابو الدرداء کے ماموں تھے' عبداللہ ابن عمرؓ ابن العاص سے کسی شخص نے پوچھا کہ مومنین کی روحیں مرنے کے بعد کہاں جائیں گی' فرمایا پرندوں کے سفید پوٹوں میں عرش کے زیر سایہ اور کافروں کی روحیں زمین کے ساتویں طبق میں۔ حضرت ابو سعید الخدریؓ روایت کرتے ہیں کہ میں نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے فرماتے تھے کہ مردہ جانتا ہے کہ اسے کون غسل دے رہا ہے' کون اٹھا رہا ہے' اور کون قبر میں اتار رہا ہے (احمد) صالح المری کہتے ہیں کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ روحیں موت کے بعد آپس میں ملتی ہیں' چنانچہ مردوں کی روحیں اس روح سے جو تازہ وارد ہوتی ہے دریافت کرتی ہیں کہ تیرا ٹھکانہ کہاں تھا' تو کون سے جسم میں تھی' پاکیزہ جسم میں یا گندے جسم میں؟ عبید اللہ ابن عمیر کہتے ہیں کہ اہل قبور مردوں کے منتظر رہتے ہیں' جب کوئی مردہ پہنچتا ہے تو اس سے پوچھتے ہیں کہ فلاں شخص کا کیا حال ہے' وہ کہتا ہے کہ جس شخص کو تم معلوم کرتے ہو وہ عرصہ ہوا مرچکا ہے' کیا یہاں نہیں آیا؟ اہل قبور کہیں گے کہ نہیں! پھر وہ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ کہتے ہوئے کہیں گے کہ اسے کہیں اور لے گئے ہیں وہ ہمارے پاس نہیں آیا' جعفر ابن سعید کہتے ہیں کہ جب آدمی مرتا ہے تو اسکی اولاد اسکا اس طرح استقبال کرتی ہے جس طرح لوگ غائب کا واپسی پر استقبال کرتے ہیں' مجاہد فرماتے ہیں کہ آدمی کو اس کے بچوں کی نیکی کی خوشخبری قبر میں سنائی جاتی ہے' حضرت ابو ایوب الانصاریؓ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ جب مومن کی روح قبض ہوتی ہے تو رحمت والے لوگ اللہ کے پاس اس سے اس طرح ملاقات کرتے ہیں جیسے دنیا میں خوشخبری لانے والے سے ملا جاتا ہے' اور کہتے ہیں اس بھائی کو دیکھو تاکہ اسے کچھ راحت مل جائے' بے چارہ بڑی اذیت میں مبتلا تھا' پھر پوچھتے ہیں فلاں شخص کیسا تھا' یا فلاں عورت کیسی تھی' کیا اس نے شادی کرلی ہے' اگر کسی ایسے شخص کے متعلق پوچھتے ہیں جو پہلے مرچکا ہے' تو آنے والا کہتا ہے کہ وہ مجھ سے پہلے مرگیا تھا' وہ لوگ کہتے ہیں اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ' اسے اسکی ماں ہاویہ کے پاس لے جایا گیا ہے۔

میّت سے قبر کی گفتگو : مردوں کا کلام یا تو زبان حال سے ہوتا ہے' یا زبان قال سے اور زبان حال مردوں کو سمجھانے کے لئے زبان قال سے فصیح تر ہے' جس کے ذریعے زندوں کو سمجھایا جاتا ہے۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ جب مردوں کو قبر میں رکھا جاتا ہے' تو قبر اس سے کہتی ہے کہ اے کم بخت انسان تجھے کس چیز نے مجھ سے دھوکہ میں رکھا' کیا تو نہیں

جانتا کہ میں فتنے' تاریکی' تنہائی' اور کیڑوں کا گھر ہوں' تو مجھ سے کس مغالطے میں مبتلا تھا کہ میرے اوپر اکڑ کر چلتا تھا' اگر مرنے والا سعادت مند ہوتا ہے تو اس کی طرف سے کوئی جواب دینے والا یہ جواب دیتا ہے کہ کیا تو نہیں جانتی کہ یہ شخص نیک کام کا حکم دیتا تھا اور برے کام سے منع کرتا تھا' قبر کہے گی تب میں اسکے لئے سرسبز و شاداب (باغ) بن جاتی ہوں' چنانچہ اس کا جسم نور بن جائے گا' اور روح اللہ تعالیٰ کی طرف پرواز کر جائے گی' (روایت میں لفظ فذاد وارد ہے' اس سے وہ شخص مراد ہے جو ایک پاؤں پہلے اٹھاتا ہے اور دوسرا بعد میں اٹھاتا ہے) (ابن ابی الدنیا' طبرانی) عبید ابن عمیر لیثی کہتے ہیں کہ جب کوئی شخص مرتا ہے تو اس کا وہ گڑھا جس میں وہ دفن ہوتا ہے اسے یہ آواز دیتا ہے کہ اے شخص میں تاریکی اور تنہائی کا گھر ہوں' اگر تو اپنی زندگی میں اللہ کا مطیع تھا تو میں آج تیرے لئے رحمت ہوں' اور اگر تو نافرمان تھا تو آج میں تجھ پر عذاب ہوں' میں وہ ہوں جو مجھ میں مطیع بن کر داخل ہوتا ہے خوش ہو کر نکلتا ہے' اور جو نافرمان بن کر داخل ہوتا ہے وہ تباہ و برباد ہو کر نکلتا ہے' محمد ابن صبیح کہتے ہیں کہ ہمیں معلوم ہوا ہےکہ جب آدمی کو اسکی قبر میں رکھ دیا جاتا ہے تو اسے عذاب ہوتا ہے یا کوئی اور پسندیدہ امر پیش آتا ہے' اس وقت پڑوسی موے اس سے کہتے ہیں کہ اے وہ شخص جو اپنے پڑوسیوں اور بھائیوں سے دنیا میں پیچھے رہ گیا تھا کیا تو ہم سے عبرت نہیں کر سکتا تھا کیا ہمارے پہلے آنے میں تیرے لئے مقام فکر نہیں تھا' کیا تو یہ نہیں دیکھ رہا تھا کہ ہمارے اعمال کا سلسلہ منقطع ہو چکا ہے' اور تجھے فرصت میسر ہے' کیا تو یہ ان کوتاہیوں کا تدارک نہیں کر سکتا تھا جو تیرے بھائیوں سے سرزد ہوئی تھیں اور وہ ان کا تدارک نہیں کر سکے تھے' زمین کے مختلف حصوں سے یہ آواز آئے گی اے دنیا کے ظاہر سے فریب کھانے والے کیا تو نے اپنے عزیزوں سے عبرت حاصل نہیں کی جو زمین کے سینے میں دفن ہو گئے ہیں' حالانکہ دنیا کے فریب میں وہ بھی مبتلا تھے' پھر موت نے سبقت کی' اور انھیں قبروں میں پہنچا دیا' تو نے دیکھا کہ دوسروں نے اپنے کاندھوں پر اٹھا کر انھیں انکی منزل تک پہنچایا جہاں پہنچنا بہر حال انکی تقدیر میں تھا۔ یزید الرقاشی کہتے ہیں کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ جب میّت کو قبر میں رکھ دیا جاتا ہے تو اسے اس کے اعمال گھیر لیتے ہیں' پھر انھیں اللہ زبان عطا کرتا ہے' اور وہ کہتے ہیں کہ اے اپنے گڑھے میں تنہا رہ جانے والے تجھے تیرے دوست احباب اور اہل و عیال تنہا چھوڑ کر جا چکے ہیں' آج ہمارے پاس تیرا کوئی غم خوار نہیں ہے' کعب کہتے ہیں کہ جب کسی نیک بندے کو اسکی قبر میں رکھا جاتا ہے تو اسے اس کے اعمال صالحہ روزہ' نماز' حج' جہاد اور صدقہ گھیر لیتے ہیں' عذاب کے فرشتے پاؤں کی طرف سے آنا چاہتے ہیں تو نماز ان سے کہتی ہے اس سے دور رہو' تم اس تک راہ نہ پاسکو گے' کیونکہ اس نے اللہ کے لئے میرے ساتھ ان پر لمبا قیام کیا ہے' وہ سر کی طرف سے آئیں گے' اس وقت روزے آڑے آئیں گے اور کہیں گے تم اس پر قابو نہیں پا سکتے کیونکہ یہ دنیا میں اللہ کے لئے لمبے عرصے تک پیاسا رہا ہے' وہ اس کے پاس جسم کی طرف سے آئیں گے' وہاں حج اور جہاد کھڑے ہو جائیں گے' اور کہیں گے کہ اس سے دور رہو' اسلئے کہ اس نے اپنے نفس کو تھکایا ہے' اور جسم کو مشقت میں ڈالا ہے' اور اللہ کے لئے حج اور جہاد کیا ہے' فرشتے ہاتھوں کی طرف سے آئیں گے' ادھر سے صدقہ کہے گا کہ میرے دوست سے دور رہو' اسلئے کہ ان ہاتھوں سے بے شمار صدقات نکلے ہیں' اور وہ اللہ کے یہاں مقبول ہوئے ہیں' کیونکہ اس نے اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لئے یہ صدقات دئے تھے' راوی کہتے ہیں کہ اب اس سے کہا جائے گا مبارک ہو' تو اچھے حال میں زندہ رہا اور تو نے اچھے حال میں موت پائی' راوی مزید کہتے ہیں کہ قبر میں رحمت کے فرشتے آتے ہیں' اور اس کے لیے جنت کا بستر بچھاتے ہیں' اور جنت کی چادر اڑھاتے ہیں' اور اسکی قبر کو حد نظر تک وسیع کرتے ہیں' اور جنت سے ایک قندیل لا کر جلائی جاتی ہے' اسکے نور سے قبر قیامت کے دن تک روشن رہیگی' عبد اللہ ابن عبید اللہ ابن عمیر نے ایک جنازے کی مشایعت کے دوران فرمایا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مردہ قبر میں بیٹھتا ہے' اور اپنے ساتھ آنے والوں کے قدموں کی آوازیں سنتا ہے' اس سے اس کی قبر کے علاوہ کوئی چیز گفتگو نہیں کرتی' وہ کہتی ہے اے ابن آدم! تیرا ناس ہو' کیا تو مجھ سے خوف زدہ نہیں تھا' کیا تجھے میری تنگی' میری گندگی' میرے کیڑوں اور میری وحشت کا ڈر نہیں تھا' پھر تو نے میرے لئے کیا تیاری کی ہے (ابن ابی الدنیا)۔

عذاب قبر اور منکر نکیر کا سوال : حضرت براء ابن عازب روایت کرتے ہیں کہ ہم سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک انصاری کے جنازے میں گئے' آپ اسکی قبر پر سر جھکا کر بیٹھ گئے' اور تین مرتبہ فرمایا: اے اللہ میں عذاب قبر سے تیری پناہ چاہتا ہوں' پھر فرمایا جب مومن آخرت میں حاضری کے لئے تیار ہوتا ہے اللہ تعالیٰ ایسے فرشتے بھیجتا ہے جن کے چہرے سورج کی مانند ہوتے ہیں' ان کے پاس اسکے لئے خوشبوئیں اور کفن ہوتا ہے' اور مرنے والے کی حد نظر تک بیٹھ جاتے ہیں' جب اسکی روح جسم سے باہر آجاتی ہے تو اس پر آسمان اور زمین کے درمیان کے تمام فرشتے اور آسمان کے تمام فرشتے نماز پڑھتے ہیں' اور آسمان کے دروازے کھول دئے جاتے ہیں' ہر دروازہ یہ چاہتا ہے کہ اسکی روح اس میں داخل ہو' جب اسکی روح آسمان پر پہنچ جاتی ہے' تو فرشتے عرض کرتے ہیں' یا اللہ! یہ تیرا فلاں بندہ ہے؟ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے اسے واپس لے جاؤ اور اسے دکھلاؤ کہ میں نے اس کے لیے کس قدر اعزاز کیا ہے' اسلئے کہ ہم یہ وعدہ کرچکے ہیں :۔

مِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ وَفِيهَا نُعِيدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً أُخْرَىٰ (پ ۱۶ ر ۱۲ آیت ۵۵)

ہم نے تم کو اسی زمین سے پیدا کیا' اور اسی میں ہم تم کو لے جائیں گے' اور پھر دوبارہ اسی سے تم کو نکالیں گے۔

وہ شخص (اپنی قبر میں) لوگوں کے جوتوں کی آوازیں سنتا ہے' جب وہ واپس لوٹتے ہیں' یہاں تک کہ اس سے کہا جاتا ہے اے شخص تیرا رب کون ہے؟ تیرا دین کیا ہے؟ اور تیرا نبی کون ہے؟ وہ جواب دیتا ہے میرا رب اللہ ہے' میرا دین اسلام ہے' اور میرے نبی محمد ہیں' یہ سوالات اس سے نہایت سختی سے کئے جاتے ہیں' اور یہ آخری آزمائش ہوتی ہے جس میں مردے کو مبتلا کیا جاتا ہے' اس وقت کوئی کہنے والا کہتا ہے تو نے سچ کہا' اور یہی معنی ہیں اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد گرامی کے :۔

يُثَبِّتُ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ (پ ۱۳ ر ۱۶ آیت ۶۷)

اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو اس پکی بات سے دنیا اور آخرت میں مضبوط رکھتا ہے۔

پھر کوئی آنے والا آتا ہے' اس کا چہرہ خوبصورت' اسکی خوشبو عمدہ' اور لباس بہترین ہوتا ہے' وہ کہتا ہے تجھے رحمت حق کی اور ایسی جنتوں کی خوشخبری ہو جن میں دائمی نعمتیں ہیں مردہ کہتا ہے اللہ تعالیٰ تجھے بھی خیر کی بشارت دے' تو کون ہے' آنے والا کہتا ہے میں تیرا نیک عمل ہوں' بخدا میں جانتا ہوں کہ تو اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں جلدی کرنے والا' اور اسکی معصیت میں دیر کرنے والا تھا' اللہ تعالیٰ نے تجھے جزائے خیر دی' اسکے بعد ایک اعلان کرنے والا یہ اعلان کرتا ہے' اسکے لیے جنت کا بستر کردو' اور اسکے لئے جنت کا دروازہ کھول دو' چنانچہ اس کے لیے جنت بستر کردیا جاتا ہے' اور جنت کی سمت ایک دروازہ کھول دیا جاتا ہے' اس وقت وہ دعا کرتا ہے اے اللہ! قیامت جلدی کرتا کہ میں اپنے اہل وعیال کی طرف واپس جاسکوں' اور کافر کا حال یہ ہے کہ جب اسے آخرت میں پیش ہونا ہوتا ہے' اور دنیا سے اسکا تعلق منقطع ہوتا ہے تو نہایت تند مزاج' اور سخت گیر فرشتے آسمان سے نیچے اترتے ہیں' ان کے پاس آگ کے کپڑے اور تیزاب کی قمیصیں ہوتی ہیں' وہ آکر اس کے پاس بیٹھ جاتے ہیں' جب اسکی روح نکل جاتی ہے' تو آسمان و زمین کے درمیان تمام فرشتے اور آسمان کے تمام فرشتے اس پر لعنت بھیجتے ہیں' اور آسمان کے تمام دروازے بند کردئے جاتے ہیں یہاں تک کہ ہر دروازہ اپنے اندر سے اسکا داخلہ ناپسند کرتا ہے' جب اسکی روح اوپر لے جاکر پھینک دی جاتی ہے تو فرشتے عرض کرتے ہیں یا اللہ! یہ تیرا فلاں بندہ ہے' اسے نہ کسی آسمان نے قبول کیا ہے اور نہ زمین نے' اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اسے واپس لے جاؤ' اور دکھلاؤ کہ میں نے اسکے لئے کیسا عذاب تیار کیا ہے' میں اس سے یہ وعدہ کرچکا ہوں مِنْهَا خَلَقْنَاكُمْ الخ۔ وہ شخص بھی واپس جانے والوں کے جوتوں کی آوازیں سنتا ہے' یہاں تک کہ اس سے پوچھا جاتا ہے کہ تیرا رب کون ہے؟ تیرا دین کیا ہے؟ اور تیرے نبی کون ہیں؟ وہ کہتا ہے میں نہیں جانتا' کہا جاتا ہے خدا کرے تو نہ جانے' پھر ایک آنے والا آتا ہے' اس کا چہرہ نہایت برا' اس کا جسم

بدبودار' اور اسکے کپڑے نہایت گندے ہوتے ہیں' وہ کہتا ہے تجھے اللہ کے غضب اور دائمی دردناک عذاب کا مژدہ ہو' مردہ کہتا ہے تجھے بھی برائی کا مژدہ ہو تو کون ہے' وہ کہتا ہے میں تیرا عمل ہوں' بخدا تو اللہ کی معصیت میں بہت زیادہ جلدی کرنے والا اور اسکی اطاعت میں نہایت سست رو تھا' اسلئے اللہ تعالیٰ نے تجھے برا بدلہ دیا' وہ کہتا ہے اللہ تعالیٰ تجھے بھی برا بدلہ دے' پھر اس پر ایک اندھا بہرا گونگا متعین کردیا جاتا ہے' اسکے پاس لوہے کا (اتنا بھاری) گرز ہوتا ہے کہ اگر جن وانس مل کر اسے حرکت دینا چاہیں تو حرکت نہ دے سکیں' اور اگر اسے پہاڑ پر مارا جائے تو پہاڑ مٹی ہوجائے اس (خوفناک) گرز سے اس کافر کو مارا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ مٹی بنجاتا ہے' پھر اس میں روح واپس آتی ہے' پھر اس کو دونوں آنکھوں کے درمیان اتنے زور سے مارا جاتا ہے کہ زمین پر رہنے والے سب چرند پرند (سوائے جن اور انسان کے) اسکی آواز سنتے ہیں' پھر ایک اعلان کرنے والا یہ اعلان کرتا ہے کہ اس کے لیے آگ کی دو تختیاں بچھادی جائیں اور اسکے لئے دوزخ کا ایک دروازہ کھول دیا جائے' چنانچہ اس کے لیے صرف آگ کی دو تختیوں کا فرش کردیا جاتا ہے' اور دروزاہ کھول دیا جاتا ہے (ابوداؤد' حاکم' ابن حبان' نسائی)۔

محمد ابن علی کہتے ہیں کہ ہر شخص کے سامنے اسکی موت کے بعد اسکے اچھے اور برے اعمال مجسم ہوکر آتے ہیں' وہ اپنی نیکیوں کو دیکھتا ہے اور برائیوں سے آنکھیں بند کرلیتا ہے' حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب مومن کی موت کا وقت قریب آتا ہے تو فرشتے اسکے پاس ریشم کے ایک کپڑے میں مشک اور ریحان کی خوشبوئیں لے کر آتے ہیں' اور اسکی روح ایسے نکالتے ہیں جیسے آٹے میں سے بال نکال لیا جاتا ہے' اور اس سے کہا جاتا ہے' اے نفس مطمئنہ! تو اللہ کی راحت اور کرامت کی طرف نکل اس حال میں کہ تو اللہ سے راضی ہے' اور اللہ تجھ سے راضی ہے' جب اس کی روح نکل جاتی ہے تو اسے مشک اور ریحان پر رکھا جاتا ہے' اور اس پر ریشم کا کپڑا ڈال دیا جاتا ہے' اور اسے علیین میں بھیج دیا جاتا ہے' اور جب کافر کی موت آتی ہے تو اسکے پاس فرشتے ٹاٹ میں آگ کے شعلے لپیٹ کر آتے ہیں' اور نہایت سختی سے روح قبض کرتے ہیں' اور اس سے کہا جاتا ہے کہ اے نفس خبیثہ! تو اللہ تعالیٰ کے عذاب اور ذلت کی طرف نکل اس حال میں کہ تو اللہ تعالیٰ سے ناخوش ہے اور اللہ تعالیٰ تجھ سے ناراض ہے' جب اس کی روح نکل جاتی ہے تو اسے آگ کے شعلوں پر رکھا جاتا ہے' روح کے بھننے کی آواز آتی ہے' اور اس پر ٹاٹ ڈال دیا جاتا ہے' پھر اسے قید خانے میں لے جایا جاتا ہے (مسند بزار' ابن ابی الدنیا' محمد ابن کعب) القرظی نے قرآن کریم کی یہ آیت تلاوت کی :-

حَتّٰىٓ اِذَا جَآءَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ رَبِّ ارْجِعُوْنِ لَعَلِّىٓ اَعْمَلُ صَالِحًا فِيْمَا تَرَكْتُ
(پ ۱۸ ر ۶ آیت ۹۹)

یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی پر موت آتی ہے تو اس وقت کہتا ہے کہ اے میرے رب مجھ کو دنیا میں پھر واپس بھیج دیجئے تاکہ جس دنیا کو میں چھوڑ کر آیا ہوں اس میں پھر جاکر نیک کام کروں۔

اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ بندے سے پوچھتا ہے کہ تو کیا چاہتا ہے' تجھے کس چیز کی خواہش ہے کیا تو یہ چاہتا ہے کہ مال جمع کرے' درخت لگائے' عمارتیں بنائے' نہریں کھودے' وہ کہتا ہے نہیں میں یہ سب کچھ نہیں چاہتا بلکہ دنیا میں جو کچھ چھوڑ آیا ہوں اس میں اچھا کام کرنا چاہتا ہوں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :-

كَلَّاۗ اِنَّهَا كَلِمَةٌ هُوَ قَآئِلُهَا (پ ۱۸ ر ۶ آیت ۱۰۰)

ہرگز نہیں! یہ ایک بات ہی بات ہے جس کو یہ کہے جارہا ہے۔

یعنی وہ موت کے وقت یہ خواہش ظاہر کرتا ہے' حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مومن اپنی قبر میں ایک سبز باغ کے اندر رہتا ہے' اس کی قبر ستر گز کشادہ کردی جاتی ہے' اور اس قدر روشن کردی جاتی ہے کہ گویا چودھویں رات کا چاند نکلا ہوا ہو' کیا تم جانتے ہو قرآن کریم کی یہ آیت کس کے بارے میں نازل ہوئی ہے :-

فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا (پ ۱۶ ر ۱۶ آیت ۱۲۴)

تو اس کے لیے تنگی کا جینا ہوگا۔

لوگوں نے عرض کیا اللہ اور اسکے رسول زیادہ جانتے ہیں' یہ کافر کا عذاب ہے' جو اس پر قبر میں ہوگا اس پر ننانوے تنین مسلط کردی جائیں گی' کیا تم جانتے ہو تنین کیا ہے' تنین ننانوے اژدہا ہیں' ان میں سے ہر ایک کے سات سر ہوں گے' یہ تمام اژدہے قیامت تک اسے کھسوٹتے ڈستے اور اسکے جسم میں پھنکارا مارتے رہیں گے (ابن حبان) تمہیں اس تعداد پر تعجب نہ کرنا چاہیے اس لئے کہ اژدھوں کی یہ تعداد اخلاق مذمومہ کے مقابلے میں ہے جیسے کبر' حسد' ریا' فریب اور کینہ وغیرہ' ان اخلاق مذمومہ کے کچھ اصول ہیں' پھر ان سے متعدد فروغ نکلتی ہیں پھر فروع کی متعدد قسمیں ہوتی ہیں' یہ صفات مہلک ہیں' اور یہی صفات قبر میں سانپ' بچھو اور اژدہا بن جاتی ہیں' قوی صفت اژدہے کی طرح ڈستی ہے' اور کمزور صفت بچھو کی طرح اور ان دونوں کے درمیان جو اوصاف ہیں وہ سانپ کی طرح ڈستے ہیں' ارباب قلوب اور ارباب بصیرت سے ان مہلکات کا اور ان کی فروع کا مشاہدہ کرتے ہیں' تاہم انکی تعداد پر نور نبوت کے بغیر مطلع ہونا ممکن نہیں ہے' اس طرح کی روایات کے ظواہر صحیح اور اسرار مخفی ہیں' لیکن ارباب بصائر کے نزدیک یہ اسرار بالکل عیاں ہوتے ہیں' جس پر روایات کے حقائق منکشف نہ ہوں اسے ظواہر کا انکار نہ کرنا چاہیے' ایمان کا کم سے کم درجہ تصدیق و تسلیم ہے۔

خلاف مشاہدہ امور کی تصدیق: رہا یہ اعتراض کہ ہم کافر کو اسکی قبر میں طویل عرصے تک دیکھتے ہیں' اور ہمیں مذکورہ بالا عذابوں میں سے کوئی عذاب واقع ہوتا ہوا نظر نہیں آتا' پھر ہم مشاہدے کیخلاف کسی امر کی تصدیق کس طرح کرسکتے ہیں' اس کا جواب یہ ہے کہ تم ان امور کی جو مشاہدے کے خلاف ہوں تین طرح تصدیق کرسکتے ہو۔

ایک صورت جو زیادہ صحیح اور نہایت واضح ہے یہ ہیکہ تم ان اژدھوں اور سانپ بچھوؤں کے وجود کی تصدیق کرو' اور اس امر کا اعتراف کرو کہ یہ میت کو ڈستے ہیں' لیکن تم ان کا مشاہدہ نہیں کرپاتے' کیونکہ تمہاری آنکھوں میں ملکوتی امور کے مشاہدے کی صلاحیت نہیں ہے' اور جو چیز بھی آخرت سے متعلق ہے وہ ملکوتی ہے' دیکھو صحابہ کرام حضرت جبرئیل علیہ السلام کے نازل ہونے پر ایمان رکھتے ہیں حالانکہ وہ حضرات جبرئیل علیہ السلام کو نہیں دیکھتے تھے' ساتھ ہی انھیں یہ بھی یقین تھا کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم جبرئیل کو دیکھتے ہیں' اگر تمہیں نزول جبرئیل کا یقین نہیں ہے تو تمہارے لئے اہم ترین بات یہ ہے کہ ملائکہ اور وحی کی تصدیق کرکے اصل ایمان کو مضبوط کرو' اور اگر تم اس پر ایمان رکھتے ہو' اور یہ بھی یقین ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت جبرئیل علیہ السلام کو دیکھتے تھے' حالانکہ امت آپ کو نہیں دیکھتی تھی' پھر تم میت کے سلسلے میں اس کا یقین کیوں نہیں رکھتے کہ بعض امور ایسے واقع ہوسکتے ہیں جو تمہارے مشاہدے سے خارج ہوں' پھر جس طرح فرشتے آدمیوں اور حیوانات کے مشابہ نہیں ہیں اسی طرح قبر کے سانپ اور بچھو بھی دنیا کے سانپ بچھو کی طرح نہیں ہیں' ان کی جنس دوسری ہے' اور ان کے ادراک کے لئے بھی دوسرے حواس ہیں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ تم سونے والے پر قیاس کرو' بعض اوقات وہ نیند میں یہ دیکھتا ہے کہ اسے سانپ نے کاٹ لیا ہے' وہ اس کی اذیت بھی محسوس کرتا ہے' اور چیخنے لگتا ہے' دوسرے لوگ اسکی چیخ سنتے ہیں' اس کی پیشانی پر پسینہ آجاتا ہے' کبھی اپنی جگہ سے اچھل پڑتا ہے' سونے والا ان تمام امور کا ادراک کرتا ہے' اور ان سے ویسی ہی تکلیف پاتا ہے جیسی جاگنے والا پاتا ہے' وہ ان چیزوں کا مشاہدہ کرتا ہے' حالانکہ تم اسے پُرسکون پاتے ہو تمہیں اسکے ارد گرد کوئی سانپ یا بچھو بھی نظر نہیں آتا' جب کہ اس کے حق میں سانپ موجود ہیں' اور اسے تکلیف ہورہی ہے' اگر عذاب کا مطلب تکلیف ہے تو پھر سانپ کے نظر آنے یا نہ آنے میں کیا فرق ہے؟

تیسری صورت یہ ہیکہ تم جانتے ہو سانپ بذات خود تکلیف دینے والا نہیں ہے بلکہ تکلیف اس کے زہر سے ہوتی ہے' پھر زہر بھی تکلیف دہ نہیں ہے' بلکہ اس اثر میں ہوتی ہے جو تمہارے جسم میں زہر پھیلنے سے رونما ہوتا ہے' اگر یہ اثر زہر کے علاوہ کسی اور

چیز سے واقع ہو تب بھی تکلیف ہوگی' تاہم عذاب کی اس نوع کا یقین نہیں کیا جاسکتا' بس اتنا کیا جاسکتا ہے کہ عذاب کو اس سبب کی طرف منسوب کردیا جائے جس کے باعث وہ اثر پھیلا ہے اور تکلیف ہوئی ہے' مثلاً اگر انسان کے اندر صحبت کی لذت پیدا ہوجائے' اور فی الحقیقت صحبت نہ ہوئی ہو تو اس لذت کو صرف اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ صحبت کی طرف اس کی نسبت کردی جائے یعنی اس طرح کہہ دیا جائے کہ وہ لذت حاصل ہوتی ہے جو عورت کے ساتھ ہم بستری سے حاصل ہوتی ہے' اس نسبت سے سبب کی معرفت حاصل ہوجائے گی' اور اس کا ثمرہ معلوم ہوجائے گا' اگرچہ سبب کی صورت حاصل نہ ہو' ویسے سبب ثمرے کے لئے مقصود ہوتا ہے' بذات خود مطلوب نہیں ہوتا۔

بہرحال یہ مہلک صفات موت کے وقت نفس میں ایذا دینے والی اور تکلیف پہنچانے والی بن جاتی ہے' اور انکی تکلیف ایسی ہوتی ہے جیسے سانپوں کے کاٹنے کی ہوتی ہے' حالانکہ ان کا وجود نہیں ہوتا' صفت کے مہلک بن جانے کی مثال ایسی ہے جیسے معشوق کے مرجانے سے عشق موذی بن جاتا ہے' پہلے وہ لذیذ تھا' پھر ایسا حال ہوا کہ لذیذ شئی تکلیف دہ بن گئی' یہاں تک کہ قلب پر ایسے عذاب وارد ہوتے ہیں کہ آدمی یہ تمنا کرنے لگتا ہے کاش اس نے عشق و وصال کا مزہ چکھاہی نہ ہوتا' میت کے مختلف عذابوں میں سے ایک عذاب کی بعینہ یہی نوعیت ہے' دنیا میں اس پر عشق مسلط تھا' یعنی وہ اپنے مال' جاہ' اولاد' اقارب اور معارف کے عشق میں مبتلا تھا' چنانچہ اگر کوئی شخص اسکی زندگی میں ان چیزوں میں سے لے لیتا اور لے کر واپس نہ دیتا تو تم دیکھتے وہ کس قدر بے چین' مضطرب اور پریشان ہوتا' اور مایوس ہو کر کہتا کاش میرے پاس مال ہی نہ ہوتا یا میں جاہ سے محروم ہوتا تاکہ مجھے آج جدائی کی اذیت نہ سہنی پڑتی' موت تو نام ہی محبوب چیزوں سے فراق کا ہے' یہ تمام چیزیں دفعتاً اس سے چھٹ جاتی ہیں' ایک شاعر کے بقول :-

مَاحَالُ مَنْ كَانَ لَهُ وَاحِدٌ غُيِّبَ عَنْهُ ذٰلِكَ الْوَاحِدُ

(اس کا کیا حال ہوگا جس کے ایک ہو' اور وہی ایک غائب ہوجائے)

غور کرو' اس شخص کا کیا حال ہوگا جو صرف دنیا سے خوش ہوتا تھا' اچانک اس سے دنیا چھین لی گئی' اور اسکے دشمنوں کو دیدی گئی' پھر اس عذاب میں وہ حسرت بھی شامل کرلیجئے' جو آخرت کی نعمتیں نہ ملنے پر' اور اللہ تعالیٰ سے محجوب رہ جانے پر ہوتی ہے' اسلئے کہ غیر اللہ کی محبت آدمی کو اللہ تعالیٰ کی ملاقات کے شرف سے محروم کردیتی ہے' اس پر اپنی محبوب چیزوں سے جدائی کا الم' اور اخروی نعمتوں سے محرومی کا غم ٹھکرائے جانے' اور اللہ تعالیٰ سے محجوب رہ جانے کی ذلت ابد الآباد تک مسلط رہے گی' جدائی کی آگ بس دوزخ کی آگ کے بعد ہے' اور ان دونوں کے درمیان کوئی تیسری آگ نہیں ہے'

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

كَلَّا إِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوبُوْنَ ثُمَّ إِنَّهُمْ لَصَالُوا الْجَحِيْمِ (پ ۳۰ ر ۱ آیت ۱۶)

ہرگز نہیں یہ لوگ اس روز اپنے رب سے روک دیئے جائیں گے پھر یہ دوزخ میں داخل ہوں گے۔

لیکن جو شخص دنیا سے انس نہ رکھتا ہو' اور اس نے اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے محبت نہ کی ہو اور وہ لقائے الٰہی کا مشتاق ہو وہ موت کے ذریعے دنیا کے قید خانے' اور شہوات کی تکلیف سے نجات پاتا ہے' اپنے محبوب کے پاس جاتا ہے' اس سے رکاوٹیں اور موانع منقطع ہوجاتے ہیں' اور اس پر زوال کے خوف کے بغیر اخروی نعمتیں دیر تک برستی ہیں' عمل کرنے والوں کو ایسے ہی درجات پر پہنچنے کے لئے عمل کرنا چاہیے۔

اب ہم اصلی مقصود کی طرف رجوع کرتے ہیں' بعض اوقات آدمی کو اپنے گھوڑے سے اس قدر محبت ہوتی ہے کہ اگر اسے اختیار دیا جائے تو اپنے گھوڑے سے ہاتھ دھولے' یا خود کو بچھو سے کٹوالے تو وہ دوسری صورت اختیار کرلیتا ہے' کیوں کہ اسکے نزدیک بچھو کے کاٹنے پر صبر کرنا گھوڑے کی فراق پر صبر کرنے سے آسان ہے' اگر گھوڑا لے لیا گیا تو اس کی محبت جان لیوا اور تکلیف دہ ہوگی' اور زیادہ ڈنک مارے گی' اگر آدمی دنیا کی محبت میں مبتلا ہے تو اسے ان ڈنکوں کے لئے تیار رہنا ہوگا' کیوں کہ موت اسے اس

کی تمام محبوب اور مرغوب چیزوں سے محروم کردے گی، اس کا گھوڑا، سواری، گھر، زمین، اہل، اولاد، احباب، معارف، جاہ اور مقبولیت سب کچھ لے لے گی، یہاں تک کہ اس کے کان، آنکھ اور دوسرے اعضاء بھی چھین لے گی، اور پھر یہ چیزیں حاصل بھی نہ ہوسکیں گی، انکی واپسی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مایوس ہوجانا ہوگا، اب اگر کسی کو ان چیزوں سے محبت ہے، اور وہ جیتے جی ان سے جدا نہ ہوتا تھا تو موت اسے جدا ہونے پر مجبور کرے گی، اور اس جدائی کی تکلیف ایسی ہوگی جیسے سانپ بچھوؤں کے ڈسنے اور کاٹنے سے ہوتی ہے، ہم پہلے ہی لکھ چکے ہیں کہ انسان کے اندر وہ قوت جسے رنج اور خوشی کا ادراک ہوتا ہے مرنے کے بعد بھی باقی رہتی ہے، بلکہ موت کے بعد یہ ادراک زیادہ سریع اور قوی ہوجاتا ہے، اسلئے محبوب چیزوں سے جدائی کی تکلیف نہایت شدید ہوتی ہے، کیونکہ زندگی میں تو وہ خود کو بولنے، اور بیٹھنے اٹھنے سے تسلی دے سکتا تھا، اور دل کو یہ کہہ کر بہلا سکتا تھا کہ وہ چیز دوبارہ مل سکتی ہے، جو چھین گئی ہے، یا اسکا عوض مل سکتا ہے، لیکن مرنے کے بعد تسلی کی کیا صورت ہوگی تسلی اور بہلاوے کے تمام راستے مسدود کردئے جائیں گے، صرف مایوسی ہی مایوسی ہوگی، بالفرض اگر کسی کو اپنے کرتے پاجامے سے ایسی محبت تھی کہ وہ اس سے چھین لیا جاتا تو ناگوار ہوتا، موت کے بعد بھی اسکے فراق کے تکلیف اٹھانی ہوگی، سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے یہی مراد ہے "نَجَا الْمُخِفُّوْنَ" (ہلکوں نے نجات پائی) اور اگر بھاری ہوا تو عذاب بھی زیادہ ہوگا جیسے اگر کسی شخص کا غم دوسرے کے غم سے ہلکا ہوگا، اور ایک درہم والا دو درہم والے سے ہلکا ہوگا چنانچہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ "ایک درہم والا حساب میں دو درہم والے سے ہلکا ہوگا۔ بہرحال دنیا میں موت کے بعد تم کوئی ایسی چیز چھوڑ کر نہیں جاؤ گے جس پر تمہیں حسرت نہیں ہوگی، اگر تم چاہو تو دنیا کی چیزوں میں کمی رکھو، اور چاہو تو زیادتی رکھو، زیادتی رکھو گے تو تمہاری حسرت بھی زیادہ ہوگی، اور کمی رکھو گے تو اپنی کمر کا بوجھ ہلکا کرو گے۔ سانپ اور بچھو ان مالداروں کی قبروں میں زیادہ ہوں گے، جو آخرت کے مقابلے میں دنیا کو پسند کرتے ہیں، اس پر خوش ہوتے ہیں، اسے پاکر مطمئن ہوتے ہیں۔

یہ ایمان و تصدیق کی وہ صورتیں جو قبر کے سانپوں اور بچھوؤں، اور عذاب کی دیگر انواع میں اختیار کی جاسکتی ہیں، ابوسعید الخدری نے اپنے بیٹے کو جو انتقال کرگئے تھے خواب میں دیکھا، اور کہا اے بیٹے! مجھے کچھ نصیحت کر، بیٹے نے کہا آپ اللہ کے ارادے کی مخالفت نہ کریں، ابوسعید الخدری نے کہا کچھ اور نصیحت کر، بیٹے نے جواب دیا آپ اس پر عمل نہ کرسکیں گے ابوسعید نے کہا تو بیان کر، بیٹے نے کہا اپنے اور اللہ کے درمیان کوئی قمیص نہ لائیں یعنی قمیص سے بھی اس قدر مانوس نہ ہوں کہ وہ اللہ کی محبت سے مشغول کردے۔ چنانچہ حضرت ابوسعید الخدریؓ نے تیس سال تک قمیص نہیں پہنا۔ اب رہا یہ سوال کہ مندرجہ بالا تین صورتوں میں سے کون سی صورت صحیح ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ بعض پہلی صورت کا انکار کریں گے، اور دوسری صورت کا اثبات کریں گے، اور بعض تیسری صورت کا اثبات کریں گے، لیکن غور و فکر کے بعد جو امر حق ہم پر منکشف ہوا ہے وہ یہ ہے کہ یہ تمام امکانی ہیں، جو لوگ بعض صورتوں کا انکار کرتے ہیں وہ اپنی پست ہمتی، جہالت، اور اللہ تعالیٰ کی وسیع تر قدرت اور عجائب تدبیر سے لاعلمی کی بنا پر کرتے ہیں، اصل میں وہ اللہ تعالیٰ کے ان افعال کا انکار کرتے ہیں جن سے وہ مانوس نہیں ہوتے، اور یہ محض جہالت اور عجز ہے، تعذیب کے یہ تینوں طریقے ممکن ہیں، اور ان کی تصدیق واجب ہے، بہت سے بندوں کو ان میں سے ایک ہی نوع کا عذاب ہوگا، اور بہت سوں میں یہ تینوں صورتیں جمع کردی جائیں گی، ہم عذاب الٰہی سے پناہ چاہتے ہیں خواہ وہ تھوڑا ہو یا زیادہ۔ یہ ہے حق بات، تم اسے تقلید کے طور پر تسلیم کرلو، روئے زمین پر کوئی ایسا شخص موجود نہیں ہے جو اس سلسلے میں تحقیق کے ساتھ کچھ کہہ سکتا ہو، میں تمہیں وصیت کرتا ہوں کہ اس کی تفصیل میں نہ پڑو، اور نہ اسکی معرفت کے حصول میں مشغول نہ ہو، بلکہ عذاب سے خود کو محفوظ رکھنے کی تدبیر کرو خواہ کیسے بھی ہو، اگر اس شخص کی طرح ہوگے جسے بادشاہ نے ہاتھ اور ناک کاٹنے کے لئے قید کرلیا ہو، اور وہ تمام رات یہ سوچتا رہے کہ بادشاہ میرے اعضاء چھری سے کاٹے گا، یا تلوار سے، یا استرے سے، اور اس سزا سے بچنے کی تدبیر نہ کرے، یہ نہایت درجے کی جہالت ہے۔ بہرحال یہ بات اچھی طرح واضح ہوچکی ہے کہ موت کے بعد بندہ یا تو عذاب الیم میں مبتلا ہوگا یا دائمی نعمتوں کا مستحق بنے گا، اسلئے بندے کو دائمی نعمتوں کے حصول کی تیاری کرنی چاہیے، ثواب و عذاب کی تفصیل پر بحث کرنا بے کار

ہے، اور وقت ضائع کرنے کے مترادف ہے۔

منکر نکیر کا سوال، ان کی صورت، قبر کا دباؤ، اور عذاب قبر کے سلسلے میں مزید گفتگو: حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جب بندہ مرجاتا ہے تو اسکے پاس دو سیاہ رو اور نیلی آنکھوں والے فرشتے آتے ہیں، ان میں سے ایک کو منکر اور دوسرے کو نکیر کہا جاتا ہے، وہ دونوں بندے سے کہتے ہیں کہ تو نبی کے سلسلے میں کیا کہتا تھا، اگر وہ مومن ہے تو کہتا ہے کہ میں انھیں اللہ کا بندہ رسول کہتا تھا میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور پھر اسکی قبر ستر گز لمبی اور ستر گز چوڑی کردی جاتی ہے، اور اسکے لئے قبر میں روشنی کردی جاتی ہے، پھر اس سے کہا جاتا ہے کہ سوجا وہ کہے گا مجھے اپنے اہل و عیال کے پاس جانے دو تاکہ میں انھیں اسکی خبر دے سکوں، وہ کہتے ہیں کہ سوجا، وہ دلہن کی طرح سوجاتا ہے، اور اسے وہی جگاتا ہے جو اسے اپنے گھر والوں میں زیادہ محبوب ہوتا ہے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اسے اسکی خواب گاہ سے اٹھائے گا، اور اگر وہ منافق ہے تو کہتا ہے میں نہیں جانتا، میں لوگوں کو کچھ کہتے ہوئے سنتا تھا، اور وہی کہہ دیتا تھا جو سنتا تھا، وہ فرشتے کہتے ہیں ہم جانتے تھے تو یہی کہے گا، پھر زمین سے کہا جاتا ہے اس پر لپٹ جا، زمین اس پر لپٹ جاتی ہے، یہاں تک کہ اس کی پسلیاں اِدھر سے اُدھر ہو جاتی ہیں، وہ قیامت تک اسی عذاب میں مبتلا رہے گا (ترمذی، ابن حبان) عطا ابن یسار روایت کرتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر ابن الخطابؓ سے ارشاد فرمایا اے عمر! جب تم مرجاؤ گے تو تمہارا حال کیا ہوگا، تمہاری قوم تمہیں لے جائے گی، اور لوگ تمہارے لئے تین ہاتھ لمبا اور ڈیڑھ ہاتھ چوڑا ایک گڑھا تجویز کریں گے، پھر تمہاری طرف واپس آئیں گے، تمہیں نہلائیں گے اور کفن پہنائیں گے، اور تمہیں خوشبو میں بسائیں گے، پھر اٹھا کر لے جائیں گے اور اس گڑھے میں رکھ دیں گے، پھر تم پر مٹی ڈالیں گے، اور دفن کردیں گے، جب وہ تمہیں وہاں رکھ کر واپس آئیں گے تو تمہارے پاس قبر کے دو فتنہ گر منکر نکیر آئیں گے، ان کی آوازیں ایسی ہوں گی جیسے کڑکنے والی بجلی، اور ان کی آنکھیں چمکنے والی بجلی کی طرح ہوں گی، ان کے بال زمین پر گھسٹتے ہوئے ہوں گے، وہ قبر کو اپنی کچلیوں سے ادھیڑ کر تجھے جھنجھوڑ ڈالیں گے اور ہلا ڈالیں گے، اے عمر! اس وقت تمہارا کیا عالم ہوگا، حضرت عمرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا اس وقت بھی میرے پاس عقل ہوگی جیسے اس وقت ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہاں، حضرت عمرؓ نے عرض کیا تب میں ان کے لئے کافی رہوں گا (یعنی میں ان سے نمٹ لوں گا) (ابن ابی الدنیا) یہ ایک نص صریح ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ عقل موت سے متغیر نہیں ہوتی، بلکہ صرف جسم اور اعضاء بدلتے ہیں، گویا مرنے کے بعد بھی انسان آلام اور لذات کا علم رکھتا ہے، اور ان کا ادراک کرتا ہے جیسے وہ اپنی زندگی میں کرتا تھا، عقل مدرک کوئی ظاہری عضو نہیں ہے، بلکہ وہ ایک باطنی شئی ہے، جس کا نہ طول ہوتا ہے، اور نہ عرض۔ بلکہ جو چیز فی نفسہٖ منقسم نہیں ہوتی وہی اشیاء کا ادراک کرنے والی ہے، اگر انسان کے تمام اعضاء بکھر جائیں، اور اسکے پاس وہ جزو مدرک باقی رہ جائے جو قابل تجزی نہیں ہو تو انسان کمال عقل کے ساتھ باقی اور قائم رہتا ہے، یہی حالت موت کے بعد بھی رہتی ہے، اسلئے کہ اس جزو پر موت طاری نہیں ہوتی، اور نہ اس میں عدم حلول کرتا ہے۔

محمد ابن المنکدر کہتے ہیں کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ کافر پر اسکی قبر میں ایک اندھا بہرا جانور مسلط کیا جائے گا، اسکے ہاتھ میں لوہے کا ایک گرز ہوگا، اور اسکا سر اونٹ کے کوہان کی طرح ہوگا، وہ اس گرز سے قیامت تک کافر کو ملتا رہے گا، نہ اسے دیکھے گا کہ بچا کر مارے اور نہ سنے گا کہ اس پر رحم کرے، حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ جب مردے کو قبر میں رکھ دیا جاتا ہے تو اسکے اعمال صالحہ آتے ہیں اور اسے گھیر لیتے ہیں، اگر وہ جانور سر کی جانب سے آتا ہے تو قرأت قرآن آجاتی ہے، اور پاؤں کی جانب سے آتا ہے تو نمازوں میں کھڑے ہونے کا عمل سامنے آجاتا ہے، اور اگر ہاتھوں کی طرف سے آتا ہے تو ہاتھ یہ کہتے ہیں بخدا یہ مجھے صدقہ اور دعا کیلئے پھیلایا کرتا تھا، تو اس پر قابو نہیں پاسکتا، اور اگر منہ کی جانب سے آتا ہے تو اس کا ذکر اور روزے آجاتے ہیں، اسی طرح نماز اور صبر بھی ایک طرف کھڑے ہو جاتے، وہ کہتے ہیں بخدا اگر ہمیں کوئی نقص نظر آیا تو ہم اسکے ساتھ ہوں گے۔ حضرت سفیان ثوریؒ کہتے ہیں کہ میت کیلئے اس کے نیک اعمال لڑتے ہیں جیسے کوئی شخص اپنے بھائی کے لئے، اور زن و فرزند اپنے شوہر اور باپ کیلئے لڑتے

ہیں' پھر اس وقت کہا جاتا ہے' اللہ تعالیٰ تجھے تیری آرام گاہ میں برکت عطا کرے' تیرے دوست بہترین دوست' اور تیرے رفیق بہترین رفیق ہیں' حضرت حذیفہ روایت کرتے ہیں کہ ہم سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ ایک جنازے میں تھے' آپ قبر کے کنارے بیٹھ گئے' اور اس میں دیکھنے لگے' پھر فرمایا مومن اس طرح دبایا جاتا ہے کہ اسکی پسلیاں اور سینے کی ہڈیاں چور چور ہو جاتی ہیں (احمد) حضرت عائشہؓ روایت کرتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قبر دبایا کرتی ہے' اگر قبر کے دبانے سے کوئی شخص محفوظ رہتا تو وہ سعد ابن معاذؓ ہوتے (احمد) حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی زینب کا انتقال ہوا' آپ اکثر بیمار رہا کرتی تھیں' سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم جنازے کے ہمراہ تشریف لے گئے' آپ کا چہرہ مبارک بدلا ہوا تھا' جب ہم لوگ قبر پر پہنچے تو آپ ان کی قبر میں اترے' جب باہر تشریف لائے تو آپ کا چہرہ مبارک کھلا ہوا تھا' ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ کی ہم نے عجیب حالت دیکھی؟ آپ نے فرمایا مجھے اپنی بیٹی کا دبنا' اور عذاب قبر کی شدت یاد آگئی تھی' جب میں قبر میں اترا تو مجھے خبر دی گئی کہ اللہ تعالیٰ نے دباؤ میں تخفیف کردی ہے' اور اسے صرف اتنا دبایا گیا ہے کہ اسکی آواز مشرق و مغرب کے درمیان سنی گئی ہے (ابن ابی الدنیا)۔

خواب میں مردوں کے احوال کا مشاہدہ: جاننا چاہیے کہ انوار بصیرت سے۔ جو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مستفاد ہوتے ہیں۔ ہمیں مردوں کے احوال کا علم ہوتا ہے' اور بالجملہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ نیک بخت ہیں' یا بدبخت' لیکن کسی فرد معین مثلاً زید عمر کا حال بالکل منکشف نہیں ہوتا' کیونکہ اگر ہم زید و عمر کے ایمان پر اعتماد بھی کرلیں تب بھی ہم یہ بات یقین کے ساتھ کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ اس کا خاتمہ ایمان پر ہوا ہے' اور اگر ظاہری تقویٰ پر اکتفا کریں تو تقویٰ کا محل قلب ہے' اور وہ خود صاحب تقویٰ پر مخفی رہتا ہے چہ جائیکہ غیر آدمی اس پر مطلع ہو' گویا اگر باطن میں تقویٰ نہ ہو تو ظاہر کی نیکی کا کوئی اعتبار نہیں ہے' اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :۔

إِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللَّهُ مِنَ الْمُتَّقِينَ (پ ۶ ر ۹ آیت ۲۷) خدا تعالیٰ متقیوں ہی کا عمل قبول کرتے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ زید و عمر کے حال کی معرفت مشاہدے کے بغیر ممکن نہیں' اور جب آدمی مرجاتا ہے تو وہ عالم ملک و شہادت سے عالم غیب و ملکوت کی طرف منتقل ہو جاتا ہے' اسلئے وہ ظاہری آنکھ سے نظر نہیں آتا' بلکہ اسے دیکھنے کے لئے دوسری آنکھ کی ضرورت ہوتی ہے' اور وہ آنکھ ہر انسان کے دل میں پیدا کی گئی ہے' لیکن انسان نے اس پر اپنی شہوات' اور دنیوی اشغال سے پردہ ڈال رکھا ہے' اسلئے وہ اس آنکھ سے دیکھ نہیں پاتا' اور نہ یہ ممکن ہے کہ وہ عالم ملکوت کی کوئی چیز اس وقت تک دیکھ سکے جب تک اسکے دل کی آنکھ پر شہوات کا پردہ ہے' کیونکہ انبیاء علیہم السلام کی آنکھوں پر یہ پردہ نہیں تھا اس لیے انہوں نے ملکوت اور اسکی عجائبات یہاں تک کہ عالم ملکوت میں مردوں کے احوال کا مشاہدہ کیا' اور بندگان خدا کو اسکی خبر دی' اسی لئے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے سعد ابن معاذؓ اور زینبؓ کے سلسلے میں یہ خبر دی کہ قبر نے انہیں دبایا' اسی طرح جب حضرت ابو جابرؓ شہید ہو گئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے صاحبزادے کو بتلایا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے باپ کو اپنے سامنے اس طرح بٹھایا کہ دونوں کے درمیان کوئی پردہ نہیں تھا' انبیائے کرام' اور درجۂ نبوت سے قربت رکھنے والے اولیائے عظام کے علاوہ کسی شخص سے اس مشاہدے کی توقع نہیں کی جاسکتی ہم جیسے لوگوں کے لئے تو ایک ضعیف مشاہدہ ہی ممکن ہے' اگرچہ یہ بھی نبوی مشاہدہ ہے' ہماری مراد خواب ہے جو نبوت کے انوار میں سے ایک نور ہے' اور جس کے متعلق سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "اچھے خواب نبوت کے چھیالیس حصوں میں سے ایک حصہ ہے" خواب بھی ایک انکشاف ہے' اور اس وقت ہوتا ہے جب دل سے پردہ ہٹ جاتا ہے' اسی لئے صرف اس شخص کے خواب کا اعتبار ہوتا ہے جو نیک چلن اور راست باز ہو' جو شخص بہت زیادہ جھوٹ بولتا ہے اس کا خواب قابل اعتبار نہیں ہوگا' جس شخص کے معاصی زیادہ ہوتے ہیں اس کا دل سیاہ ہو جاتا ہے' اور وہ نیند کے عالم میں دیکھتا ہے وہ خواب پریشان کہلاتا ہے' اسی لئے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے سونے سے پہلے وضو کا حکم دیا ہے تاکہ آدمی پاک ہو کر سوئے (بخاری و مسلم۔ براء ابن عازب) اس حدیث میں باطن کی طہارت کے لئے تکمیل اور تتمہ ہے' اور جب باطن صاف ہوتا ہے تو قلب

مبارک پر مکہ مکرمہ میں داخلہ منکشف ہو گیا تھا، حتی کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے مکاشفے کی تصدیق کیلئے یہ آیت نازل فرمائی :-

لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّؤْيَا بِالْحَقِّ (پ ۲۶ ر ۱۲ آیت ۲۷)

بے شک اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو سچا خواب دکھلایا

شاید ہی کوئی شخص ایسا ہو جو سچا خواب نہ دیکھ پاتا ہو، ورنہ عام طور لوگ خواب میں ایسی باتیں دیکھ لیتے ہیں جو بعد میں حقیقت بن کر سامنے آتی ہیں، خواب سچا ہونا، اور نیند میں امور غیب کی معرفت اللہ تعالیٰ کی عجائب صنعت اور فطرت انسانی کے روشن اور عمدہ پہلوؤں میں سے ایک پہلو ہے، اور عالم ملکوت پر واضح ترین دلیل ہے، مخلوق جس طرح قلب اور عالم کے دیگر عجائبات سے غافل ہے اسی طرح وہ خواب کے عجائب سے بھی غافل ہے۔

لیکن خواب کی حقیقت کا بیان علوم مکاشفہ کے دقائق سے متعلق ہے، اور یہاں علم معاملہ سے ہٹ کر گفتگو نہیں کی جا سکتی، اس لئے ہم صرف اس قدر ذکر کرتے ہیں جس کی اجازت ہے، اور ایک مثال کی صورت میں جس کے ذریعے تم مقصود پر بخوبی مطلع ہو سکتے ہو، دیکھو قلب کی مثال ایسی ہے جیسے آئینہ، اس میں صورتیں اور امور کے حقائق منعکس ہوتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ نے جو کچھ ازل سے ابد تک مقدر کیا ہے، وہ سب ایک جگہ لکھا ہوا ہے، اور وہ جگہ اللہ کی مخلوق ہے، اسے کبھی لوح محفوظ کہا گیا ہے، کبھی کتاب مبین، اور کبھی امام مبین، جیسا کہ قرآن شریف میں وارد ہوا ہے، عالم میں جو کچھ ہوا ہے یا جو کچھ ہونے والا ہے وہ سب اس میں نقش ہے، لیکن تم ظاہری آنکھ سے اس نقش کا مشاہدہ نہیں کر سکتے، تم یہ گمان نہ کرنا کہ وہ لوح لکڑی، لوہے یا ہڈی کی ہے، یا کتاب کاغذ اور ورق سے ہے، بلکہ یہ بات تمہیں قطعی طور پر جان لینی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کی لوح مخلوق کی لوح کے مشابہ نہیں ہے، اور نہ اسکی کتاب مخلوق کی کتاب کے مشابہ ہے، جس طرح اسکی ذات و صفات مخلوق کی ذات و صفات کے مشابہ نہیں ہوتی، اگر تم تقریب فہم کے لئے کوئی مثال جاننا چاہو تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ لوح میں مقادیر الٰہی کا ثابت ہونا ایسا ہے جیسے حافظ قرآن کے دماغ اور قلب میں قرآن کریم کے کلمات اور حروف ثابت ہو جاتے ہیں اور ایسے ہوتے ہیں جیسے لکھے ہوئے ہوں، حافظ قرآن جب قرآن پڑھتا ہے تو ایسا لگتا ہے گویا وہ کہیں دیکھ کر پڑھ رہا ہے، حالانکہ اگر اس کا دماغ کھولا جائے اور ایک ایک جزء کر کے دیکھا جائے تو ایک حرف بھی لکھا ہوا نظر نہ آئے، اسی طرز پر لوح محفوظ میں وہ سب کچھ لکھا ہوا ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے فیصلہ کیا ہے، اور جو تقدیر ازلی سے وجود پذیر ہونے والا ہے، لوح کی مثال ایک آئینے کی طرح ہے جس میں صورتیں منعکس ہوتی ہیں، اب اگر ایک آئینہ دوسرے آئینے کے مقابلے میں رکھا جائے تو دوسرے آئینے میں بھی وہی صورتیں منعکس ہوتی ہیں جو پہلے آئینے میں ہیں، بشرطیکہ دونوں کے درمیان کوئی پردہ حائل نہ ہو، قلب بھی ایک آئینے کی طرح ہے جو علوم کے آثار قبول کرتا ہے، اسی طرح لوح محفوظ بھی ایک آئینہ ہے جس میں تمام علوم کے آثار موجود رہتے ہیں، اور قلب کا شہوات کے ساتھ اشتغال اور حواس کے مقتضیات ان دونوں "آئینوں" کے درمیان ایک حجاب ہیں، قلب کا آئینہ اس حجاب کے باعث لوح کا مطالعہ نہیں کرتا جس کا تعلق عالم ملکوت سے ہے، جب "ہوا" چلتی ہے تو اس حجاب کو حرکت دیتی ہے اور اسے اٹھا دیتی ہے، اس سے قلب کے آئینے میں عالم ملکوت کے بعض انوار برق خاطف کی طرح چمکتے ہیں، بعض اوقات یہ انوار دائمی ہو جاتے ہیں، اور کبھی دائمی نہیں ہوتے، عام طور پر یہی دوسری صورت ہوتی ہے، بیداری کے دوران جو کچھ حواس کے ذریعے عالم ظاہر سے آدمی تک پہنچتا ہے وہ اسی میں مشغول رہتا ہے، اور یہی مشغولیت اس کے لئے عالم ملکوت سے حجاب بن جاتی ہیں، اور نیند کے عالم میں حواس ٹھہر جاتے ہیں، اور قلب پر وارد نہیں ہوتے، اسلئے جو کچھ قلب پر وارد ہوتا ہے، وہ خالص ہوتا ہے، اور اس کا جوہر نفس صاف ہوتا ہے، اس وقت اسکے قلب اور لوح کے درمیان سے پردہ اٹھ جاتا ہے، اور اسکی کوئی بات قلب کے آئینے میں منعکس ہوتی ہے، اگر دونوں کے درمیان کوئی حجاب نہ ہو، نیند حواس کو عمل سے روک دیتی ہے، لیکن خیال کو عمل اور حرکت سے نہیں روکتی، اسلئے جو بات دل میں واقع ہوتی ہے خیال اسی کی طرف سبقت کرتا ہے اور اسکو ایسی چیز سے مشابہت دے لیتا ہے جو اس کے قریب ہو کیونکہ خیالات حافظے میں زیادہ راسخ ہوتے ہیں، اسلئے خیال حافظے میں رہ جاتا ہے، جب آدمی بیدار ہوتا ہے تو اسے خیال کے علاوہ کوئی چیز یاد نہیں

رہتی' اسلئے تعبیر بتانے والے کو اس خیال پر نظر رکھنی پڑتی ہے اور وہ خیال و معنی میں مناسبت دیکھتا ہے' اور اسی مناسبت پر اعتماد کرتے ہوئے تعبیر بتلاتا ہے فن تعبیر سے واقف لوگوں کے سامنے اسکی بے شمار مثالیں ہیں' تاہم جو لوگ اس فن سے واقف نہیں ہم ان کیلئے ایک مثال بیان کرتے ہیں' اور وہ یہ ہے کہ ایک شخص نے امام فن علامہ ابن سیرین کی خدمت میں عرض کیا میں نے "خواب میں دیکھا ہے کہ میرے ہاتھ میں انگوٹھی ہے' اور میں لوگوں کے منہ اور شرمگاہوں پر اس سے مہر لگا رہا ہوں' ابن سیرین نے فرمایا تو مؤذن ہے' اور رمضان میں صبح سے پہلے اذان دیتا ہے' اس شخص نے کہا آپ صحیح فرماتے ہیں' دیکھو مہر لگانا منع کی علامت ہے' اسلئے ابن سیرین کے ذہن میں فوراً یہی معنی پیدا ہوئے' اور انہوں نے برجستہ تعبیر بیان کردی' کیوں کہ اس مثال میں لوگوں کا کھانے پینے اور ہم بستر ہونے سے روکنے کا علم ہوتا ہے' اور یہ حکم رمضان ہی میں ہو سکتا ہے۔

علم رویا کے متعلق یہ ایک مختصر گفتگو ہے' ورنہ یہ علم ایک ناپید اکنار سمندر ہے' اور اس کے بے شمار عجائب ہیں' اور کیوں نہ ہوں جب کہ نیند موت کی بہن ہے' اور موت خود ایک عجیب و غریب واقعہ ہے' خواب اور موت میں مشابہت کی ایک وجہ یہ ہے کہ خواب میں غیب کے کچھ واقعات ظاہر ہو جاتے ہیں' یہاں تک کہ سونے والا یہ جان لیتا ہے کہ مستقبل میں کیا ہونے والا ہے اور موت سے تو تمام حجابات اٹھ ہی جاتے ہیں اور جو کچھ پردۂ خفا میں تھا وہ سب ظاہر ہو جاتا ہے یہاں تک کہ سانس کی ڈور ٹوٹتے ہی انسان کسی تاخیر کے بغیر یہ جان لیتا ہے کہ وہ عذاب اور مصیبت میں پڑنے والا ہے' یا اخروی سعادت اور ابدی سلطنت حاصل کرنے والا ہے' اسی لئے جب بدبختوں کو اپنا انجام نظر آئے گا اور آنکھیں کھلیں گی تو ان سے کہا جائے گا۔

لَقَدْ كُنْتَ فِي غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَاءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيدٌ (پ ۲۶ ر ۱۶ آیت ۲۲)

تو اس دن سے بے خبر تھا سو اب ہم نے تجھ پر سے تیرا پردہ (ہٹادیا) سو آج تیری نگاہ بڑی تیز ہے۔

أَفَسِحْرٌ هٰذَا أَمْ أَنْتُمْ لَا تُبْصِرُونَ اصْلَوْهَا فَاصْبِرُوا أَوْ لَا تَصْبِرُوا سَوَاءٌ عَلَيْكُمْ إِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ (پ ۲۷ ر ۳ آیت ۱۵)

تو کیا یہ سحر ہے' یا یہ کہ تم کو نظر نہیں آتا' اس میں داخل ہو' پھر خواہ سہار کرنا یا سہار نا کرنا تمہارے حق میں دونوں برابر ہیں' جیسا تم کرتے تھے' ویسا ہی بدلہ تم کو دیا جائیگا۔

وَبَدَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مَا لَمْ يَكُونُوا يَحْتَسِبُونَ (پ ۲۴ ر ۲ آیت ۴۷)

اور خدا کی طرف سے ان کو وہ معاملہ پیش آئے گا جس کا ان کو گمان بھی نہ تھا۔

خلاصۂ کلام یہ ہیکہ جو شخص یہاں علماء میں سب سے بڑا عالم' اور حکماء میں سب سے بڑا حکیم ہے' اس پر موت کے بعد وہ عجائب اور نشانیاں منکشف ہوں گی کہ کبھی اس کے خواب و خیال میں بھی نہیں آئی ہوں گی' اسلئے اگر عقلمند کو اسکے علاوہ کوئی غم اور فکر نہ ہو کہ مرنے کے بعد کیا ہوگا' اور حجاب کس چیز سے اٹھے گا' شقاوت دائمی سے یا سعادت ابدی سے' اگر وہ اسی فکر رات دن مشغول رہے' اور اس فکر کے علاوہ اسے کوئی کام نہ ہو تو یہ اسے پوری عمر کے لئے کافی ہے' تعجب اس پر ہوتا ہے کہ عظیم تین مصیبتیں ہمارے سامنے ہیں اور ہم غفلت میں مبتلا ہیں' بلکہ حیرت کی بات تو یہ ہیکہ ہم اپنے احوال' اہل اسباب' اور ذریت سے' بلکہ اپنے اعضاء اور اپنی قوت سامعہ و باصرہ سے خوش ہوتے ہیں اور ان کے وجود پر نازاں ہوتے ہیں' حالانکہ ہم ان چیزوں سے یقینی طور پر جدا ہونے والے ہیں' لیکن وہ شخص کہاں ہے جس کے دل میں روح القدس وہ بات القاء کرے جو سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمائی تھی' کہ آپ جس چیز سے چاہیں محبت کرلیں آپ کو اس سے لازماً جدا ہونا ہے' اور جس قدر چاہیں دنیا میں رہ لیں' آپ کو مرنا ہے' اور جو چاہیں عمل کرلیں اسکی آپ کو جزاء ملنی ہے' کیونکہ یہ امور آپ پر یقین کے ساتھ منکشف تھے اسلئے آپ دنیا میں اس طرح رہے جیسے مسافر رہتا ہے' نہ آپ نے اینٹ پر اینٹ رکھی' اور نہ بانس پر بانس' نہ ترکے میں کوئی درہم چھوڑا اور نہ دینار' نہ کسی کو اپنا حبیب بنایا نہ دوست' ارشاد فرمایا کرتے تھے :۔

لَوْ كُنْتُ مُتَّخِذًا خَلِيلًا لَاتَّخَذْتُ أَبَا بَكْرٍ خَلِيلًا وَلٰكِنْ صَاحِبُكُمْ خَلِيلُ الرَّحْمٰنِ

اگر میں کسی کو دوست بناتا تو ابوبکر کو بناتا' لیکن تمہارا ساتھی تو اللہ کا دوست ہے۔

گویا آپ نے یہ بیان فرمایا کہ رحمٰن کی دوستی آپ کے باطن قلب میں جاگزیں ہو گئی تھی اور اسکی محبت آپ کے دل میں راسخ ہو گئی تھی' یہاں تک کہ اس میں نہ کسی دوست کی گنجائش باقی رہی تھی' اور نہ کسی حبیب کی' آپ نے اپنی امت سے ارشاد فرمایا :- إِن كُنتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ (پ ۳ ر ۱۲ آیت ۳۱)

اگر تم خدا تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو تو تم لوگ میرا اتباع کرو' خدا تعالیٰ تم سے محبت کرنے لگیں گے۔

آپ کی امت میں وہی داخل ہے جو آپ کا تبع ہو اور آپ کی اتباع صحیح معنوں میں وہی شخص کرتا ہے جو دنیا سے اعراض کرتا ہو' اور آخرت کی طرف متوجہ رہتا ہو' کیونکہ آپ نے اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت کے سوا کسی چیز کی طرف نہیں بلایا' اور نہ آپ نے دنیا اور فانی لذتوں کے علاوہ کسی چیز سے روکا' اس لئے تم جس قدر دنیا سے اعراض کرو گے' اور آخرت کی طرف راغب ہو گے اسی قدر تم اس راستے پر چلنے والے کہلاؤ گے اسی قدر آپ کے تبع کہلاؤ گے' اور جس قدر اتباع کرو گے اسی قدر آپ کی امت میں سے ہو گے' اور جس قدر دنیا پر گرو گے اسی قدر آپ کے راستے سے انحراف کرو گے' اور آپ کی اتباع سے اعراض کرو گے' اور ان لوگوں کے ساتھ مل جاؤ گے' جن لوگوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا :-

فَأَمَّا مَن طَغَىٰ وَآثَرَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا فَإِنَّ الْجَحِيمَ هِيَ الْمَأْوَىٰ (پ ۳۰ ر ۲ آیت ۳۷ تا ۳۹)

جس شخص نے سرکشی کی' اور دنیوی زندگی کو ترجیح دی' سو دوزخ اس کا ٹھکانہ ہو گا۔

کاش تم غرور کی چال سے نکل سکتے' اور اپنے نفس کے ساتھ انصاف کر سکتے' اور اس میں تمہارا ہی کیا قصور ہے' ہم سب کا یہی حال ہے' ہم سب ایک ہی راستے کے مسافر ہیں' صبح سے شام تک فانی لذتوں کے درپے رہتے ہیں' ہماری ہر حرکت اور ہر سکون دنیائے فانی کے لئے ہوتا ہے اور ان تمام نافرمانیوں کے بعد ہم یہ امید رکھتے ہیں کہ کل ہم آپ کی امت میں سے ہوں گے' اور آپ کے متبعین کی صف میں نظر آئیں گے' کتنا بعید ہے' یہ ظن' اور کتنی ناقص ہے یہ طمع۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں :-

أَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِينَ كَالْمُجْرِمِينَ مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ (پ ۲۹ ر ۴ آیت ۳۵ - ۳۶)

کیا ہم فرماں برداروں کو نافرمانوں کے برابر کر دیں گے' تم کو کیا ہوا تم کیا فیصلہ کرتے ہو۔

اب ہم اپنے اصل مقصد کی طرف چلتے ہیں' قلم مقصد سے ہٹ گیا تھا' یہاں ہم بعض وہ خواب بیان کرتے ہیں جن سے مردوں کے احوال منکشف ہوتے ہیں' یہ خواب نافع ہیں' نبوّت ختم ہو گئی ہے لیکن مبشرات یعنی خواب باقی رہ گئے ہیں۔

مردوں کے احوال سے متعلق کچھ خواب : خوابوں میں اہم ترین خواب وہ ہے جس میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہو' چنانچہ آپ کا ارشاد گرامی ہے جس نے مجھے خواب میں دیکھا اس نے واقعتاً مجھے دیکھا' اسلئے کہ شیطان میری صورت اختیار نہیں کر سکتا (بخاری و مسلم۔ ابو ہریرہؓ) حضرت عمر ابن الخطاب کہتے ہیں کہ میں نے خواب میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی' آپ میری طرف متوجہ نہیں تھے' میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! میرا کیا قصور ہے؟ آپ میری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کیا تم روزے کی حالت میں بوسہ نہیں لیتے ہو' میں نے عرض کیا اس ذات کی قسم! جس کے قبضے میں میری جان ہے میں روزے کی حالت میں کبھی کسی عورت کا بوسہ نہیں لوں گا' حضرت عباسؓ بیان فرماتے ہیں کہ میں عمر ابن الخطاب کا دوست تھا' ان کی وفات کے بعد میرے دل میں یہ تمنا ہوئی کہ میں انھیں خواب میں دیکھوں' ایک سال کے بعد یہ تمنا پوری ہوئی' اور میں نے انھیں خواب میں دیکھا کہ پیشانی سے پسینہ پونچھ رہے ہیں' اور کہتے ہیں کہ اب مجھے فرصت نصیب ہوئی ہے' اگر میں رؤف و رحیم سے نہ ملا ہوتا تو میرا تخت لوٹ چکا ہوتا۔ حضرت حسنؓ روایت کرتے ہیں کہ میرے والد نے مجھ سے بیان فرمایا کہ آج رات میں نے خواب میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی' اور عرض کیا کہ مجھے آپ کی امت سے بھلائی نہیں پہنچی' آپ نے فرمایا تم ان کے لئے بد دعا کرو' میں نے کہا اے اللہ! مجھے ان کے عوض ان سے بہتر لوگ عطا فرما' اور انھیں میرے بجائے مجھ سے برا آدمی

دے' یہ خواب بیان کرکے آپ باہر نکلے' اور ابن ملجم خبیث نے آپ کو زخمی کردیا' ایک بزرگ بیان کرتے ہیں کہ میں نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خواب میں زیارت کی اور عرض کیا یا رسول اللہ! میرے لئے دعائے مغفرت فرمایئے' آپ نے مجھ سے اعراض فرمایا میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم سے سفیان ابن عیینہ نے حدیث بیان کی ہے وہ محمد ابن المنکدر سے روایت کرتے ہیں اور وہ جابر ابن عبد اللہ سے کہ آپ سے جب بھی کوئی چیز مانگی گئی آپ نے انکار نہیں فرمایا یہ سن کر آپ میری طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا اللہ تیری مغفرت فرمائے' عباس ابن عبد المطلب سے روایت ہے کہ مجھ میں اور ابو لہب میں بھائی چارہ کا رشتہ تھا جب وہ مرگیا اور اللہ نے اسکے بارے میں خبر دی تو مجھے اس کے انجام پر افسوس ہوا' اور اسکی مجھے بڑی فکر ہوئی' میں نے اللہ تعالیٰ سے سال بھر تک یہ دعا کی اے اللہ! مجھے اسے خواب میں دکھلادے' ایک روز میں نے اسے خواب میں دیکھا کہ آگ میں جل رہا ہے' میں نے اسکا حال پوچھا' کہنے لگا کہ دوزخ کی آگ کے عذاب میں جتلا ہوں' شب و روز میں کبھی یہ آگ کم نہیں ہوتی' اور نہ عذاب سے کچھ راحت ملتی ہے' مگر دو شنبہ کی رات کو تخفیف ہوجاتی ہے' میں نے کہا دو شنبے کی رات میں کیا خصوصیت ہے' ابو لہب نے جواب دیا اس رات محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے تھے' اور ایک باندی آمنہ کے گھر میں ولادت کی خبر لے کر آئی تھی' میں یہ سن کر خوش ہوا تھا' اور اسی خوشی کے اظہار کے لئے میں نے باندی کو آزاد کردیا تھا' اس کا ثواب مجھے اللہ تعالیٰ نے اس طرح دیا ہے کہ ہر دو شنبے کی رات مجھ سے عذاب اٹھالیا جاتا ہے' عبد الواحد ابن زید کہتے ہیں کہ میں حج کے ارادے سے نکلا' میرے ساتھ ایک ایسا شخص بھی تھا جو اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے درود شریف پڑھتا رہتا تھا' میں نے اس سے اسکی وجہ دریافت کی' اس نے کہا میں پہلی بار مکہ مکرمہ گیا' اس سفر میں میرے ساتھ میرے والد بھی تھے' جب ہم لوگ واپس ہوئے تو ایک منزل پر پہنچ کر مجھے نیند آگئی' ابھی میں سو ہی رہا تھا کہ ایک آنے والا آیا اور کہنے لگا کھڑا ہو' اللہ تعالیٰ نے تیرے والد کو ماردیا ہے' اور اس کا چہرہ سیاہ کردیا ہے' میں گھبرا کر کھڑا ہوگیا میں نے اپنے باپ کے چہرے سے کپڑا ہٹا کر دیکھا وہ واقعی مرچکے تھے' اور ان کا چہرہ سیاہ ہوگیا تھا' یہ حال دیکھ کر میرے دل میں خوف بیٹھ گیا' ابھی میں اسی غم میں جتلا تھا کہ مجھ پر نیند غالب آگئی' میں نے خواب میں دیکھا کہ میرے والد کے سرہانے چار سیاہ رو شخص ہیں' اور ان کے ہاتھوں میں لوہے کے گرز ہیں' اچانک ایک شخص جو نہایت خوبرو تھا اور جس نے سبز لباس پہن رکھا تھا وہاں آیا' اور ان لوگوں سے کہنے لگا دور رہو پھر میرے والد کے چہرے پر ہاتھ پھیرا' اسکے بعد میرے پاس آیا' اور کہنے لگا کھڑا ہو' اور دیکھ اللہ تعالیٰ نے تیرے باپ کا چہرہ روشن کردیا ہے' میں نے کہا میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں' آپ کون ہیں؟ اس نے کہا میں محمدؐ ہوں' میں اپنی جگہ سے کھڑا ہوا اور اپنے والد کے چہرے سے کپڑا ہٹا کر دیکھا تو واقعی ان کا چہرہ سفید ہوگیا تھا' اس دن کے بعد سے میں نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں ہدیۂ درود و سلام بھیجنا ترک نہیں کیا' حضرت عمر ابن عبد العزیز فرماتے ہیں کہ میں نے خواب میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی حضرت ابو بکرؓ و عمرؓ آپ کی خدمت میں بیٹھے ہوئے تھے' میں نے سلام کیا اور بیٹھ گیا' اتنے میں حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ حاضر ہوئے اور ان دونوں کو میری نظروں کے سامنے ہی ایک کمرے میں داخل کیا گیا' اور کمرہ بند کردیا گیا' ابھی تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ حضرت علیؓ یہ کہتے ہوئے باہر نکلے رب کعبہ کی قسم! میرے لئے فیصلہ کردیا گیا ہے' اور حضرت علی کے نکلنے کے کچھ دیر بعد حضرت معاویہؓ یہ کہتے ہوئے نکلے کہ رب کعبہ کی قسم! میری خطا معاف کردی گئی ہے' حضرت عبد اللہ ابن عباسؓ ایک رات اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ پڑھتے ہوئے نیند سے بیدار ہوئے' اور کہنے لگے واللہ حسین کو قتل کردیا گیا ہے' یہ واقعہ اس وقت کا ہے کہ ابھی حضرت حسین علیہ السلام کی شہادت کی اطلاع وہاں نہیں پہنچی تھی' اسلئے ابن عباسؓ کے رفقاء نے آپ کی اس خبر کا یقین نہیں کیا' آپ نے فرمایا کہ میں نے خواب میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی ہے' آپ کے پاس ایک برتن میں خون تھا' آپ نے مجھ سے ارشاد فرمایا کیا تو نہیں جانتا کہ میری امت نے میرے بعد کیا کیا ہے' انھوں نے میرے بیٹے کو قتل کردیا ہے' یہ اس کا اور اس کے ساتھیوں کا خون ہے میں اسے اللہ تعالیٰ کے پاس لے جاؤنگا' چوبیس دن کے بعد خبر آئی کہ حضرت حسینؓ کو اسی دن شہید کردیا گیا تھا جس دن حضرت عبد اللہ ابن عباسؓ نے خواب میں دیکھا تھا' کسی نے حضرت ابو بکر الصدیقؓ کو خواب میں دیکھا اور دریافت کیا کہ آپ ہمیشہ اپنی زبان کے متعلق یہ ارشاد فرماتے رہے ہیں کہ اس نے مجھے

تعالیٰ کی جگہوں پر پہنچایا ہے' اب آپ کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے کیا معاملہ کیا ہے؟ انھوں نے فرمایا میں نے اس زبان سے لا الہ الا اللہ کہا تھا اسلئے اللہ تعالیٰ نے مجھے جنت میں داخل فرمایا۔

مشائخ عظام کے خواب: ایک بزرگ کہتے ہیں کہ میں نے تمیم الدورقی کو خواب میں دیکھا اور عرض کیا کہ جناب والا! اللہ تعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیا معاملہ فرمایا ہے' انھوں نے کہا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے جنتوں میں گھمایا اور دریافت فرمایا کہ کیا۔ تجھے جنت کی کوئی چیز اچھی لگی' میں نے عرض کیا نہیں' فرمایا اگر تجھے کوئی چیز اچھی لگتی تو میں وہ چیز تیرے سپرد کردیتا' اور تجھے اپنی بارگاہ میں رہنے کا شرف نہ بخشتا۔ یوسف ابن الحسین کو خواب میں دیکھ کر کسی نے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیا معاملہ کیا ہے' انھوں نے کہا کہ میری مغفرت فرمادی ہے' سائل نے دریافت کیا کس وجہ سے؟ فرمایا میں نے سنجیدہ بات کو مذاق میں نہیں اڑایا' منصور ابن اسماعیل کہتے ہیں کہ میں نے عبداللہ البزار کو خواب میں دیکھا اور پوچھا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیا معاملہ کیا ہے' انھوں نے جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنے سامنے کھڑا کیا' اور میرے وہ تمام گناہ معاف فرمادیئے جن کا میں نے اقرار و اعتراف کیا' صرف ایک گناہ ایسا تھا جس کا اعتراف کرتے ہوئے مجھے شرم آئی' اس کی سزا میں مجھے پسینے کے اندر کھڑا کیا گیا' یہاں تک کہ میرے چہرے کا گوشت گرگیا' میں نے پوچھا وہ گناہ کیا تھا' کہنے لگے میں نے ایک خوب رو لڑکے کو دیکھا وہ مجھے اچھا لگا' مجھے اللہ تعالیٰ سے شرم آئی کہ میں اسکے سامنے اسکا ذکر کروں' ابو جعفر صیدلانی کہتے ہیں کہ میں نے خواب میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا آپ کے ارد گرد کچھ فقراء بیٹھے ہوئے تھے' اچانک آسمان درمیان میں سے پھٹا اور دو فرشتے نیچے اترے ان میں سے ایک کے ہاتھ میں طشت تھا دوسرے کے ہاتھ میں لوٹا تھا۔ فرشتے نے طشت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے رکھا' آپ نے اس میں ہاتھ دھوئے' اور لوگوں کو بھی حکم دیا' چنانچہ لوگوں نے بھی ہاتھ دھوئے' پھر طشت میرے سامنے رکھ دیا گیا' ان فرشتوں میں سے ایک نے دوسرے سے کہا کہ اسکے ہاتھوں پر پانی مت ڈالنا' اسلئے کہ وہ ان میں سے نہیں ہے' میں نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا آپ نے ارشاد نہیں فرمایا کہ آدمی ان لوگوں کے ساتھ ہے جن سے وہ محبت کرے' آپ نے فرمایا ہاں میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! میں آپ سے محبت کرتا ہوں' اور ان فقراء سے محبت کرتا ہوں' سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اسکے ہاتھ بھی دھلوادو' یہ بھی انہی میں سے ہے' حضرت جنیدؒ فرماتے ہیں کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ میں لوگوں میں خطاب کررہا ہوں' اتنے میں ایک فرشتہ میرے پاس آیا اور کہنے لگا وہ عمل کون سا ہے جس سے تقرب حاصل کرنے والے اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرتے ہیں' میں نے کہا وہ مخفی عمل جو میزان عمل میں پورا اترے' وہ فرشتہ یہ کہتا ہوا واپس ہوگیا بخدا اس کا کلام توفیق یافتہ شخص کا کلام ہے' مجمع کو خواب میں دیکھ کر پوچھا گیا کہ آپ نے معاملہ کیسا پایا؟ انھوں نے جواب دیا کہ میں نے دنیا میں زہد کرنے والوں کو دیکھا کہ وہ دنیا و آخرت کی خیر سمیٹ کر لے گئے شام کے ایک شخص نے علاء ابن زیاد سے کہا کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ آپ جنت میں ہیں' وہ اپنی نشست سے اترے' اور اس شخص کے پاس آکر فرمایا کہ شیطان نے مجھے گمراہ کرنا چاہا تھا' اس سے تو بچ گیا' لیکن اب تجھے اس کام کے لئے متعین کیا ہے' محمد ابن الواسع کہتے ہیں کہ اچھے خواب مومن کو خوش کرتے ہیں' فریب نہیں دیتے صالح ابن بشر کہتے ہیں کہ میں نے عطاء سلمی کو خواب میں دیکھا اور عرض کیا آپ تو دنیا میں نہایت رنجیدہ اور مغموم رہا کرتے تھے' فرمایا اب بخدا مجھے ایک طویل راحت اور خوشی میسر ہے' میں نے پوچھا آپ کس درجے میں ہیں' انھوں نے جواب میں یہ آیت پڑھی :-

مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ (پ ۵ ر ۶ آیت ۶۹)

ان حضرات کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا ہے یعنی' انبیاء صدیقین شہداء اور صالحین۔

زرارۃ ابن ابی اوفی سے خواب میں کسی نے پوچھا کہ آپ کے نزدیک افضل ترین عمل کون سا ہے' انھوں نے جواب دیا' رضا' اور امل کا کوتاہ ہونا' یزید ابن مذعور کہتے ہیں کہ میں نے اوزاعی کو خواب میں دیکھا اور عرض کیا اے ابو عمرو مجھے کوئی ایسا عمل بتلائیں جسکے ذریعے میں اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرسکوں' انھوں نے فرمایا میں نے یہاں علماء کے درجے سے بڑا کوئی درجہ نہیں دیکھا' اسکے بعد غمگین رہنے والوں کا درجہ ہے' روایت ہے کہ یزید ابن مذعور نہایت ضعیف البصر تھے' وہ اس خواب کے بعد اس

کرتے تھے کہ ان کی بینائی جاتی رہی تھی۔

ابن عینیہؒ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے بھائی کو خواب میں دیکھا اور دریافت فرمایا کہ اے بھائی! اللہ تعالیٰ نے تیرے ساتھ کیا معاملہ کیا ہے؟ اس نے کہا کہ اللہ نے میرے تمام گناہ بخش دیے ہیں جن کی میں نے مغفرت چاہی تھی' اور جن کی مغفرت نہیں چاہی تھی وہ نہیں بخشے ہیں' علی الطلحیؒ کہتے ہیں کہ میں نے خواب میں ایک عورت کو دیکھا جو دنیا کی عورتوں جیسی نہیں تھی' میں نے اس سے پوچھا کہ تو کون ہے؟ اس نے کہا میں حور ہوں' میں نے کہا مجھ سے شادی کرلے' وہ کہنے لگی میرے آقا کو پیغام دے اور میرا مہر ادا کر' میں نے پوچھا تیرا مہر کیا ہے' وہ کہنے لگی کہ اپنے نفس کو اسکی آفات سے بچانا میرا مہر ہے۔ ابراہیم ابن اسحاق الحربی کہتے ہیں کہ میں نے زبیدہ کو خواب میں دیکھا اور پوچھا کہ اللہ نے تیرے ساتھ کیا معاملہ ہے؟ اس نے کہا اللہ تعالیٰ نے میری مغفرت کردی ہے' میں نے پوچھا اس مال کی بناء پر جو تونے مکہ مکرمہ کے راستے میں خرچ کیا ہے' اس نے کہا مال کا ثواب تو اس کے مالکوں کو ملا ہے' مجھے تو میری نیت کا صلہ عطا کیا گیا ہے' جب حضرت سفیان ثوری کا انتقال ہوگیا تو کسی نے انھیں خواب میں دیکھ کر دریافت کیا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیا معاملہ کیا ہے' انھوں نے جواب دیا کہ میں نے پہلا قدم پل صراط پر رکھا' اور دوسرا جنت میں' احمد ابن ابی الحواری کہتے ہیں کہ میں نے خواب میں ایک باندی کو دیکھا وہ بے حد حسین تھی' اتنا حسن میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا' اس کا چہرہ نور سے چمک رہا تھا' میں نے اس سے پوچھا کہ تیرے نورانی چہرے کی وجہ کیا ہے؟ اس نے کہا کہ کیا تجھے وہ شب یاد ہے جس میں تو رویا تھا' میں نے کہا ہاں مجھے یاد ہے' اس نے کہا میں نے تیرے آنسو لے کر اپنے چہرے پر مل لئے تھے' اسی وقت سے میرا چہرہ اس قدر روشن ہے' کتانیؒ کہتے ہیں کہ میں نے خواب میں حضرت جنید کو دیکھا اور پوچھا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے ساتھ کیا معاملہ کیا ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ وہ اشارات ضائع گئے اور وہ عبادتیں رائگاں ہوئیں' ہمیں جو کچھ ثواب ملا وہ ان دو رکعتوں پر ملا جو ہم رات میں پڑھا کرتے تھے' زبیدہؒ کو خواب میں دیکھ کسی نے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ نے تیرے ساتھ کیا معاملہ کیا ہے' اس نے جواب دیا کہ مجھے ان چار کلموں کی وجہ سے بخش دیا ہے' لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ اُفْنِیْ بِھَا عُمُرِیْ' لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ اُدْخُلُ بِھَا قَبْرِیْ' لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ اَخْلُوْ بِھَا وَحْدِیْ' لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ اَلْقَی بِھَا رَبِّیْ"۔ (اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اسی کلمے پر میں اپنی عمر تمام کروں' اسی پر اپنی قبر میں داخل ہوں' اسی پر اپنی خلوت میں تنہا رہوں' اسی پر اپنے پروردگار سے ملوں)۔

بشر ابن الحارث کو خواب میں دیکھ کر کسی نے پوچھا اللہ تعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیا معاملہ کیا ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ میرے اللہ نے مجھ پر رحم کیا' اور ارشاد فرمایا کہ اے بشر تجھے ہم سے شرم نہ آئی کہ ہم سے اس قدر ڈرتا تھا' ابو سلیمان کو خواب میں دیکھ کر دریافت کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیا معاملہ کیا ہے؟ فرمایا مجھ پر رحم کیا' اور ہمیں سب سے زیادہ نقصان لوگوں کے اشاروں نے پہنچایا' ابوبکر الکتانی کہتے ہیں کہ میں نے خواب میں ایک بے حد حسین و جمیل نوجوان کو دیکھا' اور اس سے دریافت کیا کہ تو کون ہے؟ اس نے کہا کہ میں تقویٰ ہوں' میں نے پوچھا تیرا مسکن کہاں ہے' اس نے کہا کہ میں ہر قلب حزیں میں رہتا ہوں' یہ کہہ کر اس نے رخ بدلا' اسکے بعد دیکھا تو وہ ایک سیاہ عورت تھی' میں نے پوچھا تو کون ہے؟ کہنے لگی میں بیماری ہوں' میں نے پوچھا تو کہاں رہتی ہے؟ اس نے کہا میں ہر خوش و خرم دل میں رہتی ہوں' اس کے بعد میں بیدار ہوگیا' اور میں نے عہد کیا کہ میں کبھی مسکراؤں گا نہیں' الاّ یہ کہ بے اختیار ہوجاؤں' ابو سعید الخراز کہتے ہیں کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ ابلیس نے مجھ پر حملہ کیا ہے؟ میں نے اسے مارنے کے لئے لاٹھی اٹھائی' مگر وہ ذرا بھی خوف زدہ نہ ہوا' اچانک یہ آواز آئی کہ ابلیس لاٹھی سے نہیں ڈرتا' بلکہ قلب کے نور سے ڈرتا ہے' مسوحیؒ کہتے ہیں کہ میں نے خواب میں ابلیس کو ننگا گھومتے ہوئے دیکھا اور اس سے کہا کہ کیا تجھے لوگوں سے شرم نہیں آتی' اس نے کہا کیا یہ آدمی ہیں' اگر آدمی ہوتے تو میں ان کے ساتھ رات دن اس طرح کیوں کھیلتا جس طرح بچے گیند کے ساتھ کھیلا کرتے ہیں' بلکہ آدمی ان کے علاوہ دوسرے ہیں' انھوں نے میرا جسم کمزور کردیا ہے' یہ کہہ کر اس نے ہمارے اصحاب تصوف کی طرف اشارہ کیا' ابو سعید الخراز کہتے ہیں' میں دمشق میں تھا' میں نے خواب میں دیکھا کہ نبی اکرم صلی اللہ

علیہ وسلم حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کا سہارا لئے ہوئے میرے پاس تشریف لائے' اور کھڑے ہوگئے' میں اس وقت کچھ کلمات کہہ کر اپنے سینے پر ضرب لگا رہا تھا' آپ نے فرمایا اس کی برائی اسکے خیر سے کم ہے' حضرت سفیان ابن عیینہؒ فرماتے ہیں کہ میں نے سفیان ثوریؒ کو خواب میں دیکھا کہ آپ جنت میں ہیں' اور ایک درخت سے دوسرے درخت پر یہ کہتے ہوئے اڑ رہے ہیں" لِمِثْلِ هٰذَا فَلْيَعْمَلِ الْعَامِلُوْنَ" میں نے کہا کہ مجھے کچھ وصیت فرمائیں' فرمایا: لوگوں کی معرفت کم کرو' ابو حاتم الرازیؒ قبیصہ ابن عقبہ سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے سفیان ثوری کو خواب میں دیکھا اور پوچھا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیا معاملہ کیا ہے' انھوں نے فرمایا:۔

نَظَرْتُ اِلٰى رَبِّيْ كِفَاحًا فَقَالَ لِيْ هَنِيْئًا رَضَائِيْ عَنْكَ يَا ابْنَ سَعِيْدٍ
فَقَدْ كُنْتَ اِذَا اَظْلَمَ الدُّجٰى بِعَبْرَةِ مُشْتَاقٍ وَقَلْبِ عَمِيْدٍ
فَدُوْنَكَ فَاخْتَرْ اَيَّ قَصْرٍ اَرَدْتَهٗ وَ زُرْنِيْ فَاِنِّيْ مِنْكَ غَيْرُ بَعِيْدٍ

(میں نے اپنے رب کو سامنے دیکھا تو اس نے فرمایا اے ابن سعید! تجھ سے میری رضامندی مبارک ہو' جب رات ہو جاتی تھی تو تو تہجد کے لئے کھڑا ہوتا تھا' قلب مشتاق اور چشم گریاں کے ساتھ اب تو جنت کا جو بھی مکان چاہے پسند کرلے' اور میری زیارت کر' میں تجھ سے دور نہیں ہوں)۔

حضرت شبلیؒ کو ان کی وفات کے تین دن کے بعد خواب میں دیکھا گیا' اور دریافت کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیا معاملہ کیا ہے' فرمایا اللہ تعالیٰ نے میرے ساتھ اس قدر مناقشہ کیا کہ میں اپنی بخشش سے مایوس ہوگیا' جب اس نے میری مایوسی دیکھی تو مجھے اپنی رحمت میں ڈھانپ لیا' بنو عامر کے مجنوں کو اسکے انتقال کے بعد خواب میں دیکھ کر پوچھا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے تیرے ساتھ کیا معاملہ کیا ہے' اس نے کہا میری مغفرت فرمائی' اور مجھے محبت کرنے والوں پر حجت قرار دیا' حضرت سفیان ثوریؒ کو خواب میں دیکھ کر کسی نے انکے ساتھ اللہ کے معاملے کے بارے میں پوچھا' انھوں نے جواب دیا کہ اللہ نے مجھ پر رحم فرمایا ہے' سائل نے دریافت کیا عبداللہ ابن المبارک کا کیا حال ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ وہ اپنے رب کے پاس ہر روز دو دفعہ جایا کرتے ہیں' ایک بزرگ کو خواب میں دیکھ کر کسی نے ان کا حال دریافت کیا' بزرگ نے کہا پہلے ہم سے سختی کے ساتھ پوچھ تاچھ کی' پھر احسان کرتے ہوئے ہمیں آزاد کردیا' مالک ابن انس کو خواب میں دیکھ کر دریافت کیا گیا کہ اللہ نے آپ کے ساتھ کیا معاملہ کیا ہے؟ فرمایا کہ میرے اس کلمے کے باعث مغفرت کردی گئی جو حضرت عثمان ابن عفان جنازے کو دیکھ کر فرمایا کرتے تھے" سُبْحَانَ الْحَيِّ الَّذِيْ لَا يَمُوْتُ" جس رات حضرت حسن بصری کا انتقال ہوا' اس رات خواب میں دیکھا گیا کہ گویا آسمان کے دروازے کھلے ہوئے ہیں اور کوئی اعلان کرنے والا یہ اعلان کررہا ہے کہ آگاہ رہو' حسن بصری اللہ تعالیٰ کے پاس اس حال میں آرہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہے' جاحظ کو خواب میں دیکھ کر کسی نے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ نے تیرے ساتھ کیا معاملہ کیا ہے' اس نے یہ شعر پڑھا:۔ وَلَا تَكْتُبْ بِخَطِّكَ غَيْرَ شَيْءٍ يَسُرُّكَ فِي الْقِيَامَةِ اَنْ تَرَاهُ

(تو اپنے قلم سے اس بات کے علاوہ کچھ نہ لکھنا جسے دیکھ کر تجھے قیامت کے دن خوشی حاصل ہو)

حضرت جنیدؒ نے ابلیس کو خواب میں دیکھا کہ وہ ننگا پھر رہا ہے' انھوں نے اس سے کہا کیا تجھے ان آدمیوں سے شرم نہیں آتی' ابلیس نے کہا کیا یہ آدمی ہیں' آدمی تو وہ ہیں جنھوں نے مسجد شونیزی میں میرے جسم کو لاغر کردیا' اور میرے جگر کو خاکستر کرڈالا' حضرت جنیدؒ کہتے ہیں کہ میں نے بیدار ہونے کے بعد مسجد کا قصد کیا' اور دیکھا کہ وہاں کچھ لوگ سر جھکائے بیٹھے ہیں' اور سوچنے میں مصروف ہیں' مجھے دیکھ کر وہ لوگ کہنے لگے تمہیں خبیث کے فریب میں نہ آنا چاہئے' نصر آبادی کو مکہ مکرمہ میں وفات کے بعد خواب میں دیکھا گیا اور دریافت کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے آپکے ساتھ کیا سلوک کیا ہے' انھوں نے کہا کہ مجھ پر شرفاء کا عتاب نازل ہوا' پھر فرمایا گیا اے ابوالقاسم کیا ملنے کے بعد جدائی ہوتی ہے' میں نے عرض کیا نہیں' اے صاحب جلال' چنانچہ مجھے ابھی قبر ہی میں رکھا گیا تھا کہ میں اپنے رب سے جاملا' عتبہ غلام نے خواب میں ایک خوبصورت حور دیکھی' حور نے ان سے کہا اے عتبہ میں تجھ پر

عاشق ہوں' اب کوئی ایسا کام نہ کرنا' جو میرے اور تیرے درمیان حائل ہو جائے' عتبہ نے کہا میں دنیا کو تین مغلظ طلاقیں دے چکا ہوں' اب رجعت کی کوئی صورت نہیں ہے' یہاں تک کہ تجھ سے ملاقات کروں روایت ہے کہ ایوب السختیانی کسی گناہ گار بندے کا جنازہ دیکھ کر گھر چلے گئے تاکہ ان کی نماز جنازہ نہ پڑھیں' رات کو کسی بزرگ نے اس شخص کو خواب میں دیکھا اور پوچھا اللہ نے میرے ساتھ کیا معاملہ فرمایا' اس نے کہا اللہ نے مجھ بخش دیا ہے' اور تم ایوب السختیانی کو یہ آیت سنا دینا :

قُل لَّوْ أَنتُمْ تَمْلِكُونَ خَزَائِنَ رَحْمَةِ رَبِّي إِذًا لَّأَمْسَكْتُمْ خَشْيَةَ الْإِنفَاقِ (پ ۱۵ ر ۱۲ آیت ۱۰۰)

آپ فرما دیجئے اگر تم لوگ میرے رب کی رحمت کے مختار ہوتے تو اس صورت میں تم خرچ کرنے کے اندیشے سے ضرور ہاتھ روک لیتے۔

ایک بزرگ کہتے ہیں کہ جس رات حضرت داؤد الطائی کی وفات ہوئی میں نے خواب میں دیکھا کہ آسمان پر ایک نور ہے' اور دنیا میں فرشتوں کی آمد و رفت جاری ہے' میں نے پوچھا یہ کون سی رات ہے؟ لوگوں نے کہا اس رات میں داؤد الطائی کا انتقال ہوا ہے' اور ان کی روح کے استقبال کے لئے جنت سجائی جارہی ہے' ابو سعید الشحام کہتے ہیں کہ میں نے سہل صعلوکی کو خواب میں دیکھا اور کہا اے شیخ! وہ کہنے لگے اب مجھے شیخ مت کہنا' میں نے کہا کیوں نہ کہوں' دنیا میں تمہارے حالات اسی قابل تھے کہ تمہیں شیخ کہا جائے' کہنے لگے وہ حالات ہمارے کچھ کام نہ آئے' میں نے کہا اللہ تعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیا معاملہ کیا ہے؟ فرمایا مجھے ان مسائل کی وجہ سے بخش دیا ہے جو فلاں بڑھیا مجھ سے دریافت کرتی تھی' ابن راشد کہتے ہیں کہ میں نے عبداللہ ابن المبارک کو وفات کے بعد خواب میں دیکھا اور دریافت کیا کیا آپ انتقال نہیں کر گئے تھے' انھوں نے فرمایا ہاں! میں نے پوچھا اللہ تعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے؟ فرمایا اللہ تعالیٰ نے میری ایسی مغفرت فرمائی جو تمام گناہوں کو محیط ہوگئی ہے' میں نے پوچھا سفیان ثوری کا کیا حال ہے' انھوں نے کہا ان کا کیا پوچھنا وہ تو ان لوگوں کے ساتھ ہیں "مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِم مِّنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ" ربیع ابن سلیمان کہتے ہیں میں نے امام شافعیؒ کو انتقال کے بعد خواب میں دیکھا اور دریافت کیا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے ساتھ کیا معاملہ کیا ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ اللہ نے مجھے سونے کی کرسی پر بٹھایا' اور مجھ پر تازہ موتی بکھیرے حسن بصریؒ کے کسی ساتھی نے انھیں ان کے انتقال کی رات خواب میں دیکھا کہ گویا ایک اعلان کرنے والا یہ اعلان کر رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم' نوح' آل ابراہیم' ور آل عمران کو تمام مخلوق پر فضیلت بخشی ہے' اور حسن بصریؒ کو اکے زمانے کے لوگوں پر فضیلت دی ہے' ابو یعقوب قاری دقیقی کہتے ہیں کہ' میں نے خواب میں ایک انتہائی طویل قامت شخص کو دیکھا لوگ اسکے پیچھے پیچھے چل رہے تھے' میں نے لوگوں سے پوچھا یہ کون صاحب ہیں؟ لوگوں نے کہا یہ اویس قرنی ہیں' میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا' اور عرض کیا کہ اللہ آپ پر رحم فرمائے مجھے کچھ نصیحت کیجئے' آپ نے بے اعتنائی فرمائی اور مجھ سے ترش روئی ظاہر کی' میں نے عرض کیا کہ میں آپ سے رہنمائی کا خواستگار ہوں' آپ میری رہنمائی فرمائیں اللہ آپ کی رہنمائی فرمائے گا' وہ میری طرف متوجہ ہوئے' اور فرمایا اپنے رب کی رحمت کو اسکی محبت کے وقت طلب کرو' اور اس کے انتقام سے اسکی معصیت کے وقت ڈرو' اور اس دوران اس سے امید کا سلسلہ منقطع مت کرو' پھر وہ مجھے چھوڑ کر آگے بڑھ گئے' ابوبکر ابن ابی مریم کہتے ہیں کہ میں نے ورقاء ابن بشرا الحضرمی کو خواب میں دیکھا اور پوچھا اے ورقاء تیرا انجام کیسا ہوا؟ اس نے جواب دیا کہ مجھے بڑی مشکل سے نجات حاصل ہوئی' میں نے کہا تمہیں کون سا عمل بہتر لگا' کہنے لگے اللہ کے خوف سے رونا' یزید ابن نعامہ کہتے ہیں کہ ایک لڑکی طاعون جارف کے زمانے میں مرگئی' رات کو اس کے باپ نے خواب میں دیکھا اور کہا اے بیٹی! مجھے آخرت کے متعلق کوئی خبر دے' اس نے کہا ابا جان! ہم ایک ایسے زبردست امر سے دوچار ہوئے ہیں جسے جانتے ہیں لیکن عمل نہیں کرتے اور تم عمل کرتے ہو لیکن جانتے نہیں ہو' اللہ کی قسم دنیا اور اسکی تمام تر نعمتوں سے بہتر میرے نزدیک یہ ہے کہ میرے نامۂ اعمال میں ایک یا دو بار کہا گیا کلمہ سبحان اللہ' اور ایک یا دو رکعت نماز ہو۔ عتبہ غلام کے ایک مرید کہتے ہیں کہ میں نے عتبہ کو خواب میں دیکھا اور دریافت کیا اللہ تعالیٰ نے تمہارے ساتھ کیا معاملہ کیا ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ میں ان کلمات دعا کے طفیل جنت میں داخل ہوا جو تیرے گھر

میں لکھے ہوئے ہیں' بیدار ہونے کے بعد میں گھر کے اندر گیا تو دیکھا کہ ایک دیوار پر عتبہ غلام نے اپنے قلم سے یہ کلمات لکھ چھوڑے ہیں :-

یَاهَادِیَ الْمُضِلِّیْنَ وَیَا رَاحِمَ الْمُذْنِبِیْنَ وَیَا مُقِیْلَ عَثَرَاتِ الْعَاثِرِیْنَ ارْحَمْ عَبْدَکَ ذَا الْخَطَرِ الْعَظِیْمِ وَالْمُسْلِمِیْنَ کُلَّهُمْ اَجْمَعِیْنَ وَاجْعَلْنَا مَعَ الْاَحْیَاءِ الْمَرْزُوْقِیْنَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ مِنَ النَّبِیِّیْنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِیْنَ اٰمِیْنَ یَارَبَّ الْعَالَمِیْنَ

اے گمراہوں کو راہ دکھلانے والے' اے خطاکاروں پر رحم کرنے والے' اے لغزش کرنے والوں کی لغزشیں دور کرنے والے' اپنے بندے پر رحم کر جو زبردست خطرے سے دوچار ہے' اور تمام مسلمانوں پر رحم کر' اور ہمیں ان زندہ لوگوں کے ساتھ کر جو رزق دیئے جاتے ہیں جن پر تو نے انعام کیا ہے' انبیاء' صدیقین شہداء اور صالحین میں سے اے تمام جہانوں کے پروردگار یہ دعا قبول فرما۔

موسیٰ ابن حماد کہتے ہیں میں نے خواب میں دیکھا کہ سفیان ثوری جنت میں ہیں' اور ایک درخت سے دوسرے درخت پر اڑ رہے ہیں' میں نے عرض کیا اے ابوعبداللہ آپ نے یہ مرتبہ کس عمل سے حاصل کیا' انھوں نے جواب دیا ورع سے' میں نے پوچھا علی ابن عاصم کا کیا حال ہے' فرمایا وہ تو ستارے کی طرح درخشاں ہیں' ایک تابعی نے خواب میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی' اور عرض کیا یا رسول اللہ مجھے نصیحت فرمایئے! فرمایا جو نقصان پر نظر نہیں رکھتا وہ نقصان اٹھاتا ہے' اور جو نقصان اٹھائے اس کے لئے موت بہتر ہے' امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ گزشتہ دنوں میں ایک ایسی مصیبت کا شکار تھا جس نے مجھے سخت پریشان کر رکھا تھا' اور اس کے باعث میں انتہائی تکلیف میں تھا' اور اس مصیبت پر اللہ کے سوا کسی کو اطلاع بھی نہیں تھی' گزشتہ رات ایک شخص میرے پاس آیا اور کہنے لگا اے محمد ابن ادریس! تو یوں کہا کر۔

اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ لَا اَمْلِکُ لِنَفْسِیْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا وَّ لَا مَوْتًا وَّلَا حَیٰوةً وَّلَا نُشُوْرًا وَّلَا اَسْتَطِیْعُ اَنْ اٰخُذَ اِلَّا مَا اَعْطَیْتَنِیْ وَلَا اَتَّقِیْ اِلَّا مَا وَقَیْتَنِیْ اَللّٰهُمَّ فَوَفِّقْنِیْ لِمَا تُحِبُّ وَتَرْضٰی مِنَ الْقَوْلِ وَالْعَمَلِ فِیْ عَافِیَةٍ

اے اللہ! میں اپنے لئے نہ کسی نفع کا مالک ہوں نہ نقصان کا' نہ موت کا' نہ حیات کا' نہ مرنے کے بعد زندہ ہونے کا' اور نہ میرے لئے ممکن ہے کہ وہ لوں جو تو مجھے نہ دے' اور اس چیز سے محفوظ رہوں جس سے تو محفوظ نہ رکھے' اے اللہ! مجھے اس قول و عمل کی توفیق عطا کر جسے تو اچھا جانتا ہے اور پسند کرتا ہے' عافیت کے ساتھ۔

صبح کو میں نے یہ دعا دوبارہ پڑھی' جب دوپہر ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے میرا مقصد پورا فرمایا' اور مجھے اس مصیبت سے نجات عطا کردی جس میں میں مبتلا تھا' لوگو! تم ان دعاؤں کا التزام کرنا' اور ان سے غفلت مت کرنا۔

یہ ہیں کچھ مکاشفات جن سے مردوں کے احوال کا پتا چلتا ہے' اور ان کا علم ہوتا ہے جو بندوں کو اللہ سے قریب کرنے والے ہیں۔

دوسرا باب

صور پھونکنے سے' جنت یا دوزخ میں جانے تک مردے کے حالات

اس سے پہلے باب میں تم سکرات موت میں میت کے احوال' اور خوف آخرت کے سلسلے میں اس کے خطرات کا بیان پڑھ چکے ہو' اور یہ جان چکے ہو کہ اگر مرنے والا ان لوگوں میں سے ہے جن پر اللہ تعالیٰ کا غضب نازل ہوگا تو اسے قبر کی تاریکی اور اسکے کیڑوں کا سامنا ہوگا' نکیرین اس سے سوال کریں گے' پھر قبر کا عذاب ہوگا' ان سے بھی زیادہ سخت مراحل عذاب وہ ہیں جو قبر کے بعد پیش آنے والے ہیں جیسے صور کا پھونکنا' قیامت کے دن دوبارہ زندہ ہونا' اللہ رب العزت کے سامنے پیش ہونا' کم و بیش کے

متعلق سوال ہونا' اعمال کی مقدار جاننے کے لئے میزان کھڑی ہونا' پھر پل صراط کو عبور کرنا جو نہایت باریک اور تیز دھار والا ہوگا' پھر سعادت یا شقاوت کے فیصلے کے لئے پیشی کا منتظر رہنا۔ تمہارے لئے ان خطرات و احوال کی معرفت حاصل کرنا اور تصدیق و جزم کے طریقے سے ان پر ایمان لانا' اور پھر ان میں طویل غور و فکر کرنا ضروری ہے تاکہ تمہارے قلب میں ان خطرات سے بچنے کے لئے تیاری کرنے کے دواعی پیدا ہوں' یوم آخرت پر ایمان اکثر لوگوں کے قلوب کی گہرائی میں داخل نہیں ہوتا اور اسکی دلیل یہ ہیکہ وہ سرد و گرم موسموں کے لئے جہنم کے سرد گرم حصوں سے بچنے کے مقابلے میں زیادہ تیاری کرتے ہیں' حالانکہ جہنم کا معاملہ زیادہ سخت اور شدید ہولناکیوں کا حامل ہے' جب ان سے یوم آخرت کے متعلق سوال کیا جاتا ہے تو وہ زبان سے اسکے وجود کا اعتراف کرتے ہیں' لیکن قلب سے غفلت برتتے ہیں' یہ تو ایسا ہے جیسے کوئی شخص کسی کو خبر دے کہ تیرے سامنے جو کھانا رکھا ہوا ہے' وہ زہر آلود ہے' اور وہ شخص یہ خبر سن کر اسکی تصدیق کرے' لیکن ہاتھ بڑھا کر کھانا بھی شروع کردے گویا اس نے زبان سے تصدیق کی ہے' اور عمل سے تکذیب کی ہے' حالانکہ عمل کے ذریعے کسی واقعے کی تکذیب کرنا زبان کے ذریعہ تکذیب کرنے سے زیادہ بلیغ ہے' سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے' ابن آدم نے مجھے گالی دی' اور اس کے لئے مناسب نہ تھا کہ مجھے گالی دیتا' اور میری تکذیب کی' اور اسکے لئے مناسب نہ تھا کہ میری تکذیب کرتا' اس کی گالی تو یہ ہے کہ وہ خدا کے لئے بیٹا تجویز کرتا ہے' اور تکذیب اس کا یہ کہنا ہے کہ مجھے دوبارہ اس طرح پیدا نہیں کریگا جیسے پہلے پیدا کیا ہے (بخاری۔ ابو ہریرہؓ) اصل میں لوگ اس طرح کے امور کی تصدیق اسلئے نہیں کرتے کہ انھیں کم سمجھتے ہیں' کیوں کہ جو واقعات عالم آخرت میں پیش آنے والے ہیں عالم فانی میں انکی نظریں کم ہیں' اگر لوگ حیوانات اور انسانوں کے بچے پیدا ہوتے ہوئے نہ دیکھتے اور ان سے کہا جاتا کہ ان بچوں کا ایک صانع ہے' جو انھیں ایک گندے قطرے سے پیدا کرتا ہے تو ان کا باطن کبھی اس سلسلۂ تخلیق کی تصدیق نہ کرتا' اسلئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

أَوَلَمْ يَرَ الْإِنسَانُ أَنَّا خَلَقْنَاهُ مِن نُّطْفَةٍ فَإِذَا هُوَ خَصِيمٌ مُّبِينٌ (پ ۲۳ ر ۴ آیت ۷۷)

کیا آدمی کو یہ معلوم نہیں کہ ہم نے اس کو نطفے سے پیدا کیا ہے سو وہ اعلانیہ اعتراض کرنے لگا۔

أَيَحْسَبُ الْإِنسَانُ أَن يُتْرَكَ سُدًى ۝ أَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّن مَّنِيٍّ يُمْنَىٰ ۝ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوَّىٰ ۝ فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْأُنثَىٰ (پ ۲۹ ر ۱۸ آیت ۳۶-۳۹)

کیا انسان یہ خیال کرتا ہیکہ یوں ہی مہمل چھوڑ دیا جائے گا کیا یہ شخص ایک قطرۂ منی نہ تھا جو (عورت کے رحم میں) ٹپکایا گیا تھا پھر وہ خون کا لوتھڑا ہو گیا پھر اللہ تعالیٰ نے (اس کو انسان) بنایا' پھر اعضاء درست کئے' پھر اسکی دو قسمیں کردیں' مرد اور عورت۔

جس طرح انسان کی تخلیق' اور اسکے اعضاء کی ترکیب و اختلاف میں بے شمار عجائبات مخفی ہیں ان سے کہیں زیادہ عجائب انسان کے دوبارہ پیدا ہونے میں ہیں' جو شخص اللہ کی قدرت و صفت کا مشاہدہ کرتا ہے وہ اسکی صنعت و حکمت کا کیسے انکار کرسکتا ہے' اگر تمہارے ایمان میں ضعف ہے تو پہلی پیدائش پر نظر کرکے اپنے ایمان کو پختہ کرلو' اسلئے کہ وہ دوسری پیدائش پہلی ہی کی نظیر ہے' بلکہ اس سے بھی زیادہ سہل ہے' اور اگر تمہارا ایمان پختہ ہے تو تمہیں اپنے دل کو ان خطروں اور اندیشوں سے واقف کرانا چاہئے جو عنقریب پیش آنے والے ہیں' اور ان میں سے زیادہ سے زیادہ فکر کرنا چاہئے اور عبرت حاصل کرنی چاہئے تاکہ تمہارے دل کا سکون و قرار جاتا رہے' او تم جبار سموات و ارض کے روبرو پیش ہونے کے لئے تیار ہوسکو۔

نفخ صور : سب سے پہلے اہل قبر جو آواز سنیں گے وہ نفخ صور کی آواز ہوگی' یہ ایک ایسی زبردست اور لرزہ خیز چیخ ہوگی کہ قبریں شق ہوجائیں گی' اور مردے اٹھ کھڑے ہوں گے' فرض کرو قیامت برپا ہوچکی ہے' صور پھونکا جاچکا ہے' اور تم قبر سے نکلے ہو' تمہارے چہرے کا رنگ متغیر ہے' تم سر سے پاؤں تک غبار آلود ہو۔ اور اس چیخ سے پریشان ہوجسے سن کر تم اپنی قبر سے اٹھ کھڑے

ہوئے تھے' اور اس سمت دیکھ رہے تھے جدھر سے یہ آواز آئی تھی' چاروں طرف مخلوق خدا اپنی اپنی قبر سے نکل کھڑی ہے' صدیوں سے لوگ قبروں میں گل سڑ رہے تھے' روحیں الگ بے چین تھیں' اور انتظار کی سختی جھیل رہی تھیں' اب یہ دوسری مصیبت سر پر آپڑی ہے' حیران پریشان کھڑے ہیں' سمجھ میں نہیں آتا کہ مرجائیں' انجام کا خوف الگ ہے' اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :۔

وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوَاتِ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ إِلَّا مَنْ شَاءَ اللّٰهُ ثُمَّ نُفِخَ فِيْهِ أُخْرٰى فَإِذَا هُمْ قِيَامٌ يَّنْظُرُوْنَ (پ ۲۴ ر ۴ آیت ۶۸)

اور صور میں پھونک ماری جائے گی' سو تمام آسمان اور زمین والوں کے ہوش اڑ جائیں گے' مگر جس کو خدا چاہے' پھر اس میں دوبارہ پھونک ماری جائے گی' تو دفعتاً سب کھڑے ہو جائیں گے۔

فَإِذَا نُقِرَ فِي النَّاقُوْرِ فَذٰلِكَ يَوْمَئِذٍ يَّوْمٌ عَسِيْرٌ عَلَى الْكَافِرِيْنَ غَيْرُ يَسِيْرٍ (پ ۲۹ ر ۱۵ آیت ۸-۱۰)

پھر جس وقت صور پھونکا جائے گا' سو وہ وقت یعنی وہ دن کافروں پر ایک سخت دن ہوگا جس میں ذرا آسانی نہ ہوگی۔

وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِيْنَ مَا يَنْظُرُوْنَ إِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً تَأْخُذُهُمْ وَهُمْ يَخِصِّمُوْنَ فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ تَوْصِيَةً وَّلَا إِلٰى أَهْلِهِمْ يَرْجِعُوْنَ وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَإِذَا هُمْ مِّنَ الْأَجْدَاثِ إِلٰى رَبِّهِمْ يَنْسِلُوْنَ قَالُوْا يَا وَيْلَنَا مَنْ بَعَثَنَا مِنْ مَّرْقَدِنَا هٰذَا مَا وَعَدَ الرَّحْمٰنُ وَصَدَقَ الْمُرْسَلُوْنَ (پ ۲۳ ر ۳ آیت ۴۸-۵۲)

اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ وعدہ کب ہوگا اگر تم سچے ہو' یہ لوگ بس ایک سخت آواز کے منتظر ہیں جو ان کو آپکڑے گی' اور وہ سب باہم لڑ جھگڑ رہے ہوں گے' اور صور پھونکا جائے گا' سو وہ سب یکایک قبروں سے اپنے رب کی طرف جلدی جلدی چلنے لگیں گے' کہیں گے کہ ہائے ہماری کم بختی ہم کو ہماری قبروں سے کس نے اٹھایا' یہ وہی ہے جس کا رحمان نے وعدہ کیا تھا' اور پیغمبر سچ کہتے تھے۔

اگر مردوں کو اس آواز کی شدت اور سختی کے علاوہ کسی اور طرح کی دہشت برداشت نہ کرنی پڑے تو بھی قیامت سے ڈرنا چاہئے' کیونکہ یہ ایک ایسی خوف ناک چیخ ہوگی جسے سن کر تمام لوگ مرجائیں گے' سوائے ان چند فرشتوں کے جنھیں اللہ زندہ رکھنا چاہے' اسی لئے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :۔

كَيْفَ أَنْعَمُ وَصَاحِبُ الصُّوْرِ قَدِ الْتَقَمَ الْقَرْنَ وَحَنَى الْجَبْهَةَ وَأَصْغٰى بِالْأُذُنِ يَنْتَظِرُ مَتٰى يُؤْمَرُ فَيَنْفُخُ (ترمذی۔ ابو سعیدؓ)

میں کیسے راحت پاؤں جب کہ صور پھونکنے والے نے نرسنگھا منہ میں رکھ لیا ہے' اور سر جھکا کر کان لگا دیئے ہیں اس انتظار میں کہ کب حکم دیا جاؤں اور صور پھونکوں۔

مقاتل کہتے ہیں کہ قرن سے نرسنگھا مراد ہے' اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ اسرافیل علیہ السلام نفیری کی شکل کے نرسنگھے پر منہ رکھے ہوئے ہیں' اور نرسنگھے کا دائرہ آسمان و زمین کی چوڑائی کے بقدر کشادہ ہے' اور وہ آسمان کی طرف نظر کئے ہوئے حکم الٰہی کے منتظر ہیں' جیسے ہی انھیں حکم ملے گا وہ صور پھونک دیں گے' جب پہلی مرتبہ صور پھونکیں گے تو اس کی دہشت سے تمام جاندار مخلوق مرجائے گی' صرف فرشتے باقی رہ جائیں گے' جبرئیل' میکائیل' اسرافیل اور ملک الموت' پھر اللہ تعالیٰ ملک الموت کو حکم دے گا کہ وہ جبرئیل کی روح قبض کریں' پھر میکائیل اور اسرافیل کی روح قبض کریں گے' پھر ملک الموت کو حکم ہوگا اور وہ خود بھی مرجائیں گے' پہلے نفخے کے بعد مخلوق چالیس سال تک برزخ میں اسی حالت پر رہے گی' اسکے بعد اللہ تعالیٰ اسرافیل علیہ السلام کو زندہ کرے گا' اور انھیں حکم ہوگا کہ وہ دوبارہ صور پھونکیں جیسا کہ قرآن کریم میں ہے :۔

ثُمَّ نُفِخَ فِيْهِ أُخْرٰى فَإِذَا هُمْ قِيَامٌ يَّنْظُرُوْنَ (پ ۲۴ ر ۴ آیت ۶۸)

پھر اس میں دوبارہ پھونک ماری جائے گی تو دفعتاً سب کے سب کھڑے ہو جائیں گے۔

یعنی وہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہو کر زندہ ہونا دیکھیں گے' سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں :۔ جب اللہ تعالیٰ نے مجھے مبعوث فرمایا تو اسرافیل علیہ السلام سے کہلا دیا انھوں نے صور اپنے منھ سے لگالیا' اور ایک قدم آگے اور دوسرا پیچھے رکھے منتظر ہیں کہ کب صور پھونکنے کا حکم ہو' اس لئے صور پھنکنے سے ڈرو۔ (۱) ذرا سوچو کہ مخلوق کے اسی ہجوم میں تم بھی موجود ہو گے تم دنیا میں جس قدر خوش حال' ذی اقتدار' اور باحیثیت ہو' اسی قدر وہاں ذلیل و خوار ہوں گے' آج جو لوگ دنیا کے بادشاہ ہیں وہ کل مخلوق میں سب سے زیادہ ذلیل اور حقیر ہوں گے' اور معمولی ذرہ سے زیادہ انکی کوئی حیثیت نہیں ہوگی' اس وقت جنگلوں اور پہاڑوں کے وحشی اپنی تمام وحشتوں کے باوجود لوگوں میں آملیں گے' حالانکہ ان سے کوئی خطا سرزد نہ ہوئی ہوگی' اسکے باوجود وہ صور کی خوفناک آواز سے گھبرا کر لوگوں کے ساتھ کھڑے ہوں گے' اور اس خوف کے باعث لوگوں کے درپے ہونے کا تصور بھی نہ کریں گے' اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :۔ وَاِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ (پ ۳۰ ر ۶ آیت ۵) اور جب وحشی جانور سب جمع ہو جائیں گے۔

پھر شیاطین سر جھکا کر آئیں گے جو پہلے انتہائی سرکش اور نافرمان تھے' وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہونے کے خوف سے لرزتے کانپتے کھڑے ہوں گے' اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :۔

فَوَرَبِّكَ لَنَحْشُرَنَّهُمْ وَالشَّيَاطِيْنَ ثُمَّ لَنُحْضِرَنَّهُمْ حَوْلَ جَهَنَّمَ جِثِيًّا (پ ۱۶ ر ۸ آیت ۶۸)

سو قسم ہے آپ کے رب کی ہم ان کو جمع کریں گے اور شیاطین کو بھی' پھر ان کو دوزخ کے گرداگرد اس حالت سے حاضر کریں گے کہ گھٹنوں کے بل گرے ہوں گے۔

میدان حشر اور اہل حشر: پھر یہ دیکھو کہ دوبارہ زندہ ہونے کے بعد انھیں کس طرح برہنہ پا برہنہ جسم اور غیر مختون میدان حشر کی طرف ہنکایا جائے گا' یہ ایک سفید' نرم اور چٹیل زمین ہوگی' جس میں حد نظر تک کوئی ٹیلہ بھی نہ ہوگا کہ آدمی اسکے پیچھے چھپ جائے' اور نہ کوئی گڑھا ہوگا کہ اس کے نیچے چھپا جائے' بلکہ وہ ایک مسطح زمین ہوگی جس میں کوئی نشیب و فراز نہ ہوگا' لوگ اسکی طرف گروہ در گروہ پہنچائے جائیں گے' پاک ہے وہ ذات جو اس میدان میں زمین کے چار جانب سے تمام مخلوق کو انکی مختلف اقسام و اصناف کے ساتھ جمع کرے گا' اس دن دلوں کے شایان شان یہ ہوگا کہ وہ خوف زدہ رہیں' اور آنکھوں کے شایان شان یہ ہوگا کہ ڈرتی رہیں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں :۔ قیامت کے روز لوگوں کا حشر ایک سفید خاکی زمین پر ہوگا جو صاف گردے کی طرح ہوگی جس میں کوئی عمارت نہ ہوگی کہ آدمی اس میں چھپ سکے' اور نہ کوئی ایسی آڑ ہوگی جو نظر کو واپس کردے' اور نہ تو یہ گمان کر کہ وہ زمین دنیا کی زمین طرح ہوگی' بلکہ وہاں کی زمین اور یہاں کی زمین صرف نام میں برابر ہوں گی' اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ (بخاری و مسلم۔ سہل ابن سعدؓ)

يَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَيْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ (پ ۱۳ ر ۱۹ آیت ۴۸)

جس روز دوسری زمین بدل جائے گی' اس زمین کے علاوہ اور آسمان بھی۔

حضرت عبد اللہ ابن عباسؓ کی رائے یہ ہیکہ اسی زمین کے اندر کچھ کمی یا زیادتی کی جائے گی' اور اسکے درخت' پہاڑ' اور جنگل ختم کردیئے جائیں اور وہ عکاظ کے چمڑے کی طرح پھیلادی جائے گی' زمین سفید چاندی کی طرح ہوگی نہ اس پر کوئی خون بہایا گیا ہوگا اور نہ اس میں کوئی گناہ کیا گیا ہوگا' اور آسمان کا سورج' چاند اور ستارے فنا ہو جائیں گے' اس لئے اے مسکین! تو اس دن کی دہشت اور شدت میں غور کر' جب مخلوق اس میدان میں کھڑی ہوگی' اور اسکے سروں کے اوپر سے ستارے چاند اور سورج بکھر جائیں گے' زمین اپنے چراغ کے گل ہونے کے باعث تاریک ہو جائے گی' ابھی تو اسی حال میں ہوگا کہ اچانک آسمان گھومے گا' اور اپنی غلظت اور سختی کے باوجود پھٹ کر گر جائے گا' انکی یہ غلظت پانچ سو برس کی مسافت کے برابر ہوگی' فرشتے ان کے کناروں پر کھڑے ہوئے ہوں گے آسمانوں کے پھٹنے سے تیرے کانوں میں زبردست گونج پیدا ہوگی' اور آسمان پگھلی ہوئی چاندی کی طرح جس

(۱) مجھے یہ روایت اس طرح نہیں ملی' بلکہ بخاری نے اپنی تاریخ میں ابو ہریرہؓ سے مختلف الفاظ میں نقل کی ہے

میں زردی کی آمیزش ہوگی بہنے لگیں گے' پھر وہ سرخ چمڑے اور گلے ہوئے تانبے کی طرح ہوجائیں گے' پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح اڑیں گے' اور آدمی بکھرے ہوئے پتنگوں کی طرح ہوں گے' اور وہ ننگے پاؤں' اور ننگے بدن پھرتے نظر آئیں گے' سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ لوگ برہنہ پا برہنہ جسم' بلا ختنہ اٹھائے جائیں گے' اور پسینہ انکے منھ اور کانوں کی لوتک لگام کی طرح پہنچ جائے گا' ام المومنین حضرت سودہ جو اس حدیث کی راویہ ہیں فرماتی ہیں کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! بڑی خرابی کی بات ہوگی ہم ایک دوسرے کو ننگا دیکھیں گے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اس دن لوگوں کو اسکی فرصت نہ ہوگی' بلکہ وہ دوسری ہی فکروں میں ہوں گے (بخاری و مسلم۔ عائشہؓ)

لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَأْنٌ يُغْنِيهِ (پ ۳۰ ر ۵ آیت ۳۷)

ان میں ہر شخص کو ایسا مشغلہ ہوگا جو اس کو اور طرف متوجہ نہ ہونے دے گا۔

وہ دن کتنا سخت ہوگا کہ لوگ ننگے ہوں گے' لیکن ایک دوسرے سے محفوظ ہوں گے' اور ایسا کیوں نہ ہو کہ بعض لوگ پیٹ کے بل' اور بعض لوگ سر کے بل چلیں گے' اس صورت میں انھیں یہ قدرت ہی کہاں ہوگی کہ وہ ایک دوسرے کی طرف التفات کرسکیں' حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن لوگوں کا حشر تین حالتوں پر ہوگا سوار' پیدل' اور سر کے بل چلنے والے' ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ! سر کے بل کس طرح چلیں گے؟ فرمایا جو ذات لوگوں کو ان کے پیروں پر چلاتی ہے وہ انھیں سر کے بل بھی چلانے پر قادر ہے (ترمذی) اصل میں آدمی طبعی طور پر ان امور سے انکار کرتا ہے جن سے مانوس نہیں ہوتا چنانچہ جو شخص سانپ کو پیٹ کے بل تیزی کے ساتھ چلتا ہوا نہیں دیکھتا وہ یہی سمجھتا ہے' کہ آدمی پاؤں کے بغیر نہیں چل سکتا' ایسے ہی اگر کوئی شخص پیروں پر چلتا ہوا نہ دیکھے وہ پیروں پر چلنے کا انکار کرے گا' اس لئے تم قیامت کے ان عجائبات کا انکار مت کرو' جو تمہارے دنیاوی قیاسات کے خلاف ہوں' تم تو دنیا کے ان عجائبات کا بھی انکار کر بیٹھو گے جو پہلے سے تمہارے مشاہدے میں نہ ہوں اور دفعتہً سامنے آجائیں' قیامت کے حیرتناک واقعات کو بھی اسی پر قیاس کرنا چاہیے' اب تم اپنے دل میں اپنی صورت کا استحضار کرو' اور چشم تصور سے دیکھو کہ تم میدان حشر میں ننگے بدن' ذلیل و خوار' حیران اور پریشان کھڑے ہوئے ہو' اور سعادت و شقاوت کے فیصلوں کے منتظر ہو' یہ حالت یقیناً سخت ہوگی' تمہیں اس سختی سے بچنے کے لئے ابھی سے کوشش کرنی چاہیے۔

میدان حشر میں آنے والا پسینہ: پھر مخلوق کے اژدہام اور اجتماع میں غور کرو' حشر کے دن جو جگہ کھڑے ہونے کے لئے مقرر کی جائے گی' وہاں ساتوں آسمانوں اور ساتوں زمینوں کے رہنے والے جمع ہوں گے' ان میں فرشتے' جن انسان' شیطان' وحشی' درندے اور پرندے سب ہوں گے' اور ان کے سروں پر سورج چمکے گا جس کی حرارت کئی گنا بڑھ چکی ہوگی' اور جو حالت اسکی پہلے تھی وہ بدل چکی ہوگی' پھر وہ لوگوں کے سروں سے اس قدر قریب ہوجائے گا کہ صرف دو کمانوں کے درمیان کا فاصلہ برقرار رہ جائے گا' زمین پر عرش رب العالمین کے سائے کے علاوہ کوئی سایہ باقی نہ رہے گا' اور اسکے سائے سے صرف وہ لوگ فائدہ اٹھا سکیں گے جو اللہ کے مقرب بندے ہوں گے' چنانچہ ان میں بہت سے لوگ ایسے ہوں گے جن کے بدن سورج کی گرمی' حرارت اور تپش سے جھلس رہے ہوں گے' اور ناقابل بیان درد و اذیت میں مبتلا ہوں گے' اس پر مستزاد یہ کہ تمام حاضرین ایک دوسرے کو دیکھ کر آگے بڑھنے کے لئے کوشاں ہوں گے' عجیب نفسا نفسی کا عالم ہوگا' دوسری طرف جبار سموات کے حضور پیش ہونے کی صورت میں متوقع رسوائی' اور ذلت کے تصور سے شرمندگی اور خوف سے عجیب حالت ہوگی گویا اس جگہ سورج کی حرارت' سانسوں کی شدت' حیا اور خوف کی آگ تینوں چیزیں بیک بوقت جمع ہوجائیں گی اور ہر بن مو سے پسینہ نکل کر قیامت کے میدان میں بہنے لگے گا' پھر وہ پسینہ ان جسموں تک اس قدر بلند ہوگا جس قدر اللہ کے نزدیک انکا مرتبہ ہوگا بعض لوگوں کے صرف گھٹنوں تک' اور بعض لوگوں کی کوکھ تک' اور بعض کے کانوں کی لوتک پسینہ ہوگا' اور بعض لوگوں کا پسینہ اس قدر ہوگا کہ وہ اس میں ڈوبتے ہوئے نظر آئیں گے'

حضرت عبداللہ ابن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے روز لوگ ربّ العالمین کے سامنے کھڑے ہوں گے' اور ان میں سے بعض اس قدر عرق آلود ہوں گے کہ نصف کان تک ڈوب جائیں گے (بخاری و مسلم) حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ لوگوں کو قیامت کے روز اس قدر پسینہ آئے گا کہ زمین میں ان کا پسینہ ستر باع (ایک سو چالیس گز) تک پھیل جائے گا اور ان کے منہ تک بصورت لگام اور ان کے کانوں تک پہنچ جائے گا (بخاری و مسلم) ایک حدیث میں ہیکہ لوگ چالیس برس تک آسمان کو مسلسل دیکھتے ہوئے کھڑے رہیں گے' اور تکلیف کی شدّت کے باعث ان کا پسینہ نکل کر لگام بن جائے گا (ابن عدی۔ ابن مسعودؓ)۔ عقبہ ابن عامر کہتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے روز سورج زمین سے قریب ہو جائے گا' اور لوگوں کو پسینہ آئے گا' بعض لوگوں کے ٹخنوں تک پسینہ ہو گا' بعض کے رانوں تک' بعض کے کوکھ تک' اور بعض کے منہ تک (آپ نے ہاتھ سے اشارہ بھی فرمایا) اور منہ پر لگام لگا دے گا اور بعض ایسے ہوں گے جو پسینے میں غرق ہو جائیں گے (یہ فرماتے ہوئے آپ نے اپنے سر مبارک پر ہاتھ پھیرا) (احمد)۔

اے بندۂ مسکین! اہل محشر کے پسینے اور انکے شدّت کرب پر اس طرح غور کر' اس وقت بعض لوگ چیخ چیخ کر کہیں گے کہ پروردگار عالم ہمیں اس کرب اور انتظار سے راحت دے' خواہ دوزخ میں ڈال کر دے' اور یہ وہ مصائب اور تکالیف ہوں گی جن کا کوئی تعلق حساب و عذاب سے نہیں ہو گا۔ تو بھی انہیں لوگوں میں سے ایک ہو گا' تو نہیں جانتا کہ پسینہ تیرے جسم کے کس حصے تک پہنچے گا' یہ بھی یاد رکھ کہ اگر تو نے حج' اور روزے نماز یعنی راہ خدا میں پسینہ نہیں بہایا' یا مسلمان کی ضرورت پوری کرنے میں تعب برداشت نہیں کیا' یا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے سلسلے میں مشقت نہیں اٹھائی تو تو قیامت کے میدان میں خوف اور حیاء کے باعث پسینہ ضرور بہائے گا' اور اس میں تیرے لئے اذیت زیادہ ہو گی' جو شخص جہل و غرور سے پاک ہوتا ہے وہ جانتا ہے کہ طاعات کی تختی اور شدت برداشت کرنا قیامت کے دن انتظار کی سختی' اور پسینے کا کرب برداشت کرنے سے زیادہ آسان' اور زمانے کے اعتبار سے نہایت کم ہے' یہ ایک سخت ترین دن ہو گا جو ایک طویل مدّت کو محیط ہو گا۔

طول یوم قیامت : وہ دن جس میں لوگ نگاہ جمائے کھڑے ہوں گے' ان کے دل ٹکڑے ٹکڑے ہوں گے نہ ان سے کوئی بات کرتا ہو گا' نہ ان کے معاملے پر توجہ دیتا ہو گا' نہ کچھ نہ کھائیں گے' نہ پئیں گے' اور نہ باد نسیم کے پُرکیف جھونکوں کا لطف لیں گے' یہ دن قیامت کا دن ہو گا' حضرت کعب و قتادہ نے يَوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعَالَمِيْنَ کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ یہ لوگ اس حالت پر تین سو ساٹھ سال تک کھڑے رہیں گے' بلکہ حضرت عبداللہ ابن عمر فرماتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ اس وقت تمہارا کیا حال ہو گا جب اللہ تعالیٰ تمہیں اس طرح جمع کرے گا جیسے ترکش میں تیر بھرے جاتے ہیں' اللہ تعالیٰ پچاس ہزار برس تک تمہاری طرف نظر نہ فرمائے گا' حضرت حسن بصری فرماتے ہیں کہ تم اس دن کے متعلق کیا سوچتے ہو جس میں لوگ اپنے پیروں پر پچاس ہزار برس تک کھڑے رہیں گے' نہ اس دوران کچھ کھائیں گے نہ پئیں گے' یہاں تک کہ پیاس کی شدّت سے ان کی گردنیں تن جائیں گی' اور بھوک کی سختی سے پیٹ جل جائیں گے' پھر انھیں دوزخ کے چشمے سے پانی پلایا جائے گا' جو نہایت گرم' تلخ اور بدذائقہ ہو گا' جب اس دن کی سختیاں ان کی طاقت و ہمت سے تجاوز کر جائیں گے تو وہ آپس میں کہیں گے آؤ اس ذات گرامی کو تلاش کریں جو اللہ کے نزدیک مکرّم و معزز ہے' تاکہ وہ انکے حق میں سفارش کر سکے' وہ لوگ تمام انبیاء کے پاس جائیں گے لیکن ہر جگہ سے انھیں دھتکارا جائے گا' ہر پیغمبر کہے گا کہ مجھے چھوڑو میں خود اپنے معاملات میں مشغول ہوں' اس مشغولیت کے باعث مجھے دوسرے کے معاملات کی فرصت نہیں ہے' ہر نبی اللہ تعالیٰ کے غضب کی شدّت کا حوالہ دے کر معذرت کرے گا اور کہے گا کہ آج ہمارا رب اس قدر غصے میں ہے کہ اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا' او نہ اسکے بعد کبھی ہو گا' یہاں تک کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ان لوگوں کے حق میں شفاعت فرمائیں گے جن کے حق میں شفاعت کرنے کی اجازت ہو گی' ارشاد باری ہے لَا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَرَضِيَ لَهُ قَوْلًا (پ ۱۶ ر ۱۵ آیت ۱۰۹)

سفارش نفع نہ دے گی مگر ایسے شخص کو جس کے واسطے رحمٰن نے اجازت دیدی ہو' اور اس شخص کے

واسطے بولنا پسند کیا ہو۔

اب اس دن کے طول' اور انتظار کی شدّت کا تصور کرو' یہاں تک کہ تمہارے لئے اس مختصر زندگی میں معاصی پر صبر کرنا آسان ہو' یاد رکھو جو شخص موت کا زیادہ انتظار کرتا ہے' اور شہوات پر صبر کرتا ہے وہ قیامت کے دن کم سے کم انتظار کرے گا کم سے کم سختی برداشت کرے گا' رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے قیامت کے دن کی لمبائی کے متعلق دریافت کیا گیا' آپ نے فرمایا اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے کہ وہ دن مومن پر اس فرض نماز سے بھی ہلکا ہو گا جو وہ دنیا میں پڑھتا ہے۔ (ابو یعلی' بیہقی۔ ابو سعید الخدری)۔ کوشش کرو کہ تم ایسے ہی مومنین میں سے ہو' جب تک زندگی کی سانس باقی ہیں معاملہ تمہارے اختیار میں ہے' اور تیاری تمہارے ہاتھ میں ہے' اسلئے تم مختصر دنوں میں لمبے دنوں کے لئے عمل کرو' اس میں تمہیں ایسا فائدہ حاصل ہو گا جس کی کوئی انتہا نہیں ہے اور اپنی عمر کو حقیر جانو' بلکہ دنیا کی عمر کو حقیر سمجھو' دنیا کی عمر سات ہزار سال ہے' اگر تم نے سات ہزار سال تک صبر کرلیا تو تمہیں ایک ایسے دن سے نجات مل جائے گی جس کی مقدار پچاس ہزار برس ہے' اس صورت میں تمہارا نفع زیادہ اور محنت کم ہو گی۔

قیامت' اس کے مصائب اور اسماء : اے بندۂ مسکین! اس یوم عظیم کے لئے تیاری کر' اسکی شان عظیم' اسکی مدّت طویل' اسکا بادشاہ زبردست' اسکا زمانہ قریب ہے' تو اس دن دیکھے گا کہ آسمان پھٹ جائے گا' ستارے اس کی دہشت سے بکھر جائیں گے' ستاروں کا نور ماند پڑ جائے گا' آفتاب کی دھوپ تہہ ہو جائے گی' پہاڑ چلائے جائیں گے' گابھن اونٹنیاں چھٹی پھریں گی' وحشی درندے اکٹھے کئے جائیں گے' دریا ابلیں گے' اور نفوس جسموں سے مل جائیں گے' دوزخ دہکائی جائے گی' جنت قریب لائی جائے گی' پہاڑ اڑیں گے زمین پھیلے گی' اس میں زلزلہ آئے گا' اور اپنے خزانے باہر نکال ڈالے گی' یہ تمام واقعات اس دن ظہور پذیر ہوں گے' جب آدمی طرح طرح کے ہو جائیں گے تاکہ اپنے اعمال کا مشاہدہ کریں' اس دن زمین اور پہاڑ اٹھائے جائیں گے' اور انھیں ایک پٹخی دی جائے گی' واقع ہونے والی چیز واقع ہو گی' آسمان پھٹ جائے گا' وہ اس دن کمزور اور سست پڑ جائے گا' فرشتے اس کے چاروں طرف ہوں گے' اور تیرے رب کا عرش آٹھ فرشتے اٹھائیں گے اس دن تم سب پیش کئے جاؤ گے اور کوئی چھپنے والی چیز تم سے چھپی نہ رہے گی' جب پہاڑ چلیں گے' اور تو زمین کو کھلی ہوئی دیکھے گا' اس روز زمین تھرائے گی' پہاڑ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر جائیں گے' اس دن لوگ پتنگوں کے طرح بکھریں گے' اور پہاڑ دھنی ہوئی روئی کی طرح اڑیں گے' اس دن دودھ پلانے والی عورتیں اپنے بچوں کو فراموش کردیں گی' اور حاملہ عورتیں بچہ جن دیں گی' تو لوگوں کو نشے میں دیکھے گا حالانکہ وہ نشے میں نہیں ہوں گے' بلکہ اللہ تعالیٰ کا عذاب نہایت شدید ہو گا' جب زمین دوسری زمین بن جائے گی اور آسمان دوسرا آسمان بن جائے گا' اور لوگ اللہ تعالیٰ کے سامنے نکلیں گے' اس دن پہاڑ اڑا' دئے جائیں گے' اور زمین چٹیل میدان کردی جائے گی' جس میں نہ کوئی موڑ ہو گا' اور نہ ٹیلا ہو گا' اس دن تم ان پہاڑوں کو بادلوں کی مانند اڑتا ہوا دیکھو گے جنھیں آج جامد خیال کرتے ہو' اس دن آسمان پھٹ پڑے گا' اور پھٹ کر لال چمڑے کی طرح ہو جائے گا' اس دن نہ کسی انسان سے اسکے گناہ کے متعلق باز پُرس کی جائے گی' اور نہ کسی جن سے' اس دن گناہ گار کو کلام سے منع کردیا جائیگا' اور نہ ان سے جرموں کے متعلق پوچھا جائیگا بلکہ وہ لوگ پیشانی کے بالوں اور پاؤں کے ذریعے پکڑے جائیں گے' اس دن ہر شخص اپنے ہر اچھے اور برے عمل کو اپنے سامنے حاضر پائے گا' اور یہ تمنا کرے گا کہ کاش اس دن کے' اور اسکے درمیان ایک طویل وقفہ حائل ہو جائے' اس دن ہر نفس کو معلوم ہو گا کہ وہ کیا لے کر آیا ہے' اور دیکھے گا کہ اس نے کیا آگے بھیجا ہے' اور کیا پیچھے چھوڑا ہے' اس دن زبانیں گنگ ہو جائیں گی' اور اعضاء کلام کریں گے۔ یہ وہ دن ہو گا جس کے ذکر نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو بوڑھا کردیا تھا' روایت ہیکہ حضرت ابوبکر الصدیق نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میں دیکھتا ہوں کہ آپ بوڑھے ہو گئے ہیں؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ مجھے سورۂ ہود اور اسکی بہنوں۔ سورۂ واقعہ' مرسلات' عم۔ تساءلون' اذا الشمس کوّرت۔۔۔۔ نے بوڑھا کردیا ہے (ترمذی' حاکم)۔

اے کم فہم قاریٔ قرآن! تجھے قرآن کریم سے صرف اس قدر واسطہ ہیکہ تو اسکے الفاظ سے زبان کو حرکت دے لیتا ہے' اگر تو

ان الفاظ میں فکر بھی کرتا تو تجھے اس چیز کا تلخ ذائقہ ملتا جس نے سید المرسلین کو بوڑھا کردیا تھا' اور کیوں کہ تو نے محض زبان کی حرکت پر قناعت کرلی ہے اسلئے اسکے ثمرات سے محروم ہے' قرآن کریم میں اللہ نے جن امور کا ذکر کیا ہے ان میں سے ایک قیامت ہے' اللہ تعالیٰ نے اسکی بعض حقیقتیں بیان فرمائی ہیں' اور اسکے بہت سے نام ذکر فرمائے ہیں' تاکہ تو ناموں کی کثرت سے معانی کی کثرت پر مطلع ہوجائے اس لئے کہ ناموں کی کثرت سے ان کا تکرار اور اعادہ مقصود نہیں ہے' بلکہ عقلمندوں کو تنبیہہ کرنا مقصود ہے۔ قیامت کے ہرنام میں ایک راز پنہا ہے' اور اسکے ہر لقب میں ایک صفت مخفی ہے' اسلئے معانی کی معرفت پر حرص کرو' اب تمہاری سہولت کے لئے قیامت کے تمام نام یہاں لکھتے ہیں۔

یوم قیامت' یوم حسرت' یوم ندامت' یوم محاسبہ' یوم مسابقت' یوم مناقشہ (جدال)' یوم منافست' یوم زلزلہ' اولٹنے کا دن' بجلی کڑکنے کا دن' واقع ہونے کا دن' کھٹکھٹانے کا دن' شور و غل کا دن' ہلانے کا دن' یوم رادفہ' ڈھانپنے والا دن' یوم مصیبت' یوم آزفہ' یوم حاقہ' ہنگامے کا دن' یوم ملاقات' یوم فراق' ہنکائے جانے کا دن' یوم قصاص' یوم مناد' یوم حساب' واپسی کا دن' یوم عذاب' یوم فرار' یوم قرار' یوم لقاء' یوم بقاء' یوم قضاء' یوم جزاء' یوم بلاء' یوم بکاء' یوم حشر' یوم وعید' پیشی کا دن' تولے جانے کا دن' یوم حق' یوم حکم' یوم افتراق' یوم اجتماع' یوم بعث' یوم فتح' یوم ذلت' یوم عظیم' بانجھ ہوجانے کا دن' مشکلات کا دن' بدلے کا دن' یوم یقین' یوم نشور' یوم مصیر' یوم نفخہ' یوم صیحہ' یوم رجفہ' یوم رجہ' یوم زجرہ' یوم سکرہ' یوم فزع' یوم جزع' یوم منتہی' یوم ماوی' یوم میقات' یوم میعاد' یوم مرصاد' یوم قلق' یوم عرق' یوم افتقار' یوم انکدار' یوم انتشار' یوم انشقاق' یوم وقوف' یوم خروج' یوم خلود' یوم تغابن' یوم عبوس' یوم معلوم' یوم موعود' یوم مشہود' وہ دن جس میں کوئی شک نہیں' وہ دن جسمیں دل کے رازوں کا امتحان ہوگا' وہ دن جس میں کوئی نفس دوسرے نفس کے کام نہ آئے گا' جس دن آنکھیں اوپر کی طرف دیکھیں گی' وہ دن جس میں کوئی رفیق دوسرے رفیق کے کام نہ آئے گا' وہ دن جس میں لوگوں کو جہنم کی طرف دھکیلا جائے گا' جس دن آگ میں منہ کے بل کھینچے جائیں گے' جس دن باپ اپنے بیٹے کے کام نہ آئے گا' جس دن آدمی اپنے بھائی سے' ماں اور باپ سے بھاگے گا' جس دن لوگ کلام نہ کرسکیں گے' اور نہ انھیں معذرت کرنے کی اجازت ہوگی' جس دن لوگوں کو اللہ کے عذاب سے کوئی بچانے والا نہ ہوگا' جس دن لوگ ظاہر ہوں گے' جس دن لوگوں کو اللہ کا عذاب دیا جائے گا' جس دن نہ مال کام آئے گا اور نہ اولاد کام آئے گی' جس دن ظلم کرنے والوں کو ان کی معذرت نفع نہ دے گی' اور اسکے لئے لعنت اور برا ٹھکانہ ہوگا' جس دن معذرتیں رد کردی جائیں گی' رازوں کا امتحان ہوگا' دل کی باتیں ظاہر ہوجائیں گی' پردے کھل جائیں گے' وہ دن جس میں آنکھیں جھکی ہوں گی' آوازیں خاموش ہوں گی' التفات کم ہوگا' مخفی باتیں ظاہر ہوں گی' خطائیں نمایاں ہوں گی' وہ دن جس میں بندوں کو ہنکایا جائے گا' اور ان کے ساتھ گواہ ہوں گے بچے بوڑھے ہو جائیں گے اور بڑوں کو نشہ ہو جائے گا۔ اس دن ترازوئیں قائم ہوں گی' رجسٹر کھلیں گے' دوزخ ظاہر کی جائے گی' پانی کھولایا جائے گا' آگ دہکائی جائے گی' کفار مایوس ہوں گے' دوزخ بھڑکائی جائے گی' رنگ بدلیں گے' زبانیں گونگی ہوں گی' انسان کے اعضاء گویا ہوں گے' اے انسان تجھے اپنے رب کریم سے کس چیز نے مغالطے میں ڈالا ہے' تو نے دروازے بند کرلئے ہیں' پردے چھوڑدئے ہیں' اور مخلوق سے چھپ کر گناہوں کا ارتکاب کیا ہے' اس دن کیا کرے گا جب تیرے اعضاء گواہی دیں گے' نہایت خرابی ہے ہم سب مبتلائے غفلت لوگوں کی' اللہ نے ہمارے پاس انبیاء کے سردار مبعوث کئے ہیں اور ہم پر کتاب مبین نازل فرمائی ہے' اور آپ نے ہمیں اس دن کی تمام صفات سے آگاہ فرمادیا ہے' اور ہماری غفلت بھی واضح فرمادی ہے' ارشاد فرمایا:۔

اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِي غَفْلَةٍ مُّعْرِضُونَ مَا يَأْتِيهِم مِّن ذِكْرٍ مِّن رَّبِّهِم مُّحْدَثٍ إِلَّا اسْتَمَعُوهُ وَهُمْ يَلْعَبُونَ لَاهِيَةً قُلُوبُهُمْ (پ ۱۷ ر ۱ آیت ۱-۲)

ان لوگوں سے ان کا (وقت) حساب نزدیک آپہنچا' اور یہ غفلت ہی میں پڑے ہیں' اور اعراض کئے ہوئے

ہیں' انکے پاس ان کے رب کی طرف سے جو نصیحت تازہ آتی ہے' یہ اس کو ایسے طور سے سنتے ہیں کہ (اس کے ساتھ) ہنسی کرتے ہیں۔

اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ (پ ۲۷ ر ۸ آیت ۱)

قیامت نزدیک آپہنچی' اور چاند شق ہو گیا۔

اِنَّهُمْ يَرَوْنَهُ بَعِيْدًا وَّنَرَاهُ قَرِيْبًا (پ ۲۹ ر ۷ آیت ۶-۷)

یہ لوگ اس دن کو بعید دیکھ رہے ہیں اور ہم اس کو قریب دیکھ رہے ہیں۔

وَمَا يُدْرِيْكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ تَكُوْنُ قَرِيْبًا (پ ۲۲ ر ۵ آیت ۶۳)

اور آپ کو اسکی کیا خبر عجب نہیں کہ قیامت قریب ہی واقع ہو جائے۔

ہمارا بہترین حال یہ ہوتا ہیکہ ہم قرآن کی تلاوت اور اسکے مطالعے کو عمل بناتے' لیکن افسوس نہ ہم اسکے معانی میں غور کرتے ہیں' نہ اس دن کے بے شمار اوصاف اور اسماء میں فکر کرتے ہیں' اور نہ اسکے مصائب سے بچنے کی تیاری کرتے ہیں' ہم اس غفلت سے اللہ کی پناہ چاہتے ہیں' اگر وہ اپنی وسیع رحمت سے اس کا تدارک نہ فرمائے۔

سوال کی کیفیت : اے بندۂ مسکین! ان احوال کے بعد تو اس سوال میں غور کر جو براہ راست تجھ سے کیا جائے گا' تھوڑے اور بہت' ذرہ اور تنکے ہر چیز کے متعلق پوچھا جائے گا' قیامت کے دن ابھی جب کہ تو اس دن کی سختی' اذیت' اور پسینے' کی تکلیف میں مبتلا ہو گا' آسمانوں کے چار جانب سے فرشتے اتریں گے' ان کے جسم نہایت ضخیم و عریض اور تندرست و توانا ہوں گے وہ مزاج کے اعتبار سے سخت گیر اور تند خو ہوں گے' انہیں حکم دیا جائے گا کہ وہ مجرمین کے پیشانی کے بال پکڑلیں اور جبار ارض و سماء کے حضور لے چلیں' سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے پاس ایسے فرشتے ہیں کہ ان کی دونوں پلکوں کی مسافت سو برس کی ہے' اس وقت تو اپنے نفس کے متعلق کیا گمان رکھتا ہے جب ان فرشتوں کو دیکھے گا جو تجھے پیشی کی جگہ لے جانے کے لئے پکڑیں گی تو خود ان کا حال بھی بھاری بھر کم جسامت کے باوجود بندوں پر نازل غضب الہی کے باعث دگرگوں ہو گا جب وہ زمین پر اتریں گے تو تمام انبیاء کرام' صدیقین' اور صلحاء اس خوف سے سجدے میں گر جائیں گے کہ کہیں فرشتے انہیں پکڑ کر نہ لے جائیں' جب مقربین کا حال یہ ہو گا تو گناہ گار مجرمین کی حالت کیا ہو گی' اس وقت بعض لوگ خوف کی شدت کے باعث ان ملائکہ سے پوچھیں گے کہ کیا تم ہی میں ہمارا پروردگار ہے' یہ سوال ان فرشتوں کے انتہائی رعب اور دبدبے کی وجہ سے ہو گا' فرشتے اس سوال سے ڈر جائیں گے' اور کہیں گے کہ ہمارا رب اس سے کہیں بلند ہے کہ وہ ہم میں سے ہو' وہ اہل زمین کے اس تو ہم سے اللہ رب العزت کی پاکی بیان کریں گے' اور بآواز بلند کہیں گے کہ ہمارا پروردگار اس سے پاک ہے کہ وہ ہم میں ہو' تاہم وہ بعد میں آنے والا ہے' اس وقت فرشتے مخلوق کو چاروں طرف سے گھیر کر صف بستہ کھڑے ہو جائیں گے' ان سب پر قیامت کی شدت سے ذلت' خضوع' خوف' اور رعب کی علامتیں ہوں گی' اس وقت اللہ تعالیٰ کے اس قول کی تصدیق ہو گی :۔

فَلَنَسْئَلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَلَنَسْئَلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ ۚ فَلَنَقُصَّنَّ عَلَيْهِمْ بِعِلْمٍ وَّمَا كُنَّا غَآئِبِيْنَ (پ ۸ ر ۸ آیت ۶-۷)

پھر ہم ان لوگوں سے ضرور پوچھیں گے جن کے پاس پیغمبر بھیجے گئے تھے' اور ہم پیغمبروں سے ضرور پوچھیں گے' پھر ہم چونکہ پوری خبر رکھتے ہیں اسلئے ان کے روبرو بیان کردینگے اور ہم کچھ بے خبر نہ تھے۔

فَوَرَبِّكَ لَنَسْئَلَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (پ ۱۴ ر ۶ آیت ۹۳)

سو آپ کے پروردگار کی قسم ہم ان سب سے ان کے اعمال کی ضرور باز پرس کریں گے۔

سب سے پہلے انبیاء علیہم السلام سے سوال کیا جائے گا :۔

يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ مَاذَا أُجِبْتُمْ قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَا إِنَّكَ أَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ
(پ ۷ ر ۵ آیت ۱۰۹)

جس روز اللہ تعالیٰ پیغمبروں کو جمع کریں گے پھر ارشاد فرمائیں گے کہ تم کو کیا جواب ملا تھا' وہ عرض کریں گے کہ ہم کو کچھ خبر نہیں' بلاشبہ تو غیبوں کا جاننے والا ہے۔

اس دن کی سختی اور شدت کا کیا کہنا جس میں انبیاء کی عقلیں جاتی رہیں گی' اور ان کے علوم فنا ہو جائیں گے' اس لیے کہ جب ان سے پوچھا جائے گا کہ تم مخلوق کے پاس گئے تھے' اور تم نے اللہ کی طرف بلایا تھا تو انھوں نے کیا جواب دیا تھا' حالانکہ انھیں جواب معلوم تھا' مگر اس وقت عقل ساتھ نہیں دے گی' اور خوف اس قدر غالب ہو گا کہ وہ اس سوال کا جواب دینے کے بجائے یہ عرض کریں گے کہ ہمیں علم نہیں ہے' بلاشبہ تو غیبوں کا جاننے والا ہے' اس وقت انبیاء کا یہی جواب درست ہو گا' کیوں کہ جب ان کی عقلیں زائل ہو جائیں گی اور علوم ختم ہو جائیں گے' تو لاعلمی کے علاوہ کیا باقی رہے گا' الّا یہ کہ اللہ تعالیٰ انھیں جواب کی قدرت عطا کرے۔

اسکے بعد حضرت نوح علیہ السلام کو بلایا جائے گا' اور ان سے پوچھا جائے گا کہ کیا انھوں نے اللہ کے بندوں تک اللہ کا پیغام پہنچا دیا تھا' وہ عرض کریں گے کہ ہاں پہنچا دیا تھا' پھر ان کی امت سے دریافت کیا جائے گا کہ کیا نوح نے ان کو اللہ کا دین پہنچایا تھا' وہ عرض کریں گے کہ ہمارے پاس کوئی ڈرانے والا نہیں آیا' حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بلایا جائے گا اور ان سے دریافت کیا جائے گا کہ کیا انھوں نے لوگوں سے کہا تھا مجھے اور میری ماں کو اللہ کے سوا معبود قرار دو' وہ اس سوال کی ہیبت سے برسوں پریشان رہیں گے' وہ دن کتنا خطرناک ہو گا' جس میں انبیاء پر اس طرح کے سوالات کی سیاست قائم کی جائے گی' پھر ملائکہ آئیں گے' اور ایک ایک کو آواز دیں گے کہ اے فلاں عورت کے بیٹے' پیشی کی جگہ آ' اس آواز سے شانے لرزنے لگیں گے' اور اعضاء مضطرب ہو جائیں گے' عقلیں حیران ہو جائیں گی' اور لوگ یہ تمنا کریں گے کہ ان کے عیوب مخلوق کے سامنے ظاہر نہ ہوں سوال کرنے سے پہلے عرش کا نور ظاہر ہو گا' اور زمین اپنے رب کے نور سے روشن ہو جائے گی' اور ہر بندے کے دل میں یہ یقین پیدا ہو گا کہ اللہ تعالیٰ اس سے بازپرس کے لئے متوجہ ہے' اور ہر شخص یہ تصور کرے گا کہ میرے علاوہ کوئی اپنے رب کو نہیں دیکھ رہا ہے' اور سوال صرف مجھ سے کیا جائے گا' دوسروں سے بازپرس نہیں ہو گی' اسکے بعد حضرت جبرئیل علیہ السلام کو اللہ رب العزت کا حکم ہو گا کہ وہ اسکے پاس دوزخ لے کر آئیں' حضرت جبرئیل علیہ السلام دوزخ کے پاس آئیں گے اور کہیں گے کہ اپنے خالق اور مالک کے حکم کی تعمیل کر' اور اللہ کے حضور پیش ہو' اس وقت دوزخ انتہائی غیظ و غضب میں ہو گی' یہ حکم سن کر وہ اور بھڑک اٹھے گی' اسمیں مزید جوش اور ہیجان پیدا ہو گا' وہ مخلوق کے لئے چیخے گی' چلائے گی' لوگ اسکے چیخنے چلانے کی آوازیں سنیں گے' اور دوزخ کے محافظ انکی طرف غصے میں بڑھیں گے اور ان پر حملہ آور ہوں گے' یہ آواز سن کر' اور محافظین جہنم کے حملوں کی تاب نہ لا کر لوگ گھٹنوں کے بل گر پڑیں گے' اور پشت پھیر کر بھاگیں گے' بعض لوگ منہ کے بل گریں گے' اور گناہ گار ہائے بدبختی' وائے ہلاکت پکاریں گے اور صدیقین نفسی نفسی کہتے نظر آئیں گے' لوگوں کو ابھی پچھلے غم سے نجات نہ ہو گی کہ دوزخ دوسری چیخ مارے گی' اس چیخ سے لوگوں کا خوف دوگنا ہو جائے گا' اعضاء ست پڑ جائیں گے' اور ہر شخص کو یہ یقین ہو جائے گا کہ وہ مصیبت میں گرفتار کر لیا گیا ہے' اس کے بعد دوزخ تیسری چیخ مارے گی' اس آواز کی دہشت سے لوگ زمین پر گر پڑیں گے' ان کی آنکھیں اوپر کی سمت نگراں ہوں گی' ظالموں کے دل سینے سے اچھل کر حلق میں آجائیں گے' نیک بختوں' اور بدبختوں سب کی عقلیں ضائع ہو جائیں گی' اسکے بعد اللہ تعالیٰ اپنے تمام مرسلین' اور پیغمبروں کی طرف متوجہ ہو گا اور دریافت فرمائے گا "مَاذَا أُجِبْتُمْ" جب گناہ گار یہ دیکھیں گے کہ آج انبیاء بھی سختی میں مبتلا ہیں یہ سوچ کر ان کا خوف فزوں ہو جائے گا' اس وقت باپ اپنے بیٹے سے' بھائی بھائی سے' اور شوہر اپنی بیوی سے بھاگے گا' ہر شخص کو اپنے اپنے معاملات کا انتظار ہو گا' پھر ہر شخص کو الگ الگ بلایا جائے گا' اور اللہ تعالیٰ اس سے بالمشافہ

سوال کرے گا' اسکے ہر ہر عمل کے متعلق باز پُرس فرمائے گا خواہ وہ تھوڑا تھا یا زیادہ' واضح تھا یا مخفی' اسکے تمام اعضاء اور جوارح سے باز پُرس ہوگی' حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! کیا ہم قیامت کے دن اپنے رب کو دیکھیں گے' فرمایا کیا تمہیں آفتاب کی رویت میں شک ہوتا ہے جب دوپہر میں سورج اور تمہارے درمیان بادل حائل نہیں ہوتا اور کیا تم چودھویں رات کے چاند کی رویت میں شک کرتے ہو جب تمہارے اور چاند کے درمیان کوئی ابر نہیں ہوتا' لوگوں نے عرض کیا نہیں' فرمایا اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے' تم اپنے رب کے دیدار میں بھی شک نہیں کرو گے' وہ بندے سے ملاقات کرے گا' اور اس سے پوچھے گا کہ کیا میں نے تجھے عزت نہیں دی تھی' تجھے سیادت نہیں دی تھی' تیرا جوڑا نہیں بنایا تھا' کیا گھوڑے اور اونٹ تیرے تابع نہیں کئے تھے کیا تجھے سرداری عطا نہیں کی تھی' بندہ عرض کرے گا پروردگار! یہ سب نعمتیں تو نے مجھے عطا کیں تھیں اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ کیا تو یہ گمان رکھتا تھا کہ تجھے مجھ سے ملنا نہیں ہے' وہ عرض کرے گا نہیں' اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ جس طرح تو نے ہمیں فراموش کیا ہم بھی تجھے فراموش کرتے ہیں۔

اے مسکین! اپنے بارے میں تصور کر' فرشتے تیرے دونوں بازو پکڑے ہوئے ہوں گے' اور تو اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑا ہوگا' اللہ تعالیٰ تجھ سے سوال کر رہا ہوگا کہ کیا میں نے تجھے شباب کی دولت عطا نہیں کی تھی' تو نے یہ شباب کس چیز میں ضائع کیا' کیا میں نے تجھے زندگی کی مہلت نہیں دی تھی' تو نے اپنی عمر کس چیز میں فنا کی' کیا میں نے تجھے رزق عطا نہیں کیا تھا تو نے یہ مال کہاں سے حاصل کیا' اور کہاں خرچ کیا' کیا میں نے تجھے علم کی فضیلت نہیں بخشی تھی' تو نے اپنے علم سے کیا عمل کیا' غور کر جب اللہ تعالیٰ اپنی نعمتوں اور تیری نافرمانیوں' اپنے احسانات اور تیری سرکشی کے واقعات بیان کرے گا تو تیری شرمندگی اور ندامت کا کیا عالم ہوگا؟ اگر تو نے ان تمام نعمتوں کا انکار کیا' اور اپنے معاصی کی نفی کی تو تیرے اعضاء گواہی دیں گے' حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ ہم سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تھے' اچانک آپ ہنسنے لگے' پھر فرمایا کیا تم جانتے ہو کہ میں کیوں ہنسا ہوں' ہم نے عرض کیا اللہ و رسول زیادہ جانتے ہیں' فرمایا میں اللہ تعالیٰ سے بندہ کے طرز خطاب پر ہنسا ہوں' وہ اللہ تعالیٰ سے کہے گا اے اللہ! کیا تو نے مجھے ظلم سے پناہ نہیں دی' اللہ تعالیٰ فرمائے گا ہاں دی ہے' وہ کہے گا کہ میں اس وقت یہ باتیں تسلیم کروں گا جب مجھ ہی میں سے کوئی گواہی دے گا' اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ آج کے دن تو ہی اپنا حساب لینے کے لئے کافی ہے' اور کراماً کاتبین گواہی کے اعتبار سے کافی ہیں' اسکے بعد بندے کے منہ پر مہر لگادی جائے گی' اور اسکے اعضاء کو بولنے کا حکم ہوگا' چنانچہ اعضاء اپنے اعمال بتلائیں گے' پھر اسے اور کلام کو تنہا چھوڑا جائے گا' چنانچہ بندہ اپنے اعضاء سے کہے گا تمہارے لئے تباہی اور بربادی ہو' میں تمہاری ہی طرف سے لڑ رہا تھا (مسلم) ہم بر سر عام اعضاء کی گواہی پر رسوا ہونے سے اللہ کی پناہ چاہتے ہیں' تاہم اللہ نے مومنین سے یہ وعدہ فرمایا ہے کہ وہ اس کی پردہ پوشی فرمائے گا' اور اس کے گناہوں پر دوسروں کو مطلع نہیں کرے گا۔ حضرت عبداللہ ابن عمرؓ سے کسی شخص نے دریافت کیا کہ آپ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سرگوشی کے بارے میں کیا سنا ہے انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم میں سے ایک شخص اپنے رب کے اس قدر قریب ہوگا کہ وہ اپنا شانہ اس پر رکھ دے گا اور فرمائے گا کہ کیا تو نے فلاں فلاں گناہ نہیں کیا' وہ عرض کرے گا ہاں' اللہ تعالیٰ فرمائے گا کیا تو نے فلاں فلاں گناہ کئے تھے' وہ عرض کرے گا ہاں کئے تھے' اللہ تعالیٰ فرمائے گا میں نے دنیا میں بھی تیری خطاؤں کی پردہ پوشی کی تھی' اور آج بھی تیری خاطر معاف کرتا ہوں (مسلم) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جو شخص مومن کی پردہ پوشی کرتا ہے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اسکی پردہ پوشی فرمائے گا لیکن یہ حکم اس شخص کے لئے ہے جو لوگوں کے عیوب چھپائے' اگر وہ اسکے حق میں کوئی کوتاہی کریں تو اسے برداشت کرے' انکی برائی کے ذکر سے اپنی زبان کو حرکت نہ دے' اور نہ انکی عدم موجودگی میں انکے بارے میں ایسی باتیں کرے کہ اگر وہ سنیں تو ناگوار گزرے' ایسا شخص قیامت کے دن یقیناً ایسے ہی سلوک کا مستحق ہوگا۔ لیکن یہ حال تو دوسروں کا ہوگا' اور دوسروں کی پردہ پوشی کی جائے گی' تیرا معاملہ اور ہے تیرے کانوں میں حاضری کی ندا پڑ چکی ہے' تیرے لئے گناہوں کی سزا میں یہی خوف کافی ہے' تیری پیشانی

کے بال پکڑے جائیں گے' اور تجھے کھینچا جائے گا' اس وقت تیرا دل دھڑکتا ہوگا شانے لرزتے ہوں گے' عقل پرواز کررہی ہوگی' اعضاء مضطرب ہوں گے' رنگ متغیر ہوگا' اور خوف ودہشت کی بنا پر تیرے لئے پوری دنیا تاریک ہوجائے گی' اب تو اپنے نفس کی متعلق غور کرکہ تیرا حال یہ ہوگا اور تو لوگوں کی گردنیں پھلانگتا ہوگا' اور صفیں چیر رہا ہوگا' اور تجھے اس طرح کھینچا جائے گا جیسے گھوڑے کو کوتل لے جایا جاتا ہے' اور لوگ تیری طرف دیکھتے ہوں گے' تصور کرکہ تو ان فرشتوں کے ہاتھوں میں قید ہے' اور وہ تجھے ربّ کریم کے عرش تک کھینچے لئے جارہے ہیں' وہ وہاں پہنچ کر تجھے پھینکتے ہیں' اور اللہ تعالیٰ تجھے پکارتا ہے' کہ اے ابن آدم! مجھ سے قریب ہو' تو یہ آواز سن کر دھڑکتے ہوئے غمزدہ دل' لرزتے کانپتے جسم' اور ڈرتی سہمتی اور ذلّت و شرمندگی کے باعث زمین کی طرف جھکی ہوئی آنکھوں کے ساتھ رحمٰن ورحیم کی طرف بڑھتا ہے' اور تجھے وہ کتاب عطا کی جاتی ہے جس میں تمام کبائر و صغائر درج ہیں' بہت سے گناہ ایسے ہی ہوں گے جنہیں تو بھول چکا ہوگا' لیکن یہ کتاب دیکھ کر تجھے وہ تمام گناہ یاد آجائیں گے' اور کتنی ہی عبادتیں ایسی ہوں گی جن کی آفتیں تیرے ذہن میں نہیں رہی ہوں گی' لیکن اعمال نامہ دیکھ کر وہ تمام آفتیں منکشف ہوجائیں گی' تجھے اس وقت کس قدر ندامت ہوگی' کس قدر عجز اور بے کسی کا عالم ہوگا' زبان ساکت ہوجائے گی' جسم کی توانائی جاتی رہے گی' میں نہیں جانتا کہ خدا تعالیٰ کے سامنے کن پیروں پر کھڑا ہوگا' اور کس زبان سے جواب دیگا' کس دل سے جواب سوچے گا' پھر یہ غور کرکہ تجھے اس وقت کتنی شرم آئے گی جب تجھے تیرے گناہ یاد دلائے جائیں گے' اور اللہ تعالیٰ فرمائے گا

اے بندے! کیا تجھے میرا برائی کے ساتھ سامنا کرنے میں شرم نہیں آتی تھی' حالانکہ تجھے لوگوں سے شرم آتی تھی' اور تو ان کے لئے اپنے اچھے اعمال کا اظہار کرتا تھا' کیا تیرے نزدیک میری حیثیت بندوں سے بھی کم تھی' تو نے اپنی طرف میری نظر کو معمولی جانا' اور میرے غیر کی نظر کو بڑا تصور کیا' کیا میں نے تجھ پر انعام نہیں کیا' پھر تجھے کس چیز نے مجھ سے فریب میں مبتلا کیا' کیا تو یہ سمجھتا تھا کہ میں تجھے دیکھ نہیں رہا ہوں' اور یہ کہ میں تجھ سے ملاقات نہیں کروں گا۔

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ کوئی شخص ایسا نہ ہوگا جس سے اللہ تعالیٰ اس حال میں سوال نہ کرے کہ اس کے اور مسئول کے درمیان کوئی پردہ حائل ہو' یا ترجمان ہو' (بخاری و مسلم' ابو حاتم) ایک حدیث میں ہے کہ تم میں سے ہر شخص اللہ تعالیٰ کے سامنے اس طرح کھڑا ہوگا کہ تمہارے اور اسکے درمیان کوئی حجاب نہ ہوگا' اللہ تعالیٰ اس سے فرمائے گا کہ کیا میں نے تجھے مال نہیں دیا تھا' وہ عرض کرے گا کہ ہاں تو نے نعمتیں عطا کیں تھیں اور مال دیا تھا' اللہ فرمائے گا کیا میں نے تیرے پاس اپنا رسول نہیں بھیجا تھا' وہ کہے گا ہاں بھیجا تھا پھر وہ اپنے دائیں دیکھے گا اور اسے وہاں دوزخ نظر آئے گی' پھر وہ اپنے بائیں جانب دیکھے گا وہاں اسے دوزخ نظر آئے گی' اس لیے تم میں سے ہر شخص دوزخ سے بچے کو چھوارے کا ایک ٹکڑا (صدقہ کرکے) یا ایک اچھے کلمے سے (بخاری۔ عدی ابن حاتم) حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ تم میں سے کوئی ایسا نہیں ہے جس سے اللہ تعالیٰ تنہا نہ ہوگا' جیسے تم میں سے ایک چودھویں کے رات کے چاند کے ساتھ تنہا ہوتا ہے' پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ اے ابن آدم! مجھ پر تجھے کس چیز نے فریب دیا ہے' اے ابن آدم! تو نے اپنے علم کے مطابق عمل نہیں کیا' اے ابن آدم! تو نے پیغمبروں کے جواب میں کیا کہا' اے ابن آدم! کیا میں تیری آنکھوں کا نگراں نہیں تھا' اور تو ان آنکھوں سے وہ چیزیں دیکھ رہا تھا جن کا دیکھنا تیرے لئے جائز نہیں تھا' کیا میں تیرے کانوں کو نہیں دیکھتا تھا' اور تو ان سے وہ باتیں سنتا تھا جن کا سننا تیرے لئے جائز نہیں تھا' اسطرح اللہ تعالیٰ تمام اعضاء کو شمار کرائے گا' مجاہد فرماتے ہیں کہ قیامت کے دن بندہ اس وقت تک اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑا رہے گا جب تک اس سے اسکی چار خصلتوں کے بارے میں نہ پوچھا جائے گا ایک عمر کے بارے میں کہ کہاں خرچ کی' دوسرے اس کے علم کے متعلق کہ کیا عمل کیا' تیسرے جسم کے متعلق کہ کس چیز میں بوڑھا کیا' چوتھے مال کے متعلق کہاں سے کمایا اور کہاں خرچ کیا' اے بندۂ مسکین! اس سے پہلے کہ اللہ تعالیٰ یہ فرمائے کہ میں نے دنیا میں بھی تیرے گناہوں کی پردہ پوشی کی تھی' اور آج بھی تیرے

گناہوں کو معاف کرتا ہوں' تیرا کیا حال ہو گا تجھے کس قدر خطرات کا سامنا ہو گا' لیکن جب تیرے گناہ بخش دیئے جائیں گے' تب تیری خوشی دوچند ہو جائے گی' اور اولین و آخرین تجھ پر رشک کریں گے' یا فرشتوں سے کہا جائے گا کہ اس برے شخص کو پکڑو' اسکے گلے میں طوق ڈال دو' اور اسے آگ میں پھینک دو' اس وقت اگر تجھ پر زمین اور آسمان روئیں تو یہ تیرے حال کے بالکل مناسب ہو گا' اس لئے کہ تیری مصیبت عظیم ہو گی' اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں تو نے جو کوتاہی کی ہے اور آخرت کے عوض دنیا کو خریدنے کا جو کاروبار تو نے روا رکھا ہے' اس پر تیری حسرت نہایت شدید ہو گی' کیوں کہ آخرت تو تجھ سے رخصت ہو ہی چکی تھی' دنیا بھی تیرا ساتھ چھوڑ دے گی' اور تو اپنے مصائب کے ساتھ تنہا رہ جائے گا۔

میزان کا بیان : پھر میزان کے باب میں فکر کر' اور اعمال ناموں کا دائیں بائیں اڑنے کا تصور کر' سوال کے مرحلے سے فارغ ہونے کے بعد لوگوں کے تین فرقے ہو جائیں گے' ان میں ایک فرقہ ان لوگوں کا ہو گا جن کا دامن ہر طرح کی نیکی سے خالی ہو گا' ایسے لوگوں کے لئے دوزخ سے ایک سیاہ گردن باہر نکلے گی' اور انھیں اس طرح اچک کر لے جائے گی جیسے پرندے دانے چگ کر اڑ جاتے ہیں' انھیں دوزخ میں ڈال دے گی' اور دوزخ انھیں نگل لے گی' اور ان کے لئے ایسی شقاوت کا اعلان کیا جائے گا' جس کے بعد کسی سعادت کی امید نہیں ہو گی' دوسرا گروہ ان لوگوں کا ہو گا جن کا دامن کسی گناہ سے آلودہ نہ ہو گا' ایسے لوگوں کے متعلق یہ اعلان کیا جائے گا' کہ ہر حال میں اللہ تعالیٰ کی حمد کرنے والے کھڑے ہو جائیں گے' نیک لوگ کھڑے ہو جائیں گے' اور جنت کی طرف چلیں گے' پھر یہ اعلان تہجد گزاروں کے لئے کیا جائے گا' پھر ان لوگوں کے لئے کیا جائے گا جنھیں دنیا کی تجارت نے اللہ کے ذکر سے نہ روکا ہو گا' اور ان کے لئے ایسی سعادت کا اعلان کیا جائے گا جس کے بعد کوئی شقاوت نہ ہو گی۔ ان دونوں کے بعد تیسرا گروہ باقی رہ جائے گا' اس گروہ میں وہ لوگ ہوں گے جنھوں نے اپنے اچھے اعمال کی آمیزش کی ہو گی' ان پر مخفی ہو گا لیکن اللہ تعالیٰ پر مخفی نہیں ہے کہ ان کے اعمال میں حسنات زیادہ ہیں یا سیئات زیادہ ہیں' لیکن اللہ نہیں چاہتا کہ وہ ان پر یہ بات ظاہر کرے تاکہ عفو میں اسکا فضل اور عذاب میں اس کا عدل واضح ہو' اسلئے وہ صحیفے اڑائے جائیں گے جن میں نیکیاں اور برائیاں لکھی ہوں گی' اور میزان کھڑی کی جائے گی' اور آنکھیں ان صحیفوں پر لگی ہوں گی کہ وہ دائیں ہاتھ میں پڑتے ہیں یا بائیں ہاتھ میں' پھر ترازو کے کانٹے کی طرف دیکھیں گے کہ وہ نیکیوں کی طرف جھکتا ہے یا برائیوں کی طرف' یہ ایک ایسی خوفناک حالت ہو گی کہ مخلوق کی عقلیں پرواز کر جائیں گی حضرت حسنؓ روایت کرتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا سر مبارک آپ کی گود میں تھا' آپ کو نیند آگئی' حضرت عائشہ کو آخرت کا خیال آیا' اور وہ رونے لگیں' یہاں تک کہ ان کے آنسو بہہ کر سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے رخسار مبارک پر گرے' آپ بیدار ہو گئے' اور فرمایا اے عائشہؓ کیوں روتی ہو' عرض کیا مجھے آخرت کا خیال آگیا تھا' کیا آپ لوگ قیامت کے دن اپنے گھر والوں کو یاد رکھیں گے' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے تین مواقع پر آدمی اپنے سوا کسی کو یاد نہ رکھے گا' ایک اس وقت جب ترازوئیں کھڑی کی جائیں گی۔ اور اعمال کا وزن کیا جائے گا اس وقت ابن آدم یہ دیکھے گا کہ اسکی ترازو کا پلڑا بھاری ہے یا ہلکا' دوسرے اس وقت جب اعمال نامے اڑائے جائیں گے' اس وقت ابن آدم یہ سوچے گا' اس کا صحیفہ دائیں ہاتھ میں آئے گا یا بائیں ہاتھ میں' اور تیسرے پل صراط کے وقت۔ حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ ابن آدم کو قیامت کے دن لایا جائے گا اور اسے ترازو کی دونوں پلڑوں کے درمیان کھڑا کیا جائے گا' اور اس پر ایک فرشتہ مقرر کیا جائے' اگر اس کا پلڑا بھاری ہوا تو فرشتہ بلند آواز میں جسے سب لوگ سنیں گے یہ اعلان کرے گا کہ فلاں شخص کے حصے میں ایسی سعادت آئی ہے کہ اسکے بعد وہ کبھی شقی نہیں ہو گا' اور اگر اسکا پلڑا ہلکا ہوا تو وہ فرشتہ ایسی ہی بلند آواز میں یہ اعلان کرے گا کہ فلاں شخص بدبخت قرار پایا اب کبھی وہ سعادت مند نہ ہو گا اور جب پلڑا ہلکا ہو گا تو دوزخ کے فرشتے جن کے ہاتھوں میں لوہے کے گرز اور جسم پر آگ کا لباس ہو گا آئیں گے اور ان لوگوں کو پکڑ کر جہنم میں لے جائیں گے' جن کے پلڑے ہلکے تھے' گویا وہ دوزخ کا حصہ دوزخ کو دیدیں گے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ آدم علیہ

السلام کو پکار کر کہے گا اے آدم! اٹھ اور ان لوگوں کو دوزخ میں بھیج جنہیں دوزخ میں جانا ہے' حضرت آدم علیہ السلام عرض کریں گے اے اللہ! وہ لوگ کتنے ہیں؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا ایک ہزار نو سو ننانوے' جب صحابہ کرام نے یہ سنا تو بہت افسردہ ہوئے' یہاں تک کہ ان کے چہروں سے مسکراہٹ رخصت ہوئی' جب آپ نے ان کا یہ حال دیکھا تو ارشاد فرمایا عمل کرو' اور مژدہ پاؤ' اس ذات کی قسم جس کی قبضے میں میری جان ہے تمہارے ساتھ دو مخلوق ایسی ہیں کہ جب کبھی کسی کے مقابل ہوئیں تو اس سے بڑھ کر رہیں' اور ان سے بھی بڑھ کر رہیں جو آدم اور ابلیس کی اولاد میں سے مرگئے' صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہ دونوں مخلوق کونسی ہیں؟ فرمایا یاجوج اور ماجوج' راوی کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد سن کر صحابہ خوش ہوگئے' اسکے بعد آپ نے ارشاد فرمایا عمل کرو اور مژدہ پاؤ' اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے کہ تم قیامت کے روز ایسے ہوگے جیسے اونٹ کے پہلو میں سیاہ داغ ہوتا ہے' یا جانور کے گھٹنوں میں ابھرا ہوا حصہ ہوتا ہے۔

خصومت اور ادائے حقوق : ابھی میزان کی ہولناکیوں اور خطروں کا ذکر تھا' اور بیان کیا گیا تھا کہ ہر شخص کی نگاہیں میزان کے کانٹے پر لگی ہوں گی کہ وہ کدھر جھکتا ہے' جس کا پلڑا بھاری ہوگا وہ خوش گوار زندگی کا لطف اٹھائے گا' اور جس کا پلڑا ہلکا ہوگا وہ آگ میں گرے گا۔ یہاں یہ بھی جان لینا چاہیے کہ میزان کے خطرے سے صرف وہ شخص سلامت رہ سکتا ہے جو دنیا میں اپنے نفس کا محاسبہ کرے' اور اس میں رہ کر میزان شریعت سے اپنے اعمال' اقوال' افکار' اور خیالات کا وزن کرے' جیسا کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا کہ اپنے نفس کا حساب کرو اس سے پہلے کہ تمہارا محاسبہ ہو' اور اس کا وزن کروں اس سے پہلے کہ تمہارا وزن کیا جائے' اور حساب نفس یہ ہے کہ موت سے پہلے ہر معصیت سے توبۂ نصوح کرے اور اللہ کے فرائض میں جو کچھ کوتاہی سرزد ہوئی ہے اس کا تدارک کرے' اور لوگوں کے حقوق ادا کرے خواہ وہ ایک حبہ برابر ہوں' اور ہر اس شخص سے معافی مانگے جس کو زبان یا ہاتھ سے ایذا دی ہو' یا دل میں اس کے متعلق غلط خیال کیا ہو' اور مرنے تک لوگوں کے دل خوش رکھے' یہاں تک کہ جب وہ مرے تو اس پر کسی کا کوئی حق واجب نہ ہو' نہ کوئی فریضہ باقی ہو' ایسا شخص بلا حساب جنت میں داخل ہوگا' اور اگر حقوق کی ادائیگی سے پہلے مرگیا' تو قیامت کے روز اسے مدعی گھیر لیں گے' کوئی ہاتھ پکڑے گا کوئی پیشانی پکڑے گا' کوئی گریبان پر ہاتھ ڈالے گا' ایک کہے گا کہ تو نے مجھ پر ظلم ڈھایا تھا' دوسرا کہے گا تو نے مجھے گالی دی تھی' تیسرا کہے گا تو نے میرا مذاق اڑایا تھا' چوتھا کہے گا تو نے میری غیر موجودگی میں ایسی باتیں کی تھیں جو مجھے بری لگتیں' پانچواں کہے گا کہ تو میرے پڑوس میں رہتا تھا لیکن تو بحیثیت پڑوسی ایک برا شخص ثابت ہوا' چھٹا کہے گا تو نے مجھ سے معاملات کئے' اور ان میں دھوکا کیا' ساتواں کہے گا تو نے مجھے فلاں چیزیں فروخت کی تھی اور اس میں مجھے لوٹ لیا تھا' اور مجھ سے اپنی مبیع کا عیب پوشیدہ رکھا تھا' آٹھواں کہے گا تو نے مجھے مظلوم پایا تھا' اور تجھے دفع ظلم پر قدرت حاصل تھی لیکن تو نے ظالم سے چشم پوشی کی' اور میری حفاظت نہیں کی' یہ تمام مدعی اپنے اپنے حقوق ذکر کریں گے' اور تیرے جسم میں اپنے پنجے پیوست کریں گے' اور تیرا گریبان مضبوطی سے پکڑیں گے' تو انکی کثرت سے حیران و پریشان ہوگا' یہاں تک کہ کوئی ایسا شخص باقی نہیں رہے گا جس سے تو نے کبھی اپنی زندگی میں کوئی معاملہ کیا تھا' اور اس میں خیانت کی تھی' یا کسی مجلس میں بیٹھ کر اس کی غیبت کی تھی' یا اسے حقارت کی نظر سے دیکھا تھا' یہ سب لوگ تیرے چاروں طرف پھیل جائیں گے' تجھ پر دست درازی کریں گے' اور تو ان کے مقابلے سے خود کو عاجز پائے گا' اور اسی عاجزی اور بے کسی کے عالم میں تیری نگاہیں اپنے اپنے مالک و مولیٰ کی طرف دیکھتی ہوں گی کہ وہی تجھے اس مصیبت سے نجات دلادے' لیکن تیری مدد نہیں کی جائے گی' بلکہ تیرے کان یہ اعلان سنیں گے :۔

اَلْيَوْمَ تُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ لَا ظُلْمَ الْيَوْمَ (پ ۲۴ر ۷ آیت ۱۷)

آج ہر شخص کو اسکے کئے کا بدلہ دیا جائے گا' آج (کسی پر) ظلم نہ ہوگا۔

اس وقت تیرا دل اچھل کر حلق میں آجائیگا اور تجھے اپنی تباہی اور بربادی کا یقین آجائے گا' اور تجھے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد یاد

آجائے گا:۔

وَلَا تَحْسَبَنَّ اللّٰهَ غَافِلًا عَمَّا يَعْمَلُ الظّٰلِمُوْنَ اِنَّمَا يُؤَخِّرُهُمْ لِيَوْمٍ تَشْخَصُ فِيْهِ الْاَبْصَارُ مُهْطِعِيْنَ مُقْنِعِيْ رُءُوْسِهِمْ لَا يَرْتَدُّ اِلَيْهِمْ طَرْفُهُمْ وَاَفْئِدَتُهُمْ هَوَآءٌ (پ ۱۳ ر ۱۹ آیت ۴۲-۴۳)

اور جو کچھ یہ ظالم کر رہے ہیں اس سے خدا تعالیٰ کو بے خبر مت سمجھ 'ان کو صرف اس روز تک مہلت دے رکھی ہے 'جس میں نگاہیں پھٹی رہ جائیں گی 'دوڑتے ہوں گے 'اپنے سر اٹھا رکھے ہوں گے (اور) انکی نظر ان کی طرف ہٹ کر نہ آوے گی 'اور ان کے دل بالکل بدحواس ہوں گے۔

آج تیری اس خوشی کا کیا ٹھکانہ جو تجھے لوگوں کا مال چھینے 'اور انکی آبرو پر ہاتھ ڈالنے میں ملتی ہے 'اس دن تیری حسرت کا کیا عالم ہوگا جب تجھے بساط عدل پر کھڑا کیا جائے گا 'اور تجھ سے سوالات کئے جائیں گے 'اس وقت تو نہایت مفلس 'تنگدست 'عاجز اور ذلیل ہوگا 'نہ تو کسی کا حق ادا کر سکے گا 'اور نہ کوئی عذر کر سکے گا 'تب حق والوں کا حق ادا کرنے کے لئے تیری نیکیاں لے لی جائیں گی 'جن میں تو نے اپنی زندگی صرف کی تھی 'اور وہ نیکیاں تیرے حقداروں کو ان کے حقوق کے عوض دیدی جائیں گی 'حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم جانتے ہو مفلس کون ہے؟ ہم نے عرض کیا مفلس ہم لوگوں میں وہ شخص ہے جس کے پاس نہ درہم و دینار ہوں اور نہ مال و متاع ہو۔ آپ نے فرمایا میری امت میں مفلس وہ شخص ہے جو قیامت کے دن نماز 'روزے اور زکوٰۃ لے کر آئے گا 'اور کسی کو گالی دی ہوگی 'یا کسی کا مال کھایا ہوگا 'یا کسی کا خون بہایا ہوگا 'یا کسی کو مارا ہوگا 'اس شخص کو اسکی کچھ نیکیاں دیدی جائیں گی 'اور کچھ نیکیاں اس شخص کے حوالے کردی جائیں گی 'اور جو حقوق اس پر واجب تھے اگر ان کی ادائیگی سے پہلے نیکیاں ختم ہوگئیں تو حقدار کے گناہ اس پر ڈال دئے جائیں گے 'اور اسے آگ میں پھینک دیا جائے گا۔ (۱) توکل پیش آنے والی مصیبت پر آج غور کرلے 'آج تیرے پاس کوئی ایسی نیکی نہیں جو ریاء کی آفتوں اور شیطان کے مکائد سے پاک ہو 'اگر تمام عمر کی ریاضت کے بعد تیرے پاس ایک خالص اور پاک نیکی آبھی گئی تو وہ قیامت کے دن تیرے حقدار چھین لیں گے اگر تو اپنے نفس کا محاسبہ کرے تو تجھے معلوم ہوگا کہ اگرچہ تو دن کے روزوں 'اور رات کی نمازوں پر مواظبت کرتا ہے 'لیکن تیرا کوئی دن ایسا نہیں گزرتا کہ تیری زبان مسلمانوں کی غیبت سے آلودہ نہ ہوتی ہو 'تیری تمام نیکیاں تو یہی غیبت سمیٹ لے جائے گی 'باقی گناہوں کا کیا ہوگا جیسے حرام اور مشتبہ مال کھانا 'طاعات میں کوتاہی کرنا 'تجھے اس دن مظالم سے نجات کی کس طرح توقع ہو سکتی ہے جس دن بے سینگ کے جانوروں کا حق سینگ دار جانوروں سے لیا جائے گا 'حضرت ابوذرؓ روایت کرتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے دو بکریوں کو دیکھا کہ وہ ایک دوسرے کے سینگ مار رہی ہیں 'آپ نے فرمایا اے ابوذرؓ! تم جانتے ہو یہ کیوں سینگ مار رہی ہیں 'میں نے عرض کیا نہیں! فرمایا لیکن اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور وہ قیامت کے روز ان دونوں بکریوں کے درمیان فیصلہ فرمائے گا (احمد) قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:۔

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا طٰٓئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ اِلَّآ اُمَمٌ اَمْثَالُكُمْ (پ ۷ ر ۱۰ آیت ۳۸)

اور جتنے قسم کے جاندار زمین پر چلنے والے ہیں 'اور جتنے قسم کے پرندے ہیں کہ اپنے بازوؤں سے اڑتے ہیں ان میں کوئی قسم ایسی نہیں جو کہ تمہاری ہی طرح کے گروہ نہ ہوں۔

حضرت ابو ہریرہؓ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ قیامت کے دن تمام مخلوق اٹھائی جائے گی 'بہائم درندے 'پرندے وغیرہ اور اللہ تعالیٰ کا عدل اس درجے پر پہنچے گا بے سینگ کے جانور کو سینگ دار جانور سے حق دلایا جائے گا پھر اس سے کہا جائے گا مٹی ہو جا 'اس وقت کافر بھی کہے گا کہ کاش میں مٹی ہوتا 'اے مسکین 'اس روز تیرا کیا عالم ہوگا 'جب تیرا صحیفہ ان حسنات سے خالی ہوگا

---

(۱) یہ روایت پہلے گزری ہے

جن کے لئے تونے اپنی تمام توانائی خرچ کردی تھی' تو کہے گا میری نیکیاں کہاں چلی گئیں' کہا جائے گا کہ تیرے حقداروں کے صحیفوں میں منتقل ہو گئیں' تجھے اپنا صحیفہ ان سیئات سے لبریز نظر آئے گا جن سے صبر کرنے میں تونے بہت سی تکلیفیں برداشت کی تھی' تو عرض کرے گا کہ یہ ان لوگوں کے گناہ ہیں جن کی تو نے غیبت کی تھی' جنھیں تونے گالی دی تھی' جنھیں ایذا پہنچائی تھی' خرید و فروخت' مجاورت' خطاب' بات چیت' اور بحث و مباحثے میں ان پر ظلم کیا تھا۔ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ شیطان سرزمین عرب پر بتوں کی پرستش سے مایوس ہو چکا ہے' لیکن وہ ان امور سے مایوس نہیں ہوا' جو بت پرستی کے مقابلے میں معمولی ہیں' اگرچہ یہ امور بھی مہلک ہیں' اسلئے تم ممکنہ حد تک ظلم سے اجتناب کرو' اسلئے کہ بندہ قیامت کے دن پہاڑوں کے برابر نیکیاں لے کر آئے گا' اور یہ سمجھے گا کہ یہ نیکیاں اسے ضرور نجات دلائیں گی' لیکن بندگان خدا آتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ پروردگار! فلاں شخص نے مجھ پر ظلم کیا ہے' اللہ تعالیٰ فرمائے گا اسکی نیکیاں کم کردو' لوگوں کی آمد کا سلسلہ جاری رہتا ہے یہاں تک کہ اسکی نیکیوں سے کچھ باقی نہیں رہتا' اس کی مثال ایسی ہے جیسے مسافر کسی جنگل میں قیام کریں' اور ان کے پاس لکڑیاں نہ ہوں' اور لوگ ادھر ادھر منتشر ہو جائیں اور لکڑیاں جمع کر کے لائیں اور آگ لگادیں' اور جو چاہتے ہیں وہ کریں' یہی حال گناہوں کا ہے (جس طرح آگ لکڑیوں کو جلا کر راکھ کردیتی ہے اسی طرح گناہ بھی تمام نیکیوں کو ختم کردیتے ہیں) (احمد' بیہقی) روایت ہیکہ جب قرآن کریم کی یہ آیت نازل ہوئی :۔

إِنَّكَ مَيِّتٌ وَإِنَّهُم مَّيِّتُونَ ثُمَّ إِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عِندَ رَبِّكُمْ تَخْتَصِمُونَ (پ ۲۳ ر ۱۷ آیت ۳۰-۳۱)

آپ کو بھی مرنا ہے' اور ان کو بھی مرنا ہے' پھر قیامت کے روز تم مقدمات اپنے رب کے سامنے پیش کرو گے۔

حضرت زبیر نے عرض کیا یارسول اللہ! کیا ہمارے گناہوں پر وہ معاملات بھی زائد کئے جائیں گے جو دنیا میں ہم لوگوں کے مابین تھے' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہاں زائد کئے جائیں گے' یہاں تک کہ تم حقداروں کا حق ادا کردو' حضرت زبیرؓ نے عرض کیا بخدا معاملہ نہایت سخت ہے (احمد' ترمذی) اس دن کی سختی اور سنگینی کا کیا کہنا جس میں ایک قدم کی بخشش نہیں ہوگی' اور ایک طمانچے یا ایک طمانچے سے بھی چشم پوشی نہیں کی جائے گی یہاں تک کہ مظلوم ظالم سے انتقام لے لے' حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ میں نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے سنا ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کو برہنہ جسم' غیر مختون اور قلاش اٹھائے گا' ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (بہما) قلاش کا کیا مطلب ہے؟ فرمایا یعنی ان کے پاس کچھ نہ ہوگا' پھر اللہ تعالیٰ انھیں ایسی آواز سے پکارے گا جسے دور و نزدیک کے تمام لوگ یکساں طور پر سنیں گے' اور فرمائے گا میں بدلہ لینے والا بادشاہ ہوں' کوئی جنتی جس کے اوپر کسی دوزخی کا حق ہو جنت میں نہیں جاسکتا یہاں تک کہ وہ اس سے اپنا حق نہ لے لے' یہاں تک کہ ایک چانٹے کا حق بھی (ادا کرے گا) ہم نے عرض کیا یہ کیسے ہوگا ہم تو اللہ تعالیٰ کے پاس برہنہ جسم' غیر مختون اور قلاش حاضر ہوں گے' آپ نے فرمایا یہ حق نیکیوں اور گناہوں سے ادا کرایا جائیگا (احمد) اللہ کے بندو! اللہ سے ڈرو' اور لوگوں پر ان کا مال چھین کر' انکی عزت پر ہاتھ ڈال کر' انکو بد دل کر کے اور معاملات میں انکے ساتھ برابر کا برتاو کر کے ظلم کا ارتکاب نہ کرو' اسلئے کہ جو گناہ اللہ اور اس کے بندے کے درمیان مخصوص ہوتا ہے اسکی طرف مغفرت بہت جلد سبقت کرتی ہے' اور جس کے اعمال نامے میں مظالم کی کثرت ہو' اگرچہ اس نے ان مظالم سے توبہ کرلی ہو' لیکن وہ مظلومین سے معاف نہ کراسکا ہو' ایسے شخص کو زیادہ سے زیادہ نیک اعمال کرنے چاہئیں تاکہ بدلے کے دن مظلومین کو نیکیاں دینے کے بعد بھی اسکے پاس اس قدر نیکیاں باقی رہیں جن سے اسکی بخشش ہوسکے' اور کچھ ایسے اعمال بھی بچا کر رکھے جو کمال اخلاص کے ساتھ ادا کئے گئے ہوں' اور جن پر اسکے مالک حقیقی کے علاوہ کوئی دوسرا مطلع نہ ہوسکتا ہے تاکہ یہ مخلصانہ اعمال اسے اللہ سے قریب کردیں' اور اللہ تعالیٰ کے اس لطف و کرم کا مستحق بنادیں جو اس

نے اپنے ان محبین کے لئے رکھا ہے' جن سے بندوں کے مظالم ادا کرنے مقصود ہیں' جیسا کہ حضرت انس روایت کرتے ہیں کہ ہم سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بیٹھے ہوئے تھے' اچانک آپ مسکرانے لگے یہاں تک کہ آپ کے دانت ظاہر ہوگئے' حضرت عمرؓ نے عرض کیا تیا رسول اللہ! آپ کس بات پر ہنستے ہیں؟ آپ پر میرے ماں باپ قربان ہوں؟ فرمایا میری امت میں سے دو شخص رب العزت کے سامنے دوزانوں ہوئے' اور ان میں سے ایک نے عرض کیا الٰہی میرے بھائی سے میرے ظلم کا بدلہ لے' اللہ تعالیٰ نے فرمایا اپنے بھائی کو اپنے ظلم کا بدلہ دے' اس نے عرض کیا یا اللہ! میرے پاس کوئی نیکی باقی نہیں رہی ہے' اللہ تعالیٰ نے مطالبہ کرنے والے سے فرمایا اب تو کیا کرے گا اسکے پاس کوئی نیکی باقی نہیں بچی ہے' اس نے عرض کیا یہ میرے گناہوں کا بوجھ اٹھائے گا' راوی کہتے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں میں آنسو آگئے' پھر فرمایا وہ نہایت سخت دن ہوگا' اس دن لوگ اس بات کے محتاج ہونگے کہ انکے گناہوں کا بوجھ کوئی دوسرا اپنے اوپر اٹھالے' پھر اللہ تعالیٰ نے مطالبہ کرنے والے سے فرمایا اپنا سر اٹھا' اور جنت کے طرف دیکھ' اس نے اپنا سر اٹھایا اور عرض کیا یا اللہ تعالیٰ میں چاندی کے بلند و بالا شہر' اور سونے کے محل جن پر موتی جڑے ہوئے ہیں دیکھتا ہوں' یہ کس نبی کے لئے ہے' یا کس صدیق کے لئے ہے' یا شہید کے لئے ہے' اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہ اس شخص کے لئے جو اسکی قیمت چکائے گا' بندہ نے عرض کیا پروردگار! اسکی قیمت کس کے پاس ہوگی؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اسکی قیمت تیرے پاس ہے' بندہ نے عرض کیا وہ کیا؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تیرا اپنے بھائی کو معاف کرنا' اس نے عرض کی الٰہی! میں نے اپنے بھائی کو معاف کیا' اللہ تعالیٰ نے فرمایا اپنے بھائی کا ہاتھ پکڑ اور اسے جنت میں لے جا' اسکے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اللہ سے ڈرو' اور آپس میں صلح رکھو' اسلئے کہ اللہ تعالیٰ مومنین کے درمیان صلح کراتا ہے' (ابن ابی الدنیا)۔ اور اس حدیث میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ یہ مرتبہ اللہ تعالیٰ کا اخلاق اپنانے سے حاصل ہوتا ہے۔

اب تو اپنے آپ پر نظر ڈال اگر تیرا صحیفہ مظالم سے خالی ہوگا تو اللہ تعالیٰ تجھے اپنے لطف و کرم سے معافی دلادے گا' اور تجھے اپنی ابدی سعادت کا یقین ہوجائے گا' اس وقت تجھے کس قدر خوشی حاصل ہوگی جب تو فیصلے کی جگہ سے واپس ہوگا اس حال میں کہ تیرے جسم پر رضائے الٰہی کی خلعت ہوگی' اور تیرے دامن میں ایسی بھرپور سعادت اخروی کا خزانہ ہوگا جس کے بعد کوئی شقاوت نہیں ہے' اور ایسی لازوال نعمتیں ہوں گی' جنھیں فنا نہیں ہونا ہے' اس وقت تیرا دل خوشی اور مسرت سے بے قابو ہوجائے گا' اور تیرا چہرا اسی قدر چمکدار اور روشن ہوجائے گا جیسے چودھویں شب میں چاند روشن ہوتا ہے' تصور کر تو اس وقت کس قدر اترائے گا' اور مخلوق کے درمیان سے سر اٹھا کر کیسے چلے گا' ہلکا پھلکا' روشن اور منور' رضائے الٰہی کی کرنیں تیری پیشانی سے پھوٹ رہی ہوں گی' اور تو اولین و آخرین کی نگاہوں کا مرکز ہوگا' وہ تجھے دیکھ رہے ہوں گے' تیرے حسن اور جمال پر رشک کررہے ہوں گے' اور ملائکہ تیرے آگے پیچھے چل رہے ہوں گے' اور یہ اعلان کررہے ہوں گے کہ یہ فلاں ابن فلاں ہے اللہ تعالیٰ اس سے راضی ہوا اور اسکو راضی کردیا' اور اس نے ایک ایسی سعادت حاصل کرلی ہے جس کے بعد شقاوت نہیں ہے' کیا تیرے خیال میں یہ منصب اس مرتبے سے افضل و اعلا ہے جو تو دنیا میں رہ کر لوگوں کے دلوں میں اپنی ریاء' مداہنت' تصنع' اور تزین سے حاصل کرنا چاہتا ہے' اگر تو یہ سمجھتا ہے کہ واقعی آخرت کا درجہ اس دنیاوی مرتبے سے بہتر ہے' بلکہ ان دونوں کے درمیان کوئی مناسبت ہی نہیں ہے تو تجھے یہ مرتبہ حاصل کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنے معاملات میں صفائے اخلاص اور صدق نیت کی مدد حاصل کرنی چاہئے' اسکے بغیر یہ مرتبہ حاصل نہیں ہوسکتا' اور اگر معاملہ اسکے برعکس ہوا' مثلاً تیرے اعمالنامے میں ایسا کوئی گناہ درج تھا جسے تو معمولی سمجھتا تھا' لیکن فی الحقیقت وہ اللہ کے نزدیک نہایت سنگین تھا' اسلئے اللہ تعالیٰ اس گناہ پر تجھ سے ناراض ہوا' اور اس نے یہ کہہ دیا کہ اے بندۂ سوء تجھ پر میری لعنت ہو' میں تیری کوئی عبادت اور اطاعت قبول نہیں کروں گا' یہ سن کر تیرا چہرہ تاریک ہوجائے گا' پھر اللہ تعالیٰ کو غضب ناک دیکھ کر فرشتے بھی اپنی ناراضگی ظاہر کریں گے' اور کہیں گے کہ اے شخص تجھ پر ہماری اور تمام مخلوق کی لعنت ہو' اس وقت جہنم کے فرشتے اپنی تند خوئی' ترش روئی اور سخت گیری کے ساتھ نہایت غضب کے عالم میں تیرے پاس آئیں گے'

اور تیری پیشانی کے بال پکڑ کر تجھے منہ کے بل گھسیٹتے ہوئے لے جائیں گے، تمام مخلوق موجود ہوگی، ہر شخص کی نظریں تیرے چہرے کی سیاہی اور تیری ذلت اور رسوائی پر ہوں گی، اور تو چیخ چیخ کر کہہ رہا ہوگا ہائے ہلاکت، وائے بربادی، اور وہ تجھ سے یہ کہیں گے کہ آج ایک ہلاکت کو مت پکار، بلکہ بہت سی ہلاکتوں کو آواز دے، فرشتے یہ اعلان کرتے ہوں گے یہ شخص فلاں ابن فلاں ہے، اللہ تعالیٰ نے آج اسے ذلیل و رسوا کردیا ہے، اور اسے اس کے بدترین گناہوں کے باعث ملعون قرار دیدیا ہے، اور اسکی قسمت میں ایسی ابدی شقاوت لکھی دی گئی ہے جس کے بعد سعادت نہیں ہے، یہ صورت حال کسی ایسے گناہ کی بدولت بھی پیش آسکتی ہے، جو تو نے بندوں کے خوف سے، یا ان کے دل میں اپنی جگہ بنانے کے لئے، یا انکے سامنے رسوائی سے بچنے کے لئے کیا ہے، تو کتنا بڑا جاہل ہے کہ بندگان خدا کے ایک مختصر گروہ کے سامنے رسوائی سے خوف زدہ ہے، اور وہ بھی ایسی دنیا میں جو بہت جلد ختم ہو نیوالی ہے، اور اس عظیم رسوائی سے نہیں جو ایک عظیم اجتماع میں ہوگی، اور اس رسوائی کیساتھ اللہ تعالیٰ کا غضب شدید، اور اسکا عذاب الیم بھی ہوگا، اور جہنم کے فرشتے بھی جہنم کی طرف کھینچ کرلے جائیں گے۔

<u>پل صراط کا بیان</u> : ان خطرات کے بعد اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں غور کرو :-

یَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِیْنَ اِلَى الرَّحْمٰنِ وَفْدًا وَّنَسُوْقُ الْمُجْرِمِیْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ وِرْدًا (پ ۱۶ ر ۶ آیت ۸۵-۸۶)

جس روز ہم متقیوں کو رحمٰن کی طرف مہمان بنا کر جمع کریں گے، اور مجرموں کو دوزخ کی طرف پیاسا ہانکیں گے۔

فَاهْدُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطِ الْجَحِیْمِ وَقِفُوْهُمْ اِنَّهُمْ مَّسْـُٔوْلُوْنَ (پ ۲۳ ر ۶ آیت ۲۴)

پھر ان سب کو دوزخ کا راستہ بتلاؤ اور ان کو ٹھہراؤ ان سے کچھ پوچھا جائے گا۔

ان خطرات سے گزرنے کے بعد لوگ پل صراط کی طرف لے جائے جائیں گے، پل صراط دوزخ کے اوپر بنا ہوا ایک پل ہے جو تلوار سے زیادہ تیز اور بال سے زیادہ باریک ہے جو شخص اس دنیا میں صراط مستقیم پر ثابت قدم رہتا ہے اس پر آخرت کی صراط عبور کرنا سہل ہوجاتا ہے، اور اس کے خطرے سے نجات پالیتا ہے، اور جو شخص دنیا میں صراط مستقیم سے انحراف کرتا ہے، اور اپنی پشت کو گناہوں سے بوجھل کرتا ہے، اور نافرمانی کرتا ہے وہ صراط آخرت پر پہلے ہی قدم میں لڑکھڑا جاتا ہے، اور گر کر ہلاک ہوجاتا ہے، اب یہ دیکھو کہ پل صراط پر قدم رکھنے سے پہلے تمہارے خوف اور گھبراہٹ کا کیا عالم ہوگا جب تمہاری نگاہ اسکی باریکی اور تیزی پر پڑے گی، اور تم اسکے نیچے جہنم کے شعلے دیکھو گے، پھر تمہارے کانوں میں جہنم کے چیخنے چنگھاڑنے اور ابلنے کی آواز آئے گی، اور تمہیں مجبور کیا جائے گا کہ تم اپنی کمزوری، قلبی اضطراب ڈگمگاتے قدموں اور کمر کے بے پناہ بوجھ کے باوجود ــــ جس کی موجودگی میں تم سطح زمین پر بھی نہیں چل سکتے ــــ اس بال سے زیادہ باریک صراط پر چلو، اس وقت کیا حال ہوگا جب تو اپنا ایک پاؤں رکھے گا، اچانک تجھے صراط کی تیزی اور حدت محسوس ہوگی، اور تو دوسرا پاؤں اٹھانے پر مجبور ہوجائیگا، اور تیری آنکھوں کے سامنے بیشمار لوگ ٹھوکریں کھاکر گرتے ہوئے، اور جہنم کے فرشتوں کے ذریعے کانٹوں سے اٹھتے ہوئے دیکھے گا، اور یہ بھی دیکھے گا کہ لوگ منہ کے بل جہنم کے گہرے کنویں میں گر رہے ہیں، کتنا خطرناک اور دہشت ناک منظر ہوگا، کتنی پُر مشقت بلندی پر چڑھنا ہوگا، کتنی تنگ رہ گزر ہوگی، چشم تصور سے دیکھو کہ تم اس حال میں ہو، اور اس بلند اور تنگ رہ گزر پر چڑھ رہے ہو، تمہاری پشت بوجھل ہے، دائیں بائیں مخلوق خدا آگ میں گزر رہی ہے، اور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم رب کریم کے سامنے سر بسجود سلامتی کی دعا مانگ رہے ہیں، دوسری طرف دوزخ کے گہرے کنویں سے فریاد اور آہ و بکا کی آوازیں آرہی ہوں گی، اور وہ لوگ اپنی تباہی و بربادی کو آواز دے رہے ہوں گے، جو پل صراط عبور نہ کرسکے اور گناہوں کے بوجھ سے لڑکھڑا کر گر پڑے، تیرا کیا حال ہوگا اگر تیرے قدم بھی ڈگمگائے، اس وقت ندامت سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا، تب تو تو تباہی اور بربادی کو پکارے گا، اور کہے گا کہ میں

اسی دن سے ڈرتا تھا' کاش میں نے اس زندگی کے لئے کچھ آگے بھیجا ہوتا' کاش میں پیغمبر کے بتلائے ہوئے راستے پر چلا ہوتا کاش میں نے فلاں کو اپنا دوست نہ بنایا ہوتا' کاش میں نے فلاں کو اپنا دوست بنایا ہوتا' کاش میں اپنے دامن میں مٹی ہوتا' کاش میں معدوم ہوتا' کاش میری ماں نے مجھے نہ جنا ہوتا' اس وقت تجھے آگ کے شعلے اپنے دامن میں لے لینگے' اور اعلان کرنے والا یہ اعلان کرے گا :-

اِخْسَئُوْا فِیْھَا وَلَا تُکَلِّمُوْنَ (پ۱۸ر۶ آیت ۱۰۸)

تم اسی (جہنم) میں راندے ہوئے پڑے رہو اور مجھ سے بات مت کرو۔

چیخنے چلانے' سانس لینے' اور مدد کے لئے پکارنے کی کوئی گنجائش نہیں ہوگی' اب تو اپنی عقل سے اسکی رائے دریافت کر' یہ تمام خطرات تیرے سامنے ہیں' اگر تو ان پر ایمان نہیں رکھتا تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ تجھے جہنم کے طبقات میں مشرکین اور کفار کے ساتھ دیر تک رہنا ہے' اور اگر تو ایمان رکھتا ہے لیکن غافل ہے' اور اس کے لئے تیاری کرنے کو اہمیت نہیں دیتا تو یہ بڑے خسارے کی بات ہے' یہ بھی سرکشی کی ایک علامت ہے' بھلا ایسے ایمان سے کیا فائدہ جو تجھے ترک معصیت اور اطاعت کے ذریعے رضائے الٰہی کے لئے سعی و عمل پر نہیں اکساتا' بالفرض پل صراط کے خطرہ کے علاوہ قیامت کے دوسرے خطرات نہ ہوں' اور صرف یہی دہشت ہو کہ میں اس تنگ اور خطرناک رہ گزر سے گزر بھی سکتا ہوں یا نہیں صرف یہی دہشت تیرے لئے ایک زبردست تازیانہ' عمل پر ایک طاقتور محرک ہونی چاہیے' سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ پل صراط جہنم کے اوپر رکھا جائے گا' اور رسولوں میں پہلا شخص میں ہوں گا جو اپنی امت کو لے کر اترے گا' اور اس دن انبیاء کے علاوہ کسی کو اذن کلام نہ ہوگا' اور انبیاء بھی صرف اس قدر کہیں گے اے اللہ سلامت رکھ' اے اللہ سلامتی عطا کر' اور جہنم میں سعدان کے کانٹوں جیسے کانٹے ہوں گے' کیا تم نے سعدان کے کانٹے دیکھے ہیں' لوگوں نے عرض کیا جی ہاں یا رسول اللہ! ہم نے دیکھے ہیں' آپ نے فرمایا دوزخ کے کانٹے سعدان کے کانٹوں جیسے ہونگے تاہم ان کا طول و عرض کوئی نہیں جانتا' یہ کانٹے انسانوں کو انکے اعمال کے مطابق اچکیں گے' بعض لوگ اپنے اعمال کی وجہ سے ہلاک ہو جائیں گے' اور بعض رائی بن جائیں گے پھر بچ جائیں گے (بخاری و مسلم۔ ابو ہریرہؓ) حضرت ابو سعید الخدریؓ روایت کرتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا لوگ پل صراط سے گزریں گے' اور اس پر کانٹے اور آنکڑے لگے ہوں گے' اور وہ لوگوں کو دائیں بائیں سے اچکیں گے' اور پل صراط کے دونوں جانب کھڑے ہوئے فرشتے کہیں گے اے اللہ سلامتی عطا کر' اے اللہ سلامتی عطا کر' بعض لوگ برق کی طرح گزر جائیں گے' بعض ہوا کی مانند' بعض تیز رو گھوڑے کی طرح' بعض دوڑتے ہوئے' بعض پیدل چلنے کے انداز میں' بعض گھٹنوں کے بل' اور بعض گھسٹتے ہوئے' اور جو لوگ دوزخ میں رہیں گے' وہ نہ مریں گے' نہ زندہ رہیں گے' لیکن جو لوگ اپنے گناہوں کی پاداش میں جہنم کے اندر ڈالے جائیں گے' وہ جل کر کوئلہ بن جائیں گی پھر شفاعت کی اجازت ہوگی (بخاری و مسلم) حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ روایت کرتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تمام اولین و آخرین کو قیامت کے دن جمع کرے گا سب لوگ چالیس برس تک آسمان کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے رہیں گے' اور حکم الٰہی کے منتظر کھڑے رہیں گے (اس حدیث میں تجود مومنین تک واقعات کا ذکر ہے اور یہ واقعات پہلے بھی گزر چکے ہیں) پھر اللہ تعالیٰ مومنین سے ارشاد فرمائے گا اپنے سر اٹھاؤ' وہ لوگ اپنے سر اٹھائیں گے' اور انھیں انکے اعمال کے بقدر نور عطا کیا جائے گا' بعض لوگوں کو جبل عظیم کے بقدر نور عطا کیا جائے گا' جو اسکے سامنے چل رہا ہوگا' اور بعض کو اس سے چھوٹا نور عطا کیا جائے گا' اور بعض کو نخلے کے برابر نور دیا جائے گا' اور بعض کو اس سے بھی کم' سب سے آخر میں جس شخص کو نور ملے گا وہ اسکے پیر کے انگوٹھے پر ہوگا' کبھی وہ نور چمکے گا' اور وہ مدھم پڑ جائے گا' جب چمکے گا تو وہ قدم اٹھائے گا اور آگے بڑھ جائے گا' اور جب تاریک ہو جائے گا تو کھڑا ہو جائے گا' اسکے بعد حدیث شریف میں پل صراط سے لوگوں کے گزرنے کی تفصیل بیان کی گئی ہے کہ سب اپنے اپنے نور کے مطابق گزریں گے' بعض لوگ پلک جھپکنے کی مدت

میں گزر جائیں گے، بعض لوگ برق کی رفتار سے، اور بعض ستاروں کے گرنے کی طرح، اور بعض گھوڑے کے دوڑنے کی رفتار سے، اور بعض آدمی کے دوڑنے کی رفتار سے گزریں گے، یہاں تک کہ وہ شخص جسے اسکے پاؤں کے انگوٹھے پر نور عطا کیا گیا تھا، اپنے چہرے، ہاتھوں، اور پیروں پر گھسٹتا ہوا چلے گا، ایک ہاتھ آگے بڑھائے گا تو دوسرا معلق ہو جائے گا، ایک پیر بڑھائے گا تو رہ جائے گا، اور اسکے اعضاء تک جہنم کی آگ پہنچ رہی ہے، وہ اسی حالت میں گھسٹتا ہوا پل صراط عبور کرنے کے بعد وہ وہاں کھڑا ہو کر کہے گا میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ مجھے ایسی نجات دی جو کسی کو نہیں دی، اور مجھے اس وقت بچایا جب میں اسے دیکھ چکا تھا، پھر وہ باب جنت کے پاس ایک تالاب پر جائے گا اور غسل کرے گا (ابن عدی، حاکم)۔

حضرت انس ابن مالکؓ روایت کرتے ہیں کہ میں نے سنا ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے تھے پل صراط تلوار کی تیزی یا دھار کی تیزی کی طرح ہے، اور فرشتے مومن مردوں اور مومن عورتوں کو بچاتے ہوں گے اور جبرئیل علیہ السلام میری کمر پکڑے ہوئے ہوں گے، اور میں یہ کہہ رہا ہوں گا رب کریم سلامتی عطا کر، اے اللہ سلامتی عطا کر، تاہم اس روز لغزش کرنے والے مرد اور لغزش کرنے والی عورتیں زیادہ ہوں گی (بیہقی)۔

یہ پل صراط کے احوال اور مصائب ہیں، تمہیں ان میں سے زیادہ سے زیادہ فکر کرنا چاہئے، اسلئے کہ قیامت کے دن لوگوں میں زیادہ سلامت وہ شخص رہے گا جو دنیا میں رہ کر ان احوال میں زیادہ فکر کرے گا، اللہ تعالیٰ کسی بندے پر دو خوف جمع نہیں کرتا، چنانچہ جو شخص ان احوال و خطرات سے دنیا میں ڈرتا ہے وہ آخرت میں مامون رہتا ہے، خوف سے میری مراد عورتوں جیسی رقت نہیں ہے کہ جب ان احوال کا ذکر ہو تو آنکھیں بھر آئیں یہ دل میں رقت پیدا ہو جائے، اور بہت جلد انھیں فراموش بھی کردو، اور اپنے لہو لعب میں لگ جاؤ، یہ چیز خوف نہیں ہے، بلکہ جو شخص کسی چیز سے ڈرتا ہے وہ اس سے بھاگتا ہے، اور جو شخص کسی چیز کی امید رکھتا ہے وہ اسے طلب کرتا ہے، تمہارے لئے صرف وہی خوف باعث نجات ہو سکتا ہے، جو تمہیں اللہ تعالیٰ کے معاصی سے روکے، اور اسکی اطاعت پر آمادہ کرے، عورتوں کے خوف سے بھی زیادہ برا ان احمقوں کا خوف ہے جو قیامت وغیرہ کا ذکر سن کر زبان سے استعاذہ کرتے ہیں، اور کہتے ہیں استعنت باللہ، نعوذ باللہ، اللّٰھم سلم سلم، اور اس کے باوجود وہ ان معاصی پر اصرار کرتے ہیں جن کے پیچھے قلعہ ہو، اور سامنے سے خطرناک درندہ حملہ کرنا چاہتا ہو، جب وہ شخص یہ دیکھتا ہے کہ درندے نے پنا جبڑا کھول لیا ہے، اور اب وہ حملہ کرنے والا ہے تو زبان سے کہنے لگتا ہے میں اس مضبوط قلعے کی پناہ چاہتا ہوں، اور اسکی محکم بنیادوں اور پختہ دیواروں اور ستونوں کا خواہاں ہوں بھلا اگر کوئی شخص زبان سے یہ الفاظ ادا کر رہا ہو، اور اپنی جگہ چپٹا کھڑا ہو تو یہ الفاظ اسے حملہ آور درندے سے کیسے بچا پائیں گے، یہی حال آخرت کے خطرات اور مصائب کا ہے، یہ خطرات سامنے سے آرہے ہیں، اور پشت پر لا الہ الا اللہ کا قلعہ موجود ہے، محض زبان سے کلمہ لا الہ الا اللہ کہنا کافی نہیں ہے، بلکہ صدق دل کے ساتھ کہنا ضروری ہے، اور صدق کے معنی یہ ہیں کہ کہنے والے کا کوئی اور مقصود و معبود اللہ کے سوا نہ ہو، جو شخص خواہش نفس کو اپنا معبود سمجھتا ہے، وہ صدق توحید سے دور ہے، اور اس کا معاملہ خطرے سے پُر ہے، اگر آدمی سے یہ سب کچھ نہ ہو سکے تو اسے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا محب، آپ کی سنن کی تعظیم پر حریص، اور آپ کی امت کے نیک قلوب کی خاطرداری کا مشتاق، اور ان کی دعاؤں کی برکات کا طالب ہونا چاہئے، ہو سکتا ہے اس طرح اسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت یا آپ کی امت کے بزرگوں کی شفاعت نصیب ہو جائے، اور معمولی سرمایہ رکھنے کے باوجود شفاعت کے ذریعے نجات پانے میں کامیاب ہو جائے۔

شفاعت : جب مومنین کے بعض گروہوں پر دوزخ میں جانا واجب ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے انکے باب میں انبیاء کرام اور صدیقین، بلکہ علماء اور صالحین کی شفاعت قبول فرماتا ہے بلکہ جس شخص کا بھی اللہ تعالیٰ کے یہاں کوئی مرتبہ یا حسن معاملہ ہے اسے اپنے اہل و عیال، قرابت داروں، دوستوں، اور واقف کاروں کے باب میں شفاعت کا حق عطا کیا جاتا ہے، اسلئے تمہیں یہ کوشش کرنی چاہئے کہ لوگوں کا یہاں مرتبۂ شفاعت حاصل کرسکو، اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ تم کبھی کسی انسان کی تحقیر مت

کرو' اللہ تعالیٰ نے اپنی ولایت بندوں میں پوشیدہ رکھی ہے' ہو سکتا ہے جس شخص کو تم حقارت کی نظر سے دیکھ رہے ہو' وہ اللہ کا ولی ہو' اور نہ کسی معصیت کو معمولی تصور کرو' اسلئے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا غضب معاصی میں مخفی کردیا ہے' ہو سکتا ہے جس گناہ کو تم معمولی سمجھ رہے ہو وہی غضب الٰہی کا باعث ہو' اور نہ کسی عبادت و اطاعت کو حقیر جانو اسلئے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی رضا طاعات میں ودیعت فرمائی ہے' ہو سکتا ہے جس اطاعت کو تم حقیر سمجھ رہے ہو وہی اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا سبب ہو' وہ اطاعت خواہ ایک اچھا کلمہ ہو' یا ایک لقمہ ہو' یا ایک اچھی نیت ہو' یا ان جیسی کوئی اطاعت ہو۔

شفاعت کے دلائل قرآن کریم اور روایات میں بھی بے شمار ہیں' اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :۔

وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَىٰ (۳۰ ر ۱۸ آیت ۵)

اور عنقریب اللہ تعالیٰ آپ کو (نعمتیں) دے گا سو آپ خوش ہو جائیں گے۔

حضرت عمرو ابن العاصؓ سے مروی ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ قول تلاوت فرمایا :۔

رَبِّ إِنَّهُنَّ أَضْلَلْنَ كَثِيرًا مِّنَ النَّاسِ فَمَن تَبِعَنِي فَإِنَّهُ مِنِّي وَمَنْ عَصَانِي فَإِنَّكَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ (پ ۱۳ ر ۱۸ آیت ۳۶)

اے میرے پروردگار! ان بتوں نے بہتیرے آدمیوں کو گمراہ کردیا' پھر جو شخص میری راہ پر چلے گا وہ تو میرا ہی ہے اور جو شخص میرا کہنا نہ مانے گا سو آپ تو کثیر الرحمت ہیں۔

اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا یہ قول بھی تلاوت فرمایا :۔

إِن تُعَذِّبْهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ (پ ۷ ر ۶ آیت ۱۱۸)

اگر آپ انکو سزا دیں تو یہ آپ کے بندے ہیں۔

پھر آپ نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے' اور فرمایا میری امت میری امت' اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام سے فرمایا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جاؤ' اور ان سے پوچھو کہ وہ کیوں روتے ہیں؟ جبرئیل علیہ السلام حاضر ہوئے اور رونے کا سبب دریافت کیا' آپ نے سبب بتلایا کہ اللہ ہی جانتا ہے وہ سبب کیا تھا' اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے جبرئیل محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جاؤ اور ان سے کہو کہ ہم آپ کی امت کے بارے میں آپ کو خوش کردیں گے' تکلیف نہیں دیں گے (مسلم۔ عبداللہ ابن عمرو ابن العاصؓ)۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ مجھے پانچ چیزیں ایسی دی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے انبیاء کو عطا نہیں کی گئیں مجھے ایک ماہ کے فاصلے کا رعب عطا کیا گیا ہے' دوسری یہ ہے کہ میرے لئے غنائم حلال کئے گئے ہیں' مجھ سے پہلے کسی کے لئے حلال نہیں تھے' تیسری چیز یہ کہ میرے لئے زمین کو مسجد اور اسکی خاک کو پاک کرنے والا بنایا گیا ہے' میری امت کے جس شخص پر نماز کا وقت آجائے اسے نماز پڑھنی چاہیے' اور چوتھی چیز یہ کہ مجھے شفاعت عطا کی گئی ہے' اور پانچویں چیز یہ کہ ہر نبی اپنی قوم کی طرف منسوب ہوا ہے' اور میں تمام انسانوں کی طرف مبعوث ہوا ہوں (بخاری و مسلم۔ جابرؓ) سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جب قیامت کا دن ہوگا تو میں انبیاء کا امام و خطیب اور ان کی شفاعت کرنے والا ہوں گا' اور اس میں کوئی فخر کی بات نہیں ہے (ترمذی' ابن ماجہ۔ ابی ابن کعبؓ) ایک روایت میں ہے آپ نے ارشاد فرمایا: میں اولاد آدم کا سردار ہوں' اور اس میں کوئی فخر کی بات نہیں ہے' اور میں ان سب لوگوں میں پہلا ہوں جو زمین پھٹنے پر نکلیں گے' اور اولین سفارشی ہوں' اور سب سے پہلے میری سفارش قبول ہوگی' میرے ہاتھ میں حمد کا پرچم ہوگا اور اس کے نیچے آدم اور دوسرے انبیاء ہوں گے (ترمذی' ابن ماجہ۔ سعید الخدریؓ) ایک روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا ہر نبی کی ایک دعا قبول ہوتی ہے' میں چاہتا ہوں کہ اپنی دعا کو قیامت کے دن اپنی امت کی سفارش کے لئے چھپائے رکھوں (بخاری و مسلم۔ انسؓ) حضرت عبداللہ ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی

اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا انبیاء کے لئے سونے کے منبر کھڑے کیے جائیں گے اور وہ ان پر بیٹھ جائیں گے' مگر میرا منبر خالی رہے گا' میں اس پر نہیں بیٹھوں گا' اور اپنے رب کے سامنے اس خوف سے کھڑا رہوں گا کہ کہیں میں جنت میں نہ بھیج دیا جاؤں اور میری امت میرے بعد باقی رہ جائے میں عرض کروں گا الٰہی میری امت' اللہ تعالیٰ فرمائے گا اے محمد آپ اپنی امت کے ساتھ کیا سلوک کرانا چاہتے ہیں' میں عرض کروں گا یا اللہ! ان کا حساب جلد لیجئے' میں شفاعت کرتا رہوں گا یہاں تک کہ مجھے ان لوگوں کی برأت کا پروانہ مل جائے گا جنھیں دوزخ میں بھیج دیا گیا تھا' اور داروغۂ جہنم مالک مجھ سے کہے گا اے محمد! آپ نے اپنی امت میں سے دوزخ میں اپنے رب کے غضب کے لئے کچھ نہ چھوڑا (طبرانی) ایک حدیث میں ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ میں قیامت کی دن زمین کے پتھروں اور ڈھیلوں (کی تعداد) سے زیادہ انسانوں کے لئے شفاعت کروں گا (طبرانی' بریدہ) حضرت ابو ہریرۃ کی روایت ہیکہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں گوشت لایا گیا' اور آپ کو بازو پیش کیا گیا (گوشت کا) یہ حصہ آپ کو مرغوب تھا آپ نے اس میں سے دانتوں سے کاٹا' پھر فرمایا میں قیامت کے دن انبیا کا سردار ہوں گا' کیا تم جانتے ہو کہ کس وجہ سے اللہ تعالیٰ تمام اولین و آخرین کو ایک میدان میں جمع فرمائے گا' اور پکارنے والے کی آواز انہیں سنائے گا اور انھیں نظر کے سامنے رکھے گا' اور آفتاب قریب ہوگا' اور لوگوں پر ناقابل برداشت غم اور تکلیف ہوگی' اور بعض لوگ بعض سے کہیں گے کیا اپنی تکلیف کا احساس نہیں کیا' کیا تم کسی ایسے شخص کو تلاش نہیں کرو گے' جو تمہارے لئے تمہارے رب سے سفارش کر سکے' بعض بعض سے کہیں گے کہ تمہیں حضرت آدم علیہ السلام کے پاس چلنا چاہئے' لوگ حضرت آدم علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوں گے اور عرض کریں گے کہ آپ ابوالبشر ہیں' آپ کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ سے پیدا فرمایا ہے' اور آپ میں اپنی روح پھونکی ہے' اور ملائکہ کو حکم دیا ہے (کہ وہ آپ کو سجدہ کریں) اور انھوں نے آپ کو سجدہ کیا ہے' آپ اپنے رب سے ہمارے لئے سفارش فرمایئے' کیا آپ نہیں دیکھتے کہ ہم کس مصیبت میں گرفتار ہیں' اور کس تکلیف میں مبتلا ہیں' حضرت آدم علیہ السلام ان سے فرمائیں گے میرا رب آج اس قدر غضب ناک ہیکہ اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا' اور نہ اسکے بعد کبھی ہوگا' اور اللہ تعالیٰ نے مجھے درخت سے منع فرمایا تھا (مگر) میں نے نافرمانی کی تھی' میں خود اپنی پریشانی میں ہوں' کسی اور کے پاس جاؤ' نوح علیہ السلام کے پاس جاؤ' لوگ حضرت نوح علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوں گے' اور عرض کریں گے کہ آپ اہل زمین کی طرف سب سے پہلے رسول بنا کر بھیجے گئے تھے' اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو عبد شکور کے خطاب سے نوازا ہے' ہمارے لئے اپنے رب سے شفاعت فرمائیں' آپ ہماری پریشانی دیکھ ہی رہے ہیں حضرت نوح علیہ السلام فرمائیں گے کہ میرا رب آج اس قدر غصے میں ہے کہ اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا اور نہ آج کے بعد کبھی ہوگا' میں نے اپنی قوم کے خلاف بددعا کی تھی' میں اپنی مصیبت میں گرفتار ہوں' کسی دوسرے کو پکڑو' ابراہیم خلیل اللہ کے پاس جاؤ' وہ لوگ حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے پاس جائیں گے اور عرض کریں گے کہ آپ دنیا والوں میں اللہ کے نبی اور دوست ہیں' کیا آپ ہماری تکلیف نہیں دیکھ رہے ہیں؟ ہمارے لئے شفاعت کیجئے' حضرت ابراہیم علیہ السلام فرمائیں گے کہ میرا رب آج اس قدر غضب ناک ہے کہ اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا اور نہ اس کے بعد کبھی ہوگا اور میں نے تین مرتبہ جھوٹ بولا تھا' اللہ انھیں یاد دلائے گا' مجھے آج خود اپنی پڑی ہے' دوسروں کے پاس جاؤ' حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس جاؤ' لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوں گے اور عرض کریں گے کہ اے موسیٰ! آپ اللہ کے رسول ہیں' اللہ نے آپ کو اپنے کلام اور پیغمبری سے لوگوں پر فضیلت بخشی' آپ ہماری حالت پر نظر فرماتے ہوئے اپنے رب سے ہماری سفارش کر دیجئے' حضرت موسیٰ علیہ السلام فرمائیں گے کہ میرا رب آج اس قدر ناراض ہے کہ نہ اس سے پہلے کبھی ہوا' اور نہ آئندہ کبھی ہوگا' میں نے ایک ایسے آدمی کو قتل کر دیا تھا' جس کے قتل کا مجھے حکم نہیں دیا گیا تھا' میں خود مصیبت میں پڑا ہوں' کسی اور کو پکڑو' حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس جاؤ' لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس پہنچیں گے' اور عرض کریں گے کہ آپ اللہ کے رسول اور اسکے کلمے ہیں جسے اس نے مریم کی طرف ڈالا تھا' اور اللہ کی روح ہیں' اور آپ نے لوگوں سے اس وقت کلام کیا جب آپ گود میں تھے آپ اپنے رب سے ہماری

سفارش فرمائیں ہم نہایت پریشان ہیں' حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرمائیں گے کہ میرا رب آج اس قدر غیظ میں ہے کہ نہ اس سے پہلے کبھی ہوا تھا اور نہ آئندہ کبھی ہو گا (آپ نے اپنی کوئی خطایان نہیں (فرمائی) میں خود اپنی پریشانی میں ہوں' تم کسی اور کے پاس جاؤ' لوگ میرے پاس آئیں گے' اور کہیں گے کہ اے محمد! آپ اللہ کے رسول ہیں' خاتم النبیین ہیں' اللہ تعالیٰ نے آپ کے اگلے پچھلے گناہ معاف فرمائے ہیں' آپ اپنے رب سے ہماری سفارش فرمادیں' آپ دیکھ ہی رہے ہیں ہم کس مصیبت میں ہیں' چنانچہ میں چلوں گا اور عرش کے نیچے آؤں گا' اور اپنے رب کے سامنے سربسجود ہو جاؤں گا' پھر اللہ تعالیٰ اپنے محامد اور حسن ثناء سے میرے اوپر وہ چیز کھول دے گا' جو مجھ سے پہلے کسی پر نہیں کھولی گئی تھی' پھر کہا جائے گا اپنا سر اٹھاؤ' جو مانگو گے دیا جائے گا' اور جو سفارش کرو گے وہ قبول کی جائے گی' میں کہوں گا الٰہی! میری امت' پھر کہا جائے گا اے محمد اپنی امت کے ان لوگوں کو جن پر حساب نہیں ہے جنت کے دائیں دروازے سے پہنچادو' اور دوسرے دروازوں میں تمہاری امت کے لوگ دوسروں کے ساتھ شریک ہیں' اسکے بعد آپ نے فرمایا اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے جنت کے دو کواڑوں کا درمیانی فاصلہ اس قدر ہے جس قدر مکہ اور حمیر کے درمیان یا مکہ اور بصرے کے درمیان ہے (بخاری و مسلم) ایک حدیث میں یہ تمام مضمون وارد ہوا ہے اور اسمیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی خطائیں بھی بیان فرمائی گئی ہیں کہ آپ نے کوکب کے متعلق فرمایا تھا ھٰذَا رَبِّیْ (یہ میرا رب ہے) یا مشرکین کے معبودوں کے متعلق فرمایا تھا بَلْ فَعَلَهٗ كَبِيْرُهُمْ (بلکہ یہ کام ان بتوں کے بڑے نے کیا ہے) یا ایک مرتبہ فرمایا تھا اِنِّیْ سَقِیْمٌ (میں بیمار ہوں) (مسلم)

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کا حال ہے جو مذکور ہوا' امت کے دوسرے لوگوں جیسے علماء اور صلحاء وغیرہ انھیں بھی شفاعت کا حق حاصل ہو گا' چنانچہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ میری امت کے ایک فرد کی شفاعت سے قبیلۂ ربیع و مضر کی تعداد سے زیادہ آدمی جنت میں جائیں گے (جزء ابی عمرابن السماک۔ ابو امامہؓ) ایک حدیث میں ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ایک شخص سے کہا جائے اٹھ کھڑا ہو' اور شفاعت کر' وہ کھڑا ہو گا' اور قبیلے کے لئے' گھر والوں کے لئے' ایک آدمی کیلئے' یا دو آدمیوں کے لئے اپنے عمل کے بقدر شفاعت کرے گا' (ترمذی' ابو سعیدؓ' بزار۔ انسؓ) حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ قیامت کے دن ایک جنتی شخص دوزخ والوں پر جھانکے گا' کوئی دوزخی اسے پکارے گا اور کہے گا اے فلاں شخص کیا تو مجھے جانتا ہے' وہ کہے گا نہیں! بخدا میں تجھے نہیں جانتا تو کون ہے؟ وہ کہے گا میں وہ ہوں کہ تو دنیا میں میرے پاس سے گزرا تھا اور تو نے پانی کا ایک گھونٹ مانگا تھا اور میں نے تجھے پانی پلایا تھا' جنتی کہے گا میں نے تجھے پہچان لیا ہے' دوزخی کہیگا تو اپنے رب کے پاس جاکر میرے اس سلوک کے حوالے سے میری شفاعت کر' وہ اللہ تعالیٰ سے یہ حال بیان کرنے کی اجازت مانگے گا اور عرض کرے گا کہ میں دوزخ والوں پر جھانک رہا تھا' اچانک ایک دوزخی نے مجھے آواز دی' اور کہنے لگا کیا تو مجھے پہچانتا ہے' میں نے کہا نہیں' میں نہیں جانتا تو کون ہے؟ اس نے کہا میں وہی ہوں جس سے تو نے پینے کے لئے پانی طلب کیا تھا اور میں نے تجھے پانی پلایا تھا' اسلئے تو اپنے رب سے میرے لئے سفارش کردے' یا اللہ! تو اس شخص کے متعلق میری سفارش قبول فرما' چنانچہ اللہ تعالیٰ اس کی سفارش قبول فرمائے گا اور اسے دوزخ سے نکالنے کا حکم دے گا (ابو منصور دیلمی) حضرت انسؓ کی ایک روایت میں ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب لوگ قبروں سے اٹھیں گے تو میں ان میں سب سے پہلے اٹھوں گا' اور جب وہ میرے پاس آئیں گے تو میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ان کی طرف سے بولنے والا ہوں گا' اور جب وہ مایوس ہو جائینگے تو میں ان کو بشارت دینے والا ہوں گا' حمد کا پرچم اس دن میرے ہاتھوں میں ہو گا' اور میں اولاد آدم میں اپنے رب کے نزدیک سب سے زیادہ مکرم رہوں گا اور اسمیں کوئی فخر نہیں ہے (ترمذی) ایک موقع پر سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میں اپنے رب کریم کے سامنے کھڑا ہوں گا' اور میرے بدن پر جنت کے لباسوں میں سے ایک لباس ہو گا' پھر میں عرش کے دائیں جانب ایسی جگہ کھڑا ہوں گا جہاں مخلوق میں سے کوئی میرے سوا کھڑا نہیں ہو گا (ترمذی۔ ابو ہریرہؓ) حضرت عبداللہ ابن عباسؓ روایت کرتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ اصحاب آپ کے انتظار میں بیٹھے ہوئے تھے' اتنے میں آپ باہر تشریف لائے' جب ان لوگوں سے قریب

ہوئے تو انہیں بحث کرتے ہوئے سنا' آپ نے ان کی بات چیت سنی کوئی کہہ رہا تھا تعجب ہے اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق میں سے کسی کو خلیل بنایا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بنایا' دوسرے نے کہا یہ بات حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کلام سے زیادہ تعجب انگیز نہیں ہے' اللہ تعالیٰ نے آپ سے کلام فرمایا' ایک شخص نے کہا اور عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے کلمہ اور اس کی روح ہیں۔ کسی نے کہا حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ نے برگزیدہ بنایا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان لوگوں کے پاس تشریف لائے اور انہیں سلام کیا' اور ارشاد فرمایا کہ میں نے لوگوں کی گفتگو سنی ہے' اور اس امر پر تعجب کرتے ہوئے سنا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ کے خلیل ہیں' واقعی وہ ایسے ہی ہیں' اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ سے کلام کرنے والے ہیں اور وہ ایسے ہی ہیں' اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام روح اللہ اور کلمۃ اللہ ہیں اور وہ ایسے ہی ہیں' اور حضرت آدم علیہ السلام اللہ کے برگزیدہ بندے ہیں' اور وہ واقعۃً ایسے ہی ہیں' آگاہ رہو میں حبیب خدا ہوں' اور کچھ فخر نہیں' اور قیامت کے دن حمد کا پرچم اٹھاؤں گا اور کوئی فخر نہیں' اور میں قیامت کے روز سب سے پہلے شفاعت کروں گا' اور میری شفاعت سب سے پہلے قبول کی جائے گی' اور کوئی فخر نہیں' اور میں سب سے پہلے جنت کے دروازے کی زنجیر ہلاؤں گا اور اس میں فخر نہیں' اللہ تعالیٰ میرے لئے جنت کے دروازے کھول دے گا اور میں اس میں داخل ہو جاؤں گا اور میرے ساتھ مومنین کے فقراء ہوں گے اور اس میں فخر نہیں' اور میں اولین و آخرین میں سب سے برگزیدہ ہوں' اور کوئی فخر نہیں (ترمذی)

<u>حوض کوثر</u> : حوض ایک گراں قدر عطیہ ہے جو اللہ ربّ العزت نے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص فرمایا ہے' روایات میں اسکا ذکر موجود ہے' ہم امید کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں دنیا میں اسکا علم اور آخرت میں اس کا ذائقہ عطا فرمائے گا' اس کا ایک اہم وصف یہ ہے کہ جو شخص اس حوض کا پانی پی لے گا وہ کبھی پیاسا نہ ہوگا' حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہلکی نیند لی' پھر مسکراتے ہوئے اپنا سر مبارک اٹھایا' صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ کیوں مسکرا رہے ہیں؟ فرمایا ایک آیت مجھ پر ابھی نازل ہوئی ہے' اس کے بعد آپ نے سورۃ الکوثر تلاوت کی پھر دریافت کیا تم جانتے ہو کوثر کیا چیز ہے' لوگوں نے عرض کیا اللہ و رسول زیادہ جاننے والے ہیں' فرمایا یہ ایک نہر ہے' جس کا میرے رب نے مجھ سے جنت میں وعدہ کیا ہے' اس پر بڑی برکات ہیں' یہاں ایک حوض ہے جس پر میری امت قیامت کے دن آئے گی' اس کے برتن اتنے ہیں جتنے آسمان میں ستارے (مسلم) حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب میں جنت کی سیر کر رہا تھا تو مجھے ایک ایسی نہر نظر آئی جس کے دونوں جانب خالی موتیوں کے قبے بنے ہوئے تھے' میں نے پوچھا اے جبرئیل! یہ کیا ہے؟ انھوں نے کہا یہ کوثر ہے جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا فرمائی ہے' پھر فرشتے نے اس پر اپنا ہاتھ مارا تو دیکھا کہ اس کی مٹی مشک اذفر ہے (ترمذی) حضرت انسؓ کی ایک اور روایت میں ہے کہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ میری حوض کے دونوں طرف کی پتھریلی زمین کے درمیان اس قدر فاصلہ ہے جس قدر مدینہ اور صنعاء کے درمیان ہے' یا مدینے اور عمان کے درمیان ہے (مسلم) حضرت عبداللہ ابن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ جب سورۂ کوثر نازل ہوئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ یہ جنت میں ایک نہر ہے' اسکے دونوں کنارے سونے کے ہیں' اور اسکا پانی دودھ سے زیادہ سفید' اور شہد سے زیادہ میٹھا' اور مشک سے زیادہ خوشبودار ہے' یہ پانی موتیوں اور مونگوں پر بہتا ہے' (ترمذی باختلاف اللفظ) سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام حضرت ثوبانؓ روایت کرتے ہیں کہ سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میرا حوض عدن سے بلقاء کے عمان تک (وسیع) ہے اس کا پانی دودھ سے زیادہ سفید' اور شہد سے زیادہ شیریں' اور اسکے برتن ستاروں کی تعداد کے برابر ہیں' جو اسمیں سے ایک گھونٹ پی لیتا ہے' وہ اسکے بعد کبھی پیاسا نہیں ہوتا' اس پر سب سے پہلے پہنچنے والے فقراء مہاجرین ہوں گے' حضرت عمر ابن الخطاب نے عرض کیا یا رسول اللہ! وہ کون ہوں گے' فرمایا وہ لوگ ہیں جن کے بال پراگندہ اور کپڑے میلے ہوتے ہیں' اور جو راحت پسند عورتوں سے نکاح نہیں کرتے' اور نہ اسکے لئے محلوں کے دروازے وا ہوتے ہیں (ترمذی' ابن ماجہ)

یہ حدیث سننے کے بعد حضرت عمرابن عبدالعزیزؒ نے ارشاد فرمایا کہ میں نے ناز و نعم والی عورت یعنی فاطمہ بنت عبدالملک سے نکاح کیا ہے' اور میرے لئے محلوں کے دروازے بھی کھولے گئے ہیں (اس لئے مجھے جنت میں داخل ہونے کی امید نہیں) الاّ یہ کہ اللہ تعالیٰ مجھ پر رحم فرمائے' اب آئندہ میں کبھی اپنے سر میں تیل نہ لگاؤں گا تاکہ بال پراگندہ ہو جائیں' اور اپنے بدن کے کپڑے نہ دھوؤں گا یہاں تک کہ وہ میلے ہو جائیں۔

حضرت ابوذرؓ روایت کرتے ہیں کہ میں نے عرض کیا یارسول اللہ! حوض کے برتن کیسے ہیں؟ فرمایا اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے' اسکے برتن تاریک اور صاف (بادل اور گرد و غبار سے) رات کے آسمان پر طلوع ہونے والے ستاروں سے زیادہ ہیں جو شخص اسمیں سے پئے گا وہ کبھی پیاسا نہ ہوگا' اس میں دو آبشار جنت سے گرتے ہیں' اسکی چوڑائی عمان اور ایلا کی درمیانی مسافت کے برابر ہے اسکا پانی دودھ سے زیادہ سفید اور شہد سے زیادہ شیریں ہے (مسلم) حضرت سمرہؓ بیان کرتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ہر نبی کے لئے ایک حوض ہے' تمام انبیاء ایک دوسرے پر اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ کس کے حوض پر کتنے زیادہ آدمی آئے ہیں' مجھے امید ہے کہ میرے حوض پر سب سے زیادہ آدمی آئیں گے (ترمذی)۔

یہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی امید اور آرزو ہے' اسلئے ہر شخص کو یہی کوشش کرنی چاہئے کہ وہ بھی حوض پر وارد ہونے والوں میں سے ہو' اور فریب آرزو سے احتراز کرے' اسلئے کہ کھیتی کاٹنے کی امید وہی کرتا ہے جو بیج بوتا ہے' زمین صاف کرتا ہے اور اسے پانی دیتا ہے' پھر اللہ تعالیٰ کے فضل پر اعتماد کرکے بیٹھتا ہے کہ وہ اسکی کھیتی اگائے گا اور آسمانی بجلی وغیرہ کی آفات سے محفوظ رکھے گا' یہاں تک کہ کھیتی پک جائے اور اسکے کاٹنے کا زمانہ آجائے' جو شخص کھیتی نہیں کرتا' زمین نہیں جوتتا' اسے صاف نہیں کرتا' پانی نہیں دیتا اور اللہ کے فضل سے یہ آس لگائے بیٹھ جاتا ہے کہ اسکے لئے غلے اور میوے پیدا ہوں گے' وہ مبتلائے فریب اور بے وقوف ہے' امید رکھنے والوں میں سے نہیں ہے عام طور پر لوگ اسی طرح کی رجاء رکھتے ہیں' یہ احمقوں کا مغالطہ ہے' ہم اس غرور و غفلت سے اللہ کی پناہ چاہتے ہیں تاکہ اللہ تعالیٰ کے باب میں فریب کا شکار نہ ہوں' دنیا سے فریب کھانے سے زیادہ سنگین کوئی عمل نہیں ہے' اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ (پ ۲۲ ر ۱۳ آیت ۵)

سو ایسا نہ ہو کہ یہ دنیوی زندگی تم کو دھوکے میں ڈالے رکھے' اور ایسا نہ ہو کہ تم کو دھوکہ باز شیطان اللہ سے دھوکے میں ڈال دے۔

<u>جہنم اور اس کے وحشتناک عذاب</u>: اے نفس سے غافل' اور دنیا کے فریب میں مبتلا تو اس دنیا میں منہمک ہے جو بہت جلد فنا ہونے والی ہے' تو اس چیز میں فکر کرنا چھوڑ دے' جس سے تو رخصت ہونے والا ہے' اور اس چیز کی فکر کر جس کے پاس تجھے پہنچنا ہے' تجھے خبر دی گئی ہے کہ دوزخ تمام لوگوں کے وارد ہونے کی جگہ ہے:۔

وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّنَذَرُ الظّٰلِمِيْنَ فِيْهَا جِثِيًّا (پ ۱۶ ر ۸ آیت ۷۱-۷۲)

اور تم میں سے کوئی بھی نہیں جس کا اس پر سے گزر نہ ہو' یہ آپ کے رب کے اعتبار سے لازم ہے جو پورا ہو کر رہے گا پھر ہم ان لوگوں کو نجات دے دیں گے جو خدا سے ڈرتے تھے' اور ظالموں کو اس میں ایسی حالت میں رہنے دیں گے کہ (مارے رنج و غم کے) گھٹنوں کے بل گر پڑیں گے۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جہنم پر تیرا ورود یقینی ہے' لیکن نجات مشکوک ہے' اسلئے اپنے دل میں اس جگہ کی دہشت کا تصور کر' شاید اس طرح تو عذاب جہنم سے نجات پانے کی تیاری کر سکے' اور مخلوق کے حال میں فکر کر کہ ابھی وہ قیامت کی مصیبتوں' اور حساب کتاب کی سختیوں سے نمٹنے بھی نہ پائے ہوں گے' اور کسی شفاعت کرنے والے کی شفاعت کے منتظر ہوں گے

کہ ان بے چاروں کو گہری تاریکیاں گھیر لیں گی' اور شعلہ خیز آگ ان پر سایہ فگن ہوجائے گی وہ دوزخ کے چیخنے اور چنگھاڑنے کی آوازیں سنیں گے' ان آوازوں سے معلوم ہوگا کہ دوزخ نہایت غیظ و غضب کے عالم میں ہے' اس وقت مجرمین کو اپنی ہلاکت کا یقین ہوجائے گا' اور قومیں گھٹنوں کے بل زمین پر جائیں گی' اور ان میں سے وہ لوگ بھی اپنی برے انجام کے خوف سے لرزنے لگیں گے جنھیں برأت کا پروانہ مل چکا ہوگا' دوزخ کے فرشتوں میں سے ایک پکارنے والا یہ اعلان کرے گا کہ کہاں ہے فلاں ابن فلاں جس کا نفس دنیا کے طول امل میں مشغول تھا' اور اسکے باعث نیک اعمال میں ٹال مٹول کیا کرتا تھا' اور اپنی عمر عزیز کو برے اعمال میں ضائع کرتا تھا' اس اعلان کے بعد دوزخ کے فرشتے لوہے کے گرز لے کر اسکی طرف بڑھیں گے' اور اسے بری طرح ڈانٹیں گے' اور اسے عذاب شدید کی طرف ہنکا کرلے جائیں گے' اور قعر جہنم میں ڈال دیں گے' اور اس سے کہیں گے کہ اس کا مزہ چکھ کہ تو (اپنی دانست میں) عزت اور بزرگی والا ہے' فرشتے اسے ایک ایسے گھر میں چھوڑ دیں گے جس کے گوشے تنگ' راستے تاریک' اور فضائیں مہلک ہیں' قیدی اس گھر میں ہمیشہ رہتا ہے' اس میں آگ بھڑکائی جاتی ہے' اور قیدیوں کو پینے کے لئے کھولتا ہوا پانی دیا جاتا ہے' فرشتے اسے گرز سے ماریں گے' اور آگ انھیں سمیٹے گی' وہاں یہ مجرم اپنی ہلاکت کی آرزو کریں گے' اور انھیں رہائی نصیب نہیں ہوگی' انکے پاؤں پیشانی کے بالوں سے بندھے ہوئے ہوں گے' اور گناہوں کی تاریکی سے چہرے سیاہ ہوں گے' وہ چیخ چیخ کر کہیں گے اے مالک! تیرا وعدۂ عذاب ہم پر پورا ہوچکا ہے اے مالک! لوہے نے ہمیں بوجھل کردیا ہے' اے مالک! آگ سے ہماری کھالیں پک گئی ہیں' اے مالک! ہمیں یہاں سے نکال دے' اب ہم گناہ نہ کریں گے' فرشتے جواب دیں گے کہ امن کا دور رخصت ہوچکا ہے' اور اب تم اس ذلّت کے گھر سے نکل نہیں سکو گے' اب اس میں ذلت کے ساتھ پڑے رہو' اور زبان نہ چلاؤ' اگر تمہیں یہاں سے رخصت دیدی گئی' اور دوبارہ دنیا میں بھیج دیا گیا تو تم وہی عمل لے کر واپس آؤ گے جو تم پہلے لے کر آئے تھے' فرشتوں کا یہ جواب سن کر مجرمین مایوس ہوجائیں گے' اور ان اعمال پر افسوس کریں گے جو خدا تعالیٰ کی نافرمانی اور سرکشی کے بطور کیئے ہوں گے' لیکن ندامت سے انھیں کوئی فائدہ نہ ہوگا' اور نہ افسوس کام آئے گا بلکہ وہ منہ کے بل' پابہ زنجیر گر پڑیں گے' انکے اوپر بھی آگ ہوگی' اور نیچے بھی' دائیں بھی شعلے بھڑک رہے ہوں گے' اور بائیں بھی' وہ سر سے پاؤں تک آگ میں غرق ہوں گے' ان کا کھانا آگ ہوگا' ان کا پانی آگ ہوگا' انکا لباس' اور بستر سب کچھ آگ سے بنا ہوا ہوگا' وہ آگ کے کپڑوں اور گندھک کے لباس میں ہوں گے' اوپر سے گرز کی ضرب ہوگی' اور بیڑیوں کا بوجھ ہوگا' یہ دوزخی اس تاریک مکان کے تنگ راستوں سے چیختے چلاتے گزریں گے' اور اسکی دیواروں سے سر ٹکراتے پھریں گے' اور اس کے اطراف میں بے چین گھومیں گے' آگ انھیں اس طرح اُبالے گی جیسے ہانڈی کو جوش دیتی ہے' وہ ہلاکت اور تباہی کو آوازیں دیں گے' اور جب بھی انکی زبان سے ہلاکت کا لفظ نکلے گا ان کے سروں کے اوپر سے کھولتا ہوا پانی ڈالا جائے گا' اس سے ان کی آنتیں اور کھالیں پگھل جائیں گی' لوہے کے گرز سے انکی پیشانیوں پر ضرب لگائی جائے گی' اور ان کا چہرہ چور چور ہوجائے گا' منہ سے پیپ بہنے لگے گی' پیاس کی وجہ سے ان کے جگر ٹکڑے ٹکڑے ہوجائیں گے' اور ان آنکھوں کے ڈھیلے نکل کر رخساروں پر بہنے لگیں گے' اور چہرے کا گوشت گل کر گر پڑے گا' بال جھڑ جائیں گے' کھال لٹک جائے گی' اور جب ان کی کھالیں گل جائیں گی تو انھیں دوسری کھالیں دیدی جائیں گی' ہڈیاں گوشت سے محروم ہوجائیں گی' اور انکی روحیں رگوں اور پٹھوں سے لٹک کر رہ جائیں گی' اور آگ کے شعلوں میں واویلا کریں گی' وہ لوگ اس عذاب الیم کی تاب نہ لاکر موت کی تمنا کریں گے' لیکن انھیں موت نہیں آئے گی۔

جب تو انھیں دیکھے گا تو تیرا کیا حال ہوگا' تو دیکھے گا کہ ان کے چہرے کوئلوں سے زیادہ سیاہ ہیں' آنکھیں بینائی سے محروم ہیں' زبانوں کو گویائی کی قوت حاصل نہیں رہی' کمریں شکستہ ہیں' ہڈیاں ٹوٹی ہوئی ہیں' کان کٹے ہوئے ہیں کھالیں پھٹی ہوئی ہیں' ہاتھ گردنوں سے بندھے ہوئے ہیں' پاؤں سر کے بالوں کے ساتھ جکڑے ہوئے ہیں' وہ لوگ آگ کے اوپر اپنے چہروں کے بل چل رہے ہیں' اور لوہے کے بنے ہوئے کانٹوں کو اپنی آنکھوں کی پتلیوں سے روندتے ہیں' آگ ان کے تمام ظاہر و باطن میں سرایت

کر چکی ہیں، دوزخ کے سانپ اور بچھو ظاہری اعضاء سے چپٹے ہوئے ہیں، منظر دیکھ کر تیرا کیا حال ہو گا۔

دوزخیوں کے یہ اجمالی حالات ہیں، اگر تفصیل میں جاؤ تو رونگٹے کھڑے ہو جائیں گے، اور دل دھڑکنا بھول جائے، آؤ ذرا تفصیلی حالات دیکھیں، پہلے دوزخ کے جنگلوں اور گھاٹیوں پر نظر ڈالیں، سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ جہنم میں ستر ہزار جنگل ہیں، اور ہر جنگل میں ستر ہزار گھاٹیاں ہیں، اور ہر گھاٹی میں ستر ہزار سانپ اور ستر ہزار بچھو ہیں، کافر اور منافق جب تک ان تمام چیزوں سے نہیں گزرتا اس کا انجام پورا نہیں ہوتا۔ (۱) حضرت علیؓ روایت کرتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا چاہ حزن یا وادیٔ حزن سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگو، لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وادیٔ حزن یا چاہ حزن کیا چیز ہے؟ فرمایا جہنم میں ایک وادی ہے جس سے خود جہنم ہر روز سات مرتبہ پناہ مانگتی ہے، اللہ تعالیٰ نے اسے ریاکار قاریوں کے لئے تیار کر رکھا ہے (ترمذی، ابن ماجہ۔ ابو ہریرہؓ) یہ جہنم کی وسعت اور اسکی وادیوں کی کثرت کا حال ہے، اس کے جنگل دنیا کے جنگلوں اور اہل دنیا کے شہوات کے بقدر ہیں، اور اسکے دروازے انسان کے ان سات اعضاء کے بقدر ہیں جن سے وہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرتا ہے، یہ دروازے ایک دوسرے پر واقع ہیں، ان میں سب سے اوپر جہنم ہے، پھر سقر ہے، پھر لظیٰ ہے، اسکے بعد حطمہ ہے، پھر سعیر ہے، پھر جحیم ہے، پھر ہاویہ ہے، ہاویہ کے عمق اور گہرائی کا کیا ٹھکانہ، جہنم کا یہ طبقہ اتنا گہرا ہے کہ اسکی کوئی حد نہیں ملتی، جیسے دنیاوی شہوات کی کوئی حد نظر نہیں آتی، جس طرح دنیا کی خواہش کے پہلو سے دوسری خواہش اور ایک ضرورت کے بطن سے دوسری ضرورت جنم لیتی ہے، اسی طرح جہنم کا ایک ہاویہ (گڑھا) پورا نہیں ہوتا کہ دوسرا گڑھا سامنے آجاتا ہے جو پہلے گڑھے سے زیادہ گہرا ہوتا ہے، حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ ہم سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تھے، اچانک دھماکہ کی آواز سنائی دی، سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے دریافت فرمایا کیا تم جانتے ہو یہ دھماکہ کیسا تھا، ہم نے عرض کیا اللہ و رسول زیادہ جانتے ہیں، فرمایا یہ ایک پتھر ہے جو ستر برس پہلے جہنم کی گہرائی میں پھینکا گیا تھا اب پہنچا ہے (مسلم)۔

آخرت کے درجات مختلف اور متفاوت ہیں، اس لحاظ سے جہنم کے درجات اور طبقات بھی یکساں نہیں ہیں، بعض بعض سے بڑے ہیں، اور بعض بعض سے چھوٹے ہیں، دنیا میں بھی لوگوں کا انہماک یکساں نہیں ہوتا، بعض لوگ اس قدر منہمک ہوتے ہیں گویا اس میں سر سے پاؤں تک ڈوب گئے ہوں بعض اس میں غوطہ لگاتے ہیں مگر ایک معین حد تک، اسی اعتبار سے ان پر آگ کا عذاب بھی مختلف ہو گا اسلئے کہ اللہ تعالیٰ کسی پر ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کرتا، اس لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ دوزخ میں جانے والے ہر شخص کو عذاب کے تمام مراحل سے گزرنا ہو گا، بلکہ ہر شخص کو عذاب کی اس کے گناہوں اور خطاؤں کے بقدر متعین حد ہو گی، یہاں تک بعض لوگوں کو بہت معمولی عذاب ہو گا، لیکن یہ معمولی عذاب بھی ایسا ہو گا کہ اگر اسکے پاس تمام دنیا کا مال و متاع ہو تو وہ اس عذاب سے بچنے کے لئے تمام مال و متاع فدیہ دیدے۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ قیامت کے دن اہل دوزخ میں کم درجے کا عذاب یہ ہو گا کہ (مجرم) کو آگ کے جوتے پہنا دئے جائیں گے، اور ان جوتوں کی حرارت سے اسکا دماغ کھولے گا (بخاری و مسلم۔ نعمان ابن بشیر) اس پر قیاس کر لو کہ جس شخص پر عذاب اپنی تمام تر شدتوں کے ساتھ نازل ہو گا اس کی اذیت کا کیا عالم ہو گا، اگر تمہیں آگ کی تکلیف میں شبہ ہو تو اپنی انگلی آگ سے قریب کر کے دیکھ لو، اور اس پر دوزخ کی آگ کو قیاس کر لو، اسکے باوجود تمہارا قیاس غلط ہو گا اس لئے کہ دنیا کی آگ کو جہنم کی آگ سے کوئی نسبت ہی نہیں ہے، لیکن کیونکہ دنیا میں بھی سخت ترین عذاب آگ کا عذاب ہے، اسلئے جہنم کے عذاب کا ذکر یہاں کی آگ کے حوالے سے کر دیا جاتا ہے، ورنہ یہاں کی آگ میں اتنی شدت کہاں، بالفرض کے لوگوں کو دنیا کی آگ کا عذاب دیا جائے تو وہ خوشی سے قبول کر لیں، حدیث میں بیان فرمایا گیا ہے کہ دنیا کی آگ نے رحمت کے ستر چشموں کے پانی سے غسل کیا تب جا کر وہ اہل دنیا کی برداشت کے قابل ہوئی (ابن عبد البر۔ ابن عباسؓ) بلکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جہنم کا وصف وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا

(۱) مجھے یہ روایت ان الفاظ میں نہیں ملی

کہ دوزخ کی آگ ایک ہزار برس تک دہکائی جائے' یہاں تک کہ وہ سرخ ہو گئی' پھر حکم ہوا کہ ایک ہزار برس تک جلائی جائے یہاں تک کہ وہ سفید ہو گئی' پھر ایک ہزار برس تک بھڑکانے کا حکم ہوا یہاں تک کہ وہ سیاہ ہو گئی' اب وہ سیاہ اور تاریک آگ ہے۔

(۱) ایک حدیث میں ہے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ آگ نے اپنے رب سے شکایت کی کہ اے پروردگار میرے بعض نے بعض کو کھالیا ہے' اللہ تعالیٰ نے دو سانس لینے کی اجازت مرحمت فرمائی' ایک سانس سردی میں' اور ایک گرمی میں' تم گرمی کی جو شدت محسوس کرتے ہو وہ اسی کی حرارت کی تاثیر ہے' اور جو شدت سردی میں محسوس کرتے ہو وہ اسی کے سانس کے اثر سے ہے (بخاری و مسلم۔ ابو ہریرہؓ)

حضرت انسؓ ابن مالک فرماتے ہیں کہ قیامت کے دن ان کافروں کو لایا جائے گا جو سب سے زیادہ ناز و نعم کے پروردہ ہوں گے' اور حکم ہوگا کہ انھیں دوزخ کی آگ میں غوطہ دیدیا جائے چنانچہ انھیں غوطہ دیا جائے گا اور دریافت کیا جائے گا کہ کیا تم نے کبھی عیش کی زندگی گزاری تھی' کیا کبھی راحت پائی تھی وہ کہیں گے نہیں' پھر ان مومنوں کو لایا جائے گا جنھوں نے دنیا کی زندگی میں سب سے زیادہ مصائب جھیلیں ہوں گے' اور حکم ہوگا کہ انھیں جنت میں غوطہ دو' چنانچہ انھیں غوطہ دیا جائے گا' پھر ان سے دریافت کیا جائے گا کہ کیا انھوں نے کوئی تکلیف برداشت کی تھی وہ عرض کریں گے نہیں' حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ اگر مسجد میں ایک لاکھ یا اس سے زائد آدمی ہوں' اور کوئی دوزخی وہاں آکر ایک سانس لے لے تو تمام لوگ ہلاک ہو جائیں۔ قرآن کریم میں ہے۔

تَلْفَحُ وُجُوْهَهُمُ النَّارُ (پ۱۸ر۶ آیت ۱۰۴)

آگ انکے چہروں کو جھلس دے گی۔

بعض مفسرین نے اس آیت میں لکھا ہے کہ آگ کی لپٹیں انھیں اس طرح جھلسائیں گی کہ کسی ہڈی پر گوشت باقی نہ رہے گا' بلکہ تمام گوشت ایڑیوں پر گر جائے گا' اس تکلیف کے بعد تم پیپ میں غور کرو جو ان کے جسموں سے نکلے گی یہاں تک کہ وہ اس میں غرق ہو جائیں گے' اس کو غساق کہتے ہیں' حضرت ابو سعید الخدریؓ روایت کرتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اگر غساق کا ایک ڈول دنیا پر انڈیل دیا جائے تو تمام اہل دنیا بدبودار ہو جائیں (ترمذی) اہل جہنم کو غساق ہی پینے کے لئے دیا جائے گا' جب وہ پیاس سے فریاد کریں گے' اللہ تعالیٰ نے اہل جہنم کے کھانے اور پینے کی چیزوں کے متعلق ارشاد فرمایا ہے:۔

وَيُسْقَىٰ مِن مَّاءٍ صَدِيدٍ يَتَجَرَّعُهُ وَلَا يَكَادُ يُسِيغُهُ وَيَأْتِيهِ الْمَوْتُ مِن كُلِّ مَكَانٍ وَمَا هُوَ بِمَيِّتٍ۔ (پ۱۳ر۱۵ آیت ۱۶-۱۷)

اور اس کو ایسا پانی پینے کو دیا جائے گا جو کہ پیپ لہو (کے مشابہ) ہوگا جس کو گھونٹ گھونٹ کرکے پئے گا اور (گلے سے) آسانی کے ساتھ اتارنے کی کوئی صورت نہ ہوگی' اور ہر طرف سے اس پر موت کی آمد ہوگی' اور وہ کسی طرح سے مرے گا نہیں۔

وَإِن يَسْتَغِيثُوا يُغَاثُوا بِمَاءٍ كَالْمُهْلِ يَشْوِي الْوُجُوهَ بِئْسَ الشَّرَابُ وَسَاءَتْ مُرْتَفَقًا (پ۱۵ر۱۶ آیت ۲۹)

اور اگر (پیاس سے) فریاد کریں گے تو ایسے پانی سے انکی فریاد رسی کیا جائے گی جو تیل کی تلچھٹ کی طرح ہوگا اور (دوزخ بھی) کیا ہی بری جگہ ہوگی۔

ثُمَّ إِنَّكُمْ أَيُّهَا الضَّالُّونَ الْمُكَذِّبُونَ لَآكِلُونَ مِن شَجَرٍ مِّن زَقُّومٍ فَمَالِئُونَ مِنْهَا الْبُطُونَ فَشَارِبُونَ عَلَيْهِ مِنَ الْحَمِيمِ فَشَارِبُونَ شُرْبَ الْهِيمِ (پ۲۷ر۱۵ آیت ۵۱-۵۵)

پھر تم کو اے گمراہو جھٹلانے والو درخت زقوم سے کھانا ہوگا' پھر اس سے پیٹ بھرنا ہوگا' پھر اس پر کھولتا

(۱) یہ روایت پہلے بھی گزر چکی ہے

ہوا پانی پیتا ہو گا پھر پینا بھی پیاسے اونٹوں کا سا۔

إِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخْرُجُ فِي أَصْلِ الْجَحِيمِ طَلْعُهَا كَأَنَّهُ رُءُوسُ الشَّيَاطِينِ فَإِنَّهُمْ لَآكِلُونَ مِنْهَا فَمَالِئُونَ مِنْهَا الْبُطُونَ ثُمَّ إِنَّ لَهُمْ عَلَيْهَا لَشَوْبًا مِنْ حَمِيمٍ ثُمَّ إِنَّ مَرْجِعَهُمْ لَإِلَى الْجَحِيمِ (پ ۲۳ ر ۶ آیت ۶۴ تا ۶۸)

وہ ایک درخت ہے جو قعر دوزخ میں سے نکلتا ہے' اس کے پھل ایسے ہیں جیسے سانپ کے پھن تو وہ لوگ اس سے کھاویں گے' اور اسی سے پیٹ بھریں گے پھر ان کو کھولتا ہوا پانی (پیپ میں) ملا کر دیا جائے گا' پھر اخیر ٹھکانہ ان کا دوزخ ہی کی طرف ہو گا۔

تَصْلَىٰ نَارًا حَامِيَةً تُسْقَىٰ مِنْ عَيْنٍ آنِيَةٍ (پ ۳۰ ر ۱۳ آیت ۴ - ۵)

آتش سوزاں میں داخل ہوں گے' اور کھولتے ہوئے چشمے سے پانی پلائے جائیں گے۔

إِنَّ لَدَيْنَا أَنكَالًا وَجَحِيمًا وَطَعَامًا ذَا غُصَّةٍ وَعَذَابًا أَلِيمًا

(ہمارے یہاں بیڑیاں ہیں اور دوزخ ہے' اور گلے میں پھنس جانے والا کھانا ہے اور دردناک عذاب ہے۔

حضرت عبداللہ ابن عباسؓ روایت کرتے ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر زقوم کا ایک قطرہ دنیا کے سمندروں پر گر پڑے' تو دنیا والوں پر انکی زندگی تنگ ہو جائے (ترمذی) غور کرو ان لوگوں کا کیا حال ہو گا جن کی غذا ہی زقوم ہو' حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ان چیزوں میں رغبت کرو جن کی اللہ نے تمہیں رغبت دی ہے' اور ان چیزوں سے ڈرو جن سے اس نے ڈرایا ہے' یعنی اسکے عذاب وعقاب سے اور جہنم سے' اگر جنت کا ایک قطرہ تمہاری اس دنیا میں تمہارے پاس ہو جس میں تم رہتے ہو تو تمہاری دنیا کو خوشگوار کردے' اور اگر ایک قطرہ دوزخ کا اس دنیا میں تمہارے پاس ہو جس میں تم رہتے ہو تمہارے لئے اس کو برا کردے۔ (۱) حضرت ابو الدرداءؓ کی ایک روایت میں ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اہل جہنم پر بھوک ڈالی جائے گی تاکہ انکا عذاب ٹھیک ٹھیک ہو' چنانچہ وہ لوگ کھانے کی فریاد کریں گے (اس کے جواب میں) انھیں کانٹوں کی غذا دی جائے گی جس میں نہ موٹا کرنے کی صلاحیت ہو گی اور نہ وہ بھوک مٹا سکے گی' وہ (پھر) کھانے کی فریاد کرینگے' اس بار انھیں ایسا کھانا ملے جو گلے میں اٹک جائے گا' وہ یاد کریں گے کہ دنیا میں پانی کے ذریعے کھانا حلق سے اتار لیا جاتا تھا' چنانچہ وہ لوگ پانی مانگیں گے (اسکے جواب میں) لوہے کے آنکڑوں سے پانی اٹھا کر انکی طرف بڑھایا جائے گا جب وہ آنکڑے انکے چہروں سے قریب ہوں گے تو ان کے چہرے جل جائیں گے' اور جب یہ پانی انکے پیٹوں میں جائے گا تو انکے پیٹ کے اندر کی چیزیں کاٹ ڈالے گا' وہ لوگ کہیں گے محافظین جہنم کو بلاؤ' چنانچہ محافظین جہنم کو بلایا جائے گا' اور اہل جہنم ان سے کہیں گے کہ اپنے رب سے دعا کرو کہ وہ ایک دن کے لئے ہم سے عذاب ہلکا کردے' محافظین کہیں گے کیا تمہارے پاس تمہارے پیغمبر معجزے لے کر نہیں آئے تھے' وہ کہیں گے لائے تو تھے' محافظین کہیں گے تب پکارا کرو' کافروں کا پکارنا محض گمراہی ہے' پھر وہ لوگ مالک کو آواز دیں گے' اور اس سے کہیں گے کہ تیرا رب ہم پر جو حکم کرنا چاہے کرے' مالک جواب میں کہے گا کہ تم لوگ اس حال میں ہمیشہ ہمیشہ رہو گے' (اعمش کہتے ہیں کہ مجھے خبر دی گئی ہے کہ اہل جہنم کے مالک کو پکارنے میں' اور مالک کے جواب میں ایک ہزار سال کا فاصلہ ہو گا) پھر کہیں گے اپنے رب کو پکارو' تمہارے رب سے بہتر کوئی نہیں ہے' وہ اپنے رب سے کہیں گے اے اللہ! ہم پر ہماری بدبختی غالب ہو گئی ہے' اور ہم گمراہ قوم تھے' اے ہمارے رب ہمیں اس جہنم سے نکال' اب اگر دوبارہ گناہ کریں گے تو بلاشبہ ہم ظالم ہوں گے' اللہ تعالیٰ کی طرف سے انھیں جواب دیا جائیگا کہ دوزخ ہی میں ذلت کے ساتھ پڑے رہو اور مجھ سے کلام نہ کرو' اس وقت وہ ہر خیر سے مایوس ہو جائیں گے' اور اس وقت حسرت کے ساتھ چیخنا چلانا شروع کردیں گے (ترمذی)۔

(۱) اس روایت کی اصل مجھے نہیں ملی

حضرت ابو امامہؓ روایت کرتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کریم کی آیت (وَيُسْقٰى مِنْ مَّآءٍ صَدِيْدٍ يَتَجَرَّعُهٗ وَلَا يَكَادُ يُسِيْغُهٗ) کی وضاحت میں ارشاد فرمایا کہ یہ پانی اسکے قریب کیا جائے گا' اور اسکے سر کی کھال گر پڑے گی' اور جب اسے پئے گا تو اس کی آنتیں کاٹ ڈالے گا اور کٹی ہوئی آنتیں پاخانے کے راستے سے باہر نکل جائیں گی (ترمذی) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَسُقُوْا مَآءً حَمِيْمًا فَقَطَّعَ اَمْعَآءَهُمْ (پ ۲۶ ر ۶ آیت ۱۵)

اور کھولتا ہوا پانی انکے پینے کو دیا جائے گا' سو وہ انکی انتڑیوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا۔

وَاِنْ يَّسْتَغِيْثُوْا يُغَاثُوْا بِمَآءٍ كَالْمُهْلِ يَشْوِى الْوُجُوْهَ (پ ۱۵ ر ۲۱ آیت ۲۹)

اور اگر فریاد کریں گے تو ایسے پانی سے انکی فریاد رسی کی جائے گی جو تیل کی تلچھٹ کی طرح ہو گا' مونہوں کو بھون ڈالے گا۔

جہنمیوں کو جب بھوک اور پیاس پریشان کرے گی تو انھیں یہ کھانا اور پانی دیا جائے گا جو اوپر مذکور ہوا اب تم غور کرو کہ جہنم میں نہایت زہریلے' جسیم' کریہہ المنظر' اور خوفناک قسم کے سانپ بچھو اور اژدھا ہوں گے' جو اہل جہنم پر بری طرح مسلط ہوں گے اور ان کے خلاف برانگیختہ کئے جائیں گے' یہاں تک کہ وہ کبھی اپنے شکار کو ڈسنے اور کاٹنے سے سستی نہ کریں گے' ایک حدیث میں ہے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے مال دیا ہو' اور وہ زکوٰۃ ادا نہ کرے قیامت کے دن وہ مال ایک گنجے سر کے سانپ کی صورت اختیار کرے گا' جس کی دو آنکھیں ہوں گی' قیامت کے دن اسے اس زکوٰۃ نہ دینے والے کے گلے میں ڈال دیا جائے گا' پھر یہ سانپ اسکی دونوں باچھیں پکڑے گا' اور کہے گا میں تیرا مال ہوں' میں تیرا خزانہ ہوں' اسکے بعد آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی (بخاری۔ ابوہریرہؓ' مسلم۔ جابرؓ)۔

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ (پ ۴ ر ۹ آیت ۱۸۰)

اور ہرگز خیال نہ کریں ایسے لوگ جو ایسی چیز میں بخل کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے انکو اپنے فضل سے دی ہے کہ یہ بات کچھ ان کے لئے اچھی ہوگی' بلکہ یہ بات اسکے لئے بہت ہی بری ہے' وہ لوگ قیامت کی روز طوق پہنا دئے جائیں گے اس کا جس میں انھوں نے بخل کیا تھا۔

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ دوزخ میں اونٹوں جیسے سروالے سانپ ہوں گے' ان کے ایک مرتبہ ڈسنے سے چالیس برس تک جسم میں اسکے زہر کی لہر رہے گی' اور وہاں پالان ڈالے ہوئے خچر جیسے بچھو ہوں گے جن کے ڈنک مارنے کی تکلیف چالیس سال تک محسوس کی جائے گی (احمد۔ عبداللہ ابن الحارث)۔

یہ سانپ اور بچھو اس شخص پر مسلط کئے جائیں گے جس پر دنیا میں بخل' بد خلقی اور ایذاء خلق جیسے عیوب مسلط ہوتے ہیں' جو شخص ان عیوب سے بچتا ہے اس کے سامنے سانپ بچھو نہیں آتے۔

اسکے بعد تم دوزخیوں کے جسموں کی ضخامت اور طوالت میں غور کرو' جس کے باعث ان کا عذاب بھی شدید ہو گا اور وہ اپنے تمام اجزائے بدن میں آگ کی تپش' بچھوؤں کے ڈسنے کی تکلیف بیک وقت اور مسلسل محسوس کریں گے' حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ دوزخ میں کافر کی داڑھ جبل احد کے برابر' اور اسکے جسم کا موٹاپا تین دن رات کی مسافت کے برابر ہو گا (مسلم) ایک روایت میں ہے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کافر کا نچلا ہونٹ سینے پر لٹک آئے گا اور بالائی ہونٹ اوپر کو اٹھ جائے گا یہاں تک کہ چہرے کو ڈھانپ لے گا (ترمذی۔ ابوسعید) سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ کافر اپنی زبان قیامت کے دن دوزخ میں گھسیٹے گا اور لوگ اسکو اپنے پاؤں سے روندیں گے' اور بہت زیادہ جسامت رکھنے کے باوجود آگ انھیں بار بار جلائے گی' اور ان پر نئی کھال اور نیا گوشت آتا رہے گا (ترمذی۔ ابن عمرؓ)

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔
كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُودُهُمْ بَدَّلْنَاهُمْ غَيْرَهَا (پ ۵ ر ۵ آیت ۵۶)
جب کہ ایک دفعہ انکی کھال جل چکے گی تو ہم اس پہلی کھال کی جگہ فوراً دوسری کھال پیدا کردیں گے۔
اس آیت کی تفسیر میں حضرت حسن بصریؒ ارشاد فرماتے ہیں کہ آگ دوزخیوں کو دن میں ستر مرتبہ کھائے گی اور جب انھیں کھالے گی تو ان سے کہا جائے گا کہ وہ پھر ایسے ہی ہو جائیں چنانچہ وہ ایسے ہی ہو جائیں گے' اب تم انکی چیخ و پکار' آہ و بکا' اور ہلاکت کی دہائی دینے پر غور کرو' یہ باتیں انکے اوپر آگ میں گرنے کے پہلے ہی مرحلے میں مسلط کردی جائیں گی' چنانچہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اس دن جہنم کو اس طرح لایا جائے گا کہ اس کی ستر ہزار باگیں ہوں گی' اور ہر باگ پر ستر ہزار فرشتے مقرر ہوں گے (مسلم۔ عبداللہ ابن مسعودؓ) حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ اہل جہنم پر رونا بھیجا جائے گا وہ روئیں گے یہاں تک کہ آنسو ختم ہو جائیں گے' پھر وہ خون روئیں گے' یہاں تک کہ چہروں میں دراڑیں پڑ جائیں گی اگر ان میں کشتیاں چھوڑ دی جائیں تو وہ بہنے لگیں' اور جب تک انھیں رونے' چیخنے' آہ بھرنے' اور تباہی و بربادی کو پکارنے کی اجازت ہوگی تب انھیں کچھ راحت ملتی رہی گی' لیکن (بعد میں) ان چیزوں سے بھی منع کردیا جائے گا (ابن ماجہ۔ انسؓ) محمد ابن کعب کہتے ہیں کہ دوزخیوں کو پانچ مرتبہ دعا مانگنے کا موقع نصیب ہوگا' اور اللہ تعالیٰ ہر بار انھیں جواب دے گا' لیکن پانچویں مرتبہ کے بعد وہ کبھی بول نہیں پائیں گے' پہلی مرتبہ وہ یہ دعا کریں گے۔
رَبَّنَا أَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ وَأَحْيَيْتَنَا اثْنَتَيْنِ فَاعْتَرَفْنَا بِذُنُوبِنَا فَهَلْ إِلَى خُرُوجٍ مِنْ سَبِيلٍ (پ ۲۴ ر ۷ آیت ۱۱)
وہ لوگ کہیں گے کہ اے ہمارے پروردگار آپ نے ہم کو دوبارہ مردہ رکھا' اور دوبار زندگی دی' سو ہم اپنی خطاؤں کا اقرار کرتے ہیں' تو کیا نکلنے کی کوئی صورت ہے۔
اللہ تعالیٰ اس کے جواب میں ارشاد فرمائے گا :۔
ذَٰلِكُمْ بِأَنَّهُ إِذَا دُعِيَ اللَّهُ وَحْدَهُ كَفَرْتُمْ وَإِنْ يُشْرَكْ بِهِ تُؤْمِنُوا فَالْحُكْمُ لِلَّهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيرِ (پ ۲۴ ر ۷ آیت ۱۲)
وجہ اسکی یہ ہے کہ جب صرف اللہ کا نام لیا جاتا تھا تو تم انکار کرتے تھے' اور اگر اس کے ساتھ کسی کو شریک کیا جاتا تھا تو تم مان لیتے تھے سو یہ فیصلہ اللہ کا ہے جو عالیشان اور بڑے رتبے والا ہے۔
اسکے بعد وہ کہیں گے۔
رَبَّنَا أَبْصَرْنَا وَسَمِعْنَا فَارْجِعْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا (پ ۲۱ ر ۱۵ آیت ۱۲)
اے ہمارے پروردگار! بس ہماری آنکھیں اور کان کھل گئے۔
اسکے جواب میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا :۔
أَوَلَمْ تَكُونُوا أَقْسَمْتُمْ مِنْ قَبْلُ مَا لَكُمْ مِنْ زَوَالٍ (پ ۱۳ ر ۱۹ آیت ۴۴)
کیا تم نے اسکے قبل قسمیں نہ کھائی تھیں کہ تم کو کہیں جانا ہی نہیں ہے۔
اسکے بعد اہل دوزخ کہیں گے۔
رَبَّنَا أَخْرِجْنَا نَعْمَلْ صَالِحًا غَيْرَ الَّذِي كُنَّا نَعْمَلُ (پ ۲۲ ر ۱۶ آیت ۳۷)
اے ہمارے پروردگار! ہمیں یہاں سے نکال لیجئے ہم اچھے کام کریں گے' برخلاف ان کاموں کے جو کیا کرتے تھے۔
اللہ تعالیٰ اسکا جواب یہ دے گا :۔

أَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَا يَتَذَكَّرُ فِيهِ مَنْ تَذَكَّرَ وَجَاءَكُمُ النَّذِيرُ فَذُوقُوا فَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ نَصِيرٍ (پ ۲۲ ر ۱۹ آیت ۳۷)

کیا ہم نے تم کو اتنی عمر نہ دی تھی کہ جس کو سمجھنا ہوتا تو وہ سمجھ سکتا' اور تمہارے پاس ڈرانے والا بھی پہنچا تھا' سو مزہ چکھو کہ ایسے ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔

اس کے بعد وہ یہ عرض کریں گے :۔

رَبَّنَا غَلَبَتْ عَلَيْنَا شِقْوَتُنَا وَكُنَّا قَوْمًا ضَالِّينَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْهَا فَإِنْ عُدْنَا فَإِنَّا ظَالِمُونَ (۱۸ ر ۶ آیت ۱۰۶-۱۰۷)

اے ہمارے رب (واقعی) ہماری بدبختی نے ہم کو گھیر لیا تھا' اور ہم گمراہ لوگ تھے' اے ہمارے رب! ہم کو اس (جہنم) سے اب نکال دیجئے' پھر اگر ہم دوبارہ کریں تو ہم بے شک پورے قصوروار ہیں۔

اسکے جواب میں اللہ تعالیٰ سختی سے فرمائے گا :۔

اخْسَئُوا فِيهَا وَلَا تُكَلِّمُونِ (پ ۱۸ ر ۶ آیت ۱۰۸)

اس میں تم راندے ہوئے پڑے رہو اور مجھ سے کلام نہ کرو۔

اسکے بعد انھیں کبھی بولنا نصیب نہ ہوگا' اور یہ شدّت عذاب کی انتہا ہوگی' قرآن کریم میں ہے :۔

سَوَاءٌ عَلَيْنَا أَجَزِعْنَا أَمْ صَبَرْنَا مَا لَنَا مِنْ مَحِيصٍ (پ ۱۳ ر ۱۵ آیت ۲۱)

ہم سب کے حق میں (دونوں صورتیں) برابر ہیں خواہ ہم پریشان ہوں خواہ ضبط کریں ہمارے لئے چھٹکارا نہیں ہے۔

انس ابن مالکؓ سے روایت ہے کہ زید ابن ارقمؓ نے مذکورہ بالا آیت کی تفسیر میں ارشاد فرمایا کہ سو سال تک صبر کیا' پھر سو برس تک بے قرار رہے اسکے بعد انھوں نے کہا کہ ہمارے لئے صبر و جزع دونوں برابر ہیں اور اب چھٹکارے کا کوئی راستہ نہیں ہے سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ قیامت کے روز موت کو سفید مینڈھے کی شکل میں لایا جائے گا' اور جنت و جہنم کے درمیان اسے ذبح کردیا جائے گا' اور کہا جائے گا کہ اے اہل جنت موت کے بغیر دوام' اور اے اہل جہنم' ہمیشگی بلا موت کے (بخاری۔ ابن عمرؓ) حضرت حسن فرماتے ہیں کہ ایک ہزار سال بعد ایک شخص کو دوزخ سے نکالا جائے گا' کاش وہ شخص میں ہی ہوں۔ حضرت حسنؓ کو ایک گوشے میں بیٹھ کر روتے ہوئے دیکھا گیا' اور دریافت کیا گیا کہ آپ کیوں روتے ہیں؟ فرمایا میں اسلئے روتا ہوں کہ کہیں مجھے دوزخ میں ڈال کر پروا نہ کی جائے۔

جہنم کے عذاب کی مختلف قسموں کا یہ ایک اجمالی بیان ہے' جہاں تک جہنم کے غموں' تکلیفوں' مصیبتوں اور حسرتوں کا تعلق ہے' اسکی تفصیل کی کوئی انتہا نہیں ہے' سب سے زیادہ سخت اور شدید بات کفار کے لئے یہ ہوگی کہ وہ عذاب جہنم کے ساتھ ساتھ جنت کی نعمتوں' راحتوں' اللہ تعالیٰ کی ملاقات اور رضا سے بھی محروم ہوں گے' اور انھیں یہ علم بھی ہوگا کہ انھوں نے یہ تمام نعمتیں اور راحتیں چند حقیر چیزوں کے عوض فروخت کرڈالی ہیں' یعنی دنیا کی چند روزہ زندگی کی حقیر شہوات کے عوض جو نا صاف تھیں' عیب اور تکدر سے پُر تھیں' آخرت کی پاکیزہ پائدار اور عظیم نعمتیں فروخت کردیں' وہ اپنے دل میں کہیں گے ہائے افسوس! وائے حسرت! ہم نے کس طرح اپنے نفسوں کو اپنے رب کریم کی نافرمانی میں ہلاک کرڈالا' اور کیوں نہ ہم نے اپنے آپ کو چند روزہ صبر کا مکلّف بنایا' اگر ہم صبر کرلیتے تو وہ دن گزر جاتے' اور آج ہم جوار رب العالمین میں رضائے الٰہی کی نعمت سے فیضیاب' عیش و آرام کی زندگی گزار رہے ہوتے' لیکن افسوس! جو کچھ ان سے فوت ہونا تھا وہ فوت ہوچکا ہوگا' اور جس مصیبت میں مبتلا ہونا تھا اس میں مبتلا ہوچکے ہوں گے' دنیا کی نعمتوں اور لذتوں میں سے کوئی چیز ان کے پاس باقی نہیں رہے گی' پھر اگر وہ جنت کی نعمتیں نہ دیکھتے تو شاید ان کی حسرت شدید نہ ہوتی' لیکن انھیں جنت کی نعمتوں کا مشاہدہ بھی کرایا جائے گا چنانچہ ایک روایت میں ہے کہ سرکار دوعالم

صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن کچھ دوزخیوں کو جنت کی طرف لایا جائے گا اور انھیں اس حد تک قریب لایا جائے گا کہ وہ اسکی خوشبو سونگھیں گے' اور اسکے محلات دیکھیں گے' اور وہ تمام چیزیں دیکھیں گے جو اہل جنت کے لئے تیار کی گئی ہیں' پھر یہ اعلان کیا جائے گا کہ ان (بدبختوں) کو یہاں سے واپس لے جاؤ' اور ان چیزوں میں ان کے لئے کوئی حصہ نہیں ہے' وہ انتہائی حسرت کے ساتھ اس طرح واپس ہوں گے کہ اولین و آخرین میں کوئی شخص اس طرح واپس نہ ہوا ہو گا' وہ کہیں گے اے ہمارے رب! اگر تو یہ ثواب' اور یہ نعمتیں جو تو نے اپنے دوستوں کے لئے تیار کر رکھی ہیں ہمیں دکھلانے سے پہلے دوزخ میں داخل کرتا تو ہمارے لئے دوزخ میں جانا زیادہ آسان ہوتا' اللہ تعالیٰ فرمائے گا میں نے جان بوجھ کر تمہارے ساتھ ایسا کیا ہے اسلئے کہ جب تم (دنیا میں) تنہا ہوتے تھے تو بڑے بڑے گناہوں کے ساتھ میرا مقابلہ کرتے تھے' اور جب لوگوں سے ملتے تو متواضع ہو کر ملتے تھے' اور لوگوں کے ساتھ ظاہر میں وہ سلوک کرتے جو دل سے میرے ساتھ نہ کرتے' لوگوں سے ڈرتے تھے اور مجھ سے نہ ڈرتے تھے' اور لوگوں کی تعظیم کرتے تھے' انکی پاسداری کے لئے کوئی چیز چھوڑ دیتے تھے' لیکن میری خاطر کوئی چیز نہیں چھوڑتے تھے' آج میں تمہیں پائدار ثواب سے محروم کر کے دردناک عذاب چکھاؤں گا (الاربعین لابی ہدبہ۔ انس)

احمد ابن حرب فرماتے ہیں کہ ہم دھوپ پر سائے کو ترجیح دیتے ہیں' لیکن جنت کو دوزخ پر ترجیح نہیں دیتے' حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں کہ کتنے تندرست جسم' حسین چہرے' اور فصیح زبان والے دوزخ کے طبقوں کے درمیان چیختے چلاتے پھریں گے' حضرت داؤد نے عرض کیا اے اللہ! میں تیرے سورج کی حرارت پر صبر نہیں کر سکتا بھلا تیری آگ کی حرارت پر کیسے صبر کر سکتا ہوں' اور میں تیری رحمت کی آواز پر صبر نہیں کر سکتا' تیرے عذاب کی آواز پر کیسے صبر کر سکتا ہوں' اے بندۂ مسکین! ان خوفناک احوال پر نظر کر' اور یہ جان لے کہ اللہ تعالیٰ نے دوزخ کو اسکی تمام خوفناکیوں کے ساتھ پیدا کیا ہے' اور اسکے لئے اہل بھی پیدا کئے ہیں جو نہ زائد ہوں گے اور نہ کم ہوں گے' یہ ایک ایسا معاملہ ہے جس کا فیصلہ ہو چکا ہے' اور جس کے حکم سے فراغت ہو گئی ہے' اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :-

وَاَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ اِذْ قُضِيَ الْاَمْرُ وَهُمْ فِيْ غَفْلَةٍ وَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ (پ ۱۶ ر ۵ آیت ۳۹)

اور آپ ان لوگوں کو حسرت کے دن سے ڈرائیے جب کہ (جنت یا دوزخ کا) فیصلہ کر دیا جائے گا' اور وہ لوگ (آج) غفلت میں ہیں اور وہ لوگ ایمان نہیں لاتے۔

اس آیت میں قیامت کے دن کی طرف اشارہ کیا گیا ہے' لیکن یہ فیصلہ قیامت کے دن نہیں ہو گا' بلکہ ازل میں ہو چکا ہے' قیامت صرف اس حکم کے ظہور کا دن ہے' تجھ پر حیرت ہوتی ہے کہ ہنستا کھیلتا' اور دنیا کی حقیر چیزوں میں مشغول نظر آتا ہے' حالانکہ تجھے یہ معلوم نہیں کہ ازل میں تیرے لئے کیا فیصلہ ہو چکا ہے' اگر تو اسی لاعلمی کو عذر بنائے اور کہے کہ میں نہیں جانتا کہ میرا انجام کیا ہو گا' مجھے کہاں جانا ہے' میرا مآل اور مرجع کیا ہے؟ اور میرے حق میں کیا فیصلہ ہوا ہے؟ ہم تجھے ایک علامت بتلاتے ہیں تو اس علامت کی روشنی میں اپنے انجام کا اندازہ کر سکتا ہے' اور وہ علامت یہ ہے کہ اپنی حال پر نظر ڈال' اپنے اعمال دیکھ' اسلئے کہ ہر شخص کو وہی چیزیں میسر ہوتی ہیں جن کے لئے وہ پیدا کیا جاتا ہے' اگر تیرے لئے خیر کی راہ آسان کی گئی ہے تو تجھے خوش ہونا چاہئے تو آگ سے دور ہے' اور اگر صورت حال یہ ہے کہ ارادہ خیر کے ساتھ ہی بہت سی رکاوٹیں تیری راہ میں مزاحم ہو جاتی ہیں' اور تجھے ارادہ خیر پر عمل کرنے سے روکتی ہیں' اور جہاں شر کا ارادہ کیا تمام اسباب خود بخود کسی مانع کے بغیر مہیا ہوتے چلے جاتے ہیں تو تجھے یہ جان لینا چاہئے کہ تیرے لئے برے انجام کا فیصلہ ہو چکا ہے' یہ علامت انجام پر دلالت کرتی ہے جیسے بارش سے سبزے' اور دھویں سے آگ پر دلالت ہوتی ہے' اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :-

اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ وَّاِنَّ الْفُجَّارَ لَفِيْ جَحِيْمٍ (پ ۳۰ ر ۷ آیت ۱۳-۱۴)

نیک لوگ بے شک آسائش میں ہوں گے' اور بدکار لوگ بے شک دوزخ میں ہوں گے۔

تو اپنے نفس کو ان دونوں آیتوں پر رکھ' اور جنت یا دوزخ میں اپنا ٹھکانہ پہچان لے۔

جنت اور اسکی مختلف نعمتیں : گذشتہ سطور میں اس کا حال مذکور ہوا جو مصیبتوں اور غموں کا گھر ہے' اسکے مقابلے میں ایک اور گھر ہے' جس میں خوشیاں اور راحتیں ہیں' اب اس گھر میں غور کرو' جو شخص ان دونوں گھروں میں سے ایک سے دور ہو گا وہ دوسرے گھر سے یقینی طور پر قریب ہو گا' اسلئے یہ ضروری ہے کہ جب تم جہنم کے اہوال اور خطرات میں فکر کرو تو اپنے دل میں خوف پیدا کرو' اور جب جنت کی دائمی راحت اور ابدی خوشی میں فکر کرو تو دل میں رجاء پیدا کرو
اس طرح تم اپنے نفس کو خوف کے تازیانوں' اور رجاء کی لگام سے صراط مستقیم کی طرف کھینچ سکتے ہو' اور المناک عذاب سے محفوظ رہ کر دائمی سلطنت حاصل کر سکتے ہو۔

اہل جنت پر تازگی' شادابی' اور رونق ہو گی' اور انھیں ایسی بوتلوں سے شراب کیف آگیں پلائی جائے گی جو سربمہر ہوں گی' وہ تازہ اور سفید موتیوں سے بنے ہوئے خیموں میں سرخ یاقوت کے منبروں پر بیٹھے ہوئے ہوں گے' خیموں میں سبز قالین کا فرش ہو گا' نہروں کے کنارے بنے ہوئے ان خیموں میں صوفوں پر ٹیک لگائے ہوئے بیٹھے ہوں گے' خیمے بچوں اور غلاموں سے پُر ہوں گے' شہد اور شراب کے ذخیروں سے لبریز ہوں گے' اور حسین چہروں اور بڑی بڑی آنکھوں والی عورتوں سے بھرے ہوئے ہوں گے' وہ عورتیں ایسی ہوں گی گویا یاقوت اور مونگے ہیں' اس سے پہلے نہ کسی انسان نے انھیں چھوا ہو گا' اور نہ جن نے' وہ جنتوں میں خراماں خراماں چلیں گی' جب ان میں سے کوئی نازوں کے ساتھ اٹھ کر چلے گی تو ستر ہزار لڑکے اسکا لباس اٹھا کر چلیں گے' اسکے اوپر اس قدر خوب صورت سفید چادریں ہو گی کہ انھیں دیکھ کر آنکھیں دنگ رہ جائیں گی' اسکے سروں پر موتیوں اور مونگوں سے مزین تاج ہوں گے' ان کی آنکھوں میں سرخ ڈورے ہوں گے' خوشبوؤں میں بسی ہوئی ہوں گی' بڑھاپے اور مفلسی کے خوف سے مامون ہوں گی' اسکے محل جنت کے خوبصورت باغوں کے درمیان بنے ہوئے ہونگے' پھر ان مردوں اور عورتوں کے درمیان شراب خالص سے لبریز صراحی اور جام کی گردش ہو گی' اور وہ شراب پینے والوں کے لئے انتہائی لذیذ ہو گی' یہ جام موتیوں جیسے خوبصورت لڑکے اور غلام لئے پھریں گے' یہ شراب انھیں ان کے اعمال کے صلے میں عطا کی جائے گی' اور اس جگہ عطا کی جائے گی جو باغوں اور چشموں اور نہروں کے درمیان مقام امین ہے' اور جہاں بیٹھ کر وہ اپنے رب کریم کے دیدار کا شرف حاصل کریں گے' ان چہروں پر شادابی اور رونق ہو گی' ذلت اور رسوائی سے انھیں کوئی سروکار نہ ہو گا' بلکہ وہ معزز بندوں کی حیثیت سے جنت میں رہیں گے' اور اپنے رب کی طرف سے طرح طرح کے تحفے اور ہدیے پاتے رہیں گے' اور اپنی دل پسند چیزوں میں ہمیشہ رہیں گے' نہ انھیں کسی طرح کا خوف ہو گا اور نہ کوئی غم ہو گا' موت سے محفوظ ہوں گے' اور جنت میں عیش کریں گے' اسکے پھل' میوے اور غذائیں کھائیں گے' اور اسکی نہروں سے دودھ' شراب اور شہد پئیں گے' اسکے پھل اسکی نہروں کی زمین چاندی کی ہو گی' اور پتھریاں مونگے ہوں گی' اور مٹی مشک ہو گی' سبزہ زعفران ہو گا' اور اسکے بادلوں سے کافور کے ٹیلوں پر نسرین کا پانی برسے گا' انھیں چاندی کے پیالے ملیں گے جن میں موتی' لعل اور مونگے جڑے ہوئے ہوں گے ان میں شیریں سلسبیل کی سربمہر شراب ہو گی' اور وہ اس قدر لطیف ہوں گے کہ اندر کی شراب اپنے سرخ رنگ اور تمام تر لطافتوں کی ساتھ عیاں ہو گی' انھیں کسی انسان نے اپنے ہاتھ سے نہیں بنایا کہ کسی طرح کا کوئی عیب یا نقص رہے گا' بلکہ وہ دست قدرت سے ترشے ہوئے ہوں گے' بے عیب اور خوبصورت' اور ایسے خدام کے ہاتھوں میں ہوں گے' جن کے چہرے سورج کی طرح منور اور تابناک ہوں گے' مگر سورج میں چہرے کی وہ لطافت' زلفوں کی وہ خوبصورتی اور آنکھوں کی وہ چمک کہاں ہے جو ان خدام میں ہو گی۔

ہمیں اس شخص پر حیرت ہوتی ہے جو ان گوناگوں اوصاف کے حامل گھر پر ایمان رکھتا ہو اور یہ یقین رکھتا ہو کہ اس گھر کے رہنے والوں کو موت نہیں آئے گی' اور نہ ان پر کسی قسم کی مصیبت واقع ہو گی' اور نہ حادثات تغیر و تبدل کی نگاہ اسکے اوپر ڈالیں گے' اس یقین و ایمان کے باوجود وہ اس گھر سے کیسے دل لگاتا ہے جس کی تباہی کا فیصلہ ہو چکا ہے' اسے یہاں کی زندگی کیسے خوشگوار محسوس ہوتی ہے' جب کہ یہ زندگی کدورتوں سے پُر ہے اور اسے فنا ہونا ہے' فرض کرو جنت میں بدن کی سلامتی' بھوک' پیاس' اور موت سے حفاظت کے علاوہ کچھ نہ ہو تب بھی اس دنیائے فانی کے لائق ترہات یہ ہے کہ اسے چھوڑا جائے' اور جنت پر اس دنیا کو

ترجیح نہ دی جائے جس کا ختم ہوجانا اور مکدر ہونا ناگزیر ہے' اور اس صورت میں تو دنیا کو چھوڑ دینا یوں بھی بے حد ضروری ہے کہ جنت والے ہر خوف سے مامون بادشاہ ہیں' انواع و اقسام کی لذتوں اور خوشیوں سے ہم کنار ہونے والے ہیں' ان کے لئے جنت میں ہر وہ چیز ہے جس کی ان کے دل میں خواہش ہے' اور وہ ہر دن عرش الٰہی کے صحن میں حاضر ہونے والے' اور رب کریم کے وجہ کریم کے دیدار سے مشرف ہونے والے ہیں' انھیں اس دیدار سے وہ لطف حاصل ہوگا جو کسی اور نعمت کو دیکھ کر حاصل نہیں ہوگا' وہ ہمیشہ انہی لذّتوں اور نعمتوں میں ان کے زوال سے مامون ہو کر رہیں گے' حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ایک اعلان کرنے والا یہ اعلان کرے گا کہ اے اہل جنت تمہارے لئے یہ بات ہے کہ تم تندرست رہو گے کبھی بیمار نہیں ہوگے' تم زندہ رہو گے کبھی مو گے نہیں' تم جوان رہو گے کبھی بوڑھے نہیں ہوگے' تم نعمتوں میں رہو گے کبھی مفلس نہیں ہوگے (مسلم) اللہ تعالیٰ کا ارشاد بھی یہی ہے :-

وَنُودُوٓا اَنۡ تِلۡکُمُ الۡجَنَّۃُ اُوۡرِثۡتُمُوۡہَا بِمَا کُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ (پ ۸ ر ۱۲ آیت ۴۳)

اور ان سے پکار کر کہا جائے گا یہ جنت تم کو دی گئی ہے تمہارے اعمال کے بدلے۔

اگر تم جنت کا حال جاننا چاہتے ہو تو قرآن کریم کی تلاوت کرو' اسلئے کہ اللہ تعالیٰ کے بیان کے بعد کوئی بیان نہیں ہے' سورۂ رحمٰن میں آیت کریمہ وَلِمَنۡ خَافَ مَقَامَ رَبِّہٖ جَنَّتٰنِ سورت کے آخر تک' اور سورۂ واقعہ وغیرہ میں جنت کا ذکر ہے۔

گذشتہ سطروں میں جنت کی نعمتوں اور خوبیوں کا اجمالی ذکر تھا' اب ہم روایات کی روشنی میں تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔

جنتوں کی تعداد : سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کریم کی آیت وَلِمَنۡ خَافَ مَقَامَ رَبِّہٖ جَنَّتٰنِ کی تفسیر میں فرمایا کہ وہ جنتیں چاندی کی ہوں گی' ان کے برتن اور جو کچھ ان میں ہے وہ بھی چاندی کا ہوگا' اور دو جنتیں سونے کی ہوں گی' انکے برتن اور جو کچھ ان میں ہے وہ بھی سونے کا ہوگا' قوم کے اور جنت عدن میں دیدار ربّ کریم کے درمیان وجہ کریم پر ردائے کبریائی کے علاوہ کوئی پردہ نہ ہوگا (بخاری و مسلم۔ ابو موسیٰؓ)۔

جنّت کے دروازے : جنّت کے دروازے اصل طاعات کے لحاظ سے بہت سے ہیں' جیسے اصل معاصی کے اعتبار سے دوزخ کے بہت سے دروازے ہیں' حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص اپنے مال میں دو جوڑے اللہ کی راہ میں خرچ کرے گا وہ جنت کے تمام دروازوں سے بلایا جائے گا جنت کے آٹھ دروازے ہیں' جو نماز والوں میں سے ہے اسے نماز کے دروازے سے بلایا جائے گا' اور جو روزہ داروں میں سے ہے اسے روزہ داروں کے دروازے سے بلایا جائے گا' اور جو اہل صدقات میں سے ہے اسے صدقے کے دروازے سے بلایا جائے گا' اور جو مجاہدین میں سے ہے' اسے باب جہاد سے بلایا جائے گا' حضرت ابو بکرؓ نے عرض کیا بخدا یہ کسی پر ضروری نہیں ہے کہ وہ کس دروازے سے بلایا جائے گا' کیا کوئی شخص ایسا بھی جسے تمام دروازوں سے بلایا جائے گا' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہاں! اور مجھے امید ہے کہ تم ان میں ہوگے (بخاری و مسلم) عاصم ابن حمزہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے سامنے ایک مرتبہ دوزخ کا ذکر ہوا تو انھوں نے اس قدر طویل تقریر کی کہ مجھے یاد نہیں رہا کہ کیا فرمایا' اسکے بعد آپ نے یہ تلاوت فرمائی :-

وَسِیۡقَ الَّذِیۡنَ اتَّقَوۡا رَبَّہُمۡ اِلَی الۡجَنَّۃِ زُمَرًا (پ ۲۴ ر ۵ آیت ۷۳)

اور جو لوگ اپنے رب سے ڈرتے تھے وہ گروہ در گروہ ہو کر جنت کی طرف روانہ کئے جائیں گے۔

اور فرمایا کہ جب لوگ جنت کے دروازوں میں سے کسی دروازے پر پہنچیں گے تو اسکے پاس ایک درخت دیکھیں گے جس کی جڑ میں دو چشمے بہہ رہے ہوں گے' وہ ان میں سے ایک پر حکم کے مطابق جائیں گے' اور اس کے پانی کے اثر سے ان کے پیٹ میں جو کچھ نجاست اور گندگی ہوگی وہ دور ہو جائے گی' پھر دوسرے چشمے پر جائیں گے' اور اس سے پاکی حاصل کریں گے' اسکے اثر سے ان پر شادمانی اور شادابی آجائے گی' اسکے بعد انکے بالوں میں کوئی تغیر نہ واقع ہوگا' نہ وہ گندے ہوں گے اور نہ الجھیں گے' گویا ان پر تیل لگا دیا گیا

ہو' پھر وہ جنت تک پہنچیں گے' جنت کے محافظین ان سے کہیں گے :-

سَلَامٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوهَا خَالِدِينَ (پ ۲۴ ر ۵ آیت ۷۳)

تم پر سلامتی ہو' تم مزے میں رہو' سو اس میں ہمیشہ رہنے کے لئے داخل ہو جاؤ۔

پھر انہیں لڑکے ملیں گے' اور ان کے گرد اس طرح طواف کریں گے جیسے دنیا کے بچے اپنے کسی عزیز کا خیر مقدم کرتے ہیں جو کہیں دور سے آیا ہو' اور آنے والے سے کہیں گے پھر اس کرامت کی خوشخبری ہو جو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے تیار کر رکھی ہے' پھر ان میں سے ایک لڑکا اسکی حوروں میں سے کسی سے کہے گا کہ فلاں شخص آیا ہے' اور وہ نام لے گا جو دنیا میں اسکا تھا' وہ پوچھے گی کیا تم نے اسے دیکھا ہے' وہ کہے گا ہاں دیکھا ہے' اور میرے پیچھے آرہا ہے' یہ سنکر حور خوشی سے اٹھے گی اور مہمان کے استقبال کے لئے گھر کی دہلیز پر آکھڑی ہوگی' جب وہ اپنے گھر میں داخل ہو گا تو یہ دیکھے گا اس کی بنیادوں میں پتھروں کی جگہ موتی لگے ہوئے ہیں اور ان کے اوپر سرخ سبز زرد رنگ کی ایک عالیشان عمارت بنی ہوئی ہوگی' جب وہ اپنے گھر میں داخل ہو گا تو یہ دیکھے گا کہ اسکی بنیادوں پر پتھروں کی جگہ موتی لگے ہوئے ہیں' اور اسکے اوپر سرخ' سبز' زرد رنگ کی ایک عالیشان عمارت بنی ہوئی ہے' اسکے بعد وہ اوپر کی طرف نظر اٹھائے گا تو اسے انتہائی روشن چمکدار چھت دکھائی دے گی' اگر اللہ تعالیٰ نے اسے قدرت نہ بخشی ہوتی عجب نہ تھا کہ اسکی نگاہ اسکی چمک سے ضائع ہو جاتی' اسکے بعد وہ نیچے نظر ڈالے گا اور دیکھے گا کہ اسکی بیویاں بیٹھی ہوئی ہیں' جام رکھے ہوئے ہیں' فرش بچھا ہوا ہے' اور تکیے لگے ہوئے ہیں' اسکے بعد وہ تکیہ لگا کر بیٹھے گا' اور کہے گا اللہ ربّ العزت کا شکر ہے کہ اس نے ہمیں جنت کی ہدایت دی' اگر وہ ہمیں ہدایت نہ دیتا تو ہم کبھی جنت تک رسائی حاصل نہ کرتے' پھر ایک اعلان کرنے والا یہ اعلان کرے گا کہ تم زندہ رہو گے کبھی مرو گے نہیں قیام کرو گے کبھی سفر نہیں کرو گے' صحت مند رہو گے کبھی بیمار نہیں ہو گے' سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ میں قیامت کے روز جنت کے دروازے پر آکر اسے کھلواؤں گا' داروغۂ جنت سوال کرے گا آپ کون ہیں؟ میں کہوں گا' محمد ہوں' وہ کہے گا مجھے آپ کے لئے حکم دیا گیا ہے کہ آپ سے پہلے کسی کے لئے (یہ دروازہ) نہ کھولوں (مسلم۔ انس)۔

جنّت کے غرفے اور ان کے درجات کی بلندی کا اختلاف : آخرت میں بڑے بڑے درجات ہیں اور بڑے بڑے فضائل ہیں' جس طرح لوگوں کی ظاہری اطاعات' اور باطنی اخلاق محمودہ میں ظاہری فرق ہوتا ہے اسی طرح انکی جزاء میں بھی فرق ظاہر ہو گا' اگر تم اعلا ترین درجات حاصل کرنا چاہتے ہو تو تمہیں یہ کوشش کرنی چاہئے کہ کوئی شخص تم سے اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں سبقت نہ کر سکے' اللہ تعالیٰ نے تمہیں اطاعات کے باب میں منافست اور مسابقت کا حکم دیا ہے' چنانچہ ارشاد فرمایا :-

سَابِقُوا إِلَىٰ مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ (پ ۲۷ ر ۱۹ آیت ۲۱) تم اپنے پروردگار کی مغفرت کی طرف دوڑو۔

وَفِي ذَٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُونَ (۳۰ ر ۸ آیت ۲۶)

اور حرص کرنے والوں کو ایسی چیز کی حرص کرنا چاہئے۔

تعجب اس بات پر ہوتا ہے کہ اگر تمہارا کوئی ساتھی یا پڑوسی تم سے ایک درہم میں آگے بڑھ جائے' یا مکان کی بلندی میں سبقت کر جائے تو تمہیں نہایت ناگوار گزرتا ہے' تمہیں تکلیف ہوتی ہے' اور حسد کی بنا پر تم اپنی زندگی کا لطف کھو بیٹھتے ہو' جب کہ دنیا میں نہ جانے کتنے لوگ تم سے بعض ایسی باتوں میں آگے ہوں گے کہ ان کے سامنے دنیا کی تمام دولت حقیر نظر آتی ہے' حضرت ابو سعید الخدریؓ روایت کرتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اہل جنت اپنے اوپر کی کھڑکیوں والوں کو اس طرح دیکھیں گے کہ جیسے تم مشرق و مغرب کے افق میں ستارے کو جاتا ہوا دیکھتے ہو' اور یہ ان کے مراتب میں فرق کی بنا پر ہو گا' صحابہ کرام نے عرض کیا یا رسول اللہ یہ مرتبہ صرف انبیاء کو حاصل ہو گا اور انبیاء کرام کے سوا کسی کو نہ ملے گا؟ آپ نے فرمایا کیوں نہیں! (دوسروں کو بھی ملے گا) اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے (یہ مرتبہ) وہ لوگ (بھی حاصل کریں گے) جو اللہ

تعالیٰ پر ایمان لائے' جنھوں نے رسولوں کی تصدیق کی (بخاری و مسلم) ایک مرتبہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ بلند درجات والے اپنے نیچے کے درجات والوں کو اس طرح دیکھیں گے جس طرح تم آسمان کے کسی افق میں روشن ستارے کو دیکھتے ہو' اور ابوبکرؓ و عمرؓ ان بلند درجات والوں میں سے ہیں' اور بلندی میں ان سے بڑھ کر ہیں (ترمذی' ابن ماجہ۔ ابوسعیدؓ) حضرت جابرؓ روایت کرتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے ارشاد فرمایا کہ میں تمہیں جنت کے غرفوں کے بارے میں نہ بتلاؤں' میں نے عرض کیا کیوں نہیں! یا رسول اللہ! آپ پر میرے ماں باپ قربان جائیں' فرمایا جنت میں جوہر کی تمام اقسام کے کمرے ہیں' ان کے باہر سے اندر کا منظر' اور اندر سے باہر کا منظر نظر آتا ہے' اور ان میں وہ نعمتیں' لذتیں اور خوشیاں ہیں کہ نہ کسی آنکھ نے دیکھیں' نہ کسی کان نے سنیں' اور نہ کسی آدمی کے دل میں ان کا خیال گزرا' میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! یہ غرفے کیسے حاصل ہوں گے؟ فرمایا یہ غرفے اس شخص کو ملیں گی جس نے سلام پھیلایا' کھانا کھلایا' مسلسل روزے رکھے' رات کو اس وقت نماز پڑھی جب لوگ محو خواب تھے' ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ! ان اعمال کی طاقت کس میں ہے؟ فرمایا میری امت اسکی طاقت رکھتی ہے' اور میں تمہیں اسکے متعلق بتلاتا ہوں' جو شخص اپنے بھائی سے ملا اور اسے سلام کیا اس نے سلام پھیلایا' جس نے اپنے اہل و عیال کو پیٹ بھر کھانا کھلایا تو اس نے کھانا کھلایا' اور جس نے ماہ رمضان اور ہر مہینے کے تین دن روزے رکھے تو اس نے ہمیشہ روزے رکھے اور جس نے عشاء اور فجر کی نماز جماعت سے ادا کی اس نے رات کو اس وقت نماز پڑھی جب لوگ نیند میں ہوتے ہیں یعنی یہود و نصاریٰ اور مجوسی (ابو نعیم)۔ قرآن کریم کی آیت "وَمَسَاكِنَ طَيِّبَةً فِي جَنَّاتِ عَدْنٍ" کی تفسیر میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ موتیوں کے محل ہوں گے' اور ہر محل میں سرخ یاقوت کے ستر گھر ہوں گے' اور ہر گھر میں سرخ زمرد کے ستر کمرے ہوں گے' ہر کمرے میں مسہریاں ہوں گی' اور ہر مسہری پر ستر بستر ہوں گے ہر رنگ کے' اور ہر بستر پر حوروں میں سے ایک بیوی ہوگی' ہر کمرے میں ستر دستر خوان ہوں گے' اور ہر دستر خوان پر ستر طرح کے کھانے ہوں گے' ہر کمرے میں ستر لونڈیاں ہوں گی' اور مومن کو ہر روز اتنی قوت عطا کی جائے گی کہ وہ سب سے ہم بستر ہو سکے (ابن حبان۔ ابو ہریرہؓ)

جنت کی دیواریں' زمین' درخت اور نہریں: ان لوگوں کی خوشی پر غور کرو جو ان جنتوں میں رہیں گے' اور ان لوگوں کی حسرت پر بھی نظر ڈالو جو آخرت کے عوض دنیا پر قانع ہونے کی بنا پر جنتوں سے محروم رہ جائیں گے' پھر جنت کی چار دیواری' اسکی زمین' نہروں اور درختوں میں فکر کرو کہ وہ کتنے خوبصورت' دلفریب' مسحور کن' اور ابدی ہونگے' ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جنت کی دیوار ایک اینٹ چاندی کی اور ایک اینٹ سونے کی ہے' اسکی خاک زعفران ہے' اور گارا مشک ہے (ترمذی) سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے جنت کی مٹی کے متعلق دریافت کیا گیا' آپ نے ارشاد فرمایا سفید میدا خالص مشک ہے (مسلم۔ ابوسعید الخدریؓ) حضرت ابوہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جو شخص یہ چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے جنت میں ریشمی لباس پہنائے وہ دنیا میں نہ پہنے (طبرانی' نسائی) ایک حدیث میں ہے کہ جنت کی نہریں مشک کے پہاڑوں یا مشک کے ٹیلوں کے نیچے سے پھوٹتی ہیں (العقیلی فی الضعفاء۔ ابوہریرہؓ) ایک روایت میں ہیکہ اگر کسی جنتی کے پاس سب سے کم زیور ہو' اور اسکے زیور کا مقابلہ تمام دنیا کے زیور سے کیا جائے تو اللہ تعالیٰ آخرت میں اسے جو زیور پہنائے گا وہ تمام دنیا کے تمام زیور سے اچھا ہوگا' (طبرانی اوسط۔ ابوہریرہؓ)۔ حضرت ابوہریرہؓ کی ایک روایت میں ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جنت میں ایک درخت ایسا ہے کہ اگر اسکے سائے میں سو سال تک چلے تو اسے طے نہ کر سکے' اگر تم چاہو تو قرآن کریم میں پڑھ لو "وَظِلٍّ مَّمْدُودٍ" (اور طویل سائے میں) (بخاری و مسلم)۔

ابوامامہؓ فرماتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں عراب اور ان کے سوالات سے نفع دیتا ہے' ایک مرتبہ ایک اعرابی آیا اور کہنے لگا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ایذا دینے والے درخت کا ذکر فرمایا ہے' اور مجھے نہیں معلوم کہ جنت میں کوئی ایسا درخت بھی ہوگا' جو اہل جنت کو تکلیف پہنچائے گا'

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ درخت کونسا ہے؟ اعرابی نے عرض کا وہ بیری کا درخت ہے اور اس میں کانٹے ہوتے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے سِدْرٍ مَّخْضُوْدٍ فرمایا ہے' یعنی اللہ تعالیٰ اسکے کانٹے کاٹ ڈالے گا اور اسکے کانٹوں کی جگہ پھل لگیں گے' اور ہر پھل میں سے بہتر رنگوں کی غذا برآمد ہوگی' اور کوئی رنگ دوسرے کے مشابہ نہ ہوگا' (ابن المبارک) جریر ابن عبداللہ کہتے ہیں کہ ہم صفاح میں اترے' ہم نے دیکھا کہ ایک شخص درخت کے نیچے سو رہا ہے' اور دھوپ اس تک پہنچنے والی ہے' میں نے غلام سے کہا کہ چڑے کا بستر لے جا اور اسکے اوپر سایہ کرلے' چنانچہ وہ گیا اور اس پر سایہ کرکے کھڑا ہوگیا' جب وہ بیدار ہوا تو میں نے دیکھا کہ وہ حضرت سلمان الفارسیؓ ہیں' میں نے انھیں سلام کیا' آپ نے فرمایا اے جریر! اللہ کے لئے تواضع اختیار کر' اسلئے کہ جو شخص دنیا میں اللہ کے لئے تواضع اختیار کرے گا' اسے اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اونچا اٹھائے گا' کیا تم جانتے ہو کہ قیامت کے دن تاریکیاں کیا ہوں گی؟ فرمایا لوگوں کا ایک دوسرے پر ظلم کرنا' پھر ایک چھوٹا سا تنکا اٹھایا جو اتنا چھوٹا تھا کہ مجھے نظر نہیں آرہا تھا اور فرمایا اے جریر! اگر تم جنت میں یہ تنکا ڈھونڈنا چاہو گے تو تمھیں مل نہیں پائے گا' میں نے عرض کیا اور جنت کے درخت کیسے ہوں گے' فرمایا انکی جڑیں موتی اور سونے کی ہوں گی' اور شاخوں پر پھل ہوں گے۔

اہل جنت کے لباس' بستر' مسہریاں' تکیے اور خیمے: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:-

یُحَلَّوْنَ فِیْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّلُؤْلُؤًا وَلِبَاسُهُمْ فِیْهَا حَرِیْرٌ (پ ۱۷ ر ۱۰ آیت ۲۳)
انکو وہاں سونے کے کنگن اور موتی پہنائے جائیں گے اور پوشاک انکی وہاں ریشم کی ہوگی۔

اس مضمون کی متعدد آیات ہیں' اور تفصیل روایات میں وارد ہے' حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص جنت میں جائے گا وہ نعمتوں سے نوازا جائے گا' وہ کبھی محتاج نہیں ہوگا' اور نہ اسکے کپڑے کبھی گندے ہوں گے' اور نہ جوانی ضائع ہوگی' اسے جنت میں وہ نعمتیں عطا ہوں گے' جو نہ کسی آنکھ نے دیکھی ہوں' نہ کسی کان نے سنی ہوں' اور نہ کسی انسان کے دل میں انکا خیال گزرا ہو (مسلم۔ و آخر الحدیث رواہ البخاری) ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ ہمیں کچھ جنت کے لباس کے متعلق بتلایئے کہ وہ مخلوق ہوں گے جو پیدا کئے جائیں گے یا مصنوع ہوں گے کہ بُنے جائیں گے' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ سکوت فرمایا' بعض لوگ ہنسنے لگے' آپ نے فرمایا کس بات پر ہنستے ہو' کیا اسلئے ہنستے ہو کہ ایک جاہل نے کسی عالم سے سوال کیا ہے' اسکے بعد فرمایا بلکہ جنت کے پھلوں میں نکلا کریں گے' یہ بات آپ نے دو مرتبہ ارشاد فرمائی (نسائی۔ عبداللہ ابن عمرؓ) حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جنت میں سب سے پہلے جو گروہ داخل ہوگا انکے چہرے چودھویں رات کے چاند کی طرح چمکتے ہوں گے' وہ جنت میں نہ تھوکیں گے' نہ ناک سنکیں گے' نہ پیشاب پاخانہ کریں گے' انکے برتن اور کنگھیاں سونے چاندی کی ہوں گی' ان کا پسینہ مشک ہوگا ان میں سے ہر ایک کے پاس دو بیویاں ہوں گی' جنکے حسن کا یہ عالم ہوگا کہ پنڈلی کا مغز گوشت کے اندر سے جھلکتا ہوگا' ان میں کوئی اختلاف نہ ہوگا' ان کے دلوں میں بغض نہ ہوگا' بلکہ سب لوگ ایک دل ہوکر صبح و شام اللہ کے لئے تسبیح کیا کریں گے' اور ایک روایت میں یہ ہے کہ ہر بیوی کے جسم پر ستر لباس ہوں گے (بخاری و مسلم) اللہ تعالیٰ کے ارشاد وَیُحَلَّوْنَ فِیْهَا مِنْ اَسَاوِرَ کی تفسیر میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ انکے سروں پر تاج ہوں گے' اسکے معمولی موتی کا عالم یہ ہوگا کہ اسکی روشنی سے مشرق و مغرب کے درمیان کا حصہ منور ہوجائے گا (ترمذی' ابو سعید الخدریؓ) سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ (جنت میں) خیمہ ایک موتی ہوگا جو بیچ سے خالی ہوگا آسمان میں اسکی لمبائی ساٹھ میل ہوگی' اس خیمے کے ہر گوشے میں مومن کی بیویاں ہوں گی جنھیں دوسرے نہیں دیکھیں گے' (بخاری و مسلم۔ ابو موسیٰ الاشعریؓ) حضرت عبداللہ ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ خیمہ ایک خالی موتی ہوگا' اسکا طول و عرض ایک فرسخ ہوگا اور اسکے چار ہزار سونے کے دروازے ہوں گے' حضرت ابو سعید الخدریؓ کی روایت کے مطابق سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت کریمہ "وَفُرُشٍ مَّرْفُوْعَةٍ" کے باب میں ارشاد فرمایا کہ دو فرشوں کے درمیان اتنا فاصلہ ہوگا جتنا فاصلہ

زمین و آسمان کے درمیان ہے (ترمذی)۔

اہل جنت کا کھانا: اہل جنت کی غذا کا بیان قرآن پاک میں ہے، یہ غذا میووں، موٹے پرندوں، من و سلویٰ، شہد، دودھ اور دوسرے انواع و اقسام کے کھانوں پر مشتمل ہوگی، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

كُلَّمَا رُزِقُوا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا قَالُوا هَٰذَا الَّذِي رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ وَأُتُوا بِهِ مُتَشَابِهًا (پ ار ۳ آیت ۲۵)

جب کبھی دیئے جائیں گے وہ لوگ بہشتوں میں سے کسی پھل کی غذا، تو ہر بار یہی کہیں گے کہ یہ تو وہی ہے جو ہم کو ملا تھا اس سے پیشتر اور ملے گا بھی ان کو دونوں بار کا پھل ملتا جلتا۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے متعدد مواقع پر اہل جنت کی شراب کا ذکر فرمایا ہے۔ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام حضرت ثوبانؓ روایت کرتے ہیں کہ میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کھڑا ہوا تھا، اتنے میں ایک یہودی عالم آیا اور اس نے چند سوالات دریافت کئے، اس نے یہ بھی پوچھا کہ سب سے پہلے پل صراط کون عبور کرے گا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا فقراء، مہاجرین، یہودی نے دریافت کیا کہ جب وہ جنت میں داخل ہوں گے تو ان کا تحفہ کیا ہوگا، فرمایا مچھلی کے جگر کے کباب، اس نے پوچھا اسکے بعد انکی غذا کیا ہوگی، فرمایا جنت کا وہ بیل انکے لئے ذبح کیا جائے گا جو انکے اطراف میں پھرتا ہے، اس نے دریافت کیا کھانے کے بعد وہ لوگ کیا پئیں گے آپ نے فرمایا جنت کی چشمے کا پانی پئیں گے جسے سلسبیل کہتے ہیں، یہودی عالم نے آپ کے جوابات کی تصدیق کی (مسلم) زید ابن ارقم روایت کرتے ہیں کہ ایک یہودی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہنے لگا اے ابوالقاسم! کیا تم یہ گمان نہیں رکھتے کہ جنت میں اہل جنت کھائیں گے اور پئیں گے، اور اپنے ساتھیوں سے کہنے لگا کہ اگر انھوں نے اس کا اعتراف کیا تو میں بحث کروں گا سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہاں میں یہی کہتا ہوں، اور اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے، کہ ان میں سے ہر شخص کو کھانے، پینے اور جماع کرنے میں سو آدمیوں کی قوت دی جائے گی، یہودی نے کہا کھانے پینے والے کو تو (پاخانے کی) حاجت ہوتی ہے، سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا انکی حاجت یہ ہوگی کہ انکے جسم سے مشک جیسا پسینہ نکلے گا اور پیٹ صاف ہو جائے گا (نسائی) حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ روایت کرتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم جنت میں پرندہ دیکھو گے اور اس کی خواہش کرو گے (اچانک) وہ پرندہ تمہارے سامنے بھنی ہوئی حالت میں آگرے گا (مسند بزار) حضرت حذیفہؓ کی روایت کے مطابق سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جنت میں کچھ پرندے بختی اونٹوں کی طرح ہیں، حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ! وہ کیا خوب ہوں گے، آپ نے فرمایا ان سے زیادہ خوب وہ ہوں گے جو انھیں کھائیں گے، اور اے ابوبکرؓ! تم ان لوگوں میں سے ہو جو جنت میں پرندوں کا گوشت کھائیں گے (احمد مثلہ عن انسؓ)۔

قرآن کریم کی آیت "يُطَافُ عَلَيْهِمْ بِصِحَافٍ" کی تفسیر میں حضرت عبداللہ ابن عمرؓ ارشاد فرماتے ہیں کہ انکے اوپر سونے کے ستر قابوں کی گردش ہوگی، ان میں سے ہر قاب میں نئی قسم کا کھانا ہوگا، حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ نے وَمِزَاجُهُ مِنْ تَسْنِيمٍ کے سلسلے میں ارشاد فرمایا کہ اصحاب یمین کے لئے ملونی ملائی جائے گی، اور مقربین اسے خالص پئیں گے، حضرت ابوالدرداءؓ نے "وَخِتَامُهُ مِسْكٌ" کی تفسیر میں فرمایا کہ وہ سفید چاندی جیسی شراب ہوگی، اس سے جنتیوں کی شراب پر مہر لگائی جائیگی، اگر دنیا والوں میں کوئی شخص اس شراب میں انگلی ڈال کر نکال لے تو تمام دنیا اس کی خوشبو سے مہک اٹھے۔

حور اور لڑکے: قرآن کریم میں متعدد جگہوں پر حوروں اور لڑکوں کی تفصیل وارد ہے، چنانچہ حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں صبح کو جانا یا شام کو جانا دنیا و مافیہا سے بہتر ہے، تم میں سے کسی کے لئے جنت میں اتنی جگہ کا ہونا جو قوس کی مقدار ہوتی ہے یا پاؤں کی جگہ کا ہونا دنیا و مافیہا سے بہتر ہے، اگر جنت کی عورتوں میں

سے کوئی عورت زمین پر جھانکے تو تمام آسمان و زمین کے درمیان روشنی اور خوشبو پھیل جائے' اس عورت کے سر کا ڈوپٹہ دنیا و مافیہا سے بہتر ہے (بخاری) حضرت ابو سعید الخدریؓ کی روایت کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے باری تعالیٰ کے ارشاد "كَأَنَّهُنَّ الْيَاقُوتُ وَالْمَرْجَانُ" کی تفسیر میں ارشاد فرمایا کہ ان کے حجرے پردوں میں سے بھی آئینے سے زیادہ صاف شفاف نظر آئیں گے' اور انکے جسم پر معمولی درجے کا ہیرا بھی مشرق و مغرب کے درمیان روشنی پھیلا دے گا' ان کے جسم پر ستر کپڑے ہونگے' لیکن نظران سے آر پار ہو کر پنڈلی کے گوشت کے پیچھے کا مغز صاف دیکھے گی (ابو یعلی) حضرت انسؓ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ جب مجھے معراج ہوئی تو میں جنت میں ایک ایسی جگہ گیا جس کا نام بیدخ ہے' وہاں موتیوں کے' سبز زبرجد کے' اور سرخ یا قوت کے خیمے نصب تھے' اچانک عورتوں نے کہا السّلام علیک یا رسول اللہ! میں نے کہا اے جبرئیل علیہ السلام یہ کیسی آواز تھی' حضرت جبرئیل علیہ السلام نے جواب دیا' یہ خیموں میں پردہ نشین عورتیں ہیں' انھوں نے اپنے رب سے آپ کو سلام کرنے کی اجازت مانگی تھی' چنانچہ انھیں اجازت دیدی گئی' وہ کہنے لگیں کہ ہم راضی ہیں' کبھی ناراض نہیں ہوں گی' ہم ہمیشہ رہنے والی ہیں' کبھی سفر نہیں کریں گی سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کریم کی یہ آیت تلاوت فرمائی (۱) :-

حُورٌ مَّقْصُورَاتٌ فِي الْخِيَامِ (پ ۲۷ ر ۱۳ آیت ۷۲)

وہ عورتیں گوری ہوں گی (اور) خیموں میں محفوظ ہوں گی۔

حضرت مجاہد اللہ تعالیٰ کے ارشاد "وَأَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ" کی تفسیر میں ارشاد فرماتے ہیں کہ وہ بیویاں حیض' پاخانے' پیشاب' تھوک' رینٹ' منی اور بچے کی پیدائش سے پاک ہوں گی' اوزاعیؒ نے آیت کریمہ "فِي شُغُلٍ فَاكِهُونَ" کی تفسیر میں فرمایا کہ ان کا مشغلہ باکرہ عورتوں کی بکارت دور کرنا ہوگا' ایک شخص نے عرض کیا یا رسول اللہ! کیا اہل جنت جماع کریں گے' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ان میں سے ہر ایک کو ایک دن میں تمہارے ستر آدمیوں سے زیادہ قوت دی جائے گی (ترمذی۔ انسؓ)

حضرت عبداللہ ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ مرتبے کے اعتبار سے کم تر جنتی وہ ہوگا جس کے ساتھ ہزار خادم ہوں گے' اور ہر خادم کو وہ کام ہوگا جو دوسرے کو نہ ہوگا' ایک حدیث میں ہے کہ جنتی مرد پانچ سو حوروں چار ہزار باکرہ اور آٹھ ہزار ثیبہ عورتوں سے نکاح کرے گا' اور ان میں سے ہر ایک کے ساتھ اتنی دیر معانقہ کرے گا جتنی دیر دنیا میں زندہ رہا ہوگا' (ابو الشیخ۔ ابن ابی اوفی) ایک روایت میں ہے کہ جنت میں ایک بازار ہے' جس میں مردوں اور عورتوں کے علاوہ کسی چیز کی خرید و فروخت نہیں ہوگی' جب کسی شخص کو کسی صورت کی خواہش ہوگی وہ بازار میں جائے گا' اور اس میں حور عین کا مجمع ہوگا' اور وہ ایسی آواز سے جو مخلوق نے نہ سنی ہوگی یہ کہتی ہوں گی ہم ہمیشہ رہنے والی ہیں' فنا نہیں ہوں گی' ہم نعمت والی ہیں کبھی مفلس نہ ہوں گی' ہم راضی رہنے والی ہیں کبھی ناراض نہ ہوں گی' اچھا ہے وہ شخص جو ہمارا ہوا اور ہم اسکے ہوئے (ترمذی۔ علیؓ) حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا حوریں جنت میں گاتی ہیں کہ ہم خوب صورت حوریں ہیں اور شریف مردوں کے لئے ہمیں چھپایا گیا ہے (طبرانی) یحییٰ ابن کثیر نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد "فِي رَوْضَةٍ يُحْبَرُونَ" کی تفسیر میں فرمایا کہ جنت میں سماع ہوگا۔ ابو امامہ الباہلی سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ جو بندہ جنت میں داخل ہوتا ہے' اسکے سرہانے' اور پاؤں کے پاس دو دو حوریں بیٹھتی ہیں اور اسے خوش گلوئی کے ساتھ گیت سناتی ہیں جسے جن و انس سب سنتے ہیں' وہ گیت شیاطین کے مزامیر نہیں ہوتے' بلکہ اللہ کی تحمید و تقدیس ہوتے ہیں (ترمذی۔ ابو ایوبؓ)۔

اہل جنت کے مختلف اوصاف جو روایات میں وارد ہیں : اسامہ ابن زیدؓ سے مروی ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اصحاب سے ارشاد فرمایا کہ کیا کوئی ہے جو جنت کے لئے تیار ہو' جنت کو کوئی خطرہ نہیں ہے ربّ کعبہ کی قسم وہ ایک چمکدار نور ہے' اور پھولوں کی ایک لہراتی ہوئی شاخ ہے' مضبوط محل ہے' جاری نہر ہے' بے شمار پکے ہوئے میوے ہیں' خوبصورت

(۱) یہ حدیث مجھے ان الفاظ میں نہیں ملی' ترمذی میں مختلف الفاظ اور مضمون کے ساتھ وارد ہے۔

حسین بیوی ہے' راحت و نعمت کے اندر مقام ابد میں شادابی ہے' عالی شان محفوظ مکان ہے' صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! ہم جنت کے لئے تیار ہیں' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ان شاء اللہ تعالیٰ کہو' پھر آپ نے جہاد کا ذکر فرمایا اور اس کی ترغیب دی (ابن ماجہ' ابن حبان) ایک شخص نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں عرض کیا کہ کیا جنت میں گھوڑے ہوں گے' مجھے گھوڑے اچھے لگتے ہیں' آپ نے ارشاد فرمایا کہ اگر تجھے گھوڑا پسند ہے تو سرخ یاقوت کا ملے گا وہ تجھے جہاں تیرا دل چاہے گا لے کر اڑے گا' ایک شخص نے عرض کیا مجھے اونٹ پسند ہیں کیا جنت میں اونٹ ہوں گے' فرمایا اے عبداللہ! اگر تو جنت میں گیا تو تجھے وہ تمام چیزیں ملیں گی جن کو تیرا دل چاہیگا' اور جن سے تیری آنکھوں کو لذت ملے گی (ترمذی۔ بریدہؓ) حضرت ابوسعید الخدریؓ کی روایت ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اہل جنت کے جب وہ چاہیں گے بچے بھی ہوں گے' حمل' وضع' جوانی' سب کچھ ایک ساعت میں ہو جائے گا (ابن ماجہ' ترمذی) ایک حدیث میں ہیکہ جب اہل جنت جنت میں ٹھہر جائیں گے تو بھائی بھائیوں کے مشتاق ہوں گے' اس کا تخت اسکے پاس جائیگا' اور دونوں ملیں گے' اور دنیا میں جو کچھ انکے درمیان تھا اسکے متعلق گفتگو کریں گے' ایک کہے گا! وہ دن اور وہ مجلس یاد کر جس میں ہم نے اللہ سے دعا کی تھی (اس دن کی دعا کے باعث) اللہ نے ہماری بخشش فرمادی (بزار۔ انسؓ) سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ جنت والے بالوں سے صاف' بے ریش' خوش رو' سرمہ لگائے ہوئے تینتیس برس کی عمر کے' آدام کی پیدائش پر' انکا طول ساٹھ ہاتھ کا' اور عرض سات ہاتھ ہوگا (ترمذی۔ ابن معاذؓ) سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اہل جنت میں ادنیٰ شخص وہ ہوگا جس کے ایک ہزار خادم اور بہتّر بیویاں ہوں گی' اور جس کے لئے موتی' زبرجد' اور یاقوت کا خیمہ نصب کیا جائے گا' اور جو جابیہ سے صنعاء تک وسیع ہوگا' اور انکے سروں پر تاج ہوں گے' اور تاج کا معمولی سا موتی مشرق سے مغرب تک روشنی کرے گا (ترمذی۔ ابوسعیدؓ)۔

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرماتے ہیں کہ میں نے جنت دیکھی' اسکے اناروں میں سے ایک انار پالان کسے ہوئے اونٹ کی پشت کی طرح تھا' اور اسکا پرندہ بختی اونٹ کی طرح تھا' میں نے اس کی باندی کو دیکھا اور اس سے پوچھا کہ تو کس کی ہے؟ اس نے کہا میں زید ابن حارثہ کی ہوں' اور جنت میں ایسی چیزیں ہیں جنھیں نہ کسی آنکھ نے دیکھا ہے' نہ کان نے سنا اور نہ کسی انسان کے دل پر ان کا خیال گزرا (ثعلبی' ابوسعید الخدریؓ) حضرت کعب الاحبار فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو اپنے ہاتھ سے بنایا' اپنے ہاتھ سے تورات لکھی' اور اپنے ہاتھ سے جنت میں درخت لگائے' پھر اس سے کہا بول' جنت نے کہا قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ (اہل ایمان کامیاب ہوئے)۔

یہ ہیں جنت کی صفات' پہلے ہم نے ان کا اجمالی ذکر کیا' اسکے بعد تفصیلات بیان کیں' حضرت حسن بصریؒ نے جنت کے اوصاف کی ان الفاظ میں تفصیل بیان کی ہے' کہ اسکے انار ڈول جیسے ہیں' اور اس کی نہروں میں نہ سڑنے والا پانی ہے' اور اس میں دودھ کی نہریں ہیں جن کا ذائقہ نہیں بدلتا' اور صاف شہد کی نہریں ہیں جو انسان نے صاف نہیں کیا' اور شراب کی نہریں ہیں جن میں پینے والوں کے لئے لذت ہے' وہ نیند میں مبتلا نہیں کرتی' اور نہ اسکے پینے سے سر میں درد ہوتا ہے' جنت میں وہ عجیب و غریب چیزیں ہیں جو نہ کسی آنکھ نے دیکھیں' نہ کسی کان نے سنیں' اور نہ کسی آدمی کے دل میں خیال پیدا ہوا' اسکے رہنے والے صاحب نعمت بادشاہ ہیں' تینتیس برس کی عمر کے' سب کی عمر ایک ہوگی' اور قد بھی یکساں یعنی آسمان میں ان کی لمبائی ساٹھ ہاتھ کی ہوگی' آنکھوں میں سرمہ لگائے ہوئے' جسم بالوں سے صاف' چہرہ داڑھی سے خالی' عذاب سے مامون' شر سے مانوس اور مطمئن' جنت کی نہریں یاقوت اور زبرجد کی کنکریوں میں بہتی ہیں' اسکے درخت' درختوں کی رگیں' اور انگور موتی ہیں' اور اسکے پھلوں کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں ہے' اور اسکی خوشبو پانچ سو برس کی مسافت تک محسوس کی جائے گی' اہل جنت کو جنت میں گھوڑے' اور اونٹ ملیں گے' جو نہایت سبک رفتار ہوں گے' انکی کاٹھیں' لگامیں' اور زین سب یاقوت کی ہوں گی' وہ ان جانوروں پر بیٹھ کر جنت کی سیر کریں گے' ان کی بیویاں بڑی بڑی آنکھوں والی حوریں ہوں گی' گویا پوشیدہ موتی ہوں' اور وہ عورتیں اپنی انگلیوں سے ستر لباس پہنیں گی' اسکے

باجود ستر لباسوں کے پیچھے سے انکی پنڈلی کا مغز صاف چمکے گا' اللہ تعالیٰ نے وہاں اخلاق کو برائی سے' اور جسموں کو موت سے پاک فرمایا ہے' جنتی وہاں نہ تھوکیں گے' نہ پاخانہ کریں گے' بلکہ پاخانہ پیشاب وغیرہ کے بجائے مشک کی خوشبو جیسی ڈکار لیں گے' اور انکے جسم سے پسینہ بہے گا' انھیں جنت میں صبح وشام رزق عطا کیا جائے گا' مگر وہاں رات نہیں آئے گی' کہ صبح کے بعد شام آئے یا شام کے بعد صبح طلوع ہو' سب کے بعد' اور سب سے کم مرتبے کا حامل جو شخص جنت میں داخل ہو گا' وہ سو برس کی مسافت کے فاصلے تک سونے چاندی کے محلات' اور موتیوں کے خیمے دیکھے گا' اور اسکی آنکھوں کو اتنی قدرت دی جائے گی کہ وہ دور و نزدیک کی تمام چیزوں کو یکساں طور پر دیکھ سکے' اسکے پاس سونے کی ستر قابیں صبح کو اور ستر شام کو لائی جائینگی' اور ہر قاب میں الگ ذائقے کا کھانا ہو گا' جنت میں ایک ایسا یاقوت ہے جس میں ستر ہزار گھر ہیں' اور ہر گھر میں ستر ہزار کمرے ہیں' جن میں نہ کہیں سوراخ ہے' اور نہ شگاف ہے۔

حضرت مجاہدؒ فرماتے ہیں کہ اہل جنت میں سب سے معمولی مرتبے کا شخص وہ ہو گا جس کی سلطنت ایک ہزار سال کی مسافت کے بقدر ہوگی' اور وہ اپنی سلطنت کی انتہائی حدود تک بالکل اس طرح دیکھ سکے گا' جس طرح قریب کی چیزوں کو دیکھے گا' اور سب سے اعلا مرتبہ اس شخص کا ہو گا جو صبح وشام اپنے رب کی زیارت کرے گا' سعید ابن المسیبؒ فرماتے ہیں کہ جنت میں ایک حور ہے جس کا نام عیناء ہے جب وہ چلتی ہے تو اسکے دائیں بائیں ستر ہزار خادمائیں چلتی ہیں' اور وہ کہتی ہے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے والے کہاں ہیں' یحییٰ ابن معاذؒ فرماتے ہیں کہ دنیا چھوڑنا سخت ہے' اور جنت کا فوت ہونا سخت تر ہے' ترک دنیا حبّ آخرت ہے' یہ بھی حضرت ابو ہریرہؓ کا قول ہے طلب دنیا میں ذلت نفس ہے' اور طلب آخرت میں عزت نفس ہے' تعجب ہے اس شخص پر جو فنا ہو جانے والی چیز کی طلب کو ذلیل کرے' اور باقی رہنے والی چیز سے اعراض کرکے عزت نفس ترک کرے۔

اللہ تعالیٰ کی وجہ کریم کی رویت : قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا :-

لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا الْحُسْنَىٰ وَزِيَادَةٌ (پ ۱۱ ر ۸ آیت ۲۶)

جن لوگوں نے نیکی کی ہے ان کے واسطے خوبی (جنت) ہے اور مزید بر آں (خدا کا دیدار)۔

یہ زیادتی اللہ تعالیٰ کی وجہ کریم کی رویت اور اسکا دیدار ہے' اور یہ ایک ایسی اعلا ترین لذت ہے جسے پا کر اہل جنت باقی تمام لذتیں اور نعمتیں بھول جائیں گے' کتاب المحبت میں رویت الٰہی کی حقیقت بیان کی گئی ہے' اور کتاب وسنت سے اسکے وہ شواہد پیش کئے گئے ہیں جو اہل بدعت کے معتقدات کی تکذیب کرتے ہیں' جریر ابن عبداللہ البجلی کہتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بیٹھے ہوئے تھے' آپ نے چودھویں شب کے چاند کو دیکھ کر ارشاد فرمایا کہ تم اپنے رب کو اس طرح دیکھو گے جیسے یہ چاند دیکھتے ہو' تم چاند کو دیکھنے میں ایک دوسرے پر نہیں گرتے' اگر تم سے ہو سکے تو طلوع آفتاب اور غروب آفتاب سے پہلے کی نمازوں سے نہ تھکو انھیں ادا کر لیا کرو' اسکے بعد آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔

وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوبِهَا (پ ۱۶ ر ۱۷ آیت ۱۳۰)

اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح کیا کیجئے' آفتاب نکلنے سے پہلے اور اسکے غروب سے پہلے۔

یہ روایت صحیحین میں ہے' امام مسلم اپنی صحیح میں حضرت صہیب سے روایت کرتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت کریمہ "وَلِلَّذِينَ أَحْسَنُوا الْحُسْنَىٰ وَزِيَادَةٌ" تلاوت فرمائی اور ارشاد فرمایا کہ جب جنت والے جنت میں اور دوزخ والے دوزخ میں داخل ہو جائیں گے' تو ایک اعلان کرنے والا یہ اعلان کرے گا کہ اے اہل جنت! تم سے اللہ کا ایک وعدہ ہے' اور وہ اب تم سے پورا کرنا چاہتا ہے' جنتی کہیں گے کہ وہ وعدہ کیا ہے؟ کیا ہمارے وزن بھاری نہیں کر چکا' کیا ہمارے چہرے روشن نہیں کر چکا' کیا ہمیں جنت میں داخل نہیں کیا' اور دوزخ سے نہیں بچایا' فرمایا اسکے بعد حجاب اٹھ جائے گا' اور وہ لوگ اللہ تعالیٰ کی وجہ کریم کا دیدار کریں گے' اور کوئی چیز اس سے زیادہ محبوب انھیں حاصل نہیں ہوگی' رویت باری تعالیٰ کی حدیث متعدد صحابہ سے

مروی ہے' دیدار الٰہی کا شرف ہی تمام اچھائیوں اور خوبیوں کی انتہا اور تمام نعمتوں کی غایت ہے۔ گزشتہ سطور میں جنت کی جو نعمتیں مذکور ہوئیں وہ اس نعمت عظمٰی کے سامنے حقیر رہ جائیں گی' لقاء خداوندی اور دیدار الٰہی کی سعادت سے انھیں جو خوشی حاصل ہوگی اسکی کوئی انتہا نہیں ہوگی' بلکہ جنت کی لذتوں کو اس لذت سے کوئی نسبت ہی نہیں ہے' یہاں ہم اس موضوع پر مزید کلام نہیں کرنا چاہتے' کیوں کہ کتاب المحبّت والشوق والرضا میں اس کا ذکر تفصیل سے آچکا ہے' یہاں صرف اتنا کہیں گے کہ جنت سے بندے کا مقصد اسکے علاوہ کچھ نہ ہونا چاہئے کہ وہاں مالک حقیقی سے ملاقات کا شرف حاصل ہوگا' جنت کی باقی نعمتوں میں تو چراگاہوں میں چرنے والے جانور بھی تمہارے شریک ہیں۔

خاتمۂ کتاب' وسعت رحمت الٰہیہ کا ذکر بطور فال نیک : جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نیک فال لینے کو پسند فرماتے تھے' ہمارے پاس ایسے اعمال نہیں ہیں' جن سے ہم مغفرت کی امید رکھیں' اسلئے ہمیں نیک فال میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء کرنی چاہئے' اور یہ امید کرنی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں ہمارا انجام بخیر کرے گا' جس طرح ہم نے اس کی رحمت کے ذکر پر اپنی کتاب ختم کی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔

إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَٰلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ (پ ۵ ر ۱۵ آیت ۴۶)

بیشک اللہ تعالیٰ اس بات کو نہ بخشیں گے کہ ان کے کہ ان کے ساتھ کسی کو شریک قرار دیا جائے اور اس کے سوا اور جتنے گناہ ہیں جس کے لئے منظور ہے گناہ بخش دیں گے۔

قُلْ يَا عِبَادِيَ الَّذِينَ أَسْرَفُوا عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوا مِنْ رَحْمَةِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ جَمِيعًا إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ (پ ۲۴ ر ۳ آیت ۵۳)

آپ کہدیجئے کہ اے میرے بندوں جنھوں نے (کفر شرک کرکے) اپنے اوپر زیادتیاں کی ہیں کہ تم خدا کی رحمت سے نا امید مت ہو' بالیقین خدا تعالیٰ تمام گناہوں کو معاف فرمادے گا واقعی وہ بڑا بخشنے والا بڑی رحمت والا ہے۔

وَمَنْ يَعْمَلْ سُوءًا أَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهُ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللَّهَ يَجِدِ اللَّهَ غَفُورًا رَحِيمًا (پ ۵ ر ۳ آیت ۱۰)

اور جو شخص کوئی برائی کرے یا اپنی جان کا ضرر کرے پھر اللہ تعالیٰ سے معافی چاہے تو وہ اللہ تعالیٰ کو بڑی مغفرت والا بڑی رحمت والا پائے گا۔

ہم اللہ تعالیٰ سے ہر اس لغزش کی معافی کے خواستگار ہیں جو اس کتاب میں یا دوسری کتابوں میں ہمارے قلم سے سرزد ہوئی ہو' اور ہم ایسے اقوال کے لئے بھی اللہ کی مغفرت چاہتے ہیں جو ہمارے اعمال کے موافق نہیں ہیں' اور ہم اللہ کے دین سے اپنی بصیرت آگہی اور علم کے دعویٰ کی بخشش چاہتے ہیں' کیوں کہ اس علم و آگہی میں ہم سے تقصیر ہوئی ہے' اور ہر اس علم و عمل کی بھی جس سے ہم نے رب کریم کی خوشنودی کا قصد کیا' لیکن بعد میں غیر کا اختلاط کر بیٹھے' اور اس وعدے کی بھی جو ہم نے اپنے نفسوں سے کیا' پھر وفائے عہد میں کوتاہی کی' اور ہر اس نعمت کی بھی جو ہمیں عطا کی گئی اور ہم نے اسے معصیت میں استعمال کیا' اور اس عیب کی بھی جس سے ہم خود متصف تھے' لیکن ہم نے صراحتاً یا بطور اشارہ دوسروں کو اس عیب سے منسوب کیا' اور اس خیال کی بھی جو محض لوگوں کو دکھلانے کے لئے' یا تصنع و تکلّف کے بطور کسی کتاب کی تالیف' خطاب یا تدریس کا محرک بنا' ان تمام امور کی مغفرت چاہنے کے بعد ہم یہ امید کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہماری اس کتاب کے پڑھنے لکھنے اور سننے والوں کو اپنی مغفرت اور رحمت سے نوازے گا' اور ہمارے تمام ظاہری' اور باطنی گناہوں اور خطاؤں سے درگذر فرمائے گا اس لیے کہ اس کا کرم عام ہے' اسکی رحمت وسیع ہے اور تمام مخلوق پر اسکی عطا شامل ہے' ہم بھی اللہ ہی کی مخلوق ہیں' ہمارے پاس اسکے فضل و

کرم کے سوا کوئی وسیلہ نہیں ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی سو رحمتیں ہیں' ان میں سے اللہ تعالیٰ نے جن و انس' چرند' پرند' اور حشرات الارض کے درمیان ایک رحمت نازل فرمائی ہے' اسی ایک رحمت کے باعث وہ آپس میں ایک دوسرے سے عطف و محبت کا معاملہ کرتے ہیں' اور اس نے اپنی ننانوے رحمتیں پیچھے رکھی ہیں' ان سے قیامت کے دن اپنے بندوں پر رحم فرمائے گا (مسلم۔ ابو ہریرہ' سلمان فارسیؓ)۔ روایت ہیکہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ عرش کے نیچے سے ایک تحریر نکالے گا' اس میں لکھا ہو گا کہ میری رحمت میرے غضب پر سبقت کر گئی' اور میں تمام رحم کرنے والوں میں سب سے زیادہ رحم والا ہوں' اسکے بعد دوزخ کے اندر سے جنتیوں سے دوگنے آدمی باہر نکلیں گے (بخاری و مسلم) ایک حدیث میں ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ہم پر ہنستا ہوا تجلی فرمائے گا' اور ارشاد فرمائے گا مسلمانو! مژدہ ہو' تم میں سے کوئی ایسا نہیں ہے جس کے عوض میں نے کسی یہودی یا نصرانی کو دوزخ میں نہ ڈالا ہو (مسلم۔ ابو موسیٰ) سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ حضرت آدم علیہ السلام کی شفاعت انکی اولاد میں سے ایک لاکھ کے لئے اور ایک روایت کے مطابق ایک کروڑ کے لئے قبول فرمائے گا (طبرانی۔ انسؓ) اللہ تعالیٰ قیامت کے دن مومنین سے فرمائے گا کہ کیا تمہیں میری ملاقات محبوب تھی' وہ عرض کریں گے ہاں! اے ہمارے رب! اللہ تعالیٰ فرمائے گا کیوں؟ وہ عرض کریں گے ہم نے تیرے عفو اور مغفرت کی امید کی تھی' اللہ تعالیٰ فرمائے گا' میں نے تمہارے لئے اپنی مغفرت واجب کر دی (احمد' طبرانی) ایک حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ فرمائے گا دوزخ سے ہر اس شخص کو نکال لو جس نے کسی دن میرا ذکر کیا تھا' یا کسی جگہ مجھ سے ڈرا تھا (ترمذی۔ انسؓ) سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب دوزخ میں اہل دوزخ جمع ہو جائیں گے' اور اہل قبلہ میں سے وہ لوگ بھی جمع ہو جائیں گے جن کو اللہ چاہے گا تو کفار مسلمانوں سے کہیں گے کیا تم مسلمان نہیں تھے؟ وہ کہیں کہ کیوں نہیں! ہم مسلمان تھے' کفار کہیں گے پھر تمہارے اسلام سے کیا فائدہ ہوا' دوزخ میں تم ہمارے ساتھ ہو' وہ کہیں گے ہم نے گناہ کئے تھے' ان گناہوں کی وجہ سے ہماری پکڑ ہوئی' اللہ تعالیٰ ان کی گفتگو سنے گا' اور دوزخ میں سے اہل قبلہ کو نکالنے کا حکم دے گا' وہ نکلیں گے' جب کفار انھیں دیکھیں گے تو (حسرت سے) کہیں گے کہ کاش ہم بھی مسلمان ہوتے' آج ان کی طرح دوزخ سے نکل جاتے' اسکے بعد سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی :-

رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ كَانُوا مُسْلِمِينَ (پ ۱۴ر ۱ آیت ۲)

کافر لوگ بار بار تمنا کریں گے کیا خوب ہوتا اگر وہ مسلمان ہوتے۔

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر بچے پر ماں کی شفقت سے زیادہ شفقت کرتا ہے (بخاری و مسلم۔ عمر ابن الخطاب) حضرت جابر ابن عبد اللہؓ روایت کرتے ہیں کہ قیامت کے دن جس شخص کی نیکیاں گناہوں سے زیادہ ہوں گی وہ بلا حساب جنت میں داخل ہو گا' اور جس کی نیکیاں اور گناہ برابر ہوں گے اس کا معمولی حساب ہو گا پھر وہ جنت میں داخل ہو جائیگا' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت اس شخص کے لئے ہوگی جس نے خود کو ہلاک کر ڈالا ہو' اور جس کی کمر گناہوں کے بوجھ سے جھک گئی ہو۔

روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ارشاد فرمایا اے موسیٰ! سے قارون نے فریاد کی تھی' مگر تم نے اسکی فریاد پوری نہیں کی' قسم ہے اپنی عزت و جلال کی! اگر وہ مجھ سے فریاد کرتا تو میں اسکی فریاد پوری کرتا' اور اسے معاف کر دیتا' سعد ابن بلال کہتے ہیں کہ قیامت کے دن دو آدمیوں کو دوزخ سے نکالے جانے کا حکم ہو گا' پھر اللہ تعالیٰ ان سے فرمائے گا' کہ یہ تمہارے اعمال کی سزا ہے' اس کے بعد حکم ہو گا کہ انھیں دوزخ میں واپس لے جاؤ' یہ حکم سنتے ہی ایک شخص پابہ زنجیر دوڑتا ہوا' دوزخ میں جا گرے گا' اور دوسرا گھسٹتا ہوا چلے گا' انھیں پھر دوزخ سے باہر لایا جائے گا' اور ان سے انکی حرکت کا سبب پوچھا جائیگا ایک تو تیز دوڑتا ہوا دوزخ میں جا پڑا' اور دوسرے نے گھسٹ گھسٹ کر قدم اٹھائے' دوڑنے والا عرض کرے گا کہ میں تیری نافرمانی کے وبال

سے خوفزدہ تھا' اس لئے اب نافرمانی کر کے مزید غضب کا مستحق بننا نہیں چاہتا تھا' دوسرا عرض کرے گا مجھے تیرے ساتھ حسن ظن تھا اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ تو مجھے دوزخ میں سے نکال کر دوبارہ اس میں نہیں ڈالے گا' چنانچہ ان دونوں کو جنت میں داخل کردیا جائے گا' سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے قیامت کے دن عرش کے نیچے سے ایک اعلان کرنے والا یہ اعلان کریگا اے امت محمد! تم پر میرے جو حقوق واجب تھے وہ میں نے معاف کردئیے ہیں' اب تمہارے ایک دوسرے کے حقوق باقی رہ گئے ہیں' وہ تم معاف کرو اور میری رحمت سے جنت میں داخل ہوجاؤ (سباعیات ابی الاسعد القشیری۔ انس) ایک اعرابی نے حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کو قرآن کریم کی یہ آیت تلاوت کرتے ہوئے سنا :-

كُنتُمْ عَلَىٰ شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَأَنقَذَكُم مِّنْهَا (پ ۴ ر ۲ آیت ۱۰۳)

اور تم لوگ دوزخ کے گڑھے کے کنارے پر تھے سو اس سے اللہ تعالیٰ نے تمہاری جان بچائی۔

یہ آیت سن کر اعرابی کہنے لگا بخدا اس نے بچایا تو نہیں بلکہ وہ تو اس میں ڈالنا چاہتا ہے' حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا اس ناسمجھ کی بات سنو' صنابحی روایت کرتے ہیں کہ میں حضرت عبادۃؓ ابن الصامت کی خدمت میں حاضر ہوا' اس وقت وہ مرض وفات میں گرفتار تھے' میں (انھیں اس حال میں دیکھ کر) رونے لگا' آپ نے فرمایا صبر کرو' کیوں روتے ہو' بخدا سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہوئی ہر وہ حدیث تم سے بیان کردی ہے' جس میں تمہارے لئے خیر ہے' سوائے ایک حدیث کے' اور وہ حدیث آج بیان کرتا ہوں۔ اس وقت جب کہ میں گھر چکا ہوں۔ میں نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے جو شخص یہ گواہی دیتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں' اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں' اللہ تعالیٰ اس پر دوزخ حرام کردیتا ہے' (مسلم)۔ حضرت عبداللہ ابن عمرو ابن العاصؓ روایت کرتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ میری امت کے ایک شخص کو تمام لوگوں کے سامنے لائے گا' اور اس پر ننانوے رجسٹر کھولے جائیں گے' ہر رجسٹر حد نظر تک وسیع ہوگا' پھر اس سے اللہ تعالیٰ فرمائے گا کیا تو ان اعمال ناموں میں سے کسی عمل کا انکار کرتا ہے' کیا میرے محافظ فرشتوں نے تجھ پر ظلم کیا ہے' وہ عرض کرے گا نہیں اے رب کریم! اللہ تعالیٰ فرمائے گا ہاں ہمارے پاس تیری ایک نیکی ہے' اور آج کے دن کسی پر کوئی ظلم نہیں ہوگا' چنانچہ ایک کارڈ نکالا جائے گا اس پر لکھا ہوگا "اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ" وہ شخص عرض کرے گا یا اللہ ان (لمبے چوڑے) رجسٹروں کے سامنے اس (معمولی) کارڈ کی کیا حقیقت ہے' اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ تجھ پر ظلم نہیں ہوگا' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں پھر تمام رجسٹر ایک پلڑے میں' اور یہ کارڈ دوسرے پلڑے میں رکھا جائے گا' رجسٹر ہلکے پڑجائیں گے' اور کارڈ بھاری رہے گا' اسلئے کہ اللہ کے نام سے زیادہ کوئی چیز بھاری نہیں ہوسکتی (ابن ماجہ' ترمذی) ایک طویل حدیث کے آخر میں جس میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامت اور صراط کا ذکر کیا ہے' یہ ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ملائکہ سے فرمائے گا جس کے دل میں دینار کے برابر بھی خیر ہو اس کو دوزخ سے باہر نکال لو' فرشتے ایسے لوگوں کو نکالیں گے' اور اس طرح بے شمار مخلوق باہر نکل آئے گی' فرشتے عرض کریں گے' یا اللہ! تو نے جن لوگوں کے متعلق حکم دیا تھا ہم نے ان میں سے کسی کو نہیں چھوڑا' پھر اللہ تعالیٰ فرمائے گا واپس جاؤ' اور جس کے دل میں ذرہ برابر بھی خیر ہو اسے دوزخ سے نکالو' چنانچہ بے شمار مخلوق باہر نکل آئے گی' فرشتے عرض کریں گے یا اللہ! تو نے جن لوگوں کے متعلق ہمیں حکم دیا تھا ان میں سے کوئی بھی دوزخ میں باقی نہیں رہا ہے' ابو سعید الخدری یہ روایت بیان کرکے فرماتے تھے کہ اگر تم اس حدیث کے سلسلے میں میری تصدیق نہ کرو تو یہ آیت پڑھ لو :-

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ وَاِنْ تَكُ حَسَنَةً يُّضَاعِفْهَا وَيُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ اَجْرًا عَظِيْمًا
(پ ۵ ر ۳ آیت ۴۰)

بلاشبہ اللہ تعالیٰ ایک ذرہ برابر بھی ظلم نہ کریں گے' اور اگر نیکی ہوگی تو اسکو کئی گنا کردیں گے' اور اپنے

پاس سے اور اجر عظیم دیں گے۔

راوی کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرمائے گا ملائکہ نے شفاعت کی انبیاء نے شفاعت کی' مومنین نے شفاعت کی' اب صرف ارحم الراحمین باقی رہ گیا ہے' یہ کہہ کر دوزخ میں سے ایک مٹھی بھر کر ایسے آدمیوں کو نکالے گا جنھوں نے کبھی نیک عمل نہیں کیا تھا' اور جو (دوزخ میں پڑے پڑے) کوئلہ ہو گئے تھے' دوزخ سے نکال کر انھیں جنت کے دروازں کے سامنے بنی نہر میں ڈال دیا جائے گا جسے نہر حیات کہتے ہیں' اس نہر میں غسل کر کے وہ ایسے نکلیں گے جیسے رو کے پانی سے سبزہ نکل آتا ہے' تم دیکھتے نہیں کہ وہ سبز پتھر اور درخت کے قریب ہوتا ہے چنانچہ اس کا جو حصہ آفتاب سے متصل ہوتا ہے وہ زرد اور سبز ہوتا ہے' اور جو سائے میں ہوتا ہے وہ سفید ہوتا ہے' صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! گویا آپ نے جنگل میں چرایا تھا' آپ نے فرمایا پھر وہ لوگ ایسے نکلیں گے جیسے موتی' انکی گردنوں میں مہریں ہوں گی' ان کی وجہ سے اہل جنت انھیں پہچانیں گے' اور کہیں گے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے آزاد کئے ہوئے ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ نے کسی عمل خیر کے بغیر جنت میں داخل کیا ہے' پھر اللہ تعالیٰ ان سے فرمائے گا تم جنت میں داخل ہو' جو تمہیں نظر آئے وہ سب تمہارا ہے' وہ عرض کریں گے اے اللہ! تو نے ہمیں اتنا عطا کر دیا ہے کہ دنیا والوں میں سے کسی کو اتنا عطا نہیں کیا' اللہ تعالیٰ فرمائے گا تمہارے لئے میرے پاس اس سے بھی عمدہ نعمت ہے' وہ عرض کریں گے اس سے افضل چیز کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا تم سے میری رضا میں اسکے بعد تم پر کبھی ناراض نہیں ہوں گا (بخاری و مسلم)۔

حضرت عبداللہ ابن عباس سے مروی ہے کہ ایک دن سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے پاس تشریف لائے اور ارشاد فرمایا کہ میرے سامنے امتیں پیش کی گئیں' ایک نبی گزرتا اور اس کے ساتھ ایک آدمی ہوتا کسی نبی کے ساتھ دو آدمی ہوتے' اور کسی کے ساتھ کوئی بھی نہ ہوتا' اور کسی کے ساتھ گروہ ہوتا پھر میں نے ایک زبردست مجمع دیکھا اور مجھے یہ توقع ہوئی کہ شاید یہ میری امت کے لوگ ہیں مجھ سے کہا گیا کہ موسیٰ علیہ السلام اور ان کی امت ہے' پھر مجھ سے کہا گیا دیکھو' میں نے ایک زبردست ہجوم دیکھا جس سے افق چھپ گیا' مجھ سے کہا گیا کہ اسی طرح دیکھتے رہو' چنانچہ میں نے بے پناہ خلقت دیکھی' مجھ سے فرمایا گیا کہ یہ آپ کی امت ہے' اور اس کے ساتھ ستر ہزار آدمی بلا حساب جنت میں داخل ہوں گے' لوگ منتشر ہو گئے' اور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بیان نہیں فرمایا کہ وہ ستر ہزار آدمی کون ہوں گے' اس پر صحابہ نے ایک دوسرے سے کہا ہم تو شرک میں پیدا ہوئے تھے' لیکن بعد میں ہم اللہ اور اسکے رسول پر ایمان لے آئے' وہ لوگ ہمارے بیٹے ہوں گے' اس گفتگو کی خبر سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو ہوئی' آپ نے ارشاد فرمایا کہ یہ وہ لوگ ہوں گے جو نہ داغ کھائیں نہ منتر پڑھیں' نہ بدفالی کریں' اور صرف اپنے رب پر توکّل کریں' عکاشہ نے کھڑے ہو کر عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! دعا فرمایئے اللہ تعالیٰ مجھے ان میں سے کر دے' آپ نے ارشاد فرمایا تو ان میں سے ہے پھر دوسرا شخص کھڑا ہوا اور اس نے بھی وہی کہا جو عکاشہ نے کہا تھا' آپ نے فرمایا عکاشہ تم پر سبقت لے گیا (بخاری) عمرو ابن حزم الانصاری کہتے ہیں کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم تین روز ہم سے غائب رہے' آپ صرف فرض نماز ادا کرنے کے لئے تشریف لاتے' اور نماز کے بعد واپس تشریف لے جاتے' چوتھے روز آپ ہمارے پاس تشریف لائے ہم نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ ہم سے غائب رہے یہاں تک کہ ہمیں یہ خیال ہوا کہ شاید کوئی حادثہ رونما ہوا ہے' آپ نے ارشاد فرمایا خیر کی بات وقوع پذیر ہوئی ہے' میرے رب نے مجھ سے وعدہ فرمایا ہے کہ وہ میری امت میں سے ستر ہزار آدمیوں کو بلا حساب جنت میں داخل کرے گا' میں نے اپنے رب سے ان تین دنوں میں یہ تعداد زیادہ کرنے کی دعا مانگی' تو میں نے اپنے رب کو بڑائی والا' ہر چیز کو موجود رکھنے والا' اور کرم والا پایا' اور اس نے ستر ہزار میں سے ہر شخص کے ساتھ ہزار آدمی کی بخشش کا وعدہ فرمایا میں نے عرض کیا یا اللہ کیا میری امت کی یہ تعداد ہو جائے گی' فرمایا ہم آپ کے لئے یہ تعداد اعراب میں سے پوری کر دیں گے (بیہقی' ابو یعلی' احمد۔ ابو بکر)۔

حضرت ابوذرؓ کی روایت ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا حق کی جانب سے جبرئیل علیہ السلام میرے

سامنے آئے' اور کہنے لگے کہ آپ اپنی امت کو خوشخبری سنا دیجئے کہ جو شخص اس حال میں مرے کہ اس نے اللہ کے ساتھ شرک نہ کیا ہو وہ جنت میں داخل ہو گا' میں نے کہا اے جبرئیل خواہ وہ شخص چوری کرے اور زنا کرے' انھوں نے کہا ہاں' خواہ وہ چوری کرے یا زنا کرے میں نے کہا خواہ وہ چوری کرے اور زنا کرے انھوں نے کہا خواہ وہ چوری کرے یا زنا کرے میں نے کہا خواہ وہ چوری کرے اور زنا کرے۔ جبرئیل نے کہا خواہ وہ چوری کرے زنا کرے اور شراب پیئے (بخاری و مسلم) حضرت ابوالدرداءؓ کی روایت میں ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی:۔

وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ جَنَّتَانِ (پ ۲۷ ر ۱۳ آیت ۴۶)

اور جو اپنے رب سے ڈرے اس کے لئے دو جنتیں ہیں۔

میں نے عرض کیا خواہ وہ چوری کرے اور زنا کرے یا رسول اللہ! آپ نے پھر یہی آیت تلاوت فرمائی' میں نے عرض کیا خواہ وہ چوری کرے اور زنا کرے یا رسول اللہ! آپ نے پھر وہی آیت پڑھی' میں نے عرض کیا خواہ وہ چوری کرے اور زنا کرے یا رسول اللہ! آپ نے فرمایا: خواہ ابوالدرداءؓ کو ناگوار گزرے (احمد) سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ قیامت کے روز ہر مومن کو دوسری ملتوں کا ایک شخص حوالہ کیا جائے گا اور اس سے کہا جائے گا یہ دوزخ سے تیری رہائی کا فدیہ ہے (مسلم۔ ابو موسیٰ الاشعریؓ) ابوبریرہؓ سے مروی ہے کہ انھوں نے حضرت عمر ابن عمر عبدالعزیزؒ سے یہ روایت بیان کی ہے کہ مجھ سے میرے والد ابو موسیٰ نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا ہے کہ کوئی مسلمان آدمی ایسا نہیں مرتا جس کی جگہ اللہ تعالیٰ کسی یہودی یا نصرانی کو دوزخ میں داخل نہ کرتا ہو حضرت عمر ابن عبدالعزیزؒ نے ابو بردہ کو تین مرتبہ اللہ کی قسم دے کر پوچھا کیا واقعی تیرے والد نے یہ حدیث بیان کی ہے ابو بردہ نے قسم کھا کر بتلایا کہ ہاں واقعی میرے والد نے یہ حدیث مجھ سے بیان کی ہے (مسلم)۔ روایت ہے کہ ایک لڑکا کسی غزوے میں کھڑا تھا' اور اس پر بولی لگائی جارہی تھی' وہ دن نہایت گرم تھا' اچانک لوگوں کے خیموں میں سے ایک عورت نظر آئی اور وہ دوڑتی ہوئی وہاں پہنچی جہاں بچہ کھڑا ہوا تھا' اس کے پیچھے اسکے ساتھی آئے' اس عورت نے بچے کو اٹھا کر اپنے سینے سے لگایا' پھر خود پتھریلی زمین پر لیٹ گئی' اور بچے کو گرمی سے بچانے کے لئے اپنے سینے سے لگایا' اور کہنے لگی میرا بیٹا' میرا بیٹا' لوگ یہ دیکھ کر رونے لگے' اور ماں بیٹے کو اس حال میں چھوڑ کر ہٹ گئے' اتنے میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے' اور وہاں کھڑے ہو گئے' لوگوں نے آپ کو واقعے کی خبر دی آپ کو انکی رحمدلی سے خوشی ہوئی' پھر انھیں خوشخبری سنائی اور فرمایا کہ کیا تمھیں اس عورت کے اپنے بچے پر رحم کرنے سے تعجب ہوا' لوگوں نے عرض کیا جی ہاں' فرمایا اللہ تعالیٰ تم سب کے ساتھ اس عورت سے کہیں زیادہ رحیم و مہربان ہے' مسلمان انتہائی خوشی' اور زبردست بشارت کے ساتھ جدا ہوئے (بخاری و مسلم مختصراً۔ عمر ابن الخطابؓ)۔

یہ روایات اور کتاب الرجاء میں ہم نے جو کچھ بیان کیا ہے اس سے ہمیں اللہ تعالیٰ کی وسیع تر رحمت کی بشارت ملتی ہے' ہم اللہ تعالیٰ سے امید کرتے ہیں کہ وہ ہمارے ساتھ ایسا معاملہ نہیں فرمائیگا جس کے ہم مستحق ہیں' بلکہ اپنے کرم' فضل' رحمت اور احسان سے وہ معاملہ فرمائے گا جو اسکے شایان شان ہے۔

تمام شد